5

مرقاة المفاتيح

شرح اردو

مشکوٰة المصابیح

للعلامه الشیخ القاری علی بن سلطان محمد القاری

مترجم: مولانا راؤ محمد ندیم

www.KitaboSunnat.com

مكتبة رحمانية

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی وشرعی جرم ہے۔

«اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں»

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

مرقاۃ المفاتیح اردو

للعلامۃ الشیخ القاری علی بن سلطان محمد القاری ھجری ۱۰۱۴

شرح

مشکوٰۃ المصابیح

للامام العلامۃ محمد بن عبداللہ الخطیب التبریزی المتوفی ۷۴۱

مترجم: مولانا راؤ محمد ندیم

جلد پنجم

www.KitaboSunnat.com

مکتبہ رحمانیہ
اقرأ سنٹر، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور
فون: 042-37224228-37355743
MAKTABA-E-REHMANIA

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جملہ حقوق ملکیت بحق ناشر محفوظ ہیں

MAKTABA-E-REHMANIA

مکتبہ رحمانیہ

نام کتاب: .... مرقاۃ المفاتیح اُردو (جلد پنجم)

مترجم: .... مولانا راؤ محمد ندیم

ناشر: .... مکتبہ رحمانیہ

مطبع: .... لٹل سٹار پرنٹرز لاہور

استدعا

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کتابت، طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری پوری احتیاط کی گئی ہے۔

بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی نظر آئے یا صفحات درست نہ ہوں تو ازراہ کرم مطلع فرما دیں۔ ان شاء اللہ ازالہ کیا جائے گا۔ نشاندہی کے لیے ہم بے حد شکر گزار ہوں گے۔ (ادارہ)

فہرست

الموضوع

الموضوع

كِتَابُ فَضَائِلُ الْقُرْاٰنِ

فضائلِ قرآن کا بیان

عمومی طور پر (اور) بعض سورتیں وآیات خصوصاً (مراد) ہیں۔فضیلت سے مراد کسی چیز کو دوسری چیز پر برتری دینا۔کہا جاتا ہے: ''لفلان فضیلة'' یعنی اچھی خصلت۔طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: اس کا اکثر استعمال صفت محمودہ پر ہوتا ہے جس طرح فضول کا استعمال اکثر مذموم اوصاف پر ہوتا ہے۔فضیلت فعل لازم کی صفت ہوتی ہے اور فاضلۃ متعدی کی صفت ہوتی ہے۔کبھی کبھی فضیلت علوم میں استعمال ہوتی ہے، اور فاضلہ اخلاق کے لئے استعمال ہوتی ہے۔

سیوطی رحمۃ اللہ علیہ ''الاتقان'' میں فرماتے ہیں: لوگوں میں اختلاف ہے کہ قرآن میں کوئی چیز دوسری چیز سے افضل ہے۔امام ابوحسن اشعری، ابوبکر باقلانی اور ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے منع کیا ہے چونکہ سارے کا سارا اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، چونکہ بعض کو بعض پر فضیلت دینے سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ فضیلت والے سے دوسرے کی فضیلت میں نقص ہے۔یہی قول امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔ دوسرے جمہور ہیں جو احادیث کے ظواہر سے فضیلت کو قبول کرتے ہیں۔قرطبی کہتے ہیں: صحیح بات یہی ہے۔ابن حصار کہتے ہیں: ان پر تعجب ہے، جو ان وارد نصوص پر اختلاف کرتے ہیں، جن میں تفضیل (فضیلت) بیان ہوئی ہے۔

غزالی رحمۃ اللہ علیہ ''جواہر القرآن'' میں کہتے ہیں: شاید آپ کہیں کہ میں نے قرآن کی بعض آیات کو بعض پر فضیلت دی ہے۔کلام تو اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔تو بعض بعض سے کیسے اشرف ہوسکتا ہے؟ آپ جان لیں کہ بصیرت کی روشنی وہ تیری راہنمائی نہیں کرے گی کہ آیت الکرسی اور آیت مداینات میں کیا فرق ہے؟ سورۃ الاخلاص اور سورۂ لہب میں کیا فرق ہے؟ آپ اپنے نفس کو فرق والے اعتقاد سے تقلید کے ساتھ روک سکتے ہیں۔وہ ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید جن پر یہ قرآن نازل کیا گیا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یٰسٓ قلب القرآن''، یٰسین قرآن کا دِل ہے۔سورۃ فاتحہ قرآن کی سورتوں سے افضل ہے۔آیت الکرسی قرآن کی آیات کی سردار ہے۔سورۃ الاخلاص ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔اس کے علاوہ بے شمار آیات ہیں، جن کو شمار نہیں کیا جاسکتا۔

پھر کہا گیا ہے کہ فضیلت والی زیادہ اُجر کی طرف لوٹتی ہے۔ثواب کا دوگنا ہونا، ان آیات کی وجہ سے ہے۔ان کی خشیت اور تدبر کی وجہ سے ہے۔ان کے بلند اوصاف کی وجہ سے جو وارد ہوئے ہیں، ان میں تفکر کی وجہ سے ہے۔ایک قول یہ ہے کہ بلکہ وہ بذات خود لفظ ہے جیسا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کو متضمن ہے: ﴿وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾ [البقرة:۱۶۳] آیت الکرسی، سورۂ حشر کی آخری آیات اور سورہ اخلاص اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور صفات پر دلالت کرتی ہیں۔یہ سورۂ لہب اور اس جیسی سورتوں میں نہیں ہے۔تفضیل معانی کی خوبصورتی

اور اس کی کثرت کی وجہ سے ہے۔ واللہ اعلم

پھر قرآن کا اطلاق کلام قدیم پر ہے، جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔ الفاظ اس کلام پر دلالت کرتے ہیں۔ یہاں دوسرا مراد ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اس معنی کے ساتھ وہ حادث ہے۔ ہمارے اور معتزلہ کے درمیان ''نفسی'' پر اختلاف ہے۔ انہوں نے اپنی ناقص عقلوں کی وجہ سے اس کی نفی کی ہے۔ وہ اس کو کلام نہیں لفظ کہتے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ پر محال ہے، اسی تعطیل پر ان کے اس قول کی بنیاد ہے: اللہ تعالیٰ کے متکلم ہونے سے مراد کہ اس نے بعض اجسام میں کلام کو پیدا کیا ہے۔ ہم نے جو کتاب وسنت میں وارد اسمائے شرعیہ ہیں ان سے عملاً اس کو ثابت کیا ہے۔ یہ تو لغت عرب سے بھی معلوم ہے، کہ کلام بذات خود یا اشتراک کے ساتھ حقیقی طور پر ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں دونوں معنی پر اطلاق ہے لفظی اور نفسی۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿مَا يَأْتِيهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ إِلَّا اسْتَمَعُوهُ وَهُمْ يَلْعَبُونَ﴾ [الانبیاء: ۲] ''ان کے پاس کوئی نصیحت ان کے پروردگار کی طرف سے نہیں آتی مگر وہ اُسے کھیلتے ہوئے سنتے ہیں'' ﴿وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوسٰى تَكْلِيمًا﴾ [النساء: ١٦٤] ''اور موسیٰ (علیہ السلام) سے تو خدا نے باتیں بھی کیں'' اور لفظ اللہ تعالیٰ پر محال ہے درخت کے لئے اس نے کلام کو مجازاً پیدا کیا ہے لیکن اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اس بات پر اعتماد ہے کہ قرآن قراءت کے معنی میں ہے۔ مصدر بمعنی مفعول ہے۔ یا قراءت سے فعلان کے وزن پر جمع کے معنی میں ہے، یہ معنی سورتوں کو جمع کرنے کے علوم کی اقسام کے لحاظ سے ہے، اور مہموز ہے۔ ابن کثیر کہتے ہیں: یہ نقل کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ شاطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ ؎

ونقل قرآن والقرآن دواؤنا

''قرآن کو نقل کیا گیا ہے اور یہ ہماری شفاء ہے''

یہ ان کے خلاف ہے جنہوں نے کہا: یہ ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملانا ہے اس لیے کہ آیات اور سورتیں قرآن میں ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی ہیں۔

امام شافعی رحمہ اللہ نے عجیب وغریب بات کہی ہے: قرآن کلام اللہ کا اسم علم ہے' یہ مہموز نہیں ہے، اور نہ ہی قراءت سے ماخوذ ہے۔ سیوطیؒ کہتے ہیں: کہ ہمارے ہاں پسندیدہ موقف وہی ہے اس مسئلہ میں جس پر امام شافعیؒ نے تصریح کر دی ہے۔ رہا ابن حجر رحمہ اللہ کا قول کہ امام شافعیؒ کا قول شاید زیادہ فصیح ہے تو زیادہ مشہور یہ ہے کہ یہ قول مردود ہے، کہ جمہور کے ہاں مہموز سے ہے، اور وہی مشہور ہے۔ ابن کثیر نے نقل کیا ہے کہ وہ ہمزہ کی طرف لوٹتا ہے، اسی پر بقیہ مشتقات اللہ تعالیٰ کے فرامین سے دلالت کرتے ہیں۔ ﴿اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ﴾ [العلق: ۳] ''پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے'' ﴿فَإِذَا قَرَأْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ﴾ [القیامۃ: ۱۸] ''جب ہم وحی پڑھا کریں تو تم اس کو سنا کرو اور پھر اس طرح پڑھا کرو'' اور اس جیسی اور بھی امثال ہیں۔

عرضِ مرتب......آدابِ تلاوت!

تلاوت کے آداب یہ ہیں: وضو کے ساتھ کرے اور اچھی جگہ متواضع اور قبلہ کی طرف منہ کر کے بیٹھے اور اپنے آپ کو حقیر سمجھے اور حضورِ دل کے ساتھ بیٹھے۔ اس طرح کہ وہ خدا تعالیٰ کے سامنے بیٹھا ہے دعا شروع کرے اور تعوذ اور تسمیہ کے ساتھ شروع کرے اور یہ جانے کہ میں خدا تعالیٰ کا کلام بغیر واسطے کے سن رہا ہوں آہستہ آہستہ تدبر' تفکر اور ترتیل کے ساتھ پڑھے اور وعدہ ورحمت کی آیات پر خوش دِل ہو کر دعا کرے اور اپنے لیے مغفرت ورحمت مانگے اور عذاب ووعید کی آیت پر پناہ مانگے۔

اور تنزیہ وتقدیس کی آیت پر تسبیح کہتے۔ یعنی جس آیت پر اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان ہو اس پر سبحان اللہ کہے اور پڑھنے کے درمیان

روئے اور اگر رونا نہ آئے تو بتکلّف غمگین ہو کر رونے والی صورت بنالے اور جلدی ختم کرنے کی کوشش نہ کرے اس لیے تھوڑا قرآن پاک پڑھنا۔ غور وفکر کے ساتھ زیادہ پڑھنے سے بہتر ہے جوان کو مذکورہ چیزوں سے خالی ہو اور زیادہ پڑھنے میں سوائے ختم کے کرے بلکہ ممنوع امر کا مرتکب ہونا لازم آتا ہے اور یہ جو اس زمانے میں رواج آیا ہے ایک دن میں ختم کرنے پر فخر کرتے ہیں۔ نہایت بری بات غفلت ونادانی ہے۔

اور بعض بزرگان سے جو زیادہ پڑھنے کے بارے میں آیا ہے وہ ان کی کرامت ہے دوسروں لوگوں کو ان کی پیروی کرنی اچھی بات نہیں ہے پس جس قدر ذوق وشوق اور حضور قلبی میسر ہو اس پر اکتفا کرے اور جس مجلس میں لوگ دوسرے کاموں میں مشغول ہوں وہاں تلاوت نہ کرے اگر اس کے علاوہ کوئی دوسری جگہ میسر نہ ہو تو نواشر پڑھے اور لوگ مستعد ہو کر سن رہے ہوں اور خاموش ہوں تو بلند آواز سے پڑھنا افضل ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ پڑھنے والا اور سننے والا اجر میں دونوں شریک ہوتے ہیں اور اسی طرح قرآن پاک کو دیکھ کر پڑھنا زبانی پڑھنے سے افضل ہے۔ اس لیے کہ اس میں آنکھیں اور اعضاء بھی عبادت میں مشغول ہوتے ہیں اور حضور قلبی زیادہ حاصل ہوتا ہے اور قرآن کریم رحل پر یا بلند چیز پر رکھ کر پڑھنا چاہیے۔ تاکہ تعظیم حاصل ہو جائے اور تلاوت کلام پاک کے دوران دُنیاوی باتوں اور کھانے پینے اور تمام کاموں سے رکا رہے اور اگر کوئی ضرورت پیش آئے تو قرآن کریم کو بند کر کے کرے۔

پھر اس کے بعد دوبارہ تعوذ (یعنی اعوذ باللہ پڑھ کر شروع کرے اور غلط پڑھنے سے پرہیز کرے اور ترتیل وتجوید کے ساتھ بلا تکلف کے پڑھے اور تلاوت کرتے وقت کسی کی تعظیم نہ کرے۔ مگر استاد عالم باعمل اور والدین کی قیام وتعظیم جائز ہے اور ختم قرآن لوگوں کے مجمع میں کرے اور اپنے محبّ اور اپنے رشتے داروں کو حاضر کرے اور دعا میں سب کو شامل کرے۔ کیونکہ قبولیت کا وقت ہوتا ہے اور تکیہ لگا کر اور لیٹ کر قرآن پاک پڑھنا جائز ہے لیکن افضل صورت یہی ہے کہ مودب بیٹھ کر پڑھے اور اسی طرح پڑھنا جائز ہے۔ اگر جنگل ہو تو پکار کر پڑھے۔ ورنہ چپکے سے پڑھے۔ ناپاک جگہ میں اور مکروہ جگہ میں جیسے حمام اور کمیلے اور کوڑے وغیرہ پڑھنا مکروہ ہے اور قرآن کی تقطیع بہت چھوٹی اور متفرق ٹکڑے ٹکڑے نہ کرے اور قرآن کریم کو اس لشکر میں نہ لے جائے کہ اس پر اعتماد امن پر نہ ہو اور دار الحرب میں نہ لے جائے؟ تاکہ کہیں کافروں کے ہاتھ نہ لگ جائے اور وہ اس کی بے حرمتی کریں اور قرآن کریم یاد کرنا اتنی مقدار میں جس سے نماز جائز ہو جائے فرض عین ہے اور تمام قرآن کا یاد کرنا فرض کفایہ ہے۔

سفر میں حفاظت کی خاطر مصحف کی خرجی (بیگ، زنبیل اور جھولا) میں رکھ کر اس پر سوار ہونا یا تکیہ کے نیچے رکھ کر سونا میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، جس مکان میں یا کمرہ میں مصحف رکھا ہو اس میں جماع کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ جب قرآن شروع ہو تو پہلے یہ دعاء پڑھے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَشْهَدُ اَنَّ كِتَابَكَ الْمُنَزَّلُ مِنْ عِنْدِكَ عَلٰى رَسُوْلِكَ مُحَمَّدِ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَاَتْبَاعِهٖ اَجْمَعِيْنَ وَكَلَامُكَ النَّاطِقُ عَلٰى لِسَانِ نَبِيِّكَ جَعَلْتَهٗ هَادِيًا مِنْكَ لِخَلْقِكَ وَحَبْلًا مُتَّصِلًا فِيْمَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ عِبَادِكَ اَللّٰهُمَّ فَاجْعَلْ نَظَرِيْ فِيْهِ عِبَادَةً وَقِرَاَتِيْ فِكْرًا وَفِكْرِيْ فِيْهِ اِعْتِبَارًا اِنَّكَ اَنْتَ الرَّئُوْفُ الرَّحِيْمُ رَبِّ اَعُوْذُبِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِيْنِ وَاَعُوْذُبِكَ رَبِّ اَنْ يَحْضُرُوْنَ.

''اے اللہ! میں گواہی دیتا ہوں کہ تیری یہ کتاب تیری طرف سے تیرے رسول پر اتاری گئی ہے جن کا نام محمد ابن عبداللہ ہے، رحمت ہو اللہ کی ان پر، ان کی اولاد پر، ان کے اصحاب پر اور ان کے تمام تابعداروں پر اور میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ تیرا

کلام ناطق ہے تیرے رسول کی زبان پر' اس کلام کو تو نے اپنی طرف سے اپنے مخلوق کے لئے ہدایت کرنے والا بنایا ہے اور اس کو اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان واسطہ متصل بنایا ہے لہٰذا اے اللہ! تو میری نظر کو اس میں عبادت گزار میری قراءت کو اس میں بافکر اور میرے فکر کو اس میں عبرت پذیر بنا' بلاشبہ تیری ذات بڑی مہربان ہے اور تو بڑا رحم کرنے والا ہے' اے میرے رب! میں شیاطین کے وسوسوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور اے میرے رب! میں اس بات سے تیری پناہ کا طلب گار ہوں کہ میرے پاس شیاطین آئیں۔''

اس دعا کے بعد قل اعوذ برب الناس الفلق اور قل اعوذ برب الناس پڑھئے اور پھر یہ دعا مانگئے:

اَللّٰهُمَّ بِالْحَقِّ اَنْزَلْتَهٗ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ اَللّٰهُمَّ عَظِّمْ رَغْبَتِیْ فِیْهِ وَاجْعَلْهُ نُوْرًا لِّبَصَرِیْ وَشِفَاءً لِّصَدْرِیْ وَذِهَابًا لِّهَمِّیْ وَحُزْنِیْ وَبَيِّضْ بِهٖ وَجْهِیْ وَارْزُقْنِیْ تِلَاوَتَهٗ وَفَهْمَ مَعَانِيْهِ بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ.

''اے اللہ! تو نے قرآن کو حق کے ساتھ اتارا اور یہ حق کے ساتھ اترا' اے اللہ! قرآن میں میری رغبت بڑی بنا' اسے میری آنکھوں کا نور' میرے سینے کیلئے شفاء اور میرے فکر وغم کے دور ہونے کا سبب بنا' اس کے ذریعہ میرے چہرہ کو روشن ومنور فرما اور اپنی رحمت کے صدقہ اے ارحم الراحمین! اس کی تلاوت مجھے نصیب کر اور اس کے معنی کی سمجھ مجھے عطا فرما۔''

ہر روز تلاوت کے بعد ہاتھ اٹھا کر یہ دعا پڑھئے:

اَللّٰهُمَّ اجْعَلِ الْقُرْاٰنَ لَنَا فِی الدُّنْيَا قَرِيْنًا وَفِی الْاٰخِرَةِ شَافِعًا وَفِی الْقَبْرِ مُوْنِسًا وَفِی الْقِيَامَةِ صَاحِبًا وَعَلَى الصِّرَاطِ نُوْرًا وَفِی الْجَنَّةِ رَفِيْقًا وَمِنَ النَّارِ سِتْرًا .

''اے اللہ! قرآن پاک کو میرے لئے دنیا میں ہم نشین' آخرت میں شافع' قبر میں غم خوار' قیامت میں مونس' پل صراط پر نور' جنت میں رفیق اور آگ سے پردہ بنا۔''

پھر آپ نے دینی اور دنیوی مقاصد وعزائم کے لئے جو بھی دعا چاہیں مانگیں انشاء اللہ آپ کی ہر درخواست مجیب الدعوات کی بارگاہ میں شرف قبولیت کے ساتھ نوازی جائے گی۔

اگر ایک شخص مشرق ومغرب کے درمیان میں سے کوئی حفظ کرے۔تو سب کے ذمے سے ساقط ہو جاتا ہے اور سورۃ فاتحہ کا یاد کرنا اور ایک سورۃ کا تمام مسلمانوں طرواجب ہے کذا فی الفتادہ الجنہ اور باقی قرآن پاک کا سیکھنا اور اس کے احکام کا سیکھنا اور اس کی سمجھ رکھنا نماز نفل سے اولیٰ ہے کذا فی الخانیۃ۔اگر سامنے قرآن (الماری میں) ہو تو پاؤں پھیلانا مکروہ نہیں ہے اور اگر قرآن پاک کھونٹی پر لٹکا ہوا ہو یا طاق میں رکھا ہو۔تو اس طرف پاؤں پھیلانا منع نہیں ہے اور خرجی میں رکھ کر سفر کرنا اور اس پر سوار ہونا یا سفر میں سر کے نیچے رکھنا حفاظت کے لیے کوئی مضائقہ نہیں ہے اور اگر قرآن پاک مکان میں رکھا ہوا ہو تو اس میں جماع کرنے میں مضائقہ نہیں ہے۔ کذا فی الخانیة

ابن مردویہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب قرآن شریف ختم کرتے تو کھڑے ہو کر یہ دعا فرماتے تھے اور بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کی ہے ابو ہریرہ سے کہ جو شخص قرآن پڑھے اور اپنے رب کی حمد بیان کرے اور نبی پر درود بھیجے اور اپنے رب سے بخشش مانگے اس نے خیر طلب کی درست ٹھکانے سے اور بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب قرآن کریم ختم فرماتے تو اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کرتے اس حال میں کہ وہ کھڑے ہوتے۔

فائدہ: جان لینا چاہیے کہ قرآن پاک کی تلاوت کی فضیلت تمام عبادتوں سے افضل ہے خصوصاً جب کہ نماز میں ہو۔اس کی فضیلت اور ثواب ایسا ہے جو تحریر میں آنا ناممکن ہے ہر حرف کے بدلے دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور نماز میں پچیس اور قرآن پاک کے پڑھنے سے خدا

کا قرب نصیب ہوتا ہے اور دلوں کو روشن کرتا اور قیامت موسفارش کرے گا اور جعل متین سے مراد قرآن کریم ہے اور مقصد اعلیٰ تلاوت سے یہ ہے کہ وہ تفکر کے باعث ہو اور تذکر کے یعنی امور دین کے یاد دلانے کے اور اس سے آخرت کی فکر نصیب ہوتی ہے اور تلاوت کلام کی کثرت کی وجہ سے احکام الٰہی یاد اور مستحضر ہوں تا کہ اس پر عمل کیا جائے اور عبرت پکڑی جائے نہ یہ کہ محض آواز وحرف کو آراستہ کر کے پڑھیں اور دل غافل رہے جو شخص قرآن پڑھے اور اس پر عمل نہ کرے تو قرآن اس کا دشمن ہوتا ہے چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے: رب قال للقرآن والقرآن یلعنه۔ ''یعنی بعض لوگ قرآن پڑھتے ہیں اور قرآن کریم لعنت کرتا ہے ان کو'' اور اس کا قرآن پڑھنا اس طرح حجت ہوگا' نعوذ باللہ منہ۔ اس کے بعد جاننا چاہیے تفکر وتذکر وافیھم معانی قرآن کریم کا استحضار آہستہ پڑھنے اور ترتیل اور حضور دل کے ساتھ پڑھنے سے حاصل ہوتا ہے اسی لیے قرآن کریم کو تجوید کے ساتھ پڑھنا لازمی ہے اور قرآن کریم کا تھوڑا پڑھنا مشروع ہے چنانچہ فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے قرآن کے حق کی ادائیگی کے لیے کافی ہے کہ وہ چالیس دن میں ختم کرے بلکہ ایک سال میں کافی ہے اور عبادت کے لیے بھی سات دن سے کم میں ختم نہیں کرنا چاہیے اور جس قدر اس سے زیادہ عرصہ میں ختم کرے افضل ہے اور جو شخص قرآن کے معانی وغیرہ نہ سمجھے اس کو بھی چاہیے کہ حضورِ دل سے شروع کرے اور ہمیشہ اپنے دل میں مشق کرے کہ یہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے اور اس کے احکام ہیں جو انہوں نے اپنے بندوں پر کیے ہیں ایسی عاجزی سے تشریف فرما ہو گویا کہ اللہ عزوجل کا کلام سماعت فرما رہا ہے۔

الفصل الاول:

لوگوں میں سے بہترین اشخاص قرآن سیکھنے اور سکھانے والے ہیں

۲۱۰۹: عَنْ عُثْمَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ خَيْرُكُمْ مَّنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۷۴/۹۔ حدیث رقم ۵۰۲۷۔ وابو داوٗد فی السنن ۱۴۷/۲ حدیث رقم ۱۴۵۲۔ والترمذی ۱۶۱/۵ حدیث رقم ۲۹۰۹۔ وابن ماجه ۷۶/۱ حدیث رقم ۲۱۱۔ والدارمی ۵۲۸/۲ حدیث رقم ۳۳۳۷۔ واحمد فی المسند ۵۷/۱۔

ترجمہ: ''حضرت عثمانؓ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔'' (بخاری)

تشریح: عن عثمان رضی اللہ عنه قال : قال رسول اللہ ﷺ خیرکم : یعنی قراء کی جماعت یا اے امت! تم میں سے افضل وہ ہے' جیسے کہ روایت میں ہے۔ من تعلم القرآن : ''یعنی جو اس کو سیکھے گا۔'' وعلمه ۔ یعنی اس کی تعلیم کا حق ادا کرے' اور اس سے صرف علوم شرعیہ کی فروعات واصول کا احاطہ ہوگا۔ اس کے ساتھ عوارفِ قرآنیہ اور معارفِ فوقانیہ حاصل ہوں گے۔ ایسا شخص اپنے نفس کے لحاظ سے کامل اور غیر کو مکمل کرنے والا ہوگا۔ یہ مؤمنین میں مطلقاً افضل ہے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مروی ہے کہ ''من علم وعمل وعلم یدعی فی الملکوت عظیمًا''۔ اس جنس میں اکمل فرد وہ صرف نبی ﷺ ہیں۔ پھر اس کے بعد درجہ بدرجہ اس کا ادنیٰ جو کتاب کا فقیہ ہے۔ واللہ اعلم۔

طیبی رحمۃ اللہ کہتے ہیں: لوگوں میں سیکھنے سکھانے کے اعتبار سے بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔ میرک رحمۃ اللہ کہتے ہیں: یعنی تم میں سے بہتر سیکھنے اور سکھانے کے اعتبار سے وہ ہے جس کے متعلق حدیث میں ہے۔ میں کہتا ہوں: تمام جو وارد ہوا ہے' وہ سیکھنے اور سکھانے میں داخل ہے۔ یہ وہم نہیں ہونا چاہئے کہ عمل ان دونوں سے خارج ہے۔ کیونکہ علم جب عمل کے لئے موجب نہیں ہوگا' تو شریعت

میں علم نہیں ہوگا۔اس بات پر اجماع ہے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی، وہ جاہل ہے۔امام احمد سے کہا گیا علم کب تک ہے اور عمل کیسے؟

انہوں نے کہا: ہم نے علم عمل کے ساتھ حاصل کیا۔پھر حدیث میں خطاب عام ہے صحابہ کے ساتھ خاص نہیں ہے اور اگر ان کے ساتھ خاص کیا گیا ہے تو ان کے علاوہ دوسرے بالاولیٰ اس طریق کے حقدار ہیں۔قرآن کا اطلاق اس کے کل اور بعض پر ہوتا ہے۔دوسرا معنی صحیح ہے یہاں اس اعتبار سے کہ جس نے اس کے سیکھنے اور سکھانے کو پایا' اگرچہ کوئی ایک آیت سیکھ لے، وہ اس سے بہتر ہے، جس نے وہ بھی نہیں سیکھی۔اس کے بہتر ہونے کی وجہ حدیث صحیح سے معلوم ہوتی ہے: "**من قرأ القرآن فقد أدرج النبوة بين جنبيه غير أنه لا يوحى اليه**".دوسری صحیح حدیث میں ہے: "**أهل القرآن هم أهل الله وخاصته**".حاصل کلام یہ ہے کہ بہترین کلام اللہ تعالیٰ کا ہے، تو نبیوں کے بعد بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھتے سکھلاتے ہیں۔لیکن ضروری ہے کہ تعلیم وتعلّم کو اخلاص کے ساتھ خاص کردیا جائے۔امام نوویؒ فتاویٰ میں کہتے ہیں: قرآن پاک سیکھنے اور سمجھنے کی جو مقدار فرض ہے، وہ فضیلت میں برابر ہے۔اس فقہ کے ساتھ جس کو سیکھنا ضروری ہے اور جو واجب پر زائد ہے، اس میں فقہ افضل ہے (یعنی سمجھنا)۔

اس بحث میں جو امام نوویؒ نے کہا ہے وہ محل نظر ہے قطع نظر اس کے کہ ان سے اس کا اطلاق درست نہیں ہوا۔چونکہ قرآن سیکھنے کی جو مقدار واجب ہے، وہ علم یقینی ہے، اور فقہ علم ظنی ہے۔تو دونوں فضیلت میں کیسے برابر ہیں۔فقہ افضل ہے اس لئے کہ قرآن کے معنی ہیں جو اس کے مقابل نہیں۔جی ہاں! اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن کے معنی کی معرفت اس کے لفظ کی معرفت سے افضل ہے۔واجب حقدار سے مراد مثال کے طور پر سورہ فاتحہ ہے ان کے مذہب کے مطابق یہ رکن ہے، اور فقہ سے رکوع کے رکن ہونے کی معرفت حاصل ہوتی ہے، یہ کسی بھی وجوہ سے برابر نہیں ہیں۔واللہ اعلم

قرآنِ پاک سیکھنے کی فضیلت

۲۱۱۰: وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَنَحْنُ فِي الصُّفَّةِ فَقَالَ اَيُّكُمْ يُحِبُّ اَنْ يَغْدُوَ كُلَّ يَوْمٍ اِلٰى بُطْحَانَ اَوِ الْعَقِيْقِ فَيَأْتِيَ بِنَا قَتَيْنِ كَوْمَا وَيْنِ فِيْ غَيْرِ اِثْمٍ وَلَا قَطْعِ رَحِمٍ فَقُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كُلُّنَا نُحِبُّ ذٰلِكَ فَقَالَ اَفَلَا يَغْدُوْا اَحَدُكُمْ اِلَى الْمَسْجِدِ فَيُعَلِّمُ اَوْ يَقْرَأُ اٰيَتَيْنِ مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّهٗ مِنْ نَاقَتَيْنِ وَثَلَاثٌ خَيْرٌ لَّهٗ مِنْ ثَلَاثٍ وَاَرْبَعٌ خَيْرٌ لَّهٗ مِنْ اَرْبَعٍ وَمِنْ اَعْدَادِهِنَّ مِنَ الْاِبِلِ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۵۵۲/۱ حدیث رقم (۲۵۱۔ ۸۰۳)۔ وابوداوٗد فی السنن ۱۴۹/۲ حدیث رقم ۱۴۵۶۔

ترجمہ: "حضرت عقبہ بن عامر سے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ باہر آئے تو ہم "صفہ" پر بیٹھے تھے' آپ ﷺ نے ہم سے فرمایا کہ تم میں سے کون یہ پسند کرتا ہے کہ وہ ہر روز بطحان یا عقیق کی طرف جائے اور وہاں سے بڑے کوہان والی دو اونٹنیاں بغیر کسی گناہ کے اور بغیر قطع رحمی کے لائے؟ ہم نے عرض کیا کہ "یارسول اللہ ﷺ! ہم سب اس بات کو پسند کرتے ہیں" آپ ﷺ نے فرمایا تم میں سے جو شخص مسجد میں جائے اور وہاں کتاب اللہ کی دو آیتیں کسی کو سکھائے یا خود پڑھے تو وہ اس کے لئے اس سے بدرجہا بہتر ہے' تین آیتیں اس کے لئے تین اونٹنیوں سے اور چار آیتیں اس کے لئے چار اونٹنیوں سے بہتر ہیں۔حاصل یہ کہ آیتوں کی تعداد اونٹنیوں کی تعداد سے بہتر ہے۔" (مسلم)

تشریح: **وعن عقبة بن عامر قال : خرج رسول الله ﷺ ونحن فی الصفة** : مختصر نہایہ میں ہے کہ اہل صفہ مہاجرین فقراء تھے جو مسجد کے سایہ میں بیٹھے تھے۔قاموس میں ہے: اہل صفہ اسلام کے مہمان تھے، جو آپ ﷺ کی مسجد کے چبوترے پر

رات گزارتے تھے۔ سیوطی نے بخاری پر جو حاشیہ لگایا ہے، اس میں ہے: ابونعیم نے ''حلیۃ الاولیاء'' میں ان کی تعداد سوشمار کی ہے۔ صفہ اس جگہ کا نام جو مسجد کے آخر میں تھی، وہ غریب لوگوں کے ٹھہرنے کے لئے تھی، جن کی کوئی جائے پناہ اور خاندان نہ تھا۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: یہ جگہ مسجد کے آخر میں تھی، جوان فقیر صحابہ کے لئے تھی، جن کا خاندان نہ تھا، ان کی تعداد بڑھتی بڑھتی دوسو تک پہنچ گئی تھی، ان کو جہاد میں بھیجا جاتا۔ وہ قرآن کی تعلیم سیکھتے' معرفت کے لئے ان کا نام صوفیہ تھا، چونکہ ان کے اوصاف اہل صفہ کے اوصاف سے ملتے جلتے تھے جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تھے۔

بعض کہتے ہیں: ان کا یہ نام صوف (اون) پہننے کی وجہ سے تھا، یا ان کے اسرار صاف ہونے کی وجہ سے یا ان کے معاملات پاک ہونے کی وجہ سے، چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے صف اول کے امیدوار تھے۔ یا پھر نیکیوں کی طرف لپکنے والے، اطاعت کے کاموں میں جلدی کرنے والے تھے، پھر کہا کہ جنہوں نے ان کی نسبت ''صفة'' یا صوف کی طرف کی ہے تو یہ ان کی ظاہری حالت سے تعبیر ہے، چونکہ یہ وہ لوگ تھے، جنہوں نے دنیا کو چھوڑ دیا اور اپنے وطن سے نکل گئے، اپنے خاندانوں کو چھوڑا، اپنے لئے بھوک برداشت کی، بیٹوں کو قربان کیا، عریاں ہونا پڑا، انہوں نے صرف اپنے ستر ڈھانپے اور تھوڑی سی خوراک ساتھ لی باقی دنیا کے سارے اسباب ترک کر دیے۔ وطن چھوڑنے کی وجہ سے ان کا نام غرباء اور کثرت سفر کی وجہ سے سیاحین ہے۔ کم کھانے کی وجہ سے جوعیہ، املاک چھوڑنے کی وجہ سے فقراء بالوں کے بنے ہوئے کھردرے اور اون کے کپڑے پہننے کی وجہ سے ان کا نام صوفیہ تھا۔ یہ تمام صفات اہل صفہ کی تھیں، جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تھے' وہ فقراء وغرباء اور مہاجرین تھے۔ وہ اپنے گھروں اور اموال سے نکل پڑے۔ ان کے اوصاف ابو ہریرہؓ اور فضالہ بن عبید نے بیان کیے ہیں۔ وہ بھوک سے گرے ہوتے تھے، لوگ ان کو مجنون سمجھتے تھے۔ ان کے لباس اُون کے تھے، جب ان کو پسینہ آتا یا بارش سے گیلے ہونے سے ''ضان'' (بھیڑ) کی بو آتی ہے۔

فقال أیکم یحب ان یغدو : صبح صبح جانا۔ یہ صبح صبح چلنے کا وقت ہوتا ہے۔ (**کل یوم الی بطحان** :''باء'' کے ضمہ کے ساتھ اور ''طاء'' کے سکون کے ساتھ مدینہ کی ایک وادی کا نام ہے۔ اس کی وسعت کی وجہ سے اس کا یہ نام ہے۔ ابن اثیر نے اس کو ''باء'' کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ (**و العقیق** :کہا گیا ہے کہ عقیق اصغر مراد ہے وہ مدینہ سے تین میل یا دو میل کے فاصلے پر ہے۔ دونوں کو خاص کیا گیا ہے چونکہ یہ ان جگہوں کے قریب ہیں، جہاں مدینہ میں اونٹ دوڑائے جاتے ہیں۔ ''أو' نوع کے لئے ہے لیکن جامع اصول میں ہے: **او قال الی العقیق**: یا عقیق کا کہنا، یہ راوی کے شک پر دلالت ہے۔ (**فیأتی بناقتین کوماوین** :تثنیہ ہے **کوماء** کی، ہمزہ کو واؤ میں بدل کر یہ اصل میں ''کوم'' علو کے معنی میں ہے، یعنی بڑی اونٹنیاں۔ یہ عربوں کا پسندیدہ مال ہے۔ اور جو ابن حجرؒ نے ذکر کیا ہے، کہ ان میں سے بعض کاف کے ضمہ کے ساتھ ہے، اس کی کوئی توجیہ ظاہر نہیں، گویا کہ ان کو وہم ہوا، جو مختصر نہایہ میں واقع ہے: ''**نحن یوم القیامة علی کوم**'' فتحہ کے ساتھ بلند جگہوں کو کہتے ہیں۔ اس کی واحد ''**کومة**'' ہے، اس سے ''**کومة من ذھب**'' ہے۔ **و من طعام**، یعنی ڈھیر۔ ان میں سے بعض نے ''کاف'' کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ کہا گیا ہے وہ ضمہ کے ساتھ اسم ہے ''کوم'' کا۔ فتحہ کے ساتھ اسم ایک دفعہ کے فعل کے لئے۔ ''**ناقة کوماء**' سے مراد وہ اونٹنی جس کی بلند کوہان ہو۔

فی غیر اثم : چوری اور غصب شدہ موجب اثم کا نام ثم مجازاً ہے۔ (**و لا قطع رحم** :اس میں جو واجب ہے۔ یہ تخصیص عموم کے بعد ہے اور فی سببیت کے لئے ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿لَمَسَّكُمْ فِيْ مَآ أَفَضْتُمْ﴾ [النور: ١٤]، ﴿لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ﴾ [یوسف : ٣٢] **فقلنا یا رسول اللہ کلنا نحب ذلك** : نون کے ساتھ، جامع اصول میں ہے **کلنا یحب ذلك**، ''یاء'' کے ساتھ۔ یہ ان کے اختیار کے منافی ہے۔ انہوں نے ایسی چیز کو اختیار کیا جس کا (فقط) آخرت میں اجر نہیں' اسی لئے ان کو فقراء اور مساکین پر لوٹایا جائے گا،

تا کہ وہ مسلمانوں کے لشکر کو تیار کریں۔ نبی ﷺ نے ان کو اسی وجہ سے بلند رتبہ دینے کا ارادہ کیا' ان کی نسبت اولیاء عظام کی طرف کرنا باعث تعجب ہے۔عیسیٰ علیہ السلام نے کہا: **يا طالب الدنيا لتبر تركك الدنيا أبر** .نبی ﷺ نے فرمایا: ''**لو أن رجلا في حجره دراهم يقسمها و آخر يذكر الله كان الذاكر لله افضل**''۔اس کو طبرانی نے روایت کیا ہے،ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے۔یہ بات ثابت ہے کہ صابر فقیر' غنی شاکر سے افضل ہے۔عالم' عابد سے بہتر ہے۔

جوابن حجرؒ نے کہا ہے کہ یہ اس کے برعکس نہیں (لیکن اجران کے لئے ہے) جو ورع اور زہد پر ہیں۔انہوں نے اس بات کو پسند کیا ہے۔میں اس سے زیادہ نہیں کہوں گا کہ یہ محبت زہد کے منافی نہیں ہے لیکن ورع سے افضل ہے اور دونوں کا جمع ہونا کفایت سے زیادہ ہے، یہ ظاہر سے معلوم ہوتا ہے۔

قال أفلا يغدو : یعنی ان کو چھوڑ کر صبح نہیں کروں گا۔ جو ابن حجرؒ نے عبارت مقدر نکالی ہے وہ عقل سے بہت دور ہے۔یعنی: **اذا كنتم كذلك أفلا يغدو**۔ (**أحدكم الى المسجد فيعلم** : تشدید کے ساتھ اور ایک صحیح نسخہ میں تخفیف کے ساتھ ہے۔**أو يقرأ** : رفع اور نصب کے ساتھ۔میرک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: کہ یہ کلمہ اس بات کا متحمل ہے کہ عرض ہو یا نفی' لیکن اس میں ''فاء'' عرض ہونے کے لئے مانع ہے، پھر کہا: یہ قول کہ ''**يعلم**'' اور ''**يقرأ**'' پہلے کی تقدیر پر منصوب ہیں اور دوسرے پر مرفوع ہیں۔میں کہتا ہوں: یہ دوسرے پر منصوب ہو سکتے ہیں کیونکہ وہ نفی کے جواب میں ہے۔پھر کہا: ''**يعلم**'' **تعليم** سے ہے،مشکوٰۃ کے اکثر نسخوں میں ہے۔

شرح میں ہے: جو جامع الاصول میں ہے وہ صحیح ہے: ''**يعلم**'' ''یاء'' کے فتحہ اور عین کے سکون کے ساتھ ہے۔أو، یہ راوی کی طرف سے شک ہے۔یہ اس وہم کو دفعہ کرنے کے لئے ہے، کہ یہ ''**تعليم**'' سے ہے۔''او'' نوع کے لئے ہو سکتا ہے۔جیسا کہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔**آيتين من كتاب الله** :اس میں دو فعلوں کا تنازع ہے۔**خير** :مبتداء محذوف کی خبر ہے وہ ''**هما**'' یا ''**الغدو**'' ہے۔

و ثلاثٌ :یعنی آیات۔(**خير له من ثلاث** :یعنی اونٹوں سے۔(**و أربع خير له من أربع و من أعدادهن** :عدد کی جمع۔(**من الاصل** : تعداد بیان کرنے کے لئے ہے۔ایک قول یہ بھی ہے کہ ''**من أعدادهن**'' کا متعلق ایک محذوف ہے،اس کی تقدیر یوں ہوگی: **و أكثر من أربع ايات خير من أعدادهن من الابل، فخمس آيات خير من خمس ابل**.اس پر باقی کو بھی قیاس کرلو۔یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا بھی احتمال ہے مراد دو آیتیں دو اونٹنیوں سے بہتر ہے۔اسی طرح اونٹوں کی گنتی، تین آیات تین اونٹوں سے بہتر ہے، اسی طرح اونٹوں کی گنتی ہے۔اسی طرح کا قول طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔

اوپر جو ذکر کیا گیا وہ اس قول کے متعلق ہے **و آيتين و ثلاث و أربع**، ان کی گنتی کا مجرور ہونا ان عددوں کی طرف لوٹتا ہے جو ان سے پہلے ہیں، اور مجرور ہیں، **ابل اعدادهن** سے بدل ہے، یا اس کے لئے بیان ہے: ''**آيتان خير من عدد كثير من الابل**'' اسی طرح تین اور چار آیات ہیں۔چونکہ قرآن پاک کی منفعت اور اس کا نفع بخلاف اونٹ کے دنیا و آخرت میں بہت زیادہ حاصل ہوتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ آپ ﷺ نے باقیات کی ترغیب دلائی ہے۔اور فانیات سے ڈرایا ہے،اس کو انہوں نے بات سمجھانے کے لئے تقریب اور تمثیل کے ساتھ ذکر کیا ہے، وگرنہ ساری دنیا اللہ تعالیٰ کی ایک آیت کے مقابلے میں حقیر ہے (یعنی آیت کی پہچان) یا اس کے بدلے جو بلند و بالا درجات ہیں، جو اُسے بطور ثواب ملیں گے۔

اس جیسی مثال ہمارے شیخ ابوحسن بکری کے ساتھ پیش آ چکی ہے۔واقعہ اس طرح ہے کہ ان کے بعض تاجر ساتھیوں نے جدہ بندرگاہ پر مکہ سے آتے ہوئے انہیں ڈھونڈا' یہ وہ دن تھے جب دوسرے ملکوں کے لوگ بحری سفروں سے آتے تھے۔ڈھونڈنے والے اس لیے ڈھونڈ رہے تھے تا کہ شیخ کے تشریف لانے سے ان کے تجارتی مال میں برکت ہو، اور شاید شیخ کی خدمت کرنے سے منافع کی مقدار بڑھ

جائے۔ شیخ نے انکار کیا، اور انہوں نے کچھ اہم معاملات کی وجہ سے نہ آنا چاہا۔ وہ ساتھی بات کو نہ سمجھے انہوں نے اپنی بات پر اصرار کیا۔ شیخ نے کہا: تمہارے اس سفر میں نفع کی کیا مقدار ہے؟ تم نے کیا نتیجہ اور اثر حاصل کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: احوال اور اموال کے مختلف ہونے کی وجہ سے نتیجہ بھی مختلف ہے۔ اکثر نفع ایک درہم سے دو درہم اور ایک سے دوگنا ہوا۔ شیخ نے مسکراتے ہوئے کہا: تم اتنے کم نفع کے لئے اتنی سخت محنت کرتے ہو، اور ہم حرم کی بدولت ملنے والی کئی گنا نیکیاں کیسے چھوڑ دیں؟ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ایک ہزار نیکیاں ایک کے بدلے ملتی ہیں، یہ فرمان اقدس جاری ہو چکا ہے ﴿قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ﴾ [البقرة : ٦٠] ''ہر انسان نے اپنے اپنے گھاٹ کو پہچان لیا ہے''۔ اور ان کی حالتیں مختلف ہیں؛ ﴿كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ﴾ [المؤمنون : ٥٣] ''اور ہر گروہ جو وہ اس کے پاس ہے اس پر خوش ہے۔'' اور لوگ غفلت میں ہیں، جب وہ فوت ہو جائیں گے، تب اس خوابِ غفلت سے بیدار ہوں گے۔

قرآنی آیات کی فضیلت

۲۱۱۱: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اِذَا رَجَعَ اِلٰى اَهْلِهٖ اَنْ يَجِدَ فِيْهِ ثَلَاثَ خَلِفَاتٍ عِظَامٍ سِمَانٍ قُلْنَا نَعَمْ قَالَ فَثَلَاثُ اٰيَاتٍ يَقْرَأُ بِهِنَّ اَحَدُكُمْ فِيْ صَلَاتِهٖ خَيْرٌ لَّهٗ مِنْ ثَلَاثِ خَلِفَاتٍ عِظَامٍ سِمَانٍ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ٥٥٢/١ حديث رقم (٢٥٠۔ ٨٠٢)۔ وابو ماجه فی السنن ١٢٤٣/٢ حديث رقم ٣٧٨٢۔ والدارمی ٥٢٣/٢ حديث رقم ٣٣١٤۔ واحمد فی المسند ٣٩٧/٢۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''تم میں سے کوئی شخص اس بات کو پسند کرتا ہے کہ جب وہ لوٹ کر گھر پہنچے تو وہاں تین حاملہ اور فربہ بڑی اونٹنیاں پائے؟'' ہم نے عرض کیا کہ ''جی ہاں'' آپ نے ارشاد فرمایا ''قرآن کی وہ تین آیتیں جو تم میں سے کوئی شخص اپنی نماز میں پڑھتا ہے تو وہ اس کے لئے تین حاملہ اور بڑی موٹی اونٹنیوں سے بہتر ہے۔''

تشریح: **وعن أبی هريرة قال : قال رسول الله ﷺ ايحب أحدكم اذا رجع الی اهله ان يجد فيه** : یعنی ان کے پاس لوٹنے میں۔ ایک قول ہے: اس کے رُاستے میں۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: اهل سے مراد ان کے محلوں میں۔ (**ثلاث خلفا** : **خلفة** کی جمع، فتحہ اور کسرہ کے ساتھ، عربوں میں کہاوت ہے: **خلفت الناقة**، یعنی اونٹنی حاملہ ہوگئی۔ (**عظام** : کمیت اور ہیئت میں۔ (**سبحان** : کیفیت اور حالت میں۔ (**قلنا، نعم** : یعنی طبیعت کے تقاضے کے مطابق۔ یا جس طرح شریعت کا حکم ہو' تاکہ وہ آخرت میں ذریعہ (نجات) بن جائے۔ (**قال** : یعنی جب تم یہ کہو، اور غفلت کرو، اس سے جو اولیٰ ہے۔ (**فثلاث آيات** : یعنی کہ تم جان لو! تین آیات کی قراءت تین خلفات (اونٹنیوں) سے بہتر ہے۔

ابن حجرؒ کہتے ہیں: اگر تم یہ پسند کرتے ہو، تو وہ تین آیات ہیں۔ اس کا عدم سبب مخفی نہیں، اسی لئے طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہنے میں تکلف کیا ہے کہ ''فا'' جو ''ثلاث'' میں ہے، یہ ایک محذوف شرط کی جزاء ہے، جو تم نے اپنے گمان سے معنی محبت کا مقرر کیا ہے جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔ پس تحقیق وہ صحیح ہے، اگر ان کے ساتھ فضیلت دی جائے، میں اس کو تمہارے لئے تین آیات کی قراءت سے ذکر کروں گا، کیونکہ یہ **الباقيات والصالحات** میں سے ہیں، باقی رہنے والی نیکیاں ہیں۔ (**يقرأبهن أحدكم** : طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: ''باء'' زائدہ ہے، یا **الصناق** کے لئے ہے۔

في صلاته : بیان اکمل اور افضلیت کو مقید کرنے کے لئے ہے۔ **(خير له من ثلاث خلفات عظام سمان۔** طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: نکرہ تعظیم اور تفخیم کے لئے ہے۔

اَٹک اَٹک کر پڑھنے والے کو دُہرا اَجر ملے گا

۲۱۱۲: وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اَلْمَاهِرُ بِالْقُرْاٰنِ مَعَ السَّفَرَةِ الْكِرَامِ الْبَرَرَةِ وَالَّذِىْ يَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ وَيَتَتَعْتَعُ فِيْهِ وَهُوَ عَلَيْهِ شَاقٌّ لَهُ اَجْرَانِ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه حديث رقم ٤٩٣٧۔ ومسلم في صحيحه ١٧٥/٥ حديث رقم ٢٩٠٤۔ وابن ماجه ١٢٤٢/٢ حديث رقم ٣٧٧٩۔ والدارمي ٥٣٧/٢ حديث رقم ٣٣٦٨۔ واحمد في المسند ٤٨/٦۔

ترجمہ: ''سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے' فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا'' ماہر قرآن ان فرشتوں کے ساتھ ہے جو لکھنے والے اور بزرگ و نیکوکار ہیں اور وہ شخص کہ جو قرآن کو اٹک اٹک کر پڑھتا ہے اور قرآن کی تلاوت اس کے لئے مشکل ہو تو اس کے لئے دوہرا ثواب ہے۔'' (بخاری و مسلم)

تشریح: **وعن عائشة رضي الله عنها قالت : قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم الماهر بالقرآن** : یعنی با کمال، ہوشیار، اس سے مراد اچھے طریقے سے حفظ یا عمدہ طریقے سے لفظوں کی ہے، یا دونوں مراد ہیں، یا پھر وہ مراد لیا جائے، جو ان دونوں سے عام ہو۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: اس سے مراد کامل حفظ جس میں وہ قراءت کو موقوف نہیں کرتا، اور نہ اس پر اس کی مشقت ہے۔

بعیر قراء کرام کا وصف یوں بیان کرتے ہیں: ہر وہ شخص جس نے پختگی سے قرآن پاک حفظ کیا، اس کے پڑھنے کا حق ادا کیا، اس کے الفاظ کو تجوید سے آراستہ کیا، اس کے آغاز اور اختتام کو جانا، اس کی قراءت کی روایت کو یاد کیا، اس کی وجہ اعراب اور لغت کو جانا اس کے مشتقات اور تصرفات کو سیکھا، ناسخ منسوخ میں رسوخ حاصل کیا، تغیر و تاویل کا ایک اچھا خاصا حصہ حاصل کیا، اور اپنی رائے سے بیان کرنے سے بچ گیا۔ عربی قیاسات سے دور رہا اور اس کام میں اُسے لمبا عرصہ بیت گیا۔ اس کا وقار عام ہو گیا، اور وہ عادل، بیدار مغز اور زہد و ورع والا تھا، دنیا سے منہ موڑ کر آخرت پر توجہ دینے والا، اللہ تعالیٰ کا قرب چاہنے والا۔ یہی وہ شخص ہے جو امام ہے، اس کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ اس پر اعتماد کیا جائے گا، اس کے اقوال قابل اقتداء اور افعال راہنما ہوں گے۔

مع السفرة : مافر کی جمع ہے، اس سے مراد رسول' جو لوگوں کی طرف اللہ تعالیٰ کے پیغامات کے ساتھ بھیجے گئے۔ ایک قول یہ ہے ''سفرہ'' سے مراد لکھنے والے فرشتے ہیں، یہ قول طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے۔

میرک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: **یعنی الکتبة**، یہ ''سَفَرَ'' سے ''سافر'' کی جمع ہے۔ اس کی اصل کشف ہے، چونکہ کتاب جو لکھا جاتا ہے، اس کو اچھی طرح بیان اور واضح کرتی ہے۔ اس سے کہا گیا ہے ''**للكتاب سفر**'' سین کے کسرہ کے ساتھ، چونکہ وہ حقائق کو کھول کر بیان کرتی ہے، اور اسے روشنی حاصل ہوتی ہے، اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جنہوں نے لوح محفوظ کو اٹھایا ہوا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿**بأيدي سفرة كرام بررة**﴾ [عبس : ١٥-١٦] ان کا یہ نام اس لئے، کہ وہ کتاب الٰہی کو انبیاء کی طرف منتقل کرتے ہیں۔ گویا کہ وہ اُسے حرف بحرف نقل کرتے تھے۔ ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: اس کا جامع معنی وحی کی حفاظت اور کتابوں کی امانت ہے۔ میرک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے مراد اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جنہوں نے سب سے پہلے قرآن کو لکھا۔ کہا گیا ہے: ''**سفرہ**'' سے مراد وہ فرشتے ہیں' جو بندوں کے نامۂ اعمال لکھتے ہیں یا پھر یہ سفار سے بمعنی اصلاح ہے۔ اِس وقت اس سے مراد فرشتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے احکامات لے کر نازل ہوتے ہیں، جن بندوں کو آفات اور نافرمانی سے بچانا اور ان کے دلوں میں خیر کا الہام وغیرہ کرنے جیسی مصلحتیں

شامل ہیں۔

قاضی عیاضؒ کہتے ہیں: اس بات کا احتمال ہے کہ اس کا فرشتوں کے ساتھ ہونے سے مراد آخرت میں فرشتوں کی رفاقت میں درجات ہوں گے، ان فرشتوں کی یہ بھی صفت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو اٹھانے والے ہوں گے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ ان کی طرح کام کرنے والے، ان (فرشتوں) کے طریقے پر چلنے والے جیسے وہ اس کی حفاظت کرتے ہیں، اور مؤمنوں کی طرف لوٹاتے ہیں، اور جو چیز ان پر............ ہو جائے وہ اس کو کھول کر بیان کر دیتے ہیں، اسی طرح ماہر ہوتا ہے۔ (**الکرام** :کریم کی جمع ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ مکرم ہیں اور اپنے مولا کے پاس مقرب ہیں، اور وہ معصیت ومخالفت کی گندگی سے اپنے آپ کو بچاتے ہیں۔ **البدرۃ** : ''بار'' کی جمع ہے، مراد نیکی کرنے والا۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: نیکی کے کاموں کو بجالانے والے اور یہ اطاعت ہے۔ یعنی آخرت میں فرشتوں کے ساتھ جن کا یہ وصف کہ جو اللہ تعالیٰ کی کتاب کو اٹھانے والے ان کے ساتھ درجات میں ہوں گے۔ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد وہ ان جیسا کام کرنے والے، حفاظت اور پہنچانے میں ان کے طریقے پر چلنے والے، یہ کام وہ مؤمنین کے لئے کرتے ہیں۔

والذی یقرأ القرآن ویتتعتع فیہ : یعنی متردد ہے، اور اس پر اس کی زبان اٹکتی ہے۔ وہ عدم مہارت کی وجہ سے قراءت میں رُکتا ہے، اس کے کلام میں لکنت ہے، مراد توقف ہے، اور زبان روانگی سے نہ چلے۔ **وھو** :یعنی قرآن کا حصول یا اس مین اُس کا متردد ہونا۔ **علیہ** :یعنی اس پڑھنے والے پر۔ **شاق** :یعنی اس کو شدید مشقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شاق جملہ حالیہ ہے۔ **لہ أجران** : قراءت کا اجر اور مشقت اُٹھانے کا اجر۔ اس قراءت کے حصول پر (پڑھنے) ابھارنا ہے۔ یہ معنی نہیں ہے کہ جو اٹک اٹک کر پڑھتا ہے اس کا اجر ماہر سے زیادہ ہے بلکہ ''**ماھر القرآن**'' افضل ہے اور اس کا اجر ''**مع السفرۃ**'' کے ساتھ زیادہ ہے۔ اس کے لئے بہت زیادہ اجر ہیں، اللہ کے مقرب فرشتوں یا انبیاء ورسل یا صحابہ کرامؓ کے طریقے پر چلنے کی بدولت ہے۔

چاروں ائمہ نے بھی اِسے روایت کیا ہے۔

حسد صرف دو چیزوں میں جائز ہے

۲۱۱۳:وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا حَسَدَ اِلَّا عَلٰی اِثْنَيْنِ رَجُلٌ اٰتَاهُ اللّٰهُ الْقُرْاٰنَ فَهُوَ يَقُوْمُ بِهٖ اٰنَآءَ اللَّيْلِ وَاٰنَاءَ النَّهَارِ وَرَجُلٌ اٰتَاهُ اللّٰهُ مَالًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ اٰنَاءَ اللَّيْلِ وَاٰنَاءَ النَّهَارِ ۔ (متفق علیہ)

اخرجہ ابخاری فی صحیحہ ۷۳/۹۔ حدیث رقم ۵۰۲۵ ومسلم فی صحیحہ ۵۵۸/۱ حدیث رقم (۲۶۶۔ ۸۱۵)۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا دو قسم کے آدمیوں پر حسد (جائز) ہے ایک تو وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کی نعمت عطا فرمائی اور وہ شخص دن رات اس قرآن میں مشغول رہتا ہے' اور دوسرا وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا ہو اور وہ اس کو رات دن خرچ کرتا ہو۔'' (بخاری ومسلم)

تشریح: **وعن ابن عمر قال : قال رسول اللہ ﷺ لا حسد** :یعنی کوئی رشک نہیں۔ (**علی اثنین** :ایک قول یہ ہے کہ اگر حسد جائز ہوتا' تو ان دو پر ہوتا۔ (**رجل** : بدل ہونے کی وجہ سے مجرور ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ان دونوں کی تقدیر کے ساتھ مرفوع ہے یا **فھما** یا **أحدھما** کے ساتھ۔ (**آتاہ اللہ القرآن** :یعنی اس پر احسان کیا، اس نے کما حقہ اس کو حفظ کیا۔ (**فھو یقوم بہ** :یعنی اس کی تلاوت، اور اچھی طرح حفظ کرنے کے ساتھ، اس کے اَحکام اور معانی یاد کرنے اور عمل کرنے کی وجہ سے، اس کے اوامر ونواہی ماننے کے ساتھ۔ یا اس کے ساتھ دعا مانگتا ہے، اور اُس کے آداب کا لحاظ رکھتا ہے۔ (**آناء اللیل و آناء النھار** : ان دونوں گھڑیوں میں۔ ''**أني**'' کی جمع ہے، کسرہ کے ساتھ بروزن ''**معی**''. **وانو** ، **وأني**، نون کے سکون کے ساتھ، اس کا معنی یہ ہے کہ وہ بہت وقت میں اس

سے غافل نہیں ہوتا ہے۔ (ور جل : دو وجھوں کے ساتھ۔ (آتاہ اللہ ما لا :یعنی رزق حلال۔ (فھو ینفق :یعنی خیر کے کاموں کے لئے۔ (آناء اللیل و آناء النھار :یعنی دونوں اوقات میں اعلانیہ اور پوشیدہ، شاید یہی نکتہ ہے کہ دونوں جگہوں پر "لیل "کو مقدم کیا ہے۔

میرک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: حسد کی دو قسمیں ہیں: حقیقی و مجازی۔ حقیقی یہ ہے کہ اپنے بھائی سے زوال نعمت کی خواہش کرنا۔ یہ نصوص صریحہ کے ساتھ حرام ہے اور مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے۔ جو مجازی ہے، وہ رشک ہے، یہ کہ جو غیر کے پاس نعمت ہے اس کا سوال کرنا، اپنے ساتھی سے ان نعمت کے زائل ہوئے بغیر۔ یعنی رشک ان دنیاوی امور میں مستحب ہے جو مباح ہیں، اگر وہ اطاعت والے ہوں، تو مستحب ہے، حدیث میں مراد یہ ہے کہ ان دو خصلتوں میں رشک جو قابل تعریف ہے جائز ہے یعنی ان دونوں اور جوان دونوں کے ہم مثل ہیں۔ اسی لئے مظہرؒ نے کہا: کسی کے لئے لائق نہیں کہ وہ اپنے بھائی کی طرح نعمت طلب کرے، مگر جس سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو، جیسے قرآن پاک کی تالوت، صدقۂ مال اور ان کے علاوہ جو نیکی کے دوسرے کام وغیرہ ہیں۔ یعنی بدنی عبادات اور مالی عبادات۔

۲۱۱۴: وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی الْاَشْعَرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَثَلُ الْمُؤْمِنِ الَّذِیْ یَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ مَثَلُ الْاُتْرُجَّةِ رِیْحُهَا طَیِّبٌ وَطَعْمُهَا طَیِّبٌ وَمَثَلُ الْمُؤْمِنِ الَّذِیْ لَا یَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ مَثَلُ التَّمْرَةِ لَا رِیْحَ لَهَا وَطَعْمُهَا حُلْوٌ وَمَثَلُ الْمُنَافِقِ الَّذِیْ لَا یَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ كَمَثَلِ الْحَنْظَلَةِ لَیْسَ لَهَا رِیْحٌ وَطَعْمُهَا مُرٌّ وَمَثَلُ الْمُنَافِقِ الَّذِیْ یَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ مَثَلُ الرَّیْحَانَةِ رِیْحُهَا طَیِّبٌ وَطَعْمُهَا مُرٌّ (متفق علیه) وَفِیْ رِوَایَةٍ اَلْمُؤْمِنُ الَّذِیْ یَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ وَیَعْمَلُ بِهٖ كَالْاُتْرُجَّةِ وَالْمُؤْمِنُ الَّذِیْ لَا یَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ وَیَعْمَلُ بِهٖ كَالتَّمْرَةِ.

اخرجه البخاری فی صحیحه ۵۵۵/۹ حدیث رقم ۵۴۲۷۔ ومسلم فی صحیحه ۵۴۹/۱ حدیث رقم (۲۴۳۔ ۷۹۷) وابوداؤد فی السنن ۱۶۶/۵ حدیث رقم ۴۸۲۹۔ واخرجه الترمذی ۱۳۸/۵ حدیث رقم ۲۸۶۵۔ والنسائی ۱۲۴/۸ حدیث رقم ۵۰۲۸۔ وابن ماجه ۷۷/۱ حدیث رقم ۲۱۴۔ والدارمی ۵۳۵/۲ حدیث رقم ۳۳۶۳۔ واحمد فی المسند ۳۹۷/۴۔

ترجمہ: ''حضرت ابوموسیٰؓ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''جو مسلمان قرآن کریم پڑھتا ہے اس کی مثال سنگترے کی سی ہے کہ اسکی کی خوشبو بھی اچھی اور اس کا مزہ بھی اچھا اور جو مسلمان قرآن کریم نہیں پڑھتا اس کی مثال کھجور کی سی ہے کہ اس میں خوشبو نہیں ہوتی البتہ اس کا مزہ شیریں ہوتا ہے اور وہ منافق جو قرآن کریم نہیں پڑھتا اس کی مثال اندرائن کے پھل کی سی ہے جس میں خوشبو بھی نہیں اور ذائقہ بھی نہایت کڑوا ہے''۔ (بخاری و مسلم) ایک دوسری روایت میں یوں ہے کہ وہ مسلمان جو قرآن کریم پڑھتا بھی ہے اور اس پر عمل بھی کرتا ہے تو اس کی مثال سنگترے کی سی ہے اور وہ مسلمان جو قرآن پڑھتا تو نہیں مگر اس پر عمل کرتا ہے اس کی مثال کھجور کی سی ہے۔''

تشریح: وعن أبی موسی قال : قال رسول اللہ ﷺ : مثل المؤمن یقرأ القرآن : جس طرح اس کے شایان شان ہے۔ اس کو فعل مضارع کے ساتھ بار بار (مکرر) افادہ کے لئے تعبیر کیا گیا ہے تا کہ وہ اس پر ہمیشگی کرے، اور اس کی عادت اس شخص جیسی ہو جائے جو مہمان نوازی کرتا ہے، حرام سے بچتا ہے، اور یتیم کو دیتا ہے۔

مثل الا ترجة : ہمزہ کے ضمہ ''تاء'' کے سکون، راء کے ضمہ اور جیم کی تشدید کے ساتھ ہے۔ بخاری کی روایت میں نون ساکن اور راء وجیم کے درمیان تخیم ہے۔ قاموس میں ''الاترج الترجة'' بمعنی ترنج، ترنجة کے ہے (سنگترہ)، یہ ایک پھل ہے اور عربوں کے ہاں بہت پسندیدہ ہے اور یہ دیکھنے میں بہت خوبصورت ہے۔ صفراء فاقع لونها تسر الناظرین۔

ریحها طیب، وطعمها طیب : ابن الملکؒ کہتے ہیں: یہ مفید ہے، خوش بودار ہے، معدے کو صاف کرتا ہے، اور ہاضمے کو قوت

دیتا ہے۔کتب طب میں اس کے بہت زیادہ فوائد ذکر کیے گئے ہیں۔اسی طرح مؤمن قاری کی مثال ہے، جو باذوق ہوتا ہے اس لیے کہ اُس کے دل میں ایمان اور ہوتا ہے، لوگ اس کی قراءت سے استراحت پاتے ہیں، اور سننے کی وجہ سے ثواب کماتے ہیں، اور اس سے قرآن پاک سیکھتے ہیں۔(**مثل المؤمن الذی لا یقرأ القرآن مثل التمرة لا ریح لها وطعمها حلو، ومثل المنافق لا یقرأ القرآن کمثل الحنظلة لیس لها ریح وطعمها مر، ومثل المنافق الذی یقرأ القرآن مثل الریحانة ریحها طیب وطعمها مر** : طیبیؒ کہتے ہیں: حقیقت میں تمثیل کا وصف معنی معقول کے ساتھ موصوف ہے، اس کی پوشیدگی صرف محسوس مشاہد کی تصور کے ساتھ ظاہر ہوسکتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا کلام جس کی تاثیر بندے کے ظاہر و باطن پر ہے، بندے اس میں متفاوت ہیں۔ان میں سے بعض جن کے لیے اس تاثیر سے وافر حصہ ہے، وہ مؤمن قاری ہے۔بعض جن کے لئے کوئی حصہ نہیں، وہ حقیقی منافق ہے۔بعض کے لئے ظاہری تاثیر ہے باطنی نہیں جس کا مشاہدہ ہوسکتا ہے' یہ وہ مؤمن ہے جو اس کی قراءت نہیں کرتا۔ان معانی کا ظہور اور محسوسات کے ساتھ ان کا تصور ہے جو حدیث میں مذکور ہے، جو اس کی موافقت نہیں پاتا، وہ ملامت کے قریب ہے اور نہ وہ اس اجماع میں شامل ہے۔مشبہ اور مشبہ بہ کا وارد و حاصل کلام پر ہے۔

(۱) چونکہ لوگ یا تو مؤمن ہیں یا غیر مؤمن۔(۲) یا منافق ہیں یا ان سے ملحق ہے۔ پہلا طریقہ (مؤمن) یا تو اس کی قراءت پر ہیشگی کرتا ہے یا نہیں۔اسی پر مشبہ بہ کے نتیجے کو قیاس کرو۔

اور مذکورات میں وجہ شبہ دو محسوس امر میں متنازع ہے، وہ ہیں طعم و ریح اور وہ الگ الگ نہیں ہیں۔جیسا کہ امرؤ القیس کا شعر ہے:

کأن قلوب الطیر رطبا ویأبسا ☆ لدی وکرها العناب والحشف البالی

خشکی اور تری کے اعتبار سے پرندوں کے دل ان عنابوں اور لالی کھجوروں کی طرح ہیں جو ان کے گھونسلے کے پاس ہیں۔(**وفی روایة المؤمن الذی یقرأ القرآن ویعمل به کالأ ترجة** : کہا گیا ہے کہ اس گھر میں جن داخل نہیں ہوتا، جس میں سنگترہ ہو۔اس سے قاری قرآن کی مشابہت کی حقیقت اور بھی زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ابن رومی کہتے ہیں:

کل الخلال التی فیکم محاسنکم
تشابهت فیکم الأخلاق والحلق
کأنکم شجر الأترج طاب معًا
حملا ونورا وطاب العود والورق

''ہر وہ عادت جو تمہارے اندر اچھے اخلاق کا باعث ہو تو تمہاری عادات اور اخلاق میں کوئی فرق باقی نہ رہے گا۔گویا کہ تم سنگترے کے ایسے درخت ہو جو پھل میں اور روشنی میں بھی عمدہ ہے اور ٹہنیوں میں پتوں میں بھی عمدہ ہے۔''

(**والمؤمن الذی لا یقرأ القرآن ویعمل به کالتمرة**).

۲۱۱۵: وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ اَقْوَامًا وَيَضَعُ بِهٖ اٰخَرِيْنَ. (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۵۵۹/۱ حدیث رقم (۲۶۹ - ۸۱۷)۔ وابن ماجه ۹۷/۱ حدیث رقم ۲۱۸۔ والدارمی ۵۳۶/۲ حدیث رقم ۳۳۶۵۔

ترجمہ: ''حضرت عمر بن خطابؓ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا'' اللہ تعالیٰ کتنے لوگوں

کواس کتاب کی بدولت بلند کرتا ہے اور اس کی بدولت کتنے لوگوں کو پست کرتا ہے۔" (مسلم)

تشریح: وعن عمر بن الخطاب قال : قال رسول الله ﷺ : ان الله يرفع بهذا الكتاب :یعنی اس پر ایمان، اس کی عزت وتکریم اور عمل کرنے کی بدولت۔ کتاب سے مراد قرآن پاک جو اپنے شرف میں مکمل، دلیل کے ظہور میں بلیغ ہے، اس سے پہلے نازل شدہ آسمانی کتابوں جو رسل پر نازل ہوئیں، اس بلیغ کے درجہ کو نہیں پہنچیں۔ أقواما :یعنی دنیا اور آخرت میں لوگوں کے بہت زیادہ درجات ہیں، وہ دنیا میں انہیں حیاتِ طیبہ کے ساتھ نوازتا ہے، اور آخرت میں ان لوگوں کے ساتھ ملا دے گا جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنے انعام کیا ہے۔ (ويضع به آخرين :وہ لوگ جو اس کے برعکس اور خلاف ہیں وہ انہیں اکمل لوگوں میں سے اٹھا کر اسفل لوگوں میں کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿يضل به كثيرًا ويهدی به كثيرًا﴾ [البقرة :۲۶] اس کے محبت کرنے والوں کے لیے پانی ہے اور اس سے اعراض کرنے والوں کے لئے خون ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وننزل من القرآن ما هو شفاء ورحمة للمؤمنين ولا يزيد الظالمين الا خسارًا﴾ [الاسراء :۸۲]۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: جس نے اس کو پڑھا اور اُس پر عمل کیا خالص اللہ تعالیٰ کے لئے، اللہ تعالیٰ اس شخص کو اونچا کر دے گا۔ جس نے ریاکاری کے لئے پڑھا، اللہ تعالیٰ اُسے اسفل لوگوں میں کر دے گا۔

بغوی نے معالم میں اپنی اسناد کے ساتھ بیان کیا ہے کہ نافع بن حارث عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے (عسفان میں) ملے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مکہ والوں پر عامل مقرر کیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: تو نے اہل مکہ پر کس کو خلیفہ بنایا، اس نے کہا: ابن ابزی کو۔ پوچھا کون ابن ابزی؟ اس نے کہا ہمارے موالی میں سے ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: تو نے ان پر ایک مولیٰ (آزاد کردہ غلام) کو خلیفہ بنا دیا۔ اس نے جواب دیا: وہ آدمی قاری قرآن اور علم فرائض کا عالم اور قاضی ہے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہمارے نبی ﷺ کا فرمان ہے: "**ان الله تعالى يرفع بهذا القرآن أقواما ويضع به آخرين**".

فرشتوں کا قرآن سننا

۲۱۱۶:وَعَنْ اَبِیْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ اَنَّ اُسَيْدَ بْنَ حُضَيْرٍ قَالَ بَيْنَمَا هُوَ يَقْرَأُ بِاللَّيْلِ سُوْرَةَ الْبَقَرَةِ وَفَرَسُهٗ مَرْبُوْطَةٌ عِنْدَهٗ اِذَا جَالَتِ الْفَرَسُ فَسَكَتَ فَسَكَنَتْ فَقَرَاَ فَجَالَتْ فَسَكَتَ فَسَكَنَتْ ثُمَّ قَرَأَ فَجَالَتِ الْفَرَسُ فَانْصَرَفَ وَكَانَ ابْنُهٗ يَحْيٰى قَرِيْبًا مِّنْهَا فَاَشْفَقَ اَنْ تُصِيْبَهٗ وَلَمَّا اَخَّرَهٗ رَفَعَ رَأْسَهٗ اِلَى السَّمَاءِ فَاِذَا مِثْلُ الظُّلَّةِ فِيْهَا اَمْثَالُ الْمَصَابِيْحِ فَلَمَّا اَصْبَحَ حَدَّثَ النَّبِیَّ ﷺ فَقَالَ اِقْرَأْيَا ابْنَ حُضَيْرٍ قَالَ فَاَشْفَقْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَنْ تَطَأَ يَحْيٰى وَكَانَ مِنْهَا قَرِيْبًا فَانْصَرَفْتُ اِلَيْهِ وَرَفَعْتُ رَأْسِيَ اِلَى السَّمَاءِ فَاِذَا مِثْلُ الظُّلَّةِ فِيْهَا اَمْثَالُ الْمَصَابِيْحِ فَخَرَجْتُ حَتّٰى لَا اَرَاهَا قَالَ وَتَدْرِیْ مَا ذَاكَ قَالَ لَا قَالَ تِلْكَ الْمَلَائِكَةُ دَنَتْ بِصَوْتِكَ وَلَوْ قَرَأْتَ لَاَصْبَحَتْ يَنْظُرُ النَّاسُ اِلَيْهَا لَا تَتَوَارٰى مِنْهُمْ. متفق عليه وللفظ للبخاری وفی مسلم **عَرَجَتْ فِی الْجَوِّ بَدَلَ فَخَرَجْتُ عَلٰى صِيْغَةِ الْمُتَكَلِّمِ۔**

اخرجه البخاری فی صحیحه ٦٣/٩ حديث رقم ٥٠١٨۔ ومسلم فی صحیحه ٥٤٨/١ حديث رقم (٢٤٢۔ ٧٩٦)۔

ترجمہ: "حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ حضرت اسید ابن حضیر رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایت کرتے ہیں کہ وہ رات کو سورۂ بقرہ پڑھ رہے تھے ان کا گھوڑا ان کے قریب ہی بندھا تھا دفعتہً گھوڑا اچھل کود کرنے لگا چنانچہ انہوں نے پڑھنا بند کر دیا

گھوڑے نے بھی اچھل کود بند کر دی۔ پھر پڑھنا شروع کر دیا' گھوڑے نے پھر اچھل کود شروع کر دی وہ پھر رک گئے تو گھوڑا بھی رک گیا' پھر جب انہوں نے پڑھنا شروع کیا تو گھوڑے نے اچھل کود شروع کی انہیں احساس ہوا کہ گھوڑے کی اچھل کود یوں ہی نہیں ہے بلکہ اس کی خاص وجہ ہے چنانچہ انہوں نے پڑھنا موقوف کر دیا ان کا بچہ جس کا نام یحییٰ تھا گھوڑے کے قریب ہی تھا انہیں خوف ہوا کہ کہیں گھوڑا اس بچہ کو کوئی تکلیف نہ پہنچا دے جب انہوں نے بچہ کو وہاں سے ہٹایا اور اُن کی نظر آسمان کی طرف اٹھی تو اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ بادل کی مانند کوئی چیز ہے' جس میں تیز چراغ جل رہے ہیں۔ جب صبح ہوئی تو اسیدؓ نے یہ واقعہ نبی کریم ﷺ کے روبرو بیان کیا آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''ابن حضیر! تم پڑھتے رہتے'' اسید نے عرض کیا ''یارسول اللہ ﷺ! مجھے اس بات کا اندیشہ ہوا کہ کہیں گھوڑا یحییٰ کو نہ روند دے کیونکہ یحییٰ گھوڑے کے قریب ہی تھا' چنانچہ جب میں یحییٰ کی طرف پھرا اور اپنا سر آسمان کی طرف اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ کوئی چیز بادل کی مانند ہے جس میں چراغوں کی مثل کوئی چیز ہے پھر میں باہر نکلا مگر وہ مجھے پھر نظر نہیں آیا۔'' آپ ﷺ نے فرمایا ''جانتے ہو وہ کیا تھا؟'' انہوں نے کہا کہ ''نہیں! فرمایا ''وہ فرشتے تھے جو تمہاری قراءت کی آواز سننے کے لئے قریب آ گئے تھے اگر تم اسی طرح پڑھتے رہتے تو اسی طرح صبح ہو جاتی اور لوگ فرشتوں کو دیکھتے اور وہ فرشتے لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہوتے'' اس روایت کو بخاری و مسلم نے نقل کیا ہے مگر الفاظ بخاریؒ کے ہیں مسلمؒ کی روایت میں فخرجت کے بجائے عَرَجَتْ فِي الْجَوِّ (یعنی وہ چیز زمین و آسمان کے درمیان ہوا میں چڑھ گئی) کے الفاظ ہیں۔''

تشریح: **وعن أبی سعید الخدری، أن أسید بن حُضیر** : تصغیر کے ساتھ (دونوں تصغیر میں) اور ''حاء'' کے ساتھ۔ (**قال** : اپنے بارے میں بتا رہے ہیں۔ (**بینما هو** :یعنی اُسید۔ (**یقرأ من اللیل** :یعنی رات کی بعض گھڑیوں میں۔ (**سورة البقرة، وفرسه مربوطة عنده** : کہا گیا ہے: ''**مربوطة**'' میں تائے تانیث ''**دابة**'' کی وجہ سے ہے درست بات یہ ہے کہ ''**فرس**'' کا اطلاق مذکر اور مؤنث دونوں پر ہے۔ اسی طرح جوہری نے کہا ہے۔ اور جملہ حالیہ ہے۔ (**اذ** :ظرف ہے **یقرأ** کی وجہ سے۔ **جالت الفرس** : گھومنا پھرنا شروع ہوا مضطرب اور حیران و پریشان کی طرح جو کسی خوف سے ہو۔ **فسکت** :یعنی اُسید قراءت سے رک گئے، تا کہ اس کے اچھلنے کودنے کا سبب جان سکیں۔ **فسکنت** :یعنی گھوڑا، اس حرکت سے رک گیا۔ انہوں نے سمجھا شاید اُچھلنے کودنے کا سبب اتفاقی ہے۔ **فقرأ فجالت فسکت** :یعنی اسی طرح۔ (**فسکنت** :انہوں نے سمجھا کہ کوئی معاملہ ہے۔ **ثم قرأ** : پھر اُسیدؓ نے ارادہ کیا، کہ وہ معاملے کی حقیقت کو دیکھیں، کچھ دیر رکنے کے بعد پھر پڑھنا شروع کیا۔ **فجالت الفرس** :انہوں نے سمجھ لیا، کہ کوئی معاملہ ہے جس نے گھوڑے کو اس کی جگہ سے پریشان کر دیا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ گھوڑے نے اس وجہ سے حرکت کی کہ فرشتے قرآن پاک سننے کے لئے نازل ہو رہے تے وہ ان سے خوف کی وجہ سے ڈر رہا تھا۔ جب وہ آسمان کی طرف چڑھنا شروع کر دیتے تو وہ ساکن ہو جاتا، یا ان کی عدم ظہور کی وجہ سے یا گھوڑا تلاوت قرآن کی قراءت کے ذائقہ سے حرکت کرتا، جب اُسید رضی اللہ عنہ قراءت چھوڑ دیتے، تو وہ بھی یہ ذوق ختم ہونے کی وجہ سے اچھلنا کودنا چھوڑ دیتا۔ **فانصرف** :یعنی اُسیدؓ نماز یا قراءت سے فارغ ہوئے۔ **فأشفق** :یعنی اُسیدؓ ڈرے۔ **أن تصیبه** : اس کے اچھلنے کودنے کی وجہ سے اپنے بیٹے کے بارے میں ڈرے۔ وہ اپنے بیٹے کو گھوڑے سے دور ہٹانے کے لئے چلے۔ **ولما آخره** : یعنی اپنے بیٹے یحیٰ کو جو گھوڑے کے قریب تھا۔ **رفع رأسه الی السماء فاذا** : **هی**، مفاجات کے لئے ہے۔ **مثل انطلة** :ضمہ کے ساتھ جس کے ساتھ آدمی سورج اور بارش وغیرہ سے بچتا ہے۔ یعنی کوئی چیز بادل کی طرح زمین اور آسمان کے درمیان ان کے سر پر تھی۔ **فیها** : یعنی اس چھتری (سائبان) میں۔ **أمثال المصابیح** :نورانی لطیف اجسام۔ **فلما أصبح** :یعنی اُسیدؓ نے جب صبح کی۔ **حدث**

النبی ﷺ : وہ سارا قصہ بیان کیا جو انہوں نے دیکھا، اور گھبراہٹ ان پر طاری ہوئی۔ **فقال** :یعنی نبی ﷺ نے اس کی گھبراہٹ کو زائل کیا اور انہیں بلند چیز کے بارے میں بتلایا، اور ان کی طمانیت میں اضافہ کیا۔

اقرأ یا ابن حضیر اقرأ یا ابن حُضیر : دو مرتبہ کہا، تین مرتبہ نہیں جو کہ ابن حجرؒ کی شرح میں تاکید کے لئے ہے، اُس پر دلیل ہے۔ انہوں نے قراءت پر دوام یعنی اس عجیب حالت پر سمجھاتے ہوئے جس کا اس جیسا سبب ہو کہ وہ اس کو نہ چھوڑے، اگر مستقبل میں ایسا واقعہ ہو تو بلکہ اس حالت کو جاری رکھے، اور تلاوت قرآن سے مستفید ہو۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: لفظ ''اقرأ'' حال میں قراءت کے امر پر متقاضی ہے، اس کا معنی تخصیص کا ہے، اور زمانہ ماضی میں طلب میں اضافہ کرتا ہے، گویا کہ وہ جب اُسے وہ عجیب وغریب حالت دوبارہ ملے، تو آپ ﷺ نے اُس کو حکم دیتے ہوئے اس پر ترغیب دی ہے۔ گویا کہ آپ ﷺ نے کہا، تو اور زیادہ کیوں نہ کیا۔ اسی لئے اگلا قول ہے۔ **قال فأشفقت** :ایک نسخہ میں ''أشفقت''۔ **یا رسول اللّٰہ! أن تطأ**...... :یعنی میں ڈر گیا کہ اگر یہ اسی حالت میں رہا تو کہیں یحییٰ کو نہ روند دے، جو اُس کے قریب ہے۔ **وکان منھا قریباً فانصرفت** :یعنی قراءت سے۔ **الیہ** :یعنی یحییٰ پر رحم کرتے ہوئے۔ **ورفعت رأسی الی السماء، فاذا مثل الظلة فیھا أمثال المصابیح** : یہ اس حالت کرنے یا چھوڑنے کے لحاظ سے تھی۔ واللہ اعلم۔ جب اُس نے آپ ﷺ سے قصہ کا بیان شروع کیا اور قراءت کے وقت گھوڑے کا ہلنا جلنا جو تھا آپ ﷺ نے فرمایا: ''اقرأ'' یعنی قراءت میں اور اضافہ کر، تو اُسیدؓ نے ترک قراءت کا عذر بیان کیا۔ (**فخرجت** :یعنی اپنے گھر سے نکلا۔ (**حتی راھا** :یعنی اُس فزع (گھبراہٹ) کے بعد ان چراغوں کو۔

قال :یعنی نبی ﷺ۔ (**متدری ما ذاك** :یعنی تو جانتا ہے، کون سی چیز دیکھی ہے؟ **قال : لا قال تلك الملائكة دنت** :یعنی نازل ہوئے اور قریب ہوئے۔ (**لصوتك** :یعنی قراءت کے ساتھ۔ (**ولو قراء ت** :یعنی صبح تک۔ **لأصبحت**: یعنی فرشتے۔ **ینظر الناس الیھا لا تتواری منھم** :یعنی غائب نہ ہوتے، اور فرشتے لوگوں سے مخفی نہ رہتے۔ مذکورہ تشبیہ کی وجہ کہ فرشتوں نے سماع قرآن پر ازدحام کیا، گویا کہ وہ اسی طرح اس کے اور آسمان کے درمیان ہو گئے گویا کہ کوئی لٹکی ہوئی ہے۔ یہ مصابیح ان کے چہرے تھے۔ کوئی مانع نہیں کہ نورانی اجسام جب ازدحام (بھیڑ) کرتے ہیں، تو وہ سائبان کی طرح ہو جاتے ہیں۔ ایسے نہیں ان میں سے بعض کا چہرہ بعض سے روشن ہوتا ہے، جیسے ابن حجرؒ نے بیان کیا ہے۔

وفی مسلم عرجت :یعنی فرشتے اوپر چڑھے اور بلند ہو گئے، اُس قراءت کے انقطاع کی وجہ سے جس کو وہ سننے کے لئے نازل ہوئے تھے۔ **فی الجوّ** :جیم کے فتحہ واؤ کی تشدید کے ساتھ، یعنی زمین و آسمان کے درمیان ہوا میں۔ **بدل فخرجت** :یعنی اس کا کلمہ کی جگہ یہ لفظ۔ **علی صیغة المتكلم** :یعنی اس میں اور صیغہ غائب پر اُس میں۔

تلاوتِ قرآن سے سکینہ نازل ہوتی ہے

۲۱۱۷:وَعَنِ الْبَرَاءِ قَالَ كَانَ رَجُلٌ يَقْرَأُ سُوْرَةَ الْكَهْفِ وَاِلٰى جَانِبِهٖ حِصَانٌ مَرْبُوْطٌ بِشَطَنَيْنِ فَتَغَشَّتْهُ سَحَابَةٌ فَجَعَلَتْ تَدْنُوْ وَتَدْ نُوْ وَجَعَلَ فَرَسُهٗ يَنْفِرُ فَلَمَّا اَصْبَحَ اَتَى النَّبِيَّ ﷺ فَذَكَرَ ذٰلِكَ لَهٗ فَقَالَ تِلْكَ السَّكِيْنَةُ تَنَزَّلَتْ بِالْقُرْاٰنِ ۔ (متفق علیه)

باخرجه البخاری فی صحیحه ۵۷/۹۔ حدیث رقم ۵۰۱۱۔ ومسلم فی صحیحه ۵۴۷/۱ حدیث رقم (۲۴۰۔ ۷۹۵) والترمذی فی السنن ۱۴۸/۵ حدیث رقم ۲۷۷۵۔ واحمد فی المسند ۲۸۱/۴۔

ترجمہ: ''حضرت براءؓ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ ایک شخص سورۂ کہف کی تلاوت کر رہا تھا اس کی ایک جانب

میں اس کا گھوڑا دو رسیوں سے بندھا تھا کہ اسے ایک ابر کے ٹکڑے نے ڈھانک لیا وہ قریب سے قریب ہونے لگا یہاں تک کہ گھوڑے نے اچھل کود شروع کی' جب صبح ہوئی تو وہ آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ماجرا کہہ سنایا' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''وہ سکینہ تھی جو قرآن پڑھنے کی وجہ سے نازل ہوئی تھی۔'' (بخاری و مسلم)

تشریح: وعن البراء قال : كان رجل يقرأ سورة الكهف والى جانبه : یعنی دائیں طرف یا بائیں طرف۔

(حصان : کسرہ کے ساتھ یہ اعلیٰ گھوڑا ہے، اور مذکر ہے یہ ''التحصن یا التحصین'' سے ہے۔ چونکہ وہ عرب اسے اپنے پانی بچانے کی بچاتے تھے وہ اعلیٰ گھوڑے پر سواری کرتے تھے، پھر اس کا استعمال کثرت سے ہونے لگا، یہاں تک کہ انہوں نے ہر مذکر گھوڑے کو یہ کہنا شروع کر دیا۔ یہ جملہ حالیہ ہے۔ (مربوط : یعنی وہ گھوڑا۔ (بشطنين : ''الشطن' دونوں فتحہ کے ساتھ لمبی اور سخت رسی، یہ اس گھوڑے کی قوت اور طاقت پر تعریف ہے۔ (فتغشته : یعنی آدمی۔ (سحابه : یعنی پردہ چھتری جیسے سر پر سائبان ہوتا ہے۔ (فجعلت : یعنی سائبان شروع ہوا۔ (تدنو : یعنی قریب تھوڑا سا۔

وتدنو : یعنی بلندی سے پستی کی طرف۔ (وجعل : یعنی شَرَعَ۔ (فرسه ينفر : ''فاء'' کے کسرہ کے ساتھ یہ ''نفور'' سے ہے یعنی وہ زیادہ مشابہ ہے، بخاری کی روایت میں ینقز ''قاف اور زاء'' کے ساتھ یعنی اس سے ڈرنے لگا۔ (فلما اصبح اتى النبى ﷺ فذكر ذلك له فقال تلك : یعنی وہ سائبان۔ (السكينة : یعنی سکون اور اطمینان، جس کی طرف دل اطمینان پکڑتا ہے اور رعب ختم ہو جاتا ہے۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: مؤمن کی طمانینت بڑھ جاتی ہے جب ان جیسی نشانیوں کا ظہور ہوتا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد رحمت ہے۔ ''قیل'' وقار مراد ہے۔ کہا گیا ہے کہ فرشتوں کی رحمت۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: فرشتے۔ اسی سے سکینت ہے جس کا نطق حضرت عمرؓ کی زبان سے ہے۔ (تنزلت : یعنی اس کا نزول ظاہر ہونا۔ (بالقرآن : یعنی اس کے سبب کی بدولت۔

۲۱۱۸: وَعَنْ اَبِىْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُعَلّٰى قَالَ كُنْتُ اُصَلِّى فِى الْمَسْجِدِ فَدَعَانِى النَّبِىُّ ﷺ فَلَمْ اُجِبْهُ ثُمَّ اَتَيْتُهٗ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّىْ كُنْتُ اُصَلِّىْ قَالَ اَلَمْ يَقُلِ اللّٰهُ اِسْتَجِيْبُوا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَا كُمْ ثُمَّ قَالَ اَلَا اُعَلِّمُكَ اَعْظَمَ سُوْرَةٍ فِى الْقُرْاٰنِ قَبْلَ اَنْ تَخْرُجَ مِنَ الْمَسْجِدِ فَاَخَذَ بِيَدِىْ فَلَمَّا اَرَدْ نَا اَنْ نَخْرُجَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّكَ قُلْتَ لَاُعَلِّمَنَّكَ اَعْظَمَ سُوْرَةٍ مِّنَ الْقُرْاٰنِ قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَا لَمِيْنَ هِىَ السَّبْعُ الْمَثَا نِىْ وَالْقُرْاٰنُ الْعَظِيْمُ الَّذِىْ اُوْتِيْتُهٗ . (رواه البخارى)

اخرجه البخارى فى صحيحه ٥٤/٩- حديث رقم ٥٠٠٦- والترمذى فى السنن ١٤٣/٥ حديث رقم ٢٨٧٥ والنسائى ١٣٩/٤ حديث رقم ٩١٣- واحمد فى المسند ٢١١/٤-

ترجمہ: ''حضرت سعید ابن معلیٰ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ میں مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلایا' اس وقت میں نے کوئی جواب نہ دیا' پھر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو عرض کیا کہ ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں نماز پڑھ رہا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ اللہ اور رسول کو جواب دو جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں بلائیں اور ان کے حکم کی اطاعت کرو؟'' پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تیرے مسجد سے نکلنے سے پہلے کیا میں تجھے قرآن کی ایک بڑی سورت نہ سکھلا دوں؟'' پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑا اور جب ہم مسجد سے نکلنے کو ہوئے تو میں نے عرض کیا کہ ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ کیا میں تمہیں قرآن کی ایک بڑی سورت نہ سکھلاؤں؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''وہ سورت الحمد للہ رب العالمین ہے وہ سات آیتیں ہیں جو بار بار پڑھی جاتی ہیں

اور وہ قرآن عظیم ہے جو مجھے عطا فرمایا گیا ہے"

تشریح: وعن أبي سعيد بن المعلى :لام مفتوحہ کی تشدید کے ساتھ۔ **(قال كنت اصلى فى المسجد** :ابن الملکؒ کہتے ہیں: ان کا قصہ اس طرح ہے کہ انہوں نے کہا میں ایک دن مسجد کے پاس سے گزرا اور رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ منبر پر تھے، میں نے سوچا کوئی نیا حکم ہے۔ میں بیٹھ گیا۔ رسول اللہؐ نے پڑھا ﴿**قد نرى تقلب وجهك فى السماء**﴾ [البقرة : ١٤٤] میں نے اپنے ساتھی سے کہا: او ہم رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے منبر سے اترنے سے پہلے پہلے دو رکعتیں اداء کریں۔ ہم پہلے تھے جنہوں نے نماز پڑھی، میں نماز پڑھ رہا تھا۔

فدعاني النبي ﷺ فلم أجبه : یہاں تک کہ میں نے نماز پڑھی، جیسا کہ دوسرے نسخہ میں ہے۔ **(ثم أتيته فقلت** :یعنی عذر پیش کرتے ہوئے۔ **(يا رسول الله! انى كنت اصلى قال الم يقل الله استجيبوا لله وللرسول اذا دعاكم)**[الانفال: ۲۴] ضمیر واحد لائی گئی اِس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی دعوت رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سے ہی سنی جاتی ہے۔ صاحب المدارک کہتے ہیں: استجابہ سے مراد اطاعت و فرمان برداری اور دعوت سے مراد نبوت اور لوگوں کو ترغیب دینا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ﴿**لما يحييكم**﴾ [الانفال: ۲۴] یعنی دین اور شریعت کے علوم، چونکہ علم زندگی ہے جیسا کہ جہالت موت ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

لا تعجبن الجهول حلته ☆ فذاك ميت وثوبه كفن

"تم جاہل آدمی کی میت کو دیکھ کر تعجب میں نہ پڑو، وہ خود مردہ ہے اور اس کا جوڑا اس کا کفن ہے۔"

طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: حدیث دلالت کرتی ہے کہ رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی بات کا جواب دینے سے نماز باطل نہیں ہوتی جیسا کہ آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کا یہ خطاب "**السلام عليك ايها النبى**" اس سے نماز باطل نہیں ہوتی۔

بیضاوی کہتے ہیں: اس میں اختلاف ہے۔ ایک قول ہے کہ آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کا بلانا نماز کو ختم نہیں کرتا، چونکہ نماز اسی طرح ایک قسم کی اجابۃ ہے۔ ایک یہ بھی ہے کہ آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کا بلانا حکم جس میں تاخیر کا احتمال نہیں ہے۔ نمازی کے لئے ضروری ہے کہ وہ نماز کو ختم کر دے، یہاں تک کہ اس کے مطابق حدیث کا ظاہر ہے۔ حدیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ پکار کا جواب مطلقاً واجب ہے آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے حق میں۔ جس طرح کہ آیت کے مطلق سے سمجھ آ رہا ہے۔ اس نماز کے بطلان اور نہ ہونے پر دلالت نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ بطلان ادلہ کی وجہ سے ہے۔ واللہ اعلم

ثم قال، الا اعلمك اعظم سورة : یعنی افضل۔ کہا گیا ہے کہ جو اجر میں بہت زیادہ ہو یہ پہلے قول کی طرح ہے۔ **(فى القرآن** : کہا گیا ہے کہ "سور" سے مراد وہ منزل جس کی بنیاد ہو، اسی سے قرآن کی "**سور**" ہیں، کیونکہ وہ منزل کے بعد منزل ہیں، اور ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔ بیضاویؒ نے کہا: یہ مترجم قرآن کی جماعت ہے، جس کی کم از کم تین آیات ہیں۔ اس کے اشتقاق میں وسعت ہے اور اس کی وضع کی حکمت کے بیان میں ہے۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس لیے کہ وہ اپنی قدر منزلت کے اعتبار سے بڑی سورت ہے، اور اس اکیلی کو اس سے خاص کیا ہے، دوسری سورتیں اس میں شامل نہیں ہیں۔ چونکہ بہت زیادہ فوائد اور معانی پر مشتمل ہے اور اس کے الفاظ میں اختصار ہے۔

کہا گیا ہے کہ تمام منازل اللہ تعالیٰ کے اس قول کے تحت گھومتی ہیں: ﴿**اياك نعبد و اياك نستعين**﴾ [الفاتحة : ۵]۔ بلکہ بعض عارفین نے کہا ہے کہ تمام پہلی کتابوں کو قرآن پاک میں جمع (خلاصہ) کیا گیا ہے، اور پورے قرآن کا خلاصہ سورۃ فاتحہ میں ہے، اور اس فاتحہ کا بسم اللہ میں۔ اور اس کا "باء" کی نقطہ میں۔ یہ تمام حقائق اور دقائق کو گھیرے ہوئے ہے۔ شاید کہ آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کا اشارہ نقطۂ توحید کی طرف ہے جس پر اہل حق کے چلنے کا مدار ہے۔ کہا گیا ہے: اس کا جمیع "باء" کے نیچے ہے۔ شاید اس کی وجہ کہ تمام علوم کا مقصد بندے

کا اپنے ربّ کی طرف پہنچنا ہے۔ یہ ''باء'' الصاق کے لئے ہے۔ یہ بندے کو اپنے ربّ سے ملاتی ہے اور یہ کمال درجے کا مقصود ہے۔ اس قول کو فخر رازی نے ذکر کیا ہے۔ اور ابن نقیب دونوں نے اپنی اپنی تفسیر میں۔ دونوں نے حضرت علیؓ سے بیان کیا ہے: **"انه قال : لو شئت او قر سبعين بعيرا من تفسير ام القرآن لفعلت"**. **(قبل أن تخرج** : یعنی تو۔ **(من المسجد** : وہ اس کو ابتداء میں جانتے تھے، یہ اس وجہ سے تھا کہ وہ اپنے ذہن کو اس طرف لگائیں، اور مکمل طور پر اس کی جانب متوجہ ہوں۔

فأخذ بيدى : صیغہ مفرد کے ساتھ۔ **(فلما أردنا أن نخرج قلت يا رسول الله انك قلت : لأعلمنك أعظم سورة من القرآن** : سورۃ الفاتحہ کا نام بڑی سورت اسی لئے رکھا گیا، چونکہ یہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کی ثناء کے ان کلمات پر مشتمل ہے، جو اس کی شایان شان ہیں۔ امر اور نہی کا حکم ہے۔ وعدے کا ذکر اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ذکر میں زیادہ بلیغ اور اشمل ہے۔ وعید کا ذکر جیسے ''یوم الدین'' سے دلالت ہے، یعنی جزاء بدلہ اور اسی طرح **"غير المغضوب"** اس نے اپنے آپ کو مفرد **"ملك"** اپنی بندگی وعبادت کے لئے ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے سے مدد مانگنے اور سوال کرنے کا کہا ہے۔ نیک اور بدبختوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان چیزوں پر مبنی جن پر تمام سورتیں مشتمل ہیں۔ قرآن پاک میں کوئی سورت ثواب میں اس جیسی نہیں۔ یہ کیفیت کے لحاظ سے بری ہے اگرچہ قرآن پاک میں کمیت (مقدار) کے لحاظ سے بڑی سورتیں بھی ہیں۔ **(الحمد لله)** [الفاتحہ : ۲] یعنی یہ سورۃ **الحمد** ہے۔ **(رب العالمين)** [الفاتحہ : ۲] اس میں بسملہ پر دلالت ہے یا نہیں؟ **هي السبع المثاني** : کہا گیا ہے لام عہد کے لئے ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ﴾ [الحجر : ۸۷] اس کا نام **"سبع"** اس لئے کہ یہ سات آیات پر مشتمل ہے، بالاتفاق۔ بعض آیات میں بصریوں اور کوفیوں میں اختلاف ہے۔ ایک قول ہے کہ اس میں سات آداب ہیں۔ ایک قول ہے: کہ یہ سات حرفوں سے خالی ہے: ''ثاء، جیم، خاء، زاء، شین، ظاء اور فاء''۔ اس قول کا رد یہ ہے کہ نام اس کے ساتھ رکھا جاتا ہے، جو چیز اس میں موجود ہو نہ کہ جو اس سے گم ہو۔ اس کا دفاع ممکن ہے کہ اس کا نام ضد کے ساتھ ہو، جیسے اسود کے لئے کافور ہے۔ ان میں سے کوئی بھی سات آیات کے منافی نہیں ہے۔ جیسا کہ دارقطنیؒ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے: مثانی نماز میں تکرار کی وجہ سے ہے جیسا کہ حضرت عمرؓ سے حسن سند کے ساتھ ہے انہوں نے کہ: **"السبع المثاني فاتحة الكتاب تثنى في كل ركعة"**. ایک قول ہے کہ دوسری سورتوں سے زیادہ پڑھی جاتی ہے، یا پھر ایک دفعہ مکہ میں نازل ہوئی اور دوسری مرتبہ مدینہ میں نازل ہوئی۔ یہ اس کی تعظیم اور اہتمام شان کی بدولت ہے۔ ایک قول ہے کہ یہ سورۃ اس امت کے لئے استثناء ہے۔ اس سے پہلے کسی امت پر نازل نہیں ہوئی۔ یا اس میں ثناء مفاعل ہے جو ثنیٰ کی جمع ہے جیسے **المحمدة** بمعنی **"حمد"** ہے یا **مثنية' مفعلة** کے وزن پر **الثنى** سے بمعنی **التثنية**، یا اسم مفعول ہے **التثنية** سے تکرار کے معنی میں۔ **(والقرآن العظيم** : **"سبع"** پر عطف ہے۔ صفت کا عطف صفت پر ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ عطف عام عطف خاص پر ہے۔ **(الذى اوتيته** : اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرف اشارہ ہے ﴿**ولقد أتيناك**﴾ : یا اس اعطاء کے ساتھ خاص کیا گیا ہے۔ اس میں دلیل ہے کہ قرآن کا اطلاق بعض پر جائز ہے۔

۲۱۱۹: وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا تَجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ مَقَابِرَ اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْفِرُ مِنَ الْبَيْتِ الَّذِىْ يُقْرَأُ فِيْهِ سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ۵۳۹/۱ حديث رقم (۲۱۲۔ ۷۸۰)۔ والترمذى فى السنن ۱۴۵/۵ حديث رقم ۲۸۷۷۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا'' اپنے گھروں کو مقبرے نہ بناؤ شیطان اس گھر سے بھاگ جاتا ہے جس میں سورۂ بقرہ پڑھی جاتی ہے۔'' (مسلم)

تشریح: وعن أبی هريرة قال : قال رسول الله ﷺ لا تجعلوا بيوتكم : ضمہ اور کسرہ کے ساتھ۔(مقابر :یعنی جو گھر ذکر اور نیکی کے کاموں سے خالی ہوں، وہ قبرستان کی طرح ہیں۔گویا کہ اس میں مردے رہتے ہیں، یا اس کے معنی ہے اپنے مردوں کو اس میں دفن نہ کرو۔ پہلا معنی زیادہ راجح ہے۔(ان الشيطان :استئناف تعلیل کی طرح ہے۔(ينفر :''فاء'' کے کسرہ کے ساتھ، وہ نکل کر بھاگتا ہے۔

من البيت الذی تقرأ فيه سورة البقرة : یعنی شیطان اور اس کے چیلے چانٹے اس سورت کی برکت سے اس گھر کے رہنے والوں سے ناامید ہو جاتے ہیں۔یا جوان گھر والوں میں سے دین کے لئے کوشش کرتا ہے، اور طلب یقین کے لئے کوشش کرتا ہے۔سورۃ البقرۃ کو اس کے ساتھ خاص کیا گیا ہے، چونکہ یہ سورۃ لمبی ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کے اسماء اور احکام کثرت کے ساتھ وارد ہیں۔اس سورت کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس میں سو امر، سو نواہی، سو حکم اور سو اخبار ہیں۔حدیث میں اس بات پر دلالت ہے کہ اس کو سورۃ البقرۃ کہنے کی کراہت نہیں، اور اس کے خلاف بھی دلیل ہے، جو یہ کہتا ہے کہ اس میں بقرۃ کا ذکر ہے، اِس لئے اس کا نام البقرۃ ہے۔

ترمذی اور نسائی نے ابو ہریرہؓ سے دوسری حدیث ان الفاظ سے بیان کی ہے:''ان الشيطان يفر من البيت الذی تقرأ فيه البقرة''.

سورۃ بقرہ اور آل عمران پڑھنے والوں کی لیے باعث برکت ہے

۲۱۲۰: وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ اِقْرَأُوا الْقُرْاٰنَ فَاِنَّهٗ يَأْتِیْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شَفِيْعًا لِاَصْحَابِهٖ اِقْرَأُوا الزَّاهْرَاوَيْنِ الْبَقَرَةَ وَسُوْرَةَ اٰلِ عِمْرَانَ فَاِنَّهُمَا تَاْتِيَانِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كَاَنَّهُمَا غَمَامَتَانِ اَوْ غَيَايَتَانِ اَوْفِرْقَانِ مِنْ طَيْرٍ صَوَافَّ تُحَاجَّانِ عَنْ اَصْحَابِهِمَا اِقْرَأُوْا سُوْرَةَ الْبَقَرَةِ فَاِنَّ اَخْذَهَا بَرَكَةٌ وَتَرْكَهَا حَسْرَةٌ وَلَا يَسْتَطِيْعُهَا الْبَطَلَةُ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ۵۵۳/۱ حديث رقم (۲۵۲۔ ۸۰۴)۔ واحمد فی المسند ۱۵٤/٤۔

ترجمہ: ''حضرت ابو امامہؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ''قرآن کریم پڑھا کرو کیونکہ وہ قیامت کے دن اپنے پڑھنے والوں کی سفارش کرے گا اور دو روشن سورتیں یعنی سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران' پڑھو کیونکہ یہ دونوں قیامت کے دن اس طرح ظاہر ہوں گی گویا کہ وہ ابر کی دو ٹکڑیاں ہیں یا وہ دو سیاہ بادل ہیں جن کے درمیان چمک ہے یا پرندوں کی صف باندھے ہوئے دو ٹکڑیاں ہیں اور وہ اپنے پڑھنے والوں کی طرف سے جھگڑیں گے' اور سورۂ بقرہ پڑھو کیونکہ (اس کے پڑھنے پر مداومت اس کے مفہوم و معانی میں غور و فکر اور) اس پر عمل کرنا برکت ہے اور اس کو ترک کرنا قیامت کے دن حسرت ہوگا اس کے پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کی طاقت وہی لوگ نہیں رکھتے جو اہل باطل اور کسل مند ہوتے ہیں۔'' (مسلم)

تشریح: وعن ابی امامة قال سمعت النبی ﷺ يقول : اقراء ة القرآن : یعنی اس کی قراءات کو غنیمت سمجھو اور اس کی تلاوت پر ہمیشگی کرو۔(فانه ياتی يوم القيامة شفيعاً : یعنی سفارش کرنے والا۔(لأصحابه : یعنی اس کے آداب کو قائم کرنے والے۔(اقرأوا : یعنی خصوصی طور پر۔(الزهراوين : الزهراء کی تثنیہ۔ أزهر کی تانیث۔شدید روشنی یعنی دونوں سورتیں ہدایت اور روشنی کے نور ہیں، اور ان دونوں کا بہت زیادہ اجر ہے۔گویا کہ ان دونوں کی نسبت اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسے ہے جیسے دو چاند ستاروں میں ہوں۔ایک قول یہ ہے کہ دونوں چاند کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے مشہور ہیں۔

البقرۃ وسورۃ آل عمران : بدل ہونے کی بناء پر منصوب ہیں یا ''أعنی'' کو مقدر مانیں گے، اور دونوں کو ردع دینا بھی جائز ہے۔ان دونوں کا نام زھراوین احکام شریعہ کی کثرت اور اللہ تعالیٰ کے اسمائے علیہ کی بناء پر ہے۔ دوسری میں سورت کا ذکر پہلی کے علاوہ یہ بتانے کے لئے کہ ہرایک کا جواز ہے۔(فانهما : یعنی ان دونوں کا ثواب جوان پر عمل کرے گا وہ اس ثواب کو پائے گا۔تأتيان : وہ دونوں حاضر ہوں گی۔(یوم القیامة کأنهما غمامتان : یعنی دو بدلیاں جو اپنے عامل کو گرمی کی جگہ پر بچائیں گی۔ایک قول ہے جو وضو کرتا ہے، وہ اس کی شدید کثافت کو مٹادے گا۔(أو غیایتان : دو ''یاء'' کے ساتھ، جوان دونوں میں کثافت کے قریب ہو، اور اپنے ساتھی کے قریب ہو جیسے بادشاہوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔اور اس سے سایہ اور وضو اکٹھا حاصل ہوتا ہے۔(او فرقان : ''فاء'' کے کسرہ کے ساتھ یعنی دو جماعتیں۔(من طیر : طائر کی جمع۔(صواف : صافة کی جمع، یہ وہ جماعت جو صف پر کھڑی ہوتی ہے، یا اپنے پروں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملائے ہوئے کھڑی ہوتی ہے۔ یہ پہلے دونوں اقوال سے زیادہ ظاہر ہے۔اس کی دنیا میں کوئی مثال نہیں سوائے اس کے جو سلیمان کا واقعہ ہے۔(أو : راوی کی طرف سے شک کا احتمال ہے، ان دونوں سورتوں کی تشبیہ میں اختیار ہے اولیٰ یہ ہے کہ دونوں کی تقسیم متواتر ہو۔چونکہ او رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہے نہ کہ راویوں کا تردد ہے۔راوی ایک راستے پر نہیں چلتے۔طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں : او، نوع بیان کرنے کے لئے ہے۔ پہلا وہ جوان دونوں کو پڑھا ہے اور معانی نہیں سمجھتا۔دوسرا وہ ہے جو پڑھتا ہے اور معانی بھی سمجھتا ہے۔تیسرا وہ ہے ان کے ساتھ دوسری تعلیم بھی ملاتا ہے۔تحاجان : یعنی دونوں سورتیں جھگڑا کر کے جہنم سے بچائیں گی، یا اپنے رب سے جھگڑا کریں گی۔

عن أصحابهما : یہ شفاعت میں مبالغہ سے کنایہ ہے۔(اقرأ وسورۃ البقرۃ : طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: عموم کے بعد تخصیص ہے۔ پہلے قراءت قرآن، پھر اس کے ساتھ شفاعت معلق ہے، پھر زھراوین کو خاص کیا گیا ہے۔ان دونوں پر نجات اور قیامت کے دن کی گرمی سے خلاصی کی بنیاد ہے۔اور تیسرا اکیلی بقرۃ اور اس پر تین امور کی بنیاد ہے جس نے کہا۔(فان اخذها : اس کی تلاوت پر ہیشگی، اس کے معانی پر تدبر اور جو کچھ اس میں ہے اُس پر عمل کرنے والا۔(برکة : یعنی بہت بڑا منافع۔(وترکها : نصب کے ساتھ اور رفع بھی جائز ہے۔یعنی اس کو چھوڑنا اور اس کی ہم مثل کو چھوڑنا۔(حرۃ : یعنی قیامت کے دن ندامت ہو گی جیسا کہ حدیث ہے: ''لیس یتحسر اهل الجنة الا علی ساعة مرت ولم یذکر والله فیها''۔ (ولا یستطیعها : مذکر اور مؤنث دونوں کے ساتھ۔یعنی اس کے حاصل کرنے پر قدرت نہ رکھتے تھے۔(البطلة : اس کے طول کی وجہ سے سستی کرتے ہیں۔ایک قول یہ ہے کہ جادوگر جو باطل ہوتے ہیں۔اس باطل فعل کی وجہ سے اس کا نام رکھا ہے، وہ اس کے اہل نہیں اور اس کی موافقت کرتے ہیں۔ممکن ہے کہا جائے اس کا معنی ہو کہ وہ اس کے ابطال پر قدرت نہ ہو یا جس کے ساتھی پر جادو ہے۔اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی وجہ سے ﴿وماهم بضارين به من احد الا باذن الله﴾ [البقرۃ : ۱۰۲]۔

۲۱۲۱:وَعَنِ النَّوَّاسِ بْنِ سَمْعَانَ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم یَقُوْلُ یُؤْتٰی بِالْقُرْاٰنِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَاَهْلُهُ الَّذِیْنَ کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ بِهٖ تَقْدُمُهٗ سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ وَاٰلِ عِمْرَانَ کَاَنَّهُمَا غَمَامَتَانِ اَوْ ظُلَّتَانِ سَوْدَاوَانِ بَیْنَهُمَا شَرْقٌ اَوْکَاَنَّهُمَا فِرْقَانِ مِنْ طَیْرٍ صَوَافَّ تُحَاجَّانِ عَنْ صَاحِبِهِمَا (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۱/۵۵۴ حدیث رقم (۲۵۳۔ ۸۰۵)۔ والترمذی فی السنن ۵/۱۴۷ حدیث رقم ۲۸۸۳ والدارمی ۲/۵۴۳ حدیث رقم ۳۳۹۱۔ واحمد فی المسند ۵/۳۶۱۔

ترجمہ: ''حضرت نواس ابن سمعانؓ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا

کہ قیامت کے دن قرآن لایا جائے گا اور ان لوگوں کو بھی جو قرآن پڑھتے تھے اور اس پر عمل کرتے تھے قرآن (اس شان سے آئے گا کہ اس) کے آگے دو سورتیں سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران ہوں گی' اس طرح گویا کہ وہ ابر کے دو ٹکڑے ہیں یا سیاہ بادل کے دوٹکڑے ہیں اور ان میں ایک چمک ہے' یا گویا دوٹکڑیاں صف بستہ پرندوں کی ہیں جو پڑھنے والوں کی طرف سے جھگڑیں گی۔'' (رواہ مسلم)

تشریح: **وعن النواس** : نون کے فتحہ اور واؤ کی تشدید کے ساتھ۔ (**ابن سمعان** :سین کے کسرہ اور فتحہ کے ساتھ۔ (**قال سمعت النبی ﷺ یقول یؤتی بالقرآن** : یعنی تصور ں غ. یا اس کا ثواب۔ (**یوم القیامة واهله** :قرآن پر عطف ہے۔ (**الذین کانوا یعملون به** : اس پر دلالت کہ جس نے قراءت (پڑھا) کی اور عمل نہ کیا، وہ اہل قرآن میں سے نہیں، نہ اس کی سفارش کرے گا۔ بلکہ قرآن ان پر حجت ہوگا۔ (**تقدمه** :یعنی اس کا اہل مقدم ہوگا یا قران۔ (**سورة البقرة و آل عمران** : جر کے ساتھ اور ایک قول: رفع کے ساتھ۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: **تقدمه** میں ضمیر قرآن کے لئے ہے یعنی ان دونوں کا ثواب قرآن کا ثواب ہے۔ ایک قول ہے کہ کل کو تصور لوگوں کے اعمال وزن کے اعتبار سے ہے۔ اس جیسی مثالوں پر ایمان لانا واجب ہے اگر چہ عقلیں اس سے عاجز ہوں۔ (**کأنهما عمامتان او ظلتان** : ظاء کے ضمہ کے ساتھ یعنی بدلیاں۔

سودوان : ان دونوں کی کثافت اور ان دونوں کا بعض کے ساتھ مل جانا، اور بادلوں میں مطلوب ہے۔ ایک قول ہے کہ ان دونوں کو سائبان بنایا گیا ہے تاکہ ان کا خوف اور زبردست محبت دلوں میں پیدا ہوجائے، چونکہ **ظلة** میں اکثر خوف ہوتا ہے۔ مظہر رحمہ اللہ کہتا ہے: اس کا احتمال ہے کہ ان دونوں کے پڑھنے سے قیامت کے دن سایہ ہوگا۔ **بینهما شرق** : شین کے فتحہ اور راء کے سکون کے ساتھ اور اس کے بعد قاف ہے۔ اور کبھی کبھی ''راء'' کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ پہلا قول مشہور ہے ضوء اور نور اشرق سے مراد سورج ہے یہ اس بات پر تنبیہ ہے کہ وہ دونوں کثافت کے ساتھ ان کی روشنی پردے میں نہیں ہوگی۔ ایک قول ہے کہ شرق سے مراد شق ہے۔ یعنی ان کے درمیان فاصلہ اور خلاء ہے جس طرح ان دونوں میں اور بسملہ میں قرآن میں ہے۔ ان کی ضوء سے مراد اس کی استغناء ہے اس قول کے ساتھ: ''**ظلتان عن بیان البینونة**'' ان کا نام **ظلتین** ہے، اور ان دونوں کے درمیان فاصلہ ہے۔ اگر کہا جائے **تبیان** کے لئے ہے، نہ کہ سائبان کے اوپر سائبان بلکہ وہ آپس میں آمنے سامنے ہوں گے، اس احتمال کے ساتھ کہ وہ دونوں دیکھنے میں متصل اور اعتبار کے لحاظ سے منفصل ہوں گے۔ (**او کانهما فرقان** :یعنی دوگروہ۔ (**من طیر صواف تحاجان عن صاحبهما**).

۲۱۲۲:وَعَنْ اُبَیِّ بْنِ کَعْبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یَا اَبَا الْمُنْذِرِ اَتَدْرِیْ اَیُّ اٰیَةٍ مِّنْ کِتَابِ اللّٰهِ تَعَالٰی مَعَکَ اَعْظَمُ قُلْتُ اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ یَا اَ بَا الْمُنْذِرِ اَ تَدْرِیْ اَیُّ اٰیَةٍ مِنْ کِتَابِ اللّٰهِ تَعَالٰی مَعَکَ اَعْظَمُ قُلْتُ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلاَّ هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ قَالَ فَضَرَبَ فِیْ صَدْرِیْ وَقَالَ لِیَهْنِکَ الْعِلْمُ یَا اَبَا الْمُنْذِرِ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۵۵۶/۱ حدیث رقم (۲۵۸۔ ۸۱۰)۔ وابوداوٗد فی السنن ۱۵۱/۲ حدیث رقم ۱۴۱۰۔ واحمد فی المسند ۱۴۲/۵۔

ترجمہ: ''حضرت ابی بن کعبؓ سے مروی ہے' فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''ابالمنذر! کیا تمہیں معلوم ہے کہ کتاب اللہ کی کون سی آیت تمہارے پاس سب سے عظیم ہے؟'' میں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہی سب سے زیادہ جاننے والے ہیں نبی کریم ﷺ نے پوچھا کہ ''ابوالمنذر! تم جانتے ہو کہ تمہارے پاس کتاب اللہ کی کون سی آیت سب سے عظیم ہے؟ میں نے کہا کہ: اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ حضرت ابی بن کعبؓ کہتے ہیں

کہ نبی کریم ﷺ نے اپنا دست مبارک میرے سینے پر مارااور فرمایا ابوالمنذ ر! خدا کرے تمہارا علم خوشگوار ہو۔'' (مسلم)

تشریح: وعن ابی بن کعب قال : قال رسول اللہ ﷺ یا أبا المنذر : فاعل کے صیغہ کے ساتھ۔ابی بن کعب کی کنیت ہے۔(أتدری ایُّ اٰیة :اسم استفہام لازم الاضافہ ہے۔اس کو مذکر اور مؤنث لانے میں اختیار ہے،اگر اس کی اضافت مؤنث کی طرف ہو۔(من کتاب اللہ تعالٰی معك :یعنی وہ تیرا ساتھی ہوگا۔طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ بیان کی جگہ پر ہے کہ جب وہ کتاب اللہ حفظ کرے گا۔کلمہ مع مصاحبت پر دلالت کرتا ہے۔اُسیدؓ نے آپ ﷺ کی زمانے میں ہی مکمل قرآن حفظ کر لیا تھا۔اسی طرح آپ ﷺ کے تین چچازاد بیٹوں نے۔(اعظم :اسحاق بن راہویہ وغیرہ نے کہا ہے۔یہ بہت زیادہ ثواب اور اجر کے معنی میں ہے۔اور یہی قول مختار ہے۔اسی طرح طیبی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔(قلت اللہ ورسوله أعلم : پہلے جواب کو مختار بنایا پھر اس کا جواب دیا۔اور آپ ﷺ سوال اور ''معاد''اس پر اپنے اس قول کے ساتھ بار بار کہا۔(قال یا أبا المنذر!تدری الی اٰیة من کتاب اللہ تعالٰی معك أعظم : یہ گمان ہے کہ آپ علیہ السلام کی مراد اس چیز کے متعلق پوچھنا ہے جو اُس کے پاس تھی،صحابی نے اپنے اس قول کے ساتھ یوں جواب دیا: (اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم) [البقرۃ : ۲۵۵] آیت الکرسی مکمل کی۔اسی طرح ابن حجرؒ کا قول ہے۔اولیٰ یہ ہے کہ پہلا ادب کے لئے تھا،دوسرا پوچھنے پر جواب تھا۔ادب اور اطاعت کو جمع کرنا یہ ارباب کمال کی عادت مبارکہ ہے۔

طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: آپ ﷺ کا صحابی سے سوال کرنا اُس کو سننے پر ابھارنا تھا،کبھی کبھی کسی کے علم اور فہم کی مقدار کو جانچنا مقصود ہوتا ہے۔پہلے آپ رضی اللہ عنہ نے ادب کی رعایت رکھی،جب دیکھا کہ وہ علم میں بے نیاز نہیں ہے،مقصود اُس کے پوشیدہ علم کو ظاہر کرنا تھا،پس جواب دیا۔ایک قول یہ ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم کا انکشاف ہوا،یا رسول اللہ ﷺ کی برکت کی بدولت جب اس نے معاملہ آپ ﷺ کی سپرد کیا اور سوالات پر حُسن ادب کو ملحوظ رکھا۔ایک قول یہ ہے کہ آیت الکرسی بہت عظیم آیت ہے،اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی توحید،تمجید اور تعظیم کو گھیرے ہوئے ہے۔اس میں اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات علیہ کا ذکر ہے۔اور اس میں ذکر معانی پر غور وفکر اور تدبر کرنا اللہ تعالیٰ کے تقرب کا ذریعہ ہے۔(قال :یعنی میرے باپ نے کہا۔(فضرب :یعنی نبی ﷺ نے۔(فی صدری :یعنی محبت کے ساتھ،اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے: ﴿واصلح لی فی ذریتی﴾ [الاحقاف :۱۵]یعنی اللہ تعالیٰ نے ان میں درستگی پیدا کردی،اور وہ ایسے ہوگئے جیسے شاعر کا قول ہے: ؎ یجرح فی عراقیبھا نصلی

اس حدیث میں اشارہ ہے کہ ان کا سینہ علم وحکمت سے بھر گیا۔وقال لیھنك العلم :ایک نسخہ میں ''نون'' کے بعد ہمزہ ہے اور تخفیف کی وجہ سے حذف کر دیا گیا تا کہ علم تیرے (سینے میں) لیے ودیعت ہو۔یا أبا المنذر : یقال ھنأنی الطعام لیھنأنی، وھنأت ای تھنئات به .ہر وہ معاملہ جو کسی مشقت کے بغیر مل جائے اس کو ''ھنئی'' کہتے ہیں۔یہ دعا علم میں آسانی اور رسوخ کے لئے ہے۔یہ اس صحابی کے بارے میں خبر ہے کہ وہ عالم تھے،اور یہی مقصود ہے۔اس لئے ابو منذر کا بہت بڑا اعزاز ظاہر ہوتا ہے۔

آیۃ الکرسی کی فضیلت

۲۱۲۳:وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ وَکَّلَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِحِفْظِ زَکَاةِ رَمَضَانَ فَاَتَانِیْ اٰتٍ فَجَعَلَ یَحْثُوْ مِنَ الطَّعَامِ فَاَخَذْتُهٗ وَقُلْتُ لَاَ رْفَعَنَّكَ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اِنِّیْ مُحْتَاجٌ وَعَلَیَّ عِیَالٌ وَلِیْ حَاجَةٌ شَدِیْدَةٌ قَالَ فَخَلَّیْتُ عَنْهُ فَاَصْبَحْتُ فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ یَا اَبَا هُرَیْرَةَ مَا فَعَلَ اَسِیْرُكَ الْبَارِحَةَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ شَکَا حَاجَةً شَدِیْدَةً وَعِیَالاً فَرَحِمْتُهٗ فَخَلَّیْتُ سَبِیْلَهٗ قَالَ اَمَا اِنَّهٗ قَدْ کَذَبَكَ وَسَیَعُوْدُ فَعَرَفْتُ اَنَّهٗ سَیَعُوْدُ

لِقَوْلِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اَنَّهٗ سَیَعُوْدُ فَرَصَدْتُّهٗ فَجَاءَ یَحْثُوْ مِنَ الطَّعَامِ فَاَخَذْتُهٗ فَقُلْتُ لَاَرْفَعَنَّكَ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ دَعْنِیْ فَاِنِّیْ مُحْتَاجٌ وَعَلَیَّ عِیَالٌ لَا اَعُوْدُ فَرَحِمْتُهٗ فَخَلَّیْتُ سَبِیْلَهٗ فَاَصْبَحْتُ فَقَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یَا اَبَا هُرَیْرَةَ مَا فَعَلَ اَسِیْرُكَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ شَكَا حَاجَةً شَدِیْدَةً وَعِیَالاً فَرَحِمْتُهٗ فَخَلَّیْتُ سَبِیْلَهٗ فَقَالَ اَمَا اِنَّهٗ قَدْ كَذَبَكَ وَسَیَعُوْدُ فَرَصَدْتُّهٗ فَجَاءَ یَحْثُوْ مِنَ الطَّعَامِ فَاَخَذْتُهٗ فَقُلْتُ لَاَرْفَعَنَّكَ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَهٰذَا اٰخِرُ ثَلَاثِ مَرَّاتٍ اِنَّكَ تَزْعَمُ لَا تَعُوْدُ ثُمَّ تَعُوْدُ قَالَ دَعْنِیْ اُعَلِّمْكَ كَلِمَاتٍ یَنْفَعُكَ اللّٰهُ بِهَا اِذَا اَوَیْتَ اِلٰی فِرَاشِكَ فَاقْرَأْ اٰیَةَ الْكُرْسِیِّ اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ حَتّٰی تَخْتِمَ الْاٰیَةَ فَاِنَّكَ لَنْ یَزَالَ عَلَیْكَ مِنَ اللّٰهِ حَافِظٌ وَلَا یَقْرَبُكَ شَیْطَانٌ حَتّٰی تُصْبِحَ فَخَلَّیْتُ سَبِیْلَهٗ فَاَصْبَحْتُ فَقَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا فَعَلَ اَسِیْرُكَ قُلْتُ زَعَمَ اَنَّهٗ یُعَلِّمُنِیْ كَلِمَاتٍ یَّنْفَعُنِیَ اللّٰهُ بِهَا قَالَ اَمَا اِنَّهٗ صَدَقَكَ وَهُوَ كَذُوْبٌ وَتَعْلَمُ مَنْ تُخَاطِبُ مُنْذُ ثَلَاثِ لَیَالٍ قُلْتُ لَا قَالَ ذَاكَ شَیْطَانٌ۔

(رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤٨٧/٤ حدیث رقم ٢٣١١۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے رمضان کی زکوۃ کی نگہبانی پر مجھے مامور فرمایا ایک شخص آیا اور اپنے ہاتھوں سے غلہ بھرنا شروع کر دیا' میں نے اسے پکڑ لیا اور کہا کہ میں تجھے نبی کریم ﷺ کے پاس لے جاؤں گا' اس نے کہا کہ ''میں محتاج ہوں' میرے اوپر میرے اہل وعیال کا نفقہ ہے اور میں سخت حاجتمند ہوں حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے اسے چھوڑ دیا' صبح کی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''اے ابو ہریرہ تمہارے گزشتہ رات کے قیدی کا کیا ہوا؟ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! وہ مجھ سے اپنی سخت حاجت اور عیال داری کا رونا رونے لگا اس لئے مجھے اس پر رحم آیا اور میں نے اسے چھوڑ دیا'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''خبردار! اس نے تم سے جھوٹ بولا ہے' وہ دوبارہ آئے گا آپ ﷺ کے ارشاد کی وجہ سے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ضرور آئے گا چنانچہ میں اس کا منتظر رہا' وہ آیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے غلہ بھرنا شروع کر دیا' میں نے اسے پکڑ لیا اور کہا کہ میں تجھے نبی کریم ﷺ کے پاس لے جاؤں گا'' اس نے کہا کہ مجھے چھوڑ دو' میں ضرورتمند ہوں میرے ذمہ اہل وعیال کا نفقہ ہے اب آئندہ نہیں آؤں گا'' مجھے اس پر رحم آیا اور میں نے اسے چھوڑ دیا (اس لئے کیا کہ اس نے آئندہ نہ آنے کا وعدہ کیا تھا ورنہ تو اپنے حاجت وضرورت کے بارے میں اس کا جھوٹ مخبر صادق یعنی نبی کریم ﷺ کی زبانی معلوم ہو ہی چکا تھا) جب صبح ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے مجھ سے پھر فرمایا کہ ''ابو ہریرہؓ! تمہارے قیدی کا کیا ہو؟'' میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! وہ میرے سامنے اپنی شدید حاجت اور عیالداری کا رونا رونے لگا' اس لئے مجھے اس پر رحم آ گیا اور میں نے اس کو چھوڑ دیا' '' آپ ﷺ نے فرمایا'' ہوشیار رہنا! اس نے جھوٹ بولا ہے وہ پھر آئے گا۔'' چنانچہ میں اس کا منتظر رہا اور وہ پھر آیا' جب اس نے غلہ بھرنا شروع کیا تو میں نے اسے پکڑ لیا اور کہا کہ ''میں آج تو تجھے ضرور ہی نبی کریم ﷺ کے پاس لے جاؤں گا یہ آخری تیسرا موقع ہے تو نے تو کہا تھا کہ آئندہ نہیں آؤں گا مگر تو پھر آ گیا'' اس نے کہا کہ مجھے چھوڑ دو میں تمہیں ایسے کلمات سکھاؤں گا کہ اللہ تعالیٰ ان کی وجہ سے نفع پہنچائے گا جب تم اپنے بستر پر جاؤ تو آیت الکرسی لا اله الا هو

الحی القیوم آخر تک (یعنی وھو العلی العظیم) تک پڑھو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے ساتھ ہمیشہ ایک نگہبان (فرشتہ) رہا کرے گا اور صبح تک تمہارے پاس کوئی شیطان (خواہ وہ انسان میں سے ہو یا جنات میں سے دنیوی تکلیف و اذیت پہنچانے کے لئے) نہیں آئے گا'' میں نے (یہ سن کر) اسے اس مرتبہ بھی چھوڑ دیا' جب صبح ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے پھر فرمایا کہ تمہارے قیدی کا کیا ہوا' میں نے عرض کیا کہ ''اس نے (جب) مجھ سے کہا کہ وہ مجھے چند کلمات سکھائے گا' جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مجھے نفع پہنچائے گا (تو میں نے اس مرتبہ بھی اس کو چھوڑ دیا) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''آگاہ رہو (اگرچہ) اس نے تم سے (ان کلمات کے بارے میں) سچ کہا ہے (مگر) وہ (دوسری باتوں میں) جھوٹا ہے اور تم جانتے ہو کہ تم ان تین راتوں میں کس سے مخاطب تھے؟'' میں نے کہا کہ نہیں!'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ شیطان تھا (جو اس طرح مکروفریب سے صدقات کے مال میں کمی کرنے آیا تھا)۔'' (بخاری)

تشریح: **وعن أبی هريرة قال وكلنی رسول الله يحفظ زكوة رمضان :** یعنی صدقۂ فطر پر، تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو فقراء پر تقسیم کریں۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: اس کی حفاظت پر یعنی ان کو سونپا گیا۔ وکالت ،لغوی معنی میں ہے۔ اور یہ مطلق طور پر کسی کو معاملہ پسرد کرنا ہے۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: اضافت ادنیٰ ملابست کے لئے ہے۔ یہ صدقۂ فطر اس لیے مشروع ہے کہ جو اس سے روزے کے دوران کوئی ظلم و زیادتی، افراط و تفریط ہوئی ہو وہ معاف ہو جائے۔ یہ لام کے معنی میں ہے۔ **(فأتانی آت :** یعنی ایک آنے والا آیا۔ **(افجعل :** یعنی وہ شروع ہوا۔ **(يحثو :** یعنی وہ بغیر ماپ کے لے رہا تھا۔

من الطعام : وہ اس کو اپنے برتن اور چادر میں مٹی کے ڈالنے کی طرح ڈال رہا تھا۔ کھانے سے مراد گندم وغیرہ ہے جو چیز فطر میں دی جاتی ہے۔ **(فأخذته وقلت له لا رفعنك :** رفع سے مرا معاملے کو حاکم کے پاس لے جانا یعنی میں تجھ کو ساتھ لے کر چلوں گا۔ **(الی رسول الله :** تاکہ وہ تیرا ہاتھ کاٹ دیں، چونکہ تو چور ہے۔ یہ قول ابن الملکؒ کا طیبی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح ہے۔ اُس میں ہے کہ جب مال کو حفاظت سے رکھا گیا ہو اور وہ اس مال سے چرائے' حالانکہ وہ اس کا مستحق نہیں ہے اس وقت اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ **(قال انی محتاج :** یعنی میں بہت فقیر ہوں۔ **(وعلی عيال :** یعنی ان کا نان ونفقہ بھی میرے ذمہ ہے، یہ اس نے فقیری کو زیادہ زیادہ ظاہر کرنے کے لئے کہا۔ **(ولی حاجة :** یعنی بہت سخت ضرورت۔ **(شديدة :** یعنی موت کی طرح سخت، یا نفاس، قرض خوار کے مطالبے۔ یا سخت بھوک یا ایسی جیسی امثال جن میں سخت ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تاکید کے بعد پھر ایک تاکید ہے۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: اس کے نفس میں فقیری تھی، وہ اپنے اہل و عیال کی وجہ سے یہ کرنے پر مجبور ہوا، اور یہ ضرورت مندوں کے لئے ہے۔ اس حدیث میں جنوں کو دیکھنے پر دلالت ہے، اور اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ﴾ [الاعراف: ۲۷] یعنی یہ ہے کہ ہم انہیں اس اصل شکل میں نہیں دیکھ سکتے جس پر ان کی تخلیق کی گئی ہے۔ اس لیے کہ ہمارے اور ان کے درمیان بہت دوری ہے۔ چونکہ ان کے ناری اجسام چھپنے اور اشتباہ میں انتہاء درجہ کو پہنچے ہوئے ہیں۔ اسی لیے امام شافعیؒ نے کہا: جس نے دعویٰ کیا کہ اُس نے جن دیکھا، اس نے قرآن کی مخالفت کی، بخلاف اس کے کہ وہ دوسری صورت اختیار کر لیں۔

قال : یعنی ابو ہریرہؓ نے کہا۔ **(فخليت :** یعنی اس کا راستہ۔ **(عنه :** یعنی میں نے اس کو چھوڑ دیا اس میں یہ دلالت نہیں، کہ اس نے غلہ لیا تھا یا نہیں' اس میں احتمال ہے کہ وہ ان پر سبقت لے جائے۔ ابن حجرؒ نے اپنے مذہب کے قواعد کے مطابق احادیث کو تطبیق دی ہے۔ **فاصبحت فقال النبی ﷺ يا أبا هريرة ما فعل :** فاعل ہونے کی بناء پر۔ **(أسيرك :** یعنی جن کو تو نے پکڑا تھا۔ **(البارحة :** گزشتہ رات۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غیب کے متعلق خبر دی ہے۔ اس میں ممکن ہے کہ ابو ہریرہؓ نے شیطان کو پکڑا اور اس کو

ذلیل ورسوا کر کے واپس لوٹا دیا۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت کی برکت ہے۔ حدیث میں صدقۂ فطر جمع کرنے کے دلیل ہے۔ پھر کسی ایک کو اس کو تقسیم کرنے پر مقرر کرنے کی راہنمائی ہے۔ (قلت یا رسول اللہ شکی حاجة شدیدة وعیالا فرحمته فخلیت سبیله، قال : یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا۔ (ما :تخفیف کے ساتھ تنبیہ کے لئے ہے۔ (انه قد کذبك :تخفیف کے ساتھ یعنی حاجت کو ظاہر کرنے کے لئے۔ (وسیعوده :یعنی اس سے دفاع کے لئے تیار ہو جا۔ (فعرفت أنه سیعود لقول رسول اللہ ﷺ انه سیعود فرصدته : میں نے اس کا انتظار کیا۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: دوسری رات پر دلالت نہیں۔ بلکہ اس کے عدم پر دلالت ہے، چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مقید نہیں کیا: "ما فعل أسیرك الاتی یقوله البارحة"۔ (فجاء یحثو : حال مقدر ہے، چونکہ "حثو" مجیٔ کے بعد ہے نہ کہ اس کے ساتھ۔ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ اس کی تقدیر یوں ہو: "فجاء فجعل یحثو اعتماد اعلی ما سبق" معنی یہ ہے کہ وہ مال چرا رہا تھا یا چرانے کا ارادہ کر رہا تھا۔ (من الطعام فاخذته فقلت لأ رفعنك الی رسول اللہ قال دعنی :یعنی مجھ کو چھوڑ دے۔

فأنی محتاج وعلی عیال...... : فرحمته : شاید اس کے یہ کہنے کی وجہ سے "لا أعود"، مگر اس کا جھوٹ محتاج ہونے کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے عیاں ہو گیا تھا۔ ایک قول ہے کہ اس نے اپنے جھوٹ سے توبہ کر لی۔ (وخلیت سبیله فأصبحت فقال لی رسول اللہ ﷺ یا أبا هریرة ما فعل أسیرك فقلت یا رسول اللہ شکا حاجة :یعنی سخت حاجت جیسا کہ صحیح نسخہ میں ہے۔ (وعیالا فرحمته فخلیت سبیله : چونکہ اس نے نہ آنے کا وعدہ کر لیا تھا، شاید کہ راوی نے اختصار کی بناء پر اُسے حذف کر دیا ہو۔ (فقال أما انه قد کذبك :یعنی لوٹ نہ نہیں آنے کا جھوٹ کہا ہے۔ (سیعود، فرصدته، فجاء یحثو من الطعام فأخذته فقلت لأ رفعنك الی رسول اللہ ﷺ : اس سے قطع ید کا ذکر کیا، کہ اس میں وہ مطلق ہے، صحابی نے کہا۔ (وهذا آخر ثلاث مرات انك : ابن حجرؒ کہتے ہیں: یہ جو تین مرتبہ کا لفظ لائے ہیں، یہ تعطیل ہے، اور اس کلام کو بھی شامل ہے کہ وہ مطلق نہیں ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ "هذا" مبتداء ہے، "آخر" اس سے بدل ہے۔ "انك" خبر ہے۔ (تزعم :تو گمان کرتا ہے، یا کہتا ہے۔ (لا تعود، ثم تعود :ایک نسخہ میں "تزعم أن لا تعود" یعنی تو گمان کرتا ہے کہ تو لوٹ کر نہیں آئے گا، تو پھر لوٹ آتا ہے۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: انك تزعم یہ "ثلاث مرات" کی صفت ہے۔ اس باطل قول کے ساتھ .... موصوف ہوگا اور ضمیر مقدر ہے یعنی "فیها"۔ (هذا آخر ثلاث مرات)۔ اس پر دلالت ہے کہ اُس نے پہلے مرتبہ بھی نہ آنے کا وعدہ کیا تھا، جس کو اختصار کی غرض سے ساقط کر دیا گیا ہے۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں : کلام شارح عقل سے بعید ہے چونکہ اس نے یہ نہیں کہا: میں صرف لوٹوں گا، اور وہ دوسری دفعہ آیا تھا۔ اس کا دفع ممکن ہے کہ نہ لوٹنے کا التزام صریحاً یا ضمناً محقق ہے۔ یہ بات جان لی گی ہے کہ مستغیث دعویٰ کرتا ہے کہ وہ دوبارہ نہیں لوٹے گا۔

قال دعنی : یعنی مجھے چھوڑ دے۔ (أعلمك : رفع کے ساتھ، ایک نسخہ میں جزم کے ساتھ۔ (کلمات ینفعك اللہ بها اذا أویت : قصر اور مد کے ساتھ، یعنی جب تو ارادہ کرے۔ (الی فراشك :نیند کی وجہ سے "ونزلت فیه"۔ (فاقرأ اٰیة الکرسی، ﴿اللہ لا اله الا هو الحی القیوم﴾ [البقرة : ۲۵۵] حتی تختم الایة، یعنی وهو العلی العظیم تک) اس کا ظاہر کوئی مذہب پر دلالت ہے کہ "القیوم" راس الایہ نہیں ہے اور بصری اس کے برعکس ہیں۔ (فانك :یعنی جب تو یہ کرے گا۔ (لن یزال علیك من اللہ :اس (اللہ) کی طرف سے یا اس (اللہ) کے حکم سے۔ (حافظ :اپنی قدرت سے یا فرشتوں کی طرف سے۔ (ولا یقربك :راء کے فتحہ کے ساتھ۔ (شیطان :نہ کسی دینی نہ دنیاوی کے لئے اور یہ ماقبل کی تاکید ہے۔ (حتی تصبح :اس کی انتہاء صبح ہے، اس کی غایت "لن" ہے، ایک قول یہ ہے کہ اسناد کا ترک اس کی وضاحت کی وجہ سے ہے۔ اس کا بھی احتمال ہے کہ کہا جائے اس کے لئے یہ کھول دیا گیا۔ یہ قول طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔ میں کہتا ہوں: صحیح بات جو نبی علیہ السلام نے ثابت کی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول جس کو بیہقی نے روایت کیا

ہے: ''من قرأها يعنى آية الكرسى حين يأخذ مصجعه أمنه الله تعالىٰ على داره ودار جاره وأهل دويرات حوله''.
(فخليت سبيله فأصبحت فقال لى رسول الله ﷺ ما فعل أسيرك : یہ نہیں کہا گزشتہ رات۔ اسی طرح پیچھے گزر چکا ہے۔
(قلت زعم أنه يعلمنى كلمات ينفعنى الله بها قال أما انه صدقك : یعنی سکھلانے میں۔ (وهو كذوب : یعنی اپنے تمام اقوال میں، یا اغلب احوال میں، یا اپنی مثالوں میں کبھی کبھی سچ بول دیتا ہے۔ تعلم : یعنی أتعلم.

من تخاطب : یعنی معین شخص سے۔ (منذ ثلاث : یعنی راتیں۔ (قلت لا، قال ذاك شيطان : تنوین کے ساتھ مرفوع ہے۔ اگر چہ اس کا ظاہر منصوب کا تقاضا کرتا ہے، چونکہ اس قول میں آپ ﷺ کا پوچھنا ''من تخاطب'' مفعول ہے، اور جملہ اسمیہ کی طرف عدول ہے۔ اس کو اسم اشارہ کے ساتھ خاص مزید تعین کے لئے ہے، اور اس (شیطان) کے مکر وفریب سے ہمشہ کے لئے بچاؤ ہے۔ یہ قول طیبی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ واحد سے مراد شیاطین ہیں یا ابلیس۔ وجہ صف کہ یہ ''شطن'' سے ماخوذ یعنی ''بعد'' کے معنی میں۔ قاموس میں ہے : اس مادہ میں شیطان معروف ہے اور ''تشیطن'' اس کا فعل جو اس نے کہا۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: کہ دونوں جگہ شیطان ان دونوں کے تغایرت پر دلالت ہے اور اس کی اجازت ہے اور یہ مشہور ہے کہ نکرہ جب انہی الفاظ کے ساتھ لایا جائے تو پہلے کے علاوہ ہوتا ہے۔ وجہ تغایرت کہ پہلا جنس کے لئے ہے چونکہ اس سے مراد ''نفی قربان'' ہے اور دوسرا یہ کہ وہ اس جنس میں سے ایک ہے۔ یعنی شیطانوں میں سے ایک ہے۔ اگر معرفہ ہو تو مقصود کے خلاف وہم ہے، چونکہ یا تو اشارہ پہلے کی طرف ہے یا جو لوگوں میں مشہور ہے۔ تو ان دونوں کا کلام واضح نہیں ہے۔

ابن الملکؒ کہتے ہیں: حدیث میں اس بات پر دلالت ہے کہ علم سیکھنا جائز ہے، اس سے جو اس قول پر عمل نہیں کرتے جنہوں نے تحسین علم کے حصول پر شرط لگائی ہے۔ اگر کوئی عمل کی تحسین اور قباحت کو نہیں جانتا، تو وہ صرف اس شخص سے سیکھے جس کی دیانت مشہور ہو اور وہ مصلح ہو۔ اس بحث میں موضوع احادیث اچھے ظاہر معنوں کے لئے ہیں، جیسے سورتوں عبادات اور دعوات وغیرہ میں ہے، ان جیسی صورتوں میں تحصیل علم صرف ثقات سے سیکھنا جائز ہے۔

سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرہ کا آخری حصہ اللہ کی طرف سے دو نور ہیں

۲۱۲۴: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ بَيْنَمَا جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَاعِدٌ عِنْدَ النَّبِيِّ ﷺ سَمِعَ نَقِيْضًا مِنْ فَوْقِهٖ فَرَفَعَ رَأْسَهٗ فَقَالَ هٰذَا بَابٌ مِنَ السَّمَاءِ فُتِحَ الْيَوْمَ لَمْ يُفْتَحْ اِلَّا الْيَوْمَ فَنَزَلَ مِنْهُ مَلَكٌ فَقَالَ هٰذَا مَلَكٌ نَزَلَ اِلَى الْاَرْضِ لَمْ يَنْزِلْ قَطُّ اِلَّا الْيَوْمَ فَسَلَّمَ فَقَالَ اَبْشِرْ بِنُوْرَيْنِ اُوْتِيْتَهُمَا لَمْ يُؤْتَهُمَا نَبِيٌّ قَبْلَكَ فَاتِحَةُ الْكِتَابِ وَخَوَاتِيْمُ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ لَنْ تَقْرَأَ بِحَرْفٍ مِّنْهُمَا اِلَّا اُعْطِيْتَهٗ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ۱/۵۵٤ حديث رقم (۲۵٤۔ ۸۰٦)۔ والنسائى ۲/۱۳۸ حديث رقم ۹۱۲۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ جب جبرئیل علیہ السلام نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے تو انہوں نے اوپر کی طرف دروازہ کھلنے کی سی آواز سنی چنانچہ انہوں نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور کہا کہ 'یہ آسمان کا دروازہ ہے جو آج ہی کھولا گیا' آج سے پہلے کبھی نہیں کھولا گیا'' جب ہی اس دروازے سے ایک فرشتہ اترا' حضرت جبرئیل نے کہا کہ 'یہ فرشتہ آج سے پہلے کبھی زمین پر نہیں اترا'' اس فرشتے نے آپ ﷺ کو سلام کیا اور کہا کہ' خوشخبری ہو کہ آپ کو وہ دو نور عطا فرمائے گئے ہیں جو آپ ﷺ سے پہلے اور کسی نبی کو نہیں دیئے گئے اور وہ سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی آخری آیتیں' ان میں سے آپ ﷺ کوئی حرف بھی پڑھیں گے تو آپ کو اس کے عوض ثواب ملے گا یا

آپ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی دعا قبول کی جائے گی۔'' (مسلم)

تشریح: وعن ابن عباس قال بینما جبریل علیه السلام قاعدا : ایک نسخہ میں رفع کے ساتھ ہے اور وہی ظاہر ہے۔ شاید کہ اس کا نصب ''کان'' کو مقدر ماننے کے ساتھ ہے۔ **عند النبی** ﷺ : ابن الملک بھی طیبی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح کہتا ہے: ان اوقات وحالات کے دوران جو آپ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے پاس تھے۔ میرک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: "**بینا، بینما**" اور "**بین**" اس کا معنی ''وسط'' ہے۔ "**بین**" ظرف مکان ہے جیسے آپ کا کہنا: ''**جلست بین القوم وبین الدار**'' یا زمان کے لئے جیسا کہ یہاں پر اس کا ذکر ہے۔ یعنی وہ وقت جس میں جبریل امین آپ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ (**سمع** : ایک نسخہ میں "**اذ سمع**" یعنی جبریلؑ نے سنا۔ (**فرفع** : یعنی جبریل نے۔ (**رأسه فقال** : یعنی جبریلؑ نے اپنا سر اٹھایا۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: کہ تینوں ضمیریں جو "**سمع، رفع** اور "**قال**" میں ہیں، جبریلؑ کی طرف راجع ہیں۔ چونکہ اسمان کے احوال کی اکثر اطلاع وہی دیتے ہیں۔ ایک قول ہے کہ نبی صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی طرف راجع ہیں۔ اور (**قال**) کی ضمیر جبریل امین کے لئے ہے، چونکہ وہ آپ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے پاس کسی عجیب امر کی خبر کے لئے حاضر ہوئے تھے، اور نبی صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اس امر سے واقف ہو گئے۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: قول مختار یہی ہے۔

هذا : یعنی یہ آواز۔ (**باب** : یعنی دروازے کی آواز۔ (**من السماء** : یعنی آسمانِ دنیا۔ (**فتح الیوم** : یعنی اب۔ (**لم یفتح قطالا الیوم فنزل منه ملك** : یہ راوی کا قول ہے، اس کی حکایت میں جو اس نے رسول اللہ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سے سنا یا اُس کو آپ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سے پہنچا۔ (**فقال** : جبریلؑ یا نبی صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے کہا۔ (**هذا** : اترنے والے فرشتے کے متعلق کہا۔ (**ملك نزل الی الارض لم ینزل قط الا الیوم فسلم** : یعنی فرشتے نے سلام کیا۔ (**علی النبی** ﷺ **فقال** : صحیح نسخہ میں "**وقال**" یعنی فرشتے نے کہا۔ (**ابشر** : ہمزہ کے فتحہ اور شین کے کسرہ کے ساتھ یعنی خوش ہو جاؤ۔ (**بنورین** : ان دونوں کا نام اس لئے ہے کہ ان میں سے ہر ایک نور ہے جو اپنے ساتھی کے سامنے دوڑ رہا ہوگا۔ یا وہ دونوں صراط مستقیم کی طرف راہنمائی کر رہے ہوں گے، اس کے معانی میں غور وفکر کی ضرورت ہے۔ جو دو آیات میں روشنی ہے۔

اوتیتهما لم یؤتها : صیغۂ مجہول کے ساتھ یعنی وہ دونوں کسی کو نہیں دی گئیں۔ (**نبی قبلك فاتحة الکتاب** : جر کے ساتھ۔ آخری دو وجہیں جائز ہیں۔ **وخواتیم سورة البقرة** : میرک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: ہمارے شیخ کے ہاں جو تمام نسخے پڑھے جاتے ہیں، ان میں اسی طرح ہے۔ اسی طرح مسلم، نسائی اور حاکم کی اصل میں ہے۔ دوسرے نسخہ میں ہے کہ سورۃ البقرۃ کا جو آخر (آخری آیات) ہے۔

''**امن الرسول**'' [البقرة : ۲۸۵] سے مراد کے متعلق اسی طرح کہا گیا ہے اور ابن حجرؒ نے بھی یہی قول اختیار کیا ہے۔ زیادہ اظہر جمع کے صیغہ کے ساتھ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس قول سے ہو: ﴿**لله ما فی السموٰت وما فی الأرض**﴾ [البقرة : ۲۸۴] پھر میں نے ابن حجرؒ کو کہتے ہوئے دیکھا کہ پہلے انبیاء پر آیت الکرسی، اور سورۃ البقرہ کی آخری اور آخری سے پہلے "**امن الرسول**" کی آیات نازل نہیں ہوئیں۔ کعب سے اس پہلے کی آیات روایت کی ہیں: ﴿**لله ما فی السموٰت وما فی الأرض**﴾ [البقرة : ۲۸۴] **لن تقرأ** : یہ آپ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سے خطاب ہے۔ مراد آپ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اور آپ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی امت ہے۔ ہر اس چیز میں آپ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی امت شامل ہے جو آپ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ پر نازل ہوا، سوائے اس کو جو آپ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے ساتھ خاص کیا گیا ہے۔

بحرف منهما : یعنی فاتحہ اور خواتیم کا ہر حرف۔ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: ''باء'' زائدہ ہے۔ کہا جاتا ہے: "**أخذت زمام الناقة، وأخذت زمامها**". یہ بھی جائز ہے کہ اس کے ساتھ قراءت کو ملایا گیا ہو، اور مراد اس سے اس کا ایک حصہ ہے شئی کا حرف اس کی طرف ہوتی ہے اور اس سے مراد مستقل جملہ ہے۔ **الا أعطیته** : یعنی آپ کو وہ چیز عطا کی جائے گی، جس پر سوال کے متعلق یہ جملہ مشتمل ہے: **کقوله** : ''**اهدنا الصراط المستقیم**'' [الفاتحة : ٦]، اسی طرح آپ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کا کہنا: "**غفرانك ربنا**" [البقرة : ۲۸۵]، اور

جو اس سے ملتی جلتی مثالیں ہیں۔ جو "غیر مسئلہ" پر مشتمل ہے، اُس میں حمد و ثناء ہے۔ تجھے اس کا ثواب دیا جائے گا۔ میرک ﷫ کہتے ہیں : کہ حرف سے مراد حرف تہجی ہو، یہ بھی ممکن ہے اس قول کا۔ (أعطيته :اس وقت تجھ کو دیا جائے گا، جب تو دنیوی اور اُخروی حاجات کے متعلق سوال کرے گا۔

نسائی اور حاکم نے بھی روایت کیا ہے اور حاکم نے صحیح کہا ہے۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: ظاہر یہ ہے کہ ابن عباس ﷠ کی مستند جو حکایت کے متعلق ہے اس میں آپ ﷺ سے توقیف ہے اور اس کی سند کو واضح ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا ہے۔ اس کا بھی احتمال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر تمام حالت کو مکمل تمثیل کے ساتھ بیان کر دیا ہو۔ جبریل امین کے ذریعے یہاں تک آپ ﷺ نے دیکھ لیا۔ آپ ﷺ نے اپنا سر اٹھایا اور آسمان سے اترنے والے فرشتے کو دیکھا، جیسے آپ ﷺ کے لئے تمثیل بیان کی گئی ہے۔ اس قول کے متعلق نقض سنا گیا ہے، اور اسکے بعد دوسرا مخفی نہیں ہے۔

۲۱۲۵: وَعَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْاٰيَتَانِ مِنْ اٰخِرِ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ مَنْ قَرَأَبِهِمَا فِي لَيْلَةٍ كَفَتَاهُ ۔(متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ۳۱۷/۷۔ حديث رقم ۴۰۰۸۔ ومسلم فی صحيحه ۵۵/۱ حديث رقم (۲۵۵۔ ۸۰۷)۔ والترمذی فی السنن ۱۴۷/۵ حديث رقم ۲۸۸۱۔ وابن ماجه ۴۳۵/۱ حديث رقم ۱۳۶۸۔ والدارمی ۵۴۲/۲ حديث رقم ۳۳۸۸۔ واحمد فی المسند ۱۱۸/۴۔

ترجمہ: "حضرت ابو مسعودؓ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا" جو شخص رات میں سورۃ بقرہ کی آخری دو آیتیں یعنی امن الرسول سے آخر تک پڑھتا ہے تو اس کے لئے وہ کافی ہے۔" (بخاری و مسلم)

تشریح: **وعن ابی مسعود** :یعنی انصاریؓ۔

قال : قال رسول الله ﷺ الایتان :یعنی جو ہونے والی ہیں۔

من آخر سورة البقرة :یعنی "**امن الرسول**" سے لیکر آخر تک۔

من قرأ بهما في ليلة كفتاه :یعنی وہ دونوں اس سے شر اور ناپسندیدہ چیزوں کو روکے رکھیں گی، یہ بات "**كفى يكفى**" سے ہے، یعنی جب کسی سے کوئی چیز دور کر دی جائے، اور اس کو مستغنی کر دیا جائے۔ ایک قول ہے: اس کو قیام اللیل کی جگہ کافی ہوں گی، یا اس کو سارے ذکروں سے کافی ہوں گی یا ان دونوں سے مراد جو ان کو قیام اللیل میں کم از کم کفایت کر جائیں گی۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: اس کا احتمال ہے کہ جو ان کا نظم ہے اس لحاظ سے وہ تجدید ایمان کے لئے کافی ہوں گی۔ اس کی شرح میں یہ بات بھی ہے کہ ان کے ساتھ کچھ مخفی چیزیں بھی ظاہر ہوتی ہیں' یہ قطعاً غیر مناسب ہے۔ یقیناً ان کے ساتھ تجدید ایمان کا حصول ہے' اور یہ دونوں اس سے کفایت کرتی ہیں۔ پس آپ اس پر غور کریں۔ یہ پھسلنے کی جگہ ہے۔ تحقیق یہ ہے کہ تجدید کی اصطلاح فقہاء سے ہے وہ حالت ارتداد کو مجہول ہے، اگر صوفیہ کی اصطلاح ہو تو مراد تجدید ہے، اس کو مؤکد اور مؤید مانا گیا ہے، چونکہ یہ ہر ظاہر سے توحید کے معنی کو شامل ہے اور ہر طرح کی غفلت کو دور کرتا ہے۔ اسی لئے ابن الفارض نے کہا ہے:

ولو خطرت لی فی سواك ارادة ☆ علی خاطری سهوا حكمت بردتی

اگر تیرے سوا میرے دل پر بھول کر بھی کوئی خیال آ جائے تو میرے مرتد ہونے کا حکم لگا دیا جائے۔

اہل علم نے یہ معنی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے اخذ کیا ہے: ﴿يا ايها الذين أمنوا أمنوا﴾ [النساء :۱۳۶] یعنی اپنے ایمان کو

لازم پکڑو۔ آپ علیہ السلام کا قول ہے: "حدودا ایمانکم"، قالوا یا رسول اللہ! کیف نجدد ایماننا؟ قال اکثروا من قول لا الہ الا اللہ"۔اس حدیث کو چاروں نے روایت کیا ہے۔

۲۱۲۶:وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ مَنْ حَفَظَ عَشْرَ اٰیَاتٍ مِنْ اَوَّلِ سُوْرَۃِ الْکَھْفِ عُصِمَ مِنَ الدَّجَّالِ. [رواہ مسلم]

اخرجہ مسلم فی صحیحہ ۵۵۵/۱ حدیث رقم (۲۵۷۔ ۸۰۹)۔ وابوداوٗد فی السنن ۴۹۷/۳ حدیث رقم ۴۳۲۳۔ والترمذی ۱۴۹/۵ حدیث رقم ۲۸۸۶۔ واحمد فی المسند ۱۹۶/۵۔

ترجمہ:"حضرت ابودرداءؓ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا" جو شخص سورۂ کہف کی پہلی دس آیتیں یاد کرے تو وہ دجال کے شر سے محفوظ رہے گا۔" (مسلم)

تشریح: **وعن ابی الدرداء قال : قال رسول اللہ ﷺ من حفظ عشر اٰیات من اول سورۃ الکھف عصم** : یعنی اس کو یاد کیا۔

من الدجال : یعنی اس کے شر سے ایک دوسری روایت میں ہے: دجال کے فتنہ سے۔طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: جیسے ان دس آیات کو حفظ کرنے والی جماعت کو اللہ تعالیٰ بچائے گا، اسی طرح اللہ تعالیٰ قاری قرآن کو سرکش لوگوں سے بچائے گا۔ایک قول یہ ہے کہ اس کا سبب اس میں عجائب اور نشانیوں کا ہونا ہے، جو ان میں غور وفکر کرے گا دجال سے بچالیا جائے گا۔ان کو جمع کرنے سے کوئی مانع نہیں ہے۔ یہ اس خصوص کے ساتھ ظاہر ہے۔لام عہد کے لئے ہے یہ آخری زمانے میں نکلے گا، اور الوہیت کا دعوے دار ہوگا، جس کے لئے خلافِ عادت نشانیاں ظاہر کرے گا۔جیسے آسمان سے کہے گا، بارش برسا' تو وہ اس وقت بارش برسائے گا۔زمین سے کہے گا، تو اُ گا، وہ اُسی وقت اُ گا دے گی۔یہ بہت بڑی آزمائش ہوگی۔اس سے بڑا فتنہ روئے زمین پر کوئی اور نہیں ہوگا۔اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اس سے اپنی قوم کو ڈرانے کے لئے بھیجا ہے۔سلف اپنے بچوں کو دجال کی حدیث بھی یاد کراتے تھے یا یہ جنس کے لئے ہے۔دجال سے اکثر جھوٹ اور باطل ہوگا۔حدیث ہے: "**لا تقوم الساعۃ فی آخر الزمان دجالون، کذابون**" یعنی وہم پیدا کرنے والے۔دوسری حدیث میں ہے: "**لا تقوم الساعۃ حتی یخرج ثلاثون دجالاً**"۔اسی طرح ابوداؤد، نسائی اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ترمذیؒ کی روایت میں ہے جیسا کہ آگے آرہا ہے: "**من قرأ ثلاث اٰیات من أول الکھف عصم من فتنۃ الدجال**"۔ایک قول ہے: تین اور دس میں جمع کرنے کی توجیہ: دس والی حدیث متاخر ہے، جس نے دس پر عمل کیا اس نے تین پر بھی عمل کرلیا۔ایک قول یہ بھی ہے کہ تین والی حدیث متاخر ہے، جو تین سے بچالیا گیا، تو اس کو دس کی ضرورت نہیں رہا، جس نے تین کو حفظ کرلیا، اس کو دس کی ضرورت نہیں۔یہ احکام نسخ کے بہت قریب ہے۔

میرک رحمہ اللہ کہتے ہیں: صرف احتمال سے نسخ ثابت نہیں ہوتا۔میں کہتا ہوں: نسخ اخبار میں داخل نہیں ہے۔کہا گیا ہے کہ حدیث عشر حفظ کے لئے ہے اور حدیث ثلاث قراءت کے لئے ہے۔جس نے دس کو حفظ کیا اور تین کی قراءت کی، اس کو کافی ہوں گی، اور دجال کے فتنہ سے بچالیا گیا۔ایک قول یہ ہے کہ جس نے دس آیات کو یاد کیا، وہ اس کی ملاقات سے محفوظ رہے گا، جس نے تین آیات قراءت کی وہ اس کے فتنہ سے محفوظ کرلیا گیا، اگرچہ وہ اس سے ملاقات کرے۔کہا گیا ہے کہ حفظ سے مراد دل سے قراءت کرنا ہے، اور عصمت سے مراد دجال کی آفات سے محفوظ رکھنا ہے۔

۲۱۲۷:وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اَیَعْجِزُ اَحَدُکُمْ اَنْ یَقْرَأَ فِیْ لَیْلَۃٍ ثُلُثَ الْقُرْاٰنِ قَالُوْا وَکَیْفَ یَقْرَأُ

ثُلُثَ الْقُرْاٰنِ قَالَ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ تَعْدِلُ ثُلُثَ الْقُرْاٰنِ . (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ٥٥٦/١ حديث رقم (٢٥٩- ٨١١)- وابوداوٗد فی السنن ١٥٢/٢- حديث رقم ١٤٦١- والترمذی ١٥٣/٥ حديث رقم ٢٨٩٦- والنسائی ١٧١/٢ حديث رقم ٩٩٦- واخرجه مالك فی الموطا-

ترجمہ:''حضرت ابودرداءؓ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا'' کیا تم میں سے کوئی ایک رات میں تہائی قرآن پڑھنے سے عاجز ہے؟'' صحابہؓ نے عرض کیا کہ'' تہائی قرآن کیسے پڑھا جا سکتا ہے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا'' قل ھواللہ احد (سورۂ اخلاص) تہائی قرآن کے برابر ہے مسلم۔

تشریح: **وعنه** : یعنی ابودرداء سے۔(**قال : قال رسول الله ﷺ ايعجز أحدكم ان يقرأ فی ليلة ثلث القرآن** : لام کے ضمہ اور سکون کے ساتھ۔(**قالوا و كيف يقرأ** :یعنی کوئی بھی۔(**ثلث القرآن** : چونکہ اس پر ہمیشگی کرنا عادتاً مشکل ہے۔**قال، قل هو الله احد** : مکمل سورت یا آخر تک۔

يعدل : مذکر اور مونث یعنی دونوں طرح ٹھیک ہے۔(**ثلث القرآن** : چونکہ معانی قرآن کی تعلیم تین علوم پر مشتمل ہے: علم توحید، علم شرائع، علم تہذیب اخلاق اور تزکیہ نفس۔ سورت الاخلاص سب سے اشرف قسم پر مشتمل ہے، بہ نسبت دوسری آخری دو قسموں کے۔ علم توحید سب سے بیّن ہے۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ اس لیے ہے کہ قرآن تین چیزوں پر مشتمل ہے: قصص، اُحکام اور اللہ تعالیٰ کی صفات۔ اور'' **قل هو الله احد**'' [**الاخلاص** :مکمل سورت] صفات پر مشتمل ہے۔ اور یہ ثلث قرآن ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کا ثواب ثلث قرآن کے برابر بڑھایا جائے گا، اس میں کمی نہ ہوگی۔ پہلے قول پر قول کو بالاستیعاب اور اس کو ختم کرنا ضروری نہیں۔

میرک رحمہ اللہ کہتے ہیں: ابوعبید نے حدیث ابودرداء بیان کی ہے، اور کہا: ''**جزأ النبی ﷺ القران ثلاثة اجزاء مجعل قل هو الله احد جزاء من القرآن**''، قرطبیؒ کہتے ہیں: بعض نے ثلاثی کو حصول ثواب پر محمول کیا، پس انہوں نے کہا: ثلث قرآن کا معنی اس کی قراءت کا ثواب ہے، قاری کو اس کی مثل ثواب حاصل ہوتا ہے، جو ثلث قرآن پڑھتا ہے۔ ایک قول ہے کہ اس کی مثل بغیر دو گنے کے ملتا ہے۔ یہ دعویٰ بغیر دلیل کے ہے۔ جب اس کو ظاہر پر محمول کیا جائے، تو یہ ثلث قرآن سے معین ہے، یعنی ثلث جو اس سے فرض کیا گیا۔ اس میں تحقیق کی ضرورت ہے۔ دوسرے قول سے لازم آتا ہے کہ جس نے تین بار سورۃ اخلاص کو پڑھا وہ اس شخص کی طرح ہے جس نے مکمل قرآن پاک پڑھا۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد جس نے شامل توحید اور اخلاص پر عمل کیا، وہ اس شخص کی طرح ہے، جس نے ثلث قرآن پڑھا۔

ابن عبدالبر کہتے ہیں: جس نے اس حدیث کی تاویل نہیں کی، وہ اس شخص سے زیادہ محفوظ ہے، جس نے رائے کے ساتھ جواب دیا۔ یہ مذہب احمد اور اسحٰق بن راہویہ کا ہے۔ ان دونوں نے حدیث کو اس بات پر محمول کیا ہے، کہ اسکا معنی اس کے ثواب کی فضیلت اس سورت کی تعلیم پر ابھارنا ہے، مگر اسکی تین بار قراءت پورے قرآن کی قراءت کی طرح ہے۔ یہ درست نہیں اگرچہ دو سو بار پڑھے۔ **عن أبی الدرداء**.

۲۱۲۸: **و رواه البخاری عن ابی سعيد** ۔

اخرجه البخاری فی صحيحه ٣٤٧/١٣- حديث رقم ٧٣٧٤-

ترجمہ:امام بخاریؒ نے اس روایت کو ابوسعید سے روایت کیا ہے۔''

سورۃ اخلاص سے محبت

۲۱۲۹:وَعَنْ عَآئِشَةَ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ بَعَثَ رَجُلًا عَلٰى سَرِيَّةٍ وَكَانَ يَقْرَأُ لِاَصْحَابِهٖ فِيْ صَلَاتِهِمْ فَيَخْتِمُ بِقُلْ

هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ فَلَمَّا رَجَعُوْا ذَكَرُوْا ذٰلِكَ لِلنَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ سَلُوْهُ لِاَيِّ شَيْءٍ يَصْنَعُ ذٰلِكَ فَسَأَلُوْهُ فَقَالَ لِاَنَّهَا صِفَةُ الرَّحْمٰنِ وَاَنَا اُحِبُّ اَنْ اَقْرأَهَا فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ اَخْبِرُوْهُ اَنَّ اللّٰهَ يُحِبُّهٗ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۴۷/۱۳۔ حدیث رقم ۷۳۷۵۔ ومسلم فی صحیحه ۵۵۷/۱ حدیث رقم (۲۶۳۔ ۸۱۳)۔ والنسائی ۱۷۰/۲ حدیث رقم ۹۹۳۔

ترجمہ: "سیّدہ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو ایک لشکر کا امیر بنا کر بھیجا وہ شخص نماز میں اپنے رفقاء کی امامت بھی کرتا تھا اور (قراءت کو قل ھو اللہ احد پر ختم کرتا تھا' جب وہ واپس آئے تو انہوں نے نبی کریم ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا' آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ اس آدمی سے دریافت کرو کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟ اس سے پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ "یہ اس لئے کرتا ہوں کہ اس سورۃ میں رحمٰن کی صفت بیان کی گئی ہے اور میں اسے پسند کرتا ہوں کہ اس سورۃ کو پڑھتا رہوں' نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ "اسے خبر کردو کہ اللہ تعالیٰ اس کو پسند کرتا ہے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: **عن عائشة رضی الله عنها ان النبی ﷺ بعث رجلاً** : یعنی اس کو امیر بنا کر بھیجا۔ (**علی سرية** : یعنی کسی لشکر پر۔ (**وکان يقرأ لأصحابه** : گویا کہ وہ ان کا امام تھا۔ (**فی صلاتهم ب "قل هو الله احد"**) [الاخلاص : ۱] جیسا کہ مصابیح میں ہے۔ **فيختم** : یعنی نماز میں اپنی قراءت کو "**قل هو الله احد**" کے ساتھ ختم کرتا، حصول برکت اور اس سورت کے ساتھ محبت کی وجہ سے یعنی ہر رکعت کے آخر میں فاتحہ کے بعد ہر نماز میں یہ سورت پڑھنا۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: یعنی اپنی قراءت کو فاتحہ کے لئے ختم کرتا۔ یا اس کے کچھ حصہ قرآن کی تلاوت کے بعد پڑھتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم نے پہلے پر محمول کیا ہے۔ یہ بلا خلاف مکروہ نہیں ہے۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت یعنی اس کی عادت تھی، وہ اس کو فاتحہ کے بعد پڑھتا تھا، تمام صورتوں کا احتمال ہے۔ ابھی ایک شکل کا ذکر ہوگا جو آنے والی حدیث میں بیان ہوئی ہے یہ زیادہ اولیٰ اس لیے ہے کہ اس کی صحت سند پر اعتماد ہے۔ (**فلما راجعوا ذكروا ذلك** : یعنی جو اس نے کیا۔ (**للنبی ﷺ فقال سلوه لای شیء يصنع ذلك** : کیا وہ اختصار کے لئے، یا اس کے علاوہ کوئی دوسری سورت یاد نہ تھی، یا کوئی اور وجہ تھی۔ (**فسألوه فقال لانها** : میں نے اس وجہ سے کیا کہ وہ۔ (**صفة الرحمٰن** : شاید کہ رحمٰن کا ذکر اشارہ ہے کہ اس کا ذکر وسیع رحمت کی امید کا باعث ہے۔

وأنا أحب أن أقرأها : کہ یہ کام ہمیشہ کروں۔ جس کو کسی چیز سے محبت ہوتی ہے وہ اکثر اس کا ذکر کرتا ہے۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: "**قل هو الله احد**" لا الہ الا اللہ کے معنی میں ہے، اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی صفت دو طرح ہے، وہ اکیلا ہے۔ وہ صمد ہے تمام مخلوقات کی حاجات اس کی طرف لوٹتی ہیں۔ اگر اس کے علاوہ کسی دوسرے صمد کا تصور کیا جائے تو نظام عالم خراب ہو جائے۔ اسی وجہ سے لفظ "اللہ" مکرر ذکر کیا گیا ہے۔ **الصمد** کو معرفہ ذکر کیا ہے، اس لیے کہ لفظ اللہ کی خبر ہے، جملہ مستانفہ بیان موجب کے لئے ہے۔ دوسری وجہ: یہاں اللہ کی وحدانیت الوہیت کے لئے ہے، اگر اس کے علاوہ کسی دوسرے الٰہ کا تصور کیا جائے، تو وہ یا تو اس سے اوپر ہو یہ محال ہے، قرآن نے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے: ﴿**لم يولد**﴾ یا اس سے نیچے۔ یہ درست نہیں ہے۔ یہ واضح اشارہ موجود ہے ﴿**لم يلد**﴾ یا اس کے مساوی ہو یہ اسی طرح محال ہے۔ اس بات کی طرف اپنے اس قول سے اشارہ کیا ہے: ﴿**ولم يكن له كفواً احد**﴾ [الاخلاص] ۔ (**فقال النبی ﷺ أخبروه ان الله يحبه** : اس سورت کے ساتھ محبت کی وجہ سے یا اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ سورت بہت محبوب ہے۔

مازریؒ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں سے محبت سے مراد ثواب اور نعمتیں دینے کا ارادہ کرتا ہے۔ ایک قول ہے کہ بذات خود ثواب اور نعمتیں۔ پہلے قول پر یہ صفات ذات ہیں۔ دوسرے قول پر صفات فعل ہیں۔ بندوں کی محبت اللہ تعالیٰ کے لئے یہ ہے کہ وہ ان

سے اعراض نہیں کرتا، وہ اس صفت سے پاک ہے۔ان کی محبت اللہ تعالیٰ کے لئے یہ ہے کہ وہ اس کی اطاعت میں استقامت اختیار کرتے ہیں۔استقامت محبت کا پھل ہے۔حقیقی محبت ان کی طرف اللہ تعالیٰ کا متوجہ ہونا ہے۔تمام وجوہات سے وہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا مستحق ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: محبت کی حقیقت نفس کا لذت والی اشیاء کی طرف متوجہ ہونا ہے۔یہ اللہ تعالیٰ کے حق میں محال ہے، تو اس کی محبت کو ارادہ ثواب پر یا نفس ثواب پر محمول کریں گے۔ بندوں کی محبت اللہ تعالیٰ کے لئے میں احتمال ہے کہ وہ بندے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اور تمام وجوہات کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ اس کا مستحق ہے۔یا اس سے مراد نفس کی استقامت اس کی اطاعت پر ہے۔اس سے حاصل کلام پہلی توجیہ کی طرف لوٹتا ہے، کہ استقامت محبت کا پھل ہے۔

۲۱۳۰: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ اِنَّ رَجُلاً قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنِّی اُحِبُّ ھٰذِہٖ السُّوْرَۃَ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ قَالَ اِنَّ حُبَّكَ اِیَّاھَا اَدْ خَلَكَ الْجَنَّۃَ. (رواہ الترمذی وروالبخاری معناہ)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲۵۳/۲۔ حدیث رقم ۷۷۴۔ والترمذی فی السنن ۱۵٦/۵ حدیث رقم ۲۹۰۱۔

ترجمہ: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں اس سورۃ یعنی قل ھو اللہ احد سے محبت کرتا ہوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''تمہاری اس سورت سے محبت تمہیں جنت میں داخل کرے گی''(ترمذی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو بالمعنی نقل کیا ہے۔''

تشریح: **وعن أنس قال : ان رجلاً** : میرک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: اس کا نام کلثوم ہے۔ایک قول یہ ہے کہ اس کا ''کرزم'' ہے، پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

قال یا رسول اللہ انی أحب ھذہ السورۃ : یعنی اس کی قراءت کرنا اور سننا۔(**قل ھو اللہ احد** :اس کی تفسیر ہے یا بدل ہے۔ **قال ان حبك ایاھا أدخلك الجنة** : یہ تجھ کو جنت کے بلند درجات میں لے جائے گی۔طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: اگر آپ کہیں کہ اس جواب اور پچھلی حدیث والے جواب میں کیا موافقت ہے؟ "**أخبروہ أن اللہ یحبه**''. میں کہتا ہوں: یہ جواب اس جواب کا نتیجہ ہے۔جب اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرے گا، تو اس کو جنت میں داخل کردے گا۔یہ کلام کی باریکی اور بلاغت ہے، پہلے قول میں صرف سبب پر اکتفاء کیا گیا ہے مسبّب کو چھوڑ دیا ہے۔دوسرے میں اس کے برعکس ہے۔وہ خوبصورتی اور حسن میں بہت زیادہ ہے۔ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے عجیب دغریب بات کہی ہے، اشارہ کا گمان ہے کہ وہاں دخول حقیقی ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا ثمرہ اس میں ہے کہ جنت میں دخول اللہ تعالیٰ کی محبت اپنے بندے کے ساتھ اس کا نتیجہ ہے۔

معناہ :اس میں مصنف پر اعتراض ہے، اور اس کا دفاع کیا گیا ہے۔حصن میں ''خاء'' اور ''ثاء'' کے ساتھ اشارہ ہے۔

میرک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: دونوں ہی حدیث انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: **"قال : کان رجل من الأنصار یؤمھم فی مسجد قباء. وکان کلما افتتح بسورۃ یقرأ بھا لھم فی الصلٰوۃ مما یقرأ به افتتح بقل ھو اللہ أحد، حتی یفرغ منھا، ثم یقرأ سورۃ أُخری معھا، وکان یصنع ذلك فی کل رکعة فکلمه اصحابه انك تفتتح بھذہ السورۃ ثم لاتری انھا تجزی حتی تقرأ أُخری، فاما ان تقرأ بھا واما ان تدعھا وتقرأ اخری، فقال ما أنا تبارکھا ان أحببتم ان أومکم بذلك فعلت وان کرھتم ترکت، وکانوا یرون أنه من أفضلھم وکرھوا ان یؤمھم غیرہ، فلما اتاھم النبی ﷺ أخبروہ الخبر فقال : یا فلان ما منعك ان تفعل ما یامرك به اصحابك؟ وما یحملك علی لزوم ھذہ السورۃ فی کل رکعة فقال : انی أحبھا فقال : حبك ایاھا أدخلك الجنة".** پھر کہا کہ آپ جان لیں! اس حدیث کو امام بخاری نے معلق

ذکر کیا ہے، ترمذی نے موصولاً ذکر کیا ہے، اس حدیث کو بزار اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔ اس حدیث کو حسن صحیح ہے۔

۲۱۳۱: وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلَمْ تَرَ اٰيَاتٍ اُنْزِلَتِ اللَّيْلَةَ لَمْ يُرَ مِثْلُهُنَّ قَطُّ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ وَقُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ١/٥٥٧ حديث رقم (٢٦٤- ٨١٤)- والترمذي في السنن ٥/١٥٧ حديث رقم ٢٩٠٢- والنسائي ٢/١٥٨ حديث رقم ٩٥٤-

ترجمہ: "حضرت عقبہ ابن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا" آج کی رات ایسی عجیب آیتیں اتاری گئی ہیں کہ ان جیسی پہلے نہیں دیکھی گئیں اور وہ قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس ہیں۔" (مسلم)

تشریح: **وعن عقبة بن عامر قال : قال رسول الله ﷺ الم تر** : اکثر نسخوں میں معروف صیغہ کے ساتھ ہے۔ ابن الملکؒ کہتے ہیں: کہ "الا راء ة" سے مبنی علی المجہول ہے یعنی **الم تعلم**؟ ابن حجرؒ کہتے ہیں: یعنی اے نیک انسان، چونکہ اس کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خطاب عام ہے۔ درست بات یہ ہے کہ خطاب راوی کو خاص ہے، اور اس سے مراد عام ہے۔ (**آیات انزلت** : آیات کی صفت ہے۔

الليلة : ظرف ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: تعجب ہے اور تعجب کی طرف اشارہ اس قول کے ساتھ ہے۔

لم یر مثلهن : اس باب میں وہ یہ صیغہ مجہول کے ساتھ ہے "**رفع مثلهن**". ایک نسخہ میں مخاطب کے ساتھ صیغہ فاعل ہے "**نصب مثلهن**" (**قط** : ماضی منفی کی تاکید کے لئے ہے۔ **قل اعوذ برب الفلق** [الفلق : ١] اور **قل اعوذ برب الناس**) [الناس : ١] شریر کے شر سے بچنے کے لئے آیات اور پوری سورتیں قاری کے لئے ان سورتوں کی مثل اور نہیں ہیں۔ ظاہر کہ بسم اللہ ان دونوں سورتوں کی آیات میں سے نہیں ہے۔

ہمارے اصحاب میں سے محققین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ سورتوں میں فصل کے لئے ہے۔ آپ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ جنوں اور انسانوں کی نظر بد سے پناہ مانگا کرتے تھے' جب یہ سورتیں نازل ہو گئیں، تو آپ ﷺ نے ان کے سوا دوسرے تمام اذکار کو چھوڑ دیا، اور ان کو اپنا لیا۔ جب آپ ﷺ پر جادو کیا گیا، تو ان دو سورتوں کے ساتھ ہی آپ کو شفاء ملی۔

ابن الملکؒ کہتے ہیں: یہ اس پر دلالت ہے کہ معوذتین قرآن کا حصہ ہیں، بعض اس کے خلاف ہیں یعنی انہوں نے اس کو قرآن پاک کا حصہ شمار نہیں کیا۔ جواہر الفقہ میں ہے: وہ کفر کا مرتکب ہ جس نے معوذتین کا قرآن ہونے سے بغیر تاویل کے انکار کیا۔ بعض متاخرین کہتے ہیں: کافر ہے تاویل کی ہو یا نہ کی ہو۔ بعض فتاویٰ میں معوذتین کا قرآن ہونے سے انکار کرنے پر مشائخ میں اختلاف ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ کفر ہے جیسا کہ "مفتاح السعادۃ" میں ہے۔ صحیح بات یہ ہے جو آدمی نے "خلاصہ" میں کہی ہے، اس نے کہا: معوذتین قرآن کا حصہ نہیں ہیں، جس نے یہ کہا وہ کفر کا مرتکب نہیں ہے۔ یہ عبداللہ بن مسعودؓ اور ابی بن کعبؓ سے روایت کیا گیا ہے، انہوں نے کہا "**ليستا من القرآن**"، بعض متاخرین کہتے ہیں: وہ کفر کرتا ہے اس لیے کہ یہ اجماع ہے کہ وہ قرآن کا حصہ ہیں۔ پہلا قول صحیح ہے کہ وہ کفر نہیں کرتا۔ اجماع بعد میں ہے شروع میں اختلاف کو دور نہیں کیا گیا۔

ابن حجرؒ کہتے ہیں: حدیث نے اس قول کو فائدہ دیا ہے کہ معوذتین قرآن پاک کا حصہ ہیں، اس پر امت کا اجماع ہے۔ اور جو ابن مسعود سے نقل کیا گیا ہے۔ یا تو ان پر جھوٹ ہے یا صحیح ہے۔ جیسا کہ بعض حفاظ نے کہا ہے لیکن انہوں نے اپنے علم کے اعتبار سے نفی کی

ہے، پھران کی نفی کے خلاف اجماع بھی ہے۔اور لفظ ''قل'' جو بسم اللہ کے بعد ہے قرآن پاک کی سورتوں میں یہ قرآن پاک کا حصہ ہیں، اس پرامت کا اجماع ہے۔

سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کے ذریعے دم کرنا

۲۱۳۲: وَعَنْ عَآئِشَةَ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ اِذَا اَوٰى اِلٰى فِرَاشِهٖ كُلَّ لَيْلَةٍ جَمَعَ كَفَّيْهِ ثُمَّ نَفَثَ فِيْهِمَا فَقَرَأَ فِيْهِمَا قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ وَقُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ وَقُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ثُمَّ يَمْسَحُ بِهِمَا مَا اسْتَطَاعَ مِنْ جَسَدِهٖ يَبْدَأُ بِهِمَا عَلٰى رَأْسِهٖ وَوَجْهِهٖ وَمَا اَقْبَلَ مِنْ جَسَدِهٖ يَفْعَلُ ذٰلِكَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ۔ (متفق عليه) **وسنذكر حديث ابن مسعو د لما اسرى برسول الله ﷺ فى باب المعراج ان شاء الله تعالى.**

اخرجه البخارى فى صحيحه ٦٢/٩۔ حديث رقم ٥٠١٧۔ والترمذى فى السنن ٤٤١/٥ حديث رقم ٣٤٠٢ وابن ماجه ١٢٧٥/٢ حديث رقم ٣٨٧٥۔ واحمد فى المسند ١١٦/٦۔

ترجمه: ''سیّدہ عائشہؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ روزانہ رات کو جب اپنے بستر پر تشریف لے جاتے تو اپنے دونوں ہاتھ ملا کر قل ھواللہ احد' قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس پڑھ کر ان پر پھونک مارتے اور پھر اپنے دونوں ہاتھ اپنے جسم پر جہاں تک ہوسکتا پھیرتے پہلے آپ ﷺ اپنا ہاتھ' اپنے سر' منہ اور بدن کے آگے حصہ پر پھیرتے آپ ﷺ یہ عمل تین مرتبہ کرتے تھے۔'' (بخاری ومسلم)

تشریح: وعن عائشة ان النبى ﷺ كان اذا اوٰى : قصر اور مدّ کے ساتھ۔

الى فراشه : یعنی آتے اور اس پر ٹھہرتے۔(**كل ليلة جمع كفيه ثم نفث فيهما :** کہا گیا ہے کہ **نفث** سے مراد وہ ہوا جو منہ سے نکالی جاتی ہے، جس کے ساتھ کچھ تراوٹ وغیرہ ہوتی ہے۔ جزری مفتاح میں کہتے ہیں: **نفث ''نفخ''** کے مشابہ ہے، اور یہ **''تفل''** سے کم ہے۔**''تفل''** کے ساتھ تھوک وغیرہ ہوتا ہے۔اس کی موافقت ہدایہ اور قاموس میں ہے۔(**فقرأ :** یعنی **''نفث''** کے بعد۔ (**فيهما :** دونوں ہتھیلیوں میں۔(**قل هو الله أحد''** [الاخلاص :١] **و ''قل اعوذ برب الفلق''** [الفلق :١] **و ''قل اعوذ برب الناس''** [الناس :١]): طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: اس حدیث میں دلالت ہے کہ نفث قراءت سے پہلے ہے۔ایک قول ہے: جادو کی مخالفت ہے، یا معنی یہ ہے یا بالمعنی پھر ''نفث'' کا ارادہ کیا، پھر پڑھا' پھر ''نفث'' والا عمل کیا۔مصابیح کے بعض شارحین نے کہا ہے۔صحیح بخاری میں وقراء ہے اور یہی بہتر ہے کیونکہ ''نفث'' کی قراءت پر تقدیم اس بحث میں سے ہے جو کسی نے نہیں کہی۔ یہ واؤ سے نہیں ''خاء'' سے لازم آتا ہے۔یا ''فاء'' راوی یا کاتب کا سہو (بھول) ہے۔

ابن الملکؒ کہتے ہیں: راویوں نے غلطی کی ہے جو انہوں نے ان کے لے رائے سے پیش کیا اس نے غلطی کی اس سے عدول کر کے انہوں نے نے غلطی کی ہے۔کیوں نہیں، انہوں نے اس ''فا'' کو اس پر قیاس کیا جو اس قول میں ہے: ﴿**فاذا قراء ت القرآن فاستعذ بالله**﴾ [النحل : ٩٨] (**فتوبوا الى بارئكم**) [البقرة : ٥٤] اس پر کہ توبہ قتل سے مؤخر ہے۔معنی یہ ہے کہ اپنی ہتھیلیوں کو اکٹھا کیا، پھر ان دونوں میں پھونکا، پھر اس پر پڑھا (قراءت کی)، رہا یہ قول کہ توبہ قتل سے مؤخر ہے، اس کی کوئی وجہ نہیں، چونکہ ان کی توبہ کی علامت تھی یا شرط تھی۔ابن حجرؒ کہتے ہیں: ''ثم'' کے ساتھ عطف ان دونوں میں ''نفث'' کی ترتیب کے لے ہے، پھر ''فاء'' ہے تاکہ بتلایا جائے یہ **نفث** اکیلا نہیں ''ریق'' کے ساتھ ہے۔اور قراءت بھی ساتھ ہے۔یہ ابتدائے نفث پر مرتب اور بقیہ کے ساتھ ملانے کے لئے ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: اس نے دعویٰ کیا ہے کہ صحیح بخاری کی حدیث واؤ کے ساتھ مردود ہے، چونکہ اس میں ''فاء'' کے ساتھ ہے۔

احتمال ہے کہ صحیح نسخہ میں ہو،مثبت منفی پر مقدم ہے۔(**ثم یمسح بھما ما استطاع من جسدہ یبدأ** : بیان کے لئے یا یسمع سے بدل ہے۔(**بھما** :یعنی ان دونوں کو چھونے کی وجہ سے۔(**علی رأسہ ووجھہ وما أقبل من جسدہ** :یعنی یا اس کے الٹ ہے۔ (**یفعل ذلك ثلاث مرات : متفق علیہ** : جزری حصن میں کہتے ہیں: اسے امام بخاری اور چاروں ائمہ نے روایت کیا ہے۔واللہ اعلم

وسنذکر حدیث ابن مسعود لما أسری برسل اللّٰہ ﷺ فی باب المعراج ان شاء اللّٰہ تعالٰی : یا تو وہ تکرار کی وجہ سے یا وہ اس باب میں زیادہ لائق ہے۔واللہ اعلم بالصواب۔میں یہاں حدیث کو شرح کے ساتھ ذکر کرتا ہوں جو مصابیح میں نہیں ہے۔وہ حدیث ابن الملکؒ نے بیان کی ہے کتاب کے فائدہ کے تتمہ کے لئے ہے۔**لما أسری برسول اللّٰہ مجھول** ۔ ''**اسری یسر اذا سری لیلاً**'' یہاں مراد لیلۃ المعراج ہے۔اس کی انتہاء سدرۃ المنتہٰی تک ہے۔یہ جنت میں درخت ہے جہاں اولین وآخرین کے علم کی انتہٰی ہو جاتی ہے۔اس سے کوئی آگے نہیں بڑھتے، یا بندوں کے اعمال، یا سیر کرنے والوں کے نفوس ملأ الاعلیٰ میں۔وہ وہاں لوگوں کی اجتماعی مجلسوں میں جمع ہوتے ہیں۔اللہ تعالیٰ کے علاوہ اس کو کوئی بھی نہیں جانتا۔آپ ﷺ کو تین چیزیں دی گئیں۔پانچ نمازیں،خواتیم، سورۃ البقرۃ،اور ہر اس شخص کی مغفرت کردی گئی جو اللہ تعالیٰ کے ذرہ برابر بھی شرک نہیں کرتا،یعنی آپ ﷺ کو اپنے امت کے اہل کبائر کے متعلق سفارش عطا کی گئی ہے۔

الفصل الثانی:

۲۱۳۳:عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ ثَلَاثَۃٌ تَحْتَ الْعَرْشِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ الْقُرْاٰنُ یُحَاجُّ الْعِبَادَۃَ ظَھْرٌ وَبَطْنٌ وَالْاَمَانَۃُ وَالرَّحِمُ تُنَادِیْ اَلَا مَنْ وَصَلَنِیْ وَصَلَہُ اللّٰہُ وَمَنْ قَطَعَنِیْ قَطَعَہُ اللّٰہُ۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

اخرجہ البغوی فی شرح اسلنۃ ۱۳/ ۲۲ حدیث رقم ۳۴۳۳۔

ترجمہ:''حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''تین چیزیں قیامت کے دن عرش کے نیچے ہوں گی ایک تو قرآن جو بندوں سے جھگڑے گا اور قرآن کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن دوسری چیز امانت ہوگی تیسری چیز رحم ہوگا جو پکارے گا' خبردار: جس شخص نے مجھے بلایا (یعنی میرے حق کی رعایت کی بایں طور کہ میرے احکام کی فرمانبرداری کی جو حق اس پر ہے اسے اداء کیا) تو اللہ تعالیٰ اسے بھی ملائے گا اور جس شخص نے مجھے قطع کیا تو اللہ تعالیٰ بھی اس شخص کو قطع کرے گا۔''

تشریح: عن عبد الرحمن بن عوف عن النبی ﷺ قال : ثلاثۃ :اشیاء یا اعمال۔(**تحت العرش یوم القیامۃ** : یعنی جس دن لوگ اپنے ربّ کے سامنے کھڑے ہوں گے۔(**القرآن** :اس کو مقدم کیا گیا، کیونکہ وہ رتبہ اور عظمت کے لحاظ سے جلیل القدر ہے،اسی لئے اس کے اور معطوف کے درمیان فاصلہ ہے۔بقولہ (**یحاج العباد** :وہ ان سے اس بارے میں جھگڑا کرے گا، جو انہوں نے ضائع کیا ہوگا اور اس کے احکام اور حدود سے اعراض انہوں نے کیا ہے، یا وہ ان سے جھگڑا اور مخاصمت ان کے حقوق کی حفاظت کے لئے کرے گا، جیسا کہ گزر چکا ہے۔یا اپنے اصحاب کے بارے میں جھگڑا کرے گا، جیسا کہ حدیث میں ہے: ''**القرآن حجۃ لك أو علیك**. **عباد** کو نصب نزع عن الخافض کی وجہ سے ہے۔

لہ : یعنی قرآن مجید۔(**ظھر** : ظاہر معنی جو غور وفکر سے خالی ہے۔اکثر لوگ اس کو سمجھتے ہیں حالانکہ اکثر طور ان کے پاس سمجھنے کے قواعد وضوابط نہیں ہوتے۔(**وبطن** :یعنی خفیہ معنی جس میں خفیہ اشارات کی مدد سے تاویل کی ضرورت ہوتی ہے۔اس کو خاص علماء ہی سمجھ سکتے ہیں۔جو اپنی استعداد اور امداد حصول کے ساتھ سمجھتے ہیں۔ایک قول یہ ہے کہ اس کے ظاہر سے مراد تلاوت کرنا جیسے وہ نازل ہوا ہے

اور بطن سے مراد تدبر ہے۔ایک قول یہ بھی ہے: ظاہر سے مراد جس میں مکلفین ایمان اور عمل اور جو ان کا تقاضہ ہے،اس میں برابر ہیں، اور بطن سے مراد جو بندوں میں فہم کا تفاوت ہے۔اس کے بعد جو قول ہے''یحاج العباد بقوله ظهر و بطن'۔اس بات پر تنبیہ ہے کہ ہر ایک اتنی مقدار طلب کرے جو اس کے پاس سیکھنے کی اور سمجھنے کی استطاعت کتاب اللہ کی ہے، جملہ حالیہ ہے، جو یحاج کی ضمیر سے ہے، یعنی جس نے ظواہر اور اس کے بواطن کی پیروی کی۔یعنی اس نے بعض حقوق ربوبیت اداء کیے۔جس نے اس کو قائم کیا، تو وہ اس وجہ افضل ہے۔الأمانة : یہ ہر وہ حق جو اللہ تعالیٰ کے لئے ہے یا ایسی چیز جس کا اداء کرنا افضل ہے۔اللہ تعالیٰ کے اس قول کی تفسیر ہے ﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ﴾ [الاحزاب: ۷۲]، یا اللہ تعالیٰ کے واجب حقوق میں سے ہے، چونکہ یہ اہم ہے۔(والرحم :استعارةً لوگوں میں قرابت کے لئے لیا گیا ہے۔(تنادی :تانیث کے صیغہ کے ساتھ، یعنی صلہ رحمی کی قرابت یا ہر ایک جس کا تعلق رحم اور امانت سے ہے۔ایک قول ہے، ہر ایک کا تعلق تین سے ہے۔(ألا :حرف تنبیہ ہے۔(من وصلنی وصله الله :یعنی رحمت۔

ومن قطعنی قطعه الله :یعنی جو اس سے اعراض کرے گا۔اس میں خبر اور دعا کا احتمال ہے۔

قاضیؒ نے اس قول کے متعلق کہا ہے: ''ثلاثة تحت العرش''، یعنی اس کا اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑا اجر ہے۔جو اس پر محافظت کرے گا وہ اس کا اجر ضائع نہیں کرے گا۔یا وہ اس کو معاف نہیں کرے جس نے ان کا ضائع کیا۔یا ان سے اعراض کیا۔ان مقربین کا حال ہے جو بادشاہوں کے تخت کے پاس ہوتے ہیں۔ان سے ملنا اور ان سے اعراض کرنا، شکر اداء کرنا، ان کی شکایات کرنا اس کی بہت تاثیر ہوتی ہے۔ان تینوں کو ذکر کے ساتھ خاص کیا گیا ہے، کیونکہ انسان جو بھی کام کرتا ہے یا تو اس کا تعلق اللہ اور بندے کے ساتھ ہے، کسی غیر کا اس میں کوئی تعلق نہیں، یا اس کے اور عامل لوگوں کے درمیان ہو یا اس کے اور اس کے عزیز واقارب اور اہل کے درمیان ہو۔ قرآن اسے حق ربوبیت کی ادائیگی کی طرف چلاتا ہے، امانت عام لوگوں کو شامل ہے۔ان کے خون، اموال، ان کی عزتیں اور تمام حقوق ان کے درمیان امانتیں ہیں، جس نے ان کو قائم کیا، اس نے عدل کیا۔جس نے صلہ رحمی کو ملایا، اقارب کا خیال رکھا، یعنی ان کے ساتھ دنیاوی امور میں اور دینی میں احسان کیا، تو اس نے ان کے حقوق کو ادا کر دیا۔قرآن کو مقدم رکھنے کی وجہ اِس لئے کہ حقوق اعظم ہیں، اور دوسروں دونوں کو بھی شامل ہے۔اس کے بعد امانت ہے، وہ رحم سے اعظم ہے اور وہ ادائے حق رحم پر مشتمل ہے، اور رحم کو صراحتاً ذکر کیا گیا ہے، یہ پہلے دو حکموں کو شامل ہے، اور اس بات پر تنبیہ ہے کہ حقوق العباد کا بہت زیادہ خیال رکھو۔

جزریؒ کہتے ہیں: اس کی اسناد میں کثیر بن عبداللہ ہے وہ بہت کمزور ہے۔

۲۱۳۴:وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُقَا لُ لِصَاحِبِ الْقُرْاٰنِ اِقْرَأْ وَارْ تَقِ وَرَتِّلْ كَمَا كُنْتَ تُرَتِّلُ فِي الدُّ نْيَا فَاِنَّ مَنْزِلَكَ عِنْدَ اٰخِرِ اٰيَةٍ تَقْرَؤُهَا۔ (رواه احمد والترمذی وابوداود او لنسائی)

اخرجه ابوداوٗد فی السنن ۱۵۳/۲ حدیث رقم ۱٤٦٤۔ والترمذی ۱۷۷/۵ حدیث رقم ۲۹۱٤۔ واحمد فی المسند ۱۹۲/۲۔

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا'' (قیامت کے دن) صاحب قرآن سے کہا جائے گا کہ پڑھتا جا اور چڑھتا جا اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھ جیسا کہ تو دنیا میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھتا تھا پس جہاں تو آخری آیت پڑھے گا وہیں تیری منزل ہوگی۔'' (احمد' ترمذی' ابوداوٗد' نسائی)

تشریح: وعن عبد الله بن عمرو قال : قال رسول الله ﷺ يقال :یعنی جنت میں داخل ہونے کے وقت۔عاملین کو ان کے اعمال کے مراتب کے لحاظ متوجہ کیا جائے گا۔(لصاحب القران :یعنی جو تلاوت کرنا اور اس پر عمل کرنے کو لازم سمجھتا ہے نہ کہ وہ جو اس کو پڑھتا ہے اور وہ اس پر لعنت کرتا ہے۔(اقرأ وارتق :یعنی جنت کے درجات کی طرف یا قرب کے مراتب کی طرف۔ورتل :

یعنی جنت میں اپنی قراءت پر جلدی نہ کر یہ صرف لذت کے لئے ہے۔ اور بہت بڑا شہود ہے جیسے فرشتوں کی عبادت۔ **کما کنت ترتل :** یعنی تیری قراءت۔ اس میں اشارہ ہے کہ اعمال کی جزاء کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے ہے۔ (**فی الدنیا :** تجوید حروف، علوم قرآن اور معارف قرآن کی معرفت کے ساتھ۔

فان منزلك عند آخر آية تقرؤها : حدیث میں وارد ہے کہ جنت کے درجات قرآن پاک کی آیات کی گنتی کے برابر ہیں۔ حدیث میں ہے: "**من اهل القرآن فليس فوقه درجة فالقراء يتصاعدون بقدرها**".دانی کہتا ہے: اس بات پر اجماع ہے کہ تعدد آیات (6000) ہے۔ پھر اس سے زیادہ ہونے میں اختلاف ہے۔ ایک قول ہے: (204) آیات ہیں۔ ایک قول پندرہ، ایک قول اُنیس۔ ایک قول (25) ایک قول (36) آیات ہیں۔ دیلمی والی حدیث کی سند میں کذاب راوی ہے۔ جنت کے درجات قران مجید کی آیات کے برابر ہیں۔ ہر آیت کے بدلے درجہ ہے۔ آیات کی تعداد 6 ہزار 2 سو سولہ ہے۔ ہر درجہ کے درمیان زمین و آسمان جتنا فاصلہ ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: چڑھنے سے مراد وہ ہمیشہ چڑھتا جائے گا۔ جب اس کی قراءت اختتام کے قریب پہنچے گی، تو وہ دوبارہ شروع کردے گا، جس کا کوئی انقطاع نہیں، وہ اسی طرح قراءت کرتا ہوا چڑھتا جائے گا، جس کی کوئی انتہاء نہیں۔ یہ اس کی قراءت فرشتوں کی تسبیح کی طرح ہے، یہ تسبیح کی لذت بڑی عظیم ہے، یہ ان کو کسی اور کام میں مشغول نہیں کرتی۔

ابن حجرؒ کہتے ہیں: اس حدیث سے یہ مسئلہ اخذ ہوتا ہے کہ یہ عظیم ثواب حافظ قرآن کو حاصل ہوگا، جس نے اس کی اداء اور قراءت کو پختہ کیا، جیسے اس کی شایان شان ہے۔ اگر آپ کہیں کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ صرف حافظ کے لیے ہے، وہ شخص نہیں جس نے مصحف کی قراءت کو لازم پکڑا۔ میں کہتا ہوں: اصل میں جنت میں اس کی حکایت کی گئی ہے، جو وہ دنیا میں کرتا تھا۔ (**فی الدنیا :** اس پر صریح ہے کہ اس کا قراءت کو لازم اختیار کرنا محل نظر ہے، اس کو مطلق حافظ قرآن نہیں کہا جا سکتا۔ یہ صرف اس کو کہا جائے گا جو کسی بھی حالت میں قرآن سے جدا نہیں ہوتا۔ احمد کی روایت میں ہے کہ صاحب قرآن سے کہا جائے گا: "**اذا دخل الجنة اقرأوا صعد، فيقرأ ويصعد بكل آية درجة حتى يقرأ شيأ معه**". "**معه**" اس بات کی صراحت ہے کہ وہ حافظ ہو۔

رامہرمزی نے حدیث نقل کی ہے: "**فاذا قام صاحب القرآن يقراته أناء الليل وأناء النهار ذكره وان لم يقم به نسيه**". بخاری وغیرہ نے روایت کیا ہے: "**من قرأ ثم مات قبل ان يستظهره اتاه ملك ليعلمه فى قبره ويلقى الله وقد استظهره**".طبرانی اور بیہقیؒ کی حدیث میں ہے: "**من قرأ القرآن وهو يتلفت منه ولا يدعه فله آجره مرتين، ومن كان حريصا عليه ولا يستطيعه ولا يدعه بعثه الله يوم القيامة مع أشراف أهله**".حاکم وغیرہ نے روایت بیان کی ہے: "**من قرأ القرآن فقد استدرج النبوة بين جنبيه غيرانه لا يوحى اليه لا ينبغى لصاحب القرآن ان يجهل مع من يجهل وفى جوفه كلام الله**".

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: اس کی منزلت جو حدیث میں ہے تو بندہ اس کو حفظ میں اور تلاوت جو منزلت ہوگی، اس اعتبار سے ہوگا اس کے علاوہ نہیں، یہ ہم نے اصل دین سے سمجھا ہے۔ کتاب اللہ پر عمل کرنے والا۔ اور اس پر تدبر کرنے والا حافظ سے بہتر ہے، جب وہ (حافظ) عمل اور تدبر نہ کرے۔ صحابہ کرام میں صدیقؓ سے زیادہ حافظ کون تھا؟ اور اکثر تلاوت ان سے ثابت ہے۔ وہ ان سے مطلق افضل ہیں۔ اس لئے کہ ان پر اس کے علم میں سبقت، تدبر اور عمل میں سبقت کی وجہ سے ہے۔ اگر ہم دوسرے کی طرف جائیں، تو وہ دو جہتوں کے ساتھ مکمل ہے۔ درجات سے مراد آیات کے ساتھ ان کا مستحق ہوگا، تو اس وقت تلاوت کی مقدار عمل کے برابر ہے۔ کوئی بھی

ایک آیت پڑھنے کی تلاوت کرے استطاع نہیں رکھتا، مگر جس نے اس کے وجوہات کا لحاظ رکھا، اور اس کے استعمال کو ملحوظ رکھا۔ یہ نبی ﷺ کے لئے ہے پھر اس کے بعد آپ ﷺ کی امت کے لیے ہے، ان کے مراتب ومنازل دین میں اور معرفت یقین کے ساتھ ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے اس کی قراءت کی مقدار کو تدبر اور عمل کے لحاظ سے لازم کرلیا۔

یہ انتہا درجے کی خوبصورتی اور حسن ہے۔ نہایت درجے کی وضاحت اور جلاء ہے۔ ابن حجرؒ کے طعن اور کلام میں تضعیف کی کوئی حیثیت نہیں۔ انہوں نے اس کو تکلف اور حدیث کے ظاہر کے منافی قرار دیا ہے۔ پس تحقیق جیسا کہ حدیث سے مستفاد ہے، اور **أن من عمل بالقرآن فکانه یقراء ہ دائماً وان لم یقرأہ ومن لم یعمل بالقرآن فکانه لم یقرأہ وان قرأہ دائما**"۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ [ص : ۲۹] "(یہ) کتاب جو ہم نے تم پر نازل کی ہے بابرکت ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں اور تاکہ اہل عقل نصیحت پکڑیں" صرف تلاوت اور حفظ کا اعتبار نہیں کہ اس پر جنت عالیہ کے مراتب ملیں گے۔

هذا حديث حسن صحيح : اسی طرح امام ترمذی نے ابو ہریرہؓ سے حسن درجے کی روایت بیان کی ہے:

"**فیقول القرآن یا رب : حله فیلبس تاج الکرامة فیقول یا رب زدہ فیلبس حلة الکرامة فیقول یا رب ارض عنه فیرضی عنه ویقال له اقرأ وارق**"۔

قرآن کریم سے خالی دِل ویران گھر کی طرح ہے

۲۱۳۵: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ الَّذِیْ لَيْسَ فِیْ جَوْفِهٖ شَیْءٌ مِّنَ الْقُرْاٰنِ كَالْبَيْتِ الْخَرِبِ۔ (رواہ الترمذی والدارمی وقال الترمذی هذا حدیث صحیح)

ترجمہ: "حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "جس شخص کے دل میں قرآن کا کچھ حصہ نہ ہو تو وہ ویران گھر کی طرح ہے۔" (ترمذی' دارمی) امام ترمذیؒ کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔"

تشریح: **وعن ابن عباس قال : قال رسول اللّٰه ﷺ، ان الذی لیس فی جوفه** : یعنی اس کا دل۔

شیء من القرآن کالبیت الخرب : "خاء" کے فتحہ اور راء کے کسرہ کے ساتھ، ایک نسخہ میں ہے۔ یعنی خراب، چونکہ دل کی آبادی ایمان کے ساتھ ہے۔ قراءۃ قرآن، باطن کو اعتقادات حق کے ساتھ مزین کر کے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر غور وفکر کرنے کے ساتھ ہے۔

طیبیؒ کہتے ہیں: **جوف** کا اطلاق کر کے دل مراد لیا ہے۔ یہ اسم محل کا اطلاق ہے حال پر اور کبھی کبھی حقیقی معنی کے لیے بھی مستعمل ہے۔

ما جعل اللّٰه لرجل من قلبین فی جوفه [الاحزاب : ٤]: اس کو ذکر کرنے کی ضرورت اس لئے تھی، تاکہ تشبیہ خراب گھر کے ساتھ مکمل ہو جائے۔ بے شک قرآن کا جوف میں جمع کرنا، گویا اس کو آباد کرنا اور اس کی قلت وکثرت کے لحاظ سے مزین کرنا ہے۔ جب اس سے خالی ہوگا، تو گویا تصدیق، اعتقادِ حق، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں تفکر اور اس کی محبت وصفات سے خالی ہوگا جس کے بغیر چارہ نہیں، اس وقت یہ دل اُجڑے گھر کی طرح ہے، جو خوبصورتی اور تجمل سے فارغ ہوتا ہے۔ اسی طرح جب قرآن سے گھر خالی ہو، تو اس پر خراب کا ظہور ہوگا۔ ابن حجرؒ نے اس پہلو سے غفلت برتی ہے اور کہ حفظ قرآن کی نفی اور اثبات پر محمول کیا ہے، اور ایسا اعتراض کیا ہے جو اس کے مناسب نہیں ہے۔

www.KitaboSunnat.com

۲۱۳۶: وَعَنْ اَبِیْ سَعِيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ الرَّبُّ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی مَنْ شَغَلَهُ الْقُرْاٰنُ عَنْ ذِكْرِیْ

وَمَسْأَلَتِیْ اَعْطَیْتُهٗ اَفْضَلَ مَا اُعْطِی السَّائِلِیْنَ وَفَضْلُ كَلَامِ اللّٰهِ تَعَالٰی عَلٰی سَائِرِ الْكَلَامِ كَفَضْلِ اللّٰهِ عَلٰی خَلْقِهٖ.

(رواه الترمذی والدارمی والبیهقی فی شعب الایمان وقال الترمذی هذا حدیث حسن غریب)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵/۱۸۴ حدیث رقم ۲۹۲۶۔ والدارمی فی السنن ۲/۵۳۳ حدیث رقم ۳۳۵۶۔

ترجمہ: ''حضرت ابوسعیدؓ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ'' اللہ بزرگ و برتر فرماتا ہے کہ جس شخص کو قرآن کریم میرے ذکر اور مجھ سے مانگنے سے مشغول رکھتا ہے تو میں اس کو اس چیز سے بہتر عطا کرتا ہوں جو سوال کرنے والوں کو عطا کرتا ہوں' اور کلام اللہ کو دیگر تمام کلاموں کے مقابلہ میں وہی عظمت و بزرگی حاصل ہے جو اللہ رب العزت کو اس کی تمام مخلوقات پر بزرگی اور برتری حاصل ہے۔ترمذی' دارمی' بیہقی نیز امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔''

تشریح: وعن أبی سعید الخدری قال : قال رسول الله ﷺ یقول رب تبارك وتعالٰی من شغله القرآن : یعنی اس کو حفظ کیا، معانی پر تدبر کیا، اور اس کے احکامات پر عمل کیا۔

عن ذکری ومسألتي أعطیته : صیغہ متکلم کے ساتھ۔ایک قول ہے: قرآن کو اپنے واجبات اور حقوق کے ساتھ قائم کیا، مسألتي عطف تفسیری ہے۔شیخ عارف ابوعبداللہ بن خفیف قدس اللہ سرہ سے منقول ہے کہ شغل قرآن سے مراد اس کے واجبات کو قائم کرنا یعنی فرائض کو بجالانا اور محارم سے اجتناب کرنا ہے، جب آدمی اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے، گویا کہ یہ اس کا ذکر ہے اگرچہ وہ صوم وصلاۃ بھی ادا کرے، اگر وہ اس کی نافرمانی کرے گا، وہ اس کو بھلا دے گا، اگرچہ اس کی نمازیں اور روزے کثرت کے ساتھ ہوں۔ایک قول یہ بھی ہے کہ ذکر اور مسئلہ سے مراد وہ دونوں قرآن میں نہیں ہیں، جیسے دعوات وغیرہ اس قول کے قرینہ سے:

وفضل کلام الله : یہ الکلام النفی پر دلالت ہے، اس کا شرف مدلول کے اعتبار سے ہے۔

علی سائر الکلام کفضل الله علی خلقه : جس طرح اشتغال اور المشتغل بہ کی فضیلت کسی دوسرے پر ہے۔ذاکرین اور سائلین کے ذکر سے مستغنی کرنے کی وجہ کہ وہ بالجملہ سائل بالفعل اور بالقوۃ ہیں، جب کہ زبان کا حال کہ ہر مخلوق ناطق ہے، کہ وہ اچھی نعمت کی طرف اس کو پھیلانے کی محتاج ہے، اس کی ایجاد کے بعد۔یہ فضیلت اسی لحاظ سے ہے مگر اس کا محل جو اس کے علاوہ اذکار اور ادعیہ مذکورہ مشروع نہیں ہیں۔حدیث میں قرآن کے مقدم ہونے کی طرف اشارہ ہے، جیسا کہ وہ محدثین اور مفسرین کا مذہب ہے، اور مخالف محدثین پر رد ہے۔

میرک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: اس کا احتمال ہے کہ یہ قول اللہ تعالیٰ کے قول کا تتمہ ہو، تو اس وقت اس میں التفات ہے، جیسا کہ مخفی نہیں ہے۔اس بات کا بھی احتمال ہے کہ وہ نبی ﷺ کا کلام ہو یہ زیادہ واضح ہے، چونکہ التفات کا مرتکب ہونے کی ضرورت نہیں۔امام بخاریؒ سے نقل کیا گیا ہے کہ یہ ابوسعید خدریؓ کا کلام ہے۔اس کو حدیث میں مدرج ذکر کیا ہے۔مرفوع ہونا ثابت نہیں۔

عسقلانیؒ کہتے ہیں: عطیہ عوضی کے سوا تمام راوی ثقہ ہیں، اس راوی میں ضوف ہے۔

وقال الترمذی هذا حدیث حسن غریب : میرک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: دارمی میں یہ الفاظ ہیں: ''من شغله ذکری عن مسألتي''. ''ذکری'' سے مراد معنی عام ہے یا خاص، وہ ظاہر ہے کہ جمع السب ہے، یہ استفادہ اضافت تشریفیہ سے ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿هذا ذکر مبارك أنزلناه﴾ [الانبیاء: ۵۰]۔

۲۱۳۷: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ قَرَأَ حَرْفًا مِّنْ كِتَابِ اللّٰهِ فَلَهٗ بِهٖ حَسَنَةٌ وَالْحَسَنَةُ

بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا لَا اَقُوْلُ الٓمّٓ حَرْفٌ اَلِفٌ حَرْفٌ وَّلَامٌ حَرْفٌ وَمِيْمٌ حَرْفٌ.

(رواه الترمذی والدارمی وقال الترمذی هذا حديث حسن صحيح غريب اسنادا)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۷۵/۵ حديث رقم ۲۹۱۰۔ والدارمی فی السنن ۵۲۱/۲ حديث رقم ۳۳۰۸۔

ترجمہ: ''حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''جو شخص قرآن کا ایک حرف پڑھے تو اس کے لئے ہر حرف کے عوض ایک نیکی ہے اور ایک نیکی دس نیکیوں کے برابر ہے میں یہ نہیں کہتا کہ سارا الٓمٓ ایک حرف ہے الف ایک حرف ہے لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے (ترمذی' دارمی) اور امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث سند کے اعتبار سے حسن صحیح غریب ہے۔''

تشریح: **وعن ابن مسعود قال : قال رسول اللہ ﷺ من قرأ حرفا :** یعنی آنے والے حرف سے جو جدا ہونے کے قابل یا یہ تمثیلاً مراد ہے۔

من كتاب الله : یعنی قرآن پاک۔ **فله به حسنة :** یعنی عطیہ۔

والحسنة بشر امثالها : یعنی اس کو دس گنا بڑھایا جاتا ہے۔ یہ سب سے کم بڑھانا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ فرمان ہے:

﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا﴾ [الانعام : ١٦٠] ﴿وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ [البقرة : ٢٦١] حرف کا اطلاق مطلق حروف تہجی اور معانی پر ہے۔ جملہ مفیدہ اور مختلف کلمات اس کی قراءت میں ہیں، اور مطلق کلمہ ہے اس لئے آپ ﷺ نے فرمایا۔

لا أقول آلٓم حرف الف : مکائی اعراب کے ساتھ سکون پر مبنی ہے۔ ایک قول تنوین کے ساتھ ہے۔

حرف، ولام حف، وميم حرف : طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: مسمّٰی ''الف'' حرف ہے۔ اسم تین حروف پر ہوتا ہے۔ اسی طرح مسمّٰی میم اور ''مه'' حرف ہے۔ جب اس کو مقرر کیا، تو لفظ میم اس مسمّٰی کے لئے قرار دیا گیا، حرف کو حدیث میں مجازی طور پر مذکورات پر محمول کیا گیا ہے۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے قول: **''ضرب الله مثلاً''** ان میں سے ہر ایک ''ض' ر' ب'' اس پر اگر مراد الم سے سورۃ الفیل کا آغاز ہو تو نیکیوں کی تعداد تیس ہوگی۔ اگر مراد سورۃ البقرۃ یا اس کے ہم مثل سورتیں ہوں تو گنتی نوے (90) ہے۔ سورہ فیل کے شروع میں جو حروف ہیں، ان نیکیوں کی تعداد تیس ہے جیسا کہ وہ مختصر عبارت ہے۔ یہ مراد نہیں کہ لفظ حدیث دونوں کو متحمل ہے۔ چونکہ ابن ابی شیبہ اور طبرانی کی روایت میں صراحتاً ہے: **''من قرأ حرفا من القرأن كتب له به حسنة له أقول (اتمّ ذٰلك الكتاب) ولكن الالف، واللام والميم، والذال، واللام، والكاف''**. اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حساب میں اعتبار حروف کا ہے لفظوں کا نہیں ہے۔ بیہقی کی روایت میں ہے:

''لا أقول بسم الله ولكن باء وسين وميم. ولا أقول آلٓم ولكن الالف، واللام، والميم''.

یعنی اس کا متن غریب نہیں، بس سند غریب ہے اور کہا کہ بعض نے اس کو موقوف قرار دیا ہے۔

قرآن پر عمل باعثِ نجات ہے

۲۱۳۸: وَعَنِ الْحَارِثِ الْاَعْوَرِ قَالَ مَرَرْتُ فِى الْمَسْجِدِ فَاِذَا النَّاسُ يَخُوْضُوْنَ فِى الْاَحَادِيْثِ فَدَخَلْتُ عَلٰى عَلِيٍّ فَاَخْبَرْتُهٗ فَقَالَ اَوَ قَدْ فَعَلُوْهَا قُلْتُ نَعَمْ قَالَ اَمَا اِنِّىْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ اَلَا اِنَّهَا سَتَكُوْنُ فِتْنَةٌ قُلْتُ مَا الْمَخْرَجُ مِنْهَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ كِتَابُ اللّٰهِ فِيْهِ نَبَاُ مَا قَبْلَكُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ وَحُكْمُ مَا بَيْنَكُمْ هُوَ الْفَصْلُ لَيْسَ بِالْهَزْلِ مَنْ تَرَكَهٗ مِنْ جَبَّارٍ قَصَمَهُ اللّٰهُ وَمَنِ ابْتَغَى الْهُدٰى فِىْ غَيْرِهٖ

اَضَلَّهُ اللّٰهُ وَهُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ وَهُوَ ذِكْرُ الْحَكِيْمِ وَهُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيْمُ وَهُوَ الَّذِىْ لَا تَزِيْغُ بِهِ الْاَهْوَاءُ لَا تَلْتَبِسُ بِهِ الْاَلْسِنَةُ وَلَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ وَلَا يَخْلُقُ عَنْ كَثْرَةِ الرَّدِ وَلَا يَنْقَضِىْ عَجَائِبُهُ هُوَ الَّذِىْ لَمْ تَنْتَهِ الْجِنُّ اِذَا سَمِعَتْهُ حَتّٰى قَالُوْا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا يَّهْدِىْ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهِ مَنْ قَالَ بِهِ صَدَقَ وَمَنْ عَمِلَ بِهِ اُجِرَ وَمَنْ حَكَمَ بِهِ عَدَلَ وَمَنْ دَعَا اِلَيْهِ هَدٰى اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔

(رواه الترمذی والدارمی وقال الترمذی هذا حديث اسناده مجهول وفی الحارث مقال)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۵۸/۵ حديث رقم ۲۹۰۶۔ والدارمی ۵۲۶/۲ حديث رقم ۳۳۳۱۔

ترجمہ: ''حضرت حارث اعور سے روایت ہے کہ میں مسجد میں سے گزرا تو لوگ احادیث میں بحث کر رہے تھے' میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور انہیں اس کے بارے میں بتایا' انہوں نے فرمایا ''کیا انہوں نے واقعی ایسا کیا ہے میں نے کہا ''جی ہاں!'' انہوں نے فرمایا ''تو پھر سن لو! میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ خبردار! عنقریب ایک فتنہ واقع ہوگا میں نے عرض کیا کہ ''حضرت ﷺ! پھر اس سے نجات پانے کا کیا راستہ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ''کتاب اللہ جس میں امم سابقہ کے احوال ہیں اور ان باتوں کی بھی خبر دی گئی ہے جو تمہارے بعد واقع ہونے والی ہیں اور اس قرآن میں وہ احکام بھی مذکور ہیں جو تمہارے درمیان ہیں ایمان کفر' اطاعت وگناہ حلال و حرام اور اسلام کے شرائع نیز آپس کے تمام معاملات وغیرہ کے بارے میں احکام بیان کئے گئے ہیں جو پوری انسانی برادری کے لئے ضروری ہیں اور وہ کتاب حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی ہے وہ کوئی بیکار ولایعنی چیز نہیں ہے اور جس متکبر نے قرآن کو چھوڑ دیا اس کو اللہ تعالیٰ ہلاک کر ڈالے گا اور جو شخص اس قرآن کے علاوہ کسی دوسری چیز سے ہدایت وروشنی چاہے گا تو اللہ تعالیٰ اسے گمراہ کر دے گا وہ قرآن اللہ کی مضبوط سیدھی رسی ہے قرآن ذکر حکیم ہے۔قرآن بالکل سیدھا اور صاف راستہ ہے قرآن وہ سرچشمہ ہدایت ہے جس کے اتباع کے نتیجہ میں خواہشات انسانی حق سے باطل کی طرف مائل نہیں ہوتیں' اور زبانیں التباس کا شکار نہیں ہوتیں' علماء اس سے سیر نہیں ہوتے اور مزاولت سے پرانا نہیں ہوتا اور نہ اس کے عجائب ختم ہوتے ہیں' قرآن کریم وہ کلام ہے جس کو جنات نے سنا تو وہ بے ساختہ کہہ اٹھے کہ ہم نے قرآن سنا جو ہدایت کی عجیب راہ دکھاتا ہے لہٰذا ہم اس پر ایمان لائے جس شخص نے قرآن کے مطابق کہا اس نے سچ کہا اور جس نے اس پر عمل کیا اسے ثواب دیا جائے گا جس شخص نے قرآن کے مطابق فیصلہ وانصاف کیا اور جس نے اس کی طرف بلایا اس کو سیدھی راہ دکھائی گئی ہے دارمی اور امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند مجہول ہے اور اس کے راوی حارث اعور کے بارے میں کلام ہے۔''

تشریح: وعن الحارث الاعور : اصحاب علیؓ میں سے' تابعی ہے۔

قال مررت فی المسجد : یعنی ان لوگوں کے پاس جو مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے۔طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: ''فی المسجد'' : ظرف ہے اور ''الممرور به'' محذوف ہے، اس پر یہ قول دلالت کر رہا ہے

فاذا الناس يخوضون : یعنی داخل ہو رہے تھے۔دخول میں مبالغہ ہے۔

فی الأحاديث : یعنی لوگوں کی وہ باتیں جو بے کار، حکایات اور قصص پر مشتمل ہوں، اور وہ قرآن کی تلاوت کو ترک کیے ہوئے تھے۔اور اس چیز کو جواز کار، آثار اور انوار برہان کا تقاضہ تھا۔

ابن حجرؒ کہتے ہیں: ظاہر یہ ہے کہ احادیث سے مراد صفات متشابہ ہیں، اس ظہور کی وجہ واضح نہیں ہے، یا وہ احادیث نبویہ کی بحث میں مبالغہ کرتے تھے، اور آیات قرآنی کے ساتھ کوترک کر دیتے تھے۔ طیبی رحمۃ اللہ کہتے ہیں: **الخوض' الشروع فی الماء والمرور فیه** اور شروع کے لئے مستعار ہے۔ اکثر جو قرآن میں ذکر ہے اس میں شروع کی مذمت ہے۔

فدخلت علٰی علی رضی الله عنه : خاص کرنے کی وجہ شاید ان کی خلافت ہے یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کو اپنے اس قول سے ممتاز کرنا مقصود ہے

أنا مدينة العلم وعلى بابها) اس کے خلاف ہے جس نے کہا کہ وہ موضوع ہے، یا جس نے ضعیف قرار دیا، مگر اس اعتبار سے کہ اس کے طرق میں افراد ہے، جیسے ابن حجرؒ نے ذکر کیا۔

فأخبرته : یعنی خبر۔ **فقاله، أو قد فعلوها** : یعنی قرآن کو چھوڑ دو، تو انہوں نے چھوڑ دیا، یعنی وہ بے کار باتوں میں مشغول ہو گئے، یا مقدر مانا جائے کہ وہ منکرات کو سرانجام دینے لگے۔

طیبی رحمۃ اللہ کہتے ہیں: کہ انہوں نے اس قبیح فعل کا ارتکاب کیا، باطل باتوں میں پڑ گئے، ہمزہ اور واؤ عاطفہ ''فعل منکر'' کی دعوے دار ہیں۔ جس پر عطف ڈالا گیا ہے۔ یعنی انہوں نے اُس برے کام کو سرانجام دیا۔

قلت نعم، قال أما : تنبیہ کے لئے ہے۔

إنی سمعت رسول الله ﷺ يقول ألا : تنبیہ کے لئے ہے۔

انها : یعنی قصہ اور اس کے بیان کے لئے ہے۔

ستكون فتنة : یعنی بہت بڑا اور عام آزمائش ہوگی۔ ابن الملکؒ کہتے ہیں: کہ فتنہ سے مراد جو صحابہ کرام کے درمیان واقع ہوا یا تاتاریوں کا خروج یا دجال کا خروج ہے یا جانور کا ظاہر ہونا ہے۔ پہلا قول یہاں غیر مناسب ہے۔

قلت : ما المخرج منها : یعنی اس سے نکلنے اور بچنے کا کیا طریقہ ہے؟ اے اللہ کے رسول! طیبی رحمۃ اللہ کہتے ہیں: نکلنے کی جگہ یا ایسا سبب جس کے ذریعے آدمی فتنہ سے نکل سکے۔

قال : كتاب الله : یعنی اس سے نکلنے کا طریقہ جس نے کتاب اللہ کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا، یہ اضافت کی بناء پر مقدر ہے۔ ابن حجرؒ نے عجیب بات کہی ہے: مقدر ماننے کی ضرورت نہیں ہے چونکہ مراد اس قول سے واضح ہی ہے: ''**ما المخرج؟**'' یعنی ایسا سبب جو اس فتنہ سے پیدا ہونے والی گمراہیوں میں پڑنے سے مانع ہو۔

فيه نبأ ما قبلكم : یعنی پہلی امتوں کے احوال۔

وخبر ما بعدكم : یہ وہ آنے والے امور ہیں، جو قیامت کی شروط میں سے ہیں، اور احوال قیامت ہیں۔ عبارت میں تفنن ہے۔

وحكم ما بينكم : ''حاء'' کے ضمہ اور کاف کے سکون کے ساتھ ہے، یعنی یہ تمہارے درمیان ہونے والے جھگڑوں کا فیصلہ کرنے والا ہے یا جو تمہارے درمیان کفر وایمان کی بدولت واقع ہو۔ اطاعت ونافرمانی، حلال وحرام اور تمام شرائع اسلام اور مبانی احکام کی وجہ سے ہو۔

هو الفصل : یعنی حق و باطل کے درمیان فیصلہ کرنے والا ہے یا غلطی اور درستگی میں فیصل وممیّز ہے، جس پر ثواب اور عذاب کا مراد ہے۔ مصدر وصف کے لئے بطور مبالغہ ہے۔

ليس بالهزل : یعنی وہ تمام کا تمام حق اور سچ ہے: **لا تاتيه الباطل من بين يديه ولا من خلفه. هزل**، اصل میں ایسا قول

ہے جو پسندیدہ (اچھے) معنی سے خالی ہو اور یہ ھزال سے مشتق ہے، جو "سمنؔ" کی ضد ہے۔ حدیث میں اقتباس اس قولِ الٰہی سے ہے: ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ﴾ [الطارق: ١٣-١٤]، اس کو حق و باطل کے درمیان فصل کہا ہے اور مبالغہ کے لئے مصدر چُنا گیا ہے۔ جیسے رجل عدل یعنی "انه مفصول به" یا قطعی طور پر وہ حق ہے، اور مابعد کے موافق ہے یا فیصلہ کرنے اور دین میں جس چیز کی ضرورت ہو اس کو بیان کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے دلیل ہے: ﴿ونزلنا عليك الكتاب﴾ [النحل: ٨٩]

من تركه: یعنی قرآن کو ایمان و عمل کے لحاظ سے۔

من جبار قصمه الله: یعنی اس کو ہلاک کردے گا، یا اس کی گردن توڑ دے گا۔ اصل میں **قصم** کا معنی توڑنا اور الگ کرنا ہے، معنی یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس کو کاٹ دے گا، اور اپنی رحمت سے دور کردے گا، یا وہ قطعی حجت ہے بخلاف اس کے جس نے قرآن کے ساتھ عمل کیا، اللہ تعالیٰ اس کو کمال کے اعلیٰ مراتب پر فائز کرے گا اور وہ وصال کے اعلیٰ وخوبصورت منازل کو پائے گا۔ یہ جملہ اس پر بددعا ہے، یا صرف خبر ہے، اسی طرح ابن الملکؒ اور طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے، ان دونوں کی ابن حجرؒ نے متابعت کی ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ وہ دونوں ضد ہیں جیسے حدیث کی بقیہ اخبار میں ہے۔ جس نے جبار کی وجہ سے ترک کیا، تاکہ وہ اس پر دلالت کرے کہ اس کو ترک پر ابھارنے والا اس کا سرکش ہونا یا حماقت ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: جس نے قرآن کی کسی آیت یا کلمہ جس پر عمل کرنا واجب تھا، اسے تکبر کی بناء پر یا کفر کی وجہ سے اس کو پڑھنا چھوڑ دیا، یا اس کے لئے ہے جس نے سستی، کمزوری اور عجز کی وجہ سے چھوڑا، باوجود اس کے کہ اس کا اعتقاد اس کی تعظیم پر ہے، اس پر کوئی گناہ نہیں، یعنی قراءت کو چھوڑنے کی وجہ سے لیکن وہ محروم ہے۔

ومن ابتغى الهدى: یعنی گمراہی سے ہدایت مانگی۔

في غيره: یعنی کتب اور علوم جو اس سے ماخوذ نہیں ہیں، اور نہ اس کے موافق ہیں۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: **فی** سبیت کے لئے ہے۔ یہ بات کسی پر مخفی نہیں کہ "**فی**" ظرفیت کے لئے ہے، اور اس دلالت پر زیادہ بلیغ ہے کہ ہدایت اس میں منحصر ہے بجائے اس کے کہ اس علاوہ اسباب ہدایت ہوں۔

أضله الله: یعنی سیدھے راستے اور اس کو گمراہی پر ڈال دے گا۔ اس میں گمراہ بدعتیوں پر ردّ ہے۔

وهو: یعنی قرآن مجید۔ **حبل الله المتين**: یعنی محکم قوی، **حبل** کو وصل کے لئے مستعار لیا گیا ہے۔ ہر اس چیز کے لئے مستعمل ہے جس کے ساتھ کسی دوسری چیز کی طرف پہنچا جاتا ہے، یعنی ایسا قوی سبب جس کے ذریعے ربّ کی پہچان اور اس کی قربت کی سعادت حاصل ہوتی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے مقتبس ہے: ﴿واعتصموا بحبل الله جميعًا﴾ [آل عمران: ١٠٣]

وهو الذكر: یعنی جس کے ساتھ حق تعالیٰ کا ذکر کیا جاتا ہے، یا جس کے ساتھ مخلوق نصیحت حاصل کرتی ہے۔

الحكيم: یعنی علم وعمل کی حکمت والا یا ہر کتاب پر حاکم ہے، یا ہر مکلف پر کہ وہ اُس پر عمل کرے۔ یا اس محکم قوی آیات پر مشتمل ہے جو قیامت تک منسوخ نہیں ہوں گی، تمام مخلوق اسکی مثل لانے سے عاجز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لا يأتيه الباطل من بين يديه ولا من خلفه﴾ [فصلت: ٤٢]، یا مراد ذکر سے شرف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان اس پر دلیل ہے: ﴿وانه لذكرلك ولقومك﴾ [الزخرف: ٤٤]

ایک قول ہے کہ بمعنی "مذکر" مراد ہے حکیم جو بہت زیادہ حکمت والا ہو۔ یہ مذکورہ تفسیر جو مذکر کے ساتھ کی گئی ہے، جیسا کہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کو ذکر کیا ہے عقل سے بعید ہے۔

وهو الصراط المستقيم [الفاتحة: ٦]: یعنی قوی راستہ جو افراط وتفریط کے درمیان ہے۔ جیسے تمثیل اور تعطیل وغیرہ اور جو اس

جیسی گمراہ اقسام ہیں، اور یہ بھی درست ہے کہ اس کی تفسیر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہو: ﴿**اهدنا الصراط المستقیم**﴾، جو اس پر چلا وہ نجات پا گیا۔ جس نے اس سے اعراض کیا وہ گمراہ ہو گیا۔

هو الذی لا تزیغ : مؤنث اور مذکر کے صیغہ کے ساتھ، یعنی وہ حق سے مائل نہیں ہوتا۔ **به** : یعنی اس کی اتباع کے ساتھ۔

الا هواء : یعنی جب اُس کی خواہش پر اس ہدایت کے موافق ہو تو گمراہ ہونے سے بچ گیا۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اس راستے پر بدعتی اور گمراہ لوگ نہیں چل سکتے۔ ایک حکایت ہے کہ شیخ ابو اسحاق کازرونی سے کہا گیا کہ اہل بدعت بھی قرآن سے استدلال کرتے ہیں، جیسا کہ اہل سنت دلیل کے وقت اس کو بطور حجت پکڑتے ہیں، تو انہوں نے کہا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "﴿**یضل به کثیرًا ویهدی به کثیرًا**﴾ [البقرۃ : ٢٦]۔

ہم کہتے ہیں: کہ گمراہی کا سبب اس سے عدم استدلال ہے۔ اہل "هوا" (خواہش پرست) نے احادیث نبویہ کو ترک کر دیا جو مقاصد قرآنی کے لئے ہی ہیں۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿**وما أتاكم الرسول فخذوه وما نهاكم عنه فانتهوا**﴾ [الحشر : ٧] انہوں نے قرآن پاک کو جس طرح پہچاننے کا حق ہے اس طرح نہیں پہچانا، انہوں نے اس قرآن پاک کو تھاما جو اپنی ادلہ کی پہچان میں کامل ہے تو وہ بھی اُسی گھڑے میں گر پڑے جس میں اکثر حدیث کا انکار اور ردّ کرنے والے گرتے ہیں۔ اسی لئے جنیدؒ نے کہا: جو قرآن پاک کی محافظت نہیں کرتا، اور حدیث نبوی کو لکھتا نہیں ہے، اس کی اقتداء نہیں کی جائے گی، جو ہمارے طریقہ پر بغیر علم کے داخل ہوا، اور جہالت پر قائم رہا، تو یہ شیطان کے لئے ہنسنے اور مذاق کرنے کا ذریعہ ہے۔ چونکہ ہمارا علم کتاب وسنت کے ساتھ مقید ہے۔ واللہ اعلم

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: "**اهل الهواء**" کے پاس اس میں تغیر وتبدیل اور اس سے مائل ہونے کی قدرت نہیں ہے یہ غالیوں کی تحریف، باطل لوگوں کا اپنا راستہ اور جاہلین کی تاویل کے وقوع کی طرف اشارہ ہے۔ "باء" متعدی کے لئے ہے۔

ایک قول ہے: "**الروایة من الازاغة**" صحیح نہیں بمعنی **اماله** سے ہے۔ "باء" تعدیہ کی تاکید کے لئے ہے۔ یعنی گمراہ لوگ سیدھے راستے اور منہجِ مستقیم سے ٹیڑھ پن اور عدم صراط مستقیم کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ جیسا کہ یہود کا فعل تھا۔ انہوں نے تورات کے کلمات کو ان کی اصل جگہوں سے بدل دیا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی حفاظت کا ذمّہ لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿**ان نحن نزلنا الذکر وانا له لحفظون**﴾ [الحجر : ٩]

ولا تلتبس به الالسنة : یعنی مؤمنوں کی زبانوں پر مشکل نہیں ہے یعنی اگرچہ وہ غیر عرب ہوں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿**فانما یسرناه بلسانك**﴾ [مریم : ٩٨] ﴿**ولقد یسرنا القرآن للذکر**﴾ [القمر : ١٧]

ایک قول ہے کہ اس میں کوئی دوسرا کلام خلط ملط نہیں ہوا، اس لحاظ سے کہ کوئی حکم مشتبہ ہو جائے، اور حق و باطل خلط ملط ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کر رہا ہے۔ ایک قول ہے کہ ربّ کا کلام کوئی دوسرے کلام سے خلط ملط نہیں ہوتا، اس کا اس بات سے پاک ہونا اس کے اعجاز پر دلالت ہے۔ اس لئے وہ اس میں ہلکا سا بھی نقص نہیں پاتے۔

وقوله تعالیٰ : ﴿**ولو كان من عند غیر الله لوجدوا فیه اختلافًا كثیرًا**﴾ [النساء : ٨٢]

ولا یشبع منه العلماء : یعنی اس کا مکمل احاطہ نہیں کر سکتے، وہ اسکی مزید طلب سے رک جاتے ہیں جیسے کوئی کھانے سے سیر ہو جائے۔ بلکہ جب کبھی وہ کسی چیز کی حقیقت کو پا لیتے ہیں تو وہ پہلی سے زیادہ دوسری چیز کے مشتاق ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ان کا یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔

ولا یخلق : "یاء" کے فتح اور لام کے ضمہ کے ساتھ اور "یاء" کے فتح اور لام کے کسرہ کے ساتھ، یہ "**خلق الثوب اذا بلی**" سے

ہے،اسی طرح "أخلق".

عن كثرة الرد : یعنی اس کی قراءت کی لذت دائمی ہے،اس کی تلاوت کی قراءت،اس کے اذکار کا استماع اور خبروں کی کثرت تکرار دائمی ہے۔مخلوق سے کثرت تکرار صادر نہیں ہوتا، جیسے اللہ تعالیٰ کے کلام کے علاوہ دوسرے کلام ہیں۔اس کے بارے میں کہا گیا ہے : جبلت النفوس على معاداة المعادات ، بلکہ یہ اس قبیل سے ہے:

اعد ذكر نعمان لنا أن ذكره ☆ هو المسك ما كررته يتضوع

"ہمارے نعمان کا ذکر بار بار کر اس کا ذکر تو کستوری ہے، جتنا تو اس میں تکرار کرے گا،اتنی زیادہ اس کی مہک پھیلے گی"۔

اس لئے جب کوئی آدمی اس کی قراءت کو بار بار کرتا ہے، یا تلاوت بار بار سنتا ہے،تو اس کی مٹھاس میں اضافہ ہو جاتا ہے،اگر چہ وہ اس کا معنی نہ بھی سمجھ پائے،لیکن وہ اُس کے حصول کا متمنی ہے۔اسی لئے شاطبیؒ نے کہا: وترداده يزداد فيه تجملاً : اور اس کا تکرار اس کے حسن میں اور اضافہ کر دیتا ہے۔یہ ابن حجرؒ کے اس قول سے اولیٰ ہے، جس میں ہے کہ "عن" بمعنی "مع" ہے۔

ولا ينقضي عجائبه : اس کے عجائب کی انتہاء نہیں ہے، جو انسان کو تعجب میں ڈالتے ہیں۔ایک قول ہے کہ عطف تفسیری ہے پچھلے دو قرینوں کی وجہ سے۔یہ قول طیبی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔اور ابن حجرؒ نے اس کی اتباع کی ہے۔اس کو تاسیس پر محمول کرنا اولیٰ ہے، عجائب کا ظہور اس حیثیت سے کہ وہ ختم نہیں ہوتے ، یہ علماء کے سیر نہ ہونے سے زیادہ قوی ہے،اور "بلی" کی نفی ہے۔بلکہ اعلیٰ اور گراں قدر ہے، یہ کوئی مخفی نہیں ہے۔

هو الذى لم ينته الجن : مذکر اور مؤنث کے ساتھ۔اذ سمعته : یعنی قرآن پاک کو۔ایک نسخہ میں "اذ اسمعته" ہے۔

حتى قالوا : یعنی جب ان کو سننے کا وقت ملا تو وہ ٹھہرے نہیں سنتے رہیں بلکہ وہ اس پر اچھی طرح متوجہ ہوئے ، بلکہ انہوں نے ایمان کی طرف بداہت کے راستے پر علم ضروری کے حصول کے لئے جلدی کی۔اور انہوں نے اس کی بہت زیادہ تعریف کی اور یوں کہا: "ان سمعنا قرآناً عجباً" یعنی جو وہ اس لحاظ سے ہے کہ بہت جزیل ہے اور اس کے معنی بہت عمدہ ہیں۔

يهدى الى الرشد : یعنی جو درست راستے کی طرف راہنمائی کرتا ہے، یا اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ لوگوں کو حق راستے کی ہدایت عطا کرتا ہے۔

فأمنا به : یعنی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لانا لازم ہو جاتا ہے۔

من قال به : جس نے اس کی خبر دی۔صدق : یعنی اس کے خبر کے بارے میں۔یا جس نے ایسا قول کہا، جو کہ اس کے قواعد کے مطلق اس کے قوانین وضوابط کے موافق ہے اس نے سچ کہا۔

من عمل به : یعنی قرآن کی دلالت پر۔

أجر : یعنی اس کے عمل پر اس کو بہت بڑا ثواب دیا جائے گا،اس لیے کہ اس کی دلالت صرف اور صرف مکارم اخلاق وأعمال اور محاسن آداب واحوال پر ابھارنا ہے۔

ومن حكم به : لوگوں کے اور ان کے جھگڑوں کے درمیان۔

عدل : یعنی اس کے فیصلے میں، کیونکہ وہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے۔

ومن دعا : یعنی لوگوں کو۔اليه : یعنی اس پر ایمان لانے اور اس کے ساتھ عمل کو لازم پکڑنے میں۔

هدى الى صراط المستقيم : ابن الملکؒ کہتے ہیں: یعنی جس کو دعوت دی گئی اور اس میں مقصود کا حصول ہے۔ابن حجرؒ کہتے

ہیں: اس کو مبنی علی الفاعل اور مفعول بنانا صحیح ہے۔ یہ عقلی احتمال ہے، مگر صحیح نسخوں میں مبنی علی المجہول ہے۔ صحیح بات وہ ہے جس کو طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔ انہوں نے مجہول بیان کیا ہے، یعنی جس نے اس کی دعوت دی، تو اس نے مزید طلب ہدایت کی موافقت کی۔

ظاہر ہے کہ اس کی سند میں مجہول ہے۔ **وفی الحارث** :یعنی جو راوی ہے۔ اور علیؓ سے بیان کرتا ہے۔ **مقال** :اس پر طعن ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: شعبی نے حارث اعور سے روایت کیا ہے اور گواہی دی ہے کہ وہ جھوٹا ہے۔ مؤلف کہتے ہیں: کہ وہ حضرت علیؓ کی صحبت میں مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے: اس نے آپؓ سے چار احادیث سنی ہیں۔ امام نسائی وغیرہ کہتے ہیں: وہ قوی نہیں ہے۔ ابن ابو داؤد کہتا ہے: وہ لوگوں سے زیادہ فقیہ، فرائض کو جاننے والا اور لوگوں سے زیادہ سمجھنے والا تھا، اور جو مسلم کی شرح میں ہے، جو نووی نے لکھی ہے۔ شعبی سے روایت ہے انہوں نے حارث اُعور سے بیان کیا ہے کہ وہ جھوٹا ہے کو اس پر محمول کیا ہے اس سے کبھی کبھی جھوٹ صادر ہو جاتا ہے، اسی لئے اس کو ''کذاب'' نہیں کہا، باوجود اس کے کہ جھوٹا کبھی کبھی سچ بول دیتا ہے۔ اسی لئے ان سے روایت کیا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اس کی حدیث اسناداً ضعیف ہے، اگرچہ اس کے معنی کے صحیح ہونے میں شک نہیں ہے۔ باوجود اس کے کہ ضعیف حدیث فضائل میں بالاتفاق معمول بہ ہے۔

۲۱۳۹: وَعَنْ مُعَاذِ الْجُهَنِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ قَرَأَ الْقُرْاٰنَ وَعَمِلَ بِمَا فِيْهِ اُلْبِسَ وَالِدَاهُ تَاجًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ ضَوْءُهٗ اَحْسَنُ مِنْ ضَوْءِ الشَّمْسِ فِيْ بُيُوْتِ الدُّنْيَا لَوْ كَانَتْ فِيْكُمْ فَمَا ظَنُّكُمْ بِالَّذِيْ عَمِلَ بِهٰذَا.

(رواہ احمد وابوداود)

اخرجہ ابوداؤد فی السنن ۱۴۸/۲ حدیث رقم ۱۴۵۳۔ واحمد فی المسند ۴۴۰/۳۔

ترجمہ: ''اور حضرت معاذ جہنیؓ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا'' جو شخص قرآن پڑھے اور اس کے مطابق عمل کرے تو قیامت کے دن اس کے ماں باپ کو ایسا تاج پہنایا جائے گا جس کی روشنی دنیا کے گھروں میں چمکنے والے آفتاب کی روشنی سے زیادہ اچھی ہوگی اگر تمہارے گھروں میں آفتاب ہو' تو خود اس شخص کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے' جس نے قرآن پر عمل کیا ہے۔''

تشریح: **وعن معاذ الجهني** :جیم کے ضمہ اور ''ھاء'' کے فتحہ کے ساتھ۔

قال : قال رسول الله ﷺ من قرأ القرآن :یعنی اس کے مطابق فیصلہ کیا، جیسے کہ روایت میں ہے، یعنی اس پر یقین کیا۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: اس کو دل سے یاد کیا۔

وعمل بما فيه ألبس والده تاجاً يوم القيامة :طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: یہ مِلک اور سعادۃ سے کنایہ ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس کو اس کے ظاہر پر محمول کیا جائے گا، جیسا کہ اس قول سے ظاہر ہے: ''**ضوءه أحسن**'' اس کو روشنی اور چمک کے ساتھ پسند کیا ہے، یہ نشانی ہے کہ تاج کی تشبیہ' جو اس میں عمدہ جواہر ہیں ان کی سورج کے ساتھ ہے۔ اکیلی روشنی اور چمک مراد نہیں، بلکہ اس کی زینت اور حسن کی بھی رعایت ہے۔

من ضوء الشمس :یہ اس کی حالت کا بیان ہے۔

فی بیوت الدنیا :اس میں اُسے مکمل طور پر جلنے سے بچانا ہے۔ **لو کانت** :یعنی سورج فرض اور تقدیر کے لحاظ سے۔

فیکم : یعنی تمہارے گھروں میں، مبالغہ کے لئے ہے۔ اگر سورج اپنی روشنی اور حُسن کے ساتھ ہمارے گھروں میں داخل ہو جائے، تو وہ بہت پیارا اور مکمل ہوگا، اگرچہ وہ اُس سے باہر ہو۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: یعنی تمہارے گھروں میں داخل ہونا۔ ابن الملکؒ

کہتے ہیں: یعنی تم میں سے کسی کے گھر میں۔ایک روایت میں ہے: "في بيت من بيوت الدنيا لو كانت فيه".

فما ظنكم : یعنی جب یہ بدلہ والدین کو اس وجہ سے ملے گا۔

بالذی عمل بهذا : ایک روایت میں ہے: "عمل به"۔طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: ظن کے مطابق یہ چھوٹا ہے، اس لیے کہ وہ اس پہچان سے ناواقف ہے، جو عامل قاری کو کرامت اور ملک کے لئے دیا جائے گا، جو کسی آنکھ نے دیکھا نہیں، کسی کان نے سنا نہیں، اور کسی آدمی کے دل میں اس کا خیال نہیں آیا، جیسا کہ "ما" استفہامیہ عقل کو حیران کر دینے والے معنی کی تاکید کے لئے ہے۔

۲۱۴۰: وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُوْلُ لَوْ جُعِلَ الْقُرْاٰنُ فِيْ اِهَابٍ ثُمَّ اُلْقِيَ فِي النَّارِ مَا احْتَرَقَ ۔ (رواه الدارمی)

اخرجه الدارمی فی السنن ٢/٥٢٢ حديث رقم ٣٣١٠۔ واحمد فی المسند ٤/١٥٥۔

ترجمہ: "حضرت عقبہ ابن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "اگر قرآن کو کسی کھال میں رکھ کر اسے آگ میں ڈال دیا جائے تو وہ جلے گا نہیں۔" (دارمی)

تشریح: وعن عقبة بن عامرٍ قال : سمعت رسول الله ﷺ يقول لو جعل القرآن : ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں: یعنی اس کے جسم کو فرض سمجھتے ہوئے۔کیونکہ معانی کا تجسم جائز ہے اگر چہ غریب ہے۔اگر اس سے مراد "الكلام النفسی" ہے تو یہ صحیح نہیں۔اگر کوئی اور معنی مراد ہے تو اس فرض کے صحیح ہونے اور مصحف کو رکھنے کی تاویل کی ضرورت نہیں۔

فی اِهاب : ایسا چمڑا جس کو رنگا نہ گیا ہو۔اسی طرح فقہاء کا قول ہے۔درست بات یہ ہے کہ مطلق چمڑا مراد ہے، یا تو اصل پر اعتماد ہے یا اس پر اطلاق ہے اور اس پر جس کو دباغت نہیں دی گئی، جیسا کہ قاموس میں ہے۔طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس قول میں تکلف کیا ہے کہ "اِهاب" کے ساتھ جو مثال بیان ہوئی ہے، یہ وہ چمڑا ہے جو رنگا نہ گیا ہو۔چونکہ فساد اس میں جلد آ جاتا ہے۔اس میں آگ پھونکی جاتی ہے جو اس کے خشک ہونے میں مدد دیتی ہے، بخلاف جس چمڑا کو رنگا گیا ہو۔پھر ہمارے لئے بغیر مدبوغ کے ساتھ وجہ تشبیہ واضح ہوتی ہے، اگر قاری قرآن "غیر مرتاض" ہو تو قرآن اس کو نفع دے گا۔

ثم القی فی النار : طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: "ثم" تراخی زمان کے لئے نہیں بلکہ اِهاب اور آگ میں ڈالنے کے درمیان تراخی کے لئے ہے۔یہ دونوں معاملات قرآن کے مرتبہ کے منافی ہیں۔دوسرا پہلے سے زیادہ بڑا ہے۔ابن حجر رحمہ اللہ نے غریب قول کہا ہے کہ "ثم علی بابها" اس کی کوئی وجہ نہیں۔ظاہر بات یہ ہے کہ وہ "فاء" کے معنی میں ہے۔

ما احترق : یعنی چمڑے کو قرآن کی برکت کی وجہ سے۔اس میں رحمت کے چشمے اور حکمت کی نہریں ہیں، جو اس آگ کو بجھا دیتی ہیں۔جیسا کہ حدیث میں ہے: "جزيا مؤمن فان نورك أطفألهبی" جب اس حقیر چمڑے کے ساتھ یہ معاملہ ہے، تو اس پیٹ (دل) کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے جس نے اس کو حفظ کیا اور وہ جسم جس نے اس پر عمل کیا، اور جس میں یہ قرآن پاک سما گیا، اور لمبا عرصہ اُس جسم کے ساتھ رہا۔تو یہ حفظ اس کو آگ سے بچائے گا، اور پردہ بن کر اس میں دوری پیدا کر دے گا۔جہنم کی آگ اس سے زیادہ اولیٰ، بلیغ اور قوی ہے۔آگ سے مراد "نار الله الموقدة" جو حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والی ہے۔اس قول کو قاضی نے ترجیح دی ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: شاید جنس زیادہ قریب اور اولیٰ ہے۔اِهاب کے ساتھ تمثیل تحقیر کے لئے ہے۔چونکہ تمثیل مبالغہ اور فرض کے لئے ہے۔تقدیر یوں ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿قل لو كان البحر مدادًا﴾ [الكهف : ١٠٩] میں کہتا ہوں: کہ مثال میں

زیادہ واضح ﴿ولو أن قرانا سيرت به الجبال أو قطعت به الارض أو كلهم به الموتى﴾ [الرعد : ۳۱] یعنی زیادہ لائق اور حق یہ ہے کہ قرآن اس حقیر چیز میں ہوتا، اور اس کو آگ میں ڈالا جاتا، تو آگ اس کو نہ چھوتی، تو مؤمن جو اللہ تعالیٰ کی اشرف اور افضل مخلوق ہے، تو اس کو کیسے چھوئے گی۔ اس نے اُسے اپنے سینے میں محفوظ کیا، اس کے معانی پر غور و فکر کیا، اس کی قراءت پر ہمیشگی کی، اس کے احکامات پر اپنے جسم کو کھپایا، تو اس کو وہ کیسے جلائے گی، اس کی فضیلت کی بدولت۔

اس نے کہا ہے: اس تاویل کے ساتھ اس حدیث اور پہلی حدیث میں مناسبت واقع ہوگئی ہے۔ معنی یہ ہے کہ جس نے قرآن پڑھا اور جو کچھ اس میں ہے اس پر عمل کیا اس کے والدین کو تاج پہنایا جائے گا، تو قاری قرآن عامل کی کیا کیفیت ہوگی؟ اگر قرآن کو کسی صحیفے میں رکھ کر آگ میں ڈالا جائے، تو آگ اس کو نہیں چھوتی۔ تو جو اس پر عمل کرنے والا ہے، اس کو کیسے چھوئے گی۔

یہ تکلف اس سے مستغنی ہے۔ چونکہ دونوں جملے جو پے در پے لفظ نبوت کے ساتھ وارد ہیں، وہ دونوں ان کے درمیان مناسبت کے لئے ہیں۔ کتاب میں دونوں حدیثوں میں بھی مناسبت کافی ہے، کہ ان کا ذکر فضائل قرآن میں ہے۔ اگرچہ ایک حدیث اپنے صاحب کی فضیلت کے بارے میں ہے۔ اس کا فضل اس سبب کے ساتھ ہے اس وجہ سے اس مناسبت کا ذکر صحیح نہیں ہے۔ چونکہ پہلی شرط حقیقی ہے، اور دوسری فرض ہے۔ کہا گیا ہے یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے۔ یہ قول طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔

مصابیح میں ان الفاظ کے ساتھ ہے: "لو كان القراٰن فى اهاب ما مسته النار". جیسا کہ "معالم" میں انہی سند کے ساتھ ذکر کیا ہے، پھر کہا ہے کہ اس کے معنی کے بارے میں کہا گیا ہے جس نے قرآن مجید حفظ کیا، اس کی قراءت کی تو قیامت کے دن اس کو آگ نہیں چھوئے گی۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: اکثر نسخوں میں روایت "مسته" کے لفظ سے ہے اور یہ "احترق" سے زیادہ اولیٰ ہے۔ اس سے مراد کہ وہ "أبلغ" ہے، نہ کہ وہ زیادہ صحیح ہے۔ صحیح نسخوں میں لفظ احترق پر اتفاق ہے۔ شاید ان کی مراد مصابیح کے اکثر نسخے ہیں۔ واللہ اعلم۔

یہ امام احمد بن حنبل سے روایت کیا گیا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کی تعلیم کی توفیق دی، اس کو قیامت کے دن آگ نہیں جلائے گی۔ گویا کہ حافظ قرآن کا جسم اس "اِهاب" کی طرح ہوگا۔ اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے، جو "شرح السنہ" میں ابوامامہ سے منقول ہے: "احفظوا القرآن فان الله لا يعذب بالنار قلبًا وعى القرآن".

اور طبرانی نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: "لو كان القراٰن فى اهاب ما أكلته النار".

حافظِ قرآن دس آدمیوں کی سفارش کرے گا جن پر جہنم واجب ہو چکی ہوگی

۲۱۴۱: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم مَنْ قَرَأَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَظْهَرَهٗ فَاَحَلَّ حَلَالَهٗ وَحَرَّمَ حَرَامَهٗ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ وَشَفَّعَهٗ فِيْ عَشَرَةٍ مِّنْ اَهْلِ بَيْتِهٖ كُلُّهُمْ قَدْ وَجَبَتْ لَهُ النَّارُ۔ (رواه احمد والترمذی وابن ماجة والدارمی وقال الترمذی هذا حديث غريب وحفص بن سليمان الراوی ليس هو بالقوی يضعف فی الحديث)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۵۷/۵ حديث رقم ۲۹۰۵۔ وابن ماجه ۷۸/۱ حديث رقم ۲۱۶۔ واحمد فی المسند ۱۴۸/۱۔

ترجمہ: "حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا" جس شخص نے قرآن مجید پڑھا پھر اسے یاد کیا اور اس کے حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام جانا تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل فرمائے گا اور اس کے ان دس عزیزوں کے حق میں اس کی سفارش قبول فرمائے گا جن پر جہنم واجب ہو چکی ہوگی" (احمد، ترمذی، ابن ماجہ، دارمی) امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے اس کا ایک راوی حفص بن سلیمان قوی نہیں ہے بلکہ ضعیف شمار

کیے جاتے ہیں۔"

تشریح: وعن علي رضي الله عنه قال : قال رسول الله ﷺ من قرأ القرآن فاستظهره : یعنی اس کو حفظ یا درکھا۔ حفظ دل کے ساتھ ہوتا ہے، یا اس کی پختگی پر مظاہرت طلب کی اور یہ معاونت ہے یا جب کسی حکم کو پڑھا اور دیکھا، تو اس کو یاد رکھنے میں خوب محنت کی۔ معنی یہ ہوا کہ جس نے قرآن پاک حفظ کیا اور اس سے دین کی معاملہ میں قوت اور مدد طلب کی۔

فأحل حلاله وحرم حرامه : اس کی حرمت اور اطاعت کی حفاظت کی۔ ایک قول یہ ہے کہ دو "فاء" کی دلیل کے ساتھ یہاں یہ تمام معانی مراد ہیں۔ ابن حجرؒ کا قول ہے: یعنی ان دونوں پر اعتقاد پہلے فعل کے ساتھ دوسرے کو چھوڑ کر صحیح نہیں، اس اعتبار سے کہ وہ پہلے فعل کے ساتھ مقید ہے۔ آپ اس پر غور کریں۔

أدخله الله الجنة وشفعه : تشدید کے ساتھ، یعنی سفارش سے پہلے۔ ابن الملکؒ کہتے ہیں: کہ اس کو سفارشی بنا دے گا۔

في عشرة من أهل بيته كلهم : تمام دس۔

قد وجبت له النار : مفرد ضمیر لفظ "کل" کی وجہ سے ہے۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: اس میں ان لوگوں پر ردّ ہے جو کہتے ہیں' کہ سفارش بلند درجات کے لئے ہوگی، نہ کہ گناہوں کو مٹانے کے لئے۔ ان کی بنیاد اس مذہب پر ہے جو انہوں نے اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے، کہ کبیرہ گناہوں کا مرتکب وہ ہمیشہ آگ (جہنم) میں رہے گا۔ اس کی معانی ممکن نہیں، یہ وجوب وعدے کی بناء پر ہے۔

صحیح نسخہ میں ہے: "والدارمی"۔

هذا حديث غريب، وحفص بن سليمان الراوی : "یاء" کے سکون کے ساتھ۔

ليس هو بالقوی : یعنی کسی حکم میں اسی کے ساتھ۔ **یضعّف** : تشدید کے ساتھ۔ ضُعف کی طرف نسبت ہے۔

في الحديث : یعنی اس کی روایت میں۔

سورۃ فاتحہ کی اہمیت

٢١٤٢: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِاُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ كَيْفَ تَقْرَأُ فِي الصَّلٰوةِ فَقَرَأَ اُمَّ الْقُرْاٰنِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ مَا اُنْزِلَتْ فِي التَّوْرَاةِ وَلَا فِي الْاِنْجِيْلِ وَلَا فِي الزَّبُوْرِ وَلَا فِي الْقُرْاٰنِ مِثْلُهَا وَاِنَّهَا سَبْعٌ مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنُ الْعَظِيْمُ الَّذِیْ اُعْطِيْتُهٗ۔ (رواه الترمذی وروی الدارمی من قوله ما انزلت ولم يذكر ابی بن كعب وقال الترمذی هذا حديث حسن صحيح)

اخرجه الترمذی فی السنن ١٤٣/٥ حديث رقم ٢٨٧٥۔ والنسائی ١٣٩/٢ حديث رقم ٩١٤۔ واحمد فی المسند ٣٥٧/٢۔

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابی بن کعبؓ سے فرمایا تم نماز میں کیسے قراءت کرتے ہو؟ انہوں نے سورۂ فاتحہ پڑھی' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "قسم ہے اس پاک ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے ایسی سورت نہ تو توریت' انجیل اور زبور میں اتری ہے اور نہ ہی (باقی) قرآن میں سورۂ فاتحہ سبع مثانی ہے اور یہ "قرآن عظیم" ہے جو مجھے دیا گیا ہے" ترمذی' دارمی' نے اس روایت کا ما انزلت سے نقل کیا ہے اور ان کی روایت میں ابی بن کعبؓ کا ذکر نہیں ہے' نیز امام ترمذیؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔"

تشریح: وعن أبی هريرةؓ قال : قال رسول الله ﷺ لأبی بن كعب، كيف تقرأ فی الصلوة فقرأ : یعنی میرے باپ نے۔

ام القرآن : یعنی سورۃ فاتحہ، اس کا نام اس لئے کہ قرآن کے تمام احکامات اس میں اجمالی طور پر موجود ہیں۔ یا "اُم" سے اصل ہے۔ یہ قواعد قرآن کی بنیاد ہے۔ اس پر تمام احکام ایمان کا دارومدار ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: اگر آپ کہیں کہ جواب سوال کے مطابق کیسے ہے؟ اس قول کے ساتھ "کیف تقرأ" سوال قراءت کے متعلق ہے نہ کہ اس کی ذات کی متعلق۔ میں کہتا ہوں: اس کو اس پر محمول کیا جائے کہ اُس نے سورۃ فاتحہ کو ترتیل اور تجوید کے ساتھ پڑھا۔ یا یہ احتمال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کی حالت میں قراءت کے متعلق سوال کیا۔ کی یہ جامع سورت ہے، جو قرآن کے معانی کو گھیرے ہوئے ہے یا نہیں، اسکو "ام القرآن" کہا، اور ذک کے ساتھ خاص ہے۔ یہ معانی قرآن کیلئے جامع ہے اور اسکی بنیاد ہے۔

فقال رسول الله ﷺ : والذی نفسی بیده ما انزلت فی التوراة ولا فی الانجیل ولا فی الزبور ولا فی القرآن : یعنی بقیہ قرآن میں کوئی بھی سورت۔

مثلها وانها سبع من الثانی : احتمال ہے کہ "مِنْ" بیان کے لئے ہے، یا تبعیضیہ ہے۔

والقرآن العظیم : مبالغہ کے لئے "کل" کا اطلاق جز پر ہے۔

الذی اعطیة : یعنی میرے سواء کسی نبی کو نہیں دی گئی۔ یعنی شروع سے آخر تک۔ **ما أنزلت ولم یذکر :** یعنی دارمی نے۔

ابی بن کعب : یعنی حدیث کے شروع میں، جو پیش آنے والا قصہ ہے۔ (**وقال الترمذی هذا حدیث حسن صحیح**).

۲۱۴۳: **وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ تَعَلَّمُوا الْقُرْاٰنَ فَا قْرَاُوْهُ فَاِنَّ مَثَلَ الْقُرْاٰنَ لِمَنْ تَعَلَّمَ فَقَرَأَ وَقَامَ بِهٖ كَمَثَلِ جِرَابٍ مَحْشُوٍّ مِّسْكًا تَفُوْحُ رِیْحُهٗ كُلَّ مَكَانٍ وَمَثَلُ مَنْ تَعَلَّمَهٗ فَرَقَدَ وَهُوَ فِیْ جَوْفِهٖ كَمَثَلِ جِرَابٍ اَوْ كِیَ عَلٰی مِسْكٍ.** (رواه الترمذی والنسائی وابن ماجة)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۴۴/۵ حدیث رقم ۲۸۷۶ وابن ماجه ۷۸/۱ حدیث رقم ۲۱۷۔

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا قرآن سیکھو اور اسے پڑھو اس شخص کی مثال جو قرآن سیکھتا ہے پھر اسے پڑھتا ہے اور اس میں مشغولیت کے لئے شب بیداری کرتا ہے اس تھیلی کی سی ہے جو مشک سے بھری ہو جس کی خوشبو ہر جگہ پھیل جاتی ہے اور اس شخص کی مثال جس نے قرآن سیکھا اور سو رہا اس کی مثال کستوری کی بند تھیلی کی ہے۔" (ترمذی' نسائی' ابن ماجہ)

تشریح: **وعنه :** یعنی ابوہریرہؓ سے۔

قال : قال رسول الله ﷺ تعلموا القرآن : یعنی لفظاً اور معناً۔ ابومحمد جوینی کہتے ہیں: قرآن پاک کو سیکھنا، اس کی تعظیم فرض کفایہ ہے، شاید اس لئے کہ اس کو تواتر حاصل نہیں ہے۔ اس میں کسی قسم کی تبدیلی اور تحریف نہیں ہوتی۔ زرکشی کہتے ہیں: جب کی شہر یا بستی میں کوئی بھی نہ ہو جو قرآن پڑھے تو وہ سبھی گنہگار ہوں گے۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: اس سے مخاطب تمام امت ہے۔ یہ تواتر سے ثابت ہے کہ جو کوئی اس کو یاد کرے گا تو سارے گناہ گار ہونے سے بچ جائیں گے۔ مذکورہ تواتر کی تعداد کا تعین اسلام کے مختلف شہروں کے اعتبار سے ہے۔ اس لحاظ سے کہ اگر کوئی بھی ایک حرف میں تبدیلی یا تحریف کرنے کا ارادہ کرے، تو سبھی اُس کو روکیں گے۔

زرکشیؒ کے کلام سے ظاہر ہے کہ جملۃً ہر بستی میں کوئی نہ کوئی قرآن پڑھنے والا ہوتا ہے، اس لیے کہ قرآن پاک کا بعض حصہ یاد کرنا فرض ہے۔ اگر وہاں پر کوئی بھی پڑھانے والا نہ ہو، تو تمام گنہگار ہوں گے۔ جو بات زرکشیؒ نے کہی ہے اس کو تواتر حاصل نہیں ہے وگرنہ ہر شہری کہے گا کہ ہم پر قرآن سیکھنا فرض نہیں ہے۔ تو عالم میں فساد برپا ہوگا۔ واللہ اعلم۔ اس پر نوویؒ کا قول دلالت کرتا ہے۔ فاتحہ سے مزید

قرآن سیکھنا نفلی نماز سے بہتر ہے، چونکہ وہ فرض کفایہ ہے۔ بعض متأخرین نے فتویٰ دیا ہے کہ حفظ میں مصروف ہونا فرض کفایہ میں مشغول ہونے سے بہتر ہے۔ باقی علوم سے سوائے اس کے جو فرض عین ہے۔

فاقرأوه : یعنی اس کو سیکھنے اور اس کے بعد۔ ایک نسخہ میں واؤ کے ساتھ اکمل کے ساتھ حکم دیا گیا ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ علم سیکھنے کے ساتھ ہے اور تجوید واجب ہے۔ یہ بات مشائخ سے لی گئی ہے۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ "فاقرأوه" میں 'فاء' اسی طرح ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے: ﴿استغفروا ربکم ثم توبوا الیه﴾ [هود : ۵] یعنی قرآن سیکھو اور اس کی تلاوت پر ہمیشگی کرو اور عمل اس کا تقاضا وہ تعلیل (علت) کرتی ہے جو اس قول میں ہے: "فان مثل القرآن لمن تعلم فقرأ وقام به" یعنی اس قراءت پر ہمیشگی کی یا اس پر عمل کرنے میں ہمیشگی کی۔

کمثل جراب: کسرہ کے ساتھ، عمومی طور پر فتحہ دیا جائے گا۔ ایک قول ہے کہ "جراب" کو فتحہ نہیں دیا جاتا اور "قندیل" کو کسرہ نہیں دیا جاتا، یہاں جراب کا ذکر خاص احتراماً ہے چونکہ وہ خوشبو کو محفوظ رکھنے کے لئے ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: یہاں مثال بیان کرنا "تعلم" کے لئے ہے جیسے "جراب" کی تمثیل ہے۔ "مثل" مبتداء ہے، اور مضاف محذوف ہے۔ "لمن" میں جو لام ہے کہ تعلم محذوف کے متعلق ہے اور یہ قول ہے: "کمثل علی تقدیر اعضاف ایضًا" تشبیہ یا تو مفرد ہے یا مرکب ہے۔

محشو : یعنی جو بہت زیادہ بھری ہوئی ہو، یہاں تک کہ اُس مزید دوسرے کے لئے جگہ نہ ہو۔

مسکًا : تمیز ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔

تفوح ریحه : یعنی اس کی خوشبو ظاہر ہوتی ہے۔

کل مکان : ابن الملک رحمہ اللہ کہتا ہے: قاری کا سینہ "جراب" کی طرح ہے، اور قرآن اس میں مسک کی طرح ہے جب وہ اس کو پڑھے گا، اُس کی برکت اُسے اور سننے والے کو حاصل ہوگی۔ میں کہتا ہوں: مکان کا اطلاق مبالغہ کے لئے ہے۔ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "تدمر کل شیء واوتینا من کل شیء"، اس میں تدمیر اور ایتاء خاص ہیں۔

ومثل من تعلمه : رفع اور نصب کے ساتھ یعنی ہوا کی مثال جس نے اُسے سیکھا۔

فرقد : یعنی قیام نہ کیا' سوگیا، یا قراءت سے غفلت کی یا ترکِ عمل سے کنایہ ہے۔

وهو : یعنی قرآن مجید۔ **فی جوفه** : یعنی اُس کے دل میں۔ **کمثل جراب أو کئی** : صیغہ مجہول کے ساتھ، یعنی باندھ رکھا۔

علی مسك : طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یعنی سختی سے باندھا تسمہ کے ساتھ۔ یہ وہ دھاگہ ہے جس کے ساتھ برتنوں کو باندھا جاتا ہے۔

مظہر رحمہ اللہ کہتے ہیں: جس نے قراءت کی (پڑھا) تو اس کی برکت اس کے گھر میں پہنچ جائے گی، اور سننے والوں کو حاصل ہوگی۔ استراحت اور ثواب کا حصول وہاں تک ہوگا جہاں تک اُس کی آواز پہنچے گی۔ یہ اس تھیلی کی طرح ہے جو خوشبو سے بھری ہوئی ہو جب اس کا منہ کھولا جائے، تو اس کی خوشبو ارد گرد تمام جگہ پھیل جاتی ہے۔ جس نے قرآن پاک سیکھا، اور اسے پڑھا نہیں، تو اس برکت صرف اسے ہی حاصل ہوگی۔ تو وہ اس تھیلی کی طرح ہوگیا جس کا منہ سختی سے باندھ دیا گیا ہو، تو اس کی خوشبو کسی تک نہیں پہنچتی صرف تھیلی میں رہتی ہے۔

۲۱۴۴: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ قَرَأَ حٰمٓ اَلْمُؤْمِنَ اِلَى اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ وَاٰيَةَ الْكُرْسِيِّ حِيْنَ يُصْبِحُ حُفِظَ بِهِمَا حَتّٰى يُمْسِيَ وَمَنْ قَرَأَ بِهِمَا حِيْنَ يُمْسِيَ حُفِظَ بِهِمَا حَتّٰى يُصْبِحَ.

(رواه الترمذی والدارمی وقال الترمذی هذا حدیث غریب)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۴۵/۵ حدیث رقم ۸۷۹۔ والدارمی ۵۴۱/۲ حدیث رقم ۳۳۸۶۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا'' جو شخص صبح کے وقت حٰمٓ کہ وہ سورۂ مؤمن ہے الیہ المصیر تک اور آیت الکرسی پڑھے تو وہ ان کی برکت سے شام تک محفوظ رہے گا اور جو شخص ان کو شام کے وقت پڑھے تو وہ ان کی برکت سے صبح تک محفوظ رہے گا۔ ترمذی' دارمی اور امام ترمذیؒ نے ارشاد فرمایا کہ یہ حدیث غریب ہے۔''

تشریح: وعنه: یعنی ابو ہریرہؓ سے۔

قال: قال رسول الله ﷺ من قرأ حم، المؤمن: میم کے کسرہ اور فتحہ کے ساتھ۔ مؤمن کو جر اور نصب کے ساتھ۔ الی المصیر)

یعنی ﴿حٰمٓ تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِیْدِ الْعِقَابِ لا ذِی الطَّوْلِ طلَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ط اِلَیْهِ الْمَصِیْرُ﴾ [المؤمن: ۱-۳] ''حٰمٓ۔ اس کتاب کا اتارا جانا خدائے غالب و دانا کی طرف سے ہے جو گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے اور سخت عذاب دینے والا اور صاحب کرم ہے اسکے سواء کوئی معبود نہیں اسی کی طرف پھر کر جانا ہے''۔

واية الكرسی: واؤ مطلق جمع کے لئے ہے۔ ان میں تقدیم و تاخیر جائز ہے۔ جو بات ہم نے کہی ہے اس پر حصن کی روایت دلالت کرتی ہے جس میں آیت الکرسی مقدم ہے۔

حين يصبح: یعنی صبح کی نماز سے پہلے یا اسکے بعد یا ''يقرأ'' سے ظرف ہے۔ حفظ بهما: یعنی ان دونوں کی قراءت اور برکت۔

حتى يمسی: یعنی جب رات ہو جائے۔ امساء' اصباح کی ضد ہے' جیسا کہ ''قاموس'' اور ''صحاح'' میں ہے۔

ومن قرأ بهما: قراۃ' اس میں دو لغات ہیں۔ حين يمسی حفظ بهما حتى يصبح.

لوحِ محفوظ میں زمین و آسمان پیدا ہونے سے دو ہزار سال قبل قرآن لکھا گیا

۲۱۴۵: وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِیْرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اِنَّ اللّٰهَ کَتَبَ کِتَابًا قَبْلَ اَنْ یَّخْلُقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِاَ لْفَیْ عَامٍ اَنْزَلَ مِنْهُ اٰیَتَیْنِ خَتَمَ بِهِمَا سُوْرَةَ الْبَقَرَةِ وَلَا تُقْرَاٰنِ فِیْ دَارٍ ثَلَاثَ لَیَالٍ فَیَقْرَبُهَا الشَّیْطٰنُ۔ (رواہ الترمذی والدارمی وقال الترمذی هذا حدیث غریب)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۴۷/۵ حدیث رقم ۲۸۸۲۔ والدارمی ۵۴۲/۲ حدیث رقم ۳۳۸۸۔ واحمد فی المسند ۲۷۴/۴۔

ترجمہ: ''حضرت نعمان بن بشیرؓ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا'' اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی تخلیق سے دو ہزار سال قبل کتاب لکھی اس کتاب میں سے وہ دونوں آیتیں نازل فرمائیں جن پر سورۂ بقرہ کا اختتام ہوتا ہے یعنی امن الرسول سے آخری سورۂ تک یہ آیتیں جس گھر میں تین رات تک پڑھی جاتی ہیں شیطان اس کے قریب نہیں آتا۔ ترمذی' دارمی امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے۔''

تشریح: وعن النعمان: نون کے ضمہ کے ساتھ۔

ابن بشير، قال: قال رسول الله ﷺ ان الله كتب كتاباً: یعنی فرشتوں کو لوح محفوظ میں قرآن پاک لکھنے کا حکم دیا۔ ایک قول ہے یعنی اس میں ثبت کرنے کا حکم دیا۔ یا اس کے علاوہ میں علوم غیبیہ کی اطلاعیں تھیں۔

قبل ان يخلق السموات والأرض بألفی عام: طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: مخلوقوں کی مقادیر ان کی تخلیق سے پچاس ہزار سال

پہلے لکھ دی تھیں، یہ قرآن پاک کی کتابت ایک ہزار سے پہلے کی منافی نہیں ہے۔ چونکہ لوح محفوظ میں لکھنے کی کتابت کے جواز میں اختلاف ہے، اور اس جواز میں کہ اس سے مراد تجدید نہیں ہے۔ صرف سبقت لے جانا شرف پر دلالت ہے۔ یا دونوں کتابوں کی مغایرت کے جواز میں۔ یہ زیادہ ظاہر ہے۔ آپ اس پر غور کریں۔

اور یہ قول بھی اس پر دلالت کرتا ہے: "أنزل منه" من جملہ جو اس کتاب میں مذکور ہے، اور مصابیح کے اکثر نسخوں میں ہے: "انزل فيه" اور ان سے اسی طرح روایت ہے جیسا کہ بعض شارحین نے کیا ہے۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: خلاصہ یہ ہے کہ تمام ہونے والے اعمال لوح محفوظ میں آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے پہلے لکھے گئے اور ان میں سے قرآن بھی ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں وغیرہ کو پیدا کیا اور ان پر قرآن کی کتابت کو واضح کیا، زمین و آسمان کی تخلیق سے ایک ہزار سال پہلے اور دونوں آیات کو ان سے خاص کیا۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ بات مصابیح کے نسخوں میں ہے۔ اس میں نازل کیا گیا۔ ایک روایت میں "انزل منه" ہے۔

آیتین: وہ دونوں آیات یہ ہیں: "امن الرسول سے آخر تک"۔

ختم بهما سورة البقرة ولا تقرآن في دار ثلاث ليال: یعنی کوئی گھر وغیرہ۔

فيقر بها الشيطان: "راء" کے فتحہ کے ساتھ منصوب اور مرفوع ہے۔ طیبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: فاء تعقیب کے لئے ہے، اور منفی پر عطف ہے، اور نفی تمام پر ہے۔ ایک قول ہے کہ وہ جمع کے لئے ہے۔ یعنی شیطان کا قرب اور قراءت اکٹھی نہیں ہوتیں۔

۲۱۴۶: وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم مَنْ قَرَأَ ثَلَاثَ اٰيَاتٍ مِنْ اَوَّلِ الْكَهْفِ عُصِمَ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ. (رواه الترمذی وقال هذا حديث حسن صحيح)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۴۹/۵ حديث رقم ۲۸۸۶۔

ترجمہ: "حضرت ابودرداءؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا" جو شخص سورۂ کہف کی ابتدائی تین آیتیں پڑھے گا وہ دجال کے فتنہ سے محفوظ رہے گا" امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔"

تشریح: وعن أبی الدرداء قال: قال رسول الله ﷺ من قرأ ثلاث آيات من أول الكهف عصم من فتنة الدجال: اس پر کلام گزر چکی ہے۔ شاید کہ تین پر اقتصار اس بات کو متضمن ہے کہ کتاب اس کجی سے محفوظ ہے، جو یہ لعین چاہتا ہے اور مؤمنوں کو احسن اجر کی بشارت ہے اور کافروں کو ڈران کے ساتھ ساتھ ہمیشہ کے عذاب کی وعید ہے۔

۲۱۴۷: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اِنَّ لِكُلِّ شَیْءٍ قَلْبًا وَّقَلْبُ الْقُرْاٰنِ يٰسٓ وَمَنْ قَرَأَ يٰسٓ كَتَبَ اللّٰهُ لَهٗ بِقِرَاءَتِهَا قِرَاءَةَ الْقُرْاٰنِ عَشْرَ مَرَّاتٍ.

(رواه الترمذی والدارمی وقال الترمذی هذا حديث غريب)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۴۹/۵ حديث رقم ۲۸۸۷۔ والدارمی ۵۴۸ حديث رقم ۳۴۱۶۔ واحمد فی المسند ۲۶/۵۔

ترجمہ: "حضرت انسؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا" ہر چیز کا دل ہوتا ہے اور قرآن کا دل سورۂ یٰسین ہے، جو شخص یٰسین پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے پڑھنے کی وجہ سے دس مرتبہ قرآن پڑھنے کا ثواب لکھتا ہے۔" (ترمذی، دارمی) امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے۔"

تشریح: وعن أنس قال: قال رسول الله ﷺ ان لكل شيء قلبًا، وقلب القرآن: یعنی اس میں مقصود کو خالصاً

بیان کیا ہے۔

یٰسٓ : اس میں احوال قیامت کے قصے بیان ہیں۔اس لحاظ سے کہ کسی دوسری سورت میں اس کی مثل نہیں ہیں۔اسی لئے قریب المرگ لوگوں کے لئے اس سورت کو خاص کیا گیا ہے۔یا پھر اس کی قراءت مُردوں اور زندوں کے دلوں کو زندہ کرتی ہے، اور غفلت کو ہٹا کر اطاعات اور عبادات کی طرف موڑ دیتی ہے۔

ابن الملکؒ کہتے ہیں: اگر اس کا دل ہونا ممکن ہوتا تو یٰسٓ اس کا دل ہوتا۔ میں کہتا ہوں: یہ دل کا کلام ہے۔جس کا دل ہو اس کی طرف ضرورت نہیں ہوتی۔طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے بہت عمدہ بات کہی ہے: وہ مختصر ہونے کے باوجود براہین، قطعی آیات، پوشیدہ علوم، دقیق معانی، وعدو وعید اور بلیغ زواجر پر مشتمل ہے۔

ممکن ہے یہ کہا جائے: کہ جس نے حقائق اور معانی کا ادراک نہیں کیا، اس کی محسوس نظر الفاظ اور معانی پر محصور ہے۔اس کا نام قلب اس لئے کہ وہ سبع مثانی کے بائیں جانب ہے۔اور اَحسن وہ ہے جو غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ایمان کا صحیح ہونا حشر ونشر کی اعتراف کے ساتھ ہے اور یہ بلیغ وجہ سے مقرر ہے، اور قرآن کا دل اس لیے ہے۔فخر رازی نے اس کو مستحسن قرار دیا ہے۔

نسفی کہتا ہے کہ اس میں تین اصول وحدانیت رسالت اور حشر بیان ہوئے ہیں ان کا تعلق صرف دل کے ساتھ ہے۔اس کا تعلق زبان اور دوسرے مذکورہ ارکان کے ساتھ نہیں ہے، جب اس میں اعمالِ قلبی ہیں دوسرے نہیں ہیں۔تو اس کا نام قلب رکھا گیا۔اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے "محتضر" کی قراءت کے وقت حکم دیا کہ اس وقت جنین کی قوت کمزور اور اعضاء ساقط ہوتے ہیں۔لیکن دل اللہ تعالیٰ کی جانب متوجہ ہوا، یہ دوسرے اقوال سے راجح ہے۔اس کے پاس اس کی قراءت کی جاتی ہے، جس سے اس کے دِل میں قوت بڑھ جاتی ہے اور اصولِ ثلاثہ کی تصدیق پر وہ سختی سے کاربند ہو جاتا ہے۔

ابن حجرؒ نے عجیب وغریب بات کہی ہے۔اس میں "کالذی قلبه" محل نظر ہے چونکہ ہر ایک پہلا معنی ہے اور دوسرا سورۃ الاخلاص میں موجود ہے۔

ومن قرأ یٰسٓ کتب اللہ له بقراتها قراء ة القرآن : یعنی اس کا ثواب۔

عشر مرات : یعنی اس کے علاوہ۔اللہ تعالیٰ اشیاء میں سے جس کی فضیلت کو چاہے، بڑھا دے۔جیسے زمانوں میں سے لیلۃ القدر اور جگہوں میں سے حرم ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: ایک راوی ہارون بن محمد جس کو رجال حدیث کے ماہر لوگ نہیں جانتے۔وہ ایسا نکرہ ہے جس کو معرفہ نہیں بنایا جا سکتا۔

حصن میں روایت ہے: "**قلب القرآن یٰسٓ لا یقرأها رجل یرید اللہ والدار الأخرة الا غفر له اقرؤها علی متوتاکم**" اس حدیث کو نسائی، ابوداؤد، ابن ماجہ اور حبان نے معقل بن یسار سے روایت کیا ہے۔اس کو احمد اور حاکم نے روایات کیا ہے، اور حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح کہا ہے۔

مرسل حدیث جس کو حضرت علیؓ سے موصولاً بیان کیا گیا ہے:

"ان القرآن أفضل من کل شیء دون اللہ، فمن وقرا القرآن وقر اللہ، ومن لم یوقر القرآن فقد استخف بحق اللہ وحرمة القرآن عند اللہ کحرمة الوالد علی ولده، القرآن شافع مشفع، وما حل مصدق، فمن شفع له القرآن شفع، ومن محل به القرآن صدق، ومن جعل القرآن أمامه قاده الی

الجنة، ومن جعله خلفه ساقه الى النار، وحملة القرأن هم المحفوفون برحمة الله اكملتسون بنور الله، المتعلمون كلام الله. من عداهم فقد عادى الله ومن والاهم فقد والى الله يا حملة كتاب الله استجيبوا لتوقير كتابه يزدكم حبًا ويحبكم الى خلقه، يدفع عن مستمع القرأن سوء الدنيا، ويدفع عن تالي القرأن بلوى الأخرة، ومستمع آية من كتاب الله خير له من صبر ذهبًا وتالى آية من كتاب الله خير له مما تحت اديم السماء وان فى القرآن لسورة عظيمة عند الله يدعى صاحبها الشريف عند الله، يشفع صاحبها يوم القيامة فى اكثر من ربيعة وحضر وهى سورة يٰسٓ".

۲۱۴۸: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اللّٰهَ تَعَا لٰی قَرَأَ طٰهٰ وَیٰسٓ قَبْلَ اَنْ یَّخْلُقَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضَ بِاَلْفِ عَامٍ فَلَمَّا سَمِعَتِ الْمَلَآئِکَةُ الْقُرْاٰنَ قَالَتْ طُوْبٰی لِاُمَّةٍ یَّنْزِلُ هٰذَا عَلَیْهَا وَطُوْبٰی لِاَجْوَافٍ تَحْمِلُ هٰذَا وَطُوْبٰی لِاَلْسِنَةٍ تَتَکَلَّمُ بِهٰذَا۔

اخرجه الدارمی فی السنن ٥٤٧/٢ حديث رقم ٣٤١٤۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا' اللہ تعالیٰ نے آسمان زمین کی تخلیق سے ایک ہزار برس پہلے سورۂ طٰہٰ اور سورۂ یٰسین پڑھی جب فرشتوں نے قرآن سنا تو کہنے لگے اس امت کے لئے خوشخبری ہو جس پر یہ قرآن اُتارا جائے گا' اور ان دِلوں کے لئے خوشخبری ہو جو اِسے یاد کریں گے اور ان زبانوں کے لئے خوشخبری ہو جو انہیں پڑھیں گی۔''

تشریح: **وعن ابی هريرة قال : قال رسول الله ﷺ ان الله تعالٰى قرأ "طٰهٰ، ويٰسٓ"** : یعنی ان دونوں کی قراءت کو واضح کیا، اور ان کی تلاوت کا ثواب بیان کیا۔ ابن الملکؒ کہتے ہیں: یعنی فرشتوں نے۔ اور ان کا معنی الہام کیا۔

ابن حجرؒ کہتے ہیں: بعض کو ان کی قراءت کا حکم دیا یہ باقی لوگوں کے ان دونوں سورتوں کے شرف ہونے پر علامت ہے۔ اس کے باقی کا ظاہر پر احتمال ہے کہ اللہ تعالیٰ۔ نے اپنے کلام نفسی کو ان دونوں سورتوں کے ذریعے ان کو سنایا۔ اس اسماع کو قراءت کہتے ہیں جیسا کہ کلام النفسی کا نام قرآن حقیقی ہے۔ ان دونوں سورتوں کو خاص کیا گیا ہے اس لئے کہ ان دونوں کا آغاز آپ ﷺ کے اسماء کے ساتھ ہے، جو کہ آپ ﷺ کی اکملیت اور انتہائی عظیم بلند درجے کی طرف اشارہ ہے۔

قبل ان يخلق السوات والأرض بألف عام فلما سمعت الملائكة القرآن : حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرشتوں کی تخلیق زمین و آسمان کی تخلیق سے بہت عرصہ پہلے کی ہے۔ ایک قول ہے کہ قرآن سے مراد قراءت ہے اور جائز ہے کہ یہ اسم ہو یعنی یہ جنس قرآن سے ہے۔ اس کا نام قرآن ان دونوں کی عظمت کو بڑھانے کے لئے ہے۔ ایک قول ہے کہ اس کا اطلاق حقیقتاً بعض پر ہوتا ہے۔

قالت : یعنی وہ فرشتے جنہوں نے دونوں سورتوں کو سنا۔

طوبٰی : یعنی اچھی حالت اور مکمل راحت حاصل ہوگی۔ **لاهة ينزل** :صیغہ مجہول یا معلوم کے ساتھ۔

هذا : یعنی قرآن۔ چونکہ اس کا ذکر قریب ہی ہے یا جو طٰہٰ اور یٰسٓ سے تعلق ہے۔ وہ سیاق سے ظاہر ہے، یا "هذا" یا اس جیسے عموم سے ظاہر ہے۔

عليها : یعنی ان دونوں پر ایمان لانے کے سبب سے۔ ایک قول ہے کہ "طوبٰی" سے مراد جنت میں درخت ہے، اور جنت کے تمام گھروں میں اس کی ٹہنیاں ہیں۔ میں کہتا ہوں: یہ "طوبٰی" اُس طُوبٰی سے ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰی لَھُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ﴾ [الرعد : ۲۹]

وطوبٰی لأجواف تحمل هذا : یعنی اس کو حفظ کرنے اور محافظت کے ساتھ۔

وطوبٰی لألسنة تتکلم بهذا : یعنی اس کو زبانی پڑھتے ہیں، یا دیکھ کر پڑھتے ہیں۔ شاید اسی لئے نہیں کہا کہ : طوبٰی ان کانوں کے لئے ہے جو اِسے سنتے ہیں، تاکہ اس کے ساتھ امت میں داخل ہو جائے جس پر نازل ہوئی ہے۔

۲۱۴۹: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ قَرَأَ حٰمٓ الدُّخَانَ فِی لَیْلَةٍ اَصْبَحَ یَسْتَغْفِرُ لَهٗ سَبْعُوْنَ اَلْفَ مَلَكٍ۔

(رواه الترمذی وقال هذا حدیث غریب وعمربن ابی خثعم الراوی یضعف وقال محمد یعنی البخاری هو منکر الحدیث)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۵۰/۵ حدیث رقم ۲۸۸۸۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''جو شخص رات کو حٰمٓ الدُّخَانَ پڑھتا ہے تو وہ اس حالت میں صبح کرتا ہے کہ ستّر ہزار ملائکہ اس کے لئے استغفار کرتے ہیں'' امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس حدیث کے راوی عمر ابن ابی خثعم ضعیف شمار کئے جاتے ہیں' نیز محمد یعنی امام بخاریؒ نے فرمایا کہ وہ منکر الحدیث ہیں۔''

تشریح: **وعنه** : یعنی ابو ہریرہؓ سے ہی یہ روایت ہے۔

قال : قال رسول الله ﷺ من قرأ حمٓ الدخان : اس کی مثال پہلے گزر چکی ہے۔

فی لیلة : جب رات ہو۔

أصبح : یعنی صبح کی یا قراءت کے بعد صبح ہوگئی۔

یستغفر له سبعون ألف ملك : ابن الملکؒ کہتے ہیں: یعنی اس کی قراءت سے لے کر صبح تک۔ یہ محل نظر ہے۔ اس سے وہ قول اور بھی عجیب وغریب ہے جو ابن حجرؒ نے کہا ہے۔ یعنی اس پر اللہ تعالیٰ کا فضلؒ ہمیشہ کے لئے وسیع ہو جاتا ہے۔

وعمر بن ابی خثعم الراوی یضعف : یعنی حدیث میں جو راوی ہے۔

وقال محمد : یعنی ابن اسماعیل۔ **یعنی** : امام ترمذی کی مراد محمد بن اسماعیل البخاری ہے۔

البخاری : یہ بات ظاہر ہے کہ اس کا تعلق مصنف کی کلام سے ہے۔ **هو** : یعنی عمر بن ابی خثعم۔

منکر الحدیث : شرح نخبہ میں ابن حجرؒ کہتے ہیں: منکر الحدیث ضعیف کہنے سے زیادہ سخت جرح ہے۔

۲۱۵۰: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ قَرَأَحٰمٓ الدُّخَانَ فِی لَیْلَةِ الْجُمُعَةِ غُفِرَلَهٗ۔

(رواه الترمذی وقال هذا حدیث غریب ضعیف وهشام ابو المقدام الراوی یضعف۔)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۵۱/۵ حدیث رقم ۲۸۸۹۔ والدارمی ۵۴۹/۲ حدیث رقم ۳۴۲۰۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ روسل اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''جو شخص جمعہ کی رات کو حٰمٓ الدُّخَانَ پڑھتا ہے تو اسے بخش دیا جاتا ہے'' امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور ہشام ابو المقدام روایت حدیث میں ضعیف شمار کئے جاتے ہیں۔''

تشریح: **وعنه** : یعنی ابو ہریرہؓ۔

قال : قال رسول الله ﷺ من قرأ حمٓ الدخان فی لیلة الجمعة : جیم ومیم کے ضمہ یا میم کے سکون کے ساتھ۔

غفر له : ایک صحیح نسخہ میں "غریب ضعیف" کے الفاظ ہیں۔ایک دوسرے نسخہ میں اس کے برعکس ہے۔ایک نسخہ میں غریب کی جگہ ضعیف ہے،ایک اور نسخہ میں ضعیف کی جگہ غریب ہے۔

هشام ابو المقدام الراوی یضعف.

۲۱۵۱: وَعَنِ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَا نَ يَقْرَأُ الْمُسَبِّحَاتِ قَبْلَ اَنْ يَّرْقُدَ يَقُوْلُ اِنَّ فِيْهِنَّ اٰيَةً خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ اٰيَةٍ۔ (رواه الترمذی وابو داود)

اخرجه ابوداوٗد فی السنن ۳۰۴/۵۔ والترمذی فی السنن ۱۶۶/۵۔ حدیث رقم ۲۹۲۱۔ واحمد فی المسند ۱۲۸/۴۔

ترجمه: "حضرت عرباض ابن ساریہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سونے سے پہلے مسبحات یعنی سورۃ الاسراء،الحدید ،الحشر،الصف،الجمعہ،التغابن اور الاعلیٰ پڑھتے تھے اور فرماتے تھے کہ ان میں ایک آیت ہے جو ہزار آیتوں سے بہتر ہے ترمذی،ابوداؤد۔

تشریح: وعن العرباض : عین کے کسرہ کے ساتھ۔

ابن سارية، ان النبی ﷺ کان یقرأ المسبحات : "باء" کے کسرہ کے ساتھ۔مجازی نسبت ہے اور اس سے مراد وہ سورتیں ہیں،جن کے شروع میں "سبحان" یا "سبح" ماضی کے صیغہ کے ساتھ یا"یسبح" یا"سبح"امر کا صیغہ ہے۔ان کی تعداد سات ہے۔سبحان الذی اسرٰی، الحدید، الحشر، الصف، الجمعة، التغابن الأعلی.

قبل ان یرقد :یعنی سونے سے پہلے۔

یقول :استئناف اس بیان کے لئے ہے کہ ان سورتوں کی قراءت پر ہر رات سونے سے پہلے ترغیب دلانا مقصود ہے۔

ان فیهن :یعنی مسبحات میں۔آیة :یعنی بہت عظمت والی۔خیر :یعنی یہ بہتر ہے۔

من ألف آیة : کہا گیا ہے کہ یہ آیت "لو أنزلنا هذا القرآن". یہ اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء میں سے سب سے زیادہ فضیلت والا نام اللہ اکبر ہے۔اسی وجہ سے ان سورتوں کے مجموعے میں ہیں۔حافظ ابن کثیرؒ سے مروی ہے کہ وہ نام "هو الاول والأخر والظاهر والباطن وهو بکل شیء علیم" یہ آیت تسبیح کے ساتھ شروع ہوتی ہے،اور اس میں جمیع معنی ہیں اور خیر یہ صفت تنزیہہ ہے جو اثبات کی صفت کو شامل ہے۔

طیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: اس آیت میں اسی طرح اخفاء ہے جیسے راتوں میں لیلۃ القدر کا اخفاء ہے۔جمعہ کے دن قبولیت کی گھڑی کا اخفاء تمام قراءت کی محافظت کے لئے ہے۔شاید اسی لئے یہ آیت الگ تھلگ ہے۔

یعنی عرباض سے روایت کیا ہے۔

اور وہ سات سورتیں ہیں:سورۃ بنی اسرائیل،الحدید،الحشر،الصف،الجمعۃ،التغابن اور سورۃ الاعلیٰ۔

قبل ان یرقد :یعنی سونے سے قبل۔یقول :جملہ استنافیہ اس بیان کے لئے ہے۔اية :یعنی عظیم آیت ہے۔

خیر :یعنی وہ آیت بہتر ہے۔من الف لیلة :بعض نے کہا ہے کہ وہ آیت لو انزلنا هذا القرآن اور یہ اللہ کے نام کی طرح کے اس کے دوسرے ناموں میں یہ فضیلت کے لحاظ سے بڑے ہیں۔اسی پر قیاس کر لیں۔

فیهن : ان میں یعنی ان تمام میں اور حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں وہ آیت هو الاول والآخر والظاهر والباطن وهو بکل شیء علیم ہے۔زیادہ واضح یہ بات ہے کہ وہ آیت وہی ہو سکتی ہے جس میں تسبیح یعنی سبح کا مادہ اور فیهن بمعنی جمیعهن یعنی ان

تمام کے مجموعہ میں اور بہترین ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ اس بہترین معنی کو شامل ہے جو صفت تنزیہی ہے جو موصوف کے اثبات کے لئے لازم ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ان میں آیت کو پوشیدہ رکھا گیا ہے، جس طرح کہ راتوں میں سے لیلۃ القدر کا مخفی ہونا اور جمعہ کے دن میں قبولیت کی گھڑی کا پوشیدہ ہونا، یہ اخفاء اس وجہ سے ہے کہ ان کو مکمل پڑھا جائے، نہ کہ صرف اسی آیت کو نادر سمجھ کر پڑھا جائے۔ عرباض سے روایت کیا ہے۔

۲۱۵۲: ورواہ الدارمی عن خالد ابن معدان مرسلا۔ وقال الترمذی ھذا حدیث غریب۔

اخرجه الدارمی فی السنن ۲/ ۵۵۰ حدیث رقم ۳٤۲٤۔

ترجمہ: نیز دارمی نے اس روایت کو خالد بن معدان سے بطریق ارسال نقل کیا ہے۔ اور امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

تشریح: عن خالد بن معدان : میم کے فتحہ اور عین ساکن کے ساتھ۔

مرسلا: کیونکہ وہ تابعین میں سے تھے، فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ستر صحابہ کی زیارت کی ہے اور وہ شامی ثقہ راویوں میں سے تھے جیسا کہ مؤلف نے ان کو ذکر کیا ہے۔ یہ حدیث نسائیؒ نے عرباض سے مرفوع روایت کی ہے، اور حدیث کے راویوں میں ایک راوی ہیں، معاویہ بن صالح ان کے قول سے موقوف روایت کی ہے، اور وہ الحدید، الحشر، الصّف اور الجمعہ اور التغابن اور الاعلیٰ ہیں۔ الحصن میں بھی اسی طرح ہے اور اس کی تائید وہ حدیث بھی کرتی ہے جس کو ہم پیچھے ذکر کر چکے ہیں، کہ آپ علیہ السلام سے مروی "انه کان لاینام حتی یقرأ بنی اسرائیل والزمر" ہے کہ آپ سورۃ بنی اسرائیل اور الزمر پڑھنے سے پہلے نہیں سوتے تھے۔

اس کو امام ترمذی نسائی اور حاکم رحمۃ اللہ علیہم نے عائشہؓ سے روایت کیا ہے۔

۲۱۵۳: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اِنَّ سُوْرَةً فِی الْقُرْاٰنِ ثَلَاثُوْنَ اٰیَةً شَفَعَتْ لِرَجُلٍ حَتّٰی غُفِرَلَهٗ وَهِیَ تَبَارَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ (رواہ احمد والترمذی وابوداود والنسائی وابن ماجة)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۲/ ۱۱۹ حدیث رقم ۱٤۰۰۔ والترمذی فی السنن ۵/ ۱۵۱ حدیث رقم ۲۸۹۱۔ وابن ماجه ۲/ ۱۲٤٤ حدیث رقم ۳۷۸٦۔ واحمد فی المسند ۲/ ۲۹۹۔

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "قرآن میں تیس آیات کی ایک سورت ہے اس سورۃ نے ایک آدمی کی سفارش کی یہاں تک کہ اس کی بخشش ہوگئی اور وہ سورۃ **ملک تبارك الذی بیده الملك** ہے" (احمد ترمذی ابوداؤد نسائی ابن ماجہ)

تشریح: وعن ابی هریرة رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم ان سورة : یعنی عظیم سورۃ۔

فی القرآن : یعنی قرآن میں موجود ہے، کائنۃ منصوب ہے کیونکہ یہ انّ کے اسم کی صفت بن رہا ہے اور یہ ابن حجرؒ کے اس قول کا محتاج نہیں ہے، جو کہ وہ فرماتے ہیں کہ یہ من کے معنی کے میں ہے۔ (**ثلاثون آیة :** مبتداء محذوف کی خبر ہے یعنی **ھی ثلاثون** اور جملہ بھی اِن کے اسم کی صفت بنے گا۔

شفعت : تخفیف کے ساتھ یہ "ف" مشددہ نہیں ہے یہ انّ کی خبر بن رہا ہے۔ اسی طرح طیبیؒ نے کہا، اور زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ ان کا قول ثلاثون، انّ کی خبر ہے اور شفعت خبر ثانی ہے بہر حال ابن حجرؒ کا قول کہنا یہ جملہ استنافیہ ہے۔ اس لحاظ سے ابن حجرؒ کا یہ قول

معنی سے بہت دور ہے۔

الازہار میں فرماتے ہیں: کہ شفعت مجہول کا صیغہ ہے، اس میں عین کلمہ ''ف'' مشدد بھی ہے یعنی اس کی شفاعت قبول کی جائے گی اور ایک قول یہ ہے کہ عین کلمہ ''ف'' مخفف ہے اور فعل میں معروف ہے اور یہ بات زیادہ صحیح ہے. اھ۔ اور اسی پر صحیح قراءت کی کتابت ہے۔

سورۃ کا شفاعت کرنا یا تو (اللہ کے علم میں) حقیقی طور پر ہے، اور یا پھر استعارہ کے طور پر ہے۔ اور یہ بات کہ اس کو جسم کی ہیئت دی جائیگی، جیسے کہ گزر چکا۔ اور یہ تمام کلام ابہام پر مبنی ہے۔

پھر یہ تفسیر سورت کی تعظیم ظاہر کرنے کے لئے ہے کیونکہ اگر یہ کہا جائے کہ: ''ان سورۃ تبارك شفعت'' تو یہ بات اتنی اہمیت والی نہ ہوگی۔

اسی حدیث سے ان لوگوں نے استدلال کیا ہے جو کہتے ہیں کہ بسم اللہ ہر سورت کی آیت کا حصہ نہیں ہے، بلکہ اس کی آیات مکمل ہیں۔ کیونکہ اس کی تیس آیات ہیں۔

صحیح بات یہ ہے کہ اگر ہم اس کو فرض کر لیں وہ ایک ایک مکمل ہے۔ حالانکہ اس کے علاوہ اس کی تیس آیات پوری ہیں، یا تو یہ اس کی آیت سرے سے ہی نہیں ہے، جیسے کہ امام ابوحنیفہؒ اور مالک اور اکثر کا مذہب ہے۔ یا پھر یہ مکمل آیت نہیں ہے، بلکہ پہلی آیت کا ٹکڑا (جزو) ہے، جیسا کہ امام شافعیؒ کے مذہب میں اسی طرح کی روایت ہے۔

لرجل حتی غفر له : شفعت کا متعلق ہے، اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ یہ ماضی کے معنی میں ہو خبر دی جا رہی ہو یعنی کہ آدمی اس کو پڑھتا تھا اور اس کی قدر و قیمت کو سمجھتا تھا اس کی تعظیم کرتا تھا۔ جب فوت ہوا اس سورت نے اس کی سفارش کی حتی کہ اس سے عذاب کو ہٹا دیا اور یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ یہ مستقبل کے معنی میں ہو یعنی اپنے پڑھنے والے کی قبر میں یا قیامت کے دن سفارش کرے گی۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: رجل کو نکرہ لانا افراد کے لئے ہے یعنی آدمیوں میں سے آدمی کی سفارش کرے گی اور اگر شفعت بمعنی تشفع ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ﴿**ونادی اصحاب الجنة**﴾ [الاعراف: ٤٤] اور ﴿**انا فتحنا لك فتحا مبينا**﴾ [الفتح: ١] تو یہ غیب کے بارے میں خبر دینا ہے اور جو آدمی اس کو پڑھے یہ سورت اس کی شفاعت کرے گی اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر ایک کو ابھارنا اور ترغیب دینا کہ ہر ایک اسی کو پڑھنے پر ہمیشگی کرے۔

وهی تبارك الذی بيده الملك [الملك:١] یعنی آخر تک مکمل سورت ہے۔

ابن حبان اور حاکمؒ نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔ اور حاکمؒ نے ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے۔ کہ میں چاہتا ہوں کہ یہ سورت ہر مؤمن کے دل میں ہو یعنی اس کو یاد ہو۔

سورۃ الملک عذابِ قبر سے نجات دلانے والی ہے

۲۱۵۴: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ ضَرَبَ بَعْضُ اَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ خِبَاءَهُ عَلٰى قَبْرٍ وَّهُوَ لَا يَحْسِبُ اَنَّهٗ قَبْرٌ فَاِذَا فِيْهِ اِنْسَانٌ يَقْرَأُ سُوْرَةَ تَبَارَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ حَتّٰى خَتَمَهَا فَاَتَى النَّبِيَّ فَاَخْبَرَهٗ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ هِيَ الْمَانِعَةُ هِيَ الْمُنْجِيَةُ تُنْجِيْهِ مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ۔ (رواه الترمذی وقال هذا حديث غريب)

اخرجه الترمذی فی السنن ١٥١/٥ حديث رقم ٢٨٩٠۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہؓ میں سے ایک شخص نے اپنا خیمہ ایک قبر پر نصب کر

لیا اسے معلوم نہ تھا کہ یہاں قبر ہے دفعتہً انہوں نے سنا کہ اس میں ایک شخص تبارك الذی بیده الملك پڑھ رہا ہے یہاں تک کہ اس نے وہ سورت ختم کی' وہ خیمہ نصب کرنے والے صاحب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ واقعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گوش گزار کیا' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''سورۂ ملک عذاب کو روکنے والی اور نجات دینے والی ہے یہ سورت اپنے پڑھنے والے کو اللہ کے عذاب سے چھٹکارا دلاتی ہے' امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔''

تشریح: وعن ابن عباس قال ضرب بعض اصحاب النبی ﷺ خباء ه : خاء کے کسرہ کے ساتھ اور اس کے بعد مد ہے اور اس کے بعد ضمیر ہے یعنی خیمته، اپنا خیمہ اور ایک نسخہ میں خبأة نکرہ آیا ہے۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: عرب کے گھروں میں سے ایک گھر کی قسم ہے، جو کہ پشم یا اون کا بنا ہوتا ہے، بالوں سے نہیں اور اس کے دو یا تین ستون ہوتے ہیں یعنی چھوٹا سا خیمہ۔

على قبر : یعنی قبر کی جگہ پر۔ وهو : یعنی صحابی۔ لا يحسب : سین کا فتحہ اور کسرہ دونوں صحیح ہیں یعنی انہیں پتا نہیں تھا۔

انه قبر : یعنی یہ قبر والی جگہ ہے۔ فاذا : اذا فجائیہ ہے۔ فيه : یعنی اس جگہ میں۔

انسان : یعنی جو وہاں دفن شدہ تھا، اس نے اس کو نیند میں سنا' یا بیداری کی حالت میں، اور یہ زیادہ ظاہر ہے، اس کے معین اور مبہم ہونے میں بھی احتمال ہے۔

يقرأ سورة تبارك الذى بيده الملك حتى ختمها) [الملك:١]، کہتے ہیں کہ شاید یہ انسان وہی ہو جس کا پہلی حدیث میں ذکر گزر چکا ہے۔ اگر اس بات کو لے لیں، تو یہ ماضی کے بارے میں خبر ہوگی اور اگر اس سے اس حدیث کو مراد نہ لیں، تو یہ غیب کے بارے بتانا خبر ہوگی یہ بات الطیبیؒ نے کہی ہے، اور یہ بات محل نظر بھی ہے۔ ابن الملکؒ کہتے ہیں اس میں اس چیز کی دلیل بھی ہے کہ بعض وہ کام مُردوں سے صادر ہوتے ہیں جو زندہ سے صادر ہوتے ہیں۔

فاتى النبى ﷺ : یعنی خیمہ والا آدمی۔ فأخبره : یعنی جو اس نے سنا تھا بیان کیا۔ فقال النبى ﷺ هى : یعنی سورۃ الملک۔

المانعة : یعنی عذاب قبر کو روکنے والی ہے یا ان گناہوں سے روکتی ہے جو عذاب قبر کو لازم کر دیتے ہیں یا پھر پڑھنے والے سے میدان حشر میں ہر قسم کی تکلیف کو روک دے گی۔

هى المنجية تنجيه من عذاب الله : یعنی جہنم کے عذاب سے یا دوسری صفت پہلی کی تاکید کے لئے ہے، اور قبر عذاب مطلق یا مقید ہوگا۔ اور اس پر یہ روایت دلالت کرتی ہے کہ قبر کے عذاب سے بچانے والی ہے یا دوسرا جملہ پہلے کی تفسیر کرتا ہے اور یہیں پر اس کے بعد یہ قول لایا تنجیه یعنی اور کو بچاتی ہے محفوظ رکھتی ہے پھر پہلی حدیث میں دو جملے شفاعت کی وضاحت کرتے ہیں۔

۲۱۵۵: وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ كَانَ لَا يَنَامُ حَتّٰى يَقْرَأَ آلٓمّٓ تَنْزِيْلُ وَتَبَارَكَ الَّذِىْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ. (رواه احمد والترمذی والدارمی وقال الترمذی هذا حديث صحيح وكذا فى شرح السنة وفى المصابيح غريب.)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۵۲/۵ حدیث رقم ۲۸۹۲۔ والدارمی ۵۴۷/۲ حدیث رقم ۳۴۱۱ واحمد فی المسند ۳۴۰/۳۔

ترجمہ: ''حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الم تنزيل السجده اور تبارك الذى بيده الملك پڑھے بغیر نہیں سوتے تھے۔ (احمد' ترمذی' دارمی) امام ترمذیؒ کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے' محی السنۃ نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے لیکن مصابیح میں کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔''

تشریح: **وعن جابر أن النبی ﷺ عليه وسلم كان لا ينام حتى يقرأ آلم تنزيل** : حکائی اعراب رفع ہے اور ایک نسخے میں نصبی حالت بھی مذکور ہے، اعنی کو مقدر کرتے ہوئے اور مضاف الیہ بھی ہوسکتا ہے۔

وتبارك الذی بيده الملك [الملك: ۱] طیبیؒ فرماتے ہیں: حتی انتہاء کے لئے آیا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کا معنی یہ ہو کہ نیند کا وقت داخل ہونے کے بعد ان دونوں سورتوں کو پڑھنے سے قبل سوتے نہیں تھے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ مطلق طور پر سونے سے پہلے ان دو سورتوں کو پڑھتے تھے ان کے پڑھے بغیر سوتے نہ تھے، اور معنی یہ ہے کہ ان سورتوں کے پڑھنے سے پہلے سونا ان کی عادت نہ تھی اس لحاظ سے سورتوں کا پڑھنا سونے کے وقت کے داخل ہونے سے پہلے ہے جو بھی وقت ہو۔ اگر یہ کہا جائے کہ رسول اللہ ﷺ ان کو رات کو پڑھا کرتے تھے تو اس سے یہ فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ اھ۔

اور افادہ سے مراد یہی پہلے والا فائدہ ہے، اور اس میں کوئی تردد نہیں ہوتا کہ دوسرا احتمال زیادہ ظاہر ہے، اس قول کی ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے کیونکہ یہ ہمیں تنگی کی طرف پہنچا دیتا ہے اور انتہائی عجیب بات ہے، کہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: آپ کا کہنا **لا ینام** یعنی نیند کا ارادہ، نیند کے وقت کے داخل ہونے سے پہلے نہیں کرتے تھے۔ تاکہ فائدہ دے اس چیز کا جس کو ائمہ نے برقرار رکھا، کہ وہ ان دو سورتوں کا دوسری سورتوں کے ساتھ پڑھنا سنت کہتے ہیں، ہر رات کو سونے سے پہلے اور اس کی تائید نسائی کی حدیث کرتی ہے، دوسرے احتمال کہ "**من قرأها كل ليلة منعه الله بها من عذاب القبر**" جو اس سورت کو ہر رات پڑھے گا، اللہ اس کو عذاب قبر سے محفوظ رکھے گا، یہاں پر جو شارح کے لئے ہے وہ اس کے خلاف کا تقاضا کرتا ہے اور وہ ان کا قول یہ کہ آپ علیہ السلام کی عادت مبارکہ تھی کہ ان دو سورتوں کو پڑھنے سے قبل نہیں سوتے تھے، اگرچہ نیند کا وقت داخل ہونے سے پہلے ہی کیوں نہ ہو، غفلت کی وجہ سے جس کو ائمہ نے بھی ذکر کیا ہے جس سے میں نے بھی ذکر کیا ہے۔ اور یہ اس پر محمول ہے کہ نہ طیبیؒ کی بات سمجھ میں آئی اور نہ دیگر ائمہ کی بات، اور اگر اس طرح نہ ہو تو طیبیؒ کے کلام اور ان ائمہ کے کلام کے درمیان اہل فہم کے لئے کوئی تفاوت نہیں ہے، ان کی عبارتوں کی اجنبیت کے باوجود یہ کہ وہ نیند کا ارادہ نہیں کیا کرتے تھے۔ **و كذا** : یعنی یہ والی مذکورہ روایت۔

فی شرح السنة وفی المصابيح غريب : یعنی یہ حدیث غریب ہے۔ الطیبیؒ فرماتے ہیں: یہ غریب ہونا اس کے صحیح ہونے کی نفی نہیں کرتا، کیوں کہ غریب حدیث بھی کبھی کبھار صحیح ہوتی ہے۔ اھ۔ نسائی نے اور ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں اور حاکمؒ نے اپنی مستدرک میں یہ روایت ذکر کی ہے اور سب نے جابرؓ سے روایت کی ہے۔

۲۱۵۶: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَّاَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا زُلْزِلَتْ تَعْدِلُ نِصْفَ الْقُرْاٰنِ وَقُلْ هُوَاللّٰهُ اَحَدٌ تَعْدِلُ ثُلُثَ الْقُرْاٰنِ وَقُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ تَعْدِلُ رُبُعَ الْقُرْاٰنِ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵/۱۵۳ حديث رقم ۲۸۹۴۔

ترجمہ: "حضرت ابن عباسؓ اور حضرت انس بن مالکؓ دونوں روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "سورۂ اذا زلزلت نصف قرآن کے برابر ہے، سورۃ قل ھو اللہ تہائی قرآن کے برابر ہے اور سورۂ قل یایھا الکفرون چوتھائی قرآن کے برابر ہے۔" (ترمذی)

تشریح: **وعن ابن عباس وأنس بن مالك قالا قال رسول الله ﷺ ﴿اذا زلزلت﴾** [الزلزلة: ۱]، **تعدل نصف القرآن و ﴿قل هو الله احد﴾** [الاخلاص: ۱]، **تعدل ثلث القرآن وقل ﴿يا أيها الكافرون﴾** [الكافرون: ۱] **تعدل ربع القرآن** : طیبیؒ فرماتے ہیں: قرآن سے مقصود مبتداء کا، آخرت کا بیان اور **اذا زلزلت** اجمالی طور پر آخرت کے ذکر پر مشتمل ہے اور بعض

روایات میں ہے کہ یہ چوتھائی قرآن کے برابر ہے

انها تعدل ربع القرآن۔اس کا بیان یہ ہے کہ مضامین قرآن چار قسموں پر مشتمل ہیں توحید، نبوت ورسالت اور گزر بسر کے احکام اور آخرت کے حالات اور یہ سورت بیان آخرت پر مشتمل ہے، اور **قل یا ایها الکافرون**، توحید کے بیان پر محتوی ہے، کیونکہ شرک سے بیزاری توحید کا اثبات ہے۔پس ان میں سے ہر ایک ربع قرآن کے برابر ہو جاتی ہے۔اس سے مکمل برابری (آیات وواقعات کے لحاظ سے) مراد نہیں ہے، تاکہ سورۃ اخلاص پر اذازلزلت کی فضیلت وبرتری ثابت نہ ہو جائے، اھ۔اس میں یہ بھی ہے کہ سورۃ اخلاص میں تسویہ حقیقی یعنی حقیقی برابری نہیں ہے، اسی طرح اس میں بھی تاویل توجیہہ کی جائے گی۔

پھر یہ کہا گیا ہے کہ یہ توجیہات ہمارے علم وفہم کے مطابق ہیں، جو کہ قصور واحتمال سے خالی نہیں ہوسکتی، بہر حال حقیقت یہ ہے کہ نبی ﷺ سے اس طرح مروی ہے اور یقیناً وہ ایسی ہستی ہیں جن تک چیزوں کی حقیقت کی معرفت کی انتہاء ہوتی ہے۔اور خفیہ علوم بھی ان پر کشف ہوتے رہے ہیں۔

پہلا ٹکڑا ترمذیؒ اور حاکمؒ کی روایت ہے جو کہ ابن عباسؓ سے بھی منقول ہے جب کہ دوسرا حصہ بخاریؒ، ابوداؤدؒ، ترمذیؒ اور حاکمؒ کی روایت ہے اور یہ سب ابوخدریؓ سے روایت کرتے ہیں۔

سورۃ حشر کی آخری تین آیات کی فضیلت

۲۱۵۷: وَعَنْ مَعْقَلِ بْنِ یَسَارٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ مَنْ قَالَ حِیْنَ یُصْبِحُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ فَقَرأَ ثَلَاثَ اٰیَاتٍ مِنْ اٰخِرِ سُوْرَةِ الْحَشْرِ وَکَّلَ اللّٰهُ بِهٖ سَبْعِیْنَ اَلْفَ مَلَكٍ یُصَلُّوْنَ عَلَیْهِ حَتّٰی یُمْسِیَ وَاِنْ مَاتَ فِیْ ذٰلِكَ الْیَوْمِ مَاتَ شَهِیْدًا وَمَنْ قَالَهَا حِیْنَ یُمْسِیْ کَانَ بِتِلْكَ الْمَنْزِلَةِ . (رواه الترمذی والدارمی وقال الترمذی هذاحدیث غریب)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۶۷/۵ حدیث رقم ۲۹۲۲۔ والدارمی ۵۵۰/۲ حدیث رقم ۳۴۲۵۔

ترجمہ: ''حضرت معقل بن یسارؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا'' جو شخص صبح کے وقت تین مرتبہ اعوذ بالله السمیع العلیم من الشیطان الرجیم اور سورۂ حشر کی آخری تین آیتیں یعنی هو الله الذی لا اله الا هو سے آخر سورت تک پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ستر ہزار فرشتے متعین کرتا ہے جو اس کے لئے شام تک رحمت کی دعا کرتے رہتے ہیں اور اس کے گناہوں کی بخشش چاہتے ہیں اور اگر وہ شخص اس دن میں مرجاتا ہے تو شہادت کی موت پاتا ہے اور جو شخص اعوذ باللہ...... اور ان آیتوں کو شام کے وقت پڑھے تو صبح تک اسے یہ سعادت حاصل ہوتی ہے'(ترمذی' دارمی) امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔''

تشریح: **وعن معقل بن یسار عن النبی ﷺ قال من قال حین یصبح** : یعنی صبح کرے۔

ثلاث مرات اعوذ بالله السمیع : یعنی اس کلمہ کو پڑھے۔ **العلیم** : میرے حال کو۔

من الشیطان الرجیم : یعنی اس کے مکروفریب سے۔دعا میں تکرار یعنی تین ۳ دفعہ پڑھنا عاجزی کی وجہ سے ہے۔اور یہ جملہ لفظاً خبریہ ہے، اور معناً انشائیہ دعائیہ ہے۔یا تین دفعہ پڑھنا آیات کی تعداد کی مناسبت سے ہے، تاکہ قاری (پڑھنے والا) اس کے پڑھنے سے نہ رُکے اور اس کے معانی میں تدبر کرے، اور اس میں جو اخلاقیات ہیں ان کو اپنائے۔

فقرأ : یعنی مذکورہ تعوذ کے بعد۔اور ظاہر یہ کی وہ دلیل بھی اس سے ٹوٹ جاتی ہے جو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے قول کے ظاہر سے

﴿فاذا قراء ت القرآن فاستعذ بالله﴾ [النحل: ۹۸] امام الطیبیؒ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کے اس قول "فاستعذ بالله" میں فاء مقابلے کے لئے ہے۔ کیونکہ آیت ظاہری طور پر قراءت کوتعوذ سے پہلے واجب قرار دیتی ہے، اور حدیث اس کے خلاف ہے۔ یہ ایسے ہے کہ کہا جائے گا۔ جب قراءت کا ارادہ کرے تو پناہ طلب کرلے، اور حدیث میں یہ تاویل مناسب نہیں ہے۔

ثلاث آیات من آخر سورة الحشر: یعنی اللہ کے فرمان: ﴿هو الله الذی لا اله الا هو عالم الغیب﴾ [الحشر: ۲۲] سے لے کر مکمل سورت تک، کیونکہ اکثر کے نزدیک یہ آیات اسم اعظم پر مشتمل ہیں۔

وكل الله به سبعین ألف ملك یصلون علیه : یعنی اس کے لئے نیکی کرنے کی توفیق اور گناہ سے دور رہنے کی دعا کرتے ہیں یا اس کے لئے استغفار کرتے ہیں۔

حتی یمسی وان مات فی ذالك الیوم مات شهیدا : یعنی حکمی شہید۔

ومن قالها : یعنی ان کلمات کو اور ابن حجر نے انتہائی عجیب بات کی ہے، کہ اس مذکورہ قصے کو کہے گا۔

حین یمسی كان بتلك المنزلة : یعنی اس لکھے ہوئے مرتبہ پر ہوگا اور ظاہر ہے کہ یہ بعض رواۃ سے نقل بالمعنی اختصاراً ذکر کیا گیا ہے۔

جان لو! کہ صبح سے مراد قاموس اور دیگر لغت کی کتابوں میں فجر ہے، یا دن کا ابتدائی حصہ، اور اس میں اشارہ ہے کہ پہلا شریعت کا اطلاق ہے، اور دوسرا معنی ہے ستاروں کی گردش سے کائنات کے احوال معلوم کرنے والوں کا، پھر فرمایا: **المساء اور الامساء** یہ **الصباح** اور **الاصباح** کی ضد ہیں، اور ابن حجرؒ نے یہاں بھی عجیب بات کہی ہے، کہتے ہیں: ظاہر ہے کہ صبح سے مراد عموماً دن کا ابتدائی حصہ اور شام سے مرادرات کا ابتدائی حصہ ہوتا ہے، اسی طرح ہر اس ذکر کے بارے میں کہا جائے گا جو صبح یا شام سے متعلقہ ہو اور یہاں ان کا لغوی معنی مراد نہیں ہے، کیونکہ اس طرح صبح تو آدھی رات سے زوال تک ہوتی ہے، اور شام زوال سے آدھی رات تک ہوتی ہے، جیسا کہ ثعلب اور اس کے ہم مذہب لوگوں کا قول ہے اھ۔

بالفرض اگر بعض لغویوں کے نزدیک اس کو صحیح مان لیا جائے تو بھی —— جمہور کے قول سے ثعلب کے قول کی طرف عدول کوئی معنی نہیں رکھتا۔ انہوں نے اس کا (ہر لغت) کا اطلاق کیا ہے پھر عرف شرعی سے جو لغت کے مطابق ہو اس کا عرف عامہ کی طرف اس کا کوئی معنی نہیں۔ حدیث اور آیت میں کے پہلے قول سے پھیرنے والی کوئی چیز نہیں اور دوسرے پر ابھارنے والی کوئی چیز نہیں۔

عرضِ مرتب:

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس حدیث میں سورۃ حشر کی آخری تین آیات یعنی: ﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ (۲۲) هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ (۲۳) هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (۲۴)﴾ کی فضیلت بیان کی گئی ہے کہ جو شخص ان کی تلاوت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے ستر ہزار فرشتے متعین کر دیتے ہیں جو اس کے لیے خیر کی توفیق کی اور شر کے دفع ہونے کی دعا مانگتے ہیں اور اس کے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں اور اگر اس دن مرے گا۔ تو شہید ہو کر مرے گا۔

۲۱۵۸: وَعَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ مَنْ قَرَأَ كُلَّ یَوْمٍ مِأَتَیْ مَرَّةٍ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ مُحِیَ عَنْهُ ذُنُوْبُ خَمْسِیْنَ سَنَةً اِلَّا اَنْ یَّكُوْنَ عَلَیْهِ دَیْنٌ۔ رواه الترمذی والدارمی وفی روایته خَمْسِیْنَ مَرَّةً وَلَمْ یَذْكُرْ اِلَّا اَنْ

يَكُوْنَ عَلَيْهِ دَيْنٌ۔

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۵٤/۵ حديث رقم ۲۸۹۸۔ والدارمی ۵۵۳/۲ حديث رقم ۳٤۳۸۔

ترجمہ: ''حضرت انسؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''جو شخص ہر روز دو سو مرتبہ قل هوالله احد پڑھے تو اس کے پچاس برس کے گناہ مٹا دیئے جاتے ہیں الا یہ کہ اس پر دین ہو (کہ وہ معاف نہیں ہوتا) (ترمذی، دارمی) ایک اور روایت میں پچاس مرتبہ ذکر ہے نیز اس روایت میں الا یہ کہ اس پر دین ہو کے الفاظ مذکور نہیں ہے۔''

تشریح: وعن انس عن النبی ﷺ قال من قرأ كل يوم مأتى مرة ﴿قل هو الله احد﴾ [الاخلاص:۱] : یعنی آخر قرآن تک مکمل سورۃ یا یہ سورت۔

محی عنه : یعنی اس کے نامہ اعمال سے۔

ذنوب خمسين سنة الا أن يكون عليه دين : یعنی اس طور پر کہ ان گناہوں کا تعلق حقوق العباد میں سے کسی کے حق کے ساتھ ہو جیسے کہ قرض وغیرہ کی عدم ادائیگی زندگی میں اور مرنے کے وقت وصیت نہ کرنا۔ یہ مجھے سمجھ آئی ہے اور وہ اسی طرح ہے جیسا کہ امام مسلم روایت کرتے ہیں: ''**يغفر للشهيد كل شىء الا الدين**'' کہ شہید کے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے سوائے قرض کے۔

طیبیؒ فرماتے ہیں: قرض کو گناہوں کی جنس میں شامل کرنے کا مقصد اس کو خوفناک بنا کر بُرا بتانا ہے۔ اور ابن حجرؒ نے بھی یہی بات کہی ہے، لیکن انہوں نے صغیرہ گناہوں کی قید لگائی ہے وہ بھی وہ جو اللہ تعالیٰ کے متعلقہ ہیں۔

روایت ہے یعنی دارمیؒ کی روایت میں اور ایک نسخہ میں اور ایک دارمی کی روایت میں۔

خمسين مرة : یعنی پچاس مرتبہ پڑھنے کے بدلے، اور یہ مناسبت میں زیادہ ظاہر ہے عمل اور اس پر حاصل ہونے والے ثواب کے مابین اور پہلی روایت کی توجیہ یہ ہے کہ آپ علیہ السلام سے زیادہ مشہور ہے۔

ولم يذكر : یعنی دارمیؒ نے اس روایت میں۔

الا ان يكون عليه دين : کیونکہ یہ بات واضح ہے کہ حقوق العباد میں کوئی نرمی نہیں ہوگی۔ اور رہا ابن حجرؒ کا قول کہ مطلق قرض مراد ہے، اگرچہ اللہ کا ہی کیوں نہ ہو جیسے زکوٰۃ اور کفارہ یہ اس طرح نہیں معاف ہوں گے، کیونکہ ان میں آدمی کے لئے مضبوط شائبہ ہے۔ کیونکہ جو اس کو اس طرف پھیرتا ہے، کہ یہ گناہ معاف نہیں ہوں گے تو یہ بات ردّ ہے کیونکہ اگر قرض سے مراد لوگوں کا قرض ہو تو اس پر اس کا اطلاق درست نہیں، اور اگر اس سے مراد اللہ کا قرض ہو پھر اس قسم میں استثنا کی کیا ضرورت ہے۔

۲۱۵۹: **وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ مَنْ اَرَادَ اَنْ يَّنَامَ عَلٰى فِرَاشِهٖ فَنَامَ عَلٰى يَمِيْنِهٖ ثُمَّ قَرَأَ مِائَةَ مَرَّةٍ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ يَقُوْلُ لَهُ الرَّبُّ يَا عَبْدِيْ اُدْخُلْ عَلٰى يَمِيْنِكَ الْجَنَّةَ۔**

(رواه الترمذی وقال هذا حديث حسن غريب)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۵٤/۵ حديث رقم ۲۸۹۸۔

ترجمہ: ''حضرت انسؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''جو شخص اپنے بستر پر سونے کا ارادہ کرے اور پھر اپنی داھنی کروٹ پہ لیٹ کر سو مرتبہ قل هوالله احد پڑھے تو قیامت کے دن پروردگار اس سے فرمائے گا کہ اے میرے بندے اپنی دائیں جنت میں داخل ہو جا'' (امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا

ہے یہ حدیث غریب ہے)۔"

تشریح: وعنه : یعنی انسؓ سے۔

عن النبی ﷺ من اراد : اور ایک نسخہ میں ہے: **قال من اراد** اور یہی زیادہ ظاہر ہے۔

أن ينام على فراشه فنام : اس کا عطف اَرَادَ پر ہے، اور فاء تعقیب کے لئے ہے۔

على يمينه : یعنی سنت طریقے کے مطابق۔(**ثم قرأ مائة مرّة** : **ثم**، تراخی کے لئے ہے ترتیب کے ساتھ۔

﴿**قل هو الله احد**﴾ [الاخلاص:۱]**اذا كان يوم القيامة يقول له الرب** : شرط اپنی اس جزاء کے ساتھ **هو يقول** ہے، پہلی شرط کے لئے جزاء ہے جو کہ "**من**" ہے، اور شرط ثانی اپنی جزا میں عمل نہیں کرسکتی میری مراد یقول ہے کہ شرط ماضی ہے اس میں عمل نہیں کرے گی تو جزاء میں بھی عمل نہیں کرے گی۔

يا عبدى! : اے میرے خاص بندے! میری توحید میں مبالغہ کرنے والے۔

ادخل على يمنك : **ادخل** کے فاعل سے حال ہے، یہ اس کے مطابق ہو گیا، **فنام على يمينه** یعنی تو نے جب میرے رسول کی اطاعت کی اور دائیں کروٹ لیٹ کر اس سورت کی تلاوت کی جس میں میری صفات ہیں، اس وجہ سے آج تو اصحاب الیمین میں سے ہے، اور دائیں طرف سے جنت میں داخل ہو جا۔

الجنة : اس حدیث میں اشارہ ہے کہ جنت کے جو باغات اور محلات دائیں جانب ہوں گے وہ بائیں جانب سے افضل ہیں، اگر چہ اس کی دونوں طرفیں داہنی ہی ہیں۔ اور اس میں اس کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جنت والے تین اقسام میں منقسم ہوں گے، پہلی قسم مقربون یہ علیین والے ہوں گے، اور ابرار یعنی نیکوکار یہ دائیں طرف والے ہوں گے، اور بخشے ہوئے یا سفارش کئے ہوئے یا پاک (عذاب سے پاک) کئے ہوئے گنہگار ہوں گے اور وہ بائیں طرف والے ہوں گے۔

یہ بات اللہ تعالیٰ کے اس قول سے اخذ ہوئی ہے: ﴿ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا﴾ [فاطر: ۳۲-۳۳]

"پھر ہم نے کتاب کا وارث ان لوگوں کو بنایا جن کو ہم نے اپنے بندوں سے چن لیا ہے ممتاز کر لیا ہے ان میں سے کچھ اپنے آپ پر ظلم کرنے والے ہیں اور کچھ درمیانے اور کچھ اللہ کے حکم سے نیکی کے کاموں میں سبقت لے جانے والے ہیں، یہ اللہ کا بہت بڑا افضل ہے ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی جنت ہے جس میں یہ لوگ داخل ہوں گے" اھ۔ یعنی ان تینوں قسموں کے ممتاز لوگ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں یہ اجر (ثواب) آدمی کے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرتے ہوئے دائیں پہلو لیٹنے اور اس سورۃ کے پڑھنے کا بدلہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔ اس کے بدلے اللہ اصحاب الیمین سے بنا دے گا اور جنت میں دائیں طرف سے دخول نصیب فرمائے گا۔

علماء فرماتے ہیں یہ بات مناسب معلوم ہوتی ہے جس کو بھی فضائل اعمال سے کوئی چیز پہنچے وہ اس پر عمل کرے اگر چہ ایک دفعہ ہی کیوں نہ ہو اور اگر چہ وہ حدیث ضعیف ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ وہ اس پر عمل اتفاقی طور پر کر رہا ہے۔

۲۱۶۰: وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ اَنَّ النَّبِىَّ ﷺ سَمِعَ رَجُلاً يَقْرَأُ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ فَقَالَ وَجَبَتْ قُلْتُ وَمَا وَجَبَتْ ؟ قَالَ الْجَنَّةُ (رواه مالك والترمذى والنسائى)

اخرجه الترمذى فى السنن ۱۵٤/۵ حديث رقم ۲۸۹۷۔ والنسائى ۱۷۱/۲ حديث رقم ۹۹٤ ومالك ۲۰۸/۱ حديث

رقم ۸ من کتاب القرآن۔ واحمد فی المسند ۲/ ۲۰۳۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو قل ھواللہ احد پڑھتے سنا تو ارشاد فرمایا ''واجب ہوگئی؟ میں نے عرض کیا کہ کیا چیز واجب ہوگئی؟ فرمایا جنت۔'' (مالک' ترمذی' نسائی)

تشریح: **وعن ابی هریرة ان النبی ﷺ سمع رجلاً یقرأ قل هو الله احد فقال وجبت** : یعنی اس کے لئے۔

فقلت ما وجبت : یعنی آپ کی اس بات کا کیا مطلب اس کے پڑھنے والے پر ثواب واجب ہوجاتا ہے یا جو کرے وہ ہے۔

قال الجنة : یعنی اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق ہے، اور اس کے اس فضل کے مطابق جس کی خلاف ورزی وہ نہ کرے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿**ان الله لا یخلف المیعاد**﴾ [الرعد: ۳۱] ''یقیناً اللہ تعالیٰ وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا''۔

۲۱۶۱: **وَعَنْ فَرْوَةَ بْنِ نَوْفَلٍ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّهٗ قَالَ يَارَسُوْ لَ اللّٰهِ عَلِّمْنِي شَيْئًا اَ قُوْلُهٗ اِذَا اَوَيْتُ اِلٰى فِرَاشِيْ فَقَالَ اِقْرَأْ قُلْ يَا اَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ فَاِنَّهَا بَرَآءَةٌ مِنَ الشِّرْكِ.** (رواہ الترمذی و ابو داود و الدارمی)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۵/ ۳۰۳ حدیث رقم ۵۰۵۵۔ والترمذی فی السنن ۵/ ٤٤٢ حدیث رقم ۳٤۰۳۔ والدارمی ۲/ ۵۵۱ حدیث رقم ۳٤۲۸۔ واحمد فی المسند ۵/ ٤۵٦۔

ترجمہ: ''حضرت فروہ ابن نوفل اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! مجھے کوئی ایسی چیز سکھلا دیجئے جسے میں اپنے بستر پر جاکر پڑھ لیا کروں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا قل یاایھا الکفرون پڑھ لیا کرو کیونکہ یہ سورت شرک سے براءت کا اعلان ہے۔'' (ترمذی' ابوداؤد' دارمی)

تشریح: **وعن فروة بن نوفل عن ابیه** : تقریب التہذیب میں ہے کہ فروۃ بن نوفل اشجعی کے صحابی ہونے میں اختلاف ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ ان کے والد صحابی تھے انہوں نے اپنے باپ سے کسب علم کیا تھا اور یہ فروہ طبقہ ثالثہ کے راویوں میں سے تھے۔

انه قال یا رسول الله علمنی شیئاً قوله اذا أویت : أویت، قصر اور مد دونوں طرح پڑھا جاسکتا ہے۔

الی فراشه فقال اقرا قل یا ایها الکافرون [الکافرون:۱] : یعنی مکمل سورت اور بعض روایات میں ہے پھر انکے اختتام پر سوجا۔

فانها : یعنی یہ سورت۔ (**بر آءة من الشرك** : یعنی شرک سے بیزاری اور توحید کے لئے موید ہے۔

اس کو نسائی اور ابن حبان اور حاکم نے اور ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے۔

سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کے ذریعے پناہ پکڑا کرو

۲۱٦۲: **وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ بَيْنَا اَنَا اَسِيْرُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ بَيْنَ الْجُحْفَةِ وَالْاَبْوَاءِ اِذْ غَشِيَتْنَا رِيْحٌ وَظُلْمَةٌ شَدِيْدَةٌ فَجَعَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَتَعَوَّذُ بِاَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ وَاَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ وَيَقُوْلُ يَا عُقْبَةُ تَعَوَّذْ بِهِمَا فَمَا تَعَوَّذَ مُتَعَوِّذٌ بِمِثْلِهِمَا۔** (رواہ ابو داود)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۲/ ۱۵۳ حدیث رقم ۱٤٦۳۔

ترجمہ: ''حضرت عقبہ بن عامرؓ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ جحفہ اور ابواء کے درمیان چل رہا تھا کہ اچانک سخت آندھی اور شدید اندھیرے نے ہمیں آ گھیرا چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اعوذ برب الفلق اور اعوذ برب الناس کے ذریعہ پناہ مانگنی شروع کی اور مجھ سے فرمایا کہ ''عقبہ'' ان دونوں سورتوں کے ذریعہ پناہ مانگو کیونکہ کسی پناہ چاہنے والے نے ان دونوں کی مانند کسی چیز کے ذریعہ پناہ نہیں چاہی ہے۔'' (ابوداؤد)

تشریح: **وعن عقبة بن عامر قال بين انا اسير مع رسول الله ﷺ بين الجحفة :** اور یہ اہل شام اور اہل مصر اور اہل مغرب کا قدیم میقات تھا۔اس دوران اس کا نام رابغ تھا اس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ سیول نامی پرندے اس کو اپنے پروں میں لے لیا تھا اور یہ وہی جگہ ہے جس کی طرف آپ ﷺ نے مدینہ کے نجار کو بھیجا تھا' یہاں سے اگر کوئی کبوتر بھی گزرتا تو اس کو بھی بخار ہو جاتا تھا۔

یا تو اس کے پانی کی قلت کی وجہ سے یا پناہ کے بارے کثرت خوف کی وجہ سے لوگ رابغ سے اپنے احرام تبدیل کرتے تھے، جو کہ امن اور پانی کی فروانی میں مشہور ہے۔

عرضِ مرتب:

والابواء : ہمزہ کے فتحہ اور باء کے سکون اور مد کے ساتھ، مکہ اور مدینہ کے درمیان پہاڑ ہے، ایک قول یہ ہے کہ یہی وہ بستی اور وہی مقام ہے جہاں رسول اللہ ﷺ کی والدہ ماجدہ نے وفات پائی۔اس کے اور جحفہ کے درمیان 20 ربیس یا تیس میل کا فاصلہ ہے۔

اذ غشيتنا ريح وظلمة شديدة فجعل : یعنی آپ نے پڑھنا شروع ہو۔

رسول الله ﷺ يتعوذ ﴿اعوذ برب الفلق﴾ [الفلق :۱] : یعنی مخلوق کے شر سے یا جہنم کے عذاب سے۔

اعوذ برب الناس)[الناس :۱]: یعنی یہ دو سورتیں اس پر مشتمل ہیں۔ **(ويقول :** اور ظاہر یہ ہے کہ روایت میں قال ہے یہ استقبال کی طرف عدول ہے ماضی اور حال کی موجودگی میں، باوجود اس کے کہ آپ علیہ اسلام سے تکرار کا وقوع اس پر ابھارنے اور ترغیب دینے کی غرض سے ہے۔

اور ابن حجرؒ کی بات بہت ہی عجیب وغریب ہے کہ انہوں نے واؤ کو حالیہ کہا، فرماتے ہیں: یعنی اور حال یہ ہے کہ جب بھی ان دو سورتوں کی قراءت سے فارغ ہوتے ،فرماتے۔

يا عقبة تعوذ بهما فما تعوذ متعوذ بمثلهما : یعنی بلکہ یہ دونوں افضل تعویذ (پناہ) ہیں اور اسی وجہ سے جب رسول اللہ ﷺ پر جادو کیا گیا تھا ایک سال تک آپ مسحور رہے، حتی کہ اللہ نے آپ کو یہ دو سورتیں سکھانے کے لئے دو فرشتے بھیجے، پس آپؐ نے پڑھیں تو آپؐ سے جادو کا اثر زائل ہو گیا۔

۲۱۶۳ :وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ خُبَيْبٍ قَالَ خَرَجْنَا فِي لَيْلَةٍ مَّطَرٍ وَظُلْمَةٍ شَدِ يْدَةٍ نَطْلُبُ رَسُو لَ اللّٰهِ ﷺ فَاَدْرَكْنَاهُ فَقَالَ قُلْ قُلْتُ مَآ اَقُوْلُ ؟ قَالَ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ وَالْمُعَوِّذَتَيْنِ حِيْنَ تُصْبِحُ وَحِيْنَ تُمْسِيْ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ تَكْفِيْكَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ. (رواه الترمذی ابوداودوالنسائی)

اخرجه ابوداؤد في السنن ۳۲۰/۵ حديث رقم ۵۰۸۲۔ والترمذی ۵۳۰/۵ حديث رقم ۳۵۷۵ والنسائی ۲۵۰/۸ حديث رقم ۵۴۲۸۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن خبیبؓ فرماتے ہیں کہ ہم برسات کی ایک سخت اندھیری رات میں رسول اللہ ﷺ کو تلاش کرتے ہوئے نکلے چنانچہ ہم نے آپ کو پالیا' آپ نے فرمایا کہ پڑھو' میں نے عرض کیا کہ ''کیا پڑھوں'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا'' صبح اور شام کے وقت تین مرتبہ قل ھواللہ احد' قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس پڑھ لیا کرو یہ تمہیں ہر چیز سے کفایت کریں گی۔'' (ترمذی'ابوداؤد'نسائی)

تشریح: **وعن عبد الله بن خبيب قال خرجنا في ليلة مطر وظلمة :** یعنی بارش اور اندھیری رات میں۔

نطلب رسول الله ﷺ : یعنی آپ کی رفتار تیز ہونے کی وجہ سے (آپ کے تیز چلنے کی وجہ سے)۔

فأدركناه فقال قل : یعنی پڑھ۔ قلت ما أقول: یعنی میں کیا پڑھوں؟

قال قل هو الله احد [الاخلاص: ۱] :قل هو الله احد کی نصبی حالت ہے اقرأ فعل محذوف مانا جائے گا،

والمعوذتين : واؤ کے کسرہ کے ساتھ اور فتحہ بھی پڑھا جاسکتا ہے،معطوف علیہ ہے۔

حين تصبح وحين تمسي ثلاث مرات تكفيك : تكفى مؤنث کا صیغہ استعمال کیا یعنی تین سورتیں یا مذکر بھی ہوسکتا ہے یا پھر اس سے مراد اللہ تعالیٰ تجھے کافی ہوگا۔

من كل شى: طیبیؒ فرماتے ہیں: تجھ سے ہر قسم کی برائی ہٹا دیں گی۔من زائدہ اثبات میں ہے ایک جماعت کے مذہب کے مطابق اور جمہور کا مذہب بھی یہی ہے، کیونکہ یکفیک یہ نفی کو متضمن ہے،اس کی تفسیر سے سمجھا جاسکتا ہے۔تدفع کے ذریعے۔اور صحیح بات یہ ہے کہ من ابتداء الغاية کے لئے ہے، یعنی تجھ سے برائی سے نچلے مرتبہ سے لے کر یعنی چھوٹی برائی سے لے کر بڑی سے بڑی برائی (مصیبت) کو تجھ سے روک لے گا۔یا پھر من تبعیضیہ ہے یعنی مصیبت کی اقسام میں سے کچھ برائیوں کو روک دیں گی۔اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کا معنی ہو تجھے اس کے علاوہ سے غنی (بے پرواہ) کر دیں گی۔اور دوسرے معنی کی تائید پہلی حدیث کا مفہوم بھی کرتا ہے، جو کہ عقبہ روایت کرتے ہیں کہ "ما تعوذ متعوذ بمثلها" اور یہ تضعیف ابن حجر کے خلاف ہو جاتی ہے،ان کا پہلا قول آنے والی روایت کے ساتھ ہے اور یہ محل نظر ہے، کیونکہ آنے والی حدیث میں سورۃ الناس اکیلی ہے اور فضائل میں قیاس کا کوئی اعتبار نہیں، وجہ جو میں وہاں ذکر وں گا اس پر غور کرنا، پس ان کی یہ بات بغیر غور فکر صادر ہوئی ہے۔

۲۱۶۴:وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَقْرَأُ سُوْرَةَ هُوْدٍ اَوْ سُوْرَةَ يُوْسُفَ قَالَ لَنْ تَقْرَأَ شَيْئًا اَبْلَغَ عِنْدَ اللّٰهِ مِنْ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۔ (رواه احمد والنسائی والدارمی)

اخرجه النسائی فی السنن ۱۵۸/۲ حدیث رقم ۹۵۳۔ والدارمی ۵۵۳/۲ حدیث رقم ۳۴۳۹۔ واحمد فی المسند ۱۴۹/۴۔

ترجمہ:"حضرت عقبہ ابن عامرؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا "یا رسول اللہ ﷺ کیا میں سورۂ ہود پڑھا کروں یا سورۂ یوسف آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا "تم اللہ کے نزدیک قل اعوذ برب الفلق سے بلیغ تر کوئی چیز نہیں پڑھ سکتے۔"

تشریح: وعن عقبة بن عامر قال قلت يا رسول الله ﷺ أقرأ : یہاں أقرأ ہے ہمزہ الاستفہام حذف ہوگیا یا یہ ہو سکتا ہے کہ اس کو مد کے ساتھ پڑھا جائے یعنی آقرأ، پھر بغیر حذف کے بھی استفہام کا فائدہ حاصل ہو جاتا ہے۔

سورة هود : ہود منصرف اور غیر منصرف دونوں طرح پڑھا جاسکتا ہے۔

أو سورة يوسف : یعنی میں اپنی پریشانی اور مصیبت کو دور کرنے کی خاطر ان میں سے کوئی ایک سورت پڑھ لوں؟

قال لن تقرأ شيئًا أبلغ : یعنی پناہ مانگنے اور مصیبت کے ٹالنے کے لئے مکمل ہے۔

عند الله : یعنی یہ کلام اللہ کی سورتوں میں سے یا اس کی قضاء اور تقدیر کے فیصلے کے مطابق۔

من قل اعوذ باب الفلق [الفلق: ۱] : یعنی اس سورت سے۔اور طیبیؒ فرماتے ہیں: یعنی ان دو سورتوں سے آپ کے اس قول تعوذ بهما ...... کے مطابق اور ابن الملکؒ فرماتے ہیں: اس سے ان دو سورتوں کو پناہ کے لئے پڑھنے کی ترغیب مزاد ہے، گویا کہ دونوں کا مقصد یہ ہے کہ یہ حدیث دو قرینوں میں سے ایک قرینے کے ساتھ دوسری سے اکتفاء کرتی ہے۔

اور یہ دونوں حدیثیں متفق علیہ ہیں، اور مسلم کی اس حدیث کے مطابق ہیں جو معوذتین کے بارے میں مذکور ہیں، ان کی طرح کی نہیں دیکھی گئیں۔

ایسے موقعہ پر ابن حجرؒ کی اس بات کی کوئی ضرورت نہیں رہتی جو انہوں نے بہت زیادہ تکلفات اور بہت عجیب وغریب باتیں ذکر کی ہیں، اور جو ہم نے ذکر کیا ہے' اس کو انہوں نے بہت دور چھوڑ دیا ہے۔

الفصل الثالث:

۲۱۶۵ :عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَعْرِبُوا الْقُرْاٰنَ وَاتَّبِعُوْا غَرَآئِبَهٗ وَغَرَآئِبُهٗ فَرَآئِضُهٗ وَحُدُوْدُهٗ۔ (البیهقی فی شعب الایمان)

اخرجه البیهقی فی شعب الایمان ۴۲۷/۲ حدیث رقم ۲۲۹۳۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا'' قرآن کے معانی بیان کرو اور اس کے غرائب کی اتباع کرو اور اس کے غرائب اس کے فرائض اور حدود ہیں۔''

تشریح: عن ابی هریرة قال:قال رسول الله ﷺ اعربوا : یعنی اے اہل علم حضرات!

القرآن : یعنی قرآن میں جو غریب الفاظ ہیں اور جو اعراب کی بارے باتیں ہیں ان کو واضح کرو۔

واتبعوا غرائبه : یعنی اس میں جو غریب الفاظ اور اجنبی لغتیں ہیں، تاکہ تکرار لازم نہ آئے اس لئے اس قول کے ساتھ تفسیر فرما دی۔

وغرائبه فرائضه وحدوده : فرائض سے مراد احکام حدود سے مراد منہیات یعنی جن کاموں سے روکا گیا ہے۔ یا فرائض سے علم الفرائض یعنی وراثت کا علم اور شرعی احکام یا مطلق طور پر قرآنی احکام اور حدود میں سے جن کے بارے علم حاصل کیا جا سکتا ہے' میری مراد باریک مسائل اور اشارے کے سمجھنے اور معنی کا حاصل بیان کریں جن پر قرآن کی آیات دلالت کرتی ہیں، ان احکام سے جن کا سمجھنا دشوار ہے، اور جو انوکھے احکام ہیں اور خرق عادت معجزات اور اچھے اخلاق اور اچھے آداب اور وعظ ونصیحت کے مقامات وعدے اور وعید اور وہ مضامین جو ترغیب وترہیب پر مشتمل ہیں، اور ان تمام کو طلباء کے لئے واضح کریں۔ تاکہ وہ اس کو سیکھیں، اور نیکی کے مقابلہ جات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں اور اس کے ذریعے کرامات میں آگے بڑھیں، یا قرآن کے مشکل الفاظ اور مشکل عبارتوں اعراب کو بیان کریں اور اس کے مجملات کو حل کریں، اور اس کے پوشیدہ معانی کو حل کریں، اور یہ اعراب کے بدلنے سے جو مختلف معانی ہوتے ہیں، ان کو یاد کرنا پلے باندھنا کیونکہ معنی ومفہوم اعراب کے مطابق ہی ہوتا ہے۔

لیکن دو اعتبار سے دونوں قولوں کے درمیان کوئی تناقض نہیں ہے۔ حسن بصری نے اس آدمی کو کہا جس نے پوچھا تھا کہ قراءت کو درست کرنے کے لئے عربی علوم کس سے سیکھوں؟ تو فرمایا بیٹے ضرور سیکھو، کیونکہ آدمی جب کوئی آیت پڑھتا ہے پھر اس کو منہ میں یاد کرتا ہے، پس وہ اسی میں فنا ہو جاتا ہے۔ قرآن کے اعراب کے بارے سب سے پہلے ضروری بات یہ ہے کہ اس کے اعراب کے مطابق اس کے معانی کو سمجھا جائے۔ وہ بھی آیت کی مراد کے مطابق سیاق وسباق کے مطابق۔

بس اتنا ہی کافی ہے جو کہ اس کے بارے ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ ''اعراب معانی کی فرع ہے اور اسی لئے سورتوں کے ابتدائی متشابہ الفاظ پر اعراب پڑھنا منع ہے' یعنی الم، حم وغیرہ جن کا علم اللہ نے اپنے پاس ہی رکھا کسی اور کو نہیں دیا۔ مشہور قول کے مطابق یہی مشاہیر قوم کا مذہب ہے۔ ابن ہشام فرماتے ہیں: اور اکثر ترکیب دان قرآن کے اعراب پر کتابیں لکھنے والوں کے قدم ڈگمگا گئے کہ انہوں نے معنی سے ہٹ کر صرف لفظ پر نظر رکھی۔ مغنی نے اپنی کتاب میں اس کی کئی ایک مثالیں ذکر کی ہیں، ان سے ایک یہ ہے کہ کسی نے قیماً کو عوجا کی صفت بنایا سورۃ کہف کے شروع میں اور اللہ تعالیٰ حفص پر رحم کرے کہ انہوں نے عوجا پر خاموشی اختیار کی کسی کجی وغیرہ سے بچتے ہوئے۔

قراءتِ قرآن کی فضیلت دوسرے اعمال پر

۲۱۶۶: وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ قِرَآءَ ةُ الْقُرْاٰنِ فِی الصَّلٰوةِ اَفْضَلُ مِنْ قِرَآءَ ةِ الْقُرْاٰنِ فِیْ غَیْرِ الصَّلَاةِ وَقِرَآءَ ةُ الْقُرْاٰنِ فِیْ غَیْرِ الصَّلٰوةِ اَفْضَلُ مِنَ التَّسْبِیْحِ وَالتَّکْبِیْرِ وَالتَّسْبِیْحُ اَفْضَلُ مِنَ الصَّدَقَةِ وَالصَّدَقَةُ اَفْضَلُ مِنَ الصَّوْمِ وَالصَّوْمُ جُنَّةٌ مِّنَ النَّارِ۔ (البیهقی فی شعب الایمان)

اخرجه البیهقی فی شعب الایمان ۴۱۳/۲ حدیث رقم ۲۲۴۳۔

ترجمہ: ''سیّدہ عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''نماز میں قرآن پڑھنا نماز کے علاوہ قرآن پڑھنے سے افضل ہے اور نماز کے علاوہ قرآن کا پڑھنا تسبیح وتکبیر سے زیادہ ثواب رکھتا ہے اور تسبیح صدقہ سے افضل اور صدقہ روزہ سے افضل ہے اور روزہ دوزخ کی آگ سے ڈھال ہے۔''

تشریح: **وعن عائشة أن النبی ﷺ قال قراء ة القرآن فی الصلاة** : کیونکہ یہ دوسری عبادتوں سے ممتاز ہے یا پھر اس میں ادب حضور حاضری کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔

أفضل من قراء ة القرآن فی غیر الصلاة : دیگر شغل وغیرہ سے روکنے والی ہوتی ہے، اکثر اور اس میں توجہ بھی ہوتی ہے۔

وقراء ة القرآن فی غیر الصلاة أفضل من التسبیح والتکبیر : یعنی ان کے ہم مثل دیگر تمام اذکار اور دعائیں قرآن کے اللہ کا کلام ہونے کی وجہ سے اور اس میں اللہ کا حکم اور اس کے احکام بھی موجود ہیں۔

والتسبیح : یعنی اور اس کی ہم مثل تکبیر وغیرہ۔

أفضل من الصدقة : یعنی ذکر سے خالی صرف صدقہ ہو کیوں کہ تمام عباد اور نیکیوں کا مقصد اللہ کا ذکر ہی ہے۔

والصدقة أفضل من الصوم : یعنی نفلی روزے سے، کیونکہ صدقہ کا نفع تجاوز کرنے والا ہے اور روزہ قاصر ہے اور اسی لئے کہا گیا ہے کہ روزہ تب فائدہ دیتا ہے کہ جب آدمی اپنا کھانا صدقہ کر دے اور اگر کھانا صدقہ نہ کرے تو فائدہ نہ دے گا کہ آدمی اپنے آپ کو روکے رکھے، پھر اکیلا ہی کھا جائے۔ اور طیبیؒ فرماتے ہیں: ایک قول یہی ہے جو کہ گزر چکا۔ کہ ''**أن کل عمل ابن آدم یضاعف الحسنة بعشر امثالها الٰی سبعمائة ضعف الا الصوم**'': ''ابن آدم کے ہر عمل کا اجر دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک بڑھایا جاتا ہے، سوائے روزے کے''۔ یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ روزہ افضل ہے۔ اس کی تطبیق اس طرح ہو گی کہ جب نفس عبادت کی دیکھا جائے تو نماز صدقے سے افضل ہے اور صدقہ روزے سے افضل ہے۔ اور جب ہر ایک کو دیکھا جائے اور ان کی خصوصیات کو دیکھا جائے جو کہ ایک دوسرے میں مشترک نہیں ہیں، تو روزہ افضل ہے۔

والصوم جنة : یعنی آگ سے بچاؤ ہے یعنی ان اسباب سے جو دنیا میں اس کو آگ کی طرف کھینچتے ہیں اور آخرت میں اللہ کے عذاب سے بچاؤ ہے۔ پس جب یہ روزے کے فوائد ہیں تو تیرا اس صدقہ کے بارے کیا خیال ہے جو اس روزہ سے افضل ہے۔

۲۱۶۷: وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَوْسٍ الثَّقَفِیِّ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ قِرَاءَ ةُ الرَّجُلِ الْقُرْاٰنَ فِیْ غَیْرِ الْمُصْحَفِ اَلْفُ دَرَجَةٍ وَقِرَآءَ تُهٗ فِی الْمُصْحَفِ تُضَعَّفُ عَلٰی ذٰلِكَ اِلٰی اَلْفَی دَرَجَةٍ۔

اخرجه البیهقی فی شعب الایمان ۴۰۷/۲ حدیث رقم ۲۲۱۸۔

ترجمہ: ''حضرت عثمان ابن عبداللہ بن اوس ثقفی اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا'' آدمی کا قرآن سے دیکھے بغیر پڑھنا ہزار درجہ ثواب رکھتا ہے اور قرآن سے دیکھ کر پڑھنے کا

ثواب دو ہزار درجہ تک زیادہ کیا جاتا ہے۔''

تشریح: وعن عثمان بن عبد اللہ ابن أوس الثقفی عن جدہ قال :قال رسول اللہ ﷺ قراء ۃ الرجل القرآن فی غیر المصحف : یعنی اپنے حافظے سے۔

الف درجۃٍ : یعنی ہزار درجات والا، یا اس کا ثواب ہزار درجے ہے اور ہر درجے میں نیکیاں ہیں۔ طیبیؒ فرماتے ہیں الف درجۃٍ۔ آپ علیہ السلام کے قول قراء ۃ الرجل کی خبر ہے مضاف کو مقدر مانتے ہوئے یعنی ذات الف درجۃ۔ تاکہ اس پر محمول صحیح ہو، جیسا کہ باری تعالیٰ کا فرمان ﴿ہم درجات﴾ ای ذو درجات، درجات والے اور ابن حجرؒ نے ایک منفرد بات ہی کی ہے، انہوں نے قراءۃ کو اس الف سے مجاز بنایا ہے، جیسے رجل عدل، تو آپ بھی غور کرلیں۔

قراء تہ فی المصحف یضعف : یضعف، مذکر اور مونث دونوں طرح اور اس عین مشدد ہے یعنی زیادہ ہوتا ہے۔

علی ذالک : یعنی زبانی پڑھنے پر۔

الی الفی درجۃ : طیبیؒ فرماتے ہیں: کہ قرآن میں دیکھنا اور اس کو اٹھانا اور اس کو چھونا اور اس میں تفکر کرنا، اور اس کے معانی کا مستنبط کرنا اھ۔ یعنی کہ یہ ان حیثیتوں سے افضل ہے اگر یہ مقاصد نہ ہوں تو نہیں۔ پس تحقیق یہ حدیث گزر چکی کہ ''ان المہر فی القرآن مع السفرۃ البررۃ''، قرآن پڑھنے میں ماہر نیک معزز فرشتوں کے ساتھ ہوگا''۔ اور کبھی حافظ کے لئے زبانی پڑھنا بھی ضروری ہوتا ہے، یاد کرنے کی غرض سے۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: کہ الی کے ساتھ غایت تضعیف کی انتہا کے لئے ہے دو ہزار درجات پر کیونکہ اس کے پڑھنے کی عبادت کے ساتھ انہوں نے قرآن میں دیکھنے کے اجر کو بھی ملا دیا کیونکہ اس میں قراءت کا ثواب اور مصحف میں دیکھنے کا ثواب مل گیا ہے۔

یہیں سے بعض نے دلیل لی ہے کہ قرآن میں دیکھ کر تلاوت کرنا مطلق طور پر افضل ہے۔ کئی دوسرے ائمہ نے زبانی پڑھنے کو افضل قرار دیا ہے' اس لئے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا عمل تھا۔ اور صحیح درمیانہ قول ہے کہ ان میں سے جس بھی طرح سے اس کا خشوع اور تدبر اور اخلاص زیادہ ہو' وہ افضل ہے وگرنہ دوسرا یعنی دیکھ کر ہی پڑھ لے۔ کیونکہ زبانی پڑھنے سے دیکھ کر پڑھنے میں تدبر اور قراءت کے دوران غور وفکر کا احتمال زیادہ ہوتا ہے۔

۲۱۶۸: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِنَّ ھٰذِہِ الْقُلُوْبَ تَصْدَأُ کَمَا یَصْدَأُ الْحَدِیْدُ اِذَا اَصَابَہُ الْمَآءَ قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَمَا جَلَاؤُھَا قَالَ کَثْرَۃُ ذِکْرِ الْمَوْتِ وَتِلَاوَۃِ الْقُرْاٰنِ.

روی البیہقی الا حا دیث الاربعۃ فی شعب الا یمان۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''یاد رکھو' یہ دل زنگ پکڑتے ہیں جیسا کہ لوہا پانی لگنے سے زنگ پکڑ لیتا ہے'' عرض کیا گیا کہ ''یارسول اللہ! اس کی صفائی کا ذریعہ کیا ہے!'' آپ ﷺ نے ارشادفرمایا ''موت کو کثرت سے یاد کرنا اور قرآن کی تلاوت کثرت سے کرنا۔''

تشریح: وعن ابن عمر قال:قال رسول اللہ ﷺ ان ہذہ القلوب : یعنی وہ دل جن کے ذریعے اللہ علام الغیوب کی ذات کا علم اور احوال اور عیوب کے مشاہدہ کا پتہ چلتا ہے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں: یعنی یہ معلوم دل کبھی رفعت کی انتہاء کو ہوتے ہیں اور کبھی انتہائی ذلیل و رذیل ہوتے ہیں، کیونکہ یہ جسموں میں بادشاہوں کی طرح ہوتے ہیں، جب یہ درست ہوں گے تو پورا وجود درست ہوگا اور جب یہ خراب ہوں گے تو پورے وجود فساد کا شکار ہوں گے۔

تصدأ : ہمزہ کے ساتھ یعنی غفلتوں کے انبار اور شہوات کی زیادتی کی وجہ سے ان پر میل کچیل پڑ جاتی ہے۔

کما یصدأ الحدید : یعنی زنگ آلود ہونا۔

اذا اصابه الماء : یعنی اس کے استعمال...... دلوں کا گناہوں میں مشغول ہونا اور محبوب کے ذکر اور اپنے مطلوب و مقصود کی فکر سے غافل ہونا اور یہ وہی زنگ ہے جس کا قرآن میں ذکر موجود ہے: کلا بل ران علی قلوبهم ما کانوا یکسبون.

قیل یا رسول الله وما جلاؤها : جیم کے کسرہ کے ساتھ یعنی عیوب کی میل کچیل کے زنگ کو دِلوں سے دور کرنے کا آلہ، جو زنگ محبوب کے سامنے آنے سے آڑے آتا ہے، اور محبوب کے دیدار اور جاننے سے روکتا ہے۔

مشہور حدیث میں ہے: "المؤمن مرآة المؤمن" "مؤمن، مؤمن کا آئینہ ہے۔

قال کثرة ذکر الموت : یہ ایک خاموش نصیحت کرنے والا ہے اور اس کی موافقت یہ حدیث بھی کرتی ہے: "اکثروا ذکر هاذم اللذات" هاد، دال کے ساتھ اور هاذم، ذال کے ساتھ دونوں طرح ہے یعنی لذتوں کو توڑنے والی یعنی موت کو کثرت سے یاد کیا کرو۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس قول ﴿ایکم احسن عملا﴾ [الملك: ۲] کی تفسیر بھی یہی کی گئی ہے کہ کون زیادہ موت کو یاد کرتا ہے۔

تلاوة القرآن : رفع اور جر دونوں جائز ہیں اور یہ بولنے والا واعظ ہے زبان حال اور بیان القال کے ذریعے سمجھانے والا ہے۔ یہ دونوں چیزیں آدمیوں کے دلوں سے غیر کی محبت یعنی مال و مرتبہ کی محبت کی غلاظتوں لے جاتی ہیں۔

آیۃ الکرسی کی اہمیت وعظمت

۲۱۶۹: وَعَنْ اَيْفَعَ ابْنِ عَبْدِالْكَلَاعِيْ قَالَ قَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَیُّ سُوْرَةِ الْقُرْاٰنِ اَعْظَمُ قَالَ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ قَالَ فَاَیُّ اٰيَةٍ فِي الْقُرْاٰنِ اَعْظَمُ قَالَ اٰيَةُ الْكُرْسِيِّ اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَيُّوْمُ قَالَ فَاَیُّ اٰيَةٍ يَا نَبِیَّ اللّٰهِ تُحِبُّ اَنْ تُصِيْبَكَ وَاُمَّتَكَ قَالَ خَاتِمَةُ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ فَاِنَّهَا مِنْ خَزَآئِنِ رَحْمَةِ اللّٰهِ تَعَالٰى مِنْ تَحْتِ عَرْشِهٖ اَعْطَاهَا هٰذِهِ الْاُمَّةَ لَمْ تَتْرُكْ خَيْرًا مِنْ خَيْرِ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ اِلَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ۔ (رواه الدارمی)

اخرجه الدارمی فی السنن ۲/ ۵٤٠ حدیث رقم ۳۳۸۰۔

ترجمہ: "حضرت ایفع ابن عبد الکلاعی کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے سے عرض کیا کہ "یارسول اللہ ﷺ! قرآن مجید میں سب سے افضل سورت کون سی ہے؟" آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا "قل هوالله احد"! اس نے عرض کیا کہ "قرآن کریم میں سب سے عظیم آیت کون سی ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا آیت الکرسی الله لآ اله الا هو الحی القیوم اس نے عرض کیا کہ "یارسول اللہ! وہ کون سی آیت ہے جس کے بارہ میں آپ ﷺ پسند کرتے ہیں کہ وہ آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کی امت کو مل جائے" آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا سورۂ بقرہ کا آخری حصہ بیشک وہ خدا کی رحمت کے خزانوں میں عرش کے نیچے سے اتری ہے اور اس امت کو عطا کی گئی ہے اور دنیا و آخرت کی ایسی بھلائی نہیں ہے جو اس میں نہ ہو۔" (ترمذی)

تشریح: وعن أیفع : ہمزہ مفتوحہ اور "ی" ساکنہ اور "ف" مفتوحہ ہے۔

ابن عبدٍ : تنوین کے ساتھ۔

الکلاعی : کاف کے فتحہ کے ساتھ جیسا کہ جامع الاصول میں ہے، اور مشکاۃ کے بعض نسخوں میں ضمہ بھی ہے، جیسا کہ طیبیؒ نے کہا ہے۔ اور جامع الاصول میں أیفع بن نا کور ہے، یمن سے ان کا تعلق ہے اور کاف کے فتحہ کے ساتھ ذی الکلاع کے نام سے مشہو

ہے ناکور "ن" کے ساتھ اور کاف کے ضمہ کے ساتھ اپنی قوم کے سردار تھے۔ اس نے اسلام قبول کر لیا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف خط لکھا تھا اسود عنسی کو قتل کرنے کے تعاون کے لئے اس نے نبی علیہ السلام سے ملاقات کی خاطر آپ کی طرف ہجرت کی لیکن رسول اللہ سے اس کی ملاقات سے قبل ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے اور اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں شرکت نہیں کی یعنی وہ صحابی نہیں۔ ابن عبد البر فرماتے ہیں کہ عمرو بن عوف بن مالک کے علاوہ کسی اور سے ان کی روایت کو میں نہیں جانتا۔

قال:قال رجل يا رسول الله اى سورةِ القرآن : ایک نسخہ میں **اى سورة من القرآن** کے الفاظ ہیں۔

اعظم : یعنی توحید کی شان میں اور یہ آپ کے اس قول کے منافی نہیں ہے جو سورۃ فاتحہ کے بارے میں آپ سے منقول ہے کہ "**انها افضل سورة القرآن**". وہ قرآن کی سورتوں میں سے سب سے افضل سورت ہے، اور ایک دوسری روایت میں ہے "**اعظم سورةً**" اعظم یعنی سب سے بڑی سورت ہے اور یہ اس کی محتاج نہیں ہے جو ابن حجرؒ نے کہا کہ فاتحہ کی افضلیت والی حدیث کے سارے طرق صحیح ہیں، اس حدیث کے برعکس اور ایک قول یہ بھی ہے کہ سورۃ فاتحہ کے بعد یہ سورۃ یعنی اخلاص اعظم ہے۔

قال قل هو الله احد قال [الاخلاص:١]

فأى آية : یعنی قرآن میں، جیسا کہ صحیح نسخہ میں **فى القرآن** کے الفاظ ہیں۔ **اعظم** : یعنی صفات الٰہی کے بیان میں۔

قال اية الكرسى الله لا اِله الا هو الحي القيوم [البقرة: ٢٥٥] یعنی آخر تک مکمل آیت مبارکہ۔

قال فاى اية يا رسول الله : اور ایک نسخہ میں یا نبی اللہ کے الفاظ ہیں۔

تحب أن تصيبك و امتك : یعنی اس کا فائدہ اور اس کا ثواب نہ کہ اس سے اس کا نازل ہونا مراد ہے اور اس پر دلیل آپ کا یہ قول ہے کہ "**لم تترك خيرا**" آخر تک روایت۔

قال خاتمة سورة البقرة : یعنی ﴿**امن الرسول**﴾ [البقرة:٢٨٥] سے لے کر آخر سورت تک یعنی یہ آیات میں پسند کرتا ہوں کہ مجھے اور میری امت کو ان کا فائدہ پہنچے باقی قرآن کی سے پہلے۔

فانها : یعنی اس کے نتائج یا نازل ہوئی۔

من خزائن رحمة الله من تحت عرشه : خبر کے بعد خبر ہے، یعنی اس کا نزول عرش کے نیچے سے ہے۔ یا خبر مقدر ہو گی **من خزائن رحمة الله الكائنة يا كائنة من تحت عرشه** اور یہ اعراب کے مطابق ہے اور رہا اس کا معنی تو ہم اس کی حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتے۔

اعطاها : یعنی نفس آیت یا اس میں قبولیت کے جو مراتب ہیں وہ۔

هذه الامة : غموں کو دور کرنے کے لئے اس امت کی خصوصی عزت و تکریم کے لئے۔

لم تترك خيرا من خير الدنيا و الآخرة الا اشتملت : یعنی سورۃ البقرۃ کی یہ آخری آیات۔

عليه : یعنی اس خیر و بھلائی پر عبارۃً اور اشارۃً دونوں طرح۔

۲۱۷۰: وَعَنْ عَبْدِ الْمَلِكِ بْنِ عُمَيْرٍ مُرْسَلًا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ فِى فَاتِحَةِ الْكِتَابِ شِفَاءٌ مِّنْ كُلِّ دَاءٍ.

(رواه الدارمى والبيهقى فى شعب الايمان)

اخرجه الدارمى فى السنن ٥٣٨/٢ حديث رقم ٣٣٧٠۔ وشعب الايمان۔

ترجمہ: "حضرت عبدالملک ابن عمیر بطریق ارسال کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "سورۃ فاتحہ ہر

بیماری سے شفاء ہے۔'' (دارمی، بیہقی)

تشریح: وعن عبد الملك بن عمير : عُمیر تصغیر کے ساتھ۔

مرسلا : طیبیؒ کہتے ہیں: یہ مشہور تابعین میں سے تھے، امام شعبی کے بعد کوفہ کے قاضی بھی رہے۔

قال: قال رسول الله ﷺ فی فاتحة الكتاب : یعنی اس کی آیات اور کلمات اور اس کے پڑھنے کے لحاظ سے اس کا لکھنا تعویذ لٹکانے کے لئے یا کسی اور اچھے کام کے لئے۔ (شفاء من كل داءٍ : دینی ہو یا دنیاوی، حسی ہو یا معنوی۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: جہالت و کفر اور گناہوں اور جسمانی امراض کی شفاء بھی اس سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

یعنی موقوفاً روایت ذکر کی لیکن حکماً یہ روایت مرفوع ہے، اور بیہقی کے الفاظ فاتحة الكتاب.... الجامع الصغیر کے ہیں۔

سورۃ آلِ عمران کی آخری آیات کی فضیلت

۲۱۷۱: وَعَنْ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ قَالَ مَنْ قَرَأَ اٰخِرَ اٰلِ عِمْرَانَ فِیْ لَیْلَةٍ کُتِبَ لَهُ قِیَامُ لَیْلَةٍ.

اخرجه الدارمی فی السنن ٥٤٤/٢ حديث رقم ٣٣٩٦۔

ترجمه: ''حضرت عثمان ابن عفانؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص رات کے وقت سورۂ آل عمران کا آخری حصہ پڑھے تو اس کے لئے قیام لیل کا ثواب لکھا جاتا ہے۔''

تشریح: وعن عثمان بن عفان رضی الله عنه قال من قرأ آخر آل عمران : یعنی ان فی خلق السموٰت والارض [البقرة: ١٦٤] سے سورۃ کے آخر تک۔

فی ليلة : یعنی رات کا ابتدائی حصہ ہو یا آخری حصہ، اور رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ جب آپ ﷺ تہجد کے وقت بیدار ہوتے تو سب سے پہلے یہ آیات پڑھتے تھے۔

کتب له قيام ليلة : یعنی اس کا نام قیام اللیل کرنے والوں میں لکھ دیا جاتا ہے۔

عرضِ مرتب:

اس حدیث پاک میں بیان کیا گیا ہے کہ جو شخص سورۃ آلِ عمران کی آخری آیات: ﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿١٩٠﴾ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿١٩١﴾ رَبَّنَاۤ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿١٩٢﴾ رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖۗ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ﴿١٩٣﴾ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ﴿١٩٤﴾ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿١٩٥﴾ لَا یَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِی الْبِلَادِ ﴿١٩٦﴾ مَتَاعٌ قَلِیْلٌ قف ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿١٩٧﴾ لٰكِنِ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴿١٩٨﴾ وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِمْ خٰشِعِیْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا یَشْتَرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِیْلًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ

عِنْدَ رَبِّهِمْ ط اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۲۰۰﴾ کی تلاوت کرے گا رات میں یعنی شروع رات میں یا آخر رات میں تو اس کے لئے تہجد پڑھنے کا ثواب لکھا جائے گا اور اسکا پڑھنا حضور ﷺ سے ثابت ہے جب آپ ﷺ تہجد کے لیے بیدار ہوتے اور وضو فرماتے تو اس وقت پڑھا کرتے تھے۔

جمعہ کے دن آل عمران پڑھنے کی فضیلت

۲۱۷۲: وَعَنْ مَّكْحُوْلٍ قَالَ مَنْ قَرَأَ سُوْرَةَ اٰلِ عِمْرَانَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ صَلَّتْ عَلَيْهِ الْمَلَائِكَةُ اِلَى اللَّيْلِ۔

(رواهما الدارمی)

اخرجه الدارمی ۵۴٤/۲ حديث رقم ۳۳۹۷۔

ترجمہ: ''حضرت مکحولؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص جمعہ کے دن سورۂ آل عمران پڑھتا ہے تو اس کے لئے رات تک فرشتے دعائیں کرتے ہیں یہ دونوں روایتیں دارمی نے نقل کی ہیں۔''

تشریح: وعن المكحول : مشہور تابعی ہیں، کہا گیا ہے کہ یہ بھی موقوف ہے، جب رائے نہ ہو تو مرفوع کے حکم میں ہے۔

قال من قرأ سورة آل عمران يوم الجمعة صلت عليه الملائكة : یعنی فرشتے اس کے لئے دعا کرتے ہیں، اور استغفار کرتے ہیں۔

الى الليل رواهما : یعنی ان دونوں حدیثوں کو۔

سورۂ بقرہ کی آخری آیات کی قدر و منزلت

۲۱۷۳: وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ نُفَيْرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ خَتَمَ سُوْرَةَ الْبَقَرَةِ بِاٰيَتَيْنِ اُعْطِيْتُهُمَا مِنْ كَنْزِهِ الَّذِيْ تَحْتَ الْعَرْشِ فَتَعَلَّمُوْهُنَّ وَعَلِّمُوْهُنَّ نِسَاءَ كُمْ فَاِنَّهَا صَلَاةٌ وَقُرْبَانٌ وَدُعَاءٌ۔

رواه الدارمی مرسلاً

اخرجه الدارمی فی السنن ۵٤۲/۲ حديث رقم ۳۳۹۰۔

ترجمہ: ''حضرت جبیر ابن نفیرؒ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا' اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ کو دو آیتوں پر ختم فرمایا ہے یہ دو آیتیں مجھے اس خزانے سے عطا فرمائی گئی ہے جو عرش کے نیچے ہے لہٰذا انہیں خود بھی سیکھو اور اپنی عورتوں کو بھی سکھلاؤ کیونکہ دو آیتیں باعث رحمت ہیں خدا کے قرب کا ذریعہ ہیں اور تمام دینی و دنیاوی بھلائیوں کے حصول کے لئے دعا ہیں اس روایت کو دارمی نے بطریق ارسال نقل کیا ہے۔''

تشریح: وعن جبير بن نفير : یعنی الحضرمی، انہوں نے جاہلیت کا زمانہ بھی پایا اور اسلام کا زمانہ بھی، اور وہ ثقہ شامیوں میں سے تھے۔ اور نُفیر، نون کے ضمہ اور فاء کے فتحہ اور ''ی'' ساکن اور آخر میں راء ہے۔ مؤلف نے ان کو اسماء الرجال میں تابعین میں شمار کیا ہے اور اسی طرح مغنی نے بھی لکھا ہے جو بعض نسخوں میں راء کی جگہ لام یعنی نفیر کی جگہ نفیل ہے، وہ نسخہ لکھنے والے کی پڑھنے یا سننے میں غلطی کی وجہ سے ہے۔

أن رسول قال ان الله ختم سورة البقرة بآيتين أعطيتهما من كنزه : یعنی معنوی خزانہ۔

الذى تحت العرش فتعلموهن : یعنی ان کے کلمات کو اور ابن حجرؒ فرماتے ہیں: یہاں پر تثنیہ کی ضمیر نہیں ذکر کی اس کی وجہ یہ

ہے کہ کسی کو یہ وہم نہ پڑ جائے کہ اس سے مراد ان دونوں آیات کا مجموعہ ہے، پس جب تثنیہ سے جمع کی طرف عدول کیا تو سمجھ آ گئی کہ اس سے مراد ان کا تمام ہے۔ نہ کہ ان دو کا مجموعہ مراد ہے، اور اس کی مثال قرآن میں ﴿هذان خصمٰن اختصموا﴾ [الحج: ۱۹] اور ﴿وان طائفتان من المؤمنين اقتتلوا﴾ [الحجرات: ۹] ہیں۔

اس کے دعوٰی کی مراد معنوی طور پر اس کی مثال لفظاً ہے یہ بات اس کی محل نظر۔

وعلموهن نسائكم : شاید کہ عورتوں کی تخصیص اس لئے کی گئی ہے کہ عورتیں دوسروں کی بہ نسبت ان کو سیکھنے کی زیادہ محتاج ہیں' نہ کہ اس کا یہ مطلب ہے کہ ان کے علاوہ ان کو کوئی اور نہ سیکھے۔

فانها : یعنی ان کے کلمات یا ان دونوں میں سے ہر ایک آیت مبارکہ۔

صلاة : یعنی استغفار یا اسکے جو اسکے ساتھ نماز پڑھی جاتی ہے۔ اور یہ زیادہ ظاہر ہے کیونکہ استغفار ہی دعا ہے، پھر تکرار ہو جائیگا۔

وقربان : قاف کے ضمہ کے ساتھ اور ایک نسخہ میں قاف کے کسرہ کے ساتھ بھی ہے۔ یعنی وہ ان اعمال سے ہے جن کے ذریعے اللہ کا تقرب حاصل کیا جاتا ہے جو کہ ان میں اذکار اور گریہ زاری اور مدد طلب کرنا ہے۔

ودعاء : یا تو زبانِ حال کے ساتھ اور یا صرف کہنے کی حد تک ہے۔ جیسا کہ اللہ کا فرمان ﴿لا تؤاخذنا﴾ [البقرة: ۲۸۶] طیبیؒ فرماتے ہیں: ان دو آیتوں کے بارے آپؐ کے قول انها میں ضمیر کلمات وحروف کے مجموعہ کی طرف راجح ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسی فرمان کی طرح ﴿وان طائفتٰن من المؤمنين اقتتلوا﴾ [الحجرات: ۹] اور صلاۃ کے لفظ سے ارکان نماز کا قصد نہیں کیا، کیونکہ وہ اس کے علاوہ ہے اور نہ اس سے مراد دعا ہے، اس سے تکرار لازم آتا ہے، بلکہ صلاۃ سے استغفار مراد لیا ہے، جیسے **غفرانك واغفر لنا** اور قربان سے مراد یا تو اللہ کا تقرب ہے، جیسے اللہ کا فرمان ﴿واليك المصير﴾ [البقرة: ۲۸۵] اور یا پھر رسول اللہ کی طرف جیسے اللہ کا فرمان ﴿آمن الرسول﴾ [البقرة: ۲۸۵]۔

حاکم نے اس روایت کو ابوذرؓ سے مرفوع رایت کیا ہے اور حاکم کی روایت میں قربان کی جگہ قرآن ہے یعنی یہ دو آیتیں نماز میں پڑھی جاتی ہیں۔

اور قرآن پڑھا جاتا ہے اور ان کے ساتھ دعا کی جاتی ہے اور حاکمؒ نے آپ کے قول نسائكم کے بعد ابناء کم کا اضافہ کیا ہے۔

سورۂ ہود جمعہ کے دن پڑھنے کی ترغیب

۲۱۷۴: وَعَنْ كَعْبٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اِقْرَءُوْا سُوْرَةَ هُوْدٍ يَوْمَ الْجُمُعَةِ ۔ (رواه الدارمی مرسلا)

اخرجه الدارمی فی السنن ۲/۵٤۵ حديث رقم ۳٤۰۳۔

ترجمہ: ''حضرت کعب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''جمعہ کے دن سورۂ ہود پڑھا کرو۔'' (دارمی)

تشریح: وعن كعب أن رسول الله ﷺ قال اقرء وا سورة هود : **هود** کو منصرف اور غیر منصرف دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے۔

يوم الجمعة : میم ساکن اور میم مضموم دونوں طرح صحیح ہے۔

حدیث مرسل ہے اور مرسل حدیث جمہور کے نزدیک حجت ہے، اور تمام کے نزدیک فضائل میں اس پر عمل کیا جا سکتا ہے۔

۲۱۷۵: وَعَنْ اَبِیْ سَعِيْدٍ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ مَنْ قَرَاَ سُوْرَةَ الْكَهْفِ فِیْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ اَضَاءَ لَهُ النُّوْرُ مَا بَيْنَ

الْجُمُعَتَيْنِ ۔

رواه البيهقی فی الدعوات الكبير

ترجمه: ''حضرت ابوسعیدؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا'' جو شخص جمعہ کے دن سورۂ کہف پڑھتا ہے تو اس کے لئے ایمان و ہدایت کا نور دو جمعوں کی درمیانی مدت کے لئے روشن رہتا ہے بیہقی نے اس روایت کو دعوات کبیر میں نقل کیا ہے۔''

تشریح: **وعن ابی سعید أن رسول الله قال من قرأ سورة الكهف فی يوم الجمعة اضاء له النور** : یعنی اس کے دل میں، یا اس کی قبر میں، یا حشر کے دن بڑے اجتماع میں۔

ما بين الجمعتين : اس جمعہ کی مقدار جو اس کے بعد آنے والا ہے۔

اور اسی طرح ہر وہ جمعہ جس میں قرآن کی اس سورت کی تلاوت ہوگی۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: اضاء، یا تو باب لازم سے ہوگا اور **بين الجمعتين**، ظرف ہوگا۔ پس ہوگا نور کی روشنی کا پھوٹنا ان ایام میں جو دو جمعوں کے درمیان والے ہیں، نور کی روشنی کے پھوٹنے کے مرتبہ پر مبالغہ کے طور پر۔ اور یا تو فعل متعدی ہوگا تو پھر **ما بين** مفعول بہ ہوگا یہی دونوں ترکیب اللہ تعالیٰ کا فرمان ﴿**فلما اضاءت ما حوله**﴾ [البقرة: ۷۱] اھ۔

اور آخری محل نظر ہے دونوں حدیثوں کے معنی کے اعتبار سے۔

حاکمؒ نے اس حدیث کو ابوسعید سے مرفوع روایت کیا ہے اور الدارمیؒ نے ابوسعید کے قول سے موقوف روایت کیا ہے کہ: ''**من قرأها ليلة الجمعة أضاء له من النور فيما بينه وبين العتيق**'': ''جو اس سورت (کہف) کو جمعہ کی رات پڑھے گا، اللہ تعالیٰ اس کے اور بیت اللہ کے مابین اس کے لئے نور کی روشنی کردے گا''۔ نسائیؒ اور حاکمؒ دونوں نے ابوسعید کی حدیث سے روایت کی ہے۔ اور لفظ نسائی کے ہیں، اور نسائی نے کہا ہے کہ اس کو مرفوع کہنا غلط ہے، اور صحیح بات یہ ہے کہ یہ موقوف روایت ہے:

''**من قرأها كما انزلت كانت له نورا من مقامه الى مكه ومن قرأ العشر آيات من آخرها فخرج الدجال لم يسلطه عليه**'': ''جس نے اس سورت (الکھف) کو اسی طرح جس طرح نازل ہوئی اس کے لئے اس جگہ سے لے کر مکہ تک نور ہی نور رہ ہوگا۔ اور جس نے اس کی آخری دس آیات پڑھیں اور پھر دجال کا خروج ہو جائے تو دجال اس پر غلبہ نہیں پاسکے گا''۔ اور طبرانی نے الاوسط میں ابوسعید سے روایت نقل کی ہے اور اسی طرح اسکے مرفوع اور موقوف ہونے میں بھی اختلاف ہے:

''**من قرأ سورة الكهف كانت له نورا يوم القيامة، ومن قرأ بعشر آيات من آخرها ثم خرج الدجال لم يضره**'': ''جس نے سورۃ الکھف پڑھی، اسکے لئے قیامت کے دن نور ہوگا، اور جس نے اس کی آخری دس آیات پڑھیں، پھر دجال کے خروج کا وقت آجائے تو دجال اس کو کچھ نقصان نہیں پہنچائے گا''۔

اور بزار وغیرہ نے مرفوع روایت کی ہے: ''**من قرأ سورة الكهف عند مضجعه كان له نورا يتلألأ فی مضجعه الى مكة حشو ذلك النور ملائكة يصلون عليه وان كان مضجعه بمكة كان له نورا يتلألأ فی مضجعه الى البيت المعمور حشو ذالك النور ملائكة يصلون عليه حتى يستيقظ**'': ''جو سورۃ کہف کو سونے کے وقت پڑھے، اس کے لئے نور ہوگا، جو کہ مکہ تک چمک رہا ہوگا، فرشتے اس کے لئے رحمت کی دعا کر رہے ہوں گے، اور جو آدمی مکہ میں لیٹا ہو تو بیت المعمور تک نور چمک رہا ہوگا، اور فرشتے بیدار ہونے تک اس کے لئے رحمت کی دعا کر رہے ہوں گے''۔

اور مدارک میں ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے: "من قرأ "قل انما انا بشر مثلکم" [الکھف:۱۱۰] **عند مضجعه**......" اسی طرح مکمل حدیث ذکر کی۔

میں کہتا ہوں کہ اس حدیث میں ایک انتہائی لطیف اشارہ ہے، اور بہت معزز اچھی بشارت ہے کہ جو بھی اس کو پڑھنے والا ہوگا تو مکہ کے زیادہ قریب ہوگا اتنی مقدار کے برابر جو مسافت سفلیہ اس کا نور بننے کے لئے کمی کا سبب ہوگی، وہ مسافت علویہ کی وجہ سے زیادہ بڑھا دیا جائے گا۔

اور جو مکہ میں لیٹا ہوگا، اس کے لئے زائد آسمانی بلندی کی ترقی کے سوا کچھ نہیں کیونکہ آسمان اور زمین کے درمیان ۵۰۰ سال کی مسافت ہے اسی طرح تمام آسمانوں کے درمیان پانچ پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ اور اسی طرح ہر آسمان کی چوڑائی، اور البیت المعمور ساتویں آسمان میں ہے، اس کے مطابق جو امام بغویؒ نے المعالم کے اندر ذکر کیا ہے۔

سورۃ الم تنزیل قاری کی شفاعت کرے گی اور جھگڑا کرے گی

۲۱۷۶: وَعَنْ خَالِدِ بْنِ مَعْدَانَ قَالَ اِقْرَأْ الْمُنْجِيَةَ وَهِيَ الٓمٓ تَنْزِيْلُ فَاِنَّهٗ بَلَغَنِيْ اَنَّ رَجُلًا كَانَ يَقْرَأُهَا مَا يَقْرَأُ شَيْئًا غَيْرَهَا وَكَانَ كَثِيْرَ الْخَطَايَا فَنَشَرَتْ جَنَاحَهَا عَلَيْهِ قَالَتْ رَبِّ اغْفِرْ لَهٗ فَاِنَّهٗ كَانَ يُكْثِرُ قِرَاءَتِيْ فَشَفَّعَهَا الرَّبُّ تَعَالٰى فِيْهِ وَقَالَ اُكْتُبُوْا لَهٗ بِكُلِّ خَطِيْئَةٍ حَسَنَةً وَارْفَعُوْا لَهٗ دَرَجَةً وَقَالَ اَيْضًا اِنَّهَا تُجَادِلُ عَنْ صَاحِبِهَا فِي الْقَبْرِ تَقُوْلُ اللّٰهُمَّ اِنْ كُنْتُ مِنْ كِتَابِكَ فَشَفِّعْنِيْ فِيْهِ وَاِنْ لَّمْ اَكُنْ مِنْ كِتَابِكَ فَامْحُنِيْ عَنْهُ وَاِنَّهَا تَكُوْنُ كَالطَّيْرِ تَجْعَلُ جَنَاحَهَا عَلَيْهِ فَتَشْفَعُ لَهٗ فَتَمْنَعُهٗ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَقَالَ فِيْ تَبَارَكَ مِثْلَهٗ وَكَانَ خَالِدٌ لَا يَبِيْتُ حَتّٰى يَقْرَأَهُمَا وَقَالَ طَاؤُسٌ فُضِّلَتَا عَلٰى كُلِّ سُوْرَةٍ فِي الْقُرْاٰنِ بِسِتِّيْنَ حَسَنَةً۔ (رواه الدارمی)

اخرجه الدارمی فی السنن ۲/ ۵٤٦ حدیث رقم ۳٤۰۸۔

ترجمہ: "حضرت خالد ابن معدان سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا اس سورت کو پڑھا کرو جو عذاب سے نجات دینے والی ہے اور وہ سورۂ الم تنزیل ہے کیونکہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ ایک آدمی صرف یہی سورت پڑھا کرتا تھا وہ اس سورۃ کے علاوہ اور کچھ نہیں پڑھتا تھا اور وہ شخص بہت زیادہ گنہگار تھا' چنانچہ اس سورۃ نے اس پر اپنے بازو پھیلا دیئے اور فریاد کی اے میرے پروردگار! اس شخص کی بخشش فرما کیونکہ یہ مجھے بہت زیادہ پڑھا کرتا تھا۔" حق تعالیٰ نے اس شخص کے حق میں اس سورت کی شفاعت قبول فرمائی اور فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کے ہر گناہ کے بدلہ نیکی لکھ دو اور اس کے درجات بلند کر دو" حضرت خالد بن معدان یہ بھی فرماتے تھے کہ "بے شک یہ سورت اپنے پڑھنے والے کی طرف سے قبر میں جھگڑا کرتی ہے کہ اے اللہ اگر میں تیری کتاب میں سے ہوں جو لوح محفوظ میں لکھا ہے تو اس کے حق میں میری شفاعت قبول فرما اور اگر میں تیری کتاب میں سے نہیں ہوں تو مجھے اس میں سے مٹا دے" نیز حضرت خالدؒ نے فرمایا" یہ سورۃ ایک پرندہ کی مانند آئے گی اور اس پر اپنے بازو پھیلا کر اس کے لئے شفاعت کرے گی۔" حضرت خالدؒ نے سورۂ تبارك الذی بیده الملك کے بارے میں بھی یہی کہا ہے حضرت خالدؒ کا معمول یہ تھا کہ وہ یہ دونوں سورتیں پڑھے بغیر نہیں سوتے تھے" حضرت طاوسؒ فرماتے ہیں کہ ان دونوں سورتوں کو قرآن کریم کی ہر سورت پر ساٹھ نیکیوں سے فضیلت دی گئی ہے۔ (دارمی) یعنی ان دونوں روایتوں کو جن میں سے ایک حضرت خالدؒ سے اور دوسری حضرت طاوسؒ سے

منقول ہے، دارمی نے نقل کیا ہے۔''

تشریح: **وعن خالد بن معدان** : ان کے بارے میں گزر چکا ہے کہ تابعی ہیں۔

قال اقرأوا : یعنی رات کے پہلے حصے میں جس طرح کہ حدیث کے آخر سے سمجھ آ رہی ہے۔

المنجية : یعنی عذاب قبر اور قیامت کے عذاب سے۔**وهی آلم تنزيل فانه** : یعنی ضمیر شان ہے۔

بلغنی : یعنی صحابہ سے، کیونکہ انہوں نے ستر صحابہ سے ملاقات کی ہے۔ایک قول کے مطابق یہ مرفوع حدیث کے حکم میں ہوگی، اور یہ جمہور کے نزدیک واقعی حجت ہے۔اور سب کے نزدیک فضائل اعمال میں اس پر عمل کیا جا سکتا ہے، اور ابن حجرؒ کو وہم ہوا ہے وہ سمجھے ہیں کہ خالد بن معدان صحابی ہیں، حالانکہ ایسی بات نہیں ہے، اور اس کے ساتھ طیبیؒ پر بھی آنے والے کلام میں اعتراض وارد ہوتا ہے۔

أن رجلا : یعنی اس امت سے۔طیبیؒ فرماتے ہیں: ان کا یہ قول جو انہوں نے کہا کہ **يشعر بان الحديث موقوف عليه**، اس سے یہ سمجھ آتی ہے کہ حدیث موقوف علیہ ہے۔پس ان کا قول **اقرؤا** میں احتمال پیدا ہوتا ہے، کہ رسول اللہ کے کلام سے ہے اور ان کا قول **بلغنی أن رجلا** ...... رسول اللہ ﷺ سے حدیث نقل کرتا ہے۔جیسے آپ نے اس حدیث میں فرمایا ''**ان سورة فی القرآن شفعت لرجل**'' اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ راوی کا اپنا کلام ہے۔ **كان يقرء ها** : یعنی اس کو اپنا وظیفہ بنالیا تھا۔

ما يقرأ شيئاً غيرها : یعنی اپنے لئے اس کے علاوہ کوئی اور وظیفہ خاص نہیں کیا۔اور ابن حجر فرماتے ہیں: یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ اس نے سورۃ الفاتحہ کے مابعد اس کے علاوہ کوئی دوسری یاد ہی نہ کی ہو، اور ظاہر بات ہے کہ یہ بہت دور کی بات ہے۔

وكان كثير الخطايا فنشرت : یعنی سورۃ کو کسی تصویر میں بنایا جائے گا یا اس کا ثواب پرندے کی شکل میں بنا دیا جائے گا۔

جناهحا عليه: یعنی اس پر وہ سایہ کرے گی۔یا اس کی رحمت کے پر پڑھنے والے پر سایہ کر لیتے ہیں، اس کو ڈھانپنے کی غرض سے۔

قالت : زبانِ حال سے یا زبانِ قال سے۔اور وہ نشرت سے بدل بعض ہے یا بدل الاشتمال ہے کیونکہ النشر یعنی پھیلانا مشتمل ہے۔اس کے پڑھنے سے حصولِ شفاعت پر۔

رب اغفر له فانه كان يكثر قراء تی فشفعها : شد کے ساتھ، یعنی شفاعت کی طرف سے۔

الرب تعالىٰ فيه : یعنی اس کے حق میں۔**وقال** : یعنی رب تعالیٰ۔**اكتبوا له بكل خطيئةٍ** : یعنی ان کو تبدیل کر دو۔

حسنة : یعنی فضل واحسان اور عزت اور اکرام ونوازش، اور طیبیؒ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے بارے میں فرماتے ہیں: ﴿فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ﴾ [الفرقان: ۷۰] اور اس میں یہ بھی ہے کہ **اولئك هم التائبون**، یہ لوگ توبہ استغفار کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے مطابق کہ ﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ...... ﴾ [الفرقان: ۷۰] ''مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اچھے عمل کئے، تو ان لوگوں کے گناہوں کو اللہ نیکیوں میں بدل دے گا''۔

وارفعوا له درجة وقال : یعنی خالد نے کہا۔ **ايضا** : یعنی پہلے قول ہی کی طرح موقوف۔ **أنها** :یعنی سورۃ الم تنزیل السجدۃ۔

تجادل عن صاحبها : یعنی جو اس کو کثرت سے پڑھتا ہوگا۔

فی القبر : یعنی اس سے سوال وجواب کی آسانی کرنے اور اس کے عذاب میں تخفیف یا اس کی قبر کا وسیع ہونا اور قبر کا روشن ہونا اور اسی طرح اس کی مثل دیگر سہولیات کے بارے سفارش شفاعت کرے گی۔

تقول : مجادلہ جھگڑا کا بیان ہے اور یہ جھگڑا اور اس کے پڑھنے والے پر پروں کا پھیلانا اس جھگڑا کرنے والی اور سائے بان کی طرح ہونے والی کے مثل ہے، جن کا الزہراوین یعنی بقرہ، آل عمران میں ذکر کیا گیا۔

اللھم ان کنت : یعنی جب میں تھی۔ من کتابك : یعنی لوح محفوظ میں جو قرآن مجید لکھا ہوا ہے۔
فشفعني : تشدید کے ساتھ یعنی میری شفاعت قبول کر۔ فیه : یعنی اس کے حق میں۔ وان لم اکن فی کتابك : یعنی فرض کرلیں۔ فامحني : حاء کے ضمہ کے ساتھ۔
عنه : یعنی اپنی کتاب سے یا اس کے دل (سینے) سے، کیونکہ تو جو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جو چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے اور تیرے پاس ام الکتاب ہے۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: اس کی مثال بعض بادشاہوں کے خواص پر دلالت کرتی ہے جیسے کوئی بادشاہ کو کہے اگر میں تیرا بندہ ہوں تو میری اس کام میں سفارش کر اور اگر نہیں تو مجھے بیچ دے۔
طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح کہ کوئی باپ اپنے اس بیٹے کو جو اپنے والد کے حق کا خیال نہیں رکھتا' کہے اگر میں تیرا باپ ہوں تو میرے حق کا خیال رکھ اور اگر میں تیرا باپ نہیں ہوں تو پھر ہرگز میرا حق اداء نہ کرنا۔ اور اس سے مراد کہ خیال رکھنا قطعی طور پر لازم ہے، جب کہ حقیقت میں تردید نہیں ہے، اور جب باپ کے حقوق کا خیال رکھنا زیادہ لازم ہے بیٹے کے خیال رکھنے سے نہیں کہے گا، اس طرح جس طرح بیٹا اپنے باپ کو کہتا ہے' باوجود اس کے کہ مناسبت میں وہ زیادہ ظاہر ہے اور شفاعت میں بالکل واضح ہے اور اسی لئے تیرے لئے واضح ہو چکا ہے کہ طیبیؒ کا مثال ذکر کرنا بہت احسن اور زیادہ بلیغ ہے۔
اس مثال سے جو حافظ ابن حجرؒ نے بیان کی ہے پھر فخر کیا اور اپنی مثال بیان کرنے میں فرمایا: یہ اس سے بہتر ہے جو شارح نے مثال بیان کی ہے، جیسا کہ غور وفکر کرنے سے پتا چل جائے گا۔ پس غور وفکر کرو۔
وانھا : یعنی اور خالد نے کہا انھا۔ تکون : یعنی قبر میں۔
کالطیر : یعنی اس جگہ اسی طرح ہے جیسا پہلے گزر چکا ہے۔ اور شاید کہ اس کو مقدم کرنا اس کی تعظیم کی وجہ سے ہو۔
تجعل جناحھا علیه : اس کو بچانے کے لئے۔
اور ابن حجرؒ کا قول لتظلہ بیان پر مناسب نہیں ہے، کیونکہ اس کا مقام میدانِ حشر ہے۔
فتشفع له فتمنعه من عذاب القبر وقال : یعنی خالد نے کہا۔
فی تبارك : یعنی اس کی سورت کی فضیلت کے بارے میں۔
مثله : یعنی اسی طرح جس طرح سورۃ السجدۃ کے بارے میں فرمایا۔ وکان خالد لا یبیت : یعنی سوتے نہ تھے۔
حتی یقرأھما وقال طاؤس : طاؤس، کبار تابعین میں سے تھے۔ فضلتا :تشدد کے ساتھ یعنی سورۃ السجدۃ اور سورۃ الملک۔
علی کل سورۃ فی القرآن ستین حسنة : اور یہ اس صحیح حدیث کی نفی نہیں کرتی جس میں ہے کہ سورۃ الفاتحہ کے بعد قرآن کی سب سے افضل سورۃ' سورۃ البقرۃ ہے۔ کبھی کبھار مفضول میں ایسی فضیلت ہوتی ہے جو کہ فاضل میں نہیں پائی جاتی یا اس کی کوئی خصوصیت ہوتی ہے اس وقت یا اس موجودہ حالت کے ساتھ جیسا کہ یہ بات کامل علم رکھنے والے اصحابِ علم پر مخفی نہیں ہے، مگر جو چیز آپ کے مشاہدے میں آرہی ہے کہ سورۃ الاعلیٰ، الکافرون اور سورۃ الاخلاص کا وتروں میں پڑھنا، دوسری سورتوں سے افضل ہے۔
اسی طرح سورۃ السجدۃ اور سورۃ الدھر کا جمعہ کے دن فجر کی نماز کے ساتھ خاص ہونا یہ ان کے علاوہ سورتوں کے پڑھنے سے افضل ہے۔ پس (یہ بات) جواب میں اس قول کی کوئی محتاج نہیں، جو ابن حجرؒ کا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ اور یہ اس طرح نہیں یعنی ضعیف ہے۔
یعنی موقوف روایت نقل کی ہے، اور لیکن یہ مرفوع مرسل کے حکم میں ہے۔ پس یقیناً اس بارے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ رائے ہے۔
۲۱۷۷:وَعَنْ عَطَاءِ بْنِ اَبِیْ رَبَاحٍ قَالَ بَلَغَنِیْ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنْ قَرَأَ یٰسٓ فِیْ صَدْرِ النَّهَارِ قُضِیَتْ

حَوَائِجُهٗ . (رواہ الدارمی مرسلا)

اخرجه الدارمی فی السنن ۵۴۹/۲۰ حدیث رقم ۳۴۱۸۔

ترجمہ: ''حضرت عطاء ابن ابی رباح کہتے ہیں کہ مجھے یہ حدیث پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''جو شخص دن کے شروع حصہ میں سورۂ یٰسین پڑھتا ہے تو اس کی (دینی و دنیوی) حاجتیں پوری کی جاتی ہیں دارمی نے اس روایت کو بطریق ارسال نقل کیا ہے۔''

تشریح: **وعن عطاء بن أبی رباح :** رباح، راء کے فتحہ کے ساتھ۔ مصنفؒ فرماتے ہیں: کہ گھنگھریالے بالوں والے سیاہ فام چپٹی ناک والے، بیمار ہاتھ والے کی انگلیاں کٹی ہوئیں، کالے اور پھر نابینا ہو گئے تھے۔ جلیل فقہاء میں سے تھے' مکی تابعی تھے۔ اوزاعی فرماتے ہیں: وہ جس دن فوت ہوئے وہ لوگوں کے ہاں اہل زمین میں سے سب سے زیادہ محبوب تھے۔ احمد بن حنبل فرماتے ہیں: کہ علم خزانے ہیں۔ جن کو اللہ تعالیٰ ان لوگوں میں تقسیم کرتا ہے جو اس کے محبوب ہیں، یعنی اپنے محبوب لوگوں میں تقسیم کرتا ہے، اگرچہ کسی کو علم کے ساتھ خاص کرتا، تو رسول اللہ کا خاندان اس کا زیادہ حقدار ہوتا۔ عطاء بن اُبی رباح حبشی النسل تھے۔

قال بلغنی أن رسول الله ﷺ من قرأ یٰس : سین کے سکون کے ساتھ اور ایک قول فتحہ کا بھی ہے۔

فی صدر النهار : یعنی دن کے شروع میں۔

قضیت حوائجه : یعنی دینی اور دنیاوی حاجات یا اخروی حاجات یا مطلق حاجات اور یہ ہی زیادہ ظاہر ہے۔

۲۱۷۸: وَعَنْ مَعْقِلِ بْنِ يَسَارِ الْمُزَنِی اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ مَنْ قَرَاَ یٰسٓ ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ تَعَالٰی غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ فَاقْرَءُوْهَا عِنْدَ مَوْتَاكُمْ. (رواہ البیهقی فی شعب الایمان)

اخرجه البیهقی فی شعب الایمان ۴۷۹/۲ حدیث رقم ۲۴۵۸۔

ترجمہ: ''حضرت معقل ابن یسار مزنیؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص اللہ رب العزت کی رضاء کے لئے سورۂ یٰسین پڑھتا ہے تو اس کے وہ گناہ بخشش دیئے جاتے ہیں جو اس نے پہلے کئے ہیں لہٰذا اس سورۃ کو اپنے مردوں کے سامنے پڑھو۔'' (بیہقی)

تشریح: **وعن معقل بن یسار :** مؤلفؒ کہتے ہیں: یہ ان صحابہ میں شامل ہیں، جو درخت کے نیچے بیعت رضوان میں بھی شریک تھے۔ المزنی، میم کے ضمہ کے ساتھ، اور زاء کے فتحہ کے ساتھ مزینہ قبیلہ کی طرف نسبت ہے۔

ان النبی ﷺ قال من قرأ یٰس ابتغاء وجه الله تعالیٰ : یعنی اللہ کی رضا کو طلب کرتے ہوئے نہ کہ اس کے علاوہ کوئی اور غرض ہو۔

غفر له ما تقدم من ذنبه : یعنی صغیرہ گناہ اور اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو کبیرہ بھی معاف کر دیئے جائیں گے۔

فاقرؤها عند موتاکم : یعنی قریب الموت آدمی کے پاس یا اپنے مُردوں کی قبروں کے پاس، کیونکہ یہ مغفرت کے زیادہ محتاج ہیں۔ اور طیبیؒ کہتے ہیں: فاء محذوف شرط کے جواب میں آیا ہے یعنی کہ جب سورۃ یٰسین کی تلاوت اخلاص کے ساتھ ہو گی' گناہ مٹ جائیں گے۔ پس اس کو قریب الموت کے پاس پڑھو حتی کہ وہ اس کو سن لے اور اس کے دل پر جاری ہو، پس وہ اس کے گذشتہ گناہوں کو ماف کر دے گا اھ۔ اور ممکن ہے کہ الموتی (مردوں) سے مراد جہالت ہو، یا اہل غفلت مراد ہوں۔

۲۱۷۹: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّهٗ قَالَ اِنَّ لِكُلِّ شَیْءٍ سَنَامًا وَاِنَّ سَنَامَ الْقُرْاٰنِ سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ وَاِنَّ لِكُلِّ

شَیْءٍ لُبَابًا وَاِنَّ لُبَابَ الْقُرْاٰنِ الْمُفَصَّلُ . (رواه الدارمی)

اخرجه الدارمی فی السنن ۲/۵۳۹ حدیث رقم ۳۳۷۷۔

ترجمه: ''حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا'' ہر چیز کے لئے رفعت و بلندی ہوتی ہے اور قرآن کی رفعت و بلندی سورۂ بقرہ ہے' ہر چیز کا خلاصہ و مغز ہوتا ہے اور قرآن کا خلاصہ مفصل ہے۔'' (دارمی)

تشریح: **وعن عبد الله بن مسعود وانه قال إن لکل شیء سناما** : سین کے فتحہ کے ساتھ یعنی بلندی، اونٹ کی کوہان سے استعارہ ہے۔

وان سنام القرآن سورة البقرة : یا تو اسکے طویل ہونے کی وجہ سے اور بہت زیادہ احکام پر محتوی ہونے کی وجہ سے یا اس وجہ سے کہ اس میں جہاد فی سبیل اللہ کا حکم ہے، اور اسکے ساتھ بھی بہت رفعت اور اعلیٰ مرتبہ ہے یعنی اسلام کی کوہان جہاد ہے۔

وان لکل شیءٍ : یعنی اس سے کہ اس کے لئے دل ہو۔

لبابا : لام کے ضمہ کے ساتھ، یعنی کسی چیز کا خلاصہ جو کہ اس کا اصل مغز ہوتا ہے۔

وان لباب القرآن المفصل : کیونکہ اس میں مسائل تفصیلاً مذکور ہیں جو کہ دیگر سورتوں میں مجمل ہیں اور ابن حجرؒ فرماتے ہیں اس اعتبار سے کہ مفصل کے خلاف جس طرح کہ اس کی افادیت اس حدیث سے واضح ہے ''**واوتیت المفصل نافلة**'' یعنی بقیہ پچھلی گزشتہ آسمانی کتابوں سے زائد جیسا کہ پہلی حدیث اس کی صراحت کر رہی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس طرح ہے کہ اس کا نچوڑ ہونے کی وجہ ظاہر نہیں مگر وجہ تسمیہ کے زیادتی کے ساتھ جس کو ہم نے برقرار رکھا' جیسا کہ اہل دانش پر مخفی نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اور صحیح قول کے مطابق مفصل سے مراد سورۃ الحجرات سے لے کر آخر قرآن تک کی سورتیں ہیں۔

موقوف ذکر کیا ہے اور اس کو ذکر نہیں کیا، اس کی وضاحت کرنے کے لئے حدیث کے اول سے۔

۲۱۸۰: وَعَنْ عَلِیٍّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ لِکُلِّ شَیْءٍ عَرُوْسٌ وَعَرُوْسُ الْقُرْاٰنِ الرَّحْمٰنُ.

اخرجه البیهقی فی شعب الایمان ۲/۴۹۰ حدیث رقم ۲۴۹۴۔

ترجمه: ''حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ہر چیز کے لئے زینت ہوتی ہے اور قرآن کریم کی زینت سورۂ رحمٰن ہے۔''

تشریح: **وعن علی رضی الله عنه قال سمعت رسول الله ﷺ یقول لکل شیء عروس** : یعنی خوبصورتی و جمال اور حسن اور زینت۔

وعروس القرآن الرحمٰن : اس کے دنیاوی اور اُخروی نعمتوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے، اور ان حور عین کی صفات پر محتوی ہونے کی وجہ سے جو اہل جنت کی دلہنیں ہوں گی، اور ان کے زیورات اور ان کے لباس کی تعریفات پر مشتمل ہے۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: عروس کے لفظ کا اطلاق مرد اور عورت دونوں پر ہوتا ہے، ان کے ایک دوسرے پر وارد ہونے کے وقت۔

اور انہوں نے زینت سے مراد یہ لیا ہے کہ دلہن زیورات کے ساتھ آراستہ کی جاتی ہے اور کپڑوں کے ساتھ مزین کی جاتی ہے۔ یا قریب ہو اس نے اُن کی مراد محبوب کے اور مطلوب کی طرف وصول۔

۲۱۸۱: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ قَرَأَ سُوْرَةَ الْوَاقِعَةِ فِیْ کُلِّ لَیْلَةٍ لَمْ تُصِبْهُ فَاقَةٌ اَبَدًا وَکَانَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ یَاْمُرُبَنَاتِهٖ یَقْرَاْنَ بِهَا فِیْ کُلِّ لَیْلَةٍ.

رواهما البيهقي في شعب الا يما ن

اخرجه البيهقي في شعب الايمان ٤٩١/٢ حديث رقم ٢٤٩٨۔

ترجمہ: ''حضرت ابن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''جو شخص سورۃ الواقعہ پڑھے گا وہ کبھی فاقہ کا شکار نہ ہوگا' حضرت ابن مسعودؓ اپنی صاحبزادیوں کو حکم دیا کرتے تھے کہ وہ ہر رات میں یہ سورت پڑھا کریں' ان دونوں روایتوں کو بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔''

تشریح: **وعن ابن مسعود قال: قال رسول الله ﷺ من قرأ سورة الواقعة في كل ليلة لم تصبه فاقة أبدا :** یعنی اسے فقر وفاقہ کبھی نقصان نہ دے گی جو کہ اس کو صبر جمیل اور اجر جزیل عطا کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے یا اس کو دلی فقر وتنگدستی پہنچے گی اس وجہ سے کہ جو اللہ تعالیٰ اسے یعنی کشادہ دل اور رب تعالیٰ کی معرفت اور اللہ پر توکل اور اعتماد اور نفس کی سلامتی عطا کر دیتا ہے اور معاملہ اللہ کی طرف سونپ دینا' جو فائدہ اس سورت کی آیات سے کرتا ہے اور معانی کے بیان سے بھی یہ مستفیض ہوتا ہے اس سورت میں جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں، وہ تصویر میں سانچہ کی طرح ہیں۔

خصوصاً اس سے متعلق ذکر ہے اللہ کا قول ﴿ **افرأيتم ما تحرثون** ﴾ [الواقعه: ٦٣] اور اللہ کا یہ قول ﴿ **وتجعلون رزقكم انكم تكذبون** ﴾ [الواقعه: ٨٢] اور تم اُس کو اپنا رزق بنا رہے ہو، کہ تم جھٹلاتے ہو (یعنی کیا تکذیب کو اپنا رزق بنا رہے ہو؟)۔ **(وكان ابن مسعود يأمر بناته يقرأن بها كل ليلة :** اور ایک دوسرے نسخہ میں **في كل ليلة** کے الفاظ ہیں۔

یعنی دونوں حدیثوں کو۔

۲۱۸۲: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ كَا نَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يُحِبُّ هٰذِ هِ السُّوْرَةَ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى۔

ترجمہ: ''حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اس سورت یعنی سبح اسم ربک الاعلیٰ کو بہت پسند کرتے تھے۔''

تشریح: **وعن علي قال كان رسول الله ﷺ يحب هذه السورة "سبح اسم ربك الاعلى"** [الاعلى: ١] یعنی زیادہ محبت اور وہ اس کی مثال ہے جو کہ سورۃ الفتح کے بارے میں وارد ہے کہ جن چیزوں پر سورج طلوع ہوتا ہے ان میں سے سب سے محبوب سورۃ الفتح ہے۔

بخاری، نسائی اور ترمذی نے عمرؓ سے مرفوع روایت کی ہے، عارف جامی، شمس الوجود میں فرماتے ہیں اور اگر اس طرح نہ ہو تو ساری دنیا کے معمور اس سے زیادہ حقیر ہے کہ اس کو حبیب کی نظر میں بڑا بنا کر پیش کرے یہ کہ وہ محبوب ہو اور..........اور اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **"لو كانت الدنيا تعدل عند الله جناح بعوضة لما سقى كافراً منها شربة ماءٍ"**. اگر دنیا کی قدر ومنزلت رب تعالیٰ کے ہاں مچھر کے پَر کے برابر بھی ہوتی، تو کسی کافر کو اس دنیا سے پانی کا گھونٹ بھی نہ پلاتا۔ سورۃ الفتح میں محبت کی زیادتی اس لئے ہے کہ اس میں فتح کی بشارت ہے اور مغفرت کا اشارہ ہے۔ اور اسی طرح یہ سورۃ یعنی الاعلیٰ ہر مشکل میں آسانی والے کاموں پر مشتمل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قول ﴿ **ونيسرك لليسرى** ﴾ [الاعلى :٨] ''اور ہم آپ کے لئے آسانی کو آسان کر دیں گے''۔

اور رسول اللہ ﷺ اس کی قراءت پر ہمیشگی کرتے تھے، وتروں کی پہلی رکعت میں اور دو توحید والی سورتوں یعنی الکافرون اور الاخلاص کو وتروں کی آخری دو رکعتوں میں **"كان النبي ﷺ يواظب على قراء تها في أول ركعات الوتر وقرأة الاخلاصين في الركعتين الأخريين"**.

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ کو اس سورت سے اس لئے محبت ہو کہ اس میں صحف ابراہیم وموسیٰ کا تذکرہ ہے۔
ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور حاکم نے روایت بیان کی ہے اور حاکم کہتے ہیں کہ صحیح الاسناد روایت ہے:

"عن ابی ذر قال: قلت یا رسول اللّٰه ﷺ علیه وسلم ما کان صحف ابراهیم؟ قال: کانت أمثالاً کلها. أیها الملك المسلط المبتلی المغرور انی لم أبعثك لتجمع الدنیا بعضها علی بعض ولکن بعثتك لتردعنی دعوة المظلوم فانی لا أردها ولو کانت من کافر وعلی العاقل ما لم یکن مغلوبا علی عقله أن یکون له ثلاث ساعات یناجی فیها ربه ساعة یحاسب فیها نفسه، وساعة یتفکر فیها فی صنع اللّٰه تعالٰی، وساعة یخلو فیها لحاجته من المطعم والمشرب، وعلی العاقل ان لا یکون ظاعنا الا لثلاث تزود لمعاد او لمرمة لمعاش او لذةٍ فی غیر محرم وعلی العاقل أن یکون بصیرا بزمانه، مقبلا علی شانه حافظا للسانه، ومن حسب کلامه من عمله قل کلامه الا فیما یعنیه قلت یا رسول اللّٰه ﷺ فما کان فی صحف موسٰی؟ قالت کانت عبرا کلها عجبت لمن أیقن بالموت ثم هو یفرح، عجبت لمن أیقن بالنار ثم هو یضحك عجبت لمن أیقن بالقدر ثم هو ینصب، عجبت لمن راعی الدنیا وتقلبها بأهلها. ثم اطمأن الیها عجبت لن أیقن بالحساب غدا ثم لا یعمل، قلت یا رسول اللّٰه ﷺ أوصنی. قال أوصیك بتقوٰی اللّٰه فانها رأس الأمر کله، قلت یا رسول اللّٰه زدنی، قال علیك بتلاوة القرآن وذکر اللّٰه تعالٰی فانه نور لك فی الأرض وذخر لك فی السماء . قلت یا رسول اللّٰه ﷺ زدنی، قال: ایاك وکثرة الضحك فانه یمیت القلب ویذهب بنور الوجه، قلت: یا رسول اللّٰه ﷺ زدنی. قال: علیك بالجهاد فانه رهبانیة امتی، قلت یا رسول اللّٰه ﷺ قال أحب المساکین وجالسهم، قلت: یا رسول اللّٰه ﷺ زدنی، قال انظر من هو تحتك ولا تنظر الٰی من هو فوتك، فهو أجدر أن لا تزدری نعمة اللّٰه عندك، قلت یا رسول اللّٰه ﷺ زدنی. قال لیردك عن الناس ما تعمله من نفسك ولا تجد علیهم فیما تأتی وکفی بك عیبا أن تعرف من الناس ما تجهلهٗ من نفسك وتجد علیهم فیما تأتی، ثم ضرب بیده علی صدری، فقال: یا أبا ذر لا عقل کالتدبیر ولا ورع کالکف ولا حسب کحسن الخلق".

ابوذرؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں: کہ میں نے پوچھا اے اللہ کے رسول! ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں میں کیا تھا؟ آپؐ نے فرمایا: وہ تمام مثالیں تھے، اے آزمائش میں پڑے ہوئے سلطنت والے اور مغرور بادشاہ! میں نے تجھے اس لئے نہیں بھیجا کہ تہ بہ تہ دنیا جمع کر، لیکن میرا تجھے بھیجنے کا مقصد یہ ہے کہ تو مجھ سے مظلوم کی بددعا کو لوٹائے کیونکہ میں اس کی بددعا کو ردّ نہیں کرتا ہوں، اگرچہ وہ کسی کافر کی ہی کیوں نہ ہو۔ اور عاقل بالغ پر جب تک کہ اس کی عقل خراب نہ ہو جائے، کہ اس کے تین وقت ہوں جن میں وہ اپنے ربّ سے گفتگو کرے، سرگوشی کرے ایک ساعت میں وہ اپنے نفس کا محاسبہ کرے، اور دوسری ساعت میں اللہ کی تخلیق کائنات میں غور وفکر کرے، اور تیسری ساعت میں علیحدہ ہو جائے اپنے کھانے اور پینے کی حاجت کے لئے یعنی صرف اپنے طعام وشراب کے لئے دعا کرے۔ اور عاقل پر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ سفر نہ کرے، مگر صرف تین وجوہ سے یعنی وہ تین وجوہ کے بغیر سفر بھی نہ کرے (ا) آخرت کے ساز وسامان کی

خاطر، (۲) معاش کی بہتری کے لئے۔ (۳) غیر حرام میں لذت تلاش کرے۔
اور عاقل پر یہ بھی ضروری ہے کہ اپنے وقت کو دیکھنے والا ہو۔ اپنے حال پر رہنے والا ہو۔ اپنی زبان کی حفاظت کرنے والا ہو۔ جس کا کلام اس کو اس کے عمل سے روک دے وہ اپنے کلام کو کم کرے اگر ہو تو با مقصد ہو یعنی لغو باتیں نہ ہوں، ۔ ابو ذرؓ فرماتے ہیں: میں نے کہا یا رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں میں کیا تھا؟ آپؐ نے فرمایا: وہ سارے کے سارے عبرت پر مشتمل تھے۔ اس آدمی پر تعجب ہے جو موت پر یقین بھی رکھتا ہے، ہشاش بشاش بھی رہتا ہے اور اس آدمی پر تعجب ہے جو جہنم پر یقین بھی رکھتا ہے پھر اس کے باوجود وہ ہنستا بھی ہے، اور اس پر بھی تعجب ہے جو تقدیر پر یقین رکھتا ہے پھر بھی اپنے آپ کو تھکا دیتا ہے، اور اس پر بھی تعجب ہے جس نے دنیا کو دیکھا اور اس کی تبدیلیوں کو (اس کے الٹ پلٹ ہونے کو) اور اس پر بھی تعجب ہے جو کل روز قیامت حساب پر بھی یقین رکھتا ہے اور عمل بھی نہیں کرتا۔

میں نے کہا اے اللہ کے رسول! مجھے وصیت کیجئے، آپؐ نے فرمایا: میں تمہیں اللہ کے ڈر یعنی تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں، کیونکہ یہ تمام اعمال کی بنیاد (جڑ) ہے۔ میں نے کہا اے اللہ کے رسول! مجھے اور (یعنی زیادہ وصیت کیجئے) آپؐ نے فرمایا: قرآن پاک کی تلاوت کو اور اللہ کے ذکر کو اپنے اوپر لازم کرلو، کہ یہ تمہارے لئے زمین باعث نور ہے، اور آسمان میں تیرے لئے ذخیرہ ہے۔ میں نے کہا یا رسول اللہ! مجھے اور وصیت کیجئے' آپؐ نے فرمایا: کہ زیادہ ہنسنے سے اجتناب کرو کیونکہ اس سے دل مردہ ہو جاتے ہیں اور چہرے کا نور چلا جاتا ہے، میں نے کہا اے اللہ کے رسول! مجھے اور نصیحت کریں، آپؐ نے فرمایا: جہاد کو لازم پکڑلو کہ یہ میری امت کی رہبانیت ہے، میں نے کہا یا رسول اللہ! مجھے اور وصیت فرمائیں۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا: مساکین کے ساتھ محبت کرو، اور ان کے پاس بیٹھا کرو۔ میں نے کہا اے اللہ کے رسول! مجھے اور وصیت کریں، آپؐ نے فرمایا: اپنے سے نچلے طبقہ کے لوگوں کی طرف دیکھو، اور اپنے سے اونچے طبقے (یعنی دنیاوی مال ومتاع واسباب کے اعتبار اور دینی بھی مراد ہوسکتا ہے) والوں کو نہ دیکھو، کیونکہ یہ بات زیادہ لائق ہے مناسب معلوم ہوتی ہے تو اللہ کی نعمتوں کو حقیر نہ جانے۔ میں نے کہا اے اللہ کے پیارے رسول مجھے اور وصیت فرمائیے۔ آپؐ نے فرمایا جو چیز تو اپنے بارے میں جانتا ہے چاہئے کہ وہ تجھے لوگوں سے روکے رکھے، اور تو ان پر ناراض نہ ہو اُس کام میں جس کا تو خود مرتکب ہوتا ہے، اور تیرے لئے یہ عیب ہی کافی ہے کہ تو لوگوں کے ان عیوب یا ان باتوں کو پہچانے جو تیرے میں موجود ہیں اور تجھے ان کا علم نہیں ہے اور تو ان پر اس کام پر غصہ کرتا ہے' جن کا تو خود مرتکب ہوتا ہے۔ پھر آپ علیہ السلام نے اپنا ہاتھ مبارک میرے سینے پر مارا، فرمایا: اے ابوذر! تدبیر کی طرح کوئی عقل نہیں اور سوال سے بچنے کی طرح کا کوئی تقویٰ نہیں، اور حسن اخلاق کی طرح کا کوئی حسب ونسب نہیں۔

سورۃ الزلزال ایک جامع سورت ہے

۲۱۸۳: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ اَتَى رَجُلٌ النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَ اَقْرِئْنِيْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ اقْرَأْ ثَلَاثًا مِّنْ ذَوَاتِ الٓرٰ فَقَالَ كَبُرَتْ سِنِّيْ وَاشْتَدَّ قَلْبِيْ وَغَلُظَ لِسَانِيْ قَالَ فَاقْرَأْ ثَلَاثًا مِّنْ ذَوَاتِ حٰمٓ فَقَالَ مِثْلَ مَقَالَتِهٖ قَالَ الرَّجُلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَقْرِئْنِيْ سُوْرَةً جَامِعَةً فَاَقْرَأَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا زُلْزِلَتِ حَتّٰى فَرَغَ مِنْهَا فَقَالَ الرَّجُلُ وَالَّذِيْ بَعَثَكَ بِالْحَقِّ لَا اَزِيْدُ عَلَيْهِ اَبَدًا ثُمَّ اَدْبَرَ الرَّجُلُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَفْلَحَ

الرُّوَيْجِلُ مَرَّتَيْنِ. (رواه احمد و ابو داود)

ابو داود' كتاب الصلاة' باب تخريب القرآن' ح ۱۲۹۹

ترجمه: ''حضرت عبداللہ بن عمروؓ کہتے ہیں کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ مجھے پڑھائیں! آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''قرآن کریم کی الرٰ والی سورتوں میں سے تین سورتیں پڑھ لو' اس نے عرض کیا' میری عمر زیادہ ہو چکی ہے اور میرا دل سخت ہو گیا ہے نیز میری زبان موٹی ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''تو پھر تم حٰمٓ والی سورتوں میں سے تین سورتیں پڑھ لو اس نے کہا کہ یارسول اللہ مجھے کوئی جامع سورت پڑھایئے چنانچہ آپ ﷺ نے اسے ''سورۃ اذا زلزلت'' پڑھائی' جب آپ ﷺ اس سے فارغ ہوئے تو اس شخص نے کہا کہ ''قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے میں اس پر کبھی بھی زیادتی نہیں کروں گا'' پھر اس شخص نے پیٹھ پھیری تو نبی کریم ﷺ نے دو مرتبہ ارشاد فرمایا کہ ''یہ شخص فلاح یاب ہو گیا۔'' (احمد' ابوداؤد)

تشریح: **وعن عبد الله بن عمرو : عمرو**، واؤ کے ساتھ ہے۔

قال أتى رجل النبى ﷺ فقال أقرئنى : ہمزہ کے فتحہ اور راء کے کسرہ کے ساتھ یعنی مجھے سکھایئے۔

يا رسول الله ﷺ فقال اقرأ ثلاثا : یعنی تین سورتیں۔

من ذوات الرٰ : اور ایک دوسرے نسخے میں **ذوات الرآء** کا لفظ ہے، مد کے ساتھ اور اس کے بعد ہمزہ بھی ہے۔ طیبیؒ کہتے ہیں: یعنی وہ سورتیں جن کے شروع میں راء ہے، یا راء سے شروع ہوتی ہیں۔

فقال كبرت : باء کے ضمہ کے ساتھ اور کسرہ بھی دیا جاتا ہے۔ **سني :** یعنی میری عمر زیادہ ہو چکی ہے۔

واشتد قلبى : میرے دل پر تھوڑا حفظ ہونا اور زیادہ بھولنا غالب آچکا ہے۔

وغلظ لسانى : یعنی بوجھل ہو چکی ہے، اس طرح سے کہ قرآن کے سیکھنے میں میری فرمانبردار نہیں بنتی، مراد یہ کہ قرآن سیکھنے کی استطاعت نہیں رکھتا اور نہ لمبی سورتیں یاد کر سکتا ہوں۔

قال : اگر تو ان کو پڑھنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔

فاقرأ ثلاثا من ذوات حم : اگر قصر پڑھا جائے یعنی حٰم مد کے علاوہ' تو ذوات الراء یعنی لا والی سورتوں بھی سے کم لمبا کر مراد چھوٹا کر۔ **فقال مثل مقالته :** یعنی پہلی بات۔

قال الرجل يا رسول الله ﷺ اقرأنى سورة جامعة : یعنی وضاحت کیجئے میرے لئے ایسی سورت جس کے الفاظ کم اور معانی زیادہ ہوں۔

فاقرأه رسول الله ﷺ اذا زلزلت حتى فرغ منها : یعنی نبی ﷺ یا وہ آدمی فارغ ہوا قراءت سے۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: گویا کہ اس کو فلاح حاصل ہوگئی۔ جب وہ اس پر عمل کرے۔ اسی لئے سورۃ جامع کہا اور اس سورت میں ایک ایسی آیت ہے کہ اس پر کسی اور آیت کی ضرورت نہیں' وہ یہ ہے: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ……﴾ [الزلزلة: ۷] کہ ''جو نیکی کرے گا اس کو دیکھ لے گا اور جو ذرا برابر بھی برائی کرے گا اس کو دیکھ لے گا''۔ اور اسی لئے یہ تطبیق کی جس کے لئے کوئی حد نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جب آپ سے گھریلو گدھوں کے بارے میں پوچھا گیا۔ اس بارے کوئی آیت اس آیت سے جامع اور مجمل نازل نہیں ہوئی، یعنی: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ﴾ [الزلزلة: ۷- ۸] طیبیؒ فرماتے ہیں: اس کی وضاحت یہ ہے کہ اعمال کے پیش ہونے میں

اوراس پرثواب کے بیان کے لئے وارد ہوئی ہے۔جیسا کہ باری تعالیٰ کا فرمان: ﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ۖ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۖ وَكَفٰى بِنَا حَاسِبِيْنَ﴾ [الانبیاء: ٤٧] ''اور وہاں قیامت کے روز ہم میزان عدل قائم کریں گے (اور سب کے اعمال کا وزن کریں گے) سو! کسی پر ذرا برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا، اور اگر (کسی کا عمل) رائی کے دانے کے برابر بھی ہوگا' تو ہم اُس کو (وہاں) حاضر کر دیں گے اور ہم حساب لینے والے کافی ہیں''۔

فقال الرجل والذی بعثك بالحق لا أزيد عليه أبدا : یعنی اس عمل پر جو آپ نے مجھے پڑھایا ہے، کہ نیکی کے کام سے اور شر یعنی برائی کے چھوڑنے سے اور شاید اس کے قسم کھانے کے ساتھ اس کا قصد پختہ عزم کی تاکید اور مکمل تائید تھا۔یقیناً آپ علیہ السلام کے سامنے جو کہ آپ کی حاضری بیعت اور عہد کی جگہ ہے اور حدیث کا ظاہر یہ ہے کہ آدمی کی خیر اور شر سے مراد ان کا عام یعنی جنس شر اور خیر کے لئے تھا، نہ کہ بشمول استغراق مراد ہے۔

بہرحال ابن حجرؒ کا خیر سے فقط واجب افعال اور شر سے فقط محرمات کی قید لگانا، پھر ان کا کہنا اور رہا مسئلہ نوافل کا وہ میں نے عمر زیادہ ہونے کی وجہ سے چھوڑ دوں گا، اور میں یہ کام اپنے دل کی سختی کی وجہ سے کرتا ہوں۔پس حلف یعنی قسم سے ارادہ صرف یہ تھا کہ وہ واجبات کو اداء کریں گے اور محرمات کو ترک کریں گے، نہ کہ وہ اس سے مستغنی ہو گئے۔باوجود اس کے کہ اس پر حدیث کے لئے کوئی دلالت ہی نہیں ہے۔طیبیؒ فرماتے ہیں: گویا کہ اس نے کہا: ''**حسبی ما سمعت و لا ابالی الا أسمع غيرها**''. کہ میرے لئے یہ کافی ہے جو میں نے سن لیا اور کسی دوسرے سے سننے کی ضرورت نہیں۔

ثم إدبر الرجل : یعنی اس نے اپنی پشت پھیر لی، اور چلا گیا۔

فقال رسول الله ﷺ أفلح : یعنی اپنے مطلوب کے ساتھ کامیاب ہو گیا' نجات پا گیا۔اور محبوب کی طرف کامیاب و کامران ہو گیا۔

الرویجل : طیبیؒ کہتے ہیں: تصغیر اس کی بعید نظری اور قوت ادراک کی وجہ سے بیان کی۔اور یہ تصغیر بھی شاذ ہے، کیونکہ قاعدے کے مطابق رجلٌ کی تصغیر ''رُجیل'' آتی ہے، اور یہ رو جیل ہے اھ۔اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ راجل بمعنی چلنے والا کی تصغیر ہو۔

مرّتين : یا تو تاکید کے لئے ہے یا ایک بار دنیا کے لئے اور ایک بار آخرت کے لئے فرمایا۔اور یہ بھی قول ہے کہ آپ علیہ السلام کی اس کے بارے شدت پسندیدگی کی وجہ سے۔ حدیث کو روایت کیا ہے احمد اور ابوداؤد نے۔

۲۱۸۴:وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلَا يَسْتَطِيْعُ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّقْرَاَ اَلْفَ اٰيَةٍ فِيْ كُلِّ يَوْمٍ قَالُوْا وَمَنْ يَّسْتَطِيْعُ اَنْ يَّقْرَاَ اَلْفَ اٰيَةٍ فِيْ كُلِّ يَوْمٍ قَالَ اَمَا يَسْتَطِيْعُ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّقْرَاَ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ. (رواه البيهقی فی شعب الايمان)

اخرجه البيهقی فی شعب الايمان ٤٩٨/٢ حديث رقم ٢٥١٨۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا'' کیا تم میں سے کوئی شخص ہر روز ایک ہزار آیات پڑھنے کی طاقت نہیں رکھتا؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ''روزانہ ایک ہزار آیات کون پڑھ سکتا ہے؟'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا'' تم میں سے کوئی روزانہ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ (ہی) نہیں پڑھ سکتا''۔ (بیہقی)

تشریح: **وعن ابن عمر قال:قال رسول الله ﷺ ألا يستطيع أحدكم ان يقرأ الف آية فی كل يوم؟ قالوا ومن يستطيع أن يقرأ الف آية فی كل يوم؟** : یعنی اتنی آیات ہمیشگی کے ساتھ روزانہ ہر ایک نہیں پڑھ سکتا۔

قال اما يستطيع أحدكم أن قرأ الهكم التكاثر؟ [التكاثر: ۱] یعنی اس کے آخر تک مکمل سورت۔ یہ دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کے علم یقین کی رغبت میں ایک ہزار آیات کی قراءت کی طرح ہے، اور ایک قول یہ ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن چھ ہزار اور کچھ اوپر آیات پر مشتمل ہے، اور جب اوپر والی زائد کو چھوڑ دیا جائے تو ہزار ہزار والے چھ ٹکڑے بن جاتے ہیں۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے مقاصد قرآن چھ(۶) ذکر کیے ہیں۔ تین اہم ہیں اور تین ان کو مکمل کرنے والے ہیں ان چھ میں سے ایک آخرت کی معرفت ہے، جس پر یہ سورت مشتمل ہے، اور اس معنی سے ہزار آیت کا معنی تعبیر کرنا زیادہ بہتر ہے، اس سے کہ اس کو سدس القرآن تعبیر کیا جائے، اور ہاں اگر اس سے ثلث القرآن تعبیر کیا جائے، تو صحیح ہے۔

۲۱۸۵: وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ مُرْسَلًا عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ مَنْ قَرَأَ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ عَشَرَ مَرَّاتٍ بُنِيَ لَهُ بِهَا قَصْرٌ فِي الْجَنَّةِ وَمَنْ قَرَأَ عِشْرِيْنَ مَرَّةً بُنِيَ لَهُ بِهَا قَصْرَا نِ فِي الْجَنَّةِ وَمَنْ قَرَأَهَا ثَلَا ثِيْنَ مَرَّةً بُنِيَ لَهُ بِهَا ثَلَا ثَةُ قُصُوْرٍ فِي الْجَنَّةِ فَقَالَ عُمَرُبْنُ الْخَطَّابِ وَاللّٰهِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِذًا النُكْثِرَ نَّ قُصُوْرَ نَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَللّٰهُ اَوْسَعُ مِنْ ذٰلِكَ۔ (رواه الدارمی)

اخرجه الدارمی فی السنن ۲/۵۵۱ حدیث رقم ۳۴۲۹۔

ترجمہ: ”حضرت سعید بن مسیبؒ بطریق ارسال روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جو شخص قل ھواللہ احد دس بار پڑھے تو اس کے بدلہ میں جنت میں اس کے لئے ایک محل بنایا جاتا ہے' جو شخص اس کو بیس مرتبہ پڑھے تو اس کے بدلہ میں جنت میں اس کے لئے دو محل بنائے جاتے ہیں اور جو شخص اس کو تیس مرتبہ پڑھے تو اس کے بدلہ میں جنت میں اس کے لئے تین محل بنائے جاتے ہیں“ حضرت عمر بن خطابؓ کہنے لگے کہ ”خدا کی قسم! اے اللہ کے رسول ﷺ! پھر تو اب ہم اپنے بہت زیادہ محل بنالیں گے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ”اللہ تعالیٰ اس سے بھی زیادہ کشائش وفراخی والا ہے“ (یعنی اس سورت کی فضیلت اور اس کا ثواب بہت عظیم اور بہت وسیع ہے لہٰذا اس بشارت پر تعجب نہ کرو بلکہ اس کے حصول کی کوشش کرو اور اس کی طرف راغب ہو)۔“

تشریح: وعن سعيد بن المسيب : یہ تابعین کے سرداروں میں سے تھے، بلکہ کہا گیا ہے کہ وہ ان کے بزرگ اور ان کے افضل ترین تابعی تھے۔

مرسلا : صحابی کو حذف کرنے کے ساتھ۔

عن النبی ﷺ قال من قرأ قل هو الله احد [الاخلاص:۱] **عشر مرات بنی له بها قصر فی الجنة ومن قرأ عشرين مرة بنی له قصران فی الجنة ومن قرأها** : یعنی سورت کو۔

ثلاثين مرة بنی له بها ثلاثة قصور فی الجنة : شاید کہ اس کو مکرر لائے ہیں، تا کہ دس کے ہندسے میں ہی حصر یعنی بند کرنے کا وہم پیدا نہ ہو اور سمجھ آجائے کہ جتنے عدد زیادہ ہوں گے، اتنے ہی درجات بڑھائے جائیں گے۔

فقال عمر بن الخطاب رضی الله عنه والله يا رسول الله اذاً : اذاً تنوین کے ساتھ جواب اور جزاء ہے اس میں تعجب کا معنی ہے۔

لنكثرن قصورنا : الاکثار باب افعال سے ہے۔ اور اس میں تشدید یعنی باب تفعیل بھی جائز ہے۔

طیبیؒ فرماتے ہیں: یعنی جب معاملہ اس طرح ہے جس طرح آپ نے ذکر فرمایا ہے کہ دس مرتبہ پڑھنے پر جنت میں محل بن جاتا ہے

تو ہم زیادہ محل بنائیں گے۔اس سورت کی کثرت سے تلاوت کے ساتھ۔پس جب محلات بے حد وحساب ہوں گے اور نہ ہی جنت سے وسیع کوئی چیز ہے۔

فقال رسول اللہ ﷺ اللہ أوسع : یعنی کثرت عطا کے لحاظ سے یعنی بہت زیادہ عطاء کرنے والا ہے۔

من ذالك : یعنی اس کی قدرت اور اس کی رحمت اس سے زیادہ وسیع ہے۔پس تم تعجب نہ کرو۔

اور عجیب بات یہ ہے کہ ابن حجرؒ دو قولوں اور ان کی تلفیق میں خلط ملط ہو گئے

جب انہوں نے یہ کہا کہ اس کی قدرت عطاء کرنے کے لحاظ سے بہت زیادہ ہے۔

۲۱۸۶:وَعَنِ الْحَسَنِ مُرْسَلاً اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ مَنْ قَرَاَ فِی لَیْلَةٍ مِائَةَ اٰیَةٍ لَمْ یُحَاجَّهُ الْقُرْاٰنُ تِلْكَ اللَّیْلَةَ وَمَنْ قَرَاَ فِی لَیْلَةٍ مِائَتَیْ اٰیَةٍ كُتِبَ لَهٗ قُنُوْتُ لَیْلَةٍ وَمَنْ قَرَاَ فِی لَیْلَةٍ خَمْسَ مِائَةٍ اِلَی الْاَلْفِ اَصْبَحَ وَ لَهٗ قِنْطَارٌ مِّنَ الْاَجْرِ قَالُوْا وَمَا الْقِنْطَارُ قَالَ اِثْنَا عَشَرَ اَلْفًا (رواہ الدارمی)

اخرجه الدارمی فی السنن ۲/۵۵۷ حدیث رقم ۳۴۵۹۔

ترجمه: ''حضرت حسن بطریق ارسال روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''جو شخص رات میں سو آیات پڑھے تو رات میں قرآن اس سے نہیں جھگڑے گا' جو رات میں دو سو آیات پڑھے تو اس کے لئے شب بیداری کا ثواب لکھا جاتا ہے اور جو شخص رات میں پانچ سو سے ہزار تک آیات پڑھے تو وہ اس حال میں صبح کرتا ہے کہ اس کیلئے قنطار کے بقدر ثواب ہوتا ہے'' صحابہؓ نے عرض کیا کہ 'قنطار کیا ہے'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''بارہ ہزار۔'' (دارمی)

تشریح: وعن الحسن : یعنی حسن بصری۔

مرسلا : کیونکہ یہ تابعی ہیں، اور انہوں نے صحابی کو حذف کیا ہے۔

أن النبی ﷺ قال من قرأ فی لیلة مائة آیة لم یحاجه القرآن : یعنی اس سے اس کی کوتاہی کے بارے میں جھگڑا نہیں کرے گا۔

تلك اللیلة : یعنی اس رات کی جہت سے۔ابن حجرؒ فرماتے ہیں: اس رات اس کی پاسداری میں کوتاہی کرنے کی وجہ سے اس سے قرآن جھگڑا نہیں کرے گا، کیونکہ اس میں کوتاہی اس سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کے عمل نہ کرنے کی وجہ سے جھگڑے گا اگر اس نے عمل نہیں کیا اس طرح جو کہ حدیث میں ہے کہ وہ اپنے جھگڑے میں اپنے بعض حافظوں کے بارے میں کہتا ہے، وہ مجھ سے سو گیا اور مجھ پر عمل نہیں کیا، یعنی میرے مطابق اس نے عمل نہیں کیا، کہ اس کو میرے بارے میں علم بھی تھا۔

وہ اس سے دو وجوہات سے جھگڑا کرے گا، پہلی یہ کہ اس کے عہد میں کوتاہی برتنا کیونکہ وہ اس کو نسیان (بھلا) دے گا۔اور دوسری وجہ اس کے مطابق عمل کرنے کے بارے میں' کیونکہ اس میں اس کے حق کے بارے میں غفلت برتتا ہے (بہت فریفتہ ہونا/لہو ولعب میں مشغول)۔

اور ممکن ہے کہ قیام اللیل کے لئے عمل پر ابھارنا ہو جیسا کہ یہ زیادہ قریب اور ظاہر ہے۔واللہ اعلم

طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ دلیل ہے اس بات کی کہ قرآن کی تلاوت ہر انسان پر لازم ہے، اور اس پر واجب بھی ہے۔ جب پڑھے گا نہیں تو قرآن اللہ کے حضور اس کے بارے جھگڑا کرے گا اور حجت کیا تو وہ اس پر غالب آ جائے گا، جھگڑے کی قرآن کی طرف نسبت مجازی ہے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں: یہ تمام کا تمام محلِ نظر ہے، بہرحال ان کا یہ کہنا کہ ''**لازمة لكل انسان و واجبة عليه**'' کہ ہر انسان پر لازم اور واجب ہے، صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ کلام حافظ کے بارے میں ہے وہ پڑھے جو اس کو یاد ہو۔ پس سمجھ لو کہ جھگڑا اس حافظ کے ساتھ ہوگا جس کو جو یاد ہو اس کو پڑھا نہیں، نہ کہ اس سے مراد وہ ہے جس نے بالکل قرآن پڑھا ہی نہیں اور نہ اس سے وہ مراد ہے جس نے بالکلیہ قرآن پڑھا ہی نہیں۔

میں کہتا ہوں: اس جگہ پر جو قرینہ سمجھا جا رہا ہے وہ معلوم ہے، بے شک ہر آدمی سے ان کی مراد حافظ قرآن ہیں، اس کے اطلاق کے زیادہ فائدہ کے ساتھ یہ اشارہ ہے قرآن کے پڑھنے کے وجوب کی طرف تھوڑا ہو یا زیادہ، جیسا کہ شرعی قواعد میں مقرر شدہ ہے، اور جائز ہے سو کے عدد کو اس کے تکرار پر اور عدم تکرار پر محمول کرنا اور اسی طرح اس کے اطلاق کو بھی اشارہ کرتے ہوئے ائمہ کرام کے قول کی طرف کہ قرآن حفظ کرنا فرض کفایہ ہے، یعنی ان اعمال میں سے ہے جو فرض کفایہ ہیں، تو اس حدیث کے ساتھ ہر زمانے کی ساری امت کو مخاطب کیا ہے کہ اچھا ہے اگر اس قرآن کو ان میں سے ایک جماعت حفظ کرلے، تو فرض کفایہ ادا ہو جائے گا، تو سب کی طرف سے ادا ہو جائے گا اور ایک جماعت یعنی چند لوگ ہی حفظ نہ کریں، تو سارے بستی والے گنہگار رہوں گے۔

وہ فرماتے ہیں کہ رہا مسئلہ آپ علیہ السلام کے اس قول کا کہ **يخاصمه** کا ذکر قرآن جھگڑا کرے گا، تو اس کے بارے میں جو اشکالات پیدا ہوتے ہیں، ان کا رَد پیچھے کئی بار گزر چکا ہے۔ مقرر قاعدہ کے ساتھ کہ شارع علیہ السلام کے الفاظ جیسے ہوں ان کو ان کے ظاہر پر باقی رہنا اس سے نہیں پھیرنا اور یہ قرآن کے جھگڑا کرنے کی بقا کے ساتھ ممکن ہے اس کے ظاہر کے مطابق یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی بولنے والی چیز کو شکل دے دے، اور اس میں یہ بھی ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو کسی غیر ظاہر صورت میں بنا دے جو حدیث میں ہے۔ باوجود اس کے کہ قرآن کریم حقیقت میں یا تو کلام نفس ہے اور یا پھر ہماری زبانوں پر جاری ہونے والا کلام ہے۔

اور قرآن وسنت مجاز کے استعمال سے بھرے ہوئے ہیں، بلکہ یہ مجاز حقیقت سے بہت زیادہ بلیغ ہے جیسا کہ کنایہ صریح سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے۔ علماءِ علمِ بیان اور اہل التفسیر علماء کی تصریح کے مطابق۔ بلکہ بڑے بڑے صوفیاء نے کہا ہے کہ اللہ کا فرمان: ﴿**قل يتوفاكم ملك الموت**﴾ [السجدة: ۱۱] کہ ''ان سے کہہ دیں تمہیں ملک الموت فوت کرے گا''۔ یہ نسبت مجازی ہے، اور باری تعالیٰ کا فرمان: ﴿**الله يتوفى الانفس**﴾ [الزمر: ٤٢] ''اللہ ہی ذی روح چیزوں کو فوت کرتا ہے''۔ یہ نسبت حقیقی ہے۔ تو اس کے کلام میں اعتراض کوئی معنیٰ نہیں رکھتا۔ لیکن شاعر کا قول ہے:

وعين الرضا عن كل عيب كليلة ☆ ولكن عيون السخط تبدى المساويا

''اور رضامندی کی آنکھ ہر قسم کے عیب سے پاک ہے، لیکن ناراضگی کی آنکھ بڑی باتوں کو ظاہر کر دیتی ہے''۔

یعنی محاسن کو بھی بُرا دکھاتی ہے، اور تو دیکھ ان افراد کی طرف جو رضا کی آنکھ رکھتے ہیں۔ اور ان کی طرف جو جماعت ناراضگی والی آنکھ رکھتی ہے۔ یہ بات آپ کے لئے لطیف نکتہ اور اس کی باطنی وظاہری حکمت کو عیاں کر دے گی۔

من قرأ في ليلة مأتي آية كتب له قنوت ليلة : یعنی اس رات کی عبادت اور قیام لکھ دیا جاتا ہے۔

ومن قرأ في ليلة خمسمائة الى الالف أصبح وله قنطار : یعنی اس کے عدد کے برابر ثواب یا اس کے وزن کے برابر ثواب۔

من الاجر قالوا وما القنطار؟ قال اثنا عشر الفا : یعنی بارہ ہزار درہم یا دینار۔ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ حدیث میں ہے کہ قنطار سے مراد ایک ہزار دو سو اوقیہ ہیں۔ اور اوقیہ آسمان اور زمین کے درمیان جو کچھ ہے (یعنی دنیا و مافیہا) اس سے بہتر ہے اور ابن حجرؒ کا قول

"اثنا عشر الفا من الارطال" کہ بارہ ہزار رطل یہ کسی نقل صحیح یا کسی صریح دلیل کا محتاج ہے۔

باب

(یہ باب متعلقات قرآن وغیرہ کے بیان میں ہے)

تنوین کے ساتھ اور ساکن بھی ہوسکتا ہے۔ یہ باب بھی احکام فضائل کے تابع ہے، اس لحاظ سے کہ اس میں مزید زائد چیزیں (یعنی فضائل) وغیرہ کی رعایت رکھتے ہوئے ذکر کیا ہے۔

الفصل الاول:

قرآن کریم غفلت سے بھول جاتا ہے

۲۱۸۷: عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی الْاَشْعَرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ تَعَاهَدُوْا الْقُرْاٰنَ فَوَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَهُوَ اَشَدُّ تَفَصِّیًا مِنَ الْاِبِلِ فِیْ عُقُلِهَا۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۷۹/۹۔ حدیث رقم ۵۰۳۳۔ ومسلم فی صحیحه ۵۴۵/۱ حدیث رقم (۲۳۱۔ ۷۹۱)۔ والدارمی فی السنن ۵۳۱/۲ حدیث رقم ۳۳۴۹۰ واحمد فی المسند ۳۹۷/۴۔

ترجمه: "حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "قرآن کی خبر گیری کرتے رہو اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے قرآن سینوں سے اتنی جلدی نکل جاتا ہے کہ اونٹ بھی اتنی جلدی اپنی رسّی سے نہیں نکلتا"۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: **وعن ابی موسٰی الأشعری قال: قال رسول اللّٰه ﷺ: تعاهدوا القرآن:** یعنی اس کی حفاظت کرو اور اس کو محافظت کے ساتھ یاد کرو، اور اس کی تلاوت پر ہمیشگی اختیار کرو۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: تعاهد سے مراد محافظت اور تجدید عهد ہے، یعنی اس کی قراءت پر مداومت کرو، اور اس کو بار بار پڑھو تاکہ بھول نہ جائے۔

فو الذی نفسی بیده لَهُوَ: یعنی قرآن۔

اشد تفصیا: یعنی بھاگنے میں، دوڑنے میں، جان چھڑا کر نکل جانے میں۔

من الابل: طیبیؒ فرماتے ہیں: التفصی سے مراد جدا ہونا، زائل ہونا۔ کہا جاتا ہے (قرض سے نجات پائی) **تفصیت الدیون،** اس وقت کہا جائے گا جب اس سے نکل جائے۔

فی عقلها: عین کے ضمہ کے ساتھ اور قاف کے ضمہ کے ساتھ۔ عِقال کی جمع ہے، جیسے کتاب سے کتب، اور لغۃً قاف کو ساکن کرنا بھی جائز ہے لیکن صحیح روایت اس کے ضمہ پر ہے اور اس سے مراد وہ رسی ہے جس کے ساتھ اونٹ کا گھٹنا باندھا جاتا ہے، اور اسی سے آپ علیہ السلام کا قول مبارکہ ہے: **"اعقل وتوکل"**.

طیبیؒ فرماتے ہیں: **عقلت الابل**، اس وقت کہا جاتا ہے جب اس کا گھٹنا باندھا جائے گا، اور ان دونوں کو ذراع کے وسط میں باندھا جائے گا۔ یہ **العقل** وہی رسی ہے، اھ۔ اور "فی" اس میں "من" کے معنی میں ہے یعنی **لهو اشدّ ذهابا من الابل اذا تخلصت من العقال** یعنی یہ بھاگنے میں اونٹ سے زیادہ جلد باز ہے، جب اس کا گھٹنا کھل جائے، پس یہ نکل جاتا ہے، حتی کہ یہ گمان ہوتا ہے اب یہ نہیں

پکڑا جائے گا، اور ایک دوسری روایت میں ہے:

''یہ قرآن لوگوں کے دلوں سے نکلنے میں اونٹ سے بھی تیز ہے، جو رسی سے نکل کر بھاگتا ہے''۔

طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ اس لئے ہے کہ قرآن کسی بشر کا کلام نہیں ہے، بلکہ طاقتور اور قدرت والے خالق کا کلام ہے، اس کی اور بشر کے درمیان کوئی قریب کی مناسبت بھی نہیں ہے، کیونکہ بشر حادث ہے اور وہ ذات قدیم ہے۔ اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اپنی کامل توفیق ومہربانی اور اپنی قدیم توقیر ورحمت کے ساتھ ان پر یعنی انسانوں پر احسان کیا اور انہیں یہ عظیم نعمت عطاء کی۔ پس اس کے لائق ہے کہ اس کو حفظ کر کے اور ہمیشگی سے حتی الوسع اس کو پڑھنے پر مداومت کی جائے۔ اس کی تجدید کی جائے یعنی بار بار تلاوت کی جائے۔

امام احمدؒ نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔

۲۱۸۸: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِئْسَ مَا لِاَحَدِهِمْ اَنْ يَّقُوْلَ نَسِيْتُ اٰيَةَ كَيْتَ وَكَيْتَ بَلْ نُسِّيَ وَاسْتَذْكِرُوا الْقُرْاٰنَ فَاِنَّهٗ اَشَدُّ تَفَصِّيًا مِنْ صُدُوْرِ الرِّجَالِ مِنَ النَّعَمِ. متفق عليه وزاد مسلم بعقلها۔

اخرجه البخاري في صحيحه ۷۹/۸۔ حديث رقم ۳۲۔۵۔ ومسلم في صحيحه ۵۴٤/۱ حديث رقم (۲۸۸۔ ۷۹۰)۔ والترمذي في السنن ۱۷۷/۵ حديث رقم ۲۹٤۲۔ والنسائي ۱۵٤/۵ حديث رقم ۹٤۳۔ والدارمي ۵۳۱/۲ حديث رقم ۳۳٤۷۔ واحمد في المسند ۳۸۲/۱۔

ترجمہ: ''حضرت ابن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا' کسی شخص کے لئے یوں کہنا بہت برا ہے کہ میں فلاں فلاں آیت بھول گیا ہوں بلکہ وہ اس طرح کہے کہ مجھے بھلا دی گئی' اور قرآن کریم یاد کرتے رہا کرو کیونکہ وہ لوگوں کے دِل سے جانوروں سے بھی جلدی نکل جاتا ہے (بخاری ومسلم) مسلم کی روایت میں لفظ بعقلها بھی ہے یعنی جو اپنی رسّی میں بندھے ہوئے ہوں''۔

تشریح: **وعن ابن مسعود قال: قال رسول الله ﷺ بئس ما لأحدهم :** ما، نکرہ موصوفہ ہے۔

ان يقول : مخصوص بالذم ہے، جیسے کہ باری تعالیٰ کا فرمان: ﴿بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ [البقرة: ۹۰] یعنی بری ہے وہ چیز جو اس آدمی کے لئے ہے۔

نسيت آية كيت و كيت، بل نسي : تشدید کے ساتھ۔ اور ایک روایت میں ہے: ''**بل هو نسي**'' کے الفاظ ہیں، اور یہ مقدار مستقل حدیث ہے۔ امام احمد اور بخاری ومسلم اور ترمذی اور نسائی نے اس کو روایت کیا ہے، اور یہ تلقین اور تعلیم دی جارہی ہے کہ آدمی یہ کہے' مجھے بھلادی گئی نہ کہ میں بھول گیا۔ جیسا کہ صحیحین میں وارد ہے: ''**لا يقل احدكم نسيت آية كذا بل هو نسي**''.

تم میں سے کوئی بھی یہ نہ کہے میں فلاں آیت بھول گیا، بلکہ اس کو بھلادی گئی''۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ وہ ''میں فلاں آیت بھول گیا'' کہنے کو ناپسند سمجھتے تھے، بلکہ کہے مجھے وہ آیت بھلادی گئی۔ پہلی میں عدم التقصیر کی سمجھ آتی ہے اور اس فعل کی طرف اشارہ ہے جو قضاء اور تقدیر کے خلاف ہے۔ اور دوسری میں بھولنے کی نسبت ترک کے معانی میں ہے، جو کہ اس کی ذات سے گناہ کا صدور ہے۔

اس ابہام کے ساتھ کہ عدم توجہ کے ساتھ، اور رہا ابن حجرؒ کا قول کہ تو یہ نہ کہہ کہ میں فلاں آیت بھول گیا، کیونکہ وہ نہیں بھولا۔ یعنی مطلق طور پر بھولنے میں اس کا کوئی عمل دخل ہی نہیں، اھ۔ اور یہ بات ان کے اطلاق کے مطابق درست نہیں ہے۔

طیبیؒ فرماتے ہیں: ان کا قول **بل نسي** یہ یاد رکھنے میں اس کی عدم کوتاہی کی طرف اشارہ ہے بلکہ اللہ نے اس کو کسی مصلحت کی وجہ

سے بھلا دیا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:﴿ما ننسخ من آية أو ننسها نأت بخير منها﴾ [البقرة:۱۰٦]اوران کا قول "نسيت" یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ انہوں نے قرآن کو اچھی طرح یاد نہیں کیا تھا۔

اور ایک دوسرے شارح فرماتے ہیں: اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے ساتھ خاص ہو۔اور آپ کے قول "نسي" کا معنی یہ ہوگا یعنی اس کی تلاوت منسوخ ہوگئی۔اور اس قول سے منع اس لئے کیا کہ قرآن کے محکمات کے ضیاع کا وہم پیدا نہ ہو۔پس ان کو بتلا دیا کہ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ہے جب اس میں حکمت دیکھی یعنی تلاوت کا منسوخ ہو جانا۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں: کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہی وہ ذات ہے جس نے اس کو کسی سبب سے بھلا دیا، چونکہ اس نے اس پر توجہ چھوڑ دی۔اس کا توجہ کو چھوڑ دینا اس کی نسیان کا سبب اور عادت بن گئی، اس کے علاوہ کوئی دوسرا سبب نہیں۔پھر فرمایا' میں نے شارحین کو دیکھا ہے کہ انہوں نے اس کو اسی طرح برقرار رکھا ہے جس طرح میں نے ذکر کیا،لیکن ہمارے ائمہ کے اقوال اس کا ردّ کرتے ہیں: انسان کے لئے مناسب نہیں کہ وہ کہے میں فلاں آیت بھول گیا۔وہ یہ کہا کرے:أنسيتها ، یاأسقطتها یعنی مجھے بھلا دی گئی، جب صحیح حدیث میں موجود ہے:"أنه سمع رجلا يقرأ بالليل' فقال يرحمه الله لقد أذكرني آية كنت اسقطتها"۔

جب رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو سنا تھا جو رات کے وقت تلاوت کر رہا تھا، تو آپ علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ اللہ اس آدمی پر رحم فرمائے اس نے مجھے وہ آیت یاد کروادی جو مجھے بھلا دی گئی تھی۔اور ایک صحیح روایت میں ہے:"كنت أنسيتها" اھ۔

اور یہ نادر اور انوکھا ردّ ہے،اور عجیب وجہ ہے۔

ابوعبیدہ کہتے ہیں: جو آدمی قرآن کے حفظ پر حریص ہو اور اس کی تلاوت میں مسلسل لگا رہے لیکن اس پر نسیان غالب آ جائے، تو اس حدیث کی دلیل کے ساتھ وہ اس حکم میں داخل نہ ہوگا۔اور کہا گیا ہے کہ نسی بمعنی عوقب بالنسيان على ذنب کہ نسی بمعنی کسی گناہ کی وجہ سے بطور سزا اس پر نسیان طاری کیا گیا۔یا غیر ذمہ داری کی وجہ سے اور یہ بھی اللہ کے اس قول سے ماخوذ ہے:﴿اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى﴾ [طٰہٰ: ۱۲٦]اور مشہور حدیث میں ہے:

"عرضت على ذنوب امتى فلم ارَاعظم ذنبا من رجل أوتى آية فنسيها'

ترجمہ:'' کہ مجھ پر میری امت کے گناہ پیش کئے گئے، میں نے اس سے بڑا کوئی گناہ نہیں دیکھا، کہ کسی آدمی کو کوئی آیت بطور علم دی گئی ہو اور وہ اس کو بھول چکا ہو''۔

پھر ہمارے علماء کے مطابق نسیان اس حالت پر محمول ہوتا ہے جو آدمی کی طاقت سے بالاتر ہو چاہے وہ حافظ ہو یا غیر حافظ ہو۔واللہ اعلم

واستذكره القرآن : یعنی دل میں اس کا استحضار (ہر وقت یاد ہو موجود ہو) کرو،اور واؤ یا استنافیہ ہے یا جملہ کا جملہ پر عطف ہے۔

طیبیؒ فرماتے ہیں: کہ "تا" مبالغہ کے لئے ہے،یعنی اپنے دلوں میں قرآن کے ذکر کو طلب کرو۔اور وہ بئس.... پر عطف ہے باعتبار معنی۔یعنی قرآن کو پختہ یاد کرنے میں سستی اور غفلت نہ برتو،اور اس کو یاد کرو۔(**فانه اشد تفصيا** : یعنی بدکنے میں۔**من صدور الرجال** : یعنی حفاظ اور مِنْ "تفصيا" : کے متعلق ہوگا۔

من النعم : نون اور عین کا فتحہ ہے جیسا کہ قاموس میں ہے،اور کبھی عین کو کسرہ بھی دیا جاتا ہے اس سے مراد اونٹ اور بکری وغیرہ ہیں یا اونٹ کے لئے خاص ہے۔جمع اس کی انعام آتی ہے۔ابن الملکؒ فرماتے ہیں: یہ چرانے والا مال ہے،اور اس کا استعمال اکثر اونٹ پر ہی ہوتا ہے۔اور یہ بھی اشدّ کے متعلق ہوگا یعنی "اشدّ من تفصى النعم المعقلة" اور رجال کا لفظ لا کر مذکر کو خاص اس لئے کیا گیا کہ قرآن کو یاد کرنے والے زیادہ تر مرد ہی ہوتے ہیں اور انہیں کی صفت ہے۔(**وزاد مسلم بعقلها** : عین اور قاف کے ضمہ کے ساتھ۔

۲۱۸۹: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ اِنَّمَا مَثَلُ صَاحِبِ الْقُرْاٰنِ كَمَثَلِ صَاحِبِ الْاِبِلِ الْمُعَقَّلَةِ اِنْ عَاهَدَ عَلَيْهَا اَمْسَكَهَا وَاِنْ اَطْلَقَهَا ذَهَبَتْ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ۷۹/۹۔ حديث رقم ۵۰۳۱۔ ومسلم فى صحيحه ۵۴۳/۱ حديث رقم (۲۲۶۔ ۷۸۹)۔ والنسائى فى السنن ۱۵٤/۲ حديث رقم ۹٤۲۔ وابن ماجه ۱۲٤۳/۲ حديث رقم ۳۷۸۳ ومالك فى الموطا ۲۰۲/۱ حديث رقم ٦ من كتاب القرآن۔ واحمد فى المسند ۱۷/۲۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حافظ قرآن کی مثال بندھے ہوئے اونٹ کے مالک کی سی ہے اگر وہ اونٹ کی خبر گیری کرتا ہے تو وہ بندھا اور رکا رہتا ہے اور اگر اسے چھوڑ دیتا ہے تو وہ جاتا رہتا ہے (اسی طرح اگر کوئی شخص قرآن کریم برابر نہ پڑھے اور یاد نہ کرتا رہے تو قرآن اس کے سینہ سے نکل جاتا ہے)۔''

(بخاری ومسلم)

تشریح: وعن ابن عمر أن رسول الله ﷺ قال انما مثل صاحب القران : اس کی عجیب صفت، عجیب حالت دلیل کے ساتھ۔

كمثل صاحب الابل المعقلة : قاف مشدد مفتوح یعنی رسیوں کے ساتھ بندھا ہوا۔

ان عاهد : یعنی ہمیشہ اس کی تلاوت کرے اور اس پر توجہ دے، حافظ قرآن اس کو یاد کرتا رہے۔

عليها أمسكها : یعنی رسیوں کے ساتھ یا اس کی مثل کوئی چیز۔

وان اطلقها : یعنی اس کو چھوڑ دے اور کھول دے۔ (ذهبت :

۲۱۹۰: وَعَنْ جُنْدُبِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِقْرَأُوا الْقُرْاٰنَ مَا ائْتَلَفَتْ عَلَيْهِ قُلُوْبُكُمْ فَاِذَا اخْتَلَفْتُمْ فَقُوْمُوْا عَنْهُ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ۱۰۱/۹۔ حديث رقم ۵۰۱۰۔ ومسلم فى صحيحه ۲۵۳/۱ حديث رقم ۲٦٦۷/۳۔ والدارمى ۵٤۳/۲ حديث رقم ۳۳٦۱۔ واحمد فى المسند ۳۱۳/٤۔

ترجمہ: ''حضرت جندب بن عبداللہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قرآن اس وقت تک پڑھو جب تک کہ تمہارے دِل کی خواہش ہو جب تمہارے خیالات منتشر ہو جائیں تو کھڑے ہو جاؤ۔'' (بخاری ومسلم)

تشریح: وعن جندب : جیم اور دال مضموم ہے، اور فتحہ بھی جائز ہے۔

ابن عبد الله قال: قال رسول الله ﷺ اقرأوا القرآن ما ائتلفت عليه قلوبكم : یعنی جب تک تمہارے دل اور تمہارے ذہن قرآن کی قراءت کی جانب مبذول رہیں، مکمل دلچسپی اور قرآن کی تلاوت کے سرور کے ساتھ، یعنی دوران تلاوت سرور حاصل ہو رہا ہو۔

فاذا اختلفتم : یعنی جب تمہارے دل مختلف ہو جائیں، اور تم اکتا جاؤ، اور تمہارے خیالات منتشر ہو جائیں اور تم سستی کا شکار ہو جاؤ۔ (فقوموا عنه : یعنی اس کو چھوڑ دو۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں: یہ زیادہ بہتر ہے کہ قرآن کی دل کی حاضری کے بغیر پڑھا جائے یا اس سے مراد یہ ہے کہ جب تک تم اس کی صحیح قرات پر اور اس کے معانی کے اسرار کی تحقیق پر متفق رہو تو پڑھتے رہو، پس جب تم اختلاف کا شکار ہو جاؤ، تو قرآن کو چھوڑ دو کیونکہ

اختلاف جھگڑے کی طرف لے جاتا ہے اور جھگڑا انکار کی طرف لے جاتا ہے، اور حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط کر دیتا ہے اللہ کریم اپنے فضل کے ساتھ ہمیں اس مصیبت سے محفوظ رکھے۔

۲۱۹۱: وَعَنْ قَتَادَةَ قَالَ سُئِلَ اَنَسٌ كَيْفَ كَانَتْ قِرَآءَةُ النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ كَانَتْ مَدًّا مَدًّا ثُمَّ قَرَأَ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ يَمُدُّ بِبِسْمِ اللّٰهِ وَيَمُدُّ بِالرَّحْمٰنِ وَيَمُدُّ بِالرَّحِيْمِ. (رواه البخاري)

اخرجه البخاري في صحيحه ۱۹/۹۔ حديث رقم ۵۰۴۶۔ وابوداؤد في السنن ۱۵۴/۲ حديث رقم ۱۴۶۵۔ والدارمي ۵۶۳ حديث رقم ۳۴۹۰۔ واحمد في المسند ۱۱۹/۳۔

ترجمہ: ''حضرت ابوقتادہؓ کہتے ہیں کہ حضرت انسؓ سے دریافت کیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کیسی ہوتی تھی؟ انہوں نے کہا کہ آپ کی قراءت مد کے ساتھ ہوتی تھی پھر انہوں نے بسم الله الرحمن الرحيم پڑھ کر بتایا کہ اس طرح بسم اللہ کو دراز کرتے تھے، رحمٰن کو دراز کرتے تھے اور رحیم کو دراز کرتے تھے۔'' (بخاری)

تشریح: **وعن قتادة**: جلیل القدر تابعی ہیں۔

قال: سئل انس: كيف كان: ایک دوسرے نسخے میں ''كيف كانت'' کے الفاظ ہیں۔

قراء ة النبي ﷺ؟: یعنی ترتیل سے پڑھتے تھے یا ٹھہر ٹھہر کر۔

فقال: یعنی انس بن مالک نے۔ **كانت**: یعنی آپ علیہ السلام کی قراءت۔

مدًّا: یعنی مد والی اور ایک نسخے میں ہے کہ مَدّآء **بالمد فعلاء تانيث أمد**، یعنی بہت زیادہ مدّوں والی اور اس سے مراد یہ ہے کہ جو بھی کلام اللہ میں حروف مد اور حروف لین ہیں، ان کو معروف مقدار کے مطابق لمبا کر کے، اور اس قاعدے کے مطابق جو قراء کے ہاں معلوم ہے۔

تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یعنی مد والی، اور بخاری میں ہے **يمدّ مدّا**. اور ایک روایت میں ہے: **كان مداً** یعنی آپ مد کیا کرتے تھے۔ اور مصابیح کے اکثر نسخوں میں **مدآء** ہے، **فعلآء** کے وزن پر۔ اور ظاہر بات یہ ہے کہ یہ تخمینہ کے قول پر ہے۔

مظہرؒ فرماتے ہیں: اس کی تفسیر اس طرح کی جائے گی کہ آپ علیہ السلام کی قراءت بہت زیادہ مد والی ہوتی تھی۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: حروف المد تین ہیں، اگر ان کے بعد ہمزہ ہو تو ایک الف کی مقدار لمبا کیا جائے گا، اور ایک قول کے مطابق دو الفوں سے لے کر پانچ (۵) الفات تک۔ اور الف کی مقدار سے مراد تیری آواز کی مقدار، جب تو تلفظ کرے گا، یَا یَاتَا کا اور اگر اس کے بعد تشدید ہو تو بالاتفاق چار الف کی مقدار لمبا کیا جائے گا۔ جیسے دآبّة، اور اگر ساکن ہو تو دو الف کی مقدار لمبا کیا جائے گا۔ جیسے صاد اور یعملو ن اور اگر ان حروف کے علاوہ کوئی اور حرف ہو اس کو صرف اس کے مخرج کے مطابق ہی لمبا کیا جائے گا۔ اور اس قاعدہ میں ہم ان کے ساتھ نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: کہ قابل اعتماد یہ ہے کہ جب حرف مد پایا جائے جو کہ مد کی شرط ہے اور وہ دو زیادتی کو واجب کر دینے والے اسباب نہیں پائے جائیں جو کہ ہمزہ اور سکون ہیں تو مدّ کے لئے ضروری ہے کہ مدّ کے مقدار الف کے برابر ہو یہ بالاتفاق ہے۔ آپ کے کہنے کے مطابق اس کے مقدار ایسے ہو سکتی ہے ''الف'' اور الف لکھنے کے برابر یا انگلی کے پورے کے برابر۔ اس کا نام طبعی، ذاتی اور اصل ہے، جب دو اسباب میں سے کوئی ایک پایا جائے تو زیادہ کرنا ضروری ہے۔ اس کا نام فرعی ہے۔ اگر سبب ہمزہ ہو تو اصل زیادتی کی مقدار میں خلاف ہے اس کی مقدار قراء کے درمیان متصل اور منفصل میں۔ مد متصل مطلق میں بالاتفاق۔ اور بعض کا منفصل میں اختلاف ہے۔ کم از کم زیادتی ایک الف اور نصف اور زیادہ سے زیادہ چار الف ہے۔ اگر سبب سکون ہو اور لازم ہو، مشدد ہو یا مخفف جیسے ''دابة'' صاد.

تمام ایک ہی نہج پر پڑھتے ہیں۔اس کی مقدار تین الف ہیں۔اگر عارض ہو جیسے **یعملون** اس میں قصر جائز ہے،اس کی مقدار الف ہے۔ توسط اس کی مقدار دو الف ہے،اور مدّ اس کی تین اقسام ہیں۔اس مسئلہ میں تفصیل ہے جو مزید مشکل کا باعث ہے۔

ثم قرأ : یعنی اس نے۔

بسم الله الرحمٰن الرحيم، يمد بسم الله : یعنی لفظ اللہ میں مد اصلی کرتے جو ایک الف کی مقدار ہے۔

ويمد بالرحمٰن : یعنی اسی طرح لفظ الرحمٰن میں الف میں۔

ويمد بالرحيم : یعنی اس کی یا میں مد اصلی یا مد عارضی۔اس قسم میں حالت وقف میں تین وجہیں جائز ہوتی ہیں،لمبا کرنا،درمیانہ اور قصر کرنا۔سکون کے ساتھ اور ایک تیسرا طریقہ قصر اور روم کے ساتھ یعنی بعض حرکات کا ہلکی پوشیدہ آواز کے ساتھ لانا۔

۲۱۹۲: **وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا اَذِنَ اللّٰهُ لِشَیْءٍ مَا اَذِنَ لِنَبِیٍّ یَتَغَنّٰی بِالْقُرْاٰنِ .** (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٦٨/٩۔ حدیث رقم ٥٠٢٣۔ ومسلم فی صحیحه ٥٤٥/١ حدیث رقم (٢٣٢۔ ٧٩٢)۔ والنسائی ١٨٠/٢ حدیث رقم ١٠١٨۔ والدارمی ٥٦٣/٢ حدیثر قم ٣٤٩٠۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' اللہ تعالیٰ جس طرح نبی ﷺ کی آواز سنتا ہے جب کہ وہ قرآن کریم کو خوش الحانی سے پڑھتے ہیں اس طرح اور کوئی آواز نہیں سنتا۔'' (بخاری ومسلم)

تشریح: **وعن أبی هريرة قال:قال رسول الله ﷺ ما أذن الله لشیء ما أذن لنبی :** پہلا ''ما'' نافیہ ہے اور دوسرا ''ما'' مصدریہ ہے،یعنی کسی چیز کی آواز کو نہیں سنا جیسے اپنے نبی کی آواز کو سنا۔یعنی محبت اور رحمت کو سننا چونکہ اللہ تعالیٰ سمع حاسہ سے منزہ ہے۔

یتغنی : یعنی خوبصورت بنائے اپنی آواز کو۔

بالقرآن : یعنی اس کی تلاوت کے ساتھ۔اور ایک قول یہ ہے کہ مصدر بمعنی **قراءة یامقروءة :** ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ قرآن سے مراد آسمانی کتابوں سے جو بھی پڑھا جائے،اور نبی کا نکرہ لانا اس پر دلالت کرتا ہے طیبیؒ کہتے ہیں: کہا جاتا ہے کہ **اذن، اذناً** :سنا۔یہاں مراد مقرب بنانا اور ثواب عطاء کرنا ہے **تغنی** سے مراد حسن صوت اور اس میں ترقیق وتحزین ہے جیسا کہ یہی امام شافعیؒ کا قول ہے،اور اکثر علماء کا بھی ہے۔

سفیان ابن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ہم مذہب جماع کا قول ہے کہ اس کا معنی لوگوں سے مستغنی ہونا ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ اس کے علاوہ احادیث اور کتابوں سے مستغنی ہونا اور ازہری فرماتے ہیں: **یتغنی به** سے مراد ہے اونچا پڑھتے۔ جیسا کہ اس پر دوسری روایت دلالت کرتی ہے اور استغنا کے ساتھ پڑھنے پر ابھارنے پر محمول کرنا لغوی اعتبار سے غلط ہے،اھ۔

لیکن لغت کے لحاظ سے **تخطئه** میں غلطی کی ہے۔نہایہ میں ہے: **رجل ربطها تغنياً** یعنی وہ لوگوں سے مانگنے سے مستغنی ہو گیا۔**من لم يغنی بالقرآن** سے مراد جو اس کے ساتھ دوسرے سے مستغنی نہ ہو۔

ایک قول یہ ہے کہ اس سے انہوں نے اس کو مراد لیا ہے جو اونچا نہیں پڑھتا۔اور ایک قول یہ ہے کہ اس کا معنی ہے خوبصورت آواز سے قراءت کرنا اور اتار چڑھاؤ کا خیال رکھنا،اور قاموس میں ہے **تغنيت استغنيت** کے معنی میں ہے،اور ابن حجرؒ فرماتے ہیں: ابن حجر کا قول لغة یعنی جو کہ امام شافعیؒ نے کہا۔اور دوسروں سے لغت کے زیادہ ماہر ہیں، بلکہ ان کے لئے مخصوص لغة ہے،اھ۔**وهو لا طائل تحته**.

پھر اس کو غریب کہا اور کہا اگر **یتغنی** کا معنی **یستغنی** ہوتا،تو کہتے: **یتغانی**۔

عیاضؒ نے کہا ہے کہ یتغنی اور یتغانی بمعنی یستغنی صحیح نہیں۔ یتغنی کا مادہ معنی کے لحاظ سے یتغانی سے مختلف ہے۔ اس کا علم نہ ہونا پر دلالت ہے، لغتاً اور لفظ و معنی کے لحاظ سے۔ واضحات میں سے ہے کہ یتقطع اور تقاطع کا مادہ ایک ہے۔ اختلاف باب میں ہے جیسا کہ اولوالالباب کے ہاں متفق علیہ ہے۔

۲۱۹۳: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا اَذِنَ اللّٰهُ لِشَیْءٍ مَّا اَذِ نَ لِنَبِیّ حَسَنِ الصَّوْتِ بِالْقُرْاٰنِ یَجْھَرُبِہٖ۔

(متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ٥١٨/١٣۔ حديث رقم ٧٥٤٤۔ ومسلم فی صحيحه ٥٤٥/١ حديث رقم (٢٣٣۔ ٧٩٢)۔ وابوداؤد فی السنن ١٥٧/٢ حديث رقم ١٤٧٣۔ والدارمی فی السنن ٤١٦/١ حديث رقم ١٤٨٨۔ واحمد فی المسند ٤٥٠/٢۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ کسی بھی چیز کو اتنی توجہ سے نہیں سنتا جتنا کہ وہ اپنے نبی کو خوش الحانی کے ساتھ بلند آواز سے قرآن پڑھتے ہوئے سنتا ہے۔'' (بخاری و مسلم)

تشریح: وعنه : یعنی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے۔

قال: قال رسول الله ﷺ ما أذن الله لشیء : یعنی ما استمع، یہ قبولیت سے کنایہ ہے۔

ما أذن لنبی حسن الصوت : صفت ہے۔

بالقرآن یجھر به : یعنی اپنی نماز میں یا اپنی تلاوت میں یا دعوت و تبلیغ کے وقت۔

۲۱۹۴: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَیْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ یَتَغَنَّ بِالْقُرْاٰنِ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحيحه ٥٠٢/١٣۔ حديث رقم ٧٥٢٧۔ وابوداؤد فی السنن ١٥٥/٢ حديث رقم ١٤٦٩۔ والدارمی ٤١٧/١ حديث رقم ١٤٩٠۔ واحمد فی المسند ١٧٢/١۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا'' جو شخص خوش الحانی سے قرآن نہیں پڑھتا وہ ہم میں سے نہیں۔'' (بخاری)

تشریح: وعنه : یعنی ابو ہریرہؓ سے۔

قال: قال رسول الله ﷺ لیس منا : یعنی باعتبار سیرت و اخلاق یا ہمارے ساتھ یا ہمارا پیروکار ہمارے مکمل طریقہ میں اتصال کی مثال اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿المنافقون والمنافقات بعضهم من بعض﴾ [التوبة: ٦٧] اور حدیث ہے لستُ من دد ولا الدد منی ،یعنی نہ میں لہو ولعب کے ساتھ ہوں اور نہ ہی لہو ولعب کا میرے ساتھ کوئی تعلق ہے۔

من لم یتغن بالقرآن : یعنی اس کے ساتھ اپنی آواز کو خوبصورت نہیں کرتا، یا اسکو اونچا نہیں پڑھتا یا اس کی وجہ سے دوسرے سے مستغنی نہیں ہوتا' یا اس کو گا کر نہیں پڑھتا یا غمگین آواز میں۔ یا اس کے ساتھ نفس کی غنا کا مطالبہ نہیں کرتا، یالم یرج به غنی الید۔ یہ سات معانی فتح الباری سے ماخوذ ہیں، وہاں سے استخراج ملا علی قاری نے کئے ہیں۔

طیبیؒ فرماتے ہیں: آپ کا قول لم یتغن کے بارے میں یہاں پر یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ استغناء کے معنی میں ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ التغنی کے معنی میں ہو۔ جب کہ یہ پچھلے کے لئے بیان نہیں ہے اور لاحق کے لئے مبین ''وضاحت کرنے والا'' نہیں ہے۔ جیسا کہ گذشتہ حدیث میں ہے۔

اور تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ نے استغناء کے معنی کو راجح قرار دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ اس کا معنی ہے کہ ہمارے طریقے والوں میں سے نہیں ہے،

اور نہ ہی ان میں سے ہے جنہوں نے ہمارے کام میں ہماری اتباع کی ہے، اور یہ وعید ہے۔ اور امت میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ کہ قرآن پڑھنے والے کو قرآن کی قراءت پر ثواب ہوتا ہے جو اپنی آواز کو تحسین نہیں بناتا، پس کیسے اس کو وعید کا مستحق ہونے پر محمول کیا جائے، حالانکہ ثواب اور اجر کا باعث ہے، اھ۔

اور طیبیؒ نے اس کا تعاقب کیا ہے۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں: مما لا يجدى نفعاً.

آپ ﷺ کا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے قراءت کا سننا

۲۱۹۵: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَهُوَ عَلَى الْمِنْبَرِ اِقْرَأْ عَلَيَّ قُلْتُ اَقْرَأُ عَلَيْكَ وَعَلَيْكَ اُنْزِلَ قَالَ اِنِّيْ اُحِبُّ اَنْ اَسْمَعَهٗ مِنْ غَيْرِيْ فَقَرَأْتُ سُوْرَةَ النِّسَاءِ حَتّٰى اَتَيْتُ اِلٰى هٰذِهِ الْاٰيَةِ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰؤُلَاءِ شَهِيْدًا قَالَ حَسْبُكَ الْاٰنَ فَالْتَفَتُّ اِلَيْهِ فَاِذَا عَيْنَاهُ تَذْرِفَانِ . (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ۹۴/۹۔ حديث رقم ۵۰۵۰۔ ومسلم فى صحيحه ۵۵۰/۱ حديث رقم (۲۴۵۔ ۷۹۹)۔ وابوداؤد فى السنن ۷۴/۴ حديث رقم ۳۶۶۸۔ والترمذى ۲۲۲/۵ حديث رقم ۳۰۲۵۔ واحمد فى المسند ۳۸۰/۱۔

ترجمہ: "حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس وقت جب کہ آپ ﷺ منبر پر تھے مجھ سے فرمایا کہ "مجھے قرآن سناؤ" میں نے عرض کیا کہ "آپ ﷺ کے سامنے میں قرآن کریم پڑھوں؟ حالانکہ قرآن کریم آپ ﷺ پر اتارا گیا ہے" آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "میں اپنے علاوہ کسی دوسرے سے سننا چاہتا ہوں!" میں نے سورۃ النساء پڑھی یہاں تک کہ جب میں اس آیت پر پہنچا: فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰؤُلَاءِ شَهِيْدًا بھلا اس دن یہود وغیرہ کا کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ بلائیں گے اور ہم آپ ﷺ کو اس امت کو گواہ بنا کر بلائیں گے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "بس رک جاؤ یعنی بس کرو۔ پھر جب میں آپ ﷺ کی طرف متوجہ ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: وعن عبد الله بن مسعود قال: قال لى : خصوصیت پر دلالت کرتا ہے۔

رسول الله ﷺ وهو على المنبر اقرأ على : تا کہ میں سن لوں۔

قلت اقرأ : یعنی میں پڑھتا ہوں۔

عليك وعليك أنزل؟ : یعنی قرآن۔ اور جملہ حالیہ ہے، یعنی حکمت کا حکیم کی زبان سے جاری ہونا زیادہ میٹھا ہے، اور محبوب کا کلام حبیب کی زبان پر زیادہ اچھا لگتا ہے۔ اور یہ اسلاف کا طریقہ ہے کہ وہ قرآن اور حدیث کو پڑھتے تھے اور طلباء کرام ان سے سنتے تھے اور وہ ان سے رغبت کے ساتھ قبول کرتے تھے۔

قال انى احب : یعنی بعض ان احوال کے بارے میں جس میں عارف کو خاموشی اچھی لگتی ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: "من عرف الله كل لسانه"۔ اور اسی سے آپ علیہ السلام کا قول "كلميني يا حمير آء"۔ اور اس کے لئے ایک دوسری حالت بھی ہے جس میں کہا جاتا ہے من عرف الله طال لسانه۔

ان اسمعه من غيرى : دو فضیلتوں کو جمع کرنے کے لئے۔ حتی کہ کہا گیا ہے کہ قرآن سننا افضل ہے، لیکن اس کو اس پر محمول کیا جائے گا کہ جب تعلیم کی غرض سے ہو۔ اسی لئے اسلاف قراء اور محدثین کرام سے اخذ علم کرتے تھے جیسا کہ وہ تلامذہ اور طلباء سے قرآن اور

حدیث کا سماع کرتے تھے اور یہ متأخرین کے فہم کی نسبت ضبط (یاد ہوئے محفوظ) کے زیادہ قریب ہے اور پہلے لوگ تو اعلیٰ مرتبہ پر تھے وہ تو سماع کے ذریعے وافر اور اعلیٰ حصہ پالیا کرتے تھے۔ اور ابن حجرؒ کا قول جو کہ انہوں نے کہا کہ **اقرأ علی وان کان أنزل علی، فانی احب**'' یہ ان کا وہم ہے کہ روایت میں ''فا'' ہے، حالانکہ ایسا بالکل نہیں بلکہ تصحیح شدہ نسخہ میں ''ف'' کے بغیر ہی ہے۔

فقراء ت سورة النسآء حتی اتیت الی هذه الآية "فكيف" : یعنی یہ کفار اور یہود اور ان کے علاوہ دیگر منکرین۔

اذا جئنا من كل امة بشهيد [النساء :۴۱] : یعنی ہم ان میں سے ان کے اعمال پر ان کے خلاف گواہ حاضر کریں گے۔ اور وہ ان کا نبی ہی ہوگا۔

وجئنابك علی هؤلاء [النساء : ٤١] : یعنی آپ کی امت کو۔ اور ابن عبد الملک نے کہا ہے کہ یعنی جھٹلانے والوں پر۔

شهيدا [النساء : ٤١] **حسبك** : یعنی جو تو نے اس قرآن کو پڑھا ہے یہ تجھے کافی ہے۔

الآن : یعنی اور کچھ نہیں پڑھنا، کیونکہ میں اس آیت میں تفکر غور وفکر کر رہا ہوں اور مجھے رونا آ گیا ہے اور رونے کی حالت سماع قرآن کے مانع ہے۔

فالتفت : یعنی آپ علیہ السلام کی طرف، جیسا کہ صحیح نسخہ میں ''الیہ'' کے الفاظ مذکور ہیں۔

فاذا عيناه تذرفان : راء کے کسرہ کے ساتھ، یعنی آنسو بہا رہی تھیں، اور ان سے آنسو جاری تھے یا تو اپنی امت پر رحمت کی وجہ سے یا اللہ تبارک وتعالیٰ کی عظمت وجلالت کے ظاہر ہونے سے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں: اس آیت کی قراءت کے وقت اسلاف کی جماعتوں نے رونا شروع کیا، اور ایک گروہ اس کے سبب سے فوت ہوگئی۔

فرماتے ہیں: کہ صحیح بات عدم انکار ہے سوائے اس کے جو اعتراف کرے کہ اس نے یہ کام بناوٹ کی غرض سے کیا۔ اور کتاب الاذکار میں فرماتے ہیں: اگر اس پر رونا مشکل ہو تو رونے کی صورت بنالی جائے، چنانچہ احمد اور بیہقی کی روایت موجود ہے کہ: ''**ان هذا القرآن نزل بحزن و كآبة فاذا قراء تموه فابكوا فان لم تبكوا فتباكوا وتغنوا به فمن لم يتغن فليس منا**''. ''یہ قرآن غم وکآبۃ کے ساتھ نازل ہوا، جب اس کو پڑھو تو روؤ، اگر رو نہ سکو تو رونے کی ہیئت بنالو، اور اس کو ترنم کے ساتھ پڑھو، جو قرآن کو اچھی آواز سے نہیں پڑھتا، وہ ہم میں سے نہیں''۔

آپ ﷺ کا حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کے سامنے قرآن پڑھنا

۲۱۹۶: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِاُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ اِنَّ اللّٰهَ اَمَرَنِيْ اَنْ اَقْرَاَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ قَالَ آللّٰهُ سَمَّانِيْ لَكَ قَالَ نَعَمْ قَالَ وَقَدْ ذُكِرْتُ عِنْدَ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ قَالَ نَعَمْ فَذَرَفَتْ عَيْنَاهُ وَفِيْ رِوَايَةٍ اِنَّ اللّٰهَ اَمَرَنِيْ اَنْ اَقْرَأَ عَلَيْكَ لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قَالَ وَسَمَّانِيْ قَالَ نَعَمْ فَبَكٰى۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۷۲۵/۸۔ حدیث رقم ۴۹۶۰۔ واحمد فی المسند ۲۱۸/۳۔

ترجمہ: ''حضرت انسؓ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابی بن کعبؓ سے ارشاد فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم فرمایا ہے کہ میں تمہیں قرآن سناؤں؟ حضرت ابیؓ نے عرض کیا کہ'' کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کے سامنے میرا نام لیا ہے' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''ہاں! حضرت ابیؓ نے کہا کہ' دونوں جہاں کے پروردگار کے پاس میرا ذکر کیا گیا؟'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہاں حضرت ابیؓ کی دونوں آنکھوں سے (خوشی کے) آنسو بہنے لگے۔ ایک روایت میں یوں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابیؓ سے ارشاد فرمایا کہ'' مجھے اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ

میں تمہارے سامنے سورۂ لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا پڑھوں" حضرت ابی نے عرض کیا کہ "اللہ تعالیٰ نے میرا نام لیا ہے؟" آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "ہاں؟" حضرت ابیؓ رونے لگے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: **وعن أنس قال: قال رسول اللّٰہ ﷺ لابی بن کعب ان اللّٰہ أمرنی أن أقرأ علیك القرآن** : یعنی باقی صحابہ میں سے خصوصی طور پر۔

قال آللّٰہ : دو ہمزوں کے ساتھ، پہلا ہمزہ برائے استفہام اور دوسرے کو الف سے بدل دیا گیا، ہمزہ استفہام کو باقی رکھنے کی غرض سے، اور اس کو تسہیل کے ساتھ پڑھنا جائز ہے۔ اور اس کا حذف بھی جائز ہے۔ اس کے معلوم ہونے کی وجہ سے یہ معنی طیبیؒ کے قول کا ہے۔ "آللّٰہ" مدّ کے ساتھ بغیر حذف کے اور اللّٰہ مدّ کے بغیر حذف کی صورت میں۔

سمانی لك : یعنی آپ کے سامنے میرا نام ذکر کیا ہے۔

اور اس سے مقصود تعجب ہے یا تو اپنے آپ کو حقیر سمجھتے ہوئے، یعنی میرے لائق یہ مقام کیسے ہو سکتا ہے؟ یا اس عالی شان مرتبہ کی خوشی محسوس کرتے ہوئے۔

قال نعم وقد ذکرت : یعنی میرے لئے یہ اور حال "قد ذکرت" خصوص کی وجہ سے یا اس وجہ مخصوص کے ساتھ۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ کلمہ تعجب کے لئے ہے۔

عندب العالمین : یعنی اللہ کی عظمت کے اور میری حقیر ذات کے باوجود۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: کہ "عند" یہاں پر ذات اور اس کی عظمت سے کنایہ ہے اور زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ یہ اس کے تقرب اور رحمت کی زیادتی سے کنایہ ہے۔

قال نعم فذرفت عیناہ : یعنی ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ یعنی قراءت کا حکم دینے میں اللہ رب العالمین کا خاص انہی کا نام لینے کی خوشی ومسرت کی وجہ سے یا پھر اللہ کی اس عظیم نعمت کا شکر یہ بجا لانے کی عاجزی کے خوف سے اور ابی بن کعب کو اس کے ساتھ خاص کرنے کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ انہوں نے قرآن کریم کے حفظ کرنے میں اپنی پوری کوشش صرف کر دی اور یہ انہیں کے لائق تھا، حتی کہ آپ علیہ السلام نے فرمایا: "تم میں سے زیادہ قرآن پڑھنے کے لحاظ سے ابی بن کعب ہیں"۔ اور جب ان کے لئے امامت کو مقدر کر دیا گیا اس حالت میں۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ السلام کو حکم دیا کہ ابی پر تلاوت کریں، تا کہ ان سے رسم التلاوۃ کو اخذ کریں۔ جس طرح اللہ کے نبی علیہ السلام نے قرآن جبرئیل علیہ السلام سے پڑھا۔ پھر اسی طرح ہر بعد والا اپنے سے پہلے والے سے کسب علم القرآن کرتا رہا اور بعد والے پہلے والوں سے اور ابی بن کعب سے بہت سے تابعین نے قرآن سیکھا پھر ان سے تبع تابعین نے اور اسی طرح۔

وفی روایۃ: ان اللّٰہ أمر فی أن اقرأ علیك ﴿لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا﴾ [البینۃ : ۱] کہا جاتا ہے کہ اس میں اہل کتاب کا واقعہ ہے۔ اور ابی بن کعب یہودی علماء میں سے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارادہ بنا کہ ابی یہود کی حالت کو جان لیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا خاص انہی کو خطاب کرنا اس لئے تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ پر اور رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر ایمان کا مضبوطی سے اقرار کر لیں، پھر یہ احتمال بھی ہوتا ہے کہ یہ روایت قرآن کے لئے پہلی روایت میں وضاحت کرنے والی ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ کوئی دوسرا قصہ ہو۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے کئی مسائل مستنبط ہوتے ہیں ان میں سے چند ایک یہ ہیں کہ ماہر قرآن پر اور اہل علم پر قراءت کا استحباب اور یہ کہ اگرچہ قاری مقروءٌ علیہ (جس پر پڑھا جا رہا ہو) سے افضل ہو اور ایک فائدہ یہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ ابی بن کعب کا ایک عالی شان مرتبہ بھی واضح ہوتا ہے اور ہم اس مرتبہ میں ان کا ہمسر نہیں جانتے۔

اور رہا مسئلہ لم یکن کی تخصیص کا وہ اس لئے ہے کہ یہ سورت اصول الدین کے بہت سے قواعد اور وعدوں اور وعیدوں کے اہم

موضوعات پر مشتمل ہے اور اسی طرح اس میں اخلاص اور دلوں کی تطہیر کا ذکر بھی ہے، اور وقت اختصار کا تقاضا کرتا ہے اور حدیث سے یہ دلیل بھی ثابت ہوتی ہے کہ جو کہ علماء کہتے ہیں، قرآن کا اطلاق کل پر بھی کیا جا سکتا ہے، اور جزو پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ جب کہ اس طرح کی کوئی بات نہیں معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابی بن کعب پر مکمل قرآن پڑھا ہو۔ (قال وسماني؟ : یعنی لك کے الفاظ بھی ہیں جیسا کہ ایک دوسرے نسخہ میں بھی موجود ہے۔ (قال نعم فبكى :

۲۱۹۷: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَنْ يُّسَافَرَ بِا لْقُرْاٰنِ اِلٰى اَرْضِ الْعَدُوِّ . متفق عليه. وفى رواية لمسلم لَا تُسَا فِرُوْا بِا لْقُرْاٰنِ فَاِنِّى لَا اٰمَنُ اَنْ يَّنَا لَهُ الْعَدُوُّ۔

اخرجه البخارى فى صحيحه ١٣٣/٦ ـ حديث رقم ٢٩٩٠ ـ ومسلم فى صحيحه ١٤٩٠/٣ حديث رقم (٩٢ ـ ١٨٦٩)۔ وابو دائود فى السنن ٨٢/٣ حديث رقم ٢٦١٠ ـ وابن ماجه ٩٦١/٢ حديث رقم ٢٨٧٩ ـ واحمد فى المسند ٦/٢۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے دشمن ملک (یعنی دارالحرب) کی طرف قرآن لے کر سفر کرنے سے منع فرمایا ہے (بخاری و مسلم) اور مسلم کی ایک روایت میں یوں ہے کہ فرمایا' قرآن لے کر سفر نہ کرو اس لئے کہ مجھے یہ اطمینان نہیں ہے کہ دشمن (یعنی کافر) اسے چھین لے۔''

تشریح: وعن ابن عمر قال نهى رسول الله ﷺ أن يسافر : فاء کے فتحہ کے ساتھ، یعنی کوئی بھی سفر کرے۔

بالقرآن : یعنی وہ صفحات جن پر قرآن درج ہو۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: باء زائدہ ہے کیونکہ یہ مفعول بہ پر داخل ہوئی ہے، جو کہ نائب الفاعل ہے اور یہ اس طرح نہیں ہے جیسا کہ آپ کا قول ''لا تسافروا بالقرآن'' یہ حال ہے یعنی اس حال میں کہ تم اس کو لئے ہوئے ہو۔ ''حال كونكم وصاحبين له''۔

الى أرض العدو : یعنی دارالحرب۔ ایک قول یہ ہے کہ آپ علیہ السلام کا اس سے منع کرنا اس وجہ سے ہے کہ مکمل قرآن تمام صحابہ کے پاس محفوظ تھا۔ پس اگر کچھ صحابہ دشمن کے علاقے کی طرف چلے جاتے اس سمیت جو ان کے پاس قرآن کا کچھ نہ کچھ حصہ ہے، اور وہ وہیں فوت ہو جاتے، تو اتنی مقدار قرآن کی ضائع ہو جاتی، اور اس کنایہ کی طرف اس لئے گئے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے دور میں قرآن نسخہ کی صورت میں تھا ہی نہیں۔

طیبیؒ فرماتے ہیں: کیوں نہیں جائز کہ قرآن سے مراد بعض آیات ہیں جو منسوخ ہو گئیں اور آپ کے عہد ہی میں لکھی گئیں یا غیب کے بارے میں خیر دنیا ہے، اور بعض نے کہا ہے کہ مصحف کو دار کفر میں لے کر جانا مکروہ ہے، اور اگر کفار کی طرف کوئی خط وغیرہ لکھا جائے اور اس میں کوئی آیت ذکر کی جائے، تو اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ علیہ السلام نے ہرقل کی طرف جو خط لکھا تھا، اس میں یہ آیت بھی تھی: ﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ م بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ط فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴾ [آل عمران: ٦٤] ''کہہ دو کہ اے اہل کتاب جو بات ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں (تسلیم کی گئی ہے) اس کی طرف آ ؤ وہ یہ کہ خدا کے سوا ہم کسی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے سوا کسی کو کارساز نہ سمجھیں اگر یہ لوگ (اس بات کو) نہ مانیں تو (ان سے) کہہ دو کہ تم گواہ رہو کہ ہم (خدا کے) فرمانبردار ہیں''۔

اور ظاہر ہے کہ یہ آپ علیہ السلام کی خصوصیات سے ہے لیکن آپ علیہ السلام کو آیت کے شروع ''قل'' کے ساتھ حکم دیا گیا ہے آپ پر تبلیغ کے فرض ہونے کے لئے، لیکن یہ بھی کہا جاتا ہے: کہ قوم میں شیخ اپنی امت میں نبی کی طرح ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ علماء اور امراء

آیت اوراس کی مثال لکھا کریں۔ جس طرح کہ جگہ اور حال تقاضا کرتے ہیں، تاکہ آخرت میں ان پر حجت پوری ہو جائے۔ اور بعض نے حدیث میں اضافہ کیا ہے "**مخافة أن يناله العدو**" کہ کہیں دشمن کے ہاتھ نہ چڑھ جائے۔

اوراس کو نبی ﷺ کے لفظ سے شمار کیا ہے، لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے، بلکہ یہ تو امام مالک علیہ الرحمہ کا قول ہے،

وفي رواية لمسلم: لا تسافروا بالقرآن فاني لا آمن : یعنی میں امن نہیں محسوس کرتا۔

من أن يناله العدو : یعنی کافر اس کو پالے گا۔ پھر اس کو جلا دے گا یا اس کو حقیر سمجھے گا، یا اس کو کسی نامناسب جگہ میں پھینک دے یا تمہیں واپس نہ کرے کہیں ضائع ہی نہ ہو جائے۔

ابن حجرؒ نے جو کہا وہ صحیح نہیں ہے، کہ اس میں بہت بلیغ ردّ ہے جس کا شارح نے دعویٰ کیا ہے کہ نہی صرف آپ علیہ السلام کے زمانے تک ہی خاص تھی کیونکہ اس وقت قرآن صحابہ کے پاس متفرق اوراق میں لکھا ہوا تھا۔ اگر اس قرآن سے کچھ بھی ضائع ہو جاتا، تو اس کا عوض نہیں ہو سکتا تھا، اھ۔

کیونکہ اس کے لئے علت بھی شامل مشترک ہے جیسا کہ مخفی نہیں ہے۔

عرضِ مرتب:

اس کا جواب یہ ہے اگرچہ تمام قرآن مصحف میں نہیں لکھا گیا تھا۔ لیکن جو کچھ نازل ہوتا تھا ہر کوئی اپنے لئے صحیفے میں لکھ کر رکھ لیتا یا آپ ﷺ نے غیب کی خبر دی کہ میرے زمانے کے بعد جو کچھ لکھا جائے گا اس کو کفار کے ملک میں لے کر نہ جانا اور بعض علماء نے کہا ہے کہ کلام اللہ دارالکفر کی طرف لے جانا مکروہ ہے اور اگر کوئی کفار کو خط بھیجے اور اس میں آیت لکھے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے اس لیے کہ حضور ﷺ نے ہرقل کے خط میں یہ آیت لکھی تھی: ﴿قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴾ (آل عمران: ٦٤) "کہہ دو کہ اے اہل کتاب جو بات ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں (تسلیم کی گئی ہے) اس کی طرف آؤ وہ یہ کہ خدا کے سوا ہم کسی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے سوا کسی کو کارساز نہ سمجھیں اگر یہ لوگ (اس بات کو) نہ مانیں تو (ان سے) کہہ دو کہ تم گواہ رہو کہ ہم (خدا کے) فرمانبردار ہیں"۔ واللہ اعلم۔

الفصل الثانی:

فقراء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے خوشخبری

۲۱۹۸: وَعَنْ اَبِىْ سَعِيْدِ نِالْخُدْرِيِّ قَالَ جَلَسْتُ فِىْ عِصَابَةٍ مِّنْ ضُعَفَاءِ الْمُهَاجِرِيْنَ وَاِنَّ بَعْضَهُمْ لَيَسْتَتِرُ بِبَعْضٍ مِّنَ الْعُرْىِ وَقَارِئٌ يَقْرَأُ عَلَيْنَا اِذْ جَاءَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَقَامَ عَلَيْنَا فَلَمَّا قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ سَكَتَ الْقَارِئُ فَسَلَّمَ ثُمَّ قَالَ مَا كُنْتُمْ تَصْنَعُوْنَ قُلْنَا كُنَّا نَسْتَمِعُ اِلٰى كِتَابِ اللّٰهِ فَقَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ جَعَلَ مِنْ اُمَّتِىْ مَنْ اُمِرْتُ اَنْ اَصْبِرَ نَفْسِىْ مَعَهُمْ قَالَ فَجَلَسَ وَسْطَنَا لِيَعْدِلَ بِنَفْسِهٖ فِيْنَا ثُمَّ قَالَ بِيَدِهٖ هٰكَذَا فَتَحَلَّقُوْا وَبَرَزَتْ وُجُوْهُهُمْ لَهٗ فَقَالَ اَبْشِرُوْا يَا مَعْشَرَ صَعَالِيْكَ الْمُهَاجِرِيْنَ بِالنُّوْرِ التَّامِّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ قَبْلَ اَغْنِيَاءِ النَّاسِ بِنِصْفِ يَوْمٍ وَذٰلِكَ خَمْسُ مِائَةِ سَنَةٍ۔ (رواه ابوداود)

اخرجه ابوداؤد فى السنن ٧٢/٤ حديث رقم ٣٦٦٦۔ واحمد فى المسند ٦٣/٣۔

ترجمہ:''حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ میں غرباء مہاجرین کی ایک کمزور جماعت کے درمیان بیٹھا تھا ان میں سے کچھ ننگے بدن ہونے کی وجہ سے اپنے ساتھیوں کے پیچھے چھپے ہوئے تھے اور قاری ہمارے سامنے قرآن پڑھ رہا تھا کہ اچانک رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور ہمارے پاس کھڑے ہو گئے' پڑھنے والے نے جب آپ ﷺ کو کھڑے ہوئے دیکھا تو وہ چپ ہو گیا اس وقت آپ نے ہمیں سلام کیا اور ارشاد فرمایا کہ ''تم لوگ کیا کر رہے ہو'' ہم نے عرض کیا کہ ہم کتاب اللہ سن رہے ہیں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''تمام تعریفیں اس خدا کے لئے ہیں جس نے میری امت میں وہ لوگ پیدا کئے ہیں جن کے بارے میں مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ان کے ساتھ بیٹھوں'' راویؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ ہمارے درمیان بیٹھ گئے تا کہ آپ ﷺ کی ذات اقدس کا تعلق ہمارے سب کے ساتھ یکساں رہے پھر آپ ﷺ نے اپنی انگلی سے اس طرح اشارہ کیا کہ سب لوگ حلقہ بنا کر بیٹھ گئے اور ان سب کے چہرے آپ کی طرف ہو گئے' اس کے بعد آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اے مہاجرین فقراء جماعت تمہیں قیامت کے دن بھرپور نور کی خوشخبری حاصل ہو اور تم مالدار لوگوں سے آدھے دن پہلے جنت میں داخل ہوں گے اور یہ آدھا دن پانچ سو برس کے برابر ہوگا۔'' (ابوداؤد)

تشریح: **وعن ابی سعید الخدری قال جلست فی عصابة** : عین کے کسرہ کے ساتھ یعنی جماعت، گروہ۔

من ضعفاء المهاجرین : یعنی اصحاب صفہ میں سے۔

وان بعضهم لیستتر ببعض من العریٰ : یعنی عُریٰ ،عین کے ضمہ اور راء ساکنہ کے ساتھ یعنی جس کا کپڑا اس کے ساتھی سے کم تھا، وہ اپنے ساتھی کے پیچھے چھپ کر بیٹھتا تھا، اور جملہ حالیہ ہے، عریٰ ننگے ہونے سے مراد ستر سے علاوہ جسم ہے۔ ستر وہ جگہ ہے جس کو کھولنے کی اجازت نہیں، جس کو عادتاً کھولا نہیں جاتا۔

وقاریء یقرأ علینا : یہ جملہ بھی حالیہ ہے، تاکہ ہم سنیں اور سیکھیں۔

اذ جاء رسول الله ﷺ : اذ، مفاجائیہ ہے، مفاجات کے لئے آیا ہے اچانک کا معنی دیتا ہے۔

فقام : ٹھہر گئے، رک گئے۔

علینا : یعنی ہمارے سروں پر یعنی کہ ہم آپ علیہ السلام کی آمد سے بے خبر تھے، ہم نے دیکھا کہ اچانک آپ ہمارے سروں پر آ کھڑے ہیں اور قرآن کریم کو غور سے سماعت فرما رہے ہیں۔

فلما قام رسول الله ﷺ سکت القاریٔ : یعنی آپ کی موجودگی کا ادب واحترام کرتے ہوئے اور آپ کے کسی حکم کا انتظار کرتے ہوئے۔

فسلّم : یعنی رسول اللہ نے سلام کیا۔ **ثم قال** : یعنی نبی علیہ السلام نے فرمایا۔

ما کنتم تصنعون؟ : آپ علیہ السلام کے سوال کرنے کا مقصد باوجود ان کے بارے علم ہونے کے یہ تھا تا کہ انہیں جواب دیں' جو ان کی حالت پر مرتب ہوگا۔

قلنا: کنا نستمع الی کتاب الله : یعنی قرآن کی قراءت کی طرف دھیان لگائے ہوئے تھے یا اس کے پڑھنے والے کی طرف۔

فقال: الحمد لله الذی جعل من امتی من امرت أن اصبر نفسی معهم : یعنی جس ذات نے ان کو فقراء میں سے بنایا' قرآن کے ساتھ چمٹے رہنے والے اور خلوص نیت والے اللہ تبارک وتعالیٰ پر توکل کرنے والے اللہ کے دربار میں مقرب اس وجہ سے اللہ

نے ان کے ساتھ ٹھہرنے کا مجھے حکم دیا ہے اپنے اس فرمان میں ﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ﴾ [الكهف: ۲۸] ''اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ ٹھہرائیے جو اپنے ربّ کو صبح وشام پکارتے ہیں، اس کی رضا وخوشنودی کو چاہتے ہیں''۔ ان کے اعمال کی تعریف کرتے ہوئے اور کفار پر ردّ کرتے ہوئے جب کہ انہوں نے کہا تھا کہ ان فقراء ومساکین لوگوں کو اپنے پاس سے بھگادو، تاکہ ہم آپ کی مجلس میں بیٹھیں اور آپ پر ایمان لے آئیں۔

اور ابن حجرؒ کا قول **فملت الی ما قولوا**: مردود ہے کیونکہ یہ ابن حجر کے علاوہ کسی اور کی طرف سے منقول نہیں ہے، اور نہ ہی آپ ﷺ سے وارد ہے۔ بلکہ اگر وارد ہوتا، تو ہم اس کو ''**أني قاربت أن ...... اليهم**'' پر محمول کریں گے۔

واصبر : کیونکہ اس سے مراد ہمیشگی ہے، جیسا کہ یہ کمال صبر ہے۔ جیسا کہ رب رحمان کے اس قول کے بارے میں کہا گیا جو کہ یہ ہے: ﴿**يا ايها النبي اتق الله**﴾ [الاحزاب: ۱] **قال** : یعنی راوی فرماتے ہیں۔

فجلس : یعنی نبی علیہ السلام بیٹھ گئے۔

وسطنا : سین ساکن کے ساتھ اور کبھی سین کو فتحہ بھی دیا جاتا ہے، یعنی ہمارے درمیان نہ کہ ہم میں سے صرف کسی ایک کے پہلو میں بیٹھے۔

ليعدل بنفسه فينا : یعنی ہمارے درمیان بیٹھنے میں بھی انصاف کو ملحوظ خاطر رکھا یعنی ہر ایک کے قریب تھے، سب کا فاصلہ برابر تھا۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: تاکہ اپنے آپ کو عدیل بنائیں۔ بعض نے یہ الفاظ زیادہ کیے ہیں کہ اِس ان کے بیٹھنے میں تواضع ہے اور رغبت کرتے ہوئے اس میں جس پر ہم ہیں۔

ثم قال : یعنی اشارہ فرمایا۔

بيده هكذا : یعنی دائرے کی شکل میں بیٹھو۔

فتحلقوا : یعنی دائرے کی شکل میں اپنے اپنے چہرے رسول اللہ کی طرف موڑ کر اس پر آپ کا یہ قول دلالت کرتا ہے۔

وبرزت : یعنی سامنے ہوگئے۔

وجوههم : آپ علیہ السلام کی طرف' کہ ان میں سے ہر ایک کا چہرہ آپؐ دیکھ سکیں۔ اللہ کے اس قول کے ساتھ مطابقت رکھتے ہوئے: ﴿**ولا تعد عيناك عنهم**﴾ [الكهف: ۲۸] یعنی ظاہری اور باطنی۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: یعنی ان کی ظاہری رنگ وروغن کو دیکھ کر مائل ہونا، یہاں تک کہ اس حلقہ میں شامل ہوجائے

اور یہ بات دلیل کی محتاج ہے باوجود اس کے کہ آپ اس سے مستغنی تھے۔

فقال ابشروا : یعنی خوش ہوجاؤ۔

يا معشر صعاليك المهاجرين : یعنی مہاجرین فقراء کی جماعت۔ **صعاليك صعلوك** کی جمع ہے۔

بالنور التام : یعنی کامل ومکمل نور۔

يوم القيامة : اور اس میں اس بات کی طرف اشارہ بھی ہے کہ اغنیاء لوگوں کا نور تام ومکمل نہیں ہوگا، اور اسی لئے آپ علیہ السلام نے فرمایا: ''**من أحب آخرته اضرّ بدنياه ومن أحب دنياه أضر بآخرته فآثر ما يبقى على ما يغنى**''. پس باقی رہنے والی چیز کو فنا ہونے والی چیز پر ترجیح دو۔

تدخلون الجنة : جملہ استنافیہ ہے لیکن اس میں تعلیل کا معنی ہے۔

قبل اغنياء الناس : یعنی شکرگزار لوگوں سے۔

بنصف يوم : جان لو! کہ فقراء سے مراد صبر کرنے والے صلحا ہیں، اور اغنیاء سے مراد شکرگزار صلحا لوگ ہیں جو اپنے اموال کے حقوق کو ادا کرتے ہیں، یعنی اپنے حلال مالوں سے جو اللہ نے ان کے لئے حلال قرار دیا ہے، یہ حساب کی غرض سے میدانِ محشر میں ٹھہریں گے ان سے مال کے بارے پوچھا جائے گا، کہ کہاں سے حاصل کیا اور کہاں پر خرچ کیا؟ اور یہ بات اس پر دلالت کرتی ہے کہ قیامت کو فقراء کا حصہ اغنیاء سے زیادہ ہوگا۔ کیونکہ اہل ثروت نے دنیا میں لذت و راحت بھی پائی تھی اور اس لئے ان کا مقام جنت میں اعلی وارفع ہوگا، کیونکہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: "**أجوعكم في الدنيا أشبعكم في الآخرة**". دنیا میں تم سے سب سے زیادہ فاقہ کاٹنے والا آخرت میں تم میں سے سب سے زیادہ سیر ہوگا۔ اور یہ حدیث اس بات پر بطور نص ہے، کہ صبر کرنے والا فقیر، شکرگزار مالدار سے افضل ہے۔

وذالك : یعنی قیامت کا آدھا دن۔ **خمسمائة سنة** : اللہ تعالیٰ کے اس قول: ﴿وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ﴾ [الحج: ٤٧] اور تمہارے ربّ کے ہاں ایک دن تمہاری گنتی کے مطابق ہزار سال کے برابر ہے"۔ اور شاید کہ یہ مقدار اور اندازہ عام مؤمنین کی بہ نسبت ہو اور بعض مؤمنوں پر اللہ اس وقت کو بالکل کم کر دے گا، جو خاص لوگ ہیں ان کے لئے ایک نماز کے وقت کے برابر یا ایک گھڑی کے برابر اور یہ بات بھی وارد ہے کہ یہ دن بعض مؤمنین پر فجر کی دو رکعتوں کے برابر ہوگا۔ اور اللہ کے اس قول ﴿واحسن مقيلاً﴾ کہ اس کے برابر یہ دن لمبا ہوگا بعض مؤمنوں پر وہ تقریباً فجر سے زوال تک ہوگا، اور یہ آخرت کے ایک ہزار سال لمبے دن کا آدھا دن ہوگا۔ اللہ عزوجل کے اس قول سے مراد "کہ تیرے ربّ کے ہاں ایک دن تمہاری گنتی کے مطابق ہزار سال کا ہے"۔ اور رہا باری تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ﴾ [المعارج: ٤] کہ اس دن کا اندازہ پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔ تو یہ کافروں کے لئے مخصوص ہے، اور یہ دن کافروں پر آسان نہیں بلکہ بہت بھاری اور گراں گزرے گا۔

۲۱۹۹: وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ زَيِّنُوا الْقُرْاٰنَ بِاَصْوَاتِكُمْ .

(رواه احمد وابوداود وابن ماجة والدارمى)

اخرجه ابوداؤد فى السنن ١٥٥/٢ ـ حديث رقم ١٤٦٨ ـ والنسائى ١٧٩/٢ حديث رقم ١٠١٥ وابن ماجه ٤٢٦/١ ـ حديث رقم ١٣٤٢ ـ والدارمى ٥٦٥ حديث رقم ٣٥٠٠ ـ واحمد فى المسند ٢٨٥/٤ ـ

ترجمہ: "حضرت براء ابن عازبؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قرآن کریم کو اپنی آوازوں سے مزین کرو (یعنی زینت بخشو)۔" (احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی)

تشریح: **وعن البراء ابن عازب قال: قال رسول الله ﷺ زينوا القرآن** : یعنی اس کی قراءت کو۔

بأصواتكم : یعنی اچھی آوازوں کے ساتھ، یا قرآن کی زینت وخوبصورتی کو اپنی آواز کے اچھا کرنے کے ساتھ واضح کرو۔ قاضیؒ فرماتے ہیں: اس کے قلب کے بارے میں بھی ایک قول ہے اس پر یہ بات دلالت کرتی ہے کہ حضرت براء بن عازب سے اس کے برعکس روایت بھی مروی ہے، اور ایک قول یہ بھی ہے کہ تزئین سے مراد ترتیل، تجوید اور آواز کا نرم رکھنا اور اس کی تحزین ہے اور "تغنی" جو حاصل ہوتی ہے حروف میں زیادتی یا کمی ہو یہ حرام ہے، پڑھنے والا بھی گنہگار ہوگا اور سننے والا بھی موجب سزا ہوگا۔ اور اس کا انکار واجب ہے کیونکہ یہ بدترین بدعت اور انتہائی فحش بدعت ہے۔

اور نسائی نے بھی یہ حدیث روایت کی ہے اور ابن حبان اور حاکم نے بھی، اور حاکم نے ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے:

"**فان الصوت الحسن يزيد القرآن حسناً**" کہ اچھی آواز قرآن کے حسن کو دوبالا کر دیتی ہے۔

اور طبرانی نے روایت کیا ہے کہ "**حسن الصوت زينة القرآن**" کہ آواز کا خوبصورت ہونا قرآن کی زینت ہے۔
اور عبدالرزاق نے روایت کیا ہے: "**لكل شى حلية وحلية القرآن الصوت الحسن**"
کہ ہر چیز کا گہنا (زیور) ہوتا ہے اور قرآن کا زیور اچھی آواز ہے۔
یعنی جس طرح زیورات وغیرہ حسینہ کے حسن کو بڑھا دیتے ہیں، اسی طرح اچھی آواز سے قرآن کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ اور یہ بات تجربہ شدہ ہے۔ پس یہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس کے برعکس جو روایت ہے اس کو قلب پر محمول کیا جائے گا نہ کہ اس کے برعکس پر، پس غور وفکر کرو اور دونوں کو جمع بھی کر سکتے ہیں۔
اور بالتحقیق ہمارے سردار اور ہمارے پیشوا مولانا القطب الربانی غوث صمدانی، الشیخ عبدالقادر جیلانی روح اللہ روحہ ورزقنا فتوحہ اپنی کتاب **غنية الطالبين** جو کہ سالکین کے بارے میں ہے، میں رقمطراز ہیں کہ وہ روایت کرتے ہیں عبداللہ بن مسعود سے کہ وہ ایک دن کوفہ کے مضافات میں سے ایک جگہ سے گزرے اچانک کیا دیکھتے کہ کچھ بدکار، نافرمان قسم کے لوگ ان میں سے ایک آدمی کے گھر میں جمع تھے اور شراب پی رہے تھے اور ان کے ساتھ ایک گلوکار تھا، جس کو "زاذان" کہا جاتا تھا وہ سارنگی بجارہا تھا اور خوبصورت آواز میں گا رہا تھا۔ جب عبداللہ بن مسعودؓ نے اس کی آواز سنی تو کہا کہ اس کی آواز کتنی پیاری ہے اگر یہ اس پیاری آواز کے ساتھ قرآن کی تلاوت کرتا تو کتنا اچھا ہوتا؟ اور انہوں نے اپنی چادر اپنے سر پر ڈالی اور چل پڑے۔
ادھر زاذان نے جب یہ بات سنی تو کہا کہ یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا عبداللہ بن مسعودؓ صحابی رسولؐ تھے، کہنے لگا' کیا کہہ رہے تھے؟ لوگوں نے بتایا کہ وہ کہہ رہے تھے کہ اس نوجوان کی آواز کتنی سریلی اور پیاری ہے اگر یہ اس آواز میں قرآن کی تلاوت کرتا، تو کتنا بہتر تھا؟ اس کے دل میں خوف خدا طاری ہوا اور وہ اٹھا سارنگی کو زمین پر پٹخ دیا' وہ ٹوٹ گئی پھر چلا اور عبداللہ بن مسعودؓ کو پالیا، اس نے چادر کو اپنی گردن میں ڈال دیا اور عبداللہ بن مسعودؓ کے سامنے زار وقطار رونے لگا۔ عبداللہ بن مسعودؓ نے اسے گردن سے اتار دیا اور وہ دونوں رونا شروع ہو گئے۔ پھر عبداللہ بن مسعودؓ کہنے لگے، میں اس آدمی سے کیوں نہ محبت کروں جس سے اللہ محبت کرتا ہے، اس کے سارنگی وغیرہ بجانے سے توبہ کر لی اور عبداللہ بن مسعودؓ کا ہم سفر ہو گیا۔ حتی کہ اس نے قرآن سیکھا اور علم کا ایک بڑا حصہ سیکھا' بڑی مقدار میں علم حاصل کیا۔ حتی کہ وہ علم میں امام بن گیا۔
اور صحیح روایت موجود ہے کہ آپ ﷺ نے ابوموسیٰ اشعریؓ کو فرمایا: "**لقد أوتيت مزماراً من مز امير آل داوٗد.**"
اور آپ علیہ السلام نے فرمایا: "**لقد رأيتنى وأنا أستمع لقراء تك البارحة**". میں نے تمہیں خواب میں دیکھا کہ میں گذشتہ رات تمہاری تلاوت سن رہا تھا"۔
اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے: "**لله اشد اذناً**" یعنی **اقبالا الى الرجل الحسن الصورت بالقراء ة من اصحاب القينة الى قينتهم**".
اور طبرانی نے روایت کیا ہے: "**أحسن الناس قراء ة من قرأ القرآن يتحزن فيه**". "قراءت کے لحاظ سے لوگوں میں سے سب سے بہترین وہ ہے جو قرآن کو پڑھتا ہے اور اس میں اس کو حزن بھی لاحق ہوتا ہے"۔
اور ابویعلیٰ نے روایت نقل کی ہے: "**اِقرؤوا القرآن بالحزن فانه نزل بالحزن**". "کہ قرآن کو تحزین کے ساتھ پڑھو کیونکہ یہ تحزین کے ساتھ نازل ہوا ہے"۔
اور وہ حاکم کی اس حدیث کی نفی نہیں کرتی جس میں آپ علیہ السلام نے فرمایا: "**نزل القرآن بالتفخيم**". "کہ قرآن تفخیم کے

ساتھ نازل ہوا ہے''۔ کیونکہ تفخیم بمعنی تعظیم ہے، اور رہا ابن حجرؒ کا قول ''کہ تفخیم کا معنی یہ ہے کہ اس کو مردوں کے لہجے میں پڑھو اور اپنی آواز کو لچک دار نہ بناؤ، کہ وہ عورتوں کی آواز کے مشابہ ہو جائے'، تو یہ حدیث کی مراد سے بہت سے بعید ہے۔ واللہ اعلم

۲۲۰۰: وَعَنْ سَعْدِ بْنِ عُبَادَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا مِنْ اِمْرِءٍ يَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ ثُمَّ يَنْسَاهُ اِلاَّ لَقِيَ اللّٰهَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَجْذَمَ. (رواه ابوداود والدارمی)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۱۵۸/۲ حدیث رقم ۱٤۷٤۔ والدارمی ۵۲۹/۲ حدیث رقم ۳۳٤۰۔ واحمد فی المسند ۲۸٤/۵۔

ترجمہ: ''حضرت سعد بن عبادہؓ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا جو شخص قرآن پڑھتا ہو پھر اسکو بھول جائے تو وہ قیامت کے دن اللہ سے اس حال میں ملاقات کریگا کہ اسے کوڑھ لاحق ہوگا۔'' (ابوداؤد' دارمی)

تشریح: عن سعد بن عبادة قال: قال رسول الله ﷺ ما من امرىء يقرأ القرآن ثم ينساه : یعنی ہمارے نزدیک ناظرہ پڑھنا بھی بھول جائے یا بھلا دے اور امام شافعیؒ کے نزدیک زبانی یاد کرنے کے بعد اپنے حفظ سے بھول جائے یا اس کا معنی یہ ہے کہ پھر اس یعنی قرآن کی قراءت کو چھوڑ دے چاہے بھول جائے یا نہ بھولے۔

الا لقى الله يوم القيامة أجذم : یعنی گرے ہوئے دانتوں کے ساتھ یا کوڑھی کی حالت پر یا اس کا ہاتھ کٹا ہوا ہوگا، یا اس کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہوگی جس کو وہ بھولنے کے عذر میں پکڑے، یا اس کا سر بارگاہ خداوندی میں جھکا ہوا ہوگا شرم وندامت کی وجہ سے جو اس نے اس کے پاک کلام کو اور اس کی عظیم کتاب کو بھلا دیا۔

طیبیؒ فرماتے ہیں کہ کوڑھ کی وجہ سے اس کا ہاتھ کٹا ہوا ہوگا۔ اور وہ کٹنا ہی تو ہے۔

اور یہ قول یہ ہے کہ وہ ''مقطوع الاعضاء ہوگا''۔ کہا جاتا ہے رجلٌ اجذم، اس وقت کہا جاتا ہے جب اس کے اعضاء کوڑھ کی وجہ سے کٹ جائیں۔

اور ایک قول یہ ہے کہ وہ ایسا ہوگا جس کے پاس نہ دلیل ہو اور نہ زور بیان، یعنی اس کے پاس نہ کوئی دلیل ہوگی اور نہ بولنے والی زبان کہ جس کے ذریعے وہ اپنی صفائی پیش کر سکے۔

اور ایک قول یہ بھی ہے کہ بھلائی سے اس کا ہاتھ خالی ہوگا اور ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کی اہے کہ آپ علیہ السلام نے فرمایا: ''مجھ پر میری امت کے اجر پیش کئے گے حتی کہ ایک تنکا بھی جس کو کوئی آدمی مسجد سے نکالتا ہے اس پر بھی اجر ملتا ہے اور مجھ پر میری امت کے گناہ پیش کئے گئے میں نے اس سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں دیکھا کہ قرآن کی کوئی سورت یا آیت کسی آدمی کو دی گئی، پھر اس نے اس کو بھلا دیا ہو''۔

۲۲۰۱: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَمْ يَفْقَهْ مَنْ قَرَأَ الْقُرْاٰنَ فِيْ اَقَلَّ مِنْ ثَلَاثٍ.

(رواه الترمذی وابو داود والدارمی)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۱۱٦/۲ حدیث رقم ۱۳۹٤۔ والترمذی ۱۸۲/۵ حدیث رقم ۳۳٤۹۔ واحمد فی المسند ۲۸٤/۵۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ ابن عمروؓ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے تین رات سے کم مدت میں قرآن پڑھا اس نے قرآن کو اچھی طرح نہیں سمجھا (یعنی قرآن فہمی سے محروم رہا)۔''

(ترمذی' ابوداؤد' دارمی)

تشریح: وعن عبد الله بن عمرو : واؤ کے ساتھ عمرو۔

أن رسول الله ﷺ قال:لم يفقه : یعنی اس نے قرآن کومکمل طور پر سمجھا نہیں۔ومن قرأ القرآن : یعنی اس کوختم کیا۔
في أقل من ثلاث : یعنی راتیں۔اورابن حجرؒ فرماتے ہیں:یعنی دنوں میں بھی۔اوراس میں تفصیل ہے، کیونکہ جب اس طرح ہو گا تواس کے لئے قرآن میں تدبر وتفکر ممکن نہیں ہوسکتا جلدی اور تیزی کی وجہ سے۔طیبیؒ فرماتے ہیں:یعنی قرآن کے ظاہری معانی نہیں سمجھا رہے قرآن کے دقائق (باریک معانی) بلکہ قرآن کا ایک کلمہ بھی تو نفي الفهم سے ثواب کی نفی مرادنہیں ہے پھرلوگوں اور ذہنوں کے مطابق فہم کا تفاوت ہے۔

اورابن حجرؒ فرماتے ہیں: رہا اس کی تلاوت کا ثواب تو وہ اُسی کو ہوگا جو سمجھے گا/یعنی سمجھ کر پڑھے گا،اور جو بالکل سمجھ نہ سکتا ہو،اس کے الفاظ کو عبادت کے طور پر پڑھے اسکے علاوہ اذکار سے،تواس کواس پر ثواب نہ حاصل ہوگا،مگراسی کو ثواب ہوگا جو سمجھے،اگر چہ مقصد کچھ بھی ہواورابن حجرؒ کا یہ قول محل نظر ہے کیونکہ ثواب کی نفی کیلئے کسی دلیل کی ضرورت ہے،کتاب اللہ سے یا کسی حدیث سے دلیل ضروری ہے۔

اور قیاس یہی کہتا ہے کہ ان کے درمیان اصل ثواب میں کوئی فرق نہیں،اگر چہ قرآن اوراس کے علاوہ کے درمیان تفاوت ہواور جو سمجھے اور جو نہ سمجھے ان میں بھی کوئی فرق نہیں۔اوراسی پر صلحاء کا عمل ہے کہ انہوں نے اذکاراور ادعیہ ماثورہ وغیرہ کوورد بنایا ہوا تھا۔اور وہ اس پر ہمیشگی کرتے رہے اور جو چیز مسلمانوں کے ہاں اچھی ہو وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہوتی ہے،اوراللہ تعالیٰ کا فضل وسیع ہے۔

پھر حدیث کے ظاہر پراسلاف کی جماعت کا عمل رہا ہے۔وہ ہمیشہ تین دنوں میں قرآن ختم کرتے رہے اور تین دنوں سے کم میں قرآن ختم کرنے کو ناپسند سمجھتے تھے۔اور دوسرے لوگوں نے اس سے دلیل لی ہے، یہ دیکھتے ہوئے کہ اصلیین کے نزدیک صحیح ترین قول کے مطابق عدد کا مفہوم حجت نہیں ہے۔ایک جماعت قرآن کو ایک دن رات میں ایک مرتبہ ختم کرتی رہی اور کچھ دوسرے ایک دن رات میں دومرتبہ اور کچھ دوسرے تین مرتبہ تک بھی ختم کرتے رہے۔

اور بے شمار لوگ ایسے ہیں جنھوں نے ایک رکعت میں قرآن ختم کیا ہے اور کچھ نے ایک رکعت میں تین تین مرتبہ بھی ختم کیا ہے۔

اور ایک جماعت اس کو ہر دو ماہ میں ایک مرتبہ ختم کرتی رہی اور کچھ دوسرے ہر ماہ میں قرآن ختم کرتے رہے اور کئی دس دن میں ایک ختم قرآن کرتے اور کچھ ہر ہفتہ میں اوراس پر اکثر صحابہ اوران کے علاوہ تابعین وغیرہ کا عمل بھی رہا ہے۔

اور شیخین نے روایت نقل کی ہے:"اقرأه في سبع ولا تزد على ذالك"."کہ رسول اللہ ﷺ نے عبداللہ بن عمروؓ سے کہا کہ سات دن میں ختم قرآن کرو،اوراس سے زیادہ میں نہ کرو"۔

اوراس کا نام"ختم الاحزاب"اوراس کی ترتیب ہی سب سے درست اور صحیح ہے، بلکہ ایک اثر یہ بھی منقول ہے جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف منسوب ہے:"فمي بشوق" انہوں نے فاء کے ساتھ سورۃ الفاتحہ کی طرف اشارہ کیا ہے،اوراس کو مجموعہ کے ساتھ کھولا گیا ہے،اور میم سے سورۃ المائدہ"ی" سے سورۃ یونس' باء سے بنی اسرائیل' پھر شین سے شعراء' پھر واؤ سے والصّٰفّٰت اور پھر"ق" سے"سورۃ ق" تا آخر القرآن۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں:پسندیدہ قول یہ ہے کہ یہ مختلف اشخاص کے ساتھ مختلف ہے۔

جس کے لئے باریک بینی اور معارف ظاہر ہوں تو وہ اس پر اقتصار کرے جتنے پر اسے کمال فہم کا اندازہ ہو۔اور جو علم کی اشاعت میں یا لوگوں کے معاملات' جھگڑے وغیرہ کے فیصلوں میں مشغول ہو وہ بھی اسی قدر پڑھے' جس سے اس کا کام چلتا رہے۔

اور جس کو اس طرح کی مصروفیات نہ ہوں وہ ممکنہ حد تک زیادہ سے زیادہ پڑھے، تجوید کی حد کے اندر رہتے ہوئے۔یا قراءت کے ساتھ اور وہ جلدی سے پڑھنا ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: السید جلیل ابن کاتب صوفی چار قرآن دن میں اور چار قرآن رات میں ختم کرتے تھے۔ میں کہتا ہوں: کہ اس کو زبان کی طی اور زمانے کی کشادگی پر محمول کرنا ہے۔

اور الشیخ موسیٰ الدرانی سے جو کہ الشیخ ابی مدین المغربی کے اصحاب میں سے ہیں، روایت کیا گیا ہے: کہ وہ دن رات میں ستر ہزار مرتبہ قرآن ختم کرتے تھے اور انہی سے نقل کیا گیا کہ انہوں نے حجر اسود کو بوسہ دینے کے بعد شروع کیا اور دروازے کے برابر آنے تک اختتام کرلیا جسے بعض تلامذہ نے حرف بحرف سنا۔ اور یہ وضاحت کتاب "نفحات الأنس فی حضرات القدس" میں بڑی تفصیل سے مذکور ہے۔

قرآنِ پاک کو اُونچی اور آہستہ آواز سے پڑھنے کی بہترین مثال

۲۲۰۲: وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْجَاهِرُ بِالْقُرْاٰنِ كَالْجَاهِرِ بِالصَّدَقَةِ وَالْمُسِرُّ بِالْقُرْاٰنِ كَالْمُسِرِّ بِالصَّدَقَةِ۔ (رواه الترمذی وابوداود والنسائی وقال الترمذی هذا حديث حسن غريب)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۸۳/۲ حديث رقم ۱۳۳۳۔ والترمذی فی السنن ۱٦٥/٥ حديث رقم ۲۹۱۹۔ والنسائی ۸۰/٥ حديث رقم ۲٥٦۱۔ واحمد فی المسند ۱٥۱/٤۔

ترجمہ: "حضرت عقبہ بن عامرؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا بلند آواز سے قرآن پڑھنے والا شخص ظاہری صدقہ دینے والے کی طرح ہے (یعنی علانیہ صدقہ کرنے کی طرح ہے آہستہ قرآن پڑھنے والا شخص چھپا کر صدقہ دینے والے کی طرح ہے" (ترمذی، ابوداؤد، نسائی) اور امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔"

تشریح: وعن عقبة بن عامر قال: قال رسول الله ﷺ: الجاهر : یعنی اونچی آواز سے پڑھنے والا۔

والمسر : یعنی آہستہ آواز میں پڑھنے والا۔

بالقرآن كالمسر بالصدقة : طیبیؒ فرماتے ہیں: کہ قرآن کی باآواز بلند تلاوت کی فضیلت کے آثار بھی موجود ہیں، اور قرآن کو آہستہ آواز میں پڑھنے کی فضیلت کی احادیث بھی آئیں ہیں، اور ان احادیث کے درمیان جمع وتطبیق کی صورت یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ جو ریا کاری سے ڈرے اس کے لئے سری آہستہ آواز میں تلاوت کرنا افضل ہے اور جس کو ریا کاری کا خوف نہیں اس کا اونچا پڑھنا افضل ہے، بشرطیکہ اس کے اونچی آواز میں پڑھنے سے کسی کو تکلیف نہ ہو، چاہے نمازی ہو یا سونے والا یا کوئی دوسرا بیمار یا کام وغیرہ میں مشغول شخص تنگ نہ ہو۔

اور یہ اس لئے ہے کہ جہراً عمل کرنے سے عمل کرنے والے کے علاوہ دیگر کو بھی نفع پہنچتا ہے یعنی سننے سے یا سیکھنے سے یا ذوق حاصل کرنے کی صورت میں ہے، یا وہ دین کے شعار میں ہے، اور اسلئے بھی کہ پڑھنے والے کا دل بیدار رہتا ہے، اور سکی توجہ مجتمع ہوتی ہے اور اس سے نیند بھاگ جاتی ہے اور عبادت میں چستی آجاتی ہے۔ پس جب ان نیتوں میں سے کوئی نیت کرکے پڑھے تو اونچا پڑھنا افضل ہے۔

۲۲۰۳: وَعَنْ صُهَيْبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا اٰمَنَ بِالْقُرْاٰنِ مَنِ اسْتَحَلَّ مَحَارِمَهٗ.

(رواه الترمذی وقال هذا حديث ليس اسناده بالقوی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱٦٥/٥ حديث رقم ۲۹۱۸۔

ترجمہ: "صہیبؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا "وہ شخص قرآن پر ایمان نہیں لایا جو اس کی حرام کردہ چیزوں کو حلال جانے" امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس روایت کی اسناد قوی نہیں ہے۔"

تشریح: وعن صهيب : تصغیر کے ساتھ۔

قال:قال رسول الله ﷺ ما آمن بالقرآن : یعنی اس کی حکم یا حقیقت میں۔

من استحل محارمه : محرم کی جمع ہے بمعنی حرام جو کہ محرم ہے حرام ہے اور محاربه میں ''هٗ'' ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے، اور مراد اس جنس سے فرد ہے۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: جو اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیز کو حلال قرار دے، تو اس نے مطلق طور پر کفر کا ارتکاب کیا۔ لیکن قرآن کو اس کی بزرگی اور عظمت کی وجہ سے خاص فرمایا۔

میں کہتا ہوں: یا اس کے قطعی ہونے کی وجہ سے۔ یا اس لئے کہ اس کے علاوہ دوسرا دلیل کے لحاظ سے بھی پہچانا جاتا ہے۔

۲۲۰۴: وَعَنِ اللَّيْثِ بْنِ سَعْدٍ عَنِ ابْنِ اَبِیْ مُلَيْكَةَ عَنْ يَعْلٰى بْنُ مَمْلَكٍ اَنَّهٗ سَاَلَ اُمَّ سَلَمَةَ عَنْ قِرَآءَةِ النَّبِيِّ ﷺ فَاِذَا هِيَ تَنْعَتُ قِرَآءَةً مُّفَسَّرَةً حَرْفًا. (رواه الترمذی و ابوداود النسائی)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۱۵٤/۲ حديث رقم ۱٤٦٦۔ والترمذی ۱٦٧/٥ حديث رقم ۲۹۲۳۔ والنسائی ۱۸۱/۳ حديث رقم ۱۰۳۲۔

ترجمہ: ''حضرت لیث بن سعدؒ حضرت ابن ابی ملیکہؒ سے نقل کرتے ہیں وہ حضرت یعلی ابن مملکؒ کے بارے میں روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے امّ المؤمنین حضرت امّ سلمہؓ سے نبی کریم ﷺ کی قراءت کے بارے میں پوچھا کہ آپ ﷺ قرآن کس طرح پڑھتے تھے؟ حضرت امّ سلمہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ قراءت واضح اور جدا جدا حرف کے ساتھ تھی۔''

تشریح: وعن الليث بن سعد عن ابی مليكة : مليكة تصغیر کے ساتھ ہے۔

عن يعلى بن مملك : پہلی میم اور لام کے فتحہ کے ساتھ۔

أنه سأل ام سلمة عن قراءة النبی ﷺ فاذا هی : یعنی ام سلمہؓ۔

تنعت : یعنی صفت بیان کرنے لگیں۔

قراءة مفسره : یعنی واضح کرکے۔

حرفا حرفا : یعنی اس طرح پڑھتے تھے کہ جو پڑھتے تھے اس کے حروف کی تعداد کو گننا ممکن تھا یا اس سے مراد حسن الترتیل اور تجوید کے ساتھ قرآن پڑھنا ہوسکتا ہے۔

طیبیؒ فرماتے ہیں: یہاں دو وجہیں ہوسکتی ہیں: پہلی یہ کہ امّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ آپ علیہ السلام کی قراءت اس طرح تھی۔

دوسری یہ ہوسکتی ہے کہ وہ ترتیل کے ساتھ پڑھنے لگیں جس طرح رسول اللہ ﷺ پڑھتے تھے ان کی قراءت کی طرح۔

ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں ایک سورت ترتیل وتجوید کا لحاظ کرتے ہوئے پڑھوں یہ مجھے زیادہ محبوب ہے، اس سے کہ میں سارا قرآن بغیر ترتیل کے پڑھ لوں۔

اور ابو یعلی نے روایت کی ہے: ''کہ میری امت میں کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو دقل کی نثر کی طرح قرآن کی تلاوت کریں گے۔ علامہ جزری نشر میں فرماتے ہیں اور ہمارے بعض ائمہ نے کتنی ہی اچھی بات کی' فرماتے ہیں: کہ ترتیل کے ساتھ قراءت کا ثواب عظیم و جلیل ہے اور عدد کے لحاظ سے بھی ثواب کثرت میں ہے، اھ۔

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کیفیت کا اعتبار کمیت کے اعتبار سے زیادہ بہتر ہے کہ ایک جوہر/ ہیرہ ہزاروں درہموں اور دیناروں

کے برابر ہوتا ہے۔

۲۲۰۵: وَعَنِ ابْنِ جُرَيْجٍ عَنِ ابْنِ اَبِىْ مُلَيْكَةَ عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَقْطَعُ قِرَاءَ تَهُ يَقُوْلُ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ثُمَّ يَقِفُ ثُمَّ يَقُوْلُ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ثُمَّ يَقِفُ. رواه الترمذی وقال لیس اسناده بمتصل لان اللیث روی هذا الحدیث عن ابن ابی ملیكة عن یعلی بن مملك عن ام سلمة وحدیث اللیث اصح۔

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۲۹۴/۴ حدیث رقم ۴۰۰۱۔ والترمذی ۱۷۰/۵ حدیث رقم ۲۹۲۷۔ واحمد فی المسند ۳۰۲/۶۔

ترجمہ: ''ابن جریج حضرت ابن ملیکہ سے اور وہ حضرت ام سلمہ سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی قراءت علیحدہ علیحدہ ہوتی تھی یعنی ٹھہر ٹھہر کر تلاوت فرماتے تھے الحمد للہ رب العٰلمین پڑھتے اور پھر وقف فرماتے پھر الرحمٰن الرحیم پڑھتے اور وقف فرماتے امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی سند متصل نہیں ہے کیونکہ اس سلسلہ کی سند یہ ہے' حضرت ابن ملیکہ نے نقل کیا حضرت یعلی ابن مملک سے اور انہوں نے نقل کیا حضرت ام سلمہ سے اور حضرت لیث کی حدیث زیادہ صحیح ہے۔''

تشریح: **وعن ابن جریج** : دونوں جیم ہیں، اور مصغر ہے۔

عن ابن ابی ملیکة عن ام سلمة قالت کان رسول اللّٰہ ﷺ یقطع قراء ته : باب تفعیل تقطیع سے ہے، یعنی ہر آیت پر وقف کرتے۔

یقول : یقطع کا بیان ہے۔ یہ بات طیبیؒ نے کہی ہے، اور وہ یقطع سے بدل یا حال یا جملہ اسنافیہ بھی ہو سکتا ہے۔

الحمد للّٰہ رب العالمین [الفاتحة :۱-۲] **ثم یقول الرحمٰن الرحیم** [الفاتحة :۱-۲] **ثم یقف۔**

کہا جاتا ہے کہ یہ روایت درست نہیں۔ ہے، بلکہ یہ ایک لہجہ ہے جس کو اہل بلاغہ پسند نہیں کرتے اور وقف تام **مالك یوم الدین** پر ہوتا ہے۔ اور اسی لئے اس پر استدراک کیا ہے اور لیث بن سعد والی حدیث زیادہ صحیح ہے۔ طیبیؒ نے اس کو ذکر کیا ہے۔

اور اس میں یہ بھی ہے کہ وقف مستحسن تین قسموں پر مشتمل ہے۔ حسن، کافی اور تام۔ قرآء عظام کے نزدیک ہر قسم پر وقف جائز ہے، اور علامہ جزریؒ نے بھی یہ کہتے ہوئے اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

وهی لماتم فان لم یوجد تعل او کان معنی فابعد، فالتام فالکافی ولفظا فامعن الا رؤوس الآی جوّز فالحسن.

اور یہ جب مکمل ہو پس اگر کوئی تعلق نہ پایا جائے یا کوئی معنی تو ابتدا سے پڑھ۔ پس وقف تام اور کافی اور لفظی طور پر''۔

اور اس کی تشریح لمبی ہو جائے گی پھر ارباب وقوف نے آیت وقف کرنے کے بارے بھی اختلاف کیا ہے، جب کہ وہاں کوئی لفظی تعلق موجود ہو، جس طرح کہ جس بحث میں ہم ہیں۔ اور اسی حدیث سے استدلال کیا ہے اور اسی پر امام شافعیؒ کا عمل بھی ہے اور جمہور نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ آپ علیہ السلام کا وقف کرنا اس لئے تھا کہ سامعین کے لئے آیات کے آغاز اور اختتام واضح ہو جائیں اور جمہور اس کے قائل ہیں کہ وصل اس میں زیادہ بہتر ہے اور علامہ جزری اس پر وقف کو مستحب قرار دیتے ہیں' انفصال کے ساتھ ساتھ۔

اور طیبیؒ نے حیرت انگیز بات ہی کہی کیونکہ انہوں نے کہا کہ لیث والی حدیث زیادہ صحیح ہے۔ جب کہ بحث میں اس کا کوئی دخل نہیں، کہ حدیث کے بعض طرق بعض سے زیادہ صحیح ہوتے ہیں، باوجود اس کے کہ حدیث متصل ہونے کے ساتھ ساتھ اصح ہو، اس کے ساتھ متصل صحیح سند والی حدیث اس حکم کو قوی کر دیتی ہے جو منفصل سند والی سے مستفاد ہو۔ مصنف کے قول میں تدبر کریں۔

کیونکہ ابن ابی ملیکہ نے ام سلمہ کو نہیں دیکھا تو واسطہ کے چھوڑنے کی وجہ سے حدیث منقطع ہوگی۔

لان الليث روى هذا الحديث عن ابن ابى مليكة، عن يعلى بن مملك، عن ام سلمة. وحديث الليث : یعنی اس کی سند میں کیونکہ ابن مملک کے ذکر کرنے سے متصل ہو جاتی ہے۔

اصح : یعنی ابن جریج والی حدیث سے زیادہ صحیح ہے، جو کہ **عن ابن ابى مليكة عن ام سلمه** ہے، اس کے منقطع ہونے کی وجہ سے۔

مؤلف علیہ الرحمۃ تابعین کی فصل میں رقمطراز ہیں کہ یہ لیث بن سعد ہیں، اہل مصر کے فقیہ ہیں، انہوں نے ابن ابی ملیکۃ عطاء، زہری سے روایت کیا ہے، یعنی یہ ان کے اساتذہ ہیں اور ان سے بہت زیادہ لوگوں نے روایت کیا ہے ان کے تلامذہ میں سے ابن مبارک ہیں، جو بغداد تشریف لائے، منصور نے انہیں مصر کا ولی بننے کی فرمائش کی، جس سے انہوں نے انکار کر دیا اور استعفیٰ دے دیا۔

قتیبہ بن سعید کہتے ہیں کہ لیث بن سعد ہر سال بیس ہزار (۲۰۰۰۰) دینار کا غلہ حاصل کرتے لیکن ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوئی، کیونکہ وہ اس پر سال گذرنے ہی نہ دیتے بلکہ پہلے ہی تقسیم فرما دیتے۔

اور یعلی بن مملک تابعی ہیں، یہ ام سلمہ سے روایت کرتے ہیں، اور یعلی سے ابن ابی ملیکہ روایت کرتے ہیں اور جب انہوں نے کہا کہ **حديث الليثى اصح**، یعنی پہلی روایت مراد ہے۔ اور ام سلمہ والی روایت دوسری حدیث سے زیادہ صحیح ہے۔ کیونکہ دوسری حدیث نہ سند کے اعتبار سے درست ہ اور نہ ہی لہجہ کے مطابق، کیونکہ یہاں موصوف اور صفت کے درمیان فاصلہ ہے، اھ۔

اور یہ بات بھی گزر چکی ہے کہ اس وقف کا نام حسن رکھا جاتا ہے۔ ناپسندیدہ لہجہ کے ساتھ یہ قبیح ہوگا، پھر یہ کہ یہاں پر دو روایتیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی روایت ہے لیکن اس کی سندیں دو ہیں۔ ایک سند منقطع ہے اور دوسری متصل۔ اور دوسری روایت زیادہ صحیح ہے۔ اور اصح صحیح کے مقابلہ میں ہے کہ ضعیف حدیث پر فضائل اعمال میں عمل کیا جا سکتا ہے۔ ان کا قول: **ليست بسديدة** سے مراد یہ ہے کہ **ليس بسديد على الصواب**.

اور "**ذهول**" محدثین اور قرآء کی اصطلاح میں انہوں نے غلط جواب کے بارے میں ہے اور بصیرت سے خالی ہے۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس کی مراد پہلی روایت سے پہلی حدیث ہے چونکہ ہم اس کا رد کرتے ہیں۔ اس کا کہنا کہ پہلی حدیث سے احتراز کرتے ہوئے اس حدیث کو روایت کیا گیا ہے۔ پس آپ غور کریں۔

الفصل الثالث:

قربِ قیامت میں لوگ دُنیاوی مقاصد کے لیے قرآن پڑھیں گے

۲۲۰۶: عَنْ جَابِرٍ قَالَ خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَنَحْنُ نَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ وَفِيْنَا الْاَعْرَابِيُّ وَالْاَعْجَمِيُّ فَقَالَ اِقْرَأُوْا فَكُلٌّ حَسَنٌ وَسَيَجِيْءُ اَقْوَامٌ يُقِيْمُوْنَهٗ كَمَا يُقَامُ الْقِدْحُ يَتَعَجَّلُوْنَهٗ وَلَا يَتَأَجَّلُوْنَهٗ۔

(رواه ابو داود والبيهقى فى شعب الا يمان)

اخرجه ابوداؤد فى السنن ۱/ ۵۲۰ حديث رقم ۸۳۰۔ واحمد فى المسند ۳/ ۱۵۵۔ والبيهقى فى شعب الايمان ۲/ ۵۳۸ حديث رقم ۲٦٤۲۔

ترجمہ: "حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے جب کہ ہم قرآن پڑھ رہے تھے ہم میں دیہاتی لوگ اور عجمی بھی تھے آپ ﷺ نے ہم سے ارشاد فرمایا کہ "پڑھو! تم پڑھو درست ہے عنقریب ایک ایسی

جماعت پیدا ہونے والی ہے جس کے افراد قرآن کریم کو اس طرح سیدھا کریں گے جس طرح تیر سیدھا کیا جاتا ہے اور اس کا بدلہ جلدی ہی حاصل کرنا چاہیں گے آخرت کے لئے کچھ نہیں چھوڑیں گے۔'' (ابوداؤد، بیہقی)

تشریح: عن جابر قال: خرج علینا رسول اللہ ﷺ ونحن نقرأ القرآن، وفینا : یعنی پڑھنے والوں کے گروہ میں۔

الاعرابی : یعنی دیہاتی۔

والعجمی : اور ایک دوسرے نسخہ میں **والأعجمی** کا لفظ ہے۔ عربی کے علاوہ فارسی ہو یا رومی یا حبشی جیسا کہ سلمان فارسی، صہیب رومی اور بلال حبشی رضی اللہ عنہم۔ طیبیؒ اس قول کے قائل ہیں۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: قولہ فینا ...... اس میں دو احتمال ہیں، پہلا یہ کہ تمام صحابہ ان دو قسموں میں منحصر تھے۔ دوسرا یہ کہ ہم میں عرب اصحاب النبیؐ کا گروہ ہیں، یا ہم میں وہ دو جماعتیں ہیں۔ اور یہ وجہ زیادہ ظاہر ہے کیونکہ نبی علیہ السلام نے عربی اور اعرابی کے درمیان فرق کیا ہے، اس کی مثال آپ علیہ السلام کے خطبہ میں موجود ہے۔ مہاجر ہے اعرابی نہیں ہے۔ آپ علیہ السلام نے مہاجر کو اعرابی کی ضد بنایا۔ اور اعراب سے مراد عرب کے دیہاتوں کے باشندے ہیں۔ جو شہروں میں نہیں رہتے۔ اور نہ ہی شہروں میں بغیر کسی حاجت کے داخل ہوتے ہیں، اور ''عرب'' لوگوں میں سے اس زمانے کے مشہور لوگوں کے نام ہے اور نہ ہی اس کا واحد ہے۔ برابر ہے کہ وہ دیہات میں رہنے والا ہو یا شہر کا۔

اور اس کا ماحصل یہ ہے کہ ''عرب'' ''اعراب'' سے زیادہ عام ہیں اور اسی سے باری تعالیٰ کا قول: ﴿وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ یَّتَّخِذُ مَا یُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّیَتَرَبَّصُ بِکُمُ الدَّوَآئِرَ...... ﴾ [التوبة: ۹۸]

فقال اقرأوا : یعنی تم سب۔

فکل حسن : یعنی تم میں سے ہر ایک کی قراءت اچھی ہے ثواب کی امید کی جاسکتی ہے جب تم آخرت کو دنیا پر ترجیح دو اور تم پر ضروری نہیں کہ تم اپنی زبانوں کو تیروں کی سیدھا کرو، **قدح** ایسے تیر کو کہا جاتا ہے۔

سیجیئ أقوام یقیمونه : یعنی قرآن کے الفاظ اور کلمات کو درستگی کے ساتھ اداء کریں گے، اور مخارج اور صفات کا خیال رکھنے میں بہت تکلف کریں گے۔

کما یقام القدح : یعنی قرآن کی قراءت میں بہت مبالغہ کریں گے ریاکاری، شہرت اور باہم فخر کی وجہ سے۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: حدیث میں حرج کے دور کرنے اور آسانی کی طرف حکم دینے کی بنا پر ظاہر ہے۔

اور ثواب کی امید وار اور عمل میں اخلاص کی کوشش کرنا، اور قرآن کے معانی میں تفکر کرنا اور اس کے احکام کی، حقیقت تک پہنچنا، اور رہا ابن حجرؒ کا قول "ومع ذلك هم مذمومون لانهم راعو هذا الامر السهل". باوجود اس کے وہ مذموم ہوں گے کیونکہ انہوں نے اس آسان کام میں بہت زیادہ تکلف شروع کر دیا اور اس قباحت میں بڑھ گئے کہ انہوں نے اسی غفلت کو اپنا لیا، کہ وہ قرآن کو دنیا کے چند ٹکوں کی خاطر پڑھتے ہیں۔ تو یہ قابل تعریف بات نہیں ہے، جب کہ آسان کام کا خیال رکھنے میں ان کا مبالغہ آرائی کرنا یہ مذموم نہیں ہے بلکہ مذمت اس چیز کی ہے کہ انہوں نے اہم کام کو چھوڑ دیا یعنی غور و فکر کو چھوڑ دیا اور ظاہری الفاظ کے مخارج و صفات کے تکلف میں پڑ گئے۔

یتعجلونه : یعنی اس کا ثواب دنیا میں ہی چاہتے ہیں۔

ولا یتأجلونه : آخرت میں اجر و ثواب کی طلب نہیں رکھتے بلکہ دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں، اور توکل نہیں کرتے۔

عرب کے لہجوں میں قرآن پاک کی تلاوت کرنا پسندیدہ ہے

۲۲۰۷ : وَعَنْ حُذَیْفَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِقْرَأُوا الْقُرْاٰنَ بِلُحُوْنِ الْعَرَبِ وَاَصْوَاتِهَا وَاِیَّاکُمْ

وَلُحُوْنَ اَهْلِ الْعِشْقِ وَلُحُوْنَ اَهْلِ الْكِتَابَيْنِ وَسَيَجِيْءُ بَعْدِیْ قَوْمٌ يُرَجِّعُوْنَ بِالْقُرْاٰنِ تَرْجِيْعَ الْغِنَآءِ وَالنَّوْحِ لَا يُجَاوِزُ حَنَاجِرَهُمْ مَفْتُوْنَةٌ قُلُوْبُهُمْ وَقُلُوْبُ الَّذِيْنَ يُعْجِبُهُمْ شَاْنُهُمْ۔

اخرجه البيهقي في شعب الايمان ٢/٥٤٥٠ حديث رقم ٢٦٤٩۔

ترجمه: ''حضرت حذیفہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''تم قرآن کریم اہل عرب کی طرح یعنی عربی لہجے میں اور ان کی آوازوں کے مطابق پڑھو اہل عشق اور اہل کتاب کے لہجوں سے بچو میرے بعد ایک جماعت پیدا ہوگی جس کے افراد راگ اور نوحہ کی طرح آواز بنا کر قرآن پڑھیں گے ان کا حال یہ ہوگا کہ قرآن انکے حلق سے آگے نہیں اترے گا نیز انکی قراءت سن کر خوش ہونے والوں کے قلوب فتنہ میں مبتلا ہوں گے۔'' (بیہقی، رزین)

تشریح: **وعن حذيفة قال: قال رسول الله ﷺ اقرأوا القرآن بلحون العرب وأصواتها**: عطف تفسیری ہے یعنی مدات کے نغمات میں بلا تکلف، حرکات میں سکنات میں بغیر تکلفات کے پڑھنا۔

واياكم ولحون اهل العشق : یعنی اصحاب فسق وفجور کے لہجہ میں پڑھنے سے منع فرمایا۔

ولحون أهل الكتابين : یعنی یہود ونصاریٰ میں سے ارباب کفر کے لہجوں سے بھی پرہیز کرو، کیونکہ **''من تشبه بقوم فهو منهم''** جو جس قوم کے ساتھ مشابہت کرے گا وہ انہی میں سے ہوگا۔

طیبیؒ فرماتے ہیں: **اللحون، لحن** کی جمع ہے، اور وہ سُر لگا کر پڑھنا اور آواز کا حلق میں گھمانا۔ جامع الاصول کے مصنف لکھتے ہیں: کہ یہ اس سے ملتا جلتا ہے جو ہمارے زمانے کے قراء عظام کر رہے ہیں۔ عجیب سُر لگاتے ہیں قرآن پڑھنے میں، حالانکہ رسول اللہ نے اس سے منع فرمایا ہے۔

وسيجيئ : یعنی سیأتی یعنی عنقریب آئے گی جیسا کہ ایک نسخہ میں یہ لفظ بھی ہے۔

بعدی قوم یرجّعون : تشدید کے ساتھ یعنی ردّ کریں گے۔

بالقرآن : یعنی اس میں تحریف کریں گے۔

ترجيع الغناء : کسرہ اور مد کے ساتھ گانے کے معنی میں ہے۔

والنوح : نون کے فتحہ کے ساتھ نوحہ کرنا اور اس سے مراد اُس کے مخرج سے نکل جانے کی تردید ہے۔

طیبیؒ فرماتے ہیں: قرآن میں ترجیع سے مراد حروف کا عیسائیوں کی قراءت کی طرح پڑھنا ہے۔ (**لا يجاوز**) یعنی انکا قرآن کو پڑھنا۔

حناجرهم : یعنی ان کے حلق سے اور یہ عدم قبولیت سے کنایہ ہے اور مقام وصول سے ردّ ہے۔

اور تجاوز صعود اور حدور یعنی چڑھنے اور نیچے اترنے دونوں معنوں کے لئے آتا ہے۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: ان کے گلے سے آسمان کی طرف نہیں چڑھے گا، ان کا تلاوت کرنا، اور نہ ہی اللہ تعالیٰ ان سے قبول کرے گا۔ اور نہ ہی ان کے حلق سے ان کے دلوں میں اترے گا ان کا تلاوت کرنا، کہ وہ اس کی آیات میں غور و فکر کریں اور اس کے مقتضاء پر عمل پیرا ہوں۔

مفتونة : حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اور مرفوع بھی ہوسکتا ہے کہ **قومٌ** کی دوسری صفت بنالی جائے۔ اور طیبیؒ نے اسی پر اقتصار کیا ہے یعنی دُنیا کی محبت کے ساتھ آزمایا جائے گا۔ اور لوگوں کا اس کی تعریف کرنے کے ساتھ۔

قلوبهم : فاعلیت کی بناء پر مرفوع ہے اور معطوف علیہ ہے۔

وقلوب الذين يعجبهم شأنهم : ہمزہ کے ساتھ۔ اور ابدال ہے، یعنی ان کی قراءت کو اچھا سمجھتے ہیں اور ان کی تلاوت کو غور

سے سنتے ہیں اور اسی طرح طبرانیؒ نے بھی روایت کیا ہے۔

۲۲۰۸: وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ حَسِّنُوا الْقُرْاٰنَ بِاَصْوَاتِكُمْ فَاِنَّ الصَّوْتَ الْحَسَنَ يَزِيْدُ الْقُرْاٰنَ حُسْنًا. (رواہ الدارمی)

اخرجه الدارمی فی السنن ۵۱۵/۲ حدیث رقم ۳۵۰۱۔

ترجمہ: ''حضرت براء بن عازبؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ ''قرآن کو اچھی آواز کے ساتھ پڑھو کیونکہ اچھی آواز قرآن کریم کے حسن میں اضافہ کرتی ہے۔'' (دارمی)

تشریح: **وعن البراء بن عازب قال سمعت رسول اللّٰه ﷺ حسنوا القرآن** : یعنی اس کو مزین کر کے پڑھو۔

باصواتکم : طیبیؒ فرماتے ہیں اور یہ ترتیل کے ساتھ ہے اور آواز کا خوبصورت بنانا نرمی اور تحزین کے ساتھ ہے، اور یہ حدیث قلب پر محمول نہیں کی جا سکتی، جیسا کہ پچھلی حدیث کو قلب پر محمول کیا ہے اس قول کی وجہ سے۔

فان الصوت الحسن یزید القرآن حسنا.

۲۲۰۹: وَعَنْ طَاؤُوْسٍ مُرْسَلاً قَالَ سُئِلَ النَّبِيُّ ﷺ اَيُّ النَّاسِ اَحْسَنُ صَوْتًا لِلْقُرْاٰنِ وَاَحْسَنُ قِرَاءَةً قَالَ مَنْ اِذَا سَمِعْتَهٗ يَقْرَاُ اُرِيْتَ اَنَّهٗ يَخْشَى اللّٰهَ قَالَ طَاؤُوْسٌ وَكَانَ طَلْقٌ كَذٰلِكَ. (رواہ الدارمی)

اخرجه الدارمی فی السنن ۵۶۳/۲ حدیث رقم ۳۴۸۹۔

ترجمہ: ''حضرت طاوسؒ بطریق ارسال نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ قرآن پڑھنے کے سلسلے میں آواز کے لحاظ کون شخص سب سے بہتر ہے اور پڑھنے کے اعتبار سے کون شخص بہتر ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''وہ شخص کہ جس کو تم قرآن کریم پڑھتے ہوئے سنو تو تمہارا گمان ہو (یعنی تمہیں محسوس ہو) کہ وہ اللہ سے ڈرتا ہے'' حضرت طاوسؒ کہتے ہیں کہ حضرت طلق میں یہی بات تھی کہ قرآن پڑھتے تو محسوس ہوتا کہ خشیت الٰہی ان پر غالب ہے۔'' (دارمی)

تشریح: **وعن طاؤس** : جلیل القدر تابعی تھے۔

مرسلا، قال سئل النبی ﷺ أی الناس أحسن صوتا للقرآن؟ : ایک قول یہ ہے کہ لام تبیین کیلئے ہے۔

وأحسن قراءة : یعنی ترتیل اور ادائیگی کے اعتبار سے۔

قال من اذا سمعته یقرأ أریت : مجہول کے صیغے کے ساتھ یعنی حسبته وظننته۔

أنه یخشی اللّٰه : اور تیرا دل اس سے متاثر ہو، یا اس پر خشیت کے آثار ظاہر ہوں، جیسا کہ اس کا رنگ متغیر ہونا، یا اس کے کثرت کے رونے سے۔ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ جواب حکمت والے کے اسلوب سے ہے۔ کیونکہ اچھی آواز کا جواب دینے کی بجائے یہ جواب دیا کہ جو شخص خوف الٰہی کے ساتھ پڑھے وہ اچھا ہے۔

قال طاؤس: وکان طلق کذالك : یعنی اس وصف سے متصف تھے۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ ابو علی طلق بن علی بن عمرو النخعی الیمامی تھے، اھ۔ مولف رحمہ اللہ نے ان کو صحابہ میں شمار کیا ہے اور ان سے ان کے بیٹے قیس نے روایت کی ہیں۔

۲۲۱۰: وَعَنْ عُبَيْدَةَ الْمُلَيْكِيِّ وَكَانَتْ لَهٗ صُحْبَةٌ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَا اَهْلَ الْقُرْاٰنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْاٰنَ وَاتْلُوْهُ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ مِنْ اٰنَاءِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَافْشُوْهُ وَتَغَنَّوْهُ وَتَدَبَّرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ وَلَا تُعَجِّلُوْا ثَوَابَهٗ

فَإِنَّ لَهُ ثَوَابًا .(رواه البيهقي في شعب الايمان)

اخرجه البخاري في صحيحه ۷۳/۵ـ ح ديث رقم ۲۳۱۹ـ ومسلم في صحيحه ٥٦٠/١ حديث رقم (٢٧٠ـ ٨١٨)ـ وابوداوٗد في السنن ١٥٨/٢ حديث رقم ١٤٧٥ـ والترمذي ١٧٧/٥ حديث رقم ٢٩٤٣ـ والنسائي ١٥٠/٢ حديث رقم ٩٣٦ـ ومالك في الموطا ٢٠١/١ حديث رقم ٥ من كتاب القرآنـ واحمد في المسند۔

ترجمہ: ''حضرت عبیدہ ملیکیؓ جو نبی کریم ﷺ کے ایک صحابی تھے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا ''اے اہل قرآن! قرآن سے تکیہ نہ کرو (یعنی اس کے معاملے میں سستی وتغافل سے کام نہ لو) اور صبح وشام پڑھا کرو جیسا کہ اس کو پڑھنے کا حق ہے قرآن کو ظاہر کرو اسے خوش آوازی کے ساتھ پڑھو جو کچھ اس میں مذکور ہے اس میں غور و فکر کرو تا کہ تمہارا مطلوب حاصل ہو اور اس کا ثواب حاصل کرنے میں جلد بازی نہ کرو کیونکہ آخرت میں اس کا بڑا اَجر ہے۔'' (بیہقی)

تشریح: **وعن عبيدة** : ''عین'' کے فتحہ کے ساتھ، یہ ابن حجرؒ کا قول ہے۔ دوسرے نسخہ میں ضمہ اور فتحہ کے ساتھ۔

المليكي : تصغیر کے ساتھ۔

وكانت له صحبة : یعنی نبی ﷺ کے ساتھ، اور یہ جملہ معترضہ ہے۔ یہ بیہقی کا یا کسی اور کا کلام ہے۔

قال: قال رسول الله ﷺ يا اهل القرآن : خطاب کے ساتھ خاص کئے گے۔ کیونکہ ان پر قرآن کے حقوق کی ادائیگی میں مبالغہ واجب ہے، دوسروں سے کیونکہ قرآن ان کے گوشتوں اور خون کے ساتھ ملا ہوا ہے۔

اور یہ بھی احتمال ہوسکتا ہے کہ اس سے تمام مؤمنین کو مراد لیا گیا ہو، کیونکہ مؤمن قرآن کے بعض سے علیحدہ نہیں ہوتے یا اهل قرآن سے مراد قرآن پر ایمان رکھنے والے ہوسکتے ہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا یا اهل البقرة کہنا۔

لا تتوسدوا القرآن : یعنی اس کو اپنا تکیہ نہ بناؤ، کہ اس کو پڑھتے ہو اور پھر اس پر سر رکھ کر سو جاتے ہو اور اس سے غافل ہو جاتے ہو، اور اس کے حقوق کے قیام سے بھی غفلت برتتے ہو، اور اس میں سستی کا مظاہرہ کرتے ہو، بلکہ اس کے لفظی حقوق کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ، اور اس کے سمجھنے اور اس کے علم اور اس پر عمل کے ساتھ اس کے حق کو قائم کرو۔

واتلوه حق تلاوته : یعنی اس کو اس طرح پڑھو جس طرح اس کے پڑھنے کا حق ہے، اور اس کی اتباع کرو، جیسا کہ اس کی اتباع کا حق ہے۔ امام نوویؒ شرح المہذب میں الشیخ ابومحمد الجوینی سے روایت نقل کرتے ہیں، اگر کسی نے ''نستعین'' لطیف وقف کے ساتھ سین اور ''تاء'' کے درمیان پڑھا، تو حرام ہے کیونکہ یہاں وقف نہیں ہے، اور نہ ہی قراء عظام میں سے کسی ایک کے نزدیک آیت کا اختتام ہے۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: اس میں دلیل ہے کہ قراءت میں مخرج، مد اور ان کے علاوہ کسی دوسری چیز پر اجماع ہو جائے۔ تو اس کا سیکھنا واجب اور اس کی مخالفت حرام ہے۔

من آناء الليل والنهار : یعنی اس کی بہت زیادہ تلاوت کرو، دن رات کی گھڑیوں میں لیکن اس کے حقوق پورے کرتے رہو۔ اور اس کی تلاوت کرو جس طرح اس کی تلاوت کرنے کا حق ہے۔

www.KitaboSunnat.com

طیبیؒ فرماتے ہیں: **لا تتوسدوا** سے دو مفہوم اخذ ہو سکتے ہیں۔

① یہ کہ سستی اور بے پرواہی سے کنایہ ہو، یعنی اس کو تکیہ نہ بناؤ کہ تم اس پر سوتے ہو اور اس سے غافل ہو جاتے ہو، بلکہ کھڑے ہو جاؤ اور رات کی گھڑیوں اور دن کے کناروں میں اس کی تلاوت کرو کیونکہ جس طرح اس کا حق ہے۔

② یہ کنایہ ہو غفلت سے کہ جس نے قرآن کو تکیہ بنایا وہ ضرور سوئے گا اور سونا اور غفلت لازم وملزوم ہیں یعنی قرآن کے معانی میں

تدبر کرنے اور اس کے اسرار کو کھولنے سے غافل نہ ہونا اور نہ ہی اس کے تقاضوں کے مطابق عمل کرنے میں سستی کرنا، اور اس کے اخلاص میں بھی کوتاہی نہ کرنا اور اس قول کا معنی ہے ﴿حق تلاوته﴾ [البقرة: ١٢١] جس طرح اس کی تلاوت کا حق ہے۔ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً یَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ﴾ [فاطر: ٢٩] ''یقیناً وہ لوگ جو کتاب اللہ کو پڑھتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں، اور ہمارے دیئے ہوئے سے خرچ کرتے ہیں، پوشیدہ بھی اور ظاہری بھی۔ وہ ایسی تجارت کی امید رکھتے ہیں جس میں ہرگز خسارہ نہ ہوگا''۔ یہ آیت دو معانی کو جمع کرنے والی ہے! باری تعالیٰ کا فرمان ﴿أقاموا﴾ [فاطر: ٢٩] اور ﴿أنفقوا﴾ دونوں ماضی ہیں اور یتلون پر عطف ہے جو کہ مضارع ہے تو یہ تلاوت میں دوام اور استمرار پر دلالت کرتا ہے جو نتیجہ خیز عمل میں تجدید کی باعث ہے جس سے امید کے ساتھ نفع مند تجارت ہوگی۔

اور ابن حجرؒ نے یہاں کلام میں مبالغہ کرتے ہوئے فقہی فروع کا ذکر کر کے جو کہ قرآن کے متعلقہ ہیں، قرآن کے ساتھ تکیہ لگانا اور اس کے کی حرمت کے بارے میں اور قرآن پر کوئی چیز رکھنے کے بارے میں اور اس کی طرف پیٹھ پھیرنے اور اس کے روندنے اور اس کو نشانہ بنانے اور اس کے لفظوں کی حرمت کے بارے اور اس کو چومنے کے جواز اور اس سے فال لینے کی کراہت کے بارے اور فال کی حرمت بعض مالکیہ سے بھی ثابت ہے۔ اور بعض حنابلہ اس کے جواز کے بھی قائل ہیں اور اس کی امثلہ اپنی جگہ پر فتاویٰ اور خلافیات کی کتابوں میں موجود ہیں۔

انہیں اس بحث میں ائمہ کے کلام پر بھروسا نہیں ہے، اور صرف اپنے فہم سے بات کی ہے جو کہ اچھا نہیں ہے۔ اور وہ عدم فہم پر مبنی ہے۔ کلام الطیبیؒ اھ۔

ائمہ کا کلام فروع فقیہ میں ہے اور آدمی جس کو نہیں جانتا اس کا دشمن ہوتا ہے۔ ﴿وقد علم کل اُناس مشربهم﴾ [البقرة: ٦٠]، ﴿وکل حزب بما لدیهم فرحون﴾۔ برتن میں جو ہوتا ہے وہی اچھلتا ہے۔

افشوه : یعنی اونچا پڑھنے کے ساتھ اور تعلیم کے لئے اور عمل کے ساتھ اور لکھنے کے ذریعے اور اس کی تعظیم کر کے۔

وتغنوه : یعنی غناء کے علاوہ دوسری اچھی طرز پر پڑھو، جیسا کہ گزر چکا ہے۔

وتدبروا ما فيه : یعنی فضیلت والی آیات میں اور زجر و توبیخ میں اور مکمل وعدوں اور وعیدوں میں۔

لعلكم تفلحون : تا کہ تم فلاح پاؤ۔ یا اس حال میں کہ تم فلاح کے لئے پُر امید ہو جاؤ۔ اور وہی کامیابی مطلوب ہے۔

ولا تعجلوا : جیم مشدد مکسورہ اور ایک نسخہ میں ''ت'' بھی مفتوح ہے، اور جیم بھی مفتوح مشدد ہے۔ یعنی اس کا ثواب جلدی نہ طلب کرو۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: یعنی جلدی دنیاوی سامان نہ بناؤ۔

فان له ثوابًا : یعنی آخرت میں بہت بڑا ثواب ہے۔

باب اختلاف القراءت وجمع القرآن

اختلافِ قراءت اور جمع القران کا بیان

الفصل الاول :

قرآن کریم کو سات قراءتوں میں پڑھنے کی اجازت ہے

۲۲۱۱ : عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ سَمِعْتُ هِشَامَ بْنَ حَكِيمِ بْنِ حِزَامٍ يَقْرَأُ سُوْرَةَ الْفُرْقَانِ عَلٰى غَيْرِ مَا اَقْرَأُهَا وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَقْرَأَنِيهَا فَكِدْتُ اَنْ اَعْجَلَ عَلَيْهِ ثُمَّ اَمْهَلْتُهُ حَتّٰى انْصَرَفَ ثُمَّ لَبَّبْتُهُ بِرِدَائِهِ فَجِئْتُ بِهٖ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّيْ سَمِعْتُ هٰذَا يَقْرَأُ سُوْرَةَ الْفُرْقَانِ عَلٰى غَيْرِ مَا اَقْرَأْتَنِيهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَرْسِلْهُ اِقْرَأْ فَقَرَأَ الْقِرَاءَةَ الَّتِيْ سَمِعْتُهُ يَقْرَأُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ هٰكَذَا اُنْزِلَتْ ثُمَّ قَالَ لِيْ اِقْرَأْ فَقَرَأْتُ فَقَالَ هٰكَذَا اُنْزِلَتْ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ اُنْزِلَ عَلٰى سَبْعَةِ اَحْرُفٍ فَاقْرَأُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ۵/۷۰ حديث رقم ۲۴۳۰۔ واحمد في المسند ۱/۴۱۲۔

ترجمہ: ''(امیر المؤمنین) حضرت عمر بن الخطابؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ہشام بن حکیم بن حزامؓ کو سنا کہ وہ سورۂ فرقان اس انداز کے خلاف پڑھ رہے تھے جس طریقہ کے مطابق میں پڑھتا ہوں اور جس طریقہ سے نبی کریم ﷺ نے وہ سورت مجھے سکھائی تھی تو قریب تھا کہ میں ان کی طرف جھپٹ پڑوں یعنی قراءت ختم کرنے سے پہلے ہی میں ان سے لڑ پڑوں یعنی تعرض کروں مگر پھر میں نے ان کو اتنی مہلت دی کہ وہ پڑھنے سے فارغ ہوئے اس کے بعد میں نے ان کی چادر ان کی گردن میں ڈالی اور انہیں کھینچتا ہوا نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لایا اور عرض کیا کہ ''یا رسول اللہ'' میں نے سنا ہے کہ یہ سورت فرقان اس انداز کے خلاف پڑھ رہا ہے' جس طریقہ سے آپ ﷺ نے مجھے وہ سورت پڑھائی ہے'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''عمر! انہیں چھوڑ دو'' پھر ہشامؓ سے کہا کہ تم پڑھو' پھر ہشامؓ نے اسی انداز سے پڑھا جس انداز سے میں نے انہیں پڑھتے سنا تو نبی کریم ﷺ نے ان کی قراءت سن کر فرمایا کہ ''یہ سورت اس طرح اتاری گئی ہے'' پھر مجھ سے فرمایا کہ ''اب تم پڑھو' چنانچہ میں نے پڑھا تو فرمایا کہ ''یہ سورت اس طرح اتاری گئی ہے یاد رکھو کہ یہ قرآن سات طریقہ (سات لہجوں میں مجھ پر اتارا گیا ہے لہٰذا ان میں سے جس طریقہ پر آسان ہو پڑھو!۔'' (اس روایت کو بخاری و مسلم نے نقل کیا ہے مگر الفاظ مسلم کے ہیں)۔

تشریح: **عن عمر بن الخطاب رضي الله عنه قال سمعت هشام بن حكيم بن حزام** : زاء سے پہلے حاء کے کسرہ کے ساتھ۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: حکیم بن حزام قریشی ہیں، اور وہ ام المؤمنین خدیجہ الکبریٰ کے چچا زاد بھائی تھے۔ اور وہ جاہلیت اور اسلام دونوں ادوار میں قریش کے اشراف میں سے تھے، فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا اور ان کی اولاد کو بھی رسول اللہ کا صحابی ہونے کا شرف حاصل ہے۔

يقرأ سورة الفرقان على غير ما أقرأها : یعنی قراءت سے۔

وكان رسولُ اللّٰه ﷺ أقرأنيها : یعنی سورۃ الفرقان۔

فكدت أن اعجل عليه : ہمزہ اور جیم کے فتحہ کے ساتھ۔ اور ایک نسخہ میں جیم مشدد ہے، یعنی میں قریب تھا کہ اس سے جھگڑ پڑتا، یا الجھ پڑتا۔ اور میرا اس پر غصہ ظاہر ہوا قراءت کے دوران جلدی کی وجہ سے۔

ثم أمهلته حتى انصرف : یعنی قراءت سے۔

ثم لببته : تشدید کے ساتھ باب تفعیل سے ہے۔

بردائه : یعنی میں شروع ہوا ان کی گردن کو پکڑنے اور اس کو کھینچنے لگا۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: کہ **لببت الرجل تلبيبًا**، تب کہا جائے جب کپڑے جمع کر لئے جائے جھگڑے سے پہلے۔ **ثم جررته**، یہ قول ان کے قرآن کے ساتھ اہتمام پر دلالت کرتا ہے، اور جس طرح سنا ہو اسی طرح اس کو یاد رکھنے پر محافظت کی دلیل ہے۔ اور اس سے بغیر انحراف کیے جس کو عرب نے جائز کیا ہے۔

فجئت به رسول الله ﷺ : یعنی الیہ آپ کی طرف۔

فقلت يا رسول الله انى سمعت هذا يقرأ سورة الفرقان على غير ما أقراء تنيها : کہا جاتا ہے کہ قرآن لغت قریش میں نازل ہوا، لیکن جب دوسروں لغتوں والوں پر گراں گزرا، تو قراءت میں سات مشہور قبائل کی لغات کی اجازت مل گئی۔ جیسا کہ اصول فقہ میں مذکور ہے، اور یہ سات سے زیادہ لغات کی قراءت کی نفی نہیں کرتا، ہر قبیلہ کی لغت کے مختلف ہونے کی وجہ سے اگر چہ وہ چھوٹا ہی کیوں نہ ہو، اور لغات میں اختلاف کے ممکن ہونے کی وجہ سے اور ایک قول یہ ہے کہ موجودہ تمام قرءآت ان حروف سے ایک ہی لغت ہے اور باقی چھ متروک ہوچکی ہیں' اس قول کے قائل طیبیؒ ہیں۔ اور ظاہری بات ہے کہ یہ بات صرف ایک قول کی حیثیت ہی رکھتی ہے، اور حرف واحد سے مراد وہ نوع جو ان حروف کے مجموع سے بنائی گئی ہے مختار ہے اور جو ان کے علاوہ وہ منسوخ ہیں۔

اور وہ وہی ہے جو مصحف عثمانؓ میں جمع کی گئی، اور پہلا نسخہ ابوبکر صدیقؓ کے جمع کردہ مصحف کے موافق ہے۔

فقال رسول الله ﷺ أرسله : یعنی اے عمر! اور حضرت عمرؓ کے اس فعل پر نرمی اس لئے اختیار کیا گیا کہ انہوں نے کسی ذاتی دشمنی کی وجہ سے یہ کام نہیں کیا تھا، بلکہ اپنے گمان کے مطابق بعض للہ یہ کام کیا تھا۔ اور رہا ابن حجرؒ کا قول کہ حضرت عمرؓ کی نسبت ہشام کے لئے اس طرح تھی جیسے کسی معلم کی متعلّم کے لئے تو یہ قول مردود ہے کیونکہ کوئی بھی معلم پہلی ہی دفعہ اپنے شاگرد کے ساتھ اس طرح نہیں پیش آتا۔

اقرأ : یعنی اے ہشام! **فقرأ :** یعنی ہشام نے۔ **القرأة التى سمعته :** یعنی **سمعت هشامًا اياه**، مفعول ثانی کو حذف کیا گیا۔

يقرأ : یعنی **يقرأها** وہی سورت پڑھنے لگے۔ **فقال رسول الله ﷺ هكذا أنزلت :** یعنی یہ سورت یا قراءت۔

ثم قال لى اقرأ. فقراء ت فقال هكذا أنزلت : یعنی جبریل کی زبانی، جیسا کہ ظاہر ہے، یا اسی طرح اختیاری نازل کی گئی۔

ان هذا القرآن : یعنی مکمل قرآن۔

أنزل على سبعة احرف : یعنی سات لغات یا سات قراءتیں یا سات اقسام پر۔ کہا گیا ہے کہ اس کے معنی میں اکتالیس (۴۱) اقوال میں اختلاف کیا گیا ہے، یعنی اکتالیس مختلف اقوال اس کے معنی میں وارد ہوئے ہیں، ان میں سے ...... مثلاً ایک یہ کہ اس کا معنی نہیں جانا جاسکتا۔ دوسرا یہ کہ حرف کا لفظ لغوی طور پر حرف ہجا، کلمہ معنی اور جہت پر صادق آتا ہے۔ علماء فرماتے ہیں، کہ یقیناً قراءتیں اگر سات سے زیادہ بھی ہوں وہ اختلافات میں سے سات وجوہات کی طرف ہی راجع ہیں۔

پہلی بذات خود کلمہ کا اختلاف کسی زیادتی یا نقصان کے ساتھ جیسے باری تعالیٰ کا قول ﴿ننشزها. وننشرها﴾ [البقرة: ۲۵۹] اور ﴿سارعوا. وسارعوا﴾ [آل عمران: ۱۳۳]

دوسری واحد اور جمع کا تغیر جیسے ﴿كتبه، كتابه﴾ [البقرة: ۲۸۵]

تیسری وجہ مذکر اور مونث کا اختلاف جیسے کہ ﴿يكن ، نكن﴾ میں۔

چوتھی وجہ حرفی اختلاف یعنی تشدید اور تخفیف کا فرق جیسے (يكذبون، يكذّبون) [البقرة: ۱۰] اور فتحہ اور کسرہ کا اختلاف جیسے

(یقنُط، یقنَط)۔

پانچویں وجہ اعراب کا اختلاف جیسے باری تعالیٰ کا قول ﴿ذو العرشِ المجیدُ﴾ [البروج: ۱۵] دال پر رفع اور جر میں۔

چھٹی وجہ اداۃ کا اختلاف جیسے (لکن الشیطینَ) [البقرۃ: ۱۰۲] نون مشدد اور مخفف دونوں طرح۔

ساتویں وجہ لغات کا اختلاف تفخیم اور امالہ یعنی پُر پڑھنا اور باریک پڑھنا۔

اگر ان میں سے کوئی نہ ہو تو قرآن میں کوئی بھی کلمہ ایسا نہیں پایا جاتا، جو ان سات وجوہات کے علاوہ پڑھا جاتا ہو، سوائے چند ایک کے جیسے عَبُد الطاغوت اور ولا تقل لھا اف [الاسراء: ۲۳] اور یہ سب کچھ اس امت مرحومہ کی آسانی کی خاطر ہے۔ اسی لئے آپ علیہ السلام نے فرمایا: فاقرأوا ما تیسر منه کہ اس قرآن سے جو تمہیں آسان لگے پڑھو۔ یعنی قراءتوں کی اقسام میں سے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے برخلاف ﴿فاقرأوا ما تیسر منه﴾ [المزمل: ۲۰] کیونکہ اس کے عموم سے مراد مقدار، جنس اور نوع ہے۔

اور حاصل کلام یہ ہے کہ آپ علیہ السلام نے اجازت دی ہے کہ اس طرح پڑھیں، جس طرح آپ علیہ السلام سے تواتر سے ثابت ہے، آپ علیہ السلام کے اس قول کی دلیل کے ساتھ "انزل علی سبعة احرف" کہ قرآن سات لغتوں میں نازل ہوا ہے اور زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ سات کے عدد سے مراد تکثیر ہے کہ تحدید یعنی متعین حد۔ پس کیونکہ یہ اقوال میں سے کسی قول پر نہیں رہا جا سکتا۔

امام نوویؒ صحیح مسلم کی شرح میں لکھتے ہیں: ان اقوال میں سے صحیح ترین اور حدیث کے معنی کے قریب اس کا قول ہے جیسا کہ کہا اس سے مراد کلمات کے بولنے کی کیفیت ہے ادغام، اظہار، موٹا پڑھنے اور باریک پڑھنے اور امالہ کرنے میں، اور مدّ اور قصر اور نرمی سے حروف کا اداء کرنا ہے کیونکہ عربوں کی لغات ان وجوہات میں مختلف تھیں، تو اللہ نے ان پر آسانی فرما دی کہ ہر ایک اپنی لغت کے موافق پڑھے، اور جو اس کی زبان پر آسان ہو اسی لغت میں پڑھے۔

اور اس میں یہ بھی ہے کہ یہ اس کے اطلاق پر نہیں ہے، کیونکہ ادغام مثلاً کئی جگہوں پر اس کا اظہار جائز نہیں اور کئی مقامات ایسے ہیں جہاں ادغام جائز نہیں، اور اسی طرح باقی صفات کو سمجھ لو۔

اور اس میں یہ بھی ہے کہ لغات کا اختلاف صرف انہی وجوہات میں منحصر نہیں ہے، وہ وجوہات جو میم جمع اور قصر کے لئے ہے۔ اور ضمیر "ھا" مکمل کرتی اور اس کا ترک کر دینا وہ بعض کے اتفاق پر ہے۔

جیسے کہ البخل اور والبخل کے اختلاف کی طرح اور یحسب اور یقنط اور "الصراط اور السراط" رہا وہ قول جو ابن عبد البر سے منقول ہے اور اس کو انہوں نے اکثر علماء رحمہم اللہ کی طرف منسوب کیا ہے "کہ سات سے مراد معانی متفقہ کی سات وجہیں الفاظ کے اختلاف کے ساتھ ہیں" جیسے: أقبل وتعال اور عجل وھم وأسرع سب ایک ہی معنی میں ہیں پس لفظ کو اس کے مترادف لفظ سے بدلنا جائز ہے یا جو اس کے معنی کے قریب ہو نہ کہ اس کے الٹ سے بدلنا جائز ہے۔ اور احمد کی جید سند والی حدیث اس بارے میں صریح ہے اور اسی طرح امام احمد کے پاس جید سند والی حدیث ابو ہریرہ سے مروی ہے "انزل القرآن علی سبعة احرف: علیما حکیما غفورا رحیما"۔ کہ قرآن سات حروف پر نازل ہوا علیمًا، حکیما، غفورا رحیمًا، اور احمد کی ایک حدیث جو کہ جید سند کے ساتھ ہے اس میں ہے کہ قرآن سارے کا سارا درست ہے جب تک مغفرت کو عذاب یا عذاب کو مغفرت نہ بنا دے، اور اسی لئے ابی بن کعب کلما اضاء لھم مشوا فیه [البقرۃ: ۲۰] کو کلما اضاء لھم سعوا فیه پڑھتے تھے۔ اور ابن مسعودؓ انظرونا [الحدید: ۱۳] کی جگہ امھلونا أخرونا پڑھتے تھے۔ اور اس بحث میں یہ بھی ہے کہ صحابہ سے ایسا ہونا بہت بعید ہے خصوصاً اُبی اور ابن مسعود سے کہ وہ اپنے پاس سے لفظ بدل دیتے تھے، اس کے بجائے جو انہوں نے نبی علیہ السلام سے سنا ہوتا تھا اور اس کو اپنی تلاوت میں قائم رکھتے۔

صحیح بات یہ ہے کہ یہ الفاظ ان کی تفسیر ہوا کرتی تھی، یا ان دونوں نے رسول اللہ ﷺ سے مختلف قراءآت سنی ہوں، ایک مرتبہ اس طرح اور دوسری مرتب اُس طرح۔ جیسا کہ اب بھی قراء کے ہاں قرآن میں اختلاف کی بناء پر قراءت کی مختلف اقسام معروف ہیں۔

اوراسی طرح امام طحاویؒ فرماتے ہیں: کہ یہ رخصت صرف اس وقت تھی جب اکثریت کے لئے ایک ہی قراءت پر تلاوت مشکل تھی، اور کتابت کا علم نہ ہونے کی وجہ سے عدم ضبط اور عدم اتقان حفظ ہونے کی وجہ سے پھر عذر ختم ہونے سے اور کتابت اور یاد کرنے میں آسانی کی وجہ سے یہ حکم منسوخ ہوگا، اوراسی طرح ابن عبدالبر، باقلانی اور دیگر نے کہا ہے۔ یہ اور گویا کہ آپ علیہ السلام کے لئے واضح کردیا گیا تھا، کہ آپ کی امت میں قراءت متواترہ سات حروف پر قائم رہے گی، اور وہی اب موجود ہے جس کے تواتر پر اتفاق ہے۔

اور جمہور کہتے ہیں: اس موجود قراءت کے علاوہ جو ہے وہ شاذ ہے اس کی قراءت جائز نہیں۔ بالمعنی یہ روایت متفق ہے۔

۔۔ حدیث کہ "نزل القرآن علی سبعة أحرف" کہ قرآن سات حروف پر نازل ہوا۔ ابوعبیدہ نے اس کے تواتر کا دعویٰ کیا ہے کیونکہ یہ روایت اکیس (۲۱) صحابہ کرام سے مروی ہے، اور تواتر سے اس کی مراد التواتر اللفظی ہے، رہا مسئلہ تواتر معنوی کا تو اس میں کوئی اختلاف نہیں، اور صحیحین یعنی بخاری ومسلم کی حدیث میں وارد ہے، کہ جبرئیل نے مجھے ایک لغت پر پڑھایا، میں مراجع کرتا رہا پس میں ان سے اور زیادہ کا مطالبہ کرتا رہا اور وہ مجھے زیادہ کرتے رہے۔ حتی کہ سات قراءتوں تک پہنچ گیا"۔

اور مسلم کی ایک روایت میں ہے "فرددت الیه ان هوّن علی امتی فأرسل الی أن أقرأه علی سبعة أحرف". میں اللہ کی طرف بار بار لوٹاتا رہا کہ میری امت پر آسانی کرو، تو اللہ نے میری طرف پیغام بھیجا کہ میں اس قرآن کو سات حروف پر پڑھوں"۔ علماء فرماتے ہیں: کہ قرآن کا سات حروف پر نازل ہونے کا سبب تخفیف اور آسانی ہے۔ اسی لئے آپ علیہ السلام نے فرمایا: "هوّن علی امتی" میری امت پر آسانی کرو۔ اور جیسا کہ دوسری حدیث میں اس کی صراحت ان الفاظ سے فرمادی: "فاقرأوا ما تیسر منه".

قراءت میں اختلاف کرنے کی ممانعت

۲۲۱۳ . وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ سَمِعْتُ رَجُلاً قَرأَ وَسَمِعْتُ النَّبِیَّ ﷺ یَقْرَأُ خِلاَفَهَا فَجِئْتُ بِهِ النَّبِیَّ ﷺ فَاَخْبَرْتُهٗ فَعَرَفْتُ فِیْ وَجْهِهِ الْكَرَاهِيَةَ فَقَالَ كِلاَ كُمَا مُحْسِنٌ فَلاَ تَخْتَلِفُوْا فَإِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ اِخْتَلَفُوْا فَهَلَكُوْا۔ (رواه البخاری)

ترجمہ: "حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں نے ایک شخص کو قرآن پڑھتے ہوئے سنا اور نبی کریم ﷺ کو سنا کہ آپ ﷺ کی قراءت اس شخص کی قراءت سے مختلف تھی چنانچہ میں اس شخص کو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لے آیا اور میں نے آپ ﷺ کو بتایا پھر میں نے محسوس کیا کہ آپ ﷺ کے چہرہ مبارک پر ناگواری کے آثار نمایاں ہے' بہرکیف آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم دونوں صحیح اور اچھا پڑھتے ہو (یعنی تم دونوں درست ہو) آپس میں اختلاف نہ کرو کیونکہ جو لوگ تم سے پہلے گزر چکے ہیں یعنی پہلی امتوں کے لوگ وہ آپس کے اختلاف کی وجہ سے ہلاک ہو گئے یعنی وہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کو جھٹلایا کرتے تھے۔" (بخاری)

تشریح: وعن ابن مسعود قال: سمعت رجلا قرأ وسمعت النبی ﷺ یقرأ لا خلافها : یعنی اس آدمی کی قراءت کے علاوہ اور ضمیر اس مصدری معنی کی طرف راجع ہے۔ جو من قراء سے سمجھ آرہا ہے۔

فجئت به : یعنی میں نے اس کو پیش کیا۔

النبی ﷺ فاخبرته : یعنی جو میں نے اس سے رسول اللہ کے قراءت کے خلاف دوسری قراءت سنی۔

فعرفت فی وجهه الکراهیة : ی، مخفف ہے، نہ کہ مشدد یعنی ناپسندیدگی کے آثار دیکھے اختلاف کرنے کی وجہ سے خوف محسوس کرتے ہوئے اہل کتاب کے اختلافات کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے۔

کیونکہ صحابہ سارے عدول ہیں اور ان کا نقل کرنا بھی صحیح ہی ہوگا، تو اس میں اختلاف کی تو کوئی وجہ ہی نہیں ہے۔

فقال: کلا کما محسن : یعنی قراءت کے روایت کرنے میں۔طیبیؒ فرماتے ہیں: کہ آدمی کے بارے میں جو کہا کہ محسن ہے تو اس کی قراءت کے بارے میں فرمایا اور جو ابن مسعود کو کہا تو وہ ان کے نبی علیہ السلام سے سماع کے بارے میں فرمایا۔اور کراھة نا پسندیدگی کا اظہار یہ جھگڑے کی طرف.....حق تو یہ تھا کہ ابن مسعودؓ اس کی قراءت پر پڑھتے اور پھر نبی علیہ السلام سے سوال کرتے، اھ۔

اور اس میں یہ بحث بھی ہے کہ اگر وہ ان کی قراءت پر پڑھتے بھی تو وہ قراءت متواترہ نہیں ہوتی تھی، بلکہ خبر آحاد اور شاذ ہوتی اور شواذ کے ساتھ قراءت جائز نہیں ہے۔اور ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ آپ علیہ السلام نے ابن مسعودؓ کے اس آدمی کے ساتھ قرآن میں اختلاف کو اس لئے ناپسند فرمایا کہ قرآن کی قراءت مختلف وجوہات پر جائز تھی، اور ان بعض وجوہ کا انکار قرآن کا انکار تھا، جو کہ جائز نہیں۔

میں کہتا ہوں: کہ ابن مسعودؓ سے یہ کام مختلف قراءتوں کے جواز کے علم سے پہلے سرزد ہوا۔اگر اس طرح نہیں' تو یہ ناممکن بات ہے کہ وہ علم کے باوجود اس چیز کا انکار کریں، جس سے قرآن کا انکار لازم آتا ہے، اور وہ قرآن کے علم کے اعتبار سے جلیل القدر صحابہ میں سے تھے، اور احکام القرآن میں بھی ان میں سے سب سے زیادہ فقیہ تھے۔

اور اس سے اس کی تائید ہوتی ہے جو ہم نے ان کی قراءت کی تاویل کو پیچھے ذکر کیا ہے، کہ انظرونا کی جگہ أمهلونا اور أخرونا پڑتے تھے، اور شاید کے آپ علیہ السلام کے چہرے پر ناخوشگواری کے اثرات ابن مسعودؓ کے اس آدمی کو پیش کرنے کی وجہ سے تھے، کیونکہ ان کا حق بنتا تھا کہ اس کے ساتھ اچھا گمان رکھیں اور اس کے واقعہ کے بارے رسول اللہ ﷺ سے سوال کریں۔اور ممکن ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے یہی کام کیا تھا، تو اس وقت بھی آپ علیہ السلام کے چہرے پر ناخوشگواری کے اثرات نمودار ہوئے ہوں۔لیکن عمرؓ اپنے غصے کی شدت کی وجہ سے محسوس نہ کر سکے ہوں، یا آپ علیہ السلام نے ان پر بردباری کا مظاہرہ کیا ہو جب آپ علیہ السلام ان کو سخت غصہ کی حالت میں دیکھا تھا۔یا رسول اللہ ﷺ نے تعظیماً ان کو کچھ نہ کہا ہو کہ وہ جلیل القدر صحابہ میں سے تھے، اور یہ اس موضوع پر ان کی اہم خدمت ہے اور یہ زیادہ بہتر ہے اس سے جو ابن حجرؒ نے احتمال کے وجہ سے ذکر کیا ہے۔اور طیبیؒ پر اعتراض کیا ہے اس کے اس قول کے بارے میں ان الکراهه راجعة الی الجدال اور اللہ ہی اصل حالت کو خوب جاننے والا ہے۔

فلا تختلفوا : یعنی اے صحابہ! یا اے امت محمدیہ! اور تم روایت میں اپنے میں سے ایک دوسرے کی تصدیق کیا کرو۔معتبر شروط کے ساتھ۔

فان من کان قبلکم : یعنی یہود و نصاریٰ میں سے۔اختلفوا : آپس میں ایک دوسرے کی تکذیب کے ساتھ۔

فهلکوا : اپنی کتاب کو ضائع کرنے کی وجہ سے۔

قرآن کریم کی مختلف قراءت کا مسئلہ

۲۲۱۳:وَعَنْ اُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ قَالَ كُنْتُ فِي الْمَسْجِدِ فَدَخَلَ رَجُلٌ يُصَلِّي فَقَرَأَ قِرَاءَةً اَنْكَرْتُهَا عَلَيْهِ ثُمَّ دَخَلَ اٰخَرُ فَقَرَأَ قِرَاءَةً سِوٰى قِرَاءَةِ صَاحِبِهٖ فَلَمَّا قَضَيْنَا الصَّلٰوةَ دَخَلْنَا جَمِيْعًا عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ فَقُلْتُ اِنَّ هٰذَا قَرَأَ قِرَاءَةً اَنْكَرْتُهَا عَلَيْهِ وَدَخَلَ اٰخَرُ فَقَرَاَ سِوٰى قِرَاءَةِ صَاحِبِهٖ وأَمَرَهُمَا النَّبِيُّ ﷺ فَقَرَءَ افَحَسَّنَ شَانَهُمَا

فَسَقَطَ فِيْ نَفْسِيْ مِنَ التَّكْذِيْبِ وَلَا اِذْكُنْتُ فِي الْجَاهِلِيَّةِ فَلَمَّا رَاى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا قَدْ غَشِيَنِيْ ضَرَبَ فِيْ صَدْرِيْ فَفِضْتُ عَرَقًا وَكَاَنَّمَا اَنْظُرُ اِلَى اللّٰهِ فَرَقًا فَقَالَ لِيْ يَا اُبَيُّ اُرْسِلَ اِلَيَّ اَنِ اقْرَاِ الْقُرْاٰنَ عَلٰى حَرْفٍ فَرَدَدْتُ اِلَيْهِ اَنْ هَوِّنْ عَلٰى اُمَّتِيْ فَرَدَّ اِلَيَّ الثَّانِيَةَ اِقْرَاْهُ عَلٰى اُمَّتِيْ فَرُدَّ اِلَيَّ الثَّالِثَةَ اِقْرَاْهُ عَلٰى سَبْعَةِ اَحْرُفٍ وَلَكَ بِكُلِّ رِدَّةٍ رَدَدْتُهَا مَسْاَلَةٌ تَسْاَلُنِيْهَا فَقُلْتُ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِاُمَّتِيْ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِاُمَّتِيْ وَاَخَّرْتُ الثَّالِثَةَ لِيَوْمٍ يَرْغَبُ اِلَيَّ الْخَلْقُ كُلُّهُمْ حَتّٰى اِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۵۶۱/۱ حدیث رقم (۲۷۳۔ ۸۲۰)۔ واحمد فی المسند ۱۲۴/۵۔

ترجمہ: ''حضرت ابی ابن کعبؓ کہتے ہیں کہ میں مسجد میں تھا کہ ایک شخص وہاں آیا اور نماز پڑھنے لگا اس نے نماز ہی میں یا نماز کے بعد ایسے انداز سے قراءت پڑھی کہ میں نے اسے درست نہیں سمجھا پھر دوسرا آدمی آیا اور اس نے پہلے شخص کے خلاف طریقہ (یعنی دوسرے انداز سے) سے قراءت پڑھی جب ہم سب نماز سے فارغ ہو چکے تو نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوئے میں نے عرض کیا کہ حضرت'' اس شخص نے ایسی قراءت پڑھی ہے جسے میں نے درست نہیں سمجھا اس کے بعد یہ دوسرا شخص آیا اس نے پہلے شخص کے خلاف طریقہ یعنی برعکس سے قراءت پڑھی! نبی کریم ﷺ نے یہ سن کر دونوں کو اپنے سامنے قرآن پڑھنے کا حکم دیا ان دونوں نے پڑھا آپ ﷺ نے ان دونوں کی قراءت کی تحسین وتوثیق کی (یعنی سراہا) یہ دیکھ کر میرے دل میں اس بات کی تکذیب کا وسوسہ پیدا ہو گیا ایسا وسوسہ اور شبہ جو ایام جاہلیت میں پیدا نہیں ہوا تھا جب نبی کریم ﷺ نے میری یہ کیفیت دیکھی جو مجھ پر طاری تھی یعنی جب نبی کریم ﷺ کو معلوم ہوا کہ میرے دل میں تردد وشبہ پیدا ہو گیا ہے تو آپ ﷺ نے اپنا دست مبارک میرے سینے پر مارا تا کہ اس کی برکت سے وسوسہ ختم ہو جائے چنانچہ میں پسینے سے شرابور ہو گیا اور خوف کی وجہ سے میری ایسی حالت ہو گئی کہ گویا میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں اس کے بعد آپ ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ ابی! جب قرآن نازل ہوا تو میرے پاس حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ یہ حکم بھیجا گیا کہ میں ایک طریقہ یعنی ایک قراءت یا ایک لغت پر قرآن پڑھوں میں نے بارگاہ الوہیت (یعنی اللہ کے حضور) میں درخواست پیش کی کہ میری امت پر آسانی فرمائی جائے۔ چنانچہ دوسری مرتبہ مجھے یہ حکم دیا گیا کہ میں دو قراءتوں پر قرآن پڑھوں! میں نے پھر درخواست پیش کی کہ میری امت کو مزید آسانی عطا فرمائی جائے چنانچہ تیسری مرتبہ مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں قرآن کریم کو سات لہجوں میں سے یعنی سات لغات یا سات قراءت کے مطابق پڑھوں اور یہ بھی فرمایا گیا کہ جتنی مرتبہ ہم نے آپ ﷺ کو حکم دیا اتنی ہی مرتبہ آپؐ ہم سے دعا مانگئے ہم اسے قبول کریں گے چنانچہ میں نے اللہ کے دربار میں دو مرتبہ یہ دعا کی کہ اے اللہ میری اُمت کو بخش دے اے اللہ میری امت کو بخش دے اور تیسری دعا میں نے اس دن کے لئے رکھ چھوڑی ہے جس دن مخلوق مجھ سے سفارش وشفاعت کی خواہش کرے گی یہاں تک کہ حضرت ابراہیم بھی مجھ سے شفاعت کی رغبت کریں گے۔''

تشریح: **وعن ابی بن کعب قال کنت فی المسجد فدخل رجل یصلی** : جملہ مستانفہ ہے یا حالیہ ہے۔

فقرأ قراءۃ : یعنی اپنی نماز میں یا نماز کے بعد۔

انکرتها علیه : یعنی دل میں یا زبان سے۔

ثم دخل آخر فقرأ قراءۃ سوی قراءۃ صاحبه : یعنی اس پر بھی میں نے تنکیر کی۔ انکار کیا۔

فلما قضينا الصلاة : یہ اس بات پر دلیل ہے کہ ابی بن کعب بھی نماز میں تھے اور ظاہر ہے کہ وہ چاشت کی نماز تھی یا اس کے علاوہ کوئی نفلی نماز تھی اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کی تقدیری عبارت ہو: ''**فلما قضينا جميعاً الصلاة المفروضة التي حضرنا لاجلها**''، کہ جب ہم سب اس فرض نماز سے فارغ ہوئے جس کے لئے ہم حاضر ہوئے تھے۔ اور پہلا معنی اس کی تائید کرتا ہے، جو کہ نسخہ میں ہے، یعنی جب **فلما قضينا الصلاة** ہم نماز سے فارغ ہوئے۔

دخلنا جميعًا : یعنی ہم سب یا جمع ہوئے تھے وہ سب۔

علي رسول الله ﷺ : یعنی مسجد میں اپنی نماز کی مخصوص جگہ پر یا آپؐ کے حجروں میں سے کسی حجرے میں۔

فقلت: ان هذا لما دخل المسجد قرأ قراء ة أنكرتها عليه ودخل آخر فقرأ سوى قراء ة صاحبه : یعنی میں نے اس پر بھی تنکیر کی جیسا کہ کلام کے سیاق وسباق سے ظاہر ہے۔

فأمرهما النبي ﷺ فقرآ : تثنیہ کے لفظ کے ساتھ، یعنی ان دونوں نے۔

فحسن شأنهما فسقط في نفسي من التكذيب : سید جمال الدین فرماتے ہیں: مشکاۃ کے اکثر نسخوں میں مجہول کا صیغہ ہے، لیکن ہمارے سماع کے مطابق صحیح مسلم کی روایت میں فعل معروف کا صیغہ ہے۔

میں کہتا ہوں: پہلا قول اس کی تائید کرتا ہے، جو مصابیح کے شارحین نے نقل کیا ہے۔ ابن الملکؒ وغیرہ کی طرح یعنی مجہول کے صیغے کی اور فی المعنیٰ یہ صحیح ہے جیسا کہ عنقریب آپ کے سامنے واضح ہو جائے گا، پس روایت اور درایت میں مطابقت ہو جائے گی، اور علامہ ابن حجرؒ دوسرے قول کے قائل ہیں، کیونکہ انہوں نے فرمایا کہ: **اى وقع في خاطرى امر عظيم لا اقدر على وصفه**، یعنی میرے نفس میں ایک بہت بڑی بات پیدا ہوگئی۔ جس کی صفت بیان کرنے پر میں قدرت نہیں رکھتا اور فاعل معلوم کو حذف کرنا جائز ہے۔ کے خیال سے کنایہ میں دل کو معانی میں استعمال ہے، اجسام کے سقط کے ساتھ جو مستعمل ہیں، یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ دل پر سخت اور ثقیل ہیں۔

اور اگر زیادہ کیا جائے اور کہا جائے: اس خاطر کا سقوط غیر اختیاری ہے۔ اہل حل وعقد کے ہاں بروزن اعتبار حسن ہوگا' سقط کے لئے۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: بعض نسخوں میں **سُقِط** مجہول کا صیغہ ہے یعنی پشیمان ہوئے۔ پس تدبر کیجئے۔ پس اس میں کوئی مضائقہ نہیں، اھ۔ گویا کہ ابی بن کعب کو وہم ہوا کہ ان کا قول شاید جھوٹ پر مبنی ہے، کہ آپ علیہ السلام نے انکار کیا ہے اس سے۔ پس تدبر کیجئے۔

ولا اذ كنت في الجاهلية : طیبیؒ فرماتے ہیں: کہ یعنی میرے دل میں نبی علیہ السلام کی تکذیب کا کھٹکا پیدا ہوا کہ انہوں نے دونوں کی قراءت کو صحیح کہہ دیا، جیسے میں اسلام سے قبل تکذیب کرتا تھا۔ کیونکہ اسلام سے قبل وہ غافل تھے یا شک میں تھے اور اس حالت کو بڑا اس لئے سمجھا کیونکہ دین کے معاملہ میں جوان کو شک داخل ہوا تھا تو وہ یقین کے ساتھ تھا۔

اور ایک قول یہ بھی ہے کہ **سقط** کا فاعل محذوف ہے یعنی میرے دل میں ایسی تکذیب کا کھٹکا پیدا ہوا، جس کی صفت بیان کرنے کی میں قدرت نہیں رکھتا۔ اور میں نے اس کی مثل پہلے کبھی محسوس نہ کیا تھا اور نہ ہی میں نے اس جیسی کوئی چیز پائی، جب کہ میں جاہلیت کے دور میں تھا اور ابی بن کعب اکابرین صحابہ میں سے تھے، اور جو چیز ان کے دل میں کھٹکی تھی وہ شیطان کا کچوکا تھا، پس جب ان کو نبی علیہ السلام کے ہاتھ مبارک کی برکت پہنچی' تو ان سے غفلت اور انکار زائل ہوگئی۔ اور وہ گویا ایسے ہوگئے جس طرح اس جگہ پر حاضر اور مشاہدہ کیا اور اس میں ابن الملکؒ بھی اسی قول کے قائل ہیں۔ اور فرماتے ہیں: میں نے تکمل اور پہچان کے بعد اس کی اتباع کی ہے۔ اور ان دونوں کے کلام کا حاصل نعوذ باللہ آپؐ کی تکفیر ہے، اور یہ قبیح حرکت اور بہت بڑی جرأت ہے۔

جب کسی کی عبارت ننانوے وجوہات کے لحاظ سے کفر پر محمول ہوگی، اور ایک وجہ اس کے خلاف ہو' اس کے متعلق جائز نہیں کہ اُس

پر ارتداد کا حکم لگائیں۔ چہ جائیکہ اس بات پر حکم لگائیں جو صحابہ کرامؓ سے وارد ہوا اور جو قراءت کے بارے میں اکمل تھے اللہ کی توفیق کے ساتھ اس کے ہاتھ میں تحقیق کی لگام ہے۔

لفظ ''سقط'' اللہ تعالیٰ کے فرمان میں: ﴿ولما سقط فی أیدیھم﴾ [الاعراف: ۱۴۹] ضمہ کے ساتھ قراءت متواترہ سے ثابت ہے۔ روایت حدیث کو ان دونوں کے درمیان مطابقت پر محمول کیا جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿فی أیدیھم﴾ [الاعراف: ۱۴۹] اور آپ کا فرمان: ''فی نفسی'' ایک ہی معنی میں ہے۔ چونکہ اکثر نے ''أیدی'' کو نفس سے تعبیر کیا ہے، وگرنہ قرآن کی بلاغت اور اس کی فرقانی فصاحت انتہاء درجہ کی بلندی کو پہنچ چکی ہے۔ اور اس کو عبارت حسنیٰ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

قاضیؒ کہتے ہیں: یہ ان کی سخت ندامت وحسرت سے اشارہ ہے، حسرت کرنے والا اپنے ہاتھ کو غم کی وجہ سے کاٹے گا، پس اس کا ہاتھ اس میں سقوط ہو جائے گا۔ ''سقط'' کو مبنی علی الفاعل پڑھا گیا ہے۔ بمعنی کہ اس میں ہاتھ کو چبانا واقع ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ان کے نفسوں میں ندامت چھا جائے گی۔

قاموس میں ہے کہ ''سقط'' ''وقع'' کے معنی میں ہے، ضمہ کے ساتھ ندامت اور حیرانگی کے معنی میں ہے، ۔ایسی ندامت جو اسلام میں اس کی مثل نہیں، ۔فتحہ والی روایت کے مطابق اس کا معنی ان دونوں کی قراءت کی تکذیب پر میرے نفس میں ندامت واقع ہے اور عاقل صرف اس کی نفی کرتا ہے جو عقل اور نقل کے منافی ہو۔ جب ''صادق المصدوق ﷺ'' نے خبر دی ہے کہ وہ دونوں صحیح ہیں۔ تو اس جیسا سب کیسے درست ہے، جو ثابت شدہ نبوت جو معجزات سے ظاہر ہے اُس میں شک کا باعث ہو۔

پھر میں نے دیکھا ابن حجرؒ نے میری موافقت کی ہے۔ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ واؤ عطف کے لئے ہے اور معطوف علیہ منفی ہے اور أن لا اس نفی کی تاکید کے لئے ہے جیسے ''ولا غربیة''۔ ولا اذ کنت محذوف مصدر کی صفت ہے، چونکہ واؤ عاطفہ مانع ہے، اور حال بننا بھی جائز ہے کیونکہ وہ تکلف سے بعید ہے۔

اس میں ہے کہ اُس کا کلام وہم والا ہے، اُس کا کہ قرآن کی تکذیب واقع ہوئی ہے اور حالانکہ ایسا نہیں ہے چونکہ قراءت تواتر سے ثابت نہیں ہے۔ اس کا انکار قرآن کی تکذیب نہیں ہے گویا کہ اُس کی مراد تکذیب کی صورت ہے' حقیقتاً نہیں۔ باوجودیکہ یہ قلبی خطرات ہیں، چونکہ اس میں واقع ہو جانے والا معذور ہے۔ یہ نوویؒ کے قول کا معنی ہے۔ اس کا معنی ہے: شیطان نے میرے لئے تکذیب کا وسوسہ ڈالا اتنا سخت کہ میں اس کے متعلق لاعلم تھا۔ چونکہ جہالت میں وہ غافل اور شک میں تھا اس وقت شک یقین میں بدل گیا، اھ۔ گویا کہ ان کی مراد شک کا داخل ہونا وسوسہ کے لحاظ سے رات کی طرح تھا، پھر ان کا پہلا کلام' شک کے داخل ہونے سے وسوسہ لازم نہیں آتا، حصول اور تکرار کی وجہ پر۔ جیسا کہ ابن حجرؒ نے کہا ہے' آپ اُس پر غور وفکر اور تدبر کیجئے۔

فلما رأی رسول اللّٰہ ما قد غشینی : یعنی مجھ پر ندامت وخجالت کے آثار نمودار ہوئے جب رسول اللہ کو میرے دل کی کیفیت کا بسبب معجزہ علم ہو گیا جو وسوسہ پیدا ہوا تھا۔

ضرب فی صدری : یا تو ادب سکھانے کے لئے یا اپنے ہاتھ کی برکت کے ساتھ وسوسہ کو ختم کرنے کے لئے یا نرمی کے لئے اور، یا پھر حفظ کا ارادہ کرتے ہوئے، یا اس واقعہ کو یاد رکھنے کے لئے اور دوبارہ اس طرح کا کام نہ کرنے کے لئے۔

ففضت : دوسری فاء مکسور ہے۔

عرقا : تمیز بن رہا ہے یعنی میرے سارے بدن سے پسینے چھوٹ گئے، آپ علیہ السلام کے سامنے شرمسار (شرم کرتے ہوئے) ہونے کی وجہ سے، اور اپنے عمل پر ندامت کی وجہ سے، نفس کے کھپانے کی وجہ سے اور حالت کے اغماء کی وجہ سے۔

و كانما : ایک نسخہ میں فکانما ہے۔

أنظر الى الله فرقا : یعنی خوف کی وجہ سے، اس کے بارے میں ایک قول ہے کہ یہ تمیز ہے لیکن زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ بوجہ مفعول لہ منصوب ہے یعنی گویا کہ اپنے عمل پر خوف کی وجہ سے میں نے اپنے آپ کو اللہ کے سامنے پایا۔

فقال لی:یا ابی : یعنی تسلی دیتے ہوئے اور وضاحت و تبیین کی غرض سے۔

أرسل الیّ : فعل مجہول یعنی اللہ نے جبریل کو پیام دے کر بھیجا اور ایک نسخہ میں فعل معروف ہے، یعنی اللہ نے میری طرف پیغام بھیجا۔

أن أقرأ القرآن : امر کے صیغہ کے ساتھ اور ایک نسخہ میں فعل بھی معروف ہے صیغہ بھی متکلم کا۔طیبیؒ فرماتے ہیں: کہ نٔ تفسیر یہ ہے سیبویہ کے مذہب میں اس کے مصدریہ ہونے کو بھی جائز کہا گیا ہے۔اگر چہ امر پر ہی کیوں نہ داخل ہو۔

علی حرف : یعنی ایک ہی قراءت۔(**فرددت** : یعنی جبریل۔**الیه** : یا میں نے اللہ تعالیٰ کی طرف مراجعت کرلی۔

أن هوّن : یعنی آسانی کر، آسان و سہل کر۔

علی امتی : أن، مصدریہ ہے، اور اس کا امر پر داخل ہونا صحیح ہے کیونکہ سیبویہ کے نزدیک اس پر داخل ہوسکتا ہے، یا تفسیر یہ ہے معنیٰ قول کے ردّ میں۔کہا جاتا ردّ الیه جب لوٹائی جائے۔اور رہا ابن حجرؒ کا قول ای **فقلت له قولا متکررا**، یعنی میں نے ان کو تکرار کے ساتھ کہا۔تو ابن حجرؒ کے اس قول پر نہ کوئی روایت دلالت کرتی ہے اور نہ کوئی درایت۔

فرد الی الثانیة : ردّ، ماضی مجہول ہے یا معلوم ہے یعنی باری تعالیٰ نے دوسری مرتبہ وحی کی طرف لوٹا دیا۔

أقرأه : امر کا یا متکلم کا صیغہ ہے، اور وہ أن کے بغیر ہے جیسا کہ تصحیح شدہ نسخہ میں ہے۔اس کے برعکس جس کو ابن حجرؒ کی عبارت نے وہم میں ڈالدیا ہے۔

طیبیؒ فرماتے ہیں: ردّ ہے اس کا جو یا تو مشاکلت کے راستے پر ہے، یا جو گزر چکا ہے آپ سے سوال جو قراءت کی کیفیت کے بارے میں تھا۔

اور ردّ سے مراد کلام کو لوٹانا اور جواب دینا ہے۔

علی حرفین : یعنی دو قسموں پر۔

فرددت الیه أن هوّن علی أمتی : یعنی آسانی کر اضافہ سے۔**فرد** : دو وجہوں کے ساتھ۔

الی الثالثة. اقرأه : دو حالتوں کے ساتھ۔ **علی سبعة أحرف، ولك بكل ردّة رددتكها** :

مسألة تسألینها : ابن الملکؒ فرماتے ہیں: یہ جملہ صفت مؤکدہ ہے، یعنی قطعی طور پر مستجاب دعا ہے۔

اور طیبیؒ فرماتے ہیں: یعنی مناسب ہے کہ تو مجھ سے اس کے بارے میں سوال کرے اور میں تیرا سوال پورا کردوں۔

فقلت:اللهم اغفر لامتی : شاید کے اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کر بیٹھے ہیں۔

اللهم اغفر لامتی : یعنی صغیرہ گناہوں والوں کو۔

اور ابن حجرؒ نے اس کے برعکس مفہوم بیان کیا ہے، یعنی پہلی بار سے اہل الصغائر اور دوسری بار سے اہل الکبائر مراد ہیں۔اور شارح فرماتے ہیں: ضرورت مند آپؐ کے امت کے ورجہ بہ درجہ مغفرت میں منقسم ہیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اطاعت میں حد سے گزرنے والے کے لئے استغفار کی، اور دوسری طرف ظالم کے لئے جو معصیت میں، حد سے گزرنے والا ہے یا پھر پہلی دعا خواص کے لئے کیونکہ ہر ایک

میں کوئی نہ کوئی کوتاہی ہوتی ہے۔ باری تعالیٰ کے حقوق کے بارے میں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿ **كلا لما يقض ما امره** ﴾: ہرگز تم اس کے حکم کے تقاضے کے مطابق عمل نہیں کر سکتے۔

اور دوسری عام لوگوں کے لئے ہے یا پہلی دعا دنیا میں اور دوسری آخرت میں۔

وأخرت الثالثة : یعنی تیسری دعا اور وہ شفاعت کبریٰ ہے۔ **ليوم** : یعنی اس دن کی وجہ سے یا اس دن تک۔

يرغب : یعنی محتاج ہوتا ہے۔ **اِلَيّ** : ی، مشدد کے ساتھ۔ **الخلق** : یعنی مکلفین مراد ہیں۔

كلهم : جب یہ کہیں گے نفسی نفسی، یعنی ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی ہوگی۔

حتى ابراهيم عليه الصلوٰة والسلام : مرفوع ہے، کیونکہ اس کا عطف خلق پر ہے۔ اور اس میں تمام انبیاء پر ابراہیم علیہ السلام کی عظمت کی دلیل ہے۔ اور ہمارے نبی محمد رسول اللہ ﷺ کی تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام پر فضیلت کی دلیل بھی ہے۔

۲۲۱۴: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اَقْرَأَنِيْ جِبْرِيْلُ عَلٰى حَرْفٍ فَرَاجَعْتُهٗ فَلَمْ اَزَلْ اَسْتَزِيْدُهٗ وَيَزِيْدُنِيْ حَتّٰى انْتَهٰى اِلٰى سَبْعَةِ اَحْرُفٍ قَالَ ابْنُ شِهَابٍ بَلَغَنِيْ اَنَّ تِلْكَ السَّبْعَةُ الْاَحْرُفَ اِنَّمَا هِيَ فِي الْاَمْرِ تَكُوْنُ وَاحِدًا لَا تَخْتَلِفُ فِيْ حَلَالٍ وَلَا حَرَامٍ۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحيحه ١٣٤/٨۔ حديث رقم ٤٩٩١۔ وامسلم فی صحيحه ٥٦١/١ حديث رقم (٨١٩/٢٧٢) واحمد فی المسند ٢٦٤/١۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''حضرت جبرئیل علیہ السلام نے پہلی مرتبہ مجھے ایک قراءت یعنی ایک لہجہ پر قرآن پڑھایا پھر میں نے اپنی امت کی آسانی کے لئے اللہ کی طرف رجوع کیا اور میں آسانی کے لیے مسلسل زیادتی طلب کرتا رہا جس کے نتیجہ میں مجھے زیادہ آسانی حاصل ہوتی رہی یہاں تک کہ سات قراءتوں (یعنی سات لہجوں) تک نوبت پہنچ گئی اور یہ آخری فیصلہ دے دیا گیا کہ قرآن کریم سات لغات پر پڑھا جاسکتا ہے اس حدیث کے راوی ابن شہاب زہریؒ کہتے ہیں کہ یہ بات مجھ تک تحقیقی طور پر پہنچی ہے کہ قراءت کے یہ سات طریقے دینی احکام و امور میں متفق و متحد (یعنی دین کے معاملے میں ایک ہی ہیں) ہیں حلال و حرام میں ان سے کوئی اختلاف واقع نہیں ہوتا۔'' (بخاری و مسلم)

تشریح: **وعن ابن عباس قال: ان رسول الله ﷺ قال: اقرأني جبريل على حرف واحد** : یعنی پہلی بار۔

فراجعته : یعنی اللہ یا جبریل مراد ہیں۔

فلم أزل أستزيده : یعنی میں اللہ سے اور زیادہ طلب کرتا رہا، یا جبریل سے مطالبہ کرتا رہا کہ وہ اللہ سے اور زیادہ کا مطالبہ کریں قبولیت کے بعد۔

ويزدني، حتى انتهى : یعنی زیادہ کا مطالبہ اور قبولیت یا قرآن کا معاملہ (حکم)۔

الى سبعة احرف : یعنی ان کے عطا کرنے تک۔

قال ابن شهاب : یعنی امام زہری۔

بلغني أن تلك السبعة الأحرف : موصوف ہونے کی بناء پر منصوب ہے، اور اس کو اضافت کی بناء پر مجرور بھی کہا گیا ہے۔

انما هي في الأمر : یعنی فی الواقع اور نفس الامر میں۔ **تكون** : تانیث کے ساتھ اور مذکر بھی بولا جاسکتا ہے۔

واحدا لا يختلف : دووجہوں کے ساتھ۔

في حلال ولا حرام : یعنی تمام کا مرجع معنی میں ایک ہی ہے۔اور بے شک لفظ کا اختلاف اس کی ہیئت میں ہے اور رہا اختلاف مثبت منفی کا اور حلال وحرام کا تو یہ چیز قرآن میں جائز نہیں ہے، کیونکہ باری تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿**ولو كان من عند غير الله لوجدوا فيه اختلافا كثيرا**﴾ [النساء:۸۲] ''اگر یہ قرآن غیر اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہوتا تو ضرور وہ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے''۔

اور یہ قرآن جب ہے ہی اللہ کی طرف سے تو اس میں معمولی سا اختلاف بھی وہ نہ پائے۔اور ابن شہاب زہری نے اس قول کے ساتھ مشہور قول کے ردّ کا قصد کیا ہے۔ کہ سات حروف سے مراد یہ ہے کہ قرآن سات حصوں میں نازل ہوا۔

کہنے والوں نے پھر اختلاف کیا ہے کہ وہ سات حصے کون سے ہیں؟ بعض نے کہا کہ امر، نہی، حلال، حرام، محکم، متشابہ اور مثالیں اور انہوں نے حاکم اور بیہقی کی حدیث سے دلیل پکڑی ہے کہ: ''**كانت الاوّل تنزل من باب واحد على حرف واحد ونزل القرآن من سبعة أبواب على سبعة أحرف زاجرا وآمر وحلال وحرام ومحكم ومتشابه وأمثال**''. پہلی کتاب سماویہ ایک ہی دروازے سے نازل ہوتی تھیں، ایک ہی حرف پر، اور قرآن سات دروازوں سے نازل ہوا، سات حروف پر زاجر، آمر، حلال، حرام محکم، متشابہ، اُمثال۔اور کچھ لوگوں نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اس سے مراد مذکورہ بالا حدیث مبارکہ میں موجود احکام مراد نہیں ہیں، کیونکہ سیاق ان کو ان پر محمول کرنے کا انکاری ہے۔جب کہ اس سے ظاہر ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ دو لہجوں میں پڑھے یا تین میں' حتی کہ سات تک پڑھ سکتا ہے۔آسانی اور سہولت کی خاطر اور ایک ہی چیز کسی آیت میں حلال اور حرام نہیں ہو سکتی اور اس چیز کو بعض لوگوں نے بڑی تاکید سے بیان کیا ہے اور کہا کہ جس نے اس طرح کی تاویل کی، تو وہ فاسد ہے۔اور جن لوگوں نے اس قول کو ضعیف کہا ان میں ابن عطیہ بھی ہیں' فرماتے ہیں: کہ اس بات پر اجماع ہے کہ وسعت حلت کے بارے میں نہیں واقع ہوئی' اور نہ ہی حرمت کے بارے میں وسعت ہے اور نہ ہی مذکورہ بالا معانی میں سے کسی کے بدلنے کے بارے میں وسعت ہے اور ماوردی نے بھی اس کی تصریح کی ہے اور ان کے علاوہ کئی ایک نے کہا ہے۔

في الحديث زاجر، .... : یہ استئناف ہے' یعنی قرآن ڈانٹنے والا بھی ہے اور حکم دینے والا بھی ہے اور اس کی تائید روایت میں زاجر کا منصوب ہونا ہے، یعنی ''**نزل من سبعة أبواب على سبعة احرف، حال كونه زاجرا**''...... **زاجرا** حال ہے۔

ابو شامہ فرماتے ہیں: یہ بھی ممکن ہے کہ مذکورہ تفسیر ابواب کے لئے ہو نہ کہ حروف کے لئے یعنی **سبعة ابواب من أبواب الكلام وأقسامه**، یعنی قرآن کو اللہ تعالیٰ نے ان قسموں پر نازل کیا کسی ایک قسم پر اقتصار نہیں کیا۔قرآن کے علاوہ دوسری کتابوں کی طرح۔

اور وہ ظاہر اور واضح ہے۔اور رہی بات فقہ کے اصولیین کی، کہ ان اقسام سے مراد مطلق اور مقید، خاص اور عام، نص اور مؤول، ناسخ اور منسوخ اور مجمل اور مفسر اور استثناء اور اس کی اقسام ہیں۔اور اگر قرآن میں موجود ہیں تو اس میں نازل ہوئی ہیں، اگر اس میں موجود نہیں ہی تو ان کو اختیار پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔اور مفہوم تبدیل ہو سکتا ہے اس وجہ سے حدیث میں وارد سبب سے اور قرآن وحدیث کے منطوق سے **فاقرأوا ما تيسر من القرآن**۔

اور اسی طرح جو کہ اہل لغت بیان کرتے ہیں کہ ان سے حذف اور وصل، تقدیم اور تاخیر، استعارہ اور تکرار، کنایہ اور حقیقت مجاز اور مرسل، مفسر اور ظاہر اور غریب الفاظ مراد ہیں۔

اور اس قیاس پر جو کہ نحویوں سے منقول ہے کہ اس سے مراد تذکیر و تانیث، اور شرط اور جزاء، گردان کرنا اور اعراب، قسمیں اور ان

کے جواب، جمع اور واحد، تصغیر اور تعظیم اور ادوات کا مختلف ہونا ہے کہ بعض اس کو ثابت قرار دیتے ہیں کہ جائز ہے اس کو بدلنا جو مذکر ومؤنث، جمع ومفرد، اعراب اور حروف کے اختلاف سے ہے۔

رہی یہ ساری صفات تو ان میں سے کچھ بھی نہیں وارد ہوا۔ اور نہ ہی ان کو اللہ کے اس قول فاقرأوا ما تیسر من القرآن کے تحت داخل کرنا جائز ہے۔ جیسا کہ صوفیاء سے بھی منقول ہے کہ دہ اقسام' زہد وقناعت یقین اور حرمت' خدمت، حیاء اور سخاوت کے ساتھ ساتھ اور پردہ نشینی فقر اور مجاہدے کے ساتھ ساتھ اور مراقبہ خوف اور رجاء کے ساتھ ساتھ۔ اور عاجزی اور استعانت شکر ورضا کے ساتھ ساتھ اور صبر محاسبہ اور محبت کے ساتھ ساتھ۔ اور شوق مشاہدہ کے ساتھ ساتھ۔ کیونکہ یہ قرآن میں اتنی زیادہ دفعہ منقول ہیں کہ ان کی تعداد ہزاروں کو پہنچ جاتی ہے، جیسا کہ سائرین کی منازل اور عارفین کے مقدمات محقق ہیں، لیکن ان مذکورہ بالا چیزوں کا موضوع حدیث سے آسانی اور تخفیف اور اختیار کے ساتھ مراد ہونے کی کوئی وجہ بنتی نظر نہیں آتی۔ جس کے لئے کوئی وجہ موجود ہی نہیں۔

اور حاصل کلام یہ ہے کہ ہر ایک اپنے مذہب کی روشنی میں دیکھتا اور پہچانتا ہے، اور اپنے گھاٹ (مذہب) کو پہچانتا ہے حدیث کے باقی حصہ کو نہیں دیکھتا اور نہ ہی اس کے سبب کو جس کے لئے وارد ہوئی ہے، تو انہوں نے کلام کیا ہے قرآن کے معانی کے بارے میں کہا کہ سات حروف پر نازل ہوا۔ واللہ اعلم

الفصل الثالث:

قراءت کا مختلف ہونا آسانی کا باعث ہے

۲۲۱۵ :عَنْ اُبَیِّ بْنِ کَعْبٍ قَالَ لَقِیَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ جِبْرِیْلَ فَقَالَ یَا جِبْرِیْلُ اِنِّی بُعِثْتُ اِلٰی اُمَّةٍ اُمِّیِّیْنَ مِنْهُمُ الْعَجُوْزَ وَالشَّیْخُ الْکَبِیْرُ وَالْغُلَامُ وَالْجَارِیَةُ وَالرَّجُلُ الَّذِیْ لَمْ یَقْرَأْ کِتَابًا قَطُّ قَالَ یَا مُحَمَّدُ اِنَّ الْقُرْاٰنَ اُنْزِلَ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُفٍ (رواہ الترمذی) وَفِیْ رِوَایَةٍ لِاَحْمَدَ وَاَبِیْ دَاؤُدَ قَالَ لَیْسَ مِنْهَا اِلَّا شَافٍ کَافٍ وَفِیْ رِوَایَةٍ لِلنَّسَائِیْ قَالَ اِنَّ جِبْرِیْلَ وَمِیْکَائِیْلَ اَتَیَانِیْ فَقَعَدَ جِبْرِیْلُ عَنْ یَمِیْنِی وَمِیْکَائِیْلُ عَنْ یَسَارِیْ فَقَالَ جِبْرِیْلُ اِقْرَاِ الْقُرْاٰنَ عَلٰی حَرْفٍ قَالَ مِیْکَائِیْلُ اسْتَزِدْهُ حَتّٰی بَلَغَ سَبْعَةَ اَحْرُفٍ فَکُلُّ حَرْفٍ شَافٍ کَافٍ۔

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۱۶۰/۲ حدیث رقم ۱۴۷۷۔ والترمذی ۱۷۸/۵ حدیث رقم ۲۹۴۴ والنسائی ۱۵۴/۲ حدیث رقم ۹۴۱۔

ترجمہ: "حضرت ابی بن کعبؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے ملاقات کی اور ان سے ارشاد فرمایا کہ جبریل! میں ایک ان پڑھ قوم کی طرف بھیجا گیا ہوں میری قوم میں بوڑھی عورتیں اور بڑے بوڑھے مرد ہیں چھوٹے بچے اور چھوٹی بچیاں ہیں اور اس قوم میں ایسا شخص بھی ہے جس نے کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی' حضرت جبریل نے کہا اے محمدؐ! قرآن کریم سات لہجوں یعنی سات لغات یا سات قراءت پر اتارا گیا ہے لہٰذا جسے جو قراءت آسان معلوم ہو اس کے مطابق قرآن کریم پڑھے' (ترمذی)

تشریح: عن ابی بن کعب قال:لقی رسول اللّٰه ﷺ جبریل فقال یا جبریل انی بعثت الی أمة أمیین : یعنی اچھی طرح قراءت نہیں کر سکتے، اگر میں ان کو ایک ہی قراءت پر پڑھاؤں، تو یہ اس پر قدرت نہیں رکھ سکتے، کیونکہ ان میں سے بعض کی

زبان امالہ پر چلتی ہے، اور بعض کی زبان سے موٹے حروف کا تلفظ ہوتا اور ان میں کچھ ایسے ہیں کہ ان کی زبان پر ادغام یا اظہار غالب آجاتے ہیں اور اسی طرح اور اس کے ساتھ ساتھ۔

منهم العجوز والشيخ والكبير : اور یہ دونوں آدمی بڑھاپے کی وجہ سے سیکھنے سے عاجز ہیں۔

والغلام والجارية : اور یہ دونوں چھوٹی عمر کے ہیں ان کیلئے قرآن ممکن نہیں۔ **والرجل** : یعنی ان میں سے متوسط آدمی بھی ہے۔

الذی لم یقرأ کتابا قط. قال : یعنی دہرائی کرنے کے بعد۔

یا محمد ان القرآن أنزل علی سبعة أحرف : یعنی سات لغتوں پر، پس ہر ایک اس طرح پڑھے جیسے اس کو آسان ہو اور اس سے قراءت میں ترکیب اور توڑنے کا جواز ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن محققین نے ایک ہی نفس میں نہی تنزیہی کی وجہ سے روکا ہے۔ اور اسی طرح انہوں نے کہا اس سے منع کرنے کا جس سے معنی تبدیل ہو جائے یہ نہی تحریمی ہے۔

اور ظاہر ہے کہ ابیؓ کی روایت جبریل سے اس اجمال پر اس سے روایت بالمعنی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ابی نے نبی علیہ السلام سے سنا اور رسول اللہ ﷺ جبریلؑ سے نقل کرتے ہیں، جس کے بارے میں تفصیل گزر چکی ہے۔ کہ ہمیشہ زیادہ کا مطالبہ کرتے رہے حتی کہ سات تک پہنچ گئے۔ یہاں پر اس کا حاصل ہے۔ پس بے شک وہ زیادہ کا مطالبہ کرنے کے بعد سات حروف پر نازل ہوا، اور اس میں یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ نے جب جبریل علیہ السلام سے ذکر کیا جو کہ حدیث میں ہے کہ فرماتے ہیں: "**ان القرآن نزل من اللوح المحفوظ الی بیت العزة علی سبعة أحرف لکنها متوقفة علی سؤالك فسلها واحدا بعد واحدٍ حتی تعطاها کلها**". بے شک قرآن لوح محفوظ سے بیت العزۃ کی طرف سات حرفوں پر نازل ہوا لیکن آپ کے سوال پر موقوف ہے، پس ایک کے بعد دوسرا سوال کریں حتی کہ اللہ تعالیٰ آپ پر ساری قراءتیں نازل کر دے۔

وفی روایة لاحمد وأبی داؤد قال : یعنی جبریل نے الأحرف کے بعد یعنی یہ قول کہنے کے بعد کہ قرآن سات حروف پر نازل ہوا۔

لیس منها : یعنی ان حروف میں سے کوئی حرف نہیں ہے۔

الا شافٍ : یعنی فہم مقصود میں مریض کے لئے۔

وکاف : بلاغت کے اظہار میں معجزے کے لئے ہے۔ ایک قول یہ بھی منقول ہے کہ شاف یعنی معنی میں اتفاق کی وجہ سے مؤمنوں کے سینوں کو شفا بخشنے والا ہے۔ اور نبی علیہ السلام کی صداقت پر دلیل کے طور پر کافی ہے۔

وفی روایة للنسائی قال: ان جبریل ومیکائیل أتیانی فقعد جبریل عن یمینی ومیکائیل عن یساری فقال : یعنی مجھے۔

جبریلُ اِقرأ القرآن علی حرف: قال میکائیل استزده : یعنی قرآن کی قراءت کی زیادتی (یعنی تعداد میں) طلب کر ایک حرف پر اللہ سے یا جبریل سے کہ وہ اللہ کے حضور آپ کے مطالبہ کو پیش کریں، تم مسلسل یہی کہتے رہے۔ اور وہ زیادہ کا مطالبہ کرتے رہے، اور ان کو جواب دیا جاتا رہا یعنی ان کی بات سنی جاتی رہی۔

حتی بلغ سبعة أحرف، فکل حرف شاف : یعنی مؤمنوں کے لئے مطلوب کے اثبات میں۔ **کاف** : کافروں پر حجت کے لئے۔

قرآن پڑھ کر لوگوں سے مانگنا منع ہے

۲۲۱۶: وَعَنْ عِمْرَانَ بْنَ حُصَيْنٍ اَنَّهٗ مَرَّ عَلٰى قَاصٍ يَقْرَأُ ثُمَّ يَسْأَلُ قَاصُمَّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ مَنْ قَرَأَ الْقُرْاٰنَ فَلْيَسْأَلِ اللّٰهَ بِهٖ فَاِنَّهٗ سَيَجِيْءُ اَقْوَامٌ يَقْرَأُوْنَ الْقُرْاٰنَ يَسْأَلُوْنَ بِهِ النَّاسَ۔ (رواه احمد والترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ١٦٤/٥ حديث رقم ٢٩١٧۔ واحمد فی المسند ٤٣٢/٤۔

ترجمہ: ''حضرت عمران بن حصینؓ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ ایک مرتبہ واعظ کے پاس سے گزرے جو قرآن کریم پڑھتا تھا اور لوگوں سے سوال کرتا تھا۔ حضرت عمران بن حصین ؓ نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا' پھر انہوں نے کہا کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص قرآن پڑھے تو اسے چاہئے کہ وہ اس کے ذریعہ اللہ ہی سے مانگے اور وہ وقت آنے والا ہے جب لوگ قران کریم پڑھیں گے اور اس کے ذریعہ (یعنی اس کے عوض) دوسروں کے آگے (دست سوال) دراز کریں گے۔'' (احمد وترمذی)

تشریح: **وعن عمران بن حصين أنه مر علی قاص:** صاد کی تشدید کے ساتھ یعنی جو قصہ کہانیاں بیان کرتا ہے، قصہ گو۔

یقرأ : یعنی قرآن کو یہ حال بنتا ہے یا الگ جملہ استنافیہ ہے۔

ثم یسأل : یعنی ان سے رزق وغیرہ کا مطالبہ کرتا ہے۔ **فاسترجع :** یعنی عمران نے کہا **انا لله وانا اليه راجعون**، کیونکہ یہ بدعت ہے اور واضح نافرمانی اور قیامت کی نشانی ہے۔ **ثم قال :** یعنی عمران نے۔

سمعت رسول الله ﷺ يقول من قرأ القرآن فليسأل الله به : یعنی دنیا اور آخرت کے متعلقہ معاملات میں سے جو چاہے وہ قرآن کے ذریعے اللہ سے ہی مانگے' نہ کہ لوگوں سے، یا اس سے مراد یہ ہے کہ جب آیت رحمت پڑھے تو اللہ سے رحمت کا سوال کرے اور عذاب وسزا کی آیت پر سے گزرے تو اس سے اللہ کی پناہ کا مطالبہ کرے اور یا یہ کہ تلاوت کے بعد ادعیہ ماثورہ کے ذریعے باری تعالیٰ سے دعا مانگے اور یہ بھی زیادہ لائق ہے کہ آخرت کے امور سے متعلقہ دعا کرے اور مؤمنوں کی معیت اور اُن کی آخرت کی اصلاح کے بارے دعا کرے۔

فانه : یعنی ضمیر شان' **سيجيئ اقوام يقرأون القرآن يسألون به الناس :** یعنی زبان کے ساتھ کہہ کر، یا اپنی حالت بیان کر کے۔

الفصل الثالث:

۲۲۱۷: عَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ قَرَأَ الْقُرْاٰنَ يَتَأَكَّلُ بِهِ النَّاسَ جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَوَجْهُهٗ عَظْمٌ لَيْسَ عَلَيْهِ لَحْمٌ۔ (رواه البيهقی فی شعب الايمان)

اخرجه البيهقی فی شعب الايمان ٥٣٢/٢ حديث رقم ٢٦٢٥۔

ترجمہ: ''حضرت بریدہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص قرآن کریم اسلئے پڑھتا کہ اس کے ذریعہ لوگوں سے کھائے تو وہ قیامت کے دن اس حالت میں اٹھایا جائے گا کہ اس کے چہرہ پر صرف ہڈیاں ہوں گی اور گوشت کا (نام ونشان) بھی نہ ہوگا۔''

تشریح: **عن بريدة قال: قال رسول الله ﷺ: من قرأ القرآن يتأكل به الناس :** یعنی اس کے ذریعے لوگوں سے کھانا مانگے ۔طیبیؒ فرماتے ہیں: یتاکل بمعنی یستأکل ہے جیسے تعجل بمعنی استعجل ہے، اور ''بہ'' میں باء آلہ کے لئے یعنی ان کے

مالوں کواخذ کرنے کا ذریعہ بنائے۔

جاء یوم القیامة و وجهه عظم لیس علیه لحم : اس کواشرف الاعضاء بنایا گیا اور اوڑھنے کا ذریعہ۔ قیامت کے دن نہایت قبیح صورت میں ہوگا۔ بعض علماء فرماتے ہیں: مردار کو گانے بجانے والے آلات کے ذریعے کھینچنا۔ مردار کو قرآن کے ذریعے کھینچنے سے بہت کم گناہ ہے اور بعض روایتوں میں ہے کہ: "**من طلب بالعلم المال کان کمن مسح أسفل مداسه و نعله بمحاسنه لینظفه**"۔ جو علم کے ذریعے مال کو طلب کرے، وہ اس شخص کی طرح ہے جو اپنے محاسن کی غرض سے اپنے جوتے کو اپنی پگڑی سے صاف کرنے کے لئے رگڑے۔

حسن بصری رحمہ اللہ سے مروی ہے فرماتے ہیں: کہ رسیوں پر کھیلنے والا مداری، ان علماء سے بدرجہا بہتر ہے جو مال کی طرف مائل ہوتے ہیں کیونکہ مداری دنیا کو دنیا کے بدلے کماتا ہے اور کھاتا ہے، جب کہ یہ بدبخت دنیا کو دین کے ذریعے کھاتے ہیں۔ ان پر اللہ کا یہ فرمان بالکل صادق آتا ہے: ﴿**اولئك الذین اشتروا الضللة بالهدیٰ فما ربحت تجارتهم وما کانوا مهتدین**﴾ [البقرة:۱۶۵] ''یہ لوگ ہیں جنہوں کے گمراہی کو ہدایت کے بدلے خرید لیا، پس ان کو ان کی تجارت نے ذرہ بھی فائدہ نہ دیا اور نہ ہی وہ ہدایت یافتہ ہیں''۔

علامہ شاطبی نے قراسبعہ اور ان کے رواۃ کی مدح اپنے ان الفاظ میں کی:

تخیرهم نقادهم کل بارع ☆ ولیس علی قرآنه متأکلا

۲۲۱۸: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ لَا يَعْرِفُ فَصْلَ السُّوْرَةِ حَتّٰى يَنْزِلَ عَلَيْهِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (رواه ابوداود)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۱/۴۹۹ حدیث رقم ۷۸۸۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک سورت سے دوسری سورت کا فرق نہیں کر پاتے تھے (یعنی فرق معلوم نہیں ہوتا تھا) یہاں تک کہ آپ ﷺ پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نازل ہوتی۔'' (ابوداؤد)

تشریح: وعن ابن عباس قال: کان رسول اللّٰه ﷺ لا یعرف فصل السورة : فصل، بغیر نقطہ کے صاد کے ساتھ ہے، یعنی اس کا جدا ہونا اور مکمل ہونا یا دوسری سورت سے علیحدہ ہونا۔

حتی ینزل "بسم اللّٰه الرحمٰن الرحیم" [الفاتحة :۱] : ہمارے اصحاب نے اس کے ساتھ اس طرح تعلق بیان کیا ہے، فرماتے ہیں: کہ **بسم اللّٰه** ...... ایک آیت ہے جو فصل کے لئے نازل ہوئی۔ اور حدیث کا ظاہر بھی یہی ہے کہ انزال مکرر ہے (یعنی کئی بار نازل ہونے سے تکرار ہو گیا)۔ اور اس میں کوئی قابل احتراز نہیں ہے۔ بلکہ تکرار اسکی فضیلت پر دلالت کرتا ہے، یعنی اس قول سے فاتحہ کا نازل ہونا۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث اور کچھ آگے آنے والی حدیث جو کہ باب کے آخر میں ہے، دونوں حدیثیں اس پر واضح دلیل ہیں کہ **بسم اللّٰه** ...... ہر سورت کا جزو ہے اور اس کے تکرار سے نزول کی وجہ سورتوں کے مابین فصل ہے۔

میں کہتا ہوں: ان دونوں حدیثوں میں کوئی دلیل نہیں، نہ ہی جزئیت کے طریق پر اور نہ کلی طور پر بلکہ اس میں اجمالی دلیل ہے کہ یہ آیات قرآنیہ میں سے ہے اور فرقان حکیم کا ٹکڑا ہے۔ بلکہ باقلانی نے کہا ہے کہ اس سے یہ دلیل نکلتی ہے کہ **بسم اللّٰه** ...... قرآن نہیں ہے، یہ تو صرف دو سورتوں کے درمیان فصل کرنے والی ہے۔

لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ آیت ہے کیونکہ یہ بھی نازل ہونے کی صفت سے متصف ہے، اور شاید کہ امام غزالی نے اسی لئے کہا ہے:

کوئی بھی صاحب انصاف اس بات کو تسلیم نہیں کرے گا' بلکہ اس کو مسترد کر دے گا اور اس کو ضعیف قرار دے گا۔ لیکن یہ کسی سورت کے متعلقہ نہیں ہے یعنی کسی سورت کا حصہ نہیں ہے سوائے سورۃ نمل کے' اور اس کی دلیل سورۃ توبہ کی ابتداء میں بسم اللہ کا نہ ہونا ہے۔ علیؓ سے مروی ہے کہ ''بسم اللہ آیت رحمت ہے اور سورۃ توبہ برأت اور قتال کو متضمن ہے، اور شاطبی کے قول کا بھی یہی مطلب ہے۔

اور رہا ابن حجرؒ کا قول کہ اس سے جو کہ ہمارے مذہب پر دلالت کرتا ہے کہ بسم اللہ صحیح ترین قول کے مطابق ہمارے نزدیک ہر سورت کی مکمل آیت ہے، سوائے سورۃ توبہ کے اور اس پر اجماع ہے۔

صحیح مسلم کی حدیث کے مطابق جو کہ انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہمارے درمیان تشریف فرما تھے کہ اچانک آپؐ پر اونگھ طاری ہوئی لحظۂ اونگھ کے بعد آپؐ نے مسکراتے ہوئے سر اٹھایا' تو ہم نے کہا اے اللہ کے نبی! آپ کو کس بات نے ہنسایا ہے؟ تو آپ علیہ السلام نے فرمایا: ابھی ابھی مجھ پر ایک سورت نازل ہوئی ہے، پھر آپؐ نے تلاوت فرمائی:

بسم الله الرحمٰن الرحیم○ انا اعطینٰك الكوثر [الکوثر :۱] **الی آخر السورة.**

اور اس میں یہ ہے کہ یہ مطلوب پر کوئی دلالت نہیں کرتی کیونکہ آپ علیہ السلام کا اس کی قراءت بسم اللہ سے شروع کرنا سورۃ کی فضیلت کا اظہار ہے یا بسم اللہ کے ساتھ برکت حاصل کرن کی وجہ سے تھا نہ کہ اس سے یہ دلیل اخذ ہوتی ہے کہ یہ سورۃ کا حصہ ہے۔ اس سے سمجھتے ہو کہ یہ ہر سورت کے شروع میں مکمل آیت ہوتی ہے، پھر فرمایا کہ: انہی یعنی انسؓ سے بخاری کی حدیث جو کہ پیچھے گزر چکی ہے کہ انسؓ سے رسول اللہ کی قراءت کے بارے سوال کیا گیا۔ تو انسؓ نے فرمایا کہ ''**كانت مدا ثم قرأ بسم الله الرحمٰن الرحيم: يمد بسم الله ويمد الرحمٰن ويمد الرحيم**''. آپ کی قراءت مد والی ہوتی تھی پھر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر سنائی، بسم پر مد کرتے اور الرحمٰن کو بھی لمبا پڑھا اور الرحیم پر بھی مد کی، اھ۔

اور جمہور کے نزدیک یہ فصل کے لئے ہے۔ اور جان لو! کہ بسم اللہ کا انکار کرنے والا کافر نہیں ہو جاتا اور نہ ہی اس کے اثبات والا اجماع کے ساتھ اس کے برعکس جو دونوں طرفوں میں اس کے بارے مغالطہ کا شکار ہو گیا۔

اور حاکمؒ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک شخص کا مکالمہ

۲۲۱۹: وَ عَنْ عَلْقَمَةَ قَالَ كُنَّا بِحِمْصَ فَقَرَأَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ سُوْرَةَ يُوْسُفَ فَقَالَ رَجُلٌ مَا هٰكَذَا اُنْزِلَتْ فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ وَاللّٰهِ لَقَرَأْتُهَا عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ اَحْسَنْتَ فَبَيْنَا هُوَ يُكَلِّمُهٗ اِذْ وَجَدَ مِنْهُ رِيْحَ الْخَمْرِ فَقَالَ اَتَشْرَبُ الْخَمْرَ وَتُكَذِّبُ بِالْكِتَابِ فَضَرَبَهُ الْحَدَّ ۔(متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۴۷/۹ ـ حدیث رقم ۵۰۰۱ ـ ومسلم فی صحیحه ۵۵۱/۱ حدیث رقم (۲۴۹ ـ ۸۰۱)۔ واحمد فی المسند ۳۷۸/۱ ـ ف

ترجمہ: ''حضرت علقمہؒ کہتے ہیں کہ ہم ''حمص'' ملک شام میں مقیم تھے وہیں ایک مرتبہ ابن مسعودؓ نے سورت یوسف کی تلاوت سنی تو ایک شخص نے ان کی تلاوت سن کر کہا کہ یہ سورت اس طرح نازل نہیں کی گئی ہے حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ خدا کی قسم! میں نے یہ سورۃ اسی طرح نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں پڑھی ہے چنانچہ آپ ﷺ نے اسے سن کر فرمایا کہ تم نے بہت خوب پڑھا'' وہ شخص جب حضرت ابن مسعودؓ سے گفتگو کر رہا تھا تو اچانک حضرت ابن مسعودؓ نے اس کے منہ سے شراب کی بو محسوس کی۔ حضرت ابن مسعودؓ نے اس سے فرمایا کیا تم شراب پیتے ہو؟ یعنی قرآن کے خلاف عمل

کرتے ہو اور اس پر طرّہ یہ کہ قرآن کریم (یعنی اس کی قراءت کو یا قراءت کے لہجہ وطرز ادائیگی کو جھٹلاتے بھی ہو) پھر حضرت ابن مسعودؓ نے اس پر حد جاری کی (یعنی شراب پینے کی سزا کے طور پر اسے کوڑے مارے۔) (بخاری ومسلم)

تشریح: وعن علقمة : جلیل القدر تابعی ہیں۔

قال کنا بحمص : حاء کے کسرہ اور میم ساکن کے ساتھ، اور یہ غیر منصرف ہے لیکن کبھی منصرف بھی ہو جاتا ہے، اور ملک شام کا ایک شہر ہے۔

فقرأ ابن مسعود سورة یوسف وقال رجل :ما هکذا أنزلت : یعنی یہ سورت یا قرآن۔

فقال عبد الله والله لقراء تها علی عهد رسول الله ﷺ : یعنی آپؐ کے زمانے میں اور مجھ پر کسی نے بھی تنکیر نہیں کی، کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے پڑھی تھی اور ابن حجرؒ فرماتے ہیں: **علی عهد** سے مراد یعنی کہ آپ علیہ السلام کی موجودگی میں اور آپ علیہ السلام سن رہے تھے۔

فقال : یعنی نبی علیہ السلام نے۔

أحسنت : یعنی تو نے ترتیل وتجوید وغیرہ کا خیال رکھتے ہوئے قراءت کی اور یہ اس کی عظیم منقبت ہے انہوں نے اس کو فخر کی وجہ سے نہیں بیان کیا بلکہ اللہ کی نعمت کے طور پر بیان ہے اور اللہ کے دشمنوں پر حجت قائم کرنے کے لئے۔

فبینا : ایک دوسرے نسخہ میں فبینما ہے۔

هو : یعنی ابن مسعودؓ۔

یکلمه : یعنی اس آدمی سے اور اس کا الٹ ترجمہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ آدمی ابن مسعودؓ سے کلام کرنے لگا۔ **اذ وجد** : یعنی ابن مسعودؓ نے۔

ریح الخمر. فقال :اتشرب الخمر : یعنی کیا تو قرآن کے معانی اور حکم کی مخالفت کرتا ہے۔

وتکذب بالکتاب؟ : اس کو پڑھنے یا اس کے حقوق کی ادائیگی میں۔

فضربه الحد : یعنی ان کے نگران ہونے کی وجہ سے۔

طیبیؒ فرماتے ہیں: اور یہ تغلیط ہے کیونکہ کتاب اللہ کی تکذیب کفر ہے، اور قراءت کا انکار کلمہ کے جوہر میں کفر سے کم ہے' اسی لیے اُس پر شراب کی حد جاری کی نہ کہ ارتداد من الدین کی حد کا نفاذ کیا۔ اور ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہ ضعیف قول پر مبنی ہے' کیونکہ اداء والی روایات متواتر نہیں۔

اور صحیح بات یہ ہے کہ جس پر قرآء نے اجماع کرلیا وہ مطلقاً متواتر ہی ہوگی۔ اور اس کا منکر زمرہ کفر میں آجائے گا۔ جی ہاں! یہ احتمال بھی تو ہوسکتا ہے کہ اس نے جس کا انکار کیا' اس وقت اس جہت سے متواتر نہ ہوئی ہو، تو وہ اس کے ساتھ کفر نہیں ہے، اگرچہ آپ علیہ السلام سے صحیح بات ہو کہ آپ نے اس کو پڑھا ہے۔

پھر حدیث کے ظاہر سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ آپ علیہ السلام نے شراب کی بُو کی بناء پر اس پر حد جاری کی، اور یہ ایک جماعت کا مذہب ہے، جب کہ ہمارا مذہب اور امام شافعیؒ کا مذہب اس کے برعکس ہے، کیونکہ صرف بدبو سے حد نہیں لگا جاسکتی کیونکہ ایسی بدبو دوسری بعض چیزوں میں بھی ہوتی ہے جیسے کہ خراب سیب اور اسی طرح بہی دانہ یہ بھی شراب کی بو کی مانند ہوتے ہیں، اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے اسے شراب زبردستی پلائی گئی ہو یا مجبوری کی حالت میں، اور صحیح حدیث میں موجود ہے کہ: **"ادرؤوا الحدود بالشبهات"**.

حدود کو شبہات کی وجہ سے جاری نہ کرو۔ شاید کہ اس نے اقرار کرلیا ہو یا اس کی کسی نے گواہی دی ہو یا پھر حد سے مراد تعزیر ہو۔ اور کلام کے سیاق و سباق سے ظاہر ہے کہ آپ نے اس پر تعزیر نہیں لگائی، بلکہ حد لگائی، جیسا کہ ان کا قول: ما هكذا انزلت تھا، کیونکہ حق تو ابن مسعودؓ کا تھا غیر القرآن کی قراءت کی نسبت جوان کی طرف تھی، تو اس کے حق سے درگزر فرما دیا۔

قرآن پاک جمع کرنے سے پہلے پتھر، کھجور کی چھال وغیرہ پر موجود تھا

۲۲۲۰: وَعَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ اَرْسَلَ اِلَيَّ اَبُوْبَكْرٍ مَقْتَلَ اَهْلِ الْيَمَامَةِ فَاِذَا عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ عِنْدَهٗ قَالَ اَبُوْبَكْرٍ اِنَّ عُمَرَ اَتَانِيْ فَقَالَ اِنَّ الْقَتْلَ قَدِ اسْتَحَرَّ يَوْمَ الْيَمَامَةِ بِقُرَّاءِ الْقُرْاٰنِ وَاِنِّي اَخْشٰى اِنِ اسْتَحَرَّ الْقَتْلُ بِالْقُرَّاءِ بِالْمَوَاطِنِ فَيَذْهَبُ كَثِيْرٌ مِنَ الْقُرْاٰنِ وَاِنِّي اَرٰى اَنْ تَأْمُرَ بِجَمْعِ الْقُرْاٰنِ قُلْتُ لِعُمَرَ كَيْفَ تَفْعَلُ شَيْئًا لَمْ يَفْعَلْهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ عُمَرُ هٰذَا وَاللّٰهِ خَيْرٌ فَلَمْ يَزَلْ عُمَرُ يُرَاجِعُنِيْ حَتّٰى شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرِيْ لِذٰلِكَ وَرَاَيْتُ فِيْ ذٰلِكَ الَّذِيْ رَاٰى عُمَرُ قَالَ زَيْدٌ قَالَ اَبُوْبَكْرٍ اِنَّكَ رَجُلٌ شَابٌّ عَاقِلٌ لَانَتَّهِمُكَ وَقَدْ كُنْتَ تَكْتُبُ الْوَحْيَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَتَتَبَّعِ الْقُرْاٰنَ فَاجْمَعْهُ فَوَاللّٰهِ لَوْ كَلَّفُوْنِيْ نَقْلَ جَبَلٍ مِنَ الْجَبَلِ مَاكَانَ اَثْقَلَ عَلَيَّ مِمَّا اَمَرَنِيْ بِهٖ مِنْ جَمْعِ الْقُرْاٰنِ قَالَ قُلْتُ كَيْفَ تَفْعَلُوْنَ شَيْئًا لَمْ يَفْعَلْهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ قَالَ هُوَ وَاللّٰهِ خَيْرٌ فَلَمْ يَزَلْ اَبُوْبَكْرٍ يُرَاجِعُنِيْ حَتّٰى شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرِيْ لِلَّذِيْ شَرَحَ لَهٗ صَدْرَ اَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرَ فَتَتَبَّعْتُ الْقُرْاٰنَ اَجْمَعُهُ مِنَ الْعُسُبِ وَاللِّخَافِ وَصُدُوْرِ الرِّجَالِ حَتّٰى وَجَدْتُ اٰخِرَ سُوْرَةِ التَّوْبَةِ مَعَ اَبِيْ خُزَيْمَةَ الْاَنْصَارِيِّ لَمْ اَجِدْهَا مَعَ اَحَدٍ غَيْرِهٖ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ حَتّٰى خَاتِمَةِ بَرَاءَةَ فَكَانَتِ الصُّحُفُ عِنْدَ اَبِيْ بَكْرٍ حَتّٰى تَوَفَّاهُ اللّٰهُ ثُمَّ عِنْدَ عُمَرَ حَيَاتَهٗ ثُمَّ عِنْدَ حَفْصَةَ بِنْتِ عُمَرَ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحيحه ۱۰/۹ حديث رقم ٤٩٨٦۔

ترجمہ: ''حضرت زید بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ جن دنوں اہل یمامہ کا قتل ہوا۔ یعنی معرکہ یمامہ کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے میری طرف پیغام بھیجا۔ میں ان کے پاس حاضر ہوا اور وہاں پہنچ کر میں کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس حضرت عمر فاروق بیٹھے ہوئے ہیں حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ عمرؓ میرے پاس آئے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرآن کے بہت سے قراء جنگ یمامہ میں شہید ہو گئے' مجھے اندیشہ ہے کہ اگر اسی کثرت سے مختلف جنگوں میں قاریوں کی شہادت ہوتی رہی تو قرآن کا بہت بڑا حصہ جاتا رہے گا لہٰذا مجھے اسی میں بہتری اور مصلحت نظر آتی ہے کہ آپ قرآن کو جمع کرنے کا حکم دے دیں حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ میں نے یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تم اس کام کو کس طرح سرانجام دو گے جسے نبی کریم ﷺ نے نہیں کیا عمرؓ نے کہا کہ خدا کی قسم! اس کام میں بھلائی اور بہتری ہے عمرؓ نے اس مسئلہ کے بارے میں مسلسل مجھ سے گفتگو کی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لئے میرا سینہ کھول دیا اور مجھے بھی اس میں وہی بہتری نظر آئی جو عمرؓ نے دیکھی ہے حضرت زیدؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ تم ایک سمجھدار نوجوان مرد ہو تمہاری نیک بختی اور سعادت کی وجہ سے قرآن کو جمع کرنے اور نقل کرنے کے سلسلے میں جھوٹ وغیرہ کا تم پر کوئی الزام نہیں لگا سکتا کیونکہ تم نبی کریم ﷺ کی وحی لکھا کرتے تھے لہٰذا تم قرآن کو تلاش (اکٹھا) کرو اور اس کو مصحف میں جمع کرو۔'' حضرت زیدؓ کا بیان ہے کہ اللہ کی قسم! اگر پہاڑوں میں سے کسی پہاڑ کو اٹھا کر منتقل

کرنے کی خدمت میرے سپرد کی جاتی تو یہ خدمت میرے لئے اس خدمت سے زیادہ سخت اور بھاری نہ ہوتی (یعنی آسان ہوتی) جو ابوبکرؓ نے قرآن جمع کرنے کی میرے سپرد فرمائی تھی۔ حضرت زیدؓ کہتے ہیں کہ بہرکیف میں نے یہ حکم سن کر حضرت ابوبکر صدیقؓ سے عرض کیا!؟ کہ آپ وہ کام کس طرح کریں گے جو رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے نہیں کیا حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا ''اللہ کی قسم! اس کام میں بھلائی اور بہتری ہے'' حضرت ابوبکرؓ مجھ سے اس سلسلہ میں گفتگو کرتے رہے یہاں تک کہ اس کام کے لئے اللہ تعالیٰ نے میرا بھی سینہ اس طرح کھول دیا جس طرح حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا سینہ کھولا تھا چنانچہ میں نے قرآن تلاش کرنا شروع کیا اس طرح کہ میں اس کو جمع کرتا تھا۔ کھجور کی شاخوں وسفید پتھروں میں سے اور لوگوں کے سینوں میں سے (یعنی حافظوں سے) یہاں تک کہ میں نے سورت توبہ کا آخری حصہ ابوخزیمہ انصاریؓ کے پاس پایا اور یہ حصہ مجھے ان کے سوا اور کسی کے پاس سے نہیں ملا اور وہ حصہ یہ ہے: **لقد جائكم رسول من انفسكم** آخر سورۂ برات تک وہ صحیفے جو میں نے جمع اور نقل کئے تھے یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس ان کی زندگی تک رہے اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زندگی میں ان کے پاس رہے اور پھر آپؓ کی بیٹی حفصہؓ کے پاس رہے۔ (بخاری)

تشریح: وعن زيد بن ثابت قال أرسل اليّ : یعنی کسی ایک کو۔

ابو بكر رضى الله عنه مقتل أهل اليمامة : ظرفیت کی بناء پر منصوب ہے یعنی ان کے قتل کے زمانے سے بعد۔ صاحب قاموس لکھتے ہیں: **اليمامه القصد كاليمام** کہ یمامہ یمام کی طرح ہے۔ اور ایک نیلگوں آنکھوں والی لڑکی تین دن کی مسافت سے قافلہ کو دیکھ لیتی تھی شہر کی فضا اس کی طرف منسوب ہیں۔ اور اس کے نام پر ان کے نام رکھے گئے۔ کیونکہ وہاں سارے حجاز سے زیادہ کھجور ہوتی تھی، اور ادھر ہی سے مسیلمہ کذاب نمودار ہوا تھا اور یہ مدینہ سے مشرق وسطیٰ کی جانب مکہ سے سولہ، بصرہ سے سولہ اور کوفہ سے بھی اتنا ہی ہے اور ابن حجرؒ نے تو عجیب ہی بات کی کہ یمام طائف اور کوفہ کے درمیان ایک بستی ہے۔ دو دن یا ایک دن کی مسافت پر۔

طیبیؒ فرماتے ہیں: ابوبکر صدیقؓ نے خالد بن ولید کو مسلمانوں کا لشکر دے کر روانہ کیا تھا یمامہ کی طرف اور بنوحنیفہ نے ان سے ایسی جنگ کی کہ مسلمانوں نے اس جیسی کبھی نہ دیکھی تھی۔ اس روز سات سو قراء (صحابہ) شہید ہو گئے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ بارہ سو مسلمان شہید ہوئے۔ مسلمانوں میں سے ایک جماعت براء بن مالک وغیرہ کی طرح کے لوگوں نے مسیلمہ کے لوگوں پر ہلہ بول دیا۔

اور مسلمان ان کے پیچھے چلے اور انہوں نے مسیلمہ کذاب اور اس کے حواریوں کو قتل کیا اور مسیلمہ کو حضرت وحشی نے قتل کا جو کہ غزوہ احد میں امیر حمزہ کے قاتل تھے۔ اور مسلمانوں نے انہیں کہا: **هذه بتلك**، یہ اس قتل کے بدلے ہے۔

فاذا عمر : یعنی زید فرماتے ہیں: کہ میں ان کے پاس آیا کہ اچانک حضرت عمر۔

ابن الخطاب عنده : یعنی ابوبکر کے پاس تھے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ان کے آنے کا سبب بھی یہی تھا کہ انہوں نے قرآن کے جمع کرنے کے لئے بلایا تھا، جو کہ منقطع سند سے وارد ہے کہ انہوں نے کسی آیت کے بارے سوال کیا، تو جواباً انہیں کہا گیا کہ وہ آیت فلاں کو یاد تھی، تو انہوں نے فرمایا: **انا لله وانا اليه راجعون** اور قرآن جمع کرنا شروع کیا، تو حضرت ابوبکر قرآن جمع کرنے والے پہلے آدمی تھے۔ اور پہلے قرآن کو جمع کرنے والے سے مراد قرآن کے جمع کرنے میں سبب بننے والے۔ (**قال أبو بكر** : یعنی زید کو۔

ان عمر أتاني فقال : یعنی عمر نے۔

ان القتل قد استحر : 'الحر'' سے بمعنی شدت یعنی زیادہ ہو گیا اور بڑھ گیا، شہادت کے واقعات۔

يوم اليمامة بقرآء القرآن واني أخشى ان استحر القتل : ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ اور کسرہ بھی ہو سکتا ہے، اُن۔

بالقرآء : استحر فعل کے متعلق ہوسکتا ہے یا قتل کے متعلق ہوسکتا ہے۔

بالمواطن : ظرفیہ ہے، یعنی جنگ کے دوسرے میدانوں میں، کیونکہ اسلام کے دشمنوں کے زیادہ ہونے کی وجہ سے جنگ کی ضرورت باقی رہتی ہے۔

طیبیؒ فرماتے ہیں: یعنی میں اس جنگ کی شدت سے خوف کھاتا ہوں، اور اس سے عموماً یوم یمامہ کا معرکہ مراد تھا۔ کیونکہ خوف یہ اس قسم سے تھا جو ناپسندیدہ امور میں سے نہیں یعنی یہاں خشیت ہونا کوئی ناپسندیدہ عمل نہ تھا۔

ان کا قول: **أن استحر . أخشٰی** کے مفعول ہے اور **فیذھب** میں فاء تعقیب کے لئے اور یہ احتمال بھی ہے کہ **ان استحر** میں ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ان ہو، اور جملہ شرطیہ **اخشٰی** کے مفعول پر دلالت کرتا ہے۔

فیذھب کثیر من القرآن : بعض نسخوں میں **کثیراً** منصوب ہے اور یہ ظاہر ہے کہ لفظاً اور معناً **استحر** پر عطف ہوگا۔ **أن** مصدر ہونے کی وجہ سے اور یہ صحیح روایت ہے اور اکثرت تصحیح شدہ اور شیوخ پر پڑھے گئے نسخوں میں رفع کے ساتھ ساتھ ہمزہ مفتوحہ بھی ہے، یعنی **أن** میں۔

پس ایک قول یہ بھی ہے کہ رفع کی وجہ یہ ہے کہ یہ شرط محذوف کی جزاء ہے یعنی **اذا استحر فیذھب**.......... یا حال پر عطف ہے، **إني أخشٰی** سے۔ یعنی تب اس دور کے بہت زیادہ قرآء کے چلے جانے سے بہت سا قرآن ضائع ہو جائے گا۔

وانی أریٰ أن تأمر : رأی سے ہے یعنی میرا خیال ہے کہ آپ وحی کے لکھنے کا حکم دیدیں۔

بجمع القرآن : اس دور کے قرآء کے منتشر ہونے سے قبل۔

قلت : یعنی ابوبکرؓ کہتے ہیں: میں نے کہا۔

لعمر: کیف تفعل : مخاطب کا صیغہ بولا۔ ایک قول متکلم یعنی **نفعل** کا صیغہ بولنے کا بھی ہے، یعنی آپ یا ہم۔

شیئاً لم یفعله رسول اللہ ﷺ : یہ بات اس روایت کی نفی نہیں کرتی جو حاکمؒ نے اپنی مستدرک میں ذکر کی ہے: "**جمع القرآن ثلاث مرات احداها بحضرة النبی ﷺ**" کہ قرآن تین بار جمع ہوا، ایک بار رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں.......... پھر حاکمؒ نے ایک سند کے ساتھ شیخین کی شرط پر حدیث ذکر کی ہے، جس کے راوی زید فرماتے ہیں: "**کنا عند النبی ﷺ یؤلف القرآن فی الرقاع**"، کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس رقاع میں قرآن کی تالیف کیا کرتے تھے...... کیونکہ یہ جمع اور ہے اور وہ جمع کرنا اور جس میں ہم تھے۔ اسی لئے بیہقیؒ نے فرمایا: یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تالیف سے مراد قرآن کی سورتوں میں جو متفرق آیات تھیں، مختلف سورتوں میں ان کو ان کی جگہ پر جمع کیا ہو، رسول اللہ کی ہدایات کے مطابق۔

فقال عمر: ھذا واللہ خیر : یعنی یہ ایک مصحف میں جمع کرنا بہتر ہے اگرچہ یہ نئی بدعت ہے لیکن یہ قرآن کی حفاظت کی غرض سے ہے، خالص بہتری کی نیت سے۔

فلم یزل عمر یراجعنی : یعنی مجھے رغبت دلاتے رہے۔ خطاب اور جواب کے ذریعے میں۔

حتی شرح اللہ صدری لذلك : یعنی اس جمع کرنے کو واجب کر لینا عدم تفرق کے لئے۔

ورأیت فی ذالك : یعنی جو جمع کرنے کے بارے ذکر کیا گیا یا شرح صدر کے بارے۔

الذی رأی عمر. قال زید: قال ابو بکر : یعنی اس حکم کے ذکر کرنے کے بعد جو پے در پے جمع کے ساتھ اجر کے لئے ہے۔

انك رجل : یعنی تو کامل مرد ہے۔

شاب عاقل : طیبیؒ فرماتے ہیں: دور اندیشی اور قوت کی طرف اشارہ ہے اور قوت ضبط کی طرف اور حفظ و امانت و دیانت کی طرف اشارہ ہے۔

لا نتهمك : یعنی تاء مشدد کے ساتھ۔ یعنی ہم آپ کے نقل کرنے کی عدالت کی وجہ سے آپ پر تہمت نہیں لگاتے۔ قاموس میں ہے: **اتهه بكذا اتهامًا. واتهمه كافتعله أدخل عليه التهمه كهمزة، اى ما يتهم عليه فاتهم هو** ۔

وقد كنت تكتب الوحى لرسول الله ﷺ : یعنی اغلبیت کی بناء پر کیونکہ کاتبین وحی کی تعداد تقریباً ۲۴ چوبیس تک پہنچی ہے، جن میں خلفائے اربعہ اور دیگر صحابہ کرامؓ ہیں، جیسا کہ المواہب میں مذکور ہے، اور حاصل معنی یہ ہے کہ آپ قرآن کو جمع کرنے اور اس کی کتابت میں امانت دار ہیں۔ **فتتبع القرآن** : باب تفعل سے امر ہے یعنی اس کے حصول کی خاطر مختلف مقامات تک رسائی حاصل کر۔

فاجمعه : یعنی ایک ہی مصحف میں کلی طور پر جمع کرو تا کہ بوقت ضرورت مراجع کیا جاسکے۔

فو الله : یعنی زیدؓ نے کہا اللہ کی قسم!

لو كلفونى : یعنی ابوبکر، عمر اور ان کے ماتحت لوگ یا اس لئے انہوں نے دو کے لئے جمع کا صیغہ بولا کہ کم سے کم جمع دو ہوتی ہے، اور یا اس سے مراد صرف صدیق اکبرؓ ہی ہیں، اور جمع کا صیغہ تعظیم کے لئے استعمال کیا ہو۔

نقل جبل من الجبال : یعنی یہ امور ممکنہ میں سے ہے۔

ما كان أثقل على مما أمرنى به من جمع القرآن : ابن حجرؒ فرماتے ہیں: اس لئے کہ اس میں جسم کی تھکاوٹ بہت ہوتی ہے، اور اس میں روح تھک جاتی ہے، اھ۔

اور زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ یہ کہا جائے، کہ یہ مباح کام ہے، اور ان کے وہم وگمان کے مطابق شریعت میں یہ جائز نہ تھا، اور اسی لئے۔

قال : یعنی زید نے کہا۔ **فقلت** : یعنی ابوبکر کو یا عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ۔

كيف تفعلون : اور یہ بھی ممکن ہوسکتا ہے کہ خطاب کی اغلبیت پر اس کو محمول کیا جائے۔

شيئاً لم يفعله: رسول الله ﷺ؟ : اور نہ ہی اس کے بارے حکم دیا۔ پس گویا کہ اس پر اکتفاء کیا جو پہلے گزرا، اور اس کے بعد ان کا سینہ کشادہ نہیں ہوا۔ اور نہ وہ تقلید کے ساتھ راضی ہوئے مشکل فیصلے کو طلب کرنے کی وجہ سے کام کرنے کے لئے، کیونکہ قطعی دلالت کے ساتھ اثبات قرآن کی طرف ضرورت ہے۔

قال : یعنی ابوبکرؓ نے۔ **هو** : یعنی قرآن کا جمع کرنا۔

والله خير فلم يزل ابو بكر يراجعنى : یعنی ابوبکر سبب ذکر کرتے رہے، اور میں اعراض کرتا رہا۔

حتى شرح الله صدرى للذى شرح : یعنی اللہ نے۔

له صدر ابى بكر وعمر : کہا جاتا ہے کہ آپ ﷺ نے قرآن کو ایک مصحف میں جمع نہیں کیا، جب آپ کی وفات کے ساتھ نزول قرآن مکمل ہوگیا، تو اللہ نے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم پر اس کے بارے الہام کیا۔ اپنے سچے وعدے کو پورا کرتے ہوئے جو کہ اس نے اس امت پر اس کی حفاظت کی ضمانت دی تھی۔ تو اس کی ابتداء حضرت عمر کے مشورہ سے صدیق اکبرؓ کے ہاتھوں ہوئی۔ فرضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

اور وہ روایت جو امام مسلم نے اپنی کتاب میں ابوسعید خدریؓ کی حدیث سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "**لا تكتبوا عنى شيئاً غير القرآن**"، قرآن کے علاوہ مجھ سے کچھ نہ لکھو (لمبی حدیث ہے)۔

تو یہ اس کی نفی نہیں کرتی کیونکہ اس حدیث میں مخصوص کتابت اور مخصوص صفت کے بارے میں کلام ہے اور بالتحقیق قرآن سارے کا سارا رسول اللہ ﷺ کے دور میں لکھا جا چکا تھا۔ لیکن کسی ایک جگہ جمع نہ تھا، اور نہ ہی سورتیں مرتب شدہ تھیں۔

اور حارث کتاب فہم السنن میں فرماتے ہیں: ''کہ کتابت قرآن بدعت نہیں' کیونکہ آپ ﷺ اس کا حکم دیا کرتے تھے، لیکن اس وقت تک قرآن متفرق تھا پتوں اور اس جیسی دیگر چیزوں میں۔ اور ابوبکر صدیقؓ نے جو حکم دیا، وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جمع کرنے کا حکم دیا اور یہ بمنزلہ اوراق کے تھا جو کہ رسول اللہ کے گھر سے پائے گئے جن میں قرآن منتشر حالت میں تھا' جمع کرنے والے نے ان کو جمع کیا اور دھاگے سے باندھ دیا' تا کہ اس سے کچھ بھی ضائع نہ ہو۔ اسی طرح الاتفاق میں مذکور ہے۔

فتتبعت القرآن اجمعه : فاعل یا مفعول سے حال ہے۔

من العسب : دونوں پر ضمہ ہے عسیب کی جمع ہے، کھجور کی شاخ، اور یہ وہ شاخ ہوتی ہے جس پر پتے نہ اُگتے ہوں۔ النہایہ میں اسی طرح ہے۔ البتہ قاموس میں صاحب قاموس نے یہ اضافہ کیا ہے کہ وہ کھجور کی سیدھی اور باریک ٹہنی ہوتی ہے، جس کے پت اترے ہوئے ہوں، اور جس پر پتے نہ اُگے ہوں' وہ سعف ہے اور السعف' کھجور کی ٹہنی ہے یا اس کا پتا ہے اور زیادہ اس کو کہا جاتا ہے جب وہ خشک ہو جائے۔

اللخاف : لام کے کسرہ کے ساتھ **لخفة**'' نقطے والی خاء کے ساتھ' کی جمع ہے، اور یہ ایک قسم کا سفید پتھر تھا جو پتلا ہوتا تھا اور قراء صحابہ کے پاس ہوا کرتا تھا۔

اور ایک روایت میں ہے: **والرقاع**، اور یہ **زقعة** کی جمع ہے اور کبھی یہ کھال کا ہوتا ہے یا پھر کبھی پتے کا۔ اور ایک دوسری روایت میں ''**وقطع الأديم** کے الفاظ ہیں' یعنی رنگے ہوئے چمڑوں کے ٹکڑوں پر، اسی طرح ایک اور روایت میں **والاكتاف** کا لفظ ہے اور ایک روایت میں **اضلاع** کا لفظ ہے اور یہ دونوں **كتف** یا **ضلع** کی جمع ہیں، جو کہ اونٹ کی یا بکری کے ہوتے ہیں، جب وہ خشک ہوتی' تو اس پر لکھ لیتے۔

اور اسی طرح ایک روایت میں **الاقتاب** کے الفاظ ہیں جو کہ **قتب** کی جمع ہے، اور یہ وہ لکڑی ہوتی ہے جو سواری کے لئے اونٹ کی پیٹھ پر رکھی جاتی ہے۔ وہ اس میں اس لئے لکھتے تے کہ ان دنوں ان کے ہاں اوراق کی کمی کی وجہ سے۔ اسی طرح اس کو ابن حجرؒ نے ذکر کیا ہے۔ یا پھر وہ ان کو بمنزلہ تختیوں کے شمار کرتے تھے، اور یاد کرنے کے لئے لکھا کرتے تھے، پھر ان کو دھو دیتے تھے اور مٹا دیتے تھے یعنی یاد کرنے کے بعد۔

وصدور الرجال : یعنی ان میں حفاظ کرام۔ اگر کہا جائے کہ ثقاہت کیسے واقع ہوتی ہے اصحاب الرقاع اور آدمیوں کے سینوں سے (کہ وہ محفوظ رہا ہو) تو کہا جائے گا کیونکہ وہ معروف نظم ونسق اور تالیف سے ظاہر کرتے تھے۔ اور انہوں نے بیس سال نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تلاوت کا مشاہدہ کیا تھا۔ خوف صرف یہ تھا کہ اس کے صحیح میں سے کچھ ضائع نہ ہو جائے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں: اور وہ لوگ جنھوں نے قرآن کو جمع کیا یعنی انہوں نے حفظ کیا آپ علیہ السلام کے دور میں وہ چار ہیں، اور سب کے سب انصار میں سے تھے۔ ① ابی بن کعب ② زید بن ثابت (یہی جمع کرنے والے)، ③ معاذ بن جبل، ④ ابوزید۔ اور ایک روایت میں ان حفاظ میں ابودرداء کا ذکر بھی ہے۔

حتى وجدت آخر سورة التوبة مع ابن خزيمة : **خزيمه**، خاء کے ضمہ اور زاء کے فتحہ کے ساتھ۔

الانصاری : طیبیؒ فرماتے ہیں: جو کہ جامع الاصول میں مذکور ہیں کہ **من الصحابة خزيمة بن ثابت الانصاری الأوسی،**

یعنی جامع الاصول میں ان کے بارے لکھا ہے کہ خزیمہ بن ثابت الانصاری الاوسی صحابہ میں سے تھے۔ جو کہ اگلی حدیث میں مذکور ہیں اور ایک ابوخیثمہ الانصاری السلمی الخزرجی ہیں، پس غور وفکر کریں۔

اور مصنف علیہ الرحمۃ نے اسماء الرجال میں صرف خزیمہ لکھا ہے شاید کہ انہیں ابوخزیمہ بھی کہا جاتا ہو۔**لم أجد مع أحد غيره : غيره**، مجرور ہے بدل ہونے کی وجہ سے یعنی میں نے ان کے علاوہ کسی اور کے پاس لکھی ہوئی نہیں دیکھی کیونکہ وہ کتابت کے علاوہ صرف حفظ پر اکتفاءنہیں کرتے تھے۔ یہ بات الحافظ ابوشامہ نے کہی ہے۔

طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ قول اس روایت کے منافی نہیں ہے جس میں ہے کہ ایک جماعت نے آپ ﷺ کی حیات مبارکہ میں مکمل قرآن حفظ کرلیا تھا، جیسے کہ ابی بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن ثابت، ابودرداء حفظ کے بعد نسیان کے جواز کے لئے۔

جب بھولنے والوں نے دوسروں سے سنا' تو انہیں یاد آ گیا، جس طرح کہ اس پر آپ علیہ السلام کا یہ قول دلالت کرتا ہے جو کہ آئندہ حدیث میں آرہا ہے کہ:"**فقدت آية من الاحزاب** ...." کہ سورۃ احزاب کی ایک آیت مجھ سے رہ گئی۔

لقد جاء كم رسول من انفسكم' [سورة التوبه :۱۲۸] **حتى خاتمة براءة :**

صاحب اتقان لکھتے ہیں: کہ ابن ابی داؤد، یحیٰی بن عبدالرحمٰن بن حاطب کے طریق سے روایت بیان کرتے ہیں کہ وہ فرماتے ہیں کہ عمرؓ آئے اور کہنے لگے جس کسی نے بھی رسول اللہ ﷺ سے جو قرآن سیکھا ہے وہ اسے لے آئے، اور وہ اس کو صحیفوں میں اور تختیوں اور چمڑوں پر لکھا کرتے تھے، اور حضرت عمرؓ کسی سے کچھ بھی نہ قبول کرتے حتی کہ دو گواہ اس پر گواہی نہ دے دیں۔ اور یہ بات ہر اس پر دلالت کرتی ہے کہ اکیلے زید کے لکھا ہوا پانے پر اکتفاءنہیں کرتے تھے حتی کہ اس پر کوئی گواہی نہ دے جس نے اس کو سماع کرتے دیکھا ہو۔ باوجود اس کے کہ زید حافظ قرآن بھی تھے۔

اور یہ کام احتیاط میں مبالغہ کے لئے کرتے تھے۔ سخاوی جمال القراء میں فرماتے ہیں: اس سے مراد یہ ہے کہ وہ دو گواہ اس چیز کی گواہی دیتے تھے کہ یہ مکتوب رسول اللہ ﷺ کے سامنے لکھا گیا، یا اس سے مراد یہ ہوسکتا ہے کہ یہ مکتوب انہی قراءتوں میں سے ہے' جن پر قرآن نازل ہوا۔ ابوشامہؒ فرماتے ہیں: ان کا مقصد اور غرض یہ تھی کہ صرف عین وہی لکھا جائے جو رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں لکھا گیا نہ کہ مجرد الفاظ۔

میں کہتا ہوں: یا تو مراد یہ ہے کہ وہ دو گواہ یہ گواہی دیں کہ یہ اسی میں سے ہے، جو رسول خدا علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ان کی وفات کے سال پیش کیا گیا

اور ابن ابی شیبہ نے باب المصاحف میں لیث بن سعد سے روایت نقل کی ہے، فرماتے ہیں: کہ سب سے پہلے قرآن کو جمع کرنے والے ابوبکرؓ ہیں اور زید بن ثابت نے اس کو لکھا اور لوگ زید بن ثابت کے پاس آتے لیکن زید دو عادل گواہوں کی گواہی کے بعد ہی لکھتے، اور سورۃ توبہ کی آخری آیت خزیمہ بن ثابت انصاری کے علاوہ کسی سے نہیں ملیں، تو ابوبکرؓ نے فرمایا: اس آیت کو لکھ لو کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے خزیمہ کی شہادت کو دو مردوں کی شہادت کے قائم مقام بنایا ہے۔ تو زیدؓ نے لکھ لیا۔ اور حضرت عمرؓ آیت رجم لے کر آئے تو زیدؓ نے نہ لکھی کیونکہ وہ اکیلے ہی تھے، اھ۔

اور حاصل کلام یہ ہے کہ انہوں نے لفظی طور پر قطعی دلیل کے ثابت ہو جانے اور اس کی کتابت پر ظنی دلیل کے ثابت ہونے کے بعد ہی جمع کیا۔

فكانت الصحف : یعنی جمع کرنے کے بعد۔

عند ابی بکر حتی توفاہ اللہ ثم عند عمر فی حیاتہ : یعنی آپ کی زندگی کے ایام میں۔

ثم عند حفصة بنت عمر : یعنی اس وقت تک کہ عثمان نے ان سے لیا پھر اس سے دوسرا یا تیسرا نسخہ مرتب کیا اور حفصہؓ کے پاس قرآن کے رکھنے کا سبب یہ تھا کہ حضرت عمرؓ نے اپنی زندگی میں خلیفہ کا تعین نہیں کیا تھا، اور حفصہؓ ان کی بیٹی تھیں اور ام المؤمنین تھیں، اس لئے ان کے پاس رکھ دیا۔

حسن سند کے ساتھ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ: مصاحف کے بارے میں لوگوں میں سے سب سے زیادہ اجر حاصل کرنے والے ابو بکر ہیں اللہ کی رحمتیں ہوں ابو بکر پر' کیونکہ یہ وہ پہلے آدمی ہیں جنہوں نے کتاب اللہ کو جمع کیا' اور یہ روایت اس روایت کے معارض نہیں ہے، جو کہ آپ سے مروی ہے کہ ''جب رسول اللہ ﷺ فوت ہوئے تو میں نے قسم کھالی کہ میں اپنی چادر نہیں لوں گا، جمعہ کی نماز کے علاوہ' حتی کہ میں قرآن کو جمع کرلوں' پھر انہوں نے اس کو جمع کیا''۔ کیونکہ یہ ضعیف ہے اور اگر اس کو صحیح بالفرض مان لیا جائے، ان کے جمع کرنے سے مراد اپنے سینے میں حفظ کرنا ہے یا ان کے جمع کرنے سے مراد انفرادی طور پر جمع کرنا ہے، اور وہ نقصان پر محمول ہے۔ جب کہ ابو بکر صدیقؓ کا جمع کرنا یہ بالا جماع جمع کرنا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس جمع کا اعتبار زیادہ اور نقصان کے عدم احتمال کے ساتھ ہوگا۔ پس ابو بکر اس کے زیادہ لائق ہیں کہ ان کے بارے میں کہا جائے کہ قرآن جمع کرنے والے سب سے پہلے وہی ہیں۔ اور اس کی تائید وہ روایت بھی کرتی ہے، جس میں ہے کہ ابو بکر صدیق کی بیعت کے بعد حضرت علیؓ اپنے گھر میں بیٹھے تھے کہ ابو بکر کو کسی نے کہا کہ حضرت علیؓ آپکی بیعت کو اچھا نہیں سمجھتے تو ان کی طرف ابو بکر نے پیغام بھیجا' بلایا اور پوچھا کیا تم میری بیعت کو برا سمجھتے ہو؟ تو علی بن ابی طالب نے کہا، نہیں اللہ کی قسم! پوچھا میرے پاس نہ بیٹھنے کی وجہ؟ کہنے لگے میں دیکھ رہا ہوں کہ کتاب اللہ میں زیادتی کی جا رہی ہے، تو میرے دل میں یہ بات آئی اور میں نے اپنے آپ سے کہا کہ میں اس وقت تک چادر نہ پہنوں گا حتی کہ قرآن کو جمع نہ کرلوں سوائے جمعہ کے دن جمعہ کی نماز کے لئے۔ ابو بکرؓ نے انہیں کہا تمہارا خیال بہت اچھا ہے اور اسی طرح منقطع سند کے ساتھ مروی ہے کہ سب سے پہلے جس نے قرآن کو مصحف میں جمع کیا وہ سالم ہیں جو کہ ابو حذیفہ کے آزاد کردہ غلام ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں قسم کھاتا ہوں کہ میں اس وقت اپنے کپڑے نہیں پہنوں گا سوائے جمعہ کے دن کے' جب تک میں قرآن جمع نہ کرلوں۔ پس انہوں نے جمع کر دیا۔ اس روایت کے رجال ثقہ ہیں، لیکن سند میں انقطاع ہے۔

بالتحقیق ابو بکرؓ نے عمرؓ اور زیدؓ کو کہا تھا کہ تم دونوں مسجد کے دروازے پر بیٹھ جاؤ، جو کوئی کتاب اللہ کا کچھ ٹکڑا دو گواہوں کی موجودگی میں لے کر آئے، اسے لکھ لو۔ علامہ العسقلانیؒ فرماتے ہیں: گویا کہ دو گواہوں سے مراد حفظ اور کتابت ہیں۔

حارث محاسبی اپنی کتاب فہم السنن میں فرماتے ہیں کہ: قرآن کی کتابت بدعت نہیں ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ لکھنے کا حکم دیا کرتے تھے، لیکن اس وقت قرآن جمع نہ تھا بکھرا ہوا تھا ابو بکر صدیقؓ نے اس کو جمع کیا اس میں سے کچھ اوراق کی صورت میں تھا، جو کہ رسول اللہ کے گھر میں سے ملے تھے، جن میں قرآن بکھرا پڑا تھا۔ جمع کرنے والے نے ان کو جمع کی، اور ان کو دھاگے سے باندھ دیا تا کہ اس سے کچھ بھی ضائع نہ ہو۔ یہ قرآن کی پختگی اور محفوظ رہنا ہے، رقاع اور اس جیسی دوسری چیزوں کے ساتھ۔ آدمیوں کے سینوں میں بھی' اس لئے کہ وہ سینوں میں محفوظ ظاہر کرتے تھے۔ اس کو معروف نظم میں آپؐ سے بیس سال مشاہدہ کیا۔ (تفصیل پیچھے گزر چکی' مترجم)

مؤطا ابن وہب میں مالک سے ان کی سند کے ساتھ عبداللہ بن عمر تک۔

ابو بکرؓ نے قرآن کو کاغذوں میں جمع کیا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ زیدؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکرؓ نے مجھے حکم دیا، تو میں نے قرآن کو چمڑوں کے ٹکڑوں اور کھجور کی شاخوں پر رقم کیا، جب ابو بکر فوت ہو گئے' اور عمرؓ خلیفہ بن گئے، تو اس قرآن کو ایک صحیفے میں لکھ دیا

گیا جو کہ ان کے پاس تھا۔ عسقلانیؒ فرماتے ہیں: پہلی بات صحیح ہے کہ قرآن چمڑوں اور ہڈیوں میں تھا ابوبکر کے عہد میں اس کے جمع کرنے سے پہلے پھر ابوبکر کے دور میں ایک مصحف میں جمع کیا، جیسا کہ ہم معنی آثار اس پر دلالت کرتے ہیں۔

میں کہتا ہوں: جمع اس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ پہلے قرآن چمڑوں اور ہڈیوں میں بکھرا پڑا تھا لوگوں کے پاس غیر مرتب حالت میں تھا' تو انہوں نے آیات اور سورتوں کے درمیان ترتیب کو مدنظر رکھتے ہوئے جمع کیا، لیکن پھر بھی وہ چمڑوں کے ٹکڑوں اور ہڈیوں میں لکھا ہوا تھا۔ پھر اس کا جمع ہونا ابوبکر صدیقؓ کے دور میں ہوا تھا۔ پھر ایک صحیفے میں جمع کیا گیا یا کئی صحیفوں میں اوراق پر لکھنے کے ساتھ جمع کیا۔ واللہ اعلم

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمات جمع قرآن کے بارے میں

۲۲۲۱: وَعَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّ حُذَيْفَةَ بْنِ الْيَمَانِ قَدِمَ عَلٰى عُثْمَانَ وَكَانَ يُغَازِىْ اَهْلَ الشَّامِ فِى فَتْحِ اَرْمِيْنِيَةَ وَاٰذَرْبِيْجَانَ مَعَ اَهْلِ الْعِرَاقِ فَاَفْزَعَ حُذَيْفَةَ اِخْتِلَافُهُمْ فِى الْقِرَاءَ ةِ فَقَالَ حُذَيْفَةُ لِعُثْمَانَ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَدْرِكْ هٰذِهِ الْاُمَّةَ قَبْلَ اَنْ يَّخْتَلِفُوْا فِى الْكِتَابِ اخْتِلَافَ الْيَهُوْدِ وَالنَّصَارٰى فَاَرْسَلَ عُثْمَانُ اِلٰى حَفْصَةَ اَنْ اَرْسِلِىْ اِلَيْنَا بِالصُّحُفِ نَنْسَخُهَا فِى الْمَصَاحِفِ ثُمَّ نَرُدُّ هَا اِلَيْكِ فَاَرْسَلَتْ بِهَا حَفْصَةُ اِلٰى عُثْمَانَ فَاَمَرَ زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ وَعَبْدَ اللّٰهِ بْنِ الزُّبَيْرِ وَسَعِيْدَ بْنَ الْعَاصِ وَعَبْدَ اللّٰهِ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ هِشَامٍ فَنَسَخُوْهَا فِى الْمَصَاحِفِ وَقَالَ عُثْمَانُ لِلرَّهْطِ الْقُرَشِيِّيْنَ الثَّلَاثِ اِذَا اخْتَلَفْتُمْ اَنْتُمْ وَزَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ فِىْ شَىْءٍ مِّنَ الْقُرْاٰنِ فَاكْتُبُوْهُ بِلِسَانِ قُرَيْشٍ فَاِنَّمَا نَزَلَ بِلِسَانِهِمْ فَفَعَلُوْا حَتّٰى اِذَا نَسَخُوا الصُّحُفَ فِى الْمَصَاحِفِ رَدَّ عُثْمَانُ الصُّحُفَ اِلٰى حَفْصَةَ وَاَرْسَلَ اِلٰى كُلِّ اُفُقٍ بِمُصْحَفٍ مِمَّا نَسَخُوْا وَاَمَرَ بِمَا سِوَاهُ مِنَ الْقُرْاٰنِ فِىْ كُلِّ صَحِيْفَةٍ اَوْ مُصْحَفٍ اَنْ يُّحْرَقَ قَالَ ابْنُ شِهَابٍ فَاَخْبَرَنِى خَارِجَةُ بْنُ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ اَنَّهٗ سَمِعَ زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ قَالَ فَقَدْتُ اٰيَةً مِّنَ الْاَحْزَابِ حِيْنَ نَسَخْنَا الْمُصْحَفَ قَدْ كُنْتُ اَسْمَعُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَقْرَأُبِهَا فَالْتَمَسْنَاهَا فَوَجَدْنَاهَا مَعَ خُزَيْمَةَ بْنِ ثَابِتٍ الْاَنْصَارِىِّ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَاَلْحَقْنَاهَا فِىْ سُوْرَتِهَا فِى الْمُصْحَفِ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحيحه ۱۱/۹ ۔ حديث رقم ۴۹۸۷ ۔ واحمد فی المسند ۱۸۸/۵ ۔

ترجمہ: ''حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ حذیفہ بن یمانؓ حضرت عثمان غنیؓ کے پاس آئے ۔ اس وقت حضرت عثمانؓ شام وعراق کے آرمینیہ اور آذر بائیجان کی جنگوں کی غرض سے سامان جہاد کی فراہمی اور تیاری میں مصروف تھے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ لوگوں کے اختلاف قراءت کی وجہ سے پریشان تھے کیونکہ وہ دیکھتے تھے کہ لوگ بلا جھجک آپس میں ایک دوسرے کی قراءت کا انکار کرتے ہیں چنانچہ انہوں نے حضرت عثمانؓ سے عرض کیا کہ ''امیر المؤمنین! اس امت کے بارے میں تدارک کی کوئی راہ نکالئے قبل اس کے وہ یہود و نصاریٰ کی طرح کلام اللہ میں اختلاف کا شکار ہو جائیں۔ حضرت عثمانؓ نے ان کی بات سن کر حضرت حفصہؓ کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ آپ وہ صحیفے جو حضرت ابوبکرؓ نے جمع کئے تھے ہمارے پاس بھیج دیجئے۔ ہم ان کی نقلیں تیار کر کے واپس بھیج دیں گے۔ حضرت حفصہؓ نے وہ تمام صحیفے حضرت عثمانؓ کے پاس بھیج دیئے حضرت عثمانؓ نے انصار میں سے زید بن ثابتؓ کو اور قریش میں عبداللہ ابن زبیرؓ، سعید بن عاصؓ اور عبداللہ بن حارث بن ہشامؓ کو ان صحیفوں کے نقل کرنے پر مامور کیا۔ ان سب حضرات نے ان کی

نقلیں تیار کیں۔حضرت عثمانؓ نے تینوں قریشیوں سے فرمایا کہ اگر قرآن کے لغات میں کسی جگہ تم میں اور زید بن ثابت میں اختلاف ہو جائے تو وہاں لغت قریش کے مطابق لکھو کیونکہ کلام اللہ لغت قریش کے مطابق ہی نازل ہوا ہے چنانچہ ان سب نے اس پر عمل کیا اور جب مصاحف میں صحیفے نقل کیے جا چکے تو حضرت عثمانؓ نے ان صحیفوں کو تو حضرت حفصہؓ کے پاس بھیج دیا اور ان مصاحف کو تمام علاقوں میں بھیج دیا۔اس کے ساتھ ہی یہ حکم جاری فرمایا کہ ان مصاحف کے علاوہ ہر اس صحیفے یا مصحف کو جلا دیا جائے جس میں قرآن لکھا ہوا ہے'' حضرت ابن شہابؒ فرماتے ہیں کہ زید بن ثابتؓ کے صاحبزادے خارجہؒ بن زید بن ثابت نے مجھے بتایا کہ میں نے اپنے والد حضرت زید بن ثابتؓ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس وقت کہ ہم قرآن کریم نقل کر رہے تھے مجھے سورۂ احزاب کی ایک آیت نہیں مل رہی تھی حالانکہ میں نبی کریم ﷺ کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا کرتا تھا۔ پھر ہم نے اس کو تلاش کیا تو مجھے یہ آیت حضرت خزیمہ بن ثابت انصاری کے پاس سے لکھی ہوئی ملی اور وہ آیت یہ ہے: مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ پھر میں نے یہ آیت مصحف میں اس کی سورت یعنی سورہ احزاب کے ساتھ ملا دی۔'' (بخاری)

تشریح: **أن حذيفة بن اليمان قدم على عثمان و كان** : یعنی حضرت حذیفہ۔ابن حجرؒ فرماتے ہیں: واؤ حالیہ ہے۔

يغازى : یعنی لڑ رہے تھے۔

اهل الشام : مفعولیت کی بناء پر منصوب ہے۔اور ایک نسخہ میں مرفوع بھی ہے پھر کان میں ضمیر، ضمیر شان ہوگی اور یہی بہتر ہے جو سخاویؒ نے شرح الرائیۃ میں کہا کہ: جب عثمانؓ کی خلافت تھی مسلمان مغربی ممالک میں غزوۂ آرمینیا میں جمع ہوئے۔یعنی عراقی لشکر اور شامی لشکر۔

تو انہوں نے قرآن میں اختلاف کیا، ایک دوسرے کی قراءت سنتے تو اس کا انکار کر دیتے، حالانکہ ہر ایک کی قراءت درست تھی اور منزل من اللہ ہی تھی، حتی کہ بعض نے یہاں تک بھی کہنا شروع کر دیا کہ میری قراءت تمہاری قراءت سے بہتر ہے۔(**في فتح أرمينية** : ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ۔

عسقلانیؒ فرماتے ہیں: ابن سمعان کے نزدیک ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ اور دیگر کے نزدیک ہمزہ کو کسرہ دیا جائے گا۔ایک قول یہ بھی ہے: مثلث راء کے سکون اور میم کے سکون کے ساتھ اس کے بعد یاء ہے، پھر نون مکسور پھر یاء غیر مشدد مفتوحہ۔اور کبھی یہ ثقیل بھی ہو جاتا ہے، یہ بڑا اور مشہور شہر ہے، جیسا کہ المقدمہ میں مذکور ہے۔اور قاموس میں ہے کہ یہ آذربائیجان کا شہر ہے۔

أذر بائيجان : تخصیص کے بعد تعمیم ہے اور وہ اسی طرح ہے جس طرح اکثر نسخوں میں ہے یعنی ہمزہ ممدودہ کے ساتھ اور ذال کے فتحہ راء کے سکون اور باء مکسور اور اس کے بعد ''ی'' ساکنہ پھر جیم ہے، لیکن تہذیب الاسماء میں فرماتے ہیں: یہ ہمزہ مفتوحہ غیر مد کے ساتھ ہے پھر ذال ہے نقطہ والی پھر راء مفتوح پھر باء مکسور پھر یاء ہے پھر جیم پھر الف پھر نون اسی طرح مشہور ہے اور اس کا ضبط بھی اور اس کا اعراب بھی اکثر اسی طرح ہے۔عسقلانیؒ فرماتے ہیں: کبھی ہمزہ کو لمبا کیا جاتا ہے اور کبھی کسرہ دیا جاتا ہے، اور کبھی حذف کر دیا جاتا ہے۔اور کبھی با کو فتحہ دیا جاتا ہے، اور کبھی اوس کے بعد الف کا اضافہ کر دیا جاتا ہے، مداولی کے ساتھ۔اور المقدمۃ میں پہلے دو پر فتحہ اور راء ساکنہ اور باء مکسور اور اس کے بعد یاء ساکنہ پھر جیم ہے، معروف شہر ہے۔اور الاصیلی نے اس کا اعراب مد کے ساتھ لگایا ہے، اور اسی طرح ''ب'' کے فتحہ کا اعراب بھی حکایت کیا گیا ہے۔

مع اهل العراق، فأفزع : **كان** پر عطف ہے۔

حذيفة : منصوب ہے۔

اختلافهم : رفع کے ساتھ یعنی لوگوں کے اختلاف کی وجہ سے گھبراہٹ واقع ہوگئی۔ یا اہل عراق کے اختلاف کا خوف پیدا ہوگیا جوان کے شانہ بشانہ تھے۔

فی القراء ة : یعنی قرآن کی قراءت میں حذیفہ کی مثل جیسا کہ بعض نے کہا یہ لفظ قرآن کا ہے، یا نہیں ہے۔ اور بعض نسخوں میں حذیفہ کے رفع کا اعراب ہے اور بعض میں نصب۔

اوران کے لئے کوئی وجہ ظاہر نہیں ہوئی اور اس کو قلب پر محمول کرنے کو اور قلب نے قبول نہیں کیا۔

أدرك هذه الامة : ادراك سے امر ہے، تدارک کے معنی میں ہے کہ تدارک کیجئے۔

قبل أن يختلفوا فی الكتاب : یعنی قرآن میں۔

اختلاف اليهود والنصارىٰ : منصوب ہے، یعنی جس طرح انہوں نے تورات اور انجیل میں اختلاف کیا حتی کہ تحریف کردی اور کمی بیشی بھی کی۔ سخاوی نے اضافہ کیا ہے: **فما كنت صانعًا** جب کہا جائے گا کہ فلاں کی قراءت اور فلاں کی قراءت جس طرح اہل کتاب نے کہا، پس تو ایسے کر کہ جمع کردے۔ عثمانؓ نے لوگوں کو جمع فرمایا، اور اس وقت ان کی تعداد پچاس ہزار تھی۔ حضرت عثمانؓ نے کہا: تم کیا کہہ رہے ہو؟ مجھے تو یہ خبر ملی ہے، کہ بعض لوگ ان میں سے کہتے ہیں کہ میری قراءت تمہاری قراءت سے بہتر ہے، اور یہ بات قریب ہے کہ کفر ہو جائے یعنی یہ بات کفر کے قریب ہے، یا یہ بات انکار کے قریب ہے۔ وہ کہنے لگے، آپ کا کیا خیال ہے؟ تو عثمان نے کہا میرا خیال ہے کہ ہم لوگوں کو ایک ہی مصحف پر جمع کریں، نہ کوئی فرق رہے اور نہ کوئی اختلاف باقی رہے۔ لوگ کہنے لگے، آپ کا خیال بہت اچھا ہے۔ انہوں نے پختہ عزم کیا اس پر جس کی طرف حذیفہ اور دیگر مسلمانوں نے اشارہ کیا تھا۔

فأرسل عثمان الى حفصة أن أرسلى الينا بالمصحف، ننسخها : جزم کے ساتھ اور رفع کے ساتھ دونوں طرح درست ہے۔

فی المصاحف : یعنی مجموعہ۔ ثم نردها : دال پر ضمہ اور فتحہ دونوں جائز ہیں۔

اليك فأرسلت بها حفصةُ الى عثمان فأمر زيد بن ثابت : یعنی انصار میں سے اور۔

وعبد الله بن الزبير وسعيد بن العاص وعبد الله بن الحارث بن هشام : یعنی یہ قریش میں سے۔

فنسخوها فی المصاحف : یعنی متعدد نسخے۔ وقال عثمان للرهط القريشيين الثلاث : یعنی زید کے علاوہ۔

اذا اختلفتم أنتم وزيد بن ثابت فی شیء من القرآن فاكتبوه بلسان قريش : یعنی ان کی لغت میں۔

فانما نزل : یعنی غالبًا۔

بلسانهم : طیبیؒ فرماتے ہیں: یعنی پہلی بار ان کی زبان میں نازل ہوا پھر رخصت دے دی کہ ساری لغتوں میں پڑھ سکتے ہو۔ سخاوی فرماتے ہیں: انہوں نے لفظ التابوت میں اختلاف کیا، زید کہنے لگے ''التابوه'' اور دوسرے ''التابوت''، تو انہوں نے حضرت عثمانؓ کی طرف رجوع کیا تو انہوں نے فرمایا کہ ''ت'' کے ساتھ لکھو، یعنی التابوت، کیونکہ یہ قریش کی لغت میں ہے، اور حضرت عثمان سے انہوں نے ''لم يتسنّ'' کے بارے میں پوچھا تو تو آپؓ نے فرمایا اس میں ''ها'' بھی لگا دو، یعنی لم يتسنّه.

اگر کہا جائے کہ عثمانؓ نے ان کو یعنی ان کاتبین کو زید کی طرف سہارا لینے کا کیوں کہا؟ حالانکہ ابوبکرؓ نے یہ کام نہیں کیا؟ میں کہتا ہوں: ابوبکر صدیقؓ کا مقصد اور غرض قرآن کو اس کے ان تمام حروف اور وجوہ کے اعتبار سے جمع کرنا تھا، جن پر وہ نازل ہوا۔ اور یہ لغت قریش پر

بھی تھا اور اس کے علاوہ پر بھی، تو ابو بکرؓ نے جو جمع کیا وہ حضرت عثمانؓ کے جمع سے مختلف ہے۔

اگر کوئی کہے: کہ اس مصحف کو حاضر کرنے کا کیا مقصد تھا حالانکہ زید موجود تھے، اور حفظ کی نسبت ان کی طرف کی گئی ہے' میں کہتا اس سے مقصد لوگوں کی غلط فہمیوں کی باتیں کرنے کا دروازہ بند کرنا تھا۔ اور اس سے کوئی گمان کرنے والا یہ گمان کر بیٹھے کہ جو مصحف میں تھا قرآن نہیں تھا۔ اور تاکہ کوئی انسان یہ خیال نہ کرے کہ اس میں انہوں نے کوئی ایسی چیز بھی لکھی ہے جو قراءت نہیں کی گئی۔ تو وہ اس کا انکار کر دے تو مصحف کے لانے کا مقصد یہ تھا کہ جو انہوں نے مصحف لکھا اس سارے کا یہ مصحف شاہد بن جائے۔

ففعلوا : یعنی انہوں نے جمع کرنا شروع کیا۔ **حتی اذا نسخوا** : یعنی لکھ لیا انہوں نے۔

أفق : ہمزہ اور فاء کے ضمہ کے ساتھ یعنی تمام اطراف میں۔ **بمصحف مما نسخوا** : سخاوی فرماتے ہیں: کہ حضرت عثمانؓ نے ان میں سے ایک نسخہ کوفہ روانہ کیا اور ایک بصرہ اور ایک شام کی طرف بھیجا، اور ایک مصحف مدینہ میں باقی رکھا۔ پھر فرماتے ہیں اور یہ بھی مروی ہے کہ عثمانؓ نے اسی طرح ایسے ہی بحرین کی طرف ایک مصحف بھیجا اور ایک مکہ کی طرف اور ایک یمن کی طرف اس طرح یہ سارے دس مصاحف ہو گئے، اور اس بارے میں مختلف روایات ہیں، ایک قول پانچ نسخوں کا ہے یعنی چار یہ مذکورہ بالا اور پانچواں مکہ کی طرف جو بھیجا اور جو بحرین اور یمن والا مصحف ہے تو اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: تحقیق یہ ہے کہ چار کاتبین کے ہاتھوں سب سے پہلے صرف چار ہی نسخے لکھے گئے تھے، تین مذکورہ شہروں کی طرف روانہ کیے اور ایک مدینہ میں رکھا اور ظاہر ہے کہ جو مدینہ میں رکھا وہ زید کا تحریر کردہ تھا کیونکہ وہ کاتبین وحی میں جلیل القدر تھے۔ تو ان کا رسم الخط زیادہ لائق ہے کہ وہ مدینہ میں اصل محفوظ رہے، پھر عثمانؓ نے اس سے دیگر مصاحف لکھوائے اور پھر سارے شہروں کی طرف روانہ کئے۔ حتی کہ کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے مسلمانوں کے لشکروں میں سے ہر لشکر کی طرف ایک ایک مصحف روانہ کیا۔

وأمر بما سواه من القرآن : یعنی منسوخ تحریر شدہ۔

في كل صحيفة أو مصحف أن يحرق : بغیر نقطہ کے حاء کے ساتھ احراق سے ہے جلانا۔ اور یہ نقطہ والی خاء سے بھی مروی ہے یعنی ختم کر دے یا کاٹ دے۔ طیبیؒ نے یہ قول ذکر کیا ہے۔ اور عسقلانی فرماتے ہیں: کہ اکثر روایات میں نقطہ والی خاء کے ساتھ "یخرق" کے الفاظ ہیں اور مروزی نے بغیر نقطہ کے کہا ہے اور الاصیلی نے دونوں کو کہا ہے اور ابوداؤد اور طبرانی وغیرہ کی ایک روایت میں ہے جو کہ بغیر نقطہ کے حاء پر دلالت کرتی ہے۔

سخاوی فرماتے ہیں: جب عثمان مصاحف کے معاملات سے فارغ ہوئے، تو اس کے ماسوا سب کو جلا دیا اور حفصہ والا مصحف کو واپس کر دیا اور وہ انہی کے پاس رہا جب مروان مدینہ کا گورنر بنا، اس نے حضرت حفصہؓ سے وہ مصحف جلانے کے لئے طلب کیا، لیکن ام المؤمنین نے نہ دیا اور نہ ہی اس کو اس بارے میں کوئی جواب دیا، جب وہ فوت ہو گئیں تو مروان ان کے جنازے میں شریک ہوا اور ان کے بھائی عبداللہ بن عمر سے وہ مصحف طلب کر لیا اور اس کام کے کرنے کا پختہ کیا، واپس پلٹے تو اس کو نکالا، اور اس کو اس ڈر سے جلا دیا کہ کہیں یہ ظاہر نہ ہو جائے اور لوگ سابقہ اختلاف کی طرف پھر پلٹ آئیں۔

اور علماء نے مصحف کے پھٹے ہوئے اوراق کے بارے اختلاف کیا ہے جب کہ ان سے کوئی نفع باقی نہ رہے کہ زیادہ بہتر بہانا ہے یا جلانا ہے۔ کہا گیا ہے کہ دوسرا یعنی جلانا' دھونے سے بہتر ہے کہ تحقیر کی ساری صورتوں کو ختم کر دیتا ہے، کیونکہ ایک قول یہ بھی ہے کہ دھوڈالنا اور دھو کر پاک جگہ میں پانی بہا دینا کیونکہ جلانے میں تحقیر کی قسم آجاتی ہے۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: اور حضرت کا فعل جلانے کو ترجیح دیتا ہے' ان کے جلانے کا مقصد مکمل طور پر حفاظت کے لئے تھا' اس میں تحقیر و توہین کا کوئی پہلو نہیں تھا۔

اور ہمارے ائمہ نے جلانے کی حرمت کو اس پر محمول کیا ہے جب کہ اس میں مال کے ضیاع کا احتمال ہو کیونکہ جس مکتوب میں قرآن ہوگا جلانے سے اس کی قیمت کا نقصان ہوگا۔ میں کہتا ہوں: کہ یہ نہایت مضحکہ خیز تاویل ہے اور عجیب استنباط ہے کیونکہ مسئلہ کی بناء اس صورت میں ہے جب کوئی فائدہ نہ ہو اور حضرت عثمانؓ کے فعل پر قیاس جائز نہیں کیونکہ ان کے فعل سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ قرآن نہیں تھا، یا اس میں بہت زیادہ اختلاط وغیرہ تھا جو کہ جدا جدا کرنے کو قبول نہیں کرتا اور انہوں نے جلانا اس لئے بہتر سمجھا کہ بعض قرآن کے چھوڑنے کے بارے شک زائل ہو جائے گا۔ جب کہ اگر وہ قرآن ہوتا تو کسی مسلمان کے لئے اس کو جلانا جائز ہی نہیں اور اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ حکم نہیں دیا گیا کہ وہ راکھ کی حفاظت کرے کہ وہ نجاست میں گرے اس بنیاد پر کہ وہ ایک صفت سے دوسری صفت میں نہیں رہی جیسا کہ شافعیہ نے بھی یہی کہا ہے، اور یہاں پر جو کلام ہے وہ قطعی طور پر ثابت ہے۔ جلانے اور دھونے میں فرق کی وجہ سے اور جلانے میں اہانت کے ظہور کی وجہ سے دھونا متعین ہے اور مناسب ہے کہ اسکا پانی پی لیا جائے، کیونکہ یہ ہر بیماری کی دوا ہے اور سینے کی بیماریوں کی شفاء ہے۔

اگر کوئی کہے کہ یہ اختلاف آج اس موجودہ دور میں بھی باقی ہے تو تمہارا اتفاق کو دعویٰ کہاں گیا؟ میں بتاتا ہوں: وہ قراءتیں جن پر ہم آج قائم ہیں، ان مذکورہ مصاحف سے باہر نہیں ہیں، جن میں زیادتی یا کمی کی طرف رجوع کیا جائے اور جو بھی اختلاف ہے وہ اعراب یا نقطوں کا ہی ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں، کیونکہ ان مصاحف کے رسم الخط نقطوں کے بغیر تھے اور ان میں تمام سارے اعراب اور نقطوں کا احتمال تھا جیسا کہ پڑھا جاتا ہے: "**فصُر هُنّ**" صاد کے ضمہ کے ساتھ اور کسرہ کے ساتھ "**كلہ للہ**" رفع اور نصب دونوں کے ساتھ اور "**ویضر کم**" اور "**بضر کم**" اور "**یقص اوریقص الحق**.

شاطبی فرماتے ہیں: تمام مصاحف کا رسم الخط مصحفِ عثمانیہ کے رسم الخط کے موافق ہونا چاہئے۔ مالک فرماتے ہیں: قرآن کتاب میں لکھا گیا نہ تو آج کے اس نئے انداز میں تھا اور نہ اس طرح سطریں تھیں اور ابو عمرو الدانی امام مالک کے قول کے بعد فرماتے ہیں کہ اس میں ان کا کوئی مخالف نہیں۔

قال ابن شهاب : یعنی الزہری۔ **فأخبرنی خارجة بن زید بن ثابت، انه سمع زید بن ثابت قال: فقدت آیة من الاحزاب حین نسخنا** : یعنی میں نے اور قریشی صحابہ نے۔

المصحف : یعنی مصاحف۔

قد كنت أسمع رسول الله ﷺ يقرأبها، فالتمسناها، فوجدناها مع خزيمة بن ثابت الانصاری : یعنی لکھی ہوئی جیسے کہ گزر چکا ہے۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ ابو عمارہ الاوسی تھے بدر اور اس کے بعد والے غزوات میں شریک ہوئے اور جنگ صفین میں حضرت علیؓ کے لشکر میں تھے جب عمارؓ شہید ہوئے تو انہوں نے اپنی تلوار ننگی کر لی اور لڑتے رہے حتی کہ شہید ہو گئے۔

﴿**من المؤمنين رجال صدقوا** ......﴾ [الاحزاب: ۲۳]

فألحقناها فی سورتها فی المصحف : اس میں اشکال ہے اور وہ یہ کہ اس کا ظاہر اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ آیت مصحف میں موجود نہ تھی اور ہر مصحف میں بعد میں لکھی گئی۔ لیکن یہ بہت دور کی بات ہے، پس درست بات یہ ہے کہ مصحف سے مراد پہلے پہل والے صحائف ہیں، جو کہ پہلی جمع کے وقت اس میں لکھے گئے تھے۔ اور متکلم کی ضمیر "ن" کے ساتھ تعظیماً ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں اس حدیث میں واضح بیان ہے کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے دو گتوں کے درمیان قرآن کو جمع کیا کہ قرآن جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ پر نازل کیا اور بعض حفاظ صحابہ کے جانے سے انہیں قرآن کے بعض حصے کے ضائع ہونے کا خوف ہوا تو انہوں نے اس کو اسی طرح لکھا جس طرح انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے وہ قرآن سنا تھا اور رسول اللہ ﷺ صحابہ کو تلقین کرتے تھے

اور جو بھی آپ پر قرآن نازل ہوتا، تو اس کی ترتیب توقیفی ہے جواب ہمارے مصاحف میں موجود ہے، یہ ترتیب صحابی کرام کو حضور ﷺ نے سکھائی جس کی راہنمائی جبریل آمین آپ کی کرتے تھے اور یہ ترتیب توقیفی ہے اور نشاندہی کرنا ہر آیت کے نزول کے وقت کہ یہ آیت فلاں سورت میں فلاں آیت کے بعد رکھنی ہے۔ اور اس کا مفہوم حضرت عثمانؓ سے مروی ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا واضح کرنا کہ دونوں سورتیں علیحدہ علیحدہ ہیں

۲۲۲۲: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قُلْتُ لِعُثْمَانَ مَا حَمَلَكُمْ عَلٰى اَنْ عَمَدْتُّمْ اِلَى الْاَنْفَالِ وَهِيَ مِنَ الْمَثَانِي وَاِلٰى بَرَاءَةَ وَهِيَ مِنَ الْمِئِيْنِ فَقَرَنْتُمْ بَيْنَهُمَا وَلَمْ تَكْتُبُوْا سَطْرَ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ وَوَضَعْتُمُوْهَا فِي السَّبْعِ الطُّوَلِ مَا حَمَلَكُمْ عَلٰى ذٰلِكَ قَالَ عُثْمَانُ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مِمَّا يَأْتِي عَلَيْهِ الزَّمَانُ وَهُوَ يُنْزَلُ عَلَيْهِ السُّوَرُ ذَوَاتُ الْعَدَدِ وَكَانَ اِذَا نَزَلَتْ عَلَيْهِ شَيْءٌ دَعَا بَعْضَ مَنْ كَانَ يَكْتُبُ فَيَقُوْلُ ضَعُوْا هٰؤُلَاءِ الْاٰيَاتِ فِي السُّوْرَةِ الَّتِيْ يُذْكَرُ فِيْهَا كَذَا وَكَذَا فَاِذَا نَزَلَ عَلَيْهِ الْاٰيَةُ فَيَقُوْلُ ضَعُوْا هٰذِهِ الْاٰيَةَ فِي السُّوْرَةِ الَّتِيْ يُذْكَرُ فِيْهَا كَذَا وَكَذَا وَكَانَتِ الْاَنْفَالُ مِنْ اَوَائِلِ مَا نَزَلَتْ بِالْمَدِيْنَةِ وَكَانَتْ بَرَاءَةُ مِنْ اٰخِرِ الْقُرْاٰنِ نُزُوْلًا وَكَانَتْ قِصَّتُهَا شَبِيْهَةً بِقِصَّتِهَا فَقُبِضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَلَمْ يُبَيِّنْ لَنَا اَنَّهَا مِنْهَا فَمِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ قَرَنْتُ بَيْنَهُمَا وَلَمْ اَكْتُبْ سَطْرَ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ وَوَضَعْتُهَا فِي السَّبْعِ الطُّوَلِ۔ (رواه احمد الترمذی وابو داود)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۴۸۹/۱ حدیث رقم ۷۸۶۔ والترمزی فی السنن ۲۵۴/۵ حدیث رقم ۳۰۸۶۔ واحمد فی المسند ۵۷/۱۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عثمانؓ سے کہا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ آپ نے سورۂ انفال کو جو ''مثانی'' (سورتوں) میں سے ہے اور سورت برأت (یعنی توبہ) کو جو ''مِیئین'' میں سے ہے، پاس رکھا ہے اور دونوں سورتوں کے درمیان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھ کر فرق بھی قائم نہیں کیا ہے پھر یہ کہ آپ نے سورۂ انفال کو سات لمبی سورتوں کے درمیان رکھا ہے آخر اس کا سبب کیا ہے؟ حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں وقت گزرتا رہتا تھا اور آیتوں والی سورتیں نازل ہوتی رہتی تھیں چنانچہ آپ ﷺ کا معمول مبارک یہ تھا کہ جب قرآن کی کوئی آیت یا اس کا کچھ حصہ آپ ﷺ پر نازل ہوتا تو آپ ﷺ کاتبان میں سے کسی کو یعنی زید بن ثابت وغیرہ کو بلاتے اور فرماتے کہ اس آیت کو اس سورت میں شامل کر دو جس میں فلاں فلاں کا ذکر ہے۔ اس کے بعد پھر جب کوئی آیت نازل ہوتی تو اس کے بارے میں فرماتے کہ اسے اس سورت میں شامل کر دو جس میں فلاں فلاں کا ذکر ہے اور سورۂ انفال ان سورتوں میں سے ہے جو مدینہ میں نازل ہوئی ہیں جب کہ سورت برأت قرآن کا وہ حصہ ہے جو آخر میں نازل ہوا ہے لیکن سورۂ انفال میں مذکورہ باتیں سورۃ برأت میں مذکور باتوں کے مشابہ ہیں یعنی دونوں سورتوں میں کافروں سے برسرِ پیکار ہونے اور عہد ختم کرنے کا بیان ہے۔ (یعنی بلحاظِ مضمون دونوں آپس میں مشابہت رکھتی ہیں۔ نبی کریم ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے لیکن ہمیں یہ نہیں بتا گئے کہ سورۃ برأت انفال کا ہی حصہ ہے یا نہیں؟ لہٰذا نبی کریم ﷺ کے نہ بتانے کے سبب اور دونوں سورتوں میں از روئے مفہوم معنی مماثلت و مشابہت ہونے کے باعث ہم نے دونوں سورتوں کو ملا دیا ہے لیکن ہم نے دونوں کے درمیان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھ کر فرق قائم نہیں کیا اور پھر ہم نے ان دونوں سورتوں کو قریب

قریب سات بڑی سورتوں کے درمیان رکھا لیکن ان دونوں کے درمیان فاصلہ رکھا یعنی دونوں کو الگ الگ رکھا کیونکہ جس طرح دونوں کے دو ہونے میں شبہ تھا اسی طرح دونوں کے ایک ہونے میں بھی شبہ تھا۔'' (احمد، ترمذی، ابوداؤد)

تشریح: **وعن ابن عباس قال:قلت لعثمان:ما حملكم :** یعنی ترغیب دینے والی ابھارنے والی چیز اور کیا سبب ہے تمہارے اس کام کا۔

علی أن عمدتم : میم کے فتحہ کے ساتھ یعنی تم نے قصد کیا۔

الی الأنفال وهی من المثانی : یعنی سبع مثانی میں سے اور وہ ہی سبع طوال ہیں، اور ان میں بعض مفسرین نے کہا کہ قرآن میں جو مثانی ہیں، ان سے مراد وہ سورتیں ہیں جن کی آیات کم ہوں سو سے۔

اور سارے قرآن کا نام بھی مثانی رکھا جاتا ہے آیت رحمت کا آیت عذاب کے ساتھ ملے ہونے کی وجہ سے اور فاتحہ کو بھی مثانی کہا جاتا ہے کیونکہ وہ نماز میں بار بار پڑھی جاتی ہے یا اس کے نزول کے وقت دو بار نازل ہوئی۔ **والی براء ة :** یعنی اس کی سورت۔

وهی : کہ اس کی (ایک سوتیں) آیات ہیں۔

من المئین : مائة کی جمع ہے، اور مائة کی اصل مائی ہے معی کی طرح اور ھاء، واؤ کے عوض میں آئی ہے، اور تم مائة کی جمع بناؤ تو مئون کہو گے اور اگر آپ مئات کہیں تو بھی جائز ہے۔

فقرنتم بینهما ولم تکتبوا سطر 'بسم الله الرحمٰن الرحیم و وضعتموها فی السبع الطول؟ :

الطول، طاء کے ضمہ اور واؤ کے فتحہ کے ساتھ۔

ما حملكم علی ذالك : ایک نسخے میں **علی ذالکم؟** ہے۔ اور یہ تکرار تاکید کے لئے ہے، اور سوال کی توجیہہ ہے کہ انفال سو سے کم آیات والی ہونے کی وجہ سے سبع طوال میں نہیں ہے، کیونکہ اس کی تو صرف ستتر (77) آیات ہیں۔

قال عثمان: کان رسول الله ﷺ مما یاتی علیه الزمان : یعنی لمبا عرصہ اور آپ پر کچھ بھی نازل نہ ہوا۔ اور کبھی کبھی آپ پر ایک زمانہ گزر جاتا۔

وهو : یعنی نبی علیہ السلام۔ اور واؤ حالیہ ہے۔

تنزل : اگر معروف پڑھیں گے تو مونث کے لئے اور اگر مجہول پڑھیں گے تو مذکر کے لئے ہوگا۔

علیها السور ذوات العدد، و کان اذا نزل علیه شیء : یعنی قصص وغیرہ میں سے۔

دعا بعض من کان یکتب : یعنی وحی لکھنے والے جیسے کہ زید بن ثابت اور معاویہ بن سفیان وغیرہ۔

فیقول:ضعوا هؤلاء الآیات فی السورة التی یذکر فیها کذا و کذا : جیسا کہ ھود اور یونس علیہما السلام کا قصہ۔

فاذا نزلت علیه الأیة فیقول:ضعوا هذه الایة فی السورة التی یذکر فیها کذا و کذا : جیسا کہ طلاق اور حج وغیرہ کا ذکر اور یہ جواب کی زیادتی اس کے ساتھ آپؐ نے دلالت کے لئے تبرع کیا، کہ آیات کی ترتیب توقیفی ہے اور اس پر اجماع بھی ہے، اور بہت سی نصوص بھی موجود ہیں، اور رہی سورتوں کی ترتیب تو اس میں اختلاف ہے جیسا کہ اتقان میں ہے۔

کانت الانفال من أوائل ما نزلت : اور ایک نسخے میں نزل کے الفاظ ہیں۔

بالمدينة و كانت براءة من آخر القرآن نزولا : یعنی یہ بھی مدنی سورت ہے۔اوران کے درمیان ترتیب کی نسبت میں پہلی اورآخری کی نسبت ہے،ان دونوں کے درمیان جمع کی وجوہ میں سے یہ ایک توجیہ ہے۔اوراس کی تائیداس کے بعدوالی روایت کرتی ہے کہ میں نے گمان کیا کہ یہ اسی میں سے ہےاور یہ بات بھی مستند ہے جس نے کہا کہ یہ دونوں ملا کرایک ہی سورت ہےاور یہ وہ روایت ہے جوابوالشیخ دوق سےاورابویعلی نے مجاہد سےاورابن ابی حاتم نے سفیان سےاورابن لہیعۃ یہ سارے کہتے ہیں کہ سورۃ توبہ انفال کا حصہ ہے،اسی لئے ان کے درمیان بسم اللہ نہیں لکھی گئی۔ان دونوں کے مضامین کے ملنے جلنے کی وجہ سے اور نبی ﷺ سے ان دونوں کا الگ الگ مستقل نام ہے۔قشیری کہتے ہیں کہ صحیح بات یہ ہے کہ بسم اللہ اس میں ہے ہی نہیں، کیونکہ جبریل اس میں بسم اللہ لے کر ہی نہیں آئے اورابن عباسؓ سے مروی ہے کہ سورۃ توبہ کے شروع میں بسم اللہ اس لئے نہیں لکھی گئی کہ بسم اللہ اَمان ہےاوراور یہ سورت تو تلوار کے ساتھ نازل ہوئی۔اور مالک سے روایت ہے کہ اس سورت کا ابتدائی حصہ جب منسوخ ہونے کی وجہ سے حذف ہو گیا تو اس کے ساتھ بسم اللہ بھی ساقط ہوگئی، کیونکہ بالتحقیق روایت ثابت ہے کہ یہ سورت توبہ اتنی لمبی تھی کہ سورۃ البقرۃ کے برابر تھی،اورایک قول کے مطابق بسم اللہ ثابت ہے۔اس کا ابتدائی حصہ ابن مسعودؓ کے مصحف میں تھااوراس پر کوئی اعتمادنہیں۔

و كانت قصتها : یعنی الانفال۔

شبيهة بقصتها : یعنی براءۃ کےاورضمائر میں اس کا عکس بھی جائز ہےاور یہ دوسری توجیہ معنوی ہے۔اورشاید کے مشابہت قتال کے معاملہ میں ہوجیسا کہ سورۃ توبہ میں فرمان الٰہی ﴿قاتلوهم يعذبهم الله﴾ [التوبة: ١٤]اوراسی طرح کی دیگرآیات اورعہد کے توڑنے کے بارے سورۂ انفال میں ﴿فانبذ اليهم﴾ [الأنفال: ٥٨] اورابن حجرؒ فرماتے ہیں: کیونکہ سورہ انفال نے مشرکین مکہ کے رسول اللہ کے ساتھ جومعاملات ان کو بیان کیا ہےاورسورۃ توبہ نے اہل مدینہ کے منافقین کے رویہ اور کردار کوواضح کیا ہےاور حاصل یہ ہے کہ جو چیز میرے لیے ہوئی وہ یہ ہے کہ ان دونوں میں حکم مشترک ہے۔

فقبض رسول الله ﷺ ولم يبيّن لنا أنها : یعنی سورۃ توبہ۔

منها : یعنی انفال سے ہے یااس کا حصہ نہیں ہے۔

فمن اجل ذلك: یعنی جواس میں عدم وضاحت کا ذکر ہےاور جو وجہ ہمارے لئے ظاہر ہوئیں وہ یہ ہیں کہ ان کے درمیان مناسبت ہے۔

قرنت بينهما، ولم اكتب سطر "بسم الله الرحمٰن الرحيم : یعنی عدم علم کی وجہ سے آیا کہ یہ مستقل سورۃ ہے کیونکہ آپ علیہ السلام پر بسم اللہ فصل کے لئے نازل ہوتی تھی اور یہاں نازل نہ ہوئی اور نہ میں نے لکھی۔

اوروہ قول اس کی نفی نہیں کرتا، جوحضرت علیؓ سے منقول ہے:کہ ''بسم اللہ کے نہ نازل ہونے میں حکمت ہے وہ یہ کہ ابن عباسؓ نے حضرت علیؓ سے پوچھا، کہ کیوں نہیں لکھی گئی؟ تو علیؓ نے کہا کہ بسم اللہ تو امان ہے، جب کہ سورۃ توبہ میں امن نہیں ہے، بلکہ وہ تلوار کے ساتھ نازل ہوئی اورعرب کارواج تھا کہ وہ صلح کے مراسلوں میں بسم اللہ لکھتے تھے اور جب عہد توڑتے تو بسم اللہ نہیں لکھتے تھے اور قرآن بھی اسی اصطلاح پر نازل ہوا تو بسم اللہ آمان کی علامت ہوگئی اوراس کی عدمیت' عہد کے توڑنے کی علامت۔ان کے قول امان کا یہ معنی ہےاوران کا قول کہ بسم اللہ آیۃ رحمت ہےاوراس کا نہ ہونا عذاب ہے،اسی طرح جعبری نے بھی اس کوذکر کیا ہے۔

و وضعتها في السبع الطول : طیبیؒ فرماتے ہیں: کہ یہ کلام دلالت کرتا ہے کہ یہ دونوں بمنزلہ ایک سورت کے نازل ہوئی ہیں، اوراس کو ملا کر سبع طوال مکمل ہوتی ہیں، پھرایک قول ہے کہ سبع طوال یہ ہیں' بقرۃ اور توبہ، اور جوسورتیں ان کے مابین ہیں اور یہ مشہور قول ہے۔لیکن نسائی اور حاکم نے ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ سبع طوال بقرۃ اورالاعراف اوران کے درمیان والی سورتیں ہیں۔راوی کہتے ہیں: اورانہوں نے ساتویں بھی ذکر کی تھی لیکن مجھے بھول گئی اور یہ احتمال بھی ہے کہ وہ سورۃ الفاتحہ ہو کیونکہ وہ بھی سبع المثانی سے ہے، یاوہ بھی سبع مثانی ہے،اوراس کی سات آیات 200 کے برابر ہیں اور یہ بھی احتمال ہے کہ انفال اکیلی یا اس کے متصل بعد والی سے مل کر مثانی میں سے ہواورابن جبیر سے صحیح روایت مروی ہے کہ وہ یونس ہےاوراسی جیسی روایت ابن عباسؓ سے مروی ہے۔

شاید اس کی توجیہ یہ ہو کہ سورۃ انفال اوراس کے بعدوالی سورت یعنی توبہ کے مثانی ہونے میں اختلاف ہے۔

اوران میں سے ہرایک سورۃ ہے یا یہ دودونوں سورتیں ہیں۔

اوراسی طرح نسائی اورابن حبان اور حاکم نے بھی روایت کی ہے۔

اور حضرت علیؓ سے صحیح روایت مروی ہے وہ فرماتے ہیں: کہ عثمانؓ کے بارے میں کلمہ خیر کے سوا کچھ نہ کہو۔اللہ کی قسم! انہوں نے مصاحف کے بارے میں جو کیا وہ ہماری موافقت اور حمایت سے ہی کیا۔فرمایا انہوں نے یعنی حضرت عثمانؓ نے کہا تھا کہ تم اس قراءت کے بارے میں کیا باتیں کرتے ہو؟ مجھے یہ خبر ملی ہے کہ تم آپس میں سے ایک دوسرے کو کہتے ہیں کہ میری قراءت تمہاری قراءت سے بہتر ہےاور یہ تو کفر کے قریب ہے؟ میں نے کہا: آپ کا کیا خیال ہے؟ تو عثمانؓ نے کہا میرا خیال ہے کہ لوگ ایک ہی مصحف پر جمع ہو جائیں کہ نہ کوئی فرقہ رہےاور نہ کوئی اختلاف۔میں نے کہا کہ آپؓ کا خیال بہت اچھا ہے۔

ابن التین فرماتے ہیں: کہ ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عثمانؓ کے جمع قرآن کے درمیان فرق یہ ہے کہ ابوبکرؓ کے جمع کرنے کا مقصد یہ تھا کہ انہیں ڈر تھا کہ قرآن کے حفاظ کے دنیا سے جانے سے قرآن میں سے کچھ ضائع نہ ہو جائے۔

کیونکہ اس وقت تک قرآن کسی ایک جگہ میں جمع نہیں تھا، تو انہوں نے قرآن کو صحائف میں سورتوں کی آیات کو اسی ترتیب پر مرتب کر کے جس پران کو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے چھوڑا تھا' جمع کیا۔

اور حضرت عثمانؓ کے جمع کرنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ جوہِ قراءت میں اختلاف زیادہ ہو گیا، جب لوگوں نے لغات کی وسعت پر اپنی لغتوں میں پڑھنا شروع کر دیا۔تو انہوں نے ایک دوسرے کی قراءت کو غلط کہا۔تو حضرت عثمان اس بڑے معاملے سے جو قرآن کے متعلق ہے ڈر گئے اور تمام صحف کو ایک صحیفے میں سورتوں کے اعتبار سے لکھ دیا۔اور ساری لغات میں سے صرف لغت قریش پر اقتصار کیا اس سے دلیل لیتے ہوئے کہ قرآن ان کی لغت میں نازل ہوا، اوراس کی قراءت میں دیگر لغتوں کی وسعت بھی وہ شروع شروع میں حرج ومشقت کے دور کرنے کی خاطر تھی۔

پس انہوں نے دیکھا کہ اب اس کی ضرورت ختم ہو گئی، تو انہوں نے ایک ہی لغت پر اقتصار کر لیا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ وہم ڈالا جاتا ہے کہ انہوں نے اس کو بھی چھوڑ دیا جس کا قرآن ہونا ثابت تھا، یعنی وہ واقعتاً قرآن ہی تھا۔اور درست بات یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ ابوبکرؓ کی جو جمع تھی' اس منسوخات اور متواتر قراءت بغیر کسی تہذیب وترتیب کے کلی طور پر جمع تھیں۔

عثمانؓ نے منسوخات کو چھوڑ دیا، اور متواترات کو باقی رکھا اور رسم الخط کو خوبصورت کر کے لکھوایا اور سورتوں اور آیات کی ترتیب مقرر

کی، عرضہ اخیرہ کے موافق جو تمام نسخے اس کے مطابق تھے جو لوح محفوظ میں ہے اگر چہ اس کے حالات ومقامات کے تقاضے کے مطابق تھوڑا تھوڑا نازل ہونے پر اختلاف کیا گیا ہے۔

اور اسی لئے باقلانی فرماتے ہیں: حضرت عثمانؓ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کی طرح صرف قراءت کا ارادہ نہیں کیا، بلکہ حضرت ابو بکرؓ نے تو صرف نبی علیہ السلام سے مروی عام معروف قراءت پر صحابہ کو جمع کرنے کا قصد کیا تھا، اور اس میں کوئی الغاء نہیں ہے۔ اور ان کو ایک مصحف میں جس میں نہ کوئی تقدیم ہے نہ تاخیر تھی اکٹھا کر دیا۔

اور حاصل کلام یہ ہے کہ یہ مقدار اس طرز وطریقہ پر ہے جو اللہ بلند و برتر کا کلام ہے متواتر طرق سے جس پر محدثین کا اجماع بھی ہے، جو اس میں کمی بیشی کرے وہ کفر میں داخل ہو گیا، پھر اس بات پر بھی اتفاق ہو گیا کہ آیات کی موجودہ ترتیب توقیفی ہے کیونکہ باعتبار نزول آخری آیت: ﴿واتقوا یوما ترجعون فیه الی الله﴾ [البقرة: ۱۸۲] ہے تو جبریل نے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حکم دیا تھا کہ اس آیت کو آیت مداینہ اور آیت الربا کے درمیان رکھیں، اسی لئے قرآن کی موجودہ ترتیب کے الٹ کو حرام کہا گیا ہے، البتہ سورتوں کی ترتیب پڑھنے میں آگے پیچھے کی جا سکتی ہے کیونکہ اس میں اختلاف ہے، اور بلا عذر اس کی مخالفت صحیح نہیں، کیونکہ ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے سورۃ النساء کو سورۃ آل عمران سے پہلے پڑھا، جواز کے بیان کے لئے یا نسیان کے ساتھ، تا کہ اس کی صحت کا علم ہو جائے، اس کے باوجود صحیح بات یہ ہے کہ سورتوں کی موجودہ ترتیب توقیفی ہے، اگر صحابہ کے مصاحف مختلف تھے عرضۃ اخیرہ سے پہلے جس پر حضرت عثمانؓ کے جمع شدہ مصحف کا مدار ہے کسی نے نزول کے اعتبار سے ترتیب دی تھی، اور یہ حضرت علیؓ کا مصحف تھا اس کی ترتیب اسی طرح تھی۔ سب سے پہلے سورۃ اقراء، پھر مدثر، پھر نون، پھر مزمل، پھر تبت، پھر تکویر، اسی طرح آخر تک مکی اور مدنی سورتیں۔

اور یہ چیز بھی اس ترتیب کے توقیفی ہونے پر دلالت کرتی ہے کہ حوامیم ''تسلسل'' کے ساتھ ہیں اور اسی طرح طواسین یعنی طس والی سورتیں جبکہ مسبحات کو تسلسل کے ساتھ مرتب نہیں کیا۔

بلکہ ان سورتوں کے درمیان فصل کیا ہے اور اسی طرح مکی اور مدنی سورتیں مکس ہیں یعنی مکی سورتوں کا مدنی سورتوں کے ساتھ اختلاط ہے۔ واللہ اعلم

كِتَابُ الدَّعْوَاتِ

یہ کتاب دعاؤں کے بیان میں ہے

دعوات : دعوۃ بمعنی دعا کی جمع ہے۔دُعا کے معنی ہیں کہ ''اعلیٰ ذات سے ادنیٰ چیزوں میں سے کچھ چیزیں بطریق عاجزی طلب کرنا'' امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہر زمانہ میں اور ہر جگہ کے علماء اس بات پر متفق رہے ہیں کہ دعا مانگنا مستحب ہے ان کی دلیل قرآن وحدیث کے ظاہری اور واضح مفہوم کے علاوہ انبیاء علیہم السلام کا فعل بھی ہے کیونکہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام دعا مانگا کرتے تھے۔

لیکن بعض زاہدین وعارفین کا کہنا ہے کہ ترک دعا (یعنی دعا نہ مانگنا) افضل ہے کیونکہ اس طرح رضاء مولیٰ اور اپنی قسمت اور تقدیر کے ساتھ راضی ہونے کا مکمل اظہار ہوتا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ پیش آیا کہ جب انہیں آگ میں ڈالا گیا تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ان سے کہا کہ آپ دعا کیجئے اور اپنے پروردگار سے اپنی نجات وسلامتی کے لئے درخواست کیجئے تو انہوں نے فرمایا کہ حق تعالیٰ جل شانہ میرا حال جانتا ہے مجھے کوئی درخواست کرنے اور دعا مانگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ایک گروہ کا کہنا ہے کہ اگر مسلمانوں کیلئے دعا مانگتا ہے تو یہ مستحسن ہے اور اگر صرف اپنے لئے مانگتا ہے تو مستحسن نہیں اور بعض کا کہنا ہے کہ اگر دعا کا کوئی باعث ہو تو دعا مانگنا مستحب ہے ورنہ نہیں۔

الفصل الاول :

قیامت کے دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم امت کی شفاعت کریں گے

۲۲۲۳ : عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم لِكُلِّ نَبِيٍّ دَعْوَةٌ مُسْتَجَابَةٌ فَتَعَجَّلَ كُلُّ نَبِيٍّ دَعْوَتَهُ وَاِنِّی اخْتَبَاْتُ دَعْوَتِیْ شَفَاعَةً لِاُمَّتِیْ اِلٰی يَوْمِ الْقِيَامَةِ فَهِیَ نَائِلَةٌ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ مَنْ مَاتَ مِنْ اُمَّتِیْ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا۔ (رواہ مسلم و للبخاری اقصر منه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۱/۱۷۰ حدیث رقم ٦٣٦١۔ ومسلم فی صحیحه ٤/۲۰۰۷ حدیث رقم (۸۸۔ ۲٦۰۰) وأحمد المسند ۲/۳۱۷۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہر نبی کے لئے ایک دعا ہوتی ہے جو قبول کی جاتی ہے پس ہر نبی نے دعا کرنے میں جلدی کی۔اور تحقیق میں اپنی دعا چھپا رکھی ہے اپنی امت کی شفاعت کے واسطے مؤخر کر دی ہے قیامت کے دن تک۔پس ہر اس شخص کو پہنچنے والی ہے اگر اللہ نے چاہا' میری امت میں سے جن کو

موت آئی اس حال میں کہ اس نے شریک نہیں کیا اللہ کے ساتھ۔اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے اور بخاری شریف کی روایت اس سے کمتر ہے۔

تشریح: قوله : ان لكل نبى دعوة مستجابة فتعجل كل نبى دعوته :

ہرایک نبی کے لئے ایک دعا ہے جو قبول کی جاتی ہے اِس جملہ کی دو تشریحات بیان کی گئی ہیں:

① اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو حکم فرمایا تھا کہ اپنے مخالفین کی تباہی کے لئے بددعا کریں' لہٰذا وہ بددعا کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ اسے منظور فرماتا تھا چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی امت کی ہلاکت وتباہی کے لئے بددعا کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی پوری امت طوفان میں غرق کردی گئی۔

اسی طرح حضرت صالح علیہ السلام نے بھی اپنی امت کی تباہی کے لئے بددعا کی اور امت ان کی حضرت جبرئیل علیہ السلام کی ایک آواز کے ذریعہ ہلاکت ہوئی وادیوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن ہوگئی (لیکن میں نے اپنی دعا کو محفوظ رکھا)۔

② یہ بات طے ہے کہ ہر نبی کی ایک دعا یقینی طور پر قبول کی جائے گی۔بخلاف باقی دعاؤں کے' باقی دعاؤں کی اجابت کی طمع کی جاسکتی ہے۔

قوله :وانی اختبأت دعوتی شفاعة لامتی فهی نائلة إن شاء الله من مات من امتی لا بشرك بالله شيئاً ::

"اختبأت" اختباء سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں چھپانا۔لام تعلیلیہ ہے۔أی لأجل أن اصرفها لهم خاصة بعد العامة (شفاعة حال ہے) أی حال كونها شفاعة ـ قوله :"إلى يوم القيامة "(کا متعلق محذوف ہے) أی مؤخرة إلى ذلك اليوم ـاور ایک نسخہ میں "يوم القيامة" ہے۔اس صورت میں یہ "شفاعة" کے لئے ظرف ہوگا۔

"مَنْ" مفعول ثانی ہے نائلة کے لئے اور "مِنْ"، "مَنْ" کا بیان ہے اور لا يشرك بالله "مات" کی ضمیر سے حال ہے۔

"شيئاً "میں ترکیبی دو احتمال ہیں: (۱) مفعول بہ ہو۔(۲) مفعول مطلق ہو۔

اور اس جملہ کا حاصل یہ ہے کہ میں نے اپنی دعا کو محفوظ رکھا' بایں طور کہ اپنے مخالفین کی ایذا پر صبر کیا اور ان کے لئے بددعا نہ کی۔اور "امت" سے مراد امت اجابت ہے۔ قیامت کے دن اس دنیا میں بددعا کے بجائے ہر اس امتی کے حق میں شفاعت فرمائیں گے جو ایمان کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوا ہو اگرچہ وہ گنہگار ہی کیوں نہ ہو۔

"إن شاء الله" کہنے کی حکمت:

ابن الملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس (شفاعت) کا حصول یقینی ہونے کے باوجود "ان شاء اللہ" فرمانا ازروئے ادب اور اس آیت کریمہ کے امتثال کی خاطر تھا: ﴿ولا تقولن لشیٔ إنی فاعل ذلك غدا الا أن يشاء الله﴾ [الكهف : ۲۳] اھ

اور زیادہ واضح بات یہ ہے کہ یہاں "ان شاء اللہ" کے کلمات فرمانا بطور تبرک کے تھا' آیت میں امر سے مراد دنیا میں واقع ہونے والے افعال ہیں' آخرت میں پیش آنے والی اخبار سے اس کا تعلق نہیں ہے۔

اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اس کا تعلق اگلے جملہ "من مات من امتی" کے ساتھ ہو۔یہ اس بات کا اعلان ہے کہ مخلوقات میں سے کسی بھی چیز کا اللہ کے ذمہ کوئی بھی حق نہیں ہے۔

ایمان میں استثناء:

محققین کا کہنا ہے کہ ایمان میں استثناء کا مسئلہ اختلافی ہے۔لیکن یہ اختلاف لفظی ہے لہٰذا جس کا ارادہ تعلیق فی الحال کا ہوگا وہ کافر ہو جائیگا، اور اگر تبری محض کا ارادہ تھا یا مآل پر نظر کرتے ہوئے تھا بالاتفاق وہ شخص کافر نہیں ہوگا۔ ہمارے اصحاب نے "أنا مؤمن ان شاء الله" کہنے سے منع فرمایا ہے کیونکہ اس میں ایہام ہے۔

قوله : والبخاری اقصر منه : عرض مرتب: مرقات کے تحتانی متن میں "اقتصر" از باب افتعال ہے اور فوقانی متن میں "أقصر" از باب افعال ہے۔مرقاۃ کے محشی فوقانی متن کی بابت لکھتے ہیں:

هكذا فی الأصل ولها وجه فی اللغة وهی علی وزن افتعال' بینما فی المشكاة "أقصر" علی وزن أفعل۔

نبی کریم ﷺ جہان والوں کے لئے رحمت بن کر آئے

۲۲۲۴ :وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَللّٰهُمَّ اِنِّی اتَّخَذْتُ عِنْدَكَ عَهْدًا لَّنْ تُخْلِفَنِيْهِ فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ فَاَیُّ الْمُؤْمِنِيْنَ اٰذَيْتُهُ شَتَمْتُهُ لَعَنْتُهُ جَلَدْتُّهُ فَاجْعَلْهَا لَهُ صَلٰوةً وَزَكَاةً وَقُرْبَةً تُقَرِّبُهُ بِهَا اِلَيْكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱۱/ ۱۳۹ حدیث رقم ۶۳۳۸۔ ومسلم فی صحیحه ۴/ ۲۰۶۳ حدیث رقم (۷۔ ۶۷۸)۔

ترجمه: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا یا الٰہی میں نے تجھ سے ایک حاجت مانگی ہے مجھے اس کے ساتھ بہرہ مند کر دیجئے اور مجھے اس میں ناامید نہ کر۔یعنی میں امیدوار ہوں کہ تو ضرور قبول کرے گا۔ پس سوائے اس کے نہیں کہ میں بشر ہوں۔ پس کسی مؤمن کو میں نے ایذا دی ہو میں نے برا کیا ہو۔ میں نے اس کو لعنت کی ہو میں نے اس کو مارا ہو پس ان سب چیزوں کو اس کے حق میں رحمت سمجھو اور گناہوں سے پاکی اور نزدیکی کا سبب کہ تو نزدیک کرے اس کو ان سب چیزوں کی وجہ اپنی طرف قیامت کے دن۔اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله: اللهم انی اتخذت عندك عهدا لن تخلفنيه**: باب افعال "اخلاف" مصدر سے ہے۔بعض کا کہنا ہے کہ اصل کلام یوں تھا: **إنی طلبت منك حاجة أسعفنی بها ولا تخيبنی فيها۔**

"**حاجة**" کی جگہ لفظ "عہد" ذکر فرمایا، اس میں حاجت کے پورا ہونے کو مبالغہ کے ساتھ بیان کرنا مقصود ہے اور **لا تخيبنی** کی جگہ **لن تخلفنيه** ذکر فرمایا۔

بعض کا کہنا ہے کہ لفظ "**عهد**" کو موضع "**وعد**" میں ذکر فرمایا ہے۔مبالغہ مقصود ہے اور اشعار ہے کہ یہ وعدہ ہے عہد کی طرح، اس میں تخلف نہیں ہو سکتا اور اسی وجہ سے "عہد" کے بعد "**خلف**" استعمال فرمایا، "نقض" ذکر نہیں فرمایا۔ یہ اسلوب تعبیر زیادتِ تاکید کی خاطر اختیار فرمایا۔بعض کا کہنا ہے کہ عہد سے مراد "امان" ہے۔ أی :**أسألك أمانا لن تجعله خلاف ما أترقبه وأرتجيه**۔ یعنی میری اس امان کو رد نہ فرمایئے۔ چونکہ انبیاء کرام علیہم السلام کی دعا رد نہیں ہوتی اور موضع سوال میں "**اتخاذ**" کو ذکر فرمانا تحقیق رجاء کی بنیاد پر ہے کہ وہ حاصل ہے یا اجابت دعا کے ساتھ موعود ہے۔ **شئ موعود** کی جگہ **مسئول معهود** کو ذکر فرمایا اور پھر **لن تخلفنيه** کے ذریعہ اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ اللہ کے وعدہ میں خلاف ورزی نہیں ہوتی۔

قوله: فإنما أنا بشر : ایک روایت میں آتا ہے: **أغضب كما يغضب البشر۔**

"فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ" عذر کی تمہید ہے کہ میں بھی انسان ہوں کبھی کبھی بتقاضائے بشریت کسی پر خفا بھی ہو جاتا ہوں۔

ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ" فرمانے میں بشر کی ظلومیت وجہولیت کی طرف اشارہ ہے۔ اھ اور حاصل یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ربّ کے دربار میں آہ وزاری کرتے ہوئے یہ دعا فرمائی ہے کہ اے میرے ربّ مجھے میرے نفس کے سپرد مت فرما۔ جیسا کہ ایک حدیث میں بھی ایسا ہی آیا ہے: ((اللهم لا تكلني إلى نفسي طرفة عين......))۔

قوله: فاي المؤمنين آذيته......يوم القيامة: یہ جملہ ماقبل کلام کیلئے بمنزلہ بیان وتفصیل کے ہے۔ کہ نبی کریم علیہ السلام نے اپنے مولیٰ سے یہ بات طلب کی ہے کہ اگر مجھ سے کوئی ایسی بات سرزد ہوگئی ہو جو بشریت کے مقتضی کے لائق نہ ہو تو عفو ومغفرت کے ذریعہ اس کا تدارک فرما دیجئے اور اس کے عوض میں میرے معتوبین کو انواع قرابت عطا فرما۔

"شتمته" آذيته کے لئے بیان ہے۔ چنانچہ اس وجہ سے حرفِ عطف کو ذکر نہیں فرمایا۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: **ذكر هذه الأمور على سبيل التعداد بلا تنسيق، وقابلها بانواع الالطاف متناسقة ليجمعها كل واحد من تلك الأمور و ليس من باب اللف۔** ان امور کو علی سبیل التعداد ذکر کرنا ان میں تنسیق قائم کئے اور ان کے مقابلہ میں تنسیق کے ساتھ ذکر کیا ہے اور یہ لف نشر مرتب کے باب میں سے نہیں ہے۔

ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "تقربه بها" یہ جملہ صلاة و زكاة وقربة کی صفت ہے۔ **أي تقربة بتلك الأذية، او بكل واحد من الصلاة واختيه۔**

دُعا کرتے وقت خدا تعالیٰ پر پورا یقین ہونا چاہئے

۲۲۲۵: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اِذَا دَعَا اَحَدُكُمْ فَلَا يَقُلْ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ اِنْ شِئْتَ ارْحَمْنِيْ اِنْ شِئْتَ ارْزُقْنِيْ اِنْ شِئْتَ وَلْيَعْزِمْ مَسْأَلَتَهُ اِنَّهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ وَلَا مُكْرِهَ لَهُ۔ (رواه البخاري)

أخرجه البخاري في صحيحه ١١/١٣٩ حديث رقم ٦٣٣٨۔ ومسلم في صحيحه ٤/٢٠٦٣ حديث رقم (٧۔ ٦٧٨)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی دعا مانگے تو یہ نہ کہے اے الٰہی! مجھے بخش دے اگر چاہے' اگر چاہے تو مجھ پر رحم کر اور اگر چاہے تو مجھ کو روزی دے اور چاہے کہ عزم بالجزم کرے اپنے مانگنے میں شک کا کلمہ نہ کہے اس واسطے کہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے اس پر کوئی زبردستی کرنے والا نہیں ہے۔ اس کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: **فلا يقل...... ان شئت:** مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے جو کچھ مانگو جزم ویقین کے ساتھ مانگو یعنی "یہی کہو کہ "اے اللہ ہمارا فلاں مطلب پورا کر"۔ جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے اس لئے یہ نہ کہو" کہ اگر تو چاہے تو ہمارا فلاں مطلب پورا کر دے۔" کیونکہ اس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے قبولیت دعا میں شک پیدا کرنا ہے حالانکہ قبولیت دعا میں یقین ہونا چاہئے کیونکہ اس نے قبولیت دعا کا وعدہ کیا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کیا کرتا وہی کرتا ہے جو چاہتا ہے اس لئے اپنی دعا کے ساتھ یہ کہنا کہ "اگر تو چاہے" بالکل بے فائدہ اور لا حاصل ہے۔

قوله: وليعزم مسألته انه يفعل ما يشاء:

"انه يفعل ما يشاء" یہ جملہ مستانفہ ہے تعلیل کے معنی کو متضمن ہے۔ ایک نسخہ میں "انه" ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

ابن الملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: روایت معتبرہ میں "انه" ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ "ليعزم" کا مفعول لہ ہے۔ **أي لأنه يفعل ما يشاء۔** یا مسالة کیلئے مفعول بہ ہے۔ **أي ليجزم مسألته فعل ما شاء** اھ۔ مفعول بہ ہونا معنی کے اعتبار سے درست نہیں۔ (فتأمل)

۲۲۲۶: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا دَعَا اَحَدُكُمْ فَلَا يَقُلْ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِي اِنْ شِئْتَ وَلٰكِنْ لِيَعْزِمْ لِيُعَظِّمُ الرَّغْبَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَتَعَاظَمُهُ شَيْءٌ اَعْطَاهُ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۲۰۹۵/٤ حدیث رقم (۹۔۲۷۳۵)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس وقت تم سے کوئی دعا مانگے پس یہ نہ کہے الٰہی مجھے کو بخش اگر تو چاہے۔ لیکن طلب کرے بغیر شک کے یقین کے ساتھ اور رغبت زیادہ کرے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی چیز دینی مشکل نہیں ہے۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: وليعظم......الخ: ''ليعظم'' (باب تفعیل سے ہے) ظاء مشدد ہے۔

''لا یتعاظمه'': اہل عرب کہتے ہیں: تعاظم زيد هذا الامر۔ أى كبر عليه وعسر۔

اور مطلب یہ ہے کہ کسی بھی شی کا عطا کرنا اللہ کے نزدیک بڑا نہیں۔ بلکہ تمام موجودات اس کے حکم میں آسان ہیں، وہ ہر شی پر قادر ہے۔ حدیث میں آتا ہے:

لو اجتمع الأولون والآخرون على صعيد واحد، فسأل كل مسألة وأعطيه اياها ما نقص ذلك من ملكى شيئا۔

''اگر اگلے اور پچھلے ایک جگہ جمع ہوں اور تم میں سے ہر شخص اپنی انتہائی آرزو و خواہش کے مطابق مانگے (یعنی جس کے دل میں جو بھی آرزو اور خواہش ہو مجھ سے مانگے) اور پھر تم میں سے ہر شخص کو (اس کی خواہش کے مطابق دوں) تو اس سے میری خدائی میں کچھ بھی کمی نہیں ہوگی۔''

عرض مرتب: اس کے ہم معنی دو روایات آگے بھی آرہی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے: حدیث ۲۳۲۶ اور حدیث: ۲۳۵۰ھ۔

۲۲۲۷: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُسْتَجَابُ لِلْعَبْدِ مَا لَمْ يَدْعُ بِاِثْمٍ اَوْ قَطِيْعَةِ رَحِمٍ مَالَمْ يَسْتَعْجِلْ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ مَا الْاِسْتِعْجَالُ ؟ قَالَ يَقُوْلُ قَدْ دَعَوْتُ وَقَدْ دَعَوْتُ فَلَمْ اَرَ يُسْتَجَابُ لِيْ فَيَسْتَحْسِرُ عِنْدَ ذٰلِكَ وَيَدَعُ الدُّعَاءَ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۲۰۹۵/٤ حدیث رقم (۹۰ ۲۷۳۵)۔ (۱) الترمذی فی السنن حدیث رقم ۳۵۵۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا بندے کی دعا قبول کی جاتی ہے یعنی بندے کی دعا قبولیت کی شرطوں کے بعد جب تک کہ وہ گناہ کی دعا نہ مانگے' یا رشتہ توڑنے کی دعا نہ مانگے۔ جب تک وہ جلدی نہ کرے۔ کہا گیا یا رسول اللہ جلدی کیا ہے' آپ نے فرمایا: وہ کہے کہ تحقیق میں نے دعا مانگی اور تحقیق میں نے دعا مانگی' یعنی اکثر بار میں نے دعا مانگی۔ پس میں نے دیکھا کہ قبول میری دعا نہ ہوئی۔ پھر وہ تھک جائے اور دعا مانگنی چھوڑ دے۔

تشریح: قوله: يستجاب للعبد ما لم يدع باثم او قطيعة رحم: ''ما'' يستجاب کیلئے ظرف ہے۔ أى مدة كونه۔

یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ مؤمن کی دعا اس وقت قبول ہوتی ہے جب کہ وہ نہ گناہ کی کوئی چیز طلب کرے اور نہ ناتہ توڑنے کی دعا کرے اور نہ جلد بازی سے کام لے۔

گناہ کی چیز مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص یہ دعا مانگنے لگے ''اے اللہ''! مجھے فلاں شخص کو (جو مسلمان ہے) قتل کر دینے کی صلاحیت عطا فرما' یا یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے شراب یا کوئی حرام وغیرہ عطا فرما' یا یہ کہے کہ ''اے اللہ! فلاں شخص کو بخش دے درانحالیکہ اس بارے میں یقین

ہے کہ وہ کافر مرا ہے ظاہر ہے اس قسم کی دعا مانگنا اور پھر ان کی قبولیت کی توقع ہی رکھنا دیدہ دلیری ہی کہا جا سکتا ہے اس طرح محال اور غیر ممکن الوقوع چیزوں کی دعا مانگنا اور ان کی قبولیت کی امید رکھنا بھی انتہائی حماقت اور بے وقوفی کی بات ہے مثلاً کوئی عقل کا اندھا یہ دعا مانگے کہ اے اللہ! تو مجھے دنیا ہی میں حالت بیداری میں اپنا دیدار عطا فرما۔ ''ناتہ توڑنے کی دعا'' کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بد باطن شخص یہ دعا مانگنے لگے کہ ''اے اللہ! مجھ میں اور میرے باپ میں جدائی اور تفریق کر دے'' اس حدیث کے مفہوم کے مطابق مؤمن کی ایسی غیر ایمانی دعا بھی قبول نہیں ہوتی۔۔

حدیث کے آخر میں الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ یہ بات بندہ مؤمن کی شان کے لائق نہیں ہے کہ اگر قبولیت دعا میں تاخیر محسوس ہو تو تھک کر بیٹھ جائے اور دعا مانگنا ہی چھوڑ دے کیونکہ دعا بھی عبادت ہے اور عبادت سے اس طرح اکتاہٹ یا دل گرفتگی مؤمن کے لئے کسی بھی حال میں مناسب نہیں ہے پھر یہ کہ قبولیت دعا میں تاخیر یا تو اس لئے ہوتی ہے کہ اس کا وقت نہیں آتا کیونکہ ازل ہی میں ہر چیز کے وقوع اور تکمیل کا ایک وقت مقرر ہے جب تک وہ وقت نہیں آیا وہ چیز بھی وقوع پذیر نہیں ہوتی یا یہ دعا مانگنے والا جو دعا مانگتا ہے اس کی تقدیر میں اس کی دعا کا اس دنیا میں قبول ہونا لکھا نہیں ہوتا اس صورت میں اسے اس کے بدلہ میں آخرت کا ثواب عطا کیا جاتا ہے یا پھر قبولیت میں تاخیر اس لئے ہوتی ہے تاکہ دعا مانگنے والا دعا مانگنے میں پوری عاجزی و انکساری، سچی لگن اور تڑپ اور کمال عبودیت کا اظہار کرتا رہے کیونکہ دعا میں ان چیزوں کو اختیار کرنے والے کو اللہ تعالیٰ بہت پسند کرتا ہے۔

''**أو قطيعة رحم**'': یہ تخصیص بعد از تعمیم ہے۔

''**مالم يستعجل**'': امام طیبیؒ فرماتے ہیں: بظاہر **مالم يستعجل** کے ساتھ حرف عطف ذکر کرنا چاہئے تھا۔ لیکن اس بات پر تنبیہ کی خاطر ترک فرمایا کہ یہ دونوں مستقل قیودات ہیں۔ أي: **يستجاب مالم يدع يستجاب مالم يستعجل**۔

ابن حجرؒ لکھتے ہیں: **في تخليد المؤمن والرؤية نظر ظاهر، فان الخلاف شهير** ......۔اھ۔

ابن حجرؒ کا یہ کلام مردود ہے، چونکہ خوارج اور معتزلہ کے اختلاف کا کوئی اعتبار ہی نہیں ہے۔ اور رؤیت باری تعالیٰ شرعاً محال ہے، موسیٰ علیہ السلام کا رؤیت باری تعالیٰ کا سوال کرنا اس بناء پر تھا کہ رؤیت باری تعالیٰ عقلاً محال نہیں ہے۔ چنانچہ جب انہیں افاقہ ہوا اور رؤیت باری تعالیٰ کا شرعاً محال ہونا معلوم ہوا تو پکار اٹھے: ﴿**سبحانك تبت اليك وأنا أول المسلمين**﴾ [الاعراف: ۱۴۳] یعنی کہ آپ کو دنیا میں نہیں دیکھا جا سکتا۔ کہا گیا ہے کہ: ''**ومنه أخف زللنا عن الكرام الكاتبين۔ نعم، ان قصد التوفيق للتوبة عقب الزلة حتى لا يكتبها الملك جاز**۔ اس کی دلیل ابن عساکر کی یہ حدیث ہے: **اذا تاب العبد أنسى الله تعالىٰ الحفظة ذنوبه، وأنس ذلك جوارحه ومعالمه من الأرض، حتى يلقى الله تعالىٰ وليس عليه شاهد من الله بذنب**۔ اور اسی قبیل سے وہ احادیث آحاد ہیں جو اس کے ثبوت پر دلالت کر رہی ہیں۔ مثلاً: **اللهم اغفر للمسلمين جميع ذنوبهم**۔ چونکہ احادیث صحیحہ اس پر دلالت کر رہی ہیں کہ ایک جماعت لازمی طور پر جہنم میں جائے گی۔ اور یہ قول بھی اس کے منافی نہیں: **اللهم اغفرلي ولجميع المسلمين**۔ چونکہ اس کا محل وہ صورت ہے کہ جب مسلمانوں کیلئے مطلق مغفرت کا سوال کرے۔ البتہ جب اپنے لئے اور ان کیلئے آخرت میں عموم مغفرت کا ارادہ ہو تو یہ محل حرمت میں ہے، چونکہ اس صورت میں یہ شخص احادیث صحیحہ کی تکذیب کا مرتکب ہو رہا ہے۔ عجمی زبان میں مانگی گئی ہر مجہول المعنی دعا بھی اسی قبیل سے ہے۔ اور اسی قبیل سے یہ بد دعا بھی ہے کہ جب کسی نے اس پر بالکل ظلم نہ کیا ہو اور یہ اس کیلئے بد دعا کرے۔ یا ظالم کے ظلم سے بڑھ کر اس کے خلاف کوئی بد دعا کی جائے۔ سعد بن زید کا قصہ اس کے منافی نہیں کہ انہوں نے اپنے اوپر کئے جانے والے ظلم سے بڑھ کر ان کے حق میں بد دعا کی تھی، یہ صحابی کا مذہب ہے۔ ترمذی کی ایک حدیث میں

آتا ہے: من دعا علی ظالمه فقد انتصر۔

کسی ظالم کے سوءِ خاتمہ کی بدعا کرنا:

کسی ظالم کے بارے میں سوء خاتمہ کی بدعا کرنے میں جواز وعدم جواز کا اختلاف ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ مباح ہے۔ جیسا کہ نوح علیہ الصلاۃ والسلام نے کی تھی: ﴿ولا تزد الظالمين الا ضلالا﴾[نوح:٢٤] اور موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا: ﴿واشدد علی قلوبهم﴾[یونس:٨٨] عتبہ بن أبی وقاص نے جنگ احد میں جب نبی کریم ﷺ کے دندان مبارک شہید کئے اور آپ ﷺ کا چہرۂ انور زخمی کیا تو آپ ﷺ نے اسے یہ بددعا دی: ''اللهم لا تحل عليه الحول حتى يموت كافرا''۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ ممنوع ہے۔

ابن حجرؒ لکھتے ہیں: بعض اہل علم نے دونوں کے درمیان جمع کی صورت یہ بیان کی ہے کہ اول کو ایسے سرکش پر محمول کیا ہے جس کا ظلم عام ہو۔ اور دوسری صورت کو غیر ظالم پر محمول کیا ہے۔ اھ درست یہ ہے کہ پہلی صورت کافر پر محمول ہے اور دوسری صورت مسلم پر محمول ہے۔

قوله: ما الاستعجال :...... **فلم أر** : (رؤیت بمعنی علم ہے یا بمعنی ظن ہے۔) **أی فلم أعلم أو أظن دعائی**۔ یہ مفعول اول ہے اور مفعول ثانی محذوف ہے۔ (**كذا قاله الطيبی**) اور زیادہ واضح یہ ہے کہ **يستجاب** سے پہلے'' **أن** ''مقدر ہے۔ یا بغیر **أن** کے بتاویل مصدر ہے۔

میں نے دعا کو قبول ہوتے نہیں دیکھا کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنی دعا کی قبولیت کے آثار نہیں دیکھے۔ (یہ کہنا دو حال سے خالی نہیں کہ یا تو) یہ ''استبطاء'' ہے یا اظہار ''یاس'' ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں مذموم ہیں۔

''استبطاء'' اس وجہ سے مذموم ہے کہ اجابت کا ایک وقت معین ہے، جیسا کہ مروی ہے:

ان بين دعا موسى وهارون على فرعون وبين الأجابة أربعين سنة

کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون نے فرعون کیلئے جو بددعا کی اس کی قبولیت میں چالیس سال کا عرصہ لگا

اور ''یاس'' اس وجہ سے مذموم ہے کہ یہ حکم قرآنی کے مخالف ہے: ﴿**فلا ييأس من روح الله الا القوم** ......﴾

اجابت دعا کی اقسام:

واضح رہے کہ اجابت کی دو قسمیں ہیں: (ا) عین مطلوب بروقت مطلوب حاصل ہو جائے۔ (ب) عین مطلوب کسی اور وقت میں حاصل ہو، اور اعتقاد یہ ہو کہ اللہ نے کسی حکمت کے پیش نظر اس کو مؤخر کر دیا ہے۔

غائب کی دُعا غائب کے لئے بہت جلد قبول ہوتی ہے

٢٢٢٨ وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ دَعْوَةُ الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ لِاَخِيْهِ بِظَهْرِ الْغَيْبِ مُسْتَجَابَةٌ عِنْدَ رَاْسِهٖ مَلَكٌ مُوَكَّلٌ كُلَّمَا دَعَا لِاَخِيْهِ بِخَيْرٍ قَالَ الْمَلَكُ الْمُوَكَّلُ بِهٖ اٰمِيْنَ وَلَكَ بِمِثْلٍ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ٢٠٩٤/٤ ــ حديث رقم (٨٦ـ ٢٧٣٢)ـ وابن ماجه فی السنن ٩٦٦/٢ حديث رقم ٢٨٩٥ـ واحمد فی المسند ١٩٥/٥ـ

ترجمہ: حضرت ابی درداءؓ سے روایت ہے کہ مسلمان آدمی کی دعا اپنے مؤمن بھائی کے لئے اس کے پیٹھ پیچھے (یعنی غائب آدمی کی دعا غائب کے لئے قبول کی جاتی ہے۔اس کے لئے ایک فرشتہ متعین کر دیا جاتا ہے یعنی دعا مانگنے والے کے لئے ایک فرشتہ متعین کیا جاتا ہے جب وہ اپنے بھائی کے لئے بھلائی کی دعا مانگتا ہے متعین کیا گیا فرشتہ کہتا ہے کہ یا اللہ اس کی دعا قبول کر۔اور تیری بھی اسی طرح سے۔اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله:دعوة المرء المسلم لاخيه بظهر الغيب مستجابة :**

امور نحویہ: ''المرء '' مرد وعورت دونوں کو شامل ہے۔لفظ ''ظهر '' مقحم للتاکید ہے۔(اصل عبارت یوں ہے):أى: **في غيبة المدعوله عنه**۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''**بظهر الغيب**'' مضاف الیہ سے حال ہونے کی بناء پر موضع نصب میں ہے، چونکہ لفظ ''**دعوة**'' مصدر اپنے فاعل کی طرف مضاف ہے۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ مصدر کیلئے ظرف ہو اور ''**مستجابة** '' اس کی خبر ہو۔

یہاں تو بطور خاص اس دعا کی قبولیت کی بشارت دی گئی ہے جو اپنے مسلمان بھائی کے لئے اس کی عدم موجودگی میں زبان سے نکلے لیکن ایسے ہی اگر کوئی مسلمان کے لئے اس کے سامنے اپنے دل میں چپکے سے دعا کرے تو وہ دعا بھی اس بشارت کے تحت آتی ہے کیونکہ جس طرح غائبانہ دعا میں خلوص کارفرما ہوتا ہے اور اس کے نتیجہ میں دعا قبول ہوتی ہے اسی طرح اس کی موجودگی میں اپنے دل میں یا چپکے سے دعا کرتے وقت بھی پوری طرح خلوص ہی کی کارفرمائی ہوتی ہے۔

قوله: عند رأسه ملك مؤكل: جملہ مستانفہ ہے، استجابت کا بیان ہے۔

قوله:كلما دعا لاخيه.....لك بمثل : ''**آمين**'':(اسم بمعنی فعل امر ہے)أى :**استجب له يا رب**۔

''**لك**'':میں ''التفات'' ہے۔یا اصل عبارت یوں ہے:**استجاب الله دعاك في حق أخيك**

''**بمثل**'': میم کے کسرہ، ثائے مثلثہ کے سکون اور لام کی تنوین کے ساتھ ہے۔ابن حجر کا یہ کہنا کہ ''دونوں کے فتحہ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔'' بے موقع محل ہے۔أى :**ولك مشابه هذا الدعا** ۔

امام طیبیؒ لکھتے ہیں: ''**بمثل** ''مبتدا پر داخل یہ باء زائدہ ہے، جیسا کہ **بحسبك الدرهم** میں باء زائدہ ہے۔

حدیث کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ دعا قبول کرنے والے کے ساتھ جو فرشتہ متعین کیا جاتا ہے کہ وہ دعا کے وقت بارگاہ حق شانہ میں یہ سفارش پیش کرتا ہے کہ الٰہی اس شخص کی دعا اس کے بھائی کے حق میں قبول فرما اور پھر وہ دعا کرنے والے کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ ''جس طرح اس دعا کے نتیجہ میں تیرا بھائی خیر و بھلائی کو پہنچے گا اسی طرح خدا کرے کہ تجھے بھی خیر و بھلائی حاصل ہو۔

دُعا کا ایک انداز:

بعض کا کہنا ہے کہ بعض سلف کی عادت تھی کہ جب وہ اپنے لئے کوئی دعا مانگنے کا ارادہ کرتے تو بعینہ وہی دعا اپنے مسلمان بھائی کیلئے مانگتے تھے، تاکہ فرشتہ ان کیلئے بھی اس کے مثل کی دعا دے اور قبولیت کیلئے زیادہ معین ہو۔اھ

لیکن یہ بظاہر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کے مخالف ہے، چنانچہ عنقریب آجائے گا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کے مخالف ہے، چنانچہ عنقریب آجائے گا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پہلے اپنے لئے دعا فرماتے تھے، اور پھر دوسرے کیلئے دعا فرماتے تھے۔

بد دُعا کرنے سے ممانعت

۲۲۲۹ : وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا تَدْعُوْا عَلٰی اَنْفُسِكُمْ وَلَا تَدْعُوْا عَلٰی اَوْلَادِكُمْ وَلَا

تَدْعُوْا عَلٰی اَمْوَالِکُمْ لَا تَوَافِقُوْا مِنَ اللّٰهِ سَاعَةً یُسْأَلُ فِیْهَا عَطَاءً فَیَسْتَجِیْبُ لَکُمْ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۲/۸۸ حدیث رقم ۱۵۳۲۔

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اپنی جانوں کے خلاف بددعا نہ کرو۔ اور نہ ہی اپنی اولاد کے خلاف بددعا کرو۔ اور نہ ہی اپنے مالوں کے خلاف بددعا کرو۔ یعنی غلام ولونڈیوں کے خلاف اور جانوروں کے خلاف تاکہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ایسی ساعت کہیں نہ ہو کہ اس میں تمہارے لئے بخشش مانگی جائے اور اللہ تعالیٰ تمہارے لئے قبول کر لے۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله لاتدعوا علی انفسکم ...... لاتوافقوا من الله ساعة:**

"**عطاء**": مفعول ثانی ہونے کی بناء پر منصوب ہے، ایک نسخہ میں مرفوع ہے، اس صورت میں یہ "**یسأل**" کا نائب فاعل ہوگا۔

"عطاء" کہتے ہیں ہر عطا کردہ چیز، خواہ وہ خیر ہو، خواہ وہ شر ہو۔ اس کا اکثر و بیشتر استعمال "خیر" کے معنی میں ہوتا ہے۔

(**فیستجیب**) مرفوع ہے۔ چونکہ اس کا عطف "**یسئل**" پر ہو رہا ہے، یا اس لئے کہ جملہ مستانفہ ہے۔ ای **فهو یستجیب**۔ سید جمال الدینؒ رقمطراز ہیں کہ ہم نے اس کو مرفوع ہی سنا ہے۔ اھ۔

اور کچھ شارحینؒ فرماتے ہیں: "**یسئل**" میں ضمیر لفظ جلالہ کی طرف راجع ہے۔ اور یہ جملہ "**ساعة**" کی صفت واقع ہے اور "**فیستجیب**" منصوب ہے کیونکہ یہ "**لا توافقوا**" کا جواب ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ جواب نہی "**لا تدن من الاسد فیأکلك**" کے قبیل سے ہے۔ امام کسائی کے مذہب کے مطابق اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ مرفوع ہو تقدیری عبارت یوں ہو: "**فهو یستجیب**"۔

کچھ اوقات ایسے ہوتے ہیں جس میں حق تعالیٰ کی بارگاہ میں ہر دعا کو شرف قبولیت سے نوازا جاتا ہے اس لئے کہیں ایسا نہ ہو کہ تم جس وقت اپنے لئے یا اپنی اولاد یا اپنے مال کے لئے بددعا کرو وہی وقت قبولیت دعا کا ہو اور پھر تمہاری بددعا قبول ہو جائے جس کے نتیجے میں پشیمانی بھی ہو لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ جو نادان کسی مصیبت و تکلیف یا غصہ کے وقت اپنے لئے یا اپنی اولاد کے لئے اپنے اموال کے لئے بددعا کرتے ہیں وہ مناسب نہیں ہے۔

قوله: اتق دعوة المظلوم: یہ پوری حدیث اس طرح ہے: "**اتق دعوة المظلوم، فانه لیس بینها و بین الله حجاب**" یعنی جب وہ ظالم کیلئے بددعا کرتا ہے تو وہ قبول ہوتی ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ کسی پر ظلم نہ کر، یوں کہ کسی سے اس کا حق چھین لو، یا کسی کے حق کو روک لو، یا بہتان باندھ کر کسی کی عزت پر ہاتھ ڈال دو تاکہ وہ تجھے بددعا نہ دے۔

قوله فی کتاب الزکوٰة: چونکہ یہ دعا وہاں ایک طویل حدیث کے ضمن میں مذکور ہے تکرار کی وجہ سے یہاں ذکر نہیں کی، فقط اس کی طرف اشارہ کر دیا۔ (واللہ اعلم بالصواب)۔

الفصل الثالث:

ہر حاجت کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو

۲۲۳۰: وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِیْرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ ثُمَّ قَرَأَ وَقَالَ رَبُّکُمُ ادْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ۔ (رواہ احمد والترمذی وابو داود والنسائی وابن ماجة)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/٢٧٩ حدیث رقم ٤٠٤٩۔ وابن ماجه ١٢٥٨/٢ حدیث رقم ٣٨٢٨ واحمد فی المسند ٢٦٧/٤۔

ترجمہ: حضرت نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارساد فرمایا دعا عبادت ہے پھر یہ آیت پڑھی اور تمہارے پروردگار نے کہا کہ مجھ سے دعا مانگو میں قبول کروگا تمہارے لئے اس کو امام احمد اور ترمذیؒ اور ابوداؤ داور نسائیؒ نے نقل کیا ہے اور ابن ماجہؒ نے۔ اسنادی حیثیت: امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

تشریح: **قوله: الدعا هو العباده**: یعنی یہی وہ حقیقی اور اصلی عبادت ہے جو عبادت کہلانے کا استحقاق رکھتا ہے، کیونکہ اس میں اللہ کی طرف توجہ اور غیر اللہ سے اعراض ہوتا ہے۔ بایں طور کہ نہ تو داعی کو کسی غیر سے امید ہوتی ہے اور نہ ہی غیر سے کوئی خوف رکھتا ہے۔ اس کا یہ عمل فرضیت عبودیت کا عکاس ہے اور اس کی ربوبیت کے اعتراف کا آئینہ دار، نیز یہ نعمت ایجاد کا دل سے معتقد ہے اپنی مراد کے موافق اللہ کی مدد اور سعادتمندی کی توفیق کا طالب۔

امام راغبؒ فرماتے ہیں کہ ''**عبودية**'' اظہار ذلت کا نام ہے اور دعا سے بڑھ کر کوئی افضل عبادت نہیں کیونکہ اس میں انتہا درجہ کا اظہار تذلل ہے اور اس کا مستحق بس وہی ہستی ہوسکتی ہے جس میں انتہائی درجہ کی برتری ہو۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں یہ بھی ممکن ہے کہ عبادت کو اس کے لغوی معنی پر محمول کیا جائے جو انتہائی درجہ کے تذلل، احتیاج اور مسکینی کو کہتے ہیں اور عبادت بھی اس لئے شروع کی گئی ہے کہ اس میں خالق تعالیٰ کے سامنے عجز وانکساری ہو اور اس کے سامنے اپنی احتیاج کا اظہار ہو اس کی تائید آیت کے اگلے حصہ: ﴿**ان الذين يستكبرون عن عبادتی سيدخلون جهنم داخرين**﴾ [غافر: ٦٠] سے بھی ہوتی ہے چنانچہ اس میں عدم افتقار وتذلل کی تعبیر تکبر سے کی گئی ہے۔ اور ''**دعائی**'' کے بجائے ''**عبادتی**'' کہا گیا ہے، نیز استکبار کی سزاء ذلت وخواری قرار دی گئی ہے۔

علامہ میرکؒ فرماتے ہیں کہ درمیان میں ضمیر فصل اور خبر معرّف باللام لائی گئی ہے۔ تا کہ اس بات پر دلالت ہو کہ عبادت دعا کے سوا کچھ نہیں۔

اور اس کا مطلب یہ ہے کہ دعا عظیم عبادت ہے، جیسے کہا جاتا ہے ''**الحج عرفة**'' حج میں ایک عظیم رکن وقوف عرفہ ہے۔

اور اس کا یہ ہے کہ دعا ہی عبادت ہے۔ خواہ قبول ہو یا نہ ہو کیونکہ یہ بندہ کی طرف سے اظہار واحتیاج ہے، اور اس میں یہ اعتراف ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی دعا کو قبول کرنے پر کامل قدرت رکھتا ہے، وہاں بخل کا گذر ہے نہ فقر کا، نہ وہاں ضرورت واحتیاج ہے تا کہ وہ اپنے لئے کچھ ذخیرہ کرے اور اپنے بندوں سے روکے رکھے اور یہی چیزیں عین عبادت ہیں۔

حافظ ابن حجرؒ نے غریب بات فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں شارح نے فرمایا کہ عبادت نہیں ہے مگر دعا یہ مقلوب ہے اور درست یہ ہے کہ دعا نہیں ہے مگر عبادت الخ۔

یہ حافظ صاحب کی غلطی ہے پہلی ہی بات درست ہے۔ کیونکہ یہ مبالغہ پر دلالت کرتی ہے اس حصر کی وجہ سے جو فصل لانے اور خبر کو معرف باللام ذکر کرنے سے پیدا ہوا ہے۔ جیسے علم معانی اور علم بیان میں مذکور ہے۔

قوله: ثم قرأ: ﴿**وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ ط**﴾ [غافر: ٦٠] کہا گیا ہے کہ اس آیت سے اس بات پر استدلال کیا گیا ہے کہ دعا عبادت ہے کیونکہ آیہ میں دعا مامور بہ ہے اور مأمور بہ عبادت ہوتا ہے۔

قاضیؒ صاحب فرماتے ہیں: کہ آیت سے استشہاد اس لئے کیا ہے کہ مطلوب دعا پر اس طرح مرتب ہوتا ہے جس طرح جزاء شرط پر اور مسبّب سبب پر مرتب ہوتا ہے اور یہ کامل ترین عبادت ہوتا ہے۔ اسی کی قریب وہ حدیث ہے جس میں ہے: ''**الدعا مخ العبادة**'' کہ

دعا عبادت کا مغز ہے یعنی خلاصہ ہے۔

دُعا عبادت کا مغز ہے

۲۲۳۱: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۲۵/۵ حدیث رقم ۳۴۳۱۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دعا عبادت کا مغز ہے۔ اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله: الدعا مخ العبادة**: یعنی خلاصہ ہے اور یہی عبادت سے مقصود بالذات ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ ''مخ الشیء'' خالصہ، کہ مخ ہر چیز کے خلاصہ کو کہا جاتا ہے چنانچہ ''مخ الدماغ'' خالص تھا اور ''مخ العین ومخ العظم'' یعنی آنکھ اور ہڈی کی چربی۔ مطلب یہ ہے کہ عبادت کا وجود دعا ہی سے ہے جیسے انسان کی بقا و قیام مغز سے ہے۔

۲۲۳۲: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَيْسَ شَىْءٌ اَكْرَمَ عَلَى اللّٰهِ مِنَ الدُّعَاءِ.

(رواه الترمذی و ابن ماجة وقال الترمذی هذا حدیث حسن غریب)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۲۵/۵/۳۴۲۹۔ وابن ماجه ۱۲۵۸/۲ حدیث رقم ۳۸۲۹۔ واحمد فی المسند ۳۶۲/۲۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ کے نزدیک ''دعا سے زیادہ بلند مرتبہ کوئی چیز نہیں ہے۔'' (ترمذی' ابن ماجہ' اور امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے)۔''

اسنادی حیثیت: امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

تشریح: **قوله: لیس شیء اکرم علی الله......** ''اکرم'' یہ ''لیس'' کی خبر ہے اور ''علٰی'' بمعنی ''عند'' ہے۔

یعنی اذکار و عبادات میں سے۔ لہٰذا یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿ان اکرمکم عند الله اتقاکم﴾ [الحجرات: ۱۳] کے معارض نہیں حتی کہ اس کے جواب کیلئے تکلف کرنے کی ضرورت پڑے جیسا کہ امام طیبیؒ نے اختیار کیا ہے گو کہ ان کے جواب کا مآل بھی وہی ہے جو ہم نے کہا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں: ہر چیز کی افضلیت و اشرفیت کا اپنا اپنا باب ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے ان کا تعاقب کرتے ہوئے فرمایا کہ شارحؒ کی مذکورہ تشریح کچھ بلا ضرورت ہے اور کچھ ہمارے مسئلہ کے مطابق نہیں۔

لیکن حافظؒ صاحب کا مذکورہ طعن مبہم اور علامہؒ کی بات کو نہ سمجھنے پر مبنی ہے۔

خواہ دعا بزبان حال ہو، خواہ بزبان قال ہو، چونکہ دعا مانگنے میں بندہ کی عاجزی افتقار، تذلل اور انکسار کا اظہار ہوتا ہے اور اللہ جل شانہ کی قوت و قدرت، غنی و مغنی ہونے کا اعتراف ہے، اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا اعتراف ہے اور اس بات کا اعتراف ہے کہ اللہ جل شانہ نہ ہی وہ ذات ہیں جو اپنے دشمن کے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑتی ہے تو اپنے احباء و اولیا کے قلوب متکسرہ کا انجبار کیوں نہیں فرمائیں گے۔

۲۲۳۳: وَعَنْ سَلْمَانَ الْفَارِسِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا يَرُدُّ الْقَضَاءَ اِلَّا الدُّعَاءُ وَلَا يَزِيْدُ فِى الْعُمَرِ اِلَّا الْبِرُّ. (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۳۰۳/۳ حدیث رقم ۲۲۲۵۔ وابن ماجه ۳۵/۱ حدیث رقم ۹۰۔ (۱) البخاری فی صحیحه ۱۷۹/۱۰ حدیث رقم ۵۷۲۹۔

ترجمہ: ''اور حضرت سلمان فارسیؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تقدیر کو دعا کے علاوہ اور کوئی

چیز نہیں بدلتی اور عمر کو نیکی کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں بڑھاتی۔'' (ترمذی)

تشریح: قوله: لا یرد القضاء الا الدعاء: ''قضاء'' اس امر کو کہتے ہیں جو تقدیر میں لکھا گیا ہو اور حدیث کا مطلب یہ ہے : کہ قضاء سے مراد وہ مصیبت جس کا انسان کو خطرہ ہو اور وہ اس سے بچنے کی تدبیر کرتا ہو پس جب اسے دعا کی توفیق ہو جاتی ہے تو اللہ اس سے اس مصیبت کو ہٹا دیتا ہے تو اس کو قضاء کے نام سے موسوم کرنا مجاز ہے۔ بچنے کی تدبیر کرنے والے کے اعتقاد کے موافق اس کی وضاحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جھاڑ پھونک کے بارے میں اس فرمان مبارک سے ہوتی ہے: ''**هو من قدر الله**'' یہ اللہ کی لکھی ہوئی تقدیر ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے علاج کرنے اور دعا کرنے کی تلقین فرمائی ہے باوجود یکہ جو نوشتہ، تقدیر ہے وہ ہو کے رہنے والا ہے کیونکہ اس کا وجود اور عدم وجود لوگوں سے پوشیدہ ہے۔

حضرت عمرؓ جب شام پہنچے اور انہیں یہ خبر ملی کہ یہاں طاعون کی وباء ہے تو وہاں سے واپس ہوئے اس پر حضرت ابو عبیدہؓ نے فرمایا ''**اتضر من القضاء**'' امیر المؤمنین آپ قضاء سے بھاگ رہے ہیں! اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا ابو عبیدۃ کاش یہ بات آپ نہ کہتے اور فرمایا: ''**نعم نفر من قضاء الله الى قضاء الله**'' جی ہاں ہم اللہ کی قضا سے اللہ کی قضا کی طرف بھاگتے ہیں۔

یا ردِ قضاء سے مراد اس کو آسان کر دینا اور اس میں اتنی تخفیف کر دینا ہے کہ گویا کہ وہ مصیبت نازل ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس کی تائید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اگلی حدیث سے بھی ہوتی ہے:

''**الدعا ینفع مما نزل ومما لم ینزل**''

''بے شک دعا اس چیز کے لئے نافع ہے جو پیش آچکی ہے اور اس چیز کے لئے بھی نافع ہے جو پیش نہیں آئی ہے۔''

بعض لوگ فرماتے ہیں کہ دعا ڈھال کی طرح اور مصیبت تیر کی مانند ہے اور قضاء ازلی تقدیر ہے۔

قوله: ولا یزید فی العمر الا البرّ:

''**العمر**'': میم کے ضمہ کے ساتھ اور ساکن بھی پڑھا جاتا ہے۔ ''**البرّ**'': ''باء'' کے کسرہ کے ساتھ بمعنی احسان وطاعت۔

بعض کہتے ہیں حقیقۃً عمر میں اضافہ ہوتا ہے۔ چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: ﴿**وما یعمر من معمر**......﴾

دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿**یمحوا الله ما یشاء**......﴾ [الرعد: ۳۹]

کشاف میں مذکور ہے کہ نہیں طویل ہوتی عمر کسی انسان کی اور نہ کم ہوتی ہے مگر ایک کتاب میں درج ہے اور اس کی شکل یہ ہے کہ لوح محفوظ میں یہ درج کر دیا جاتا ہے کہ فلاں شخص اگر حج نہ کرے غزوہ میں نہ جائے تو اس کی عمر چالیس برس ہوگی اور اگر وہ حج پر جائے اور غزو کرے تو اس کی عمر ساٹھ برس ہوگی پس جب وہ یہ دونوں کام کرے اور اس کو ساٹھ سال کی عمر نصیب ہو جائے تو اس کی عمر طویل ہوگئی۔

اور اگر اس نے ان دونوں میں سے ایک کام کیا اور اس کی عمر چالیس (۴۰) سال سے آگے نہ بڑھی تو اس کی وہ عمر جس پر اس کی انتہاء تھی یعنی ساٹھ سال کم ہوگئی۔ معالم التنزیل میں اسی طرح کا مضمون وارد ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب یہ حسن سلوک کرے گا تو اس کی عمر ضائع نہیں ہوگی (بلکہ اس میں برکت ہوگی اور کم عمر میں زیادہ کام کر جائے گا) تو گویا کہ اس کی عمر بڑھ گئی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نیکی کے کام طویل عمر کے لیے سبب فرض ومقدر کئے گئے ہیں۔ جیسے کہ دعا کو مصیبت ٹالنے کا سبب مانا گیا ہے چنانچہ والدین اور دیگر رشتہ داروں کیلئے دعا عمر میں اضافہ کرتی ہے بایں طور کہ اس کی عمر میں برکت دی جاتی ہے چنانچہ وہ تھوڑی سی عمر میں اتنے نیک اعمال کر جاتا ہے کہ جو عام آدمی زیادہ عمر میں بھی کر نہیں پاتا۔ لہٰذا یہ زیادت مجازی ہے کیونکہ موت کے اوقات مقرر ہیں وہ

ان سے آگے پیچھے نہیں ہو سکتی۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: جان لو کہ اللہ کی تقدیر علمی جب اس بات سے متعلق ہوگئی کہ مثلاً زید سن ۵۰۰ ہجری میں وفات ہوگا تو اب یہ بات محال ہے کہ زید اس وقت سے پہلے یا بعد میں مرے، لہٰذا یہ ناممکن ہے کہ جن عمروں سے اللہ تعالیٰ کی تقدیر علمی متعلق ہو چکی ہے اس میں کمی بیشی ہو۔ اب یہ شکل متعین ہے کہ یہ زیادتی و کمی ملک الموت یا اس کے علاوہ ان فرشتوں کی بہ نسبت ہو جو قبض ارواح پر من جانب اللہ موکل و مامور ہیں۔

بایں طور کہ اللہ نے ان فرشتوں کو اس کا حکم دیا یا لوح محفوظ میں اسے درج کیا اس میں سے کم کردے یا بڑھادے۔ یہ باری تعالیٰ کے اس قول: ﴿یمحوا اللّٰہ ما یشاء﴾[الرعد:۳۹] کے ہم معنی ہے اور اس معنی پر باری تعالیٰ کے اس قول کو محمول کیا جائے گا: ﴿ثم قضی اجلاً و جل مسمی عندہ﴾[الانعام:۲]

اس میں ''اجل'' اول سے مراد جو کچھ لوح محفوظ میں درج ہے اور اجل ثانی سے مراد جو باری تعالیٰ کے اس قول: ﴿وعندہ ام الکتاب﴾ اور ﴿اذا جاء اجلھم لا یستأخرون﴾[الاعراف:۳۴] میں ہے۔

خلاصہ یہ کہ قضائے معلق میں تبدیلی ہوتی ہے اور قضائے مبرم میں نہیں۔

ابن حبان اور حاکم کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں:

''لا یرد القدر الا الدعا و لا یزید فی العمر الا البر و ان الرجل لیحرم الرزق بالذنب یذنبہ''۔

۲۲۳۴: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ الدُّعَاءَ يَنْفَعُ مِمَّا نَزَلَ وَمِمَّا لَمْ يَنْزِلْ فَعَلَيْكُمْ عِبَادَ اللّٰهِ بِالدُّعَاءِ. (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵/۲۱۲ حدیث رقم ۳۶۱۶۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا بلاشبہ دعا اس چیز کے لئے نافع ہے جو پیش آ چکی ہے اور اس چیز کے لئے بھی نافع ہے جو پیش نہیں آئی ہے لہٰذا اے اللہ کے بندو! دعا کو اپنے لئے ضروری سمجھو۔'' (ترمذی)

تشریح: قولہ: ان الدعا ینفع مما نزل و مما لم ینزل:

دعا نازل شدہ مصیبت میں بایں طور نافع ہے کہ اگر وہ قضاءِ معلق ہو تو اس کو ہٹا کر اور اگر وہ قضائے مبرم ہو تو برداشت میں سہولت پیدا فرما لیتے ہیں اور اس کو صبر عطا فرما دیتا ہے۔ اور راضی بالقضاء کر دیتا ہے۔ چنانچہ اسے اس کے برعکس کی تمنا ہی نہیں رہتی بلکہ اسے اس مصیبت میں لذت محسوس ہوتی ہے جیسے کہ دنیاداروں کو دنیا کی نعمتوں سے لذت ملتی ہے۔

اور غیر نازل شدہ مصیبت میں بایں طور نافع ہے کہ وہ مصیبت اس سے پھیر لے اور دور کر دے، یا اس کے ساتھ پیشگی مدد کر اور اس کو اس طرح سے مضبوط و مستحکم بنا دے کہ اس پر اس مصیبت کا جھیلنا بالکل آسان ہو جاتا ہے۔

رد قضاء ممکن نہیں تو دعا کا کیا فائدہ؟

امام غزالیؒ فرماتے ہیں اگر یہ سوال ہو کہ جب قضاء کا رد ممکن نہیں تو پھر دعا کا کیا فائدہ؟

تو جان لو! کہ یہ بھی قضاء میں سے ہے کہ دعا سے مصیبت ہٹے دعا مصیبت کو ٹالنے اور رحمت کے وجود میں آنے کا سبب ہے جیسا کہ ڈھال تیر کو دور کرنے کا اور پانی زمین میں سے نباتات کے خروج کا سبب ہیں اور اعتراف بالقضاء کیلئے یہ شرط نہیں کہ نہتا ہو جایا جائے۔

حالانکہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ نساء میں فرمایا ہے: ﴿لیاخذوا حذرهم واسلحتهم﴾[النساء:۱۰۲]
اللہ تعالی نے امور اور ان کے اسباب بنائے ہیں۔
دعا میں کئی فوائد ہیں۔اس میں حضور قلب اور اظہار محتاجی ہے اور یہی عبادت ومعرفت کی غایت اور روح ہے۔
قوله:فعليكم عبادالله بالدعا : ''عباد الله'': (یہاں حرف نداء محذوف ہے۔)
اے اللہ کے بندو! جب دعا کی یہ شان ہے تو دعا کو لازم پکڑو۔کیونکہ یہی اس عبودیت کے لوازمات میں سے ہے جس سے حق ربوبیت کو قائم رکھا جاسکتا ہے۔

۲۲۳۵: ورواه احمد عن معاذ بن جبل وقال الترمذی هذا حديث غريب۔

اخرجه احمد فی المسند ۲۳۴/۵۔

ترجمہ: اس کو احمدؒ نے حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت کیا ہے۔
اسنادی حیثیت: امام ترمذیؒ نے فرمایا: یہ حدیث (سند کے لحاظ سے) غریب ہے۔

۲۲۳۶: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا مِنْ اَحَدٍ يَدْعُوْا بِدُعَاءٍ اِلَّا اٰتَاهُ اللّٰهُ مَا سَأَلَ اَوْكَفَّ عَنْهُ مِنَ السُّوْءِ مِثْلَهُ مَا لَمْ يَدْعُ بِاِثْمٍ اَوْقَطِيْعَةِ رَحْمٍ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۳۰/۵۔ حدیث رقم ۳۴۴۱۔ واحمد فی المسند ۳۶۰۔

ترجمہ: ''اور حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جو بھی شخص دعا مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ یا تو اسے وہ چیز عطا فرما دیتا ہے جو وہ مانگتا ہے بشرطیکہ اس چیز کا دینا ازل میں اس کے مقدر میں لکھا جا چکا ہو یا اس کے عوض میں اس سے برائی روک دیتا ہے یعنی اس چیز کا اگر دینا اس کے مقدر میں لکھا نہیں ہوتا تو اس کے عوض میں اللہ تعالیٰ اس کے لئے مانگنے کے بقدر اس سے مصیبت و بلا کو دور کر دیتا ہے جب تک وہ گناہ کی کوئی چیز یا ناتہ توڑنے کی دعا نہیں مانگتا۔'' (ترمذی)

تشریح: قوله: ''ما من أحد يدعو بدعا الا آتاه الله ما سأل'' یعنی اگر ازلی تقدیر میں اسے اس کا ملنا مقرر ہو **(او كف عنه من السوء مثله)** یعنی مانگی ہوئی شی نہ دینے کے عوض میں اس سے وہ مصیبت ہٹادی جاتی ہے جو اس پر آنی ہوتی ہے۔
امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ ایک سوال ہے کہ جلب منفعت کو دفع مضرت کا کس طرح مثل قرار دیا گیا اور دونوں میں وجہ تشبیہ کیا ہے۔
اسکا جواب یہ ہے کہ وجہ تشبیہ یہ دونوں (جلبِ منفعت اور دفع مضرت) ایسے ہیں کہ سائل ان کا محتاج ہے اور اسے ان سے استغناء نہیں۔
حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: کہ اللہ اس سے اس تکلیف کو ہٹا دیتا ہے جس سے اس کو ایسی راحت نصیب ہوتی ہے جو مانگی ہوئی چیز کی راحت کے بقدر ہوتی ہے۔لہٰذا مثلیت بلحاظ اس راحت کے ہے، جو مصیبت کے دفع کرنے اور مانگی ہوئی شی کے ملنے میں ہے۔پھر پرمسرت انداز میں یہ فرمایا کہ جو تقریر میں نے ذکر کی ہے وہ زیادہ واضح بلکہ زیادہ درست ہے بہ نسبت شارحؒ کے تقریر کے۔
میں کہتا ہوں کہ زیادہ درستگی کے اطلاق میں حافظ صاحب غلطی کر رہے ہیں کیونکہ امام طیبیؒ کی مراد مثلیت حقیقیہ ہے چنانچہ اگر قضائے معلق میں یہ بات ہو کہ اس کے مال میں سے ایک دینار لیا جائے گا۔اور وہ اللہ سے ایک دینار زائد طلب کر رہا ہو۔تو اب یا تو اللہ اسے اپنے فضل سے ایک دینار زیادہ دے دے گا یا اس سے چور ڈاکو کو پھیر دے گا اور وہ اس کا مال نہ لے جاسکے گا۔اور یہ راحت جو مرتب ہو رہی ہے امام طیبیؒ کے قول سے مفہوم ہوتی ہے۔باوجودیکہ دفع تکلیف میں راحت مجازی ہے اس بناء پر کہا جاتا ہے کہ نا امیدی دو

راحتوں میں سے ایک ہے۔

قوله: ما لم يدع باثم اوقطيعة رحم: ''اوقطیعة رحم'': اس میں تخصیص بعداز تعمیم ہے۔

۲۲۳۷: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ سَلُوْا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ اَنْ يُّسْأَلَ وَاَفْضَلُ الْعِبَادَةِ اِنْتِظَارُ الْفَرَجِ (رواه الترمذی وقال هذا حديث غريب)

اخرجه الترمذی فی السنن ٥/٢٢٥ حديث رقم ٣٦٤٢۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل مانگا جائے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں کہ ان سے مانگا جائے اور عبادت کی سب سے بہتر چیز کشادگی کا انتظار کرنا ہے۔'' امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔''

تشریح: قوله: وعن ابن مسعود: ایک نسخہ میں ''ابن مسعودؓ'' کی جگہ ابی مسعود ہے۔ **(سلوا الله من فضله)** یعنی کچھ فضل، چنانچہ اللہ کا فضل وسیع ہے اور وہاں کوئی مانع بھی نہیں۔ حافظ ابن حجرؒ کا ''من'' کو تعلیلیہ قرار دینا ظاہر کے خلاف ہے۔

قوله: فان الله يحب ان يسأل: اس بناء پر کہ سخی، انعام کرنے والا، بہت بخشش کرنے والا، دینے والا، غنی، غنی کرنے والا اور پھیلانے والا ہے۔ **يجب ان يسأل** اس کا فضل مانگا جائے۔ اور اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اللہ تعالیٰ کی طرح عدل کر نہیں کرسکتا۔

قوله: وافضل العبادة انتظار الفرج یعنی مصیبت اور غم کے ٹلنے کی امید رکھنا، وہ یوں کہ غیر کے سامنے جزع فزع نہ کیا جائے۔

اور اس کا افضل عبادت ہونا اس لحاظ سے ہے کہ مصیبت کے وقت صبر کرنا تقدیر کے سامنے سرتسلیم خم کرنا ہے اور یہ اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے نصیب کرتا ہے۔

۲۲۳۸: وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ لَّمْ يَسْأَلِ اللّٰهَ يَغْضَبْ عَلَيْهِ.

اخرجه الترمذی فی السنن ٥/١٢٦ حديث رقم ٣٤٣٣۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا'' جو شخص اللہ سے نہیں مانگتا اللہ اس سے ناراض ہو جاتا ہے (کیونکہ ترک دعا اللہ سے تکبر اور استغناء کی علامت ہے)۔'' (ترمذی)

تشریح: قوله: من لم يسأل الله يغضب عليه: جو شخص اللہ سے نہیں مانگتا اللہ اس سے ناراض ہو جاتا ہے کیونکہ نہ مانگنا تکبر اور استغنا ہے۔ جس کا بندہ کسی صورت حقدار نہیں۔

غضب سے مراد عقوبت رسانی کا ارادہ کرنا ہے۔ اور شاعر نے کیا ہی خوب کہا ہے۔

الله يغضب ان تركت سواله ☆ وبنى آدم حين يسئل يغضب

''اللہ سے نہ مانگو تو اللہ ناراض ہوتا ہے جبکہ انسان اس کے برعکس مانگنے سے غصہ ہوتا ہے۔''

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ اس لئے کہ اللہ اس پر خوش ہوتا ہے کہ اس سے اس کا فضل مانگا جائے اور پس جو سوال نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہو جاتے ہیں، جس سے خفا ہو جایا جائے تو وہ یقینی طور پر مغضوب علیہ ہوتا ہے۔

اور ایک حدیث میں وارد ہے کہ: ''**ازهد فى الدنيا يحبك الله وازهد فيما فى ايدى الناس يحبك الناس**''

دنیا سے بے رغبت ہو جائے تو اللہ کے چہیتے بن جاؤ گے۔ اور لوگوں کے مال سے بے رغبت ہو جائے لوگ تجھے چاہنے لگ جائیں گے۔

اور حدیث صحیح میں یہ بات گذر چکی ہے"**من شغله ذكرى عن مسألتى اعطيته افضل ما اعطى السائلين**"
جس کو میری یاد نے میرے سامنے مانگنے سے مصروف کر دیا تو میں اسے افضل ترین چیز جو میں سائلین کو عطا کرتا ہوں سے نوازلوں گا۔
گویا کہ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ زبان حال سے طلب کرنا حصول کمال کا زیادہ مؤثر سبب ہے، زبان قال سے۔
اس بنا پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا"**حسبى من سؤالى علمه بحالى**" میرے لئے مانگنے سے اس کا میری حالت کا علم کفایت کر جاتا ہے۔ اور یوں شاعر کہتا ہے:

"اذا أثنى عليك المرء يومًا ☆ كفاه من تعرضه الثناء"

یعنی جب کوئی ثناخواں تیری ثنا میں لگا رہے تو اس کی ثنا خوانی، مانگنے سے اس کیلئے کفایت کر جاتی ہے۔

۲۲۳۹: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ فُتِحَ لَهُ مِنْكُمْ بَابُ الدُّعَاءِ فُتِحَتْ لَهُ اَبْوَابُ الرَّحْمَةِ وَمَا سُئِلَ اللّٰهُ شَيْئًا يَعْنِى اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ اَنْ يُّسْأَلَ الْعَافِيَةَ۔ (رواه الترمذى)

اخرجه الترمذى فى السنن ۵/۲۱۲ حديث رقم ۳۶۱۶۔

ترجمه: "اور حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا" تم میں سے جس شخص کے لئے دعا کا دروازہ کھولا گیا (یعنی جس شخص کو پورے آداب و شرائط کے ساتھ بہت دعا مانگنے کی توفیق عطا کی گئی) تو سمجھو کہ اس کے لئے رحمت کے دروازے کھول دیئے گئے اور اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز نہیں مانگی جاتی یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ اور محبوب بات یہ ہے کہ اس سے عافیت مانگی جائے۔" (ترمذی)

تشریح: **قوله: من فتح له منكم باب الدعا فتحت له ابواب الرحمة:**
یعنی اسے کثرت کے ساتھ شرائط و آداب کے ساتھ دعا مانگنے کی توفیق نصیب ہوئی۔

"**فتحت له ابواب الرحمة**" یہ: جملہ دعائیہ وخبریہ دونوں ہونے کا احتمال رکھتا ہے۔ خبریہ ہونے کی صورت میں دوسرا جملہ پہلے جملے کیلئے جزا بھی بن سکتا ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ پہلا جملہ دوسرے کیلئے علامت ہو۔
اور مطلب یہ ہے کہ کبھی مانگی ہوئی چیز دی جاتی ہے۔ اور کبھی اس کے بقدر اس سے کوئی تکلیف و سختی ہٹادی جاتی ہے۔ جیسے کہ بعض نسخوں میں اس کے بجائے"**فتحت له ابواب الاجابة**" اور بعض دیگر نسخوں میں"**فتحت له ابواب الجنة**" وارد ہے۔ یعنی اللہ کی دنیوی واخروی نعمتوں وراحتوں کے دروازے۔

قوله: وما سئل الله شيئا۔ يعنى احب اليه۔ من ان يسئل العافية:
امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ"احب اليه"، مطلق کو"یعنی" کے ذریعے مقید کیا گیا ہے اور یہ درحقیقت"شيئا" کی صفت ہے اھ۔ اس مقام پر "یعنی" بے معنی ہے کیونکہ"یعنی" کا ذکر وہاں ہوتا ہے جہاں اس سے پہلے کلام تام مقید ہو اور الفاظ میں اس کی تقیید کی ضرورت ہو یا معنی میں اس کی تفسیر کی حاجت ہو حالانکہ یہاں کلام"يعنى" کے مابعد سے پورا ہو رہا ہے اور وہ"احب" کا لفظ ہے۔
اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ لفظ"یعنی" اکثر کتب حدیث میں مذکور نہیں چنانچہ حصن وغیرہ میں بھی نہیں ہے۔
اب بعض کا یہ خیال ہے کہ"شيئاً"، مفعول مطلق ہے اور احب اس کی صفت ہے۔ اور (**من ان يسئل العافية**) میں"ان"

مصدر یہ ہے۔اور تقدیر عبارت ''ما سئل الله سوالاً احب اليه من سوال العافية''یعنی عافیت کے سوال سے بڑھ کر اللہ کے ہاں کوئی سوال زیادہ محبوب نہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ ''سوالاً''،مفعول بہ ہو یعنی اللہ سے مانگی ہوئی کوئی چیز عافیت سے بڑھ کر محبوب نہیں اور ''یسأل'' کا اضافہ مسئول کی شان کے اہتمام کیلئے ہے اور اس بات پر آگاہی کیلئے ہے کہ محبوب ترین سوال عافیت ہے نہ کہ نفس عافیت، حافظ ابن حجرؒ نے ان کی متابعت کی ہے وہ مزید آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ: کیونکہ یہ صفات محدثات میں سے ہیں۔

لیکن حافظ صاحب کی اس تعلیل میں اشکال ہے کیونکہ ظاہر یہ ہے کہ سوال محبوب ترین ہے اس لئے کہ یہ احتیاج اور عبودیت کو متضمن ہے اور اس میں اظہار کمال ربوبیت ہے اس حکمت کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے مشقتیں اور مصیبتیں پیدا فرمائی ہیں۔اگر نفس عافیت اللہ کو محبوب ترین ہوتی تو اللہ اس کے اضداد پیدا نہ فرماتا۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اصل کلام یہ تھا (ما سئل الله شيئاً احب اليه من العافية) مفسر نے درمیان میں یہ لفظ ''ان یسأل'' کلام نبوۃ میں سے نہیں ہے۔اور اس کی کوئی ظاہری توجیہ نہیں ہوسکتی۔الا یہ کہ یہ کہا جائے کہ یہ کسی راوی کا کلام ہے اس کی آخری توجیہہ یہ ہو کہ ''یعنی'' کے بعد والا کلام نقلِ روایت بالمعنی ہو۔

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ لفظ: یعنی کو اپنے مقام سے مقدم کیا گیا اور موصوف ''شيئاً'' اور اس کی صفت ''احب'' کے درمیان اس کو فاصل بنایا گیا جبکہ اصل عبارت اس طرح تھی: ''وما سئل الله شيئاً احب اليه يعني من ان يسأل العانية'' کیونکہ پہلا کلام تفسیر میں زیادہ واضح ہے اور اس لئے بھی کہ اس کا موصوف وصفت کے درمیان آنا اس کے مفسرہ ہونے کی واضح دلیل ہے، جو خبر کی تفسیر بننے کی واضح دلیل ہے، جو خبر کی تفسیر بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

میں کہتا ہوں عبارت میں مناقشہ سے صرف نظر کرتے ہوئے یہ بات مدلول ہے کہ ''من ان یسأل'' کلام نبوت میں سے نہیں ہے۔حالانکہ بات ایسی نہیں کیونکہ اس کے بغیر کلام تام نہیں ہوتا اور اس کے ماقبل پر اکتفاء کرنا درست نہیں۔

<u>عافیت کیا ھے</u>؟ تمام شراح کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عافیت سے مراد صحت ہے یہ امام طیبیؒ کی عبارت ہے،اور عافیت اس لئے اس کے ہاں محبوب ترین ہے کہ یہ ایک ایسا لفظ ہے جو دنیا و آخرت کے تمام خیر کیلئے جامع ہے۔جیسے دنیا میں صحت اور دنیا و آخرت کی سلامتی وغیرہ،اس لئے کہ عافیت یہ ہے کہ انسان امراض وشدائد سے محفوظ ہو جائے اور یہی معنی مرض کے وقت صحت کا ہے۔

ظاہر یہ ہے کہ یہ اپنے ظاہر پر محمول نہیں بلکہ تحقیقی بات یہ ہے کہ عافیت سے مراد دین کے معاملہ میں مصیبت سے حفاظت وسلامتی ہے اس کے ساتھ جسم کی صحت ہو یا نہ ہو۔

ابن عطاء فرماتے ہیں کہ ایک شخص میرے آقا شیخ ابوالعباس مرسی کے پاس اس وقت تشریف لائے جب میرے شیخ کسی درد میں مبتلا تھے اس شخص نے کہا: ''عافاك يا سيدى'' اس پر میرے شیخ خاموش رہے اور اسے کوئی جواب نہ دیا۔اس شخص نے دوبارہ یہ کہا تو میرے شیخ نے اسے کہا ''ما أنا سألت الله العافية، قد سألته العافية والذى اذا فيه هو العافية''یعنی میں نے جسم کی سلامتی اللہ سے نہیں مانگی بلکہ میں نے دین کی سلامتی کی دعا مانگی ہے اور یہ سلامتی مجھے نصیب ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ سے عافیت کی دعا مانگی ہے اس کے باوجود فرمایا۔''ما زالت أكلة خيبر تعاودنى فالآن قطعت ابهرى''،یعنی خیبر کے زہریلا کھانے کا اثر بار بار آ رہا ہے اور اب کے تو اس نے میری رگ جان کو کاٹ ڈالا۔

حضرت ابوبکرؓ نے بھی عافیت کی دعا مانگی حالانکہ زہر کی وجہ سے شہید ہوئے۔حضرت عمرؓ نے بھی عافیت کی دعا مانگی لیکن نیزہ مار کے

شہید کئے گئے۔ حضرت عثمان نے بھی اللہ سے عافیت طلب کی حالانکہ ذبح کئے گئے۔ حضرت علیؓ نے بھی اللہ سے عافیت مانگی حالانکہ شہید کئے گئے۔ لہٰذا جب تم اللہ سے عافیت مانگو تو جو اللہ کے ہاں آپ کیلئے عافیت ہے وہ مانگو۔

شبلیؒ سے منقول ہے کہ وہ جب کسی دنیادار کو دیکھتے تو فرماتے: ''أسأل اللّٰه العافية'' میں اثر سے عافیت کا خواستگار ہوں۔

صحیح بات یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ عافیت ''عفاء'' کو دور کرنے کا نام ہے اور ''عفاء'' ہلاکت کو کہتے ہیں اور یہاں پر مراد یہ ہے کہ انسان کے پاس ضرورت کی غذا ہو، عبادت کرنے کیلئے جسم میں قوت ہو۔ دین کے ساتھ علم و عمل کے اعتبار سے مشغولیت ہو، جس چیز میں خیر نہ ہو یا اس کی ضرورت نہ ہو، اس کو ترک کر رہا ہو، ان سب کیلئے عافیت سے بڑھ کر کوئی اور جامع لفظ نہیں یہی وجہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ سے ان کے چچا حضرت عباسؓ نے یہ درخواست کی کہ مجھے ایسی دعا سکھایئے جو میں اللہ سے مانگتا رہوں تو آپ ﷺ نے ''عافية'' کے لفظ کو اختیار فرمایا اور عباسؓ سے کہنے لگے: چچا! میں آپ سے محبت کرتا ہوں اللہ سے دنیا و آخرت میں عافیت طلب کرنا۔

۲۲۴۰: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يَسْتَجِيْبَ اللّٰهُ لَهٗ عِنْدَ الشَّدَائِدِ فَلْيُكْثِرِ الدُّعَاءَ فِی الرَّخَاءِ۔ (رواه الترمذی وقال هذا حديث غريب)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۳۰/۵ حديث رقم ۳۴۴۵۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جس شخص کے لئے یہ بات پسندیدگی اور خوشی کا باعث ہو کہ تنگی اور سختی کے وقت اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول کرے تو اسے چاہئے کہ وہ وسعت و فراخی کے زمانہ میں بہت دعا کرتا رہے۔'' اس روایت کو ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔''

تشریح: قوله: من سره ان يستجيب اللّٰه له عند الشدائد: یعنی جس کو یہ بات بھلی معلوم ہو اور اس کا دِل خوش ہو اور اس کو مسرور بنائے۔

''شدائد'' شديدة کی جمع ہے اور یہ سخت حادثہ کو کہا جاتا ہے اور ''حصن'' کے اندر ''کرب'' کا اضافہ ہے۔ کرب کربة کی جمع ہے یہ دل پر گرفت کرنے والے غم کو کہتے ہیں۔

قوله: فليكثر الدعا فی الرخاء: ''رخاء'' براء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

خوشحالی، صحت، فراغت اور عافیت کی حالت میں۔ کہتے ہیں کہ قدر دان (۱) مؤمن کی علامت یہ ہے کہ تیر پھینکنے سے پہلے ہی اس پر لگائے اور سختی اور مشقت آنے سے قبل ہی اللہ کی طرف رجوع کرے اور اسی کے حضور میں پناہ لے۔

۲۲۴۱: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اُدْعُوا اللّٰهَ وَاَنْتُمْ مُوْقِنُوْنَ بِالْاِجَابَةِ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَجِيْبُ دُعَاءً مِنْ قَلْبٍ غَافِلٍ لَاهٍ (رواه الترمذی وقال هذا حديث غريب۔

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۷۹/۵ حديث رقم ۳۵۴۵۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا قبولیت دعا کا یقین رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ غافل اور کھیلنے والے دل کی دعا قبول نہیں کرتا یعنی اس شخص کی دعا قبول نہیں ہوتی جس کا دل دعا مانگتے وقت اللہ تعالیٰ سے غافل اور غیر اللہ میں مشغول ہو امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔''

تشریح: قوله: ''ادعوا اللّٰه وانتم موقنون بالاجابة: واوَ حالیہ ہے۔

یعنی درآنحالیکہ تم دعا کے وقت ایسی حالت پر ہو جاؤ کہ تمہاری دعا قبول ہونے کے قابل ہو جائے، بایں طور کہ نیکی کرو، برائی سے اجتناب کرو دعا کی شرائط" جیسے حضور قلب اوقات شریفہ اور مقامات عالیہ کی تاک میں لگے رہنا اور انبساط کے لمحات و حالات سے فائدہ اٹھانے" جیسے سجدہ وغیرہ کی حالت کی رعایت رکھو۔ تاکہ دعا کی قبولیت کی امید اس کے مسترد ہونے کے مقابلہ میں زیادہ غالب ہو۔

یا مراد یہ ہے کہ تم یہ اعتقاد رکھو کہ اللہ تم کو نامراد نہیں کرے گا کیونکہ وہ بڑی کریم ذات ہے اور اس کی قدرت کامل ہے اور اس کا علم محیط ہے۔ یہ اعتقاد امید کی صدق کو ثابت کرنے اور دعا کے خالص ہونے کیلئے ضروری ہے۔ کیونکہ داعی کی امید جب مضبوط نہ ہو تو اس کی طلب صادق نہیں کہلاتی۔

قولہ: واعلموا ان اللہ لا یستجیب دعا من قلب غافل لاہ : مطلب عدم قبولیت کا مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ عموماً اس شخص کی دعا قبول نہیں کرتا...اور دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کی دعا کامل طور پر قبول نہیں کرتا...۔

"**قلب غافل**" میں اضافت و ترک اضافت دونوں جائز ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ سے اعراض کر رہا ہو یا اپنی دعا سے۔

"**لاہ**" یہ "لھو" سے ماخوذ ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی دعاء سے استہزاء کر رہا ہو یا وہ غیر اللہ کے ساتھ مشغول ہو رہا ہو۔

حضورِ قلب آداب دعا میں سے عمدہ ترین ادب ہے اس لئے صرف اسی کو ذکر کیا۔

۲۲۴۲: وَعَنْ مَالِكِ بْنِ يَسَارٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا سَأَلْتُمُ اللّٰهَ فَاسْأَلُوْهُ بِبُطُوْنِ اَكُفِّكُمْ وَلَا تَسْأَلُوْهُ بِظُهُوْرِهَا۔

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۲/۷۸ حدیث رقم ۱٤۸٦۔

ترجمہ: "اور حضرت مالک بن یسارؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا" جس وقت تم اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو اس سے اپنے ہاتھوں کے اندرونی رخ کے ذریعے مانگو اس سے اپنے ہاتھوں کے اوپر کے رخ کے ذریعہ نہ مانگو۔"

راویٔ حدیث:

مالک بن یسار۔ یہ مالک یسار کے بیٹے "سکونی" اور "عوفی" ہیں۔ ان کا شمار اہل شام میں ہے۔ "ابو بحریہ" نے ان سے روایت کی ہے۔ ان کے صحابی ہونے میں اختلاف ہے۔ "سکونی" میں سین پر فتحہ اور کاف اور نون ہے۔

تشریح: **قولہ: اذا سألتم اللہ فاسألوہ ببطون اکفکم**: یہاں سأل کا مفعول بہ محذوف ہے جو "شیئا" ہے مطلب یہ ہے کہ جب تم اللہ سے حصول نفع یا رفع مضرت کو طلب کرو۔

"اکف" "کف" کی جمع ہے مطلب یہ ہے کہ ہاتھ اوپر کی طرف اٹھا کر۔

یہاں پر "باء" آل کیلئے ہے۔ جبکہ کچھ حضرات کا خیال ہے کہ "با" مصاحبت کے معنی میں ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: کیونکہ یہ حالت ہوتی ہے جو لینے کا انتظار کر کے طلب کر رہا ہو۔ لہٰذا اس حالت کی رعایت ہر حالت میں کی جائے گی جیسے حدیث سے بھی یہی معلوم ہو رہا ہے۔ اور یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ مصیبت اور تکلیف کے وقت نیک شگونی اور پلٹنے کی حالت کی رعایت کرتے ہوئے ہاتھوں کے پشتوں کو اوپر کر لے۔ اھ۔ لیکن یہ نص کے مقابلہ میں قیاس ہے لہٰذا یہ غیر مقبول ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے استسقاء میں اپنے ہاتھوں کے بالائی حصہ سے دعا مانگی ہے اور اس کا معنی یہ

ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے ہاتھ انتہائی طور پر بلند کئے یہاں تک آپ ﷺ کے بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی، اور آپ ﷺ کے ہاتھ مبارک سر مبارک کے برابر میں آ گئے ۔ آنحضرت ﷺ اس حالت سے اس بات کو طلب فرما رہے تھے کہ اللہ مجھے سرتا پا اپنی رحمت وسیع میں گھیر لے۔

۲۲۴۳: وَفِي رِوَايَةِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ سَلُوْا اللّٰهَ بِبُطُوْنِ اَكُفِّكُمْ وَلَا تَسْأَلُوْهُ بِظُهُوْرِهَا فَإِذَا فَرَغْتُمْ فَامْسَحُوْا بِهَا وُجُوْهَكُمْ. (رواہ ابوداود)

اخرجه ابو داؤد في السنن ۲/۷۸ حديث رقم ۱۴۸۵۔

ترجمہ: ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''کہ اللہ تعالیٰ سے اپنے ہاتھوں کے اندرونی رخ کے ذریعہ مانگو اور جب تم دعا سے فارغ ہو جاؤ تو اپنے ہاتھوں کو اپنے منہ پر پھیر لو (تا کہ وہ برکت جو ہاتھوں پر اترتی ہے منہ کو بھی پہنچ جائے)۔'' (ابوداؤد)

تشریح: **قوله: سلوا الله ببطون اكفكم ولا تسألوه بظهورها**: حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اسلئے کہ جب انسان کسی شئے کے حصول کو طلب کرتا ہو تو اس کیلئے مناسب یہی ہے کہ اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کو عاجزی کرتے ہوئے دراز کرلے اور پھیلائے۔ تا کہ وہ (اللہ تعالیٰ) اسے اپنے وسیع وعریض عطا سے لبریز کردے۔

تاہم اگر کوئی کسی مصیبت کے دور کرنے کا خواستگار ہو جو اس پر پڑی ہو تو پھر سنت طریقہ یہ ہے کہ ہاتھوں کے بالائی حصہ (پشتوں) کو اٹھائے، یہ حضور ﷺ کے اتباع میں اور اول میں اس کی حکمت مقصود حصول کی نیک شگونی ہے۔ اور ثانی میں مصیبت کے دور ہونے کا شگون ہے۔

اور شارح کا طرز عجیب ہے کہ انہوں ایسی تاویل کی ہے جو اس کے ائمہ کے کلام اور ان کے اس تفصیل کے جس کو میں نے ذکر کیا ہے' مخالف ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ شارحؒ نے ان کے کلام میں غور نہیں فرمایا اھ۔

اور جمہور کے ہاں یہ (ہاتھ کے بالائی حصہ کے ساتھ) اشارہ بہ تقدیر صحت استسقاء کے ساتھ مخصوص ہے۔ چادر پلٹنے کی طرح نیز اس میں تاویل بھی کی جا سکتی ہے اور روایت کے اندر ''اشارہ'' کے لفظ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دعا ہاتھ کے پشتوں سے نہیں مانگی گئی ہے۔ اور حق کی اتباع زیادہ مناسب ہے۔

اور مصنف محقق سے انوکھی بات نہیں کہ وہ ظاہر متبادر الی الفہم دلیل ذکر کرلے اور تقلید کے اس دائرے سے نکل جائے جو بیمار معذور کے شایان شان ہے۔ لہٰذا یہ رویہ غیر مناسب ہے کہ اس وجہ سے کسی کی نسبت جہالت کی طرف کی جائے۔ اگر چہ بفرض تقدیر کسی زعی جزئیہ کا ان سے ذھول بن جائے۔ (**فاذا فرغتم**) یعنی جب دعا سے فارغ ہو جاؤ (**وامسحوا بها**) یعنی اپنے ہاتھ ہتھیلیوں سے ۔(**وجوهكم**) کیونکہ ہاتھوں میں اللہ کی رحمت کے آثار کا نزول ہوتا ہے تو اس کی برکت چہروں تک پہنچے گی۔

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں میں نے اس کو ایک حدیث میں دیکھا ہے اور یہ چہرے پر اللہ کی عطا کو بہانا ہے قبولیت کے متحقق ہونے کی شگون کیلئے اور شیخ ابن عبدالسلامؒ کا یہ قول کہ ہاتھوں سے چہرے کو مسح کرنا خلاف سنت ضعیف ہے اس لئے کہ مسح کی حدیث کا ضعیف ہونا مضر نہیں کیونکہ یہ بات طے ہے کہ فضائل میں ضعیف حدیث بھی بالاتفاق حجت ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات ہے کہ علامہ جزریؒ نے ''حصن'' میں ''**وانت عليه مسح الوجه باليدين**'' کو آداب دعا میں سے شمار کیا ہے اور اس کی اسناد ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان اور حاکم کی طرف فرمائی ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے خوب مبالغہ سے کام لیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں اس حدیث اور اس سے پیوستہ گذشتہ حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر دعا میں رفع الیدین الی السماء مسنون ہے، بہ کثرت صحیح احادیث کے اندر وارد ہے۔

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں: ''ومن ادعی حصرها فقد غلط غلطافاحشا، وهذه الرواية لكونها مثبت مقدمة على رواية الشيخين الذی الأصل فيه الايصال، على أن المراد أنه كان لا يبالغ فی رفع يديه فی شئٍ من الدعا الا الاستسقاء''اھ۔ اگرچہ شیخین کی روایت میں اتصال اصل ہے۔ باوجودیکہ یہ معنی بھی مراد ہو سکتے ہیں کہ کسی بھی دعا میں رفع یدین مبالغہ کے ساتھ نہیں فرماتے تھے سوائے صلاۃ استسقاء کے۔

اس میں کئی ابحاث ہیں منجملہ ان میں سے ایک یہ ہے کہ مذکورہ حدیث اور اس سے پیوستہ گذشتہ حدیث میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو رفع پر نفیاً یا اثباتاً دلالت کرتی ہو البتہ حضرت ابن عمرؓ کی آنے والی حدیث اس سلسلہ میں صریح ہے۔

اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ حافظ صاحب کا یہ فرمانا ''فی كل دعاءٍ'' ہر دعا میں یہ بھی درست نہیں اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ قائل حصر کی تغلیط بھی کھلا تخمینہ ہے۔

اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ ان کا یہ فرمانا ''ان هذا الرواية'' کو ''على تقدير تسليم الافادة'' تسلیم کر لیا جائے اور ابوداؤد کی روایت کو بھی صحیح تسلیم کر لیا جائے تو ابوداؤد کی روایت کو شیخین کی روایت پر مقدم کرنا تو اصول محدثین کے قاعدہ کی خلاف ورزی ہے۔

لہٰذا درست بات یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ ان دونوں میں کوئی مضافات نہیں کیونکہ دونوں کو جمع کرنا ممکن ہے کہ نفی سے مراد نفی مبالغہ فی الرفع ہے۔

۲۲۴۴: وَعَنْ سَلْمَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ رَبَّكُمْ حَيِيٌّ كَرِيْمٌ يَسْتَحِيْ مِنْ عَبْدِهٖ اِذَا رَفَعَ يَدَيْهِ اَنْ يَرُدَّ هُمَا صِفْرًا. (رواه الترمذی وابو داود والبيهقی فی الدعوات الكبير)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۷۸/۲ حديث رقم ۱۴۸۸۔ والترمذی ۲۱۷/۵ حديث رقم ۳۶۲۷۔

ترجمہ: ''اور حضرت سلمانؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا'' تمہارا پروردگار بہت حیا مند ہے یعنی وہ حاجت مندوں کا سا معاملہ کرتا ہے وہ بغیر مانگے دینے والا ہے اور وہ اپنے بندہ سے حیا کرتا ہے کہ اسے خالی ہاتھ واپس کر دے جب کہ اس کا بندہ اس کی طرف اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتا ہے۔'' (ترمذی' ابوداؤد' بیہقی)

تشریح: قوله: ان ربكم حيي كريم: ''حيي'' حیاء سے فعیل کا وزن ہے۔ جو برائے مبالغہ ہے یعنی انتہا کا حیادار۔ اللہ تعالیٰ کے حق میں اس سے مراد اس کا غرض وغایت ہے اور کسی شی سے حیادار ہونے کا غرض اس کو ترک کرنا ہوتا ہے اس لئے کہ حیاء دراصل ایسے تغیر اور ٹوٹ پھوٹ کا نام ہے کہ کسی ایسی چیز کے خوف کی وجہ سے لاحق ہوتا ہے جس کی بناء پر وہ معیوب و مذموم ہو جاتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے حق میں ممتنع ہے لیکن اس کی غرض خوش کن کام کو کرنا اور مضر امر کو ترک کرنا ہے۔

یا اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مستحس کا معاملہ کرنے والا ہے۔

''کریم'': یہ ایسی ہستی کو کہا جاتا ہے جو مانگے بغیر عطا کرے۔ لہٰذا مانگنے سے تو بطریق اولیٰ عطا کرے گا۔

قوله: يستحي من عبده ...... ان يردها صفرا یعنی مؤمن بندے سے

''صفر'': صاد کے کسرہ اور ''فا'' کے سکون کے ساتھ بمعنی خالی یعنی رحمت سے فارغ اور خالی۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس میں مذکر ومؤنث تثنیہ وجمع سب برابر ہیں۔

۲۲۴۵: وَعَنْ عُمَرَ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا رَفَعَ يَدَيْهِ فِي الدُّعَاءِ لَمْ يَحُطَّهُمَا حَتّٰى يَمْسَحَ بِهِمَا وَجْهَهُ. (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۳۱/۵ حدیث رقم ۳۴۴۶۔

ترجمہ: ''اور حضرت عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب دعا میں اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھاتے تو انہیں اس وقت تک نہ رکھتے جب تک کہ اپنے منہ پر نہ پھیر لیتے۔'' (ترمذی)

تشریح: قوله: كان رسول الله اذا رفع يديه فى الدعاء:

کہتے ہیں کہ ہاتھ آسمان کی طرف بلند کرنے کی حکمت یہ ہے کہ یہ دعا کا قبلہ، رزق وحی اور برکت اترنے کا سرچشمہ ہے۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ داعی اپنی نگاہ آسمان کی طرف نہ اٹھائے ایک حدیث کی وجہ سے جو انہوں نے بیان کی۔

اس پر حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: لیکن یہ حدیث امام غزالی کی دلیل نہیں' اس لئے کہ یہ صحیح مسلم کی روایت ہے اور یہ دعا فی ''حالة الصلوٰة'' کے ساتھ مقید ہے میرے نزدیک راجح روایت ابن عماد کی ہے چنانچہ انہوں نے **رفع البصر الى السماء** کو مسنون قرار دیا ہے۔اھ۔

اور یہ عجیب سی بات ہے کیونکہ مسلم کی حدیث از روئے قیاس امام غزالیؒ کیلئے وزنی دلیل ہے کیونکہ منع کی علۃ اللہ تعالیٰ کیلئے مکان وجہت ہونے کا ابہام ہے اور یہ علم نماز وخارج نماز دونوں حالتوں میں موجود ہے۔ پھر ایک اور عجیب بات کہ انہوں نے رفع البصر کے سنت ہونے کو ترجیح دی ہے حالانکہ یہ کسی بھی حدیث میں وارد نہیں۔

امام جزریؒ نے ''حصن'' میں آداب دعا میں سے یہ بھی شمار کیا ہے کہ آسمان کی طرف نگاہ نہ اٹھائے اور اس کی اسناد مسلمؒ اور نسائیؒ کی طرف ہے۔

پھر حافظ ابن حجرؒ نے ذکر فرمایا کہ ہاتھوں کے بلند کرنے کا محل یا تو بالائی حصہ کو بلند کرنا ہے یا پھر اندرونی حصہ کو حائل کے ساتھ صحیح قول کے مطابق لیکن اندرونی حصہ کو حائل کئے بغیر بلند کرنا تو یہ مکروہ ہے۔

یہ تفصیلی مناقشہ سے صرف نظر کرتے ہوئے حدیث کے اطلاق کے منافی ہے۔ (واللہ اعلم)۔

قوله: هم يحطّهما حتى يمسح بهما وجهه:

ابن الملک فرماتے ہیں یہ اس نیک شگون کا عکاس ہے کہ دونوں ہاتھ آسمانی برکات اور انوار الٰہیہ سے بھر گئے ہیں۔اھ۔

یہ بڑی اچھی بات فرمائی ہے تاہم ''کان'' (جو بمعنی شاید ہے) کا کلمہ آنحضرت ﷺ کی دعا کے شایان شان نہیں البتہ غیروں کے مناسب ہے اور یوں ہی ''تفاول'' کا لفظ کیونکہ وہاں دعا کے قبول ہونے اور برکات کے حصول میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔

۲۲۴۶ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَسْتَحِبُّ الْجَوَامِعَ مِنَ الدُّعَاءِ وَيَدَعُ مَا سِوٰى ذٰلِكَ.

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۷۷/۲ حدیث رقم ۱۴۸۲۔

ترجمہ: ''اور سیدہ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ ان دعاؤں کو پسند کرتے تھے جو جامع ہیں اور ان دعاؤں کو چھوڑ دیتے تھے جو جامع نہیں ہیں۔'' (ابوداؤد)

تشریح: قوله: كان رسول الله ﷺ يستحب الجوامع من الدعاء:

''یہ وہ دعا ہوتی ہے جو تمام نیک اغراض پر مشتمل ہو یا وہ دعا جس میں اللہ کی ذات کی ثناء ہو اور دعا کے آداب کا لحاظ ہو۔

مظہرؒ فرماتے ہیں یہ وہ دعا ہوتی ہے جس کے الفاظ مختصر اور معنی کثیر ہوں ''ربنا آتنا فی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة وقنا عذاب النار''

''اللهم انی أسالك العفو والعافية فی الدین والدنیا والآخرة''

''اللهم انی أسالك الهدٰی والتقی والعفاف والغنی'' یا جیسے فلاح وکامرانی کی دعا۔

قوله: ویدع ما سوٰی ذلك یعنی جو جامع دعا نہیں ہوتی تھی اسے چھوڑ دیتے تھے۔ بایں طور کہ وہ کسی جزوی امر کو طلب کرنے کیلئے ہوتی تھی جیسے یہ کہے کہ اللہ مجھے خوبصورت بیوی دے دے۔

سب سے بہترین دعا :

زیادہ بہتر اور مانگنے کے لائق دعا یہ ہے کہ یا اللہ دنیا وآخرت کی راحت نصیب کردے۔

اس لئے کہ یہ ایسی جامع دعا ہے جو اس کے اس مدعا وغیرہ سب کو شامل ہے۔

۲۲۴۷: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اَسْرَعَ الدُّعَاءِ اِجَابَةً دَعْوَةُ غَائِبٍ لِغَائِبٍ

. (رواه الترمذی وابوداوٗد)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۸۹/۲ حدیث رقم ۱۵۳۵۔

ترجمہ: ''اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا زیادہ قبول ہونے والی وہ دعا ہے جو غائب غائب کے لئے کرے۔'' (ترمذی' ابوداوٗد)

تشریح: قوله: وعن عبدالله بن عمرو: عمرو بفتح العین ہے بضم العین نہیں۔

قوله: قال رسول اللّٰه ﷺ ان اسرع الدعا اجابة: اجابة کالفظ منصوب علی التمیز ہے۔

غائب کی دعا غائب کے لئے بہت جلد اس لئے قبول ہوتی ہے کہ ایسی دعا مخلصانہ اور نیت صاف ہوتی ہے نیز ایسی دعا میں ریاء اور شہرت نہیں ہوتی۔

۲۲۴۸: وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ اسْتَاذَنْتُ النَّبِیَّ ﷺ فِي الْعُمْرَةِ فَاَذِنَ لِیْ وَقَالَ اَشْرِكْنَا یَا اُخَیَّ فِیْ دُعَائِكَ وَلَا تَنْسَنَا فَقَالَ كَلِمَةً مَا یَسُرُّنِیْ اَنَّ لِیْ بِهَا الدُّنْیَا.

(رواه ابوداود والترمذی وانتهت روایته عند قوله ولا تنسنا)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۸۰/۲ حدیث رقم ۱۴۹۸۔ والترمذی ۲۲۰/۵ حدیث رقم ۳۶۳۳۔ وابن ماجه فی السنن ۹۶۶/۲ حدیث رقم ۶۸۹۴۔ وآخر فی المسند۔

ترجمہ: ''اور حضرت عمر بن خطابؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے نبی کریم ﷺ سے ادائیگی عمرہ کے لئے اجازت مانگی تو آپ ﷺ نے مجھے اجازت عطا فرمائی اور فرمایا کہ ''اے میرے چھوٹے بھائی اپنی دعا میں ہمیں بھی شریک کرلینا اور دعا کے وقت مجھے نہ بھولنا! حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایسا کلمہ ارشاد فرمایا کہ اگر اس کے بدلہ میں مجھے تمام دنیا بھی دے دی جائے تو مجھے خوشی نہ ہوگی۔ (ابوداوٗد' امام ترمذی) نے اس روایت کو لفظ ولا تنسنا پر ختم کیا ہے۔''

تشریح: قوله: استأذنت النبی فی العمرة: یہ عمرہ مدینہ سے تھا۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں یہ قضا عمرہ تھا جس کی انہوں

نے جاہلیت میں نذر مانی تھی۔

قوله: قال: اشركنا في دعائك يا أخي ولا تنسنا:

"اشركنا" جمع متکلم کا صیغہ استعمال فرمانے میں یہ بھی احتمال ہے کہ یہ جمع تعظیمی ہو یا مراد یہ ہو کہ مجھے اور میرے متبعین کو۔

"أخي" یہ تصغیر ہے اخٌ کی۔ یہاں تصغیر برائے تحقیر نہیں بلکہ برائے عنایت ونوازش ہے۔ اور ایک روایت "يا أخي" یعنی تصغیر کے بغیر وارد ہے۔

اس (دعا کی درخواست) میں مقام عبودیت اور عجز وانکساری کا مظاہرہ ہے۔ چنانچہ اس میں دعا کا التماس ایسے شخص سے کیا ہے جس کا راہ ہدایت پر ہونا معروف ہے۔

اور اس میں امت کو اس بات پر برانگیختہ کرنا ہے کہ امت کے صالح اور عبادت گزار لوگوں سے دعائیں کروائی جائیں۔ نیز اس میں اس بات پر تنبیہ کرنا بھی مقصود ہے کہ دعا صرف اپنے ہی لئے مخصوص نہ کرو اس طرح کہ اپنے دوسرے اقارب واحباب کو شریک نہ کرو خاص کر کے ایسی دعاؤں جن کی قبولیت کی خاص امید ہو، اس حدیث میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شان کی رفعت کی شہادت ہے اور اس امر کی طرف رہنمائی ہے جو دعا کو مسترد ہونے سے محفوظ کرتی ہے۔

"ولا تنسنا": یہ تاکید ہے، یا تاسیس ہے اور مراد ساری حالتیں ہیں۔

قوله: فقال كلمة ما يسرني ان لي بها الدنيا: "فقال" کا عطف "قال اشركنا" پر ہے اور "فاء" تعقیب کیلئے ہے اور معطوف معطوف علیہ کیلئے بیان ہے۔ یہاں "قال" بمعنی تکلم ہے۔ "بها": باء بدل کے معنی میں ہے۔ "ما" نافیہ ہے اور "ان" اپنے اسم وخبر کے ساتھ مل کر "يسرني" کا فاعل ہے اور تقدیری عبارت یوں ہے "ما يسرني كون جميع الدنيا لي بدلها" یعنی اس کے بدلہ میں ساری دنیا میری ہو مجھے اس پر کوئی خوشی نہ ہوگی۔

وہ خوش کن کلمہ کونسا تھا؟ اس میں کئی احتمال ہیں: ا۔ یہ کلمہ "اشركنا" تھا۔ ۲۔ لفظ "يا اخي" تھا۔ ۳۔ لفظ "لا تنسنا" تھا۔

۴۔ کوئی اور کلمہ ہے جسے انہوں نے تفاخر یا اس جیسے دوسری آفت نفسیہ سے بچنے کی خاطر ذکر نہیں کیا۔

۲۲۴۹: وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ثَلَاثَةٌ لَّا تُرَدُّ دَعْوَتُهُمُ الصَّائِمُ حِيْنَ يُفْطِرُ وَالْاِمَامُ الْعَادِلُ وَدَعْوَةُ الْمَظْلُوْمِ يَرْفَعُهَا اللّٰهُ فَوْقَ الْغَمَامِ وَتُفْتَحُ لَهَا اَبْوَابُ السَّمَاءِ وَيَقُوْلُ الرَّبُّ وَعِزَّتِيْ لَاَ نْصُرَنَّكَ وَلَوْ بَعْدَ حِيْنٍ. (رواه الترمذی)

اخرجه ابن ماجه فی السنن ۱/۵۵۷ حدیث رقم ۱۷۵۲۔

ترجمہ: "اور حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا تین شخص ہیں جن کی دعا رد نہیں ہوتی (۱) روزہ دار جب وہ افطار کرتا ہے (۲) لوگوں کا سردار حاکم جو عدل وانصاف کرے (۳) مظلوم کی دعا جب مظلوم دعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا کو بادلوں کے اوپر اٹھاتا ہے اور اس دعا کے لئے آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور پروردگار فرماتا ہے کہ "قسم ہے مجھے اپنی عزت کی" میں تیری مدد ضرور کروں گا اگرچہ وہ کچھ مدت بعد ہی ہو۔" (ترمذی)

تشریح: قوله: قال رسول الله ﷺ ثلاثة لا ترد دعوتهم: یعنی تین شخص، یہ تفسیر حافظ ابن حجر کی تفسیر "من الرجال" سے زیادہ بہتر ہے، چنانچہ وہاں رجال کا ذکر تغلیبی ہے۔

کہتے ہیں کہ مانگنے والے کی دعا کا جلد قبول ہونا یا تو اس لئے ہوتا ہے کہ وہ صالح ہوتا ہے یا اس لئے کہ اس کی دعا میں اللہ کے سامنے عجز وانکسار زیادہ ہوتی ہے۔

قوله: الصائم حين يفطر)یعنی روزہ داروں میں سے کوئی ایک۔

(حين يفطر) کیونکہ یہ دعا ایک عبادت کے بعد ہوتی ہے نیز یہ حالت عجز ومسکنت کی ہوتی ہے۔

قوله: والامام العادل: کیونکہ حدیث کا مفہوم ہے کہ ایک لمحہ کا عدل ساٹھ لمحات کی عبادت سے بہتر ہے۔

قوله: ودعوة المظلوم: ظاہر کا تقاضا یہ تھا ''والمظلوم'' کہہ دیا جاتا (یعنی مضاف دعوة کو حذف کر دیا جاتا) لیکن چونکہ مظلومیت کے مطلوب بذاتہا ہونے کا ابہام تھا اس کو دور کرنے کیلئے لفظ دعوۃ کو شروع میں بڑھا دیا۔

امام طیبیؒ نے الصائم اور الامام کے شروع میں بھی لفظ ''دعوة'' کو (تفسیر میں) ''دعوة المظلوم'' کے قرینہ سے بڑھا دیا۔

ترکیب میں یہ گذشتہ ''دعوة'' سے بدل ہوگا اور ''يرفعها'' کا جملہ حال ہوگا یہ ترکیب سلف سے منقول ہے۔

لیکن زیادہ اچھی بات یہ ہے کہ ''يرفعها'' کا جملہ ''دعوة المظلوم'' مبتدا کیلئے خبر ہو اور اس قسم کو سابقہ دونوں قسموں سے اس لئے قطع کیا گیا ہے تاکہ مظلوم کی دعا کی شدت اہتمام ظاہر ہو اگرچہ وہ کافر وفاسق ہو۔

اس ترکیبی صورت کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ ''ويقول الرب'' جملہ کا عطف ''وتفتح'' جملہ پر ہو رہا ہے اور یہ عطف پہلی ترکیبی صورت کے مناسب نہیں کیونکہ اس صورت میں يرفعها کی ضمیر منصوب متصل کا مرجع لفظ ''دعوة'' ہوگا نہ کہ لفظ ''دعوة المظلوم''۔

اور ظاہر یہ ہے کہ يرفعها کی مذکورہ ضمیر کا مرجع دونوں ترکیبی صورتوں میں ''دعوة المظلوم'' ہے۔

اور مظلوم کی دعا کی قبولیت میں مبالغہ اس لئے کیا گیا کہ جب اسے آتش ظلم نے جھلسایا اور اس کے اندرون کو ظلم نے جلایا تو اس کے دل سے دعا عجز وانکساری کے ساتھ زبان پر آئے گی اور اس کو اضطرار کی صورت حاصل ہوگی لہٰذا اس کی دعا یقینی طور پر قبول ہوگی چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان مقدس ہے: ﴿امن يجيب المضطر اذا دعاه ويكشف السوء﴾ [سورۃ النمل: ۶۲]

قوله: يرفعها الله فوق الغمام......: کا مطلب یہ ہے کہ وہ بادلوں سے اوپر تجاوز کر جاتی ہے۔

''يفتح'' کا لفظ تذکیر وتانیث، مجہول کے صیغے کے ساتھ بھی مروی ہے۔ ''رفع'' اور ''فتح'' جلدی قبول ہونے اور مطلوب تک پہنچنے سے کنایہ ہیں۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ دعا کا بادلوں کے اوپر اٹھانا اور اس کیلئے آسمان کے دروازوں کا کھلنا کنایہ ہے اس بات سے کہ وہ آسمانی اسباب وآثار کو اس کی مدد کیلئے ابھارتا ہے اور جمع کرتا ہے کہ وہ ظالم سے انتقام لیں اور اس پر سختی ومشقت نازل کریں۔

قوله: ويقول الرب: وعزتي لانصرنك......الخ: ''كاف'' کے فتحہ کے ساتھ بتقدیر مظلوم اور یوں ہی ''كاف'' کے کسرہ کے ساتھ بتقدیر دعا ''حين'' کا اطلاق مطلق وقت پر بھی ہوتا، چھ ماہ کے عرصہ پر بھی اور چار سال کی مدت پر بھی (والله اعلم بالمراد)۔

مطلب یہ ہے کہ بندے میں تیرا حق ضائع نہیں کروں گا اور نہ ہی تیری دعا کو مسترد کروں گا گو کہ اس دوران طویل عرصہ گذر جائے اس لئے کہ میں حلیم ذات ہوں۔ میں بندوں کو سزا دینے میں عجلت سے کام نہیں لیتا میں انہیں مہلت دیتا رہتا ہوں کہ شاید یہ ظلم وستم ترک کر کے توبہ کرے اور مظلوم کو راضی کر لیں اور اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ولا تحسبن الله غافلاً عما يعمل الظالمون﴾ [ابراهيم: ٤٢] اور ارشاد ہے: ﴿وربك الغفور ذوالرحمة﴾ [الكهف: ٥٨]

۲۲۵۰: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ثَلَاثُ دَعَوَاتٍ مُسْتَجَابَاتٌ لَا شَكَّ فِيهِنَّ دَعْوَةُ الْوَالِدِ وَدَعْوَةُ الْمُسَافِرِ وَدَعْوَةُ الْمَظْلُوْمِ. (رواه الترمذی وابو داود وابن ماجة)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۸۹/۲ حدیث رقم ۱۵۳۶۔ والترمذی فی السنن ۱٦٤/۵ حدیث رقم ۳۵۰۹۔ وابن ماجه ۱۲۷۰/۲ حدیث رقم ۳۸٦۲۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں تین دعائیں قبول کی جاتی ہیں ان کی قبولیت میں کوئی شک نہیں ایک تو باپ کی دعا' دوسری مسافر کی دعا اور تیسری مظلوم کی دعا۔'' (ترمذی' ابوداؤد' ابن ماجہ)

تشریح: **قوله: ثلاث دعوات مستجابات**...... ''ثلاث'' یہ مبتدا ہے اور ''مستجابات'' اس کی خبر ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ گذشتہ حدیث میں لفظ ثلاثہ (بالتانیث) تھا اور مذکورہ حدیث میں لفظ ثلاث (بالتذکیر) وارد ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گذشتہ حدیث میں ثلاثہ کی تمیز داعی (دعا کرنے والا) مذکر ہے۔ وہاں کلام داعی کی شان اور راہ قبولیت میں اس کی کوشش و جستجو دعا کی قبولیت کا مدار ہے یعنی صوم اور عدل میں ہے۔

اس کے برعکس مذکورہ دعا میں والد اور مسافر کی دعا (مونث) تمیز ہے۔ کیونکہ یہاں پر دعا کی قبولیت کیلئے انہیں کسی قسم کی عملی جدوجہد کی ضرورت نہیں۔ (سوائے مسافر و والد ہونے کے) اھ۔

یہ ایک نفیس نکتہ اور عالی حکمت اور اس کی بلاغت وفصاحت اپنی انتہاء کو چھو رہی ہے۔

اور حافظ ابن حجرؒ کا قول انتہائی عجیب ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں وہاں لفظ ''ثلاثه'' مونث مذکور ہے اور اس جگہ لفظ ''ثلاث'' مذکر ہے اور انہوں نے اس کے علاوہ کے ساتھ فرق کرنے کو عجیب قرار دیا ہے اور فرمایا کہ اس میں پوشیدگی اور تکلف کا ارتکاب لازم آتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ جو پوشیدگی کی بات ہے وہ تو یہ ہے کہ اس لئے کہ یہ دقیق قسم کی باتیں فصیح و بلیغ علماء پر واضح ہو سکتی ہے۔

اور رہا ان کا یہ خیال کہ امام طیبیؒ نے معدود کے تذکیر و تانیث کے اعتبار سے ثلاثہ اور ثلاث میں فرق نہیں کیا تو یہ ایسی بے بنیاد اور غلط بات ہے جو کسی سے بھی مخفی نہیں۔ کیونکہ امام طیبیؒ عربیت کے امام ہیں اور قرآن اور حدیث کے الفاظ کے حل میں علم کے بلند اور بڑے پہاڑ ہیں۔

البتہ وہ فقہی فروعات میں شہرہ نہیں رکھتے تھے لیکن یہ اس کیلئے قادح نہیں۔

''**لا شك فيهن**'' کے الفاظ میں بنسبت پچھلی حدیث کے زیادہ تاکید ہے، جس میں ''**لا ترد**'' کے الفاظ ہیں۔ اس جگہ قبولیت کی تاکید کی وجہ یہ ہے کہ یہاں دعا طلب صادق کے ساتھ پائی جاتی ہے۔

قوله: دعوة الوالد: یعنی والد کی دعا اپنی اولاد کے حق میں یا ان کے خلاف اس کی بددعا۔ رہی والدہ تو اس ذکر اس لئے ترک کر دیا گیا ہے کہ اس کا حق والد سے بڑھ کر ہے لہٰذا اس کی دعا کی قبولیت بطریق اولیٰ ثابت ہوگی۔

اور یا اس کو ترک کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ماں کی بددعا اولاد کیلئے قبول نہیں ہوتی کیونکہ اولاد پر رحم کرتی ہے اور اولاد کیلئے بددعا دل سے نہیں دیتی۔ ''**كذا ذكره زين العرب**'' لیکن اس میں یہ اشکال ہے کہ والد کی دعا بھی بطور شفقت کے ہوتی ہے اور نہ دل سے ہوتی ہے اس طرح اس کی بددعا کیونکہ ان کی بددعا بھی اس بات کا پرزور مظاہر ہے کہ اولاد نے اسکے ساتھ بُرا سلوک کیا ہے۔

لہٰذا بہتر یہ ہے والدہ کو بطریق اولویت والد پر قیاس کیا جائے۔ جیسے یہ مفہوم ایک حدیث میں وارد ہے کہ والد کیلئے دو تہائی حسن سلوک ہے اور والدہ کیلئے ایک تہائی۔

کیونکہ حمل، ولادت، رضاعت، پرورش کی جو تکالیف ماں برداشت کرتی ہے وہ ان تکالیف سے بڑھ کر ہیں جو والد کو اس کے کھانے پینے کی کفالت اور لباس کے انتظامات کے سلسلہ میں اٹھانی پڑتی ہیں۔

جیسے کہ یہ باری تعالیٰ کے اس قول کریم کا مدلول ہے: ﴿ووصینا الانسان بوالدیه حملیته امه وهنا﴾[لقمان:١٤]

چنانچہ اس آیت کریمہ میں "حملته امه" کا جملہ مفسر یعنی "ان اشکرنی" اور مفسر یعنی "وصینا" کے درمیان بطور جملہ معترضہ کے لایا گیا۔ اور اس جملہ معترضہ کو لانے کا فائدہ والدین کے حق کی تلقین میں زور پیدا کرنا خاص کر والدہ کے حق میں کیونکہ اس نے حمل ورضاعت وغیرہ کی بڑی مشقتیں برداشت کی ہیں اور اس لئے بھی کہ والدہ زیادہ شفیق اور نرم دل ہوتی ہے اس لئے اس کی دعا قبولیت کے زیادہ لائق ہوتی ہے۔

قوله: ودعوة المسافر: مسافر کی دعا سے مراد یا تو احسان کرنے والے کے حق میں اچھی دعا ہے یا پھر برائی کرنے والے کے خلاف بددعا ہے کیونکہ اس کی دعا بھی دل سے ہوتی ہے۔

قوله: ودعوة المظلوم: یہ مراد ہے کہ مظلوم کی دعا اس شخص کیلئے جو اس کی مدد واعانت کرتا ہے۔ یا اسے تسلی دے کر مصیبت کو سہل کر دیتا ہے اور یا مراد اس شخص کے خلاف جس نے کسی طرح کا ظلم کیا ہو۔

الفصل الثالث:

۲۲۵۱: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِيَسْأَلْ اَحَدُ كُمْ رَبَّهٗ حَا جَتَهٗ كُلَّهَا حَتّٰى يَسْأَلَهٗ شِسْعَ نَعْلِهٖ اِذَا انْقَطَعَ۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٥/٢٤٢ حديث رقم ٣٦٨٢۔

ترجمه: "اور حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا تم میں سے ہر شخص کو چاہئے کہ وہ اپنی حاجتیں اپنے پروردگار سے مانگے یہاں تک کہ اگر اس کے جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو وہ بھی خدا سے مانگو"

تشریح: قوله: یسال احدکم ربه حاجته کلها : یہ مفعول بہ ثانی ہے۔ (کلها) یہ مفعول بہ ثانی کی تاکید ہے۔ یعنی اپنی تمام مرادیں میں مانگیں اس میں اس بات پر تنبیہ واعلان ہے کہ ہمہ وقت مدد واستعانت کی ضرورت واحتیاج ہو۔

قوله: حتی یساله شسع نعله اذا انقطع: یعنی اللہ سے اور ایک صحیح نسخہ میں "حتی یسال" ضمیر مضحب کے بغیر بھی آیا ہے۔ "شسع" شین کے کسرہ اور سین کے سکون کے ساتھ ہے بمعنی جوتے کا تسمہ۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ "شسع" جوتے کے دو تسموں میں سے ایک کو کہتے ہیں اور یہ از باب تمیم ہے کیونکہ اس سے ماقبل از قبیل مبہمات ہے اس کے بعد از قبیل متممات ہے۔

۲۲۵۲: زَادَ فِیْ رِوَايَةٍ عَنْ ثَابِتٍ الْبُنَانِيِّ مُرْسَلاً حَتّٰى يَسْأَلَهُ الْمِلْحَ وَحَتّٰى يَسْأَلَهُ شِسْعَهٗ اِذَا انْقَطَعَ .

اخرجه الترمذی فی السنن ٥/حديث رقم ٣٦٨٣۔

ترجمه: ترمذی نے ایک اور روایت میں جو ثابت بنانی سے بطریق ارسال نقل کی ہے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ یہاں تک کہ نمک بھی اس سے مانگے اور اگر جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو وہ بھی اس سے مانگے۔" (ترمذی)

تشریح: قوله: زاد فی روایة: مصنف کو یہ کہنا چاہئے تھا (وفی روایة) یا یوں کہنا چاہئے تھا کہ: **رواه الترمذی وزاد فی روایة۔**

قوله: حتی یساله الملح: یہی وہ اضافہ ہے جو امام ترمذی نے ثابت بنانی کے طریق سے مرسلا روایت کیا ہے۔

''حتی یسأله'' کا تکرار اس بات پر دلالت کرنے کے واسطے ہے کہ وہاں مانگنے والے کو اس کے مطلوب سے روک ٹھوک کرنے والا نہیں کیونکہ جس سے مانگا گیا وہ انتہائی مہربان ذات ہے اور ہمہ وقت مطلوب کو عطا کرنے پر تیار تا کہ بندہ اس کی طرف التجا کرتا رہے اور اس پر بھروسا کرتا رہے۔

''شسع نعله'' تو دونوں روایتوں میں موجود ہے البتہ مقدار زائد پر تنبیہ کیلئے دوسری روایت کے اس حصہ کو بھی ذکر کیا۔

۲۲۵۳: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَرْفَعُ فِي الدُّعَاءِ حَتّٰى يُرىٰ بَيَاضُ اِبْطَيْهِ)

ترجمہ: ''اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ دعا کے وقت اپنے ہاتھوں کو اتنا اٹھاتے تھے کہ آپ ﷺ کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگتی تھی۔''

تشریح: قوله: وعن انسؓ: اس مقام پر عنه کے بجائے عن انسٍ اس لئے کہا کہ یہ وہم نہ ہو کہ ضمیر کا مرجع ثابت بنانی ہے گو کہ ایک نسخہ میں یہ الفاظ بھی موجود ہیں۔

قوله: کان رسول الله ﷺ یرفع یدیه......الخ ''حتی یری'': یہ بصیغہ مجہول ہے اور رؤیت کے معنی میں ہے۔

یعنی نبی کریم ﷺ دعا کے بعض مخصوص مواقع پر اپنے ہاتھوں کو اتنا اٹھاتے تھے کہ آپ ﷺ کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگتی تھی۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ بغلوں کی سفیدی سے مراد اطراف بغل کی سفیدی ہو۔ کہ نبی کریم ﷺ دعا کے مواقع پر اپنے ہاتھوں کو اتنا اٹھاتے تھے کہ آپ ﷺ کی بغلوں کی اطراف کی سفیدی نظر آنے لگتی تھی۔

یہ اس حدیث کے منافی نہیں جسے ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے کہ ''المسألة ان ترفع یدیك حذو منکبیك'' کیونکہ یہ حدیث محمول ہے کم از کم رفع پر یا اکثر اوقات پر اور وہ حدیث محمول ہے بیان جواز پر یا مخصوص حالات واوقات پر جیسے استسقاء وغیرہ، یا دعا میں مبالغہ پر۔

۲۲۵۴: وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ كَا نَ يَجْعَلُ اِصْبَعَيْهِ حِذَاءَ مَنْكِبَيْهِ وَيَدْعُوْ.

ترجمہ: ''اور حضرت سہل ابن سعدؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپ ﷺ اپنی دونوں انگلیوں یعنی دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کے سرے اپنے مونڈھوں کے برابر لے جاتے اور پھر دعا مانگتے۔''

تشریح: قوله: عن النبی ﷺ قال: کان یجعل أصبعیه......:

یہ حدیث رفع یدین کے سلسلہ میں میانہ روی کی دلیل ہے۔ اور یہ اکثر حالات میں ہے اور گذشتہ حدیث میں زیادۃ ہے اور وہ مبالغہ اور دعا کے الحاح وزاری کی حالت میں ہے۔

حاصل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کے سرے اپنے مونڈھوں کے برابر لے جاتے اور پھر ہاتھ اٹھانے کے بعد دعا مانگتے۔

۲۲۵۵: وَعَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيْدَ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ اِذَا دَعَا فَرَفَعَ يَدَيْهِ مَسَحَ وَجْهَهُ بِيَدَيْهِ.

(رواه البیهقی الا حادیث الثلا ثة فی الدعوات الکبیر)

ترجمہ: ''اور سائب بن یزید اپنے والد مکرم سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب دعا مانگتے اور اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھاتے تو اپنے منہ پر دونوں ہاتھوں کو پھیرتے۔'' (مذکورہ بالا تینوں حدیثیں بیہقی نے دعوات کبیر میں نقل کی ہیں۔'')

تشریح: قوله: فرفع یدیه: یہ ''دعا'' پر عطف ہے۔

قولہ: مسح وجهه بيديه: حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ ''اذا'' کا جواب ہے۔اھ۔
لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ ''کان'' کی خبر ہے اور ''اذا'' اس کیلئے ظرف ہے۔
امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جب آپ ﷺ ہاتھ دعا میں نہ اٹھاتے تو پھر چہرے مبارک پر نہ پھیرتے اور یہ ایک اچھا قید ہے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ بکثرت دعا مانگا کرتے تھے۔ چنانچہ نماز کی حالت میں مانگتے تھے طواف کی حالت میں مانگتے تھے اس کے علاوہ حالات واوقات میں مانگتے تھے۔ جیسے نمازوں کے بعد کی دعائیں، سوتے وقت کی دعا کھانے کے بعد کی دعا وغیرہ ذلک، آپ ﷺ جب ہاتھ نہ اٹھاتے تو پھر منہ پر نہ پھیرتے۔
اور رہا حافظ ابن حجرؒ کا یہ قول: کہ لفظ حدیث سے جو یہ مستفاد ہے کہ آپ ﷺ جب ہاتھ اٹھائے بغیر دعا مانگتے تو پھر منہ پر نہ پھیرتے تو یہ فرضی بات ہے کیونکہ یہ بات گذر چکی ہے کہ آپ ﷺ ہر دعا میں ہاتھ مبارک اٹھاتے تھے۔اھ۔
یہ قول مردود ہے اس لئے کہ سابق میں ایسی کوئی بات نہیں گذری جو کلیہ پر دلالت کرے اور رہا ان کا آپ ﷺ کے فعل کے بارے میں یہ کہنا کہ فرضی بات ہے، بے فائدہ ہے۔

۲۲۵۶: وَعَنْ عِكْرَمَةَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ الْمَسْأَلَةُ اَنْ تَرْفَعَ يَدَيْكَ حَذْوَمَنْكِبَيْكَ اَوْنَحْوَ هُمَا وَالْاِ سْتِغْفَارُ اَنْ تُشِيْرَ بِاِصْبَعٍ وَاحِدَةٍ وَالْاِبْتِهَالُ اَنْ تَمُدَّ يَدَيْكَ جَمِيْعًا وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ وَالْاِبْتِهَالُ هٰكَذَا وَرَفَعَ يَدَيْهِ وَجَعَلَ ظُهُوْرَهُمَا مِمَّا يَلِيْ وَجْهَهٗ۔ (رواہ ابوداود)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۷۹/۲ حدیث رقم ۱۴۸۹۔

ترجمہ: ''اور حضرت عکرمہ حضرت ابن عباسؓ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا ''سوال کرنے کا ادب طریقہ یہ ہے کہ تم اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے مونڈھوں کے برابر یا ان کے قریب تک اٹھاؤ استغفار کا ادب یہ ہے کہ تم اپنی انگلی کے ذریعہ اشارہ کرو اور دعا میں انتہائی عجز ومبالغہ اختیار کرنا یہ ہے کہ تم اپنے دونوں ہاتھوں کو اکٹھے دراز کرو یعنی اتنے اٹھاؤ کہ بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگے۔'' (ابوداؤد) ایک روایت میں یوں ہے کہ انہوں نے کہا ''دعا میں انتہائی عاجزی کا اظہار اس طرح ہے اور یہ کہہ کر انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور ان کی پشت کو اپنے منہ کے قریب کیا۔ابوداؤد

تشریح: قوله: المسألة......أو نحوهما: مسأله مصدر میمی ہے بمعنی مانگنے کے۔ یہاں پر ''مسأله'' سے پہلے مضاف مقدر ہے یہ تقدیر حمل درست ہونے کی خاطر ہے تقدیر عبارت ہے، آداب المسألة۔
''نحو'' بمعنی ''قریب'' کے ہیں یعنی کاندھوں کے قریب لیکن اوپر کی طرف گذشتہ حدیث کے قرینہ کی بناپر۔
قوله: والاستغفار ان تشير باصبع واحدة: امام طیبیؒ فرماتے ہیں استغفار کے آداب میں سے یہ ہے کہ شہادت کی انگلی سے اشارہ کیا جائے نفس امارہ اور شیطان کی تذلیل اور ان دونوں سے پناہ مانگتے ہوئے۔
ایک انگلی کے ساتھ مقید کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ دو انگلیوں سے اشارہ کرنا مکروہ ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ سے مروی ہے۔ کہ آپ ﷺ نے ایک شخص کو دو انگلیوں سے اشارہ کرتے ہوئے دیکھا اس پر آپ ﷺ نے فرمایا ''احد احد'' یعنی وہ ایک ہے وہ ایک ہے۔
قوله: والابتهال ان تمد يديك: یعنی عجز وانکسار نفس سے سختی ومشقت دور کرنے کیلئے دعا کے اندر مبالغہ اور تضرع کرنا یہ آداب دعا میں سے ہے یعنی اتنی مقدار کہ آپ کے بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگے۔

قوله: والابتهال هكذاورفع......: یہ تعلیم بالفعل ہے جس کی تفسیر اگلے الفاظ میں ہے۔ورفع يديه رجعل ظهورهما مما يلي وجهه:یعنی آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ مبارک انتہائی بلند فرمائے حتی کہ آپ ﷺ کے بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی اور آپ ﷺ کے ہاتھ مبارک سر مبارک کے برابر میں ہو گئے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: شاید آپ ﷺ نے ابتہال سے پیش آنے والے تحیلاتی عذاب کا دفاع مراد لیا ہے۔اور اپنے دست مبارک کو ڈھال بنالیا تا کہ اس عذاب وسختی سے بچاؤ ہو۔

۲۲۵۷:وَعَنِ ابْنِ عُمَرَاَنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّ رَفْعَكُمْ اَيْدِ يَكُمْ بِدْ عَةٌ مَا زَادَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَلٰى هٰذَا يَعْنِىْ اِلَى الصَّدْرِ۔ (رواه احمد)

ترجمہ:''اور حضرت ابن عمرؓ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ ''تمہارا اپنے ہاتھوں کو بہت زیادہ'' اٹھانا بدعت ہے نبی کریم ﷺ اکثر اس سے زیادہ یعنی سینہ سے زیادہ اوپر نہیں اٹھاتے تھے۔'' (احمد)

تشریح: قوله:ان رفعكم ايديكم بدعة :یعنی ہاتھ بلند کرنے میں مبالغہ کرنا۔

قوله:ما زاد رسول الله ﷺ على هذا : یعنی اغلبی واکثری حالات واوقات میں۔

على هذا يعني: مشارالیہ سے مراد ہے۔(الى الصدر)۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ لفظ ''یعنی'' کے ساتھ ابن عمرؓ کے فعل کی تفسیر کی گئی ہے کہ رفع یدین سینے تک ہے،حضرت ابن عمرؓ نے عمومی حالات میں رفع یدین میں مبالغہ پر نکیر فرمائی ہے۔

نیز اس بات پر کہ تمام حالات کے اندر یکساں ہاتھ اٹھائے جائیں۔چنانچہ بعض حالات میں سینے تک بعض حالات میں کاندھوں تک ہیں۔جبکہ بعض دیگر حالات کے اندر کاندھوں سے اوپر تک ہیں۔حضرت ابن عمرؓ کی یہ تطبیق بہت لائق تحسین ہے،اس سے حافظ ابن حجرؒ کا۔یہ قول بے وزن ہو جاتا ہے کہ ابن عمرؓ کے اس قول کا استناد ان کا علم ہے وہ زائد کی نفی کر رہے ہیں جبکہ ان کے علاوہ دوسرے حضرات آپ ﷺ سے کاندھوں تک اٹھانا اور اس سے اوپر تک اٹھانا نقل کر رہے ہیں تو ان حضرات کا قول مثبت ہے اور مثبت کے قول کا اعتبار ہوتا ہے،تعجب کی بات یہ ہے کہ انہون نے بڑے فخر یہ انداز میں یہ کلام کیا ہے کہ اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے ایسی تقریر کی ہے جو اشکال اور ابہام سے خالی نہیں لہٰذا اس سے اجتناب کیا جائے۔

حدیث میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے یوم عرفہ میں دعا کے اندر اپنے دونوں ہتھیلیوں کو یکجا کیا اور سینے کے برابر اٹھایا کھانا طلب کرنے والے مسکینی کی کیفیت میں دعا مانگی۔

۲۲۵۸:وَعَنْ اُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا ذَكَرَ اَحَدًا فَدَعَالَهٗ بَدَأَ بِنَفْسِهٖ۔

رواه الترمذى وقال هذا حديث حسن غريب صحيح

اخرجه الترمذى فى السنن ۵/۱۳۱ حديث رقم ۳۴۴۵۔

ترجمہ:''اور حضرت ابی بن کعبؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب کسی کا ذکر کرتے اور پھر اس کے لئے دعا کرتے تو پہلے اپنے لئے دعا کرنا شروع کرتے اس کے بعد اس شخص کے لئے دعا کرتے امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔''

تشریح: قوله:اذا ذكر احدًا فدعا له:''دعا'' کا عطف ہے ''ذکر'' پر ہے۔

مراد ہے جب آپ ﷺ کسی کیلئے دعا کرنا چاہتے تھے تو پہلے اپنے لئے دعا کرتے کیونکہ اللہ تعالیٰ سے کوئی مستغنی نہیں۔صحیح حدیث کے اندر یہ بات آئی ہے کہ آپ ﷺ نے ''ابدأ بنفسك'' یعنی اپنے سے ابتدا کر۔

اس میں امت کیلئے تعلیم ہے اوراس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب اپنے حق میں اس دعا قبول ہوجائے گی تو دوسرے کے حق میں اس کی دعا مسترد نہیں ہوگی۔

۲۲۵۹:وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِالْخُدْرِیِّ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ مَا مِنْ مُسْلِمٍ یَدْعُوْ بِدَعْوَۃٍ لَیْسَ فِیْھَا اِثْمٌ وَلَا قَطِیْعَۃُ رَحِمٍ اِلَّا اَعْطَاہُ اللّٰہُ بِھَا اِحْدٰی ثَلَاثٍ اِمَّا اَنْ یُّعَجِّلَ لَہٗ دَعْوَتَہٗ وَاِمَّا اَنْ یَّدَّخِرَ ھَالَہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ وَاِمَّا اَنْ یَّصْرِفَ عَنْہُ مِنَ السُّوْءِ مِثْلَھَا قَالُوْا اِذًا نُکْثِرُ قَالَ اللّٰہُ اَکْثَرُ. (رواہ احمد)

احمد فی المسند ۱۸/۳۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابوسعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا''جو بھی مسلمان کوئی دعا مانگتا ہے ایسی دعا کہ اس میں نہ تو گناہ کی کوئی چیز کی طلب ہو اور نہ ناتہ توڑنے کی تو اللہ تعالیٰ اسے اس دعا کے نتیجے میں تین چیزوں میں سے ایک چیز ضرور دیتا ہے یا تو یہ کہ جلد ہی اس کا مطلب عطا فرمادے یا یہ کہ اس کے لئے اس دعا کو ذخیرہ آخرت بنادے'' کہ دنیا میں اس کا مطلب حاصل نہ ہونے کی صورت میں اس کے عوض آخرت میں اجر عطا کرے یا یہ کہ اسے اس کی دعا کے بقدر برائی سے بچائے'' صحابہؓ نے یہ سن کر عرض کیا کہ یارسول اللہ! ہم تو اب بہت زیادہ دعائیں مانگیں گے کیونکہ ہمیں دعا کے بڑے فائدے معلوم ہوگئے آپ ﷺ نے ارشادفرمایا''اللہ کا فضل بہت زیادہ ہے۔''(احمد)

تشریح: **قولہ: ما من مسلم ......احدی ثلاث:(لیس فیھا اثم)** یعنی اپنے تک محدود معصیت۔**(ولا قطیعۃ رحم)** یعنی دوسروں تک متجاوز برائی۔**(الا اعطاہ اللّٰہ بھا)** یعنی اس دعا سے**(احدیٰ ثلاث)** یعنی تین خصلتوں میں سے۔

قولہ: اما ان یعجل لہ دعوتہ......مثلھا یعنی بعینہٖ مانگی ہوئی چیز یا اس کی جنس میں سے کچھ دنیا ہی میں دے دیتا ہے اگر دنیا میں اس کا ملنا مقدر ہو۔

و اما أن یدخرھا: یعنی اس کا وہ مطلوب یا اس کا مثل یا اس سے افضل و برتر یا اس کا ثواب اور متبادل۔**(لہ)** یعنی دعا مانگنے والے کیلئے **(فی الآخرۃ)** یعنی اگر دنیا میں اس کا وقوع مقدر نہ ہو۔**(واما ان یصرف)** بمعنی **یدفع** ۔**(عنہ من السوء)** دین و دنیا کے معاملہ میں نازل ہونے والی کوئی مصیبت یا بیماری وغیرہ۔

(مثلھا) یعنی کم وکیف کے اعتبار سے اگر اس کا وقوع دنیا میں مقدر نہ ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس کا وقوع دنیا میں مقدر نہ ہو تو اس دعا میں داعی کیلئے دو میں سے ایک چیز ہے۔یا تو اس کے لیے ذخیرہ آخرت بنا لیتا ہے،یا پھر اس کے بقدر اس پر آنے والی آفت مصیبت کو روک دیتا ہے۔اس میں گذشتہ حدیث کی بہ نسبت یہ اضافہ ہے کہ جو مقدر نہ ہو دنیا میں تو اس کے بقدر اس سے آفت و مصیبت روک دی جاتی ہے۔

قولہ: قالوا اذا نکثر: حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ جب دعا مسترد نہیں کی جاتی اور دعا مانگنے والے کو محروم نہیں کیا جاتا۔**(نکثر)** یعنی دعا بکثرت مانگیں گے کیونکہ اس کے فوائد بڑے بڑے ہیں۔(شارح فرماتے ہیں) میں کہتا ہوں کہ ظاہر یہ ہے کہ **نکثر** فعل منصوب ہے۔لیکن موجودہ تمام صحیح نسخوں میں سید جمال الدین کے نسخوں میں سے بالرفع منضبط ہے۔

اور رفع کی صورت میں ''اذًا'' کے مدخول فعل سے حال کا معنی مراد لینا شرط ہے اور یہ ظاہر کے خلاف ہے کیونکہ متبادر الی الفہم یہ ہے کہ ہم دعا بکثرت کریں گے مستقبل میں۔

البتہ یہ مراد ہو سکتا ہے کہ حال سے حال الحیاۃ مراد ہو، یا جلد قبولیت کا لحاظ کر کے مبالغہ استقبال سے حال مراد ہو۔ (واللہ اعلم بحقیقۃ الحال)۔

تحقیق مقصود کی خاطر جو بات بطور استیناس کے ذکر کی جاسکتی ہے وہ ہے کہ جسے حسن چلپیؒ نے مطول کے حاشیہ میں تحریر کیا ہے کہ حال ماضی کے آخر اور مستقبل اول اجزاء کا نام ہے اور مقدار حال کی تعیین افعال کے مطابق عرف کے سپرد ہے۔ اس کیلئے کوئی مخصوص مقدار متعین نہیں چنانچہ کہا جاتا ہے ''زیدٌ یا کل'' زید کھاتا ہے۔ ''ویمشی'' اور چلتا ہے ''ویحج'' حج کرتا ہے۔ ''ویکتب القرآن'' قرآن کریم لکھتا ہے یہ حال شمار کیے جاتے ہیں حالانکہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اس کے زمانے کے تقادیر مختلف ہیں۔

اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ حال کے اندر یہ بات ہر حال میں ضرور ہے کہ فاعل سے حالت تکلم میں فعل کا صدور ہو رہا ہو اور موجودہ صورت حال میں فی الوقت تو دعا بھی موجود نہیں چہ جائیکہ اکثار ہو۔ الا یہ کہ نیت فعل کو فعل کا قائم مقام تصور کیا جائے۔

قولہ: قال: اللہ اکثر: اکثر نسخوں میں ''**بالثاء المثلۃ**'' ہے جبکہ ایک نسخہ میں ''**اکبر**'' ''**بالباء المؤحدہ**'' وارد ہے۔ تو پھر یہ ہوگا کہ اللہ اس سے بہت بالاتر ہے کہ اس پر کوئی چیز بڑھ جائے، اور پہلے نسخہ کے مطابق امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ اللہ قبول کرنے میں تمہاری دعاؤں سے بہت زیادہ ہے اور میرے ہاں ظاہر بات یہ ہے کہ اللہ کا فضل بہت زیادہ ہے یعنی اللہ جو اپنے فضل اور وسیع کرم سے عطا کرتا ہے وہ اس سے بہت زیادہ ہے جو وہ تمہیں تمہارے مانگنے سے عطا کرتا ہے۔

یا مراد یہ ہے کہ اللہ اکثار میں غالب ترین ہے کہ تم زیادہ مانگ کر عاجز نہیں کر سکتے ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے خزانے ختم ہونے اور اس کے عطیات فنا ہونے سے مبرا ہیں۔ پھر میں نے حافظ ابن حجر کو اپنے ساتھ کچھ کچھ موافقت کرتے پایا، چنانچہ وہ رقمطراز ہیں کہ اللہ ثواب وعطا کے لحاظ سے اس سے بڑھ کر ہے جو تمہاری نفوس میں طلب ہے تو جو چاہو کثرت سے طلب کرو۔ کیونکہ اللہ کریم تمہاری دعاؤں سے زیادہ اور بڑا عطا کرے گا۔

پھر آگے لکھتے ہیں کہ میری تقریر سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ شارح کی یہ بات غیر ضروری ہے کہ اللہ کی طرف سے قبولیت تمہاری دعا سے بڑھ کر ہے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ کریم کی اجابت کا میدان وسیع ہے، تمہاری دعا سے اس کے باب میں اور یہ قریب قریب اس قول کی طرح ہے، ''**العسل احل من الخل۔ والصیف احر من الشتاء**''۔ یعنی سہد سرکہ سے زیادہ شیریں اور موسم گرما جاڑے کے موسم سے زیادہ گرم ہے۔

اور ''**اکثر**'' ''**بالثاء**'' کالانا نکثر کے مشاکلت کی رعایت کے لحاظ سے ہے اور میرے قول (**مما نفوسکم**) سے یہ مذکورہ خرابی بھی دور ہو گئی، شارح کہتا ہے اس میں دو غیر مناسب ایہام ہیں۔

اول یہ کہ ان کے نفوس میں یہ بات ہے کہ اللہ کی اجابت اکثر نہیں حالانکہ یہ حقیقت نہیں۔

دوم یہ کہ اس میں اکثریت مقید ہے حالانکہ وہ مطلق ہے۔ اس کی کوئی انتہا اور غایت نہیں۔

۲۲۶۰: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ خَمْسُ دَعْوَاتٍ يُسْتَجَابُ لَهُنَّ دَعْوَةُ الْمَظْلُوْمِ حَتّٰى يَنْتَصِرَ وَدَعْوَةُ الْحَاجِّ حَتّٰى يَصْدُرَ وَدَعْوَةُ الْمُجَاهِدِ حَتّٰى يَقْعُدَ وَدَعْوَةُ الْمَرِيْضِ حَتّٰى يَبْرَأَ وَدَعْوَةُ الْاَخِ لِاَخِيْهِ بِظَهْرِ الْغَيْبِ ثُمَّ قَالَ وَاَسْرَعُ هٰذِهِ الدَّعْوَاتِ اِجَابَةً دَعْوَةُ الْاَخِ بِظَهْرِ الْغَيْبِ۔ (رواہ البیہقی فی الدعوات الکبیر)

اخرجه في صحيحه ۲۰۷/٤ الحدیث رقم (۳۹۔ ۲۷۰۰)۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عباسؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا پانچ دعائیں ہیں جنہیں شرف قبولیت سے نوازا جاتا ہے (۱) مظلوم کی دعا یہاں تک کہ وہ ظالم سے اپنے ہاتھ سے یا اپنی زبان کے ذریعہ بدلہ لے لے (۲) حاجی کی دعا یہاں تک کہ وہ اپنے شہر اور اپنے اہل وعیال کے پاس واپس آ جائے یا حج سے فارغ ہو جائے (۳) جہاد کرنے والے کی دعا یا طلب علم و عمل میں سعی وکوشش کرنے والے کی دعا یہاں تک کہ وہ جہاد وسعی و کوشش سے فارغ ہو کر بیٹھ جائے (۴) مریض کی دعا یہاں تک کہ وہ اچھا ہو جائے یا مر جائے (۵) ایک بھائی کی اپنے بھائی کے لئے غائبانہ دعا'' پھر اس کے بعد آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''ان دعاؤں میں سب سے جلدی قبول ہونے والی ایک بھائی کی اپنے بھائی کے لئے غائبانہ دعا ہے۔''

قوله: خمس ...... دعوة : ''خمس'' مبتدا ہے اور ''دعوة'' اس کی خبر ہے۔

قوله: دعوة المظلوم حتى ينتصر یعنی اس وقت تک کہ جب وہ ظالم سے ہاتھ یا زبان کے ذریعہ انتقام نہ لے لے۔

کیونکہ اگر اس نے شرعی حق کے بقدر اپنا انتقام لیا، تو اس نے اپنا حق پورا وصول کر لیا۔ یا اپنے حق سے کم وصول کیا، تو بھی صورت واضح ہے، یا اپنے شرعی حق کے علاوہ انتقام لیا ہوگا یا اس سے زائد لیا ہوگا تو ضرور ظالم ہو جاوے گا۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''حتی'' ان چاروں مقامات میں ''الی'' کے معنی میں ہے۔ جیسے اس قول کے اندر ''حتی'' بمعنی ''الی'' ہے۔ **سرت حتى تغيب الشمس** کیونکہ ''حتی'' کا مابعد اس کے ماقبل میں داخل نہیں ہے۔

قوله: ودعوة الحاج حتى يصدر : سے یا حج اکبر مراد ہے یا حج اصغر۔ **(حتى يصدر)** یہ 'دال' کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور معنی ہے کہ وہ اپنے شہر اور گھر لوٹ آئے، یا حج سے فارغ ہو کر واپس آ جائے۔

قوله: ودعوة المجاهد حتى يقعد یعنی اللہ کے راستہ میں، یا مراد علم وعمل کے میدان میں سعی کوشش کرنے والا ہے۔ **(حتى يقعد)** یہ قاف کے سکون اور عین کے ضمہ کے ساتھ ہے اور معنی ہے کہ جہاد سے آ کر بیٹھ جائے یا مجاہدہ سے فارغ ہو کر بیٹھ جائے، اور ایک صحیح نسخہ میں ''**يفقد**'' یعنی 'فا' کے سکون اور 'قاف' کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''**أي يفقد ما يستتب له من مجاهدته أي حتى يفرغ منهااھ واستتب له الأمر أي تهيأ واستقام۔ (على ما في الصحاح)** ابن حجرؒ آخری معنی پر اکتفاء کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''**هو من فقد يفقد كضرب يضرب، أي: الى أن لا يجد أهبة جهاده لفراغها، أو سرقتها، أو الى أن يفرغ من جهاده**اھ۔

لہٰذا آخری ہی درست ہے کیونکہ اول الذکر وثانی الذکر تو دعا کی قبولیت کو اور قوی کرتے ہیں چہ جائیکہ وہ دعا کی قبولیت کیلئے مانع ہوں۔

علامہ میرکؒ نے حاشیہ مشکوٰۃ میں لکھا ہے کہ یہ ''**حتى يقفل**'' قاف کے سکون اور ''فا'' کے کسرہ کے ساتھ ہے جو رجوع کے معنی ہے اور اسی وجہ سے نیک شگونی کی خاطر قافلہ کو قافلہ کہا جاتا ہے اور اس پر ''ظاء'' کا نشان لگا کر اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہی ظاہر ہے لیکن یہ بات مخفی نہیں کہ حدیث کے اس لفظ کو ظاہر پر محمول کرنا ممکن نہیں بالخصوص جب دوسری دو روایات ثابت ہیں اور ان کا معنی بھی واضح ہے۔

www.KitaboSunnat.com

قوله: ودعوة المريض حتى يبرأ : یعنی تندرست ہو جائے یا فوت ہو جائے۔

قوله: ودعوة الاخ لاخيه بظهر الغيب یعنی مسلم بھائی کی غیر موجودگی میں جب تک اس سے مل نہ لے۔

قوله:واسرع هذه......بظهر الغيب:

یعنی اپنی بھائی کیلئے (بظهر الغيب) کیونکہ یہ دعا خلوص نیت اور صفائے سرشت کے ساتھ ہوتی ہے رہے باقی لوگ تو ان کی دعا میں ان کے نفسانی ساجھا اور طبعی اغراض ملی ہوتی ہیں۔ چنانچہ حدیث میں وارد ہے:

ان الله فى عون العبد مادام العبد فى عون أخيه المسلم

"اللہ بندے کی مدد میں لگا رہتا ہے جب تک بندہ اپنے مسلمان بھائی کی اعانت میں ہوتا ہے۔"

بَابُ ذِكْرِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَالتَّقَرُّبِ اِلَى اللّٰهِ

ذکر اللہ اور تقرب الی اللہ کا بیان

علامہ جزریؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر فقط تسبیح وتہلیل وتکبیر میں منحصر نہیں بلکہ جو بھی اپنے اعمال وافعال میں اللہ کا فرمانبردار ہوگا وہ ذاکر شمار ہوگا۔

اور سب سے بہتر اور افضل ذکر تلاوت قرآن ہے، تاہم جہاں قرآن کی تلاوت کا موقع نہ ہو جیسے رکوع وسجود کی حالت، پھر آگے جا کر فرماتے ہیں ہر ذکر جو شرعاً مشروع ہو یعنی اس کا حکم ہو وہ واجب ہو یا مستحب اس وقت تک معتبر نہیں جب تک اس کا اس طرح تلفظ نہ ہو کہ خود اس کو سن سکے اھ۔ اس سے ان کا مقصود فقہی حکم بیان کرنا ہے یعنی کہ اگر قراءت کی حالت میں اپنے دل میں پڑھا بایں طور کہ خود اس کو نہ سن سکا یا رکوع، سجود کی حالت میں اسی طرح سے آہستہ پڑھا تو وہ فرضِ قراءت اور سنت تسبیح کو ادا کرنے والا نہ ہوگا، یہ مطلب نہیں کہ ذکر قلبی پر اخروی اجر وثواب مرتب نہیں ہوتا۔

چنانچہ ابویعلیٰؒ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کی تخریج کی ہے وہ فرماتی ہیں۔" کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اس ذکر خفی کا اجر جسے حفظہ فرشتے بھی نہ سن سکیں، وہ ستر گنا ہے، جب قیامت کا دن ہوگا اور اللہ تعالیٰ ساری مخلوق کو حساب وکتاب کے لئے جمع کرلے گا اور حفظہ فرشتے اپنے لکھے اور محفوظ کئے ہوئے کو حاضر کرلیں گے، اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا دیکھو کیا تمہارے پاس اس کا کچھ مزید ہے وہ کہیں گے نہیں، جو کچھ ہم نے جانا اور معلوم کیا سب ہم نے لکھ کر محفوظ کرلیا ہے۔

اس پر اللہ کہے گا میرے پاس آپ کی ایک ایسی نیکی ہے جسے آپ بھی نہیں جانتے اور میں آپ کو اس کا بدلہ دوں گا اور وہ ذکر خفی ہے، امام سیوطیؒ نے (البدور السافرة فى احوال الآخرة) میں ذکر کیا ہے (والتقرب اليه) یعنی اللہ کا ذکر کر کے اللہ کے قریب ہونا یا نوافل کی ادائیگی سے اللہ سے قریب ہونا۔

مطلب یہ ہے کہ یہ باب ان احادیث کے بیان میں ہے جو ان دونوں سے متعلق وارد ہیں۔

الفصل الاول:

۲۲۶۱: وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ وَاَبِىْ سَعِيْدٍ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا يَقْعُدُ قَوْمٌ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا حَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ وَنَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِيْنَةُ وَذَكَرَهُمُ اللّٰهُ فِيْمَنْ عِنْدَهُ. (رواه مسلم)

اخرجه فى صحيحه ۲۰۷/۴ الحديث رقم (۳۹۔ ۲۷۰۰)۔

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہؓ اور ابوسعید خدریؓ دونوں روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب بھی کوئی جماعت اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے کے لئے بیٹھتی ہے تو ان کو وہ فرشتے گھیر لیتے ہیں اور ان کو رحمت اپنی آغوش میں لے لیتی

ہے اور ان پر سکینہ کا نزول ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ان ذکر کرنے والوں کا تذکرہ اپنے پاس والوں میں کرتا ہے۔'' (مسلم)

تشریح: **قولہ: لا یقعد قوم یذکرون اللّٰہ:** اگر اس مقام میں ''قعود'' سے مراد قیام کا ضد ہو تو اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہوگا کہ ذاکر کی سب سے بہتر کیفیت یہی ہے کیونکہ اس ہیئت میں ظاہر و باطنی حواس مجتمع ہوتے ہیں، اور اگر یہ استمرار سے کنایہ ہو تو پھر اس میں مداومتِ ذکر کی طرف اشارہ ہوگا۔

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ''قعود'' کے ساتھ تعبیر غالب اعتبار سے ہے۔ کیونکہ اصل مقصود اپنے نفس کو اللہ کے ذکر کا پابند بنا کر ذاکرین کی صف میں شامل ہونا ہے تاکہ اپنی سانسوں کی برکات اور ذکر کے ساتھ مانوس ہونے کا پورا حصہ ان کو ملے۔ لہٰذا کسی اطاعت جیسے طواف نماز جنازہ، طلب علم، وعظ ونصیحت کا سننا وغیرہ کیلئے اٹھ کھڑے ہونا اس کے منافی نہیں۔

قولہ: الا حفتھم الملائکۃ......الخ: یعنی انہیں وہ فرشتے جو گلیوں کوچوں میں گھومتے ہیں اور اہل ذکر کو تلاش کرتے ہیں۔

(وغشیتھم الرحمۃ) یعنی وہ رحمت الٰہی ان کی ڈھانک لیتی ہے جو اللہ تعالیٰ کو بکثرت یاد کرنے والے مردوں اور عورتوں کیلئے خاص ہوتی ہے۔ **(ونزلت علیھم السکینۃ)** یعنی طمانیت اور وقار اور اس کی دلیل باری تعالیٰ کا یہ قول بھی ہے: ﴿**الا بذکر اللّٰہ تطمئن القلوب**﴾[الرعد:۲۸]

اسی طرح باری تعالیٰ کا قول: ﴿**ھو الذی انزل السکینۃ فی قلوب المؤمنین لیزدادوا ایماناً**﴾[الفتح:۰٤]

(وذکرھم اللّٰہ) یعنی فخر ومباہات کے طور پر ان کے عمل کی تحسین کرکے اور ان کیلئے بڑے اجر کا وعدہ کرکے **(فیمن عندہ)** یعنی مقرب فرشتے اور نبیوں اور رسولوں کے ارواح، عندیت سے مراد عندیۃ رتبہ ہے' عندیت مکان نہیں کیونکہ وہ مکان وزمان کے قیود سے منزہ اور نقص وحدوث کے تمام امارات سے مبرا ہے۔

۲۲٦۲: وَعَنْہُ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ یَسِیْرُ فِیْ طَرِیْقِ مَکَّۃَ فَمَرَّ عَلٰی جَبَلٍ یُقَالُ لَہٗ جُمْدَانُ فَقَالَ سِیْرُوْا ھٰذَا جُمْدَانُ سَبَقَ الْمُفَرِّدُوْنَ قَالُوْا وَمَا الْمُفَرِّدُوْنَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ الذَّاکِرُوْنَ اللّٰہَ کَثِیْرًا وَّالذَّاکِرَاتُ۔

اخرجہ فی صحیحہ ٤/۲۰٦۲ الحدیث رقم (٤/۱٦۷٦)۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ مکہ کے راستہ پر چلے جا رہے تھے کہ ایک پہاڑ کے پاس سے گزرے جس کا نام جمدان تھا آپ ﷺ نے اس وقت ارشاد فرمایا ''چلے چلو یہ جمدان ہے' مفردون سبقت لے گئے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! مفردون کون ہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''وہ مرد جو اللہ کو بہت زیادہ یاد کریں اور وہ عورتیں جو اللہ کو بہت یاد کریں۔'' (مسلم)

تشریح: **قولہ: کان رسول اللّٰہ ﷺ یسیر فی طریق مکۃ:**

یعنی ظاہری طور پر مکہ کے راستہ میں تھے جبکہ باطنی پر سیر کے لحاظ سے رب کعبہ کی راہ میں تھے۔ یہ سفر مدینہ سے مکہ کی طرف تھا یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے برعکس مکہ سے مدینہ کی طرف ہو۔

قولہ: فمرّ علی جبل یقال لہ بجمدان: یہ مدینہ سے ایک دن کے فاصلہ پر تھا۔

''جمدان'' ''جیم'' کے ضمہ اور ''میم'' کے سکون کے ساتھ ہے اور اس کے آخر میں نون ہے۔ یہ اپنے ٹھوس اور جامد ہونے کے باوجود رحمٰن کے ذکر کا اعلان کر رہا ہے اور اہل معرفت میں سے جو اس پر گزرتا ہے اس سے خوش ہوتا ہے۔ جیسے کہ روایات میں وارد ہے کہ

ایک پہاڑ نام لے کر دوسرے پہاڑ کو پکارتا ہے اور کہتا ہے: ''ای فلان هل مرّبك احد ذكر الله؟ فاذا قال: نعم استبشر۔ کہ اے فلان کیا آپ کے اوپر کسی ایسے شخص کا گزر ہوا ہے جو اللہ کو یاد کر رہا ہو؟ جب اس کا جواب ہاں میں ہو تو وہ خوش ہو جاتا ہے۔

اور عوارف المعارف میں حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ما من صباح ولا رواح الا وبقاع الارض ينادى بعضها بعضا هل من بلك اليوم احد صلّى عليك او ذكر الله عليك فمن قائلة: نعم ومن قاملة: لا، فاذا قالت: نعم علمت ان لها بذالك فضلاً عليها''۔

قوله: فقال: سيروا هذا جمدان: یعنی اچھی چال چلو جس میں اللہ کا ذکر اور دھیان ہو۔ شکر اور سرور ہو (هذا جمدان) یہ حرکت میں ہے اگرچہ تم اسے حیران شخص کی طرح ساکن خیال کر رہے ہو۔ حضرت جنید سے پوچھا گیا کہ آپ نے سماع کیوں چھوڑی؟ اس پر انہوں نے جواب میں فرمایا: کہ اللہ نے فرمایا: ﴿وترى الجبال تحسبها﴾ [النمل: ۸۸]

قوله: سبق المفردون یہ ''را'' مکسورہ مشددہ یا مخففہ کے ساتھ ہے۔ یعنی وہ لوگ جو دوسرے ہمسروں سے اپنے آپ کو یکتا بنائے اور تقرب الٰہی حاصل کر لیں، بلند درجات کی طرف ترقی کر کے اپنی حالت و ہیئت کو دوسروں کے مقابلہ میں ممتاز بنالیں۔ کیونکہ یہ اللہ کا ذکر کر کے غیر ذاکرین کے مقابلہ میں یگانہ ہیں۔

یا مراد یہ ہے کہ انہوں نے اکیلے اللہ کا ذکر کیا اس کے ماسوا کے ذکر کو ترک کر لیا اور یہی اس جگہ حقیقی تفرید ہے۔

قوله: قالوا: وما الفردون؟ : کہتے ہیں کہ سوال صفت کے بارے میں ہے یعنی تفرید یا افراد کے بارے میں، کیونکہ ''ما'' کے ذریعہ جس طرح کسی ''شے'' کی حقیقت و ماہیت کے بارے میں سوال ہوتا ہے اسی طرح شے کے وصف کے بارے میں بھی سوال ہوتا ہے جیسے فرعون نے کہا تھا (وما رب العلمين) موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جواب میں فرمایا تھا۔ (رب السمٰوٰت والارض) یہی وجہ ہے کہ صحابہؓ نے (من هم) نہیں فرمایا۔ پس آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ حقیقی قابل اعتبار تفرید تو یہ ہے کہ بندہ اکثر و بیشتر اوقات میں اپنے نفس کو اللہ کے ذکر کیلئے اکیلا اور ہلکا پھلکا کرے تو گویا کہ صحابہؓ نے یہ دریافت کیا کہ مفردین کی کیا صفت ہے تا کہ ہم ان کی اقتدا کر کے ان غایتوں کی طرف سبقت لے جائیں جن کی طرف وہ سبقت لے گئے ہیں۔ اور ہم بھی ان اسرار پر مطلع ہوں جن پر وہ مطلع ہو گئے ہیں۔

قوله: الذاكرون الله كثيرا والذاكرات: كثيرا مفعول مطلق ہے تقدیری عبارت یہ ہے ''ذكرا كثيرا'' کہتے ہیں کہ کثرت سے کثرت حالات مراد ہیں۔ جیسے ایک اور حدیث شریف میں اس کی تفسیر اسی طرح وارد ہے۔ (والذاكرات) یہاں پر مفعول بہ لفظ ''اللہ'' کو سابق میں مذکور ہونے کی وجہ سے حذف کیا گیا ہے یہ بھی ایک آیت کریم کا حصہ ہے۔ اور اس لئے بھی کہ یہ ضمیر مفعول ہے اور ایسی ضمیر کا حذف عام اور شائع ہے اھ۔

اس کا یہ قول یہ آیہ کریمہ کا حصہ ہے بالکل درست ہے۔ اور ذاکر کثیر وہ کہلاتا ہے جو کسی بھی حال میں اللہ کو نہ بھولے۔ یہ مراد نہیں کہ وہ کثرت الفاظ کے ساتھ ذکر کرتا ہے اور ان سے وہ لوگ مراد ہیں جو اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کیلئے خاص کر لیں۔

اسی کی یاد دوسروں سے کٹ اسی کے ہو کر رہیں دوستوں کو چھوڑے اور وطن کو ترک کریں تمام وسائل واسباب سے کٹ کر اس کے دروازے سے چمٹیں۔ شہوات سے الگ تھلگ ہوں اور لذتوں کو ترک کریں ان کی لذت بس اس کی یاد ہے اور ان کی نعمت بس اس کا شکر ہے کیونکہ مقام تفرید تحقق توحید کے بعد ان اشیاء کے بغیر ممکن نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وتبتل اليه تبتيلاً﴾ [المزمل: ۰۸] یعنی دوسروں سے بالکل الگ تھلگ ہو کر اسی کا ہو کر رہو۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ "ما" "من" کے معنی میں ہو لیکن زیادہ واضح بات یہ ہے کہ "ما" اس جگہ غیر عقلا تغلیب کی وجہ سے ہے کیونکہ غیر عقلاء، عقلاء کے مقابلہ میں زیادہ ہیں۔ چنانچہ آپ کو معلوم ہے کہ تمام اشیاء کا ذکر و تسبیح خداوندی اور اس کی معرفت وخوف کا اپنا اپنا حصہ ہے۔ جس کی وضاحت اپنے مقام پر کی گئی ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ صحابہ جب مدینہ کے قریب آئے اور اپنے وطنوں کے شوق میں ان میں سے ایک جماعت آگے بڑھی اس پر آنحضرت ﷺ نے پیچھے رہنے والے لوگوں سے فرمایا: چلے چلو وطن قریب آپہنچا، یہ جمدان پہاڑ ہے مفردون سبقت لے گئے عرب کہتے ہیں: **فرد برأیه وافرد، وفرد،** بمعنی **انفرد به**۔ یعنی انفرادی اور کہا جاتا ہے: "**فرد نفسه**" جب وہ عبادت کیلئے سب سے کٹ جائے اور الگ ہو جائے اور رہا ان کے سوال کا آپ ﷺ کی طرف سے جواب تو وہ اسلوب حکیم کے طور پر ہے اور مطلب یہ ہے کہ اپنا یہ سوال ترک کرو کیونکہ یہ تو بالکل واضح ہے، اور جو بھلائیوں کی طرف سبقت لے گئے ہیں ان کے بارے میں سوال کرو وہ جنہوں نے اپنے آپ کو اللہ کے ذکر کیلئے خالص کر لیا۔

حافظ ابن حجرؒ نے ان کا تعاقب کیا اور فرمایا اس توجیہہ کی بنیاد ایک امید اور ایک شک پر ہے جس کے وقوع وعدم وقوع کا علم نہیں۔ چنانچہ فرمایا: **لعلهم كانوا راجعين الى المدينة ولما قربوا اھ**)۔

یہ مسلم کی روایت ہے اور ترمذی نے بھی اس کو روایت کیا ہے اور اس کے الفاظ جواب کے اندر یہ ہیں "**قال المستهترون**" "دونوں تاؤں کے فتحہ کے ساتھ" یعنی اللہ کا ذکر کثرت کے ساتھ کرنے والے اللہ کا ذکر ان پر سے ان کا بوجھ اتارتا ہے تو وہ قیامت کے روز ہلکے پھلکے ہو کر آئیں گے۔

۲۲۶۳: وَعَنْ اَبِىْ مُوْسٰى قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَثَلُ الَّذِىْ يَذْكُرُ رَبَّهٗ وَالَّذِىْ لَا يَذْكُرُ مَثَلُ الْحَيِّ وَالْمَيِّتِ ۔(متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ٢٠٨/١١ الحديث رقم ٦٤٠٧۔ ومسلم في ٥٣٩/١ الحديث رقم (٢١١ ۔ ٧٧٩)۔

ترجمہ: "اور حضرت ابو موسیٰؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا" جو شخص اپنے پروردگار کو یاد کرتا ہے اور جو شخص اپنے پروردگار کو یاد نہیں کرتا ان دونوں کی مثال زندہ شخص اور مردہ شخص کی سی ہے۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: **قوله: مثل الذى ......مثل الحىّ والميت**: اس میں لف نشر مرتب ہے۔

(**لا يذكره**) یعنی اپنے رب کو خواہ اس کے غیر کا ذکر کرتا ہے یا نہیں۔ پس جو زندہ ہوتا ہے اس کا ظاہر نور حیاۃ اور منشا کے مطابق تصرف تام کرنے سے زندہ ہوتا ہے اور اس کا باطن علم وادراک کی لو سے، یوں ہی ذکر کرنے والے کا ظاہر نور طاعت اور باطن معرفت کی روشنی سے مزین ہوتا ہے جبکہ غیر ذاکر کا ظاہر بے کار اور باطن بے حقیقت ہوتا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ تشبیہ میں وجہ شبہ دوستی کرنے والے کو نفع دینے اور دشمنی کرنے والے کو ضرر دینا ہے لیکن یہ میت میں جاری نہیں ہو سکتا یہ کہنا بھی خارج از امکان نہیں کہ یہ کہا جائے کہ اس حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایسی ذات کا ذکر جو ابدی زندہ ہے جس پر موت نہیں آتی وہ ذاکر کیلئے حیات ابدی کا ضامن ہے جس پر کبھی فنا نہیں آئے گی چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اللہ کے اولیاء مرتے نہیں بلکہ ایک جہاں سے دوسرے جہاں میں منتقل ہوتے ہیں۔ یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔

جبکہ مسلم کے الفاظ یہ ہیں: "**البيت الذى يذكر الله فيه والبيت الذى لا يذكر الله فيه مثل الحىّ والميّت**" اس کی معنوی تقریر یوں ہوگی۔

مثل بیتی الحیّ والمیّت، یا پھر ''بیت'' سے مراد دل ہے۔ کیونکہ وہ اللہ کا بیت ہے پس وہ شخص لائق تحسین وبشارت ہے جس نے اس کو زندہ اور آباد رکھا۔ اور تاسف ہے ایسے نالائق پر جس نے اس کو اجاڑا اور برباد کیا۔

۲۲۶۴: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰی اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ وَاَنَا مَعَهٗ اِذَا ذَكَرَنِیْ فَاِنْ ذَكَرَنِیْ فِیْ نَفْسِهٖ ذَكَرْتُهٗ فِیْ نَفْسِیْ وَاِنْ ذَكَرَنِیْ فِیْ مَلَاٍ ذَكَرْتُهٗ فِیْ مَلَاٍ خَيْرٍ مِّنْهُمْ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۳/۳۸٤ الحدیث رقم ۷٤۰۵ ومسلم فی ٤/۲۰٦۱ الحدیث رقم (۲۔ ۲٦۷۵)۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اپنے بندہ کے گمان کے قریب ہوں جو وہ میرے بارے میں رکھتا ہے جب وہ دل سے یا زبان سے مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے پاس ہوتا ہوں پس اگر وہ اپنی ذات میں یعنی خفیہ طور پر اپنے دل میں مجھے یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اپنی ذات میں یاد کرتا ہوں یعنی نہ کہ اس کو صرف پوشیدہ طور پر ثواب دیتا ہوں بلکہ اس کو ازخود ثواب دیتا ہوں ثواب دینے کا کام کسی اور کے سپرد نہیں کرتا اگر وہ مجھے جماعت میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اس کا ذکر جماعت میں کرتا ہوں جو اس کی جماعت سے بہتر ہے۔'' (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: انا عند ظن عبدی بی: ایک روایت میں ان الفاظ کا اضافہ ہے: ''ان ظن خیرا وان ظن شرا'' اور ایک روایت میں ہے ''فلیظن بی ما شاء''

اور ایک اور روایت میں ہے: ''فلا یظن بی الا خیرًا'' مطلب یہ ہے کہ میرا معاملہ بندے کے ساتھ اس کے میرے بارے میں یقین کے مطابق ہے، میری مہربانی پر اعتماد کرنے میرے وعدے پر بھروسہ کرنے، میری وعیدوں سے ڈرنے اور جو انعامات میرے پاس ہیں ان کے اندر رغبت کرنے میں، جو وہ مجھ سے مانگتا ہے میں اسے عطا کرتا ہوں، جب وہ مجھے پکارتا ہے میں اس کی پکار کو سنتا ہوں۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''ظن'' شک اور یقین کے درمیان کی کیفیت کا نام ہے۔ لہٰذا جب اس کے اندر علامات قوی ہوں تو یہ بمعنی یقین کے ہوتا ہے جب علامات ضعیف ہوں تو یہ بمعنی شک کے ہوتا ہے۔ باری تعالیٰ کے اس قول: ﴿الذین یظنون انهم ملقوا ربهم﴾ [البقرة: ٤٦] میں یہ معنی اول یعنی یقین پر محمول ہے جب کہ باری تعالیٰ کے قول: ﴿وظنوا انهم الینا لا یرجعون﴾ [القصص: ۳۹] میں ''ظن'' معنی ثانی یعنی شک پر محمول ہے۔

اور مذکورہ حدیث میں یہ بھی جائز ہے کہ ''ظن'' کو اپنے ظاہر پر محمول کیا جائے اور مطلب یہ ہو کہ میں اس کے ساتھ اس کے میرے بارے میں ''ظن'' کے مطابق معاملہ کروں گا اور جو مجھ سے توقع کرے گا اچھے یا برے سلوک کا تو اس کے ساتھ اسی طرح سے پیش آؤں گا۔ اور اس سے مقصود اس بات پر برانگیختہ کرنا ہو کہ خوف پر امید کو غالب رکھا جائے اور اللہ کریم سے متعلق گمان اچھا رکھا جائے۔

چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے ''لا یموتن احدکم الا وهو یحسن الظن بالله'' یعنی تم میں سے کوئی نہ مرے مگر یہ کہ وہ اللہ کے بارے میں اچھا گمان رکھتا ہو۔ اور یہ جائز ہے کہ ''ظن'' سے مراد یقین ہو اور مطلب یہ ہو کہ میں اپنے بارے میں بندے کے یقین کے مطابق پیش آتا ہوں کہ اس کا پلٹنا میری طرف ہے اس کا حساب وکتاب میرے ذمہ ہے اور یہ کہ جو اس کے خیر وشر کے متعلق میری قضا ہے اس کو کوئی ٹالنے والا نہیں جو میں روکوں وہ کوئی عطا نہیں کر سکتا، اور جو میں عطا کروں اس کا کوئی روکنے والا نہیں۔ یعنی جب بندہ مقام توحید میں راسخ ہو جائے ایمان اور اللہ کریم پر بھروسہ کرنے میں مستحکم ہو جائے تو اسے قرب الٰہی نصیب ہوتا ہے اور درمیان کے پردے

اٹھ جاتے ہیں اب جب وہ اسے بلاتا ہے تو وہ اس کی پکار سنتا ہے اور جب وہ اس سے کچھ مانگتا ہے تو وہ اس کو عطا کرتا ہے۔ جیسے کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول حدیث قدسی میں ہے: ''اذا علم عبدی ان له ربًّا یغفر الذنب ویأخذ به غفرت له''۔

جب بندہ یہ یقین کر لیتا ہے کہ اس کا ایک رب ہے جو گناہوں کو معاف کرتا ہے اور ان پر مواخذہ کرتا ہے تو میں اس کے گناہوں کو معاف کر لیتا ہوں۔

ابو طالب مکیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ قسم اٹھا کے کہتے تھے کہ کوئی بندہ ایسا نہیں جو اپنا گمان اللہ کے بارے میں اچھا کر لے اور اللہ اسے عطا نہ کرے کیونکہ بھلائی سب کے سب اسی کریم ذات کے دست قدرت میں ہے، پس جب اس نے اپنے بارے حسن ظن کی دولت اس کو عطا کر دی تو جو یہ گمان رکھے اس کریم ذات کے بارے میں وہ اس کو عطا کرے گا۔ کیونکہ جس ذات نے اپنے بارے میں اس کے گمان کو اچھا کیا ہے وہی اس کے گمان کے تحقق کا ارادہ کرتا ہے۔

حضرت ابن عطاؒ فرماتے ہیں کہ اگر اللہ کے اچھے اوصاف کی وجہ سے آپ حسن ظن نہیں رکھتے تو اس کے اپنے ساتھ معاملہ کی وجہ سے حسن ظن رکھ، اس نے آپ کو خوبی کا عادی بنایا اور اس نے تیرے ساتھ احسان ہی کا سلوک کیا۔

شارح حکم بن عباد فرماتے ہیں، کہ اللہ کے بارے میں ''حسن ظن'' دنیوی واخروی دونوں امور میں مطلوب ہے، دنیا کے معاملہ میں تو اس طرح کہ وہ یہ بھروسہ رکھے کہ اللہ بغیر مشقت کے یا ہلکے پھلکے مشقت کے ساتھ جس کی اجازت ہے، اور وہ باعث اجر بھی ہے اگر وہ فرض یا نفل میں سے کسی کی تفویت کا باعث نہیں منافع اور سہولیات بہم پہنچاتا ہے، تو یہ احساس کے اس اطمینان قلبی اور جسمانی راحت کا باعث ہوگا، تو اب اسے کسی چیز کا طلب مشتغل نہیں کرے گا، اور نہ ہی وہ کسی سبب سے گھبرائے گا یا پریشان ہوگا اور آخرت کے معاملہ میں یوں کہ وہ اپنے اعمال صالحہ کی قبولیت کی قوی آس لگائے رکھے اور دارالجزاء میں ان پر پورا اجر ملنے کا پوری امید رکھے یہ احساس اللہ کے اوامر کی تعمیل پر اسے اکسائے گا اور نیک اعمال کی تکثیر پر بھی اسے ایک گونہ مٹھاس، رشک اور لذت ونشاط کا احساس ہوگا۔

اور اللہ کے بارے میں حسن ظن کے مواقع میں سے ایک موقع یہ ہے کہ انسان سختیوں، مشقتوں اور اہل ومال میں آفتوں کے نزول کے وقت میں اس ٹھنڈے وہم کو نہ چھوڑے تا کہ اس مرہم کے نہ ہونے کی وجہ سے یہ جزع فزع اور ناگوار صورتحال سے دوچار نہ ہو۔

حضرت ابن عطاؒ فرماتے ہیں کہ اللہ کی قضا سے لطف وکرم کے انفکاک کا مدعی ہے تو یہ اس کا قصور فہم ہے۔

میں نے اس سلسلہ میں تفصیل سے کلام اس لئے کیا ہے کہ اکثر لوگ غرور و حسن ظن کو خلط کر کے دونوں میں تمیز نہیں کرتے۔

قوله: وأنا معه اذا ذكرنی: یعنی توفیق، حفاظت اور مدد کے ساتھ، یا یہ کہ میں اس کی بات کو سنتا ہوں، یا یہ کہ اس کی حالت کو جانتا ہوں، اس کی گفتگو میں سے کچھ بھی میرے پر پوشیدہ نہیں۔ (اذا ذكرنی) یعنی اپنی زبان یا دل سے

قوله: فان ذكرنی فی نفسه ذكرته فی نفسه :

یہ سابق پر تفریع ہے اور اس بات کا فائدہ دیتا ہے کہ اللہ ذاکر کے ساتھ ہوتا ہے خواہ وہ اسے اپنے دل میں یاد کرے یا غیر کے سامنے۔ (فی نفسه) یعنی پوشیدہ طور پر یا اخلاص کے ساتھ (ذكرته فی نفسه) یعنی میں اس کے اجر وثواب کو اس کے طرزِ عمل کی طرح پر مخفی رکھ لیتا ہوں اور اس کا اجر میں بذات خود دوں گا کسی اور پر نہیں چھوڑوں گا۔

قوله: وان ذكرنی فی ملأ ......خير منهم:

یعنی مؤمنین کے جماعت کے ساتھ یا ان کی موجودگی میں (ذكرته) یعنی تحسین کے الفاظ کے ساتھ، عظیم اجر عطا کر کے، حسن قبول کے ساتھ اور آمد کی توفیق کے ساتھ۔

بعض لوگوں کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد بندے کو اس کے فعل سے زیادہ اچھا بدلہ عطا کرنا اور اس کے لائے ہوئے عمل سے افضل وبرتر اجر دینا ہے۔

(**فی ملأ خیر منھم**) یعنی ذاکرین کی جماعت سے یہ برتری اس لحاظ سے ہے کہ وہ جماعت معصوم ہے معاصی کے ارتکاب سے معصوم ہے طاعت وامتثال اوامر میں شدید وقوی ہے الوہیت کے اسرار ورموز پر کامل اطلاع رکھتے ہیں، انوار ملکوتی کا مشاہدہ کرتی ہے۔

حصن کے الفاظ میں ''منھم'' کے بجائے ''منہ'' مفرد لفظ کے ساتھ ہے۔ اس میں ''ملأ'' کے لفظ کا لحاظ ہے۔

علامہ میرکؒ حصن کے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ اصل سماع میں اسی طرح ہے اور حصن کے تمام موجودہ نسخوں میں بھی یوں ہے یعنی بصیغۂ مفرد لیکن اصول یعنی بخاری، مسلم، ترمذی اور ابن ماجہ میں ''منھم'' بصیغۂ جمع وارد ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ برتر جماعت سے مقرب فرشتے اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ارواح مراد ہیں، پس اس میں فرشتوں کے بشر سے افضل ہونے کی کوئی دلیل نہیں۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ آیا انسان فرشتوں سے افضل ہیں کہ نہیں، ہر قول کے مرجحین موجود ہیں کہتے ہیں کہ مختار مذہب یہ ہے کہ خواص بشر جیسے انبیاء کرام خواص ملائکہ جیسے جبرئیل امین وغیرہ سے افضل ہیں۔

رہے عوام بشر تو وہ ہرگز فرشتوں سے افضل نہیں لہٰذا آپ ﷺ کے قول شریف ''فی ملأ خیر منھم'' میں برتری کی حالت ہے کیونکہ فرشتوں کی حالت طاعت وکوشش پیہم میں انسان کی حالت سے برتر وافضل ہے۔ چنانچہ اللہ کریم کا ارشاد گرامی ہے: ﴿**لا یعصون اللہ ما امرھم**﴾[التحریم:٦]

اور مؤمنین کی حالتیں طاعت ومعصیت میں اور کوشش وکاہلی میں یکساں نہیں اور امام طیبیؒ کی مراد یہ ہے کہ جنسِ بشر جنس ملک سے افضل ہے اور مشہور تفصیل اس کے منافی نہیں۔

اور رہا حافظ ابن حجرؒ کا یہ قول کہ وہ جماعت جو اس وصف کے ساتھ موصوف ہے کہ وہ بشر سے افضل ہے، وہ مقرب فرشتوں کی جماعت ہے وہ جن کے بارے میں یہ بات محقق ہے کہ وہ عوام بشر سے افضل ہیں۔

اس وقت یہ حدیث اس تفصیل کے منافی نہیں جو اہل سنت کے ہاں اصح ہے اور اس سے شارح کے قول کا مسترد ہونا معلوم ہو رہا ہے۔ یہ (حافظ کا) قول مردود ہے کیونکہ بشر کی وہ جماعت جو ذاکر ہے ممکن ہے کہ اس میں کوئی نبی ہو تو پھر امام طیبیؒ والی تاویل کام آئے گی۔ یا پھر برتری کو نسبتی امر پر یا استغراق پر یا غلبہ پر محمول کرنا لازم آئے گا۔

بزّار نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی مرفوع روایت ذکر کی ہے جس میں ہے: (**قال: قال تبارك وتعالٰی: یا ابن آدم اذا ذکرتنی خالیا ذکرتك خالیا واذ ذکرتنی فی ملأ ذکرتك فی ملأ خیر من الذین تذکرنی فیھم**) یعنی اے انسان جب تو مجھے تنہائی میں یاد کرتا ہے تو میں بھی تجھے ایسی جماعت میں یاد کرتا ہوں جو اس جماعت سے افضل ہے جس میں تو مجھے یاد کرتا ہے۔

۲۲۶۵: وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰی مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَاَزِیْدُ وَمَنْ جَاءَ بِالسَّیِّئَةِ فَجَزَاءُ سَیِّئَةٍ مِثْلُهَا اَوْ اَغْفِرُ وَمَنْ تَقَرَّبَ مِنِّیْ شِبْرًا تَقَرَّبْتُ مِنْهُ ذِرَاعًا وَمَنْ تَقَرَّبَ مِنِّیْ ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ مِنْهُ بَاعًا وَمَنْ اَتَانِیْ یَمْشِیْ اَتَیْتُهٗ هَرْوَلَةً وَمَنْ لَقِیَنِیْ بِقُرَابِ الْاَرْضِ خَطِیْئَةً لَا یُشْرِكُ بِیْ شَیْئًا لَقِیْتُهٗ بِمِثْلِهَا مَغْفِرَةً۔ (رواہ مسلم)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۹۵/۱۳ حدیث رقم ۷٤۰۵ ومسلم فی صحیحه ۲۰٦۸/٤ حدیث رقم (۲۲۔ ۲٦۸۷)۔

والترمذی فی السنن ۲۰۸/۵ حدیث رقم ۳۶۰۸۔ وابن ماجہ ۱۲۵۵/۲ حدیث رقم ۳۸۲۱ واحمد فی المسند ۱۶۹/۵۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابوذرؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو شخص ایک نیکی کرتا ہے اس کو اس جیسی دس نیکیوں کے برابر ثواب ملتا ہے اور اس سے زیادہ بھی دیتا ہوں جس کو چاہتا ہوں اس کو اس سے صدق واخلاص کے مطابق سات سو گناہ تک بلکہ اس سے بھی زیادہ ثواب دیتا ہوں جو شخص کوئی برائی کرتا ہے تو اس کی اسی برائی کے برابر سزا ملتی ہے یا میں اسے بھی معاف کر دیتا ہوں جو شخص اطاعت وفرمانبرداری کے ذریعے ایک بالشت میری طرف آتا ہے تو میں ایک گز اس کی طرف آتا ہوں یعنی میں اس کی توجہ والتفات سے کہیں زیادہ اس پر اپنی رحمت کے دروازے کھولتا ہوں جو شخص میری طرف ایک گز آتا ہے میں اس کی جانب دونوں ہاتھوں کے پھیلانے کے برابر بڑھتا ہوں جو شخص میری طرف اپنی چال سے آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں اور جو شخص زمین کے برابر بھی گناہ لے کر مجھ سے ملے گا بشرطیکہ اس نے میرے ساتھ شریک نہ کیا ہو یعنی شرک میں مبتلا نہ ہو تو اگر میں چاہوں گا تو اس کو زمین کے برابر ہی مغفرت عطا کروں گا۔'' (مسلم)

تشریح: **قوله: من جاء بالحسنة فله عشر امثالها وازيد**: جسے لغو ہونے سے بچائے رکھے اسی وجہ سے ''من فعل الحسنة'' نہیں فرمایا اور یہ حسنہ وہی ہے جو: ﴿من جاء بالحسنة فله عشر امثالها﴾ [الانعام: ۱۶۰] ''میں مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی ایک نیکی لے کے آگئے، (فله عشر امثالها) یعنی اس طرح کے دس نیکیوں کا ثواب، ممیز جو موصوف تھا اس کو حذف کیا گیا اور صفت کو اس کا قائم مقام بنایا گیا۔ حاصل یہ ہے کہ اس کو دس بدلے ملیں گے ان میں سے ہر ایک کیفیت میں اس نیکی کے مثل ہوگا۔

وعدہ کے مطابق یہ حرم کے علاوہ میں تضعیف کا کم از کم مقدار ہے اس لئے فرمایا (وأزيد) یعنی اہل سعادۃ میں سے جس لئے چاہو دس گنا سے بڑھا کر سات سو گنا یا ایک لاکھ گنا یا اس سے زائد تک بڑھا دوں۔

قوله: ومن جاء بالسيئة......او اغفر:

یعنی ایسی برائی جس کا کفارہ نہ ہوا ہو۔ یہ وہی سیئہ ہے جو باری تعالیٰ کے اس قول میں ہے: ﴿فجزاء سيئةٍ مثلها﴾ بتقاضائے عدل۔ (او اغفر) بمقتضائے فضل واحسان۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ جزاء کا ذکر ثانی یعنی سیئہ کے ساتھ خاص کر لیا گیا اس کی وجہ یہ ہے کہ جو صلہ نیکی کے عوض میں دیا جاتا ہے وہ سراسر فضل واکرام ہی ہوتا ہے اور جو سیئہ کے مقابلہ میں ہوتا ہے وہ عدل وقصاص ہوتا ہے لہٰذا یہ ثواب کی طرح مقصود بالذات نہیں ہوتا اس لئے اس کو جزاء کے ساتھ خاص کیا گیا۔

اور رہی ''سیئہ'' کو دوبارہ نکرہ لانے کی حکمت سو وہ یہ ہے کہ: ''السئية'' معرفہ میں جو وحدت کا معنی مبہم طور پر پایا جاتا ہے اس کی تنصیص اور تقریر ہو جائے۔ اور ''وأزيد'' میں ''واؤ'' مطلق جمع کیلئے ہے اگر زیادت سے مراد اللہ کریم کا دیدار ہو۔ جیسے کہ باری تعالیٰ کا فرمان اقدس ہے: ﴿للذين احسنوا الحسنٰى وزيادة﴾ [یونس: ۲۶] اور اگر زیادہ سے مراد اضعاف ہوں تو پھر ''واؤ'' بمعنی اس ''او'' کے جو تنویع کا فائدہ دے۔ جیسے کہ ''او اغفر'' میں ہے۔

حافظ ابن حجرؒ کی بات زیادہ واضح ہے کہ دس گنا اور اس سے زائد کا اجتماع ممکن ہے، جبکہ برائی کا بدلہ اور مغفرت دونوں جمع نہیں ہو سکتے لہٰذا ''او'' جو احد الامرین کے وقوع پر دلالت کیلئے ہے کا لانا ضروری تھا۔

قوله: ومن تقرب منى شبرا تقربت منه ذراعًا:) قریب ہونا چاہا (منی) اطاعت کے ساتھ (شبرا) یعنی کچھ تھوڑا سا

۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں مذکورہ حدیث میں شبرا، ذراعًا اور باعًا کے الفاظ شرط وجزاء دونوں میں منصوب ہیں۔کیونکہ یہ ظرف ہیں۔یعنی جوایک بالشت میرے قریب آتا ہے۔

(تقربت) یعنی رحمت کو قریب کرتا ہوں۔(منه ذراعًا) بعض کہتے ہیں کہ میں اس کے تقرب سے زیادہ اس تک اپنی رحمت پہنچاتا ہوں، بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے۔واللہ اعلم۔کہ جو نیکی لے کر قریب آتا ہے میں اس سے کئی گنا بڑھا کر بدلہ عطا کرتا ہوں۔رہا جزاء وثواب کو تقرب کا نام دینا سو یہ مشاکلہ ومقابلہ کے قبیل سے ہے اور یا اس لئے کہ ثواب تقرب کا سبب ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ اللہ کے تقرب سے مراد یہ ہے کہ اللہ ہدایت نصیب کرے اور اللہ کی طرف قریب ہونے کیلئے اس کے سینے کو کھولدے اور مطلب یہ ہوا کہ جب بندہ قرب کا قصد وعمل کرتا ہے تو اللہ اس سلسلہ میں اس کی اعانت کرتا ہے۔اور وہ اس کیلئے اسے آسان بنالیتا ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں یہ حدیث احادیث صفات متشابہ میں سے ہے اس کو اس کے ظاہر پر محمول کرنا ممکن نہیں تو اب مطلب یہ ہوا کہ جو طاعت کر کے میرے قریب ہوتا ہے تو میں رحمت کے ساتھ اس کے قریب ہوں گا۔

قوله: ومن تقرب منی ذراعًا تقربت منه باعًا: باع دو ہاتھوں کے پھیلاؤ کے برابر مقدار تو کہتے ہیں اس نسبت سے جب بندہ کے تقرب کا مقدار بڑھے گا تو اللہ کریم کی طرف سے رحمت بڑھے گی۔

لہٰذا ذراع وغیرہ کا تذکرہ بندہ کے تقرب کے صلہ میں اللہ کے لطف وکرم کے تضعیفی مجازات کے سلسلہ میں محض تمثیلی وتصویری ہے۔

قوله: ومن أتانی یمشی اتیته هرولة: اگلہ جملہ (یمشی) حال ہے۔مراد ہے میری اطاعت میں چلتا ہے۔(اتیته هرولةً) ''هرولة'' دوڑنے سے کم تیز چلنے کو کہتے ہیں اور مراد ہے میں اس پر اپنی رحمت بہالیتا ہوں۔

بعض کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو معمول کے چال چل کر میری طرف بڑھتا ہے میری رحمت لپک کر اس کی طرف بڑھتی ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ''هرولة'' مصدر بمعنی مفعول حال ہے یا مفعول مطلق ہے کیونکہ ''هرولة'' ''اتیان'' کی ایک نوع ہے تو یہ ترکیب ''رجعت القهقری'' کی مانند ہے لیکن اس کو حال پر محمول کرنا زیادہ مناسب ہے، اس لئے کہ اس کا مقابل ''یمشی'' حال ہے۔حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہ سابق میں دس گنا عطا کرنے کے وعدہ کیلئے بمنزلہ تشریح کے ہے۔

اور نیکی کے مقابلہ میں بندوں کیلئے اجر کی تضعیف کے وعدہ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ کے فضل وکرم کی وسعت اپنی انتہاء کو پہنچ چکی ہے۔جس کا کوئی ہمسر نہیں۔یہ میں کہتا ہوں کہ جس طرح آنحضرت ﷺ کا قول (اغفر) اللہ کی مغفرت کی وسعت پر دال ہے۔

قوله: ومن لقینی بقراب الأرض......: یہ قاف کے ضمہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ ہے یہ قرب سے ماخوذ ہے جو مثل کے معنی میں ہے۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی ہے صغیرہ وکبیرہ گناہوں کی اتنی مقدار جو قریب قریب زمین کو بھردے۔

(خطیئة) یہ تمیز ہے (لا یشرك بی) یہ لقینی کے ضمیر فاعل جو ''من'' کی طرف راجع سے حال ہے (شیئًا) یہ مفعول مطلق ہے یا مفعول بہ ہے، یہ مفہوم اس قرآنی آیت سے ماخوذ ہے: ﴿**ان اللّٰه لا یغفر ان یشرك به**......﴾ [النساء:٤٨] **لقیته بمثله مغفرة**۔اگر میں یہ چاہوں اس کیلئے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿**ویغفر ما دون ذلك لمن یشاء**﴾ [النساء:٤٨] لیکن حدیث میں (اس شرط کے) حذف کا نکتہ یہ ہے کہ یہ شرط اس کا مذکورہ آیت سے معلوم ہو رہا ہے، اور امید کی وسعت میں مبالغہ پر دلالت کیلئے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ حدیث کا مقصود گناہوں کی کثرت کی وجہ سے پیدا ہونے والی مایوسی کو ختم کرنا ہے۔ لہٰذا یہ مناسب نہیں کہ اس کی وجہ سے دھوکہ میں مبتلا ہو جایا جائے اور کثرت سے گناہ کرتا رہے۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ وہ جسے چاہتا ہے بخشا ہے جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے اور کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کن میں سے ہے۔ اھ۔ یعنی وہ جسے چاہتا ہے بڑے گناہ پر معاف کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے چھوٹے گناہ پر سزا دے دیتا ہے یا وہ جس کے چاہے بہت سارے گناہ معاف فرما دیتا ہے اور جسے چاہے چھوٹے گناہ پر عذاب دے دیتا ہے یہ حدیث آخری حصہ کا مقصود ہے۔

اور حدیث کے ابتدائی حصہ سے مقصود عبادت و طاعت میں مجاہدہ کی ترغیب ہے۔ اور اس پر برانگیختہ کرنے کا درس ہے، سستی اور کاہلی کو ختم کرنے کی غرض سے یہ حدیث سالکین کے دلوں کیلئے ایک مفید معجونِ مرکب ہے اور طالبین کے اشتیاق میں تحریک پیدا کرنے والا نیز گناہگاروں کے سینوں کیلئے قوت بخش غذا ہے۔

اور جان رکھو! کہ احادیث میں اس قدر امید افزا حدیثیں کم ہی ہیں چنانچہ یہاں فقط عدم اشراک پر ''لقیته بمثلها مغفرة'' کو مرتب کر دیا گیا ہے اور اعمال صالحہ کا تذکرہ سرے سے نہیں کیا گیا۔ لیکن یہ بات کسی کو زیب نہیں دیتی کہ وہ اس سے دھوکہ میں پڑے اور کہے کہ جب معاملہ یہ ہے تو گناہ بکثرت کرو۔ تاکہ اللہ کی مغفرت زیادہ سے زیادہ ہو جائے اور اللہ کا یہ فرمان تو فقط اس مقصد کیلئے ہے کہ گناہ گار اللہ کی مغفرت و رحمت سے مایوس نہ ہو جائیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اللہ کے پاس مغفرت و عقوبت دونوں ہیں لیکن اس کی رحمت و مغفرت غالب ہے۔ لیکن کسی بھی شخص کو یہ معلوم نہیں کہ وہ مغفورین کی فہرست میں شامل ہے یا معذبین کی فہرست میں کہ باری تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿فریق فی الجنة و فریق فی النار﴾ [الشوری: ۷] مبہم ہے۔ لہٰذا اب یہی مناسب ہے وہ خوف و امید کے درمیان رہے۔

کیونکہ جو بات متواتر المعنی احادیث سے ثابت ہے اور وہ بدیہی طور پر معلوم ہے وہ یہ ہے کہ اس امت کے مؤحدین کی ایک جماعت کا آگ میں جانا پھر اس سے نکلنا ضروری ہے اس کے ساتھ ساتھ ایمان پر خاتمہ کا اعتبار ہے اور یہ بات مبہم ہے۔

رواہ مسلم: قال ابن حجر، کما فی النسخة المعتمدة واغتر شارح بنسخة سقیمة وجدها مخالفة لذلک فاعترض بسببها علی المصابیح بما لیس فی محلهاه۔ ولم یعرف الشارح ولاوجه للاعتراض فهو تجهیل مجهول عند أهل العلم غیر مقبول، اذلیس تحته محصول۔

۲۲۶۶: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی قَالَ مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَیْهِ وَمَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّهٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ کُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهُ الَّذِیْ یُبْصِرُ بِهٖ وَیَدَهُ الَّتِیْ یَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِیْ یَمْشِیْ بِهَا وَاِنْ سَاَلَنِیْ لَاُعْطِیَنَّهٗ وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِیْ لَاُعِیْذَنَّهٗ وَمَا تَرَدَّدْتُّ عَنْ شَیْءٍ اَنَا فَاعِلُهٗ تَرَدُّدِیْ عَنْ نَفْسِ الْمُؤْمِنِ یَکْرَهُ الْمَوْتَ وَاَنَا اَکْرَهُ مَسَاءَتَهٗ وَلَا بُدَّ لَهٗ مِنْهُ (رواہ البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۱/ج۳ الحدیث رقم ۶۵۰۲۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو شخص میرے ولی کو ایذاء پہنچاتا ہے تو میں اس کے ساتھ اپنی لڑائی کا اعلان کرتا ہوں اور میرا کوئی بندہ مؤمن میرا تقرب ایسی چیز کے ذریعہ حاصل نہیں کرتا جو میرے نزدیک ہو جیسے ادائیگی فریضہ کے ذریعہ میرا تقرب حاصل کرتا ہے ہمیشہ نوافل

کے ذریعہ یعنی ان اطاعات وعبادات کے ذریعہ جوفرائض کے علاوہ اور فرائض سے زائد ہیں میرا تقرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اسے اپنا دوست بنالیتا ہوں اور جب میں اسے اپنا دوست بنالیتا ہوں تو میں اس کی سماعت بن جاتا ہوں کہ وہ اس کے ذریعہ سنتا ہے میں اس کی بینائی بن جاتا ہوں وہ اسی کے ذریعہ دیکھتا ہے میں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں کہ وہ اسی کے ذریعہ پکڑتا ہے میں اس کا پاؤں بن جاتا ہوں کہ وہ اسی کے ذریعہ چلتا ہے اگر وہ مجھ سے مانگتا ہے تو میں اسے دیتا ہوں اور وہ برائیوں اور مکروہات سے میری پناہ چاہتا ہے تو میں اسے پناہ دیتا ہوں اور میں اس طرح تردد نہیں کرتا جس طرح کہ میں بندہ مؤمن کی جان قبض کرنے میں تردد کرتا ہوں کیونکہ وہ موت کو پسند نہیں کرتا حالانکہ اس کی ناپسندیدگی کو میں ناپسند کرتا ہوں اور موت سے کسی حال میں مفر نہیں ہے۔''

تشریح:قوله:من عادى لي وليا: یعنی میرے اولیاء میں کسی کو ولی ''فعیل'' کے وزن پر بمعنی مفعول ہے اور یہ ولی ہوتا ہے جس کی ذمہ داری اللہ لے لیتا ہے اور ایک لمحہ کو بھی اسے اس کے نفس کے حوالہ نہیں کرتا چنانچہ اللہ کریم کا ارشاد گرامی ہے:﴿وهو يتولى الصالحين﴾[الاعراف:۱۹۶]اور یا یہ فعیل برائے مبالغہ فاعل ہے اور معنی ہے ایسا شخص جو لگاتار بغیر معصیت کئے اللہ کے اطاعت میں لگا رہے۔

اول کو مراد اور مجذوب سالک کا نام دیا جاتا ہے، جبکہ موخر الذکر کو مرید اور سالک مجذوب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اور اس میں اختلاف ہے کہ مذکورہ دونوں میں سے کون سا افضل ہے، تو واقعی اور حقیقی بات یہ ہے کہ ہر مرید مراد اور ہر مراد مرید ہوتا ہے۔البتہ ابتداءً، انتہاء اور اہتمام ورعایت کے اعتبار سے دونوں میں قدرے تفاوت ہے۔

قوله:فقد آذنته بالحرب: یہ باب افعال سے ہے بمعنی ''اعلمته''(بالحرب) یعنی میری طرف سے اس کے ساتھ جنگ کا میرے ولی کی وجہ سے یا اس کی طرف سے میرے ساتھ جنگ ہے گویا کہ وہ میرے مقابلہ میں لڑنے والا ہے۔ائمہ فرماتے ہیں کہ معاصی میں یہ اور سود کو چھوڑ کر باقی کوئی ایسی معصیت نہیں جس کے ارتکاب کرنے والوں کو اللہ کے ساتھ تحارب کی وعید دی گئی ہو چنانچہ اللہ کریم کا ارشاد پاک ہے:﴿فاذنوا بحربٍ من الله ورسوله﴾[البقرة:۲۷۹]ور یہ وعید ان دو گناہوں کے زیادہ خطرناک ہونے کی دلیل ہے کیونکہ اللہ کے بندے کی مخالفت کا مطلب یہی ہے کہ انجام برا ہوگا اس لئے اللہ جس کا مخالف ہو جائے وہ کبھی بھی فلاح نہیں پا سکتا۔

قوله:وما تقرب الى عبدى......مما افترضت: یعنی مؤمن بندہ، وصف عبدیت کی ترجیح اس وجہ سے ہے کہ عبدیت کی شان یہ ہے کہ عبد اپنے آقا کی طرف طرح طرح کی خدمت وطاعت کے ذریعہ قرب حاصل کرتا رہتا ہے۔

(**بشيء**) کوئی بھی عمل کر کے (**احب الى مما افترضت**) یعنی جو کچھ میں نے لازم قرار دیا اس کو ادا کر کے۔(**عليه**) یعنی اوامر کی تعمیل کرنا اور زواجر سے اجتناب و پرہیز کرنا اور ''أحب'' کے لفظ میں اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ قرب کے بہت وسائل وذرائع ہیں لیکن ان سب میں افضل فرائض کی ادائیگی ہے۔تو اس قرب کے رسائل میں نوافل وغیرہ مندرج ہوں گے۔اس لئے آگے فرمایا(**قوله:وما يزال عبدى......حتى أحبه**) جوفرائض کے قرب سے مالا مال ہو۔(**يتقرب**) یعنی وہ مزید قرب طلب کر رہا ہوتا ہے۔

(**اتى بالنوافل**) یعنی فرائض وہ واجبات سے زائد طاعات کے قرب کے ساتھ۔(**حتى أحببته**) اور ایک نسخہ میں ''حتى أحبه'' کے الفاظ ہیں اور یہاں محبت سے مراد کامل محبت ہے جوفرائض ونوافل کو جمع کرنے کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے یہ تفصیل اس کے برخلاف ہے۔جو امام طیبیؒ کے کلام سے مفہوم ہوتا ہے وہ یہ کہ ''ما يزال'' میں اس بات کا بیان ہے: کہ مفضل علیہ یعنی نوافل کا جب حال

ہے تو مفضل یعنی فرائض کا پھر کیا کہنا!

قولہ: فاذا احببته...... التی یمشی بها: (**فکنت سمعه**) اور ایک صحیح نسخہ میں ہے: (**فاذا احببته کنت سمعه**) حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: کہ مشہور مآخذ کے اندر ''**حتی احببته فکنت سمعه**'' کے الفاظ ہیں۔ یہ باب افعال سے ہے۔ ''طا'' کے کسرہ کے ساتھ بمعنی پکڑنے کے۔ (**بها ورجله التی یمشی بها**)۔

امام خطابیؒ فرماتے ہیں کہ: (اس کا مطلب یہ ہے کہ) ان آلات کی طرف منسوب کاموں کو اس کیلئے سہل بنا دیتا ہوں اور میں اسے اس طرح توفیق بخشتا ہوں کہ گویا کہ میں ہی یہ آلات ہوں۔

بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ: (اس کا مطلب یہ ہے کہ) اللہ اس کے حواس اور آلات کو اپنی رضا کے وسائل وذرائع بنا دیتا ہے پس وہ وہی سنتا ہے جس کو اللہ پسند کرتا ہو اور اس سے خوش ہوتا ہو لہٰذا یہ ایسا ہو گیا جیسے (**واللّٰه اعلم**) اللہ ہی اس کے سننے کا آلہ ہے۔

بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ (اس کا مطلب یہ ہے کہ) اللہ اپنی محبت اس پر غالب کر دیتا ہے حتی کہ وہ نہیں سنتا اور دیکھتا مگر وہی جو اللہ پسند کرتا ہو اور وہ نہیں کرتا مگر وہی جو اللہ کو پسند ہو۔

اور ان امور میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس کا مؤید معاون اور وکیل ہوتا ہے۔ وہ اس کے کان، آنکھ، ہاتھ اور پاؤں کو ان تمام کاموں سے محفوظ رکھتا ہوں جو میری ناراضگی کا باعث بنے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ (اس کا مطلب یہ ہے کہ) کہ میں اس کی حاجت روائی میں اس کے کانوں کے سننے، آنکھوں کے دیکھنے، ہاتھوں کے چھونے اور پاؤں کے چلنے سے زیادہ عجلت کرتا ہوں۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا مطلب یہ ہو کہ: جب فرائض کے ادائیگی کے ذریعے قرب حاصل کرتا ہے اور نوافل وغیرہ جو فرائض کے مکملات ہی میں سے اس کے قرب میں ترقی کرتا ہے۔ من جملہ ان میں سے ذکر پر مداومت ہے وہ وصول کے مشاہدہ اور حصول کے خوشیوں اور مسرتوں کا سبب ہے اور فناعن النفس اور بقاء بہ کا مقام ہے۔ تو اس کیلئے اللہ کے ازلی محبت کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں اور اس کے ابدی قرب کے انوار اس پر منکشف ہونے لگتے ہیں اور پھر اسے یہ حقیقت دکھائی دیتی کہ سننے، دیکھنے کی قوت اور دیگر تمام قوتیں دراصل اللہ کے دیکھنے، سننے اور دیگر قوتوں کا پرتو ہے، اور رہی اپنی ذات تو ہیچ ہے پس وہ جہاں میں اللہ کے سوا کسی کو نہیں دیکھتا۔

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ وہ جو سنتا ہے، جو دیکھتا ہے، جو پکڑتا ہے جو چلتا ہے تو اس احساس اور دھیان کے ساتھ کہ ان سب کا ایجاد کنندہ اور قدرت دینے والا بس وہی (اللہ) ہے۔ پس وہ میرے ان تمام انعامات کا جو اس پر ہوئی ہوتی ہیں کو بس اسی طرف پھیرتا ہے جس کے لیے ان کو پیدا کیا گیا ہے یعنی اللہ کی اطاعت کی طرف۔

پس وہ اپنے کان اور دیگر حواس کو بس میری رضا جوئی اور قرب میں استعمال کرتا ہے۔ پس وہ جس چیز کی طرف بھی متوجہ ہوتا ہے تو اس کے دیکھنے اور سننے کے مقام ومرکز میں ہوتا ہوں۔ میں اس کا کان، آنکھ، ہاتھ، پاؤں، معاون کارساز، محافظ اور مددگار ہوتا ہوں۔ یہ حقیقت بس اہلِ معرفت پر کھل سکتی ہے۔

رہے ان کے علاوہ لوگ تو عبارت کی اختصار کی وجہ سے ان سے ان توہمات اور مغالطوں کے خطرات موجود ہیں جو نا حقیقت شناس لوگوں کو ہوتے ہیں مثلاً حلول واتحاد وغیر قسم کے لغویات۔

اور شریعت کے طوق کو اتار کر ضلالت کی تنگیوں میں جا گھسنا اور اس تفصیل سے ایک اہم قاعدہ واضح ہو رہا ہے وہ یہ کہ اولیاء اللہ کے عبارات میں سے اگر کسی میں اشتباہ ہو جائے تو اگر اس کی تاویل کرنا ممکن ہو تو درست کر جیسے ابو یزیدؒ کا یہ قول: (**لیس فی الجبة غیر

اللّٰہ) اور اگر ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو اگر وہ مقام غیب میں ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اس وقت مکلف ہی نہیں اگر میں اس میں شک ہو تو کوئی حرج نہیں ہے کہنے والے میں۔ اور اگر وہ اس کے ہوش واحواس کے قیام کی حالت میں ہوا ہو تو پھر اس پر اس کا شرعی حکم لاگو کیا جائے گا کیونکہ ولی معصوم نہیں ہوتا، محفوظ ہوتا ہے۔ اور محفوظ سے کبھی کبھی ایسے امور کا صدور ہوسکتا ہے جس کی وجہ سے اس پر عتاب ہو جاتا ہے اور پھر سے وہ اپنی حالت پہ ہو جاتا ہے۔

قوله: وان سالني لأعطينه...... لاعيذنه: تاکید کے صیغے کے ساتھ۔ ''اذا'' کے بجائے ''ان'' سے تعبیر کرنے کی حکمت یہ ہے کہ کبھی وہ ایسے مقام تک پہنچ جاتا ہے کہ وہ اس بھروسہ سے سوال ترک کرتا ہے کہ اللہ اس کے حال سے واقف ہے اور یا اس لئے کہ اسے اس برتر بادشاہ کے علاوہ کی طلب ہوتی ہی نہیں۔

(وان استعاذني) حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہ لفظ دو طریقوں کے ساتھ ضبط ہے اول ''ذال'' کے بعد ''نون'' کے ساتھ دوم ''ذال کے بعد ''با'' کے ساتھ اول الذکر زیادہ مشہور ہے۔

(لا عيذنه) یعنی اس بُعد سے جس کا اسے خطرہ ہے۔

قوله: وما ترددت عن شی وانا فاعله ترددی عن نفس المؤمن:

اور ایک نسخہ میں اس کے بجائے **(عن قبض نفس المؤمن)** ہے۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: جیسے ایک روایت میں وارد ہے۔

کہتے ہیں کہ ''تردد'' دو کاموں میں اس طرح کی تحیر کو کہا جاتا ہے جس میں یہ نہ سوجھے کہ کسے اختیار کیا جائے؟ اس معنی میں اس کا ذات باری پر اطلاق ممتنع ہے لہٰذا علماء نے اس میں تاویل کرتے ہوئے اس کو تردید اسباب ووسائط پر محمول کیا ہے۔

اور موسیٰ علیہ وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ کے ملک الموت کے ساتھ قصہ کو اپنے موقف کی دلیل بنایا ہے۔

بعض حضرت فرماتے ہیں کہ ''تردد'' سے مراد ''مؤمن'' ہے تو مؤمن کو مذکورہ اسباب کے ساتھ بتدریج زندگی کی قیمت جو اس کو دامنگیر ہے سے پیچھے کھینچنے کو ''تردد'' کے ساتھ تعبیر کیا گیا۔ کیونکہ صفت کے لحاظ سے کسی متردد کا فعل ہوسکتا ہے۔

قاضیؒ فرماتے ہیں ''تردد'' دو رایوں اور خیالوں کے تعارض اور آگے پیچھے آنے کو کہتے ہیں۔ یہ اگرچہ اللہ کے حق میں محال و ناممکن ہے۔ لیکن اپنی غایت وانتہاء کے اعتبار سے جو کہ توقف اور آہستگی اختیار کرنے کے اعتبار سے اس کا اطلاق اس ذات اقدس پر کرنا درست ہے۔ یہی حال ان تمام صفات کے اطلاق کا ہے جو مخلوق کی صفات ہیں مثلاً غضب، حیاء اور مکر وغیرہ۔ اور مطلب یہ ہے: کہ کوئی بھی کام جسے میں سرانجام دیتا ہوں۔

میں کسی امر میں متردد شخص کی طرح نہیں رکا اور توقف نہیں کیا جس طرح کا توقف میں اپنے مؤمن بندے کی روح قبض کرنے میں کرتا ہوں میں اس کی روح قبض کرنے میں توقف کرتا ہوں اور اسے وہ راحتیں، نعمتیں اور اعزازات دکھاتا ہوں جو میں نے اس کیلئے تیار کر رکھی ہے، تاکہ موت اس کیلئے سہل دکھائی دے اور اس کا دل اللہ کی طرف مائل ہو جائے اس اشتیاق میں کہ وہ مقربین کی لڑی میں پرو دیا جائے۔ اور اعلیٰ علیین میں جگہ پائے۔

قوله: یکره الموت وانا اکره مساء ته ولا بد له منه: یہ جملہ مستانفہ ہے یہ اس سوال کے جواب میں ہے کہ اس تردد کا سبب کیا ہے؟ اور مراد یہ ہے کہ وہ موت کی شدت کو بتقاضائے بشری ناپسند کرتا ہے تاہم نفسِ موت تو اس کیلئے ایک بیش بہا تحفہ ہے جو اس کے اور اللہ کے مابین ملاقات کا ذریعہ ہے تو پھر اسے ناگواری کیسی؟

(وانا اکره مساء ته) ابن الملکؒ فرماتے ہیں: یعنی موت کی اذیت وپریشانی کی وجہ سے جو ایذا اسے پہنچتی ہے اس کی

ناپسندیدگی کو حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ میں اس کو تکلیف دینے والی چیز کو ناپسند کرتا ہوں کیونکہ میں اس کے ساتھ اس کے والدین سے بھی بڑھ کر شفیق ہوں، لیکن موت سے تو چارہ نہیں کیونکہ یہ غموں اور کدورتوں کی جگہ سے نعمتوں اور خوشیوں کے گھر میں منتقل ہونے کیلئے ناگزیر ہے میں بس اس نعمت کبریٰ اور بڑی خواہش سے سرفراز کرنے کی خاطر اسے اس ناگواری سے دوچار کیا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ایک مشفق باپ اپنے بیٹے کو تعلیم کی سختیوں اور کلفتوں میں ڈالتا ہے اس کمال کے پیش نظر جو اس سے وابستہ ہے اگرچہ یہ بیٹے کو ناگوار ہوتا ہے۔ یہ امام طیبیؒ کے کلام کا خلاصہ ہے۔

ان کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ **مساء ة** کی اضافت از قبیل اضافة المصدر الی مفعولہ ہے لیکن اس میں یہ اشکال ہے کہ اگر یہ اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے تو پھر خارج میں اس کا وجود نہ ہوتا کیونکہ اشیاء کا وجود اللہ کی قدرت سے ہے اور وہ اللہ کے ارادے پر موقوف ہے اور اللہ کو اشیاء کی ایجاد میں کوئی مجبور کرنے والا تو ہے ہی نہیں۔

لہٰذا ظاہر یہ ہے کہ ''**مساء ة**'' کی اضافت اپنے فاعل کی طرف ہو اور یہ اللہ کے ارادے کا منافی نہیں چنانچہ اپنے مقام پر ارادے اور مشیت اور رضا و کراہت کے درمیان فرق واضح ہو چکا ہے۔

چنانچہ بعض مراد ایسے بھی ہوتے ہیں جو ناپسندیدہ ہوتے ہیں، مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں اس کی موت کی کراہت کو ناپسند کرتا ہوں۔ اس لئے کہ موت کو ناپسند کرنا مناسب نہیں بلکہ اس کے ساتھ محبت کرنی چاہئے کیونکہ جو اللہ کے ساتھ ملنے کو پسند کرتا ہے اللہ اس کی ملاقات کو پسند کرتا ہے اور جو اللہ کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے اللہ اس کے ساتھ ملنے کو ناپسند کرتا ہے۔

اور ایک صحیح نسخہ میں اس طرح ہے: (**ولا بدله منه**)۔ علامہ میرکؒ کے اصل نسخہ میں اس طرح ہے۔ نیز ابن الملکؒ کے شرح المصابیح میں بھی اسی طرح ہے۔ اور حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں جیسے ایک روایت میں ہے۔

اور مطلب یہ ہے کہ مؤمن کیلئے موت ایک ناگزیر حقیقت ہے اس لئے ناگواری چہ معنی دارد! یہی وجہ ہے کہ میں موت کو مؤمن بندے سے دور نہیں کرتا۔ اللہ کریم کا ارشاد ہے: ﴿**وعسٰی ان تکرھوا شیئاً ویجعل اللّٰہ فیه خیرا کثیراً**﴾

کہتے ہیں کہ حدیث کا یہ آخری حصہ کتاب بخاری، حمیدی، جامع الاصول شرح السنہ میں ہے۔ ان میں ''**فاذا احببته**'' کے الفاظ نہیں جس طرح مصابیح کے نسخوں میں ہیں اسی طرح ''**نفس المؤمن**'' کے شروع میں ''**قبض**'' کا لفظ نہیں اور حدیث کے آخر میں ''**ولا بد له منه**) حضرت انسؓ نے روایت کیا ہے جو شرح السنہ میں ہے۔

۲۲۶۷: وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْ لُ اللّٰہِ ﷺ اِنَّ لِلّٰہِ مَلَائِکَةً یَطُوْفُوْنَ فِی الطُّرُقِ یَلْتَمِسُوْنَ اَھْلَ الذِّکْرِ فَاِذَا وَجَدُوْا قَوْمًا یَّذْکُرُوْنَ اللّٰہَ تَنَادُوْا ھَلُمُّوْا اِلٰی حَاجَتِکُمْ قَالَ فَیَحُفُّوْنَھُمْ بِاَجْنِحَتِھِمْ اِلَی السَّمَاءِ الدُّنْیَا قَالَ فَیَسْأَلُھُمْ رَبُّھُمْ وَھُوَ اَعْلَمُ بِھِمْ مَا یَقُوْلُ عِبَادِیْ قَالَ یَقُوْلُوْنَ یُسَبِّحُوْنَکَ وَیُکَبِّرُوْنَکَ وَیَحْمِدُوْنَکَ وَیُمَجِّدُوْنَکَ قَالَ فَیَقُوْ لُ ھَلْ رَأَوْنِیْ قَالَ فَیَقُوْلُوْنَ لَا وَاللّٰہِ مَارَأَوْکَ قَالَ فَیَقُوْلُ کَیْفَ لَوْرَأَوْنِیْ قَالَ فَیَقُوْلُوْنَ لَوْرَأَوْکَ کَانُوْا اَشَدَّ لَکَ عِبَادَةً وَاَشَدَّ لَکَ تَمْجِیْدًا وَاَکْثَرَ لَکَ تَسْبِیْحًا قَالَ فَیَقُوْلُ فَمَا یَسْأَلُوْنَ قَالُوْا یَسْأَلُوْنَکَ الْجَنَّةَ قَالَ یَقُوْلُ وَھَلْ رَأَوْھَا قَالَ فَیَقُوْلُوْنَ لَا وَاللّٰہِ یَارَبِّ مَارَأَوْھَا قَالَ یَقُوْلُ کَیْفَ لَوْرَأَوْھَا قَالَ یَقُوْلُوْنَ لَوْ اَنَّھُمْ رَأَوْ ھَا کَا نُوْا اَشَدَّ عَلَیْھَا حِرْصًا وَاَشَدَّ لَھَا طَلَبًا وَاَعْظَمَ فِیْھَارَغْبَةً قَالَ فَمِمَّ یَتَعَوَّ ذُوْنَ قَالَ یَقُوْ لُوْنَ مِنَ النَّارِ قَالَ فَھَلْ رَأَوْھَا قَالَ یَقُوْلُوْنَ لَا وَاللّٰہِ یَا رَبِّ مَا رَأَوْھَا قَالَ یَقُوْلُ

فَكَيْفَ لَوْرَاَوْهَا قَالَ يَقُوْلُوْنَ لَوْ رَأَوْهَا كَانُوْا اَشَدَّ مِنْهَا فِرَا رًا وَاَشَدَّ ا لَهَا مُخَافَةً قَالَ فَيَقُوْلُ فَاُ شْهِدُ كُمْ اَنِّیْ قَدْ غَفَرْتُ لَهُمْ قَالَ يَقُوْلُ مَلَكٌ مِنَ الْمَلَائِكَةِ فِيْهِمْ فَلَانٌ لَيْسَ مِنْهُمْ اِنَّمَا جَاءَ لِحَاجَةٍ قَالَ هُمُ الْجُلَسَاءُ لَا يَشْقٰى جَلِيْسُهُمْ (رواه البخاری وفی رواية مسلم) قَالَ اِنَّ لِلّٰهِ مَلَائِكَةً سَيَّارَةً فُضُلًا يَبْتَغُوْنَ مَجَالِسَ الذِّكْرِ فَاِذَا وَجَدُوْا مَجْلِسًا فِيْهِ ذِكْرٌ قَعَدُوْا مَعَهُمْ وَحَفَّ بَعْضُهُمْ بَعْضًا بِاَجْنِحَتِهِمْ حَتّٰى يَمْلَؤُ مَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ السَّمَاءِ الدُّنْيَا فَاِذَا تَفَرَّقُوْا عَرَجُوْا وَصَعِدُوْا اِلَى السَّمَاءِ قَالَ فَيَسْأَلُهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ اَعْلَمُ مِنْ اَيْنَ جِئْتُمْ فَيَقُوْلُوْنَ جِئْنَا مِنْ عِنْدِ عِبَادِكَ فِی الْاَرْضِ يُسَبِّحُوْنَكَ وَيُكَبِّرُوْنَكَ وَيُهَلِّلُوْنَكَ وَيُمَجِّدُوْنَكَ وَيُسْأَلُوْنَكَ قَالَ وَمَا ذَا يَسْأَلُوْنِی قَالُوْا يَسْأَلُوْنَكَ جَنَّتَكَ قَالَ وَهَلْ رَأَوْ جَنَّتِیْ قَا لُوْا لَا اَیْ رَبِّ قَالَ وَكَيْفَ لَوْرَ اَوْجَنَّتِیْ قَا لُوْا وَيَسْتَغْفِرُوْنَكَ قَالَ وَمِمَّا يَسْتَغْفِرُوْنِیْ قَالُوْا مِنْ نَارِكَ قَالَ وَهَلْ رَاَوْنَارِیْ قَالُوْالَا قَالَ فَكَيْفَ لَوْرَاَوْ نَارِیْ قَالُوْا يَسْتَجِيْرُوْنَكَ قَالَ فَيَقُوْلُ قَدْ غَفَرْتُ لَهُمْ فَاَعْطَيْتُهُمْ مَا سَأَلُوْ وَاَجَرْتُهُمْ مِمَّا اسْتَجَارُوْا قَالَ يَقُوْلُوْنَ رَبِّ فِيْهِمْ فُلَانٌ عَبْدٌ خَطَّاءٌ اِنَّمَا مَرَّ فَجَلَسَ مَعَهُمْ قَالَ فَيَقُوْلُ وَلَهُ غَفَرْتُ هُمُ الْقَوْمُ لَا يَشْقٰى بِهِمْ جَلِيْسُهُمْ۔

اخرجه البخاری فی صحيحه ۳۴۸/۱۱ حديث رقم ۶۵۰۲۔ ومسلم فی صحيحه ۲۰۶۹/۴ حديث رقم (۲۵۔ ۲۶۶۹) واحمد فی المسند ۳۸۲/۲۔

ترجمہ: ''اور ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اللہ تعالیٰ کے کتنے ہی فرشتے مسلمانوں کے راستے پر پھرتے ہیں اور ذکر کرنے والوں کو ڈھونڈتے ہیں تا کہ ان سے ملیں اور ان کا ذکر سنیں چنانچہ جب وہ ان لوگوں کو پالیتے ہیں جو ذکرِ الٰہی میں مشغول رہتے ہیں تو وہ آپس میں ایک دوسرے کو پکار کر کہتے ہیں کہ اپنے مطلوب کی طرف جلدی آجاؤ! نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اس کے بعد وہ فرشتے ان لوگوں کو اپنے پروں سے آسمان دنیا تک گھیر لیتے ہیں۔'' نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''ان فرشتوں سے ان کا پروردگار ان لوگوں کے بارے میں پوچھتا ہے کہ میرے بندے کیا کہتے ہیں حالانکہ پروردگار ان فرشتوں سے کہیں زیادہ ان لوگوں کے بارے میں جانتا ہے'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''فرشتے جواب دیتے ہیں کہ وہ تیری پاکی کی تسبیح کرتے ہیں تجھے یاد کرتے ہیں' تیری بڑائی بیان کرتے ہیں تیری تعریف کرتے ہیں اور بزرگی و عظمت کے ساتھ تجھے یاد کرتے ہیں'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ پھر اللہ تعالیٰ ان فرشتوں سے پوچھتا ہے ''کہ کیا انہوں نے مجھے دیکھا ہے'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اس کے جواب میں فرشتے کہتے ہیں کہ ''نہیں خدا کی قسم انہوں نے تجھے نہیں دیکھا ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اللہ تعالیٰ ان فرشتوں سے کہتا ہے کہ ''اچھا اگر وہ مجھے دیکھتے تو پھر ان کی کیفیت کیا ہوتی''؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''فرشتے کہتے ہیں کہ اگر وہ تجھے دیکھتے تو پھر وہ تیری عبادت بہت ہی کرتے' بزرگی و عظمت کے ساتھ تجھے بہت ہی یاد کرتے' اور تیری تسبیح بہت ہی کرتے'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''پھر اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتا ہے کہ وہ بندے مجھ سے مانگتے کیا ہیں؟ فرشتے کہتے ہیں کہ وہ تجھ سے جنت مانگتے ہیں'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتا ہے کہ کیا انہوں نے جنت کو دیکھا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''فرشتے کہتے ہیں کہ ''نہیں! اے پروردگار! خدا کی قسم انہوں نے جنت کو

نہیں دیکھا ہے'' آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا ''اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتا ہے کہ اچھا اگر انہوں نے جنت کو دیکھا ہوتا تو ان کا کیا حال ہوتا؟ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا ''فرشتے جواب دیتے ہیں کہ اگر انہوں نے جنت کو دیکھا ہوتا تو جنت کے لئے ان کی حرص کہیں زیادہ ہوتی 'اس کے لئے ان کی خواہش وطلب کہیں زیادہ ہوتی اور اس کی طرف ان کی رغبت کہیں زیادہ ہوتی کیونکہ کسی چیز کے بارے میں محض علم ہونا اس کے دیکھنے کے برابر نہیں اس کے بعد اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے کہ ''اچھا وہ پناہ کس چیز سے مانگتے ہیں؟ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا ''فرشتے جواب دیتے ہیں کہ وہ دوزخ سے پناہ مانگتے ہیں'' آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا ''اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتا ہے کیا انہوں نے دوزخ کو دیکھا ہے؟'' فرشتے جواب دیتے ہیں کہ نہیں ''ہمارے پروردگار! خدا کی قسم! انہوں نے دوزخ کو نہیں دیکھا'' آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا ''اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتا ہے کہ اگر وہ دوزخ کو دیکھ لیتے تو پھر ان کی کیفیت کیا ہوتی '' آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا ''فرشتے جواب دیتے ہیں '' کہ اگر انہوں نے دوزخ کو دیکھ لیا ہوتا تو وہ اس سے بہت ہی بھاگتے یعنی ان چیزوں سے بہت ہی دور رہتے جو دوزخ میں لے جانے کا سبب بنتی ہیں اور ان کے دل کہیں زیادہ ڈرنے والے ہوتے'' نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا ''پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرشتوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے '' کہ میں تمہیں اس بات پر گواہ بناتا ہوں کہ میں نے انہیں بخش دیا'' نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا ''یہ سن کر فرشتوں میں سے ایک فرشتہ کہتا ہے '' ذکر کرنے والوں میں وہ فلاں شخص ذکر کرنے والا نہیں ہے کیونکہ وہ اپنے کسی کام کے لئے آیا تھا پھر وہیں ذکر کرنے والوں کے پاس بیٹھ گیا اس لئے تو وہ اس مغفرت کی بشارت کا مستحق نہیں اللہ اُس سے فرماتا ہے کہ اہل ذکر ایسے بیٹھنے والے ہیں کہ ان کا ہم نشین بے نصیب نہیں ہوتا۔ (بخاری) اور مسلم کی روایت میں ہے کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا ''اللہ تعالیٰ کے کتنے ہی فرشتے ایسے ہیں جو پھرنے والے اور زیادہ ہیں چنانچہ وہ فرشتے ذکر کی مجلسیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں' جب وہ کسی ایسی مجلس کو پا لیتے ہیں جس میں اکثر ذکر ہی ہوتا ہے تو وہ اس میں بیٹھ جاتے ہیں اس وقت وہ فرشتے آپس میں ایک دوسرے کو اپنے پروں میں گھیر لیتے ہیں تاکہ ذکر والوں اور آسمان کے درمیان فرشتے ہی فرشتے بھر جائیں جب ذکر سے فراغت کے بعد مجلس برخاست ہو جاتی ہے تو وہ فرشتے بھی اوپر چڑھتے ہیں اور ساتویں آسمان پر پہنچ جاتے ہیں آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا ''اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتا ہے کہ تم کہاں سے آئے ہو'' حالانکہ اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں خوب جانتا ہے کہ وہ کہاں سے آئے ہیں فرشتے کہتے ہیں کہ ہم تیرے ایسے بندوں کے پاس سے آئے ہیں جو زمین پر ہیں تیری تسبیح کرتے ہیں تیرا کلمہ پڑھتے ہیں تجھے بزرگی وعظمت کے ساتھ یاد کرتے ہیں اور تجھ سے مانگتے ہیں'' اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے کہ وہ مجھ سے کیا مانگتے ہیں؟ فرشتے کہتے ہیں کہ وہ تجھ سے تیری جنت مانگتے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کیا انہوں نے میری جنت دیکھی ہے'' فرشتے کہتے ہیں کہ نہیں پروردگار اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اگر انہوں نے جنت کو دیکھا ہوتا تو ان کا کیا حال ہوتا؟ فرشتے کہتے ہیں کہ وہ تیری پناہ بھی مانگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں '' وہ کس چیز سے میری پناہ مانگتے ہیں؟ فرشتے کہتے ہیں'' وہ تیری آگ سے پناہ مانگتے ہیں'' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کیا انہوں نے میری آگ کو دیکھا ہے؟ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ نہیں! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اگر وہ میری آگ کو دیکھ لیتے تو پھر ان کی کیا کیفیت ہوتی؟ فرشتے کہتے ہیں وہ تجھ سے بخشش بھی طلب کرتے ہیں۔'' نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں نے ان کی مغفرت کر دی' فرشتے یہ سن کر عرض کرتے ہیں کہ پروردگار اس میں فلاں بندہ تو بہت ہی زیادہ گناہ گار ہے تو وہ

وہاں سے صرف اپنے کام سے گزر رہا تھا کہ ان کے پاس بیٹھ گیا نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے اسے بخش دیا کیونکہ وہ ذکر کرنے والے ایسے لوگ ہیں کہ جن کے سبب سے اور جن کی برکت کی وجہ سے ان کا ہمنشین بے نصیب نہیں ہوتا۔"

تشریح: قولہ: ان للہ ملائکۃ.....یذکرون اللہ: (فی الطرق) یعنی مسلمانوں کے راستوں میں۔ **(یلتمسون اھل الذکر)** یعنی ان کی تلاش میں رہتے ہیں۔ تاکہ ان کی زیارت ہو جائے اور ان کا ذکر سن لیں۔ **(فاذا وجدوا قومًا یذکرون اللہ)** یعنی کسی بھی طرح سے اللہ کو یاد کر رہے ہوں۔

رہا امام طیبیؒ کا یہ قول کہ ذکر سے مراد: تسبیح، تکبیر، تحمید اور تمجید ہے۔ تہلیل کا ذکر نہیں کیا تاہم تمجید سے یہ مفہوم ہوتا ہے، اس کی تائید مسلم شریف کی اس حدیث سے ہو رہی ہے جس میں تمجید کی جگہ تہلیل کے الفاظ ہیں۔ تو حدیث کی ظاہر پر مبنی ہے اور زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ یہاں پر مراد اعم ہو۔ اور رہی مذکورہ تعیین تو یہ بطور تمثیل کے ہے یا ذکر سے ماثور و منقول اذکار مراد ہیں۔ فتأمل۔ اس لئے کہ تلاوت کلام پاک ہر ذکر سے افضل ہے دعائیں، استغفار، اذکار ہی کی قبیل سے ہے اور اس میں اس بات پر دلیل بھی ہے کہ اجتماعی ذکر کی اپنی ایک خصوصیت و مرتبہ ہے۔

قولہ: تنادوا ھلموا الی حاجتکم: یعنی بعض فرشتے دوسروں کو آواز دیتے ہیں اور کہتے ہیں جلدی آؤ **(الی حاجتکم)** یعنی ذکر سننے، ذکر کرنے والے کی زیارت کرنے، اور یاد کئے جانے والے کی اطاعت کرنے کیلئے۔ اور یہاں "**ھلم**" کا استعمال بنوتمیم کے لغت کے مطابق ہے یعنی بنوتمیم اس کو تثنیہ، جمع اور تانیث کے ساتھ بھی استعمال کرتے ہیں۔ جب کہ حجازیین کا مسلک اس کے برعکس ہے، وہ اس لفظ کو مبنی بر فتح قرار دیتے ہیں اور تمام تثنیہ، جمع اور مؤنث تمام حالتوں میں اس کو ایک صورت میں رکھنے کے قائل ہیں۔ اس کا مؤید باری تعالیٰ کا قول: ﴿**ھلم شھداء کم**﴾[الانعام: ۱۵۰] بھی ہے۔

قولہ: فیحفونھم بأجنحتھم الی السماء الدنیا: بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ "با" تعدیہ کیلئے ہے اور مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے پروں کو ذاکرین کے اردگرد گھما دیتے ہیں۔

بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ "با" استعانت کیلئے ہے اور مطلب یہ ہے: کہ وہ فرشتے ان کے اردگرد گھومتے ہیں اور طواف کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کا آسمان تک مؤمنین کا احاطہ کرنا پروں ہی کے ذریعہ ممکن ہو سکتا ہے۔

اور جو بات مسلم شریف کی آئندہ حدیث سے واضح ہو رہی ہے وہ یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں بعض دوسروں کو اپنے پروں کی استعانت سے گھیرتے ہیں تاہم ان دونوں میں اس طرح تطبیق کرنا ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ پہلے وہ ذاکرین کو گھیرتے ہیں پھر ایک دوسرے کا احاطہ کرتے ہیں اور متوجہ ہوتے ہیں۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: کہ ایک دوسرے کے اوپر کھڑے ہوتے ہیں اور آسمان تک پہنچ جاتے ہیں اور رہا حافظ ابن حجرؒ کا یہ قول کہ فرشتوں کی ایک جماعت ان کی طرف آگے بڑھتی ہے اور ان کا احاطہ کرتی ہے اور ان کو اپنے پروں کے ساتھ ڈھانک لیتی ہے پھر اس کے بعد دوسری جماعت آتی ہے وہ ان کو گھیر لیتی ہے اور ڈھانک لیتی ہے اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے حتیٰ کہ وہ آسمان کے دامن تک پہنچ جاتے ہیں تو اس قول کی صحت کسی مرفوع روایت پر موقوف ہے، ورنہ تو یہ مردود قول ہوگا کیونکہ یہ خواہ مخواہ کی ضرورت سے زائد تکلف ہے۔

آگے جا کر وہ ایک اس سے بڑی عجیب بات لکھتے ہیں چنانچہ امام طیبیؒ سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: ظاہر یہ ہے کہ "با" استعانت کیلئے ہے پھر فرمایا اور اس کا ظاہر ہونے میں تردد ہے اس کی غرابت کی وجہ یہ ہے کہ حافظ صاحبؒ کا قول **(ویسترونھم**

بأجنحتهم) خود اس بات کی تصریح ہے کہ ''با'' استعانت کیلئے ہے تعدیہ کیلئے نہیں۔ پھر اس کا معارضہ صریح مناقضہ ہے۔

قوله: فيسألهم ربهم وهو اعلم بهم ما يقول عبادي: یعنی ان فرشتوں سے زیادہ علم رکھتا ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''وهو اعلم'' کا جملہ حالیہ ہے لیکن اس کا معترضہ ہونا یا تتمیم کیلئے ہونا زیادہ اچھا ہے، اس تو ہم سے بچنے کی وجہ سے کہ ممکن ہے کہ حالِ منتقلہ ہو حالانکہ یہ حالِ مؤکدہ ہے۔ یہ انتہائی باریکی کی بات ہے کہ حد درجہ کی تحقیق ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے عجیب بات کی ہے وہ کہتے ہیں: اس تو ہم کا بفرضِ تسلیم کوئی اعتبار نہیں۔ کیسے حالانکہ ''فیسألهم'' سے پیدا شدہ وہم کو دور کرنا مقصود ہے۔ اچھی طرح غور کرلو۔ (ما يقول عبادي) یائے متکلم کی طرف اضافہ تشریفی ہے مسئول کا علم ہونے کے باوجود سوال کا فائدہ فرشتوں پر ان کے اس قول: ﴿اتجعل فيها من يفسد فيها﴾[البقرة: ۳۰] کی وجہ سے تعریض کرنا ہے۔ (قال) یعنی نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔

قوله: يقولون: يسبحونك......ويمجدونك:

يحمدونك) یہ بتخفیف میم ہے۔ (ويمجدونك) یہ بتشدید الجیم ہے۔ یعنی تیری عظمت کا چرچا کر رہے تھے، یا آپ کو عظمت واکرام کی طرف منسوب کر رہے تھے۔ بعض کا قول ہے کہ اس سے مراد ''لا حول ولا قوة الا بالله'' کہنا ہے۔ مسلم شریف کی آنے والی روایت میں ''تمجید'' کی جگہ تہلیل ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان الفاظ کا تذکرہ بطورِ اشتراط کے نہیں بلکہ بطورِ تمثیل کے ہے کیونکہ مقصود ان میں سے کچھ سے بھی حاصل ہو جاتا ہے اور ان کے علاوہ سے بھی اور سب سے غرض اس تہلیل کا افادہ ہے جو توحید کا لب لباب اور اللہ کو ایک ماننے کا خلاصہ ہے۔

قوله: لا والله ما رأوك: ذاکرین کی مدح میں مبالغہ کے پیش نظر فرشتوں نے قسم کھائی ہے۔ (ما رأوك) اس میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ انسانوں کی تسبیح وتقدیس اعلیٰ اور اشرف ہے کیونکہ یہ موانع کے باوجود عالم غیب میں ہے اور فرشتوں کی تقدیس بغیر کسی رکاوٹ کے عالم شہادۃ میں ہے۔

قوله: قال: فيقول: كيف لو رأوني: اس میں تعجب بھی ہے اور تعجب میں ڈالنا بھی اور اس سوال کا جواب بھی جو ''کیف'' کا مدلول ہے کیونکہ ''کیف'' حال سے متعلق سوال کیلئے موضوع ہے اور مطلب یہ ہے کہ اگر وہ مجھے دیکھتے تو پھر ذکر کا عالم کیا ہوتا؟

قوله: فيقولون: لو رأوك كانوا اشد ......لك تسبيحا:

اور ایک نسخہ میں يقولون بغیر ''فاء'' کے ہے۔

اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ خدمت کی مشقت کا تحمل معرفت ومحبت کے بقدر ہوتا ہے۔

قوله: فما يسئلون؟ قالوا يسئلونك الجنة: اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جنت کا سوال کرنا کسی بھی طرح مذموم نہیں کیونکہ وہ تو ہے ہی دار الجزاء واللقاء، البتہ مذموم وہ ہے جو فقط جنت کی امید اور آگ کے خوف کی وجہ سے اللہ کی عبادت کرے کیونکہ اللہ عبادت کا لذاتہ مستحق ہے نہ کہ کسی غیر کی وجہ سے۔

قوله: وهل رأوها فيقولون: اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جنت مخلوق ہے اور اس کا وجودِ حسی ہے۔

(فيقولون) اور ایک نسخہ میں ''قال: فيقولون'' یعنی ''قال'' کے زیادتی کے ساتھ ہے۔

قوله: فمم يتعوذون یعنی کس چیز سے (''من'' جارہ اور ''ما'' استفہامیہ ہے)

قوله: يقولون من النار: کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے غضب وعقاب کی علامت ہے اور اللہ کی پھٹکار پڑے لوگوں کا ٹھکانہ بھی۔

قوله: كانوا اشد منها فراراً واشد لها مخافة : ان چیزوں سے فرار کہ جو جہنم میں جانے کا سبب ہیں۔(**وأشد لها مخافة**) یعنی وہ بکثرت اس سے پناہ مانگیں گے بوجہ دلی خوف کے۔

سوال وجواب خوب بسط وتفصیل کے ساتھ کئے گئے جس کا مقتضی ان مؤمنین کی طرف سے عقلمندوں کی جماعت ہیں۔ رب الارباب کے ذکر کی کثرت ہے اور یہی اس وعدہ کا مظہر ہے: "**من ذكرني في ملاءٍ ذكرته في ملاءٍ خيرٍ منه**" اور اس حدیث میں اس بات کی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے کہ غیب کی حالت میں عبادت افضل ہے۔ جیسے کہ ایمان بالغیب ایمان بالشہادۃ سے افضل ہے۔اس وجہ سے امت کے اولیا کو مکاشفہ تامہ ہوتا ہے۔

پھر یہ جو کچھ بتایا گیا ہے یہ امت کے مؤمنین کے بارے میں ہے رہے کافر لوگ تو ان کے بارے میں تو اللہ کا یہ ارشاد ہے: ﴿**ولو ردوا لعادوا لما نهو عنه وانهم لكاذبون**﴾[الانعام:۲۸]

قوله: انی قد غفرت لهم: یعنی ان کے ذکر کی وجہ سے کیونکہ نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں۔

قوله: فيهم فلان وليس منهم انما جاء لحاجة : یہ اس مبینہ شخص کے نام ونسب سے کنایہ ہے۔(**وليس منهم**) یعنی ذاکرین میں سے نہ تھا۔ یہ خبر کے اندر مستتر ضمیر سے حال واقع ہے بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ یہ "**فلان**" سے حال ہے۔ یہ قول سیبویہؒ کے مذہب کے مطابق ہے۔(**لحاجةٍ**) یعنی اپنی دنیوی ضرورت کے لئے آیا اور ان کے پاس بیٹھا اس فرشتے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اس مغفرت کا استحقاق نہیں رکھتا۔

قوله: هم الجلساء لايشقى جليسهم: جو کامل طور پر ذکر کیلئے جمع ہیں۔(**لا يشقى**) یاء کے فتحہ کے ساتھ۔(**جليسهم**) یعنی ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والا۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ ایسا مجمع ہے کہ ان کے ساتھ بیٹھنے والا ان کے بخشش وجود سے نامراد نہیں ہوتا کہ بد بخت ہو۔ طیبیؒ کی بات پوری ہوگئی۔اس حدیث مبارک میں اہل ذکر کے ساتھ میل جول کی ترغیب ہے۔

چنانچہ اللہ کریم کا بھی ارشاد گرامی ہے: ﴿**يا ايها الذين اتقوا الله وكونوا مع الصادقين**﴾[التوبة:۱۱۹] بعض عارف حضرات کا قول ہے اللہ کے دوست بنو اگر یہ نہ کر سکو تو ان لوگوں کے ساتھی بنو جو اللہ کے ساتھی بنے ہیں۔

قوله: ان لله ملائكةً سيارةً فضلاً : یعنی بہت گھومنے والے اسی سے صوفیاء کی سیاحت ماخوذ ہے۔

(**فضلاً**) یہ "**ملائكة**" کی صفت ثانیہ ہے یہ "**فاء**" وضاد کے ضموں اور ثانی کے سکون کے ساتھ بھی ہے اور ایک نسخہ میں "**فضلاء**" بروزن علماء کا لفظ ہے علامہ سید جمال الدینؒ فرماتے ہیں، ہماری روایت مشکوٰۃ میں "**فا**" کے فتحہ اور "**ضاذ**" کے سکون کے ساتھ، اور "**فا**" کے ضمہ اور "**ضاذ**" کے سکون کے ساتھ اور "**فا**" اور "**ضاذ**" دونوں کے ضمہ کے ساتھ، اور "**فاء**" کے ضمہ اور "**ضاذ**" کے فتحہ کے ساتھ اور ان چاروں وجوہات میں نصب کے ساتھ۔

اور مسلم کی شرح میں ہے: کہ "**فضلاً**" کو ہم نے چار طریقوں سے ضبط کیا ہے۔ اوّل جو سب سے راجح اور ہمارے ہاں سب سے مشہور ہے "**فضلاً**"، "**فا**" اور "**ضاذ**" کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ دوم: "**فاء**" کے ضمہ اور "**ضاذ**" کے سکون کے ساتھ۔ بعض حضرات نے اس کو کثیر اور زیادہ درست قرار دیتے ہوئے راجح قرار دیا ہے۔ سوم: "**فاء**" کے فتحہ اور "**ضاذ**" کے سکون کے ساتھ۔ قاضیؒ فرماتے ہیں کہ مسلم وبخاری میں ہمارے جمہور مشائخ کی روایت اسی طرح ہے۔ چہارم: "**فاء**" اور ضاد کے ضمہ کے ساتھ مرفوع ہے۔ بنا بریں کہ مبتداءِ محذوف کی خبر ہے۔ اور ایک طریقہ "**فضلاء**" بالمد ہے جو فاضل کی جمع ہے۔

علماء فرماتے ہیں کہ تمام روایات کے مطابق اس کا معنی یہ ہے کہ یہ دوسرے حفظہ فرشتوں سے برتر ہیں۔ ذکر کے حلقوں میں جانے

کے علاوہ ان کا کوئی اور کام نہیں ہے اور ترمذی شریف کی روایت میں ہے۔ (ان للہ ملائکۃ سیّاحین فی الارضِ فضلا من کتاب الناس)۔

قوله: يبتغون مجالس الذكر: یعنی طلب کرتے ہیں یعنی ڈھونڈتے ہیں۔ (مجالس الذكر) اور ایک نسخہ میں ہے (يتبعون) ''تا'' کی تشدید اور ''با'' کے کسرہ کے ساتھ اور ایک نسخہ میں ''تا'' کی تخفیف اور ''با'' کے فتحہ کے ساتھ ہے اور ایک صحیح نسخہ میں ''يتتبّعون'' از باب تفعل وارد ہے۔

اور مسلم شریف کی شرح میں ہے کہ علماء نے اس کو دو طرح سے ضبط کیا ہے۔ اول: بے نکتہ ''عین'' کے ساتھ جو 'تتبع'' سے ماخوذ ہے بمعنی جستجو و تفتیش اور دوم: نکتہ والے ''غین'' کے ساتھ جو 'ابتغاء'' سے ماخوذ ہے۔

قوله: فاذا وجدوا مجلساً فيه ذكر...... كيف لو رأوا جنتي: یعنی غالب اس میں ذکر ہو۔ (قعدوا معهم) یعنی ذاکرین کے ساتھ۔ (وحف بعضهم) یعنی کچھ فرشتے (بعضًا) یعنی بعض دوسرے فرشتوں کو (بأجنحتهم) یعنی ان کی مدد سے (حتی یملأوا) یعنی وہ فرشتے (ما بينهم) یعنی ذاکرین کے درمیان۔ (وبين السماء الدنيا فاذا تفرقوا) یعنی جب اہل ذکر منتشر ہو جاتے ہیں۔ (وصعدوا) صاد کے کسرہ کے ساتھ۔

(الى السماء) یعنی ساتویں آسمان پر (قال: فيسألهم الله وهو اعلم) یعنی ان سے یا ان کے حال سے جیسے کہ دو مختلف نسخوں میں وارد ہے۔ (من أين جئتم فيقولون جئنا من عند عبادك) اس میں اولاد آدم کی انتہاء درجہ کی تکریم ہے۔ (في الأرض) یہ حال ہے۔ (يسبحونك ويكبرونك ويهللونك...... وما ذا يسألوني) نون کی تشدید کے ساتھ اور اس کو تخفیف کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: کہ 'لو'' کا جواب ''كيف'' کا مدلول ہے۔ کیونکہ ''كيف'' حال کے بارے میں سوال کیلئے موضوع ہے اور مطلب یہ ہے کہ اگر وہ میری جنت کو دیکھتے تو ان کے ذکر کا عالم کیا ہوتا؟

اگر کوئی یہ سوال کرے کہ بخاری میں ''كيف'' کا جواب فرشتوں کی طرف سے مذکور ہے جب اس کے برعکس مسلم شریف کی روایت میں ''كيف'' کا جواب مذکور نہیں ان دونوں میں کیا فرق ہے۔

جواب یہ ہے کہ بخاری شریف کی روایت میں ''كيف'' فقط حال سے متعلق سوال کیلئے ہے جب کہ مسلم شریف کی روایت میں یہ تعجب کرنے اور تعجب میں ڈالنے کے واسطے ہے۔

قوله: ويستجيرونك قال: ومما يستجيروني؟: اس کا عطف 'ويسئلونك'' کے اوپر ہے اور یہ سوال و جواب کا جملہ درمیان میں معترضہ ہے اور مراد یہ ہے کہ وہ تیری پناہ طلب کر رہے تھے۔ (قال: ومما يستجيروني؟) دونوں طریقوں پر (یعنی بالتشدید والتخفیف)

قوله: يستغفرونك: یعنی یوں ہی، اور ایک روایت میں 'ويستغفرونك'' یعنی واو عاطفہ وارد ہے۔

قوله: قد غفرت لهم فاعطيتهم ما سألوا: ''واوَ'' سے ''فاء'' کی طرف عدول اس حکمت کے پیش نظر ہے کہ یہ عطاء کرنا مغفرت پر مرتب ہے۔

قوله: أجرتهم مما استجاروا: یہ 'اجار يجير'' سے ماخوذ ہے۔ جب کسی خطرہ سے بے خوف کر لے اور امان دے۔

قوله: يقولون رب فيهم فلان عبد خطاء یعنی بہت گنہگار، یا گناہ سے نہ جدا ہونے والا۔ 'عبد خطاء'' ترکیب نحوی میں ''فلان'' سے بدل ہے۔

قولہ: وانما مرّ فجلس معھم: یعنی کسی حاجت وضرورت کیلئے (فجلس معھم) امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ اس فلان نے تو فقط مرور کا کام کیا ہے اور اس کے بعد بیٹھنا ہے اس نے تو اللہ کریم کا ذکر نہیں کیا اھ۔ مطلب یہ ہے کہ اس نے بالقصد ذکر نہیں کیا یا اخلاص کے ساتھ نہیں کیا ورنہ تو ذکر سننا بھی ذکر کرنے کے مترادف ہے۔

قولہ: ولہ غفرت ...... : یعنی میں نے اس کو بھی انہیں کی طرح معاف کر دیا یا میں نے اس کو ان ذاکرین کے طفیل و برکت سے معاف کر دیا۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں اول الذکر ''غفرت'' دونوں فریقوں کو شامل تھا یعنی اس کا مطلب یہ تھا کہ میں نے ان ذاکرین کے مجمع کی بھی اور اس نو وارد کی بھی مغفرت کر دی پھر دوبارہ ولہ غفرت مزید تاکید وتقویت کیلئے ہے۔ (ھم القوم) امام طیبیؒ فرماتے ہیں: خبر کا معرف باللام لانا اس کے کمال کا مظہر ہے۔ یعنی یہ جس سعادت کے اندر ہیں اس میں انہیں کمال حاصل ہے۔ (ولا یشقٰی) یعنی مشقت نہیں پاتا یا بد بخت ونامراد نہیں ہوتا۔ (بھم) یعنی ان کے سبب و برکت سے (جلیسھم) ان کے ساتھ مجالست کرنے والا۔

یہ آخری جملہ ''القوم'' کی صفت ہے کیونکہ ''القوم'' قوۃ نکرہ میں ہے اس لئے کہ اس کے اندر ''الف لام'' عہدی ہیں جو افادۂ تعریف سے معرّی ہے۔

یا یہ جملہ حال ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ جملہ مستانفہ ہو زیادۃِ کمال بتانے کیلئے لایا گیا ہو۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں: (مطلب یہ ہے) کہ یہ اجر وثواب سے محروم نہیں ہوگا بلکہ یہ ان کی برکت سے اپنا حصہ پائے گا۔

اور اس میں بندوں کیلئے اس بات کی ترغیب ہے کہ صلحاء کے مجالس سے جدا نہ ہوں کہ آپ کو بھر پور حصہ ملے۔

۲۲۶۸: وَعَنْ حَنْظَلَةَ بْنِ الرَّبِيْعِ الْاُسَيْدِيِّ قَالَ لَقِيَنِيْ اَبُوْ بَكْرٍ فَقَالَ كَيْفَ اَنْتَ يَاحَنْظَلَةُ قُلْتُ نَافَقَ حَنْظَلَةُ قَالَ سُبْحَانَ اللّٰهِ مَا تَقُوْلُ قُلْتُ نَكُوْنُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ يُذَكِّرُنَا بِالنَّارِ وَالْجَنَّةِ كَاَنَّا رَأْىَ عَيْنٍ فَاِذَا خَرَجْنَا مِنْ عِنْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ عَافَسْنَا الْاَزْوَاجَ وَالْاَوْلَادَ وَالضَّيْعَاتِ نَسِيْنَا كَثِيْرًا قَالَ اَبُوْبَكْرٍ فَوَ اللّٰهِ اِنَّا لَنَلْقٰى مِثْلَ هٰذَا فَانْطَلَقْتُ اَنَا وَاَبُوْبَكْرٍ حَتّٰى دَخَلْنَا عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقُلْتُ نَافَقَ حَنْظَلَةُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَمَا ذَاكَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ نَكُوْنُ عِنْدَكَ تُذَكِّرُنَا بِالنَّارِ وَالْجَنَّةِ كَاَنَّا رَأْىَ عَيْنٍ فَاِذَا خَرَجْنَا مِنْ عِنْدِكَ عَافَسْنَا الْاَزْوَاجَ وَالْاَوْلَادَ وَالضَّيْعَاتِ نَسِيْنَا كَثِيْرًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَالَّذِيْ نَفْسِي بِيَدِهٖ لَوْتَدُوْمُوْنَ عَلٰى مَا تَكُوْنُوْنَ عِنْدِيْ وَفِي الذِّكْرِ لَصَافَحَتْكُمُ الْمَلَائِكَةُ عَلٰى فُرُشِكُمْ وَفِيْ طُرُقِكُمْ وَلٰكِنْ يَا حَنْظَلَةُ سَاعَةً وَسَاعَةً ثَلَاثَ مَرَّاتٍ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ٤/ ٢١٠٦ حدیث رقم (١٢۔ ٢٧٥٠)۔ والترمذی فی المسند ٤/ ٧٥ حدیث رقم ٢٦٣٣۔ واحمد فی المسند ٤/ ٣٤٦۔ بتغیر بسیط۔

ترجمہ: ''اور حضرت حنظلہ بن ربیع اسیدیؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھ سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی ملاقات ہوئی تو وہ مجھ سے پوچھنے لگے کہ کہو حنظلہ! تمہارا کیا حال ہے یعنی نبی کریم ﷺ جو کچھ وعظ ونصیحت فرماتے ہیں اس پر تمہاری استقامت کیسی ہے؟ میں نے کہا کہ حنظلہ تو منافق ہوگیا حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ ''سبحان اللہ حنظلہ! یہ تم کیا کہتے ہو! یعنی ابوبکرؓ نے بڑے تعجب سے پوچھا کہ کیا بات کہہ رہے ہو اس کا مطلب تو بیان کرو میں نے کہا کہ جب ہم نبی کریم ﷺ کے پاس ہوتے ہیں اور جس وقت آپ ﷺ ہمیں دوزخ کے عذاب سے ڈراتے ہیں یا جس وقت آپ ﷺ ہمیں جنت کی نعمتوں کی بشارت سناتے ہیں تو اس وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا ہم جنت اور دوزخ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ

رہے ہیں مگر جب ہم نبی کریم ﷺ کی صحبت سے جدا ہوتے ہیں اور اپنی بیویوں' اپنی اولادوں' اپنی زمینوں اور اپنے باغات میں مشغول ہوتے ہیں تو بہت کچھ بھول جاتے ہیں حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ اب جب کہ تم نے اپنی یہ حالت بیان کی ہے تو سنو کہ خدا کی قسم ہم بھی اسی حالت کو پہنچے ہوئے ہیں یعنی ہمارا بھی یہی حال ہے کہ حاضر و غائب میں تفاوت ہے اس کے بعد میں اور حضرت ابوبکرؓ دونوں چلے یہاں تک کہ ہم نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے میں نے عرض کیا ''یارسول اللہ'' حنظلہ منافق ہوگیا! نبی کریم ﷺ نے پوچھا کہ کیا مطلب ہے؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت جب ہم آپ کے پاس ہوتے ہیں اور آپ ہمیں بطور تذکیر و نصیحت جنت و دوزخ کے بارے میں بتاتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا ہم ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں مگر جب ہم آپ کے پاس سے اٹھ جاتے ہیں اور اور اپنی بیویوں' اپنی اولاد' اپنی زمینوں اور باغات میں مشغول ہوتے ہیں تو ہم نصیحت کی بہت سی باتیں بھول جاتے ہیں یہ سن کر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر تم پر ہمیشہ وہی کیفیت طاری رہے جو میری صحبت اور حالت ذکر میں تم پر ہوتی ہے یعنی تم ہر وقت صاف دل اور اللہ سے ڈرنے والے رہو تو یقیناً فرشتے تم سے تمہارے بچھونوں پر اور تمہارے راستوں میں مصافحہ کریں لیکن اے حنظلہ! یہ ایک ساعت ہے اور وہ ایک ساعت ہے اور آپ ﷺ نے یعنی حنظلة ساعة و ساعة تین مرتبہ فرمایا۔'' (مسلم)

راویٔ حدیث:

حنظلة بن الربیع۔ یہ حنظلہ بن الربیع ''بنوتمیم'' میں سے ہیں۔ ان کو ''کاتب'' کہا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے آنحضور ﷺ کے لئے وحی کی کتابت کی۔ پھر وہ مکہ تشریف لے گئے اور وہاں سے قرقسیا پہنچ کر اقامت گزین ہوگئے اور حضرت معاویہؓ کے دورِ خلافت میں انتقال کیا ان سے ابوعثمان نہدی اور یزید بن شخیر روایت کرتے ہیں۔

''ربیع'' راء کے ضمہ' بائے موحدہ کے فتحہ' اور بائے مکسورہ مشددہ کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں ''ربیع'' بروزن ''سمیع'' ہے۔ یہی راجح ہے۔ ابن حجر رحمہ اللہ مقدمہ میں لکھتے ہیں الربیع کثیر و بالتصغیر امرأتان اھ ''اسیدی'' میں ہمزہ مضموم' سین مہملہ مفتوح اور یاء مشددہ مخفف دونوں طرح ہے۔ شرح مسلم کے مطابق یائے مشدد اصح و مشہور ہے واضح رہے کہ یہ وہ حنظلہ نہیں ہیں جو غسیل ملائکہ کہلاتے ہیں۔

تشریح: قولہ: وعن حنظلة بن الربیع الاسیدی: یہ وہ حنظلہ نہیں جو غسیل الملائکۃ ہے بلکہ یہ اور حنظلہ ہے جو آنحضرت ﷺ کے کاتب محترم تھے۔ (**ابن الربیع**) ''راء'' کے ضمہ' ''باء'' کے فتحہ اور ''یائے'' مشددہ مکسورہ کے ساتھ اور ایک نسخہ میں یہ لفظ ''راء'' کے فتحہ' ''باء'' کے کسرہ اور ''یا'' کے سکون کے ساتھ بھی ہے۔

شارح بخاری علامہ کرمانیؒ کے مخطوطہ میں یوں ہی ہے۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے جو حافظ ابن حجرؒ نے مقدمہ میں کہا ہے کہ **الربیع کثیر وبالتصغیر امرأتان** '' کہ ربیع کے نام کے بہت شخصیات ہیں اور تصغیر کے ساتھ یہ دو عورتوں کے نام ہیں۔ لہٰذا اس پر اعتماد مناسب ہے۔ (**الا سیدی**) ہمزہ مفہوم، سین مفتوح کے ساتھ اور ''یا'' کی تشدید و تخفیف دونوں کے ساتھ البتہ اول الذکر زیادہ مشہور ہے جیسے کہ شرح مسلم میں ہے۔

قولہ: قال: لقینی ابو بکرؓ: شاید یہ اس وقت مغلوب الحال تھے چنانچہ ادب کا تقاضا یہ تھا کہ وہ یوں کہتے: **''لقیت ابا بکرؓ''** کہ میں نے حضرت ابوبکرؓ سے ملاقات کی۔

قولہ: فقال: کیف انت یا حنظلة: یہ حال سے متعلق سوال ہے یعنی آپ کا ان باتوں پر استقامت کا کیا حال جو

آنحضرت ﷺ سے سنتے ہیں۔یا وہ بدستور قائم ہے یا نہیں؟ امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ: آیا آپ راہ مستقیم پر ہیں کہ نہیں؟

قوله: قلت نافق حنظلة: اپنی نفس کی تعبیر غائب۔(**علم**) کے لفظ کے ساتھ کرنے کی حکمت یہ ہے کہ وہ نفس سے دور تھے۔
اور مطلب یہ ہے کہ: وہ منافق ہوگیا لیکن اس مقام پر نفاق سے مراد ایمان کا نفاق نہیں بلکہ حال کا نفاق مراد ہے۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس میں تجرید ہے،اصل کلام یہ تھا''نافقت'' پھر اس نے اپنے نفس سے اس کی طرح کا ایک شخص منتزع کیا اب یہ اس کے بارے میں خبر دے رہا ہے۔یہ اس لئے کہ جب اس نے اپنے نفس سے ہو غیر مرضی اھ۔دیکھیے مثلاً باطن کا ظاہر سے مخالف ہونا۔

قوله: سبحان الله ما تقول؟ : یہ تعجب کے واسطے ہے۔یا تنزیہ کے بیان کیلئے (**ما تقول؟**) یعنی اپنی بات کا مطلب و معنی بیان کرو۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''ما'' استفہامیہ ہے۔اور ''**تقول**'' کا جملہ متعجب معنی پر ہے۔یعنی آپ کے اس قول جس میں تو نے اپنے اوپر نفاق کا حکم لگایا سے مجھے تعجب ہوا۔
مطلب یہ ہے کہ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ ہم سب آپ ﷺ کے پاس ہوتے ہیں۔اور صیغۂ جمع لانے کی حکمت یہ ہے کہ یہ بات کو معلوم ہے کہ حاضرین مکہ مجمع میں بہت سے ایسے ہوں جو اس واصف میں حنظلہؓ کے مشابہ ہوں گے۔اور ''**نافقنا**'' نہیں فرمایا تاکہ عموم کا وہم نہ ہو۔

قوله: نكون عند رسول الله ﷺ ...... نسينا كثيرا:

(**يذكرنا**) یہ تشدید کے ساتھ ہے یعنی ہمیں وعظ فرماتے ہیں (**بالنار**) یعنی کبھی جہنم کے عذاب کے ساتھ۔(**والجنّة**) یعنی کبھی جنت کی نعمتوں اور آسائشوں کے ساتھ بطور ترغیب و ترہیب کے یا یہ مطلب ہے کہ وہ ہمیں ان کے ذریعہ اللہ کی یاد دلاتے ہیں یا ان کے قرب کے ذریعہ، یا اس بنا پر کہ یہ اللہ تعالیٰ کے صفات جلال و جمال کے مظاہر ہیں۔(**كأنا**) یعنی حتی کہ ہم اس طرح ہو جاتے ہیں کہ (**رأى عين**) یہ منصوب ہے۔بنا بر مفعول مطلق اور تقدیر عبارت اس طرح ہے۔''**كأنا نرى الله أو الجنّة والنار رأى عينٍ**'' یعنی اس کا عامل ''**نرى**'' ،فعل مضمر ہے۔
اور ایک نسخہ میں ''**رفع**'' کے ساتھ ہے۔اور تقدیر یوں ہے ''**كأنا رأوت نا بالعين**'' بایں طور کہ رأیٌ مصدر بمعنی اسم فاعل ہو اور یا یہ جملہ مبالغۃً ہے اور یہ خبر ہے جیسے کہ ''**رجلٌ عدلٌ**'' میں ہے۔(**فاذا خرجنا**) یعنی جب ہم منتشر ہو کے جدا ہو جاتے ہیں (**من عند رسول الله عافسنا الازواج والاولاد**''
یعنی ہم ان سے رل مل جاتے ہیں اور کھیل کود میں لگ جاتے ہیں اور ان کے کاموں اور مصلحتوں میں مگن ہو جاتے ہیں۔(**والضيعات**) یعنی زمینوں اور باغات میں اور امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ''**ضيحة**'' کسی شخص کی ایسی چیز جس پر اس کے معاش کا انحصار ہو۔جیسے زراعت، تجارت وغیرہ (**نسينا**) یہ ''**عافسنا**'' سے بدل اشتمال ہے۔اور یا یہ ''**اذا**'' کا جواب ہے رہا عافسنا کا جملہ تو وہ اس توجیہ کے مطابق حال ہے اور اس کے شروع میں ''**قد**'' مقدر ہے۔اور مطلب یہ ہے کہ ہم بکثرت بھول جاتے ہیں جیسے کہ ایک صحیح نسخہ میں لفظ کثیراً موجود ہے۔یعنی بہت سی وہ باتیں جس کی ہمیں یاد کرائی گئی تھی ہم بھول جاتے ہیں یعنی کثیراً مفعول بہ ہے اور بعض کا قول یہ ہے کہ یہ مفعول مطلق ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے: ''**نسينا نسيانًا كثيرًا**'' (**قال ابو بكر**) جب آپ نے یہ تذکرہ کیا۔یعنی اہل کمال کے صحبت کے اثرات کا یہ تفاوت۔(**وما ذالك**) یعنی اس کہنے کا سبب کیا ہے۔(**قلت...... نسينا كثيرًا**) امام طیبیؒ فرماتے ہیں یا یہ لفظ کثیراً مفعول بہ ہے اور تقدیر یوں ہے ''**كثيرا مما ذكرتنا به**'' اور یا یہ مفعول مطلق ہے اور تقدیر یوں ہے (**نسيانًا كثيرًا**) بہت بھول جاتے ہیں جیسے کہ ہم نے آپ سے کبھی کچھ سنا ہی نہ ہو۔اور یہ آخری توجیہ ''**رأى عين**'' کے ساتھ زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

قوله:لو تدومون ......وفی طرقکم :یعنی تمہارے میرے پاس غیر موجودگی کی حالت میں (علی ما تکونوا عندی) یعنی صفائے دل اور خوف خدا کا وہی عالم ہو جو میرے پاس موجودگی کے وقت ہوتا ہے یہ امام طیبیؒ کی تشریح ہے۔اور یا مراد دوام ذکر اور کامل دھیان ہے۔آخر الذکر توجیہہ کے مطابق۔

اگلہ لفظ (وفی الذکر)''علی ما تکونوا'' کیلئے عطف تفسیری ہوگا۔اور امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ:''وفی الذکر'' کا عطف تکونون کی خبر''عندی'' پر ہے۔اور ابن الملکؒ فرماتے ہیں: کہ''واؤ'' بمعنی''اَو'' ہے۔اور تقدیر یوں ہے:''لو تدومون فی الذکر'' یا ''علی ما تکونون فی الذکر''۔

یعنی اس حالت میں جب تم مجھ سے جدا اور دور ہو یعنی اگر تم اس میں مگن ہو جاؤ۔(لصافحتکم الملائکة) بعض کا قول ہے کہ اس مصافحہ سے علانیہ مصافحہ مراد ہے کیونکہ اہل ذکر سے فرشتوں کا مطلق مصافحہ تو مسلمہ حقیقت ہے۔

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ تمام احوال کے اندر سرعام اگر چہ تم (علی فرشکم وفی طرقکم) یعنی فراغت و مشغولیت کے تمام حالات کے اندر نیز دن اور رات کے اوقات کے اندر ہوں، کیونکہ جب تم حضور و غیبت دونوں احوال میں مذکورہ وصف پر ہو جاؤ گے تب تم ہمیشہ کامل ترین حالت میں ہو گے۔اور جو بشری رکاوٹوں اور نفسانی دیواروں کے باوجود اس کیفیت میں ہوگا تو یقیناً وہ فرشتوں کو اپنے سامنے زانو کے تبرک ٹیکے۔اور ہر زمان و مکان میں اس کی تعظیم کرتے دیکھے گا۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد دوام ہے۔

قوله:ولکن یا حنظلة ساعة:یعنی ایک گھڑی نافسہ کی ہے (وساعة) یعنی ایک گھڑی مشق و مزارلت کی ہے۔

اور مصابیح کے اندر''ساعة فساعة''(''فاء'' کے ساتھ) ہے۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں دوسرے''ساعة'' کے اندر''فا'' اس بات کی آگہی کیلئے ہے کہ ایک گھڑی دوسری کے پیچھے لگی ہوئی ہے اور بعض نسخوں میں''واؤ'' کے ساتھ ہے اھ۔

اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے انسان منافق نہیں ہوتا کہ ایک زمانے میں وہ کامل دھیان و حضور کے کیف میں ہوتا ہے اور ایک زمانے میں اس پر فتور آجاتا ہے تو تم حضور کے لمحات اپنے رب کے حقوق کی ادائیگی میں لگے رہتے ہو اور فتور کی کیفیت میں حاجتیں وخواہشیں پوری کرتے ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ''ساعة وساعة'' کے الفاظ رخصت دینے اور تحفظ کیلئے ہوں تاکہ نفس کو عبادت سے اکتاہٹ نہ ہو جائے۔

حاصل یہ ہے کہ حنظلہ! یہ مذکورہ امور پر مداومت ایسی تکلیف ہے کہ ہر کوئی اس کا متحمل نہیں ہوسکتا اس لئے کوئی اس کا مکلّف نہیں بنایا گیا اور جس کا اکثر انسان متحمل ہوسکتے ہیں وہ یہ ہے کہ انسان کبھی اس حالت پر ہو،اور اس پر کوئی حرج نہیں کہ وہ کبھی اپنے آپ کو مذکورہ مشق مزادلت کی طرف پھیر دے اور آپ کی کیفیت بھی یہی ہے۔لہٰذا آپ راہِ راست پر ہیں اور نفاق کا آپ کے پاس سے بھی گذر نہیں ہوا لہٰذا آپ کا یہ گمان سراسر غلط ہے۔خبردار اس عقیدے سے باز آ۔یہ وہ وسوسہ ہے جسے شیطان سالکین کے دل میں ڈالتا رہتا ہے۔تاکہ انہیں ان کے مقصد و منزل سے ہٹا دے اور شیطان مسلسل ایسا کرتے رہتے ہیں تاکہ یہ لوگ یکسر عمل کو ترک کر دیں۔(ثلاث مر آت) یعنی حضور ﷺ نے یہ تین مرتبہ ارشاد فرمایا۔اس میں یہ بھی امکان ہے کہ آپ ﷺ نے والذی نفس بیده سے آخر تک تین مرتبہ فرمایا ہو۔جیسے کہ یہ بھی ممکن ہے کہ آخری جملہ''ولکن یا حنظله ساعة فساعة'' تین مرتبہ فرمایا ہو۔امام طیبیؒ نے آخری احتمال کو پسند فرمایا ہے اس کے متحقق ہونے کی وجہ سے یہ علامہ کی تحقیق کی دلیل ہے۔

اس سے حافظ ابن حجرؒ کا یہ قول کہ''شارح کی تعیین پر کوئی دلیل نہیں'' مسترد ہو گیا میں کہتا ہوں کہ جملوں کے بعد استثناء کا آنا اس

مبحث کامثل ہے چنانچہ ہمارے محققین ائمہ کے نزدیک یہ استثناء آخری جملہ کی طرف عائد ہوتی ہے۔اس کے برخلاف شوافعؒ کا مذہب ہے۔چنانچہ ان کے نزدیک سابق میں مذکور پورے کلام کی طرف عائد ہوتی ہے جیسے کہ باری تعالیٰ کے قول: ﴿ولا تقبلوا لهم شهادة أبدًا واولئك هم الفاسقون الا الذين تابوا من بعد ذالك﴾[النور:٤-٥]

چنانچہ امام شافعیؒ کے نزدیک قاذف کی گواہی توبہ کے بعد مقبول ہے جبکہ ہمارے نزدیک قبول نہیں۔

اور ''ابدًا'' کا لفظ اس بات کا مؤید ہے کہ ''ثلاث مرّات'' تاکید کے واسطے ہے۔اور حنظلہ کے اندرونی غم وکرب کا ازالہ بھی مقصود ہے۔نیز اس بات کو بیان کرنے کیلئے کہ کسی فتور کے بغیر ہمہ وقتی حضور بندوں کی بس کی بات نہیں ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے تین مرتبہ یہ فرمایا: کہ کوئی گھڑی ذکر وحضور میں لگا رہے گا اور کوئی وقت ازواج واولاد وغیرہ کے ساتھ مصروف ومشغول ہوگا۔

اور اس میں حنظلہؓ کی اس حالت کی تقریر ہے جس پر وہ اس وقت قائم تھے اور انہیں اس سے ناگواری ہوتی تھی۔یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت حنظلہؓ کا نام لے کر پکارا تا کہ اس بات پر تنبیہ ہو جائے کہ وہ راہِ راست پر جاری وساری ہے اور وہ کبھی بھی منافق نہیں ہوئے یعنی عرفی نفاق کے ساتھ موصوف نہیں ہوئے اور وہ یہ ہے کہ کوئی دل میں کفر رکھے اور ایمان کا اظہار کرے۔

اور حضرت حنظلہؓ نے ''نافق حنظلة'' میں نفاق سے یا تو نفاق لغوی مراد لیا ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ آپ ﷺ کے پاس ایک حالت پر ہوتے تھے اور جب وہاں سے ہٹتے تو حالت بدل جاتی۔اور یا یہ تشبیہ حال ہے یعنی اس کی حالت منافق کی حالت کے مشابہ ہے کہ ہمہ جہتی یکسانیت نہیں۔

الفصل الثانی:

۲۲۶۹: عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلَا اُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرِ اَعْمَالِكُمْ وَاَزْكَاهَا عِنْدَ مَلِيْكِكُمْ وَاَرْفَعِهَا فِیْ دَرَجَاتِكُمْ وَخَيْرٌ لَّكُمْ مِنْ اِنْفَاقِ الذَّهَبِ وَالْوَرِقِ وَخَيْرٌ لَّكُمْ مِنْ اَنْ تَلْقَوْا عَدُوَّكُمْ فَتَضْرِبُوْا اَعْنَاقَهُمْ وَيَضْرِبُوْا اَعْنَاقَكُمْ قَالُوْا بَلٰی قَالَ ذِكْرُ اللّٰهِ (رواه مالك واحمد والترمذی وابن ماجة) **الا ان ما لكا وقفه علی ابی الدرداء۔**

اخرجه الترمذی فی السنن ١٢٧/٥ حديث رقم ٣٤٣٧۔ وابن ماجه ١٢٤٥/٢ حديث رقم ٣٧٩٠ ومالك فی الموطأ۔ واحمد فی المسند ٤٤٧/٦۔

ترجمہ: ''حضرت ابودرداءؓ کہتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم ﷺ نے صحابہؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ ''کیا میں تمہیں ایک ایسے عمل سے آگاہ نہ کروں جو تمہارے اعمال میں بہت بہتر' تمہارے بادشاہ کے نزدیک بہت پاکیزہ تمہارے درجات بلند اور تمہارے روپیہ اور سونا خرچ کرنے سے بہتر ہے اور اس سے بہتر ہے کہ تم اپنے دشمنوں سے ملو اور تم ان کی گردنیں مارو اور وہ تمہاری گردنیں ماریں؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ 'ہاں اور ہمیں بتایئے کہ وہ کون سا عمل ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا' خدا کا ذکر' اس روایت کو مالک' احمد' ترمذی اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے لیکن امام مالکؒ نے اس روایت کو حضرت ابودرداء سے بطریق موقوف نقل کیا ہے۔''

تشریح: قوله: الا انبئكم ...... ويضربوا اعناقكم:

وازکاھا: یعنی زیادہ بڑھوتری والا اور پاک صاف (**عند ملیککم**) یعنی تمہارے پروردگار کے فیصلہ میں۔ (**والورق**) ''راء'' کے کسرہ کے ساتھ اور کبھی اسے ساکن بھی پڑھا جاتا ہے بمعنی چاندی یعنی اللہ کی رضاجوئی میں ان اشیاء کو خرچ کرنے سے زیادہ بہتر وافضل۔ (**وخیرٌ لکم من ان تلقوا عدوکم**) یعنی اللہ کی راہ میں مال وجان قربان کرنے سے زیادہ اچھا (**فتضربوا اعناقھم**) یعنی کچھ کافروں کے گردنوں کو (**ویضربوا**) یعنی بعض تمہارے گردن اڑائیں، یہ مجاہدۃ فی سبیل اللہ کی اعلیٰ مراتب کی تصویر کشی ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کے قول میں ''ضمیر'' مجرور ہے اس کا عطف معنوی طور پر **خیر اعمالکم** پر ہے کیونکہ اس کی معنوی تقدیر یہ ہے ''**الا انبئکم بمٰ ھو خیر لکم من بذل اموالکم وانفسکم فی سبیل اللّٰہ**''۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: کہ اس کا عطف ''**خیر اعمالکم**'' پر ہے اور یہ عطف از قبیل عطف خاص علی العام ہے۔ کیونکہ اول الذکر مطلقاً خیر الاعمال ہے۔ اور یہ مال وجان کے صرف کرنے سے افضل ہے، اور یا یہ عطف برائے مغائرت ہے بایں طور کہ اعمال سے اعمال لسانی مراد ہوں تو یہ (**صرف مال وجان**) اس کا متضاد ہوگا کیونکہ مال وجان قربان کرنا عملی افعال ہیں اور یہاں خبر سے مغائر مراد ہے۔

قولہ: قال ذکر اللّٰہ: ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ ذکر سے ذکر قلبی مراد ہے کیونکہ یہی وہ ذکر ہے جسے مال وجان کو صرف کرنے پر فوقیت حاصل ہے کیونکہ یہ دِل کا فعل ہے اور دل کا کام اعضاء کے کام سے زیادہ مشقت والا ہوتا ہے بلکہ یہ تو جہاد اکبر ہے نہ کہ ایسا ذکر جو زبان سے چیخ وپکار کے ساتھ ہو اور اس میں گردن کو حرکتیں دی جائیں اور جسم کو کثرت سے موڑا جائے، جسے بعض لوگ اس احساس کے تحت کرتے ہیں کہ یہ دھیان لانے کا باعث ہے اور سرور کا سبب ہے۔

سبحان اللہ! یہ تو الٹا دھیان کو ختم کرنے کا سبب ہے اور نرا غرور ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ذکر کا اطلاق ذکر قلبی اور ذکر لسانی دونوں پر ہوتا ہے لیکن مدار دل پر ہے جو کہ ذکر کی وجہ سے حالت غیوبت سے حالت حضور کی طرف پلٹتا ہے اور رہا ذکر لسانی تو یہ ایک وسیلہ ہے اور اس در تک پہنچ کر حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔

مبتدی کیلئے ان دونوں میں سے کون سا افضل ہے؟ اس میں مشائخ کا اختلاف ہے اگرچہ منتہی کی انتہاء بھی ذکر قلبی کی طرف ہوتی ہے۔

اور رہے اس سلسلہ میں بدعات اور خرافاتی امور اور دنیوی اغراض تو وہ ذکر سے یکسر خارج ہیں۔

اور یہ بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ دونوں انواع کو جمع کرنا کمال ہے۔ اور ثواب کے حصول میں زیادہ افضل صورت ہے اور ظاہر یہ ہے کہ یہاں پر یہی مراد ہے کیونکہ مذکورہ مجاہد اور مقاتل ذکر قلبی سے عاری نہیں۔

البتہ یہ ممکن ہے کہ کہا جائے کہ مذکورہ مجاہد کا ذکر قلبی جو جہاد باطنی ہے اس کی اس جہاد ومقاتلہ سے افضل ہے جو جہاد ظاہری ہے۔ تو اس توجیہہ پر یہ حدیث آپ ﷺ کے اس قول کی نظیر ہو جائے گی۔ (**لو ان رجلاً فی حجرہ دراھم یقسمھا وآخر یذکر کان الذاکر للّٰہ افضل**) جیسے کہ اس کو طبرانی نے حضرت ابوموسیٰ سے روایت کیا ہے۔

اور اس تقریر سے حافظ ابن حجرؒ کی وہ حیرت بھی جاتی رہے گی جو وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ ذکر جو تلاوت قرآن کو شامل ہے کا بقیہ لسانی اعمال سے افضل ہونے میں تو کوئی خفا نہیں لیکن اللہ کیلئے جان ومال کے خرچ کرنے سے افضل ہونے میں تأمل ہے، چنانچہ ہمارے ائمہ کے کلام کا تقاضا اس کے برعکس ہے۔

مذکورہ اشکال کو دور کرنے کیلئے شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام نے اپنے قواعد میں لکھا ہے: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ ثواب تمام عبادات کا بقدر مشقت نہیں بلکہ کبھی اللہ کریم کم عبادت پر بھی کثیر عبارت کا اجر عطا کر دیتا ہے تو گو کہ ثواب کا ترتب شرف میں تفاوت مراتب پر ہے اھ۔ یہ بالکل برحق بات ہے اور رہا حافظ ابن حجرؒ کا یہ قول کہ: اب یہ رواج ہو چلا ہے کہ ظاہر حدیث پر عمل ہوتا ہے اور

ائمہ کرام کے کلام کے مقتضیات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے تو یہ فری تقلید ہے۔
پھر آگے اور بھی عجیب بات کہہ دی، فرماتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا بخل کی بیماری کو ختم کرتا ہے اس کی وجہ سے نفس سے بزدلی کی بیماری ختم ہو جاتی ہے، جبکہ ذکر کی پابندی مذکورہ دونوں خبیث ترین بیماریوں یا ان میں سے کسی ایک کا خاتمہ نہیں کرتی وہ تو بس مقصود کی حد کا فائدہ دیتی ہے۔
لیکن یہ بات حافظؒ صاحب کی ذکر کے مفہوم وحقیقت سے غفلت پر مبنی ہے۔ اس لئے کہ تمام ظاہری و باطنی اثرات کا ارتفاع ذکر کی وجہ سے ہے، جس کی تاثیر براہ راست تمام اعضاء کے رئیس دل پر ہوتی ہے۔
اور یہی پھر نفس و مال کے صرف کرنے کا داعی و باعث بنتا ہے۔ اور اس کے بغیر یہ سب مالی خسارہ اور بے فائدہ جانی ضیاع ہے۔ چنانچہ اس میں یہ دونوں قرب کا ذریعہ نہیں۔
اس وجہ سے شارحؒ نے فرمایا کہ ممکن ہے کہ ذکر کی یہ ارفعیت اور خیریت کی وجہ یہ ہو کہ سونا چاندی خرچ کرنا، دشمن کے ساتھ مقاتلہ ومجاہدہ کرنا اور دیگر عملی افعال تو اللہ کے قرب کے ذرائع و وسائل ہیں اور ذکر ہی مقصود اعلیٰ ہے اور بلند و رفع مطلوب ہے اور ذکر کی فضیلت کے سلسلہ میں آپ کو اللہ کا یہ فرمان کافی ہے: ﴿**فاذكرونى اذكركم**﴾[البقرة:۱۵۲] اور اسی طرح حدیث شریف میں ہے ''**أنا جليس من ذكرنى وأنا معه اذا ذكرنى**'' یعنی میں ذاکر کا جلیس ہوتا ہوں جب وہ مجھے یاد کرتا ہے میں اس کے پاس ہوتا ہوں۔ وغیرہ وغیرہ۔
یہی وجہ ہے کہ امام غزالیؒ نے مقام ذکر میں داخل ہونے کے بعد فرمایا: کہ میں نے عمر کا ایک حصہ وجیز، وسیط اور بسیط میں صرف کر کے ضائع کر دیا بلکہ عارفین حضرات تو غفلت کو بلا مبالغہ ارتداد کے انواع میں شمار کرتے ہیں۔
اگر چہ یہ کچھ لمحات کو ہو۔ جیسے ایک شاعر کا قول

ولو خطرت لى فى سواك ارادةً ☆ على خاطرى سهوا حكمت بردتى

''یعنی اگر میری خاطر میں کبھی آپ کے علاوہ کا خیال بھی بھول کر آئے تو میں اپنی ارتداد کا فیصلہ صادر کر دوں گا۔''
پھر اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ سب سے افضل ذکر ''**لا اله الا اللّٰه**'' ہے۔ اور یہی وہ اساس ہے جس پر ارکان دین کی عمارت کھڑی ہے، یہی عالیشان کلمہ ہے اور یہی وہ مسجود ہے جس کے گرد دین کی چکی گھوم رہی ہے اور یہی ایمان کا بلند و بالا شعبہ ہے۔
امام طیبیؒ فرماتے ہیں: بلکہ یہی سارا دین ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿**قل انما يوحى إلىٰ انما الهكم اله واحد**﴾ اس میں وحی کو اللہ کی وحدانیت پر محصور کیا گیا ہے۔ کیونکہ وحی کا سب سے بڑا مقصد توحید ہے باقی ساری تکلیفیں اس کی شاخیں ہیں پھر آگے فرمایا: یہی وجہ ہے کہ آپ عارفین اور اہل دل حضرات کو دیکھتے ہیں کہ وہ اس کلمہ کی درد کی دوسرے تمام اذکار پر ترجیح دیتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اس کلمہ کے ان خواص کا ادراک کیا جو بس وجدان صحیح اور ذوق سلیم سے معلوم ہو سکتے ہیں اھ۔
اس بات کی وضاحت اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ: حضرت علی بن میمون مغربیؒ نے جب شیخ علوان حمویؒ کے بارے میں تصرف کیا جو مفتی اور مدرس تھے تو انہوں نے شیخ صاحب کو ذکر کے علاوہ تمام مصروفیات سے روک دیا۔ نادان لوگوں نے انہیں تنقید کا نشانہ بنایا اور کہا کہ انہوں نے شیخ الاسلام کو گمراہ کر دیا اور لوگوں کو نفع رسانی سے اسے روکے رکھا، اس کے بعد حضرت علی بن میمونؒ کو پتہ چلا کہ شیخ صاحب کبھی کبھار قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں تو انہوں نے اس سے منع فرمادیا، جس پر لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ تو زندیق قرآن کریم کی تلاوت بھی نہیں کرنے دیتا جو ایمان کا محور و مدار ہے اور یقین کی پختگی میں معاون بھی، لیکن مرید بسلسبل موافقت کرتے رہے حتی

کہ اس کی ترقی ہوگئی اور آئینۂ دل صاف ہوگیا اور رب کا مشاہدہ ہونے لگا، تب انہوں نے اسے تلاوت قرآن کریم کی اجازت دے دی پھر جب انہوں نے قرآن کریم کو کھولا تو ان پر ازلی، ابدی فتوحات کھلیں اور ظاہری باطنی معارف کے خزانے نمودار ہونے لگے۔

تو جناب علی بن میمونؒ کہنے لگے: میں نے آپ کو تلاوت کلام پاک سے نہیں روکا تھا بلکہ میں نے تو آپ کو صرف زبان کو حرکت دینے اور قرآنی حقائق سے غافل ہونے سے منع کیا تھا اور اللہ ہی سے مدد کی درخواست ہے۔

قوله: الا ان مالكا وقفه على ابى الدرداء:

امام مالکؒ نے اسے حضرت ابوالدرداء پر موقوف کیا ہے یعنی باقی حضرت نے اسے مرفوعاً نقل کیا ہے۔

لیکن اس سے کچھ حرج واقع نہیں ہوگا کیونکہ اعتبار وصل کا ہوتا ہے نہ کہ وقف کا اس لئے کہ وصل کرنے والے کے پاس وصل کا اضافی علم ہے اور ثقہ کا اضافہ معتبر ہے اور اس لئے بھی کہ یہ ایسی بات ہے جو اپنی رائے سے کہی جاسکتی ہے لہٰذا یہ وقف بمنزلۂ رفع ہے۔

۲۲۷۰: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ بُسْرٍ قَالَ جَاءَ اَعْرَابِيٌّ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ اَيُّ النَّاسِ خَيْرٌ فَقَالَ طُوْبٰى لِمَنْ طَالَ عُمُرُهُ وَحَسُنَ عَمَلُهُ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَيُّ الْاَعْمَا لِ اَفْضَلُ قَالَ اَنْ تُفَارِقَ الدُّنْيَا وَلِسَانُكَ رَطْبٌ مِنْ ذِكْرِ اللّٰهِ۔ (رواه احمد والترمذى)

اخرجه الترمذى فى السنن ۳۸۷/۳ حديث رقم ۲۴۳۱۔ والدارمى فى السنن ۳۹۸/۲ حديث رقم ۲۷۴۸۔ واحمد فى المسند ۴۳/۵۔

ترجمہ: ''اور حضرت عبداللہ ابن بسرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک دیہاتی آیا اور عرض کیا کہ ''یارسول اللہ!'' کون شخص بہتر ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''خوش بختی ہے اس کے لئے جس کی عمر دراز ہوئی اور اس کے اعمال نیک ہوئے'' اس نے عرض کیا یارسول اللہ! کونسا عمل بہتر ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''یہ کہ جب تم دنیا سے جدا ہو تو تمہاری زبان خدا کے ذکر سے تر ہو۔'' (ترمذی، احمد)

تشریح: **قوله: عن عبدالله بن بسر**: ''باء'' کے ضمہ اور ''سین'' کے سکون کے ساتھ۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: کہ ایک نسخہ میں ''بُسر'' کے بجائے ''نمیر'' ہے۔ اھ۔ لیکن یہ کھلی تصحیف (غلطی) ہے۔

قوله: طوبى لمن طال عمره وحسن عمله: یہ ''طیب'' سے بروزن فعلی ہے، اس سے مقصود اس کی تحسین اور دنیا و آخرت میں اس کے لیے خوشحالی کی دعا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ یہ خبر ہے کیونکہ یہ ''ای الناس خیرٌ'' کے جواب میں ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ''طوبٰی'' سے جنت مراد ہو یا اس سے جنت کا ایک درخت جو اہل جنت پر چھائے ہوگا مراد ہو۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں ظاہر یہ ہے کہ جواب ''**من طال عمره وحسن عمله**'' سے شروع ہو گویا کہ یہ فرمایا کہ یہ بات مخفی نہیں کہ سب لوگوں میں بہترین مذکورہ لوگ ہیں تو ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے لوگوں کیلئے دعا کی جائے تاکہ ان کی برکت سے مستفیض ہوں اھ۔ حافظ ابن حجرؒ نے ان کی موافقت کرتے ہوئے فرمایا: کہ زیادہ واضح بات یہ ہے کہ اس کی خوشحالی اور خوبی وانجام کی خبر ہے، آپ ﷺ کی گفتگو کی بلاغت کی وجہ سے یہ جواب کو بھی متضمن ہے۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ مسئول عنہ کی ذات سے عدول کر کے ایسی علامات بتائی گئیں جو مسئول عنہ کے اندر ہیں یعنی دنیا و آخرت کی سعادت جب اس کی عمر طویل اور عمل اچھا ہو کیونکہ مسئول عنہ کی ذات کا علم ان امور غیبیہ میں سے ہے جس کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔

اس کلام میں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ بالکل غیر مربوط اور بے وزن کلام ہے پر میرے خیال میں آیا کہ ''طوبیٰ'' کا کلمہ شاید اس لئے بڑھایا تا کہ یہ ایک جامع کلام ہو اور چوتھی مستقل حکمت ہو جو سوال کا تابع نہ ہو اسی طرح اس کو طبرانیؒ نے روایت کیا ہے اور ابونعیمؒ نے اس کو ''حلیۃ'' میں روایت کیا ہے لیکن اس میں آمد کے سبب کا ذکر نہیں۔

قوله: ان تفارق الدنيا ولسانك رطب من ذكر الله :

''واؤ'' حالیہ ہے۔ (رطبٌ) یعنی حال ہی میں ذکر کیا ہو، یا یہ مراد ہے کہ اس کی زبان ذکر سے تر ہو اور حرکت کر رہی ہو۔

ذکر اللہ سے ذکر جلی و ذکر خفی دونوں مراد ہو سکتے ہیں جیسے زبان سے زبان قلبی اور زبان قالی دونوں مراد ہیں۔ اور مراد لینے میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں بلکہ مقام جمع میں تو یہ بطریق اولیٰ مراد لیا جا سکتا ہے۔

اور اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ افضل ترین اعمال وہ ہیں جن پر احوال کا خاتمہ ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ دنیا سے مفارقت و جدائی سے **زهد عن الدنيا** مراد ہو، اور ''**رطب اللسان**'' اللہ کے ذکر سے دلوں کی تر و تازگی مراد ہو۔

کیونکہ برتن سے وہی ٹپکتا جو اس کے اندر ہوتا ہے اور جو کسی شی سے محبت کرتا ہے وہ اسے بکثرت زبان سے یاد کرتا ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ''**رطوبة اللسان**'' سے مراد ذکر کا سہولت و آسانی کے ساتھ زبان پر جاری ہونا ہے۔ جیسے ''**يبس لسان**'' سے اس کے متضا (رکنے) کا کنایہ کہا جاتا ہے اور روانی زبان مداومتِ ذکر سے ہوتا ہے۔

تو گویا کہ یہ کہا گیا کہ **افضل الاعمال مداومة الذكر** کیونکہ ذکر مقصود ہے اور دیگر اعمال اس کے ذرائع و وسائل ہیں۔

اور ابن حبان، بزار، طبرانی نے حضرت معاذؓ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں کہ آخری بات جو میں نے آنحضرت ﷺ سے سن کر علیحدہ ہوا یہ ہے کہ: میں نے کہا۔ ''**اى الاعمال احب الى الله قال: ان تموت ولسانك رطب من ذكر الله**'' اور طبرانی میں اضافہ ہے: ''**قلت يا رسول الله! اوصنى قال: عليك بتقوى الله ما استعت واذكر الله عند كل حجر وشجر وما عملت من سوءٍ فاحدث لله فيه توبة السرّ بالسرّه والعلانيه بالعلانيه**''۔ یعنی میں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ مجھے وصیت کیجئے آپ ﷺ نے فرمایا'' آپ پر اللہ کا تقوی حسب استطاعت لازم ہے اور ہر شجر و مدر کے پاس اللہ کا ذکر کیا کیجئے اور جو برائی آپ سے صادر ہو تو علانیہ گناہ سے علانیہ توبہ کر اور پوشیدہ گناہ کا پوشیدہ توبہ کر۔ اھ''۔

علامہ میرکؒ فرماتے ہیں کہ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب آپ ﷺ نے ان کو یمن کی طرف حاکم بنا کر بھیج رہے تھے بوقت رخصت یہ فرمایا تھا۔

۲۲۷۱: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا مَرَرْتُمْ بِرِيَاضِ الْجَنَّةِ فَارْتَعُوْا قَالُوْا وَمَا رِيَاضُ الْجَنَّةِ قَالَ حِلَقُ الذِّكْرِ۔ (رواه الترمذى)

رواه الترمذى فى السنن ١٩٤/٥ حديث رقم ٣٥٧٧۔ واحمد فى المسند ٦٥/٣۔

ترجمه: ''اور حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''جب تم جنت کے باغات میں سے گزرو تو میوہ خوری کرو'' صحابہؓ نے عرض کیا کہ جنت کے باغات سے کیا مراد ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا'' ذکر کے حلقے۔''

تشريح: **قوله: اذا مررتم برياض الجنة فارتعوا**: یہ از قبیل تسمیۃ الشي باعتبار مآل کے ہے یا باعتبار ایصال و دلالت کے ہے۔ (**فارتعوا**) یہ کامل و وافر حصہ ملنے سے کنایہ ہے۔

قوله: قال حلق الذكر: ''حلق'' حاء کے کسرہ اور لام کے فتحہ کے ساتھ اور کبھی ''حاء'' کو فتحہ بھی دیا جاتا ہے۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ''حلق'' بکسر الحاء وفتح اللام حلقۃ کی جمع ہے۔جیسے ''قصعة'' کی جمع قصعٌ آتی ہے۔اور یہ لوگوں کی جماعت کو کہتے ہیں جو دائرے کے شکل میں بیٹھے ہوں۔

علامہ جوہریؒ فرماتے ہیں: یہ ''حلقةٌ'' (بفتح الحاء) کی علی خلاف القیاس جمع ہے۔

علامہ ابن عمرو نے یہ حکایت کی ہے کہ اس کا مفرد ''حلقة'' جو بالتحریک ہے اور اس کا جمع حلق بالفتح ہے اھ۔گویا کہ یہاں جمع سے مراد جنس ہے بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ: یہ حدیث مکان اور ذکر کے سلسلہ میں مطلق ہے تو اس کو اس مقید پر محمول کیا جائے گا جو باب المساجد میں مذکور ہے اور وہ ذکر سبحان اللہ، الحمد للہ ہے۔امام طیبیؒ نے یہ ذکر کیا ہے بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد حلال وحرام کے مجالس ہیں۔

لیکن زیادہ ظاہر یہ ہے کہ اس کو عموم پر محمول کیا جائے، اور کسی مخصوص کامل فرد کا ذکر منصوص کے عموم کے منافی نہیں۔اور حاصل معنی یہ ہے کہ: جب تم ایسی جماعت کے پاس سے گذرو جو اللہ کا ذکر کرتی ہو تو تم بھی ان کی موافقت میں اللہ کا ذکر کرو کیونکہ وہ تو جنت کے باغات میں سے ہیں۔

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں: کہ جس طرح ذکر کرنا مستحب ہے یوں ہی اہل ذکر کے پاس بیٹھنا بھی مستحب ہے، اور یہ ذکر کبھی قلبی ہوتا ہے اور کبھی لسانی اور بہترین وہ ہے جو قلب ولسان دونوں سے ہو۔

اور اگر کوئی ان دونوں میں سے کسی ایک پر اکتفا کرنا چاہئے تو پھر دل زیادہ افضل ہے اور یہ نامناسب ہے کہ اپنے متعلق ریاء کے خیال کے خوف کی وجہ سے ذکر لسانی بالاخلاص کو ترک کیا جائے۔

اور علامہ فضیل صاحب سے منقول ہے کہ لوگوں کی وجہ سے عمل ترک کرنا ریاء ہے اور لوگوں کی وجہ سے عمل کرنا شرک ہے اور اخلاص یہ ہے کہ ان دونوں سے اللہ خلاصی نصیب کرے۔

لیکن اگر انسان لوگوں کے رعایت کا دروازہ اپنے اوپر کھول دے۔اور ان کے ظنون باطلہ کے پیش آنے سے بھی بچنا چاہے تب تو خیر وبھلائی کے اکثر دروازے اس پر مسدود ہو جائیں گے اھ۔

مروی ہے کہ کچھ مریدین نے اپنے شیخ سے عرض کیا کہ میں اللہ کا ذکر کرتا ہوں مگر میرا دل غافل رہتا ہے۔اس پر شیخ نے اس سے فرمایا کہ ذکر کرتا جا اور شکر بجالا کہ اس نے تیرے ایک عضو کو اپنے ذکر میں مشغول کر دیا ہے اور اس ذات سے یہ طلب کر کہ وہ آپ کو دلی دھیان بھی نصیب کرے۔

قاضی عیاضؒ نے ایک انوکھی بات کہی ہے کہ ذکر بالقلب میں کوئی ثواب نہیں اور تعجب کی بات یہ ہے کہ امام طیبیؒ جیسے آدمی نے اس پر یہ فرمایا کہ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں یہ بالکل برحق بات ہے۔

لیکن ممکن ہے کہ ان دونوں بزرگوں کا کلام محمول ہو اس ذکر پر جس کے بارے میں شریعت کا مقررہ حکم یہ ہے کہ اپنے آپ کو سنانا ضروری ہے جیسے کہ علامہ جزریؒ حصن میں رقمطراز ہیں: ہر وہ ذکر جو شرع میں مامور بہ ہے واجب ہو یا مستحب ہو اس کا اس وقت تک اعتبار نہیں جب تک اس کا تلفظ نہ ہو اور ذاکر اسے خود نہ سن لیوے۔اھ۔

لہٰذا مطلقاً یہ کہنا کہ ذکر قلبی میں ثواب نہیں درست نہیں چنانچہ ابو یعلیٰؒ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں: وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت فضلؓ سے فرمایا: **الذكر الخفى الذى لا يسمعه الحفظة سبعون ضعفا اذا كان يوم القيمة جمع الله**

الخلائق لحسابهم وجاء ت الحفظة بما حفظوا وكتبوا قال لهم: انظروا هل بقى له من شيءٍ؟ فيقولون: ما تركنا شيئاً مما علمناه وحفظناها الا وقد أحصيناه وكتبناه فيقول الله: ان لك عندى حسنا لا تعلمه، وانما اجريك به وهو الذكر الخفى اھ''۔

یعنی ذکرِ خفی جس کو ملائکہ حفظہ کے علاوہ دیگر مخلوق نہ سنے وہ ستر گنا زیادہ فضیلت رکھتا ہے جب روز قیامت ہوگا اور اللہ تعالیٰ ساری مخلوق کو حساب کیلئے جمع فرمالے گا اور حفظہ فرشتے اپنے محفوظ کردہ اعمال لے کر حاضر ہو جائیں گے اللہ تعالیٰ ان سے ارشاد فرمائے گا ۔دیکھو میرے اس بندے کے کچھ اعمال تمہارے پاس باقی تو نہیں؟ تو وہ عرض کریں گے یا اللہ! ہمارے علم کے اندر اس کے جو جو اعمال تھے وہ ہم نے ان صحیفوں میں درج کر کے محفوظ کر لیے ہیں ہم نے کچھ چھوڑا نہیں ہے۔تب اللہ فرمائے گا ہاں! آپ کا میرے پاس ایک ایسا عمل ہے جس کو تو نہیں جانتا اس کا بدلہ میں ہی آپ کو دوں گا اور وہ عمل آپ کا ذکر خفی ہے انتہیٰ۔اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ''**الذكر الخفى خير من الذكر الجلى**'' کا یہی مطلب ہے۔یعنی حضرت انسؓ سے اور انہوں نے ابو ہریرہؓ کی مرفوع حدیث میں ان الفاظ سے ذکر کی ہے ''**اذا مررتم بریاض الجنة فارتعوا'' قلت وما رياض الجنة؟ قال المساجد قلت: وما الرّتع يا رسول الله قال: سبحان الله والحمد لله ولا اله الا الله والله اكبر''**۔

۲۲۷۲: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم مَنْ قَعَدَ مَقْعَدًا لَمْ يَذْكُرِ اللّٰهَ فِيْهِ كَانَتْ عَلَيْهِ مِنَ اللّٰهِ تِرَةً وَمَنِ اضْطَجَعَ مَضْجَعًا لَا يَذْكُرُ اللّٰهَ فِيْهِ كَانَتْ عَلَيْهِ مِنَ اللّٰهِ تِرَةً۔ (رواہ ابو داود)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ٤/٢٦٤ حديث رقم ٤٨٥٦۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''جو شخص'' کسی مجلس میں بیٹھے اور اس میں اللہ کو یاد نہ کرے تو اس میں اس کا بیٹھنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی قضا وقدر کے سبب سے اس کے لئے حسرت اور ٹوٹے کی بات ہوگی اور جو شخص اپنی خوابگاہ میں لیٹے اور اس میں اللہ کو یاد نہ کرے تو یہ اللہ کی طرف سے اس کے لئے حسرت اور ٹوٹے کی بات ہوگی۔'' (ابوداؤد)

تشریح: قوله: من قعدمقعدا ......من الله ترة: ''مقعدا'' یہ ظرف ہے یعنی مجلس یا مصدر میمی ہے بمعنی تعود ۔(**ولم يذكر الله فيه**) یعنی اس مجلس میں اور اس بیٹھنے کے دوران (**كانت**) بلفظ مونث بتاویل ''**قعدةٌ**'' اور ایک نسخہ ''**كان**'' مذکر لفظ کے ساتھ ہے بتاویل ''**قعود**''۔(**عليه**) یعنی ''**على القاعد**'' ہٗ ضمیر کا مرجع قاعد ہے۔(**من الله**) یعنی اللہ کے حکم، امر قضاء وقدر کی جہت سے (**ترةً**) یہ لفظ ''تا'' کے کسرہ اور ''را'' کی تخفیف کے ساتھ ہے جس کا معنی عتاب اور خفگی ہے یا نقصان اور حسرت کیلئے مستعمل ہے جس کا مادہ اشتقاق ''**وتر**'' بھی ''**نقص**'' ہے۔چنانچہ کہا جاتا ہے ''**وتره حقه**'' بمعنی **نقصه** اور یہ حسرت وافسوس کا سبب ہے اور اس معنی میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**ولن يتركم اعمالكم**﴾ [محمد:٣٥] اور اس لفظ کے آخر میں جو ''تا'' مربوطہ ہے یہ دراصل ''فائے کلمہ'' سے حذف شدہ حرف علت کے عوض ہے بعینہٖ ''**عدةٌ**'' کی طرح اور یہ منصوب ہے بنا برخبریت فعل ناقص۔

اور ایک نسخہ میں بالرفع بھی ہے بنا بریں کہ ''**كان**'' تامہ بمعنی وجد ہو۔

قوله: ومن اضطجع مضجعًا ......من الله ترة: یہ ظرف بمعنی **موضع وضجعة وافتراش** ہے یعنی لیٹنے اور دراز ہونے کی جگہ (**لا يذكر الله فيه كانت**) ضمیر کا مرجع **اضطجاعة** ہے یعنی لیٹنا یا اس سے مراد عدم ذکر اللہ ہے جو ''**لا يذكر الله**'' سے مفہوم ہے۔ (**عليه من الله ترةً**) گذشتہ ''**ترة**'' میں مذکور دونوں اعرابی صورتوں اور توجیہوں کے ساتھ۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں ''کانت'' دونوں جگہوں میں ابوداؤد اور جامع الاصول دونوں کتابوں کے اندر بلفظ تانیث وارد ہے اور اس کے بعد آنے والی دو حدیثوں میں ان دونوں کتابوں کے اندر بلفظ مذکر ہے۔

میں کہتا ہوں کہ بصورت تانیث لفظ ''کانت'' اور رفع ''ترۃٌ'' مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ''کانت'' کے اندر کی ضمیر کا مرجع القعدۃ ہو یا الاضطجاعۃ ہو جائے۔

جو لفظ ''القعدۃ'' اور ''الاضطجاعۃ'' اس صورت میں ''مقرۃ'' مبتدا ہوگا اور جار مجرور ظرف مستقر اس کی خبر ہوگی اور مبتدا خبر مل کر جملہ محلاً منصوب کانت کی خبر ہے۔

اور رہی وہ روایت جس میں ''کان'' بلفظ مذکر اور ''ترۃً'' منصوب ہے جیسے کہ مصابیح میں ہے تب تو ظاہر ہے۔ اور جار مجرور کا تعلق ''ترۃ'' کے ساتھ ہے۔ آنے والی احادیث سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ ''کانت'' کی تانیث کی خبر کی تانیث کی وجہ سے ہے۔ پھر مذکورہ دونوں مکانوں کے ذکر سے مقصود تمام جگہوں کا استیعاب ہے جیسے دو زمانوں ''بکرۃ وعشیا'' کا اطلاق کیا جاتا ہے اور مراد استیعاب ازمنہ ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ جس نے لحہ بھر کسی بھی جگہ کسی بھی حالت میں مثلاً بیٹھنے، کھڑے ہونے، سونے کی حالت میں تو یہ اس کیلئے حسرت وندامت کا باعث ہوگا۔ کیونکہ اس نے ذکر کا عظیم ثواب ضائع کر دیا چنانچہ ایک حدیث شریف میں وارد ہے کہ اہل جنت کو اس بات کے علاوہ کسی بات پر افسوس نہیں ہوگا کہ انہوں نے دنیا میں کوئی ایک لحہ کو اللہ کے ذکر کے بغیر گذارا۔

پھر اس حدیث کے اندر پہلے جملہ کے ساتھ ''لم'' اور دوسرے جملہ کے ساتھ ''لا'' ذکر کیا گیا ہے یہ ''تفنن'' کی غرض سے ہے۔ اور یونہی اگلی دونوں حدیثوں میں اسی غرض سے ایسا کیا گیا ہے۔

امام خطابیؒ فرماتے ہیں کہ ''لم تراعوا'' کا معنی ہے ''لا تخافوا'' خوف مت کرو اور عرب ''لم'' کو ''لا'' کی جگہ استعمال کرتے رہتے ہیں۔

۲۲۷۳: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا مِنْ قَوْمٍ يَقُوْمُوْنَ مِنْ مَّجْلِسٍ لَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ فِيْهِ اِلَّا قَامُوْا عَنْ مِثْلِ جِيْفَةِ حِمَارٍ وَكَانَ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً۔ (رواه احمد وابوداود)

اخرجه اخرجه ابوداؤد فی السنن ۲٦٤/٤ حديث رقم ٤٨٥٥ واحمد فی المسند ٣٨٩/٢۔

ترجمہ: ''اور ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا'' جو لوگ کسی نشست کے بعد اٹھیں اور اس نشست میں خدا کا ذکر نہ ہو تو وہاں سے ان کا اٹھنا مردار گدھے کی مانند ہے اور یہ حسرت وافسوس کا سبب ہوگا۔'' (ابوداؤد)

تشریح: **قوله: ما من قوم يقومون ...... مثل جيفة حمارٍ)** یعنی ان کا اٹھنا ایسا ہی ہے یہاں ''قاموا'' ''تجاوزوا'' اور ''تعبدوا'' کے معنی کو متضمن ہے اس لئے ''عن'' اس کے صلہ میں لایا گیا ہے۔ یہ امام طیبیؒ کی تحقیق ہے۔

یعنی ان کا یہ قیام مردار کھا کر منتشر ہونے والوں کے قیام کی طرح ہے وہ مردار جو گندگی اور نجاست کی انتہا پر ہے۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ گدھے کی تخصیص اس بنا پر ہے کہ یہ تمام مردار جانوروں میں انسانوں کے زیادہ قریب ہے۔ انتہی۔ یا اس لئے کہ یہ تمام حیوانات میں بلید تر ہے یا اس لئے کہ اس کا شیطان کے ساتھ اختلاط ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کے ہنہنانے کے وقت خدائے رحمٰن کی پناہ مانگی جاتی ہے۔

قوله: وكان عليهم حسرة: مذکورہ بالا دونوں اعرابی وجہوں کے ساتھ

روایات باب: نسائی، ابن حبان نے بھی اس کو روایت کیا ہے تاہم ان کے الفاظ یہ ہیں: **ما من قوم جلسوا مجلسا وتفرقوا ولم يذكروا الله فيه الا كأنما تفرقوا عن جيفة حمار وكان عليهم حسرة يوم القيمة وما مشىٰ احدٌ ممشى لم يذكر الله فيه الا كان عليه ترة وما اوى احد الى فراشه ولم يذكر الله فيه الا كان عليه ترة**

یہ اور اس جیسی ایک اور روایت جس کو حضرت معاذؓ نے مرفوعاً روایت کیا ہے وہ ہے کہ اہل بہشت کو کوئی حسرت نہیں (یعنی قیامت والے دن جیسے کہ ایک روایت میں ہے) مگر اس گھڑی پر جس کو انہوں نے اللہ کے ذکر کے بغیر گذارا ہوں۔ (طبرانی نے اس کو روایت کیا ہے)۔

۲۲۷۴: **وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا جَلَسَ قَوْمٌ مَجْلِسًا لَمْ يَذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْهِ وَلَمْ يُصَلُّوْا عَلٰى نَبِيِّهِمْ اِلَّا كَانَ عَلَيْهِمْ تِرَةً فَاِنْ شَاءَ عَذَّبَهُمْ وَاِنْ شَاءَ غَفَرَ لَهُمْ۔** (رواه الترمذى)

اخرجه الترمذى فى السنن ١٢٩/٥ حديث رقم ٣٤٤٠ واحمد فى المسند ٤٥٣/٢۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا'' جو لوگ کسی مجلس میں بیٹھیں اور وہاں نہ تو اللہ کا ذکر کریں اور نہ اپنے نبی پر درود بھیجیں تو وہ مجلس ان کے لئے باعث افسوس ہی ہوگی اب چاہے تو اللہ تعالیٰ انہیں عذاب میں مبتلا کرے اور چاہے تو انہیں بخش دے۔'' (ترمذی)

تشریح: **قوله: لم يذكروا الله فيه ولم يصلوا على نبيهم** :یہ تخصیص بعد التعمیم ہے (**الا كان**) یعنی وہ مجلس (**عليهم ترة فان شاء عذبهم**) یعنی ان کے سابقہ گناہوں کی وجہ سے اور آنے والے تقصیرات کی وجہ سے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ (**ترةٌ**) سے مراد ہے ''**تبعة**'' ناراضگی اور خفگی ہے۔

اور امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ''**ان شاء عذبهم**'' یہ تشدید اور تغلیظ کے طور پر فرمایا گیا اور یہ بھی احتمال ہے کہ شاید اہل مجلس سے کوئی ایسی بات سرزد ہو جائے جو موجب عقوبت ہو اور اس حدیث میں ''**صلاة على الرسول**'' کے ذکر میں اشارہ ہے باری تعالیٰ کے قول: ﴿**ولو انهم اذ ظلموا انفسهم جاء وك فاستغفروا الله واستغفرلهم الرسول لوجدوا الله توابًا رحيما**﴾[النساء:٦٤] کی طرف۔

قوله: و ان شاء غفرلهم :اور چاہے تو اپنی رحمت اور فضل کی بنا پر انہیں بخش دے اور اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جب وہ ذکر کرتے ہیں تو یقینی طور پر وہ عذاب سے بچ جائیں گے بلکہ حتمی طور پر مغفرت ہوگی۔

۲۲۷۵: **وَعَنْ اُمِّ حَبِيْبَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ كُلُّ كَلَامِ ابْنِ اٰدَمَ عَلَيْهِ لَا لَهُ اِلَّا اَمْرٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ نَهْىٌ عَنْ مُّنْكَرٍ اَوْ ذِكْرُ اللّٰهِ۔** (رواه الترمذى وابن ماجة وقال الترمذى هذا حديث غريب)

اخرجه ابن ماجه فى السنن ١٣١٥/٢ حديث رقم ٣٩٧٤۔

ترجمہ: ''اور حضرت امّ حبیبہؓ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا'' ابن آدم کا ہر کلام اس کے لئے وبال ہے علاوہ اس کلام کے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یا اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لئے ہو۔'' اس روایت کو ترمذی اور ابن ماجہ نے نقل کیا نیز ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔''

تشریح: **قوله : كل كلام ابن آدم عليه لا له**: یعنی اس کلام کا نقصان اور وبال اس پر ہوگا یعنی ''**على**'' ضرر کیلئے ہے اور بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ معنی یہ ہے ''**يكتب عليه**'' (**ليس له**) یعنی اس میں اس کا نفع نہیں یا وہ اس کیلئے نہیں لکھا جائے گا۔ یا

سابقہ جملہ مضمون کیلئے تاکید ہے۔

قولہ :الا امرٌ بمعروفٍ......:اوامر شرعیہ میں سے جن کے اندر غیر کا نفع ہو(أونهی ما عن منكر) امور منہی عنہا سے لوگوں کی موعظت اور نصیحت ہو(أو ذکر اللّٰه) یعنی جن اذکار الٰہیہ میں اللہ کی رضاء اور خوشنودی ہو جیسے تلاوۃ قرآن کریم صلوٰۃ علی النبیؐ تسبیح، تہلیل اور والدین کیلئے دعا اور اس جیسی دیگر باتیں۔

اس حدیث مبارکہ کے ظاہر سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ لوگوں کیلئے کلام کا کوئی نوع مباح نہ ہوتا ہم اگر اس حدیث کو مبالغہ اور تاکید فی الزجر پر محمول کیا جائے تو پھر یہ اشکال وارد نہ ہوگا۔البتہ بعض نسخے ایسے ہیں جن میں ''علیه'' کا لفظ نہیں ہے ان کے مطابق کوئی اشکال نہیں ہے اور مقصود بھی ظاہر ہے۔

کہا گیا ہے کہ ''لاله'' کا لفظ ''علیه'' کی تفسیر ہے اور یہ بات محقق ہے کہ مباح کلام کا مآل نفع سے خالی ہے۔

یا یہ مطلب ہوگا کہ ابن آدم کا سارا کلام اس کیلئے حسرت کا باعث ہوگا اس میں اس کا کوئی نفع نہیں ہوگا سوائے مذکورہ اذکار کے تب یہ باقی ذکر شدہ احادیث کے موافق ہو جائے گا۔اور یہ باری تعالیٰ کے قول:﴿لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّنْ نَّجْوٰهُمْ......﴾ [النساء:١١٤] کے مطابق ہے اور اسی سے امر مباح بارے میں شراح کا اضطراب رفع ہوگا۔

٢٢٧٦:وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا تُكْثِرُوْا الْكَلَامَ بِغَيْرِ ذِكْرِ اللّٰهِ فَإِنَّ كَثْرَةَ الْكَلَامِ بِغَيْرِ ذِكْرِ اللّٰهِ قَسْوَةٌ لِلْقَلْبِ اِنَّ أَبْعَدَ النَّاسِ مِنَ اللّٰهِ الْقَلْبُ الْقَاسِي۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/٥٢٥ الحديث رقم ٢٤١١۔

ترجمہ:''اور حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا'' ذکر اللہ کے علاوہ زیادہ کلام نہ کرو کیونکہ ذکر اللہ کے علاوہ کلام کی کثرت دل کی سختی کا باعث ہے اور یاد رکھو کہ آدمیوں میں اللہ سے دور سب سے وہ شخص ہے جس کا دل سخت ہو۔'' (ترمذی)

تشریح: قولہ :لا تکثر الکلام بغیر......قسوۃ للقلب :اس میں اشارہ ہے کہ کچھ کلام مباح ہوتا ہے اور وہ کلام جو مقصود ہو(فان کثرۃ الکلام بغیر ذکر اللّٰه قسوۃ) یعنی قساوۃ قلبی کا سبب ہے اور ''قسوۃ'' سماع حق سے گریز مخلوق سے اختلاط کی طرف میلان، خشیت الٰہی کی کمی، عجز وزاری کا فقدان اور اس دار البقاء سے کثرۃ غفلت کو کہتے ہیں۔

قولہ :وان ابعد الناس من اللّٰه القلب القاسی: یعنی اللہ تعالیٰ کی نظر رحمت اور نگاہ کرم سے دور(القلب القاسی) یعنی صاحب قلب قاسی اور یا یہ مطلب ہے ''ابعد قلوب الناس القلب القاسی'' اور یا یہ مراد ہے۔''ابعد الناس من له القلب القاسی''۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ قلب کا اطلاق کر کے صاحب قلب مراد لیا جائے۔اس لئے کہ آدمی قلب ہی سے ہے چنانچہ کہا جاتا ہے:''المرء باصغریه'' اور اس سے مراد قلب اور لسان ہے۔تب یہ ضرورت بھی نہ رہے گی کہ موصول بمعہ بعض صلہ حذف ہو۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْم بَعْدِ ذٰلِكَ......﴾ [البقرة:٧٤] اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ......﴾ [الحديد:١٦]

٢٢٧٧:وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ لَمَّا نَزَلَتْ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِيْ بَعْضِ اَسْفَارِهٖ فَقَالَ بَعْضُ اَصْحَابِهٖ نَزَلَتْ فِي الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ لَوْ عَلِمْنَا اَيُّ الْمَالِ خَيْرٌ فَنَتَّخِذُهٗ فَقَالَ اَفْضَلُهٗ

لِسَانٌ ذَاكِرٌ وَقَلْبٌ شَاكِرٌ وَزَوْجَةٌ مُؤْمِنَةٌ تُعِينُهُ عَلٰى اِيْمَانِهٖ۔ (رواه احمد والترمذی وابن ماجة)

اخرجه ابن ماجه فی السنن ۵۹۶/۱ حدیث رقم ۱۸۵۶ مع تغییر۔ واحمد فی المسند ۲۷۸/۵۔

ترجمہ: ''اورحضرت ثوبانؓ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت والذین یکنزون الذھب والفضة الایة جولوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں......نازل ہوئی تو اس وقت ہم لوگ نبی کریم ﷺ کے ہمراہ کسی سفر میں تھے بعض صحابہؓ نے کہا کہ سونے اور چاندی کے بارے میں تو یہ آیت نازل ہوگئی اور ہمیں ان چیزوں کا حکم اوران کی مذمت معلوم ہوئی کاش ہمیں یہ معلوم ہوجائے کہ سونے اور چاندی کے علاوہ اورکون سا مال بہتر ہے تاکہ ہم اسے جمع کریں؟ آپ ﷺ نے ارشادفرمایا ''خدا کا ذکر کرنے والی زبان شکرادا کرنے والا دل اور مسلمان بیوی جو اپنے شوہر کے ایمان کے مددگار رہو'' بہترین مال ہیں'' (احمد، ترمذی، ابن ماجہ)

تشریح: **قوله: لما نزلت......فنتخذه:**

یعنی یہ آیت کریمہ سونے اور چاندی کے بارے میں اتری ہے۔ اور ہم نے اس کا حکم اور مذمت معلوم کر لی ہے۔(لو علمنا)''لو'' تمنائیہ ہے۔(ای المال خیرٌ) یہ مبتدااور خبر جملہ اسمیہ قائم مقام دومفعولوں کا علمنا کیلئے تعلیق کے طور پر (فنتخذهٗ) ''فا'' جواب تمنی کیلئے ہے اوراس کے بعد ''ان'' مقدر ہے ''نتخذ'' اس کی وجہ سے منصوب ہے۔

کہتے ہیں اگر چہ بظاہر یہ سوال تعیین مال کے بارے میں ہے۔لیکن ان کی مراد یہ تھی کہ جب ساری حاجتیں، کونسا مال نفع بخش ہے ۔اس لئے آگے مذکورہ جواب دیا گیا تو یہ ایک طرح کا اسلوب حکیم کے طرز کا جواب ہے۔

قوله: افضله لسانٌ ذاكرٌ، وقلبٌ شاكر: یعنی افضل مال یا وہ بہترین چیز جس کو انسان سرمایہ بنائے۔

یعنی اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے والی زبان، قدردان دل اور ایمان والی رفیقۂ حیات۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ **افضله** کی ضمیر مجرور کا مرجع ''مال'' ہے۔نافع کی تاویل یعنی اگر ہمیں نفع کے اعتبار سے سب سے افضل چیز کے بارے میں معلوم ہوتا تو ہم اسے اپنے لئے ذخیرہ بنالیتے، یہی راز ہے کہ اللہ تعالیٰ ''**من اتی بقلبٍ سلیمٍ**'' کی ''**یوم لا ینفع مالٌ ولا مبنون**'' سے استثناء کی ہے۔

اور قلب جب آفات سے سالم ہو تو وہ اللہ کا شکر گذار رہتا ہے پھر یہ زبان تک سرایت کرتا ہے اور وہ اللہ کی ثنا میں تر رہتی ہے اور یہ سب کچھ فراغ قلب اور ایک ایسے معاون رفیق کے بغیر ممکن نہیں جو اللہ کی اطاعت میں اس کے ساتھ تعاون کرے۔انتہی کلام۔

اسی وجہ سے فرمایا

قوله: زوجةٌ مؤمنة تعينه علی ایمانه: یعنی اس کے دین میں اس کے ساتھ تعاون کرتی ہے۔ بایں طور کہ اسے نماز، روزہ اور دیگر عبادات کی یاددہانی کراتی ہے اوراسے زنا اور دیگر معاصی سے باز رکھتی ہے۔

آپ ﷺ نے مذکورہ جواب اس لئے دیا کہ کیونکہ مال انسان کیلئے نفع بخش نہیں اور مذکورہ اشیاء سے بڑھ کر انسان کیلئے کوئی فائدہ کی چیز نہیں۔

امام طیبیؒ کے کلام سے یہ ظاہر ہورہا ہے کہ ان کے نسخہ میں ''قلب'' کا ذکر ''لسان'' کے ذکر پر مقدم ہے اس لئے انہوں نے اس پر بنیاد رکھ کر یہ بات فرمائی ہے ورنہ تو یہ کہا جائے گا کہ جب وہ لسان سے اللہ کو یاد کرے گا تو یہ اس کے دل تک سرایت کرجائے گا پھر وہ اس احسان پر شکر کرے گا پھر اللہ اس کو ایسے مونسہ بیوی عطا کرے گا جو اس کے ساتھ اس کے دین میں اعانت کرے گی یہی مریدین کا طریقہ

ہے اور اکثر سالکین کا مسلک ہے، اور جو امام طیبیؒ نے ذکر کیا ہے وہ مرادین مجذوبین کا راستہ ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وقليل ماهم ......﴾ ﴿وقليل من عبادى الشكور......﴾

الفصل الثالث:

۲۲۷۸: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ خَرَجَ مُعَاوِیَةُ عَلٰی حَلْقَةٍ فِی الْمَسْجِدِ فَقَالَ مَا اَجْلَسَکُمْ قَالُوْا جَلَسْنَا نَذْکُرُ اللّٰهَ قَالَ اللّٰهِ مَا اَجْلَسَکُمْ اِلاَّ ذٰلِكَ قَالُوْا اللّٰهِ مَا اَجْلَسَنَا غَیْرُهٗ قَالَ اَمَا اِنِّیْ لَمْ اَسْتَحْلِفْکُمْ تُهْمَةً لَّکُمْ وَمَا کَانَ اَحَدٌ بِمَنْزِلَتِیْ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اَقَلَّ عَنْهُ حَدِیْثًا مِّنِّیْ وَاِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ خَرَجَ عَلٰی حَلْقَةٍ مِنْ اَصْحَابِهٖ فَقَالَ مَا اَجْلَسَکُمْ هٰهُنَا قَالُوْا جَلَسْنَا نَذْکُرُ اللّٰهَ وَنَحْمَدُهٗ عَلٰی مَا هَدَانَا لِلْاِسْلَامِ وَمَنَّ بِهٖ عَلَیْنَا قَالَ اللّٰهِ مَا اَجْلَسَکُمْ اِلاَّ ذٰلِكَ قَالُوْا اللّٰهِ مَا اَجْلَسَنَا اِلاَّ ذٰلِكَ قَالَ اَمَا اِنِّیْ لَمْ اَسْتَحْلِفْکُمْ تُهْمَةً لَّکُمْ وَلٰکِنَّهٗ اَتَانِیْ جِبْرِیْلُ فَاَخْبَرَنِیْ اَنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ یُبَاهِیْ بِکُمُ الْمَلَائِکَةَ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى واحمد فى المسند ۹۲/٤۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت امیر معاویہؓ ایک حلقہ کے پاس پہنچے جو ایک مسجد میں جما ہوا تھا انہوں نے حلقہ والوں سے پوچھا کہ تمہیں یہاں کس چیز نے بیٹھایا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ''ہم یہاں اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کے لئے بیٹھے ہوئے ہیں'' حضرت امیر معاویہؓ نے کہا کہ ''بخدا تمہیں خدا کے ذکر ہی نے یہاں بیٹھایا ہے؟ انہوں نے کہا کہ خدا کی قسم! اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمیں صرف خدا کے ذکر ہی نے یہاں بیٹھایا ہے؟ حضرت معاویہ نے کہا ''دیکھو! میں نے تم پر تہمت رکھنے کے لئے تمہیں قسم نہیں دی بلکہ میں نے نبی کریم ﷺ کے اتباع کے پیش نظر قسم کھلوائی ہے کہ آپ ﷺ نے بھی اسی طرح کہا تھا اور پھر معاویہؓ نے کہا کہ نبی کریم ﷺ کی حدیث کو نقل کرنے کے سلسلہ میں میرے برابر کوئی نہیں تھا یعنی میں احتیاطاً بہت کم احادیث روایت کرتا تھا کہ مبادا کہیں کوئی کمی و زیادتی ہو جائے اور پھر اس کا وبال میری گردن پر ہو اس بات سے حضرت معاویہؓ کا مقصد یہ آگاہی تھی کہ روایت حدیث میں مجھ سے کوئی بھول نہیں ہوتی کیونکہ نسیان کا احتمال تو اسی شخص کے لئے ہوتا ہے جو بہت زیادہ روایت کرے اور ظاہر ہے کہ میں ایسا نہیں تھا بہرکیف حضرت معاویہؓ نے کہا کہ اسی طرح ایک دن نبی کریم ﷺ اپنے صحابہؓ کے ایک حلقہ کے پاس پہنچے آپ نے ان سے ارشاد فرمایا کہ ''یہاں تمہیں کس چیز نے بیٹھایا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا! ہم یہاں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اور ہم اس کی اس بات کی تعریف کرتے ہیں کہ اس نے ہمیں اسلام کی ہدایت بخشی اور اس کے ذریعہ ہم پر احسان کیا'' نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بخدا تمہیں صرف اسی چیز نے یہاں بیٹھایا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ خدا کی قسم اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہمیں اس چیز نے یہاں بٹھایا ہے'' نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دیکھو میں تم پر جھوٹ کی تہمت رکھنے کے لئے تم سے قسم نہیں کھلوائی بلکہ میرے پاس جبرئیل آئے اور انہوں نے مجھے بتایا کہ اللہ عز و جل اپنے فرشتوں کے سامنے تم پر فخر کرتا ہے۔'' (مسلم)

تشریح: قوله: خرج معاوية على حلقة فى المسجد : حلقہ لام کے سکون کے ساتھ ہے اور کبھی اس کو فتحہ بھی دیا جاتا ہے دائرے کے شکل میں بیٹھے لوگوں کی جماعت کو کہتے ہیں۔ جو آمنے سامنے بیٹھے ہوئے اپنی اجتہاد سے ذکر کر رہے تھے۔

قوله: فقال: ما أجلسكم: یعنی وہ کونسا سبب ہے جس نے تمہیں اس خاص کیفیت پر بیٹھنے پر مجبور کیا ہے "ما" استفہامیہ ہے۔

قوله: جلسنا نذكر الله قال: آللّٰه ما اجلسكم الا ذلك: یعنی ہمارے بیٹھنے کا باعث اللہ کے ذکر کیلئے اجتماع ہے۔

"آللّٰه" شروع میں ہمزہ ممدودہ اور آخر میں جر کے ساتھ **(ما اجلسكم الا ذالك)** یہ "ما" نافیہ ہے۔ سید جمال الدین فرماتے ہیں کہ یہ بالجر درست ہے کیونکہ محقق شریف نے اپنے حاشیہ میں لکھا ہے کہ ہمزۂ استفہام جب حرف قسم کا بدل بن کر آئے تو اس کے ساتھ جر واجب ہے۔ انتہی۔ نیز مشکوٰۃ کے صحیح نسخوں اور صحیح مسلم میں بالجر واقع ہے۔ جبکہ مشکوٰۃ کے بعض نسخوں میں بالنصب وارد ہے۔ انتہی۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ سید شریف کا مشکوٰۃ کے اوپر جو حاشیہ ہے وہ طیبی کا خلاصہ ہے اور یہ بات لوگوں میں مشہور بھی ہے لیکن یہ بعید ہے اولاً تو اس لئے کہ اس کا ذکر کی تالیفات میں نہیں ہے اور ثانیاً اس لئے کہ وہ اپنی جلالت شان کے باوجود ایسا کیسے کر سکتا ہے کہ کچھ تصرف کئے بغیر مجرد اختصار کرے۔

نیز علامہ عفیف الدینؒ کے نسخہ میں چاروں جگہ نصب ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں "آللّٰه" بالنصب ہے اور تقدیر ہے "**اتقسمون باللّٰه**" تو "با" حرف جر کو حذف کر کے اسے فعل کے ساتھ ملایا گیا بطور حذف وایصال کے پھر فعل کو بھی حذف کر لیا گیا۔ انتہی۔

حافظ ابن حجرؒ نے گرفت کی ہے تاہم ان کی گرفت میں تکلف اور سینہ زوری ہے۔

قوله: قالوا: آللّٰه ما أجلسنا غيره: یعنی ہاں ہمیں اللہ کی قسم ہے۔ **(ما أجلسنا غيره)** یہاں ہمزہ "ای" کی جگہ واقع ہوا ہے مشاکلت کی غرض سے۔

لیکن یہ بات مخفی نہیں ہے کہ اس کی ضرورت نہیں کیونکہ ہمزہ حرف قسم کے بدلہ میں آیا ہے تو پھر مشاکلت چہ معنی دارد ہاں یہ بات ضرور ہے کہ جواب میں ایک طرح کا اطناب واقع ہوا ہے چنانچہ "نعم" "ای" نہیں کہا گیا۔

قوله: اما انی لم استحلفكم...... حديثا منی: (ما) یہ تخفیف کے ساتھ ہے حرف تنبیہ ہے (انی) یہ حرف بالکسر ہے صحیح نسخوں میں۔

اور رہا حافظ ابن حجرؒ کا یہ قول کہ "أما" یا استفتاحیہ ہے اور یا بمعنیٰ "حقًّا" ہے اور اس کے بعد "انی" معنی اول کے مناسبت سے مکسور اور معنی ثانی کے مناسبت سے مفتوح یہ ان کی اپنی اختراع ہے تاہم "اما" کا حقًّا کے معنی میں ہونا کسرہ کے منافی نہیں۔ **(لم استحلفكم تهمةً لكم)** "تهمة" کا لفظ "ہا" کے سکون کے ساتھ ہے اور کبھی اس کو فتحہ بھی دیا جاتا ہے۔

"نہایہ" میں ہے کہ "**تهمة**" کا لفظ کبھی مفتوح الہاء بھی استعمال ہوتا ہے جو "وہم" کے مادہ سے "**فعلةٌ**" کا ہم وزن ہے اس کے شروع کی "تا" واؤ سے مبدل ہے۔ کہا جاتا ہے "**اتّهمته**" یعنی جو اس کی طرف منسوب ہے میں نے اس کو اس میں خیال کیا۔ اور قاموس میں ہے کہ "**تهمةٌ**" "**همزةٌ**" کی طرح ہے، اور مطلب یہ ہے کہ میں نے تم سے قسم اس لئے نہیں لی کہ میں تمہیں متہم بالکذب کر رہا ہوں بلکہ میں نے تو فقط متابعت اور مشابہت رسول اللہ ﷺ کیلئے ایسا پوچھا ہے چنانچہ ایسا واقعہ حضور ﷺ اور صحابہؓ کے درمیان بھی ہوا ہے۔ اور انہوں نے آپ ﷺ نے اپنا قرب نقل کر حدیث کا تذکرہ کر کے اپنے اوپر سے تہمت کذب کی نفی کی ہے اپنے نقل کردہ کلام میں۔ **(وما كان احدٌ بمنزلتی)** یعنی جو قرب رسول کے لحاظ سے میرا مرتبہ ہے۔ **(من رسول اللّٰه)** کیونکہ ایک تو وہ ام المؤمنین حضرت ام حبیبہؓ کے بھائی تھے اسی وجہ سے مولانا روم نے مثنوی میں "خال المؤمنین" سے انہیں تعبیر کیا ہے۔ اور اس لئے بھی کہ وہ جلیل القدر لوگوں میں سے ایک تھے کو کتابت وحی پر مامور تھے۔ **(أقل)** یہ "کان" کی خبر ہے۔ **(عنه)** یعنی رسول اللہ ﷺ سے۔ **(حديثا منّی)** کیونکہ میں

حدیث کے نقل میں احتیاط سے کام لیتا تھا ورنہ ان کی قربت کا تقاضا تو یہ تھا۔ یہ روایت حدیث میں سب سے آگے ہوتا اور یہ شاید اس لئے بھی کہ یہ روایت بالمعنی کو نا جائز تصور کرتے تھے۔

قوله: وان رسول الله ﷺ ...... من أصحابه: امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ مقصد یہ ہے کہ میں نے تم سے قسم نہیں اٹھوایا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکلے۔

لكنّه أتاني جبرئيل ''اور درمیان میں'' **وما كان** ''......۔ جملہ معترضہ ہے یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ بات نہیں بھولے اور'' **ان رسول الله** '' **انی لم استحلفكم** کے ساتھ متصل ہے۔ جیسے کہ استدراک مستدرک کے ساتھ متصل ہوتا ہے۔

قوله: ما أجلسكم الا ذلك: انہوں نے جواب میں عرض کیا کہ ہم بیٹھے اللہ کو یاد کر رہے ہیں اور اللہ پاک نے ہمیں جو اسلام کی ہدایت سے نوازا اور اسلام کی وجہ سے ہم پر احسان کیا ہم اس پر اللہ پاک کی تعریف کر رہے ہیں۔ یعنی اللہ پاک نے ہم پر اپنی یاد اور اسلام کے سبب ہم پر احسان کیا۔ (**علينا**) یعنی لوگوں میں ہمیں ہدایت عطا فرمائی۔ جیسا کہ اللہ پاک اہل جنت کا مقولہ حکایت فرماتے ہیں: ﴿**الحمد لله الذى هدانا للاسلام وما كنا لنهتدى به لولا ان هدانا الله**﴾[الاعراف:۴۳] یہ آیت کریمہ صحابہ کرامؓ کے اس شعر کی ترجمانی ہے۔ ''**لو لا الله ما اهتدينا۔ ولا تصدقنا ولا صلينا**''۔

(**فقال آللّٰه...... ذلك**) شاید آپ نے اپنی اس بات سے اخلاص کا ارادہ کیا ہے (یعنی خالصتاً تم اللہ ہی کے ذکر کیلئے جمع ہو اور کوئی غرض نہیں۔

قوله: اما انى لم استحلفكم تهمة لكم: کیونکہ مؤمنین کی بات کی صداقت کو پرکھنے کیلئے قسم لینا یہ مؤمنین کے ساتھ حسن ظن کے منافی ہے۔

قوله: ولكنه اتانى جبريل...... الملائكة: یعنی ''لکنہ'' میں ضمیر ضمیر شان ہے اور ایک نسخہ میں لکنی بھی منقول ہے۔

بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ ذاکرین کی وجہ سے اللہ رب العزت کے مباہات کا مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک فرشتوں کو فرماتے ہیں کہ میرے ان بندوں کو دیکھو میں نے ان پر ان کے نفوس' خواہشات' شہوات' شیطان اور اس کے لشکر کو کیسے مسلط کر رکھا ہے اور اس کے باوجود ان کو ترک عبادت وذکر و باطل کی طرف تقویٰ کی مخالفت کیلئے میں نے ان کی ہمت کو تقویت عطا فرمائی ہے۔

تو لہٰذا بنا بریں وہ تم سے زیادہ تعریف کے مستحق ہیں اس لئے کہ تم کو کسی طرح بھی عبادت کیلئے مشقت نہیں اور اس عبادت کا تم سے صدور اس طرح ہوتا ہے جس طرح انسانوں سے سانس کا صادر ہونا (یعنی جس طرح سانس بے قصد از خود کرتا رہتا ہے اس طرح تم سے عبادت بھی از خود بے قصد صادر ہوتی ہے۔

اس سانس لینے میں نفس انسانی کیلئے انتہائی راحت اور خوشگواری ہوا کرتی ہے (اسی طرح تمہارے لئے عبادت راحت کا سبب ہے نہ کہ مشقت کا)۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بات کا مطلب یہ کہ میں تحقیق کرنا چاہتا تھا کہ اس اکٹھے ہونے کا سبب کیا ہے سبب دریافت ہونے کے باوجود قسم لینا مزید پختگی اور تاکید کیلئے ہے نہ کہ کسی تہمت کی وجہ سے جبکہ اصل وضع تحلیف اور قسم لینے کی رفع تہمت ہی کیلئے ہے اس لئے جو شخص متہم ہی نہ ہو تو اس سے قسم بھی نہیں لی جاتی۔

۲۲۷۹: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ بُسْرٍ اَنَّ رَجُلاً قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ شَرَا ئِعَ الْاِسْلَامِ قَدْ كَثُرَتْ عَلَيَّ فَاَخْبِرْنِي بِشَيْءٍ اَتَشَبَّثُ بِهٖ قَالَ لَا يَزَالُ لِسَانُكَ رَطْبًا مِنْ ذِكْرِ اللّٰهِ.

(رواه الترمذی وابن ماجة وقال الترمذی هذا حديث حسن غريب)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵/۱۲۶ حدیث رقم ۳۴۳۵۔ وابن ماجه ۲/۱۲۴۶ حدیث رقم ۳۷۹۳۔

ترجمہ: ''اور حضرت عبداللہ بن بسرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اسلام کے احکام مجھ پر بہت بھاری ہیں یعنی نوافل اتنے ہیں کہ میں اپنے ضعف و عجز کی بنا پر ان کی ادائیگی سے معزور رہوں اس لئے آپ مجھے ایسی چیزیں بتا دیجئے کہ جن کو میں لازم پکڑو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''تمہاری زبان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ہمیشہ تر ''یعنی جاری رہنی چاہئے'' (ترمذی، ابن ماجہ) ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔''

تشریح: **قوله عن عبد الله بن بسر:** لفظ بسر میں باء مضموم اور سین ساکن ہے۔

قوله: ان شرائع الاسلام قد كثرت علي: امام طیبیؒ شریعت لغت میں جاری پانی پر اونٹ کے وارد ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ اور حدیث میں شریعت سے مراد وہ چیز ہے جس کو اللہ پاک نے اپنے بندوں کے لیے ظاہر فرمائی ہیں۔ انتہیٰ کلامہ، اور ظاہر یہاں یہ ہے کہ حدیث مبارکہ میں شریعت سے مراد نوافل ہیں، شریعت سے نوافل مراد لینے کا قرینہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے (قد كثرت علي) ہے اور لفظ کثرت ثاء کے ضمہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ ہے یعنی یا رسول اللہ! مجھ پر نوافل کی کثرت غالب آ گئی ہے میں اپنے ضعف کی وجہ سے نوافل سے عاجز آ چکا ہوں۔

قوله: فاخبرني بشيءٍ اتشبث به: کہا گیا ہے کہ سائل کی مراد شئے سے یہ ہے کہ شئے تو تھوڑی ہو لیکن اس کا اجر بڑا ہوتا کہ میں اس شئے قلیل کی وجہ سے اپنے اوپر غالب آنے والے اور مشقت رساں نوافل سے مستغنیٰ ہو جاؤں۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ''بشي'' میں تنکیر برائے تقلیل ہے اور تقلیل بھی ایسی جو تعظیم کے معنی کو متضمن ہو جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ورضوان من الله اكبر﴾ [التوبة: ۷۲] سائل کے قول کا مطلب یہ ہے کہ ایسی آسان چیز مجھے بتلایئے جو نفع کثیر کھینچ لانے والی ہو۔ انتہیٰ کلامہ۔

(اتشبث) ای تعلق (به) یعنی ایسی جامع عبادت جو ایک مخصوص مکان میں یا کسی مخصوص زمانہ میں یا کسی مخصوص حال میں علاوہ، مثلاً کھانے پینے کی حالت اٹھنے اور بیٹھنے کی حالت لوگوں سے ملنے اور ان سے جدا ہونے کی حالت جوانی اور بڑھاپے کی حالت مانع ہونے کی وجہ سے مشقت میں ڈالنے والی نہ ہو۔ (بلکہ ہر حالت ہر مکان و زمان میں ادا کی جا سکتی ہو)۔

قوله: قال لا يزال لسانك رطبا من ذكر الله: یعنی وہ عبادت یہ ہے کہ ہمیشہ (لسانك) یعنی زبان سے مراد یا تو زبان قالب یعنی ظاہرا گوشت کی لوٹ پوٹ ہونے والی زبان یا دل کی زبان مراد ہے۔ (رطباً) ای طریا ہر قریب زمانہ میں مشغول ہونے والی

۲۲۸۰: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ سُئِلَ اَیُّ الْعِبَادِ اَفْضَلُ وَاَرْفَعُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ قَالَ الذَّاكِرُوْنَ اللّٰهَ كَثِیْرًا وَالذّٰكِرَاتُ قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمِنَ الْغَازِیُّ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ قَالَ لَوْ ضَرَبَ بِسَیْفِهٖ فِی الْكُفَّارِ وَالْمُشْرِكِیْنَ حَتّٰی یَنْكَسِرَ وَیَخْتَضِبَ دَمًا فَاِنَّ الذَّاكِرَ لِلّٰهِ اَفْضَلُ مِنْهُ دَرَجَةً

(رواه احمد والترمذی وقال هذا حدیث غریب)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵/۱۲۷ حدیث رقم ۳۴۳۶۔ واحمد فی المسند ۳/۷۵۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو سعیدؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کون سا بندہ بہتر ہے اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک بلند تر درجہ کا مالک ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''اللہ کو بہت زیادہ یاد کرنے والے مرد اور عورتیں'' عرض کیا گیا کہ ''یا رسول اللہ! کیا یہ جہاد کرنے والوں سے بھی افضل ہیں اور بلند مرتبہ ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اگر کوئی شخص کفار اور مشرکین پر اپنی تلوار مارے یہاں تک کہ وہ تلوار ٹوٹ جائے اور خون سے رنگین ہو جائے تو اس میں

کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا شخص باعتبار درجہ کے اس شخص سے بہتر ہے۔'' (احمد' ترمذی) ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: قوله:سئل ای العباد افضل ......والذاکرات: یعنی جو حصول ثواب کے اعتبار سے بہت زیادہ ہو۔

ذاکرین اور ذاکرات کا مفعول بہ لفظ اللہ ہے (یعنی اللہ کا زیادہ ذکر کرنے والے مرد اور عورتیں افضل العباد ہیں) اور بعض نسخہ جات میں ذاکرات کا لفظ نہیں ہے اور کہا گیا کہ ان بندوں سے مراد وہ بندے ہیں جو اللہ کے ذکر وفکر پر مداومت کرنے والے ہوں اللہ کی فرمانبرداری پر قائم رہنے والے ہوں اور اس کے شکر پر مواظبت اختیار کرنے والے ہوں اور کہا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ بندے جو حدیث میں وارد ہونے والے اذکار کو تمام اوقات واحوال میں بجالانے والے ہوں اور حقیقت میں یہی بات مراد ہے اس لئے کہ یہ صورت اکثر اوقات کو مشغولی ذکر کے ساتھ ضبط کرنے والی ہے

قوله: من الغازی ......افضل منه درجة : کہا گیا کہ منشاء اس سوال کا یہ ہے کہ ذاکرین غیر ذاکرین سے تو افضل ہیں کیا ذاکرین غازی فی سبیل اللہ بھی افضل ہیں یہ بات انہوں نے بر بنائے تعجب کہی۔

''**لو ضرب بسيفه في الكفار**'' حدیث کا یہ جملہ یہ ''**يجرح في عزاقيبها نصلى**) کے قبیل سے ہے یعنی وہ شخص زخم کرتا ہے اس کی کونچوں میں یعنی کونچوں کو یہاں بھی مفعول بہ کی جگہ مفعول فیہ کو لایا گیا ہے اور یہ ارتکاب کہ ان کافروں میں ضرب بالسیف پائے جانے اور ان کو مکان ضرب ٹھہرانے کیلئے مبالغہ کے طور پر کہا گیا اور اس بات کی توضیح علامہ ابن حجر کے اس قول سے بھی ہوتی کہ وہ فرماتے ہیں ان کو ضرب بالسیف کیلئے مکان اور ظرف بنانا ان کو صرف مضروب بالسیف بنانے سے ابلغ ہے۔(**والمشركين**) یہ تخصیص بعد التمیم مشرکین کی اہتمام شان کی وجہ سے ہے کیونکہ مشرکین موحدین کی ضد ہے (اس لئے عام کفار کے بعد خاص کفار کا ذکر کیا)۔(**حتى ينكسر**) ینکسر کا فاعل سیف ہے۔(**ويختضب**) **يختضب** کا فاعل یا تو غازی یا اس کی تلوار ہے۔(**دمًا**) یہ غازی کے مرتبہ شہادت پر فائز ہونے سے کنایہ ہے۔(**فان الذاكر**) تکرار برائے تاکید وپختگی۔(**الله**) یعنی ذکر سے مراد اللہ کا ذکر ہے نہ کہ اللہ کے غیر کا ذکر۔ (**افضل منه**) اور ایک دوسری روایت اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر ہے یعنی **افضل من الغازی** ہے۔(**درجةٌ**) درجۃ میں یہ بھی احتمال ہے کہ تاء برائے وحدۃ ہو جس کا **بدرجة واحدة عظيمة** (یعنی ذاکر غازی سے ایک عظیم درجہ افضل ہے)۔اور درجۃ جنس کا احتمال بھی رکھتا ہے۔یعنی ذاکر متعدد درجات کے ساتھ نمازی سے افضل ہے اور ایک روایت **لكان الذاكرون الله افضل** بھی آیا ہے۔

۲۲۸۱: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ الشَّيْطَانُ جَاثِمٌ عَلٰى قَلْبِ ابْنِ اٰدَمَ فَاِذَا ذَكَرَ اللّٰهَ خَنَسَ وَاِذَا غَفَلَ وَسْوَسَ۔

رواه البخاری تعليقا

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا'' شیطان انسان کے دل سے چپکا رہتا ہے جب وہ دل سے اللہ کو یاد کرتا ہے تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے اور جب وہ ذکر اللہ سے غافل ہوتا ہے تو شیطان اس کے دل میں وسوسے ڈالتا رہتا ہے'' اس روایت کو بخاری نے بطریق تعلیق نقل کیا ہے۔''

تشریح: قوله:**الشيطان جاثم على قلب ابن آدم**: یعنی ہمیشہ چمٹنے والا اور لازم الجلوس ہے

قوله:فاذا ذكر الله......: ذکر کا فاعل یا ابن آدم ہے یعنی اپنے دل سے اپنے اللہ کو یاد کرتا ہے۔یا ذکر کا فاعل قلب ابن آدم ہے یعنی ابن آدم کا دل اللہ کو یاد کرتا ہے۔

(یعنی خنس) یعنی شیطان منقبض ہو جاتا ہے ذاکر سے پیچھے ہٹ کر چھپ جاتا ہے اور شیطان کا وسوسہ کمزور پڑ جاتا ہے اور شیطان کا ضرر کم ہو جاتا ہے۔ (واذا غفل) غفل کا فاعل یا تو ذاکر ہے یا ذاکر کا قلب یعنی جب ذاکر یا ذاکر کا دل اللہ کے ذکر سے غافل ہو جاتا تو (وسوس) یونی اس ذاکر کی طرح وسوسہ ڈالتا ہے اور ذاکر قلب پر مکمل تسلط جمالیتا ہے تو اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ غفلت وسوسہ شیطان کا سبب ہے۔ عام علماء صوفیاء کے نزدیک یہی بات مشہور ہے۔

(اس کو بخاری نے روایت کیا تعلیقاً) یعنی تعلیق کا مطلب ہے حدیث کو بلا سند ذکر کرنا۔ علامہ جزریؒ نے اپنی کتاب حصن میں وسوسۂ شیطانی کے واقعہ کو ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

ما من آدمی الا ولقلبه بيتان فی احدهما الملك وفی الآخر الشيطان فاذا ذكر الله خنس واذا لم يذكر الله وضع الشيطان منقاره فی قلبه ووسوس اليه

''ابن آدمی کے دل میں دو گھر میں ایک میں فرشتہ دوسرے میں شیطان ہوتا ہے جب آدمی اللہ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو شیطان اپنی چونچ ابن آدم کے دل پر رکھ دیتا ہے اور وسوسہ ڈالتا ہے۔''

اس کو ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں ذکر کیا ہے اور ظاہر بات یہ ہے کہ شیخ قدس سرہٗ کا اس حدیث کو اپنی کتاب میں لانا یہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ یہ حدیث مرفوع ہے لیکن صاحب سلاح نے اس کو عبداللہؓ بن شقیق سے موقوفاً نقل کیا ہے۔

اور صاحب سلاح نے حدیث کے آخر میں یہ بات ذکر کی ہے کہ اس کو ابن ابی شیبہ نے کتاب فضائل القران میں روایت کیا ہے اور اسی طرح اس کو ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف ابن ابی شیبہ کتاب میں بھی روایت کیا ہے اور اس روایت کے تمام راوی صحیح ہیں۔ انتہیٰ کلامہٗ۔ اس ساری قیل وقال کے بعد اس بات کا بھی احتمال ہے کہ حدیث مصنف ابن ابی شیبہ میں مرفوع ہو اور کتاب فضائل القرآن میں موقوف اور حضرت انسؓ کی حدیث جو مرفوعًا منقول ہے (اسی مضمون پر مشتمل ہے) وہ بھی اس حدیث کے مرفوع ہونے کی شہادت دیتی ہے حدیث انسؓ یہ ہے:

ان الشيطان واضع خرطومهٗ على قلب ابن آدم فان ذكر الله خنس فان نسی التقم قلبه۔ ''شیطان ابن آدم کے قلب پر اپنا سونڈھ رکھ لیتا ہے اگر وہ اللہ کا ذکر کرے تو پیچھے ہٹ جاتا ہے اگر غافل ہو جائے تو اس کے دل کو لقمہ بنالیتا ہے۔

(ابن ابی دنیا اور ابو یعلیٰ اور بیہقی نے اس حدیث کی تخریج کی ہے یہ جملہ آحادیث بعض عارفین کے اس قول کی تائید کرتی ہیں کہ کسی عارف نے اللہ پاک سے سوال کیا اے اللہ! سب انسانوں کے قلب پر وسوسہ شیطانی کی کیفیت کو اس پر کھول دیجئے تو عارف نے دیکھا کہ شیطان بائیں کندھے کی نرم ہڈی کے نیچے بیٹھا ہوا ہے مچھر کی طرح اس کا سونڈھ لمبا ہوتا ہے تو اپنے مُنہ کو اسی مقام پر دھنسا دیتا، یہاں تک کہ اس کا سونڈھ ابن آدم کے قلب تک پہنچ جاتا ہے اگر وہ دیکھتا ہے کہ ابن آدم ذکر کر رہا ہے تو پیچھے ہٹ جاتا ہے اور باز آجاتا ہے۔ اور اگر غافل پاتا ہے تو وہ اپنا سونڈھ انسان کے قلب کی طرف بڑھا دیتا ہے اور قلب انسان میں وہ خباثت ڈال دیتا ہے جس کا اللہ پاک ارادہ فرماتے ہیں پھر شیطان اپنا یہ کام ہمیشہ جاری رکھتا یہاں تک قلب انسانی میں ذرا بھر بھی خیر باقی نہیں رہتا۔ حضراتِ علماء آپ ﷺ کے اس ارشاد کے مطلب کے بارے میں اختلاف کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: **ان الشيطان يجری من ابن آدم مجریٰ الدم**......۔

بعض حضرات نے فرمایا ہے حدیث اپنے ظاہر پر محمول ہے کیونکہ اللہ پاک نے شیطان کو ایسی قوت اور قدرت عطا کی ہے کہ وہ انسان کے باطن اور اس کی رگوں کے خون دوڑنے کی جگہ میں دوڑتا ہے۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ شیطان کے کثرت وساوس سے کنایہ ہے گویا کہ وہ شیطان انسان سے جدا نہیں ہوتا جس طرح انسان کا خون اس

سے جدا نہیں ہو پاتا۔

بعض علماء نے فرمایا کہ شیطان انسانی بدن کے باریک سوراخوں میں وسوسہ ڈالتا ہے وہاں سے وہ وساوس قلب انسانی تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔

۲۲۸۲: وَعَنْ مَالِكٍ قَالَ بَلَغَنِي أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يَقُوْلُ ذَاكِرُ اللّٰهِ فِي الْغَافِلِيْنَ كَالْمُقَاتِلِ خَلْفَ الْفَارِّيْنَ وَذَاكِرُ اللّٰهِ فِي الْغَافِلِيْنَ كَغُصْنٍ أَخْضَرَ فِي شَجَرٍ يَابِسٍ۔

رواہ رزین۔

ترجمہ: ''اور حضرت امام مالکؒ کہتے ہیں کہ مجھ تک یہ روایت پہنچی ہے کہ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں ''غافلوں کے درمیان خدا کا ذکر کرنے والا بھاگنے والوں کے پیچھے لڑنے والے کی مانند ہے جو میدان کارزار میں اپنے لشکر کے بھاگ کھڑے ہونے کے بعد تنہا ہی کافروں کے مقابلہ میں ڈٹا رہے ایسے شخص کی بہت ہی زیادہ فضیلت منقول ہے اور غافلوں کے درمیان خدا کا ذکر کرنے والا خشک درخت میں سرسبز شاخ کی مانند ہے۔''

تشریح: **قوله: ذاكر الله في الغافلين كالمقاتل خلف الغافلين: غافلين** کا صلہ **عن ذكر الله** یعنی اللہ کی یاد سے غافل لوگ (**كالمقاقل**) مقاتل کا صلہ **للكفار** ہے یعنی کافروں سے قتال کرنے والا۔ (**خلف الفارين**) **اى المنهرمين** شکست خوردہ۔

قوله: وذاكر الله في الغافلين كغصن اخضر في شجر يابس:

لفظ ذاکر اللہ کا مکرر لانا اس وجہ سے ہے تاکہ ہر دفعہ میں اس کے ساتھ وہ چیز متعلق ہو جائے جس چیز نے دوسرے لفظ ذاکر اللہ کا تعلق پکڑا ہے اور ذاکر اللہ کے مکرر لانے سے اس بات کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے کہ اللہ کا ذکر ایک ایسا امر عظیم ہے جس کے متعدد فوائد ہیں اور ہر فائدہ اپنی جگہ پر مستقل ہے۔ (**في الغافلين**) یعنی غافلین کے درمیان رہ کر ذکر اللہ کرنا خواہ وہ غافلین مسجد میں ہوں یا بازار میں۔

فی حرف جار ظرف کیلئے ہے اس لئے **في الغافلين بينهم** کے معنی میں ہے اس لئے کہ فی کا ظرفیت کیلئے ہونا ظاہر بات ہے۔ یا جملہ **في الغافلين** محلاً مرفوع اس بنا پر کہ یہ صفت ہے موصوف محذوف کیلئے تقدیر عبارت یوں ہوگی۔ ''**الذاكر الكائن في الغافلين**'' باقی رہا علامہ ابن حجرؒ کا قول کہ تقدیر عبارت ''**ذاكر الله حال كونه في الغافلين أى بينهم**'' ابن حجر کے اس قول کو ضابطہ کے خلاف سمجھا گیا جس پر جمہور ہیں۔ یعنی مبتدا سے حال بنانا درست نہیں ہے۔

(**كغض اخضر في شجر يابس**) یعنی ذاکر غافلین میں اس طرح ہے جیسا کہ سرسبز درخت خشک درختوں کی ایک جانب میں کھڑا ہو۔

۲۲۸۳: وَفِي رِوَايَةٍ مَثَلُ الشَّجَرَةِ الْخَضْرَاءِ فِي وَسَطِ الشَّجَرِ وَذَاكِرُ اللّٰهِ فِي الْغَافِلِيْنَ مِثْلُ مِصْبَاحٍ فِي بَيْتٍ مُظْلِمٍ وَذَاكِرُ اللّٰهِ فِي الْغَافِلِيْنَ يُرِيْهِ اللّٰهُ مَقْعَدَهُ مِنَ الْجَنَّةِ وَهُوَ حَيٌّ وَذَاكِرُ اللّٰهِ فِي الْغَافِلِيْنَ يَغْفِرُ لَهُ بِعَدَدِ كُلِّ فَصِيْحٍ وَأَعْجَمَ وَالْفَصِيْحُ بَنُوْ آدَمَ وَالْأَعْجَمُ الْبَهَائِمُ۔ (رواہ رزین)

رواہ رزین۔

ترجمہ: ''ایک روایت میں یوں ہے کہ'' درختوں کی درمیان سرسبز و شاداب درخت کی مانند ہے اور خدا کا ذکر کرنے

والا اندھیرے گھر میں چراغ کی مانند ہے اور غافلوں میں خدا کا ذکر کرنے والا ایسا شخص ہے جس کو اللہ تعالیٰ اس کی زندگی ہی میں جنت میں اس کی جگہ دکھلاتا ہے یعنی یا تو بذریعہ مکاشفہ دکھاتا ہے یا خواب میں اور یا اس کو ایسا یقین بخشتا ہے کہ گویا وہ اسے دیکھ رہا ہے اور غافلوں میں خدا کو یاد کرنے والا ایسا شخص ہے جس کے گناہ ہر فصیح اور اعجم کے عدد کے بقدر بخشے جاتے ہیں' فصیح سے مراد انسان اور اعجم سے مراد جانور ہیں۔'' (رزین)

تشریح: **قوله:مثل الشجرة الحضراء فی وسط الشحر :**

لفظ مثل میم اور ثاء کے فتحہ کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں میم کے کسرہ اور ثاء کے سکون کے ساتھ ہے اور لفظ **کغض** سے بدل (**فی وسط الشجره**) شین کے فتح اور سکون دونوں کے ساتھ ہے۔ اور شجر سے خشک درخت مراد ہیں' یہی مطلب اس حدیث کا ہے کہ جس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ ذکر کرنے والے اور نہ کرنے والے کی مثال زندہ اور مردہ کی سی ہے۔

قوله: وذاكر الله فی الغافلین مثل مصباح فی بیت مظلم: یعنی اللہ کا ذکر کرنے والا چراغ کی مثل ہے۔ (**فی بیت مظلم**) اس لئے کہ اللہ کا ذکر روشنی خوشی اور حضوری ہے لیکن غفلت سراسر اندھیر انفرت اور غیبوبت ہے۔

قوله: وذاكر الله ...... من الجنة وهو حی: یعنی وہ جگہ جو اللہ نے خصوصی طور پر ذاکر و شامل کیلئے تیار کر رکھی ہے۔

'' **وهو حی**''، جملہ حالیہ ہے یعنی اس کی حالت حیات ہی میں اس کو جنت کا ٹھکانا دکھلا دیا جاتا شاید یہ جنت کا ٹھکانہ بذریعہ کشف دکھلایا جائے گا یا جان کنی کے وقت فرشتوں کے نازل ہونے کے ساتھ ہی جنت کا ٹھکانہ دکھلا دیا جائے گا' اس پر قرینہ قرآن حکیم کی یہ آیت ہے: ﴿**ان الذین قالو ربنا الله ثم استقاموا**﴾ (فصلت: ۳۰)

قوله: وذاكر الله فی الغافلین یغفرله ......: ای ذنوبه یعنی اس کے گناہوں کو بخش دیا جاتا ہے۔ (**بعد دكل فيصيح واعجمَ**) اس لئے کہ خداوند قدوس نے ضابطہ بیان کیا ہے کہ نیکیاں برائیوں کو لے جاتیں ہیں۔

اس کو بزار اور طبرانی نے بھی اپنی کتاب اوسط میں روایت کیا ہے اور یہ دونوں روایتیں حضرت ابن مسعودؓ سے مرفوعًا ان الفاظ کے ساتھ منقول ہیں: **ذاكر الله فی الغافلین بمنزلة الصابر فی الفارین۔**

۲۲۸۴: **وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ مَا عَمِلَ الْعَبْدُ عَمَلًا اَنْجٰى لَهُ مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ ذِكْرِ اللّٰهِ۔**

(رواه مالك والترمذی وابن ماجة)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۲۸/۵ حدیث رقم ۳۴۳۷۔ وابن ماجه ۱۲۴۵/۲ حدیث رقم ۳۷۹۰۔ ومالك۔

ترجمہ: ''اور حضرت معاذ بن جبل فرماتے ہیں کہ ''ایسا کوئی عمل نہیں ہے جسے بندہ کرے جو ذکر اللہ سے زیادہ اللہ کے عذاب سے نجات دلائے۔'' (مالک' ترمذی' ابن ماجہ)

تشریح: اسنادی حیثیت: یہ حدیث حضرت معاذ پر موقوف نہیں بلکہ اگر ہو بھی تو بھی یہ مرفوع کے حکم میں ہوگا۔ کیونکہ صحابی اس قسم کی بات اپنی رائے سے نہیں کر سکتا۔

قوله: ما عمل العبد عملاً: یعنی عمل سے مضبوط قسم کا مسنون اور مستحب عمل مراد ہے یا مطلقاً عمل مراد ہے۔

قوله: انجی له من عذاب الله من ذكر الله: پہلا '' من '' بیان کیلئے اور دوسرا ''من'' وہ ہے جو اسم تفضیل کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔

روایات باب: اسی مضمون کی حدیث کو احمد طبرانی ابن ابی شیبہ نے مرفوعًا ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا:

ما عمل آدمی انجی له من عذاب اللّٰه من ذکر اللّٰه قالوا ولا الجهاد فی سبیل الله قال ولاالجهاد فی سبیل الله الا ان یضرب بسیفه حتی ینقطع قاله ثلاث مرات ۔

''ایسا کوئی عمل نہیں ہے جسے کوئی بندہ کرے وہ ذکر اللہ سے زیادہ اللہ کے عذاب سے نجات دلائے۔تو صحابہ نے عرض کی کہ اے اللہ کے رسول! کیا جہاد فی سبیل اللہ اللہ کے ذکر سے زیادہ نجات دینے والا نہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جہاد فی سبیل اللہ بھی ایسا نہیں الا یہ کہ مجاہد اپنی تلوار چلائے اور اتنی چلائے کہ وہ ٹوٹ جائے تو اس قسم کا جہاد فی سبیل اللہ انجی **من ذکر اللّٰه** آپ نے یہ بات تین دفعہ ارشاد فرمائی۔''

۲۲۸۵: **وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اِنَّ اللّٰهَ تَعَا لٰی یَقُوْلُ اَنَا مَعَ عَبْدِیْ اِذَا ذَکَرَنِیْ وَتَحَرَّکَتْ بِیْ شَفَتَاهُ۔** (رواہ البخاری)

اخرجه البخاری تعلیقاً ۱۳/۵۸۰ فی باب ((ولا تحرك لسانك لتعجل به))۔

ترجمه: ''اور حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب میرا بندہ مجھے یاد کرتا ہے اور میرے ذکر کے لئے اپنے دونوں ہونٹ ہلاتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔'' (بخاری)

تشریح: قوله: **انا مع عبدی اذا ذکرنی وتحرکت بی**......: یعنی معیت سے مراد اعانت، توفیق رحمت اور رعایت کی صورت میں معیت ہے اور بعض نے کہا کہ معیت کنایہ ہے شرف وقربت سے اس لئے کہ حدیث بیہقی میں یہ بات وارد ہوئی ہے کہ اللہ پاک فرماتے ہیں ''**انا جلیس من ذکرنی** اور جیسا کہ کہا جاتا ہے ''**فلان جلیس السلطان** یعنی فلاں آدمی بادشاہ کے ہاں معزز ومقرب ہے اور یہ حدیث اثبات قربت کے سلسلہ میں ابلغ اس لئے کہ یوں نہیں فرمایا کہ وہ میرے ساتھ ہوتا بلکہ یوں فرمایا کہ میں اس کا ساتھی ہوں۔(**اذا ذکرنی**) یعنی دل کے ساتھ مجھے یاد کرتا ہے یا زبان کے ساتھ۔(**وتحرکت بی**) ای **بذکری** یعنی میرے ذکر کی وجہ سے۔(**شفتاهٗ**) امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ''**اذا ذکرنی باللسان**'' کی نسبت ''**اذا ذکرنی و تحرکت بی شفتاهٗ** میں زیادہ مبالغہ ہے۔(اس لئے کہ وہاں ذکر باللسان محض ہے) اور یہاں حرکت لسان کے ساتھ حرکت شفتہ کا ذکر ہے لیکن یہ ساری تقریر اس صورت میں جبکہ واؤ کو حالیہ بنایا جائے۔اگر واؤ کو عاطفہ بنایا جائے تو پھر ذکر باللسان وذکر بالقلب کے جمع ہونے کا بھی احتمال ہے اور یہ تاویل ثانی زیادہ بہتر ہے کیونکہ مؤثر اور نافع ایسا ذکر باللسان ہے جو حضور قلبی کے ساتھ ہو۔(یعنی حضور قلبی کی حیثیت تابع کی سی ہو)۔ باقی یکبارگی مستقل طور پر زبان اور قلب کے ساتھ علیحدہ علیحدہ ذکر کرنا زیادہ نافع نہیں ہے بلکہ یہ محض مشغولی کا باعث ہے۔

۲۲۸۶: **وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم اَنَّهٗ کَا نَ یَقُوْلُ لِکُلِّ شَیْءٍ صَقَالَةٌ وَصَقَالَةُ الْقُلُوْبِ ذِکْرُ اللّٰهِ وَمَا مِنْ شَیْءٍ اَنْجٰی مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ ذِکْرِ اللّٰهَ قَا لُوْا وَلَا الْجِهَادُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ قَالَ وَلَا اَنْ یَضْرِبَ بِسَیْفِهٖ حَتّٰی یَنْقَطِعَ۔** (رواہ البیهقی فی الدعوات الکبیر)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲۱۴/۱۱ حدیث رقم ۶۴۱۰ ومسلم فی صحیحه ۲۰۶۲/۴ حدیث رقم (۵۔ ۲۶۷۷)۔ وابن ماجه ۱۲۶۹/۲ حدیث رقم ۳۸۰۔ ۸۳۸۶۱ واحمد فی المسند ۲۶۷/۲۔

ترجمه: ''اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''ہر چیز کے لئے صفائی ہے اور قلوب کی صفائی خدا کا ذکر ہے اور ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو ذکر الٰہی کے برابر خدا کے عذاب سے بہت نجات دلائے۔صحابہؓ نے عرض کیا کہ ''کیا اللہ کی راہ میں جہاد کرنا بھی ایسی چیز نہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''نہیں!

اگر چہ وہ مجاہد اپنے تلوار اتنی مارے کہ اس کی تلوار ٹوٹ جائے۔'' (بیہقی)

تشریح: لکل شی یعنی ہر چیز کے زنگ کیلئے حقیقۃً یا مجازاً (صقالۃٌ) صقالة کا معنی ہے روشن کرنا' خالی کرنا' پاک اور صاف کرنا باقی علامہ ابن حجر کا قول ''لکل شی صقالة '' کی توضیح کرتے ہوئے آیت ''یصقل بھا صدؤہٗ ...... '' کے الفاظ سے ظاہر نہیں ہو پاتا۔

قولہ: صقالة القلوب ذکر اللّٰہ: اس لئے کہ اللہ کے ذکر کی وجہ سے قلب اغیار اللہ کی گرد وغبار سے چھٹ جاتا اور دل مطالعہ آثار کیلئے صاف شفاف آئینے کی مانند ہو جاتا ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ دلوں کا زنگ رین ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے: ﴿کلا بل ران علی قلوبھم ما یکسبون﴾ [مطففین:١٤]۔ کسب قلب سے مراد خواہش نفس کی پیروی کرنا ہے۔ جس کا ذکر ایک دوسری آیت سے اس طرح ہے۔ ﴿افرأیت من اتخذ الھہٗ ھواہٗ﴾ [الفرقان:٤٣] پس کلمہ لا الٰہ دل کا تخلیہ ہے یعنی غیر اللہ سے دل کو خالی کر لینا کلمہ الا اللہ دل کا تجلیہ ہے یعنی دل روشن ہو جاتا ہے۔ علامہ ابو علی دقاق فرماتے ہیں۔ کہ جب بندہ لا الٰہ کہتا ہے تو اس کا دل صاف وشفاف ہو جاتا ہے اور بندہ کا الا اللہ صاف وشفاف دل کو لگتا ہے (وما من شیٔ انجی) یعنی ذاکر کیلئے (من عذاب اللّٰہ) یعنی عذاب سے اللہ کا عقاب اور بندے کر رؤیت سے محروم کرنے کیلئے حجاب میں رہنا مراد ہے۔ (حتی ینقطع) ینقطع کا فاعل یا تو مجاہد ہے یا اس کی تلوار ہے۔

کِتَابُ اَسْمَآءِ اللّٰہِ تَعَالٰی

اللہ تعالیٰ کے اسمائے مبارکہ

اللہ کا وہ نام کہ جس کا ذات باری تعالیٰ پر اطلاق کیا جاتا ہے اور یا تو یہ نام ذات کے اعتبار سے ہوگا جیسے اللہ یا یہ نام باعتبار صفت سلبیہ کے ہوگا جیسے قدوس اس کا معنی ایسی پاکیزہ ذات جس سے جملہ عیوب مسلوب ہوں یا وہ نام حقیقۃ ثبوتیہ کے اعتبار سے ہوگا جیسے علیم اور قادر علم اور قدرت یہ دونوں ایسی حقیقتیں ہیں جو ذاتِ باری تعالیٰ کیلئے ثابت ہیں یا وہ نام اضافت کے اعتبار سے ہوگا جیسے حمید اور ملیک یا وہ نام اللہ تعالیٰ کے افعال میں سے کسی فعل کے اعتبار سے ہوگا جیسے رزاق اور خالق۔

اسم وہ لفظ ہے جو وضع کے اعتبار سے معنی پر دلالت کرتا ہو اور مسمّٰی اسم کے معنی موضوع کو کہتے ہیں اور تسمیہ اس لفظ کے اس معنی کیلئے وضع کو کہتے ہیں یا اس لفظ کے اس معنی پر اطلاق کو تسمیہ بولتے ہیں۔ اور کبھی اسم کا اطلاق کر کے معنی بھی مراد لیتے ہیں تو تقدیر ثانی پر اسم سے مراد مسمّٰی ہوگا گویا اسم بول کر مسمّٰی مراد لیا گیا ہے۔ تقدیر اول کی صورت میں اسم مسمّٰی کا غیر ہے اسی وجہ سے اہل سنت والجماعت اور معتزلہ کا اختلاف ہو جاتا ہے کہ آیا اسم مسمّٰی کا عین ہے یا اسم مسمّٰی کا غیر ہے معتزلہ کہتے ہیں اسم تسمیہ کو کہتے ہیں مسمّٰی کو نہیں لیکن ہمارے مشائخ فرماتے ہیں کہ تسمیہ اس لفظ کو کہتے ہیں جو مسمّٰی پر دال ہو اور اسم معنی مسمّٰی بہ کو کہتے ہیں (گویا اسم اور تسمیہ الگ الگ چیزیں ہیں) علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں امام اشعریؒ کا مذہب یہ ہے کہ اسم کبھی تو مسمّٰی کا عین ہوتا ہے جیسے اسم اللہ اللہ کی ذات کا عین ہے (اس کا ذاتِ باری تعالیٰ سے کسی صورت میں انفکاک نہیں ہو سکتا)۔ اور اسم کبھی مسمّٰی کا غیر بھی ہوتا ہے جیسے اسم خالق (اس لئے کہ فعل خلق ہر گھڑی ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ نہیں ہوتا) اور کبھی اسم مسمّٰی کا غیر بھی ہوتا ہے اور نہ عین ہوتا ہے جیسے عالم اس لئے کہ علم اللہ تعالیٰ کی ذات کا عین اور نہ ہی اس کا غیر اس لئے کہ غیر اس کو کہتے ہیں جس کا جانبین سے انفکاک اور جدا ہونا ممکن ہو حالانکہ نہ تو علم کا انفکاک ذات باری تعالیٰ سے ممکن ہے اور نہ ذات باری تعالیٰ کا انفکاک علم سے ممکن ہے۔

اور یہ بات بھی جان لیجئے کہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی جتنی بھی صفات ہیں وہ اللہ کی ذات کا عین نہیں ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ معانی جیسے پیدا کرنا رزق دینا وغیرہ۔صفات باری تعالیٰ سے لغت اور عقل کے اعتبار سے سمجھے جاتے ہیں اور اگر یہ صفات ذات باری تعالیٰ کیلئے ثابت نہ ہو تو ذات باری تعالیٰ میں نقص کی خرابی لازم آتی ہے اس لئے کہ یہ جتنی بھی صفات ہیں ساری صفات کمال ہیں اور اگر یہ صفات ذاتِ باری تعالیٰ کیلئے ثابت ہوں تو بالضرورۃ زائد ہی ہوگی۔(زائد اس معنی میں کہ یہ صفات ذات باری تعالیٰ کی حقیقت میں داخل نہیں ہیں)اور وجہ یہ بھی ہے کہ جو معانی ان صفات سے اخذ ہوتے ہیں ان پر قائم ہونا اپنی ذات کے اعتبار سے نہیں بلکہ یہ صفات کی وجہ سے ساتھ قائم ہوئے تو اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جتنی بھی صفات ہیں نہ تو وہ ذات باری تعالیٰ کا عین ہیں اور نہ ہی ذات باری تعالیٰ کا غیر ہیں اس لئے کہ وہ دو چیزیں جو آپس میں ایک دوسرے کا غیر ہو تو ان کا ایک دوسرے سے جدا ہونا ممکن ہونا (حالانکہ صفات باری کا ذات باری سے جدا ہونا ممکن نہیں ہے)اور فلاسفہ کا نظریہ یہ ہے کہ صفات ذات باری تعالیٰ کا عین ہیں انہیں کے قریب ہی معتزلہ کا قول ہے اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ اللہ عالم ہے علم کی وجہ سے نہیں بلکہ ذات کی وجہ سے(گویا کہ وہ صفات کے معانی کا کوئی اعتبار نہیں کرتے)۔بہر کیف اس بحث کا محل عقائد کی کتب ہیں سلف نے اس بحث میں پڑنے کا تکلف نہیں کیا طلب سلامتی کیلئے۔

الفصل الاول:

۲۲۸۷: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْ لُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ لِلّٰهِ تِسْعَةً وَّ تِسْعِیْنَ اِسْمًا مِائَةً اِلَّا وَاحِدًا مَنْ اَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ وَفِی روایة وَهُوَ وَتْرٌ یُحِبُّ الْوِتْرَ۔ (متفق علیہ)

ترجمہ:''حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا''اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں یعنی ایک کم سو جس شخص نے ان ناموں کو یاد کیا وہ ابتداء ہی میں بغیر عذاب کے جنت میں داخل ہو گیا''ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ''اللہ تعالیٰ طاق ہے اور طاق کو پسند کرتا ہے۔''(بخاری ومسلم)

تشریح:قولہ:ان للّٰہ تسعة وتسعین اسمًا:ایک نسخہ میں زیادتی ہے(تعالیٰ)کی۔یہاں اسم سے مراد صفت ہے۔

قولہ:مائة الا واحدًا:اور ایک نسخہ میں الا واحدةً ہے علامہ زین العرب فرماتے ہیں کہ مصابیح کتاب میں الا واحدة کا لفظ آیا ہے اور امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ایک روایت میں الا واحدة کا لفظ ہے اس لئے یا تو واحدةً سے پہلے کلمةٌ کا لفظ محذوف ہے یا نقہ کا لفظ یا تسمیہ کا لفظ بہر کیف تینوں صورتوں میں لفظ واحدۃ صفت ہے۔(یعنی کلمۃ واحدۃً یاصفۃ واحدۃ یاتسمیۃ واحدۃ ہے)۔

بعض شارحین مصابیح نے کہا ہے کہ آپ ﷺ کا قول(مائة الا واحدةً)یہ ان کے اسم یعنی تسعۃ وتسعین سے بدل الکل ہے اسی لئے کہ ننانوے اور سوا ایک کم ایک چیز ہے۔یا مائة الا واحدةً منصوب ہے اس سے پہلے اعنی فعل محذوف ہے۔باقی تسعۃ وتسعین کے بعد مائة الا واحدةً کا ذکر کرنا یہ اسما کے باری تعالیٰ میں زیادتی اور نقصان کے معنی میں تاکید اور مبالغہ ہے اس لئے کہ اسمائے تعالیٰ توقیفی ہیں ان میں اجتہاد کا کوئی دخل نہیں ہے دوسری وجہ مائة الا واحدة کو ذکر کرنے کی یہ بھی ہے تاکہ تسعۃ وتسعین کا سبعۃ وتسعین کے ساتھ التباس لازم نہ آئے۔سبعہ میں سین کے مقدم ہونے کی وجہ سے یا سبعۃ وسبعین کے ساتھ التباس نہ ہو اس لئے کہ سبعین میں سین مقدم ہے یہ التباس لکھائی کی لغزش اور قلم کے پھسلنے کی وجہ سے ہو سکتا ہے۔تو لہٰذا نتیجہ یہ نکلے گا سنا ہوا لکھے ہوئے سے مختلف ہو جائے گا اس مائة الا واحدة کے ساتھ تاکید لائے تاکہ اختلاف کا مادہ منقطع ہو جائے اور اس باب میں احتیاط کی طرف رہنمائی ہو جائے یا مائة الا واحدة سے اس لئے تاکید کی کہ تسعۃ وتسعین میں جو واؤ ہے اس واؤ کے بارہ میں احتمال ہے کہ یہ او کے معنی میں ہو اس لئے کہ اس کی نظیر ارشاد باری تعالیٰ میں موجود ہے:﴿ثلاثة ایام فی الحج وسبعة اذا رجعتم تلک عشرة کاملة﴾[البقرۃ:۱۹۶]۔یہاں واؤ بمعنی

او ہے اس احتمال کے دفعیہ کیلئے مائة الا واحدة سے تاکید لائے۔

صاحب معالم التنزیل نے معالم التنزیل میں آیت: ﴿وذروا الذين يلحدون في اسمائه﴾ [الاعراف: ۱۸۰] کی تفسیر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اسمائے باری تعالیٰ میں الحادیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ایسے نام کے ساتھ موسوم کرنا جس کو کتاب وسنت واجماع نے بیان نہ کیا ہو یہی وجہ ہے کہ جو نام ذات باری تعالیٰ کا ان اصول ثلثہ میں وارد ہوا ذات باری تعالیٰ کی توصیف میں اسی نام کا اطلاق کرنا واجب ہے۔

علامہ ابوالقاسم قشیری فرماتے ہیں اسمائے باری توقیفی ہیں (یعنی ان اصول ثلثہ پر موقوف ہیں) اس وجہ سے ان اسماء کے بارہ میں کتاب وسنت واجماع کی رعایت از حد ضروری ہے۔ جو اسماء ان اصول ثلثہ میں پائے جاتے ہیں ان کا تو اطلاق ذات باری تعالیٰ پر درست ہوگا اور جو اسمائے ان اصول ثلثہ میں نہیں پائے جائے ان کا اطلاق بھی ذات باری تعالیٰ پر درست نہ ہوگا اگر چہ اس کا معنی درست ہی کیوں نہ ہو۔

علامہ راغب اصفہانیؒ فرماتے ہیں کہ معتزلہ کا نظریہ ہے کہ جس اسم کا معنی درست ہو اس کا ذات باری تعالیٰ پر اطلاق درست ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کی صحیح فہم اور عقل سلیم کو ذات باری تعالیٰ کی صفات اختیار کرنے میں گنجائش اور مجال ہے۔ لیکن علامہ راغب اصفہانیؒ فرماتے ہیں کہ بات وہی درست ہے جو اصحاب حدیث نے کی۔ (یعنی اسمائے باری تعالیٰ توقیفی ہیں عقل اور رائے کو دخل نہیں) علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے آئمہ کے نزدیک اصح بات یہی ہے کہ اسمائے ذات باری تعالیٰ توقیفی ہیں۔ امام غزالی و باقلانی کے علاوہ کیونکہ وہ اس باب میں معتزلہ کے ہمنوا ہیں۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ امام نوویؒ نے امام قشیریؒ سے یہ بات نقل کی ہے کہ یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ اسم اور مسمّٰی ایک ہی چیز ہیں کیونکہ اگر ان دونوں کے درمیان علاقہ مغایرت ثابت کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ یہ اسماء مسمّٰی کے غیر کیلئے بھی ہو سکتے ہیں۔ قاضیؒ صاحب نے اسما مفہوم کی تلخیص کر کے اس پر ہونے والے اعتراض کا جواب دیا ہے۔

سوال یہ ہوتا کہ بقول کسی کے اسم اور مسمّٰی ایک ہی چیز ہیں ان میں غیریت کا علاقہ نہیں تو پھر آپ ﷺ کے قول ''ان لله تسعة وتسعين اسمًا'' سے تعدد الٰہ کا حکم لازم آتا ہے۔ (اس لئے کہ اسم کے متعدد سے مسمّٰی کا تعدد ہو گیا)۔

تو اس کا جواب دو طریقوں سے ہے۔ (۱) اسم سے مراد یہاں لفظ ہے اور اسم کے لفظ کے معنی میں وارد ہونے میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ جھگڑا تو اس بات میں ہے کہ کیا اسم کا اطلاق کر کے اس سے عین مسمّٰی مراد لیا جا سکتا ہے اور اسماء کے تعدد سے مسمّٰی کا تعدد لازم نہیں آتا ہے۔ (۲) جتنے بھی الفاظ کا اطلاق کا ذات باری پر کیا جاتا ہے تو وہ سارے الفاظ ذات باری پر صفة حقيقيه کے اعتبار سے دلالت کرتے ہیں اور اس بات سے کوئی خرابی لازم نہیں آتی (اس کی صفات متعدد ہیں) اور یہ بات کوئی محال نہیں کہ ایک شخصیت اور ذات کی متعدد صفات ہو سکتی ہیں باقی آپ ﷺ کا قول تسعة وتسعين برائے حصر نہیں کیونکہ قرآن مجید میں ان ننانوے ناموں کے علاوہ بھی منقول ہے۔ اسی طرح حدیث پاک میں حنان منان دائم اور جمیل وغیرہ بھی وارد ہوا ہے باقی ذکر کے اعتبار سے ان اسماء کی تخصیص اس وجہ سے کیونکہ یہ اسماء لفظ اور معنی کے اعتبار سے زیادہ مشہور ہیں اور دوسری وجہ یہ بھی ہے زیادہ واضح اور روشن اسماء اور سب اسماء میں سے اصولی اسماء جو اپنے علاوہ دیگر اسماء کے معانی کو بھی مشتمل ہیں وہ یہی اسماء ہیں اور جملہ من احصاها یہ تسعة وتسعين کی صفت ہے اور یہ اسماء حصر پر دلالت نہیں کرتی کیونکہ اگر یوں کہا جائے کہ فلاں کی ہزار بکریاں ایسی ہیں جن کو اس نے مہمانوں کے لئے تیار کر رکھی ہے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس کی ملک میں اس کو علاوہ بکریاں ہی نہیں۔ **قوله: من احصاها دخل الجنة:** یعنی جو ان اسماء پر ایمان لائے اور ان کو شمار کرے اور ترتیل کے طریقہ پر بطور تبرک واخلاص ان اسماء کو الگ الگ کلمہ کر کے پڑھے یا ان اسماء کی بناؤں کو یاد کرے اور ان

اسماء کے معانی کو جانے اور جو کچھ ان معانی میں پنہاں ہے ان کو اپنے اخلاق بنائے وہ ابتداء ہی میں بغیر عذاب کے جنت میں داخل ہو گیا۔ یا مقام عظمت وعزت میں دخول مراد ہے یا جنت کے اعلیٰ اور ارفع مقام میں داخل ہونا مراد ہے۔

ترمذی اور مسلم کی روایت میں ہے ''من حفظها دخل الجنة ''یعنی اس جنت سے مراد یا تو وہ جنت حسی جو آخرت میں فرمانبرداروں کو ملنی ہے یا جنت سے مراد دنیا کے اندر جنت معنوی مراد ہے (یعنی دنیا میں رہ کر بھی جنت کا سامنہ آئے)۔

قوله:وفی رواية: میرکؒ نے حصن کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ یہ الفاظ بخاری کی ایک روایت میں ہیں۔

قوله:وهووتر يحب الوتر:''وتر'' واؤ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات یکتا ہے نہ تو کوئی اس کے مشابہ ہے اور نہ ہی کوئی اس کی مثل ہے۔ وہ اعمال واذکار میں سے وتر کو پسند کرتا ہے۔ یعنی جو اعمال اخلاص کے طریقہ پر اللہ کے لیے متفرد ہو کر کئے جائیں۔ ان کو پسند کرتا ہے یہی امام طیبیؒ کے قول يثيب على العمل الخ کا مطلب ہے یعنی جو عمل وتر کے طریقہ پر بجالایا جائے اللہ اس پر مکمل وکامل جزا عنائت فرماتے ہیں (گویا کہ محبت اثابتہ کے معنی میں ہے) اس لئے کہ کسی عمل کو وتر اور تفرد کے طریقہ پر بجالانا یہ قلبًا اور لسانًا اور ایمان واخلاص کے مطالب فردیہ پر تنبیہ ہوتی ہے۔

روایات باب: بخاری کی ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: لا يحفظها احد الا دخل الجنة

''جو بھی ان اسماء کو حفظ کرے گا وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا۔''

الفصل الثانی:

۲۲۸۸:عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ لِلّٰهِ تَعَالٰى تِسْعَةٌ وَّ تِسْعِيْنَ اِسْمًا مَنْ اَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ هُوَ اللّٰهُ الَّذِىْ لَا اِلٰهَ اِلاَّ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ الْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ الْغَفَّارُ الْقَهَّارُ الْوَهَّابُ الرَّزَّاقُ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ الْقَابِضُ الْبَاسِطُ الْخَافِضُ الرَّافِعُ الْمُعِزُّ الْمُذِلُّ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ الْحَكَمُ الْعَدْلُ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ الْحَلِيْمُ الْعَظِيْمُ الْغَفُوْرُ الشَّكُوْرُ الْعَلِىُّ الْكَبِيْرُ الْحَفِيْظُ الْمُقِيْتُ الْحَسِيْبُ الْجَلِيْلُ الْكَرِيْمُ الرَّقِيْبُ الْمُجِيْبُ الْوَاسِعُ الْحَكِيْمُ الْوَدُوْدُ الْمَجِيْدُ الْبَاعِثُ الشَّهِيْدُ الْحَقُّ الْوَكِيْلُ الْقَوِىُّ الْمَتِيْنُ الْوَلِىُّ الْحَمِيْدُ الْمُحْصِىُّ الْمُبْدِئُ الْمُعِيْدُ الْمُحْيِى الْمُمِيْتُ الْحَىُّ الْقَيُّوْمُ الْوَاجِدُ الْمَاجِدُ الْوَاحِدُ الْاَحَدُ الصَّمَدُ الْقَادِرُ الْمُقْتَدِرُ الْمُقَدِّمُ الْمُؤَخِّرُ الْاَوَّلُ الْاٰخِرُ الظَّاهِرُ الْبَاطِنُ الْوَالِىُ الْمُتَعَالِى الْبَرُّ التَّوَّابُ الْمُنْتَقِمُ الْعَفُوُّ الرَّءُ وْفُ مَالِكُ الْمُلْكِ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ الْمُقْسِطُ الْجَامِعُ الْغَنِىّ الْمُغْنِىُ الْمَانِعُ الضَّارُّ النَّافِعُ النُّوْرُ الْهَادِىُ الْبَدِيْعُ الْبَاقِى الْوَارِثُ الرَّشِيْدُ الصَّبُوْرُ۔

(رواه الترمذی والبیهقی فی الدعوات الكبير وقال الترمذی هذا حديث غريب)

اخرجه الترمذی فی السنن ١٩٢/٥ حديث رقم ٣٥٧٤۔

ترجمہ:''حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جو شخص ان ناموں کو یاد کرے وہ جنت میں داخل ہوگا وہ اللہ ہے کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور اسم ذات لفظ اللہ کے علاوہ ننانوے ہیں نام یہ ہیں: (۱) الرحمٰن (۲) الرحیم (۳) الملک (۴) القدوس (۵) السلام (۶) المؤمن (۷)

المھیمن (۸) العزیز (۹) الجبار (۱۰) المتکبر (۱۱) الخالق (۱۲) الباریٔ (۱۳) المصور (۱۴) الغفار (۱۵) القہار (۱۶) الوہاب (۱۷) الرزاق (۱۸) الفتاح (۱۹) العلیم (۲۰) القابض (۲۱) الباسط (۲۲) الرافع (۲۳) المعز (۲۴) الخافض (۲۵) المذل (۲۶) السمیع (۲۷) البصیر (۲۸) الحکم (۲۹) العدل (۳۰) اللطیف (۳۱) الخبیر (۳۲) الحلیم (۳۳) العظیم (۳۴) الغفور (۳۵) الشکور (۳۶) العلی (۳۷) الکبیر (۳۸) الحفیظ (۳۹) المقیت (۴۰) الحسیب (۴۱) الجلیل (۴۲) الکریم (۴۳) الرقیب (۴۴) المجیب (۴۵) الواسع (۴۶) الحکیم (۴۷) الودود (۴۸) المجید (۴۹) الباعث (۵۰) الشہید (۵۱) الحق (۵۲) الوکیل (۵۳) القوی (۵۴) المتین (۵۵) الولی (۵۶) الحمید (۵۷) المحصی (۵۸) المبدی (۵۹) المعید (۶۰) المحی (۶۱) الممیت (۶۲) الحی (۶۳) القیوم (۶۴) الواجد (۶۵) الاحد (۶۶) الصمد (۶۷) القادر (۶۸) المقتدر (۶۹) المقدم (۷۰) المؤخر (۷۱) الاول (۷۲) الاخر (۷۳) الظاہر (۷۴) الباطن (۷۵) الوالی (۷۶) المتعالی (۷۷) البر (۷۸) التواب (۷۹) المنتقم (۸۰) العفو (۸۱) الرؤف (۸۲) مالک الملک (۸۳) ذوالجلال والاکرام (۸۴) المقسط (۸۵) الجامع (۸۶) المغنی (۸۷) الغنی (۸۸) المانع (۸۹) الضار (۹۰) النافع (۹۱) النور (۹۲) الہادی (۹۳) البدیع (۹۴) الباقی (۹۵) الوارث (۹۶) الرشید (۹۷) الصبور (۹۸) الماجد (۹۹) الواحد۔ اس روایت کو ترمذی نے اور بیہقی نے دعوات کبیر میں نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: ان لله تعالی تسعة وتسعین اسما:

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے زیادہ مشہور نام لفظ اللہ ہے اس لئے کہ سارے اسماء کی اضافت اللہ ہی کی طرف ہوتی ہے اور یہ بات بھی منقول ہے کہ اسم اعظم لفظ اللہ ہی ہے۔

مالکی نحوی کہتے ہیں کہ لفظ اللہ اسم اعظم ہے اسم صفت نہیں (باقی اسماء اگر چہ اسم صفت ہیں) کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہر اسم اللہ ہی کے اسماء میں سے ہے اس لئے کہ اللہ کا ہر نام اللہ ہی کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ مثلاً یوں کہا جاتا ہے کہ کریم اللہ کے اسماء میں سے ہے۔ اور یوں نہیں کہا جاتا کہ کریم کے اسماء میں سے اللہ بھی ہے۔

قوله: من احصاها دخل الجنة:

یعنی اللہ کے اسماء کو یاد کیا۔ اکثر حضرات نے یہی معنی بیان کیا ہے۔ اس تفسیر کی تائید اس روایت صحیح سے بھی ہوتی جس کو امام نوویؒ نے ذکر کیا ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**من حفظها دخل الجنة**''۔ امام طیبیؒ بھی فرماتے ہیں ''**ای حفظها**'' جیسا کہ بعض روایات صحیحہ میں اسی طرح آیا ہے۔ اس لئے کہ حفظ احصاء و تکرار کے مجموعے سے حاصل ہوتا ہے۔ احصاء کنایہ ہے حفظ سے، یا احصاء کنایہ ہے اسماء باری تعالیٰ کے ضبط سے۔ یعنی ان کو حصر، ایمان، تعداد، علم و عمل کے اعتبار سے ضبط کرنے سے، یا احصاء کنایہ ہے اسمائے باری تعالیٰ کے حق کو حسبِ استطاعت قائم کرنے اور اسماء باری تعالیٰ کے مقتضی پر عمل بجالانے سے۔ اور یہ سب کچھ اس وقت ہوسکتا ہے جبکہ اسماء باری تعالیٰ کے معانی کا اعتبار کیا جائے۔ اسماء باری تعالیٰ میں جو صفات ربوبیت اور احکام بندگی پوشیدہ ہیں ان کا اپنے نفس سے مطالبہ کیا جائے کہ ان امور کو بطور اخلاق اپنایا جائے۔ ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ مثلاً جب بندہ یہ جان لیتا ہے کہ اللہ پاک سمیع و بصیر ہے تو اب اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنی زبان اور اپنے کان کو ناجائز کام سے روک لے اور اسی طرح باقی اسماء کا حال ہے۔ (انتہی)

اسمائے باری تعالیٰ کو اپنا اخلاق بنانے کے بارے میں امام غزالیؒ نے اپنی کتاب ''المقصد الاسنیٰ'' میں بڑا بسیط کلام کیا ہے۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ہر نام اخلاق بنانے کیلئے ہے، سوائے لفظ اللہ کے، کہ یہ ذات باری تعالیٰ سے تعلق جوڑنے کیلئے ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جو ان اسماء کو یاد کرے گا وہ جنت میں داخل ہوگا۔ یہ اس روایت کے منافی نہیں کہ جس میں ارشاد فرمایا کہ جو ان اسماء میں زیادتی کرے گا تو جنت میں اس کیلئے بھی زیادتی ہو جائے گی اس لئے کہ ابن ماجہ کی روایت میں ایسے اسماء بھی ہیں جو اس روایت میں نہیں ہیں مثلاً تام قدیم وتر شدید کافی ابد وغیرہ۔ اور اسی طرح قرآن حکیم میں بھی چند ایسے اسماء وارد ہوئے ہیں جو اس روایت میں موجود نہیں ہیں مثلاً ''**المجيد ذوالطول ذوالقوة ذوالمعارج ذوالعرش الكريم لاعلٰى احكم الحاكمين ارحم الرحمين احسن الخالقين رفيع الدرجات** وغیرہ(انتہٰی) اور اس کے علاوہ رب العالمین اور مالك يوم الدين بھی ہیں۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ جزاء دخل ماضی کی صورت میں بطور تحقیق کے ذکر کی گئی ہے۔ (گویا کہ دخول جنت تحقیقی اور یقینی ہے جس طرح امرِ ماضی یقینی ہوتا ہے)

قوله: هو الله الذى لا اله الا هو:

اسماء کی تعداد بیان کر کے شمار میں صرف لفظ اللہ کو لایا گیا ہے جملہ اسماء میں سے اور یہ جملہ ذات باری تعالیٰ کیلئے الٰہیت اور معبودیت کے حصر اور اثبات کا اور اللہ تعالیٰ کے غیر سے معبودیت کی نفی کا فائدہ دیتا ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ مستانفہ ہے یا تو یہ ان اعداد کی مقدار بیان کرنے کیلئے ہے کہ آپ ﷺ کے قول ''**ان لله تسعة و تسعين**'' اسماء میں کون سے اسماء ہیں۔ باقی ھو ضمیر کا ذکر خبر کی رعایت کرتے ہوئے (یعنی ھو مبتدا ہے اور آگے جملہ اس کی خبر ہے) یا یہ جملہ آپ ﷺ کے قول **من احصاها** میں ذکر کردہ احصاء کی کیفیت کو بیان کرنے کیلئے ہے۔ یعنی اللہ کے اسماء کا احصاء کیسے کیا جائے۔ اور ضمیر ھو مسمّٰی کی طرف لوٹتی ہے جس پر آپ ﷺ کا قول (**لله**) دلالت کر رہا ہے۔ گویا کہ جب کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ ہیں تو سوال کیا گیا کہ وہ اسماء حسنیٰ کیا ہیں تو جواب دیا گیا کہ ھو اللہ یا جب کہا گیا کہ ''**من احصاها دخل الجنة**'' تو سوال کیا گیا کہ ان کا احصاء کیسے کیا جائے تو جواب دیا کہ یوں کہ ھو اللہ۔ تو اس احتمال پر ضمیر ضمیر شان ہوگی اور مبتدا بنے گی اور لفظ اللہ مبتدا ثانی ہے اور آپ ﷺ کا قول ''**الذى لا اله الا هو**'' اس کی خبر ہے اور پورا جملہ مبتدا اول کی خبر ہے اور موصول جملہ مل کر لفظ اللہ کی صفت ہے۔

اس کلمہ کے کئی مراتب ہیں:

(پہلا مرتبہ) یہ ہے کہ منافق آدمی محض زبان کے ساتھ تو اس کلمہ کا تکلم کرتا ہے لیکن یہ تکلم تصدیق قلبی سے خالی ہوتا ہے تو یہ کلمہ منافق آدمی کے لیے تو دنیا میں اس کے خون مال و جان کے محفوظ ہونے کے سلسلہ میں نفع پہنچائے گا لیکن آخرت میں نہیں۔

(دوسرا مرتبہ) یہ ہے کہ آدمی یقین قلبی اس کلمہ کے مضمون پر محض بر بنائے تقلید کرتا ہے (یعنی دوسروں کی دیکھا دیکھی میں) اس کلمہ کی صحت کے بارے میں اختلاف ہے لیکن صحیح بات یہی ہے کہ یہ کلمہ صحیح اور معتبر ہے۔ (**نافع فى الدنيا و الآخره** ہے)۔

(تیسرا مرتبہ) یہ ہے کہ آدمی کلمہ کے مضمون پر اعتقاد محض تقلید کے وجہ سے نہیں بلکہ علامات توحید کی وجہ سے رکھتا ہے۔ اکثر حضرات اس کلمے کا اعتبار کرتے ہیں۔

(چوتھا مرتبہ) یہ ہے کہ اس کلمے پر اعتقادِ جازم ہو حجت قطعی کی وجہ سے یہ کلمہ تو بالاتفاق مقبول اور معتبر ہے۔

(پانچواں مرتبہ) یہ ہے کہ کلمہ پڑھنے والا اپنی بصیرت کی وجہ سے کلمہ کے مفہوم کو خوب کھول کر رکھ دے یہ تمام مراتب میں بلند مرتبہ ہے۔

علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں امام اشعری سے جو کچھ عوام کے ایمان کی عدم صحت کے بارے میں نقل کیا گیا ہے یہ درحقیقت امام اشعری پر جھوٹا الزام ہے کیونکہ اکثر عوام الناس درحقیقت ایمان کے بارہ میں غیر مقلد ہوتے ہیں۔ (یعنی بصیرت ذاتیہ کی وجہ سے ایمان ہوتا ہے نہ کہ دوسرے کی تقلید میں) اتنی بات ضرور ہے کہ وہ ایمان بالتوحید کے اثبات کیلئے متکلمین کے قواعد کے طرز پر ترتیب برہان سے عاجز

ہوتے ہیں بلکہ ترتیب برہان کے بعد ایمان لانے والے کیلئے بہتر تو اس شخص کا ایمان ہے کہ جس کا اعتقاد بالتوحید محض ظن وگمان کی وجہ سے پیدا ہو۔ پھر وہ شخص بہتر ہے جس کو اعتقاد بالتوحید میں قطعیت حاصل ہوگئی ایسے شخص کے کمال ایمان کے بارہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور اس شخص کا ایمان نافع فی الدنیا والآخرۃ ہے اور اگر یہ ایمان فقط دل کے ساتھ ہو تو دیکھا جائے گا عدم اقرار باللسان عذر فی اللسان کی وجہ سے ہے۔ جیسے گونگاپن وغیرہ۔ تو بالاتفاق اس کا ایمان بھی نافع فی الدنیا والآخرۃ ہوگا اگر یہ بات کسی عذر کی وجہ سے نہ ہو تو پھر علامہ نوویؒ نے اہلسنت والجماعت کا اجماع نقل کیا ہے کہ اس قسم کا ایمان نافع فی الآخرۃ نہ ہوتا لیکن امام غزالیؒ اور ان کے متبعین محققین اس ایمان کے نافع فی الدنیا والآخرۃ ہونے کے قائل ہیں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ ایمان بالقلب فقط اس وقت معتبر ہوگا جبکہ اس سے اقرار باللسان کا مطالبہ نہ کیا گیا ہو اگر مطالبہ کے بعد وہ اقرار باللسان سے باز آجاتا ہے تو بالاجماع ایسا شخص کافر ہی کہلائے گا جیسا کہ ابوطالب کا واقعہ مشہور ہے۔ اہل اشارہ کہتے کہ توحید کا قائل اگر مقالۂ توحید میں مخلص ہو تو وہ اسی اخلاص کی حالت میں جنت میں داخل ہو جائے گا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ولمن خاف مقام ربه جنتان﴾ [الرحمن:٤٦] دو جنتوں سے جو دنیاوی جنت ہے وہ ہے فرمانبرداری کی حلاوت اور مناجات کی لذت اور اُخروی جنت ہے قبولیت اعمال اور بلندئی درجہات۔ انتہیٰ کلامہ۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ هو الله الذی میں اشارہ کیلئے اور اہل اشارہ کے نزدیک هو کے ذریعہ سے انتہائی اثبات توحید کی خبر ہے اس لئے کہ جب اثباتِ توحید میں لفظ ھو کہا تو کہنے والوں کے دل میں سوائے حق تعالیٰ کی ذات کے کوئی نہیں آتا۔

اور کہا جاتا ہے کہ لفظ اللہ اصل میں لاھا ہے جو سریانی زبان کا لفظ ہے پھر عربی میں لفظ اللہ استعمال ہونے لگا اور بعض حضرات کہتے ہیں یہ اصل میں عربی ہی ہے اور علم کی طرح مخصوص ذات کیلئے وضع کیا گیا ہے اس لئے کہ علم کی طرح لفظ موصوف تو بن سکتا ہے لیکن حقیقت نہیں لیکن حق بات یہ ہے کہ یہ اصل میں وصف ہے اس لئے کہ اللہ کی من حیث الذات امر حقیقی یا اس کے علاوہ کسی اور امر کا اعتبار کئے بغیر انسانی سمجھ میں آنے والی نہیں تو جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی لفظ کو وضع کر کے پھر اس پر لفظ کا اطلاق کرے اس کی طرف اشارہ ناممکن ہے لیکن جب لفظ اللہ کا غلبۂ استعمال ذات باری تعالیٰ پر ہو اس حیثیت سے کہ وہ اللہ کے علاوہ کیلئے استعمال نہیں ہوتا تو آپ پر علم کی طرح ہوگیا۔ جس طرح علم پر اوصاف جاری ہوتے ہیں تو یہ اجراء اوصاف میں علم کے قائم مقام ٹھہرا تو لہٰذا لفظ اللہ کے ذریعہ کسی کی صفت تو بیان نہیں کی جاسکتی۔ ہاں اگر یہ موصوف بن سکتا ہے علم کی طرح۔ اور اس کی طرف شرکت کا احتمال تک نہیں جاسکتا ہے اور لفظ اللہ کا معنی ہے مستحق عبادت۔

حضرات فرماتے ہیں کہ اس کا مادۂ استعمال اللہ ہے۔ وزن، معنی اور صیغہ کے اعتبار سے عبد کی طرح اور الہ بمعنی مانوہٗ کے ہے۔

کہا گیا ہے کہ یہ یلیه، لیها اور لاها سے مشتق ہے جس کا معنی ہے چھپ جانا بلند ہو جانا اور چونکہ ذات باری تعالیٰ بھی آنکھوں کے ادارک سے محجوب ہے اور جو چیز ذات باری تعالیٰ کے لائق نہیں اس سے وہ بلند و بالا ہے اس لئے ذات باری تعالیٰ کو انه سے موسوم نہیں کیا جاتا ہے۔

کہا گیا ہے کہ یہ اله سے مشتق ہے جس کا معنی ہے حیران وسرگردان ہو جانا۔ اور چونکہ اہل عقل کی عقول ذات باری تعالیٰ کی صفات کی معرفت میں حیران وسرگردان ہیں چہ جائیکہ وہ ذات کی کماحقہ، معرفت کرسکیں (اس ذات باری تعالیٰ کو الہ کہا جاتا ہے)۔

کہا گیا ہے کہ یہ مشتق ہے اله بمعنی فزع سے گھبرا جانا اور چونکہ لوگ ذاتِ باری تعالیٰ سے گھبراتے ہیں اور اس کی طرف گھبرا کر دوڑتے ہیں اس لئے اله کہا جاتا ہے۔

کہا گیا ہے کہ یہ الهت الی كذا سے مشتق ہے۔ اور الهت الی کذا یہ سکنت الیه کے معنی میں ہے۔ اور چونکہ قلوب ذات

باری تعالیٰ کے ذکر سے مطمئن ہوتے ہیں اور روحیں اس کی معرفت کی وجہ سے سکون حاصل کرتی ہیں۔ (اس لئے ذات باری تعالیٰ کو الٰہ کہا جاتا ہے)۔

اکثر علماء کے نزدیک ننانوے اسماء میں سے یہی اسم اعظم ہے کیونکہ یہ ایک ایسی ذات پر دلالت کرتا ہے جو تمام صفات الوہیت کو جامع ہے۔

قطب ربانی شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں کہ اسمِ اعظم لفظ اللہ ہی ہے بشرطیکہ جب لفظ اللہ کہیں تو آپ کے دل میں اللہ کے سوا کوئی چیز بھی نہ کھٹکنے پائے۔

کہا گیا ہے کہ یہ اسم شریف عوام الناس کیلئے تو اس طور پر ہے کہ وہ اس کو زبان پر جاری کریں۔ خشیت و تعظیم کے طریقہ پر اس نام کا ذکر کریں۔ اور خواص کیلئے یہ ہے کہ وہ اس کے معنی میں غور وفکر کریں اور بات کو جانیں کہ اس اسم شریف کا اطلاق صرف ایسی ذات پر کیا جا سکتا ہے جو موجود' بے انتہا سخاوت والا ہے (یعنی جس کی سخاوت کی کوئی انتہا نہیں) اور وہ ذات جو تمام صفات الوہیت کی جامع اور ربوبیت کے صفات کے ساتھ متصف ہے۔ اور جو لوگ خواص الخواص ہیں ان کیلئے یہ ہے کہ وہ اپنے دل کو ذات باری تعالیٰ میں مستغرق کر دیں اللہ کے علاوہ کسی کی طرف ذرا بھر بھی التفات نہ کریں۔ پیش آمدہ چیز کے بارے میں امید اور خوف صرف ذات باری تعالیٰ ہی سے رکھیں اس لئے کہ وہی ذات حق وثابت ہے اور اس کے علاوہ ہر چیز باطل ہے۔ اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس کو امام بخاریؒ نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں نقل کیا ہے کہ لبید شاعر نے کیا ہی سچی بات کہی ہے اور وہ یہ ہے: ''**الا کل شئ ما سوا اللّٰہ باطل**'' یعنی خبر دار اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے۔ (یہاں باطل سے مراد وہ چیز ہے جس کو قرار و دوام نہ ہو) پھر کہا گیا ہے کہ اگر الہ سے مراد اعم لیا جائے (یعنی اللہ کے سوا سب سے معبودیت کی نفی کی جائے) تو تقدیر عبارت یوں ہوگی ''**لا الہ معبود بحق الا ھو**'' یعنی نہیں کوئی معبود برحق مگر وہی ذات۔ (اگرچہ معبود باطل لوگوں نے اور بھی بنا رکھے ہیں)۔ اور اگر الہ سے مراد اخص لیا جائے کہ وہی معبود برحق ہے تو پھر تقدیر عبارت یوں ہوگی ''**لا الہ موجود الا ھو**'' یعنی اللہ کے علاوہ کوئی معبود برحق موجود ہی نہیں ہے۔ بہر حال جو بھی تقدیر عبارت ہو۔ لفظ ھو محلاً مرفوع ہے ہاں البتہ نصب بھی جائز ہے۔ (رفع مبتد ہونے کی وجہ سے۔ اور نصب اعنی فعل مقدر ماننے کی وجہ سے)۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ لا سے نفی اور اس کے بعد حرف الاّ وغیرہ سے استثناء کا فائدہ غایت اثبات ہے کیونکہ **لا اخ لی سواك** یعنی میرا تیرے سوا کوئی بھائی نہیں۔ یہ جملہ **انت اخی** یعنی تو میرا بھائی ہے سے زیادہ مؤکد ہے (کیونکہ جملہ ثانیہ میں مخاطب کیلئے اخوت کے اثبات کے ساتھ اس کے غیر سے اخوت کی نفی نہیں بخلاف پہلے جملہ کے)۔ بہر کیف لا اور الاّ وغیرہ کا فائدہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے اس چیز کی نفی ہو جاتی ہے جس کا اصل سے وجود ہی محال ہے۔ اور وہ شریک اور اس چیز کا اثبات ہے جس کا عدم محال ہے اور وہ ہے ذات باری تعالیٰ۔ مطلب یہ ہے کہ انسان اس نفی اور اثبات کے اعتقاد کو ظاہر کرے جو ایمان مطلوب کی صحت کیلئے شرط کے درجے میں ہے۔ کیونکہ اس نفی اور اثبات کے اعتقاد کی وجہ سے معرفت ویقین کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

قولہ: الرحمٰن الرحیم: امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں صیغے مصدر رحمت سے بطور مبالغہ کے ہے۔ اور رحمت لغت میں ایسی رقت قلبی اور مہربانی ونرمی کو کہتے ہیں جو من رق لہ یعنی جس کیلئے انسان نرم دل ہوا اس پر فضل واحسان کا تقاضا کرے۔ (باقی رہا یہ کہ اللہ تعالیٰ کیلئے رقت قلبی کا اثبات اللہ کی شان اقدس کے منافی ہے تو جواباً عرض ہے) کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء اور اس کی صفات کا وجود غایات کے اعتبار سے ہوا کرتا ہے جو افعال ہیں نہ کہ مبادی کے اعتبار سے ہے۔ جیسے (مشتعل ہونا اور کسی چیز کے اثر کو قبول کرنا اللہ کی شان کے منافی

ہے نہ کہ فعل)۔

عارف کا حصہ ان دونوں اسماء میں یہ ہے کہ وہ پوری پوری طرح ذات رحمٰن کی پا کیزہ بارگاہ کی طرف متوجہ ہو جائے اور اسی پر بھروسہ رکھے اور جو چیز اس کیلئے تکلیف دہ ہے اس چیز کے بارے میں اسی کی طرف التجا کرے اور اپنے باطن کو اس کے ذکر سے مشغول رکھے اور اس کے غیر سے اعراض کر کے اسی سے مدد طلب کرے۔

جب عارف آدمی ان دونوں اسماء سے یہ بات سمجھ لے کہ ذاتِ رحمٰن و رحیم ہی منعم حقیقی ہے اور جتنی بھی نعمتیں ہیں موجودہ یا آئندہ ان سب کی مالک ذاتِ رحمٰن و رحیم ہی ہے تو وہ عارف اللہ کے بندوں پر رحم کرے جس کی صورت یہ ہے کہ مظلوم کی معاونت کرے ظالم کو اس کے ظلم سے احسن طریقہ کے ساتھ باز رکھنے کی کوشش کرے خوابِ غفلت میں ڈوبے ہوئے آدمی کو بیدار کرے۔ اور گناہگار کو رحمت کی نظر سے دیکھے نا کہ حقارت کی نظر سے اور منکر کے ازالہ میں سعی کرے اور حسب استطاعت احسن طریقے پر اس کو مٹائے اور اپنی وسعت اور طاقت کے بقدر محتاج لوگوں کی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کرے۔

''اللہ کی رحمت بندوں پر'' کے دو مطلب ہو سکتے ہیں:

① اس سے مراد اللہ کا اپنے بندوں انعام کا ارادہ کرنا اور ان سے ضرر کا دفع کرنے کا ارادہ کرنا ہے۔ اس صورت میں رحمٰن و رحیم دونوں صفاتِ ذات کے اسماء ہوں گے۔

② یعنی ارادہٴ فعل نہیں بلکہ نفس فعل ہے) اس صورت میں رحمٰن و رحیم افعال کی صفات کہلائیں گے۔ صفت فعل اور صفت ذات میں فرق یہ ہے کہ صفت کے متقضی ہونے' نقص اور عیب لازم آتا ہے جبکہ صفت فعل کے متقضی ہونے سے نقص لازم نہیں آتا۔

لفظ رحمٰن لفظ رحیم سے ابلغ ہے کیونکہ مبنی میں الفاظ کی زیادتی معنی کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے اور یہ زیادتی کبھی مقدار و کمیت کے اعتبار سے پائی جاتی ہے اور کبھی کیفیت کے اعتبار سے۔ تو پہلی صورت میں یا رحمٰن الدنیا اور یا رحیم الآخرۃ کہا جائے گا اس سے دنیاوی رحمت مؤمن و کافر سب کو عام ہے اور اخروی رحمت محض مؤمنین کے ساتھ خاص ہے اور زیادتی بصورت کیفیت ہو تو اس صورت میں یا رحمٰن الدنیا والآخرۃ اور یا رحیم لآخرۃ کہا جائے گا۔ اس لئے کہ آخرت کی ساری نعمتیں مکمل ہیں اور دنیا کی نعمتیں جلیل و حقیر' قلیل و کثیر اور تام اور غیر تام کی طرف تقسیم ہوتیں ہیں اور رحمٰن کا معنی ہوگا وہ منعم حقیقی جس کی رحمت تام اور اس کا احسان عام ہے یہی وجہ ہے کہ اس کا اطلاق ذات باری تعالیٰ کے علاوہ کسی پر نہیں کیا جا سکتا۔ اور رحمٰن کو خاص اللفظ عام المعنی کہا جاتا ہے۔ بخلاف لفظ رحیم کے کہ اس کو عام اللفظ خاص المعنی کہا جاتا ہے۔ (اس لئے کہ اس کا اطلاق ذات باری اور اس کے غیر پر کیا جا سکتا ہے اور اس کی رحمت دنیا کے ساتھ خاص ہے)۔

قولہ: **الملك** یعنی مکمل بادشاہت والا۔ مکمل بادشاہت والا ہونے سے مراد ایجاد و اختراع پر قادر ہونا ہے، اس لئے کہ یہ اہل عرب کا مقولہ ہے ''**فلان یملك الا نتفاع بکذا**'' یعنی فلاں آدمی اتنا نفع پہنچانے کا مالک ہے یہ اس وقت کہا جاتا ہے جبکہ وہ آدمی اتنا اتنا نفع پہنچانے اور ایجاد کرنے پر قدرت و دسترس رکھتا ہو۔ تو **ملك** بھی قادر کی طرح اسماء صفاتی میں سے ہے۔

کہا گیا ہے کہ **ملك** کا مطلب ہے ایسی ذات جو چیزوں کو وجود میں لانے اور ان کو ختم کرنے میں ان کو زندہ کرنے اور مارنے میں مکمل متصرف ہو۔ تو اس صورت میں لفظ **ملك** اسماءِ افعالی میں سے ہوگا خالق کی طرح۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ علی اسلوب الشکیل لفظ **ملك** کا حدیث میں واقع ہونا یہ ''**مالك یوم الدین**'' کے قرآن مجید میں واقع ہونے کی طرح ہے۔ (اس لئے کہ قرآن مجید میں بھی جن تین اسماء کے بعد ''**ملك یوم الدین**'' ہے انہیں تین اسماء کے بعد حدیث میں

بھی ہے) اس لئے کہ جب اللہ نے اس چیز کا ذکر کیا جو نعمتوں اور مہربانیوں پر دلالت کرتی ہے تو اس کے بعد اس چیز کا ذکر کیا جو غلبہ اور قوۃ پر دلالت کرتی ہے وہ یہ کہ اللہ بادشاہ حقیقی ہے اور اس کے سوا کائنات کا کوئی مالک نہیں اور بندہ اپنے وجود میں اللہ ہی کا محتاج اور محتاج ہونا بادشاہت کے منافی ہے تو نتیجہ یہ نکلا کہ بندے کیلئے مطلقاً بادشاہت نہیں ہو سکتی۔

ہاں اگر بندے کی طرف بادشاہت کی اضافت کی بھی جاتی ہے تو مجازاً کی جاتی ہے ورنہ حقیقی بادشاہت تو اللہ ہی کی ہے۔ پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اوصافِ باری تعالیٰ میں صفت ملک کو بیان کیا تو چونکہ اس صفت کے ساتھ افراد مخلوق بھی متصف ہوتے ہیں تو اس سے خالق کے ساتھ مخلوق کی تشبیہ کا گمان ہوتا ہے تو اس لئے اس کے بعد صفت قدوس لائے۔ اسی طرح چلتے جائیں سارے اسماءِ باری تعالیٰ ذات باری کی ثناء میں بیان کئے گئے ہیں۔

اسم **ملک** سے عارف کی ذمہ داری یہ ہے کہ عارف اس بات کو سمجھے کہ ذات باری تعالیٰ ہر چیز سے علی الاطلاق مستغنی ہے اور اس کے ہر چیز اپنے وجود اور اس کی بقاء میں اس کی طرف محتاج ہے اور ہر چیز اس کے فیصلے اور حکم کے تابع ہے۔ اور وہ آقا اور سردار ہونے میں لوگوں سے مستغنی ہے اور وہ اپنی مملکت خاصہ کے اندر جو انسان کا دل اور اس کا جسم ہے تصرف کرنے میں پوری طرح مستقل ہے۔ اور اس اپنے طاقتور لشکر اور رعایا اور ان کو دارین کی بھلائی میں استعمال کرنے پر مکمل تسلط اور غلبہ حاصل ہے۔

بعض حضرات **ملک** کے معنی میں فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنے نفس کا مالک ہو تو وہ آزاد ہے اور جس شخص کی خواہش نفس اس کی مالک ہو تو وہ غلام ہے۔

قولہ: القدوس: قدوس بھی رحمٰن و رحیم کی طرح مبالغہ کے لیے ہے۔

اس کا معنی ہے ایسی ذات جو فی نفسہٖ نقصان کی تمام علامت سے طاہر اور منزہ ہو۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے یہ پہچان لیا کہ اللہ تعالیٰ قدوس ہے تو اس کی ہمت بلند ہو جاتی ہے یہاں تک کہ حق تعالیٰ اس کو اس کے عیوب و آفات سے پاک فرما دیتے ہیں۔ اور اس کو جملہ حالات میں گناہوں کی میل کچیل سے پاکیزہ رکھتے ہیں تو ایسا شخص اپنے وقت کو کدورتوں سے صاف رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور وہ جمیع اوقات میں اچھے انداز سے اللہ سے استعانت کیلئے رجوع کرتا ہے۔

جس شخص کی زبان کو اللہ پاک غیبت سے پاک فرما دیتے تو اللہ پاک اس کے دل کو بھی غیبت سے پاک فرما دیتے اور جس شخص کے دل کو اللہ پاک غیبت سے پاک فرما دیتے ہیں تو اللہ پاک اس شخص کی آنکھ کو شک و شبہ کی نگاہ سے پاک فرما دیتے اور جس شخص کی آنکھ کو اللہ پاک شک و شبہ کی نگاہ سے پاک فرما دیتے ہیں تو اس اللہ اس شخص کے باطن کو اپنی قربی قربت و موانع و حجابات سے پاک فرما دیتے ہیں۔

ابراہیم بن ادہمؒ سے حکایت نقل کی گئی ہے کہ وہ راستے میں ایک ایسے شخص کے پاس سے گزرے جو نشہ میں لت پت گرا پڑا تھا اور اس نے قے کر رکھی تھی۔ ابراہیم بن ادہمؒ نے اس شخص کو نظر رحمت سے دیکھا اور کہا کہ اس زبان کو یہ آفت کیونکر پہنچی حالانکہ کبھی تو اس نے اس زبان سے اللہ کو یاد کیا ہوگا آگے بڑھے اور اس کے منہ کو دھویا۔ جب اس شخص کو آفاقہ ہوا اور اس کو سارے واقعے کی خبر دی گئی تو وہ بہت شرمندہ ہوا اور اس نے نشہ کرنے سے توبہ کی۔ ابراہیم بن ادہمؒ نے خواب میں دیکھا کہ کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے۔ اے ابراہیم بن ادہمؒ! تم نے اس آدمی کے منہ کو ہماری وجہ سے دھویا ہم نے اس کے دل کو تمہاری وجہ سے دھو دیا۔ (یعنی توبہ کی توفیق دے دی)۔

قولہ: السلام: یہ مصدر ہے اس کے ساتھ اللہ کی صفت بطور مبالغہ لائی گئی ہے۔

ایسی ذات جو مطلقاً ذات وصف اور فعل کے اعتبار سے آفات پیش آنے سے سلامتی والی ہو، تو وہ ہستی ہے جس کی ذات عیب سے سلامت ہو اور جس کی صفات نقص سے سلامت ہوں اور جس کے افعال شر محض سے سلامت ہوں۔ سلام کا شمار بھی اسماءِ تنزیہہ میں سے

ہوتا ہے۔

کہا گیا ہے کہ سلام کا معنی ہے ایسا مالك جو بندوں کو خوفناک اور ہلاکت خیز چیزوں سے محفوظ رکھے۔تو نتیجۃً اس کا مآل اور مرجع صفت قدرت ہی بنتی ہے۔جو ذات کی صفات میں شمار ہوتی ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ سلام کا معنی ہے ایسی ذات جو جنت میں اپنے بندوں پر سلام بھیجنے والی ہے۔جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿**سلامٌ قول من رب رحیم**﴾[یس:۵۸] تو اس صورت میں سلام کا مرجع کلام قدیم ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ صفت قدوس اور صفت سلام کے درمیان فرق یہ ہے کہ صفت قدوس کسی چیز کے ایسے نقص سے براءۃ پر دلالت کرتی ہے جس نقص کا تقاضا خود ذات کرتی ہو اور وہ نقص اس ذات کے ساتھ قائم ہے اور صفت سلام کسی چیز کے ایسے نقص سے پاکیزگی پر دلالت کرتی ہے جو نقص اس چیز کو کسی آفت کے پیش آنے یا اس چیز سے کسی فعل کے صادر ہونے کی وجہ سے لاحق ہو۔تو گویا قدوس شے کی ذاتی طہارت و پاکیزگی کو کہتے ہیں۔

اور اسی کے قریب بعض حضرات کا قول ہے جو یوں فرق بیان کرتے ہیں کہ قدوس اس چیز کے سلسلہ میں جو ہمیشہ رہی ہو اور سلام اس چیز کے سلسلہ میں جو ہمیشہ رہے گی اور باقی عارف کی ذمہ داری یہ ہے کہ صفت سلام کے ساتھ پختگی حاصل کرے۔بایں طور کہ وہ اپنے دل کو کینہ حسد اور خیانت اور ایسے ارادۂ شر سے جس کے ضمن میں خیر کا قصد نہ کیا گیا ہو محفوظ رکھے۔اور اپنے اعضاء کو ممنوعات اور گناہوں کے ارتکاب سے محفوظ رکھے۔اور اہل اسلام کی سلامتی چاہنے والا ہو۔اور جس کو بھی دیکھے اس پر سلام پیش کرے خواہ وہ اس کو جانتا ہو یا نہ جانتا ہو۔

اور بعض عارفین سے یہ بات بھی منقول ہے کہ بندوں میں سے سلیم وہ شخص ہے جو اپنے کی مخالفتوں سے حالت سرّ و اعلانیہ میں محفوظ رہے اور ظاہری امور باطنی عیوب سے جدا ہو جائے۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص اس اسم شریف کو بطور اخلاق اپنانا چاہتا ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ اپنے آقا کی طرف قلب سلیم کے ساتھ لوٹے۔بعض عارفین فرماتے ہیں کہ اسم سلام جب مصدر سلامت سے مشتق ہے تو عارف بھی اس اسم شریف کی وجہ سے سلامتی کا طالب ہوتا ہے۔اور ہر وقت اس کو طلب سلامت کی فکر ہی دامنگیر رہتی ہے تا کہ اس کیلئے جملہ احوال میں کمال تنزیہ جمع رہے۔

اور صفت سلام کو بطور اخلاق اپنانے میں یہ بھی ہے کہ مسلمان اس کی زبان اور ہاتھ سے محفوظ رہیں۔بلکہ مزید مسلمانوں پر شفقت اور مہربانی کا معاملہ کرے۔پس جب اپنی عمر سے بڑے آدمی کو دیکھے تو اس کے بارے میں کہے کہ یہ مجھ سے بہتر ہے۔اس لئے کہ اس کی نیکی مجھ سے زیادہ ہے اور ایمان و معرفت کے لحاظ سے مجھ سے سابق ہے۔اور اگر اپنی عمر سے چھوٹے کو دیکھے تو اس کے بارے میں بھی یہی کہے کہ یہ مجھ سے بہتر ہے کیونکہ اس کے گناہ مجھ سے کم ہیں اور جب اپنے کسی مسلمان بھائی کی جانب سے معصیت کو ظاہر ہوتا دیکھے تو اس کیلئے ستر مرتبہ معذرت طلب کرے اگر اس کیلئے اس کی ہدایت واضح ہو جائے تو فبہا ورنہ لوٹ کر اپنے نفس ہی کو ملامت کرے کہ تو بھی برا آدمی ہے کہ تیرے بھائی کی جانب سے ستر عذر قبول نہ کئے گئے۔

قولہ: المؤمن: جس نے اپنی مخلوق کو ضرر رساں چیزوں کو دفع کرنے کیلئے آلات کا فائدہ پہنچا کر مامون کر دیا۔

یا نیک لوگوں کو قیامت کے دن کی بڑی گھبراہٹ سے مامون کر دیا۔

یا اپنے بندوں کو ظلم سے مامون کر دیا بلکہ اللہ پاک اپنے بندوں کے ساتھ جو معاملہ کریں گے وہ یا تو مبنی بر فضل ہوگا یا مبنی بر عدل (اور یہ دونوں معاملے ظلم سے پاک ہیں) اور سراسر امان ہیں تو بایں صورت مؤمن کا مرجع اسماء افعال ہیں یا مؤمن کا معنی ہے اپنے نبیوں کی

تصدیق معجزات کے ساتھ فرمائی۔تو اس صورت میں مؤمن کا مرجع کلامِ قدیم ہے۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ موافقت فی الاسماء مشابہت فی الذوات کا تقاضا نہیں کرتی اس لئے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا مؤمن ہونا درست ہے۔(اگر چہ مؤمن بندے کی صفت بھی ہے) تو اس مشابہت فی الصفات کی وجہ سے بندہ رب کے مشابہ نہیں ہو جاتا (کیونکہ حق سبحانہ وتعالیٰ کا مؤمن ہونا اور حیثیت سے ہے اور بندے کا مؤمن ہونا اور حیثیت سے) دونوں ایمانوں کے درمیان واضح فرق ہے۔انتہیٰ کلام۔

اور عارف کی ذمہ داری صفت مؤمن کے بارے میں یہ ہے کہ وہ حق کی تصدیق کرے اور اس تصدیق کو مزید پختہ کرے اور کسی پر ظلم کرنے یا کسی کو ضرر پہنچانے سے باز آجائے اور اس طرح ہو جائے کہ لوگ اس کی تکالیف سے مامون ہو جائیں بلکہ مزید خوفناک چیزوں اور دین و دنیا کے امور میں رخنہ انداز مفاسد کے دفع کیلئے لوگ اس سے تقویت حاصل کریں۔

کہا گیا ہے کہ جب آدمی اس بات کو جان لے کہ حق تعالیٰ اپنے وعدہ میں صادق ہے اور اپنے بندوں میں سے جس کی چاہے تصدیق فرماتا ہے تو ایسے شخص کو حق تعالیٰ کی تصدیق کے علاوہ سکون ہی نہ آئے اور مؤمن کا عطف سلام پر کیا گیا ہے۔کیونکہ امن دینے والا معنی مؤمن میں سلام کی نسبت زیادہ پایا جاتا ہے۔اس لئے کہ مؤمن کا معنی ہے کسی کے طلب امن کو قبول کر کے اس پر امن دینے کیلئے متوجہ ہو جانا یعنی قبول و اقبال۔واللہ اعلم۔

قولہ: المھیمن: یعنی ایسا نگہبان جو انتہائی حفاظت اور نگہبانی کرنے والا ہو۔اسی سے ماخوذ ہے "**مھیمن الطائر**" یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی پرندہ اپنے بچوں کی حفاظت کیلئے ان پر اپنے پروں کو بچھا دے۔

اور مھیمن اسماء افعال میں سے ہے۔

اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ مھیمن کا معنی ہے شاہد اور شاہد بمعنی عالم ہے یعنی ایسی جاننے والی ذات کہ جس سے رائی کے دانے کے برابر بھی کوئی چیز چھپنے نہ پائے۔تو اس صورت میں مھیمن کا مرجع علم ہے۔

اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ مھیمن کا معنی ہے وہ ذات جو ہر نفس کے عمل و سبب پر گواہی دے گی۔تو اس صورت میں مھیمن کا مرجع قول ہے۔اور اس سے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**ومھیمناً علیہ**﴾[المائدة:٤٨] یہاں مھیمن بمعنی شاہد ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ مھیمن ایسی ذات کو کہتے ہیں کہ جو مخلوق کے اعمال اور ان کے رزق اور ان کی عمریں اور ان کی اخلاق جیسے امور کو قائم کرنے والی ہو۔تو اس صورت میں مھیمن کا مرجع قدرت ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس کی اصل مؤمن ہے ہمزہ کو ہاء سے بدل دیا گیا یہ فعیل کے وزن پر ہے اور مھیمن یہ امانۃ سے ہے یعنی ایسی ذات جو اپنے وعدہ میں صادق ہو۔تو اس صورت میں مؤمن کا مرجع کلام ہے۔اور کہا گیا ہے کہ کتب قدیمہ میں یہ ذات باری تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ مھیمن ایسی ذات کا نام ہے جس میں تین صفات جمع ہوں:

(۱) کسی چیز کے حال کو جاننا۔(۲) اس چیز کی مصلحتوں کی رعایت پر مکمل قدرت۔(۳) اس چیز کی مصلحتوں کا قیام۔

باقی رہا مھیمن سے عارف کا حصہ وہ یہ ہے کہ عارف اپنے دل کی مکمل نگہبانی کرے اور دل کے احوال کو درست کرے اور اپنے اعضاء اور قویٰ ایسے شغل سے محفوظ رکھے جس کے نتیجہ میں اس کا ذات باری تعالیٰ کی پاکیزہ بارگاہ سے اعراض کرنے لگے اور یہ اعراض حق تعالیٰ شانہٗ اور عارف کے درمیان حائل ہو جائے کسی کہنے والے نے کہا ہی خوب بات کہی ہے کہ جو شخص یہ جان لے کہ ذات باری تعالیٰ

مھیمن ہے تو وہ جملہ احوال میں اس کے جلال کے سامنے پست رہے۔

قوله: العزيز:

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿و اللّٰه غالب علٰى امره﴾ [يوسف: ٢١]

بعض حضرات کہتے ہیں کہ عزیز کا معنی ہے جس کی کوئی مثال نہیں تو اس صورت میں عزیز کا مرجع تنزیہ ہے۔

اور بعض حضرات کہتے ہیں عزیز ایسی ذات کو کہتے ہیں کہ جس کا اس کے اوصاف کے ساتھ احاطہ مشکل ہو۔

باقی رہا عارف کی ذمہ داری اسمِ عزیز سے وہ یہ ہے کہ اپنے نفس کو عزت والا بنائے اور اپنے نفس کو لوگوں سے سوال کی وجہ سے اور ان کی طرف احتیاجی ظاہر کرنے کی وجہ سے گھٹیانہ بنائے۔

ابو العباس ؒ فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم میں نے عزت مخلوق سے اپنا قصداً اٹھا لینے میں ہی دیکھی ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ اللہ کو عزیز وہ جانتا ہے جو اس کے حکم اور بندگی کو بڑا سمجھے، اور جو شخص اللہ کے اوامر کو ہلکا سمجھتا ہے تو یہ بات محال ہے کہ وہ اللہ کے عزیز ہونے کا پختہ اعتقاد رکھتا ہو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ ......﴾ [المنافقون: ٨]

قوله: الجبار: اس کی بناء جبر مصدر سے بطور مبالغہ ہے جبر کہتے ہیں سختی کے ساتھ شے کی اصلاح کرنا۔ اور اس کا اطلاق محض اصلاح پر بھی کیا جاتا۔ جیسے کہ جناب علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے "یا جابر کل کسیر" اے ہر ٹوٹی ہوئی چیز کی اصلاح کرنے والی ذات۔ اور اس طرح جبر کا اطلاق قہر محض پر ہوتا ہے جیسے کہ وارد ہوا (لا جبر ولا تفويض) یہاں جبر مطلقاً قہر محض کے معنی میں ہے اور پھر مجازاً ایسی بلندی پر بھی جبر کا اطلاق کر دیا جاتا ہے جو علو اور بلندی قہر اور غلبے کے سبب سے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ معظمہ کو بھی جبارۃ کہا جاتا ہے۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ جبار بندوں کے امور کی اصلاح کرنے والی ذات کو کہتے ہیں۔ جو ذات مؤمن کو اس کے فقر سے بے پرواہ کر دے اور مؤمن کی کسرِ نفسی سے اس کی عظمت شان کی اصلاح کر دے۔ اور جبار یہ اسماء افعال میں سے ہے۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ جبار ایسی بلند و بالا ذات کو کہتے ہیں کہ جس کو مکاروں کا مکر لاحق نہ ہو سکے اور قاصدین کا قصد نہ پا سکے تو اس صورت میں "جبار" کا مرجع تنزیہ باری تعالیٰ ہوگا۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ جبار کا معنی ہے ایسی ذات جو بندوں کو اپنے ارادے پر قہراً مجبور کر دے خواہ وہ ارادہ امر سے متعلق ہو یا نہی کے متعلق یا ایسی ذات جو "علی سبیل لا جبار" ان سے اپنا ارادہ صادر ہونے پر مجبور کر دے پس بندے کی خوشی ناخوشی اللہ کے ارادے کے مطابق ہو جائے۔ خواہ وہ ارادہ اخلاق کے متعلق یا اعمال کے متعلق بندوں کے رزق کے متعلق ہو یا ان کی عمروں کے متعلق اور اس صورت میں جبار صفاتِ ذات میں سے ہوگا۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ عارف کی ذمہ داری اس اسم شریف سے یہ ہے کہ وہ اپنے نفس پر متوجہ ہو کمالِ فضائل کے حصول کے ساتھ نفس کے نقائص کی اصلاح اور تلافی کرے اور نفس کو رزائل سے بچنے پر ہمیشہ برانگیختہ کرے اور مختلف قسم کے لمحے کی ریاضتوں اور مجاہدوں کے ساتھ نفس کی خواہش و شہوات کو توڑ ڈالے اور حق تعالیٰ شانہٗ کے علاوہ سے علیحدگی اختیار کرے۔ مخلوق کی طرف التفات نہ کرے وقار و سکون والے اخلاق اپنائے۔ بایں حقیقت کہ حوادثات زمانہ کا پے در پے آنا اس کے پائے استقامت کو متزلزل نہ کر پائے اور اسی طرح مصائب کا مسلسل نازل ہونا اس میں مؤثر نہ ہو۔ بلکہ اصلاح اور رہنمائی کی صورت میں نفوس انسانی اور جہان میں تاثیر کیلئے مضبوطی اختیار کرے۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ جب کوئی اسم ایسے کوئی معانی کا احتمال رکھتا جن میں سے بعض کو ذات باری تعالیٰ کی صفت میں لانا درست ہو تو جو شخص ذات باری تعالیٰ کو اسم کے ساتھ پکارے گا تو گویا اس نے انہیں معانی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اللہ جل شانہٗ کی ثناء کی ہے۔(یعنی جن معانی کا ذات باری تعالیٰ کی صفت میں لانا درست ہے) تو اس لئے اللہ پاک جبار بایں معنی کہ وہ ایسا عزیز و متکبر ہے جو اپنے بندوں پر احسان کرنے والا ہے۔کوئی چیز اس کی بادشاہت میں اس کی مراد کے خلاف جاری نہیں ہوسکتی جو شخص یہ بات جان لے کہ اللہ کو اس کی بلندی قدرت کی وجہ سے کوئی ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔تو اس بات کا یقین کرلے کہ اس کو قدرت استعمال کرنے سے روکنے کیلئے کوئی راستہ نہیں اور بندے کو اس کی طرف سے لطف و احسان بھی پہنچتا ہے۔آج اس کی معرفت ہے تو کل اس کی مغفرت۔عارف جب یہ بات جان لے کہ وہ مخلوق کو اپنے ارادے پر مجبور کرسکتا ہے اور اس کی سلطنت و بادشاہت میں اس چیز کا اجراء نہیں ہوسکتا جس چیز کو وہ ناپسند سمجھتا ہے اور جس چیز کا وہ انکار کرتا ہے۔تو آپ عارف کو چاہئے کہ وہ اپنی چاہت کو چھوڑ دے اور اپنے مولیٰ کے حکم کے تابع ہوجائے۔تو ایسا عارف سوچ و فکر کی مشقت اور امور تدبیر کی تھکاوٹ سے راحت حاصل کرے گا۔جیسا کہ بعض کتب میں یہ حدیث قدسی منقول ہے۔اللہ پاک فرماتے ہیں کہ اے میرے بندے تو بھی ارادہ کرتا ہے میں بھی ارادہ کرتا ہوں، اور ہوتا وہی ہے جس چیز کا میں ارادہ کرتا ہوں۔اگر تو میرے ارادے اور میری چاہت پر راضی ہوجائے تو میں تیرے ارادے اور تیری چاہت کی طرف سے کفایت کردوں گا اگر تو میرے ارادے پر راضی نہ ہوا تو میں تجھے تیرے ارادے کے حصول میں تھکا ڈالوں گا پھر بھی ہونا وہی ہے جو میرا ارادہ ہوگا۔یہی وجہ ہے کہ ابوزید کو کہا گیا کہ آپ کیا ارادہ رکھتے ہیں تو انہوں نے جواب میں کہا کہ میرا ارادہ یہ ہے کہ میں ارادہ نہ کروں۔

ابوعبداللہ انصاری نے کہا کہ عدم ارادہ کا ارادہ بھی ارادہ ہے۔امام غزالیؒ نے جبار کا ماحصل اور خلاصہ بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ بندوں میں سے جبار وہ ہے جو اپنے رب کی اتباع کی وجہ سے بلند ہوجائے اور دوسرے کو اپنے تابع کرنے کا درجہ پالے اور اپنے بلندئ مرتبہ کی وجہ سے بایں انداز منفرد ہوجائے کہ مخلوق کو اپنی خاص ہیئت و صورت کے ساتھ اپنی اقتدا پر اور اپنی خصلت و سیرت کی اتباع پر مجبور کرڈالے۔مخلوق خدا کو فائدہ پہنچائے ان سے فائدہ طلب نہ کرے۔دوسروں میں مؤثر ہو دوسروں سے متاثر نہ ہو۔یہ مقام علی وجہ الکمال صرف اور صرف ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوا۔اسی وجہ سے آپ نے فرمایا ''**لو کان موسٰی حیًا لما وسعہٗ الا اتباعی وانا سید ولد آدم ولا فخر** ''یعنی اگر موسیٰ علیہ السلام بھی اگر زندہ ہوتے ان کو بھی میری اتباع کے علاوہ چارہ نہ ہو۔اور میں اولاد آدم کا سردار ہونا اور اس میں فخر کی کوئی بات نہیں۔

قولہ: المتکبر : معنی ہے ذوالکبریاء یعنی بڑائی والی ذات اور وہ ذات پروردگار اور بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔

متکبر کا معنی ہے ایسی ذات جو مخلوق کی صفات سے بلند و بالا ہو۔اور کہا گیا ہے کہ متکبر کامل و اکمل ذات کو کہتے ہیں۔ذات باری تعالیٰ کے علاوہ متکبر کسی کی صفت نہیں لائی جاسکتی۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ متکبر کا معنی ہے ایسی ذات جو اپنی ذات کی نسبت اپنے علاءہ کو حقیر سمجھے اور وہ اپنے علاوہ کو اس طرح دیکھے جیسے مالک اپنے غلام کو دیکھتا ہے۔

متکبر کا لفظ جب مطلقاً بولا جائے تو ذات باری تعالیٰ کے علاوہ تصور کسی اور طرف نہیں ہوجاتا پس ذات باری تعالیٰ ہر چیز کی نسبت ہر طرح سے عظمت و کبریائی میں منفرد ہے۔یہی وجہ ہے کہ متکبر کا اطلاق صرف ذات باری تعالیٰ کیا جاتا ہے اگر ذات باری تعالیٰ کے غیر پر متکبر کا اطلاق کیا بھی جاتا ہے تو مذمت کے زمرے میں کیا جاتا ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ تکبر باب تفعل سے ہے اور باب تفعل کی خاصیت اور وضع ایسی چیز کیلئے ہے جو

حقیقت میں تو نہ ہو اس کے اظہار کیلئے تکلف سے کام لیا جائے۔تو مناسب یہ ہے کہ متکبر کا اطلاق ذات باری تعالیٰ پر نہ کیا جائے۔

امام طیبیؒ جواب دیتے ہیں کہ باب تفعل میں جو بالفعل تکلف ہے وہ مبالغہ کو بھی متضمن ہے اس لئے لفظ متکبر کا اطلاق جب ذات باری تعالیٰ پر کیا جائے گا تو اس کو تکلف بالفعل سے مجرد کر کے محض مبالغہ ہی ملحوظ ہوگا اور اس کی نظائر کلام عرب میں شائع ذائع ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ باب تفعل تکلف کے علاوہ کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے جیسے تقمص اور تعمم جس کا معنی ہے محض قمیص پہننا عمامہ باندھنا ہے یہاں کوئی تکلف والا معنی نہیں۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ جس نے اللہ پاک کی بلندئی شان اور اس کی کبریائی کو پہنچان لیا تو اس کو چاہئے کہ وہ عاجزی کے طریقے کو لازم پکڑے تذلل اور تواضع کے راستے پر چل پڑے۔بعض حضرات کہتے ہیں جو شخص اپنے مرتبے سے تجاوز کرتا ہے تو وہ اپنا ہتک ستر کر بیٹھتا ہے۔اور بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا ہے کہ فقیر اپنے پرانے کپڑوں میں اس آدمی سے اچھا ہے جو دوسرے کے نئے کپڑے پہنے پھر رہا ہو۔اور سرداروں کی موجودگی میں خدام کیلئے تواضع سے بڑھ کر کوئی اچھی چیز نہیں۔اور بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ جو شخص اللہ کی محبت میں سچا اور اس کی مودت میں مخلص ہے تو اللہ کو جو اس کے نہ دینے میں لذت آتی ہے وہ لذت اس لذت سے کہیں بڑھ کر ہے جو لذت اس کو عطاء کرنے میں ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ متکبر سے آپ کا حصہ یہ ہے کہ جب آپ نے اس کی کبریائی کا مشاہدہ کر لیا تو آپ کو چاہئے کہ آپ شہوات کی طرف مائل ہونے اور مرغوبات کی طرف سکون حاصل کرنے سے تکبر اختیار کریں۔(یعنی ان چیزوں کا ارتکاب نہ کیجئے)۔اس لئے ان چیزوں میں تو جانور بھی آپ کے ساتھ شریک ہیں بلکہ ہر ایسی چیز سے تکبر اختیار کر لیجئے جو آپ کے دل کو حق تعالیٰ سے مشغول کر دے اللہ کی پاکیزہ بارگاہ کی طرف پہنچنے کے علاوہ دنیا و آخرت کی ہر لذیز چیز کو حقیر سمجھے اور آپ سے بڑائی کے سارے دعوے زائل ہو جانے چاہئیں تا کہ آپ کا نفس صاف ستھرا ہو جائے اور اس پر حق کی مہر چھاپ جائے۔یہاں تک کہ نفس کی بھڑکتی ہوئی آگ ٹھنڈی ہو جائے اور اس کے نشانات ختم ہو جائیں۔نفس کا کوئی اختیار باقی نہ رہے اور نفس کو حق تعالیٰ کے علاوہ قرار و سکون نہ ہو۔

قوله: الخالق:یہ خلق مصدر سے ہے۔اور اس کا معنی ہے درست اور سیدھا اندازہ کرنا اور اسی سے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**فتبارك احسن الخالقين**﴾[المؤمنون:١٤] تو خالقین مقدرین کے معنی ہے یعنی اللہ بہترین اندازہ کرنے والے ہیں اور اس طرح : ﴿**وتخلقون افكا**﴾[العنكبوت:١٧]**تقدرون كذباً**' کے معنی میں ہے اسی طرح خلق بمعنی ابداع استعمال ہوتا ہے یعنی کسی چیز کو انوکھے انداز میں پیدا کرنا۔

اسی طرح شئ کو بغیر اصل کے ایجاد کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**خلق السمٰوٰت والارض**﴾[الانعام:٠١]

اور اسی طرح تکوین کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے ارشاد باری تعالیٰ: ﴿**خلق الانسان من نطفة**﴾[النحل:٠٤]اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ﴿**اللّٰه خالق كل شئ**﴾ میں خالق' قادر اور موجد کے معنی مین ہے یعنی اصل سے یا بغیر اصل کے اندر ہر چیز کے مقدر اور موجد ہیں۔

قوله: البارئ:اس کے آخر میں ہمزہ ہے یعنی وہ ذات جس نے مخلوق کو تفاوت اور فرق سے بری اور پاک کیا۔

قوله: المصور : واؤ مشددہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔یعنی وہ ذات جو انوکھے انداز میں ایجادات کی صورتیں بنانے والی ہے اور اس کی مزین اور مرتب کرنے والی ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ مصور ایسی ذات کو کہتے ہیں جو چیز کی صورت ایسی ہیئت پر بنائے کہ جس کی وجہ سے اس کے خواص وافعال مکمل ہو جائیں۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو اصل یا بغیر اصل ایجاد کرنے والا اور اس چیز کے بارے میں بغیر کسی خلل اور فرق اللہ وجل شانہٗ کی بات سبقت کر چکی ہے۔ اور اللہ ایسی صورت کا مصور ہے کہ جس پر اس کے خواص مرتب ہوتے ہیں اور اس پر اس کا کمال تام ہو جاتا ہے یہ تینوں اسماء نہیں ہیں (بلکہ معانی کے لحاظ سے بہت تفاوت ہے۔''**کما عرفت معانیها المختلفه فی السابق**''۔

عارف کا حصہ صفت مصور سے وہ یہ ہے کہ وہ کسی امر کا تصور نہ کرے۔ ہاں البتہ ایسی چیز میں ضرر وغور وغوض کرے جس میں حق جل شانہٗ کی واضح قدرت اور اس کی کاریگری کے عجائبات چھلک رہے ہوں۔ تاکہ وہ مخلوق سے خالق کی طرف ترقی کر جائے اور مصنوع کا ملاحظہ کرنے کی وجہ سے صانع کی طرف منتقل ہو جائے۔ حتی کہ وہ ایسا بن جائے کہ جب بھی وہ کسی چیز کی طرف نظر کرے تو اس چیز کے ہاں وہ اللہ ہی کو پائے۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ بندہ جب یہ بات جان لے نہ تو وہ کوئی چیز تھا اور نہ ہی عین تھا' پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو شے بنایا اور اس کو عین بنا دیا۔ تو مناسب یہ ہے کہ بندہ اپنے حال پر عجب پسندی سے کام نہ لے اور نہ ہی اس کے افعال عجب پر دال ہوں۔ اور بندے پر اس کے انجام کا حکم مخفی کر دیا گیا ہے اور ایسا شخص کیونکہ عاجزی نہیں کرے گا جو یہ جانتا ہوں کہ وہ ابتداء میں ایک حقیر نطفہ تھا اور انتہا کے اعتبار سے وہ ایک مردار ہو گا اور وہ فی الحال واضح بھوکا اور پیٹ بھرا قیدی ہے۔ اور اس بندے میں اتنے نقائص ہیں کہ اگر وہ ان میں ذرا بھی غور وفکر کرے تو اس کو اپنے رب کے جلال اور اس کی بزرگی کی معرفت حاصل ہو جائے گی۔

پھر جان لیجئے کہ یہ تیرہ اسماء جن کا ذکر پیچھے گذر چکا ہے۔ اسم جلالت یعنی اسم اللہ کے علاوہ اپنے اپنے معانی پر دائر ہونے کے ساتھ ساتھ ان میں سے ہر ایک اسم شریف اپنے سے سابق ومقدم کے اسم شریف کے مقابلہ میں زیادتی معنی کا فائدہ بھی دیتا ہے اور سورۂ حشر کے اختتام پر بھی یہ اسماء اسی ترتیب سے وارد ہوئے ہیں۔ لیکن وہاں ان کے ساتھ **عالم الغیب** اور **العزیز الحکیم** کی زیادتی بھی ہے۔ بعض حضرات نے کہا کہ سورۃ حشر کا آخر اللہ کے اسم اعظم پر مشتمل ہے۔ واللہ اعلم۔

قوله: الغفار: یعنی ایسی ذات جو دنیا میں گناہوں اور عیبوں پر پردہ ڈال کر ڈھانپ دے اور آخرت میں عذاب عقاب نہ کرنے کی صورت میں پردہ ڈال کر ڈھانپ دے۔

زیادتی الفاظ کی وجہ سے یہ لفظ غفور سے ابلغ ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں غفار میں مبالغہ کمیت ومقدار کے اعتبار سے ہے اور غفور میں مبالغہ کیفیت کے اعتبار سے ہے اور غفر کا اصل معنی ڈھانپنا ہے اور یہ اسماء افعال میں سے ہے۔

آپ کا حصہ صفتِ غفار سے تو وہ یہ کہ آپ اس بات کا یقین کر لیں کہ ذات باری تعالیٰ کے علاوہ گناہوں کو بخشنے والا کوئی نہیں اور آپ کو بھی چاہئے کہ اللہ کے بندوں کی ستر پوشی کریں اور ان سے معافی تلافی والا معاملہ کریں اور استغفار کو لازم پکڑیں خصوصاً اوقات سحر میں۔

امام قشیریؒ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: ﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ......﴾ [النساء: ۱۱۰] کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ثم تراخی کا تقاضا کرتا ہے۔ تو گویا اللہ پاک فرماتے ہیں کہ جس نے اپنی ساری عمر لغزشوں میں گذار دی۔ اور اپنی حیات مستعار کو اپنے پروردگار کی مخالفتوں میں فناء کر دیا اور اپنی جوانی کو غلط کاموں میں برباد کر دیا پھر وہ موت سے پہلے شرمندہ ہو گیا تو وہ اپنے اللہ کی

جانب اپنے گناہوں کی معافی ہی پائے گا۔ من یعمل سوءًا ' میں بندے کے فعل کی خبر دی گئی اور ثم یستغفر اللّٰہ میں بندے کے قول کی خبر دی گئی ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے جن لوگوں کی لغزشیں ان کی حالت ہے۔ اور ان کی توبہ ان کی بات ہے اے مخاطب! اللہ پاک نے آپ پر معاملہ سہل کر دیا کہ آپ کی جانب سے ایک بات پر وہ راضی ہو جاتا ہے۔ حالانکہ آپ نے جو عمل کیا سو وہ کیا ہے۔ استغفار محض مغفرت کا تقاضا کرتا ہے تو اس کے مقابلہ میں یجد اللّٰہ گناہگار کی حالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے لایا گیا جیسے وہ مغفرت طلب کرے یا اللہ کو پالے گا۔

قولہ: القہار یعنی وہ ذات کہ موجودات میں سے کوئی بھی چیز ایسی نہیں جو اس کی قدرت کے نیچے مشہور اور اس کے فیصلے اور تقدیر کے سامنے تابع نہ ہو۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وهو القاهر فوق عباده﴾[الانعام:۱۸] اور قہار کا مرجع قدرت ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ قہار ایسی ذات کو کہتے ہیں جو بڑے بڑے ظالموں کو رسوا کر دے اور ان کو ہلاک کر کے ان کی کمروں کو توڑ دے۔ اس صورت میں ''قہار'' اسماء افعال میں سے ہے۔

کہنے والے نے کیا ہی اچھی بات کہی ہے کہ ''قہار'' وہ ذات ہے کہ اس کے حملے کے سامنے ہر سرکش اور جابر کا حملہ مضمحل اور کمزور ہو جائے۔ اور اس کی شان وشوکت کے سامنے بادشاہوں اور اہل فخر وتکبر کے قویٰ ختم ہو جائیں۔ خصوصاً اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿لمن الملك اليوم لله الواحد القهار﴾[الغافر:٦٦] کے وقت کہاں ہوں گے شاہان فارسی اس خطاب کے وقت اور کہاں ہوں گے انبیاء اور رسل اور مقرب فرشتے اس عتاب کے وقت کہاں ہونگے' حاملین ضلالت وایجاد۔ اور حاملین توحید وارشاد کہاں ہوں گے آدم علیہم السلام اور ان کی اولاد کہاں ہوا ابلیس اور اس کا گروہ۔ گویا کہ وہ ختم ہو چکے گویا کہ وہ اس کائنات میں کبھی رہے ہی نہ تھے جانیں نکل چکی ہوں گی اور روحیں اپنے مقام پر پہنچ چکی ہوں گی اور جیسا کہ متفرق ہو چکے ہوں گے۔ صرف ایک ایسی ذات موجود رہ جائے گی جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ اس کے علاوہ اول تا آخر ساری چیزیں ختم ہو جائیں گی انسانوں کے جوڑ اور ان کے اعضاء متفرق ہو چکے ہوں گے۔ اور بطور فائدہ یہ بات بھی جان لیجئے کہ اللہ پاک نے عابدین کے نفوس کو اپنے حقوقِ عبودیت کے ساتھ اور عارفین کے قلوب کو اپنی قربت کی شان وشوکت کے ساتھ اور رواجدین کو اپنی کشفِ حقیقت کے ساتھ مقہور کر رکھا ہے۔ عابد بے نفس ہوا کرتا ہے کیونکہ عابد کے نفس کے افعال پر باری تعالیٰ کی حجت غلبہ پا چکی ہوتی ہے۔ اور عارف بے دل ہوا کرتا ہے اس لئے کہ اس کے دل پر ذات باری کی توجہ حجت غلبہ پا چکی ہوتی ہے اور واجد بے روح ہوتا ہے اس لئے کہ اس کی روح پر اس کے جلال وجمال کے کشف پر غلبہ پا چکا ہوتا ہے۔

قولہ: الوہاب: یعنی ہمیشہ دینے والی کثیر النعمۃ ذات جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وما بكم من نعمة فمن الله﴾[النحل:٥٣] ﴿وان تعدوا نعمة الله لا تحصوها﴾[النحل:١٨]

ہبہ حقیقتاً اس کو کہتے ہیں جو اعراض اور اغراض کی غرض سے خالی ہو لہٰذا جو کسی غرض سے دیتا ہے گویا وہ اپنا عوض کرنے والا ہے وہ واحب نہیں ہے اور واہب اسماء افعال میں سے ہے۔

قولہ: الرزاق یعنی وہ ذات جو ان ارزاق واسباب کی خالق ہے جن ارزاق واسباب سے نفع اٹھایا جاتا ہے اور رزق اس چیز کو کہتے ہیں جس سے نفع اٹھایا جائے خواہ وہ چیز مباح ہو یا ممنوع۔ لیکن معتزلہ کہتے ہیں رزق وہ کہلائے گا جو انسان کی ملک میں ہوگا لیکن ان کے اس قول کا فاسد ہونا طرداً اور عطفاً ظاہر ہے۔ طرداً تو فاسد ہونا اس لئے ظاہر ہے کہ اللہ کے سوا ہر چیز ملک ہو سکتی ہے لیکن ہر چیز رزق نہیں کہلاتی۔ اور عطفاً اس لئے فاسد ہے کہ اللہ پاک نہ جانوروں کو ان کا رزوق عطا کرتے ہیں کیونکہ ارشاد باری: ﴿وما من دابة في الارض الا على الله رزقها﴾[هود:٦]

اس رزق کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) ظاہری جو بدن وغیرہ کیلئے ہوتا ہے جیسے اشیاء خورد ونوش اور دیگر ساز وسامان۔ (۲) باطنی۔ جو قلوب اور نفوس کیلئے ہوتا ہے جیسے علوم ومعارف وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ بعض محققین کہتے ہیں کہ رزاق اس ذات کو کہتے ہیں جو دلوں کو اپنے لطف کے فوائد اور روحوں کو اپنے کشف کے عوائد کا رزق عطا کرے۔

بعض دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ رزاق وہ ذات ہے جو نیک لوگوں کے نفوس کو اپنی توفیق عطا کرے اور بہترین لوگوں کے قلوب کو اپنی توفیق سے روشن کردے۔

باقی رہا عارف کا حصہ صفت رزاق سے یہ ہے کہ وہ رزاق کے معنی کا خوب تحقیق کرے تاکہ اس کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ رزاق کہلانے کا مستحق اللہ ہی ہے رزق کا انتظار اور اس کی توقع صرف اللہ ہی سے کی جاسکتی ہے اور اپنے معاملہ کو اللہ کے سپرد کرے۔ اور رزق کے سلسلہ میں اللہ ہی پر بھروسہ کرے۔ اور اپنے ہاتھ کو اپنے رب کا خزانہ بنادے اور اپنی زبان کو اللہ اور اس کی مخلوق کے درمیان تعلیم صرف مال اور ان کے حق میں دعائے خیر کے واسطہ سے ان کی طرف روحانی جسمانی رزق پہنچانے کی صورت میں واسطہ بناڈالے تاکہ وہ بھی اس صفتِ حسنہ سے حصہ وافر پالے۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں جو شخص یہ پہچان لے کہ اللہ ہی رزاق ہے تو اس کو چاہئے کہ ہمیشہ اللہ پر بھروسہ کرنے کی صورت میں اسی طرف قصد کرے اور اس کا تقرب حاصل کرنے کی کوشش میں لگا رہے۔ جیسا کہ عارفین میں سے کسی ایک سے جب یہ سوال کیا گیا کہ آپ کھاتے کہاں سے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ جب سے میں نے اپنے خالق کو پہچانا ہے تو رزق کے سلسلہ میں میں کبھی بھی تشکیک کا شکار نہیں ہوا۔ اور اسی طرح کسی عارف سے جب سوال کیا گیا کہ آپ کی روزی کیا ہے تو انہوں نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ میری روزی ایسی زندہ ذات کا ذکر ہے جس کو کبھی موت نہیں آئے گی۔

اسی طرح بعضے، از عارفین کا یہ قول بھی منقول ہے کہ وہ حقیر چیز کا سوال حقیر سے کرتا ہے تاکہ وہ اس کے بدلے اس کو بڑی اور خطیر چیز دیدے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**من ذا الذی یقرض اللّٰہ قرضًا حسنًا**﴾[البقرۃ:۲۴۵] اسی سے ملتا جلتا واقعہ حضرت شبلیؒ کا ہے انہوں نے ایک مالدار آدمی کی طرف اپنا قاصد بھیجا کہ ہمیں بھی وہ اپنی دنیا میں سے کچھ دے تو مالدار نے جواب میں لکھ بھیجا کہ اپنے مولیٰ سے اپنے لئے دنیا کا سوال کرو تو شبلیؒ نے جواب میں فرمایا کہ دنیا بھی حقیر ہے اور تو بھی حقیر ہے تو اس لئے کہ میں حقیر چیز کا سوال حقیر ہی سے کرتا ہوں۔ میں اپنے مولیٰ سے تو اپنے عظیم مولیٰ کو طلب کرتا ہوں۔ اس سے کوئی اور چیز طلب نہیں کرتا۔

اور باقی یہ واقعات اس روایت کے منافی نہیں جس میں یہ وارد ہوا کہ ''**یا موسٰی سلنی حتی ملح عجینك**'' کہ اے موسیٰ مجھ ہی سے سوال کرو اگرچہ یہ سوال آٹے کے نمک کے سلسلہ ہی میں کیوں نہ ہو۔ اس لئے کہ مخلوق سے اس چیز کے بارے میں سوال کرنا جو عموماً ان کے پاس پائی جاتی ہیں۔ یہ اس کے منافی نہیں ہے کہ اللہ سے اس چیز تک پہنچنے کے اسباب کی آسانی کا سوال کیا جائے۔

قولہ: الفتاح یعنی مخلوق کے درمیان فیصلہ کرنے والی ذات۔ یہ فتحہ سے ہے اور فتح بمعنی حکم ہے اور اسی سے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**ربنا افتح بیننا وبین قومنا وانت خیر الفاتحین**﴾[الاعراف:۸۹] اور حکم کو فتح اس لئے کہتے ہیں کیونکہ حکم اور فیصلہ بھی خصمین کے درمیان امرِ مغلق کو کھول دیتا ہے اور اللہ پاک نے رسولوں کو بھیجنے اور کتابوں کو نازل کرنے اور عقلی اور نقلی دلائل قائم کرنے کی صورت میں حق کو ظاہر کر کے اس کو واضح کر دیا اور باطل کو ظاہر کر کے اس کو مٹا دیا۔ اس صورت میں صفت فتاح کا مرجع علم بنتا ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ فتاح ایسی ذات کو کہتے ہیں جو مختلف قسم کی مخلوقات پر اپنی رحمت کے دروازے کھول دے۔ اسی سے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**وعندہٗ مفاتیح الغیب لا یعلمھا الا ھو**﴾[الانعام:۵۹] اور اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**ما یفتح**

اللّٰہ للناس من رحمة فلا ممسك لها ﴾[الفاطر:۲]

بعض حضرات کہتے ہیں کہ مفتاح یہ فتح سے ہے اور فتح کہتے ہیں حسّی اور معنوی تنگی کو کھول دینا جیسے وہ شخص جو اپنے فیصلے کے ذریعے حق کے سلسلے میں خصمین کی تنگی کو کھول دیتا ہے۔

بعض بزرگوں سے یہ بھی منقول ہے کہ فتاح وہ ذات ہے کہ جو گناہوں کی وجہ سے نعمت کے راستوں کو بند نہ کرے اور بھلا دینے کی وجہ سے ایصال نعمت نہ چھوڑے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ فتاح اس ذات کو کہتے ہیں جو مؤمنین کے دلوں کو اپنی معرفت کے نور کی وجہ سے کھول دے اور گنہگاروں پر اپنی مغفرت کے دروازے کھول دے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ فتاح اس ذات کو کہتے ہیں جو نفوس پر اپنی توفیق کا دروازہ اور دلوں پر اپنی تحقیق کا دروازہ کھول دے۔

آپ کا حصہ صفت فتاح سے وہ یہ ہے کہ آپ لوگوں کے درمیان فتاح کی سعی اور کوشش کریں اور آپ مظلوموں کی نصرت کریں اور مخلوق خدا پر جو دینی یا دنیاوی امور گراں یا مشکل ہیں ان کو آسان کرنے کا ارادہ کریں تا کہ آپ کیلئے بھی اس اسم شریف سے حصہ ہو جائے۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ جب بندہ یہ بات جان لے کہ بند دروازوں کو کھولنے والی اور اسباب کو آسان کرنے والی جملہ امور کو درست کرنے والی ذات وہی ہے تو پھر اس کو چاہئے کہ وہ اپنے دل کو اس کے علاوہ کسی بھی ذات کے ساتھ معلق نہ کرے اور اس کی سوچ وفکر اس کے علاوہ کسی اور چیز میں مشغول نہ ہو اگر اللہ کی طرف سے مصیبت وآزمائش میں زیادتی ہو تو اس کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اعتماد اور امید میں اضافہ کر دینا چاہئے اور یہ بھی جان لیجئے کہ اللہ تعالیٰ نفوس کیلئے توفیق کی برکات کو اور قلوب کیلئے تحقیق کے درجات کو کھول دیتا ہے اور نفوس کا مجاہدات کے ساتھ مزین ہونا اسی کی توفیق کی برکات کی وجہ سے ہوتا ہے اور قلوب کا مشاہدات کے ساتھ مزین ہونا اس کی تحقیق کے درجات کی وجہ سے ہوتا ہے اور جو شخص یہ بات جان لے کہ اللہ کی ذات ہی فتاح ہے تو اس کے آداب میں سے یہ ہے کہ اس کے کرم کے حصول کیلئے اس کو حسن انتظار سے کام لینا چاہئے اور اس کے لطف ومہربانی پانے کیلئے ہمیشہ منتظر رہنا چاہئے اور اس کے اجرائے حکم کے تحت ساکن رہنا چاہئے اور وہ اس بات کو جان لے کہ جس چیز کو اس نے مؤخر کر دیا ہے اس کو کوئی مقدم کرنے والا نہیں اور جس چیز کو اس نے مقدم کر دیا ہے اس کو کوئی مؤخر کرنے والا نہیں ہے۔ جیسا کہ ایک آدمی نے حضرت علیؓ کی لونڈی کو کہا کہ مجھے تجھ سے محبت ہے تو اس لونڈی نے یہ بات حضرت علیؓ کو ذکر کی تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اس کو جا کر کہہ دو کہ میں بھی تجھ سے محبت کرتی ہوں تو اس کے بعد کیا کرنا ہے تو اس لونڈی نے یہ بات جا کر کہہ دی تو اس آدمی نے کہا صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان وصال کا فیصلہ فرما دے تو لونڈی نے یہ ساری بات جا کر حضرت علیؓ کو ذکر کی تو حضرت علیؓ نے اس آدمی کو بلایا اور اس سے سارے قصے کے بارے میں پوچھ گچھ کی تو اس نے ساری بات سچ سچ بتلا دی حضرت علیؓ نے فرمایا اس لونڈی کو لے جاؤ یہ تیری ہے اللہ نے تمہارے درمیان وصال کا فیصلہ فرما دیا ہے۔ فتاح اسمائے افعال میں سے ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ فتاح اس ذات کو کہتے ہیں جو فتح اور نصرت کو انوکھے انداز میں پیدا کر دے اور اسی سے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿انا فتحنا لك فتحًا مبينا ﴾[الفتح:۱]

قوله: العليم:

ایسی عالم ذات جو علم میں انتہا کو پہنچی ہوئی ہو اور اس کا علم علمِ محیط ہو اور اس کا علم تمام چیزوں کے ظاہر و باطن سے اور ان کے چھوٹے

اور بڑے سے اوران کی کلیات وجزیات سے سبقت کرنے والا ہے اور یہ علیم صفات ذات میں سے ہے اور ایسی عالم ذات اللہ کی ہے جو اپنی ذات وصفات اور اپنے اسماء کو جانتا ہے جو کچھ ہو چکا اس کو بھی جانتا ہے اور جو کچھ ہو تو سکتا ہے لیکن ہوگا نہیں اس کو بھی جانتا ہے اور اگر وہ چیز ہو جائے تو اس کی کیا کیفیت ہوگی' اس کو بھی وہ جانتا ہے۔ اور محال چیز کو اور وہ کس اعتبار سے محال ہے اس کو بھی جانتا ہے اور اگر بفرض محال وہ محال نہ رہے تو اس پر کیا مرتب ہوگا وہ اس کو بھی جانتا ہے جیسا کہ اللہ پاک نے ارشاد فرمایا: ﴿**لو كان فيهما الا الله لفسدتا**﴾[الانبیاء:۲۲] (یعنی تعدد الٰہ محال ہے اگر ہو جائیں تو فساد مرتب ہوگا۔ تو خلاصہ کلام یہ ہے کہ وہ ایسی علیم ذات ہے کہ اس پر کوئی چیز مخفی نہیں۔

کیا ہی اچھی بات ہے جو کسی قائل نے کہی ہے کہ جس شخص نے یہ پہچان لیا کہ اللہ اس کی حالت کو بخوبی جانتا ہے تو ایسے شخص کو چاہئے کہ وہ اس کی آزمائش پر صبر کرے اور اس کی عطا پر شکر کرے اور اپنی خطاؤں سے معافی مانگے۔ امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے یہ جان لیا کہ اللہ تمام مخفی چیزوں کو بخوبی جاننے والا ہے اور دل کے کھٹکوں سے بخوبی باخبر ہے تمام حالات میں تمام حوادث میں سے کوئی چیز بھی اس پر مخفی نہیں ایسے آدمی کیلئے لائق یہ ہے کہ وہ اس کی اطلاع پانے کی جگہوں سے حیا کرے اور اس کی اچھی پردہ پوشی کی وجہ سے دھوکے میں پڑنے سے بچے بعض کتابوں میں یہ حدیث قدسی منقول ہے کہ اللہ پاک فرماتے ہیں کہ اے میرے بندو اگر تم یہ نہیں جانتے کہ میں تم کو دیکھ رہا ہوں تو پھر تمہارے ایمان میں خلل ہے اور اگر تم یہ جانتے ہو کہ میں تم کو دیکھتا ہوں تو پھر تم اپنی طرف دیکھنے والوں میں سے مجھے زیادہ ہلکا کیوں سمجھتے ہو۔

قوله: القابض الباسط:

یعنی وہ ذات جو جس پر چاہے جسے چاہے رزق وغیرہ تنگ کردے یا فراخ کردے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ قابض ایسی ذات کو کہتے ہیں جو موت کے وقت جسموں سے روحوں کو قبض کرے اور حیات کے وقت روحوں کو ان جسموں میں پھیلا دے اور یہ دونوں صفاتِ افعال میں سے ہیں۔

بعض عارفین کہتے ہیں کہ ان دونوں کا معنی یہ ہے کہ کبھی ضلالت وہدایت کی صورت میں دلوں کو قبض کرے۔ اور ان میں فراخی پیدا کردے اور کبھی خوف اور امید کی صورت میں دلوں کو قبض کرے اور ان میں فراخی پیدا کردے۔ (امید اور ہدایت کا تعلق بسط سے ہے خوف اور ضلالت کا تعلق قبض سے ہے) اور بعض کہتے ہیں وہ ذات ہے جو آپ پر اپنے جلال کو کھول کر آپ کو فنا کر ڈالے اور آپ پر اپنا جمال کھول کر آپ میں غناء پیدا کردے جیسے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿**والله يقبض ويبسط**﴾[البقرۃ:۲۴۵] یعنی ہر چیز میں اللہ قبض اور بسط کرتا ہے۔ خواہ وہ چیز اخلاق سے تعلق رکھتی ہو یا رزق سے یا اسی طرح اس چیز کا تعلق روحوں سے ہو یا دلوں سے جب قبض کرے تو کوئی طاقت نہیں جب بسط اور فراخی کردے تو کوئی فاقہ نہیں اور یہ دونوں صفتیں اللہ کی پختہ حکمت اور کمال قدرت پر دلالت کرتی ہیں اور باقی رہا ان دونوں صفتوں سے آپ کا حصہ تو سو وہ یہ ہے کہ آپ قبض اور بسط دونوں حالتوں کا خیال رکھیں مخلوق میں سے کسی کو عیب مت لگائیں۔ اور آپ مصیبت کی حالت میں اللہ سے مایوس نہ ہوں اور اس کی عطا پر بے خوف نہ ہو جائیں اگر آپ بطور عدل کے اللہ کی جانب سے حالت قبض پائیں تو صبر کیجئے اور اگر اس کی جانب سے آپ بطور فضل بسط کی کیفیت پائیں تو شکر کیجئے اور آپ اس کے فیصلے پر فی المال اور فی الحال راضی ہو جائیے۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں یہ دونوں صفتیں اہل معرفت پر ایک دوسرے کے بعد وارد ہوتی ہیں جب عارف پر خوف کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ منقبض ہو جاتا ہے اور جب امید کا غلبہ ہوتا ہے تو اس میں انبساط آجاتا ہے حضرت جنید بغدادیؒ سے یہ بات نقل کی گئی ہے کہ وہ فرماتے ہیں

کہ خوف مجھے منقبض کر دیتا ہے اور امید مجھ میں انبساط پیدا کر دیتی ہے اور حق مجھے سمیٹ دیتا ہے اور حقیقت مجھے جدا کر دیتی ہے اور وہ ان تمام حالتوں میں مجھے وحشت دلانے والا ہوتا ہے' میرا مؤنس نہیں۔ اور پھر فرمایا کہ حالت قبض میرے لئے باعث وحشت اور حالت بسط میرے لئے باعثِ انس ہوتی ہے انتہیٰ کلامہ۔ بندے کیلئے مناسب یہ ہے کہ وہ حالت قبض میں اکتانے سے بچے اور حالت بسط میں ترک ادب اور حد سے زیادہ چوڑا ہونے کا ارتکاب نہ کرے اور ہمارے بڑے حالت بسط میں اس چیز کے ارتکاب سے ڈرتے رہے ہیں۔

قولہ: الخافض، الرافع: یعنی وہ ذات جو میزان عدل کے پلڑے کو جھکاتی اور بلند کرتی ہیں۔

وہ ذات جو کافروں کو ذلت ورسوائی کی صورت میں پست کرتی ہے اور مؤمنین کو مغفرت وعزت کی صورت میں بلندی کرتی ہے۔

وہ ذات جو اپنے دشمنوں کو دور کر کے ان کو پست کرتی ہے اور اپنے دوستوں کو سعادت سے بہرمند کر کے ان کو بلند کرتی ہے۔

آپ کا حصہ خافض اور رافع میں یہ ہے کہ آپ اپنے احوال میں کسی حال پر اعتماد نہ کریں۔ اور اپنے علوم واعمال میں کسی چیز پر بھروسہ نہ کریں۔ خافض اور رافع کو بطور اخلاق کے اپنانا اس طرح ہے کہ جس چیز کو اللہ نے آپ کو پست رکھنے کا حکم دیا ہے اس کو پست رکھیں جیسے نفس اور خواہش اور جس چیز کے بارے میں اللہ نے آپ کو بلند کرنے کا حکم دیا ہے اس کو بلند کریں جیسے قلب اور روح۔ جیسے ایک آدمی کو ہوا پر اڑتا دیکھا گیا تو اس سے پوچھا گیا کہ آپ ہوا پر کیسے اڑ رہے ہیں تو اس نے جواب دیا میں نے اپنی ہوا یعنی خواہش کو قدموں کے نیچے رکھ دیا تو اللہ نے میرے لئے ہوا کو مسخر کر دیا۔

قولہ: المعز المذل: "اعزاز" کہتے ہیں کسی چیز کو ایسا کمال والا بنا دینا کہ جس کی وجہ سے چیز مرغوب اور قلیل المثال بن جائے۔ اذلال اعزاز کی ضد ہے اور حقیقی اعزاز انسان کا حاجت اور اتباع شہوت کی ذلت سے چھٹکارا پانا ہے۔ اور اپنے نفس کو مقہور کر کے اپنے آپ کو اپنی مراد پر غالب کرنا ہے۔

بعض عارفین فرماتے ہیں معزّ وہ ذات ہے جو اپنے دوستوں کو معصیت سے محفوظ کر کے ان کے اعزاز بخش دے اور پھر ان اپنی رحمت سے معاف کر دے اور پھر ان کو اپنے عزت کے گھر کی طرف منتقل کر دے پھر وہاں اپنے دیدار اور مشاہدے کی صورت میں ان کو اعزاز بخشے۔ اور مذل وہ ذات ہے جو اپنے دشمنوں کو اپنی معرفت سے محروم کر دے۔ اور پھر ان کو اپنے دارِعقوبت کی طرف منتقل کر دے اور پھر وہاں ان کو دھتکار کر اپنے رحمت سے دور فرما کر ان کی اہانت کر دے۔

معز اور مذل والی صفت سے آپ کا حصہ یہ ہے کہ آپ اللہ کے غیر سے عزت طلب نہ کریں اور اللہ کے غیر کیلئے اپنے آپ کو ذلیل نہ کریں۔ اور آپ حق اور اہل حق کی عزت کریں اور باطل اور اہل باطل کو ذلیل کر دیں۔ اور اللہ جل شانہٗ سے اپنی عزت کے اسباب کی توفیق مانگیں اور اللہ عزوجل سے ذلت سے پناہ مانگیں۔

مشائخ فرماتے ہیں کہ جس شخص کو اللہ عزاسمہٗ اس کے نفس کی کی رسوائی کی طرف راہنمائی کر دیں تو اس سے بڑھ کوئی اعزاز نہیں ہو سکتا اور جس شخص کو عزت کے وہم میں مبتلا کر دیں تو اس سے بڑھ کر کوئی اذلال نہیں ہو سکتا۔

اللہ عزاسمہٗ کے اس ارشاد: ﴿وتعز من تشاء وتذل من تشاء﴾ [آل عمران:۲۶] کے بارے میں بعض حضرات نے کہا ہے کہ اللہ پاک موحدین محبین مریدین عافین زاہدین اور عابدین میں سے ہر ایک کو اس کے مقام کے مناسب اعزاز عطا کرتے ہیں۔ جس کی تفصیل یوں ہے کہ اللہ عزاسمہٗ زاہد کو اپنے نفس کے دنیا سے موڑ لینے کی صورت میں اعزاز عطا فرماتے ہیں اور عابد کو ترک خواہش خدمتِ مولیٰ کی صورت میں اعزاز عطا فرماتے ہیں اور مریدین کو مخلوق کی صحبت سے زہد اختیار کر لینے کی صورت میں عزت بخشتے ہیں اور عارف کو مقام سرگوشی کا اہل بنانے کی صورت میں عزت بخشتے ہیں اور محب کو کشف وملاقات کی صورت میں عزت کے عطا کرتے ہیں اور موحد کو ایسی

ذات کی جلالت اور بزرگی کی حضوری کی صورت میں عزت بخشتے ہیں کہ جس ذات کے لئے ہمیشہ کی بقاء اور پررونق عظمت ہے۔

قولہ: السمیع البصیر: سمع اور بصر کہتے ہیں سنائی دینے والی اور دکھائی دینے والے چیزوں کا انکشاف تام اور کامل صورت میں ادراک کرنے کو۔

اللہ کی آٹھ ذاتی صفات میں سے یہ دو صفتیں بھی ہیں اور یہ دونوں صفتیں صفتِ علم کا غیر ہیں کیونکہ یہ دونوں صفتیں دکھائی دینے والی اور سنائی دینے والی چیزوں کے ادراک کے ساتھ مختص ہیں۔ اور صفتِ علم ان دونوں اور ان دونوں کے علاوہ سے عام ہے۔ جیسے یہ بات سابق میں گذر چکی ہے۔ اور باقی رہا علامہ ابن حجرؒ کا یہ قول کہ ان دونوں صفتوں کی وجہ سے انکشاف اتم ہوتا ہے۔ یہ ان کا قول ناقص ہے۔ (انکشاف تام تو کہہ سکتے ہیں انکشاف اتم تنہا درست نہیں)۔ کیونکہ یہ دونوں صفتیں صفتِ علم کی طرف لوٹتی ہیں۔ (کیونکہ مسموعات اور مبصرات کا ادراک بھی ایک قسم کا علم ہے)۔ اور یہ دونوں صفتِ علم سے زائد نہیں ہیں (کیونکہ خاص عام سے زائد نہیں ہوا کرتا)۔ اور یہ بات بھی مسلمات سے ہے کہ رؤیت یعنی دیکھنا علم کی قسم ہے اس سے سننا بھی ایک قسم کا علم ہے۔ تو انتہائی بات یہی ہے کہ یہ دونوں صفتیں ادراک کے معنی میں ہو کر صفت علم کی طرف لوٹتی ہیں۔ لیکن پھر بھی عقیدے کے سلسلے میں علیم کے ضمن میں صفتِ علم کے اجمالی اثبات سے صفت سمع اور بصر کے کتاب وسنت میں وارد ہونے والے الفاظ کے ضمن میں صفتِ سمع اور بصر کے تفصیلی اثبات سے استغناء نہیں برتا جا سکتا اس لئے کہ جو کچھ کتاب وسنت میں وارد ہوا ہے ہم اس کے پابند ہیں۔

شرح مواقف میں ہے کہ یہ دونوں صفتیں صفتِ علم سے زائد ہیں۔ بالآخر قیل وقال میں یہی کہا جائے گا کہ سمع اور بصر کے الفاظ چونکہ کتاب وسنت میں وارد ہوئے ہیں۔ اس لئے ہم ان کے اثبات برائے ذات باری تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں اور ہم یقین رکھتے ہیں کہ یہ سمع اور بصر معروف دو آلوں یعنی آنکھ اور کان کے ذریعہ سے نہیں (اس لئے کہ اللہ ان چیزوں سے پاک ہے) بلکہ ہم یہ برملا اعتراف کرتے ہیں کہ ہمیں ان کی حقیقت سے واقفیت نہیں۔

باقی رہی علامہ ابن حجرؒ کی یہ بات کہ جس نے صفت سمع وبصر کو علم کے مترادف ٹھہرایا ہے اس کو وہم ہوا ہے ہم بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں۔ (کہ صفت سمع اور بصر علم کے مترادف نہیں ہیں) بلکہ میرا گمان تو یہ ہے کہ اہل علم میں سے کسی کو ان دونوں کے مترادف علم ہونے کا وہم نہیں لگا ہوگا' نہ ہی اللہ کے حق میں اور نہ ہی مخلوق کے حق میں اتنی بات ضرور ہے کہ اس کا اتم ہونا مخلوق کے حق میں قاصر اور ناقص ہے اللہ کے حق میں نہیں بلکہ ہمارے حق میں علم یقینی حس تک پہنچنے کے علاوہ نہیں ہوتا جو شخص چکھے نہ شے کا ذائقہ جانتا نہیں۔ باقی رہا اللہ کا علم دکھائی دینے والی سنائی دینے والی کڑوی اور میٹھی چیزوں کلیات اور جزیات کو محیط ہے۔ صفات میں بغیر کسی فرق کے۔

آپ کا ان دو عظیم اسموں اور عمدہ وصفوں سے حصہ وہ یہ ہے کہ آپ بھی یقین کرلیں کہ آپ اللہ کے سننے اور دیکھنے کی جگہ پر ہیں وہ اللہ آپ پر مطلع ہے اور وہ آپ کی طرف دیکھ رہا ہے اور وہ آپ کے جملہ احوال پر نگہبان ہے خواہ وہ احوال افعال سے تعلق رکھتے ہوں یا اقوال سے اس بات سے ڈریئے کہ اللہ آپ کو وہاں دیکھے جہاں آپ کو منع کیا ہے۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص اس چیز کو جس کو وہ اللہ سے نہیں چھپاتا وہ اس چیز کو غیر اللہ سے چھپاتا پھر رہا ہے۔ تو ایسے شخص نے اللہ کی نظر کو ہلکا سمجھا اور جو شخص کسی معصیت کا ارتکاب کرتا ہو حالانکہ وہ جانتا ہے اللہ اس کو دیکھ رہا ہے کیا ہی اس کی جرأت ہے کیا ہی اس کی جسارت ہے۔ اور جو یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ اس کو دیکھ نہیں رہا تو کیا ہی اس کا کفر ہے کیا ہی اس کی ناشکری ہے۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ جب تم اپنے مولا کی نافرمانی کرو تو ایسی جگہ نافرمانی کرو جہاں اللہ آپ کو دیکھ نہ رہا ہو۔ اس بات سے مراد تعلیق بالمحال (یعنی اللہ کا کسی جگہ نہ دیکھنا) محال ہے تو لہٰذا کسی جگہ بھی اللہ کی نافرمانی نہیں کرنی چاہئے۔ اور اللہ کی اپنے بندوں کے ساتھ مہربانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ

اللہ ان کے کان اور آنکھ کی حفاظت کرتے ہیں اور کسی کی طرف اللہ نے اپنے اس ارشاد میں اشارہ کیا ہے۔حدیث قدسی ہے ''كنت لهٗ **سمعًا وبصرًا فبی یسمع وبی یبصر**'' یعنی میں اپنے بندے کا کان اور آنکھ بن جاتا ہوں وہ میرے ذریعے سنتا ہے وہ میرے ذریعے دیکھتا ہے۔اور آداب میں سے یہ بھی ہے کہ آپ اللہ کی صفت سمع اور بصر کی وجہ سے آپ اپنے ذاتی انتقام سے باز آ جائیں۔اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو ارشاد فرمایا: ﴿**لقد نعلم انك يضيق صدرك**﴾[الحجر:۹۷] یعنی ہم جانتے ہیں کہ آپ کا سینہ تنگ ہو جاتا لیکن پھر دیکھئے کہ اللہ پاک نے آپ ﷺ کو کیسے تسلی دی اور آپؐ سے آپ کی آزمائش کے بوجھ کو آپ پر خفیف اور ہلکا کر دیا اور آپ ﷺ کی توجہ ان موذی کافروں سے اپنے اس فرمان کے ذریعہ ہٹا دی: ﴿**فسبح بحمد ربك**﴾[ ] یعنی آپ ہماری مدح وثنا سجود وشہود کو بیان کیجئے مطلب یہ ہے کہ جب آپ کو ان کی طرف سے کوئی برائی سننے کی وجہ سے دل آزاری ہو تو ہماری مدح کر کے راحت طلب کیجئے۔

قولہ: الحكم یعنی ایسی ذات کہ جس کے فیصلے کو کوئی ٹالنے والا نہ ہو اور جس کے حکم کو کوئی روکنے والا نہ ہو۔تو اس صورت میں صفت کا مرجع یا تو ایسا قول بنے گا جو حق وباطل کے درمیان فاصلہ کرنے والا ہو۔اور نفس نے جو اچھا یا برا کام کیا ہے اس کی جزا وسزا کو واضح کرنے والا ہو یا اس کا مرجع ایسا قول بنے گا جو بد بخت اور خوش قسمت کے درمیان ثواب وعقاب کے ذریعہ فرق کرنے والا ہو یا صفت حکم کا مرجع ایسا فعل بنتا ہے جو دلائل اور نشانیوں کے قیام کی صورت میں حق وباطل شقی وسعید پر دلالت کرنے والا ہو (یعنی دلائل اور نشانیوں کو تسلیم کر کے توحید کو مان لینے کی صورت حق اور سعادت ہے۔اور عدم تسلیم کی صورت باطل اور شقاوت ہے)

بعض حضرات کہتے ہیں حکم کا اصل معنی ہے منع کرنا یہی وجہ ہے کہ علوم کو بھی حکم کہا جاتا کیونکہ علوم صاحب علم کو جاہل لوگوں کی عادت اپنانے سے روکتے ہیں۔

آپ کا صفت حکم سے حصہ تو وہ یہ ہے کہ جب آپ نے یہ پہچان لیا کہ اللہ کی ذات حکم ہے۔تو آپ اس کو حکم تسلیم کیجئے اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم ہو جایئے اس لئے کہ اگر آپ اللہ کے فیصلے پر راضی نہ بھی ہوں تو اللہ اپنے فیصلے کو آپ کے بارے میں جبراً نافذ کر دے گا۔اگر بخوشی قلب اللہ کے فیصلے پر راضی ہو جاتے ہیں تو اللہ پاک آپ کے ساتھ اپنے لطف خفی کا معاملہ فرمائیں گے۔آپ راضی اور خوش ہو کر زندگی بسر کریں گے۔جب آپ اللہ کے فیصلے پر راضی ہو جائیں تو آپ کو کسی اور کی طرف اپنا فیصلہ لے جانے کی حاجت نہیں۔اور اسی طرف آپ ﷺ نے اشارہ فرمایا آپ فرماتے ہیں ''**اللهم لك اسلمت وبك آمنت واليك حاكمت وبك خاصمت**'' اور صفت حکم کے ذریعے اللہ کا تقرب بطور تعلق کے یوں حاصل کیا جا سکتا ہے کہ ہر پیش آمدہ چیز کے بارے میں اللہ ہی کی طرف شکوہ کیا جائے۔اور ہر معاملے میں اللہ ہی کی ذات پر بھروسہ کرنا چاہئے۔اور صفت حکم کو بطور اخلاق اپنانا اس طرح ہے کہ آپ اپنے قلب ونفس کے درمیان حکم بن جایئے۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ اللہ نے ازل میں اپنی مشیت کے مطابق اپنے بندوں کیلئے حکم فیصلہ کر دیا ہے پس بندوں میں سے بعضے شقی ہیں اور بعضے قریب ہیں اور بعضے اللہ سے بعید۔جس کیلئے اللہ نے ازل سے سعادت کا فیصلہ کر دیا وہ کبھی شقی نہ ہوگا اور جس کے حق میں شقاوت کا فیصلہ صادر فرما دیا وہ بھی سعادت سے بہرمند نہ ہوگا۔اسلئے کہتے ہیں کہ جس کو پہلی چیزوں نے کنارے لگا دیا ہو تو وسائل بھی اس کے قریب نہیں بھٹکتے اور اسی طرح دانا لوگوں نے یہ بھی کہا کہ جس کا بخت بیٹھ جائے تو اس کو اس کا دادا بھی کھڑا نہیں کر سکتا۔بطور فائدہ یہ بات بھی جان لیجئے کہ لوگوں کی چار قسمیں ہیں۔

① اصحاب سوابق۔ان کی فکر وسوچ ہمیشہ اس چیز کے بارہ میں ہوتی ہے جو ازل میں ان کے رب کی جانب سے ان کیلئے سبقت کر چکی وہ جانتے ہیں کہ ازلی فیصلے کو بندے کا ہاتھ پاؤں مارنا تبدیل نہیں کر سکتا۔

۲ اصحاب عواقب۔ ان لوگوں کی فکر ہمیشہ اس چیز کے بارے میں ہوتی ہے جس چیز پر ان کے معاملے کا اختتام ہونا ہے اس لئے کہ امور کا اعتبار خاتمے پر ہوگا۔ اور انجام مخفی ہوا کرتا ہے۔ اس لئے کہا گیا ہے کہ آپ کو وقت کا سازگار ہونا دھوکے میں نہ ڈالے۔ اس لئے کہ اس وقت کے نیچے نجانے کتنی آفات پنہاں ہیں کتنے ارادہ کرنے والے لوگ ہوتے ہیں کہ ان پر ان کے ارادے کے انوار چمک رہے ہوتے ہیں اور ان پر ان کی سعادت کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں اور ان کی شہرت جہاں میں پھیل جاتی ہے اور لوگ گمان کرتے ہیں کہ یہ علی الاطلاق اولیاء میں سے ہیں لیکن وقت کی سازگاری وحشت سے بدل جاتی ہے اور اس کی چمک دمک اندھیروں سے بدل جاتی ہے۔

۳ اصحاب وقت: یہ لوگ سابقہ اور لاحقہ چیزوں کے بارے میں سوچ وفکر میں مشغول نہیں ہوتے بلکہ اپنے موجودہ وقت کی رعایت کرتے اور اس وقت میں جس حکم کے وہ مکلّف ہوتے ہیں اس کی ادائیگی کر کے ذمہ داری سے سبکدوش ہوجاتے ہیں اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ عارف اپنے وقت کا بیٹا ہوتا ہے۔

۴ اصحاب شہود: یہ وہ لوگ ہیں جن پر حق کا ذکر غالب آچکا ہوتا ہے وہ ہمیشہ حق کی حضوری میں پکڑے رہتے ہیں اوقات کی رعایت کئے بغیر وہ وقت اور زمانے کی رعایت کی طرف متوجہ نہیں ہو پاتے اور نہ ہی ان کو کسی وقت کی حضوری پر اطلاع ہوتی ہے۔

قولہ: العدل یعنی وہ ذات جو عدالت میں انتہا کو پہنچی ہوئی ہو۔ اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ عدل سے مراد وہ ہے جو ظلم کا مخالف ہے۔ عدل اصل میں مصدر ہے لیکن اس کو صفت عادل کے قائم مقام ٹھہرایا گیا ہے عدل عادل سے ابلغ ہے کیونکہ مسمّٰی کی ذات کو بطور مبالغہ عدل ٹھہرایا گیا ہے جو یقیناً مبالغہ ہے۔ اور عدل صفات افعال میں سے ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ عدل ایسی ذات کو کہتے ہیں کہ جو اپنے احکامات میں اور اپنے افعال میں ظلم وجور سے بری اور پاک ہو۔

باقی رہا آپ کا حصہ صفت عدل سے تو وہ یہ ہے کہ آپ گواہی دیجئے کہ اللہ پاک اپنے فیصلوں میں عادل ہے اور اللہ کے احکام کی وجہ سے آپ اپنے جی جزع فزع اور ان احکام کو توڑنے کی صورت میں کسی قسم کا حرج نہ پائیں اور آپ اپنے آپ کو اللہ کی طرف سپرد کرنے اور اس پر بھروسہ اور اعتماد کرنے میں راحت حاصل کیجئے اور جو چیز بھی اللہ کی جانب سے آئے اس کو حق اور عدل پر مبنی سمجھئے اور اللہ کی طرف سے جو کچھ آپ کو پہنچا ہے اس کو استعمال کیجئے۔ جہاں عقل وشریعت مناسب سمجھے اور اللہ کے عدل کی شان وشوکت خائف رہے اور اس کے فضل کی نرمی کے امیدوار رہیئے اور اللہ کی تدبیر سے بے خوف مت ہوں اور اس کے فضل سے مایوس نہ ہوں اور اپنے بڑے بڑے امور میں افراط وتفریط سے بچیئے۔ مثلاً افعال شہویہ میں یا تو افراط سے کام لیتے ہوئے زنا میں پڑ جائیں یا تفریط کا مظاہرہ کرتے ہوئے بالکل بجھ جائیں یا اسی طرح افعال غضبیہ میں یا تو افراط سے کام لیتے ہوئے آپے سے باہر ہوجائیں یا تفریط کا مظاہرہ کرتے ہوئے بالکل بزدلی اختیار کرلیں۔ بلکہ ان افعال میں میانہ روی کو اختیار کیجئے۔ مثلاً افعال شہویہ میں عفت اور افعال غضبیہ میں بہادری جن دونوں کے مجموعے کو عدالت سے تعبیر کرنے میں حکمت یہ ہے' یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿كذلك وجعلنا كم امة وسطا﴾ [البقرة:۱۴۳] کے تحت مندرج ہو سکے۔

قولہ: اللطیف: یعنی اپنے بندوں کے ساتھ بھلائی کرنے والی ذات ایسی بھلائی جو ان بندوں کو ایسی چیز کی طرف پہنچا دے جس چیز سے وہ دنیا وآخرت میں نفع اٹھائیں۔ اور وہ بھلائی ان کیلئے ایسی چیز مہیا کردے کہ جس چیز کے ذریعے وہ اپنی مصلحتوں کی طرف ایسی جگہ سعی اور کوشش کریں۔ جس جگہ کا نہ تو ان کو علم ہو اور نہ ہی گمان رکھتے ہوں اور صفت خبیر اسمائے افعال میں سے ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ جمیل بھی مجمل کی طرح ہے۔

بعض دیگر حضرات فرماتے ہیں کہ لطیف ایسی ذات کو کہتے ہیں جو مخفی اور باریک امور کو جاننے والی ہو اور کہا گیا ہے کہ لطیف کا معنی ہے ایسی ذات جو ادراک سے مخفی ہو۔

ابن عطاء اپنی حکمت کی باتوں میں فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ کے لطف کو اللہ کی تقدیر سے جدا گمان کرتا ہے تو اسکی قصورِ نظر کا نتیجہ ہے۔ باقی رہا اس اسم شریف کو بطور اخلاق اپنانا تو وہ یہ ہے کہ مخلوق خدا کے ساتھ ان کی حق کی جانب راہنمائی کرنے کی صورت میں لطف اور مہربانی کا معاملہ کیا جائے۔

قولہ: **الخبیر**: یعنی اشیاء کے باطن کو جاننے والی ذات۔ یہ خبرۃ سے مشتق ہے اور خبرۃ کہتے ہیں مخفی اور باطنی چیزوں کا جاننا۔

آپ کا حصہ صفت خبیر سے تو وہ یہ ہے کہ جب آپ اس بات پر شاہد ہیں کہ وہ آپ کے راز پر مطلع ہے اور آپ کے اندرونی معاملہ کو بخوبی جاننے والا ہے تو آپ اللہ کے علم پر اکتفا کیجئے اور اللہ کے غیر کو اللہ کی یاد کے پہلو میں منسوب کیجئے۔

تقوی کی لگام کو مضبوطی سے باندھ لیجئے اور گمراہی کے راستے سے باز آجایئے۔ لزومِ اخلاص اور ترک ریاء کی صورت میں اپنی اعانت کیجئے تاکہ آپ اہل اختصاص کے مقام تک رسائی حاصل کر سکیں اور آپ اپنے باطنی احوال سے غافل نہ ہوں مزید برآں اپنے باطنی احوال کی اصلاح میں مشغول رہیں اور باقی احوال سے جو آپ کے سامنے قبائح ظاہر ہوں ان کو فلاح کی طرف گردانے کی صورت میں تلافی کیجئے اور اپنے دینی اور دنیاوی معاملہ کے سلسلہ میں خوب باخبر رہیے اور جو چیز آپ پر واجب ہے یا آپ کیلئے استحباب کے درجہ میں ہے ایسی چیز کے سلسلہ میں حزب بین رہیے۔

قولہ: **الحلیم**: ایسی ذات جو ایمان والوں کو سزا دینے میں جلدی نہ کرے بلکہ ان کی سزا کو اس وجہ سے مؤخر کر دے شاید وہ اپنے گناہوں سے تائب ہو جائیں۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ حلیم ایسی ذات کو کہتے ہیں جس کو غصہ بے قابو نہ کر پائے اور غصہ اس کو جلد سزا دینے پر برانگیختہ نہ کر سکے۔

اسمِ حلیم کے ذریعے اللہ کا تقرب بطور تعلق یوں حاصل کیا جا سکتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے حلم کے سلسلہ میں احسان کا شکریہ ادا کیجئے لیکن اللہ کی مہربانی کی وجہ سے دھوکے میں پڑنے کی بھی ضرورت نہیں۔

بطور اخلاق صفت حلیم کو یوں اپنایا جائے کہ آپ اپنے غصہ کو پی جائیں اور حلم کے ذریعے غصہ کی آگ کو بجھا ڈالیں اور کامل درجے کا حلم یہ ہے کہ آپ اس شخص کے ساتھ بھی بھلائی کا معاملہ کریں جو آپ کے ساتھ برائی سے پیش آئے۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ جب اللہ نے فی الحال اپنے فضل سے پردہ پوشی فرما دی تو امید کی جاتی ہے کہ فی المآل (آئندہ) بھی اللہ پاک اپنی مہربانی سے معاف کر دیں گے اور صفت کا مرجع تنزیہ باری تعالیٰ ہے۔

قولہ: **العظیم**: یہ عظم الشئی سے ماخوذ ہے اور عظم الشئی کا معنی ہے کسی چیز کی عظمت کا بڑا ہو جانا پھر مجازاً عظیم ہر ایسے بڑی مقدار والے جسم کو کہا جاتا ہے جس مقدار کبیر آنکھ کو پُر کر دے جیسے ہاتھی اور اونٹ وغیرہ۔ یا جس کی مقدار کبیر تمام جوانب سے احاطے بصر کو روک دے جیسے آسمان اور زمین۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ورب **العرش العظیم**﴾ پھر ہر کبیر المقدار چیز کے مراتب ہیں۔ مطلق عظیم ایسی ذات کو کہتے ہیں جو عظمت کے مراتب میں سے انتہائی مرتبہ کو پہنچی ہوئی ہو۔ اور ایسی ذات وہ کہ عقل اس کے تصور سے قاصر ہو۔ اور عقل **علی وجه البصیرة** اس کا بتمام احاطہ نہ کر سکے۔ اور مطلق عظیم ذات اللہ تعالیٰ کی ہے اور عظیم کا مرجع تنزیہ ذات باری تعالیٰ ہے۔

اور باقی رہا آپ کا حصہ صفت عظیم سے تو وہ یہ ہے جب آپ نے اللہ کی عظمت کا مشاہدہ کر لیا تو آپ کی آنکھ میں اللہ کے سوا ہر چیز چھوٹی نظر آنے لگے۔ ہاں مگر وہ چیز جس کو عظمت ہی نسبت مع اللہ کی وجہ سے ملی ہو اور اپنے نفس کو بھی حقیر جانیئے۔ اور اپنے نفس کو اللہ کے

اوامر بجالانے اور اس کی نواہی سے اجتناب کی صورت میں ذلیل کر کے اپنے نفس پر اللہ کو کلی طور پر متوجہ کر لیجئے اور ہر ایسی چیز کے بارے میں کوشش کیجئے جو اللہ کی پسندیدہ اور مرضی کی ہو۔

صفتِ عظیم کے ذریعے تقرب بطور معلق یوں کہ آپ تذلل اور احتیاج کو علی طریق الدوام لازم کر لیجئے۔ اور صفتِ عظیم کو بطور اخلاق یوں اپنایا جائے کہ آپ مذموم اوصاف اور گناہوں کے ارتکاب سے بلندی اختیار کر لیجئے۔

قولہ: الغفور: یعنی کثیر المغفرت۔ کہتے ہیں بندے کے گناہ معاف کر کے اس کو اس سزا سے بچالینا جس کا وہ مستحق ہو چکا ہو۔

یہ غفر سے مشتق ہے اور غفر کا معنی چیز کو ایسی چیز کے ساتھ ڈھانپ دینا یا پہنا دینا کہ جس کی وجہ سے چیز میل کچیل سے محفوظ رہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ غفار غفور سے ابلغ ہے زیادتی بناء کی وجہ سے ہے لیکن بہترین بات وہ ہے کہ جو بعض حضرات نے غفور او غفار کے درمیان فرق کرتے ہوئے کہی ہے کہ غفار میں مبالغہ ''**من جهة الكيفية**'' اور غفور میں مبالغہ ''**من جهة الكمية**'' ہے۔ اور شاید رحمت اور مغفرت کو اللہ کے ننانوے ناموں میں مبالغہ کے وزن پر لانے کی وجہ رحمت اور مغفرت کے معاملہ کی تاکید ہے۔ (رحمت کی مبالغہ والی بنائیں رحمٰن و رحیم ہیں اور مغفرت کی غفار اور غفور ہیں)۔ اور ان بناؤں کو لا کر اس بات پر دلالت مقصود ہے کہ اللہ عظیم الرحمۃ ہے رحمت کے عام ہونے کے اعتبار اور کبیر المغفرۃ ہے۔ مغفرت کے کثیر ہونے کے اعتبار سے اور اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ اللہ کی رحمت اللہ کے غضب پر غالب ہے اور اس کی مغفرت سزا پر غالب ہے۔

اس لئے بعض حضرات نے ارشاد باری تعالیٰ: ﴿**وما ربك بظلام للعبيد**﴾ [فصلت: ٤٦] پر وارد ہونے والا مشہور اشکال کا جواب دیا ہے اور اشکال یہ ہے کہ مبالغہ کی نفی سے اصل فعل کی نفی لازم نہیں آتی تو اس لئے ظلام کی نفی سے ظالم ہونے کی نفی لازم نہیں آتی۔ اللہ پاک سے تو اصل ظلم ہی منفی ہے کیونکہ ظلم کہتے ہیں وضع الشئ فی غیر محلہ کو یا تصرف فی ملک الغیر کو اور یہ دونوں باتیں اللہ تعالیٰ سے محال ہیں۔ جواب دیا کہ اللہ جس وصف کے ساتھ بھی موصوف ہوتے ہیں تو **علی وجه الكمال** موصوف ہوئے ہیں۔ اللہ پاک نے مبالغہ کا صیغہ ظلام لا کر اس بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اگر اللہ بفرض محال صفت ظلم کے ساتھ موصوف ہوتے تو **علی وجه الأبلغية** ہوتے مبالغہ کی نفی سے اصل فعل کی نفی لازم آتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفت مبالغہ سے جدا نہیں ہو پاتی یہی وجہ ہے کہ سمیع کے معنی میں سامع کا اطلاق ذات باری تعالیٰ پر درست نہیں کیونکہ سامع میں مبالغہ فوت ہو جاتا ہے۔

باقی رہا علامہ جزریؒ کا قول: **يقول راجي عفو رب سامع**۔ میں جو اللہ تعالیٰ پر سامع کا اطلاق کیا گیا ہے اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ وہ اللہ پکارنے والے کی پکار کا جواب دینے والا ہے اور جو شخص اس سے امید وابستہ کرے وہ اس کو رسوا کرنے والا نہیں۔

صفت غفور کے ذریعے اللہ کا تقرب بطور تعلق کے وہ اس طرح ہے کہ انسان دن اور رات استغفار کو لازم پکڑے خصوصاً اوقاتِ سحر میں اور صفت غفور کے ذریعے اخلاق یوں اپنائے کہ جو شخص آپ کے درپے آزار ہو آپ کا جواب معافی تلافی میں ہو۔

قولہ: الشکور: یعنی ایسی ذات جو تھوڑے سے کام پر بہت زیادہ اجرت عطا کرے اور اس کا مرجع صفات فعلیہ ہیں۔

ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے کہ ایک مرنے والے آدمی کو کسی نے خواب میں دیکھا تو اس سے پوچھا کہ اللہ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ تو اس نے جواب میں کہا کہ اللہ نے مجھ سے حساب و کتاب لیا میری نیکیوں کا پلڑا ہلکا پڑ گیا پھر دفعۃً اس پلڑے میں ایک تھیلی آ گری تو میں نے عرض کی کہ اے اللہ یہ کیا ہے۔ فرمایا کہ یہ مٹی کا ایک لپ ہے جو تو نے کسی مسلمان کی قبر میں ڈالا تھا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿**فمن يعمل مثقال ذرةٍ خيرًا يره**﴾ [الزلزلة: ٠٧]

کہا گیا ہے کہ شکور ایسی ذات کو کہتے ہیں جو فرمانبرداروں کی تعریف کرے تو اس صورت صفت شکور کا مرجع صفات قولیہ ہیں۔

کہتے ہیں شکور ایسی ذات کو کہتے ہیں جو بندوں کو ان کے شکر پر جزا دے تو اس صورت میں یہ باب مقابلہ سے ہوگا (کیونکہ جانبین سے شکریہ ہے) تو اس صورت میں یہ معاملہ کے مرتبہ میں ہوگا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**ومکروا ومکر اللّٰہ**﴾[آل عمران:٥٤]اور ﴿**وجزاء سیئة سیئة مثلها**﴾[الشوریٰ:٤٠]

بندے کا حصہ صفت شکور سے یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو پہچانے اور اس کے شکر کے تقاضوں کو بجالائے اور اس کے امر کے وظائف پر مواظبت کرے۔ اور لوگوں کی نیکیوں اور بھلائیوں پر ان کا بھی شکریہ بجالائے کیونکہ حدیث پاک میں ہے: ''**لا یشکر اللّٰہ من لم یشکر الناس**'' یعنی جو انسانوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکریہ بھی ادا نہیں کرتا تو گویا اس صورت لفظ اللہ اور الناس منصوب ہیں، یشکر فعل کا مفعول ہونے کی وجہ سے علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ دونوں مرفوع بھی ہو سکتے ہیں اور مضوب بھی۔ یا ان میں سے ایک مرفوع اور دوسرا منصوب ہے۔ (اگر دونوں مرفوع ہوں تو دونوں یشکر فعل کا فاعل ہوں گے۔ یعنی اللہ تعالیٰ بھی اس آدمی کا شکریہ نہیں کرتے جس کا لوگ شکریہ نہ کریں۔ یا اللہ مرفوع ہو کر فاعل ہو اور الناس منصوب ہو کر مفعول ہو تو معنی ہوگا اللہ اس آدمی کا شکریہ نہیں کرتا جو لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا ہو)۔ بہر کیف ساری صورتوں میں مرجع واسطہ کی تعظیم ہے (یعنی اللہ کے شکر کا واسطہ لوگوں کا شکریہ ہے) باوجود اس کے کہ منعم حقیقی صرف اللہ ہی کی ذات ہے۔

شکر کی مشہور تعریف یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں کو اپنے رب کی اس عبادت میں خرچ کر ڈالے جس کیلئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔

بعض حضرات اللہ کے ارشاد: ﴿**قلیل من عبادی الشکور**﴾[سبا:١٣] کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ میرے تھوڑے بندے ایسے ہیں جو اس بات کی گواہی دیں کہ نعمت میری جانب سے ہے۔ اس لئے کہ شکر کی حقیقت ہے منعم کی حضوری کی وجہ سے حضوریٔ نعمت سے غیبت اختیار کر لینا۔ شاکر مالدار کو صابر فقیر پر فضیلت دینے کی بحث کا اس مطلب میں کوئی دخل نہیں جبکہ اس کو علامہ ابن حجرؒ نے اولیاء اور جمہور علماء کے اجماع کے خلاف ذکر کیا ہے۔

قولہ: **العلیّ** یاء کی تشدید کے ساتھ فعیل کے وزن پر علو سے مشتق ہے۔ اور علی ایسی ذات کو کہتے ہیں، جو بلندیٔ مرتبہ میں انتہا کو پہنچی ہوئی ہو اس طرح کہ ہر مرتبہ اس مرتبہ سے بہتر ہو۔

کہا گیا ہے کہ علی ایسی ذات کو کہتے ہیں جو اپنی ذات کے ادراک سے بلند اور اپنی صفات کے تصور سے بڑی ہو۔

بعض دیگر حضرات کہتے ہیں کہ علی ایسی ذات کو کہتے ہیں کہ قلوب اس ذات کے جلال میں حیران و سرگردان ہو اور عقول اس کے وصف کمال سے عاجز آ چکی ہوں۔

صفت علی سے آپ کا حصہ یہ ہے کہ جب آپ ذاتِ باری تعالیٰ کی بلندی کا مشاہدہ کریں تو آپ کی ہمت بھی ذات باری کی طرف بلند ہو جائے۔ اور جمیع احوال میں آپ اپنی ہمت کو ذات باری تعالیٰ پر موقوف کر دیں اور اپنے نفس کو اس کی ظاہری اور باطنی عبادات وطاعات میں مٹا دیجئے۔ اور اپنی روح کو علم وعمل میں خرچ کر دیجئے۔ یہاں تک آپ پاکیزہ حالات اور انسانی کمالات اور علم وعمل سے متعلق بلند درجات کی انتہا کو پہنچ جائیں۔ اور حدیث پاک میں آتا ہے کہ اللہ پاک بلند امور کو پسند فرماتے ہیں اور گھٹیا امور کو ناپسند کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علیؓ نے ارشاد فرمایا کہ بلندیٔ ہمت ایمان کا حصہ ہے۔

مشائخ نے ہمت اور خدمت کی افضلیت میں اختلاف کیا ہے۔ میرے نزدیک خدمت بھی ہمت ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اور جو بات حقیقت ہو اس میں کوئی اختلاف نہیں ہوا کرتا۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ اللہ کی بلندیٔ شان میں سے یہ ہے کہ وہ بندوں کی بڑائی بیان کرنے کی وجہ سے یا بندوں کا اس کی بزرگی

بیان کرنے کی وجہ سے وہ بڑا یا بزرگ نہیں بنتا بلکہ وہ جس کو اپنی بزرگی بیان کرنے کی توفیق دیدے تو وہ شخص اس کی توفیق کی وجہ سے بزرگ ہے اور جس کی تائید اپنی بڑائی یا تعظیم کرنے کی صورت میں فرمادے تو گویا اللہ نے اس کے مرتبہ کو بلند کردیا اور جو شخص اللہ کی عظمت کو پہچان لے تو اس کو چاہیے کہ وہ اس کی مخلوق کے سامنے ذلیل نہ ہو ہاں البتہ اللہ کی رضا کیلئے مخلوق خدا کیلئے تواضع اپنائے۔ اس لئے کہ جو شخص اللہ کیلئے اپنے نفس کو تذلل اور تواضع پر مجبور کردے تو اللہ پاک انسانوں میں اس کی قدرومنزلت بلند فرمادیتے ہیں۔ اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ مؤمن کیلئے تکبر زیبا نہیں بلکہ اس کیلئے تو عزت ہے اور مؤمن کو تواضع زیبا دیتی ہے نہ کہ ذلت۔

قولہ: الکبیر: کبیر کی ضد صغیر ہے۔ صغر اور کبر یہ دونوں اجسام کی مقداروں اور مراتب کے اعتبار سے استعمال ہوتے ہیں اور یہاں صغر اور کبر باعتبار رتبہ مراد ہے۔ ذات باری تعالیٰ کبریائی باعتبار رتبہ کے یا تو اس لئے ہے کہ ذات باری تعالیٰ موجودات میں سے اکمل واشرف ذات ہے کیونکہ وہ جمیع موجودات کی نسبت قدیم اور ازلی ذات ہے اور ذات باری تعالیٰ علی الاطلاق غنی ہے اور باقی موجودات بالاتفاق ایجاد وامداد میں اس کی طرف محتاج ہو کر حادث ہیں۔

یا ذات باری تعالیٰ کی کبریائی باعتبار رتبہ کے اس طرح ہے کہ وہ عقلوں کے ادراک اور اس کے مشاہدہ سے بلند اور بڑا ہے۔ دونوں صورتوں میں کبیر اسماء تنزیہ میں سے ہوگا۔

بعض حضرات نے اللہ اکبر کا مطلب بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ اس سے بھی بہت بڑا ہے، کہ اس کیلئے اکبر کہا جائے یا اللہ اس سے بہت بڑا ہے کہ اللہ کا غیر اس کی کبریائی کا بتمام ادراک نہ کرسکے۔

اور باقی رہا آپ کا حصہ صفت کبیر سے تو وہ یہ ہے کہ آپ ہمیشہ ذات باری تعالیٰ کی کبریائی کے شاہد رہیے یہاں تک آپ اس کے علاوہ کی کبریائی بھول جائیں اور آپ اپنے نفس کی علمی اور عملی تکمیل کی کوشش کرتے رہیں یہاں تک کہ آپ کا کمال آپ کے غیر کی طرف متعدی ہو جائے اور آپ کے نقش قدم کی پیروی کی جائے اور آپ کے انوار سے روشنی اخذ کی جائے۔

اس اسم شریف کے ذریعے تقرب بطور تعلق یہ ہے کہ آپ تواضع میں مبالغے سے کام لیں اور اس اسم شریف کے ساتھ تعلق بایں انداز ہے کہ آپ لزوم خدمت اور حفاظت حرمت کے ساتھ سوءِ ادب سے بچیں۔ صحیح روایت میں آتا ہے کہ اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں ''**الکبریاء ردائی والعظمة ازاری فمن نازعنی واحدًا منهما قصمته**'' یعنی بڑائی میری چادر اور عظمت میرا تہبند ہے۔ ''**کما یلیق بشانه**'' پس جو مجھ سے ان دونوں چیزوں میں سے کسی ایک کے بارے میں جھگڑا کرے گا تو فرمایا میں اس کے ٹکڑے کردوں گا یعنی میں اس کو ہلاک کردوں گا۔ اور اس کی گردن توڑ کر رکھ دوں گا۔ حدیث قدسی میں عظمت کو ازار کے ساتھ اور کبریائی کو رداء کے ساتھ خاص کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ کبیر فخامت میں عظیم سے اوپر ہوا کرتا ہے۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک اللہ تعالیٰ کیلئے خاص ہے کسی بھی وجہ سے ان میں اللہ کا کوئی شریک نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں کسی ایک کے بارے میں جھگڑنے والے کو توڑنے پھوڑنے کا فرمایا۔

قولہ: الحفیظ: یعنی ایسی ذات جو حفاظت میں انتہائی مبالغہ کرنے والی ہے جو ذات موجودات کو اوقات میں سے جتنی مدت چاہے زوال واختلال سے محفوظ رکھے۔ اور اس کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**ولا یؤدهٗ حفظهما**﴾[البقرة:۲۵۵] یعنی زمین وآسمان اور ان کے مابین کی جتنی چیزیں ہیں اللہ کو ان کی حفاظت تھکا نہیں پاتی۔

یا ایسی ذات جو بندوں کے اعمال واقوال کی حفاظت کرے۔ اور اسی سے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ﴿**وما جعلناك علیهم حفیظًا**﴾

صفت حفیظ سے آپ کا حصہ یہ ہے کہ آپ اپنے اعضاء کی گناہوں سے اور اپنے باطن کی ملاحظہ اغیار سے حفاظت کریں۔ اور جملہ

امور میں اللہ فی تدبیر پر اکتفاء کیجئے' اور اس کے اچھے فیصلے اور تقدیر پر راضی ہو جائیے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ جو اللہ کیلئے اپنے اعضاء کی حفاظت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل کی حفاظت کرتا ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کیلئے اپنے دل کی حفاظت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے حصے کی حفاظت فرماتا ہے۔

صالحین میں سے کسی کی نظر ممنوع چیز پر پڑ گئی تو عرض کی کہ الٰہی میں اپنی نگاہ سے تیرا ارادہ رکھتا ہوں اور وہ نگاہ جب تیرے حکم کی مخالفت کا سبب بن گئی تو الٰہی اس نگاہ کو سلب کر لے' بعینہٖ یہی ہو۔ اور وہ صالح آدمی رات کو نماز پڑھا کرتے تھے۔ تو ان کو وضو کیلئے پانی درکار تھا لیکن پانی کے حصول پر قدرت نہیں ہو پا رہی تھی۔ تو عرض کی کہ الٰہی میں نے عرض کیا تھا کہ میری نگاہ کو اپنی رضا کیلئے لے لے تو اب جبکہ رات کے وقت میں اس نگاہ کا تیرے لئے ہی محتاج ہوں تو اللہ پاک نے اس صالح آدمی بصارت اور نگاہ واپس لوٹا دی۔

قولہ: المقیت: میم کے ضمہ قاف کے کسرہ اور یاء کے سکون کے ساتھ ہے یعنی بدنی اور معنوی ارزق اور پیدا کرنے والی ذات اور پھر رزق بدنی کو جسموں تک اور رزق معنوی کو روحوں تک پہچانے والی ذات، یہ اقاتۃ' یقیتہ' سے ہے۔ اور اقاتۃ' کا معنی ہے اعطاہ القوت یعنی اس کو روزی عطا کی اور اس کی تائید حدیث سے بھی ہوتی ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ''**کفی بالمرء اثمًا ان یضیع من یقیت**'' یعنی کسی آدمی کے گناہگار ہونے کیلئے یہی کافی ہے کہ وہ اس کو ضائع کر ڈالے جو اس کو روزی دیتا ہے اور مقیت اسماء افعال میں سے ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ مقیت کسی شئی پر شاہد اور مطلع ذات کو کہتے ہیں اور یہ اقات الشئ سے ہے۔ اور اقات الشئ کا معنی ہے ''**اطلع علی الشئ**'' بہر کیف دونوں صورتوں میں مقیت صفات ذات میں سے شمار ہوگا اور مقیت کے یہ دونوں حصے بہت مناسب ہیں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی وجہ: ﴿**وکان اللّٰہ علی کل شئ مقیتاً**﴾ [النساء: ۸۵] تو یہاں مقیت مقتدر اور شاہد و مطلع دونوں معنوں میں موزوں ہے۔

اور باقی رہا آپ کا حصہ صفت مقیت سے تو وہ یہ ہے کہ جب آپ نے ذات تعالیٰ کے مقیت ہونے کی معرفت حاصل کر لی۔ تو پھر آپ مقیت کے ذکر کی وجہ سے قوت یعنی روزی کا ذکر بھول جائیے۔ جیسا کہ حضرت سہلؒ سے روزی کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا ''**ھو الحیی الذی لا یموت**'' یعنی میری روزی ایسی زندہ ذات ہے جس کو کبھی موت نہیں آئے گی۔ شاید حضرت سہلؒ سبب روزی سے مسبب یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف منتقل ہو گئے' تو ان کو کہا گیا کہ ہم نے آپ سے قوت دینے والی چیز کے بارے میں سوال کیا ہے تو انہوں نے ارشاد فرمایا کہ قوت دینے والی چیز علم ہے۔ شاید وہ جسموں کو قوت دینے والی چیز سے روحوں کو قوت دینے والی چیز کی طرف منتقل ہو گئے۔ اس لئے کہ ہر برتن سے وہی چیز ٹپکتی ہے جو چیز اس برتن میں ہو (چونکہ حضرت سہلؒ صاحب علم آدمی تھے) تو انہوں نے کہا کہ ہم نے آپ سے جسمانی غذا کے بارے میں پوچھا ہے' تو انہوں نے جواب دیا کہ کیا آپ اپنی اور اپنے جسم کی فکر میں پڑے ہیں' چھوڑ دو جو اس جسم کا اول امر میں متولی وہی اس کا آخر امر میں متولی ہے اور باقی رہا کہ اگر کسی کام کو آپ دیکھتے ہیں کہ وہ آپ کو تھکا رہا ہے تو اس کام کو اس کے صانع اور کاریگر کی طرف لوٹا دیں' کیونکہ وہ ان کو جانتا ہے۔ تو گویا کہ حضرت سہلؒ نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ہم اصلاح باطنی کے سلسلہ میں' مامور ہیں۔ اگرچہ حقیقت میں علی الاطلاق مصلح اللہ کی ذات ہے اور اس میں اس مضمون کی طرف اشارہ ہے جو حدیث ''**من حسن السلام ترك مالا یعنیہ**'' میں وارد ہوا ہے۔ مفہوم حدیث یہ ہے کہ لایعنی چیز کو ترک کر دینا انسان کے حسن اسلام کی علامت ہے۔

آپ کا صفت معیت کے ذریعہ تقرب بطور تعلق تو وہ بایں طور ہوگا کہ آپ روزی اور طاقت اپنے مولی ہی سے طلب کریں۔ اللہ

تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿ان من شئ الا عندنا خزائنه﴾[الحجر:۲۱]

صفت مقیت کے ذریعے تخلق اس طریقہ پر ہوگا جو بھی آپ سے متعلق ہو آپ اس کو اس کی استحقاقی روزی دیں۔حدیث پاک میں آتا ہے: ''ابدأ بنفسک ثم بمن تعول'' یعنی ابتدا اپنے نفس سے کیجئے اور پھر جس کی پرورش آپ کے ذمہ ہے' آپ کی عادت نفع پہچانا ،بھوکے کو کھانا کھلانا اور بھٹکے ہوئے کو راہ راست لانا ہو۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں اقوات مختلف ہیں اللہ کے بعض بندے ایسے ہیں کہ اللہ نے ان کے نفس کی روزی عبادات کی توفیق اور ان کے دل کی روزی مکاشفات کی تحقیق اور ان کے ارواح کی روزی مشاہدات کا دوام مؤانسات کا لزوم بنائی ہے۔ ہر ایک کو مقامات اور حالات کے مناسب چیز کے ساتھ خاص کیا ہے۔ جب اللہ اپنے کسی بندے کو اپنی طاعت میں مشغول کر دیتا ہے تو اللہ پاک اس کیلئے ایسا آدمی کھڑا کر دیتا ہے جو اس کے مطیع بندے کی خدمت اور کام سرانجام دیتا ہے۔اور جب بندہ اپنی خواہش نفس کی طرف لوٹتا ہے تو اللہ پاک اس کو اس کے حول وقوت کی طرف لوٹا دیتے ہیں اور اس سے اپنی عنایت وحمایت کا سایہ اٹھا لیتے ہیں۔

قوله: الحسیب: کا معنی کافی ، یہ **حسب** مصدر سے مشتق ہے سین کے سکون ساتھ **حسب** کا معنی ہے اکتفاء یا کفایۃ ۔اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿**من یتو کل علی اللّٰہ فھو حسبهٗ**﴾[الطلاق:۳] اور حسیب فعیل کے وزن پر مفعل بکسر العین کے معنی میں ہے۔جیسے **الیم مؤلیم** اور بدیع مبدع کے معنی میں ہے یعنی بندوں کو ان کی بقدر کفایت عطا کرنے والی ذات۔

یا ان کیلئے ان کے امور کے سلسلہ میں کفایت کرنے والی ذات۔ یہ اہل عرب کے قول حسبی بمعنی **یکفینی** سے مشتق ہے۔اور یہ بناء کے اعتبار سے اتم اور معنی کے اعتبار سے اعم ہے۔

اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ حسب مصدر سے مشتق ہے۔اور حسبٌ سردار اور شرافت کے معنی میں ہے۔اور حسیب علی الاطلاق اللہ کی ذات ہے' اس لئے کہ کفایت کا حصول ان تمام اشیاء میں جن کی طرف شئ اپنے وجود اور اپنی بقا اور جسمانی وروحانی کمال میں محتاج ہوئی ہے ذات باری تعالیٰ کے علاوہ کسی سے ممکن نہیں ۔تو اس صورت صفت حسیب کا مرجع فعل ہوگا۔اور اپنے مولیٰ کے ارادے کے بغیر کوئی بھی شرافت اور سرداری تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔

یا حسیب شریف کے معنی میں ہے تو اس صورت میں اس کا مرجع صفت ہوگا اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ حسیب حساب مصدر سے مشتق ہے۔یعنی وہ اللہ قیامت کے دن تمام مخلوقات سے حساب لینے والا ہے اور حسیب فعیل محاسب مفاعل کے معنی میں ہے جیسے جلیس مجالس کے معنی میں ہے۔ اگر محاسبہ سے مکافاۃ یعنی اعمال کی جزا دینا مراد لیا جائے تو بھی اس کا مرجع فعل بنتا ہے اور امر محاسبہ سے مراد سوال وعتاب اور جو نیکیاں اور برائیاں کیں ان کی گنتی مراد لی جائے تو اس صورت میں صفت حسیب کا مرجع قول ہوگا۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ حسیب کا معنی ہے مخلوقات کے سانس کا حساب اور گنتی کرنے والی ذات۔اور بعض حضرات نے دو معنوں کو جمع کر کے یوں کہا کہ حسیب اس ذات کو کہتے ہیں جو آپ کے سانسوں کی گنتی کرے اور اپنے فضل سے آپ کی تکلیف وغیرہ پھیر دے اور حسیب کے معنی میں کہا گیا ہے کہ اللہ آپ کے ساتھ ہے تو پھر آپ کو کس چیز کا خوف ہے اور اگر اللہ ساتھ نہیں تو کس سے امید رکھتے ہو؟ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ نے کہا''**حسبنا اللّٰہ ونعم الوکیل**'' اور سرکارِ دوعالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے فرمایا''**حسبی اللّٰہ لا الہ الا ھو علیہ توکلت وھو رب العرش العظیم**''۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں اللہ کی بندے کیلئے کفایت یہ ہے کہ اللہ اس کو اس کے جمیع احوال واشغال میں کفایت کر دے۔اور کفایات میں سے اعلیٰ درجے کی کفایت یہ ہے کہ اللہ بندے کو شئ مطلوبہ منفع کا ارادہ عطا فرما دیں۔اور جس شخص نے یہ جان لیا کہ اللہ اس کو کافی ہے

تو اگر ساری مخلوق بھی اس سے اعراض کرے تو وحشت محسوس نہیں کرتا۔ کیونکہ اسے اس بات پر بھروسہ ہوتا ہے کہ جو چیز اس کے حصہ میں تقسیم ہو کر آگئی ہے تو وہ اس سے کسی صورت فوت نہیں ہوگی اور جو چیز اس کی قسمت میں نہیں تو وہ کسی صورت میں اس تک پہنچ نہیں پائے گی۔ اگر چہ ساری مخلوق اس پر متوجہ ہو جائے۔ اور اپنے احوال کے سلسلہ میں اللہ کی بہتر تولیت پر اکتفا کر لیتا ہے تو عن قریب اس کا مولیٰ اپنی پسندیدہ چیز سے اس کو راضی کر دے گا۔ تو اس وقت پھر وہ نہ ہونے کو ہونے پر اور فقر کو غنی پر ترجیح دے گا۔ اور وہ اپنے مولیٰ کے تصرف کا مشاہدہ کرنے کی وجہ سے فقدان اسباب کی طرف راحت حاصل کرے گا۔ جیسا کہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ فتح موصلی مشہور بزرگ رات کے وقت اپنے گھر لوٹے لیکن انہوں نے گھر میں رات کے کھانے اور چراغ نام کی کوئی چیز نہ پائی تو انہوں نے اللہ کی حمد اور آہ وزاری میں مبالغہ کیا ہے اور کہنے لگے الٰہی کون سے سبب کی وجہ سے اور وسیلے اور استحقاق کی وجہ سے تو نے میرے ساتھ وہ معاملہ کیا جو معاملہ تو اپنے دوستوں کے ساتھ کرتا ہے۔

قولہ: الجلیل یعنی ایسی ذات جو صفاتِ جلال کے ساتھ متصف ہے اور جلال کی تمام صفات پر ''علی وجہ الکمال'' حاوی ہے۔ بایں طور کہ کسی کیلئے یہ ممکن نہیں کہ مرتبہ میں اس کے قریب ہو۔ چہ جائے کہ کوئی مرتبہ میں اس کے مساوی ہو اور بعض حضرات کہتے ہیں ان بعض میں امام فخر الدین رازی بھی ہیں کہ حقیقت جلال کمالِ صفات کی طرف لوٹتی ہے جیسا کہ صفت کبیر عظمت ذات کی طرف لوٹتی ہے۔ اور صفتِ عظیم کمال صفات اور عظمت ذات دونوں کی طرف لوٹتی ہے۔ لیکن زیادہ ظاہر بات یہی ہے کہ جلیل ایسی ذات کو کہتے ہیں جو خاص طور پر صفات جلال کے ساتھ متصف ہو۔ جیسا کہ منتقم قہار اور شدید العقاب تینوں خالصۃً اور خاصۃً صفات جلال کا مظہر ہیں اور اس پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ذوالجلال والاکرام بھی دلالت کرتا ہے۔ اس طرح کہ آیت میں صفت جلال اور صفت اکرام کا تقابل ہے اور کریم عفو اور غفور اور ان جیسی دیگر صفات اللہ کی صفات حالیہ وکمالیہ میں سے ہیں۔ اور صفت جلیل جمال کمال اور جلال تینوں صفات کی جامع ہے۔ اور باقی یہ ساری صفات یعنی جلیل ہو یا کریم عفو وغیرہ دو عظیم صفتوں کا مظہر اور دو عمدہ صفتوں کے مشاہدہ کی جگہ ہیں۔ یعنی صفت جمال وکمال۔

آپ کا حصہ صفت جلیل سے یہ ہے کہ جب آپ کے سامنے ذات باری تعالیٰ کا جلال واضح ہو چکا اور تمام جہانوں میں اس کی بزرگی ظاہر ہو چکی تو آپ کے دل میں اس کی ہیبت بھی بہت زیادہ ہونی چاہئے۔ آپ کی ذات باری تعالیٰ سے محبت ہونی چاہئے اور اس کے ساتھ آپ کا انس ہونا چاہئے۔ اور اللہ کی کتاب اور اس کے محبوبین کا آپ کے دل میں احترام ہونا چاہئے۔

آپ کا تقرب بطور تعلق یہ ہے کہ آپ اللہ کے علاوہ کسی سے محبت نہ کریں۔ اور اس کی رضا ہی آپ کا مطلوب ہو۔ اور صفت جلیل سے تخلق بایں طور ہے کہ آپ اپنے نفس کو گھٹیا اور حقیر امور سے خالی کر دیں۔ کیونکہ آپ اشرف المخلوقات ہیں۔ ابن عطاء اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ پاک نے آپ کو اپنے ملک اور ملکوت کے درمیانی عالم میں رکھا ہے۔ تاکہ آپ کو تمام مخلوقات کے درمیان سے اپنی قدرت کی جلالت سمجھا دے کیونکہ آپ ایک ایسے جوہر ہیں کہ آپ پر اللہ کی مکنونیات کی سپیاں لپٹی ہوئی ہیں۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے عابدین کے قلوب کو اپنے ثواب وانعام اور اپنے عذاب وسزا کی حضوری میں رکھا ہے۔ جب وہ اللہ کے فضل وانعام میں غور وفکر کرتے ہیں تو ان کی رغبت بڑھ جاتی ہے اور جب وہ اللہ کے عذاب میں سوچ وبچار کرتے ہیں تو ان کے خوف میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور اللہ پاک نے عارفین کے اسرار کی پاکیزگی کو اپنے جلال وجمال کی حضوری میں رکھا ہے۔ جب ان پر صفت جلال کھولی جاتی ہے تو ان کے احوال بجھاؤ در بجھاؤ میں ہوتے ہیں اور جب ان پر صفت جمال کھولی جاتی ہے ان کے احوال انس در انس میں ہو جاتے ہیں۔

قولہ: الکریم: کریم ایسی کثیر الجود والعطاء ذات کو کہتے ہیں جس کی عطاء ختم نہ ہو۔ اور اس کے خزانے فناء نہ ہوں۔ یہ ذات کریم

مطلق ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ کریم ایسی ذات کو کہتے ہیں جو بغیر وسیلہ اور سوال کے از خود فضل کرے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ کریم ایسے معاف کرنے والی ذات کو کہتے ہیں جو سزا میں انتہا نہ کرے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کریم اس ذات کو کہتے ہیں جو جب قادر ہو تو معاف کر دے اور جب وعدہ کو پورا کرے۔ اور جب دے تو امید سے بڑھ کر دے۔ اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ کس کو دیا ہے اور کتنا دیا ہے اور اگر بندہ حاجت کو اس کے غیر کی طرف لے جائے تو وہ اس بات کو ناپسند کرے۔ جیسا کہ فرماتے ہیں ''ان لنا للآخرۃ و الاولیٰ''۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ کریم ایسی ذات کو کہتے ہیں نقائص سے پاک ہو اور عمدہ صفات کے ساتھ متصف ہو۔ کیونکہ اہل عرب بھی نفیس اموال کو نفاست کی بناء پر اموال کرائم سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور حدیث پاک میں بھی ''ایاکم و کرائم اموالھم'' ہے تو یہاں کرائم اموال سے نفیس اموال مراد ہیں۔ اسی وجہ سے انگور کے درخت کو بھی کرم کہا جاتا ہے۔ کیونکہ انگور بھی عمدہ پھل اور حصول کے اعتبار سے ہاتھوں کے قریب ہوا کرتا ہے۔ بخلاف کھجور وغیرہ کے کہ ان میں یہ صفات نہیں۔

بندے کا حصہ صفت کریم سے بطور تخلق کے تو وہ یہ ہے کہ قدرت کے باوجود معاف کر دے بغیر وعدہ کے عطاء کرے۔ گھٹیا اخلاق اور ایذاء رساں افعال سے اجتناب کرے۔

قولہ: الرقیب: رقیب ایسی حفیظ ذات کو کہتے ہیں جو اشیاء کی اس طرح نگرانی کرے کہ آسمان اور زمین میں کوئی چیز بھی رائی کے دانہ کے برابر اس سے مخفی نہ ہو۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ رقیب ایسی ذات کو کہتے ہیں جو بندوں کے احوال و افعال کو جانتی ہو۔ اور ان کے سانسوں کی تعداد کا احاطہ کرتی ہو۔ اور ان کی طبعی عمروں کا علم رکھتی ہو۔ تو اس صورت میں صفت رقیب کا مرجع صفت ذات ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿ان اللّٰہ کان علیکم رقیبًا﴾[الاحزاب:۵۲]﴿ و کان اللّٰہ علیٰ کل شیٔ رقیبًا ﴾[النساء:۰۱]

آپ کا حصہ صفت رقیب سے تو وہ یہ ہے کہ آپ کو ہر حال میں اللہ کا خیال رہے۔ اور سوال کے سلسلہ میں اس کے غیر کی طرف متوجہ نہ ہوں اور آپ بھی رقیب بن جائیے۔ خصوصاً اس پر جس پر آپ کو راعی (نگہبان) بنایا گیا ہے۔ آپ تمام احوال میں اس کی طرف ہمہ تن متوجہ رہیں اور حدیث پاک میں آتا ہے ''کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ'' یعنی تم میں سے ہر ایک نگران ہے اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ مراقبہ صوفیاء کے گروہ کے ہاں یہ ہے کہ بندے پر اس کے رب کا ذکر کلی غالب ہو جائے۔ اور بندے کو اس بات کا علم ہو کہ اس کا رب اس کے حال پر مطلع ہے۔ اور بندہ ہر حال میں اللہ کی طرف رجوع کرے۔ اور ہر وقت ذات باری سے با ہیبت رہے۔ اور صاحب مراقبہ، اللہ کے عقوبت کے خوف سے نئے گناہوں کو ترک سے زیادہ اللہ سے حیاء اور مصیبت کی وجہ سے مخالفات کو چھوڑ دیتا ہے۔ دل کی حفاظت کی صورت یہ ہے کہ وہ اپنے سانسوں کو اللہ کے ذکر کے ساتھ شمار کرے اور وہ اپنے سانس کو اللہ کے ذکر کے بغیر ضائع نہیں کرتا۔ اور اللہ کی طاعات سے ایک لمحہ خالی نہ رہے اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اللہ اس سے ہر چیز کا حساب لے گا۔ چھوٹی ہو یا بڑی۔ جیسا کہ بعض حضرات سے یہ حکایت نقل کی گئی ہے کہ ان کو کوئی آدمی خواب میں دکھایا گیا اس سے سوال کیا گیا کہ اللہ نے آپ سے کیا معاملہ کیا تو اس نے جواب دیا اللہ نے میرے ساتھ اچھا سلوک کیا اور مجھے بخش دیا۔ ہاں البتہ اللہ پاک نے مجھ سے حساب لیا اور مجھ سے اس ایک دن کا مطالبہ کیا جس دن میں روزے دار تھا اور جب افطار کا وقت ہوا تو میں اپنے دوست

کے صندوق سے بغیر اجازت گندم لے لی اور اس کو کوٹا پھر مجھے یاد آیا کہ گندم تو میری نہیں ہے۔تو پھر میں نے اس کوٹی ہوئی گندم کو دوست کی گندم پر ڈال دیا تو اللہ پاک نے مجھ سے گندم کے کوٹنے کی مقدار کے جرمانے میں نیکیاں لے لیں۔جس کو اس بات کا یقین ہو جائے تو وہ اپنی عمر غلط کاموں میں ضائع نہیں کرتا اور اپنا وقت غفلتوں میں ختم نہیں کرتا۔انتہیٰ کلامہ۔اور اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿**یا آیھا الذین آمنوا اتقوا اللّٰہ ولتنظر نفس ما قدمت لغدٍ واتقوا اللّٰہ ان اللّٰہ خبیر بما تعملون**﴾[الحشر:۱۸]اور حدیث پاک میں آتا ہے:''**حاسبو انفسکم قبل ان تحاسبو**''۔اپنے نفسوں کا محاسبہ کرو اس سے پہلے کہ تمہارا حساب و کتاب لیا جائے۔

قولہ: المجیب: مجیب ایسی ذات کو کہتے ہیں جو پکارنے والے کی پکار کا جواب دے اور مضطر اور مجبور آدمی جس چیز کی درخواست اور تمنا کرے اس کی درخواست اور تمنا کے سلسلہ میں اپنے آقا و مولیٰ کی بات کو قبول کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿**فلیستجیبوا لی ولیومنوا بی**﴾[البقرۃ:۱۸۶] پھر اللہ پاک اپنے بندوں سے ان کے سوال کو پورا کرنے اور ان کو جواب دینے کی صورت میں ملاقات کرتا ہے۔

امام قشیریؒ حدیث''**ان اللّٰہ یستحی ان یرد یدی عبدہ صفرًا**''یعنی اللہ پاک اپنے بندے کو خالی ہاتھ لوٹانے سے حیا فرماتے ہیں کے بارے میں فرماتے ہیں۔اللہ پاک جب جان لیتے ہیں کہ میرے دوستوں نے دل کے ساتھ میرے سامنے اپنی حاجت کو پیش کیا ہے تو اللہ پاک ان کی مراد کو پورا فرماتے دیتے ہیں۔

بعض حضرات نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اللہ کے دوست اللہ کو زبان سے یاد کرتے ہیں اور بسا اوقات ان کا حال ان پر تنگ ہو جاتا ہے۔یہاں تک کہ جب وہ مایوس ہو جاتے ہیں۔اور یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ اللہ ان کی پکار کا جواب نہیں دے گا تو اللہ پاک ان کی مایوسی کا تدارک اپنی بہترین ایجاد اور اچھی امداد کی صورت میں فرماتا ہے۔انتہیٰ کلامہٗ۔اور ارشاد باری تعالیٰ بھی ہے: ﴿**وھو الذی ینزل الغیث من بعد ما قنطوا**﴾[الشوریٰ:۲۸]

اور مجیب میں نبی اکرم ﷺ کے ارشاد سمع اللہ لمن حمدہٗ کی طرف اشارہ ہے۔کیونکہ سمع بمعنی اجاب اور احسن خطابہٗ کے ہے۔لیکن بعض عارفین کہتے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے آپ کیلئے اجابت دعا کی ذمہ داری اٹھائی ہے لیکن اس چیز کے سلسلہ میں جس کو اللہ سبحانہٗ آپ کیلئے پسند کرتا ہے نہ کہ اس چیز میں جس کو آپ اپنے لئے پسند کرتے ہیں۔اور قبولیت دعاؤں کی ضمانت اس وقت میں ہے جس وقت میں اللہ کا ارادہ قبولیت دعا کا ہو نہ کہ جس وقت میں آپ کا ارادہ ہے۔

صفت مجیب سے آپ کا حصہ یہ ہے کہ آپ دستِ سوال اللہ کے علاوہ کسی کے سامنے دراز نہ کریں اور جو کچھ مانگنا ہو اللہ سے مانگیں۔یہاں تک کہ اپنا آٹا گوندھنے کیلئے نمک تک اللہ سے مانگیں اور امام احمدؒ دعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ جس طرح آپ نے میرے چہرے کو اپنے غیر کے سجدہ سے محفوظ رکھا ہے تو اسی طرح میرے چہرے کو بھی اپنے غیر سے سوال کرنے سے بھی محفوظ رکھ اور حدیث صحیح میں آتا ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا''**ادعوا اللّٰہ وانتم موقنون بالاجابۃ**''یعنی تم اللہ سے قبولیت دعا کے یقین کے ساتھ دعا مانگو اس لئے کہ قبولیت دعا ہر حال میں ہوگی خواہ قبولیت دعا معجّل ہو یا فی المآل۔

صفت مجیب کے ساتھ بابِ تخلق میں سے آپ ﷺ کا یہ ارشاد ہے''**لو دعیت الی کراعٍ راجبت**''یعنی اگر مجھے کراع کی طرف دعوت دی جائے تو میں اس داعی کی دعوت کو قبول کرونگا۔کراع یہ ایک جگہ کا نام ہے اس جگہ اور مدینہ کے درمیان آٹھ دن کی مسافت ہے یا کراع سے مراد کراع الغنم ہے اور اسی طرح آپ ﷺ کا یہ ارشاد بھی ہے:''**من لم یجب الداعی فقد عصٰی ابا القاسم**''''جو داعی کی دعوت کو قبول نہ کرے تو اس نے ابوالقاسم ﷺ کی نافرمانی کی ہے۔''

قولہ: الواسع: وہ ذات کہ جس کی کرسی زمین وآسمان سے کشادہ ہے۔ اور وہ ملک اور ملک کے اعتبار سے وسیع ہے اور اس کی رحمت ہر چیز کو شامل ہے۔ وہ کثیر الرحمۃ والعطاء ہے۔ کوئی چیز اپنی ابتداء اور انتہا میں اس کی عطاء سے مستغنی نہیں۔ اور اس ذات نے علم کے اعتبار سے ہر چیز کا احاطہ کر رکھا اور جملہ موجودات معلومات فلکیات وجزئیات کو جاننے والا ہے اس کی برہان وسلطان کی کوئی انتہا نہیں۔ اور اس کے احسان کی کوئی حد نہیں۔

صفت واسع سے بندے کا حصہ یہ ہے کہ بندہ اپنے اخلاق ومعارف کی کشادگی میں کوشش کرے اور غناءِ نفس کے اعتبار سے بالطبع جواد بن جائے اور اس کا دل فوت شدہ چیز کے مفقود ہونے کی وجہ سے تنگ نہ ہونے پائے اور حصول ضروریات کا زیادہ اہتمام نہ کرے۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ بندے پر واجب ہے کہ وہ اس بات کو جانے کہ خواہش نفس تک رسائی اور امید کے حصول پر قدرت اور اسباب دنیا کا اکٹھا ہو جانا یہ اللہ کے جملہ انعامات نہیں ہے بلکہ بندوں سے دنیا کا ہٹا دینا یہ اللہ کا بہت بڑا لطف اور بندوں کی طرف اللہ کا بہت زیادہ وافر مقدار میں احسان ہے۔ کیونکہ بندے کا اللہ سے قرب دنیا سے دوری کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ اور بعض کتب میں یہ بات مذکور ہے کہ اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں ''زیادہ سہل چیز جو میں کسی عالم کے ساتھ کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ جب دنیا کی طرف میلان اختیار کرتا ہے تو میں اس سے اپنی مناجات اور اپنی بندگی کی لذت چھین لیتا ہوں۔''

قولہ: الحکیم:

حکیم صاحب حکمت ذات کو کہتے ہیں اور حکمت کہتے ہیں کامل علم اور پختہ عمل کو۔

یا حکیم فعیل بمعنی حاکم فاعل کے ہے۔ تو اس صورت میں حکیم مبالغۃً حاکم ہوگا۔ اس لئے کہ اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جس کا ارادہ کرلے اس کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ اس کے فیصلے پر کوئی اس سے پوچھنے والا نہیں۔

فعیل مفعل کے معنی میں ہے (یعنی حکیم بمعنی محکم) کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی اشیاء کو محکم اور مضبوط کرتا ہے۔ اور اسی سے ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿صنع اللّٰہ الذی اتقن کل شیٔ﴾ [النمل: ۸۸] بایں طور کہ معارفِ الٰہیہ کے حصول کی صورت میں اپنے قوائے نظریہ کی تکمیل کی کوشش کریں۔ اور اپنے نفس کو رزائل سے خالی کرنے اور اس کو فضائل سے مزین کرنے اور اس کو اچھی خصائل سے روشن کرنے کی صورت میں اپنی قوت عملیہ کا کمال حاصل کریں۔ جو آپ کیلئے بلند درجات کی اور قرب مولیٰ کا موجب ہو۔ اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتے ہیں حکمت سے نواز دیتے ہیں۔ اور جو شخص حکمت سے نواز دیا گیا تو گویا کہ وہ خیر کثیر سے نواز دیا گیا۔ اور حکمت کتاب وسنت کا علم ہے نہ کہ فلاسفہ کے علوم۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ اللہ کا حکم اپنے بندوں پر یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کو بغیر استحقاق وسبب کے بلا کوشش وطلب حکیم سعادۃ کے ساتھ مخصوص فرما دیتا ہے۔ بلکہ اللہ کا علم قدیم اس کو سعادت مند ٹھہرانے کے متعلق اور اللہ کا حکم ازل اس سعادت کو وجود میں لانے کے متعلق ہو چکا ہوتا ہے اور کسی قوم کو اللہ پاک رندہ درگاہ ہی' دوری کے ساتھ مخصوص فرما دیتا ہے بغیر کسی سابقہ جرم کے اور اکتساب گناہ کے اس کی قدر ومنزلت کو اپنے بندوں کے درمیان سے گھٹا دیتا بلکہ کلمۂ شقاوت اس کے حق میں ثابت ہو چکا ہوتا اور اللہ کی مشیت اس کے دل کی قیادت اور انکار کی صورت میں نافذ ہو چکی ہوتی ہے۔ جو بندہ اللہ کے حکم میں شقی ہو چکا ہوتا ہے تو اللہ اس کو اپنے دوستوں کی صف میں ظاہر فرماتے ہیں۔ پھر اسی کی انتہائی مذمت فرماتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے: ﴿فمثلہ کمثل الکلب﴾ اور جو اللہ کے حکم میں سعید ہو چکا ہوتا ہے تو اللہ پاک اس کو کتے کی صورت میں پیدا کر کے اس کا حشر اپنے دوستوں کی جماعت میں فرماتا ہے۔ اور اس کتے کا ذکر اپنے جملہ خاص دوستوں میں کرتے ہوئے فرماتا ہے: ﴿رابعھم کلبھم﴾ [الکھف: ۲۲] انتہیٰ کلامہٗ۔ یہی مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿لا

یسأل عما یفعل وھم یسألون﴾[الانبیاء:۲۳]

قولہ: الودود: یہ مبالغہ واد ہے اور ودّ مصدر سے مشتق ہے اور وُد محبت کو کہتے ہیں یعنی ''ودود'' وہ ذات ہے جو تمام مخلوقات کیلئے بھلائی کو محبوب رکھے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ ودود ایسی ذات کو کہتے ہیں جو اپنے دوستوں سے محبت کرے۔ اور یہی بات زیادہ ظاہر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿واللہ یحب المحسنین﴾[آل عمران: ۱۱٤] اور دوسری آیت ہے: ﴿انہٗ لا یحب الظالمین﴾ (شوریٰ :۴۰)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ صفت ودود کا مرجع ارادہ مخصوص ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ فعول ودود بمعنی مفعول ودود محبوب کے ہے۔ کیونکہ اللہ پاک اپنی تمام مخلوقات کے دلوں میں محبوب اور اپنی تمام مصنوعات کی وجہ سے مطلوب ہے۔ اور حقیقت میں جیسا کہ اصحاب شہود کا نظریہ ہے کہ عالم کون میں اللہ کے سوا کسی کا وجود نہیں اور وہی محب اور محبوب ہے جبکہ وہ حامد و محمود شاہد و مشہود ہے۔

بندے کا حصہ صفت ودود سے یہ ہے کہ مخلوق خدا کیلئے بھی اس چیز کا ارادہ رکھے جس چیز کا وہ اپنے حق میں ارادہ رکھتا ہے۔ اور اپنی قدرت اور گنجائش کے مطابق مخلوق خدا کے ساتھ احسان کرے۔ اسی کی طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا ہے۔ ''**لا یومن احدکم حتی یحب لا خیہ ما یحب لنفسہ**''۔ یعنی تم میں سے کوئی کمال ایمان حاصل نہیں کر سکتا۔ تاوقتیکہ جو چیز اپنے لئے پسند کرتا ہے وہ اپنے بھائی کیلئے پسند کرے۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ ذات باری تعالیٰ کی صفت کے سلسلہ میں ودود کا معنی ہے ایسی ذات جو مؤمنین سے محبت کرے اور مؤمنین اس سے محبت کریں جبکہ اللہ ارشاد فرماتا ہے: ﴿یحبھم ویحبونہ﴾[المائدۃ: ٥٤]۔ حق تعالیٰ شانہٗ کا اپنے بندوں سے محبت کرنے کا مطلب بندوں پر رحمت کرنا اور ان کیلئے اچھائی کا ارادہ کرنا اور ان کی تعریف کرنا ہے اور بندوں کی اللہ سے محبت ان کا اللہ کی اطاعت اور اس کے حکم کی موافقت اور اس کی تعظیم اور اس سے ڈرتے رہنے کے معنی میں ہوگی۔ انتہیٰ کلامہ۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿ان الذین آمنو اوعملوا الصالحات سیجعل لھم الرحمن ودًا﴾[سورہ مریم :۹٦] یعنی اپنے اور ان کے درمیان یا اپنے اور مخلوق کے درمیان اور ان دو محبتوں کو جمع کرنے سے کوئی رکاوٹ نہیں' ایک حدیث قدسی ہے اللہ پاک فرماتا ہے کہ میری طرف محبوب وہ ہے: میری عبادت بغیر عطاء کے کرتے تا کہ وہ ربوبیت کو اس کا حق ادا کردے۔

قولہ: المجید: یہ مبالغہ ماجد ہے اور مصدر مجد سے مشتق ہے۔ مجد کرم کی کشادگی کو کہتے ہیں اور مجید وہ ذات ہے کہ جس کے کرم کی کشادگی کا ادراک نہ کیا جا سکے۔ اور اس کی لگا تار بخشیں اور احسانات کی کوئی انتہا نہ ہو۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ اللہ کے بڑے انعامات جو اپنے بندوں پر ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ اللہ نے اپنے بندوں کی توحید اور ان کے دین کی حفاظت کی ہے جس کی وجہ سے وہ راہِ راست سے ٹیڑھے اور ہٹتے نہیں پاتے اگر اس کا لطف واحسان نہ ہوتا وہ گمراہ ہو کر راہ راست سے بھٹک جائے۔ اور اللہ کے بڑے احسانات جو اکثر مخلوق سے مخفی نہیں وہ یہ ہے کہ اللہ پاک نے ان قلوب کو محفوظ رکھا اور ان کے اوقات کو کدورتوں سے پاک رکھا۔ اس لئے کہ سب سے بڑی نعمت قلوب کا اچھا ہونا ہے۔ جیسا کہ سب سے بڑی مشقت قلوب کی مشقت ہے۔

یا مجید مجد سے مشتق ہے اور مجد انتہائی شرف کو کہتے ہیں اور اللہ وہ ذات ہے جس کیلئے شرف ذات اور اچھی صفات ہیں۔

کہا گیا ہے کہ مجید عظیم اور بلند مرتبہ ذات کو کہتے ہیں اور عظیم فعیل مفعل کے معنی میں ہے۔

بندے کا حصہ صفت مجید سے تو وہ یہ ہے کہ بندہ لوگوں کے ساتھ کرم اور اچھے اخلاق والا معاملہ کرے تا کہ لوگوں میں ماجد اور اللہ کے ہاں پائی جانے والی خیر کا واجد بن جائے۔

قولہ: الباعث یعنی احکام اور حکمتیں دے کر رسولوں کو امتوں کی طرف مبعوث کرنے والی ذات۔

یا وہ ذات جو حشر و نشر کیلئے قبروں میں پڑے ہوؤں کو اٹھائی گئی۔

کہا گیا ہے کہ باعث سے مراد ایسی ذات ہے جو اپنے بندے کی طرف ایسی جگہ سے رزق بھیجتی ہے جہاں سے بندے کا گمان نہ گذرا اگر چہ بندہ ہاتھ پاؤں نہ بھی مارے۔

کہا گیا ہے کہ باعث ایسی ذات کو کہتے ہیں کہ جو توحید کے پیمانوں میں ارادوں کو ترقی کی طرف اٹھا دے اور بندوں کی صفات کو ظلم سے پاک کرنے کی طرف۔

بندے کا حصہ صفت باعث سے یہ ہے کہ اولاً باعث کے مطالب پر ایمان لائے اور متوجہ ہو۔ ابتداء اپنی ذات سے کرے پھر اس کو جو اس کے اعتبار سے زیادہ قریب ہو اور رتبہ کے اعتبار سے اس سے ادنیٰ ہو۔

قولہ: الشھید: یہ مبالغۂ شاہد ہے اور مصدر شہود بمعنی حضور سے مشتق ہے اور شہید کا معنی ہے ایسی ذات جو اشیاء کے ظاہر کو اور ایسی چیزوں کو جن کا مشاہدہ ممکن ہے بخوبی جاننے والی ذات جیسا کہ خبیر ایسی ذات کو کہتے ہیں جو باطن اشیاء کو اور ایسی چیزوں کو جن کا احساس ممکن نہ ہو جاننے والی اور ارشاد باری تعالیٰ: ﴿**عالم الغيب و الشهادة**﴾[الانعام:۷۳]

شہید شہادۃ مصدر سے شاہد کا مبالغہ ہے اور معنی ایسی ذات جو روزِ قیامت اپنے علم کی وجہ سے مخلوق پر گواہی دے گی اور مخلوق میں سے گواہ بنائے گی اور اس سے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**و كفى بالله شهيدًا**﴾[سورة النساء :۷۹]۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ اہل معرفت اللہ کے ساتھ اللہ کے سوا کسی کو مونس نہیں بناتے بلکہ وہ اپنے احوال پر بطور شہید کے اور اپنے افعال و امور پر بطور علیم اللہ کے ساتھ راضی ہو جاتے ہیں۔ اور ایسا کیوں نہ ہو حالانکہ وہ رازوں اور انتہائی خفیہ باتوں کو جانتا ہے۔ اور سرگوشی کو سنتا ہے۔ تکلیف اور مصیبت کو ٹالتا ہے۔ بھلائی کو بڑھاتا ہے اور گھٹیا چیز کو پھیرتا ہے۔ دنیا و آخرت کا مالک ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اسی سے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**اولم يكف بربك انهٗ على كل شئ شهيد**﴾[فصلت:۵۳]

اور باقی رہا آپ کا حصہ صفت شہید سے تو وہ یہ ہے کہ آپ ہر وقت اپنے پروردگار کا خیال رکھیں یہاں تک کہ اللہ پاک آپ کو وہاں نہ دیکھے جہاں سے آپ کو منع کیا ہے۔ اور وہاں سے آپ کو گم نہ پائے جہاں کا آپ کو حکم دیا ہے اور آپ اپنی ضروریات کو غیر کی طرف لے جائے اور نیکی و بھلائی کیلئے طلب غیر کی طرف مائل ہونے سے اللہ کے علم پر اکتفا کریں۔

صفت شہید سے آپ کا تخلق تو وہ یہ ہے کہ آپ حق کے شاہد اور سچ کی رعایت کرنے والے بن جائیں تا کہ آپ جملہ لوگوں میں سے مقبول الشہادۃ ہو جائیں جن لوگوں کے بارے میں اللہ نے ارشاد فرمایا: ﴿**وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا**......﴾ [البقرة :۱۴۳]

قولہ: الحق: یعنی ایسی ثابت ذات کہ جس کے وجود کا یقینی ہونا متحقق ہو چکا ہو اور اس کے غیر کا تحقق بھی اسی کے فضل و کرم سے ہو اور حق کی ضد باطل آتی ہے۔ معدوم کو یا ایسی موجود چیز کو جو حق کے مقابلہ میں موہوم کے مرتبہ میں ہو باطل کہتے ہیں۔ اور جملہ موجودات اس حیثیت سے کہ وہ ''**فی حد ذاتها**'' ممکن ہے اور ان کا ثبوت از خود نہیں بلکہ ساری موجودات کا ثبوت اللہ کی جانب سے ہے اور اللہ کی طرف لوٹتا ہے۔ تو اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے۔ اس حیثیت سے کہ کوئی بھی چیز اس کی اپنی ذات کی جانب سے یا اپنی ذات میں حقیقۃ نہیں چہ جائیکہ وہ چیز ثابت رہ جائے اسی کی طرف ارشاد باری تعالیٰ: ﴿**كل شئ هالك الا وجههٗ**﴾[القصص:۸۸] اور ﴿**كل من عليها**

فان﴾[الرحمن:۲۶] سے اشارہ ہے۔من مستعمل برائے ذوالعقول لانا ''تغلیباً'' ہےاوراس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جب یہ فناء ہوجائیں گے تو غیر ذوالعقول تو بدرجہ اولی فنا ہوجائیں گے اور جس شاعر کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ گواہی دی کہ زیادہ سچی بات وہ ہے جولبید شاعر نے کہی اوراس کی بات ''الا کل شئ ما خلا اللّٰہ باطل'' کا بھی یہی مطلب ہے۔یعنی باطل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہر چیز فناء اورزوال کوقبول کرنے والی ہے۔ بلکہ ارباب شہود کی نظر میں ہر چیز ہمیشہ کمزوری کے مرتبہ میں ہے۔اور ہمارے شیخ المشائخ ابوالحسن بکریؒ کے قول 'استغفر اللّٰہ مما سوی اللّٰہ'' کا یہی مطلب ہے۔جیسا کہ میں نے اس قول کوشرح کے ساتھ شرح حزب الفتح میں تحریر کیا ہے۔اور حضرت لبیدؓ کی جلالت شان پر یہ بات دلالت کرتی ہے کہ جب حضرت لبیدؓ اسلام لائے تو انہوں نے شعر کہنا چھوڑ دیئے اور فرمایا کہ مجھے قرآن کافی ہے تو بہرکیف حق اس معنی کی وجہ سے صفات ذات میں سے شمار ہوگا۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ حق کا معنی ہے محق یعنی حق کو ظاہر کرنے والی ذات۔یاشی کو اس کی حکمت کے مقتضیٰ کے مطابق ایجاد کرنے والی ذات تو اس صورت میں صفت حق صفات افعال میں سے ہوگی۔

آپ کا حصہ صفت حق سے تو وہ یہ ہے کہ جب آپ نے یہ پہچان لیا کہ وہ ذات حق ہے تو آپ مخلوق کا ذکر بھول جائیں۔اور باقی رہا آپ تخلق تو وہ یہ ہے کہ آپ جمیع اقوال افعال اوراحوال میں حق کو لازم پکڑیں۔

قولہ:الوکیل: یعنی بندوں کے امور کو قائم کرنے والی اوران کی مصلحتوں کی کفالت بردار ذات۔

بعض حضرات کہتے ہیں وکیل اس ذات کو کہتے ہیں کہ جس کی طرف اقامت اور کفایت کے اعتبار سے بندوں کی تدبیریں سونپ دی گئیں ہو اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ شئ کی اقامت کے لحاظ سے ہر چیز پر وکیل اور کارساز ہے۔اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا وکیل ہونا دو چیزوں کی طرف مشیر ہے:(۱) کہ مخلوق مناسب انداز میں اپنے جملہ امور کے قیام سے عاجز ہے اس لئے کہ عموماً کوئی عاقل آدمی اپنا کام دوسرے کی طرف سپرد نہیں کرتا۔الا یہ کہ اس کیلئے خود اس کام کو کرنا مشکل یا متعذر رہو جائے۔(۲) کہ اللہ مخلوق کے حال کو جانتا ہے اور جس چیز کی طرف مخلوق کو احتیاج ہے وہ اس پر قادر ہے۔اور مخلوق پر مہربان ہے اور جو شخص اپنے اندران صفات کو جمع نہ کر سکتا ہو تو اس کی طرف کام سپرد کرنا بھی اچھا نہیں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:﴿وکفی باللّٰہ وکیلاً﴾[نساء:۸۱]﴿وعلی اللّٰہ فتوکلوا ان کنتم مؤمنین﴾[المائدۃ: ۲۳]﴿ومن یتوکل علی اللّٰہ فھو حسبہ﴾[الطلاق: ۰۳] ﴿وتوکل علی الحی الذی لا یموت﴾[الفرقان:۵۸] ﴿وتوکل علی العزیر الرحیم﴾[الشعراء :۲۱۸]

اور باقی رہا صفتِ وکیل کے ساتھ تخلق تو وہ اس طرح ہے کہ آپ بندگان خدا کے امور اوران کے مطالب کو قائم کیجئے۔اوران کی ضرورت پروری کی کوشش کیجئے۔

قولہ:القوی: مرتبہ کے اعتبار سے قوت کا اطلاق کئی معانی پر ہوتا ہے اوراس کا انتہائی رتبہ ایسی کامل درجہ کی قدرت ہے جو انتہا کو پہنچنے والی اور تمام اشیاء کو گھیرنے والی اور درجہ کمال کو ملنے والی ہو۔اور اللہ تعالیٰ اسی معنی میں قوی ہے۔اوراگر غیر کو قدرے قوت حاصل ہے بھی صحیح تو وہ اللہ تعالیٰ کی وجہ سے ہے۔اوراس کی وضاحت یہ ہے کہ اولاً انسان جو اپنے اندر عمل کا ایک احساس سا پاتا ہے اس احساس کو حول کہتے ہیں۔اور پھر اپنے اعضاء میں اس کام کی طاقت رکھنے کا جو احساس پاتا ہے اس کو قوۃ کہتے ہیں۔اور پھر پکڑنے اور لینے کی صورت میں جو انسان پر عمل ظاہر ہوتا ہے اس کو قدرت کہتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ لاحول ولاقوۃ کو جنت کے خزانوں میں سے خزانہ قرار دیا گیا۔کیونکہ یہ کلمہ تمام امور کے اللہ کی طرف لوٹنے پر دلالت کرتا ہے۔

علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ جب آپ نے اللہ کے غیر سے لاحول ولاقوۃ کی صورت میں قوۃ کے پہلے دو درجوں کی نفی کر دی تو بہتر

یہی ہے کہ آپ قوت کے تیسرے درجے یعنی قدرت کی بھی غیر اللہ سے نفی کر دیں۔ لیکن علامہ ابن حجرؒ کی یہ بات قابل اشکال ہے کیونکہ تیسرے درجے یعنی قدرت کا اللہ کے غیر سے منفی ہونا ظاہر ہے۔ تو لہٰذا نفی کو ذکر کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ کوئی سفیہ آدمی بھی اپنی ذات کیلئے قدرت کا وہم نہیں کرتا' چہ جائیکہ علماء سے اس وہم کا صدور ہو۔ ہاں البتہ حول اور قوت کے بارے میں اپنے نفسوں کی طرف نسبت کا وہم کبھی جہالت اور غفلت کی بناء پر پیدا ہو جاتا ہے اس لئے ان کی نفی ذکر کی گئی۔ جیسا کہ معتزلہ کا گمان بھی یہی ہے کہ جو کچھ کرتے ہیں بندے ہی کرتے ہیں اس لئے ان کے وہم کا دفعیہ کیا گیا اور ان کی سمجھ کو غلط قرار دیا گیا۔

آپ کا تقرب بطور تعلق صفت قوی سے تو وہ بایں طور ہے کہ آپ تدبیر کو ساقط کر دیجئے اور تقدیر کا جھگڑا ترک کر دیجئے اس لئے کہ دیر کسی قسم کی تبدیلی قبول نہیں کرتی۔ اور دعویٰ کے ارد گرد چکر مت کاٹیئے اور دنیا کے غموں کی پرواہ مت کیجئے۔ اور باقی رہا اس کے ساتھ آپ کا تخلق تو وہ یہ ہے کہ آپ اللہ کی ذات کے سلسلہ میں اس طرح قوی ہو جایئے کہ آپ اللہ کے راستہ میں کسی بھی ملامت گر کی ملامت کا خوف نہ کیجئے۔

قولہ: المتین: یہ متانت اور شدت سے ہے۔ اور متین اور قوی کا مرجع وصفِ کمال قدرت اور شدت قوۃ ہے اور اللہ تعالیٰ بالغ القدرۃ اور دائم القدرۃ ہونے کی حیثیت سے قوی ہے۔ اور شدید القوۃ ہونے کی حقیقت سے متین ہے۔

کہا گیا ہے کہ متین متانۃ سے اور متانت کہتے ہیں کہ شی کا اس طرح مضبوط اور مستحکم ہونا کہ وہ شی کسی سے متاثر نہ ہونے پائے تو گویا متین وہ ذات جو دوسری شئ میں مؤثر تو ہو لیکن دوسرے شی سے متاثر نہ ہو۔ اور وہ ذات ہے کہ جس پر نہ تو غلبہ پایا جا سکے اور نہ ہی وہ کسی سے مغلوب ہو پائے اور نہ ہی وہ ذات اپنی قوت میں کسی مادے اور سبب کی محتاج ہو۔ جیسا ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**ان اللّٰہ ھو الرزاق ذو القوۃ المتین**﴾[الذاریات:۵۸] اور اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جو اگر کسی بندے کو ہلاک کرنا چاہے تو اپنی قدرت سے ہلاک کر دے۔ ذبح کی صورت میں یا اس کے علاوہ گلا گھوٹنے اور جلانے اور غرق کرنے کی صورت میں۔ اسی طرح استاذ علی دقاق فرماتے ہیں ایسی ذات سے ڈر جو تیری ہلاکت کیلئے مدد کی محتاج نہیں۔ اگر وہ تجھے ہلاک کرنا چاہے تو وہ تجھے تیرے ہاتھوں سے بھی ہلاک کر کے بھی تیری جان نکال سکتا ہے۔

آپ کا حصہ صفت متین سے تو وہ یہ ہے کہ آپ اللہ پر بھروسہ اور اس کی طرف سہارا لیں۔

قولہ: الولی: یعنی اپنے دوستوں سے محبت کرنے والی ذات اور ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں ان کی مدد کرنے والی ذات خواہ ان کے دشمن ان کے نفسوں کی صورت میں ہوں یا خواہشات کی صورت میں یا اس کے علاوہ ہر ایسی چیز جو ان کو اللہ کے غیر کی ملاقات کی طرف بلائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**واللّٰہ ولی المتقین**﴾[الجاثیۃ:۱۹] ﴿**وھو الولی الحمید**﴾[الشوری:۲۸]

بعض حضرات کہتے ہیں کہ ولی کا معنی ہے ایسی ذات جو اپنی ساری مخلوق کے امور کی متولی ہو۔ اور اپنی حکمت کے مطابق ان کے بارے میں جو جانتی ہے کرتی ہے۔ اور اپنی عزت کی وجہ سے جس چیز کا ارادہ کرتی ہے فیصلہ کر دیتی ہے۔

ولی ایسی ذات کو کہتے ہیں جو اپنے بندوں میں سے خاص بندوں کو منتخب کرنے اور ان کو سعادت مند بنانے کی صورت میں ان کے امور کی متولی ہو۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**اللّٰہ ولی الذین آمنوا یخرجھم من الظلمات الی النور**﴾[البقرۃ:۲۵۷]

صفت ولی سے آپ کا حصہ تو وہ یہ ہے کہ جب آپ نے یہ پہچان لیا کہ اللہ تعالیٰ مؤمنین کا ولی ہے تو آپ اللہ اور اس کی محبین کے علاوہ کسی سے دوستی نہ کریں۔ کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿**ومن یتول اللّٰہ ورسولہ والذین آمنوا فان حزب اللّٰہ ھم الغالبون**﴾[المائدۃ:۵۶] تو آپ ولایت خاصہ کے اس درجے کو پالیں گے جس کی طرف اللہ پاک نے اپنے ارشاد: ﴿**الا ان اولیاء اللّٰہ لا خوف**

علیهم ولاهم یحزنون الذین آمنو و کانوا یتقون﴾[یونس:٦٢-٦٣] میں اشارہ کیا ہے۔
امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ اللہ کی اپنے بندے کی ولایت کی علامات میں سے ہے کہ اللہ پاک اپنے بندے کو توفیق داعی سے نوازتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر بندہ کسی برائی کا ارادہ کرے یا کسی ممنوع چیز کا قصد کرے تو اللہ پاک اس کو اس کے ارتکاب سے محفوظ فرمادیتے ہیں۔ اور اگر بندہ اس کی اطاعت کے سلسلہ میں کسی کوتاہی کی طرف جھکنے لگے تو اللہ پاک اس کو جھکنے نہیں دیتے بلکہ مزید اس کو طاعت کیلئے توفیق اور تائید مہیا کرتے ہیں۔ اور ساری علامت سعادت کی اور اس کے برعکس جملہ علامات شقاوت کی ہیں۔
اور اللہ کی ولایت کی علامات میں سے یہ بھی ہے کہ اللہ پاک اپنے دوستوں کے دلوں میں اپنے بندے کی محبت بٹھا دیتے ہیں۔ اور اللہ ہر وقت اپنے دوستوں کے دلوں کی طرف نظر فرماتے ہیں۔ جب ان کے قلوب میں کسی بندے کیلئے جگہ دیکھتے ہیں تو ان کی طرف نظر لطف فرماتے ہیں اور جب اللہ پاک اپنے اولیاء میں سے کسی ولی کے ارادے کو کسی بندے کے حال کے بارے میں دیکھتے ہیں یا اپنے ولی کو کسی شخص کے حال کے بارے میں دعا کرتے ہوئے سنتے ہیں تو اللہ پاک اسے روک دیتے ہیں۔ اور یہ کہ وہ اس کی طرف فضل واحسان کرے اور اللہ نے سنت کریمہ اس طرح جاری رکھی ہوئی ہے۔
میں نے شیخ ابوعلی دقاقؒ کو سنا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ اگر اولیاء اللہ میں سے کوئی ولی کسی شہر سے گذر جائے تو اہل شہر اس ولی کے گذرنے کی برکت حاصل کر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اللہ ان اہل شہر کو معاف کر دیتے ہیں۔
ولایت کی خصوصیات میں سے یہ خصوصیت ہے کہ اہل ولایت ''ذلت'' سے منزہ ہوا کرتے ہیں ''کما قال تعالیٰ : ﴿**ولم یکن له ولی من الذل**﴾[الاسراء:١١١] اور اولیاء اللہ ہمیشہ دنیا وآخرت میں اپنے مولیٰ کی عزت میں مستغرق ہوتے ہیں۔ اللہ پاک اپنے اولیا سے راضی ہوتے ہیں۔ اور اللہ پاک اپنے کرم واحسان سے ہمیں بھی اپنے زمرۂ اولیا میں شامل فرمائے آمین۔
قوله: الحمید: یعنی محمود اور ثناء کی مستحق ذات۔ اس لئے کہ اللہ پاک ہر کمال سے موصوف اور ہر عطاء کا مالک ہے۔ اور فعالِ کل ہونے کی وجہ سے شکور ہے تو نتیجہ یہ نکلا کہ علی الاطلاق محمود ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿**وان من شئ الا یسبح بحمده**﴾ [الاسراء: ٤٤] ہر چیز کا تسبیح بیان کرنا یا تو بیان قول کے ساتھ ہوگا یا زبان حال کے ساتھ کہا گیا ہے کہ اللہ پاک نے ازل میں جیسا کہ اس کی شان کے لائق ہے اپنی تعریف کی۔ اور بندے ہمیشہ اللہ کی الہام کردہ تعریف کرتے رہیں گے۔ اور وہ اللہ ہمیشہ تعریف کا مستحق ہے۔ بلکہ حقیقت میں حامد اور محمود وہی ہے۔ جیسا کہ اس پر صیغہ حمید فعیل دلالت کرتا ہے کیونکہ اس میں احتمال ہے کہ یہ حامد اور محمود فاعل کو مفعول کے معنی میں ہو جیسا کہ احمد الحامدین ﷺ کا ارشاد ہے: **سبحانك لا احصی ثناءً علیك كما انثیت علی نفسك**'' یعنی جس طرح تو نے اپنی تعریف آپ کی ہے۔ میں اس طرح تیری تعریف کرنے سے قاصر ہوں اور آپ کا حصہ صفت حمید سے تو وہ ہے جو صاحب حکم نے فرمایا ہے یعنی مؤمن کو اللہ کی ثناء اس کو اپنی ذات کا شاکر ہونے سے مشغول رکھے۔ اور اس کو اللہ کے حقوق اپنے ذاتی حقوق کی یاد آوری سے مشغول رکھیں۔
صفت حمید کے ذریعہ تقرب بطور تعلق یہ ہے کہ آپ جملہ احوال میں کثرت سے اس کی حمد میں رطب اللسان رہیں۔
صفتِ حمید سے تخلق تو وہ بایں طور ہے کہ آپ اچھی صفات اور اچھے افعال سے اپنے آپ کو مزین کرنے کی کوشش کریں۔
امام قشیریؒ فرماتے ہیں بندے کی اللہ کیلئے حمد بندے کا شکر ہے۔ تو مناسب ہے کہ یہ شکر حضور ئی منعم کے ساتھ ہونا چاہئے اس لئے کہ شکر کی حقیقت کا یہ ہے کہ منعم کی حضوری کی وجہ سے حضور ئی نعمت سے غیبت اختیار کر لینا۔ اور کہا جاتا ہے کہ جناب داؤد علیہ السلام نے اپنی مناجات میں عرض کی کہ الٰہی میں آپ کا شکر کیسے ادا کروں اس لئے کہ میرا آپ کا شکر ادا کرنا درحقیقت یہ بھی تو آپ کی جانب سے مجھ

پر ایک نعمت ہے۔ اللہ نے جناب داؤد علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ اے ابوداؤد تو نے اب میرا شکرا ادا کر دیا ہے۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ شکر سے عاجز آ جانا یہ بھی شکر ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ ادراک کے درک سے عاجز آ جانا بھی ادراک ہے۔ پھر کتنے بندے ہیں جو بظاہر نعمت میں ہیں تو ان پر اس کا شکر واجب ہے کیونکہ وہ درحقیقت ایک قسم کی مشقت میں صبر ضروری ہے۔ اس لئے فی الحقیقت نعمت وہ ہے جو آپ کو منعم کی طرف پہنچا دے۔ نہ آپ کو منعم سے ہٹا دے اور نعمتیں حقیقت میں دینیہ بھی ہوا کرتی ہیں۔ ہاں اگر ان کے ساتھ دنیا کی راحتیں بھی میسر ہو جائیں تو یہ نور علی نور اور سرور علی سرور ہے۔ اور سید شاذلیؒ کی دعا بھی کچھ اسی قسم کی ہے کہ ''**اللھم یسر امونا مع الرحۃ لقلوبنا** ......'' اے اللہ ہمارے امور کو راحت قلبی کے ساتھ آسان فرما۔ پھر اگر بندہ نعمت کو اس مصرف میں خرچ کرنے کی صورت میں کہ جس طرف کیلئے اس نعمت کی تخلیق ہوئی ہے شکر کی توفیق پاتا ہے۔ تو یہ بہت اچھا ہے اگر ایسا نہیں تو مشقت محض مشقت ہی رہ جاتی ہے۔
یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿**وفی ذلکم بلاء من ربکم عظیم**﴾[الاعراف:۱٤۱] میں بلاء کی تفسیر نعمت اور نقمت سے کی گئی ہے اور اللہ عزوجل ارشاد فرماتے ہیں: ﴿**وننزل من القرآن ما ھو شفاءً رحمۃ للمؤمنین ولا یزیدا الظالمین**﴾[الاسراء:۸۲]

قولہ: المحصی: یعنی ایسی جاننے والی ذات کہ جس نے معلومات و موجودات کا اس طرح احاطہ کر رکھا ہو جیسا کہ گننے والا گنے جانے والی چیز کا یا ضبط کرنے والا ضبط کی جانے والی چیز کا اجمالاً اور تفصیلاً احاطہ کر لیتا ہے۔ اگر چہ بندے کیلئے بعض ممکنات کو حصر میں لانا اور بعض معدودات تک رسائی ممکن ہے لیکن وہ اکثر اور اغلب معدودات کے احصاء اور ضبط سے عاجز ہے۔ اور بندے کی جہالت اس کے علم سے زیادہ ہے۔ اسی وجہ سے اللہ پاک نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿**وما اوتیتم من العلم الا قلیلاً**﴾[الاسراء:۸۵] بندے کیلئے مناسب یہی ہے کہ وہ اپنی ذات سے متعلق اعمال کا احاطہ کرتا رہے۔ اس سے قبل کہ اس کا احاطہ کیا جائے۔ اور استقصاء سے قبل اپنے قبیح اعمال کی تلافی کرتا رہے۔ اور کہا گیا ہے کہ محصی ایسی قادر ذات کو کہتے ہیں کہ جس سے مقدورات میں سے کوئی چیز چھوٹنے نہ پائے۔ تو اس صورت میں صفت محصی کا مرجع صفت علم یا صفت قدرت ہے۔ صفت محصی سے آپ کا حصہ یہ ہے کہ آپ سے کسی سکون اور حرکت میں کسی لمحہ اور لحظہ سے غفلت واقع ہونے نہ پائے۔

صفت محصی کے ذریعہ آپ کا تقرب بطور تعلق یہ ہے کہ آپ تمام سانسوں میں اپنے نفس کا اس طرح محاسبہ کریں کہ آپ کا کوئی سانس اللہ کی فرمانبرداری کے بغیر نہ پایا جائے۔ اسی وجہ سے وارد ہوا کہ اہل جنت صرف اسی گھڑی پر حسرت کریں گے جو ان کی بغیر اللہ کی یاد گذر گئی ہو۔ اور کہا گیا ہے کہ جب دنیا ایک ساعۃ ہے تو اس دنیا کو آپ اللہ کی طاعت اور فرمانبرداری میں لگا ڈالیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿**وان تعدوا نعمۃ اللّٰہ لا تحصوھا**﴾[ابراھیم:۳٤] یعنی تم تو اللہ کی نعمتوں کو گننے کی طاقت نہیں رکھتے چہ جائیکہ تم ان نعمتوں کا شکرادا کرو۔

بعض بزرگوں کو دیکھا گیا کہ وہ اپنے تسبیح کو شمار کر رہے تھے تو ان سے پوچھا گیا کہ آپ اس پر شمار کر رہے ہیں۔ فرمایا نہیں بلکہ اس کیلئے شمار کر رہا ہوں۔ پس آدمی پر واجب ہے کہ اپنے آپ کی رعایت کرے اور اپنے گناہوں کو شمار کرے۔ اور جس اچھی چیز کا وہ مالک ہو اسے اس پر شکرادا کرے۔ اور آنے والے قبیح سے بچے اور طاعات سے خالی ایام کو یاد کرے۔ اور غفلتوں میں گذرے اوقات ماقیہ پر افسوس کرے۔ اس لئے کہا گیا ہے کہ وقت سے زیادہ نفیس اور عمدہ کوئی چیز نہیں۔ اس لئے کہ وقت کے علاوہ کوئی ایسی نفیس چیز نہیں کہ جس کا عوض لانا ممکن نہ ہو۔ اس لئے بعض حضرات کہتے ہیں کہ وقت کاٹنے والی تلوار ہے اور وقت تلوار کی مثل ہے۔ اگر آپ اسے نہیں کاٹیں گے تو یہ آپ کو کاٹ ڈالے گا۔ اگر آپ وقت عبادت کی صورت میں نہیں کاٹیں گے تو یہ آپ کو غلط کاموں کی صورت میں کاٹ ڈالے گا۔ اور اسی طرح بعض حضرات یہ بھی فرماتے ہیں کہ صوفی ابن الوقت اور ابوالوقت ہوا کرتا ہے اور ان دونوں کے درمیان دقیق فرق ہے۔ جو اس

جگہ کے علاوہ میں زیادہ مناسب ہے۔

قولہ: المبدیء: ہمزہ کے ساتھ ہے اور اس ہمزہ کو وقف سے بدلنا بھی جائز ہے۔

مبدیٔ ایسی ذات کو کہتے ہیں جو اپنے جودوکرم سے کائنات کو عدم سے وجود کی طرف ظاہر کرنے والی ہو۔ اور مبدیٔ خالق کے معنی میں ہے۔

مبدیٔ ایسی ذات کو کہتے ہیں کہ بغیر کسی مثال سابق کے اشیاء کی مخترع اور منشیٔ ہو اور معید کے مقابلہ میں یہی زیادہ مناسب ہے۔

قولہ: المعید: معید ایسی ذات کو کہتے ہیں جو دنیا میں مخلوق کو حیات سے ممات کی طرف لوٹاتی ہے اور ممات کے بعد ان کو حیاتِ اخروی کی طرف لوٹائے گی۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ پاک اشیاء محدثات کا ان کے جواہر اور اعراض کے منعدم ہونے کے بعد اعاد کرنے والا ہے۔ اور یہ بات ان حضرات کے مخالف ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ اعادہ شی کی مثل کو پیدا کرنے کا نام ہے نہ کہ بغیر مثل کے شیٔ کو پیدا کرنا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ مکلفین کے تمام اجزاء متفرقہ کا اعادہ ہو اس لئے کہ جب اللہ ساری مخلوق کو اٹھائے گا اور ان کو اکٹھا کرے گا تو ان کا اعادہ بھی کرے گا۔

کیفیت اعادہ کے بارے میں اختلاف ہے کرامیہ کی ایک جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ اشیاء کے جواہر منعدم نہیں ہوتے بلکہ متفرق ہو جاتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ ان کو جمع کرے گا اور ان کو پہلے طریقے سے جوڑ دے گا۔ لیکن حق بات یہ ہے کہ جواہر بھی منعدم ہو جائیں گے۔ ہاں مگر وہ جس کے عدم انعدام کے بارے میں نص وارد ہوئی وہ منعدم نہیں ہوتا۔ پھر بقیہ اس کا اعادہ کیا جائے گا۔ آپ ﷺ کے ارشاد ''**کل ابن ادم یفنی الا عجب الذنب**'' یعنی سارے انسان فنا ہو جائیں گے مگر اس کی ریڑھ کی ہڈی اور مسئلہ ظنی ہے جیسا کہ اس کی امام غزالی رحمۃ اللہ نے صراحت کی ہے۔ علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں حق بات یہ ہے کہ جو چیز منعدم ہو چکی ہے اس کا بقیہ اعادہ ہوگا۔ اور جو چیز متفرق ہوگی اس کو جوڑ دیا جائے گا۔ لیکن یہ ساری قیل وقال انبیاء علیہم السلام کے علاوہ کے حق میں ہے۔ کیونکہ اللہ نے زمین پر اس بات کو حرام کر دیا ہے کہ وہ انبیاء کے جسموں کو مٹائے۔ اور یہی حال شہدا کا ہے کیونکہ وہ زندہ ہوا کرتے ہیں تو لہٰذا ان کی طرف اعادہ کی نسبت سے مراد ان کی روحوں کا ان کے جسموں کی طرف اعادہ ہے۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ مبدیٔ اور معید دونوں ایک ہی اسم ہیں اس لئے کہ مبدی کا معنی معید کے ساتھ پورا ہوتا ہے اور ان دونوں کے درمیان ایسا تعلق ہے۔ جو انفکاک کو قبول نہیں کرتا۔ جیسا کہ پہلے بھی اس طرح کے اسماء گذرے ہیں۔ جیسے خافض اور رافع معز اور مذل، قابض اور باسط۔ اور جو صفات متقابلہ آگے آرہی ہیں یہ دونوں اس کے مشابہ ہیں۔ جیسے محی اور ممیت اور مقدم ومؤخر وغیرہ۔ اس لئے یہ اشکال وارد نہیں ہوگا کہ ان دونوں کو اسم واحد کہنا نص کے منافی ہے۔

مبدی اور معید سے آپ کا حصہ یہ ہے کہ جب آپ نے اللہ کے مبدی اور معید ہونے کی شہادت دے دی تو آپ کو چاہئے کہ آپ ہر چیز کے معاملہ میں اولاً اور ثانیاً اسی طرف رجوع کریں۔ اس لئے کہ ہر چیز کی ابتداء بھی اسی سے ہوئی اور ہر چیز اسی کی طرف لوٹ جائے گی۔ اور ہر موجود چیز کے ظہور سے مقصود اللہ کی ذات ہی ہے۔ اور ہر چیز میں اللہ کیلئے ایک شاہد ہے۔ جو اللہ کی وحدانیت پر دال ہے۔

ان دونوں صفتوں کے ذریعے آپ کا تقرب بطور تعلق اس طرح ہے کہ آپ ہر مقصد میں اسی کی طرف توجہ کریں۔ اور ہر شی سے پناہ مانگیں۔ ان دونوں صفتوں کے ذریعے آپ کا تخلق بایں طور ہے کہ آپ اپنی نظر کو ابتداء کی طرف لوٹائیں اور اس نظر کی وجہ سے نفس کو ہدایت کی طرف ڈال دیں۔ اسی وجہ سے کہا گیا ''**النھایۃ ھی الرجوع الی الھدایۃ**'' یعنی انتہاء یہ ابتداء کی طرف لوٹنا ہے۔

قولہ: المحیی الممیت: ان دونوں کا مرجع صفتِ افعال ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿**خلق الموت والحیاۃ**﴾

الملك:۲] اور اسی سے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ويحی الارض بعد موتها﴾[الروم:۱۹] ﴿ ويخرج الحی من الميت ويخرج الميت من الحی ﴾[یونس:۳۱] نبی اکرم ﷺ نے حضرت عکرمہؓ ابن ابی جہل کو جب مشرف با اسلام ہونے کے وقت دیکھا تو یہی آیت تلاوت فرمائی اور اشارہ کر دیا اس بات کی طرف کہ اللہ پاک قلوب کو ایمان و اسلام معارف وعلوم کے ذریعے حیات بخشتا ہے۔جیسا کہ اللہ پاک قلوب کو جہالت وضلالت لہو ولعب کی صورت میں مردہ کر دیتا ہے۔اسی سے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿او من كان ميتاً فاحييناه ﴾[الانعام:۱۲۳]

اور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا''مثل الذی یذکر ربهٗ والذی لا یذکرهٗ مثل الحی والميت ''یعنی ذکر کرنے والے اور نہ کرنے والے کی مثال زندہ اور مردہ کی طرح ہے۔اسی طرح اس سلسلہ میں صوفیاء کا کلام بھی ہے کہ اللہ تو وہ ذات ہے جو عارفین کے قلوب کو اپنے انوار کی معرفت کے ساتھ اور ان کی ارواح کو اپنے مشاہدہ کے لطف کے ساتھ حیات بخشتی ہے۔اور غفلت کی صورت میں قلوب کو اور شہوۃ کی صورت میں نفوس کو مردہ کر دیتی ہے۔اللہ پاک حیات کا خالق اور اس حیات کو دوام عطا کرنے والا ہے اور اسی طرح اس موت کو مقدر فرمانے والا ہے جو حیات پر عدم طاری کر دیتی ہے۔اور آپ ﷺ کا ارشاد''الحمد لله الذی احيانا بعد ما اماتنا واليه النشور ''موت وحیات کے معنی میں مجاز ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ احیاء کہتے ہیں جسم میں حیات پیدا کرنے کو اور اماتت کہتے ہیں جسم سے حیات کو زائل کر دینے کو۔اگر آپ یہ اشکال کریں کہ موت تو عدم حیات کو کہتے ہیں اور عدم ایک ایسی چیز ہے جو فاعل سے صادر نہیں ہوتا ہے۔تو میں اس کا جواب دیتا ہوں کہ عدم اصلی تو اسی طرح ہے کہ وہ فاعل سے صادر نہیں ہوا کرتا۔لیکن عدم متجدد فاعل ہی سے صادر ہوتا ہے۔لیکن فاعل عدم والا فعل نہیں کرتا بلکہ جو چیز عدم کو مستلزم ہوتی ہے۔(جیسے فعل اماتۃ مستلزم ہے عدمِ حیات کو تو اللہ اماتۃ کرتا ہے نہ کہ عدمِ حیات)۔ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وكنتم امواتا فاحياكم ثم يميتكم﴾[البقرۃ:۲۸] ترجمہ:''اور تم مردہ تھے پھر اس نے تمہیں حیوۃ بخشی' پھر وہی تمہیں موت دے گا۔''

اللہ پاک نے موت ثانی کی نسبت تو اپنے فضل کی طرف کی ہے لیکن موت اول کی نہیں۔اس لئے کہ موت اول عدمِ اصلی ہے اور آپ کا حصہ ان دونوں صفتوں سے یہ ہے کہ آپ موت وحیات کی فکر میں مت پڑیں بلکہ اپنے معاملہ کو اللہ کے حکم وقضاء وقدر کے سپرد کر دیں یہ کہتے ہو جو آپ کے ارشاد میں وارد ہے:''اللهم احينی ما كانت الحياة خيرًا لی وتوفنی اذا كانت الوفاة خيرًا لی واجعل الحياة زيادةً لی فی كل خيرًا اجعل الموت راحة لی من كل شر ''یعنی اے اللہ مجھے وہ زندگی عطا فرما جو زندگی میرے حق میں بہتر ہو اور مجھے موت اس وقت دینا جس وقت موت میرے لئے بہتر ہو اور زندگی کو میرے زیادتی خیر کا سبب اور موت کو ہر شر سے راحت کا سبب بنادے۔امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ جس پر حق تعالیٰ متوجہ ہو جائیں اس کو حیات بخشتے ہیں۔اور جس سے اعراض فرما لیں اس کو موت وفنا کے گھاٹ میں اتار دیتے ہیں۔

قوله: الحی: یعنی ابدی اور ازلی حیات والی ذات اور حی فعال اور درّاک ذات کو کہتے ہیں۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں ہمارے اکثر اصحاب اور معتزلہ کا نظریہ یہ ہے کہ حی اللہ کی صفت حقیقۃ ہے جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔اس صفت حقیقۃ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا جاننا اور اندازہ لگانا درست ہے۔اور بعض دیگر حضرات کا نظریہ یہ ہے کہ حی کا معنی ہے ایسی ذات جس کا علم اور اندازہ ممتنع نہ ہو۔یہ ساری بات ذات باری تعالیٰ کے حق میں ہے۔باقی ہمارے حق میں حیاۃ جنس حیوان کے ساتھ مزاج مخصوص کے معتدل ہونے کا نام ہے۔

کہا گیا ہے کہ حیاۃ ایسی قوت کو کہتے ہیں جو جنس حیوان کے تابع ہو اور ارادی حس و حرکت کے قبول کیلئے تیار شدہ ہو۔
بندے کا حصہ صفت حیی سے تو وہ یہ ہے کہ بندہ اللہ کی وجہ سے ایسا حیی اور زندہ ہو جائے کہ اس کو موت نہ آنے پائے۔اس لئے کہ اللہ کے اولیاء کو موت نہیں آیا کرتی بلکہ وہ ایک گھر سے دوسرے گھر کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں۔جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿**ولا تحسبن الذين قتلوا في سبيل اللّٰه امواتاً بل احياء عند ربهم**﴾[آل عمران:۱٦۹]
امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ جب بندہ یہ بات جان لے کہ اللہ پاک ایسا حیی ہے کہ اس کو کبھی موت نہیں آئے گی اور وہ عالم و قدیر ذات ہے تو اس کا اللہ پر بھروسہ درست ہے۔اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:﴿**وتوكل على الحي الذي لا يموت**﴾[الفرقان:۵۸] اس لئے کہ جو شخص مخلوق پر سہارا کرتا ہے اور اپنی حاجت کے دن کیلئے مخلوق پر بھروسہ کرتا ہے تو اس بات پر احتمال ہے کہ وہ اپنی وفات کے وقت بھی اس کی طرف محتاج ہوگا۔اور اس کے ہاں اس کی آس و امید ضائع ہو جائے گی۔
صفت حیی کے ذریعہ آپ کا تعلق بطور تقرب یہ ہے کہ آپ اللہ کے سامنے اس طرح رہیں جیسے نہلانے والے کے سامنے میت اور صفت حیی کے ذریعے تخلق تو وہ اس طرح ہے کہ آپ اپنی معرفت کے انوار کے ساتھ دلوں اور اپنے مشاہدہ کے اسرار کے ساتھ روحوں کو زندہ کیجئے۔

قولہ: القيوم: یعنی ایسی ذات جو بنفسہٖ قائم ہو کر دوسرے کو قائم کرنے والی ہو۔اور صفت قیوم اطلاق و عموم کے اعتبار سے صرف ذات باری تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔اس لئے کہ ذات باری تعالیٰ کا قوام بذاتہٖ ہے۔اور کسی طرح بھی غیر پر موقوف نہیں اور ہر چیز کا قوام ذات باری تعالیٰ کی ہی وجہ سے ہے۔اس لئے کہ اشیاء کا وجود اور دوام ذات باری تعالیٰ کے وجود ہی کے ساتھ متصور ہو سکتا ہے۔اور بندے کا قائم بنفسہٖ ہونے میں صرف اتنا سا دخل ہے کہ بندہ اللہ کے ماسوا اور لوگوں کی امداد سے مستغنی ہوا کرتا ہے اور صفت قیوم کی ترکیب اوصاف جلال و صفاتِ افعال سے ہے۔
امام قشیریؒ فرماتے ہیں جو شخص اللہ کے قیوم ہونے کو جان لیتا ہے تو وہ شخص تدبیر کی مشقت اور شغل کی تھکاوٹ سے راحت پاتا ہے۔اور تفویض و تسلیم کی راحت کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے۔اور اپنے دل میں دنیا کو گراں قیمت نہیں بناتا ہے۔
قیوم مفعول کے وزن پر قائم کا مبالغہ ہے جیسے دیوم دائمہ کا مبالغہ ہے۔
شیخ سہروردیؒ فرماتے ہیں کہ قیوم ایسی ذات کو کہتے ہیں کہ جس کو کمی اور زیادتی اور تغییر لاحق نہ ہونے پائے۔زیادتی تو اس لئے کہ وہ غایت سے قاصر اور نقصان اس لئے کہ وہ انتہا سے مختلف ہے اور وہ غایات نہایات کا خالق ہے۔

قولہ: الواجد:
جیم کے ساتھ یعنی ایسی ذات کہ وہ جس چیز کا ارادہ کرے یا اس کو طلب کرے تو اس کو پالے اور اس سے کوئی چیز فوت نہ ہونے پائے۔
بعض حضرات کہتے ہیں کہ واجد کا معنی غنی ہے اور یہ وجد سے ماخوذ ہے۔جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿**اسكنوهن من حيث سكنتم من وجدكم**﴾[الطلاق:٦] تو یہاں وجد غنی کے معنی میں ہے۔امام طیبیؒ نے بھی اسی طرح ذکر کیا ہے۔
ظاہر یہی ہے کہ دوسرا معنی پہلے معنی سے اعم ہے اور باقی رہا علامہ ابن حجرؒ کا یہ قول کہ دوسرا معنی پہلے معنی کے مترادف ہے مغایر نہیں۔یہ قول اس قول کے خلاف ہے۔جو کلام شارح سے وہم پیدا ہوتا ہے تو لہٰذا یہ شارح کی جانب سے وہم اور سہو ہے۔
امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں کے ہاں وجد وہ احوال ہیں کہ بغیر تکلیف اور طلب کے اس کے مقابل ہو جائیں۔ثوریؒ فرماتے ہیں کہ وجد ایک ایسا شعلہ ہے جو دلوں میں پیدا ہوتا ہے اور شوق کی وجہ سے کھینچا چلا آتا ہے۔اور ورود وجد کے وقت اعضاء خوشی یا

غم کے اعتبار سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ وجد حبیب کی خوشبو پانے کو کہتے ہیں۔جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿انی لا جد ریح یوسف﴾[یوسف:۹٤] جیسا کہ صوفیاء کے ہاں بھی یہ مشہور ہے اگر چہ کتب حدیث میں یہ بات مجھے نہیں ملی اور وہ ہے''انی لاجد نفس الرحمن قبل الیمین'' واللہ اعلم۔

قولہ: الماجد: مجد سے مشتق اور مجد کشادگی کرم اور انتہائی شرف کو کہتے ہیں۔علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ماجد مجید کے معنی میں لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ مجید میں مبالغہ ہے اور ماجد میں مبالغہ نہیں ورنہ دونوں مجد سے مشتق ہیں انتہیٰ کلامہ۔

اور اس میں ایک ایسی چیز کا ابہام ہے جو مخفی نہیں اور ابہام یہ ہے کہ اللہ کی جملہ صفات غایتِ کمال میں ہیں۔خواہ وہ صفات صیغہ مبالغہ کے ساتھ ہوں جیسے مجید اور علیم وغیرہ یا بغیر صیغہ مبالغہ کے جیسے ماجد اور عالم۔اور باقی یہ جو ذکر کیا گیا ہے کہ مجید میں مبالغہ ہے اور ماجد میں نہیں یہ مبنیٰ کے اعتبار سے ہے اصل معنی کے لحاظ سے نہیں۔(اصل معنی کے اعتبار سے مجید اور ماجد دونوں میں مبالغہ ہے) لیکن پھر ظاہراً تکرار کا سوال پیدا ہوتا ہے۔یعنی جب دونوں کا معنی ایک ہے تو تکرار ہوا اور تکرار محقق لوگوں کے ہاں پسندیدہ چیز نہیں ہے۔

جواب کے طور پر میرے دل میں جو بات کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ مجید کے بعد ماجد کے اعادہ میں نکتہ یہ ہے کہ ماجد اپنے سے سابق اسم واجد کے مقابل میں لایا گیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ روایات میں آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو کعبہ کا غلاف تھامے ہوئے ''یا واجد یا ماجد۔ لا تزل عنی نعمةً انعمت بها علی'' کہتے سنا یعنی اے واجد اور ماجد ذات جو انعام تو نے مجھ پر کیا ہے اس کو ہمیشہ رکھ۔

قولہ: الواحد:

اور ایک نسخہ میں اس کے بعد احد کی زیادتی ہے۔امام طیبیؒ جامع الاصول میں فرماتے ہیں کہ الواحد کے معنی الاحد ہے۔لیکن جامع ترمذی اور بیہقی کی کتاب الدعوات اور شرح السنۃ میں الاحد کا لفظ موجود نہیں۔

واحد کا معنی ایسی ذات جس کی تخریج نہ ہو سکے اور صفات میں اس کی کوئی نظیر نہ ہو۔اور افعال میں اسکا کوئی شریک نہ ہو انتہیٰ کلامہٗ۔

مصابیح کے بعض شراح فرماتے ہیں کہ واحد ایسی متفرد بالذات ذات کو کہتے ہیں کہ جس کا کوئی شریک نہ ہو۔اور احد ایسی ذات کو کہتے ہیں جو صفات کے اعتبار سے متفرد اور صفات میں اس کا کوئی شریک نہ ہو۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ وحدۃ کا اطلاق کر کے اس سے مراد عدم تجزی اور عدم انقسام ہوا کرتا ہے۔اور واحد اس معنی میں اکثر استعمال ہوتا ہے اور کبھی وحدۃ کا اطلاق کثرت اور تعدد کے مقابل بھی کیا جاتا ہے۔اور اس معنی میں اکثر اطلاق احد ہوتا ہے اور اللہ پاک اس حیثیت سے بلند و بالا ہے۔کہ اس کیلئے کوئی مثل ہو جس کے نتیجہ میں اس کی طرف تعدد اور اشتراک راہ پیدا کرلیں۔اس معنی کے اعتبار سے احد ہے۔اور اس حیثیت سے کہ ترکیب اور مقدار وغیرہ سے منزہ ہو کر تقسیم اور تجزی کو قبول نہیں کرتا واحد ہے۔اور یہ قول زیادہ ظاہر ہے واللہ اعلم۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ احد اور واحد دونوں وحدۃ سے ماخوذ ہیں اور احد اصل میں وحد تھا واؤ کو ہمزہ سے بدل دیا گیا اور واحد اور احد کے درمیان لفظ کے اعتبار سے کئی وجہ سے فرق ہے۔

پہلی وجہ: احد اثبات کے سلسلہ میں غیر اللہ پر استعمال نہیں ہوتا اس لئے اللہ احد تو کہا جاتا ہے لیکن زید احد نہیں کہا جا سکتا۔اور زید واحد کہا جا سکتا ہے۔گویا کہ وہ عدد کی نفی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

دوسری وجہ: احد کی نفی عام ہوتی ہے اور واحد کی نفی کبھی عام ہوتی ہے اور کبھی نہیں' اس لئے ''**لیس فی الدار واحد بل فیھا اثنان**'' کہنا درست ہے۔(اگر واحد کی نفی عام ہوتی تو اثنان کی بھی نفی ہو جاتی)۔اور احد کے بارے میں یہ درست نہیں۔

تیسری وجہ: لفظ واحد سے عددوں کا افتتاح کیا جاتا ہے لفظ احد سے نہیں۔جیسے کہا واحد اثنان ثلث ،لیکن احد اثنان وغیرہ نہیں کہا جاتا۔

چوتھی وجہ: لفظ واحد کو تاء لاحق ہوتی ہے اور کہا جاتا ہے واحدۃ ۔لیکن لفظ احد کو تاء لاحق نہیں ہوتی اس لئے احدۃ کہنا درست نہیں ہے۔اور معنی کے اعتبار سے بھی ان دونوں کے درمیان کئی وجوہ سے فرق ہے۔

پہلی وجہ: لفظ احد بناء کے اعتبار سے واحد سے ابلغ ہے کیونکہ لفظ احد ان صفاتِ متشابہات کے قبیل سے ہے جن کی بنا برائے معنی اثبات ہوا کرتی ہے۔

دوسری وجہ: کبھی وحدۃ کا اطلاق کرے اس سے عدم تجزی مراد ہوتا اور کبھی عدم تثنیہ دوسرے کی مثال جیسے وحدۃ الشمس ۔کیونکہ یہ سورج کا تثنیہ نہیں ہے۔واحد کا اطلاق اکثر پہلے معنی پر ہوتا ہے اور احد کا اغلب استعمال دوسرے معنی میں ہے۔یہی وجہ ہے کہ احد کی جمع لائی جاتی ہے۔علامہ ازہریؒ فرماتے ہیں کہ احمد بن یحییٰ سے سوال کیا گیا کہ احاد واحد کی جمع ہے تو آپ نے فرمایا معاذ اللہ۔احد کی جمع نہیں ہے۔اور یہ بعید نہیں کہ کہا جائے کہ حاد واحد کی جمع ہے جیسے اشھاد شاہد کی جمع ہے۔اور واحد سے عدد کا آغاز و افتتاح نہیں کیا جاتا۔اور جس نے یہ کہا کہ احد وصل کیلئے اور واحد فصل کیلئے ہے اس نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

تیسری وجہ وہ ہے جو بعض متکلمین نے ذکر کی ہے وہ یہ ہے کہ واحد ذات کے اعتبار سے ہے اور احد صفات کے اعتبار سے ہے یعنی وہ احد اس اعتبار سے ہے کہ صفات میں اسکی کوئی نظیر اور شبیہ نہیں ممکن ہے کہ احد کو ننانوے اسماء میں ذکر نہ کرنے کا سبب بھی یہی ہو۔کیونکہ ظاہراً احد کا عدم ذکر تعداد اسماء کے منافی ہے اس لئے بطور اکتفاء اسم احد پر اسم واحد کو باعتبار یعنی غلبہ دے دیا جاتا ہے اس لئے اسم احد کو ذکر نہیں کیا جاتا۔

بندے کا حصہ صفت واحد سے یہ ہے کہ بندہ توحید کے چشمہ میں گھس جائے اور تفرید کے دریا میں غرق ہو جائے یہاں تک کہ ازل سے ابد تک واحد اور احد کے علاوہ وہ کسی کو نہ دیکھے۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں توحید تین قسم پر ہے:

اول: حق تعالیٰ کی توحید اپنی ذات کیلئے وہ یہ ہے کہ اللہ کا اپنے واحد ہونے کے متعلق علم اور اس کی اپنے بندوں کو خبر دینا جیسے میں کہتا ہوں کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**شھد اللہ انہ لا الہ الا ھو**﴾[آل عمران:۱۸]

دوم: حق تعالیٰ کی اپنے بندے کے لئے توحید وہ یہ ہے کہ توحید کی توفیق دے' میں کہتا ہوں اس کی دلیل جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**فاعلم انہٗ لا الہ الا اللہ**﴾[محمد:۱۹]

سوم: بندے کی اپنے رب کے لئے توحید وہ یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے میں کہتا ہوں اسی کی طرف اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ **ھوا اللہ الذی لا الہ الا ھو**﴾[الحشر:۲۲] میں اشارہ ہے۔

علامہ جندی فرماتے ہیں کہ توحید قدم کو حدث سے جدا کر دینے کا نام ہے۔

آپ کا حصہ صفت واحد سے تو وہ یہ ہے کہ آپ اپنے قلب کو اللہ کیلئے منفرد کر لیں کیونکہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے **ان اللہ وتر یحب الوتر** اور حدیث پاک میں وتر سے اللہ تعالیٰ کیلئے منفرد قلب ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ؎

اذا کان من تھواہٗ فی الحسن واحدًا ☆ فکن واحداً فی الحب ان کتب تھواہٗ

وہ ذات جس کوتو چاہتا ہے جب وہ حسن میں واحد ہے تو تو بھی اس کی حجت میں یکسو ہو کر واحد ہو جا اگر تو اس کو چاہتا ہے۔

قولہ: الصّمد :یعنی ایسا سردار جس پر سرداری کی انتہا ہو جاتی ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ صمد ایسی ذات کو کہتے ہیں جس کا کوئی پیٹ نہ ہو وہ دوسروں کو کھلاتا ہو اور خود کھانے سے پاک ہو۔

کہا گیا ہے کہ صمد ایسی ذات کو کہتے ہیں جو حاجت پیش آنے اور آفت لاحق ہونے سے پاک ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں یہ صمد باقی رہنے والی اور نہ زائل ہونے والی ذات کو کہتے ہیں۔

بعض حضرات کہتے ہیں صمد ہمیشہ رہنے والی ذات کو کہتے ہیں۔

اور بعض دیگر حضرات نے اس کے علاوہ بھی اس بارے میں کلام کیا ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں صمد ایسی ذات کو کہتے ہیں جس کی طرف مرغوبات میں احتیاج کی جائے اور مصائب میں اس کا قصد کیا جائے اور وہ معتمد ذات ہے اور صمد وہ ذات ہے کہ لوگ اپنی دنیا و دین کی جملہ مہمات (میں جوان کیلئے مشقت رسانی ہوں) کے سلسلہ میں اس طرف قصد کریں۔ اور جو شخص توحید میں پختہ مر جائے اور دین متصلب بن جائے کہ مصائب کے پے در پے آنے کی وجہ سے متزلزل نہ ہو پائے تو ایسے شخص نے اس وصف عظیم سے حصہ پالیا۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں، جو شخص اللہ کی اس وصف کے ساتھ معرفت حاصل کرلے تو اس شخص کا حق ہے کہ اپنے نفس کی فناء اور زوال اور سفر باندھ لینے کی صورت میں معرفت حاصل کرے۔ اور کائنات کو فناء اور انتقال کی آنکھ سے ملاحظہ کرے اور دنیا کے ساز و سامان سے زہد اختیار کرے حرام تو دور کی بات ہے اس کے حلال میں بھی رغبت نہ کرے۔

اور جو شخص اس بات کی معرفت حاصل کر لیتا ہے کہ اللہ پاک خود کھانے سے پاک ہے دوسروں کا کھلاتا ہے تو ایسے شخص کو چاہئے کہ وہ اپنی تمام تر رغبتیں ضروریات کے وقت اللہ کی طرف متوجہ کردے اور جملہ حالات میں اپنے توکل کو دکھلائے۔ اور رزق کے معاملہ میں تفکر نہ ہو۔ اور جس طرح وہ اسکی مخلوق میں سے کسی سے استعانت نہیں لیتا' تو اسی طرح اس کے رزق میں بھی اس کا کسی کو شریک نہ بنائے اور جب بندہ یہ پہچان لے کہ تمام تر حاجات میں اسی کی طرف احتیاجی کی جاتی ہے تو اپنی حاجت اور فاقہ کے وقت اسی کی طرف شکوہ کرے اور اس کے سامنے اپنی حاجت اور فاقہ پیش کرے اور اس کے تصرف کے ساتھ تعلق پکڑے اور اس کے توسل کے مختلف اقسام کے ساتھ قرب حاصل کرے۔

قولہ: القادر المقتدر : ان دونوں کا معنی ہے قدرت والی ذات لیکن مقتدر قادر سے الگ ہے اس لئے کہ مقتدر کے وزن میں تکلف اور اکتساب والا معنی ہے اگرچہ حقیقۃً تکلف اور اکتساب والا معنی ذات باری تعالیٰ کے حق میں ممتنع ہے لیکن یہ معنی مقید برائے مبالغہ ہے۔ اور جو لوگ دونوں کے معنی میں برابری کے قائل ہیں ان کی مراد حق ہے کیونکہ ان دونوں اسموں سے مراد مبالغہ فی القدرت ہے۔

باقی رہا ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ ان دونوں اسموں کے مستوی فی معنی ہونے کا گمان کرنا مراد سے بعید ہے تو خود علامہ ابن حجر کا یہ قول ہی مراد سے بعید ہے کیونکہ ساری کلام ہی معنی میں ہے اور اختلاف مبنی میں ہے اور یہ بات ذکر کردی گئی ہے کہ تکلف اور اکتساب والا ہی ذات باری تعالیٰ کے حق میں محال ہے (اس لئے استواء فی المعنی کا قائل ہونا پڑے گا)۔

کہا گیا ہے کہ ان دونوں اسموں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی صفت لانے سے اللہ تعالیٰ سے اس چیز کے سلسلہ میں جس چیز کا اللہ ارادہ کرتا ہے عجز کی نفی کرنا مراد ہے اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ کا قدرت مطلقہ کے ساتھ موصوف ہونا محال ہے۔ اگرچہ لفظوں کے اعتبار سے غیر اللہ پر قدرت مطلقہ کا اطلاق کردیا جائے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں ان دونوں اسموں کا حق یہ ہے کہ ان دونوں کے ساتھ غیر اللہ کو موصوف نہ کیا جائے۔ اس لئے کہ قادر بالذات اور ممکنات پر مقتدر ذات اللہ ہی کی ہے اور اللہ کا غیر اگر بعض حالات میں بعض چیزوں پر قدرت رکھتا بھی ہے تو اللہ ہی کی عطائے قدرت کی وجہ سے قادر ہے اس لئے لائق یہی ہے کہ غیر اللہ کو قادر مقتدر نہ کہا جائے یا تقیید کا مقصد کر کے کہا جائے۔

قولہ: المقدم المؤخر: ان دونوں کا معنی ہے قریب اور دور کرنے والی ذات جس کو اس نے قریب کر دیا تو اس کو مقدم کر دیا اور جس کو دور کر دیا تو اس کو مؤخر کر دیا۔ کہا گیا ہے کہ مقدم اور مؤخر وہ ذات ہے بعض چیزوں کو بعض چیزوں پر مقدم کر دے یہ تقدیم یا تو ذات کے اعتبار سے ہوتی ہے جیسے بسائط کی تقدیم مرکبات پر داتا ہوا کرتی ہے۔ یا تقدیم وجود کے اعتبار سے ہوگی جیسے اسباب کی مسببات پر تقدیم یا یہ تقدیم شرف وقرب کے اعتبار سے ہوگی جیسے انبیاء اور صالحین کی اپنے ماسوا پر تقدیم یا یہ تقدیم مکان کے اعتبار سے ہوتی ہوگی جیسے اجسام علویہ کی اجسام سفلیہ پر تقدیم یا یہ تقدیم زمانہ کے اعتبار سے ہوگی جیسے بعض قرون کی تقدیم بعض پر۔

بعض عارفین فرماتے ہیں کہ مقدم وہ ذات ہے جو نیک لوگوں کو مختلف نیکیوں کی صورت میں مقدم کر دے اور مؤخر وہ ذات ہے جو گناہگار لوگوں کو مؤخر کر کے ان کو اغیار کے ساتھ مشغول کر دے۔

اور بندے کا حصہ ان دونوں صفتوں سے یہ ہے کہ بندہ اپنے معاملہ کی فکر کرے اور معاملات میں سے جو اہم ہے۔ اس کو مقدم رکھے اسی طرح **اھم فالاھم** کو مقدم کرتا جائے خوف اور امید کے درمیان رہے۔

قولہ: الاول: یعنی ایسی اول ذات جس کی اولیت کی کوئی ابتداء نہ ہو۔

قولہ: الآخر: یعنی اپنی ساری مخلوق کے فناء ہونے کے بعد باقی رہنے والی ذات اور ایسی ذات کہ جس کی آخریت کو انتہا نہ ہو۔ اسی سے ہر معاملہ کی ابتداء ہوتی ہے اور اسی کی طرف ہر معاملہ لوٹتا ہے اور وجود کے مراتب میں وہی مقصود ذات ہے۔

قولہ: الظاھر الباطن: یعنی وہ ذات جس کے وجود کا ظاہر آیات باہرہ کی وجہ سے ظاہر ہو چکا ہو۔ اور اس کی ذات کی حقیقت عقول ماھرہ سے چھپ چکی ہو۔

کہا گیا ہے کہ ظاہر وہ ذات ہے کہ جس کے وجود کے شواہد آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کی تخلیق کی وجہ سے ظاہر ہو جائیں۔

کہا گیا ہے کہ ظاہر وہ ذات ہے جو ہر چیز پر ظاہر اور بلند ہو چکی ہو۔ اور کہا گیا ہے کہ ظاہر وہ ذات ہے جس کو اس کے افعال اور اوصاف کے ظاہر ہونے کی وجہ سے استدلال عقلی کے طریقہ پر پہچانا جائے۔ اور باطن وہ ذات ہے جو مخلوق کی نگاہ اور عقل کی نظر سے اپنی کبریائی کے پردے میں مخفی ہو' آنکھ اس کا ادراک نہ کر سکے اور وہم اس کا احاطہ نہ کر سکے۔

کہا گیا ہے کہ باطن وہ ذات ہے جو چھپی ہوئی چیز کو جان لے جیسا کہ جب آپ کسی معاملہ کی حقیقت کو جان لیں تو کہا جاتا ہے **مطنت الامر** یعنی عرفت باطنہ۔

کہا گیا ہے کہ ظاہر و باطن وہ ذات ہے جو اپنی نعمت کے ساتھ ظاہر اور اپنی رحمت کے ساتھ باطن ہو۔

کہا گیا ہے کہ وہ ذات جو بعض لوگوں کیلئے ظاہر ہے۔ اسی وجہ سے وہ لوگ اس کی توحید بیان کرتے ہیں۔ اور بعض لوگوں سے باطن اسی وجہ سے وہ انکار کرتے ہیں۔

کہا گیا ہے کہ وہ جو ہر چیز سے اول اور ہر چیز سے آخر ہو۔ اپنی قدرت کی وجہ سے ظاہر اور فکروں سے باطن ہے۔

کہا گیا ہے کہ وہ ذات جو بلا ابتداء اور بلا انتہا آخر اور بغیر قریب ہونے کے ظاہر اور بغیر چھپنے کے باطن ہو۔ اور شاید آیت: ﴿ھوا

لاول والآخر والظاهر والباطن ﴾ میں مرتبۂ جمع کی طرف اشارہ اور وہم تناقص کے رفع کا اظہار ہے۔اسی وجہ سے بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ظہور کے باوجود شدت ظہور کی وجہ سے مخفی ہے۔اس کا ظہور اس کے مخفی ہونے کا سبب ہے۔اور اس کا نور اس کے نور کا پردہ ہے اور ہر وہ چیز جو اپنی حد سے تجاوز کر جائے تو وہ اپنی ضد کی طرف انعکاس پزیر ہوا کرتی ہے۔

قوله: الوالي: یعنی وہ ذات جو جملہ امور کی متولی اور غم وخوشی کے اعتبار سے جملہ امور میں حاکم ہو۔

قوله: المتعالي: مبالغہ کی ایک نوع کے ساتھ علی کے معنی میں ہے اور کہا گیا ہے کہ متعالی وہ ذات ہے جو بلندی میں انتہاء کو پہنچنے والی ہو اور جملہ نقائص سے بلند و بالا ہو۔

قوله: البر:

یعنی وہ محسن ذات جو نیکی اور احسان میں انتہاء کو پہنچنے والی ہے۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ اللہ پاک جس کے ساتھ احسان فرماتا ہے تو اس کو اپنے نفس کی مخالفت کی وجہ سے گناہ سے معصوم رکھتے ہیں اور اس کو اپنے انس کے لطائف کے فنون کے ساتھ دوام بخشتے ہیں اور اس کے دل کو خوشی مرحمت فرمادیتے ہیں۔اور اس کی مراد پوری فرما کر تقویٰ کو اس کیلئے توشہ بنا دیتے ہیں۔اور اس کو اپنی مہربانیوں سے غنی فرمادیتے ہیں۔اور اپنی توجہ کی برکت سے اس کو اپنے مخالفت بچالیتے ہیں وہ ایسا بادشاہ ہے جو لشکر اور تعداد کی وجہ سے غلبہ حاصل نہیں کرتا اور وہ ایسی غنی ہے جو مال اور گنتی کی وجہ سے متمول نہیں ہوتا۔اور حکمت کی باتوں میں سے ہے کہ اللہ پاک جب آپ کو عطا کرتے ہیں تو آپ کو اپنے احسان پر گواہ بنالیتے ہیں اور جب آپ سے روک دیتے ہیں تو آپ کو اپنے قہر پر گواہ بنالیتے ہیں وہ ان تمام حالات میں آپ کو اپنی پہچان کرواتے ہیں اور آپ پر لطف کے وجود کے ساتھ متوجہ ہوتے ہیں۔

قوله: التواب: یعنی وہ ذات جو التزام طاعت کی طرف رجوع کرنے والے ہر گناہگار پر اس کی قبول توجہ کی صورت میں رجوع بالانعام فرمائے۔یہ توب سے مشتق ہے۔اور توب کا معنی ہے رجوع۔

کہا گیا ہے کہ توّاب ایسی ذات کو کہتے ہیں جو گناہ گاروں کیلئے اسباب توبہ کو آسان فرمادے۔اور ان کو توبہ کی توفیق مرحمت فرمادے۔ تو گویا شی کے مسبب کا نام شی کے فاعل کے نام پر رکھ دیا (کیونکہ تواب بندہ ہے اور مسبب اللہ ہے یہی تواب اللہ کا نام ہے)۔

اور کہا گیا ہے کہ تواب وہ ذات ہے جو بار بار اپنے بندوں کی توبہ قبول کرے۔

اور بندے کا حصہ صفت تواب سے یہ ہے کہ بندہ قبول توبہ کا پختہ یقین رکھے اور نزول رحمت سے مایوس نہ ہو اور مجرمین سے درگذر کرے۔عذر خواہوں کا عذر قبول کرے۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں' اللہ کی بندے پر توبہ کا مطلب بندے کو توبہ کی توفیق مرحمت فرمانا ہے تو جب توبہ کی ابتداء اور اصل اللہ کی جانب سے ہے تو توبہ کا اتمام بھی اللہ پر ہی ہوتا ہے۔

اور اگر اللہ بندے پر رجوع نہ کرتا تو پھر بندے کیلئے توبہ کی توفیق کہاں سے ہوتی۔اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿**ثم تاب عليهم ليتوبوا**﴾[التوبة:۱۱۸]

قوله: المنتقم: گناہ گاروں کو ان کے برے افعال پر سزا دینے والی ذات۔

یہ نقم الشئ سے باب افتعال ہے۔اور نقم الشئ کا معنی کسی چیز کو انتہائی ناپسند کرنا،

انتقام کی صفت بندے کیلئے اس وقت محمود ہوئی جبکہ بندے کا انتقام اللہ کی رضا کیلئے اللہ کے دشمنوں سے ہو۔اور دشمنوں میں سے

انتقام کے زیادہ لائق اس کا اپنا نفس ہے۔لہٰذا اس کا نفس جب بھی معصیت سے ملنے پائے یا طاعت سے جدا ہونے پائے تو اس کو اس چیز کی مخالفت پر مجبور کر کے اس سے انتقام لے۔

قوله: العفو: اصل میں یہ عفو بروزن فعول ہے' وہ ذات جو سیئات کو مٹا ڈالے اور معاصی سے درگذر کر دے۔

یہ غفور سے ابلغ ہے۔اس لئے کہ غفران ستر پوشی کا نام ہے اور عفو کا معنی محو یعنی' مٹا دینا ہے اور عفو اصل میں کسی شیٔ کے لینے کے قصد کو کہتے ہیں اور محو کو عفو اس لئے کہتے ہیں کہ محو بھی محو کے ازالہ کا قصد ہوتا ہے۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ کے عفو ہونے کو پہچان لیتا ہے تو اس کو چاہئے کہ وہ اس کے عفو کو طلب کرے۔اور اس کے عفو کی طلب میں سے یہ بھی ہے کہ وہ شخص اس کی مخلوق سے درگذر کرے اس لئے اللہ پاک نے اپنے بندوں کو یہ ادب سکھلایا ہے اور اسی کو ادب کی طرف اپنے ارشاد ﴿**ولیعفوا ولیصفحوا الا تحبون ان یغفر اللّٰہ لکم**﴾ [النور:۲۲]

قوله: الرؤف: یعنی صاحب رأفت ذات۔اور رأفت شدت رحمت کو کہتے ہیں۔رؤف رحیم سے ایک مرتبہ ابلغ ہے۔اور راحم سے دو مرتبہ۔اسی طرح امام طیبیؒ نے ذکر کیا ہے۔لیکن علامہ ابن حجرؒ تصحیف کر کے راحم کی جگہ رحمٰن لائے ہیں۔اور شارح امام طیبیؒ پر "**وھو عجیب من اشارح**" کہہ کر اعتراض کیا ہے۔اور علامہ ابن حجرؒ راحم کی جگہ رحمٰن اس لئے لائے ہیں کیونکہ رحیم رحمٰن سے ابلغ ہے۔(اور رؤف جب رحیم سے ایک درجہ ابلغ ہے تو رحمٰن سے دو درجہ ابلغ ہوتا) حالانکہ یہ قول مشہور نہیں ہے۔

حکایت نقل کی گئی ہے کہ ایک آدمی اپنے شریر ہمسائے کی نماز جنازہ سے پیچھے ہٹ گیا' اس مرنے والے ہمسائے کو کسی نے خواب میں دیکھا اور اس سے پوچھا کہ اللہ نے تیرے ساتھ کیا معاملہ کیا تو اس ہمسائے نے جواب دیا کہ اللہ نے مجھے بخش دیا اور ساتھ ہی یہ کہا فلاں یعنی میرے ہمسائے کو پیغام دے دینا "**لو انکم تملکون خزائن رحمة ربی لا سکتم خشیة الانفاق**"۔

قوله: مالك الملك: وہ ذات اپنے جو اپنے ملک میں اپنی مشیت کو نافذ کر ڈالے اور اپنے ملک میں جملہ امور کو باقی رکھنے یا فناء کرنے یا ایجاد کرنے یا معدوم کرنے کے اعتبار سے جس طرح چاہے جاری کر ڈالے' اس کے فیصلے کو رد کرنے والا کوئی نہیں' اس کے حکم پر اس کو پوچھنے والا کوئی نہیں۔علامہ شاذلیؒ فرماتے ہیں کہ ایک دروازے پر آ کر کھڑا ہوتا کہ تیرے لئے کئی دروازے کھول دیئے جائیں۔اور ایک بادشاہ کے سامنے جھک جا تا کہ کئی گردنیں تیرے لئے جھک جائیں۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿**و ان من شیء الا عندنا خزائنه**﴾ [الحجر:۲۱]

قوله: ذوالجلال والاکرام: کہا گیا ہے کہ ذوالجلال والاکرام اس ذات کو کہتے ہیں کہ ہر قسم کا شرف و کمال اسی کیلئے ہو اور ہر قسم کی عزت اور جائے عزت اسی کی جانب ہو۔اور اللہ کا جلال اللہ کی ذات میں ہے' اور اکرام اس کی جانب سے اس کی جملہ مخلوقات پر بہنے والا ہو۔اور حدیث شریف میں آتا ہے: "**الظوابیا ذاالجلال والاکرام**"۔

کہا گیا ہے کہ ذوالجلال والاکرام اسم اعظم ہے، جب بندہ اس کے ذریعے پکارتا ہے تو اللہ اس کی پکار کا جواب دیتا ہے۔

قوله: المقسط:

جب کوئی ظلم کرے تو کہا جاتا ہے "**قسط فلانٌ**" اور اسی سے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**واما القاسطون فکانوا لجھنم حطباً**﴾ [الجن:۱۵] ترجمہ:

اور کوئی عدل کر کے ظلم کا ازالہ کرے تو اقسط فلاں کہا جاتا ہے۔

اور مقسط اس ذات کو کہتے ہیں جو ظالموں سے مظلوموں کو انصاف دلائے اور کمزور لوگوں سے ناانصافی کے حرج کا دفیعہ کرے۔

اسی سے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ان اللّٰہ یحب المقسطین﴾[الحجرات:۰۹]

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ﴿واقیموا الوزن بالقسط﴾[الرحمن:۰۹]یعنی بالعدل تو یہاں قسط اقسط کا اسم مصدر ہے نہ کہ قسط کا مصدر اس لئے کہ اگر ایسا ہو تو دو معنوں میں تضاد آتا ہے۔

قولہ: الجامع یعنی وہ ذات ہے جو عالم حقیر اور عالم کبیر میں متضاد اور مختلف قسم کے حقائق کو بطور مجاورت اور بطور علامت جمع کر ڈالے۔

کہا گیا ہے کہ جامع وہ ذات ہے جو حمد وثناء کے جملہ اوصاف کی جامع ہو۔

میں کہتا ہوں کہ یہ اس طرح ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے ''**جامع الناس لیوم لا ریب فیه**''۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ اللہ پاک اپنے دوستوں کے قلوب کو اپنی تقدیر کی حضوری کی طرف جمع فرما دیتا ہے۔ یہاں تک اللہ کا دوست اسباب کے تفرقہ سے خلاصی پا کر خوش عیشی کی زندگی گزارتا ہے' اس لئے کہ مؤمن کو اللہ کی ملاقات کے بغیر چین ہی نہیں۔ مؤمن آدمی وسائط کو ملحوظ نہیں رکھتا اور حادثات کی طرف تقدیر کی آنکھ سے نظر نہیں کرتا۔ اگر کوئی نعمت میسر ہو تو وہ جان لیتا ہے کہ یہ نعمت عطیہ من جانب اللہ ہے۔ اور اگر کسی سختی سے سابقہ پڑتا ہے تو وہ یہ جان لیتا ہے کہ اس سختی کو زائل کرنے والی اللہ ہی کی ذات ہے۔

قولہ: الغنی: یعنی وہ جو اپنی ذات اور صفات کے اعتبار سے ہر چیز سے اور ہر چیز کے بارے میں مستغنی ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿**یا ایها الناس انتم الفقراء الی اللّٰہ واللّٰہ هو الغنی الحمید**﴾[الفاطر:۱۵]

قولہ: المغنی: وہ ذات جو اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے جس چیز کے ساتھ چاہے غنی کر ڈالے۔

کہا گیا ہے کہ مغنی اس ذات کو کہتے ہیں جو اپنے خاص بندوں کو اپنے ماسوا سے غنی کر ڈالے۔ بایں طور کہ ان کی ہر حاجت اللہ ہی کی طرف ہو۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ اللہ پاک اپنے بعض بندوں کو اپنے بعض بندوں سے حقیقۃً بے پرواہ کر دیتے ہیں۔ اس لئے کہ جملہ حاجات وضروریات میں جو شخص اللہ کی طرف اشارہ کر کے پھر اپنی حاجات کے سلسلہ میں غیر اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اللہ پاک اس کو احتیاج الی المخلوق میں مبتلا فرما دیتا ہے اور مخلوق کے دل سے رحمت کو کھینچ لیتا ہے۔ اور جو شخص اپنی احتیاج کے وقت اللہ کی طرف حاضر ہو جاتا ہے اور حسن معرفت کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اللہ پاک اس کو ایسی جگہ سے غنی کر دیتا ہے کہ جہاں سے اس کا گمان تک نہیں ہوتا۔ اور اللہ پاک اس کو ایسی جگہ سے عطا کرتا ہے جو جگہ اس کے حاشیہ خیال میں نہیں ہوتی۔

اللہ کا اپنے بندوں کو غنی کرنا دو قسم پر ہے: (۱) بعض بندوں کے مال میں اضافہ کر کے ان کو غنی کر دیتا ہے (۲) اور بعض بندوں کو ان کے احوال کا تصفیہ کر کے ان کو غنی کر دیتا ہے اور حقیقی غنی یہی لوگ ہیں۔

قولہ: المانع: ادیان اور ابدان میں ہلاکت اور نقصان کے اسباب کو دفع کرنے والی ذات۔

کہا گیا ہے کہ المانع منعۃ سے مشتق ہے یعنی وہ ذات جو اپنے دوستوں کا احاطہ اور اپنے خواص کی نصرت کرتی ہے۔

کہا گیا ہے کہ مانع منع سے مشتق ہے۔ یعنی اس سے روک لے' جو روکے جانے کا مستحق ہے۔ اور اسی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ''**لا مانع لما اعطی ولا معطی لما منع**'' یعنی جس سے اللہ پاک روک دے اس کو دینے والا کوئی نہیں اور جس کو دے اسے کوئی روکنے والا نہیں۔

ابن عطاء فرماتے ہیں بسا اوقات اللہ آپ کو دیتے ہیں اس کے بعد روک لیتا ہے اور بسا اوقات آپ سے روک دیتا ہے پھر آپ کو عطاء کر دیتا ہے۔ علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ایک میں المعطی المانع ہے۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں ذات باری تعالیٰ کی صفت میں مانع کا معنی ہے۔ اپنے دوستوں سے مصیبت کو دور کرنے والی ذات۔ اور

اپنے دوستوں اور دشمنوں میں جس سے چاہے عطاء کو روک دینے والی ذات اور کبھی اللہ پاک امیدوں اور شہوات کو عوام سے ارادات اور اختیارات کو خواص کے قلوب سے روک دیتا ہے اور یہ چیز ان بڑی نعمتوں میں سے ہے، جس کے ساتھ اپنے مقرب بندوں کو خاص کر دیتا ہے۔ اور اپنے اولیاءِ عارفین کا اس کے ذریعہ اکرام کرتا ہے۔

قوله: الضار النافع: یہ دونوں ایک صفت کے درجہ میں ہیں۔ یہ صفت ایسی قدرت ہے جو ضرر اور نفع دونوں کو شامل ہے۔ کہا گیا ہے کہ ضار اور نافع کا مطلب خالق ضرر اور خالق نفع ہے۔ یا وہ ذات جس سے نفع اور ضرر صادر ہو۔ یہ ضرر اور نفع کا صدور کبھی بلا واسطہ ہوتا ہے اور کبھی بواسطہ۔

امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ ان دونوں صفتوں کے معنی میں توحید کی جانب اشارہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اس کی ملک میں ہر چیز کا حدوث اللہ کی ایجاد اور اس کی حکمت اور اس کے ارادے کے اور مشیت کے ساتھ ہوتا ہے۔ جو شخص اس کے حکم کو تسلیم کر لیتا ہے۔ تو وہ راحت کی زندگی گزارتا ہے۔ اور جو شخص اپنے نفس کے اعتبار کو ترجیح دیتا ہے تو ہر آفت میں واقع ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ بات وارد ہوئی ہے کہ اللہ پاک ارشاد فرماتا ہے:

''میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں جو میرے فیصلے کو تسلیم کر لیتا ہے اور میرے آزمائش پر صبر کرتا ہے اور میری نعمتوں پر شکر بجالاتا ہے تو وہ میرا حقیقی بندہ ہے اور جو شخص میرے فیصلے کو تسلیم نہیں کرتا اور میری بلاء پر صبر نہیں کرتا اور میری نعمتوں پر شکر نہیں بجالاتا تو میرے سوا کوئی اور رب ڈھونڈ لے۔''

۲۲۸۹: وَعَنْ بُرَيْدَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ سَمِعَ رَجُلاً يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّى اَسْئَلُ بِاَنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلاَّ اَنْتَ الْاَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِىْ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ فَقَالَ دَعَا اللّٰهَ بِاسْمِهِ الْاَعْظَمِ الَّذِىْ اِذَا سُئِلَ بِهٖ اَعْطٰى وَاِذَا دُعِىَ بِهٖ اَجَابَ۔ (رواه الترمذی وابو داود)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۷۹/۲ حديث رقم ۱۴۹۳ والترمذی فی السنن ۱۷۸/۵ حديث رقم ۳۵۴۲ وابن ماجه ۱۲۶۷/۲ حديث رقم ۳۸۵۷۔

ترجمه: ''اور حضرت بریدہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو یہ دعا مانگتے ہوئے سنا کہ ''اے الٰہی میں تجھ سے اپنا مقصود مطلوب اس وسیلہ کے ساتھ مانگتا ہوں کہ تو اللہ ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو ایسا یکتا اور بے نیاز ہے کہ نہ تو اس نے کسی کو جنا اور نہ اسے کسی نے جنا اور اس کا کوئی ہمسر نہیں یہ سن کر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس شخص نے اللہ تعالیٰ کے اسم اعظم کے ساتھ دعا مانگی' ایسا اسم اعظم کہ جب اللہ تعالیٰ سے اس کے ذریعہ سوال کیا جاتا ہے تو وہ سوال پورا کرتا ہے اور جب اس کے ذریعہ دعا مانگی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اسے قبول کرتا ہے یعنی وہ دعا اکثر قبول ہوتی ہے۔'' (ترمذی' ابوداؤد)

تشریح: **قوله: ان رسول الله ﷺ سمع رجلاً يقول**: رجل سے مراد ظاہراً حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ ہی ہیں جبکہ آئندہ حدیث عنقریب آئے گا۔

قوله: اللهم انى اسئلك ......انت) یہ انت ماقبل کی تاکید کیلئے ہے۔

قوله: الاحد الصمد: یعنی ذات وصفات کے اعتبار سے احدیت مراد ہے۔ (الصمد) یعنی تو ہی مقصودِ کلی اور مطلوب حقیقی ہے۔

قوله: الذى لم يلد ولم يولد) یعنی وہ حدوث ونقصان کی جملہ جہات سے پاک ہے۔

قوله: ولم یکن له کفواً احد: یعنی ذات میں کوئی اس کی مثل اور صفات میں کوئی اس کے مشابہ اور افعال میں کوئی اس کی نظیر نہیں۔
دعا میں صحابیؓ نے مسئول کو ذکر نہیں کیا۔ (ممکن ہے کہ محض تعظیم ہی مقصود ہو)۔ اس لئے مسؤول کو ذکر کرنے کی حاجت نہیں۔

قوله: دعا الله باسمه الاعظم: یعنی دعا کا فاعل رجل ہے۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہاں اعظم عظیم کے معنی میں ہے۔ اس لئے کہ اللہ کے سارے اسماء ہی عظیم ہیں۔ اور کہا گیا ہے کہ۔ ہر وہ اسم جس میں دوسرے اسم کی نسبت اللہ کی تعظیم زیادہ ہے تو وہ اکثر تعظیم والا اسم اقل تعظیم والے اسم کی نسبت اعظم ہے۔ تو اس لئے اسمِ رحمٰن اسمِ رحیم کی نسبت اعظم ہے۔ اس لئے کہ رحمٰن میں رحیم کی نسبت مبالغہ اور الفاظ زیادہ ہیں۔

(اللہ) اللہ یہ رب کی نسبت اعظم ہے۔ کیونکہ اسم اللہ میں اللہ کا کوئی شریک نہیں۔ نہ ہی اضافت کی صورت میں اور نہ ہی اضافت کے علاوہ کی صورت میں، لیکن رب کا اطلاق بصورت اضافت مربی اور آقا پر بھی کیا جاتا ہے۔

قوله: الذی اذا سئل ...... اجاب:

اجابت دعا مجیب کے نزدیک داعی کی وجاہت پر دلالت کرتی ہے۔ اور اجابت دعا ضرورت کو پورا کر دینے کو بھی مشتمل ہے۔ بخلاف اعطاء کے (یعنی معطی کے اعطاء کی وجہ سے معطی لہٗ کی وجاہت پر کوئی دلالت نہیں ہوتی)۔ اس وجہ سے اجاب اعطی کی نسبت ابلغ ہے اس بات کو امام طیبیؒ نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی فرمایا ہے کہ حدیث میں اس بات پر دلالت ہے کہ اللہ کے اسماء میں سے ایک ایسا اسمِ اعظم ہے جس کے ذریعے اللہ کو پکارا جائے۔ تو اللہ پاک داعی کی پکار کا جواب مرحمت فرماتے ہیں۔ اور یہی بات یہاں حدیث میں مذکور ہے۔ یہ حدیث ان لوگوں پر حجت ہے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہر اللہ کا نام جو اخلاص کامل کے ساتھ ماسوا سے اعراض کرتے ہوئے ذکر کیا جائے وہ اسمِ اعظم ہے اس لئے کہ محض حروف کو کوئی شرف نہیں (اس لئے کوئی مخصوص اسم اسمِ اعظم نہیں) اور دیگر احادیث میں بھی اس قسم کی بات ذکر کی گئی ہے۔ اور ان احادیث میں ایسے اسماء کا بھی ذکر ہے جو اس حدیث میں مذکور نہیں۔ لیکن لفظ اللہ جملہ احادیث ہی میں مذکور ہے۔ تو اس سے استدلال کیا جا سکتا ہے۔ اللہ ہی اسم اعظم ہے۔ انتہیٰ کلامہ، اور جمہور کا قول بھی یہی ہے اور اس کی شرط پہلے گذر چکی ہے۔

۲۲۹۰: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ کُنْتُ جَالِسًا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِي الْمَسْجِدِ وَرَجُلٌ يُّصَلِّي فَقَالَ اللّٰهُمَّ اِنِّي اَسْأَلُكَ بِاَنَّ لَكَ الْحَمْدُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ الْحَنَّانُ الْمَنَّانُ بَدِيْعُ السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْضِ يَا ذَالْجَلَا لِ وَالْاِكْرَامِ يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ اَسْأَلُكَ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ دَعَا اللّٰهَ بِاسْمِهِ الْاَعْظَمِ الَّذِيْ اِذَا دُعِيَ بِهٖ اَجَابَ وَاِذَا سُئِلَ بِهٖ اَعْطٰي۔

(رواہ الترمذی وابو داود والنسائی وابن ماجۃ)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۷۹/۲ حدیث رقم ۱۴۹۵۔ والنسائی واخرجه ابن ماجه ۱۲۶۸/۲ حدیث رقم ۳۸۵۸۔ واحمد فی المسند ۱۲۰/۳۔

ترجمہ: "اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نبیؐ کے ساتھ مسجد میں بیٹھا تھا اور ایک شخص نماز پڑھ رہا تھا۔ اس نے یہ دعا مانگی "یا الٰہی"! میں تجھ سے اپنا مطلب اس وسیلہ کے ساتھ مانگتا ہوں کہ تمام تعریفیں تیرے لئے ہیں، تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں تو بہت مہربان بہت دینے والا اور آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنے والا ہے اے بزرگی و بخشش کے مالک! اے زندہ! اے خبر گیری کرنے والے! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں"! نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا "اس شخص نے اللہ تعالیٰ سے اس کے بڑے نام کے ساتھ دعا مانگی ایسا بڑا نام کہ جب اللہ تعالیٰ سے اس کے ذریعہ دعا کی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اسے قبول کرتا ہے اور جب اس کے ذریعہ سوال کیا جاتا ہے تو وہ سوال پورا کرتا ہے۔" (ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

تشریح: قوله: اللهم انى اسألك : شاید یہاں مسؤول کے علم پر اکتفا کرتے ہوئے مفعول کو حذف کر دیا گیا ہے۔

قوله: بان لك الحمد : یہاں حرفِ جار کی تقدیم برائے اختصاص ہے۔

قوله: لا اله الا انت الحنان المنان: یعنی کثیر العطاء بہت زیادہ دینے والی ذات۔ اور یہ مصدر منة سے مشتق ہے۔ اور منة کا معنی ہے یا تو محض نعمت ہے یا نعمت ثقیلہ۔ اور منة مخلوق کی جانب سے مذموم چیز ہے کیونکہ مخلوق کسی چیز کی مالک حقیقی نہیں۔ صاحب صحاح فرماتے ہیں کہ منَّ علیه منًّا یہ انعم کے معنی میں ہے۔ اور منان اسماءِ باری تعالیٰ میں سے ہے۔ انتہی کلامہ۔ اور ہوسکتا ہے کہ یہ یعنی منان منة بمعنی احسان مشتق ہو۔ کیونکہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اپنے بندوں پر مختلف قسم کے احسانات اور ان کی ایمان کی طرف رہنمائی اور ان کو عدم سے وجود میں لانے کی صورت میں زیادہ احسان کرنے والے ہیں۔ اور صحیح نسخہ میں حنان منّان سے مقدم ہے۔ اور کتاب مفاتیح سے بھی یہی کچھ مفہوم ہوتا ہے۔ اور نہایہ میں ہے کہ حنان کا معنی ہے۔ اپنے بندوں کے ساتھ مہربانی کرنے والی ذات اور حضرت علی کرم اللہ وجہ فرماتے ہیں حنان اس ذات کو کہتے ہیں جو اس آدمی پر بھی متوجہ ہو جو اس سے اعراض کر رہا ہو۔ اور منان اس ذات کو کہتے ہیں جو بندے کے سوال سے پہلے بندے کو از خود نعمت سے نواز دے)۔ یہ بات ابن صلاح کی کتاب سے لی گئی ہے۔

قوله: بديع السموت والارض: بديع کو مرفوع بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ اور منصوب بھی رفع کی دو وجہیں ہیں۔ (۱) بدیع منان کی صفت ہے۔ (۲) مبتدا محذوف هُوَ یا اَنْتَ کی خبر ہے۔ زیادہ ظاہر رفع ہی ہے۔ اور ندا کی بناء پر منصوب بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ اس کی تقویت اس روایت سے بھی ہوتی۔ جس کو علامہ واحدیؒ نے اپنی کتاب کتاب الدعا میں نقل کیا ہے وہاں "یا بديع السموت والارض" ہے۔ اسی طرح جزریؒ کی اس شرح میں ہے جو انہوں نے مصابیح پر لکھی ہے۔ اور بدیعُ السموت والارض کا معنی ہے۔ مبدعهما یعنی بغیر نمونے کے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والی ذات۔ اور لغت کی کتاب صحاح میں ہے کہ ابدعت الشئ ۔ اخترعه لا على مثال سبق کے معنی میں ہے۔ یعنی ابداع کہے بغیر مثال سابق کے کسی چیز کو ایجاد کرنا۔

قوله: يا ذالجلال والاكرام: یعنی صاحب عظمت واحسان ذات۔

قوله: يا حى يا قيوم اسألك: یعنی تیرے علاوہ میں کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتا اور تیرے سوا میں کسی سے طلب نہیں کرتا۔ یا جو بھی میں مانگتا ہوں تو تجھ سے مانگتا ہوں یا یہ اسألك پہلے اسألك کی تاکید ہے۔ لیکن یہ دوسرا اسألك کتاب حصن میں مذکور نہیں۔

قوله: رواه الترمذى ......وابن ماجه: علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ایک نسخہ میں وابن ماجہ کے ساتھ والدارمی بھی ہے۔ علامہ جزریؒ نے مصابیح پر لکھے جانے والی اپنی شرح میں فرمایا ہے کہ ترمذی ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ کے علاوہ احمد وابن حبان وحاکم وابن ابی شبہ نے بھی روایت کو نقل کیا ہے۔ لیکن احمد کی روایت میں لفظ اسم الاعظم اور باقیوں کی روایت میں اسمِ العظیم کا لفظ ہے۔ اور ابن ماجہ نے پوری روایت کے بعد "لا اله الا انت وحدك لا شريك لك" کا بھی اضافہ کیا ہے اور ابن حبان نے الحنان کو المنّان سے پہلے نقل کیا ہے۔ اور ابن ابی شیبہ نے یا حی یا قیوم کا تذکرہ نہیں کیا۔

۲۲۹۱: وَعَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيْدَ اَنَّ النَّبِىَّ ﷺ قَالَ اِسْمُ اللّٰهِ الْاَعْظَمُ فِى هَاتَيْنِ الْاٰيَتَيْنِ وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمِ وَفَاتِحَةُ اٰلِ عِمْرَانَ الٓمّٓ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَىُّ الْقَيُّوْمُ.

(رواه الترمذى وابوداؤد وابن ماجه والدارمى)

اخرجه ابوداؤد فى السنن ۸۰/۲ حديث رقم ۱۴۹۶۔ والترمذى ۱۷۸/۵ حديث رقم ۳۵۴۳ وابن ماجه ۱۲۶۷/۲

حدیث رقم ۳۸۵۵۔ والدارمی ۵٤۲/۲ حدیث رقم ۳۳۸۹۔

ترجمہ: ''حضرت اسماء بنت یزیدؓ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اللہ کا سب سے بڑا نام ان دو آیتوں میں ہے وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ (تمہارا معبود وہ ایک معبود ہے اس کے علاوہ اور کوئی معبود نہیں اور وہ بخشنے والا اور مہربان ہے) اور سورہ آل عمران کی یہ ابتدائی آیت الٓمّٓ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ الم اللہ کہ اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں وہ زندہ ہے اور خبر گیری کرنے والا ہے۔'' (ترمذی' ابوداؤد' ابن ماجہ' دارمی)

راویٔ حدیث:

اسماء بنت یزید بن سکن انصاریہ۔ بہت ہی عقلمند اور دین دار خاتون تھیں۔ سکن میں سین مہملہ اور کاف دونوں مفتوح ہیں' مؤلف علیہ الرحمۃ نے الاکمال میں ان کا اسم گرامی ذکر نہیں کیا۔ مرتب عرض کرتا ہے علامہ طاہر پٹنی لکھتے ہیں کہ جنگ یرموک میں انہوں نے ایک لکڑی کے ذریعہ نو (۹) کافروں کو موت کے گھاٹ اتارا' اور اسی جنگ میں شہید ہوگئیں۔

بعض روایات میں اسماء بنت یزید اور بعض احادیث میں اسماء بنت یزید بن سکن آیا ہے یہ دونوں علیحدہ علیحدہ خواتین کے نام ہیں یا ایک ہی خاتون ہیں' اس کی تحقیق نہیں ہو سکی۔ اھ اسماء بنت سکن صحابیہ ہیں۔ (المغنی فی ضبط اسماء الرجال ص:۱۲۹)

تشریح: **قوله: عن اسماء بنت یزید**: یعنی یزید سے مراد یزید ابن سکن ہے۔ یہ بات علامہ میرکؒ نے ذکر کی ہے اور مؤلف نے اسماء کا ذکر ''الاکمال'' میں ذکر نہیں کیا۔

قوله: وفاتحة...... ال عمران: لفظ فاتحہ یا تو مجرور ہے اس بناء پر کہ یہ اور اس کا ماقبل ''الایتین'' دونوں کی وجہ ظاہر ہے۔ (یعنی نصب اس لئے کہ فاتحہ سے قبل اعنی فعل محذوف مانا جائے گا اور رفع اسلئے کہ یہ خبر ہے مبتدا (وف ھی کی)۔

اسم اعظم کونسی سورت میں ہے؟

حاکم نے **اسم الله تعالٰی الاعظم فی ثلاث سورہ البقرہ وال عمران وطٰهٰ**۔ روایت کیا ہے۔ یعنی اللہ کا اسم اعظم تین سورتوں میں ہے اور وہ تین سورتیں بقرہ، آل عمران اور طٰہٰ ہیں اور قاسم بن عبدالرحمٰن شامی تابعی فرماتے ہیں کہ میں نے سو صحابہؓ سے ملاقات کی اور میں نے ان تین سورتوں میں اسم اعظم تلاش کیا تو میں نے اسم اعظم **الحی القیوم** کو پایا۔ اور امام فخر الدین رازیؒ نے اس روایت کی تقریر فرمائی ہے یعنی اسم اعظم **الحی القیوم** ہی ہے۔ اور استدلال انہوں نے ان دونوں کے اسم اعظم ہونے پر اس طرح کیا ہے کہ یہ دونوں صفات ربوبیت پر دلالت کرتے ہیں ان دونوں کے علاوہ دیگر اسماء اس طرح صفات ربوبیت پر دلالت نہیں کرتے۔ اور علامہ نوویؒ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ اور علامہ جزریؒ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک اسم اعظم **لآ اله الا هو الحی القیوم** ہے۔ اور علامہ فخر الدین رازیؒ نے بھی بعض اصحابِ کشف سے یہ نقل کیا ہے کہ اسم اعظم **هو** ہے۔ اور استدلال یوں کیا ہے کہ جو شخص کسی کی موجودگی میں کلام معظم کو تعبیر کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو وہ انت نہیں کہتا ھو کہتا ہے۔ انتہیٰ کلامہ۔

اور یہاں اسم اعظم کی تعیین میں دیگر اقوال بھی ہیں ان میں سے ایک قول یہ بھی ہے کہ اسم اعظم رب ہے۔ اس کا ذکر ابن عباسؓ اور ابودرداؓ کی روایت میں ہے۔ جس کی تخریج حاکم نے کی ہے کہ وہ دونوں حضرات فرماتے ہیں کہ **اسم الله الاکبر ربِّ ربِّ** یعنی اللہ کا اسم اعظم رب رب ہے کہ ان اقوال میں سے ایک قول یہ بھی ہے کہ اسم اعظم **الله الله الله الذی لا اله الا هو رب العرش العظیم** ہے۔ اس روایت کو زین العابدین سے نقل کیا گیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس کا اسم اعظم ہونا خواب میں دیکھا ہے۔ اور ان اقوال میں سے ایک قول یہ بھی ہے کہ اسم اعظم کلمہ توحید ہے۔ اس کو قاضی عیاض نے بعض علماء سے نقل کیا ہے۔ اور ان اقوال میں سے ایک قول

یہ بھی ہے کہ اسم اعظم اللہ ہے۔ کیونکہ اس اسم کا اطلاق اللہ کے علاوہ پرنہیں کیا جاتا اور اس وجہ سے بھی کہ اسماء حسنیٰ میں سے بنیادی اسم اللہ ہے۔ اور اس کے علاوہ باقی اسماء کی اضافت اسی کی طرف کی جاتی ہے۔ اور ان اقوال میں سے ایک قول یہ بھی ہے کہ اسم اعظم اللہ الرحمن الرحیم ہے۔ شاید اس کی دلیل وہ روایت ہے جس کی تخریج ابن ماجہ نے کی ہے کہ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی اکرم ﷺ سے سوال کیا کہ مجھے اسم اعظم سکھلا دیجئے لیکن آپؐ نے نہیں سکھلایا۔ حضرت عائشہؓ نے نماز پڑھی اور یوں دعا مانگی ''ادعوك اللّٰه وادعوك الرحمن وادعوك الرحيم وادعوك باسمائك الحسنٰى ما علمت منها ومالا اعلم'' یعنی میں تجھے اللہ پکارتی ہوں رحمٰن اور رحیم پکارتی ہوں اور تجھے تیرے اسماء حسنیٰ کے ساتھ پکارتی ہوں جن کو میں جانتی ہوں یا نہیں جانتی۔ اور اسی روایت میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت عائشہ کو فرمایا کہ یہی اسماء اسم اعظم ہیں۔ جن کے ذریعے سے تم نے دعا کی۔ میں کہتا ہوں اس روایت کی سند ضعیف ہے اور اس سے استدلال پکڑنا بھی ضعیف ہے۔ علامہ سیوطیؒ نے ان تمام اقوال کو اپنے رسالہ میں بالاستیعاب ذکر کیا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ اسم اعظم اسماء حسنیٰ میں مخفی ہے اور اس کی تائید حضرت عائشہ ؓ کی حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ اور بعض علماء نے اللہ کے بعض اسماء کو بعض اسماء پر ترجیح دینے کے سلسلے میں انکار کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ یہ ترجیح جائز نہیں کیونکہ یہ ترجیح مفضول کے افضل سے ناقص ہونے کے اعتقاد کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اور جن بعض روایات میں کسی اسم کے اسم اعظم ہونے کے بارے میں یہ تعیین ہے بھی صحیح تو وہاں وہ اعظم کی تاویل عظیم سے کرتے ہیں اس لئے کہ اللہ کے سارے اسماء ہی عظیم ہیں۔

علامہ ابوجعفر طبرانیؒ فرماتے ہیں کہ اسم اعظم کی تعیین کے بارے میں آثار مختلف ہیں۔ میرے نزدیک سارے اقوال صحیح ہیں اس لئے کہ کسی بھی اسم کے بارے میں یہ خبر وارد نہیں ہوئی کہ یہی اسم اعظم ہے۔ اس سے اعظم کوئی چیز نہیں گویا کہ علامہ طبرانیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ کے اسماء میں سے ہر اسم کا وصف اعظم کے ساتھ لایا جا سکتا ہے۔ اور یہ اعظم عظیم کے معنی میں ہو کر لوٹے گا۔

ابن حبانؒ فرماتے ہیں کہ احادیث میں اسماء کے سلسلے میں جو وصفِ اعظمیت وارد ہوا ہے۔ اس سے مراد دعا کرنے والے کے ثواب میں زیادتی ہے۔ جبکہ وہ ان احادیث میں وارد شدہ اسماء کے ذریعے دعا کرے۔ جیسا کہ ان اسماء کا اطلاق قرآن مجید میں بھی ہوا ہے۔ وہاں قرآن پڑھنے والے کے ثواب میں زیادتی مراد ہوگی۔ کہا گیا ہے کہ اسم اعظم سے مراد اللہ کے اسماء میں سے ہر ایسا اسم ہے جس کے ذریعے بندہ مستغرق ہو کر دعا کرے اور استغراق کا یہ عالم ہو کہ اس حالتِ استغراق میں اس کے دل اور سوچ میں اللہ کے سوا کوئی نہ ہو یہ بات امام جعفر صادقؒ سے منقول ہے اور دیگر حضرات فرماتے ہیں کہ اللہ نے اسم اعظم کے علم کو مخفی رکھا ہے اس پر آج تک کوئی مطلع نہیں ہوا اور بعض دیگر حضرات نے اسم اعظم کو ثابت کیا ہے۔ لیکن اس اثبات کے سلسلہ میں بھی ان کے قول مضطرب ہیں۔ جیسا کہ بعض اقوال ہم نے ذکر کیے ہیں۔ اور بعض کو خود مصنف نے ذکر کیا ہے۔

۲۲۹۲: وَعَنْ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ دَعْوَةُ ذِی النُّوْنِ اِذَا دَعَا رَبَّهٗ وَهُوَ فِیْ بَطْنِ الْحُوْتِ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ لَمْ يَدْعُ بِهَا رَجُلٌ مُّسْلِمٌ فِیْ شَیْءٍ اِلَّا اسْتَجَابَ لَهٗ. (رواه احمد والترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۹۱/۵ حدیث رقم ۳۵۷۲۔ واحمد فی المسند ۱۷۰/۱۔

ترجمہ: ''اور حضرت سعدؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا مچھلی والے یعنی حضرت یونس علیہ السلام کی وہ دعا جو انہوں نے مچھلی کے پیٹ میں اپنے پروردگار سے مانگی تھی یہ ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ (تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں، تو پاک ہے بلا شک میں ظالموں میں سے تھا) جو مسلمان شخص اس دعا کے ذریعہ خدا سے کوئی چیز مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا سوال پورا کرتا ہے۔'' (احمد، ترمذی)

تشریح: قوله: ذی النون یعنی مچھلی والا اس سے مراد یونس علیہ السلام ہیں۔

قوله: اذا دعا ربه وهو فی بطن الحوت: یعنی اپنے رب کو پکارا صحیح نسخہ میں اسی طرح ہے۔اور ترمذی کے اندر ربہ کا لفظ مذکور نہیں لیکن کتاب الاذکار کے ضمن میں موجود ہے۔کتاب مفاتیح میں بھی اسی طرح ہے اور یہ لفظ دعوت کیلئے ظرف ہے۔(وھو فی بطن الحوت) یہ جملہ حالیہ ہے۔

قوله: لا اله الا انت سبحانك انی کنت من الظلمین: یہ سارا دعائیہ جملہ ہے دعوت مصدر سے بدل ہے یعنی وہ دعا یہی ہے کیونکہ اصل میں یہ سارا جملہ یکبارگی دعا ہی ہے اور یہاں مراد مدعو بہ ہے ساتھ اس وسیلہ کے جو اس میں مذکور ہے۔جو قبولیت دعا کا سبب ہے۔

قوله: لم یدع بها رجل مسلمٌ فی شیٔ ......الخ: ضمیر کا مرجع یا تو مصدر دعوۃ ہے یا کلمات ہیں۔

(**رجل مسلمٌ فی شیٔ**) یعنی حاجات میں سے کسی حاجت کے بارے میں۔(**الا استجاب الله لهٗ**) اس دعا کے ذریعے قبولیت دعا شاید اللہ کے اس ارشاد کی وجہ سے ہے: ﴿**فاستجبنا له ونجینٰه من الغم و کذلك ننجی المؤمنین**﴾[الانبیاء:۸۸]

قصہ یونس علیہ السلام:

حضرت یونس علیہ السلام کا قصہ مختصراً یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں موصل شہر کی بستی نینویٰ میں مبعوث فرمایا۔حضرت یونس علیہ السلام نے ان کو ایمان کی طرف بلایا۔لیکن وہ ایمان نہ لائے۔پس اللہ پاک نے یونس علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ اپنی قوم کو بتادو کہ تین دن کے بعد ان پر عذاب نازل ہوگا۔حضرت یونس علیہ السلام اپنی قوم سے نکل گئے اس کے بعد ایک سیاہ بادل ظاہر ہوا اور قوم کے قریب ہوگیا۔یہاں تک کہ وہ بادل ان کے شہر پر آ کر کھڑا ہوگیا۔پھر اس سے دھواں ظاہر ہونے لگا۔جب ان کو یقین ہوگیا کہ عنقریب ہم پر عذاب نازل ہوجائے گا تو وہ لوگ اپنے بیوی بچوں اور جانوروں کو لے کر صحرا کی طرف نکل کھڑے ہوئے اور جانوروں اور انسانوں میں سے ماؤں اور بچوں کے درمیان جدائی کردی گئی اور اللہ کے سامنے آہ وزاری کی صورت میں انہوں نے اپنی آوازیں بلند کردیں اور ایمان لے آئے اور کفر ومعصیت سے توبہ تائب ہوگئے اور یوں دعا گو ہوئے''**یا حی حین لا حیی لا اله الا انت**''یعنی اے زندہ پائندہ رکھنے والی ذات جو اس وقت بھی زندہ پائندہ ہوگی جس وقت کوئی زندہ نہ ہوگا۔نہیں کوئی معبود مگر تو ہی۔تو اللہ نے ان سے عذاب ٹال دیا۔حضرت یونس علیہ السلام تین دن کے بعد جب ان کے شہر کے قریب گئے تا کہ ان کے حال سے باخبر ہوں۔دور سے دیکھا کہ شہر حسبِ سابق آباد ہے۔اور اہل شہر زندہ ہیں۔تو جناب یونس علیہ السلام شرما گئے کہ میں نے تو ان کو کہا تھا کہ عذاب تین دن بعد اتر پڑے گا لیکن عذاب تو ابھی تک نازل نہیں ہوا۔لیکن اس سے باخبر نہ ہوئے کہ عذاب اتر کو ان سے اٹھا بھی لیا گیا ہے۔یونس علیہ السلام واپس چل پڑے ساحل دریا پر پہنچے کشتی میں سوار ہوئے جب کشتی میں سوار ہوئے تو کشتی رک گئی۔سب نے کشتی چلانے کی انتھک کوشش کی لیکن کشتی نے چلنے کا نام ہی نہ لیا۔اور کشتی بانوں نے کہا کہ کوئی بھاگا ہوا غلام کشتی میں آ گھسا ہے۔جس کی وجہ سے کشتی چلنے نہیں پا رہی۔تو لہٰذا انہوں نے کشتی والوں کے درمیان قرعہ اندازی کی۔قرعہ حضرت یونس علیہ السلام کے نام نکلا تو حضرت یونس علیہ نے کہا کہ میں ہی بھاگا ہوا غلام ہوں۔اور اپنے آپ کو دریا میں ڈال دیا۔مچھلی نے جناب یونس علیہ السلام کو اللہ کے حکم سے لقمہ بنالیا۔اور اللہ نے مچھلی کو حکم دیا کہ وہ یونس علیہ السلام کی حفاظت کرے۔حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں رہے۔حضرت یونس علیہ السلام لے کر دریائے نیل کی طرف وہاں سے دریائے فارس اور پھر وہاں سے دجلہ کی طرف لے چلی۔حضرت یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ میں یہ دعا کی''**لا اله الا انت سبحانك انی کنت من الظالمین**''یعنی میں ظالموں میں سے ہوں بوجہ نکلنے میرے اپنے قوم سے آپ کی اجازت سے قبل اللہ

نے ان کی دعا قبول کی اور مچھلی کو حکم دیا کہ وہ یونس علیہ السلام کو شام کے شہر نصیبین میں ڈال دے۔

الفصل الثالث:

۲۲۹۳: عَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ دَخَلْتُ مَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ الْمَسْجِدَ عِشَاءً وَاِذَا رَجُلٌ يَقْرَأُ وَيَرْفَعُ صَوْتَهٗ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَتَقُوْلُ هٰذَا مُرَاءٍ قَالَ بَلْ مُؤْمِنٌ مُنِيْبٌ قَالَ وَاَبُوْ مُوْسٰى الْاَشْعَرِيُّ يَقْرَأُ وَيَرْفَعُ صَوْتَهٗ فَعَجَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَتَسَمَّعُ لِقِرَاءَتِهٖ ثُمَّ جَلَسَ اَبُوْ مُوْسٰى يَدْعُوْ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اُشْهِدُكَ اَنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَحَدًا صَمَدًا لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَقَدْ سَأَلَ اللّٰهَ بِاسْمِهِ الَّذِىْ اِذَا سُئِلَ بِهٖ اَعْطٰى وَاِذَا دُعِىَ بِهٖ اَجَابَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اُخْبِرُهٗ بِمَا سَمِعْتُ مِنْكَ قَالَ نَعَمْ فَاَخْبَرْتُهٗ بِقَوْلِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ لِىْ اَنْتَ الْيَوْمَ لِىْ اَخٌ صَدِيْقٌ حَدَّثْتَنِىْ بِحَدِيْثِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ (رواه رزين)

اخرجه رزين۔

ترجمہ: ''حضرت بریدہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن میں نبی کریم ﷺ کے ہمراہ عشاء کی نماز کے لئے مسجد میں داخل ہوا تو وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص قرآن کریم پڑھ رہا ہے اور اپنی آواز بلند کر رہا ہے میں نے کہا کہ یارسول اللہ کیا آپ ﷺ اس شخص کو ریا کار نہیں کہیں گے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''نہیں'' بلکہ مؤمن ہے جو رجوع کر رہا ہے۔ ''بریدہؓ کہتے ہیں کہ ''ابوموسیٰ باآواز قرآن کریم پڑھتے رہے اور نبی کریم ﷺ ان کی قراءت سنتے رہے' پھر ابوموسیٰ بیٹھے اور بارگاہ الٰہی میں یوں عرض رساں ہوئے! اے الٰہی! میں تجھ کو گواہ بنا کر تیرے حق میں یہ اعتقاد و قرار کرتا ہوں کہ تو اللہ ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو ایسا یکتا و بے نیاز ہے کہ نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ اسے کسی نے جنا اور اس کا کوئی ہمسر نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اس نے خدا سے اس کے نام کے ساتھ سوال کیا ایسا نام کہ جب اس کے ذریعہ سوال کیا جاتا ہے تو اللہ وہ سوال پورا کرتا ہے اور جب اس کے ذریعہ دعا مانگی جاتی ہے تو دعا قبول کرتا ہے'' حضرت بریدہؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ ''یارسول اللہ! میں نے آپ ﷺ سے جو یہ بات سنی ہے اسے ابوموسیٰ تک پہنچا دوں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''ہاں'' چنانچہ میں نے ابوموسیٰ تک آپ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی پہنچایا تو انہوں نے کہا کہ آج کے دن سے تم میرے سچے بھائی ہو کہ تم نے نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد مجھ تک پہنچایا ہے۔'' (رزین)

تشریح: **قوله: دخلت مع رسول الله المسجد عشاء**: یعنی میں آپ ﷺ کے ہمراہ وقت عشاء میں یا عشاء کی نماز میں داخل ہوا۔

قوله: فاذا رجل...... یا رسول الله ا تقول؟: اذا مفاجاتیہ ہے۔ یعنی اچانک۔ علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اتقول ''اتری'' کے معنی میں ہے۔ یعنی آپ کیا رائے ہے۔ اور یہ شارح کے قول ''ای اتعتقد او تحکم'' سے بہتر ہے یعنی آپ کیا اعتقاد رکھتے ہیں یا آپ کیا حکم لگاتے ہیں شرح السنہ کی روایت اتراہ مرائیا یعنی کیا آپ اس آدمی کو ریا کار سمجھتے ہیں۔ انتہی کلامہٗ۔ اور اس میں بھی اشکال ہے کہ ترکی بھی شارح کی تفسیر کا محتاج ہے جس طرح آپ دیکھ رہے ہیں۔

قوله: هذا مراءٍ: مشارالیہ رجل ہے۔ یعنی هذا رجل۔ (مراءٍ) یعنی منافق ہے شہرت اور ریاء کاری کے طور پر پڑھ رہا ہے۔

جس کا قرینہ اس کا آواز کو بلند کرنا ہے۔ جس پر احتمال پیدا ہوتا ہے کہ وہ ریاء کار ہی ہوگا۔

قولہ: قال بل مؤمن منیب: یعنی غفلت سے یادالٰہی کی طرف لوٹنے والا ہے اس لئے کہ انابت خاص لوگوں کی توبہ کو کہتے ہیں اور یہ عوام کی توبہ سے اخص ہوا کرتی ہے۔ کیونکہ عوام کی توبہ معصیت سے طاعت کی لوٹنے کی صورت میں ہوتی ہے۔

قولہ: وابو موسٰی الاشعری یقرأ ویرفع صوتہٗ: یعنی حضرات ابوموسیٰ اشعریؓ بھی رجل کی طرح باآواز بلند قراءت کرر ہے تھے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ قال کا فاعل آپ ﷺ ہیں تو اس صورت میں وابوموسیٰؓ کی واؤ حالیہ ہوگی۔ یعنی آپ ﷺ نے یہ بات فرمائی یعنی مؤمن منیب اس حالت میں حضرت ابوموسیٰ بلند آواز سے قراءت کرر ہے تھے اور علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ قال کا فاعل حضرت بریدہؓ ہی ہیں۔ یعنی حضرت بریدۃ فرماتے ہیں کہ میں نے یہ بات یعنی **اتقول ھذا مراءٍ** جب نبی اکرم ﷺ کو کہی تو اس وقت حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ باآواز بلند قرأۃ کرر ہے تھے۔ لیکن ظاہر یہی ہے کہ یہ دونوں قول مقصد سے بعید ہیں اور ظاہر میں تقدیر عبارت وہ جو ہم نے تقریر کلام اور تحریم نظام میں ذکر کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ پہلا آدمی تو اجنبی اور غیر معروف۔ (یعنی جس کے بارے میں حضرت براۃ نے **اتقول مراءٍ** کا جملہ کیا اور اس کی قراءت میں منکر من القول وزورًا کا احتمال ہے۔ (یعنی اخلاص سے نہ ہو بلکہ ریاء سے ہو) اسی وجہ سے حضرت بریدۃ نے اس کی رفع صوت والی حالت کو ریاء سمجھ کر نبی اکرم ﷺ سے پوچھا اور آپ ﷺ نے ان کو بیان کیا اور باقی رہے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ وہ تو اجلاء صحابہ میں سے ہیں۔ ان کے بارے میں ریاء اور نفاق کا گمان کرنا انتہائی بعید ہے۔ مگر روایت سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ **رافع صوت** حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ ہی ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ ابتداءِ حدیث میں رجل سے مراد حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ ہی ہیں۔ باقی رہا حضرت بریدہؓ کا ان کے بارے میں ظن ریاء اور اس کے نتیجہ میں **اتقول ھذا مراءٍ** کا قول کرنا یہ عدم معرفت پر محمول ہوگا۔ یعنی وہ اس سے قبل حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو جانتے نہ تھے۔

قولہ: ثم جلس ابو موسٰی یدعو: یہ جلوس یا تو نماز میں تھا یا بعد از نماز۔ علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرأۃ مع رفع صوت کھڑے ہو کر کرر ہے تھے۔

قولہ: فقال: اللھم انی اشھدك...... کفوا احد: یعنی قال کا فاعل ابوموسیٰ اشعریؓ ہیں یعنی انہوں نے اپنی دعا میں کہا (**اللھم انی اشھدك**) یعنی تیرے بارے میں اعتقاد رکھتا ہوں۔ (**انك انت...... حمدًا**) احدً اور حمدً اختصاص کی بناء پر منصوب ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓىِٕكَةُ ......﴾ [آل عمران:۱۸] تک اور شرح السنہ کی روایت میں نکرہ کے بجائے **الاحد الحمد** معرفہ ہیں۔ اور مرفوع ہیں کیونکہ یہ دونوں اللہ کی صفتیں ہیں۔ (**لم یلد**) یعنی اس کی کوئی اولاد نہیں کیونکہ اولاد حادث ہوتی ہے اور قدیم حادث کا محل نہیں ہوسکتا۔ اللہ کا کوئی والد اور والدہ نہیں۔ اس لئے کہ وہ قدیم ذات جو حدوث اور توالد سے منزہ ہے۔ کفو کا معنی ہے شبیہ اور نظیر۔ یعنی مخلوق میں سے کوئی بھی آپ کے مشابہ اور مثل نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿لیس کمثلہ شئ﴾ [الشوریٰ:۱۱] کا بھی یہی مطلب ہے۔

قولہ: لقد سأل اللہ ...... دعی بہ اجاب :) یعنی سأل کا فاعل جناب ابوموسیٰ اشعریؓ ہیں۔ یہ اسم اعظم کی تعریف ہے۔

قولہ: أخبرہ بما سمعت منك؟: حرف استفہام محذوف ہے۔

قولہ: فقال لی: انت الیوم لی......: قال ثانی کا فاعل ابوموسیٰ اشعریؓ ہیں۔ یعنی میں نے جب آپ ﷺ کی ساری بات حضرت ابوموسیٰ کو ذکر کی تو حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے خوشی کے طور پر مجھے فرمایا۔ (**انت الیوم لی**) یوم بمعنی زمانہ ہے۔ (**أخ صدیق**) یعنی تو اخوت اور دوستی کو جمع کرنے والا ہے۔ (**حدثتنی**) یہ جملہ یا تو حال ہے۔ انت ضمیر یا جملہ استینافیہ۔

بَابُ ثَوَابِ التَّسْبِيْحِ وَالتَّحْمِيْدِ وَالتَّهْلِيْلِ وَالتَّكْبِيْرِ

تسبیح، تحمید، تہلیل اور تکبیر کے ثواب کا بیان

یہ باب تسبیح وتحمید وتحلیل وتکبیر کے ثواب کے بیان میں ہے۔ باب ذکر اللہ کے بعد یہ باب تخصیص بعد التمیم کے قبیل سے ہے۔ اور علامہ ابن حجرؒ کے نسخہ میں تہلیل کو سہواً تحمید پر مقدم کیا گیا ہے۔ اور پھر اس تقدیم کی توجیہہ بیان کرنے میں تکلف سے کام لیا گیا ہے۔

الفصل الاول :

۲۲۹۴: عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَفْضَلُ الْكَلَامِ اَرْبَعٌ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ وَفِیْ رِوَايَةٍ اَحَبُّ الْكَلَامِ اِلَى اللّٰهِ اَرْبَعٌ سُبْحَا نَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ لَا يَضُرُّكَ بِاَيِّهِنَّ بَدَاْتَ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه الرواية الاولى البخاری تعليقاً ٥٦٦/١١ باب ١٩ من كتاب الايمان والنذر واخرجه ابن ماجه فی السنن ٢٥٣/٢، حديث رقم ٣٨١١ واحمد فی المسند ١٠/٥ واخرج الرواية الثانية مسلم فی صحيحه ١٦٨٥/٣ حديث رقم (١٢ - ٢١٣٧)۔

ترجمہ: ''حضرت سمرہ ابن جندبؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''انسان کے کلام میں سب سے بہتر کلام چار ہیں سبحان الله الحمد الله لا اله الا الله الله اکبر ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ کلام چار ہیں (۱) سبحان اللہ۔ (۲) الحمد للہ۔ (۳) لا الہ الا اللہ۔ (۴) اللہ اکبر۔ ان میں سے کسی بھی کلمہ سے شروع کرنا تمہارے لئے نقصان دہ نہیں ہے۔'' (مسلم)

تشریح: قوله: قال افضل الکلام اربع: کلام سے مراد انسان کا کلام ہے اس لئے کہ چوتھی چیز قرآن مجید میں موجود نہیں۔ جو چیز قرآن میں نہ ہو وہ قرآن مجید میں مذکور وموجود چیز سے افضل نہیں ہوسکتی۔ اور کلام بشر مراد ہونے پر آپ ﷺ کا ارشاد ''ھی افضل الکلام بعد القرآن وھی من القرآن'' یعنی ان چار میں سے اکثر قرآن مجید میں سے ہیں اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ چار چیزیں کلام اللہ کو بھی شامل ہیں۔ کیونکہ ان میں سے تین تو لفظاً کلام میں موجود ہیں۔ یعنی تسبیح تحمید اور تہلیل۔ اور چوتھی یعنی تکبیر اگرچہ کلام اللہ میں لفظاً تو موجود نہیں لیکن معنًی وہ بھی کلام اللہ میں موجود ہے۔ اور تکبیر کی افضلیت مطلقاً ہے اس لئے کہ تکبیر تنزیہ توحید کے جمیع معانی اور حمد وثناء کی جملہ اقسام کو جامع ہے۔ تنزیہ وتوحید وحمد وثناء کا ہر کلمہ تو کلام اللہ سے شمار کیا جاتا ہے۔ اور وہی من القرآن جو وارد ہوا ہے اس کا یہی مطلب ہے۔ یعنی یہ چاروں کلام اللہ میں سے ہیں۔ اور باقی رہا ان کا کسی مخصوص وقت یا کسی مخصوص حالت میں پڑھے جانے کا منقول ہونا تو اس صورت میں ان کے ساتھ مشغول ہونا قرآن پڑھنے سے افضل ہوگا۔ ورنہ قرآن کا پڑھنا مطلق عن الوقت یا مطلق عن الحال تسبیح وتہلیل سے افضل ہوگا۔ یہ ساری کلام امام طیبیؒ کی اور شیخ ابن حجرؒ ان کے ہمنوا ہیں۔ کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا ''افضل الذکر بعد کتاب اللہ سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر''۔ باقی رہا ان چاروں کی افضلیت کا سبب تو وہ یہ ہے کہ یہ چاروں ذکر کی جملہ انواع تنزیہ یا توحید۔ تحمید ہو یا تسبیح وغیرہ سب کو شامل ہیں۔ اور چاروں جملے مطالب الوہیہ پر اجمالاً دال ہیں۔ اور بہت ساری احادیث میں ان کو باقیات صالحات سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس پر ایک اعتراض ہوتا ہے کہ ان کو باقیات کہا گیا ہے حالانکہ آخرۃ

کے جملہ اعمال باقی رہنے والے ہیں۔تو اس کا جواب یہ ہے کہ شاید ان کو باقیات فناء ہونے والی چیزوں جیسے مال اور اولاد وغیرہ کے مقابلہ میں کہا گیا ہے۔جیسا کہ مال اور اولاد کا ذکر باقیات صالحات والے جملہ سے قبل بیان کردہ مثال میں ہے۔اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اہل دنیا کے اکمل اسباب میں سے مال اور اولاد ہیں۔اور اہل آخرت کی عبادات میں سے افضل یہ مذکورہ چار کلمات ہیں۔ کیونکہ یہ چاروں اللہ کی صفات کا خلاصہ، اور اللہ کے عمدہ کلمات میں سے ہیں۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں اس حدیث سے بعض حضرات نے استدلال کیا ہے کہ اگر کسی نے یوں قسم اٹھائی کہ اللہ کی قسم میں آج کے دن کلام نہیں کروں گا اور پھر اس نے اسی دن سبحان اللہ یا لا الٰہ الا اللہ یا اللہ اکبر پڑھ لیا تو وہ حانث ہو جائے گا کیونکہ ان کو افضل الکلام کہا گیا ہے۔تو گویا یہ سارے کلمات کلام اور حنث کی شرط میں موجود ہے۔اور بعض علماء کا قول بھی یہی ہے لیکن علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے مذہب میں یہ آدمی حانث نہیں ہوگا کیونکہ حدیث پاک میں آتا ہے یہ نماز لوگوں کے کلام کا محل نہیں بلکہ یہ نماز تسبیح وتحمید اور ان کے علاوہ اللہ کے ذکر کا محل ہے۔تو گویا تسبیح اور تحمید وغیرہ کلام الناس میں سے نہیں ہیں۔

ہمارے علماء فرماتے ہیں: عدمِ حنث کی وجہ وہ نہیں جو علامہ ابن حجرؒ نے بیان کی بلکہ عدمِ حنث کی وجہ یہ ہے کہ تسبیح اور تہلیل وغیرہ کو عرف میں کلام نہیں کہا جاتا اور قسموں کا اعتبار عرف کے لحاظ سے ہے۔

قولہ: سبحان اللّٰہ: یعنی اللہ صفت حدثیہ اور نقصان سے منزہ ہے۔

قولہ: والحمد للّٰہ: یعنی اللہ پاک جلال و جمال اور صفات کمال کے ساتھ متصف ہے۔

قولہ: ولا الہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر: یعنی ذاتاً اکیلا اور صفاتاً یکتا ہے۔اللہ کیلئے کبریائی اور عظمت کے اثبات کے ساتھ متصور حمد کا اعتراف ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا ''**اللھم لا احصی ثناءً علیك كما اثنيت على نفسك**''۔

قولہ: وفی روایۃ احب الکلام ...... اللّٰہ اکبر:

یعنی مسلم اور ترمذی کی روایت میں ہے۔یعنی ہر وہ چیز جو اس کی کمال صفات اور جمال ذات کے لائق نہیں میں اس سے منزہ ہونے کا اعتقاد رکھتا ہوں۔اور یہ تخلیہ کے مرتبہ میں ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد وہ کلمات لائے جو اللہ کے اسمائے حسنیٰ اور بلند صفات کے ساتھ متصف ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔اور وہ ذات اس بات کی مستحق ہے کہ اس کے شکر وثناء کو ظاہر کیا جائے اور یہ کلمات تحلیہ کے مرتبہ میں ہیں۔

''**الحمد للّٰہ ولا الہ الا اللّٰہ**'' میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اللہ پاک صفات سلبیہ وثبوتیہ میں اکیلا ہے۔پھر اپنے آنے والے قول اللہ اکبر سے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ اللہ کی عظمت وکبریائی کی رداء (چادر) اور ازار (تہبند) کی حقیقت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

قولہ: لا یضرك بایھن بدأت: یعنی اگرچہ یہ ترتیب اہل تہذیب وتادیب کے مفہوم کا تقاضا ہے۔لیکن امام طیبیؒ فرماتے ہیں اس مذکورہ ترتیب کے مطابق پڑھنا عزیمت اور اولیٰ ہے۔باقی اس ترتیب کے علاوہ اگر پڑھے تو رخصت اور جواز ہے۔علامہ ابن ملک فرماتے ہیں کہ **بایھن بدأت** کا مطلب یہ ہے کہ سبحان اللہ سے ابتدا کریں یا الحمد للہ سے یا **لا الہ الا اللّٰہ** سے یا اللہ اکبر سے تمام صورتیں جائز ہیں۔معلوم ہوا کہ ان میں سے ہر جملہ مستقبل ہے مذکورہ ترتیب کے مطابق کسی کا ذکر ضروری نہیں۔ہاں البتہ اس نظم اور ترتیب کی رعایت بہتر ہے۔اس لئے کہ جو چیز معارف کے زمرے میں آتی ہو تو وہاں اولاً اس چیز کی صفات جلالیہ کی معرفت حاصل کی جائے یعنی اس سے مراد اس ذات کا ایسی چیز سے منزہ ہونا جو چیز اس ذات میں موجب نقص ہو۔پھر اس کو صفات کمالیہ کے ساتھ پہچانا جائے۔اور

اس سے مراد صفات ثبوتیہ ہیں جن صفات کی وجہ سے وہ ذات حمد کی مستحق قرار پائی۔ پھر یہ جانا جائے کہ اس صفت میں اس کا کوئی مماثل نہیں اور اس کے علاوہ الوہیت کا کوئی مستحق نہیں۔ تو ان ساری چیزوں سے اس کے سامنے اس ذات کا اکبر کھل جائے گا اس لئے کہ اس کی ذات علاوہ ہر چیز ہلاکت سے دوچار ہونے والی۔ انتہیٰ کلامہ اور یہ سارا کلام ابتدا اور انتہا کے اعتبار سے بہتر ہے۔

۲۲۹۵: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَاَنْ اَقُوْلَ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا طَلَعَتْ عَلَيْهِ الشَّمْسُ۔ (رواه مسلم)

اخرجه البخاری فی صحيحه ۲۰۶/۱۱ حديث رقم ٦٤٠٥۔ ومسلم فی صحيحه من حديث طويل ۲۰۷۱/٤ حديث رقم (۲۸۔ ۲٦۹۱)۔ واحمد فی المسند ۳۷۵/۲۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا میرا سبحان الله والحمد لله ولا اله الا الله والله اکبر کہنا بلاشبہ میرے نزدیک اس چیز پر جس پر طلوع ہوتا ہے زیادہ پسندیدہ ہے۔'' (مسلم)

تشریح: قوله: **سبحان الله**: سبحان اللہ مصدر منصوب ہے ایسے فعل کی وجہ سے جس کو محذوف ماننا واجب ہے۔ یعنی تقدیر عبارت یوں ہے ''**اُسبح سبحان الله**''۔

قوله: **و الحمد لله**: للہ جار مجرور متعلق ثابت کے ہے یعنی اللہ کی کوئی تعریف کرے یا نہ کرے۔ تمام تعریفیں اللہ کیلئے ثابت ہیں۔ (**و لا اله الا الله**) یعنی موجود معبود اور مشہود اللہ ہی ہے۔

قوله: **و الله اكبر**: یعنی اللہ پاک بہت بڑا ہے۔ اس سے بھی بڑا کہ اس کی کبریائی کی حقیقت کو پہچانا جائے۔

قوله: **احب الی مما طلعت عليه الشمس**: یعنی دنیا اور دنیا میں جو مال اسباب وغیرہ ہیں ان سب سے مجھے یہ کلمات زیادہ محبوب ہیں۔ علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہاں احب صیغہ اسم تفضیل اپنی حقیقت پر نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مجھے یہ کلمات کثیر ثواب ہونے کی وجہ سے ساری دنیا سے زیادہ محبوب ہیں۔ کیونکہ دنیا فناء اور زائل ہونے والی چیز ہے اور یہ حدیث **ركعتا الجر خير من الدنيا و ما فيها** کی طرح ہے۔ عارف حامیؒ فرماتے ہیں کہ حدیث پاک میں شمس سے مراد شمس وجودی ہے یعنی جن چیزوں پر جسم کا سورج طلوع ہوتا ہے۔ علامہ ابن عربیؒ فرماتے ہیں ان کلمات کے کہنے اور جن چیزوں پر سورج طلوع ہوتا ہے ان دونوں کے درمیان ایک دوسرے کا فضیلت میں مقابلہ کیا گیا ہے۔ اور دو چیزوں کے درمیان فضیلت کے مقابلے کیلئے شرط یہ ہے کہ وہ دونوں چیزیں اصل معنی کے اعتبار سے تو برابر ہوں لیکن پھر ان میں سے ایک دوسرے سے بڑھ جائے۔ حالانکہ دنیا کی چیزیں اور یہ کلمات اصل معنی میں بھی برابر نہیں۔ علامہ ابن بطال نے جواب یہ دیا ہے جن چیزوں پر سورج طلوع ہوتا ہے یہ کنایہ ہے۔ ہر چیز سے یعنی مجھے یہ کلمات ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں۔ اور ظاہر یہ ہے کہ شئ اور چیز دنیا اور آخرت ہی ہیں۔

اور ظاہر یہ ہے کہ دنیا کے سوا آخرت ایک ایسی شی ہے جو اصل معنی میں ان کلمات کے برابر ہے۔ اور علامہ ابن عربیؒ نے جواب دیا ہے کہ کبھی افعل اسم تفضیل سے محض اصل فعل ہی مراد ہوتا ہے وہاں مفاضلہ کا کوئی اعتبار نہیں کیا جاتا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**خير مستقرًا واحسن مقيلا**﴾ [الفرقان: ۲٤] یعنی جنت جہنم کے مقابلہ میں بہتر جائے قرار اور قیلولے کی اچھی جگہ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جنت اور جہنم کے درمیان کوئی مفاضلہ نہیں۔ تو لہٰذا احسن حسن کے معنی میں ہے۔

یا یہ خطاب اکثر لوگوں کے نفس میں قرار پانے والی چیز پر واقع ہوا اس لئے کہ اکثر لوگ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ دنیا کی طرح کوئی چیز نہیں۔ اور دنیا ہی مقصود ہے۔ تو اسلئے آپ ﷺ نے باخبر کر دیا کہ یہ کلمات مجھے اس دنیا سے زیادہ محبوب ہیں۔ جس کے بارے میں تمہارا

گمان یہ ہے کہ اس سے کوئی چیز افضل نہیں۔اور کہا گیا ہے کہ یہ بھی احتمال ہے کہ مراد اس سے یہ ہو کہ یہ کلمات مجھے اس بات سے زیادہ محبوب ہیں کہ ساری دنیا میری ہو جائے۔اور میں اس کو صدقہ کر ڈالوں بہر کیف خلاصہ کلام یہ ہے کہ جو ثواب ان کلمات کے کہنے پر مرتب ہوتا ہے۔وہ ثواب اس ثواب سے کہیں بڑھ کر ہے۔جو ثواب صدقہ جمیع الدنیا کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔

اور حدیث پاک سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا:

''لو ان رجلاً فی حجرہ دراھم یقسمھا و آخر یذکر اللّٰہ کان الذاکر اللّٰہ افضل''

''ایک آدمی کے پاس درہم ہوں اور وہ ان کو دونوں ہاتھوں سے لٹا رہا ہے اور دوسرا آدمی بیٹھا اپنے رب کو یاد کر رہا ہے تو یہ ذاکر قاسم دراھم سے افضل ہے۔''

اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ یہ کلمات مجھے دنیا جمع کرنے اور کمانے سے زیادہ محبوب ہیں۔کیونکہ اہل عرب جمع اموال کا سلسلہ میں تفاخر کیا کرتے تھے۔

۲۲۹۶:وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ قَالَ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ فِیْ یَوْمٍ مِائَةَ مَرَّةٍ حُطَّتْ خَطَایَا وَاِنْ كَانَتْ مِثْلَ زَبَدِ الْبَحْرِ۔(متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲۰۶/۱۱ حدیث رقم ٦٤٠٥۔ ومسلم فی صحیحه من حدیث طویل ۲۰۷۱/٤ حدیث رقم (۲۸۔ ۲٦۹۱)۔ واحمد فی المسند ۳۷۵/۲۔

ترجمہ:''اور حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا''جس شخص نے کسی دن میں سو مرتبہ سبحانَ اللّٰہ وبحمدہ پڑھا تو اس کے گناہ ختم کر دیئے جاتے ہیں اگر چہ وہ دریا کے جھاگ کی مانند یعنی کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں۔''

تشریح: **قولہ:سبحان اللّٰہ وبحمدہ** : یہاں بحمدہ کی باء برائے مقارنت ہے۔اور اس سے پہلے واؤ زائدہ ہے۔یعنی میں اللہ کی ایسی پاکی بیان کرتا ہوں جو اس کی تعریف کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔اسبحہ تسبیحاً مقروناً بحمدہ یا بحمدہ جار مجرور متعلق ہے۔فعل محذوف ابتدائی وغیرہ کے۔تو اس صورت میں واؤ عطف ہوگی اور عطف الجملہ علی الجملۃ ہوگا۔اور تقدیر عبارت ہوگی''**ابتدیٔ بحمدہ واثنی بثنائہ**''یعنی میں اللہ کی پاکی بیان کرتا ہوں اور اس کی حمد کے ساتھ ابتداء کرتا ہوں۔

قولہ:فی یوم مائۃ مرۃ:یعنی یوم سے مراد اجزاء یوم ہیں۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں یوم سے مراد مطلق یوم ہے یعنی **لا علی التعیین** اوقات یوم میں سے کسی وقت میں یہ کلمات کہے۔یوم کو کسی خاص وقت کے ساتھ مقید نہیں کیا جائے گا۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں۔یہ کلمات سو مرتبہ یکبارگی کہے یا متفرق کر کے ایک مجلس میں کہے یا مختلف مجالس میں دن کے اول حصہ میں کہے یا دن کے آخری حصہ میں۔لیکن بہتر یہی ہے کہ ان کو دن کے ابتدائی حصہ میں کہا جائے۔انتہیٰ کلامہ۔

بقول امام طیبیؒ دن کے ابتدائی حصہ میں اولویت شاید اس وجہ سے ہے کہ اس میں اذکار و اوراد کی طرف مساعت اور پائی جاتی ہے ورنہ آنے والی حدیث میں مساء اور صباح کی قید ہے۔

قولہ:حطت خطایاہ :یعنی اس کے اعمال نامہ سے مٹا دی جاتی ہیں۔(**خطایاہٗ**)صغیرہ گناہ مراد ہیں۔کبیرہ کا بھی احتمال ہے۔

قولہ:وان کانت مثل زبد البحر:سمندر کی جھاگ سے مماثلت کیفیتاً اور کمیتاً دونوں طرح ہے۔یعنی سمندر کے جھاگ جیسے گناہ ہوں یا جھاگ جتنے گناہ ہوں۔یہ مثال اور اس جیسی اور مثالیں کنایہ ہوتی ہیں عرفاً ان سے کثرت تعبیر کی جاتی ہے۔

تنبیہ: یہ بات بڑی قابل تعجب ہے کہ شیخ جزریؒ نے اس حدیث کو اپنی کتاب حصن میں ابوعوانہ کی طرف منسوب فرمایا ہے۔

۲۲۹۷: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ قَالَ حِيْنَ يُصْبِحُ وَحِيْنَ يُمْسِي سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ مِائَةَ مَرَّةٍ لَمْ يَأْتِ اَحَدٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِاَفْضَلَ مِمَّا جَاءَ بِهٖ اِلَّا اَحَدٌ قَالَ مِثْلَ مَا قَالَ اَوْ زَادَ عَلَيْهِ۔

اخرجه مسلم فی صحيحه ٢٠٧١/٤ حديث رقم (٢٩۔ ٢٦٩٢)۔ والترمذی فی السنن ١٧٥/٥ حديث رقم ٣٥٣٦۔ واحمد فی المسند ٣٧١/٢۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا' جس نے صبح کے وقت اور شام کے وقت سو مرتبہ سبحان اللہ وبحمدہ کہا تو قیامت کے دن کوئی شخص اس عمل سے بہتر عمل نہیں لائے گا علاوہ اس شخص کے جس نے اس کی مانند یا اس سے زیادہ کہا۔'' (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: من قال حين يصبح:

قوله: وحين بمسى مرة: یعنی صبح اور شام سو مرتبہ سبحان وبحمدہ کہے۔ بایں طور کہ کچھ مقدار صبح اور کچھ مقدار شام کو کہے یا صبح اور شام دونوں وقتوں سو سو مرتبہ کہے۔ اور زیادہ ظاہر بات بھی یہی ہے۔ لیکن علامہ نوویؒ کا آنے کا والا کلام پہلے قول کا مؤید ہے۔ گویا علامہ نوویؒ نے اقل جو یقینی اس کا اعتبار کیا ہے۔

قوله: لم يأت احد......مما جاء) جاء کا فاعل مذکورہ کلمات کا قائل ہے۔ (به) ضمیر کا مرجع سو مرتبہ کلمات کا کہنا ہے۔

قوله: الا احد قال ......زاد عليه: مشہور اعتراض کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں یا تو استثناء منقطع ہے یا او بمعنی واوٴ ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں جملہ لم یأت احدٌ......'' کا مطلب یہ ہے کہ جو قائل یہ کلمات لایا ہے یہ کلمات افضل ہوں گے ان کلمات سے جو کلمات ان کے علاوہ قائل لایا ہو۔ ہاں البتہ ان کلمات سے افضل نہیں ہوں گے جو قائل انہیں کی مثل کلمات لایا ہو یا اس پر زیادتی کی ہو۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جو شخص عدد مذکور یعنی سو مرتبہ پر زیادتی کرے گا تو اکیلئے اجر مذکور بھی ہوگا اور زیادتی اجر بھی ہوگی۔ اور جو عدد ذکر کئے گئے ہیں یہ کوئی ایسی تحدید نہیں کہ جس پر زیادتی ناجائز ہو جیسا کہ عدد طہارت اور عدد رکعات میں زیادتی ناجائز ہوا کرتی ہے۔ انتہیٰ کلامہ۔

اور شاید عدد مذکور اور زیادتی میں فرق یہ ہو کہ عدد مذکور برائے تشریع ہوں اور زیادتی برائے ترغیب ہو۔ علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ حدیث پاک میں اس بات پر بھی دلیل ہے کہ اگر یہی کلمات دن میں سو مرتبہ سے زائد بھی کہے تو بھی اس کیلئے یہی اجر مذکور ہوگا۔

۲۲۹۸: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ كَلِمَتَانِ خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ ثَقِيْلَتَانِ فِي الْمِيْزَانِ حَبِيْبَتَانِ اِلَى الرَّحْمٰنِ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ٥٦٦/١١ حديث رقم ٦٦٨٢۔ ومسلم فی صحيحه ٢٠٧٢/٤ حديث رقم (٣١۔ ٦٩٤) والترمذی فی السنن ١٧٤/٥ حديث رقم ٣٥٣٤۔ وابن ماجه ١٢٥١/٢ حديث رقم ٣٨٠٦۔ واحمد فی المسند ٣٣٢/٢۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا دو کلمے جو زبان سے کہنے سے تو ہلکے ہیں لیکن ترازو میں بھاری ہیں اور بخشنے والے خدا کے نزدیک بہت پیارے ہیں اور وہ دو کلمے یہ ہیں۔ سبحان اللہ۔

تشریح: وبحمدہ سبحان اللہ العظیم یعنی اللہ پاک ہے اور اپنی حمد کے ساتھ موصوف ہے جو اللہ بڑا ہے۔''

(بخاری ومسلم)

قولہ: کلمتان خفیفتان علی اللسان ثقیلتان فی المیزان: یعنی دو کلموں سے مراد دو مفید جملے ہیں۔ یعنی زبان پر بآسانی جاری ہو جاتے ہیں۔ ترازو میں جزا کے اعتبار سے وزنی ہیں۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں یہاں خفت کنایہ ہے سہولت سے اس کلام کے زبان پر آسانی سے جاری ہونے کو تشبیہ دی گئی ہے۔ بعض اٹھائی جانے والی چیزوں میں سے ایسی چیز کے ساتھ کہ جس کا اٹھانا اٹھانے والے پر ہلکا ہو اور اس کو اس کا اٹھانا باعث مشقت نہ ہو تو یہاں ذکر مشبہ یعنی خفت کا ہے اور مراد مشبہ بہ یعنی سہولت ہے۔ اور باقی رہا ثقل تو اس سے حقیقت مراد ہے۔ کیونکہ اعمال ترازو پر مجسم ہو کر رکھ جائیں گے انتہی کلامہ۔

اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ اعمال کے دفتر تولے جائیں گے۔ اور اس پر حدیث بطاقہ وسجلات دلالت کرتی ہے۔ اور دفتر اعمال از قبیل اجسام ہیں اعراض نہیں۔ واقعات میں یہ بات نقل کی گئی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ کیا وجہ ہے کہ نیکی گراں لگتی ہے اور برائی آسان، تو آپ نے جواب دیا کہ کڑواہٹ سامنے آجاتی ہے اور اس کی حلاوت اور مٹھاس غائب ہے۔ اس وجہ سے نیکی تم کو گراں لگتی ہے لیکن نیکی کا گراں گزرنا تمہیں ترک نیکی پر برانگیختہ نہ کر پائے۔ کیونکہ روز جزا نیکی کی وجہ ہی سے میزان بوجھل ہو گا اور برائی آسان اس لئے لگتی ہے کیونکہ اس کی حلاوت سامنے ہوتی ہے۔ اور اس کی کڑواہٹ غائب ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمہیں آسان لگتی ہے۔ لیکن برائی کا آسان ہونا تم کو ارتکاب پر آمادہ نہ کرے۔ اس لئے کہ برائیوں کی وجہ سے روز جزا میزان ہلکا ہو جائے گا۔

قولہ: حبیبتان الی الرحمن: حبیبتان یہ تثنیہ ہے حبیبۃ کی اور حبیبہ محبوبہ کے معنی میں ہے۔ اور ان دونوں کلموں کے محبوب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان میں اللہ کی تعریف ہے۔ صفات سلبیہ اور صفات ثبوتیہ کے ساتھ صفات سلبیہ پر تنزیہ دلالت کرتی ہے اور صفات ثبوتیہ پر حمد اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ ان کلمات کا کہنے والا اللہ کا محبوب ہے۔ اور اللہ کی بندے کے ساتھ محبت یہ ہے کہ اللہ پاک بندے کو بھلائی پہنچانے کا ارادہ فرمالیں۔ اور باقی رہی رحمٰن کو خاص طور پر ذکر کرنا تو وجہ تخصیص یہ ہے کہ اللہ کے صفاتی ناموں میں سے رحمٰن کا ذکر کر کے اللہ کی وسعت رحمت پر تنبیہ مقصود ہے۔ اس طرح کہ اللہ عمل قلیل کے بدلے میں اجر جزیل عطا فرمائیں گے۔

فائدہ: یہ صحیح بخاری کی آخری حدیث ہے۔

۲۲۹۹: وَعَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ قَالَ کُنَّا عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ اَیَعْجِزُ اَحَدُ کُمْ اَنْ یَّکْسِبَ کُلَّ یَوْمٍ اَلْفَ حَسَنَةٍ فَسَأَلَهٗ سَائِلٌ مِّنْ جُلَسَائِهٖ کَیْفَ یَکْسِبُ اَحَدُنَا اَلْفَ حَسَنَةٍ قَالَ یُسَبِّحُ مِائَةَ تَسْبِیْحَةٍ فَیُکْتَبُ لَهٗ اَلْفُ حَسَنَةٍ اَوْ یُحَطُّ عَنْهُ اَلْفُ خَطِیْئَةٍ. (رواہ مسلم وفی کتا بہ فی جمیع الروایات عَنْ مُوْسٰی الْجُهَنِیِّ اَوْیُحَطُّ قَالَ اَبُوْبَکْرٍ الْبُرْقَانِیْ ورواہ شعبۃ وابو عوانۃ ویحی بن سعید القطان عن موسی فقالو اویحط بغیر الف ھکذا فی کتا ب الحمید ی)

اخرجہ مسلم فی صحیحہ ۲۰۷۳/٤ حدیث رقم (۳۷۔ ۲۶۹۸)۔ واحمد فی المسند ۱۷٤/۱۔

ترجمہ: ''حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کہتے ہیں کہ ایک دن جب کہ ہم نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے آپ نے ارشاد فرمایا ''کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات پر قادر نہیں ہے کہ ہر روز ایک ہزار نیکیاں حاصل کرے؟ مجلس میں موجود صحابہؓ میں سے ایک صحابی نے پوچھا کہ ''ہم میں سے کوئی شخص' ایک ہزار نیکیاں کس طرح حاصل کر سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا وہ ایک سو مرتبہ سبحان اللہ پڑھ لے اس کے لئے ایک ہزار نیکیاں لکھی جائیں گی یا اس کے ایک ہزار گناہ دور کئے جائے گے (مسلم) ابوبکر برقانیؒ کہتے ہیں کہ صحیح مسلم میں موسیٰ جہنی سے جو روایتیں منقول ہیں ان سب میں لفظ او یحط ہی نقل کیا گیا ہے لیکن شعبہؒ ابو عوانہؒ اور یحییٰ ابن سعید قطان نے موسیٰ جہنی سے ہی یہ روایت

نقل کی ہے اس میں لفظ ویحط بغیر الف کے ذکر کیا ہے اور کتاب حمیدی یعنی جمع بین الصحیحین میں بھی اسی طرح منقول ہے۔''

تشریح: قولہ: ایعجز...... الف خطیئۃ:: جیم کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اس لئے کہ ایک نیکی کے بدلہ میں اس کی مثل دس نیکیوں کی جزا ملے گی۔ یہ مضاعفت جزا کی اقل تعداد ہے۔ جس کا قرآن کریم میں وعدہ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿من جاء بالحسنة فلهٗ عشر امثالها﴾[انعام: ١٦٠]

﴿والله يضاعف لمن يشآء﴾[ ] اور حرم محترم کی ایک نیکی کے بدلے میں ایک لاکھ نیکی کی جزا ملے گی۔ خطیئہ میں حقیرہ اور کبیرۃ دونوں احتمال ہیں۔ اور یہ ساری اللہ کی مشیت کے مطابق ہے۔ علامہ نوویؒ نے کتاب الاذکار میں ویحط کہا ہے۔ یعنی واؤ کے ساتھ اور مسلم کے عام نسخوں میں بھی اسی طرح ہے۔ میں کہتا ہوں اس کی تائید ترمذی نسائی اور ابن حبان کی روایت کے ساتھ میں ہوتی ہے۔ کہ ویحط واؤ کے ساتھ ہے، او کے ساتھ نہیں۔

قولہ: وفي كتابه:في جميع الروايات عن موسٰى الجهني اويحط: کتاب سے مراد مسلم شریف ہے۔ (في جميع الروايات عن موسٰى الجهتي اويحط) یعنی الف کے ساتھ ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں۔ موسیٰ جھنی سے مراد ابوعبداللہ موسیٰ بن عبداللہ جھنی کوفی ہیں۔ اور انہوں نے حضرت مجاہد و مصعب بن سعید سے سماع کیا ہے اور ان سے حضرت شعبہ اور یحییٰ بن سعید قطان نے روایت حدیث کی ہے۔

قولہ: قال ابو بكر البرقاني...... : باء کے کسرہ اور فتح دونوں کے ساتھ ہے۔ اور راء کے سکون کے ساتھ ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں۔ ابوبکر برقانی سے مراد احمد بن محمد خوارزمی برقانی ہیں۔ باء راء اور قاف کے ساتھ۔ (فقالو) صحیح نسخوں میں جمع کے صیغے کے ساتھ ہے۔ اور قالو کی ضمیر کا مرجع۔ شعبہ اور ابوعوانہ اور یحییٰ بن سعید ہیں۔ اور ایک نسخہ میں قال واحد کا صیغہ ہے۔ یعنی قال کا فاعل موسیٰ ہیں۔ (ويحط بغير الف) یعنی او نہیں بلکہ واؤ کے ساتھ ہے۔ (هكذا) اسم اشارہ کا مشار الیہ قول: وفي كتابه الى آخره ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ جب واؤ سے مراد احد الامرین ہو تو پھر واؤ کا معنی مختلف ہو جاتا ہے اور اگر واؤ بمعنی او سے بیان نوع کا ارادہ کیا جائے تو پھر او اور واؤ دونوں مقصد میں برابر ہیں۔ اور کبھی واؤ بمعنی او بھی ہوا کرتی ہے تو پھر او اور واؤ والی دونوں روایتوں میں کوئی منافات نہیں تو پھر معنی ہوگا کہ جس نے یہ کلمات کہے اس کیلئے ایک ہزار نیکیاں لکھی جائیں گی اگر اس کے ذمہ کوئی گناہ نہ ہو۔ اور اگر اس کے ذمہ کوئی گناہ ہوا تو پھر بعض گناہ گرا دیئے جائیں گے اور بعض نیکیاں لکھ دی جائیں گی اور ممکن ہے کہ او بمعنی واؤ ہو یا بمعنی بل ہو تو اس صورت میں ہزار گناہوں کا مٹانا اور ہزار نیکیوں کا لکھے جانا دونوں جمع ہو جائیں گے۔ اور اللہ کا فضل اس سے بھی زیادہ وسیع ہے۔

۲۳۰۰: وَعَنْ اَبِيْ ذَرٍّ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَيُّ الْكَلَامِ اَفْضَلُ قَالَ مَا اصْطَفَى اللّٰهُ لِمَلَآئِكَتِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ . (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ٢٠٩٣/٤ حديث رقم (٨٤۔ ٢٧٣١)۔

ترجمہ: ''حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون سا کلام بہتر ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''وہ کلام جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کے لئے چن لیا ہے اور وہ یہ ہے سبحان الله وبحمده۔'' (مسلم)

تشریح: قوله: اى الكلام افضل؟ یعنی تمام اذکار میں سے کون سا ذکر۔

قوله: ما اصطفى الله لملائكته: یعنی وہ ذکر جو اللہ نے ملائکہ کیلئے پسند کیا ہے

دوام کا حکم کیا ہے۔

قوله: سبحان الله وبحمده: نبی اکرم ﷺ نے ان کلمات کے ذریعے اللہ کے ارشاد: ﴿نحن نسبح بحمدك ونقدس لك﴾ [البقرة: ۱۳۰] کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اور یہ سابقہ چار کلمات کا اختصار ہے۔ اس لئے کہ تسبیح نفی شریک کو متضمن ہے۔ اور شریک باری کی نفی تہلیل کہلاتی ہے اور ذات باری کا اکبر ہونا بھی لازم آتا ہے۔

۲۳۰۱: وَعَنْ جُوَيْرِيَّةَ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ خَرَجَ مِنْ عِنْدِ هَا بُكْرَةً حِيْنَ صَلَّى الصُّبْحَ وَهِيَ فِيْ مَسْجِدِهَا ثُمَّ رَجَعَ بَعْدَ اَنْ اَضْحٰى وَهِيَ جَالِسَةٌ قَالَ مَازِلْتِ عَلَى الْحَالِ الَّتِيْ فَارَقْتُكِ عَلَيْهَا قَالَتْ نَعَمْ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ لَقَدْ قُلْتُ بَعْدَكِ اَرْبَعَ كَلِمَاتٍ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ لَوْ وُزِنَتْ بِمَا قُلْتِ مُنْذُ الْيَوْمِ لَوَ زَنَتْهُنَّ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ عَدَدَ خَلْقِهٖ وَرِضَا نَفْسِهٖ وَزِنَةَ عَرْشِهٖ وَمِدَادَ كَلِمَاتِهٖ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۲۰۹۰/٤ حدیث رقم (۷۹۔ ۲۷۲٦)۔ وابن ماجه ۱۲۵۱/۲ حدیث رقم ۳۸۰۸۔

ترجمہ: ''حضرت جویریہؓ سے منقول ہے کہ ایک دن نبی کریم ﷺ صبح کے وقت نماز فجر کے لئے ان کے پاس سے نکلے اور وہ اپنے مصلّٰی پر بیٹھی ہوئی تھی جب نبی کریم ﷺ اشراق کے وقت واپس تشریف لائے تو وہ اپنی جگہ مصلّٰی پر بدستور بیٹھی ہوئی تھیں آپ ﷺ نے یہ دیکھ کر ان سے فرمایا کہ ''جس حالت میں تمہیں چھوڑ کر گیا تھا کیا اس طرح مسلسل بیٹھی ہوئی ہو؟ (یعنی صبح کے وقت سے اب تک اشراق کا وقت آ گیا ہے مصلّٰی پر بیٹھی ہوئی اسی طرح ذکر الٰہی میں مشغول ہو) انہوں نے کہا ''جی ہاں'' نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''میں نے تمہارے پاس سے جانے کے بعد چار کلمے تین مرتبہ کہے ہیں وہ چار کلمے ایسے ہیں اگر ان کو اس چیز سے تولا جائے جس کے کہنے میں تم ابتداء دن سے اب تک مشغول رہی ہو تو یقیناً چار کلمے اس چیز پر بھاری رہیں گے اور وہ چار کلمے یہ ہیں سبحان الله وبحمده عدد خلقه ورضاء نفسه وزنة عرشه ومداد كلماته ''میں اللہ کی پاکی بیان کرتا ہوں اور اس کی تعریف کرتا ہوں اس کی مخلوقات کی تعداد کی بقدر اور اس کی ذات کی مرضی کے موافق اور اس کے عرش کے وزن کے مطابق اور اس کے کلموں کی مقدار کے مانند ہے۔'' (مسلم)

www.KitaboSunnat.com

راویٔ حدیث:

جویریہ امّ المؤمنین۔ یہ جویریہ ''حارث'' کی بیٹی ہیں۔ ''جویریہ'' جاریہ کی تصغیر ہے۔ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن میں سے ہیں۔ ان کو آنحضور ﷺ نے غزوۂ مریسیع میں قید کیا تھا۔ (اسی غزوہ کو غزوہ بنوالمصطلق کہتے ہیں جو ۵ھ میں واقع ہوا تھا)۔ یہ ''ثابت بن قیس'' کے حصہ میں آئی تھیں اور ثابت بن قیس نے ان سے ''مکاتبت'' کر لی تھی۔ آنحضور ﷺ نے بدل کتابت ادا فرمایا اور اس کے بعد ان کو آزاد کر کے اپنی زوجیت کے شرف سے نوازا۔ ان کا نام ''برہ'' تھا۔ آنحضور ﷺ نے اس کے بجائے جویریہ نام رکھ دیا۔ ربیع الاول ۵٦ھ میں وفات پائی اور ان کی عمر پینسٹھ (٦۵) سال کی ہوئی۔ حضرت ابن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت جابر رضی اللہ عنہم ان سے احادیث روایت کرتے ہیں۔

تشریح: **قوله: عن جويرية:** تصغیر کے ساتھ ہے۔ جویریہ بنت حارث زوجہ رسول اللہ ﷺ مراد ہیں۔

قوله: ان النبی ﷺ خرج ...... مسجدها: یعنی دن کے ابتدائی حصہ میں (حين صلّى الصبح) یعنی صبح کی نماز پڑھنے کا

ارادہ کیا۔(وھی فی مسجدھا)مسجد جیم کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ ہے۔یعنی وہ نماز کے سجدہ کی جگہ پر تھیں۔

قوله:ثم رجع......فارقتك عليها: یعنی حضرت جویریہ کی طرف لوٹے۔(بعد ان اضحى)یعنی آپ وقت ضحوۃ میں داخل ہو ئے تھے اور ضحوۃ کہتے ہیں سورج کا ایک نیزے کی مقدار بلند ہوجانا اور بعض حضرات کہتے ہیں بعد الضحیٰ کا مطلب ہے آپ ﷺ نماز چاشت ادا کرنے کے بعد تشریف لائے۔(وھی جالسة)یعنی اپنی جگہ میں۔(قال مازلت)تاء کے کسرہ کے ساتھ۔(على الحال)اور لفظ حال اس کا مذکر اور مؤنث دونوں لانا جائز ہے۔اسی وجہ سے آپ نے فرمایا۔(التي فارقتك عليها)یعنی حالت سے مراد جلوس لذکر اللہ کی حالت ہے۔

قوله:قال النبی ﷺ ،لقد قلت بعدك اربع كلمات ثلاث مرات: یعنی تیرے پاس سے نکلنے کے بعد۔

(اربع كلمات)کلمات محلاً مصدر مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔تقدیر عبارت ہے۔تكلمت بعد مفارقتك اربع كلمات یعنی تجھ سے جدا ہونے کے بعد میں نے چار کلمات کہیں ہیں۔(ثلاث مرات)مرات منصوب بر بنائے ظرفیت ہے۔

قوله:لو وزنت بما قلت منذ اليوم لوزنتهن : زیادہ صحیح قول کے مطابق وُزنت مجہول کا صیغہ ہے اور وزنت قوبلت کے معنی میں ہے۔(لما قلت)یعنی اس سارے ذکر کے مقابلہ میں جو تو نے کیا ہے۔(منذ)میم کے ضمہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ ہے۔(اليوم)زیادہ صحیح قول کے مطابق یوم مجرور ہے اور رفع بھی جائز ہے۔یہ ساری تفصیل قاموس میں موجود ہے۔یعنی اس دن میں یا اس مذکورہ وقت میں۔(لوزنتهن)یعنی یہ کلمات تخییر سے سارے ذکر پر غالب آجائیں گے۔اور اجر وثواب میں تیرے سارے ذکر سے بڑھ جائیں گے۔جبکہ کہا جاتا''وازنهٗ فوزنهٗ''یعنی فلاں نے فلاں سے مقابلہ کیا اور پھر وہ اس پر غالب ہوگیا۔اور وزن میں اس سے بڑھ گیا۔جیسا کہ کہا جاتا ہے''حاجته فحجتهٗ''یعنی میں دلیل سے اس کا مقابلہ کیا اور پھر میں دلیل میں اس پر غالب آ گیا۔یالوزنتهن لساوتهن کے معنی میں ہے۔(یعنی میرے چار کلمات تیرے سارے ذکر کے برابر ہوں گے)جیسا کہ کہا جاتا ہے''هذا يزني درهمًا''یعنی یہ درہم کے مساوی ہے۔اور آپ ﷺ کا فرمان''لو كانت الدنيا تزن عند الله جناح بعوضة لما سقٰى كافرًا منها شربة ماءٍ''میں بھی وزن مساوات کے معنی میں ہے۔یعنی اگر اللہ کے ہاں مچھر کے پر کے مساوی بھی دنیا کی قدر و قیمت ہوتی تو اللہ کسی کافر کو اس دنیا سے ایک گھونٹ پانی نہ پلاتا یہ ساری امام طیبیؒ کے کلام کی توضیح ہے۔یعنی لو زنتهن یا تو لساوتهن کے معنی میں ہے یا غلبتهن کے معنی میں ہے۔اور لوزنتهن کی ضمیر معنی ما کے مقتضیٰ کی طرف راجع ہے۔ وما قلت میں لفظ ما کی طرف راجع نہیں اور اس میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ یہ کلمات کثیر المعنی ہیں اگر ان کا مقابلہ اس ذکر سے کیا جائے جو تو نے کیا تو یہ کلمات اس سارے ذکر کے برابر ہوں گے۔

قوله:سبحان الله و بحمده: یعنی تقدیر عبارت بحمدہٖ احمدہٗ ہے۔

قوله:عدد خلقه: لفظ عدد حرج جر باء کے خذف کی وجہ سے منصوب ورنہ تقدیر عبارت بعدد کل واحد من مخلوقاته ہے۔

علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں نصب بر بنائے ظرفیت ہے یعنی قدر عدد۔

قوله:رضاء نفسه: یعنی میں اتنی مقدار میں اس کی تسبیح اور تحمید کرتا ہوں کہ جتنی مقدار اس کو راضی کردے اس کیلئے خالص اور مخلص ہو اور نفس سے مراد ذات ہے۔اور معنی ہے میں تسبیح اور تحمید اس کی رضامندی طلب کرنے کیلئے کرتا ہوں۔

قوله:زنة عرشه: یعنی میں اس کے عرش کے ثقل کے برابر یا اس کے عرش کی مقدار کے برابر اس کی تسبیح وتحمید کرتا ہوں۔

قوله:مداد كلماته: مدادٌ مدد کی طرح مصدر ہے اور مداء کہتے ہیں زیادتی اور کثرت کو یعنی میں اللہ کی تسبیح اور تحمید اتنی مقدار میں

کرتا ہو جو مقدار کثرت میں اللہ کے کلمات کے مساوی یہ مساوات خواہ معیار کے ذریعہ ہو یا وزن اور کیل کے ذریعے یا اس کے علاوہ حصر اور انداز کرنے کے دیگر ظروف کے ذریعے اور اس بیان کردہ تمثیل سے ارادہ تقریب افہام کا کیا گیا۔ (یعنی اس مثال کی وجہ سے بات جلد سمجھ آجاتی ہے)۔ ورنہ کلام کیل میں نہیں آسکتا اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کے کلمات سے مراد اللہ کی کلام اور صفت ہے۔ وہ بھی شمار اور انحصار میں نہیں آسکتی تو گویا حقیقت مراد نہیں بلکہ مجازاً مبالغہ فی الکثرت مراد ہے کیونکہ آپ ﷺ نے اولاً مخلوق کے عدد کثیر کا ذکر کیا۔ جس عدد کو ضبط میں لایا جاسکتا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے اس چیز کی جانب ترقی فرمائی جو اس سے بھی کہیں بڑھ کر ہے اور جس کے عدد کا احصاء ناممکن ہے۔ یعنی ایسی حمد جیسے اللہ تعالیٰ کے کلمات کہ شمار ممکن نہیں۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ الفاظ منصوب ہیں، بر بنائے مصدر مفعول مطلق یعنی تقدیر عبارت یوں ہے ''**اعد تسبیحه، المقرون بحمدہ عدد خلقه**'' یعنی میں گنتی کرتا ہوں اس کی ایسی تسبیح کی جو اس کی حمد کے ساتھ ملی ہوئی اس کی مخلوق کے گنتی کے برابر اور اس طرح ''**اقدر مقدار ما یرضی بنفسہ وزنة عرشه و مقدار کلماته**'' ہیں اور مداد الشی اور مدد الشی کہتے ہیں۔ شیٔ کا لمبا زیادہ اور کثیر ہو جانا۔ اور یہاں مراد مقدار ہے۔ یعنی تقدیر عبارت یوں ہے۔ اسبحہٗ و احمدہٗ بمقدار کلماتہٖ یعنی میں اللہ کے کلمات کی مقدار کے برابر اس کی تسبیح اور تحمید کرتا ہوں۔ اور اللہ کے کلمات سے مراد اس کی کتابیں اور نازل شدہ صحائف ہیں۔ اور کلمات کا اطلاق اللہ کے جملہ امر اور جملہ موجودات پر بھی ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ حدیث میں اس بات پر دلالت ہے کہ ذاکر کے ذہن میں کیفیت فی الذکر مذکورہ تصور کے اعتبار کمیت اور مقدار سے زیادہ راجح ہے۔ جو مقدار مذکورہ کیفیت سے خالی ہو۔ **وھذا القیاس** قرآن کریم کی قراءت تدبر تفکر اور حضور قلبی وحصول نصیحت کے ساتھ اگرچہ مذکورہ صفات ایک آیت ہی میں کیوں نہ پائی گئی ہو لیکن اس کے باوجود یہ ایک آیت ایسی بہت زیادہ قراءت ہے جو ان صفات سے خالی ہو فضیلت رکھتی ہے۔ اس ساری کیفیت کے ذکر سے آپ ﷺ کی مراد ام المؤمنینؓ کو ذکر کے سلسلہ میں حضورِ قلب پر برانگیختہ کرنا اور ترغیب دینا ہے۔ اور یہ بات تو ظاہر ہے کہ جو کلمات آپ ﷺ کی زبان اقدس پر وارد ہوئے ہیں۔ وہ ان تمام اذکار سے افضل ہیں جو اذکار آپ ﷺ کے علاوہ کی زبان پر وارد ہوئے ہیں۔ واللہ اعلم۔

۲۳۰۲: **وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ فِیْ یَوْمٍ مِائَةَ مَرَّةٍ كَانَتْ لَهٗ عَدْلَ عَشْرِ رِقَابٍ وَكُتِبَتْ لَهٗ مِائَةُ حَسَنَةٍ وَمُحِیَتْ عَنْهُ مِائَةُ سَیِّئَةٍ وَكَانَتْ لَهٗ حِرْزًا مِنَ الشَّیْطَانِ یَوْمَهٗ ذٰلِكَ حَتّٰی یُمْسِیَ وَلَمْ یَأْتِ اَحَدٌ بِاَفْضَلَ مِمَّا جَاءَ بِهٖ اِلَّا رَجُلٌ عَمِلَ اَكْثَرَ مِنْهُ۔** (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۱/۲۰۱۔ حدیث رقم ۶۴۰۳ ومسلم فی صحیحه ۴/۲۰۷۱ حدیث رقم ۲۸۱۔ ۲۶۹۱)۔ والترمذی فی السنن ۵/۱۷۵ حدیث رقم ۳۵۳۵۔ واحمد فی المسند ۴/۶۰۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص یہ کلمات **لا الله الا الله وحدہ لا شریك له** ''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں'' **له الملك وله الحمد وھو علی کل شیء قدیر** ''اس کے لئے بادشاہت ہے اور اسی کے لئے تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے'' دن میں سو مرتبہ کہے اس کو سو غلاموں کے آزاد کرنے کا ثواب ملتا ہے' اس کے لئے سو نیکیاں لکھی جاتی ہیں اس کے سو گناہ دور کئے جاتے ہیں اور اس کو اس دن شام تک شیطان سے پناہ حاصل رہتی ہے اور کوئی اس کے لائے ہوئے عمل سے بہتر کوئی عمل لے کر نہیں آئے گا علاوہ اس شخص کے جس نے ان کلمات کو اس سے زیادہ پڑھا۔'' (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: لا اله الا الله وحده لا شريك له : یعنی وجود میں کوئی معبود برحق نہیں۔ صفات میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ ''وحدہٗ'' حال برائے تاکید ہے۔

قوله: له الملك: یعنی ملکوت کی بادشاہی ملکوں کی بادشاہی علم کی بادشاہی قناعت کی بادشاہی اوراس طرح اور چیزوں کی بادشاہی۔ یعنی جمیع امور کی بادشاہت اسی کے ارادے اور تقدیر اور تصرف کے ساتھ ہے۔

قوله: وله الحمد: یعنی حقیقت میں ثناء جزیل علی طریق الجمیل اللہ کیلئے ہے۔ اگرچہ اللہ کے علاوہ کی بھی کبھی مجازاً اور صورۃً تعریف کردی جاتی ہے۔

قوله: وهو على كل شئ قدير: یعنی شیٔ سے مراد یا تو ایسی چیز ہے جس کو اللہ چاہتا ہے اور اس کا ارادہ کرتا یا شیٔ سے مراد مطلق ہے۔ یعنی ہر چیز (قدیر) یعنی وہ قدرت میں انتہا کو پہنچنے والا ہے اور قوت میں کامل ہے۔ کمزوری اور عجز سے پاک ہے۔

قوله: في يوم مائة مرةٍ: یعنی سو مرتبہ اکٹھا کہے یا متفرق طور پر۔

قوله: كانت له عدل عشر رقاب: كانت کے بجائے كان مذکر ہے۔ تو پھر كان کا اسم ماذکر محذوف مانا جائے گا لیکن كانت کے بجائے كان حدیث کے آخر حصہ سے مناسبت اور مطابقت نہیں رکھتا کیونکہ وہاں كانت اور حرزٌ مذکور ہے۔ (له) یعنی ضمیر کا مرجع اس کلمے کا قائل ہے۔

(عدل عشر رقاب) لفظ عدل عین کے کسرہ اور فتح دونوں کے ساتھ ہے۔ اور عدل مثل کے معنی میں ہے۔ یعنی اس کیلئے دس غلاموں کو آزاد کرنے کے ثواب کی مثل ہوگا۔ رقاب رقبۃ کی جمع ہے۔ اور رقبہ اصل میں گردن کو کہتے ہیں لیکن یہاں انسان کی جمیع ذات مراد ہے۔ یہ تسمیۃ الشی ببعضہ کے قبیل سے ہے۔ یعنی پوری چیز کا نام اس کے ایک حصہ کے نام پر رکھ دیا جائے یعنی اس کلمہ کے ثواب کو اتنا بڑھا کر دیا جائے گا تاکہ وہ ثواب اصل عتق کے ثواب کے مثل ہوگا۔

قوله: وكتبت له ...... يومه ذالك: یعنی ثابت ہوں گی۔ اسی دن میں جس دن اس نے یہ کلمہ کہا ہے۔ (حتى يمسى) ظاہراً تقابل سے تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگر قائل نے یہ کلمہ رات کے وقت کہا تو اس کیلئے رات بھر شیطان سے حفاظت ہوگی یہاں تک کہ صبح ہوجائے۔ احتمال یہ ہے کہ اختصار راوی کی جانب سے ہو یا آپ ﷺ نے رات کا ذکر واضح ہونے کی وجہ سے ترک کردیا۔ اور باقی رہی دن کی تخصیص تو یہ اس لئے ہے کہ دن کے وقت رات کی نسبت شیطان سے حفاظت کی طرف زیادہ احتیاجی ہے۔ علامہ نوویؒ فرماتے ہیں یہ اجر تو سو کا ہے۔ اگر کوئی اس پر زیادتی کرتا ہے تو اس کے ثواب میں بھی زیادتی ہوگی اور اس سو (۱۰۰) سے مراد بھی عام ہے خواہ یہ سو پے در پے کہے یا متفرق انداز میں لیکن پے در پے کہنا اور دن کے ابتدائی حصہ میں کہنا زیادہ بہتر ہے' تاکہ دن بھر شیطان سے حفاظت رہے۔

(قوله: ولم يأت احد...... : محل اتیان قیامت کا دن ہے۔

ایک روایت میں اكثر منه کے بجائے من ذالك ہے۔ یعنی وہ زیادہ ذکر مذکورہ ذکر کی جنس سے ہو یا اس کی جنس کے علاوہ سے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں اس حدیث میں تہلیل کو سیئات کی مقدار معلوم یعنی سو برائیوں کو مٹانے والا قرار دیا گیا ہے اور تسبیح والی حدیث میں تسبیح کو سمندر کی جھاگ کے برابر برائیاں مٹانے والا کہا گیا ہے۔

اس سے تسبیح کا تہلیل سے افضل ہونا لازم آتا ہے۔ اور حالانکہ تہلیل والی مذکورہ حدیث میں ''ولم يأت احد بافضل مما جاء به'' فرمایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تہلیل ہر ذکر سے افضل ہے۔

قاضی عیاضؒ نے جواب دیا ہے کہ اس مذکورہ حدیث میں جس تہلیل کا ذکر کیا گیا ہے' تہلیل تسبیح سے افضل ہے کیونکہ تسبیح کے جزاء

میں سمندر کی جھاگ کی مقدار محوسیئات ہے اور یہاں جزاء محوسیئات پر بھی مشتمل ہے اور اس کے علاوہ دس غلاموں کو آزاد کرنے اور سو نیکیوں کے اثبات اور حفاظت از شیطان پر بھی جزا میں شامل ہیں۔

۲۳۰۳: وَعَنْ اَبِیْ مُوسٰی الْاَشْعَرِیِّ قَالَ كُنَّا مَعَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فِي سَفَرٍ فَجَعَلَ النَّاسُ يَجْهَرُوْنَ بِالتَّكْبِيْرِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَيُّها النَّاسُ اِرْبَعُوا عَلٰى اَنْفُسِكُمْ اِنَّكُمْ لَا تَدْعُوْنَ اَصَمَّ وَلَا غَائِبًا اِنَّكُمْ تَدْعُوْ نَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا وَهُوَ مَعَكُمْ وَالَّذِیْ تَدْعُوْنَهٗ اَقْرَبُ اِلٰی اَحَدِكُمْ مِنْ عُنُقِ رَاحِلَتِهٖ فَقَالَ اَبُوْ مُوْسٰی وَاَنَا خَلْفَهٗ اَقُوْلُ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ فِیْ نَفْسِی فَقَالَ يَا عَبْدَ اللّٰهِ بْنِ قَيْسٍ اَلَا اَدُلُّكَ عَلٰی كَنْزٍ مِّنْ كُنُوزِ الْجَنَّةِ فَقُلْتُ بَلٰی يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ١٨٧/١١ـ حديث رقم ٦٣٨٤ـ ومسلم فی صحيحه ٢٠٧٦/٤ حديث رقم ٤٤ـ ٢٧٠٤ـ
اخرجه الترمذی فی السنن ١٧٢/٥ حديث رقم ٣٥٢٨ـ

ترجمہ: ''حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم لوگ نبی کریم ﷺ کے ہمراہ ایک سفر میں تھے کہ لوگوں نے پکار پکار کر تکبیر کہنی شروع کر دی آپ ﷺ نے یہ سن کر ارشاد فرمایا ''لوگو! اپنی جانوں کے ساتھ نرمی اختیار کرو کیونکہ تم کسی بہرے یا غیر موجود کو نہیں پکارتے یا یاد نہیں کرتے بلکہ اس کو پکارتے ہو جو سننے والا اور دیکھنے والا ہے اور وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں بھی ہو چاہے تم اسے باآواز بلند یاد کرو چاہے آہستہ آواز سے اس کے لئے دونوں برابر ہیں اور جس کو تم پکارتے ہو وہ تم میں سے ہر شخص کے اس کی سواری کی گردن سے بھی زیادہ قریب ہے'' حضرت ابوموسیٰ کہتے ہیں کہ میں آپ ﷺ کے پیچھے اونٹ پر یا پیادہ تھا اور اپنے دل میں یہ پڑھ رہا تھا کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''عبداللہ ابن قیس! یہ حضرت ابوموسیٰ کا نام ہے کیا میں تمہیں جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ نہ بتلادوں؟ میں نے عرض کیا ''ہاں یارسول اللہ ﷺ! ضرور بتایئے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''وہ خزانہ لاحول ولا قوة الا باللہ ہے۔'' (بخاری ومسلم)

تشریح: **قوله: يجهرون بالتكبير**: یعنی یہ اظہار اور جہر بالتکبیر بلند مقامات پر تھا کیونکہ بلند مقام پر چڑھتے وقت تکبیر کے سلسلہ میں حدیث وارد ہوئی ہے۔ یا اس سے مراد تکبیر اور تکبیر کی مثل دیگر اذکار ہیں اور شاید آپ ﷺ کسی جہادی سفر میں ہوں تو اس صورت میں تکبیر کی تخصیص جہادی سفر کے مناسب ہے۔ یا اس سے مراد مطلقاً تعظیم ہے۔ جو تکبیر اور کبیر کے علاوہ کو بھی شامل ہے۔

قوله: ايها الناس اربعوا على انفسكم: ایک نسخہ میں حرف ندا یا کے ساتھ یا ایها الناس ہے۔ ''اربعوا'' باء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

اور مطلب یہ ہے کہ اپنے نفسوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرو اور اس جہر سے باز آجاؤ جو تمہارے لئے مضر ہے۔

قوله: انكم لا تدعون......من عنق راحلته:

یہ جملہ استنافیہ اور بیان علت کے معنی میں ہے۔ ''لا تدعون'' کا مفعول لفظ اللہ ہے یعنی تم نہیں پکار رہے اللہ کو تکبیر کے ذریعہ سے یا لا تدعون لا تذكرون کے معنی میں ہے۔ علامہ ابن حجرؒ کا گمان یہ ہے کہ لا تدعون' تسألون اور تطلبون کے معنی میں ہے۔ پس نرمایا کہ تدعون' تعبدون کے معنی میں ہے کیونکہ ان سے صادر ہونے والی چیز محض اللہ اکبر تھا۔ جیسا کہ لفظ تکبیر سے اس طرف اشارہ ملتا ہے۔ (اور محض اللہ اکبر کہنا عبادت ہے)۔ اور یہ محض اس بارے میں دعویٰ ہے ہاں یوں کہا جائے گا کہ یہ عبادت کے ساتھ معنی دعا کو بھی

شامل ہے جیسا کہ اس میں امیہ بن صلت کے قول سے اشارہ ملتا ہے جس میں امیہ بن صلت کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **کاد ان یسلم** قریب ہے۔ کہ امیہ بن صلت مشرف باسلام ہو جائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا امیہ بن صلت کے اشعار کی طرف جھکاؤ بھی تھا اور امیہ بن حلت کا قول یہ ہے۔ ''**اذا اثنی علیك المرءُ یومًا كفاهُ من تعرضه الثناء**''۔

(**اصم ولا غائبًا انکم**) یہ تاکید (**تدعون سمیعًا بصیرًا**) امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اگر آپ یہ سوال کریں کہ دعا کے مقام پر بصیرًا کی زیادتی کا کیا فائدہ۔ تو میں اس کا جواب دیتا ہوں کہ سمیع اور بصیر یہ ضریر یعنی کورنگاہ اور اعمٰی یعنی اندھا کے مقابلہ میں ادراک کے اعتبار سے اشد اور احساس کے اعتبار سے اکثر ہیں۔ لیکن زیادہ ظاہر جواب وہ ہے جو علامہ ابن حجرؒ نے ذکر کیا ہے کہ سمیع تو رحم کے مقابلہ میں ہے اور بصیر کو اس لئے لایا گیا ہے کیونکہ ذکر کے سلسلہ میں بصیر سمیع کو لازم ہے۔ (یعنی عموماً ان دونوں کو معاً ذکر کیا جاتا ہے) کیونکہ ان دونوں کے درمیان ادراک کی مناسبت موجود ہے۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ جواب یوں دیا جائے کہ جب دعا عبادت قولی اور فعلی دونوں کو شامل ہے تو اس لئے سمیع اور بصیر دونوں کو اکٹھا لائے۔ (کیونکہ عبادت قولی سننے سے اور عبادت فعلی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے)۔ لیکن زیادہ حق بات یہ ہے کہ بصیر کو اس لئے لائے تا کہ اس بات پر دلالت ہو جائے کہ سمیع اور بصیر یہ دونوں ایسی صفتیں ہیں جو ایک دوسرے کو لازم ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آگے **وھو معکم** سے ایسی معیت کو بطور تکمیل لا رہے ہیں جس سے یہ علم ہوتا ہے۔ (یعنی جو ساتھ ہوگا تو اس کو ساتھ کے حالات کا علم بھی ہوگا)۔ اور سمع اور بصر دونوں سے اعم ہے۔ کما مرّ۔ (**وھو معکم**) یعنی وہ علم کی صورت میں تمہارے پاس حاضر ہے اور اس کو تمہارے احوال پر اطلاع ہے تم جہاں بھی ہو خواہ تم اپنے احوال ظاہر کرو یا اسے پوشیدہ رکھو۔

اور **معکم** ظاہر کے اعتبار سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد **غائبًا** کے مقابلہ میں ہے۔ اور پھر اس معیت معنوی کے اثبات میں جو انتہائی شرافت وعظمت پر دال ہے۔ اپنے ارشاد: ''**لا والذی تدعونهٗ اقرب الی احدکم من عنق راحلته**'' سے اضافہ فرمادیا بلکہ وہ تو شاہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ اور مقام کی مناسبت کے اعتبار سے یہ ایک تمثیل ہے جو بات کو ایک عاقل کے فہم سے قریب کرنے کیلئے ہے۔ مطلب ہے کہ وہ قریب سے بھی قریب ہے اور **وھو معکم** سے اس میں مزید ترقی ہوگی۔

قوله: ونا خلفه اقول لا حول ولا قوة الا بالله فی نفسی : یعنی ظاہر میں کوئی حرکت نہیں۔ باطن میں کوئی استطاعت نہیں۔ نہیں ہے کسی چیز سے پھرنا اور نہ ہی کسی چیز پر طاقت مگر اللہ کے ارادے اور اس کی مشیت کے ساتھ۔

اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ حول بمعنی حیلہ ہے اس لئے کہ اللہ کی مدد کے سوا کسی چیز کو دفع کرنا یا منع کرنا محض حیلہ سے ممکن نہیں۔

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہ کلمہ **لا حول ولا قوة** یہ کلمہ تفویض ہے یعنی کسی معاملہ میں بندہ کسی چیز کا مالک نہیں۔ اور دفع شر میں اس کے پاس کوئی حیلہ نہیں اور جلب خیر کیلئے اس کے پاس کوئی طاقت نہیں۔ ہاں مگر سب کچھ اللہ کے ارادے سے ہوگا۔ انتہیٰ کلامہ۔

اور کلمہ لاحول کے سلسلہ میں بہترین بات وہ ہے جو ابن مسعودؓ سے منقول ہوئی کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں لاحول الخ پڑھا تو آپ نے فرمایا ابن مسعود جانتے ہو کہ اس کی تفسیر کیا ہے۔ تو میں نے عرض کی کہ اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ جانتے ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اس کی تفسیر **لا حول عن المعصیة الا بعصمة الله ولا قوة علی طاعة الله الا بعون الله**'' یعنی اللہ کی حفاظت کے بغیر معصیت سے بچا نہیں جا سکتا' اور اللہ کی مدد کے بغیر بچا نہیں لا جا سکتی۔

اور باقی رہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حول اور قوت کو معصیۃ اور طاعت کے ساتھ خاص کرنا تو یہ اس وجہ سے ہے کہ یہ دونوں دین کے اہم امور میں سے ہیں۔ (**فی نفسی**) جار مجرور اقول کے متعلق ہے۔ اور احتمال ہے کہ حضرت ابو موسیٰؓ کی مراد یہ ہو کہ میں یہ کلمہ اپنے دل میں کہہ

رہا تھا یا آواز کو بلند کئے بغیر اس کلمہ کو اپنی زبان سے کہہ رہا تھا۔اور یہی زیادہ مناسب ہے۔اور باقی رہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سماع تو وہ یا تو اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حضرت موسیٰ رضی اللہ عنہ کے دل میں یہ بات منکشف ہوگئی ہو یا ان کلمات کو بار بار پڑھنے کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے سن لیا ہو۔

قوله: فقال یا عبداللّٰه ...... كنز من كنوز الجنة: یہ ابوموسیٰ اشعری کا نام ہے۔''کنزٍ'' کی تنوین برائے تعظیم ہے۔یعنی خزانے سے مراد عظیم خزانہ ہے۔اس کلمہ کا تسمیہ کنز کے ساتھ اس لئے ہے کیونکہ یہ کلمہ بھی اپنی نفاست اور لوگوں کی نظروں سے محفوظ ہونے کی وجہ کنز کی مثل ہے۔یا اس لئے کہ یہ کلمہ جنت کے ذخائر میں سے ہے۔یا اس لئے کہ یہ کلمہ جنت کو عمدہ چیزوں کے انتخاب میں سے ہے۔علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کنز ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے کہنے کی وجہ سے ایسا عمدہ ثواب ہوتا جو اس کلمے کے قائل کیلئے جنت میں ذخیرہ ہو جاتا ہے۔

قوله: فقلت بلٰی یا رسول اللّٰه: یعنی ضرور بتلایئے۔کیونکہ نیکی کا کام بتلانے والا بھی نیکی کرنے والے کی مثل ہے۔

ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جس رات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کرائی گئی تو آپ کا گذر جناب ابراہیم علیہ السلام پر ہوا تو جناب ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ اے محمد! اپنی امت کو حکم دو کہ وہ جنت میں زیادہ سے زیادہ درخت لگائیں اور جنت کا درخت ''**لا حول ولا قوة الا باللّٰه** ہے۔اس کی تخریج احمد و ترمذی نے بھی کی ہے اور ابن حبان نے اس کو صحیح قرار دیا ہے اور بعض روایات میں آتا ہے کہ **لا حول**..... جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے۔شاید اس کے نتائج کا اختلاف اس کے کہنے والے لوگوں کے مراتب کے اختلاف کی وجہ سے ہو۔

الفصل الثاني:

۲۳۰۴: عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم مَنْ قَالَ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ وَبِحَمْدِهٖ غُرِسَتْ لَهٗ نَخْلَةٌ فِي الْجَنَّةِ. (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵/۱۷٤ حدیث رقم ۳۵۳۲۔

ترجمہ: ''حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''جس شخص نے'' **سبحان الله العظيم وبحمده** کہا اس کے لئے جنت میں کھجور کا درخت لگا دیا جاتا ہے۔''(ترمذی)

تشریح: قوله: سبحان الله العظيم وبحمده: کہا گیا ہے کہ **وبحمده** کی واؤ زائدہ ہے یعنی میں ایسی تسبیح کرتا ہوں جو اللہ کی حمد کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔

قوله: غرست له نخلة في الجنة: یعنی یہ غرس ہر مرتبہ کہنے کی وجہ سے ہوگا۔'' **نخلة** '' کی تنکیر برائے تعظیم ہے۔**نخلة عظيمٌ**۔

یعنی وہ جنت جو اس کے قائل کیلئے تیار کی گئی ہے۔اور درختوں میں سے کھجور کی تخصیص اس کی منفعت کے کثیر اور اس کے پھل کے عمدہ ہونے کی وجہ سے کی گئی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اللہ پاک نے مؤمن اور مؤمن کے ایمان کی مثال کھجور اور اس کے پھل کے ساتھ بیان کی ہے۔ارشاد فرمایا: ﴿**الم تر كيف ضرب الله مثلاً كلمةً طيبةً**﴾[ابراهيم: ۲٤] اور کلمہ طیبہ سے مراد کلمہ توحید ہے اور شجرہ طیبہ کھجور کا درخت ہے۔

فائدہ: بزار نے ''**فانها عبادة الخلق وبها تقطع ارزاقهم** کی زیادتی کی ہے۔یعنی یہ کلمہ مخلوق کی عبادت ہے اور اسی کلمہ کی وجہ

سے مخلوق کے رزق متعین کئے جاتے ہیں۔

۲۳۰۵: وَعَنِ الزُّبَيْرِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا مِنْ صَبَاحٍ يُصْبِحُ الْعِبَادُ فِيْهِ اِلاَّ مُنَادٍ يُنَادِىْ سَبِّحُوا الْمَلِكَ الْقُدُّوْسَ . (رواه الترمذى)

اخرجه الترمذی فی السنن ۲۲۳/۵ حديث رقم ۳۶۲۰۔

ترجمہ: ''اور حضرت زبیرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''ایسی کوئی صبح نہیں ہوتی کہ جس میں ایک فرشتہ پکارنے والا پکار کر یہ نہ کہتا ہو'' ''کہ پاک بادشاہ کو اس کی پاکی کے ساتھ یاد کرو۔'' (ترمذی)

تشریح: **قوله: ما من صباح يصبح العباد فيه**: امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ صباح نکرہ سیاق نفی میں واقع ہوا ہے اور شمول کا فائدہ پہنچانے کیلئے اس کے ساتھ من استغراقیہ کو ملا دیا گیا۔ اور پھر مزید احاطہ کیلئے **یصبح صباح** کی صفت مؤکدہ لائی گئی ہے۔ اس کی نظائر کلام اللہ میں بھی ہیں جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**وما من دابة فى الارض الا على الله رزقها**[هود:۰٦] ترجمہ:

قوله: الا مناد ينادى الملك القدوس: یعنی ایسی چیز سے اس کی تنزیہ بیان کرو جس سے وہ نفس الامر میں منزہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اس بات کا اعتقاد رکھو کہ وہ منزہ ہے مراد انشاء تنزیہ نہیں۔ کیونکہ وہ تو ازل اور ابد کے اعتبار سے منزہ ہے۔ اس کو انشاء تنزیہ کی احتیاج نہیں یا مطلب یہ ہے کہ اس کو تسبیح کے ساتھ یاد کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿**ان من شىء الا يسبح بحمده**﴾ [الاسراء:٤٤]

اسی وجہ سے امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ **سبحوا** کا مطلب ہے **قولو سبحان الملك القدوس** یا **قولو سبوح قدوس رب الملائكة والروح**، یا ان کی مثل **سبحان الله وبحمده سبحان العظيم وبحمده** وغیرہ۔

۲۳۰۶: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَفْضَلُ الذِّكْرِ لَا اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ وَاَفْضَلُ الدُّعَاءِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ.

(الترمذى وابن ماجة)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۳۰/۵ حديث رقم ۳٤٤۳۔ وابن ماجه فی السنن ۲۲٤۹/۲ حديث رقم ۳۸۰۰۔

ترجمہ: ''حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا سب سے بہتر ذکر لا اله الا الله ہے اور سب سے بہتر دعا الحمد الله ہے'' (ترمذی، ابن ماجہ)

تشریح: **قوله: افضل الذكر لا اله الا الله**: ایک روایت میں افضل الذکر کے بجائے افضل الحسنات آیا ہے۔ جس روایت کو احمد نے نقل کیا ہے وجہ افضلیت یہ ہے کہ اس پر صحت ایمان موقوف ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ بعض محققین نے یہ بات ذکر کی ہے کہ تہلیل کو افضل الذکر اس لئے قرار دیا گیا ہے کیونکہ تہلیل کو ان صفات مذمومہ سے جو ذاکر کے باطن میں معبود کا درجہ رکھتے ہیں۔ تطہیر باطن میں ایک خاص قسم کی تاثیر ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿**افرأيت من اتخذ الهه هواه**﴾[الجاثية:۲۳] یعنی کیا دیکھا ہے آپ نے اس شخص کو جس نے اپنی خواہش نفس کو معبود بنا رکھا ہے۔ **لا اله** سے عام الہ کی نفی ہوتی ہے اور **الا الله** سے توحید ثابت ہوتی ہے اور ذکر ظاہر لسان سے باطن قلب کی طرف عود کرتا ہے اور پھر ذکر قلب میں جگہ بنالیتا ہے اور ذاکر کے اعضاء پر غلبہ پالیتا ہے۔ اور اس ذکر کی حلاوت وہی شخص پاتا ہے جس نے اس کو چکھا ہو۔

قوله: و افضل الدعا الحمد لله: کیونکہ دعا نام ہے اللہ کے ذکر کا اور اللہ سے اپنی حاجت طلب کرنے کا اور الحمد تو ان دونوں چیزوں کو شامل ہے بایں طور کہ جس نے اللہ کی تعریف کی تو گویا اس نے اللہ کی تعریف اللہ نعمت پر کی اور نعمت پر اللہ کی تعریف یہ مزید نعمت کو

طلب کرنا ہے۔اور یہی چیز شکر کی بنیاد ہے۔انتہیٰ کلامہ۔اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿لئن شکرتم لازیدنکم﴾[ابراھیم:۰۷] یہی وجہ ہے کہ الحمد للہ پر مشتمل ہونے کی وجہ سے فاتحہ کو ام القرآن قرار دیا گیا ہے۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں۔الحمد پر دعا کا اطلاق علی طریق المجاز ہے۔اور شاید الحمد للہ کو افضل الدعا ٹھہرانا اس حیثیت سے ہے کہ الحمد اللہ ایسا لطیف قسم کا سوال ہے کہ جس کا راستہ انتہائی دقیق ہے جیسا کہ کسی شاعر امیہ بن ابی صلت کسی بادشاہ کے دربار میں حصولِ عطاء کے لئے کہا۔

؎ اذا اثنی علیك المرء یومًا ☆ کفاهٗ من تعرفه الثناء

اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ ﷺ کا قول الحمد للہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿اھدنا الصراط المستقیم﴾ کی طرف اشارہ اور تلمیح کے باب سے ہو۔(یعنی پوری فاتحہ افضل دعا ہے) کیونکہ فاتحہ میں مذکور ''اھدنا الصراط المستقیم'' سے زیادہ جامع اور افضل واکمل دعا کون سی ہوسکتی ہے۔

۲۳۰۷:وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْحَمْدُ رَأْسُ الشُّكْرِ مَا شَكَرَ اللّٰهَ عَبْدٌ لَا يَحْمَدُهٗ.

اخرجه البیهقی فی شعب الایمان ٩٦/٤ الحدیث رقم ٤٣٩٥۔

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بن عمروؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا'' حمد شکر کا سر ہے جس بندہ نے خدا کی حمد نہیں کی اس نے خدا کا شکر ادا نہیں کیا''۔

تشریح: قوله: الحمد لله رأس الشكر: یعنی الحمد کا صلہ للہ محذوف ہے۔جیسا کہ ایک نسخہ میں للہ صراحۃً مذکور ہے۔گویا کہ الحمد کے علاوہ دیگر الفاظ شکر غیر معتد بہا ہیں۔

قوله: ما شكر الله عبدٌ لا يحمدهٗ: گویا کہ الحمد للہ کا تارک رأس الشکر سے اعراض کرنے والے کی طرح ہے۔بعض شارحین فرماتے ہیں کہ حمد صرف زبان سے ہوا کرتی ہے اور شکر زبان دل اور اعضاء سب سے ہوتا ہے۔تو نتیجہ یہ نکلا کہ زبان سے حمد شکر کے شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے اور شکر کا بعض ہے اور کسی چیز کا رأس یعنی سر بھی شیٔ کا بعض ہوا کرتا ہے۔تو اس جہت سے حمد باللسان بھی شکر کا بعض ہے۔اور باقی رہا بعضیت میں حمد باللسان کو رأس کیوں قرار دیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ زبان کے ساتھ کسی نعمت کا تذکرہ کرنا اور پھر مولیٰ نعمت کی ثناء کرنا یہ پوشیدگی اعتقاد کی وجہ مکانِ نعمت پر زیادہ دلالت کرنے والا ہے۔چونکہ دیگر اعضاء کے اعمال تو احتمال ہے لیکن عمل لسان یہ بات نہیں کیونکہ عمل لسان ہے نطق یعنی بولنا۔جو دیگر اعضاء کے اعمال کی نسبت زیادہ واضح اور کھلا ہوا ہے۔

ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو

۲۳۰۸: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَوَّلُ مَنْ يُدْعٰى اِلَى الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ الَّذِيْنَ يَحْمَدُوْنَ اللّٰهَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ۔ (رواهما البیهقی فی شعب الایمان)

اخرجه البیهقی فی شعب الایمان ٩٠/٤ الحدیث رقم ٤٣٧٣۔

ترجمہ:''اور حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن جنت کی طرف جن لوگوں کو پہلے بلایا جائے گا' وہ ہوں گے جو خوشی کے وقت بھی اور سختی کے وقت بھی اللہ کی تعریف کرتے ہیں ان دونوں روایتوں کو بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے''

تشریح: تشریح: قیامت کے دن جنت کی طرف جن لوگوں کو پہلے بلایا جائے گا ان میں وہ ہوں گے جو صحت اور مرض میں یا سختی اور خوشحالی میں یا غنیٰ اور فقر میں یعنی وہ لوگ کہ جن پر ان کے مولیٰ کی جانب سے جو بھی حکم جاری ہوا خواہ وہ حکم غنا کا ہو یا فقر کا سختی کا ہو

یا آسانی کا ہر حکم میں وہ اپنے مولیٰ سے راضی رہتے ہیں۔یعنی مراد اس سے ان کی ہمیشہ کی رضاء ہے اور اس انداز میں کسی چیز کے دوام کو بیان کرنا بدیع کے فن کے اسلوبوں میں سے ایک اسلوب ہے۔

۲۳۰۹: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ اِلْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ مُوْسٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ یَارَبِّ عَلِّمْنِیْ شَیْئًا اَذْکُرُکَ بِہٖ اَوْاَدْعُوْکَ بِہٖ فَقَالَ یَا مُوْسٰی قُلْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ فَقَالَ یَا رَبِّ کُلُّ عِبَادِکَ یَقُوْلُ ھٰذَا اِنَّمَا اُرِیْدُ شَیْئًا تَخُصُّنِیْ بِہٖ قَالَ یَا مُوسٰی لَوْ اَنَّ السَّمٰوَاتِ السَّبْعِ وَعَامِرَ ھُنَّ غَیْرِیْ وَالْاَرَضِیْنَ السَّبْعَ وُضِعْنَ فِیْ کَفَّۃٍ وَّلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ فِیْ کِفَّۃٍ لَمَا لَتْ بِھِنَّ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔ (رواہ فی شرح السنة)

اخرجه الترمذی فی السنن ٥/٤٩٢ الحدیث رقم ٣٤٣٠۔

ترجمہ: ''حضرت ابو سعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ پروردگار! مجھے کوئی ایسی چیز سکھلا دے جس کے ذریعہ میں تجھے یاد کروں اور تجھ سے دعا مانگوں! پروردگار نے فرمایا! موسیٰ لا الہ الا اللہ کہو! موسیٰ نے عرض کیا ''میرے پروردگار'' تیرے تمام بندے یہ کلمہ کہتے ہیں میں تو کوئی ایسی چیز چاہتا ہوں جسے تو میرے ہی لئے مخصوص کر دے جس میں میرا اور کوئی شریک نہ ہو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''موسیٰ! اگر ساتوں آسمان اور میرے علاوہ ان کے سارے مکین اور ساتوں زمینیں ایک پلڑے میں رکھی جائیں اور لا الہ الا اللہ یعنی اسکا ثواب دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو یقیناً ان چیزوں کے پلڑے سے لا الہ الا اللہ کا پلڑا جھک جائے۔''

(شرح السنہ)

تشریح: قوله: علمنی شیئا اذکرك به او ادعوك: یعنی اذکار میں سے کوئی ذکر (اذکرك به) یہ مرفوع کیونکہ یہ خبر ہے۔تقدیر عبارت انا اذکرك به ہے۔بعض حضرات نے اسی طرح کہا ہے لیکن اس کو خبر بنانے کی حاجت نہیں کیونکہ یہ شیئًا کی صفت ہے اور یہ امر کا جواب بھی نہیں اس کی دلیل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ''او ادعوك'' ہے۔او ادعوك حرف عطف کے ساتھ زیادہ صحیح ہے اور اکثر کے ہاں او ہے اور اقل کے نزدیک واؤ ہے اور ادعوك میں واؤ پڑھی جائے گی۔

اور پھر حدیث میں لفظ او بظاہر بیان نوع کیلئے ہے کیونکہ واؤ والی روایت اس پر دال ہے۔(یعنی شیٔ کی ایک نوع ذکر ہے اور ایک نوع دعا ہے)۔اور احتمال یہ بھی ہے کہ او برائے شک ہو۔(یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شک گذرا کہ حضرت ابو موسیٰ نے اذکرك کہا یا ادعوك)۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ شیٔ کی تعیین دعا سے کی جا رہی ہے یا ذکر سے۔کیونکہ ہر دعا ذکر ہے اور ہر ذکر دعا ہے۔اس وجہ سے کہ یہ ایک لطیف قسم کا سوال ہے۔یا ادعوك میں دعا بمعنی عبادت ہے اور تقدیر عبارت ہے: ''عبدك بذکرہ''۔ یعنی میں اس شیٔ کو ذکر کر کے یا اس شیٔ کے مضمون کو ذکر کر کے میں آپ کی عبادت کروں۔

قوله: فقال یا موسٰی قل لا اله الا اللّٰه: اس لئے کہ لا اله الا الله ۔اللہ تعالیٰ کی وحدانیت ذات اور یکتائی صفات پر دلالت کرنے کے ساتھ ساتھ دعا اور ذکر میں سے ہر ایک کو شامل ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اگر آپ یہ سوال کریں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس ذکر یا دعا کا مطالبہ کیا تھا جس کی وجہ سے وہ اپنے علاوہ پر فائق ہو جائیں تو یہاں سوال اور جواب کی مطابقت نہیں (کیونکہ یہ ذکر اور دعا تو دوسرے بھی کرتے ہیں)۔تو میری طرف سے جواب یہ ہے کہ گویا اللہ نے فرمایا اے موسیٰ تو نے ایک شیٔ محال کو طلب کیا ہے۔کیونکہ اس سے زیادہ افضل ذکر اور دعا ہے نہیں۔

قوله: فقال یا رب کل عبادك ...... تخصنی به : یعنی موحدین بندے (یقول) یقول صیغہ مفرد لفظ کی اعانت کی وجہ سے

ہے اس کے معنی کا لحاظ کئے بغیر۔ (بہ) یعنی اپنے عام بندوں کے درمیان سے مجھے اس چیز کے ساتھ خاص کر دے۔ کیونکہ طبیعت انسانی اس وقت اچھی طرح خوش نہیں ہوتی جب تک اس کو دوسروں سے ہٹ کر کسی چیز کے ساتھ خاص نہ کر دیا جائے۔ جیسا کہ ایک انسان کے پاس ہیرا موجود ہو جو دوسروں کے پاس نہ ہو۔ یہی حال اسماء وادعیہ اور انوکھے علوم اور عجیب فنون کا ہے باوجود اس کے کہ جس طریقہ پر عادت اللہ جاری ہے اور یہ اللہ کی عادت رحمت شاملہ اور کامل مہربانی میں سے ہیں۔ زیادہ نافع اور مفید اور گراں قدر چیز وجود کے اعتبار سے زیادہ ہوا کرتی ہیں۔ جیسے گھاس پھوس نمک اور پانی وغیرہ۔ نہ کہ یاقوت موتی اور زعفران۔ (کیونکہ اول الذکران چیزوں کے بغیر گذارہ نہیں بخلاف ثانی الذکر چیزوں کے) اور اس طرح قرآن مجید یہ کتابوں میں سے گراں قدر کتاب ہے۔ اور دوسری کتابوں کی نسبت زیادہ بھی ہے اور سستی بھی۔ اور اسی طرح علم کیمیاء اور اس جیسے دیگر علوم جو محض خیالات فاسدہ ہیں ان علوم کا حامل جہلاء میں سے ہے لیکن وہ علم کیمیا کی وجہ سے جتنا خوش ہوتا اتنا کتاب وسنت کے علم سے نہیں۔ اور حجر اسود زمین میں اللہ کا دائیاں ہاتھ ہے **کما یلیق شانہ** اور اللہ کے بندے اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہیں یہ اس مقام ابراہیم سے افضل ہے جس مقام میں جناب ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں ثبت ہو گئے تھے۔ لیکن عوام کالانعام حجر اسود کے استلام کے مقابلہ میں مقام ابراہیم کی زیارت سے زیادہ خوش ہوتے ہیں اور انہیں گراں قدر چیزوں میں سے کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت بھی ہے۔ جو کلمات میں سے زیادہ اشرف اور عبادات میں سے زیادہ نفیس اور اذکار میں سے زیادہ افضل اور نیکیوں میں سے زیادہ اکمل ہے۔ اور یہ وجود کے اعتبار سے اکثر اور حصول کے اعتبار سے زیادہ آسان ہے لیکن عوام اس کو چھوڑ کر انوکھے اسماء اور عجیب دعاؤں کی مواظبت کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ جن غریب اسماء اور عجیب ادعیہ کی غالباً کتاب وسنت میں کوئی بنیاد تک نہیں ہوتی۔ تو گویا کہ اللہ پاک نے اپنے کلیم کی زبان پر وہ چیز جاری فرما دی جو رب عظیم کی جانب سے جواب کا سبب بن جائے تا کہ خواص وعوام کے سامنے اس کلمہ کی جلالت شان ظاہر ہو جائے کہ وہ حصول مقصود کے حصول کیلئے ہر زمانے اور ہر مکان میں اس کلمہ کا اہتمام کریں۔ اور یہ اس وجہ سے ہے کیونکہ یہ کلمہ دائرہ اذکار کا قطب اور نقطہ اسرار کا مرکز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث پاک میں وارد ہوا ہے کہ "**لا الہ الا اللّٰہ**" اور اللہ کے درمیان کو حجاب نہیں یہ کلمہ فوراً اللہ کی طرف پہنچ جاتا ہے۔

قولہ: لو ان السمٰوت السبع ......الخ: امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے ملنے والے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ اے موسیٰ! تو نے ایسے امر کا مطالبہ کیا ہے جو تیرے ساتھ مختص ہو اور تمام اذکار پر فائق ہو یہ محال ہے کیونکہ یہ کلمہ آسمان اور اہل زمین اور اس کے پہاڑ ان تمام کائنات پر راجح اور غالب ہے۔ اور زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ خلاصہ جواب یوں ہے کہ یہ کلمہ افضل ذکر ہے جیسا کہ حدیث سابق میں گذرا ہے۔ اور خواص کی خصوصیت اس کلمہ کے معانی کو سمجھنے اور اس کی معانی کی تحقیق اور جو کچھ اس کلمہ میں ہے اس پر یقین کرنے اور اس کلمہ کے ذکر میں اخلاص اور اس پر ہمیشگی کرنے اور اس کی طرف محبت کا میلان کرنے اور اسی کی وجہ سے لذت وسرور حاصل کرنے اور صاحب کلمہ کا مراقبہ اور مشاہدہ کرنے کے اعتبار سے ہے۔

(وعامرھنّ) یہ منصوب ہے اور اس عطف ہے السمٰوت پر۔ اور **عامر الشی** شئی کے محافظ مصلح اور مدبر کو کہا جاتا ہے جو شئی کو خلل پڑنے سے محفوظ رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شہر کے رہائشی اور مقیم کو عامر کہا جاتا اور یہ عمرت المکان سے ہے۔ اور یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب آپ کسی مکان میں اقامت اختیار کر لیں۔ اور یہاں معنی اعم یعنی ساکن مراد ہے تا کہ اللہ کے ارشاد غیری کا استثناء درست ہو سکے۔

(غیری) یہ بات امام طیبیؒ نے کہی ہے اور بعض نے غیرہٗ کہا ہے۔ ضمیر کا مرجع ساکن یعنی ان کے ساکن کے علاوہ اس صورت میں استثناء منقطع ہے۔ یا عامرھن سے **ممسکھن** مراد لیا جائے تو اس صورت میں استثناء متصل ہوگا۔ کیونکہ اللہ بھی ممسک ہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**ان اللّٰہ یمسك السموات والارض ان تزولا**﴾

21/21

اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ عامرھن سے آسمانوں کے عاجزی جنس مراد ہے۔خواہ وہ فرشتہ ہو یا اس کے علاوہ کوئی اور۔اور اللہ بھی آسمانوں کی حفاظت اور نور پیدا کرنے کے اعتبار سے عامر ہے۔تو لہٰذا اللہ بھی عامرِ آسمان کی جنس میں اس حیثیت سے داخل ہیں کہ آسمانوں کی صلاح ذات باری تعالیٰ پر موقوف ہے۔جیسا کہ ان کی صلاح ساکن پر موقوف ہے۔اسی وجہ سے استثناء فرمایا یا اور ایک صورت یہ ہے کہ یا غیری یا عامر سے مراد حاضر لیا جائے۔تو اللہ بھی ان آسمانوں میں علم اور اطلاع کے اعتبار سے حاضر اور موجود ہے۔

(والارضین) راء کے فتح اور سکون کے ساتھ ہے۔(السبع) یعنی سات طبق مراد ہیں۔بعض کہتے ہیں کہ سات اقلیم مراد ہیں۔لیکن یہ بات ان کی ضعیف ہے۔(وضعن) مجہول کا صیغہ ہے۔(فی کفۃٍ) کاف کے کسرہ اور فاء کی تشدید کے ساتھ ہے۔یعنی میزان کے دو پلڑوں میں ایک پلڑا ہے۔اور کفہ کا اطلاق ہر گول چیز پر کیا جاتا ہے۔(ولا الٰہ الا اللّٰہ) یعنی اس کلمے کا مفہوم یا اس کلمے کا ثواب رکھا جائے۔(فی کفۃٍ) اور اس پر حدیث بطاقۃ بھی دلالت کرتی ہے۔(لمالت بھن) یعنی یہ کلمہ ان ساری چیزوں کے مقابلہ میں راجح اور غالب ہو جائے گا۔اس لئے کہ ساری چیزیں اللہ کے سوا اللہ کے وجود کے پیش نظر معدوم کی مثل ہیں۔اس لئے کہ اللہ کی ذات کے سوا ہر چیز ہلاکت سے دوچار ہونے والی ہے۔اور ظاہر ہے کہ معدوم چیز ثابت اور موجود چیز کا موازنہ اور مقابلہ نہیں کر سکتی۔اور حدیث بطاقہ میں آپ ﷺ کے فرمان ''لا یثقل مع اسم اللّٰہ شیئ کا یہی مطلب ہے یعنی اللہ کے نام کے مقابلہ میں کوئی چیز وزنی نہیں ہو سکتی۔(لا الٰہ الا اللّٰہ) یہ اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو لانے کے قبیل سے ہے۔ممکن ہے کہ اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر لا الٰہ الا اللّٰہ کو لانا برائے تعجب یا بر بنائے پختگی تلقین ہو۔

اختلافِ روایت: اس کو ابن حبان اور نسائی نے ابو سعید خدریؓ سے اور بزار نے ابن عمر سے مرفوعاً ''لو ان اھل السمٰوات والارضین السبع فی کفۃ ولا الٰہ الا اللّٰہ فی کفۃٍ مالت بھم'' کے الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے۔یعنی کلمہ لا الٰہ الا اللہ ان ساری چیزوں پر راجح اور زائد ہو جائے گا۔اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ باء برائے تعدیہ ہے۔تو مالت بھم امالتھن کے معنی میں ہوگا۔تو اس صورت میں رجحان اور زیادتی والی تفسیر بالازم ہوگی۔(اس لئے کہ کسی کو جھکا دینا یہ لازم ہے راجح ہونے کو)۔اور مالت بھم میں ھم ضمیر برائے ذوی العقول ذوی العقول کی شرافت کے پیش نظر لائی گئی ہے۔جیسا کہ اس کے برعکس ھن ضمیر غیر ذوی العقول تعلیباً ان کی کثرت کی وجہ سے لائی گئی ہے۔اور یہ حدیث اس بات کی بہت زیادہ صراحت کرنے والی ہے کہ افضل الذکر لا الٰہ الا اللہ ہے کیونکہ اس کے ثواب سے بڑھ کر کوئی ثواب نہیں ہے۔

۲۳۱۰: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ وَاَبِیْ هُرَیْرَةَ قَا لَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ صَدَّ قَهٗ رَبُّهٗ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا وَاَنَا اَكْبَرُ وَاِذَا قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَ هٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ يَقُوْلُ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا وَحْدِیْ لَا شَرِيْكَ لِیْ وَاِذَا قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَ نَا لِیَ الْمُلْكُ وَلِیَ الْحَمْدُ وَاِذَا قَالَ لا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ قَالَ لا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِیْ وَكَا نَ يَقُوْلُ مَنْ قَالَهَا فِیْ مَرَضِهٖ ثُمَّ مَا تَ لَمْ تَطْعَمْهُ النَّارُ. (رواه الترمذی وابن ماجة)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۵٦/۵ حدیث رقم ۳٤۹۰۔ وابن ماجه ۱۲٤٦/۲ حدیث رقم ۳۷۹٤۔

ترجمہ: ''حضرت ابو سعید خدریؓ و حضرت ابو ہریرہؓ دونوں کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص یہ کہتا ہے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ بہت بڑا ہے تو اس کا رب اس کی تصدیق کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ لا الٰہ الا انا و انا اکبر بیشک میرے سوا کوئی معبود نہیں اور میں بہت بڑا ہوں جب وہ شخص یہ کہتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو یکتا

ہے اس کا کوئی شریک نہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں میرے ہی لئے بادشاہت ہے اور میرے ہی لئے تعریف ہے اور جب وہ شخص یہ کہتا ہے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور گناہوں سے بچنا اور اطاعت کی قوت پانا اللہ ہی کی مدد سے ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے بے شک میرے سوا کوئی معبود نہیں' گناہوں سے بچنا اور اطاعت کی قوت پانا میری ہی مدد سے ہے نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص ان کلمات کو اللہ تعالیٰ کے جوابوں کے علاوہ اپنی بیماری میں کہتا رہے اور پھر مرجائے تو اسے آگ نہیں جلائے گی یعنی وہ دوزخ کے عذاب سے محفوظ رہے گا۔'' (ترمذی وابن ماجہ)

تشریح: قولہ: (قال رسول صلی اللہ علیہ وسلم ......قال) یعنی قال کا فاعل ربہٗ ہے۔ یعنی اس کا رب اسکے بیان کی تصدیق کے طور پر فرماتا ہے۔ (لا الٰه الا انا وانا اکبر) یہ اللہ پاک کے قائل کیلئے صدقت کہنے سے زیادہ ابلغ ہے۔ (واذا قال) یعنی قال کا فاعل عبد ہے۔

(لا الٰه الا اللّٰه وحدهٗ لا شریك له یقول اللّٰه) یعنی اپنے بندے کی تصدیق کے طور پر کہا جاتا ہے۔ (لا الٰه الا انا وحدی ولا شریك لی) یعنی ذات وصفات میں میرا کوئی شریک نہیں۔ اور یہاں جملہ صدقهٗ ربهٗ کو اس لئے حذف کر دیا گیا کیونکہ ماقبل سے اس کا علم ہو جاتا ہے۔ بطور تفنن فی الکلام یہاں اللہ کے فرمان کو یقول کے ساتھ تعبیر کیا گیا اور اس سے سابق میں اور آئندہ آنے والے مقام میں یقال سے تعبیر کیا۔

اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اختلاف تعبیر میں ایک مقام پر یقول سے تعبیر کرنا اس حالت مستمرہ دائمہ کے ازلی اور ابدی طور پر استحضار کی وجہ سے ہو۔ (یعنی اللہ کی یہ تصدیق وامانہ امانی کے ساتھ مقید نہیں بلکہ جس وقت سے بندے یہ کہتے آرہے ہیں اور کہتے رہیں گے۔ اللہ پاک بھی تصدیق کرتے آرہے ہیں کرتے رہیں گے۔ توحید محض اور تفرید محض پر مشتمل ہونے کی وجہ سے دیگر کلمات کی نسبت اس کلمے کی خصوصیت کے طرف اشارہ ہے۔

(واذ قال لا الٰه الا اللّٰه له الملك وله الحمد) یعنی حمد اس کے غیر کیلئے نہیں جیسا کہ یہ حصر تقدیم مفعول سے سمجھا جارہا ہے۔ اور لہ کا لام برائے ملک واستحقاق واختصاص ہے (یعنی حمد اور ملک اللہ کی ملک ہے اور اللہ ہی ان کا مستحق ہے اور یہ چیزیں اللہ ہی کے ساتھ مختص ہیں)۔

(قال لا الٰه الا انا لی الملك ولی الحمد) یعنی جس طرح میرے بندے نے کہا۔ (واذا قال لا الٰه اللّٰه ولا حول ولا قوة الا باللّٰه) اور ولا حول میں واؤ یا تو برائے عطف ہے یا برائے حال لیکن اس کا حالیہ ہونا زیادہ ظاہر ہے یہی وجہ ہے کہ آنے والے جملہ میں واؤ کو ترک کر دیا گیا۔ (قال لا الٰه الا انا لا حول) اور ایک نسخہ میں ماقبل والے ولا حول سے مطابقت پیدا کرتے ہوئے ولاقوۃ ہے۔ (ولا فوق الابی) یعنی جیسا کہ میرے بندے نے اس کا اقرار کیا ہے۔ (وکان) یعنی جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

(یقول من قالها) یعنی ضمیر کا مرجع یہ کلمات ہیں ان کے جوابات نہیں۔ (فی مرضه ثم مات) یعنی موت اسی مرض کی وجہ سے ہو۔ (لم تطعمه النار) یعنی آگ ان کلمات کے قائل کو نہ تو جھلسائے گی نہ جلائے گی۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ لم تطعمهٗ لم تاکله کے معنی میں ہے اور یہاں بطور مبالغہ استعارۃً طعم کو جلانے کے معنیٰ استعمال کیا گیا ہے۔

۲۳۱۱: وَعَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ اَنَّهٗ دَخَلَ مَعَ النَّبِیِّ عَلٰی امْرَاَةٍ وَبَیْنَ یَدَیْهَا نَوًی اَوْحَصًی تُسَبِّحُ بِهٖ فَقَالَ اَلَا اُخْبِرُكِ بِمَا هُوَ اَیْسَرُ عَلَیْكِ مِنْ هٰذَا اَوْاَفْضَلُ سُبْحَانَ اللّٰهِ عَدَدَ مَا خَلَقَ فِی السَّمَاءِ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ عَدَ دَ مَا خَلَقَ فِی الْاَرْضِ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ عَدَدَ مَابَیْنَ ذٰلِكَ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ عَدَدَ مَا هُوَ خَالِقٌ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ مِثْلَ ذَا لِكَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ مِثْلَ ذٰلِكَ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مِثْلَ ذٰلِكَ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ مِثْلَ ذٰلِكَ.

(رواہ الترمذی وابوداود وقال الترمذی هذا حدیث غریب)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۲/ ۸۰ حدیث رقم ۱۵۰۰ ـ والترمذی فی السنن ۵/ ۲۲۲ تحت رقم ۳۶۳۹ـ

ترجمہ: ''حضرت سعد ابن وقاصؓ سے روایت ہے کہ ایک دن نبی کریم ﷺ کے ہمراہ ایک خاتون کے ہاں گئے اس خاتون کے سامنے کھجور کی گٹھلیاں یا کنکریاں پڑی ہوئی تھیں اور وہ ان پر تسبیح پڑھ رہی تھی نبی کریم ﷺ نے یہ دیکھ کر ارشاد فرمایا'' کیا میں تمہیں ایک ایسی تسبیح نہ بتا دوں جو اس تسبیح کے مقابلہ میں تمہارے لئے بہت آسان بھی ہے بلکہ وہ تسبیح بہت بہتر ہے اور وہ تسبیح یہ ہے: سُبْحَانَ اللّٰهِ عَدَدَ مَا خَلَقَ فِي السَّمَاءِ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ عَدَدَ مَا خَلَقَ فِي الْاَرْضِ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ عَدَدَ مَابَيْنَ ذٰلِكَ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ عَدَدَ مَا هُوَ خَالِقٌ۔ اللہ کے لئے پاکی ہے اس مخلوق کی بقدر جو زمین وآسمان کے درمیان ہے اور اللہ تعالیٰ کے لئے پاکی ہے اس مخلوق کی تعداد کے بقدر جو زمین وآسمان کے درمیان ہے اور اللہ تعالیٰ کیلئے پاکی ہے اس مخلوق کی تعداد کے بقدر جو اسکے بعد ازل سے ابد تک کی جانے والی ہے اور اللہ اکبر بھی اسی طرح پڑھے اور الحمد للہ بھی اسی طرح پڑھے اور لا الہ الا اللہ بھی اسی طرح پڑھے اور لا حول ولا قوۃ الا باللہ بھی پڑھے۔ (ترمذی، ابوداؤد) امام ترمذی فرماتے ہیں: ''یہ حدیث غریب ہے'' اور ایک نسخہ میں حسن غریب کے الفاظ ہیں۔

تشریح: **انه دخل مع النبی ﷺ علی امراة:** یعنی یہ عورت یا تو آپ ﷺ کی محرم تھی۔ یا یہ واقعہ حکم حجاب نازل ہونے سے پہلے کا ہے پھر داخل ہونے سے دیکھنا لازم نہیں آتا اور اگر رویت پائی جائے تو اس پر حصول شہوت لازم نہیں آتا۔ (**وبین یدیها**) واؤ حال یہ ہے۔ (**نویً**) یہ نواۃ کی جمع ہے۔ اور نواۃ کھجور کی گٹھلی کو کہتے ہیں۔ (**او حصًی**) یہ شک راوی کی جانب سے ہے۔ (**تسبح**) فاعل امراۃ ہے۔ (**به**) یعنی ضمیر کا مرجع گٹھلی یا کنکری ہے اور یہ حدیث آپ ﷺ کی تقریر کی وجہ سے دانوں والی تسبیح کے جواز کیلئے صحیح بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے کہ یہ تسبیح بھی ان کنکریوں اور گٹھلیوں کے معنی میں ہے اس لئے کہ جس چیز سے شمار کیا جائے خواہ وہ پروئی ہو یا بکھری ہوئی ہو اس میں کوئی فرق نہیں۔ لہٰذا جو لوگ اس مروجہ تسبیح کو بدعت کہتے ہیں ان کی بات کا کوئی اعتبار نہیں۔

اور بعض مشائخ کہتے ہیں کہ یہ تسبیح شیطان کا گھوڑا ہے اور یہ واقعہ بھی نقل کیا جاتا ہے کہ ایک دن کسی نے حضرت جنیدؒ کی وصول اللہ کی انتہائی حالت میں ان کے ہاتھ میں تسبیح دیکھی اور پوچھا کہ حضرت یہ کیا تو آپ نے جواب دیا کہ ہم اسی تسبیح کی وجہ سے تو اللہ کی طرف پہنچے ہیں۔ اب بھلا اس کو کیسے چھوڑ دیں۔ حضرت جنیدؒ کا یہ قول شاید صوفیاء کے قول النهاية هي الرجوع الى البداية کے مطالب میں سے ایک مطلب ہے یعنی انتہا درحقیقت ابتدا کی طرف لوٹنا ہے۔

(**فقال**) قال کا فاعل نبی اکرم ﷺ ہیں۔ (**والا اخبرك بما هو یسر**) یعنی زیادہ آسان اور ہلکا (**علیك من هذا**) یعنی اس تعداد سے۔ (**او افضل**) بعض حضرات کہتے ہیں کہ او یہ حضرت سعدؓ کے جانب سے شک یا ان کے علاوہ کی جانب سے اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ او واؤ کے معنی میں ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ یہ او بل کے معنی میں اور بل کے معنی میں ہونا اس کا زیادہ ظاہر۔

علامہ ابن ملکؒ امام طیبیؒ کی متابعت میں فرماتے ہیں کہ ان کے افضل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان کلمات میں اپنے قصور کا اعتراف ہے۔ بایں طور کہ بندہ اس کی ثناء کا احاطہ کرنے پر قادر نہیں۔ اور گٹھلیوں سے شمار کرنے میں اس بات پر اقدام ہے کہ وہ احصاء اور احاطہ پر قادر ہے۔ انتہیٰ کلامہ۔

لیکن ابن ملک کی یہ بات قابل اشکال ہے اس لئے کہ گٹھلیوں سے شمار کرنے میں اس قسم کا اقدام لازم نہیں آتا۔ اور اس قسم کی چیز پر اقدام عوام کا انعام ہی کر سکتے ہیں۔ بلکہ مراد کو اللہ زیادہ جانتا ہے۔ ممکن ہے کہ آپ ﷺ نے اس عورت کی کثرت الفاظ کے عالم سے

حقائق اور معانی کی وحدۃ کی طرف ترقی کا ارادہ کیا ہو۔اور حقائق و معانی کی وحدت گنتی سے خارج ہے بلکہ یہ مدد امداد پر موقوف ہے۔یا یہ ہے کہ اذکار کے سلسلہ میں شمار اس عورت کے دل میں ایک حال سا پیدا کر دیتا ہو۔جو حال ہر حالت میں اس کے دل میں کھٹکتا رہتا ہو۔اور یہ چیز ارباب کمال کے ہاں عیب ہے۔یہی وجہ ہے کہ ارباب کمال میں کسی نے اپنے دوست کو فرمایا جو گن گن کر دے رہا تھا کہ تو گناہ اندازے کے ساتھ کرتا ہے اور معصیت بغیر لکھنے کے اور اللہ کو حساب سے یاد کرتا ہے۔یا اس وجہ سے کہ جب اللہ بندے پر انعام بلا احصاء کرتا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وان تعدو نعمة الله لا تحصوها﴾[ابراهيم:٣٤] تو اس لئے معاملہ میں بہتر مقابلہ علی وجہ المماثلة ہونے چاہئے۔(یعنی جس طرح نعمت من جانب اللہ بلا حساب ہے تو اس کی یاد بھی بلا حساب ہونی چاہئے)۔تو اس لئے سالک اللہ کو بغیر حساب کے یاد کرے یا اس حدیث میں جمیع اشیاء کی تسبیح کی صورت میں مقامِ مکاشفہ کی طرف اشارہ ہے۔"کما قال تعالیٰ: ﴿ ان من شئ الا يسبح بحمده ولكن لا تفقهون تسبيحهم﴾[اسراء:٤٤]

(وسبحان الله عدد ما خلق في الارض) یعنی جملہ عالم سفلیات ہیں۔بعض حضرات نے اسی طرح کہا ہے لیکن زیادہ ظاہر یہ ہے کہ یہاں متعین زمین و آسمان ہی مراد ہیں۔اس کی دلیل آپ ﷺ کا ارشاد (وسبحان الله عدد ما بين ذالك) ہے یعنی مذکورہ آسمان و زمین کے درمیان کی چیزیں خواہ وہ ہوا ہو یا پرندے یا اس کے علاوہ بادل وغیرہ۔(وسبحان الله عدد ما خلق) یعنی ان چیزوں کی تعداد کے برابر جن کا وہ خالق ہے یا جن چیزوں کو بعد میں پیدا کرنے والا ہے اور اسی کو علامہ ابن حجرؒ نے اختیار کیا ہے اور زیادہ ظاہر بھی یہی ہے۔لیکن زیادہ دقیق اور مخفی قول وہ ہے جس کے قائل امام طیبیؒ ہیں۔یعنی جن چیزوں کا وہ اول سے ابد تک خالق ہے ان چیزوں کی تعداد کے برابر اللہ کی پاکی،اور مراد اس سے دوام واستمرار ہے اور یہ چیزوں کی تفصیل کے بعد ان کا اجمال ہے اسلئے کہ جب اسم فاعل کا اسناد ذات باری تعالیٰ کی طرف ہو۔تو اس میں ابتدائے خلق سے ابد تک استمرار ہوا کرتا ہے۔اس لئے کہ جب آپ یوں کہتے ہیں کہ اللہ قادر عالم تو اللہ کے علم وقدرت کے سلسلہ میں آپ کا قصد کسی زمانہ متعین کے ساتھ خاص نہیں ہوتا۔

(والله اكبر مثل ذالك) امام طیبیؒ فرماتے ہیں۔کہ عدد ماهو خالق میں لفظ عدد قرائن سابقہ کی وجہ سے مصدریت کی بناء پر منصوب ہے۔اور بعض شارحین نے مثل کو بھی منصوب کہا ہے۔کیونکہ یہ مثل بھی عدد کے معنی میں ہے تقدیر عبارت یوں ہوگی: "الله اكبر عدد ما هو خالقهٗ" یعنی جن چیزوں کا اللہ خالق ہے ان چیزوں کی تعداد کے برابر اللہ اکبر۔تو گویا اشارہ ذالک کا مرجع مذکورہ زیادہ قریبی کو بنایا گیا ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ مشار الیہ مذکورہ تمام چیزیں ہیں تقدیر عبارت یوں ہوگی "الله اكبر عدد ما خلق في السماء والله اكبر عدد ما خلق في الارض والله اكبر عدد ما بين ذلك ـ والله اكبر عدد ما هو خالق"۔

(الحمد لله مثل ذالك) یعنی اس طریقے پر۔(ولا اله الا الله مثل ذالك) یعنی اس حالت پر (ولا حول ولا قوة الا بالله مثل ذالك) یعنی اسی طرح۔اظہر بات یہی ہے کہ یہ اختصار راوی کی جانب سے ہے۔راوی نے ملالت طوالت کے ڈر سے حدیث کے آخری حصہ کو بالمعنی نقل کر دیا ہے۔اور یہ جو ہم نے کہا ہے اس پر بعض آثار دلالت کرتے ہیں۔واللہ اعلم۔

۲۳۱۲: وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ سَبَّحَ اللّٰهَ مِائَةً بِالْغَدَاةِ وَمِائَةً بِالْعَشِيِّ كَانَ كَمَنْ حَجَّ مِائَةَ حَجَّةٍ وَمَنْ حَمِدَ اللّٰهَ مِائَةً بِالْغَدَاةِ وَمِائَةً بِالْعَشِيِّ كَانَ كَمَنْ حَمَلَ عَلٰى مِائَةِ فَرَسٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَنْ هَلَّلَ اللّٰهَ مِائَةً بِالْغَدَاةِ وَمِائَةً بِالْعَشِيِّ كَانَ كَمَنْ اَعْتَقَ مِائَةَ رَقَبَةٍ مِنْ وُلْدِ اِسْمَاعِيْلَ وَمَنْ كَبَّرَ اللّٰهَ مِائَةً بِالْغَدَاةِ وَمِائَةً بِالْعَشِيِّ لَمْ يَاْتِ فِيْ ذٰلِكَ الْيَوْمِ اَحَدٌ بِاَكْثَرَ مِمَّا اَتٰى بِهٖ اِلَّا مَنْ قَالَ مِثْلَ ذٰلِكَ اَوْزَادَ عَلٰى مَا قَالَ. (رواه الترمذی وقال هذا حديث حسن غريب)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵/۱۷۶ حدیث رقم ۳۵۳۸۔

ترجمہ: ''حضرت عمرو ابن شعیب اپنے والد مکرم سے اور وہ اپنے جد محترم سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''جو شخص سو مرتبہ دن کے ابتدائی حصہ میں اور سو مرتبہ دن کے آخری حصہ میں سبحان اللہ کہے تو وہ اس شخص کے مانند ہے جس نے سو حج کئے ہوں جو شخص سو مرتبہ دن کے ابتدائی حصہ میں اور سو مرتبہ دن کے آخری حصہ میں الحمد اللہ کہے تو اس شخص کی مانند ہے جس نے سو آدمیوں کو خدا کی راہ میں سو گھوڑوں پر سوار کرایا ہو جو شخص سو مرتبہ دن کے ابتدائی حصہ میں اور سو مرتبہ دن کے آخری حصہ میں لا الہ الا اللہ کہے وہ اس شخص کی مانند ہے جس نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے سو غلام آزاد کئے ہوں' اور جو شخص سو مرتبہ دن کے ابتدائی حصہ میں اور سو مرتبہ دن کے آخری حصہ میں اللہ اکبر کہے تو اس دن کوئی شخص اس ثواب سے زائد ثواب لے کر نہیں آئے گا جو وہ لائے گا علاوہ اس شخص کے جس نے اس کی مانند مذکورہ تعداد میں کہا ہوگا تو یہ شخص درجہ ثواب کے اعتبار سے اس کے برابر ہوگا یا وہ شخص جس نے اس سے زائد کہا ہوگا۔ اسنادی حیثیت: امام ترمذیؒ نے فرمایا: ''یہ حدیث حسن غریب ہے۔''

تشریح: مائۃً: یعنی جس نے سو مرتبہ سبحان اللہ کہا۔ (بالغداۃ) غین اور دال دونوں مفتوح ہیں ان کے بعد الف ہے اور غین کا مضموم ہونا اور دال ساکن ہونا بھی جائز ہے اس صورت میں دونوں کے بعد واؤ ہوگا۔ یعنی غدوۃ۔

(ومائۃ بالعشی) یعنی دن کے ابتدائی حصہ میں اور رات کے ابتدائی حصہ میں یا صبح اور رات بھر۔ **(کان کمن حج مائۃ حجۃ)** یعنی حج سے مراد حج نفل ہے۔ حدیث اس بات پر دال ہے کہ ایسا ذکر جو ذات باری تعالیٰ کی حضوری شرط کے ساتھ بآسانی ہو جائے وہ غفلت کی حالت میں کی ہوئی عبادات شاقہ سے افضل ہے۔ ممکن ہے کہ حدیث مبالغہ فی الترغیب کی وجہ سے ناقص کو کامل کے ساتھ لاحق کرنے کے قبیل سے ہو۔ یا حدیث سے دگنے اجر والی تسبیح اور غیر دگنے اجر والے حج کے درمیان تساوی کا ارادہ کیا گیا ہو۔

(ومن حمد اللہ مائۃ بالبداۃ ومائۃ بالعشی کان کمن حمل) حمل تخفیف کے ساتھ یعنی سو آدمیوں کو سوار کیا۔ **(علی مائۃ فرس فی سبیل اللہ)** سبیل اللہ سے مراد جہاد ہے۔ یہ سوار کرنا صدقہ کے طور پر ہو یا عادت کے طور پر۔ اس حدیث میں ذاکر کیلئے ذکر کے بارے میں ترغیب ہے۔ تاکہ وہ دنیا کی طرف التفات نہ کرے۔ اور اپنے ارادے کو اپنے مولیٰ کی حضوری میں مجتمع کرے۔ اس لئے کہ مولیٰ کی حضوری ہی جمیع عبادات بدنیہ و مالیہ سے مقصود ہے۔ اور ان عبادات مالی و بدنی کا مرکب اللہ کا ذکر ہے۔ اور مطلوب وسیلہ سے زیادہ بہتر ہوا کرتا ہے۔ (یعنی ذکر اللہ وسیلہ سے اس سے مطلوب حضوری مع اللہ)۔

(ومن ھلل) یعنی جس نے لا الہ الا اللہ کہا۔ **(مائۃ مرۃً بالغدوۃ ومائۃ بالعشی کان کمن اعتق مائۃ رقبۃً)** اس جملہ حدیث میں ان ذاکرین کیلئے تسلی ہے۔ جو بوجہ فقر ان عبادات مالیہ سے عاجز ہیں جو مالدار لوگوں کے ساتھ مختص ہوتی ہیں۔ **(من ولد اسماعیل)** لفظ ولد واؤ کے ضمہ اور لام کے سکون کے ساتھ ہے اور ان دونوں کا مفتوح ہونا بھی درست ہے۔ یعنی ولد اس کا اطلاق واحد تثنیہ جمع سب پر ہوتا ہے۔ یعنی وہ عرب جو جناب اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ کیونکہ غلاموں کی اصناف میں سے یہ افضل صنف ہے۔ کیونکہ یہ لوگ ہمارے نبی ﷺ کے اقارب میں سے ہیں۔ اور یہ معنی عتق میں ایک قسم کا مبالغہ اور تعمیم ہے۔

(ومن کبر اللہ...... ذالک الیوم) یوم سے مراد یوم قیامت ہے۔ **(باکثر)** یعنی اس سے اکثر ثواب نہیں لائے گا۔ یا اس سے مراد افضل عمل نہیں لائے گا۔ اس لئے کہ اکثر افضل کے معنی میں ہے۔ **(مما اتی بہ)** یعنی جو اس ذکر کو لایا ہے یا اس کی مثل کو۔ علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں ظاہر یہی ہوتا ہے کہ یہ آخری ذکر ماقبل والے تمام اذکار سے افضل ہے۔ اور جس چیز پر احادیث صحیح کثیرہ دلالت کرتی ہیں وہ یہ ہے کہ افضلیت کی ترتیب یوں ہے۔ پہلے تہلیل پھر تحمید پھر تکبیر پھر تسبیح۔ (حالانکہ یہاں تکبیر سب سے افضل ہے)۔ تو اس لئے یہاں

تاویل کی جائے گی اور تقدیر عبارت کے طور پر یوں کہا جائے گا "لم یات فی ذالك الیوم احد غیر المهلل والحامد۔ اکثر مما اتٰی به) یعنی قیامت کے دن کوئی مہلل اور حامد کے علاوہ اس سے بڑھ کر ثواب نہیں لائے گا جو یہ مذکور لایا ہے۔

۲۳۱۳: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلتَّسْبِیْحُ نِصْفُ الْمِیْزَانِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ یَمْلَؤُهٗ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ لَیْسَ لَهَا حِجَابٌ دُوْنَ اللّٰهِ ﷺ حَتّٰی تَخْلُصَ اِلَیْهِ.

(رواه الترمذی وقال هذا حدیث غریب ولیس اسناده بالقوی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۹۷/۵ حدیث رقم ۳۵۸٤۔

ترجمہ: "حضرت عبداللہ ابن عمروؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا "سبحان اللہ کہنا آدھی میزان اعمال کو بھر دیتا ہے الحمدللہ کہنا پوری میزان عمل کو بھر دیتا ہے اور لا الٰہ الا اللہ کے لئے خدا تک کوئی پردہ حائل نہیں یہ سیدھا خدا تک پہنچتا ہے" امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے۔ اسنادی حیثیت: امام ترمذی نے کہا ہے کہ "یہ حدیث غریب ہے، اس کی اسناد قوی نہیں ہے۔" اھ۔ یعنی اس کی سند ضعیف ہے۔ لیکن اعمال کی فضیلت کے سلسلہ میں اس حدیث پر عمل کیا جائے گا۔

تشریح: نصف المیزان: یعنی اس کا ثواب مجسم ہونے کے بعد نصف میزان کو بھر دے گا اس سے مراد میزان کے دو پلڑوں میں سے ایک پلڑا مراد ہے جو نیکیاں رکھنے کیلئے بنایا گیا ہے۔ (والحمد لله یملاهٗ) یعنی پورے میزان کو بھر دے گا یا نصف میزان کو۔ دوسرا احتمال زیادہ ظاہر ہے۔ کیونکہ جملہ اذکار دو چیزوں میں منحصر ہیں۔ (۱) تحمید۔ (۲) تنزیہ۔ (اور یہاں صرف تحمید ہے اس لئے یہ نصف ذکر ہے نصف میزان کو بھرے گا)۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں۔ نصف میزان تسبیح ہے اور دوسرا نصف تحمید ہے۔ تسبیح اور تحمید مساوی ہیں۔ اور حدیث ثقیلتان فی المیزان اس کے زیادہ مناسب ہے۔ اور تحمید کی تسبیح پر فضیلت کا بھی احتمال ہے۔ کہ اکیلا الحمدللہ میزان کو بھر دے گا۔ کیونکہ یہ تنزیہ کو بھی شامل ہے۔ اس لئے کہ الحمدللہ یہ وصف بالکمال ہے اور وصف بالکمال نقصان کی نفی کو بھی متضمن ہے۔ اور نقصان کی نفی تنزیہ کہلاتی ہے۔ اور اس کی تائید جناب نبی اکرم ﷺ کے ارشاد (ولا اله الا الله لیس لها......) سے ہوتی ہے کیونکہ یہ تہلیل تحمید اور تنزیہ دونوں کے متعلق ہے۔ اسی وجہ سے یہ تہلیل موجب قرب باری تعالیٰ ہے۔ اور آپ ﷺ کے ارشاد (حتی تخلص) کا یہی مطلب ہے تخلص لام کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ (الیه) یعنی اللہ کے پاس پہنچ جائے۔ اور محل قبولیت میں جا پڑنے۔ لیس لها حجاب والے جملے یا اس کی مثل دوسرے جملوں سے سرعت قبولیت اور کثرت اجر و ثواب مراد ہے۔ اور اس حدیث میں اس بات پر ظاہری دلالت ہے کہ لا الٰہ الا اللہ سبحان اور الحمد للہ سے افضل ہے۔

۲۳۱۴: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا قَالَ عَبْدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُخْلِصًا قَطُّ اِلَّا فُتِحَتْ لَهٗ اَبْوَابُ السَّمَآءِ حَتّٰی یُفْضِیَ اِلَی الْعَرْشِ مَا اجْتَنَبَ الْکَبَآئِرَ (رواه الترمذی وقال هذا حدیث غریب)

اخرجه الترمذی فی السنن ۲۳۳/۵ حدیث رقم ۳٦٦۰۔

ترجمہ: "حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جب کوئی بندہ خلوص قلب کے ساتھ یعنی بغیر ریا کے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے تو اس کلمہ کے لئے آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ عرش تک پہنچتا ہے یعنی جلد قبول ہوتا ہے بشرطیکہ وہ کلمہ کہنے والا کبیرہ گناہوں سے بچتا ہو۔

اسنادی حیثیت: امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: عبدٌ: یعنی اپنی عبدیت اور اپنے وجود کے حدوث کا شعور رکھتے ہو۔ اور اپنے رب کی الوہیت اور اپنے معبود کی واحدانیت کو یاد کرتے ہوئے۔ (**لا اله الا الله مخلصًا**) یعنی ریاء اور شہرت کی نیت سے نہ کہے یا مؤمن ہو منافق نہ ہو۔ (**ابو اب السماء حتی یفضی**) لفظ یفضی یاء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ **ای یصل**۔ (**الٰی لعرش ما اجتنب**) اجتنب کا فاعل قائل ہے۔ (**الکبائر**) اور ایک نسخہ میں اجتنب صیغہ مجہول کے ساتھ ہے اور کبائر نیابت فاعل کی بناء پر مرفوع ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں حدیث سابق تہلیل کے تجاوز من العرش پر دلالت کرتی ہے۔ حتی کہ تہلیل اللہ تعالیٰ کی طرف پہنچ جاتی ہے۔ لیکن مراد چونکہ اس سے سرعت قبولیت ہے۔ اور کبائر سے اجتناب سرعتِ قبولیت کی شرط ہے۔ ثواب قبولیت کی شرط نہیں۔ اس طرح کبائر سے اجتناب کمال ثواب کی شرط ہے یا قبولیت کے اعلیٰ مراتب کی شرط ہے۔ اس لئے کہ برائی نیکی کو ضائع نہیں کرتی بلکہ نیکی برائی کو ختم کر دیتی ہے۔ اور اس حدیث کا یہ مطلب حدیث سابق کے مطابق ہے۔ اور باقی علامہ ابن حجر کا **الا فتحت لهٗ** کی وضاحت کرتے ہوئے: **ای لروحه عقب موته** کی تقدیر عبارت تقدیر غیر محلہ ہے۔ (یعنی اس عبارت کی تقدیر اس محل کے مناسب نہیں ہے)۔ اور نہ ہی اس کی طرف احتیاج ہے اور پھر اس تقدیر عبارت کی یہ علت بیان کرنا کہ وہ قائل چونکہ مؤمنین میں سے ہے اور مؤمنین کیلئے آسمان کے دروازے کھولے جاتے کافروں کیلئے نہیں۔ اس لئے قائل مؤمن کی روح کیلئے اس کی موت کے بعد آسمان کے دروازے کھول دیئے جائیں گے۔ یہ علت بیان کرنا بھی درست نہیں ہے۔ کیونکہ حدیث میں کبائر سے اجتناب کے ساتھ مقید ہے۔

۲۳۱۵: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَقِيْتُ اِبْرَاهِيْمَ لَيْلَةَ اُسْرِیَ بِیْ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ اِقْرِئْ اُمَّتَكَ مِنِّی السَّلَامَ وَاَخْبِرْ هُمْ اَنَّ الْجَنَّةَ طَيِّبَةُ التُّرْبَةِ عَذْ بَةُ الْمَاءِ وَاَنَّهَا قِيْعَا نٌ وَاَنَّ غِرَ اسَهَا سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ. (رواه الترمذی وقال هذا حديث حسن غريب اسنادا)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۷۳/۵ حدیث رقم ۳۵۲۹۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''جس رات مجھے معراج کی سعادت نصیب ہوئی اس رات میں ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے میری ملاقات ہوئی انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ ''محمد! اپنی امت کو میرا سلام کہئے گا اور انہیں بتا دیجئے گا کہ جنت کی مٹی پاکیزہ ہے' اس کا پانی شیریں ہے' اس کا میدان خالی ہے اور اس کے درخت ہیں سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ۔ امام ترمذیؒ اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ روایت باعتبار اسناد کے غریب ہے۔''

تشریح: ......**امرهم**: اس سے مراد جناب خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں جیسا کہ ایک نسخہ میں خلیل کی صراحت ہے۔ (**لیلة اسری بی**) لفظ لیلۃ مابعد کی طرف مضاف ہے اور ایک نسخہ میں لفظ لیلۃ تنوین کے ساتھ ہے۔ یعنی **لیلة اسری فیها بی** اور اس سے مراد معراج کی رات ہے۔

(**فقال**) قال کا فاعل حضرت ابراہیمؑ ہیں۔ اور یہ اس رات ساتویں آسمان میں اپنے مقام پر بیت المعمور کی طرف ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ (**یا محمد اقرئُ امتك**) یعنی ان کو پہنچا دیجئے۔ (**من السلام**) اور ایک نسخہ میں **اقرأ امتك منی** ہے۔ یعنی میری جانب سے یا میرے ہاں سے۔ لغت کی کتاب نہایہ میں ہے کہ کہا جاتا ہے **اقرأ فلان فلانًا السلام** یعنی فلاں نے فلاں کو سلام پڑھایا۔ اور **اقرا علیه السلام** یعنی اس کو سلام پڑھا دے۔ گویا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ اس کو سلام پہنچائے گا تو اس کو اس بات پر برانگیختہ

کرنا کہ وہ سلام پڑھے اور اس کو واپس لوٹائے۔ مقدمہ میں اسی طرح ہے لیکن لغت کی کتاب صحاح اور قاموس میں یوں ہے کہ: قرأہٗ السلام اور اقرأہٗ السلام ایک ہی معنی میں ہیں۔ تو جناب ابراہیم علیہ السلام کے سلام کو جو شخص بھی سنے تو اس کو چاہئے کہ وہ یوں کہے **علیه السلام ورحمة الله وبرکاتهٗ**۔

(**واخبرهم ان الجنة طيبة التربة**) تربت سے مراد تراب یعنی مٹی ہے۔ کیونکہ جنت کی مٹی کستوری اور زعفران ہیں اور ان میں سے زیادہ عمدہ کوئی چیز نہیں۔ (**قيعان**) قاف کے کسرہ کے ساتھ قاع کی جمع ہے اور قاع ایسی زمین کو کہتے ہیں جو برابر اور درختوں سے خالی ہو۔ (**وان**) فتح اور کسرہ دونوں کے ساتھ ہے۔ (**غراسها**) غین معجمہ کے کسرہ کے ساتھ اور بفتح الغین غرس کی جمع ہے۔ اور غرس ہر ایسی چیز کو کہتے ہیں۔ جس کو زمین میں چھپایا جائے۔ جیسے بیج وغیرہ تاکہ وہ اس چھپائے جانے کے بعد اگ آئے اور جب مٹی عمدہ ہو اور اس کا پانی شیریں ہو تو پودا بہت عمدہ ہوتا ہے اور خصوصاً جبکہ یہ کھیتی کلمات طیبہ ہوں جن کو باقیات صالحات کہا گیا ہے۔

(**سبحان والحمد لله ولا اله الا الله والله اكبر**) اور مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ اپنی امت کے لوگوں کو یہ بتلا دیں یہ کلمات اور اس کی مثل دیگر کلمات اپنے قائل کیلئے دخول جنت کا اور کثرت اشجار کا سبب ہیں جن اشجار میں اس قائل کا ٹھکانہ ہوگا۔ اس لئے کہ جب ان کلمات کو بار بار پڑھے گا تو ان کی تعداد کے برابر درخت اگتے جائیں گے۔ علامہ ابن ملکؒ فرماتے ہیں یعنی یہ کلمات اپنے قائل کو جنت کا وارث بنا دیں گے تو گویا سبب یعنی کلمات سے مراد مسبب یعنی جنت لی گئی ہے۔ انتہیٰ کلامہ۔ اور اس میں مزید بحث بھی ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں اس حدیث میں ایک اشکال ہے وہ یہ ہے کہ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ جنت کی زمین درختوں اور محلات سے خالی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ﴿**جنٰت تجری من تحتها الانهار**﴾[البقرة:٢٥] اس پر دلالت کرتا ہے کہ جنت کی زمین درختوں سے خالی نہیں۔ اس لئے کہ اس کا نام جنت ہی ایسے درختوں کی وجہ سے رکھا گیا ہے۔ جو درخت ٹہنیوں کے آپس میں ملنے کی وجہ سے گھنے اور سایہ دار ہیں۔ جواب اشکال کا یہ ہے کہ جنت کی زمین اصل کے اعتبار سے تو چٹیل میدان ہی تھی پھر اللہ پاک نے عارفین کے اعمال کے اعتبار سے اس میں درخت اور محلات پیدا فرما دیئے۔ اور ہر عامل کیلئے اس کے عمل کے سبب سے وہ چیز ہوگی جو اس کے ساتھ مختص ہے۔ پھر اللہ پاک نے اس کیلئے پیدا کردہ عمل کی تفسیر فرمائی تاکہ وہ اس کی وجہ سے ثواب کو پا سکے تو اس عامل کو مجازاً درخت لگانے کی طرح قرار دیا۔ سبب کا مسبب پر اطلاق کرنے کے طور پر اور دوسرا جواب یہ بھی ہے کہ حدیث میں جنت کے کلی طور پر درختوں اور محلات سے خالی ہونے پر دلالت نہیں اس لئے کہ صاف میدان ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اکثر حصہ پر تو درخت لگے ہوئے ہیں لیکن اس حصہ کے علاوہ اور بھی بہت ساری وسیع جگہیں ہیں جہاں درخت نام کی کوئی چیز نہیں تاکہ ان کلمات کے ذریعے درخت لگائیں جا سکیں۔ اس درخت اصلی جو بغیر کسی سبب کے لگے ہوئے ہیں اور وہ درخت جن کا سبب یہ کلمات ہیں۔ جدا جدا ہیں۔ علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ خلاصہ کلام یہ ہے کہ اکثر حصے پر تو درخت لگے ہوئے ہیں تاکہ وہ درخت ان کلمات کے علاوہ دیگر اعمال صالحہ کے مقابلہ میں ہو سکیں۔ اور باقی درخت ان کلمات کی وجہ سے لگتے ہیں۔ تاکہ ان کلمات کا ثواب اپنی عظیم فضیلت کیوجہ سے ممتاز ہو جائے۔ جیسا کہ احادیث سابقہ سے معلوم ہو چکا ہے۔ انتہیٰ کلامہ۔

لیکن علامہ ابن حجرؒ کے سارے کلام کا دونوں جوابوں کا حاصل ہونے یا کسی ایک جواب کا حاصل ہونے میں اشکال ظاہر ہے۔ تأمل کیجئے۔ اور میرے دل میں جو بات کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ اہل جنت میں اقل وہ ہوگا جس کے درخت ہوں گے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿**ولمن خاف مقام ربه جنتان**﴾[الرحمن:٤٦] اور کہا جاتا ہے کہ جنت میں درخت نہریں یہ ساری چیزیں محض نفل کے طور پر پیدا کی گئی ہیں۔ اور دوسری جنت میں مذکورہ چیزیں ہونے کے اعمال واذکار حدوث کی وجہ سے پائی جائیں گی اور ان کا تعلق باب عدل

سے ہے۔اس آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں بعض صوفیاء کے قول جنت فی الدنیا وجنت فی العقبٰی کا یہی مطلب ہے۔یعنی ایک جنت دنیا میں ہے جو اعمال واذکار ہیں۔اور ایک جنت آخرت میں وہ فضل خداوندی ہے۔

اختلاف روایت: ابن ماجہ حاکم طبرانی نے حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً یغرس لك لكل واحدة شجرة فی الجنة روایت کیا گیا ہے۔

۲۳۱۶: وَعَنْ يُسَيْرَةَ كَانَتْ مِنَ الْمُهَاجِرَاتِ قَالَتْ قَالَ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَلَيْكُنَّ بِالتَّسْبِيْحِ وَالتَّهْلِيْلِ وَالتَّقْدِيْسِ وَاعْقِدْنَ بِالْاَنَامِلِ فَاِنَّهُنَّ مَسْؤُلَاتٌ مُسْتَنْطَقَاتٌ وَلَا تَغْفُلْنَ فَتَنْسَيْنَ الرَّحْمَةَ. (رواہ الترمذی وابوداود)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۸۱/۲ حديث رقم ۱۵۰۱۰۔ والترمذی فی السنن ۲۳۰/۵ حديث رقم ۳۶۵۳۔ واحمد فی المسند ۳۷۱/۶۔

ترجمہ: ''حضرت یسیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جو مہاجرات میں سے ہیں فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ہم عورتوں سے ارشاد فرمایا کہ سبحان اللہ لا الہ الا اللہ سبحان الملك القدوس یا سبوح القدوس رب الملائکۃ کو پڑھنا اپنے لئے ضروری قرار دو‘اوران مذکورہ تسبیحات کو‘اپنی انگلیوں پر شمار کرو کیونکہ ان انگلیوں سے پوچھا جائے گا اور ان کو گویائی دی جائے گا اور یاد رکھو‘ذکر سے غافل مت ہونا یعنی ذکر کو ترک نہ کرنا‘ورنہ رحمت سے تمہیں بھلایا جائے گا یعنی ذکر کو چھوڑ کر بیٹھ جاؤ گی تو اس کے بے شمار ثواب سے محروم ہوگی۔'' (ترمذی‘ابوداؤد)

راویٔ حدیث:

یسیرۃ۔ یہ یسیرہ ''یاسر'' کی والدہ ہیں۔یہ مہاجر عورتوں میں سے ہیں۔ان سے ان کی پوتی ''حمیضہ بنت یاسر'' نے روایت کی۔'' یسیرہ''میں یاء پر ضمہ سین مہملہ پر فتحہ‘یاء ساکن اور راء ہے۔ان کو''اُسیرہ'' بھی کہا جاتا ہے۔

تشریح: وعن یسرة : یاء کے ضمہ اور سین فتح کے ساتھ ہے اور کہا گیا ہے کہ اسیرہ ہمزہ کے ساتھ ہے اور یہ ام یاسر انصاریہ صحابیات میں سے ہیں۔بعض کہتے ہیں کہ مہاجرات میں ہیں۔ اور ظاہر یہی ہے اس لئے کہ متن میں وکانت من المهاجرات ہے۔اور باقی رہا ابن ملک کا قول کہ یہ راویہ بنت یاسر ہیں۔ یہ ان کے قلم کا سہو ہے۔(قالت قال لنا) یعنی عورتوں کی جماعت کو فرمایا۔(رسول اللهﷺ علیکن) یہ اسم فعل الزمن اور اسکن کے معنی میں ہے۔یعنی تم عورتیں لازم پکڑو۔(بالتسبیح والتهلیل والتقدیس) یعنی سبحان الملك القدوس یا سبوح قدوس رب الملائکه واروح وغیرہ کہنا۔ممکن یہ ہے کہ آپ ﷺ کی مراد تقدیس سے تکبیر ہو۔کیونکہ اس کو ان معدودات میں ذکر کرنا جن کا ذکر اس کے موافق دیگر روایات میں بھی پایا جاتا ہے اس پر دال ہے۔

علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اہل عرب کی عادت ہے ایک کلمہ جب تکرار سے ان کی زبانوں پر آتا ہو تو وہ تسہیل تکرار کیلئے اس کلمے کے بعض حروف کو بعض حروف کے ساتھ ملا کر مختصر کر لیتے ہیں جیسے حوقلہ‘حیعلہ‘بسملہ اور جیسے تہلیل وغیرہ یہ تہلیل لا الہ الا اللہ سے ماخوذ ہے۔جب کوئی لا اله الله کہے تو اہل عرب کہتے ہیں''هیلل الرجل وهلل الرجل۔یعنی آدمی نے لا الہٰ الا اللہ کہا۔لیکن علامہ ابن حجر کی یہ بات کئی وجہ سے درست نہیں۔پہلی وجہ تو یہ ہے کہ بسم اللہ جیسے دیگر کلمات مصنوعہ ہیں۔اہل عرب کے وضع کردہ نہیں ہیں۔(اس لئے ان کو عادت عرب کی طرف منسوب کرنا درست نہیں)۔اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اختصار والی بات حوقلہ حیعلہ وغیرہ میں درست ہے۔لیکن تسبیح اور تقدیس یہ دونوں قیاسی مصدر ہیں کیونکہ تقدیس اور تسبیح کا معنی ہے اللہ کو صحیح اور قدس بنانا یعنی اللہ کو ذکر واعتقاد کی صورت میں صفات حلول

حدوث اور اتحاد سے منزہ کرنا۔ اور تہلیل کا معنی ہے اللہ کو مہلل بنانا اور احلال کا معنی ہے رفع الصوت یعنی اللہ کی توحید اور اس کی یکتائی کے اثبات کی صورت میں اس مرفوع الصوت بنانا۔ ہاں البتہ **هيلل** یہ **بسمل** کے قبیل سے ہے نہ کہ تہلیل اس طرح کہ سجل اور قدسل میں یہ سارے کلمات مختصر ہیں لیکن تسبیح اور تقدیس تہلیل وغیر مصادر قیاسی ہیں۔ اگر سجل اور قدسل سنے جائیں یا ان کی بناء کی جائے تو درست ہے کیونکہ ان دونوں کے مقابل کلمات کی دلالت پائی جا رہی ہے۔ (یعنی جس طرح دیگر کلمات کا اختصار بن سکتا ہے تو ان کا بھی)۔ لیکن مذکورہ تسبیح تہلیل اور تقدیس وغیرہ میں ایسی بات نہیں اور یہ بات بھی ہے کہ یہ مصادر یا باب تفعیل کے موضوع طریقے پر ہیں۔ مصدر موضوع صرف باب **فعللہ** کے ساتھ خاص ہے۔ جیسا کہ یہ بات طے شدہ ہے۔

اور باقی رہا ان کا تسبیح کی تفسیر سبحان اللہ سے کرنا اور تہلیل کی لا الہ الا اللہ سے اور تقدیس کی سبحان الملک القدس سے تو یہ ہماری بات کو مضر نہیں کیونکہ یہ تفسیر معنوی ہے، جو معنی کلی کی طرف سے جو مفہوم مصدری ہے کفایت کرنے والی ہے۔ **(واعقدن)** قاف کے کسرہ کے ساتھ یعنی تسبیح اور تہلیل وتقدیس کے عدد کو شمار کرو۔ **(بالانامل)** یعنی پوروں کے جوڑوں یا ان کے سیروں کے ذریعے جیسا کہ کہا جاتا **عقد الشیٔ بالانامل**۔ یعنی اس نے چیز کو پوروں کے ذریعے شمار کیا۔ باقی رہا علامہ ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ **اعقدن** کا معنی **عدھن** یا تقدیر عبارت **اعددن** ہے۔ ان دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں۔ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان عورتوں کو اس بات پر تحریض کی ہے کہ ان کلمات کا اپنے پوروں کے ذریعے احصاء کریں تا کہ ان کلمات کے ذریعے ان کے وہ گناہ زائل ہو جائیں جن کا وہ ارتکاب کرتیں ہیں۔ اور یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ عورتیں ضبط حساب کو جانتی تھیں۔ علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں ایک جماعت کے مذہب کے مطابق بالانامل میں باء اثبات میں زائد ہے۔ (یعنی نفی میں باء زائدہ نہیں ہوتی بلکہ اثبات میں زائد ہوتی ہے تو اس لئے باء بمعنی من ہو گی یعنی **من الانامل**) لیکن باء کو اثبات میں زائد کہنا اور اس سے من کی طرف انتقال محض وہم ہے۔ وگرنہ باتفاق جو مغنی اللبیب کتاب میں ضابطہ ہے وہ یہ ہے کہ مفعول میں باء کی زیادتی کثیر ہے اور یہ زیادتی اثبات اور نفی کے ساتھ مقید نہیں جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**وهزی الیك بجرع النخلة**﴾[مریم:۲۵] اور: ﴿**فلیمدد بسبب الی السماء**﴾[الحج:۱۵] اور ﴿ **ومن یردفیه بالحاد**﴾[الحج:۲۵] اور ﴿**فطفق مسحًا بالسوق**﴾[ص:۳۳] اور ﴿**ولا تلقوا بایدیکم الی التهلکة**﴾[البقرۃ:۱۹۵] اور ظاہر یہی ہے کہ انامل سے مراد اصابع یعنی انگلیاں ہیں اور یہ بعض کا اطلاق کر کے کل مراد لینے کے قبیل سے ہے۔ اور یہ مبالغہ کے طور پر جو ارشاد باری تعالیٰ: ﴿**یجعلون اصابعهم فی اذانهم**﴾[البقرۃ:۱۹] میں وارد ہوا ہے۔ اس کے برعکس ہے۔ (یعنی یہاں اصابع کل بول کر انامل بعض مراد ہے)۔ اور اس حدیث میں اذکار کے شمار اور ابرار کی دانوں والی تسبیح کا جواز ہے اور حضرت ابو ہریرۃ کے پاس ایک دھاگہ تھا جس میں گانٹھیں تھیں اور حضرت ابو ہریرہؓ اس دھاگے کے ذریعے تسبیح کیا کرتے تھے۔ اور مروجہ تسبیح کے عدم جواز کا گمان درست نہیں۔ کیونکہ اس کی اصل سنت سے ثابت ہے۔ اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''**اصحابی کالنجوم بایهم اقتدیتم اهدیتم**'' اس لئے حضرت ابو ہریرہؓ کی اقتدا بھی باعث ہدایت ہے۔ اور عقد کو انامل کے ساتھ مقید کرنا افضل ہونے پر دلالت ہے۔ اس لئے کہ اس پر اس کی علت دلالت کرتی ہے۔ اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: **(فانهن)** یعنی انگلیوں کے یہ پورے بھی دیگر اعضاء کی طرح **(مسؤولات)** یعنی انگلیوں کے ان پوروں سے ان کے کیے ہوئے کے بارے میں سوال کیا جائیں۔ اور یہ سوال کیا جائے گا کہ ان کو کس کام استعمال کیا گیا ہے۔ **(مستنطقات)** طاء کے فتح کے ساتھ ہے۔ یعنی ان میں قوت گویائی پیدا کی جائے گی جس کی وجہ سے کلام کریں گے اور صاحب انامل کے حق میں یا اس کے خلاف گواہی دیں گے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**یوم تشهد علیهم السنتهم وایدیهم وارجلهم بما کان**

یعملون﴾[النور:۲٤]اور﴿**وما کنتم تسترون ان یشھد علیکم ولا ابصارکم ولا جلودکم**﴾[فصلت:۲۲]
اس میں اعضاء کواپنے رب کی مرضی میں استعمال کرنے پرترغیب اوراعضاء کوفواحش اور گناہوں سے محفوظ رکھنے پر تحریض ہے۔
(**ولا تغفلن**) فاء کے ضمہ کے ساتھ اور فاء کا مفتوح ہونا غلط ہے۔اوراس کا صلہ عن الذکر ہے۔یعنی تم عورتیں ذکر کو مت چھوڑنا۔
(**فتنسین**) تاء کے فتحہ کے ساتھ یعنی فتترکن۔(**الرحمة**) یعنی غفلت کے سبب سے اورنسیان مراد رحمت کے اسباب کو بھول جانا ہے۔
یعنی تم عورتیں ذکر کو مت چھوڑنا اس لئے کہ اگر تم نے ذکر کو چھوڑ دیا تو تم اس کے ثواب سے محروم ہو جاؤ گی۔گویا کہ تم اللہ کی رحمت کو چھوڑ بیٹھو گی اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:﴿**فاذکرونی**﴾[البقرۃ:۱۵۲]یعنی مجھے طاعت کی صورت میں یاد کرو اذکرکم یعنی میں تم کو رحمت کی صورت میں یاد کروں گا اور ایک نسخہ میں باب انساء سے مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے۔یعنی تم کوذکرِ رحمت کا محافظ بنایا گیا ہے۔اورتم ان کے سوال کے متعلق حکم دیا گیا ہے اور جب غفلت اختیار کرو گی تو گویا تم جو چیز تمہارے پاس ودیعت رکھی گئی تھی تم نے اس کو ضائع کر ڈالا اور تم نے اللہ کی رحمت کو چھوڑ ڈالا۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ **لا تغفلن** میں دو چیزوں کی نہی ہے۔یعنی جو چیزیں ذکر کی ہیں اس سے غفلت اختیار نہ کرنا لیکن عدم غفلت اس طرح ہو کہ ذکر اور اس کی محافظت اور اس کو توثیقاً انگلیوں کے ساتھ شمار کرنے پر لزوم ہو۔اور آپ ﷺ کا ارشاد فتنسین یہ جواب لو ہے یعنی اگر تم اس چیز جس کو ذکر کیا ہے۔غافل ہو گئیں تو تم اللہ کی رحمت کو چھوڑ بیٹھو گی اور یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد:﴿**لا تطغوا فیه فیحل علیکم غضبی**﴾[طه:۸۱]
یا مطلب یہ ہے کہ تمہارے جانب سے غفلت نہ ہو ورنہ اللہ کی جانب سے ترک رحمت ہوگا۔تو گویا نسیان کو ترکِ رحمت سے تعبیر کیا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿**وکذلك الیوم تنسٰی**﴾[طه:۱۲٦] ترجمہ:

الفصل الثالث:

۲۳۱۷: عَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ قَالَ جَاءَ اَعْرَابِیٌّ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ عَلِّمْنِی كَلَامًا اَقُوْلُهُ قَالَ قُلْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ اَللّٰهُ اَكْبَرُ كَبِيْرًا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا وَسُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ قَالَ فَهٰؤُلَاءِ لِرَبِّیْ فَمَا لِیْ فَقَالَ قُلْ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ وَارْحَمْنِیْ وَاهْدِنِیْ وَارْزُقْنِیْ وَعَافِنِیْ شَكَّ الرَّاوِیْ فِیْ عَافِنِیْ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ٤/۲۰۷۲ حدیث رقم (۳۳۔ ۲٦۹٦)۔

ترجمہ:''حضرت سعد ابن وقاصؓ کہتے ہیں کہ ایک دیہاتی نے نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ مجھے کوئی ایسا ذکر بتا دیجئے کہ جسے میں کہتا رہوں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا یہ پڑھ لیا کرو۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ اَللّٰهُ اَكْبَرُ كَبِيْرًا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا وَسُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اللہ بہت بڑا ہے اور اللہ ہی کے لئے بہت تعریف ہے اور پاکی ہے اللہ کے لئے جو پالنہار ہے تمام عالم کا گناہ سے بچنے کی طاقت اور عبادت کرنے کی قوت اللہ ہی کی مدد سے جو غالب حکمت والا ہے۔اس دیہاتی نے عرض کیا کہ کلمات تو میرے پروردگار کے ذکر کے لئے ہیں میرے لئے وہ کون سے کلمات ہیں جن کے ذریعہ میں اپنے لئے دعا مانگوں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اس طرح مانگو۔ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِیْ وَارْحَمْنِیْ وَاهْدِنِیْ وَارْزُقْنِیْ ...... اے میرے پروردگار! مجھے بخش دے مجھ پر رحم فرما مجھے ہدایت پر ثابت قدم

رکھ مال حلال سے مجھے روزی دے اور مجھے عافیت بخش! راوی کو لفظ عافنی کے بارے میں شک ہے آیا روایت میں یہ لفظ بھی ہے یا نہیں۔'' (مسلم)

تشریح: الی رسول اللّٰہ: اور ایک نسخہ میں الی لبنی ﷺ ہے۔ (قال قل لا الہ اللّٰہ وحدہٗ لا شریك لہ) آپ ﷺ نے ابتداء بالتوحید علی طریق التفرید فرمائی۔ اس لئے کہ توحید ہی ہر عبادت کا آغاز ہے۔ اور مرید و مراد کی کل سعادت کا اختتام ہے۔ (اللّٰہ اکبر) یعنی ہر کبیر سے اکبر ہے۔ یا یہ کہ اس سے کہ اس کی کبریائی کا احاطہ کیا جائے اکبر ہے اور یہی مطلب زیادہ بہتر ہے۔ (رب العالمین) یعنی تمام مخلوقات کا رب ہے اور العالمین جمع برائے ذوالعقول کو شرافت کی وجہ سے غلبہ دیا گیا ہے۔ (ولا حول ولا قوۃ الا باللّٰہ العزیز الحکیم) اور بزار کی روایت میں العلی العظیم کے الفاظ ہیں اور زبانوں پر بھی یہی کلمہ زیادہ مشہور ہے۔ اگر چہ یہ کلمہ صحیح مسلم میں وارد نہیں ہوا۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اکثر روایات میں یہ وارد نہیں ہوا۔ صرف امام احمد بن حنبل ہی جملہ کے بعد یہ کلمہ لائے ہیں۔ (قال) قال کا فاعل اعرابی ہے۔ (فھو لاء) مشار جملہ کلمات ہیں۔ اور ایک صحیح نسخہ میں ھو لاء بغیر فاء کے ہے۔ (لربی) یعنی یہ کلمات تو میرے رب کے ذکر کیلئے وضع شدہ ہیں۔ (فمالی) یعنی میری ذات کیلئے کیا دعا ہے۔ (فقال قل اللھم اغفرلی) یعنی برائیوں کو مٹانے کی صورت میں۔

(وارحمنی) یعنی جملہ حرکات وسکنات میں توفیق اطاعت کی صورت میں رحم فرما۔ (واھدنی) یعنی اچھے احوال کی طرف راہنمائی فرما۔ (وارزقنی) یعنی مال حلال۔ (شك الراوی فی عافنی) راوی کو لفظ عافنی کے اثبات اور نفی میں شک ہے۔ لیکن اولیٰ عافنی کے سلسلہ میں اثبات ہے کیونکہ اختتام دعا کے بعد اس کو لانے میں تو کوئی خرابی نہیں۔ باقی رہا علامہ ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ راوی کو لفظ عافنی میں شک گزرا ہے کہ آیا لفظ عافنی نبی اکرم ﷺ کی کلام سے ہے یا نہیں اور یہ اپنے ظاہر کے اعتبار سے اس بات پر مبنی ہے کہ راوی جس کو شک گزرا ہے وہ صحابی ہی ہو۔ حالانکہ راوی متعین نہیں تو اس لئے احتمال ہے کہ صحابی کے علاوہ کسی اور راوی کی جانب سے یہ شک ہوا اور پھر علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ عافنی کو احتیاطاً ذکر کیا جاتا ہے اس احتمال کی رعایت کے پیش نظر کہ ممکن ہے آپ ﷺ نے عافنی کا لفظ فرمایا ہو اور باقی رہا علامہ ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ اس کی نظیر ''رب انی ظلمت نفسی ظلمًا کثیرًا ہے کہ اس میں کثیراً اور کبیراً دونوں کو پڑھا جائے۔ تاکہ جو بھی روایت میں وارد ہوا ہے۔ اس کا ذکر یقینی ہو جائے۔ امام نووی کا یہ قول نقل کرنا یہ بات قاری صاحب کی نظر میں قابل اعتراض ہے کیونکہ اس طریقہ پر جمع کرنا وارد نہیں ہو۔ بلکہ جمع کے سلسلہ میں صحیح طریقہ یہ ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ دعا میں سے ایک مرتبہ کثیراً کہے اور دوسری مرتبہ کبیراً۔ واللہ اعلم۔

۲۳۱۸: وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْ لَ اللّٰہِ ﷺ مَرَّ عَلٰی شَجَرَۃٍ یَا بِسَۃِ الْوَرَقِ فَضَرَبَھَا بِعَصَاہُ فَتَنَاثَرَ الْوَرَقُ فَقَالَ اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰہِ وَسُبْحَانَ اللّٰہِ وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ تُسَاقِطُ ذُنُوْبَ الْعَبْدِ کَمَا یَتَسَاقَطُ وَرَقُ ھٰذِہِ الشَّجَرَۃِ۔ (رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث غریب)

اخرجہ الترمذی فی السنن ۵/۲۰۳ حدیث رقم ۳۵۹۹۔

ترجمہ: ''اور حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ خشک پتوں والے ایک درخت کے پاس سے گزرے تو آپ نے اپنا عصاء مبارک اس کی ٹہنیوں پر مارا جس کی وجہ سے پتے جھڑنے لگے۔ پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ الحمد للہ وسبحان اللہ' لا الہ الا اللہ واللہ اکبر پڑھنا بندوں کے گناہوں کو اسی طرح جھاڑتا ہے جس طرح اس درخت کے پتے جھڑ رہے ہیں'۔ اسنادی حیثیت: امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح:فضربها: یعنی درخت کی شاخوں کو۔(**بعصاہ فتناثر الورق**)ای **تساقط** گرنے لگے۔(**فقال ان الحمد للّٰہ**)اعراب حکائی کی بناء پر یا مبتدا ہونے کی وجہ سے الحمد مرفوع ہے اور ایک نسخہ میں منصوب ہے۔لیکن نصب ضعیف ہے۔(**و سبحان اللّٰہ**)اس کا نصب مصدر مفعول مطلق کی بناء پر ہے۔یعنی **سبحت سبحان اللّٰہ**۔(**و لا الٰہ الا اللّٰہ و اللّٰہ اکبر**)امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ کلمات اسم انّ منصوب ہیں اور اس کی خبر(**تساقط**)ہے۔تاء کے ضمہ کے ساتھ۔(**ذنوب العبد**)یعنی مذکورہ کلمات کو کہنے والا بندہ۔

(**کما یتساقط**)امام طیبیؒ فرماتے ہیں۔ تقدیر عبارت ہے **ای تساقط فتساقط کما یتساقط**۔(**ورق ھذہ الشجرہ**)آپ ﷺ کے قول **کما یتساقط** کو اگر مصدر تساقط محذوف کی صفت بنائے جائے تو پھر دو مصدروں کے درمیان مطابقت نہیں رہتی۔اور اگر اس کو ذنوب سے حال بنایا جائے تو درست ہے۔اور تقدیر عبارت یوں ہوگی۔**یتساقط الذنوب شبھًا تساقطھا یتساقط الورق** یعنی گرتے ہیں گناہ درآنحالیکہ ان کا گرنا مشابہ ہوتا ہے پتوں کے گرنے کے۔امام طیبیؒ کی تحقیق بھی اس طرح ہے لیکن علامہ ابن حجر نے اس موقع پر بہت غریب کلام کیا' وہ فرماتے ہیں کہ **کما** میں ما زائدہ ہے۔اور کاف مثل کے معنی میں ہو کر حال ہے۔اور تقدیر عبارت یوں ہوئی حال **کون تساقط الذنوب مثل تساقط ورق ھذہ الشجرۃ**۔یعنی درآنحالیکہ گناہوں کا گرنا اس درخت کے پتوں کے گرنے کی مثل ہے۔یہ عبارت شارحؒ کے مسلک سے اولیٰ ہے **کما لا یخفی** اور اس کی غرابت کی وجہ تقدیر عبارت میں بعینہٖ عبارت کو لانا ہے۔

۲۳۱۹: وَعَنْ مَکْحُوْلٍ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اَکْثِرْ مِنْ قَوْلِ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ فَاِنَّھَا مِنْ کَنْزِ الْجَنَّۃِ قَالَ مَکْحُوْلٌ فَمَنْ قَالَ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ وَلَا مَنْجَاً مِنَ اللّٰہِ اِلَّا اِلَیْہِ کَشَفَ اللّٰہُ عَنْہُ سَبْعِیْنَ بَابًا مِّنَ الضُّرِّ اَدْنَاھَا الْفَقْرُ. رواہ الترمذی **وقال ھذا حدیث لیس اسنادہ بمتصل ومکحول لم یسمع عن ابی ھریرۃ.**

اخرجہ الترمذی فی السنن ۵/۲۳۸ ۳۶۷۱۔ واحمد فی المسند ۳۳۳/۴۔

ترجمہ:''اور حضرت مکحولؒ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمایا: لاحول ولاقوۃ الا باللہ کثرت سے کہا کر' کہ یہ جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔مکحولؒ فرماتے ہیں جو شخص لا حول ولا قوۃ الا باللہ ولا منجأ من اللہ الا الیہ یعنی ضرر ونقصان کو دفع کرنے کی قوت اور نفع حاصل کرنے کی طاقت اللہ تعالیٰ کی حفاظت اور اس کی قدرت کی طرف سے ہے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نجات اسی پر منحصر ہے'' تو اللہ تعالیٰ اس سے ضرر ونقصان کی ستر قسمیں دور کر دیتا ہے جس میں ادنیٰ قسم فقر محتاجگی ہے امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس روایت کی سند متصل نہیں ہے کیونکہ حضرت ابو ہریرہؓ سے حضرت مکحولؒ کی سماعت ثابت نہیں ہے۔''

تشریح:(**وعن مکحول**)حضرت مکحول جلیل القدر تابعی سوڈان سے تعلق رکھتے تھے۔علامہ زہریؒ فرماتے ہیں کہ علماء چار ہیں۔مدینہ میں سعید ابن مسیب' کوفہ میں امام شعبی اور بصرہ میں حضرت حسنؒ اور شام میں مکحول۔اور یہ مفتی شام تھے جب تک **لا حول ولا قوۃ الا باللہ** نہ پڑھ لیتے اس وقت تک فتویٰ نہ دیتے اور انہوں نے حضرت انس بن مالکؓ واثلہ بن اسقع ابو ہند الوزان وغیرہم سے سماع کیا ہے اور ان سے علامہ زہریؒ امام اوزاعیؒ یحییٰ بن یحییٰ العسلؒ، ابن جریجؒ اور مالک بن انس نے سماع کیا ہے۔

(**عن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللّٰہ ﷺ اکثر من قول لا حول**)یعنی ضرر ختم کرنے سے۔(**ولا قوۃ**)یعنی جلب

منفعت پر۔(الا باالله)یعنی اسی کی حفاظت وقدرت کے ساتھ۔(فانها من كنز الجنة)یعنی یہ جنت کے ایسے ذخائر اور نفیس چیزوں میں سے ہے جو ایسے دن میں اپنے کہنے والے کو نفع پہنچائیں گے جس دن مال واولاد سودمند ثابت نہ ہوگی۔

(ادنا)یعنی جنس ضرر کا اقل درجہ۔(الفقر)یعنی فقر کا ضرر ہے اور ایک صحیح نسخہ میں ادناۂ کے بجائے ادرناھا ہے۔یعنی تکلیف کے ستر درجوں میں سے سب سے پست اور مغفرت کی نوع کے مراتب میں سے ادنیٰ مرتبہ فقر ہے۔اور فقر سے مراد فقر قلبی ہے۔جس کا ذکر ''كاد الفقر ان يكون كفرًا'' والی حدیث میں آیا ہے۔اس لئے کہ جب ان کلمات کا قائل ان کلمات کے معنی کا تصور کرے گا تو کلمات اس کے ہاں پختہ ہو جائیں گے۔اور اس کے قلب میں اس بات کا یقین بیٹھ جائے گا کہ معاملہ سارا اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔نفع اور ضرر اللہ ہی کی جانب سے ہوتا ہے اور عطاء کر دینا اور روک دینا اسی کی وجہ سے ہوتا ہے۔تو نتیجتاً بندہ معیت سے صبر اور نعمت پر شکر بجالاتا ہے۔اور اپنے معاملے کو زمین وآسمان کے پروردگار کی طرف سونپ دیتا ہے۔اور اللہ کی تقدیر اور اس کے فیصلے پر راضی ہو کر صف اولیاء اللہ میں شامل ہو جاتا ہے۔

اور پھر اس عدم اتصال کو(ومكحول لم يسمع عن)سے بیان کیا ہے۔علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ تمام نسخوں میں اسی طرح ہے۔اور مشہور من ہے یعنی لم يسمع من ہے عن کے جگہ۔میں کہتا ہوں کہ مشہور اس کا بنفسہ ایک کی طرف متعدی ہونا ہے اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ دو کی طرف تو تقدیر عبارت یوں ہوگی''لم يسمع مكحول الحديث ناقلاً او روايًا عن (ابی هريرة)اور یہ وہ نکتہ ہے جو حضرت مکحول نے مؤلف کی جاری شدہ عادت کے خلاف ابتدائے حدیث میں ذکر کیا ہے۔تاکہ انقطاع حدیث کی طرف اشارہ ہو جائے۔لیکن مؤلف کی تقویت حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے مرفوع روایت کی وجہ سے ہو جاتی ہے اور وہ یہ ہے''فقل لا حول ولا قوة الا باالله فانها كنز من كنوز الجنة''اس طرح صحاح ستہ کی جماعت نے روایت کیا ہے۔اور نسائی و بزار نے حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً''لا حول ولا قوة الا باالله کو بمع''لا منجا من الله الا اليه كنز من كنوز الجنة''روایت کیا ہے۔

۲۳۲۰:وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِا للّٰهِ دَ وَاءٌ مِنْ تِسْعَةٍ وَّ تِسْعِيْنَ دَاءً اَيْسَرُهَا الْهَمُّ .

اخرجه ابن ابی الدنيا ذكره فی كنز العمال ٤٥٤/١ الحديث رقم ١٩٥٦۔

ترجمہ:''حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِا للّٰهِ ننانوے بیماریوں کی دوا ہے جس میں سے ادنیٰ بیماری غم ہے۔''

تشریح:(وعن ابی هريرة..........دواء)یعنی ایسی معنوی دواء کہ جس کی تاثیر قوی ہے۔(من تسعة وتسعين داء)یعنی دنیا اور آخرت کی بیماریوں میں سے۔(ايسرها)یعنی ان میں اقل اور اسہل۔(الهم)مراد جنس ھم ہے خواہ دین کے متعلق ہو یا دنیا کے متعلق یا معاش کا حصہ اور آخرت کا غم۔اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ مرض ھم،غم نفس اور تنگیٔ نفس کا موجب اور ضعف قویٰ اور اختلال اعضاء کا سبب ہے۔اسی وجہ سے اللہ پاک نے اپنے نبی یونسؑ کو غم سے عافیت دے کر احسان جتلایا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿فاستجبنا له ونجيناه من الغم وكذلك ننجی المؤمنين﴾[الانبياء:۸۸]

۲۳۲۱:وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلَا اَدُلُّكَ عَلٰی كَلِمَةٍ مِنْ تَحْتِ الْعَرْشِ مِنْ كَنْزِ الْجَنَّةِ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَا لٰی اَسْلَمَ عَبْدِیْ وَاسْتَسْلَمَ (رَوَاهُمَا الْبَيْهَقِی فی الدعوات الكبير)

اخرجه الحاكم فی المستدرك۔

ترجمه: ''حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا تمہیں ایک ایسا کلمہ نہ بتا دوں جو عرش کے نیچے والے بہشت کے خزانے سے اترا ہے اور وہ یہ ہے لاحول ولا قوۃ الا باللہ جب کوئی بندہ یہ کلمہ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔''میرا بندہ تابعدار اور بہت فرمانبردار رہوا'' یہ دونوں حدیثیں بیہقی نے دعوات کبیر میں نقل کی ہیں۔''

تشریح: قال.......... کنز الجنۃ: امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ من تحت العرش یہ کلمۃ کی صفت ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ من برائے ابتداء ہو یعنی تقدیر عبارت تلك الكلمة ناشئة كائنة تحت العرش ہوگی اور من کنز الجنۃ میں من بیانیہ ہے اور جب عرش کو جنت کی چھت قرار دے دیا جائے تو پھر من کنز الجنۃ کا من تحت العرش سے بدل بننا بھی جائز ہے۔ انتہیٰ کلامہ۔

اور مطلب یہ ہے کہ یہ کلمہ عرش کے معنوی خزانوں اور بلند و بالا جنت کے ذخائر میں سے ہے۔ نہ کہ فانی حسی اور سفلی خزانوں میں سے ۔علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ''ای کلمة انزلت من الکنز الذی تحت العرش''۔یعنی یہ کلمہ اس خزانے میں سے ہے جس کو عرش کے نیچے اتارا گیا ہے اور یہ بات گذر چکی ہے کہ عرش کے نیچے خزانہ ہے۔ اور سورہ بقرہ کی آخری آیتیں بھی اسی خزانہ میں سے نازل کی گئی ہیں۔ اور یہ بھی جنت کے خزانہ میں سے ہیں۔من کنوز کی من برائے تبعیض ہے جیسا کہ حدیث مکحول میں اس کی صراحت ہو چکی۔

(لا حول ولا قوة الا باالله) یعنی دنیا اور آخرت کے امور میں۔ (یقول اللہ تعالیٰ) بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ استینافیہ ہے ان کلمات اور ان کے قائل کی بیان فضیلت کیلئے۔ اور امام طیبیؒ فرماتے ہیں یہ شرط محذوف کی جزاء ہے۔ اور وہ شرط''اذ قال العبد ھذہ الکلمة'' ہے۔یعنی جب بندہ یہ کلمہ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں اللہ کا یہ قول برائے ملائکہ ہوتا یعنی اللہ پاک اس کلمہ کے قائل کے کمال اور اس کے معنی کی عمدگی کو ملائکہ کے سامنے بیان کرنے کیلئے ملائکہ کو فرماتا ہے۔

(اسلم عبدی) یعنی میرا بندہ عناد کو ترک کر کے میرے تابع ہو گیا ہے اور ربوبیت کو تسلیم کرنے کی صورت میں عبودیت میں مخلص ہو گیا ہے۔(واستسلم) یعنی مکمل تابعداری اختیار کر لی ہے یا تابعداری میں انتہا کو پہنچ کر اس نے بندوں سے قطع نظر کر لیا ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں''ای غوص امور......''یعنی بندے نے کائنات کے جملہ امور اللہ کی طرف سونپ کر خود مخلص فی الدین ہو کر اللہ کی تابعداری اختیار کر لی ہے۔

۲۳۲۲: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّهٗ قَالَ سُبْحَانَ اللّٰهِ هِیَ صَلٰوةُ الْخَلَائِقِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ كَلِمَاتُ الشُّكْرِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ كَلِمَةُ الْاِخْلَاصِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ تَمْلَاُ مَابَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ وَاِذَا قَالَ الْعَبْدُ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اَسْلَمَ وَاسْتَسْلَمَ ۔ (رواہ رزین)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۰۱/۱۱۔ حدیث رقم ٦٣٠٧۔ وابن ماجه فی السنن ۱۲٥٤/۲ حدیث رقم ۳۸۱٦۔ واحمد فی المسند ۳٤۱/۲۔

ترجمه: ''اور حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا سبحان اللہ مخلوقات کی عبادت ہے الحمد للہ شکر کا کلمہ ہے۔ لا الہ الا اللہ اخلاص کا کلمہ ہے اور اللہ اکبر کا ثواب زمین و آسمان کے درمیان کو بھر دیتا ہے اور جب کوئی بندہ حضور قلب کے ساتھ لاحول ولا قوہ الا باللہ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ بندہ فرمانبردار ہوا اور اس نے مکمل فرمانبرداری کی۔''

تشریح: (سبحان اللہ ھی صلاۃ الخلائق) یعنی یہ ان کی عبادت و اطاعت ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿ان من شئ الا یسبح بحمدہ﴾

اس کو امام طیبیؒ نے ذکر کیا ہے اور اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿**کل قد علم صلوتہٗ وتسبیحہ**﴾[طور : ٤١] تسبیح یا زبانِ حال سے ہوتی ہے یا زبانِ قال سے۔ اس طرح کہ وہ تسبیح صانع پر اور اس کی قدرت حکمت پر دال ہو۔ (**والحمد للّٰہ کلمۃ الشکر**) یعنی عمدۃ الشکر اور رأس الشکر ہے جیسا کہ گذر چکا ہے۔ (**ولا الہ الا اللّٰہ کلمۃ الاخلاص**) یعنی ایسا کلمہ توحید ہے جو اپنے قائل کیلئے اخلاص من النار کا موجب ہے یا یہ ایسا کلمہ ہے جو صدق واخلاص کے بغیر سودمند نہیں ہے۔ (**واللّٰہ اکبر تملأ**) تملأ صیغہ مؤنث کلمہ کی صفت کے پیش نظر ہے۔ اور لفظوں کے اعتبار سے یہ مذکر ہے یعنی **یملأ ثوابھا او عظمتہ**" یعنی اس کا ثواب یا اس کی عظمت بھر دیتی ہے۔

(**ما بین السماء والارض**) اس لئے کہ زمین آسمان میں جو بھی بڑی چیز ہے وہ ان دونوں کی نسبت حقیر ہے۔ (**واذ قال العبد ولا حول ولا قوۃ الا باللّٰہ**) یعنی کہ مبنیٰ کا تصور اور اس کے معنی کا یقین کر لے۔ (**قال اللّٰہ تعالٰی اسلم**) یعنی اسلاماً کاملاً۔ (**واستسلم**) یعنی ظاہر اور باطن کے اعتبار سے تابع ہو چکا۔

بَابُ الْاِسْتِغْفَارِ وَالتَّوْبَةِ

استغفار وتوبہ کا بیان

استغفار کا معنی طلب مغفرت ہے اور کبھی لفظ استغفار توبہ کے معنی کو متضمن ہوتا ہے اور کبھی متضمن نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے علیحدہ طور پر لفظ توبہ لائے ہیں یا استغفار زبان سے ہوتا ہے اور توبہ دل سے اور پھر توبہ واستغفار معصیۃ سے توبہ کی طرف یا غفلت سے ذکر کی طرف اور رعیت سے حضور کی طرف لوٹ جانے کو کہتے ہیں۔ اور یہ شریعت کے مقاصد میں ایک اہم مقصد ہے۔ اور سالک آخرت کے مقامات میں سے پہلا مقام ہے۔ اور اللہ کی بندے کیلئے مغفرت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک دنیا میں بندے کے گناہ کو اس طرح چھپا دے کہ کسی کو اس پر اطلاع نہ ہونے پائے اور آخرت میں اس گناہ پر سزا نہ دے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ توبہ ابتدا میں گناہ کو اس کی قباحت کی وجہ سے ترک کر دینے اور جو کچھ اس سے صادر ہوا ہے اس پر شرمندہ ہو جانے اور ترک معاودۃ پر پختہ ارادہ کرنے اور ممکن حد تک تدارک کرنے کا نام ہے۔ لہٰذا متروکہ اعمال کا اعادہ کی صورت میں تدارک کرے یہ امام راغب کا کلام ہے۔

علامہ نوویؒ کچھ زیادتی کرتے ہوئے یوں فرماتے ہیں کہ اگر گناہ بنی آدم کے متعلق ہے تو اس کیلئے یہ بھی شرط ہے کہ دبایا ہوا حق صاحب حق کی طرف رد کرے یا اس سے براۃ حاصل کرے۔ اور علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں۔ پھر اگر اس پر کوئی حق ہو جیسے قضاء نماز تو وہ وقت کو نفل یا فرض کفایہ میں خرچ کرنے کی وجہ سے تسامح سے کام نہ لے۔ اس لئے کہ فسق سے نکلنا اس قضاء نماز کی ذمہ داری سے نکلنے پر موقوف ہے تو وہ آدمی مثلاً جب تک نفل پڑھتا رہے گا تو وہ اسی فسق میں باقی رہے گا۔ باوجودیکہ اس کو اس سے پر نکلنے پر قدرت ہے۔ اور قضا نماز کے باوجود نفلوں میں باقی رہنا فسق ہے جیسا کہ یہ بات واضح ہے۔

الفصل الاول :

۲۳۲۳: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنِّی لَاَ سْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَاَتُوْبُ اِلَیْهِ فِی الْیَوْمِ اَكْثَرَ مِنْ سَبْعِیْنَ مَرَّةً. (رواہ البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ١٠١/١١۔ حدیث رقم ٦٣٠٧۔ وابن ماجه فی السنن ١٢٥٤/٢ حدیث رقم ٣٨١٦۔

واحمد فی المسند ۲/۳٤۱۔

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''قسم ہے اللہ کی میں دن میں ستر بار سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں''۔ (بخاری)

تشریح: قال رسول اللہ ﷺ واللّٰہ: یہ قسم برائے تاکید خبر ہے۔ (انی لاستغفر اللّٰہ) یعنی طاعت میں اپنی کوتاہی کی وجہ سے یا عبادت میں اپنے آپ کو کچھ سمجھنے کی وجہ سے یہی وجہ ہے آپ ﷺ اپنی نماز کے بعد ترجیع اور تکرار کی صورت میں استغفار بجا لاتے۔ (واتوب الیہ) یعنی اس کی شریعت اور شعائر کے بعد اس کے احکام کی طرف رجوع کرتا ہوں یا ممکن ہے کہ لفظ استغفار سے اس کی طرف توبہ کے جدا ہونے کا اشارہ ہے۔ یا استغفار اشتغال بالخلق کو اور توبہ التفات الی الحق کو کہتے ہیں۔

(فی الیوم اکثر من سبعین مرۃً) اس میں تحدید کا احتمال ہے جیسا کہ مائۃ مرۃ دونوں روایتوں کے پیش نظر جو آگے آ رہی ہیں اور اس بات کا بھی احتمال ہے کہ سبعین مرۃً اور مائۃ مرۃ) دونوں روایتوں سے تکثیر مراد ہو۔ ابن ملک فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کی ہر دن میں ستر مرتبہ توبہ اور استغفار گناہ کی وجہ سے نہ تھی اس لئے کہ آپ ﷺ معصوم ہیں بلکہ ذوالجلال والاکرام ذات کی بارگاہ کے شایانِ شان عبودیت کی عدمِ بجا آوری کے سلسلہ میں اعتقاد قصور کی وجہ سے تھا جب آپ ﷺ معصوم ہونے اور تمام مخلوقات سے بہتر ہونے کے باوجود ہر دن میں ستر مرتبہ سے اکثر اپنے رب کی طرف توبہ اور استغفار کرتے تھے تو گناہ گاروں کو تو اس سے بھی زیادہ کرنا چاہئے۔ اور استغفار کہتے ہیں قول و فعل کے ساتھ اللہ سے مغفرت طلب کرنا اور اللہ کی جانب سے مغفرت کا مطلب یہ ہے کہ بندے کو عذاب پہنچنے سے محفوظ کر دے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ زمین پر اللہ کے عذاب سے دو امان تھے۔ ایک امان تو اٹھا لیا گیا تو لہٰذا تم دوسرے امان کو اختیار کر کے اس کو مضبوطی سے تھام ہو جو امان روئے زمین سے اٹھا لیا وہ امان جناب نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی ہیں۔ اور جو امان روئے زمین پر باقی ہے وہ استغفار ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ما کان اللّٰہ معذبھم وھم یستغفرون﴾ میں کہتا ہوں کہ جب استغفار کافروں کیلئے مفید ہے تو یہ استغفار مؤمنین کو کیونکر نہ نافع ہوگا اور کہا گیا ہے کہ آپ ﷺ کا استغفار اپنے لئے نہ تھا بلکہ اپنی امت کیلئے تھا تو لہٰذا آپ ﷺ کا استغفار امت کے حق میں شفاعت کے مرتبہ میں ہوگا۔

۲۳۲۴: **وَعَنِ الْاَغَرِّ الْمُزَنِی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّهٗ لَيُغَانُ عَلٰى قَلْبِیْ وَاِنِّیْ لَاَ سْتَغْفِرُاللّٰهَ فِی الْيَوْمِ مِائَةَ مَرَّةٍ** (رواہ مسلم)

اخرجہ مسلم فی صحیحہ ٤/۲۰۷۵ حدیث رقم ٤۱۔ ۲۷۰۲۔ واحمد فی المسند ٥/٤۱۱۔

ترجمہ: ''اور حضرت اغر مزنیؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک میرے دل پر پردہ ڈالا جاتا ہے اور میں دن میں سو مرتبہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتا ہوں''۔ (مسلم)

راویٔ حدیث:

الاغر المزنی۔ یہ ''اغر مزنی'' صحابی ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ ''جہنی'' ہیں ان کا شمار اہل کوفہ میں ہے ابن عمر رضی اللہ عنہ اور معاویہ بن قرہ نے ان سے روایت کی ہے۔ ''اغر'' میں ہمزہ مفتوح اور غین معجمہ مفتوح اور راء مشدد ہے۔ ''مزنی'' قبیلہ ''مزینہ'' کی طرف منسوب ہے صحاح ستہ میں ان سے صرف یہی ایک حدیث مروی ہے۔

تشریح: (عن الاغر) ہمزہ اور عین کے فتحہ اور راء کی تشدید کے ساتھ۔ (المزنی) یہ نسبت ہے قبیلہ مزنیہ کے ساتھ اور مزنیہ تصغیر ہے اور نے نسبت جھنی ذکر کی ہے۔ ان کو آپ ﷺ کی صحبت کا شرف حاصل ہوا ہے۔ اس حدیث کے علاوہ صحاح ستہ کے کتب میں

ان سے کوئی روایت مروی نہیں ہے۔ یہ بات علامہ میرکؒ نے ذکر کی ہے۔(قال قال رسول اللهﷺ انه) یعنی یہ ضمیر شان ہے۔ (ليغان) یاء کے ضمہ کے ساتھ یعنی يبطق يغشي يستر يغطي سب کا معنی ڈھانپ لینا ہے۔(على قلبى) یعنی میرے رب کے ارادہ کے وقت۔ (وانى لاستغفر الله) یعنی اس غین کی وجہ سے عین کے ساتھ حجاب بین کے ساتھ این کے مرتبہ سے بڑھ کر۔(فى اليوم) یعنی اس سے مراد یا تو وقت ہے جس کا آپ ﷺ نے ارادہ کیا ہے یا وہ وقت مراد ہے کہ جس میں مرید مراد میں گم ہو جاتا ہے یہ وہی وقت ہے جس میں وقت کی وجہ سے صوفیہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ صوفی ابن الوقت ہے یا ابوالوقت ہے۔ جیسا کہ آپ ﷺ سے بھی مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میرا ایک اللہ کے ساتھ ایک ایسا مخصوص وقت ہے جس وقت میں میرے ساتھ نہ تو کسی نبی مرسل کی گنجائش ہوتی ہے اور نہ ہی کسی مقرب فرشتہ کی ملک سے جبرائیل علیہ السلام اور نبی مرسل سے آپ کی اپنی ذات مراد ہے۔(مائة مرةً) اس سے کثرت مراد ہے' اس لئے کہ اس مقام میں زمانہ کو پھیلا دیا جاتا ہے اور زبان لپیٹ دی جاتی ہے۔

۲۳۲۵: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَاۤاَيُّهَا النَّاسُ تُوبُوْا اِلَى اللّٰهِ فَاِنِّي اَتُوْبُ اِلَيْهِ فِي الْيَوْمِ مِائَةَ مَرَّةٍ.

(رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ۲۰۷۵/٤ حديث رقم ٤٢ ـ ۲۷۰۲ـ

ترجمہ: "اور حضرت اغر مزنیؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "لوگو! اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرو میں دن میں سو مرتبہ اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرتا ہوں"۔ (مسلم)

تشریح: (یا ایها الناس) بظاہر لوگوں سے مراد مؤمنین ہیں۔ اس کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے: ﴿وتوبوا الى الله جميعا أيها المؤمنون لعلكم تفلحون﴾[النور: ۳۱] یہ آیت اور حدیث باب دونوں اسی بات پر دلیل وشاہد ہیں کہ ہر شخص اپنے حال و مقام کے مطابق ترقی کمال کیلئے رجوع کا محتاج ہے۔ اور ہر شخص حق عبودیت کی کما حقہ ادائیگی سے قاصر ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿كلا لما يقض ما أمره﴾[عبس: ۲۳] اور حدیث کا اگلا جملہ بھی اسی پر دلالت کر رہا ہے: "فانی أتوب اليه أى أرجع رجوعا يليق الى شهوده أو سؤاله أو اظهار الافتقار بين يديه"۔

۲۳۲۶: وَعَنْ اَبِي ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فِيْمَا يَرْوِيْ عَنِ اللّٰهِ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى اِنَّهٗ قَالَ يَا عِبَادِيْ اِنِّي حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلٰى نَفْسِيْ وَجَعَلْتُهٗ بَيْنَكُمْ مُحَرَّمًا فَلَا تَظَالَمُوْا يَا عِبَادِيْ كُلُّكُمْ ضَالٌّ اِلَّا مَنْ هَدَيْتُهٗ فَاسْتَهْدُوْنِي اَهْدِكُمْ يَا عِبَادِيْ كُلُّكُمْ جَائِعٌ اِلَّا مَنْ اَطْعَمْتُهٗ فَاسْتَطْعِمُوْنِيْ اُطْعِمْكُمْ يَا عِبَادِيْ كُلُّكُمْ عَارٍ اِلَّا مَنْ كَسَوْتُهٗ فَاسْتَكْسُوْنِي اَكْسُكُمْ يَا عِبَادِيْ اِنَّكُمْ تُخْطِئُوْنَ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَاَنَا اَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا فَاسْتَغْفِرُوْنِي اَغْفِرْلَكُمْ يَا عِبَادِيْ اِنَّكُمْ لَنْ تَبْلُغُوْا ضُرِّي فَتَضُرُّوْنِي وَلَنْ تَبْلُغُوا نَفْعِيْ فَتَنْفَعُوْنِي يَا عِبَادِيْ لَوْ اَنَّ اَوَّلَكُمْ وَاٰخِرَكُمْ وَاِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ كَانُوْا عَلٰى اَتْقٰى قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِنْكُمْ مَا زَادَ ذٰلِكَ فِيْ مُلْكِيْ شَيْئًا يَا عِبَادِيْ لَوْ اَنَّ اَوَّلَكُمْ وَاٰخِرَكُمْ وَاِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ كَانُوْا عَلٰى اَفْجَرِ قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِنْكُمْ مَا نَقَصَ ذٰلِكَ مِنْ مُلْكِيْ شَيْئًا يَا عِبَادِيْ لَوْ اَنَّ اَوَّلَكُمْ وَاٰخِرَكُمْ وَاِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ قَامُوْا فِيْ صَعِيْدٍ وَاحِدٍ فَسَاَلُوْنِي فَاَعْطَيْتُ كُلَّ اِنْسَانٍ مَسْاَلَتَهٗ مَا نَقَصَ ذٰلِكَ مِمَّا عِنْدِيْ اِلَّا كَمَا يَنْقُصُ الْمِخْيَطُ اِذَا اُدْخِلَ الْبَحْرَ يَا عِبَادِيْ اِنَّمَا هِيَ اَعْمَالُكُمْ اُحْصِيْهَا عَلَيْكُمْ ثُمَّ اُوَفِّيْكُمْ اِيَّاهَا فَمَنْ وَجَدَ خَيْرًا فَلْيَحْمَدِ اللّٰهَ وَمَنْ وَجَدَ غَيْرَ ذٰلِكَ فَلَا يَلُوْمَنَّ اِلَّا نَفْسَهٗ ۔

اخرجه مسلم فی صحيحه ۱۹۹٤/٤ حديث رقم (٥٥ ـ ۲٥۷۷)۔

ترجمہ:''حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان حدیثوں کے سلسلہ میں کہ جو آپ ﷺ اللہ تبارک وتعالیٰ سے روایت کرتے ہیں' فرمایا کہ (ایک حدیث قدسی یہ بھی ہے کہ) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے میرے بندو! میں نے اپنے اوپر ظلم کو حرام قرار دیا ہے (یعنی میں ظلم سے پاک ہوں) اور چونکہ میرے حق میں بھی ایسا ہے جیسے کہ تمہارے حق میں اس لئے میں نے تمہارے درمیان بھی ظلم کو حرام قرار دیا ہے پس تم آپس میں (ایک دوسرے پر) ظلم نہ کرو۔ اے میرے بندو! تم سب گمراہ ہو علاوہ اس شخص کے جس کو میں ہدایت بخشوں پس تم سب مجھ سے ہدایت چاہو' میں تمہیں ہدایت دوں گا' اے میرے بندو! تم سب بھوکے ہو (یعنی کھانے کے محتاج) ہو علاوہ اس شخص کے جس کو میں کھلا دوں۔ پس تم سب مجھ سے کھانا مانگو میں تمہیں کھلاؤں گا اے میرے بندو! تم سب ننگے یعنی ستر پوش کے لئے کپڑے کے محتاج ہو) علاوہ اس شخص کے جس کو میں نے پہننے کے لئے دیا پس تم سب مجھ سے لباس مانگو میں تمہیں پہناؤں گا۔ اے میرے بندو! تم اکثر دن رات خطائیں کرتے ہو اور میں تمہاری خطائیں بخشتا ہوں پس تم سب مجھ سے بخشش مانگو میں تمہیں بخشوں گا۔ اے میرے بندو! تم ہرگز میرے ضرر کو نہیں پہنچ سکو گے تا کہ مجھے نقصان پہنچا سکو اور ہرگز میرے نفع کو نہیں پہنچ سکو گے تا کہ مجھے فائدہ پہنچا سکو (یعنی گناہ کرنے سے بارگاہ صمدیت میں کوئی نقصان نہیں اور اطاعت کرنے سے کوئی فائدہ نہیں بلکہ دونوں کا نقصان وفائدہ صرف تمہیں ہی پہنچتا ہے چنانچہ آگے اس کی تفصیل فرمائی کہ اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور تمہارے پچھلے انسان اور جنات (غرض کہ سب کے سب مل کر بھی تم میں سے کسی ایک نہایت پرہیزگار دل (والے شخص) کی مانند ہو جائیں تو اس سے میری مملکت میں کوئی زیادتی نہیں ہوگی (یعنی اگر تم سب کے سب) اتنے ہی پرہیزگار اور اتنے ہی نیک بن جاؤ جتنا کہ کوئی شخص پرہیزگار و نیک بن سکتا ہے مثلاً تم سب محمد ﷺ ہی کی طرح پرہیزگار بن جاؤ کہ روئے زمین پر کوئی بھی ایسا شخص باقی نہ رہے جس کی زندگی پر فسق وفجور اور گناہ ومعصیت کا ہلکا سا اثر بھی ہو تو اس سے میری سلطنت و میری مملکت میں ادنیٰ سی بھی زیادتی نہیں ہوگی) اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے' تمہارے پچھلے انسان اور جنات (غرضکہ سب کے سب) مل کر تم میں سے ایک نہایت بدکار دل (والے شخص) کی مانند ہو جائیں (یعنی تم سب مل کر شیطان کی مانند ہو جاؤ) تو اس سے میری مملکت کی کسی ادنیٰ سی چیز کو بھی نہیں نقصان پہنچے گا' اے میرے بندو! اگر تمہارے پچھلے انسان اور جنات (غرض کہ سب کے سب مل کر کسی جگہ کھڑے ہوں اور مجھ سے پھر مانگیں اور میں ہر ایک کو اس کے مانگنے کے مطابق (ایک ہی وقت میں اور ایک ہی جگہ) دوں تو میرا یہ دینا اس چیز سے جو میرے پاس ہے اتنا ہی کم کرتی ہے جتنا کہ ایک سوئی سمندر میں گر کر (اس کے پانی کو کم کرتی ہے) اے میرے بندو! جان لو میں تمہارے اعمال یاد رکھتا ہوں اور انہیں تمہارے لئے لکھتا ہوں' میں تمہیں ان کا پورا پورا بدلہ دوں گا' پس جو شخص بھلائی پائے (یعنی اسے اللہ تعالیٰ کی نیک توفیق حاصل ہو اور وہ عمل خیر کرے) تو اسے چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تعریف کرے اور جو شخص بھلائی کے علاوہ پائے (یعنی اس سے کوئی گناہ سرزد ہو) تو وہ اپنے نفس کو ملامت کرے (کیونکہ اس سے گناہ کا سرزد ہونا نفس ہی کے تقاضا سے ہوا''۔ (مسلم)

تشریح: (أنه) بکسر الھمزہ اور بالفتح دونوں طرح درست ہے۔ (یا عبادی) یا خطاب ''ثقلین'' کو ہے چونکہ تقوی وفجور کا اظہار یہی دو مخلوقات کرتے ہیں۔ اور احتمال یہ ہے کہ یہ خطاب ملائکہ کو بھی ہو۔ اس صورت میں اس خطاب کے مخاطب ہونا نہ صدور فجور پر موقوف ہوگا اور نہ امکان صدور فجور پر۔ اھ۔ یہی بات حاجت طعام ولباس میں بھی ہے لیکن امکان عقل پر محمول کرنا اولیٰ ہے۔ یا خطاب

تغلیبی پر محمول کیا جائے۔

(**وجعلته بینکم محرما**) ابن حجرؒ فرماتے ہیں: **أی تحریما غلیظا جدًا، فھو آکد من حرمته علیکم، فلذا عدل الیه** ۔اور صحیح بات یہ ہے کہ عدول اس وجہ سے کیا تا کہ معنی تحریم میں مشارکت کا وہم نہ ہو۔(**فلا تظالموا**) تاءمفتوح ہے۔ایک تاءکو تخفیف کی غرض سے حذف کر دیا گیا ہے۔اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے پر ظلم مت کرو، چونکہ مظلوم کی طرف سے میں ظالم سے انتقام لوں گا۔جیسا کہ حدیث میں آتا ہے۔(**یقول اللّٰہ تعالیٰ جل جلاله، لأنتصرن للمظلوم ولو بعد حین**) اللہ جل شانہ فرماتے ہیں:

﴿**ولا تحسبن اللّٰہ غافلا**...... ﴾[ابراھیم:۴۲] وہ ڈھیل دیتا ہے چھوڑتا نہیں ہے۔(**یا عبادی کلکم ضال الا من ھدیته**) **یا عبادی** یہ خطاب عام ہے جو ہر خاص وعام کو شامل ہے نیز اس اسلوب میں تانیس تام بھی ہے۔مکرر ارشاد فرمایا، اپنی عظمت اور علوشان پر تنبیہ کیلئے۔قالہ ابن حجر۔اور اظہر یہ ہے کہ مقتضی عبودیت کی طرف اشارہ مقصود ہے۔تم میں افتقار ہے تم حقوق ربوبیت کی رعایت رکھو۔**کلکم ضال الا من ھدیته**' بعض کا کہنا ہے اس سے مراد آنحضرت ﷺ کی بعثت سے قبل لوگوں کی حالت مراد ہے۔یہ مطلب نہیں کہ تم لوگ گمراہی میں پیدا کیے گئے ہو۔

کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ اس سے دنیا اور دین کا ہر کمال' ہر سعادت اور تمام ہی بھلائیاں ہوں' ہر شخص کے اندر کچھ نہ کچھ کمی اور کوتاہی ضرور ہوتی ہے اور اگر کوئی دینی اور اخروی اعتبار سے اپنے اندر کوئی کمی اور کوتاہی وگمراہی رکھتا ہے تو کسی کے اندر دنیاوی امور کے اعتبار سے کوئی نہ کوئی کمی اور کجی ہوتی ہے اس لئے فرمایا کہ تم سب گمراہ ہو۔یعنی دنیوی اور دینی دونوں اعتبار سے درجۂ کمال سے ہٹے ہوئے ہو۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد کی مراد یہ ہے کہ اگر لوگوں کو ان کی اس حالت وکیفیت پر چھوڑ دیا جو ان کی طبیعت اور ان کے نفس کی بنیاد ہوتی ہے تو وہ خودرو درخت کی طرح جس طرح چاہیں بڑھیں اور جس سمت چاہیں چلیں' جس کا نتیجہ گمراہی اور بے راہ روی ہے اس لئے میں جس کو چاہتا ہوں اسے فکروذہن کی سلامت اور اعمال نیک کی ہدایت بخشتا ہوں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا نفس صحیح راستہ پر چلتا ہے اور اس کی طبیعت نیکی ہی کی سمت بڑھتی ہے اس بات کو نبی کریم ﷺ نے اس طور پر بیان فرمایا ہے کہ:

اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ الْخَلْقَ فِیْ ظُلْمَةٍ ثُمَّ رَشَّ عَلَیْھِمْ مِنْ نُوْرِہٖ: ''اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو اندھیرے میں پیدا کیا اور پھر ان پر اپنے نور کا چھینٹا دیا''۔

اس موقع پر یہ خلجان پیدا نہیں ہونا چاہئے کہ یہ بات اس حدیث: **کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَةِ** ''ہر بچہ فطرت (اسلام کی فطرت) پر پیدا کیا جاتا ہے''۔

کے منافی ہے کیونکہ ''فطرت'' سے مراد ''توحید'' ہے اور ''ضلالت یا عظمت'' سے مراد احکام ایمان کی تفصیل اور اسلام کے حدود و شرائط کا نہ جاننا ہے۔

اور اسی قبیل سے یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**ووجدك ضالا فھدی**﴾[الضحیٰ:۷] بعض نے اس کے معنی ''عاشق'' بیان کئے ہیں۔**فاستھدونی أھدکم**''۔تم مجھ سے ہدایت کی جو نوع چاہو گے میں تمہیں ہدایت دوں گا۔چونکہ میرے سوا کوئی ہادی نہیں۔اگر میری طرف سے ہدایت نہ ہوتی تو تم راہ راست نہیں پا سکتے تھے۔اس میں اشارہ ہے کہ جو شخص بھی اخلاص نیت کے ساتھ ہدایت چاہے گا اس کو ہدایت ضرور ملے گی۔ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**ولولا فضل اللّٰہ علیکم ورحمته لکنتم من الخاسرین**﴾ یہاں تک امور دینیہ پر امتنان تھا، آگے امور دنیویہ کا بیان ہے۔

یا عباد کلکم جائع الا من أطعمته، فاستطعمونی أطعمکم: دواہم امور پر اقتصار کیا، یعنی طعام ولباس پر۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ میں جنت کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿**وان لك أن لا تجوع فيها ولا تعرى وانك لا تظمأ فيها ولا تضحى**﴾[طه:۱۱۸۔۱۱۹] ممکن ہے کہ حدیث میں طعام کا ذکر کرنا اور مشروب کا ذکر نہ کرنا دلالت مقابلہ کی وجہ سے۔ از باب اکتفاء ہو اور اس آیت کریمہ کے قبیل سے ہو: ﴿**سرابیل تقیکم الحر**﴾[النحل:۸۱] أي: **والبرد**۔ اور ٹھکانہ کا ذکر اس وجہ سے نہیں کیا کہ ''کسوہ'' بھی بمنزلہ ''سترۃ'' کے ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے اگر یہ اشکال کیا جائے کہ **الا من أطعمته و کسوته** کے استثناء کا مطلب کیا ہے؟ چونکہ ہم میں سے کوئی شخص ان دونوں نعمتوں سے محروم نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اطعام وکسوۃ کو نفع تام اور رزق میں کشادگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور ان دونوں چیزوں کے نہ ہونے کو تقتیر وتضییق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**الله يبسط الرزق لمن يشاء ويقدر**﴾[الرعد:۲۶] اس سے جواب بآسانی مل جاتا ہے۔ اس ساری تقریر سے ظاہر ہوا کہ مستثنیٰ منہ میں اثبات جوع وعری سے، شبع وکسوۃ کی بالکلیہ نفی مراد نہیں ہے۔ اور نہ ہی مستثنیٰ میں شبع وکسوۃ کا مطلق اثبات ہے۔ بلکہ بسط وتکثیر مراد ہے۔ فصل ثانی کی چودھویں حدیث اس کی مزید وضاحت کر رہی ہے۔ کہ اس میں الفاظ یوں ہیں: ''**کلکم فقراء الا من أغنيته**'' کہ یہ حمد بالکل اپنے موقع محل میں ہے۔ اھ۔ یہ کلام انتہائی خوبصورت ہے۔ ابن حجر نے بھی بعینہ یہی کلام لیا ہے۔

یا عبادی انکم تخطئون باللیل والنهار وأنا أغفر الذنوب جمیعا: یعنی اکثر لوگ بالفعل اور تھوڑے لوگ بالقوہ خطائیں کرتے ہیں۔ ابن حجر کا کہنا ہے کہ اس کلام کے مخاطب غیر معصوم سابقین ولاحقین سب کو شامل ہے۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے: **حسنات الابرار سیئات المقربین واستغفارهم غیر استغفار المذنبین**''۔ اور دن کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ دن میں گناہوں کا غلبہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**وهو الذی یتوفاکم باللیل ویعلم**......﴾[الانعام:۶۰]

''**وأنا اغفر الذنوب جمیعا**''۔ میں تمہاری تمام خطائیں بخشتا ہوں۔ کامل توبہ کرلو گے تو تمام خطائیں بشمول کفروشرک کے معاف کر دوں گا۔ یا استغفار واذکار وغیرہ کے ذریعہ تمام خطائیں معاف کر دوں گا۔ ''**انکم لم تبلغوا اضری فتضرونی، ولن تبلغوا نفعی فتنفعونی:** ضری: ضاد پر فتحہ ضمہ دونوں درست ہیں۔ **فتضرونی** اور **فتنفعونی** دونوں جواب نفی ہیں۔ اس لئے حالت نصبی میں ہیں۔ اور نون اعرابی کو حذف کر دیا گیا ہے۔ **وانسکم وجنکم:** یہ تفصیل وتبیین ہے۔ یا تعمیم بعد التعمیم برائے تاکید ہے۔

''**وکانوا علی أتقی قلب رجل واحد منکم:** أي لو کنتم علی غایة التقویٰ بأن تکونوا جمیعا علی تقوی أتقی قلب رجل، واحد منکم'' قاضیؒ نے اس جملہ کی توضیح یوں کی ہے۔ ''أي: **علی تقوی أتقی أحوال قلب رجل، أي: کان کل واحد منکم علی هذه الصفة**۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ان دونوں میں سے ایک تقدیر بہرحال ضروری ہے تاکہ اُتقی کی خبر کان میں واقع ہونا درست ہوجائے۔ واضح رہے کہ شارع کی مراد یہ نہیں کہ سب لوگ مل کر بمنزلہ **رجل واحد اتقی** کے ہوجائیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ ہر ہر فرد بمنزلہ رجل اتقی کے ہوجائے۔ چونکہ یہ مفہوم ابلغ ہے۔ جیسا کہ عرب کہتے ہیں۔ **رکبوا فرسهم**۔ یہ ارشاد باری تعالیٰ بھی اسی طرح ہے: ﴿**ختم الله علی قلوبهم وعلی سمعهم**﴾[البقرہ:۰۷]

صیغۂ افعل کی نکرہ مفردہ کی طرف اضافت اس پر دال ہے۔ کہ اے مخاطب اگر مخلوقات میں سے ہر ہر فرد کے دل کو بھی ٹٹولے تو اس شخص سے زیادہ متقی تو کسی کو نہ پائے اھ۔ چنانچہ اسی وجہ سے **اتقی قلب رجل** کی تفسیر حضرت محمد عربی ﷺ کے ساتھ اور قلب اشقی کی تفسیر قلب ابلیس کے ساتھ کی گئی ہے۔

یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿یوم تبیض وجوہ وتسود وجوہ فأما الذین اسودت وجوھھم﴾[آل عمران:۱۰۶]

(ما نقص ذلك من ملكي شيئا) نقص تخفیف کے ساتھ ہے۔اور ذلک کا مشار الیہ ماذکر ہے۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اگر نقص کو فعل متعدی مان لیا جائے تو شیئاً مفعول بہ ہے، اور اگر ناقص کہا جائے تو مفعول مطلق ہے۔أن: نقص نقصانا قليلا۔اور تنوین برائے تحقیر ہے۔اور اس کی دلیل اگلی حدیث مبارکہ کا یہ جملہ جناح بعوضة ہے۔یہ کلام ''لن يبلغو اخرى فيضروني'' کی طرف راجع ہے۔اور ابن حجرؒ نے عجیب بات کہی کلام افصح کے مطابق نقص متعدی بدو مفعول ہے۔اور شیئااس کا مفعول ثانی ہے۔جیسا کہ لم ينقصوكم شيئا اھ۔اور وجہ غرابت یہ ہے کہ اس حدیث میں دوسرا مفعول تو ہے ہی نہیں۔چہ جائیکہ مفعول ثانی ہو۔اور شاید کہ ان کو یہ وہم ہوا کہ ذلک مفعول اول ہے، فساد معنی کی وجہ سے اس کا خطا ہونا بالکل واضح ہے۔درست بات یہ ہے کہ ذلک فاعل ہے نقص کا۔

چنانچہ امام طیبیؒ کا کلام بالکل درست ہے۔البتہ جس مسئلہ میں آیت سے استدلال کیا ہے یہ درست نہیں، چونکہ شیئامیں ایک احتمال یہ ہے کہ منصوب علی المصدریۃ ہو۔أي شيئا من النقص۔اور یہ احتمال بھی ہے کہ منصوب علی المفعولیۃ ہو۔أي شيئا من شروط العهد۔اس صورت میں یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ ينقصوكم باب حذف وایصال سے ہو۔أي: لم ينقصوكم منكم أي من عهودكم شيئا''۔ابوالبقاء فرماتے ہیں: جمہور نے اس کو صاد کے ساتھ پڑھا ہے، البتہ ضاد کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔''أي عهودكم''مضاف کو حذف کر دیا گیا اور شیئا موضع مصدر میں ہے۔(كانوا على أفجر) یہاں مضاف محذوف ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: قاموا في صعيد کی قید اس لئے لگائی کہ سوالات کا تزاحم اور سائلین کا ازدحام یہ ان چیزوں میں سے ہیں۔جو مسئول کو مدہوش کر چھوڑتی ہیں۔اور مسؤل کیلئے سائلین کے مطالب ومقاصد کو پورا کرنے میں رکاوٹ ڈالتی ہیں، اور پورا کرنا مشکل کر دیتی ہیں۔كما ينقص: اس''ما'' کے بارے میں دو احتمال ہیں۔(۱) یہ ما مصدریہ ہے۔''أي: كالنقص''۔(۲) یا''ما'' موصوفہ ہے۔أي الشئ الذي ينقصه۔المخيط: بکسر المیم وسکون الخاء۔أي: الابرة۔سوئی۔البحر: اُدخل کا مفعول ثانی ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: سوئی سمندر میں گر کر اس کے پانی کو جس قدر کم کرتی ہے وہ کمی نہ محسوس ہوتی ہے اور نہ اہل عقل کے ہاں کسی شمار میں آتی ہے۔بلکہ وہ حکماً کالعدم ہوتی ہے۔تو یہ مثال چونکہ اقرب المحسوسات تھی کہ جس کے ذریعہ تمام مخلوقات کو ان کی حوائج عطا کرنے کے مشابہ قرار دیا جاسکتا تھا کہ اللہ اگر اس کم وکیف کے ساتھ دے تو اس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں آتی۔اور ابن الملکؒ فرماتے ہیں: یا یہ کہا جائے کہ یہ بات بطور فرض وتقدیر کے فرمائی، یعنی فرض کرلو کہ اللہ کی مملوکات میں کمی آجائے گی تو بس اسی قدر آئے گی۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: حدیث مبارکہ کے اس جملہ کا مفہوم درحقیقت قرآن کریم کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے: ﴿وان من شئ الا عندنا خزائنه وما ننزله الا بقدر معلوم﴾[الحجر:۲۱]۔یہ حدیث باب حدیث خضر کی نظیر ہے۔کہ جب حضرت خضر اور حضرت موسیٰ کشتی میں سوار ہوئے تو ایک چڑیا اس کے کنارے پر آبیٹھی، اس نے سمندر میں چونچ ماری، یہ دیکھ کر حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا: ما نقص علمي وعلمك من علم الله الا كما نقص هذا العصفور من هذا البحر''۔شراح کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ کلام از باب فرض وتنزیل ہے۔أي: لو فرض النقص لكان مقداره مقدار الممثل به، اگر سمندر میں کمی واقع ہوئی ہے تو بات یہ ہے کہ سمندر متناہی ومحدود ہے۔لیکن اس میں آنے والی قلت، مراتب قلت میں سے اتنے ادنیٰ درجہ کی ہے کہ اس کو محسوس بھی نہیں کیا جاسکتا، ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: نقص کی صرف صورت ہی متصور ہے وگرنہ تو حقیقت میں یہ جنس کثیر سے شئ قلیل کا انتقال ہے دوسری طرف حقیقت میں کوئی کمی نہیں آرہی ہے۔بلکہ اس میں زیادہ افادہ ہے، چونکہ اس قطرہ پانی میں چڑیا کی جان وحیان ہے۔اور بعض علوم شرعیہ ولدنیہ کا حصول ہے موسیٰ وخضر علیہما السلام کی طرف۔یہ علم بدیع کی قسم ہے۔اس کو ''باب تاكيد

الحکم بما یشبه الاستثناء" کہتے ہیں۔ جیسا کہ ان آیات میں کہا ہے: ﴿وما نقموا منهم الا أن یؤمنوا باللّٰه العزیز الحمید﴾[البروج:۸] ﴿لا یسمعون فیها لغوا الا سلاما﴾[مریم:٦٢]اور شاعر کا یہ قول:

ولا عیب فیهم وغیر أن سیوفهم　　　بهن فلو لا من قراع الکتائب

اس (شعر) کو از باب تاکید المدح بما یشبه الذم قرار دیا ہے۔

یا عباد! انما هی......الا نفسه "ابن الملکؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث اس مسئلہ میں صریح ہے: "الخیر من اللّٰه والشر من النفس" اھ۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: یہ بڑی عجیب وغریب بات کہی حالانکہ عقیدہ کا پکا ٹھکا مسئلہ ہے۔ "الخیر والشر کله من اللّٰه خلقا ومن العبد کسبا"۔ اہل بدعت میں سے خوارج ومعتزلہ اس مسئلہ میں اختلاف رکھتے ہیں۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ ادب مع اللہ تعالیٰ کا تقاضا یہ ہے کہ شر کو نفس کی طرف منسوب کیا جائے۔ جیسا کہ اس آیت کے بارے میں کہا گیا ہے: ﴿واذا مرضت فهو بشفین﴾[الشعراء: ۸۰]اور یہی معنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی: "الخیر بیدیك والشر لیس الیك" کے ہیں۔

ابوادریس خولانی جب اس حدیث کو بیان فرماتے تو تعظیم باری تعالیٰ کے غلبہ سے "جاثیہ" (گھٹنوں کے بل) بیٹھ جاتے۔

۲۳۲۷: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ كَانَ فِیْ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ رَجُلٌ قَتَلَ تِسْعَةً وَتِسْعِیْنَ اِنْسَانًا ثُمَّ خَرَجَ یَسْأَلُ فَاَتٰی رَاهِبًا فَسَأَلَهٗ فَقَالَ اَلَهٗ تَوْبَةٌ قَالَ لَا فَقَتَلَهٗ وَجَعَلَ یَسْأَلُ فَقَالَ لَهٗ رَجُلٌ اِئْتِ قَرْیَةَ كَذَا وَكَذَا فَاَدْرَكَهُ الْمَوْتُ فَنَاءَ بِصَدْرِهٖ نَحْوَهَا فَاخْتَصَمَتْ فِیْهِ مَلَائِكَةُ الرَّحْمَةِ وَمَلَائِكَةُ الْعَذَابِ فَاَوْحَی اللّٰهُ اِلٰی هٰذِهٖ اَنْ تَقَرَّبِیْ وَاِلٰی هٰذِهٖ اَنْ تَبَاعَدِیْ فَقَالَ قِیْسُوْا مَا بَیْنَ هُمَا فَوُجِدَ اِلٰی هٰذِهٖ اَقْرَبَ بِشِبْرٍ فَغُفِرَلَهٗ. (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٥١٢/٦ حدیث رقم ٣٤٧٠۔ واخرجه مسلم فی صحیحه ٢١١٨/٤ حدیث رقم (٤٦۔ ٢٧٦٦)

ترجمہ: "اور حضرت ابوسعید خدریؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "بنی اسرائیل (حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں) ایک شخص تھا جس نے ننانوے آدمیوں کو قتل کیا اور پھر (لوگوں سے یہ) پوچھنے نکلا (کہ اگر میں توبہ کر لوں تو وہ توبہ قبول ہوگی یا نہیں؟) چنانچہ اسی سلسلہ میں وہ ایک عابد وزاہد کے پاس آیا اور اس سے پوچھا کہ کیا اس (اتنے بڑے گناہ سے یا اس اتنے بڑے گناہ کرنے والے) کے لئے توبہ ہے؟ یعنی کیا اس کی توبہ قبول ہوگی یا نہیں؟ اس عابد وزاہد نے کہا کہ نہیں! اس شخص نے (یہ سنتے ہی) اس عابد وزاہد کو بھی قتل کر دیا اور پھر (دوسرے لوگوں سے) پوچھنے لگا' ایک شخص نے اس سے کہا کہ تم فلاں بستی میں جاؤ۔ چنانچہ وہ شخص اس بستی کی طرف چل کھڑا ہوا ابھی آدھے ہی راستے پر پہنچ پایا تھا کہ اچانک اسے موت نے آ دبوچا (چنانچہ اسے موت کی علامت محسوس ہوئیں) تو اس نے اپنا سینہ اس بستی کی طرف جھکا دیا اور پھر اس کی روح قبض کرنے کے وقت رحمت کے فرشتے اور عذاب کے فرشتے جھگڑنے لگے' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس بستی کو جس کی طرف وہ توبہ کرنے جا رہا تھا حکم دیا کہ وہ میت کے قریب آ جائے اور اس بستی کو جہاں سے وہ قتل کر کے آ رہا تھا حکم دیا کہ وہ میت سے دور ہو جائے پھر اللہ تعالیٰ نے ان فرشتوں سے فرمایا تم دونوں بستیوں کے درمیان پیمائش کرو اگر میت اس بستی کے قریب ہوگی جہاں وہ توبہ کے لئے جا رہا تھا تو اسے رحمت کے فرشتوں کے حوالہ کیا جائے گا اور اگر اس بستی کے قریب ہو جہاں سے وہ قتل کر کے آ رہا تھا تو عذاب کے فرشتوں کے حوالہ کیا جائے گا۔ چنانچہ جب فرشتوں نے پیمائش کی تو وہ توبہ کے لئے جس بستی کی طرف جا رہا تھا اس سے ایک بالشت

قریب پایا گیا پس حق تعالیٰ نے اسے بخش دیا''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: راھب کی تعریف: **هو عابد زاهد معتزل عن الخلق مقبل على الحق غالب عليه الخوف فقال أله توبة؟** ضمیر مجرور فعل یا فاعل کی طرف راجع ہے۔''**أى: لهذا الفعل أو لهذا الفاعل؟**''ابن حجرؒ لکھتے ہیں: **فقال له: أى: صحيحة**۔ بعض کا کہنا ہے کہ بخاری کی روایت میں ہمزہ نہیں ہے۔اور شیخ کا کہنا ہے کہ''**له توبة**''میں اداۃ استفہام محذوف ہے۔اس میں تجرید ہے، چونکہ قیاس کا تقاضایہ کہ عبارت یوں ہو: **ألى توبة؟** ایک روایت میں''**هل لى توبة**''کے الفاظ مروی ہیں۔اور مصابیح کے نسخہ میں **ألى توبة** کے الفاظ ہیں۔قال: **لا** ۔ یہاں دونوں مطلب ہو سکتے ہیں: (۱) **لا توبة له**۔ (۲) **لا توبة لك**۔ **جعل يسأل**۔ یہ جعل بمعنی شرع ہے۔ **ائت قرية كذا و كذا**: پہلا کذا کنایہ از نام بستی اور دوسرا کذا کفایہ از وصیف بستی ہے۔ای: **ائت قرية كذا باسمهاء وكذا بوصفها أى القرية الفلانية التى أهلها حاصلحاء۔ فأدركه الموت**۔ اس جملہ کا عطف کلام محذوف پر ہے: **أى فقصدها وسار نحوها وقرب من وسط طريقها۔ أن تباعدى**: تاء کے فتحہ کے ساتھ،اور صلہ محذوف ہے۔ای: **عن الميت** یہ کہنا کہ اشارہ ملائکہ کی طرف ہے۔ **دراية ورواية** ہر دو طرح غلط ہے۔ **قيسوا**: یہ خطاب ملائکہ متخاصمین سے ہے۔

(قال: لا) یعنی اس عابد وزاہد نے اس قاتل سے کہا کہ تمہارے لئے توبہ نہیں۔اس زاہد نے یہ کیوں کہا؟ یا تو اس وجہ سے کہ وہ توبہ کے بارے میں جانتا نہیں تھا، یا اس کا گمان یہ تھا کہ اس طرح کے شخص کی توبہ مقبول نہیں۔اگر چہ مستحقین و متعلقین راضی ہی ہوں۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہاں اشکال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ اگر ہم''ناں'' کہتے ہیں تو نصوص کی مخالفت لازم آتی ہے اور اگر''ہاں'' کہیں تو تب بھی شریعت کی مخالفت لازم آتی ہے۔چونکہ حقوق العباد توبہ سے تو ساقط ہوتے نہیں۔حقوق العباد سے توبہ کی یہی صورت ہے کہ مستحقین کو ان کا حق دیا جائے، یا حلال کرالیا جائے، کہ جب کوئی بندہ قلب ونیت کے اخلاص کے ساتھ بارگاہ الوہیت کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے حق کا مطالبہ کرنے والوں کو بھی اس سے راضی کر دیتا ہے۔

فاختصمت فيه ملائكة الرحمة وملائكة العذاب: ابن ملکؒ کہتے ہیں کہ جب ملک الموت نے اس شخص کی روح قبض کی تو رحمت کے فرشتے اور عذاب کے فرشتے دونوں ملک الموت سے اس کی روح لینے کے لئے جھپٹنے لگے، رحمت کے فرشتے تو یہ کہتے تھے کہ چونکہ یہ شخص توبہ کے لئے اس بستی کی طرف متوجہ ہونے کی بناپر تائب تھا اس لئے ہم اسے رحمت خداوندی کی طرف لے جائیں گے اور عذاب کے فرشتے یہ کہتے تھے کہ اس شخص نے چونکہ ایک سوآدمیوں کو ناحق قتل کیا ہے اور ابھی تک اس نے توبہ نہیں کی تھی اس لئے ہم اسے عذاب الہٰی کی طرف لے جائیں گے! چنانچہ حق تعالیٰ نے اس کا فیصلہ جس طرح فرمایا وہ اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

فوائد: یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ طالب توبہ کیلئے حق تعالیٰ کی رحمت کی وسعت کسی قید اور حد کی پابند نہیں ہے اسکی بے پایاں رحمت خلوص قلب کے ساتھ اپنی طرف متوجہ ہونے والے بڑے سے بڑے سرکش اور گنہگار کو بھی اپنے دامن میں چھپا لیتی ہے نیز توبہ کی ترغیب ہے اور مایوسی سے ممانعت ہے۔امام بغویؒ فرماتے ہیں: مسلم کی روایت میں بھی اسی سے ملتا جلتا مفہوم ہے:

فدل على رجل عالم ،فقال :انه قتل مائة نفس هل له من توبة؟ قال: نعم ومن يحول بينه وبين التوبة، انطلق الى ارض كذا وكذا ،فان بها اناسا يعبدون الله فاعبدالله معهم ولاترجع الى ارضك فانهاارض سوء ۔فانطلق حتى نصف الطريق اتاه الموت فاختصمت ملائكة الرحمة ملائكة العذاب ، فاتاهم ملك فى صورة آدمى فجعلوه بينهم فقال قيسوا ما بين الارضين فالى ايتهما ادنى فهوله ۔فوجدوه ادنى الى الارض التى اراد فقبضته ملائكة الرحمة اھ۔

اس حدیث سے عالم کی عابد پر فضیلت معلوم ہوتی ہے۔

۲۳۲۸: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَوْلَمْ تُذْنِبُوْ الَذْهَبَ اللّٰهُ بِکُمْ وَلَجَاءَ بِقَوْمٍ یُذْنِبُوْنَ فَیَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ فَیَغْفِرُ لَهُمْ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۲۱۱۳/۴ حدیث رقم ((۱۔ ۲۷۴۹) واخرجه احمد فی المسند ۳۰۹/۲۔

ترجمه: ''اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ و قدرت میں میری جان ہے اگر تم لوگ گناہ نہ کرو تو اللہ تعالیٰ تمہیں اٹھا لے اور (تمہاری جگہ) ایسے لوگ پیدا کر دے جو گناہ کریں اور خدا سے بخشش و مغفرت چاہیں اور پھر اللہ تعالیٰ انہیں بخشے''۔ (مسلم)

تشریح: (لو لم تذنبو) یہ خطاب تمام مکلّفین سے ہے، یا مسلمانوں سے ہے۔ دونوں احتمال ہیں۔ لذهب الله بکم: یہ باء برائے تعدیہ ہے۔ اگلا جملہ بھی اسی طرح ہے۔ یذنبو ن: یعنی تمہارے ہم جنس یا کسی اور جنس کے افراد کو لے آئے گا جن سے گناہ کا وقوع ممکن ہوگا۔ اور بعض سے بالفعل گناہ صادر بھی ہوں گے۔ چنانچہ جب وہ توبہ کریں گے تو اللہ سے مطلقا مغفرت طلب کریں گے۔ تو اللہ تعالیٰ اپنی صفات غفار و غفور اور غافر الذنب کے مقتضی کے مطابق ان کو معاف فرمائے گا۔ زین العرب فرماتے ہیں: اس حدیث میں ابھارا جا رہا ہے کہ رجاء کو خوف پر غالب رکھو۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کے ذریعہ گناہ کی ترغیب مقصود نہیں ہے کیونکہ گناہ سے بچنے کا حکم خود اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اور اپنے پیغمبر ﷺ کو اس دنیا میں اسی لئے بھیجا ہے کہ آپ ﷺ لوگوں کو گناہ و معصیت کی زندگی سے نکال کر طاعت و عبادت کی راہ پر لگائیں۔
بلکہ اس حدیث میں اللہ جل شانہ کی صفت عفو کا بیان ہے۔ اس ارشاد گرامی کا مقصد مغفرت اور رحمت باری تعالیٰ کی وسعت کو بیان کرنا اور یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اسم پاک ''غفور'' کی شان کو ظاہر کرنے کیلئے اتنا بخشش کرنے والا ہے' اس لئے لوگوں کو چاہئے کہ وہ اپنے گناہوں سے توبہ کرنے میں کوتاہی نہ کریں۔ اس جملہ میں مراد یہ ہے کہ جیسے اللہ جل شانہ اس بات کو پسند فرماتے ہیں کہ نیکو کاروں پر عطائیں کی جائیں۔ اسی طرح اس بات کو بھی پسند کرتا ہے کہ بدکاروں سے عفو و درگزر کیا جائے۔ اس (صفت) پر اللہ جل شانہ کے بہت سے اسماء حسنی دلالت کرتے ہیں۔ چنانچہ غفار، حلیم، تواب، عفو وغیرہ اسی شان کا اظہار ہیں۔ اللہ جل شانہ نے اپنے (تمام) بندوں کیلئے ایک ہی شان نہیں رکھی۔ (بلکه کل یوم هو فی شأن) مثلاً جیسا کہ ملائکہ تنزہ عن الذنوب۔ ان کی جبلت میں رکھا گیا ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات میں بعض ایسے لوگ پیدا کرتا ہے۔ کہ جو طبعاً اپنی خواہشات نفسانی کی طرف مائل ہوتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ اس کو مکلّف بنا دیتا ہے اور اس کو ڈراتا ہے اور توبہ سے روشناس کرتا ہے۔ چنانچہ اگر وہ (اپنی توبہ کو) پورا کرتا ہے۔ تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے اور اگر راستہ بھٹک جاتا ہے تو توبہ پھر اس کے سامنے ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اپنے اس ارشاد گرامی میں اس حقیقت کا اجاگر کیا ہے کہ اگر تمہاری جبلت، ملائکہ والی ہو تو اللہ تعالیٰ تمہیں اٹھا لے اور تمہارے جگہ ایسے لوگ پیدا کرے جو گناہ کریں، اللہ ان پر اپنی حکمت کے مقتضی صفات کے ساتھ ان پر تجلی فرمائے گا۔ چونکہ ''غفار'' ''مغفور'' کا تقاضا کرتا ہے جیسا کہ ''رزاق'' ''مرزوق'' کو چاہتا ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: حدیث کی ابتداء میں قسم کا ذکر فرمانا رد ہے ان پر جو لوگ عباد سے ذنوب کے صدور کے منکر ہیں۔ اور گناہوں کو بندہ کے حق میں مطلقا نقص شمار کرتے ہیں۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے گناہوں کے صدور کا ارادہ نہیں کیا، جیسا کہ معتزلہ اور ان کے ہم نوا کہتے ہیں۔ انہوں نے ظاہر کو دیکھا کہ وہ باعث فساد ہے اور اس راز کو نہیں پایا کہ یہ جالب توبہ ہے، توبہ اللہ جل شانہ سے محبت کی ایک امید ہے کہ ﴿ان الله یحب التوابین ویحب المتطهرین﴾[البقرة:۲۲۲] وان الله یبسط یده باللیل لیتوب

مسئ النهار، والله أشد فرحا بتوبة عبده''۔صفات کرم، حلم اور غفران کے اظہار میں شاید یہی راز ہے کہ اگر یہ صفات (بالفعل) نہ پائی جائیں تو صفات الوہیہ کی ایک جانب کا ظہور نہ ہو پائے گا۔انسان تو اللہ کی دھرتی پر اس کا خلیفہ ہے۔اس پر اپنی صفات وجلال واکرام، قہر، لطف، انعام کے ساتھ تجلی فرماتا ہے۔ملائکہ نے جب اللہ جل شانہ کے قہر وجلال پر نظر ڈالی تو پکار اٹھے: ﴿أتجعل فيها من يفسد فيها و يسفك الدماء﴾[البقرة: ۳۰] اور جب اللہ جل شانہ نے اپنی صفت لطف واکرام پر نظر ڈالی تو فرمایا: ﴿وانی أعلم ما لا تعلمون﴾[البقرة: ۳۰]۔چنانچہ حدیث مبارکہ کا یہ جملہ: ''لذهب الله بكم''اس معنی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔اور اسی وجہ سے: ''ولم يذنبوا الجاء الله بقوم يذنبون'' پر اکتفاء نہیں فرمایا۔چنانچہ یہ اس حدیث کی نظیر ہے۔''كلكم خطاؤون، وخير الخطائين التوابون''۔

۲۳۲۹:وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِنَّ اللّٰہَ یَبْسُطُ یَدَہٗ بِاللَّیْلِ لِیَتُوْبَ مُسِیْءُ النَّھَارِ وَیَبْسُطُ یَدَہٗ بِالنَّھَارِ لِیَتُوْبَ مُسِیْءَ اللَّیْلِ حَتّٰی تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِھَا۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۲۱۱۳/۴ حدیث رقم (۱۱۔ ۲۷۴۹)۔ واحمد فی المسند ۳۹۵/۴۔

ترجمہ:''حضرت ابوموسیٰ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ رات میں اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے تا کہ دن میں گناہ کرنے والا توبہ کرے اور دن میں اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے تاکہ رات میں گناہ کرنے والا توبہ کرے یہاں تک کہ سورج مغرب کی سمت سے نکلے''۔(مسلم)

تشریح:(ان الله يبسط يده):(یہ کلام متشابہات کے قبیل سے ہے۔چنانچہ اس میں متعدد تاویلات کی جاتی ہیں)۔

۱۔بسط الید ''ہاتھ پھیلانا''''ہاتھ پھیلانا'' دراصل کنایہ ہے طلب کرنے سے چنانچہ جب کوئی شخص کسی سے کچھ مانگتا ہے تو اس کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے ''لہٰذا اللہ تعالیٰ رات میں ہاتھ پھیلاتا ہے الخ'' کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ گنہگاروں کو توبہ کی طرف بلاتا ہے! بعض حضرات کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ پھیلانا اس کی رحمت ومغفرت سے کنایہ ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: بسط، کنایہ ہے قبول توبہ اور عرض توبہ سے۔اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہگاروں کو توبہ کی طرف بلاتا ہے۔بعض کا کہنا ہے کہ بسط عبارت ہے توسع فی الجو دو العطاء والتنزہ عن المنع سے۔

فوائد حدیث: اس حدیث سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اللہ کی رحمت بہت وسیع ہے، وہ اپنے بندوں کے گناہوں سے بہت زیادہ درگزر کرتا ہے۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ تمثیل اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ توبہ اللہ کے ہاں مطلوب ہے۔محبوب یا ہے، گویا کہ اللہ جل شانہ گناہ گار شخص سے توبہ کا تقاضا کر رہا ہے۔حدیث کے آخری الفاظ یہاں تک کہ سورج مغرب کی طرف سے نکلے'' کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کی طلب توبہ کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ قرب قیامت میں سورج مشرق کی بجائے مغرب سے نکلے کیونکہ جب آفتاب مغرب کی طرف سے طلوع ہوگا تو توبہ کا دروازہ بند ہوجائے گا۔اس کے بعد پھر کسی کی توبہ قبول نہیں ہوگی۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يوم تأتي بعض آيات ربك لا ينفع نفسا ايمانها﴾[الانعام: ۱۵۸]

اور بعض کا کہنا ہے کہ یہ حکم اس شخص کے ساتھ مخصوص ہے کہ جس نے اس کا طلوع پایا ہو، چنانچہ جو شخص اس کے بعد پیدا ہوگا، یا بالغ ہوا اور وہ کافر تھا اور ایمان قبول کر لیا، یا گناہ گار تھا اور توبہ کر لی تو اس کا ایمان مقبول ہے۔اس کی توبہ مقبول ہے، عدم مشاہدہ کی وجہ سے۔

۲۳۳۰:وَعَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا اعْتَرَفَ ثُمَّ تَابَ تَابَ اللّٰہُ عَلَیْہِ . (متفق علیہ)

اخرجه البخاری ۴۳۱/۷۔ حدیث رقم ۴۱۴۱۔ ومسلم فی صحیحه ۲۱۲۹/۴ حدیث رقم (۵۶۔ ۲۷۷۰)۔

ترجمہ:''اور ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب بندہ (اپنے گناہ کا ندامت وشرمندگی کے ساتھ) اعتراف کرتا ہے اور پھر توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: ارکان توبہ چار ہیں: (۱) ندامت۔ (۲) خلع (یعنی گناہ چھوڑنا)۔ (۳) عزم (آئندہ نہ کرنے کا پکا ارادہ کرنا)۔ (۴) تدارک۔

تاب اللّٰه علیه: اللہ جل شانہ کا اپنے بندہ کی توبہ کا قبول فرمانا اپنے اس ارشاد کے بموجب ہے: ﴿هو الذی یقبل التوبة عن عباده﴾ [الشوری:۲۵] امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس (یعنی قبول توبہ) کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر رحمت فرماتا ہے۔

۲۳۳۱: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ تَابَ قَبْلَ اَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا تَابَ اللّٰهُ عَلَیْهِ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۲۰۷۶/۴ حدیث رقم (۴۳۔ ۲۷۰۳) واحمد فی المسند ۵۰۶/۲۔

ترجمہ:''اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص مغرب کی سمت سے آفتاب طلوع ہونے سے پہلے پہلے توبہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمائے گا''۔ (مسلم)

عرض مرتب: اس کی تشریح پچھلی حدیث کے ذیل میں ملاحظہ فرمایئے۔

۲۳۳۲: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَلّٰهُ اَشَدُّ فَرَحًا بِتَوْبَةِ عَبْدِهٖ حِیْنَ یَتُوْبُ اِلَیْهِ مِنْ اَحَدِكُمْ كَانَتْ رَاحِلَتُهٗ بِاَرْضِ فَلَاةٍ فَانْفَلَتَتْ مِنْهُ وَعَلَیْهَا طَعَامُهٗ وَشَرَابُهٗ فَاَیِسَ مِنْهَا فَاَتٰی شَجَرَةً فَاضْطَجَعَ فِیْ ظِلِّهَا قَدْ اَیِسَ مِنْ رَاحِلَتِهٖ فَبَیْنَمَا هُوَ كَذٰلِكَ اِذْ هُوَ بِهَا قَائِمَةٌ عِنْدَهٗ فَاَخَذَ بِخِطَامِهَا ثُمَّ قَالَ مِنْ شِدَّةِ الْفَرَحِ اَللّٰهُمَّ اَنْتَ عَبْدِیْ وَاَنَا رَبُّكَ اَخْطَاَ مِنْ شِدَّةِ الْفَرَحِ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۲۱۰۴/۴ حدیث رقم ۲۷۴۷۔

ترجمہ:''اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''اللہ تعالیٰ اس شخص سے جو اس کے سامنے توبہ کرتا ہے اتنا زیادہ خوش ہوتا ہے کہ جتنا تم میں وہ شخص بھی خوش نہیں ہوتا جس کی سواری بیچ جنگل بیابان میں ہو اور پھر وہ جاتی رہی ہو (یعنی گم ہوگئی ہو) اور اس سواری پر اس کا کھانا بھی ہو اور پانی بھی ہو اور وہ (اس کو تلاش کرنے کے بعد) ناامید ہو جائے اور ایک درخت کے پاس آ کر اپنی سواری سے ناامیدی کی حالت میں (انتہائی مغموم و پریشان) لیٹ جائے اور پھر اسی حالت میں اچانک وہ اپنی سواری کو اپنے پاس کھڑے ہوئے دیکھ لے۔ چنانچہ وہ اس سواری کی مہار پکڑ کر انتہائی خوشی میں (جذبات سے مغلوب ہو کر) یہ کہہ بیٹھے ''اے اللہ! تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں'' مارے خوشی کی زیادتی کے اس کی زبان سے یہ غلط الفاظ نکل جائیں''۔

(**للّٰہ**) یہ لام ابتداء ہے یا لام قسم ہے۔ (**کان راحلته**) ایک نسخہ میں **کانت راحلته** کے الفاظ ہیں۔ (**قدأیس من راحلته**) یہ جملہ حالیہ ہے۔ (**بأرض فلاة**) اضافت وتنوین ہر دو کے ساتھ مروی ہے۔ **من احدکم**: یہاں حذف مضاف ہوا ہے۔ **أی من فرح أحدکم**۔ یعنی تم میں سے کسی کی خوشی سے۔

(**للّٰہ أشد فرحا بتوبة......**) امام طیبیؒ فرماتے ہیں۔ اس سے مراد کمالِ رضا ہے۔ چونکہ فرح متعارف کا اطلاق اللہ جل شانہ کی

ذات اقدس پر درست نہیں ہے۔ اور متقدمین محدثین نے ان الفاظ کے معانی کی چھان پھٹک نہیں کی، اور یہی طریقہ اسلم ہے۔ بعض مرتبہ راسخین کے قدم بھی ڈگمگا جاتے ہیں۔ ''**وعلیها طعامه و شرابه**'': ان دو چیزوں کی وجہ تخصیص یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں اس کے زندہ رہنے کے اسباب میں سے ہیں۔ **اذهو بها قائمة عنده**: اس کی تقدیری عبارت یوں ہے: ''**اذ الرجل حاضر بتلك الراحلة حال کونها قائمة عنده**''۔

من شدة الفرح: اس کو مکرر لا کر اس کے عذر اور سبب کی طرف اشارہ فرمایا۔ کہ خوشی اور غم کی شدت سے بعض مرتبہ آدمی مدہوش ہو جاتا ہے۔ حتی کہ اس کی عقل بدیھیات کے ادراک سے عاجز آ جاتی ہے۔ اور گاہے آدمی اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

عرض مرتب: اور شاید کہ اس موقع پر یہ کہنا بے موقع نہ ہو۔ ع ہر چیز کی بہتات میں نقصان بہت ہے۔

۲۳۳۳: **وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ عَبْدًا اَذْنَبَ ذَنْبًا فَقَالَ رَبِّ اَذْنَبْتُ فَاغْفِرْهُ فَقَالَ رَبُّهٗ اَعَلِمَ عَبْدِیْ اَنَّ لَهٗ رَبًّا یَغْفِرُ الذَّنْبَ وَیَاْخُذُ بِهٖ غَفَرْتُ لِعَبْدِیْ ثُمَّ مَكَثَ مَا شَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ اَذْنَبَ ذَنْبًا فَقَالَ رَبِّ اَذْنَبْتُ ذَنْبًا فَاغْفِرْهُ فَقَالَ اَعَلِمَ عَبْدِیْ اَنَّ لَهٗ رَبًّا یَغْفِرُ الذَّنْبَ وَیَاْخُذُ بِهٖ غَفَرْتُ لِعَبْدِیْ ثُمَّ مَكَثَ مَاشَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ اَذْنَبَ ذَنْبًا فَقَالَ رَبِّ اَذْنَبْتُ ذَنْبًا اٰخَرَ فَاغْفِرْهُ لِیْ فَقَالَ اَعَلِمَ عَبْدِیْ اَنَّ لَهٗ رَبًّا یَغْفِرُ الذَّنْبَ وَیَاْخُذُبِهٖ غَفَرْتُ لِعَبْدِیْ فَلْیَفْعَلْ مَا شَاءَ**. (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۴۶۶/۱۳۔ حدیث رقم ۷۵۰۷۔ ومسلم فی صحیحه ۲۱۱۲/۴ حدیث رقم (۲۹۔ ۲۷۵۸)۔ واحمد فی المسند ۴۰۵/۲۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ایک بندے نے گناہ کیا اور پھر کہنے لگا ''اے میرے پروردگار! میں نے گناہ کیا ہے تو میرے اس گناہ کو بخش دے'' اللہ تعالیٰ نے (فرشتوں سے) فرمایا ''کیا میرا یہ بندہ جانتا ہے کہ اس کا ایک پروردگار ہے جو (جس کو چاہتا ہے اور جب چاہتا ہے) اس کے گناہ بخشتا ہے اور (جس کو چاہتا ہے اور جب چاہتا ہے) اس کے گناہ پر مواخذہ کرتا ہے (تو جان لو) کہ میں نے اپنے بندہ کو بخش دیا۔ وہ بندہ اس مدت تک کہ اللہ نے چاہا (گناہ کرنے سے) باز رہا' اس کے بعد اس نے پھر گناہ کیا اور عرض کیا کہ ''اے میرے پروردگار! میں نے گناہ کیا ہے تو میرے اس گناہ کو بخش دے'' اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا ''کیا یہ میرا بندہ یہ جانتا ہے کہ اس کا ایک پروردگار ہے جو گناہ کو بخشتا ہے اور اس پر مواخذہ کرتا ہے؟ میں نے اس بندہ کو بخش دیا''۔ وہ بندہ اس مدت تک کہ اللہ نے چاہا گناہ سے باز رہا اور اس کے بعد پھر اس نے گناہ کیا اور عرض کیا کہ ''اے میرے پروردگار! میں گناہ کیا ہے تو میرے اس گناہ کو بخش دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا ''کیا میرا یہ بندہ جانتا ہے کہ اس کا ایک پروردگار ہے جو گناہ بخشتا ہے اور اس پر مواخذہ کرتا ہے میں نے اس بندہ کو بخش دیا جب (تک وہ استغفار کرتا رہے) جو چاہے کرے''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: **(أذنب ذنباً فقال)**: بظاہر اس کا عطف أذنب پر ہو رہا ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: خبر ان ہے، اس کا اسم نکرہ موصوفہ ہے۔ **رب أذنبت**: حرف ندا محذوف ہے۔ **أی: یا رب**: **فأغفره**: ضمیر غائب ''ذنب'' کی طرف راجع ہے۔ اور فاء سببیہ ہے۔ **(أعلم)** ہمزہ استفہامیہ ہے۔ اور ''علم''، فعل ماضی ہے۔ ''**ثم أذنب ذنبا**'': ثم مفید تراخی ہے۔ **تراخی فی الذنوب** کا فائدہ دے رہا ہے۔ اور دوسرا ثم اس کی تاکید ہے۔ **(فلیفعلُ ماشاء)**: ایک نسخہ میں ''**فلیعمل ما شاء**'' کے الفاظ ہیں۔ ''**أن له ربا**'' تنوین برائے

تعظیم ہے۔

فاغفرہ: اپنے گناہ کے اعتراف کو سبب مغفرت قرار دیا کہ اللہ تعالیٰ نے بطور وعدہ اپنے اوپر مغفرت کو واجب کیا ہے۔ کہ ان تائبین کیلئے کہ جو اپنے گناہوں کے معترف ہو۔ اور ظاہر یہ محمول کرنا بھی صحیح ہے کہ اس نے مغفرت بغیر توبہ کے چاہی ہو۔ بیان وسعت رحمت میں یہ مفہوم زیادہ بلیغ ہے۔ **أعلم عبدی:** امام طیبیؒ فرماتے ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ یہ کلام باری تعالیٰ مباہاۃ کیلئے ہے، یا استفہام تقریر و تعجیب کیلئے ہے۔ اور علم عبد کی صیغۂ خطاب سے صیغہ غائب کی طرف عدول کرنے میں اس کے فعل کی تحسین ہے۔ **ثم أذنب ذنبا:** ثم کا مفہوم مخصوص (الا) میں ہونا یہ مذنب کی عظمت دلالت کرتا ہے کہ اس کی طاعت اس کی معصیت پر غالب ہے اور یہ کہ وہ طلب مغفرت کے معاملہ میں سریع الرجوع (جلد رجوع کرنے والا) ہے۔ **غفرت لعبدی:** اس میں سبب مغفرت کا اظہار ہے بایں طور کہ وہ میرا بندہ ہے چونکہ اس سے جب بھی گناہ صادر ہوتا ہے وہ مجھے ''رب'' کہہ کر پکارتا ہے۔ ابن الملکؒ فرماتے ہیں: **أی ما شاء من الذنب التی بینی وبینه مما لا یتعلق بفعل العباد، ثم لیتب** اھ۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں یہ قید بلا دلیل ہے۔ اور بلا دلیل ہونے کی دلیل یہ ہے: ''**ان اللّٰه لا یغفر أن یشرك به ویغفر ما دون ذلك لمن یشاء**''۔ (**فلیفعل ماشاء**) یہ صیغہ تلطف اور اظہار عنایت وشفقت کیلئے ہے۔ یعنی اے بندے جو تو کر رہا ہے اگر اس سے کئی گنا کرے، استغفار کرے تو میں مغفرت کروں گا۔ چونکہ میں گناہوں کو معاف کرتا ہوں۔ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد گرامی: ''**ما أصر من استغفر ولو عاد فی الیوم سبعین مرة**'' کے بھی یہی معنی ہیں۔

عرض مرتب: یہی حدیث آگے متن میں بھی آ رہی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے: حدیث: ۲۳۴۰۔

ابن الملکؒ نے بڑی عجیب بات کہی: **ما دمت تتوب وتستغفر عنها، ولكن ذلك مشروط بأن تكون نيته أن لا يعود الى الذنب** اھ'' اس لئے کہ جس چیز کو انہوں نے بطور شرط ذکر کیا ہے وہ درحقیقت ارکان توبہ میں سے ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: **أی اعمل ماشئت ما دمت تذنب ثم تتوب انی أغفرلك**''۔ یہ عبارت مقام سخط وناراضگی میں استعمال ہوتی ہے جیسا کہ یہاں: ﴿**اعملوا ما شئتم**﴾[فصلت: ٤٠] اور مقام جفاوت یعنی مقام تلطف میں بھی استعمال ہوا' جیسا کہ حدیث میں ہے اور حاطب ابن ابی بلتعہ کے بارے میں یہ ارشاد نبوی: ''**لعل اللّٰه اطلع علی أهل بدر فقال: اعملوا ما شئتم فقد غفرت لكم**''۔ نیز اسی طرح جب آپ کا محبوب آپ کو اذیت دے تو اس سے بھی یوں کہتے ہیں: ''**اصنع ما شئت فلست**...''تم جو چاہے کرو میں تمہیں نہیں چھوڑنے والا۔ قصہ مختصر یہ فعل کی ترغیب نہیں بلکہ اظہار جفاوت ہے۔

امام طیبیؒ نے فرمایا: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ گناہ کی طرف عود کرنا، اگرچہ ابتدائے گناہ سے زیادہ قبیح ہے چونکہ اس میں نقض توبہ کا گناہ بھی ہے۔ لیکن توبہ کی طرف عود کرنا ابتدائے توبہ سے زیادہ بہتر ہے۔ چونکہ اس میں ایک کریم ذات سے طلب مسلسل ہے۔ اس سے مانگنے میں الحاج وزاری ہے، اور اس بات کا اعتراف ہے کہ اس کے علاوہ کوئی بھی گناہوں کو معاف نہیں کرنے والا۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ گناہ اگرچہ مکرر بار صادر ہوں، سو مرتبہ ہوں خواہ ہزار مرتبہ ہوں خواہ اس سے زیادہ ہوں وہ ہر بار توبہ کرتا ہے تو اس کی توبہ قبول ہوتی ہے۔ اور اگر تمام گناہوں سے ایک توبہ کرتا ہے تو اس کی یہ توبہ بھی صحیح ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: یہ آخری بات اجماع سے ثابت ہے۔ البتہ اس صورت میں اختلاف ہے۔ کہ جب بعض گناہوں سے توبہ کرتا ہے (اور بعض سے نہیں کرتا) یا جب توبہ توڑ ڈالے، اس صورت میں صحیح بات یہی ہے کہ اس کی توبہ صحیح ہے۔ سبکی کبیرؒ فرماتے ہیں: استغفار طلب مغفرت کا نام ہے، خواہ وہ (طلب مغفرت) زبان کے ذریعہ ہو، خواہ دل کے ذریعہ ہو۔ خواہ دل وزبان دونوں کے ذریعے ہو۔ پہلی صورت نافع ہے، اور تیسری

صورت اس سے بھی زیادہ نافع ہے کیونکہ یہ چپ رہنے سے تو بہتر ہے پھر اس میں ایک اچھی بات کی عادت ہے اور دوسری صورت بہت مفید ہے لیکن یہ دونوں (دل وزبان) گناہ کو نہیں ختم کرتے ،حتیٰ کہ توبہ کی جائے ، جو عاصی مصر مغفرت کا طالب ہوتا ہے، لیکن یہ وجود توبہ کو مستلزم نہیں اھ۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: سبکیؒ کے اس قول ''لا یمحصان الذنب حتی توجد التوبة'' کی مراد یہ ہے: ''**لا یمحصان قطعا وجزما لا أنه لا یمحصان أصلاً**'' چونکہ استغفار ایک دعا ہے، کبھی اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی دعا قبول فرمالیتا ہے۔ چنانچہ اس کے گناہ کو ختم کردیتا ہے، اور اس وجہ سے بھی کہ تمحیص کبھی اللہ جل شانہ کے فضل سے بھی ہوجاتی ہے اور کبھی بندہ کی کسی طاعت کے بدلہ میں ہوجاتی ہے اور کبھی کسی آزمائش کی وجہ سے ہوجاتی ہے۔

(امام سبکی اسی سلسلہ کلام میں آگے) فرماتے ہیں: میں نے یہ جو ذکر کیا کہ استغفار کے معنی توبہ سے ہٹ کر ہیں یہ باعتبار وضع لفظ کے ہے۔ لیکن اکثر لوگ بیشتر اوقات استغفر اللہ کو توبہ کے معنی میں لیتے ہیں۔ پس جس شخص کا یہ اعتقاد ہو تو وہ توبہ مراد لیتا ہے۔ آگے فرمایا: بعض علماء فرماتے ہیں کہ توبہ بغیر استغفار کے تام نہیں ہوتی۔ اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**وان استغفروا ربکم ثم توبوا الیه**﴾[ھود:۳]

۔اور مشہور یہ ہے کہ یہ شرط نہیں ہے اھ۔ واضح رہے کہ اکثر شراح نے استغفار کو توبہ پر محمول کیا ہے۔ اور ظاہر حدیث اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ بندہ کا اعتراف گناہ ہی اس کی مغفرت کا سبب ہے۔ اس سے عدول کا کوئی موجب نہیں ہے، بلکہ اس حدیث میں ان قائلین پر تعریض ہے جو یہ کہتے ہیں: ''**انه تعالیٰ لا یغفر الا بالتوبة**'' ۔جیسا کہ معتزلہ کا مذہب ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

حدیث کے آخری الفاظ ''پس جو چاہے کرے'' کا مطلب یہ ہے کہ یہ بندہ جب تک گناہ کرتا رہے گا اور استغفار کرتا رہے گا اس کے گناہ بخشتا رہوں گا لہٰذا جملہ سے خدانخواستہ گناہ کی طرف رغبت دلانا مقصود نہیں ہے بلکہ استغفار کی فضیلت اور گناہوں کی بخشش میں استغفار کی تاثیر کو بیان کرنا مقصود ہے

تخریج: اس حدیث کو امام نسائی نے بھی روایت کیا ہے۔

۲۳۳۴: وَعَنْ جُنْدُبٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ حَدَّثَ اَنَّ رَجُلاً قَالَ وَاللّٰهِ لَا يَغْفِرُ اللّٰهُ لِفُلَانٍ وَاَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَالَ مَنْ ذَالَّذِىْ يَتَأَلّٰى عَلَىَّ اَنِّىْ لَا اَغْفِرُ لِفُلَانٍ فَاِنِّىْ قَدْ غَفَرْتُ لِفُلَانٍ وَاَحْبَطْتُ عَمَلَكَ اَوْكَمَا قَالَ.

اخرجه مسلم فی صحیحه ۲۰۲۳/٤ الحدیث رقم (۱۳۷۔ ۲٦۲۱)۔

ترجمہ: ''اور حضرت جندبؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ بیان فرمایا ''اس امت میں سے یا گزشتہ امتوں میں سے ایک شخص نے کہا کہ خدا کی قسم اللہ تعالیٰ فلاں شخص کو نہیں بخشے گا'' پھر آپ ﷺ نے بیان فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کون شخص ہے جو میری قسم کھا کر کہتا ہے کہ میں فلاں شخص کو نہیں بخشوں گا اور یہ جان لے کہ) میں نے اس شخص کو بخش دیا اور تیرے عمل کو ضائع کیا (یعنی تیری قسم کو جھوٹا کیا)۔'' (مسلم)

تشریح: (**والله لا یغفر الله لفلان**) اس شخص نے یہ جملہ کیوں کہا؟ اس میں متعدد احتمالات ہیں یا اس وجہ سے کہ اس کے گناہ کو بہت بڑا سمجھتا تھا۔

ان الله تعالیٰ: ہمزہ مفتوحہ کے ساتھ پڑھنا درست ہے۔ **أی أن الله تعالیٰ**۔ اور ہمزہ کو مکسور پڑھنا بھی درست ہے۔ ''**أی والحال ان الله تعالیٰ**۔ **أحبطت عملك**: مظہرؒ اس کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں یعنی میں نے تیری قسم کو باطل کردیا، اور تیرے حلف کو کاذب کردیا، چونکہ ایک دوسری حدیث میں آتا ہے ''**من یتألی علی الله یکذبه**'' ۔معتزلہ کیلئے اس حدیث سے مسئلہ

ذیل میں تمسک درست نہیں: صاحب مرتکب کبیرہ عدم استحلال کے باوجود بھی مخلد فی النار ہوتا ہے۔جیسا کہ کفر اسکے عمل کو حبط کر دیتا ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ استفہام انکاری ہے، بظاہر یوں کہنا چاہئے تھا: ''أنت الذی یتألی علیّ''۔اس کی دلیل اگلا کلام ہے: ''أحبطت عملك''۔صیغۂ خطاب سے عدول اولاً تو اس وجہ سے کیا کہ اس کے فعل سے شکایت ہے اور ثانیا اس سے اعراض مقصود ہے ۔حدیث سابق کے برعکس۔

لہٰذا کسی بھی شخص کے بارے میں قطعی طور پر یہ کہنا کہ وہ جنتی ہے یا دوزخی ہے جائز نہیں ہے ہاں قرآن وحدیث نے وضاحت کے ساتھ جن لوگوں کو جنتی و دوزخی کہا ہے ان کو قطعی طور پر جنتی یا دوزخی کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے جیسا کہ عشرہ مبشرہ۔ہم اگر یہ کہیں کہ اس کا یہ قول (واللّٰہ لا یغفر اللّٰہ لفلان) کفر ہے تو فأحبطت عملك ظاہر ہے۔اور اگر ہم یہ کہیں کہ یہ معصیت ہے تو معتزلہ کے مذہب پر اس کا جواب وہی ہے۔(جو اوپر گزرا) اور اہل سنت کے مذہب کے مطابق یہ تغلیظ پر محمول ہے۔اھ۔اس میں اعتراض ہے۔اس کو کفر پر محمول کرنا بعید ہے۔اور علی سبیل التنزل ان کا قول بالکل ظاہر ہے۔ ہمارے مذہب پر۔ چونکہ امام شافعیؒ کا مذہب یہ ہے کہ ''احباط'' کیلئے کفر پر موت شرط ہے۔اور معتزلہ کے مذہب میں یہ بات معروف نہیں کہ ہر معصیت سارے اعمال کو حبط کر دیتی ہے۔پھر یہ کہ کلام کو ہماری ذکر کردہ توجیہہ پر محمول کرنا تغلیظ پر محمول کرنے سے اولیٰ ہے۔نیز وہ اس کے منافی نہیں۔واللہ تعالیٰ اعلم۔''أو کما قال'': راوی کو شک یہ ہے کہ اس کلام کا قائل نبی کریم ﷺ ہیں، یا کوئی اور، نیز بعینہٖ یہی بات کہی تھی یا اس کے مثل یہ نقل بالمعنی پر تنبیہ ہے یہ اولیٰ ہے تا کہ نقل باللفظ کا توہم نہ ہو۔

۲۳۳۵: وَعَنْ شَدَّادِ بْنِ اَوْسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ سَيِّدُ الْاِ سْتِغْفَارِ اَنْ تَقُوْلَ اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبِّی لَآ اِلٰهَ اَنْتَ خَلَقْتَنِیْ وَاَنَا عَبْدُكَ وَاَنَا عَلٰی عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ اَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ اَبُوْءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَیَّ وَاَبُوْءُ بِذَنْبِیْ فَاغْفِرْلِی فَاِنَّهٗ لَا یَغْفِرُالذُّنُوْبَ اِلَّآ اَنْتَ قَالَ وَمَنْ قَالَهَا مِنَ النَّهَارِ مُوْقِنًا بِهَا فَمَاتَ مِنْ یَوْمِهٖ قَبْلَ اَنْ یُمْسِیَ فَهُوَ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَمَنْ قَالَهَا مِنَ اللَّیْلِ وَهُوَ مُوْقِنٌ بِهَا فَمَاتَ قَبْلَ اَنْ یُّصْبِحَ فَهُوَ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی الصحیح ۹۷/۱۱۔ حدیث رقم ۶۳۰۶۔ والترمذی ۱۳۵/۵ حدیث رقم ۳۴۵۳۔

ترجمہ: ''اور حضرت شداد بن اوسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''افضل استغفار یہ ہے کہ تم یوں دعا مانگو: اے اللہ! تو ہی میرا پروردگار ہے' تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں تو نے مجھے پیدا کیا اور میں تیرا بندہ ہوں! میں تیرے عہد پر ہوں (یعنی عہد میثاق پر قائم ہوں) اور تیرے وعدے پر ہوں (یعنی تو نے حشر وغیرہ کے بارے میں جو وعدہ کیا ہے اس پر یقین کامل رکھتا ہوں) میں اپنی طاقت کے بقدر اس برائی (یعنی گناہ سے) تیری پناہ چاہتا ہوں جس میں میں مبتلا ہوا۔میں تیری نعمتوں کو جو تو نے مجھے عنایت فرمائیں اقرار کرتا ہوں اور اپنے گناہوں کا بھی اعتراف کرتا ہوں پس تو مجھے بخش دے۔کیونکہ گناہوں کو تیرے علاوہ کوئی نہیں بخشتا۔پھر آنحضرت ﷺ نے فرمایا'' جو شخص ان کلمات کو دن میں ان کے معنی پر یقین رکھ کر پڑھے اور پھر اسی دن شام سے پہلے مرجائے تو وہ جنتیوں میں سے ہے اور جو شخص ان کلمات کو رات میں ان کے معنی پر یقین رکھ کر پڑھے اور اسی رات صبح ہونے سے پہلے مرجائے تو وہ جنتیوں میں سے ہے''۔(بخاری)

تشریح: (أن تقول) کے بعد عبارت محذوف ہے: أی أیها الراوی، یا أیها المخاطب، اس میں خطاب عام ہے۔

خلقتني: جملہ مستانفہ ہے، تربیت کا بیان ہے۔ وأنا عبدك جملہ حالیہ ہے۔

موقنابها: منصوب علی الحالیۃ ہے۔ أى حال كونه معتقدا...... من شر ما صنعت: من تعلیلیہ ہے۔ أى: من أجل ترضعي۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''استعير لفظ السيد من الرئيس المقدم الذى يعمد اليه فى الحوائج لهذا الذى هو جامع لمعانى التوبة كلها، وقد سبق أن التوبة غاية الاعذار اھ۔ ابن حجر نے امام طیبیؒ کی اتباع کی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ استغفار سے مراد توبہ ہے، اور حدیث کے ظاہر سے بھی اطلاق معلوم ہوتا ہے۔ لیکن توبہ کے معنی کو جامع ہونا ممنوع ہے۔ جیسا کہ مخفی نہیں۔ چونکہ اس میں صرف اعتراف بالذنب لناشئ عن الندامة ہے، عدم عود کا عزم، اور حقوق کی ادائیگی وغیرہ۔ اس سے بالکل مفہوم نہیں ہوتی۔ وأنا على عهدك کی دوسری تشریح یہ ہے: اے اللہ آپ پر ایمان لانے، اور اخلاص کے ساتھ آپ کی طاعت کی بجا آوری کا میں نے آپ سے جو عہد و پیمان کئے ہیں میں ان پر قائم ہوں۔ اور میں بھی قائم ہوں، اور مضبوطی سے تھامے ہوئے ہوں، آپ کے عہد کو اور آپ کی طرف سے اجر و ثواب کے پورا کرنے کو عہد کو۔ استطاعت کی شرط لگانا در حقیقت اپنی عاجزی کا اظہار ہے، قصہ مختصر یہ کہ اے اللہ میں آپ کی کماحقہ عبادت پر قادر نہیں، لیکن اپنی طاقت کے بقدر بھرپور کوشش کروں گا۔

عرض مرتب: على عهدك ووعدك میں بظاہر اضافت الی المفعول اور اضافت الی الفاعل ہر دو کا احتمال ہے اھ۔

صاحب النہایہ فرماتے ہیں: واستثنى بقوله: ''ما استعطت'' موضع القدر السابق لأمره أى: ان كان قد جرى القضاء على أن أنقض العهد يوما، فانى أميل عند ذلك الى الاعتذار لعدم الاستطاعة فى دفع ما قضيت۔ أبؤ بذنبي: ابن حجرؒ فرماتے ہیں: ''أى الذنب العظيم الموجب للقطعية لو لا واسع عفوك وهامع فضلك اھ۔ ابن حجر سے یہاں ذہول اور غفلت دونوں کا صدور ہوا ہے، انہوں نے اس بات کی طرف دھیان نہیں کیا کہ یہ کلام کس کا ہے۔ یہ کلام تو رسول اللہ ﷺ کا ہے، وہ تو معصوم ہیں حتی کہ ''زلّہ'' سے بھی۔ اور اس سے عجیب بات یہ ہے کہ انہوں نے امام طیبیؒ کی بات پر طعن کیا ہے۔ باوجودیکہ ان کا کلام کمال حسن رکھتا ہے۔ چنانچہ (امام طیبیؒ) لکھتے ہیں: ''اعترف أولا بأنه تعالى أنعم عليه ولم يقيده يشمل كل الانعام ثم اعترف بالتقصير، وأنه لم يقم بأداء شكرها، وعده ذنبا مبالغة فى هضم النفس تعليما الأرمة''۔

فمات من يومه: اس کی احتیاج پیش آئی باوجودیکہ فاء برائے تعقیب موجود ہے، چونکہ ہر شئی کی تعقیب اس کے مناسب حال ہوتی ہے۔ مثلاً تزوج فولدله، وهذا لا يوجب قولها فى ذلك اليوم۔

تخریج: اس حدیث کو امام نسائی نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔ حصن میں مروی بزار کی روایت میں الفاظ یوں ہیں ''سيد الاستغفار أن يقول الرجل واذا جلس فى صلاته''۔

الفصل الثانی:

۲۳۳۶: عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى يَا ابْنَ اٰدَمَ اِنَّكَ مَا دَعَوْتَنِىْ وَرَجَوْتَنِىْ غَفَرْتُ لَكَ عَلٰى مَا كَانَ فِيْكَ وَلَا اُبَالِىْ يَا ابْنَ اٰدَمَ لَوْ بَلَغَتْ ذُنُوْبُكَ عِنَانَ السَّمَاءِ ثُمَّ اسْتَغْفَرْتَنِىْ غَفَرْتُ لَكَ وَلَا اُبَالِىْ يَا ابْنَ اٰدَمَ اِنَّكَ لَوْ لَقِيْتَنِىْ بِقُرَابِ الْاَرْضِ خَطَايَا ثُمَّ لَقِيْتَنِىْ لَا تُشْرِكُ بِىْ شَيْئًا لَاَتَيْتُكَ بِقُرَابِهَا مَغْفِرَةً. (رواه الترمذى)

اخرجه الترمذى فى السنن ۵/۲۰۸ حديث رقم ۳۶۰۸۔

ترجمہ: ''حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے ابن آدم! جب تک

تو مجھ سے گناہوں کی معافی مانگتا رہے گا اور مجھ سے امید رکھے گا میں تجھے بخشوں گا تو نے جو بھی برا کام کیا ہوگا اور مجھ کو اس کی پرواہ نہیں ہوگی (یعنی تو چاہے کتنا ہی بڑا گناہ گار ہو تجھے بخشا میرے نزدیک کوئی بڑی بات نہیں ہے) اے ابن آدم! اگر تیرے گناہ آسمان کی بلندیوں تک بھی پہنچ جائیں اور تو مجھ سے بخشش چاہے تو میں تجھ کو بخش دوں گا اور مجھ کو اس کی پرواہ نہیں ہوگی' اے ابن آدم! اگر تو مجھ سے اس حال میں ملے کہ تیرے ساتھ گناہوں سے بھری ہوئی زمین ہو تو میں تیرے پاس بخشش و مغفرت سے بھری ہوئی زمین لے کر آؤں گا۔ بشرطیکہ تو نے میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا ہو۔ (یعنی شرک میں مبتلا نہ ہوا ہو) ترمذیؒ

تشریح: (ما دعوتنی) ما مصدریہ ظرفیہ ہے۔ (یعنی ما بمعنی مادام ہے)۔ أی: **ما دمت تدعونی وترجونی** یعنی **فی مدة دعائك ورجائك۔ غفرت لك علی ما كان فيك:** حال ہے۔ أی: **حال كونك سمترا علی ما وجدته فيك من الذنب۔ ولا أبال:** یہ جملہ بھی حالیہ ہے۔ ابن آدم انك۔ ایک روایت میں یا ابن آدم ہے۔

لا تشرك بی شيئا: یہ جملہ فاعل سے حال ہے یا مفعول سے حال ہے۔ **لأيتك:** ایک روایت میں بصیغہ مضارع متکلم **لآتيك** ہے۔ "**مغفرة**": یہ بھی تمیز ہے۔ **عنان السماء:** بعض کا کہنا ہے کہ یہ اضافت از باب "تاکید" ہے۔ جیسا کہ یہ آیت: ﴿**فخر عليهم السقف من فوقهم**﴾ [النحل:٢٦] ابن حجرؒ فرماتے ہیں: آسمان کا اطلاق جرم معہود پر بھی ہوتا ہے۔ اور سحاب کی مانند ہر بلند چیز پر بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ اس تقریر پر یہ اضافت بیانیہ ہے۔ أی: **سحاب هو السماء** اھ۔ اور یہ بات درست نہیں، چونکہ اضافت بمعنی من بیانیہ میں عموم وخصوص من وجہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ خاتم فضة۔ **لو بلغت ذنوبك عنان السماء:** کی معنوی تقدیر یوں ہے۔ "**لو تجسمت ذنوبك وملأت بين السماء والأرض**۔ (**غفرت لك ولا أبالی**) اور جملہ کو مکرر لایا گیا ہے۔ اس میں معتزلہ پر رد بلیغ ہے۔ **ثم يقتنی لا تشرك بی شيئا:** امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ "ثم" تراخی کیلئے ہے عدم شرک مطلوب اولی ہے۔ اس وجہ سے یقتنی کی قید کا اضافہ فرمایا۔ وگرنہ تو اتنا کہہ دینا بھی کافی تھا: **خطايا لا تشرك** ۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں۔ اس قید کا فائدہ یہ ہے کہ موت توحید پر ہونی چاہئے۔

۲۳۳۷: ورواه احمد والدارمی عن ابی ذر وقال الترمذی هذا حديث حسن غريب۔

اخرجه الدارمی فی سننه ٤١٤/٢ حديث رقم ٢٧٨٨۔ واحمد فی المسند ١٤٧/٥۔

ترجمہ: اور احمدؒ و دارمیؒ نے اس روایت کو ابو ذرؓ سے نقل کیا ہے۔ نیز امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے"۔

۲۳۳۸: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی مَنْ عَلِمَ اَنِّیْ ذُوْ قُدْرَةٍ عَلٰی مَغْفِرَةِ الذُّنُوْبِ غَفَرْتُ لَهٗ وَلَا اُبَالِیْ مَا لَمْ يُشْرِكْ بِیْ شَيْئًا. (رواه فی شرح السنة)

شرح السنة ٣٨٨/١٤ الحديث رقم ٤١٩١۔ والحاكم فی المستدرك ٢٦٢/٤۔

ترجمہ: "اور حضرت ابن عباسؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس شخص نے یہ جانا کہ میں گناہوں کو بخشنے پر قادر ہوں تو اسے بخش دوں گا اور مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوگی بشرطیکہ وہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا ہو"۔ (شرح السنۃ)

تشریح: (**من علم أنی ذو قدرة......**)۔ شرک کا استثناء کرنے کی ضرورت نہیں چونکہ یہ اعتقاد مؤمن کے علاوہ کسی اور

کا نہیں ہوسکتا۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ کلام اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ اس بات کا اعتراف مغفرت کا سبب ہے۔ یہ اس حدیث مبارکہ کی نظیر ہے۔ **أنا عند ظن عبدی بی**۔ اور ذو قدرہ میں وعید بھری تعریض ہے۔ ان پر جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں یعنی معتزلہ: **انه لا یغفر الا بالتوبة**۔ اس کی دلیل اگلا جملہ **و لا ابالی** ہے۔ **ما لم یشرك بی**: یہ قید اس کی حکمت کا مقتضیٰ ہے۔ واللہ اعلم بھا۔ وگرنہ جہت عقل وکمال فضل اس سے کوئی مانع نہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا مقتضیٰ اللہ جل شانہ کے اسماء جلالیہ اور صفات جبروتیہ: قہار، منتقم، اور شدید العقاب وغیرہ ہوں۔ ان صفات کیلئے مظاہر کا ہونا ضروری ہے تاکہ آثار سخط وغضب کا اظہار ہو سکے۔ جس طرح کے اسماء جلالیہ اور نعوت رحموتیہ کیلئے مظاہر ہیں۔ غفاریت اور غفوریت کیلئے بھی مظاہر ہیں۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ بندہ کو اس بات کا جاننا کہ اللہ تعالیٰ گناہوں کی مغفرت پر قادر ہے اس کی مغفرت وبخشش کا سبب ہے کیونکہ جو شخص یہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہوں کی بخشش پر قدرت رکھتا ہے وہ اس سے امید رکھتا ہے اور جو شخص کریم سے امید رکھتا ہے کریم اسے محروم نہیں رکھتا لہٰذا یہ حدیث قدسی اس حدیث قدسی **انا عند ظن عبدی بی** میں اپنے بندہ کے گمان کے قریب ہوں جو وہ میرے بارے میں رکھتا ہے کے مانند ہے۔

منقول ہے کہ حضرت سفیان ثوریؒ بیمار ہوئے تو حضرت حماد بن سلمہؒ ان کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے حضرت سفیان ثوریؒ نے حضرت حمادؒ سے کہا کہ کیا آپ کو اس بات کا گمان ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ جیسے کو بخش دے گا؟ حضرت حمادؒ نے جواب دیا کہ ''اگر مجھے اس بات کا اختیار دے دیا جائے کہ حساب کتاب کے لئے چاہے تو میں اپنے باپ کے سامنے پیش ہو جاؤں چاہے اللہ تعالیٰ کے سامنے تو میں اللہ تعالیٰ ہی کے سامنے پیش ہونے کو ترجیح دوں گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ باپ سے زیادہ مجھ پر رحم کرتا ہے''۔ گویا حمادؒ کے اس جواب کا مقصد یہ تھا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی مغفرت وبخشش کی امید رکھئے اس کی رحمت پر بھروسہ کیجئے کیونکہ وہ ارحم الراحمین ہے اور اس فصل الخطاب کے ضمن میں جواب بھی ہو گیا۔

۲۳۳۹: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ لَزِمَ الْاِ سْتِغْفَارَ جَعَلَ اللّٰهُ لَهُ مِنْ كُلِّ ضِيْقٍ مَّخْرَجًا وَمِنْ كُلِّ هَمٍّ فَرَجًا وَرَزَقَهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (رواه احمد وابوداود)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۸۵/۲ حدیث رقم ۱۵۱۸۔ وابن ماجه ۱۲۵۴/۲ حدیث رقم ۳۸۱۹۔ واحمد فی المسند ۲۴۸/۱۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو استغفار کو اپنے اوپر لازم قرار دے لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے ہر تنگی سے نکلنے کی راہ نکال دیتا ہے اور اسے ہر رنج وغم سے نجات دیتا ہے نیز اس کو ایسی جگہ سے (پاک وحلال) روزی بہم پہنچاتا ہے۔ جہاں سے اس کو گمان بھی نہیں ہوتا''۔ (احمد، ابوداود، ابن ماجہ)

تشریح: **من لزم الاستغفار**:

''استغفار کو اپنے اوپر لازم قرار دے لینا کا'' مطلب یہ ہے کہ جب بھی گناہ سرزد ہو جائے یا کوئی آفت ومصیبت اور رنج وغم ظاہر ہو تو استغفار کرے! یا پھر اس کے معنی یہ ہیں کہ استغفار پر مداومت وہمیشگی اختیار کرے کیونکہ زندگی کا کوئی لمحہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں انسان استغفار کا محتاج نہ ہو اس لئے سرکار دو عالم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے:

طُوْبٰى لِمَنْ وَجَدَ فِيْ صَحِيْفَتِهٖ اِسْتِغْفَارًا كَثِيْرًا: ''خوش بختی ہے اس شخص کے لئے جس نے اپنے نامہ اعمال میں استغفار کی کثرت پائی''۔

اس حدیث کو ابن ماجہ نے سندِ "حسن صحیح" کے ساتھ روایت کیا ہے۔ "**من کل ضیق مخرجا**: جار مجرور "مخرجا" کے متعلق ہے۔ اور شدت اہتمام کے باعث یہاں اور اگلے جملہ میں جار مجرور کو مقدم کیا ہے۔ **من حیث لا یحتسب**: یعنی نہ جہاں سے اس کو گمان ہوتا ہے، نہ امید ہوتی ہے اور نہ اس کے دل میں یہ خیال گزرا ہوتا ہے۔ اس جملہ میں صوفیہ کے اس قول کی طرف اشارہ ہے۔ **المعلوم شؤم**: چونکہ دل اس میں اٹکا ہوا ہوتا ہے۔ اور اس پر بھروسہ کرتا ہے۔ اور تعلق و توکل تو قادرِ مطلق ہی کی ذات پر ہونا چاہئے۔

حدیث میں مذکورہ بالا فضیلت کی بنیاد یہ ہے کہ جو شخص استغفار کو اپنے اوپر لازم قرار دے لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ سے اس کے قلب کا تعلق اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر اس کا اعتماد مستحکم وقوی ہوتا ہے اور اس کے گناہ بخشے جاتے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں اس کا شمار "اللہ سے ڈرنے والوں" اور اللہ کی ذات پر اعتماد کرنے والوں میں ہوتا ہے جن کے بارے میں حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے جو مذکورہ بالا حدیث کی بنیاد بھی ہے کہ:

وَمَنْ يَّتَقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ.

"جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے (ہر تنگی سے) نکلنے کی راہ نکال دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے روزی بہم پہنچاتا ہے جہاں اس کو گمان بھی نہیں ہوتا اور جو شخص اللہ پر اعتماد کرتا ہے اللہ اس کے لئے کافی ہو جاتا ہے"۔

استغفار کی فضیلت اور اس کا فائدہ مند ہونا اس آیت سے بھی ثابت ہوتا ہے:

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا

"پس میں نے کہا کہ تم اپنے رب سے بخشش مانگو کیونکہ وہ بہت زیادہ بخشنے والا ہے۔ وہ تم پر بکثرت بارش برسائے گا اور تمہیں مال اور اولاد دے گا اور تمہارے لئے باغ بنائے گا اور تمہارے لئے نہریں جاری کرے گا"۔ حضرت حسن بصریؒ کے بارے میں منقول ہے کہ ایک شخص نے ان سے قحط سالی کی شکایت کی تو انہوں نے اس سے کہا کہ اللہ سے استغفار کرو، پھر ایک اور شخص نے محتاجگی کا شکوہ کیا اور ایک اور نے اولاد نہ ہونے کا اور ایک اور نے زمین کی پیداوار میں کمی کی شکایت کی، انہوں نے سب ہی سے کہا کہ استغفار کرو! لوگوں نے عرض کیا کہ آپ کے پاس کئی شخص آئے اور سب نے اپنی الگ الگ پریشانی ظاہر کی۔ مگر آپ نے سب ہی کو استغفار کرنے کا حکم دیا اس کی کیا وجہ ہے؟ انہوں نے اس کے جواب میں مذکورہ بالا آیت فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا ...... پڑھی اور اس طرح انہیں بتایا کہ میں نے جن باتوں کے لئے استغفار کا حکم دیا ہے اس آیت سے وہ سب ثابت ہیں۔

تخریج: اس حدیث کو امام نسائی اور ابن حبان نے بھی روایت کیا ہے۔

۲۳۴۰: وَعَنْ اَبِیْ بَكْرٍ الصِّدِّيْقِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا اَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ وَاِنْ عَادَ فِی الْيَوْمِ سَبْعِيْنَ مَرَّةً. (رواه الترمذی وابوداود)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۸۴/۲ حدیث رقم ۱۵۱۴۰۔ والترمذی ۲۱۸/۵ حدیث رقم ۳۶۳۰۔

ترجمہ: "اور حضرت ابوبکر صدیقؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جس شخص نے (اپنے گناہ) پر استغفار کیا اس نے اپنے گناہ پر اصرار نہیں کیا اگرچہ وہ دن میں ستر بار گناہ کرے"۔ (ترمذی وابوداؤد)

تشریح: (ما أصر) ما نافیہ ہے۔ ستر کا عدد بظاہر تکریر و تکثیر کیلئے ہے۔ ہمارے بعض علماء فرماتے ہیں: مصروہ ہے جو نہ استغفار کرے اور نہ اپنے گناہ پر شرمندہ و شرمسار ہو۔ اور اصرار کا مطلب ہے بکثرت کرنا۔ ابن الملکؒ بھی تقریباً یہی فرما رہے ہیں: **الاصرار**

الثبات والدوام علی المعصة: یعنی من عمل معصیة، ثم استغفر، فندم علی ذلك خرج عن کونه مصرّا۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: **الاستغفار یرفع الذنوب**: استغفار رافع ذنوب ہے۔ اور یہ جو حدیث میں آتا ہے۔ **لا صغیرة مع الاصرار ولا کبیرة مع الاستغفار**: تو بعض کا کہنا ہے کہ اصرار کی حد یہ ہے کہ اس سے گناہ صغیرہ کا بار بار صدور ہو، ابن حجرؒ فرماتے ہیں ممکن ہے کہ استغفار سے مراد توبہ ہو۔ اس صورت میں نفی اصرار بالکل واضح ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ استغفار سے مراد خود استغفار مع ذلت واستصغار ہو۔ چونکہ اس معیت کے ساتھ کبھی گناہ محو کر دیئے جاتے ہیں، جیسا کہ ماقبل میں معلوم ہوا۔ آگے فرماتے ہیں: **ویشعر بقلة مبالات کاشعار الکبیرة، وکذا اذا اجتمعت صغائر مختلفة الأنواع بحیث یشعر مجموعها بما یشعر به أصغر الکبائر۔**

اس ارشادِ گرام کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص اپنے کسی گناہ پر شرمندہ ہوتا ہے اور اس سے استغفار کرتا ہے خواہ وہ گناہ صغیرہ ہو یا کبیرہ تو وہ حد اصرار سے خارج ہوتا ہے چاہے اس سے اس گناہ کا ارتکاب کتنی ہی مرتبہ کیوں نہ ہو کیونکہ گناہ پر ارتکاب کرنے والا تو اسی کو کہیں گے جو بار بار گناہ کرے مگر نہ تو وہ اس گناہ سے شرمندہ و نادم ہو اور نہ ہی استغفار کرے۔

۲۳۴۱: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ كُلُّ بَنِيْ اٰدَمَ خَطَّاءٌ وَّخَيْرُ الْخَطَّائِيْنَ التَّوَّابُوْنَ۔ (رواه الترمذی وابن ماجة والدارمی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۷۰/٤ حدیث رقم ۲٦۱٦۔ وابن ماجه ۱٤۲۰/۲ حدیث رقم ٤۲٥۱۔ واحمد فی المسند ۱۹۸/۳۔

ترجمہ: ''اور حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہر انسان خطا کار ہے (یعنی ہر انسان گناہ کرتا ہے علاوہ انبیاء کرام کے کیونکہ وہ معصوم عن الخطاء ہیں) اور بہترین خطا کار وہ ہیں جو توبہ کرتے ہیں''۔ (ترمذی' ابن ماجہ' دارمی)

تشریح: (خطاء) (مبالغہ کا صیغہ ہے) بمعنی کثیر الخطا۔ لفظ کل کی ظاہری رعایت کے پیش نظر ''خطاء'' کو مفرد لایا گیا ہے۔ اور ایک روایت میں خطاؤن ہے، اس میں لفظ ''کل'' کے معنی کی رعایت کی گئی ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ ''کل'' مراد ہے **من حیث هو کل أو کل واحد۔ کل بنی آدم خطاء** کے مفہوم سے انبیاء کرام مخصوص و مستثنیٰ ہیں، (چونکہ انبیاء معصوم ہوتے ہیں) یا یہ کہ وہ اصحاب صغائر ہیں۔ پہلی توجیہہ اولیٰ ہے۔ چونکہ انبیاء کرام کے (جو) امور (ان کی بلند شان کے موافق نہیں معلوم ہوتے) وہ ترک اولیٰ کے قبیل سے ہیں۔ یا **حسنات الأبرار سیئات المقربین** کے قبیل سے ہی۔ یا چند اشیاء کی بابت ان کے امور **عما لا تلیق بشانهم** کے صدور کو ان کو ''زلات'' کہا جائے۔ اس تفصیل کے ساتھ کہ وہ امور ان سے خطأً ونسیاناً صادر ہوئے۔ قصد عصیان کے بغیر۔

التوابون: یہ بھی مبالغہ کا صیغہ ہے۔ ''ای: رجاعون''۔ اس کا ایک مفہوم یہ ہو سکتا ہے۔ بہترین خطا کار وہ ہیں جو معصیت سے توبہ کر کے طاعت کے ذریعہ اللہ کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ بہترین خطا کار وہ ہیں جو غفلت کو ترک کر کے انابت کے ذریعہ ذکر (یعنی ذکر اللہ) کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔ تیسرا مفہوم یہ ہے کہ بہترین خطا کار وہ ہیں جو ''غیبت'' سے ''حضور'' کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمد اور حاکم نے روایت کیا ہے۔

۲۳۴۲: وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ الْمُؤْمِنَ اِذَا اَذْنَبَ كَانَتْ نُكْتَةٌ سَوْدَاءُ فِيْ قَلْبِهٖ

فَإِنْ تَابَ وَاسْتَغْفَرَ صُقِلَ قَلْبُهُ وَإِنْ زَادَتْ حَتّٰى تَعْلُوْ قَلْبَهُ فَذَا لِكُمُ الرَّانُ الَّذِىْ ذَكَرَ اللّٰهُ تَعالٰى كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ. (رواه احمد والترمذی وابن ماجه وقال الترمذی هذا حديث حسن صحيح)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۰۵/۵ حديث رقم ۳۳۹۰۔ وابن ماجه ۱۴۱۸/۲ حديث رقم ۴۲۵۱۔ واحمد فی المسند ۱۹۸/۳

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب کوئی مؤمن گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ ہو جاتا ہے اور اگر وہ اس گناہ سے توبہ کر لیتا ہے اور استغفار کرتا ہے تو اس کا دل (اس نقطۂ سیاہ سے) صاف کر دیا جاتا ہے اور اگر زیادہ گناہ کرتا ہے تو وہ سیاہ نقطہ بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے دل پر چھا جاتا ہے۔ پس یہ ران یعنی زنگ ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ یوں ہرگز نہیں بلکہ ان کے دلوں پر اس چیز (یعنی گناہ) کا زنگ ہے جو وہ کرتے تھے (یہاں تک کہ ان کے دلوں پر خیر و بھلائی بالکل باقی نہیں رہی) اس روایت کو احمدؒ ترمذیؒ ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔ امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے''۔

تشریح: (نکتة) بمعنی ''اثر''، کانت نکتة سوداء: أی: وحدثت فهی تامة۔ اور ایک نسخہ میں منصوب ہے۔ اس صورت میں یہ ضمیر ذنب کے مدلول سیئہ کی طرف راجع ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: کانت نکتة أی: الذنب بتأویل السیئة۔ وروی یرفع نکتة علی أن کان تامة فیقدر منه أی: من الذنب۔ یہ نکتہ کاغذ پر ٹپکائے جانے والی سیاہی کے نکتہ کی مانند ہوتا ہے، اور اس کی مقدار حسب معصیت ہوتی ہے۔ بعض حضرات نے اس کو از باب تمثیل وتشبیہ قرار دیا ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں: دل کو کپڑے کے ساتھ مشابہت دی گئی ہے اور وجہ تشبیہ سفیدی اور صفائی ہے۔ اور معصیت کو انتہائی سیاہ شی کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جو کپڑے پر لگ گئی ہو۔ تو لازمی بات ہے کہ اس داغ کی وجہ سے اس کپڑے کا حسن و جمال جاتا رہے گا۔ یہی معاملہ انسان کا ہے۔ جب وہ معصیت کا ارتکاب کرتا ہے تو گویا اس کے دل کے اجلے سفید کپڑے پر معصیت کا کالا سیاہ دھبہ لگ گیا۔ چنانچہ اگر وہ گناہ سے توبہ کر لیتا ہے اور اللہ کی طرف رجوع کر لیتا ہے تو اس کا دل تجلیاتِ ربانی کی بدولت صاف شفاف ہو جاتا ہے۔ چونکہ توبہ بمنزلہ صیقل کے ہے جو اس کے دل کی حقیقی یا تمثیلی میل کچیل کو ختم کر دیتا ہے۔ اس کو حقیقت پر محمول کرنا تمثیل وتشبیہ پر محمول کرنے سے اولیٰ ہے۔ ابن حجر نے بڑی عجیب وغریب بات کہی کہ بلاشبہ یہ بات تمثیل سے ہے۔

''یہاں تک کہ وہ اس کے دل پر چھا جاتا ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ جوں جوں گناہ میں زیادتی ہوتی جاتی ہے توں توں وہ سیاہ نقطہ بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ پورے قلب پر حاوی ہو جاتا ہے اور قلب کے نور کو ڈھانپ لیتا ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ مؤمن دل کی بینائی سے محروم ہو جاتا ہے چنانچہ نہ تو نفع دینے والے علوم اور نفع دینے والے نیک اعمال ہی کی کوئی اہمیت اس کی نظروں میں باقی رہتی ہے اور نہ فائدہ مند عقل وحکمت کی باتوں کا اس پر کوئی اثر ہوتا ہے اس طرح وہ شفقت و رحمت کے حیات آفرین وصف سے خالی ہو جاتا ہے کہ نہ اپنے اوپر رحم کرتا ہے اور نہ دوسروں کے ساتھ رحم وکرم کا معاملہ کرتا ہے اور آخر کار اس کے قلب میں ظلم وجہل اور شر وفتنہ کی تاریکی اپنا تسلط جما لیتی ہے جس کا نتیجہ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ گناہ پر اس کی جرأت بڑھ جاتی ہے اور معصیت آمیز زندگی ہی اس پر چھا جاتی ہے۔

فذالکم: بعض کا کہنا ہے کہ اس کلام کے مخاطب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں۔ **الران**: ران پر ال کے دخول کی وجہ سے ہو سکتی ہے۔ ران فعل ہے، البتہ حکایت لفظ مقصود ہے، اسم کے قائم مقام کر دیا گیا ہے۔ یا بمنزلہ مصدر ہے۔ ''ران'' بمعنی ''رین'' یعنی الطبع والتغطیه۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ران اور رین دونوں یکساں ہیں۔ جیسا کہ ''عاب'' اور ''عیب''۔ مذکورہ بالا آیت کافروں کے

بارے میں نازل ہوئی ہے، لیکن مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا کہ اگر مسلمان گناہوں کا ارتکاب کریں گے تو دل سیاہ ہو جائیں گے، دل کی سیاہی کے اعتبار سے کافروں کے مشابہہ ہو جائیں گے، اور اگر پے در پے گناہوں کا ارتکاب کرتے رہے تو یہ سیاہی بڑھتی چلی جائے گی۔ (اور ایک وقت ایسا آئے گا کہ سارا دل سیاہ ہو جائے گا اور پھر وہی ہوگا جو اوپر مذکور ہوا) ابن الملکؒ نے بھی تقریباً یہی بات فرمائی ہے: **هذه الآية مذكورة في حق الكفار، لكن ذكرها رسول اللهﷺ تخويفا للمؤمنين كي يحترزوا عن كثرة الذنب كيلا تسود قلوبهم كما اسودت قلوب الكفار، ولذا قيل: المعاصي بريد الكفر۔**

۲۳۴۳: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اللّٰهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَا لَمْ يُغَرْ غِرْ .

(رواه الترمذی و ابن ما جة)

اخرجه الترمذی فی السنن ۲۵٦/۵ حديث رقم ۳٦۰۳۔ وابن ماجه ۱٤۲۰/۲ حديث رقم ٤۲۵۳۔ واحمد فی المسند ۱۳۲/۲۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ اس وقت تک قبول کرتا ہے جب تک کہ غرغرہ کی کیفیت شروع نہ ہو جائے''۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

تشریح: (**ان الله يقبل توبة العبد**) ظاہر کے اعتبار سے ''عبد'' مطلق ہے، لیکن بعض حنفیہ نے اس کے ساتھ کافر کی قید لگائی ہے۔

اس ارشادِ گرامی میں ''جب تک کہ غرغر کی کیفیت شروع نہ ہو جائے'' کا مطلب یہ ہے کہ جب تک موت کا یقین نہیں ہوتا اس وقت تک توبہ قبولیت سے نوازی جاتی ہے مگر جب موت بالکل یقینی ہو جائے یعنی مذکورہ بالا کیفیت شروع ہو جائے تو اس وقت توبہ قبول نہیں ہوتی۔

اس حدیث کے ظاہری اور واضح مفہوم سے تو یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ مرنے کے وقت مطلقاً توبہ صحیح نہیں ہوتی خواہ کفر سے توبہ ہو یا گناہوں سے یعنی اس وقت نہ تو کافر کا ایمان لانا صحیح و درست ہوگا اور نہ مسلمانوں کی گناہوں سے توبہ صحیح ہوگی چنانچہ قرآن کریم کی آیت وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ الخ سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے لیکن بعض علماء اس بات کے قائل ہیں کہ گناہوں سے توبہ تو صحیح ہوگی لیکن کفر سے توبہ صحیح نہیں ہوگی گویا ان حضرات کے نزدیک (یاس ناامید) کا ایمان غیر مقبول ہے اور یاس کی توبہ مقبول ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ حدیث مذکورہ بالا کے تحت جو حکم بیان کیا گیا ہے اس کا تعلق گناہوں سے توبہ کرنے سے ہے کہ حالت غرغرہ میں توبہ قبول نہیں ہوتی لیکن ایسی حالت میں اگر کسی سے اس کا کوئی حق معاف کرایا جائے اور وہ صاحب حق معاف کر دے تو یہ صحیح ہوگا۔

اسی طرح اگر چیز کی وصیت کی، یا کسی کو اپنے بچہ کا ولی مقرر کر دیا یا کسی خیر کے کام کیلئے کسی کو ولی مقرر کر دیا تو اس کی یہ وصیت صحیح ہوگی۔ اھ۔ **عدم المعاودة** کی شرط لگانا مذہب جمہور کے خلاف ہے۔ اس طرح وصیت کی بابت جو کچھ فرمایا ہے، ابن حجر نے اس کا تعاقب کیا ہے کہ احکامات میں فرق نہیں ہوتا۔

www.KitaboSunnat.com

امام طیبیؒ غرغرہ کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے۔ **الغرغرة أن يجعل المشروب في الفم، ويرد الى أصل الحلق ولا يبتلع**۔ حدیث میں مذکور مسئلہ کی بنیاد یہ ہے کہ شرائط توبہ میں سے ایک شرط یہ ہے کہ جس گناہ سے توبہ کی ہے اس کے ترک اور عدم معاداۃ کا عزم کرے۔ اور یہ شرط تب ہی متحقق ہو سکتی ہے کہ تائب کو تمکنُ حاصل ہو، اس شرط کو اختیار کرنے کا وقت بھی ہے، چنانچہ جب موت کا یقین ہو گیا تو اس چیز کے پورا کرنے کا موقع کہاں رہا۔

بعض کا کہنا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عباس نے موت کی تعبیر معائنہ ملک الموت کے ساتھ کی ہے۔ تو یہ حکم اغلبی ہے، چونکہ بہت سارے لوگ تو ملک الموت کو دیکھ ہی نہیں پاتے۔ اور بہت سے لوگ غرغرہ سے پہلے دیکھتے ہیں۔ ابن حجر نے بڑی دور کی بات کہی چنانچہ

لکھتے ہیں: ورد بأن قوله تعالیٰ: ﴿قل یتوفا کم ملك الموت الذی و کل بکم﴾[السجدة:١١] یدل علی أن کل أحد یراہ فمدعی العدم یلزمه الدلیل علیه اھ۔ وجہ غرابت یہ ہے کہ اس آیت کریمہ میں رؤیت کا تو کوئی ذکر ہی نہیں۔ اور دلیل کا مطالبہ ''مانع'' سے نہیں کیا جاتا، ہاں اگر ابن عباسؓ کے بارے میں یہ بات ہوتی کہ انہوں نے یوں کہا ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی توبہ کو اس وقت تک قبول کرتا ہے جب تک کہ وہ بندہ ملک الموت کو نہ دیکھ لے۔ اسی طرح کی موقوف روایت حکماً مرفوع ہوتی ہے، چونکہ اس قسم کی بات عقل کے ذریعے نہیں کہی جاسکتی، یا یہ کہ ان کا کلام دوسروں پر حجت ہے یا یہ کہ وہ امام المفسرین ہیں، البتہ ان کی بات پر یہ آیت دلالت کرتی ہے: ﴿فلم یك ینفع ایمانهم لما رأو بأسنا﴾[غافر:٨٥] اور پچھلی آیت بھی اس کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ حقیقت میں حضور مَلک کے علاوہ نہیں ہے، یا موت کیلئے ہے تو اس صورت میں یہ مجازاً ہوگا۔ اور نسبت حقیقۃً، نسبۃ مجازیہ سے اولیٰ ہے۔ چنانچہ اس قبیل سے ہوگا: ﴿واسأل القریة﴾[یوسف:٨٢]

تقدیری عبارت یوں ہوگی: حضر أحدهم ملك الموت واللّٰه اعلم۔

مکرمین کی جانب سے روح کشی کی حکمت: بعض کا کہنا ہے کہ انسان کی روح کشی کی ابتداء پیروں سے ہوتی ہے تا کہ دل اور زبان ذکر میں رہیں۔ اور اللہ کی طرف رجوع کریں، لوگوں سے اپنے مظالم معاف کرالیں کارہائے خیر کی وصیت کرے، اور تا کہ اس کا آخری کلام لا اله الا اللّٰه ہو۔

۲۳۴۴: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ الشَّیْطَانَ قَالَ وَعِزَّتِكَ یَا رَبِّ لَا اَبْرَحُ اُغْوِیْ عِبَادَكَ مَا دَامَتْ اَرْوَاحُهُمْ فِیْ اَجْسَادِهِمْ فَقَالَ الرَّبُّ عَزَّوَجَلَّ وَعِزَّتِیْ وَجَلَالِیْ وَارْتِفَاعِ مَكَانِیْ لَا اَزَالُ اَغْفِرُلَهُمْ مَا اسْتَغْفَرُوْنِیْ۔ (رواہ احمد)

اخرجه احمد فی المسند ۲۹/۳۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابوسعید خدریؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''شیطان نے اللہ تعالیٰ سے کہا کہ قسم ہے تیری عزت کی اے میرے پروردگار! میں تیرے بندوں کو ہمیشہ گمراہ کرتا رہوں گا' جب تک کہ ان کی روحیں ان کے جسم میں ہیں! پروردگار عزوجل نے فرمایا: ''قسم ہے اپنی عزت اور بزرگی کی اور اپنے مرتبے کی بلندی کی' میرے بندے جب تک مجھ سے بخشش مانگتے رہیں گے۔ میں بھی ہمیشہ ان کو بخشتا رہوں گا''۔ (احمد)

تشریح: (وان الشیطان) ایک روایت میں ''ابلیس'' آیا ہے۔ قال: بعزتك: ایک روایت میں وجلالك کا اضافہ ہے۔ لا أغوی: از باب افعال، فعل مضارع واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ لا أزال: ایک روایت میں لا أبرح ہے۔ لا أزال والی روایت صنعت تفنن وتبین کے باعث اولیٰ ہے۔

اس حدیث سے اشارۃً یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ابلیس رئیس الضلال ومظہر الجلال ہے، جیسا کہ ہمارے نبی کریم ﷺ مظہر عنایت وجلال ہیں۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں۔ یہ حدیث مبارکہ اس آیت کریمہ کے معارض ہے: ﴿لاغوینهم أجمعین الا عبادك منهم المخلصین قال: فالحق والحق أقول لأملأن جهنم منك وممن تبعك منهم أجمعین﴾[ص:٨٤-٨٥] یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ مخلصین ہی ''ناجی'' ہیں۔ فقط، اور حدیث کی دلالت اس پر ہے کہ غیر مخلصین بھی ''ناجی'' ہوں گے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ''ممن تبعك'' کی قید سے مستغفرین ہی خارج ہیں' چونکہ ممن تبعك کا مطلب ہے کہ جو متابعت پر استمرار کے ساتھ قائم رہے، نہ رجوع الی اللہ کیا اور نہ استغفار کیا۔ اھ۔ ابن حجر نے بھی یہی بات کہی ہے اور کہا: ''ولم یرجع الی

بالتوبة''۔ ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں: اس اشکال کا زیادہ ظاہر جواب جس میں معتزلہ کا رد بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ مخلصین سے مراد وہ موحدین ہیں کہ جن کو اللہ جل شانہ نے شرک سے خلاصی عطا فرمائی ہے۔ اور لفظ مخلصین لانے میں شاید یہ حکمت ہو کہ مسلمانوں کے دلوں میں یہ خوف بیٹھا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مخلصین بھی کافروں کے ہمراہ جہنم میں چلے جائیں۔

تخریج: اس حدیث کو ابن اُبی شیبہ نے اپنے مصنف میں روایت کیا ہے۔

۲۳۴۵: وَ عَنْ صَفْوَانَ بْنِ عَسَّالٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى جَعَلَ بِالْمَغْرِبِ بَابًا عَرْضُهُ مَسِيْرَةَ سَبْعِيْنَ عَامًا لِلتَّوْبَةِ لَا يُغْلَقُ مَا لَمْ تَطْلُعِ الشَّمْسُ مِنْ قِبَلِهٖ وَذٰلِكَ قَوْلُ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيَاتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ۔ (رواه الترمذی وابن ماجة)

اخرجه الترمذی فی السنن ٢٥٥/٥ حديث رقم ٣٦٠٢۔ وابن ماجه ١٣٥٣/٢ حديث رقم ٤٠٧٠۔

ترجمہ: ''اور حضرت صفوان بن عسالؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے مغرب کی جانب ایک دروازہ بنایا ہے جو توبہ کے لئے ہے اور جس کی چوڑائی ستر سال کی مسافت (کے بقدر) ہے اور یہ دروازہ اس وقت تک بند نہیں کیا جائے گا۔ جب تک کہ آفتاب مغرب کی سمت سے نکلے (یعنی مغرب کی سمت سے آفتاب کا نکلنا قبولیت توبہ کا مانع ہے) اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کہ ''اس دن آئیں گی بعض نشانیاں تیرے پروردگار کی' نہیں نفع دے گا کسی ایسی جان کو ایمان لانا جو پہلے سے ایمان نہیں لائی تھی'' کا یہی مطلب ہے''۔ (ترمذی' ابن ماجہ)

تشریح: (جعل بالمغرب بابا): اس میں دونوں احتمال ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ دروازہ حسّی ہو، اور یہ بھی ممکن ہے معنوی ہو۔ عرضه ميسرة سبعين عاما: یعنی جب اس دروازہ کی چوڑائی اتنی ہے تو لمبائی کتنی ہوگی۔ اس دروازہ کی وسعت میں مبالغہ مقصود ہے۔ للتوبة: (ہاں کچھ عبارت محذوف ہے)۔ أی مفتوحة لأصحاب التوبة: یعنی وہ دروازہ اصحاب توبہ کیلئے کھلا ہوا ہے۔ علامة لصحة التوبة و قبولها: یعنی وہ دروزاہ صحت توبہ اور اس کی قبولیت کی علامت ہے۔ ما لم تطلع الشمس من قبله: من قبلہ کے یعنی من جانب الباب۔ (قاله ابن الملك) ابن حجر نے اس کی وضاحت من المغرب کے ساتھ کی ہے۔ یہ توضیح واضح ہے۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: اس میں احتمال یہ ہے کہ وہ دروازہ حقیقتاً ہو یہی ظاہر ہے اور اس دروازے کو بند کرنے کا فائدہ درحقیقت ملائکہ کیلئے اعلان ہے کہ توبہ کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے یہ تمثیل ہو۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''جو توبہ کے لئے ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ توبہ کرنے والوں کے لئے کھلا ہوا ہے یا یہ کہ وہ توبہ کے صحیح ہونے اور توبہ کے قبول ہونے کی علامت ہے! حاصل یہ کہ جب تک آفتاب مغرب کی جانب سے نہیں نکلتا لوگوں کے لئے توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے جس کا جی چاہے اپنے شرک اور کفر سے توبہ کرے اور جس کا جی چاہے اپنے گناہوں سے توبہ کر کے اس دروازہ کے ذریعہ آخرت کی حیات ابدی راحتوں اور سعادتوں کا مستحق ہو جائے۔ جب مغرب کی سمت سے آفتاب نکلے گا تو توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ حدیث میں جس آیت کریمہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ پوری یوں ہے:

يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيَاتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْ اِيْمَانِهَا خَيْرًا......

''اس دن آئیں گی بعض نشانیاں تیرے پروردگار کی (یعنی قرب قیامت پروردگار بعض نشانیاں ظاہر کرے گا ان ہی میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ ایک دن آفتاب مشرق کی بجائے مغرب سے طلوع ہوگا اس دن نہیں نفع دے گا کسی ایسی جان کو ایمان لانا جو پہلے سے (یعنی پروردگار کی نشانی ظاہر ہونے سے پہلے) ایمان نہیں لائی تھی اور اس جان کو کہ جس نے حالت ایمان میں بھلائی (یعنی توبہ) نہیں کی تھی (اس دن اس کی توبہ یہ کوئی نفع نہیں دے گی''۔

اس آیت کا حاصل یہی ہے کہ جس دن آفتاب مغرب کی سمت سے طلوع ہوگا تو جو شخص اس سے پہلے ایمان نہیں لایا ہوگا یا ایمان پر تو ہوگا مگر توبہ نہیں کی ہوگی اب نہ اس کا ایمان نفع دے گا اور نہ اس کی توبہ کوئی فائدہ پہنچائے گی۔

توبہ اور ایمان کے عدم قبولیت کی وجہ یہ ہے کہ جب لوگ اس منظر کا اپنی نگاہوں سے مشاہدہ کرلیں گے تو ایمان اور توبہ کی طرف مجبور ہوجائیں گے، چنانچہ اس وقت انہیں اس توبہ اور ایمان کا فائدہ نہ ہوگا جیسا کہ محتضر کو اس کا فائدہ نہ ہوگا۔ اور دروزاہ کا بند ہونا مغرب میں ہے تو پتہ چلا کہ توبہ کا دروازہ کھلا ہوا بھی مغرب ہی میں ہے۔ اور **میسرة سبعین عاما** کے الفاظ میں اس دروازہ کے توسع کو مبالغہ کے ساتھ بیان کرنا مقصود ہے۔ یا تقدیر عبارت یوں ہے: **لعرض الباب بمقدار ما یسده جرم الشمس الطالع من المغرب۔ وذلك** (کا مشار الیہ محذوف ہے)۔ **أی طلوع الشمس من مغربها المانع من قبول التوبة معنی قوله ﴿یوم تأتی لم تکن آمنت من قبل﴾**[انعام: ۱۵۸]

یہ جملہ حالیہ ہے، او کسبت کا عطف آمنت پر ہے۔ **أی أولم تکن النفس کسبت فی حال ایمانها توبة من قبل۔** اس تقدیر پر حدیث اور آیت کے درمیان مناسبت تامہ واضح ہو جاتی ہے۔ اور طلوع شمس کا معائنہ کرنا نظیر ہے حضور موت کی۔ اور مناسبت دونوں میں یہ ہے کہ اس وقت نہ قبول ایمان کوئی فائدہ دے گا، نہ توبہ کوئی نفع پہنچائے گی۔ اس تقریر سے معتزلہ کے اس عقیدہ کی بھی تردید ہوجاتی ہے کہ بغیر اعمال کے ایمان محض ذرہ برابر بھی نفع نہیں پہنچائے گا۔ شرح طیبیؒ میں لکھتے ہیں: **لم تکن آمنت من قبل**: نفسا کی صفت ہے۔ اور: **﴿أو کسبت فی ایمانها خیرا﴾**[الانعام: ۱۵۸] کا عطف آمنت پر ہے۔ اور معنی یہ ہوں گے: **ان أشراط الساعة اذا جاء ت وهی آیات لمجیئة ذهب أوان التکلیف عندها۔ فلم ینفع الایمان حینئذ نفسا غیر مقدمته من قبل ظهور الآیات، أو مقدمة ایمانها غیر کاسبة خیر فی ایمانها۔** چنانچہ نفس کافرہ میں جب وہ غیر وقت ایمان میں ایمان لائے، اور نفس مؤمنہ میں۔ جو بروقت ایمان لایا ہو لیکن اعمال خیر نہ بجالایا ہو، کوئی فرق نہیں کیا۔ واضح رہے کہ: **﴿والذین آمنوا وعملوا الصالحات﴾** میں دونوں کو جمع فرمایا ہے تا کہ مکلف فلاح وسعادت حاصل کرے۔ چنانچہ ان دونوں کو جدا جدا کرنا ٹھیک نہیں، وگرنہ تو بدبختی وہلاکت ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: جواب یہ ہے کہ اگر ان کی کہی ہوئی بات پر محمول کریں گے ''**فی ایمانها**'' کا فائدہ نہ ہوگا چونکہ آمنت پر عطف کرنے کی وجہ سے حصول کسب کا ایمان میں داخل ہونا لازم ہوجائے گا۔ لہٰذا توجیہہ یہ کی جائے کہ لف تقدیری پر محمول کیا جائے یعنی یوں کہا جائے: ''**لا ینفع نفسا ایمانها حینئذٍ أو کسبها فی ایمانها خیرا حینئذٍ لم تکن آمنت من قبل، أو کسبت فی ایمانها خیرا من قبل والایجاز من حلیة التنزیل** اھ۔ اس (تفسیر) کو ابن عطیہ، ابن حاجب اور ابن ہشام نے ذکر کیا ہے، اور میری تقریر وتحریر کی تائید اگلی حدیث سے ہورہی ہے۔

۲۳۴۶: **وَعَنْ مُعَاوِيَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْ لُ اللّٰهِ ﷺ لَا تَنْقَطِعُ الْهِجْرَةُ حَتّٰى تَنْقَطِعَ التَّوْبَةُ وَلَا تَنْقَطِعُ التَّوْبَةُ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا.** (رواه احمد وابوداود والدارمی)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۳/۳ حدیث رقم ۲۴۷۹۔ واحمد فی المسند ۳۱۲/۲ والدارمی فی السنن ۳۱۲/۲ حدیث رقم ۲۵۱۳۔

ترجمہ: ''اور حضرت معاویہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہجرت (یعنی گناہوں سے توبہ کی طرف رجوع) موقوف نہیں ہوگی تاوقتیکہ توبہ موقوف نہ ہو اور توبہ اس وقت تک موقوف نہیں ہوگی جب تک کہ آفتاب مغرب کی طرف سے نہ نکلے''۔ (ابوداؤد، احمد، دارمی)

تشریح: (**لا تنقطع**) صیغۂ مذکر ومؤنث ہر دو طرح پڑھا گیا ہے۔ (**لا تنقطع الهجرة حتی تنقطع التوبة**): ابن الملکؒ

فرماتے ہیں: ہجرت سے مراد کفر سے ایمان کی طرف منتقل ہونا، دار الشرک سے دار السلام کی طرف منتقل ہونا اور معصیت سے توبہ کی طرف رجوع کرنا ہے اور ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں آخری صورت میں عموم ہے جو سب کو شامل ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ہجرت سے بکثرت مدینہ کی طرف ہجرت کرنا مراد نہیں ہے، چونکہ یہ ہجرت موقوف ہو چکی ہے، اور نہ ہجرت من الذنوب مراد ہے، چونکہ ایک حدیث میں آتا ہے۔ ''والمهاجرين هجر الذنوب والخطايا''۔ چونکہ یہ نفس توبہ ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں۔ اس میں کوئی مانع نہیں ہے، چونکہ مآل کمال یہ ہے کہ توبہ کا سلسلہ موقوف نہیں ہوگا۔ جب تک کہ طلوع شمس نہ ہو۔ (ابن الملکؒ آگے) لکھتے ہیں: بل الهجرة من مكان لا يتمكن فيه من الأمر بالمعروف والنهى عن المنكرو اقامة حدود الله، :﴿الم تكن أرض الله واسعة﴾ [النساء:۹۷]

''ولا تنقطع التوبة حتى تطلع الشمس من مغربها''۔ حدیث کے اس جملہ کی تشریح ماقبل میں گزر چکی۔

۲۳۴۷: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ رَجُلَیْنِ كَانَا فِیْ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ مُتَحَابَّیْنَ اَحَدُهُمَا مُجْتَهِدٌ فِی الْعِبَادَةِ وَالْاٰخَرُ یَقُوْلُ مُذْنِبٌ فَجَعَلَ یَقُوْلُ اَقْصِرْ عَمَّا اَنْتَ فِیْهِ فَیَقُوْلُ خَلِّنِیْ وَرَبِّیْ حَتّٰی وَجَدَهُ یَوْمًا عَلٰی ذَنْبٍ اسْتَعْظَمَهُ فَقَالَ اَقْصِرْ فَقَالَ خَلِّنِیْ وَرَبِّیْ اَ بُعِثْتَ عَلَیَّ رَقِیْبًا فَقَالَ وَاللّٰهِ لَا یَغْفِرُ اللّٰهُ لَكَ اَبَدًا وَلَا یُدْخِلُكَ الْجَنَّةَ فَبَعَثَ اللّٰهُ اِلَیْهِمَا مَلَكًا فَقَبَضَ اَرْوَاحَهُمَا فَاجْتَمِعَا عِنْدَهُ فَقَالَ لِلْمُذْنِبِ اُدْخُلِ الْجَنَّةَ بِرَحْمَتِیْ وَقَالَ لِلْاٰخَرِ اَتَسْتَطِیْعُ اَنْ تَحْظُرَ عَلٰی عَبْدِیْ رَحْمَتِیْ فَقَالَ لَا یَارَبِّ قَالَ اِذْهَبُوْا بِهٖ اِلَی النَّارِ۔

اخرجه احمد فى المسند ۳۲۳/۲۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بنی اسرائیل میں دو شخص تھے جو آپس میں دوست تھے ان میں سے ایک تو عبادت میں بہت ریاضت کرتا تھا اور دوسرا گناہ کرتا تھا اور کہتا تھا کہ میں گناہگار ہوں (یعنی وہ اپنے گناہوں کا اقرار کرتا تھا) چنانچہ عبادت کرنے والے نے اس سے کہنا شروع کیا جس چیز میں تم مبتلا ہو (یعنی گناہ میں) اس سے باز آ جاؤ گناہ گار اس کے جواب میں کہتا کہ ''تم میرے پروردگار پر چھوڑ دو! کیونکہ وہ غفور الرحیم ہے وہ مجھے معاف کرے گا) یہاں تک کہ ایک دن اس عابد نے اس شخص کو ایک ایسے گناہ میں مبتلا دیکھا جسے وہ بہت بڑا گناہ سمجھتا تھا اس نے اس سے کہا کہ تم اس گناہ سے باز آ جاؤ گنہگار نے جواب دیا کہ تم مجھے میرے پروردگار پر چھوڑ دو' کیا تم میرے داروغہ بنا کر بھیجے گئے ہو؟ (عابد نے یہ سن کر) کہا کہ ''خدا کی قسم! اللہ تمہیں کبھی نہیں بخشے گا اور نہ تمہیں جنت میں داخل کرے گا اس کے بعد حق تعالیٰ نے ان دونوں کے پاس فرشتہ بھیج کر ان کی روحیں قبض کرائیں اور پھر جب وہ دونوں (یعنی ان کی روحیں) حق تعالیٰ کے حضور (برزخ میں یا عرش کے نیچے) حاضر ہوئیں تو حق تعالیٰ نے گنہگار سے تو فرمایا کہ تو میری رحمت کے سبب جنت میں داخل ہو جا اور دوسرے سے فرمایا کہ ''کیا تو اس بات کی طاقت رکھتا ہے کہ میرے بندے کو میری رحمت سے محروم کر دے؟ اس نے کہا کہ ''نہیں'' پروردگار پھر اللہ تعالیٰ نے ان فرشتوں کو (جو دوزخ پر مامور ہیں) فرمایا کہ اس کو دوزخ کی طرف لے جاؤ''۔ (احمد)

تشریح: (رجلين كانا فى بنى اسرائيل) ممکن ہے کہ یہ دونوں آدمی خود بھی بنی اسرائیل میں سے ہوں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ بنی اسرائیل میں سے نہ ہوں۔ بلکہ کسی اور قوم سے تعلق رکھتے ہوں لیکن بنی اسرائیل کے ساتھ رہتے ہوں۔ متحابين: اس میں

ایک احتمال تو یہ ہے کہ ان میں باہم رشتۂ محبت کسی دنیاوی سبب سے ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی اور سبب سے ہو۔ لیکن اللہ کی خاطر نہیں تھا مطیع وعاصی کی باہمی محبت کا کوئی جوڑ نہیں بنتا، جوڑ کی اصل علت تو جنسیت ہوتی ہے چونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**لا تجد قوما يؤمنون بالله واليوم الآخر يوادّون من حاد الله ورسوله**﴾[المجادلة:۲۲]۔ اور دوسری جگہ یوں فرمایا: ﴿**الأخلاء يومئذ بعضهم بعض عدو الا المتقين**﴾[الزخرف:٦٧]۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اولاً ''**متحابين**'' (دونوں دوست) ہوں، پھر ان دونوں میں سے ایک معصیت میں جا پڑا ہو، اور اور یہی اظہر ہے۔ اور پھر بھائی چارگی اور نصیحت کے طور پر اس کو سمجھا رہا ہو۔

بعض صوفیہ کے نزدیک قطع صحبت کے مقابلہ میں نصیحت کا عمل اولیٰ ہے۔ اور (ان کی) دلیل یہ آیت ہے: ﴿**فان عصوك فقل ان برئ مما تعملون**﴾[الشعراء:۲۱٦] کہ یہاں منکم نہیں فرمایا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ منکم مقدر ہو، اور'' **مما تعملون**'' علت براءت ہو۔ جیسا کہ بعض کا یہی مذہب ہے اور ''**الحب في الله والبغض في الله**'' والی حدیث سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے اور حدیث کو ابتدا پر محمول کرنا اطلاق کے ظاہر کے خلاف ہے۔ **والآخر يقول**: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یقول کا فاعل نبی کریم ﷺ ہیں۔) **أي: الرسول** ﷺ **مذنب**: (ھو مبتدا محذوف کی خبر ہے)۔ **أي: هو مذنب**۔ ابن الملکؒ نے مظہر کی اتباع کرتے ہوئے یوں لکھا ہے: **أي يقول الآخر: أنا مذنب۔ أي معترف بالذنب**۔ (یقول کا فاعل الآخر ہے، اور مذنب کا مبتدأ أنا ہے)۔ اور یقول کی بناء یہی اظہر، چونکہ پہلے قول کے اختیار کرنے کی صورت میں کوئی خاص فائدہ نہیں ہے، اور اس صورت میں حسن مقابلہ کی بھی ضرورت نہیں کہ یوں کہا جائے **مجتهد في المعصية**۔ چنانچہ امام طیبیؒ لکھتے ہیں: **يمكن أن يقال: ان المعنىٰ والآخر منهمك في الذنب ليطابق قوله مجتهد في العبادة، لأن كثيرا ما يعبر به في الأفعال المختلفة بحسب المقام**اھ۔ **وفيه أنه لا دخل للقول حينئذٍ في المقال، كما لا يخفى على ذوي الآفهام**، بظاہر **والآخر مذنب** کہنے کے بجائے **والآخر يقول: مذنب** کی تعبیر کی طرف عدول اس لئے کیا تا کہ اس کا قول اس کی طرف رعایت ادب کے ساتھ منسوب ہو، چونکہ نبی کریم ﷺ تو یہ بات جانتے تھے کہ یہ شخص اپنے رب کے ہاں خوش بخت ہے۔ مغفور ہے۔ اور بعینہٖ اسی نکتہ کی وجہ سے (یعنی اپنے علم کی بنیاد پر) **مجتهد** فرمایا، صالح یا عابد ارشاد نہیں فرمایا۔ **فجعل يقول**: جعل فعل شروع کے معنیٰ میں ہے۔ **أقصر**: باب افعال سے امر کا صیغہ ہے۔ **أبعثت**: صیغۂ مجہول کے ساتھ ہے اور استفہام انکاری ہے۔ **ولا يدخلك الجنة**: اس میں مبالغہ در مبالغہ ہے۔ (گویا کہ اس نے حد کر دی) ابن حجرؒ لکھتے ہیں، **تاكيد لما قبله، لأن عدم الغفران لازم لعدم دخول الجنة**۔ ابن حجر کا یہ فرمانا درست نہیں، اس لئے کہ اہل سنت کا مذہب ہے: **المؤمن المذنب قد لا يغفر الله له فيعذبه ثم يدخله الجنة**۔ **قبض أرواحهما**: یہ کلام اس آیت کریمہ کے قبیل سے ہے: ﴿**فقد صغت قلوبكما**﴾[التحريم:۳]

وقال الآخر مجتہد کی تعبیر سے الآخر کی تعبیر کی طرف عدول کرنے میں جو نکتہ ہے وہ پوشیدہ نہیں، وہ یہ کہ اس کا اجتہاد فی العبادۃ اس کے قلت عمل، اور اپنے رب کی صفات سے عدم واقفیت کی بناء پر ضائع ہو گیا۔ سارا معاملہ پلٹا کھا گیا۔ اور یہ ''مجتہد'' گناہ کے اعتبار سے دوسرے شخص کی طرح ہو گیا، اور وہ ''مذنب'' اپنے حسن عقیدت، تقصیر فی المعصیت کے اعتراف کے باعث بمنزلہ مجتہد کے ہو گیا۔ **أتسطيع**: ہمزہ انکاری ہے، **أن تحظر**: ظاء معجمہ کے ضمہ کے ساتھ۔ **فقال: اذهبوا به**۔ یہ خطاب ان ملائکہ کو تھا جو جہنم کے موکل تھے، یا اسی فرشتہ کو تھا، اور جمع برائے تعظیم ہے، یا (چونکہ وہ جسمانی طور پر بہت بڑا تھا) اس کے کبر جثہ کے اعتبار سے گویا کہ وہ بمنزلہ کئی کے ہے۔ ابن الملکؒ فرماتے ہیں: **ادخاله النار كان مجازاة له على قسمه بأن الله لا يغفر للمذنب ذنبه، لأنه جعل الناس آيسين من رحمة الله، وحكم بأن الله غير غفور**اھ۔ ابن الملکؒ کے اس کلام میں غرابت ہے، اس لئے کہ اس کلام سے یہ مفہوم مستفاد

نہیں ہورہا، اس نے تو محض امر بالمعروف میں مبالغہ سے کام لیا تھا، اس سے کلام غصہ کی حالت میں صادر ہوا تھا، اگر یہ کلام صرف اللہ کیلئے ہوتا، تو یقیناً اس سے مسامحت ہوجاتی، لیکن چونکہ اپنے اجتہاد عبادت پر مغرور تھا، اور مذنب کو حقیر سمجھ رہا تھا، اس وجہ سے کہ وہ ایسے گناہ پر بار بار اصرار کررہا تھا جو مستوجب عقوبت تھا، اس وجہ سے کہا گیا ہے: **معصية أورثت ذلا واستصغارا خير من طاعة أوجبت عجبا واستكبارا۔**

چونکہ عبادت کرنے والے نے اپنی عبادت اور اپنے نیک اعمال پر غرور و تکبر کا اعتماد کیا اور اس گنہگار کو اپنے سے حقیر جان کر اس سے یہ کہا کہ حق تعالیٰ تمہیں نہیں بخشے گا اس لئے اسے مستحق عذاب قرار دیا گیا اسی لئے کسی بزرگ کا قول ہے کہ جو گناہ اپنے کو حقیر و ذلیل سمجھنے کا باعث ہو وہ اس طاقت وعبادت سے بہتر ہے جو غرور و تکبر اور نخوت میں مبتلا کردے۔

لا يا رب: ابن حجرؒ لکھتے ہیں: **أكذب نفسه وحلفه فاستحق العتاب، فمن ثم قال: اذهبوا به الى النار لأنه آيس من رحمة اللّٰه: والبأس منها كفر لمن استحله كهذا الرجل، كما دلّ عليه حلفه السابق المتضمن للحكم على اللّٰه تعالٰى بأنه لا يغفر الذنوب، وعلى صاحبه بأنه ليس من رحمة اللّٰه۔** ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ مجتہد ''یاس'' کا شکار ہوگیا تھا اور گویا کہ مستحل ہوگیا تھا، اور مآل کار کافر ہوگیا تھا، یہ باتیں درست نہیں ہیں اور **على سبيل التنزيل** سے معتزلہ کا مذہب ہے کہ وہ صاحب گناہ کبیرہ کی عدم مغفرت کے قائل ہیں، اور اہل سنت میں سے کسی نے بھی خوارج ومعتزلہ کی تکفیر نہیں کی، البتہ اس حدیث میں معتزلہ کے عقیدہ پر ردّ بلیغ ہے، بایں طور کہ اللہ تعالیٰ گناہگار کی نہ صرف یہ کہ مغفرت کرتا ہے، بلکہ اس کے عدم رجوع وتوبہ کے باوجود اس کو اپنی رحمت کے ساتھ نسبت میں بھی داخل کرتا ہے۔ امام بغویؒ اپنی سند کے ساتھ معالم میں ضمضم بن جوس سے نقل کرتے ہیں، فرماتے ہیں: میں مدینہ کی مسجد میں داخل ہوا تو مجھے ایک بوڑھے نے پکارا اور مجھ سے کہا او یمامی! ادھر آ۔ میں ان صاحب کو نہیں پہچانتا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا: تم کسی بھی شخص سے یوں ہرگز مت کہنا کہ اللہ کبھی بھی تیری مغفرت نہیں کرے گا۔ اور تجھے جنت میں داخل نہیں کرے گا۔ میں نے عرض کیا اللہ آپ پر رحم فرمائے آپ ہیں کون؟ وہ بولے: ابو ہریرہ۔ راوی کہتے ہیں میں نے کہا ہم میں سے کوئی آدمی جب غصہ میں ہوتا ہے تو اپنے گھر والوں، یا بیوی یا خادم سے یہ کلمہ کہہ جاتا ہے۔ ابو ہریرہ نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ دو آدمی......اور پھر ابو ہریرہؓ نے فرمایا: **والذي نفسي بيده لتكلم بكلمة اوبقت بدنياه وآخرته۔**

ابن حجر اس کی علت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: **لأنها صيرّته الى النار المؤبدة عليه۔** شیخ ابن حجرؒ کے اس کلام کا کھلم کھلا خطا ہونا بالکل واضح ہے۔

۲۳۴۸: وَعَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيْدَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقْرَأُ يَا عِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا وَلَا يُبَالِيْ.

(رواه احمد والترمذی وقال هذا حديث حسن غريب وفی شرح السنة يقول بدل يقرأ)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤٨/٥ حديث رقم ٣٢٩٠۔

ترجمہ: ''اور حضرت اسماء بنت یزیدؓ کہتی ہیں کہ میں نے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ آیت کریمہ پڑھا کرتے تھے: **يَا عِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا** ۔ اے میرے وہ بندو جنہوں نے (گناہ کرنے کے سبب) اپنے نفس پر زیادتی کی ہے، رحمت خداوندی سے مایوس مت ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ سب گناہ بخشتا ہے۔ (نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ) اللہ تعالیٰ کو اس کی پرواہ نہیں کہ بندے کتنے ہی

گناہ کرتے ہیں اور وہ سب کو بخش دیتا ہے) امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن غریب ہے اور شرح السنہ میں لفظ یقرأ کی بجائے لفظ یقول ہے''۔

تشریح: (یا عبادی): یاء کے فتحہ اور سکون دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ **لا تقنطوا**: نون کے فتحہ اور کسرہ ہر دو کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ **ان اللّٰہ یغفر الذنوب جمیعا**: یہ جملہ متانفہ، تعلیلیہ ہے۔

''اللہ تعالیٰ سب گناہ بخشتا ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ کافروں کو تو توبہ کے ساتھ بخشتا ہے کہ اگر کوئی کافر اپنے کفروشرک سے توبہ کر کے ایمان کی دولت قبول کرلے تو اسے حق تعالیٰ ابدی نجات و بخشش کا مستحق قرار دے دیتا ہے اور مؤمن کو توبہ کے ساتھ بھی بخشتا ہے اور اپنے بے پایاں فضل وکرم کی بنا پر اگر چاہتا ہے تو بغیر توبہ کے بھی بخش دیتا ہے۔

یہ حدیث فرقۂ ''وعیدیہ'' کا رد کررہی ہے۔ اس آیت کے بارے میں ایک احتمال یہ ہے کہ آیت منسوخ ہے۔ اور اس بات کا احتمال بھی ہے کہ **أن یکون زیادۃ من عندہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کالتفسیر الآیہ**: امام بغویؒ فرماتے ہیں: سعید بن جبیر از ابن عباس روایت کرتے ہیں: **أن أناسا من أھل الشرك کانوا قتلوا وأکثروا، وزنوا فأکثروا، فأتوا النبی ﷺ فقالوا: ان الذی تدعونا الیہ لحسن لو تخبرنا أن لما عملناہ کفارۃ، فنزلت ھذہ الآیۃ**: اھ۔ چنانچہ اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں خطاب کفار سے ہے، اور مطلب یہ ہوا کہ اللہ ان کے گناہوں کو ایمان کی بدولت معاف فرمادے گا۔ چونکہ ایمان پچھلی باتوں کو منہدم کردیتا ہے۔ اسی تفسیر کی بنیاد پر ابن حجر کی بات کا دفعیہ بھی ہوجائے گا، کہ اضافت اس بات کی مقتضی ہے کہ وہ مسلمان تھے۔

۲۳۴۹: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ فِی قَوْلِ اللّٰہِ تَعَالٰی اِلَّا اللَّمَمَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِنْ تَغْفِرِ اللّٰھُمَّ تَغْفِرْ جَمًّا وَاَیُّ عَبْدٍ لَکَ لَا اَلَمَّا. (رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث حسن صحیح غریب)

اخرجہ الترمذی فی السنن ۵/۷۱ حدیث رقم ۳۲۳۸۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عباسؓ سے اللہ تعالیٰ کے اس قول الا اللمم کی تفسیر کے ضمن میں روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے پڑھا

اِنْ تَغْفِرْ اَللّٰھُمَّ تَغْفِرْ جَمًّا ☆ وَاَیُّ عَبْدٍلَكَ لَا اَلَمَّا

اگر بخشے تو اے الٰہی تو بڑے گناہ بخش دے اور تیرا کون سا بندہ ہے جس نے چھوٹے گناہ نہ کئے ہوں

امام ترمذی نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے

تشریح: (کبائر): کبیرہ کی جمع ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس سے مراد ہر وہ گناہ ہے جس میں ''حد'' مقرر ہے اور فواحش، فاحشہ کی جمع ہے۔ فواحش سے مراد وہ گناہ ہیں جن پر وعید آئی ہے، یا زنا کے ساتھ مخصوص ہے۔ **لمم**: بروزن قلم، اس کی متعدد تفسیریں کی گئی ہیں۔ (۱) صغائر۔ (۲) **قیل نظرۃ، غمزہ قبلہ**۔ (۳) **قیل: الخطرۃ من الذنب**۔ (۴) **قیل کل ذنب لم یذکر اللّٰہ فیہ حلا ولا عذابا**۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: **الا اللمم** میں استثناء منقطع ہے، چونکہ لمم کہتے ہیں چھوٹے گناہ کو، **ألم بالمکان** اس وقت کہتے ہیں جب قیام تھوڑے عرصہ کیلئے ہو۔ لمم کے معنی ہیں پڑاؤ ڈالنا، اور ألم کہتے ہیں جب کسی فعل لمم کا صدور ہو۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ الا بمعنی غیر ہو، اور ''لمم'' صفت ہو۔ **جما**: بمعنی کثیر وکبیر۔ **ألما**: فعل ماضی ہے صیغہ واحد مذکر غائب ہے، اور الف برائے اطلاق ہے۔ **لا ألمم** کا مطلب ہے: **لم یلم بمعصیۃ**۔

اِلَّا اللَّمَمَ۔ ایک آیت کا ٹکڑا ہے اور وہ پوری آیت یہ ہے:

وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ

''اور (جن نیکوکاروں کا پیچھے ذکر ہوا) یہ وہ لوگ ہیں جو پرہیز کرتے ہیں بڑے گناہوں سے اور بے حیائی کی باتوں سے علاوہ چھوٹے گناہوں کے (کہ جن سے بچنا ممکن نہیں ہے) اور بے شک تیرا رب مغفرت کا وسیع کرنے والا ہے''۔

پس آیت میں چھوٹے گناہوں کا جو استثناء کیا گیا ہے اسی کی دلیل کے طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ بالا شعر پڑھا کہ اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھی مؤمن صغیرہ گناہوں سے خالی نہیں ہوتا۔

شعر کا حاصل یہ ہے کہ پروردگار! تیری شان رحمت ایسی ہے اور تیرے فضل و کرم کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ اگر تو چاہے تو کبیرہ گناہوں کو بھی بخش دے چھوٹے گناہوں کی تو حقیقت ہی کیا ہے اور پھر تیرا کون سا بندہ ایسا ہے جو چھوٹے گناہ نہیں کرتا اور تو اسے نہیں بخشتا بلکہ تو ان چھوٹے گناہوں کو نیکیوں کے ذریعہ جھاڑتا رہتا ہے اور اس طرح ان بندوں کو چھوٹے گناہوں کے بوجھ سے بھی بچاتا ہے۔

تیرے سارے ہی بندے خطا کار ہیں، اس آیت کریمہ کی طرف اشارہ ہے: ﴿ان ربك واسع المغفرة﴾[النجم:۳۲]

امام طیبیؒ لکھتے ہیں: **البيت لأمية بن أبى الصلت انشده النبى ﷺ اى من شانك اللهم ان تغفر غفرانا كثيرا للذنوب العظيمة ،واماالجرائم الصغيرة فلاتنسب اليك لانها لايخلوا عنها احد ،وانها مكفرة باجتناب الكبائر۔ انتهى۔وتبعه ابن حجر۔** اس عبارت پر اشکال یہ ہے کہ مذکورہ بالا تکفیر، یہ بعض معتزلہ کا مذہب ہے۔ جیسا کہ شرح العقائد میں لکھا ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: **ان تغفريں**: ان برائے شک نہیں بلکہ تعلیل کیلئے ہے۔ جیسے کہ اس آیت کریمہ میں: ﴿**ولا تهنوا ولا تحزنوا وأنتم الأعلون ان كنتم مؤمنين**﴾[آل عمران:۱۳۹]۔أى: **لأجل أنكم مؤمنون لا تهنوا**: چنانچہ اس مصرعہ کا مطلب یہ ہوا: **لأجل أنك غفار اغفر جمًّا**۔ جیسے بادشاہ سے کہا جاتا ہے: **ان كنت سلطانا فأعط الجزيل**۔ اس سلسلۂ کلام میں آگے فرماتے ہیں: یہ شعر کئی محاسن پر مشتمل ہے مثلاً ان میں سے ایک یہ ہے کہ اتحاد شرط و جزاء ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: امام طیبیؒ نے یہ بات ''جمًّا'' کی قید سے غفلت کے باعث فرمائی ہے۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: ان بمعنی ''اذ'' ہے جیسا کہ اس آیت کریمہ میں: ﴿**وخافون ان كنتم مؤمنين**﴾[آل عمران:۱۷۵]

چنانچہ امام طیبیؒ کی بات ساقط (ساقط الاعتبار) ہے۔ اس پر اشکال یہ ہے کہ حاصل دونوں کا ایک ہے۔ چونکہ ''اذ'' تعلیل کیلئے بھی آتا ہے۔ جیسا کہ اس ارشاد باری تعالیٰ میں: تب بھی تعلیل کے معنی مراد لینے میں کوئی مانع نہیں۔ لہٰذا سقوط کی کوئی وجہ نہیں بنتی۔ علاوہ ازیں شعر میں ظرفیت کے معنی مراد لینا درست نہیں، چونکہ اللہ جل شانہ کا غفار ہونا کسی وقت کے ساتھ خاص نہیں ہے، اور پھر امام طیبیؒ کے کلام پر نقض وارد کرتے ہوئے جو در حقیقت امام طیبیؒ کے مقصود کی اتباع ہی ہے۔: **فالمعنى لأجل أنك غفار......**۔

عرض مرتب: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر اشعار آنے کی بابت تفصیلی کلام جلد ہشتم باب الشعر میں ملاحظہ فرمائیے۔

۲۳۵۰: وَعَنْ اَبِىْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى يَا عِبَادِىْ كُلُّكُمْ ضَالٌّ اِلَّا مَنْ هَدَيْتُ فَاسْتَأْلُوْنِىْ الْهُدٰى اَهْدِكُمْ وَكُلُّكُمْ فُقَرَاءُ اِلَّا مَنْ اَغْنَيْتُ فَاسْأَلُوْنِىْ اَرْزُقُكُمْ وَكُلُّكُمْ مُذْنِبٌ اِلَّا مَنْ عَافَيْتُ فَمَنْ عَلِمَ مِنْكُمْ اَنِّىْ ذُوْقُدْرَةٍ عَلَى الْمَغْفِرَةِ فَاسْتَغْفَرَنِىْ غَفَرْتُ لَهٗ وَلَا اُبَالِىْ وَلَوْ اَنَّ اَوَّلَكُمْ وَاٰخِرَكُمْ وَحَيَّكُمْ وَمَيِّتَكُمْ وَرَطْبَكُمْ وَيَا بِسَكُمْ اِجْتَمَعُوْا عَلٰى اَتْقٰى قَلْبِ عَبْدٍ مِنْ عِبَادِىْ مَا زَادَ ذٰلِكَ فِىْ مُلْكِىْ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ وَلَوْاَنَّ اَوَّلَكُمْ وَاٰخِرَكُمْ وَحَيَّكُمْ وَمَيِّتَكُمْ وَرَطْبَكُمْ وَيَا بِسَكُمْ اجْتَمَعُوْاعَلٰى اَشْقٰى

قَلْبِ عَبْدٍ مِنْ عِبَادِیْ مَا نَقَصَ ذٰلِكَ مِنْ مُلْكِیْ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ وَلَوْ اَنَّ اَوَّلَكُمْ وَاٰخِرَكُمْ وَحَيَّكُمْ وَمَيِّتَكُمْ وَرَطْبَكُمْ وَيَابِسَكُمْ اِجْتَمَعُوْا فِیْ صَعِيْدٍ وَاحِدٍ فَسَأَلَ كُلُّ اِنْسَانٍ مِنْكُمْ مَا بَلَغَتْ اُمْنِيَّتُهٗ فَاَعْطَيْتُ كُلَّ سَائِلٍ مِنْكُمْ مَا نَقَصَ ذٰلِكَ مِنْ مُلْكِیْ اِلَّا كَمَا لَوْ اَنَّ اَحَدَكُمْ مَرَّ بِالْبَحْرِ فَغَمَسَ فِيْهِ اِبْرَةً ثُمَّ رَفَعَهَا ذٰلِكَ بِاَنِّیْ جَوَادٌ مَاجِدٌ اَفْعَلُ مَا اُرِيْدُ عَطَائِیْ كَلَامٌ وَعَذَابِیْ كَلَامٌ اِنَّمَا اَمْرِیْ لِشَیْءٍ اِذَا اَرَدْتُ اَنْ اَقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ.

(رواہ احمد و الترمذی و ابن ماجۃ)

اخرجہ الترمذی فی السنن ٦٧/٤ حدیث رقم ٢٦١٣ ـ وابن ماجہ ١٤٢٢/٢ حدیث رقم ٤٢٥٧ ـ واحمد فی المسند ١٥٤/٥ ـ

ترجمہ: ''اور حضرت ابوذرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے میرے بندو! تم سب گم کردہ راہ ہو علاوہ اس شخص کے جس کو میں نے ہدایت بخشی پس تم سب مجھ سے ہدایت چاہو میں تمہیں ہدایت بخشوں گا۔تم سب ظاہر و باطن میں محتاج ہو علاوہ اس شخص کے جس کو میں نے غنی بنا دیا پس تم سب مجھ سے روزی مانگو میں تمہیں (پاک و حلال) روزی دوں گا تم سب گنہگار ہو (یعنی سب ہی سے گناہ متصور ہے) علاوہ اس شخص کے جس کو میں نے بچا لیا ہو (یعنی انبیاء کرام) پس تم میں سے جس شخص نے جانا کہ میں بخشنے پر قادر ہوں اور پھر اس نے مجھ سے بخشش مانگی تو میں اس کو (یعنی اس کے سب گناہ) بخش دوں گا اور مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوگی اور اگر تمہارے پچھلے اگلے' تمہارے زندہ تمہارے مردے تمہارے تر اور تمہارے خشک (یعنی تمہارے جوان و بوڑھے) اور یا تمہارے عالم و جاہل اور یا تمہارے فرمانبردار و گنہگار غرضکہ ساری مخلوقات) میرے بندوں میں سب سے زیادہ متقی دل بندہ (محمد ﷺ) کی طرح ہو جائیں تو اس سے (یعنی تمام مخلوقات کے عابد و متقی ہو جانے سے) میری خدائی میں ایک مچھر کے برابر بھی زیادتی نہیں ہوگی اور اگر تمہارے اگلے تمہارے پچھلے' تمہارے زندے' تمہارے مردے' تمہارے تر اور تمہارے خشک (غرضیکہ ساری مخلوقات) میرے بندوں میں سب سے زیادہ (بدبخت بندہ شیطان لعین) کی طرح ہو جائیں تو اس سے میری خدائی میں ایک مچھر کے پر کے برابر بھی کمی نہ ہوگی اور اگر تمہارے اگلے' تمہارے پچھلے' تمہارے زندے' تمہارے مردے' تمہارے تر اور تمہارے خشک ایک جگہ جمع ہوں اور تم میں سے ہر شخص اپنی انتہائی آرزو و خواہش کے مطابق مانگے (یعنی اس کے دل میں جو بھی آرزو اور خواہش ہو مجھ سے مانگے) اور پھر تم میں سے ہر شخص کو (اس کی خواہش کے مطابق دوں) تو اس سے میری خدائی میں کچھ بھی کمی نہیں ہوگی (ہاں اگر بفرض محال کمی ہو بھی) تو اسی قدر مثلاً تم میں سے کسی شخص کا دریا پر گزر ہو اور وہ اس میں سوئی ڈال کر پھر اسے نکالے (یعنی اگر بفرض محال کسی کمی کا تصور بھی کیا جائے تو وہ اسی قدر ہوگی جتنا کہ ایک سوئی پر پانی لگ جاتا ہے ورنہ حقیقت میں خدا کی خدائی میں کمی کے کسی بھی درجہ کا کیا سوال وہ کتنا بھی دے اس کے ہاں ہرگز کمی نہیں ہوتی) اور اس کا سبب یہ ہے کہ میں بہت سخی ہوں۔ بہت دینے والا ہوں اور جو چاہتا ہوں کرتا ہوں (یعنی یہ تمام سخاوت اور کرم میرے ارادہ و اختیار کے ہی تحت ہے اس میں کسی بندے کے ارادے کو دخل نہیں ہے) میرا دینا صرف حکم کرنا ہے اور میرا عذاب صرف حکم دینا ہے (یعنی یہ سب چیزیں صرف میرے ایک حکم سے ہو جاتی ہیں میں ذرائع اور اسباب کا محتاج نہیں ہوں اور میں کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہوں تو اس کیلئے میرا صرف اتنا ہی حکم ہے کہ میں کہہ دیتا ہوں ''ہو جا'' اور وہ ہو جاتی ہے''۔ (احمد' ترمذی' ابن ماجہ)

عرض مرتب: اس حدیث کے قریب ماقبل میں ایک حدیث گذری ہے اس حدیث کے کئی جملہ اس حدیث سے کافی حد تک مناسبت

رکھتے ہیں۔ ان جملوں کی وضاحت پچھلی حدیث میں ملاحظہ کر لی جائے۔**یا عبادی: کلکم ضال الا من هدیت، فاسئلونی الهدی أهدکم**: اس جملہ کی تشریح کیلئے ملاحظہ فرمائیے، حدیث:۲۳۲۶۔**و کلکم فقراء الا من أغنیت**: اس کی ذات سے کسی بھی لحہ استغناء ممکن نہیں۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿**والله الغنی و أنتم الفقراء**﴾[محمد:۳۶]**الا من عافیت**: عافیت میں تنبیہ ہے کہ ''ذنب'' مرض ذاتی ہے، اس سے صحت یا بی اللہ کی عصمت وحفظ واَمان ہی کے ذریعہ ہے۔دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم میں سے ہر شخص بالفعل گناہگار ہے، اور ہر شخص کا ذنب اس کے مقام کے مناسب ہے، سوائے اس شخص کے جس کو میں مغفرت ورحمت اور توبہ واَوبہ کے ذریعہ عافیت عطا کروں۔**فمن علم منکم أنی ذو قدرة علی المغفرة فاستغفرنی غفرت له**: اس جملہ کی تشریح کیلئے ملاحظہ فرمائیے حدیث:۲۳۳۸۔**ولو أن أولکم و آخرکم** میں احاطہٗ وشمول مراد ہے، اور **حیکم میتکم ورطبکم ویابسکم**، یہ کلام ارادۂ استیعاب کی تاکید ہے۔ابن الملکؒ فرماتے ہیں: رطب سے مراد نبات وشجر ہے اور یابس سے مراد مدر وحجر ہے۔اور ممکن ہے کہ ان دونوں سے مراد بحر وبر ہوں۔یعنی ان کے اہل مراد ہیں۔یا مطلب یہ ہے کہ بحر وبر میں جو بھی مخلوقات ہیں مثلاً شجر وحجر، مچھلیاں اور تمام جانور آدمی بن جائیں۔

تشریح: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ دونوں، استیعاب تام سے عبارت ہیں، جیسا کہ یہ ارشاد باری تعالیٰ:﴿**ولا رطب ولا یابس الا فی کتاب بین**﴾[الانعام:۵۹] اور ضمیر مخاطب کی طرف اضافت نوع انسانی میں استیعاب کی مقتضی ہے، چنانچہ یہ تاکید بعد التاکید ہوگی، برائے شمول، اور تقریر بعد التقریر ہے۔انتہیٰ۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ اور ان کی عصمت کے مسئلہ کو اس کے تحت داخل کرنے کی کوئی وجہ نہیں بنتی، جیسا کہ ابن حجر نے کہا ہے۔''**اجتمعوا علی أتقی......ثم رفعها**'' اس عبارت کی تشریح کیلئے ملاحظہ فرمائیے حدیث:۲۳۳۶۔

جواد: (مبالغہ کا صیغہ ہے) کثیر الجواد۔**ماجد**: **واسع العطاء**۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں:''**الماجد، الجواد**'' سے ابلغ ہے، چونکہ مجد کہتے ہیں وسعت کرم کو، چنانچہ ان (دونوں اسماء کو اس ترتیب سے ذکر کرنے) میں صنعت ترقی ہے۔

أفعل ما أرید: ایک حدیث قدسی میں آتا ہے:''**ترید وأرید، ولا یکون الا ما أرید**۔ابو زید سے پوچھا گیا:**ما ترید؟** انہوں نے جواب میں فرمایا:**أرید أن لا أرید**۔

ندیم الباری شیخ الاسلام عبداللہ انصاری فرماتے ہیں:''**هذا أیضًا وارادة للذین أحسنوا الحسنی وزیادة**۔**أن أقول له کن فیکون**'': مرفوع ومنصوب دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔یہ جملہ تفسیر ہے عطائی کلام وعذابی کلام کی۔قاضیؒ فرماتے ہیں: میں جب کسی کیلئے عطاء یا عذاب کا ارادہ کرتا ہوں تو ردّ وکدّ اور مزاولت عمل کی حاجت پیش نہیں آتی، بلکہ اپنی مراد کے حصول وصول کیلئے صرف اس کے ہونے کا ارادہ کافی ہے۔صاحب کشاف لکھتے ہیں: کن، فعل تامہ ہے۔**أی أحدث فیحدث**۔یہ تمثیل پر محمول ہے۔اور مطلب یہ ہے کہ اللہ جس امر کا فیصلہ کر لیتا ہے اور اس کے ہونے کا ارادہ کر لیتا ہے تو وہ چیز ہو جاتی ہے، اور وہ چیز بغیر کسی امتناع وتوقف کے معرض وجود میں آجاتی ہے، اس مطیع مامور کی طرح کہ جس کو حکم دیا جائے۔چنانچہ وہ امتثال امر کرتا ہے، اور انکار نہیں کرتا۔

۲۳۵۱: وَعَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِیِّ اللّٰہِ ﷺ اَنَّهٗ قَرَأَ هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰی وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ قَالَ قَالَ رَبُّكُمْ اَنَا اَهْلُ اَنْ اُتَّقٰی فَمَنِ اتَّقَانِیْ فَاَنَا اَهْلُ اَنْ اَغْفِرَلَهٗ (رواه الترمذی وابن ماجة والدارمی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۰۲/۵ حدیث رقم ۳۳۸٤۔ وابن ماجه ۱٤۳۷/۲ حدیث رقم ٤۲۹۹۔ والدارمی ۳۹۲/۲ حدیث رقم ۲۷۲٤۔

ترجمه: ''اور حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: **هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ** (وہی صاحب تقویٰ ہے اور صاحب بخشش ہے) پھر آپ ﷺ نے اس کی تفسیر کے سلسلہ میں فرمایا کہ تمہارا پروردگار فرماتا ہے کہ میری شان کا تقاضا یہ ہے کہ لوگ میرے ساتھ کسی کو شریک کرنے سے پرہیز کریں لہٰذا جو شخص شرک سے بچتا ہے تو پھر میرے لائق یہی ہوتا ہے کہ میں اسے بخش دوں''۔ (ترمذی' ابن ماجہ' دارمی)

تشریح: (قال ربکم) یہاں سے آگے حدیث قدسی ہے یا تفسیری معنی ہے۔ **أهل**: کی اضافت ہو رہی ہے مابعد کی طرف۔ **أتقي**: فعل مجہول ہے۔ معنوی اعتبار سے تقدیری عبارت یوں ہے: **أنا حقيق وجدير بأن يتقى من الشرك بي۔ فمن اتقاني**: ترمذی کی روایت میں اتنا اضافہ ہے: **فلم يجعل معنى الها**:

مذکورہ بالا آیت کا مضمون اس آیت کے مضمون کی مانند ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ اللہ تعالیٰ اس بات کو معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے اس (شرک) کے علاوہ (ہر گناہ) کو جس کے لئے چاہے معاف کر دیتا ہے۔

ابن حجرؒ لکھتے ہیں: **اغفرله ما فرط منه فان ذلك قليل في جنب اعماله صالحة۔ ومن ثم ورد: ان اجتناب الكبائر مكفر لارتكاب الصغائر**۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: دلیل اور مدلول کے درمیان ربط نہیں ہے، ان کے قول کی دلیل یہ آیت کریمہ ہو سکتی ہے: ﴿**ان الحسنات يذهبن السيئات**﴾[هود: ۱۱٤] اور ابن حجر کا یہ کہنا: **ما ورد**...... معلول ہے، چونکہ یہ ثابت نہیں ہے، مزید یہ کہ ہم ماقبل میں واضح کر چکے ہیں کہ یہ مذہب معتزلہ کا ہے۔

۲۳۵۲: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ اِنْ كُنَّا لَنَعُدُّ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِي الْمَجْلِسِ يَقُوْلُ رَبِّ اغْفِرْلِي وَتُبْ عَلَيَّ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الْغَفُوْرُ مِائَةَ مَرَّةٍ (رواه احمد والترمذی وابوداود وابن ماجة)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۸٥/۲ حدیث رقم ۱٥۱٦۔ والترمذی ۱٥۸/٥ حدیث رقم ۳۸۱٤۔ وابن ماجه ۱۲٥۳/۲ حدیث رقم ۳۸۱٤۔ واحمد فی المسند ۲۱/۲۔

ترجمه: ''اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ہم یہ شمار کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ ایک مجلس میں سو مرتبہ یہ کہا کرتے تھے رَبِّ اغْفِرْلِي وَتُبْ عَلَيَّ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الْغَفُوْرُ میرے پروردگار! مجھے بخش دے اور میری توبہ قبول فرما بلاشبہ تو ہی بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔'' (احمد' ترمذی' ابوداؤد' ابن ماجہ)

تشریح: إن: مخففہ من المثقلہ ہے۔ **لنعد**: میں لام فارقہ ہے، اور رسول اللہ ﷺ لنعد کے متعلق ہے۔ الحصن کی روایت میں **الواحد** کا اضافہ بھی ہے۔ **يقول**: مرفوع ہے، اور بتقدیر أن منصوب ہے۔ **التواب الغفور**: یہ دونوں صیغے مبالغہ کے ہیں۔ **مائة مرة**: **لنعد** کیلئے مفعول مطلق ہے۔ **رب اغفرلي**: شاعر کے اس قول کی طرح ہے: **احضر الوعی۔ تب علی** کے تین مطلب ہو سکتے ہیں: (۱) **ارجع علي بالرحمة**۔ (۲) **وفقني للتوبة**۔ مجھے توبہ کی توفیق عطا فرما۔ (۳) **أقبل توبتي**۔ میری توبہ کو قبول فرما۔

تخریج: اس حدیث کو امام نسائی اور ابن حبان نے بھی روایت کیا ہے۔ البتہ ابن حبان اور ابوداؤد کی روایت میں **الغفور** کے بجائے **الرحيم** ہے۔

۲۳۵۳: وَعَنْ هِلَالِ بْنِ يَسَارِ بْنِ زَيْدٍ مَوْلَى النَّبِيِّ ﷺ قَالَ حَدَّثَنِيْ اَبِيْ عَنْ جَدِّيْ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ

يَقُوْلُ مَنْ قَالَ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِىْ لَآ اِلٰهَ هُوَ الْحَىُّ الْقَيُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ غُفِرَ لَهٗ وَاِنْ كَانَ قَدْ فَرَّ مِنَ الزَّحْفِ.

(رواه الترمذی وابوداود والكنه عند ابی داود هلال ابن يسار وقال الترمذی هذا حديث غريب)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۸۵/۲ حديث رقم ۱۵۱۷۔ والترمذی ۲۲۸/۵ حديث رقم ۳۶۴۸۔

ترجمہ: ''اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ کے پوتے حضرت ہلال بن یسارؒ کہتے ہیں کہ میرے والد (حضرت یسارؒ) نے مجھ سے یہ حدیث بیان کی جسے انہوں نے میرے دادا (حضرت زیدؓ) سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے (یعنی حضرت زیدؓ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص یہ کہے اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِىْ لَآ اِلٰهَ هُوَ الْحَىُّ الْقَيُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ میں اللہ سے بخشش چاہتا ہوں وہ اللہ کہ نہیں معبود علاوہ اس کے جو زندہ ہے اور خبر گیری کرنے والا ہے۔ تو اس کی بخشش کی جاتی ہے اگر چہ وہ جہاد سے بھاگا ہوا ہو (جو ایک بہت بڑا گناہ ہے) اس روایت کو ترمذیؒ اور ابو داؤد نے نقل کیا ہے لیکن ابوداؤدؒ کے نزدیک (ہلال بن یسار کی بجائے) بلال بن یسار ہے۔ نیز امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

راویٔ حدیث:

ہلال بن یسار۔ یہ بلال ہیں یسار کے بیٹے' جو زید کے بیٹے تھے جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ تھے۔ اور یہ زید زید بن حارثہ نہیں ہیں جو اسامہ کے والد تھے۔ انہوں نے اپنے باپ سے اور دادا سے روایت کی ہے اور ان سے ''عمرو بن مرہ'' نے روایت کی۔ ان کی حدیثیں بصرہ والوں میں رائج ہیں۔ ابن حجر لکھتے ہیں کہ زید یسار کے والد ہیں' صحابی ہیں' ان سے صرف ایک حدیث مروی ہے اور ابو موسیٰ مدینی نے ذکر کیا ہے کہ وہ ''عبد نوبی'' تھے۔

تشریح: مولی النبی' ''زید'' کا بیان ہے۔ ایک نسخہ میں مولی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہیں۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں **الحی القیوم** کو منصوب پڑھنا بھی درست ہے (جیسا کہ ایک روایت میں مروی ہے) لفظ جلالہ کی صفت ہونے کی وجہ سے، یا مدح ہونے کی وجہ سے۔ اور مرفوع پڑھنے کی صورت میں (ھو) خبر سے بدل ہیں۔ یا مدح ہیں، مبتدا محذوف کی خبر ہیں اھ۔ اکثر ''بدل'' بناتے ہیں اور یہی زیادہ مشہور ہے۔ ابن حجرؒ لکھتے ہیں: کہ یہ دونوں اسم ھو کی صفت ہونے کی بناء پر مرفوع ہیں۔ ابن حجرؒ نے اسی ترکیب پر اکتفا کیا ہے۔ یہ قول مرجوع ہے، اور کسائی کی طرف منسوب ہے۔ جمہور کا کہنا ہے کہ **الضمیر لا یوصف**''۔ **وان کان فو**: ایک نسخۂ صحیحہ میں ''**قد فرّ**'' ہے۔ حصن میں اسی طرح ہے۔ **الزحف**: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: **الزحف الجیش الکثیر الذی یری لکثرته کأنه یزجف**۔ اور صاحب النہایہ لکھتے ہیں: **من زحف الصبی اذا دبّ علی استه قلیلا قلیلا**۔ مظہرؒ فرماتے ہیں: **ھو اجتماع الجیش فی وجه العدو**۔

کوئی بھی دعا' کوئی بھی ذکر ہو اور کوئی بھی عمل ہو ورد ہو جب تک نیت و مقصد کا اخلاص اور دل کی تڑپ و لگن زبان کی ہمنوا نہ ہو نہ اس دعا کا اثر ہوتا ہے نہ اس ذکر و عمل کا۔ اسی لئے علماء لکھتے ہیں کہ جب بھی استغفار پڑھا جائے تو خلوصِ دل اور خلوصِ نیت کے ساتھ پڑھا جائے کیونکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ گناہ سے استغفار کرنے والا درانحالیکہ وہ اس گناہ پر قائم ہو اپنے پروردگار سے ٹھٹھول کرنے والا ہے۔ (نعوذ باللہ)۔ **ان المستغفر من الذنب وھو مقیم علیه کالمستھزئ بربه**:

عرض مرتب: اس حدیث کی تخریج کیلئے ملاحظہ فرمائیے حدیث: ۲۲۶۳ کی تخریج۔

مظہرؒ فرماتے ہیں: واضح رہے کہ میدان جنگ سے پیٹھ پھیرنا گناہ کبیرہ ہے، ہاں اگر کفار کی تعداد مسلمانوں سے دوگنی ہو، یا تحرف

وتحیز کی نیت سے بھاگتا ہے تو وہ اس سے مستثنیٰ ہے اھ۔ ابن الملکؒ شرح مصابیح میں ذکر کرتے ہیں: قیل: هذا يدل على أن الكبائر تغفر بالتوبة والاستغفار اھ۔ یہ مسئلہ اجماعی ہے اس میں کوئی نزاع نہیں ہے۔ هلال بن يسار: اعراب کے اعتبار سے مرفوع ہے۔ البتہ حکایۃ کی تقدیر پر مجرور ہے۔

حافظ منذریؒ فرماتے ہیں: اسناده جيد متصل ،فقدذكر البخاري في تاريخه ان بلالا سمع اباه يسار اوهو سمع من ابيه زيد مولى رسول الله ﷺ وقد اختلف في يسار والد بلال انه بالباء الموحدة او بالياء المثناة التحتانيه ،وذكر البخاري في تاريخه بالموحدة والله تعالى اعلم۔ اور اس کو امام حاکم نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ یہ روایت شیخین کی شرط پر ہے۔ البتہ ان کی روایت میں تین بار کہنے کا ذکر ہے۔ اھ۔

حصن کی روایت سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ترمذی کی روایت میں ثلاث مرات کا اضافہ ہے۔ اور ابن حبان نے انہیں زید سے اور طبرانی نے ابن مسعود کے قول کے طور پر موقوفاً ذکر کیا ہے۔ صاحب السلاح فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام ترمذی نے ابوسعید سے نقل کیا ہے۔ اس میں تین بار کا ذکر ہے۔ اھ۔ ابوسعید سے مروی ترمذی کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: من قال حين يأوي الى فراشه استغفرالله الذي لا اله الا هو الحي القيوم واتوب اليه ثلاث مرات غفرالله له ذنوبه ،وان كانت مثل زبد البحر ـوان كانت عدد ورق الشجر،وان كانت عدد رمل عالج،وان كانت عدد ايام الدنيا ـ اس میں میدان جنگ سے فرار کا ذکر نہیں ہے۔ امام ترمذی اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: یہ حدیث غریب ہے۔ ہم اس کو صرف اسی طریق سے جانتے ہیں۔ (میرک)

الفصل الثالث:

۲۳۵۴: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ لَیَرْفَعُ الدَّرَجَةَ لِلْعَبْدِ الصَّالِحِ فِی الْجَنَّةِ فَیَقُوْلُ یَا رَبِّ اَنّٰی لِیْ هٰذِهٖ فَیَقُوْلُ بِاِسْتِغْفَارِ وَلَدِكَ لَكَ (رواه احمد)

اخرجه ابن ماجه في السنن ١٢٠٧/٢ حديث رقم ٣٦٦٠۔ واحمد في المسند ٥١٩/٢۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ عزوجل جنت میں اپنے بندہ نیک بخت وصالح کا درجہ بلند کرتا ہے تو وہ پوچھتا ہے: ''میرے پروردگار مجھے یہ درجہ کیسے حاصل ہوا؟'' اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''تیرے لئے تیرے بیٹے کے استغفار کی وجہ سے''۔ (احمد)

تشریح: في الجنة: لیرفع کے متعلق ہے۔ ولدك لك: ولد کا اطلاق مذکر ومؤنث دونوں پر ہوتا ہے اور یہاں اس سے مراد مؤمنین ہیں۔

۲۳۵۵: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا الْمَیِّتُ فِی الْقَبْرِ اِلَّا كَالْغَرِیْقِ الْمُتَغَوِّثِ یَنْتَظِرُ دَعْوَةً تَلْحَقُهٗ مِنْ اَبٍ اَوْ اُمٍّ اَوْ اَخٍ اَوْ صَدِیْقٍ فَاِذَا لَحِقَتْهُ كَانَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنَ الدُّنْیَا وَمَا فِیْهَا وَاِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی لَیُدْخِلُ عَلٰی اَهْلِ الْقُبُوْرِ مِنْ دُعَاءِ اَهْلِ الْاَرْضِ اَمْثَالَ الْجِبَالِ وَاِنَّ هَدِیَّةَ الْاَحْیَاءِ اِلَی الْاَمْوَاتِ الْاِسْتِغْفَارُ لَهُمْ. (رواه البيهقي في شعب الايمان)

اخرجه البيهقي في شعب الايمان ٢٠٢/٦ الحديث رقم ٧٩٠٤۔

ترجمہ:''اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''قبر میں مردہ کی حالت ایسی ہے جیسا کہ کوئی شخص ڈوب رہا ہو اور کسی کو پکار رہا ہو (کہ کوئی اس کا ہاتھ پکڑ کر پانی سے باہر نکالے) چنانچہ وہ مردہ ہر وقت اس بات کا منتظر رہتا ہے کہ اس کے باپ کی طرف سے یا اس کی ماں کی طرف سے یا اس کے بھائی کی طرف سے یا اس کے دوست کی طرف سے اس کو دعا پہنچے پس جب اسے (کسی کی طرف سے دعا پہنچتی ہے تو یہ دعا کا پہنچنا اس کے لئے دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے محبوب ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ قبر والوں کی طرف سے دعا کا ثواب پہاڑ کی مانند (یعنی بہت زیادہ ثواب اور رحمت وبخشش) پہنچاتا ہے اور زندوں کی طرف سے مردوں کے لئے بہترین ہدیہ استغفار ہے''۔ (بیہقی)

تشریح: صدیق کا مطلب یہ ہے کہ کوئی ساتھی، محبّ یا رفیق۔ اور یہ ممکن ہے کہ اس سے مراد ولد ہو۔ **فاذ الحقته**: ابن حجرؒ نے فرمایا: اجماع امت ہے کہ یہ دعا میت کو پہنچتی ہے۔ **کان أحب الیه**: کان کی ضمیر کا مرجع **لحقوقها** ہے۔ **من الدنیا و ما فیها** سے مراد دنیا کے مستلذات ہیں۔ اور ابن حجرؒ فرماتے ہیں: **لو عاد الیها**۔ (یعنی یہ دعا کا پہنچنا اس کیلئے دنیا و مافیہا کی طرف لوٹ آنے سے زیادہ محبوب ہوتا ہے)۔ **من دعا أهل الأرض**: یہ من تعلیلیہ ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ابتدائیہ ہو۔ **أمثال الجبال**: یعنی دعا کے ثواب کو اگر جسمانی صورت دی جائے تو وہ پہاڑ کی مانند ہوں۔

۲۳۵۶: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ بُسْرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ طُوْبٰى لِمَنْ وَجَدَ فِي صَحِيْفَتِهٖ اسْتِغْفَارًا كَثِيْرًا (رواه ابن ماجة وروى النسائى فى عمل يوم وليلة)

اخرجه النسائى عمل اليوم والليلة۔ وابن ماجه فى السنن ۱۲۵٤/۲ حديث رقم ۳۸۱۸۔

ترجمہ:''اور حضرت عبداللہ بن بسرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''خوش بختی ہے اس شخص کے لئے جس نے اپنے نامہ اعمال میں بہت استغفار کی (یعنی مقبول استغفار پایا) ابن ماجہ اور نسائی نے اس روایت کو اپنی کتاب عمل یوم ولیلۃ میں نقل فرمایا ہے''۔

تشریح: طوبیٰ کے کئی معنی آتے ہیں: (۱) **الحالة الطيبة**۔ (۲) **العشية الراضية**۔ (۳) **الشجرة المشهورة فى الجنة العالية**۔ استغفار سے مراد استغفار مقبول ہے۔ رابعہ عدویہ فرماتی ہیں: **استغفارنا يحتاج الىٰ استغفار كثير**۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: شارع علیہ السلام نے **طوبى لمن استغفر كثيرا** کے بجائے مذکورہ بالا تعبیر اختیار فرمائی۔ اس عدول کا کیا فائدہ ہے؟ یہ کنایہ ہے۔ یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ فضیلت مشروط بالاً خلاص ہے، چونکہ جو شخص صدقِ دل کے ساتھ استغفار نہیں کرے گا، اس کا یہ عدم صدق کے ساتھ استغفار کرنا اس کے خلاف دلیل وحجت بنے گا۔

تخریج: اس حدیث کو امام بیہقی نے بھی روایت کیا ہے۔ (میرک) **وروى النسائى**: مصنف کو چاہئے تھا کہ وہ بذریعہ عطف یوں فرماتے: **والنسائى**، یا یوں فرماتے: **ورواه النسائى**۔

اور بزار نے حضرت انس سے مرفوعاً نقل کیا ہے:

ما من حافظين يرفعان الى الله فى يوم صحيفة فيرى اى الله فى اول الصحيفة وفى آخرها استغفارا الا قال تبارك وتعالى: غفرت لعبدى مابين طرفى الصحيفة۔

اور طبرانی اوسط میں زبیر بن عوام سے مرفوعاً نقل کیا ہے:

من اهب ان تسره صحيفة فليكثر فيها من الاستغفار اى لعله يقبل واحد منها
استغفار کی فضیلت کے سلسلہ میں ایک یہ حدیث بھی ملاحظہ فرمائیے جسے بزارؒ نے حضرت انسؓ سے بطریق مرفوع روایت کیا ہے کہ اعمال لکھنے والے دونوں فرشتے جب بندے کا اعمال نامہ لے کر اوپر جاتے ہیں تو حق تعالیٰ اس اعمال نامہ کے اول و آخر میں استغفار دیکھ کر فرماتا ہے کہ میں نے اپنے بندے کے وہ تمام گناہ بخش دیئے جو اس نامہ اعمال کے دونوں کناروں کے درمیان ہیں۔ اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص صبح و شام استغفار کرتا ہے اسے یہ فضیلت و سعادت حاصل ہوتی ہے۔

۲۳۵۷: **وَعَنْ عَآئِشَةَ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ كَانَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ الَّذِيْنَ اِذَا اَحْسَنُوْا اِسْتَبْشَرُوْا وَاِذَا أَسَاءُوْا اسْتَغْفَرُوْا.** (رواه ابن ماجة والبيهقى فى الدعوات الكبير)

اخرجه البخارى فى صحيحه ١٠٢/١١ ۔ حديث رقم ٦٣٠٨ ۔ ومسلم فى صحيحه ٢١٠٢/٤ حديث رقم (٣۔ ٢٧٤٤) واحمد فى المسند ٣٨٣/١ ۔

ترجمه: ''اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ یہ دعا کیا کرتے تھے: ''اے اللہ! مجھے ان لوگوں میں سے بنا جو نیکی کریں تو خوش ہوں اور برائی کریں تو استغفار کریں''۔ (ابن ماجہ' بیہقی)

تشریح: احسان سے مراد احسانِ علم و عمل ہے۔ اور اس توفیق پر خوش ہوں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**قل بفضل الله وبرحمته فبذلك فليفرحوا**﴾[یونس:۵۸] اور جب برائی کریں یعنی علم و عمل میں ان سے کوئی تقصیر ہو تو استغفار کریں۔ صفت مقابلہ کا تقاضا یہ تھا کہ (استغفروا کے بجائے) حزنوا فرماتے۔ (یعنی **واذا أحسنوا استبشروا واذا أساؤا حزنوا** فرماتے) تعبیر کے اس عدول میں درحقیقت داء سے دوا کی طرف اشارہ مقصود ہے، کہ صرف ''حزن'' کافی و مفید نہیں ہے۔ حزن اسی وقت مفید ہوگا کہ جب وہ **مقرون بالاستغفار المزيل للاصرار** ہو۔

۲۳۵۸: **وَعَنِ الْحَارِثِ بْنِ سُوَيْدٍ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مَسْعُوْدٍ حَدِيْثَيْنِ اَحَدُهُمَا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَالْاٰخَرُ عَنْ نَفْسِهٖ قَالَ اِنَّ الْمُؤْمِنَ يَرٰى ذُنُوْبَهٗ كَاَنَّهٗ قَاعِدٌ تَحْتَ جَبَلٍ يُخَافُ اَنْ يَّقَعَ عَلَيْهِ وَاِنَّ الْفَاجِرَ يُرٰى ذُنُوْبَهٗ كَذُ بَابٍ مَرَّ عَلٰى اَنْفِهٖ فَقَالَ بِهٖ هٰكَذَا اَیْ بِيَدِهٖ فَذَبَّهٗ عَنْهُ ثُمَّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ لَلّٰهُ اَفْرَحُ بِتَوْبَةِ عَبْدِهِ الْمُؤْمِنِ مِنْ رَجُلٍ نَزَلَ فِیْ اَرْضٍ دَوِيَّةٍ مُهْلِكَةٍ مَعَهٗ رَاحِلَتُهٗ عَلَيْهَا طَعَامُهٗ وَشَرَابُهٗ فَوَضَعَ رَأْسَهٗ فَنَامَ نَوْمَةً فَاسْتَيْقَظَ وَقَدْ ذَهَبَتْ رَاحِلَتُهٗ فَطَلَبَهَا حَتّٰى اِذَا اشْتَدَّ عَلَيْهِ الْحَرُّ وَالْعَطَشُ وَمَا شَاءَ اللّٰهُ قَالَ اَرْجِعُ اِلٰى مَكَانِیَ الَّذِیْ كُنْتُ فِيْهِ فَاَنَامُ حَتّٰى اَمُوْتَ فَوَضَعَ رَأْسَهٗ عَلٰى سَاعِدِهٖ لِيَمُوْتَ فَاسْتَيْقَظَ فَاِذَا رَاحِلَتُهٗ عِنْدَهٗ عَلَيْهَا زَادُهٗ وَشَرَابُهٗ فَاللّٰهُ اَشَدُّ فَرَحًا بِتَوْبَةِ الْعَبْدِ الْمُؤْمِنِ مِنْ هٰذَا بِرَاحِلَتِهٖ وَزَادِهٖ.** (روى مسلم المرفوع الى رسول الله منه فحسب وروى البخارى الموقوف على ابن مسعود ايضا)

اخرجه البخارى فى صحيحه ١٠٢/١١ ۔ حديث رقم ٦٣٠٨ ۔ ومسلم فى صحيحه ٢١٠٢/٤ حديث رقم (٣۔ ٢٧٤٤) واحمد فى المسند ٣٨٣/١ ۔

ترجمه: ''اور حضرت حارث بن سویدؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے مجھ سے دو حدیثیں بیان کیں ایک تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے نقل کی اور دوسری اپنی طرف سے بیان کی۔ چنانچہ انہوں نے فرمایا: ''مؤمن اپنے گناہوں کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے وہ ایک پہاڑ کے نیچے بیٹھا ہوا اور خوفزدہ ہو کہ پہاڑ اس کے اوپر نہ گر پڑے اور فاجر

اپنے گناہوں کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے اس مکھی کو جو اس کی ناک پر اڑے اور وہ اس کی طرف اس طرح یعنی اپنے ہاتھ سے اشارہ کرے اور اسے اڑا دے (حاصل یہ کہ مؤمن گناہ سے بہت ڈرتا ہے اور اسے اس بات کا خوف رہتا ہے کہ کہیں میں اس گناہ کی پاداش میں پکڑا نہ جاؤں اس لئے اس کی نظر میں چھوٹے چھوٹے گناہ بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں لیکن فاجر اپنے گناہوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتا اس کی نظر میں بڑے سے بڑے گناہ کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہوتی) پھر حضرت عبداللہ نے (آنحضرت ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ اپنے مؤمن بندے کی توبہ سے اس شخص سے زیادہ خوش ہوتا ہے (جو اپنے سفر کے دوران) کسی ایسے ہولناک میدان میں اترے جہاں سبزہ و درخت کا نام ونشان تک نہ ہو اور اس کے ساتھ جو سواری ہو اس پر اس کے کھانے پینے کا سامان ہو پھر (وہ استراحت کے لئے) وہیں زمین پر سر رکھ کر ایک نیند سو گیا ہو اور جب جاگنے کے بعد اسے معلوم ہو کہ سامان سے لدی ہوئی اس کی سواری گم ہو گئی ہے تو وہ اس کی تلاش میں مصروف ہو گیا ہو یہاں تک کہ گرمی کی تپش اور پیاس کی شدت اور گرمی اور پیاس کے علاوہ دوسری تکلیف اور پریشانی کی) ان چیزوں نے جو اللہ کو منظور تھیں اس پر غلبہ پا لیا ہو تو اس نے یہ کہا ہو کہ میں اپنی جگہ لوٹ چلوں جہاں میں (سر رکھ کر سویا تھا) وہیں سو جاؤں تا کہ نیند کی حالت میں میرا خاتمہ ہو جائے۔ چنانچہ وہ اپنے بازو پر سر رکھ کر موت کی انتظار میں سو رہا ہو کہ اس کی آنکھ کھل جائے اور اچانک وہ دیکھے کہ اس کی سواری اس کے سامنے موجود ہو جس پر اس کے کھانے پینے کا سامان موجود تھا۔ پس اللہ تعالیٰ اپنے مؤمن بندہ کی توبہ کی وجہ سے اس شخص سے زیادہ خوش ہوتا ہے جو اپنی سواری اور اپنے کھانے پینے کا سامان پا کر خوش ہوتا ہے۔ مسلمؒ نے ان دونوں روایتوں میں سے صرف اس روایت کو نقل کیا ہے جسے ابن مسعودؓ نے آنحضرت ﷺ سے نقل کیا ہے (یعنی جس میں مؤمن بندہ کی توبہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے بہت خوش ہونے کا بیان ہے) اور اس روایت کو نقل نہیں کیا ہے جسے ابن مسعودؓ نے اپنی طرف سے بیان کیا ہے اور جس میں گناہ کے بارے میں مؤمن اور فاجر کے فرق کو بیان کیا گیا ہے) اور بخاریؒ نے اس روایت کو بھی نقل کیا ہے جسے ابن مسعودؓ نے اپنی طرف سے بیان کیا ہے۔ حاصل یہ کہ حدیث مرفوع کو تو بخاریؒ و مسلمؒ دونوں نے نقل کیا ہے لیکن حدیث موقوف کو صرف بخاریؒ نے نقل کیا ہے''۔

راویٔ حدیث:

الحارث بن سوید۔ یہ حارث بن سوید تمیمی کوفی ہیں۔ یہ کبار تابعین میں سے ہیں محدثین کے نزدیک قابل اعتماد ہیں۔ انہوں نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت حدیث کی ہے اور ان سے ابراہیم تیمی نے۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے آخر دور میں انہوں نے وفات پائی۔

تشریح: حدیثین: مفعول ثانی ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ **یری ذنوبه:** امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ذنوبه، مفعول اول ہے اور مفعول ثانی محذوف ہے۔ **أی کالجبال۔** اس کے حذف کی دلیل اگلے جملہ میں موجود لفظ ''کذباب'' ہے۔ **أی بیده:** اشارہ کی تفسیر ہے۔ **أی دفع الذباب بیده۔ فذبه عنه:** یہ ماقبل کی تفسیر ہے۔ **أی دفع الذباب عن نفسه۔**

یہ حدیث اس بات کے منافی نہیں کہ خوف و رجاء میں اعتدال مطلوب و محبوب ہے، چونکہ مؤمن کو اپنے رب سے رجاء اور حسن ظن انتہاء درجہ کا ہوتا ہے۔

من رجل: أفرح کے متعلق ہے۔

دويّة: بتشديدالواووالياء نسبة للدواى الهلاك ـوفى رواية داوية بقلب احدى الواوين الفا والدوة المغازة الخالية ذكره الطيبي ـقال النووى: بتشديد الواو والياء جميعا وذكر مسلم فى رواية اخرى بزيادة الالف وهى بتشديد الياء ايضا و هى الارض القفر والمغازة الخالية ـفالدويه منسوبة الى الدو واماالداوية فبابدال احدى الواوين الفا كالطائى۔

اقول فى قوله بزيادة الف مسامحة اذ ينافيه الابدال فكانه اراد الزيادة االلغوية لاالصرفية الوزنية وقوله: كالطائى نظير لا مثيل ففى القاموس: الطاء ة كالطاعة الابعاد فى المرعى ،ومنه ابوالقبيلة او من طاء يطوء اذا ذهب وجاء والنسبة طائى والقياس كماجى حذفوا الياء الثانية فبقى طىء فقلبوا الياء الساكنة الفاً ووهم الجوهرى۔

مهلكة: میم کے فتحہ کے ساتھ ہے، اور لام کو مفتوح ومکسور دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔اور بعض نسخوں میں بضم المیم وکسر اللام ہے۔
والعطش: چونکہ گرمی کی وجہ سے پیاس لگتی ہے اس لئے صرف پیاس کا ذکر کیا(کھانے کا ذکر نہیں کیا)۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ از باب اکتفاء ہو۔أوماشاء الله: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: راوی کو شک ہے۔اور تقدیر یوں ہے: قال رسول اللهﷺ ذلك۔ يا۔ قال ماشاء الله۔اور یہ بھی احتمال ہے کہ ''أو'' برائے تنویع ہو۔أي: اشتد الحر أوماشاء الله من العذاب اھ۔ كلامه فى المختصر۔اور اظہر یہ ہے کہ اُو بمعنی واوَ ہے،اس صورت میں یہ تعمیم بعد تخصیص ہوگی۔أي وماشاء الله بعد ذلك۔اور برائے تنویع قرار دینے کی صورت میں یہ وہم ہوتا ہے کہ حروعطش اللہ کی مشیت سے خارج ہیں۔حاشاللہ۔میں نے امام طیبیؒ کی عبارت دیکھی تو لکھتے ہیں: أي ماشاء الله من العذاب والبلاء غير الحر والعطش اھ۔قصہ مختصر یہ ہے کہ ان کی مختصر عبارت مخل ہے۔

پہلی فصل میں بھی اس قسم کی حدیث گزر چکی ہے وہاں بھی بتایا گیا ہے کہ بندہ کی توبہ سے اللہ تعالیٰ کے بہت زیادہ خوش ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی توبہ سے راضی ہوتا ہے اور اس کی توبہ قبول کرتا ہے گویا اس حدیث سے اس آیت کریمہ کی طرف اشارہ ہے:
اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ ''اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے''۔

حضرت امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ ایک بہت بڑے عالم باعمل حضرت استاد ابی اسحٰق اسفرائی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا میں نے اللہ سبحانہ تعالیٰ سے مسلسل تیس برس تک یہ دعا کی کہ مجھے توبہ نصوح کی سعادت سے بہرہ مند فرمائے لیکن میری دعا قبول نہیں ہوئی میں نے اپنے دل میں بہت تعجب کیا اور کہنے لگا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کتنی پاک اور مستغنی ہے کہ میں نے تیس برس تک اپنی ایک خواہش کی تکمیل کی دعا کی لیکن وہ بارگاہ الوہیت میں قبولیت سے نوازی نہیں گئی کہ جب ہی میں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی مجھ سے کہہ رہا ہے۔''تمہیں اس بات پر تعجب ہے کیا تم یہ بھی جانتے ہو کہ تم مانگ کیا رہے ہو؟ تمہاری دعا کا حقیقی منشاء تو یہی ہے تا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں دوست اور محبوب رکھے؟ تو کیا تم نے اللہ تعالیٰ کی یہ بشارت نہیں سنی کہ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ لہٰذا اس خواہش کی تکمیل نہ صرف یہ کہ بہت ہی آسان ہے بلکہ اس کی بشارت بھی دی جا چکی ہے۔

اس حدیث میں لطیف اشارات ہیں کہ حضرت عبداللہ نے (آنحضرت ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ اپنے مؤمن بندے کی توبہ سے اس شخص سے زیادہ خوش ہوتا ہے (جو اپنے سفر کے دوران) کسی ایسے ہولناک میدان میں اترے جہاں سبزہ ودرخت کا نام ونشان تک نہ ہو اور اس کے ساتھ جو سواری ہو اس پر اس کے کھانے پینے کا سامان ہو پھر (وہ استراحت کے لئے) وہیں زمین پر سر رکھ کر ایک نیند سو گیا ہو اور جب جاگنے کے بعد اسے معلوم ہو کہ سامان سے لدی ہوئی اس کی سواری گم ہوگئی ہے تو وہ اس کی تلاش میں مصروف ہو گیا ہو یہاں تک کہ گرمی کی تپش اور پیاس کی شدت اور گرمی اور پیاس کے علاوہ دوسری تکلیف اور پریشانی کی) ان چیزوں نے

جو اللہ کو منظور تھیں اس پر غلبہ پالیا ہو تو اس نے یہ کہا ہو کہ میں اپنی جگہ لوٹ چلوں جہاں میں (سر رکھ کر سویا تھا) وہیں سو جاؤں تا کہ نیند کی حالت میں میرا خاتمہ ہو جائے۔ چنانچہ وہ اپنے بازو پر سر رکھ کر موت کی انتظار میں سو رہا ہو کہ اس کی آنکھ کھل جائے اور اچانک وہ دیکھے کہ اس کی سواری اس کے سامنے موجود ہو جس پر اس کے کھانے پینے کا سامان موجود تھا۔ پس اللہ تعالیٰ اپنے مؤمن بندہ کی توبہ کی وجہ سے اس شخص سے زیادہ خوش ہوتا ہے جو اپنی سواری اور اپنے کھانے پینے کا سامان پا کر خوش ہوتا ہے۔

اسنادی حیثیت کی توضیح: حدیث مرفوع متفق علیہ ہے، اور حدیث موقوف بخاری کی متفرد روایات میں سے ہے۔

۲۳۵۹: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْعَبْدَ الْمُؤْمِنَ الْمُفَتَّنَ التَّوَّابَ)

اخرجه احمد فی المسند ۱/ ۸۰۔

ترجمہ: ''اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اس بندہ مؤمن کو بہت دوست رکھتا ہے جو گناہ میں مبتلا ہوتا ہے اور بہت زیادہ توبہ کرتا ہے''۔

تشریح: عبد مؤمن سے مراد وہ مؤمن ہے جو عبودیت میں کامل ہو، اور اوصاف عبودیت کا نہ صرف مقر ہو بلکہ تہ دل سے ان کی تصدیق بھی کرتا ہو۔ **المفتن**: کے تین مطلب بیان کئے ہیں: (۱)۔ جو گناہوں میں بہت زیادہ مبتلا ہوتا ہو۔ (۲)۔ غفلتوں کا شکار۔ (۳)۔ **المحجوب عن الحضرات**۔ اللہ اس عبد مؤمن کو اس وجہ سے پسند کرتا ہے کہ ایسا عبد مؤمن عجب وغرور جیسے کبائر میں مبتلا نہ ہو۔ یہ دونوں گناہ اعظم الذنوب ہیں۔

عرض مرتب: اس لفظ تواب کی تشریح کیلئے ملاحظہ فرمائیے: حدیث: ۲۳۴۱ میں ذکر کردہ لفظ توابون کی تشریح۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: **المفتن الممتحن يمتحنه الله بالذنب، ثم يتوب، ثم يعود اليه، ثم يتوب منه وهكذا هو صريح فی صحة التوبة مع وقوع العودة**۔

۲۳۶۰: وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ مَا اُحِبُّ اَنَّ لِيَ الدُّنْيَا بِهٰذِهِ الْاٰيَةِ يَا عِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا الاٰيَةَ فَقَالَ رَجُلٌ فَمَنْ اَشْرَكَ فَسَكَتَ النَّبِيُّ ﷺ ثُمَّ قَالَ اَلَا وَمَنْ اَشْرَكَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ)

اخرجه احمد فی المسند ۵/ ۲۷۵۔

ترجمہ: ''اور حضرت ثوبانؓ کہتے ہیں کہ میں نے سنا کہ رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے تھے: ''میں اس آیت یَا عِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا الاٰيَةَ کے مقابلہ میں اپنے لئے تمام دنیا کا حصول بھی پسند نہیں کرتا'' ایک شخص نے پوچھا کہ جس شخص نے شرک کیا (کیا وہ بھی اس آیت کی بشارت کا مستحق ہے؟) نبی کریم ﷺ نے (کچھ دیر) خاموشی اختیار فرمائی) تا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آنے کے بعد یا پھر غور وفکر کر کے جواب دیں) پھر وحی آنے کے بعد یا خود اپنے اجتہاد سے کام لیتے ہوئے) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جان لو! جس شخص نے شرک کیا اور اپنی زندگی ہی میں اس سے توبہ کر لی اور پھر اس کی توبہ قبول بھی ہوئی تو وہ بھی اس آیت کی بشارت کا مستحق ہے۔ یہ بات آپ ﷺ نے تین مرتبہ فرمائی۔

عرض مرتب: حدیث میں مذکور آیت کریمہ سے متعلق اختلاف قراءت وغیرہ ماقبل میں حدیث: ۲۳۴۸ کے تحت ذکر کیا جا چکا ہے، وہاں ملاحظہ فرمائیے۔

تشریح: آپ ﷺ کے اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ تھا کہ اگر اس آیت کریمہ کے مقابلہ میں مجھے دنیا اور دنیا کی تمام چیزیں بھی دے دی جائیں اور میں دنیا کی ان تمام چیزوں کو خدا کی راہ میں صدقہ کردوں اور جن چیزوں سے لذت حاصل کی جاسکتی ہے ان سے لذت حاصل کروں تو بھی میں اسے پسند نہیں کروں گا کیونکہ اس آیت کریمہ میں گناہوں سے مغفرت و بخشش کی سب سے عظیم سعادت کی بشارت دی گئی ہے جو اسی ایک دنیا نہیں بلکہ اس جیسی سینکڑوں دنیا کے مقابلے میں کہیں زیادہ گراں قدر ہے۔ پوری آیت کریمہ یہ ہے:

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ.

''اے میرے وہ بندو جنہوں نے (گناہوں کے ذریعہ) اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے ناامید و مایوس نہ ہو بلا شک اللہ تعالیٰ گناہوں کو بخشتا ہے اور وہ نہایت بخشنے والا مہربان ہے''۔

اسی مضمون کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ان اشعار کے ذریعہ ادا کیا ہے ۔

اَيَا صَاحِبُ الذَّنْبِ لَا تَقْنَطَنْ فَاِنَّ الْاِلٰهَ رَءُ وْفٌ رَؤُوْفٌ

''اے گنہگار شخص ناامید اور مایوس مت ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ مہربان ہے بڑا ہی مہربان''۔

وَلَا تَرْحَلَنَّ بِلَا عِدَّةٍ فَاِنَّ الطَّرِيْقَ مَخُوْفٌ مَخُوْفٌ

''بغیر زادراہ کے کوچ نہ کر۔ کیونکہ راستہ بڑا دہشت ناک ہے بڑا ہی دہشت ناک''۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: قرآن میں یہ آیت انتہائی امید دلانے والی ہے۔ اسی وجہ سے حضرت حمزہ کے قاتل وحشی کو اسی آیت سے اطمینان حاصل ہوا۔ اھ۔

امام بغویؒ معالم میں نقل کرتے ہیں کہ عطاء بن ابی رباح نے ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وحشی کو اسلام کی دعوت دینے کیلئے بھیجا تو وحشی نے آپ ﷺ کی طرف یہ پیغام بھجوایا کہ آپ مجھے اپنے دین کی طرف دعوت کیسے دے رہے ہیں حالانکہ آپ کا زعم ہے کہ جس نے قتل کیا، یا زنا کیا، یا شرک کیا تو اس کو سزا سے سابقہ پڑے گا۔ قیامت کے روز اس کا عذاب بڑھتا چلا جائے گا۔ اور میں نے یہ سارے کام کئے ہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿**الا من تاب و امن وعمل عملاصالحا**﴾ [الفرقان: ۷۰] تو وحشی نے کہا یہ تو مجھ پر بڑی کڑی شرط ہے۔ اور شاید میں اس پر قادر نہ ہوسکوں تو کیا اس کے علاوہ بھی کوئی اور حل ہے؟ اس پر اللہ جل شانہ نے قرآن کریم کا یہ حصہ نازل فرمایا: ﴿**ان الله لا يغفر ان يشرك به......**﴾ [النساء: ۴۸] اس پر وحشی نے کہا: میں ابھی بھی شبہ دیکھ رہا ہوں کیا معلوم میری مغفرت ہو کہ نہ ہو؟ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿**یاعبادی الذین اسرفوا ......**﴾ [الزمر: ۵۳] اس پر وحشی نے کہا ہاں یہ ہے۔ چنانچہ وہ آئے اور اسلام قبول کرلیا۔ مسلمانوں نے کہا: یہ ان کے ساتھ خاص ہے یا عام مسلمانوں کیلئے بھی ہے؟ تو آپ فرمایا: بلکہ عام مسلمانوں کیلئے ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس سوال کو ''**یا عبادی......**'' پر بھی منطبق کیا جاسکتا ہے، یعنی کیا مشرک بھی اس حکم میں شامل ہے اور اس کو **یا عبادی** کے ذریعہ خطاب کیا جاسکتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں۔ اور **علی الذین اسرفوا** کے مصداق لوگوں کو یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا؟ تو اس کا جواب ہے کہ ہاں، **لا تقنطوا**، ان کو قنوط سے منع کیا گیا ہے۔ تو اس کا جواب ہے کہ ہاں، اور اس آیت: ﴿**ان الله يغفر الذنوب جميعا**﴾ پر بھی؟ تو اس کا جواب ہے کہ ہاں، اھ۔ یہ چار احتمالات ہیں۔ پہلا اور چوتھا احتمال تاویل کا محتاج ہے۔ دوسرا احتمال سوال کے لائق نہیں، اور تیسرا احتمال یہ وہی ہے کہ جس کو میں نے احتمال کے درجہ میں ذکر کیا ہے۔ **واللّٰہ اعلم بالحال**۔ **ثلاث مرات**: یہ قال کا ظرف ہے اور تکرار کا منشأ تاکید حکم ہے، یا اختلاف حالات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔

۲۳۶۱: وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی لَیَغْفِرُ لِعَبْدِہٖ مَا لَمْ یَقَعِ الْحِجَابُ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ وَمَا الْحِجَابُ قَالَ اَنْ تَمُوْتَ النَّفْسُ وَھِیَ مُشْرِکَۃٌ رَوَی الْاَحَادِیْثَ الثَّلٰثَۃَ (احمد وروی البیھقی الا خیر فی کتاب البعث والنشور)

اخرجه احمد في المسند ۱۷٤/٥۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ذرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے (گناہوں میں سے جنہیں چاہتا ہے ان کو) بخشتا ہے جب تک بندہ اور رحمت حق کے درمیان پردہ حائل نہ ہو' صحابہؓ نے عرض کیا یارسول اللہ! پردہ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''یہ کہ آدمی شرک کرتا ہوا (یعنی مشرک مرے) مذکورہ بالا تینوں روایتیں امام احمدؒ نے نقل کیا ہے۔ نیز یہ آخری روایت بیہقی نے ''کتاب البعث والنشور'' نقل کی ہے''۔

تشریح: تمام انواع کفر شرک کے حکم میں داخل ہیں۔

۲۳۶۲: وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ مَنْ لَقِیَ اللّٰہَ لَا یَعْدِلُ بِہٖ شَیْئًا فِی الدُّنْیَا کَانَ عَلَیْہِ مِثْلَ جِبَالٍ ذُنُوْبٌ غَفَرَ اللّٰہُ لَہٗ۔ (رواہ البیھقی فی کتاب بعث والنشور)

اخرجه ابن ماجه في السنن ۱٤۱۷/۲ حديث رقم ٤۲٥۰۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ذرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص اللہ سے اس حال میں ملاقات کرے (یعنی اس حال میں مرے) کہ وہ دنیا میں خدا کی مانند کسی کو نہ مانتا ہو (یعنی شرک میں مبتلا نہ ہو) تو اگر مرنے کے بعد اس کے اوپر پہاڑ کی مانند بھی گناہ ہوں گے تو اللہ تعالیٰ (اگر چاہے گا تو) اس (کے ان سب گناہوں کو بخش دے گا''۔ (بیہقی)

تشریح: شيئا في الدنيا: شيئاً منصوب بنزع الخافض ہے۔ أي: لا يتجاوز عنه الى غيره۔ مثل جبال: یہ کان کی خبر ہے، اور اسم ''ذنوب'' ہے۔ ابن حجرؒ نے لکھا ہے: بیان للواقع، اذا لاشراك انما يكون فيها، وأما الأخرة فكل الناس فيها مؤمنون، وان لم ينفع أكثرهم ايمانهم اھ۔ اس عبارت میں ابہام ہے، ان کو یہ تعبیر اختیار کرنی چاہئے تھی: وان لم ينفع الكفار ايمانهم۔

۲۳۶۳: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَہٗ (رواہ ابن ما جۃ والبیھقی فی شعب الا یمان وقال تفرد بہ النھر انی وھو مجھول وفی شرح السنۃ رواہ عنہ مو قوفا قال النَّدَمُ تَوْبَۃٌ وَّالتَّائِبُ کَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَہٗ۔

اخرجه ابن ماجه في السنن ۱٤۱۷/۲ حديث رقم ٤۲٥۰۔

ترجمہ: ''اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''گناہوں سے (صحیح اور پختہ) توبہ کرنے والا اس شخص کی مانند ہے جس نے گناہ نہ کیا ہو۔ (بیہقی) بیہقیؒ نے کہا ہے کہ اس روایت کو صرف نہرانی نے نقل کیا ہے سو وہ مجہول ہیں۔ نیز بغویؒ نے شرح السنہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی یہ روایت موقوف نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا (گناہوں پر شرمندگی اور) پشیمانی کا مطلب توبہ ہے اور توبہ کرنے والا اس شخص کی مانند ہے جس نے گناہ نہ کیا ہو''۔

تشریح: حدیث کا مطلب یہ ہے کہ گناہوں سے صحیح اور پختہ توبہ کرنے والا شخص عدم مؤاخذہ کے اعتبار سے اس شخص کی مانند ہے جس نے گناہ نہ کیا ہو۔ (یعنی جس طرح بے گناہ شخص سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا، اسی طرح گناہ گار تائب سے بھی مؤاخذہ نہ ہوگا۔ قصہ مختصر بے گناہ اور گناہ گار تائب دونوں کا مؤاخذہ نہ ہوگا)۔ اس کی تائید حضرت رابعہ سے منقول قصہ کے ذریعہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے اہل زمانہ، سفیانین اور ثوری وغیرہ پر فخر کرتے ہوئے کہا کرتی تھیں: **ان ذنوبی بلغت من الكثرة ما لم تبلغه طاعتكم، فبتوبتی منها بدلت حسنات** تحقیقیہ کہاں گئیں یا جن پر زیادت مضاعف کا ترتب ہوتا ہے۔ میرے نزدیک تحقیق بات یہ ہے کہ سفیانین کی ایک نیکی مثلاً کوئی ایک سنت کہ جس پر قیامت تک عمل ہوتا رہے گا، کی نقل کرتے ہیں تو یہ نیکی، رابعہ کی تمام نیکیوں سے بڑھ کر ہے۔ سفیانین کا ان کی خدمت میں حاضر ہونا، اور ان سے طلب دعا کرنا درحقیقت نبی کریم ﷺ کی اقتداء میں تھا، بلکہ (ممکن ہے) ان کو ایسے امور دینیہ سے آگاہ کر کے نفع پہنچاتے ہوں کہ جن کا وہ علم نہ رکھتی ہوں۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہاں مبالغہ مقصود تھا اس لئے الحاق الناقص بالکامل کا اسلوب اختیار کیا۔ جیسا کہ اہل عرب کہتے ہیں: **زيد كالأسد**: یہ بات بلا شک ہے کہ مشرک تائب، نبی معصوم کی طرح نہیں ہو سکتا، ابن حجر ان کی بات کا تعاقب کرتے ہوئے لکھتے ہیں: **المراد بمن لا ذنب له من هو عرضة له لكنه حفظ منه، فخرج الأنبياء والملائكة فليسوا مقصودين بالتشبيه**۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: چنانچہ اختلاف لفظی ہے، اصل اختلاف ان دو اشخاص کے بارے میں ہے کہ جس میں سے ایک شخص سے گناہ کا صدور ہوا اور پھر اس نے توبہ کر لی اور دوسرا شخص وہ ہے کہ جس نے گناہ کا ارتکاب سرے سے کیا ہی نہیں۔ ان دونوں میں سے کون افضل ہے۔ تو بعض کا کہنا ہے کہ پہلا شخص یعنی گناہ گار تائب افضل ہے، چونکہ اس نے لذت معصیت چکھنے کے بعد توبہ کی ہے۔ یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس میں اعلیٰ درجہ کا صدق اور ایمان اقوی پایا جاتا ہے، چونکہ اس نے مانع کا ارتکاب کرنے کے بعد اس کو چھوڑا ہے بخلاف دوسرے کے، اور بعض کا کہنا ہے کہ یہ شخص بے گناہ افضل ہے، چونکہ اس نے اپنے آپ کو گناہوں میں ملوث و پراگندہ ہی نہیں کیا، بخلاف اول کے اور ان دونوں باتوں میں کس قدر فرق ہے۔ لہٰذا یہ اختلاف لفظی نہیں۔ چنانچہ بعض عارفین فرماتے ہیں: **اما عصمة من الأول واما توبة فی الآخر**۔ اور ظاہر یہ ہے کہ انبیاء و ملائکہ معصومین اور اولیاء و اصطفیاء محفوظین کی مشابہت رکھنے والا شخص افضل ہے، چونکہ یہ عبد اکمل ہے، چونکہ اگرچہ اس کی مغفرت کر دی گئی لیکن حیاء خجلت سے تو خالی نہیں۔ اور ابن حجرؒ نے اس مسئلہ میں توقف اختیار کیا ہے۔

یہ بات جان لینی چاہئے کہ جب کوئی گناہ گار شخص صدق دل کے ساتھ اپنے گناہ پر شرمندہ و نادم ہوتا ہے اور شرائط معتبرہ کے ساتھ توبہ کرتا ہے تو اس کی توبہ قبول ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں رہتا کیونکہ خود حق تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ **وَهُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ** اور (اللہ) ایسا ہے جو اپنے بندہ کی توبہ قبول کرتا ہے۔

اور ''استغفار'' جو توبہ کے بغیر ہو اور جس کا تعلق خدا کے سامنے اپنے عجز وانکساری اور کسر نفسی کے اظہار سے ہو کبھی تو گناہوں کو مٹا دیتا ہے اور کبھی نہیں مٹاتا لیکن اس پر ثواب بہر صورت ملتا ہے گویا اس کا انحصار مشیت ایزدی پر ہے کہ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے اپنے فضل و کرم سے استغفار کے ذریعہ گناہ کو دور کر دیتا ہے اور جب چاہتا ہے دور نہیں کرتا لیکن ثواب دونوں صورتوں میں دیتا ہے۔ واللہ اعلم۔

تخریج: اس حدیث کو ابن ماجہ نے اپنی سنن میں ذکر کیا ہے۔ امام سیوطیؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام حاکم نے حضرت ابوسعید سے نقل کیا ہے۔ نہرانی مجہول الحال بھی ہو سکتے ہیں اور مجہول الذات بھی۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: **مع هذا لا يضر لأن الحديث الضعيف يعمل به فی الفضائل**۔ شرح السنہ میں مروی حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت اگرچہ سنداً موقوف ہے لیکن حکماً مرفوع ہے۔

الندم توبة: یعنی توبہ کا رکن اعظم ندامت وشرمساری ہے۔ چونکہ بقیہ امکان توبہ کا ترتب اسی پر ہوتا ہے، یہ جملہ، **الحج عرفة** کی

نظیر ہے، مگر اس میں عکس مبالغہ ہے۔

تخریج: امام قشیریؒ نے اپنے رسالہ میں، اور ابن نجار نے حضرت انس سے ان الفاظ کے ساتھ مرفوعاً نقل کیا ہے: **التائب من الذنب کمن لاذنب له، واذا أحب اللّٰه عبدًا لم یضره ذنب**۔ بیہقی اور ابن عساکر نے اس حدیث کو بحوالہ ابن عباس ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: **التائب من الذنب کمن لا ذنب له، والمستغفر من الذنب وهو مقیم علیه کالمستهزئ بربه، ومن آذی مسلما کان علیه من الذنوب مثل منابت النخل۔(کذا ذکره السیوطی فی الجامع الصغیر)** ابن الربیع فرماتے ہیں: **حدیث التائب من الذنب کمن لاذنب له، أخرجه ابن ماجة، والطبرانی فی الکبیر، والبیهقی فی شعب الایمان۔ ورجاله ثقات، وحسنه ابن حجر بشواهده۔**

باب رحمة اللّٰه

رحمت باری تعالیٰ کی وسعت کا بیان

لفظ باب کو ضمہ کی تنوین کے ساتھ پڑھنا اور وقفاً ساکن پڑھنا دونوں طرح درست ہے۔ اس باب کی اکثر بیشتر احادیث رحمت باری تعالیٰ کے بیان میں ہیں، رحمت باری تعالیٰ توبہ کا باعث ہے، موجب امید ہے اور مغفرت کی اُمید دلاتی ہے۔

الفصل الاول:

۲۳۶۴: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَمَّا قَضَی اللّٰهُ الْخَلْقَ کَتَبَ کِتَابًا فَهُوَ عِنْدَهٗ فَوْقَ عَرْشِهٖ اِنَّ رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ وَفِی روایة غَلَبَتْ غَضَبِیْ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۵۲۲/۱۳۔ حدیث رقم ۷۴۰۴۔ ومسلم فی صحیحه ۲۱۰۷/۴ حدیث رقم (۴۱۔ ۲۷۵۱)۔ وابن ماجه فی السنن ۱۴۳۵/۲ حدیث رقم ۴۲۹۵۔ واحمد فی المسند ۴۳۳/۲۔

ترجمه: ''حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (جب میثاق) کے دن مخلوقات کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا (یا یہ کہ جب مخلوقات کو پیدا کرنا شروع کیا) تو ایک کتاب لکھی (یعنی فرشتوں کو وہ کتاب لکھنے کا حکم دیا یا قلم کو لکھنے کا حکم فرمایا) وہ کتاب حق تعالیٰ کے پاس عرش کے اوپر ہے اس کتاب میں لکھا ہوا ہے'' بلاشبہ میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی ہے'' ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ''میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: **فهو**: اس ضمیر کی مراد میں دو احتمال ہیں: ① کتاب مراد ہے، چنانچہ کتاب بمعنی مکتوب ہے۔ ② علم مراد ہے۔

عنده: یہاں عند یہ مکانہ مراد ہے، نا کہ عند یہ مکان، چونکہ اللہ جل شانہ علامات حدوث سے مبرأ ومنزہ ہے۔ **فوق عرشه**: یہ جملہ اس کتاب کی عظمت شان کو ظاہر کرتا ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: **فان اللوح المحفوظ تحت العرش**۔ ابن حجر اس پر اضافہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں: **لأنه فی جبهة اسرافیل رئیس حَملة العرش والکتاب المشتمل علی هذا الحکم فوق العرش لجلالة قدره۔**

بعض کا کہنا ہے: **المراد بالکتاب اما القضاء الذی قضاه اللّٰه وأوجبه، فعلی هذا یکون معنی قوله: فهو عنده**

فوق عرشه أى فعلمه عنده تعالٰى فوق العرش لا ينسى ولا ينسخه ولا يبدله واما اللوح المحفوظ المذكور فيه الخلق وبيان احوالهم وأرزاقهم والأقضية النافذة فيهم، وأحوال عواقب أمورهم، فحينئذ يكون معناه فذكره عنده۔

جس کتاب میں حق تعالیٰ کی طرف سے بشارت عظمیٰ لکھی ہوئی ہے کہ اللہ کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے اس کتاب کی عظمت اور بزرگ قدری کا کوئی اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کتاب کی اس عظم و بزرگ قدری کے پیش نظر حق تعالیٰ نے اس کو اپنے پاس عرش کے اوپر رکھا ہے۔

ان رحمتی: ان کو بکسر الہمزہ اور بفتح الہمزہ دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ عسقلانیؒ فرماتے ہیں: کتاب سے بدل ہونے کی صورت میں بفتح الہمزہ ہوگا، اور مضمون کتاب کی حکایت کے طور پر پڑھیں تو بکسر الہمزہ ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: دوسرے احتمال کی تائید شیخین کی اس روایت سے ہوتی ہے: **ان رحمتی تغلب غضبی**، حدیث مبارکہ کے اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ میری رحمت کے آثار، میرے غضب کے آثار پر غالب ہیں۔ یہ ماقبل کی تفسیر ہے۔ اس جملہ میں خود صفات کا ایک دوسری پر سبقت لے جانا مراد نہیں کیونکہ اللہ جل شانہ کی صفات سبقت وغلبہ کے ساتھ موصوف نہیں ہوسکتیں۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یعنی جب اللہ جل شانہ نے مخلوق کو پیدا کیا تو یہ حکم جازم فرمایا، اور یہ وعدہ لازم فرمایا کہ جس میں کوئی خلاف ورزی نہیں: **ان رحمتی سبقت غضبی**، جب کوئی ذات اپنے کسی حکم میں مبالغہ ہے وہ اپنے ارادہ میں احکام چاہتی ہے تو ایک تحریر بناتی ہے اور محفوظ کر لیتی ہے۔

قضاء خلق اور سبقت رحمت میں مناسبت یہ ہے کہ مخلوق عبادت کیلئے پیدا کی گئی ہے تا کہ وہ اللہ جل شانہ کی بیش بہا نعمتوں کا شکر ادا کرے۔ اور کوئی بھی شخص اللہ جل شانہ کے کما حقہ ادائے شکر پر قادر نہیں، اور بعض لوگ اس میں تقصیر بھی کرتے ہیں، چنانچہ اللہ جل شانہ کی رحمت شاکر کے حق میں سبقت کر جاتی ہے۔ بایں طور کہ اس کو پورا پورا بدلہ دیتا ہے اور مزید بھی اس قدر عطا کرتا ہے کہ جس کا کوئی احاطہ نہیں کیا جاسکتا، اور اس کی رحمت مقصر کے حق میں بھی سبقت کرتی ہے بایں طور کہ گناہ گار جب توبہ کرتا ہے تو اللہ جل شانہ اس کے ساتھ عفو و درگزر کا معاملہ فرماتا ہے، اور سبقت رحمتی میں یہ بتانا مقصود ہے کہ اکثر واغلب احوال میں میری رحمت میرے غضب پر غالب وحاوی ہوتی ہے۔

۲۳۶۵: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ لِلّٰهِ مِائَةَ رَحْمَةٍ اَنْزَلَ مِنْهَا رَحْمَةً وَاحِدَةً بَيْنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالْبَهَائِمِ وَالْهَوَامِّ فَبِهَا يَتَعَاطَفُوْنَ وَبِهَا يَتَرَاحَمُوْنَ وَبِهَا تَعْطِفُ الْوَحْشُ عَلٰى وَلَدِهَا وَاَخَّرَ اللّٰهُ تِسْعًا وَّتِسْعِيْنَ رَحْمَةً يَرْحَمُ بِهَا عِبَادَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ. (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۰/۴۳۱۔ حدیث رقم ۶۰۰ ومسلم فی صحیحه ۲/۲۱۰۸ حدیث رقم (۱۷۔ ۲۷۵۲)۔ والترمذی فی السنن ۵/۲۰۹ حدیث رقم ۳۶۰۹۔ وابن ماجه ۲/۱۴۳۵ حدیث رقم ۴۲۹۳۔ والدارمی ۲/۴۱۳ حدیث رقم ۲۷۸۵۔ واحمد فی المسند ۲/۵۱۴۔

ترجمه: ''اور حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے پاس سو رحمتیں ہیں اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ایک رحمت تو جنات' انسان' چوپایوں اور زہریلے جانوروں میں اتاری ہے چنانچہ اسی ایک رحمت کے سبب وہ آپس میں میل ملاپ رکھتے ہیں اور اسی کے سبب وہ آپس میں رحم کرتے ہیں اور اسی کے سبب وحشی جانور اپنے بچوں سے الفت رکھتا ہے اور ننانوے رحمتیں اللہ تعالیٰ نے رکھ چھوڑی ہیں جن کے ذریعہ وہ قیامت کے

دن اپنے (مؤمن) بندوں پر رحم کرے گا۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: رحمة: یہاں رحمت کے انتہائی معنی یعنی ''نعمت'' مراد ہیں، چونکہ اللہ جل شانہ حقیقت رحمت کے تعدد سے منزہ ہیں۔ **رحمة واحدة**: سے مراد روحانی تعطف اور نفسانی میلان ہے۔ یہاں اس جگہ رحمت کو اس کے حقیقی معنی پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے۔ یہ رحمت اللہ جل شانہ کے آثار رحمت میں سے ہے، اور انزال کے ذریعہ تمثیل میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ رحمت امور طبعیہ میں سے نہیں ہے، بلکہ یہ امور سماویہ میں سے ہے، جس کی تقسیم مخلوقات کی استعداد کے مطابق کی گئی ہے۔ **هوام**: میم مشدّد ہے۔ هامة کی جمع ہے۔ ہر زہریلی چیز کو ''هامّه'' کہتے ہیں۔ اور کبھی اس کا اطلاق زمین پر رینگنے والی چیزوں پر بھی ہوتا ہے، جیسا کہ حشرات اور جوئیں۔ (کذا فی النہایة) اس میں اشارہ ہے کہ رحمت اب غیر طبعی ہے، اور جب سلب کی جاتی ہے تو بالکلیہ سلب کی جاتی ہے۔ **تعطف الوحش علی ولدها**: اولاد کی تخصیص شاید اس وجہ سے ہے کہ جانوروں میں باہمی طور پر تعاطف کا معاملہ نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ جانوروں کی اولاد خود اپنے والدین پر بھی مہربانی نہیں کرتی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان میں بھی رحمت ہوتی ہو۔ جیسا کہ اس حدیث: **احد جبل ونحبه** سے مستفاد ہوتا ہے اور اس آیت سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے: ﴿وان من الحجارة لما يتفجر منه الأنهار﴾[البقرة: ٧٤] اور تمام اشیاء کو بھی اسی پر قیاس کر لیا جائے۔ مثلاً نباتات کا ظہور، اشیاء کے خواص، آگ اور ہوا سے منفعت وغیرہ۔

وأخر الله: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس کا عطف ''أنزل منها رحمة'' پر ہے اور ضمیر کی جگہ اسم ظاہر لانا اللہ جل شانہ کی اخروی رحمت کی شدت عنایت کا بیان ہے۔ **یوم القیامة**: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اللہ جل شانہ کی رحمت لامتناہی ہے۔ چنانچہ جو کچھ ذکر فرمایا ہے اس میں بھی تحدید مقصود نہیں ہے۔ بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ اہل ایمان کے ساتھ آخرت میں جو عدل وانصاف کا معاملہ ہوتا ہے اور تمام مخلوقات کے ساتھ دنیا میں جو عدل وانصاف کا معاملہ ہے دونوں معاملات میں انتہائی فرق ہے اھ۔ یہ تفسیر منافی نہیں اس تفسیر کے کہ جس میں رحمت کی تفسیر نعمت کے ساتھ کی ہے، اور نہ تقسیم رحمت بمعنی مثوبۂ عظمیٰ ہی اس کے منافی ہے۔ جیسا کہ وارد ہے کہ ہر روز ایک سو بیس رحمتیں نازل ہوتی ہیں، ساٹھ رحمتیں طواف کرنے والے کیلئے کعبہ پر نازل ہوتی ہیں، اور چالیس رحمتیں نمازیوں کیلئے نازل ہوتی ہیں، اور بیس رحمتیں ناظرین کیلئے نازل ہوتی ہیں۔ ابن حجرؒ نے امام طیبیؒ کا تعاقب کیا ہے، مگر مذکورہ بالا توجیہ سے اس تعاقب کا بھی دفعہ ہو جاتا ہے۔ اس حدیث میں اشارہ ہے کہ اللہ جل شانہ اپنے مسلمان بندوں پر انتہائی فضل وکرم فرماتا ہے، اور اشارہ ہے کہ اللہ جل شانہ ارحم الراحمین ہے۔

۲۳۶۶: وَفِیْ رِوَایَةٍ لِمُسْلِمٍ عَنْ سَلْمَانَ نَحْوَهُ وَفِیْ اٰخِرِهٖ قَالَ وَاِذَا کَانَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ اَکْمَلَهَا بِهٰذِهِ الرَّحْمَةِ)

اخرجه مسلم فی صحیحه ٢١٠٩/٤ الحدیث رقم (٢١ـ ٢٧٥٣)۔

ترجمه: اور مسلمؒ نے ایک روایت حضرت سلمانؓ سے اسی کے مانند نقل کی ہے۔ اس کے آخر میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: پس جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ ان ننانوے رحمتوں کو اس رحمت کے ساتھ (جو دنیا میں اتاری گئی ہیں) ''پورا فرما دے گا''۔

۲۳۶۷: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَوْ یَعْلَمُ الْمُؤْمِنُ مَا عِنْدَ اللّٰهِ مِنَ الْعُقُوْبَةِ مَا طَمَعَ بِجَنَّتِهٖ اَحَدٌ وَلَوْ یَعْلَمُ الْکَافِرُ مَا عِنْدَ اللّٰهِ مِنَ الرَّحْمَةِ مَا قَنَطَ مِنْ جَنَّتِهٖ اَحَدٌ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٣٠١/١١۔ حدیث رقم ٦٤٦٩۔ ومسلم فی صحیحه ٢١٠٩/٤ حدیث رقم (٢٣۔ ٢٧٥٥)۔ واحمد فی المسند ٣٣٤/٢۔

''اور حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اگر مؤمن یہ جان لے کہ خدا کے ہاں کس قدر عذاب ہے تو پھر کوئی شخص اس کی جنت کی امید بھی نہ رکھے (یعنی عذاب کی فراوانی اسے جنت سے مایوس کر دے) اور اگر کافر یہ جان لے کہ اللہ کی رحمت کس قدر ہے تو پھر کوئی اس کی جنت سے ناامید نہ ہو''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: عنه: ایک نسخہ میں عن أبی هريرة ہے۔ یہ زیادہ واضح ہے، چونکہ ضمیر کی صورت میں ضمیر کے مرجع کے بارے میں یہ وہم ہونا ہے، کہ جو پیچھے قریب ترین مذکور ہے وہ مرجع ہو اور وہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ ہیں' اگر اقرب مذکور مراد لیں تو وہ مسلمان ہیں۔ اور مشہور نسخوں کے مطابق اصل یہی ہے گویا کہ عنوان پر اعتماد کیا ہے۔ **ما عند الله من العقوبة**: یہ ''ما'' کا بیان ہے۔ **ما طمع بجنة احد** کا ایک مفہوم تو وہ ہے جو حدیث کے ترجمہ میں بین القوسین ذکر کیا ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ''أحد'' اپنے عموم پر ہو۔

اِس حدیث کا منشاء درحقیقت اللہ کی رحمت اور اس کے عذاب کی کثرت کو ظاہر کرنا ہے تا کہ مؤمن تو اس کی رحمت پر اعتماد کر کے نہ بیٹھ جائے اور اسکے عذاب سے بالکل بے خوف و نڈر نہ ہو جائے اور کافر اسکی رحمت سے ناامیدی نہ اختیار کرلے اور توبہ کرنا نہ چھوڑے اور حاصل اس حدیث کا یہ ہے کہ بندہ کو چاہئے کہ وہ بین الخوف والرجاء (خوف اور امید کے درمیان) رہے یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت پر امید بھی رکھے اور اس کے عذاب سے بھی ڈرتا رہے' چنانچہ حضرت عمرؓ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا ''اگر قیامت کے دن یہ اعلان کیا جائے کہ ایک شخص جنت میں داخل ہوگا تو میں امید رکھوں گا کہ وہ شخص میں ہوں اور اسی طرح اگر یہ اعلان کیا جائے کہ ایک شخص دوزخ میں داخل کیا جائے گا تو میں گمان رکھوں گا کہ وہ شخص میں ہی ہوں''۔

من جنته أحد کی تشریح امام طیبیؒ وغیرہ نے **من الکافرین** سے کی ہے، اور ابن الملک نے یوں کی ہے: **اذا دخل فی الاسلام**، اور حسن مقابلہ کا تقاضا یہ ہے کہ مقید نہ کیا جائے، چونکہ عدم تقیید مفید مبالغہ ہے، مزید یہ کہ شرطیہ غیر لازمۃ الوقوع ہے۔ ''**أنه لو نودی فی القیامة أن یدخل أحد الجنة أرجو أن أکون أنا، وکذا فی النار**۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث اللہ جل شانہ کی صفت قہر و رحمت کا بیان ہے، جیسے اللہ جل شانہ کی دوسری صفات غیر متناہیہ ہیں، اور ان کی ''کنہ'' کا ادراک نہیں کیا جا سکتا، یہی معاملہ ان دونوں صفات کا بھی ہے۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ مؤمن اللہ جل شانہ کی صفت قہاریت کی کنہ سے واقف ہے، تو اس سے وہ کچھ ظاہر ہوگا چنانچہ کوئی بھی شخص جنت کی طمع نہیں کرے گا، ضمیر کی جگہ لفظ مؤمن صراحتًا ذکر کئے جانے کی صورت میں یہ معنی مراد ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ المؤمن میں جنس کے معنی **علی سبیل الاستغراق** مراد ہوں۔ اس صورت میں تقدیری عبارت یوں ہوگی، **أحد منهم**۔ اس کے ایک اور معنی بھی ممکن ہیں وہ یہ کہ مؤمن مختص ہے، کہ وہ جنت کی طمع کرے، چنانچہ جب مؤمن کی بابت طمع کی نفی ہوگئی تو سب سے نفی ہو جائے گی، اسی طرح کافر مختص بالقنوط ہے، چنانچہ جب کافر کے تئیں قنوط کی نفی ہوگئی تو سب سے نفی ہو جائے گی۔

۲۳۶۸: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْجَنَّةُ اَقْرَبُ اِلٰی اَحَدِكُمْ مِنْ شِرَاكِ نَعْلِهٖ وَالنَّارُ مِثْلُ ذٰلِكَ. (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۱۲/۱۱۔ حدیث رقم ۶۴۸۱۔ ومسلم فی صحیحه ۲۱۰۹/۴ حدیث رقم (۲۴۔ ۲۷۵۶)

ترجمه: ''اور حضرت ابن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جنت تم میں سے ہر شخص کے جوتے کے تسمے سے زیادہ اس کے قریب ہے اور دوزخ بھی اسی طرح ہے''۔ (بخاری)

تشریح: شراك: بروزن کتاب، جوتے کا تسمہ، امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اہل عرب شراک کو ضرب المثل کے طور پر استعمال کرتے

ہیں۔ چونکہ ثواب وعقاب کے حصول کا سبب بندہ کی سعی وکوشش ہوتی ہے۔ اور سعی اقدام کے ذریعہ ہوتی ہے، اور جو شخص بھی کوئی نیک عمل کرے گا وہ جنت کا حقدار اس کے وعدہ کے بموجب ہوگا۔ اور جو بھی شخص کوئی نیک عمل کرے گا وہ جنت کا مستحق اس کی وعید کے بموجب ہوگا، غرضیکہ اس کا ہر وعدہ ہر وعید پوری ہو کر رہے گی، تو گویا کہ دونوں حاصل ہیں اھ (یعنی گویا کہ وعدہ اور وعید دونوں پورے ہو گئے)۔

اس سے ایک لطیف نکتہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ کو اپنے نعلین مبارک عنایت فرما کر بھیجا تھا۔ چونکہ شراک انفکاک کو قبول کرتا ہے، بخلاف عمل کے، اس آیت کریمہ میں اسی طرف اشارہ ہے: ﴿**کل انسان ألزمناه طائره فی عنقه**﴾[الاسراء:۱۳] پس جو چیز گلے میں مستقل طور پر لٹکی ہوئی ہے بلاشبہ وہ اقرب ہے اس چیز کے مقابلہ میں جو بعض ایام میں پاؤں کے نیچے لٹک رہی ہوتی ہے۔ **واللہ تعالٰی اعلم اشارات کلام سید الأنام، والنار مثل ذلك**: ذلک سے امر مذکور کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی: **النار مثل الجنة فی کونها أقرب من شراك النعل**۔ بظاہر یہ اقتصار راوی کی طرف سے ہے، پھر بعض کا کہنا ہے کہ یہ اس سبب سے ہے کہ کسی بھی شخص کے دخول جنت ونار کا سبب یعنی عمل صالح اور سیہ اس شخص کے جوتے کے تسمیہ سے زیادہ قریب ہے، چونکہ وہ اس کا مجاور ہے اور عمل وہ صفت ہے جو اس کے ساتھ قائم ہے۔

اور ابن حجر کا یہ کہنا: **أو هی نفسها باعتبار سرعة انقضاء الدنیا التی یلیها دخولها**، اگرچہ نفس الأمر کے اعتبار سے صحیح ہے، لیکن بظاہرہ **من کونه أقرب من الشراك** غیر صحیح ہے۔ الا یہ کہ مبالغہ وادعاء پر محمول کیا جائے، جیسا کہ مخفی نہیں، اور ان کا یہ کہنا: **أو نزل الوعد بها الناجز لمن عمل عملا صالحا منزلة حصولها نفسها**، یہ بعینہٖ وہی قول ہے جس کو امام طیبیؒ نے اقتصار کیا ہے، اور یہی معتمد ومعوّل ہے۔

۲۳۶۹: **وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْ لُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ رَجُلٌ لَمْ یَعْمَلْ خَیْرًا قَطُّ لِاَهْلِهٖ وَفِیْ رِوَایَةٍ اَسْرَفَ رَجُلٌ عَلٰی نَفْسِهٖ فَلَمَّا حَضَرَهُ الْمَوْتُ اَوْصٰی بَنِیْهِ اِذَا مَا تَ فَحَرِّقُوْهُ ثُمَّ اَذْرُوْا نِصْفَهٗ فِی الْبَرِّ وَنِصْفَهٗ فِی الْبَحْرِ فَوَاللّٰهِ لَئِنْ قَدَرَ اللّٰهُ عَلَیْهِ لَیُعَذِّ بَنَّهٗ عَذَابًا لَا یُعَذِّبُهٗ اَحَدًا مِنَ الْعَالَمِیْنَ فَلَمَّا مَاتَ فَعَلُوْ مَا اَمَرَهُمْ فَاَمَرَ اللّٰهُ الْبَحْرَ فَجَمَعَ مَا فِیْهِ ثُمَّ قَالَ لَهٗ لِمَ فَعَلْتَ هٰذَا قَالَ مِنْ خَشْیَتِكَ یَارَبِّ وَاَنْتَ اَعْلَمُ فَغَفَرَ لَهٗ.** (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۱۲/۱۱۔ حدیث رقم ٦٤٨١۔ ومسلم فی صحیحه ۲۱۰۹/٤ حدیث رقم (۲٤۔ ۲۷۵٦)

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایک شخص تھا جس نے کبھی کوئی نیکی نہیں کی تھی اور ایک روایت میں یہ ہے کہ اس نے اپنے نفس پر زیادتی کی تھی یعنی بہت ہی زیادہ گناہ کئے تھے' جب اس کی موت کا وقت قریب آیا تو اس نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ جب وہ (یعنی خود) مرجائے تو اس کو (یعنی مجھے) جلا کر آدھی راکھ جنگل میں اڑا دینا اور آدھی راکھ دریا میں بہا دینا کیونکہ قسم ہے خدا کی! اگر اللہ تعالیٰ نے مجھ سے مواخذہ کرلیا اور حساب میں سختی کی تو وہ اس کو ایسا عذاب دے گا کہ آج تک عالم کے لوگوں میں سے کسی کو نہ دیا ہوگا' چنانچہ جب وہ شخص مرگیا تو اس کے بیٹوں نے اس کی وصیت کے مطابق عمل کیا (کہ اس کو جلا کر آدھی راکھ تو جنگل میں اڑا دی اور آدھی کو دریا میں بہا دیا) اللہ تعالیٰ نے دریا کو (اس کی راکھ جمع کرنے کا حکم دیا) اور اس نے وہ راکھ جو اس کے اندر تھی جمع کی اور جنگل کو حکم دیا اور اس نے بھی جو راکھ اس کے اندر تھی جمع کی) جب دریا اور جنگل نے اس کے اجزاء جمع کر لئے تو اس شخص کو ان اجزاء سے استوار کر کے حق تعالیٰ کے سامنے پیش کیا گیا' حق تعالیٰ نے پوچھا کہ تو نے ایسا کیوں کیا تھا؟ اس نے جواب دیا کہ پروردگار! تیرے خوف سے تو حقیقت حال کو خوب جانتا ہے'' اللہ تعالیٰ نے یہ سن کر اسے بخش

دیا''۔(بخاری ومسلم)

تشریح: امورنحویہ: رجل لم یعمل: (یہ جملہ محل رفع میں) رجل کی صفت ہے۔ **فلما حضره الموت...... فحرقوه:** امام طیبیؒ فرماتے ہیں: پہلی روایت کی تقدیر پر قال کا مقولہ ہے۔اور دوسری روایت کی بناء پر أوصی کا معمول ہے، جس میں تنازع ہے۔اھ۔اور یہی درست ہے، چونکہ ایک روایت **أوصى بنيه** تک ہے۔ جملہ معترضہ ہے بخلاف زین العرب کے، وہ کہتے ہیں: پہلی روایت کی تقدیر پر کلام یوں ہے: **رجل لم يعمل قط خيرا لأهله فلما حضره الموت**......،اور دوسری روایت کی بنیاد پر آنحضرت ﷺ کے ارشاد گرامی کی ابتداء **أسرف رجل على نفسه** سے ہے،اور(**أسرف على نفسه** کا) مطلب یہ ہے کہ اس نے بہت زیادہ گناہ کئے تھے اھ۔اصل کلام یوں تھا: **اذا أنا مت فحر قوني**۔اس اسلوب کو چھوڑ کر غائب کی تعبیر اختیار کرنے میں عدم اعتناء کی طرف اشارہ ہے اور اس چیز کو مقدم ذکر کیا کہ جس کے باعث وہ سعداء کے مراتب سے غائب ہوگیا۔(**كذا قاله ابن حجر**)۔اس کا حاصل یہ ہے کہ اس عبارت میں صنعت التفات ہے(بعض کے مذہب پر) تقریباً یہی بات امام طیبیؒ نے فرمائی ہے: **لو حكى ما تلفظ به الرجل لكان ينبغي أن يقال: اذا مت فحر قوني، ثم اذا نصغي، ولو نقل معنى ما تلفظ به الرجل لقال: اذا مات فليحرقه قومه م ليذروا، فعدل عن ضمير المتكلم الى الغائب تحاشيا عن وصمة نسية التحريق، وتوهم الشك في قدرة الله الى نفسه**اھ۔

ابن حجرؒ لکھتے ہیں: **وكلامي أولى مما قيل عدل...... لأن هذا العدول لا يمنع اليها له الشك في قدرة الله تعالىٰ**۔ ابن حجرؒ سے غفلت وذہول ہوا ہے، بایں طور کہ معدول عنہ کلام یہ ہے: **لئن قدر الله عليّ...... قدر الله عليه**۔اگرچہ اس کو امام طیبیؒ نے بھی ذکر نہیں کیا۔ **ثم اذروا:** ہمزہ وصلی ہے، **الذرى** بمعنی **التذرية** سے مأخوذ ہے،اور اس ہمزہ کو قطعی بنا کر پڑھنا بھی درست ہے۔ عرب کہتے ہیں: **ذرته الريح وأذرته، اذا أطارته۔ نصفه:** یہاں درمیان میں مضاف محذوف ہے)۔**أي نصف رماده۔ فوالله عليه:** ابن حجرؒ لکھتے ہیں: ایک نسخہ میں علی ہے، امام نووی نے بھی اس پر اعتماد کیا ہے۔ بظاہر یہ کسی کاتب سے سہو ہوا ہے، چونکہ یہ تحریف فی الکتاب ہے۔اس کے ضعف پر اگلا جملہ بھی دلالت کر رہا ہے۔ **ليعذبنه**، چونکہ جملہ شرطیہ اور جملہ قسمیہ کے دو اجزاء کے درمیان التفات معہود نہیں ہے اور اس کے ثبوت کی تقدیر پر اس کو اس معنی پر محمول کیا جائے گا کہ وہ شخص مدہوش ودہشت زدہ تھا۔ **عذابا**(باب تفعیل کا مصدر ہے، جیسے سلام اور کلام) **أي: تعذيب۔ لا يعذبه:** (ضمیر منصوب متصل عذاب کی طرف راجع ہے) **أي: ذلك العذاب۔ لئن قدر الله عليه** سے کیا مراد ہے؟ (۱) قدر قدرۃ سے مأخوذ نہیں۔ چونکہ قدرت باری تعالیٰ میں شک کرنا کفر ہے۔ بلکہ قدر، قدر بمعنی تضییق سے مأخوذ ہے، چنانچہ مطلب یہ ہوگا: **لئن ضيق الله عليه، وناقشه في الحساب**۔

حدیث کے آخر میں آیا ہے: **خشيتك وغفر له**،اور کافر نہ اللہ سے ڈرتا ہے،اور نہ اس کی مغفرت ہوگی۔اس میں دو تاویلیں کی گئیں ہیں۔ پہلی تاویل یہ ہے کہ قدر تخفیف کے ساتھ ہے، بمعنی ضیق۔ یہ آیت کریمہ بھی اسی قبیل سے ہے: ﴿**قدر عليه رزقه**﴾ اس کو تخفیف وتشدید دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے، اور یہ ارشاد باری تعالیٰ بھی اسی قبیل سے ہے: ﴿**فظن أن لن نقدر عليه**﴾[الانبیاء:۸۷] اور دوسری تاویل یہ ہے کہ قدر تخفیف وتشدید ہر دو کے ساتھ بمعنی قضا ہے، لیکن حدیث کے بعض طرق میں آتا ہے: **فلعلي أضل الله؟ أي أفوته**۔یعنی ممکن ہے میں اللہ تعالیٰ سے بچ جاؤں اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس طریقہ سے اللہ تعالیٰ کی قدرت سے نکل بھاگنا چاہتا تھا۔اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے اس کی مغفرت کی خبر دی ہے، لہٰذا کوئی نہ کوئی ایسی توجیہ کرنا ضروری ہے کہ اس توجیہ کے ہوتے ہوئے وہ مؤمن بھی شمار ہو۔ چنانچہ بعض کا کہنا ہے: اس شخص کا ظن یہ تھا کہ جب وہ یہ کام کر گزرے گا تو اس کا

''نشور'' نہیں ہوگا اور عذاب بھی نہیں ہوگا، اور جہاں تک تعلق ہے اس کے قول لئن قدر الله، اور ''فلعلي أضل الله کا، سو وہ اس بات سے جاہل تھا۔ اس جیسے شخص کے بارے میں اختلاف ہے کہ اس کی تکفیر کی جائے گی یا نہیں؟ بخلاف اس شخص کے جو صفت قدرت کا منکر ہو اور بعض کا کہنا ہے: هذا ورد مورد التشكك فيما لا شك، علم بلاغہ کی اصطلاح میں اس کو ''تجاہل عارفانہ'' کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ یہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿فان كنت في شك﴾ [یونس: ۹۴] اور بعض کا کہنا ہے کہ وہ اس قدر ڈر گیا کہ دہشت زدہ ہو گیا، اور اس کی عقل مسلوب ہو گئی تھی، خبر کی وجہ سے وہ اپنی بات تمہید و توضیح کے ساتھ بیان نہیں کر سکا۔ اور اس کے منہ سے جلدی میں ایک گری ہوئی بات نکل گئی، اور اس شخص سے جو کلام یہاں صادر ہو وہ گویا ایسے شخص کا کلام تھا کہ جو اس کی حقیقت کا معتقد نہ ہو۔ یہ توجیہہ سب سے ''اَسلم'' ہے۔ واللہ اعلم۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ کلام اس سے غلبہ حیرت و دہشت کی وجہ سے صادر ہوا، چنانچہ اس نے اپنے کلام میں تدبر نہیں کیا، جیسا کہ غافل اور ناسی کا حال ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کے کلام پر مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ میں کہتا ہوں حدیث سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے، جیسا کہ عنقریب آ رہا ہے: قال تعالىٰ: لم فعلت؟ قال: من خشيتك يا رب وأنت أعلم۔ واللہ اعلم۔

اور بعض کا کہنا ہے: اس پر اور اس جیسا واقعہ جیسا کہ ماقبل میں واجد الضا کا گزرا تھا' مؤاخذہ نہیں۔ امام طیبیؒ کی اتباع میں ابن حجرؒ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ یہ بات محل نظر ہے، چونکہ ''واجد الضالة'' سے وہ کلام سہواً وخطاً صادر ہوا تھا، بخلاف اس شخص کے، لہٰذا اس کا ''مقیس'' ہونا کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ کسی ایک وصف کا انکار ہو مگر دوسرے اوصاف کا اقرار کرتا ہو تو مستوجب کفر نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں ایک وصف سے جہالت میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ امام طیبیؒ لکھتے ہیں: یہ شخص اللہ جل شانہ کی صفات میں سے ایک صفت سے جاہل تھا، چنانچہ ایسے شخص کی تکفیر کا مسئلہ علماء کے درمیان اختلافی ہے۔ قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں: وممن كفره ابن جرير الطبري، وقال به أبو الحسن الأشعري أولا، وقال آخرون: لا يكفر به، بخلاف جحدها، واليه رجع أبو الحسن، وعليه استقر مذهبه، قال: لأنه لم يعتقد ذلك اعتقادا يقطع بصوابه ويراه دينا شرعا، وانما يكفر من اعتفذ أن مقالته حق، وقالوا: لو سئل الناس عن الصفات لوجد العارف بها قليلا۔ وقيل: هذا من بديع استعمالات العرب، ويسمى مزج الشك باليقين، والمراد اليقين، كقوله تعالىٰ: ﴿فان كنت في شك﴾۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ تھا کہ اہل کتاب کے معاملہ میں نبی کریم ﷺ پر جو کچھ نازل ہوا ہے وہ نبی کریم ﷺ کے تئیں پختہ ہو جائے، اور یہ معلوم ہو جائے کہ نبی کریم ﷺ کو اس میں قطعاً کوئی شک نہیں ہے۔ اس اسلوب کے ذریعہ نبی کریم ﷺ کو برانگیختہ کیا جا رہا ہے تاکہ آپ ﷺ کو مزید رسوخ و ثبات حاصل ہو جائے، اس طرح یہ آدمی بھی جانتا تھا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو زندہ کرنے اور عذاب دینے پر قادر ہے۔ اور اس کی تائید دوسری روایت سے بھی ہوتی ہے: أن الله يقدر على أن يعذبني۔ چنانچہ اس شخص کا ارادہ اپنی قوم کو اپنی وصیت کی تنفیذ پر ابھارنا تھا، چنانچہ اس نے اپنے کلام کو معرض تشکیک میں پیش کیا، تاکہ وہ لوگ اس کی وصیت میں سستی نہ کریں، اور ٹھیک ٹھیک پوری کریں اھ۔ حدیث اور آیت کریمہ کے درمیان عدم مناسبت کسی پر مخفی نہیں چونکہ آیت میں اللہ جل شانہ کا کلام ہے اور مخاطب نبی کریم ﷺ ہیں، اور یہ کلام على سبيل الفرضية ارشاد فرمایا ہے، نبی کریم ﷺ کی بابت تو شک کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا: لا أشك ولا أسأل۔ اور حدیث میں جس شخص کے کلام کا ذکر ہے وہ غیر معصومہ ہے اس شخص کی بابت ابتداءً یا انتہاءً شک متصور ہو سکتا ہے، اور دوسری روایت سے بھی تائید نہیں ہوتی، چونکہ یہ معنوی اعتبار سے بلاغبار ہے، اور صحیح ہے، لیکن اس روایت کے مباین ہے، چونکہ وہ موہم ہے، ہاں یہ روایت اس پر ضرور دلالت کرتی ہے کہ وہ شخص مؤمن تھا، اس کا کلام محتاج تاویل ہے، اور بہترین تاویل وہی ہے جو اس آیت کریمہ: ﴿فظن أن لن نقدر عليه﴾ میں کی گئی ہے۔ اور أضل الله والی

روایت أضیع طاعته کے معنی پر محمول ہے، اور ''لعل'' برائے اشفاق ہے۔ اور اس کی دلیل ''من خشیتك یا رب'' کے الفاظ ہیں، یہ ''لعل'' ترجی کے معنی کیلئے نہیں ہے، جیسا کہ شراح نے ترجی کے معنی پر محمول کیا ہے، اور خود اپنے اوپر اشکال کر بیٹھے، اور اس شخص کی تکفیر کر ڈالی، اور غایت فی الباب یہ ہے کہ اس نے مضارع کا صیغہ حال ماضیہ کے استحضار کیلئے ذکر کیا تھا، اس پر کوئی محظور لازم نہیں آتا۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ اس شخص کا یہ واقعہ زمانۂ فترت کا ہے، اور زمانۂ فترت میں مجرد توحید نافع ہوتی ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: مذہب صحیح کے مطابق ورود شرع سے پہلے تو ''تکلیف شرعی'' ہے ہی نہیں۔ اس کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے: ﴿وما كنا معذبين حتى نبعث رسولا﴾[الاسراء: ۱۵] یہاں اشکال یہ ہوتا ہے کہ جب وہ زمانہ تکلیف کا تھا ہی نہیں، اور توحید بھی محقق تھی تو خوف کے کیا معنی؟ نیز امام طیبیؒ کا کلام خود ان کے اپنے مذہب کے مقتضی کے مطابق نہیں ہے، چونکہ شافعیہ کے نزدیک زمانۂ فترت میں بالکل توحید وغیرہ سے متعلق ''تکلیف'' نہیں ہے۔ قال: من خشيتك يا رب! وأنت أعلم: بعض کا کہنا ہے کہ اس نے یہ وصیت اس وجہ سے کی تھی کہ وہ اپنے آپ کو حقیر سمجھتا تھا، اور اپنے گناہوں کے باعث سزا سے بھی ڈرتا تھا، اور اس بات کی امید بھی رکھتا تھا کہ اللہ اس پر رحم کرتے ہوئے معاف فرمادے گا۔ اس توجیہ سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ لئن قدر بمعنی ضیق ہے، ابن حجرؒ لکھتے ہیں: المراد لئن بعثني، وان ههنا بمعنى اذا، أو اذ على حدّ: ﴿وخافون ان كنتم مؤمنين﴾[آل عمران: ۱۷۵] ابن حجرؒ کا یہ کلام مردود ہے۔ چونکہ لام موطئہ صرف شرط ہی پر داخل ہوتا ہے۔

۲۳۷۰: وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ قَدِمَ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ سَبْيٌ فَإِذَا امْرَأَةٌ مِّنَ السَّبْيِ قَدْ تَحَلَّبَ ثَدْيُهَا تَسْعٰى اِذَا وَجَدَتْ صَبِيًّا فِي السَّبْيِ اَخَذَتْهُ فَأَلْصَقَتْهُ بِبَطْنِهَا وَاَرْضَعَتْهُ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ اَتَرَوْنَ هٰذِهٖ طَارِحَةً وَلَدَهَا فِي النَّارِ فَقُلْنَا لَا وَهِيَ تَقْدِرُ عَلٰى اَنْ لَّا تَطْرَحَهٗ فَقَالَ اللّٰهُ اَرْحَمُ بِعِبَادِهٖ مِنْ هٰذِهٖ بِوَلَدِهَا (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ۴۲۶/۱۰۔ حديث رقم ۵۹۹۹۔ ومسلم في صحيحه ۲۱۰۹/۴ حديث رقم (۲۲۔ ۲۷۵۴)

ترجمہ: ''اور حضرت عمر بن خطابؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) نبی کریم ﷺ کے پاس کچھ قیدی آئے جن میں ایک عورت بھی تھی (اور دودھ کی کثرت کی وجہ سے) اس کی چھاتیاں بہہ رہی تھیں (کیونکہ اس کا بچہ نہیں تھا جو اس کا دودھ پیتا) وہ اپنا دودھ پلانے کی خاطر کسی بچہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر دوڑتی تھی چنانچہ جب وہ قیدیوں میں سے کسی بچہ کو پالیتی تو (اپنے بچہ کی محبت میں) اسے لے کر اپنے پیٹ سے لگاتی اسے دودھ پلانے لگتی (یہ دیکھ کر) نبی کریم ﷺ نے ہم سے فرمایا کہ ''کیا تمہارے خیال میں یہ عورت اپنے بچے کو آگ میں ڈال دے گی؟ (یعنی جب یہ غیر کے بچے کے ساتھ اتنی محبت کرتی ہے تو کیا اس بات کا خیال کیا جا سکتا ہے کہ یہ اپنے بچے کو آگ میں ڈال دے گی؟ ہم نے کہا ہرگز نہیں ڈالے گی۔ بشرطیکہ وہ ڈالنے پر قدرت رکھتی ہو'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ عورت اپنے بچے پر جتنا رحم و پیار کرتی ہے اللہ تعالیٰ اپنے (مؤمن) بندوں پر اس سے کہیں زیادہ رحم و پیار کرتا ہے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قد تحلب: باب تفعل سے ہے، أترون: تاء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ فقلنا لا: یہاں تقدیری عبارت یوں ہے: لانظن أنها طارحة۔ ابن حجرؒ نے تقدیری عبارت یوں بیان کی ہے: لا تطرحه۔ مگر مقدم الذکر تقدیری عبارت ابن حجر کی عبارت سے اولیٰ ہے۔ اختلاف نسخ وروایت: تسعی: اس عبارت کی بابت نسخوں میں طویل اختلاف پایا جاتا ہے۔ وہ اختلاف بعینہٖ ذکر کیا جا رہا ہے۔

وروی: تسقى أى ترضع الولد قال العسقلاني: للكشميهني بسقى بكسر الموحدة وفتح المهملة وسكون القاف وتنوين التحتانية وللباقين تسعى بفتح العين المهملة من السعى قال الشارح اى تعدوا و روى في كتاب

مسلم تبتغي ای تطلبولدها و اما تسقی علی ما فی بعض النسخ للمصابیح والبخاری ایضا فلیس بشیء قلت نسبته الی البخاری لیس بشیء لماتقدم من کلام العسقلانی من ان روایة البخاری منحصرة فی الصیغتین لکن فی شرح الطیبی قال القاضی الصواب ما فی روایة البخاری تسقی بالقاف من السقی اقول قوله وفی کتاب البخاری تسقی کما فی بعض نسخ المصابیح ان کان ردا للروایة فلا کلام فیه،وان کان الرد من حیث الدرایة فغیرمستقیم،لان تسقی جعل حالا مقدرة من ضمیر المرأة بمعنی قد تحلب ثدیها مقدرة السقی فای بعد فیه ۔اھ کلامه والذی یظهر لی ان المراد بقول القاضی الصواب ما فی روایة البخاری تسقی بالقاف من السقی بالقاف وتبعه النووی بقوله الصواب ما فی البحاری تسقی بالسین من السقی هو روایةالکشمیهنی لیطابق نقل العسقلانی وقولهما من السقی بالقاف احتراز من السعی بالعین ولادلالة فی کلامهما علی انه بصیغة المصدر المدخول علیه حرف الجر او علی انه بصیغة المضارع فیتعین حمل کلامهما علی الاول جمعا بین النقول واما الشارح الذی زیف ما فی بعض النسخ المصابیح وکتاب البخاری فهی تسقی بصیغة المضارع من السقی بالقاف من جهة الروایة فتامل فانه موضع زلل فاندفع به کام ابن حجر فعجیب نب هذه الجسارة علی الروایة الصحیحة وردها بمجرد محمل لا حقیقة له۔

خلاصہ کلام یہ ہے: مشکوۃ کے متن میں تسعیٰ ہے۔یعنی بفتح العین المہملہ سعی سے مأخوذ ہے۔ بخاری کے تمام نسخوں میں بھی یہی لفظ ہے۔البتہ کشمیہنی اور مصابیح کے بعض نسخوں میں تسقی بالقاف من السقی ہے۔مسلم کی روایت میں تبتغی ای تطلب ولدها کے الفاظ ہیں۔

فقال: الله أرحم بعباده من هذه بولدها: ملاعلی قاریؒ لکھتے ہیں: وهنا يفتح باب القدر والقضاء، ويموج بحراله الالهي الذي يضيق فيه القضاء، فالتسليم فيه أسلم والله أعلم، ولابن حجرهنا اعتراض وكلام مما لا يلتفت اليه في المقام۔

۲۳۷۱: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَنْ یُنْجِیَ اَحَدًا مِّنْکُمْ عَمَلُهٗ قَالُوْا وَلَا اَنْتَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَلَا اَنَا اِلَّا اَنْ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللّٰهُ مِنْهُ بِرَحْمَتِهٖ فَسَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَاغْدُوْا وَرُوْحُوْا وَشَیْءٌ مِنَ الدُّلْجَةِ وَالْقَصْدَ الْقَصْدَ تَبْلُغُوْا۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲۹۴/۱۱ حدیث رقم ۲٤٦۳۔ ومسلم فی ۲۱٦۹/٤ حدیث رقم (۷۸۔ ۲۸۱٦)

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم میں سے کسی کا عمل اسے (آگ سے) نجات نہیں دے گا (یعنی صرف عمل ہی نافع نہیں ہوگا بلکہ جب حق تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت بھی شامل حال ہوگی تب ہی عمل بھی فائدہ دے گا) صحابہؓ نے عرض کیا کہ ''کیا آپ ﷺ کو بھی (آپ ﷺ کا عمل باوجود کامل ہونے کے نجات نہیں دلائے گا) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا نہیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت کے سایہ میں لے لے۔لہٰذا تم لوگ اپنے اعمال کو تیر کی طرح راست و درست کرو عمل میں میانہ روی اختیار کرو (یعنی کسی عمل کو کمی و زیادتی کے ساتھ نہ کرو) دن کے ابتدائی حصہ میں بھی عبادت کرو دن کے آخری حصہ میں بھی عبادت کرو اور رات میں بھی کچھ عبادت کرو (یعنی نماز تہجد پڑھو) اور عبادت میں میانہ روی اختیار کرو میانہ روی اختیار کرو اپنی منزل کو پالو۔

گئے"۔(بخاری ومسلم)

تشریح:لن ینجي:اس کے معنی میں تین احتمال ہیں:(۱)۔مجرد نفی کیلئے ہے۔(۲)۔بعض کا کہنا ہے تو کید نفی کیلئے ہے۔ (۳)۔اور معتزلہ کا مذہب ہے کہ تابید کیلئے ہے۔اس موقع پر یہ سب معانی مراد لینا درست ہے۔**ولا أنت یا رسول اللّٰہ**؟امام طیبیؒ فرماتے ہیں:بظاہر عبارت یوں ہے:**ولا ایاك**۔کیونکہ اس کا عطف"**أحدًا**"پر ہو رہا ہے،جملہ فعلیہ سے جملہ اسمیہ کی طرف عدول کرنا برائے مبالغہ ہے۔أی:**ولا أنا ممن یتنی عمله...... الا أن یتغمدنی اللّٰہ عنه برحمته**:یہ استثناء منقطع ہے۔

الدلجة:بعض نسخوں میں دال کے ضمہ اور لام کے سکون کے ساتھ ہے۔اور النہایہ میں ہے کہ الدلجۃ دال کے فتحہ اور ضمہ کے ساتھ ہے۔اس کے معنی ہیں:رات کو چلنا۔اور القاموس میں ہے کہ دلجہ دال کے ضمہ اور فتحہ کے ساتھ،رات کے اول حصہ میں چلنے کو کہتے ہیں۔کہا جاتا ہے:قد ادلجوا۔اگر رات کے آخری حصہ میں چلنے کے معنی میں ہو تو کہا جاتا ہے:فادلجوا۔

بالتشدید:خلاصہ یہ ہے کہ **دلجه** بروزن **رحمة و ظلمة** ہے،رات کے وقت،رات کے ابتدائی وقت میں چلنا۔اور باب افعال سے ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں:رات کے آخری حصہ میں چلنا۔**شی من الدلجة**:شئ مرفوع علی الابتداء ہے اور خبر مقدر ہے۔أی:**اعملوا فھی أو مطلوب عملکم فیه أو مطلوب عملکم فیه**۔اور بعض کا کہنا ہے کہ تقدیری عبارت یوں ہے:**ولیکن شیئ من الدلجة**۔بعض کا کہنا ہے کہ یہ مجرور ہے،اور اس کا معطوف علیہ مقدر ہے۔أی:**أعملوا بالغدوۃ والروحة وشیئ من الدلجة**۔اور عسقلانی فرماتے ہیں:شیئا محذوف کیلئے منصوب ہے۔أی **افعلوا اله**۔لیکن رسم الخط اس توجیہ کی تائید نہیں کرتا۔

والقصد القصد:اس کا فعل محذوف ہے۔اور تکرار برائے تاکید ہے یا باعتبار اخلاق واعمال کے ہے۔أی **الزموا القصد**۔ **تبلغوا** کا مفعول محذوف ہے۔أی **تبلغوا المنزل**۔جواب امر ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے۔**لن ینجي أحدا منکم عمله**:بلکہ اللہ کا فضل اور اس کی رحمت ہی نفع دے گی۔اللہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ چاہے تو مطیع کو عذاب دے،اور عاصی کو ثواب سے نواز دے،نیز عمل اگر چہ کسی بھی حد کو کیوں نہ پہنچ جائے وہ تقصیر سے خالی نہیں،اور تقصیر موجب ردّ ہوتی ہے۔اگر اللہ اپنا فضل فرماتے ہوئے اس کو قبول نہ کرے۔حدیث مبارکہ میں نہ تو عمل کی توہین مقصود ہے اور نہ اس کی نفی مطلوب ہے،بلکہ بندوں کو آگاہ کرنا مقصود ہے کہ عمل،اللہ کے فضل ورحم سے ہی تام ہوتا ہے۔تاکہ کہیں لوگ اپنے اعمال پر گھمنڈ نہ کرنے لگیں۔زین العرب فرماتے ہیں:یعنی نجات اور کامیابی اللہ جل شانہ کے فضل ورحم ہی کے ذریعہ ہے،ان میں اعمال غیر مؤثر ہیں۔خطاب اگر چہ صحابہ سے ہے،مگر مراد بنی آدم ہیں،یا تغلیباً مکلفین مراد ہیں۔ **الا أن یتغمدني اللّٰہ منه برحمته**۔سوائے اس کے کہ مجھے اپنی رحمت کا لباس پہنا دے،اور مجھے جنت میں داخل فرمادے۔تغمد کے معنی آتے ہیں:ستر،یعنی مجھے اپنی رحمت سے چھپا دے اور میری ایسی حفاظت فرمائے کہ جیسے غمد (یعنی تلوار کی نیام) کے ذریعہ تلوار کی حفاظت ہوتی ہے۔اور اس کی رحمت میرا احاطہ اس انداز سے کرلے کہ جیسے نیام تلوار کا احاطہ کرتی ہے۔اور حدیث کا حاصل یہ ہے کہ عمل مجرد نافع نہیں،عمل تب ہی مفید ہوگا کہ جب اللہ کا فضل اور اس کی رحمت شامل ہو۔امام طیبیؒ کا کلام بھی زین العرب کے کلام کی مانند ہے، چنانچہ طیبیؒ لکھتے ہیں:**أی النجاۃ من العذاب والفوز بالثواب بفضل اللّٰہ ورحمة۔ والعمل غیر مؤثر فیھا علی سبیل الایجاب بل غایته أنه یعد العامل لأن یتفضل علیه ویقرب الرحمة الیه وکذا قال فسددوا**۔**فسدوا**:تسدید میں اور اجابۃ صواب اور فعل میں مبالغہ اختیار کرو،اور قول سدید (سیدھی بات) کہو۔چونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے::﴿**یا أیھا الذین امنوا اتقوا اللّٰہ وقولوا قولا سدیدا**﴾[الاحزاب:۷۰]**أی صوابا وعدلا**۔**وقاربوا**:تمام امور کو دھیان کے ساتھ سرانجام دو،تمہارے اعمال افراط وتفریط سے پاک ہوں،یا مطلب یہ ہے کہ کثرت قربات کے ذریعہ اللہ کا قرب حاصل کرو۔لیکن اس کا لحاظ رہے کہ طاعات

وعبادات میں تمہیں ملال نہ ہونے لگے۔ واغدوا وروحوا: یعنی اللہ کی عبادت کرو، دن کے دونوں اطراف میں اور رات کے کچھ حصہ میں۔ نبی کریم ﷺ کا یہ جملہ اس آیت کی طرح ہے: ﴿وأقم الصلاۃ طرفی النهار وزلفا من اللیل﴾[هود:۱۱٤]۔ زلفا من اللیل کے مفہوم کو شئی من الدلجہ کے ذریعہ بیان فرمایا ہے۔ امام طیبیؒ لکھتے ہیں: شبها هذه الأوقات من حیث انها توجه الی مقصد وسعی للوصول الیه بالسلوك والسیروقطع المسافة فی هذه الأوقات: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اولاً تو یہ بیان فرمایا کہ عمل نجات نہیں دے گا، تاکہ لوگ اعمال پر بھروسہ نہ کر بیٹھیں، اور آخر میں عمل پر ابھارا تاکہ عمل میں تفریط نہ کریں کہ جب عمل کا ہونا نہ ہونا برابر ہے تو عمل کی کیا ضرورت ہے؟

۲۳۷۲: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْ لُ اللّٰهِ ﷺ لَا يُدْخِلُ اَحَدًا مِّنْكُمْ عَمَلُهُ الْجَنَّةَ وَلَا يُجِيْرُهُ مِنَ النَّارِ وَلَا اَنَا اِلَّا بِرَحْمَةِ اللّٰهِ . (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ٢١٧١/٤ حدیث رقم ٧٧۔ ٢٨١٧۔

ترجمہ: ''اور حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کسی کا عمل نہ اسے جنت میں داخل کرے گا اور نہ اسے دوزخ سے بچائے گا اور نہ مجھے میرا عمل جنت میں داخل کرے گا ہاں وہ جو اللہ کی رحمت کے ساتھ ہو''۔ (مسلم)

تشریح: لا یدخل: باب افعال سے معروف کا صیغہ ہے۔ علمه: فاعل ہے لا یدخل کا۔ ولا أنا: اس میں وہی تقریر ہے جو پچھلی حدیث میں گزری۔ الا برحمة اللّٰه: تقدیری عبارت یوں ہے۔ الا عملا مقرونا برحمته۔ چنانچہ یہ استثناء متصل ہے۔ عرض مرتب: اس حدیث کی تشریح کیلئے پچھلی روایت ملاحظہ فرمائیے۔

۲۳۷۳: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا اَسْلَمَ الْعَبْدُ فَحَسُنَ اِسْلَا مُهٗ يُكَفِّرُاللّٰهُ عَنْهُ كُلَّ سَيِّئَةٍ كَا نَ زَلَّفَهَا وَكَانَ بَعْدُ الْقِصَاصُ الْحَسَنَةُ بِعَشْرِاَمْثَا لِهَا اِلٰى سَبْعِ مِا ئَةِ ضِعْفٍ اِلٰى اَضْعَا فٍ كَثِيْرَ ةٍ وَالسَّيِّئَةُ بِمِثْلِهَا اِلَّا اَنْ يَتَجَا وَزَا اللّٰهُ عَنْهَا (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٩٨/١۔ حدیث رقم ٤١۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابوسعیدؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب کوئی بندہ اسلام قبول کرتا ہے اور اس کا اسلام اچھا ہوتا ہے (یعنی نفاق سے پاک صاف ہوتا ہے) کہ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے وہ تمام گناہ دور کر دیتا ہے جو اس نے قبول اسلام سے پہلے کئے تھے اور اس کے بعد اسے بدلہ ملتا ہے جس کا حساب یہ ہے کہ) ایک نیکی کے بدلہ میں دس سے لے کر سات سو تک نیکیاں لکھی جاتی ہیں (یعنی اسلام لانے کے بعد وہ بھی جو عمل کرتا ہے) بلکہ سات سو سے بھی زیادہ اور برائی کا بدلہ اسی کے مانند ملتا ہے یعنی جتنی برائی کرتا ہے وہ اتنی ہی لکھی جاتی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ اس سے بھی درگزر کرتا ہے''۔ (بخاری)

تشریح: کان زلّفها: لام کی تشدید کے ساتھ ہے، زلفی بمعنی قرب وتقدم سے مأخوذ ہے۔ وکان بعد القصاص۔ زین العربؒ فرماتے ہیں: بعض نسخوں میں لفظ ''بعد'' مبنی علی الضم ہے، اور لفظ ''قصاص'' مرفوع ہے۔ اور بعض نسخوں میں اضافت کے ساتھ ہے (یعنی بعد اپنے مابعد کی طرف مضاف ہے) اور بعض نسخوں میں والحسنة بعشر أمثالها واؤ عاطفہ کے ساتھ ہے اور بعض نسخوں میں بغیر واؤ کے ہے۔

عطف کی صورت میں پہلے معنی یہ ہوں گے: وكان بعد الاسلام أى يثبت عليه بعده القصاص ان جنى على أحد، أو وكان بعد القصاص ان كان عليه لأحد حق مالى، ويثبت له الحسنة بعشر أمثالها، والسيئة بمثلها۔ بغیر عطف کے معنی بالکل ظاہر ہیں چونکہ الحسنة..... قصاص کا ''بیان'' ہوگا۔ أى المجازاة والتتبع الذى يفعل معه فى حسناته وسيئاته، عطف کے ساتھ دوسرے معنی یہ ہوں گے: وكان أى المذكور من تكفير الله عنه كل سيئة كان زلفها بعد القصاص أى الاسلام وعقيبه دون التمهل والترافى الى ظهور حسن، وكان له أيضا عقيب اسلامه الحنسة بعشر أمثالها۔ چنانچہ اس صورت کے مطلق حسنة کا عطف كان کی ضمیر مستتر پر ہوگا، اور یہ عطف بغیر تاکید منفصل کے بھی درست ہے چونکہ ظرف کا فصل آ گیا ہے۔ اس کے معنی بغیر حرف عطف کے بھی ظاہر ہیں، چونکہ كان کا فاعل حسنہ ہوگا، اور قصاص، معنی میں ہوگا اسلام کے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد ''قود'' ہو۔ القصاص الحسنة بعشر أمثالها: یہ جملہ، قصاص کیلئے بیان وتفسیر ہے۔ ابن الملکؒ فرماتے ہیں: وفى بعض النسخ: والحسنة بواد العطف يعنى: وكانت الحسنة بعشر أمثالها...... بخلاف ما قبل الاسلا، فانه اذا عمل حسنة فى الكفر، ثم أسلم يعطى بكل حسنة ثواب حسنة واحدةا۔ ان کا یہ دعوی دلیل وبرہان کا محتاج ہے، چونکہ کافر سے عالت کفر میں جو اچھے اعمال صادر ہوتے ہیں وہ محض صورۃ ہی ''حسنة'' ہوتے ہیں، (حقیقۃً حسنہ نہیں ہوتے)۔

قصاص: قصص سے مأخوذ ہے اس کے معنی ہیں: تتبع الاثر، وهو رجوع الرجل من حيث جاء۔ اس ارشاد باری تعالیٰ میں بھی یہی معنی ہیں: ﴿فارتدا على آثارهما قصصا﴾ [الكهف: ٦٤] قود کو ''قصاص'' بھی کہا جاتا ہے۔

۲۳۷۴: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُو لُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ فَمَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ لَهُ عِنْدَهُ حَسَنَةً كَامِلَةً فَاِنْ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ لَهُ عِنْدَهُ عَشَرَ حَسَنَاتٍ اِلٰى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ اِلٰى اَضْعَافٍ كَثِيْرَةٍ وَمَنْ هَمَّ بِسَيِّئَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ لَهُ عِنْدَهُ حَسَنَةً كَامِلَةً فَاِنْ هُوَ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ لَهُ سَيِّئَةً وَّاحِدَةً۔ (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ٣٢٣/١١۔ حديث رقم ٦٤٩١۔ ومسلم فى صحيحه۔

ترجمه: ''اور حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے نیکیاں اور برائیاں لکھیں (یعنی فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ لوح محفوظ میں نیکیوں اور برائیوں کے بارے میں یہ تفصیل لکھ دیں کہ) جو شخص کسی نیکی کا ارادہ کرے اور وہ اس پر عمل نہ کر سکے (یعنی ارادہ کے باوجود وہ کسی عذر کی بنا پر اس نیکی کو کرنے پر قادر نہ ہو سکے) تو اللہ تعالیٰ اس کیلئے اپنے ہاں اس ارادہ ہی کو) ایک پوری نیکی لکھ لیتا ہے اور جو شخص نیکی کا ارادہ کرے اور پھر اس نیکی کو کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے اپنے ہاں دس گنا سے سات سو گنا تک بلکہ اس سے بھی زیادہ نیکیاں لکھ لیتا ہے (یعنی اپنے بندوں میں سے جس کے لئے اللہ چاہتا ہے اپنے فضل وکرم سے بحسب اخلاص اور ادائیگی شرائط وآداب کے زیادہ ثواب لکھتا ہے) اور جو شخص کسی برائی کا ارادہ کرے اور پھر (خدا کے خوف کی وجہ سے) اس برائی میں بھی مبتلا نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے اپنے ہاں ایک پوری نیکی لکھ لیتا ہے اور جس شخص نے کسی برائی کا ارادہ کیا تو پھر اس برائی میں مبتلا ہو گیا تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے ایک ہی برائی لکھتا ہے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: ان الله كتب الحسنات والسيئات: اس کے متعدد مطالب بیان کئے گئے ہیں: (۱)۔ أثبتهما فى سابق علمه وأرا الملائكة بكتبها فى اللوح المحفوظ۔ (۲) بينهما وعينهما فى كتابه۔ (۳) قضاهما قدرهما۔ (۴) أمر

الحفظة بكتابتهما ليوازنهما۔ (۵)۔صحفهما يوم القيامة۔اربعین کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں:ثم بيّن ذلك۔ أى مقدارهما وعين مبلغهما للسفرة الكرام......، یا نبی کریم ﷺ نے اس اجمال کی تفصیل اپنے مابعد کلام کے ذریعہ فرمادی۔چنانچہ یہ کلام راوی کا ہوگا اور دلیل اس کی یہ ہے کہ اس کو ترک کر دیا ہے، اور باعتبار مذکور کے اسم اشارہ کو ذکر کیا۔حسنات سے مراد وہ اعمال ہیں جن کو کرنے سے ثواب ملتا ہے اور سیئات سے مراد وہ اعمال ہیں جن کو کرنے سے عذاب کا مستحق ہوتا ہے۔فمن هم: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ فاء تفصیلیہ ہے بایں طور کہ کتب الحسنات مجمل تھا، کیفیت کتابت مجہول تھی، كتبها الله له عنده حسنة كاملة: کتب میں تضمین ہے،تصییر کے معنی کو متضمن ہے، یا حال موطئہ ہے۔

فمن همّ بحسنة......:

جو شخص کسی نیکی کا ارادہ کرے اور وہ نیکی کسی وجہ سے نہ کر سکے تو اس کے لئے بھی ایک نیکی اس لئے لکھی جاتی ہے کہ کسی بھی عمل کا ثواب نیت پر موقوف ہے اور مؤمن کی نیت اس کے عمل سے بہتر اور افضل ہوتی ہے بلکہ یوں کہئے کہ اصل تو نیت ہی ہے عمل کا درجہ اس کے بعد ہے کیونکہ عمل کے بغیر صرف نیت پر تو ثواب دیا جاتا ہے مگر نیت کے بغیر صرف عمل پر ثواب نہیں دیا جاتا۔ہاں اتنا فرق ضرور ہوتا ہے کہ بغیر عمل کے نیت پر جو ثواب ملتا ہے وہ مضاعف نہیں ہوتا۔

سیدؒ نے لکھا ہے: نیکی پر ثواب کے مضاعف ہونے کی مقدار کو سات سو تک بیان کیا جاتا ہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ ثواب میں کتنا اضافہ کرتا ہے اس کی آخری حد اور مقدار کسی کو معلوم نہیں ہے کیونکہ سات سو کے بعد مقدار کو اللہ تعالیٰ نے مبہم رکھا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ کسی چیز کی طرف رغبت دلانے کے لئے اس کو معین کر کے ذکر کرنے کی بجائے مبہم کرنا زیادہ مؤثر ہوتا ہے اس لئے فرمایا گیا ہے کہ فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّاۤ اُخۡفِیَ لَہُمۡ مِّنۡ قُرَّۃِ اَعۡیُنٍ۔

حدیث قدسی میں آتا ہے:أعددت لعبادى الصالحين مالا عين رأت ولا أذن سمعت ولا خطر على قلب بشر۔

ومن هم بسيئة فلم يعملها......۔اور اس کمال کی وجہ یہ ہے کہ یہ شخص ''من خاف مقام ربه'' اور ''نهى النفس عن الهوى'' کا مصداق ہے، چونکہ اس شخص نے اس سیئہ پر قدرت حاصل ہونے کے باوجود اللہ جل شانہ کے خوف و مراقبہ کے باعث چھوڑا ہے۔عدم قدرت کے باعث نہیں چھوڑا۔فان هو: یہ ضمیر شان بھی ہو سکتی ہے۔اور اس کا مرجع فعل سیئہ کا ارادہ کرنے والا شخص بھی ہو سکتا ہے۔

هم بها فعملها: دونوں قیودات خطاً و زلل سے احتراز ہیں۔اَربعین کی روایت میں لفظ ''هو'' موجود نہیں ہے۔باقی الفاظ یوں ہیں:وان هم بها فعملها۔ابن الملکؒ فرماتے ہیں:وانما كان كذلك لأن رحمة أكثر من غضبه:قال ابن حجر: فيه دليل على أن لا مؤاخذة بالهم وهو الأصح، خلافا لمن زعم المؤاخذة به، والكلام كما علمت من الحديث فى الهم الذى لم ينضم اليه تصميم، أما المنضم اليه ذلك فهو سيئة على الأصح أيضًا اھ۔

یہ بات علی الاطلاق درست نہیں ہے۔بلکہ تحقیقی بات یہ ہے کہ عدم مؤاخذہ ان امور میں ہے جہاں اس کا کوئی اختیار نہ ہو۔اس کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے:﴿وان السمع والبصر والفؤاد كل أولئك كان عنه مسؤل﴾[الاسراء:۳۶]۔اور دوسری دلیل آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے: انما يحشر الناس على نياتهم۔اور تیسری دلیل اجماع ہے کہ عجب کبر اور ''ریا'' پر مؤاخذہ ہے۔الا یہ کہ اللہ جل شانہ کے خوف سے باز آجائے، اور وہ اس کو محو کر دے۔یا اس کا ارتکاب کر گزرے اور اس کے نامۂ اعمال میں سیئہ واحدہ ہی لکھا جائے، اللہ جل شانہ کے فضل کے باعث۔امام نوویؒ فرماتے ہیں: اے بھائی غور کر۔اللہ مجھے اور تجھے اپنے لطف اور ان الفاظ میں تأمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

لفظ ''عنده'' اللہ جل شانہ کی اعتناء کی طرف اشارہ ہے۔اور کاملة تاکید ہے اور شدت اعتناء کا اظہار ہے۔اور سیئہ کی بابت یہ فرمانا: کتبها الله عنده حسنة کاملة، یعنی حسنہ کو کاملہ کے ذریعہ مؤکد فرمایا ہے۔اور اگر اس کو کر گزرا تو سیئه واحدة لکھی جائے گی، تقلیل کو واحدۃ کے ساتھ مؤکد فرمایا ہے، فللّٰه الحمد و المنة۔

الفصل الثّانی:

۲۳۷۵: عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِنَّ مَثَلَ الَّذِیْ یَعْمَلُ السَّیِّئَاتِ ثُمَّ یَعْمَلُ الْحَسَنَاتِ كَمَثَلِ رَجُلٍ كَانَتْ عَلَیْهِ دِرْعٌ ضَیِّقَةٌ قَدْ خَنَقَتْهُ ثُمَّ عَمِلَ حَسَنَةً فَانْفَكَّتْ حَلْقَةٌ ثُمَّ عَمِلَ اُخْرٰی فَانْفَكَّتْ اُخْرٰی حَتّٰی تَخْرُجَ إِلَی الْاَرْضِ. (رواه فی شرح السنة)

اخرجه احمد فی المسند ١٤٥/٤۔

ترجمہ: ''اور حضرت عقبہ بن عامرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص برائیاں کرتا ہو اور پھر نیکیاں کرنے لگے اس کی حالت اس شخص کی سی ہے جس کے جسم پر تنگ زرہ ہو اور اس زرہ کے حلقوں نے اس (کے جسم) کو بھینچ رکھا ہو۔ پھر وہ نیکی کرے اور اس کی زرہ کا ایک حلقہ کھل جائے پھر وہ دوسری نیکی کرے اور دوسرا حلقہ کھل جائے۔ یہاں تک کہ (اسی طرح) اس کے حلقے کھلتے رہیں اور وہ ڈھیلی ہو کر زمین پر گر پڑے''۔ (شرح السنۃ)

تشریح: ثم عمل حسنة: تنوین برائے تنکیر ہے۔أی: أی حسنة کانت۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ برائی کرنے سے سینہ تنگ و تاریک ہو جاتا ہے اور برائی کرنے والا نہ صرف یہ کہ اپنے تمام امور میں ضمیر کی صحیح رہنمائی سے محروم ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں اس کی تمام فکری اور عملی راہوں پر یقین و اعتماد اور سکون و استقلال کے نور کی بجائے تحیر و گھبراہٹ اور اضطراب و عدم استقلال کے تاریک سایہ ہوتے ہیں بلکہ وہ لوگوں کی نظروں میں بے وقعت اور کمتر ہو جاتا ہے اور تمام ہی نیکی پسند انسان اسے غصہ اور حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں اس کے برعکس نیکی کرنے سے سینہ کشادہ اور فراخ ہوتا ہے اور نیکی کرنے والا اپنے ہر کام میں آسانی و سہولت اور یقین و اعتماد کے سکون آمیز اثرات محسوس کرتا ہے نیز یہ کہ وہ لوگوں کی نظر میں محبوب و پسندیدہ اور باوقعت رہتا ہے۔

حدیث بالا میں اسی بات کو تنگ زرہ سے مشابہت دی گئی ہے کہ تنگ زرہ پہننے سے جسم تنگی اور بے چینی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس زرہ کا بدن پر سے کھلنا فراخی اور خوش دلی کا باعث ہوتا ہے۔

ابن حجر لکھتے ہیں: أی أوصل نعمة لمن له قدرة علی فك حلق تلك الدرع، فجازاه بفك واحدة منها۔ ابن حجر کے اس کلام پر دو نقض وارد ہوتے ہیں۔ (۱)۔ یہ ذکر کردہ توضیح، تخصیص کا وہم پیدا کر رہی ہے۔ (۲) تمثیل معنوی ہے۔ ابن حجر کی تقریر کی تقدیر پر یہ امر حسی ہو جائے گا اور اگلی بات بھی عجیب لکھی: وما قررته فی عمل حسنة هو الذی یصح به ترتیب الحدیث، ویتضح به التمثیل، بخلاف ما أوهم کلام شارح من بقاء الحسنة علی معناها من مجرد عمل العبادة، لأنه لا مناسبة بین عملها وفك تلك الحلق فتأمله اھ۔ ہم نے بہت تأمل کیا، تأمل کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ آپ کا کلام غیر مقبول المعنی ہے۔ کیونکہ کسی شخص کے ساتھ یکے بعد دیگرے بایں طور احسان کرنا ہر بار میں ایک حلقہ کھل کر گر جائے، یہ مشکل ہے، بلکہ عادۃ بھی متعذر ہے، نیز جس شخص نے ایسی تنگ زرہ پہنی ہوئی ہو کہ جس سے گلا بھی گھٹتا ہو، وہ اس کو اتارنے پر بھی قادر ہوتا ہے، وہ اس بات کا محتاج نہیں ہوتا کہ ایک طویل زمانہ تک لوگوں کے ساتھ احسان کرتا رہے، یہاں تک کہ اس مشکل سے چھٹکارا حاصل ہو جائے۔ حتی تخرج الی

الأرض: اس کی وضاحت دو طرح سے کی گئی ہے۔
ا۔ أي: حتى تسقط الدرع۔ یہاں تک کہ زرہ گر جاتی ہے۔ (۲)۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: أي: حتى تنحل وتنفك بالكليه، ويخرج صاحبها من ضيقها۔ تخرج الى الأرض: یہ اس کے سقوط سے کنایہ ہے۔ اھ۔ یہ حدیث ایک تمثیل ہے، اور درحقیقت اس آیت کی تفسیر ہے: ﴿ان الحسنات يذهبن السيئات﴾

۲۳۷۶: وَعَنْ اَبِي الدَّرْدَاءِ اَنَّهٗ سَمِعَ النَّبِيَّ ﷺ يَقُصُّ عَلَى الْمِنْبَرِ وَهُوَ يَقُوْلُ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ قُلْتُ وَاِنْ زَنٰى وَاِنْ سَرَقَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ الثَّانِيَةَ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ فَقُلْتُ الثَّانِيَةَ وَاِنْ زَنٰى وَاِنْ سَرَقَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ الثَّالِثَةَ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ فَقُلْتُ الثَّالِثَةَ وَاِنْ زَنٰى وَاِنْ سَرَقَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَاِنْ رَغِمَ اَنْفُ اَبِي الدَّرْدَاءِ. (رواه احمد)

اخرجه احمد في المسند ٦/٤٤٢۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو درداءؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو منبر پر وعظ و نصیحت فرماتے ہوئے سنا چنانچہ (ابو درداءؓ کہتے ہیں کہ جب آپ ﷺ نے یہ فرمایا وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ یعنی اور جو شخص (قیامت کے دن حساب کے لئے) اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اس کے لئے دو جنتیں ہیں۔'' میں نے (یہ سن کر از راہ تعجب) پوچھا کہ ''یا رسول اللہ اس (ڈرنے والے) نے زنا ہی کیا ہو اور چاہے اس نے چوری ہی کی ہو'' (تب بھی اسے دو جنتیں ملیں گی؟) آنحضرت ﷺ نے پھر دوسری مرتبہ یہی ارشاد فرمایا: ﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ﴾ میں نے پھر دوسری مرتبہ پوچھا: یا رسول اللہ! چاہے اس نے زنا ہی کیا ہو اور چاہے اس نے چوری کی ہو؟ آپ ﷺ نے پھر تیسری مرتبہ فرمایا وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ میں نے پھر تیسری مرتبہ پوچھا کہ ''یا رسول اللہ! چاہے اس نے زنا ہی کیا ہو اور چاہے اس نے چوری ہی کی ہو۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اگرچہ ابو درداء کی ناک خاک آلودہ ہی کیوں نہ ہو''۔ (احمد)

تشریح: وهو يقول: یہ جملہ حالیہ ہے۔ ﴿ولمن خاف مقام ربه جنتان﴾ [الرحمن: ٤٦] مقام سے مراد وہ موقف ہے کہ جہاں مخلوق خدا قیامت کے دن حساب کتاب کیلئے ٹھہری ہوئی ہوگی۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس سے مراد وہ موقف ہے جہاں بارگاہ تعالیٰ میں اعمال پیش کئے جائیں گے۔ بعض کا کہنا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے: ولمن خاف من القيام بحضرة ربه يوم القيامة: قال تعالىٰ: ﴿يوم يقوم الناس لرب العالمين﴾ [مطففين: ٦] ويجوز أن يراد به أن الله تعالىٰ قائم عليه أي: حافظ مهيمن من قوله: ''أفمن هو قائم'' الآية ۔ فهو يراقب ذلك ولا يجرأ على معصية۔

عرض مرتب: ﴿ولمن خاف مقام ربه جنتان﴾ [الرحمن: ٤٦] میں لفظ مقام میں گویا کہ تین احتمال ہیں۔ (۱) ظرف ہے۔ (۲)۔ مصدر۔ مصدر کی صورت میں پھر دو احتمال ہیں کہ مصدر کی اضافت فاعل کی طرف ہے۔ یا مفعول کی طرف۔ پہلے کی دونوں مفہوم، مقام کو ظرف ماننے کی تقدیر پہ ہیں، تیسرا مفہوم اضافۃ المصدر الی الفاعل اور چوتھا مفہوم اضافۃ المصدر الی المفعول تقدیر پر ہے۔ اھ۔

واضح رہے کہ اس آیت میں جن دو جنتوں کا ذکر ہے یہ جنتیں ان جنتوں کے مقابلہ میں اعلیٰ درجہ کی ہوں گی جن کا ذکر ''من دونهما'' کے تحت کیا گیا ہے۔ دو جنتیں دینے کی خاص وجہ: بعض کا کہنا ہے کہ ایک جنت اعمال طاعت بجالانے پر ہے اور دوسری جنت ترک سیئات پر ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ ایک جنت از راہ عدل، ثواب کے طور پر ہے اور دوسری جنت از روئے فضل، اقتراب کے طور پر ہے۔

دو جنتوں کا دیا جانا اس بناء پر ہے کہ اللہ جل شانہ کا خوف، دوام مراقبۂ حق اور اعمال صالحہ کے دوام پر ابھارتا ہے اور نیک اعمال، مقامات عالیہ تک پہنچاتے ہیں۔ بعض صوفیہ فرماتے ہیں: **جنة معجلة فی الدنیا بالحضور مع المولٰی وجنة مؤجلة فی الآخرة بلقاء المولی والدرجات العلی۔** زیادہ واضح بات یہ ہے کہ دو جنتوں کے بارے میں بعض احادیث میں آیا ہے کہ ایک جنت تو ایسی ہے جس میں مکان، محل، برتن اور زیورات وغیرہ سب کے سب سونے کے ہیں اور ایک جنت ایسی ہے جس میں اسی طرح سب سامان چاندی کا ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک جنت سابقین کیلئے ہو اور ایک جنت اصحاب یمین کیلئے ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک جنت ان کے دائیں جانب اور ایک جنت ان کی بائیں جانب ہو۔ **وان زنی وان سرق**: ان وصلیہ ہے۔ معنوی طور پر عبارت یوں ہے: **ولو زنی وسرق الخائف له جنتان۔**

ابن حجرؒ فرماتے ہیں: **وان سبق منه قبل هذا الخوف نحو الزنا والسرقة، یصح علی بعد۔ وان فعلهما مع هذا الخوف، ووجه بعده اجتماع هذا الخوف وفعل ذینك وأمثالهما** اھ۔ دوسرا مفہوم ظاہر ہے۔ اور مقید مبالغہ ہے، چونکہ پچھلا خوف جو توبہ کا باعث بنا نہ اس کے بارے میں پوچھا جائے گا اور نہ وہ عجیب ہے۔

حدیث کا ظاہر ''من'' کے عموم پر دلالت کر رہا ہے، اور خائف سے مراد مؤمن ہے۔ چنانچہ یہ حدیث باب ابوذر سے مروی اس حدیث مرفوع کی نظیر ہے: **ما من عبد قال لا اله الا اللّٰه ثم مات علی ذالك الا دخل الجنة، قلت: وان زنی وان سرق؟ قال: وان زنی وان سرق ثم قال فی الثالثة أو الرابعة علی رغم أنف أبی ذر** - یہ حدیث کتاب کی ابتداء میں گزر چکی ہے۔

وان رغم: کے متعدد مطالب بیان کئے گئے ہیں۔ (۱)۔ **قیل: معناه ذل**۔ (۲) **قیل: اضطرب**۔ (**قیل: غضب**۔ ابن ملکؒ نے یہاں بہت کی دور کی بات کہی: **یعنی من خاف اللّٰه فی معصیة فترکها۔ یعطیه اللّٰه أجرا غفر تلك الزنیة والسرقة۔**

آپ ﷺ پرندوں کے لیے بھی رحمت بن کر تشریف لائے

۲۳۷۷: وَعَنْ عَامِرٍ الرَّامِ قَالَ بَیْنَا نَحْنُ عِنْدَهٗ یَعْنِیْ عِنْدَ النَّبِیِّ ﷺ اِذَا اَقْبَلَ رَجُلٌ عَلَیْهِ كِسَاءٌ وَفِیْ یَدِهٖ شَیْءٌ قَدِ الْتَفَّ عَلَیْهِ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَرَرْتُ بِغَیْضَةِ شَجَرٍ فَسَمِعْتُ فِیْهَا اَصْوَاتَ فِرَاخِ طَائِرٍ فَاَخَذْتُهُنَّ فَوَضَعْتُهُنَّ فِیْ كِسَائِیْ فَجَاءَ تْ اُمُّهُنَّ فَاسْتَدَارَتْ عَلٰی رَاْسِیْ فَكَشَفْتُ لَهَا عَنْهُنَّ فَوَقَعَتْ عَلَیْهِنَّ فَلَفَفْتُهُنَّ بِكِسَائِیْ فَهُنَّ اُوْلَاءِ مَعِیْ قَالَ ضَعْهُنَّ فَوَضَعْتُهُنَّ وَاَبَتْ اُمُّهُنَّ اِلَّا لُزُوْمَهُنَّ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَتَعْجَبُوْنَ لِرَحِمِ اُمِّ الْاَفْرَاخِ فِرَاخَهَا فَوَالَّذِیْ بَعَثَنِیْ بِالْحَقِّ اللّٰهُ اَرْحَمُ بِعِبَادِهٖ مِنْ اُمِّ الْاَفْرَاخِ بِفِرَاخِهَا اِرْجِعْ بِهِنَّ حَتّٰی تَضَعَهُنَّ مِنْ حَیْثُ اَخَذْتَهُنَّ وَاُمُّهُنَّ مَعَهُنَّ فَرَجَعَ بِهِنَّ۔ (رواہ ابوداود)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۱۸۲/۳ حدیث رقم ۳۰۸۹۔

ترجمه: عامر تیر اندازؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں اس وقت نبی کریم ﷺ کے نزدیک تھا۔ کہ اچانک ایک شخص آیا اور اس کے ہاتھ میں کملی تھی اور اس کے ہاتھ میں کچھ چیز تھی اس پر کملی لپیٹ رکھی تھی اس نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ میں درختوں کے پاس سے گزرا پس اس میں سے میں نے پرندوں کے بچوں کی آوازیں سنی۔ پس میں نے ان کو پکڑ لیا اور ان کو میں نے اپنی کملی میں رکھ لیا۔ پھر بچوں کی ماں میرے پاس آئی میرے سر پر پھرنے لگی۔ پس میں

نے ماں کے لیے بچوں کے اوپر سے کملی کھول دی۔تا کہ بچوں کو دیکھ لے۔پس وہ ان پر گر پڑی۔پھر میں نے ماں اور بچوں کو اپنی چادر میں لپیٹ لیا پس یہ سب میرے پاس ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رکھ دے پس میں نے ان کو رکھ دیا یعنی اور کھولا ان کو اور ان کی ماں نے چھوڑ دی ہر چیز سوائے چمٹنے کے۔ان سے پھر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کیا تم بچوں کی ماں کے رحم کرنے کے بارے میں تعجب کرتے ہو۔پس قسم ہے اس ذات کی جس نے بھیجا ہے مجھ کو حق کے ساتھ۔ البتہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بہت زیادہ رحم کرنے والا ہے بہ نسبت بچوں والی ماں کے جو اپنے بچوں پر کرتی ہے پھر مجھ سے فرمایا ان کو لے جا یہاں تک کہ رکھ دے جہاں سے تو نے ان کو پکڑا تھا اور ان کی ماں اس کے ساتھ ہو۔پھر وہ لے گیا ان کو۔نقل کی یہ ابوداوُدؒ نے۔

تشریح: **یعنی عند النبی** صلی اللہ علیہ وسلم - یہ جملہ حدیث کے راوی ''رامی'' کا ہے، جو ماقبل کی تفسیر کر رہا ہے۔ **کساء**: بروزن رجال۔**قد التف علیه**:ضمیر مجرور شی کی طرف راجع ہے۔**فقال**:سوال مقدار کا جواب ہے۔**أی باھذا الشیء**۔لہٰذا یہ فاء ''فصیحیہ'' ہے۔

فراخ: بروزن ''رجال'' ہے،فرخ کی جمع کثرت ہے۔اس کی جمع قلت **أفراخ** آتی ہے۔اس حدیث میں جمع قلت اور جمع کثرت دونوں آئی ہیں۔ اتساع کی وجہ سے یا اشتراک فی الجمعیۃ کی وجہ سے۔جیسا کہ اس آیت کریمہ میں: ﴿**والمطلقات یتربصن بأنفسھن ثلاثة قروء**﴾[البقرة:۲۲۸] یا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ قلت عادت سے خارج تھی اور حد کثرت کو پہنچی ہوئی تھی۔ اس کی تائید اگلے جملوں میں موجود ضمائر سے بھی ہوتی ہے۔(**کذا حقیقة الطیبی**)۔

فکشفت لھا:لام تعلیلیہ ہے۔**أی: امتنعت الا لزومھن۔ أی:ما فارقتھن بعد کشف الکساء بل ثبتت معھن من غایة رحمتھا بھن۔ لرحم**: راء کے ضمہ کے ساتھ مصدر ہے جیسا کہ **رحمة** اور لفظ **عسر** کی مانند تحریک الحاء بالضم بھی درست ہے۔ **فراخھا**:منصوب علی المفعولیۃ ہے۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ منصوب **بنزع الخافض** ہو۔اس کی تائید ایک نسخہ سے بھی ہوتی ہے کہ جس میں **بفراخھا** کے الفاظ آئے ہیں۔**حتی تضعھن من حیث أخذتھن**: یہ ''من'' فی کے معنی میں ہے۔جیسا کہ اس آیت کریمہ: ''**اذا نودی للصلوة من یوم الجمعة**'' اور بعض کا کہنا ہے ''ابتدائیہ'' ہے۔**أی تجعل ابتداء وضعھن مکانا أخذتھن منه أن لا تضعھن مکانا آخر**۔اور بعض کا کہنا ہے کہ زائدہ ہے۔اس قول کی بناء اخفش کے مذہب پر ہے۔**وأمھن معھن**: یہ جملہ حالیہ ہے۔

حتی تضعھن من حیث أخذتھن: یہ قید اس لئے بڑھائی کہ عموماً تمام مخلوقات اور خصوصاً پرندوں کو اپنے ہی آشیانہ سے اُلفت ومحبت ہوتی ہے۔**شیئ قد التف**:ابن حجرؒ لکھتے ہیں:**أی ذلك الکساء**۔لیکن اس جزم کی کوئی وجہ نہیں بنتی۔**غیضة شجر**:**غیضة** کے معنی ہیں: **غاب وھو مجتمع الأشجار** (جنگل) **غیضة** کی شجر کی طرف اضافت بیان مزید کیلئے ہے، یا اس سے مراد ''**الشجر المرعی**'' ہے۔جیسا کہ حدیث میں آتا ہے۔**فأی بی الشجر أی بعدبی المرعی والشجر**۔ابن حجرؒ لکھتے ہیں:**الاضافة بیانیة أی بغیضة ھی شجر ملتف بعضه علی بعض لکثرته**۔ابن حجرؒ کا یہ کلام صاحب النہایہ کے ظاہر کلام پر مبنی ہے، چنانچہ صاحب النہایہ لکھتے ہیں:**ان الغیضة ھی الشجر الملتف** اور چونکہ اضافت بیانیہ اس معنی پر درست نہیں بیٹھتی۔چونکہ اول خاص ہے اور ثانی عام ہے،تو سوال وجواب کے انداز میں فرمایا:**فان قلت: لیست الغیضة اسما لمطلق الشجر، بل للشجر الملتف فلا تکون الاضافة بیانیة۔ قلت**:**تنوینھا للتنکیر، فکأنه قال بغیضة اسما لمطلق الشجر کبیر، ومن لازمه الا لتفاف غالبا اھ**۔تنوین کے بارے میں درست بات یہ ہے کہ ''تعظیم'' کیلئے ہے اور غالبًا کی قید کے باوجود اس کا اضافت بیانیہ ہونا صحیح نہیں، بلکہ اس قید کے بغیر بھی۔جیسا کہ خاتم فضہ میں کہ ان کے درمیان عموم خصوص من وجہ کی نسبت ہے۔لہٰذا درست بات وہی ہے جو ہم نے

قاموس کی مطابقت میں ذکر کی ہے۔

الفصل الثالث:

اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر رحمت کا نزول

۲۳۷۸ :عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِيْ بَعْضِ غَزَوَاتِهٖ فَمَرَّ بِقَوْمٍ فَقَالَ مَنِ الْقَوْمُ قَالُوْا نَحْنُ الْمُسْلِمُوْنَ وَامْرَأَةٌ تَحْضِبُ بِقِدْرِهَا وَمَعَهَا ابْنٌ لَّهَا فَاِذَا ارْتَفَعَ وَهَجٌ تَنَحَّتْ بِهٖ فَاَتَتِ النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَتْ اَنْتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ قَالَ نَعَمْ قَالَتْ بِاَبِيْ اَنْتَ وَاُمِّيْ اَلَيْسَ اللّٰهُ اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ قَالَ بَلٰى قَالَتْ اَلَيْسَ اللّٰهُ اَرْحَمَ بِعِبَادِهٖ مِنَ الْاُمِّ بِوَلَدِهَا قَالَ بَلٰى قَالَتْ اِنَّ الْاُمَّ لَا تُلْقِي وَلَدَهَا فِي النَّارِ فَاَكَبَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ يَبْكِيْ ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهٗ اِلَيْهَا فَقَالَ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُعَذِّبُ مِنْ عِبَادِهٖ اِلَّا الْمَارِدَ وَالْمُتَمَرِّدَ وَالَّذِيْ يَتَمَرَّدُ عَلَى اللّٰهِ وَاَبٰى اَنْ يَّقُوْلَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ (رواه ابن ماجة)

اخرجه ابن ماجه فی السنن ۱۴۳۶/۲ حديث رقم ۴۲۹۷۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایک غزوہ میں تھے پھر حضور ﷺ کا گزرا یک قوم پر ہوا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا تم کون لوگ ہو۔ انہوں نے عرض کیا ہم مسلمان ہیں اور ایک عورت ہانڈی کے نیچے آگ جلاتی تھی اور اس کے ساتھ اس کا بیٹا تھا پس جس وقت آگ کی لپیٹ اٹھتی لڑکے کو دور کرتی یعنی تاکہ آگ کی گرمی سے رنج نہ اٹھائے پھر وہ عورت نبی کریم ﷺ کے پاس آئی اور اس نے کہا تم خدا کے رسول ہو فرمایا ہاں۔ اس عورت نے کہا میری ماں اور میرا باپ آپ پر قربان ہو۔ کیا اللہ تعالیٰ بہت زیادہ رحم کرنے والا نہیں ہے رحم کرنے والوں میں سے فرمایا کہ ہاں اس عورت نے کہا کہ کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر زیادہ رحم کرنے والا نہیں ہے ماں کے اپنے بچے کے ساتھ فرمایا کہ ہاں اس عورت نے کہا کہ تحقیق ماں نہیں ڈالتی اپنے بچے کو آگ میں پس نبی کریم ﷺ نے روتے ہوئے اپنا سر جھکایا پھر اس عورت کی طرف اپنا سر اٹھایا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو عذاب نہیں کرتا یعنی ہمیشہ مگر سرکشی کرنے والے کو ایسے سرکش پر کہ وہ اللہ تعالیٰ پر سرکشی کرے یعنی اس کے حکم کے خلاف کرے اور لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا انکار کرے اس کو ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وامرأة تحضب: یہ جملہ اسمیہ حال واقع ہو رہا ہے۔ اور تحضب: حاء مہملہ اور ضاد معجمہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ وهج: ھاء کے فتحہ کے ساتھ، أی حر النار اور ھاء کے سکون کے ساتھ مصدر ہے۔ البتہ یہاں پہلے معنی میں مستعمل ہے۔ ایک نسخہ میں فاذا ارتفعت کے الفاظ ہیں۔ یہاں مضاف الیہ سے کسب تانیث کیا ہے۔ فقالت أنت رسول اللّٰه: کلمۂ استفہام محذوف ہے۔ بأبی وأمی: اس کی ترکیب جلد نہم میں ملاحظہ فرمائیے۔ ان اللّٰه لا یعذب من عباد الا المارد المتمرد الذی یتمر علی اللّٰه وأبی۔

من عباد میں اضافت برائے استغراق ہے۔ بأی: من جمیع عباده۔ اور اس کی دلیل استثناء کا ہونا ہے۔ ابن حجر نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا اور من عباده کی توضیح من عباده المؤمنین کے ساتھ کر دی۔ المترد: ''مارد'' کا مبالغہ ہے۔ اور أبی کا عطف یتمرد پر ہو رہا ہے۔ یا یہ عطف تفسیری ہے اور تقدیری عبارت یوں ہے: وقد أبی۔

نحن المسلمون: امام طیبیؒ فرماتے ہیں بظاہر جواب یوں دینا چاہئے تھا: نحن مضریون أو قرشیون أو طائیون، اور ظاہر

سے عدول کرتے ہوئے، حصر کی غرض سے خبر کو معرفہ ذکر کیا۔ أی: **نحن قوم لا نتجاوز الاسلام**، اس خیال سے کہ کہیں رسول اللہ ﷺ نے انہیں غیر مسلم نہ سمجھ لیا ہو۔ ابن حجرؒ نے بھی امام طیبیؒ کے کلام کی اتباع کی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ امام طیبیؒ نے تکلف سے کام لیا ہے۔ **تنحت به فأتت النبی ﷺ**: اپنے کام کو چھوڑ چھاڑ کر اس خاتون کا نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کا بظاہر داعیہ یہ ہوا ہوگا کہ جب اس نے اس سارے عمل میں اپنے بچہ پر اپنی خصوصاً شفقت کو دیکھا، تو اسے اللہ جل شانہ کی اپنے بندوں پر خصوصی رحمت کرنا یاد آیا، اسی غرض سے وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اللہ کی رحمت کی بابت آپ ﷺ سے سوال فرمایا۔

فقال: أنت رسول الله: اس کلام کے بارے میں دو احتمال ہیں۔ پہلا یہ کہ اس کا سوال حقیقی تھا، یہ اس بات کے منافی نہیں کہ وہ اس بات کو اجمالاً جانتی ہو اور مسلمان بھی ہو۔ اگرچہ آپ ﷺ کی ذات اقدس کے بارے میں معلوم نہیں تھا (کہ نبی آخر الزمان یہی شخص ہیں) اس سوال سے مقصود تقریر و استلذاذ بھی ہوسکتا ہے، چونکہ نبی کریم ﷺ کوئی عام شخص تو نہ تھے بلکہ اللہ کے نبی تھے، اور اس کے خلیفہ تھے۔ پہلے احتمال کی تائید اگلے کلام سے ہوتی ہے۔ **ألیس الله أرحم الراحمین؟ قال: بلی**: یہ اسلوب کلام، اس کلام باری کی طرز پر ہے: ﴿**ألست بربکم قالوا بلی**﴾[الاعراف:۱۷۲]

عرض مرتب: حدیث مبارکہ کا اگلا کلام: **قالت: ألیس الله أرحم بعباده من الأم بولدها؟ قال: بلی**۔ بھی اسی قبیل سے معلوم ہوتا ہے۔ اھ۔ **ان الله لا یعذب من عباده**: کا ایک مطلب تو ترجمہ میں بین القوسین ذکر کر دیا گیا ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے: اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے صرف کافروں کو عذاب دیتا ہے، عاصیوں (کو عذاب نہیں دیتا ان) کی تہذیب کرتا ہے۔

اللہ جل شانہ کی عبودیت کا منکر شخص اس شخص کی مانند ہے جو اپنی ماں سے کہتا ہے، تو میری ماں نہیں، میری ماں کوئی اور ہے؟ اور اس کی نافرمانی بھی کرتا ہے، اور ماں کی نگاہوں میں یہ شخص کتے اور خنزیر کی شکل رکھتا ہو۔ تو بلاشبہ یہ ماں اس سے اظہار براءت کرے گی، اور اگر اس میں قدرت ہوئی تو اس کو سزا بھی دے گی۔

نیکی کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی رحمت ڈھانپ لیتی ہے

۲۳۷۹: وَعَنْ ثَوْبَانَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ اِنَّ الْعَبْدَ لَيَلْتَمِسُ مَرْضَاةَ اللّٰهِ فَلَا يَزَالُ بِذَالِكَ فَيَقُوْلُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ لِجِبْرِيْلَ اِنَّ فُلَانًا عَبْدِيْ يَلْتَمِسُ اَنْ يُّرْضِيَنِيْ اَلَا وَاِنَّ رَحْمَتِيْ عَلَيْهِ فَيَقُوْلُ جِبْرِيْلُ رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلٰى فُلَانٍ وَيَقُوْلُهَا حَمَلَةُ الْعَرْشِ وَيَقُوْلُهَا مَنْ حَوْلَهُمْ حَتّٰى يَقُوْلَهَا اَهْلُ السَّمٰوَاتِ السَّبْعِ ثُمَّ تَهْبِطُ لَهُ اِلَى الْاَرْضِ۔ (رواہ احمد)

اخرجه احمد فی المسند ۲۷۹/۵۔

ترجمہ: حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تحقیق نیک بندہ البتہ تلاش کرتا ہے اللہ کی مرضی (رضا) یعنی نیکیوں کو ادا کرنے کے ساتھ پھر ہمیشہ اس کو تلاش کرتا رہتا ہے پس اللہ تعالیٰ جبرئیل کو فرماتا ہے کہ میرا فلاں بندہ تلاش کرتا ہے یہ کہ وہ مجھ کو راضی رکھے۔ خبردار میری رحمت کا ملنا اس پر ہے پھر جبرئیل علیہ السلام کہتے ہیں کہ خدا کی رحمت فلانے پر ہو اور یہی بات عرش کے اٹھانے والے فرشتے کہتے ہیں اور وہ فرشتے بھی کہتے ہیں جو ان کے گرد ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس بات کو ساتوں آسمانوں کے فرشتے کہتے ہیں پھر اس شخص کے لیے رحمت اترتی ہے زمین کی طرف اس کو امام احمدؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **فلا یزال بذلك**: تقدیری عبارت یوں ہے: **فلا یزال ملتبسا بذلك الالتماس**۔ **ان فلانا**: یہ اس کے نام

ووصف سے کنایہ ہے۔ **عبدی**: سے اضافت تشریفی ہے۔ **ألا**: برائے تنبیہ ہے۔ **ثم تهبطه**: مضارع معروف کا صیغہ ہے۔ بعض روایات میں بصیغۂ مجہول آیا ہے۔ **أی تنزل الرحمة لأجله**: اور لام تعلیلیہ ہے۔ **الی الأرض**: یہاں مضاف محذوف ہے۔ **أی الی أهل الأرض**۔ یعنی **محبة اللّٰه اياه ثم يوضع له القبول فيها**۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث اور حدیث محبت متقارب ہیں۔ اھ۔

حدیث محبت سے مراد مسلم شریف کی یہ حدیث ہے جو ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً مروی ہے' وہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام حاملین عرش اور دیگر تمام ملائکہ مقربین سے افضل ہیں۔ ابن حجر لکھتے ہیں: **أن قول الشارح: ثم تهبطه أی الرحمة لأجله الى الأرض انما يصار اليه ان صح أن تهبط بالمثناة الفوقية والا فالسياق والمعنٰى معًا قاضيان بأنه بالمثناة التحتية وأن ضميره لجبريل** اھ۔ ابن حجر کا یہ کلام غیر موجہ ہے، چونکہ تصحیح شدہ نسخہ جات، اور اصول معتمدہ ضبط بالمثناۃ الفوقیہ پر متفق ہیں۔ اس کے ضبط میں جو اختلاف تھا وہ اوپر ذکر کر دیا گیا ہے۔ تصحیح لفظ در روایت سے پہلے حدیث کے معنی بیان کرنے کا اقدام درست نہیں ہے، ان کا مذکورہ بالا کلام ان کے اس زعم پر مبنی ہے: **ان جبريل ينزل بين ملائكة أهل الأرض فيقول: رحمة اللّٰه على فلان فی الأرض الأولى، ويقولها ملائكتها، ثم يقولها فی الثانية، وهكذا حتى ينتهی الى الأرض السابعة......**۔

ایمان والا ہر حال میں جنتی ہے خواہ وہ گنہگار ہی کیوں نہ ہو

۲۳۸۰: **وَعَنْ اُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ فِیْ قَوْلِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ قَالَ كُلُّهُمْ فِی الْجَنَّةِ۔**

رواه البيهقی فی كتاب البعث والنشور۔

ترجمہ: اسامہ بن زیدؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ سے نقل کیا ہے۔ اللہ عزوجل کے قول کی تفسیر میں کہ بعض ان میں سے ظالم ہیں۔ اپنے نفس پر اور بعض ان میں سے میانہ رو ہیں یعنی میانہ روی کرنے والے ہیں اور بعض ان میں سے سبقت کرنے والے ہیں نیکوں میں۔ فرمایا یہ بہشت میں ہیں اس کو بیہقیؒ نے بعث ونشور میں نقل کیا ہے۔

تشریح: **مُقْتَصِد**: باب افتعال اسم فاعل بمعنی میانہ روی کرنے والا۔

اس حدیث میں جس آیت کریمہ کی تفسیر کے ضمن میں مذکورہ بالا بشارت ارشاد فرمائی گئی ہے وہ پوری یہ ہے: **ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ**۔ "پھر ہم نے کتاب وشریعت دی ان لوگوں کو کہ جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے (ایمان واسلام کے ذریعہ) برگزیدہ کیا پس ان برگزیدہ لوگوں (یعنی مسلمانوں) میں سے بعض اپنے نفس کے حق میں ظالم ہیں (بایں طور کہ وہ ممنوع چیزوں کا ارتکاب کرتے ہیں اور اپنے آپ کو گناہوں میں مبتلا کرتے ہیں) اور ان میں سے بعض میانہ رو ہیں (بایں طور کہ وہ نیکیاں بھی کرتے ہیں) اور ان میں سے بعض نیکیوں میں سبقت کرنے والے ہیں (بایں طور کہ وہ علم حاصل کرنے اور عمل کرنے میں بہت سعی اور جدوجہد کرتے ہیں اور اپنے علم وعمل کے ساتھ دوسروں کو بھی اپنے علم' تذکیر ونصیحت کے ذریعے رشد وہدایت کے راستے پر لگاتے ہیں)۔

واضح رہے کہ **فمنهم** کی فاء تفصیلیہ ہے، جو ماقبل کلام کی تفصیل بیان کر رہی ہے: ﴿**جنات عدن يدخلونها**﴾ [الفاطر:۳۳] مبتدا خبر ہیں، اور ضمیر ان تینوں (اقسام کے افراد) کی طرف راجع ہے، یا مقتصد اور سابق کی طرف عائد ہے، چونکہ ان دونوں سے مرا دجنس ہے۔ اور اس آیت کریمہ: ﴿**وذلك هو الفضل الكبير**﴾ [الفاطر:۳۲] میں اسم اشارہ کا مشار الیہ ایراث، اصطفاء یا سبق ہے۔ (علی ما قررہ القاضی)۔

صاحب کشاف نے اس کی تفسیر یہ بیان کی ہے: ''من أن جنات بدل من الفضل الكبير المعنى به السبق، وأخرج الظالم والمقتصد من هذا العام ومن الفضل الكبير والجنات، ويطابق التفسير الأول قولهم: ان ربنا لغفور شكور۔ أى كثير الغفران للظالم وكثير الشكر أى: الا تامة للسابق، فالتأم السابق واللاحق۔ یہ تفسیر درست نہیں ہے۔

ابن مردویہ نے اور بیہقی نے ''کتاب البعث والنشور'' میں حضرت عمر سے مرفوعاً نقل کیا ہے:

سابقنا سابق، ومقتصدنا ناج، وظالمنا مغفور له۔

حضرت عائشہؓ سے منقول ہے: اماالسابق فمن مضى على عهد رسول الله ﷺ وشهدله بالجنة، واماالمقتصد فمن تبع اثره من اصحابه حتى لحق به، واماالظالم فمثلى ومثلك۔ حضرت علی سے مروی ہے:

الظالم انا، والمقتصد انا، والسابق انا۔ کہ میں ظالم ہوں، میں مقتصد بھی ہوں، اور میں سابق بھی ہوں۔ پوچھا گیا وہ کیسے؟ فرمایا میں اپنی معصیت کے سبب ظالم ہوں، اور اپنی توبہ کی بدولت مقتصد ہوں، اور اپنی محبت کے باعث سابق ہوں۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ''سبقت کرنے والے'' سے وہ شخص مراد ہے جس کی نیکیاں، برائیوں پر غالب ہوں، یعنی نیکیاں زیادہ کرتا ہو اور برائیوں میں کم مبتلا ہوتا ہو! میانہ رو وہ شخص ہے جس کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں اور ''ظالم'' سے مراد وہ شخص ہے جس کی زندگی میں برائیاں نیکیوں پر غالب ہوں۔

پس حدیث بالا کا حاصل یہ ہے کہ ان تینوں اقسام کے لوگ برگزیدہ بندوں یعنی مؤمنین ہی میں سے ہیں اور یہ سب جنتی ہیں۔ اب یہ الگ بات ہے کہ ان کو جنت میں اپنے احوال وافعال کے اعتبار ہی سے درجات ملیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کی رحمت کتنی وسیع اور عام ہے کہ جس طرح اس کے نیکوکار بندے اس کی رحمتوں سے نوازے جائیں گے اسی طرح اس کے گنہگار بندے بھی اسی کے سایۂ رحمت میں ابدی سعادتوں سے ہمکنار ہوں گے۔

بَابُ مَا يَقُوْلُ عِنْدَ الصَّبَاحِ وَالْمَسَاءِ وَالْمَنَامِ

صبح، شام اور سوتے وقت پڑھی جانے والی دعاؤں کا بیان

قوله: ما يقول عند الصباح والمساء والمنام:

ممکن ہے کہ صباح ومساء سے مراد دن کے دونوں اطراف ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد لیل ونہار ہوں۔ یہ معنی زیادہ ظاہر ہیں۔ اسی معنی کی تائید اس دعا سے بھی ہوتی ہے: أسألك خير هذه الليلة۔ ''المنام'' کو ظرف زمان اور ظرف مکان دونوں معنی میں لینا درست ہے۔ أى في مكان النوم أو زمانه۔ اور اگر مصدر میمی مانیں تو مصدری معنی مراد ہوں گے۔ أى: عند ارادة النوم۔

صبح وشام کے وقت کی تعیین:

''صبح'' سے مراد ہے آفتاب طلوع ہونے تک دن کا بالکل ابتدائی حصہ۔ ''شام'' سے مراد ہے آفتاب کے غروب ہونے کے وقت سے شفق کے غروب ہونے کے وقت تک دن کا بالکل آخری حصہ لہٰذا جو دعائیں صبح کے وقت پڑھنے کے لئے منقول ہیں ان کو چاہے نماز فجر سے پہلے پڑھا جائے نماز فجر کے بعد دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں ہے اسی طرح شام کے وقت جن دعاؤں کا پڑھنا منقول ہے ان کو بھی چاہے تو مغرب کی نماز سے پہلے پڑھا جائے چاہے مغرب کی نماز کے بعد۔

صبح وشام وغیرہ کے اذکار کی حکمت:

علماء فرماتے ہیں سونے اور جاگنے کے وقت یہ اذکار وادعیہ کرنے کی حکمت یہ ہے کہ (دن بھر کے) اعمال کا خاتمہ بھی عبادت وطاعت پر ہو اور (دن کے) افعال کی ابتداء بھی عبادت ہی سے ہو۔ (ماخوذ از فوائد حدیث)

الفصل الاول:

آپ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سے منقول صبح وشام کی دعائیں

۲۳۸۱: عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا اَمْسٰى قَالَ اَمْسَيْنَا وَاَمْسَى الْمُلْكُ لِلّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ اَللّٰهُمَّ اِنِّى اَسْاَلُكَ مِنْ خَيْرِ هٰذِهِ اللَّيْلَةِ وَخَيْرِ مَافِيْهَا وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّمَا فِيْهَا اَللّٰهُمَّ اِنِّى اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْكَسَلِ وَالْهَرَمِ وَسُوْءِ الْكِبَرِ وَفِتْنَةِ الدُّنْيَا وَعَذَابِ الْقَبْرِ وَاِذَا اَصْبَحَ قَالَ ذٰلِكَ اَيْضًا اَصْبَحْنَا وَاَصْبَحَ الْمُلْكُ لِلّٰهِ وَفِىْ رِوَايَةٍ رَبِّ اَعُوْذُبِكَ مِنْ عَذَابٍ فِى النَّارِ وَعَذَابٍ فِى الْقَبْرِ۔ (رواه مسلم)

اخرجه البخارى فى صحيحه ١١/حديث رقم ٦٣٦٥۔ ومسلم فى صحيحه ٢٠٨٨/٤ حديث رقم (٧٤۔ ٢٧٢٣)۔

ترجمه: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جس وقت شام کرتے تھے۔ ہم شام میں داخل ہوئے اور ملک شام میں داخل ہوا۔ اس حال میں کہ ملک اللہ تعالیٰ کے واسطے ہے اور سب تعریف اللہ کے لیے ہے اور کوئی معبود نہیں ہے مگر اللہ وہ ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اس کے لیے بادشاہیت ہے اور اس کے لیے تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اے الٰہی تحقیق میں مانگتا ہوں اس کی بھلائی سے اور بھلائی اس چیز کی سے جو اس میں ہے یعنی جو چیز رات میں پیدا ہوتی ہے اور میں پناہ مانگتا ہوں تیرے ساتھ (یعنی تجھ سے) اس رات کی برائی سے اور برائی اس چیز کی سے جو اس میں ہے اے الٰہی! میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں۔ نیکی کرنے میں کاہلی سے اور نہایت بڑھاپے سے کہ بعض قوی میں خلل آ جائے اور بڑھاپے کی برائی سے یعنی عقل جاتی ہے اور وہ چیزیں کہ جن کی وجہ سے برا حال پیدا ہو اور میں دنیا کے فتنے سے پناہ مانگتا ہوں۔ یعنی دنیا کے فتنوں سے اور دنیا کی محبت میں گرفتار ہونے سے اور قبر کے عذاب سے اور جس وقت حضور صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صبح کرتے کہتے وہ یعنی شام کے وقت پڑھتے تھے وہ صبح میں بھی پڑھتے تھے لیکن امسینا کے بدلے اور امسى الملك الله کے اصحنا واصبح الملك الله اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اے میرے رب میں پناہ مانگتا ہوں جہنم کے عذاب سے اور عذابِ قبر سے۔ (مسلم)

حل لغات: أمسينا: شام میں داخل ہونا، أصبحنا: صبح میں داخل ہونا۔ الكسل: بروزن "قلم"۔ استطاعت ہونے کے باوجود طاعت میں بوجھل پن کرنا۔ اور امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ایسے امور میں سستی کرنا کہ جن میں سستی مناسب نہیں، اور اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ ظہور استطاعت کے باوجود، نفس کار خیر کیلئے آمادہ نہیں ہوتا۔ الهرم: بروز قلم: بڑھاپے کی وہ عمر کہ جس میں قوی جسمانیہ ضعیف و مضمحل ہو جاتے ہیں، یعنی ارذل عمر۔

تشریح: سوء الكبر: باء کے فتحہ کے ساتھ روایت ودرایت کے اعتبار سے یہی ضبط اصح ہے۔ سوء الکبر سے مراد وہ عوارض ہیں جو بڑھاپے میں لاحق ہو جاتے ہیں۔ مثلاً قوت کا ڈھل جانا' عقل میں فرق آ جانا' اختلاطِ رائے' وغیرہ وغیرہ۔ مختصر یہ کہ بڑھاپے کی

بدحالی سے پناہ چاہی ہے۔ الكبر: باء کے سکون کے ساتھ بھی مروی ہے۔اس سے مراد ''بطر'' ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: درایت پہلی روایت کی مؤید ہے۔چونکہ بطر وہرم کو بذریعہ عطف جمع کرنا ایسا ہے جیسا ''ضب'' و''نون'' کو جمع کرنا ہے۔ابن حجرؒ ان سے نزاع فرماتے ہوئے لکھتے ہیں: **ألاول أصح أى: أشهر رواية وأما دراية فالثانى يفيد ما لا يفيده ما قبله، وهو الهرم فهو تأسيس محض بخلاف الاول، فانه انما يفيد ضربامن التاكيد والتأسيس خير من التاكيد** اھ۔ابن حجر کی یہ بات عجیب ہے، چونکہ ان دونوں کے درمیان مغایرت تو حددرجہ واضح ہے۔ان میں ایسی مغایرت ہے جیسی ضب اورنون میں کلام تو متعاطفین کے درمیان مناسبت ملائمہ پر ہے، اس کا اعتبار تو علماء معانی نے بھی کیا ہے۔

علاوہ ازیں امام طیبیؒ نے اس کو تاکید پر محمول نہیں کیا ہے، بلکہ سوء الکبر کی تفسیر یہ کی ہے **سوء الكبر ناشي از هرم** ہے۔چنانچہ دونوں میں تغایرت بالکل واضح ہے، اوراس کی دلیل یہ ہے کہ لفظ سوء کو ذکر فرمایا ہے جو کبر بفتح الباء کے مناسب ہے، چونکہ ''کبر'' بسکون الباء تو مطلقاً مذموم ہے۔**عذاب**: کی تنوین برائے تقلیل ہے، تفخیم کیلئے نہیں ہے ابن حجرؒ کو اس بارے میں وہم ہوا ہے انہوں نے اس کے برعکس یہاں بیان کیا ہے۔

امورِ نحویہ: **أمسينا وأمسى الملك لله** کی ترکیب: (۱) تقدیری عبارت یوں ہے: **أمسينا وأمسى الملك كائنا لله ومختصابه۔**

(۲)۔دوسری ترکیب یہ ہے کہ (بعد والا جملہ) جملہ حالیہ ہے بتقدیر ''قد'' بھی ہوسکتا ہے، اور ''قد'' کی تقدیر کے بغیر بھی ہوسکتا ہے۔**أى أمسينا وقد صار بمعنى كان ودام الملك الله۔ والحمد لله**۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس کا عطف **أمينا وأمسى الملك** پر ہے۔**أى صرنا نحن وجميع الملك وجميع الحمد لله** اھ **أى عرفنا فيه أن الملك لله وأن الحمد لله لا لغيره**۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ الحمد للہ ایک مستقل جملہ ہو۔اور تقدیری عبارت یوں ہو: **والحمد لله على ذلك۔**

ولا اله الا الله: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس کا عطف الحمد پر ہے، اور تاویل یوں ہوگی: **أمسى الفردانية والوحدانية مختصين بالله۔ (وحده)**: حال مؤکدہ ہے۔**أى منفردا بالألوهية۔**

له الملك: اپنے ماقبل جملہ (**لا شريك له**) کی تاکید ہے۔''ال'' جنسیہ ہے۔**أى جنسه مختص له۔ وله الحمد**۔یہ ''ال'' استغراق کا ہے۔**أى بجميع أفراده۔ اللهم انى أسألك**: (فعل کا معمول محذوف ہے)۔**أى نصيبا وافرا وحظا وافيا۔**

وخير ما فيها سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مختلف اقوال ہیں۔

(۱) امام طیبیؒ فرماتے ہیں۔**أى: من خير ما ينشأ فيها وخير ما يسكن فيها۔ قال تعالىٰ ﴿وله ما سكن فى الليل﴾** [الانعام:۱۳]

(۲) ابن حجرؒ لکھتے ہیں: **أى مما أردت وقوعه فيها لخواص خلقك من الكمالات الظاهرة والباطنة، وخير ما يقع فيها من العبادات التى أمرنا بها فيها أو المراد خير الموجودات التى كان وجودها هذه الليلة وخير كل موجود الآن۔**

وأعوذبك من شرها وشرّ ما فيها: اس حدیث مبارکہ سے اظہارِ عبودیت اور **افتقار الى تصرفات الربوبية** کا پتہ چلتا ہے۔

(۲) تمام امور شر وخیر اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔(۳)۔بندہ کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے۔(۴) امت کو آداب کی تعلیم ہے۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ان اوقات مخصوصہ میں اللہ جل شانہ سے مختلف چیزوں کا سوال کرنا، درحقیقت ان اوقات میں کی جانے والی طاعات سے مجاز ہے، اور استعاذہ ان ((اوقات میں سرزد ہونے والے ذنوب سے) طلب عفو سے مجاز ہے۔

قوله :اللهم انی أعوذبك من الكسل والهرم وسوء الكبروفتنة الدنياوعذاب القبر:

ان امور سے خصوصی طور پر پناہ مانگی ہے چونکہ ان امور سے متصف شخص مقصود حیات یعنی علم وعمل سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔اس لئے ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿**لکیلا یعلم بعد علم شیئا**﴾[النحل:۷۰] اس تقریر کے ذریعہ ابن حجر کے کلام کا دفعیہ بھی ہو گیا، وہ لکھتے ہیں:حضورﷺ ''هرم'' سے اس وجہ سے پناہ مانگی کہ یہ ایک ایسی بیماری ہے کہ جس کی کوئی دوانہیں جیسا کہ ایک حدیث میں آتا ہے:''**وفتنة الدنیا:من الافتنان بها ومجتها۔ أو الابتلاء بفتنة فيها۔**

''**عذاب القبر**'' سے مرادنفس عذاب قبر بھی ہوسکتا ہے،اور یہ بھی ممکن ہے موجبات عذاب قبر مراد ہوں اور بظاہر دوسرے معنی مراد ہیں۔**واذا أصبح......**۔

جب یہ دعا صبح کے وقت پڑھی جائے گی تو اس میں اللیلۃ کی بجائے الیوم پڑھا جائے گا یعنی یوں پڑھیں گے اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُكَ مِنْ خَیْرِ ھٰذَا الْیَوْمِ نیز جہاں رات کی رعایت سے مؤنث کی ضمیریں استعمال ہوتی ہیں وہاں دن کی رعایت سے مذکر ضمیریں استعمال ہوں گی یعنی ھا کی جگہ ہ پڑھا جائے گا بقیہ عبارت جوں کی توں رہے گی۔

سوکر اُٹھنے کی مسنون دُعا

۲۳۸۲:وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ كَانَ النَّبِیُّ ﷺ اِذَا اَخَذَ مَضْجَعَهٗ مِنَ اللَّيْلِ وَضَعَ يَدَهٗ تَحْتَ خَدِّهٖ ثُمَّ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ بِاسْمِكَ اَمُوْتُ وَاَحْيٰى وَاِذَا اسْتَيْقَظَ قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ اَحْيَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ ۔

(رواه البخاری ومسلم عن البراء)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۳/ حدیث رقم ۷۳۹۴۔ وابوداؤد فی السنن ۳۱۱/٤ حدیث رقم ۵۰٤۹۔ والترمذی فی السنن ٤٦٦/۵ حدیث رقم ۳٤۷۷۔ وابن ماجه فی السنن ۱۲۷۷/۲ حدیث رقم ۳۸۸۰۔ واحمد فی المسند ۱۵٤/۵۔

ترجمه:حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جس وقت بچھونے پر تشریف لاتے تھے تو اپنا دایاں ہاتھ اپنے رخسار کے نیچے رکھتے یعنی دائیں رخسار کے نیچے رکھتے تھے پھر کہتے اے الٰہی تیرے نام کے ساتھ مرتا ہوں اور زندہ ہوتا ہوں میں تیرے نام کے ساتھ یعنی سوتا ہوں اور جاگتا ہوں اور جس وقت جاگتے تو کہتے سب تعریفیں اس خدا کے واسطے ہیں کہ جس نے جلایا (یعنی جگایا) ہم کو ہمارے مارنے کے بعد یعنی سلانے کے بعد اور اس کی طرف لوٹنا ہے۔اس کو بخاری اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔ براءؓ سے۔

تشریح: **قوله أخذ مضجعه من الليل وضع يده تحت خده:**

مضجعه: جیم کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ صاحب قاموس لکھتے ہیں: **ضجع كمنع ضجعا وضجوعا وضع جنبه بالأرض، والمضجع كمقعد موضعه**اھ۔

عرض مرتب: حدیث ۲۴۰۳ کے تحت اس کا امکان بھی لکھا ہے۔

أخذ مضجعه من الليل کا مطلب ہے:**أتى فراشه ومرقده فی بعض أجزاء الليل**۔امام طیبیؒ نے یہاں تکلف سے کام لیا ہے، اور ابن حجر نے ان کی اتباع کی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:''**كأنه قيل أخذ حظه من الليل، اذ لكل أحد منه حظ بالسكون والنوم والراحة، قال تعالىٰ**:﴿**جعل لكم الليل والنهار لتسكنوا فيه**﴾[القصص:۷۳]

والمضجع مصدراھ۔

ایک روایت میں **تحت خدہ** کے بجائے"**تحت رأسه**"کے الفاظ آئے ہیں۔

عرض مرتب: اس حصہ سے متعلقہ کچھ کلام حدیث ۲۴۰۰ کے تحت آ رہا ہے۔

اس ہیئت میں اشارہ ہے کہ سونے والے شخص کو گویا کہ قبر میں رکھا جا رہا ہے۔ چنانچہ جس شخص کو یہ بات مستحضر ہوگی اس کی نیند میں خفت ہوگی اور دن اچھا گزرے گا۔

قوله: اللهم باسمك أموت وأحيي: بعض کا کہنا ہے کہ (اسم بول کر) مسمّٰی مراد ہے، اور بعض کا کہنا ہے کہ اسم زائد ہے۔ای ربك جیسا کہ شاعر کے اس کلام میں ہے: ع ...... **الى الحول ثم اسم السلام عليكما۔**

أموت وأحيي: یعنی سوتا ہوں اور جاگتا ہوں۔ بعض نے اس کے معنی یوں بیان کئے ہیں: **باسمك اعميت أموت وباسمك المحي أجا، أو يذكر اسمك المحي أحيا۔ أو يذ كر اسمك أحياما أجيت وعليه أموت۔**

قرطبیؒ فرماتے ہیں: **باسمك أموت** دلالت کر رہا ہے کہ اسم ہی مسمّٰی ہے۔ أی: **أنت تميتني وأنت تحييني**۔ یہ کلام اس ارشاد باری تعالیٰ کی طرح ہے: ﴿**سبح اسم ربك الأعلٰى**﴾[الاعلیٰ:۱] **أی سبح ربك هكذا۔(نقله ميرك)۔**

قوله الحمد لله أحيانا بعد ما أماتنا واليه النشور: یعنی ہماری وہ قوت وحرکت ہمارے جسموں میں دوبارہ لوٹا دی کہ جس کو ہماری نیند کی حالت میں ہم سے زائل کر دیا گیا تھا۔

"**اليه النشور**"نشور: **نشر الميت نشورا اذا عاش بعد الموت وأنشره الله۔** کا ایک مطلب یہ ہے کہ آخر کار موت کے بعد حساب اور جزاء وسزا کیلئے اس ذات باری تعالیٰ کی طرف لوٹنا ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ بظاہر نشور سے مراد نیند کے بعد چاک وچوبند ہو کر تفرق فی طلب المعاش وغیرہ ہے۔ یہ دونوں امور موت اور بعث بعد الموت کے مشابہ ہیں۔

امام نوویؒ فرماتے: "**أماتنا**" سے مراد"نوم" ہے، اور"نشر" نام ہے **احياء للبعث بعد الموت** کا۔ نبی کریم ﷺ نے اس حدیث مبارکہ میں تنبیہ فرمائی ہے کہ نیند کے بعد بیداری، موت اور بعث بعد الموت کی طرح ہے۔

نیند کو موت کہنے کی وجہ:

ابو اسحاق زجاج فرماتے ہیں: نیند کے وقت جو نفس جسم سے جدا ہوتا ہے یہ نفس برائے تمیز ہے اور موت کے وقت جو نفس جسم سے جدا ہوتا ہے یہ نفس برائے حیات ہے اور یہ وہ نفس ہے کہ جس کے جسم سے رخصت ہو جانے کے بعد عمل تنفس ختم ہو جاتا ہے، اور نیند کو موت اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ اس کے ساتھ عقل، حرکت، تمثیل وتشبیہ سب کچھ زائل ہو جاتا ہے اور کبھی موت پر مشقت احوال، فقر، ذلت، سوال، ہرم، معصیت وجہل کیلئے بطور استعارۃً استعمال ہوتا ہے۔

امام قرطبیؒ فرماتے ہیں: **انقطاع تعلق الروح بالبدن** ایسا مفہوم ہے جو نوم اور موت دونوں کو جامع ہے کبھی یہ ظاہر ہوتا ہے، جیسا کہ نیند۔ اسی وجہ سے کہتے ہیں: "**النوم أخو الموت**"۔ اور کبھی یہ باطنًا ہوتا ہے، یہی موت ہے۔ قصہ مختصر نوم پر موت کا اطلاق مجاز کے قبیل سے ہے، چونکہ یہ دونوں **انقطاع تعلق الروح بالبدن** میں مشترک ہیں۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: نوم پر موت کا اطلاق کرنے کی حکمت یہ ہے کہ انسان کا حیات کے ذریعہ انتفاع، اللہ کی رضا جوئی اس کی طاعت کا قصہ، اس کے سخط وعقاب سے اجتناب کرنے میں ہے، چنانچہ جس شخص سے یہ انتفاع بالکلیہ فوت ہو گیا تو گویا وہ میت کی طرح ہے۔ لہٰذا اللہ کی حمد وثناء اس نعمت کے ہونے، اور اس مانع کے زائل ہونے پر ہے، اور یہ تاویل **أمسينا وأمسٰى الملك لله والحمد**

للہ کے بھی مطابق ہے اور وان أرسلتها فاحفظها...... کے بھی موافق ہے۔ اسی اسلوب پر الیه النشور بھی ہے۔أی والیه المرجع والمآب فی نیل الثواب بما یکتسب فی الحیاۃ۔

علماء فرماتے ہیں سونے اور جاگنے کے وقت یہ اذکار وادعیہ کرنے کی حکمت یہ ہے کہ (دن بھر کے) اعمال کا خاتمہ بھی عبادت وطاعت پر ہو اور (دن کے) افعال کی ابتداء بھی عبادت ہی سے ہو۔

۲۳۸۳: وَمُسْلِمٌ عَنِ الْبَرَاءِ۔

اخرجه مسلم فی صحیحه۔

ترجمه: لیکن مسلم نے (حضرت حذیفہؓ) کی بجائے حضرت براءؓ سے روایت کیا ہے''۔

فائدہ: واضح رہے کہ یہ حدیث متفق علیہ ہے، البتہ راوی مختلف ہیں اس حدیث کو حضرت حذیفہ سے اسی طرح امام ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ابی شیبہ نے بھی روایت کیا ہے۔

الفصل الثانی:

سونے کا مسنون طریقہ

۲۳۸۴: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا اَوٰی اَحَدُكُمْ اِلٰی فِرَاشِهٖ فَلْیَنْفُضْ فِرَاشَهٗ بِدَاخِلَةِ اِزَارِهٖ فَاِنَّهٗ لَایَدْرِیْ مَا خَلَفَهٗ عَلَیْهِ ثُمَّ یَقُوْلُ بِاسْمِكَ رَبِّیْ وَضَعْتُ جَنْبِیْ وَبِكَ اَرْفَعُهٗ اِنْ اَمْسَكْتَ نَفْسِیْ فَارْحَمْهَا وَاِنْ اَرْسَلْتَهَا فَاحْفَظْهَا بِمَا تَحْفَظُ بِهٖ عِبَادَكَ الصَّالِحِیْنَ وَفِیْ رِوَایَةٍ ثُمَّ لِیَضْطَجِعْ عَلٰی شِقِّهِ الْاَیْمَنِ ثُمَّ لِیَقُلْ بِاسْمِكَ (متفق علیه) وَفِیْ رَوَایَةٍ فَلْیَنْفُضْهُ بِصَنِفَةِ ثَوْبِهٖ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ وَاِنْ اَمْسَكْتَ نَفْسِیْ فَاغْفِرْلَهَا۔

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۱/۱۱۵۔ حدیث رقم ۶۳۲۰۔ ومسلم فی صحیحه ۲۰۸۴/۴ حدیث رقم (۶۴۔ ۲۷۱۴)۔ وابوداؤد فی السنن ۳۱۱/۴۔ والترمذی فی السنن ۱۳۹/۵ حدیث رقم ۳۴۶۱۔ وابن ماجه ۱۲۷۵/۲ حدیث رقم ۳۸۷۴ والدارمی ۳۷۶/۲ حدیث رقم ۲۶۸۴۔ واحمد فی المسند ۲۹۵/۲۔

ترجمه: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی آدمی سونے کے لیے اپنے بستر پر آئے پس اس کو چاہے کہ اپنے بستر کو جھاڑے اپنی لنگی کے اندر کے حصے کے ساتھ کیونکہ وہ نہیں جانتا ہے کہ اس کی عدم موجودگی میں اس کے بستر پر کیا چیز تھی اور پھر یہ دعا پڑھے۔ **باسمك ربی وضعت جنبی وبك ارفعه ان امسكت نفسي فارحمها وان ارسلتها فاحفظها بها تحفظ به عبادك الصالحین** اور ایک روایت میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی اپنے بستر پر آئے تو اس کو چاہیے کہ وہ پہلے اپنے بستر کو جھاڑے پھر اپنی داھنی کروٹ پر لیٹے اور پھر **باسمك** مذکورہ مال دعا آخر تک پڑھے۔ **تخریج**: اس حدیث کو اصحاب اربعہ نے بھی روایت کیا ہے۔

تشریح: **اذا آوی**: بقصر ومد دونوں طرح درست ہے۔ **فلینفض**: فاء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ **داخلة ازارہ**: اسکے متعدد مطلب بیان کئے گئے ہیں: (۱)۔ وهی حاشیة التی قلبی الجسد وتماسه۔ ۲۔ قیل هی طرفه مطلقا۔ ۳۔ قیل: مما یلی

طوقه۔۴۔وفی القاموس :طرفه الذی علی الجسد الأیمن۔خلفه:بروزن نصر،

صنفة:اس لفظ کے ضبط ومعنی میں علماء کا اختلاف ہے۔:ففی مختصر النهایة صنفة ازاره بکسر النون طرفه مما یلی طرته ۔قلت زاد الفارسی وقیل جانبه الذی لا هدب له ۔وفی القاموس صنفة الثوب کفرحة۔وصنفة صنفته بکسرهما حاشیته ای جانب کان اوجانبه الذی لا هدب له او الذی فیه الهدب۔اه وفی المشارف فلینفضه بصنفة ثوبه بفتح الصاد وکسرالنون فقیل طرفه وقیل حاشیته وقیل هی الناحیة التی علیها هدب وقیل الطرة والمراد هنا طرفه فما ذکره ابن حجر بفتح المهملة والنون والفاء مخالف لما فی کتب اللغة والروایة ۔

خلاصۃ الآراء:ا۔یہ لفظ تین طرح ضبط کیا گیا ہے:ا۔صاد کے فتحہ،اورنون کے کسرہ کے ساتھ ہے۔۲۔ابن حجر کا بیان کردہ ضبط لغت وروایت ہر دواعتبار سے اس کے مخالف ہے۔۳۔اس کے معانی مندرجہ ذیل ہیں:ا۔طرف الثوب۔۲۔حاشیة الازار التی تلی الجسد۔ ۴۔ طرفه مما یلی طرته۔۴۔طرة۔۵۔طرف۔

فلینفض:لنگی کے کونے سے جھاڑنے کا حکم اس لئے فرمایا کہ باہر کے کونے سے جھاڑنے سے اوپر کا کونہ یا حصہ میلا ہو جائے گا، جس سے بدنمائی پیدا ہوگی،پہلی بات تو یہ ہے کہ اکثر اہل عرب کی حالت یہ تھی کہ ان کے پاس جسم کے کپڑوں ازارورداء کے علاوہ کوئی کپڑا ہی نہیں ہوتا تھا۔تیسری بات یہ کہ اس میں سہولت ہے چوتھی بات یہ کہ اس صورت میں کشف عورۃ کم سے کم ہوتا ہے۔آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی اس بناء پر تھا کہ اہل عرب کا رواج یہی تھا کہ سونے کا بستر دن رات بچھا ہی رہتا تھا(تہہ نہیں کرتے تھے)۔فانه لا یدری ما خلفه:فانه کی ضمیر شان بھی ہوسکتی ہے،اور أحد کم کی طرف بھی راجع ہوسکتی ہے۔اوراس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ بستر تو بچھا ہوا تھا،تمہیں کیا معلوم کہ تمہاری عدم موجودگی میں تمہارے بستر پر کوئی کیڑا مکوڑا کوئی زہریلی چیز چڑھ گئی ہو۔تمہارے بستر پر گردوغبار ،کوئی میل کچیل یا کوئی نجاست ہو،امام طیبیؒ فرماتے ہیں:قام مقام بعده من تراب أوقذاة أوهامة۔ما خلفه: میں''ما''استفہامیہ بھی ہوسکتا ہے،اور یہ بھی ممکن ہے کہ موصولہ ہو۔

باسمك ربی: أی باسمك القوی والقادر۔ایک روایت میں بسم اللہ کے الفاظ ہیں۔وضعت جنبی وبك: یہاں دو احتمال ہیں:(۱)أی باسمك۔(۲)بمعونتك بحولك وقوتك وارادتك وقدرتك۔ ان أمسكت نفسی:ایک روایت میں ان أمتها کے الفاظ ہیں۔وان أرسلتها:ایک روایت میں وان رددتها کے الفاظ ہیں۔

''لنگی کے اندر کونے'' سے مراد کپڑے کا وہ حصہ یا کونا ہے جو اندرونی طرف اور بدن سے لگا ہوا ہوتا ہے خواہ وہ لنگی ہو یا کوئی اور لباس! نیز لنگی کے کونے سے جھاڑنے کے لئے اس لئے فرمایا ہے کہ باہر کے کونے سے جھاڑنے سے اوپر کا کونہ یا حصہ میلا ہو جائے گا جس سے بدنمائی پیدا ہو جائے گی۔

جب انسان سوتا ہے تو وہ گویا مردے ہی کے حکم میں ہو جاتا ہے کہ حق تعالیٰ اس کی روح عارضی طور پر قبض کر لیتا ہے پھر اس کے بعد اس کی روح کو اس کے جسم میں بھیج دیتا ہے یعنی اسے نیند سے بیدار کر دیتا ہے یا اس کی روح کو چھورتا ہے یعنی مستقل طور پر قبض کر لیتا ہے اور اس شخص پر موت طاری کر دیتا ہے چنانچہ اسی چیز کے بارے میں مذکورہ بالا دعا میں درخواست ہے کہ ''پروردگار! اگر تو سونے کی حالت میں میری روح کو رکھ چھوڑے اور مجھ پر موت طاری فرمادے تو اس صورت میں مجھے بخش دیجئے اور اگر میری روح کو واپس بھیج دے اور مجھے زندہ رکھے تو پھر اسی طرح میری نگہبانی فرمایئے جس طرح تو اپنے نیک بندوں کی نگہبانی فرماتا ہے یعنی نیکی و بھلائی کی توفیق دیجئے گناہوں سے بچایئے اور میرے ہر کام وفعل میں میرا معین ومددگار بنئے۔

''نیک بندوں'' سے مراد وہ بندے ہیں جو خدا اور اس کے رسول کی اطاعت وفرمانبرداری اور عبادت وطاعت کے ذریعہ اللہ کا حق بھی ادا کرتے ہیں اور بندوں کے حقوق بھی جو ان کے ذمہ ہوتے ہیں پورا کرتے ہیں۔

دائیں کروٹ میں سونے میں حکمت یہ ہے کہ دل چونکہ بائیں پہلو میں ہوتا ہے اس لئے دائیں کروٹ سونے کی صورت میں دل لٹکا رہتا ہے جس کی وجہ سے نیند میں استراحت اور غفلت زیادہ نہیں ہوتی اور نماز تہجد وغیرہ کے لئے جاگنا آسان ہوتا ہے جب کہ بائیں کروٹ سونے کی صورت میں دل اپنی جگہ ٹھہرا رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے نیند میں غفلت اور استراحت بہت زیادہ ہوتی ہے۔

واضح رہے کہ یہ بات ہماری نسبت سے ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت یہ بات درست نہیں، چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب اطہر سوتا نہیں ہے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں دائیں کروٹ یا بائیں کروٹ سونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

دائیں کروٹ پر سونے کی وجہ:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دائیں کروٹ پر سونے کو (کئی وجہ سے) ترجیح دیتے تھے:

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام مہتم بالشان امور میں دائیں جانب کو پسند کرتے تھے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کو تعلیم دینا چاہتے تھے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ یہ حالت درحقیقت حالت موت اور میت کے قبر میں رکھے جانے کے مشابہ ہے۔

سونے کے لیے بستر کو جھاڑنا مسنون ہے

۲۳۸۵: وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اِذَا اَوٰى اِلٰى فِرَاشِهٖ نَامَ عَلٰى شِقِّهِ الْاَيْمَنِ ثُمَّ قَالَ اَللّٰهُمَّ اَسْلَمْتُ نَفْسِىْ اِلَيْكَ وَوَجَّهْتُ وَجْهِىْ اِلَيْكَ وَفَوَّضْتُ اَمْرِىْ اِلَيْكَ وَاَلْجَاْتُ ظَهْرِىْ اِلَيْكَ رَغْبَةً وَرَهْبَةً اِلَيْكَ لَا مَلْجَاً وَلَا مَنْجَاً مِنْكَ اِلَّا اِلَيْكَ اٰمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِىْ اَنْزَلْتَ وَبِنَبِيِّكَ الَّذِىْ اَرْسَلْتَ وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم مَنْ قَالَهُنَّ ثُمَّ مَاتَ تَحْتَ لَيْلَتِهٖ مَاتَ عَلَى الْفِطْرَةِ وَفِىْ رِوَايَةٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم لِرَجُلٍ يَا فُلَانُ اِذَا اَوَيْتَ اِلٰى فِرَاشِكَ فَتَوَضَّأْ وُضُوْءَكَ لِلصَّلٰوةِ ثُمَّ اضْطَجِعْ عَلٰى شِقِّكَ الْاَيْمَنِ ثُمَّ قُلْ اَللّٰهُمَّ اَسْلَمْتُ نَفْسِىْ اِلَيْكَ اِلٰى قَوْلِهٖ اَرْسَلْتَ وَقَالَ فَاِنْ مُتَّ مِنْ لَيْلَتِكَ مُتَّ عَلَى الْفِطْرَةِ وَاِنْ اَصْبَحْتَ اَصَبْتَ خَيْرًا۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤٦٢/١٣۔ حدیث رقم ٧٤٨٨۔ ومسلم فی صحیحه ٢٠٨١/٤ حدیث رقم (٥٦۔ ٢٧١٠)۔ والترمذی فی السنن ١٣٥/٥ حدیث رقم ٣٤٥٤۔ وابن ماجه ١٢٧٥/٢ حدیث رقم ٣٨٧٦۔ والدارمی ٣٧٦/٢ حدیث رقم ٢٦٨٣۔ واحمد فی المسند ٢٨٥/٤۔

ترجمه: حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے بستر پر سوتے تو دائیں کروٹ پر سوتے تھے اور سونے سے پہلے یہ دعا پڑھتے تھے۔ **اللهم اسلمت نفسی الیك ووجهت وجهی الیك وفوضت امری الیك وابحات ظهری الیك رغبة ورهبة الیك لاملجأ ولا منجا منك الا الیك امنت بكتابك الذی انزلت وبنبیك الذی ارسلت**۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص نے سونے سے پہلے ان کلمات کو پڑھا اور پھر وہ اسی رات مر گیا' تو وہ دین اسلام پر مرا۔ ایک اور روایت میں یوں آیا ہے کہ حضرت براء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

ایک شخص سے فرمایا۔ اے فلاں شخص جب تم اپنے بستر پر لیٹو تو نماز کے وضو کی طرح وضو کرو اور پھر داھنی کروٹ پر لیٹو اور اللھم اسلمت نفسی ارسلت تک پڑھو۔ یعنی مذکورہ بالا دعا پڑھو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر اس رات تمہاری موت واقع ہو جائے تو تم دین اسلام پر مرو گے اور اگر تم نے صبح کر لی تو بہت زیادہ بھلائیوں کو پالو گے۔

تشریح: شقہ: شین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ نفسی: یاء کو مبنی علی السکون اور مبنی علی الفتح دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے۔ الیك: أی مائلة الی حکمك۔

عرض مرتب: اس تقدیری عبارت سے یوں لگتا ہے کہ الی کا متعلق مذکورہ نہیں بلکہ مائلۃ محذوف ہے جو حال واقع ہو رہا ہے۔ اور الیك اصل میں الی حکمك تھا، مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کی جگہ رکھ دیا گیا ہے۔ رغبة و رهبة: بعض کا کہنا ہے کہ یہ مفعول لہ ہیں ألجات کیلئے اور امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ دونوں اسم منصوب علی العلة (یعنی مفعول لہ) ہیں، البتہ لف ونشر ہے۔ (گویا اصل عبارت یوں ہے): أی: فوضت أموری طمعا فی ثوابك، وألجات ظهری من المکاره الیك مخافة من عذابك اھ۔ یہ معنی بالکل صحیح ہیں بلکہ اس میں صنعت بدیع بھی ہے۔ ابن حجرؒ نے اس پر بھی اعتراض کیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں: هذا تحکم، والوجه بل الصواب ما ذکرته من أن کل ما ذکر معلل بالرغبة والرهبة اھ۔ اور زیادہ واضح بات یہ ہے کہ دونوں اسم (اسم فاعل کے معنی میں ہو کر) حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں۔

أی: راغباً وراهباً: یا منصوب علی الظرفیہ ہیں، أی: فی حال الطمع والخوف۔ ان دونوں میں ماقبل کے تمام افعال کا تنازع ہے۔ الیك: رغبة کے متعلق ہے، اور رهبة کا متعلق محذوف ہے۔ أی: منك۔ بالمحذوف ہے، اور تقدیری عبارت یوں ہے: متوجها لهما الیك۔ علامہ کرمانیؒ فرماتے ہیں: أی طمعافی ثوابك وخوفامن عقابك اور الیك: رغبة کے متعلق ہے، جیسا کہ عرب کا یہ قول: علفتها تبنا وماء ا باردا، اور یہ بھی کوئی بعید نہیں کہ ان دونوں کا الیك کے بارے میں تنازع ہو۔ أی: رغبتی الیك۔ یہ مفہوم بالکل واضح ہے، ورهبتی الیك اور اس کے معنی یہ ہوں گے: انی حالة الخوف لا أرجع الا الیك فانه لا ملجأ ولا منجأ منك الا الیك۔ ملجأ: مہموز ہے اور منجا مقصور ہے۔ کبھی ''ازدواج'' کی وجہ سے منجا کو بھی مہموز العین پڑھا جاتا ہے اور کبھی اسی وجہ سے اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔

عرض مرتب: بظاہر یوں سمجھ میں آتا ہے کہ کبھی ازدواج کی وجہ سے ملجا کو بھی مقصور پڑھ دیا جاتا ہے۔ اھ۔

کرمانیؒ فرماتے ہیں: منجا اسم مقصور ہے، اس کا اعراب ''عصا'' کی طرح ہے، باقی رہی یہ بات کہ اس کو تنوین کے ساتھ پڑھا جائے یا بغیر تنوین کے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ترکیب چونکہ لاحول ولا قوة کی طرح ہے، لہٰذا اس کو بھی پانچ طرح سے پڑھنا درست ہے۔ حالت نصبی اور مبنی علی الفتح میں تنوین کے ذریعہ فرق ہوگا، اور تنوین کے وقت الف ساقط ہو جائے گا۔ فرماتے ہیں: ملجا اور منجا اگر دونوں مصدر ہوں تو ان دونوں کا منك کے بارے میں تنازع ہوگا، اور اگر یہ دونوں اسم مکان ہوں تو (تنازع) نہیں ہوگا، کیونکہ اسم مکان عمل نہیں کرتا، اور تقدیری عبارت یوں ہوگی: لا ملجأ منك الی أحد الا الیك ولا منجا الا الیك۔ آمنت: جملہ مستانفہ تعلیلیہ ہے۔

نفسی سے مراد ذات ہے، اور وجہی سے مراد جهتی وتوجهی وقصد قلبی ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ یہاں اس حدیث میں ''نفس'' اور ''وجہ'' دونوں ذات کے معنی میں ہے یعنی جعلت ذاتی طائعة لحکمك ومنقادة لك۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ان أسلمت اشارة الی أن جوارحه منقادة لله تعالٰی فی أوامره ونواهیه امام طیبیؒ کا یہ کلام انتہائی مستقیم ہے، اس پر ابن حجرؒ نے اعتراض کیا ہے: یہ مقام نوم ہے یہاں کیسی ''تکلیف'' یہ اعتراض یوں دور ہو جاتا ہے کہ امام طیبیؒ کی مراد تحقق نوم کا وقت نہیں ہے، جیسا کہ کسی بھی شخص

پر مخفی نہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ ارادۂ نوم کے وقت یا نوم سے پہلے مطلقا۔ اس حدیث مبارکہ سے لطیف یہ اشارہ ملتا ہے کہ مسلمان کیلئے مناسب ہے کہ وہ اس وقت بھی اللہ کی طرف متوجہ ہو، تا کہ جب سوئے تو مطیع ہونے کی حالت میں ہو۔ ہماری اس بات کی تائید امام طیبیؒ کے اس کلام سے بھی ہوتی ہے وہ لکھتے ہیں: **وفوضت أمری الیك: فیه اشارة الی أن أموره الخارجة والداخلة مفوضة الیه لا مدبرلها غیره** اھ۔

اور مطلب یہ ہے کہ میں اپنے تمام امور میں آپ پر توکل کرتا ہوں۔ **وألجأت ظهری الیك:** امام طیبیؒ فرماتے ہیں: **فیه اشارة الی أنه بعد تفویض أموره التی هو مفتقر الیها وبها معاشه وعلیها مدار أمره ملتجئ الیه مما یضره ویؤذیه من الأسباب الداخلة والخارجة۔**

آمنت بکتابك الذی أنزلت اور منزل علیہ محذوف ہے۔ **أی: أنزلت علیّ**۔ کتاب سے مراد قرآن کریم ہے کہ جو ان اخلاق بہیہ، مقامات علیہ اور حالات سنیہ کو اپنانے پر ابھارتا ہے۔ چنانچہ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''**آمنت بکتابك**'' **تخصیص بعد التعمیم** ہے۔ ابن حجرؒ نے اس عام معنی پر توجہ نہ دی اور امام طیبیؒ پر اعتراض کر بیٹھے: **لا تعمیم فیما ذکره لأن الفعل فی حیز الأثبات، لا عموم فیه کالنکرة التی بهی کذلك**۔ تأمل کرنے سے ابن حجر کی بات کا خلل بالکل واضح ہو جائے گا۔

دینك الذی أرسلت، ایک نسخہ میں نبیك کے الفاظ ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے خود اپنے او پر ایمان لانے کا بھی ذکر فرمایا، چونکہ نبی کریم ﷺ رسول برحق تھے، چنانچہ آپ ﷺ پر لازم تھا وہ اس امر ربی کی تصدیق فرمائیں، اور امت کو تعلیم ہے اسی لئے آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے: **وأشهد أنی رسول الله**۔ نبی کریم ﷺ پر ایمان لانا۔ احادیث نبویہ سے متعلق علوم خاصہ پر ایمان لانے کو متضمن تھا۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: تخصیص از تخصیص ہے۔ ابن حجر نے ان پر عجیب وغریب اعتراض کیا ہے۔ **وقال: کما یعلم من تأملك ما قاله وما قلته**۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: ابن حجر اگر خود تأمل کر لیتے تو ہمیں تأمل کرنے کا حکم نہ دیتے لہٰذا تأمل کریں اور اللہ ہی پر توکل کریں۔

ثم مات تحت لیلة: أی تحت حادثه فیها۔ ابن حجرؒ نے ''اعجب العجاب'' بات کہی ہے لکھتے ہیں: **أی عقب طلوع فجرها**۔ ایک طرف ابن حجر کی ذکر کردہ تشریح، اگلی حدیث کے منصوص الفاظ کے مخالف ہے: **فان مت من لیلتك أو فی لیلتك مت علی الفطرة: وان أصبحت أصبحت خیرا**۔ دوسری وجہ یہ کہ دوسری طرف طیبی کی اس بات پر اعتراض کیا ہے۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: **ومعنٰی تحت لیلة أنه لم ینجاوز عنه الی النهار، لأن اللیل یسلخ منه النهار فهو تحته، أو یکون بمعنی: ان مت تحت نازلة علیك من لیلتك وأی من أجل ما یحدث لیلتك**۔ اس پر ابن حجر لکھتے ہیں: **وفی جمیعه نظر۔ وکون اللیل سلخ منه النهار لا یؤید ما ذکره أولا فی معنی التحت کما هو واضح، أو یکون ......: فی غایة البعد والتکلف والأحسن عندی أن سبب التعبیر بالتحت أن الله جعل اللیل لباسا، فالناس مغمورون ومستورون تحته کالمستور تحت ثیابه ولباسه وهذا معنی واضح جدا، فالعدول الی ما ذکره الشارح من الأمرین السابقین عدول عن الجوهرء الی الصرف**۔ اھ۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں، امام طیبیؒ نے اولاً جو بات ذکر کی ہے وہ بھی بعینہ یہی بات ہے ''جلد'' لباس کے مشابہ ہے، چنانچہ دونوں آیات کا حاصل ایک ہی ہے، باوجودیکہ ابن حجر کا آخری کلام ان کے اپنے آغاز کلام کے مناقض ہے۔ ابن حجر کے اعتراضات کا سبب ان فقہی مسائل میں عجب وغرور اور صناعات بدیعیہ کے دقائق سے جہالت، اعتبارات عربیہ کے حقائق کی عدم فہم ہے۔ ان تمام تر باتوں کے باوجود امام طیبیؒ کے بارے میں لکھتے ہیں: **وکان سبب وقوعه فیما علمت من المواضع التی رددتها علیه قوله أول شرح**

هذا الحديث أن فيه غرائب وعجائب لا يعرفها الا الثقات من أهل البيان۔ فكان ذلك وقع منه تبجحا، فلم يصب الجادة الواضعة فى أكثر شرحه، كما يعلم بتأمل ما ذكره وما ذكرته اھ۔ ان دونوں کے کلام میں تأمل کے نتیجہ میں دونوں میں آسمان زمین کا فرق ہے کہ ابن حجرؒ طیبیؒ کی عقل کو نہیں پہنچ پائے، اور طیبی کی تحقیق وتدقیق کا ارادہ کر بیٹھے۔ اور فضیلت تو متقدم کیلئے ہے، اور اجر کامل بھی اسی کیلئے ہے، اور ان سے جو صادر ہوا وہ "**تبحج**" نہیں تھا بلکہ از روئے تحدّث تھا، اور ان کی سچائی کی علامت یہ ہے کہ اللہ جل شانہ نے ان کو یہ توفیق بخشی کہ وہ ان کے کلام ومرام کو مزین ومبین فرمائیں، اور امید ہے کہ وہ اس حدیث کے مصداق ہیں: **ان الله يبعث لهذه الأمة على رأس كل مائة سنة من يجددلها دينا۔** اس حدیث کو ابوداؤد، حاکم اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔ (**كما ذكره شيخ مشايخنا الحافظ الجلال السيوطى فى جامعة الصغير**) اگر ابن حجر کی شرح کا تتبع کیا جائے تو وہ فروع فقہیہ اور کلمات اعتراضیہ کے علاوہ کوئی چیز ان کے پاس نہ بچے، اور یہ بات انصاف پر مبنی نہ ہوگی کہ حلویات کی نسبت خود ان کی طرف اور مریات کی اسناد ان کے زعم کے مطابق ان کے بھائی کی طرف کی جائے، بلکہ ان کیلئے کی جائے۔ ان تمام تر باتوں کے باوجود ہم اللہ جل شانہ سے امیدوار ہیں کہ وہ ان پر مؤاخذہ نہیں کرے گا۔

قال رسول الله ﷺ لرجل: امام طیبیؒ کا بیان ہے کہ وہ صاحب اسید بن حضیر تھے، سوتے وقت وضو کرنا مندوب ہے۔ **فتوضأ۔ وضوء ك:** (یہاں تقدیری عبارت یوں ہے): **وضوء ا كاملا مثل وضوئك للصلاة:** (اس تقدیر سے معلوم ہوتا ہے کہ **وضوئك** سے پہلے مضاف محذوف ہے، جو نائب عن المفعول المطلق بن رہا ہے)۔ **وقال: فان......** اس قال کا فاعل ہے نبی کریم ﷺ ہوں تو اس قال کے قائل حضرت براء ہوں گے، اور اس کا عطف **قال رسول الله لرجل :** پر ہوگا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا فاعل حضرات براء ہوں، **أى قال البراء ايضا** ﷺ، اس صورت میں اس کا عطف قال پر ہوگا لیکن اس تقدیر سے وقف کا شبہ ہوتا ہے، اگرچہ اس جیسی بات عقل کے بل بوتے پر نہیں کہی جاسکتی۔ اس حصہ کے مرفوع ہونے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ یہ خطاب صحابی سے ہے اور کسی صحابی کو اس قسم کی بات کہنا روا نہیں۔ **فان مت:** میم پر ضمہ پڑھنا بھی درست ہے اور کسرہ پڑھنا بھی درست ہے۔ **من ليلتك:** ایک نسخہ میں **فى ليلتك** ہے۔ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس روایت کے بعض طرق میں یوں آتا ہے: **قال: قلت: ورسولك الذى أرسلت۔ فقال: ونبيك۔** آنحضرت ﷺ ان کی تردید اس لئے کی کہ **ورسولك** کہنے کی صورت میں **الذى أرسلت** محض مفید تاکید ہوگا، بعض لوگوں کے اس کلام کا مطلب بھی یہی ہے: **لأن البيان صار مكررا من غير افادة زيادة فى المعنى وذلك مما بأماة التبلغ اھ۔**

اور ممکن ہے کہ فائدہ مقدر ہو، کہ یہ کہا جائے: **ألذى أرسلته الينا أو أرسلته الى الخلق، كافة** ۔ باوجودیکہ تاکید تو بلغاء کے کلام میں بھی واقع ہوئی ہے، جیسا کہ اس آیت کریمہ میں: ﴿**وما من دابة فى الأرض ولا طائر يطير بجناحيه**﴾[انعام:۳۸] ﴿**فخر عليهم السقف من فوقهم**﴾[النحل:۲۶] البتہ نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی **ما من صباح يصبح العباد فيه** اس قبیل سے نہیں ہے، بخلاف ابن حجر کے، انہیں وہم ہوا ہے۔ زیادہ واضح وجہ تردید یہ ہے کہ ماثور دعاؤں میں تغیر لفظی نہ کیا جائے، اور اسی طرح احادیث بھی، اور "تصانیف" بھی اسی معنی میں ہیں۔ حدیث کو بالمعنی نقل کرنے کی اجازت بھی اسی وقت ہے کہ جب مجبوری ہو اور الفاظ بعینہ یاد نہ ہوں، چونکہ **مالا يدرك وكله لا يترك كله۔** الفاظ حدیث یاد ہونے کے باوجود نقل بالمعنی کرنے میں اندیشہ ہے کہ کہیں اس حدیث کی وعید میں نہ آجائے۔ **من كذب على متعمدا فليتبوأ مقعده من النار۔** اسی وجہ بعض محققین فرماتے ہیں: قواعد نحو یہ کی رعایت کرنا بھی ضروری ہے، محافظت مخارج اور صفات حرفیہ کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: النبی فعیل بمعنی فاعل للمبالغہ ہے' نبأ بمعنی خبر سے مأخوذ ہے۔ وجہ مناسبت یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اللہ جل شانہ کی خبریں دیتے ہیں۔ اس کلمہ میں تحقیق ہمزہ بھی درست ہے۔ اور تخفیف ہمزہ کے ساتھ ''نبی'' پڑھنا بھی درست ہے، اس صورت میں یہ نباوۃ بمعنی شیٔ مرتفع (بلند چیز) سے مأخوذ ہوگا، جس وقت حضرت براء نے ورسولك الذی أرسلت فرمایا، تو نبی کریم ﷺ نے ان کا رد فرمایا، تاکہ دونوں لفظ مختلف ہو جائیں، اور ارتفاع وارسال دونوں طرح کی ثناء جمع ہو جائے، اور دونوں حالتوں میں نعمت شمار ہو، اور دونوں صورتوں میں تعظیم ''منۃ'' بھی حاصل ہو جائے۔ نہی کی علت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ وہ رسول ہونے سے پہلے نبی تھے، میں نے نووی کا کلام دیکھا ہے کہ انہوں نے ماوردی وغیرہ کے بیان کردہ سبب نہی کو مستحسن قرار دیا ہے، کہ اذکار تعبدیہ میں مروی الفاظ پر (ہی) اقتصار کرنا چاہئے، اور جزاء بھی اس کے ساتھ متعلق ہے اور ہوسکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ پر ان کلمات کی وحی آئی ہو۔ لہٰذا ان کی ادائیگی بعینہٖ متعین ہے۔ اھ۔ **فالحمد لله علی التوارد فی المحافظة علی الواردة۔**

ایک روایت میں الفاظ آئے ہیں: **ولیجعلهن آخر ما یتکلم به۔**

۲۳۸۶: وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ اِذَا اَوٰى اِلٰى فِرَاشِهٖ قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَكَفَانَا وَاٰوَانَا فَكَمْ مِمَّنْ لَّا كَافِیَ لَهٗ وَلَا مُؤْوِیَ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۲۰۸۵/٤ حدیث رقم (٦٤- ٧١٥)- وابوداؤد فی السنن ۳۱۲/۳ حدیث رقم ۵۰۵۳- والترمذی ۱۳٦/۵ حدیث رقم ۳٤۵٦-

ترجمہ: ''اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب اپنے بستر پر تشریف لاتے تو یہ کہتے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَكَفَانَا وَاٰوَانَا مِمَّنْ لَّا كَافِیَ لَهٗ وَلَا مُؤْوِیَ۔ (مسلم)

تشریح: کفانا: یعنی جس نے ہم سے موذیوں کے شر کو دور رکھا، ہماری مہمات کیلئے ہمیں کافی ہوگیا اور ہماری حاجت بر آری کی۔ آوانا: امام نوویؒ فرماتے ہیں: اوی ممدود و مقصود دونوں طرح ہے، البتہ مدّ کے ساتھ فصیح و مشہور ہے، ان دونوں میں قصر بھی منقول ہے اور مدّ بھی منقول ہے اھ یعنی اللہ نے ہمیں مسکن عنایت فرمایا۔ ابن حجر اس مفہوم میں اضافہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: **مع تیسیر الخدم وتوفر المؤن فی السلامة خالیامن الأمراض والمحن** اھ۔ واضح رہے کہ حدیث سے یہ مفہوم مستفاد نہیں ہو رہا۔

فکم ممن لا کافی له ولا مؤوی: '' **کافی** ''یاء کے فتحہ کے ساتھ ہے، بعض نسخوں میں (لفظ کافی) ہمزہ کے ساتھ ہے یہ سہو ہے۔ '' **مؤوی** ''اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ یہاں ''لہ'' مقدر ہے، **أی ولا مؤوی له۔** یعنی دنیا میں کتنے ایسے افراد ہیں کہ ان کے دشمنوں کے شر سے اللہ ان کی کفایت نہیں کرتا، بلکہ ان کو اور ان کے شر کو ان کے حال پر چھوڑ دیا ہے، حتی کہ ان کے دشمن ان پر غالب آ گئے۔

دعا کے آخری الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ اس وسیع و عریض دنیا میں ایسے لوگوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے جو روزمرہ کی تکلیف و پریشانیوں میں مبتلا رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کو تکالیف و پریشانیوں سے محفوظ نہیں رکھتا بلکہ وہ ان پر غالب رہتی ہیں چنانچہ نہ صرف یہ کہ وہ لوگ اپنی روزمرہ کی ضروریاتِ زندگی ہی میں رحمت خداوندی کی التفات سے محروم رہتے ہیں بلکہ قضا و قدر خداوندی کے تحت ان کو سر چھپانے کے لئے کوئی ٹھکانہ بھی میسر نہیں ہوتا بلکہ وہ کوچوں' بازاروں میں فٹ پاتھ اور سڑکوں پر اور جنگلات و ویرانوں میں اپنی سخت کوش زندگی کی گھڑیاں گزارتے ہیں نہ انہیں گرمی سے بچنے کی راحت نصیب ہوتی ہے اور نہ سردی کی ایذاء تکلیف سے نجات کی کوئی پناہ گاہ۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: یہاں آوانا کے معنی ہیں: **رحمنا**، چنانچہ **ممن لا مؤوی له** کا مطلب ہوگا: **أی لا راحم وعاطف علیه۔**

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ایسا قلیل ونادر ہے، یہ مفہوم، ''کم'' کے مقتضی کے مناسب نہیں، چونکہ ''کم'' کثرت کے معنی رکھتا ہے، مزید یہ کہ کلام کا آغاز بھی **أطعمناء سقانا** سے ہورہا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ حدیث مبارکہ اس آیت قرآنی جیسا مفہوم رکھتی ہو: ﴿**ذلك بأن الله مولى الذين آمنوا وان الكافرين لا مولٰى لهم**﴾[محمد:۱۱] چنانچہ (حدیث کا) مطلب یہ ہوگا کہ ہم اللہ جل شانہ کی حمد وثنا بیان کرتے ہیں اس بات پر کہ اس نے اپنی نعمتوں کی ہمیں پہچان کروائی اور پھر ان نعمتوں کا شکرادا کرنے کی توفیق عطا فرمائی، بہت سے منعم علیہ ایسے ہیں کہ وہ اپنے رب کی نعمتوں کو نہ پہچانتے ہیں اور نہ شکرادا کرتے ہیں۔ اسی طرح (آیت کا مطلب یہ ہے کہ) اللہ کل کائنات کا مولیٰ ہے بایں معنی کہ وہ سب کا رب ہے، سب کا مالک ہے، لیکن مددگار ومحبّ صرف مسلمانوں کا ہے، لہٰذا ''فکم'' کی فاء تعلیلیہ ہے، مولانا عصام الدین رحمہ اللہ (بھی تقریباً یہی) فرماتے ہیں: **قوله: فكم ممن لا كافي له من قبيل قوله تعالى**﴿**لا مولى لهم**﴾**مع ان الله تعالى مولى كل احد اى لايعرفون مولى لهم فلم لم يتفرع على كفانا بل على معرفة الكافى التى يستفاد من الاعتراف وانما حمد الله تعالى على الطعام والسقى وكفاية المهمات فى وقت الاضطجاع لان النوم فرع الشبع والرى وفراغ الخاطر عن المهمات والامن من الشرور۔وقال النووى معنى آوانا هنا رحمنا و قوله كم من من لا مؤوى له اى لا راحم له ولا عاطف عليه**

۲۳۸۷: وَعَنْ عَلِيٍّ اَنَّ فَاطِمَةَ اَتَتِ النَّبِيَّ ﷺ تَشْكُوْ اِلَيْهِ مَا تَلْقٰى فِيْ يَدِهَا مِنَ الرَّحٰى وَبَلَغَهَا اَنَّهٗ جَاءَهٗ رَقِيْقٌ فَلَمْ تُصَادِفْهُ فَذَكَرَتْ ذٰلِكَ لِعَائِشَةَ فَلَمَّا جَاءَ اَخْبَرَتْهُ عَائِشَةُ قَالَ فَجَاءَنَا وَقَدْ اَخَذْنَا مَضَاجِعَنَا فَذَهَبْنَا نَقُوْمُ فَقَالَ عَلٰى مَكَانِكُمَا فَجَاءَ فَقَعَدَ بَيْنِيْ وَبَيْنَهَا حَتّٰى وَجَدْتُ بَرْدَ قَدَمِهٖ عَلٰى بَطْنِيْ فَقَالَ اَلَا اَدُلُّكُمَا عَلٰى خَيْرٍ مِّمَّا سَاَلْتُمَا اِذَا اَخَذْتُمَا مَضْجَعَكُمَا فَسَبِّحَا ثَلَاثًا وَّثَلَاثِيْنَ وَاحْمَدَا ثَلَاثًا وَّثَلَاثِيْنَ وَكَبِّرَا اَرْبَعًا وَّثَلَاثِيْنَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمَا مِنْ خَادِمٍ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ۵۰۶/۹۱۔ حديث رقم ۵۳۶۱ ومسلم ۲۰۹۱/۴ حديث رقم (۸۰۔ ۲۷۲۷) وابوداؤد فى السنن ۳۱۵/۴ حديث رقم ۵۰۶۲۔ والترمذى ۱۴۲/۵ حديث رقم ۳۴۶۹ واحمد ۸۰/۱۔

ترجمہ: ''اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں کہ (میری زوجہ محترمہ اور نبی کریم ﷺ کی صاحبزادی) حضرت فاطمہؓ نبی کریم ﷺ کے ہاں اس غرض سے حاضر ہوئیں کہ چکی پینے کی وجہ سے ان کے ہاتھ جس زحمت ومشقت میں مبتلا تھے اس کی شکایت آنحضرت ﷺ سے کریں (اور کوئی خدمتگار مانگیں) کیونکہ حضرت فاطمہؓ کو معلوم ہوا تھا کہ آنحضرت ﷺ کے پاس کچھ غلام آئے ہیں مگر (اس وقت) آپ ﷺ سے ان کی ملاقات نہیں ہوئی چنانچہ انہوں نے حضرت عائشہؓ کے سامنے اس کا تذکرہ کیا (یعنی ان سے کہا کہ جب آنحضرت ﷺ تشریف لائیں تو کہہ دیجئے گا کہ فاطمہ اپنی مشقت وتکلیف کے پیش نظر ایک غلام مانگنے حاضر ہوئی تھیں) پھر جب آنحضرت ﷺ تشریف لائے تو حضرت عائشہؓ نے حضرت فاطمہؓ کا پیغام آپ ﷺ تک پہنچا دیا۔ حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد آنحضرت ﷺ ہمارے ہاں اس وقت تشریف لائے جب کہ ہم اپنے بستروں پر لیٹ چکے تھے (آپ ﷺ کو دیکھ کر ہم نے اٹھنے کا ارادہ کیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اپنی جگہ پر لیٹے رہو'' پھر آپ ﷺ ہمارے نزدیک) تشریف لائے اور میرے اور فاطمہؓ کے درمیان بیٹھ گئے یہاں تک کہ میں نے اپنے پیٹ پر آپ ﷺ کے مبارک قدموں کی ٹھنڈک محسوس کی پھر آپ ﷺ نے فرمایا (مجھے فاطمہ کا پیغام مل گیا ہے) کیا میں تمہیں وہ چیز نہ بتلا دوں جو اس چیز (یعنی غلام)

سے بہتر ہے جوتم نے مانگی تھی اور وہ یہ کہ جب تم اپنے بستر پر آؤ تو تینتیس بار سبحان اللہ تینتیس بار الحمد للہ اور چونتیس بار اللہ اکبر کہو تمہارے لئے خادم سے یہ چیز بہتر ہے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: **تشكو اليه** مفعول لہ ہے، اور أن کو تخفیف کی غرض سے حذف کردیا ہے، **أي أتت اليه ارادة أن تشكو**۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ أتت کے فاعل سے حال مقدرہ ہے، **أى مقدرة الشكونى، في يدها**۔ ایک نسخہ میں ''**في يديها**'' کے الفاظ ہیں۔ **من الحى**: (یہاں دو مضاف محذوف ہیں)۔ **أى اثر ادارة الرحي۔ وبلغها**: أتت کی ضمیر سے حال ہے (اور قد مقدر ہے) **أي: وقد بلغ فاطمة۔ أنه**: یہ ضمیر شان ہے۔ **رقيق**: کے معنی ہیں: **مملوك**، کبھی اس کا اطلاق جمع پر بھی ہوتا ہے، **فذكرت** کا عطف **أتت** پر ہے۔ **فلما جاء أخبرته عائشة**۔ متون کے نسخوں میں عبارت اسی طرح ہے، بخلاف شرح کے نسخوں کے۔ **فجاء نا وقد أخذنا مضاجعنا**: (**وقد أحدنا مضاجعنا** حال ہے، اور جاء کی ضمیر ذوالحال ہے)۔ **أي: جاء النبي ﷺ حال كوننا مضطجعين**۔ ابن حجر کا (اس جملہ کی بابت تشریحی) کلام **فجا آنا أى: هو وهي** بظاہر عربیت کے مطابق نہیں ہے۔

فذهبنا نقوم: (ذهب فعل شروع کرنے کے معنی میں ہے) **أى شرعنا وقصدنا لنقوم له۔ على مكارنكما: أي: أثبتا على ما أنتما عليه من الاضطجاع**۔ ابن حجر لکھتے ہیں: **أى الزماه ولا تقوما** اور مراد یہ ہے: **دوما واثبتا على ما أنتما عليه**، ابن حجر نے برعکس کیا، چونکہ پہلے معنی حاصل معنی ہیں۔ **برد قدمه**: ایک نسخہ میں **برد قدميه** ہے۔

فجاء فقعد......على بطني: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہ اور حضرت علیؓ ایک ہی لحاف میں تھے، اور حضرت علیؓ کا ستر کے علاوہ باقی بدن برہنہ تھا۔ ابن حجرؒ کا یہ کہنا بلا دلیل ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی قدمہائے مبارک (ان کے اوپر) رکھے تھے۔ اور اسی طرح یہ کہنا بھی بلا دلیل ہے: **أنه وضع قدميه على بطنها ليسرى اليهما**۔ ان دونوں کا غلام مانگنا ممکن ہے کہ بزبان قال ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ بزبان حال ہے، یا ان کی رضا بمنزلہ سوال کے ہو، یا اس وجہ سے کہ عورتوں کی ضرورت مردوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ (غلام طلب کرنے تو حضرت فاطمۃ الزہرا، تن تنہا گئیں تھیں، حضرت علیؓ ان کے ہمراہ نہ تھے لیکن اس کے باوجود نبی کریم ﷺ نے طلب غلام کی نسبت ان دونوں کی طرف فرمائی) تقدیم وتاخیر۔

ابن حجر کی یہ بات: **انه لم تأت للسؤال الا باذن علي**۔ احتمال کی حد تک تو درست ہے، بالجزم درست نہیں ہے۔

ابن حجر نے یہاں یہ کلام مقدر بھی ذکر کیا ہے: **قالا: نعم**، اس تقدیری کلام کی بھی کوئی حاجت نہیں، چونکہ ألا میں احتمال یہ ہے کہ یہ برائے تنبیہ ہو، اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ ہمزہ استفہام کا ہو، چونکہ دلالت الی الخیر کی طرف میلان معلوم تھا' اس لئے جواب سے پہلے ہی فرمادیا: **اذا آخذتما......**۔

مذکورہ بالا کلمات کی ترتیب کے سلسلہ میں جزریؒ نے شرح مصابیح میں کہا ہے کہ تکبیر پہلے ہے چنانچہ ابن کثیرؒ فرمایا کرتے تھے کہ نمازوں کے بعد تو پہلے سبحان اللہ پڑھنا چاہئے اس کے بعد الحمد للہ اور پھر اللہ اکبر لیکن سوتے وقت پہلے اللہ اکبر ہی پڑھ لینا چاہئے۔ اس سلسلہ میں علماء لکھتے ہیں کہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اللہ اکبر کو کبھی تو پہلے پڑھا جائے اور کبھی بعد میں تاکہ اس بارہ میں منقول دونوں روایتوں ہی پر عمل ہو اور یہی اولیٰ اور زیادہ بہتر ہے۔

بظاہر اس عدد کی تحصیل مقصود ہے، اور جن سے بھی ابتدا ہو کوئی نقصان کی بات نہیں۔ جیسا کہ ایک حدیث میں آتا ہے، **سبحان الله والحمد لله ولا اله الا الله والله اكبر لا يضرك بأيهن بذأت**۔ تکبیر میں زیادتی کی تخصیص اشارہ ہے کہ اثبات عظمت وکبریائی میں مبالغہ مقصود ہے، چونکہ یہ ان تمام صفات تنزیہہ اور ثبوتیہ کو مستلزم ہے کہ جو صفات تسبیح وحمد سے مستفاد ہیں۔ **واللہ أعلم**۔

خادم: واحد ہے، اور جمع خدم آتی ہے، اس کا اطلاق مذکر و مؤنث دونوں پر ہوتا ہے۔
ارشاد گرامی ''تمہارے لئے یہ چیز خادم سے زیادہ بہتر ہے'' کے ذریعہ حضرت فاطمہؓ کو دنیا کی مشقتوں اور تکالیف اور دنیاوی طور پر ناپسندیدہ چیزوں مثلاً مرض وفقر پر صبر کی ترغیب دلائی گئی ہے' نیز اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ شکر کرنے والے مالدار کی بنسبت صبر کرنے والا مفلس زیادہ افضل ہے۔ ابن حجر نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا ہے۔

۲۳۸۸: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ جَاءَتْ فَاطِمَةُ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ تَسْأَلُهٗ خَادِمًا فَقَالَ اَلَا اَدُلُّكِ عَلٰى مَا هُوَ خَيْرٌ مِّنْ خَادِمٍ تُسَبِّحِيْنَ اللّٰهَ ثَلَاثًا وَّثَلَاثِيْنَ وَتَحْمِدِيْنَ اللّٰهَ ثَلَاثًا وَّثَلَاثِيْنَ وَتُكَبِّرِيْنَ اللّٰهَ اَرْبَعًا وَّثَلَاثِيْنَ عِنْدَ كُلِّ صَلَاةٍ وَعِنْدَ مَنَامِكِ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ٢٠٩٢/٤ حدیث رقم (٨١۔ ٢٧٢٨)۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ حضرت فاطمہ زہرہؓ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں اس مقصد سے حاضر ہوئیں کہ آپ ﷺ سے کوئی خادم مانگیں لیکن آپ ﷺ سے ان کی ملاقات نہ ہوسکی۔ جب آنحضرت ﷺ کو یہ معلوم ہوا تو آپ ﷺ (حضرت فاطمہؓ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ کیا میں تمہیں وہ چیز نہ بتادوں جو خادم سے بہتر ہے (اور وہ یہ ہے کہ) ہر نماز کے بعد اور سوتے وقت سبحان اللہ تینتیس بار اور الحمدللہ تینتیس بار اور اللہ اکبر چونتیس بار پڑھ لیا کرو''۔

تشریح: اس حدیث میں سوال کی نسبت خصوصی طور پر حضرت فاطمہ کی طرف ہے، چونکہ طلب خادم کا باعث اصل حضرت فاطمہ تھیں، یا یہ حدیث (روایت باللفظ نہیں ہے بلکہ) روایت بالمعنی ہے یا راوی نے اختصار کیا ہے، واللہ اعلم
سونے کے وقت ان تسبیحات کا پڑھنا دن بھر کی مشقت و کوفت اور ہر قسم کے رنج وغم کو دور کرتا ہے۔

الفصل الثانی:

صبح وشام کی دعا

۲۳۸۹: عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا اَصْبَحَ قَالَ اَللّٰهُمَّ بِكَ اَصْبَحْنَا وَبِكَ اَمْسَيْنَا وَبِكَ نَحْيٰى وَبِكَ نَمُوْتُ وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ وَاِذَا اَمْسٰى قَالَ اَللّٰهُمَّ بِكَ اَمْسَيْنَا وَبِكَ اَصْبَحْنَا وَبِكَ نَحْيٰى وَبِكَ نَمُوْتُ وَاِلَيْكَ النُّشُوْرُ۔ (رواه الترمذی وابوداود وابن ماجة)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ٣١٧/٤ حدیث رقم ٥٠٦٨۔ والترمذی ١٣٤/٥ حدیث رقم ٣٤٥١۔ وابن ماجه ١٢٧٣/٢ حدیث رقم ٣٨٦٨۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جس وقت صبح کرتے تو کہتے اے الٰہی ہم نے تیرے نام اور قدرت کے ساتھ صبح کی اور تیری قدرت کے ساتھ ہم شام کی اور تیرے نام کے ساتھ ہم جیتے ہیں یعنی زندہ ہوتے ہیں اور تیرے نام کے ساتھ ہم مرتے ہیں اور تیری طرف ہی لوٹ کر جانا ہے اور جس وقت شام کرتے تھے اور کہتے تھے الٰہی تیری قدرت کے ساتھ ہم نے شام کی اور تیری قدرت کے ساتھ ہم نے صبح کی اور تیری مدد کے ساتھ ہم زندہ رہتے ہیں اور تیری مدد کے ساتھ ہم مرتے ہیں اور تیری طرف ہی اٹھنا ہے یعنی مرنے کے بعد۔ اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا

ہے اور ابوداؤد اور ابن ماجہؒ نے۔

تشریح: **اللهم بك أصبحنا:** ''باء'' محذوف کے متعلق ہے اور وہ محذوف أصبحنا کی خبر ہے۔ یہاں مضاف مقدر ماننا ضروری ہے۔ أي: **أصبحنا ملتبسين بحفظك۔ أمغمورين بنعمتك، أو مشتغلين بذكرك، أو مستعينين باسمك، أو مشمولين بتوفيقك، أو متحركين بحولك وقوتك، أمتقلبين بارادتك قدرتك۔ بك فحيٰى اوبك نموت:** آئندہ حال کی حکایت ہے، یعنی: **يستمر حالنا على هذا في جميع الأوقات وسائر الحالات۔** اس کے مثل حضرت حذیفہ کی یہ حدیث مرفوع ہے: **اللهم باسمك أموت وأحي۔ أي: لا أنفك عنه ولا أهجره۔** امام نوویؒ فرماتے ہیں: اس کے معنی ہیں **أنت تحييني وأنت تميتني۔ اليك المصير:** کا مطلب ہے: **الى ختمك المرجع في الدنيا والمآب في العقبى۔ واذا أمسى:** اس کا عطف، **اذا أصبح** پر عائد ہو رہا ہے۔

امام جزریؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو اصحاب اربعہ واحمد نے، ابن حبان نے اپنی صحیح میں، اور ابوعوانہ نے اس طرح نقل کیا ہے کہ ''صباح'' کے ساتھ ''النشور''، اور ''مساء'' کے ساتھ ''المصير'' کے الفاظ ہیں، اور ابوداؤد کی روایت میں صباح مساء دونوں کے ساتھ ''النشور'' نقل کیا ہے اور ترمذی میں دونوں جگہ ''المصير'' ہے۔ اھ۔

توضیح: اس عبارت کی روشنی میں مصنف علیہ الرحمہ پر دو اعتراض وارد ہوتے ہیں:

پہلا یہ کہ انہوں نے روایت مشہورہ کے برعکس کیا ہے، باوجودیکہ روایت مشہورہ میں مناسبت طرفین بھی ہے، اور توفیق بین الروایتین بھی۔

دوسرا یہ کہ ایسی خاص ترکیب کے ساتھ جوڑا ہے کہ جو روایتاً ثابت نہیں ہے۔

عرض مرتب: ''اليك النشور'' کی تشریح حدیث: ۲۳۸۲ کے تحت ملاحظہ فرمایئے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے تجویز کردہ وظیفہ

۲۳۹۰: وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ اَبُوْبَكْرٍ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مُرْنِى بِشَىْءٍ اَقُوْلُهُ اِذَا اَصْبَحْتُ وَاِذَا اَمْسَيْتُ قَالَ قُلْ اَللّٰهُمَّ عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَاطِرَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ رَبَّ كُلِّ شَىْءٍ وَمَلِيْكَهُ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ نَفْسِىْ وَمِنْ شَرِّ الشَّيْطَانِ وَشِرْكِهٖ قُلْهُ اِذَا اَصْبَحْتَ وَاِذَا اَمْسَيْتَ وَاِذَا اَخَذْتَ مَضْجَعَكَ۔ (رواه الترمذی وابو داود والدارمی)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۳۱۷/٤ حدیث رقم ٥٠٦٧۔ والترمذی ١٣٤/٥ حدیث رقم ٣٤٥٢۔ والدارمی ٣٧٨/٢ حدیث رقم ٢٦٨٩۔ واحمد فی المسند ١٩٦/٢۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کچھ ایسی چیز پڑھنے کو دے دیجئے جس کو میں صبح وشام پڑھتا رہوں۔ فرمایا: کہو۔ اے الٰہی تو پوشیدہ اور ظاہر کو جاننے والا ہے اور آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے اے ہر چیز کے رب اور ہر چیز کے مالک میں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی معبود نہیں ہے مگر تو، میں تجھ سے اپنے نفس کی ہر برائی سے پناہ مانگتا ہوں اور شیطان کی برائی سے اور شیطان کے شریک کروانے سے تو کہہ اس کو جس وقت صبح کرے اور جو جس وقت تو شام کرے اور جس وقت تو اپنے سونے کی جگہ پر جائے اس کو امام ترمذیؒ اور ابوداؤدؒ اور دارمیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: قال أبو بكر: يا رسول الله: ایک نسخہ میں قلت: یا رسول اللہ کے الفاظ ہیں۔

قوله: اللهم عالم الغيب والشهادة فاطر السمٰوت والأرض رب كل شيء ومليكه:

''غیب'' سے مراد بندوں سے غائب امور واشیاء ہیں، اور شہادت۔ سے مراد ظاہر امور واشیاء ہیں۔

''فاطر السمٰوت والأرض'' یعنی وہ ذات کہ جس نے آسمان وزمین کو بغیر کسی نمونہ سابقہ کے وجود بخشا۔

فائدہ: (یہاں) علم کو مقدم کیا، (بایں طور کہ پہلے ''عالم الغيب والشهادة'' کو'' فاطر السموات والارض'' سے مقدم ذکر کیا، چونکہ علم صفت ذاتیہ قائمہ ہے۔ اور قرآن کریم میں ''فاطر'' کو مقدم فرمایا، چونکہ وہ مقام استدلال ہے۔

''مليكه'' فعيل بمعنی فاعل، برائے مبالغہ ہے۔ جیسا کہ ''قدير'' بمعنی ''قادر''

قوله: أشهد أن لا اله الا أنت، أعوذبك من شر نفسي ومن شر الشيطان وشركه:

یعنی آپ کی طرف سے خیر ہی آتی ہے، اور میں اپنا کوئی معاملہ آپ کے غیر کے سپرد نہیں کرتا اور میں اپنے نفس کے شر سے اللہ کی پناہ میں آتا ہوں چونکہ نفس منبع اشرار ہے، جیسا کہ دل منبع اسرار ہے۔ اور میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں شیطان کے وسوسہ، اس کے ورغلانے اور گمراہ کرنے سے۔

''شركه'' کو دو طرح ضبط کیا ہے: اول: شین کے کسرہ اور راء کے سکون کے ساتھ۔ روایت کے اعتبار سے مشہور اور درایت کے لحاظ سے اظہر بھی یہی ہے۔ أي: ما يدعوا اليه من الاشراك بالله اس صورت میں مطلب یوں ہوگا:

یعنی ان شیطانی باتوں سے میں اپنے رب کی پناہ میں آتا ہوں، جو شرک ہیں۔ یا شرک کی طرف لے جانے والی ہیں۔

ثانی واول: شین اور دونوں کے فتحہ کے ساتھ۔ أي: مصائده وحبائله التي يفتتن بها الناس۔ اس صورت میں مطلب یوں ہوگا: میں اپنے رب کی پناہ میں آتا ہوں شیطان کے مکر وفریب اور اس کے حیلوں سے کہ جو لوگوں کو آزمائش میں ڈالنے والے ہیں۔

پہلی صورت میں مصدر کی اضافت فاعل کی طرف ہے، اور دوسری صورت میں اضافت محضہ ہے، اور ہر دو تقدیر، یہ عطف تخصیص بعد از تعمیم برائے اہتمام ہے۔

مذکورہ دعا پڑھنے سے اللہ تعالیٰ اس کو بیماری سے حفاظت میں رکھتا ہے

۲۳۹۱: وَعَنْ اَبَانَ بْنِ عُثْمَانَ قَالَ سَمِعْتُ اَبِیْ یَقُوْلُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا مِنْ عَبْدٍ یَقُوْلُ فِیْ صَبَاحِ كُلِّ یَوْمٍ وَمَسَاءِ كُلِّ لَیْلَةٍ بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِیْ لَا یَضُرُّ مَعَ اسْمِهٖ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَاءِ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ فَیَضُرُّهٗ شَیْءٌ فَكَانَ اَبَانٌ قَدْ اَصَابَهٗ طَرَفُ فَالِجٍ فَجَعَلَ الرَّجُلُ یَنْظُرُ اِلَیْهِ فَقَالَ لَهٗ اَبَانٌ مَا تَنْظُرُ اِلَیَّ اَمَا اِنَّ الْحَدِیْثَ كَمَا حَدَّثْتُكَ وَلٰكِنِّیْ لَمْ اَقُلْهُ یَوْمَئِذٍ لِیُمْضِیَ اللّٰهُ عَلَیَّ قَدْرَهٗ (رواه الترمذی وابو داود وابن ماجة وفی روایته) لَمْ تُصِبْهُ فُجَاءَةُ بَلَاءٍ حَتّٰی یُصْبِحَ وَمَنْ قَالَهَا حِیْنَ یُصْبِحُ لَمْ تُصِبْهُ فُجَاءَةُ بَلَاءٍ حَتّٰی یُمْسِیَ۔

اخرجه ابوداؤد فی السنن ٣٢٣/٤ حديث رقم ٥٠٨٨۔ والترمذی ١٣٢/٥ حديث رقم ٣٤٤٨۔ وابن ماجه ١٢٧٣/٢ حديث رقم ٣٨٦٩۔ واحمد فی المسند ٦٢/١۔

ترجمہ: حضرت ابان بن عثمانؒ سے روایت ہے کہ میں نے اپنے باپ سے سنا کہتے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد

فرمایا کہ کوئی بندہ ایسا نہیں ہے کہ وہ کہے ہر روز صبح کے وقت اور ہر رات شام کو کہ میں نے صبح کی اور میں نے شام کی۔ اللہ کے نام کے ساتھ کہ اس کے نام کے ساتھ کوئی چیز ضرر نہیں کرتی زمین میں اور نہ آسمان میں اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے اس کو تین بار کہے کہ ضرر کرے اس کو یعنی جو کوئی صبح وشام اس دعا کو تین بار تین بار پڑھ لے۔ تو کوئی چیز اس کو ضرر نہیں پہنچائے گی۔ اور نہ ہی اس کو کوئی آفت پہنچے گی۔ پس ابان تحقیق ان کو ایک قسم کی فالج کی بیماری پہنچی تھی پس سننے والے شخص نے شروع کیا جو ابان کی طرف دیکھتا تھا۔ یعنی از راہِ تعجب کے دیکھتا تھا کہ یہ روایت کرتے ہیں جو کوئی اس دعا کو پڑھے گا۔ اس کو کچھ ضرر نہیں پہنچے گا اور خود فالج کی بیماری میں گرفتار ہے پس ابان نے کہا کیا دیکھتا ہے میری طرف خبردار جاؤ۔ تحقیق حدیث اس طرح ہے جس طرح میں نے تجھ سے بیان کی ہے یعنی صبح ہے لیکن میں نے اس دن نہیں پڑھی تھی وہ دعا تا کہ اللہ تعالیٰ مجھ پر اپنی تقدیر جاری کرے اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور ابن ماجہؒ اور ابوداؤدؒ اور ابو داؤدؒ کی روایت میں یہ ہے۔ **لم تصبه فجاءة بلاء:** جو شخص یہ دعا ہر شام کو تین بار پڑھے اس کو ناگہانی مصیبت نہیں پہنچتی صبح تک اور جو شخص صبح کے وقت اس دعا کو پڑھے اس کو ناگہانی بلا شام تک نہیں پہنچی۔

راویٔ حدیث:

ابان بن عثمان بن عفان قرشی محدثین اہل مدینہ میں سے ہیں، تابعی ہیں اپنے والد عثمان اور دیگر اصحاب سے روایات کرتے تھے اور ان کی روایات بکثرت ہیں۔ ان سے ''زہری'' نے روایت کی ہے۔ یزید بن عبدالملک کے زمانہ میں مدینہ میں وفات ہوئی۔

''ابان'' میں ہمزہ مفتوح ہے اور باء پر تشدید نہیں۔ منصرف ہے چونکہ ''فعال'' کے وزن پر ہے اور اگر غیر منصرف پڑھا جائے تو یہ بھی ممکن ہے، چونکہ وزن ''افعل'' ہے البتہ صحیح ومشہور اس کو منصرف پڑھنا ہے۔

تشریح: قوله: فی صباح کل یوم ومساء کل لیلة: أی فی أوائلهما۔ ابن حجر کا اس بابت یہ کہنا کہ ''یہ خلاف تصریح ہے'' اور پھر اس کی توجیہ بیان کی ہے جو صحیح نہیں ہے، تفصیل ماقبل میں گذر چکی ہے۔

باسم الله الذی لا یضر مع اسمه : (جار مجرور کا متعلق محذوف ہے) **أی: استعین أو أتحفظ من کل مؤذ باسم الله۔**

مع اسمه: (یہاں مضاف محذوف ہے۔) **أی مع ذکر اسمه باعتقاد حسن ونیة خالصة۔**

قوله: ما من عبد یقول...... ثلاث مرات فیضره شیء: ''ثلاث'' **یقول** کا ظرف ہے۔ ''**فیضره**'' **ما من عبد** کا جواب ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اور رفع کے ساتھ اس کا عطف **یقول** پر ہے، اور یہ فاء اس جملہ کی فاء کے مانند ہے: **لا یموت لمؤمن ثلاثة من الولد فتمسه النار۔ أی لا یجتمع هذا القول مع المضرة، کما لا یجتمع من النار مع موت ثلاثة من الولد بشرطه۔ اھ۔** ابن حجر نے ان کی اتباع کی ہے، لیکن واضح رہے کہ تصحیح شدہ نسخوں اور اصول معتمدہ میں رفع موجود نہیں ہے، لہٰذا تکلفات مذکورہ کی کوئی حاجت نہیں۔

قوله: فکان ابان قد اصابه طرف فالج: کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: **وهو بفتح اللام استرخاء لأحد شقی البدن لانصاب خلط بلغمی تنسد منه سالك الروح۔**

قوله: ما تنظر الی۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ ''ما'' استفہامیہ ہے، اور اس کا صلہ محذوف ہے، اور **تنظر الی:** حال ہے۔ أی

مالك تنظر الیّ؟أما: برائے تنبیہ ہے،اور بعض کا کہنا ہے کہ حقاً کے معنی میں ہے۔

قوله:ليمضيعلى قدره: دال کے فتحہ کے ساتھ ہے۔**أی مقدره**۔امام طیبیؒ لکھتے ہیں:**قوله:ليمضی الله عليه لعدم القول، وليس بغرض له،كما فی:قعدت عن الحرب جبناً**۔

بعض کا کہنا ہے کہ لام برائے عاقبت ہے،جیسا کہ اس قول میں:**لدوا للموت وابنوا للحزاب**۔

ابن حجر کا یہ کہنا: **اللام ليست من الحكمة بالنسبة ونظيره قوله تعالیٰ:﴿وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون﴾**[ـالذاريات:٥٦] ہمارے موضوع سے خارج ہے۔چونکہ اللہ جل شانہ کے''امضاء''میں کوئی بھی محذور نہیں کہ وہ عدم قول عبد کے باعث علت وسبب ہو۔

امام طیبیؒ کے کلام میں نفی کا تعلق عبد کے ساتھ ہے،نا کہ اللہ کے ساتھ **وليس بغرض له أی للعبد لا لله** جیسا کہ معتقد کو وہم ہو رہا ہے کہ افعال باری تعالیٰ معلل بالاغراض نہیں،بلکہ مختلف حکمتیں افعال عبد،عمل وترک اور تذکرہ ونسیان کی مقتضی ہوتی ہے۔اس کی غایت یہ ہے کہ دعا وذکر کے پڑھنے کو ترک کرنا۔اسی وجہ سے امام طیبیؒ نے اس کو علت سببیہ حقیقیہ یا علت غائیہ مجازیہ قرار دیا ہے(**فتأمل فی الفرق بين المقامات لئلا تقع فی الزلل من الخيالات الجبرية والخباطات القدرية**)۔

قوله:لم تصبه فجاءة بلاء: اضافت بیانیہ کے ساتھ ہے۔**فجاءة**،فاء کے ضمہ اور مدّ کے ساتھ ہے۔اور ایک نسخہ میں فاء کے فتحہ اور جیم کے سکون کے ساتھ ہے۔

مختصر النہایہ میں لکھتے ہیں:**فجأ الامر وفجئه فجاء' بالضم والمد، وفبحاءة بالفتح وسكون الجيم من غير مد، وفاجأه مفاحاة اذا جاءة بغتة من غير تقدم سبب** اھ۔اس سے اشارۃً یہ معلوم ہوا کہ **الفجأة**،مصدر بمعنی مفعول ہے۔**أی ما يفجأ به**۔یہ أعم ہے،خواہ بالمد ہو کہ بالقصر ہو۔

امام طیبیؒ کی اپنے اس قول سے **قيده بعضهم بفتح الفاء وسكون الجيم علی المرة** سے مراد ضبط لفظ ہے،اس کی حقیقت یعنی وحدت مراد نہیں ہے۔ابن حجر کا یہ کہنا:**انه يفهم من ذلك انتفاء التدريج بالأولیٰ** خلاف اولی ہے۔چونکہ یہ بات بلا دلیل ہے،وہ مسکوت عنہ ہے۔

وجہ تخصیص:

اور اس کی وجہ تخصیص یہ ہے کہ یہ افظع واعظم ہے،گویا کہ یوں فرمایا گیا ہے:**لم تصبه بلية عظيمة**،چونکہ مؤمن کسی علت،قلت یا ذلت سے خالی نہیں ہوتا۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ روایت:پچھلی روایت میں مذکور لفظ مضرت کے مفہوم کیلئے تفسیر وبیان ہو۔یا نفی مضرت سے مراد آزمائش کے وقت جزع وفزع کا نہ کرنا مراد ہے،اس توجیہہ سے دلائل نقلیہ اور عقلیہ میں توافق بھی ہو جائے۔

قوله بحتی يصبح......حتی يمسی: ان دونوں غایتوں میں اشارہ ہے کہ قائل دن کے یارات کے جس حصہ میں خواہ ابتدائی حصہ میں کہے،خواہ درمیانی حصہ میں کہے،جس وقت یہ کلمات کہے گا اسی وقت سے **فجأة ومضرة** سے حفاظت کے سلسلہ کا آغاز ہو جائے گا۔

اور ابن حجر کا یہ دعوی بلا دلیل ہے کہ اگر اس دعا کو دن یارات کے ابتدائی حصہ میں پڑھنے کے بجائے درمیانی حصہ میں پڑھا تو اس کو یہ فائدہ حاصل نہ ہوگا۔مزید یہ کہ ایک وقت کا اثبات دوسرے وقت کی نفی پر دلالت نہیں کرتا۔

فائدہ: پہلی روایت کو امام نسائی،ابن حبان،حاکم اور ابن ابی شیبہ نے بھی روایت کیا ہے، جب کہ دوسری روایت ابوداؤد کی ہے۔

صبح وشام کی دعا

۲۳۹۲:وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ كَا نَ يَقُوْلُ اِذَا اَمْسٰی اَمْسَيْنَا وَاَمْسَی الْمُلْكُ لِلّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ رَبِّ اَسْئَلُكَ خَيْرَ مَا فِی هٰذِهِ اللَّيْلَةِ وَخَيْرَ مَا بَعْدَ هَا وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ مَا فِی هٰذِهِ اللَّيْلَةِ وَشَرِّمَا بَعْدَ هَا رَبِّ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْكَسَلِ وَمِنْ سُوْءِ الْكِبَرِ اَوِ الْكُفْرِ وَفِی رِوَايَةٍ مِنْ سُوْءِ الْكِبَرِ وَالْكِبْرِ رَبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابٍ فِی النَّارِ وَعَذَابٍ فِی الْقَبْرِ وَاِذَا اَصْبَحَ قَالَ ذٰلِكَ اَيْضًا اَصْبَحْنَا وَاَصْبَحَ الْمُلْكُ لِلّٰهِ۔

(رواه الترمذی وابوداود وفی رواية لم يذكر من سوء الكفر)

اخرجه مسلم فی صحيحه ۲۰۸۸/٤ حديث رقم (۷٤۔ ۲۷۲۳)۔ وابوداؤد فی السنن ۳۱۷/٤ حديث رقم ۵۰۷۱۔ والترمذی ۱۳۳/۵ حديث رقم ۳٤۵۰۔

ترجمہ:حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کہتے تھے جب شام کرتے تھے کہ ہم نے شام کی اور ملک نے شام نے خدا کی واسطے اور تمام تعریفیں خدا کے واسطے ہیں اور کوئی معبود نہیں ہے مگر اللہ تنہا ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔اسی کے لیے بادشاہت ہے اور اسی کے لیے تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اے میرے پروردگار میں تجھ سے بھلائی مانگتا ہوں اس چیز کی جو اس شب میں واقع ہو اور بھلائی اس چیز کی جو اس شب کے بعد واقع ہو اور میں پناہ مانگتا ہوں تیرے ساتھ اس چیز کی برائی سے کہ اس رات میں واقع ہو اور اس چیز کی برائی سے کہ جو اس رات کے بعد واقع ہو۔اے میرے پروردگار میں پناہ مانگتا ہوں تیرے ساتھ کاہلی سے یعنی عبادت میں اور بڑھاپے کی برائی سے یا کہا کہ کفر کی برائی سے اور ایک روایت میں آیا ہے کہ میں پناہ مانگتا ہوں تیرے ساتھ بڑھاپے کی برائی سے اور تکبر سے اے میرے پروردگار میں پناہ مانگتا ہوں تیرے ساتھ دوزخ کے عذاب سے اور قبر کے عذاب سے اور جس وقت آپ ﷺ صبح کرتے تو کہتے اس کو۔یعنی جو شام کے وقت صبح کے وقت بھی پڑھتے لیکن امسينا اور' امسى الملك الله کی بجائے' اصبحنا' واصبح الملك لِله پڑھتے۔اس کو ابوداؤدؒ اور ترمذی نے نقل کیا ہے اور ترمذی کی روایت میں من سوء الكفر کا ذکر نہیں ہے۔

تشریح: قوله: أمسينا وأمسى......قدير:

عرض مرتب: حدیث کے اس قدر حصہ سے متعلقہ اعراب ومعانی کی مباحث ماقبل میں گذر چکی ہے۔

قوله رب! أسألك خيرما......بعدها:''ما'' سے مراد تقدیرات الہیہ ہیں۔اور''ما بعدها'' سے مراد مطلق (یعنی مطلق زمانہ) ہے۔یا یہ کہ اس رات کے بعد آنے والی راتیں مراد ہیں۔

قوله: أعوذبك من الكسل ومن سوء الكبر:مرتب عرض کرتا ہے کہ اس حصہ کی تشریح کیلئے ملاحظہ فرمائیے۔حدیث: ۲۳۸۱۔

قوله:ومن سوء الكبر أو الكفروفی رواية من سوء الكبر والكبر:راوی کو شک ہے۔کفر سے مراد''کفران'' بھی ہو سکتا ہے۔پہلا الکبر باء کے فتحہ (بمعنی کبر السن) اور دوسرا باء کے سکون کے ساتھ ہے (بمعنی تکبر عن الحق)۔ابن حجر کا بیان کردہ ضبط حرکات،تصحیح شدہ نسخوں کے معارض ہے: بكسر فسكون وبكسر ففتح۔عرض مرتب:ممکن ہے کہ ابن حجر کا بیان کردہ ضبط

حرکات لف نشیر کے طور پر ہوا ہے۔

قولہ: رب أعوذبك من عذاب فی النار: (''فی النار''صفت ہے''عذاب''کی) **أی عذاب کائن فی النار۔**

اس میں تمام انواع عذاب سے سہولت کی طرف اشارہ ہے۔ابن حجر کی بیان کردہ توضیح ''أی: بھا ''نامناسب ہے۔مزید یہ کہ آگ میں ہونے والا عذاب، خود آگ اور آگ کے علاوہ کے ذریعہ بھی ہوگا۔ **کما ھو مقرر فی محلھا**۔اور تیسری بات یہ ہے کہ ازروئے لغت باء بمعنی فی تو آتا ہے،لیکن ''فی'' ''باء'' کے معنی میں نہیں آتا ہے۔

اورابن حجر کا یہ کہنا: **ویصح بقاؤھا علی ظاھرھا، وأرید بالعذاب الذی فیھا مزید البعد عن رحمة اللّٰه ورضاه** بھی خطأ فاحش ہے۔چونکہ نبی کریم ﷺ کا مقصود استعاذہ یعنی مطلق بعد ہے۔لہٰذا ارادہ زیادتہا زیادت ضرر ہے اور قائل کے حق میں کمال نقصان ہے۔**قولہ :وعذاب فی القبر:** مرتب عرض کرتا ہے کہ اس جملہ کی تشریح بھی حدیث:۲۳۸۱ کے تحت ملاحظہ فرمایئے۔

قولہ: وفی روایتہ لم یذکر: ''لم یذکر ''کومعروف ومجہول دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔یہ حدیث فصل اول میں گذر چکی ہے۔**فتأمل**۔مرتب عرض کرتا ہے کہ بظاہر فصل اول کی پہلی حدیث کی طرف اشارہ ہے۔

آپ ﷺ اپنی بیٹیوں کو مذکورہ دعا سکھلاتے تھے

۲۳۹۳:وَعَنْ بَعْضِ بَنَاتِ النَّبِيِّ ﷺ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يُعَلِّمُهَا فَيَقُوْلُ قُوْلِي حِيْنَ تُصْبِحِيْنَ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ مَاشَاءَ اللّٰهُ كَانَ وَمَا لَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ وَاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا فَاِنَّهٗ مَنْ قَالَهَا حِيْنَ يُصْبِحُ حُفِظَ حَتّٰى يُمْسِيَ وَمَنْ قَالَهَا حِيْنَ يُمْسِيْ حُفِظَ حَتّٰى يُصْبِحَ۔ (رواه ابوداود)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳۱۹/٤ حدیث رقم ۵۰۷۵۔

ترجمہ: نبی کریم ﷺ کی بعضوں بیٹیوں سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ ان کو سکھلاتے تھے۔پس فرماتے ۔کہ جس وقت تو صبح کرتے ۔اللہ تعالیٰ پاک ہیں اپنی تعریف کے ساتھ اور نہیں قوت یعنی تسبیح وحمد وغیرہ پر مگر اللہ تعالیٰ کی مدد کے ساتھ کہ جو چاہا اللہ تعالیٰ کے ہوگیا اور جو نہ چاہا نہ ہوا اور میں جانتا ہوں یعنی اعتقاد رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو ازروئے جاننے کے گھیر رکھا ہے۔پس تحقیق جس شخص نے یہ کلمات کہے صبح کے وقت تو بلاؤں اور خطاؤں سے محفوظ رہتا ہے شام تک اور جس نے شام کے وقت یہ کلمے کہے وہ صبح تک محفوظ رہتا ہے اس کو ابو داوُدؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: امام میرکؒ فرماتے ہیں:سب نے اس حدیث کو عبدالحمید مولی بنی ہاشم، عن امہ، عن بعض بنات النبی ﷺ روایت کیا ہے۔ام عبدالحمید کے بارے میں حافظ منذریؒ فرماتے ہیں: **أم عبدالحمید لا أعرفھا** ۔اور شیخ ابن حجرؒ لکھتے ہیں: **لم أقف علی اسمھا وکأنھا صحابیة۔**

فیقول: اس ''فاء'' کے بارے میں ایک احتمال عاطفہ ہونے کا ہے،اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ تفسیر یہ ہو۔**لا قوة:** ایک نسخہ میں (واؤ کے اضافہ کے ساتھ ہے،یعنی) **ولا قوة** ہے۔

''سبحان''، تسبیح کا علم ہے،اور منصوب علی المصدر یہ ہے۔(**کذا فی المغرب**)۔(**سبحان اللّٰه وبحمده** کی تقدیری عبارت یوں ہے): **أنزھه من کل سوء وأبتدی بحمده**۔اور مغرب میں (اس کی تقدیری عبارت) یوں ہے: **سبحنك بجمیع آلائك،**

صبح وشام کی دعا

۲۳۹۲:وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ کَا نَ یَقُوْلُ اِذَا اَمْسٰی اَمْسَیْنَا وَاَمْسَی الْمُلْكُ لِلّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ رَبِّ اَسْئَلُكَ خَیْرَ مَا فِی هٰذِهِ اللَّیْلَةِ وَخَیْرَ مَا بَعْدَ هَا وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ مَا فِی هٰذِهِ اللَّیْلَةِ وَشَرِّمَا بَعْدَ هَا رَبِّ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْكَسَلِ وَمِنْ سُوْءِ الْكِبَرِ اَوِ الْكُفْرِ وَفِی رِوَایَةٍ مِنْ سُوْءِ الْكِبَرِ وَالْكِبْرِ رَبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابٍ فِی النَّارِ وَعَذَابٍ فِی الْقَبْرِ وَاِذَا اَصْبَحَ قَالَ ذٰلِكَ اَیْضًا اَصْبَحْنَا وَاَصْبَحَ الْمُلْكُ لِلّٰهِ۔

(رواه الترمذی وابوداود وفی روایة لم یذکر من سوء الکفر)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۲۰۸۸/٤ حدیث رقم (۷٤۔ ۲۷۲۳)۔ وابوداؤد فی السنن ۳۱۷/٤ حدیث رقم ۵۰۷۱۔ والترمذی ۱۳۳/۵ حدیث رقم ۳٤۵۰۔

ترجمہ:حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کہتے تھے جب شام کرتے تھے کہ ہم نے شام کی اور ملک نے شام نے خدا کی واسطے اور تمام تعریفیں خدا کے واسطے ہیں اور کوئی معبود نہیں ہے مگر اللہ تنہا ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔اسی کے لیے بادشاہت ہے اور اسی کے لیے تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اے میرے پروردگار میں تجھ سے بھلائی مانگتا ہوں اس چیز کی جو اس شب میں واقع ہو اور بھلائی اس چیز کی جو اس شب کے بعد واقع ہو اور میں پناہ مانگتا ہوں تیرے ساتھ اس چیز کی برائی سے کہ اس رات میں واقع ہو اور اس چیز کی برائی سے کہ جو اس رات کے بعد واقع ہو۔اے میرے پروردگار میں پناہ مانگتا ہوں تیرے ساتھ کاہلی سے یعنی عبادت میں اور بڑھاپے کی برائی سے یا کہا کہ کفر کی برائی سے اور ایک روایت میں آیا ہے کہ میں پناہ مانگتا ہوں تیرے ساتھ بڑھاپے کی برائی سے اور تکبر سے اے میرے پروردگار میں پناہ مانگتا ہوں تیرے ساتھ دوزخ کے عذاب سے اور قبر کے عذاب سے اور جس وقت آپ ﷺ صبح کرتے تو کہتے اس کو۔یعنی جو شام کے وقت صبح کے وقت بھی پڑھتے لیکن امسینا اور امسی الملك الله کی بجائے اصبحنا واصبح الملك لِله پڑھتے۔اس کو ابوداؤدؒ اور ترمذی نے نقل کیا ہے اور ترمذی کی روایت میں من سوء الکفر کا ذکر نہیں ہے۔

تشریح: قوله: أمسینا وأمسی......قدیر:

عرض مرتب: حدیث کے اس قدر حصہ سے متعلقہ اعراب ومعانی کی مباحث ماقبل میں گذر چکی ہے۔

قوله رب! أسألك خیرما......بعدها: ''ما'' سے مراد تقدیرات الهیه ہیں۔اور ''ما بعدها'' سے مراد مطلق (یعنی مطلق زمانہ) ہے۔یا یہ کہ اس رات کے بعد آنے والی راتیں مراد ہیں۔

قوله: أعوذبك من الكسل ومن سوء الكبر:مرتب عرض کرتا ہے کہ اس حصہ کی تشریح کیلئے ملاحظہ فرمائیے۔حدیث: ۲۳۸۱۔

قوله: ومن سوء الكبرأو الكفروفی روایة من سوء الكبر والكبر: راوی کو شک ہے۔کفر سے مراد ''کفران'' بھی ہو سکتا ہے۔پہلا الکبر باء کے فتحہ (بمعنی کبرالسن) اور دوسرا باء کے سکون کے ساتھ ہے (بمعنی تکبر عن الحق)۔ابن حجر کا بیان کردہ ضبط حرکات، تصحیح شدہ نسخوں کے معارض ہے: بکسر فسکون وبکسر ففتح۔عرض مرتب: ممکن ہے کہ ابن حجر کا بیان کردہ ضبط

حرکات لف نشیر کے طور پر ہوا ہے۔

قوله: رب أعوذبك من عذاب فی النار: (''فی النار'' صفت ہے ''عذاب'' کی) **أی عذاب كائن فی النار۔**
اس میں تمام انواع عذاب سے سہولت کی طرف اشارہ ہے۔ ابن حجر کی بیان کردہ توضیح ''أی: بها'' نامناسب ہے۔ مزید یہ کہ آگ میں ہونے والا عذاب، خود آگ اور آگ کے علاوہ کے ذریعہ بھی ہوگا۔ **كما هو مقرر فی محلها۔** اور تیسری بات یہ ہے کہ ازروئے لغت باء بمعنی فی تو آتا ہے، لیکن ''فی'' ''باء'' کے معنی میں نہیں آتا ہے۔

اور ابن حجر کا یہ کہنا: **ويصح بقاؤها علی ظاهرها، وأريد بالعذاب الذی فيها مزيد البعد عن رحمة الله ورضاه** بھی خطأ فاحش ہے۔ چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود استعاذہ یعنی مطلق بعد ہے۔ لہٰذا ارادۂ زیادت تھا زیادت ضرر ہے اور قائل کے حق میں کمال نقصان ہے۔ **قوله: وعذاب فی القبر:** مرتب عرض کرتا ہے کہ اس جملہ کی تشریح بھی حدیث: ۲۳۸۱ کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔

قوله: وفی روايته لم يذكر: ''لم يذكر'' کو معروف و مجہول دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ یہ حدیث فصل اول میں گذر چکی ہے۔ **فتأمل۔** مرتب عرض کرتا ہے کہ بظاہر فصل اول کی پہلی حدیث کی طرف اشارہ ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیٹیوں کو مذکورہ دعا سکھلاتے تھے

۲۳۹۳: وَعَنْ بَعْضِ بَنَاتِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم اَنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم كَانَ يُعَلِّمُهَا فَيَقُوْلُ قُوْلِی حِيْنَ تُصْبِحِيْنَ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ مَا شَاءَ اللّٰهُ كَانَ وَمَا لَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ وَاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا فَاِنَّهٗ مَنْ قَالَهَا حِيْنَ يُصْبِحُ حُفِظَ حَتّٰی يُمْسِیَ وَمَنْ قَالَهَا حِيْنَ يُمْسِیْ حُفِظَ حَتّٰی يُصْبِحَ۔ (رواه ابوداود)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ٤/٣١٩ حديث رقم ٥٠٧٥۔

ترجمه: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعضوں بیٹیوں سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو سکھلاتے تھے۔ پس فرماتے۔ کہ جس وقت تو صبح کرتے۔ اللہ تعالیٰ پاک ہیں اپنی تعریف کے ساتھ اور نہیں فوت یعنی تسبیح وحمد وغیرہ پر مگر اللہ تعالیٰ کی مدد کے ساتھ کہ جو چاہا اللہ تعالیٰ کے ہوگیا اور جو نہ چاہا نہ ہوا اور میں جانتا ہوں یعنی اعتقاد رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو از روئے جاننے کے گھیر رکھا ہے۔ پس تحقیق جس شخص نے یہ کلمات کہے صبح کے وقت تو بلاؤں اور خطاؤں سے محفوظ رہتا ہے شام تک اور جس نے شام کے وقت یہ کلمے کہے وہ صبح تک محفوظ رہتا ہے اس کو ابو داؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: امام میرکؒ فرماتے ہیں: سب نے اس حدیث کو عبدالحمید مولی بنی ہاشم، عن امہ، عن بعض بنات النبی صلی اللہ علیہ وسلم روایت کیا ہے۔ ام عبدالحمید کے بارے میں حافظ منذریؒ فرماتے ہیں: **أم عبدالحميد لا اعرفها** ۔ اور شیخ ابن حجرؒ لکھتے ہیں: **لم أقف علی اسمها وكأنها صحابية۔**

فيقول: اس ''فاء'' کے بارے میں ایک احتمال عاطفہ ہونے کا ہے، اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ تفسیر یہ ہو۔ **لا قوة:** ایک نسخہ میں (واؤ کے اضافہ کے ساتھ ہے، یعنی) **ولا قوة** ہے۔

''سبحان'' تسبیح کا علم ہے، اور منصوب علی المصدریہ ہے۔ (**كذا فی المغرب**)۔ (**سبحان الله وبحمده** کی تقدیری عبارت

وبحمدك سبحتك۔ أي:على التسبيح أو التحميد وغيرهما۔

قوله :ما شاء الله كان وما لم يشألم يكن:

ی ہ" کان" تامہ ہے بمعنی "وجد" أي ماشاء الله وجوده وجد في أي وقت أراده۔اورابن حجرؒ فرماتے ہیں: أي وجد على الفور۔ یہ بات علی الاطلاق نہیں ہے، چونکہ یہ کلمہ موضوع ہے لاحاطة المشيئة بالأشياء الكائنة کیلئے۔اورقید سے کائنات تدریجیہ خارج ہو جائیں گی، یا اشیاء مراد یہ کا قدم لازم آئے گا، چونکہ ارادہ ازلی ہے، اور دونوں قول بالاجماع باطل ہیں۔(كما هو مقرر في كتب الكلاميه وان عريت منهما الفتاوى الفقهية)اوراللہ نے جس شئی کا ارادہ نہیں فرمایا، وہ کبھی بھی نہیں ہوگی۔

قوله:أعلم ان الله......شئ علما:(یہاں علم'اعتقاد' کے معنی میں ہے۔)أي أعتقد أن۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ دونوں صفات یعنی قدرت شاملہ اور علم کامل۔اصول دین کے ستون ہیں۔اورانہی دوصفات کے ذریعہ حشر ونشر کا اثبات ہوتا ہے، اور ملاحدہ کی بھی تردید ہوتی ہے کہ جو بعث وحشر اجساد کے منکرین ہیں۔چونکہ اللہ جل شانہ کو جزئیات وکلیات کا علم ہے، اور زمین کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے اجزائے متفرقہ متلاشیہ کی بابت بھی علم محیط رکھتا ہے، چونکہ جب وہ ان کے جمع کرنے پر قادر ہے تو ان کو زندہ کرے گا، اسی وجہ سے یہاں ان دونوں کو خصوصی طور پر ذکر فرمایا اھ۔امام طیبیؒ کا یہ کلام انتہائی حسین وتام ہے۔اورابن حجر نے جو اس پر طعن کیا ہے سو وہ فہم مقصد میں غفلت برتنے کی وجہ سے ہے۔

قوله:فانه من قالها......: یہ جملہ،" قولي" کیلئے"معلله" ہے۔

۲۳۹۴:وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ قَالَ حِيْنَ يُصْبِحُ فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ اِلٰى قَوْلِهٖ وَكَذَالِكَ تُخْرَجُوْنَ اَدْرَكَ مَا فَاتَهُ فِيْ يَوْمِهٖ ذٰلِكَ وَمَنْ قَالَهُنَّ حِيْنَ يُمْسِيْ اَدْرَكَ مَا فَاتَهُ فِيْ لَيْلَتِهٖ۔ (رواہ ابوداود)

اخرجه ابوداؤد ٤/٣١٩ حديث رقم ٥٠٧٦۔

ترجمہ:حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص صبح کے وقت کہے پاکی کے ساتھ اللہ کو یاد کرو یا نماز پڑھو۔اللہ تعالیٰ کی اس وقت کہ جب تم شام کرتے ہو۔یعنی مغرب اور عشاء کے وقت اور اس وقت کے صبح کرتے ہو اور اس کے لیے تعریف آسمانوں اور زمین میں ہے اور پاکی کے ساتھ یاد کرو۔یا نماز پڑھو عصر کے وقت اور ظہر کے وقت اس قول تک و كذلك تخرجون تک جیسے یہ آیتیں صبح کے وقت پڑھیں اس نے وہ چیز پالی جو اس سے رہ گئی تھی اس دن میں اور جس نے یہ آیتیں شام کے وقت پڑھیں اس نے وہ چیز پالی جو اس سے اس رات کے وقت رہ گئی تھی اس کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح:وَحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ کے بعد یہ آیت یوں ہے:يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ اور اس وقت پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے:" پاکی کے ساتھ اللہ کو یاد کرو یعنی نماز پڑھو اس وقت جب کہ تم شام کرتے ہو (یعنی مغرب وعشاء کے وقت) اور اس وقت جب کہ تم صبح کرتے ہو (یعنی فجر کے وقت اور زمین وآسمانوں میں تمام تعریفیں اسی کے لئے ہیں اور پاکی کے ساتھ اللہ کو یاد کرو (یعنی نماز پڑھو) عصر کے وقت اور ظہر کے وقت اللہ تعالیٰ زندے کو مردے سے نکالتا ہے (یعنی بچے کو منی سے اور انڈے سے پیدا کرتا ہے) اور مردے کو زندہ سے نکالتا ہے (یعنی منی اور انڈے کو جاندار سے نکالتا ہے) اور زمین کو مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے (یعنی زمین کو خشک ہو جانے کے بعد سرسبز کرتا ہے) اور اسی طرح تم بھی (قبر سے) نکالے جاؤ گے۔

سبحان اللّٰہ کا مطلب ہے کہ اللہ کی تنزیہ بیان کروان امور سے کہ جو اس کی عظمت شان کے شایان نہیں۔ایک حدیث مرسل میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بندہ کے قول سبحان اللہ کے بارے میں فرمایا:انها براء ۃ اللّٰہ من السوء۔ یہ نہ کہا جائے کہ نفی مدح نہیں ہوتی، الا یہ کہ ثبوت کو متضمن ہو، چونکہ اللہ جل شانہ سے نقص کی نفی، اثبات کمال کو مستلزم ہے۔چونکہ سب کے نزدیک اللہ جل شانہ کیلئے کمال مسلم ہے:﴿ولئن سألتهم من خلق السمٰوٰت والأرض ليقولن اللّٰه﴾[لقمن: ۲۵]۔﴿ويقولون هؤلاء شفعاء نا عند اللّٰه﴾[یونس: ۱۸] لہٰذا صفاتِ جمال وجلال کا ثبوت کمال اللہ جل شانہ کو ہمیشہ سے حاصل ہے، ہمیشہ حاصل رہے گا، اور مخلوق کو تنزیہ عن التشبیہ کا حکم دیا، اسی وجہ سے انبیاء کرام کے آنے کا مقصد محض امر بالتوحيد والعبادة على وجه التفريد تھا۔ یہ مقصد یہ تھا کہ اللہ کیلئے نماز پڑھیں اور اس کو حق عبودیت ادا کریں۔

قوله: حين تمسون وحين تصبحون: اسی معنی میں ہے جس معنی میں أصبح اور أمسى ہے۔حين تصبحون: سے صبح کا وقت مراد ہے۔اور حين تمسون سے مغرب اور عشاء کا وقت مراد ہے۔

قوله:وله الحمد في السموات والأرض: ثابت کو محذوف کے متعلق ہو کر خبر ہے۔یہ جملہ معترضہ حالیہ ہے۔

قوله: وعشيا وحين تظهرون: ''عشيا'' کا عطف ''حين'' پر ہے، اور اس سے عصر کا وقت مراد ہے۔''تظهرون'' دوپہر کے وقت میں داخل ہونا، ظہر کا وقت مراد ہے۔یہ اوقات ان حالات کے ظہور کا محل ہیں، اس لئے اس کے مناسب حال یہ تھا کہ اللہ کی تنزیہ بیان کی جائے کہ وہ حدوث وآفات سے منزہ ہے۔

قال نافع من الأزرق لابن عباس:هل تجد الصلوات الخمس في القرآن؟ قال:نعم وقرأهاتين الآيتين، وقال: جمعت الآية الصلوات الخمس ومواقيتهااھ۔

معالم التنزیل میں منقول ہے کہ حضرت نافع سے ابن ارزق نے حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا کہ کیا آپ قرآن کریم میں پانچوں نمازوں کا حکم (وقت کے تعین کے ساتھ پاتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ ''ہاں'' اور پھر انہوں نے یہ مذکورہ بالا آیت پڑھ کر فرمایا کہ ان آیتوں نے پانچوں نمازوں کو اوران کے اوقات کو جمع کر دیا ہے۔

امام طیبیؒ نے تسبیح کے عمومی معنی یعنی مطلق تنزیہ کو اختیار کیا ہے، چونکہ یہ اس کے حقیقی معنی ہیں جو مجازی معنی یعنی اطلاق الجزء وارادۃ الکل سے اولیٰ ہیں۔باوجودیکہ اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے نا کہ خصوصی سبب کا۔چونکہ أعم کا فائدہ اتم ہوتا ہے۔

سوال: آگے فرماتے ہیں: اگر آپ یہ کہیں کہ ظاہر کا تقاضا یہ تھا کہ وله الحمد کو فسبحان اللّٰہ کے بعد ذکر کیا جاتا، جیسا کہ سبحان اللہ وبحمدہ میں ہے۔اور ''عشيا'' کو ''حين تصبحون'' کے بعد ذکر کیا جاتا۔لہٰذا اس فصل کا کیا فائدہ؟ اور تسبیح کو ظرف زمان کے ساتھ، اور تحمید کو ظرف مکان کے ساتھ خاص کیوں کیا؟

جواب: میں کہتا ہوں ماقبل میں گذر چکا ہے کہ حمد تسبیح سے اشمل ہے، چنانچہ تسبیح کو مقدم ذکر فرمایا، اور اصباح وامساء کو اس کے ساتھ معلق کیا، اور تحمید کو مؤخر کیا اور آسمان وزمین کو اس کے ساتھ معلق کیا۔اس کو معطوف معطوف علیہ کے درمیان اس لئے داخل کیا تا کہ حمد میں ظرف زمان ومکان دونوں اکھٹے ہو جائیں۔چونکہ اقتران الشئ بالشئ میں بھی ایک قسم کا معنوی تعلق ہوتا ہے۔اگر چہ تعلق نہ بھی پایا جائے۔اور اگر حمد کو مقدم کر دیا جاتا تو دونوں ظروف میں مشترک ہو جائے، اور اگر حمد کو مؤخر کر دیا جاتا تو حمد مکان کے ساتھ مخصوص ہو جاتی۔اھ۔ومن فهم حسن كلامه وطيب مرامه لا يطعن فيه بأنه مما لا يكاد يفهم من أصله أو مما لا تعلق له بما نحن فيه كما يعلم من تأمله على ما ذكره ابن حجر رحمه اللّٰه فانه شهادة من نفسه عليه بقلة الفهم لديه وان كان

مرجع بعض الفقهاء الیه۔ الی قوله: ایک نسخہ میں ''تعالیٰ'' کا اضافہ بھی ہے۔

فائدہ: مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عکرمہ بن ابی جہل کو دیکھا تو یہ آیت پڑھی، تو یہ نبی کریم ﷺ کی طرف سے اس آیت کی تفسیر ہے کہ ''حی'' سے مراد مؤمن اور میت سے مراد کافر ہے۔ اور انہی معنی میں عالم و جاہل، صالح و فاسق، اور ذاکر و غافل ہیں۔

مذکورہ وظیفہ پڑھنے سے غلاموں کو آزاد کرنے کے برابر ثواب ملتا ہے

۲۳۹۵: وَعَنْ اَبِیْ عَیَّاشٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنْ قَالَ اِذَا اَصْبَحَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ كَانَ لَهٗ عِدْلُ رَقَبَةٍ مِنْ وَلَدِ اِسْمَاعِیْلَ وَكُتِبَ لَهٗ عَشْرُ حَسَنَاتٍ وَحُطَّ عَنْهُ عَشْرُ سَیِّئَاتٍ وَرُفِعَ لَهٗ عَشْرُ دَرَجَاتٍ وَكَانَ فِیْ حِرْزٍ مِّنَ الشَّیْطَانِ حَتّٰی یُمْسِیَ وَاِنْ قَالَهَا اِذَا اَمْسٰی كَانَ لَهٗ مِثْلُ ذٰلِكَ حَتّٰی یُصْبِحَ قَالَ حَمَّادُ بْنُ سَلَمَةَ فَرَاٰی رَجُلٌ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فِیْمَا یَرَی النَّائِمُ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ اَبَا عَیَّاشٍ یُحَدِّثُ عَنْكَ بِكَذَا وَكَذَا قَالَ صَدَقَ اَبُوْ عَیَّاشٍ۔

(رواه ابوداود وابن ماجة)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۳۱۹/٤ حدیث رقم ۵۰۷۷۔ وابن ماجه ۱۲۷۳/۲ حدیث رقم ۳۸٦۷۔

ترجمہ: ابو عیاشؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص صبح کے وقت کہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے اللہ تعالیٰ تنہا ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے اس کے لیے بادشاہت ہے اور اسی کے لیے تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہوتا ہے اس کے لیے غلام آزاد کرنے کے برابر ثواب ملتا ہے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے اور اس کے لیے دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور اس سے دس برائیاں دور کی جاتی ہیں اور اس کے لیے دس درجے بلند کئے جاتے ہیں اور شیطان سے پناہ میں ہو جاتا ہے یعنی اس کے شر (بہکانے) سے شام تک اور جس نے ان کلمات کو کہا شام کے وقت اس کے لیے اسی طرح صبح تک ہوتا ہے حماد بن سلمہ اس حدیث کے ایک راوی ہیں' کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول خدا ﷺ کو خواب میں دیکھا پس کہا اے اللہ کے رسول ﷺ تحقیق ابو عیاش حدیث نقل کرتا ہے آپ سے ایسی اور ایسی یعنی جو مذکور ہوئی ہے فرمایا ابو عیاشؓ نے سچ کہا ہے اس کو ابوداؤد اور ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

ابو عیاش۔ ابو عیاش زید بن الصامت انصاری وزرقی ہیں' ہجرت کے چالیس (۴۰) سال بعد وفات پائی۔ ان سے ایک جماعت روایت کرتی ہے۔

تخریج: ورواه النسائی و ابن ابی شیبه و ابن سنی وزاد بعد قوله: وله الحمد کے بعد یحی ویمیت وهو حی لا یموت۔

تشریح: قوله: عن أبی عیاش: یاء تحتانیہ اور شین معجمہ کے ساتھ ہے۔ مصابیح کے بعض نسخوں میں تصحیف ہوئی ہے، اور اس لفظ کو ابن عباس سے ضبط کیا گیا ہے۔ یہ ابو عیاش وہی ہیں جن کو زید بن صامت انصاری کہا جاتا ہے، یہ صحابی ہیں۔ ان صحابی کی منقبت، اور ان کے صدق پر دلالت کیلئے۔

''صدق ابو عیاش'' فرما دینا ہی کافی ہے۔

قولہ:من قال اذا اصبح :یہ ''من'' شرطیہ ہے۔اذا أصبح :اذا ظرفیہ ہے۔

کان له عدل من ولد اسماعیل : یہ جملہ جواب شرط ہے۔(یہاں مضاف محذوف ہے)۔أی: عدل عتقھا۔''عدل'' عین کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ ضبط کیا گیا ہے،بمعنی مثل۔بعض کا کہنا ہے کہ بالفتح وہ مثل کہ جو غیر جنس سے ہو۔اور بالکسر وہ مثل کہ جو جنس سے ہو۔اور بعض نے اس کے برعکس کہا ہے۔''من ولد اسماعیل'' رقبة کی صفت ہے۔''ولد'' کو دو طرح پڑھا جا سکتا ہے:

۱۔واؤ اور لام دونوں کے فتحہ کے ساتھ۔۲۔واؤ کے ضمہ اور لام کے سکون کے ساتھ بمعنی''اولاد'' ہے۔

حضرت اسماعیل کی تخصیص کی وجہ ان کی شرافت ہے۔

فائدہ:اس حدیث میں عرب کی غلامی کے جواز و عدم جواز پر کوئی دلالت موجود نہیں ہے۔جب کہ ابن حجرؒ اس حدیث سے جواز کا قول اخذ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:والقول بمنعه عجیب۔

قولہ:فرأی رجل رسول اللّٰہ ﷺ فما یری النائم:

امام طیبیؒ فرماتے ہیں:فی النوم ذکر فرما کر اس خواب کی حقیقت پر تنبیہ فرمائی ہے۔اور یہ کہ یہ خواب اجزاء نبوت میں سے ایک جزء کا ہے۔اور النائم کا ''ال'' عہد ذہنی کا ہے۔أی النائم الصادق الرؤیا۔اور اگر ''فی النوم'' فرماتے تو احتمال تھا کہ یہ خواب ''اضغاث أحلام'' کے قبیل سے ہو۔

چونکہ اس بات پر اجماع ہے کہ خوابوں پر عمل نہیں کیا جائے گا۔اس وجہ سے نہیں کہ خواب میں شک ہے،خواب کا برحق ہونا احادیث صحیحہ میں منصوص ہے،بلکہ اس وجہ سے کہ نائم اپنے خواب کو ضبط نہیں کر پاتا،بعض مرتبہ سنی ہوئی بات کے برعکس نقل کر دیتا ہے۔کبھی اس کا کلام تاویل و تعبیر کا محتاج ہوتا ہے۔اور تفسیر میں اختلاف ہوتا ہے۔اور اس وجہ سے کہ اگر وہ خواب شریعت کے موافق ہو تو اس کا اعتبار کیا جائے گا،ورنہ اس کا کوئی اعتبار نہ ہوگا،چونکہ جب وہ خواب اس کے مخالف ہے تو خواب کے ذریعہ اس (حکم شرعی) کو منسوخ تو نہیں کیا جا سکتا۔

قولہ:یحدث عنك بکذا:اور ایک نسخہ میں ''کذا'' ہے۔اور یہ تکرار ممکن ہے کہ صبح و شام کے دو جملوں کے اعتبار ہو۔

مذکورہ دُعا پڑھنے کی برکت سے آگ سے خلاصی کا وعدہ

۲۳۹۶:وَعَنِ الْحَارِثِ بْنِ مُسْلِمِ التَّمِيْمِيِّ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اَنَّهٗ اَسَرَّ اِلَيْهِ فَقَالَ اِذَا انْصَرَفْتَ مِنْ صَلَاةِ الْمَغْرِبِ فَقُلْ قَبْلَ اَنْ تُكَلِّمَ اَحَدًا اَللّٰهُمَّ اَجِرْنِيْ مِنَ النَّارِ سَبْعَ مَرَّاتٍ فَاِنَّكَ اِذَا قُلْتَ ذٰلِكَ ثُمَّ مُتَّ فِيْ لَيْلَتِكَ كُتِبَ لَكَ جَوَازٌ مِنْهَا وَاِذَا صَلَّيْتَ الصُّبْحَ فَقُلْ كَذٰلِكَ فَاِنَّكَ اِذَا مُتَّ فِيْ يَوْمِكَ كُتِبَ لَكَ جَوَازٌ مِنْهَا۔

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۴/۳۲۰ حدیث رقم ۵۰۷۹۔

ترجمہ:حضرت حارث بن مسلم تمیمی سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے باپ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے چپکے سے ان سے بات کہی۔پس جس وقت تو مغرب کی نماز سے فارغ ہو جائے تو کسی سے کلام کرنے سے پہلے تو سات بار کہے اے الٰہی تو پناہ دے مجھ کو آگ سے پس تحقیق تو جس وقت یہ کہے گا اور اس رات اگر مر گیا تو تیرے لیے آگ سے خلاصی لکھی جائے گی اور جس وقت تو صبح کی نماز پڑھے پھر اس کو سات بار کہے کسی سے کلام کرنے سے پہلے پس اگر تو مر جائے گا۔اس دن تو تیرے لیے آگ سے خلاصی لکھی جائے گی۔اس کو ابو

داؤدؒ نے نقل کیا ہے

راویٔ حدیث:

حارث بن مسلم: یہ حارث بن مسلم بنوتمیم میں سے ہیں۔ان کی حدیث شامیوں میں مشہور ہے۔ان سے عبدالرحمٰن بن حسان نے روایت حدیث کی ہے۔

فائدہ: امام میرکؒ فرماتے ہیں: سب نے اس حدیث کو مسلم بن حارث سے روایت کیا ہے۔ان کو حارث بن مسلم تمیمی بھی کہا جاتا ہے۔اول اصح ہے اھ۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

تشریح: قوله: أنه أسر اليه :اسراء کے لغوی معنی ہیں :اعلان واخفاء۔گویا کہ ہمزہ کبھی سلب کیلئے بھی ہوتا ہے۔بعض شراح نے أسر اليه کی توضیح تکلم معہ خفیۃ کے ساتھ ہے۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں:في الاسرار ترغيبه فيه حتى يتلقاه، و يتمكن فى قلبه تمكن السر المكنون لا انضة أى البخل به من غيره۔ اذا انصرفت: کی توضیح ابن الملک نے رجعت کے ساتھ کی ہے۔ملا علی قاریؒ نے اس توضیح کو غریب کہا ہے۔

قوله:فقل قبل أن تكلم ...... سبع مرات:قبل ازتکلم کی قید کی حکمت یہ ہے کہ اس وقت تک آدمی پر نماز کا خشوع وتدبر ہوتا ہے۔چنانچہ ایسی حالت میں مانگی گئی دعا علی وجہ الکمال واقع ہوگی۔

''سبع مرات'' قل کیلئے ظرف ہے۔أی: كرر ذلك سبع مرات۔اورسات کے عدو کی تخصیص شاید یہ ہے کہ جہنم کے دروازے اورطبقات بھی سات ہیں یا یہ کہ انسان کے سات اعضاء سے تکلم کیا جائے گا۔

قوله:ثم مت فی ليلتك كتب لك جوازمنها :''مت ''میم کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ،ہردوطرح درست ہے۔

''جواز'' جیم کے فتحہ (اورزاء) کے ساتھ ہے،بمعنی''خلاص''۔''جواز'' اصل میں اس ''براءت'' کو کہتے ہیں جوکسی آدمی کے پاس ہوتی ہے تا کہ اس کو کوئی بھی شخص گزرنے سے روک نہ سکے۔ چنانچہ حدیث باب میں مذکورہ فضیلت کی راہ میں صرف اورصرف تحلة القسم رافع ہوگی۔

''جواز منها'' کے دومطلب ہوسکتے ہیں:

(۱)اللہ تعالیٰ دخول نار سے خلاصی عطا فرمائے گا۔(۲)اللہ تعالیٰ خلودنار سے خلاصی عنایت فرمائے گا۔

فائدہ: ابن حجر کی شرح میں''منها'' کے بجائے''من النار'' کے الفاظ آئے ہیں لیکن یہ الفاظ اصول معتمدہ کے خلاف ہیں۔

عرض مرتب:مرقات کے محشیٰ لکھتے ہیں:رواه أبو داؤد فی سننه الحديث رقم ۵۰۷۹، ۵۰۰ ولفظته جوار بالراء، أى أجارك الله منها، والله اعلم اھ۔

مذکورہ دُعا پر آپ ﷺ کی مواظبت

۲۳۹۷:وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ لَمْ يَكُنْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَدَعُ هٰؤُلَاءِ الْكَلِمَاتِ حِيْنَ يُمْسِي وَحِيْنَ يُصْبِحُ اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَسْاَلُكَ الْعَافِيَةَ فِيْ دِيْنِيْ وَدُنْيَايَ وَاَهْلِيْ وَمَالِيْ اَللّٰهُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِيْ وَاٰمِنْ رَّوْعَاتِيْ اَللّٰهُمَّ احْفَظْنِيْ مِنْ بَيْنِ يَدَيَّ وَمِنْ خَلْفِيْ وَعَنْ يَمِيْنِيْ وَعَنْ شِمَالِيْ وَمِنْ فَوْقِيْ وَاَعُوْذُ بِعَظْمَتِكَ اَنْ اُغْتَالَ مِنْ تَحْتِيْ يَعْنِي الْخَسْفَ۔ (رواہ ابوداود)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳۱۸/٤ حديث رقم ٥٠٧٤ ـ وابن ماجه ۱۲۷۳/۲ حديث رقم ۳۸۷۱ ـ

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ ان کلمات کو صبح کے وقت اور شام کے وقت چھوڑا نہیں کرتے تھے اے الٰہی تحقیق میں تجھ سے سوال کرتا ہوں' دنیا ورآخرت میں عافیت کا اے الٰہی تحقیق میں تجھ سے گناہوں کی معافی مانگتا ہوں اور عیبوں سے سلامتی اپنے دین کے کاموں میں اور اپنی دنیا کے کاموں میں ۔اپنے اہل اور مال کے حق میں اے الٰہی میرے عیبوں کو ڈھانک دے اور خوف کی چیزوں سے امن میں رکھ ۔یعنی مجھ سے بلائیں دفع کر اے الٰہی مجھ کو میرے آگے سے محفوظ رکھ اور میرے پیچھے سے اور میرے دائیں سے اور بائیں سے اور میرے اوپر سے اور میں پناہ مانگتا ہوں تیرے بڑائی سے کہ میں اچانک ھلاک کیا جاؤں اپنے نیچے سے یعنی زمین میں دھنس جانے سے ۔اس کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله:لم يكن رسول الله ﷺ يدع...... حين يصبح:

بظاہر یہ کان ناقصہ ہے، اور یدع......کان کی خبر ہے۔ أی: **لم يكن تاركا لهن فی هذين الوقتين، بل يداوم عليها فيهما**۔ابن حجرؒ نے لکھا ہے:**الظاهر أن يكون تامة، وأن يدع حملة حاليته من الفاعل أی:لم يوجد رسول اللهﷺ حال كونها تاركا لها حين يمسی وحين يصبح اھ**۔ابن حجر کے اس کلام میں غرابت ہے، معنوی رکاکت ہے، اور پھر عجیب بات یہ ہے کہ ان کا یہ کلام معارض ہے۔امام طیبیؒ ان کے کلام پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں:**وقال الشارح أخذا من كلام الكشاف:لم يكن يدع هؤلاء أی لا يتأتی منه ذلك ولا يليق بحاله أن يدعها اھ وفيه نظر ظاهر، بل يتأتی منه تركها ويليق بحاله لبيان جواز تركها الواجب عليه، ولا اشتغال بما هو أهم منها اھ**۔ان کا یہ اعتراض ان کے تناقض کو ثابت کرتا ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: شارح کی مراد صرف مواظبت میں مبالغہ مقصود ہے، جیسا کہ حدیث سے مستفاد ہوتا ہے۔ وگرنہ تو یہ اجماعی ہے، اور اس کا مراد صرف مواظبت میں مبالغہ مقصود ہے، جیسا کہ حدیث سے مستفاد ہوتا ہے۔ وگرنہ تو یہ اجماعی ہے، اور اس کا ضروریات دین میں سے ہونا معروف بات ہے کہ اس دعا کو ان دو وقتوں میں پڑھنا آپ ﷺ پر لازم نہیں تھا، اور ان دو وقتوں میں تو کیا دیگر اوقات میں بھی پڑھنا ضروری نہیں تھا، چہ جائیکہ وہ کچھ کہا جائے جو کچھ کہ ابن حجر نے فرمایا۔

قوله: اللهم انی أسألك العافية: اے اللہ میں تمام آفات دینیہ سے سلامتی مانگتا ہوں، اور دنیاوی حادثات وواقعات پر تحمل وصبر اور رضا بالقضاء مانگتا ہوں۔تمام بری بیماریوں مثلاً برص، جنون، جذام وغیرہ سے اور مصیبتوں سے حفاظت مانگتا ہوں۔**عافية** بروزن فاعلۃ مصدر ہے۔ **قوله:اللهم استر عوراتی وآمن روعاتی**:عورات سے مراد عیوب وذنوب ہیں اور مطلب یہ ہے کہ اے اللہ میرے عیوب پر پردہ ڈالے رکھ اور میرے گناہوں کو مٹا دے۔عورات روعات کو اس روایت میں بصیغۂ جمع لانے میں ان کی کثرت کی طرف اشارہ ہے۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں:عورۃ سے مراد آدمی کا وہ حصہ جس کو وہ چھپاتا ہے اور اس کو یہ گوارا نہیں ہوتا کہ کوئی اس حصہ کو دیکھے اور روعۃ سے مراد ہے' خوف کی چیزیں۔

قوله:اللهم احفظنی من...... وعن شمالی: قاضی بیضاویؒ اس آیت کریمہ:﴿**ثم لآتينهم من بين أيديهم ومن خلفهم وعن أيمانهم وعن شمائلهم**﴾[الاعراف:۱۷] کے تحت لکھتے ہیں: پہلے دونوں (اسماء،**بين أيديهم وخلفهم**) کے ساتھ فعل کو حرف ابتداء (یعنی ''من'') کے ساتھ متعدی کیا**لأنه منهما متوجه اليهما**:چونکہ وہ ان دونوں جانبوں سے ان کی طرف متوجہ ہوگا، اور آخری دونوں (اسموں **أيمانهم** اور **شمائلهم**) کے ساتھ فعل کو حرف مجاوزۃ (یعنی ''عن'') کے متعدی کیا۔**فان الآتی منهما**

کالمنحرف عنهم المار علی عرضهم۔ کیونکہ ان دونوں جانبوں سے آنے والا گویا کہ ان سے انحراف کر رہا ہے اور ان پر سے عرضاً گذر رہا ہے۔ اس کی نظیر جلست عن یمینه ہے۔

قوله: أعوذ بعظمتك أن: ایک نسخہ میں: من أن ہے أغتال: صیغۂ مجہول کے ساتھ ہے، دھوکہ سے کسی ایسی جگہ لے کر قتل کرنا جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: تمام جہات کا ذکر فرمایا چونکہ آفات انہی اطراف سے آتی ہیں اور نیچے کی جہت میں مبالغہ فرمایا، چونکہ اس سمت سے آنے والی آفات بہت گھٹیا ہوتی ہیں۔ ابن حجر نے اس کی جو توضیح کی ہے وہ نا قابل التفات ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں: لأنه لا حیلة فی دفع ما یخشی وقوعه فیها بخلاف بقیة الجهات فانه یمکن فیها الحیلة حتی جهة الفوق۔

قوله: قال وکیع: یعنی الخسف: قاموس میں لکھتے ہیں: خسف الله بفلان الأرض، أی غیبه فیها۔

مذکورہ کلمات کو پڑھنے سے اللہ تعالیٰ گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے

۲۳۹۸: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ قَالَ حِیْنَ یُصْبِحُ اَللّٰهُمَّ اَصْبَحْنَا نُشْهِدُكَ وَنُشْهِدُ حَمَلَةَ عَرْشِكَ وَمَلٰئِكَتِكَ وَجَمِیْعَ خَلْقِكَ اِنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ وَحْدَكَ لَا شَرِیْكَ لَكَ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُكَ وَرَسُوْلُكَ اِلَّا غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ مَا اَصَابَهٗ فِیْ یَوْمِهٖ ذٰلِكَ مِنْ ذَنْبٍ وَاِنْ قَالَهَا حِیْنَ یُمْسِیْ غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ مَا اَصَابَهٗ فِیْ تِلْكَ اللَّیْلَةِ مِنْ ذَنْبٍ۔ (رواه الترمذی وابوداودو قال الترمذی هذا حدیث غریب)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ٤/ ٣٢٠ حدیث رقم ٥٠٧٨۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص صبح کے وقت کہے اے الٰہی ہم نے صبح کی اس حال میں کہ گواہ کرتے ہیں ہم تجھ کو اور گواہ کرتے ہیں ہم تیرے عرش کے اٹھانے والوں کو اور تیرے فرشتوں کو اور تیری سب مخلوقات کو ساتھ اس کے کہ تحقیق تو اللہ ہے کوئی معبود نہیں ہے مگر تو اللہ ہے تیرا کوئی شریک نہیں ہے یعنی اھل وصفات میں اور تحقیق محمد ﷺ تیرے بندے ہیں اور تیرے رسول ہیں۔ کوئی شخص نہیں کہتا یہ کلمے صبح مگر اللہ تعالیٰ اس کے وہ گناہ بخش دیتا ہے جو اس سے صادر ہوئے ہیں اس دن میں یعنی سوائے کبیرہ گناہوں اور حقوق العباد کے اور اگر ان کلمات کو شام کے وقت کہے اللہ تعالیٰ اس کے وہ گناہ بخش دیتا ہے جو کہ صادر ہوئے ہوتے ہیں اس سے رات میں نقل کیا۔ اس کو امام ترمذیؒ اور ابوداؤدؒ اور امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: قوله: اللهم أصبحنا نشهدك: ان کلمات کا صبح و شام پڑھنا درحقیقت شہادت کا اقرار بھی ہے، تاکید بھی ہے اور تجدید بھی ہے، اور عرض حال بھی ہے کہ اے اللہ ہم شہادت کے عہد و پیمان سے غافل نہیں۔

قوله: ونشهد حملة عرشك وملائكتك وجمع خلقك: ملائكتك کا عطف "حملة" پر ہو رہا ہے، لہٰذا منصوب ہے، تعمیم بعد التخصیص ہے، اور وجمیع خلقك دوسری تعمیم ہے۔ أنك: ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ (اور باء حرف محذوف ہے)۔ أی علی شهادتی واعترافی بأنك۔

قوله: الا غفر الله له......تلك اللیلة من ذنب: یہ مستثنیٰ مفرغ ہے، بشرط مذکور کے جواب محذوف سے۔ أی ما قال قائل هذا الدعا الا غفر الله له۔ ایک نسخہ میں "فی لیلته تلك" کے الفاظ ہیں۔ "ذنب" (تنوین برائے تعمیم ہے)۔ أی: أیّ ذنب

تعالیٰ بھی ہر آن متحضر ہے: ﴿ان اللّٰه لا يغفر أن يشرك به ويغفر ما دون ذلك لمن يشاء﴾

ما أصابه في يوم ذلك: جملہ مَنْ قَالَ حِينَ يُصْبِحَ میں من معنی کے اعتبار سے نافیہ کی جگہ استعمال ہوا ہے نیز یہ ممکن ہے کہ اِلَّا غَفَرَ اللّٰہُ لَہٗ میں لفظ اِلَّا زائد ہو چنانچہ جملہ وَاِنْ قَالَهَا...... سے اسی کی تائید ہوتی ہے کہ لفظ اِلَّا زائد ہے۔

فائدہ: حصن کی روایت میں "نشهد" کے بجائے صیغۂ مفرد کے ساتھ مذکور ہے۔

صبح وشام کے پڑھنے کا وظیفہ

۲۳۹۹: وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا مِنْ عَبْدٍ مُسْلِمٍ يَقُوْلُ اِذَا اَمْسٰى وَاِذَا اَصْبَحَ ثَلَاثًا رَضِيْتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالْاِسْلَامِ دِيْنًا وَبِمُحَمَّدٍ نَبِيًّا اِلَّا كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ اَنْ يُرْضِيَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (رواه احمد والترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ١٣٣/٥ حديث رقم ٣٤٤٩۔ وابن ماجه ١٢٧٣/٢ حديث رقم ٣٨٧٠۔ واحمد فی المسند ٣٦٧/٥

ترجمہ: حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جوکوئی مسلمان بندہ شام اور صبح کے وقت تین بار کہے کہ اللہ کے ربّ ہونے پر اور اسلام کے دین ہونے پر اور محمد (ﷺ) کے نبی ہونے پر راضی ہوں تو ازارہِ فضل وکرم اللہ تعالیٰ پر لازم ہوگا کہ اس کو قیامت کے دن راضی کرے (یعنی اتنا ثواب دے گا کہ وہ راضی ہو جائے گا)۔اس کو امام احمدؒ اور ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: مامن عبد مسلم يقول...... ثلاثا: ابن الملکؒ فرماتے ہیں: (مسلم کی) تنوین برائے تعظیم ہے۔ أی کامل فی اسلامه۔ ابن حجر نے اس قول کی اتباع کی ہے۔اور اظہر یہ ہے کہ تنوین محض تنکیر کیلئے ہے جیسا کہ من استغراقیہ کے عموم سے سمجھ آ رہا ہے۔

"ثلاثا" (کی تمیز محذوف ہے۔) أی: يقول ثلاث كلمات بمعنی جمل مفيدة۔ ثلاثًا کی تقدیم اس پر دال ہے۔اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اصول معتمدہ میں یہ موجود ہی نہیں ہے۔

قوله: رضيت بالله رباو بالاسلام دينا وبمحمد رسولا: "ربا" تمیز ہے۔

رب سے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تمام احکام شرعیہ اور قضاء قدر پر راضی ہوں اور اگلے جملہ میں تمام مذاہب یہودیت ونصرانیت وغیرہ سے براءت کا اظہار ہے۔اور محمد عربی ﷺ پر ایمان لانا مراتب ایمان کے اجمالاً قبول کو لازم ہے۔

قوله: الاكان حقا على الله أن يرضيه يوم القيامة: "كان" کی خبر ہے، اور اسم مؤخر ہے أن يرضيه يوم القيامة۔ اور پورا جملہ "ما" کی خبر ہے۔اور استثناء مفرغ ہے۔

فائدہ: حصن میں "رضيت" بصیغۂ مفرد کے بجائے بصیغۂ جمع "رضينا" مروی ہے، اور "نبياً" کے بجائے رسولا ہے، نیز ثلاث کے الفاظ موجود نہیں ہیں۔(گویا حصن کی روایت یوں ہے: رضينا بالله ربا وبالاسلام دينا وبمحمد رسولا) اور فرماتے ہیں: اس حدیث کو اصحاب اربعہ، امام حاکم، احمد اور طبرانی نے بھی روایت کیا ہے۔

امام میرکؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث نبی کریم ﷺ کے خادم ابو سلام سے مروی ہے۔ابن البرؒ فرماتے ہیں: یہی صحیح ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ اس حدیث کے راوی ثوبان ہیں۔اور صاحب حصن نے رضیت بصیغۂ مفرد، نبیا ثلاث مرات کے ساتھ ذکر کیا ہے۔اور فرمایا: اس حدیث کو ابن ابی شیبہ اور ابن السنی نے روایت کیا ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: بعض روایتوں میں لفظ نبیا ہے اور بعض میں رسولاً لہٰذا مستحب یہ ہے کہ دونوں ہی لفظ پڑھے جائیں یعنی یوں

کہا جائے وَبِمُحَمَّدٍ نَبِيًّا وَ رَسُوْلاً۔ اور اگر کسی ایک پر اکتفاء کرلے تو تب بھی عامل بالحدیث ہوگا اھ۔

" نبیا" کو "رسولا" پر مقدم فرمایا حالانکہ آخر کے الفاظ جمہور کی روایت کے ہیں۔ چونکہ وصف نبوت، وصف رسالت پر وجود کے اعتبار سے مقدم ہے۔ یا عموم وخصوص مراد ہے۔ واللہ اعلم۔

سوتے وقت کی مسنون دعا

۲۴۰۰: وَعَنْ حُذَيْفَةَ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ اِذَا اَرَادَ اَنْ يَنَا مَ وَضَعَ يَدَهٗ تَحْتَ رَأْسِهٖ ثُمَّ قَالَ اَللّٰهُمَّ قِنِي عَذَابَكَ يَوْمَ تَجْمَعُ عِبَا دَكَ اَوْ تَبْعَثُ عِبَادَكَ۔ (رواہ الترمذی واحمد عن البراء)

اخرجه الترمذی فی السنن ١٣٧/٥ حديث رقم ٣٤٥٨۔ وابن ماجه ١٣٧٦/٢ حديث رقم ٣٨٧٧۔

ترجمہ: حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جس وقت سونے کا ارادہ کرتے تھے اپنا ہاتھ اپنے سر کے نیچے رکھتے۔ پھر کہتے اے الٰہی مجھ کو بچا اپنے عذاب سے اس دن کہ جس دن تو جمع کرے گا تو اپنے بندوں کو یا فرمایا تو اٹھائے گا اپنے بندوں کو یعنی راوی کو شک ہوا ہے کہ تَجْمَعُ عبادك کہا یا بجائے اس کے تَبْعَثُ عِبَادَكَ کہا اس کو امام ترمذیؒ نے اور احمد نے براء سے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: وضع يده تحت رأسه: ایک روایت میں (یدہ کے ساتھ) الیمنی (کا اضافہ بھی) ہے۔ نیز ایک اور روایت میں (تحت رأسه کے بجائے) تحت خده کے الفاظ ہیں۔ یہ اختلاف اختلاف اوقات پر محمول ہے، ہر راوی نے اپنی رؤیت کے اعتبار سے ذکر کیا ہے۔ بابرکت ہاتھ کا کچھ حصہ رخسار مبارک کے نیچے ہوتا تھا، اور کچھ حصہ سر مبارک کے نیچے ہوتا تھا۔ ہر راوی نے اس کیفیت کو اپنے غلبۂ اعتبار کے لحاظ سے ذکر کیا ہے۔

اس روایت میں تو یہ ہے کہ "آپ ﷺ دست مبارک سر کے نیچے رکھتے تھے" جب کہ ایک اور روایت میں منقول ہے کہ رخسارۂ مبارک کے نیچے رکھتے تھے لہٰذا ان دونوں روایتوں میں یوں مطابقت پیدا کی جائے کہ آپ ﷺ اپنا ہاتھ کبھی تو سر کے نیچے رکھتے ہوں گے اور کبھی رخسارِ مبارک کے نیچے جس راوی نے جو دیکھا اس کو روایت کر دیا یا یہ کہ ہاتھ کا کچھ حصہ تو سر کے نیچے ہوتا ہوگا اور کچھ حصہ رخسارہ کے نیچے۔ لہٰذا جس راوی نے ہاتھ کا کچھ حصہ سر کے نیچے دیکھا اس نے یہ بیان کیا کہ آپ ﷺ اپنا ہاتھ سر کے نیچے رکھتے تھے اور جس راوی نے ہاتھ کا کچھ حصہ رخسارہ کے نیچے اس نے رخسارہ کے نیچے رکھنے کو ذکر کیا۔

قوله: تجمع عبادك أو تبعث عبادك : راوی کو شک ہے یا پہلی روایت کی تفسیر ہے۔

عرض مرتب: دائیں کروٹ پر لیٹنے کی حکمت حدیث: ۲۳۸۲ کے تحت ملاحظہ فرمائیے اھ۔

۲۴۰۱: **واحمد عن البراء۔**

اخرجه احمد فی المسند ٢٨١/٤۔

امام احمد نے اس روایت کو براءؓ سے نقل کیا ہے"۔

قوله: وأحمد: ایک نسخہ میں "ورواہ احمد" ہے۔

سونے کا مسنون طریقہ

۲۴۰۲: وَعَنْ حَفْصَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ كَا نَ اِذَا اَرَادَ اَنْ يَرْقُدَ وَضَعَ يَدَهُ الْيُمْنٰى تَحْتَ خَدِّهٖ ثُمَّ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ

قِنِی عَذَابَكَ يَوْمَ تَبْعَثُ عِبَادَكَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ۔ (رواه ابوداود)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ٣١٠/٤ حديث رقم ٥٠٤٥۔

ترجمہ: حضرت حفصہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب سونے کا ارادہ کرتے تھے۔تو اپنا دایاں ہاتھ اپنے گال یعنی (رخسار) کے نیچے رکھتے۔پھر تین بار کہتے الٰہی تو مجھ کو اپنے اس دن کے عذاب سے بچا جس دن تو اپنے بندوں کو اٹھائے گا اس کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: اللهم......ایک روایت میں (اللھم کے بجائے) ''رب'' کے الفاظ ہیں۔

قوله:تبعث عبادك:ایک روایت میں (تبعث عبادك کے بجائے) ''تجمع عبادك'' کے الفاظ ہیں۔

قوله ثلاث مرات:اور ایک نسخہ میں (ثلاث مرات کے بجائے) ''ثلاث مرار'' کے الفاظ ہیں۔

سوتے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ مذکورہ دعا پڑھا کرتے تھے

۲۴۰۳:وَعَنْ عَلِيٍّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَا نَ يَقُوْلُ عِنْدَ مَضْجَعِهٖ اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَعُوْذُ بِوَجْهِكَ الْكَرِيْمِ وَكَلِمَاتِكَ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّمَا اَنْتَ اٰخِذٌ بِنَاصِيَتِهٖ اَللّٰهُمَّ اَنْتَ تَكْشِفُ الْمَغْرَمَ وَالْمَأْ ثَمَ اَللّٰهُمَّ لَا يُهْزَمُ جُنْدُكَ وَلَا يُخْلَفُ وَعْدُكَ وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ۔ (رواه ابو داود)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ٣١٢/٤ حديث رقم ٥٠٥٢۔

ترجمہ: حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سوتے وقت فرماتے تھے اے الٰہی تحقیق میں پناہ مانگتا ہوں ۔تیری بزرگی کے ساتھ اور تیرے پورے کلمات کے ساتھ یعنی اسماء صفات کے اور اس چیز کی برائی سے کہ اس کی پیشانی کے بال پکڑنے والا ہے۔یعنی جو چیز تیرے قبضہ قدرت میں ہے یعنی ہر چیز کی برائی سے۔الٰہی تو قرض کو دور کرتا ہے اور گناہ کو۔اے الٰہی شکست نہیں دیا جاتا۔تیرا لشکر آخر الامر میں مغلوب نہیں ہوتا اور تیرا وعدہ خلاف نہیں کیا جاتا اور دولتمند کو تیرے عذاب سے دولتمندی نفع نہیں دیتی بلکہ عمل صالح نفع دیتے ہیں۔تو پاک ہے اور پاکی بیان کرتا ہوں تیری تعریف کے ساتھ۔اس کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

استغفار کی فضیلت

۲۴۰۴:وَعَنْ اَبِیْ سَعِيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ قَالَ حِيْنَ يَأْوِیْ اِلٰی فِرَاشِهٖ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَيُّوْمُ وَاَ تُوْبُ اِلَيْهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ غَفَرَاللّٰهُ لَهٗ ذُنُوْ بَهٗ وَاِنْ كَانَتْ مِثْلَ زَبَدِ الْبَحْرِ اَوْعَدَ دَ رَمْلِ عَالَجٍ اَوْ عَدَ دَوَرَقِ الشَّجَرِ اَوْعَدَدَ اَيَّامِ الدُّنْيَا۔ (رواه الترمذی وقال هذا حديث غريب)

اخرجه الترمذی فی السنن ١٣٧/٥ حديث رقم ٣٤٥٧۔

ترجمہ: حضرت ابی سعیدؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص اپنے بچھونے پر جاتے ہوئے کہے کہ میں اس اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے وہ زندہ قیوم ہے اور میں توبہ کرتا ہوں اس کی طرف تین بار تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو بخش دیتا ہے اگر چہ وہ دریا کی جھاگ کے برابر ہوں۔یا ریت کے ذروں کے برابر یا درخت کے پتوں کی تعداد کے برابر یا دنیا کے دنوں کی گنتی کے برابر۔اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا

ہے یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: **قوله:أستغفر الله الذی لا اله الا هو الحی القیوم:** عرض مرتب:اس کی ترکیب جاننے کیلئے حدیث:۲۳۵۴ ملاحظہ فرمایئے ۔

واتوب الیه: اس کی تشریح ابھی گزری۔

قوله:من قال......ثلاث مرات: ''ثلاث مرات'' قال کاظرف ہے۔

قوله:غفر الله له ذنوبه۔ عرض مرتب:اس کی تشریح ماقبل گذر چکی ہے۔

قوله:وان کانت مثل زبد البحرأ وعدد رمل عالج: ''کانت'' کی ضمیر ''ذنوب'' کی طرف راجع ہے۔اور''أو'' برائے تنویع ہے۔

لفظ''عالج'' کی تحقیق:

''**عالج**''لام کے کسرہ کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے،اورلام کے فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے۔یہ اسم منصرف ہے،اوربعض کا کہنا ہے کہ غیر منصرف ہے۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں:اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں ریت بہت زیادہ ہو۔صاحب النہایہ لکھتے ہیں: **العالج ما تراکم من الرمل و دخل بعضه علی بعض، وجمعه عوالج۔** ''التحریر'' میں لکھا ہے: **عالج موضع مخصوص** ۔اوربعض کا کہنا ہے ''عالج''،مغرب میں واقع ایک عریض وطویل ریتلی وادی کا نام ہے۔

امام میرکؒ فرماتے ہیں: روایت (میں یہ لفظ) اضافت کے ساتھ ہے، چنانچہ صاحب النہایہ کے قول کی توجیہہ یہ ہوگی کہ یہ **اضافة الموصوف الی الصفة** کے قبیل سے ہے۔یا یہ اضافت''بیانیہ'' ہے۔اور''**عدد**''منصوب ہے۔اس کا عطف''**مثل**'' پر ہورہا ہے، اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مجرور ہواوراس کا عطف''زبد'' پر ہورہا ہو۔اگلی عبارت کی ترکیب بھی اسی طرح ہے۔

اس حدیث میں ان تمام چیزوں کو بطور مثال بیان کرنے کی غرض یہ بتانا ہے کہ اگر گناہ بہت زیادہ ہوں گے تب بھی بخشے جائیں گے۔

قوله:عدد أيام الدنيا: میں احتمال ہے کہ دنیا کے اوقات اور گھنٹے مراد ہوں۔

قرآن پاک کی سورت کے پڑھنے کی برکت سے اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ مقرر فرمادیتے ہیں

۲۴۰۵:وَعَنْ شَدَّادِ بْنِ اَوْسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَأْخُذُ مَضْجَعَهٗ بِقِرَاءَ ةِ سُوْرَةٍ مِّنْ كِتَابِ اللّٰهِ اِلَّا وَكَّلَ اللّٰهُ بِهٖ مَلَكًا فَلَا يَقْرَبُهٗ شَىْءٌ يُؤْذِيْهِ حَتّٰى يَهُبَّ مَتٰى هَبَّ۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ١٤١/٥ حدیث رقم ٣٤١٨۔

ترجمہ: حضرت شدا بن اوسؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشادفرمایانہیں ہے کوئی مسلمان کہ جب اپنی خوابگاہ میں آ کر کوئی کسی سورت کو پڑھے ۔مگر کہ اللہ تعالیٰ متعین کرتا ہےاس کے ساتھ ایک فرشتہ کہ ضرر کرنے والی چیزوں سے نگہبانی کرے پس اس کے کوئی چیز نزدیک نہیں ہوتی' جواس کوایذا دے۔ یہاں تک کہ جاگے جس وقت جاگے۔یعنی دیر کے بعد خواہ جلدی اس کوامام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله:ما من مسلم يأخذ مضجعه يقرأ سورة:** ایک روایت میں یوں ہے: **ما من رجل يأوی الی فراشه فيقرأ سورة:** امام میرکؒ حاشیہ حصن میں لکھتے ہیں: ترمذی اور جامع الاصول کی روایت میں بصیغۂ مضارع آیا ہے،لیکن مصابیح کے بہت

سارے نسخوں میں ''بقراء ۃ'' آیا ہے۔امام طیبیؒ لکھتے ہیں:أی مقتضی القراء ۃ سورۃ۔(یعنی مقتضیا سے متعلق ہے جو حال واقع ہو رہا ہے)۔اور بعض کا کہنا ہے(متلبسا کے متعلق ہے)۔أی:متلبسابھا۔ الا و کل اللّٰہ بہ ملکا:استثناء مفرغ ہے۔

قولہ:الا و کل اللّٰہ بہ ملکا فلا یقر بہ شئ یؤ ذیہ ......:

حصن کی روایت میں یوں ہے:الا بعث اللّٰہ الیہ ملکًا یحفظہ من کل شئ یؤ ذیہ

حصن میں لکھا ہے:اس حدیث کو امام احمدؒ نے روایت کیا ہے۔اور بزار نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے:

اذا وضعت جنبك علی الفراش وقراء ت فاتحۃ الکتاب وقل ھو اللّٰہ احد فقد أمنت من کل شئ الا الموت:(آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا)جب تم اپنے بستر پر اپنا پہلو رکھو یعنی سونے لگو اور اس وقت سورۂ فاتحہ اور سورۂ قل ھو اللّٰہ پڑھ لو تو (جب تک سوتے رہو گے'موت کے علاوہ ہر چیز سے حفاظت میں رہو گے)۔

امام ابن ابی داوٗد نے حضرت علی کرم اللہ وجہ سے موقوفاً نقل کیا ہے:

ما کنت أری أحدا یعقل ینام قبل أن یقرأ الآیات الثلاث الأواخر من البقرۃ۔ اس حدیث کی سند شیخین کی شرط پر ہے۔

نماز کے بعد اور سوتے وقت تسبیحات کا بیان

۲۴۰۶:وَعَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرِوبْنِ الْعَاصِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم خَلَّتَانِ لَا یُحْصِیْھِمَا رَجُلٌ مُسْلِمٌ اِلَّا دَخَلَ الْجَنَّۃَ اَلَا وَھُمَا یَسِیْرٌ وَمَنْ یَّعْمَلُ بِھِمَا قَلِیْلٌ یُسَبِّحُ اللّٰہَ فِیْ دُبُرِ کُلِّ صَلَاۃٍ عَشْرًا وَیَحْمَدُہٗ عَشْرًا وَیُکَبِّرُہٗ عَشْرًا قَالَ فَاَنَا رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم یَعْقِدُھَا بِیَدِہٖ قَالَ فَتِلْكَ خَمْسُوْنَ وَمِائَۃٌ بِاللِّسَانِ وَاَلْفٌ وَخَمْسُ مِائَۃٍ فِی الْمِیْزَانِ وَاِذَا اَخَذَا مَضْجَعَہٗ یُسَبِّحُہٗ وَیُکَبِّرُہٗ وَیَحْمَدُہٗ مِائَۃً فَتِلْكَ مِائَۃٌ بِاللِّسَانِ وَاَلْفٌ فِی الْمِیْزَانِ فَاَیُّکُمْ یَعْمَلُ فِی الْیَوْمِ وَاللَّیْلَۃِ اَلْفَیْنِ وَخَمْسَ مِائَۃِ سَیِّئَۃٍ قَالُوْا وَکَیْفَ لَا نُحْصِیْھِمَا قَالَ یَأتِیْ اَحَدَکُمُ الشَّیْطَانُ وَھُوَ فِیْ صَلَاتِہٖ فَیَقُوْلُ اُذْکُرْ کَذَا اُذْکُرْ کَذَا حَتّٰی یَنْفَتِلَ فَلَعَلَّہٗ اَنْ لَّا یَفْعَلَ وَیَاتِیْہِ فِیْ مَضْجَعِہٖ فَلَا یَزَالُ یُنَوِّمُہٗ حَتّٰی یَنَامَ (رواہ الترمذی وابوداود والنسائی وفی روایۃ ابی داود) قَالَ خَصْلَتَانِ اَوْ خَلَّتَانِ لَا یُحَافِظُ عَلَیْھِمَا عَبْدٌ مُسْلِمٌ وَکَذَا فِیْ رِوَایَتِہٖ بَعْدَ قَوْلِہٖ وَاَلْفٌ وَخَمْسُ مِائَۃٍ فِی الْمِیْزَانِ قَالَ یُکَبِّرُ اَرْبَعًا وَّثَلَاثِیْنَ اِذَا اَخَذَ مَضْجَعَہٗ وَیَحْمدُ ثَلَاثًا وَّثَلَاثِیْنَ وَیُسَبِّحُ ثَلَاثًا وَّثَلَاثِیْنَ وَفِیْ اَکْثَرِ نُسَخِ الْمَصَابِیْحِ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عُمَرَ۔

اخرجہ ابوداؤد ۳۱۶/۴ حدیث رقم ۵۰۶۵۔ والترمذی فی السنن ۱۴۳/۵ حدیث رقم ۳۴۷۱۔ واخرجہ النسائی حدیث رقم۔

ترجمہ:حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دو چیزیں ہیں کہ محافظت نہیں کرتا' ان پر مسلمان مرد مگر بہشت میں داخل ہوتا ہے یعنی نجات پانے والوں کے ساتھ داخل ہوگا۔خبردار ہو جاؤ وہ دونوں چیزیں آسان ہیں۔ان پر عمل کرنے والے کم ہیں یعنی ان پر مداومت کرنے والے نادر ہیں'ایک تو یہ ہے کہ پاکی بیان کرے اللہ کی ہر فرض نماز کے بعد(یعنی سبحان اللّٰہ)دس بار کہے اور اللہ کی حمد کرے یعنی الحمد اللّٰہ کہے دس مرتبہ اور اللّٰہ اکبر کہے دس مرتبہ۔ابن عمرو نے کہا ہے پس میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ وہ ان کو گن رہے تھے اپنے ہاتھ سے یعنی انگلیوں پر۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ ڈیڑھ سو ہیں۔(یعنی پانچوں نمازوں کی وجہ سے)زبان پر اور ڈیڑھ ہزار

میزان میں ہے۔یعنی میزان میں اس حساب سے کہ ہر نیکی دس کے برابر لکھی جاتی ہے اور دوسری چیز یہ ہے کہ جب سونے کے لیے بستر پر جائے تو اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرے اور بہت زیادہ تکبیر کہے اور جو شخص ان کلمات کو سو بار پڑھے گا یعنی سبحان اللہ ۳۳ بار الحمد للہ ۳۳ بار، اللہ اکبر ۳۴ بار۔ پس یہ سو مرتبہ زبان پر ہے اور میزان میں ہزار ہیں پس تم میں سے کون شخص ہے جو دن رات میں اڑھائی ہزار برائیاں کرتا ہوگا صحابہؓ نے عرض کیا ہم کس طرح ان چیزوں میں کہ وہ اپنی نماز میں ہوتا ہے جب شیطان تم میں سے کسی کے پاس آتا ہے اس حال میں وہ کہ اپنی نماز میں ہوتا ہے پھر شیطان کہتا ہے فلانی چیز کو یاد کر فلانی چیز کو یاد کر یعنی امورِ دنیا اور احوالِ نفسانیہ سے یا جو کہ کچھ کہ نماز کے ساتھ متعلق نہیں اگر چہ امور آخرت سے ہو۔ یہاں تک کہ نماز پڑھ کر پھرتا ہے پس شاید کہ وہ ان کلمات پر مخاطب نہ کرے اور شیطان اس کی خوابگاہ میں آتا ہے۔ پس ہمیشہ سلاتا رہتا ہے اس کو یہاں تک کو سو جاتا ہے اس کو امام ترمذیؒ اور ابوداؤدؒ اور نسائیؒ نے ابوداؤد کی روایت میں اختلاف ہے بعض لفظوں میں اسی طرح سے آیا ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا دو خصلتیں ہیں یا فرمایا دو خصلتیں ہیں راوی کو شک ہو گیا ہے کہ وہ لفظ فرمایا یا یہ یعنی دونوں ایک ہی ہیں یعنی دو چیزیں ہیں کہ ان پر مسلمان بندہ محافظت نہیں کرتا بجائے لَا یَحْصِیْهِمَا رَجُلٌ مُسْلِم کے لَا یُحَافِظُ عَلَیْهِمَا عَبْدٌ مُسْلِمٌ ہے اور اسی طرح سے ابوداؤد کی روایت میں ہے ان کے قول کے پیچھے وَاَلْفٌ وَخَمْسُ مِائَةٍ فِی الْمِیْزَانِ کے اس طرح ہے کہ فرمایا اور تکبیر کہے چونتیس مرتبہ جس وقت اپنے سونے کی جگہ پر آئے اور تینتیس مرتبہ حمد کرنے اور تینتیس مرتبہ حمد کرے اور تسبیح کرے مرتبہ اور مصابیح کے اکثر نسخوں میں عبداللہ بن عمرؓ ہے یعنی یہ اور فائدہ ذکر کیا گیا ہے کہ مؤلف نے عبداللہ بن عمرو بن العاص سے یہ حدیث نقل کی ہے اور مصابیح کے اکثر نسخوں میں عبداللہ بن عمرؓ سے ہے۔

تشریح: **قوله عن عبد الله بن عمرو بن عاص :** لفظ ''عاص'' کی تحقیق ماقبل میں بہت تفصیل کے ساتھ گزر چکی ہے۔

قوله:خلتان لا يحصيهما رجل مسلم الا دخل الجنة: ''خلتان'' خاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ ایک روایت میں (**لا يحصيهما** کے بجائے) **لا يحافظ عليها** کے الفاظ ہیں۔اور ''**الا دخل الجنة**''میں استثناء مفرغ ہے۔

قوله:الا وهما يسير ومن يعمل بهما قليل: ''**الا**'' حرف تنبیہ ہے۔'' **وهما يسير**''جملہ معترضہ ہے۔ واؤ حالیہ ہے، اور عاملہ معنی تنبیہ ہے۔

قوله: يسبح الله: یہ جملہ **خلتان** کا بیان ہے، اور ضمیر رجل مسلم کی طرف عائد ہے۔**قال: فتلك:** ایک نسخہ میں ''**فقال**'' ہے۔ **و اذا أخذ مضجعه** خلّت ثانیہ کا بیان ہے، اور **اذا** ظرفیت مجردہ کیلئے ہے۔**فأيكم يعمل:** فاء، شرط محذوف کا جواب ہے۔ اور استفہام میں ایک قسم کے انکار کے معنی ہیں۔**و كيف لا نحصيها:** ایک نسخہ میں **لا نحصيهما** ہے۔**يأتي أحدكم:أحدكم** مفعول مقدم ہے۔**فلعله:** یہ فاء شرط محذوف کی جزاء ہے۔

يعقدها بيده: ''ید'' سے مراد اصابع، انامل اور عقد تینوں ہو سکتے ہیں۔ابن حجر لکھتے ہیں:**مر الأمر بالعقد الأنامل فى حديث فيحتمل أنه مخير ويحتمل أن المراد باليد الأنامل، ويحتمل العكس**۔حقیقی معنی پر محمول کرنا، مجازی معنی پر محمول کرنے سے اولیٰ ہے۔نیز اَنامل کو ذکر کر کے ''ید'' مراد لینا مقصود سے انتہائی بعید بات ہے۔فتأمل۔

پس تم میں سے کون ہے؟ یہ جواب ہے شرط محذوف کا اور اس استفہام میں ایک طرح کا انکار ہے یعنی اس استفہامیہ جملہ کا حاصل یہ ہے کہ جب ان دونوں چیزوں پر محافظت کی اور اس کے بدلہ میں دن رات میں ڈھائی ہزار نیکیاں حاصل ہوئیں تو ان میں سے ہر نیکی

کے بدلہ برائیاں دور کی جاتی ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّئَاتِ (بلاشبہ نیکیاں برائیوں کو دور کرتی ہیں)۔

لہٰذا تم میں سے ایسا کون ہے جو دن رات میں ان نیکیوں سے زیادہ برائیاں کرتا ہے اور جتنی بھی برائیاں کرتا ہو وہ ان نیکیوں کی وجہ سے معاف نہ ہو جاتی ہوں' اس لئے ایسی صورت میں تمہارے لئے یہ بات کیسے بہتر ہو سکتی ہے کہ تم ان دونوں چیزوں پر محافظت نہ کرو' حاصل یہ کہ ان دونوں چیزوں پر عمل کرنے سے نیکیاں برائیوں سے کہیں زیادہ ہو جاتی ہیں اور پھر نہ صرف یہ کہ وہ برائیاں ان نیکیوں کی وجہ سے دور ہو جاتی ہیں بلکہ نیکیوں کی زیادتی کی وجہ سے درجات بھی بلند ہو جاتے ہیں' لہٰذا تمہیں چاہئے کہ تم پابندی کے ساتھ ان دونوں چیزوں پر عمل کرتے رہو پھر جب صحابہؓ نے ان دونوں چیزوں کا اتنا زیادہ ثواب اور ان کی اتنی فضیلت سنی تو کہنے لگے کہ جب یہ بات ہے تو پھر ہمارے لئے ایسی کوئی چیز مانع نہیں ہو سکتی کہ ہم ان دونوں چیزوں پر محافظت نہ کریں گویا انہوں نے ان چیزوں کے ترک کرنے سے بعید جانا مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس استبعاد (یعنی بعید جاننے کی) تردید فرمائی کہ شیطان جو انسان کی نیکی کا ازلی دشمن ہے۔اپنی گھات میں رہتا ہے وہ کب برداشت کرتا ہے کہ کوئی شخص اتنی عظیم سعادت کو حاصل کر لے اس لئے وہ نماز میں وسوسے پیدا کرتا ہے یہاں تک کہ وہ نماز کے بعد کے اوراد و اذکار سے غافل کر دیتا ہے اسی طرح وہ سوتے وقت ذکر سے غافل کر کے سلا دیتا ہے۔

صبح و شام کے وقت مذکورہ دعا پڑھنے کی فضیلت

۲۴۰۷:وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ غَنَّامٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم مَنْ قَالَ حِیْنَ یُصْبِحُ اَللّٰهُمَّ مَا اَصْبَحَ بِیْ مِنْ نِعْمَةٍ اَوْ بِاَحَدٍ مِنْ خَلْقِكَ فَمِنْكَ وَحْدَكَ لَا شَرِیْكَ لَكَ فَلَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ فَقَدْ اَدّٰی شُكْرَ یَوْمِهٖ وَمَنْ قَالَ مِثْلَ ذٰلِكَ حِیْنَ یُمْسِیْ فَقَدْ اَدّٰی شُكْرَ لَیْلَتِهٖ۔ (رواہ ابوداود)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ٣١٦/٤ حديث رقم ٥٠٧٣۔

ترجمہ:حضرت عبداللہ بن غنام سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص صبح کے وقت کہے اے الٰہی جو چیز مجھ کو صبح کے وقت حاصل ہوئی نعمت سے یعنی دینی اور دنیاوی اور ظاہری اور باطنی یا کسی تیری مخلوق سے پس تیری ہی طرف سے ہے تو تنہا ہے نہیں کوئی شریک تیرا' پس تیرے ہی لیے تعریف ہے اور تیرے لیے شکر ہے پس جو شخص یہ دعا صبح کے وقت پڑھے پس تحقیق اس نے اس دن کا شکر ادا کیا اور جو شخص اسی کی طرح (یعنی یہی دعا) شام کے وقت پڑھے پس تحقیق اس نے رات کا شکر ادا کیا۔اس کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

عبداللہ بن غنام۔یہ عبداللہ بن غنام کو بیاضی بھی کہا جاتا ہے۔ان کا شمار اہل حجاز میں ہوتا ہے۔ان کی صحابیت مختلف فیہ ہے۔بہرحال ان سے صرف ایک حدیث مروی ہے۔ان کی حدیث ''دعاء'' کے بارے میں **ربيعة بن ابی عبدالرحمٰن عن عبد الله بن عنبسة عن عبد الله بن غنام** سند کے ساتھ مروی ہے۔

تشریح: **قوله: عن عبدالله بن غنام**:غین معجمہ کے فتحہ اور نون کی تشدید کے ساتھ، یہ وہی ہیں جن کو ''بیاضی'' کہا جاتا ہے۔

قوله: اللهم ما اصبح بي من نعمة أو بأحد من خلقك فمنك وحدك لاشريك لك:

''أو'' برائے تنویع ہے۔اور مراد تعمیم ہے۔''وحدك''،ضمیر مجرور بحرف جر'' **فمنك** '' سے حال ہے۔أي: **فحاصل منك منفردا**۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ فاء جواب شرط پر داخل ہے، جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ہے:﴿وما بكم من نعمة فمن الله﴾[النحل:۵۳]اور جزاء کیلئے یہ شرط ہے کہ وہ شرط کیلئے سبب ہو،اس آیت مبارکہ میں یہ مفہوم اس صورت میں درست ہے کہ اخبار و تنبیہ علی الخطا مانی جائے،کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتے تھے، بلکہ معاصی کے ذریعہ ان کا انکار کرتے تھے۔تو ان سے خطاب کر کے کہا گیا:ان أخبركم بأن ما التبس بكم من نعم الله تعالىٰ وأنتم لا تشكرونها سبب لأن أخبركم بأنها من الله تعالىٰ حتى تقوموا بشكرها،اور حدیث میں اس کے برعکس ہے:اني أقرو أعترف بأن كل النعم الحاصلة الواصلة من ابتداء الحياة الى انتهاء دخول الجنة فمنك وحدك، فأوزعني أن أقوم بشكرها ولا أشكر غيرك فيها اھ۔ یہاں بھی ابن حجرؒ نے اپنی عادت کے موافق عبارت سمجھے بغیر تعاقب کیا ہے۔

قوله: فلك الحمد ولك الشكر :بعض کا کہنا ہے کہ یہ مطلوب کی تقریر کیلئے ہے۔اسی وجہ سے خبر کو مبتدا پر مقدم کیا ہے جو مفید حصر ہے۔گویا قائل یوں کہہ رہا ہے:اذا كانت النعمة مختصة بك، فها أنا أنقاد اليك، وأخص الحمد والشكر لك قائلا لك:الحمد لا يغيركم ولك الشكر لا لأحد سواك۔

قوله: فقد أدى شكر...... حدیث مبارکہ کا یہ جملہ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ شکر نام ہے منعم حقیقی کے اعتراف اور ہر چھوٹی بڑی نعمت میں غور و فکر کرنے کا اور اس کا (یعنی شکر کا) کمال درجہ یہ ہے کہ حق نعمت بجالایا جائے اور منعم کی رضا کے موافق مصرف میں لایا جائے۔

سوتے وقت کی ایک اور دُعا

۲۴۰۸ :وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ اَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ اِذَا اَوٰى اِلٰى فِرَاشِهٖ اَللّٰهُمَّ رَبَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَرَبَّ كُلِّ شَيْءٍ فَالِقَ الْحَبِّ وَالنَّوٰى مُنْزِلَ التَّوْرَاةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ اَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ كُلِّ ذِیْ شَرٍّ اَنْتَ اٰخِذٌ بِنَاصِيَتِهٖ اَنْتَ الْاَوَّلُ فَلَيْسَ قَبْلَكَ شَيْءٌ وَاَنْتَ الْاٰخِرُ فَلَيْسَ بَعْدَكَ شَيْءٌ وَاَنْتَ الظَّاهِرُ فَلَيْسَ فَوْقَكَ شَيْءٌ وَاَنْتَ الْبَاطِنُ فَلَيْسَ دُوْنَكَ شَيْءٌ اِقْضِ عَنِّى الدَّيْنَ وَاَغْنِنِیْ مِنَ الْفَقْرِ۔

(رواه ابوداود والترمذی وابن ماجة ورواه مسلم مع اختلاف يسير)

اخرجه مسلم فی صحيحه ۲۰۸٤/٤ حديث رقم (٦١۔ ٢٧١٣)۔ وابوداؤد فی السنن ۳۱۲/٤ حديث رقم ۵۰۵۱۔ والترمذی ۱۳۸/۵ حديث رقم ۵۰۵۱۔

ترجمه:حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے وہ کہتے تھے جب آپ سونے کے لیے آتے تو کہتے اے الٰہی! اے آسمانوں کے پروردگار اور اے زمین کے پروردگار اور اے ہر چیز کے پروردگار اور اے دانے کے اور گٹھلی کے پھاڑنے والے۔یعنی ان کو پھاڑ کر زراعت اور کھجور کا درخت نکالنے والے اے توریت انجیل اور قرآن کے اتارنے والے۔میں پناہ مانگتا ہوں تیرے ساتھ برے کی برائی سے تو اس کی پیشانی کے بال پکڑنے والا ہے یعنی تیرے قبضہ قدرت میں ہے یعنی تو ہی پہلے ہے یعنی قدیم ہے بلا ابتداء کے پس تجھ سے پہلے کوئی چیز نہیں ہے اور تو ہی آخر ہے یعنی بغیر انتہا کے باقی ہے پس تیرے پیچھے کوئی چیز نہیں ہے اور تو ظاہر ہے یعنی باعتبار افعال وصفات کے۔پس تیرے اوپر کوئی نہیں ہے یعنی تیرے ظہور کے اوپر کوئی چیز تجھ سے ظاہر تر نہیں ہے اور تو پوشیدہ ہے یعنی باعتبار ذات کے۔پس کوئی چیز تجھ سے پوشیدہ نہیں ہے اور مجھ سے قرض یعنی اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق ادا کر دیجئے اور مجھ کو فقر سے غنی کر دے یعنی مخلوق کے محتاج ہونے سے یا دل کی محتاجگی سے اس کو ابوداؤدؒ اور

ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ اور اس کو مسلمؒ نے تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله عن النبي ﷺ انه كان يقول اذا اوى الى فراشه: حصن کی روایت میں'' يقول وهو مضطجع'' ہے۔

قوله: اللهم رب السموٰت ورب الأرض ورب كل شئ فالق الحب والنوى ومنزل التوراة والانجيل والفرقان: مسلم کی بعض روایات میں (السموٰت کے ساتھ) ''السبع'' کا اضافہ ہے۔اور حصن کی روایت میں ''ورب العرش العظيم'' کا اضافہ ہے۔اور (العظيم کو) مجرور منصوب دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔''ورب كل شئ'' تعمیم بعد از تخصیص ہے۔ ''فالق''، فلق بمعنی ''شقّ'' سے ماخوذ ہے۔اور ''النوى'' نواة کی جمع ہے۔''نوى'' کی تخصیص اس کی فضیلت کے باعث ہے یا اس وجہ سے کہ دیار عرب میں بکثرت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ ''فالق الحب والنوى'' کا مطلب ہوا: يا من شقهما فأخرج منهما الزرع والنخيل۔

''منزل'' باب افعال سے (اسم فاعل کا صیغہ) ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ باب تفعیل سے (اسم فاعل کا صیغہ) ہے۔اور حصن کی روایت میں ''القرآن'' کے بجائے ''الفرقان'' آیا ہے۔

والانجيل والقرآن: حصن کی روایت کے پیش نظر اس کی وجہ تسمیہ یہ ہوگی کہ قرآن حق و باطل میں فرق واضح کرتا ہے۔ یہاں زبور کا ذکر نہیں فرمایا چونکہ تورات میں شامل ہے یا اس وجہ سے کہ زبور میں صرف مواعظ تھے، احکامات نہیں تھے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں اگر آپ کہیں کہ ان قرائن کے درمیان وجہ نظم و مناسبت کیا ہے؟ تو میں کہتا ہوں: وجہ اس کی یہ ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے اللہ جل شاہ کی بابت اس کا رب السموٰت والأرض ہونا ارشاد فرمایا تو اس کے بعد فالق الحب والنوى ذکر فرمایا تاکہ خالقیت اور مالکیت دونوں معنی اکٹھے ہو جائیں۔ چونکہ یہ آیت کریمہ: ﴿يخرج الحى من الميت ويخرج الميت من الحى﴾[الروم: ۱۹] ﴿فالق الحب والنوى﴾ کی تفسیر ہے۔اور اس کا مطلب یہ ہے کہ حیوان نامی کو نطفہ سے پیدا کرتا ہے۔اور دانہ کو گٹھلی سے پیدا کرتا ہے۔اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے۔یعنی ان اشیاء کو حیوان اور نامی سے نکالتا ہے یا یہ کہ حیوان اور نامی کو نکالتا ہے۔ اس کے بعد منزل التوراة ذکر فرمایا، تاکہ معلوم ہو جائے کہ ان اشیاء کو عدم سے وجود بخشا محض اس لئے ہے کہ ان کے خالق کو جانے اور اس کی عبادت کی جائے۔اور اس کی تحصیل نزول کتاب اور بعثت رسول کے بغیر ہو نہیں سکتی۔ گویا کہ یوں فرمایا ہے: يا مالك يا مدبر يا هادى أعوذبك: یہ پاکیزہ کلام ہے، اس قابل ہے کہ سونے کے پانی سے لکھا جائے، اور ابن حجرؒ نے اس پر گرفت فرمائی ہے، ابن حجرؒ کا کلام ایسا ہے کہ جس کو ماء زمزم سے اس قدر دھویا جائے کہ ختم ہو جائے۔

قوله: أعوذ بك من شر كل ذى شر أنت آخذ بنا صيته: ایک نسخہ میں واؤ عاطفہ کے (اضافہ کے) ساتھ ''وأعوذ'' ہے۔ حصن کی روایت میں (منْ شر كل ذى شر کے بجائے) من شر كل شئ ہے۔اور مسلم کی روایت میں (أنت آخذ بناصيته کے بجائے) ''من شر كل دابة أنت آخذ بناصيتها'' وارد ہوا ہے۔

قوله أنت الأول فليس قبلك شئ وانت الآخر فليس بعدك شيء: اور حصن کی روایت میں ''اللهم انت الأول'' کے الفاظ ہیں۔ بعد والا جملہ معنی سابق کی تقریر ہے۔ کہ آپ ہی وہ باقی ذات ہیں جس کی کوئی انتہا نہیں۔اور آپ کی '' آخریت'' کے بعد کوئی شی ایسی نہیں کہ جس کو بقاء لذاتہ حاصل ہو۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ '' بعدك '' معنی میں ''غيرك '' کے ہو۔اور مطلب یہ ہے کہ آپ کا غیر فی حدہ ذاتہ فانی ہے۔ اگرچہ حالت

الصالحين﴾[النمل: ۱۹]**أی أجعلنی مندرجا فی جملتهم مغمورا فی بر كتهم، بخلاف اجعلنی منهم فانه يصدق أن يكون من جملة عددهم، وهذا ليس فيه كبير فخر اھ۔**

ابن حجرؒ کے اس کلام میں غرابت ہے، وہ یوں کہ یہ بات اس تقدیر پر درست ہے کہ ''ندی'' سے مراد ''اہل مجلس'' ہیں، جیسا کہ یہی ظاہر ہے، البتہ جب ''ندی'' سے مراد ''مجلس'' ہو تو ''فی'' کا وجود متعین ہے۔ اور ''أبلغيت'' کا دعویٰ بھی ممنوع ہے۔

اس کی نظیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے: **واحشرنی فی زمرة المساكين**۔ چونکہ اس میں مبالغہ فی التواضع کی کئی انواع ہیں۔ بلکہ تحقیقی بات یہ ہے کہ ''**اجعل**'' متعدی بدو مفعول ہے، جیسا کہ ان آیات مبارکہ میں ہے: ﴿**رب اجعلنی مقيم الصلاة**﴾[ابراهيم: ۴۰] اور ﴿**رب اجعل هذا البلد آمنا**﴾[البقرة: ۱۲۶] میں۔ چنانچہ ''**فی**'' کے لانے کی صورت میں ''**جعل**'' میں ''**ايقاع**'' کے معنی کی تضمین ہوگی جیسا کہ اس جملہ میں ہے:

يجرح فی عراقيبها نصلی۔

چنانچہ اس کے نتیجہ میں ابن حجر کے قول اور ان کی پیش کردہ نظیر ﴿**أدخلنی برحمتك فی عبادك الصالحين**﴾[النمل: ۱۹] دونوں کی تردید ہو جاتی ہے۔ چونکہ ابن حجر کی پیش کردہ نظیر نہ لفظاً نظیر ہے، نہ معنًی نظیر ہے۔

''رہن'' (گروی) سے مراد نفس ہے مطلب یہ ہے کہ میرے نفس کو بندوں کے حق سے آزاد بری الذمہ کر اور میری لغزشوں کو معاف فرما کر اپنے عذاب سے نجات بخش۔

''اعلیٰ'' سے مراد ''ملأ اعلی'' ہے، یعنی فرشتے یا فرشتوں کی مجلس مراد ہے۔ **أی اجعلنی من المجتمعين فی الملأ الأعلی من الملائكة۔**

ایک احتمال یہ ہے کہ مقام اعلیٰ سے مراد درجۂ رفیعہ اور وہ مقام وسیلہ مراد ہے جس کی بابت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انه لا يكون الا لعبد، وأرجو أن أكون أنا هو۔ أی ذلك العبد۔

تورپشتیؒ فرماتے ہیں: ایک احتمال یہ ہے کہ اس سے مراد ''نداء اہل الجنۃ'' ہو، کہ یہ لوگ رتبہ اور مکان کے اعتبار سے اہل نار سے اعلیٰ ہوں گے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں آتا ہے: ﴿**ونادی أصحاب الجنة أصحاب النار أن قد وجدنا ما وعدنا ربنا حقا**﴾[الاعراف: ۴۴] اور نداء اسفل سے مراد اہل نار کا اہل جنت کو پکارنا ہے: ﴿**أن أفيضوا علينا من الماء أو مما رزقكم الله**﴾[الاعراف: ۵۰] اور مطلب یہ ہے کہ اے اللہ مجھے اہل جنت میں سے بنا۔

سوتے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جامع دعا

۲۴۱۰: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ اِذَا اَخَذَ مَضْجَعَهٗ مِنَ اللَّيْلِ قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ كَفَانِیْ وَاٰوَانِیْ وَاَطْعَمَنِیْ وَسَقَانِیْ وَالَّذِیْ مَنَّ عَلَیَّ فَاَفْضَلَ وَالَّذِیْ اَعْطَانِیْ فَاَجْزَلَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی كُلِّ حَالٍ اَللّٰهُمَّ رَبَّ كُلِّ شَیْءٍ وَمَلِيْكَهٗ وَاِلٰهَ كُلِّ شَیْءٍ اَعُوْذُبِكَ مِنَ النَّارِ۔ (رواه ابو داود)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳۱۳/۴ حديث رقم ۵۰۵۸۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ تحقیق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنی خوابگاہ کی طرف تشریف لے جاتے یعنی رات کو فرماتے سب تعریف خدا کے لیے ہے جس نے مجھ کو کفایت کیا یعنی مخلوق سے بے پروا کیا اور مجھ کو مکان دیا رہنے کو کہ وہ سردی اور گرمی کو دور کرتا ہے پس اس نے بہت دیا اللہ تعالیٰ کا شکر ہے بہرحال اے اللہ ہر چیز کے پروردگار

اور اس کے مالک اور ہر چیز کے معبود میں تیرے ساتھ یعنی تجھ سے آگ سے پناہ مانگتا ہوں یعنی ان چیزوں سے جو عذاب ودوزخ کا باعث ہیں اس کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: اذا أخذ مضجعه: ایک نسخہ میں من الليل کا اضافہ بھی ہے۔

قوله: الحمد لله الذی کفانی و آوانی و أطعمنی و سقانی۔

عرض مرتب: اتنے حصہ کی تشریح حدیث: ۲۳۸۶ کے تحت ملاحظہ فرمایئے اھ۔

قوله: والذی من علی فأفضل والذی اعطانی فاجزل: ''فأفضل'' فاء کے ساتھ ہے، اور ایک روایت میں واؤ کے ساتھ ''و أفضل'' ہے۔ افضل کے کئی معنی بیان کئے ہیں: (۱) زاد۔ (۲) أکثر۔ (۳) أحسن۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ فاء ترتب تفاوت کیلئے ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: خذ الأفضل فالأکمل واعمل الأحسن فالأجمل: چنانچہ اعطاء ''حسن'' ہے: وهكذا المعنون۔ منّ کو مقدم کیا چونکہ وہ غیر مسبوق بعمل العبد ہے۔ بخلاف اعطاء کے، چونکہ وہ کبھی مسبوق بہ بھی ہوتی ہے۔

قوله: الحمد لله علی کل حال: اس میں اشارہ ہے کہ تمام حالات، مصائب وبلیات ایسی ہیں کہ ان پر شکر ادا کرنا واجب ہے، چونکہ یہ چیزیں رافع سیئات ہوتی ہیں یا رافع درجات ہوتی ہیں۔ بخلاف اہل نار کے احوال کے، چونکہ وہ لوگ دنیا میں تھے تو حالت معصیت میں تھے، اور دار عقبیٰ میں عقوبت میں ہوں گے۔ چنانچہ ان احوال پر شکر نہیں بلکہ اللہ کے حکم پر صبر اور اس کی قدر وقضاء پر رضامند ہونا چاہئے۔ اللہ جل شانہ ہر حال میں اپنی صفات وافعال محمود ہے۔

قوله: اللهم رب کل شیء ومليکه واله کل شیء:

قوله: و أعوذبك من النار: مرتب عرض کرتا ہے کہ اس حصہ کی تشریح ماقبل میں گذر چکی ہے۔

۲۴۱۱: وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ شَكَا خَالِدُ بْنُ الْوَلِيْدِ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا اَنَامُ اللَّيْلَ مِنَ الْاَرَقِ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ اِذَا اَوَيْتَ اِلٰى فِرَاشِكَ فَقُلْ اَللّٰهُمَّ رَبَّ السَّمٰوٰاتِ السَّبْعِ وَمَا اَظَلَّتْ وَرَبَّ الْاَرْضِيْنَ وَمَا اَقَلَّتْ وَرَبَّ الشَّيَاطِيْنِ وَمَا اَضَلَّتْ كُنْ لِيْ جَارًا مِنْ شَرِّ خَلْقِكَ كُلِّهِمْ جَمِيْعًا اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيَّ اَحَدٌ مِنْهُمْ اَوْ اَنْ يَّبْغِيَ عَزَّ جَارُكَ وَجَلَّ ثَنَاؤُكَ وَلَا اِلٰهَ غَيْرُكَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ (رواه الترمذی وقال هذا حديث ليس اسناده بالقوی والحكيم بن ظهير الراوی قد ترك حديثه بعض اهل الحديث)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۹۹/۵ حديث رقم ۳۵۸۹۔

ترجمہ: حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ خالد بن ولیدؓ نے نبی کریم ﷺ سے شکایت کی پس عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ میں رات کو سو نہیں سکتا۔ بے خوابی کی وجہ سے پس نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تو اپنے سونے کی جگہ کی طرف جائے پس تو کہے اے الٰہی سات آسمانوں کے پروردگار اور اس چیز کے جس پر آسمان سایہ کیے ہوئے ہیں اور اے زمینوں کے پروردگار اور اس چیز لے کر آ تار ہی ہیں زمینیں یعنی مخلوقات اور اے شیطانوں کے پروردگار اور ان کے کہ ان کو شیطان نے گمراہ آیا ہے۔ یعنی جن وانس ہو میرے لیے پناہ دینے والا اپنی مخلوقات کی سب سے برائی سے اس سے کوئی مجھ پر کوئی زیادتی کرے ان میں سے یا ظلم کرے تیرا پناہ چاہنے والا غائب ہے اور تیری تعریف بہت بڑی ہے اور تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے مگر تو ہی ہے اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا گے اور کہا ہے کہ اس حدیث کی اسناد قوی نہیں

ہے اور حکم بن ظہر اس حدیث کے راوی ہیں تحقیق چھوڑ دی ہے اس کی حدیث بعض اہل حدیث نے۔

اسنادی حیثیت: امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ اس روایت کی اسناد قوی نہیں ہے۔اس حدیث کے ایک راوی حکیم بن ظہیر کی روایت کو بعض محدثین نے ترک کیا ہے۔اھ ''حکم'' میں حاء اور کاف دونوں مفتوح ہیں۔اور سید کے اصل نسخہ میں ''الحکیم'' ہے، یعنی یاء کے ساتھ ہے، اور حاشیہ میں لکھا ہے کہ ''الحکم'' درست ہے۔(کما فی الکاشف والتقریب)

تشریح: قوله: شكاخالد الى النبى ﷺ ......الارق: ''شکا'' صاحب قاموس لکھتے ہیں۔شکویٰ: وینون وشکاية بالکسر وشکوت اھ۔پہلی لغت فصیح ہے۔اس کے مطابق شکا اُلف کے ساتھ لکھا جائے گا۔جیسا کہ علم الخط کا مقررہ قاعدہ ہے۔

''أرق'' بروزن قلم ہے۔(اور ''مِنْ'' تعلیلیہ ہے)۔أی: من أجل السهر۔

قوله: فقال نبى الله ﷺ اذا أويت الى فراشك: ''أويت'' قصر کے ساتھ ہے۔

قوله: اللهم......ورب الأرضين وماأقلت: راء کے فتحہ، نیز سکون کے ساتھ۔

قوله: ورب الشياطين وما أضلت: یہاں ''ما'' بمعنی ''من'' ہے، اور ماقبل میں غیر عاقل کو عاقل پر غلبہ دیا گیا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ''ما'' برائے مشاکلت ہو، یا تنزیل منزلہ کے ہو، یا یہ کہ تمام مواقع میں وصفیت کیلئے ہے۔

قوله: كن لى جارامن شر خلقك كلهم جميعا: اور ایک روایت میں من شر خلقك أجمعين کے الفاظ آئے ہیں۔

أى كفا لى مانوا ومجيرا وحافظا: استجرت فلانا فأجارنى: یہ ارشاد باری تعالیٰ بھی اسی معنی میں ہے: ﴿وهو يجير ولا يجار عليه﴾[المؤمنون:۸۸] ''جميعا'' حال ہے، تاکید معنوی ہے اور ''كلهم'' تاکید لفظی ہے۔

قوله: أن يفرط على احد منهم اوان يبغى: شترهم سے بدل الاشتمال ہے۔(یا حرف جر مقدر ہے) لئلا يفرط أو كراهة أن يفرط۔مفاتیح میں لکھتے ہیں: أى يقصد باذائ مبرعا۔ ثناؤك: اضافت الی الفاعل ہے۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ اضافت الی المفعول ہو۔اور یہ بھی احتمال ہے کہ شیٔ اس کا غیر ہو یا اس کی ذات ہو۔چنانچہ ان الفاظ نبویہ کے مشابہ ہوگا: أنت كما أثنيت على نفسك۔

قوله: عز جارك وجل ثناؤك لا اله غيرك لا اله الا أنت: یہ بعدوالا جملہ توحید کی تاکید ہے۔اور ''تفرید'' کی تائید ہے۔

اختلاف روایت: حصن میں لکھتے ہیں: اس حدیث کو امام طبرانی نے الأوسط میں اور ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے، لیکن الفاظ یہ ہیں: جل ثناؤك ولا اله غيرك کے بجائے تبارك اسمك کے الفاظ ہیں۔امام میرکؒ نے لکھا ہے: اس حدیث کو امام طبرانی نے کبیر میں بھی روایت کیا ہے، الکبیر کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: عز جارك وجل ثناؤك ولا اله غيرك۔

الفصل الثّالث:

آپ ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کو صبح کے وقت مذکورہ دعا تلقین کیا کرتے تھے

۲۴۱۲: عَنْ اَبِىْ مَالِكٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اِذَا اَصْبَحَ اَحَدُكُمْ فَلْيَقُلْ اَصْبَحْنَا وَاَصْبَحَ الْمُلْكُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَسْئَلُكَ خَيْرَ هٰذَا الْيَوْمِ فَتْحَهُ وَنَصْرَهُ وَنُوْرَهُ وَبَرَكَتَهُ وَهُدَاهُ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ مَا فِيْهِ وَمِنْ شَرِّ مَا بَعْدَهُ ثُمَّ اِذَا اَمْسٰى فَلْيَقُلْ مِثْلَ ذٰلِكَ۔ (رواه ابو داود)

اخرجه ابوداؤد ۴/۳۲۲ حديث رقم ۵۰۸۴۔

ترجمہ: حضرت ابی مالکؓ سے روایت ہے تحقیق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس وقت تم میں سے کوئی صبح کرے پس چاہیے کہ وہ کہے ہم نے صبح کی اور ملک نے صبح کی۔ خالص خدا کے واسطے۔ عالموں کا پروردگار ہے۔ اے الٰہی تحقیق میں تجھ سے بھلائی مانگتا ہوں اس دن کی کشائش سے یعنی میں مقصود کو پہنچوں اور مدد اس کی یعنی اس دن میں میری مدد کر۔ نفس اور شیطان اور دشمنوں پر غالب ہوں اور اس کا مور مانگتا ہوں یعنی علم و عمل کی اس میں توفیق ہو اور اس کی برکت ہو یعنی اس دن رزق حلال طیب ہاتھ لگے اور اس کی ہدایت یعنی عمل اور اعتقاد حق پر رہوں اور میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں ہر اس چیز کی برائی سے۔ کہ اس دن میں ہو اور اس چیز کی برائی سے کہ اس کے پیچھے ہو پھر جب کہ شام کرے۔ پس چاہیئے کہ کہے اس کے مانند۔ اس کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

اسنادی حیثیت: امام نوویؒ فرماتے ہیں: اس کو ابوداود نے سند کے ساتھ روایت کیا ہے اور اس کو ضعیف قرار نہیں دیا۔

تشریح: قوله: اصبحنا......العالمین: ''العالمین'' میں تغلیب ہے، ذوی العقول کو ان کے شرف کی وجہ سے ''غلبہ'' دیا گیا ہے۔

قوله: اللهم انی اسالك خير هذا اليوم فتحه ونصره وبركته وهداه: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: فتحه اور اس کے مابعد اسماء خير هذا اليوم سے بدل ہیں۔

تشریح: فتح کے معنی ہیں مقصود پر ظفر یابی، هداه: یعنی متابعت ھدی اور مخالفت ھویٰ پر ثابت قدمی۔ امام طیبیؒ لکھتے ہیں: **الفتح هو الظفر بالتسلط صلحا وقهرا، والنصر الاعانة والاظهار على العدو۔ وهذا أصل معناهما، ويمكن التعميم فيهما يعني فيفيد التاكيد۔**

قوله: واعوذبك من شرمافيه، ومن شرمابعده: سوال خیر کا مذکورہ بالا اسلوب اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ درالمفاسد، جلب المنافع سے اہم ہے۔

قوله: ثم اذاامسى فليقل مثل ذلك:

انسان کو عافیت مانگنی چاہیے

۲۴۱۳: وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِیْ بَكْرَةَ قَالَ قُلْتُ لِاَبِیْ یَابَتِ اَسْمَعُكَ تَقُوْلُ كُلَّ غَدَاةٍ اَللّٰهُمَّ عَافِنِیْ فِیْ بَدَنِی اَللّٰهُمَّ عَافِنِیْ فِی سَمْعِی اَللّٰهُمَّ عَافِنِیْ فِیْ بَصَرِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ تُكَرِّرُهَا ثَلَاثًا حِیْنَ تُصْبِحُ وَثَلَاثًا حِیْنَ تُمْسِیْ فَقَالَ یَا بُنَیَّ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَدْعُوْبِهِنَّ فَاَنَا اُحِبُّ اَنْ اَسْتَنَّ بِسُنَّتِهٖ۔ (رواه ابوداود)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ٣٢٤/٤ حديث رقم ٥٠٩٠۔

ترجمہ: حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرہؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے کہا کہ میں آپ کو ہر روز صبح شام یہ الفاظ کہتے ہوئے سنتا ہوں: اے الٰہی! مجھ کو میرے بدن میں عافیت دے۔ اے الٰہی مجھ کو میری شنوائی (یعنی میری سماعت میں عافیت دے الٰہی مجھ کو میری بینائی میں مدد دے۔ کوئی معبود نہیں ہے مگر تو یہی ہے' اس نے کہا اے میرے بیٹے میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ دعا مانگتے تھے ان کلموں سے پس میں پسند کرتا ہوں کہ پیروی کروں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی۔ اس کو امام ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

راوئ حدیث:

عبدالرحمن بن ابی بکرۃ۔عبدالرحمٰن بن ابی بکرہ انصار بنوثقیف میں سے ہیں۔بصرہ ہی میں ۱۴ھ میں مسلمانوں کے وہاں پہنچنے پر پیدا ہوئے۔بصرہ میں مسلمانوں کے یہاں سب سے پہلے ان کی پیدائش ہوئی تابعی ہیں۔کثرت سے روایات نقل کرتے ہیں۔اپنے والد اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایات سنی ہیں۔ان سے ایک جماعت روایت کرتی ہے۔

مرتب عرض کرتا ہے یہ وہی ابوبکرہ ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ ہیں۔

تشریح: قوله: قلت لابی یا أبت اسمعك تقول كل غداة :''أبت'' تاء کے کسرہ نیز فتحہ کے ساتھ ہے۔'' أسمعك''(اصل کلام یوں تھا)أي أسمع كلامك حال كونك ۔''غداة''صبح کو کہتے ہیں۔اور بظاہر مراد دن ہے،جیسا کہ اگلے کلام سے معلوم ہوتا ہے۔

قوله: اللهم عافنی...... سمعی......فی بصری:''سمع''اور''بصر'' کا خصوصی طور پر ذکر فرمایا،چونکہ نگاہ آفاق میں پھیلی ہوئی اللہ کی نعمتوں کا ادراک کرتی ہے،اور کان رسول پر نازل ہونے والی آیات کا ادراک کرتے ہیں۔پس یہ دونوں ادلہ نقلیہ وعقلیہ ادراک کرتی ہیں،اور''سمع''کو''بصر''پر مقدم ذکر کرنے میں اس کی افضلیت کی طرف اشارہ ہے۔اسی قبیل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادگرامی ہے:

اللهم متعنا بأسماعنا وأبصارنا وقوتنا ما أحييتنا واجعلها الوارث منا۔

قوله: لا اله الا أنت:اقرار الوہیت اوراعتراف ربوبیت کے مجموعہ کا نام کمال عبودیت ہے۔

تکررها ثلاثا حين تصبح وثلاثا حين تمسی: ھا ضمیر سے مراد هذه الجمل یا هذه الدعوات ہیں۔اور ترکیبی اعتبار سے'' تقول '' سے بدل ہے،یا حال ہے۔''حين تصبح'' تقول کیلئے ظرف ہے اور''حين تمسی''کی بھی یہی ترکیب ہے۔

قوله:فقال یا بنی سمعت رسول الله ﷺ يدعو بهن:''بنی ''یاء کے فتحہ نیز کسرہ کے ساتھ،دونوں طرح درست ہے۔اور تصغیر برائے شفقت ہے۔(يدعو بهن کے بعد كذلك محذوف ہے۔)أي كذلك۔

صبح کے وقت کی دُعا

۲۴۱۴:وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِیْ اَوْفٰى قَالَ كَا نَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا اَصْبَحَ قَالَ اَصْبَحْنَا وَاَصْبَحَ الْمُلْكُ لِلّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَالْكِبْرِ يَاءُ وَالْعَظْمَةُ لِلّٰهِ وَالْخَلْقُ وَالْاَ مْرُ وَاللَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَمَا سَكَنَ فِيْهِمَا لِلّٰهِ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ اَوَّلَ هٰذَا النَّهَا رِ صَلَاحًا وَاَوْسَطَهٗ نَجَاحًا وَاٰخِرَهٗ فَلَاحًا يَا اَرْحَمَ الرَّ احِمِيْنَ ذَكَرَهُ النَّوَوِيُّ فِیْ كِتَابِ الْاَ ذْكَارِ بِرِوَايَةِ ابْنِ السِّنِّی ۔

اخرجه النووی فی الاذكار ص ۱۵۵ الحديث رقم ۱۹۲ وابن السنی فی عمل اليوم والليلة ص ۲۳ الحديث ۳۸۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب صبح کرتے تھے تو کہتے کہ میں نے صبح کی اور ملک نے صبح کی۔خدا کے واسطے اور تمام تعریفیں خدا کے واسطے ہیں اور ذات کی بزرگی اور صفات کی بزرگی خدا کے لیے ہے اور مخلوقات اور حکم اور رات اور دن اور جو رات میں آرام پکڑتے ہیں اور دن میں آرام پکڑتے ہیں۔اے الٰہی کردے اس کے پہلے حصے کو خیر بنادے اور اس کے درمیان کو حاجات کے برآمد کا سبب بنادے اور اس کے آخر کو نجات

کا سبب بنا دے۔ اے سب سے زیادہ رحم کرنے والے سب رحم کرنے والوں میں سے علامہ نووی نے یہ حدیث کتاب الاذکار میں نقل کی ہے ابن سی کی روایت کے ساتھ۔

تشریح: **قوله: اصبحنا...... والكبرياء والعظمة لله والخلق والامر والليل والنهار وما سكن فيهما:**

یعنی صفات ذاتیہ اور صفات فعلیہ اللہ ہی کیلئے ہیں، اس کا کوئی شریک نہیں۔ جیسا کہ حدیث قدسی میں آتا ہے: ''**والخلق أى الايجاد التدريجي والأمر أى الايجاد الآتي أو واحد الأوامر والمراد به الجنس أو واحد الأمور**'' اور اس سے مراد تصرف وحکم ہے، یا خلق سے مراد ''ایجاد'' اور امر سے مراد ''امداد'' ہے، پہلے سے اشارہ عالم صور کی طرف ہے اور ثانی سے عالم معانی کی طرف اشارہ ہے۔ **ومنه:** ''**قل الروح من أمر ربى**''۔ **والليل والنهار** سے مرادان کا زمانہ ومکان مراد ہے۔

وما سكن فيهما، اگرچہ تحرک کا ذکر نہیں مگر مراد وہ بھی ہے، چنانچہ یہ باب اکتفاء سے ہے۔ جیسے ''**سرابيل تقيكم الحر**'' **أى والبرد**: یا سکن بمعنی ثبت ہے اور ایک روایت میں **وما يضحى**، اور مطلب یہ ہے کہ چاشت کے وقت میں جو چیز بھی داخل ہوتی ہے، یا ظاہر و بارز ہوتی ہے اس میں نہ حقیقۃً نہ صورۃً کسی بھی اعتبار سے غیر اللہ کا کوئی دخل نہیں۔

قوله: اللهم اجعل أول هذا النار صلاحا وأوسط نجاحا وآخره فلاحا: بظاہر اول وآخر اور اوسط سے مراد تمام اوقات وساعات کو اللہ جل شانہ کی عبادات اور طاعات میں صرف کرنا ہے، یہی وہ چیزیں ہیں کہ جن کے ذریعہ دنیا کے حالات ومعاملات میں حسن آتا ہے، اور آخرت کے بلند درجات تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: **صلاحا فى ديننا** بایں طور کہ ہم سے ایسے اعمال صادر ہوں کہ جس کے ذریعہ ہم آپ کے نیک بندوں کے زمرہ میں شامل ہو جائیں، پھر ہمیں نجاح عطا فرما، اور ہمارے امر کا خاتمہ کامیابی پر فرما، کہ جو دخول جنت کا سبب ہے، پس ہم ان لوگوں کی لڑی میں شامل ہو جائیں کہ جن کے حق میں فرمایا: ''**أولئك على هدى من ربهم وأولئك هم المفلحون**'' اھ۔

اسی وجہ سے (علماء) فرماتے ہیں: ''**أجمع كلمة فى الشريعة كلمة الفلاح**۔ میں کہتا ہوں اسی وجہ سے اللہ جل شانہ نے فرمایا: ﴿**قد أفلح المؤمنون الذين هم فى صلاتهم خاشعون......**﴾

قوله: يا أرحم الراحمين: ان کلمات پر اختتام دعا فرمایا، چونکہ یہ (ان کلمات پر دعا کا اختتام کرنا) دعا کے جلد قبول ہونے کا سبب ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔ حاکم نے اپنی مستدرک میں ابو امامہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے اور صحیح قرار دیا ہے:

ان لله ملكا مؤكلا لمن يقول: يا أرحم الراحمين فمن قالها ثلاثا قال له الملك: ان أرحم الراحمين قد أقبل عليك فسل:

جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے جس دعا کو ارحم الراحمین پر ختم کیا جائے وہ جلد قبول ہوتی ہے اسی لئے آنحضرت ﷺ نے اس دعا کو انہیں الفاظ پر ختم کیا۔ حاکم نے مستدرک میں ابو امامہؓ سے بطریق مرفوع بیان کیا ہے کہ یا ارحم الراحمین کہنے والوں پر اللہ تعالیٰ فرشتہ متعین فرما دیتا ہے چنانچہ جو شخص اس جملہ کو تین بار کہتا ہے تو وہ فرشتہ اس سے کہتا ہے کہ ارحم الراحمین تیری طرف متوجہ ہے جو مانگنا ہے مانگ لو۔

اور ''ثلاثا'' کی قید بظاہر اس لئے ہے کہ غالب یہی ہے کہ جو شخص ان کلمات کو تین مرتبہ کہے گا تو اس کا دل اور خدا کی رحمت متوجہ ہوگی۔

اختلاف روایت: اس حدیث کو امام جزریؒ نے حصن میں بروایت ابن ابی شیبہ تھوڑے سے تغیر کے ساتھ یوں نقل کیا ہے:

''أوسطه فلاحا ،وآخره نجاحا ،أسألك خير الدنيا والآخرة۔''

آپ ﷺ بعض وقت میں یہ دعا بھی پڑھا کرتے تھے

۲۴۱۵:وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ اَبْزٰی قَالَ کَانَ رَسُوْ لُ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ اِذَا اَصْبَحَ اَصْبَحْنَا عَلٰی فِطْرَةِ الْاِ سْلَامِ وَکَلِمَةِ الْاِخْلَاصِ وَعَلٰی دِیْنِ نَبِیِّنَا مُحَمَّدٍ ﷺ وَعَلٰی مِلَّةَ اَبِیْنَا اِبْرَاهِیْمَ حَنِیْفًا وَّمَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔ (رواه احمد والدارمی)

اخرجه الدارمی فی السنن ۳۷۸/۲ حدیث رقم ۲۶۸۸۔

ترجمہ:حضرت عبدالرحمٰن بن ابزیٰؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جس وقت صبح کرتے تھے تو کہتے تھے ہم نے صبح کی دین اسلام کے اوپر اور کلمہ توحید کے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ اور اپنے نبی کے دین پر یعنی محمد ﷺ کے اور اپنے باپ کے دین پر یعنی ابراہیمؑ کے دین پر باطل دین سے بیزار ہو کر متوجہ تھے دین حق پر اور ابراہیمؑ مشرکوں سے نہ تھے۔ نقل کی یہ احمدؒ اور دارمیؒ نے۔

اسنادی حیثیت:صاحب السلاح کا فرمانا ہے کہ اس حدیث کو امام نسائی نے کئی طرق سے روایت کیا ہے،اور اس کے رجال صحیح کے رجال ہیں۔

تشریح: **قوله:اصبحناعلی فطره الاسلامو کلمة الاخلاص**:فطرت سے مراد خلقت ہے۔

بعض کا کہنا ہے کہ فطرۃ اور فطر میں وہی نسبت ہے جو خلقہ اور خلق میں ہے کہ یہ حالت کا اسم ہے، پھر اس کو خلقۃ کا اسم بنا دیا گیا۔ اس کا اطلاق خصوصاً اس خلقت پر ہوتا ہے جو دین حق کو قبول کرنے والی ہو۔اسی قبیل سے یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿**فأقم وجهك للذين حنيفا فطرة الله التى فطر الناس عليها**﴾[الروم: ۳۰]اور حدیث میں آتا ہے: **کل مولود یولد علی الفطرة**۔

كلمة الاخلاص: سے مراد وہ توحید خالص ہے جو دنیا میں حجاب سے اور عقبیٰ میں عقاب سے چھٹکارا دلانے والی ہے،یعنی کلمہ توحید اور کلمہ طیبہ:**لا اله الا الله محمد رسول الله**۔

قوله:وعلى ديننا محمد:یہ ماقبل سے اُخص ہے،چونکہ تمام انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کی ملتوں کو''اسلام'' کا نام دیا جاتا ہے،اور یہی مشہور ہے۔چنانچہ ملاحظہ فرمائیے یہ تمام آیات کریمہ:﴿**ان الدين عند الله الاسلام**﴾[سورۃآل عمران: ۱۹۰]حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول:﴿**فلا تموتن الا وأنتم مسلمون**﴾[البقرة: ۱۳۲]

تورپشتیؒ فرماتے ہیں: **كذا فى الحديث وهو غير ممتنع**۔اور ممکن ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ کلمات اس لئے جہراً ارشاد فرمائے ہوں تاکہ دوسرے لوگ بھی سن لیں اور سیکھ لیں۔ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں:''لعل'' کی تعبیر اختیار کرنے کی کوئی وجہ نہیں بنتی، چونکہ روایت سماع پر ہی متفرع ہو رہی ہے،اور سماع جہر کے بغیر متحقق نہیں ہوتا۔

قوله:وعلى ملة ابينا ابراهيم حنيفا:حضرت ابراہیم علیہ السلام ابوالعرب ہیں،چونکہ عرب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل میں سے ہیں۔چنانچہ اس میں تغلیب ہے یا یہ کہ انبیاء بمنزلہ آباء کے ہوتے ہیں۔اسی وجہ سے ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿**النبى أولى بالمؤمنين من أنفسهم وأزواجه أمهات**﴾[الاحزاب: ۶۰] ۔اور ایک قراءت شاذہ میں **وهو أب لهم** کے الفاظ ہیں۔اس تخصیص کی احتیاج اس وجہ سے ہے:﴿**أن اتبع ملة ابراهيم حنيفا**﴾[النحل:۱۲۳]۔یعنی اصول دین میں یا بعض فروع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اقتداء فرمائیے،مثلاً ختان اور باقی دس مشہور سنتیں۔

''حنیفا'' کا مطلب ہے تمام ادیان باطلہ سے ملت ثابتہ عادلہ کی طرف مائل شخص کو۔ حنیف کی ضد ملحد، حنف اور الحاد کے لغوی معنی مطلق ''میزان'' کے ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ حنیف مسلم مستقیم کو کہتے ہیں، اور یہ وصف حضرت ابراہیم علیہ السلام پر غالب ہے۔ یا اس سے مراد مسلم ہے یعنی جو منقاد کامل ہو، بایں طور کہ غیر اللہ کی طرف متوجہ نہ ہو، حتی کہ جبرائیل علیہ السلام سے کہا: **أما اليك فلا**۔ اسی قبیل سے آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے: **بعثت بالحنيفية السمحة**۔

قوله: وما كان من المشركين۔ اس جملہ میں کفار عرب کے اس قول کی تردید ہے: **نحن على دين أبينا ابراهيم**، اور یہود ونصاری پر تعریض ہے۔ یہ جملہ اور ماقبل والے حال، احوال متداخلہ ہیں، ان کے لانے کا مقصد تقریر ہے، اور اس وہم سے صیانۃ مقصود ہے کہ ممکن ہے کہ حنیفا حال منتقلہ ہو، چنانچہ اس توہم کی تردید فرمادی کہ وہ ہمیشہ موحد ہی رہے، اور یہ حال مشبتہ ہے مؤکدہ ہے۔

تخریج: اسی طرح اسی حدیث کو امام نسائی نے اپنی سنن میں اور طبرانی نے الکبیر میں روایت کیا ہے، مگر احمد اور طبرانی کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: **في الصباح والمساء جميعا**۔ اور نسائی کی روایت میں صرف **في الصباح** کے الفاظ ہیں۔ (كذا نقله الجزرى)

بَابُ الدَّعَوَاتِ فِي الْاَوْقَاتِ

مختلف اوقات کی دعاؤں کا بیان

جواذ کار یعنی دعائیں وغیرہ شارع سے کسی بھی وقت اور کسی بھی حالت سے متعلق منقول ہیں ان کو اختیار کرنا اور ان اذکار کو ان کے منقول اوقات میں پورا کرنا ہر شخص کے لئے مسنون ہے اگر ان اذکار کو پابندی کے ساتھ اختیار کیا جائے تو کیا ہی کہنے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم سے کم ایک مرتبہ تو ضرور ہی پورا کیا جائے تاکہ آنحضرت ﷺ کی اتباع کی سعادت حاصل ہو جائے۔

ابن حجر لکھتے ہیں: **بل ويكون أفضل من غيره حتى القرآن، وان ورد لذلك الغير فضل أكثر من هذا، لأن فى ن الاتباع ما يرابوا على غيره، ومن ثم قالوا: صلاة النافلة فى البيت أفضل منها فى المسجد الحرام، وان قلنا بالأصح أن المضاعفة تختصّ به** اھ۔ ان کا یہ کلام محل بحث ہے، چونکہ یہ بات اپنے اطلاق کے ساتھ درست نہیں، چونکہ دعائیں اور اذکار مسنونہ معینہ مثلاً حالت رکوع وسجود وغیرہ کی حالت کے اذکار، بلاشبہ ان کا بجالانا اس وقت تلاوت قرآن سے افضل ہے، البتہ ان کے علاوہ اذکار دعا خواہ معینہ ہوں یا مطلقہ ان کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ یہ قرآن سے افضل ہیں۔ اور اس کی دلیل یہ حدیث قدسی ہے:

''**من شغله القرآن عن ذكرى ومسألتى أعطيته أفضل ما أعطى السائلين**۔''

الفصل الاول:

جماع کے وقت کی دعا

۲۴۱۶: **عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَوْ اَنَّ اَحَدَكُمْ اِذَا اَرَادَ اَنْ يَّاْتِىَ اَهْلَهٗ قَالَ بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا فَاِنَّهٗ اَنْ يُّقَدَّرَ بَيْنَهُمَا وَلَدٌ فِىْ ذٰلِكَ لَمْ يَضُرُّهٗ شَيْطَانٌ اَبَدًا**۔ (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ٣٣٥/٦۔ حديث رقم ٣٢٧١۔ ومسلم فى صحيحه ١٠٥٨/٢۔ حديث رقم (١١٦۔

۱۲۳٤)۔ واخرجه ابوداؤد فی السنن ۲٤۹/۲ حدیث رقم ۲۱٦۱ والترمذی ۲۷۷/۲ حدیث رقم ۹۸۔۱۔ وابن ماجه ٦۱۸/۱ حدیث رقم ۱۹۱۹ والدارمی ۱۹٥/۲ حدیث رقم ۲۲۱۲۔

ترجمه: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم میں سے کوئی اپنی بیوی سے صحبت کرنے کا ارادہ کرے یا اپنی لونڈی سے تو وہ کہے ہم چاہتے اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ اے الٰہی تو دور رکھ ہم کو شیطان سے اور شیطان کو اس اولاد سے دور رکھ جو تو ہم کو نصیب کرے۔ پس تحقیق شان یہ ہے اگر مقدر میں ہوا تو اس جماع سے مرد وعورت کو فرزند دے دیا جائے گا۔ شیطان اس کو کبھی ضرر نہیں پہنچائے گا۔ اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: **لو أن أحدكم اذاارادان ياتی اهله**: ایک نسخہ صحیحہ میں ''**أحدهم**'' ہے۔ اور ''لو'' میں دو احتمال ہیں۔(۱) ''لو'' شرطیہ ہے، اور اس کا جواب محذوف ہے۔ **أی لنال خيرا كثيرا**۔(۲) برائے تمنی ہے اور اس کی جزاء **قال اذا أراد**...... ہے۔

عرض مرتب: مرقاۃ کے محشی لکھتے ہیں: **هكذا فی الأصل باثبات (قال) فتبدو مقحمة ولعلها من فعل النسّاح**۔ واللہ اعلم اھ۔

اذا أراد: اذا شرطیہ ہے، چنانچہ اس کو جواب کی احتیاج نہیں۔ **أی تمنيت ثبوت هذا لأحدكم**۔ اور ابن حجر لکھتے ہیں: ''**لو**'' **للتمنی وجزاء ها تقديره: لو ثبت قول حين أراد أحدهم اتيان أهله لكان حسنا، لانه**ﷺ **كان يحب لأمته ما يحسب لنفسه واذا خبر ان أو ظرف لخبرها**۔ ملا علی قاریؒ نے ابن حجر کے اس کلام کی طرف غرابت کی نسبت کی ہے۔

قوله: **قال: بسم اللّٰه: أی مستعينا به وبذكر اسمه، ''اللهم جنبنا'' أی بعدّنا**۔ ابن حجر نے اس کی توضیح یوں کی ہے: **أی: بعد أنا وهی**۔ ملا علی قاریؒ نے اس توجیہہ کو بھی غریب کہا ہے۔

جنب الشيطان ما رزقتنا: (یہاں تھوڑی سی عبارت محذوف ہے)۔ **أی: حينئذ من الولد**۔ یہ ''**جنب**'' کا مفعول ثانی ہے۔

قوله: **فانه ان يقدر بينهما ولد فی ذلك لم يضره**: ''**فانه**'' یہ جملہ معللہ ہے، اور ضمیر شان ہے۔ اور '' **ذلك**'' کا مشار الیہ ''**الوقت**'' محذوف ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ''**الاتيان**'' ہو۔ اور ''**لم يضره**'' میں راء پر فتحہ نیز ضمہ پڑھنا درست ہے۔ **أبدا**: اس میں اشارہ ہے کہ اس مبارک ذکر کی برکت کے باعث بچہ کا خاتمہ بالخیر ہوگا۔

اگر یہ اشکال پیدا ہو کہ اکثر لوگ یہ دعا پڑھتے ہیں مگر اس کے باوجود ان کی اولاد شیطان کے تصرف اور اس کے ضرر سے محفوظ نہیں رہتی؟ تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ ''شیطان کبھی ضرر نہیں پہنچائے'' سے مراد یہ ہے کہ شیطان انہیں کفر کی کھائیوں میں نہیں پھینک سکتا' لہٰذا اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ صحبت کے وقت ذکر اللہ کی برکت سے اولاد خاتمہ بخیر کی سعادت ابدی سے نوازی جاتی ہے یا پھر اس کے معنی یہ ہیں کہ شیطان اس کی اولاد کو آسیب اور صرع (یعنی ہاتھ پاؤں ٹیڑھے) کر دینے یا اسی قسم کی دوسری بلاؤں میں مبتلا کر کے ضرر پہنچانے پر قادر نہیں رہتا۔

حضرت امام جوزیؒ کے قول کے مطابق اس کا مطلب یہ ہے کہ شیطان اس شخص کی اولاد کے دین واعتقاد پر اثر انداز نہیں ہوتا اور جس طرح کہ شیطان دوسروں کے صحیح اعتقادات اور دینی رجحانات میں نقصان پہنچاتا ہے ان کی بہ نسبت اس شخص کی اولاد کے حق میں اس کا ضرر ونقصان بے اثر رہتا ہے۔

اور بعض کا کہنا ہے کہ پہلے (شیطان کو) معرفہ لانا اور پھر نکرہ ذکر کیا، چونکہ پہلے میں جنس کے معنی مراد ہیں، اور دوسرا اعم ہے، یا دوسرے سے اس کے تمام اعوان مراد ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ ولادت کے وقت اس بچہ کو شیطان کچوکا نہیں لگا سکے گا، بخلاف دوسرے بچوں کے، میں کہتا ہوں، کچوکا نہ لگا سکنے سے مراد سخت قسم کا کچوکا لگانا مراد ہے: چونکہ حدیث سے دو افراد کا استثناء حضرت عیسیٰ اور ان کی

29 والدہ کا معلوم ہوتا ہے، نیز یہ بات خلاف مشاہدہ بھی ہے، اور کہا گیا ہے کہ: کسی ایک نے بھی اس حدیث کو عموم پر محمول نہیں کیا۔ یعنی یہ نہیں کہا کہ یہ بچہ ہر قسم کے ضرر اور اغواء شیطانی وو ساوس سے محفوظ رہے گا۔ اھ۔

وسوسہ وغیرہ پر محمول کیا بھی کیسے جا سکتا ہے، کہ ان سے تو صرف معصوم ہی محفوظ ہو سکتا ہے، لیکن مخبر صادق نے اس کی خبر دی ہے، چنانچہ کوئی نہ کوئی ظاہر تاثیر ضرور ہوگی، وگرنہ تو اس کا کیا فائدہ؟ اور جس شخص کو اللہ جل شانہ نے اس حدیث پر عمل کرنے کی توفیق بخشی ہو تو وہ اپنی اولاد میں اس کی برکت دیکھتا ہے۔ یہ بات تو محقق ہے: ﴿وما ينطق عن الهوى﴾

تخریج: اصحاب اربعہ نے یہ حدیث از بن عباس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوں نقل کی ہے:

قال: لو أن أحدكم اذا أتى أهله قال باسم الله......، فقضى بينهما ولد لم يضره۔

اور بخاری کی ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: **لم يضره شئ أبدا۔**

ابن أبی شیبہ ابن مسعود سے موقوفاً نقل کرتے ہیں: **اذا أنزل قال: اللهم لا تجعل الشيطان فيما رزقتني نصيبا۔**

فائدہ: یہ دعا اپنے دل میں مانگے، یا جماع کر کے علیحدہ ہو چکنے کے بعد مانگے۔ چونکہ حالت جماع میں زبان کے ساتھ ذکر کرنا بالا جماع مکروہ ہے۔

فکر وغم کی شدت کے وقت مذکورہ دعا پڑھنی چاہیے

۲۴۱۷: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم كَانَ يَقُوْلُ عِنْدَ الْكَرْبِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْعَظِيْمُ الْحَلِيْمُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ السَّمٰوَاتِ وَرَبُّ الْاَرْضِ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ١٤٥/١١۔ حديث رقم ٦٣٤٥۔ ومسلم فی صحيحه ٢٠٩٢/٤ حديث رقم (٨٣۔ ٢٧٣٠)۔ والترمذی فی السنن ١٥٩/٥ حديث رقم ٣٤٩٦ وابن ماجه ١٢٧٨/٢ حديث رقم ٣٨٨٣۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہتے تھے فکر وغم کی شدت کے وقت۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے بزرگ بردبار ہے کوئی معبود نہیں ہے سوائے اللہ کے عرش بڑے کا پروردگار اللہ کے سوا کوئی آسمانوں کا پروردگار نہیں ہے اور زمین کا پروردگار اور بڑے عرش کا پروردگار ہے۔ اس کو بخاری اور مسلم رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: **ان رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم كان يقول عندالكرب:** ''الكرب'' کاف کے فتحہ، راء کے سکون اور آخر میں باء موحدہ۔

چنانچہ صحاح میں لکھتے ہیں: **أى الغم الذى يأخذ النفس۔** (جان لیوا غم) بعض کا کہنا ہے: **الكرب أشد الغم** (سخت ترین غم) اور ابن حجر نے یوں لکھا ہے: **هو ما يدهم المرء مما يأخذ بنفسه فيغمه ويحزنه۔**

قوله: لا اله الا الله العظيم الحليم: یعنی جو اپنی ذات وصفات میں عظیم ہے، کوئی بھی سوال ومسئلہ اس کے تئیں بڑا نہیں۔ ''الحلیم'' وہ ذات جو سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا، چنانچہ جو اس کے حق خدمت میں کوتاہی برتے اس سے انتقام لینے میں جلدی نہیں کرتا، بلکہ اپنی رحمت کے ذریعہ اس کی مضرت کو دور کرتا ہے،

قوله: لا اله الا الله رب العرش العظيم: ''العظیم'' کو مجرور ومرفوع دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔

قوله: لا اله الا الله رب السموٰت ورب الأرض رب العرش الكريم: ''الکریم'' کو بھی انہی دو وجوہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ ابن التین، دراوردی سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے ''العظیم'' کو رفع کے ساتھ روایت کیا ہے، اور ''الکریم'' کو بھی اسی

طرح روایت کیا ہے، یہ دونوں لفظ" رب "کی صفت ہے۔اس آیت کریمہ:﴿رب العرش الكريم[المومنون:۱۱۶] میں جمہور نے ''الکریم'' کو مجرور پڑھا ہے۔اور ابن محیصن نے دونوں میں رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ابن کثیر سے بطور شاذ یہ بھی مروی ہے، اور ابن جعفر سے بھی مروی ہے۔اور دو غریب وجوہ بیان کی ہیں۔پہلی تو وہ گزر چکی ہے، اور دوسری یہ ہے کہ رفع کے ساتھ ''عرش'' کی صفت ہو، بایں طور کہ مبتدا محذوف کی خبر ہو، برائے مدح ماقبل سے منقطع کر دی گئی ہو اور اس کو راجع قرار دیا ہے، چونکہ دونوں روایتوں میں توافق ہو جاتا ہے۔ابوبکر اصم نے پہلی صورت کو راجح قرار دیا ہے، چونکہ ''عظیم'' کو ''رب'' کی صفت قرار دینا ''عرش'' کی صفت قرار دینے سے اولیٰ ہے، یہ بات محل نظر ہے، چونکہ ''عظیم'' کی طرف مضاف شئی کی صفت ''العظیم'' لانا ''عظیم'' کی تعظیم میں اولیٰ ہے۔''ہدہد'' نے بلقیس کے بارے میں ''عرش عظیم'' کی تعبیر اختیار کی، لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس پر کوئی نکیر نہیں فرمائی۔واللہ اعلم۔

اس دعا میں اشارہ ہے کہ غم کو زائل کرنا اللہ جل شانہ کے علاوہ کسی اور کے بس کی بات نہیں۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ وہ ذکر ہے کہ جس (کا ورد کرنے) پر کرب و غم دور ہو جاتا ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: اگر کہا جائے کہ یہ ذکر ہے دعا تو نہیں؟ تو اس کے دو جواب ہیں: (ا) اس ذکر سے دعا کی ابتداء کی جائے، پھر جو دعا مانگنا چاہے مانگے۔(۲) یہ ذکر اس قبیل سے ہے: **من شغله ذكرى عن مسألتى أعطيته أفضل ما أعطى السائلين** اھ۔

(امام نوویؒ کے ذکر کردہ) پہلے (جواب) کی تائید ابوعوانہ کی روایت سے ہوتی ہے (کہ جس میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں): **ثم يدعو بعد ذلك**: یا یہ کہا جائے کہ یہ ثناء متضمن دعا ہے۔گویا کہ تعریض ہے جیسا کہ سائل اور شاعر انتہائی لطیف اشارہ کرتے ہیں۔اسی قبیل سے امیہ بن ابی صلت کا یہ شعر ہے کہ جس میں وہ کسی بادشاہ کی تعریف کر رہے ہیں کہ جس سے انعام مقصود ہے۔

اذا أثنى عليك المرء يوما　　　　كفاه عن تعرضه الثناء

اور اسی قبیل سے یہ دعا ہے: **أفضل الدعا، يوم عرفة لا اله الا الله وحده**......۔یا یہ کہا جائے کہ یہ درحقیقت ثناء باللسان ہے، دعا بالجنان ہے اور اتکال علی الملک المنان ہے۔جیسا کہ مروی ہے کہ خلیل (یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام) سے کہا گیا: **لم لا تسأل ربك الجليل**؟ آپ اپنے رب جلیل سے سوال کیوں نہیں کرتے؟ تو آپ علیہ السلام نے فرمایا: **حسبى من سؤالى علمه بحالى**۔

غصے کو دور کرنے کا وظیفہ

۲۴۱۸: **وَعَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ صُرَدٍ قَالَ اسْتَبَّ رَجُلَانِ عِنْدَ النَّبِيِّ ﷺ وَنَحْنُ عِنْدَهُ جُلُوْسٌ وَاَحَدُ هُمَا يَسُبُّ صَاحِبَهُ مُغْضَبًا قَدِ احْمَرَّ وَجْهُهُ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ اِنِّى لَاَ عْلَمُ كَلِمَةً لَوْ قَالَهَا لَذَهَبَ عَنْهُ مَا يَجِدُ مِنَ الْغَضَبِ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ فَقَالُوا لِلرَّجُلِ اَلَاتَسْمَعُ مَا يَقُوْلُ النَّبِىُّ ﷺ قَالَ اِنِّى لَسْتُ بِمَجْنُوْنٍ**۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخارى فى صحيحه ٥١٨/١٠۔ حديث رقم ٦١١٥۔ واخرجه مسلم فى صحيحه ٢٠١٥/٤ حديث رقم (١٩۔ ٢٦١٠)۔ وابوداؤد ٢٤٨/٤ حديث رقم ٤٧٨٠۔ والترمذى فى السنن ١٦٧/٥ حديث رقم ٣٥١٦۔ وأحمد المسند ٢٤٠/٥

ترجمہ: حضرت سلیمان بن صردؓ سے روایت ہے فرمایا دو شخصوں نے برا کہا۔آپس میں نبی کریم ﷺ کے نزدیک اور ہم نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور ایک ان میں سے بہت برا کہتا تھا غصے میں بھرا ہوا۔تحقیق اس کا چہرہ غصے

میں سرخ ہو گیا تھا پس نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا تحقیق میں البتہ ایک کلمہ جانتا ہوں۔ اگر اس کو کہے تو اس کا غصہ جاتا رہے وہ یہ ہے کہ میں پناہ مانگتا ہوں اللہ تعالیٰ کی شیطان مردود کی۔ پس صحابہؓ نے کہا کہ کیا تو نے نہیں سنا ہے وہ جو کہ نبی کریم ﷺ فرما رہے ہیں‘ اس نے کہا میں دیوانہ نہیں ہوں۔ اس کو بخاری اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله: استب رجلان عند النبی ﷺ ونحن عنده جلوس:** ’’استب ‘‘ باب افتعال سے ہے اور ’’سبّ‘‘ سے ماخوذ ہے۔

قوله: واحدهما یسب صاحبه مغضبا قد احمر وجهه: ’’مغضبا‘‘ ضاد کے فتحہ کے ساتھ، ’’یسب‘‘ کے فاعل سے ’’حال‘‘ ہے۔

شدت غضب کے باعث دل میں بہت زیادہ حرارت پیدا ہو جاتی ہے، کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ اس کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے تو صاحب غصہ کیلئے جان لیوا ہوتی ہے، اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ یہ حرارت اعضاء و جوارح خصوصاً چہرہ پر پھیل جاتی ہے، چونکہ چہرہ تمام اعضا کے مقابلہ میں لطیف اور دل کے بہت قریب ہے۔

قوله: فقال النبی ﷺ : انی لاعلم کلمة لو قالها لذهب عنه مایجد: یہاں ’’کلمة ‘‘ سے مراد کلمہ لغوی ہے، جو جملہ مفیدہ کو بھی شامل ہوتا ہے۔ یہ حدیث مبارکہ درحقیقت اس آیت کریمہ سے مقتبس ہے:

﴿**واما ینزغنك من الشیطان نزغ فاستعذ بالله انه سمیع علیم**﴾[الاعراف: ۲۰۰] امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یعنی استعاذہ آپ کی امت میں سے صرف متقین کو ہی نفع پہنچائے گا۔ اور اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**ان الذین اتقوا اذا مسّهم طائف من الشیطان تذکروا**﴾[الاعراف: ۲۰۱]

قوله: لا تسمع مایقول النبی ﷺ انی لست بمجنون: ایک نسخہ میں ’’**الا تسمع**‘‘ ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں: یہ کلام ایسے شخص کا ہے جس نے اپنے آپ کو انوار شریعت کے ذریعہ مہذب نہ بنایا ہو اور دین کی سمجھ حاصل نہ کی ہو۔ اور اس کو وہم ہو کہ استعاذہ جنون کے ساتھ مخصوص ہے، اور اسے یہ معلوم نہ ہو کہ غضب نزغات شیطان میں سے ہے، اور اسی وجہ سے انسان حال اعتدال سے خارج ہو جاتا ہے، اور کلام باطل زبان سے نکالتا ہے۔ اور فعل مذموم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے وصیت طلب کرنے والے شخص کے بارے میں فرمایا تھا: **لا تغضب**، اس شخص نے اپنا یہ سوال کئی مرتبہ دہرایا مگر دربار نبوت سے ہر بار یہی جواب ملا: **لا تغضب** اور اپنی اس وصیت میں ’’**لا تغضب**‘‘ کے علاوہ کوئی اور بات ارشاد نہیں فرمائی۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ غصہ، اور اس سے ناشی اخلاق و افعال کے بہت بڑے مفاسد ہیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ غصہ فرو کرنے کا بڑا آسان طریقہ یہ ہے کہ اعوذ باللہ پڑھ لیا جائے اس سے غصہ فرو ہو جائے گا اس حدیث کی بنیاد یہ آیت ہے وَاِمَّا یَنۡزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ اور اگر تمہیں شیطان بہکا کر اپنے جال میں پھانسے تو اللہ سے پناہ مانگو بلاشبہ وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

جس شخص کو آنحضرت ﷺ نے یہ کلمہ تعلیم فرمایا وہ علم شریعت کے زیور سے آراستہ نہیں تھا اور دین کی سمجھ سے بالکل کورا تھا۔ چنانچہ اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ یہ کلمہ پڑھنے کے لئے اس شخص کو کہا جاتا ہے جو دیوانگی میں مبتلا ہو میں دیوانگی میں مبتلا نہیں ہوں اس لئے یہ کلمہ کیوں پڑھوں۔

آنحضرت ﷺ کی اس تعلیم کی طرف اس شخص کی بے اعتنائی کے سلسلہ میں امام طیبیؒ تو یہ فرماتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ وہ شخص منافق

رہا ہو یا پھر پرلے درجے کا بدخو، چڑچڑا اور گنوار۔

ایک دوسری روایت میں آتا ہے: **غير أني لست بمجنون، فانطلق اليه رجل فقال له: تعوذ بالله من الشيطان الرجيم فقال: أترى لي بأس أمجنون أنا أذهب۔** اور ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ یہ صاحب معاذ تھے۔ یہ بھی ناشی از غضب، قلت تحمل اور سوء ادب ہے۔ اھ۔ اگر یہ بات صحیح طور پر ثابت ہو کہ یہ معاذ ابن جبل ہی تھے تو اس کی یہ تاویل متعین ہے کہ یہ واقعہ ان کے قبول اسلام کے قریب زمانہ کا ہے اور یعنی شدت غضب کے باعث انہیں یاد نہ رہا، جیسا کہ ماقبل میں شدت فرح وخوف کا واقع گزرا۔ چونکہ حضرت معاذؓ کا شمار نبی کریم ﷺ کی صحبت بابرکت بعد میں اجلاء وا کابر صحابہ کرام میں ہونے لگا۔ حتی کہ نبی کریم ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا:

أعلم أمتي بالحلال والحرام معاذ بن جبل: اور ایک طویل عرصہ تک ان کو یمن کا گورنر مقرر کئے رکھا، ایک موقع پر نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا: **یا معاذ اني أحب لك ما أحب لنفسي، فاذا فرغت من صلاتك فقل: اللهم اعنى على ذكرك وشكرك وحسن عبادتك۔** اور ماقبل بات کی تائید **لا تغضب** والی حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

شیطان سے پناہ مانگو

۲۴۱۹: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْ لُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا سَمِعْتُمْ صِيَاحَ الدِّيَكَةِ فَاْسْاَلُوْا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ فَاِنَّهَا رَاَتْ مَلَكًا وَاِذَا سَمِعْتُمْ نَهِيْقَ الْحِمَا رِ فَتَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ فَاِنَّهٗ رَاٰى شَيْطَانًا۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ٣٥٠/٦۔ حديث رقم ٣٣٠٣۔ ومسلم في صحيحه ٢٠٩٢/٤ حديث رقم (٨٢۔ ٢٧٢٩)۔
واخرجه ابوداؤد ٣٢٧/٤ حديث رقم ٥١٠٢۔ والترمذي في السنن ١٧١/٥ حديث رقم ٣٥٢٤۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم مرغوں کی آواز سنو۔ پس اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل مانگو۔ اس لیے تحقیق وہ فرشتے کو دیکھتے ہیں اور جب تم گدھے کی آواز سنو۔ پس تم اللہ تعالیٰ سے شیطان مردود کی پناہ مانگو۔ اس لیے تحقیق وہ شیطان کو دیکھتا ہے اس کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله: اذاسمعتم صياح ديكة فاسئلوا الله من فضله فانها رأت ملكا:** ''**ديكة**'' **ديك** کی جمع ہے، جیسے: ''**قردة**'' **قرد** کی، اور **فيلة، فيل** کی جمع ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ کئی مرغوں کی آواز سننے کے بعد اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل مانگا جائے، بلکہ ایک مرغ کی آواز سن لینا بھی کافی ہے۔ ''**فاسئلوا**'' ہمزہ کے ساتھ اور نقل کے ساتھ بھی درست ہے۔

اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہے کہ مرغ فرشتے کو دیکھ کر بانگ دیتا ہے اس سے اس وقت تم خدا سے دعا مانگو تاکہ وہ آمین کہے اور تمہارے لئے بخشش چاہے اور جب گدھے کی آواز سنو تو اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ پڑھو کیونکہ وہ شیطان کو دیکھ کر ریکتا (آواز نکالتا) ہے۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ نیک ہستیوں کے آنے کے وقت اللہ کی رحمت اور برکت نازل ہوتی ہے اور لہٰذا اس وقت دعا مانگنی مستحب ہے نیز اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ کافروں پر چونکہ اللہ کا غضب اور عذاب نازل ہوتا ہے اس لئے کفار کے سامنے گزرنے کے وقت اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنا مستحب ہے اس خوف سے کہ کہیں ان بدبختوں کی نحوست اور ان کی برائی کے جراثیم اپنے تک نہ پہنچ جائیں۔

قوله: واذاسمعتم نهيق الحمارفتعوذوابالله من الشيطان فانه رأى شيطانا:اور ایک روایت میں ''نهيق الحمير'' کے الفاظ ہیں۔اور ایک روایت میں (من الشیطان کے بعد) ''الرجيم'' کا اضافہ بھی ہے۔مصابیح میں (''فانه رأى شيطانا'' کے بجائے) الفاظ یوں ہیں: فانها رأت شيطانا۔ (اس صورت میں ''الحمار'') ''دابة'' کی تاویل میں ہے، ''مقابلہ'' کی رعایت پیش نظر ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اللہ کا ذکر کرنے والوں کی آواز کے سب سے زیادہ مشابہ مرغ کی آواز ہے، چونکہ اللہ کی رحمت سے دور مخلوقات کی آواز کے سب سے زیادہ مشابہ آواز گدھے کی ہے۔اھ۔اور اسی وجہ سے جہنم میں پڑے کفار کی چیخ و پکار کی آواز کو گدھے کی آواز کے مانند قرار دیا ہے۔چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لهم فيها زفير وشهيق﴾[هود:١٠٦]

اختلاف روایت: ابوداؤد، نسائی اور حاکم عبداللہ سے نقل کرتے ہیں: أنه كذلك اذا سمع نباح الكلاب۔امام حاکم فرماتے ہیں: یہ حدیث صحیح ہے، علی شرط مسلم ہے۔

سفر کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا

۲۴۲۰: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَا نَ اِذَا اسْتَوٰى عَلٰى بَعِيْرِهٖ خَارِجًا اِلَى السَّفَرِ كَبَّرَ ثَلَاثًا ثُمَّ قَالَ سُبْحَانَ الَّذِىْ سَخَّرَلَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ وَاِنَّا اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْأَلُكَ فِىْ سَفَرِنَا هٰذَا الْبِرَّ وَالتَّقْوٰى وَمِنَ الْعَمَلِ مَا تَرْضٰى اَللّٰهُمَّ هَوِّنْ عَلَيْنَا سَفَرَنَا هٰذَا وَاطْوِلَنَا بُعْدَهٗ اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الصَّاحِبُ فِى السَّفَرِ وَالْخَلِيْفَةُ فِى الْاَهْلِ وَالْمَالِ اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ وَعْثَاءِ السَّفَرِ وَكَاٰبَةِ الْمَنْظَرِ وَسُوْءِ الْمُنْقَلَبِ فِى الْمَالِ وَالْاَهْلِ وَاِذَا رَجَعَ قَالَهُنَّ وَزَادَ فِيْهِنَّ اٰئِبُوْنَ تَائِبُوْنَ عَابِدُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ٩٧٨/٢- حديث رقم (٤٢٥- ١٣٤٢)- وابوداؤد فى السنن ٣٤/٣ حديث رقم ٢٦٠٢-

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر کے لئے نکلتے اور اپنے اونٹ پر سوار ہو جاتے تو اللہ اکبر تین بار کہتے پھر یہ آیت پڑھتے۔کہ اللہ تعالیٰ پاک ہے کہ جس نے یہ سواری ہمارے لئے مطیع کر دی ہے اور ہم اس کے واسطے طاقت رکھنے والے نہیں ہیں اور ہم اپنے پروردگار کی طرف پھرنے والے ہیں اور اے الٰہی! تحقیق ہم تجھ سے اس سفر میں ایسی نیکی، تقویٰ اور عمل کا سوال کرتے ہیں جس سے تو راضی ہو جائے۔یعنی اے الٰہی! تو اس کو قبول کر لے ہم پر ہمارا سفر آسان کر دے اور ہمارے واسطے لپیٹ دے یعنی اس کی درازگی کو دور کر دے۔اے الٰہی! تو ہی ہے سفر میں نگہبانی کرنے والا اور اہل میں خبرگیری کرنے والا۔اے الٰہی! تحقیق میں سفر کی مشقت سے اور بری حالت کے دیکھنے سے یعنی اہل و مال میں نقصان دیکھنے سے پناہ مانگتا ہوں اور غمگین اور بری حالت سے پناہ مانگتا ہوں اور مال اور اہل اور اولاد میں برائی کے آنے سے پناہ مانگتا ہوں یعنی اس چیز سے پناہ مانگتا ہوں کہ سفر سے لوٹ کر آؤں تو اپنے اہل و مال میں نقصان دیکھوں اور رنج اٹھاؤں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے واپس تشریف لاتے تو اس دعا میں ان الفاظ کے ساتھ اضافہ فرماتے کہ ہم سفر سے سلامتی کے ساتھ اپنے ہم وطنوں کی طرف پھرنے والے ہیں، توبہ کرنے والے ہیں اور بندگی کرنے والے ہیں اپنے پروردگار کی تعریف کرنے والے ہیں۔اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: اذا استوى على بعيره خارجا الى السفر كبر ثلاثا: سواری پر سوار ہو چکنے کے بعد تکبیر کی حکمت شاید

یہ ہے کہ یہ مقام مقامِ علو ہے، اور اس میں ایک قسم کی عظمت ہے، چنانچہ اس موقع پر اپنے خالق کی عظمت کو یاد کیا جائے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ تکبیر تعجب من التسخیر کی وجہ سے ہو۔ چنانچہ حضرت علیؓ کی یہ حدیث اس کی مؤید ہے: **انه عليه الصلوة والسلام كان اذا وضع رجله فى الركاب قال: بسم الله، فاذا استوى على ظهرها قال: الحمد لله۔ ثم قال:** ایک روایت میں ہے: **قرا:** یعنی اللہ جل شانہ کے اس فرمان: ﴿**وجعل لكم من الفلك والانعام ما تركبون لتستووا على ظهوره ثم تذكروا نعمة ربكم اذا استويتم عليه وتقولوا**﴾[الزخرف:۱۲۔۱۳] کی تکمیل کی خاطر یہ آیت کریمہ: ﴿**سبحان الذى سخرلنا هذا وما كنا له مقرنين وانا الى ربنا لمنقلبون**﴾[الزخرف:۱۳]

قوله: ﴿**سبحان الذى سخرلنا هذا وما كنا له مقرنين وانا الى ربنا لمنقلبون**﴾[الزخرف:۱۳] یہ دعا درحقیقت اپنے عجز کا اعتراف ہے، اور یہ کہ اس سواری پر سوار ہونے کی قدرت اللہ ہی کے قدرت دینے اور مسخر کرنے سے حاصل ہوئی ہے۔ ''**لمنقلبون**'' کا لام برائے تاکید ہے، اس میں اشارہ ہے کہ انسان کا حیات کی سواری پر استیلاء پانا ایسا ہی ہے جیسا کہ وہ سواری کی پشت پر ہے، اور عنقریب اس پر زوال آجائے گا، حتی کہ وہ اپنے مولیٰ سے ملاقات کیلئے تیار ہو جائے گا، اور خصوصاً سواری کبھی موت کا باعث بھی بن جاتی ہے۔ مثلاً خدانخواستہ سواری کا جانور بدک جائے وغیرہ۔ خواہ کسی بھی سواری پر سوار ہوا جائے، خواہ سفر کیلئے سوار ہوا جائے یا غیر سفر کیلئے اس دعا کا پڑھنا مسنون ہے۔ اس آیت کریمہ: ﴿**من الفلك والأنعام**﴾[الزخرف:۱۲] میں اس سے مراد اونٹ ہیں۔ چونکہ بلادِ عرب میں زیادہ جانور یہی تھا۔ اور راوی کا یہ جملہ: **خارجا الى السفر** ایک طرف حکایت حال ہے اور دوسر طرف ضبط مقال پر دلالت کر رہا ہے۔

قوله: اللهم انا نسئلك فى سفرنا هذا البر والتقوى ومن العمل ماترضى: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اللہ جل شانہ کی طرف لوٹنا یہ سفر اعظم ہے، لہٰذا اس کیلئے زادِ راہ ہونا چاہئے، **اللهم:** ایک روایت میں **وقال اللهم** ہے یعنی اے اللہ ہم اپنے اس سفر حسی میں طاعت اور معصیت سے بچاؤ طلب کرتے ہیں۔ یا بر سے مراد لوگوں سے حسن سلوک ہے۔ یا یہ کہ اے اللہ ہمارے ساتھ حسن سلوک فرما۔ اوامر کا بجالانا اور زواجر سے اجتناب برتنا یہ بھی تقوی کا حصہ ہے۔ (حدیث مبارکہ کے اس جملہ میں درحقیقت) اس ارشاد باری تعالی کی طرف اشارہ ہے: ﴿**وتزودوا فان خير الزاد التقوىٰ**﴾[البقرة:۱۹۷]

ومن العمل: جنس مراد ہے۔ **ما ترضى:** کا صلہ محذوف ہے)۔ **أى به عنّا:** ابن حجرؒ فرماتے ہیں: ایک نسخہ میں اس (**ما ترضى**) کے ماقبل **تحبه** کے الفاظ بھی ہیں۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: اس نسخہ کا صحیح ہونا اللہ ہی جانتا ہے۔

عرض مرتب: ملا علی قاریؒ نے اس سے آگے مشیت، ارادہ رضا، امر و محبت کے درمیان کی نسبت پر کلام کیا ہے، جو ایک صفحہ کے لگ بھگ ہے۔ ہم نے وہ سارا کلام یہاں سے حذف کر کے کتاب الایمان میں ذکر کیا ہے۔ اھ۔

قوله: اللهم هون علينا سفرنا هذا: هون کیلئے مفعول ہے، یا اس کا ظرف ہے۔ مفعول مقدر ہے۔ **أى، يسر أمورنا مع الراحة لقلوبنا وأبداننا فى سفرنا۔ هذا: أى بالخصوص، لأن الصوفى ابن الوقت۔** اور یہ بھی ممکن ہے کہ ظاہر میں اشارہ سفر ظاہری کی طرف ہو، اور باطن میں سفر باطنی کی طرف اشارہ ہو۔ جیسا کہ ایک حدیث میں آتا ہے: **كن فى الدنيا كأنك غريب أوعا برسبيل۔ وأشار الشاطبى بقوله: قريبا غريبا، وفى كلام الصوفية يعبرون عنها بكائن بائن وعرش وفرش ولا نهوتى تاسوتى۔**

وقوله: واطو لنا بعده: ''اطو'' طیّ سے امر کا صیغہ ہے۔

اوراس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ اس دور کے سفر کو قریب بنادے، اوراس سفر میں ہماری حاجات کو پورا فرمادے۔اس جملہ میں اہل معرفت کی اصطلاح پر زمان ومکان کی طرف اشارہ ہے۔ابن حجرؒ (اس کا مطلب بیان کرتے ہوئے) لکھتے ہیں: اے اللہ اس سفر کے بعد کو ہمارے لئے حقیقۃً لپیٹ دے۔ چونکہ حدیث میں آتا ہے: **ان للّٰه ملائكة يطوون الأرض للمسافر كما تطوى القراطيس**۔یا مراد یہ ہے کہ ہماری مشقت کو ہلکا فرمادے۔

قوله: اللهم أنت الصاحب فى السفروالخليفة فى الأهل والنال: (یہاں) "صاحب "حافظ ومعین کے معنی میں ہے،اوراصل میں "صاحب" "ملازم" کو کہتے ہیں،اورمراد یہ ہے کہ اے اللہ آپ ہمیں اپنی مصاحبت یعنی عنایت وحفظ اوررعایت عطا فرمادیجئے۔حدیث مبارکہ کے اس جملہ میں تنبیہ ہے کہ بھروسہ اللہ ہی کی ذات پر کرنا چاہئے۔ چنانچہ حدیث قدسی میں آتا ہے: **أنا يدك اللازم فلازم يدك**۔

عرض مرتب: مرقاۃ کے محشی لکھتے ہیں: **والخليفة فى الأهل** کا اضافہ مشکوۃ سے کیا ہے اھ۔

"**الخليفة**" **من يقول مقام أحد فى اصلاح أمره**۔تورپشتیؒ فرماتے ہیں: اس کا معنی یہ ہے کہ آپ ہی وہ ذات ہیں جس سے میری رجاء وابستہ ہے، میرے سفر میں میرا بھروسہ آپ ہی پر ہے، میرے معین ومحافظ ہوجایئے، اورمیری غیوبت میں میرے اہل خانہ کے نگہبان ہوجایئے، ان کی پراگندگی کو دور کردیجئے، ان کی بیماریوں میں ان کی تداوی آپ ہی فرمایئے، ان کے دین اوران کی امانت کی حفاظت فرمایئے۔

قوله: اللهم انى أعوذبك من وعثاء السفروكآبة المنظر: "وعثاء" واؤ کے فتحہ اورعین کے سکون کے ساتھ ہے بمعنی شدت ومشقت۔ کآبۃ: مد کے ساتھ ہے۔اس کی توضیح میں عبارات مختلف ہیں: (۱) **سوء الحال وتغير النفس**۔(۲) **قيل: المراد منه الاستعاذة من كل منظر يعقب النظر اليه الكآبة عند النظر اليه**۔(۳) **فى النهاية: الكآبة تغير النفس بالانكسار من شدة الهم والحزن**۔تصحیح شدہ نسخ اصول میں لفظ "المنظر" ظاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ یہ مصدر ہے،ابن حجرؒ لکھتے ہیں: **والمنظر بكسر الظاء ما نظرت اليه فأعجبك ويصح ارادته هنا**۔ابن حجر کا یہ کلام روایت ودرایت کے مخالف ہونے کی وجہ سے غیر صحیح ہے۔مزید یہ کہ صاحب قاموس لکھتے ہیں: **ان المنظرو المنظرة ما نظرت اليه، فأعجبك أساء ك**۔صاحب قاموس نے معنی میں عموم رکھا ہے، کسرہ کی کوئی تخصیص ذکر نہیں کی۔

وسوء المنقلب فى المال والأهل: "المنقلب "لام کے فتحہ کے ساتھ، مصدر میمی ہے۔میرے لوٹنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں کوئی غم یا بیماری پیش آئے۔مقصد پورا ہوئے بغیر لوٹ آنے سے اور یہ کہ جان کو کوئی مصیبت پیش آجائے مثلاً بیماری وغیرہ۔اور مال ومتاع کے لٹ جانے اور چوری ہوجانے سے۔"**أهل** " سے مراد بیوی، خادم اوراقارب ہیں۔مطلب یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بیمار ہوجائے، یا گم ہوجائے۔

قوله: آئبون تائبون عابدون لربنا حامدون: "آئبون "ہمزہ ممدودہ کے بعد ہمزہ مکسورۃ ہے۔آب یؤوب بمعنی رجع سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔سلامتی کے ساتھ ہم سفر سے اپنے وطن کی طرف، یا غیبت سے حضور کی طرف یا غفلت سے ذکر کی طرف لوٹ کرآنے والے ہیں۔

"**تائبون**" یعنی معصیت سے طاعت کی طرف لوٹ کرآنے والے ہیں۔تقدیری عبارت بظاہر یوں ہے: **نحن آئبون تائبون**۔ یہ کلام بطوراخبار کے ہے، تحدیث بنعمۃ اللّٰہ ہے۔اوراللہ کی طاعت پر ثبات کا قصد ہے۔ابن حجر کا یہ کہنا کہ یہ خبر بمعنی دعا ہے، صحیح نہیں،

خصوصاً جبکہ ''تائبون'' کی نسبت نبی کریم ﷺ اور اکثر صحابہ کرام کی طرف ہے۔

عابدون لربنا حامدون کے بارے میں بھی کلام کچھ یوں ہی ہے۔ عابدون کے بارے میں ابن حجرؒ لکھتے ہیں: أي وفقنا في رجوعنا هذا للعبادة۔ یہ تکلف ہے، بلکہ تعسّف ہے۔ ''لربنا'' عابدون کے متعلق ہے، یا ما بعد یعنی '' حامدون '' کے متعلق ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ تنازع کے قبیل سے ہو۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''لربنا'' ممکن ہے کہ ''عابدون '' کے متعلق ہو، چونکہ اسم فاعل کا عمل ضعیف ہے۔ چنانچہ اس ذریعہ اس کو تقویت مل جائے گی۔ یا '' حامدون'' کے متعلق ہے اور مفید تخصیص ہے۔ أي نحمد ربنا لا نحمد غيره۔ یہ (ترکیب) اولیٰ ہے، چونکہ یہ ایسا ہے جیسا کہ دعا کیلئے خاتمہ اھ۔

اور ابن حجرؒ لکھتے ہیں: لربنا لا لغيره، حامدون: مبتدأ مؤخر، فهو خبر بمعنى انشاء الثناء على الله وحده اھ۔ اول تو اس کلام میں غرابت ہے، ثانی یہ کہ ان کا یہ کلام پچھلے کلام انه خبر بمعنى الدعاء کے مناقض ہے، اور ثالث یہ کہ حامدون کی بیان کردہ ترکیب درست نہیں، چونکہ یہ حمل درست نہیں۔ مزید یہ کہ خود ان ہی کے کلام لربنا لا لغيره سے اس کی تردید ہو رہی ہے۔ اور درست بات یہ ہے کہ ''نحن '' مبتدا محذوف ہے، اور آئبون تائبون عابدون لربنا حامدون سب اس کی اخبار ہیں، بغیر حرف عطف کے۔ جیسا کہ اس ارشاد باری تعالیٰ میں ہے: ﴿وهو الغفور الودود ذو العرش المجيد فعال لما يريد﴾ [البروج: ١٤-١٦] اور یہ لام اس کی نظیر ہے، بس فرق اتنا ہے کہ حدیث میں افادۂ حصر کی خاطر اس کو مقدم کر دیا ہے۔ اور آیت میں رعایت فواعل کے خاطر مؤخر کر دیا ہے۔ (والعلم عند اللہ تعالیٰ) ابن حجرؒ نے اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ لکھی ہے: وما قررته في لربنا أولى وأظهر من تعليقه بعابدون، لأن خاتمة الدعا بالحمد سنة مؤكدة وتعليقه بعابدون بعيد عن السياق اھ۔ اور وجہ تعجب یہ ہے کہ ان کی ذکر کی ذکر کردہ یہ بات بعینہ وہی ہے جو امام طیبیؒ نے فرمائی ہے۔ فالعجب أنه ذهب الى مذهب ما حصل فيه الا التعب۔

حضور ﷺ سفر کی مشقتوں سے پناہ مانگا کرتے تھے

۲۴۲۱: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ سَرْجِسٍ قَالَ كَا نَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا سَفَرَ يَتَعَوَّذُ مِنْ وَعْثَاءِ السَّفَرِ وَكَآبَةِ الْمُنْقَلَبِ وَالْحَوْرِ بَعْدَ الْكَوْرِ وَدَعْوَةِ الْمَظْلُوْمِ وَسُوْءِ الْمَنْظَرِ فِی الْاَهْلِ وَالْمَالِ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ٩٧٩/٢ حديث رقم (٤٢٦- ١٣٤٣)۔ والترمذی فی السنن ١٦١/٥ حديث رقم ٣٥٠٢۔ وابن ماجه ١٢٧٩/٢ حديث رقم ٣٨٨٨۔ والدارمی فی السنن ٣٧٣/٢ حديث رقم ٢٦٧٢۔ واحمد فی المسند ٨٢/٥۔

ترجمہ: عبداللہ بن سرجسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب سفر کرتے تھے تو سفر کی مشقت سے پناہ مانگتے تھے اور بری حالت کے لوٹنے سے اور نقصان سے پیچھے زیادتی میں یعنی اعمال صالح میں اور اہل و مال میں اور مظلوم کی بد دعا سے اور اہل و مال کی بری حالت دیکھنے سے۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: يتعوذ من وعثاء السفر وكآبة المنقلب: چونکہ سفر کی مشقت ذکر وفکر سے غافل کر دیتی ہے، اس کی شدت حضور قلب مع اللہ میں رکاوٹ بنتی ہے، بعض کا کہنا ہے: السفر قطعة من سفر۔ (آگے لکھتے ہیں): وفيه تعمية لطيفة من جهة الكتابة والحساب، فتأمل تدركهما على وجه الصواب۔ حدیث میں آتا ہے: السفر قطعة من العذاب۔ یعنی جہنم کے عذاب کی ایک قسم ہے۔ اس آیت میں اسی کا ذکر ہے: ﴿سارهقه صعودا﴾ [المدثر: ١٧] أي سأكلفه عقبة شاقة المصعد۔

قاضی بیضاویؒ لکھتے ہیں: هو مثل لما يلقى من الشدائد۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ حقیقت پر محمول ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں آتا ہے: انه جبل من نار يصعد فيه سبعين خريفا، ثم يهوى فيه كذلك أبدا۔ اس حدیث کو امام احمد، ترمذی، حاکم، اور ابن

حبان نے از ابوسعید سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے۔

''وكآبة المنقلب'' فائق میں لکھتے ہیں: هو أن ينقلب الى وطنه فيلقى ما يكتئب منه من أمر أصابه فى سفره أو فيما يقدم عليه اھ۔ (حدیث مبارکہ کے) اس (جملہ) میں دنیا سے آخرت کے وطن کی سفر کی طرف اشارہ ہے۔ اور یہ بات استعاذہ کے زیادہ لائق ہے۔ اور اسی قبیل سے یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وسيعلم الذين ظلموا أى منقلب ينقلبون﴾

[الشعراء: ۲۲۷]

قوله: والحور بعد الكور: یہ دونوں لفظ بروزن ''جور'' ہیں۔ لفظ ''کور'' کے آخر میں راء ہے، اور بعض نسخوں میں ''کور'' راء کے بجائے ''الحور'' حاء کے فتح اور واؤ کے سکون کے ساتھ ہے۔ ''حور'' کے اصل معنی ہیں: نقض العمامة بعد لفها۔ یا عرب کے اس قول سے مأخوذ ہے: حار بعد ما كان۔ کور اصل میں كور العمامة سے مأخوذ ہے۔ کہا جاتا ہے: كار عمامته:

''الكور'' نون کے ساتھ ہے یعنی ''کون'' ہے۔

اس جملہ کے متعدد مطالب بیان کئے گئے ہیں:

(۱) النقصان بعد الزيادة۔ (۲) التفرق بعد الاجتماع۔ (۳) قيل: من فساد الأمور بعد اصلاحها۔

(۴) قيل: الرجوع عن الجماعة بعد أن كان فيهم۔ (۵) من التنزل بعد الترقى۔ (۶) من الرجوع الى المعصية بعد التوبة۔ (۷) من الرجوع الى الغفلة بعد الذكر۔ (۸) من الرجوع الى الغيبة بعد الحضور۔ (۹) قيل: من الشذوذ بعد الجماعة۔ (۱۰) من القلة بعد الكثرة۔ (۱۱) من الايمان الى الكفر۔ (۱۲) من احالة القبيحة بعد الحالة الجميلة۔

قوله: ودعوة المظلوم: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اگر آپ یہ کہیں کہ مظلوم کی بددعا سے تو بہرحال بچنا چاہئے، خواہ حضر ہو، خواہ سفر ہو۔ میں کہتا ہوں یہی معاملہ حور بعد الكور کا بھی ہے، لیکن سفر چونکہ مظان بلایا و مصائب میں سے ہے، اس لئے خصوصی طور پر ذکر فرمایا۔ اھ۔ اور ان کی مراد یہ ہے کہ اس وقت (یعنی حالت سفر میں) دین و دنیا کے نقصان کا زیادہ اندیشہ ہے، حتی کہ رفقائے سفر وغیرہ کے ساتھ زیادتی تک کی نوبت آ جاتی ہے، خصوصاً جب کہ پانی کی تنگی ہو، جیسا کہ سفر حج میں مشاہدہ ہے، تو دوسرے مواقع کا کیا کہنا۔ اور اسی وجہ سے بعض مشائخ اس کو یہ نام دیتے تھے۔

السنة التى عصيت الله فيها: حتی کہ بعض حضرات اسی وجہ سے مکہ جانے کے بجائے راستے سے واپس آ گئے۔ اس کلام سے ابن حجرؒ کے اس کلام کا رد بھی ہو جاتا ہے جو انہوں نے طیبیؒ کے کلام پر اعتراض کرتے ہوئے کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں: وهو عجيب، لأن جوابه لا يلاقى السؤال أصلاً فتأمل: یا یہ کہا جائے کہ مظلوم جب سفر میں ہوتا ہے تو اس کی دعا قبولیت کے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ دو وجوہ سے، (۱) وہ مشکل و مصیبت میں ہوتا ہے۔ (۲) وہ پردیس میں ہوتا ہے۔

قوله: سوء المنظر: ظاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ فى الأهل والمال: یعنی اس بات سے کہ کوئی ظالم یا فاجر میرے اہل و مال میں کوئی طمع کرے۔

مکان میں داخل ہوتے وقت کی دعا

۲۴۲۲: وَعَنْ خَوْلَةَ بِنْتِ حَكِيْمٍ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ مَنْ نَزَلَ مَنْزِلاً فَقَالَ اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّآمَّاتِ مِنْ شَرِّ مَاخَلَقَ لَمْ يَضُرُّهُ شَیْءٌ حَتّٰى يَرْتَحِلَ مِنْ مَنْزِلِهٖ ذٰلِكَ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ۲۰۸۰/۴ حديث رقم (۵۴۔ ۲۷۰۸)۔ وابوداؤد فى السنن ۱۳/۴ حديث رقم ۳۴۹۹۔

والترمذی فی السنن ۱۵۹/۵ حدیث رقم ۳۴۹۹۔ وابن ماجه ۱۱۷٤/۲ حدیث رقم ۳۵٤۷۔ والدارمی ۳۷۵/۲ حدیث رقم ۲٦۸۰ واحمد فی المسند ۲۹۰/۲۔

ترجمہ: حضرت خولہ حکیم کی بیٹی سے روایت ہے۔ کہ کہا میں نے نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے سنا ہے۔ فرمایا کرتے تھے جو کسی مکان میں اترے یعنی سفر میں ہو یا حضر میں پھر وہ کہے کہ میں پناہ مانگتا ہوں اللہ تعالیٰ کے کلموں کے ساتھ کہ پورے ہیں یعنی اسماء وصفات یا اس کی کتابیں اس چیز کی برائی سے جو پیدا کی۔ اس کو کوئی چیز ضرر نہیں کرتی۔ یہاں تک کہ وہ کوچ کرے اس منزل سے۔ اس کو امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

خولة بنت حکیم ۔ یہ ''خولہ'' بنت حکیم حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی بیوی ہیں۔ بڑی صالح اور فاضل بی بی تھیں ان سے ایک جماعت نے روایت کی ہے۔ ان سے صرف یہی ایک حدیث مروی ہے ''خولہ'' میں خائے معجمہ مفتوح اور واؤ ساکن ہے۔

تشریح: **قوله: من نزل منزلا:** ابن حجر نے اسے سفر کے ساتھ مقید کیا ہے، میں کہتا ہوں کہ حضر کا معاملہ بھی یوں ہی ہے، تنوین تنکیر کے باوجود تقیید کی کوئی وجہ نہیں بنتی۔

قوله: أعوذ بکلمات الله التامات من شر ماخلق: یعنی ایسے کامل کلمات کہ جن میں نہ کوئی نقص داخل ہوسکتا ہے، اور نہ کوئی عیب داخل ہوسکتا ہے، اور بعض کا کہنا ہے کہ کلمات نافعہ شافیہ مراد ہیں۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ قرآن مراد ہے۔ (ذکرہ النووی)

اور زیادہ واضح بات یہ ہے کہ اس سے مراد اللہ جل شانہ کے اسماء وصفات ہیں یا کتب منزلہ مراد ہیں، چونکہ وہ قدیم ہیں، ان میں کوئی نقص نہیں ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ اللہ جل شانہ کا ''کلام نفسی'' مراد ہے، یا اس کا علم مراد ہے، یا اس کے قضایا مراد ہیں۔ اور ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: **أی بشؤونه المشار الیها بکل یوم أی وقت هو فی شأن** ۔ لیکن یہ غیر صحیح ہے، لفظاً تو اس وجہ سے ٹھیک نہیں کہ کلمہ کا اطلاق ''شأن'' پر نہیں ہوتا، اور معنًی اس وجہ سے کہ اللہ جل شانہ کے شؤون میں سے مخلوقات بھی ہیں، اور وہ خود اس بات کی تصریح کر چکے ہیں کہ تعوذ قدیم سے مانگا جائے، محدث سے نہ مانگا جائے۔ نیز علماء فرماتے ہیں: **شؤون یبدیها ولا یبتدیها، فانها مقدرة قبل وجودها:** نیز **من شر ما خلق** بھی اس سے مناسبت نہیں رکھتا۔ **من شر ما خلق:** اس میں اشارہ ہے کہ مخلوق من حیث ہو مخلوق شر سے خالی نہیں۔ اور ممکن ہے کہ اس سے شر کا صدور رہو۔ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس مبنیٰ کی طرف دھیان نہیں دیا، چنانچہ وہ لکھتے ہیں: **مما فیه شر**۔

قوله: لم یضره شیء حتی یرتحل من منزله ذلك: ''**لم یضره** '' راء کے فتحہ اور ضمہ کے ساتھ ہے۔ ''شیء'' کی تنوین سے مستفاد تعمیم مفید مبالغہ ہے۔ یہ معنی، ابن حجر کی لگائی ہوئی قید **مما فیه ضرر** سے اولیٰ ہے۔ اس حدیث میں اہل جاہلیت کے ایک فعل کا رد بھی ہے، کہ جب وہ کسی جگہ پڑاؤ ڈالتے تھے تو کہتے: **نعوذ بسید اهل الوادي**، اس کو ''کبیر الجن'' کا نام دیتے تھے۔ سورۃ جن کی یہ آیت کریمہ بھی اسی معنی میں ہے: ﴿**وأنه کان رجال من الانس یعوذون برجال من الجن فزادوهم رهقا**﴾ [الجن:٠٦] اس میں حقیقت ''تفرید'' اور حقیقت توحید کی طرف اشارہ ہے۔ چونکہ غیر اللہ نہ اپنے نفع کا مالک ہے، نہ اپنے نقصان کا، نہ زندگی کا مالک ہے، نہ حیات ونشور کا۔

بلکہ صاحب معرفت کی نظر میں اس کی حقیقت یہ ہے: ''**لیس في الدار غیره دیار، وانما السوی فی عین أهل الهوی، کالهباء في الهواء**۔ ایک اور عارف باللہ فرماتے ہیں: **سوی الله والله ما فی الوجود**۔

بچھو کے ڈسنے کی دعا

۲۴۲۳: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَا لَقِيْتُ مِنْ عَقْرَبٍ لَدَغَتْنِی الْبَارِحَةَ قَالَ اَمَا لَوْ قُلْتَ حِيْنَ اَمْسَيْتَ اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّا مَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ لَمْ تَضُرُّكَ۔

(رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ۲۰۸۱/٤ حديث رقم (۹۰ - ۲۷۰)۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا۔ پس اے اللہ کے رسول! میں نے ایک بچھو سے ایذا پائی کہ اس نے مجھ کو گذشتہ رات میں کاٹا ہے۔ فرمایا خبردار ہو جاؤ۔ اگر تو اس وقت کہتا جب شام کی تو نے تو کہتا کہ میں پناہ مانگتا ہوں اللہ تعالیٰ کے کلموں کے ساتھ کہ پورے ہیں اس چیز کی برائی سے کہ پیدا کی۔ نہ ضرر پنچائے تجھ کو۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تخریج: و کذا الاربعة

تشریح: **قوله: ما لقيت من عقرب لدغتنی البارحة**: اس ''ما'' کے بارے میں کئی احتمال ہیں:

ا۔ یہ ''ما'' استفہامیہ ہے۔ أی: **أی شیٔ لقيت ای۔ لقيت وجعا شديدا**۔ ۲۔ ''ما'' تعجبیہ ہے۔ **أی أمرا عظيما**۔ ۳۔ ''ما'' موصولہ ہے اور خبر محذوف ہے۔ **أی الذی لقيته لم أصفه لشدته۔ ''البارحة'' ای الليلة الماضية**۔ ابن حجرؒ لکھتے ہیں: **لذغتنی بالذال المعجمة والغين المعجمة ولذعتنی النار بالمعجمة ثم المهملةاھ**۔ یہ ضبط، نسخ مصحہ کے بھی خلاف ہے، اور اصول معتمدہ کے بھی مخالف ہے۔ چونکہ یہ لفظ دال مہملہ اور غین معجمہ کے ساتھ ضبط کیا گیا ہے۔ نیز کتب لغت قاموس اور نہایہ وغیرہ کے موافق ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ صاحب کتاب کے قلم سے سہو ہو گیا ہو، واللہ اعلم بالصواب۔

قوله: قال: اما لو قلت حين امسيت ...... : ''اما'' برائے تنبیہ ہے۔ **لو قلت**: ''لو'' شرطیہ ہے۔

تخریج: اور ترمذی کی ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: **من قال حين يمسی ثلاث مرات لم يضره حمة تلك الليلة**۔ اس حدیث کو امام طبرانی نے الأوسط میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے: **من قال حين يصبح ويمسی** اور ایک روایت میں فقط ''**حين يمسی**'' ہے۔ دارمی کی ایک روایت میں اور ابن السنی کی روایت میں ''**ثلاث مرات**'' کے الفاظ ہیں۔

سفر کی حالت میں سحری کے وقت خدا کی تعریف کرنا

۲۴۲۴: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ كَانَ اِذَا كَانَ فِی سَفَرٍ وَاَ سْحَرَ يَقُوْلُ سَمِعَ سَامِعٌ بِحَمْدِ اللّٰهِ وَحُسْنِ بَلَائِهٖ عَلَيْنَا رَبَّنَا صَا حِبْنَا وَاَفْضِلْ عَلَيْنَا عَائِذًا بِاللّٰهِ مِنَ النَّارِ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ۲۰۸٦/٤۔ حديث رقم (٦٨ - ۲۷۱۸)۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جس وقت سفر میں ہوتے تھے اور سحری کا وقت ہوتا تھا سننے والے میری خدا کی تعریف کر لی سنی سننے والوں نے میری خدا کی تعریف کرنی اچھ میرا اقرار کرنا۔ ساتھ اس کی نعمت کی خوبی کے ہم پر ہے۔ اے ہمارے رب ہماری نگہبانی کر اور احسان کر۔ ہم پر ہم یہ کلام خدا کے ساتھ پناہ مانگتے ہوئے کہتے ہیں۔ آگ سے۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح:قوله:ان النبی ﷺ كان اذا كان فی سفر يقول:"كان "أی عادته و دأبه أومن آدابه۔اسحر:سحر کے وقت میں داخل ہونا۔طلوع صبح صادق سے کچھ پہلے کا وقت اورزمخشری لکھتے ہیں:رات کا آخری چھٹا حصہ۔

قوله:سمع سامع بحمد الله وحسن بلائه علينا:''سمع''بروزن عَلِمَ ،تخفیف کے ساتھ ہے۔(صورۃ ماضی ہے مگر امر مراد ہے)۔أی يسمع سامع ليشهد من سمع أصواتنا۔''حمد الله''(مصدر کی اضافت مفعول کی طرف ہے،اور فاعل محذوف ہے)۔أی بحمدنا الله تعالیٰ۔

وحسن بلائه علينا:(یہاں کچھ عبارت محذوف ہے)۔أی باعترافنا بحسن انعامه۔یہ کلام خبر بمعنی امر ہے۔(قالہ الخطا)۔اور تورپشتیؒ فرماتے ہیں:ظاہر لفظ کی بناء پر خبر کے معنی پر محمول کرنا اولیٰ ہے۔معنوی تقدیر یوں ہے:سمع من كان له سمع بأنا نحمد الله ونحسن نعمه وافضاله علينا:اور مطلب یہ ہے کہ ہمارا اللہ جل شانہ کی نعمتوں اور اس کے ہم پر انعامات کی تعریف کرنا اس قدر ذائع شائع بات ہے کہ کسی صاحب سماعت پر مخفی نہیں۔اور سامع کو نکرہ لانے میں عموم مراد ہے جیسا:تمرة خير من جرادة میں بلاء سے مراد یہاں ''نعمت'' ہے۔اللہ سبحانہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کبھی مصیبت ومشقت میں ڈال کر آزماتا ہے تاکہ صبر کریں،اور کبھی نعمتیں دے کر آزماتا ہے تاکہ شکر ادا کریں۔لہٰذا نعمت ومصیبت امتحان کے مواقع پر دونوں ہی آزمائش ہیں۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿ونبلوكم بالشر والخير فتنة والينا ترجعون﴾[الانبیاء:۳۵]شرح طیبی میں لکھتے ہیں:بعض کا کہنا ہے کہ مسلم شریف کی اکثر روایات میں سمع از باب تفعیل ،ماضی معروف واحد مذکر غائب کے صیغہ کے ساتھ ہے۔اس صورت میں مطلب یہ ہوگا:بلغ سامع قولی هذا الی غيره۔اور یہ تنبیہ کیلئے ارشاد فرمایا کہ یہ وقت دعا وذکر میں مشغولیت کا ہے،خطابی وغیرہ نے لام مخففہ کے کسرہ کے ساتھ ضبط کیا ہے۔ابن حجرؒ نے لکھا ہے:بحمد الله کی باء تشدید کی صورت میں زائدہ ہے۔اور تخفیف والی صورت میں بمعنی ''علیٰ'' ہے اھ۔اور یہ دونوں باتیں غیر صحیح ہیں،چونکہ عرب یوں استعمال کرتے ہیں:بلغ الناس بكذا اورسمع بهذا الخبر۔اور جب شھد (کے معنی میں)ہوتو باء کالانا ضروری ہے،چونکہ عرب کا محاورہ یوں ہے:شهد بكذا۔مشہود لہٗ اور مشہود علیہ دونوں برابر ہیں۔امام طیبیؒ لکھتے ہیں:البلاء النعمة أو الاختيار بالخير يتبين الشكر أو بالشكر ليظهر الصبر۔اھ۔امام طیبیؒ کا یہ کلام مستحسن ہے۔

اختبار میں دوسرا معنی اظہر ہیں،چونکہ حمد،نعمت کا پتہ دیتی ہے،لہٰذا ابلاء کو اختیار پر محمول کرنا ضروری ہے تاکہ بندہ مراتب کمال کو جامع ہو۔یہ آیت کریمہ اسی مفہوم کی طرف اشارہ کر رہی ہے:﴿ان فی ذلك لآيات لكل صبار شكور﴾[ابراهيم:۰۵]أی لكل مؤمن:ایمان کے دو حصے ہیں،نصف ایمان صبر اور نصف ایمان شکر ہے۔اور''علیٰ''کے لانے میں اس طرف اشارہ کا غلبہ دینا مقصود ہے۔ کہ ہم اللہ کے حکم وارادہ اور قدر وقضاء کے تحت مقہود ہیں،اللہ جل شانہ جس پر چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور جس پر چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے،ہم مکلّف ہیں۔دلیل یہ آیت کریمہ ہے:﴿ان عرضنا الأمانة على السموت والأرض﴾[الاحزاب:۷۲] اس تقریر سے وہ اعتراض بھی دور ہوجاتا ہے جو ابن حجر نے امام طیبیؒ پر کیا ہے:لو أريد المعنى الثانی لقيل لنا مع أن مناوبة حروف الجر بعضها لبعض شائع سائغ، وأمثال هذه المناقشات من النفسيات لامن المنافسات۔عجب بات ہے کہ انہوں نے اس بحث سے غفلت برتی ہے اور وحسن بلائهکی واؤ بمعنی مع واقع ہونا درست بتلایا ہے۔ باوجودیکہ سمع سے عدم مناسبت کے باعث بحمد الله علينانہیں کہا جا سکتا، بلکہ مناسب بات یہ ہے کہ حمد مصدر اپنے مفعول کی طرف مضاف ہو۔أی سمع بحمدنا اياها وحسن انعامه الموجب للحمد والشكر علينا:چنانچہ واؤ کا عاطفہ ہونا متعین ہوجاتا ہے۔چنانچہ ان کا کلام باطل ٹھہرا۔اور تقریر سے معلوم ہوا کہ وحسن بلائه کی واؤ کا عاطفہ ہونا متعین ہونا اور بمعنی واؤ ہونا تشدید وتخفیف کی تقدیر درست ہے۔اور شارح کا

یہ کہنا کہ تشدید کے ساتھ عطف کیلئے ہے۔اور تخفیف کی صورت میں بمعنی مع ہے چونکہ حسن البلاء غیر مسمع بلکہ مبلغ ہے اھ۔

قوله: ربنا صاحبناو أفضل علیناعائذا باللّٰہ من النار: ''ربنا'' منادی ہے،اور حرف نداء محذوف ہے۔''صاحبنا'' صیغۂ امر کے ساتھ ہے۔أی: أعنا وحافظنا۔''أفضل'' صیغۂ امر کے ساتھ ہے۔عائذا باللّٰہ من النار: بعض کا کہنا ہے: تعوذ عیاذا کقولھم: قم قائما أی قیاما،اسم فاعل کومصدر کے قائم مقام کردیا گیا ہے،یا یقول کی ضمیر سے حال ہے۔یا أسحر سے۔اس صورت میں یہ کلام راوی کا ہوگا۔لفظ عائذ مرفوعاً بھی مروی ہے۔(مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی بناء پر)۔أی: أنا عائذ۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں: منصوب علی المصدریۃ ہے۔أی أعوذ عوذا باللّٰہ۔یا منصوب علی الحالیۃ ہے۔پہلی تقدیر پر نبی کریم ﷺ کا کلام ہوگا اھ۔ان کی مراد یہ ہے کہ جب عائذا مصدر ہوتو رسول اللہ ﷺ کے کلام کا حصہ ہے۔اور حال مانیں تو نبی کریم ﷺ سے آگے روایت کرنے والے راوی کا کلام ہے۔امام نوویؒ نے اس کا حال ہونا جائز قرار دیا ہے۔اور یہ کہ نبی کریم ﷺ کا کلام ہو۔گویا کلام یوں ہے: انی أقول ھذا فی حال استعاذتی من النار۔امام طیبیؒ لکھتے ہیں: وھو الأرجح لئلا ینخرم النظم، وأنه ﷺ لما حمد اللّٰہ علی تلك النعمة الخطیرة وأمر باستماعھا کل من یتأتی منه السماع لفخامته وطلب الثبات علیه، قاله ھضما لنفسه وتواضعا للّٰہ، ولیضم الخوف مع الرجاء تعلیما لأمته اھ۔

ابن حجرؒ لکھتے ہیں: نصب علی المصدر، أونصب علی الحال من ضمیر یقول أی: أقول ذلك فی حال کونی مستعیذا، فعل الأول یکون من کلام النبی ﷺ: غرابت بایں طور ہے کہ جب یقول کی ضمیر سے حال ہوگا،تو راوی کا کلام ہوگا،اور جب کہا جائے گا یعنی أقول ذلك......تو نبی کریم ﷺ کا کلام ہوگا۔درست بات یہ ہے کہ امام نوویؒ فرماتے رہے ہیں: فعل مقدراً قول کی ضمیر فاعل سے ہے۔ابن حجر نے امام طیبیؒ کے کلام پر اعتراض کیا ہے: وأما زعم شارح ان عائذا ان کان مصدرا أی: أعوذ عیاذا أقیم اسم الفاعل مقام المصدر، وان کان حالا کان من کلمات الراوی فیرد بأن ھذا غفلة عما تقرر فی الحال الرافع لتأویله بالمصدر، ولزعمه أنه حینئذ من کلام الراوی اس کلام پر غور کریں،آپ پر عجائب وغرائب کا ظہور ہوگا۔

تخریج: اس حدیث کو ابوعوانہ اور حاکم نے بھی روایت کیا ہے۔ان کی روایت میں اتنا اضافہ ہے: یقول ذلك ثلث مرات ویرفع بھا صوته۔

جہاد یا عمرہ سے واپس لوٹتے وقت کی دعا

۲۴۲۵: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِذَا قَفَلَ مِنْ غَزْوٍ اَوْحَجٍّ اَوْعُمْرَۃٍ یُکَبِّرُ عَلٰی کُلِّ شَرَفٍ مِنَ الْاَرْضِ ثَلَاثَ تَکْبِیْرَاتٍ ثُمَّ یَقُوْلُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَعَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اٰیِبُوْنَ تَا ئِبُوْنَ عَابِدُوْنَ سَاجِدُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ صَدَقَ اللّٰہُ وَعْدَہٗ وَنَصَرَ عَبْدَہٗ وَھَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَہٗ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٦١٨/٣ حدیث رقم ١٧٩٧۔ ومسلم فی صحیحه ٩٨٠/٢ حدیث رقم (٤٢٨۔ ١٣٤٤)۔ وابو داؤد فی السنن ٨٨/٣ حدیث رقم ٢٧٧٠ والترمذی ٢١٣/٢ حدیث رقم ٩٥٧۔ واحمد فی المسند ٥/٢۔

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کہ جس وقت جہاد سے لوٹے یا حج سے یا عمرہ سے تو تکبیر کہتے ہر بلند جگہ پر تین تکبیریں پھر کہتے کوئی معبود نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے اسی کے لئے

ملک ہے اور اسی کے لیے حمد اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اور ہم وطن کی طرف پھرنے والے ہیں۔ توبہ کرنے والے ہیں' عبادت کرنے والے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرنے والے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی (بے شمار) تعریف کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ سچ کیا ہے یعنی دین کو غالب کرنے کی اور اپنے بندے کی مدد کرے یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور کفار کے گروہوں کو تنہا شکست دی۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله: کان رسول الله ﷺ اذا قفل من غزو أو حج أوعمرة یکبر......** ''**قفل**'' فاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ راوی نے تعین انواع کا ذکر کر کے گویا استیعاب کا قصد کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سفر انہی اغراض و مقاصد کیلئے ہوتا تھا۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں بلندی پر چڑھتے وقت ذکر فرمانے کی وجہ یہ تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تجدد احوال پر ذکر کو پسند فرماتے تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس سلسلہ میں مکان و زمان کی رعایت فرماتے تھے، چونکہ ذکر اللہ ایسی چیز ہے جو ہر حال میں یاد رکھے جانے قابل ہے۔ اھ۔ ابن حجرؒ لکھتے ہیں: **انه لم یستحضر أنه ﷺ اذا نزل وادیا سبح۔**

امام طیبیؒ کی مراد یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت اور ہر جگہ کی مناسبت سے ذکر فرمایا کرتے تھے۔ یہ اس بات کے منافی نہیں کہ وہ اترائی سے اترتے وقت اترائی کے مناسب دعا یعنی کلمات تنزیہ سبحان اللہ پڑھا کرتے تھے۔ اور چڑھائی پر چڑھتے وقت عظمت و کبریائی کے مناسب کلمات ادا فرماتے تھے۔

قوله: ثم یقول: لا اله الا الله......قدیر: اس قدر حصہ کی تشریح ماقبل گزر چکی ہے۔

قوله: آئبون تائبون عابدون: اس قدر حصہ کی تشریح ماقبل گزر چکی ہے۔

قوله: ساجدون لربنا حامدون: ترمذی کی روایت میں ساجدون کے بجائے ''**سائحون**'' کے الفاظ ہیں۔ ''**سائحون**'' سائح کی جمع ہے، **ساح الماء یسیح اذ اجری علی وجه الأرض** سے ماخوذ ہے۔

قوله: صدق الله وعده ونصر عبده وهزم الأحزاب وحده:

وَنَصَرَ عَبْدَہٗ وَھَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَہٗ سے غزوہ خندق کے موقع پر تائید و نصرت الٰہی کی طرف اشارہ ہے کہ علاوہ یہود قریظہ و نضیر کے تقریباً دس یا بارہ ہزار کفار مدینہ پر چڑھ آئے تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کا ارادہ رکھتے تھے۔ مگر اللہ نے ہوا اور ملائکہ کی جماعت کو کفار کے لشکر پر مسلط کر دیا۔ جس کی وجہ سے جنگ کے بغیر ہی وہ ہلاک و خراب ہو گئے۔

اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں: ﴿**یأیها الذین آمنوا اذکروا نعمة الله علیکم اذ جاء تکم جنود فأرسلنا علیهم ریحا وجنودا لم تروها**﴾ اور بعض کا کہنا ہے کہ عموم مراد ہے، یعنی تمام مواقع پر کفار کو ہزیمت سے دوچار کیا۔

مشرکین کے خلاف بددُعا

۲۴۲۶: وَ عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ اَبِیْ اَوْفٰی قَالَ دَعَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ یَوْمَ الْاَحْزَابِ عَلَی الْمُشْرِکِیْنَ فَقَالَ اَللّٰھُمَّ مُنْزِلَ الْکِتَابِ سَرِیْعَ الْحِسَابِ اَللّٰھُمَّ اھْزِمِ الْاَحْزَابَ اَللّٰھُمَّ اھْزِمْھُمْ وَزَلْزِلْھُمْ۔

(متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۰۶/۶۔ حدیث رقم ۲۹۳۳۔ ومسلم فی صحیحه ۱۳۶۳/۳ حدیث رقم (۲۱۔ ۱۷۴۲)۔ وابوداؤد فی السنن ۴۲/۳ حدیث رقم ۲۶۳۱۔ وابن ماجه فی السنن ۹۳۵/۲ حدیث رقم ۲۷۹۶۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن اوفیٰ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ احزاب کے دن مشرکوں کے خلاف بد

دعا کی۔ پس کہا اے الٰہی کتاب اتارنے والے حساب کے جلدی کرنے والے (یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ آدھے دن میں حساب لے گا)۔ اے الٰہی کافروں کے گروہ کو شکست دے دے۔ اے الٰہی شکست دے اوران کو ہلا دے۔ یعنی ان کو ثابت نہ رکھ۔ مقابلہ میں اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله: دعارسول الله ﷺ ...... فقال: اللهم منزل الكتاب سريع الحساب:** ''دعا'' کی تفسیر ہے۔ یا دعا بمعنی ''أراد الدعا'' ہے۔ ''منزل ''باب افعال سے اسم فاعل کا صیغہ ہے، اور بعض کا کہنا ہے کہ باب تفعیل سے ہے۔ کتاب: سے مراد جنس ہے۔ یا قرآن مراد ہے۔ ''سريع الحساب'' یعنی قیامت کے دن اپنی تمام مخلوقات کا حساب تیزی سے لے کر نصف النہار سے پہلے لے کر فارغ ہو جائے گا۔ جیسا کہ مروی ہے۔

قوله: اللهم اهز مهم......: تاکید وتعمیم ہے۔

۲۴۲۷:وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ بُسْرٍ قَالَ نَزَ لَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَلٰى اَبِىْ فَقَرَّبْنَا اِلَيْهِ طَعَامًا وَوَطْبَةً فَاَكَلَ مِنْهَا ثُمَّ اُتِىَ بِتَمْرٍ فَكَانَ يَاكُلُهُ وَيُلْقِى النَّوٰى بَيْنَ اِصْبَعَيْهِ وَيَجْمَعُ السَّبَّابَةَ وَالْوُسْطٰى وَفِىْ رِوَايَةٍ فَجَعَلَ يُلْقِى النَّوٰى عَلٰى ظَهْرِ اِصْبَعَيْهِ السَّبَّابَةَ وَالْوُسْطٰى ثُمَّ اُتِىَ بِشَرَابٍ فَشَرِبَهٗ فَقَالَ اَبِىْ وَاَخَذَ بِلِجَامِ دَابَّتِهٖ اُدْعُ اللّٰهَ لَنَا فَقَالَ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَهُمْ فِيْمَا رَزَقْتَهُمْ وَاغْفِرْ لَهُمْ وَارْحَمْهُمْ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۱۶۱۵/۳۔ حدیث رقم (۱۴٦۔ ۲۰۴۲) وابوداؤد فی السنن ۳۳۸۱۳ حدیث رقم ۳۷۲۹۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن بسرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ میرے باپ کے پاس بطور مہمان کے تشریف لائے۔ پس ہم نبی کریم ﷺ کے پاس گئے پس ہم حضور ﷺ کے پاس کھانا اور ایک مالیدہ جیسی چیز لے کر گئے۔ پھر آپ ﷺ نے اس میں سے کھایا پھر خشک کھجور لائی گئی۔ پھر حضور ﷺ ان کھاتے اور گٹھلی دونوں انگلیوں کے درمیان میں ڈالتے اور اکٹھی کرتے اپنی شہادت کی انگلی اور درمیان کی۔ پھر آپ ﷺ کے پاس پانی لایا گیا اور آپ ﷺ نے پیا۔ پھر میرے باپ نے کہا اس حال میں کہ حضور ﷺ کے جانور کی لگام پکڑے ہوئے تھے کہنے لگے میرے لیے دعا مانگو اللہ سے۔ پس حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اے الٰہی تو برکت دے ان کے لیے اس رزق میں برکت دے جو تو نے ان کو عطا کیا ہے اور ان کی بخشش فرما اور ان پر رحم کر دے اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله: فقر بنا اليه طعاما وطبة:** اس لفظ کے ضبط ومعنی میں شدید اختلاف ہے۔ چنانچہ وہ تمام اختلاف من وعن ملاحظہ فرمائیے۔

ووطبة: بواوين وطاء ساكنة فموحدة فى جميع نسخ المشكوة المصححة وفى المصابيح بلا عاطفة ،قال شارح الوطبة بالباء المنقوطة من تحت بنقطة وهى سقاء اللبن من الجلد والمحققون على انها تصحيف وانما هى وطيئة على وزن وثيقة وهى طعام كالحيس سمى به لانه يوطأ باليد اى يمرس ويدلك على صحة ذلك قول الراوى :فاكل منها والوطبة لايوكل منها بل يشرب وكذا قوله:اتى بشراب فهى صفة طعام وروى بواوين فعلى هذا يحمل طعام على الخبز

وفى شرح الطيبى قال النووى الوطبة بالواو واسكان الطاء وبعدها باء موحدة وهو الحيس بجمع التمر البرنى والاقط المدقوق والسمن وقال الحميدى هو براء مضمومة وطاء مفتوحة فى اكثر نسخ مسلم وهو

تصحيف من الراوى وانما هو بالواو وقول ابن حجر: رواه اكثرون بواو فطاء ساكنة فموحدة وآخرون براء مضمومة وطاء مفتوحة ورد بانه تصحيف والذى فى اكثر نسخ مسلم هوالاول غلط لما عرفت من كلام الحميدى ونقل القاضى عياض وطاة بفتح الواو وكسر الطاء بعدها همزة وادعى انه الصحيح وقال هى طعام يتخذ من التمر كالحيس وقيل سقاء اللبن و رد بانه يشرب الا ان يقال غلب الاكل على الشرب وان قوله ثم اتى بشراب يرده الا ان يراد به الماء وفى مختصر النهاية الوطئة بالهمز الغرارة يكون فيها الكعك والقديد وغيرهما وطعام يتخذ من التمر كالحيس وروى بالموحدة وقيل هو تصحيف والوطب الذى يكون فيه السمن واللبن وفى القاموس الوطيئة بالهمز كسفينة تمر يخرج نواه ويعجن بلبن والغرارة فيها القديد والكعك فالاظهر ان المراد بالطعام الخبز بالوطئة وعاء فيها بعض الادام وبه يلتئم اختلاف المقام

خلاصة الآراء:

① مصابیح کے نسخہ میں واؤ عاطفہ ہے، اور مشکوٰۃ کے تمام نسخ مصححہ میں واؤ عاطفہ کے ساتھ ہے۔

② وطبة: اس لفظ کو ۵ طرح ضبط کیا گیا ہے:

❶ وطبة: واؤ، پھر طاء ساکنہ، پھر بائے موحدۃ بروزن وهلة۔

❷ وطبة: واؤ، پھر طاء ساکنہ اور پھر یا بروزن وثيقة وسفينة۔

❸ ربطة: شرح میں راء مضمومہ پھر طائے مفتوحہ۔ جیسا کہ مسلم شریف کے اکثر نسخوں میں ہے۔ یہ راوی کی تصحیف ہے۔

❹ وطئة: پہلے واؤ مفتوحہ، پھر طائے مکسورۃ اور پھر ہمزہ۔ جیسا کہ صاحب نہایہ اور قاضی نے بیان کیا ہے۔ قاضی عیاض نے اس کو درست قرار دیا ہے۔

❺ الوطيئة: بروزن رديئة سفينة۔ یہ ضبط صاحب قاموس کا ذکر کردہ ہے۔ گٹھلی نکال کر دودھ میں گوندھی گئی کھجور۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: زیادہ واضح بات یہ ہے کہ طعام سے مراد خبز یعنی روٹی ہے، اور وطئہ سے مراد وعاء فيه بعض الأدام یعنی سالن کا ڈونگہ کہ جس میں تھوڑا سا سالن تھا۔ اس توجیہہ سے تطبیق ہو جاتی ہے۔

قوله: فأكل منها...... والوسطىٰ: ضمیر "وطبہ" کی طرف راجع ہے۔ بظاہر "منها" کہنا چاہئے تھا، منہ کی صورت میں مذکور کی تاویل ہوگی۔ چنانچہ وہ اس قبیل سے ہے: ﴿والذى يكنزون الذهب والفضة ولا ينفقونها فى سبيل الله﴾[التوبة: ٣٤] ضمیر مذکور اقرب کی طرف راجع ہے، اور پہلے کو اس کے واضح ہونے کے باعث ترک کر دیا، چنانچہ یہ از باب اکتفاء ہے۔ **يلقى:** یاء اول کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ **النوى:** "ال" جنس کا ہے۔ **أصبعه:** اس لفظ میں نو لغات ہیں۔ مشہور ترین لغت ہمزہ کے کسرہ اور باء کے فتحہ والی ہے۔ **على ظهر أصبعيه السبابة والوسطى:** مجرور علی البدلیت یا بیان میں مرفوع اور منصوب پڑھنا بھی درست ہے۔ **وفى رواية فجعل يلقى النوى على ظهر السبابة والوسطى:** ابن حجرؒ لکھتے ہیں: **هذه الراوية مبينة للمراد من الأولى،** یعنی یہ دوسری روایت پہلی روایت (میں موجود بلقى النوى بين اصبعيه ويجمع السبابة والوسطى) کی مراد بیان کر رہی ہے۔ (یعنی پچھلی روایت میں یہ بیان کیف کچھ تشنہ تھا، اس کی یہاں وضاحت ہوگئی کہ آپ ﷺ نے گٹھلیاں انگلیوں کی پشت پر رکھی ہوئی تھیں، اندرونی حصہ میں نہیں تھیں)۔

ابن حجرؒ کا یہ کہنا مردود ہے کہ وہ روایت وضع بين أصبعيه پر دلالت کر رہی تھی اور یہ روایت وضع النوى على ظهرهما پر

دلالت کر رہی ہے۔اولیٰ یہ ہے کہ دونوں روایتوں میں جمع کیا جائے،
ایک روایت تو یہ بتاتی ہے کہ آپ ﷺ گٹھلیاں دونوں انگلیوں کے درمیان رکھتے جاتے تھے اور ایک روایت یہ بتا رہی ہے کہ دونوں انگلیوں کی پشت پر ڈالتے تھے۔ بظاہر اس بات میں اختلاف نظر آتا ہے۔لیکن اگر ذہن میں یہ بات رہے کہ آپ ﷺ گٹھلیوں کو دونوں انگلیوں کے درمیان کبھی رکھتے جاتے ہوں گے اور کبھی دونوں انگلیوں کی پشت پر ڈالتے جاتے ہوں تو ان دونوں روایتوں میں کوئی تعارض نظر نہیں آئے گا اور پھر پشت پر انگلیوں کی گٹھلیوں کو ڈالنے کی وجہ یہ تھی تا کہ ہاتھ کے اندر کا رخ گٹھلیوں میں لگے ہوئے لعاب وغیرہ سے ملوث نہ ہو کیونکہ اندر کی صفائی اور ستھرائی باہر کی صفائی اور ستھرائی سے اولیٰ ہے۔

ہاں دوسری روایت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دونوں صورتیں ''ظہر'' پر محمول ہیں۔اور بائیں ہاتھ کی انگلیاں مراد ہیں۔
ابن حجرؒ لکھتے ہیں: **وحكمة ذلك تعليم أمته أدب أكل التمر ونحوه بأن يلقى على هذه الكيفية حتى لا يمسه باطن الأصابع، فتعاف النفس عودها الى الطعام لما فيها من أثر الريف**۔ابن حجر کا یہ فرمانا کھانے کے آداب سے غفلت کا نتیجہ ہے، کہ اس کا تعلق دائیں کے ساتھ ہوتا ہے نا کہ بائیں کے ساتھ۔

قوله: ثم اتى ...... وأخذ بلجام دابته: أدع الله لنا: یہ جملہ حالیہ ہے، جو قول و مقولہ کے درمیان واقع ہوا ہے۔
یہ حدیث ایسی کئی باتوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو مہمان اور میز بان کے لئے مسنون کا درجہ رکھتی ہے۔مثلاً اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اکابر اور مہمان کی سواری کی رکاب اور لگام کو از راہ تواضع اور خاطر داری پکڑنا مسنون ہے۔اسی طرح مہمان کو رخصت کرنے کے لئے مکان کے دروازے یا باہر کچھ دور تک اس کے ساتھ جانا سنت ہے۔نیز اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ میز بان کے لئے تو یہ مسنون ہے کہ وہ مہمان سے طلب دعا کرے اور مہمان کے لئے یہ مسنون ہے کہ میز بان کے لئے دعا کرے۔

أدع الله لنا: ان صحابی کا نبی کریم ﷺ سے اس موقع پر دعا کا طلب کرنا اس دعوت کو کھلانے کے مقابلہ میں احسان کے طور پر نہیں تھا، صحابہ کرام تو اصحاب کرم و مروّت تھے، ان کے بارے میں یہ گمان کیسے کیا جا سکتا ہے۔یہ تو درحقیقت اس لطف اور نظرِ رحمت کا سوال تھا کہ جو نظر رحمت و لطف ہر عام و خاص پر فرماتے تھے۔اور دلیل اس کی یہ ہے کہ دعا کی درخواست کھانے سے فارغ ہونے کے وقت نہیں کی بلکہ سوار ہونے کے وقت کی۔

ابن حجرؒ لکھتے ہیں: **لاينافيه أنه يسن لمن تصدق على فقير أن لا يطلب منه الدعاء، لئلا تكون صدقته فى مقابلة الدعا فيفوت الاخلاص، لأن الضيافة آكد من الصدقة لقول كثيرين بوجوبها، فلا يتخيل أنها فى مقابلة الدعاء**۔
ابن حجرؒ کا یہ کلام کئی وجوہ سے مردود ہے۔

۱۔اتنی بات تو مسنون ہے کہ فقیر جب متصدق کو دعا دے، جیسا کہ آداب میں سے ہے، تو متصدق اس کو جواب دے۔تا کہ دعا کے مقابلہ میں دعا ہو جائے، اور اس کو صدقہ کا ثواب مل جائے۔البتہ یہ کہنا کہ ''دعا کا طلب نہ کرنا مسنون ہے'' دلیل کا محتاج ہے۔
۲۔جب یہ بات ٹھہری کہ طلب دعا، اخلاص کامل کو فوت کر دیتی ہے تو بات یہ ہے کہ صدقہ اور ضیافت میں کوئی فرق نہیں ہے، دونوں قسمیں خواہ واجبہ ہوں خواہ نافلہ ہوں کمال اخلاص کی محتاج ہیں۔

۳۔اس حدیث سے یہ کہیں معلوم نہیں ہو رہا کہ یہ ضیافت واجبہ تھی۔۴۔نفل کے بابت دعا کے مقابلہ میں ہونے کا خیال تو ہو سکتا ہے، لیکن واجب میں نہیں، اس وجہ سے کہا گیا ہے: **الفرض لا يدخل فيه الرياء**۔۵۔علماء فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی اور شخص (کے ہاں) کا کھانا کھائے تو اس کیلئے یہ دعا مانگنا مسنون ہے۔خواہ وہ (میز بان) دعا کی درخواست کرے، خواہ نہ کرے۔چنانچہ ابن حجر کا یہ کہنا

باطل ٹھہرا: ان من هذا يؤخذ أن المضيف اذا سأل من الضيف أن يدعوا له، سن للضيف أن يدعوله۔

ابن حجرؒ کے اس کلام کا مفہوم (مفہوم مخالف) یہ نکلتا ہے کہ جب میزبان دعاؤں کی درخواست نہ کرے تو مہمان اگر یہ دعا مانگے تو مسنون نہ ہوگا۔ اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ اولیٰ یہ ہے کہ میزبان صحابہ کے فعل کی اقتداء کرے نیز اس پر نبی کریم ﷺ کی تقریر ثابت ہے اپنے مہمان سے دعا کی درخواست کرے۔٦۔ انبیاء واولیاء سے دعا کی درخواست کرنا امر مطلوب ہے، تو اس قسم کی غرض مذموم کا باعث کیا ہے۔

قوله: فقال: اللهم بارك لهم فيما رزقتم واغفرلهم وارحمهم: اور برکت کی علامت یہ ہے کہ قناعت حاصل ہو جائے، اور طاعت کی توفیق مل جائے۔ واغفرلهم وارحمهم: دونوں افعال سے پہلے واؤ ہے۔ شیخ جزریؒ فرماتے ہیں: والذى رويناه فى جميع أصول مسلم: فاغفرلهم بالفاء۔ وكذلك فارحمهم فى أكثرها وليس رواية: فجعل يلقى النوى على ظهر أصبعيه فى صحيح مسلم: بل هى فى سنن ابى داؤد۔

الفصل الثانی:

چاند دیکھتے وقت کی دعا

۲۴۲۸: عَنْ طَلْحَةَ بْنِ عُبَيْدِ اللّٰهِ اَنَّ النَّبِىَّ ﷺ كَانَ اِذَا رَأَى الْهِلَالَ قَالَ اَللّٰهُمَّ اَهِلَّهُ عَلَيْنَا بِالْاَمْنِ وَالْاِيْمَانِ وَالسَّلَامَةِ وَالْاِسْلَامِ رَبِّى وَرَبُّكَ اللّٰهُ۔ (رواه الترمذى وقال هذا حديث حسن غريب)

اخرجه الترمذى فى السنن ١٦٧/٥ حديث رقم ٣٥١٥۔ والدارمى ٧/٢ حديث رقم ١٦٨٧۔ واحمد فى المسند ١٦٢/١۔

ترجمہ: حضرت طلحہ بن عبید اللہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جس وقت چاند کو دیکھتے۔ تو کہتے اے الٰہی تو چاند کو نکال امن کے ساتھ ہم پر اور ایمان اور سلامتی کے اور اسلام کے ساتھ۔ میرا رب اور تیرا رب اللہ ہے اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ حدیث حسن غریب ہے۔

مصیبت زدہ کو دیکھ کر مذکورہ دعا پڑھنی چاہیے

۲۴۲۹: وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ وَاَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا مِنْ رَجُلٍ رَاٰى مُبْتَلًا فَقَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ عَافَانِىْ مِمَّا ابْتَلَاكَ بِهٖ وَفَضَّلَنِىْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِمَّنْ خَلَقَ تَفْضِيْلًا اِلَّا لَمْ يُصِبْهُ ذٰلِكَ الْبَلَاءُ كَائِنًا مَا كَانَ۔ (رواه الترمذى)

اخرجه الترمذى فى السنن ١٥٧/٥ حديث رقم ٣٤٩٢۔

ترجمہ: حضرت عمر بن خطابؓ سے اور ابو ہریرہؓ سے روایت ہے دونوں نے کہا کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ مبتلائے بلا کو دیکھے پھر وہ کہے سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے مجھ کو بچایا اس چیز سے کہ اس نے گرفتار کیا تجھ کو اس کے ساتھ اور بہتوں پر مجھ کو عزت بخشی ان لوگوں سے دنیا کی بزرگی ان کو بخشی مگر اس کو آزمائش نہیں پہنچتی اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

۲۴۳۰: ورواه ابن ماجة عن ابن عمرو قال الترمذى هذا حديث غريب وعمرو بن دينار الراوى ليس بالقوى۔

اخرجه ابن ماجه ۱۲۸۱/۲ حدیث رقم ۳۸۹۲۔

ترجمہ:اس روایت کو ابن ماجہ نے ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے۔ نیز امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے یہ حدیث غریب ہے اور (اس کے ایک راوی عمرو بن دینار قوی نہیں ہیں)''۔

اسنادی حیثیت:امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔ اس کے ایک راوی عمرو بن دینار قوی نہیں ہیں۔

بازار میں داخل ہونے کی دُعا

۲۴۳۱:وَعَنْ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنْ دَخَلَ السُّوْقَ فَقَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ وَهُوَ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ كَتَبَ اللّٰهُ لَهٗ اَلْفَ اَلْفِ حَسَنَةٍ وَمُحِيَ عَنْهُ اَلْفَ اَلْفَ سَيِّئَةٍ وَرَفَعَ لَهٗ اَلْفَ اَلْفَ دَرَجَةٍ وَبَنٰى لَهٗ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ۔ (رواه الترمذی وابن ما جة وقال الترمذی هذا حديث غريب وفی شرح السنة من قال فی سوق جا مع يباع فيه بدل من دخل السوق)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۵۵/۵ حدیث رقم ۳۴۸۸۔ وابن ماجه ۷۵۲/۲ حدیث رقم ۲۲۳۵۔

ترجمہ:حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص بازار میں داخل ہو اور وہ کہے کہ کوئی معبود نہیں مگر اللہ کہ وہ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے اسی کے لیے بادشاہت ہے اور اس کے لیے تعریف ہے وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور وہ زندہ ہے مرے گا نہیں' اسی کے ہاتھ میں خیر ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اللہ اس کے لیے دس لاکھ نیکیاں لکھتا ہے اور اس سے دس لاکھ برائیاں دور کرتا ہے اور اس کے لیے دس لاکھ درجے بلند کرتا ہے اور اس کے لیے بہشت میں گھر بناتا ہے اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور ابن ماجہؒ نے اور امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ حدیث غریب ہے اور شرح السنۃ میں دخل السوق کے بدلے یہ الفاظ ہیں کہ جو شخص کہے یعنی کلمہ مذکور پڑھے بازار میں جہاں خرید وفروخت ہوتی ہے اور اکثر چیزیں بکتی ہیں۔اس میں۔

www.KitaboSunnat.com

جنت کا داخلہ پوری نعمت ہے

۲۴۳۲:وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ سَمِعَ النَّبِيُّ ﷺ رَجُلًا يَدْعُوْ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْاَلُكَ تَمَامَ النِّعْمَةِ فَقَالَ اَيُّ شَيْءٍ تَمَامُ النِّعْمَةِ قَالَ دَعْوَةٌ اَرْجُوْبِهَا خَيْرًا فَقَالَ اِنَّ مِنْ تَمَامِ النِّعْمَةِ دُخُوْلَ الْجَنَّةِ وَالْفَوْزَ مِنَ النَّارِ وَسَمِعَ رَجُلًا يَقُوْلُ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ فَقَالَ قَدِ اسْتُجِيْبَ لَكَ فَسَلْ وَسَمِعَ النَّبِيُّ ﷺ رَجُلًا وَهُوَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْاَلُكَ الصَّبْرَ فَقَالَ سَئَلْتَ اللّٰهَ الْبَلَاءَ فَسَلْهُ الْعَافِيَةَ۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۲۰۲/۵ حدیث رقم ۳۵۹۵۔

ترجمہ:حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو دُعا مانگتے ہوئے سنا وہ کہتا ہے اے الٰہی! تحقیق میں تجھ سے پوری نعمت مانگتا ہوں۔ پس فرمایا پوری نعمت کیا چیز ہے؟ پس اس شخص نے کہا میں اس دعا کے ساتھ بہت زیادہ مال کی امید رکھتا ہوں۔ تحقیق پوری نعمت جنت میں داخل ہونا ہے اور دوزخ سے نجات پانا ہے اور حضور ﷺ نے ایک شخص کو کہتے ہوئے سنا کہ اے صاحب بزرگی اور بخشش فرمانے والے! آپ ﷺ نے فرمایا تحقیق

تیری دُعا قبول کی گئی اور نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو سنا کہ وہ کہہ رہا ہے اے الٰہی! تحقیق میں تجھ سے صبر مانگتا ہوں پس آپ ﷺ نے کہا تو نے اللہ سے بلا مانگی۔ پس اس سے عافیت مانگ۔ اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

مجلس سے اٹھتے وقت کی دعا

۲۴۳۳: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ ﷺ مَنْ جَلَسَ مَجْلِسًا فَكَثُرَ فِیْهِ لَغَطُهٗ فَقَالَ قَبْلَ اَنْ یَّقُوْمَ سُبْحَانَكَ اَللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ اِلَّا غُفِرَلَهٗ مَا كَانَ فِیْ مَجْلِسِهٖ ذٰلِكَ۔ (رواه الترمذی والبیهقی فی الدعوات الكبیر)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۵۸/۵ حدیث رقم ۳۴۹۴۔ واحمد فی المسند ۴۵۰/۳۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ جو شخص ایک جگہ پر بیٹھا ہوا اور اس میں بے فائدہ باتیں بہت زیادہ ہوں پھر وہ اٹھنے سے پہلے کہے اے الٰہی تو پاک ہے اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں تیری تعریف کے ساتھ میں گواہی دیتا ہوں۔ کوئی معبود نہیں ہے مگر تو۔ میں تجھ سے بخشش مانگتا ہوں اور میں تیری طرف توبہ کرتا ہوں۔ تو اس کے لیے بخش کی جاتی ہے جو اس مجلس میں گناہ ہو۔ اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور بیہقی نے دعورت کبیر میں۔

سواری پر سوار ہوتے وقت کی دُعا

۲۴۳۴: وَعَنْ عَلِیٍّ اَنَّهٗ اُتِیَ بِدَابَّةٍ لِیَرْكَبَهَا فَلَمَّا وَضَعَ رِجْلَهٗ فِی الرِّكَابِ قَالَ بِسْمِ اللّٰهِ فَلَمَّا اسْتَوٰی عَلٰی ظَهْرِهَا قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ثُمَّ قَالَ سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَلَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ وَاِنَّا اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ثُمَّ قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ثَلَاثًا وَاللّٰهُ اَكْبَرُ ثَلَاثًا سُبْحَانَكَ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْلِیْ فَاِنَّهٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّآ اَنْتَ ثُمَّ ضَحِكَ فَقِیْلَ مِنْ اَیِّ شَیْءٍ ضَحِكْتَ یَا اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ قَالَ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ صَنَعَ كَمَا صَنَعْتُ ثُمَّ ضَحِكَ فَقُلْتُ مِنْ اَیِّ شَیْءٍ ضَحِكْتَ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اِنَّ رَبَّكَ لَیَعْجَبُ مِنْ عَبْدِهٖ اِذَا قَالَ رَبِّ اغْفِرْلِیْ ذُنُوْبِیْ یَعْلَمُ اَنَّهٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ غَیْرِیْ۔ (رواه احمد والترمذی وابوداود)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۳۴/۳ حدیث رقم ۲۶۰۲۔ والترمذی ۱۶۴/۵ حدیث رقم ۳۵۱۱۔ واحمد فی المسند ۹۷/۱۔

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے پاس جانور حاضر کیا گیا کہ وہ اس پر سوار ہو جائیں جب انہوں نے اپنا پاؤں رکاب میں رکھا تو بسم اللہ کہا۔ پس جب کہ اس کی پیٹھ پر چڑھ گئے تو الحمد للہ کہا۔ یعنی سواری کی نعمتوں اور اس کے علاوہ کی بھی نعمتوں پر اللہ کا شکر ہے۔ پھر انہوں نے کہا کہ پاک ہے وہ ذات ہے کہ اس نے اس جانور کو ہمارے واسطے تابعدار کیا اور ہم اس کے واسطے طاقت رکھنے والے نہ تھے اور تحقیق ہم اپنے پروردگار کی طرف پھیرنے والے ہیں پھر تین بار الحمد للہ کہا اور تین مرتبہ اللہ اکبر کہا تو پاک ہے میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے پس میرے لیے بخشش کر دے۔ پس تحقیق تیرے سوا گناہوں کو کوئی نہیں بخشتا پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ ہنسے۔ پوچھا گیا کہ اے امیر المؤمنین آپ کس بات پر ہنسے؟ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ انہوں نے ایسا ہی کیا جیسا کہ میں نے کیا۔ پھر میں نے پوچھا تھا کہ اے اللہ کے رسولؐ! آپ ﷺ کس چیز سے ہنسے؟ فرمایا تحقیق اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے راضی ہوتا

ہے پس جب وہ کہتا ہے اے میرے پروردگار! میرے واسطے میرے گناہ بخش دے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کیا بندہ جانتا ہے کہ میرے علاوہ کوئی گناہ نہیں بخشتا۔ اس کو امام احمدؒ اور ترمذیؒ اور ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

مسافر کورخصت کرنا مسنون عمل ہے

۲۴۳۵: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ اِذَا وَدَّعَ رَجُلًا اَخَذَ بِيَدِهٖ فَلَا يَدَعُهَا حَتّٰى يَكُوْنَ الرَّجُلُ هُوَ يَدَعُ يَدَ النَّبِيِّ ﷺ وَيَقُوْلُ اَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِيْنَكَ وَاَمَانَتَكَ وَاٰخِرَ عَمَلِكَ وَفِى رِوَايَةٍ وَخَوَاتِيْمَ عَمَلِكَ رَوَاهُ التِّرْمَذِىُّ وَاَبُوْدَاوٗدَ وَابْنُ مَاجَةَ وَفِىْ رِوَايَتِهِمَا لَمْ يُذْكَرُوَاٰخِرَعَمَلِكَ۔

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۳٤/۳ حديث رقم ۲٦۰۰۔ والترمذی ١٦٢/٥ حديث رقم ۳٥۰٥۔ وابن ماجه ۹٤۳/۲ حديث رقم ۲۸۲٦۔ واحمد فی المسند ۷/۲۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت کسی شخص کو رخصت کرتے تھے تو یعنی مسافر کا ہاتھ پکڑتے تھے پس اس کے ہاتھ کو نہ چھوڑتے تھے یہاں تک کہ وہ شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ کو چھوڑتا یعنی یہ حسن خلق اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تواضع کی وجہ سے تھا اور فرماتے تھے کہ میں نے اللہ کو تیرا دین اور تیری امانت سونپی یعنی میں اللہ تعالیٰ سے تیرے لئے حفاظت دین اور تیری امانت اور تیرا آخری عمل یعنی خاتمہ بخیر طلب کرتا ہوں اور ایک روایت میں خواتیم عملک کے بجائے آخر عملک کے الفاظ ہیں یعنی تیرے آخری عمل بھی اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتا ہوں' مطلب وہی تھا جو پہلے جملے کا تھا۔ اس کو امام ترمذیؒ، ابوداؤد، ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے اور ابوداؤدؒ اور ابن ماجہؒ کی روایت میں آخر میں **عملك** کا لفظ نہیں ہے۔

مسافر کو الوداع کرنے کا طریقہ

۲۴۳۶: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ الْخَطْمِيِّ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا اَرَادَ اَنْ يَسْتَوْدِعَ الْجَيْشَ قَالَ اَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِيْنَكُمْ وَاَمَانَتَكُمْ وَخَوَاتِيْمَ اَعْمَالِكُمْ۔ (رواه ابو داود)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۳٤/۳ حديث رقم ۲٦۰۱۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ خطمیؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت لشکر کو رخصت کرنے کا ارادہ کرتے تھے تو فرماتے میں اللہ تعالیٰ کو تمہارا دین سونپتا ہوں اور تمہاری امانت اور تمہارے آخری اعمال۔ اس کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

اپنے اکابرین سے دعا کروانے کا ثبوت

۲۴۳۷: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّى اُرِيْدُ سَفَرًا فَزَوِّدْنِى فَقَالَ زَوَّدَكَ اللّٰهُ التَّقْوٰى قَالَ زِدْنِى قَالَ وَغَفَرَ ذَنْبَكَ قَالَ زِدْنِى بِاَبِى اَنْتَ وَاُمِّى قَالَ وَيَسَّرَلَكَ الْخَيْرَ حَيْثُ مَا كُنْتَ۔ (رواه الترمذی وقال هذا حديث حسن غريب)

اخرجه الترمذی فی السنن ١٦۳/٥ حديث رقم ۳٥۰۷۔ والدارمی ۳۷۲/۲ حديث رقم ۲٦۷۱۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا کہنے لگا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تحقیق

میں سفر کا ارادہ رکھتا ہوں پس مجھ کو تحفہ دیجئے یعنی میرے لئے دعا کیجئے کہ اس کی برکت میرے سفر میں ہو توشے کی طرح ۔پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔اللہ تعالیٰ تجھ کو تقویٰ کا توشہ دے یعنی پرہیز گاری نصیب کرے۔کہ وہ آخرت کا توشہ ہے اس نے کہا کہ میرے لیے زیادہ دعا کرو۔اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ تیرے گناہ بخشے اس نے کہا کہ زیادہ دعا کیجئے میرے لیے۔میرے ماں باپ آپ پر قربان آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور اللہ تعالیٰ تیرے لیے آسان کرے اور تجھے دین و دنیا کی بھلائی کی توفیق دے جہاں ہو۔اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

مسافر کو نصیحت کرنا مسنون ہے

۲۴۳۸:وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَجُلاً قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اِنِّی اُرِیْدُ اَنْ اُسَافِرَ فَاَوْصِنِیْ قَالَ عَلَیْكَ بِتَقْوَی اللّٰهِ وَالتَّكْبِیْرِ عَلٰی كُلِّ شَرَفٍ فَلَمَّا وَلَّی الرَّجُلُ قَالَ اَللّٰهُمَّ اَطْوِلَهُ الْبُعْدَ وَهَوِّنْ عَلَیْهِ السَّفَرَ۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۶۳/۵ حدیث رقم ۳۵۰۸۔

ترجمہ:حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ تحقیق ایک شخص نے کہا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں سفر کا ارادہ رکھتا ہوں۔پس مجھ کو نصیحت فرما دیجئے اپنے اوپر خدا کا تقویٰ کو لازم کرو اور ہر بلند جگہ پر اللہ اکبر کہو پس جب اس شخص نے پشت پھیری تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے دعاء کی اے الٰہی تو اس کے لیے سفر کی دوری کو لپیٹ دے یعنی سفر کی مشقت کو دور کر دے بمعنی مسافت کو نزدیک کر دینے کی وجہ سے اور اس پر سفر آسان کر یعنی سفر کے تمام امور اس پر آسان کر دے اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تکلیف دینے والی چیزوں سے پناہ مانگنا

۲۴۳۹:وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اِذَا سَفَرَ فَاَقْبَلَ اللَّیْلُ قَالَ یَا اَرْضُ رَبِّی وَرَبُّكِ اللّٰهُ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شَرِّكِ وَشَرِّ مَا فِیْكِ وَشَرِّ مَا خُلِقَ فِیْكِ وَشَرِّ مَا یَدُبُّ عَلَیْكِ وَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ اَسَدٍ وَاَسْوَدٍ وَمِنَ الْحَیَّةِ وَالْعَقْرَبِ وَمِنْ شَرِّ سَاكِنِ الْبَلَدِ وَمِنْ وَالِدٍ وَمَا وَلَدَ۔ (رواه ابو داود)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳۴/۳ حدیث رقم ۲۶۰۳۔ واحمد فی المسند ۱۳۲/۲۔

ترجمہ:حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب رات آتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے۔اے زمین تیرا پروردگار اور میرا پروردگار اللہ ہے۔اللہ تعالیٰ سے تیری برائی سے پناہ مانگتا ہوں یعنی جو کہ تیری ذات میں برائی ہے مثل خسف وغیرہ یا اس چیز کی برائی سے جو تجھ میں ہے یعنی پانی یا کوئی ایسی بوٹی جو زمین سے پیدا ہوا اور ہلاک کر دے میں اس سے بھی پناہ مانگتا ہوں اور اس چیز کی برائی سے کہ تجھ میں یعنی زہریلے جانور اور ہلاک کرنے والی چیزیں اور اس چیز کی برائی سے کہ جو تجھ پر چلتی پھرتی ہیں یعنی حشرات الارض اور حیوانات کہ ضرر پہنچاتے ہیں اور میں اللہ تعالیٰ سے شیر' کالے سانپ' ہر طرح کے سانپ' بچھو اور شہر میں رہنے والوں کی برائی سے یعنی آدمیوں کی برائی سے پناہ مانگتا ہوں اور بعضوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد جن ہیں کہ ہر شہر ہر زمین میں رہتے ہیں اور جننے والے کی برائی سے اور اس چیز کی برائی سے کہ جنا گیا یعنی ابلیس کے شر سے اور اس کی اولاد سے یا ہر جننے والی کے شر سے اور اس کی اولاد سے میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔اس کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

جہاد کے موقع پر آپ ﷺ کی دعا

۲۴۴۰: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا غَزَا قَالَ اَللّٰهُمَّ اَنْتَ عَضُدِىْ وَنَصِيْرِىْ بِكَ اَحُوْلُ وَبِكَ اَصُوْلُ وَبِكَ اُقَاتِلُ۔ (رواہ الترمذی وابو داود)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ٤٢/٣ حديث رقم ٢٦٢٢۔ واحمد فی المسند ١٨٤/٣۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب جہاد کرتے تھے تو کہتے تھے اے الٰہی! تو معتمد علیہ میرا ہے یعنی تجھ پر میرا ہر امر میں بھروسہ ہے اور تو میرا پروردگار ہے' تیری قوت کے ساتھ میں کفار کے مکر کو دفع کرنے کا حیلہ کرتا ہوں اور تیری قوت کے ساتھ دین کے دشمنوں پر حملہ کرتا ہوں اور تیری مدد کے ساتھ دشمنانِ دین سے لڑتا ہوں۔ اس کو امام ترمذیؒ اور ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

دشمن سے خوف کے وقت کی دعا

۲۴۴۱: وَعَنْ اَبِىْ مُوْسٰى اَنَّ النَّبِىَّ ﷺ كَانَ اِذَا خَافَ قَوْمًا قَالَ اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَجْعَلُكَ فِىْ نُحُوْرِهِمْ وَنَعُوْذُ بِكَ مِنْ شُرُوْرِهِمْ. (رواہ احمد وابوداود)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ٨٩/٢ حديث رقم١٥٧٣۔ واحمد فی المسند ٤١٤/٤۔

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تحقیق نبی کریم ﷺ کو جس وقت کسی قوم سے اندیشہ ہوتا تو کہتے اے الٰہی! تحقیق ہم تجھ کو کفار کے مقابل کرتے ہیں یعنی تجھ سے مدد مانگتے ہیں کہ تو ان کے شر کو ہم سے دفع کر دے اور ہمارے اور ان کے درمیان حائل ہو جا اور ہم تیرے ساتھ ان کی برائی سے پناہ مانگتے ہیں۔ اس کو امام احمد اور ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

گھر سے نکلتے وقت کی مسنون دعا

۲۴۴۲: وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ اَنَّ النَّبِىَّ ﷺ كَانَ اِذَا خَرَجَ مِنْ بَيْتِهٖ قَالَ بِسْمِ اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَعُوْذُ بِكَ مِنْ اَنْ نَزِلَّ اَوْنَضِلَّ اَوْ نَظْلِمَ اَوْ نُظْلَمَ اَوْنَجْهَلَ اَوْيُجْهَلَ عَلَيْنَا رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِىُّ وَالنَّسَائِىُّ وَقَالَ التِّرْمِذِىُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ وَفِىْ رِوَايَةِ اَبِىْ دَاوٗدَ وَابْنِ مَاجَةَ قَالَتْ اُمُّ سَلَمَةَ مَا خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مِنْ بَيْتِىْ قَطُّ اِلَّا رَفَعَ طَرْفَهٗ اِلَى السَّمَاءِ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ اَنْ اُضِلَّ اَوْ اُضَلَّ اَوْ اَظْلِمَ اَوْاُظْلَمَ اَوْاَجْهِلَ اَوْيُجْهَلَ عَلَىَّ۔

اخرجه ابوداؤد فی السنن ٣٢٥/٤ حديث رقم ٥٠٩٥۔ والترمذی ١٥٤/٥ حديث رقم ٣٤٨٧۔ وابن ماجه ١٢٧٨/٢ حديث رقم ٣٨٨٤۔ واحمد فی المسند ٣٠٦/٦۔

ترجمہ: حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ تحقیق نبی کریم ﷺ جس وقت اپنے گھر سے نکلتے تو کہتے میں اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ نکلتا ہوں۔ میں نے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیا۔ اے الٰہی! تحقیق ہم پناہ مانگتے ہیں تیرے ساتھ اس سے کہ ہم پھسلیں یعنی بغیر قصد کے گناہ کریں یا گمراہ ہو جائیں۔ یعنی قصداً گناہ کریں یا ظلم کریں یا ظلم کیے جائیں یا ہم

جہالت برتیں یا ہم پر جہالت کی جائے۔اس کو امام احمد' ترمذیؒ اور نسائی ؒ نے نقل کیا ہے اور امام ترمذیؒ نے کہا ہے یہ حدیث حسن صحیح ہے اور ابوداؤد کی روایت میں ہے اور ابن ماجہ کی روایت میں یوں ہے کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی میرے گھر سے نکلتے تو آسمان کی جانب نگاہ اٹھاتے اور فرماتے اے الٰہی! تحقیق میں پناہ مانگتا ہوں تیرے ساتھ کہ میں گمراہ کیا جاؤں یعنی کوئی مجھے گمراہ کر دے یا ظلم کروں یا ظلم کیا جاؤں یا جہالت کروں یا جہالت مجھ پر کی جائے۔

گھر سے نکلتے وقت جامع دعا

۲۴۴۳:عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اِذَا خَرَجَ الرَّجُلُ مِنْ بَيْتِهٖ فَقَالَ بِسْمِ اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ يُقَالُ لَهٗ حِيْنَئِذٍ هُدِيْتَ وَكُفِيْتَ وَوُقِيْتَ. فَيَتَنَحّٰى لَهُ الشَّيْطَانُ وَيَقُوْلُ شَيْطَانٌ اٰخَرُ كَيْفَ لَكَ بِرَجُلٍ قَدْ هُدِىَ وَكُفِىَ وَوُقِىَ۔ (رواہ ابو داود وروی الترمذی الی قولہ له الشيطان)

اخرجه ابوداؤد فى السنن ٣٢٥/٤ حديث رقم ٥٠٩٥۔ والترمذى ١٥٤/٥ حديث رقم ٣٤٨٦ وابن ماجه ١٢٧٨/٢ حديث رقم ٣٨٨٦۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب کوئی شخص اپنے گھر سے نکلے پھر وہ کہے میں اللہ کا نام لے کر گھر سے نکلتا ہوں میں نے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیا اللہ تعالیٰ کی مدد کے سوا میں گناہوں سے نہیں رک سکتا اور عبادت پر قوت نہیں رکھ سکتا۔ کہتے ہیں کہ اس کے لیے ایک فرشتہ ندا کرتا ہے کہ اے اللہ کے بندے! تجھے راہ راست دکھائی گئی اور تو جمیع مہمات میں کفایت کیا گیا اور تو سب برائیوں سے محفوظ رہا۔ پس شیطان اس سے کنارے ہو جاتا ہے (یعنی ایک طرف ہو جاتا ہے) اور دوسرا شیطان کہتا ہے یعنی اس شیطان کی تسلی کے لیے کہ تجھ کو اس شخص پر تسلط اور تعرض کیسے میسر ہوگا کہ تحقیق وہ ہدایت کیا گیا اور کفایت کیا گیا اور سب برائیوں سے محفوظ رہا اس کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے لفظ: لَهُ الشَّيْطَان تک ابن سنی کی کتاب میں ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں۔

گھر میں داخل ہونے کی دعا

۲۴۴۴:وَعَنْ اَبِىْ مَالِكٍ الْاَشْعَرِىِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اِذَا وَلَجَ الرَّجُلُ بَيْتَهٗ فَلْيَقُلْ اللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَسْئَلُكَ خَيْرَ الْمَوْلِجِ وَخَيْرَ الْمَخْرَجِ بِسْمِ اللّٰهِ وَلَجْنَا وَعَلَى اللّٰهِ رَبِّنَا تَوَكَّلْنَا ثُمَّ لِيُسَلِّمْ عَلٰى اَهْلِهٖ۔ (رواہ ابو داود)

اخرجه ابوداؤد فى السنن ٣٢٥/٤ حديث رقم ٣٤٨٦۔

ترجمہ: حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس وقت کوئی شخص اپنے گھر میں داخل ہو پس چاہیے کہ وہ کہے: الٰہی! تحقیق میں تجھ سے داخل ہونے کی بھلائی مانگتا ہوں یعنی آنا اور نکلنا بھلائی کے ساتھ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا نام لے کر ہم داخل ہوتے ہیں اور اللہ ہمارا رب ہے۔ ہم نے اسی پر بھروسہ کیا پھر اپنے اہل کو سلام کرے۔ اس کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

نکاح کے وقت مبارک باد دینا مسنون ہے

۲۴۴۵: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ کَا نَ اِذَا رَفَّأَ الْاِنْسَانَ اِذَا تَزَوَّجَ قَالَ بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ وَبَارَكَ عَلَیْكُمَا وَجَمَعَ بَیْنَكُمَا فِیْ خَیْرٍ۔ (رواہ احمد والترمذی وابوداود وابن ماجة)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۲۴۱/۲ حدیث رقم ۲۱۳۰۔ والترمذی ۲۷۶/۲ حدیث رقم ۱۰۹۷۔ والدارمی ۱۸۰/۲ حدیث رقم ۲۱۷۳۔ وابن ماجه ۶۱۴/۱ حدیث رقم ۱۹۰۵۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جس وقت کسی آدمی کو دعا دیتے یعنی دعا کا ارادہ کرتے نکاح کے اوپر وقت تو کہتے ۔اللہ تعالیٰ تیرے واسطے برکت دے اور تم دونوں کو برکت دے یعنی میاں بیوی کو یعنی تم پر رحمت ہو اور رزق اور اولاد بہت ہو اور جمع کرے تمہارے درمیان بھلائی' یعنی طاعت کرتے رہو اور صحت اور عافیت سے رہو اور آپس میں سکون رہے اولاد نیک ہو اس کو امام احمدؒ اور ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے۔

اپنے اہل والوں کے لیے خیر و برکت کی دعا کرنا

۲۴۴۶: وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَیْبٍ عَنْ اَبِیْهِ عَنْ جَدِّهٖ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ اِذَا تَزَوَّجَ اَحَدُكُمْ اِمْرَأَةً اَوِاشْتَرٰی خَادِمًا فَلْیَقُلْ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ خَیْرَهَا وَخَیْرَ مَا جَبَلْتَهَا عَلَیْهِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّمَا جَبَلْتَهَا عَلَیْهِ وَاِذَا اشْتَرٰی بَعِیْرًا فَلْیَاْخُذْ بِذِرْوَةِ سَنَامِهٖ وَلْیَقُلْ مِثْلَ ذٰلِكَ وَفِیْ رِوَایَةٍ فِی الْمَرْأَةِ وَالْخَادِمِ ثُمَّ لِیَاْخُذْبِنَا صِیَتِهَا وَلْیَدْعُ بِالْبَرَكَةِ۔ (رواہ ابوداود وابن ماجة)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۲۴۸/۲ حدیث رقم ۲۱۶۰۔ وابن ماجه ۶۱۷/۱ حدیث رقم ۱۹۱۸۔

ترجمہ: حضرت عمرو بن شعیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے اپنے باپ یعنی شعیب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا اور انہوں نے اپنے دادا یعنی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے اور عبداللہ نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے کہ فرمایا جس وقت تم میں سے کوئی کسی عورت سے نکاح کرے یا بردہ (غلام) خریدے پس اس کو چاہیے کہ وہ کہے اے الٰہی!! تحقیق میں تجھ سے اس کی بھلائی کا سوال کرتا ہوں یعنی اس کی ذات کی بھلائی کا اور اس چیز کی بھلائی کا جس کو تو نے اس میں پیدا کیا یعنی اچھے اخلاق اور میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں اس کی برائی سے اور اس چیز کی برائی سے کہ جو تو نے پیدا کی یعنی برے اخلاق وافعال اور جب اُونٹ خریدے تو اس کی کوہان کی بلندی کو پکڑے اور کہے اسی طرح یعنی مذکورہ دُعا پڑھے اور ایک روایت میں عورت اور بردے (یعنی غلام) کے بارے میں یوں آیا ہے پھر اس کو چاہیے کہ عورت کی پیشانی کو پکڑے اور برکت کے لیے دُعا کرے۔اس کو ابوداؤدؒ سے نقل کیا اور ابن ماجہؒ نے۔

غمزدہ کی دُعا

۲۴۴۷: وَعَنْ اَبِیْ بَكْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ دَعَوَاتُ الْمَكْرُوْبِ اَللّٰهُمَّ رَحْمَتَكَ اَرْجُوْ فَلَا تَكِلْنِیْ اِلٰی نَفْسِیْ طَرْفَةَ عَیْنٍ وَاَصْلِحْ لِیْ شَأْنِیْ كُلَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ۔ (رواہ ابوداود)

اخرجه ابوداؤد ۳۲۴/۴۔ حدیث رقم ۵۰۹۰۔

ترجمہ: حضرت ابوبکرؓ سے روایت ہے غم زدہ آدمی کی دعا یہ ہے کہ اس کے پڑھنے سے غم جاتا رہتا ہے اے الٰہی تیری رحمت کا امیدوار ہوں پس مجھ کو میرے نفس کے حوالے نہ کر ایک لمحہ بھی اس لیے کہ وہ میرا بڑا دشمن ہے اور میری حاجت کو پورا کر دے اور میرے کام کو درست کر دے۔ تیرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے اس کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

قرض کی ادائیگی کی دعا

۲۴۴۸: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَجُلٌ هُمُوْمٌ لَزِ مَتْنِیْ وَدُیُوْنٌ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اَفَلَا اُعَلِّمُكَ كَلَامًا اِذَا قُلْتَهٗ اَذْهَبَ اللّٰهُ هَمَّكَ وَقَضٰی عَنْكَ دَیْنَكَ قَالَ قُلْتُ بَلٰی قَالَ قُلْ اِذَا اَصْبَحْتَ وَاِذَا اَمْسَیْتَ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْهَمِّ وَالْحُزْنِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْكَسَلِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنَ الْبُخْلِ وَالْجُبْنِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ غَلَبَةِ الدَّیْنِ وَقَهْرِ الرِّجَالِ قَالَ فَفَعَلْتُ ذٰلِكَ فَاَذْهَبَ اللّٰهُ هَمِّیْ وَقَضٰی عَنِّیْ دَیْنِیْ۔

(رواہ ابوداود)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۹۳/۲ حدیث رقم ۱۵۵۵۔

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! مجھے فکریں لاحق ہیں اور میرے ذمے قرض ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تجھ کو ایسا کلام نہ سکھا دوں کہ جس وقت تو اس کو کہے اللہ تعالیٰ تیری فکر دور کر دے اور تجھ سے تیرا قرض ادا کر دے۔ میں نے کہا ضرور بتلائیں۔ فرمایا جس وقت تو صبح کرے اور جس وقت شام کرے تو یہ کہہ اے الٰہی! تحقیق میں فکر و غم سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور میں عاجزی اور سستی سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور میں بخیلی اور نامردی سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور میں غلبہ دَین سے یعنی اس کی کثرت سے اور لوگوں کے غلبہ سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ اس شخص نے کہا میں نے یہ کام کیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے میری فکر دور کر دی اور میرا قرضہ ادا کر دیا۔ اس کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

ادائیگی قرض کے لیے دعا

۲۴۴۹: وَعَنْ عَلِیٍّ اَنَّهٗ جَاءَهٗ مُكَاتَبٌ فَقَالَ اِنِّیْ عَجَزْتُ عَنْ كِتَابَتِیْ فَاَعِنِّیْ قَالَ اَلَا اُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ عَلَّمَنِیْهِنَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم لَوْ كَانَ عَلَیْكَ مِثْلُ جَبَلٍ كَبِیْرٍ دَیْنًا اَدَّاهُ اللّٰهُ عَنْكَ قُلْ اَللّٰهُمَّ اكْفِنِیْ بِحَلَالِكَ عَنْ حَرَامِكَ وَاَغْنِنِیْ بِفَضْلِكَ عَمَّنْ سِوَاكَ۔ (رواہ الترمذی والبیهقی فی الدعوات الکبیر)

اخرجه الترمذی فی السنن ۲۲۰/۵ حدیث رقم ۳۶۳۴۔

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے پاس ایک مکاتب آیا پس اس نے کہا کہ تحقیق میں اپنا بدل کتابت ادا کرنے سے عاجز ہوں یعنی مال کتابت کے ادا کا وقت پہنچ گیا ہے اور میرے پاس مال نہیں ہے پس مال اور دعا کے ساتھ میری مدد کیجیے فرمایا کہ کیا میں تجھ کو وہ کلمات سکھلا دوں جو مجھ کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھائے کہ اگر تجھ پر بڑے پہاڑ کے برابر قرض ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کو تیرے ذمے سے ادا کر دے گا۔ تو کہہ اے الٰہی! مجھ کو اپنے حلال کے ساتھ حرام سے کفایت کر یعنی رزق حلال پہنچا کہ اس کی وجہ سے حرام سے بے پرواہ ہو جاؤں اور مجھ کو بے پرواہ کر ان چیزوں سے جو تیرے سوا ہیں۔ اس کو امام ترمذیؒ نے اور بیہقی نے دعوات کبیر میں نقل کیا ہے۔

الفصل الثالث:

مجلس سے اُٹھتے وقت کی دعا

۲۴۵۰: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ اِذَا جَلَسَ مَجْلِسًا اَوْصَلّٰى تَكَلَّمَ بِكَلِمَاتٍ فَسَأَلْتُهُ عَنِ الْكَلِمَاتِ فَقَالَ اِنْ تُكُلِّمَ بَخَيْرٍ كَانَ طَابِعًا عَلَيْهِنَّ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَاِنْ تُكُلِّمَ بِشَرٍّ كَانَ كَفَّارَةً لَهٗ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ۔ (رواه النسائى)

اخرجه النسائى فى السنن حديث رقم ٧٧/٦۔ واحمد فى المسند۔

ترجمه: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ تحقیق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب ایک جگہ پر بیٹھتے یا نماز پڑھتے یعنی مجلس سے اٹھتے وقت اور نماز سے فارغ ہونے کے بعد چند کلمے پڑھتے۔ میں نے ان سے پوچھا یعنی ان کا فائدہ پوچھا پس فرمایا اگر نیک کلام کیا جائے یعنی ان کلموں سے پہلے تو یہ کلمے ان پر میسر ہونگے یعنی نیک کلام پر قیامت تک۔ یعنی وہ کلام محفوظ ہوگا۔ اس کا ثواب محفوظ رہے گا۔ ضائع نہیں ہوگا۔ اگر برا کلام کیا جائے۔ یعنی ان کلموں سے پہلے اگر گناہ کا کلام کیا جائے گا تو یہ کلمے اس کی بخشش کا سبب ہو جائیں گے۔ وہ کلمات یہ ہیں: اے الٰہی! تو پاک ہے اور ہم تیری پاکی کے ساتھ تیری تعریف بیان کرتے ہیں۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ میں تجھ سے بخشش چاہتا ہوں اور میں تجھ سے توبہ کرتا ہوں۔ اس کو امام نسائی نے نقل کیا ہے۔

چاند دیکھنے کی دعا

۲۴۵۱: وَعَنْ قَتَادَةَ بَلَغَهٗ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ اِذَا رَأَى الْهِلَالَ قَالَ هِلَالُ خَيْرٍ وَرُشْدٍ هِلَالُ خَيْرٍ وَرُشْدٍ هِلَالُ خَيْرٍ وَرُشْدٍ اٰمَنْتُ بِالَّذِىْ خَلَقَكَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ يَقُوْلُ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ ذَهَبَ بِشَهْرِ كَذَا وَجَاءَ بِشَهْرِ كَذَا۔ (رواه ابو داود)

اخرجه ابو داؤد فى السنن ٣٢٤/٤ حديث رقم ٥٠٩٢۔

ترجمه: حضرت قتادہؒ سے روایت ہے کہ اس کو یہ بات پہنچی ہے۔ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب نئے چاند کو دیکھتے تو کہتے کہ بھلائی کا چاند ہے ہدایت کا چاند ہے بھلائی کا اور ہدایت کا میں ایمان لایا اس ذات پر جس نے تجھ کو پیدا کیا' یہ بھی تین بار کہتے پھر کہتے سب تعریف ہے اس خدا کے واسطے کہ اس مہینے کو لے گیا اور لایا اس مہینے کو یعنی گذشتہ ماہ اور آئندہ کا نام لیتے اس کو ابو داؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

غم و فکر کے وقت کی دعا

۲۴۵۲: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنْ كَثُرَ هَمُّهٗ فَلْيَقُلِ اللّٰهُمَّ اِنِّىْ عَبْدُكَ وَابْنُ عَبْدِكَ وَابْنُ اَمَتِكَ وَفِىْ قَبْضَتِكَ نَاصِيَتِىْ بِيَدِكَ مَاضٍ فِىَّ حُكْمُكَ عَدْلٌ فِىَّ قَضَائُكَ اَسْأَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ سَمَّيْتَ بِهٖ نَفْسَكَ اَوْ اَنْزَلْتَهٗ فِىْ كِتَابِكَ اَوْعَلَّمْتَهٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ اَوْ اَلْهَمْتَ عِبَادَكَ اَوِ اسْتَأْثَرْتَ بِهٖ فِىْ مَكْنُوْنِ الْغَيْبِ عِنْدَكَ اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْاٰنَ رَبِيْعَ قَلْبِىْ وَجِلَاءَ هَمِّىْ وَغَمِّىْ مَا قَالَهَا عَبْدٌ قَطُّ اِلَّا اَذْهَبَ اللّٰهُ

غَمَّهُ وَاَبْدَ لَهُ بِهٖ فَرَحًا۔

رواہ رزین۔

ترجمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تحقیق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص کو بہت زیادہ فکر لاحق ہو۔پس چاہیے کہ وہ کہے اے الٰہی! تحقیق میں تیرا بندہ ہوں اور تیرے بندے کا بیٹا ہوں اور تیری لونڈی کا بیٹا ہوں اور میں تیرے قبضے میں ہوں یعنی تیرے ملک وتصرف میں ہوں۔میری پیشانی کے بال تیرے ہاتھ میں ہیں۔کوئی حرکت وقوت نہیں ہے سوائے تیری مدد کے ساتھ جو کہ میرے حق میں جاری ہے یعنی تیرے حکم کو کوئی روکنے والا نہیں ہے جو کہے اور چاہے وہ ہی ہوگا۔تیری قضا یعنی فیصلہ میرے امر میں عدل ہے میں ہر نام کے ساتھ تجھ سے وسیلہ مانگتا ہوں۔وہ تیرے واسطے ہیں تو نے اس کے ساتھ اپنی ذات کا نام رکھا' تو نے اس کو اپنی کتاب میں اتارا یا تو نے وہ نام اپنی مخلوق کو سکھایا یعنی انبیاء علیہم السلام کو الہام کیا۔کتاب میں ذکر کرنے کے بغیر یا تو نے اس کو غیب کے پردے کے بیچ اپنے نزدیک کسی کو اختیار کیا۔اس کی اطلاع سوائے تیرے کسی کو نہیں ہے یہ کہ تو قرآن کو میرے دل کی بہار اور میری آنکھوں کی روشنی اور میرے غم کا دور کرنے والا اور خوف اور غم کو دور کرنے کا ذریعہ بنا' اس کو کوئی بندہ کبھی بھی نہیں کہتا مگر اللہ تعالیٰ اس کا غم دور کر دیتا ہے اور غم کی جگہ بدل دیتا ہے اور خوشی کو لے آتا ہے۔

بلندی پر چڑھتے وقت اور اترتے وقت کی دعا کا ذکر

۲۴۵۳:وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ كُنَّا اِذَا صَعِدْ نَا كَبَّرْ نَا وَاِذَا اَنْزَلْنَا سَبَّحْنَا۔

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۳۵/٤۔ حدیث رقم ۲۹۹۳۔ والدارمی فی السنن ۳۷۳/۲ حدیث رقم ۲٦۷٤۔ واحمد فی المسند ۳۳۳/۳۔

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے جب ہم بلند جگہ پر چڑھتے۔تو اللہ اکبر کہتے اور جب اترتے تو سبحان اللہ کہتے ہیں۔اس کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

پریشانی کے وقت کی دعا

۲۴۵۴:وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم كَانَ اِذَا كَرَبَهٗ اَمْرٌ يَقُوْلُ يَاحَيُّ يَاقَيُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِيْثُ۔ (رواہ الترمذی وقال هذا حدیث غریب ولیس بمحفوظ)

اخرجه الترمذی فی السنن ۲۰۱/۵ حدیث رقم ۳۵۹۳۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے۔کہ تحقیق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی امر غمگین کرتا تو کہتے اے زندہ قائم رہنے والے تیری رحمت کی فریادرسی کرتا ہوں اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے محفوظ نہیں ہے۔

خوف کے وقت کی دعا

۲۴۵۵:وَعَنْ اَبِیْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ قَالَ قُلْنَا يَوْمَ الْخَنْدَقِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم هَلْ مِنْ شَیْءٍ نَقُوْلُ وَقَدْ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ قَالَ نَعَمْ اَللّٰهُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِنَا وَاٰمِنْ رَّوْعَاتِنَا قَالَ فَضَرَبَ اللّٰهُ وُجُوْهَ اَعْدَائِهٖ بِالرِّيْحِ وَهَزَمَ اللّٰهُ بِالرِّيْحِ۔ (رواہ احمد)

اخرجه احمد فی المسند ۳/۳۔

ترجمہ: حضرت ابی سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ہم نے خندق کے دن عرض کیا۔اے اللہ کے رسول! کوئی چیز ہے یعنی ذکر و دعا کہ ہم اس کو پڑھیں۔ کیوں کہ ہمارے دل گردن کو پہنچ گئے ہیں۔یعنی نہایت دشواری اور محنت لاحق ہوتی ہے فرمایا ہاں وہ یہ ہے۔اے الٰہی ہمارے عیب ڈھانک اور امن میں رکھ ہم کو ڈر سے۔ابوسعید نے کہا ہے پس اللہ نے ماری ان کے دشمنوں کے منہ ساتھ یاد کے اور اللہ نے شکست دی بار (یعنی ہوا کے) اس کو امام احمدؒ نے نقل کیا ہے۔

بازار میں داخل ہونے کی دعا

۲۴۵۶: وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ اِذَا دَخَلَ السُّوْقَ قَالَ بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَسْأَلُكَ خَيْرَ هٰذِهِ السُّوْقِ وَخَيْرَ مَافِيْهَا وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّ مَافِيْهَا اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَعُوْذُبِكَ مِنْ اَنْ اُصِيْبَ فِيْهَا صَفْقَةً خَاسِرَةً۔

رواه البيهقى فى الدعوات الكبير۔

ترجمہ: حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب بازار میں تشریف لاتے تو فرماتے میں اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ آیا ہوں اے الٰہی تحقیق میں مانگتا ہوں تجھ سے بھلائی اس بازار کی۔یعنی رزق حلال میسر ہو اور نفع اور برکت ہو اسمیں اور اس چیز کی بھلائی کہ اس میں ہے یعنی لوگ اور میں پناہ مانگتا ہوں تیرے ساتھ اس کی برائی سے اور اس چیز کی برائی سے جو اس میں ہے یعنی عقد فاسد اور نقصان سے اور مفسد لوگوں سے اے الٰہی تحقیق میں پناہ مانگتا ہوں تیری اس سے کہ میں نقصان کے معاملہ کو پہنچوں۔یہ بیہقی نے نقل کی ہے دعوات کبیر میں۔

بَابُ الْاِسْتِعَاذَةِ

پناہ مانگنے کا بیان

الفصل الاول:

آزمائش سے پناہ مانگنا

۲۴۵۷: وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ تَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنْ جَهْدِ الْبَلَاءِ وَدَرْكِ الشَّقَاءُ وَسُوْءِ الْقَضَاءِ وَشَمَاتَةِ الْاَعْدَاءِ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ۵۱۳/۱۱۔ حديث رقم ٦٦١٦۔ ومسلم فى صحيحه ۲۰۸۰/٤ حديث رقم (۵۳۔ ۲۷۰۷)۔ واحمد فى المسند ۲٤٦/۲۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ سے پناہ پکڑو۔بلا کی مشقت سے اور بدبختی کے پہنچنے سے اور بری تقدیر سے اور دشمنوں کے خوش ہونے سے۔اس کو امام بخاری اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: تعوذوا بالله من جهد البلاء : یہ امر برائے ''ندب'' ہے۔باللّٰہ: اس قید سے غیر اللہ کی نفی کرنا مقصود ہے۔جہد: جیم کے فتحہ وضمہ کے ساتھ۔اس لفظ کی وضاحت میں علماء کی عبارات مختلف ہیں،اگر چہ حاصل ایک ہی ہے۔

(۱)مشقته الى الغاية وشدته الى النهاية۔(۲)قيل: الجهد مصدر أجهد جهدك أى: أبلغ غايتك۔(۳)قد يطلق على المشقة۔ وهى المصائب التى تصيب الانسان فى دينه أو دنياه، ويعجز عن دفعها، ولا يصبر علٰى وقوعها۔

جهد البلاء: (۱) امام طیبیؒ فرماتے ہیں: جہد بلا، اس حالت کو کہتے ہیں جس میں انسان کی اس قدر سخت آزمائش ہو کہ وہ موت کو ترجیح دے اور اس کی تمنا کرنے لگے اھ۔ (۲) حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس کی تفسیر قلتِ مال وکثرتِ عیال سے کی ہے۔ گویا کہ انہوں نے جہد البلاء سے اس کی شدید ترین نوع مراد لی ہے۔ اسی وجہ سے حدیث میں آتا ہے: كاد الفقر أن يكون كفرا۔

قوله بدرك الشقاء، وسوء القضاء، وشماتة الاعداء: ''درك'' بروزن ''شمس وقمر'' دونوں طرح پڑھا جاتا ہے۔ اس کی بھی مختلف توضیحات کی گئی ہیں۔ (۱) الدرك من الادراك لما يلحق الانسان من تبعته۔(۲)قال فى النهاية: الدرك هو اللحرق والوصول الٰى شئ، يقال: أدركته ادراكا ودركا۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں۔ (۳) صاحب السلاح لکھتے ہیں: الدرك بفتح الراء اسم وبالسكون المصدر، والشقاء بفتح الشين بمعنى الشقاوة نقيض السعادة، ويجئ بمعنى التعب كقوله تعالى: ﴿طه ما أنزلنا عليك القرآن لتشقى﴾[طه:۱۔۲] (۴)قيل هو واحد دركات، ومعناه من موضع أهل الشقاوة وهى جهنم، أو من موضع يحصل لنا فيه شقاوة، أوهو مصدر اما مضاف الى المفعول، أو الى الفاعل أى: من درك الشقاء ايانا أو من دركنا الشقاء۔(۵)قيل المراد بالشقاء الهلاك، ويطلق على السبب المؤدى اليه۔

اسی قبیل سے یہ حدیث ہے: لو قال: ان شاء الله لم يحنث وكان دركاله فى حاجته وسوء القضاء: (۱) أى ما ينشأ عنه سوء فى الدين والدنيا والبدن والمال والخاتمة۔ (۲)قال بعض العلماء: هو ما يسوء الانسان أو يوقعه فى المكروه۔ (۳)قال الطيبىؒ لفظ السوء منصرف الى المقضى عليه۔(۴)قال زين العرب: هو مثل قوله: من شر ما قضيت۔(۵)قال ابن بطال: المراد بالقضاء المقضى لأن حكم الله كله حسن لاسوء فيه۔ القضاء الحكم بالكليات على سبيل الاجمال فى الأزل۔ والقدر الحكم يوقوع الجزئيات التى لتلك الكليات على سبيل التفصيل۔

قدر تقدیر کے ہم معنی ہے، وہ فیصلہ خداوندی جو بندوں کیلئے کر دیا گیا ہے۔

شماتة الأعداء: شماتت کی تعریف یہ ہے: وهى فرح العدو ببلية تنزل بمن يعاديه۔ چنانچہ دشمن کی خوشی سے پناہ مانگنے سے مراد یہ ہے کہ دین ودنیا کی کسی بھی ایسی مصیبت میں مبتلا ہونے سے میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں جس سے دشمن خوش ہوتا ہے۔ یہ چاروں کلمات تمام انواع بلاء کیلئے جامع مانع ہیں۔ ان کے درمیان عموم خصوص من وجہ ہے۔ جیسا کہ بلغاء وفصحاء کے کلام میں ہوتا ہے۔

ابن حجرؒ سے اس موقع پر چوک ہوئی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں: ولكون المقام مقام الاطناب لم يؤثر فيه تداخل بعض معانى ألفاظه واغناء بعضها عن بعض اھ۔ حدیث میں بیان کردہ نکات کو آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کا یہ کلام غایت ایجاز کو پہنچا ہوا ہے، بلکہ اعجاز کے قریب قریب ہے۔ لہٰذا ابن حجرؒ کا یہ کہنا: ''یہ مقام اطناب ہے'' درست نہیں۔

حصن کے مطابق بخاری کی روایت کے الفاظ یوں ہیں: اللهم انا نعوذبك من جهد البلاء...... واضح رہے کہ حدیث کے طرقِ صحیحین سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل حدیث میں تین جملے مرفوع ہیں، اور چوتھا جملہ سفیان بن عیینہ نے اپنی طرف سے بڑھایا ہے، لیکن یہ واضح نہیں کیا کہ وہ کونسا کلمہ ہے، اسماعیلی نے اپنی روایت میں سفیان سے نقل کرتے ہوئے وضاحت کرتے ہیں کہ سفیان کا اپنی طرف سے بڑھایا ہوا جملہ: ''شماتة الأعداء'' ہے۔

اندیشہ اور غم سے نجات کے لیے جامع دعا

۲۴۵۸: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ ﷺ یَقُوْلُ اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْھَمِّ وَالْحُزْنِ وَالْعَجْزِ وَالْکَسَلِ وَالْجُبْنِ وَالْبُخْلِ وَضَلَعِ الدَّیْنِ وَغَلَبَةِ الرِّجَالِ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۷۸/۱۱۔ حدیث رقم ۶۳۶۹۔ وابو داؤد فی السنن ۹۰/۲ حدیث رقم ۱۵۴۱۔ والترمذی ۱۷۲/۵ حدیث رقم ۳۵۵۱۔ واحمد فی المسند ۲۲۶/۳۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ فرماتے تھے اے الٰہی تحقیق میں پناہ پکڑتا ہوں تیرے اندیشے سے اور غم سے اور عاجز ہونے سے اور سستی سے اور نامردی سے اور بخیلی سے اور دین کے بوجھ سے اور لوگوں کے غلبہ سے یعنی ظالموں سے۔ اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تخریج: رواہ ابو داود والترمذی والنسائی ،والمفهوم من الحصن انه من افراد البخاری

تشریح: **قوله: اللهم انی أعوذبك...... والبخل**: ''انی'' یاء کو ساکن ومفتوح دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے۔

''**أعوذبك...... والبخل**'': ہر ہر کلمہ کے متعلق توضیحات ماقبل میں گزر چکی ہیں۔

قوله: ضلع الدین وغلبة الرجال: ضلع کو بروزن شمس وقمر دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ ضلع الدین سے دین کی شدت وثقل مراد ہے۔ خصوصاً جب کہ قرض کی ادائیگی کی کوئی صورت نہ دکھائی دیتی ہو اور ادائے قرض کا مطالبہ بھی ہو۔ بعض سلف نے فرمایا: ''**ما دخل هم الدین قلبا الا أذهب من العقل ما لا یعود الیه**''۔ اور اسی وجہ سے مروی ہے: **الدین شین الدین**۔

''**غلبة الرجال**'': غلبہ سے ان کے تسلط کا قہر وشدت مراد ہے۔ اور ''رجال'' سے ظالم یا دائن مراد ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس سے پناہ چاہی چونکہ اس سے ''**وهن فی النفس**'' لازم آتا ہے۔

کرمانیؒ فرماتے ہیں: یہ دعا جوامع الکلم میں سے ہے، چونکہ ''رذائل'' کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) بدنیہ۔ (۲) نفسانیہ۔ (۳) خارجیہ۔ رذائل نفسانیہ باعتبار قوی کے تین ہیں۔ (۱) عقلیہ۔ (۲) غضبیہ۔ (۳) شھویۃ۔ چنانچہ ''**هم وحزن**'' کا تعلق عقلیہ سے ہے۔ ''**جبن**'' کا تعلق ''**غضبیه**'' سے ہے۔ ''بخل'' کا تعلق ''شھویہ'' سے ہے، عجز وکسل کا تعلق ''بدنیہ'' سے ہے۔ رذائل بدنیہ اس وقت پائے جاتے ہیں جب اعضاء آلات وقوی تمام سلامت ہوں۔ اور پہلا کسی عضو وغیرہ کے نقص ونقصان کے وقت ہوتا ہے، اور ضلع وغلبہ خارجیہ کی وجہ سے ہوتا ہے، چنانچہ پہلا ''مالی'' دوسرا ''جاہی'' ہے۔ اور یہ دعا ان تمام کو شامل ہے۔

جامع دُعا

۲۴۵۹: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ کَا نَ النَّبِیُّ ﷺ یَقُوْلُ اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْکَسَلِ وَالْھَرَمِ وَالْمَغْرَمِ وَالْمَاْثَمِ اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِکَ مِنْ عَذَابِ النَّارِ وَفِتْنَةِ النَّارِ وَفِتْنَةِ الْقَبْرِ وَعَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ شَرِّ فِتْنَةِ الْغِنٰی وَمِنْ شَرِّ فِتْنَةِ الْفَقْرِ وَمِنْ شَرِّ فِتْنَةِ الْمَسِیْحِ الدَّجَّالِ اَللّٰھُمَّ اغْسِلْ خَطَایَایَ بِمَاءِ الثَّلْجِ وَالْبَرَدِ وَنَقِّ قَلْبِی کَمَا یُنَقَّی الثَّوْبُ الْاَ بْیَضُ مِنَ الدَّنَسِ وَبَا عِدْ بَیْنِی وَبَیْنَ خَطَایَایَ کَمَا بَاعَدْتَّ بَیْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۸۱/۱۱۔ حدیث رقم ۶۲۷۵۔ ومسلم فی صحیحه ۲۰۷۸/۴ حدیث رقم (۴۹۔ ۵۸۹)۔

والترمذی فی السنن ۱۸٦/۵ حدیث رقم ۳۵٦۰ واحمد فی المسند ۱۸۵/۲۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے اے الٰہی! تحقیق میں سستی سے یعنی طاعت میں سستی سے اور بڑھاپے سے یعنی بڑھاپے کی وجہ سے بے حواس ہو جانے سے اور اعضاء کے ناکارہ ہونے سے اور قرض سے اور گناہ سے پناہ مانگتا ہوں۔ اے الٰہی! تحقیق میں تیرے آگ کے عذاب سے اور قبر کے فتنہ سے اور قبر کے عذاب سے اور دولت کے فتنہ کی برائی سے اور فقر کی فتنہ کی برائی سے اور کالے دجال کے فتنے کی برائی سے پناہ مانگتا ہوں۔ اے الٰہی! میرے گناہوں کو برف والے پانی کے ساتھ اور اولوں کے ساتھ دھو دے یعنی مجھ کو گناہوں سے پاک کر دے طرح کی مغفرتوں کے ساتھ پاک کر دے جیسے کہ یہ چیزیں میل سے پاک کرتی ہیں اور میرے دل کو برے اخلاق سے پاک کر دے جیسا کہ سفید کپڑا میل سے پاک کیا جاتا ہے اور میرے درمیان اور میرے گناہوں کے درمیان دوری ڈال دے جیسے کہ تو نے مشرق و مغرب کے درمیان دوری رکھی ہے۔ اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: اللهم انی أعوذ...... وعذاب القبر: ان تمام کی تشریح ماقبل گزر چکی ہے۔

قوله: ومن شر فتنة الغنی: مالداری کا فتنہ بطر وطغیان ہے، مال کو حرام طریقے سے یا حرام جگہوں سے حاصل کرنا، نافرمانی میں خرچ کرے، یا مال و جاہ پر تفاخر کرے۔

قوله: ومن شر فتنة الفقر: مالداروں سے حسد کرنا، مالداروں کے مال میں لالچ کرنا، اس قدر تذلل اختیار کرنا کہ جس سے عزت خاک میں مل جائے یا دین بدنام ہو۔ اور اللہ کی تقسیم پر راضی نہ ہونا، اور اس کے علاوہ وہ تمام صورتیں بھی اس ضمن میں آتی ہیں کہ جن کا انجام اچھا نہ ہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: **کاد الفقر أن یکون کفرا:** بعض کا کہنا ہے کہ ''فتنہ'' سے یہاں ابتلاء وامتحان مراد ہے، **أی من بلا الغنی وبلاء الفقر** ۔ یعنی اس غناء وفقر سے پناہ چاہتا ہوں جو بلاء ومشقت ہو، اور یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ فقر وغنی اپنی ذات کے اعتبار سے دونوں محمود ہیں، اگرچہ جمہور فرماتے ہیں کہ فقر ''اسلم'' ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**ان ربك یبسط الرزق لمن یشاء ویقدر انه کان بعباده خبیرا بصیرا**﴾[الاسراء: ۳۰] چنانچہ اس آیت میں اشارہ ہے کہ ''تسلیم'' افضل ہے، اور رزق کا بسط وقدر ہر بندہ کے مناسب حال ہے۔ حدیث قدسی میں آتا ہے: **ان من عبادی من لا یصلحه الا الفقر، ولو أغنیته لفسد حاله، وان من عبادی من لا یصلحه الا الغنی، ولو أفقرته لفسد حاله** ۔ پس فقیر کی شرط یہ ہے کہ وہ صابر ہو، اور غنی کی شرط یہ ہے کہ شاکر ہو۔ پس جب دونوں اس طرح کے نہیں ہوں گے تو ہر ایک کیلئے اس کا فقر وغنا فتنہ ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو رب کے قریب کرے وہ تیرے لئے مبارک ہے۔ اور ہر وہ چیز جو رب سے دوری پیدا کرے وہ تیرے لئے ''شؤم'' ہے، خواہ وہ فقر ہو، خواہ وہ غنی ہو۔ بعض محققین نے فرمایا: دونوں کے ساتھ ''شر'' کی قید لگی ہوئی ہے، چونکہ ان میں سے ہر چیز ایک اعتبار سے ''خیر'' ہے، اور ایک اعتبار سے ''شر'' ہے، چنانچہ ''شر'' کی قید سے وہ فقر وغنا خارج ہے جس میں ''خیر'' ہو، خواہ قلیل ہو کہ کثیر۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اگر فتنہ کی تفسیر محنت ومصیبت کے ساتھ کی جائے تو اس کا شر یہ ہے کہ آدمی مفلسی پر صبر نہ کرے اور جزع کرے، اور اگر امتحان واختبار کے ساتھ کی جائے تو اس کا شر یہ ہے کہ خوشحالی میں حمد وثناء نہ بیان کی جائے، اور بدحالی میں صبر نہ ہو۔

امام غزالی قدس اللہ سرّہ فرماتے ہیں: غناء کا فتنہ ''حرص'' ہے۔ اور یہ کہ ناجائز طریقہ سے کمانے کی محبت ہو، اور حقوق وواجبات کی ادائیگی میں رکاوٹ بن جائے، اور فقر کے فتنہ سے مراد وہ فقر ہے کہ جس فقر پر صبر نہ کر سکے، تقویٰ وورع کا دامن چھوڑ بیٹھے، اور اس کے سبب

ایسے بھنور میں پھنس جائے کہ جو اہل دین ومروت کے شایان شان نہ ہو۔اور فقر وفاقہ کی وجہ سے حرام کی تمیز بھی نہ رہے اور اس پر کود پڑے۔

قوله: ومن شر فتنة المسيح الدجال: حاء مہملہ کے ساتھ ہے، خاء معجمہ کے ساتھ بھی مروی ہے، اس کو "مسیخ" کہنا اس اعتبار سے ہے کہ اس کی ایک آنکھ مکمل طور پر مسخ ہوگی، اور دوسری آنکھ جزوی طور پر۔ مشکوٰۃ کے تصحیح شدہ معتمد نسخوں میں یہ لفظ حائے مہملہ کے ساتھ ضبط کیا گیا، اور ابن حجر کی عبارت: **بالحاء المهملة والمعجمة** سے وہم پیدا ہوتا ہے، لہٰذا دھوکہ نہ لگ جائے، اور اس کو اختلاف نسخ پر محمول کرتے ہوئے کوئی نسخہ نہ سمجھ لیا جائے، بلکہ یہ ایک روایت ہے۔

ابن بطالؒ فرماتے ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ تعوذ "**تعليمًا للأمة**" ہے۔ چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے ان تمام امور سے مأمون کر رکھا ہے۔ قاضی عیاضؒ نے بھی اسی پر جزم کیا ہے۔ عسقلانی لکھتے ہیں: **أراد التعوّذ من وقوع ذلك بأمته** اھ یا افتقار وعبودیت کا اظہار مقصود ہے۔ کہ اللہ جل شانہ کی ذات عالی مستغنی اور کبریائی والی ہے۔

قوله: اللهم اغسل خطاياى بماء الثلج والبرد: **البرده** بروزن قلم۔ اے اللہ مجھے تمام انواع مغفرت کے ساتھ گناہوں سے اس طرح طاہر کر دیجئے، جیسا کہ یہ اشیاء مطہرہ میل کچیل سے پاک کر دیتی ہیں۔

ابن دقیق العیدؒ فرماتے ہیں: یہ تعبیر "غایت محو" کیلئے اختیار کی گئی، اس لئے کہ وہ کپڑا کہ جس کو کئی بار دھویا گیا ہو تو وہ انتہائی صاف ستھرا ہوتا ہے۔ عسقلانیؒ فرماتے ہیں: گویا خطایا کو بمنزلہ جہنم کے قرار دیا، چونکہ یہ اس کا سبب ہیں۔ اور غسل کو اطفاء حرارت سے تعبیر کیا، اور انتہائی ٹھنڈے پانیوں کے استعمال کا ذکر مبالغہ فرمایا۔

قوله: ونق قلبى كما ينقى الثوب الابيض من الدنس: اس میں اشارہ ہے کہ اصل فطرت کے تقاضا کے طور پر دل سلیم ونظیف اور ابیض وظریف ہوتا ہے، گناہوں کے ارتکاب، اور عیوب کے تخلق کے باعث یہ سیاہ ہو جاتا ہے۔

قوله: باعد بينى وبين ...... "**أبعد**" کا مبالغہ ہے، چونکہ باب مفاعلہ جب "مغالبہ" کیلئے نہ ہو تو مبالغہ کیلئے ہوتا ہے۔ چنانچہ اس میں قوت تکرار ہے۔ قلائیؒ فرماتے ہیں: مباعدہ سے مراد **صحو ما حصل منها والعصمة عما سيأتى** ہے۔ یہ کلام مجاز پر محمول ہے، چونکہ حقیقت کے اعتبار سے مباعدہ زمان ومکان میں ہوتا ہے، اور التقاء مشرق ومغرب مستحیل ہے، تو گویا مراد یہ ہے کہ **لا يبقى منها أثرا۔ أى: بالكلية۔**

کرمانیؒ فرماتے ہیں: لفظ "بین" کو مکرر لایا گیا چونکہ ضمیر مجرور پر عطف کیلئے اعادۂ خافض ہوتا ہے، اور فرمایا: احتمال یہ ہے کہ دعوات ثلاثیہ سے ازمنۂ ثلاثہ کی طرف اشارہ فرمایا ہو۔ غسل سے ماضی کی طرف تنقیہ سے حال کی طرف، اور مباعدہ سے استقبال کی طرف ابن دقیق العیدؒ فرماتے ہیں: احتمال یہ ہے کہ یہ تمام اشیاء مجاز ہیں اس صفت سے کہ جس کے ذریعہ محو ہوتا ہے۔ جیسا کہ یہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿**واعف عنا واغفرلنا وارحمنا**﴾

دنیا و برزخ میں لاحق ہونے والی پریشانیوں سے پناہ مانگنا

۲۴۶۰: وَ عَنْ زَيْدِ بْنِ اَرْقَمَ كَا نَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّى اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْكَسَلِ وَالْجُبْنِ وَالْبُخْلِ وَالْهَرَمِ وَعَذَابِ الْقَبْرِ اَللّٰهُمَّ آتِ نَفْسِى تَقْوَاهَا وَزَكِّهَا اَنْتَ خَيْرُ مَنْ زَكّٰهَا اَنْتَ وَلِيُّهَا وَمَوْلَاهَا اَللّٰهُمَّ اِنِّى اَعُوْذُبِكَ مِنْ عِلْمٍ لَّا يَنْفَعُ وَمِنْ قَلْبٍ لَّا يَخْشَعُ وَمِنْ نَفْسٍ لَّا تَشْبَعُ وَمِنْ دَعْوَةٍ لَّا يُسْتَجَابُ لَهَا۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ۲۰۸۸/٤ حديث رقم (۷۳۔ ۲۷۲۲)۔

ترجمہ: حضرت زید بن ارقمؓ روایت ہے۔ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے اے الٰہی تحقیق میں پناہ مانگتا ہوں تیرے ساتھ عاجز ہونے سے۔ یعنی قدرت نہ رکھنے سے۔ اطاعت پر اور سستی سے یعنی اچھے کاموں میں اور نامردی سے اور بخیلی سے اور بڑھاپے سے یعنی ناکارہ ہونے اعضاء کے سے اور برھاپے کی وجہ سے بے خوشی سے اور عذاب قبر سے یعنی قبر کی تنگی سے اور وحشت سے اور گرزوں کے سے مار سے اور بچھوؤں کے ڈنک مارنے سے اور سانپوں کے ڈسنے سے اور ان کی مانند۔ اے الٰہی میرے نفس کو پرہیزگاری عطا کر اور اس کو پاک کر۔ تو بہترین ہے ان کے لیے جنہوں نے اس کو پاک کیا تو اس کارساز ہے اور اس کا مالک ہے اے الٰہی تحقیق میں پناہ مانگتا ہوں تجھ سے اس کے علم سے کہ جو نفع نہ دے اور اس دل سے کہ نہ ڈرے یا نہ تسکین پائے اللہ کے ذکر سے اور اس نفس سے نہ سیر ہو یعنی حریص ہو اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اس پر قناعت نہ کرے اور اس دعا سے کہ نہ قبول کی جائے۔

تشریح: **قوله: اللهم انی اعوذ بك من العجز......عذاب القبر: أی عدم القدرة علی الطاعة، وعدم القوة علی العبادة**: یعنی اے اللہ میں پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ طاعت پر قادر نہ رہوں اور عبادات کے کرنے کی مجھ میں طاقت نہ رہے۔

قوله: اللهم آت نفسی تقواها: أی صیانتها عن للحظورات۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: مناسب ہے کہ تقویٰ کی تفسیر اس فجور کے مقابل سے کی جائے، جس کا ذکر اس آیت کریمہ میں ہے: ﴿**فالهمها فجورها وتقواها**﴾ [الشمس:۸] یہاں تقویٰ سے مراد یہ ہے کہ خواہشات نفسانی کی متابعت، اور فجور فواحش کے ارتکاب سے بچا جائے، چونکہ حدیث آیت کیلئے تفسیر و بیان کی طرح ہے۔ ''آتِ'' دلالت کررہا ہے کہ آیت میں ''الہام'' سے مراد: **خلق الداعية الباعثة علی الاجتناب عن المذكورات** ہے۔

قوله: وزكها أنت خير من زكاها: یہ دلالت کرتا ہے کہ آیت میں نفس کی طرف تزکیہ کا اسناد، **نسبة الكسب الی العبد** کی قبیل سے ہے، نا کہ **خلق الفعل** والی نسبت، جیسا کہ معتزلہ کا گمان ہے، چونکہ ''خیریت'' **مشاركة بين كسب العبد وخلق القدرة فيه** کی مقتضی ہے۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: **ولا يلزم من مقابلة التقوی للفجور قصرها علی ضد الفجور، خلافا لمن توهمه**۔ ابن حجرؒ کا یہ کہنا ''کھلم کھلا مکابرہ'' ہے۔ چونکہ آیت مذکورہ میں ذکر کردہ یہ مقابلہ بالکل صحیح ہے۔

قوله: أنت وليها ومولاها: ''ولی'' یہاں ''ناصر'' کے معنی میں ہے۔ ای: **ناصرها**: اس جملہ کا تعلق **آت نفسی تقواها** سے ہے، گویا کہ اصل کلام یوں ہے: **انصرها علی فعل ما يكون سببا لرضاك عنها لأنك ناصرها**۔ **مولاها**: یہ کلام ''زکھا'' کی طرف راجع ہے، یعنی: **طهرها بتأديبك اياها۔ كما يؤدب المولی عبيده**۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: **أنت وليها ومولاها** مستانفہ ہے۔ اللہ سے درخواست کی جارہی ہے کہ **آت تقواها وزكها** چونکہ اللہ ہی ان امور کا متولی و مالک ہے۔ پس اگر تزکیہ کو تطہیر النفس عن الافعال والاقوال والاخلاق الذمیمۃ پر محمول کیا جائے تو تقوی کی نسبت سے ممکن فی الباطن کے مظاہر ہوں گے، اور اگر انماء و اعلاء بالتقویٰ پر محمول کیا جائے تو تحلیہ بعد التخلیہ ہوگا، چونکہ از روئے شرع وہ شخص متقی ہے جو نواہی سے اجتناب کرتا ہو، اور اوامر کو بجالاتا ہو۔ بعض عارفین سے منقول ہے: **تقوی البدن الكف عمالا يتيقن حله، وتقوی القلب عما سوی الله فی الدارين وعدم الالتفات الی غيره سبحانه**۔

قوله: اللهم انی أعوذبك من علم لا ينفع: امام طیبیؒ اس کا مطلب یہ بیان فرماتے ہیں:

''غیر نفع بخش علم'' سے پناہ مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ میں اس علم سے پناہ مانگتا ہوں جس پر عمل نہ کروں جو دوسروں کو نہ سکھاؤں اور جو اخلاق و افعال کو نہ سدھارے' یا پھر اس سے وہ علم مراد ہے جو دین کے لئے ضروری نہ ہو اس طرح وہ علم بھی مراد ہوسکتا ہے جس کو حاصل کرنے کی

شریعت نے اجازت نہیں دی ہے۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں: علم اپنی ذات کے اعتبار سے مذموم نہیں، چونکہ ''علم'' اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے، بلکہ اس (کے مذموم ہونے) کے تین اسباب ہیں۔ یا تو اس وجہ سے کہ وہ ایصال الضرر کا وسیلہ ہے، یا ایصال الشر الی غیرہ کا ذریعہ ہے، جیسا کہ علم السحر اور طلسمیات۔ چونکہ یہ دونوں علوم اضرار بالخلق اور وسیلہ للشر کے علاوہ کوئی صلاحیت نہیں رکھتے۔ یا اپنے صاحب کو ظاہری طور پر نقصان پہنچائیں گے، جیسا کہ علم النجوم۔ اس لئے کہ یہ سارے کا سارا علم مضر ہے، اور اس کی چھوٹی سے چھوٹی مضرت یہ ہے کہ آدمی لایعنی کام شروع کر دیتا ہے، اور عمر عزیز جیسی قیمتی ترین پونجی کو بلا فائدہ انتہائی گھاٹے میں ضائع کر دیتا ہے، یا اس کے دقیق ہونے کی وجہ سے، جیسا کہ دقیق علوم کے جلی ہونے سے پہلے ان کے ساتھ تعلق، اور اسرار الٰہیہ سے بحث کرنے والا شخص۔ چنانچہ لوگوں پر واجب ہے کہ وہ اس سے بحث کرنے سے رک جائیں۔ اور اس چیز کی طرف لوٹایا جائے کہ جس کی بابت شریعت نے کلام کیا ہے۔ اھ۔ اس تقریر سے ابن حجرؒ کے اس قول کا فاسد ہونا بھی ظاہر ہو جاتا ہے: **لا يحيط بها الا نبی أو ولی**، چونکہ ''احاطہ'' اللہ جل شانہ کی صفت خاص ہے، اسی وجہ سے امام صاحبؒ نے فرمایا: **لجلالة المقام لا يستقل بها، والوقوف على طرف بعضها إلا الانبياء والأولياء عليهم الصلوة والسلام۔**

قوله: ومن نفس لا تشبع: یعنی ایسے نفس سے پناہ مانگتا ہوں جو اللہ کے عطایا سے سیر نہ ہو۔ تیرے دیئے ہوئے رزق پر قانع نہ ہو، شدت حرص کے باعث مال جمع کرنے سے تھکتا نہ ہو۔ دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اپنے نفس سے پناہ مانگتا ہوں جو سیر نہیں ہوتا اور بہت زیادہ کھاتا ہے۔ ابن الملکؒ فرماتے ہیں: ایسا نفس جو مال جمع کرنے اور مناصب حاصل کرنے کا حریص ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ حقیقی معنی مراد ہیں، اس کی شدت حرص کی وجہ سے یا دنیا کی حرص سے اس قدر کھانے پر قادر نہیں کہ جو اس کو سیر کر دے۔ یا جوع البقر کے استیلاء کی وجہ سے۔

قوله: ومن دعوة لايستجاب لها: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''لها'' کی ضمیر ''دعوت'' کی طرف لوٹ رہی ہے، اور لام زائدہ ہے اور جامع الاصول میں یوں ہے: **دعوة لا تستجاب** اھ۔ اور ایک روایت میں **ومن دعا لا يسمع**۔ ایک اور روایت میں: **ومن هؤلاء الأربع**، یہ حدیث سجع کے جواز پر دلالت کرتی ہے، بشرطیکہ طبع کے موافق ہو، اور بلا تکلف ہو۔

اچانک عذاب اور غضب خداوندی سے پناہ مانگنا

۲۴۶۱: **وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ مِنْ دُعَاءِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَعُوْذُ بِكَ مِنْ زَوَالِ نِعْمَتِكَ وَتَحَوُّلِ عَافِيَتِكَ وَفُجَاءَ ةِ نِقْمَتِكَ وَجَمِيْعِ سَخَطِكَ۔** (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ۲۰۹۷/۴ حديث رقم (۹۶۔ ۲۷۳۹)۔ و ابوداؤد فی السنن ۹۱/۲ حديث رقم ۱۵۴۵۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی دعاؤں میں سے یہ دعا بھی تھی اے الٰہی تحقیق میں پناہ مانگتا ہوں تجھ سے تیری رحمت کے جاتے رہنے سے اور تیری عافیت کے بدلنے سے۔ یعنی مثلاً صحت کے بدلے بیماری ہو اور غنا کے بدلے محتاجگی ہو اور تیرے اچانک عذاب سے اور تیری تمام ناراضگی سے۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: اللهم انی اعوذبك من زوال نعمتك وتحول عافيتك: ''تحوّل'' واؤ مشددہ ہے۔ میرکؒ فرماتے ہیں: اگر یہ سوال کیا جائے کہ ''زوال'' و ''تحول'' میں کیا فرق ہے؟ تو میں کہتا ہوں زوال کی نسبت ایسی شی کی طرف کی جاتی ہے کہ جو پہلے کسی چیز میں موجود ہو، پھر اس سے جدا ہو گئی ہو، اور تحول یہ ہے کہ شی میں تغیر آ جائے اور غیر سے جدا ہو جائے۔ چنانچہ زوال نعمت کا

مطلب ہوگا: ذھا بھا من غیر بدل، اور تحول کا یہاں مطلب ہوگا: ابدال الصحة بالمرض والغنی بالفقر۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: أی تبدل ما رزقتنی من العافیة الی البلاء والداھیة۔ ابوداؤد کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: وتحویل عافیتك۔ تحویل باب تفعیل سے ہے، چنانچہ اضافۃ المصدر الیٰ مفعولہ کی قبیل سے ہے۔

قولہ: وفجأة نقمتك وجمیع سخطك: نون کے کسرہ اور فتحہ کے ساتھ اور قاف ساکن ہے۔ بروزن فرحة۔ جاء ة: فاء کے ضمہ اور مدّ کے ساتھ۔ ایک نسخہ میں فاء کے فتحہ اور جیم کے سکون کے ساتھ ہے۔ بمعنی بغتة یعنی اچانک۔

''جمیع سخطك''، یعنی تمام امور سے کہ جو آپ کے غصہ کا سبب بنیں، دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہم آپ کے غضب کے جمیع آثار سے پناہ چاہتے ہیں۔

صفت متجزی نہیں ہوتی

ابن حجرؒ کا یہ کلام خطا فاحش پر مبنی ہے: وجمیع جزئیات سخطك۔ چونکہ صفت متجزی نہیں ہوتی۔

۲۴۶۲: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ مَا عَمِلْتُ وَمِنْ شَرِّ مَا لَمْ اَعْمَلْ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۲۰۸۵/٤ حدیث رقم (۹۵۔ ۲۷۱٦)۔ وابوداؤد فی السنن ۹۲/۲ حدیث رقم ۱۵۵۰۔ واحمد فی المسند ۱۳۹/٦۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ فرماتے تھے اے الٰہی تحقیق میں پناہ مانگتا ہوں۔ تجھ سے اس کام کی برائی سے جو میں نے کیا اور اس کام کی برائی سے جو میں نے نہیں کیا اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: اللھم انی اعوذ بك من شرما عملت: واضح رہے کہ ''عمل'' سے مراد فعل ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: مطلب یہ ہے کہ میں نے جو برے کام کئے ہیں ان سے بھی پناہ مانگتا ہوں بایں معنی کہ ان کی وجہ سے عذاب میں مبتلا نہ ہو جاؤں اور وہ برے کام معاف فرما دیئے جائیں اور جو کام نہیں کئے ہیں ان سے بھی پناہ مانگتا ہوں بایں معنی کہ آئندہ ایسا کوئی کام نہ کروں جو تیری ناراضگی کا باعث ہو یا یہ کہ برے کاموں کے ترک کو اپنا کمال نہ سمجھوں بلکہ اسے صرف تیرا فضل جانوں۔

۔ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿واتقوا فتنة لا تصیبن الذین ظلموا منکم خاصة﴾[الانفال: ۲۵] اور ایک احتمال یہ ہے کہ ناکردہ فعل پر تعریف کی خواہش سے پناہ چاہتا ہوں اھ۔ یہ سارا کلام انتہائی دقیق ہے۔

قولہ: ومن شر ما لم أعمل: ابن حجرؒ نے یہاں عجیب معاملہ کیا ہے کہ من شر ما لم أعمل کی بالکل تشریح نہیں کی۔ گویا کہ انہوں نے لا أدری نصف العلم پر عمل کیا۔ آگے لکھا ہے: والقول الثانی أقرب، بل فی الأول من البعد عن ظاھر اللفظ ما لا یخفی اھ۔ اور ممکن ہے کہ مالم أعمل سے مراد ایسا فعل جس کا زمانہ مستقبل میں صدور ہوا۔

اختلاف روایت: امام نسائی اور ابن ابی شیبہ نے اس روایت کو حضرت عائشہ سے بایں الفاظ نقل کیا ہے: اللھم انی أعوذبك من شر ما عملت ومن شر مالم أعمل۔

آپ ﷺ کی ایک جامع دعا کا بیان

۲۴۶۳: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ لَكَ اَسْلَمْتُ وَبِكَ اٰمَنْتُ وَعَلَيْكَ

تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْكَ اَنَبْتُ وَبِكَ خَاصَمْتُ اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَعُوْذُ بِعِزَّتِكَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ مِنْ اَنْ تُضِلَّنِي اَنْتَ الْحَيُّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ وَالْجِنُّ وَالْاِنْسُ يَمُوْتُوْنَ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۱۶/۱۱۔ حدیث رقم ۶۳۱۷۔ ومسلم ۲۰۸۶/٤۔ حدیث رقم (۶۷۔ ۲۷۱۷)۔ والدارمی فی السنن ٤۱۵/۱ حدیث رقم ۱٤۸۶۔ واحمد فی المسند ۹۵/۱۔

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ فرماتے تھے۔اے الٰہی تیرے واسطے میں نے فرمانبرداری کی اور تجھ پر ایمان لایا اور تجھی پر میں نے توکل کیا اور تیری ہی طرف میں نے رجوع کیا یعنی گناہوں سے تیری اطاعت کی طرف میں رجوع کیا اور تیری مدد کے ساتھ میں لڑتا ہوں۔یعنی کافروں سے اے الٰہی تحقیق میں پناہ مانگتا ہوں تیری عزت کے ساتھ کوئی معبود نہیں ہے مگر تو اس سے کہ تو گمراہ کرے مجھ کو زندہ ہے کہ مرے گا نہیں اور جن اور آدمی مریں گے۔اس کو امام بخاری اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله: اللهم لك أسلمت وبك آمنت وعليك توكلت:** غیر اللہ کو خارج کر دیا۔ **اسلمت وبك آمنت:** یہاں ''اسلام'' سے مراد انقیاد ظاہری اور ''ایمان'' سے مراد تصدیق باطنی ہے۔''**وعليك توكلت**'' کے کئی مطلب بیان کئے ہیں: (۱) اپنے تمام امور کے آغاز واختتام پر آپ ہی کی ذات پر بھروسہ ہے۔(۲) میں نے اپنے تمام امور آپ ہی کے سپرد کر دیئے۔ آپ ہی تدبیر فرمائیے، چونکہ میں ان امور میں نفع کا مالک ہوں نہ نقصان کا۔اور آپ ہی پر ایمان لانا یعنی آپ کی عطا کردہ توفیق سے ہی میں ان تمام چیزوں پر ایمان لایا جن پر ایمان لانا ضروری ہے۔اور اپنے تمام امور میں آپ ہی پر بھروسہ کیا۔ابن حجرؒ نے ''**وعليك توكلت**'' کے بارے میں انوکھی بات ذکر کی ہے: **عليك** ''تجوز'' **وان ضمن توكلت باعتمدت لتعذر تعديه بعلى بدون التضمين**۔واضح رہے کہ لفظ ''توکل'' ''صرف ''علیٰ'' کے واسطہ سے ہی متعدی ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن وحدیث اور لغت اس پر شاہد ہے، تعدیہ اور استعلاء کے اعتبار سے ''توکل'' اور ''اعتماد'' میں کوئی فرق نہیں ہے۔چنانچہ تضمین کی کوئی ''تک'' نہیں بنتی۔چونکہ وہ بعینہٖ استعلاء کے معنی کا فائدہ دے رہا ہے۔''تضمین'' اس وقت صحیح ہوتی اگر اس کا غالب استعمال بغیر ''علیٰ'' کے ہوتا۔اور کبھی ''علیٰ'' کے ساتھ استعمال ہوتا تو تضمین میں ایسے فعل کی احتیاج ہوتی جو ''علیٰ'' کے بغیر مستعمل نہ ہو۔جیسا کہ ارباب عقل ونہی پر مخفی نہیں۔

قوله: واليك أنبت وبك خاصمتك: کے تین معنی ہو سکتے ہیں: (۱) **انابة من الغفلة الى الذكر**۔(۲) **انابة من المعصية الى الطاعة**۔ (۳) **وانابة من الغيبة الى الحضور**۔ **وبك خاصمتك:** (باء برائے استعانت ہے) **أى: باعانتك حاربت أعداء ك**۔

قوله اللهم انى أعوذ بعزتك لااله الاانت ان تضلنى: ''عزۃ'' سے مراد ''غلبہ'' ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**فان العزة لله جميعا**﴾ **لا اله الا أنت:** یعنی جب آپ ہی ''الٰہ'' ٹھہرتے تو فلا **وجود ولا معبود ولا مقصود الا أنت، ولا سؤال الا منك، ولا استعاذة الا بك أن تضلى:** ''أعوذ'' کے متعلق ہے۔اور کلمۂ توحید (جملہ) معترضہ ہے، ''عزة'' کی تاکید کیلئے آیا ہے۔چنانچہ اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ ہوا: **أعوذ من أن تضلنى بعد اذ هديتنى، ووفقنى للانقياد الظاهر والباطن فى حكمك وقضائك، وللانابة الى جنابك، والمخاصمة مع أعداء ك، والالتجاء فى كل حال الى عزتك ونصرتك**۔ اس آیت کی طرف اشارہ ہے: ﴿**ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ هديتنا**﴾[آل عمران:۸]

قوله: أنت الحى الذى لا يموت......: صیغہ غائب کے ساتھ ہے۔اور حصن کی روایت میں: ''**أنت الحى لا تموت**''

صیغۂ خطاب کے ساتھ ہے۔ اوراسم موصول مذکور نہیں ہے۔ اس میں بھی ''عزۃ'' کی تاکید ہے۔ اورابن حجرؒ نے یہاں انوکھی بات کہی: **قوله: أن تضلني أي: تغيبني عن حضرتك طرفة عين، بل اجعلني دائم الشهود لك، أو عن القيام بأوامرك ونواهيك، بل اجعلني دائم التعبدلك، أو عن الايمان بك، بل اجعلني دائم التصديق بما جاء من عندك۔ اهـ۔** پہلی بات تو یہ ہے کہ ابن حجرؒ کے کلام میں **أن تضل** بمعنی غاب استعمال ہوا ہے۔ حالانکہ یہ اضلال سے ماخوذ ہے، جوضل کا متعدی اور''ھدایۃ'' کا متضاد ہے۔

دوسری غلطی یہ ہے کہ جملوں کی ترتیب برقرار نہیں ہے، چونکہ ایمان کو اسلام واحسان سے مقدم ذکر کرنا چاہئے تھا، جیسا کہ اہل عرفان میں معروف ہے۔

تیسری بات یہ کہ وہ فرماتے ہیں: **ولما كان في الاضلال بكل هذه المعاني الثلاثة نوع من الاماتة المعنوية عقب بما يوجب ضده من الحياة الأبدية فقال: أنت الحي...... اهـ۔** اس کلام میں اولاً تو تکلف وتعفف ہے۔ ثانیاً اضداد کا غلط استعمال ہے۔ بایں طور کہ ''**اماته معنويه**'' کی ضد ''**حياة حقيقيه**'' ہے۔ اور ''**حياة فانيه**'' کی ضد ''**حياة ابديه**'' ہے۔ مشہور ضابطہ ہے: **انما تبين الأشياء بأضدادها۔**

''**والجن والانس يموتون**''، جن وانس کا خصوصی طور پر ذکر فرمایا چونکہ یہی دونوں مخلوقات مکلف ہیں، اوران ہی کو تبلیغ کرنا مقصود ہے۔ گویا کہ یہ دونوں اصل ہیں۔

الفصل الثاني:

چار چیزوں سے پناہ مانگنے کا بیان

۲۴۶۴: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْاَرْبَعِ مِنْ عِلْمٍ لَّا يَنْفَعُ وَمِنْ قَلْبٍ لَّا يَخْشَعُ وَمِنْ نَفْسٍ لَّا تَشْبَعُ وَمِنْ دُعَاءٍ لَّا يُسْمَعُ۔

(رواه احمد وابو داود وابن ماجة ورواه الترمذی عن عبد الله بن عمرو و النسائی عنهما)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۸۱/۵ حديث رقم ۳۵۴۹۔ وابن ماجه فی السنن ۱۲۶۱/۲ حديث رقم ۳۸۳۷۔ واحمد فی المسند ۱۶۷/۲۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ فرمایا کرتے تھے اے الٰہی تحقیق میں پناہ مانگتا ہوں تیری چار چیزوں سے اس علم سے کہ نفع نہ دے اوراس دل سے کہ عاجزی نہ کرے اوراس نفس سے جو سیر نہ ہو اوراس دعا سے کہ جو قبول نہ کی جائے ۔اس کو امام احمدؒ اورابوداؤدؒ اورابن ماجہ نے نقل کیا ہے اورامام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے عبداللہ بن عمروؓ سے اورنسائی نے ابوہریرہؓ اورعبداللہ بن عمروؓ سے۔

تشریح: **قوله: اللهم انی اعوذ بك ...... لايسمع** سے مراد **لا يستجاب** ہے، **لا يسمع** کی تعبیر سے پتہ چلتا ہے کہ جو دعا قبول نہیں ہوتی گویا کہ اس کا اعتبار ہی نہیں، اورایسا ہے جیسا کہ دعا سنی ہی نہیں۔ کہا جاتا ہے: **اسمع دعائي: أي أجب**، چونکہ سماع سے اجابت وقبول مراد ہوتا ہے۔

ابوطالب مکی فرماتے ہیں کہ جس طرح آنحضرت ﷺ نے شرک نفاق اور برے افعال سے پناہ مانگی ہے اسی طرح آپ ﷺ نے علم کی اس ایک قسم سے پناہ مانگی (جو اسلامی عقائد واعمال کے نقطۂ نظر سے مضر ہے اور جو انسان کو تقویٰ اور خوف آخرت کی راہ پر لگانے کی

بجائے دنیا کی حرص ومحبت کے راستہ پر لے جائے) چنانچہ جس علم کے ساتھ تقویٰ اور خوف آخرت نہ ہو وہ دنیا کے دروازوں میں سے ایک دروازہ اور دنیاداری کی اقسام میں سے ایک قسم ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے: جان لیجئے کہ ان چاروں قرائن میں سے ہر ہر قرینہ اس بات کا مشعر ہے کہ اس کا وجود اس کی غایت پر مبنی ہے۔ اور قرینہ سے یہی غایت اصل غرض ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ علوم اس لئے حاصل کئے جاتے ہیں تا کہ ان سے نفع اٹھایا جا سکے، چنانچہ جب علم سے نفع نہیں اٹھائے گا تو برابر سرابر چھٹکارا حاصل نہیں ہوگا، بلکہ الٹا وبال ہوگا، اسی وجہ سے علم غیر نافع سے پناہ چاہی ہے، اور دل کو اس لئے پیدا فرمایا تا کہ اپنے پیدا کرنے والے سے خشوع اختیار کرے، اور اپنا سینہ اسی کیلئے کھلا رکھے اور اس میں نور ڈالے۔ چنانچہ جب ''دل'' ایسا نہیں ہوگا بلکہ ''قاسی'' ہوگا۔ تو اس سے استعاذہ واجب ہے۔ اللہ جل شانہ فرماتے ہیں: ﴿**فويل للقاسية قلوبهم من ذكر الله**﴾[الزمر:۲۲] اور نفس کا اعتبار ہی اس وقت ہے جب وہ دار الغرور سے پہلو کشاں ہو، دار الخلو د کی طرف ''راجع'' ہو۔ اور یہی نفس جب حریص ہوگا، دنیا سے سیر نہ ہوگا، تو آدمی کا سب سے بڑا دشمن ہوگا۔ چنانچہ اشیاء میں سے اولیٰ بالاستعاذہ منہ ''نفس'' ہی ہے۔ اور دعا کا قبول ہونا دلیل ہے کہ داعی نے اپنے علم وعمل سے نفع نہیں اٹھایا۔ اس کے دل میں خشوع نہیں، اور نفس سیر نہیں۔ **والله الهادى الى سواء السبيل وهو حسبنا ونعم الوكيل**۔

۲۴۶۵: **ورواه الترمذى عن عبد الله بن عمرو و النسائى عنهما**۔

ترجمہ: نیز اس روایت کو ترمذیؒ نے حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے اور نسائی نے حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ دونوں سے روایت کیا ہے''۔

تشریح: **قوله: عن عبد الله بن عمرو**: ''عمرو'' واؤ کے ساتھ ہے۔

پانچ چیزوں سے پناہ پکڑنے کا بیان

۲۴۶۶: **وَعَنْ عُمَرَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَتَعَوَّذُ مِنْ خَمْسٍ مِنَ الْجُبْنِ وَالْبُخْلِ وَسُوْءِ الْعُمُرِ وَفِتْنَةِ الصُّدُوْرِ وَعَذَابِ الْقَبْرِ**۔ (رواه ابو داود والنسائى)

اخرجه ابو داؤد ۲/ ۹۰ حديث رقم ۱۵٤۰۔ وابن ماجه ۲/ ۱۲٦۳ حديث رقم ۳۸٤٤۔ واحمد فى المسند ۱/ ۲۲۔

ترجمہ: حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ پانچ چیزوں سے پناہ پکڑتے تھے' نامردی اور بخیلی سے اور عمر کی برائی سے۔ یعنی اتنی عمر ہو کہ قوی حواس میں فرق آ جائے اور طاعت کی قوت نہ رہے اور سینہ کے فتنے سے یعنی سینے میں برے اخلاق اور برے عقائد جگہ پکڑیں یا حق بات کو قبول نہ کرے اور آزمائشوں کا متحمل نہ ہو ان سے پناہ مانگتے تھے اور عذاب قبر سے پناہ مانگتے ہیں۔ اس کو ابو داؤدؒ اور نسائیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله: كان يتعوذ من خمس: من الجبن والبخل**: زیادت کے منافی نہیں۔

من الجبن والبخل: جبن اور بخل پر کلام ماقبل میں تفصیل کے ساتھ گزر چکا ہے۔

قوله: وسوء العمر وفتنة الصدور: سوء العمر سے مراد سوء الکبر ہے، سوء الکبر کی تفصیل بھی ماقبل میں گزر چکی ہے۔

''**فتنة الصدور**'' کی متعدد توجیہات کی گئی ہیں: (۱) ان فتنوں سے قساوت قلب، حبّ دنیا اور اس جیسے رذائل مراد ہیں۔ (۲) **فتنة الصدور** سے مراد حقد، عقائد باطلہ اور اخلاق سیئہ ہیں۔ (۳) امام طیبیؒ فرماتے ہیں: **فتنة الصدور** سے مراد وہ ''ضیق'' ہے جس کی طرف اس آیت کریمہ میں اشارہ کیا ہے: ﴿**ومن يرد أن يضله يجعل صدره ضيقا حرجا كانما يصعد فى السماء**﴾ چنانچہ

فتنة الصدور سے مراد یہ ہے کہ دل اس دار الغرور کی طرف متوجہ ہو جائے کہ جو مؤمن کا قید خانہ ہے۔ اس ''دار الخلود'' سے پہلے تجافی اختیار کرے کہ جو وہ جنت ہے کہ جس کی چوڑائی آسمانوں زمینوں کی طرح ہے متقین کیلئے تیار کی گئی ہے۔ اھ۔ (۴) فتنة الصدور سے مراد اس ''شرح صدر'' کی ضد ہے، کہ جس کا بیان اس آیت کریمہ میں ہے: ﴿فمن یرد الله أن یهدیه یشرح صدره للاسلام﴾ جب نبی کریم ﷺ سے اس کی علامت پوچھی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''التجافی عن دار الغرور، والانابة الی دار الخلود، والاستعداد للموت قبل نزوله۔

ذلت اور محتاجگی سے پناہ مانگنے کا بیان

۲۴۶۷: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ یَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْفَقْرِ وَالْقِلَّةِ وَالذِّلَّةِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ اَنْ اَظْلِمَ اَوْ اُظْلَمَ۔ (رواه ابو داود والنسائی)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۹۱/۲ حدیث رقم ۱۵۴۴۔ النسائی ۲۷۱/۸۔ وابن ماجه ۱۲۶۳/۲ حدیث رقم ۳۸۴۲۔ واحمد فی المسند ۳۰۵/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کہتے تھے اے الٰہی تحقیق میں پناہ مانگتا ہوں محتاجگی سے اور کمی سے اور ذلت سے اور میں پناہ مانگتا ہوں۔ تیرے ساتھ۔ اس کے کہ ظلم کروں یا ظلم کیا جاؤں اس کو ابوداؤد اور نسائیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: اللهم انی أعوذبك من الفقر: اس کی تفصیل حدیث: ۲۴۵۹ میں ''من شر فتنة الفقر'' کے تحت ملاحظہ فرمایئے۔

قوله: والقلة:

''محتاجگی'' سے مراد دل کی محتاجگی ہے یعنی مال وزر جمع کرنے کا حریص ہو یا اس سے مراد مال کی محتاجگی (افلاس) ہے کہ اس کی وجہ سے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ لہٰذا حقیقت تو یہ ہے کہ آپ ﷺ نے محتاجگی کے فتنہ سے پناہ مانگی خواہ وہ دل کی محتاجگی ہو یا مال کی۔

قلت سے مراد نیکیوں کی قلت (کمی) ہے مال وزر کی قلت مراد نہیں ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ تو خود مال وزر میں قلت وکمی رکھتے تھے اور مال کی کثرت وزیادتی کو ناپسند فرماتے تھے یا پھر قلت سے مال کی اتنی قلت مراد ہے کہ وہ قوت لایموت (بقدر بقاء زندگی کی غذا) کے لئے بھی کافی نہ ہو جس کی وجہ سے عبادات میں کوتاہی اور نقصان واقع ہو بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہاں (صبر کی کمی) مراد ہے

قوله: والذلة: یعنی اس بات سے تیری پناہ میں آتا ہوں کہ میں لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل ہو جاؤں، بایں طور کہ وہ میرے ساتھ استخفاف وحقارت کا معاملہ کریں، اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ اس سے وہ ذلت مراد ہے جو کسی معصیت کے نتیجہ میں اٹھانی پڑے۔ یا وہ تذلل ہے جو اپنی مسکنت کے باعث اغنیاء کے ہاں اٹھانا پڑے۔ ''ذلت'' سے مراد گناہوں کے نتیجہ میں ملنے والی ذلت ہے گنہگار اللہ تعالیٰ کے ہاں ذلیل ہوتا ہے یا پھر مالداروں کی مفلسی یا غربت کی بناء پر ذلیل ہونا مراد ہے۔

قوله: وأعوذبك أن أظلم أو أظلم: پہلا ''أظلم'' معروف اور دوسرا ''أظلم'' بصیغۂ مجہول ہے۔ ا

مرتب عرض کرتا ہے اس جملہ کی تفصیل بھی ماقبل میں گزر چکی ہے۔

نفاق اور برے اخلاق سے پناہ مانگنے کی دعا

۲۴۶۸ :وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّى اَعُوْذُبِكَ مِنَ الشِّقَاقِ وَالنِّفَاقِ وَسُوْءِ الْاَخْلَاقِ۔ (رواه ابوداود والنسائى)

اخرجه ابوداؤد فى السنن ۹۱/۲ حديث رقم ۱۵٤٦۔ والنسائى ۲٦٤/۸۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کہتے تھے اے الٰہی تحقیق میں پناہ مانگتا ہوں تیرے خلاف سے اور نفاق سے اور برے اخلاق سے اس کو ابوداؤدؒ اور نسائیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله:اللهم انی أعوذبك من الشقاق:**

''خلاف'' سے مراد ہے حق کی مخالفت اور بعض حضرات نے کہا کہ آپس میں اختلاف وعداوت مراد ہے۔''نفاق'' سے نفاق کی تمام قسمیں مراد ہیں خواہ عقیدہ میں نفاق ہو یا عمل میں۔مثلاً دل میں کفر وشرک کی تاریکی رکھنا اور زبان سے اسلام کا اظہار کرنا' کسی سے زبان سے تو کچھ کہنا اور دل میں کچھ رکھنا' بہت زیادہ جھوٹ بولنا' امانت میں خیانت کرنا اور وعدہ کے خلاف کرنا۔وغیرہ وغیرہ۔

یہ ارشاد باری تعالیٰ اسی معنی میں ہے:﴿**بل الذين كفروا فى عزة وشقاق**﴾ امام طیبیؒ لکھتے ہیں:**الشقاق العداوة ومنه قوله تعالى:﴿فى عزة وشقاق﴾** طیبیؒ کے اس کلام میں بُعد ہے۔اور ابن حجر کے کلام میں اس سے بھی زیادہ بُعد ہے وہ لکھتے ہیں:**قيل فى معنى الشقاق الخلاف والعداوة وفيه نظر لأن المراد بالأول المذموم وبالثانى العداوة لأهل الحق، وحينئذ فهما قول واحد لا قولان اه**۔یہ بالکل واضح بات ہے کہ مخالفت بغیر عداوت کے متصور نہیں ہوسکتی،اور عداوت بغیر مخالفت کے بھی پائی جاتی ہے۔اور غایت کلام یہ ہے کہ یہاں اہل حق کی عداوت ''اعم'' مراد ہے،خواہ مخالفت صوری موجود ہو یا نہ ہو۔لیکن اس کو عداوت لازم نہیں۔جیسا کہ ابو طالب نبی کریم ﷺ کے مخالف تھے،لیکن ان کو آپ ﷺ سے عداوت نہ تھی،اور نہ صرف عداوت نہ تھی، بلکہ آپ کا دفاع بھی فرماتے،اور حفاظت بھی فرماتے تھے،اور کہا گیا ہے کہ ''خلاف'' کے معنی ہیں ''عداوت''،چونکہ متعاوبین میں سے ہر ایک، ایک شق میں ہوتا ہے،**أى ناحية**،یا آخرت کی مشقت مراد ہے۔

قوله: والنفاق:نفاق کے معنی ہیں اسلام ظاہر کرنا اور کفر کو چھپانا۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں:**أى: أن تظهر لصاحبك خلاف ما تصبره**۔کہا گیا ہے کہ نفاق عمل میں نمایاں ہوتا ہے،کہ منافق بکثرت جھوٹ بولتا ہے،امانت میں خیانت کرتا ہے،وعدہ خلافی کرتا ہے، اور مخاصمت کے وقت فجور کا ارتکاب کرتا ہے۔زیادہ ظاہر یہ ہے کہ لام برائے جنس کا ہے۔چنانچہ جنس کے تمام افراد کو شامل ہے،لہٰذا بعض اقوال کو بعض اقوال پر ترجیح دینا ایک بے معنی بات ہے،اور دوسرے پر طعن ہے۔جیسا کہ ابن حجرؒ نے امام طیبیؒ پر کیا ہے، باوجودیکہ ان کا قول تمام اقوال کو شامل ہے۔

قوله: وسوء الاخلاق:عطف العام علی الخاص کی قبیل سے ہے۔اس میں اشارہ ہے کہ ابتدا میں ذکر کردہ امور اخلاق سیئہ میں عظیم ترین ہیں۔چونکہ ان کا ضرر ان کے غیر تک پہنچتا ہے۔(ذکرہ الطیبی)۔ابن حجرؒ گرفت فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:**وقضيته أن المراد بها أو صاف النفس المحرمة، كالزنا، والحسد، وحينئذ فليس ذانك أعظمهما بمقتضى ما فسرهما به مما ردته، فالوجه أن يراد بها كل خلق ذمه الشرع، وان لم يحرم ككثرة الأكل والنوم، وحينئذ فلا اشعار فيه بما ذكرنا على أنا نمنع كون ذينك أعظمهما، بل من الأخلاق الذيمة ما هو أعظم من ذينك كالحسد والجبروت الذى ينشأ عنه قتل النفس، وهتك الأعراض بنحو الزنا والقذف والأموال بحو السرقة۔**

میں کہتا ہوں، سبحان اللہ! اس سے مراد اوصاف نفس محرفہ ہیں۔ مطلق اخلاق ذمیمہ مراد نہیں ہے۔ اور پھر یہ کہنا، کالزنا۔ یہ تو خطأ فاحش ہے۔ چونکہ ''زنا'' افعال میں سے ہے، نا کہ اخلاق میں سے۔ اور اسی طرح کثرت اکل و نوم۔ یوں لگتا ہے کہ ابن حجرؒ نے کتب اخلاق میں سے کچھ بھی نہیں پڑھا۔ اگر ان کو کچھ پتہ ہوتا تو معلوم ہوتا کہ افعال محرمہ اور مکروہ سارے کے سارے اخلاق مذمومہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ چونکہ افعال ذمیمہ ان ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً قتل نفس، لوگوں کے اموال لوٹنا، ہتک أعراض، بلکہ تمام اخلاق مذمومہ بھی اسی کی پیداوار ہیں۔ جیسا کہ حسد و جبروت وغیرہ۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: **لا یؤمن أحدکم حتی یحب لأخیه ما یحب لنفسه**۔ امام شاطبیؒ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وقل صادقا لو لا الوئام وروحه   لطاح الأنام الکل فی الخلف والقلی

اس مشہور مثل: **لو لا الوئام لهلك الانام** کی طرف اشارہ ہے۔ خاص و عام میں اس کا عام مشاہدہ ہے۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل حق اہل خانہ اور اقارب کو اذیت پہنچائی جائے، سخت کلامی سے پیش آیا جائے، ان سے درگزر نہ کی جائے، اور جب ان سے خطا ہو جائے تو عفو کا دامن چھوٹ جائے۔

بھوک اور خیانت سے پناہ مانگنے کا بیان

۲۴۶۹: **وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْجُوْعِ فَاِنَّهٗ بِئْسَ الضَّجِيْعُ وَاَعُوْذُبِكَ مِنَ الْخِيَانَةِ فَاِنَّهَا بِئْسَتِ الْبِطَانَةُ.** (رواه ابو داود والنسائی وابن ماجة)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۹۱۱/۲ حدیث رقم ۱۵۴۷۔ وابن ماجه ۱۱۱۳/۲ حدیث رقم ۳۳۵۴۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ تحقیق نبی کریم ﷺ کہتے تھے اے الٰہی تحقیق میں پناہ مانگتا ہوں تجھ سے بھوک سے۔ پس تحقیق وہ بری ہے ہم خواب سے اور میں پناہ مانگتا ہوں تیرے ساتھ خیانت سے۔ پس تحقیق وہ اندر کی بری خصلت ہے اس کو ابوداؤدؒ اور نسائیؒ نے نقل کیا ہے اور ابن ماجہؒ نے۔

تشریح: **قوله: اللهم انی أعوذبك من الجوع فانه بئس الضجیع**: معدے کے غذا سے خالی ہونے کے وقت جانداروں کو محسوس ہونے والے الم کو جوع کہتے ہیں۔ کبھی بھوک کی وجہ سے مرض جنم لیتا ہے اور کبھی بھوک کی وجہ سے موت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

بھوک سے اس لئے پناہ مانگی کہ اس کی وجہ سے انسان کے بدن' قویٰ اور حواس میں کمزوری ہو جاتی ہے اور اس کا اثر عبادت میں نقصان اور حضوری میں خلل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے لہٰذا بدترین بھوک وہی ہے جو نقصان و خلل کا باعث بنے اور اکثر ہو جب کہ وہ بھوک جو ریاضت و مجاہدہ کے مقصد سے بطریق اعتدال اور اپنی حالت کے موافق ہو بدترین نہیں ہے بلکہ وہ باطن کی صفائی دل کی نورانیت اور بیماریوں سے بدن کی صحت و سلامتی کا سبب ہے۔

اس حدیث سے اس مسئلہ پر بھی استدلال کیا جاتا ہے کہ جوع مجرد میں کوئی ثواب نہیں۔

قوله: أعوذبك من الخیانة: خیانت ضد ہے ''أمانة'' کی۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: **الخیانة هی مخالفة الحق بنقض العهد فی السر**۔ زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ خیانت تمام ''تکالیف شرعیہ'' کو شامل ہے، جیسا کہ یہ آیت کریمہ اس پر دلالت کر رہی ہے: ﴿**انا عرضنا الامانة**﴾ [الاحزاب: ۷۲] اور اسی طرح یہ آیت: ﴿**یا أیها الذین آمنوا لا تخونوا اللّٰه والرسول وتخونوا أماناتکم**﴾ خیانت کی تمام اقسام کو شامل ہے۔

قولہ: فانها بئست البطانة: باطنی خصلت کو کہتے ہیں۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: البطانة، ضد ہے الظهارة کی یہ اصل میں کپڑے کو کہا جاتا ہے، چنانچہ پھر انسان کے باطنی احوال کیلئے بطور استعارہ استعمال ہونے لگا۔ اس کے اور بھی مطالب بیان کئے گئے ہیں۔ (۱) قیل: أي بئس الشئ الذی یستطبنه من أمره ویجعله بطانة حاله۔ (۲) فی المغرب: بطانة الشئ أهله أو خاصته، مستعارة من بطانة الثوب۔ ابن الملکؒ فرماتے ہیں: ''جوع'' کو ''ضجیع'' قرار دیا، اور ''خیانہ'' کو ''بطانہ'' قرار دیا ہے چونکہ ان کے درمیان ایسی ہی ملابست ہے، جیسے کہ انسان کو اس کا ضجیع اپنا بطانہ اوڑھاتا ہے۔

کوڑھ اور جذام اور دیوانگی سے پناہ مانگنے کا بیان

۲۴۷۰: وَعَنْ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْبَرَصِ وَالْجُذَامِ وَالْجُنُوْنِ وَمِنْ سَيِّءِ الْاَسْقَامِ. (رواہ ابوداود والنسائی)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۹۳/۲ حدیث رقم ۱۵۵٤۔ واحمد فی المسند ۱۹۲/۳۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ فرماتے اے الٰہی تحقیق میں تیری پناہ مانگتا ہوں تیرے ساتھ کوڑھ اور جزام سے اور دیوانگی سے اور بری بیماریوں سے اس کو ابوداؤد اور نسائی نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: اللهم انی اعوذ بك من البرص والجذام والجنون: ''برص'' بروزن قلم، مشہور مرض ہے۔

الجذام: جیم کے ضمہ کے ساتھ، یہ ایک بیماری ہے کہ جس کے سبب سے اعضاء کے بال جھڑ جاتے ہیں، قاموس میں لکھتے ہیں: جذام بروزن غراب، ایک بیماری ہے، جو سارے جسم میں سوداء کے پھیل جانے کے سبب ہوتی ہے، چنانچہ اعضاء انسانی کا مزاج اور ان کی ہیئت بگڑ جاتی ہے۔ اور بعض مرتبہ اس قدر بڑھتی ہے کہ اعضاء کو کھا جاتی ہے۔

الجنون: زوال عقل کو کہتے ہیں۔

قولہ: سیئ الأسقام: (بری بیماریوں) کا ذکر تعمیم بعد تخصیص کے طور پر ہے یعنی پہلے تو آپ ﷺ نے خاص طور پر چند بری بیماریوں کا نام لیتے ہوئے پناہ مانگی ہے۔ پھر عام طور پر ہر بری بیماری مثلاً استسقاء اور دق وغیرہ سے پناہ مانگی۔ ان بیماریوں سے آپ ﷺ نے پناہ اس لئے مانگی کہ جس شخص کو ان میں سے کوئی بیماری لاحق ہوتی ہے اکثر لوگ اس سے گھبراتے ہیں اور اس کے پاس اٹھنے بیٹھنے سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔ نیز برص اور کوڑھ تو ایسے مرض ہیں جن کی وجہ سے مریض کا جسم بدہیئتی اور بدنمائی کا شکار ہو جاتا ہے اس طرح وہ جسم کے معاملہ میں اپنے ہی جیسے انسانوں کی صف سے باہر ہو جاتا ہے پھر یہ کہ مرض ہمیشہ کے لئے چپک کر رہ جاتے ہیں جو کبھی اچھے نہیں ہوتے برخلاف اور امراض کے مثلاً بخار، سر درد وغیرہ کا یہ حال نہیں ہوتا ان میں تکلیف بھی کم ہوتی ہے اور ثواب بھی بہت ملتا ہے۔

ابن ملکؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ جو مرض ایسا ہو کہ لوگ مریض سے احتراز کرتے ہوں نہ خود مریض دوسروں سے منقطع ہو سکتا ہو اور نہ دوسرے اس سے کوئی فائدہ حاصل کر سکتے ہوں اور مریض اس مرض کی وجہ سے حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی سے عاجز ہو جاتا ہو تو اس مرض سے پناہ مانگنی مستحب ہے۔

علماء کا خیال ہے کہ کوڑھ اور جذام بالطبع متعدی نہیں ہیں یعنی مرض کسی کو از خود نہیں لگتے مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوڑھیوں کے بدن سے اپنا بدن لگانے کی وجہ سے جذامی کی پیپ لگ کر یہ بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

اور اضافت بمعنی من نہیں، بلکہ اضافۃ الصفۃ الی الموصوف کی قبیل سے ہے۔ ان امراض کو ان کی طبیعت کے اعتبار سے متعدی کہنا غلط ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے: فمن أعفی الأول۔ اور دوسری جگہ فرمایا: لا عدویٰ۔ أی بطبع المعدی: اس خبر صحیح کے

معارض نہیں: وفر من المجزوم فرارك من الأسد، کہ یہ بیان جواز پر محمول ہے، یا یہ اس لئے فرمایا تا کہ مخلوق خدا میں سے کوئی اس میں مبتلا نہ ہو، تا کہ اعداء بالطبع کی طرف منسوب نہ کی جائے۔ اور فساد عقیدہ میں مبتلا نہ ہو جائے کہ غیر اللہ بھی مؤثر ہے، نبی کریم ﷺ نے دونوں پر عمل کیا ہے، جو درحقیقت اس حدیث سے ناشی اشکال کا جواب ہیں۔ مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے پاس ایک مجذوم شخص آیا، تو آپ نے یہ دعا پڑھ کر اس کے ساتھ کھانا تناول فرمایا: بسم اللّٰہ ثقة باللّٰہ وتو کلا علیه۔ ایک اور مجذوم بیعت کیلئے آیا تو آپ ﷺ نے اس کی طرف اپنا دست اقدس نہیں بڑھایا اور فرمایا: قد بایعت۔ چنانچہ پہلے واقعہ میں آپ ﷺ کی نظر ''مسبب'' پر تھی، اور دوسرے واقعہ میں آپ ﷺ کی نظر سبب پر تھی، فرق بھی فرما دیا اور وضاحت بھی فرما دی کہ یہ دونوں معاملات برحق ہیں، جس شخص پر توکل کا غلبہ ہو، یا وہ مقام جمع پر فائز ہو۔ اس کیلئے پہلا عمل افضل ہے۔ اور دیگر افراد کیلئے دوسرا عمل افضل ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

برے عملوں اور اخلاقِ سیئہ سے پناہ مانگنے کا بیان

۲۴۷۱: وَعَنْ قُطْبَةَ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَقُوْلُ اللّٰهُمَّ اِنِّي اَعُوْذُبِكَ مِنْ مُنْكَرَاتِ الْاَخْلَاقِ وَالْاَعْمَالِ وَالْاَهْوَاءِ۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵/۵۷۵ الحدیث رقم ۳۵۹۱۔

ترجمہ: حضرت قطبہ بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کہتے تھے اے الٰہی تحقیق میں پناہ پکڑتا ہوں برے خلقوں سے اور برے عملوں سے اور بری خواہشوں سے اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

قطبة بن مالک۔ یہ قطبہ ''مالک'' کے بیٹے ہیں۔ خاندانی اعتبار سے ''بنوثعلب'' میں سے ہیں۔ کوفہ کے رہنے والے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ''ذبیانی'' ہیں۔ یہ صحابی ہیں۔ ان سے ان کے برادرزادہ زیادہ بن علاقہ نے روایت کی۔ ''قطبہ'' قاف کے ضمہ' طاء کے سکون اور بائے موحدہ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

تشریح: قوله: اللهم انی اعوذبك من منكرات الاخلاق:

''منکر'' اسے کہتے ہیں کہ جسے شریعت نے بھلائی میں شمار نہ کیا ہو یا شریعت نے جس کی برائی بیان کی ہو۔

''اخلاق'' سے مراد باطنی اعمال ہیں لہٰذا منکر الاخلاق سے پناہ مانگنے کا مطلب یہ ہوا کہ اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں دل کے برے اعمال سے مثلاً حسد و کینہ وغیرہ سے۔

قوله: والاعمال والأهواء: ''برے اعمال سے'' مراد ظاہری برے افعال ہیں اور بری خواہشات سے مراد برے عقائد اور غلط افکار و نظریات ہیں۔

ھوی کی جمع ہے، ھوی یھوی کا مصدر ہے۔

مشتھی کو بھی ھوی کہا جاتا ہے، خواہ محمود ہو کہ مذموم، لیکن غالب احوال میں ھوی کا اطلاق غیر محمود پر ہوتا ہے (کذا فی المغرب) امام طیبیؒ فرماتے ہیں: پہلے دو میں اضافت الصفة الی الموصوف ہے، ار تیسرے میں اضافتِ بیانیہ ہے، چونکہ ''اھواء'' ہوتی ہی منکر ہیں اھ۔ زیادہ ظاہر یہ ہے کہ ان تینوں میں ایک ہی طرح کی اضافت ہے۔ اور ''ھوی'' کو اس کے لغوی معنی پر محمول کیا جائے، جیسا کہ اس آیت کریمہ میں: ﴿ومن أضل ممن اتبع هواه بغير هدى من اللّٰه﴾ چنانچہ اسی وجہ سے کہا گیا ہے:

الھوی اذا وافق الھدی یکون کالزبدۃ مع العسل۔ یعنی جب کسی عمل میں یہ دونوں جمع ہوں تو وہ میٹھا ہو جاتا ہے، شاذلیؒ فرماتے ہیں: اذا شربت الحلو البارد أحمد ربی من وسط قلبی۔ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: اللھم اجعل حبّك أحبّ الیّ من حبّ الماء البارد۔ یا یہ کہ من چاہے عقائد مراد ہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿أفرأیت من اتخذ الھه ھواہ﴾ [الجاثیة: ۲۳] پس ''اھواء'' سے مراد مطلق اعتقادات وعقائد ہیں، اور المنکرات الأھویة سے مراد اعتقادات فاسدہ ہیں، یعنی وہ عقائد جو اہل السنۃ والجماعۃ کے دو ائمہ ابوالحسن اشعری، اور ابومنصور ماتریدی کے عقائد کے مخالف ہوں۔

توضیح: حصن کی روایت میں ''والأدواء'' کا اضافہ ہے، یہ ''داء'' کی جمع ہے، اور ''سیئ الاسقام'' کے معنی میں ہے۔ میرکؒ حاشیۂ حصن میں لکھتے ہیں: جان لیجئے کہ صاحب السلام کے کلام سے یوں مفہوم ہوتا ہے کہ ''والأدواء'' کا اضافہ مستدرک حاکم کی روایت میں ہے، نا کہ ترمذی شریف کی روایت میں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ''والأھواء'' یہ روایت ترمذی، حاکم اور ابن حبان کی صحیح کی ہے، اور حاکم فرماتے ہیں: یہ حدیث صحیح ہے، علی شرط مسلم ہے، اور آخر میں ''والأدواء'' کا اضافہ کیا ہے، اور بعض روایات میں ''والآراء'' ہے، یہ الفاظ ترمذی کے ہیں: فتأمل منه واللہ أعلم اھ۔ زیادہ واضح بات یہ ہے کہ ترمذی کی متعدد روایات ہیں، اور متعدد طرق ہیں، اس سے اشکال زائل ہو جاتا ہے۔

جامع دعا

۲۴۷۲ شُتَیْرِ بْنِ شَکَلِ بْنِ حُمَیْدٍ عَنْ اَبِیْهِ قَالَ قُلْتُ یَا نَبِیَّ اللّٰهِ عَلِّمْنِی تَعْوِیْذًا اَتَعَوَّذُ بِهٖ قَالَ قُلْ اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ سَمْعِیْ وَشَرِّ بَصَرِیْ وَشَرِّ لِسَانِیْ وَشَرِّ قَلْبِیْ وَشَرِّ مَنِیِّیْ۔

(رواہ ابوداود والترمذی والنسائی)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۹۲/۲ حدیث رقم ۱۵۵۱۔ واحمد فی المسند ۴۲۹/۳۔

ترجمہ: حضرت شتیر بن شکل بن حمید سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے باپ سے نقل کیا ہے کہ اے اللہ کے نبی ﷺ مجھ کو ایک تعویذ سکھاؤ۔ یعنی دعا کہ اس کے ساتھ پناہ پکڑوں فرمایا کہو اے الٰہی تحقیق میں تیری پناہ مانگتا ہوں اپنی بری شنوائی سے یعنی برا کلام نہ سنوں اور اپنی بینائی کی برائی سے یعنی بری چیز اس سے نہ دیکھوں اور اپنی زبان کی برائی یعنی برے کلام اور بے فائدہ اس کے نہ کروں اور اپنے دل کی برائی سے۔ یعنی برے عقیدے اور حسد وکینہ وغیرہ دل میں نہ رکھوں اور برے کام پر مصمم (یعنی مضبوط رادہ نہ کروں) اور اپنی منی کی برائی سے یعنی زنا میں صرف نہ ہو اور شہوت کی نظر سے کسی کو نہ دیکھوں۔ اس کو ابوداؤد ترمذی اور نسائیؒ نے نقل کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

شکل بن حمید۔ یہ شکل بن حمید عبسی ہیں۔ ان کو شرف صحابیت حاصل ہے۔ ان سے ان کے بیٹے ''شتیر'' کے علاوہ اور کوئی روایت نہیں کرتا۔ ان کا شمار کوفیوں میں ہوتا ہے۔ ''شکل'' شین وکاف کے زبر اور لام کے ساتھ ہے۔ ''شتیر'' شتر کی تصغیر ہے۔ ''شکل'' بروزن ''قمر'' ہے اور ''حمید'' بصیغۂ تصغیر ہے۔

تشریح: قوله علمنی تعویذا: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: عوذ، معاذ اور تعویذ تینوں ہم معنی ہیں۔

قوله اللھم انی اعوذبك من شر سمعی...... شر منی:

''شر مني ''بعض علماء نے فرمایا: المنی، منية کی جمع ہے، منية کے معنیٰ ''طول الأمل '' ہیں۔ میں کہتا ہوں بظاہر یہ صحیح نہیں ہے، چونکہ منیۃ میم کے فتحہ کے ساتھ بمعنی موت ہے، اور ''منی'' کے معنی میں بھی آتا ہے۔ میم کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ بمعنی اُمنیۃ آتا ہے، جیسا کہ قاموس میں ہے۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: اور کہا گیا ہے کہ منية کی جمع ہے۔ أی من شر الموت أی قبض روحه علی عمل قبیح۔ اور اس پر اشکال یہ ہے کہ متکلم واحد کے اعتبار سے کئی اموات کا کوئی مطلب نہیں بنتا۔

زہریلے جانوروں اوراچانک ہلاک کردینے والی چیزوں سے پناہ پکڑنا

۲۴۷۳: وَعَنْ اَبِی الیَسَرِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ کَانَ یَدْعُوْ اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْهَدْمِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنَ التَّرَدِّیْ وَمِنَ الْغَرَقِ وَالْحَرَقِ وَالْهَرَمِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ اَنْ یَتَخَبَّطَنِیَ الشَّیْطَانُ عِنْدَ الْمَوْتِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ اَنْ اَمُوْتَ فِیْ سَبِیْلِكَ مُدْبِرًا وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ اَنْ اَمُوْتَ لَدِیْغًا۔

(رواه ابوداود والنسائی وزاد فی روایة اخری والغم)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۹۲/۲ حدیث رقم ۱۵۵۲۔ واحمد فی المسند ۴۲۶/۳۔

ترجمہ: حضرت ابو الیسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ دُعا مانگا کرتے تھے کہ اے الٰہی! تحقیق میں تجھ سے مکان کے گرنے سے پناہ مانگتا ہوں یعنی مجھ پر دیوار یا مکان نہ گر پڑے کہ ہلاک ہو جاؤں اور میں تجھ سے بلند جگہ سے گرنے سے پناہ مانگتا ہوں اور ڈوبنے سے اور جلنے سے اور بہت زیادہ بڑھاپے سے پناہ مانگتا ہوں اور میں تیرے ساتھ اس سے کہ شیطان مجھ کو مرنے کے وقت حیران کر پناہ مانگتا ہوں ۔مرنے کے وقت یعنی وسوسے ڈالے اور دین کو تباہ کر دے اس سے پناہ مانگتا ہوں اور میں پناہ مانگتا ہوں تجھ سے کہ راستے میں پشت دکھا کر مروں یعنی جہاد میں کفار سے بھاگ کر اور میں تجھ سے سانپ' بچھو اور ان کی مانند زہریلے جانور کے کاٹنے سے پناہ مانگتا ہوں۔ اس کو ابوداؤد اور نسائی نے نقل کیا ہے اور نسائیؒ نے ایک روایت میں غم کا لفظ زیادہ کیا ہے یعنی میں تیرے ساتھ غم سے پناہ مانگتا ہوں۔

راویٔ حدیث:

ابو الیسر۔ یہ ابو الیسر (یاء پر فتحہ اور اس کے نیچے دو نقطے اور سین مہملہ پر فتحہ ہے) ان کا نام ''کعب'' ہے اور یہ ''عمرو'' کے بیٹے ہیں۔ ان کا ذکر حرف کاف میں آچکا ہے۔

کعب بن عمرو۔ یہ ''کعب'' ہیں جو ''عمرو'' کے بیٹے ہیںؓ انصاری اور ''بنو سلیم'' میں سے ہیں۔ بیعت عقبہ اور غزوۂ بدر میں موجود تھے۔ انہوں نے جنگ بدر میں ''عباس رضی اللہ عنہ'' بن عبد المطلب کو گرفتار کیا تھا۔ ۵۵ھ میں بمقام مدینہ طیبہ انتقال فرمایا۔ اس سے ان کے بیٹے عمار اور حنظلہ بن قیس نے حدیث روایت کی۔

تشریح: قوله: اللهم انی اعوذبك من الهدم: ''الهدم'' دال کے سکون کے ساتھ، عمارت کا گرجانا، اور دال کے فتحہ کے ساتھ، اسم (ذکرہ الطیبی) ابن حجرؒ نے اتنا اضافہ کیا ہے: أی المهدوم۔ لیکن یہ تشریح درست نہیں، چونکہ استعاذہ ''مہدوم'' سے نہیں بلکہ ''ہدم'' سے اور بوقت ہدم منفصل ہونے والی شیٔ سے ہے۔

قوله: واعوذبك من التردی والغرق والحرق والهرم: ''تردی'' کے معنی ہیں کسی اونچی جگہ سے گرجانا، مثلاً پہاڑ، اور چھت وغیرہ، کسی نچلی جگہ میں گر پڑنے پر بھی تردی کا اطلاق ہوتا ہے، مثلاً کنویں وغیرہ میں گرجانا۔

''الغرق'' بروزم قلم، غرق، غرقا، کا مصدر ہے۔ ''الحرق'': بروزن قلم۔

اگر چہ یہ اشکال پیدا ہو کہ حدیث میں مذکورہ چیزیں بعض تو ایسی ہیں جن کے سبب سے موت واقع ہو جانے کی صورت میں شہادت کا درجہ ملتا ہے پھر آنحضرت ﷺ نے ان سے پناہ کیوں مانگی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان چیزوں میں مبتلا ہونے کی وجہ سے مصیبت و تکلیف اور پریشانیوں کا گویا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایسے نازک اور سخت موقع پر کوئی صبر کا دامن چھوڑ بیٹھے اور شیطان کو موقع مل جائے اور وہ بہکا کر دینی واخروی سعادتوں کو ملیامیٹ کر دے اس لئے آپ ﷺ نے ان سے بھی پناہ مانگی تاکہ امت کے لوگ ان چیزوں سے پناہ مانگیں۔

اور کہا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان چیزوں سے شاید اس لئے پناہ مانگی کہ یہ امور ظاہر کے اعتبار سے امراض، مصائب دبلایا ہیں، ان امراض سابقہ کی طرح کہ جن کا ذکر پچھلی احادیث میں گزرا۔ اور ان پر شہادت کا ثواب ملنا، اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے عبد مؤمن کو پہنچنے والی ہر تکلیف حتی کہ کانٹا چبھنے پر بھی ثواب عنایت فرماتے ہیں۔ ان تمام تر باتوں کے باوجود ''عافیت'' زیادہ وسیع ہے۔ دوسری بات یہ ہے شہادت حقیقیہ اور ان امور میں فرق ہے، بایں طور کہ شہادت حقیقی ہر مؤمن کا مطلوب ومقصود ہے۔ بلکہ بعض مرتبہ تو شہادت کی تمنا اور اس کیلئے جرأت دکھانا واجب ہوتا ہے۔ بخلاف تردی وغیرہ کے، اس جیسے امور سے احتراز واجب ہے، اور ان امور میں اگر سعی کرتا ہے تو عاصی ہوگا۔

والهرم: زیادہ بڑھاپے سے پناہ مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ بڑھاپے کی برائی سے کہ حواس وقویٰ میں فرق آجائے بیہودہ ولایعنی کلام زبان سے نکلنے لگیں اور عبادت میں فتور آجائے ان سے پناہ مانگتا ہوں' منقول ہے کہ جو شخص کلام اللہ یاد کر لیتا ہے وہ ان آفات سے محفوظ رہتا ہے۔

واضح رہے کہ **والهرم** کے الفاظ تمام نسخ مصححہ میں موجود ہیں۔ چنانچہ ابن حجرؒ کا کہنا: **وفي نسخة: الهرم** بے موقع محل ہے۔

وقوله: وأعوذبك من ان يتخبطني الشيطان عند الموت: شیطان سے مراد ابلیس، یا اس کے اعوان ومددگار مراد ہیں۔ کہا گیا ہے کہ تخبط سے مراد ''افساد'' ہے، یعنی عقل ودین کا فساد مراد ہے۔ اور عند الموت کی تخصیص اس لئے فرمائی کہ مدار خاتمہ پر ہے۔ قاضیؒ فرماتے ہیں: تخبط سے مراد نزعات شیطان ہیں، یعنی اے اللہ میں آپ کی پناہ میں آتا ہوں اس بات سے کہ شیطان مجھے ورغلائے۔ جس سے میرے قدم پھسل جائیں، اور عقل ووہم بچھڑ جائیں۔ تخبط کے اصل معنی ہیں: **ان يضرب البعير الشيئ بخف يده فيسقط۔**

وقوله: واعوذبك من ان اموت في سبيلك مدبرا: مدبر کے تین مطلب بیان کئے گئے ہیں۔ (۱) مدبر سے مرتد مراد ہے۔ (۲) **مدبرا عن ذكرك ومقبلا على غيرك۔** (۳) امام طیبیؒ فرماتے ہیں: **مدبرا أى فارا۔** ابن حجرؒ امام طیبیؒ کی اتباع کرتے ہوئے لکھتے ہیں: **ادبارا محرما أو مطلقا۔** اس پر اشکال ہے وہ یہ کہ یہاں موت کی قید مناسب نہیں۔ الا یہ کہ یوں کہا جائے ''تائب'' کو نکالنا مقصود ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ دعا در حقیقت اپنی امت کیلئے تعلیم ہے، و گرنہ تو رسول اللہ ﷺ کیلئے تخبط، فرار من الزحف، اور امراض مزمنہ جائز نہیں۔

وقوله: واعوذبك من ان اموت لديغا: فعیل بمعنی مفعول ہے، ''لدغ'' سے مأخوذ ہے، زہریلی چیزوں سانپ، بچھو وغیرہ کے ڈسنے کیلئے ''لدغ'' کا لفظ بولا جاتا ہے، اس حدیث مبارکہ کا یہ جملہ طبرانی کی اس روایت کے منافی نہیں: **عن علی کرم الله وجه، أنه لدغت النبی ﷺ عقرب وهو يصلی، فلما فرغ قال: لعن الله العقرب لا تدع مصليا ولا غيره۔ ثم دعا بماء وملح فجعل يمسح عليها أی اعلى موضع لدغها، ويقرأ ﴿قل يا أيها الكافرون﴾ و ﴿قل أعوذ برب الفلق﴾ و ﴿قل أعوذ**

برب الناس ﴾۔

وقولہ: وزاد فی روایۃ اخریٰ: والغم: اس کی وضاحت میں تین اقوال ہیں۔ (۱) **الھم الشدید الذی یغم نفس النفس۔** (۲) **ھم الدنیا۔** (۳) **مطلق الھم۔** پس حاصل یہ ہے کہ توکل، تفویض وتسلیم کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے، یہی سلامتی کا راستہ ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

تخریج: اس حدیث کو امام حاکم نے بھی روایت کیا ہے۔

۲۴۷۴: **وَعَنْ مُعَاذٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ اسْتَعِيْذُوْا بِاللّٰهِ مِنْ طَمَعٍ يَهْدِىْ إِلٰى طَبَعٍ۔**

(رواہ احمد البیہقی فی الدعوات الکبیر)

اخرجہ احمد فی المسند ۵/۲۳۲۔

ترجمہ: حضرت معاذؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی پناہ پکڑتا ہوں طمع سے کہ وہ تم کو طبع تک پہنچا دے۔ اس کو احمدؒ اور بیہقیؒ نے دعوات کبیر میں نقل کیا ہے۔

تشریح: وقولہ: واستعیذباللہ من طمع یھدی الی طبع: "طمع" کے معنی ہیں: **نزوع النفس الی الشیٔ شھوۃ لہ۔**

"**یھدی**" **أی یدنی ویوصل۔** امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ہدایت کے معنی ہیں کسی شیٔ کی طرف راہنمائی اور دلالت کرنا، پھر یہ لفظ **توسّعا، ادناء من الشیٔ والایصال الیہ،** ابن حجرؒ نے فرمایا: لفظ ہدایت جو دلالت **علی الخیر**، اور ایصال الی الخیر کے معنی میں مستعمل ہے اس کے یہ معنی بیان کرنا "تھکم" ہے اھ۔ میرے نزدیک زیادہ واضح یہ ہے کہ لفظ "**ھدایھۃ**" یہاں "دلالت" کے معنی میں ہے، جیسا کہ طیبیؒ نے نقل کیا ہے اور تجرید کے معنی یہی ہیں' جیسا کہ ابن حجرؒ نے نقل کیا۔ لفظ "**ھدایۃ**"، کبھی متعدی بنفسہٖ ہوتا ہے، جیسا کہ اس آیت میں: ﴿**اھدنا الصراط المستقیم**﴾ کبھی لام کے ذریعہ استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ اس آیت میں آیا ہے: ﴿**ان ھذا القرآن لھدی للتی ھی أقوم:**﴾ اور کبھی بواسطہ الیٰ مستعمل ہوتا ہے، جیسے: ﴿**وانک لتھدی الی صراط مستقیم**﴾ چنانچہ اس کو بمعنی **الادنا، یاالایصال** ماننے کی کوئی ضرورت نہیں۔

"طمع" کے معنی ہیں مخلوق خدا سے مال وزر کی امید رکھنا اور طبع کے اصل معنی تو ہیں تلوار کو زنگ لگنا' لیکن یہاں اس لفظ سے مراد "عیب" ہے لہٰذا حدیث بالا کے مطابق "طمع" سے پناہ مانگنے کا مفہوم یہ ہے کہ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں طمع سے جو مجھے اس مقام پر پہنچا دے جہاں میری زندگی عیب دار ہو جائے اور وہ عیب ہے اہل دنیا کے سامنے تواضع وانکساری اختیار کرنا' کم ظرف' پست خیال اور بدکردار دنیا داروں کے آگے اپنے آپ کو ذلیل کرنا' سمع وریا (کسی بھی کام کے وقت دکھانے سنانے کے جذبہ) کو ظاہر کرنا' سرمایہ داروں کی بے جا تعریف ومدح اور ان کی چاپلوسی میں مبتلا ہونا اور اسی قسم کی وہ ذلیل حرکتیں جو طمع کی حالت میں صادر ہوتی ہیں۔

حاصل یہ کہ طمع سے اجتناب ضروری ہے کیونکہ یہی وہ حقیر جذبہ ہے جو انسان کی عزت نفس' خودداری اور ضمیر کے شرف ووقار کے لئے بہت بڑا عیب ہے جس کی وجہ سے انسان نہ صرف دنیاوی طور پر ذلیل وحقیر اور بے وقعت ہو جاتا ہے بلکہ دینی طور پر بھی اس کی روح کی بالیدگی اور پاکیزگی کے لئے ایک ناسور سے کم نہیں ہے جو آہستہ آہستہ دین کے تمام گوشوں میں مختلف طریقوں سے زہر کی آمیزش کرتا رہتا ہے اسی لئے کہا گیا ہے کہ طمع دین کے فساد کی جڑ ہے اور ورع (پرہیزگاری) دین کی اصلاح کا ذریعہ ہے۔

حضرت شیخ علی متقیؒ فرماتے ہیں کہ "طمع" اسے کہتے ہیں کہ اس مال کی امید رکھی جائے جس کے حاصل ہونے میں شک ہو اگر اس کے حصول کا یقین ہو جیسے کسی پر کوئی حق ہو یا کسی کا وعدہ صادق ہو اور یا کسی سے اتنی راسخ محبت ہو کہ وہ اس کی ہر خواہش کی تکمیل ضرور کرتا

ہوتو اسی صورت میں اس سے توقع رکھنے کو طمع نہیں کہتے۔

ابن حجرؒ نے عجیب سی بات لکھی ہے، وہ فرماتے ہیں: **الطمع هو أخذ المال من غير حقه أو امساكه عن حقه بخلابه۔**

طبع: کے معنی ''عیب'' کے ہیں، اور اصل کے اعتبار سے طبع، سیف کے عرض پر موجود ''دنس'' کو کہتے ہیں، پھر یہ لفظ گناہوں کی مانند ''دنس'' کیلئے استعمال ہونے لگا۔

چاند کے غروب ہونے سے پناہ پکڑنا

۲۴۷۵:وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ نَظَرَ اِلَی الْقَمَرِ فَقَالَ یَا عَائِشَةُ اسْتَعِیْذِیْ بِاللّٰهِ مِنْ شَرِّ هٰذَا فَاِنَّ هٰذَا هُوَ الْغَاسِقُ اِذَا وَقَبَ۔ (رواه الترمذی)

اخرجه احمد فی المسند ۲۱۵/۶۔ والترمذی فی السنن ۴۲۱/۵ حدیث رقم ۳۳۶۶۔

ترجمہ: حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے کہ تحقیق نبی کریم ﷺ نے چاند کی طرف دیکھا پس فرمایا اے عائشہ! تو اللہ تعالیٰ سے پناہ پکڑ۔ اس کی برائی سے پس تحقیق یہ غاسق ہے اندھیرا کرنے والا ہے جب بے نور ہو جائے۔ اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله: نظر الی القمر...... الغاسق: غسق يغسق غسقا وغسوقا،** از باب ضرب، **اذا أظلم،** یعنی رات کا تاریک ہونا غاسق سے کیا مراد ہے؟ **قيل: الغاسق هو الليل اذا غاب الشفق وقوی ظلامه۔** ابن الملکؒ فرماتے ہیں: (**من شر هذا** ہے) مراد ''شر اللیل'' ہے، چونکہ رات ہلاکت کے اعتبار سے زیادہ سخت ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے اس سے استعاذہ کا حکم آیا ہے، چونکہ اس وقت میں ''شر'' دیگر اوقات کے مقابلہ میں زیادہ پھیلتا ہے، مثلاً قتل نفس، بدکاری، اور لوٹ مار وغیرہ۔ یہ اس آیت کی تفسیر ہے، اور جہاں تک تعلق ہے حدیث کا تو وہ بھی اسی پر مؤول ہے، تا کہ حدیث آیت کے ایسے معنی کے موافق ہو جائے کہ جو معنی اکثر مفسرین نے اختیار کئے ہیں، چونکہ **نظر الی القمر** سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ آپ ﷺ کی مراد بھی چاند ہو۔

''**هذا هو الغاسق**'' اس میں احتمال ہے کہ اشارہ ''ظلام'' کی طرف ہو، بایں طور کہ وہ اوٹ میں چلا گیا ہے، اور اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ یہاں غاسق کا اطلاق قمر پر اس لئے کیا ہے: **لأنه يظلم اذا خسف،** اور ''وقوبِ قمر'' سے مراد اس کا دخول فی الخسوف ہے۔

چنانچہ حدیث مبارکہ کے اس جملہ کا مطلب یہ ہوا: **استيعذی باللّٰه من الآفات والبليات:** امام طیبیؒ فرماتے ہیں:

قرآن مجید کی سورت غاسق **اذا وقب** کا بھی ذکر ہے یعنی پناہ مانگو اندھیرا پھیلانے والے کی برائی سے جب وہ بے نور ہو جائے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کے ارشادِ گرامی نے غاسق **اذا وقب** کی وضاحت فرمائی کہ اس سے مراد چاند ہے جب وہ گہن میں آ جاتا ہے لہٰذا اس سے پناہ مانگنے کا سبب یہ ہے کہ اس کا گرہن میں آنا اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے کہ یہ بلاؤں کے نازل ہونے کا اشارہ دیتا ہے چنانچہ احادیث میں آتا ہے کہ جب چاند کو گرہن لگتا تو اس وقت آنحضرت ﷺ لرزاں و ترساں اُٹھ کھڑے ہوتے۔

لیکن اتنی بات ذہن نشین رہے کہ ''بلاؤں کے نازل ہونے سے'' وہ بلائیں اور حادثات مراد نہیں جو منجم یا بدعقیدہ لوگ کسوف و خسوف (چاند سورج کے گرہن لگنے) کے سلسلہ میں بتاتے ہیں کیونکہ اہل اسلام کے نزدیک ان کا کوئی اعتبار نہیں بلکہ اس سے مراد عبرت کے مواقع ہیں۔ مثلاً جب چاند گرہن میں آتا ہے تو وہ ایک بڑے عبرت کا وقت ہوتا ہے جو ہر انسان کو احساس دلاتا ہے کہ جب چاند باوجود اپنی اس نورانیت کے اپنے نور کو کھو چکا ہے اور اس کو اپنے نور کی بقاء پر کوئی قدرت حاصل نہیں ہے تو ایسا نہ ہو کہ میرے ایمان اور میرے عمل کا نور بھی جاتا رہے اسی اعتبار سے اس سے پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ یہاں اسم اشارہ استعمال ہوا ہے، اور اسم اشارہ تعیین کے اعتبار سے ایسا ہے جیسا کہ وضع ید۔ اسم اشارہ اور اس کی خبر معرف کے درمیان ضمیر فصل کا لانا دلالت کرتا ہے کہ مشار الیہ "قمر" ہی ہے، کوئی اور چیز نہیں، میں کہتا ہوں: کبھی یہ اسلوب ادعاً اور ارادۂ مبالغہ اور قصد تخصیص کیلئے بھی اختیار کیا جاتا ہے، یہ بتانے کیلئے کہ یہ اپنی نوع کے اعظم افراد میں سے ہے، اور اس سے کتاب وسنت میں جمع بھی ہو جائے گا، اور ان کے اس قول کا جواب بھی ہو جائے گا: **وتفسير الغاسق بالليل يأباه سياق الحديث كل الاباء**۔ ان کے اس قول: اور چونکہ رات کا داخل ہونا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے، اور اللہ تعالیٰ نے بہت سی آیات میں اپنے بندوں پر اس نعمت کو جتلایا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**جعل لكم الليل تسكنوا فيه**﴾ (۲) ﴿**فلما جن عليه الليل رأى كوكبا**﴾۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دوسری آیت میں تو کوئی چیز نہیں ہے جو امتنان پر دلالت کرے۔ یہاں پہلی آیت ضرور دال ہے، اس میں کسی کو بھی شک نہیں۔ اللہ جل شانہ کا فرمان ہے: ﴿**وجعلنا نومكم سباتا وجعلنا الليل لباسا وجعلنا النهار معاشا**﴾ لیکن اس کے نعمت ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ ناراضگی کو متضمن نہیں۔ اسی لئے اللہ جل شانہ نے سورت کے آغاز میں ہی فرما دیا: ﴿**قل أعوذ برب الفلق من شر ما خلق**﴾ پہلے یہ اندازِ تعمیم اختیار فرمایا۔ پھر اگلی آیات: ﴿**من شر غاسق اذا وقب**﴾ میں اسلوب تخصیص اپنایا۔ ابن عباس اور مفسرین کی ایک جماعت کی طرف منسوب ہے کہ اس آیت کا مطلب ہے: **من شرّ الذكر اذا قام**۔ (آلہ تناسل کا حرکت میں آنا) تو گویا کہ ظلمت نفسانیہ کی طرف اشارہ فرمایا کہ کبھی یہ معصیت کے ان گھٹاٹوپ اندھیروں کی طرف دھکیل دیتی ہے کہ جہاں ایمان ومعرفت کا نور کامل سلب ہو جاتا ہے، اور قبر کے اندھیروں کی طرف لے جاتی ہے، بلکہ قیامت کے ایسے اندھیروں کی طرف لے جاتی ہے کہ جن اندھیروں پر کئی تاریکیاں چھائی ہوئی ہیں، ابن حجرؒ نے اس موقع پر کلام میں اطناب سے کام لیا ہے، نیز ان کے کلام میں تعارض وتدافع ہے، اس لئے میں ان کے کلام کو ذکر کرنے سے اعراض کر رہا ہوں۔

مختصر اور جامع دعا کا بیان

۲۴۷۶: وَعَنْ عِمْرَانَ بْنَ حُصَيْنٍ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ لِاَ بِيْ يَا حُصَيْنُ كَمْ تَعْبُدُ الْيَوْمَ اِلٰهًا قَالَ اَبِيْ سَبْعَةً سِتًّا فِي الْاَرْضِ وَوَاحِدًا فِي السَّمَاءِ قَالَ فَاَيُّهُمْ تَعُدُّ لِرَغْبَتِكَ وَرَهْبَتِكَ قَالَ الَّذِيْ فِي السَّمَاءِ قَالَ يَاحُصَيْنُ اَمَا اِنَّكَ لَوْاَسْلَمْتَ عَلَّمْتُكَ كَلِمَتَيْنِ تَنْفَعَانِكَ قَالَ فَلَمَّا اَسْلَمَ حُصَيْنٌ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ عَلِّمْنِي الْكَلِمَتَيْنِ اللَّتَيْنِ وَعَدْتَنِيْ فَقَالَ قُلْ اَللّٰهُمَّ اَلْهِمْنِيْ رُشْدِيْ وَاَعِذْنِيْ مِنْ شَرِّ نَفْسِيْ۔ (رواه الترمذى)

اخرجه الترمذى فى السنن ٥/٤٨٥ حديث رقم ٣٤٨٣۔

ترجمہ: حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے میرے باپ کے (مشرف باسلام ہونے سے قبل) فرمایا: اے حصین! کتنے معبودوں کی آج کے دن بندگی کرتا ہے۔ میرے باپ نے کہا سات معبودوں کی چھ زمین میں یعنی یغوث اور یعوق اور نسر اور لات اور منات اور عزیٰ (بتوں کے نام ہیں) اور ایک آسمان میں کہ جو سب کا خالق ہے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا پس تو کس کو ان میں سے امید و ڈر کے شمار کرتا ہے یعنی کس سے بھلائی کی امید رکھتا ہے اور ڈرتا ہے؟ حصین رضی اللہ عنہ نے کہا جو آسمان میں ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا اے حصین! خبردار ہوا گر تو اسلام لاتا تو میں تجھ کو دو کلمے سکھاتا کہ تجھ کو دارین میں فائدہ دیتے۔ عمران نے کہا ہے۔ جب حصین مسلمان ہوئے تو انہوں نے عرض کیا اے اللہ کے رسولؐ! مجھ کو وہ دو کلمے سکھلائیں کہ آپ ﷺ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہہ اے الٰہی! میرے دل میں ہدایت ڈال دے اور میرے نفس کی برائی سے مجھ کو پناہ دے۔ اس کو امام ترمذی نے نقل کیا

ہے۔اسنادی حیثیت: امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو''حسن غریب'' قرار دیا ہے۔(میرک)

تشریح: **قوله: یاحصین: کم تعبد الیوم**:''ال''عہد حاضر کا ہے۔جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿**الیوم أکملت لکم دینکم**﴾ **الهًا**،تعبد کا مفعول ہے،اور ممیّز کو استغناءً حذف کر دیا گیا،چونکہ وہ اس پر دال ہے۔ابن حجرؒ کے نزدیک کم استفہامیہ کی تمیز ہونا مختار ہے۔اور فصل مضر نہیں،چونکہ غیر اجنبی کا ہے۔(وفیہ توقف)۔

قوله: قال ابی: سبعة......السماء: یہ أعبد فعل محذوف کا مفعول ہے۔**أی أعبد سبعة من الآلهة**۔

امام طیبیؒ نے فرمایا: قرآن کریم میں چھ سات معبودوں کے نام مذکور ہیں: (۱)یغوث۔(۲)یعوف۔(۳)نسر۔(۴)لات۔(۵)مناۃ۔(۶)عزیٰ۔اور چونکہ ان میں اللہ جل شانہ بھی شامل ہیں اس لئے لفظ''**سبعة**''استعمال کیا،جانب تذکیر کو غلبہ دیتے ہوئے، پھر چھ کو مؤنث ذکر کیا،اور ساتویں کو مذکر ذکر کیا۔اھ۔(**وتبعه ابن حجر**)۔

یہ محل نظر ہے۔تفصیل اس کی یہ ہے کہ یغوث،یعوق اور نسر حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے بت تھے،ان اسماء کے مؤنث ہونے کی دلیل موجود نہیں ہے۔اور عرب کے متعدد الٰہہ تھے،ان میں سے چند کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے۔اور اکثر ایسے ہیں کہ ان کا نام ذکر نہیں کیا۔مروی ہے کہ بیت اللہ شریف میں فتح مکہ کے وقت تین سو ساٹھ بت تھے،نبی کریم ﷺ کا گزر جس بت پر ہوتا لکڑی کے ساتھ کی اس کی طرف اشارہ فرماتے،اور یہ فرماتے جاتے: ﴿**جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل کان زهوقا**﴾۔چنانچہ بت اپنے چہرے کے بل گر پڑتا۔رواہ البیہقی۔

لطیفہ: اہل عرب میں سے ایک شخص نے دیکھا کہ اس کے بت پر ایک لومڑی پیشاب کر رہی ہے،یہ دیکھ کر اس نے اسلام قبول کر لیا۔مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک نو مسلم شخص سے پوچھا: **هل نفعك أصنامك یوما**؟ اس نے جواب دیا: ہاں مجھے اس بت نے نفع دیا کہ جس کو میں نے''حیس'' سے بنایا تھا۔قحط پڑ گیا،میں نے اس بت کو کھالیا،چنانچہ اس بت کے کھانے نے مجھے نفع دیا۔نبی کریم ﷺ یہ بات سن کر مسکرا پڑے۔

قوله: قال فایهم تعد لرغبتك ورهبتك:''ایهم''یاء پر ضمہ ہے۔**تعد**: تاء کے فتحہ کے اور عین کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

لرغبتك ورهبتك۔اور ایک نسخہ میں بضم الاول،وکسر الثانی ہے: **أی تهیئه لینفعك حین ترجو وتخاف**۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں: فاء شرط محذوف کی جزا (پر دال) ہے۔**أی: اذا کان کذلك فأیهم تخصه وتلتجیٔ الیه اذا نابتك نائبة**۔

قوله: قال: الذی فی السماء: اصل عبارت یوں ہے: **الذی معبود فی السماء**،یہ بات حضرت حصین نے اپنے زعم کے مطابق کہی،اور نبی کریم ﷺ کا سکوت ہو سکتا ہے کہ تألف کیلئے ہو۔

قوله: قال: یاحصین! أما انك لو اسلمت علمتك کلمتین تنفعانك: برائے تنبیہ ہے،تخفیف کے ساتھ ہے۔ **انك**: ہمزہ مکسورہ کے ساتھ ہے۔ **علمتك کلمتین**: کلمتین سے مراد دو دعائیں ہیں۔

لو اسلمت علمتك کلمتین تنفعانك: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ ارخاء العنان کے باب سے ہے۔چونکہ ظاہر کا تقاضا یہ تھا کہ اس کے اس اقرار کے بعد ان سے کہا جاتا **اسلم ولا تعاند**۔ابن حجرؒ نے عجیب سی بات کہی: یہ''باب ارخاء''سے نہیں ہے۔ **بلکه الاغراء علی الشیٔ بذکر ما یحمل علیه** کے باب سے ہے۔

میں کہتا ہوں: **عباراتنا شتی وحسنك واحد ☆ فکل الی ذاك الحمال یشیر**

چونکہ دونوں عبارتوں کا حاصل ایک ہی ہے،اسی قبیل سے یہ آیت مبارکہ ہے: ﴿**وانا أو ایاکم لعلی هدی أو فی ضلال**

مبین﴾

فقال: قل: بظاہر اس دعا کیلئے کسی وقت کی تخصیص نہیں فرمائی۔ ابن حجرؒ کا اس دعا کو بین السجدتین کے ساتھ مقید کرنا انتہائی بعید ہے۔

قوله: اللهم ألهمني رشدي: رشد کے معنی ہیں: الا هتداء الى الصلاح۔

قوله: وأعذني من شر نفسي: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اس میں اشارہ ہے کہ ان الہہ کو معبود بنانا نفس امارہ بالسوء کے بہکاوے کے علاوہ کچھ نہیں، آگے لکھتے ہیں: وان الرشد الى الطريق المستقيم والدين القويم هو العلى الحكيم۔

تعویذ کا ثبوت نابالغ بچے کے لیے

۲۴۷۷: وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اِذَا فَزِعَ اَحَدُكُمْ فِي النَّوْمِ فَلْيَقُلْ اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ غَضَبِهٖ وَعِقَابِهٖ وَشَرِّ عِبَادِهٖ وَمِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِيْنِ وَاَنْ يَّحْضُرُوْنِ فَاِنَّهَا لَنْ تَضُرَّهٗ وَكَانَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عَمْرٍو يُعَلِّمُهَا مَنْ بَلَغَ مِنْ وَلَدِهٖ وَمَنْ لَّمْ يَبْلُغْ مِنْهُمْ كَتَبَهَا فِيْ صَكٍّ ثُمَّ عَلَّقَهَا فِيْ عُنُقِهٖ۔ (رواه ابو داود والترمذی وهذا اللفظ)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۲۱۹/٤ حدیث رقم ۳۸۹۳۔ والترمذی فی السنن ۵۰٦/۵ حدیث رقم ۳۵۲۸۔ واحمد فی المسند ۱۸۱/۲۔

ترجمہ: حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ یعنی شعیب رضی اللہ عنہ سے اور وہ اپنے دادا یعنی عبداللہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس وقت تم میں سے کوئی نیند میں ڈر جائے پس چاہیے کہ وہ کہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے کلمات کے ساتھ اس کے غضب سے اور اس کے عذاب سے اور اس کے بندوں کی برائی سے اور شیطانوں کے وسوسے سے اور اس سے کہ میرے شیطان میرے پاس حاضر ہوں، پناہ مانگتا ہوں۔ پس ان کلمات کو کہنے والے کو ہرگز نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ یہ کلمات اس کو سکھاتے جو ان کی اولاد میں بالغ ہوتا اور نابالغ ہوتا تو یہ کلمات کاغذ پر لکھ کر اس کو اُس کی گردن میں (بطور تعویذ) لٹکاتے۔ اس کو ابوداؤد اور ترمذی نے نقل کیا ہے اور یہ الفاظ ترمذی کے ہیں۔

تشریح: قوله: اعوذ بكلمات الله التامات......ان يحضرون: سے مراد اللہ تعالیٰ کے اسماء، اس کی صفات اور آیات کتب ہیں۔ ومن همزات الشياطين: یہ تخصیص بعد تعمیم ہے، یا اشارہ ہے کہ شیاطین اس کے مخصوص بندوں میں سے نہیں ہیں۔ یا علی الاطلاق ہے۔ اور ان کی جنس سے اظہار نفرت بطور مبالغہ ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ان الشيطان لكم عدو﴾ وأن يحضرون: یائے متکلم محذوف ہے، اس محذوف پر دلالت کیلئے نون وقایہ پر کسرہ ہے۔ اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ میں پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ شیطان میری نماز، قراءت، ذکر، دعوت اور میری موت کے وقت میرے پاس آئیں۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ نیند میں ڈرنا شیطان کے تصرف اور اس کی شرارت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ نیز یہ مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ گلے میں تعویذ ڈالنا اور لٹکانا جائز ہے اس مسئلہ میں اگرچہ علماء کے اختلافی اقوال ہیں لیکن زیادہ صحیح اور مختار بات یہی ہے کہ حرزات وغیرہ تو گلے میں لٹکانا حرام اور مکروہ ہیں لیکن ایسے تعویذ لٹکانا جائز ہیں جن میں آیات قرآن یا اسمائے الٰہی لکھے ہوں۔

قوله: كتبها في صك: اس کی وضاحت صاحب النہایہ اور صاحب قاموس نے ''کتاب'' کے ساتھ کی ہے۔ ابن حجرؒ نے اس کی وضاحت كتف من عظم'' کے ساتھ کی ہے، یہ توضیع لغۃ اور عرفاً ہر اعتبار سے ''غریب'' ہے۔

تخریج: امام ابوداؤدؒ نے اس کے ہم معنی روایت نقل کی ہے، اور اسی طرح امام نسائی اور امام حاکمؒ نے روایت کی ہے۔ اور امام احمد نے اس سند کے ساتھ یوں نقل کی ہے: **عن محمد بن يحيىٰ بن حبان عن الوليد بن الوليد، أخي خالد بن الوليد، أنه قال: يا رسول الله! انى أجد وحشة، قال: اذا أخذت مضجعك فقل**...... اور پھر آگے روایت باب کے مثل حدیث ذکر کی ہے۔ ابن السنی کی کتاب میں ہے کہ حضرت خالد بن ولید کو بے خوابی کی شکایت ہوئی، تو انہوں نے آنحضرت ﷺ سے اس کا ذکر کیا۔ نبی کریم ﷺ نے ان کی بات سن کر انہیں یہی کلمات پڑھنے کی تلقین فرمائی۔

امام طبرانیؒ نے الاوسط میں نقل کیا ہے کہ حضرت خالد بن ولید نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ وہ رات کے وقت خوف محسوس کرتے ہیں، جو ان کے اور ان کی نماز کے درمیان حائل ہوتا ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے خالد بن ولید کیا میں تمہیں چند ایسے کلمات نہ سکھاؤں کی جن کو تین مرتبہ کہنے سے یہ چیز تم سے دور ہو جائے؟ انہوں نے عرض کیا: ہاں، کیوں نہیں یا رسول اللہ ! میرے ماں باپ آپ پر قربان، میں نے اس خوف کی شکایت آپ سے اسی امید پر کی ہے۔ (کہ آپ مجھے اس مسئلہ کا کوئی حل ارشاد فرمائیں گے۔) تو آپ ﷺ نے فرمایا: یوں کہا کر: **اعوذ بکلمات التامات من غضبه** ...... الخ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ چند راتیں ہی گزری تھیں کہ حضرت خالد بن ولید تشریف لائے اور عرض کیا یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا، میں یہ کلمات تین بار کہنے بھی نہیں پایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے وہ چیز دور کر دی۔ حتیٰ کہ اگر میں رات کو شیر کی کچھار میں گھسوں تو ڈر نہیں لگتا۔

الخيس: صاحب قاموس لکھتے ہیں: **الخيس بالكسر الشجر الملتف موضع الأسد كالخيسة**۔ گھنے اور گنجان درخت، شیر کا مسکن۔ خیسہ کے بھی یہی دو معنی ہیں۔

جنت کا سوال کرنا اور آپ ﷺ سے پناہ مانگی

۲۴۷۸: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ سَأَلَ اللّٰهَ الْجَنَّةَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ قَالَتِ الْجَنَّةُ اَللّٰهُمَّ اَدْخِلْهُ الْجَنَّةَ وَمَنِ اسْتَجَارَ مِنَ النَّارِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ قَالَتِ النَّارُ اَللّٰهُمَّ اَجِرْهُ مِنَ النَّارِ۔ (رواه الترمذی والنسائی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۶۰۳/٤ حديث رقم ۲۵۷۲۔ والنسائی فی السنن ۲۷۹/۸ حديث رقم ۵۵۲۱۔ واحمد فی المسند ۲۰۸/۳۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے جنت مانگے۔ تین بار یعنی یوں کہے: **اَللّٰهُمَّ مَنْ سَأَلَكَ اللّٰهَ الْجَنَّةَ** (اے اللہ! میں جنت میں داخلے کا سوال کرتا ہوں تو) یا کہے: **اَللّٰهُمَّ اَدْخِلْهُ الْجَنَّةَ** (اے اللہ! مجھے جہنم کی آگ سے بچا) تو جنت کہتی ہے اے الٰہی تو داخل کر اس کو جنت میں اور جو شخص آگ سے تین بار پناہ مانگے...... تو آگ کہتی اے الٰہی تو محفوظ رکھ اس کو آگ سے اس کو امام ترمذیؒ اور نسائیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله: من سأل الله الجنة قالت الجنة اللهم ادخله الجنة**: دخول جنت کی دعا مانگنا زیادہ ظاہر ہے۔

''تین مرتبہ'' چاہے تو ایک ہی مجلس میں یہ دعا مانگی جائے اور چاہے کئی مجلسوں میں گڑگڑا کر دعا مانگنی چاہئے۔

چونکہ یہ آداب دعا میں سے ہے۔ یہی معنی اس کے ظاہر و متبادر ہیں۔ اور ایک احتمال یہ ہے کہ ثلاث مرات سے ثلاث اوقات مراد ہوں، مثلاً امتثال طاعت کے وقت، انتہاء معصیت کے وقت، اور مصیبت کے وقت، یا یہ تین اوقات مراد ہیں۔ (۱) تصدیق۔ (۲) اقرار۔ (۳) **قالت الجنة**: اس میں تین احتمال ہیں۔ (۱) جنت یہ کلام بزبان حال کرے گی۔ (۲) جنت یہ کلام بزبان قال کرے

گی، چونکہ اللہ جل شانہ کو انطاق جمادات پر قدرت حاصل ہے۔ (۳) یہ کلام جنت نہیں بلکہ اہل جنت غلمان کریں گے۔ **اللھم أدخله الجنة:** اس میں دو احتمال ہیں۔ (۱) اس دخول جنت سے مراد دخول اولی ہے۔ (۲) اس سے مراد مطلقاً دخول جنت مراد ہے۔

قوله: ومن استجار من النار ثلث مرات قالت النار اللھم أجره من النار: اس میں دو احتمال ہیں: (۱) دخول نار سے مطلقاً محفوظ فرما۔ (۲) دخول ابدی سے محفوظ فرما۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ضمیر متکلم کی جگہ اسم ظاہر جنت و نار کا ذکر کرنے میں صنعتِ تجرید ہے، اور ایک قسم کا التفات ہے۔ مزید فرماتے ہیں: جنت و دوزخ کا از خود کلام کرنا حقیقتاً ہے، اس میں کوئی بعد نہیں، جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿**وتقول هل من مزيد**﴾ اور یہ بھی ممکن ہے کہ استعارہ ہو۔

استحقاق عبد کو اللہ کے وعدہ سے تشبیہ دی۔

اور ان کے ثبوت کو نطق ناطق سے تشبیہ دی، گویا کہ جنت اس کی مشتاق ہے۔ اس کے دخول جنت کی سائل و داعی ہے، اور جہنم اس سے نفرت کرتی ہے، اس کیلئے جہنم سے دوری کی دعا کر رہی ہے۔ لفظ قول استعمال کر کے، تحقق و ثبوت مراد ہے، اور یہ بھی جائز ہے کہ مضاف مقدر ہو۔ **أي قال خزنتها**، چنانچہ قول حقیقی ہوگا۔ میں کہتا ہوں لیکن اسناد مجازی ہوگا۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: بزبان حال پر محمول کرنا، اور مضاف مقدر ماننا دونوں باتیں قواعد مقررہ کے مخالف ہیں: **ان کل ما ورد فی الکتاب والسنة، ولم یحل العقل حمله علی ظاهره لم یصرف عنه الا بدلیل**۔ اور جمادات کا تکلم کرنا عرف میں واقع ہوا ہے۔ مثلاً نبی کریم ﷺ کے دست اقدس میں کنکر یوں کا تسبیح پڑھنا اور کھجور کے تنے کا رونا وغیرہ اھ۔

میں کہتا ہوں یہ قاعدہ ظواہر کے قواعد کے قریب ہے۔ اس آیت: ﴿**واسأل القرية**﴾ کی تاویل پر مفسرین کا اجماع ہے، کسی ایک بھی مفسر نے یہ نہیں کہا کہ بطور خرق عادت قریہ کا سوال و جواب کرنا ممکن ہے، باوجودیکہ معاملہ نفس الامر میں بھی ایسا ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی طرف نظر کرتے ہوئے نقل قطع نظر، **عقل مالوف و معتاء** کی طرف نظر کرتے ہوئے یہی کہتے ہیں کہ جمادات کا نطق کرنا محال ہے، علماء نے اطوار آخرت اور اسرار الٰہیہ بیان کئے ہیں، یہ سارے من وراء العقل نقل سے ثابت ہیں۔ اسی لئے فلاسفہ اور ان کے متبعین نے ان کا انکار کیا ہے، ان کے اپنے گمان کے مطابق یہ اعقل العقلاء ہیں۔ ان کو انبیاء کی ضرورت نہیں، انبیاء کی بعثت تو ''اغبیاء'' کی طرف ہوئی ہے۔ بلکہ بہت سے اسلامی فرقے مثلاً معتزلہ وغیرہ نے بعض ایسے امور نقلیہ کا بھی انکار کیا ہے جو متواتر المعنی احادیث سے ثابت ہیں، مثلاً عذاب قبر، میزان، صراط، اور رؤیت وغیرہ، ان کا مقابلہ بعض ظاہریہ نے کیا اور قرآن کو اس کے ظاہر پر محمول کیا اور اللہ تعالیٰ کیلئے صفات جسمانیہ ثابت کرنے لگے، اور اللہ تعالیٰ کیلئے جوارح مثلاً ہاتھ، آنکھ اور انگلیوں وغیرہ جیسے محالات عقلیہ نقلیہ کے قائل ہو گئے، ان کا معارضہ بعض باطنیہ نے کیا، چنانچہ یہ اہل باطن قرآن وسنت میں تاویل کرنے لگے، اور قرآن وحدیث کو ان کے ظاہر سے پھیرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ کہنے لگے کہ موسیٰ سے مراد قلب، فرعون سے مراد نفس وغیرہ ہے۔ اور مذہب اہل السنۃ والجماعہ ہر ذی حق کو اس کا پورا حق دیتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

الفصل الثالث:

جادو وغیرہ سے بچنے کی دعا

۲۴۷۹: وَعَنِ الْقَعْقَاعِ اَنَّ كَعْبَ الْاَحْبَارِ قَالَ لَوْلَا كَلِمَاتٌ اَقُوْلُهُنَّ لَجَعَلَتْنِیْ يَهُوْدُ حِمَارًا فَقِيْلَ لَهٗ مَاهُنَّ قَالَ اَعُوْذُ بِوَجْهِ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ الَّذِیْ لَيْسَ شَیْءٌ اَعْظَمَ مِنْهُ وَبِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ الَّتِیْ لَا يُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَّلَا

فَاجِرٌ وَبِاَسْمَاءِ اللّٰهِ الْحُسْنٰى مَا عَلِمْتُ مِنْهَا وَمَالَمْ اَعْلَمْ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَذَرَأَ وَ بَرَأَ۔ (رواه مالك)

اخرجه مالك في الموطأ ٢/ ٩٥١ حديث رقم ١٢ من كتاب السفر۔

ترجمہ: حضرت قعقاعؒ روایت ہے کہ کعب احبارؒ نے فرمایا اگر میں یہ کلمات نہ کہتا ہوتا تو البتہ یہود مجھ کو گدھا بنا لیتے ۔پس ان سے کہا گیا کہ وہ کلمے کیا ہیں ۔کعب نے کہا میں اللہ کی اس ذات سے پناہ مانگتا ہوں جو وہ بڑا ہے کہ کوئی چیز اس سے بڑی نہیں ہے اور اللہ کے کلموں سے کہ وہ پورے ہیں کہ ان سے کوئی نیک اور بد تجاوز نہیں کرتا اور اللہ تعالیٰ کے اچھے ناموں کے ساتھ' جو کچھ کہ میں ان ناموں سے جانتا ہوں اور جو کچھ کہ نہیں جانتا ۔اس چیز کی برائی سے پیدا کی اور برابر کی ۔متناسب الاعضاء کی اس نے ۔اس کو امام مالکؒ نے نقل کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

القعقاع بن حکیم۔ ان کا نام قعقاع ہے۔ یہ ''حکیم'' کے بیٹے ہیں ۔مدینہ کے رہنے والے اور تابعی ہیں ۔جابر بن عبداللہ اور ابو یونس رضی اللہ عنہم سے حدیث کی سماعت کی ۔ان سے سعید مقبری اور محمد بن عجلان نے روایت کی ۔ابو یونس رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے آزاد کردہ ہیں۔

تشریح: **قوله: لولا كلمات اقولهن لجعلتني يهود حمارا**: کعب احبار قوم یہود کے ایک بڑے دانشمند فرد تھے وہ اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانہ میں تھے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے شرف سے محروم رہے ۔پھر بعد میں حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانہ میں ایمان و اسلام کی دولت سے مالا مال ہوئے انہیں کعب کا بیان ہے کہ جب میں ایمان لایا اور مسلمان ہوا تو یہود میرے مخالف ہو گئے وہ میرے بارے میں اس قدر بغض و کینہ رکھتے تھے کہ اگر ان کی حرکتیں کامیاب ہو جاتیں اور میں یہ دعا نہ پڑھتا تو وہ سحر کر کے مجھے گدھا بنا دیتے یعنی مجھے ذلیل و بے وقوف اور گدھے کی مانند مسلوب العقل کر دیتے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: شاید کہ ان کی مراد یہ تھی کہ یہود نے ان پر جادو کر دیا۔ اور اگر میں یہ دعا نہ کر رہا ہوتا تو وہ میری حقیقت تبدیل کرنے میں کامیاب ہو جاتے اھ۔ یہ درست نہیں ،چونکہ ''قلب حقائق'' صرف اللہ ہی کے ساتھ مخصوص ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**كونوا قردة**﴾ اور دوسری جگہ فرمایا: ﴿**يخيل اليه من سحرهم أنها تسعى**﴾ یہ آیت دلالت کر رہی ہے کہ جادوگروں نے فرعون کا تقرب اور مال و جاہ حاصل کرنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا، اور جادو کی یہ صورت اس وقت اختیار کی ۔چنانچہ اگر ان کے دست قدرت میں اس سے کچھ بھی زیادہ ہوتا تو وہ بھی کر گزرتے ۔لہٰذا جب وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے عظیم الشان نبی کے خلاف اس سے بڑھ کر جادو کا کوئی کرتب نہیں دکھا سکتے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ سید الانبیاء والرسل کے خلاف اس سے بڑھ کر جادو کو کوئی کرتب دکھا سکیں، چہ جائیکہ حقیقت کو بدل ڈالیں ۔چنانچہ قاضی بیضاویؒ لکھتے ہیں: **والمراد بالسحر ما يستعان في تحصيله بالتقرب الى الشيطان مما لا يستقل به الانسان، وذلك لا يستتب الا لمن يناسبه في الشرارة وخبث النفس، فان التناسب شرط في التضام والتعاون، وبهذا تميز الساحر عن النبي والولي، وأما ما يتعجب منه كما يفعله أصحاب الحيله بمعونة الآلات والأدوية، فتسميته سحر على التجوز اھ**۔

جب شیطان کو یہ قدرت حاصل نہیں کہ وہ اپنے آپ کو حمار حقیقی بنا ڈالے، تو دوسروں کی کیا جرأت ۔لہٰذا جو اس کے قریب توسل کا دامن تھامے ہو تو وہ کیسے حقیقت کو بدل سکتا ہے ۔صاحب مدارک لکھتے ہیں: **وللسحر حقيقة عند أهل السنة كثرهم الله تعالىٰ، وتخييل وتمويه عند المعتز خذلهم الله**۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی: السحر حق کا مطلب یہ ہے کہ جادو ایک شئ واقع ہے، کوئی خیال فاسد نہیں جیسا کہ بھینگے کو ہر چیز دو نظر آتی ہیں۔ اور نہ ایسا کہ جیسا کہ جب دماغ میں کوئی خلل واقع ہو، یا افکار فاسدہ ڈیرہ ڈالے ہوں۔ سحر کے ثبوت پر قرآن وسنت میں دلائل موجود ہیں۔ چنانچہ ایک مقام پر فرمایا: ﴿یعلمون الناس السحر﴾ اور دوسری جگہ فرمایا: ﴿فیتعلمون منهما ما یفرقون به بین المرء وزوجه﴾۔ اس سے مراد علم سحر ہے کہ جس کے ذریعہ میاں بیوی میں جدائی کر دیتے ہیں، اللہ جل شانہ جادو کے وقت ایسی صورت حال پیدا فرما دیتے کہ جس کے نتیجہ میں نشوز وخلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ اور معاملہ تفریق تک پہنچ جاتا۔ یہ آیت بھی سحر کے ثبوت پر دلالت کرتی ہے۔ ﴿ومن شر النفثت فی العقد﴾ جیسا کہ مشہور ہے کہ یہودیوں نے نبی کریم پر جادو کر دیا تھا۔ اس ساری تفصیل سے امام بغویؒ کے کلام کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے: والصحيح أن السحر عبارة عن التمويه والتخييل، والسحر وجوده حقيقة عند أهل السنة، وعليه أكثر الأمم۔ امام شافعی کے بارے میں منقول ہے وہ فرماتے ہیں: جادو دیوانہ بنا دیتا ہے اور بیمار بھی کر دیتا ہے۔

حتی کہ مسحور مر بھی جاتا ہے، چنانچہ مسحور کے قاتل پر قصاص واجب ہوگا۔ اور کہا گیا ہے کہ جادو قلب اعیان میں بھی مؤثر ہے، چنانچہ آدمی کو گدھے کی شکل کا بنا دیتا ہے، اور گدھے کو آدمی کی شکل کا بنا دیتا ہے۔ اور زیادہ صحیح بات یہ ہے (کہ ایسا نہیں ہوتا بلکہ) یہ تخییل ہوتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يخيل اليه من سحرهم أنها تسعى﴾ لیکن اتنی بات بہر حال ہے کہ اجسام میں مؤثر ہوتا ہے، چنانچہ مسحور امراض کا شکار ہو جاتا ہے، جنون بھی ہو جاتا ہے، جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، اھ۔ قلب حقائق کے بطلان پر اہل سنت اور معتزلہ کا اتفاق ہے۔ عقل ونقل دونوں سے اس کا بطلان ثابت ہے، مزید یہ کہ ایسا کبھی ہوا بھی نہیں ہے۔

عرض مرتب: ملا علی قاریؒ نے ابن حجرؒ کے حوالہ سے جادو کا ایک قصہ نقل کیا ہے اور اس پر نقد بھی کیا ہے، بوجوہ وہ قصہ ہم نے حذف کر دیا ہے۔

فرض نماز کے بعد وظیفہ پڑھنے کا ذکر

۲۴۸۰: وَعَنْ مُسْلِمِ بْنِ اَبِیْ بَکْرَۃَ قَالَ کَانَ اَبِیْ یَقُوْلُ فِیْ دُبُرِ الصَّلٰوۃِ اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْكُفْرِ وَالْفَقْرِ وَعَذَابِ الْقَبْرِ فَكُنْتُ اَقُوْلُهُنَّ فَقَالَ اَیْ بُنَیَّ عَمَّنْ اَخَذْتَ هٰذَا قُلْتُ عَنْكَ قَالَ اَنَّ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم كَانَ يَقُوْلُهُنَّ فِیْ دُبُرِ الصَّلٰوۃِ۔

(رواه النسائی والترمذی الا انه لم يذكر فی دبر الصلوة وروی احمد لفظ الحديث وعنده فی دبر كل صلاة)

اخرجه ابوداؤد فی المسند ۳۲۵/۵۔ حديث رقم ۵۰۹۰۔ والنسائی ۲۶۲/۸ حديث رقم ۵۴۶۵۔ واحمد فی المسند ۳۶/۵

ترجمہ: ابی بکرہ کے بیٹے مسلمؒ فرماتے ہیں کہ میرا باپ کہتا تھا نماز کے بعد یعنی فرض نماز کے بعد اے الٰہی تحقیق میں تیری پناہ مانگتا ہوں۔ کفر سے اور فقر سے یعنی فقر قلبی کے فتنہ سے کہ وہ بے صبری ہے اور عذاب قبر سے پس میں کہتا تھا یہ کلمے پس میرے باپ نے کہا اے میرے بیٹے تو نے یہ کلمے کس سے سکھے ہیں میں نے کہا آپ سے کہا کہ تحقیق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کہتے تھے ان کلموں کو نماز کے بعد اس کو نسائی اور ترمذیؒ نے روایت کیا ہے' مگر ترمذی نے لفظ دبر الصلوٰۃ کا ذکر نہیں کیا اور احمدؒ نے نقل کیے ہیں لفظ حدیث کے یعنی باپ اور بیٹے کے ذکر کرنے کے بغیر اور احمدؒ کے نزدیک لفظ فی دبر کل صلوٰۃ یعنی لفظ کل اس میں زیادہ ہے۔

راوئ حدیث:

مسلم بن ابی بکرۃ۔ یہ ''مسلم'' ہیں ابوبکرہ کے بیٹے ہیں۔ ثقفی اور تابعی ہیں۔ ان کے والد صحابی تھے۔ انہوں نے اپنے والد سے اور ان سے ''عثمان شحام'' نے روایت کی۔

تشریح: قولہ: یقول فی دبر الصلاۃ: ''دبر'' لغت مشہورہ اور روایت معروفہ کے مطابق دال مہملہ کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ ابوعمرو مطرزی فرماتے ہیں: دبو: دال کے فتحہ کے ساتھ۔ نماز وغیرہ کا آخری وقت اور فرمایا: لغت میں یہی معنی معروف ہیں، اور دبر بمعنی پچھلا حصہ دال کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ ماوردی نے ابن اعرابی سے نقل کیا ہے: دبر الشیئ بالضم و بضمتین نقیض القبل، ومن کل شیئ عقبہ ومؤخرہ۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ لفظ دبر تین طریقے سے پڑھا جاتا ہے: (۱) بروزن شمس۔ (۲) بروزن کتب۔ (۳) بروزن جند۔

''الصلاۃ'' یہاں ''صلوٰۃ'' سے کون سی نماز مراد ہے؟ اس میں متعدد احتمالات ہیں۔ (۱) صلوۃ سے مراد فرض نماز ہے۔ (۲) جنس صلوۃ مراد ہے۔ اس میں احتمال ہے کہ نماز کے آخر میں سلام سے پہلے یہ دعا مانگتے تھے، زیادہ واضح بات یہ ہے سلام پھیرنے کے بعد یہ دعا مانگتے تھے۔

قولہ: اللھم انی أعوذبك من الکفر و الفقر وعذاب القبر: اس کی تشریح ماقبل میں گزر چکی ہے۔

بنی: یائے مشددہ کے فتحہ کے ساتھ ہے کسرہ بھی درست ہے۔ اور یہ تصغیر برائے شفقت ہے۔

قولہ: عمن أخذت ھذا؟: اس جملہ میں اشارہ ہے کہ سالک کو چاہئے کہ وہ ادعیہ ماثورہ مانگا کرے، اپنی طرف سے اختراع نہ کرے۔

توضیح: حصن میں لکھا ہے: اس حدیث کو حاکم، ابن ابی شیبہ اور ابن السنی نے روایت کیا ہے، لیکن یہ معلوم نہیں کہ انہوں نے یہ قصہ روایت کیا ہے یا کہ نہیں۔

کفر اور قرض سے پناہ مانگو

۲۴۸۱: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الْکُفْرِ وَالدَّیْنِ فَقَالَ رَجُلٌ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَتَعْدِلُ الْکُفْرَ بِالدَّیْنِ قَالَ نَعَمْ وَفِی رِوَایَۃٍ اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْکُفْرِ وَالْفَقْرِ قَالَ رَجُلٌ یَعْدِلَانِ قَالَ نَعَمْ۔ (رواہ النسائی)

اخرجہ النسائی فی السنن ۲۶۷/۸ حدیث رقم ۵۴۸۵۔ واحمد فی المسند ۳۸/۳۔

ترجمہ: حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرماتے تھے کہ میں اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتا ہوں کفر سے اور دین سے پس ایک شخص نے کہا اے اللہ کے رسول آپ ﷺ نے کفر کو دین کے برابر کر دیا فرمایا کہ ہاں اور ایک روایت میں آیا ہے اے الٰہی! تحقیق میں تیری پناہ مانگتا ہوں کفر کرنے سے اور فقر سے اور ایک شخص نے کہا کہ اس میں برابر کئے جاتے ہیں کفر و فقر فرمایا کہ ہاں اس کو نسائیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ: اتعدل الکفر بالدین؟ قال نعم:

قولہ: قال رجل: ولا یعدلان؟ ایک نسخہ میں یوں ہے: فقال رجل: یعدلان۔

''یعدلان'' صیغۂ مجہول کے ساتھ ہے، اور ایک نسخہ میں بصیغۂ معروف ہے۔ أي يعدل أحدهما بالآخر۔

قوله قال: نعم: امام طیبیؒ فرماتے ہیں۔ یہاں اصل عبارت یوں ہے: **أي نعم أساوي الدائن بالمنافق**......،

''کفر اور قرض'' کو برابر اس لئے فرمایا کہ قرض کی وجہ سے انسان جھوٹ بولتا ہے' مکاری کرتا ہے اور وعدہ کے خلاف کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ بدترین خصلتیں کفار اور منافقین ہی میں ہوتی ہیں۔

''کفر'' اور ''فقر'' کو برابر بایں معنی کیا گیا ہے کہ فقر کی وجہ سے انسان بےصبری کرتا ہے' اپنی قسمت کو کوستا ہے' تقدیر کا گلہ کرتا ہے اپنی زبان سے ایسے الفاظ نکال بیٹھتا ہے جو کفر کا باعث ہوتے ہیں۔

جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے: **والفقير الذى لم يصبر على فقر أسوأ حالاً من الدائن**۔ نیز مروی ہے: **كاد الفقر أن يكون كفرا** اھ۔ اور اس لئے بھی کہ کبھی دائن متحمل ہوتا ہے، اور اپنے رب پر توکل کئے ہوتا ہے۔ **(وتعقبه ابن حجر بما لا طائل تحته)**۔

بَابُ جَامِعِ الدُّعَا

جامع دُعاؤں کا بیان

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ ''**اضافة الصفة الى الموصوف**'' کی قبیل سے ہے۔ **أي: الدعا الجامع لمعان كثيرة في ألفاظ يسيرة**۔ ابن حجرؒ نے لفظ'' **الدعوات** ''ذکر کیا ہے، یہ ''اصول'' کے مخالف ہے۔ آگے جا کر ابن حجرؒ لکھتے ہیں: **ثم قوله أي: الدعوات الجامعة فهو من اضافة الصفة الى الموصوف، غير مطابق بين الصفة والموصوف**۔ ابن حجرؒ کی یہ بات قابل تأمل ہے۔

الفصل الاول:

جامع دعا

۲۴۸۲: عَنْ اَبِيْ مُوْسٰى الْاَشْعَرِيِّ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ اَنَّهٗ كَانَ يَدْعُوْا بِهٰذَا الدُّ عَاءِ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ خَطِيْئَتِيْ وَجَهْلِيْ وَاِسْرَافِيْ فِيْ اَمْرِيْ وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّيْ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ جِدِّيْ وَهَزْلِيْ وَخَطَائِيْ وَعَمَدِيْ وَكُلُّ ذٰلِكَ عِنْدِيْ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ مَاقَدَّمْتُ وَمَا اَخَّرْتُ وَمَا اَسْرَرْتُ وَمَا اَعْلَنْتُ وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّيْ اَنْتَ الْمُقَدِّمُ وَاَنْتَ الْمُؤَخِّرُ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ۱۹۶/۱۱۔ حديث رقم ۶۳۹۸۔ ومسلم فی صحيحه ۲۰۸۷/۴ حديث رقم (۷۰۔ ۲۷۱۹)۔ واحمد فی المسند ۴۱۷/۴۔

ترجمه: حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے کہ تحقیق وہ یہ دعا مانگتے تھے: اے الٰہی! میرے لیے میری خطا کو اور میری نادانی کو یعنی جن چیزوں کا جاننا یا عمل کرنا مجھ پر ضروری تھا اور میں نے نہیں جانا ان کو اس کو بخش دے اور میری زیادتی میرے کام میں اور وہ گناہ کہ جن کو تو خوب جانتا ہے ان کو مجھ سے یعنی مجھے ان کا علم نہیں ہے جیسا کہ تجھے ہے۔ اے الٰہی! میرے قصد کرنے اور میری ہنسی کو بخش اور میرے نادانستہ

اور جان بوجھ کر کرنے کو بخش دے۔ اے الٰہی! میرے لیے میرے گناہ کہ جو میں نے پہلے کیے اور وہ گناہ کہ جو (بالفرض والتقدیر) اس کے بعد ہوں گے اور وہ گناہ جو میں نے چھپ کر کیے ہیں اور وہ گناہ جن کو میں نے اعلانیہ کیا ہے اور وہ گناہ جن کو تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے بخش دے تو جس کو چاہے اپنی رحمت سے توفیق میں آگے کر دے اور جس کو چاہے اپنی قوت سے پیچھے ڈال دے اور تو ہر چیز پر قادر ہے۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله: اللهم اغفر لي خطيئتي وجهلي واسرافي في امري :**

''**خطيئتي**'' ہمزہ میں تسہیل کر کے ''**خطيّة**'' یائے مشددہ کے ساتھ بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

خطيئة کی دو تفسیریں کی گئی ہیں۔ (۱) **خطيئة** سے مراد ''سیئہ'' ہے۔

''**جهلي**''**جهل**، ''علم'' کی ضد ہے۔ **اسراف**: اسراف کہتے ہیں: **مجاوزة الحد في كل شئ** کو۔ یہ مجاوزہ بصورت تقصیر بھی ہو سکتا ہے اور بصورت تجاوز بھی۔

في أمري: کرمانیؒ فرماتے ہیں۔ اس میں احتمال ہے کہ یہ تمام مذکورہ امور کے متعلق ہو۔

قوله: ومالنت اعلم ...... وخطئي وعمدي:

وما أنت أعلم به مني: یہ تعمیم بعد التخصیص ہے۔ اس میں اعتراف ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم ہر شئ کو محیط ہے۔ اور اقرار ہے کہ میں خود اپنے نفس کی معرفت سے بھی عاجز ہوں، چنانچہ کہا جاتا ہے: **من عرف نفسه فقد عرف ربه**۔

جد: ہزل کا متضاد ہے۔ **خطئ**: صحاح میں لکھا ہے: **خطأ**، صواب کی نقیض ہے، کبھی مدّ کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے، خطا کے معنی ہیں ''ذنب''۔

قوله: وكل ذلك عندي: (خبر محذوف ہے اور وہ ہے:) **موجود أو ممكن**۔ یہ آخری جملہ ماقبل کلام کیلئے بمنزلہ ''تذییل'' کے ہے۔

امام طیبیؒ نے فرمایا: **أي: أنا متصف بجميع هذه الأشياء فاغفرها لي، قاله تواضعا وهضما، وعن علي: أنه عدّ ترك الأولٰى وفوات الكمال ذنبا، وقيل: أراد ما كان عليهما عجيبة، فان الأصح المختار عند المحققين أن الانبياء صلوات الله وسلامه عليهم معصومون قبل النبوة وبعدها من كبائر الذنوب وصغائرها عمدها وسهوها اھ**۔

امام طیبیؒ کا امام نوویؒ کے کلام پر اظہار تعجب خود اکبر العجائب ہے۔ چونکہ امام نوویؒ نے اسی چیز کو مقدماً ذکر کیا ہے جو محققین کے نزدیک مختار ہے، جیسا کہ انہوں نے لکھا: **قاله هضما لقسه**، اور پھر اس مذہب مختار کی تقویت و تائید کیلئے حضرت علیؓ کا کلام نقل کیا کہ اس سے مراد خلاف اولیٰ ہے۔ اور پھر مذہب غیر مختار کو لفظ ''**قيل**'' سے تعبیر کیا۔ اور قیل اشارہ ہے کہ یہ ان کے نزدیک ضعیف ہے۔ چنانچہ اس سیاق و سباق کے ہوتے ہوئے اس کو سکوت شمار نہیں کیا جا سکتا، چہ جائیکہ اس پر اظہار تعجب کیا جائے۔ اور یہ بھی عجائب میں سے ہے کہ **وكل ذلك عندي** کے بعد لکھتے ہیں: **أي: أنا متصف بهذه الاشياء**...... ممکن ہے کہ جو کچھ مصنف نے ذکر کیا ہو وہ کسی روایت میں آیا ہو، یا کسی نسخہ میں ہو۔

عرض مرتب: اس حدیث کے ذیل میں ملا علی قاریؒ نے ''انبیاء'' کے **معصوم عن الكذب** ہونے کا مسئلہ ذکر کیا ہے، ہم نے اسے یہاں سے حذف کر دیا ہے۔

قوله: اللهم اغفر لي ما قدمت وما أخرت:

ماضی کی تعبیر اختیار فرمائی چونکہ: المتوقع کالمتحقق۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے: ما ترکت من العمل أو قلت سأفعل أو سوف أترك۔

قوله: وأنت علی کل شئ قدیر:

أی أردته من التقدیم والتاخیر وغیرهما۔ ابن حجرؒ نے اس کی وضاحت یوں کی ہے: علی کل شئ تریده۔ لیکن یہ وضاحت ''موہم'' ہے۔ قدیر: اس کا مطلب ہے: کامل القدرة تامّ الارادة۔

توضیح: حصن سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اللهم اغفرلی ما قدمت......منی تک روایت، افراد مسلم میں سے ہے، اس کو ابوداؤد ، ترمذی اور نسائی نے بھی روایت کیا ہے، البتہ اس کے علاوہ حصہ ''متفق علیہ'' ہے، لیکن متعدد روایات سے۔

دین و دنیا کی اصلاح کی دعا

۲۴۸۳: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ کَا نَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یَدْعُوْ اَللّٰهُمَّ اَصْلِحْ لِیْ دِیْنِیَ الَّذِیْ هُوَ عِصْمَةُ اَمْرِیْ وَاَصْلِحْ لِیْ دُنْیَایَ الَّتِیْ فِیْهَا مَعَاشِیْ وَاَصْلِحْ لِیْ آخِرَتِیَ الَّتِیْ فِیْهَا مَعَادِیْ وَاجْعَلِ الْحَیٰوةَ زِ یَادَةً لِیْ فِیْ کُلِّ خَیْرٍ وَاجْعَلِ الْمَوْتَ رَاحَةً لِّیْ مِنْ کُلِّ شَرٍّ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۲۰۸۷/٤ حدیث رقم (۲۷۲۱/۷۱)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کہتے تھے اے الٰہی میرے لیے میرا دین درست کر دے جو میرے کام کا بچاؤ ہے یعنی نفس اور مال اور آبرو دین اور میرے لیے میری دنیا کو درست کر دے کہ اس میں زندگانی ہے میری اور میرے لیے میری آخرت کو درست کر دے وہ کہ اسی کی طرف میرا رجوع کرنا ہے اور میرے لیے ہر نیکی میں زندگی کو زیادتی کا سبب بنا دے کہ زیادہ دیر تک زندہ رہوں اور بہت زیادہ نیک کام کروں اور موت کو میرے لیے راحت کا سبب بنا' ہر برائی سے اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: اللهم اصلح لی دینی الذی هو عصمة امری:

الصحاح میں لکھتے ہیں: عصمة کے معنی ہیں: ''المنع والحفظ''۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿واعتصموا بحبل اللّٰه﴾ ''حبل اللّٰه'' سے مراد ''عہد'' یعنی ''دین'' ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ''دین'' میرے تمام امور کا محافظ ہے، چونکہ جس شخص کے دین میں بگاڑ ہوگا اس کے تمام امور میں بگاڑ ہوگا، وہ شخص غیبت و حضور، حزن و سرور کی حالت میں ہوتے ہوئے بھی خائب و خاسر ہوگا۔

قوله: واصلح لی دنیای التی فیهامعاشی:

قوله: واصلح لی آخرتی التی فیهامعادی:

''معاد'' عاد کا مصدر ہے، بمعنی رجع۔ اور اس جملہ کا مطلب یہ ہے: وفقنی للطاعة التی هی اصلاح معادی۔ آخرت کی درستی و اصلاح کا انحصار جن امور پر ہوتا ہے۔

قوله: واجعل الحیاة زیادة لی فی کل خیر:

قوله: واجعل الموت راحة لی من کل شر یعنی میری زندگی کا خاتمہ شہادت' حسن اعتقاد اور توبہ پر ہوتا کہ میری موت دنیا کی مشقتوں سے نجات اور آخرت کی راحت کے حصول کا باعث ہو۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اصلاح الدنیا عبارت ہے کہ آدمی کی احتیاج پوری ہوتی رہے، وہ حلال ہو، اللہ تعالیٰ کی طاعت کیلئے معین

ومددگار رہو، اور اصلاح معاد کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت وطاعت کی توفیق مل جائے، اور طلب راحت بالموت میں نبی کریم ﷺ کی اس دعا کی طرف اشارہ ہے: **اذا أردت بقوم فتنة فتوفنی غیر مفتون**۔ یہ نقصان قرینہ سابقہ کی زیادتی کے مقابل ہے۔

ہدایت اور تقویٰ مانگنا

۲۴۸۴: **وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ اَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَسْأَلُكَ الْهُدٰی وَالتُّقٰی وَالْعَفَافَ وَالْغِنٰی۔** (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۲۰۸۷/٤ حدیث رقم (۷۲۔ ۲۷۲۱)۔ والترمذی فی السنن ٤٨٨/٥ حدیث رقم ۳٤٨٩۔ وابن ماجه ۱۲٦۰/۲ حدیث رقم ۳۸۳۲ واحمد فی المسند ٤۱۱/۱۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے وہ کہتے تھے اے الٰہی تحقیق میں مانگتا ہوں تجھ سے ہدایت اور تقویٰ اور نفس کو حرام ومکروہ چیزوں سے باز رکھتا ہے اور بے پرواہی کا سوال کرتا ہوں یعنی دل کی اور ظاہر کی۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله: اللهم انی اسئلك الهدی والتقی والعفاف والغنی:**

"**العفاف**" بروزن کلام، بمعنی کفاف، کہا جاتا ہے: **عفّ عن الحرام یعف عفا وعفة وعفافا أی کف**۔ (کذا فی الصحاح)

عفاف کے دو معنی بیان کئے گئے ہیں: (۱) معاصی سے حفاظت۔ (۲) قلب ونفس کی اصلاح۔

"**الغنی**": اس کے دو مطلب بیان ہوئے ہیں: (۱) غنائے قلبی مراد ہے۔ (۲) لوگوں کے پاس موجود، سیم وزر ودیگر اشیاء سے استغناء۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: "ہدیٰ" اور "تقیٰ" کو مطلق ذکر فرمایا تا کہ یہ ان امور واشیاء کو شامل ہو جائے جن سے آگاہی ضروری ہے۔ مثلاً امر معاش، معاد، مکارم اخلاق، اور ان تمام امور کو بھی شامل ہو جن سے بچنا ضروری ہے۔ مثلاً شرک ومعاصی، اخلاق رذیلہ۔ طلب عفاف وغنی یہ تخصیص بعد از تعمیم ہے۔

افعال وگفتار کی درستگی کا سوال کرنا

۲۴۸۵: **وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ لِی رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ قُلِ اللّٰهُمَّ اهْدِنِی وَسَدِّدْنِی وَاذْكُرْ بِالْهُدٰی هِدَايَتَكَ الطَّرِيْقَ وَبِالسَّدَادِ سَدَادَ السَّهْمِ۔** (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۲۰۹۰/٤ حدیث رقم (۲۷۲٥۰۷۸) وأبو داؤد فی السنن ۱۳۰/٤ حدیث رقم ٤۲۲٥۔

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ روایت ہے کہ آپ ﷺ نے مجھ کو ارشاد فرمایا کہو اے الٰہی! مجھ کو سیدھے راستے کی طرف ہدایت فرما یعنی مجھ کو سیدھی راہ دکھا یعنی افعال وگفتار سیدھی کر دے اور مجھے سیدھا کر دے (آپ ﷺ نے فرمایا) جب تم اللہ سے ہدایت طلب کرو تو سیدھا راستہ طلب کرو تو تیر کی طرح درستی کا تصور کرو۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله: اللهم اهدنی وسددنی:** اس کے متعدد مطالب بیان کئے گئے ہیں۔ (۱) اے اللہ مجھے ہدایت پر ثابت قدم فرما۔ (۲) اے اللہ کمالات زائدہ کی طرف میری راہنمائی فرما۔ جیسا کہ اللہ جل شانہ کا فرمان ہے: ﴿**والذین جاهدوا فینا لنهدینهم سبلنا**﴾ [العنکبوت۔ ٦۹]

وسددنی: ''سداد'' سے ماخوذ ہے۔ ''سداد'' سین کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ کہا گیا ہے کہ ''سداد'' کے معنی ہیں: اصابة القصد فی الأمر والعدل فيه۔ چنانچہ اللهم اهدنی وسددنی کا مطلب ہے: اے اللہ میں تجھ سے غایت ھدیٰ اور نہایتِ سداد کا سوال کرتا ہوں۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: حدیث میں بیان کردہ مفہوم وہی ہے جو ان آیات میں ہے: ﴿فاستقم كما أمرت﴾[هود : ١١٢] ﴿اهدنا الصراط﴾[الفاتحة۔٦] یعنی اے اللہ! مجھے ایسی ہدایت عطا فرما کہ اس کے ہوتے ہوئے میں افراط وتفریط کی طرف مائل نہ ہونے پاؤں۔

قوله: واذكر بالهدى هدايتك الطريق وبالسداد سداد السهام: اس کا عطف ''قل'' پر ہے۔

آخری جملہ کا مطلب یہ ہے تم ہدایت سداد کا سوال کرنے میں سہم مسدّد کی طرح ہو جاؤ، صراط مستقیم کی پشت کے سوار کی طرح ہو جاؤ۔ اس میں شئ معقول کو شئ محسوس کی تصویر میں پیش کیا ہے، چونکہ یہ ''اوقع فی النفس'' ہے۔ تقریباً اسی مفہوم کو امام طیبیؒ نے اپنے الفاظ میں یوں ذکر کیا ہے: **أمره بأن يسأل الله الهدى والسداد، وأن يكون فى ذكره مخطرا بباله۔ والمعنى: أن يكون فى سؤاله طالبا غاية العدل ونهاية السداد، اذا المطلوب هداية كهداية من ركب متن الطريق، وسدادا يشبه سداد السهم نحو الغرض۔**

جب تم اللہ رب العزت سے طلب ہدایت کرو تو تمہارے ذہن میں یہ بات رہنی چاہئے کہ مجھے وہی ہدایت حاصل ہو جو صراط مستقیم پر گامزن شخص کو حاصل ہوتی ہے اور جب تم راستی مانگو تو یہ خیال رکھو کہ مجھے ایسی ہی راستی حاصل ہو جس طرح تیر سیدھا ہوتا ہے۔

نئے مسلمان کو مذکورہ کلمات سکھایا کرتے تھے

۲۴۸۶: وَعَنْ اَبِیْ مَالِكٍ الْاَ شْجَعِیْ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ كَانَ الرَّجُلُ اِذَا اَسْلَمَ عَلَّمَهُ النَّبِیُّ ﷺ الصَّلَاةَ ثُمَّ اَمَرَهٗ اَنْ يَّدْعُوَ بِهٰؤُلَاءِ الْكَلِمَاتِ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ وَارْحَمْنِیْ وَاهْدِنِیْ وَعَافِنِیْ وَارْزُقْنِیْ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ٢٠٧٣/٤ حديث رقم (٣٥۔ ٦٩٧)۔

ترجمہ: حضرت ابو مالک اشجعیؒ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے باپ سے نقل کی کہ آدمی جب مسلمان ہوتا تو اس کو نبی کریم ﷺ نماز سکھلاتے تھے پھر اس کو حکم کرتے۔ کہ دعا کرے ان کلمات کے ساتھ کہ اے الٰہی میری بخشش فرما اور مجھ پر رحم کر۔ یعنی میرے عیبوں کو ڈھانکنے کے ساتھ اور مجھ کو ہدایت کر اور عافیت سے رکھ مجھ کو اور روزی دے مجھ کو۔ یعنی حلال اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: علمه النبی ﷺ الصلوة: اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: (۱) مسائل نماز سکھاتے، نماز کے شرائط وارکان بتاتے۔ (۲) وہ نماز سکھلاتے جس نماز کا وقت ہو رہا ہوتا تھا چونکہ یہ فرض عین ہے۔

۲۴۸۷: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ اَكْثَرُ دُعَاءِ النَّبِیِّ ﷺ اَللّٰهُمَّ اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ١٩١/١١۔ حديث رقم ٦٣٨٩۔ ومسلم فی صحيحه ٢٠٧١/٤ حديث رقم (٢٧۔ ٢٦٩٠)۔ والترمذی فی السنن ٤٨٧/٥ حديث رقم ٣٤٨٧۔ واحمد فی المسند ٢٠٨/٣۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی اکثر دعا یہ ہوا کرتی تھی اے الٰہی! ہم کو دنیا میں نیکی

عطا فرما یعنی نعمتیں اور اچھی حالت عطا فرما اور آخرت میں یعنی موت کے بعد نیکی یعنی اچھے مراتب اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: كان اكثر دعا النبی ﷺ :

قوله: اللهم اتنا فی الدنیا حسنة: قوله: وفی الآخرة حسنة: قوله: وقناعذاب النار : آنحضرت ﷺ کثرت سے یہ دعا اس لئے پڑھا کرتے تھے کہ یہ ایک جامع دعا ہے، جس میں دین و دنیا کے تمام مقاصد آجاتے ہیں پھر یہ کہ یہ دعا قرآن کریم میں نازل کی گئی ہے۔

طالب صادق اگر حضور و مناجات کے وقت خلوت میں بیٹھ کر باطن کی صفائی کے ساتھ دنیا و آخرت کے حسنات کے ہر ہر گوشے کا تصور کر کے دعا پڑھے تو وہ دیکھے گا کہ کیا کچھ ذوق و جمعیت، سکون و اطمینان اور نورانیت و سعادت حاصل ہوتی ہے۔

مزید یہ کہ یہ دعا مانگنے والا شخص اللہ جل شانہ کے ہاں ''ممدوح'' ہے۔

اس دعا کی متعدد تشریحات کی گئی ہیں:

(۱) کہا گیا ہے **حسنه فی الآخره** کا مطلب یہ ہے کہ ''رفیق اعلیٰ'' کی موافقت مل جائے، اور آگ کے عذاب سے بچا کہ یہ مولیٰ سے حجاب ہے۔

(۲) نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے لفظ ''حسنہ'' کو مکرر فرمایا، اور نکرہ ذکر فرمایا، علم معانی کا قاعدہ ہے کہ جب نکرہ کا اعادہ کیا جاتا ہے تو غیر اُولیٰ مراد ہوتا ہے، چنانچہ پہلے حسنہ سے دنیاوی حسنات یعنی استقامت و توفیق، اکتساب طاعت کے وسائل اور **عند الله** مقبول نیکیاں مراد ہیں۔ اور حسنۂ ثانیہ سے مراد مذکورہ بالا امور پر مرتب ہونے والا ثواب اور عقبیٰ کی رضامندی ہے۔ اسی آیت کی تفسیر میں کئی اقوال ہیں، تمام اقوال کا حاصل مذکورہ بالا معانی سے ''اعم'' ہے۔

(۳) **فی الدنیا حسنه** سے مراد طاعت وقناعت ہے اور ''**وفی الآخره**'' سے تخفیف حساب رفع عذاب، دخول جنت اور رؤیت باری تعالیٰ مراد ہے۔ اور صرف عذاب نار سے حفاظت طلب فرمانے پر اکتفاء کیا، اس میں اشارہ ہے کہ اصل شکل توبہ ہے۔ اس کے علاوہ تمام امور آسان ہیں۔ بلکہ وہ محو سیئات اور رفع درجات کیلئے سبب کے درجہ میں ہیں۔ تو گویا کہ دعاً یوں ہے: **وقنا كل سيئة فی الدنيا سيئه** کو ''عذاب النار'' سے تعبیر فرمایا، سیئہ سے وہ سیئہ مراد ہے، جس پر جہنم کے عذاب کا ترتب ہوتا ہے، اس سیئہ سے احتراز ہے کہ جس کو توبہ یا شفاعت، یا مغفرت مٹا ڈالتی ہے۔ امام طیبیؒ نے فرمایا: **وقنا عذاب النار "تتميم"** ہے۔

گویا کلام یوں ہے: **إن صدر منّا ما يوجبه من التقصر والعصيان فاعف عنا وقنا عذاب النار** ۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: **عذاب النار أی الحسّية والمعنوية، وهی الحجاب ولشمول النار لهذا تغليبا ومجازا مشهورا يعلم أن هذا ليس من باب التتميم۔**

یہ سراسر خطا ہے، اور اس خطا کا سبب یہ ہے کہ ''تتمیم'' کے معنی کو ٹھیک طور پر سمجھا نہیں، چونکہ تتمیم، حصول تعیم کے بعد ہی لائی جاتی ہے۔ تفصیل یہ ہے کہ حصول حسنہ فی الدنیا اور وصول حسنہ فی الآخرہ کے بعد عذاب النار باقی نہیں رہتا۔ نہ بمعنی عذاب، اور نہ بمعنی حجاب۔ چنانچہ کلام میں تتمیم کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔ سوائے اس کے کہ بطور فرض و تقدیر کے، یعنی **لو وقع الذنب والتقصير، فلا تؤاخذنا بالتعذيب والتعزير۔**

تخریج: حصن کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: **اللهم ربنا آتنا الخ** ۔ اور فرماتے ہیں: بخاری، مسلم، ابوداؤد اور نسائی ان تمام حضرات نے

اس روایت کو حضرت انسؓ سے ذکر کیا ہے۔

توضیح: مصنف نے جو الفاظ ذکر کئے ہیں ممکن ہے کہ کسی روایت یا نسخہ میں ہوں۔البتہ ان کے درمیان جمع کرنا بلا شبہ بہتر ہے، اور کسی ایک پر اکتفاء کرنا بھی درست ہے، چونکہ مقصود بہر حال حاصل ہے۔

دین ودنیا کی نعمتوں کا سوال

۲۴۸۷:وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ کَانَ اَکْثَرُ دُعَاءِ النَّبِیِّ ﷺ اَللّٰھُمَّ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۹۱/۱۱۔ حدیث رقم ۶۳۸۹۔ ومسلم فی صحیحه ۲۰۷۱/۴ حدیث رقم (۲۷۔ ۲۶۹۰)۔ والترمذی فی السنن ۴۸۷/۵ حدیث رقم ۳۴۸۷۔ واحمد فی المسند ۲۰۸/۳۔

ترجمه: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی اکثر دعا یہ ہوا کرتی تھی اے الٰہی ہم کو دنیا میں نیکی عطا فرمایا یعنی نعمتیں اور اچھی حالت اور آخرت میں یعنی موت کے بعد نیکی یعنی اچھے مراتب اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

الفصل الثانی:

اللہ تعالیٰ سے کفار پر فتح کا سوال کرنا

۲۴۸۸:عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ ﷺ یَدْعُوْا یَقُوْلُ رَبِّ اَعِنِّی وَلَا تُعِنْ عَلَیَّ وَانْصُرْنِی وَلَا تَنْصُرْ عَلَیَّ وَامْکُرْ لِیْ وَلَا تَمْکُرْ عَلَیَّ وَاھْدِنِیْ وَیَسِّرْلِیَ الْھُدٰی لِی وَانْصُرْنِی عَلٰی مَنْ بَغٰی عَلَیَّ رَبِّ اجْعَلْنِیْ لَکَ شَاکِرًا لَکَ ذَاکِرًا لَکَ رَاھِبًا لَکَ مِطْوَاعًا لَکَ مُخْبِتًا اِلَیْکَ اَوَّاھًا مُنِیبًا رَبِّ تَقَبَّلْ تَوْبَتِیْ وَاغْسِلْ حَوْبَتِیْ وَاَجِبْ دَعْوَتِیْ وَثَبِّتْ حُجَّتِیْ وَسَدِّدْ لِسَانِیْ وَاھْدِ قَلْبِیْ وَاسْلُلْ سَخِیْمَةَ صَدْرِیْ۔

(رواه الترمذی وابو داود وابن ماجة)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۱۷۵/۲ حدیث رقم ۱۵۱۰۔ والترمذی فی السنن ۵۱۷/۵ حدیث رقم ۳۵۵۱۔ وابن ماجه ۱۲۵۹/۲ حدیث رقم ۳۸۳۰۔ واحمد فی المسند ۲۲۷/۱۔

ترجمه: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ دعا مانگا کرتے تھے اے میرے رب میری مدد کر۔ یعنی مجھ کو توفیق دے اپنے ذکر اور شکر کی اور اپنی حسن عبادت کی اور مجھ پر ان کو غالب نہ کر۔ کہ وہ منع کریں مجھ کو تیری اطاعت سے۔ خواہ شیاطین ہوں خواہ نفس خواہ کفار اور مجھ کو فتح دے اور نہ فتح دے مجھ پر یعنی کفار پر مجھے غالب کر اور ان کو مجھ پر غالب نہ کر اور میرے واسطے مکر کر اور میرے خلاف مکر نہ کر اور سیدھا راستہ دکھا مجھ کو اور سیدھی راہ چلنا آسان کر دے میرے واسطے اور میری مدد کر ان پر جنہوں نے زیادتی کی مجھ پر۔ اے میرے رب مجھ کو اپنے واسطے شکر کرنے والا بنا یعنی اپنے واسطے ہر وقت ذکر کرنے والا بنا۔ یعنی ہر حال میں اپنے واسطے ڈرنے والا اپنے واسطے بہت زیادہ فرمانبردار اپنے واسطے' عاجزی کرنے والا اپنے طرف بہت زیادہ آہ کرنے والا یعنی درازی کرنے والا رجوع کرنے والا اے میرے پروردگار قبول کر میری توبہ اور میرے گناہ کو دھو دے اور میری دعا تو قبول کر اور میری دلیل ثابت رکھ۔ یعنی اپنے

دشمنوں پر دنیا اور آخرت میں اور سچی اور درست کر میری زبان بھی نہ بولے مگر سچ اور حق اور میرے دل کو سیدھی راہ دکھا اور میرے سینے کی سیاہی نکال دے اس کو امام ترمذیؒ اور ابوداؤد اور ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے۔ اسنادی حیثیت: امام ترمذی نے کہا ہے یہ حدیث باعتبار سند کے حسن غریب ہے۔

تشریح: قوله: كان النبی ﷺ يدعو يقول:

"يقول" میں دو ترکیبی احتمال ہیں۔(۱) "يدعو" سے "بدل" ہے۔(۲) يدعو کی ضمیر سے حال ہے۔ وامكرلی ولا تمكر علّی: قوله: امكر لی ولاتمكر علیّ:

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: مکر کے معنی ہیں "خداع"

"مکر" کے معنی فریب لیکن جب اس لفظ کی نسبت خدا کی طرف ہوتی ہے تو اس سے مراد ہوتا ہے (دشمنان دین اسلام پر ایسی جگہ سے بلاؤں کا اترنا جہاں سے انہیں گمان بھی نہ ہو)۔

"سینہ کی سیاہی" سے مراد ہے کینہ، بغض، حسد اور اسی قسم کی دوسری خصلتیں۔

اور کہا گیا ہے کہ اس کا مطلب ہے بندہ کے ساتھ طاعت میں استدراج۔ چنانچہ آدمی کو وہم ہوتا ہے کہ اس کی عبادت مقبول ہے، حالانکہ اس کی وہ طاعت (عنداللہ) مردود ہوتی ہے۔ ابن الملکؒ فرماتے ہیں: المكر الحيلة، والفكر فی دفع عدوّ بحيث لا يشعر به العدو۔ چنانچہ مطلب یہ ہوگا: اللهم اهدنی الیٰ طريق دفع أعدائی عنی، ولا تهد عدوی الی طريق دفعه إيای عن نفسه۔

بعض عارفین نے اس آیت مبارکہ: ﴿سنستدرجهم من حيث لا يعلمون﴾ کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ان سے کرامات کا ظہور ہوگا، حتیٰ کہ انہیں یہ گمان ہوگا کہ وہ اللہ کے ولی ہیں، پھر اللہ تعالیٰ ان کی پکڑ فرمائیں درانحال یہ کہ وہ لوگ خواب غفلت وفریب خوری میں پڑے ہوں گے، اور ان کی موت بھی اسی حالت میں آئے گی۔

قوله: واهدنی ويسر الهدی لی:

"اهدنی": اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں (۱) مجھے بھلائی کے راستے سُجھا دیجئے (۲) مجھے میرے نفس کے عیوب پر مطلّع فرما دیجئے۔

"ويسر الهدی لی": (۱) یعنی میرے لئے ہدایت کی اتباع کرنا آسان فرما دیجئے (۲)....حتی کہ میں طاعت میں ثقل محسوس نہ کرو، اور عبادت کو چھوڑ کر کسی اور چیز میں مشغول نہ ہوں۔

قوله: وانصرنی علی من بغی علیّ: ابن حجرؒ فرماتے ہیں: یہ جملہ، اعنی کیلئے "تاکید" ہے۔

عرضِ مرتب: یہاں ملا علی قاریؒ نے ابن حجرؒ کے کلام کے اگلے حصہ پر کچھ نقد کیا ہے، لیکن ابن حجرؒ کا وہ کلام نقل نہیں کیا ہے، سو وہ نقد ذکر کیا جا رہا ہے۔ والصواب أنه لا تخصيص لقوله وانصرنی فی الأول۔

قوله: رب اجعلنی لك شاكرا، لك ذاكرا: اہتمام واختصاص کی وجہ سے جار مجرور کو مقدم کیا ہے۔ یا تحقیق مقام اخلاص کی وجہ سے مقدم ذکر کیا ہے۔ حصن میں یہ اضافی ہے: لك شكارا لك رهابا۔ بروزن ثواب، مبالغہ کے صیغے ہیں۔

قوله: لك مطواعا، لك مخبتا: میم کے کسرہ کے ساتھ، بروزن مطلاق، مبالغہ کا صیغہ ہے۔

أی: كثير الطوع۔ وهو الانقياد والطاعة۔ اور ابن ابی شیبہ کی روایت میں "مطيعا" کا لفظ ہے۔ أی: منقادا۔

" لك مخبتا" میں افادۂ اختصاص کیلئے لام کو "الی" کے قائم مقام کیا گیا ہے۔ "خبت" سے ماخوذ ہے۔ کہا جاتا ہے: أخبت الرجل۔ إذا بزل الخبت، الخبت وهو المطمئن من الأرض۔ (۱) پست وکشادہ زمین، نشیبی زمین جس میں ریت ہو۔ (۲) گہری اور دراز وادی جس میں نباتات ہوں۔ پھر لفظ "خبت" کا استعمال "لین وتواضع" کے معنی میں ہونے لگا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وأخبتوا إلى ربّهم﴾ أی: اطه أنوا إلى ذلكره، أو سكنت نفوسهم إلى أمره۔ دوسری جگہ ہے: ﴿وبشر المخبتين﴾ الذين إذا ذكر الله وجلت قلوبهم والصابرين على ما أصابهم والمقيمى الصلاة ومما رزقناهم ينفقون﴾۔

قوله: إليك أواهامنيبا: "أواها" أی متضرعا۔

بروزن "اوّاب" مبالغہ کا صیغہ ہے۔ کہا جاتا ہے: أوّه تأويها، وتأوآه تأوّها۔ إذ قال: أوّه أی: قائلا كثيرا لفظ أوّه۔ وهو صوت الحزين۔ اے اللہ مجھے تفریط پر حزین ومتفجع بنا دیجئے۔ کہا گیا ہے کہ اوّاہ کے معنی ہیں بکاء۔

مينبا: ای راجعا۔

توبہ، انابت اور اُوبۃ میں فرق:

کہا گیا ہے کہ "توبہ" عبادت ہے رجوع میں المعصية إلى الطاعة سے، اور إنابة نام ہے "رجوع من الغفلة إلى الذكر والفكرة" کا اور أوبة کہتے ہیں "رجوع من الغيبة إلىٰ الحضور والمشاهدة کو۔ اھ۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: "اليك أواها منيبا" میں ایک جملہ پر اکتفاء کیا ہے، چونکہ انابت، "تأوه" کو لازم ہے، اس کا ردیف ہے، گویا کہ شئ واحد ہیں۔ اسی سے یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إن ابراهيم لحليم أوّاه منيب﴾ اھ۔ ابن حجرؒ نے امام طیبیؒ کے کلام پر ایسی گرفت کی ہے جس کا ذکر کرنا صحیح ہے۔

قوله: رب تقبل توبتي: یعنی میری توبہ کو ایسی بنا جو صحیح ہو، شرائط وآداب توبہ کو جامع ہو، کہ ایسی توبہ قبول ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وهو الذى يقبل التوبة عن عباده﴾

ابن حجرؒ فرماتے ہیں: حتى تكون نصوحا فلا أنكثها أبدا۔ ابن حجرؒ کے اس کلام سے یہ وہم ہوتا ہے کہ نصوح توبہ کو "عدم نکث" لازم ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اللہ جل شانہ فرماتے ہیں: ﴿توبوا إلى الله توبة نصوحا﴾ نصوح نون کے فتحہ کے ساتھ۔ أی بالغة فى النصح، اصل کے اعتبار سے تائب کی صفت ہے چونکہ هو ينصح نفسه بالتوبة اس کے ساتھ توبہ کو موصوف کرنا بطور اسناد مجازی کے ہے، مبالغہ مقصود ہے۔ ابوبکر نے نون کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، یہ مصدر ہے بمعنیٰ "النصح"۔ اور تقدیری عبارت ذات نصوح یا تنصح نصحا لأنفسكم ہے، نصوحا کی تفسیر "صادقه خالصه" کے ساتھ کی ہے، عوام میں یہ مشہور ہے کہ نصوح سے مراد نصوح (نامی) تائب ہے۔ مفسرین کے نزدیک بالاجماع یہ تفسیر مراد نہیں ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ عزم على عدم العود صحت توبہ کی شرط ہے، لیکن مذہب صحیح یہ ہے کہ عدم النكث شرط نہیں ہے۔ اگرچہ بعض نے اس میں اختلاف کیا ہے۔ حدیث مرفوع میں ہے: إن التوبة النصوح أن يتوب ثم لا يعود إلى الذنب حتى يعود اللبن الى الضرع۔ اس حدیث کو کمال پر محمول کیا گیا ہے۔

قوله: واغسل حوبتي: چونکہ "حوب" اصل میں زجر الإبل کو کہتے ہیں۔ لفظ "اثم" کی جگہ "حوب" مصدر کو ذکر کیا چونکہ الاستبراء من فعل الذنب أبلغ منه من نفس الذنب۔ (كذا قيل) اور یہ بھی ممکن ہے رعایت سجع کیلئے یہ لفظ ارشاد فرمایا ہو۔ قرآن کریم میں آتا ہے: ﴿إن كان حوبا كبيرا﴾ حوبة کے ساتھ غسل ذکر فرمایا کہ ازالہ بالکلیہ مراد ہے، جیسا تنزہ اس قدر سے

کیا جاتا ہے کہ جس کی مجاورت سے ناگواری ہوتی ہو۔

ابن حجر: لکھتے ہیں :أی :أزل آثامی بتبدیلها حسنات۔ یہ بیان کردہ توضیح لغت اور مفہوم حدیث سے خارج ہے۔

قوله: وأجب دعوتی: ''دعوت'' سے مراد 'دعاء' ہے اور ابن حجرؒ لکھتے ہیں: **ذکر لأنه من فوائد قبول التوبة** اھ اس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ غیر تائب کی دعا قبول نہیں ہوتی' حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ یہ صحیح روایت ہے کہ مظلوم کی دعا مقبول ہوتی ہے اگرچہ وہ فاجر ہی کیوں نہ ہو۔ اور ایک روایت میں (تو یہاں تک) آتا ہے: **ولو کان کافرا۔**

قوله: وثبت حجتی: اس کے دو مطلب بیان کئے ہیں (۱) میری دلیل و حجت کو اپنے دشمنوں پر دنیا و عقبی میں ثابت فرما۔ (۲) میرے قول و تصدیق کو دنیا میں اور حوابِ ملکین کے وقت ثابت فرما۔

قوله: واسلل سخیمة صدری: امر کا صیغہ ہے، از باب نصر، بمعنی أخرج، **سل السیف إذا أخرج من العمد** سے ماخوذ ہے۔ چنانچہ اس کے معنی ہوئے **أخرجها ونق الصدر منها۔ سخیمة صدری:** ابن ابی شیبہ کی روایت میں ''صدری'' کی بجائے ''قلبی'' آیا ہے۔ ''سخیمة'' کے مختلف معانی ذکر کئے ہیں۔

(۱) السخیمة: الضغن والحقد، من السخمة، وهو السواد، ومنه سخام القدر۔

(۲) قیل: السخیمة الضغینة، وإضافتها إلی الصدر لأن مبدأها القوة الغضبية التی فی القلب الذی هو فی الصدر۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: اگر یہ کہا جائے کہ حرف عطف ترک کرنے کا کیا فائدہ ہے؟ کہ **رب اجعلنی إلی نیبا** میں ذکر نہیں کیا، اور پچھلے جملوں کا ذکر کیا ہے۔ جواب یہ ہے: **أما الترك فللتعداد والإحصاء، لبدل علی أنه ما کان لله غیر معدود، ولا داخل تحت محدود، فینعطف بعضها علی بعض، ولذا قدم الصلة علی متعلقاتها، وأما الإتیان بالعطف فیما کان للعبد فلا نضباطه** اھ۔ ابن حجرؒ نے امام یحییٰؒ کے کلام پر بے فائدہ گرفت کی ہے۔ ابن حجرؒ اگر **فتأمله** کہہ دیتے تو ان کے **فتأمله** پر توجہ دینا مناسب ہوتا۔

اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو

۲۴۸۹: وَعَنْ اَبِیْ بَکْرَةَ قَالَ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَلَى الْمُنْبَرِ ثُمَّ بَکٰى فَقَالَ سَلُوْا اللّٰهَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فَاِنَّ اَحَدًا لَمْ يُعْطَ بَعْدَ الْيَقِيْنِ خَيْرًا مِّنَ الْعَافِيَةِ۔

(رواه الترمذی وابن ماجة وقال الترمذی هذا حدیث حسن غریب اسنادا)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵۲۱/۵ حدیث رقم ۳۵۵۸۔ وابن ماجه ۱۲۶۵/۲ حدیث رقم ۳۸۴۹۔ واحمد فی المسند ۳/۱۔

ترجمه: حضرت ابی بکرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ منبر پر کھڑے ہوئے پھر روئے اور فرما اللہ سے بخشش مانگو اور عافیت اس لیے کہ کوئی یقین بعد نہیں دیا گیا۔ یعنی ایمان کی دولت کے بعد کوئی نعمت عافیت سے بہتر نہیں ہے اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور ابن ماجہؒ نے کہا اور امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے باعتبار سند کے۔

اسنادی حیثیت: امام ترمذیؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث باعتبار سند کے غریب ہے۔

تشریح: قوله: قام رسول الله ﷺ علی المنبر ثم بکی: آنحضرت ﷺ جانتے تھے کہ میری امت کے افراد خواہشات نفس، ہوس و حرص اور غلبہ شہوت کے فتنوں میں مبتلا ہوں گے اس لئے آپ ﷺ اس کے تصور سے بھی رونے لگے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے منبر رشد و ہدایت سے یہ حکم فرمایا کہ لوگ اللہ تعالیٰ سے اپنی مغفرت و بخشش کی طلب کریں اور عافیت مانگیں تا کہ پروردگار انہیں ان آفات

وبلاء سے محفوظ و مامون رکھے۔

قوله: سلوا الله العفو والعافية: ''عفو'' یہ ہے کہ گناہ محو ہو جائیں، اور عیوب پر پردہ پڑ جائے۔ العافية: (١) قيل: هو أن يعافيك الله من الناس و يعافيهم منك (٢) قيل: ان تعفوا عنهم ويعفوا عنك۔ زیادہ واضح بات یہ ہے جو اوپر ذکر کی چونکہ بیان کردہ دونوں معانی، لفظ ''عافیت'' کے نہیں، بلکہ ''معافاۃ'' کے ہیں۔ جیسا کہ (اہل علم پر) مخفی نہیں۔

''عافیت'' کے معنی ہیں سلامتی حاصل ہونی دین میں فتنہ سے اور جسم و بدن کو بری بیماریوں' شدید مصائب اور سخت رنج و تکلیف سے۔

قوله: فان احدا...... من العافية: سے مراد ''علم الیقین'' یعنی ایمان اور دین میں بصیرت ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: وهي السلامة من الآفات فيندرج فيها العفو۔ اھ یعنی ''عافی'' کے معنی میں چونکہ عموم ہے چنانچہ ''عفو'' کو بھی شامل ہے، اسی لئے ثانیاً صرف ''عافیت'' کو ذکر فرمایا، ''عفو'' کا ذکر نہیں کیا، اور پہلے جملہ میں دونوں کو صراحۃً ذکر فرمانا اشارہ ہے کہ ''عفو'' عافیت کی اقسام وانواع میں سے اہم ہے۔ ابن حجرؒ، امام طیبیؒ کے کلام کا خلاصہ ذکر کرنے کے بعد ''انوکھی'' بات کہی ہے: فإن قلت: كيف أفرد العافية بعد جمعها؟ قلت: لأن معنى العفو محو الذنوب، ومعنى العافية السلامة عن الأسقام والبلايا، فاستغنى عن ذكر العفو بها لشمولها له۔

ملا علی قاریؒ وجۂ غرابت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ان أخذ الذنوب من البلايا ليس من كتاب اللغة، ولا من باب التعارف، وإن كانت الصوفية قد يعبرون عن المعصية بالبلية، ولكنه من أصحاب العبارات لامن أرباب الإرشادات۔

تخریج: میرکؒ فرماتے ہیں: حاکم کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: سلوا الله العفو و العافية و اليقين في الأولىٰ والآخرة۔

سب سے بہتر دعا عافیت مانگنا ہے

۲۴۹۰: وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَجُلاً جَاءَ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَيُّ الدُّعَاءِ اَفْضَلُ قَالَ سَلْ رَبَّكَ الْعَافِيَةَ وَالْمُعَافَاةَ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ثُمَّ اَتَاهُ فِي الْيَوْمِ الثَّانِيْ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَيُّ الدُّعَاءِ اَفْضَلُ فَقَالَ لَهُ مِثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ اَتَاهُ فِي الْيَوْمِ الثَّالِثِ فَقَالَ لَهُ مِثْلَ ذٰلِكَ قَالَ فَاِذَا اُعْطِيْتَ الْعَافِيَةَ وَالْمُعَافَاةَ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَقَدْ اَفْلَحْتَ۔ (رواه الترمذى وابن ماجة وقال الترمذى هذا حديث حسن غريب اسنادا)

اخرجه الترمذى فى السنن ٤٩٩/٥ حديث رقم ٣٥١٢۔ وابن ماجه ١٢٦٥/٢ حديث رقم ٣٨٤٨۔ واحمد فى المسند ١٢٧/٣

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ تحقیق ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور اس نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ کون سی دعا بہتر ہے فرمایا اپنے رب سے عافیت مانگ۔ یعنی دین میں سلامتی اور بدن میں اور معافات یعنی۔ تجھ کو اللہ تعالیٰ عافیت سے رکھے لوگوں سے اور عافیت سے رکھے ان کو تجھ سے دنیا میں اور آخرت میں۔ پھر وہ شخص نبی کریم ﷺ کے پاس دوسرے دن آیا پھر اس نے کہا اے اللہ کے رسول کون سی دعا بہتر ہے پس فرمایا اس کی مانند یعنی جو پہلے دن فرمایا تھا۔ پھر وہ تیسرے دن آیا پس فرمایا اس سے اسی کی مانند یعنی فرمایا جس وقت تو عافیت دیا جائے اور دنیا اور آخرت میں معافات پس تحقیق چھٹکارا پایا تو نے اور مقصد کو پہنچا اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور ابن ماجہ نے اور امام ترمذیؒ نے کہا یہ حدیث غریب ہے سند کے اعتبار سے۔

تشریح: قوله: سل ربك العافية......الآخرة:

قوله: فقال له مثل ذلك: "منصوب على المصدريه" ہے۔

قوله: فقد أفلحت: أى خلصت من خوفك وظفرت بمقصودك۔ کہا گیا ہے کہ شریعت میں أفلح سے زیادہ جامع کوئی نہیں، سوائے عافیت کے اور اسی طرح نصیحت ہے۔

توضیح: هذا حديث حسن غريب إسنادا: ثانی سے تمیز کرنا مقصود ہے، چونکہ "غرابت" کبھی متن میں ہوتی ہے اور کبھی اسناد میں۔ كما هو مقرر فى أصول الفقه۔ "حسن" ہونا باعتبارِ سند ہی کے ہوتا ہے۔ لہذا اس میں ایسا کوئی ابہام نہیں کہ اس ابہام کو دور کرنے کیلئے تمیز کی ضرورت پڑے۔ چنانچہ ابن حجرؒ کا یہاں اور اس جیسی دوسری جگہوں پر یہ کہنا: "تيميز عن حسن وغريب"، کثرت غفلت یا قلت تمیز کی وجہ سے ہے۔

تخریج: امام طبرانی حضرت عباسؓ سے نقل کرتے ہیں: انه قال، قلت: يا رسول الله! علمنى شيئاً أدعوا الله به، فقال: سل ربك العافية، فمكثت أياما ثم جئت، فقلت: يا رسول الله! علمنى شيئاً أسأله ربى عزوجل، فقال: ياعمّ! سل الله العافية فى الدنيا والآخرة۔ طبرانی کی ایک روایت میں یوں ہے: ياعمّ! اكثر الدعا بالعافية۔

اللہ تعالیٰ سے محبت کا سوال کرنا

۲۴۹۱: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ يَزِيْدَ الْخَطْمِيِّ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ فِى دُعَائِهٖ اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِىْ حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ يَّنْفَعُنِىْ حُبُّهٗ عِنْدَكَ اَللّٰهُمَّ مَا رَزَقْتَنِىْ مِمَّا اُحِبُّ فَاجْعَلْهُ قُوَّةً لِىْ فِيْمَا تُحِبُّ اَللّٰهُمَّ مَا زَوَيْتَ عَنِّىْ مِمَّا اُحِبُّ فَاجْعَلْهُ فَرَاغًا لِىْ فِيْمَا تُحِبُّ۔ (رواه الترمذى)

اخرجه الترمذى فى السنن ۴۸۸/۵ حديث رقم ۳۴۹۱۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن یزید خطمیؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے یہ کہ وہ اپنی دعا میں کہتے تھے اے الٰہی مجھے اپنی دوست نصیب کر اور اس شخص کی دوستی جو مجھ کو نفع دے اس کی دوستی جو تیرے نزدیک ہے اے الٰہی جو کچھ کہ تو نے مجھ کو دیا اس چیز سے کہ میں پسند کرتا ہوں پس تو اس کو میری قوت بنا' اس چیز میں جسے تو پسند کرتا ہے یعنی جو نعمتیں تو نے دی ہیں مال اور عافیت اور نعمت دنیویہ اور اس کو طاعت اور شکر کا سبب بنا کہ خرچ کروں ان کی تیری راہ میں اور تیری رضا مندی میں۔ اے الٰہی جو کچھ سمیٹ رکھا ہے۔ مجھ سے اس چیز سے جس کو میں پسند کرتا ہوں پس اس کو میری فراغت کا سبب بنا دے اس چیز میں جس کو تو پسند کرتا ہوں۔ اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: اللهم ارزقنى حبك: اس اضافت میں دو احتمال ہیں (۱) مصدر کی اضافت اپنے فاعل کی طرف ہے۔ (۲) مصدر کی اضافت اپنے مفعول کی طرف ہے۔ پہلا احتمال زیادہ بلیغ ہے، اور اصل بھی یہی ہے، باوجودیکہ دونوں متلازم ہیں۔ اللہ جل شانہ فرماتے ہیں: ﴿يحبهم و يحبونه﴾ اور دوسرا احتمال زیادہ واضح ہے، چونکہ اول ازلی ہے، اور دعا کا تعلق حادث ہی کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور اگلے جملہ مناسبت سے بھی یہی واضح ہے۔

قوله: وحب من ينفعنى حبه عندك: ظرف "ينفعنى" کے متعلق ہے۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: وهو من يتقرب إليك بحبه من المقربين إليك۔ یہ عبارت "وہم" ہے۔ فتأمل:

قوله: اللهم ما رزقتنى......فيما تحب: حسن کی روایت میں "كما رزقنى" ہے۔

قوله: اللهم ما زويت......فيما تحب: حصن کی روایت میں اللهم وما زويت کے الفاظ ہیں۔ زويت، زیّ سے ماخوذ

ہے: بمعنی "قبض وجمع" اسی معنی میں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد گرامی ہے: اللهم أزو لنا الأرض وهوّن علينا السفر۔ أى اطوها جیسا کہ دوسری روایت میں آیا ہے۔

دعا کے آخری جز کا مطلب یہ ہے کہ تو نے مجھے مال وزر میں سے جو کچھ نہیں دیا ہے اس کو میرے لئے اپنی عبادت میں مشغولیت کا سبب بنا کہ مجھے قناعت وتوکل کی دولت حاصل رہے اور وہ مال وزر جو مجھے حاصل نہیں ہوا ہے اس سے بے پرواہ ہو کر بغیر مانع کے تیری عبادت میں مشغول رہوں اور حاصل دعا کے آخری دونوں جملوں کا یہ ہے کہ اگر تو مجھے دنیا کی نعمتیں عطا کرے تو پھر ان کا شکر ادا کرنے کی توفیق بھی عطا فرما تا کہ میرا شمار شکر کرنے والے اغنیاء کے زمرہ میں ہو اور اگر مجھے وہ نعمتیں حاصل نہ ہوں تو میرے دل کو فارغ رکھ بایں طور کہ میں ان سے بے پرواہ ہو جاؤں میرا دل ان میں نہ لگا رہے۔ میں پورے اطمینان کے ساتھ تیری عبادت میں مشغول رہوں اور جزع وفزع، شکوہ وشکایت نہ کروں تا کہ میرا شمار صبر کرنے والے فقراء میں ہو۔ قاضیؒ اور طیبیؒ نے بھی اس سے ملتی جلتی تشریح کی ہے۔

قال القاضي: يعني ما صرفت عني من محابي فتحه عن قلبه واجعله سببا لفراغي لطاعتك ولا تشغل به قلبي فيشغل عن عبادتك ـ وقال الطيبي: اى اجعل ما نحيته عني من محابي عونا لي على شغلي بمحابك وذلك ان الفراغ خلاف الشغل فاذا زوى عنه الدنيا ليتفرغ بمحابي ربه كان ذلك الفراغ عونا له على الاشتغال بطاعة الله وفي الحديث قال عمر: عجبت لما زوى الله عنك ـ

ایک جامع دعا

۲۴۹۲: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَلَّمَا كَا نَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْمُ مِنْ مَجْلِسٍ حَتّٰى يَدْعُوَ بِهٰؤُلَآءِ الدَّعْوَاتِ لِاَصْحَابِهٖ اَللّٰهُمَّ اقْسِمْ لَنَا مِنْ خَشْيَتِكَ مَا تَحُوْلُ بِهٖ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَعَاصِيْكَ وَمِنْ طَاعَتِكَ مَا تُبَلِّغُنَا بِهٖ جَنَّتَكَ وَمِنَ الْيَقِيْنِ مَا تُهَوِّنُ بِهٖ عَلَيْنَا مُصِيْبَاتِ الدُّنْيَا وَمَتِّعْنَا بِاَسْمَاعِنَا وَاَبْصَارِنَا وَقُوَّاتِنَا مَا اَحْيَيْتَنَا وَاجْعَلْهُ الْوَارِثَ مِنَّا وَاجْعَلْ ثَأْرَنَا عَلٰى مَنْ ظَلَمَنَا وَانْصُرْنَا عَلٰى مَنْ عَادَانَا وَلَا تَجْعَلْ مُصِيْبَتَنَا فِيْ دِيْنِنَا وَلَا تَجْعَلِ الدُّنْيَا اَكْبَرَ هَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا وَلَا تُسَلِّطْ عَلَيْنَا مَنْ لَّا يَرْحَمُنَا۔

(رواه الترمذى وقال حديث حسن غريب)

اخرجه الترمذى فى السنن ٤٩٣/٥ حديث رقم ٣٥٠٢۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب کسی مجلس سے اٹھتے تھے یہاں تک کہ یہ دعائیں اپنے صحابہ کے لئے مانگتے تھے یعنی اس لیے کہ وہ اس میں داخل ہیں یا ان کی تعلیم کے لیے۔ اے الٰہی! ہمارے لیے اپنا خوف نصیب کر اس قدر کہ تو اس کی وجہ سے ہمارے اور ہمارے گناہوں کے درمیان حائل ہو جائے یعنی اس ڈر کے سبب سے تیرے گناہوں سے بچیں اور ہمیں اپنی طاعت نصیب فرما۔ اس قدر کے تو ہم کو اس کی وجہ سے اپنی بہشت میں پہنچائے اور یقین سے نصیب اچھے کر اس قدر کہ جس کی وجہ سے ہم پر دنیا کی مصیبتیں ٹل جائیں اور بہرہ مند کر ہم کو ہماری سماعتوں کے ساتھ بہرہ مند فرما اور ہماری بے تابیوں کو ہماری قوت کے ساتھ بہرہ مند فرما، جب تک کہ تو ہم کو زندہ رکھے اور بہرہ مندی کو ہمارا وارث بنا یعنی اخیر عمر تک اس کو باقی رکھ۔ یعنی تمام عمر اعضاء اور ہمارے حواس کو سلامت رکھ۔ ہمارے کینہ وانتقال میں اس شخص کو مشغول کر جنہوں نے ہم پر ظلم کیا ہے یعنی ہم کو ظالموں پر بدلہ لینے پر قادر کر دے۔ یا ہماری طرف سے بدلہ لے اور ہم کو فتح دے اس سے جو ہم سے دشمنی رکھے دشمن دینی ہو یا دنیوی اور ہماری مصیبت

ہمارے دین میں شمار نہ کر یعنی ایسی چیزوں میں مبتلا نہ کر' جو دین کے نقصان کا باعث ہوں اور دنیا کو ہمارے لئے بہت بڑا اندیشہ نہ کر وا ور نہ ہمارے علم کو مطمع نظر بنا اور ہم پر اس کو مسلط نہ کر کہ جو ہم پر رحم نہ کرے۔اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

تشریح:قوله: اللهم اقسم من خشيتك......معاصيك: ''خشية''خوف مع التعظيم کو کہتے ہیں۔ما تحول به: أى مقدارا تحجب أنت بسببه۔چونکہ معاصی اور ہمارے درمیان آپ کی خشیت سے بڑھ کر کوئی مانع نہیں، حدیث میں آتا ہے:نعم العبد صهيب لولم يخف الله لم يعصه۔ان کے کمال کو مبالغہ کے ساتھ بیان فرمایا، کہ ان میں ترک عصیان محبت سے پیدا ہوا ہے نا کہ اس رهب مع الخشيه سے جوخوف سے ''اخص'' ہے۔جیسا کہ ہم نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ایک نسخہ میں ''یحول'' ہے، یعنی یائے تحتانیہ کے ساتھ، اور ''به'' مذکور نہیں ہے۔أى: قدرا يمنع بيننا وبينها۔ حال يحول حيلولة سے ماخوذ ہے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں:أى بسببه أو هى باء الآلة، وكلاهما مجاز اھ۔ابن حجرؒ کا یہ کلام درست نہیں ہے، چونکہ حقیقت کے اعتبار سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، مزید یہ کہ اللہ جل شانہ کے حق میں '' آلہ'' کا اطلاق خطاً فاحش ہے۔اور اگر مجاز سے مراد حقیقت کی ضد ہے باعتبار لغت، تو واضح رہے کہ ارباب لغت کا کہنا ہے کہ:انهما حقيقتان فى معنييهما۔چنانچہ قاموس میں لکھتے ہیں: باء برائے سببیت ہے: ﴿فكلاّ أخذنا بذنبه﴾ (۲) ﴿إنكم ظلمتم أنفسكم باتخاذكم العجل﴾ اور ''استعانت'' کیلئے ہے: ''كتبت بالقلم وتجرت بالقدوم اور اسی قبیل سے بائے ''بسمله'' ہے اھ ان مثالوں کے ذکر کرنے میں ایک قسم کی تنبیہ بھی ہے اور اپنی کہی ہوئی بات کہ توجیہ وجیہ بھی کہ اللہ جل شانہ افعال پر سببیت کا اطلاق اور دوسروں کے افعال میں بھی۔بخلاف آلہ واستعانت کے۔چونکہ اللہ جل شانہ ان دونوں سے منزہ ہے۔''ماتبلغنا'':از باب تفعيل، واحد مذکر حاضر کا صیغہ ہے۔

قوله:ومن طاعتك ما تبلغنا به جنتك: ابن حجرؒ نے اس کی تشریح یہ بیان کی ہے:أى نصيبا وافرا يحصل لنا بتلغنا۔اس کے ظاہر سے یوں لگتا ہے کہ تبلغنہ باب تفعّل کا مصدر ہے روایۃً اور درایۃً ہر اعتبار سے خطا ہے۔مزید لکھتے ہیں أبان تدخلنا مع الناجين یہ تشریح اس مقام کے مناسب نہیں ہے۔

قوله:ومن اليقين ما تهون به علينا مصيبات الدنيا:

ایک روایت میں ''مصائب الدنيا'' ہے۔

''ہمیں اتنا یقین عطا فرما'' کا مطلب یہ ہے کہ تو اپنی ذات وصفات پر اور سرکارِ دو عالم ﷺ کے ارشادات وتعلیم پر ہمیں اس درجہ کا یقین واعتماد عطا فرما کہ دنیا کی سختیاں اور یہاں کے مصائب وآلام ہمارے لئے آسان ہوں۔مثلاً جس شخص کو یہ یقین ہوگا کہ اللہ تعالیٰ رزاق ہے ہر جاندار کی ضروریاتِ زندگی پورا کرتا ہے تو اسے ہرگز کوئی فکر نہیں ہوگی اور وہ اس کی ذات پر بھروسہ واعتماد کرے گا اسی طرح جسے اس یقین کی دولت حاصل ہو جائے گی کہ آخرت کی سختیاں اور وہاں کے مصائب زیادہ سخت ہیں۔دنیا کی سختیاں بالکل ناپائیدار اور ختم ہو جانے والی ہیں ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے تو اس کے لئے دنیا کی مصیبتیں آسان ہو جائیں گی۔

ہم دنیا کی بہت زیادہ فکر وتدبیر میں نہ لگے رہیں۔بلکہ آخرت کی فکر' وہیں کے اندیشہ کا زیادہ خیال رکھیں' دنیا کی صرف اتنی ہی فکر اور اپنے معاش کا اتنا ہی خیال رکھیں جو ضروری ہے اور جس کے لئے نہ صرف ہمیں اجازت ہے بلکہ مستحب بھی ہے۔

اور اس بات کا یقین کہ کوئی آپ کی قضاء وقدر کو ردّ کرنے والا نہیں، جو کچھ آپ نے لکھ دیا ہے وہ ہو کر رہے گا۔آپ نے جس کو جو طاقت وقوت دی ہے، حکمت ومصلحت سے خالی نہیں۔

ایک روایت میں ''ما یهون علینا'' ہے اور ''به'' کا اضافہ بھی نہیں ہے۔اس روایت کا تقاضا یہ ہے کہ آخر میں یاء ہونا چاہئے اور ''به'' کے اثبات کا تقاضا یہ ہے کہ تائے مثناۃ کے ساتھ ہو۔

قوله: ومتعنا بأسماعنا وأبصارنا وقوتنا ماأحييتنا:

یعنی ہماری سماعت، بصارت وقوت سے نفع اٹھانے کی توفیق عطا فرما کہ ہم ان کو آپ کی اطاعت میں صرف کریں۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں: **سمع وبصر** سے نفع اٹھانے کا مطلب یہ ہے کہ ہماری موت کے وقت تک یہ تمام صحیح وسالم رہیں۔اور کہا گیا ہے کہ سمع سے مراد **ما یسمع**،اور بصر سے مراد **ما یبصر** ہے۔باقی قوی کے بارے میں بھی اسی طرح مراد ہے۔

''**ما أحيتنا**'': (میں ''ما'' مصدریہ ظرفیہ ہے۔) **أي مدة حياتنا۔**

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: حواس میں سے سمع وبصر کی وجہ تخصیص یہ ہے کہ توحید اور معرفت باری تعالیٰ تک لے جانے والے دلائل انہی دو ذرائع سے حاصل ہوتے ہیں۔چونکہ براہین آیات سے ماخوذ ہوتے ہیں، اور یہ بذریعہ سمع ہوتا ہے یا جہاں میں پھیلی ہوئی نشانیوں سے ماخوذ ہوتے ہیں۔اور اس کا ادراک بذریعہ بصر ہوتا ہے۔چنانچہ ان دو اعضاء سے متمتع ہونے کا سوال کیا۔تاکہ جن لوگوں کے دلوں اور کانوں پر اللہ تعالیٰ نے مہر لگادی ہے ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور انہی دو اعضاء سے معرفت حاصل ہوتی ہے اور اسی معرفت پر ''عبادت'' کا ترتب ہوتا ہے، چنانچہ ''قوت'' کا سوال بھی کیا تاکہ اپنے رب کی عبادت پر تمکن حاصل ہو سکے۔اھ

آیت اور حدیث دونوں میں سمع کا ذکر بصر سے مقدم ہے۔جمہور کا قول ہے کہ یہ تقدیم سمع کی اُفضیلت پر دلالت کر رہی ہے....

عرض مرتب: اس موضوع پر کلام ماقبل میں گزر چکا ہے، وہاں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔اھ

قوت سے مراد: اس سے مراد تمام اعضاء وحواس کی قوت ہے۔یا تمام حواس کی قوت مراد ہے۔اس صورت میں ''بہ'' تعمیم بعد تخصیص کی قبیل سے ہوگا۔ابن حجرؒ لکھتے ہیں: **وبما تقرر علی وجه ذكر هذين دون بقية الحواس، ثم رأيت الشارح صرح بما ذكرته فقال: وإنما خص السمع والبصر الخ۔**

ملا علی قاریؒ اس کی تردید میں لکھتے ہیں: **وأما قول ابن حجر: . . . . فمردود لأن مراد الطيبي أنه إنما خص السمع والبصر سابقا مع دخولهما في تعميم قوتنا لاحقا، لا أنه إنما خصّا بالذكر بمعنى أنه لم يذكر غيرهما من القوى الظاهرية والباطنية فقال: لأن الفرق دقيق وبالتأمل حقيق۔**

قوله: واجعله الوارث منا: ضمیر غائب ''**ما متعنابه**'' کی طرف عائد ہے۔**أي اجعل كل واحد منها يعني اجعل مامتعنا به**۔زین العرب فرماتے ہیں: زمخشری نے ضمیر کو مصدر محذوف کی طرف لوٹایا ہے، **أي اجعل الجعل، أو جعلا الوارث من عشيرتنا**۔چنانچہ ''منّا'' مفعول ثانی ہوگا، **جعل** کیلئے۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ضمیر مصدر کی طرف راجع ہے۔**أي اجعل الجعل**۔اور ''**الوارث**'' مفعول اوّل ہے۔اور ''منا'' مفعول ثانی کی جگہ ہے۔**أي اجعل الوارث من نسلنا، لا كلالة فارجة عنا**۔صاحب کشف الکشاف لکھتے ہیں: عقلاء کے ہاں یہی معنی مقصود ہیں، اللہ جل شانہ حضرت زکریا علیہ السلام کے بارے میں فرماتے ہیں: ﴿**فهب لي من لدنك وليا يرثني ويرث من آل يعقوب**﴾ اور یہ اولیٰ ہے....

اور اس وجہ سے بھی اصل عدم تاویل ہے کہ اس کی تائید اس آیت مبارکہ سے بھی ہو رہی ہے: ﴿**رب لا تذرني فردا وأنت خير الوارثين**﴾ ابن حجرؒ نے اس قول پر بے سود گرفت کی ہے۔اسی وجہ سے ہم یہاں ابن حجرؒ کا کلام ذکر نہیں کر رہے۔اور کہا گیا ہے کہ ضمیر مصدر التمتیع کی طرف لوٹ رہی ہے، وہ اس کا مفعول اول ہے اور ''**الوارث**'' مفعول ثانی ہے، اور ''منا'' اس کا صلہ ہے۔**أي اجعل**

التمتیع باقیاسنا مأثورا فیمن بعدنا۔اس کا ایک مطلب یہ بیان کیا گیا ہے:وفقنا لحیازۃ العلم لا المال حتی یکون العلم هو الذی یبقی منا۔

کہا گیا ہے کہ ضمیر بتاویل ''مذکور'' اسماع، ابصار وقوت کی طرف راجع ہے۔أی: اجعل المذکور باقیا لازما عند الموت لزوم الوارث۔

صاحب ''الکشاف'' لکھتے ہیں: مراد یہ ہے کہ ان اعضاء کو ہماری موت تک ہمارے ساتھ صحیح وسالم رکھ اور اس میں مبالغہ کرتے ہوئے فرمایا ان کو ایسا بنا گویا کہ موت کے بعد بھی باقی رہیں۔چونکہ وارث موت کے بعد باقی رہتا ہے اور کہا گیا ہے کہ ضمیر اس ''تمتع'' کی طرف راجع ہے جس پر ''تمتیع'' دلالت کر رہا ہے۔اور مطلب یہ ہے:اجعل تمتعنا باقیامنا محفوظا لنا إلی یوم الحاجة۔اور خطابیؒ نے ذکر کیا ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ جل شانہ سے یہ سوال کیا کہ جب میں بڑھاپے کو پہنچ جاؤں اور میرے تمام اعضاء کمزور پڑ جائیں تو سمع وبصر کو باقی رکھنا تا کہ یہ دونوں اعضاء میری تمام قوتوں اور تما اعضاء کے وارث ہو جائیں۔اھ

یہ کلام محل نظر ہے چونکہ قوت سامعہ وباصرہ انفع القوی ہیں، اس لئے اولا ان دونوں کو خصوصی طور پر ذکر فرمایا، اور پھر تعمیماً ذکر فرمایا۔

اور کہا ہے کہ یہ مراد اولیٰ ہے:لا ینقطع هذا الفیض الإلهی عنه، وعن أتباعه لکونه رحمة للعالمین وهدی للمتقین۔

قوله:واجعل ثأرنا علی من ظلمنا:

''ثأر'':بالهمز بعد المثلثة المفتوحة۔اس کے اصل معنی ''حقد'' و''غضب'' ہیں۔کہا جاتا ہے:ثأرت القتیل وبالقتیل أی قتلت قاتلی۔ابن حجرؒ فرماتے ہیں:ثوران سے مؤخوذ ہے کہا جاتا ہے:ثار أی هاج غضبه۔ازروئے لغت یہ کھلم کھلا خطا ہے۔چونکہ ''ثأر''، مہموز العین ہے، اور ثار معتل العین ہے۔لہٰذا دونوں کا مادّہ جدا ہے، جیسا کہ قاموس اور نہایہ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ممکن ہے کہ ابن حجرؒ کے نسخہ میں ثارنا الف کے ساتھ ہو، یا انہوں نے الف کے ساتھ پڑھا ہو۔لیکن بہرحال حجت نہیں۔چونکہ ہمزہ ساکنہ کو سب ہی ابدال کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

قوله:ولا تجعل مصیبتنا فی دیننا:یعنی ہمیں ایسی مصیبتوں میں مبتلا نہ کر جو دین کے نقصان کا باعث ہوں، کہ ہم سوءِ اعتقاد کا شکار ہو جائیں، یا حرام خوری میں مبتلا ہو جائیں، یا عبادت میں سستی وکوتاہی ہونے لگے وغیرہ۔

قوله:لا تجعل الدنیا اکبر همنا:دنیا کو ہماری سوچ اور فکر مت بنا، کہ ہم مال وجاہ کے چکر میں پڑ جائیں، اور اس کی تحصیل میں لگ جائیں، بلکہ ہماری سوچ اور فکر کا محور اعمال آخرت کو بنا۔اس جملہ میں اشارہ ہے کہ معاش کی تھوڑی بہت سوچ اور فکر نا صرف مرخص و مستحب بلکہ واجب ہے۔اور ابن حجرؒ یوں لکھتے ہیں:وخرج بأکبر ما لوساوی هم الخیر وهم الدنیا أو نقص الثانی، إذ صاحبه من أهل الجنة۔ابن حجرؒ کی ذکر کردہ تشریح مقامِ دعا کے مناسب نہیں۔

قوله:ولا مبلغ علمنا:یعنی ہمیں ایسا فکر مند بنا دے کہ ہم ایسے علوم میں لگے رہیں کہ جو اللہ جل شانہ اور دار آخرت سے تعلق رکھتے ہیں۔مبلغ:الغایة التی یبلغه الماشی ولمحاسب فیقف عنده۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿فأعرض عمن تولی عن ذکرنا ولم یرد الا الحیاة الدنیا ذلك مبلغهم من العلم﴾ اور دوسری جگہ فرمایا:﴿یعلمون ظاهرا من الحیاة الدنیا وهم عن الآخرة هم غافلون﴾ حدیث میں اس عالم کی مدح فرمائی ہے جس کا حال اس کے برعکس ہو۔چنانچہ فرمایا:أکثر أهل الجنة البله۔ أی لا یعلمون أمور الدنیا وهم بالآخرة عالمون موقنون۔

قوله:ولا تسلط علینا من لا یرحمنا:اس سے مراد کافر ہیں، یا ظالم امراء ہیں، یا بیوقوف جہلاء ہیں۔خلاصہ یہ کہ اللہ ان جیسے

لوگوں کو ہم پر مسلط نہ کرے اور امام طیبیؒ لکھتے ہیں: **أی لا تجعلنا مغلوبین للكفار والظلمة ويحتمل أن يراد: ولا تجعل الظالمين علينا حاكمين، فان الظالم لا يرحم لرعية** ...... ۔ اولیٰ یہ ہے کہ اس سے مراد قبر کے ملائکہ ہوں۔ یہ مفہوم مراد لینے کی صورت میں ''**وانصرنا علی من عادانا**'' کے ساتھ تکرار لازم نہیں آئے گا اھ۔ اولیٰ یہ ہے کہ معنی اعم پر محمول کیا جائے۔ اس صورت میں تعمیم بعد التخصیص ہوگی۔ چونکہ تخصیص کی تقریر پر بھی تکرار سے خلاصی ممکن نہیں۔

ابن حجرؒ لکھتے ہیں: **من لا يرحمنا للكفر أو عتو أو بدعة أو محنة نحو مال يريده منا بأن تجعل له شوكة يتمكن بها على ما يريده منا**۔ یہ سارا مفہوم **من عادانا** کے تحت پہلے سے شامل ہے، لہٰذا مزید یہ کہنا درست نہیں: **وبما قررته يعلم أن قوله: وانصرنا على من عادانا لا يغني عن هذا خلافا لمن زعمه**۔ آگے لکھتے ہیں: **وانما سألوا ذلك لضعفهم عن احتمال فتنة البصر عن الأذية**۔ یہ بھی خطا فاحش ہے، چونکہ یہ دعا مانگنے والا اللہ کا نبی ہے۔ اور اس کے ساتھ موجود لوگ صحابہ کرام ہیں، جو کاملین ہیں جن کے بارے میں قرآن کریم یوں کہہ رہا ہے: ﴿**والصابرين فى البأساء والضراء وحين البأس**﴾ نبی کریم ﷺ کے اس سوال میں اظہار عبودیت ہے، اور اشارہ ہے کہ عافیت مصیبت میں مبتلا ہونے سے زیادہ وسیع ہے، وقوع بلاء سے، پہلے کیلئے حکم یہی ہے۔ اور مصیبت میں مبتلا ہوجائے تو حکم یہ ہے: ﴿**وما صبرك الا بالله**﴾ اور ﴿**واصبروا ان الله مع الصابرين**﴾ چنانچہ اللہ کی طرف کامل رجوع کریں گے اور یہ مانگیں گے: ﴿**ربنا أفرغ علينا ضرار وتوفنا مسلمين**﴾۔

علم کی زیادتی کا سوال کرنا

۲۴۹۳: **وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ كَا نَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ انْفَعْنِىْ بِمَا عَلَّمْتَنِىْ وَعَلِّمْنِىْ مَا يَنْفَعُنِىْ وَزِدْنِىْ عِلْمًا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى كُلِّ حَا لٍ وَّاَعُوْذُ بِا للّٰهِ مِنْ حَالِ اَهْلِ النَّارِ**۔

(رواه الترمذی و ابن ما جة وقال الترمذی هذا حديث غريب اسنادا)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵۴۰/۵ حديث رقم ۳۵۹۹۔ وابن ماجه ۹۲/۱ حديث رقم ۲۵۱۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کہتے تھے اے الٰہی نفع دے مجھ کو اس چیز سے جو تو نے مجھ کو سکھلائی یعنی عمل علم پر نصیب ہو اور مجھ کو وہ چیز سکھا جو نفع دے مجھ کو۔ یعنی ایسا علم دے کہ نفع دے مجھ کو۔ وہ اور عمل کرنا اس پر دین میں اور آخرت میں اور میرے علم کو زیادہ کر یعنی علم دین کا سب تعریف ہے اللہ تعالیٰ کے واسطے بہر حال اور میں پناہ مانگتا ہوں فوزخیوں کے حال سے یعنی دنیا میں کفر و فسق سے بچوں اور آخرت میں عذاب سے۔ اس کو امام ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ اور امام ترمذیؒ نے کہا کہ حدیث غریب ہے باعتبار سند کے۔

تشریح: **قوله: اللهم انفعنى...... وزدنى علما**: امام طیبیؒ اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: **أى اجعلنى عالما يعلمى، وعلمنى علما أعمل به**۔ اس جملہ میں اس حدیث مبارکہ کی طرف اشارہ ہے۔ **من عمل بما علم ورثه الله علم مالم يعلم** اور مزید علم کی طلب کرنا یہ ''سلوک'' کی انتہاء ہے۔ کہا گیا ہے کہ اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو علم کے علاوہ کسی بھی شیٔ کے مزید طلب کرنے کا حکم نہیں، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**وقل رب زدنی علما**﴾

قوله: زدنى علما: علم ''لدنی'' عطا فرما۔ جو آپ کی ذات، اسماء وصفات سے تعلق رکھتا ہے۔ اس جملہ سے پتہ چلا کہ علم کو عمل پر فضیلت حاصل ہے۔

قوله: الحمد لله على كل حال: یعنی مزید نعمتوں کے حصول کیلئے بندہ کو چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کرے۔ ارشاد باری

تعالیٰ ہے: ﴿لئن شکرتم لأزیدنکم﴾

تخریج: اس حدیث کو امام نسائی اور حاکم نے حضرت انس سے بایں الفاظ نقل کیا ہے:

اللهم انفعني بما علمتني وعلمني ما ينفعني، وارزقني علما تنفعني به۔

وحی کی کیفیت کا بیان

۲۴۹۴: وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ الْوَحْيُ سُمِعَ عِنْدَ وَجْهِهٖ دَوِيٌّ كَدَوِيِّ النَّحْلِ فَأُنْزِلَ عَلَيْهِ يَوْمًا فَمَكَثْنَا سَاعَةً فَسُرِّيَ عَنْهُ فَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ وَرَفَعَ يَدَيْهِ وَقَالَ اللّٰهُمَّ زِدْنَا وَلَا تَنْقُصْنَا وَاَكْرِمْنَا وَلَا تُهِنَّا وَاَعْطِنَا وَلَا تَحْرِمْنَا وَاٰثِرْنَا وَلَا تُؤْثِرْ عَلَيْنَا وَاَرْضِنَا وَارْضَ عَنَّا ثُمَّ قَالَ اُنْزِلَ عَلَيَّ عَشْرُ اٰيَاتٍ مَنْ اَقَامَهُنَّ دَخَلَ الْجَنَّةَ ثُمَّ قَرَأَ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى خَتَمَ عَشْرَ اٰيَاتٍ۔ (رواه احمد والترمذي)

اخرجه الترمذي في السنن ٥/٣٠٥ حديث رقم ٣١٧٣۔ واحمد في المسند ١/٣٤۔

ترجمہ: حضرت عمر بن خطابؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جس وقت وحی اترتی تھی حضور ﷺ کے منہ کے پاس سے شہید کی مکھی کی آواز کی طرح سنی جاتی پس ایک دن ان پر وحی اتاری گئی پھر ہم ایک ساعت ٹھہرے۔ یعنی منتظر رہے۔ پس سختی جو وحی کے اترنے کی وجہ سے وارد ہوئی، رفع ہوگئی پس وہ حالت حضور ﷺ سے دور کی گئی تو حضور ﷺ قبلہ کے سامنے ہوئے اور اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور کہا اے الٰہی زیادہ کر ہم کو یعنی دنیا و آخرت کی نعمتیں یا مسلمان بہت ہوں اور ہمارے لیے دنیا و آخرت میں کمی نہ ہو۔ یا مسلمانوں کو کم نہ کرو اور ہمارا اکرام کرو۔ حاجت روائی کے ساتھ اور ہم کو ذلیل نہ کر۔ یعنی مذکورہ چیزوں کے نہ ہونے کی وجہ سے اور ہم کو دنیا و آخرت کی خیر دے اور ہم کو محروم نہ کر اور ہم کو برگزید کر۔ یعنی رحمت و عنایت اپنی کے ساتھ اور برگزید نہ کر ہم پر یعنی ہمارے علاوہ کو لطف و حمایت کے ساتھ اور دین کے دشمنوں کو غالب نہ کر ہم پر اور راضی کر ہم کو یعنی اپنی قضا پر صبر اور شکر کی توفیق دینے سے اور ہم سے راضی ہو جائے تھوڑی فرمانبرداری سے پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مجھ پر ابھی دس آیتیں اتاری گئی ہیں اور جو شخص ان کو برپا رکھے یعنی پڑھا کرے۔ ان کو یعنی ان پر عمل کرتا رہے گا۔ تو وہ بہشت میں نیکیوں کے ساتھ داخل ہوگا۔ پھر حضور ﷺ نے یہ آیتیں پڑھیں تحقیق مؤمنوں نے فلاح پائی یہاں تک کہ دس آیتیں ختم کی۔ اس کو امام احمدؒ اور ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله: اذا أنزل عليه**: ایک نسخۂ صحیحہ میں صیغۂ مجہول کے ساتھ آیا ہے۔ از باب افعال۔ **سمع**: بصیغۂ مجہول کے ساتھ ہے۔ **عند وجهه**: مضاف محذوف ہے۔ **أي عند قرب وجهه**۔ **دوی**: ناقابل فہم آواز کو کہتے ہیں۔ یہاں حضرت جبرائیل علیہ السلام کی آواز مراد ہے۔ جو اس وقت رسول اللہ ﷺ کو وحی پہنچا رہے تھے۔ اور حاضرین مجلس کو ان کی آواز سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ امام طیبیؒ لکھتے ہیں: **أي: سمع من جانب وجهه وجهته صوت خفي كأن الوحي كان يؤثر فيهم وينكشف لهم انكشافا غير تام، فصاروا كمن يسمع دوي صوته، ولا يفهمه أو أراد لما سمعوه من غطيطه وشدة تنفّسه عند نزول الوحي**۔ ابن حجرؒ لکھتے ہیں: **أي: "عند القرب من وجهه" وادعى أن هذا أوضح وهو غير واضح۔ فضلاً عن أن يكون أوضع**۔ امام طیبیؒ نے یہاں حاصل معنی مراد لئے ہیں۔ وگرنہ تو حقیقت یہ ہے نبی کریم ﷺ کے رخ زیبا کے قریب کوئی بھی نہیں ہوتا تھا کہ اس کی آواز مکھی کی بھنبھناہٹ کی طرح سنائی دے۔ نبی کریم ﷺ جب وحی کے سماع میں مشغول ہوتے تو ہانڈی کے جوش مارنے، زور زور سے سانس لینے کی آواز آتی تھی، اور فرشتہ کی آمد کی وجہ سے سانس متواتر ہو جاتا، صلصلۃ الجرس کی مانند۔ اس لئے کہ قوت بشریہ اس کے تحمل کی قدرت

نہیں رکھتی، اور وحی کے ثقل کی وجہ سے پسینہ پسینہ ہو جاتے تھے اس آیت کریمہ میں اسی طرف اشارہ ہے: ﴿انا سنلقی علیك قولا ثقیلا﴾ نزول وحی کے وقت کی تفصیلی کیفیات کیلئے کتاب الایمان کا مطالعہ فرمائیے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: مبالغہ وتاکید کی غرض سے نواہی کا عطف اوامر پر کیا ہے، اور تعمیم کی غرض سے مفعولات کو حذف کر دیا ہے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں: **انه أفاد بحذف المفعول الثانی هنا، وفیما یأتی اجراء لهذا مجری فلان یعطی مبالغة وتعمیما اھ۔قاله تبعا للطیبیؒ:**

آنحضرت ﷺ پر جب وحی نازل ہوتی تھی اور حضرت جبرائیل علیہ السلام کلام الٰہی کو آپ ﷺ تک پہنچاتے تھے تو صحابہؓ حضرت جبرائیل علیہ السلام کی آواز کو سنتے تو تھے مگر اسے سمجھ نہیں پاتے تھے جیسا کہ شہد کی مکھی کی آواز سنی تو جاتی ہے مگر سمجھ میں نہیں آتی اسی لئے حضرت جبرئیل علیہ السلام کی اس آواز کو حضرت عمر فاروقؓ نے شہد کی مکھی کی آواز سے مشابہت دی۔ وہ دس آیتیں اس وقت آنحضرت ﷺ پر نازل ہوئی تھیں اور جن پر عمل کرنے والے کے لئے مذکورہ بالا حدیث میں آپ ﷺ نے بشارت عطا فرمائی یہ ہیں: قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ○ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ○ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّکٰوةِ فَاعِلُوْنَ○ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ○ اِلَّا عَلٰی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ○فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ○ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ○وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلٰوتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ○ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوَارِثُوْنَ○ الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ۔ بے شک وہ ایمان والے راستگار ہو گئے (یعنی انہوں نے فلاح پائی) جو نماز میں (باطنی وظاہری طور پر) عجز ونیاز کرتے ہیں اور جو بے ہودہ چیزوں سے خواہ وہ کہنے کی ہوں یا کرنے کی منہ موڑتے ہیں اور جو زکوۃ ادا کرتے ہیں اور جو حرام کاری سے اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں مگر اپنی بیویوں سے یا اپنی کنزیوں سے صحبت کرتے ہیں تو ان پر کوئی ملامت نہیں۔ ہاں جو اس کے علاوہ کے طالب ہوں (یعنی جو لوگ اپنی بیویوں سے اور کنیزوں کے علاوہ دوسرے افعال بد میں مبتلا ہوں۔ مثلاً اغلام بازی، جلق یا متعہ وغیرہ کریں) تو وہ خدا کی مقرر کی ہوئی حد سے (یعنی دائرہ حلال سے) تجاوز کرنے والے (اور حرام میں مبتلا ہونے والے) ہیں اور جو امانتوں اور عہد وپیمان کی محافظت کرتے ہیں اور جو نمازوں کی پابندی کرتے ہیں (یعنی شرائط وآداب کے ساتھ نمازیں پابندی سے ادا کرتے ہی) یہی وہ لوگ ہیں جو وارث ہیں کہ یہی فردوس کے مالک ہوں گے (جو جنت کا اعلیٰ درجہ ہے) وہ لوگ (یعنی یہ مؤمنین جن کی یہ صفات بیان کی گئی ہیں) اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

الفصل الثالث:

بینائی کی محرومی پر صبر کرنے سے جنت کا وعدہ

۲۴۹۵: عَنْ عُثْمَانَ بْنِ حُنَیْفٍ قَالَ اِنَّ رَجُلاً ضَرِیْرًا لُبَصَرِاَتَی النَّبِیَّ ﷺ فَقَالَ اُدْعُ اللّٰهَ اَنْ یُعَافِیَنِیْ فَقَالَ اِنْ شِئْتَ دَعَوْتُ وَاِنْ شِئْتَ صَبَرْتَ فَهُوَ خَیْرٌ لَّكَ قَالَ فَادْعُهُ قَالَ فَاَمَرَهُ اَنْ یَتَوَضَّأَ فَیُحْسِنَ الْوُضُوْءَ وَیَدْعُوَ بِهٰذَا الدُّعَاءِ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُكَ وَاَتَوَجَّهُ اِلَیْكَ بِنَبِیِّكَ مُحَمَّدٍ نَبِیِّ الرَّحْمَةِ اِنِّیْ تَوَجَّهْتُ بِكَ اِلٰی رَبِّیْ لِیَقْضِیَ لِیْ فِیْ حَاجَتِیْ هٰذِهٖ اَللّٰهُمَّ فَشَفِّعْهُ فِیَّ۔ (رواہ الترمذی وقال هذا حدیث حسن صحیح غریب)

اخرجه ابن ماجه فی السنن ۱/۴۴۱ حدیث رقم ۱۳۸۵۔ واحمد فی المسند ۴/۱۳۸۔

ترجمہ: حضرت عثمان بن حنیف سے روایت ہے کہ تحقیق ایک شخص کم سوجھ یا اندھا نبی کریم ﷺ کے پاس آیا۔ پس

اس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو کہ اللہ تعالیٰ عافیت دے مجھ کو یعنی آنکھ کے خلل سے۔فرمایا اگر تو چاہے تو میں تیرے لیے دعا کروں۔پس اگر تو چاہے تو صبر و رضا سے کام لے پس تیرے لیے صبر کرنا بہتر ہے اس نے کہا اللہ تعالیٰ کی جناب میں دعا کیجئے پس حضرت عثمانؓ نے کہا۔پس آپ ﷺ نے حکم کیا اس کو یہ کہ وضو کرے۔پس اچھا وضو کرے یعنی آداب اور سنتوں کے ساتھ اور ایک روایت میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے دو رکعت نماز پڑھنے کا حکم کیا اور یہ دعا مانگے اے الٰہی تحقیق میں سوال کرتا۔تجھ سے اپنے مقصود کا اور تیری طرف متوجہ ہوتا ہو تیرے نبی ﷺ کے ساتھ وسلیہ پکڑتے ہوئے کہ محمد ﷺ رحمت والے ہیں تحقیق میں متوجہ ہوتا۔پس تمہارے وسیلے کے ساتھ اے اے نبی اپنے پروردگار کی طرف تا کہ وہ میری حاجت کے لیے حکم کرے یہ ہے اے الٰہی! نبی کی شفاعت میرے حق میں قبول کر۔اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

راویٔ حدیث:

عثمان بن حنیف۔ یہ عثمان بن حنیف ''انصار'' میں سے ہیں۔''سہل'' کے بھائی ہیں۔ان کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آبادی عراق کی پیمائش اور اس پر ٹیکس مقرر کرنے کا حاکم بنا دیا تھا۔انہوں نے وہاں کے رہنے والوں پر خراج اور جزیہ مقرر فرمایا تھا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ''بصرہ'' کا حاکم بنایا تھا۔پھر حضرت طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم نے ان کو نکال دیا جب کہ یہ دونوں بصرہ آئے۔واقعہ جنگ جمل کی وجہ سے ایسا ہوا۔اس کے بعد یہ کوفہ میں مقیم رہے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک زندہ رہے۔ان سے ایک گروہ روایت کرتا ہے۔
''حنیف'' حائے مہملہ کے ساتھ ہے'اسم مصغر ہے۔

اسنادی حیثیت: امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔

تشریح: قوله: فهو خير لك اس بنیاد پر فرمایا کہ ایک دوسری حدیث میں آتا ہے: **ان الله تعالىٰ قال: اذا ابتليت عبدى بحبيبتيه ثم صبر عوضته منهما الجنة۔** ابن حجرؒ لکھتے ہیں: **ولو من عين واحدة۔** اھ۔لیکن یہ محل کلام ہے، چونکہ اس میں نص کی مخالفت ہے، اور اس وجہ سے بھی کہ ایک آنکھ نہ ہونے کی صورت میں بھی دوسری سے کام چلتا ہے، چنانچہ ضرورت کاملہ نہ رہی۔
فادعه: اس میں دو احتمال ہیں۔(۱) یہ ہائے ضمیر ہے۔اس کا مرجع لفظ اللہ ہے۔**أى: ادع الله:** یا ''عافیہ'' ہے۔**أى: أسأل العافية۔**
(۲) ہائے سکتہ ہے۔

ابن حجرؒ لکھتے ہیں: **وانما اختار الدعا لأنه أيسر الأمرين مع امكان حصول الآخر، فانه ليس هناك ما يدل على منع الجمع، بل فيه ما يشعر بأن هناك ما يدل على منع الخلو فيه ان من خير بين أمرين فأختار المفضول منهما لا حرج عليه، على أن يحتمل أن ذلك الرجل ظن أن فى عود بصره اليه مصالح دينية يفوق ثوابها ثواب الصبر** اھ۔
میں کہتا ہوں یہ ''علی'' برائے ضرر ہے، چونکہ ایسا گمان کیوں کر ہوسکتا ہے کہ ایک طرف تو **فهو خير لك** فرمایا۔جو اس آیت کی طرف اشارہ ہے:

﴿**عسى أن تكرهوا شيئا وهو خيرلكم**﴾[النساء:۱۹] اور ہماری اس تقریر کی تائید امام طیبیؒ کے کلام سے بھی ہوتی ہے۔فرماتے ہیں: **أسند النبىﷺ الدعا الى نفسه، وكذا طلب الرجل أن يدعو هو ﷺ ثم أمرهﷺ أن يدعو هو أى الرجل، كانه لم يرض منه اختياره الدعا لما قال: الصبر خيرلك، لكن فى جعله شفيعا له وسيلة فى استجابة الدعا ما يفهم أنهﷺ شريك فيه۔** ابن حجرؒ نے اپنے کلام سابق کے بعد انوکھی بات لکھی ہے: **وبهذا يندفع قول الشارح على أنه هو**

ردّہ بقوله لكن في جعله......ابن حجرؒ کا یہ کلام عجیب وغریب قسم کے ضبط وخیال پر مشتمل ہے۔فامرہ:ایک صحیح نسخہ میں: قال ہے۔ أی قال عثمان:فأمره۔

قوله:ان يتوضأ فيحسن الوضوء:اس کا مطلب مختار تو حدیث کے ترجمہ میں ذکر ہو چکا ہے۔ایک دوسرا انوکھا مطلب ابن حجرؒ نے ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: أن يأتي بواجباته أو مكملاته۔ انوکھا پن ہونا بایں طور ہے کہ اگر پہلے معنی مراد ہوتے تو فيتوضأ فرمانے پر اکتفاء فرماتے لہٰذا فيحسن الوضوء میں تحصیل مکملات مراد ہیں، تاکہ اس زیادت سے افادۂ حسنہ ہو۔ایک روایت میں:ويصلي ركعتين کا اضافہ بھی ہے۔

قوله: اللهم انی أسألك......الرحمة:مفعول مقدر ہے۔ أی أطلبك مقصودی بنبيّك:باء برائے تعدیہ ہے۔ انی توجهت بك:ایک نسخہ میں''أتوجه'' ہے۔اور باء برائے استعانت ہے۔(كذا ذكره الطيبیؒ)اس باء اور پہلی باء میں وجۂ فرق شاید یہ ہے کہ اس کو برائے تعدیہ قرار دیا، کہ پہلے جملہ میں''متوجه به'' نبی کریم ﷺ ہیں، لہٰذا تعدیہ کے معنی متعین ہیں، اور دوسرے جملہ میں ''اللہ جل شانہ مستعان ہے۔جیسا کہ اياك نعبد و اياك نستعين کا حصر اس پر دلالت کر رہا ہے، لہٰذا استعانت بغیر اللہ کا حقیقۃ استعمال جائز نہیں۔اگرچہ کبھی مجازاً استعمال ہو جاتا ہے۔ابن حجرؒ پر یہ واضح فرق مخفی رہا جس کی وجہ سے وہ امام طیبیؒ پر اعتراض کر بیٹھے۔اور اشارہ کیا کہ دونوں جگہ باء برائے تعدیہ ہے، اور خطاب نبی کریم ﷺ سے ہے، على طريق الالتفات۔ابن حجرؒ فرماتے ہیں: ایک روایت میں یوں ہے، يا محمد انی توجهت الى ربی ليقضی:صیغۂ غائب کے ساتھ ہے، اور فاعل ضمیر غائب ہوگی جو''ربی'' کی طرف عائد ہے۔اور کہا گیا ہے کہ صیغۂ حاضر کے ساتھ ہے۔أی:لتوقع القضاء۔

قوله:انی توجهت......فی حاجتی هذه:ظرف ہے، اس کی نظیر یہ ہے:و اصلح لی فی ذریتی۔

ويجرح فی عراقيبها نصلی

لی:اجمال کیلئے ہے۔یہ اشرح لی صدری کی طرح ہے۔(کذا حققہ الطیبی)

ابن حجرؒ نے طیبیؒ کا کلام سمجھا نہیں، چنانچہ اعراض برتا، اور فرمایا:اللام للاختصاص، وفی للمكان المجازی مبالغة ان کا کلام صحیح نہیں، اولاً تو اس وجہ سے کہ اختصاص کے کوئی معنی نہیں ہیں چونکہ اس سے تضیق واسع لازم آتی ہے۔جیسا کہ مروی ہے کہ ایک اعرابی نے یوں دعا مانگی :اللهم اغفرلی ومحمدا، ولا تغفر معنا أحدا۔ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا:لقد تحجرّت واسعا۔(أی:ضيقت ما وسعه الله فخصصت به نفسك دون غيرك ۔ثانیاً محل اشکال یہ ہے کہ''قضاء'' متعدی بنفسہ ہے، تو ''فی'' کی زیادتی کی کیا حکمت ہے؟ تو اس مثال اور اس کے امثال کا جواب یہ ہے کہ''فی'' کے ساتھ تعدیہ اس لئے کیا کہ وہ''ایقاع'' کے معنی کو متضمن ہے، اور''ایقاع''''فی'' کے ساتھ ہی متعدی ہوتا ہے۔مکان حقیقی میں''قضا'' متصور نہیں ہو سکتی حتی کہ کہا جاتا ہے کہ یہ مکان مجازی کیلئے ہے اور مکان مجازی کیلئے ہونے کی تقدیر پر، جیسا کہ آپ کا یہ قول:نظرت فی الكتاب اس میں کون سا مبالغہ ہے؟ فتأمل فيه تنبيهٌ نبيهٌ۔

حصن کی اصل میں یوں ہے:وأتوجه بك الى ربی فی حاجتی هذه ليقضٰی لی۔صیغۂ مجہول کے ساتھ ہے۔ اللهم:التفات ثانی ہے۔

قوله:اللهم فشفعه فیّ:فاء کی تشدید کے ساتھ۔أی: اقبل شفاعته۔ فیّ۔ أی:فی حقی۔امام طیبیؒ نے فرمایا: فاء کا عطف ''أتوجه'' پر ہے۔''توجهت بك'' فرمانے میں وہی معنی ہیں جو اس آیت میں ہیں:﴿من ذا الذی يشفع عنده الا باذنه﴾ کہ

اللہ تعالیٰ سے اولاً بطریق خطاب سوال کیا، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے توسل سے بصیغۂ خطاب، پھر اللہ سے خطاب کیا کہ نبی کے توسل سے ان کی دعا قبول فرما۔

اللہ تعالیٰ سے محبت کا سوال کرنا

۲۴۹۶: وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ كَانَ مِنْ دُعَاءِ دَاوٗدَ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَسْأَلُكَ حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ يُّحِبُّكَ وَالْعَمَلَ الَّذِیْ يُبَلِّغُنِیْ حُبَّكَ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ حُبَّكَ اَحَبَّ اِلَیَّ مِنْ نَفْسِیْ وَمَا لِیْ وَاَهْلِیْ وَمِنَ الْمَاءِ الْبَارِدِ قَالَ وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا ذَكَرَ دَاوٗدَ يُحَدِّثُ عَنْهُ يَقُوْلُ كَانَ اَعْبَدَ الْبَشَرِ۔

(رواه الترمذی وقال هذا حديث حسن غريب)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤٨٨/٥ حديث رقم ٣٤٩٠۔

ترجمہ: حضرت ابو درداءؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ داؤد علیہ السلام کی دعاؤں میں سے یہ تھی اے الٰہی! تحقیق میں تم سے تیری محبت مانگتا ہوں اور اس شخص کی دوستی جو وہ تجھ کو دوست رکھے اور وہ عمل مجھ کو تیرے تک پہنچائے۔ اے الٰہی! اپنی دوستی و محبت کو زیادہ پسندیدہ بنا میرے نزدیک۔ میری طرف میری جان کی محبت سے اور میرے اہل سے اور میرے مال سے اور ٹھنڈے پانی سے راوی نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر کرتے اور پہلے ان کے بارے میں بات کرتے تو کہتے تھے داؤد علیہ السلام اپنے زمانے کے عابد لوگوں میں سب سے زیادہ عبادت کرنے والے تھے اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا یہ حدیث حسن غریب ہے۔

اسنادی حیثیت: امام ترمذی نے کہا کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: **قوله: كان من دعا داود يقول: اللهم انی أسألك حبك**: (۱) مصدر کی اضافت فاعل کی طرف ہے۔ (۲) مصدر کی اضافت مفعول کی طرف ہے۔ پہلا (احتمال) زیادہ واضح ہے، چونکہ اس میں آیت مبارکہ کی طرف ''تلمیح'' ہے: ﴿**يحبهم ويحبونه**﴾ اور ابن حجرؒ کا یہ کہنا: ''**أی: حبی اياك، فانه فاتحة كل كمال**'' ارباب حال کی اصطلاح سے غفلت کا نتیجہ ہے۔

قوله: وحب من يحبّك: اس میں بھی حسبِ سابق دو احتمال ہیں۔ (۱) یہاں فاعل کی طرف اضافت کا ہونا، واضح ہے۔ جیسا کہ آپ کا علماء و صلحاء سے محبت کرنا۔ (۲) اضافۃ الی المفعول ہو تو وہ بھی مطلوب ہے۔ جیسا کہ ایک دعا میں آتا ہے: **وحببنا الی أهلها وحبب صالحی أهلا الينا**۔ اور ایک احتمال یہ ہے کہ مساکین کی محبت کا سوال مراد ہو، جیسا ایک دوسری حدیث میں آتا ہے۔

قوله: والعمل الذی يبلغنی حبك: منصوب ہے، اس کا عطف مفعول ثانی پر ہو رہا ہے، اور ایک نسخہ میں مجرور ہے۔ **أی: وحبّ العمل**۔ اس صورت میں یہ صرف اضافۃ المصدر الی المفعول ہوگی۔ **يبلغنی حبك**: ''**يبلغنی**'' از باب تفعیل ہے، اور ''**حبك**'' میں دونوں احتمال ہیں۔

قوله اللهم اجعل حبك احب ......: یہاں اضافۃ المصدر الی المفعول ہے۔ **أی حبی اياك**۔ قاضیؒ فرماتے ہیں: **اللهم اجعل نفسك** سے (**اللهم اجعل حبك** کی طرف) عدول فرمانا، رعایت ادب کی وجہ سے ہے، کہ اپنے نفس کو اللہ جل شانہ کے نفس کے مقابلہ میں ذکر نہیں فرمایا۔ اگر یہ کہا جائے کہ وجہ عدول ممکن ہے یہ ہو کہ ''نفس'' کا اطلاق اللہ جل شانہ کی ذات مبارکہ میں نہیں ہوتا۔ میں کہتا ہوں بلکہ یہ اطلاق صحیح ہے۔ قرآن کریم میں بطور ''مشاکلت'' کے آیا ہے: ﴿**تعلم ما فی نفسی ولا أعلم ما فی نفسك**﴾ اس پر کلام ہے وہ یہ کہ ''مشاکلۃ'' ثانی میں ہوا کرتا ہے، نا کہ اول میں۔ (**علی ما ذكره البانيون**) لیکن میں نے

''مشاکلت'' اول میں بھی پائی ہے، بخاری کی روایت ہے:وثبت علینا حبّة، فقال النبیﷺ :اقتلوھا فذھبت، فقال النبیﷺ: وقیت شرکم کما وقیتم شرھا۔امام سیوطیؒ فرماتے ہیں: کبھی مقدم بھی ہوتا ہے۔جیسا کہ یہ آیت مبارکہ: ﴿فاعتدوا علیه بمثل ما اعتدی علیکم﴾ ہاں، حدیث میں بغیر مشاکلت کے بھی آیا ہے:أنت کما أثنیت علی نفسك۔لیکن تحقیقی بات یہی ہے کہ ''نفس''، بمعنی ''ذات'' کا اطلاق اللہ جل شانہ کی ذات مبارکہ پر درست ہے۔البتہ ''نفس''، بمعنی ''تنفس'' کا اطلاق نہیں ہوتا، اور جہاں لفظ ''موہم'' ہوسو وہاں جواز اطلاق ''توفیقی'' ہے۔وما توفیقی الا باللّٰہ۔

ابن حجرؒ لکھتے ہیں:وتجویز الشارح ھذہ المشاکلة غیر صحیح، لأن ماورد فی حقه تعالیٰ موھم نقصا لا یجوز ذکرہ الا باللفظ الوارد فیه، وأما اختراع لفظ آخر وذکرہ فیه فلا یجوز، وان قلنا بما قاله الغز الی والباقلانی فی أسماء اللّٰہ تعالیٰ وصفاته التی لم ترد، لأن محل الجواز عندھما فیما لا یوھم نقصا بوجه فممتنع باتفاق الکل، وھذا أبلغ راد الکلام الشارح فأعرض عنه ولا تلتفت الیه۔ابن حجرؒ کا یہ کلام بڑا عجیب وغریب ہے۔اس کا منشأ عدم فہم اور اپنی فقاہت علمی پر اقتصار ہے۔نبی کریم ﷺ کے کلام میں مقابلہ کا مقتضی یہ تھا کہ یوں کہا جاتا:''اجعل حب نفسك أحبّ الی من نفسی۔لیکن نبی کریم ﷺ نے اس اسلوب کلام سے بوجہ ادب عدول کیا۔اور اپنے نفس کو اللہ جل شانہ کے نفس کے مقابلہ میں احتراز کیا۔ اگر یہ ملاحظہ نہ ہوتا اور بالفرض اطلاق ہو جاتا، تو یہ اطلاق نبی کریم ﷺ کی طرف سے جائز تھا، کیوں کہ آپ ﷺ شارع ہیں۔چنانچہ اس وقت ''مشاکلت'' کے ساتھ کلام درست ہے، جیسا کہ اس آیت مبارکہ میں: ﴿تعلم ما فی نفسی ولا أعلم ما فی نفسك﴾ یہ ساری تفصیل معلوم ہو جانے کے بعد ابن حجرؒ کا یہ کہنا ''لأن ما ورد فی حقه تعالیٰ...... '' تطویل عبث ہے، چونکہ یہ بحث محل کلام نہیں ہے۔اور ابن حجرؒ کا کہنا:''أما اختراع لفظ آخر'' اگر ان کی مراد یہ ہے کہ ''شارع کیلئے یہ جائز نہیں'' تو یہ کفر محض ہے، چونکہ نبی کریم ﷺ سے یہ ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے اللہ جل شانہ کی ذات اقدس پر ''نفس'' کا اطلاق بغیر ''مشاکلت'' کے کیا ہے۔چنانچہ فرمایا:أنت کما أثنیت علیٰ نفسك۔تو علیٰ سبیل المقابله کیوں کر جائز نہ ہوگا، اور اگر ابن حجرؒ کی مراد یہ ہے کہ غیر شارع کیلئے جائز نہیں۔تو یہ ''حشو'' ہے۔چونکہ غیر کے بارے میں کلام ہی نہیں ہے۔اور جہاں تک تعلق ہے اسماء وصفات کی بابت امام غزالیؒ اور باقلانی کا مذہب ذکر کرنے کی تو یہ بھی خارج از بحث ہے، چونکہ ''مشاکلت'' کی بحث اسماء وصفات کی بحث سے ''اعم'' ہے۔نیز ان کا مذہب ''مخترع'' کے بارے میں ہے، نا کہ فی ما ورد عن الشارع کے بارے میں، اور اگر ان سے یہ علیٰ سبیل الفرض صادر ہوا ہے تو یہ ان کے کلام اور فہم مرام کیلئے ابلغ ہے۔

قوله:ومن الماء البارد:اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹھنڈا پانی انتہائی محبوب ترین چیز ہے۔''من'' کا اعادہ فرمانا، دلالت کر رہا ہے کہ پانی کا ٹھنڈا ہونا مستقل ایک محبوب چیز ہے۔اور ایسا بعض اوقات ہے، پانی روح کے برابر ہے، بعض فضلاء سے مروی ہے:لیس للماء قیمة لأنه لا یشتری اذا وجد، ولا یباع اذا فقد، کسی عارف کا کہنا ہے:اذا شربت الماء البارد أحمد ربی من صمیم قلبی۔اور ممکن ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔کہ روح سے کنایہ ہو، چونکہ اس کی حیات پانی سے متعلق ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وجعلنا من الماء کل شئ حیی﴾ چنانچہ ''نفسی'' سے مراد اس کی مرادیں اور چاہتیں ہیں۔ابن حجرؒ کا یہ کہنا:عجیب قول الشارح، وعن بعض الفضلاء:لیس للماء قیمة......، فانه ان أراد بذلك أن ھذا حکم شرعی للماء کان باطلا بل ھو مثلی تارۃ ومتقومة أخری، وان کنی بذلك عن نفاسة الماء کانت العبارۃ قاصرۃ، وکان یکفی فی ذلك أن یقول ما صرح به الفقھاء أن الشربة قد تساوی دنانیر، لا لکون ذلك قیمة له، بل لتوقف الحیاۃ علیه۔ان کے اس

زعم باطل پر مبنی ہے کہ معرفت فقہ اس میں اور اس کے امثال میں منحصر ہے، چونکہ ''مثلی'' اور ''قیمی'' ہونے کا حکم مذکور فضلاء تو کیا جہلاء پر بھی مخفی نہیں، سو بلاشبہ فاضل نے اس سے پانی کا قیمتی ہونا بطریق مبالغہ مراد لیا ہے، بلکہ علی سبیل الحقیقہ مراد ہے، چونکہ پانی کسی کے پاس موجود ہونے کی تقدیر پر اس کو کوئی خریدتا نہیں ہے، چنانچہ پانی کی کوئی قیمت نہ ہوئی، اور جب مفقود ہوتا ہے یعنی کسی کے پاس بھی نہیں ہوتا تو یہ بھی صحیح ہے کہ اس کی کوئی قیمت نہیں چونکہ وہ اس کے ساتھ خریدا نہیں جا سکتا، اس سے فقہاء کی عبارت کا قصور واضح ہو جاتا ہے جو یہ کہتے ہیں: **ان الشربة قد تساوی دنانیر لا لکون ذلك قيمة له**، اس میں کھلم کھلا تعارض ہے، چونکہ جب کوئی شئی کسی شئی کے مساوی ہوتی ہے خواہ وہ پانی ہو، پتھر ہو، طعام ہو یا درخت ہو اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جاتا کہ: **ذلك لا يكون قيمة له**۔ چنانچہ قیمت عادیہ کی نفی کی تقدیر پر فقہاء کا کلام صحیح ہے۔

قوله: وكان......يحدث عنه يقول: ''**يحدث**'' سے بدل (كذا ذكره الطيبي، وتبعه ابن حجر) اور زیادہ واضح یہ ہے کہ ''**يحدث**'' کی ضمیر سے ''حال'' ہے۔

قوله: وكان أعبد البشر: امام طیبیؒ نے یہاں ''فی زمانہ'' کے ساتھ مقید کیا ہے۔ یعنی حضرت داؤد علیہ السلام اپنے زمانہ کے آدمیوں میں بڑے عابد تھے۔ اھ۔ اگر یہ قید نہ لگائی جائے بلکہ مطابق رکھا جائے تو تب بھی کوئی محذور لازم نہیں آتا، چونکہ ''أعبد'' ہونے سے ''اعلم'' ہونا لازم نہیں آتا۔ چہ جائیکہ افضل ہونا لازم آئے۔ اور کہا گیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام ان میں سب سے شکر گزار تھے، اور دلیل یہ آیت مبارکہ ہے: ﴿**اعلموا آل داود شكرا**﴾ أی: **بالغ فی شكری وابذال سعيك فيه**(كذ اذكره الطيبیؒ) اس پر اشکال یہ ہے کہ اس میں **اكثر البشر شكرا على الاطلاق** ہونے کی دلیل نہیں ہے، چونکہ حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿**انه كان عبدا شكورا**﴾ ہاں ان کے نبی ہونے سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ اپنے اہل زمانہ میں سب سے زیادہ شکر گزار تھے جیسا کہ یہ آیت دلالت کر رہی ہے: ﴿**اعملوا آل داود شكر**﴾ کہ آل داؤد کی نسبت سے مطلق عمل شکر کے ذکر پر اکتفاء کیا، پھر اس کے ذیل میں بمنزلہ تعلیل کے یہ فرمایا: ﴿**وقليل من عبادی الشكور**﴾ اس میں اشارہ ہے کہ شکور کا رتبہ انبیاء ہی کیلئے ہے، چنانچہ اس تقریر کے ذریعہ ''بالغ فی شکرک'' بھی درست ہو جائے گا۔ وگرنہ وہ معنی اس آیت: ﴿**اعملوا آل داود شكر**﴾ سے ماخوذ نہیں ہوتے۔

يحدث: امام طیبیؒ فرماتے ہیں: **يحدث** مرفوع ہے شرط کی جزاء ہے، اور جب شرط ماضی اور جزاء مضارع ہو تو اس میں دونوں صورتیں جائز ہوتی ہیں۔ اھ۔ امام طیبیؒ کی مراد یہ ہے کہ **يحدث** کو مرفوع پڑھنا متعین ہے۔

جامع دعا

۲۴۹۷: وَعَنْ عَطَاءِ بْنِ السَّائِبِ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ صَلّٰى بِنَا عَمَّارُ بْنُ يَاسِرٍ صَلاَةً فَاَوْجَزَ فِيْهَا فَقَالَ لَهٗ بَعْضُ الْقَوْمِ لَقَدْ خَفَّفْتَ وَاَوْجَزْتَ الصَّلاَةَ فَقَالَ اَمَا عَلَيَّ ذٰلِكَ لَقَدْ دَعَوْتُ فِيْهَا بِدَعَوَاتٍ سَمِعْتُهُنَّ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَلَمَّا قَامَ تَبِعَهٗ رَجُلٌ مِّنَ الْقَوْمِ هُوَ اَبِیْ غَيْرَ اَنَّهٗ كَنٰى عَنْ نَفْسِهٖ فَسَأَلَهٗ عَنِ الدُّعَاءِ ثُمَّ جَاءَ فَاَخْبَرَ بِهِ الْقَوْمَ اَللّٰهُمَّ بِعِلْمِكَ الْغَيْبُ وَقُدْرَتِكَ عَلَى الْخَلْقِ اَحْيِنِيْ مَا عَلِمْتَ الْحَيٰوةَ خَيْرًا لِّيْ وَتَوَفَّنِيْ اِذَا عَلِمْتَ الْوَفَاةُ خَيْرًا لِّيْ اَللّٰهُمَّ وَاَسْئَلُكَ خَشْيَتَكَ فِي الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ وَاَسْاَلُكَ كَلِمَةَ الْحَقِّ فِي الرِّضَا وَالْغَضَبِ وَاَسْاَلُكَ الْقَصْدَ فِي الْفَقْرِ وَالْغِنٰى وَاَسْاَلُكَ نَعِيْمًا لاَ يَنْفَدُ وَاَسْاَلُكَ قُرَّةَ عَيْنٍ لاَ تَنْقَطِعُ وَاَسْاَلُكَ الرِّضَا بَعْدَ

الْقَضَاءِ وَاَسْأَلُكَ بَرْدَ الْعَيْشِ بَعْدَ الْمَوْتِ وَاَسْأَلُكَ لَذَّةَ النَّظَرِ اِلَى وَجْهِكَ وَالشَّوْقَ اِلَى لِقَائِكَ فِيْ غَيْرِ ضَرَّاءَ مُضِرَّةٍ وَلاَ فِتْنَةٍ مُضِلَّةٍ اَللّٰهُمَّ زَيِّنَّا بِزِيْنَةِ الْاِيْمَانِ وَاجْعَلْنَا هُدَاةً مَهْدِيِّيْنَ ۔ (سنن نسائی)

اخرجه النسائي في السنن ٣/ ٥٤ حديث رقم ١٣٠٥۔ واحمد في المسند ٤/ ٢٦٤۔

ترجمہ: حضرت عطاء بن سائبؒ سے روایت ہے انہوں نے اپنے باپ سے نقل کی ہے کہتے ہیں کہ ہم کو عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھائی پس اس میں کوتاہی کی یعنی لمبی قراءت اور تسبیحات وغیرہ زیادہ نہ پڑھیں پس ان کو بعض لوگوں نے کہا تحقیق تم نے ہلکی نماز پڑھی اور نماز کو مختصر کر دیا۔ پس عمار رضی اللہ عنہ نے کہا۔ اے فلانے مجھ کو یہ تخفیف مضر نہیں ہے۔ البتہ تحقیق میں نے اس نماز میں یعنی اس کے قعدے میں سجدے میں کئی دُعائیں مانگیں کہ میں نے ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے پس جناب عمارؓ کھڑے ہوئے ان کے ساتھ قوم سے ایک شخص کھڑا ہوا وہ میرا باپ (عطاء) تھا۔ راوی نے کہا ہے کہ وہ شخص میرا باپ (سائب) تھا اس نے اپنے نفس سے کنایہ کیا ہے یعنی شخص نے اپنے کو کہا اور یوں نہ کہا کہ میں نے عمار رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا پس اس شخص نے عمارؓ سے دُعا کا حال پوچھا۔ پس اس نے دُعا بتا دی۔ پھر وہ شخص آیا اور دُعا کے ساتھ قوم کو خبر دی' وہ یہ ہے: اے الٰہی! بحق اپنے جاننے کے غیب کو اور بحق اپنی مخلوق پر قدرت کے مجھ کو زندہ رکھ جب تو زندگی کو میرے لیے بہتر جانے یعنی جب تک بھلائی برائی پر غالب رہے تو زندگی بہتر ہے اور مجھ کو مار جب کہ تو مرنے کو میرے لیے بہتر جانے یعنی جب برائی بھلائی پر غالب نہ آ جائے اور ظاہری و باطنی فتنے ظاہر ہوں تو اس وقت مرنا بہتر ہے اور اے الٰہی! میں تجھ سے تیرا ظاہر و باطن میں ڈر مانگتا ہوں اور خوشی میں اور خفگی (یعنی پریشانی) میں کلمہ حق کا کہنا مانگتا ہوں اور میں تجھ سے فقر اور دولت کی حالت میں میانہ روی مانگتا ہوں یعنی بہت زیادہ فقیر نہ ہو جاؤں اور رنج اٹھاؤں اور یا نہایت مالدار ہو جاؤں کہ اسراف کروں اور میں تجھ سے جنت کی نعمتیں مانگتا ہوں جو ختم نہ ہوں اور میں تجھ سے آنکھ کی ٹھنڈک مانگتا ہوں۔ جو ختم نہ ہو اور میں تجھ سے قضاء کے بعد رضا مانگتا ہوں اور میں تجھ سے مرنے کے بعد والی زندگی کی ٹھنڈک مانگتا ہوں۔ یعنی ہمیشہ کی راحت کا سوال کرتا ہوں۔ قرض کے بعد رضا مانگنا اور میں تیرے چہرے کے دیدار کی لذت مانگتا ہوں اور تیرے ملنے کے شوق کی طرف سخت حالت کے بغیر جو کہ ضرر پہنچائے اور نہ فتنے میں گمراہ کرے۔ اے الٰہی! ہم کو ایمان کی زینت کے ساتھ زینت دے کہ ایمان پر ثابت رہیں اور بہت زیادہ نیکیاں کریں اور ہم کو راہ راست دکھانے والے کی طرح راہ راست چلنے والے کی طرح کر دے۔ اس کو نسائی نے نقل کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

عطاء بن السائب۔ نام عطاء۔ ''سائب'' ابن یزید کے بیٹے ہیں۔ خاندان کے اعتبار سے ''ثقفی'' ہیں۔ ۱۳۶ھ یا تقریباً اس زمانہ میں وفات پائی۔ سائب بن یزید کے حالات ماقبل میں گزر چکے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے: جلد دوم' حدیث: ۴۷۶۔

تشریح: **قوله: صلى بنا ......فيها:**

قوله: لقد خففت وأوجزت الصلاة: اس میں تنازع فعلین ہے۔

قوله: فقال: أما على ذلك: أما تخفيف کے ساتھ ہے، امام طیبیؒ فرماتے ہیں: أما کا ہمزہ ''انکار'' کیلئے ہے، گویا کہ انہوں نے یوں کہا: **أتقول هذا أي اسكت ما عليّ ضرر من ذلك**۔ یا برائے ندا ہے۔ اور ''منادیٰ'' قوم کا کوئی فرد ہے۔ **أي: يا فلان! ليس علي في ذلك نظر**۔ اور ایک احتمال یہ ہے کہ برائے تنبیہ ہو۔ چنانچہ کلام یوں ہے۔ **أما عليّ ذلك بيانه**۔

قولہ: فلما قام......هو أبی: یہ کلام ''عطاء'' کا ہے۔

غير أنه كنى عن نفسه: أی: برجل ولم يقل تبعته۔ طیبیؒ فرماتے ہیں: استثناء کی تقریری عبارت یوں ہے: لم يصرح السائب الا أنه كنى عن نفسه بالرجل اھ۔ عدم تصریح سے مراد یہ ہے کہ ریاء کے خوف سے انتہائی اخفاء سے کام لیا۔ اس توجیہ سے ابن حجرؒ کی ذکر کردہ توجیہہ کی تردید ہوجاتی ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں: انہوں نے تواضع کی وجہ سے کنایہ کیا، چونکہ اگر وہ یوں کہتے: فتبعته، اس میں اپنی مدحت کا وہم ہوتا۔ فاخبر: ایک نسخہ میں ''وأخبر'' ہے۔

قولہ: اللهم بعلمك......خيرا لی: باء برائے ''استعطاف'' ہے۔ أی: أنشدك بحق علمك المغيبات عن خلقك۔ وقدرتك: (اس کا عطف ''علمك'' پر ہورہا ہے)۔ أی بقدرتك۔ ما علمت الحياة: ''ما'' مصدریہ ظرفیہ ہے۔

قولہ: اللهم وأسألك ......فی الرضا والغضب: بظاہر اس کا عطف پہلے والے ''اللهم'' پر ہے۔ اور حرف عطف محذوف ہے، جیسا کہ احادیث میں وارد ہے بہت سی دعاؤں میں (حذف ہوا) ہے۔ اسی قبیل سے آیات قرآنیہ میں بغیر عطف کے ''ربنا'' کا تکرار ہے۔ وأسألك میں واؤ کی موجودگی بھی قابل حرج نہیں، یہ واؤ اس آیت میں وارد واؤ کی نظیر ہے: ﴿ربنا وآتنا﴾ وأسألك: اس کا عطف ''أنشدك'' مقدر پر ہورہا ہے۔

''فی الرضا والغضب'': معنوی اعتبار سے عبارت میں دو احتمال ہیں۔ (۱) أی: فی حال رضا الخلق وغضبهم۔ (۲) فی حال رضائی وغضبی۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ اے اللہ میں اپنے تمام اوقات واحوال میں کلمۂ حق پر استمرار کا سوال کرتا ہوں۔ حصن کی روایت میں:

وكلمة الاخلاص کا اضافہ ہے۔ اس میں ایک احتمال یہ ہے کہ ''کلمۂ حق'' کی تفسیر ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿له دعوة الحق﴾ أی: دعوة التوحيد المطلق والشرع المحقق۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ ''کلمۂ حق'' سے ''حکم بالعدل'' اور کلمۂ اخلاص سے توحید، یا ریاء وسمعہ سے پاک صاف خالص نیت مراد ہے۔ چنانچہ اس صورت میں جار مجرور کی بابت تنازع ہوگا۔ ابن حجرؒ نے ''كلمة الحق'' کی تفسیر ''مالا اثم فيه'' سے کی ہے۔ اس تفسیر میں نا صرف غایتِ بُعد ہے۔ بلکہ نادرست ہے، چونکہ نبی کریم ﷺ کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں ہوسکتا کہ کلام مباح پر مداومت کا سوال کریں۔ حالانکہ ایک طرف خود فرمارہے ہیں: من حسن اسلام أطرء تركه مالا يعنيه۔ اور دوسری طرف ارشاد گرامی ہے: ﴿والذين هم عن اللغو معرضون﴾

www.KitaboSunnat.com

قولہ: وأسألك القصد فی الفقر والغنی: یہ جملہ دلیل ہے ان حضرات کی جو یہ کہتے ہیں: الكفاف أفضل من الفقر والغنی۔ حصن کی روایت میں یہ جملہ چھوٹا ہوا ہے۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں اس کے معنی ہیں: توفيق القصد۔ چونکہ غیر قصد مذموم ہے۔ چنانچہ اللہ جل شانہ کا فرمان ہے: ﴿ولا تجعل يدك مغلولة الى عنقك﴾ بظاہر مقام کا سیاق وسباق اس معنی پر محمول کرنے سے انکار کررہا ہے، چونکہ کلام امتثال اوامر واجتناب النواہی کے متعلق نہیں ہے، وگرنہ ذکر کرنا اولیٰ تھا، باوجودیکہ آپ سے مخالفت مامور اور مباشرت محظور کا تصور بھی نہیں ہوسکتا۔

قولہ: واسألك نعيمالا ينفد: دال مہملہ کے ساتھ ہے۔ أی: لا يغنی ولا ينقص۔ جنت کی نعمتیں مراد ہیں، چونکہ: كل نعيم لا محالة زائل۔

قولہ: وأسألك قرة عين: اور حصن کی روایت میں وقرة عين واؤ کے ساتھ ہے، بغیر اعادۂ فعل کے۔ اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جس سے انسان کامل لذت اٹھائے۔ بعض کا کہنا ہے کہ غیر مقطوع نسل مراد ہے، ممکن ہے کہ اس آیت کریمہ سے مأخوذ ہو: ﴿ربنا هب

لنا من أزواجنا وذرياتنا قرة أعين﴾ کہا گیا ہے: نماز پر مداومت مراد ہے۔ چنانچہ مروی ہے: وقرة عيني في الصلاة۔

قوله: أسألك الرضا بعد القضاء: مقصور ہو تو محض مصدر رہتا ہے، اور ممدود ہو تو اسم ہوتا ہے۔ (كذا ذكره جوہری)۔

أسألك الرضا بعد القضاء: بعض روایات میں ''وأسألك الرضا بالقضاء'' آیا ہے۔ گویا کہ تحقق وتقرر رضاء کے بعد طلبِ رضا کا سوال کیا ہے۔

ابوعثمان سے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس فرمان کے بارے میں پوچھا گیا: أسألك الرضا بعد القضاء، عزم على الرضا بعد القضاء ہے؟ فرمایا: لأن الرضا قبل القضاء عزم على الرضا بعد القضاء وهو الرضا۔

(كذا في الغنية للقطب الرباني الشيخ عبد القادر الجيلاني قدس الله سرة الباري)

قوله: وأسألك برد العيش بعد الموت: أي طيبه وحسنه۔ حصن کی روایت میں ''وبرد العيش'' آیا ہے۔ وأسألك لذة النظر: حصن کی روایت میں حرف عطف کے ساتھ، لیکن أسألك کے بغیر آیا ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''نظر'' کو لذت کے ساتھ مقید کیا، چونکہ عرصات قیامت میں اللہ جل شانہ کی طرف اٹھنے والی نظر یا تو نظر ہیبت وجلال ہوگی یا جنت میں نظر لطف وجمال ہوگی۔

قوله: وأسألك لذة النظر...... فتنة مضلة: حرف جار یا تو ''والشوق الى لقائك'' کے متعلق ہے۔ أي: أسألك شوقا لايؤثر في سيري وسلوكي، بحيث يمنعني عن ذلك، وأن يضرني مضرة۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ "أحيني" کے متعلق ہے۔ دوسرا احتمام معنی کے اعتبار سے زیادہ واضح ہے، اور پہلا احتمال لفظاً زیادہ قریب ہے۔ دوسرے احتمال کی تائید حصن کی روایت سے ہوتی ہے: أعوذ بك من ضراء مضرة۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ظرف کا متعلق میں متعدد احتمال ہیں: (۱) آخری جملہ کے متعلق ہے۔ یعنی والشوق الى القائك اور مطلب یہ ہوگا: شوقا لا يؤثر في سيري وسلوك وإن ضرني مضرة۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ''أحيني ما عملت الحياة خير الى'' کے متعلق ہو، اور ضراء غير مضرة سے مراد وہ ضرر ہے جس پر صبر کیا جائے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے، نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: عجبا

لأمر المؤمن إن أصابته سراء شكر فكان خيرا له۔ وإن أصابته ضراء صبر فكان خيرا له اھ۔

امام طیبیؒ کا یہ کہنا: بحيث يكون ضراء غير مضرة صحیح نہیں ہے، چونکہ ایسا شوق مطلوب نہیں جو ''ضراء'' ہو، اسی لئے اس پر ''غیر'' داخل ہے، اور پھر اس کو مضرة سے موصوف کیا تا کہ پتا چلے کہ کوئی بھی ضراء مضر نہیں جب مضرة نہ ہو۔ جیسا کہ اس پر وإن ضرني مضرة دلالت کر رہا ہے۔ امام طیبیؒ کی عبارت کو ادنیٰ عنایت سے ہمارے مذکورہ مفہوم پر محمول کیا جاسکتا ہے، اور حاصل معنی یہ ہے: اللهم إني أسألك شوقا لايضرني في بدني بأن أفعل مالا طاقة لي به، ولا في قلبي بأن تغلب على الجذية بحيث أخرج عن طور عقلي، فيفوتني مرتبة الجمع۔

قوله: اللهم زينابزينة الايمان:

قوله: واجعلناهداةمهديين: ''هداة'' هادٍ کی جمع ہے۔ مهديين: حصن میں ''مهتدين'' آیا ہے۔ أي: تابتين على الهداية وطريق اليقين۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: هداة کو مهديين کے وصف سے متصف ذکر فرمایا، چونکہ جب تک ہادی بنفسہ ''مہدی'' نہیں ہوگا، غیر کیلئے بھی ''ہادی'' ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا، چونکہ اگر وہ ایسا کرے گا تو مخلوق کو اس انداز سے گمراہی میں مبتلا کرے گا کہ خود اس کو شعور نہ ہوگا۔ اور میں کہتا ہوں لوگوں کو بھی شعور تک نہ ہوگا،

''اور مانگتا ہوں کلمہ حق'' کا مطلب یہ ہے کہ میرے اندر اتنی استقامت اور بے خوفی پیدا فرما کہ میں ہمیشہ کلمہ حق یعنی حق بات ہی کہوں چاہے مجھ سے لوگ خوش ہوں یا ناراض ہوں یا یہ کہ اپنی خوشی کی حالت میں بھی اور خفگی کی حالت میں بھی کلمہ حق ہی کہوں عوام کی طرح نہ ہو جاؤں کہ جب وہ خفگی کی حالت میں ہوتے ہیں تو برا کہتے ہیں اور جب خوش ہوتے ہیں تو خوش آمد کرتے ہیں۔

''آنکھ کی ٹھنڈک'' سے مراد وہ چیزیں ہیں جن سے جذبہ طاعت وعبادت کامل اور حقیقی لذت وکیف پاتا ہے۔ یا اس سے مراد دعا مانگنے والے کے مرنے کے بعد اس کی اولاد کا باقی رہنا ہے' اسی طرح آنکھ کی ٹھنڈک سے نماز پر پختگی اور اس کی پابندی بھی مراد ہو سکتی ہے اور اس کے مفہوم کو زیادہ وسعت دی جائے تو دونوں جہان کی بھلائیاں بھی مراد لی جا سکتی ہیں۔

ترجمہ سے ظاہر ہے شوق ملاقات سے ہے یعنی میں تیری ملاقات کا ایسا شوق چاہتا ہوں جو میری راہ سلوک میں' راہ ادب پر میری استقامت میں اور احکام واعمال کی بجا آوری اور ادائیگی میں نقصان نہ پہنچائے۔ چنانچہ اگلے جملہ ولا فتنة مضلة کا بھی یہی مطلب ہے کہ ایسا شوق چاہتا ہوں جو راہ استقامت سے ہٹانے والی اور احکام واعمال میں بے راہ روی پیدا کرنے والی آزمائش میں مبتلا نہ کرے۔

یا پھر کہا جائے گا کہ اس جملہ کا تعلق دعا کے ابتدائی لفظ "احینی" سے ہے تا کہ اس کا مفہوم دعا میں مذکور تمام چیزوں پر حاوی ہو جائے یعنی مجھ کو اس مذکورہ نعمتوں کے ساتھ اس طرح زندہ رکھ کہ ایسی بلاء وآزمائش میں گرفتار نہ ہو جاؤں جس میں صبر وشکر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے اور میں گمراہی میں پڑ جاؤں۔

''راہ راست پر چلنے والے بنا'' کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہم دوسروں کو اچھی راہ بتائیں اور دوسروں کو نیک زندگی اختیار کرنے کی تلقین کریں اسی طرح ہم خود بھی اس پر عمل کرتے ہوئے اچھی راہ اپنائیں اور نیک زندگی اختیار کریں۔ ہماری حالت ''خود را فضیحت و دیگر نصیحت'' والی نہ ہو بلکہ ہمارا عمل ہمارے قول کے مطابق ہو۔

فجر کی نماز کے بعد کی دعا

۲۴۹۸ وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ كَا نَ يَقُوْلُ فِیْ دُ بُرِ الْفَجْرِ اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَسْأَلُكَ عِلْمًا نَافِعًا وَعَمَلاً مُتَقَبَّلًا وَرِزْقًا طَيِّبًا۔ (رواه احمد وابن ماجة والبيهقی فی الدعوات الكبير)

اخرجه ابن ماجه فی السنن ۲۹۸/۱ حديث رقم ۹۲۴۔ واحمد فی المسند ۲۹٤/٦۔

قوله:كان يقول فی دبر صلاة الفجر :أی فی دبر صلوة الفجر۔ جیسا کہ ایک نسخہ میں ہے اور ''اذکار'' میں ''**إذا صلی الصبح**'' آیا ہے۔

قوله: اللهم انی اسالك......رزقا طيبا:'' متقبلا'': بائے موحدہ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ بمعنی ''مقبول''۔ مختصر الطیبی میں ہے کہ رزق طیب کا سوال اس لئے اہم ہے کہ یہ ان دونوں چیزوں کیلئے بمنزلہ رأس کے ہے، اور اس کے بغیر علم وعمل کا بھی کوئی اعتبار نہیں اھ میں کہتا ہوں اسی لئے ایک روایت میں اس کا ذکر ابتداء میں آیا ہے، چنانچہ اس روایت کو طبرانی نے اوسط میں اور ابن السنی نے بھی روایت کیا ہے۔

شرح الطیبی میں لکھا ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ بظاہر رزق حلال کو ''علم'' پر مقدم ذکر کرنا چاہئے تھا، چونکہ جب تک رزق طیب نہیں ہو گا علم نافع نہیں ہو گا، اور جب عمل بغیر علم نافع کے ہو گا تو مقبول بھی نہ ہو گا۔ میں کہتا ہوں اس کو مؤخر ذکر کیا تا کہ پتہ چلے کہ علم وعمل اسی وقت معتبر ہوں گے جب رزق حلال پر مبنی ہوں گے، اور یہی مرتبہ علیا ہے، اور اگر مقدم ذکر ہوتا تو یہ اشارہ نہ ہوتا۔ جیسا کہ آپ کسی آدمی کے بارے میں پوچھیں یہ بتایا گیا کہ وہ عالم باعمل ہے۔ چنانچہ آپ پوچھتے ہیں: اس کا ذریعۂ معاش کیا ہے؟ تو جواب ملتا ہے کہ وہ بادشاہ کا ایک وزیر ہے تو یہ سن کر آپ کو ناگواری ہو گی، اور اس کا علم وعمل ہیچ نظر آئے گا اھ

سوال کا حاصل یہ ہے کہ ''رزق'' حساً مقدم ہے، چونکہ تحصیل علم وعمل کیلئے سبب ہے۔ اسی وجہ سے اللہ جل شانہ نے قرآن کریم میں ''رزق'' کو مقدم ذکر فرمایا ہے: ﴿یا أیها الرسول کلو من الطیبات واعملوا صالحا﴾ ﴿یا أیها الذین آمنوا کلوا من طیبات ما رزقناکم واشکرو اللہ إن کنتم إیاہ تعبدون﴾ اسی وجہ سے یحییٰ بن معاذ رازیؒ فرماتے ہیں: الطاعة مخزونة فی خزائن اللہ ومفتاحها الدعاء،

وأسنانه الحلال۔ ابن عباسؓ سے مروی ہے: لا یقبل اللہ صلاۃ امرئ فی جوفه حرام۔ اور یہ واضح ہے کہ نافع اور عمل صالح رزقِ حلال کا نتیجہ ہوتے ہیں اور جواب کا حاصل یہ ہے کہ یہ ترتیب برائے ''ترقی'' ہے، نا کہ برائے ''تدلی'' اور اس کی دلیل یہ جملہ: ''وهی المرتبة العلیا'' ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنے سے پہلے کے کمال کیلئے قید ہے۔ ''من أین معاشه'' سے اسی طرف اشارہ ہے۔ اس کا ایک جواب یہ بھی ممکن ہے کہ علم کو مقدم ذکر کرنے میں اس کے اساس ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ اسی پر دین کا مدار ہے، یعنی اعتقاد واحوال، صحت اعمال، معرفت حلال وحرام اسی پر موقوف ہے۔ علم کے بعد نتیجۂ علم کا ذکر فرمایا کہ وہ عمل ہے، چونکہ اگر اپنے علم پر عمل نہ کیا تو گویا وہ جاہل ہے۔ اس کی دلیل یہ آیت قرآنی ہے: ﴿إنما التوبة علی اللہ للذین یعملون السوء بجهالة﴾ امام بغویؒ لکھتے ہیں: أجمع السلف رحمهم اللہ تعالیٰ علی أن من عصی اللہ جاهل۔

اور میں کہتا ہوں وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ چنانچہ سرکار کائنات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: أشد الناس عذابا یوم القیامة عالم لم ینفعه اللہ بعلمه۔ مروی ہے: ویل للجاهل مرة وویل للعالم سبع مرات۔ بلکہ امام غزالیؒ تو یہاں تک فرماتے ہیں: إن أقل العلم بل أدنی الإیمان أن یعلم أن الدنیا فانیة والعقبیٰ باقیة، ونتجته أن یؤثر الباقی علی الفانی۔ چونکہ رزق حلال بھی جملہ اعمال میں سے ہے اس کو خصوصی طور پر ذکر فرمایا، اس لئے رزق حلال نہ صرف نتیجۂ علم اور صحتِ علم کے اعتبار سے اساس ظاہری ہے، بلکہ ترتب عمل، اخلاص عمل اور قبول عمل کیلئے بھی بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ ابن حجرؒ لکھتے ہیں: قدّمه إشارة إلی أن حکم الأول: أن ینور القلب، ویزید فی العلم۔ والثانی: أنه ربما أظلم القلب، ونقص من العلم. والثالث: أنه یظلم القلب ویجد من اللہ ویوجب مقته وخذلاته. اول تو ان کے اس کلام میں ''رکاکتِ لفظی'' ہے، ثانی یہ کہ معنوی اعتبار سے ''مغلق'' ہے۔ جوارباب عبارات کے مناسب نہیں۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا خاص وظیفہ

۲۴۹۹: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ دُعَاءٌ حَفِظْتُهُ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ لَا اَدَعُهُ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ اُعَظِّمُ شُکْرَكَ وَاُکْثِرُ ذِکْرَكَ وَاَتَّبِعُ نُصْحَكَ وَاَحْفَظُ وَصِیَّتَكَ۔ (رواہ الترمذی)

اخرجه احمد فی المسند ۲/۳۱۱۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے ایک دعا یاد کی ہے۔ نبی کریم ﷺ سے میں اس کو چھوڑتا نہیں ہوں اے الٰہی مجھے ایسا بنادے کہ تیرا زیادہ شکر کروں اور بہت زیادہ کروں تیرا ذکر اور تیری نصیحت کی پیروی کروں اور میں یاد رکھوں تیری وصیت کو۔ اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: دعا حفظته من رسول اللہ ﷺ لا أدعه: مبتدا ہے، اگرچہ نکرہ ہے، چونکہ نکرہ موصوفہ ہے۔ حفظته من رسول اللہ ﷺ: یہ جملہ صفت ہے۔ لا أدعه: خبر ہے۔

قوله: اللهم اجعلنی اعظم شکرك: تخفیف وتشدید دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے، مرفوع ہے۔ مفعول ثانی ہے، أن مقدر

ہے۔یا **معظما** کے معنی میں ہے۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''أجعلنی''''صیرّ نی'' کے معنی میں ہے،اسی لئے مفعول ثانی کو بصورت فعل لایا گیا،اوراس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ ''جعل'' جب بمعنی صار ہوگا تو مفعول ثانی بصورت فعل آئے گا، حالانکہ ایسا نہیں ہے،اس کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے: ﴿**وجعلنا نومکم سباتا**﴾ بلکہ مراد یہ کہ ''جعل'' بمعنی ''خلق'' نہیں ہے،جیسا کہ کبھی کبھی استعمال ہوتا ہے۔جیسے اس آیت میں ﴿**وجعل الظلمات والنور**﴾ کہ متعدی بیک مفعول ہوتا ہے،اور کبھی بمعنی ''صار'' ہوتا ہے، چنانچہ اس وقت متعدی بدو مفعول ہوتا ہے۔اور ابن حجرؒ کا یہ کہنا:**أی أعده عظیما أو آتی به عظیما** اس کا غیر واضح ہونا مخفی نہیں۔چونکہ بلا وجہ ظاہر سے عدول کیا ہے۔

قوله: وأكثر ذكرك: پچھلے اکثر کی طرح ہے۔(۱) ممکن ہے کہ یہ جملہ تخصیص بعد التعمیم ہو اور (۲) زیادہ واضح یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان ''**عموم خصوص من وجه**'' ہے۔اور ابن حضرؒ لکھتے ہیں: **تصریح مما علم قبله إطنانا واستلذ اذا بالحطاب**۔ اھ ابن حجرؒ کا

یہ کہنا صحیح نہیں ہے چونکہ یہ وہاں ہوتا ہے جہاں ثانی اول کے منطوق کا مفہوم ہو۔فتأمل۔

قوله: وأتبع نصحك، واحفظ وصیتك: از باب افتعال واحد متکلم کا صیغہ ہے۔نصیحت ووصیت میں فرق۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: ''نصیحت'' و''وصیت'' متقارب الالفاظ ہیں اور ''اقرب'' یہ ہے کہ دونوں میں فرق ہے۔ چنانچہ نصیحت کہتے ہیں **ارادة الخیر للمنصوح له** کو،اوراس سے مراد حقوق العباد ہوتے ہیں،اور وصیت سے مراد حقوق اللہ سے متعلقہ اوامر ونواہی کی متابعت ہے۔

نصیحت سے مراد بندوں کے حقوق ہیں اور ''وصیت'' سے مراد اللہ تعالیٰ کے حقوق ہیں' اس کا مطلب یہ ہے کہ خدایا! تو نے لوگوں کے حقوق ادا کرنے کا مجھے جو حکم دیا ہے اور اپنے حقوق کی ادائیگی کا جو فریضہ مجھ پر عائد کیا ہے اس پر محافظت کروں یعنی دونوں قسم کے حقوق ادا کرتا ہوں۔

جسمانی وروحانی صحت کا سوال کرنا

۲۵۰۰: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ كَا نَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَسْأَلُكَ الصِّحَّةَ وَالْعِفَّةَ وَالْاَمَانَةَ وَحُسْنَ الْخُلُقِ وَالرِّضٰی بِا لْقَدَرِ۔

اخرجه البزار ذكره في كنز العمال ۱۸۳/۲ الحديث رقم ۳۶۵۰۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کہتے تھے اے الٰہی میں تجھ سے صحت مانگتا ہوں۔یعنی بدن کی تندرستی بری بیماریوں سے یا احوال صحت اور افعال اور اعمال اور حرام سے بچنا اور امانت میں خیانت نہ کروں۔لوگوں کے اموال میں یا شریعت کے تمام حقوق میں اور اچھا اخلاق ہونا اور تقدیر سے راضی ہونا۔

تشریح: **قوله: اللهم انی اسالك......بالقدر**:

نفاق' ریاکاری' جھوٹ وغیرہ سے پناہ مانگنا

۲۵۰۱: وَعَنْ اُمِّ مَعْبَدٍ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ طَهِّرْ قَلْبِی مِنَ النِّفَاقِ وَعَمَلِی مِنَ الرِّیَآءِ وَلِسَانِی مِنَ الْكَذِبِ وَعَیْنِی مِنَ الْخِیَانَةِ فَاِنَّكَ تَعْلَمُ خَائِنَةَ الْاَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ۔

(رواهما البيهقي في الدعوات الكبير)

اخرجه الخطيب ذكره في كنز العمال ۱۸٤/۲ الحديث رقم ۳۶۶۰۔

ترجمہ:ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا ہے کہ آپ ﷺ فرماتے تھے اے الٰہی میرے دل کو نفاق سے پاک کر دے اور میرے عمل کو ریا سے اور میری زبان کو جھوٹ سے اور میری آنکھ کو خیانت سے یعنی نظر حرام سے پس تحقیق تو آنکھوں کی خیانت جانتا ہے اور اس چیز کو جو دل چھپاتے ہیں۔یعنی خواہش اور گناہ یہ دونوں حدیثیں بیہقیؒ نے دعوات کبیر میں نقل کی ہیں۔

راویٔ حدیث:

ام معبد بنت کعب۔یہ ''ام معبد'' ہیں۔''کعب بن مالک'' کی بیٹی ہیں۔انصار میں سے ہیں۔انہوں نے دونوں قبلہ (بیت المقدس وکعبۃ اللہ) کی طرف نماز پڑھی ہے۔ان سے ان کے بیٹے معبد نے روایت کی۔یہ ابن مندہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ ام معبد کعب بن مالک انصاری سلمی کی بیوی ہیں۔اور معبد بن کعب بن مالک انصاری کی ماں ہیں۔ان سے ان کے بیٹے معبد نے روایت کی۔جو کچھ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخ میں باب معبد میں مذکور ہے یہ ہے کہ معبد کعب بن مالک انصاری کے بیٹے ہیں۔یہ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی تائید کرتا ہے۔''معبد'' میم اور باء معجمہ دونوں کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

تشریح: **قوله:اللهم طهر......من الكذب :**

''**الرياء**'':ہمزہ کے ساتھ ہے اور کبھی ابدال کرتے ہیں۔**الكذب**:علم وزبان کے معاصی کا خصوصی طور پر ذکر فرمایا چونکہ اس کے معاصی **عند الله وعند الخلق** بہت بڑے اور قبیح ترین ہوتے ہیں۔

قوله:وعينى من الخيانة......:یعنی آنکھ سے ایسی چیز کو دیکھوں جیسے دیکھنا جائز نہ ہو،یا آنکھ سے ایسا کوئی اشارہ کروں کہ جس پر فساد برپا ہو جائے۔

فإنك تعلم خائنة الأعين:قاضی بیضاویؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

الخائنة صفت ہے **النظرة** کی،جیسا کہ **نظرة ثانيه إلى المحرّم**۔ **استراق النظر الى مالا يحل** جیسا کہ اہل ریب کرتے ہیں،اس سے **خائنه من الاعين** مراد لینا مستحسن نہیں چونکہ **وما تخفى الصدور** سے اس مفہوم کو مساعدت حاصل نہیں ہو رہی۔

صاحب مدارک''**وما تخفى الصدور**'' کے بارے میں لکھتے ہیں:**أى وما تسره من أمانة أو خيانة**۔

ابن حجرؒ کا یہ کہنا بالکل مردود ہے:**أى:الخائنة منها وهى التى تتعمد ذلك النظر المحرم مع استراقه حتى لايفطن أحد له**۔ مزید لکھتے ہیں:**وقد يراد بخائنة الاعين أن يظهر الانسان خلاف ما يبطن كأن يشير بطرف عينه إلى قتل إنسان، مع أنه يظهر له الرضا عنه**۔ان کی یہ عبارت بھی عجیب وغریب ہے اور اشارہ بھی بڑا انوکھا ہے۔ان تمام تر باتوں کے باوجود یہ تقریر قضیہ مذکورہ بالا کے مطابق نہیں ہے۔اور یہی حال ان کی پیش کردہ اس دلیل کا ہے جو آگے آ رہی ہے:**ومن ذلك ما وقع يوم فتح مكة اى ممن أهدر دمهم يؤمئذ جئ به الى النبى ﷺ مشفع فيه عثمان رضى الله عنه ، فكست ﷺ هنيهة، ثم شفع عثمان فيه، ثم قال لأصحابه: هلا بادر أحدكم إلى قتله حين سكت۔ فقالوا: يا رسول الله! هلّا أشرت إلينا بقتله؟ فقال النبى ﷺ:ما كان لنبى أن يكون له خائنة الأعين**۔

اسی وجہ سے ہمارے ائمہ نے فرمایا:نبی کریم علیہ الصلوٰۃ السلام کے خصائص میں سے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر خائنۃ الاعین کا حرام ہونا بھی ہے،اور خائنۃ الاعین یہ ہے کہ **أن يبطن خلاف ما يظهر إلا فى التورية بالحرب أو فيه اه**۔اس میں اشکال یہ ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کیلئے وجہ اختصاص واضح نہیں ہے۔آگے لکھتے ہیں:''**ما تخفى الصدور**'' **أى تكنه القلوب وتضمره**

الأفئدة من توالى خطراتها المتنافية۔ وفى ترق لأن هذه الحظرات أقبح من تلك النظرات اھ۔ میں کہتا ہوں ایسا نہیں ہے۔ چونکہ ''خطرات'' تومعفوعنها ہیں، بخلاف ''نظرات المعتمد بها'' کے۔ آگے لکھتے ہیں: أما قول الكشاف: ولا يحسن أن ير خائنة الأعين بما مرّ عن الفقهاء، فهو واضح لأن خائنتها حينئذ مما تخفيه الصدور، فيكون من عطف الأعم، وهو خلاف الأصل من التغاير الحقيقى بين المعطوف والمعطوف عليه، أوسن تفسيرها بما مر أوّلا مندفعا بما قررته من الترقى المذكور، وبهذا الفرق الذى قررت به كلامه من إيضاحه على الأول واندفاعه على الثانى يعلم ما فى كلام الشارح هنا فتأمله اھ۔

چنانچہ ہم تأمل کیا تو صاحب کشاف اور طیبی کو عربیت وتفسیر میں امام محقق ومدقق پایا۔ عطف العام علی الخاص کی معرفت رکھتے ہیں۔ عطف کی یہ قسم کتاب اللہ میں بکثرت واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ ان کے کلام کی مراد یہ ہے کہ ''وما تخفى الصدور'' کہ اللہ جل شانہ سینوں کے مختلف احوال کو جانتا ہے اور متعاطفین کے درمیان حسن تقابل کا تقاضا ہے کہ اس کے معنی یہ ہوں: خائنة الأعين الأحوال الكامنة الكائنة فى الأعين،

چونکہ ''صدر'' کے مقابلہ میں مذکور ذات یہی ہے، اور ''علم'' کا ذوات میں سے ہونا واضح بات ہے، چنانچہ اس کا تعلق احوال مخفیہ سے ہونا ''أبلغ وأفيد'' ہے۔ اس صورت میں ترقی دقیق سے ''أدق'' کی طرف ہوگی، جیسا کہ اس فرمان باری تعالیٰ میں: ﴿يعلم السر وما يخفى﴾ والله تعالىٰ أعلم۔

صحابی کی دعا' حضور ﷺ کا دنیا وآخرت کی عافیت مانگنے کی نصیحت کرنا

۲۵۰۲: وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَادَ رَجُلاً مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ قَدْ خَفَتَ فَصَارَ مِثْلَ الْفَرْخِ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ هَلْ كُنْتَ تَدْعُوْ اللّٰهَ بِشَيْءٍ اَوْ تَسْأَلُهٗ اِيَّاهُ قَالَ نَعَمْ كُنْتُ اَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ مَا كُنْتَ مُعَاقِبِيَّ بِهٖ فِي الْاٰخِرَةِ فَعَجِّلْهُ لِيْ فِي الدُّنْيَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ سُبْحَانَ اللّٰهِ لَا تُطِيْقُهٗ وَلَا تَسْتَطِيْعُهٗ اَفَلَا قُلْتَ اَللّٰهُمَّ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ قَالَ فَدَعَا اللّٰهَ بِهٖ فَشَفَاهُ اللّٰهُ ۔

اخرجه مسلم فى صحيحه ۲۰۶۸/۴ حديث رقم (۲۳۔ ۲۶۸۸)۔ والترمذى فى السنن ۴۸۷/۵ حديث رقم ۳۴۸۷۔ واحمد فى المسند ۱۰۷/۳۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبیؐ نے ایک شخص کی عیادت کی مسلمانوں میں سے۔ کہ وہ پرندے کے بچے کی طرح خفیف ہوگیا تھا پس اس کو نبیؐ نے ارشاد فرمایا کیا تو اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتا تھا کسی چیز کے ساتھ یا یہ کہا کہ تو اللہ تعالیٰ سے کچھ چیز مانگتا تھا۔ کہا کہ ہاں مانگتا تھا۔ اے الٰہی جو کہ عذاب کرنے والا ہے تو میرے لیے آخرت میں تو اس کو میرے لیے دنیا میں جلدی کر دے۔ پس نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا تو نے عجب دعا مانگی تو اللہ کے عذاب کی طاقت نہیں رکھتا۔ یعنی دنیا میں اور تو اس کے عذاب کو دور نہیں کر سکے گا۔ پس تم نے کیوں نہ کہا۔ کہ اے الٰہی ہم کو دنیا میں بھلائی دے یعنی عافیت اور آخرت میں بھی بھلائی یعنی تقصیرات سے درگزر اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔ پس روایت کرنے والے نے کہا ہے پس اس شخص نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی پس اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو شفا دے دی۔

تشریح: قوله: عاد رجلا......الفرخ: '' خفت'' بروزن ضرب۔ خفت يخفت إذا ضعف و سكن۔ سے مأخوذ ہے أو يسأله إياه: کہا گیا ہے کہ یہ راوی کا شک ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں: بظاہر یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کلام ہے، أى:

قوله: هل كنت تدعو......اياه: بشئ من الأدعية التي يسئل فيها مكروه، أو هل سألت الله البلاء الذى أنت فيه؟ اس تقریر پر ضمیر منصوب اس "بلاء" کی طرف راجع ہے جس پر حال دلالت کر رہا ہے، اور خفت اس کا پتہ دے رہا ہے، چنانچہ اولاً عموم رکھا اور پھر اس میں تخصیص فرمائی۔ ابن حجرؒ نے "أو" کو برائے تنویع قرار دیا ہے، دعا کو تلویح کے ساتھ، اور سوال کو تصریح کے ساتھ مختص کیا ہے۔ یہ ایک اچھی توجیہ ہے۔

قوله: قال: نعم......الدنيا: یہ جملہ دلالت کر رہا ہے کہ "أو" راوی کے شک کا بیان ہے، نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف سے تردید نہیں ہے۔ اللهم ما كنت: یہ "ما" شرطیہ بھی ہوسکتا ہے۔ موصولہ ہے۔ قوله: سبحان الله لا تطيقه و لا تستطيعه:

"سبحان الله" اس کے یہاں دو معنی مراد ہو سکتے ہیں: (۱) اللہ جل شانہ ظلم و عجز سے منزہ ہے (۲) یہ برائے تعجب ہے۔

"لا تطيقه و لا تستطيعه": اس کا ایک مطلب ترجمہ کے ذیل میں بیان ہو چکا ہے اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ تاکید کیلئے ہے۔ چنانچہ ابن حجر کا یہ کہنا باطل ٹھہرا کہ دونوں جملوں کا آل ایک ہے، چونکہ ان کا اختلاف ان کے تعلق کے اختلاف سے ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: لا تطيقه اور كنت اقول یہ حکایت ہے حال ماضیہ کی جو مستمره الحال والاستقبال ہے۔ ابن حجرؒ نے انوکھی بات کہی: أي: لا تطيق هذا العذاب الذى سألته لافى هذه الحالة التي أنت فيها، ولا فيما سواها، كما دل عليه عموم النفي، فاندفع قول الطيبي الخ۔ تأمل فرمائیے، عقل مند کیلئے اشارہ بھی کافی ہے اور غافل کیلئے کثرت عبارت بھی نافع نہیں۔

قوله: اللّهم آتنا . . . . عذاب النار: اس سارے کی تشریح ماقبل میں گزر چکی ہے۔

قوله: قال: فدعا الله به: أي: بهذا الدعا الجامع۔ اور ابن حجرؒ لکھتے ہیں: أي: حال كونه ملتبسا بقوله هذا الدعا۔ أو استغنى عنه، ابن حجر کی یہ توجیہ درحقیقت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس جملہ: "هل دعوت الله بشيئ" سے غفلت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے، چونکہ باء برائے تعدیہ ہے، یعنی مفعول ثانی ہے۔

بلاؤں میں گرفتار ہو جانا اپنے نفس کو ذلیل کرنے کے مترادف ہے

۲۵۰۳: وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا يَنْبَغِي لِلْمُؤْمِنِ اَنْ يُذِلَّ نَفْسَهُ قَالُوْا وَكَيْفَ يُذِلُّ نَفْسَهُ قَالَ يَتَعَرَّضُ مِنَ الْبَلَاءِ لِمَا لَا يُطِيْقُ۔

(رواه الترمذی و ابن ماجة والبيهقی فی شعب الا يمان وقال الترمذی هذا حديث حسن غريب)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤٥٣/٤ حديث رقم ٢٢٥٤۔ واحمد فی المسند ٤٠٥/٥ والبيهقی فی شعب الايمان۔

ترجمہ: حضرت حذیفہؓ سے روایت کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ مؤمن کے لیے لائق نہیں ہے یہ کہ اپنے نفس کو ذلیل کرے صحابہ نے عرض کیا ہے کس طرح اپنے نفس کو ذلیل کرتا ہے۔ فرمایا بلاؤں میں گرفتار ہو جائے اور اس کی طاقت نہ رکھتا ہو۔ اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور ابن ماجہؒ نے اور بیہقیؒ نے شعب الایمان میں اور امام ترمذیؒ نے کہا یہ حدیث حسن غریب ہے۔ اسنادی حیثیت: امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: قوله: لاينبغي......لما لايطيق: حدیث باب اس کے منافی نہیں: المؤمنين لا يخلوا من علة أو قلة أو ذلة وجہ استبعاد یہ تھی کہ اپنے نفس کے اعزاز کی محبت تو انسان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے، چنانچہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کوئی انسان اپنے آپ کو اپنے اختیار سے ذلت میں ڈالے۔

من البلاء: "من" بیانیہ ہے۔ لما لايطيق: بظاہر "لام" بمعنی "الی" ہے، اور ایک نسخہ میں یہ محذوف ہے۔ اور ابن حجرؒ نے

یہاں انوکھی بات کہی کہ أن یذل نفسه کیلئے بیان ہے۔

ظاہر و باطن کی بہتری کے لیے دعا مانگنا

۲۵۰۴: وَعَنْ عُمَرَ قَالَ عَلَّمَنِي رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ قَالَ قُلِ اللّٰهُمَّ اجْعَلْ سَرِيْرَتِيْ خَيْرًا مِنْ عَلَانِيَتِيْ وَاجْعَلْ عَلَانِيَتِيْ صَالِحَةً اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْأَلُكَ مِنْ صَالِحِ مَا تُؤْتِي النَّاسَ مِنَ الْاَهْلِ وَالْمَالِ وَالْوَلَدِ غَيْرَ الضَّالِّ وَلَا الْمُضِلِّ۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٥/ ٥٣٤ حدیث رقم ٣٥٨٦۔

ترجمه: حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے سکھایا کہ اے الٰہی میرے باطن کو بہتر بنا دے میرے ظاہر سے اور میرے ظاہر کو شائستہ کر دے اے الٰہی تحقیق میں مانگتا ہوں تجھ سے اس چیز کی بہتری جو تو دیتا ہے لوگوں کو اہل سے اور مال سے اور اولاد سے کہ نہ گمراہ ہوں اور نہ گمراہ کریں۔ اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا۔

تشریح: قوله: علمنی رسول الله ﷺ قال:

(کا مفعول یہ محذوف ہے) أی دعاء۔ قال: "علمّنی" کا بیان ہے۔

قوله: اللهم اجعل...... صالحة: واضح رہے کہ سریرۃ اور سرّ ہم معنی ہیں۔

علانیتی: تخفیف کے ساتھ ہے۔ پہلے یہ طلب کرنا کہ باطن کو ظاہر سے بہتر بنا اور پھر یہ کہنا کہ ظاہر کو باطن سے بہتر بنا۔ اس وہم کو دور کرنے کیلئے ہے کہ بعض مرتبہ باطنی غیر صالح ظاہر سے بہتر ہوتا ہے۔ ابن حجرؒ نے یہاں بے سود گرفت کی ہے۔

قوله: اللهم إنی أسألك من صالح...... المضل:

کہا گیا ہے کہ اخفش کے مذہب کے مطابق یہ "من" زائدہ ہے۔

من الأهل: "ما" کا بیان ہے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ "تبعیضیہ" ہو۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ اسم مجرور اہل، مال اور ولد ان میں سے ہر ایک سے بدل ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ "ضال" میں معنی نسبتی ہوں۔ **أی: غیر ذی ضلال۔ والله تعالٰی أعلم۔**

اور سب سے جامع یہ دعا منقول ہے: **اللهم إنی أسألك من الخیر كله عاجله و آجله ما علمت منه وما لم اعلم، واعوذبك من الشر كله عاجله و آجله ما علمت منه و مالم اعلم، اللهم انی اسالك من خیر ما سالك عبدك و نبیك، واعوذبك من شر ما عاذ منه عبدك ونبیك، اللهم انی اسالك الجنة وما قرب الیها من قول اوعمل، واعوذ بك من النار وما قرب الیها من قول او عمل، واسالك ان تجعل كل قضاء لی خیرا۔**

اس دعا کو ابن ماجہؒ اور ابن حبانؒ دونوں حضرات نے صدیقہ کائنات بنت صدیق حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے۔

دعواتِ قرآنیہ کے بعد میں نے دعواتِ نبویہ کو بھی جمع کیا ہے اور اس کے آخر میں درود وسلام کا مجموعہ ہے۔ میرا یہ مجموعہ دیگر تمام احزاب و اوراد وظائف کے مقابلہ میں محافظت کا زیادہ حقدار ہے۔ میرا یہ مجموعہ درحقیقت شمائل سنیہ کو جامع اور اختلاف ردیہ کیلئے مانع ہے۔ یہ رسالہ صوفیہ صفیہ کے رسائل کا "لب لباب" ہے۔

كِتَابُ الْمَنَاسِكِ

یہ کتاب افعالِ حج کے بیان میں ہے

مناسك ، منسك کی جمع ہے۔سین کے کسرہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ ہے اور قراءتِ سبعہ میں یہ آیت: ﴿لكل امة جعلنا منسكا﴾[الحج: ٦٧] دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔منسك' نسك، ينسك سے بمعنی تعبد مصدر میمی ہے، پھر حج کے تمام افعال کا نام "مناسك" رکھ دیا گیا۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، النسك، العبادة، و الناسك العابد کہ نسک، عبادت کو کہتے ہیں اور ناسک اس عابد کو کہتے ہیں جو افعال حج ادا کر رہا ہو، اور مناسک حج کے افعال اور اعمال کے جگہوں کو کہتے ہیں اور اور نسيكه، ذبیحہ کے کے ساتھ خاص ہے اور حج فتحہ اور کسرہ کے ساتھ قراءت سبعہ میں:

﴿ولله على الناس حج البيت﴾[آل: عمران: ٩٧] دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔

اور حج لغت میں قصد و ارادہ کو کہتے ہیں۔

اور بعض نے کہا ہے کہ کسی با عظمت چیز کی طرف قصد کرنے کو کہتے ہیں۔

اور قاموس میں ہے کہ مکہ کا قصد کرنا ادائے نسک کیلئے اس کو حج کہتے ہیں اور ظاہر یہ ہے کہ یہ حج کا اصطلاحی معنی ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ حج کا شرعی معنی ہے، بیت اللہ کا قصد کرنا دین کے ارکان میں سے ایک رکن کے ادائیگی کیلئے، (اور ابن ہمام پھر فرماتے ہیں) کہ والظاهر انه عبادة عن الافعال المخصوصة، من الطواف، والوقوف فی وقته محرمًا بنية الحج سابقًا۔لیکن یہ بات مخفی نہیں ہے کہ احرام نیت اور تلبیہ سے عبارت ہے۔تو ابن ہمام کے تعریف میں بنية الحج مستدرک ہے اور سابقًا ،حال ہے یعنی حال کون الاحرام المقرون بالنية متقدما على الافعال؛ احرام کا مقدم ہونا اس لیے ضروری ہے کہ یہ ہمارے نزدیک شرط ہے۔

حج کا سبب:

حج کیلئے سبب بیت اللہ ہے اس لیے کہ حج کی اضافت اسی کی طرف ہوتی ہے۔

حج کا تاریخی پس منظر:

معالم التنزیل میں ہے کہ علماء کا اس آیت: ﴿ان اول بيت وضع للناس﴾[آل عمران:٩٦] کے تفسیر میں اختلاف ہے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ پہلا گھر ہے جو آسمان و زمین کے پیدائش کے وقت سب سے پہلے پانی کے اوپر بنایا گیا اللہ نے اس کو زمین کے خلقت سے دو ہزار سال پہلے پیدا کیا ہے۔ پانی کے اوپر سفید قسم کا جھاگ تھا اسی کے نیچے زمین کو بچھایا گیا، یہ عبداللہ بن عمر، مجاہد، قتادہ اور سدی کا قول ہے اور یہی مشہور قول ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ پہلا گھر ہے جو زمین کے اوپر بنایا گیا ہے۔

حضرت علی بن حسین سے روایت کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ نے عرش کے نیچے ایک گھر بنایا اور وہ بیت المعمور ہے اور فرشتوں کو اس کا طواف کرنے کا حکم دیا۔ پھر زمین پر رہنے والے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ زمین پر اس گھر کی طرح ایک گھر بنائیں تو فرشتوں نے بنایا اور اس کا نام ضراح ہے اور زمین والوں کو اس کا طواف کرنے کا حکم دیا جیسا کہ آسمان والے بیت المعمور کا طواف کرتے ہیں۔

اور یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ آدم علیہ السلام کی پیدائش سے دو ہزار سال پہلے فرشتوں نے بیت اللہ کو بنایا تھا اور پھر وہ بیت اللہ کا حج کرتے تھے جب آدم علیہ السلام نے اسکا حج کیا تو فرشتوں نے کہا، کہ تیرا حج قبول ہو، ہم نے آپ سے دو ہزار سال پہلے اس گھر کا حج کیا ہے۔

حج کی شرعی حیثیت:

حج کی فرضیت، کتاب، سنت اور اجماع سے ثابت ہے اور اس کا منکر بالاتفاق کافر ہے۔

پھر یہ بات جان لینی چاہیے کہ جنات انسانوں کے تابع ہے ان احکام میں جن کے وہ مکلّف ہے تو آیت اور حدیث میں الناس کا لفظ جنات کو بھی شامل ہے۔ بعض مأخذ اشتقاق کو دیکھتے ہوئے جیسا کہ قاموس میں ہے۔

سابقہ امم کے لئے حج کی حیثیت:

پھر اس بات میں اختلاف ہے کہ کیا حج ہم سے پہلے امتوں پر بھی فرض تھا یا اس کی فرضیت ہمارے امت کے کامل ہونے کی وجہ سے ہمارے ساتھ مختص ہے؟ تو ثانی زیادہ ظاہر ہے اور ابن حجر نے پہلے قول کو اختیار کیا ہے اور اس نے استدلال کیا ہے اس حدیث سے جس میں ہے **ما حسن نبی الاوحج البیت**: تو اس سے معلوم ہوا کہ یہ قدیم شرائع میں سے ہے اور روایت میں ہے کہ آدم علیہ السلام نے ہندوستان سے چالیس سال تک پیدل حج کیا ہے اور جبریل نے ان سے کہا کہ فرشتے تجھ سے پہلے سات ہزار سال اس گھر کا طواف کرتے رہے۔

لیکن جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ روایت حج کے وجوب کے اثبات یا نفی پر دلالت نہیں کر رہے ہیں بلکہ ان سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ حج ہم سے پہلے انبیاء علیہ السلام میں مشروع تھا اور اسکے مشروع ہونے سے اس کا واجب ہونا لازم نہیں آتا۔ علاوہ ازیں ہمارا کلام سابقہ امتوں کے بارے میں ہے نہ کہ انبیاء کے بارے میں، تو یہ بات کوئی بعید نہیں کہ ہم سے پہلے انبیاء پر تو واجب ہو مگر ان کے امتوں پر واجب نہ ہو۔ تو یہ خصوصیات انبیاء علیہم السلام میں سے ہوا۔ جیسا کہ باب الوضوء میں اس کی تحقیق گزری اور صحیح روایت سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حج الوداع کے موقع پر جب عسفان پہنچے تو فرمایا اے ابوبکر یہ کونسی وادی ہے؟ ابوبکر نے کہا وادی غسیان ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''لقد مر به هود و صالح علی بکرین احمرین خطمهما اللیف، وأزرهم العباء و اردیتهم النمار، یلبون یحجون البیت العتیق'' (رواہ احمد) کہ اس وادی سے حضرت ہود علیہ السلام اور صالح علیہ السلام دو سرخ اونٹوں پر سوار ہو کر گزرے اونٹوں کی نکیل کھجور کی چھال سے بنی ہوئی تھی اور ان کے ازاء اور رداء اون کی موٹی چادریں تھی۔

اور مسلم نے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم وادی ازرق سے گزرے کہ گویا کہ میں دیکھ رہا ہوں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف ثنیہ سے کہ وہ انگلیاں اپنے کانوں میں رکھے ہوئے وادی سے گزر رہے ہیں اور اس کیلئے گڑگڑانا ہے اللہ کی طرف تلبیہ کے ساتھ۔

اس وادی اور مکہ کے درمیان ایک میل کا فاصلہ ہے۔

اور عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ہے: **لیھلن لن عیسی بن مریم بفج الروحاء۔**

یہ دلالت کر رہا ہے کہ انبیاء برزخ میں حقیقۃً زندہ ہیں اور وہ اللہ کے ہاں قربت حاصل کرتے ہیں ان کو مکلف بنائے بغیر، جیسا کہ وہ قبروں میں نماز کے ذریعے اللہ کی قربت حاصل کرتے ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت انس سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قبر میں نماز پڑھتے دیکھا اور بخاری کی روایت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے اور مسلم کے ایک اور روایت میں حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر ہے۔

الفصل الاول:

حج کرنا زندگی میں ایک مرتبہ فرض ہے

۲۵۰۵: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم فَقَالَ اَیُّهَا النَّاسُ قَدْ فُرِضَ عَلَیْکُمُ الْحَجُّ فَحُجُّوا فَقَالَ رَجُلٌ اَکُلَّ عَامٍ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَسَکَتَ حَتّٰی قَالَهَا ثَلَاثًا فَقَالَ لَوْ قُلْتُ نَعَمْ لَوَجَبَتْ وَلَمَا اسْتَطَعْتُمْ ثُمَّ قَالَ ذَرُوْنِیْ مَا تَرَکْتُکُمْ فَاِنَّمَا هَلَكَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ بِکَثْرَةِ سُؤَالِهِمْ وَاخْتِلَافِهِمْ عَلٰی اَنْبِیَائِهِمْ فَاِذَا اَمَرْتُکُمْ بِشَیْءٍ فَأْتُوْا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاِذَا نَهَیْتُکُمْ عَنْ شَیْءٍ فَدَعُوْهُ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۹۷۵/۲ حدیث رقم (۴۱۲۔ ۱۳۳۷)۔ والنسائی فی السنن ۱۱۰/۵ حدیث رقم ۲۶۱۹۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا۔ پس فرمایا اے لوگو! تم پر حج فرض کیا گیا ہے پس حج کرو۔ پھر ایک شخص نے کہا ہم ہر سال حج کریں۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے یہاں تک کہ اس شخص نے یہ بات تین بار کہی۔ پھر فرمایا اگر میں ہاں کہتا تو (مبادا) ہر سال حج فرض ہو جاتا اور تم طاقت نہ رکھتے۔ پھر فرمایا مجھ کو چھوڑ دو۔ جب تک کہ میں تم کو نہ چھوڑوں۔ پس وہ لوگ جو تم سے پہلے تھے یعنی یہود و نصاریٰ کثرت سوال کی وجہ سے اور اپنے انبیاء کے اوپر اختلاف کرنے کی وجہ سے ہلاک ہوئے جیسے بنی اسرائیل کی قوم سے منقول ہے پس جس وقت میں تم کو کسی چیز سے منع کروں، پس تم اس کو چھوڑ دو۔ اس کو امام مسلم رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله: قد فرض علیکم الحج فحجوا:** ۸ھ کو جو فتح مکہ کا سال ہے عتاب بن اسید نے لوگوں کو حج کرایا اور ۹ھ کو ابو بکر نے کرایا اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۰ھ کو حج کیا، اسی طرح شمنی نے ذکر کیا ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ حج کی فرضیت ۹ھ کو ہوئی یا ۵ھ کو یا ۶ھ کو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حج ۱۰ھ تک مؤخر کرنا اس میں حج فوت ہونے کا خطرہ نہیں تھا اگر چہ حج فی الفور لازم ہوتا ہے اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ حج ادا کرنے تک زندہ رہیں گے اور لوگوں کو حج کے احکام اور افعال سکھائیں گے تکمیل تبلیغ کیلئے (انتھا)۔

اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مؤخر کیا ۵ھ یا ۶ھ سے مکہ فتح نہ ہونے کی وجہ سے اور ۸ھ سے مؤخر کیا ہے وہ نسیٔ کی وجہ سے اور ۹ھ سے جو مؤخر کیا ہے تو اس کی وجہ ہم نے اپنے رسالہ جس کا نام "**التحقیق فی موقف الصدیق**" ہے میں ذکر کیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ حج ہجرت سے پہلے واجب ہوا ہے اور بعض نے اسکے علاوہ قول اختیار کیا ہے۔ یہاں تک کہ اسکے فرضیت کے بارے میں گیارہ قول ہیں۔ ابن اثیر کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت سے قبل ہر سال حج کیا کرتے تھے اور اسکے موافق ابن جوزی کا قول ہے کہ آپ

ﷺ نے اتنے حج کئے جن کی تعداد معلوم نہیں اور حاکم نے سند صحیح کے ساتھ ثوری سے نقل کیا ہے کہ آپ علیہ اسلام نے ہجرت سے پہلے کئی حج کیے ہیں۔

باقی جو ترمذی کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے ہجرت سے قبل دو حج کیے اور ابن ماجہ اور حاکم کی روایت میں تین کا ذکر ہے تو اس کی بنیاد ان کے علم پر ہے اور یہ دوسرے کی زیادۃ کے اثبات کے منافی نہیں ہے۔

قوله : فقال رجل اكل عام؟: ''ا کل عام'': فعل مقدر کے بناء پر منصوب ہے۔ یعنی اصل میں **أتأمرنا ان نحج كل عام** ہے یا **أخوض علينا ان نحج كل عام** ہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ سوال انہوں نے اس لئے کیا کہ ان کے عرف میں حج کا معنی قصد بعد القصد کا تھا تو صیغہ سے تکرار کا وہم ہو رہا تھا، لیکن زیادہ ظاہر یہ ہے کہ ان کے سوال کی بنیاد حج کو باقی عبادات نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ پر قیاس کرنا تھا۔ اور ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ ہر سال حج کا فرض ہونا تمام مکلفین کے بنسبت محال ہے جیسا کہ اہل کمال پر واضح ہے۔

قوله : فسكت حتى قالها ثلاثا: ''**فسكت**'' جواب دینے سے سکوت فرمایا یا اس لیے کہ سکوت بے علم کیلئے جواب ہے۔ کیونکہ حسن سؤال نصف علم ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ آپ ﷺ نے تنبیہا سکوت اختیار کیا کہ اس سوال کے کرنے سے خاموش رہنا بہتر تھا۔ کیونکہ نبی ﷺ اس بات سے سکوت نہیں فرماتے تھے جس کے وضاحت کی امت محتاج ہوتی تھی۔ پس اس طرح کا سوال رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش قدمی ہے اور مؤمنین کو کسی بھی قول و فعل میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش قدمی سے اس آیت میں منع فرمایا ہے۔

﴿**يايها الذين آمنوا لا تقدموا بين يدى الله ورسوله**﴾ [الحجرات:۱]

اے ایمان والو! آگے نہ بڑھو اللہ سے، اور اس کے رسول سے، موضح القرآن۔ الحجرات

اور آپ ﷺ سے بات میں پیش قدمی جہالت کی ایک قسم ہے۔ لیکن جب آپ ﷺ نے دیکھ لیا کہ نہ تو وہ منع ہو رہا ہے اور نہ ہی صبر اور قناعت کر رہا ہے مگر صریح جواب پر تو آپ ﷺ نے صراحت فرما دی۔

قوله :لوقلت :نعم لوجبت ولمااستطعتم:

''**لوجبت**'': بعض روایات میں لوجب بغیر تاء کے ہے اگر تاء کے ساتھ ہو تو فاعل ''**العبادة**'' ہوگا یعنی **لوجبت هذه العبادة** اور اگر بغیر تاء کے ہو تو فاعل الحج ہوگا یعنی **لو جب الحج كل عام**۔

اور یہ بھی بعید نہیں ہے کہ آپ ﷺ کا سکوت وحی یا الہام کے انتظار کی وجہ سے ہو۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: کہ بعض حضرات نے کہا ہے کہ حج کا واجب کرنا یہ آپ ﷺ کو مفوض تھا لیکن اس قول کی تردید کی گئی ہے کہ آپ ﷺ کا یہ قول ''**لو قلت نعم**'' عام ہے کہ اس کا ایجاب خود آپ ﷺ کی طرف سے ہو یا نازل شدہ وحی کے ذریعے ہو یا حضور ﷺ کے رائے اور اجتہاد سے ہوا اگر ہم حضور ﷺ کیلئے اجتہاد جائز قرار دیں۔ یہ بات علامہ طیبیؒ نے ذکر کی ہے۔

لیکن اس میں یہ بات ہے کہ وہ تفویض بھی تو عام ہے لہٰذا اس کا رد درست نہیں اور اسکے ساتھ اس کا یہ لکھنا کہ ایجاب خود آنحضرت ﷺ کی طرف سے ہو یعنی جو وحی جلی اور حق سے بالکل خالی ہو تو یہ قول بھی مردود ہے کیونکہ اللہ کا ارشاد ہے: ﴿**وما ينطق عن الهوى ان هو الا وحى يوحى**﴾ [النجم:۳-۴] اور نہیں بولتا اپنی نفس کی خواہش سے۔ یہ تو حکم ہے بھیجا ہوا۔ موضح القرآن۔ النضو۔

لوجبت: یعنی یہ عبادت یا فریضہ حج جس پر فرض دلالت کر رہا ہے یا ہر سال حج کرنا یا بہت سارے حج کرنا ہر ایک پر فرض ہو جاتا ہے۔

قوله :ذرونی ماترکتکم،فانما هلك من كان قبلكم بكثرة سؤالهم:
ایک نسخہ میں (فانما هلك کے بجائے) اهلك همزہ کے ساتھ بصیغہ مجہول ہے۔
''بكثرة سؤالهم'' جیسے انہوں نے اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا' اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کا سوال کیا۔ بقرہ (گائے) کے بارے میں سوالات کیے۔

قوله :واختلافهم على انبيآئهم:
''واختلافهم'' اس کا عطف کثرۃ پر ہے نہ کہ سؤال پر۔ کیونکہ بعض اختلاف بھی موجب ہلاکت ہے اگر چہ بغیر کثرۃ کے ہو۔
''على انبيآئهم'' یعنی جب انبیآء ان کو حکم دیتے سوال کرنے کے بعد یا قبل، اوران نے انبیآء پر اختلاف کیا بس ہلاکت ہوئے اور ہلاکت کرنے کے مستحق ہوگئے۔

قوله :''ما استطعتم'' کیونکہ جو چیز پوری حاصل نہیں کی جاسکتی وہ پوری چھوڑنی بھی نہیں چاہیے۔
فرماتے ہیں کہ یہ اسلام کے بڑے قواعد اور جوامع الکلم میں سے ہے اور اس کے تحت بے شمار اَحکام آجاتے ہیں جیسے نماز اپنے تمام انواع کے ساتھ کیونکہ جب کوئی نماز کے بعض ارکان کے ادائیگی سے اور بعض شروط سے عاجز ہو تو باقی ادا کرلے۔

قوله :واذانهيتكم عن شيء فدعوه:''فدعوه'' یعنی مکمل چھوڑ دو۔ یہاں تک کہ کہا گیا ہے کہ بعض گناہوں سے توبہ کرنا درست نہیں۔ حالانکہ صحیح یہ ہے کہ توبہ درست ہے۔

۲۵۰۶:وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَیُّ الْعَمَلِ اَفْضَلُ؟ قَالَ اِيْمَانٌ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ قِيْلَ ثُمَّ مَاذَا قَالَ الْجِهَادُ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قِيْلَ ثُمَّ مَاذَا قَالَ حَجٌّ مَبْرُوْرٌ ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۷۷/۱۔ حدیث، رقم ۲۶۔ ومسلم فی صحیحه ۸۸/۱ حدیث رقم (۱۳۵۔ ۸۳)۔ والترمذی فی السنن ۱۵۹/٤ حدیث رقم ۱٦۵۸۔ والنسائی ۱۱۳/۵ حدیث رقم ۲٦۲٤۔ والدارمی ۲۱٤/۲ حدیث رقم ۲۳۹۳ واحمد فی المسند ۳۷۲/٦۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کونسا عمل بہتر ہے فرمایا اللہ پر ایمان لانا اوراس کے رسول ﷺ کے کہا گیا پھر کونسا عمل بہتر ہے اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :ای العمل افضل: علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ افضل اعمال کے بارے میں مختلف احادیث ہیں کہ جن میں تطبیق وتوفیق مشکل ہے اور تطبیق کی صحیح وجہ وہی ہے جو ہم کتاب الصلاۃ کے شروع میں ذکر کر چکے ہیں اور ایمان دل کی تصدیق کو کہتے ہیں اور یہ باطنی اعمال میں سے ہے۔

قوله :الجهادفی سبيل الله الجهاد: میں الف لام تعریف کیلئے ہے اور مراد اس سے خالص جہاد ہے۔''**فی سبيل الله**'' کیونکہ مجاہد نمازی اور روزہ دار ہوتا ہے۔

قوله :''حج مبرور'' مبرور مقبول کے معنی میں ہے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں۔ **بره، ای احسن اليه،** کہا جاتا ہے **بر الله عمله** یعنی اللہ نے اس کے عمل کو قبول کرلیا تو گویا کہ عمل کو قبول کر کے اللہ نے اسکے عمل کے ساتھ احسان کیا۔''ایمان'' تنکیر تفخیم کے ساتھ ہے۔
''**حج مبرور**'' یعنی جس نے حج کے ساتھ کوئی گناہ نہ ملایا ہو۔ علامہ سیوطی نے الدر میں لکھا ہے کہ اصبہانی نے حضرت حسن سے یہ بات نقل کی ہے کہ ان سے پوچھا گیا کہ حج مبرور کیا ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ وہ اس حالت میں لوٹے کہ دنیا سے زاہد اور آخرت کی

طرف راغب ہو۔

اور اس حدیث سے افضلیت میں ترتیب ظاہر ہوتی ہے کہ اس میں کوئی نزاع نہیں ہے کہ ایمان مطلقاً سب سے افضل ہے۔ پھر جہاد افضل ہے کیونکہ عام عادت کے مطابق جہاد کے ساتھ اجتہاد فی العبادت بھی ہوتی ہے۔ اور آخرت کی طرف رغبت زیادہ ہوتی ہے۔ شہادت کے سعادت کے حاصل کرنے کی کوشش کے ساتھ۔ پھر حج افضل ہے جو عبادت بدنیہ اور مالیہ کو جمع کرنے والا ہے اور اپنے مانوس وطن کو چھوڑنا اور اپنے اہل وعیال کو چھوڑنا ہے۔ معروف طریقے پر یا یہ کہا جائے کہ آپ ﷺ نے افضل اعمال کا ذکر اسکے فرضیت کے ترتیب سے کیا کہ ایمان کے بعد جہاد فرض ہوا ہے ۔ پھر حج کو فرض کیا گیا ہے ارکان کے تکملہ کیلئے۔ اللہ کا ارشاد ہے:

﴿الیوم اکملت لکم دینکم﴾[المائدۃ:۳] آج کے دن تمہارے لیے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا۔

(بیان القرآن)

حج کے دوران معصیت سے پرہیز کرے

۲۵۰۷: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمَ وَلَدَتْهُ اُمُّهٗ ۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۸۲/۳۔ حدیث رقم ۱۵۲۱۔ ومسلم فی صحیحه ۹۸۳/۲ حدیث رقم (۴۳۸۔ ۱۳۵۰)۔ والترمذی فی السنن ۱۷٦/۳ حدیث رقم ۸۱۱۔ والنسائی ۱۱۴/۵ حدیث رقم ۲٦۲۷۔ والدارمی ۴۹/۲ حدیث رقم ۱۷۹٦۔ وابن ماجه ۹٦۴/۲ حدیث رقم ۲۸۸۹۔ واحمد فی المسند ۴۹۴/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص حج کرے اللہ کے واسطے اور وہ اپنی عورت سے صحبت نہ کرے اور نہ فسق کرے۔ تو گناہوں سے ایسے پاک صاف لوٹے گا جیسا کہ جس دن اس کی ماں نے اس کو جنا تھا۔ اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :من حج لله فلم يرفث ولم يفسق:

''فلم یرفث'' فاء پر تینوں حرکات درست ہیں اور ضمہ زیادہ مشہور ہے۔ سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ رفث کا اطلاق جماع، تعریض اور فحش قول پر ہوتا ہے۔ اور یہاں مراد آخری ہے۔ اور فاء پر ماضی اور مضارع دونوں میں تینوں حرکات آسکتے ہیں۔ اور زیادہ فصیح ماضی میں فتح اور مضارع میں ضمہ ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ رفث، جماع کی تصریح ہے اور ازہری فرماتے ہیں کہ رفث ایک جامع کلمہ ہے جو ہر اس شے کو شامل ہے جو مرد عورت سے چاہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ حج میں رفث کہتے ہیں عورتوں کے پاس آنا۔ اور فسوق، گالی کو کہتے ہیں۔ اور جدال دوستوں کے ساتھ جھگڑنے کو کہتے ہیں۔ حدیث میں جدال کا ذکر نہیں ہے آیت پر اعتماد کرنے کی وجہ سے یا یہ فسق میں داخل ہے یا رفث میں داخل ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ چونکہ مراد اس سے نہی ہے نہ کہ نفی۔ ابن الملک فرماتے ہیں کہ رفث، فحش قول اور عورتوں کے سامنے جماع کے باتوں کو کہتے ہیں اور فسق، حد استقامت سے نکلنے کو کہتے ہیں۔ ''یفسق'' سین کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ امور نحویہ ''کیوم ولدته امه'' یوم مبنی بر فتح ہے۔ مضاف ہے۔ مابعد جملے کی طرف۔ بعض نے کہا ہے کہ رجع، صار کے معنی میں ہے اور کیوم اس کیلئے خبر ہے۔ اور یہ بھی درست ہے کہ رجع اپنے معنی موضوع پر ہو اور کیوم حال ہو۔

''لم یفسق'' یعنی دوران حج گناہ کبیرہ کا ارتکاب نہ کیا ہو اور نہ ہی صغیرہ پر اصرار کیا ہو اور معاصی سے توبہ نہ کرنا بھی کبائر میں سے ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے: ﴿ومن لم یتب فأولئك هم الظالمون﴾[الحجرات:۱۱]

قوله :رجع كيوم ولدته امه:علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں،یعنی اپنے گناہوں سے بری ہونے میں یہ اس دن کی طرح ہے جس دن والدہ نے اس کو جنا تھا۔

یعنی وطن کی طرف لوٹا اس حال میں کہ مشابہ ہے اس کا یہ دن اس دن کے ساتھ جس دن اس کو والدہ نے جنا تھا۔لیکن اس مطلب کے مطابق حدیث میں جو کچھ ذکر ہوا اس سے مکی نکل جاتا ہے۔لیکن یہ بھی جائز ہے کہ اس کا معنی یہ ہو کہ حج کے اعمال سے فارغ ہو جائے۔

اس حدیث کی بنیاد اللہ کے اس ارشاد پر ہے: ﴿**وسبعة اذا رجعتم**﴾ [البقرة: ١٩٦] اور سات ہیں جب حج سے تم لوٹ آ ؤ۔

۔اس اختلاف کی بنیاد پر جو ہمارے اور امام شافعی کے درمیان رجوع کے معنی میں ہے اور وہ یہاں لازم نہیں ہے' حدیث کے بارے میں ہم کہتے ہیں کہ وہ لوٹا اپنے گھر کی طرف۔پس مکی اس سے نہیں نکلے گا۔

یہ بات جان لینی چاہیے کہ اس حدیث کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ سابقہ کبیرہ اور صغیرہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں لیکن اس پر اجماع ہے کہ مکفرات خاص ہے ان صغائر کے ساتھ جن کا تعلق حقوق العباد سے نہ ہو کیونکہ ان کی بخشش بندوں کے رضامندی پر موقوف ہے۔ہاں شرک کے علاوہ تمام گنا مشیئت کے تحت ہیں جس کیلئے جو گناہ اللہ چاہے معاف کر دیگا اور اس مسئلہ کی تحقیق میں، میں نے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے۔پھر جان لیے کہ جس شخص نے حج کیا' حج اور تجارت دونوں کے نیت سے تو اس کا ثواب اس سے کم ہوگا جس کی حج میں تجارت کی نیت نہ ہو۔اور قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ تاجر حاجی کو بالکل ثواب ہی نہ ملے کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا ہے''**من حج لله**'' مگر ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح طور پر نقل ہے کہ لوگ دوران حج تجارت کرنے سے کتراتے تھے تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿**ليس عليكم جناح ان تبتغوا فضلا من ربكم**﴾ [البقرة: ١٩٨] تم کو اس میں ذرا گناہ نہیں کہ معاش کی تلاش کرو تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے۔(بیان القرآن)

اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ ان سے ایک آدمی نے پوچھا کہ ایک شخص اپنے اونٹوں کو کرایہ پر دے کر حج بھی کرنا چاہتا ہے اور لوگ اس کو کہتے ہیں کہ آپ کا حج نہیں ہوگا تو ابن عمرؓ نے فرمایا کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور یہی سوال کیا جو آپ نے مجھ سے کیا۔یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوگئی:

(**ليس عليكم جناح ان تبتغوا فضلا من ربكم**) تو آپ ﷺ نے اس شخص کے پاس پیغام بھیجا اور یہ آیت ان پر پڑھی اور فرمایا کہ تیرا حج درست ہے۔اور سند حسن کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے ان سے پوچھا کہ اگر میں اپنے آپ کو ان لوگوں کو کرایہ پر دوں اور حج کروں تو کیا مجھے ثواب ملے گا، تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿**اولئك لهم نصيب مما كسبوا والله سريع الحساب**﴾ [البقرة:٢٠٢] ایسے لوگوں کو بڑا حصہ ملے گا، بدولت ان کے اس عمل کے اور اللہ تعالیٰ جلد ہی حساب لینے والے ہیں۔(بیان القرآن)

ایک عمرہ دوسرے عمرہ تک کفارہ ہے

٢٥٠٨:وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْعُمْرَةُ اِلَى الْعُمْرَةِ كَفَّارَةٌ لِمَا بَيْنَهُمَا وَالْحَجُّ الْمَبْرُوْرُ لَيْسَ لَهُ جَزَاءٌ اِلَّا الْجَنَّةُ ۔(متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ٥٩٧/٣۔ حديث رقم ١٧٧٣۔ ومسلم فى صحيحه ٩٨٣/٢ حديث رقم (٤٣٧۔ ١٣٤٩)۔ والترمذى فى السنن ٢٧٢/٣ حديث رقم و ابن ماجه ٩٦٤/٢ حديث رقم ٢٨٨٨۔ ومالك فى الموطأ ٣٤٦/١ حديث رقم ٦٥ من كتاب الحج۔ واحمد فى المسند ٢٤٦/٢۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ایک عمرہ دوسرے عمرے تک کفارہ ہے۔ان گناہوں کے لیے کہ ان دونوں کے درمیان میں ہوں۔یعنی صغیرہ گناہ اور مقبول حج کا بدلہ صرف بہشت ہے ۔اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله :العمرة إلى العمرة كفارة لما بينهما:**

''**العمرة**''عین کے ضمہ اور میم کے سکون کے ساتھ ہے جیسا کہ قداءات میں تواتر سے ثابت ہے۔اور لغات میں ثابت ہے۔ لیکن ابن حجر نے اس میں عجیب وغریب لغت ذکر کی ہے کہ یہ ضمہ اور سکون کے ساتھ ہے یا فتحہ اور سکون کے ساتھ ہے۔لغت میں عمرہ زیارت کو کہتے ہیں اور شرعاً طواف اور سعی کے ارادہ کو کہتے ہیں۔

قوله :والحج المبرور ليس له جزاء الا الجنة:

''**الجنة**'': یہ رفع یا نصب کے ساتھ ہے اور یہ **ليس الطيب الا المسك** کی طرح ہے۔کیونکہ بنی تمیم اس کو رفع دیتے ہیں اس کو حمل کرتے ہیں کہ لیس نفی کے ختم ہونے کی صورت میں مہمل ہو جاتا ہے جیسا کہ اہل حجاز نے ''ما''کو لیس پر حمل کیا ہے۔جیسا کہ معنی اللبیب میں ہے۔

رمضان میں عمرہ کرنے کی فضیلت

۲۵۰۹:وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ عُمْرَةً فِيْ رَمَضَانَ تَعْدِلُ حَجَّةً۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ۶۰۳/۳۔ حديث رقم ۱۷۸۲۔ ومسلم فی صحيحه ۹۱۷/۲ حديث رقم (۲۲۱۔ ۱۲۵۶)۔ والنسائی ۱۳۰/۴ حديث رقم ۔۲۱۱۰۔ وابن ماجه ۹۹۶/۲ حديث رقم ۲۹۹۴۔ والدارمی ۷۳/۲ حديث رقم۱۸۵۹۔ واحمد فی المسند ۲۲۹/۱۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تحقیق رمضان میں عمرہ کرنا حج کے برابر ہوتا ہے یعنی ثواب میں اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله :ان عمرة فی......الخ**

''**تعدل حجة**''ایک روایت میں ''**حجة معی**''کے الفاظ ہیں۔تو اس صورت میں یہ مبالغہ ہے الحاق ناقص بالکامل کے ساتھ ترغیب کیلئے۔

اس حدیث میں دلالت ہے کہ عبادت کی افضلیت میں وقت کی فضیلت سے زیادتی ہوتی ہے اور یہ رمضان کے دن اور رات دونوں کو شامل ہے یا افضلیت میں زیادتی مشقت سے ہوتی ہے تو یہ رمضان کے دن کے ساتھ خاص ہوگا۔واللہ اعلم

پھر بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس سے مراد افاقی عمرہ ہے اور مکی عمرہ رمضان میں جائز نہیں ہے اور اس حدیث کا سبب ورود ان کی تائید کرتا ہے اور وہ سبب یہ ہے کہ ایک عورت نے آپ سے شکایت کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کرنے سے پیچھے رہنے کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا''**اعتمری**'' کہ عمرہ کرلو۔اور اس عورت کا میقات ذوالحلیفہ تھا اور یہ بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے رمضان میں عمرہ ادا کرنا منقول نہیں باوجود یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے کچھ دن مکہ میں فتح مکہ کے بعد گزارے اور اسکے ساتھ یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں بغیر احرام کے داخل ہوئے تھے۔اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام عمرے ذیعقدہ میں کیے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ ابن عمر کی روایت کے مطابق ایک عمرہ رجب میں کیا ہے۔اور حضرت عائشہ نے اس کا انکار کیا ہے۔اور امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ سال میں ایک بار سے زائد

عمرہ جائز نہیں اور مزنی نے بھی اس کی اتباع کی ہے۔مگر ہمارے علماء اور امام شافعی کا مذہب یہ ہے کہ اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوص سبب کا۔ واللہ اعلم

عمرہ کے افعال رمضان میں ہوں نہ کہ صرف احرام جیسا کہ اس کی طرف ابن حجر مائل ہیں۔

نابالغ کو نفلی حج کا ثواب ملتا ہے

۲۵۱۰: وَعَنْهُ قَالَ اِنَّ النَّبِیَّ ﷺ لَقِیَ رَکْبًا بِالرَّوْحَاءِ فَقَالَ مَنِ الْقَوْمُ قَالُوْا الْمُسْلِمُوْنَ فَقَالُوْا مَنْ اَنْتَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ فَرَفَعَتْ اِلَيْهِ امْرَاَةٌ صَبِيًّا فَقَالَتْ اَلِهٰذَا حَجٌّ قَالَ نَعَمْ وَلَكِ اَجْرٌ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ۹۷۴/۲ حديث رقم (۴۰۹۔ ۱۳۳۶)۔ وابن ماجه ۹۷۱/۲ حديث رقم ۲۹۱۰۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایک قافلے سے روحاء میں ملاقات کی۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کونسی قوم ہیں؟ قافلہ والوں نے کہا۔ہم مسلمان ہیں۔پھر قافلہ والوں نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ فرمایا کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایک عورت نے لڑکے کو بلند کیا یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھلایا کجاوے سے اونچا کر کے پھر کہا اس کے واسطے حج ہے یعنی حج کا ثواب فرمایا ہاں تیرے واسطے بھی ثواب ہے اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله :ان النبی ﷺ لقی رقبا بالروحاء:**

"رکبًا" : راء کے فتحہ اور کاف کے سکون کے ساتھ راکب کی جمع ہے یا اسم جمع ہے صاحب کی طرح اور یہ سفر کی حالت میں دس یا دس سے زائد اونٹ سواروں کو کہتے ہیں نہ کہ دوسرے چوپائیوں کو پھر ہر جماعت پر اس کا اطلاق ہونے لگا۔

"الروحاء" : راء کے فتح کے ساتھ ایک جگہ کا نام ہے جو مدینہ سے چالیس میل کے فاصلے پر ہے اور کتاب مسلم میں ہے کہ مدینہ سے ۳۶ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

قوله :من القوم؟قالوا :المسلمون : استفہام کے ساتھ ہے۔

قوله :الهذا حج ؟قال :نعم،ولك اجر : یعنی تمہیں بھی ثواب ملے گا چونکہ تم اس کے حج کی سبب بنوگی اور افعال حج سکھلاؤ گی اگر وہ ممیّز ہے یا نیابت احرام کا ثواب ملے گا اور رمی اور وقوف کے نیابت کا اور طواف اور سعی میں اس کو اٹھانے کا ثواب ملے گا۔اگر وہ ممیّز نہ ہو۔

دوسرے کی طرف سے حج کرنے کا مسئلہ

۲۵۱۱: وَعَنْهُ قَالَ اِنَّ امْرَاَةً مِنْ خَثْعَمَ قَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ فَرِيْضَةَ اللّٰهِ عَلٰى عِبَادِهٖ فِى الْحَجِّ اَدْرَكَتْ اَبِىْ شَيْخًا كَبِيْرًا لَا يَثْبُتُ عَلَى الرَّاحِلَةِ اَفَاَحُجُّ عَنْهُ قَالَ نَعَمْ وَذٰلِكَ فِىْ حَجَّةِ الْوَدَاعِ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ۳۷۸/۳۔ حديث رقم ۱۵۱۳۔ ومسلم فی صحيحه ۹۷۴/۲ حديث رقم (۴۰۸۔ ۱۳۳۵)۔ وابوداؤد فی السنن ۴۰۰/۲ حديث رقم ۱۸۰۹۔ والترمذی فی السنن ۲۶۷/۳ حديث رقم ۹۲۸۔ والنسائی ۱۱۸/۵ حديث رقم ۲۶۴۱ وابن ماجه ۹۷۰/۲ حديث رقم ۲۹۰۷۔ والدارمی ۶۱/۲ حديث رقم ۱۸۳۱۔ ومالك فی الموطأ ۳۵۹/۹ حديث رقم ۹۷۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت ہے کہ کہا قبیلہ خثعم کی ایک عورت نے کہا اے اللہ کے رسول! تحقیق اللہ تعالیٰ کا فرض اپنے بندوں پر ہے حج کے بارے میں میرا باپ بہت بوڑھا ہے۔سواری پر نہیں ٹھہر سکتا۔یعنی نہیں بیٹھ سکتا۔کیا میں اس کی طرف سے حج کرلوں؟ فرمایا کہ ہاں! اور یہ سوال و جواب حَجَّةِ الْوَدَاعِ کے موقع پر تھا۔اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله :ان امرأة من الخثعم:**

''خثعم'' خاء اور عین کے فتح کے ساتھ بمعنی کے ایک قبیلے کے باپ کا نام ہے پھر اس کے نام سے قبیلہ کا نام رکھا گیا اور اس کا منصرف اور غیر منصرف ہونا دونوں جائز ہے۔

قوله :ان فريضة الله ......الراحلة:

''**في الحج**'' فی بمعنی من بیانیہ ہے۔

''ابی'' ادرکت کیلئے مفعول ہے۔شیخاً حال ہے کبیراً شیخاً کیلئے صفت ہے **لا يثبت على الراحلة** صفت ثانی ہے یا جملہ مستانفہ ہے بیان کیلئے۔

اس حدیث کے شروع میں ہے: **ان الفضل بن عباس كان رديف النبی ﷺ، فجعل ينظر اليها، وتنظر اليه، وجعل رسول الله ﷺ يصرف وجه الفضل الى الشق الأخر۔ وقال يا ابن أخی هذا يوم من ملك فيه بصره الامن حق وسمعه الامن حق ولسانه الامن حق. غفرله۔**

فضل بن عباسؓ نبی ﷺ کے ردیف تھے پس وہ اس عورت کو دیکھنے لگے اور عورت اس کو دیکھنے لگی اور رسول اللہ ﷺ فضل کے چہرے کو دوسرے طرف موڑ دیتے تھے اور فرمایا اے بھتیجے یہ ایسا دن ہے کہ اگر اس میں کسی نے اپنے نگاہ اپنے کان اور اپنی زبان حق کے علاوہ چیزوں سے بچالیے تو اسکے گناہ معاف ہوجائیں گے۔

اس کی تخریج بیہقی نے کی ہے جیسا کہ سیوطی نے الدر میں کیا ہے''ادركت......'' علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ جب وہ بڑھاپے میں مسلمان ہوا اور اس کے پاس مال تھا جس کی وجہ سے اس پر حج فرض ہوا یا اس حالت میں اس کو مال حاصل ہوا جس کی وجہ سے اس پر حج فرض ہوا۔

ابن الملک فرماتے ہیں اس حدیث میں دلیل ہے کہ حج اپاہج اور اس بوڑھے پر جو خود حج ادا کرنے سے عاجز ہو فرض ہے۔اور یہی امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے۔(انتھا)، یعنی اس میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا اختلاف ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ اس کی طرف سے حج کرنا تب درست ہے جب حج کی فرضیت بڑھاپے سے پہلے نہ ہو یعنی وہ وسائل حج کا مالک بڑھاپے کے بعد ہوا ہو۔

اور صاحبین سے ''ظاهر الرواية'' کے مطابق اس پر حج واجب ہے جب وہ توشہ، سواری، اور اس شخص کے خرچے کا جو اس کو سواری پر بٹھائے' اتارے اور حج کے اعمال ادا کرنے کے جگہوں کی طرف لیجائے۔اور امام حسن نے امام ابوحنیفہؒ سے یہی قول نقل کیا ہے اور جب یہ عاجز ہو تو پھر اس پر دوسرے سے حج کرانا ضروری ہے کیونکہ اس پر اصل حج لازم ہے۔اور وہ حج بالبدن ہے تو اس پر بدل بھی لازم ہے۔اور وہ دوسرے سے حج کرانا ہے۔

صاحبین کی دلیل حدیث خثعمیہ ہے کہ انہوں نے کہا میرے والد پر حج فرض ہے اور وہ بہت زیادہ بوڑھا ہے۔سواری پر نہیں ٹک سکتا

تو کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ آپ مجھے بتا دے کہ اگر تیرے والد پر دین (قرض) ہو اور آپ اس کی طرف سے ادا کر دیں تو یہ اس کی طرف ادا ہو جائے گا؟ تو عورت نے کہا جی ہاں تو آپ ﷺ نے فرمایا تو اللہ کا دین زیادہ حقدار ہے ادائیگی کا۔

اور ہماری دلیل اللہ کا یہ ارشاد: ﴿من استطاع اليه سبيل﴾ [آل عمران: ۹۷] کہ وجوب کو مقید کیا ہے استطاعت کے ساتھ اور مذکورہ امور کے ساتھ عجز لازم ہوتا ہے نہ کہ استطاعت۔

یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ عورت کا مرد کی طرف سے حج کرنا درست ہے اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ درست نہیں ہے کیونکہ عورت حالت احرام میں وہ لباس پہنتی ہے جو مرد نہیں پہنتا۔ امام مالک اور امام احمد فرماتے ہیں کہ زندہ کی طرف سے حج کرنا درست نہیں ہے۔ خواہ مال عجز سے پہلے حاصل ہوا ہو یا بعد میں جیسا کہ مظہر نے ذکر کیا ہے۔

اور ظاہر یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عورت نے کہا کہ فریضہ حج میرے والد پر لازم ہے اور وہ خود اس کی ادائیگی سے عاجز ہے تو کیا میرے لیے درست ہے کہ میں اس کی طرف سے شرعاً حج کروں تو آپ ﷺ نے فرمایا ہاں۔

اس حدیث میں دلیل ہے کہ حج امر (حکم کرنے والے) کی طرف سے واقع ہوتا ہے اور یہی شمس الائمہ سرخسی کا مختار مذہب ہے اور محققین کی ایک جماعت کا بھی یہی قول ہے اور یہی ظاہر مذہب ہے۔

قوله: وذلك في حجه الوداع: ''الوداع'' واؤ کے فتح کے ساتھ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ کسرہ کے ساتھ ہے۔

وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس حج میں رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو الوداع کہا اور ہجرت کے بعد اسکے علاوہ آپ نے کوئی حج نہیں کیا اور یہ ۱۰ھ کو ہوا۔

حج بدل کا مسئلہ

۲۵۱۲: وَعَنْهُ قَالَ اَتٰى رَجُلٌ النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَ اِنَّ اُخْتِيْ نَذَرَتْ اَنْ تَحُجَّ وَاِنَّهَا مَاتَتْ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ لَوْ كَانَ عَلَيْهَا دَيْنٌ اَكُنْتَ قَاضِيَهٗ قَالَ نَعَمْ فَاقْضِ دَيْنَ اللّٰهِ فَهُوَ اَحَقُّ بِالْقَضَاءِ۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی المسند ۱۱/۵۸٤۔ حدیث رقم ٦٦٩٩۔ واحمد فی المسند ۱/۳۱۰۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا کہ میری بہن نے نذر مانی تھی کہ وہ حج کرے گی اب وہ مرگئی ہے۔ پس نبی کریم ﷺ نے فرمایا اگر اس پر قرض ہوتا کیا تو اس کو ادا کرتا کہا کہ ہاں تو لہٰذا اللہ کا دین بھی ادا کرو۔ وہ لائق تر ہے ادا کرنے کے ساتھ۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: وانها ماتت: ''انها'' ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

قوله: اكنت قاضيه: ...... **قوله: فاقض دين الله فهو احق بالقضاء:** کہ اس کو بہن کے ورثہ میں کچھ مال ملا ہوگا چنانچہ آنحضرت ﷺ نے حقوق اللہ کو حقوق عباد پر قیاس کرتے ہوئے اس کو بہن کا حج نذر کے ادا کرنے کا حکم دیا۔ لیکن یہ اجمال ہمارے فقہی تفصیل کے منافی نہیں ہے۔ کہ وارث کی طرف حج کرنا تب واجب ہے جب وہ وصیت کرلے ورنہ یہ حج نفلی ہوگا۔

مسلم نے روایت کیا ہے کہ عورت نے کہا اللہ کے رسول ﷺ کہ میری والدہ وفات پا گئی ہیں اور اس نے حج نہیں کیا تو کیا میں اس کی طرف سے حج کرلوں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اسکی طرف سے حج کرلو۔

اور یہ بھی صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ قبیلہ خثعم کے ایک آدمی نے کہا اللہ کے رسولؐ! کہ میرے والد مسلمان ہوگئے ہیں اور وہ بہت زیادہ بوڑھے ہیں سواری پر سوار ہونے کی طاقت نہیں رکھتا اور حج اس پر فرض ہے تو کیا میں اس کی طرف سے حج کرلوں؟ تو آپ ﷺ نے

فرمایا کہ مجھے بتا کہ آپ ان کے بڑے بیٹے ہیں؟ تو اس نے کہا ہاں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے بتا اگر تیرے والد پر قرض ہو اور وہ تو اس کی طرف سے ادا کردے تو وہ اسکی طرف سے ادا ہو جائے گا؟ تو اس نے کہا ہاں تو آپؐ نے فرمایا تو پھر اس کی طرف سے حج کردے۔

عورت کے ساتھ سفر میں محرم کا ہونا ضروری ہے

۲۵۱۳: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا يَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ وَلَا تُسَافِرَنَّ امْرَأَةٌ إِلَّا وَمَعَهَا مَحْرَمٌ فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اُكْتُتِبْتُ فِيْ غَزْوَةِ كَذَا وَكَذَا وَخَرَجَتِ امْرَأَتِيْ حَاجَّةً قَالَ اذْهَبْ فَاحْجُجْ مَعَ امْرَأَتِكَ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ١٤٢/٦۔ حدیث رقم ٣٠٠٦۔ ومسلم فی صحیحه ٩٧٨/٢ حدیث رقم (٤٢٤۔ ١٣٤١)۔

٢٥١٤: اخرجه البخاری فی صحیحه ٧٥/٦۔ حدیث رقم ٢٨٧٥۔ وابن ماجه فی السنن ٩٦٨/٢ حدیث رقم ٢٩٠١۔ واحمد فی المسند ٦٧/٦۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی شخص کسی عورت کے ساتھ خلوت نہ کرے یعنی اجنبی مرد و عورت تنہا ایک مکان میں جمع نہ ہوں اور عورت بغیر محرم کے سفر نہ کرے پس ایک شخص نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ میرا نام فلانے غزوہ میں لکھا گیا ہے اور فلانے کے یعنی فلانا جہاد جو درپیش ہے اور وہاں لشکر جانا ہے اس میں میرا نام بھی لکھا گیا کہ میں ان کے ساتھ بیٹھ جاؤں اور میری بیوی نے حج کا ارادہ بھی کیا ہے یعنی میں کیا کروں آیا جہاد کے لیے جاؤں یا بیوی کو اکیلا حج کے لیے جانے دوں یا بیوی کے ساتھ جاؤں اور جہاد میں نا جاؤں۔ فرمایا اپنی عورت کے ساتھ حج کرو فرمایا کہ غازی بہت ہیں تیری بیوی کے ساتھ تیرے علاوہ کوئی محرم نہیں ہے اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :لایخلون رجل......الا ومعها محرم:

''**الا ومعها محرم**'' ابن ہمام فرماتے ہیں کہ صحیحین میں ''**لا تسافر امرأة ثلاثًا الا ومعها ذورحم**'' ہے اور صحیحین کے بعض روایات کے الفاظ میں ''**فوق ثلاث**'' ہے۔

بخاری کے الفاظ :''**ثلاثة ایام**'' ہے اور بزار کی روایت میں **لا تحج امرأة الا ومعها ذو محرم** اور دارقطنی کی روایت میں **لا تحجن امرأة الا ومعها ذو محرمٌ** ہے ''**مع امرأتك**'' اور بزار کی روایت میں ''**قال ارجع فحج معها**'' ہے۔

حل لغات: ''**لا یخلون**'' نہی میں مبالغۃً تاکید ہے۔

قوله :أکتتبت فی ......: ''**أکتتب**'' مجہول متکلم کا صیغہ ہے باب افتعال سے علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ **أکتتب** کا مطلب ہے کہ میرا نام جہاد میں نکلنے والوں میں لکھا ہے کہا جاتا ہے **أکتتب الکتاب**، بمعنی **کتبته**، **اکتتب الرجل** کہتے ہیں جب آدمی اپنا اندراج بادشاہ کے دیوان میں کرے۔

''**فاحجج**'' جیم اول کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ ابن مالک فرماتے ہیں کہ جب عورت کے ساتھ محرم نہ ہو تو اس پر حج لازم نہیں ہے۔ اور یہی امام ابوحنیفہ اور احمد کا مذہب ہے۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ جب اس کے ساتھ عورتوں کی ایک پوری جماعت ہے تو پھر حج فرض ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس پر حج لازم ہو جاتا ہے جب اس کے ساتھ قابل بھروسہ عورت ہو۔ (انتہیٰ)

شمنی فرماتے ہیں: یہ امام مالکؒ کا مذہب ہے کہ جب عورت کو پرامن مصاحب ملے تو اس پر حج لازم ہے۔ کیونکہ یہ سفر ہجرت کی طرح فرض ہے۔ اور امام شافعی کا مذہب ہے کہ اس کے ساتھ قابل بھروسہ عورتیں ہوں تو ان کے ساتھ اس پر حج فرض ہے۔ پھر امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ یہ بات جان لیں کہ عورت کیلئے یہ بھی شرط ہے کہ وہ معتدہ نہ ہو۔

محرم اصطلاحِ شریعت میں اس کو کہتے ہیں جس کے ساتھ نکاح ہمیشہ کیلئے حرام ہو۔ خواہ قرابت کے لحاظ سے ہو یا دودھ کے رشتہ سے یا سسرال کے ناطے سے۔ نیز محرم کا عاقل و بالغ ہونا اور مجوسی و فاسق نہ ہونا بھی شرط ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ اہم کام کو مقدم کرنا چاہیے کیونکہ جہاد میں کوئی اور اس کا قائم مقام ہو سکتا ہے۔

عورتوں کا جہاد حج ہے

۲۵۱۴: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتِ اسْتَأْذَنْتُ النَّبِیَّ ﷺ فِی الْجِهَادِ فَقَالَ جِهَادُ کُنَّ الْحَجُّ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۵٦٦/۲۔ حدیث رقم ۱۰۸۸۔ ومسلم ۹۷۵/۲ حدیث رقم (۴۱۳۔ ۱۳۳۸)۔ والترمذی فی السنن ۲۷۲/۳ حدیث رقم ۱۱٦۹۔ وابن ماجه ۹٦۸/۲ حدیث رقم ۲۸۹۸۔ والدارمی ۳۷۴/۲ حدیث رقم ۲٦۷۸۔ ومالك فی الموطأ ۱۷۹/۲ حدیث رقم ۳۷ من کتاب الاستذان۔ احمد فی المسند ۱۳/۲۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ میں نے اجازت مانگی نبی کریم ﷺ سے جہاد کرنے کی۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تمہارا جہاد حج ہے یعنی تم پر جہاد نہیں ہے اور اگر استطاعت ہو تو حج ہے اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ابن ملک فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ تم پر جہاد نہیں ہے بلکہ تم پر حج لازم ہے اگر اس کی استطاعت ہو۔

عورت کو بغیر محرم سفر کرنے کی اجازت نہیں ہے

۲۵۱۵: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا تُسَافِرُ امْرَأَةٌ مَسِیْرَةَ یَوْمٍ وَّلَیْلَةٍ اِلَّا وَمَعَهَا ذُوْ مَحْرَمٍ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۵٦٦/۲۔ حدیث رقم ۱۰۸۸۔ ومسلم ۹۷۵/۲ حدیث رقم (۴۱۳۔ ۱۳۳۸)۔ والترمذی فی السنن ۲۷۲/۳ حدیث رقم ۱۱٦۹۔ وابن ماجه ۹٦۸/۲ حدیث رقم ۲۸۹۸۔ والدارمی ۳۷۴/۲ حدیث رقم ۲٦۷۸۔ ومالك فی الموطأ ۱۷۹/۲ حدیث رقم ۳۷ من کتاب الاستذان۔ احمد فی المسند ۱۳/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کوئی عورت ایک دن اور ایک رات کی مسافت کی بقدر سفر نہ کرے مگر یہ کہ اس کے ساتھ محرم ہو۔ اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله : لا تسافر امرأة: یہ نفی بمعنی نہی ہے اور ایک نسخہ میں صیغہ نہی کے ساتھ ہے۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ عورت کیلئے مدت سفر سے کم مدت کیلئے بغیر محرم کے نکلنا جائز ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں یہ صحیحین کی حدیث سے اشکال ہوتا ہے کہ ابو سعید خدریؓ سے مرفوع روایت ہے "لا تسافر المرأة یومین الا ومعها زوجها او ذو محرم منها" کہ عورت دو یوم کی سفر نہ کرے مگر یہ کہ اس کے ساتھ شوہر یا اس کا کوئی محرم ہو۔ اور صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ سے مرفوع روایت ہے: " لا یحل لامرأة تؤمن باللّٰه والیوم الأخر أن تسافر مسیرة یوم ولیلة الامع ذی محرم علیها" اور مسلم کی روایت میں "مسیرة لیلة" کے الفاظ ہے

یعنی ایک رات کے سفر میں بھی بغیر محرم کے نہ جائے۔ اور ایک روایت میں "یوم" کا لفظ ہے۔ اور ابوداؤد کی روایت میں "بریدًا" کا لفظ ہے۔ یعنی دو فرسخ یا بارہ میل، جیسا کہ قاموس میں ہے۔ اور یہ حدیث صحیح ابن حبان میں بھی ہے اور حاکم کی کتاب میں بھی ہے۔ حاکم فرماتے ہیں کہ یہ حدیث مسلم کی شرط پر صحیح ہے اور طبرانی کے معجم میں تین میل کا ذکر ہے ان سے پوچھا گیا کہ لوگ کہتے ہیں یہ لفظ ثلاثۃ ایام یعنی تین دن ہے تو انہوں نے کہا کہ یہ لوگوں کو وہم ہوا ہے۔

منذری کہتے ہیں کہ ان الفاظ میں کوئی تباین اور اختلاف نہیں ہے کیونکہ اس میں یہ احتمال ہے کہ آپ ﷺ نے یہ الفاظ مختلف جگہوں پر سوالات کے مطابق فرمائے ہوں اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ مثال پیش کی ہے اقل مدتوں کی تو ایک دن پہلا عدد اور اقل عدد ہے اور دو دن یہ پہلا کثیر ہے اور کثیر میں سب سے اقل ہے۔ اور تین دن پہلا جمع ہے، تو گویا کہ اس سے اشارہ کیا کہ کم مدت کیلئے بھی عورت بغیر محرم کے نہیں نکل سکتی تو زیادہ کیلئے کیسے نکل سکتی ہے (انتہی)

حاصل یہ ہے کہ آپ ﷺ نے مطلقاً نکلنے سے منع پر تنبیہ فرمائی ہے مگر محرم یا شوہر کے ساتھ۔ اور منع کی صراحت بھی ہے اگر سفر سے مراد لغوی ہو۔ صحیحین میں ابن عباس مرفوع روایت ہے: (**لاتسافر المرأة الا مع ذی محرم**) اور لغت میں سفر کا اطلاق اس سے کم مدت پر بھی ہوتا ہے۔ محقق ابن ہمام کا کلام مکمل ہوا۔

(لیکن اس تضاد و اختلاف کو دور کرنے کیلئے علماء فرماتے ہیں کہ حدیث مطلق طور پر جو یہ منقول ہے کہ کوئی عورت اپنے خاوند یا محرم کے بغیر سفر نہ کرے تو چونکہ شرعی طور پر سفر کا اطلاق تین دن سے کم پر نہیں ہوتا اس لیے فقہاء نے اس حدیث کو تین دن کی مسافت کے بقدر سفر پر محمول کیا ہے۔ اور جن حدیثوں میں دو دن یا ایک دن کی مسافت کے بقدر سفر سے منع کیا ہے تو اس کو فتنہ و فساد پر محمول کیا ہے)۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ محرم عورتیں جس کی طرف دیکھنا جائز ہو اور جن کے ساتھ سفر جائز ہو ہر وہ عورت ہے جس کے ساتھ ہمیشہ کیلئے نکاح حرام ہو۔ سبب مباح سے اس کی حرمت کی وجہ سے تو ہمیشہ کی قید سے بیوی کی بہن، پھوپھی اور خالہ نکل گئی اور سبب کی قید سے موطوءۃ بالشبہہ کی ماں اور بہن نکل گئی، کیونکہ ان دونوں سے نکاح ہمیشہ کیلئے حرام ہے مگر یہ محرم نہیں ہے کیونکہ وطی بالشبہۃ کو مباح نہیں کہا جاتا۔ کیونکہ وہ فعل مکلّف کے ساتھ نہیں ہے اور حرمت کی قید سے لعان والی عورت نکل گئی کیونکہ اسکے ساتھ نکاح کا حرام ہونا احترام کی وجہ سے نہیں بلکہ بطور سزا ہے۔ اور **مسیرۃ یوم ولیلۃ** سے مراد تحدید نہیں ہے کیونکہ ہر وہ مسافت جس کو سفر کہا جائے تو اس میں عورت کے ساتھ شوہر یا محرم کا ہونا ضروری ہے۔ یا قابل بھروسہ عورتیں، خواہ عورت جوان ہو یا بوڑھی ہو، ہاں عورت کیلئے دار الکفر سے بغیر محرم کے ہجرت کرنا جائز ہے (انتہی)

اور اسی پر محمول کیا جائے وہ حدیث جس میں ہے کہ قریب ہے کہ عورت حیرہ سے اکیلے نکل کر بیت اللہ کا طواف کرے گی اور اللہ کے سوا کسی کا خوف اس کو نہ ہوگا۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔

اور یہی حکم اس عورت کا ہے جو قید سے رہا ہو جائے۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ علماء کا اتفاق ہے کہ عورت حج اور عمرہ کے سفر کیلئے بغیر محرم کے نہ جائے۔ مگر دار الحرب سے ہجرت کر سکتی ہے کیونکہ دار الحرب میں رہنا جب دین کے قائم کرنے پر استطاعت نہ ہو حرام ہے اور اس میں جوان اور بوڑھی برابر ہے کیونکہ عورت محل شہوت ہے اور ہر گری پڑی چیز کو کوئی اٹھانے والا ہوتا ہے۔

مواقیتِ حج

۲۵۱۶: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ وَقَّتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ذَا الْحُلَيْفَةِ وَلِاَهْلِ الشَّامِ الْجُحْفَةَ وَلِاَهْلِ نَجْدٍ قَرْنَ الْمَنَازِلِ لِاَهْلِ الْيَمَنِ يَلَمْلَمَ فَهُنَّ لَهُنَّ وَلِمَنْ اَتٰى عَلَيْهِنَّ مِنْ غَيْرِ اَهْلِهِنَّ لِمَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَجَّ

وَالْعُمْرَةَ فَمَنْ كَانَ دُوْنَهُنَّ فَمُهَلَّهٗ مِنْ اَهْلِهٖ وَ كَذٰلِكَ وَكَذٰلِكَ حَتّٰى اَهْلُ مَكَّةَ يُهِلُّوْنَ مِنْهَا۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۸۷/۳۔ حدیث رقم ۱۵۲۶۔ ومسلم فی صحیحه ۸۳۸/۲ حدیث رقم (۱۱۔ ۱۱۸۱) وابوداؤد فی السنن ۳۵۳/۲ حدیث رقم ۱۷۳۸۔ والنسائی ۱۲٦/۵ حدیث رقم ۲٦۵۸۔ والدارمی فی السنن ۴۷/۲ حدیث رقم ۱۷۹۲۔ واحمد فی المسند ۳۳۲/۱۔

ترجمه: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام باندھے کی جگہ مقرر کی۔اہل مدینہ کے لیے ذوالحلیفہ اور شام والوں کے جحفہ کو اور نجدیوں کے لیے قرن منازل کو اور یمن والوں کے لیے یلملم پس یہ تمام جگہیں احرام باندھنے کی ہیں ان شہر والوں کے لیے جو کہ مذکورہ ہوئے ہیں اور ان کے لیے بھی جو ان مقامات سے گزریں ان کے اہل کے علاوہ یعنی مثلاً ہندوستان والے جب یمن کے راستے پر پہنچے تو یلملم سے احرام باندھیں اور اسی طرح دوسرے شہر والوں کا حال ہے۔ کہ جب وہ احرام کی جگہ پر آئیں وہیں احرام باندھیں یہ جگہیں احرام کی ہیں' اس لیے وہ حج کا ارادہ کرے اور عمرے کا۔ جو شخص ان مواضع کے اندر رہنے والا ہے۔ اس کے احرام کی جگہ اپنے گھر سے ہے اور اسی طرح اور اسی طرح یہاں تک کہ اہل مکہ مکے سے احرام باندھیں۔

تشریح: قوله :وقت رسول الله ﷺ لاهل المدينة ذاالحليفة: ''وَقَّتَ'' قاف کی تشدید کے ساتھ ہے۔کہا گیا ہے کہ وقت مفروضہ زمانہ کے استیفاء کو کہتے ہیں اور میقات کام کیلئے مقررہ وقت کو کہتے ہیں اور کام کی جگہ کو بھی کہتے ہیں، میقات اہل مدینہ اس جگہ کو کہا جاتا ہے جہاں سے مدینہ والے احرام باندھتے ہیں۔

''وَقَّتَ'' کا معنی ہے کہ اس جگہ کو احرام باندھنے کیلئے میقات مقرر کیا، یعنی احرام کا حد اور اس کیلئے جگہ کو بیان کیا۔

''ذالحليفة'' مدینہ سے دو فرسخ پر واقع ایک مقام کا نام ہے۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مکہ سے دس مراحل پر واقع ہے۔ یہ ابن الملک رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے اور یہ بنی جُشم کے پانیوں میں سے ایک پانی ہے اور حلیفة تصغیر ہے۔ حلفة قصبه کی طرح اور یہ پانی کے اندر ایک قسم کی گھاس کا نام ہے۔اس کی جمع حلفاء ہے۔اور اب یہ بئر علی کے نام سے مشہور ہے۔لیکن اس نام کا مسمیٰ معلوم نہیں اور یہ جو کہا گیا ہے کہ اس میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے جن سے لڑائی کی تھی تو یہ جھوٹ ہے جس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

قوله :ولاهل الشام الجحفة: ''الجحفة'' جیم کے ضمہ کے ساتھ اور حاء کے سکون کے ساتھ ہے۔مکہ اور مدینہ کے درمیان شامی جانب سے ایک مقام کا نام ہے۔ذوالحلیفہ کے محاذات میں ہے مکہ سے ''۵۰'' فرسخ پر ہے۔ابن الملک نے جو ذکر کیا ہے اس کے مطابق اس کا نام مهيعة تھا۔سیلاب یہاں کے رہنے والوں کو بہا گیا، تو اس کا نام جحفه رکھا گیا، کہا جاتا ہے اجحف، جب اس کو لیجائے۔سیل حجاف کہتے ہیں۔جب زمین میں گڑھا بنادے اور زمین کو بہا کے لے جائے۔اور اب یہ الرابغ کے نام سے مشہور ہے۔

''ولا هل الشام'' یعنی ان کے پرانے راستے کے مطابق ورنہ اب شام والے مدینہ سے گزرتے ہیں، ابن حجر فرماتے ہیں کہ جب وہ مدینہ کے راستے سے نہ گزرے ورنہ تو پھر ان پر ذوالحلیفہ سے احرام باندھنا لازم ہوگا اس پر اجماع ہے۔امام نووی کے قول کے مطابق۔لیکن امام نووی کا یہ قول بہت عجیب وغریب ہے کیونکہ امام مالک اور ابوثور کے نزدیک ان کیلئے جحفہ تک احرام مؤخر کرنا جائز ہے اور ہمارے احناف کے نزدیک مدینہ والے کیلئے بھی جحفہ تک احرام میں مؤخر کرنا جائز ہے۔تو اس اختلاف کے ہوتے ہوئے اجماع کا دعویٰ باطل ہے، اور امام شافعی کی روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں کہ اہل شام، مصر اور مغرب کیلئے جحفہ ہے۔

قوله :ولاهل نجد قرن المنازل: ''قرن المنازل'' راء کے سکون کے ساتھ اور راء کے حرکت کے ساتھ خطاء ہے۔گول چکنا

پہاڑ ہے۔گویا کہ انڈہ ہے عرفات کے اوپر ہے۔

قوله : ولاهل يمن يلملم: ''یَلَمْلَمْ'' تہامہ کے پہاڑوں کے درمیان ایک پہاڑ ہے۔مکہ سے دورات کے مسافت پر واقع ہے۔اوراس کو ألملم، ہمزہ کے ساتھ بھی کہا گیا ہے۔

قوله :فهن لهن ...... والعمرة: ''فهن ''یعنی یہ مواضع ''لهن ''ان مواضع کے لوگوں کیلئے ہے اور ابن الملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں علامہ طیبیؒ کے اتباع میں، کہ یہ مواقیت، ان مواقیت کے رہنے والوں کیلئے ہے اور اس پر آنے والا قول دلالت کر رہا ہے ''**ولمن اتى عليهن الخ**'' کہ یہ میقات یہاں کے مقیم لوگوں کیلئے ہے اور ان لوگوں کیلئے ہے جو یہاں کے مقیمین کے علاوہ یہاں سے آئے۔لیکن یہ دووجہوں سے صحیح نہیں ہے۔

اولاً تو اس لیے کہ ''**فهن** ''میں فاء مابعد کو ماقبل پر تفریع کرنے کیلئے ہے کہ اس کو تفصیل کے بعد اجمالاً ذکر کیا' تاکہ اس پر عطف کر دے ان مواضع کا حکم جو ذکر نہیں ہوئے استیفاء حکم کے خاطر۔اس کا درست مطلب یہ ہے کہ یہ میقات یہاں کے لوگوں کیلئے ہے چاہے وہ یہاں مقیم ہوں یا مسافر ہوں۔اور ان لوگوں کیلئے ہے جو یہاں سے گزرے اور ان علاقوں کے نہ ہو۔

ابن ہمام فرماتے ہیں۔ایک روایت میں ''**هن لهم** ''کے الفاظ ہیں لیکن اول مشہور ہے اور وہ حذف مضاف کے ساتھ ہے یعنی **هن لا هلهن** ہے۔

اور ثانیاً: اس وجہ سے کہ مذہب یہ ہے کہ یہ مواقیت باہر سے آنے والوں کیلئے ہے کہ ان پر واجب ہے کہ وہ ان سے بغیر احرام نے تجاوز نہ کرے حرم کے تعظیم کی وجہ سے، جس میں ان کے داخل ہونے کا ارادہ ہے۔باقی ان مواقیت کے رہائشی لوگ تو ان کا حکم وہی ہے جو اس شخص کا ہے جو حل سے اس میقات میں داخل ہوا ہو، کہ ان کا میقات حل ہے اور ان کیلئے احرام کے بغیر میقات سے تجاوز کرنا جائز ہے جب ان کا ارادہ حج وعمرہ کا نہ ہو۔اگر ان کا ارادہ ہو تو پھر بغیر احرام کے ان کیلئے بھی جانا جائز نہیں ہے۔

''**لمن كان** ''ماقبل سے بدل ہے یعنی حج وعمرہ میں سے کسی ایک کی جگہ اور وہ ہمارے نزدیک حرم ہے اور امام شافعی کے اقوال میں تفصیل اور مختلف اقوال ہیں اور ابن حجر کا یہ قول بہت عجیب وغریب ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ احرام کو لازم کرنا ارادہ حج کے ساتھ ظاہر دلیل ہے کہ حج میں تراخی جائز ہے اور اس میں وجہ غرابت ظاہر ہے۔

قوله :فمن كان دونهن فمهله من اهله:

''**فمهله** ''مفعول کا صیغہ ہے۔معنی ہے احرام باندھنے کی جگہ۔

ابن الملک فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ جس کا گھر مکہ کے قریب ہوان مواقیت سے (انتہیٰ)

اور صحیح یہ ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو مواقیت اور حرم کے درمیان رہتے ہوں اور نفس مواقیت کے لوگوں کا حکم آپ ﷺ نے ذکر نہیں کیا ہے۔جمہور کا قول یہ ہے کہ ان کا حکم وہی ہے جو داخل مواقیت کا ہے۔اور طحاوی کے نزدیک ان کا حکم آفاقی کا ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث دلالت کر رہی ہے کہ مکی کیلئے میقات مکہ ہے حج اور عمرہ دونوں میں اور مذہب یہ ہے کہ عمرہ کرنے والا احرام کیلئے حل کی طرف نکلے گا۔کیونکہ آپ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حل کی طرف نکلنے کا حکم دیا تھا۔تو یہ حدیث حج کے ساتھ مخصوص ہے۔

باقی ابن حجر کا یہ قول کہ حل کا سب سے افضل جگہ جعرانہ ہے اس لیے کہ آپ ﷺ نے یہی سے احرام باندھا تھا حنین سے واپسی کے وقت ۱۲، ذیقعدہ ۸ھ رات کے وقت، اور واپسی بھی رات کو ہوئی۔تو یہ پوشیدہ اور غیر واضح ہے، اور اسی وجہ سے بعض صحابہ نے اس کا انکار

کیا ہے اوراس قول کی بنیاد امام شافعی کا اصول میں اس مذہب پر ہے کہ فعل، قول سے زیادہ قوی ہوتا ہے برخلاف ہمارے مذہب کے کہ ہمارے نزدیک بنیاداس پر ہے کہ فعل تو کبھی اتفاق بھی ہوتا ہے برخلاف قول کے کرو، صرف ارادۃً ہوتا ہے۔اوراس کی وضاحت یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم طائف اور جعرانہ سے اسی کے راستے سے لوٹے تو وہاں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا احرام تو متعین ہے، ہاں اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے نکل کر جعرانہ سے احرام باندھ لیتے تو یہ اس کے افضلیت کی صحیح وجہ ہوتی۔

اوراس کی مثال حضرت علی کا احرام یلملم سے باندھا ہے جبکہ وہ یمن کے راستے سے آرہے تھے اور شیعہ مکہ سے نکل کر یلملم سے احرام باندھتے ہیں اور یہ عکس موضوع ہے بلکہ خلاف شرع اور جس نے یہ کہا ہے کہ ۷ھ کو عمرۃ القضاء میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام جعرانہ سے باندھا تھا تو وہ خطاء میں پڑے ہیں بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذوالحلیفہ سے احرام باندھا تھا۔اوراسی طرح حدیبیہ کے سال بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا احرام یہیں سے تھا۔

اور جس نے یہ کہا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں سے عمرہ کرنے کا ارادہ کیا تھا تو ان کو وہم ہوا ہے۔

''یهلون''یعنی حج کا احرام باندھتے ہیں، علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ''مہل'' موضع اہلال کو کہتے ہیں اور اہلال تلبیہ کہتے ہوئے آواز بلند کرنے کو کہتے ہیں۔

میقات احرام کا بیان

۲۵۱۷: وَعَنْ جَابِرٍ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مُهَلُّ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مِنْ ذِى الْحُلَيْفَةِ وَالطَّرِيْقُ الْاٰخَرُ الْجُحْفَةُ وَمُهَلُّ اَهْلِ الْعِرَاقِ مِنْ ذَاتِ عِرْقٍ وَمُهَلُّ اَهْلِ نَجْدٍ قَرْنٌ وَمُهَلُّ اَهْلِ الْيَمَنِ يَلَمْلَمُ۔

(رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ٨٤١/٢ حديث رقم (١٨ ـ ١١٨٣)۔ والنسائى فى السنن ١٢٢/٥ حديث رقم ٢٦٥١۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ مدینہ والوں کے لیے احرام باندھنے کی جگہ ذی الحلیفہ ہے اور دوسرا راستہ جحفہ ہے اور عراق والوں کی احرام باندھنے کی جگہ ذات عرق ہے جو ایک جگہ کا نام ہے جو مکہ سے دو منزل کے فاصلے پر ہے اور نجد والوں کی جگہ قرن ہے اور یمن والوں کی احرام کی جگہ یلملم ہے۔اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :مهل اهل المدينة من ذى الحليفة والطريق الآخر الجحفة: حل لغات:''مہل''اسم مکان ہے بمعنی احرام کی جگہ اور ابن حجر کی یہ بات غرابت سے بھری ہے کہ وہ کہتے ہیں مهل اهل مدينه کا مطلب ہے احرامهم یعنی ان کا احرام ۔اس کا اصل ہے اهلالهم ان کے احرام کی جگہ پھراس کا اطلاق ظرف زمان اور مصدر پر ہونے اوراس کا معنی مصدری ہے تلبیہ کے ساتھ اور بلند کرنا، اوراس قول کی غرابت کی وجہ مخفی نہیں ہے کیونکہ مزید کا اسم مفعول مشترک ہوتا ہے، اسم زمان، مکان اور مصدر کے مابین جیسا کہ علم الصرف کے متون میں یہ ذکر ہے۔

''الجحفة''ابن الملک فرماتے ہیں کہ اسکا مطلب ہے کہ جب وہ جحفہ کے راستے سے آئے تو یہی جحفہ ان کا میقات ہے (انتھیٰ)

لیکن یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ مذہب یہ ہے کہ جو شخص بغیر احرام کے اپنے میقات سے تجاوز کر لے پھر کسی اور میقات پر آکر وہاں سے احرام باندھ لے تو یہ اس کیلئے جائز ہے اور اپنے میقات سے احرام باندھنا زیادہ پسندیدہ ہے۔اور بعض نے کہا ہے کہ تاخیر مکروہ ہے۔اور بعض نے کہا ہے کہ تاخیر مناسب ہے۔اوراس مسئلہ میں امام شافعی کا اختلاف ہے۔کیونکہ ان کے نزدیک دوسرے میقات پر جانا

جائز نہیں ہے۔اسی وجہ سے ابن حجر نے اس حدیث کے حل کرنے میں تکلف سے کام لیا ہے کہا ہے کہ احرام باندھنے کی جگہ دوسرے راستے والوں کیلئے جوذوالحلیفہ سے نہیں گزرتے اور نہ اس کے دائیں اور بائیں سے گزرتے ہیں' جحفہ ہے۔

قوله :مهل اهل العراق من ذات عرق: ''عرق'' عین کے کسرے کے ساتھ مکہ سے دو مراحل پر ایک مقام ہے اس کو ابن الملک نے ذکر کیا ہے۔

اور علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ایک جگہ ہے جس میں عرق ہے اور عرق چھوٹے پہاڑ کو کہتے ہیں۔

''**ذات عرق**'' اور ایک نسخہ میں ''**من ذات عرق**'' ہے۔

''**ذات عرق**'' کہا گیا ہے کہ ذات عرق کا میقات ہونا حضرت عمرؓ کے اجتہاد سے ثابت ہے۔امام شافعی نے الام میں ذکر کیا ہے اور اس پر بخاری کی روایت دلالت کر رہی ہے' جو ابن عمرؓ سے ہے کہ جب بصرہ اور کوفہ فتح ہوئے حضرت عمرؓ کے زمانہ میں تو وہ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آگئے اور کہنے لگے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجد والوں کیلئے قرن کو مقرر کیا ہے اور ہم جب قرن آنے کا ارادہ کرتے ہیں تو یہ ہم پر گراں گزرتا ہے تو حضرت عمر نے فرمایا کہ اپنے راستے سے قرن کے حدود تلاش کرو۔پھر ان کیلئے ذات عرق مقرر کر دیا۔امام شافعی نے ان دونوں روایتوں کی جمع اور تطبیق یوں کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تک یہ حدیث نہیں پہنچی تھی تو اس نے اجتہاد کیا اور اسی کا اجتہاد صحیح اور حدیث کے مطابق ہوا۔اور یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عادات میں سے ہے موافقات میں۔اسی سے امام شافعی نے دونوں روایتیں ذکر کی ہے۔اور یہ اس بات کے منافی نہیں ہے کہ عراق تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد فتح ہوا ہے (تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کیلئے میقات کیسے مقرر کی) کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ عراق فتح ہوگا تو اس لیے وہاں کے لوگوں کیلئے میقات مقرر فرمایا۔جیسا کہ مصر اور شام والوں کیلئے ان کے فتح ہونے سے پہلے میقات مقرر فرمائے تھے۔پھر اہل عراق کی طرح اہل خراسان بھی ہیں اور ان کے علاوہ جو ذات عرق سے گزرتے ہیں اور یہ ترمذی کی روایت کے بھی منافی نہیں اور اس کے حسن ہونے کے بھی منافی نہیں۔اگر چہ اس پر بعض نے اعتراض کیا ہے کہ اس میں ضعیف راوی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مشرق کیلئے عقیق مقام کو میقات مقرر فرمایا تھا۔کیونکہ عرق' عقیق کے اوپر ایک پہاڑ ہے۔اور ذات عرق کے قرب و جوار کا علاقہ خراب ہو چکا ہے اسی وجہ سے امام نووی نے فرمایا کہ اہل عراق پر لازم ہے کہ وہ سوچیں اور ذات عرق کے پرانے نشانات تلاش کریں تا کہ وہاں سے احرام باندھیں۔ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ جب وہ عقیق سے احرام باندھے تو یہ زیادہ احوط ہے۔کیونکہ یہ ذات عرق سے پہلے ہے اور اس کی نظیر جحفہ اور رابغ ہے کہ وہ جحفہ سے مقدم ہے۔پس احتیاط پہلے والے سے احرام باندھنے میں ہے۔

قوله :و مهل اهل نجد قرن: ''قَرن'' راء کے سکون کے ساتھ ہے اور جوہری کو وہم ہوا ہے کہ انہوں نے اس کو راء کے فتح کے ساتھ کہا ہے کیونکہ یہ ایک قبیلہ کا نام ہے جس کی طرف اویس قرنی کی نسبت ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمروں کا بیان

۲۵۱۸:وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ اعْتَمَرَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم اَرْبَعَ عُمَرٍ كُلُّهُنَّ فِيْ ذِى الْقَعْدَةِ اِلَّا الَّتِىْ كَانَتْ مَعَ حَجَّتِهٖ عُمْرَةٌ مِنَ الْحُدَيْبِيَةِ فِيْ ذِى الْقَعْدَةِ وَعُمْرَةٌ مِنَ الْعَامِ الْمُقْبِلِ فِيْ ذِى الْقَعْدَةِ وَعُمْرَةٍ مِنَ الْجِعْرَانَةِ حَيْثُ قَسَمَ غَنَائِمَ حُنَيْنَ فِىْ ذِى الْقَعْدَةِ وَعُمْرَةٌ مَعَ حَجَّتِهٖ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۴۳۹/۷۔ حدیث رقم ۴۱۴۸ ومسلم فی صحیحه ۹۱۶/۲ حدیث رقم (۲۱۷۔ ۱۲۵۳)۔

وابوداؤد فی السنن ٥٠٦/٢ حدیث رقم ١٩٩٤۔ والترمذی ١٧٩/٣ حدیث رقم ٨١٥۔ والدارمی ٤٦/٢ حدیث رقم ١٧٨٧۔ واحمد فی المسند ١٣٤/٣۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے چار عمرے کیے۔ سب ذی قعدہ میں تھے مگر وہ عمرہ جو حج کے ساتھ کیا وہ جو ذی الحجہ کے مہینے میں تھا اور ان چار عمروں کا بیان یہ ہے کہ ایک عمرہ حدیبیہ سے ذیقعد کے مہینے میں اور دوسرا عمرہ اس سے اگلے برس میں وہ بھی ذیقعد میں ہوا اور تیسرا عمرہ جعرانہ سے ہوا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں غزوہ حنین کی غنیمت بانٹی گئی۔ یہ عمرہ بھی ذیقعدہ کے مہینے میں ہوا اور چوتھا عمرہ ذی الحجہ کے مہینے میں حج کے ساتھ تھا۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :اعتمر رسول الله ﷺ ......مع حجته: ''عُمر'' یہ عمر علم کے وزن پر ہے لیکن یہ منصوف ہے عمرۃ کی جمع ہے۔

''القعدة'' : قاف کے فتحہ کے ساتھ ہے اور کسرہ کے ساتھ بھی ہے اگر اس کی بناء ''مرة'' یا ''هئية'' کیلئے ہو۔

''حجة'' حاء کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ ہے۔

قوله :عمرة من الحديبية:في ذی القعدة: ''الحديبية'' تخفیف کے ساتھ ہے اور تشدید کے ساتھ بھی ہے۔

حرم کے حدود میں سے ایک حد ہے مکہ سے (۹) میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

''عمرة من الحديبية'' نصب کے ساتھ بدل ہے اور رفع کے ساتھ مبتداء موصوف ہے۔ من الحديبية صفت ہے اور فی ذی القعدة خبر ہے۔

قوله :عمرة من الجعرانة: ''الجعرانة'' جیم کے کسرہ اور عین کے سکون کے ساتھ ہے اور بعض کہتے ہیں عین کے کسرہ اور راء کی تشدید کے ساتھ ہے اور یہ (٦) میل یا (۹) میل کے مسافت پر ہے دوسرا زیادہ صحیح ہے۔

قوله :''عمرة مع حجة'' یہ عمرہ بھی احرام کے اعتبار سے ذیقعدہ میں تھا تو ابن حجر کا یہ قول کہ یہ عمرہ ذی الحجہ میں کیا تھا محمول ہے افعال عمرہ کی ادائیگی پر، لیکن اس وقت ان پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ ان کے مذہب کے مطابق قارن کیلئے تداخل افعال ہے تو ان کے مذہب کے مطابق افعال عمرہ حقیقۃً نہیں ہوئے بلکہ حکماً ہوئے اور اس کے بعد ظاہر ہے۔

پھر حضرت انسؓ کا یہ قول کہ احرام حدیبیہ سے باندھا تھا۔ حالانکہ بخاری میں یہ بات ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے اس عمرے کا احرام ذوالحلیفہ سے باندھا تھا تو انس کا قول محمول ہے اس پر کہ آپ ﷺ نے احرام کی حالت میں داخل ہونے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن پھر آپ کو روکا گیا تو فی الجمله اس پر عمرہ کا اطلاق کیا گیا ہے باوجود یہ کہ افعال عمرہ ادا نہیں ہوئے تھے اس نیت کا اعتبار کرتے ہوئے جس پر ثواب مرتب ہوتا ہے اور حدیبیہ ایک کنواں ہے جدہ اور مکہ کے درمیان اب اس کو بئر شمیس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے اور مکہ کے درمیان ٦ فرسخ کا فاصلہ ہے جیسا کہ ابن حجر نے اس کو ذکر کیا ہے۔

لیکن قابل اعتماد بات وہی ہے جو ہم پہلے ذکر کر چکے کہ تین فرسخ کا فاصلہ ہے۔

اسی طرح عمرة القضاء کا احرام بھی ذوالحلیفہ سے باندھا تھا اور شوافع کا قضا کی تاویل قضیہ' مقاضات اور تقاضی سے کرنا جو مقافات اور تقاض جو بمعنی صلح کے ہے کرنا تعصب کا نتیجہ ہے اور اس کی بحث کافی طویل ہے تو ہم نے اس کو مکمل طور پر ترک کر دیا۔ باوجود یہ کہ ابن حجر کے اس قول میں کہ آپ ﷺ نے اہل مکہ کے ساتھ صلح حدیبیہ میں یہ شرط لگائی تھی کہ آپ ﷺ آئندہ سال احرام کی حالت میں

آئیں گے اور وہ آپ ﷺ کو مکہ میں تین دن تک قیام کی اجازت دیں گے۔ ابن حجر اور دوسروں پر واضح حجت اور دلیل ہے۔

باقی جو واقدی کے کاتب محمد بن سعد نے جو ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے کہ جب آپ ﷺ طائف سے واپس ہوئے تو جعرانہ میں ٹھہرے اور وہاں مال غنیمت تقسیم فرمایا پھر وہی سے عمرہ کیا اور یہ شوال کی ۲۶ تاریخ کو ہوا، تو یہ ضعیف ہے اور اہل سیر اور محدثین کے نزدیک معروف بات وہی ہے جو پہلے گزری۔ واللہ اعلم۔

آپ ﷺ کے عمروں کا ذکر

۲۵۱۹: وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ اعْتَمَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِيْ ذِی الْقَعْدَةِ قَبْلَ اَنْ يَحُجَّ مَرَّتَيْنِ.

اخرجه البخاري في صحيحه ٣/ ٦٠٠۔ حديث رقم ١٧٨١۔

ترجمہ: حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ فرماتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے ذیقعدہ کے مہینے میں حج سے پہلے دو مرتبہ عمرہ کیا ہے۔

تشریح: قوله :"قبل ان يحج مرتين" یہ ماقبل کے منافی نہیں ہے کیونکہ عمرہ حدیبیہ حقیقت میں شمار نہیں ہے کیونکہ آپ ﷺ نے اس کا احرام باندھا تھا لیکن افعال ادا نہیں کیے تھے۔ کیونکہ آپ ﷺ محصر تھے اور وہ عمرہ جو آپ ﷺ نے حج کے ساتھ ادا کیا وہ ذیقعدہ میں احرام کے اعتبار سے تھا باقی افعال ذی الحجہ میں ادا کیے تھے۔ اور ہماری یہ تاویل ابن حجر کے قول سے زیادہ بہتر ہے گویا کہ اس نے جعرانہ سے عمرہ کو یاد نہیں کیا کیونکہ پہلے گزرا کہ بعض صحابہ نے اس کا انکار کیا ہے اس کے فناء اور پوشیدگی کی وجہ سے۔

الفصل الثانی:

حج پوری عمر میں ایک مرتبہ فرض ہے

۲۵۲۰: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَا اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلَيْكُمُ الْحَجَّ فَقَامَ الْاَقْرَعُ بْنُ حَابِسٍ فَقَالَ اَفِيْ كُلِّ عَامٍ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَوْ قُلْتُهَا نَعَمْ لَوَجَبَتْ وَلَوْ وَجَبَتْ لَمْ تَعْمَلُوْا بِهَا وَلَمْ تَسْتَطِيْعُوْا وَالْحَجُّ مَرَّةً فَمَنْ زَادَ فَتَطَوُّعٌ۔ (رواه احمد والنسائی والدارمی)

اخرجه ابوداؤد في السنن ٢/ ٣٤٤ حديث رقم ١٧٢١۔ والنسائی ٥/ ١١ حديث رقم ٢٦٢٠۔ وابن ماجه ٢/ ٩٦٣ حديث رقم ٢٨٨٦۔ والدارمی ٢/ ٤٦ حديث رقم ١٧٨٨۔ واحمد في المسند ١/ ٢٥٥۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اے لوگو! تحقیق اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے۔ اقرع بن حابسؓ کھڑے ہوئے کہا کہ ہر سال حج فرض ہے اے اللہ کے رسولؐ! فرمایا اگر میں اس حج کے لیے ہاں کہہ دیتا یعنی حج واجب ہونے کے واسطے تو واجب ہو جاتا تو تم اس کو نہ کرتے اور نہ تم طاقت رکھتے لہٰذا حج ایک ہی بار فرض ہے تو جو ایک مرتبہ سے زیادہ کرے وہ نفل ہے۔ اس کو امام احمدؒ اور نسائیؒ اور دارمیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :يا ايها الناس ان الله كتب عليكم الحج: "ان الله كتب....." یعنی اللہ نے تم پر حج فرض کیا ہے اپنے اس قول کے ذریعے: ﴿ولله علي الناس حج البيت من استطاع اليه سبيلا﴾ [آل عمران:۹۷] اور اللہ کے واسطے لوگوں کے ذمہ اس مکان کا حج کرنا ہے یعنی اس شخص کے جو کہ طاقت رکھے وہاں تک کے راستے کی۔ (بیان القرآن)

قولہ :أفي کل عام: صوم وزکوٰۃ پر قیاس کرتے ہوئے کیونکہ اول عبادت بدنی ہے اور ثانی عبادت مال ہے اور حج ان دونوں سے مرکب ہے۔

قولہ :قال لو......ولم تستطیعوا: ''ولم تستطیعوا'' یہ یا عطف تفسیر ہے اور خطاب اجمالی امت کو یا حاضرین کو ہے اور باقی کیلئے بالتبع ہے اور اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جس میں ''ولم تستطیعوا أن تعملوا بھا'' ہے اور یا عطف تغایر ہے اور عدم استطاعت ان کے ساتھ خاص ہے جو حرم سے دور ہے۔

باقی ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کا یہ کہنا: لو قلتھانعم' بدل ہے ضمیر سے جو ماقبل کی طرف راجع ہے' بے فائدہ بات ہے۔ یہ ترکیب کے اعتبار سے اور نہ معنی کے اعتبار سے جیسا کہ ظاہر ہے۔

''لم تستطیعوا'' یعنی تم اس پر قدرت نہ رکھتے یہاں استطاعت سے مراد قدرت علی الفعل ہے اور آیت میں استطاعت سے مراد زاد و راحلہ ہے لہٰذا دونوں میں کوئی منافات نہیں ہے۔

قولہ :والحج مرۃ فمن زاد تطوع:...... ''والحج مرۃ'' مبتداء، خبر ہے۔

اس حدیث میں رد ہے بعض شیعہ پر کہ وہ کہتے ہیں کہ حج فرض عین ادا کرنے کے بعد فرض کفایہ ہوتا ہے۔ حالانکہ شریعت میں اس کی کوئی نظیر نہیں۔ ہاں جو آدمی قدرت والا ہو تو اس کیلئے مستحب ہے کہ ہر پانچ سال میں ایک حج کرے۔

کیونکہ ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ بندہ جس کو جسمانی لحاظ سے صحت اور معاش کے اعتبار سے وسعت حاصل ہو اور اس پر پانچ سال گزر جائیں اور وہ میری طرف نہ آئے تو وہ محروم ہے۔ اس حدیث کی وجہ سے ہر پانچ سال میں ایک مرتبہ حج کو واجب کہا گیا ہے۔

لیکن اس قول کو رد کیا گیا ہے کہ یہ اجماع کے خلاف ہے اور جن کا خیال ہے کہ ہر سال واجب ہے تو یہ مکان کے اعتبار سے محال ہے کیونکہ تمام لوگوں کیلئے وہاں ہیئت اجتماع کے ساتھ حج ممکن نہیں۔

حج کی فرضیت کے لیے شرائط

۲۵۲۱:وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ مَلَكَ زَادًا وَرَاحِلَةً تُبَلِّغُهٗ اِلٰى بَيْتِ اللّٰهِ وَلَمْ يَحُجَّ فَلَا عَلَيْهِ اَنْ يَّمُوْتَ يَهُوْدِيًّا اَوْ نَصْرَانِيًّا وَذٰلِكَ اَنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى يَقُوْلُ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا۔

(رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث غریب وفی اسنادہ مقال وھلال بن عبد اللہ مجھول والحارث یضعف فی الحدیث)

اخرجہ الترمذی فی السنن ۱۷۶/۳ حدیث رقم ۸۱۲۔

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص سواری اور توشہ کا مالک ہو کہ اس کو بیت اللہ تک پہنچا دے اور اس نے حج نہ کیا۔ پس اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے اور یہ جو کچھ مذکورہ ہوا ہے زادِ راہ اور سواری کا' یہ بطورِ شرط کے ہے اور اسی عبادت کے ترک پر وعید ہے کہ اللہ تعالیٰ بابرکت و برتر نے فرمایا کہ اللہ کے واسطے لوگوں پر خانہ کعبہ کا حج کرنا واجب ہے' اس پر کہ اس کی طرف طاقت رکھے۔ اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس کی سند میں گفتگو ہے اور ہلال بن عبد اللہ مجہول ہیں اور حارث حدیث میں خفیف شمار ہوتا ہے۔

تشریح: قوله : ملك زاد وراحلة تبلغه......ولم یحج :اگرچہ کرایہ کی ہو۔

واپسی کے خرچ کا ذکر نہیں کیا کیونکہ اس کی ضرورت بالکل ظاہر ہے یا اس وجہ سے کہ واپس لوٹنا کوئی ضروری نہیں ہے۔

''تبلغه''لام کی تشدید اور تخفیف دونوں کے ساتھ ہے۔''ولم یحج'' جیم شدد کے فتح کے ساتھ ہے اور ضمہ اور کسرہ بھی جائز ہے اور یہ کلمہ ابن حجر کے نسخہ میں نہیں تھا اسی وجہ سے اس نے یہ عبارت مقرر نکالی ہے''ثم ترك المجئ الیه للحج''۔

قوله :فلاعلیه ان یموت یهودیا او نصرانیا :اگراس نے قدرت کے باوجود حج اس لیے نہیں کیا کہ وہ اس کی فرضیت کا منکر ہے تو پھر اس مابعد کا تعلق کفر سے ہوگا اور اگر فرضیت کا منکر ہوئے بغیر حج نہ کیا تو اس مشابہت کا تعلق گناہ سے ہوگا اور بعض نے کہا ہے کہ یہ وعید آپ ﷺ نے از راہ تغلیظ فرمائی ہے۔

ابن الملک کہتے ہیں کہ یہاں ذکر میں یہود ونصاری کو اس لیے خاص کیا کہ ان کے نزدیک حج کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے حج ان پر فرض نہیں تھا کیونکہ فرضیت حج اس امت کا شعار ہے۔(انتہی)

ابن الملک کے اس قول میں واضح مناقشہ ہے۔اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ ان کے تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ اہل کتاب ہیں اور کتاب پر عمل نہیں کرتے تو ان کے ساتھ تشبیہ دی۔اس کی جس نے حج کو ترک کیا کہ اس نے بھی اللہ کی کتاب پر عمل نہیں کیا اور اس کو پیٹھ پیچھے پھینکا' گویا کہ وہ اسے جانتا ہی نہیں۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ اس حالت میں مرنا اور یہودیت اور نصرانیت پر مرنا برابر ہے اور مقصود وعید میں تغلیظ ہے۔جیسے کہ اس ارشاد میں ہے(ومن کفر......)اس کو حج نہ کرنے کی جگہ ذکر کیا ہے۔

فان الله غنی عن العلمین [آل عمران:۹۷] کہ یہاں عنہ سے **عن العلمین** کی طرف عدول کیا ہے مبالغہ کیلئے۔یعنی اللہ اس سے اور تمام بندوں اور ان کی عبادتوں سے بے نیاز ہے بلکہ یہ بندے ہی اللہ کے محتاج ہیں' ایجاد میں بھی اور امداد میں بھی اور اطاعت کا فائدہ ان ہی کی طرف لوٹتا ہے اور معبودیت کے ساتھ قائم رہنا ان پر واجب ہے۔

ابن حجر رحمہ اللہ نے اس حدیث میں مقدرات نکالے ہیں(جس کا مطلب یہ ہے)کہ کوئی فرق نہیں ہے کہ یہ حج ترک کرنے کی حالت میں مرجائے یا یہودی اور نصرانی بن کر مرجائے۔یعنی کافر بن کر ہی مرجائے کیونکہ یہ دونوں حالتیں برابر ہیں حقیقتاً اگر وہ حج کو ترک کرے قدرت کے باوجود اس کے وجوب کا ترک کرتے ہوئے اور ابن حجر نے اس کو اس آیت کی طرح قرار دیا ہے:﴿**فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر**﴾ [الکهف: ۲۹] سو جس کا جی چاہے ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کافر رہے۔(بیان القرآن)

تحذیر اور وعید میں۔لیکن ابن حجر کے قول کا صحیح نہ ہونا کوئی مخفی نہیں ہے اور اسکے تقریرات میں تکلف ہے۔کیونکہ اگر یہ شخص اس کو حلال سمجھ کر چھوڑ رہا ہے تو جیسا کہ ابن حجر کے تحریر میں ہے تو پھر اس کی مقدرات نے کوئی فائدہ ہی نہیں دیا کیونکہ اس سے زیادہ حدیث کے اپنے الفاظ وعید اور تحذیر ہے اور اس کے دل میں جو بات ہے اس کے ترک پر زیادہ ابھارنے والی اور حج جو اس کے کفر کا موجب بن رہی ہے اس کے انکار کے بعد اس کی طرف زیادہ توجہ دلانے والی ہے اور ایک روایت میں' ہے **فلیمت ان شاء یهودیا او نصرانیا** یہ ابن حجر کے تقریر کو باطل کر دیتی ہے،فتامل۔کیونکہ احادیث بعض،بعض کی تفسیر کرتی ہیں اور کلام میں اصل عدم تقدیر ہے اگر بغیر تغیر کے کلام کا مطلب صحیح بنتا ہو۔

''**سبیلاً**''،بمعنی راستہ۔حضور ﷺ نے اس کی تفسیر زاد وراحلہ سے کی ہے حاکم وغیرہ نے اس کو روایت کیا ہے جیسا کہ جلالین میں ہے۔بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے یہ آیت پوری پڑھی ہوگی۔کیونکہ استدلال تو پوری ہی آیت سے ہوتا ہے۔لیکن راوی نے الیه

سبیلا تک آیت کونقل کیا ہے۔ جیسا کہ علامہ طیبیؒ نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور وجہ بیان کی ہے۔

تخریج: کہا گیا ہے کہ یہ حدیث ابوامامہ سے بھی روایت کی گئی ہے اور حدیث جب کئی طرق سے روایت کی گئی ہو تو وہ قوی ہو جاتی ہے اگرچہ وہ ضعیف ہو کیونکہ اس کے صدق کا احتمال راجح ہو جاتا ہے۔ یہ علامہ طیبیؒ نے ذکر کیا ہے۔

علامہ عراقی فرماتے ہیں کہ اس کو ابن عدی نے حدیث ابوہریرہ سے روایت کیا ہے۔

علامہ ذھبی فرماتے ہیں کہ یہ اس سند سے زیادہ صحیح سند کے ساتھ بھی آئی ہے۔ علامہ زرکشی فرماتے ہیں کہ اس کے موضوع قرار دینے میں خطاء ہوئی ہے۔ کیونکہ راوی کے وہم سے حدیث کی وضع لازم نہیں آتا۔

قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ ابن جوزی کا اس حدیث کو موضوع قرار دینے کی طرف التفات نہ کیا جائے۔ یہ موضوع کیسے ہو سکتی ہے حالانکہ امام ترمذی نے اس کی تخریج اپنے جامع میں کی ہے اور فرمایا ہے کہ میری کتاب کی تمام احادیث معمول بہ ہیں سوائے دو حدیثوں کے اور یہ ان دونوں میں سے نہیں ہے۔

اور ایک روایت میں ہے "**من لم یمنعه من الحج حاجة او مرض حابس او سلطان جائر فلیمت ان شاء یهودیا او نصرانیا**" اس کی سند ضعیف ہے لیکن حضرت عمر سے موقوف صحیح ثابت ہے اور یہ مرفوع کے حکم میں ہے لہٰذا اس اعتبار سے حدیث صحیح ہے۔

استطاعت کے باوجود حج نہ کرنے پر وعید

۲۵۲۲: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا صَرُوْرَةَ فِی الْاِسْلَامِ۔

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳۴۸/۲ حدیث رقم ۱۷۲۹۔ واحمد فی المسند ۳۱۲/۱۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ صرورت اسلام میں نہیں ہے اس کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

تخریج: اس حدیث کو امام حاکم وغیرہ نے صحیح قرار دیا ہے۔

تشریح: "صرورة" صاء کے فتحہ کے ساتھ اس کو کہتے ہیں جس نے کبھی حج نہ کیا ہو' بمعنی جو شخص باوجود فرض ہونے کے بھی حج نہ کرے تو وہ مسلمان نہیں۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس کا مفہوم یہ ہے جو حج کی استطاعت رکھے اور حج نہ کرے تو وہ کامل مسلمان نہیں۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ صرورة کا معنی ہے نکاح ترک کرنا یعنی نکاح ترک کرنا اسلام کا طریقہ نہیں ہے بلکہ یہ رہبانیت میں داخل ہے۔

باقی امام شافعی اور اس کے کچھ متبعین کا یہ کہنا کہ جو شخص حج نہ کرے اس کو صرورة کہنا مکروہ تنزیہی ہے تو امام نووی وغیرہ نے اس کا تعقب کیا ہے کہ یہ استدلال محل نظر ہے کیونکہ حدیث میں اس کی ممانعت سے کوئی تعرض نہیں ہے بلکہ حدیث کا مفہوم وہی ہے جو اوپر گزرا۔

ارادۂ حج کی تکمیل جلدی ہونی چاہیے

۲۵۲۳: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ مَنْ اَرَادَ الْحَجَّ فَلْيُعَجِّلْ۔ (رواہ بوداود و الدارمی)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳۵۰/۲ حدیث رقم ۱۷۳۲۔ وابن ماجه ۹۶۲/۲ حدیث رقم ۲۸۸۳۔ والدارمی ۴۵/۲ حدیث

رقم ۱۷۸٤۔ واحمد فی المسند ۱/۲۱٤۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو حج کا ارادہ کرے اس کو چاہیے کہ جلدی کرے اس کو ابوداؤدؒ اور دارمیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ :"فلیعجل": جیم کی تشدید کے ساتھ ہے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ جو حج کرنے پر قادر ہو جائے تو موقع کو غنیمت جانے اور بعض نے کہا ہے کہ امر استحباب کیلئے ہے (انتہیٰ) ہمارے نزدیک صحیح یہ ہے کہ حج علی الفور واجب ہے۔ یہ امام ابو یوسف اور امام مالک رحمہما اللہ کا قول ہے اور امام ابو حنیفہؒ کا ایک قول بھی اس پر دلالت کر رہا ہے اور وہ روایت ابن شجاع نے ان سے نقل کی ہے کہ ایک آدمی اتنا مال پالے کہ جس کے ذریعے وہ حج کرسکتا ہو اور وہ شادی کا بھی ارادہ رکھتا ہے تو امام صاحب فرماتے ہیں کہ وہ حج کرے۔

امام محمد اور ایک قول میں امام ابو حنیفہ اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ حج علی التراخی واجب ہے ہاں اگر تاخیر کی صورت میں فوت ہونے کا خطرہ ہو تو علی الفور لازم ہے۔ کیونکہ حج کا وقت پوری عمر ہے انسان کی بقاء کے ظاہر حال کو دیکھتے ہوئے تو یہ اپنے وقت میں نماز کی طرح ہے تو حج میں آخر عمر تک تاخیر جائز ہے جیسا کہ نماز کو آخر وقت تک مؤخر کرنا جائز ہے۔ مگر امام محمد کے نزدیک یہ تاخیر مشروط ہے کہ حج فوت نہ ہو جائے۔ یعنی اگر یہ شخص بغیر حج کیے مرا تو گنہگار ہوگا۔

امام ابو یوسفؒ کی دلیل یہ ہے کہ حج سال میں ایک معین وقت میں ہوتا ہے اور سال کے اندر موت کا آنا نادر نہیں ہے۔ چنانچہ احتیاط کے پیش نظر اس پر تنگی ہے نہ کہ بالکلیہ وسعت ختم کرنے کیلئے۔ اگر آنے والے سال وہ حج کرلے تو بالاتفاق وہ حج کو ادا کرنے والا ہوگا اور اگر دوسرے سال ادا کرنے سے پہلے فوت ہو گیا تو بالاتفاق گنہگار ہوگا۔ ثمرہ اختلاف اس شخص کے حق میں نکلتا ہے کہ جس نے حج کو مؤخر کر دیا ہو تو علی الفور کے جو قائل ہیں ان کے نزدیک یہ فاسق ہے اور اس کی گواہی قبول نہیں اور جو تراخی کے قائل ہیں ان کے نزدیک یہ نہیں ہے۔ جیسا کہ شمنی نے اس کی تحقیق کی ہے۔

تخریج: اور ایک روایت میں ہے: **حجوا قبل ان لا تحجوا فکانی انظر الی حبشی اصمع افدع بیدہ معول یھدمھا حجرا حجرا۔**

یعنی حج کرو قبل اس کے کہ ایسا باعث پیدا ہو جائے کہ تم حج نہ کرسکو گویا کہ میں دیکھ رہا ہوں چھوٹے کانوں اور ٹیڑھی ٹانگوں والے حبش کو کہ وہ اس بیت اللہ کو ایک ایک پتھر کر کے گرا رہا ہے۔

حج قرآن کرو

۲۵۲۴: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ تَابِعُوْا بَيْنَ الْحَجِّ وَالْعُمْرَةِ فَاِنَّهُمَا يَنْفِيَانِ الْفَقْرَ وَالذُّنُوْبَ كَمَا يَنْفِي الْكِيْرُ خَبَثَ الْحَدِيْدِ وَالذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَلَيْسَ لِلْحَجَّةِ الْمَبْرُوْرَةِ ثَوَابٌ اِلاَّ الْجَنَّةُ۔

(رواہ الترمذی والنسائی ورواہ احمد وابن ماجۃ عن عمر الی قولہ) **خَبَثُ الْحَدِيْدِ**۔

اخرجہ الترمذی فی السنن ۳/۱۷۵ حدیث رقم ۸۱۰۔ والنسائی ٥/۱۱٥ حدیث رقم ۲٦۳۰۔

ترجمہ: حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے۔ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا حج اور عمرہ کو پے در پے کرو۔ یہ دونوں فقر اور گناہوں کو دور کرتے ہیں جیسے بھٹی لوہے کی میل کو دور کرتی ہے اور سونے کا اور چاندی کا اور نہیں ہے حج مقبول کے واسطے ثواب' سوائے بہشت۔ یہ ترمذی اور نسائیؒ نے اور احمدؒ اور ابن ماجہؒ نے **خبث الحدید** تک حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :تابعوا بين الحج و العمرة :حج اور عمرہ دونوں ایک ساتھ کرو کا مطلب یہ ہے کہ حج قران کرو یا ایک کے بعد دوسرا کرو۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ جب تم عمرہ کر چکے تو اس کے بعد حج کرو اور جب حج کر چکے تو اس کے بعد عمرہ کرو۔

قوله :فانهما ينفيان...... والذهب والفضة: ''الكير'' جس میں لوہار آگ بھڑکانے کیلئے پھونکتا ہے یعنی بھٹی۔

فقر سے مراد ظاہری فقر بھی ہوسکتا ہے اور باطنی بھی یعنی حج وعمرہ کرنے سے اللہ تعالیٰ مال دولت کی نعمت سے نوازتا ہے یا یہ کہ دل غنی ہو جاتا ہے۔

قوله :وليس للحجة المبرورة ثواب الا الجنة'' رفع اور نصب دونوں کے ساتھ ہے۔

حج کے کچھ فضائل کا بیان

۲۵۲۵ :وَرَوَاهُ اَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَةَ عَنْ عُمَرَ اِلٰى قَوْلِهٖ خَبَثُ الْحَدِيْدِ ۔

اخرجه ابن ماجه فی السنن ۹٦٤/۲ حدیث رقم ۲۸۸۷۔ واحمد فی المسند ۳۸۷/۱۔

ترجمہ: ''اور امام احمد اور ابن ماجہ نے اس روایت کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے لفظ خبث الحدید تک نقل کیا ہے''۔

تشریح: منذری نے حدیث نقل کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو حج کیلئے آیا اور مقصد صرف اللہ کی خوشنودی ہو تو اس کے اگلے پچھلے تمام گناہ بخش دیے جاتے ہیں اور جس کیلئے یہ دعا کرے اس کے حق میں اس کی سفارش قبول ہو جاتی ہے۔

اور ایک اور حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس نے حج ادا کیا اور لوگ اس کے زبان اور ہاتھ سے محفوظ رہے تو اس کے اگلے اور پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ جب حاجی گھر سے نکل جائے تو وہ اللہ کی حفاظت میں ہوتا ہے پس اگر حج ادا کرنے سے پہلے مر جائے تو اس کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔اور حج میں ایک درہم خرچ کرنا اس کے علاوہ میں ایک لاکھ خرچ کرنے کے برابر ہے۔

حج کن چیزوں کی وجہ سے واجب ہوتا ہے

۲۵۲٦ :وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا يُوْجِبُ الْحَجَّ قَالَ الزَّادُ وَالرَّاحِلَةُ . (رواه الترمذی و ابن ماجة)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۷۷/۳ حدیث رقم ۸۱۳۔ وابن ماجه ۹٦۷/۲ حدیث رقم ۲۸۹۷۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا اے اللہ کے رسول! حج کو کونسی چیز واجب کرتی ہے؟ فرمایا توشہ اور سواری اس کو امام ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :ما يوجب الحج:

کون سی چیز حج واجب کرتی ہے؟ کا مطلب یہ ہے کہ حج واجب ہونے کی شرط کیا ہے ورنہ واجب کرنے والا تو اللہ ہے۔

قوله :قال :الزاد والراحلة :چنانچہ آپؐ نے ایک چیز تو زادِراہ بتائی جس کی مراد یہ ہے کہ اتنا مال ہو جو سفر حج میں جانے اور آنے کیلئے کافی ہو دوسری چیز سواری بتائی جس پر سوار ہو کر بیت اللہ تک پہنچا جا سکے اگرچہ حج کے واجب ہونے کی شرطیں اور بھی ہیں مگر یہاں بطور خاص ان دو چیزوں کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ اصل میں یہی دو شرائط ایسی ہیں جو حج کیلئے بنیادی اور ضروری اسباب کا درجہ رکھتی ہیں۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ ان کے واجب ہونے کیلئے شرط ہونے میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے (انتہیٰ)

اور یہ حدیث اپنے عموم کے ساتھ مکی اور غیر مکی سب کو شامل ہے برخلاف ان لوگوں کے جن نے اس کے خلاف کہا ہے۔

اور یہ حدیث امام مالک کے مسلک کی تردید کرتی ہے ان کے ہاں اس شخص پر بھی حج واجب ہوتا ہے جو پیادہ چلنے پر قادر ہو اور تجارت یا مزدوری کے ذریعے سفر کے اخراجات کے بقدر روپے پیسے حاصل کر سکتا ہو۔

تخریج: ابن ہمام فرماتے ہیں کہ حاکم نے انسؓ سے اس آیت کے بارے میں (**وللّٰہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا**) روایت نقل کی ہے **قیل یا رسول اللّٰہ! ما السبیل؟ قال: الزاد والراحلۃ**' حاکم نے کہا ہے کہ شیخین کی شرط پر یہ حدیث صحیح ہے اور مختلف طرق سے مرفوع روایت کی گئی ہے ابن عباس، ابن عمر، عائشہ، جابر، عبداللہ بن عمرو، ابن مسعودؓ کی حدیث سے اور ابن عباسؓ کی حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور باقی احادیث اپنے طرق کے ساتھ ان صحابہ سے جو ہم نے ذکر کیے ترمذی، ابن ماجہ، دارقطنی اور ابن عدی کے نزدیک ضعیف ہے۔ اگر کسی حدیث کی صحیح طرق نہ ہو تو کثرت طرق سے وہ درجہ حسن تک پہنچ جاتا ہے پھر اگر جب کہ اس میں صحیح طرق بھی ہو: (انتہیٰ)

اس سے ابن حجر کا یہ قول باطل ہوا کہ اس میں بالاتفاق ضعیف ہے۔ کیونکہ ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے اور بیہقی، ابن صلاح اور ع نووی نے ضعف کو ضعیف لذاتہ پر بھی محمول کیا جاتا ہے اور یہ حدیث حسن لغیرہ ہے۔

اور حسن کو کبھی صحیح بھی کہا جاتا ہے لہٰذا نزاع ختم ہوا۔

حاجی کی صفات کا بیان

۲۵۲۷: وَعَنْهُ قَالَ سَأَلَ رَجُلٌ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ مَا الْحَاجُّ قَالَ الشَّعِثُ التَّفِلُ فَقَامَ اٰخَرُ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَيُّ الْحَجِّ اَفْضَلُ قَالَ الْعَجُّ وَالثَّجُّ فَقَامَ اٰخَرُ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا السَّبِيْلُ قَالَ زَادٌ وَرَاحِلَةٌ ۔

(رواہ فی شرح السنۃ وروی ابن ماجۃ فی سننہ الا انہ لم یذکر الفصل الا خیر)

اخرجہ ابن ماجہ فی السنن ۹٦۷/۲ حدیث رقم ۲۸۹٦۔ والبغوی فی شرح السنۃ ۱٤/۷ حدیث رقم ۱۸٤۷۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا۔ کہ حاجی کی صفت کیا ہے فرمایا سر غبار آلودہ پراگندہ بالوں سے پسینے اور میل کی وجہ سے بو آتی ہو۔ یعنی زینت کو چھوڑنے والا ہو۔ پھر ایک شخص کھڑا ہوا اور کہا اے اللہ کے رسول حج میں کون سی چیزیں بہت زیادہ ثواب رکھتی ہیں۔ یعنی حج کے ارکان کے بعد فرمایا ۔ آواز کا بلند کرنا۔ لبیک کہنے کے ساتھ اور قربانی یا ہدی کا خون بہانا۔ پھر ایک اور شخص کھڑا ہوا اور کہا اے اللہ کے رسول کیا ہے کوئی راستہ اللہ تعالیٰ کی کلام میں حج کی آیت میں جو آیا ہے **من استطاع الیہ اسبیلا** تو سبیل سے کیا مراد ہے فرمایا توشہ اور سواری مراد ہے۔ اس کو شرح السنہ میں نقل کیا گیا ہے اور ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے اپنی سنن میں مگر اخیر کی عبارت ذکر نہیں کی۔

تشریح: **قولہ: ما الحاج:** اس کا معنی **ما صفۃ الحاج الذی یحج یاما بمعنی من** کے ہے۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ ''ما'' کے ذریعے جنس اور وصف دونوں کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے۔ اور یہاں مراد ثانی ہے۔

''**الشعث**''، عین کے کسرہ کے ساتھ یعنی غبار آلود سر غسل نہ کرنے کی وجہ سے اور بکھرے بال کنگھی نہ کرنے کی وجہ سے حاصل اس کا **تارك الزینۃ** ہے۔

''التفل'': فاء کے کسرہ کے ساتھ یعنی کبھی وہ تیل ہونا ہے جس سے بدبو پیدا ہو جاتی ہے یہ **تفل الشی من فیه** سے ماخذ ہے جب کسی چیز کو کراہت کی وجہ سے منہ سے پھینکنا۔

قوله :ای الحج افضل؟:..... :العج والثج :''**العج والثج**'' دونوں تشدید کے ساتھ ہیں اول کا معنی ہے تلبیہ کے ساتھ اور بلند کرنا اور ثانی کا معنی ہے ہدی کا خون بہنا اور بعض نے کہا ہے کہ قربانی کے جانوروں کا خون بہانا۔اس سے مراد استعیاب ہے کیونکہ اس میں حج کا اول جو کہ احرام ہے اور آخر جو کہ خون بہانا ہے ذکر کیا ہے یعنی تمام افعال کے ذکر کرنے کے بجائے ابتداء اور انتہاء پر اکتفاء کیا ہے مطلب یہ ہے کہ وہ شخص جو حج کے تمام اعمال فرائض، مستحبات وغیرہ ادا کرے تو اس کا حج ثواب کے اعتبار سے زیادہ افضل ہے۔

''**الفصل**'' سے مراد کلام کا فقرہ ہے۔

حج بدل کا ثبوت

۲۵۲۸ وَعَنْ اَبِیْ رَزِیْنٍ الْعُقَیْلِیِّ اَنَّهٗ اَتَی النَّبِیَّ ﷺ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ اَبِیْ شَیْخٌ کَبِیْرٌ لَا یَسْتَطِیْعُ الْحَجَّ وَلَا الْعُمْرَةَ وَلَا الظَّعْنَ قَالَ حُجَّ عَنْ اَبِیْكَ وَاعْتَمِرْ

(رواہ الترمذی وابو داود والنسائی وقال الترمذی هذا حديث حسن صحيح)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۴۰۲/۲ حديث رقم ۱۸۱۰۔ والترمذی ۲۶۹/۳ حديث رقم ۹۳۰۔ والنسائی ۱۱۱/۵ حديث رقم ۲۵۲۱۔ وابن ماجه ۹۷۰/۲ حديث رقم ۲۹۰۶ واحمد فی المسند ۱۰/۴۔

ترجمہ:حضرت ابورزین عقیلیؓ سے روایت ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آیا پھر اس نے کہا اے اللہ کے رسول! تحقیق میرا باپ بہت بوڑھا ہے حج کی طاقت نہیں رکھتا اور نہ عمرے کی اور نہ سوار ہونے کی یعنی حج اور عمرے کے افعال نہیں کرسکتا اور نہ سوار ہو کر ان کے لیے جاسکتا ہے فرمایا حج کروا اپنے باپ کی طرف سے اور عمرہ کرو۔اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے ابوداؤدؒ اور نسائیؒ نے اور امام ترمذیؒ نے کہا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

راویٔ حدیث:

ابورزین۔ابورزین کا نام لقیط ہے یہ عامر بن صبرہ کے بیٹے ہیں۔''رزین'' بروزن ''جمیل'' ہے۔ان کا ذکر دوسری جلد میں حدیث نمبر ۴۰۵ کے تحت گذر چکا ہے۔

تشریح: **قوله :لایستطیع الحج ولاالعمرۃ ولاالظعن**: ''**الظعن**'' عین کے سکون اور فتحہ کے ساتھ سفر کے معنی میں ہے۔

قوله :حج عن ابیك واعتمر: ''**حج**'' جیم پر تینوں حرکات درست ہیں اور فتحہ معتمد ہے۔

یہ حدیث نیابت کے جواز کی دلیل ہے۔

پھر یہ جان لیجے کہ عمرہ ہمارے نزدیک سنت ہے اور یہی امام مالک کا قول ہے اور امام شافعی کا قول جدید یہ ہے کہ عمرہ فرض ہے کیونکہ اللہ کے اس ارشاد میں عمرہ حج کے ساتھ ذکر ہے: ﴿**واتموا الحج والعمرۃ للّٰه**﴾[البقرۃ:۱۹۶] اور دوسری دلیل ابورزین کی مذکورہ حدیث ہے جس کو حاکم نے علی شرط شیخین روایت کی ہے۔

اور ہماری دلیل وہ حدیث ہے جو ترمذی نے روایت کی ہے اور کہا ہے کہ یہ حسن صحیح ہے۔جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ (سنل

رسول الله ﷺ عن العمرة أواجبة؟ قال "لا") کہ آپ ﷺ سے عمرہ کے بارے میں پوچھا گیا کہ کیا واجب ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔

اور آیت کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ: "قران فی الذکر" حکم میں مساوات کا تقاضا نہیں کرتا اور اگر آیت حج کے ساتھ عمرے کا قران مان بھی لیا جائے تو یہ اتمام کے لحاظ سے ہے جو شروع کرنے کے بعد لازم ہوتا ہے۔

حدیث ابی زرین کا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے یہ حکم دیا ہے کہ وہ اپنے والد کی طرف سے حج اور عمرہ کرے اور والد کی طرف سے حج اور عمرہ کرنا اس پر واجب نہیں تھا اور ابی زرین کا یہ قول "لا یستطیع الحج ولا العمرة" تقاضا کرتا ہے کہ ان کے والد پر یہ واجب نہیں تھے تو حدیث ابی زرین میں امر استحباب کیلئے ہے۔ اسی طرح ذکر کیا ہے شمنی نے۔

ابن حجر کا یہ قول کہ یہ حدیث میت کی طرف سے نیابت کے جواز پر دلیل ہے درست وجہ نہیں بلکہ درست وجہ یہ ہے کہا جائے یہ حدیث زندہ کی طرف سے نیابت کے جواز پر دلیل ہے تو میت کی طرف سے بطریق اولیٰ ہوگا۔

حج بدل کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اپنا حج کرے

۲۵۲۹: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ سَمِعَ رَجُلًا يَقُوْلُ لَبَّيْكَ عَنْ شُبْرُمَةَ قَالَ مَنْ شُبْرُمَةُ قَالَ اَخٌ لِّيْ اَوْ قَرِيْبٌ لِّيْ قَالَ اَحَجَجْتَ عَنْ نَفْسِكَ قَالَ لَا قَالَ حُجَّ عَنْ نَفْسِكَ ثُمَّ حُجَّ عَنْ شُبْرُمَةَ۔

(رواه الشافعي وابو داود وابن ماجة)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۴۰۳/۲ حدیث رقم ۱۸۱۱۔ وابن ماجه ۹۶۹/۲ حدیث رقم ۲۹۰۳۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس ؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو سنا جو کہہ رہا تھا' شبرمة کی طرف لبیک! آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ شبرمہ کون ہے؟ اس نے کہا کہ میرا بھائی ہے یا کہا کہ میرا قریبی ہے فرمایا کیا تو اپنی طرف سے حج کر چکا ہے؟ اس نے کہا نہیں فرمایا پہلے تو اپنی طرف سے حج کر پھر شبرمہ کی طرف کر!۔ اس کو امام شافعیؒ اور ابوداؤدؒ اور ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :لبيك عن شبرمة: "شبرمة" شین وراء کے ضمہ اور باء موحدہ کے سکون کے ساتھ ہے۔

قوله :قال :اخ لي او قريب: راوی کو شک ہے۔

قوله :أحججت عن نفسك: "أحججت" کے شروع میں ہمزہ استفہامیہ ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث دلالت کر رہی ہے کہ جس شخص نے خود حج نہ کیا ہو وہ دوسرے کی طرف سے حج نہیں کر سکتا اور یہی امام اوزاعی، شافعی اور احمدؒ کا مذہب ہے کیونکہ اگر یہ غیر کی طرف سے احرام باندھے تو وہ خود بخود اس کی طرف سے ہو جائیگا اور امام مالک، ثوری اور احناف کے نزدیک دوسرے کی طرف سے حج کر سکتا ہے مگر اس طرح کرنا مکروہ ہے تو اس حدیث کو استحباب اور اولیٰ پر عمل کرنے پر محمول کریں گے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ بیہقی نے کہا ہے اس باب میں اس سند سے زیادہ صحیح اور کوئی سند نہیں ہے اور اس کی بنیاد پر امام شافعی ایسے شخص کیلئے جس نے خود حج نہ کیا ہو دوسرے کی طرف سے حج کو جائز قرار نہیں دیتا۔

ہم کہتے ہیں کہ اس حدیث کے ابن عباس ؓ سے موقوف ہونے میں اضطراب ہے اور اس کے رفع میں بھی اضطراب ہے۔

ابن ہمام نے اس کو تفصیل کے ساتھ ذکر کر کے پھر کہا ہے کہ اور اس وجہ سے بھی کہ ابن مغلس نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے کہ بعض علماء نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے کیونکہ سعید بن ابی عروبہ نے اس کو بصرہ میں کرتے ہوئے ابن عباس کا کلام قرار دیا پھر کوفہ میں اس کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی یہ سعید پر حالت کے مشتبہ ہونے کا فائدہ دیتا ہے۔

اور اگر اس کو صحیح بھی مان لیا جائے تو اس کا حاصل یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ پہلے اپنی طرف سے حج کرے اور اس میں ندب کا احتمال ہے تو اس پر محمول کیا جائے گا' اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خثعمیہ کو فرمایا ہے ''**حجی عن ابیك**'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ان کے حج کے بارے میں نہیں پوچھا کہ ان سے پہلے حج کیا ہے یا نہیں۔

اور حدیث شبرمہ اپنے حج کے مقدم کرنے کے استحباب کا فائدہ دیتا ہے تو اس کے ساتھ روایات جمع ہو گئی اور فرض کو نفل پر مقدم کرنے کی افضلیت ثابت ہوئی۔ مؤخر کرنے کے جواز کے ساتھ۔ (انتہی)

عرضِ مرتب: لیکن ہمارے قواعد کے مطابق اس پر پھر بھی اشکال باقی ہے کہ جب کوئی آدمی دوسرے کی طرف سے احرام باندھے تو اب وہ اس سے اپنے احرام کی طرف منتقل ہونے پر قادر نہیں ہے کیونکہ شروع کرنے سے لزومِ شرعی آ گیا ہے اور از خود اس کا تبدیل ہونا بھی جائز نہیں۔ پس اس سے کوئی مخلص نہیں مگر حدیث کو ضعیف یا منسوخ قرار دینے کے ساتھ کیونکہ حدیث خثعمیہ حجۃ الوداع کے موقع پر فرمائی ہے یا مخاطب کی خصوصیت پر محمول ہے۔

اہل مشرق کا میقات

۲۵۳۰: عَنْهُ قَالَ وَقَّتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِاَهْلِ الْمَشْرِقِ الْعَقِيْقَ۔ (رواه الترمذی و ابو داود)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳۵۵/۲ حدیث رقم ۱۷٤۰۔ والترمذی فی السنن ۱۹۳/۳ حدیث رقم ۸۳۲۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام کی جگہ متعین کر دی۔ مشرق والوں کے لیے عقیق۔ اس کو امام ترمذیؒ نے اور ابو داؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

اسنادی حیثیت: امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے لیکن اس کا تعقب کیا گیا ہے کہ اس حدیث میں ضعف ہے۔

تشریح: ''العقیق'' ایک جگہ کا نام ہے جو ذات العرق کے محاذات میں واقع ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ذات العرق کی حدود میں داخل ہے۔ عقیق اصل میں ہر اس نالے کو کہتے ہیں جسے سیلاب نے کاٹ کر گہرا کر دیا ہو ''عق'' سے ماخوذ ہے جو ''قطع'' اور ''شق'' کے معنی میں ہے۔

مشرق والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو حرم سے باہر مکہ کے مشرقی جانب کے علاقوں میں رہنے والے ہیں یہی لوگ عراقی بھی کہلاتے ہیں۔

احرام کی جگہ کا تعین

۲۵۳۱: وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ وَقَّتَ لِاَهْلِ الْعِرَاقِ ذَاتَ عِرْقٍ۔ (رواه ابو داوٗد والنسائی)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳٥٤/۲ حدیث رقم ۱۷۳۹۔ والنسائی ۱۲۵/۵ حدیث رقم ۲٦٥٦۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عراق والوں کے لیے احرام کی جگہ ذات عرق معین فرمائی۔ اس کو ابو داؤدؒ اور نسائیؒ نے نقل کیا ہے۔

تخریج: وکذا دار قطنی وسندہ صحیح علی شرط البخاری وھو موافق لخبر مسلم السابق فی الفصل الاول۔

تشریح: ابن الملک فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے مشرق والوں کیلئے دو میقات مقرر کیے، عقیق اور ذات العرق۔ پس جس ذات العرق پہنچنے سے پہلے عقیق سے احرام باندھا تو یہ افضل ہے اور جس نے عقیق سے تجاوز کر کے ذات العرق سے احرام باندھا تو یہ جائز ہے اور اس پر کوئی کفارہ وغیرہ نہیں ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ ذات عرق کو میقات مقرر کرنے کے بارے میں مسلم میں حضرت جابر سے روایت ہے راوی کہتا ہے کہ میرا گمان ہے کہ حضرت جابر نے اس کو مرفوع ذکر کیا ہے اس حدیث میں ہے ''مھل اھل المدینة...... پھر ہے ''مھل اھل العراق ذات عرق'' اور اس کے مرفوع ہونے میں راوی کو شک ہے اور ایک جگہ روایت کیا ہے جو ابن ماجہ نے نقل کیا ہے اس میں شک نہیں ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں ''ومھل اھل الشرق ذات عرق''۔ مگر اس کی سند میں ابراہیم بن یزید الخوزی ہے جس کی حدیث سے استدلال نہیں کیا جاتا۔ اور ابوداؤد نے حضرت عائشہ کی روایت نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے اہل عراق کیلئے ذات عرق میقات مقرر کیا ہے اور نسائی نے الفاظ کے زیادت کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اور شافعی فرماتے ہیں کہ بیہقی یہ یہ کاوش ان کے طریق میں ہے ''لم یوقت النبی ﷺ ذات عرق ولم یکن اھل الشرق حینئذ فوقت الناس'' کہ آپ ﷺ نے ذات عرق کو میقات نہیں بنایا اور اس زمانہ میں مشرق والے نہ تھے۔ پس اس کو لوگوں نے میقات بنایا ہے۔

طاؤس کہتے ہیں کہ اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو بخاری نے اپنی سند کے ساتھ نقل کی ہے ''عن نافع عن ابن عمر لما فتح المصران أتوا عمر فقالوا، یا امیر المؤمنین ان رسول اللہ ﷺ حد لاھل نجد قرنا وھی جور عن طریقنا وانا اذا اردنا قرنا شق علینا قال: انظروا حذوھا من طریقکم'' تو حضرت عمر نے ان کیلئے ذات عرق کو میقات مقرر کیا۔ شیخ تقی الدین الامام میں فرماتے ہیں کہ المصران سے مراد بصرہ اور کوفہ ہیں۔

اور حذوھا سے مراد اس کے قریب کا علاقہ ہے اور فرمایا کہ یہ دلالت کر رہا ہے کہ ذات عرق کا میقات ہونا اجتہادی ہے منصوص نہیں ہے۔ (انتہیٰ)

اور حق یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ کا ذات عرق کو میقات بنانے کی خبر نہیں پہنچی تھی۔ آپ ﷺ کا اس کو میقات بنانے کی احادیث صحیح ہیں تو پھر حضرت عمر کا اجتہاد آپ ﷺ کے میقات مقرر کرنے کے موافق ہو ورنہ تو اس کا میقات ہونا اجتہادی ہے۔

حج انسان کے گناہوں کے بخشنے کا ذریعہ ہے

۲۵۳۲: وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ مَنْ اَهَلَّ بِحَجَّةٍ اَوْ عُمْرَةٍ مِنَ الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰى اِلَى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ وَمَا تَاَخَّرَ اَوْ وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ۔

(رواہ ابو داود وابن ماجة)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۳۵۵/۲ حدیث رقم ۱۷۴۱۔ وابن ماجه ۹۹۹/۲ حدیث رقم ۳۰۰۱ واحمد فی المسند ۲۹۹/۶۔

ترجمہ: ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ کہا میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص حج یا عمرے کا احرام بیت المقدس سے باندھے مسجد الحرام تک یعنی مکے تک اس کے واسطے گناہ بخشے جاتے ہیں جو اس نے پہلے کئے ہیں اور وہ گناہ جو بعد میں کرے گا یا فرمایا کہ اس کے لیے بہشت واجب ہو جاتی ہے یعنی ابتداً۔ اس کو ابوداؤدؒ اور ابن ماجہؒ نے نقل

کیا ہے۔اسنادی حیثیت: حدیث متن کو بیہقی اور دوسرے حضرات نے روایت کیا ہے اوران کے کلام کا مقتضا یہ ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث قوی نہیں ہے۔اھ۔لیکن دونوں میں کوئی منافات نہیں ہے کیونکہ'' **حسن لغيره**''کو'**ليس لقوی**'' کہا جاتا ہے۔

مسجد اقصیٰ کی وجہ تخصیص:

قوله :من اهل بحجة......المسجدالاقصٰی:

کہا گیا ہے کہ مسجد اقصیٰ کو خاص کیا گیا ہے اس کے فضیلت کی وجہ سے اور اس ملت کو رد کرنے کی وجہ سے جن کے حج کی جگہ بیت المقدس تھی۔

قوله :غفر له ماتقدم :''أو وجبت''أو شک کیلئے ہے۔

یعنی حفائد اور کبائد کی بھی امید کی جاسکتی ہے بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس طرف اشارہ کررہی ہے کہ احرام باندھنے کی جگہ جتنی دور ہوگی ثواب بھی اتنا زیادہ ہوگا اور جان لو کہ احرام باندھنا میقات سے پہلے اور اپنے گھر سے ہمارے نزدیک افضل ہے اور یہی امام شافعی کا ایک قول ہے جس کو شافعی وغیرہ نے صحیح قرار دیا ہے۔لیکن یہ اس صورت میں ہے کہ جب ممنوعات احرام سے بچ سکے ورنہ میقات سے ہی احرام باندھنا افضل ہوگا۔

حج کے مہینوں سے پہلے احرام باندھنا ہمارے نزدیک مکروہ ہے امام مالک اور امام احمد کراہت ہی کے قائل ہیں۔امام شافعی کا ایک قول اگر چہ یہ بھی ہے کہ حج کے مہینوں سے پہلے احرام باندھنے والوں کا احرام ہی درست نہ ہوگا۔لیکن ان کا مسلک یہ ہے کہ اگر کوئی شخص حج کے مہینوں سے پہلے احرام باندھے گا تو اس کا وہ احرام حج کے بجائے عمرہ کا ہوجائے گا۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ حاکم رحمہ اللہ نے مستدرک میں حضرت عبداللہ بن سلمہ المری ؓ سے روایت کیا ہے کہ حضرت علی ؓ سے اس آیت :﴿**واتموا الحج والعمرة لله**﴾ [البقرة: ١٩٦] کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ''**ان تحرم من دويرة اهلك**'' کہ آپ اپنے گھر سے احرام باندھ لے۔حاکم نے کہا ہے کہ یہ حدیث شیخین کی شرط پر صحیح ہے(انتہی)

اور آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ''**من اهل من المسجد الاقصٰی بحجة او عمرة غفرله ما تقدم من ذنبه**'' رواہ احمد وابو داؤد۔

اور روایت کیا گیا ہے کہ ابن عمر نے بیت المقدس اور عمران بن معین نے بصرہ اور ابن عباس نے شام اور ابن مسعود نے قادسیہ جو کوفہ کے قریب ہے سے احرام باندھا۔

باقی ابوداؤد کا یہ فرمانا کہ میقات سے پہلے احرام باندھنا صحیح نہیں ہے تو یہ مردود ہے کیونکہ اس پر پہلے سے اجماع ہے کہ یہ صحیح ہے۔

الفصل الثالث:

سفر کے لیے کھانے پینے کا انتظام کرنا توکل کے منافی نہیں ہے

۲۵۳۳:عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ اَهْلُ الْيَمَنِ يَحُجُّوْنَ فَلَا يَتَزَوَّدُوْنَ وَيَقُوْلُوْنَ نَحْنُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ فَإِذَا قَدِمُوْا مَكَّةَ سَأَلُوْا النَّاسَ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَتَزَوَّدُوْا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۔ (رواه البخارى)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۸۳/۳۔ حدیث رقم ۱۵۲۳۔ وابوداؤد فی السنن ۳٤۹/۲ حدیث رقم ۱۷۳۰۔

ترجمه: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یمن والے حج کرتے تھے اور توشہ نہیں لیتے تھے اور وہ کہتے تھے کہ ہم توکل کرنے والے ہیں پس جب مکہ میں آئے تو لوگوں سے مانگتے پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی تو سوال کرنے کے بجائے توشہ اور پرہیز گاری اختیار کرو۔ اس لیے کہ بہترین توشہ پرہیز گاری ہے یعنی یہ سفر آخرت کا توشہ ہے اس کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :تزودوا: "تزودوا" کا مفعول محذوف ہے اور وہ تقویٰ ہے اور جب اس کے مفعول کو حذف کیا تو اس کو ان کے خبر میں ظاہر کر دیا تا کہ محذوف پر دلالت کرے۔

یعنی وہ حج کرتے اور اسباب کو ترک کرتے یا تو مطلقاً اپنے ساتھ زادراہ نہیں لیتے یا اتنا لیتے جو سفر کیلئے کافی ہو جائے اور توکل کا دعویٰ کرتے جس میں کوئی حقیقت نہیں تھی بلکہ صرف دعویٰ تھا اور حقیقت میں وہ متأکلین تھے یا لوگوں پر اعتماد کرنے والے تھے۔

بغوی نے اس حدیث میں یہ الفاظ زائد ذکر کیے ہیں کہ وہ کہتے تھے کہ ہم اللہ کے گھر کا حج کرتے ہیں اور وہ ہمیں کھلاتا نہیں۔

اور جب مکہ پہنچ جاتے تو، توشہ دان کے فارغ ہونے کی وجہ سے لوگوں سے یہ سوال کرتے یا مکہ میں بھی اسی طرح گداگری کرتے جس طرح راستہ میں کرتے تھے۔ اور بغوی نے ذکر کیا ہے کہ کبھی حالت ڈاکہ اور غصب تک پہنچ جاتی۔

''وتزودوا'' یعنی اپنے ساتھ کھانے میں سے زادراہ کو اور گداگری اور لوگوں پر بوجھ بننے سے بچو۔

بغوی کہتے ہیں اتنے مقدار میں کہ جس کے ذریعے تم وہاں پہنچ جاؤ اور اپنے آپ کو لوگوں سے بچا لو اور اہل تفسیر نے زاد کی تفسیر کعک (کیک) کشمش، ستو اور کھجور وغیرہ سے کی ہے۔

قوله :﴿فان خیر الزاد التقوی﴾ [البقرة: ۱۹٦] یعنی اعمال صالحہ کیلئے زادراہ اختیار کرو جو کہ آخرت کے سفر کیلئے زادراہ ہے۔ اور تقویٰ میں سے گداگری سے بچنا اور لوگوں کو ملال میں ڈالنے سے بچنا بھی ہے اس طرح ذکر کیا ہے سید معین الدین صفویؒ نے اپنی تفسیر میں۔

آیت اور حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ اسباب وسائل اختیار کرنا رب الارباب پر توکل کے منافی نہیں ہے۔

اور جو شخص خالص توکل کرنا چاہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے جبکہ وہ اپنے عزم وارادہ پر مستحکم ہو اور اپنے مال میں مضطرب نہ ہو اور مخلوق کا کوئی پرواہ اس کے دل میں نہ ہو۔

اور جن لوگوں کی مذمت کی گئی ہے یہ اس لیے کہ انہوں نے توکل کا حق ادا نہیں کیا بلکہ ان کا اعتماد اپنے تھیلوں پر تھا اور اس بات سے غافل رہے کہ یہ تقسیم کرنے والی ذات کی تقسیم ہے۔

عورتوں کا جہاد

۲۵۳۴: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ عَلَی النِّسَاءِ جِهَادٌ قَالَ نَعَمْ عَلَیْهِنَّ جِهَادٌ لَا قِتَالَ فِیْهِ الْحَجُّ وَالْعُمْرَةُ.

اخرجه ابن ماجه ۹٦۸/۲ حدیث رقم ۲۹۰۱۔

ترجمه: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ کہا میں نے اے اللہ کے رسولؐ! عورتوں پر جہاد ہے فرمایا کہ عورتوں پر ایسا جہاد ہے کہ اس میں لڑائی نہیں ہے وہ حج وعمرہ کریں اس کو ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :علی النسآء جهاد؟ شروع میں حرف استفہام محذوف ہے۔

قوله :عليهن جهاد لا قتال فيه:الحج والعمرة: ''الحج والعمرة'' یہ بدل ہے ''جهاد '' سے یا خبر ہے مبتداء محذوف کی اوران کو منصوب پڑھنا بھی جائز ہے اعنی فعل مقدر کی وجہ سے۔

''لاقتال فيه'' بلکہ اس میں محنت مشقت سفر زادراہ کا بوجھ گھر والوں سے مفارقت وطن سے جدائی ہے جیسا کہ جہاد میں ہوتا ہے۔ اس حدیث سے امام شافعی نے عمرہ کے وجوب پر استدلال کیا ہے اور اس پر سیر حاصل بحث گزر چکا ہے۔

وسعت کے باوجود حج نہ کرنے پر وعید

۲۵۳۵:وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ مَنْ لَّمْ یَمْنَعْہُ مِنَ الْحَجِّ حَاجَۃٌ ظَاھِرَۃٌ اَوْ سُلْطَانٌ جَائِرٌ اَوْ مَرَضٌ حَابِسٌ فَمَا تَ وَلَمْ یَحُجَّ فَلْیَمُتْ اِنْ شَاءَ یَھُوْدِیًّا وَاِنْ شَاءَ نَصْرَانِیًّا۔

اخرجه الدارمی فی السنن ٢/٤٥ حديث رقم ١٧٨٥۔

ترجمہ:حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص کہ جس کو ظاہری حاجت نے حج سے منع نہ کیا ہو کہ سواری اور توشہ کا نہ ہونا۔ یا بادشاہ ظالم نے یا مرض روکنے والے نے پس وہ مرگیا اور حج نہ کیا۔ پس اگر وہ چاہے تو یہودی ہو کر مرے اور اگر چاہے تو نصرانی ہو کر مرے۔ اس کو دارمیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :من لم يمنعه من الحج حاجة ظاهرة اوسلطان جائر او مرض حابس:
حاجت ظاہری سے مراد زادراہ اور سواری کا نہ ہونا ہے کیونکہ استطاعت بلاخلاف شرط وجوب ہے۔

''او سلطان جائر'' :اس میں اشارہ ہے کہ وہ روکنا معتبر ہے جب وہ اس کو ظلم اور سختی کے طور پر روکے۔ چنانچہ بطور محبت اور نرمی کے روکنے کا کوئی اعتبار نہیں ہے اسی طرح وجوب حج کے موانع میں سے یہ بھی ہے کہ راستے میں ظالم بادشاہ سے جان یا مال کا خطرہ ہو۔ ان دونوں سے سلامتی کی شروط میں سے ہے اصح قول کے مطابق۔ ہاں اگر امن غالب ہو تو قول صحیح کے مطابق حج واجب ہوگا۔

''او مرض حابس ''یعنی شدت مرض سفر کیلئے مانع ہو پس بیماریوں سے بدن کا سلامت ہونا وجوب کیلئے شرط ہے اور یہی صحیح ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ شرط ادا ہے۔ قول اول کے مطابق اندھے، اپاہج، پاؤں کٹے، بیمار اور اس بوڑھے پر جو سواری پر ٹک نہ سکتا ہو نہ حج واجب ہے نہ دوسرے سے حج کرانا اور نہ وصیت کرنا لازم ہے۔

قوله :فليمت ان شاء يهوديا وان شاء نصرانيا۔

یعنی ان کے مشابہ ہو کر مرے، کہ انہوں نے اپنی کتاب پر عمل نہیں کیا باوجودیکہ وہ اپنی کتاب پر ایمان رکھتے تھے اس کی تلاوت کرتے تھے اور مواضع خطاب کا علم بھی رکھتے تھے اور اس پر مرتب ہونے والے عقاب کا بھی ان کو علم تھا۔

فائدہ:''رواه الدارمی'' :ایک نسخہ میں اس کی جگہ'' الترمذی ''ہے۔

حج اور عمرہ کرنے والے اللہ تعالیٰ کے مہمان ہیں

۲۵۳۶ :وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ اَنَّہٗ قَالَ الْحَاجُّ وَالْعُمَّارُ وَفْدُ اللّٰہِ اِنْ دَعَوْہُ اَجَابَھُمْ وَاِنِ اسْتَغْفَرُوْہُ غَفَرَ لَھُمْ۔ (رواہ ابن ماجة)

اخرجه ابن ماجه فی السنن ٢/٩٦٦ حديث رقم ٢٨٩٢۔

ترجمہ:حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے پیغمبر ﷺ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ حج

کرنے والا اور عمرہ کرنے والا اللہ تعالیٰ کے مہمان ہیں اگر وہ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی دعاء قبول کرتا ہے اور اگر بخشش چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو بخش دیتا ہے۔اس کو ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :الحاج والعمار وفد الله:

''والعمار'' عین کے ضمہ اور میم کی تشدید کے ساتھ ہے ''العامر'' کی جمع ہے ''معتمر'' کے معنی میں ہے۔علامہ زمخشری فرماتے ہیں کہ ہم نے ''عمر'' بمعنی ''اعتمر'' کے نہیں سنا ہے۔لیکن عمر اللہ بمعنی عبدہ کے سنا ہے شاید ہمارے علاوہ دوسرے حضرات نے سنا ہو۔ اور اسکے بعض تعاریف مستعمل ہو اور بعض نہ ہو۔

''وفد الله'' میں اضافت تشریف کیلئے ہے۔مراد وفد حرم ہے۔

یعنی اس جماعت کی طرح ہیں جو اللہ کے ہاں آئے ہوں اور اس کے ہاں ٹھہر کر اس کا تقرب حاصل کر رہے ہوں۔

ابن حجر فرماتے ہیں کہ الحاج کے مفرد ہونے اور اس کے مابعد کے جمع ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں اشارہ ہے حج کے تمیز اور منفرد ہونے کی طرف کہ حج کرنے والا اگر چہ اکیلا ہو تو وہ وفد کے قائم مقام ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ برخلاف عمرہ کے کہ اس کا مرتبہ کم ہونے کی وجہ سے عمرہ کرنے والا بہت سارے لوگوں کے مقام نہیں بن سکتا (انتہی)

یہ بڑی عمدہ وجہ ہے جیسا کہ ظاہر ہے اور اس میں ہمارے مذہب کی طرف اشارہ ہے کہ عمرہ سنت ہے ورنہ مذہب شافعی کے مقتضی کے مطابق فرضیت میں تفاوت کی وجہ ظاہر نہیں ہو سکتا کیونکہ ان کے نزدیک قطعی اور ظنی دلائل میں فرق نہیں ہے۔اور ان کے اس آیت سے استدلال کی وجہ سے ''واتمو الحج والعمرة لله'' کہ اس میں حج اور عمرہ آمریت کے اقتضاء میں برابر ہے۔

۲۵۳۷:وَعَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ وَفْدُ اللّٰهِ ثَلَاثَةٌ اَلْغَازِیْ وَالْحَاجُّ وَالْمُعْتَمِرُ۔ (رواه النسائی والبیهقی فی شعب الایمان)

اخرجه ابن ماجه فی السنن ۲/۹۶۶ حدیث رقم ۲۸۹۳۔ والبیهقی فی شعب الایمان۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا ہے فرماتے ہیں کہ اللہ کے مہمان تین ہیں۔ جہاد کرنے والے اور حج کرنے والے اور عمرہ کرنے والے۔اس کو امام نسائیؒ نے نقل کیا ہے اور بیہقی نے شعب الایمان میں۔

تشریح: قوله :وفدالله ثلاثة: نہایہ میں ہے کہ ''وفد'' ان لوگوں کو کہتے ہیں جو جمع ہو کر ایک ساتھ مختلف شہروں میں جاتے ہوں یا بڑوں اور رؤسا کے پاس زیارت وغیرہ کے قصد سے جاتے ہوں۔حاصل یہ ہے کہ ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جن کا بڑے اور عظیم لوگوں کے ہاں رتبہ اور عزت ہو۔کہ ان کے مطالبات مانے جاتے ہو اور ان کی ضروریات پوری کی جاتی ہوں۔

قوله : ''الغازی'' کفار کے ساتھ دین کی سربلندی کیلئے جہاد کرنے والا۔

حاجی سے سلام ومصافحہ کا ثبوت

۲۵۳۸:وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا لَقِيْتَ الْحَاجَّ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ وَصَافِحْهُ وَمُرْهُ اَنْ يَّسْتَغْفِرَلَكَ قَبْلَ اَنْ يَّدْخُلَ بَيْتَهٗ فَاِنَّهٗ مَغْفُوْرٌ لَّهٗ۔ (رواه احمد)

اخرجه احمد فی المسند ۲/۶۹۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس وقت تو حاجی سے ملاقات کرے یعنی جو کہ حج کر چکے ہیں تو اس کو سلام کر اور اس سے مصافحہ کر اور اس سے کہہ کہ وہ تمہارے لئے اللہ تعالیٰ سے استغفار مانگے' اس سے پہلے کہ وہ اپنے گھر میں داخل ہو۔ اس لیے کہ تحقیق وہ بخشا گیا ہے۔

تشریح: **قوله :مره:** ''مرہ'' اُمَرَ سے امر کا صیغہ ہے' ہمزہ تخفیف کے واسطے حذف کیا ہے۔

''**ان یستغفرلك**'' اس میں عظیم مبالغہ ہے اس کے حق میں کہ اس کے استغفار کرنے سے دوسروں کی مغفرت کی امید ہے۔

''**قبل ان یدخل بیته**'' بیشتر اس کے کہ وہ دنیا میں ملوث ہو جائیں اور اہل وعیال کے ساتھ مشغول ہو جائیں۔ کیونکہ جس کیلئے مغفور دعا کرلے اس کی بخشش ہو جاتی ہے۔

ایک موضوع حدیث:

واضح رہے کہ یہ حدیث: ''**من اکل مع مغفورله غفرله**'' موضوع ہے' یعنی من گھڑت ہے۔

''جس نے کسی ''مغفورلہ'' شخص کے ساتھ کھانا کھایا اس کی بھی مغفرت کردی جاتی ہے۔''

حج وعمرہ کرنے والے کو جہاد کرنے والے کے برابر ثواب ملتا ہے

۲۵۳۹: **وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ خَرَجَ حَاجًّا اَوْ مُعْتَمِرًا اَوْ غَازِیًا ثُمَّ مَاتَ فِیْ طَرِیْقِهٖ كَتَبَ اللّٰهُ لَهٗ اَجْرَ الْغَازِیْ وَالْحَاجِّ وَالْمُعْتَمِرِ۔** (رواه البیهقی فی شعب الا یمان)

اخرجه البیهقی فی شعب الایمان ۴۸۴/۳۔ حدیث رقم ۴۱۰۰۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص حج کے ارادہ سے نکلا یا عمرے کے ارادے سے یا جہاد کے پھر اس کی راہ میں مرگیا' اللہ تعالیٰ اس کے لیے جہاد کرنے والے کا ثواب لکھتا ہے اور حج کرنے والے کا اور عمرہ کرنے والے کا۔ اس کو بیہقی ؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله : من خرج حاجا......** : کیونکہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: **ومن یخرج من بیته مهاجرا الی الله ورسوله ثم یدرکه الموت فقد وقع اجره علی الله۔** اور جو شخص اپنے گھر سے اس نیت سے نکل کھڑا ہو کہ اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کرونگا پھر اس کو موت آ پکڑے تب بھی اس کا ثواب ثابت ہو گیا۔ (بیان القرآن)

علامہ طیبی نے اس حدیث کے تحت یہ اعتراض نقل کیا ہے کہ جس شخص پر حج واجب ہو اور اس کی ادائیگی میں تاخیر کی پھر ایک زمانہ کے بعد حج کا ارادہ کیا اور راستے میں مرگیا تو وہ گنہگار رہوگا۔ تو یہ حدیث اس بات کے خلاف ہے؟

چونکہ حدیث میں اس کے مطلوب کی تصریح نہیں ہے کیونکہ حدیث مطلق ہے تو اس کو محمول کیا جائے گا اس شخص پر جو حج واجب ہوتے ہی نکل جائے حج کیلئے اور جب اس کے علاقے کے لوگ حج کیلئے نکل جائے یا اس پر محمول ہے کہ جب وہ حج میں تاخیر کردے کسی عارض کے پیش آنے کی وجہ سے بیماری' قید' یا راستے کے امن نہ ہونے کی وجہ سے۔ پھر عارض کے ختم ہونے پر حج کیلئے نکلا اور مرا تو یہ مطیع ہو کر مرا اور جس شخص نے بغیر عذر کے حج کی ادائیگی میں تاخیر کی اور پھر راستے میں مرا تو بغیر کسی اختلاف کے وہ گنہگار رہے۔ ہمارے نزدیک باوجود اس اختلاف کے کہ حج کا وجوب **علی الفور** ہے یا **علی التراخی** اور صحیح یہ ہے کہ **علی الفور** ہے۔

لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ ہم یہ کہیں کہ حاجی کو فی الجملہ اجر دیا جاتا ہے کیونکہ اللہ کسی نیکی کرنے والے کی نیکی ضائع نہیں کرتے اور اس

سے کوئی مانع نہیں ہے کہ من وجہ عاصی ہو اور من وجہ مطیع ہو۔ پھر اس کے بعد میں نے دیکھا کہ ابن حجر نے فرمایا ہے کہ یہ علامہ طیبی کا اپنے امام شافعی اور اپنے اہل مذہب اور مالک وغیرہ سلف اور خلف کے فضلاء کی طرف سوءِ ادب کی نسبت ہے۔

بَابُ الْاِحْرَامِ وَالتَّلْبِيَةِ

احرام باندھنے اور لبیک کہنے کا بیان

احرام کی حقیقت "دخول فی الحرمة" ہے اور مراد اس سے مخصوص حرمات کا التزام ہے اور ان کا التزام شرعاً حج کیلئے شرط ہے۔

اور حرام کا ثبوت بغیر نیت اور تلبیہ کے متحقق نہیں ہوتا یا جو ان کا قائم مقام ہو۔ پس تلبیہ کا عطف احرام پر **عطف الخاص علی العام** کے قبیل سے ہے یا اس کی بنیاد قواعد شافعیہ پر ہے کہ احرام فقط نیت کا نام ہے یا تلبیہ سے مراد یہاں جو نیت سے ملا ہوا نہ ہو یعنی اس کے الفاظ، احوال اور فضائل کے بیان میں۔

باقی ابن حجر کا یہ قول کہ یہ حج اور عمرہ کے ارکان میں سے ہے بالا جماع۔ لیکن اس پر یہ اعتراض ہے کہ اس میں ایک قول اس کے شرط ہونے کا بھی ہے تو اجماع کیسے ہے؟ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اجماع مطلق رکنیت پر نہیں ہے بلکہ وجوب پر ہے اور وہ حج میں داخل ہونے کی نیت ہے۔ کیونکہ نیت ہی ارکان میں سے ہے بموجب: **انما الاعمال بالنیات** حدیث کے (انتہی)۔

لیکن اس میں چند ابحاث ہیں جو مخفی نہیں ہے جن میں سے ایک یہ ہے کہ ان کا یہ دعویٰ ہے کہ احرام کے رکن ہونے پر اجماع ہے۔ اگر اجماع سے مراد اجماع سلف صحابہ اور تابعین میں سے ہو تو ان سے اس بارے میں کوئی تصریح نہیں ہے بلکہ ان کے عادات میں سے رکن اور شرط کو الگ کرنا ہی نہیں تھا۔ اور اگر اجماع خلف مراد ہے تو پھر اس میں آپ کیلئے کافی ہے امام اعظم ہمام کا یہ قول کہ یہ شرط ہے، پھر اس کا جواب یہ دینا کہ اجماع مطلق رکنیت پر نہیں بلکہ وجوب پر ہے۔ یہ شیخ الاسلام کی طرف سے انتہائی عجیب وغریب بات ہے کہ انہوں نے احکام میں رکن اور مطلق وجوب میں فرق نہیں کیا ہے۔ کیونکہ ہر رکن تو واجب ہے لیکن ہر واجب رکن نہیں ہے۔ جیسا کہ یہ اصول میں ثابت ہے۔ پھر اس کی تفسیر نسک میں داخل ہونے کی نیت سے کرنا اور **انما الاعمال بالنیات** سے استدلال کرنا مردود ہے ان دلائل کی وجہ سے جس کی طرف ہم اس حدیث کے تحقیق میں شروع کتاب میں اشارہ کر چکے ہیں۔ **واللہ اعلم بالصواب**۔

فائدہ! احرام کو احرام اس لیے کہتے ہیں۔ کہ کتنی چیزیں احرام باندھنے والے کو اپنے اوپر حرام کرنی ہوتی ہیں چنانچہ ان کا بیان انشاء اللہ آگے ہوگا۔

الفصل الاول:

احرام کی حالت میں خوشبو لگانا

۲۵۴۰: عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كُنْتُ اُطَيِّبُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ لِاِحْرَامِهٖ قَبْلَ اَنْ يُّحْرِمَ وَلِحِلِّهٖ قَبْلَ اَنْ يَّطُوْفَ بِالْبَيْتِ بِطِيْبٍ فِيْهِ مِسْكٌ كَاَنِّيْ اَنْظُرُ اِلٰى وَابِيْصِ الطِّيْبِ فِيْ مَفَارِقِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَهُوَ مُحْرِمٌ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۹۶/۳۔ حدیث رقم ۱۵۳۹ مسلم فی صحیحه ۸۴۷/۲ حدیث رقم (۳۷۔ ۱۱۸۹)۔

وابوداؤد فی السنن ۳۵۸/۲ حدیث رقم ۱۷۴۵ والترمذی ۲۵۹/۳ حدیث رقم ۹۱۷۔ والنسائی ۱۳۷/۵۔ حدیث رقم

۲۶۹۳ وابن ماجه ۹۷٦/۲ حديث رقم ۲۹۲٦۔ ومالك في الموطأ ۳۲۸/۱۳۲۸ حديث رقم ۱۷ من كتاب الحج، في السنن ۵۱/۲ حديث رقم ۱۸۳۔ واحمد في المسند ۹۸/٦۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں خوشبو لگاتی تھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام کو احرام باندھنے سے پہلے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احرام سے حلال ہونے کے لیے پہلے طواف کعبہ سے پہلے خوشبو لگاتی تھی کہ اس میں مشک ہوتا تھا گویا کہ میں دیکھتی ہوں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مانگ میں خوشبو کی چمک اس حال میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم محرم ہوتے تھے گویا کہ وہ چمک میری آنکھوں کے سامنے پھرتی ہے۔اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :كنت اطيب رسول الله ﷺ لاحرامه ......فيه مسك :

''**لاحرامه**''یعنی حضور کے احرام باندھنے کے ارادہ کی وجہ سے یا اسکے حج کے احرام کی وجہ سے۔

قوله :قبل ان يحرم: ابن حجر فرماتے ہیں کہ یہاں سے ہمارے علماء نے اخذ کیا ہے کہ مرد وعورت چاہے جوان ہو یا غیر جوان کیلئے خوشبو لگانا سنت ہے غسل کرنے کے بعد،سوائے اس عورت کے جو حالت سوگ میں ہو۔مگر بدن پر لگائے۔عورتوں کیلئے جمعہ اور جماعت کیلئے نکلتے وقت خوشبو لگانا جو مکروہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں زمان اور مکان دونوں کی تنگی ہوتی ہے۔پس ان کیلئے مردوں سے اجتناب ممکن نہیں ہوتا برخلاف حالت احرام کے (انتہی)

لیکن یہ بات مخفی نہیں کہ حدیث میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جو ابن حجر کے مدعا پر دال ہو۔

''**بطيب**'':اطیب کے ساتھ متعلق ہے۔

قوله :كاني انظر الى وبيص الطيب في مفارق رسول الله ﷺ:

مسلم کے بعض طرق میں ''**مفرق**'' واحد کے لفظ کے ساتھ ہے، یہ بات ابن الملک نے ذکر کی ہے۔''**مفارق**''میم کے فتحہ کے ساتھ جمع ہے مفرق راکے کسرہ کے ساتھ کی اور اس میں راء کا فتحہ بھی منقول ہے،اور یہ سر کے وسط کو کہتے ہیں جہاں سے بولوں میں مانگ نکالی جاتی ہے،اور اس کو جمع کے ساتھ ذکر کیا ہے تا کہ سر کے تمام اطراف کو شامل ہو گویا کہ وہ لوگ سر کے ہر حصہ کو مفرق کہتے تھے۔

''**فيه مسك**''ایک روایت متفق علیہ میں **ذريرة** کا لفظ ہے لیکن اس میں کوئی منافات نہیں ہے کیونکہ وہ مشک کے ساتھ ملاتے تھے۔

قوله :ولحله قبل ان يطوف بالبيت بطيب فيه مسك:''مراد طواف افاضہ ہے۔

''**فيه مسك**'' یہ مشک کے پاک ہونے کی دلیل ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث دلالت کر رہی ہے کہ اگر خوشبو احرام سے پہلے لگائی جائے اور اس کا اثر احرام کے بعد بھی باقی رہے تو کوئی حرج نہیں اور اس پر کوئی فدیہ بھی لازم نہیں ہوتا جیسا کہ امام شافعی کا مذہب ہے لیکن امام مالک کے نزدیک اس طرح خوشبو لگانا مکروہ ہے اور اس نے فدیہ کو لازم کیا ہے جو اثر باقی رہے اس پر (انتہی)

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس مسئلے میں شافعی اور احمد سے سبقت لے گیا ہے اور یہی جمہور علماء سلف وخلف کا مذہب ہے۔قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ حالت احرام میں خوشبو کے چمک سے مراد یہ ہے کہ اس خوشبو کے ٹکڑے احرام کے بعد اس پر باقی رہتے،اس طور پر کرو،اس میں چمکتے۔لیکن قاضی کا تعقب کیا گیا ہے کہ اس سے یہ لازم نہیں آتا کیونکہ چمک محض اثر سے بھی ہوتا ہے اگرچہ عین باقی نہ ہو۔

باقی ابن حجر کا یہ قول کہ قاضی کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جس میں ہے''**طيبته طيبا لا يشبه طيبكم**'' کہ ان کی خوشبو عمدہ ہوتی تھی تمہاری خوشبو کی طرح نہ ہوتی تھی،تو ان کے اس قول کی وجہ غیر ظاہر ہے۔

اور حضرت عائشہ کی ایک روایت میں''**طيبته عند احرامه ثم طاف في نسائی ثم اصبح محرمًا ينضح طيبا**''اور ایک

روایت میں **لاحرامہ حین یحرم** کے الفاظ ہے۔

اور اس سے قبل **ان یحرم** والی روایت کی یہ تاویل غلط ہوگی کہ یہ خوشبو احرام کیلئے نہیں ہوتی تھی۔

باقی ابن حجر کا یہ قول کہ تاویل ان الفاظ کی وجہ سے بھی غلط ثابت ہوتی ہے: **کانی انظر**۔ تو یہ قول خود غلط ہے جیسا کہ ظاہر ہے۔

اس طرح ان کا یہ قول کہ وہ دیکھائی دینے والا خوشبو کا اثر ہوتا تھا نہ کہ عین کیونکہ عین غسل سے ختم ہو جاتا ہے، انتہائی دور از کار ہے۔ پس اس پر اعتماد نہ کیا جائے (انتہیٰ)

ابوداؤد نے سند حسن کے ساتھ روایت کی ہے حضرت عائشہ سے کہ وہ فرماتی ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ کی طرف نکلتے اور ہم احرام کے وقت اپنے پیشانیوں پر خوشبو لگاتی بس جب ہم میں سے کسی کو پسینہ آتا تو خوشبو اس کے چہرے پر بہتی، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسے دیکھتے، پس اس حدیث میں اس پر دلالت ہے کہ احرام کے بعد خوشبو کا دوام سلے ہوئے کپڑوں کے دوام کی طرح نہیں ہے۔ اس میں ان لوگوں کا اختلاف ہے جنہوں نے وارد نص کے خلاف کرتے ہوئے فاسد قیاس کیا، پھر اس حدیث سے عورتوں کیلئے خوشبو لگانے کے جواز پر استدلال درست ہے نہ کہ ماقبل والی حدیث سے۔ **واللہ اعلم بالصواب**

اور جو حضرات ایسی خوشبو لگانے کے قائل نہیں ہے کہ جس کا اثر احرام کے بعد بھی باقی رہے جو کہ امام محمد اور امام مالک کا قول ہے ان کے نزدیک اس حدیث کی تاویل یہ ہے کہ طیب سے مراد خوشبودار تیل ہے یا وہ خوشبو مراد ہے جس کا عین باقی نہ رہتا ہو اور خوشبو باقی رہتی ہو، اور کپڑوں پر خوشبو لگانے کے بارے میں اختلاف ہے اور معتمد قول یہ ہے کہ یہ مندوب نہیں ہے بلکہ مکروہ ہے تو اس کا ترک مؤکد ہوگا تاکہ اختلاف سے بچ جائیں جو کہ بالاجماع مستحب ہے کیونکہ بعض نے اس کو حرام قرار دیا ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ امام محمد اور امام مالک کی دلیل وہ حدیث ہے جو بخاری اور مسلم نے علی بن امیہ سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی آیا جو خوشبو میں لت پت تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا ''**اما الطیب الذی بك فاغسله ثلاث مرات واما الجبة فانزعها ثم اصنع فی عمرتك ما تصنع فی حجتك**'' کہ تجھ پر خوشبو لگی ہوئی ہے اسے تین بار دھولے اور جو جبہ ہے اسے اتارو، پھر اپنے عمرے میں وہی اعمال کر جو تو حج میں کر رہا ہے۔ اس حدیث کی وجہ سے بعض حضرات نے کہا ہے کہ خوشبو کا حلال ہونا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تھا کیونکہ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لگائی ہے اور دوسرں کو منع فرمایا ہے۔

لیکن اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ شاید آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس آدمی کو یہ حکم دینا حرمت خوشبو کی وجہ سے ہو یا یہ ممانعت اس خوشبو کے ساتھ خاص ہو کہ وہ خلوق تھا لہٰذا اس کو منع کرنے سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا جائز ہونا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تھا۔ پھر ہم نے صحیح مسلم میں حدیث مذکور میں دیکھا کہ اس میں یہ الفاظ بھی ہیں :''**وھو مصفر لحیته ورأسه**'' کہ اس کے سر اور داڑھی پر زعفران لگا ہوا تھا۔''**وقد نھوا عن التزعفر**'' حالانکہ ان کو زعفران لگانے سے منع کیا گیا تھا اور مسلم کے الفاظ میں یہ بھی ہے ''**نھی ان یتزعفر الرجل**'' اور یہ ابوداؤد کے اس روایت سے مقدم ہے جس میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی داڑھی کو ورس اور زعفران سے زرد کرتے تھے۔

اگرچہ ابن قطان نے اس کو صحیح قرار دیا ہے کیونکہ صحیحین کی روایت زیادہ قوی ہوتی ہے۔ خصوصاً جبکہ وہ مانع ہے پس مقدم ہوگی اور مسند احمد کی روایت میں صراحۃً آیا ہے:''**اغسل عنك ھذا الزعفران**'' کہ یہ زعفران اپنے آپ سے دھولے۔

اور اختلاف کی وجہ سے انہوں نے مستحب سمجھا ہے کہ وہ محرم خوشبو کے عین اور جسم کو ختم کردے۔

بلند آواز سے تلبیہ کہنا

۲۵۴۱: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ يُهِلُّ مُلَبِّدًا يَقُوْلُ لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ

لَكَ لَبَّيْكَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَا يَزِيْدُ عَلٰى هٰؤُلَاءِ الْكَلِمَاتِ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ۴۰۸/۳ حديث رقم ۱۵۴۰۔ ومسلم فى صحيحه ۸۴۲/۲ حديث رقم (۲۱۔ ۱۱۸۴)۔
وابو داؤد ۳۶۰/۲ حديث رقم ۱۷۷۴۔ وابن ماجه ۱۰۱۳/۲ حديث رقم ۳۰۴۷۔ والدارمى ۵۳/۲ حديث رقم ۱۸۰۸۔
واحمد فى المسند ۱۳۱/۲۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا۔ کہ بلند آواز سے کہتے میں حاضر ہوں تیری خدمت میں اے الٰہی میں تیری خدمت میں حاضر ہوں۔ میں تیری خدمت میں حاضر ہوں۔ تیرا کوئی شریک نہیں ہے میں تیری خدمت میں حاضر ہوں۔ تحقیق سب تعریف اور نعمتیں تیرے واسطے ہیں اور بادشاہت تیرے واسطے۔ ان کلمات پر زیادتی نہیں کرتے تھے اس بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله :يهل ملبدا يقول**: ''ملبدا'' باء کے کسرہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ ہے۔

تلبید کرنا یہ ہے کہ محرم اپنے سر کے بالوں میں گوند یا خطمی یا مہندی یا اور کوئی چیز لگا لیتا ہے۔ قاموس میں ہے **تلبيد الصوف ونحوه** بمعنی **تداخل و لزق بعضه لبعض**، یعنی ایک دوسرے میں داخل ہونا اور ایک دوسرے کے ساتھ چپک جانا۔

''ملبداً'' ابن الملک فرماتے ہیں کہ تلبید کہتے ہیں سر کے بالوں کو گوند یا خطمی کے ساتھ آپس میں چپکانا تاکہ ان میں گرد وغبار نہ بیٹھیں اور جوؤں سے محفوظ رہیں اور دھوپ سے بچے رہیں اور یہ امام شافعی کے نزدیک جائز ہے اور ہمارے نزدیک اس پر ایک دم لازم ہوگا اگر تلبید ایسی چیز سے کی ہو جس میں خوشبو نہ ہو۔ کیونکہ یہ سر ڈھانپنے کی طرح ہے اور اگر اس میں خوشبو بھی ہو تو دو دم لازم ہوں گے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں کہ رشید الدین بصری نے جو یہ ذکر کیا ہے کہ احرام سے قبل تلبید کرنا اچھا ہے تو یہ اشکال سے خالی نہیں کیونکہ قبل از احرام کے ڈھانپے ہوئے سر کو ڈھانپا ہوا رکھنا جائز نہیں۔ برخلاف خوشبو کے (انتہی)

لیکن اس کے قول کو بمع حدیث کے تلبید لغوی پر محمول کرنا ممکن ہے کہ اس سے مراد بالوں کو اکھٹے رکھنا اور ان کو بکھرے ہوئے نہ چھوڑنا ہو۔

''**يقول**'' **يهل** سے بدل ہے اور یہ شاطبی کا مذہب ہے مسائل نحو میں۔

قوله :لبيك اللهم لبيك: ''**لبيك**'' اس کی تقریر ہے **البت يا رب بخدمتك البابا بعد الباب** یہ ماخوذ ہے **الب بالمكان** سے بمعنی کسی جگہ اقامت اختیار کرنا، تو اس کا معنی ہے کہ میں تیری اطاعت پر قایم اور کھڑا ہوں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے **اجبت اجابتك اجابة بعد اجابت** اور اس کو تثنیہ ذکر کرنے سے مراد تکثیر ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: ﴿**ثم ارجع البصر كرتين**﴾ [الملك:۴] یعنی **كرة بعد كرة** کے معنی میں ہے۔ اور زوائد کا حذف تخفیف کیلئے ہے اور نون کا حذف اضافت کی وجہ سے ہے۔

''**اللهم لبيك**'' ابن ہمام فرماتے ہیں کہ اس میں تو کوئی اختلاف نہیں ہے کہ دعا اور پکار کا جواب ہے لیکن اختلاف داعی کے بارے میں ہے کہ وہ کون ہے؟ پس بعض نے کہا ہے کہ داعی اللہ پاک خود ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں بعض کہتے ہیں کہ ابراہیم خلیل اللہ ہیں اور یہی زیادہ ظاہر ہے۔

ملاعلی قاری فرماتے ہیں کہ صحیح بات یہ ہے کہ جواب میں جو خطاب ہے یہ اللہ کو ہے کیونکہ یا تو وہ حقیقتاً داعی ہے یا حکماً؛ پھر جو حضرات کہتے ہیں کہ منادی ابراہیم ہیں تو اس قول کے مطابق کہا گیا ہے کہ وہ مقام ابراہیم پر کھڑے ہو کر ندی دی یا حجون یہ یا جبل اُبی قیس پر لیکن

اس کو جمع کرنے سے کوئی مانع نہیں ہے۔

قوله :لبيك لاشريك لك لبيك:

''**لبيك لاشريك**...... '' پہلا تلبیہ جو مؤکد بالثانیہ ہے اثبات الوہیت کیلئے ہے اور یہ تلبیہ اللہ کی ذات اور صفات ثبوتیہ میں شرک کی نفی کیلئے ہے۔

قوله :ان الحمد و النعمة لك و الملك:

''**ان الحمد**'' اس میں إن کسرہ کے ساتھ ہے اور کسرہ ہی روایۃً اور درایۃً مختار ہے اور فتح کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ فتح روایت عامہ ہے اور محدثین کے ہاں دونوں مشہور ہیں اور ثعلب کہتے ہیں کہ کسرہ زیادہ عمدہ ہے کیونکہ فتح کی صورت میں معنی ہوگا لبیك بهذا لسبب اور کسرہ کی صورت میں مطلق تلبیہ ہے۔

اور ابن حجر کا یہ قول کہ **النعمة** نصب کے ساتھ افصح قول کے مطابق اور رفع بھی جائز ہے اور معنی اس کا ہے کہ انعام یا اس کا اثر جو مخلوق تک پہنچنے والا ہے۔تو یہ قواعد عربیت سے غفلت ہے کیونکہ ''ان'' کے اسم کے محل پر عطف خبر کے ذکر سے پہلے جائز نہیں ہے۔

''**والملك**'' نصب کے ساتھ اس کا عطف ہے **الحمد** پر۔اسی وجہ سے **والملك** پر وقف مستحب ہے اور پھر **لا شريك لك** سے ابتداء کرے اور اس سے بھی کوئی مانع نہیں کہ **والملك** مرفوع ہو اور **لا شريك لك** خبر ہو۔

قوله :لا شريك لك'' یعنی حمد کے استحقاق اور ایصال نعمت میں آپ کا کوئی شریک نہیں ہے۔اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ﴿**وما بكم من نعمة فمن الله**﴾[النحل:۵۳] اور تمہارے پاس جو کچھ بھی نعمت ہے وہ سب اللہ ہی کیطرف سے ہے۔(بیان القرآن) اور حمد کے نعمت پر مقدم کرنے میں اشارہ ہے حمد کے معنی کے عموم کی طرف اور اشارہ ہے کہ اللہ بالذات حمد کا مستحق ہے۔چاہے انعام کرے یا نہ کرے اور ابن حجر کی یہ تعلیل کہ تھوڑا سا وقفہ جو لا کو ماقبل کے ساتھ ملانے سے ہو جائے تو کہیں اس سے نفی یا قبل کا وہم پیدا ہوتا ہے اور یہ کفر ہے تو یہ وہم ہے جو کہ ماقبل اور مابعد کے ذہول سے پیدا ہوا ہے۔

تلبیہ کے بارے میں اختلاف ہے ہمارے نزدیک احرام کے صحیح ہونے کیلئے تلبیہ شرط ہے۔امام مالک کہتے ہیں کہ تلبیہ واجب نہیں لیکن تلبیہ ترک کرنے کی وجہ سے دم لازم آتا ہے۔اور امام شافعی کے ہاں تلبیہ سنت ہے۔اس کے ترک کرنے کی صورت میں دم لازم نہیں آتا۔اور بعض اصحاب شافعی کہتے ہیں کہ تلبیہ واجب ہے ترک پر دم لازم ہے۔اور بعض کا خیال ہے کہ حج کے دوران تلبیہ واجب ہے۔

قوله :لايزيد على هؤلاء الكلمات: یہ غالب حالات پر محمول ہے جیسا کہ فصل ثانی میں ابن عمر کی مرفوع حدیث آرہی ہے پھر اس سے کم کرنا مکروہ ہے۔بغیر کسی اختلاف کے۔اور طحاوی کے ہاں زیادہ کرنا بھی مکروہ ہے اور مذہب مختار یہ ہے کہ زیادہ مکروہ نہیں ہے بلکہ اچھا یا مستحب ہے۔کیونکہ صحابہ اور تابعین سے ثابت ہے اور زیادت میں یہ الفاظ کہے:''**لبيك و سعديك والخير كله بيديك، والرغباء اليك۔ والعمل لك لبيك حقاحقا، لبيك تعبدًا ورقًا، لبيك ان العيش عيش الأخرة**'' یا اس طرح کے اور الفاظ کہے۔

جمہور کے ہاں تلبیہ کہتے ہوئے آواز بلند کرنا مستحب ہے اور داؤد نے مسلم کی حدیث نقل کیا ہے''**اذا توجهتم الى المنٰى فاهلوا بالحج**'' اور اہلال کہتے ہیں تلبیہ کے ساتھ آواز بلند کرنا،لیکن اس کا یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ **فاهلوا** سے مراد ہے حج کا احرام باندھو اور احرام نیت اور تلبیہ کے ساتھ ہوتا ہے جیسا کہ احناف کا مذہب ہے یا صرف نیت سے ہوتا ہے جیسا کہ شافعی کا مذہب ہے۔

۲۵۴۲: وَعَنْهُ قَالَ كَا نَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا اَدْخَلَ رِجْلَهٗ فِي الْغَرْزِ وَاسْتَوَتْ بِهٖ نَاقَتُهٗ قَائِمَةً اَهَلَّ مِنْ

عِنْدَ مَسْجِدِ ذِی الْحُلَيْفَةِ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٦٩/٦۔ حدیث رقم ٢٨٦٥۔ ومسلم فی صحیحه ٨٤٥/٢ حدیث رقم (٢٧۔ ١١٨٧)۔ وابو داؤد فی السنن ٣٧٥/٢ حدیث رقم ١٧٧٣ والنسائی ١٦٢/٥ حدیث رقم ٢٧٥٧۔ وابن ماجه ٩٧٣/٢ حدیث رقم ٢٩١٦۔ والدارمی ٩٨/٢ حدیث رقم ١٩٢٩۔ ومالك فی الموطأ ٣٣٢/١ حدیث رقم ٢٩ من كتاب الحج۔ واحمد فی المسند ١٨/٢۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے جب آپ اپنا پاؤں رکاب میں داخل کرتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اونٹنی اٹھاتی اس حال میں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم احرام باندھتے مسجد ذی الحلیفہ کے پاس اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله :اذاادخل رجله فی الغرز**:''الغرز'' عین کے فتحہ اور راء کے کسرہ کے ساتھ چمڑے یا لکڑی سے بنے ہوئے رکاب کو کہتے ہیں۔

قوله :واستوت به ناقته قائمة:''به ناقتة'' میں باء تعدیہ کیلئے ہے اور بعض نے کہا ہے کہ به حال ہے اور اسی طرح قائمة بھی حال ہے۔

قوله :اهل من عند مسجد ذی الحلیفة: ابن الملک فرماتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد ذوالحلیفہ سے تلبیہ کی ابتداء کی اور یہ ان سے خلاف مذہب روایت ہے کیونکہ مستحب یہ ہے کہ احرام کے دو رکعت نفل کے بعد بیٹھے ہوئے نیت کرے اور تلبیہ کہے، (انتھیٰ) ابن الملک کا یہ کہنا کہ یہ خلاف مذہب ہے یہ رعایت ادب کے خلاف ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لبیک کہنے کے بارے میں روایات مختلف ہیں ابن قیمؒ نے زاد المعاد میں ان سب کو یوں جمع کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مصلے پر بیٹھ کر لبیک کہا پھر اونٹنی پر بیٹھے تو اس وقت بھی لبیک کہا، اور اس کے بعد جب میدان بیداء پر پہنچے تو پھر لبیک کہا (انتھیٰ) چنانچہ علماء نے اسی لیے لکھا ہے کہ حالت اور وقت اور جگہ کے تبدیل ہونے کے وقت لبیک کی تکرار مستحب ہے۔

اور ایک حدیث ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازوں کے بعد لبیک کہا تھا۔لیکن اس کو بیہقی نے ضعیف قرار دیا ہے اور ان کا تعقب کیا گیا ہے کہ ترمذی نے اس کو حسن کہا ہے۔اور امام نووی بھی اسی کی طرف مائل ہے۔اور اس کی تائید ابن عباس کے تلبیہ کے بارے میں مختلف روایات کی تطبیق جمع کرنے سے بھی ہوتی ہے۔جیسا کہ ابوداؤد نے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے بعد تلبیہ کہا تو کچھ لوگوں نے سنا اور محفوظ کیا پھر جب سوار ہوئے اور اونٹنی پر سیدھے بیٹھ گئے تو لبیک کہا تو کچھ لوگوں نے وہ سن کر محفوظ کر لیا اور یہ کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہیں سے لبیک کہا ہے۔

پھر جب بیداء پر پہنچے تو لبیک کہا تو کچھ لوگوں نے وہاں سنا اور کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہیں سے لبیک کہا ہے کیونکہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جماعت در جماعت آتے تھے۔ابن حجر نے اس کا جواب دیا ہے جس کے تحت کوئی فائدہ نہیں ہے۔پھر اپنے مذہب کیلئے مسلم کی روایت سے استدلال کیا ہے''اذا رحتم الی منیٰ متوجهین فاهلوا بالحج''۔اور اس کے تقدیر میں یہ ہے کہ''اذا اردتم الرواح الیها متوجهین الی عرفات'' یعنی کہ جب تم منیٰ کی طرف چل پڑو عرفات کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے۔

بلند آواز سے تلبیہ کہنے کا ثبوت

۲۵۴۳: وَعَنْ اَبِی سَعِیْدِ الْخُدْرِيِّ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم نَصْرُخُ بِالْحَجِّ صُرَاخًا۔

اخرجه مسلم فی صحیحه ٩١٤/٢ حدیث رقم (٢١١۔ ١٢٤٧)۔ واحمد فی المسند ٥/٣۔

ترجمہ: حضرت ابی سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے اس حال میں کہ میں چلاتے تھے

ساتھ حج کے چلانا اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله :نصرخ بالحج صراخا:**

''**نصرخ**'' خاء کے ضمہ کے ساتھ حال ہے۔''**صراخا**'' **بضم الصاد مفعول مطلق** ہے۔

صرف حج کا ہی ذکر اس لئے کیا کہ حج ہی اصل اور مقصود اعظم ہے اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ یہ حالت راوی نے اپنے بارے میں کہی ہے زیادہ سے زیادہ اس کا تعلق ان لوگوں سے بھی ہوسکتا ہے جو راوی کی طرح صرف حج کے لئے تلبیہ کرتے تھے۔ یا زیادہ سے زیادہ وضاحت سے یوں کہئے کہ یہ حدیث صرف ان لوگوں کا حال بیان کر رہی ہے جنہوں نے افراد کا احرام باندھا تھا۔ جہاں تک آنحضرت ﷺ کا تعلق ہے تو آپ ﷺ کے بارے میں یہ حدیث ساکت ہے کہ اس کی وضاحت دوسری روایت سے ہوگی اس لئے یہ روایت روایات آئندہ کے منافی نہیں ہے۔واللہ اعلم

بلند آواز سے تلبیہ کہنا

۲۵۴۴:وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كُنْتُ رَدِيْفَ اَبِيْ طَلْحَةَ وَاِنَّهُمْ لَيَصْرَخُوْنَ بِهِمَا جَمِيْعًا اَلْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ۔

(رواہ البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۴۲۱/۳ حدیث رقم ۱۵۶۲۔ واخرجه مسلم فی صحیحه ۸۷۳/۲ حدیث رقم (۱۱۸۔ ۱۲۱۱)۔ واخرجه ابوداؤد ۳۸۱/۲ حدیث رقم ۱۷۷۹ وابن ماجه ۹۹۸/۲ حدیث رقم ۳۰۰۰۔ ومالك فی الموطأ ۳۳۵/۱ حدیث رقم ۳۶ من کتاب الحج۔

ترجمه: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں ابوطلحہ کی سواری کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا اور تحقیق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یعنی اکثر صحابہ چلاتے تھے دونوں کے ساتھ یعنی حج اور عمرہ کے لیے اکٹھے۔اس کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله :وانهم ليصرخون بهما جميعا**: یہ انسؓ کا کلام ہے یا ان سے روایت کرنے والے راوی کا۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ قران افضل ہے چنانچہ حنفیہ کا یہی مسلک ہے۔اس حدیث کو مستدل قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ تھے وہ آنحضرت ﷺ کے خلاف عمل کرنا کب گوارا کر سکتے تھے۔لہٰذا آنحضرت ﷺ نے قران کیا ہوگا اس لئے اکثر صحابہؓ نے بھی آپ ﷺ کی اتباع ہی میں قران کیا۔

قوله :الحج والعمرة:''**الحج والعمرة**'' جر کے ساتھ بدل ہے بهما کی ضمیر سے اور رفع کے ساتھ مبتداء محذوف جو کہ هما ہے کے خبر ہونے کی وجہ سے،اور نصب کے ساتھ اعنی فعل مقدر کی وجہ سے۔

حج کرنے والوں کی اقسام

۲۵۴۵.وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ عَامَ حَجَّةِ الْوَدَاعِ فَمِنَّا مَنْ اَهَلَّ بِعُمْرَةٍ وَمِنَّا مَنْ اَهَلَّ بِحَجٍّ وَعُمْرَةٍ وَمِنَّا مَنْ اَهَلَّ بِالْحَجِّ وَاَهَلَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِالْحَجِّ فَاَمَّا مَنْ اَهَلَّ بِعُمْرَةٍ فَحَلَّ وَاَمَّا مَنْ اَهَلَّ بِالْحَجِّ اَوْ جَمَعَ الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ فَلَمْ يَحِلُّوا حَتّٰى كَانَ يَوْمَ النَّحْرِ۔

(متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۵۳۹/۳۔ حدیث رقم ۱۶۹۱۔ ومسلم فی صحیحه ۹۰۱/۲ حدیث رقم (۱۷۴۔ ۱۲۲۷)

وابوداؤد فی السنن ۳۹۷/۲ حدیث رقم ۱۸۰۵ والنسائی ۱۵۱/۵ حدیث رقم ۲۷۳۲۔ واحمد فی المسند ۱۳۹/۲۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے حجۃ الوداع کے موقعہ پر ہم میں سے بعض وہ لوگ تھے کہ جنہوں نے محض عمرے کا احرام باندھا اور بعض وہ لوگ تھے جنہوں نے حج اور عمرے کا اکٹھے احرام باندھا اور بعض ہم میں وہ لوگ تھے جنہوں نے محض حج کا احرام باندھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کا احرام باندھا۔ پس جس نے عمرے کا احرام باندھا اچھ حلال ہو گیا اور جس نے احرام باندھا حج کا اور یا جمع گیا حج اور عمرے کو پس وہ نحر کے دن تک حلال نہیں ہوگا۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قولہ : "فمنا من اهل بعمرة"** شاید کہا اس نے حج پہلے ادا کیا ہو تو سفر کو صرف عمرہ کیلئے کیا، یا جواز پر عمل کیا، یا صرف عمرہ کے ذکر پر اکتفاء کیا ہے۔

قولہ : "واهل رسول الله ﷺ بالحج" خطابی فرماتے ہیں کہ بعض نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے **لبيك بحجة** سنا اور **بعمرة** نہ سن سکا تو اس نے نقل کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مفرد تھے بعض نے **بحجة و عمرة** سنا تو کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قارن تھے۔ اس بارے میں اکثر احادیث ان دو وجہوں کی طرف لوٹتی ہیں۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قارن ہوں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی **لبيك بحجة** کہا اور کبھی کہا **لبيك بعمرة** اور کبھی **لبيك بحجة و عمرة** کہا۔ اور ہر ایک نے وہی نقل کیا ہے جو اس نے سنا تو اب اس تاویل کی ضرورت نہیں کہ اس نے و عمرۃ نہیں سنا۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث امام شافعی کی قطعی دلیل ہے کہ افراد حج کے تمام انواع میں سے افضل ہے اور ابن حجر نے ان کا تعقب کیا ہے کہ اس طرح کے اشارات سے قطعی دلیل کیسے حاصل ہو سکتی ہے حالانکہ ہم تو صریح عبارات میں بھی اس بارے میں علیل ہیں۔

قولہ :فاما من اهل بعمرة فحل:

یعنی عمرہ سے نکل گیا طواف اور سعی کرنے کے بعد اور اس کیلئے وہ تمام امور جو احرام کی وجہ سے ناجائز ہو چکے تھے حلال ہو گئے پھر اس کے بعد حج کا احرام باندھا۔

قولہ :واما من اهل حتى كان يوم النحر: "**فلم يحلوا**" حاء کے کسرہ کے ساتھ **لم يخرجوا** کے معنی میں ہے۔ پس **يوم نحر** کو **جمرة العقبه** کے رمی اور سر مونڈوانے سے ان کیلئے تمام محظورات حلال ہو گئے سوائے عورتوں کے ساتھ مباشرت کہ وہ طواف زیارت کے بعد حلال ہوئی۔

حج کو عمرے کے ساتھ داخل کرنا

۲۵۴۶: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ تَمَتَّعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِيْ حَجَّةِ الْوَدَاعِ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ بَدَاَ فَاَهَلَّ بِالْعُمْرَةِ ثُمَّ اَهَلَّ بِالْحَجِّ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۵۳۹/۳۔ حدیث رقم ۱٦۹۱۔ ومسلم فی صحیحه ۹۰۱/۲ حدیث رقم (۱۷٤۔ ۱۲۲۷)۔

وابوداؤد فی السنن ۳۹۷/۲ حدیث رقم ۱۸۰۵ والنسائی ۱۵۱/۵ حدیث رقم ۲۷۳۲۔ واحمد فی المسند ۱۳۹/۲۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہتے ہیں کہ تمتع کیا یعنی فائدہ اٹھایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں

عمرے کا احرام باندھا اور پھر حج کا احرام باندھا یعنی حج کو عمرے میں داخل کیا۔ پس قارن ہونے اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قولہ :تمتع رسول اللہ ﷺ بالعمرۃ الی الی الحج:**

"**إلی الحج**":**من العمرۃ** سے حال ہے تقدیرِ عبارت یوں ہے **تمتع بالعمرۃ منضمۃ الی الحج۔**

قولہ :فاھل بالعمرۃ ثم اھل بالحج: "تمتع کیلئے بیان ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ عمرہ کے نیت میں حج کو داخل کیا، ابن الملک فرماتے ہیں کہ پہلے میقات سے عمرہ کا احرام باندھا پھر عمرہ کے افعال ادا کر کے مکہ سے حج کا احرام باندھا۔ پھر ابن الملک نے کہا ہے کہ اگر کوئی یہ کہے کہ ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے حج افراد کیا تھا ایک میں ہے کہ آپ ﷺ کا حج تمتع تھا ایک میں قران کا ذکر ہے؟

تو ہم اس میں توفیق و تطبیق کے بارے میں کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ابتداء میں عمرہ کا احرام باندھا اور اس کو حالت تمتع میں جاری رکھا پھر عمرہ کے طواف سے قبل حج کا احرام باندھا اور حج کیلئے احرام الگ اور مستقل باندھا تو اس کی وجہ سے قارن ہوئے۔ لیکن ابن الملک کے کلام کے اور اول آخر میں تناقص ہے۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ عمرے سے فائدہ اٹھایا اس کے ساتھ حج ملاتے ہوئے اور بعض نے کہا کہ جب عمرہ سے نکل گئے تو جن چیزوں پر پابندی تھی ان کی اجازت سے فائدہ اٹھایا یہاں تک کہ پھر حج کا احرام باندھا۔

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ تمتع سے منع کرتے تھے نہی تنزیہی کے طور پر اس بنیاد پر کہ افراد افضل ہے۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تمتع کیا مگر ہم ڈر رہے تھے۔

یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ مفرد تھے اور حضرت انسؓ کی حدیث جس میں ہے **یصرخون بھما** اور مراد اس سے نبی ﷺ اور صحابہ ہیں، سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ قارن تھے اور عبداللہ المزنی کی روایت میں ہے کہ: "**سمعت رسول اللہ ﷺ یقول لبیک عمرۃ وحجًا**" اور ابن عمر کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ مفرد تھے اور یہ تمام روایات میں جمع اور تطبیق کی صورت یہ ہے کہ فعل کی نسبت اُمر کی طرف کی جاتی ہے جیسا کہ عرب کا قول **بنیٰ فلان دارا**۔ اس وقت بولتے ہیں جب کسی نے گھر بنانے کا حکم دیا ہو۔ آپ ﷺ نے بذات خود صرف ایک قسم کا حج کیا تھا اور آپ ﷺ کے صحابہ میں سے بعض قارن تھے اور بعض مفرد تھے اور بعض متمتع تھے۔ اور یہ سب نبی ﷺ کے حکم اور اُمر کی وجہ سے تھا لہٰذا سب کی نسبت نبی ﷺ کی طرف درست ہے۔

یہ امام شافعی رحمہ اللہ سے منقول ہے اور اس میں بحث ہے۔

کیونکہ آپ علیہ اسلام سے یہ کہیں منقول نہیں کہ آپ ﷺ نے کسی کو حج کے انواع میں سے کسی خاص نوع کا حکم دیا ہو۔ ہاں جس نے جو نوع اپنایا اس کو اس پر برقرار رکھا۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ صحیح بات یہ ہے کہ آپ ﷺ پہلے مفرد تھے پھر اس کے بعد عمرہ کا احرام باندھا تو قارن ہو گئے۔

اور جس روایت میں تمتع منقول ہے وہاں لغوی معنی مراد ہے کیونکہ تمتع کا معنی ہے فائدہ اٹھانا اور یہ مفہوم قران سے بھی حاصل ہوتا ہے۔ بایں طور کہ قارن عمرہ سے متنفع ہوتا ہے جو وہ حج کے ساتھ کرتا ہے یا ایک سفر میں کرتا ہے۔

شمنی کہتے ہیں کہ ابن حزم نے اس بارے میں کتاب قائم کی ہے کہ آپ ﷺ حجۃ الوداع میں قارن تھے اور باقی احادیث میں تاویل کی ہے۔

ہمارے نزدیک قران مطلقاً افضل ہے اور امام مالک اور شافعی کے نزدیک افراد مطلقاً افضل ہے اور امام احمد کے ہاں تمتع افضل ہے مطلقاً۔

اور شوافع کا مشہور قول یہ ہے کہ افراد اس وقت افضل ہے جب اس کے بعد الگ طور پر عمرہ بھی ادا کر دے۔ اور ابن حجر نے تصریح کی ہے کہ جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج افراد کیا اور پھر تنعیم سے عمرہ کیا تو انہوں نے بڑی فحش غلطی کی ہے اور اس طرح ان لوگوں کا قول بھی غلط ہے کہ آپ نے تمتع کا احرام باندھا تھا پھر اس سے حلال ہو کر آٹھ ذی الحجہ کو حج کا احرام باندھا۔ اور اس کے بارے میں صحیحین میں حدیث ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بارے میں یہ بتایا کہ انہوں نے قربانی کا جانور ساتھ لایا ہے پس وہ احرام سے نہیں نکلیں گے یہاں تک کہ اس کو ذبح کر دیں۔ اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بارے میں خبر دی ہے جس میں وہم اور غلطی کا دخل نہیں ہو سکتا برخلاف دوسروں کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں خبر دینے کے۔

الفصل الثانی:

احرام میں سلے ہوئے کپڑے پہننے کی اجازت نہیں ہے

۲۵۴۷: وَعَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ اَنَّهٗ رَأَى النَّبِيَّ ﷺ تَجَرَّدَ لِاَهْلَالِهٖ وَاغْتَسَلَ۔ (رواہ الترمذی والدارمی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۹۲/۳ حدیث رقم ۸۳۰ والدارمی فی السنن ۴۸/۲ حدیث رقم ۱۷۹۴۔

ترجمہ: حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ننگے ہوئے اپنے احرام کے لیے یعنی سلے ہوئے کپڑے اتارے اور غسل کیا۔ اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور دارمیؒ نے نقل کیا ہے۔

اسنادی حیثیت: امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

تشریح: **قوله :انه رأى رسول الله ﷺ تجرد لاهلاله** ''مصابیح کے نسخوں میں'' **لاحرامه** ''ہے۔

''**تجرد**'' یعنی سلے ہوئے کپڑوں اور ازار اور رداء سے۔

قوله : واغتسل: غسل کرنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سنت میں سے ہے اور شاید کہ یہ فال ہو گناہوں کے دھونے سے اور حسن بصری فرماتے ہیں کہ یہ غسل واجب ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ اگر گھر سے احرام باندھ رہا ہے تو پھر چاہیے کہ بیوی سے صحبت بھی کر لے کہ اس (جماع) سے بعد میں اس کو یا بیوی کو فائدہ حاصل ہوگا اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے **ابراهیم بن المستنشر عن ابيه عن عائشه** کی سند سے روایت کیا ہے: ''**قالت اطيب رسول الله ﷺ ثم يطوف فى نسائه ثم يصبح محرما**'' کہ میں رسول اللہ کیلئے خوشبو تیار کرتی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیوی کے پاس چکر لگا کر پھر محرم بن جاتے۔

تلبید کرنے کی اجازت ہے

۲۵۴۸: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَبَّدَ رَأْسَهٗ بِالْغُسْلِ۔ (رواہ ابو داود)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳۶۰/۲ حدیث رقم ۱۷۴۸۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سر کے بال جمائے ایسی چیزوں کے ساتھ جن سے سر دھویا جاتا ہے اس کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :ان النبی ﷺ لبد رأسه بالغسل:

''الغسل'' : غین کے کسرہ کے ساتھ اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعے سر وغیرہ دھویا جائے جیسے خطمی وغیرہ۔

اس حدیث پر پہلے بات ہو چکی ہے اور یہ حدیث اس بات پر دلالت نہیں کر رہی ہے کہ یہ احرام سے قبل تھا۔ اور مصنف کا اس کو یہاں ذکر کرنے کا کوئی اعتبار نہیں کیونکہ اس کی بنیاد ان کا اپنا فہم اور سمجھ ہے اور اس کی تائید دار قطنی کی اس روایت سے ہوئی ہے جو سند حسن کے ساتھ روایت کی ہے کہ آپ ﷺ جب احرام کا ارادہ فرماتے تو اپنے سر کو خطمی اور اشنان وغیرہ سے دھوتے۔

بلند آواز سے تلبیہ کہنا

۲۵۴۹: وَعَنْ خَلَّادِ بْنِ السَّائِبِ عَنْ اَبِیْهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَ تَانِیْ جِبْرِیْلُ فَاَ مَرَنِیْ اَنْ اٰمُرَ اَصْحَابِیْ اَنْ یَّرْفَعُوْا اَصْوَاتَهُمْ بِالْاِهْلَالِ اَوِ التَّلْبِیَةِ۔ (رواه مالك والترمذی وابو داود والنسائی وابن ماجة والدارمی)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۴۰۵/۲ حدیث رقم ۱۸۱۴۔ والترمذی فی السنن ۱۹۱/۳ حدیث رقم ۸۲۹ والنسائی فی السنن ۱۶۲/۵ حدیث رقم ۲۷۵۳۔ وابن ماجه ۹۷۵/۲ حدیث رقم ۲۹۲۲۔ والدارمی ۵۳/۲ حدیث رقم ۱۸۰۹۔ ومالك فی الموطأ ۳۳۴/۱ حدیث رقم ۳۴ من کتاب الحج۔ واحمد فی المسند ۵۵/۴۔

ترجمہ: حضرت خلاد بن سائب ؒ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے باپ سے نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میرے پاس جبرئیل علیہ السلام آئے مجھے حکم دیا کہ میں اپنے دوستوں کو حکم کروں کہ وہ اپنی آوازیں بلند کریں اہلال کے ساتھ یا تلبیہ کہا۔ اس کو امام ترمذیؒ اور ابوداؤدؒ اور نسائیؒ اور ابن ماجہؒ اور دارمیؒ نے نقل کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

خلاد بن السائب۔ یہ ''خلاد سائب ابن الخلاد'' کے بیٹے ہیں۔ ''خزرجی'' ہیں۔ باپ بیٹا دونوں صحابی ہیں۔ یہ اپنے والد اور زید بن خالد سے روایت کرتے ہیں اور ان سے حیان بن واسع وغیرہ۔ سائب ابن الخلاد کے حالات جلد دوم میں حدیث ۴۷ کے تحت گذر چکے ہیں۔

تشریح: قوله :فامرنی ان أمر اصحابی:

قوله :أن یرفعوا ...... علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ تمام نسخوں میں یہ عبارت اسی طرح ہے اور مصابیح کے نسخوں میں ''بالاحرام والتلبیة'' ہے اور یہ تصحیف ہے۔

''ملا علی قاری فرماتے ہیں'' بلکہ تحریف ہے اور اس کے ہونے کی وجہ، کمزور وہم ہے کیونکہ ''اهلال'' اکثر ''احرام'' کے معنی میں آتا ہے تو ناسخ کو وہم ہوا اور نقل بالمعنی کیا اور اس بات سے غافل رہے کہ یہ تلبیہ کے ساتھ اور بلند کرنے کے معنی میں آتا ہے۔

اور یہاں بلند کرنے کے معنی سے خالی کیا ہے یا مبالغہ مراد ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ با آواز بلند لبیک کہنا سنت ہے اگر کسی نے اس کو ترک کر دیا تو وہ گناہگار ہوگا اور اس پر کوئی دل لازم نہ ہوگا۔ اور اس میں اتنا مبالغہ بھی نہ کرے کہ اپنے آپ کو تھکا دے اور تکلیف پہنچے۔

مزید فرماتے ہیں کہ یہ بات مخفی نہیں ہونی چاہیے کہ ہمارے اس قول ''بلند آواز سے اپنے آپ کو نہ تھکائے'' اور وہ روایات جو شدت کے ساتھ آواز بلند کرنے کے استحباب پر دلالت کرتی ہے، میں کوئی منافات نہیں ہے۔

کیونکہ کبھی آدمی طبعی طور پر بلند آواز والا ہوتا ہے تو باآواز بلند لبیک کہنا بغیر تھکاوٹ کے حاصل ہو جاتا ہے ابن الحاج مالکی فرماتے ہیں اور بچنا چاہیے اس فعل سے جو بعض لوگ کرتے ہیں کہ وہ لبیک اتنے بلند اواز سے کہتے ہیں کہ اپنے گلے پھاڑ دیتے ہیں اور بعض اتنے پست آواز سے کہتے ہیں کہ وہ سنائی نہیں دیتا۔ اور سنت طریقہ اس میں درمیانہ ہے۔ اور عورتیں اتنی آواز سے لبیک کہیں کہ وہ خود ہی سن سکیں دوسروں تک آواز نہ پہنچے۔ اسی طرح شرح کنز میں ہے اور ابن حجر کا یہ قول بہت عجیب وغریب ہے کہ انہوں نے کہا ہے کہ تلبیہ کہنے والے کیلئے سنت ہے کہ وہ کانوں میں انگلیاں رکھے۔

لبیک کہنے والے کی عظمت

۲۵۵۰: وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا مِنْ مُسْلِمٍ يُلَبِّىْ اِلَّا لَبّٰى مَنْ عَنْ يَمِيْنِهٖ وَشِمَالِهٖ مِنْ حَجَرٍ اَوْ شَجَرٍ اَوْ مَدَرٍ حَتّٰى تَنْقَطِعَ الْاَرْضُ مِنْ هٰهُنَا وَهٰهُنَا۔ (رواه الترمذی وابن ماجة)

اخرجه الترمذی فی السنن ۱۸۹/۳ حدیث رقم ۱۲۸۔ وابن ماجه ۹۷۴/۲ حدیث رقم ۲۹۲۱۔

ترجمه: حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو مسلمان بھی لبیک کہتا ہے تو اس کے دائیں بائیں کے پتھر، درخت اور مٹی ڈھیلے بھی لبیک کہتے ہیں۔ یہاں تک کہ زمین ختم ہو جائے اس طرف سے یعنی دائیں اور بائیں طرف سے۔ اس کو ابن ماجہؒ اور ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :قال رسول الله ﷺ :ما من ...... الا لبي من عن ...... ''من حجر:
اس میں مِن بیان ہے مَن سے۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ جب تسبیح کی نسبت حجر و شجر وغیرہ کی طرف کی تو پھر اس کی تعبیر بھی اس لفظ ''مَنْ'' سے کی جس سے ذوی الفھوم کی تعبیر کی جاتی ہے (انتہی) اور بعض نسخوں میں ''ما عن یمینه'' ہے تو اس صورت میں پھر کوئی اشکال ہی نہیں۔

قوله :حتی تنقطع الارض من ھھنا......: یعنی مشرق کی جانب سے ''وھھنا'' یعنی مغرب کی جانب سے۔ یعنی زمین کے اس انتہاء تک جہاں تک اس کی آواز پہنچی ہے اور شرق وغرب کی تخصیص افادہ عموم کیلئے ہے ورنہ یہ قدام بھی آگے اور وراء یعنی پیچھے کی جانب کے منافی نہیں ہے۔

پھر اس حدیث میں واضح دلالت ہے کہ جمادات اور نباتات کائنات میں واقع ہونے والے امور کا ادراک رکھتے ہیں اور ان کو اپنے رب کی توحید بالذات وصفات کا علم بھی ہے اور ان کی تسبیح اور تلبیہ زبان قال سے کرتے ہیں۔ جیسا کہ جمہور اہل حال کا مذہب ہے اور یہی صحیح ہے۔

احرام باندھنے کے بعد آپ ﷺ کا معمول مبارک

۲۵۵۱: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَرْكَعُ بِذِى الْحُلَيْفَةِ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ اِذَا اسْتَوَتْ بِهِ النَّاقَةُ قَائِمَةً عِنْدَ مَسْجِدِ ذِى الْحُلَيْفَةِ اَهَلَّ بِهٰؤُلَاءِ الْكَلِمَاتِ وَيَقُوْلُ لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ فِىْ يَدَيْكَ لَبَّيْكَ وَالرَّغْبَاءُ اِلَيْكَ وَالْعَمَلُ۔ (متفق علیه ولفظه لمسلم)

اخرجه البخاری فی صحیحه حدیث رقم ۱۵۴۹۔ ومسلم فی صحیحه ۸۴۲/۲ حدیث رقم (۱۹۔ ۱۱۸۴)۔ وابوداؤد فی السنن ۴۰۴/۲ حدیث رقم ۱۸۱۲۔ والترمذی ۱۸۸/۳ حدیث رقم ۸۲۶ والنسائی ۱۶۰/۵ حدیث رقم ۲۷۵۰ وابن

ماجه ۲/۹۷٤ حديث رقم ۲۹۱۸۔ ومالك في الموطأ ۱/۳۳۱ حديث رقم ۲۸ من كتاب الحج۔ واحمد في المسند ۳/۲۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ذی الحلیفۃ میں دو رکعتیں پڑھتے تھے جس وقت کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ذی الحلیفۃ کے پاس کھڑی اونٹنی اٹھاتی تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کلمات کے ساتھ اپنی آواز بلند کرتے یعنی مشہور تلبیہ پڑھتے اور اس پر اضافہ بھی فرماتے میں تیری خدمت میں حاضر ہوں۔ اے الٰہی میں تیری خدمت میں حاضر ہوں ۔ میں تیری خدمت میں حاضر ہوں اور تیری خدمت میں حاضری سے سعادت حاصل کرتا ہوں اور بھلائی تیرے ہاتھ میں ہے میں تیری خدمت میں حاضر ہوں اور تیری طرف رغبت ہے اور عمل تیرے ہی لیے ہے۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے اور اس کے لیے الفاظ مسلم کے ہیں۔

تشریح: **قوله : اهل بهؤلاء الكلمات ويقول**:''**ويقول**'' ابن حجر نے یقول کی ضمیر ابن عمر یا ان کے والد کی طرف لوٹائی ہے اور شیخین نے دونوں کی تصریح کی ہے۔ شیخین کی ایک روایت میں ہے عن نافع اور اس کے الفاظ یہ ہیں ''**ان تلبية رسول الله ﷺ ، لبيك لاشريك لك لبيك، ان الحمد والنعمة لك والملك لا شريك لك**'' نافع کہتے ہیں کہ ابن عمر اس میں یہ الفاظ: ''**لبيك وسعديك والخير بيديك والرغباء اليك والعمل**'' زیادہ کرتے تھے۔ اور شیخین کی ایک روایت میں حدیث الباب کے ذکر کرنے کے بعد یہ ہے ''**اتی بهولآء الكلمات وكان ابن عمر يقول: كان عمر يهل باهلال رسول الله ﷺ من هولآء الكلمات ويقول لبيك**''۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ مصنف کے اصل نسخہ سے تقریباً دو سطر کہیں ساقط ہوئے جو اس نسخہ کے موافق تھے جس کی میں نے شرح کی ہے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ نسخے تمام اس کے موافق ہیں شاید مصنف نے ایسا اختصار کیا ہے جو مخل ہے جس سے ذہن اس طرف جاتا ہے کہ یہ زیادت مرفوع ہے۔

قوله :لبيك اللهم لبيك، لبيك وسعديك:

''**لبيك اللهم لبيك، لبيك وسعديك**'' تکرار تاکید کیلئے ہے یا تاکہ اس پر عطف کیا جا سکے۔

''**وسعديك**'':ای **ساعدت على طاعتك ساعدة واسعادا بعدا سعاد**: یعنی تیری اطاعت سے نیک بختی حاصل کرتا ہوں ایک نیک بختی کے بعد دوسری۔ اور یہ دونوں (یعنی لبیک اور سعدیک) بنابر مصدریت منصوب ہے۔ جیسا کہ علامہ طیبی نے اس کو ذکر کیا ہے۔

سعديك تثنيه مضاف ہے اور مقصود اس سے تکرار ہے برائے تکثیر جیسا کہ لبیک میں ہے۔ یعنی اصل میں ہے **اسعد اجابتك سعادة بعد سعديك منفرداً**۔ بغیر لبیک کے نہیں سنا گیا ہے اور اسعاد صرف نوحہ میں مدد کرنے کو کہتے ہیں۔

قوله :والخير في يديك: یعنی تیرے قبضہ میں منحصر ہے صفت قدرت وارادہ میں سے یا صفت جمال وجلال میں سے، تو اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تمام افعال میں محمود ہے یا یہ باب الاکتفاء میں سے ہے ورنہ تو تمام امور اللہ کیلئے ہیں اور خیر وشر سب اللہ کے اندازے اور فیصلے سے ہیں یا یہ حسن ادب کے باب سے ہے اضافت اور نسبت میں، جیسا کہ اللہ کے اس ارشاد میں ہے:

﴿**واذا مرضت فهو يشفين**﴾[الشعراء: ۸۰] ترجمہ: اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہ مجھے شفاء دیتا ہے۔ (بیان القرآن)

اور اسی کے قبیل سے یہ منقول ہے ''**والشر ليس اليك**'' یعنی شر کی نسبت تیری طرف نہیں کی جاتی ادب کی وجہ سے۔

اور ابن حجر کا یہ قول عجیب وغریب ہے کہ انہوں نے کہا ہے کہ یدیك میں اور یداہ مبسوطتان میں تثنیہ سے مراد حقیقت نہیں ہے بلکہ اس سے مراد تکثیر ہے جس کی کوئی انتہاء نہ ہو۔ جیسا کہ لبیک اور سعد یک میں ہے کیونکہ اللہ کی نعمتیں اور قدرت جن سے یہ الفاظ کنایہ ہیں وہ بے شمار ہیں' ابن حجر کے اس قول کی غرابت مخفی نہیں ہے کیونکہ ان کے کلام کا مآل تثنیہ کا اعتبار ہے حالانکہ محققین کا مذہب وہ ہے جو پہلے گزرا۔'' واللہ اعلم''۔

قوله :لبیك و الرغباء الیك و العمل:''**الرغبآء**'' : اس کو راء کے فتحہ اور مد کے ساتھ روایت کیا گیا ہے اور یہی مشہور ہے۔

اور اسی کو رغبٰی راء کے ضمہ اور قصر کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے اور اس کی نظیر **العلیاء** اور **العلی**، اور **النعماء** اور **النعمٰی** ہے۔

اور ابوعلی سے روایت ہے کہ یہ راء کے فتحہ اور بغیر مد کے ہے طلب اور سوال کرنے کے معنی میں ہے اور اس کی طرف راغب ہونا جس کے ہاتھ میں خیر و بھلائی ہو، کے معنی میں ہے۔

اور علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ اسی طرح ''**والعمل**'' ہے کہ اس کا احسان اسی کی طرف ہے کیونکہ اس سے مقصود ہی یہی ہے (انتہٰی)

لیکن زیادہ ظاہر یہ ہے کہ اس کی تقریر یہ ہے ''**والعمل لك**'' یعنی عمل تیری رضا کیلئے ہے یا تقریر یہ ہے **والعمل بك یا باسرك وتوفیقك**، یا اس کا مطلب ہے کہ عمل کا معاملہ تیری طرف ہے یعنی اس کے قبول کرنے اور رد کرنے میں۔

اور طحاوی کا یہ کہنا انتہائی عجیب وغریب ہے کہ حضرت سعد سے منقول مشہور تلبیہ پر زیادہ مکروہ ہے پھر کہا ہے کہ **هذا اختیار الطحاوی** کہ یہی ہمارا قول ہے۔ بحر میں ہے کہ **هذا اختیار الطحاوی** شاید کہ امام طحاوی کا مقصد یہ ہو کہ آدمی اپنی طرف سے منقول تلبیہ پھر زیادہ کرے تو وہ مکروہ ہے اس پر قرینہ امام طحاوی کا اس سے پہلے والا قول ہے جو انہوں نے ذکر کیا ہے یہ کہ کوئی حرج نہیں کہ آدمی زیادہ کرے اس میں اللہ کا ذکر میں سے جو پسند کرے۔

اور یہ امام محمد کا قول ہے یا ان کا مواد یہ ہے کہ مسنون تلبیہ کے درمیان میں زیادہ مکروہ ہے کیونکہ ہمارے علماء نے کہا ہے کہ اگر اس پر زیادہ کرے تو یہ مستحب ہے تو صاحب سراج الوھاج کہتے ہیں کہ یہ استحباب مسنون تلبیہ کہنے کے بعد ہے اگر درمیان میں زیادہ کرے تو وہ مستحب نہیں ہے۔

(متفق علیه و لفظه مسلم) نسائی میں ہے کہ آپ ﷺ نے ظہر کی نماز قصر کے ساتھ پڑھی پھر سوار ہوئے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ حدیث میں دو رکعت نماز سے مراد یہی ہے اور بخاری میں ہے کہ صبح کی نماز پڑھی اور پھر سوار ہوئے۔

ابن عبدالبر نے ذکر کیا ہے کہ تمام علماء نے اس کو مستحب سمجھا ہے کہ یہ نفل یا فرض نماز کے بعد ہو اور قاضی عیاض وغیرہ نے نقل کیا ہے حسن بصری سے کہ وہ فرماتے ہیں فرض نماز کے بعد مستحب ہے کیونکہ وارد ہے کہ یہ دو رکعت صبح کی نماز تھی۔ اور صحیح وہی ہے جو جمہور نے کہا ہے اور وہی ظاہر حدیث کا مطلب ہے تو یہ امام بغوی پر اعتراض ہے کہ ان کی اصطلاح صحیح اور حسن کے بارے میں مختلف ہے۔ لیکن شیخ الاسلام نے احادیث مشکوٰۃ کے تحریر میں کہا ہے کہ اس حدیث کو احمد نے لفظاً اور بخاری نے معنیً ذکر کیا ہے مگر اس نے ''**بهذه الکلمات**'' کے بعد کہا ہے یعنی التلبیة اس کے مطابق پھر کوئی اعتراض نہیں ہے اور ابن المنذر نے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ الفاظ: **لبیك ذاالنعماء والفضل الحسن لبیك مرغوبا ومدھوبا الیك** زیادہ کرتے تھے۔

اور حضرت جابر سے صحیح طور پر ثابت ہے کہ لوگ ذا المعارج زیادہ کرتے تھے اور نبی ﷺ ان کو سنتے اور ان کو کچھ نہ کہتے۔

اور ابن منذر نے مرفوع روایت کیا ہے: ''**لبیك حقًا حقًا تعبد ورقًا**'' اور حضرت انس سے یہ موقوف روایت ہے۔ اور آپ علیہ السلام سے یہ صحیح طور پر ثابت ہے کہ آپ ﷺ فرماتے تھے ''**لبیك ان العیش عیش الاٰخرة**'' کبھی وسعت اور خوشی کی حالت میں

جو کہ عرفہ میں تھی اور کبھی سختی کی حالت میں جو خندق کھودنے کے وقت تھی اور حکمت دونوں میں یہ تھی کہ دنیا کی آسانی اور خوشی پر غرور نہ کرنا کیونکہ اعتبار اصل میں عقبیٰ کا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جب آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم ذوالحلیفہ پہنچتے تو وہاں پہلے آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم دو رکعت نماز پڑھتے جو احرام کیلئے مسنون ہے اور ان دونوں رکعتوں میں **قل یایها الکفرون** اور **قل هو الله احد** کی قراءت کرتے اور پھر نیت کرتے اور اس کے بعد لبیک کہتے، اور پھر جب اونٹنی آپ کو لے کر کھڑی ہوتی تو اس وقت بھی آپ پہلے انہیں کلمات کے ذریعے تلبیہ کرتے جو مشہور ہیں۔

اور ابن حجر کا یہ قول بعید از صحت ہے کہ اس سے مراد وہ تلبیہ ہے جو فصل اوّل میں گزرا۔

اللہ تعالیٰ سے خوشنودی مانگنا اور طلب معافی کرنا

۲۵۵۲: وَعَنْ عُمَّارَةَ بْنِ خُزَيْمَةَ بْنِ ثَابِتٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ كَانَ اِذَا فَرَغَ مِنْ تَلْبِيَتِهٖ سَأَلَ اللّٰهَ رِضْوَانَهٗ وَالْجَنَّةَ وَاسْتَعْفَاهُ بِرَحْمَتِهٖ مِنَ النَّارِ۔ (رواه الشافعي)

اخرجه الامام الشافعي۔

ترجمہ: حضرت عمارہ بن خزیمہ بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نقل کیا ہے اپنے باپ یعنی خزیمہ سے۔ انہوں نے نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم سے نقل کیا ہے کہ جب حضور صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم فارغ ہوتے اپنے لبیک کہنے سے اللہ تعالیٰ سے خوشنودی مانگتے اور جنت اور عافیت طلب کرتے اسکی رحمت کے ساتھ آگ سے۔ اس کو امام شافعیؒ نے نقل کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

خزیمہ بن ثابت: یہ خزیمہ ثابت ہیں۔ ان کی کنیت ''ابوعمارہ'' ہے۔ یہ ''انصاری اوسی'' ہیں۔ ''ذوالشہادتین'' کے لقب سے معروف ہیں۔ جنگ بدر اور مابعد کے غزوات میں حاضر ہوئے۔ جنگ صفین میں حضرت علی رَضِيَ اللهُ عَنْهُ کے ہمراہ تھے۔ جب عمار بن یاسر رَضِيَ اللهُ عَنْهُ شہید ہو گئے تو انہوں نے اپنی تلوار سونت لی اور مقاتلہ کیا یہاں تک کہ آپ شہید ہو گئے۔ آپ سے ان کے بیٹے عبداللہ اور عمارہ اور جابر بن عبداللہ نے روایت کی ہیں۔ ''خزیمہ'' بصیغۂ تصغیر ہے یعنی خائے معجمہ کے ضمہ اور زائے معجمہ کے فتحہ کے ساتھ ہے ''عمارہ'' عین کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ مؤلف رَحْمَةُ اللهِ عَلَيْهِ نے ''الاکمال'' میں ابوخزیمہ کا نام ذکر نہیں کیا' البتہ خزیمہ کے بھتیجے عمارہ بن خزیمہ بن ثابت رَضِيَ اللهُ عَنْهُ کے حالات **فصل صحابہ** رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ میں ذکر کیا اور کہا ہے کہ یہ اپنے والد وغیرہ سے روایت کرتے ہیں عمارہ کے صحابیت اصحاب صلاح کو تردد ہے اور بظاہر یہاں ''خزیمہ'' سے مراد عمارہ ہیں۔

تشریح: **قوله :سال الله رضوانه والجنة واستعفاه برحمة من النار:** ایک روایت میں ''استغفارہ'' ہے اور حصن میں ''استعتقه'' کا لفظ ہے۔

''رضوانه'' راء کے کسرہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ ہے۔ دنیا اور آخرت کی رضامندی اور خوشنودی مراد ہے۔

''استعفا'' اس کا عطف سأل پر ہے ابن الملک فرماتے ہیں کہ اس کو استغفادہ روایت کیا گیا ہے تو پھر اس کا عطف افوانہ پر ہوگا۔

''برحمته'' یعنی اللہ کی رحمت کے سبب سے نہ کہ اپنے ذاتی کسب سے۔ ہمارے علماء فرماتے ہیں کہ تلبیہ سے فراغت کے بعد نبی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم پر درود بھیجنا مستحب ہے اور یہ آہستہ آواز سے پڑھے اور اللہ سے اس کی خوشنودی اور جنت کا سوال کرے اور اس کے ساتھ جہنم سے پناہ مانگے۔ اور اپنے لیے اور اپنے ساتھ جس کیلئے چاہے دعاء کرے جو چاہیے اور مستحب ہے کہ ہر مرتبہ تلبیہ تین بار تکرار کے ساتھ پڑھے،

اور پے در پے پڑھے درمیان میں کوئی کلام نہ کرے۔ اور اگر درمیان میں سلام کا جواب دیا تو جائز ہے۔ لیکن دوسرے کیلئے مکروہ ہے کہ اس حالت میں اس کو سلام کرے، اور جب کوئی چیز دیکھے جو اس کو اچھی لگے تو "لبيك ان العيش عيش الأخرة" کہے۔

ایک بار تلبیہ کہنا ہمارے نزدیک شرط ہے اور ایک سے زائد سنت ہے یہاں تک کہ ترک پر گنہگار ہوگا۔

تخریج: "رواہ الشافعی" اس کو دارقطنی نے بھی روایت کیا ہے ابن ہمام کے قول کے مطابق، دارقطنی اور بیہقی نے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ تلبیہ کے بعد اپنے اوپر درود بھیجتے تھے اور ماقبل کی طرح جمہور نے اس کو بھی ضعیف قرار دیا ہے۔ مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ یہ حدیث فضائل کی احادیث میں سے ہے اور مستحب یہ ہے کہ درود کو تلبیہ کی بنسبت پست آواز سے پڑھے تاکہ مرتبہ میں فرق ظاہر ہو۔

الفصل الثالث:

آپ ﷺ کا حج کے لیے اعلان کرنا

۲۵۵۳ : وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ لَمَّا اَرَادَ الْحَجَّ اَذَّنَ فِي النَّاسِ فَاجْتَمَعُوْا فَلَمَّا اَتَى الْبَيْدَاءَ اَحْرَمَ۔ (رواه البخاری)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۸٤٣/٢ حديث رقم (۲۲۔ ۱۱۸۵)۔

ترجمه: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے جب حج کا ارادہ کیا تو لوگوں میں اعلان کروایا۔ پس لوگ جمع ہوئے اور میدان بیداء میں آئے اور احرام باندھا۔ اس کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :اذن في الناس: اللہ کے اس ارشاد کی بناء پر: ﴿واذن في الناس بالحج﴾ [الحج:۲۷] یعنی آپ ﷺ نے لوگوں میں اعلان کر دیا کہ میں حج کا ارادہ کر رہا ہوں۔ یہ ابن الملک نے کہا ہے اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ آپ ﷺ نے منادی کا حکم دیا کہ وہ اعلان کرے کہ آپ ﷺ حج کا ارادہ رکھتے ہیں جیسا کہ عنقریب حضرت جابر کی بھی حدیث میں آنے والا ہے۔

"فاجتمعو" یعنی بہت سارے لوگ مدینہ میں جمع ہو گئے۔

قوله :فلما اتى البيداء احرم: "البيداء" اصل میں چٹیل میدان کو کہتے ہیں اور یہاں اس سے مراد ایک مخصوص جگہ کا نام ہے جو ذوالحلیفہ کے پاس ہے۔

"احرم" یعنی احرام مکرر باندھا یا اس کا اظہار کیا اور یہ زیادہ ظاہر ہے کیونکہ یہ پہلے ثابت ہو چکا ہے کہ آپ ﷺ نے ابتداء ذوالحلیفہ ہی میں احرام کیلئے دو رکعت نماز پڑھ کر احرام باندھا تھا۔

ابوداؤد کی روایت میں ہے عن انس انه عليه الصلاة والسلام صلى الظهر ثم ركب راحلته فلما علا على جبل البيداء اهل " کہ آپ نے ظہر کی نماز پڑھی پھر سواری پر سوار ہوئے اور جب بیداء پہاڑ پر چڑھے تو احرام باندھا۔

اور صحیحین میں ابن عمر سے روایت ہے: ما اهل الا عند المسجد یعنی مسجد ذوالحلیفہ کے پاس سے احرام باندھا۔

اور ایک روایت میں ہے: ما اهل الا عند المسجد حين قام به بعيره اور دوسری روایت میں ہے حين وضع رجله في الغرز واستوت به راحلته قائمًا اهل عند مسجد ذى الحليفة۔ کہ آپ ﷺ نے احرام نہیں باندھا مگر جب آپ نے رکاب میں پاؤں رکھا اور سواری پر بیٹھ کر سواری سیدھی ہوگی تو آپ نے مسجد ذوالحلیفہ سے احرام باندھا۔ اور ابوداؤد اور ترمذی کی ایک اور روایت میں ہے کہ جب آپ نے حج کا ارادہ کیا تو لوگوں میں اعلان کرایا تو لوگ جمع ہو گئے جب بیداء مقام پر پہنچے تو آپؐ نے احرام باندھا۔

مشرکوں کا تلبیہ پڑھنا

۲۵۵۴: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ الْمُشْرِكُوْنَ يَقُوْلُوْنَ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ فَيَقُوْلُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَيْلَكُمْ قَدْ قَدْ اِلَّا شَرِيْكًا هُوَ لَكَ تَمْلِكُهٗ وَمَا مَلَكَ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا وَهُمْ يَطُوْفُوْنَ بِالْبَيْتِ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۸۴۳/۲ حديث رقم (۲۲۔ ۱۱۸۵)۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس ؓ سے روایت ہے کہ مشرک کہتے تھے ہم تیری خدمت میں حاضر ہیں ۔ تیرا کوئی شریک نہیں ہے۔ پس نبی کریم ﷺ فرماتے تھے کہ تم پر افسوس ہے۔ بس اتنا ہی کہو (اس سے آگے نہ کہو لیکن وہ پھر بھی آگے یہ الفاظ کہتے تھے: پس معنی میں اتنا ہی کہو۔ اس سے زیادہ نہ کہو۔ مگر وہ مشرک اس سے زیادہ کہتے تھے مگر وہ بس شریک کہ ملک تیرے لیے ہے اور تو اس کا مالک کا یعنی بت کا اور مشرک کہتے تھے اور وہ شریک یعنی بت تیرا مالک نہیں ہے ان کلمات کو خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے کہتے تھے۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله : ويلكم قدِ قدِ: "قد قد"** : دونوں میں دال کے سکون کے ساتھ بھی ہے اور کسرہ مع تنوین بھی درست ہے۔ **اي كفاكم هذا الكلام**: مطلب ہے کہ تمہارے لیے یہ بات کافی ہے۔

قوله : الاشريكا هو لك تملكه وما ملك: الاشريكا'' اس میں ظاہر تو یہ ہے کہ یہ مرفوع ہے محل سے بدل ہونے کی سے جیسا کہ کلمہ التوحید میں ہے تو سفلی کلمہ میں سفلی لغت اختیار کی گئی جیسا کہ عالی کلمہ میں لغت عال اختیار کی گئی۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ مشرکین کہتے تھے ''**لبيك لا شريك لك الا شريكًا هو لك تملكه وما ملك**''۔

جب ان کی بات **لا شريك لك** تک پہنچ جاتی تو رسول اللہ ﷺ فرماتے بس اسی پر اکتفاء کرو اور اس سے مابعد کی طرف تجاوز نہ کرو۔

''**وما ملك**'' میں ''ما'' نافیہ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ موصولہ ہے۔

قوله : يقولون هذا: یہ ابن عباس کا قول ہے۔

بَابُ قِصَّةِ حَجَّةِ الْوَدَاعِ

حجۃ الوداع کے واقعہ کا بیان

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ:

حجۃ الوداع کا ذکر

۲۵۵۵: عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ مَكَثَ بِالْمَدِيْنَةِ تِسْعَ سِنِيْنَ لَمْ يَحُجَّ ثُمَّ اَذَّنَ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ فِي الْعَاشِرَةِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ حَاجٌّ فَقَدِمَ الْمَدِيْنَةَ بَشَرٌ كَثِيْرٌ فَخَرَجْنَا مَعَهٗ حَتّٰى اِذَا اَتَيْنَا ذَا الْحُلَيْفَةِ فَوَلَدَتْ اَسْمَاءُ بِنْتُ عُمَيْسٍ مُحَمَّدَ بْنَ اَبِيْ بَكْرٍ فَاَرْسَلَتْ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ كَيْفَ اَصْنَعُ قَالَ اغْتَسِلِيْ وَاسْتَثْفِرِيْ بِثَوْبٍ وَاَحْرِمِيْ فَصَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِي الْمَسْجِدِ ثُمَّ رَكِبَ

الْقَصْوَاءَ حَتّٰى اِذَا اسْتَوَتْ بِهٖ نَاقَتُهٗ عَلَى الْبَيْدَاءِ اَهَلَّ بِالتَّوْحِيْدِ لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ قَالَ جَابِرٌ لَسْنَا نَنْوِىْ اِلَّا الْحَجَّ لَسْنَا نَعْرِفُ الْعُمْرَةَ حَتّٰى اِذَا اَتَيْنَا الْبَيْتَ مَعَهٗ اسْتَلَمَ الرُّكْنَ فَطَافَ سَبْعًا فَرَمَلَ ثَلَاثًا وَمَشٰى اَرْبَعًا ثُمَّ تَقَدَّمَ اِلٰى مَقَامِ اِبْرَاهِيْمَ فَقَرَأَ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى فَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ فَجَعَلَ الْمَقَامَ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْبَيْتِ وَفِىْ رِوَايَةٍ اَنَّهٗ قَرَأَ فِى الرَّكْعَتَيْنِ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ وَقُلْ يَا اَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ ثُمَّ رَجَعَ اِلَى الرُّكْنِ فَاسْتَلَمَهٗ ثُمَّ خَرَجَ مِنَ الْبَابِ اِلَى الصَّفَا فَلَمَّا دَنَا مِنَ الصَّفَا قَرَأَ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ اَبْدَأُ بِمَا بَدَأَ اللّٰهُ بِهٖ فَبَدَأَ بِالصَّفَا فَرَقِىَ عَلَيْهِ حَتّٰى رَأَى الْبَيْتَ فَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ فَوَحَّدَ اللّٰهَ وَكَبَّرَهٗ وَقَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ اَنْجَزَ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ ثُمَّ دَعَا بَيْنَ ذٰلِكَ قَالَ مِثْلَ هٰذَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ نَزَلَ وَمَشٰى اِلَى الْمَرْوَةِ حَتَّى انْصَبَّتْ قَدَمَاهُ فِىْ بَطْنِ الْوَادِىْ ثُمَّ سَعٰى حَتّٰى اِذَا صَعِدَتَا مَشٰى حَتّٰى اَتَى الْمَرْوَةَ فَفَعَلَ عَلَى الْمَرْوَةِ كَمَا فَعَلَ عَلَى الصَّفَا حَتّٰى اِذَا كَانَ اٰخِرُ طَوَافٍ عَلَى الْمَرْوَةِ نَادٰى وَهُوَ عَلَى الْمَرْوَةِ وَالنَّاسُ تَحْتَهٗ فَقَالَ لَوْ اَنِّى اسْتَقْبَلْتُ مِنْ اَمْرِىْ مَا اسْتَدْبَرْتُ لَمْ اَسُقِ الْهَدْىَ وَجَعَلْتُهَا عُمْرَةً فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ لَيْسَ مَعَهٗ هَدْىٌ فَلْيَحِلَّ وَلْيَجْعَلْهَا عُمْرَةً فَقَامَ سُرَاقَةُ بْنُ مَالِكِ بْنِ جُعْشُمٍ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَلِعَامِنَا هٰذَا اَمْ لِاَبَدٍ فَشَبَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَصَابِعَهٗ وَاحِدَةً فِى الْاُخْرٰى وَقَالَ دَخَلَتِ الْعُمْرَةُ فِى الْحَجِّ مَرَّتَيْنِ لَا بَلْ لِاَبَدٍ لَا بَلْ لِاَبَدِ اَبَدٍ وَقَدِمَ عَلِىٌّ مِّنَ الْيَمَنِ بِبُدْنِ النَّبِىِّ ﷺ فَقَالَ لَهٗ مَاذَا قُلْتَ حِيْنَ فَرَضْتَ الْحَجَّ قَالَ قُلْتُ اللّٰهُمَّ اِنِّىْ اُهِلُّ بِمَا اَهَلَّ بِهٖ رَسُوْلُكَ قَالَ فَاِنَّ مَعِىَ الْهَدْىَ فَلَا تَحِلُّ قَالَ فَكَانَ جَمَاعَةُ الْهَدْىِ الَّذِىْ قَدِمَ بِهٖ عَلِىٌّ مِنَ الْيَمَنِ وَالَّذِىْ اَتٰى بِهِ النَّبِىُّ ﷺ مِائَةً قَالَ فَحَلَّ النَّاسُ كُلُّهُمْ وَقَصَّرُوْا اِلَّا النَّبِىُّ ﷺ وَمَنْ كَانَ مَعَهٗ هَدْىٌ فَلَمَّا كَانَ يَوْمُ التَّرْوِيَةِ تَوَجَّهُوْا اِلٰى مِنٰى فَاَهَلُّوْا بِالْحَجِّ وَرَكِبَ النَّبِىُّ ﷺ فَصَلّٰى بِهَا الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ وَالْمَغْرِبَ وَالْعِشَاءَ وَالْفَجْرَ ثُمَّ مَكَثَ قَلِيْلًا حَتّٰى طَلَعَتِ الشَّمْسُ وَاَمَرَ بِقُبَّةٍ مِّنْ شَعْرٍ تُضْرَبُ لَهٗ بِنَمِرَةَ فَسَارَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَلَا تَشُكُّ قُرَيْشٌ اِلَّا اَنَّهٗ وَاقِفٌ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ كَمَا كَانَتْ قُرَيْشٌ تَصْنَعُ فِى الْجَاهِلِيَّةِ فَاَجَازَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ حَتّٰى اَتٰى عَرَفَةَ فَوَجَدَ الْقُبَّةَ قَدْ ضُرِبَتْ لَهٗ بِنَمِرَةَ فَنَزَلَ بِهَا حَتّٰى اِذَا زَاغَتِ الشَّمْسُ اَمَرَ بِالْقَصْوَاءِ فَرُحِلَتْ لَهٗ فَاَتٰى بَطْنَ الْوَادِىْ فَخَطَبَ النَّاسَ وَقَالَ اِنَّ دِمَاءَكُمْ وَاَمْوَالَكُمْ حَرَامٌ عَلَيْكُمْ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا فِىْ شَهْرِكُمْ هٰذَا فِىْ بَلَدِكُمْ هٰذَا اَلَا كُلُّ شَىْءٍ مِنْ اَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ تَحْتَ قَدَمَىَّ مَوْضُوْعٌ وَدِمَاءُ الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوْعَةٌ وَاِنَّ اَوَّلَ دَمٍ اَضَعُ مِنْ دِمَائِنَا دَمُ ابْنِ رَبِيْعَةَ بْنِ الْحَارِثِ وَكَانَ مُسْتَرْضِعًا فِىْ بَنِىْ سَعْدٍ فَقَتَلَهٗ هُذَيْلٌ وَرِبَا الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوْعٌ وَاَوَّلُ رِبًا اَضَعُ

مِنْ رِبَانَا رِبَا عَبَّاسِ بْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ فَإِنَّهُ مَوْضُوْعٌ كُلُّهُ فَاتَّقُوا اللّٰهَ فِي النِّسَاءِ فَإِنَّكُمْ اَخَذْ تُمُوْهُنَّ بِاَمَانِ اللّٰهِ وَاسْتَحْلَلْتُمْ فُرُوْجَهُنَّ بِكَلِمَةِ اللّٰهِ وَلَكُمْ عَلَيْهِنَّ اَنْ لَا يُوْطِئْنَ فُرُشَكُمْ اَحَدًا تَكْرَهُوْنَهُ فَاِنْ فَعَلْنَ ذٰلِكَ فَاضْرِبُوْهُنَّ ضَرْبًا غَيْرَ مُبَرِّحٍ وَلَهُنَّ عَلَيْكُمْ رِزْ قُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِا لْمَعْرُوْفِ وَقَدْ تَرَكْتُ فِيْكُمْ مَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهٗ اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهٖ كِتَابُ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تُسْئَلُوْنَ عَنِّيْ فَمَا اَنْتُمْ قَائِلُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّيْتَ وَنَصَحْتَ فَقَالَ بِاَصْبَعِهِ السَّبَّابَةِ يَرْفَعُهَا اِلَى السَّمَاءِ وَيَنْكُتُهَا اِلَى النَّاسِ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ اَذَّنَ بِلَالٌ ثُمَّ اَقَامَ فَصَلَّى الظُّهْرَ ثُمَّ اَقَامَ فَصَلَّى الْعَصْرَ وَلَمْ يُصَلِّ بَيْنَهُمَا شَيْئًا ثُمَّ رَكِبَ حَتّٰى اَتَى الْمَوْقِفَ فَجَعَلَ بَطْنَ نَاقَتِهِ الْقَصْوَاءِ اِلَى الصَّخْرَاتِ وَجَعَلَ حَبْلَ الْمُشَاةِ بَيْنَ يَدَيْهِ وَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ فَلَمْ يَزَلْ وَاقِفًا حَتّٰى غَرَبَتِ الشَّمْسُ وَذَهَبَتِ الصُّفْرَةُ قَلِيْلًا حَتّٰى غَابَ الْقُرْصُ وَاَرْدَفَ اُسَامَةَ وَدَفَعَ حَتّٰى اَتَى الْمُزْدَلِفَةَ فَصَلّٰى بِهَا الْمَغْرِبَ وَالْعِشَاءَ بِاَذَانٍ وَاحِدٍ وَاِقَامَتَيْنِ وَلَمْ يُسَبِّحْ بَيْنَهُمَا شَيْئًا ثُمَّ اضْطَجَعَ حَتّٰى طَلَعَ الْفَجْرُ فَصَلَّى الْفَجْرَ حِيْنَ تَبَيَّنَ لَهُ الصُّبْحُ بِاَذَانٍ وَّاِقَامَةٍ ثُمَّ رَكِبَ الْقَصْوَاءَ حَتّٰى اَتَى الْمَشْعَرَ الْحَرَامَ فَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ فَدَعَاهُ وَكَبَّرَهٗ وَهَلَّلَهٗ وَوَحَّدَهٗ فَلَمْ يَزَلْ وَاقِفًا حَتّٰى اَسْفَرَ جِدًّا فَدَفَعَ قَبْلَ اَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ وَاَرْدَفَ الْفَضْلَ بْنَ عَبَّاسٍ حَتّٰى اَتٰى بَطْنَ مُحَسِّرٍ فَحَرَّكَ قَلِيْلًا ثُمَّ سَلَكَ الطَّرِيْقَ الْوُسْطٰى الَّتِيْ تَخْرُجُ عَلَى الْجَمْرَةِ الْكُبْرٰى حَتّٰى اَتَى الْجَمْرَةَ الَّتِيْ عِنْدَ الشَّجَرَةِ فَرَمَاهَا بِسَبْعِ حَصَيَاتٍ يُكَبِّرُ مَعَ كُلِّ حَصَاةٍ مِّنْهَا مِثْلَ حَصَى الْخَذْفِ رَمٰى مِنْ بَطْنِ الْوَادِيْ ثُمَّ انْصَرَفَ اِلَى الْمَنْحَرِ فَنَحَرَ ثَلَاثًا وَّسِتِّيْنَ بَدَنَةً بِيَدِهٖ ثُمَّ اَعْطٰى عَلِيًّا فَنَحَرَ مَا غَبَرَ وَاَشْرَكَهٗ فِيْ هَدْيِهٖ ثُمَّ اَمَرَ مِنْ كُلِّ بَدَنَةٍ بِبَضْعَةٍ فَجُعِلَتْ فِيْ قِدْرٍ فَطُبِخَتْ فَاَكَلَا مِنْ لَحْمِهَا وَشَرِبَا مِنْ مَرَقِهَا ثُمَّ رَكِبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَاَفَاضَ اِلَى الْبَيْتِ فَصَلّٰى بِمَكَّةَ الظُّهْرَ فَاَتٰى عَلٰى بَنِيْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ يَسْقُوْنَ عَلٰى زَمْزَمَ فَقَالَ انْزِعُوْا بَنِيْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ فَلَوْلَا اَنْ يَّغْلِبَكُمُ النَّاسُ عَلٰى سِقَايَتِكُمْ لَنَزَعْتُ مَعَكُمْ فَنَاوَلُوْهُ دَلْوًا فَشَرِبَ مِنْهُ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۸۸۶/۲ حدیث رقم (۱۴۷۔ ۱۲۱۸)

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں نو برس ٹھہرے رہے حج نہیں کیا لیکن عمرہ کیا جیسا کہ گزرا پھر لوگوں کو دسویں سال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے خبر دی گئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حج کا ارادہ رکھتے ہیں۔ پس مدینہ میں بہت زیادہ آدمی آئے پس ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ظہر وعصر کے مابین نکلے یعنی جبکہ پانچ دن ذیقعدہ میں سے باقی رہ گئے تھے۔ یہاں تک کہ ہم ذوالحلیفہ میں پہنچے۔ پس اسماء بنت عمیسؓ نے محمد بن ابی بکرؓ کو جنم دیا تو اسماء رضی اللہ عنہا نے کسی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا یعنی کہ میں احرام کے بارے میں کیا کروں؟ یعنی احرام باندھوں یا نہیں اور باندھوں تو کیونکر باندھوں؟ فرمایا غسل کر اور کپڑے کی لنگوٹ اور احرام باندھ۔ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد ذی الحلیفہ میں نماز پڑھی اور پھر اپنی اونٹنی قصواء پر سوار ہوئے جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کا نام ہے۔ یہاں تک کہ جب میدان بیداء پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کھڑی ہوئی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے باآواز بلند تلبیہ پڑھا' یعنی اے الٰہی! میں تیری خدمت میں حاضر ہوں اے

الٰہی میں تیری خدمت میں حاضر ہوں تیری خدمت میں حاضر ہوں تیرے لیے کوئی شریک نہیں ہے میں تیری خدمت میں حاضر ہوں۔ تحقیق نعمت، تعریف و بادشاہت تیرے ہی لئے ہے، تیرا کوئی شریک نہیں۔ جابر رضی اللہ عنہ نے کہا ہم اس سے پہلے حج کی نیت نہیں کرتے تھے اور نہ ہی ہم (حج کے مہینوں میں) عمرے کو جانتے تھے یہاں تک کہ جب ہم خانہ کعبہ کے نزدیک آئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجر اسود کو بوسہ دیا۔ یعنی اس پر ہاتھ رکھا اور بوسہ دیا پھر تین بار جلدی اور اکڑ کر خانہ کعبہ کے گرد طواف کیا اور چار بار آہستہ پھر مقام ابراہیم کے پاس تشریف لائے پھر یہ آیت تلاوت فرمائی اور فرمایا تم مقام ابراہیم کو یعنی اس کے حوالی کو جائے نماز بناؤ۔ پھر مقام ابراہیم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے درمیان اور خانہ کعبہ کے درمیان شمار کیا اور ایک روایت میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعتوں میں قل ھو اللہ احد اور قل یا یھا الکافرون پڑھی۔ پھر حجر اسود کی طرف لوٹے پس اس کو بوسہ دیا پھر مسجد کے دروازے سے نکلے یعنی باب الصفا سے صفا پہاڑ کی طرف نکلے۔ پس جب صفا پہاڑ کے قریب ہوئے تو یہ آیت تلاوت فرمائی تحقیق صفاء اور مروہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ یعنی اللہ کے دین کی نشانیوں میں سے ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میں شروع کرتا ہوں اس چیز کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ نے شروع کیا اس چیز کے ساتھ جیسے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے ذکر صفا کا کیا اور پھر مروہ کا کیا۔ اس طرح میں بھی پہلے صفا پر چڑھتا ہوں اور پھر مروہ پر چڑھوں گا۔ پس صفا کے ساتھ شروع کیا پس اس پر چڑھے یہاں تک کہ خانہ کعبہ کو دیکھا پھر بیت اللہ کے سامنے ہوئے پس پھر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت بیان کی۔ یعنی لا الہ الا اللہ کہا اور اس کی بڑائی بیان کی یعنی اللہ اکبر کہا اور کہا کہ کوئی معبود نہیں ہے مگر اللہ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے اسی کے لیے بادشاہت ہے اور اسی کے لیے تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے کوئی معبود نہیں مگر اللہ ایک ہے اس نے اپنا وعدہ پورا کیا یعنی اسلام کا بول بالا کرنے کا وعدہ کیا اور بندے کی مدد کی۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور کافروں کے گروہ کو شکست دی۔ تنہا یعنی خندق کی لڑائی میں پھر اس کے درمیان دعا کی۔ اس طرح تین بار کہا۔ یعنی ذکر کیا اور دعا کی اور پھر ذکر کیا اور دعا کی اس طرح تین مرتبہ کیا اور صفا سے اترے اور مروہ پہاڑ کی طرف چلے۔ یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک نشیبی میدان کی طرف پہنچے یعنی میدان کی بلندی سے پستی کی طرف آئے پھر دوڑے یہاں تک کہ جب چڑھنے لگے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں قدم یعنی نشیبی سے بلندی مروہ پر چڑھنے لگے۔ آہستہ چلے یعنی دوڑنا بند کر دیا یہاں تک کہ مروہ پر آئے پھر مروہ پر بھی ایسا ہی کیا جو صفا پر کیا تھا۔ یہاں تک جب آخری چکر مروہ پر ہوا۔ تو پکارا اس حالت میں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مروہ پر تھے اور لوگ پہاڑ کے نیچے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اگر میں اپنے معاملے کے بارے میں پہلے جانتا ہوتا جو کہ میں نے بعد میں جانا تو میں اپنے ساتھ ہدی نہ لاتا اور میں حج کو عمرہ بنا دیتا۔ پس جو شخص تم میں سے ایسا ہو کہ اس کے پاس ہدی نہ ہو پس چاہیے کہ حلال ہو جائے یعنی حج کے احرام سے باہر ہو جائے اور حج کو عمرہ بنا ڈالے۔ پس سراقہ بن مالک بن جعشم کھڑے ہوئے اور انہوں نے کہا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کیا اسی سال ہمارے لیے ہے یا یہ حکم ہمیشہ ہمارے لیے ہے۔ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈالیں اور فرمایا کہ عمرہ حج میں داخل ہو گیا ہے۔ دو مرتبہ فرمایا یعنی یہ حکم خاص اسی برس میں نہیں ہے بلکہ ہمیشہ کے لیے۔ یعنی حج کے مہینوں ہمیشہ کے لئے عمرہ کرنا جائز ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ یمن سے اکثر اونٹ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے لے کر آئے۔ یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ یمن کے حاکم بن کر گئے تھے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ارشاد فرمایا کیا تم پر احرام باندھتے وقت حج لازم تھا؟

جب تو نے حج کی نیت کی تھی تو کیا کہا تھا؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا اے الٰہی میں احرام باندھتا ہوں اسی چیز کے ساتھ کہ جس کے ساتھ تیرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام باندھا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میرے ساتھ ہدی ہے' میں احرام سے نکل نہیں سکتا۔ یعنی جب تم نے نیت کی ہے۔ تو میں حج و عمرے کا احرام باندھے ہوئے ہوں اور میرے ساتھ ہدی احرام سے میں نہیں نکل سکتا ہے۔ یہاں تک کہ عمرے اور حج سے فارغ نہ ہو جاؤں۔ پس تم بھی احرام سے نہ نکلو۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا پس یہ تمام اونٹ حضرت علی رضی اللہ عنہ یمن سے لائے تھے اور وہ اونٹ جن کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے ان کی تعداد سو (۱۰۰) تھی تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے کہا پس سب لوگ حلال ہوئے اور اپنے بال کتروائے یعنی جن کے ساتھ ہدی نہ تھی اور وہ عمرے سے فارغ ہونے کے بعد عمرے کے احرام سے نکل آئے۔ مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور وہ لوگ کہ جن کے ساتھ ہدی تھی وہ حلال نہ ہوئے پس جب کہ ترویہ کا دن آیا یعنی ذی الحجہ کی آٹھویں تاریخ تو منیٰ کی طرف متوجہ ہونے کا ارادہ فرمایا پس صحابہ رضی اللہ عنہم نے حج کا احرام باندھا۔ یعنی وہ لوگ جو عمرے کے احرام سے نکل آئے تھے اپنے عمرے سے فارغ ہونے کے بعد اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سوار ہوئے یعنی جب آفتاب طلوع ہوا اور منیٰ میں پہنچے پس منیٰ میں نماز پڑھی۔ یعنی مسجد خیف میں ظہر اور عصر اور مغرب اور عشاء اور فجر تک ٹھہرے رہے یعنی نماز فجر ادا کرنے کے بعد تھوڑی دیر ٹھہرے رہے یہاں تک سورج نکل آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیمے لگانے کا حکم کیا جو بالوں کا بنا ہوا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وادیٔ نمرہ میں خیمہ کھڑا کیا جائے پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ سے عرفات کی طرف چلے اور قریش گمان نہیں کرتے تھے مگر یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حج کے لیے مشعر حرام کے پاس ٹھہرے ہونگے جیسے کہ قریش زمانہ جاہلیت میں کرتے تھے پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مزدلفہ سے گزرے یہاں تک کہ میدان عرفات میں آئے پس خیمہ جو کہ وادیٔ نمرہ میں کھڑا کیا گیا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں اُترے اور اس میں ٹھہرے یہاں تک کہ جب دوپہر ڈھلی۔ قصوا کو لانے کا حکم کیا جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کا نام تھا۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے زین کسی گئی پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اونٹنی پر سوار ہو کر وادیٔ نمرہ میں تشریف لائے پھر لوگوں کو خطبہ دیا اور ارشاد فرمایا تمہارے خون اور تمہارے مال یعنی آپس میں ایک دوسرے کا خون نہ کرو اور کسی کا مال چوری دغا بازی سے نہ کھاؤ تمہارے اس دن یعنی عرفہ کی حرمت کی طرح اور تمہارے اس مہینے یعنی ذی الحجہ کی حرمت کی طرح اور تمہارے اس شہر یعنی مکہ کی حرمت کی طرح تم پر حرام قرار دیئے ہیں یعنی جیسے تم حرام جانتے ہو کسی کا مال لینے سے اور اس دن میں خون کرنے سے اور اس مہینے میں اور اس شہر میں۔ اس طرح سے ہمیشہ اور ہر جگہ خون کرنا اور ناحق مال لینا۔ آپس میں حرام ہے خبردار امر جاہلیت کی ہر چیز میرے قدموں کے نیچے رکھی گئی ہے اور پست و پامال ہے یعنی باطل و موقوف ہے یعنی جو کچھ کسی نے کہا اسلام سے پہلے میں نے معاف کر دیا اور جو جاہلیت کی رسمیں تھیں موقوف کر دیں اور جاہلیت کے خون موقوف کر دیئے یعنی نہ اس میں قصاص ہے اور نہ دیت اور نہ کفارہ اور تحقیق سب سے پہلا خون میں اپنے خونوں میں سے معاف کرتا ہوں وہ خون ابن ربیعہ بن حارث کا ہے اور وہ بنی سعد کے ہاں دودھ پیتا تھا۔ اس کو ہذیل نے قتل کیا تھا اور جاہلیت کے سود کو موقوف کیا گیا اور سب سے پہلا سود اپنے سودوں میں حضرت عباس بن عبد المطلب کا ہے تحقیق وہ بالکل موقوف کر دیا گیا۔ پھر عورتوں کے حق کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ پس تحقیق تم نے ان کو اللہ کی امان کے ساتھ لیا۔ یعنی اس کے عہد کے ساتھ لیا ہے ان کے حقوق کی رعایت میں اور تم نے ان کی شرمگاہوں کو اللہ کے حکم کے ساتھ حلال کیا۔ فانکحوا ہے اور تمہارا ان پر حق ہے کہ وہ تمہارے بچھونوں پر کسی ایسے

شخص کو نہ آنے دیں کہ تم جس کو ناپسند سمجھتے ہو۔ یعنی تمہاری مرضی کے بغیر کسی کو گھر میں آنے کی اجازت نہ دیں۔ خواہ مرد ہو یا عورت۔ پس اگر یہ کام کریں یعنی آنے کی اجازت دیں پس ان کو سختی کے بغیر مارو اور ان کا حق تم پر بھی ان کی روزی یعنی کھانا پینا اور اسی کے حکم میں داخل ہے اپنے مکان اور ان کا کپڑا اپنے وسعت کے مطابق دو اور تحقیق میں نے تم میں ایک ایسی چیز چھوڑی ہے کہ تم ہرگز گمراہ نہیں ہوں گے جب تک اس کو مضبوط سے تھامے رکھو گے اور اس پر عمل کرتے رہو گے۔ اگر تم چنگل ماروں گے اس چیز کے ساتھ جو کتاب اللہ میں ہے اور تم سے میرے بارے میں دین کے احکامات کو پہنچانے اور نہ پہنچانے سے متعلق پوچھا جائے گا۔ پس تم کیا جواب دو گے؟ تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے جواب دیا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دیں گے کہ تحقیق آپ نے پیغمبری پہنچا دی اور آپ نے امانت ادا کر دی اور آپ نے خیر خواہی کی پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت کی انگلی کو آسمان کی طرف اٹھایا اور اس کو لوگوں کی طرف جھکایا اور تین مرتبہ فرمایا اے الٰہی گواہ رہ گواہ رہ۔ یعنی اپنے بندوں کے اقرار پر گواہ رہو پھر حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان دی پھر تکبیر کہی پھر نماز پڑھی۔ پھر تکبیر کہی پھر عصر کی نماز پڑھی اور ان دونوں کے درمیان کچھ نہیں پڑھا یعنی نہ سنت اور نہ نفل۔ پھر سوار ہوئے یہاں تک کہ میدانِ عرفات میں موقف کی جگہ تشریف لائے۔ پس اپنی قصواء اونٹنی کا پیٹ پتھروں کی طرف کیا اور جبل مشاۃ کو اپنے آگے کیا۔ جو کہ ایک جگہ کا نام ہے اور قبلے کے سامنے ہوئے پس مسلسل کھڑے رہے یہاں تک کہ آفتاب غروب ہوا اور زردی جاتی رہی۔ یہاں تک کہ آفتاب غائب ہوا اسامہ رضی اللہ عنہ کو پیچھے سوار کیا اور جلدی چلے یہاں تک کہ مزدلفہ میں آئے پھر اس میں ایک اذان اور دو تکبیروں کے ساتھ مغرب وعشاء کی نمازیں پڑھیں اور ان دونوں کے درمیان کوئی نماز نہیں پڑھی نہ سنت اور نہ نفل پھر لیٹے رہے یہاں تک فجر طلوع ہوئی پھر فجر کی نماز پڑھی۔ اس وقت کہ ان کے واسطے فجر اذان اور تکبیر کے ساتھ ظاہر ہوئی پھر اونٹنی پر سوار ہوئے یہاں تک مشعر حرام پر آئے۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم قبلہ کے سامنے کھڑے ہوئے اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی اور تکبیر کہی اور لا الہ الا اللہ کہا اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت بیان کی۔ یعنی لا الہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ...... ۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل کھڑے رہے یہاں تک کہ صبح خوب روشن ہو گئی پھر آفتاب کے نکلنے سے پہلے چلے اور فضل بن عباسؓ کو پیچھے سوار کیا اور وادی محسر میں پہنچے۔ پس سواری کو تھوڑی سی حرکت دی۔ پھر درمیان کے راستے میں سے جمرہ عقبہ کے پاس پہنچے یہاں تک کہ جمرہ کے پاس آئے جو کہ ایک درخت کے پاس ہے پس اس پر خذف کی کنکریوں کی طرح سات کنکریاں پھینکیں یعنی جو انگلیوں میں رکھ کر پھینکتے ہیں۔ ان کی مقدار کو بیان کرنا مقصود ہے وہ باقلا کے دانے کے برابر تھیں' ان کنکریوں میں سے ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکریاں وادی کے اندر سے ماریں۔ پھر قربانی کی جگہ کی طرف لوٹ گئے جو کہ منیٰ میں ہے۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تریسٹھ (۶۳) اونٹ اپنے ہاتھ سے ذبح کئے' باقی یعنی سینتیس حضرت علی نے ذبح کیے' اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنی ہدی میں شریک کیا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر اونٹ میں سے ایک ایک گوشت کا ٹکڑا لیا پھر یہ ٹکڑے ایک ہانڈی میں ڈالے گئے پس ٹکڑے پکائے گئے پس دونوں صاحبوں نے اس قربانی کے گوشت میں سے کھایا اور دونوں نے اس کا شوربہ پیا۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سوار ہوئے اور خانہ کعبہ کی طرف چلے اور طواف کیا پس مکہ میں ظہر کی نماز پڑھی پھر عبد المطلب کی اولاد کے پاس آئے یعنی اپنے چچا عباس رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد کے پاس تشریف لائے کہ وہ زمزم کا پلاتے تھے اور اولاد عبد المطلب سے زمزم کا پانی کھنچواتے تھے اس لیے کہ یہ بہت ثواب کی بات ہے اگر مجھے

خوف نہ ہوتا اس کا کہ لوگ تم پر غلبہ کریں گے۔تمہارے پانی پلانے پر تو البتہ میں بھی تمہارے ساتھ پانی کھینچتا۔یعنی خوف صرف اس بات کا ہے کہ لوگ مجھے کھینچتا ہوا دیکھ کر میری اتباع کریں گے۔اور ازدحام (بھیڑ) کریں گے اور یہ منصب تمہارے ہاتھ سے جاتا رہے گا۔اگر اس کا خوف نہ ہوتا تو میں بھی تمہارے ساتھ کھینچتا تو اولاد عبدالمطلب نے آپ ﷺ کو ڈول دیا حضور ﷺ نے اس سے پیا اور اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله :مكث بالمدينة تسع سنين لم يحج......فخرجنا معه:** ''مکث'' کاف کے ضمہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ حج سنہ ۶ ھ میں فرض ہوا تھا۔بعض نے ۸ ھ اور بعض نے ۹ ھ ذکر کیا ہے۔جیسا کہ پہلے گزرا۔

ثم أذن في الناس: اور ایک نسخہ میں صیغہ مجہول کے ساتھ اُذِّن ہے یعنی ایک منادی نے آپ ﷺ کے حکم سے اعلان کیا۔

ان رسول الله ﷺ حاجٌّ: ایک نسخہ میں ''حاجٍ'' کسرہ کے ساتھ ہے تو پھر یہ بھی مقولہ میں سے ہوگا۔

قوله : ''**فقدم المرينة بشر كثير**'' تاکہ اللہ کے اس ارشاد کا تحقق ہو: ﴿**يأ توك رجالا**﴾ کہ تیرے پاس آئیں گے پیدل: ﴿**وعلى كل ضامر**﴾ اور ہر کمزور اونٹ پر، (**يأتون من كل فج عميق**﴾ [الحج: ۲۷] دور راستے سے: ﴿**ليشهدوا منافع لهم**﴾ [الحج: ۲۸] تاکہ دنیوی، دینی اور اخروی فائدوں کو حاصل کر سکے اور ایک روایت میں ہے کہ ہر ایک تلاش کرے گا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی اقتداء کرے اور ان جیسے عمل کرے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس حج میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ نوے ہزار آدمی تھے اور بعض حضرات نے ایک لاکھ تیس ہزار تعداد بتائی ہے، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے حج ایک بوسیدہ کجاوہ پر کیا جس کی قیمت چار درہم کے مساوی تھی۔

قوله :فخرجنا معه حتى اذا اتينا......واحرمي واستثفري بثوب:

حتى اذا اتينا ذا الحليفة: ''یہاں تک کہ جب ہم ذی الحلیفہ آئے'' تو آپ ﷺ نے وہاں قیام فرمایا اور عصر کی نماز دو رکعت پڑھی اور وہی رات گزاری اور مغرب، عشاء اور فجر اور ظہر کی نماز بھی وہاں پڑھی، اور آپ ﷺ کی تمام بیویاں آپ ﷺ کے ساتھ تھی، تو اس رات آپ ﷺ نے ان سب کے پاس چکر لگایا پھر دوسری مرتبہ احرام کیلئے غسل فرمایا جو پہلے بار جماع کیلئے غسل کے علاوہ تھا۔اور مسلم نے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے ظہر کی نماز ذوالحلیفہ میں پڑھی پھر اپنی اونٹنی کو منگوایا اور اس کے کان کے دائیں جانب کو زخمی کیا اور اپنے ہاتھ سے اس کے خون کا صاف کیا جیسا کہ ایک روایت میں ہے یا انگلی سے صاف کیا جیسا کہ دوسری روایت میں ہے۔اور اس کے گلے میں دو جوتوں کا تلادہ باندھا، اور ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے اونٹنی کے بارے میں حکم دیا تو اس کے کوھان کے دائیں جانب کو کاٹا گیا، (یعنی اس کا اشعار کیا گیا) اور اس سے خون صاف کیا اور قلادہ باندھا۔اور ایک روایت میں ہے کہ اونٹنی کے بارے میں حکم دیا تو اس کے کان کو دائیں جانب سے کاٹا گیا اور پھر اس کا خون صاف کیا گیا اور دو جوتوں کا قلادہ باندھا اور اشعار یعنی کان کو زخمی کرنا قلادہ سے مقدم ہونا جیسا کہ مسلم کی روایت میں ہے زیادہ اولیٰ ہے قلادہ کے مقدم ہونے سے اگرچہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اشعار کا تقدیم ضروری ہے اور ابن عمر کے فعل سے بھی یہی ثابت ہے۔

قوله :فولدت اسماء بنت عميس محمدبن ابى بكر: ''عمیس'' تصغیر کے ساتھ ہے۔

قوله :فصلى رسول الله ﷺ في المسجد ثم ركب القصواء:

یعنی احرام کی دو رکعت نفل نماز مسجد ذوالحلیفہ میں پڑھی، ابن العجمی، منسک میں فرماتے ہیں کہ اگر میقات میں مسجد ہو تو مسجد ہی میں یہ

دو رکعت پڑھنا زیادہ اولیٰ ہے ہاں اگر کوئی شخص مسجد کے علاوہ کسی دوسری جگہ پڑھ لے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں اور اگر بغیر نماز کے احرام باندھ لیا تو بھی جائز ہے نیز اوقات مکروہ میں یہ نماز نہ پڑھی جائے اور تحیۃ المسجد کی طرح فرض بھی اس نماز کے قائم مقام ہو جاتی ہے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز پڑھی تھی ابن قیم کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ظہر کی نماز کے علاوہ احرام کیلئے دو رکعت نماز منقول نہیں ہے۔ اور ابن حجرؒ کی یہ بات بوسیدہ اور عجیب ہے کہ انہوں نے ابن قیم کا تعقب کرتے ہوئے کہا ہے کہ بات اس طرح نہیں ہے جیسا کہ ابن قیم کا زعم ہے صحیحین میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ذوالحلیفہ میں دو رکعت نماز پڑھتے تھے اور پھر جب مسجد ذوالحلیفہ کے پاس سواری پر آپ بیٹھ جاتے اور سواری سیدھی ہو جاتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم تلبیہ کہتے (انتہی) اور اس کے کلام کا اعجب مخفی نہیں ہے کیونکہ اس حدیث میں ان کے مدعیٰ پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

''القصواء'' قاف کے فتحہ اور مد کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں قاف کے ضمہ اور قصر کے ساتھ ہے جو کہ خطا ہے جیسا کہ شرح مسلم میں ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کا نام ہے۔

کہا گیا ہے کہ جس کے کان کٹے ہوئے ہوا سکو جدع کہتے ہیں اور جب وہ کٹا ہوا ایک چوتھائی تک پہنچے تو اسکو قصو کہتے ہیں اور اگر اس سے زیادہ ہو جائے تو اسکو عضب کہتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ قصواء اسکو کہتے ہیں جس کے کان کے اطراف کٹے ہوئے ہو۔

اور بعض نے کہا ہے کہ اس اونٹنی کو اس کی تیز رفتاری کی وجہ سے قصواء کہتے تھے۔

محمد بن ابراہیم تیمی التابعی کہتے ہیں کہ قصواء اور جدعاء دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ہی اونٹنی کے نام تھے۔

قولہ :حتی اذااستوت ......اھل بالتوحید: ''اھل بالتوحید'' ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ احرام باندھا صرف حج کا آواز بلند کرتے ہوئے، اور اس بات میں تکلف کا ہونا مخفی نہیں ہے اور ابن حجر کی یہ بات بھی عجیب ہے کہ انہوں نے اس سے استدلال کیا ہے کہ آپ علیہ السلام کا حج، حج افراد تھا: اور ظاہر یہ ہے کہ اس کا معنی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید یعنی تلبیہ پر آواز بلند کی اور اس کا بیان لبیك اللھم لبیك الخ ہے اور اس میں امام ابوحنیفہؒ کی دلیل ہے کہ احرام کی نیت کے صحت کیلئے تلبیہ کا ملانا شرط ہے پس تلبیہ، تکبیر تحریمہ کے بمنزلہ ہے جو نماز کی ادائیگی میں نیت سے ملا ہوتا ہے اسی وجہ سے ہر ذکر اس کا قائم مقام ہے۔

قولہ :لبیك اللھم لبیك: ''لبیك'' ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ مصدر مثنیٰ ہے اور تثنیہ سے مراد تکثیر ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں ہے: ﴿ثم ارجع البصر کرتین﴾ [الملک:۴] یعنی کئی بار۔ اور یہ لازم النصب اور اضافت ہے جیسا کہ آپ نے دیکھا اور ناصب اس کا من غیر لفظہ ہے تقریر یوں ہے اجبت اجابتك اجابة بعد اجابة الیٰ مالانھایة لہ گویا کہ یہ الب بالمکان سے ماخوذ ہے یہ اس وقت بولتے ہیں جب کسی جگہ قیام کرے۔ تو اس سے اس کا معنی معلوم ہو سکتا ہے لہٰذا یہ مصدر ہے۔ بحذف الذوائد۔

''لبیك'' کا معنی ہے دعوت کو قبول کرنا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت اور اعلان کو قبول کرنا ہے اور اس کا جواب ہے جیسا کہ حاکم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو کہا اے رب میں تو فارغ ہو گیا ہوں تو اللہ نے فرمایا ﴿أذن فی الناس بالحج﴾ ترجمہ: اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو۔ (بیان القرآن) ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ یارب میری آواز کیسے پہنچے گی ان تک، تو اللہ نے فرمایا آپ اعلان کرے اور آواز پہنچانا میرا کام ہے تو ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا کہ کیا کہوں؟ تو اللہ نے فرمایا کہ کہو اے لوگوں اللہ نے تم پر حج فرض کیا ہے پرانے گھر کا حج۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا تو آسمان وزمین کے درمیان تمام لوگوں نے اس کو سن لیا۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ لوگ زمین کے آخری کنارے سے تلبیہ کہتے ہوئے آتے ہیں۔

حاکم کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے اور شیخین نے اس کی تخریج نہیں کی ہے اور حاکم نے اس کی ایک اور طریق سے تخریج کی

ہے اوران کے علاوہ نے الفاظ کی کمی زیادتی کے ساتھ اس کی تخریج کی ہے۔اورازرقی نے تاریخ مکہ میں عبداللہ بن سلام سے روایت کیا ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ وہ لوگوں میں اعلان کردے توقام علی المقام حتی اشرف علی ما تحته الحدیث اورمجاہد سے روایت ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوئے اور فرمایا اے لوگوں اپنے رب کے اعلان کو قبول کرلوتو لوگوں نے کہالبیك اللھم لبیك پس جس نے حج کیا تو یہ ان لوگوں میں سے ہے جن نے اس دن ابراہیم علیہ السلام کے اعلان کو قبول کیا تھا۔

قوله :ان الحمد والنعمة لك والملك: صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہے نہ کہ فتح کے ساتھ۔ابن ہمام فرماتے ہیں یعنی عمدہ وجہ یہی ہے۔ورنہ نفس جواز کے طور پر فتح بھی جائز ہے۔کسرہ کی صورت میں ثناء میں استیناف ہوگا اور تلبیہ ذات کیلئے ہوگا اور فتح کی صورت میں یہ تلبیہ کیلئے علت ہوگا۔

یعنی میں حاضر ہوں کیوں کہ تعریف اور نعمت تیرے لیے ہے اور ملک اور حکمرانی تیرے لیے ہے۔اوراس میں کوئی شک نہیں کہ اجابت جس کی کوئی انتہاء نہیں اس کو ذات کے ساتھ معلق کرنا اس صفت کے اعتبار سے اولیٰ ہے۔اگر چہ کسرہ کے ساتھ استیناف ثناء متعین نہیں ہے کیونکہ جائز ہے کہ وہ علت مستانفہ ہو۔جیسا کہ تیرے اس قول میں ''علم ابنك العلم ان العلم نافعه'' اوراللہ کے اس قول میں: ﴿وصل علیھم إن صلاتك سكن لھم﴾[التوبة:۱۰۳] یہ علم اصول میں علت کے مسلکوں میں ثابت ہے لیکن جب دونوں میں سے ایک جائز ہے تو اس کو اول پر حمل کیا جائے گا اس کے اولیٰ ہونے کی وجہ سے برخلاف فتح کے کیوں کہ اس میں صرف علت ہی کا احتمال ہے۔

قوله : ''لاشریك لك'' یعنی ان میں سے کوئی آپ کا شریک نہیں اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت جابر فرماتے ہیں ''اھل الناس بھذا الذی یھلون به'' اوررسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں سے کسی بات کورد نہیں کیا اوررسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تلبیہ کو لازم پکڑا۔

قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں اشارہ ہے اس روایت کی طرف جس میں لوگوں کے تلبیہ ہی میں ذکر وثناء کے زیادہ کرنے کا بیان ہے جیسا کہ شرح مسلم میں ہے۔

قوله : ''لسنا نعرف العمرة'' یہ جملہ پہلے جملہ لسنا ننفر الا الحج کی تاکید کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

مطلب اس کا یہ ہے کہ ہم اشہرالحج میں عمرہ کو جائز نہیں سمجھتے تھے زمانہ جاہلیت کی عادت کے مطابق، کہ ایام جاہلیت میں یہ معمول تھا کہ لوگ حج کے مہینوں میں عمرہ کرنے کو بڑا گناہ سمجھتے تھے۔اوربعض نے اس کا یہ مطلب ذکر کیا ہے کہ ہم حج کے ساتھ عمرہ کو ملا کر کرنے کو نہیں جانتے تھے یا حج کے مہینوں میں عمرہ ادا کرنے کو نہیں جانتے تھے۔

بخاری نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ صحابہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے اور وہ حج کے سواء کچھ نہیں جانتے تھے۔تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کیلئے احرام کے اقسام اور طریقے بیان کیے اوران کیلئے حج کے مہینوں میں عمرہ ادا کرنے کو جائز قرار دیا۔اورفرمایا جو عمرہ کا احرام باندھنا چاہیے تو وہ عمرہ کا احرام باندھے اور جو حج کا احرام باندھنا چاہیے تو وہ حج کا احرام باندھے۔

قوله : حتی اذا أتینا البیت معه: یعنی جب ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیت اللہ پہنچے یعنی پہلے ہم ذی طویٰ میں اترے اور رات کو وہیں قیام کیا اور پھر ۴ ذوالحجہ کو نہادھو کر ثنیا علیا کی طرف سے مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے اور پھر باب السلام کی جانب سے مسجد احرام میں آئے اور وہاں تحیۃ المسجد کی نماز نہیں پڑھی کیونکہ بیت اللہ کا طواف ہی وہاں کا تحیہ ہے پھر برابر، آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل چلتے رہے یہاں تک کہ حجر اسود کو بوسہ دیا۔

''استلم الركن'' رکن سے مراد حجر اسود ہے۔اوراستلام، السلام سے افتعال کے وزن پر ہے ''التحیة'' کے معنی میں ہے اوراہل یمن رکن کو الحیا کا نام دیتے ہیں کیونکہ لوگ اس کو سلام کے ساتھ تحیہ کرتے ہیں اوربعض نے کہا ہے کہ یہ السلام، سین کے کسرہ کے ساتھ

سے ماخوذ ہے، پتھر کو کہتے ہیں۔ کہا جاتا **استلم الحجر** جب اس کو لمس کرے اور بوسہ لے۔ یہاں استلام کا معنی ہے کہ اس پر پیشانی بھی رکھنا۔

''**فرمل ثلاثاً**'': رمل کہتے ہیں کندھے ہلاتے ہوئے دوڑنا اور تیز چلنا۔

یعنی تین بار سات چکروں میں اور چار میں اپنے ہیئت پر چلے اور ان تمام چکروں میں آپ ﷺ اضطباع کیے ہوئے تھے۔

قوله :ثم تقدم الی مقام ابراهيم...... فقرأ :......قل ياايها الكافرون﴾:

''**ثم تقدم**'' اور مسلم کے ایک تصحیح شدہ نسخہ میں ''**نفذ**'' نون، ناء اور ذال کے ساتھ ہے جو توجہ کے معنی میں ہے۔

''**مقام ابراهيم**'' میم کے فتحہ کے ساتھ ابراہیم علیہ السلام کے کھڑے ہونے کی جگہ۔

''**واتخذوا**'' خاء کے کسرہ کے ساتھ امر ہے اور فتحہ کے ساتھ بھی ہے اس صورت میں یہ خبر ہوگا۔

''**مصلیً**'' تنوین کے ساتھ ہے نمازِ طواف کی جگہ مراد ہے۔

اور پھر آپ ﷺ نے دو رکعت نماز پڑھی اور ان دو رکعتوں میں **قل هو الله احد** اور **قل يأيها الكافرون** پڑھی اور کی عبارت سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ **قل هو الله احد** پہلے پڑھی اور **قل يأيها الكافرون** بعد میں، اس لیے علماء نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ یہاں عبارت میں واؤ مطلق جمع کیلئے ہے نہ کہ ترتیب کیلئے لہٰذا کوئی اشکال باقی نہ رہا۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں صحیح مسلم اور شرح السنۃ میں یہ حدیث اسی طرح ہے اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سورۃ کافرون سورہ اخلاص مقدم ہے جیسا کہ مصابیح کی روایت میں ہے۔ اور اس میں یہ نکتہ ہوسکتا ہے کہ سورۃ اخلاص اللہ کی وحدانیت کے اثبات اور اظہار کیلئے ہے اور سورۃ الکافرون شرک سے بیزاری کیلئے ہے اسی لیے توحید کی عظمت اور اس کی اہمیت کی سب سے زیادہ ہونے کی بناء پر اس کو مقدم کیا اور **قل يأيها الكافرون** کو مقدم کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ اس میں معبودانِ باطلہ کی نفی کو اثبات واجب الوجود پر مقدم کیا ہے جیسا کہ کلمہ توحید میں ہے۔

پھر یہ جان لیجئے کہ مقام ابراہیم کی جگہ اور محل اب بھی وہی ہے جو آپ ﷺ کے زمانہ میں تھا صحیح قول کے مطابق اور جو سالم بن عبد اللہ نے حضرت عبداللہ ابن عمر سے نقل کیا ہے کہ مقام ابراہیم اور بیت اللہ کے درمیان چار ذراع کا فاصلہ تھا پھر جب لوگ زیادہ ہوگئے اور جگہ تنگ ہوگئی تو حضرت عمر نے اس کو موجودہ جگہ تک مؤخر کر دیا تو یہ حدیث غریب ہے اور بعض ائمہ نے اسی کو لیا ہے۔ نوویؒ فرماتے ہیں کہ حدیث کے مذکورہ جملے کا مطلب ہے کہ آپ ﷺ نے پہلی رکعت میں فاتحہ کے بعد **قل يايها الكافرون** پڑھی اور دوسری رکعت میں فاتحہ کے بعد **و ل هو الله احد** پڑھی۔

اور بیہقیؒ نے صحیح سند کے ساتھ مسلم کی شرط پر جعفر بن محمد عن ابیہ عن جابر کی سند سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے بیت اللہ کا طواف کیا اور رمل کیا حضر اسود سے تین بار، پھر دو رکعت نماز پڑھی اور ان میں **قل يايها الكافرون** اور **قل هو الله احد** پڑھی۔

قوله :''**ثم رجع الی الرکن**'': یہ صحیح طور پر ثابت ہے کہ آپ ﷺ جب طواف سے فارغ ہوگئے تو حجر اسود کو بوسہ دیا اور اس پر دونوں ہاتھ رکھے اور ان کو اپنے چہرے پر ملا اور یہ کہ آپ ﷺ نے اس کو بوسہ دیا اور اس پر سجدہ کیا بلکہ یہ بھی صحیح طور پر ثابت ہے کہ آپ ﷺ حجر اسود کی طرف لوٹنے کے بعد زمزم پر گئے اور اسے پیا اور اس سے اپنے سر پر پانی ڈالا، پھر لوٹے اور حجر اسود کو بوسہ دیا۔

''**شعائر الله**'' شعیرۃ کی جمع ہے ان علامات کو کہتے ہیں جو مقرر ہے ان اطاعات کیلئے جن کا حج میں حکم ہے جیسے وقوف عرفہ، رمی، سعی، طواف۔

''**أبدأ بما بدأ الله به**'': ''**أبدأ**'' صیغہ متکلم کے ساتھ ہے۔ ترتیب ذکری کا امر شرعی میں اعتبار ہوتا ہے استحبابی طور پر یا وجوبی

طور پر، اگر چہ آیت میں واو مطلق جمع کیلئے ہے۔نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نسائی میں اس حدیث میں صحیح سند کے ساتھ أبدأو اصیغہ جمع کے ساتھ ثابت ہے۔ بہرصورت یہ سعی کے وجوب پر دلالت کرتا ہے نہ کہ رکنیت پر، بلکہ صحابہ اوران کے علاوہ نے اس کوظاہر آیت کی وجہ سے نقل کیا ہے۔

آیت کا سبب نزول حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ ذکر کیا ہے کہ جب عروہ بن زبیر نے ان سے پوچھا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ یہ آیت اسی طرح نازل ہوئی کیونکہ انصار صفا اور مروہ کے درمیان سعی میں حرج محسوس کرتے تھے یعنی اس کے گناہ ہونے سے ڈرتے تھے۔تو انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

باقی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول جو امام شافعی وغیرہ نے سند حسن کے ساتھ نقل کیا ہے اور حاکم نے مستدرک میں اور ابن سکین نے صحاح میں نقل کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سعی کی جگہ میں لوگوں کا سامنا کیا تو فرمایا:''**یایها الناس اسعوا فان الله کتب علیکم السعی**'' اے لوگو سعی کرو کہ اللہ نے تم پر سعی لازم کی ہے۔

تو یہ وجوب کا فائدہ دیتا ہے نہ کہ رکن ہونے کا اور اس کی سند متکلم فیہ ہے اگر چہ ابن عبد البر وغیرہ نے اس کا جواب دیا ہے، حاصل یہ ہے کہ آیت اور حدیث دونوں کی دلالت ظنی ہے رکن یہ ہے کہ آیت اور حدیث دونوں کی دلالت ظنی ہے رکن ہونے کا فائدہ نہیں دیتا۔

''**فرقی**'' قاف کے کسرہ کے ساتھ صعد کے معنی میں ہے۔''**قال**'' اذا کا جواب ہے اور ایک تصحیح شدہ نسخہ میں فقال، فاء کے زیادہ کے ساتھ ہے اور جن نسخوں میں''**نادیٰ وهو علی المروة والناس تحته فقال**'' ہے تو اسکی کوئی اصل نہیں ہے۔

''**علی المروة**'' کان کے متعلق ہے۔''**فاستقبل القبلة**''ضمیر کی جگہ اسم ظاہر لا کر اس بات کو واضح کیا کہ بیت اللہ ہی قبلہ ہے اور اس بات پر تنبیہ کی کہ مقصود بالذات قبلہ کی طرف توجہ ہے نہ کہ خصوصی طور پر بیت اللہ کا دیکھنا، اور بیت اللہ اب بغیر اوپر زیادہ چڑھے بھی نظر آتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ پیدل آدمی کے قد کے بقدر چڑھنے سے نظر آتا ہے۔

قوله : ''**لا اِله الا الله**'' یہ یا تو سابق کیلئے تفسیر ہے اور تکبیر اس کے معنی سے مستفاد ہے اور یا سابق کے علاوہ قول ہے یہ علامہ طیبی کا قول ہے اور ظاہر یہی ہے کہ یہ دوسرا قول ہے اور گویا کہ یہ وحدہ کیلئے اجمال اور تفصیل ہے۔

''**وحده**'' حال مؤکدہ ہے یعنی **منفردا بالألوهية یامتوحدا بالذات** کی تاویل میں ہے۔

''**لا شریك له**''**فی الألوهية**،تو یہ تاکید ہوگا یا **فی الصفات** تو پھر تاسیس ہوگا اور یہ زیادہ اولیٰ ہے جیسا کہ مخفی نہیں ہے۔

''**وله الحمد**''یعنی اچھی تعریف اسی کیلئے دنیا و آخرت میں ثابت ہے نہ کہ اس کے غیر کیلئے اور امام شافعیؒ نے ایک صحیح روایت میں یہ الفاظ''**یحییٰ ویمیت**''زائد ذکر کیے ہیں۔

''**نصر عبده**''یعنی مقام اختصاص میں اپنے بندہ خاص کی زبردست مدد کی اور واضح فتح نصیب کی۔

''**وهزم الاحزاب وحده**''علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ لشکر ہیں جو خندق کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جمع ہوئے تھے اور اللہ نے ان کو بغیر لڑائی کے شکست دی (انتہیٰ) اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد کفار کے وہ مختلف انواع ہوں جو شکست اور فرار کے ساتھ مغلوب ہوئے۔

قوله :ثم دعا بین ذلك ،قال مثل ذلك ثلاث مرات :

''**ثم دعا......**'' یہاں لفظ''ثم''محض ترتیب کیلئے ہے نہ کہ تراخی کیلئے۔

ابن الملک فرماتے ہیں کہ ماقبل میں جو لا اِله الا الله کہا تھا اُس کی طرف اشارہ ہے۔لیکن اس کے اور متصور کے درمیان واضح

بعد ہے۔علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ لفظ ثم دلالت کررہا ہے کہ دعاء اس ذکر سے مؤخر تھی اور کلمہ بین کا تقاضہ ہے کہ دعاء ذکر کے درمیان میں ہوجیسا کہ علی کل شئ کے بعد دعاء کرے۔اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے وھزم الاحزاب وحدہ کے بعد دعاء کی جس طرح چاہا پھر ذکر کرکے لوٹے پھر تیسری بار پھر لوٹے (انتہیٰ) جواب کی صحیح وجہ ظاہر نہیں ہورہی پس ہم کہتے ہیں واللہ اعلم بالصواب کہ یہ قول ''قال مثل هذا ثلاث مرات'' جملہ حالیہ ہے اور تقدیر عبارت یوں ہے: ''ثم دعا بين ذلك ، والحال انه قد قال ﷺ مثل هذا الذكر ثلاث مرات: یا ہم کہتے ہیں کہ بین بمعنی وصل اور فرقۃ کے آیا ہے یعنی دعا کی اس حال میں کہ ذکر سابق کو دعا لاحق کے ساتھ ملانے والے تھے یا جدا کرنے والے تھے۔

حاصل یہ ہے کہ آپ ﷺ نے پہلی بار ذکر سے فارغ ہونے کے بعد اور تیسری بار شروع کرنے سے پہلے دعا کی۔

قوله :ثم نزل ومشى الى المروة ...... كما فعل على الصفا:

''حتّٰی انصبت قدماه'' انحدرت کے معنی میں ہے اور یہ مجاز ہے عرب کے اس قول سے حب الماء فانصب۔

''بطن الوادی'' مراد دوڑنے کی جگہ ہے اور یہ اصل میں پہاڑوں کے درمیان راستہ کو اور ٹیلہ کو کہا جاتا ہے جیسا کہ قاموس میں ہے یعنی پاؤں آسانی سے زمین کے پست حصہ میں پہنچے۔

''ثم سعٰی'' یعنی تیزی کے ساتھ دوڑے۔''ثم سعٰی'' مصابیح اور مشکوٰۃ کے بعض نسخوں میں اسی طرح ہے اور اصول مصحہ میں یہ موجود نہیں ہے اور اس پر علامہ طیبی کا قول جو قاضی عیاض سے نقل کیا ہے وہ دلالت کررہا ہے کہ قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں ایک کلمہ ساقط ہے جس کا ہونا ضروری ہے اور وہ کلمہ ''رَمَلَ'' ہے ''فی بطن الوادی'' کے بعد جیسا کہ مسلم کے علاوہ کی روایت میں ہے۔اسی طرح ذکر کیا ہے حمیدی نے ،اور موطأ میں رَمَلَ کی جگہ سعٰی ہے۔نووی فرماتے ہیں کہ یہ رمل کے معنی میں ہے۔اور مسلم کے بعض نسخوں میں بھی موطأ کی طرح واقع ہے۔'' ملا علی قاری فرماتے ہیں'' کہ رمل بمعنی سعٰی کے ہے نہ کہ سعٰی بمعنی رمل کے۔

''حتّٰی اذا صعِدتا'' عین کے کسرہ کے ساتھ ہے جیسا کہ تصحیح شدہ نسخوں میں ہے: ای ارتفعت قدماه اور جس نسخے میں جمع متکلم کے صیغہ کے ساتھ ہے تو وہ تصحیف ہے اور ایک نسخہ میں اصعدنا ہمزہ کے ساتھ ہے۔اور مصابیح میں ''اذا صعدت قدماه'' ہے۔

شارح مصابیح کہتے ہیں کہ ''ای اخذت قدماه فی الصعود'' اور اصعادہ زمین میں جانے اور چڑھنے یا اترنے میں دوری کو کہتے ہیں (انتہیٰ) اور قاموس میں ہے ''صعد فی السلم کسمع، وصعد فی الجبل وعلیه، تصعیدًا اور صعدفیه نہیں سنا گیا ہے۔اور اصعد فی الارض کا معنی ہے زمین میں چلنا۔اور فی الوادی کا معنی ہے اترنا۔اور علامہ طیبی کہتے ہیں کہ اصعاد مطلقًا ذهاب فی الارض کو کہتے ہیں۔حدیث میں اس کا معنی ہے قدمین کا بطن وادی سے اونچی جگہ کی طرف اٹھ جانا کیونکہ یہ انصبت قدماه کے مقابلہ میں ہے جس کا معنی ہے اترائی میں داخل ہوئے اور اس کے مطابق ہم کہتے ہیں کہ اصعدنا ہمزہ کے ساتھ والا نسخہ راجح ہے۔واللہ اعلم۔

''کما فعل علی الصفا'' یعنی اوپر چڑھے استقبالِ بیت اللہ کیا' ذکر اور دعا کی۔

حدیث کے الفاظ سے اور اس کے ماقبل کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے سوار ہو کر سعی نہیں کی اور یہ وجوب کا فائدہ دیتا ہے جبکہ عذر نہ ہو' آپ ﷺ کے اس ارشاد کی وجہ سے ''خذوعی مناسککم'' باقی جو مسلم کی روایت میں آپ ﷺ کے سوار ہونے کا ذکر ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا کہ تیرے قوم کا خیال ہے کہ سعی میں سواری سنت ہے،تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ انہوں نے سچ بولا ہے اور جھوٹ بولا ہے: آپ ﷺ پر لوگوں نے ہجوم کرلیا' اور کہنے لگے کہ یہ محمد ﷺ ہیں یہ محمد ﷺ ہیں۔ یہاں تک کہ دوشیزائیں

گھروں سے باہر نکل گئی اور لوگ آپ ﷺ کے سامنے نہیں چلتے تھے۔ جب لوگوں کا رش بڑھ گیا تو آپ ﷺ سوار ہوگئے اور پیدل چلنا اور سعی کرنا افضل ہے۔تو یہ روایت جو ہم نے پہلے ذکر کی اس کے منافی نہیں ہے بلکہ یہ اس کو اور مضبوط کر رہی ہے کیونکہ یہ حدیث محمول ہے آپ ﷺ کے عمرۃ القضاء کے سعی پر جیسا کہ ابوداؤد نے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے عمرہ القضاء میں سوار ہوکر طواف کیا تا کہ لوگ آپ ﷺ کی بات سن لیں اور آپ کی جگہ دیکھ لیں اور لوگوں کے ہاتھ آپ کو مس نہ کریں کیونکہ لوگ آپ ﷺ سے منع نہیں کر رہے تھے۔

قولہ :"قال" اذا کا جواب ہے اور ایک تصحیح شدہ نسخہ میں فقال، فاء کی زیادتی کے ساتھ ہے اور جن نسخوں میں "**نادیٰ وھو علی المروۃ والناس تحته فقال**" ہے تو اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

"**لم اسق**" سین کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ "**الھدی**": نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "**الھدی**" دال کے سکون کے ساتھ ہے اور دال کے کسرہ اور یاء کی تشدید کے ساتھ بھی ہے اور دال کے فتحہ اور یاء کی تخفیف کے ساتھ بھی ہے۔

"**فلیحل**" حاء کے کسرہ کے ساتھ یعنی حلال ہو جائے اور احرام سے نکل جائے۔

"**ولیجعلھا**" واؤ مطلق جمع کیلئے ہے کیونکہ "**جعل**" خروج سے مقدم ہے کیونکہ جعل سے مراد فسخ ہے اور وہ اس طرح ہے کہ حج کی نیت فسخ کر کے اس کے افعال منقطع کر دے اور احرام عمرہ کیلئے کر دے یا واؤ عطف تفسیری ہے۔

"**لوأني استقبلت من امری......**": یعنی اگر میری یہ رائے جو اس وقت ہے اگر شروع میں اور حج کیلئے نکلتے وقت بنتی تو میں ساتھ قربانی کا جانور نہ لاتا اور نہ ہی اس کے گلے میں قلادہ باندھتا اور نہ ہی اس کا اشعار کرتا۔

کیونکہ جب آدمی قربانی کا جانور ساتھ لیجائے تو وہ احرام سے نہیں نکلتا یہاں تک کہ اس کو ذبح کر دے اور اس کو یوم النحر سے پہلے ذبح نہیں کر سکتا تو اس کیلئے عمرہ کے ذریعے حج فسخ کرنا درست نہیں برخلاف اس شخص کے جو قربانی کا جانور ساتھ لے کر نہ جائے کہ اس کیلئے حج فسخ کرنا جائز ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ بات آپ ﷺ نے صحابہؓ کی دلجوئی کیلئے فرمائی تھی کہ ان کیلئے افضل وہی ہے جس کی طرف آپ ﷺ نے ان کو بلایا ہے کیونکہ صحابہؓ پر آپ ﷺ کی متابعت کو ترک کرنا گراں گزر رہا تھا۔اور یا اس وجہ سے کہ ان پر آپ ﷺ کی بات گراں گزری کہ وہ ان دنوں میں عورتوں کے پاس جانے کو حج ادا کرنے سے پہلے مناسب نہیں سمجھتے تھے، جیسا کہ حضرت جابر کی حدیث میں منقول ہے کہ صحابہؓ نے کہا کہ ہم عرفہ جائیں گے اس حال میں کہ ہمارے مذاکیر سے منی ٹپک رہی ہوگی۔ اس حدیث سے تمتع کو افضل کہنے والوں نے استدلال کیا ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بارے میں صریح ہے کہ آپ ﷺ متمتع نہ تھے۔

اس حدیث سے اور اس کے ساتھ ایک اور حدیث جس میں ہے "**من احرم لعمرۃ واھدیٰ فلا یحل حتیٰ ینحر ھدیه**" "کہ جس نے عمرہ کا احرام باندھا اور قربانی کا جانور ساتھ لے کر گیا تو وہ احرام سے نہیں نکلے گا یہاں تک کہ قربانی کو ذبح کرے"۔ سے امام ابوحنیفہ اور امام احمد نے استدلال کیا ہے کہ حج تمتع کرنے والا جب جانور ساتھ لے کر جائے تو وہ عمرہ کے احرام سے حلال نہیں ہو سکتا، یہاں تک کہ یوم النحر کو اس ہدی یعنی قربانی کے جانور کو ذبح کر دے: لیکن امام شافعی اور مالک کہتے ہیں کہ محض افعال عمرہ کی ادائیگی کے بعد احرام سے باہر آنا جائز ہے۔خواہ ہدی ساتھ لایا ہو یا ساتھ نہ ہو۔اور انہوں نے استدلال کیا ہے حاجی کے احرام سے باہر آنے پر قیاس کرتے ہوئے اگر چہ اس نے ہدی کا نحر نہ کیا ہو۔لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ نص کے مقابلہ میں قیاس کرنا ممتنع ہے۔ باقی اس روایت کا جو انہوں نے جواب دیا ہے کہ یہ روایت، مسلم کی روایت جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کی ہے جو حضرت جابر کی اس روایت کے بعد آ رہی

ہے سے مختصر کی گئی ہے اس میں ہے ''**من كان معه هدى فليهلل بالحج والعمرة. ثم لا يحل حتى يحل منهما جميعًا**'' تو یہ حضرات فرماتے ہیں کہ یہ واضح کر رہا ہے کہ اس روایت میں حذف ہے اور وہ یہ ہے **ومن احرم لعمرة فليهل بحج ولا يحل حتى ينحر هديه** ''یعنی کہ یہ مستحب ہے کیونکہ یہ اتفاقی مقام ہے'' لیکن یہ تاویل اس وقت متعین ہوگی جب دونوں روایتوں کا مضمون اور راوی ایک ہو۔ اور یہ واضح طور پر محل نظر ہے۔

کیونکہ امر اصل میں وجوب کیلئے ہے اور وجوب سے ندب کی طرف بغیر کسی صارف کے نہیں پھیرا جا سکتا پھر ان کے قول ''**ومن احرم بعمرة فليهل بحج**'' سے عمرہ کا فسخ حج کے ذریعے لازم آتا ہے حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں ہے۔ اور نوویؒ کا قول ہے کہ حج کے احرام کو عمرہ کی طرف فسخ کرنے میں علماء کا اختلاف ہے اور اکثر اس کو ممنوع قرار دیتے ہیں اور اس روایت کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ یہ اس سال کے ساتھ خاص تھا کیونکہ مقصود ان کو زمانہ جاہلیت کے طریقوں سے پھیرنا تھا اور ان کے دلوں میں حج کے مہینوں میں عمرہ کے جواز کو بٹھانا تھا اور اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو بلال بن حارث سے ہے کہ انہوں نے کہا کہ اللہ کے رسول ﷺ حج کا فسخ کرنا ہمارے لیے خاص ہے یا ہمارے بعد والوں کیلئے بھی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا تمہارے لیے خاص ہے۔

قوله :فقام سراقة بن مالك بن جعشم ......لا بل لأبد أبد: ''**سراقة**'' سین کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

''**جعشم**'' جیم اور شین کے ضمہ کے ساتھ ہے اور ان کو فتحہ بھی دیا جاتا ہے۔

''**في الاخرىٰ**'' عامل مضمر کی وجہ سے منصوب ہے اور حال مؤکدہ ہے۔ اس کو ذکر کیا ہے علامہ طیبی رحمہ اللہ نے۔ یا ایک ہاتھ کی انگلیاں مراد ہے نہ کہ ایک انگلی تو اس صورت میں بدل کل ہوگا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ منصوب ہو اصابعہ سے بدل بعض ہونے کی وجہ سے۔

''**بل لأبد أبد**'' اس کو تاکید کے واسطے مکرر ذکر کیا۔

کہا گیا ہے کہ اس کا مطلب ہے کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کا جائز ہونا قیامت تک ہے اور مقصود اس سے زمانہ جاہلیت کے اس گمان کو باطل کرنا تھا کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کرنا جائز نہیں ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ یہی مطلب جمہور کے نزدیک ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ عمرے کا حج میں داخل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ عمرہ کی فرضیت ساقط ہوگئی ہے حج کی فرضیت سے، لیکن اس پر یہ اشکال ہے کہ عمرہ فرض کب ہوا تھا کہ اس کی فرضیت ساقط ہوگئی۔ نوویؒ فرماتے ہیں کہ حدیث کا سیاق اس مطلب کے بطلان کا تقاضا کر رہا ہے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ قران جائز ہے۔ اور تقدیر عبارت یہ ہے ''**دخلت افعال العمرة فى الحج الىٰ يوم القيامة**'' کہ عمرہ کے افعال قیامت تک کیلئے حج میں داخل ہو گئے اور اس پر آپ ﷺ کا انگلیوں کو ایک دوسرے میں داخل کرنا دلالت کر رہا ہے، لیکن اس پر یہ اعتراض ہے کہ اس مطلب کے مطابق سوال اور جواب کے درمیان کوئی مناسبت باقی نہیں رہتی۔ پس آپ غور کریں صحیح وجہ آپ کے سامنے ظاہر ہوگا اور بعض کہتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ حج کا فسخ کرنا عمرہ کیلئے درست ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ عمرہ کے ساتھ اس فسخ حج کے بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ آیا یہ اس سال میں صرف صحابہؓ ہی کے لئے تھا یا ہمیشہ کے لئے دوسروں کو بھی ایسا جائز ہے؟ چنانچہ امام احمدؒ اور اہل ظاہر کی ایک جماعت نے تو یہ کہا ہے کہ یہ فسخ حج صرف صحابہؓ ہی کے لئے نہیں تھا بلکہ یہ حکم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باقی ہے۔ لہٰذا اس شخص کے لئے جو حج کا احرام باندھے اور ہدیٰ اس کے ساتھ نہ ہو یہ جائز ہے کہ وہ حج کا احرام عمرہ کے ساتھ فسخ کر دے اور افعال عمرہ کی ادائیگی کے بعد حلال ہو جائے یعنی احرام کھول دے جب کہ امام اعظم ابو حنیفہؒ امام مالکؒ امام شافعیؒ اور علماء سلف وخلف کی اکثریت کا کہنا یہ ہے کہ یہ حکم صرف اسی سال میں صحابہؓ کے لئے تھا کہ زمانۂ جاہلیت میں حج کے مہینوں میں عمرہ کرنے کو جو حرام سمجھا جاتا تھا اس کی تردید ہو جائے۔

لیکن اس فسخ کے منع ہونے اور بیان مخصص کیلئے کلام دلیل کا محتاج ہے پھر میں نے ابوذرؓ کی وہ حدیث دیکھی جو جمہور کی دلیل ہے مسلم نے اس کو روایت کیا ہے: **کانت المتعة فی الحج لاصحاب محمد خاصة**'' کہ حج میں فسخ اصحاب محمد ﷺ کیلئے خاص تھا اور حدیث نسائی میں ہے:

''**یا رسول الله فسخ الحج للعمرة لناخاصة ام للناس عامة**''تو آپ ﷺ نے فرمایا''**لنا خاصة**''اور ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ جب سرف مقام پر ٹھہرے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حیض آیا بعد اس کے کہ وہ آپ ﷺ سے سن چکی تھی کہ آپ ﷺ فرمارہے تھے:''**من لم یکن معه هدی فاحب أن یجعلها عمرة فلیفعل، ومن کان معه هدی فلا**''تو عائشہؓ رونے لگی تو آپ ﷺ نے فرمایا''**ما یبکیك**؛''تو عائشہؓ نے وہ بات ذکر کی جو آپ ﷺ سے سن چکی تھی اور یہ کہ اس کے سبب سے اس کے حیض کی وجہ سے وہ عمرہ نہیں کر سکے گی، تو آپ ﷺ نے فرمایا''**لا یضرك انما انت من بنات آدم کتب الله علیك ما کتب علیهن فکونی فی حجك**''، شیخین نے یہ حدیث روایت کی ہے اور ایک روایت میں ہے''**فافعلی ما یفعله الحاج غیر ان لا تطوفی بالبیت حتی تطهری**''اس روایت میں جو تصریح ہے کہ حضرت عائشہؓ حج کا احرام باندھی ہوئی تھیں۔ یہ بخاری کی اس روایت کا معارض ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:''**وکنت فیمن أهل بعمرة**''اور احمد کی روایت میں''**ولم اسق هدیًا**''کے الفاظ زائد ہیں۔اور ایک روایت حضرت عائشہؓ سے ہے:''**خرجنا مع رسول الله** ﷺ **نلبی لا نذکر حجًا لا عمرة**''ان روایات کو بایں طور جمع کیا گیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے صرف حج کا احرام باندھا تھا جیسا کہ بعض صحابہ نے کیا تھا۔ پھر آپ ﷺ نے ان کو حج کے ذریعہ عمرہ فسخ کرنے کا حکم دیا تو حضرت عائشہؓ نے ایسا ہی کیا تو وہ تمتع ہوگیا پھر جب وہ مکہ میں حیض کی حالت میں داخل ہوگئی تو اس کیلئے طواف کرنا مشکل ہوگیا تو آپ ﷺ نے حکم دیا کہ وہ حج کا احرام باندھے۔

اور امام مالک نے حضرت عائشہؓ کے عمرہ کے احرام باندھنے کی روایت کو رد کیا ہے۔ ابن عبدالبر مالکیؒ نے اس کی یہ تاویل کی ہے کہ وہ اس طور پر ہے کہ عمرہ کو فسخ کرنا اور اس کو حج بنانا اس کا کوئی قائل نہیں ہے۔

برخلاف حج کو عمرہ کی طرف فسخ کرنا کہ اس کے جواز میں اب تک اختلاف ہے اور عمرہ کو بالکلیہ ترک کرنا غیر ثابت ہے پس علماء کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ اس میں یہ احتمال ہے کہ آپ ﷺ کا ان کو عمرہ کے چھوڑنے کے حکم سے مراد عمرہ سے حلال ہونے کو ترک کرنا اور اس پر حج کو داخل کرنا تھا تاکہ وہ حج قران ہوجائے یہ بات ابن حجر نے ذکر کی ہے۔لیکن یہ احتمال رد ہوجاتا ہے آپ ﷺ کے ان کو بال کھولنے اور کنگھی کرنے کے حکم دینے سے۔اور مسلم کی روایت سے جس میں ہے''**فامسکی من العمرة**''یعنی عمرہ کو چھوڑنے کہ وجہ سے اس کے اعمال سے رک جانا۔ باقی ابن حجر کا یہ کہنا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جو یہ کہا تھا:''**وارجع بحج**''یہ اس لیے کہ اس کا یہ اعتقاد تھا کہ عمرہ حج سے الگ کرنا افضل عمل ہے۔لیکن یہ تاویل مسند احمد کی روایت سے رد ہوجاتا ہے جس میں ہے''**وارجع أنا بحجة لیس معها عمرة؟**''اور یہ ہمارے ائمہ کے قول کے بارے میں صریح ہے کہ حضرت عائشہؓ نے عمرہ چھوڑ کر صرف حج کیا تھا۔اور اس سے ائمہ نے یہ اخذ کیا ہے کہ عورت نے اگر حج تمتع کیلئے عمرہ کا احرام باندھا ہو اور طواف سے پہلے وہ حائضہ ہوگئی تو اس کیلئے جائز ہے کہ وہ عمرہ چھوڑ کر صرف حج کا احرام باندھ لے۔اور اسی طرح جب وقت میں تنگی ہو اور قارن نے افعال عمرہ کی ادائیگی سے قبل وقوف عرفہ کیا تو وہ عمرہ کو چھوڑنے والا ہوا پس وہ اس کی قضاء کرے گا۔اس پر دم لازم ہوگا، اور یہ مسلم کی اس روایت کے منافی نہیں ہے۔جس میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے احرام باندھا عمرہ کا۔بس سرف مقام میں ان کو حیض آیا تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا''**اهلی بالحج**''یعنی حج کا احرام باندھ لے۔

پس جب وہ پاک ہوگئی اور طواف کیا اور سعی کی وقوف کے بعد تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا ''قد حللت من حجك وعمرتك'' تو آپ نے یہ اس لیے فرمایا تھا کہ اس نے عمرہ کے افعال کو ترک کر دیا تھا نہ کہ عمرہ کو حج کے ساتھ فسخ کر دیا تھا۔ کیونکہ اس کا کوئی قائل نہیں ہے جیسا کہ امام مالک نے فرمایا ہے: پھر جب انہوں نے شکایت کی کہ وہ دل میں یہ وسوسہ پا رہی ہے کہ میں نے صرف حج کے بعد طواف کیا اور باقی لوگ حج اور عمرہ کامل دونوں کر کے لوٹ رہے ہیں تو آپ ﷺ نے تنعیم سے ان کو عمرہ کرایا۔

باقی جو مسلم کی روایت ہے ''طوافك يسعك لحجتك وعمرتك'' اس کا مطلب ہے کہ فی الجملہ آپ کا طواف دونوں کا قائم مقام ہے اور یہ کہ وہ عمرہ کے احرام سے نکل گئی ہے۔

قوله :وقدم علیؓ من اليمن...... فان معی الهدی فلا تحل:

''ببدن النبی ﷺ'' باء کے ضمہ اور دال کے سکون کے ساتھ بدنۃ کی جمع ہے' یہاں اس سے مراد قربانی کے اونٹ ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہؓ کو پایا کہ وہ عمرہ سے حلال ہو چکی ہے اور رنگے ہوئے کپڑے پہن چکی ہیں اور سرمہ لگایا ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس پر نکیر فرمائی۔ نوویؒ فرماتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خیال یہ تھا کہ یہ ناجائز ہے: تو فاطمہؓ نے فرمایا کہ میرے والد نے مجھے یہ حکم دیا ہے۔ حضرت علی چونکہ ان دنوں عراق میں تھے تو وہ فرماتے ہیں کہ میں چلا رسول اللہ ﷺ کی طرف اس حال میں کہ مجھے فاطمہؓ کے کیے ہوئے پر غصہ تھا رسول اللہ ﷺ سے پوچھنے کیلئے اس بات کے بارے میں جو فاطمہؓ نے ذکر کی تھی۔ تو میں نے آپ ﷺ کو خبر دی کہ میں فاطمہؓ کیلئے پر نکیر کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ انہوں نے سچ بولا ہے سچ بولا ہے۔

''حين فرضت الحج'' یعنی جب تو نے حج اپنے اوپر نیت اور تلبیہ کے ساتھ لازم کیا اللہ کا ارشاد ہے ﴿فمن فرض فيهن الحج﴾ ترجمہ: سو جو شخص ان میں حج مقرر کرے۔ (بیان القرآن)

''اهل بما أهل به رسولك'' ابن الملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ دلالت کر رہا ہے آدمی کا اپنا احرام دوسرے کے احرام پر معلق کرنے کے جواز پر۔

تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب تو نے اپنا احرام میرے احرام پر معلق کر دیا ہے تو میں نے عمرہ کا احرام باندھا ہے اور میرے ساتھ قربانی کا جانور ہے تو میں عمرہ کے احرام سے نہیں نکل سکتا تو آپ بھی عمرہ سے نہ نکلے یہاں تک کہ حج اور عمرہ دونوں سے فارغ ہو جائیں۔

''فان معی'' یاء کے سکون اور فتحہ دونوں کے ساتھ ہے۔

قوله :فحل الناس كلهم......ومن كان معه هدی:

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ بعض کا کہنا ہے کہ یہ عام مخصوص ہے کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے احرام نہیں کھولا تھا اور نہ ہی ان لوگوں میں سے تھی جو جانور ساتھ لے کر گئے تھے۔ ملا علی قاری کہتے ہیں شاید حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حج، عمرہ کے ساتھ فسخ کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا یا وہ عمرہ کرنے والی تھی اور ان کو عمرہ پر حج داخل کرنے کا حکم دیا گیا تا کہ وہ قارن ہو جائے۔ جیسا کہ عنقریب آ رہا ہے۔

''وقصروا'' علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ انہوں نے بال کٹوائے حالانکہ حلق کرنا افضل ہے تا کہ ان کے کچھ بال باقی رہے جو حج میں حلق کر سکیں (انتہی) اور ان کے بال حج کے میزان میں بھی ان کے اجر کے زیادہ ہونے کا سبب بنے اور تا کہ وہ مقصرین اور محلقین دونوں میں داخل ہو جائیں۔ اور رخصت وعزیمت دونوں کو جمع کرنے والے ہو جائیں۔

قوله :فلما كان يوم التروية......فسار رسول الله ﷺ :

''يوم التروية'' آٹھ ذی الحجہ کو کہتے ہیں اس کا نام یہ اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس دن حجاج سیراب ہوتے ہیں اور پانی پیتے ہیں اور

جانوروں کو پلاتے ہیں اور بعض نے وجہ تسمیہ یہ ذکر کی ہے کہ یہ ترّ دی سے ہے بمعنی تفکر کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس دن حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبح کے بارے میں سوچ وفکر کی تھی کہ وہ کیا کریں یہاں تک کہ دس ذی الحجہ کو ان کا پختہ ارادہ بنا ذبح کرنے کا۔

''منیً'' تنوین کے ساتھ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ بغیر تنوین کے ہے اور اس کو الف کے ساتھ لکھا جائے گا اور اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ان دنوں میں خون بہایا جاتا ہے یا اس وجہ سے اس کو منیٰ کہتے ہیں کہ حجاج کو افعال کے مکمل کرنے پر ان کے آرزو عطاء کیے جاتے ہیں۔ منیٰ آرزو کو کہتے ہیں۔

''ثم مكث'' کان کے فتحہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ ہے۔ ''من شعر'' عین کے فتحہ اور سکون دونوں کے ساتھ ہے۔

''تُضرب'' صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

''بنمرة'' نون کے فتحہ اور میم کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ یہ غیر منصرف ہے۔ عرفہ کے دائیں طرف خارج میں واقع ایک جگہ کا نام ہے۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ عرفات کے قریب ایک پہاڑ ہے جو عرفات میں سے نہیں ہے۔

''المشعر'' عین کے فتحہ کے ساتھ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ کسرہ کے ساتھ ہے۔

قوله : ''ولا تشك قريش الا انه واقف عندمشعر الحرام'': علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ قریش کو شک نہیں بلکہ یقین تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مناسک حج میں ان کی مخالفت کریں گے سوائے وقوف کے کہ اس کے بارے میں ان کو یقین تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی موافقت کریں گے، کیونکہ اہل حرم مشعر الحرام جو مزدلفہ میں ایک پہاڑ ہے جس کو قزح کہا جاتا ہے کے پاس وقوف کرتے تھے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ پورے مزدلفہ کا نام ہے یہی جمہور مفسرین اور محدثین کا قول ہے اور یہی مطلب ہے اس قول کا۔ (جیسا کہ قریش زمانہ جاہلیت میں کیا کرتے تھے) اور کہتے تھے کہ ہم حرم کے محافظ ہیں پس ہم اس سے نکلتے نہیں۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ بعثت سے قبل آپ صلی اللہ علیہ وسلم قریش ہی کی موافقت فرماتے تھے' لیکن حقیقت ایسی نہیں ہے جیسا کہ بعض روایات میں صراحۃً آیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے قبل بھی عام لوگوں کے ساتھ وقوف فرماتے تھے۔ جیسا کہ درمنثور میں مذکور ہے۔

''فاجاز رسول الله ﷺ'' یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم مزدلفہ سے آگے بڑھے اور وہاں وقوف نہیں کیا اور ضب کے راستے سے چل پڑے ضب کنویں کے متصل ایک پہاڑ کا نام ہے۔ عرفہ جاتے ہوئے دائیں طرف آتا ہے۔

''فنزل بها'' یہ دلالت کر رہا ہے کہ محرم کیلئے خیمہ وغیرہ کے ذریعے سایہ حاصل کرنا جائز ہے امام مالک اور احمد، کجاوہ وغیرہ سے سایہ کے حصول کو جائز نہیں کہتے۔

''فرحلت له'' مجہول اور مخفف ہے یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے اس پر کجاوہ باندھا گیا۔

''فاتی بطن الوادی'': ''بطن الوادی'' عرفات میں ایک جگہ ہے جس کو عرنۃ کہا جاتا ہے۔

یہ عرفات کا حصہ نہیں ہے۔ اس میں امام مالک کا اختلاف ہے اور اس میں مسجد ابراہیم جو آج موجود ہے کا کچھ حصہ ہے۔ مسجد ابراہیم کے بانی کے بارے میں اختلاف ہے صحیح یہ ہے کہ اس کی نسبت ابراہیم خلیل علیہ السلام کی طرف ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے اس کو مصلیٰ بنایا۔ اور بعض نے کہا ہے ابراہیم قیسی ہے جس کی طرف مسجد کے ایک دروازے کی نسبت ہے یہ بنوعباس کے ابتدائی دور میں تھے اس کی طرف منسوب ہے کیونکہ وہ اس کے بانی ہے۔ یا نئے سرے سے بنانے والے ہیں۔

قوله :فخطب الناس......فی بلدكم هذا:

''تحت قدمی'' تثنیہ کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں مفرد ہے اور اول مبالغہ پر زیادہ دلالت کر رہا ہے۔

''موضوع''یعنی اس شئی کی طرح جس کو پاؤں تلے رکھا جائے۔ یہ مجاز ہے اس کے ابطال سے۔عرب اس چیز کے بارے میں کہتے ہیں کہ جس کا لوٹنا اور اس کا ذکر پھر نہ ہو **جعلت ذلك دبر أذني وتحت قدمي**۔

آپ ﷺ نے دو خطبے پڑھے پہلے خطبے میں تو حج کے احکام بیان کیے اور عرفات میں کثرت ذکرو دعا پر ترغیب دلائی، دوسرا خطبہ پہلے خطبے کے بنسبت چھوٹا تھا اس میں صرف دعا تھی۔اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ جب امام اس دوسرے خطبہ کیلئے کھڑا ہو جائے تو مؤذن اقامت کیلئے کھڑا ہو جائے تا کہ دونوں ایک ساتھ فارغ ہوں۔جیسا کہ بیہقیؒ نے بیان کیا ہے۔

''**في بلد كم هذا**''اس میں تاکید ہے کہ اموال اور ابدان کی حرمت کے تشبیہ میں حرمت زمان اور مکان کو جمع کیا ہے۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ برلف ونشر مشوش ہو، بایں طور کہ حرمۃ نفس، حرمۃ بلد کی طرح ہو کیونکہ یہ اپنی جگہ ثابت اور برقرار ہے اور حرمۃ مال، حرمۃ زمان کی طرح ہو کیونکہ مال آنے جانے والا ہے اور اس میں حرمت نفس کی قوت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ حرمت بلد مؤید ہے اور حرمت زمان مؤقت ہے۔لیکن اس کے باوجود اس کے منسوخ ہونے سے نفس و مال کی حرمت کا نسخ لازم نہیں آتا۔کیونکہ وہ اس کا تابع نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور تشبیہ **من كل الوجوه** لازم نہیں ہے۔اسی لیے علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ تحریم کی تشبیہ عرفہ، ذی الحجہ اور شہر مکہ کے ساتھ دی ہے کیونکہ عرب اس میں کسی چیز کے استباحت کو سخت حرام سمجھتے تھے۔

قوله :الا كل شيء من امر الجاهلية ......فقتله هذيل :

''**تحت قدمي**''تثنیہ کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں مفرد ہے اور اول مبالغہ پر زیادہ دلالت کر رہا ہے۔

''موضوع''یعنی اس شئی کی طرح جس کو پاؤں تلے رکھا جائے۔ یہ مجاز ہے اس کے ابطال سے۔عرب اس چیز کے بارے میں کہتے ہیں کہ جس کا لوٹنا اور اس کا ذکر پھر نہ ہو **جعلت ذلك دبر أذني وتحت قدمي**۔

''**من دمائنا**''یعنی جس کا اہل اسلام استحقاق رکھتے ہیں یہ ایک قول ہے۔اور ظاہر یہ ہے کہ **دمائنا** سے مراد اقارب کا خون ہے اسی لیے علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ قتل اور خون کے معاف کرنے میں اپنے اہل واقارب سے ابتداء کی تا کہ سامعین کے دلوں میں بات مضبوطی سے بیٹھ جائے اور اس کی اجازت کے طمع کا دروازہ بند ہو جائے۔

''**دم ابن ربيعه**'' ربیعہ کے بیٹے کا نام ایاس تھا یہ چھوٹا بچہ تھا گھروں کے درمیان گھٹنوں کے بل چلتا تھا اور سعد کی ھذیل کے ساتھ جنگ کے دوران ان کو روکا اور ہذیل نے اس طرح اس کو قتل کر دیا۔حارث بن عبدالمطلب آپ ﷺ کے چچا تھے عمر میں آپ ﷺ سے بڑے تھے اور آپ ﷺ سے ان نے روایت بھی کی ہے حضرت عمرؓ کے خلافت میں وفات پائی۔

تصحیح روایت:بعض راویوں نے اس کو **دم ربيعة بن الحارث** روایت کیا ہے اور بخاری کی روایت بھی یہی ہے اور اسی طرح اہل علم کی بڑی جماعت اس روایت میں خطاء کر گئی ہے کیونکہ درست **دم ابن ربيعة** ہے اور اس میں تصحیح اس طور پر ممکن ہے کہ کہا جائے کہ دم کی اضافت ربیعہ کی طرف اس لیے کی ہے کہ ولی دم وہ تھے یا حذف مضاف کے ساتھ ہے قصہ کے شہرت پر اعتماد کرتے ہوئے مضاف کو حذف کیا ہے۔

''مسترضعًا''مفعول کا صیغہ ہے''یوطئن''ہمزہ کے ساتھ اور ابدال ہمزہ کے ساتھ باب افعال سے ہے۔

قوله :وربا الجاهلية موضوع ......فانه موضوع كله:

''ربا عباس بن عبدالمطلب'' کہا گیا ہے کہ یہ بدل ہے ربانا سے اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ یہ خبر ہے۔

''**موضوع كله**''تاکید بعد تاکید ہے۔

مراد اس سے ان کے غصب کیے ہوئے اور لٹے ہوئے اموال ہے اور ربا کو خاص کرنا ذکر میں تاکید کیلئے ہے کیونکہ یہ شروع کی صورت میں فی الجملہ معقول نظر آتا ہے۔

قوله :ولكم عليهن ان لايوطئن فرشكم......رزقهن و كسوتهن بالمعروف: علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس جملے کا مطلب ہے کہ وہ عورتیں، شوہروں کے گھروں میں کسی کو آنے کی اجازت نہ دیں اور ممانعت مردوں اور عورتوں دونوں کو شامل ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ وہ کسی اجنبی مردوں کو اجازت نہ دیں کہ وہ ان کے پاس آکر باتیں کریں۔ عرب کی عادت یہ تھی کہ وہ اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔ جب آیت حجاب نازل ہوئی تو وہ اس سے منع ہو گئے، اور یہ زنا سے کنایہ نہیں ہے ورنہ تو پھر سزا رجم ہے نہ کہ مار۔

''مبرح'' راء مکسورہ کی شد کے ساتھ ہے یعنی زخمی کرنے والا یا زیادہ مشقت والا۔

قوله :"فاتقو الله فى النسآء

''**فاتقو الله فى النسآء**'': فاء فصیحہ ہے علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ مصابیح کی روایت میں واؤ کے ساتھ ہے اور یہ دونوں درست ہیں اور اس کا ماقبل پر عطف ہے معنوی طور پر، یعنی اللہ سے ڈرو خون کے مباح جاننے اور اموال لوٹنے اور عورتوں کے بارے میں۔

''**بكلمة الله**'' ایک نسخہ میں **بكلمات الله** ہے۔

قوله :" وقد تركت فيكم ما......اللهم اشهده ثلاث مرات:

''**فيكم ما**'': ما موصولہ ہے یا موصوفہ ہے الذمو افعل مقدا کی وجہ سے ہے۔

''**كتاب الله**'' نصب کے ساتھ بدل ہے یا بیان ہے کیونکہ ابہام کے بعد تفسیر شان قرآن کی تفخیم ہے۔ اور رفع بھی جائز ہے کہ یہ مبتداء محذوف کی خبر ہو جو کہ ھُوَ ہے۔

''**كتاب الله**'' صرف کتاب پر اکتفاء اس لیے کیا کہ کتاب سنت پر عمل کرنے کو مشتمل ہے اللہ کے اس ارشاد کی وجہ سے ﴿**اطيعوا الله واطيعوا الرسول**﴾[النساء:۵۹]

اور اللہ کا ارشاد ﴿**وما آتاكم الرسول فخذوه وما نهاكم عنه فانتهوا**﴾[الحشر:۷] اور جو دے تم کو رسول، سو لے لو، اور جس سے منع کریں سو چھوڑ دو، موضح القرآن (حشر)۔ پس کتاب پر عمل کرنے سے سنت پر عمل کرنا لازم آتا ہے اور اس میں اشارہ ہے کہ اصل اصیل کتاب اللہ ہے۔

''**تسئلون عنى**'' صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

''**السبابة**'' جو، نصب اور رفع تینوں کے ساتھ ہے۔

''**يرفعها**'' قال کے فاعل سے حال ہے تقریر ہے **راقعًا اياها** یا **السبابة** سے حال ہے تو تقریر **مرفوعة اياها** ہوگی۔

''**ينكتها**'' کاف کے ضمہ کے ساتھ ہے اور تاء کے ساتھ ہے اور ''**نكت**'' کہتے ہیں انگلیوں کے پوروں کو زمین پر مارنا اور ایک تصحیح شدہ نسخہ میں باء کے ساتھ ہے یعنی لوگوں کی طرف جھکا رہا تھا۔ نوویؒ فرماتے ہیں کہ اس طرح ہم نے اس کو تاء کے ساتھ ضبط کیا ہے۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسی طرح روایت ہے اور یہ معنی کے اعتبار سے بعید ہے۔ قاضی فرماتے ہیں کہ کہا گیا ہے کہ اصل اس کا **ينكبها** ، باء کے ساتھ ہے اور قاضی نے کہا ہے کہ ہم نے اس کو سنن ابی داؤد میں روایت کیا ہے۔

''**اللّٰهم اشهد**'' اس کا مطلب ہے کہ اے اللہ اپنے بندوں پر گواہ رہ کہ وہ اقرار کر چکے ہیں کہ میں آپ کا پیغام ان تک پہنچا چکا ہو،

اسی طرح کہا ہے ابن الملک رحمہ اللہ نے۔اور مطلب ہے کہ اے اللہ تو ہی گوارہ کیونکہ آپ ہی کی گواہی کافی ہے۔

قوله : ''**ثم اقام فصلى الظهر ثم اقام فصل العصر**''یعنی دونوں کوظہر کے وقت میں جمع کیا جس طرح مزدلفہ میں جمع کرتے ہیں۔نیز ان دونوں نمازوں کے درمیان سنت ونوافل وغیرہ نہیں پڑھی جاتی تا کہ دونوں نمازوں کے درمیان وقفہ ہو جانے کی وجہ سے جمع باطل نہ ہو جائے کیونکہ ان نمازوں کو پے درپے پڑھنا واجب ہے۔

''**الموقف**'' سے مراد سرزمین عرفات ہے۔یالام عہد کیلئے ہے اور مراد اس سے آپ ﷺ کا خاص موقف ہے۔

یہاں موقف مستحب ہے اگر یہاں وقوف سے عاجز ہو جائے تو پھر اس کے قریب بحسب الامکان وقوف کرے۔اور جو عوام کے درمیان پہاڑ کے اوپر چڑھنے کا اہتمام مشہور ہے اور یہ وہم ہے کہ اس کے علاوہ میں وقوف درست نہیں ہے تو یہ غلط ہے اور صحیح یہ ہے کہ عرفات کی ہر چیز میں وقوف درست ہے اور وقوف کا وقت یوم عرفہ یعنی نو ذی الحجہ کے زوال کے وقت سے لے کر دس ذی الحجہ کے طلوع فجر تک ہے اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ وقوف کا وقت نو ذی الحجہ کے فجر کے وقت سے داخل ہوتا ہے۔

''**ناقة القصواء**''**القصواء**،رفع،نصب،جر تینوں کے ساتھ درست ہے۔

''**الصخرات**'' صاد اور خاء کے فتحہ کے ساتھ بڑے پتھروں کو کہتے ہیں۔صخرات سے مراد وہ پہاڑ ہے جو عرفات کے درمیان ہے۔امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہ جبل رحمت کے نیچے بچھے ہوئے پتھر ہیں اور یہ وہ پہاڑ ہے جو عرفات کے درمیان ہے۔

''**حبل المشاة**''نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کو حاء کے ساتھ اور باء کے سکون کے ساتھ روایت کیا گیا ہے اور جیم اور باء کے فتحہ کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے۔قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اول حدیث کے زیادہ مشابہ ہے:

حبل المشاة پیدل لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں اور **حبل الرمل** جو اس سے لمبا ہو اس کو کہتے ہیں اور جیم کے ساتھ اس کا معنی ہے ان کا راستہ اور اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں پیدل چلنے والے جاتے ہیں۔علامہ طیبیؒ کہتے ہیں کہ حاء کے ساتھ کا معنی ہے ان کا وہ راستہ جس پر وہ ریت میں جاتے ہیں۔تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ **حبل المشاه** جگہ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ایک اونچی ریتلی جگہ کا نام ہے جیسا کہ ٹیلہ ہوتا ہے۔اور بعض کہتے ہیں کہ حبل مستطیل ریت کو کہتے ہیں اور اس کی اضافت المشاۃ کی طرف اس لیے کی ہے کہ اس پر پیدل چلنے والوں کے علاوہ کوئی نہیں چڑھ سکتا ہے۔یا ان کے وہاں اجتماع کی وجہ سے سواروں کے ٹھہرنے کی جگہ نہ بچتی ہو۔اور رسول اللہ ﷺ بھی یہی وقوف کا فکر کرتے تھے۔

''**حتى غاب القرص**''تمام نسخوں میں اس طرح ہے بعض نے کہا ہے کہ صحیح **حين غاب القرص** ہے لیکن اس میں اشکال ہے کیونکہ **ذهبت الصفرة قليلا حين غاب القرص** کا کوئی مطلب نہیں بنتا تو گویا کہ قائل قید علت سے غافل رہا اور اس روایت سے ذھول کر گیا ہے جو درایت کے مطابق ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ اپنے ظاہر پر ہو غیبوبۃ کیلئے کیونکہ کہیں اس کا اطلاق معظم قرص پر بھی ہوتا ہے۔

''**ودفع**''ایک روایت میں ہے''**ودفع رسول الله ﷺ وقد شنق**''نون کی تخفیف کے ساتھ ہے یعنی ملایا اور تنگ کیا قصواء کیلئے لگام کو۔''**حتى ان رأسها ليصيب مورك رجله**''جیم اور راء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔اور حاء اور راء کے فتحہ کے ساتھ بھی ہے اور''**المورك**''میم کے فتحہ اور راء کے کسرہ کے ساتھ۔کجاوہ کا وہ حصہ جہاں سوار تھک کر ٹانگ پھیلا دے۔اور قاضی نے اس کو راء کے فتحہ کے ساتھ ضبط کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ چمڑے کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے جس پر سوار سہارا لیتا ہے اس کو کجاوہ کے اگلے حصے میں رکھ لیتا ہے اور یہ چھوٹے تکیہ کے مشابہ ہوتا ہے۔اس کو امام نووی نے ذکر کیا ہے۔

قوله :اردف اسامة ...... ''**المزدلفة**'' کہا گیا ہے کہ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہاں لوگ رات کے شروع کی ساعات میں آتے ہیں اور اسی سے ہے:﴿**واذ الجنة ازلفت**﴾[التکویر:۱۳]

یہی ائمہ ثلاثہ اور امام زفر رحمہ اللہ کا مذہب ہے اور مغرب وعشاء کے درمیان سنت ونوافل نہیں پڑھی، لیکن معتمد یہ ہے کہ آپ ﷺ ان دونوں نمازوں کے بعد مغرب اور عشاء کی سنتیں اور وتر پڑھتے تھے''اور پھر لیٹ گئے'' یعنی رواتب عشاء اور وتر کے بعد جیسا کہ ایک روایت میں ہے''یہاں تک کہ فجر طلوع ہوئی'' اور یہ آرام بدن کی تقویت اور امت پر مہربانی کیلئے تھا اور چونکہ اس آنے والے دن میں بہت ساری عبادات ہیں جو کہ نشاط چاہتے ہیں اور یہ اس حدیث کے منافی نہیں ہے جس میں ہے،''**من احیا لیلة العید احیا الله قلبه یوم تموت القلوب**'' کیونکہ رات کا احیاذ کر وفکر کے ساتھ بغیر نوافل کے بھی ہوسکتا ہے اور ساتھ حدیث کا مراد فی الجملہ اس رات کا احیا ہے یا اکثر رات کا احیا مراد ہے پھر رات گزارنا ہمارے نزدیک سنت ہے اور یہی بعض شوافع محققین کا مذہب ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ یہ واجب ہے اور یہی امام شافعی کا مذہب ہے۔

اور بعض کا کہنا ہے کہ یہ رکن ہے وقوف کی طرح اس کے بغیر حج بھی درست نہیں ہوسکتا اور یہی بڑے علماء میں سے ایک جماعت کا مذہب ہے۔اور امام مالک فرماتے ہیں کہ وہاں نزول واجب ہے اور رات گزارنا سنت ہے اور اسی طرح اس کے بعد وقوف اور پھر اکثر رات گزارنا ہے۔اور صحیح یہ ہے کہ وجوب مزدلفہ میں ایک لحظہ کیلئے حاضر ہونے سے پورا ہوجاتا ہے۔

قوله :ثم رکب القصواء ...... ''**مشعر الحرام**'' مزدلفہ میں ایک خاص جگہ کا نام ہے جہاں قیام کرنے کو حکم ہے اور مزدلفہ اور مشعر حرام میں مغایرت پر بخاری کی وہ روایت دلالت کررہی ہے جس میں ہے ابن عمر رضی اللہ عنہ اپنے کمزور اہل وعیال کو پہلے بھیجتے تھے اور وہ مشعر الحرام کے پاس وقوف کرتے اور اللہ کو یاد کرتے اور ایک جماعت کا کہنا ہے کہ مشعر حرام، مزدلفہ ہی ہے۔

قوله :فدفع قبل ان تطلع الشمس......حتی اتی بطن محسر ،فحرك قليلا:

''**بطن محسر**'' سین کی شد اور کسرہ کے ساتھ ہے مزدلفہ اور منی کے درمیان ایک گھاٹی کا نام ہے۔

تحسر تھکنے کو کہتے ہیں اور اسی سے ہے:﴿**ینقلب الیك البصر خاسئا وهو حسیر**﴾[الملك:٤] اور اس کو محسر اس لیے کہتے ہیں کہ اصحاب فیل کا ہاتھی یہاں رک گیا تھا تھک کر۔اس کو ذکر کیا ہے امام نووی نے لیکن اس قول کے مطابق ہے کہ وہ ہاتھی حرم میں داخل ہو گیا تھا اور یہی تمام علماء کا قول ہے اور بعض کے ہاں راجح یہ ہے کہ وہ حرم میں داخل نہیں ہوا تھا بلکہ حرم سے کچھ پہلے ان پر عذاب آیا تھا عرفہ کے قریب۔پس ان میں سے کوئی نہیں بچا تھا سوائے ایک کے جس نے پچھلے لوگوں کو خبر دی۔

آپ ﷺ جب مشعر حرام سے روانہ ہوئے اور اس وادی میں پہنچے تو اپنی سواری تیز کردی بعض کا کہنا ہے کہ یہاں سواری تیز کرنے کی حکمت یہ ہے کہ یہاں جو شخص شکار کرتا ہے اس پر آگ نازل ہوتی ہے اور اسی وجہ سے اہل مکہ نے اس وادی کا نام وادی نار رکھا ہے اور صحیح طرف سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ جب دیار ثمود سے گزرے تو اپنی سواری تیز کردی اور صحابہ کو بھی سواریاں تیز کرنے کا حکم دیا اس ڈر سے کہ کہیں وہ عذاب جو قوم ثمود پر آیا تھا وہ ان کو نہ پہنچے۔یا نصاریٰ کی مخالفت کی وجہ سے کہ نصاریٰ وادی محسر میں وقوف کرتے تھے تو ہمیں ان کی مخالفت کا حکم دیا گیا ہے۔شاید کہ نصاریٰ مزدلفہ کی جگہ یہاں ٹھہرے تھے یا مزدلفہ میں وقوف کرنے کے بعد یہاں بھی وقوف کرتے تھے۔فی الجملہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وجہ تخصیص اسراع یعنی سواری تیز کرنے کا عرفات سے واپسی کے موقع پر ہے نہ کہ جاتے ہوئے۔اور اور آپ عرفات ضب کے راستے سے گئے تھے اور یہ بات بھی بعید نہیں کہ یہاں پہنچ کر ہر شخص کیلئے چاہیے حاجی ہو یا نہ ہو آنے والا ہو یا جانے والا ہو مستحب ہے کہ وہ اپنی سواری تیز کردے۔اس کے نزول عذاب کے محل ہونے کی وجہ سے،''**والله اعلم**''

ابن الملک فرماتے ہیں کہ سواری تیز کرنے میں پیدل چلنے والے بھی داخل ہیں کہ وہ بھی تیز چلے۔ اوراس کی وجہ اوراس میں اشکال ہے کہ یہ وجہ تسمیہ نہیں بن سکتا کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہاں تیز چلنا یہاں عذاب نازل ہونے کی وجہ سے ہے۔

''فحرك قليلا'' آپ ﷺ جب وادی محسر میں آئے تو آپ ﷺ نے سواری تیز کر دی یہاں تک کہ وادی سے نکل گئے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ پتھر پھینکنے کے مقدار وادی سے دور ہو گئے۔ باقی جو حضرت ابن عباسؓ اور اسامہ سے صحیح روایت ہے کہ آپ ﷺ نے عرفہ سے منیٰ تک اسراع کو ترک کیا تھا تو وہ محمول ہے ازدحام کے وقت ترک پر۔ کیونکہ اثبات مقدم ہے خاص کر کے جب اس کے راوی زیادہ اور سند زیادہ صحیح ہے۔ اور کبھی اس پر محمول کیا جاتا ہے کہ بعض راستے میں سواری تیز کی تھی اور بعض میں ترک اسراع کیا تھا۔

اور سنت ہے کہ یہاں سے گزرنے والا وہ کلمات کہے جو ابن عمر کی روایت میں ہے اور طبرانیؒ نے ان میں سے بعض کو مرفوع روایت کیا ہے۔

''اليك تعدو قلقًا وضينها ۔ معترضا فى بطنها جنينها۔ مخالفا دين النصارٰى دينها۔ قد ذهب الشحم الذى يزينها''

اور مستحب ہے کہ یہ کلمات بھی کہے **''اللّٰهم لا تقتلنا بغضبك، لا تهلكنا بعذابك، وعافنا قبل ذلك''**۔

قوله :ثم سلك الطريق الوسطى ...... رمى من بطن الوادى:

''**مثل حصى الخذف**'' علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ایک صحیح نسخہ میں **مثل حصى الخذف** ہے (ہمارے پاس موجودہ نسخہ میں بھی یہی ہے) نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قول ''**فرماها بسبع حصيات يكبر مع كل حصاة منها حصى الخذف**'' اسی طرح ہے نسخوں میں اور قاضیؒ نے بھی اکثر نسخوں سے اسی طرح نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ درست **مثل حصى الخذف** ہے اور کہا ہے کہ اسی طرح مسلم کے بعض راویوں نے اس کو روایت کیا ہے۔ یہ قاضی کا کلام تھا۔

نوویؒ کہتے ہیں کہ جن نسخوں میں لفظ مثل کے بغیر ہے وہ درست ہے۔ بلکہ اس کے علاوہ کی کوئی توجیہ ہی نہیں ہو سکتی۔ اور کلام بھی صرف اسی صورت میں تمام ہو سکتا ہے اور **حصى الخذف حصيات** سے متعلق ہے اور اصل میں یوں ہے۔ **رماها بسبع حصيات حصى الخذف يكبر مع كل حصاة**۔ پس **حصى الخذف حصيات ست** متصل ہے اور یہی صحیح ہے نووی کا کلام مکمل ہوا۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک **حصى الخذف** کا **مع كل حصاة** سے تعلق ہونا لفظاً زیادہ قریب اور معنیً زیادہ مناسب ہے اور اس صورت میں نہ ہی تو کوئی جملہ معترضہ ہوگا اور نہ ہی کسی ایک نسخے کا خطاء ہونا لازم آئے گا۔ کیونکہ اس کا متعلق ہونا **حصاة** کے ساتھ یا **حصيات** کے ساتھ لفظ مثل کے لفظاً یا تقریراً وجود کے منافی نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ جب لفظ مثل موجود ہوگا تو معنی واضح ہوگا ورنہ تو تشبیہ بلیغ کے باب سے ہوگا اور تشبیہ بلیغ کہتے ہیں اداۃ تشبیہ کو حذف کرنا، یعنی اصل میں ہے **كحصى الخذف** بلکہ اس کے علاوہ تعلق کا کوئی مطلب ہی نہیں بنتا۔ پس دونوں روایات صحیح ہیں اور جو عنقریب حدیث میں آرہا ہے۔ حضرت جابر سے جس کو ترمذی نے روایت کیا ہے ''**وامرهم ان يرموا بمثل حصى الخذف**'' کے الفاظ کے ساتھ اور مسلم نے ان سے روایت کیا ہے ''**رمى الجمرة بمثل حصى الخذف**'' کے لفظ کے ساتھ تو یہ لفظ مثل کے وجود کو راجح قرار دیتا ہے اور ایک نسخہ میں

''**الخذف**'' خاء کے ساتھ انگلیوں کے پوروں سے پھینکنے کو کہتے ہیں۔

''**رمى من بطن الوادى**'' یہ بدل ہے۔ فرماها سے یا استیناف مبین ہے اور یہی زیادہ ظاہر ہے۔

بخاری کی روایت میں ابن مسعود سے اور اسی طرح شافعی رحمہ اللہ کی عبارت سے اوپر سے رمی کے جواز پر دلالت ہو رہا ہے اور اس

طرح باقی جمرات پر قیاس کرتے ہوئے کہ ان کی رمی تمام جانبوں سے جائز ہے اگرچہ مستحب ایک جانب ہے باقی اس کی یہ تاویل کرنا کہ اس کا مطلب ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جمرہ کو اوپر سے نیچے کی طرف مارا نہ کہ پشت کی طرف تو یہ تاویل بعید ہے کیونکہ یہ ظاہر روایات اور درایت کے مخالف ہے تو ابن حجرؒ کا قول: '' ان الرمی من فوقھا '' باطل ہے جس کے تحت کوئی فائدہ کی بات نہیں ہے۔

قولہ :ثم انصرف الی المنحر......وشربا من مرقھا: ''**المنحر**'' میم کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

یہ جمرہ عقبہ کے قریب ہے باقی جو مشہور ہے مسجد کی صورت جمرہ وسطیٰ کے قریب راستے سے دائیں طرف۔ اور اس کے سامنے مسجد بنی ہوئی ہے جس کو عام لوگ مسجد نحر کہتے ہیں تو یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قربان گاہ نہیں ہے بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا منحر مسجد خیف کے قریب قبلہ کی جانب جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ٹھہرے تھے وہ ہے۔

''**وستین بدنة بیدہ**'' بظاہر مشکوٰۃ کے الفاظ دو روایتوں کا مجموع ہے کیونکہ صحیح روایت ثلاثاً **وستین بیدہ** ہے بغیر لفظ **بدنة** کے۔ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسی طرح ہے نسخوں میں اور اسی طرح قاضی نے روایت کیا ہے تمام راویوں سے سوائے ابن ماہان کے کہ انہوں نے **بدنة** روایت کیا ہے فرماتے ہیں کہ دونوں صحیح ہے اور اول زیادہ صحیح ہے۔

''**واشرك فی هدیه**'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قربانی کے جانوروں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی شریک کرلیا تھا یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے علی رضی اللہ عنہ کو کچھ اونٹ دے دیئے تاکہ وہ اپنی طرف سے ذبح کریں اب یا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں وہ اونٹ اپنے باقی اونٹوں میں سے یا دوسرے اونٹوں میں سے دیئے ہوں گے۔

''**ببضعة**'' باء ثانی کے فتحہ کے ساتھ گوشت کے ٹکڑے کو کہتے ہیں۔

''**فاکلا من لحمها**'': ضمیر مجرور قدر کی طرف راجع ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ ھدایا کی طرف راجع ہو یہ ابن الملک رحمہ اللہ نے فرمایا ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ ظاہر یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نفس قربانی میں ان کو شریک کرلیا تھا۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حقیقۃً ان کو شریک نہیں کیا تھا بلکہ ان کو کچھ جانور ذبح کرنے کی غرض سے دیئے تھے۔

اور ظاہر یہ ہے کہ وہ اونٹ جو مدینہ سے آئے تھے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ذبح کیے اور وہ تریسٹھ تھے جیسا کہ ترمذی کی روایت میں آیا ہے اور وہ اونٹ جو یمن سے آئے تھے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دے دیئے تھے اور یہ سب ملا کر سو تھے۔

اور یہ بھی بعید نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے قربانی کے ثواب میں شریک کیا ہو۔ کیونکہ حج کی ہدی کا وہی حکم ہوتا ہے جو عام قربانی کا ہوتا ہے کہ ثواب میں دوسروں کو شریک کرسکتا ہے۔

امام نوویؒ نے فرمایا کہ اس سے معلوم ہوا کہ قربانی کا جانور یوم نحر کو ذبح کرنا مستحب ہے اگرچہ وہ زیادہ ہوں۔ اور ان میں سے بعض کو ایام تشریق تک مؤخر نہ کریں۔

''**وشربا من مرقھا**'' ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ یہ دلالت کررہا ہے کہ نفلی قربانی کے گوشت میں سے کھانا جائز ہے۔ صحیح یہ ہے کہ مستحب ہے اور بعض نے کہا ہے کہ واجب ہے۔ کیونکہ اللہ کا امر ہے ﴿**فکلوا منها**﴾ تو تم خود بھی کھاؤ۔ (بیان القرآن)

قولہ :''فأفاض الی البیت'' فصلی بمکة الظهر: یعنی پھر بیت اللہ پہنچے طواف فرض ادا کرنے کیلئے۔ اور اس طواف کو طواف افاضہ اور رکن بھی کہتے ہیں۔ اکثر علماء جن میں سے امام ابوحنیفہ بھی ہیں طواف زیارت کو دوسری نیت سے جائز قرار نہیں دیتے اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے نذر یا طواف وداع وغیرہ کی نیت کی تو بھی اس نیت سے طواف افاضہ واقع ہوگا۔

''فصلي بمكة الظهر'' یہ ابن عمر کی اس حدیث کے خلاف ہے جس کو مسلم نے روایت کیا ہے احادیث طواف افاضہ میں کہ آپ نے زوال سے پہلے طواف افاضہ کیا اور پھر منیٰ میں ظہر کی نماز پڑھی۔ دونوں روایتوں میں مطابقت یوں پیدا کی جائے کہ آپ نے طواف افاضہ زوال سے پہلے کیا اور پھر مکہ میں ظہر کی نماز اول وقت میں ادا کی پھر منیٰ کی طرف لوٹے اور وہاں صحابہ کے ساتھ دوبارہ ظہر کی نماز پڑھی جب انہوں نے اس بارے میں سوال کیا تو منیٰ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز بطور نفل ادا کی۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کو ایسے قول پر محمول نہ کیا جائے جس کے جواز میں اختلاف ہے۔ پس اس کی یہ تاویل کی جائے گی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں دو رکعت طواف کی نماز پڑھی اور پھر منیٰ میں ظہر کی نماز صحابہ کے ساتھ پڑھی۔ یا کہا جائے کہ جب دونوں روایتیں متعارض ہوئیں تو دونوں ساقط ہو گئی اب ترجیح اس بات کو دی جائی گی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز مکہ میں پڑھی کیونکہ مکہ میں نماز پڑھنا افضل ہے اور اس کی تائید ضیق وقت.. سے ہوتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مشعر حرام سے طلوع شمس سے کچھ دیر پہلے لوٹے اور منیٰ میں رمی اور سو اونٹ ذبح کیے اور ان کا گوشت پکایا اور اس میں سے کھایا پھر مکہ گئے اور طواف کیا اور سعی کی تو اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کا وقت مکہ ہی مین پایا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم وقت مختار سے بغیر ضرورت کے نماز مؤخر نہیں کرتے تھے اور وہاں کوئی ضرورت نہیں تھی۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ وغیرہ سے جو حدیث منقول ہے کہ آپ علیہ السلام نے یوم نحر کو زیارت رات تک مؤخر کر دی تھی؛ تو وہ محمول ہے اس پر کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواج کے ساتھ زیارت کیلئے لوٹے تھے نہ کہ طواف افاضہ کیلئے اور اس تاویل کا ہونا احادیث کے مابین مطابقت کیلئے ضروری ہے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ تاویل ضروری ہے مگر یہ تاویل ضروری نہیں کیونکہ اس پر نہ لفظاً کوئی دلالت ہے نہ معنیً اور نہ ہی حقیقۃ اور نہ مجازاً، اور اس کے ساتھ ان کے کلام کے پیش کرنے میں غرابت بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم زیارت کیلئے لوٹے تھے۔ پس اچھا یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلقاً رات تک تاخیر زیارت کی اجازت دی تھی یا اپنے ازواج کی زیارت کو رات تک مؤخر کرنے کا حکم دیا تھا۔ اور ابن حجرؒ کا قول کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ گئے صحیح نہیں۔ کیونکہ رات کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا لوٹنا ازواج کے ساتھ ثابت نہیں، واللہ اعلم۔

قوله فاتى على بني عبد المطلب......فشرب منه:

''بني عبد المطلب'' حرفِ ندا کے حذف کے ساتھ ہے ''وامر بفية'' رکب پر عطف ہے یا حال ہے۔

''دلوا'' قاموس میں ہے الدلو معروف وقد يذكر۔

''فشرب منه'' بعض حضرات نے کہا ہے کہ کھڑے ہو کر زمزم کا پینا مستحب ہے۔ لیکن یہ محل بحث ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کھڑے ہو کر پینے سے منع ثابت ہے بلکہ جس نے کھڑے ہو کر پیا اس کو حکم دیا ہے کہ وہ قئی کر لے، جو اس نے پیا ہے یہاں تک کہ بعض ائمہ نے کہا ہے کہ کھڑے ہو کر پینا حرام ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یا بیان جواز کیلئے پیا تھا اور عذر کی وجہ سے کہ اس جگہ کیچڑ تھا یا ازدحام تھا۔

تخریج: ابن ہمام صحیح فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو ان کے علاوہ نے بھی روایت کیا ہے جیسا کہ ابن ابی شیبہ، ابوداؤد، نسائی، عبد بن حمید، بزاز، دارمی نے اپنے مسانید میں جعفر بن محمد سے اور انہوں نے اپنے والد سے نقل کیا ہے کہ ہم جابر بن عبد اللہؓ کے پاس گئے تو انہوں نے لوگوں کے بارے میں پوچھا یہاں تک کہ میری باری آ گئی تو میں نے کہا کہ میں محمد بن علی بن حسین ہوں، تو اس نے میرے سر کی طرف ہاتھ بڑھایا پس میرے اوپر والے بٹن کو کھولا پھر نچلا بٹن کھولا پھر اپنی ہتھیلی میرے سینے پر رکھی اور میں ان دنوں جوان مرد تھا تو انہوں نے کہا ''مرحباً بك يا ابن اخي، سل عماشئت'' تو میں نے ان سے پوچھا اور وہ نابینا تھے اتنے میں نماز کا وقت ہوا پس وہ اپنی چادر میں لپٹے ہوئے کھڑے ہو گئے پس ہم نے نماز پڑہی۔ پس میں نے ان سے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کے بارے میں ہمیں بتا۔

تو انہوں نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا: ان رسول الله ﷺ مكث تسع سنين لم يحج۔ الحدیث: یہ بہت بڑی اصل ہے اور اس باب میں سب سے جامع حدیث ہے۔

"نصر عبده" یعنی مقام اختصاص میں اپنے بندہ خاص کی زبردست مدد کی اور واضح فتح نصیب کی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حج کا واقعہ واحرام باندھنے کا طریقہ

۲۵۵۶: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ خَرَجْنَا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ فَمِنَّا مَنْ اَهَلَّ بِعُمْرَةٍ وَمِنَّا مَنْ اَهَلَّ بِحَجٍّ فَلَمَّا قَدِمْنَا مَكَّةَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ اَهَلَّ بِعُمْرَةٍ وَلَمْ يُهْدِ فَلْيَحْلِلْ وَمَنْ اَحْرَمَ بِعُمْرَةٍ وَاَهْدٰى فَلْيُهِلَّ بِالْحَجِّ مَعَ الْعُمْرَةِ ثُمَّ لَا يَحِلُّ حَتّٰى يَحِلَّ مِنْهُمَا وَفِيْ رِوَايَةٍ فَلَا يَحِلُّ حَتّٰى يَحِلَّ بِنَحْرِ هَدْيِهٖ وَمَنْ اَهَلَّ بِحَجٍّ فَلْيُتِمَّ حَجَّهُ قَالَتْ فَحِضْتُ وَلَمْ اَطُفْ بِالْبَيْتِ وَلَا بَيْنَ الصَّفَاءِ وَالْمَرْوَةِ فَلَمْ اَزَلْ حَائِضًا حَتّٰى كَانَ يَوْمُ عَرَفَةَ وَلَمْ اُهْلِلْ اِلَّا بِعُمْرَةٍ فَاَمَرَنِيَ النَّبِيُّ ﷺ اَنْ اَنْقُضَ رَأْسِيْ وَاَمْتَشِطَ وَاُهِلَّ بِالْحَجِّ وَاَتْرُكَ الْعُمْرَةَ فَفَعَلْتُ حَتّٰى قَضَيْتُ حَجِّيْ بَعَثَ مَعِيَ عَبْدَالرَّحْمٰنِ بْنَ اَبِيْ بَكْرٍ وَاَمَرَنِيْ اَنْ اَعْتَمِرَ مَكَانَ عُمْرَتِيْ مِنَ التَّنْعِيْمِ قَالَتْ فَطَافَ الَّذِيْنَ كَانُوْا اَهَلُّوْا بِالْعُمْرَةِ بِالْبَيْتِ وَبَيْنَ الصَّفَا وَالْعُمْرَةَ ثُمَّ حَلُّوْا ثُمَّ طَافُوْا بَعْدَ اَنْ رَجَعُوْا مِنْ مِنًى وَاَمَّا الَّذِيْنَ جَمَعُوْا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ فَاِنَّمَا طَافُوْا طَوَافًا وَاحِدًا۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤١٩/١ حدیث رقم ٣١٩۔ ومسلم ٨٧٠/٢ حدیث رقم (١٢١١/١١١)۔ واخرجه ابو داؤد فی السنن ٣٨١/٢ حدیث رقم ١٧٨١۔ والنسائی فی السنن ١٦٥/٥ حدیث رقم ٢٧٦٤۔ واحمد فی المسند ١٧٧/٦۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، فرماتی ہیں کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ حجۃ الوداع میں نکلے۔ پس بعض لوگ ہم میں سے وہ تھے جنہوں نے عمرے کا احرام باندھا تھا فقط اور بعض ہم میں سے وہ لوگ تھے جنہوں نے صرف حج کا احرام باندھا تھا۔ پس جب ہم مکہ میں آئے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے فقط عمرے کا احرام باندھا ہے اور ہدی ساتھ نہیں لایا پس اس کو چاہیے کہ حلال ہو جائے یعنی سر منڈائے یا بال کتراونے کے ساتھ احرام سے نکل آئے اور جس نے عمرے کا احرام باندھا ہے اور ہدی بھی ساتھ لایا ہے پس اسکو چاہیے کہ عمرے کے ساتھ حج کا بھی احرام باندھے یعنی حج کو عمرے کے ساتھ داخل کرے، پس قارن ہو جائے پھر احرام سے نہ نکلے۔ یہاں تک کہ دونوں سے حلال ہو۔ یعنی حج اور عمرے کے افعال پورے کرے اور ایک روایت میں آیا ہے کہ وہ حلال نہ ہو جب تک اپنی ہدی کو ذبح نہ کرلے۔ یعنی عید کے دن اور جس نے حج کا احرام باندھا ہے چاہے وہ ہدی ساتھ لایا ہو۔ حج کے ساتھ عمرے کا احرام باندھا ہو یا نہ باندھا ہو۔ پس اس کو چاہیے کہ وہ اپنا حج پورا کرے مگر جس شخص کو حج کے ساتھ عمرہ کرنے کا حکم کیا گیا ہو وہ پورا نہ کرے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں حائضہ ہوئی اور میں نے عمرے کی وجہ سے خانہ کعبہ کا طواف بھی نہیں کیا تھا اور نہ ہی میں صفا اور مروہ میں گئی تھی۔ اس لیے کہ سعی طواف سے قبل درست نہیں ہے۔ ورنہ حیض کی حالت میں سعی منع نہیں ہے پس میں حیض کی حالت میں مبتلا رہی۔ یہاں تک کہ عرفہ کا دن آ گیا اور میں نے عمرے کے علاوہ احرام نہیں باندھا تھا۔ پس مجھ کو نبی کریم ﷺ نے حکم فرمایا یہ کہ میں اپنا سر کھولوں اور میں کنگھی کروں یعنی میں عمرے کے احرام سے نکلوں اور ان چیزوں کو مباح کروں جو احرام کی وجہ سے مجھ پر حرام ہوئی تھیں اور حج کا احرام

باندھوں اور میں عمرے کو چھوڑ دوں پھر جب فارغ ہو جاؤں حج سے تو عمرے کے احرام کی قضا کروں پس میں نے یہ کام کیا یہاں تک کہ میں نے اپنا حج ادا کیا تو میرے ساتھ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ (میرے بھائی) کو اور مجھے حکم دیا کہ میں اپنے عمرے کے بدلے تنعیم سے عمرہ کروں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ان شخصوں نے خانہ کعبہ کا طواف کیا کہ جنہوں نے عمرے کا احرام باندھا تھا۔ یعنی عمرے کا طواف کیا اور صفا اور مروہ کے درمیان سعی کی۔ پھر احرام سے نکلے اور پھر اس کے بعد اور طواف کیا پھر منیٰ سے مکہ کی طرف تشریف لے آئے اور یہ طواف حج کے لیے کیا۔ اس کو طواف افاضہ کہتے ہیں اور جن شخصوں نے حج اور عمرے کو جمع کیا تھا۔ پس اس کے علاوہ انہوں نے ایک طواف نہیں کیا۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :خرجنا مع رسول الله ﷺ فی حجة الوداع:

قوله :فمنا من اهل بعمرة......بحج:

''**فقال رسول الله ﷺ**'' ایک نسخہ میں فقال ہے اور وہ ہی زیادہ ظاہر ہے۔

''**ولم يهد**'' یہ اهداء سے ہے یعنی ان کے پاس قربانی کا جانور نہ ہو۔

''**فليحلل**'' یاء کے فتحہ اور لام کے کسرہ کے ساتھ ہے یعنی احرام سے نکلے حلق یا قصر کرنے کے ساتھ۔

''**فلا يحل**'' نفی کے ساتھ ہے اور نہی کا بھی احتمال ہے۔

مکہ کے قریب ایک جگہ ہے مکہ اور اس کے درمیان ایک فرسخ کا فاصلہ ہے۔

امور نحویہ: ''**ففعلت حتى قضيته**'' بعض کا کہنا ہے کہ یہ جملہ استنافیہ ہے۔ یہ علامہ طیبیؒ نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ''**لما قدمنا**'' کیلئے جواب ہو اور ''**فقال**'' فاء کے ساتھ یا واو کے ساتھ عطف ہو۔

''**عمرتي**'' منصوب ہے بنا پر مصدریت۔ یہ ابن الملک کا قول ہے۔

''**من التنعيم**'' **اعتمر** کے متعلق ہے۔

''**بالبيت**'' **طاف** کے متعلق ہے۔

''**وبين الصفا والمروة**'' طواف سے مراد ''دور'' گھومنا ہے جو کہ سعی کو بھی شامل ہے تو عطف درست ہے پس عامل کے مقرر ماننے اور اس کو ''**علفتها تبنا وماء باردًا**'' کی قبیل سے ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔

''**فليهل بالحج مع العمرة**'' مطلب یہ ہے کہ حج کو عمرہ میں داخل کرے تاکہ قارن بن جائے۔

''**ثم لا يحل الخ**'' یعنی پھر احرام سے نہیں نکلے گا اور نہ ہی اس کیلئے ممنوع چیزوں میں سے کوئی چیز حلال ہوگی۔ یہاں تک کہ حج اور عمرہ دونوں مکمل کر لے۔

''**حتى يحل بنحر هديه**'' یعنی عید کے دن کیونکہ اس سے پہلے قربانی کے جانور کو ذبح کرنا جائز نہیں ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ، حدیث کے الفاظ، **ومن احرم بعمرة واهدى** کو ان الفاظ کے ساتھ **وفی رواية "حتى يحل بنحر هديه"** ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس نے عمرہ کا احرام باندھا اور قربانی کا جانور ساتھ لے گیا تو وہ احرام سے نہیں نکل سکتا یہاں تک کہ اس جانور کو ذبح کر دے۔

اور امام مالک اور شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ احرام سے نکل جائے گا جب وہ طواف کر لے اور سعی کر لے اور سر منڈوا لے۔

اور پہلی روایت یعنی جس میں **فلیهل بالحج مع العمرة**، دلالت کر رہی ہے کہ آپ ﷺ نے عمرہ ادا کرنے والے کو حکم دیا تھا کہ وہ حج کو عمرہ کے ساتھ ملائیں۔ پس وہ حلال نہ ہو گا مگر اس ہدی کے نحر کرنے کے ساتھ۔ پس لازم ہے اس دوسری روایت کو پہلی روایت پر محمول کرنا کیونکہ قصہ ایک ہے (انتہی)۔ اور اگر وفی **روایة افلا یحل**'' کو **ثم لا یحل** کی جگہ رکھنا درست ہو جائے تو اشکال ہی ختم ہو جاتا ہے۔

اور حنفیہ کیلئے استدلال کرنے کے دوسرے طریقے بھی ہیں کہ پہلی روایت اس قابل ہے کہ اس کو دوسری پر حمل کیا جائے نہ کہ اس کا عکس جیسا کہ ظاہر ہے اور اس کی تحقیق پہلے گزر چکی ہے۔

''**ولا بین الصفا والمروة**'' یعنی زمین میں صفا اور مروہ کے مابین سعی کی کیونکہ سعی صحیح نہیں ہے مگر طواف کے بعد ورنہ حیض سعی سے مانع نہیں ہے۔

''**فامرنی النبی ﷺ**'' ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ آپ ﷺ نے مجھے عمرہ کے احرام سے نکلنے کا حکم دیا اور یہ کہ میں عمرہ چھوڑ دوں' عمرہ کے ممنوعات کو جائز کرنے کے ساتھ جیسے کنگھی وغیرہ کرنا۔ بوجہ عمرہ پر حیض کی وجہ سے قدرت نہ ہونے کے۔ اور علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ آپ ﷺ نے مجھے حکم دیا عمرہ کے احرام سے نکلنے اور محظورات احرام کے استباحت کا اور یہ کہ اس کے بعد میں حج کا احرام باندھوں اور جب میں حج سے فارغ ہو جاؤں تو عمرہ کا احرام باندھوں عمرہ کے قضاء کرنے کیلئے۔ اور یہ مطلب زیادہ واضح ہے۔

اس حدیث سے استدلال کیا ہے امام ابوحنیفہؒ نے اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ کو عمرہ مکمل طور پر چھوڑنے کا حکم دیا، بلکہ عمرہ کے افعال کے ترک کا حکم دیا تھا یعنی طواف وسعی وغیرہ کو۔ اور حج کو عمرہ میں داخل کرنے کا حکم دیا تھا تا کہ قارن ہو جائے۔ ''ملاعلی قاری فرماتے ہیں'' کہ قارن محظورات کو مباح نہیں بناتا۔ پھر امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ حج سے فراغت کے بعد جو انہوں نے عمرہ کیا تھا تو وہ نفلی تھا ان کے طیب نفس کیلئے تھا تا کہ وہ یہ گمان نہ کرتی کہ عمرہ کے ترک کرنے سے اس کے اعمال میں کمی آگئی ہے۔ ''ملاعلی قاری فرماتے ہیں'' کہ حاشا وکلا کہ وہ یہ گمان کیسے کر سکتی تھی حالانکہ آپ ﷺ خود قارن تھے۔ اور اس کے ساتھ شوافع تداخل افعال کے بھی قائل ہیں۔

''**فانما طافوا طوافًا واحد**'' یعنی یوم نحر کو حج وعمرہ دونوں کیلئے ایک ہی طواف کیا اور یہی امام شافعیؒ کا مسلک ہے اور ہمارے نزدیک قارن کیلئے دو طواف لازم ہیں ایک وقوف عرفہ سے پہلے عمرہ کیلئے اور ایک اس کے بعد حج کیلئے۔ اسی طرح اس کو ذکر کیا۔ ہے ابن الملک رحمہ اللہ نے۔

ملاعلی قاری فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ ﷺ قارن تھے جیسا کہ نوویؒ نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ اور حدیث جابر میں صحیح طور پر ثابت ہے کہ آپ ﷺ جب مکہ آئے تو طواف کیا اور طواف زیارت وقوف عرفہ کے بعد کیا۔ تو پھر صحابہؓ کا طواف دونوں کیلئے ایک سا ہوا حالانکہ وہ نبی ﷺ کی مخالفت نہیں کیا کرتے تھے؟

پس اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بھی ان خصوصیات میں سے ہے جو بعض صحابہ کے ساتھ متعلق ہے، یا اس کا مطلب یہ ہے کہ منیٰ سے واپسی پر انہوں نے حج کیلئے ایک ہی طواف کیا کیونکہ وہ اس سے پہلے ایک طواف کر چکے تھے۔ تو ''واحداً'' تاکید ہے وقوف کے بعد قارن کے متعدد طواف کرنے کے وہم کو دور کرنے کیلئے لایا گیا ہے۔ پس حضرت عائشہؓ کا مراد اس طواف سے فرض طواف ہے اور اس سے پہلے جو طواف تھا وہ طواف قدوم اور تحیہ تھا جو کہ بالاتفاق سنت ہے، یا اس سے مراد عمرہ کا فرض طواف ہے۔

حاصل یہ ہے کہ قارن دو طواف کرے گا اور دو مرتبہ سعی کریگا۔ ہمارے نزدیک حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اس حدیث کی وجہ سے: ان

النبی ﷺ کان قارناً فطاف طوافین و سعٰی سعیین اس کو دارقطنی نے روایت کیا ہے اور اس طرح اس کو روایت کیا ہے عمران بن حصین، علی اور عبداللہ ابن مسعودؓ سے۔ القارن یطوف طوافین و یسعی سعیین اس کو علامہ طحاویؒ نے ذکر کیا ہے۔

حدیث مذکورہ میں حضور ﷺ کے متمتع اور قارن ہونے کا ذکر

۲۵۵۷: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ تَمَتَّعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ حَجَّةِ الْوَدَاعِ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَسَاقَ مَعَهُ الْهَدْىَ مِنْ ذِى الْحُلَيْفَةِ وَبَدَ أَفَاَ هَلَّ بِالْعُمْرَةِ ثُمَّ اَهَلَّ بِا لْحَجِّ فَتَمَتَّعَ النَّاسُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِا لْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَكَانَ مِنَ النَّاسِ مَنْ اَهْدٰى وَمِنْهُمْ مَنْ لَّمْ يُهْدِ فَلَمَّا قَدِمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَكَّةَ قَالَ لِلنَّاسِ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ اَهْدٰى فَاِنَّهٗ لَا يَحِلُّ مِنْ شَىْءٍ حَرُمَ مِنْهُ حَتّٰى يَقْضِىَ حَجَّهٗ وَمَنْ لَمْ يَكُنْ مِنْكُمْ اَهْدٰى فَلْيَطُفْ بِالْبَيْتِ وَبِالصَّفَا وَالْمَرْوَةِ وَلْيُقَصِّرْ وَلْيَحْلِلْ ثُمَّ لِيُهِلَّ بِالْحَجِّ وَلْيُهْدِ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ هَدْيًا فَلْيَصُمْ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعَ اِلٰى اَهْلِهٖ فَطَافَ حِيْنَ قَدِمَ مَكَّةَ وَاسْتَلَمَ الرُّكْنَ اَوَّلَ شَىْءٍ ثُمَّ خَبَّ ثَلَاثَةَ اَطْوَافٍ وَمَشٰى اَرْبَعًا فَرَكَعَ حِيْنَ قَضٰى طَوَافَهٗ بِالْبَيْتِ عِنْدَ الْمَقَامِ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ سَلَّمَ فَانْصَرَفَ فَاَتَى الصَّفَاءَ وَالْمَرْوَةَ سَبْعَةَ اَطْوَافٍ ثُمَّ لَمْ يَحِلَّ مِنْ شَىْءٍ حَرُمَ مِنْهُ حَتّٰى قَضٰى حَجَّهٗ وَنَحَرَ هَدْيَهٗ يَوْمَ النَّحْرِ وَاَفَاضَ فَطَافَ بِالْبَيْتِ ثُمَّ حَلَّ مِنْ كُلِّ شَىْءٍ حَرُمَ مِنْهُ وَفَعَلَ مِثْلَ مَا فَعَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَاقَ الْهَدْىَ مِنَ النَّاسِ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۵۳۹/۳ حدیث رقم ۱۶۹۱۔ ومسلم فی صحیحه ۹۰۱/۲ حدیث رقم (۱۷۴۔ ۱۲۲۷)۔ وابوداؤد فی السنن ۳۹۷/۲ حدیث رقم ۱۸۰۵ والنسائی ۱۵۱/۵ حدیث رقم ۲۷۳۲۔ واحمد فی المسند ۱۳۹/۲۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے حجۃ الوداع میں عمرے کے ساتھ حج میں فائدہ اٹھایا۔ یعنی سب سے پہلے عمرے کا احرام باندھا اور پھر حج کا اور پھر اپنے ساتھ ذی الحلیفہ سے ہدی لے کر چلے جو کہ ایک جگہ کا نام ہے۔ حضور ﷺ نے وہاں سے احرام باندھا تھا اور شروع فرمایا پھر احرام باندھا عمرے کا اور پھر حج کا احرام باندھا۔ پس لوگوں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ عمرے کو حج کے ساتھ کر کے تمتع کیا۔ یعنی عمرے کے ساتھ ملایا۔ پس بعض لوگوں میں یہ بھی تھے کہ جنہوں نے عمرے کا احرام باندھا تھا ان میں بعض ہدی لائے تھے اور بعض ان میں وہ تھے کہ وہ ہدی نہیں لائے تھے۔ پس جب کہ نبی کریم ﷺ مکہ میں تشریف لائے تو لوگوں کے لیے حکم فرمایا یعنی عمرہ کرنے والوں کے لیے جو تم میں سے ہدی لے کر آیا ہے پس وہ حلال نہ ہو کسی چیز سے اور وہ باز رہے۔ یعنی احرام سے نہ نکلے یہاں تک کہ حج کر لے اور جو شخص تم میں سے ہدی لے کر نہ آیا ہو وہ خانہ کعبہ کا طواف کرے۔ یعنی عمرے کا طواف کرے اور صفا اور مروہ کی سعی کرے اور بال کتروائے اس کو چاہیے کہ وہ عمرے کے احرام سے نکلے یعنی جو چیزیں منع تھیں احرام میں اب وہ مباح ہو گئیں پھر حرم کی زمین سے حج کا احرام باندھے اور یوم نحر کو ہدی ذبح کرے احرام کرے حج کے ساتھ یعنی حرم کی زمین سے اور ہدی ذبح کرے یعنی نحر کے دن رمی جمار کے بعد سر منڈانے سے پہلے کہ متمتع کے لیے شکر گزاری کے لیے واجب ہے۔ اس نعمت کی کہ حج اور عمرہ کو ادا کرنے کی توفیق ہوئی پس جو شخص ہدی نہ پائے پس چاہیے کہ حج کے ایام میں تین دن روزے رکھے یعنی حج کے مہینوں میں احرام کے بعد نحر کے دن سے پہلے تین روزے

رکھے اور افضل یہ ہے کہ ساتویں' آٹھویں' نویں کو رکھے اور سات دن جب کہ اپنے اہل والوں کی طرف پھرے یعنی لوٹے۔ یعنی صبح کے افعال سے فارغ ہو جائے اگر چہ مکہ میں ہوں پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خانہ کعبہ کا طواف کیا۔ جب کہ مکہ میں آئے یعنی عمرے کا طواف کیا اور لبیک کہنے کے بعد حجر اسود کو بوسہ دیا پھر تین مرتبہ طواف میں جلدی جلدی اکڑ کر چلے اور چار مرتبہ اپنی چال چلے۔ یعنی ایک بار جو خانہ کعبہ کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ اس کو شوط کہتے ہیں پس سات شوط بطور مذکور ہے اور سات شوط کا ایک طواف ہوتا ہے۔ پھر مقام ابراہیم کے نزدیک دو رکعت نماز پڑھی۔ اس وقت اس نے اپنا طواف پورا کیا پھر سلام پھیرا۔ یعنی صلوٰۃ الطّواف پڑھی کہ وہ ہمارے نزدیک واجب ہے پھر خانہ کعبہ سے اور صفا پر آئے' آپ نے خانہ کعبہ کے گرد سات چکر لگائے پھر کسی چیز سے حلال نہ ہوئے کہ باز رہے تھے اس چیز سے یعنی احرام سے نہ نکلے۔ یہاں تک کہ اپنا حج پورا کیا اور اپنی ہدی قربانی کے دن یعنی دس ذی الحجہ کو ذبح کی۔ پس اب حلق کے ساتھ حلال ہوئے ہر چیز سے سوائے جماع کے اور منیٰ سے چل کر مکہ میں آئے پھر خانہ کعبہ کا طواف کیا یعنی طواف افاضہ پھر ہر چیز سے حلال ہو گئے کہ روکا ہوا تھا اپنے آپ کو اس چیز سے یعنی اب جماع کرنا بھی حلال ہو گیا اور اس چیز کی طرح کیا۔ یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس شخص کی طرح کیا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح ہدی لے کر آیا تھا۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

اختلاف نسخ: ''**فاتی الصفا**'' ایک نسخہ میں **والمروۃ** بھی ہے۔

امور نحویہ: ''**عند المقام**'': رکع کے متعلق ہے۔

تشریح: اس حدیث میں تمتع سے مراد تمتع لغوی ہے جو کہ آخر میں قران ہوتا ہے اور مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے حج کا احرام باندھا پھر عمرہ کا احرام باندھا تو قارن ہو گئے۔ اور احادیث میں تطبیق کیلئے اس تاویل کا ہونا ضروری ہے جیسا کہ پہلے گزرا۔ یہ علامہ طیبیؒ نے ذکر کیا ہے۔ اور اس حدیث کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے عمرہ کا احرام باندھا اور پھر حج کا اور اس پر یہ الفاظ ''**وبدأ فاھل بعمرۃ الخ**'' دلالت کر رہے ہیں اور یہ ادخال اس کے عکس سے افضل ہے مگر احادیث میں صراحۃ وارد ہے کہ آپ نے حج کا احرام باندھا پھر عمرے کا۔ پس اس ادخال کی طرف کیسے جایا جا سکتا ہے؟ اور اگر یہ ثابت ہو جائے تو یہ معارض ہے۔ پس اس کا جواب یہ ہے کہ حج فرض ہونے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اول وھلہ میں عمرہ سے ابتداء نہیں کی کیونکہ آپ نے ہجرت کے بعد کئی مرتبہ عمرہ ادا کیا تھا۔

پس صحیح یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اول ہی سے قارن تھے اور حضرت عائشہؓ کے اس قول **فاھل بالعمرۃ** کا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دونوں عبادتوں کو جمع کیا تو ذکر میں عمرہ کو حج پر مقدم کیا۔ کیونکہ قران میں مسنون طریقہ یہی ہے نہ کہ اس کا عکس۔ پھر اکثر آپ کے احرام میں حج کا ذکر ہوتا ہے کیونکہ حج اصل اور فرض ہے اور عمرہ تابع اور سنت ہے۔

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کو دو عبادتوں پر حمل کرنا ایک عبادت پر حمل کرنے سے اولیٰ ہے۔

''**ولیقصر**'' یعنی حج سے حلال ہونے کیلئے کچھ بال کو باقی رکھتے ہوئے قصر کر لے۔

''**ثلاثۃ ایّام فی الحج**'' یعنی حج کے مہینوں میں اور افضل یہ ہے کہ اس کا آخری دن یوم عرفہ ہے۔

''**وسبعۃ اذا رجع الی اھلہ**'' یہ توسعاً ہے ورنہ اگر ایام تشریق کے بعد مکہ میں یہ روزے رکھ لے تو بھی جائز ہے، ہمارے نزدیک۔

''**ثم خب**'' یعنی تین چکروں میں رمل کیا ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ یہ اپنے نفس اور اپنے صحابہ میں قوت اور مردانگی کے اظہار کیلئے

کیا تا کہ کفار یہ گمان نہ کریں کہ یہ لوگ عاجز اور کمزور ہیں۔

ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کی علت تھی۔ **عمرة القضاء** میں اور پھر زوال علت کے بعد یہ سنت مستمرہ ٹھہرا۔

مزید احادیث: ابوداؤد نے اسماء بنت ابی بکر سے روایت کی ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کیلئے نکلے یہاں تک کہ جب ہم عرج میں تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں ٹھہرے اور ہم بھی ٹھہرے تو عائشہؓ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں بیٹھی اور میں ابو بکرؓ کے پہلو میں بیٹھی۔ اور حضرت ابو بکر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری ایک تھی جو ابو بکر کے غلام کے پاس تھی۔ پس ابو بکر اس کے آنے کے انتظار میں بیٹھے۔ پس وہ آ گئے اور ان کے پاس اونٹ تھا تو ابو بکر نے پوچھا تمہارا اونٹ کہاں ہے؟ تو اس نے کہا کہ وہ تو رات کو گم ہو گیا ہے تو ابو بکر نے کہا کہ ایک ہی اونٹ تھا وہ بھی تو نے گم کر دیا۔ میں نے اس کو مارنا شروع کر دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا رہے تھے اور فرما رہے" **انظروا الیٰ هذا المحرم ما يصنع** " اور اس سے زائد کچھ نہیں کہے رہے تھے اور مسکرا رہے تھے۔ اس میں ان لوگوں کی قول کی تقویت ہے جو کہتے ہیں " تمام الحج ضرب الجمال"۔

کیونکہ یہ صدیق کی سنت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کہ انہوں نے ابو بکر کو منع نہیں کیا، اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابواء اور ودان مقام پر پہنچے تو صعب بن جثامہ نے آپ کو وحشی گدھا ہدیہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو واپس کر دیا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے چہرے پر تبدیلی کے آثار دیکھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" **انا لم نرد عليك الا انا حرم** " اس کو شیخین نے روایت کیا ہے۔ اور ایک اور روایت میں ہے کہ وہ وحشی گدھے کا بعض حصہ تھا جس سے خون ٹپک رہا تھا اور بعض نے اس حصہ کو متعین کیا ہے کہ وہ پچھلا حصہ تھا۔ اور ایک روایت میں ہے اس کا ایک ٹکڑا تھا۔ بیہقیؒ وغیرہ نے اس کی تطبیق یوں کی ہے کہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک گدھا ہدیہ کیا اور کچھ ذبح کیا ہوا گوشت ہدیہ کیا تھا۔ تمام روایت اس پر متفق ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو واپس لوٹایا تھا۔ سوائے اس روایت کے جو ابن وھب اور بیہقی نے سند حسن کے ساتھ روایت کی ہے کہ" **انه اهدیٰ له عجز حمار وحشي وهو بالجحفة ، فأكل منه** " بیہقی کہتے ہیں کہ اگر یہ محفوظ ہے تو شاید کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گوشت کو قبول کیا ہو اور زندہ کو لوٹایا ہو، کیونکہ وہ شکار تھا۔ اور گوشت کو کبھی اس لے لوٹایا کہ وہ ان کیلئے شکار کیا تھا اور کبھی قبول کیا کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے شکار نہیں کیا ہے۔ اور اس کو اس پر بھی حمل کیا جا سکتا ہے کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے واپسی پر لوٹایا تھا اور واپسی کے وقت آپ محرم نہ تھے پس عدم قبول کا تصور نہیں ہو سکتا۔

قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ اس نے ذبح شدہ گدھا حاضر کیا ہو اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس سے ایک ٹکڑا کاٹا ہو، اور آپ کو پیش کیا ہو، پس جس نے کہا ہے کہ **اهدیٰ حمارا** تو انہوں نے ابتداء مراد لیا ہے اور جس نے کہا ہے **بعضه** تو انہوں نے جو پیش کیا تھا وہ مراد لیا ہے۔

اور یہ بھی احتمال ہے کہ انہوں نے زندہ گدھا دیا ہو لیکن جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو واپس لوٹا دیا تو انہوں نے اس کو ذبح کر کے اس کا کچھ حصہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا ہو' اس خیال سے کہ واپس لوٹانا کسی خاص وجہ سے تھا جو اس پورے میں تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منع کرنے سے ان کو بتلایا کہ جزء کا حکم وہی ہے جو کل کا ہے۔ اور جب تک روایات میں تطبیق ممکن ہو تو یہ بہتر ہے اس سے کہ اس کو بعض ردات کا وہم قرار دیا جائے (انتہی)

لیکن یہ بات مخفی نہیں ہے کہ کل زندہ کا حکم جزء کے حکم کا مغایر ہے کیونکہ اول شکار ہے اس کا پکڑنا جائز نہیں ہے۔ اور جزء میں یہ بھی احتمال ہے کہ اس کیلئے شکار کیا ہو تو پھر نا جائز ہے اور اگر اس کیلئے شکار نہ کیا ہو تو حلال ہے۔ صحابہؓ کی ایک جماعت نے فرمایا ہے کہ محرم کیلئے شکار کا گوشت کسی بھی طریقے سے جائز نہیں ہے ان کا استدلال صعب کے قصہ سے ہے اور جمہور نے مسلم کی حدیث کو لیا ہے کہ آپ

نے اس شکار کے بارے میں جو ابو قتادہ نے صحابہ کیلئے کیا تھا اور ابو قتادہ حلال اور دیگر صحابہ احرام میں تھے فرمایا تھا ''هو حلال فكلوه'' اور ایک روایت میں ہے ''هل معكم منه شيئ؟'' تو صحابہ نے کہا کہ ہمارے پاس اس کی ٹانگ ہے تو آپ ﷺ نے وہ لے کر کھالی۔

حج کے مہینوں میں عمرے کا جواز

۲۵۵۸: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ هٰذِهٖ عُمْرَةٌ اسْتَمْتَعْنَا بِهَا فَمَنْ لَمْ يَكُنْ عِنْدَهُ الْهَدْىُ فَلْيَحِلَّ الْحِلَّ كُلَّهٗ فَاِنَّ الْعُمْرَةَ قَدْ دَخَلَتْ فِى الْحَجِّ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۹۱۱/۲ حديث رقم (۲۰۳۔ ۱۲۴۱)۔ والنسائي في السنن ۱۸۱/۵ حديث رقم ۲۸۱۵۔ والدارمي ۷۲/۲ حديث رقم ۱۸۵٦۔ واحمد في المسند ۲۳٦/۱۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا یہ عمرہ ہے ہم نے اس کے ساتھ فائدہ اٹھایا پس وہ شخص جس کے پاس ہدی نہ ہو اس کو چاہیے کہ حلال ہو جائے' اس لیے کہ عمرہ کرنا حج کے مہینوں میں قیامت کے دن تک داخل ہوا ہے۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے اور یہ باب دوسری فصل سے خالی ہے۔

تشریح: **قوله: هذه عمرة استمتعنا بها**: یہاں استمتاع سے مراد عمرہ مقدم کر کے اس سے فارغ ہونا ہے ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ اس سے ان لوگوں نے استدلال کیا ہے جو کہتے ہیں کہ آپ ﷺ متمتع تھے۔ اور آپ ﷺ کے استمتاع کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے حج پر عمرہ کو مقدم کیا اور عمرہ سے فارغ ہونے کے بعد محظورات احرام کو مباح کیا یہاں تک کہ اس کے بعد حج کا احرام باندھا۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ یہ مطلب خطاء ہے اور اجماع کا مخالف ہے اور اس کے ساتھ آپ ﷺ نے عمرہ سے فارغ ہونے کے بعد محظورات احرام کو مباح بھی نہیں جانا تھا اور نہ ہی اس کا ارتکاب کیا تھا۔ پھر ابن الملکؒ نے فرمایا ہے کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ قارن تھے تو وہ استمتعنا کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ یہ استمتاع آپ کے صحابہ میں سے کسی نے کیا تھا اور آپ نے ان کے فعل کی نسبت اپنی طرف کی کیونکہ آپ امر تھے (انتہی) لیکن یہ ایسا تکلف ہے جس کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہاں استمتاع سے مراد استمتاع لغوی ہے بمعنی انتفاع کے جیسا کہ ماقبل میں گزرا۔

قوله: ...... : ''**فليحل**'' یاء کے فتحہ اور حاء کے کسرہ کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں **فليحل** حاء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

''**الحل**'' منصوب ہے بنا بر مصدریت اور ''**كله**'' اس کیلئے تاکید ہے۔

قوله: فان العمرة ...... الى يوم القيامة:

ابن الملکؒ فرماتے ہیں یعنی حج کے مہینوں میں عمرہ کا حج میں داخل ہونا اس سال کے ساتھ خاص نہیں تھا بلکہ ہر سال جائز ہے۔

وَهٰذَا الْبَابُ خَالٍ عَنِ الْفَصْلِ الثَّانِى: ''اور اس باب میں دوسری فصل نہیں ہے''۔

الفصل الثّالث:

احرام کی تبدیلی کے حکم پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تامل

۲۵۵۹: وَعَنْ عَطَاءٍ قَالَ سَمِعْتُ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ فِىْ نَاسٍ مَعِىَ قَالَ اَهْلَلْنَا اَصْحَابَ مُحَمَّدٍ ﷺ

بِالْحَجِّ خَالِصًا وَحْدَهُ قَالَ عَطَاءٌ قَالَ جَابِرٌ فَقَدِمَ النَّبِيُّ ﷺ صُبْحَ رَابِعَةٍ مَضَتْ مِنْ ذِي الْحِجَّةِ فَأَمَرَنَا أَنْ نَحِلَّ قَالَ عَطَاءٌ قَالَ حِلُّوْا وَأَصِيبُوا النِّسَاءَ قَالَ عَطَاءٌ وَلَمْ يَعْزِمْ عَلَيْهِمْ وَلٰكِنْ أَحَلَّهُنَّ لَهُمْ فَقُلْنَا لَمَّا لَمْ يَكُنْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ عَرَفَةَ إِلَّا خَمْسٌ أَمَرَنَا أَنْ نُفْضِيَ إِلٰى نِسَائِنَا فَنَأْتِيَ عَرَفَةَ تَقْطُرُ مَذَاكِيْرُنَا الْمَنِيَّ قَالَ يَقُوْلُ جَابِرٌ بِيَدِهٖ كَأَنِّي أَنْظُرُ إِلٰى قَوْلِهٖ بِيَدِهٖ يُحَرِّكُهَا قَالَ فَقَامَ النَّبِيُّ ﷺ فِيْنَا فَقَالَ قَدْ عَلِمْتُمْ أَنِّي أَتْقَاكُمْ لِلّٰهِ وَأَصْدَقُكُمْ وَأَبَرُّكُمْ وَلَوْ لَا هَدْيِي لَحَلَلْتُ كَمَا تَحِلُّوْنَ وَلَوِ اسْتَقْبَلْتُ مِنْ أَمْرِي مَا اسْتَدْبَرْتُ لَمْ أَسُقِ الْهَدْيَ فَحِلُّوْا فَحَلَلْنَا وَسَمِعْنَا وَأَطَعْنَا قَالَ عَطَاءٌ قَالَ جَابِرٌ فَقَدِمَ عَلِيٌّ مِنْ سِعَايَتِهٖ فَقَالَ بِمَ أَهْلَلْتَ قَالَ بِمَا أَهَلَّ بِهِ النَّبِيُّ ﷺ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَأَهْدِ وَامْكُثْ حَرَامًا قَالَ وَأَهْدٰى لَهُ عَلِيٌّ هَدْيًا فَقَالَ سُرَاقَةُ بْنُ مَالِكِ بْنِ جُعْشُمٍ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ أَلِعَامِنَا هٰذَا أَمْ لِأَبَدٍ قَالَ لِأَبَدٍ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۸۸۳/۲ حدیث رقم (۱۴۱۔ ۱۲۱۶)۔ والنسائی فی السنن ۱۷۸/۵ حدیث رقم ۲۸۰۵۔ وابن ماجه ۹۹۲/۲ حدیث رقم ۲۹۸۰۔ واحمد فی المسند ۱۷۵/٤۔

ترجمہ: حضرت عطاء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے سنا' میرے ساتھ سننے میں بہت سے آدمی شریک تھے۔ جابر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم نے یعنی نبی کریم ﷺ کے صحابہؓ نے حج کا خالص تر یعنی صرف حج کا بغیر عمرے کے احرام باندھا۔ عطاءؒ نے کہا کہ جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ذی الحجہ کی چوتھی تاریخ کی صبح کو تشریف لائے۔ پس ہم کو حکم کیا کہ حلال ہو جائیں۔ عطاءؒ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ حلال ہو جاؤ اور عورتوں کے پاس جاؤ یعنی ان سے صحبت بھی کرو۔ عطاء فرماتے ہیں کہ صحبت کرنی ان پر واجب نہیں ہے لیکن عورتیں ان کے لیے حلال ہیں امر وجوب کے لیے تھا اور صحبت کرنے کا حکم اباحت کے لیے ہے ہم نے بطور تعجب کے کہا جب کہ ہمارے درمیان اور عرفہ کے درمیان پانچ راتیں تھیں ہم کو حکم کیا کہ ہم اپنی بیویوں سے صحبت کریں پھر میدان عرفات میں حاضر ہوں۔ اس حالت میں کہ ہمارے عضو مخصوص منی کو ٹپکا رہے ہوں۔ یعنی جماع کے قریب ہوئے ہوں اور اس کو جاہلیت میں عیب شمار کرتے تھے اور حج میں باعث نقصان سمجھتے تھے عطاءؒ نے کہا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اپنے ہاتھ کے ساتھ اشارہ کیا گویا کہ میں ان کے ہاتھ کے اشارے کی طرف دیکھ رہا ہوں اور وہ اپنے ہاتھ کے ساتھ ہلاتے تھے۔ پس جابر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی کریم ﷺ ہمارے درمیان خطبہ کہنے کے لیے کھڑے ہوئے پس آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہاری نسبت خدا سے بہت زیادہ ڈرتا ہوں اور تم میں سے زیادہ سچا ہوں۔ اور تم میں سے زیادہ نیک ہوں اور اگر میرے ساتھ ہدی نہ ہوتی البتہ میں حلال ہو جاتا جیسے کہ تم حلال ہوئے اور اگر میں اپنے کام کو پہلے سے جانتا ہوتا' اس چیز کو جو میں نے بعد میں جانا تو میں ہدی کو نہ لاتا یعنی اگر مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا احرام سے نکلنا ایسا شاق ہوگا تو میں ہدی ساتھ نہ لاتا اور میں بھی احرام سے نکل آتا۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا حلال ہو جاؤ تو پھر ہم حلال ہوئے اور ہم نے سنا اور طاعت کی۔ عطاءؒ کہتے ہیں کہ جابر رضی اللہ عنہ نے کہا۔ پس حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے کام سے آئے جو یمن کے قاضی بن کر گئے تھے وہاں سے آئے پس حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کس چیز کے ساتھ تم نے احرام باندھا۔ کہا اس چیز کے ساتھ احرام باندھا جس کے ساتھ نبی کریم ﷺ نے احرام باندھا تو حضور ﷺ نے ان کو ارشاد

فرمایا کہ یوم نحر کو ہدی ذبح کرنا جو کہ قارن کے لیے واجب ہے اور حالت احرام میں ٹھہرے رہو۔ اب جیسے کہ میں نے کہا ہے جابر رضی اللہ عنہ نے کہا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہدی لے کر آئے یا اپنے لئے ہدی لے کر آئے پس سراقہ بن مالک بن جعشم یعنی مالک کے بیٹے سراقہ نے کہا اے اللہ کے رسول! کیا اس سال کے لیے ہے یا ہمیشہ کے لیے؟ یعنی عمرے کا جائز ہونا حج کے مہینوں میں اسی سال کے لئے ہے یا ہمیشہ کے لئے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں! بلکہ ہمیشہ کے لئے ہے۔

اختلاف نسخ: ''امرنا'' ایک نسخہ میں صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

حل لغات: ''حلوا'' حاء کے کسرہ اور لام کے شد کے ساتھ ہے۔

تشریح: ''**ذی الحجة**'' حاء کے کسرہ کے ساتھ ہے نہ کہ اس کے غیر کے ساتھ۔

''**سعاية**'' سین کے کسرہ کے ساتھ ہے ''**نفضی**'' افضاء سے ہے فصل کے معنی میں ہے۔

امور نحویہ: ''**اصحاب محمد** صلی اللہ علیہ وسلم'' منصوب بالاختصاص ہے یا یہاں فعل مقرر کی وجہ سے منصوب ہے۔

''**فناتی**'' مرفوع ہے۔

''**تقطر مذاكيرنا المنىٰ**'' جملہ حالیہ ہے۔

''**ما استدبرت**'' ما موصولہ ہے مفعول ہونے کی وجہ سے محلاً منصوب ہے۔

امور بلاغۃ: ''**وأصيبوا النسآء**'' تخصیص بعد التعمیم ہے اہتمام کیلئے اور تنصیص ہے ابہام سے دفع ایہام کیلئے۔

''**بيده يحركها**'' شاید کہ مذاکیر کے حرکت کو تشبیہ دینے کا ارادہ کیا ہو تحریک ید کے ساتھ یا ان کے اور عرفہ کے درمیان قلت مدت کی طرف اشارہ ہے۔ یا اشارہ ہے ان لوگوں پر نکیر کرنے اور ان پر اظہار افسوس کی طرف۔

''**بالحج خالصًا وحده**'' حضرت جابر کے گمان کے مطابق ہے ورنہ پہلے گزر چکا ہے کہ بعض صحابہ نے صرف عمرہ کا احرام باندھا تھا۔ یا اصحاب سے مراد اکثریت ہے یا بعض صحابہ مراد ہیں یا وہ مراد ہے جو ہدی ساتھ لے کر نہیں گئے تھے اور یہ وجہ زیادہ واضح ہے۔ اور حضرت جابر نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حج سے سکوت اختیار کیا ہے تو اس کو حمل کیا جائے گا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قارن تھے۔

''**ولكن احلهن لهم**'' یعنی جماع ان کیلئے عزیمت نہیں قرار دیا بلکہ رخصت قرار دیا برخلاف فسخ کے کہ وہ عزیمت تھا پس ''حلوا'' کا امر وجوب کیلئے ہے اور اصیبوا کا امر اباحت یا استحباب کیلئے ہے۔

''**ان نفضی الی نسائنا**'' یہ کہنا یہ ہے جماع سے جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: ﴿**وقد افضىٰ بعضكم الىٰ بعض**﴾[النساء: ۲۱] حالانکہ تم باہم ایک دوسرے سے بے حجابانہ مل چکے ہو۔

''**تقطر مذاكيرنا** ......'' قرب جماع سے کنایہ ہے اور زمانہ جاہلیت میں یہ عیب تھا کہ وہ لوگ اس کو حج میں نقصان کا باعث سمجھتے تھے۔

''**سعاية**'' یعنی یمن میں قضاء وغیرہ کے عوض میں جو ملا تھا اس میں سے لے کر آئے تھے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ارباب صدقات سے صدقات وصول کرنے کے عوض جو کچھ ملا تھا اس میں سے ہدی لے کر آیا اور اسی سے ہے کہ عامل زکوٰۃ کو ساعی کہتے ہیں۔ اور دونوں باتیں جمع ہونے سے کوئی مانع نہیں ہے۔

''**العامنا هذا**......'' یعنی عمرہ کا حج کے مہینوں میں جواز یا حج کا عمرہ کی طرف فسخ کرنا اس سال کے ساتھ خاص ہے یا ہمیشہ کیلئے ہے؟ اور پہلا جمہور کا قول ہے اور ثانی امام احمد کا قول ہے۔

احرام کی تبدیلی حکم پر لوگوں کا متردد ہونا

۲۵۶۰: وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّهَا قَالَتْ قَدِمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِاَ رْبَعٍ مَضَيْنَ مِنْ ذِی الْحِجَّةِ اَوْ خَمْسٍ فَدَخَلَ عَلَیَّ وَهُوَ غَضْبَانٌ فَقُلْتُ مَنْ اَغْضَبَكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ النَّارَ قَالَ اَوَ مَا شَعَرْتِ اَنِّی اَمَرْتُ النَّاسَ بِاَمْرٍ فَاِذَا هُمْ يَتَرَدَّدُوْنَ لَوْ اِنِّی اسْتَقْبَلْتُ مِنْ اَمْرِیْ مَا اسْتَدْبَرْتُ مَا سُقْتُ الْهَدْیَ مَعِی حَتّٰی اَشْتَرِيَهٗ ثُمَّ اَحِلَّ كَمَا حَلُّوْا ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۸۷۹/۲ حدیث رقم (۱۳۰۔ ۱۲۱۱)۔

ترجمه: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ ذی الحجہ کی چوتھی تاریخ گزری تھی تو تشریف لائے یا پانچویں تاریخ پھر آئے میرے پاس اس حالت میں کہ غصّے میں تھے پس میں نے کہا کس نے غصہ دلایا آپ ﷺ کو اے اللہ کے رسولؐ! اللہ تعالیٰ اس کو آگ میں داخل کرے فرمایا کیا تو نہیں جانتی ہے کہ تحقیق میں نے حکم کیا لوگوں کو یعنی بعضوں کو ایک کام کا پھر وہ تردد کرتے ہیں اور اگر مجھے پہلے سے معلوم ہوتی وہ چیز جو میں نے بعد میں جانی تو میں اپنی ہدی اپنے ساتھ نہ لاتا۔ یہاں تک کہ میں اس کو مکے میں خرید تا یا راستے سے پھر حلال ہو جاتا جس طرح لوگ حلال ہوئے اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :قدم رسول الله ﷺ لاربع ......او خمس:

قوله :وهو غضبان:"وهو غضبان" یعنی غصے سے بھرے ہوئے تھے جب بعض صحابہ نے حج کو عمرہ کی طرف فسخ کرنے میں تاخیر کی۔مشہور علتوں میں سے کسی علت کی وجہ سے۔

بَابُ دُخُوْلِ مَكَّةَ وَالطَّوَافِ

مکہ میں داخل ہونے اور طواف کرنے کا بیان

یعنی یہ باب مکہ میں داخل ہونے کے آداب کے بارے میں ہے۔"والطواف" کا عطف "دخول" پر ہے۔

الفصل الاول:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دخول مکہ کے وقت معمول

۲۵۶۱: عَنْ نَافِعٍ قَالَ اِنَّ ابْنَ عُمَرَ كَانَ لَا يَقْدُمُ مَكَّةَ اِلَّا بَاتَ بِذِیْ طُوًی حَتّٰی يُصْبِحَ وَيَغْتَسِلَ وَيُصَلِّی فَيَدْخُلَ مَكَّةَ نَهَارًا وَاِذَا نَفَرَ مِنْهَا مَرَّ بِذِی طُوًی وَبَاتَ بِهَا حَتّٰی يُصْبِحَ وَيَذْكُرُ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ كَانَ يَفْعَلُ ذٰلِكَ ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۴۳۵/۳ حدیث رقم ۱۷۷۳۔ ومسلم فی صحیحه ۹۱۹/۲ حدیث رقم (۲۲۶۔ ۱۲۵۹)۔
وابوداؤد فی السنن ۴۳۵/۲۔ حدیث رقم ۱۸۶۵ والنسائی فی السنن ۱۹۹/۵ حدیث رقم ۲۸۶۲۔ والدارمی ۹۷/۲

حدیث رقم ۱۹۲۷۔ ومالك فی الموطأ ۳۲٤/۱ حدیث رقم ۲۰ من کتاب الحج۔

ترجمہ: حضرت نافعؒ سے روایت ہے کہ تحقیق ابن عمر رضی اللہ عنہما مکہ مکرمہ میں تشریف نہیں لاتے تھے مگر کہ رات گزارتے ذی طوی میں یہاں تک صبح کرتے اور نہاتے اور نماز پڑھتے پھر مکے میں داخل ہوتے' دن کے وقت اور جس وقت نکلتے تو ذی طوی میں رات گزارتے اس میں صبح تک رہتے اور ذکر کرتے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے ہی کیا کرتے تھے۔اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله :لایقدم مکة الا بات بذی طوی...... یدحل مکة نهارا:**

''**لا یقدم**'' دال کے فتحہ کے ساتھ **لا یجیئ** کے معنی میں ہے۔

''**بذی طوی**'' طاء کے فتحہ اور ضمہ اور کسرہ تینوں کے ساتھ ہے۔اور فتحہ زیادہ فصیح اور مشہور ہے پھر اس کے بعد ضمہ زیادہ ہے اور یہی جمہور قراء کا مسلک ہے۔اور یہ منصوب اور غیر منصوب دونوں ہے۔مکہ میں حرم کے اندر ایک مقام ہے۔اور بعض کا کہنا ہے کہ یہ ایک کنویں کا نام ہے مکہ کے پاس اہل مدینہ کے راستے میں۔

''**یدخل مکة نهارا**'': ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ افضل طریقہ یہ ہے کہ مکہ میں دن کے وقت داخل ہوتا کہ بیت اللہ کو دور سے دیکھ لے (انتہی)۔اور بعض نے کہا ہے تا کہ مکہ میں نقصان پہنچانے والوں سے محفوظ رہے اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ وہ وہاں استراحت، غسل کرنے اور پاکی حاصل کرنے کیلئے ٹھہرتے تھے۔

قوله :ویذکر ان النبی ﷺ کان یفعل ذلك:

''**ویذکر**'' کا عطف ''**لا یقدم**'' پر مطف ہے۔یعنی جو کچھ ذکر ہوا یہ سب کچھ نبی کرتے تھے نکلتے وقت اور داخل ہوتے وقت۔

کسی صاحب حال نے کیا خوب کہا ہے:

وسنا برق نفی عنی الکری لم یزل یلمع بی من ذی طویٰ

منزل سلمیٰ به نازلة طیب الساحة معمور الفنا

نہایۃ میں ہے کہ دن کو داخل ہو یا رات کو اس میں کوئی نقصان نہیں ہے۔ابن ہمام فرماتے ہیں اس کی دلیل نسائی کی روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں دن اور رات دونوں کو داخل ہوئے حج کے موقع پر دن کے وقت داخل ہوئے اور عمرہ کے موقع پر رات کے وقت۔

باقی جو ابن عمر سے روایت ہے کہ وہ رات کے وقت داخل ہونے سے روکتے تھے تو وہ سنت کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ حاجیوں پر مشقتؒ کی وجہ سے تا کہ وہ چوروں سے محفوظ رہیں۔

ابن حبانؒ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام مکہ میں پیدل، برہنہ پاؤں داخل ہوتے تھے۔بیت اللہ کا طواف کرتے اور اور حج کے افعال پیدل اور ننگے پاؤں ادا کرتے تھے۔

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سات لاکھ بنی اسرائیل نے بیت اللہ کا حج کیا ہے اور وہ لوگ اپنے جوتوں کو تنعیم میں رکھ کر مکہ میں ننگے پاؤں داخل ہوتے تھے بیت اللہ کی تعظیم کی وجہ سے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دخول مکہ کا ذکر

۲۵۶۲: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ لَمَّا جَاءَ اِلٰی مَکَّةَ دَخَلَهَا مِنْ اَعْلَاهَا وَخَرَجَ مِنْ اَسْفَلِهَا۔

(متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤٣٧/٣۔ حدیث رقم ١٥٧٧۔ ومسلم فی صحیحه ٩١٨/٢ حدیث رقم (٢٢٤۔ ١٢٥٨)۔
وابوداؤد فی السنن ٤٣٧/٢ حدیث رقم ١٨٦٩۔ والترمذی فی السنن ٢٠٩/٣ حدیث رقم ٨٥٣۔ والنسائی ٢٠٠/٥
حدیث رقم ٢٨٦٥۔ وابن ماجه ٩٨١/٢ حدیث رقم ٢٩٤٠ واحمد فی المسند ٤٠/٦۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ تحقیق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ کی طرف تشریف لائے یعنی حجۃ الوداع میں بلندی کی طرف سے داخل ہوئے اور نشیب کی طرف سے نکلے۔اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :دخلها من اعلاها: اس سے مراد ثنية كداء ہے۔

''ثنية كداء'' کاف کے فتحہ اور مد اور تنوین کے ساتھ ہے اور عدم تنوین کے ساتھ بھی ہے اس بات کو دیکھتے ہوئے کہ یہ ایک جگہ کا نام ہے اور یہ وہ جگہ ہے جس سے مقبرہ کی طرف جس کو عام لوگ المعلات کے نام سے یاد کرتے ہیں اترا جاتا ہے اور خواص کے نزدیک اس مقبرہ کا نام الحجون ہے اور اس کا اس ثنیہ پر بھی ہوتا ہے جو اس سمت تھوڑا پہلے ہے۔اور ثنیہ دو پہاڑوں کے درمیان تنگ راستے کو کہتے ہیں۔اور اس کے نیچے ثنیہ کدی ہے کاف کے ضمہ اور قصر کے ساتھ اور تنوین کے ساتھ ہے اور ترک تنوین کے ساتھ بھی ہے۔اور اب اس کا نام باب الشكية ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شوافع کے نزدیک مکہ میں ثنیۃ العلیا سے داخل ہونا اور ثنیۃ السفلی سے نکلنا مستحب ہے۔خواہ یہ ثنیہ مکہ کے راستے میں ہو جیسے مدنی کیلئے یا نہ ہو جیسے یمنی کیلئے۔بعض حضرات کا کہنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دخول اور خروج میں راستے کو تبدیل کیا تغیر حال پر فال لینے کیلئے۔جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عید میں کیا تھا۔اور تا کہ دونوں راستے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے گواہی دے اور تا کہ دونوں راستوں والے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہاں سے گزرنے سے برکت حاصل کرلیں۔(انتہی)

یا ثنیہ علیا کا دخول اور سفلی کا خروج کے ساتھ مناسبت کی وجہ سے کیا۔یا اس وجہ سے کہ مکہ میں آنے کے مناسب ظہور اور اعلان ہے اور مکہ سے خروج کے مناسب خفاء اور کتمان ہے کیونکہ مکہ میں دخول نیکی ہے اور اس سے خروج صورتاً بدی ہے۔اور اس وجہ سے بھی کہ ابراہیم علیہ السلام بلندی پر تھے جب انہوں نے فرمایا: ﴿فاجعل افئدة من الناس تهوى اليهم﴾[ابراهيم:٣٧] تو آپ لوگوں کے قلوب ان کی طرف مائل کردیجئے۔

جیسا کہ سہیلی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔اور یہ بھی روایت ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے جب بیت اللہ کو بنالیا تو اس پتھر پر جس کو مقام ابراہیم کہتے ہیں کھڑے ہو کر اور ثنیہ علیا پر بھی کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ اے لوگو اللہ نے تمہارے لیے گھر بنایا ہے پس تم اس گھر کا حج کرو۔پس ان کو جواب دیا نطفوں نے پیٹھ اور رحم میں ''لبيك'' کے الفاظ سے اور جس کے حق بیت اللہ کی زیارت مکرر لکھی گئی تھا انہوں نے مکرر جواب دیا اسی طرح ابن حجرؒ نے ذکر کیا ہے۔

اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ جواب ان ارواح اور اشباح نے دیا تھا جن کو اللہ نے مقرر کیا تھا اور یہ فیصلہ فرمایا تھا کہ یہ بیت اللہ کے زیارت کا شرف حاصل کریں گے۔

طواف کرنے کے لیے پاکی شرط ہے

٢٥٦٣:وَعَنْ عُرْوَةَ ابْنِ الزُّبَيْرِ قَالَ قَدْ حَجَّ النَّبِيُّ ﷺ فَاَخْبَرَتْنِي عَآئِشَةُ اَنَّ اَوَّلَ شَيْءٍ بَدَأَبِهٖ حِيْنَ قَدِمَ مَكَّةَ اَنَّهٗ تَوَضَّأَ ثُمَّ طَافَ بِالْبَيْتِ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ عُمْرَةٌ ثُمَّ حَجَّ اَبُوْ بَكْرٍ فَكَانَ اَوَّلُ شَيْءٍ بَدَأَ بِهِ الطَّوَافِ بِا

لِّبَيْتِ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ عُمْرَةٌ ثُمَّ عُمَرُ ثُمَّ عُثْمَانُ مِثْلَ ذٰلِكَ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۴۹۶/۳۔ حدیث رقم ۱۶۱۴۔ ومسلم فی صحیحه ۹۰۶/۲ حدیث رقم (۱۹۰۔ ۱۲۳۵)۔

ترجمہ: عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تحقیق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کیا۔ پس مجھے عائشہ رضی اللہ عنہا نے خبر دی کہ پہلی چیز جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی وہ یہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں آئے تو وضو کیا اور پھر خانہ کعبہ کا طواف کیا۔ یعنی عمرے کا طواف کیا (اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قارن تھے یا متمتع تھے) پھر عمرہ نہ ہوا پھر (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد) حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حج کیا تو انہوں نے بھی خانہ کعبہ کے طواف سے حج کے مناسک کی ابتداء کی پھر عمرہ نہ کیا پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح کیا۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله :اول شیء بدأ به ....توضأ:**

''اول '' رفع کے ساتھ ہے۔''انه توضأ'' یعنی تجدید وضوء کیونکہ پہلے گزر چکا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غسل کر چکے تھے۔ یا وضوء سے معنی لغوی مراد ہے۔

بہرصورت اس میں طہارت کا صحت طواف کیلئے شرط ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ اس کی مشروعیت پر اجماع ہے بلکہ اختلاف طہارت واجب ہے اور جمہور کے نزدیک شرط ہے باقی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے استدلال کرنا: ''**الطواف بالبیت صلاۃ**'' درست نہیں کیونکہ یہ حدیث ضعیف ہے اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ کسی چیز کے ساتھ تشبیہ تمام چیزوں میں مشارکت کا مقتضی نہیں ہوتی کیا نہیں دیکھتے ہو کہ طواف میں کھانا پینا جائز ہے بالا جماع اور نماز میں بغیر کسی نزاع کے ناجائز ہے۔

اور ابن حجرؒ کا یہ قول غریب ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جمہور نے اس حدیث کے مرفوع ہونے کے ضعف کو نہیں دیکھا کیونکہ زیادہ سے زیادہ یہ قول صحابی ہوگا اور قول صحابی صحیح قول کے مطابق حجت ہے۔ وجہ غرابت یہ ہے کہ اس جیسی روایات شرط ہونے کا فائدہ نہیں دیتی۔

قوله :ثم طاف بالبیت: یعنی عمرے کا طواف کیا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قارن تھے یا متمتع تھے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ طواف قدوم کیا کیونکہ شوافع کے نزدیک قارن کے حق میں تداخل افعال ہوتا ہے۔ لیکن یہ علامہ طیبیؒ کا وہم ہے کیونکہ مفرد اور قارن میں سے ہر ایک کیلئے طواف قدوم سنت ہے بالاتفاق بلکہ امام مالک نے واجب کہا ہے اور اس وقت اس سے طواف رکن متصور نہیں ہو سکتا کیونکہ طواف رکن کا وقت ان کے حق میں وقوف کے بعد داخل ہوتا ہے بالا جماع اور طواف قدوم بالاتفاق وقوف کرنے سے فوت ہو جاتا ہے۔

قوله :ثم حج ابوبکر فکان اول شیء : ''اول '' رفع کے ساتھ ہے۔

قوله :ثم لم تکن عمرة :

''**لم تکن**'' تذکیر و تانیث دونوں کے ساتھ ہے۔

''**ثم لم تکن عمرة**'' یعنی اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی عمرہ نہیں کیا بلکہ اسی عمرہ پر اکتفاء کیا جو حج کے ساتھ ملا ہوا تھا۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج افراد کیا۔ لیکن ان کے اس قول پر اشکال ہے کہ حج افراد کرنا اس طور پر کہ اس کے بعد عمرہ نہ کرے شافعیؒ کے نزدیک بھی خلاف افضل ہے تو حدیث کو اس پر کیسے حمل کیا جا سکتا ہے؟

ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کا یہ مطلب ذکر کیا ہے کہ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمرہ کے افعال یعنی سعی، حلق وغیرہ ادا نہیں کیے بلکہ صرف طواف پر اکتفاء کیا۔ تو یہ دلالت کر رہا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طواف قدوم کیلئے تھا اور اس کا تصور صرف مفرد کیلئے ہو سکتا ہے کیونکہ قارن کیلئے

افعال میں تداخل ہے جو کہ ہمارے نزدیک غیر معتبر ہے۔

ہمارے علماء میں سے مصابیح کے بعض شراح نے کہا ہے کہ یہ قول"ثم لم تکن عمرۃ" جیسا کہ بخاری میں ہے اس کا مطلب ہے کہ وہ اپنے اس احرام سے نہیں نکلے اور اس کو عمرہ نہیں بنایا۔ پھر اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ یہ حضرت عائشہؓ کا قول ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ عروہ کا قول ہو لیکن نسق کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت عروہ کا قول ہے پھر یہ قول ثم حج ابو بکر آخر حدیث تک یہ بغیر کسی تردد کے عروہ کا قول ہے کیونکہ مسلم کی حدیث کے سیاق میں ہے ثم حج عثمانؓ اور مسلم کی اس روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے اول شیء بدأ به الطواف بالبیت ثم حججت مع ابی الزبیر بن العوام و کان اول شیء بدأ به الطواف کہ یہ عروہ کا قول ہے اور اس سے ابن حجر کا قول رد ہوا کہ انہوں نے کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ یہ سب حضرت عائشہؓ کا قول ہے اور مسلم میں ثم لم تکن عمرۃ کی جگہ ثم لم تکن غیرہ ہے اور مطلب اس کا یہ ہے کہ پھر وہاں احرام سے حلال نہ ہوئے اور یہاں تک کہ اپنے ھدایا کو ذبح کیا۔

قوله :ثم عثمان مثل ذلك: "مثل" نصب کے ساتھ ہے تقدیر عبارت یوں ہے"فعلا مثل ذلك" اور ایک نسخہ میں رفع کے ساتھ ہے پھر تقدیر عبارت یہ ہوگی"فعلهما مثل ذلك"۔حاصل یہ ہے کہ ان سب نے حج کے بعد عمرہ نہیں کیا ہے۔ اس لیے بعض حفاظ نے کہا ہے کہ مکہ سے صرف عمرہ کیلئے خروج حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ کسی سے ثابت نہیں ہے اور انہوں نے ضرورت کی وجہ سے کیا تھا کہ عمرہ چھوڑ چکی تھی۔ پھر اس کا قضا کیا۔ واللہ اعلم

طواف کی کیفیت کا ذکر

۲۵۶۴:وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَا نَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا طَافَ فِي الْحَجِّ اَوِ الْعُمْرَةِ اَوَّلَ مَا يَقْدِمُ مَعِيَ ثَلَاثَةَ اَطْوَافٍ وَمَشٰى اَرْبَعَةً ثُمَّ سَجَدَ سَجْدَتَيْنِ ثُمَّ يَطُوْفُ بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ - (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۴۷۷/۳۔ حدیث رقم ۱۶۱۶۔ ومسلم فی صحیحه ۹۲۰/۲۔ حدیث رقم (۲۳۱۔ ۱۲۶۱)۔ وابوداؤد فی السنن ۴۴۹/۲ حدیث رقم ۱۸۹۳ والنسائی فی السنن ۲۲۹/۵ حدیث رقم ۲۹۴۱۔ واحمد فی المسند ۱۲۵/۲۔

ترجمه: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب حج یا عمرے کا طواف کرتے تو آپ ﷺ تین شوط (چکروں) میں جلدی کرتے اور اپنی چال پر چلتے چار مرتبہ یعنی چکروں میں اپنی چال چلتے پھر طواف کی دو رکعتیں پڑھتے پھر صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتے۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :کان رسول الله ﷺ اذا طاف فی الحج......ثلاثة طواف:

"فی الحج": اور ایک نسخہ میں بالحج ہے۔

"او": تنویع کیلئے ہے"اول ما یقدم" ظرف ہے"سعی" جواب شرط ہے اور یہ بھی بعید نہیں کہ یہ طاف کیلئے ظرف ہو اور رمل کے معنی میں ہو۔ جیسا کہ ایک روایت میں ہے"ثلاثة اشواط" مفعول فیہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے نہ کہ مفعول ہونے کی وجہ سے جیسا کہ ابن حجرؒ نے ذکر کیا ہے اور نہ اس وجہ سے کہ یہ مصدر محذوف کیلئے صفت ہے جیسا کہ علامہ طیبیؒ نے کہا ہے اور رمل سے مراد خبب ہے یعنی بغیر دوڑنے اور کودنے کے تیز تیز چلنے کو کہتے ہیں۔

قوله :ومشی اربعة......ثم یطوف بین الصفا والمروة:

"یطوف" مضارع سے تعبیر کیا ہے اس میں اور یقدم دونوں میں حال ماضی کی حکایت ہے۔

طواف میں چلنے کی کیفیت کا بیان

۲۵۶۵: وَعَنْهُ قَالَ رَمَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مِنَ الْحَجَرِ اِلَى الْحَجَرِ ثَلَاثًا وَمَشٰى اَرْبَعًا وَكَانَ يَسْعٰى بِبَطْنِ الْمَسِيْلِ اِذَا طَافَ بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۴۷۷/۳۔ حدیث رقم ۱۶۴۴۔ ومسلم فی صحیحه ۹۲۰/۲ حدیث رقم (۲۳۰۔ ۱۲۶۱)۔ والترمذی فی السنن ۲۱۲/۳ حدیث رقم ۸۵۷ ومالك فی الموطأ ۳۶۵/۱ حدیث رقم ۱۰۸ من کتاب الحج۔ والدارمی فی السنن ۶۴/۲ حدیث رقم ۱۸۴۱۔ واحمد فی المسند ۴۰/۲۔

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم طواف کے دوران حجر اسود سے حجر اسود تک تین چکروں میں جلدی چلے اور اپنی موافق چال چلے چار چکروں میں اور وطن میل میں دوڑتے تھے جس وقت صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتے تھے اس کو امام مسلم رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :رمل رسول الله ﷺ من الحجر الی الحجر:

اس میں رد ہے ان لوگوں پر جو کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکنیت کے درمیان رمل نہیں کیا ہے۔

قوله :وکان یسعی ببطن المسیل ...... والمروۃ: صفامروہ کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے۔

سعی امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک فرض اور ہمارے نزدیک واجب ہے اور دوڑنا بالاتفاق سنت ہے۔

جان لیجئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام کا حجر اسود سے حجر اسود تک رمل کرنا یہ حجۃ الوداع ۱۰ھ میں ہوا ہے اس لیے اس روایت کو مسلم کی اس روایت پر مقدم کیا جو عمرۃ القضاء کے بارے میں ہے۔ ۷ھ کو، کیونکہ جب صحابہ مکہ میں آئے تو کفار نے کہا یثرب (مدینہ) کے بخار نے ان کو کمزور کر دیا ہے اور پھر حجر اسود کے پاس بیٹھ گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو حکم دیا کہ صرف حجر اسود کی جانب میں رمل کرے تو مشرکین نے صحابہ کی قوت اور بہادری کے بقاء پر تعجب کیا۔ اسی لیے ابوداؤد کی روایت میں ہے **کانهم الغذلان۔**

پھر اس کی مشروعیت ہمیشہ کیلئے ہوگئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حجۃ الوداع کے موقع پر اس کے کرنے کی دلیل سے باوجود یہ کہ اس وقت اس کا سبب جو کہ کفار کے سامنے اظہارِ قوت تھا ختم ہو چکا تھا۔ تاکہ رمل کرنے والا اس سبب کو مستحضر رکھے اور سبب کفار پر غلبہ ہے اور خاص کر کے اس شرف والی جگہ میں اور تاکہ اس کو صحابہ کی حالت اور ان کے دین کی خدمات میں سخت تکالیف برداشت کرنا یاد رہے اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے صحیح طور پر ثابت ہے کہ انہوں نے رمل اور اضطباع میں کندھوں کے کھولنے کے بارے میں فرمایا کہ ان کے اسباب اگرچہ ختم ہو چکے ہیں لیکن ہم اس کام کو جو ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ کیا ہو چھوڑنے والے نہیں ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حجر اسود کا بوسہ لینا

۲۵۶۶: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ لَمَّا قَدِمَ مَكَّةَ اَتَى الْحَجَرَ فَاسْتَلَمَهٗ ثُمَّ مَشٰى عَلٰى يَمِيْنِهٖ فَرَمَلَ ثَلَاثًا وَمَشٰى اَرْبَعًا ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۹۲۰/۲ حدیث رقم (۲۳۲۔ ۱۲۶۱)۔ والترمذی فی السنن ۲۱۱/۳ حدیث رقم ۸۵۶۔ والنسائی ۲۲۸/۵ حدیث رقم ۲۹۳۹۔ والدارمی ۶۴/۲ حدیث رقم ۱۸۴۰۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ میں تشریف لائے تو حجر اسود کے پاس آئے‘

اس کو بوسہ دیا پھر اپنے دائیں طرف چلے۔ رمل کیا یعنی جیسے کہ پہلوان چلتے ہیں تین مرتبہ اور اپنی چال چلے چار مرتبہ ۔یعنی چار چکروں میں۔اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: مشہور روایات میں حجر اسود پر سجدہ کرنے اور اس کے پاس تثلیث ذکر نہیں ہے۔یعنی اپنے دائیں طرف دروازے کی طرف سے اور بعض نے کہا ہے کہ حجر اسود کے دائیں طرف۔مطلب یہ ہے کہ آپ کعبہ کے گرد گھومتے تھے اپنے دائیں جانب سے تا کہ دل جو بیت الرب ہے بیت اللہ کے محاذات اور برابری میں ہو مقام قربت میں۔

آپ ﷺ کے حجر اسود کو بوسہ دینے کا ذکر

۲۵۶۷: وَعَنِ الزُّبَيْرِ بْنِ عَرَبِيٍّ قَالَ سَاَلَ رَجُلٌ ابْنَ عُمَرَ عَنْ اِسْتِلَامِ الْحَجَرِ فَقَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَسْتَلِمُهُ وَيُقَبِّلُهُ۔ (رواہ لبخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۴۷۵/۳۔ حدیث رقم ۱۶۱۱۔ والترمذی فی السنن ۲۱۵/۳ حدیث رقم ۸۶۱۔ والنسائی ۲۳۱/۵ حدیث رقم ۲۹۴۶۔

ترجمہ: حضرت زبیر بن عربیؒ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے حجر اسود کو بوسہ دینے کے بارے میں پوچھا۔فرمایا کہ میں نے دیکھا نبی کریم ﷺ کو کہ حجر اسود کو ہاتھ لگاتے تھے اور بوسہ دیتے تھے۔اس کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

الزبیر العربی۔ یہ عربی نمیری اور تابعی بصری ہیں۔حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں اور ان سے معمر اور حماد بن زید روایت کرتے ہیں یہ ثقہ راوی ہیں۔

تشریح: قوله :سال رجل ابن عمر عن استلام الحجر:

آپ ﷺ کا رکن یمانی کا استیلام کرنا

۲۵۶۸: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ لَمْ اَرَا لنَّبِیَّ ﷺ يَسْتَلِمُ مِنَ الْبَيْتِ اِلاَّ الرُّكْنَيْنِ الْيَمَانِيَيْنِ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۴۷۳/۳۔ حدیث رقم ۱۶۰۹۔ ومسلم فی صحیحه ۹۲۵/۲ حدیث رقم (۲۴۷۔ ۱۲۶۹)۔ والترمذی فی السنن ۲۱۳/۳ حدیث رقم ۸۵۸۔ واحمد فی المسند ۱۱۴/۲۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو خانہ کعبہ کو ہاتھ لگاتے ہوئے نہیں دیکھا مگر دو رکنوں کو جو یمن کی جانب ہیں۔اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے

تشریح: قوله :الا الرکنین الیمانیین:

"یمانیین" یاء اول کی تخفیف اور تشدید دونوں کے ساتھ ہے علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ رکن ہے جس میں حجر اسود ہے اور رکن یمان اور باقی دو کو شامیین کہتے ہیں (انتہی) ان دونوں میں تغلیب ہے۔

نبی ﷺ نے ان کا استیلام اس لئے کیا کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کے بناء پر باقی ہے اور حجر اسود کا استیلام اسے چھونا ہے ہاتھ کے ساتھ یا چومنے کے ساتھ یا دونوں کے ساتھ اور رکن یمانی کا استیلام ہمارے مذہب میں صحیح قول کے مطابق ہاتھ کے ساتھ ہے۔

عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بیت اللہ میں چار رکن ہیں۔ پہلے رکن کی دو فضیلتیں ہیں نمبرا) حجر اسود کا اس میں ہونا نمبر۲) ابراہیم علیہ السلام بناء پر باقی رہنا اور دوسرے رکن کی فضیلت صرف بناء ابراہیم پر بقاء ہے اور باقی دو کیلئے ان میں سے کوئی فضیلت ثابت نہیں ہے اسی وجہ سے پہلے کو بوسہ دیا جاتا ہے' دوسرے کا استیلام کیا جاتا ہے اور آخری دو رکنوں کو نہ بوسہ دیا جاتا ہے اور نہ ان کا استلام کیا جاتا ہے یہ جمہور کی رائے کے مطابق ہے اور بعض نے رکن یمانی کے بوسہ کو مستحب قرار دیا ہے (انتہی)۔ اور ہمارے ائمہ میں سے امام محمد کا بھی یہی قول ہے رکن پر قیاس کرتے ہوئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عصا کے ذریعے حجر اسود کا استیلام کرنا

۲۵۶۹: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ طَافَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم فِيْ حَجَّةِ الْوَدَاعِ عَلٰى بَعِيْرٍ يَسْتَلِمُ الرُّكْنَ بِمِحْجَنٍ۔

(متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۴۷۲/۳۔ حدیث رقم ۱۶۰۷۔ ومسلم فی صحیحه ۹۲۶/۲ حدیث رقم (۲۲۳۔ ۱۲۷۲)۔
وابوداؤد ۴۴۱/۲ حدیث رقم ۱۸۷۷۔ والنسائی ۱۲۳۳/۵ حدیث رقم ۲۹۵۴۔ وابن ماجه ۹۸۳/۲ رقم ۲۹۴۸۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ کہا۔ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف کیا۔ حجۃ الوداع میں اونٹ پر عصا کے ذریعے حجر اسود کا استیلام کرتے تھے۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله :طاف النبی ﷺ فی حجة الوداع علی بعیر :**
یہ طواف افاضہ میں تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی یا عذر کی وجہ سے کیونکہ طواف میں چلنا ہمارے نزدیک واجب ہے۔ اور علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوار ہو کر طواف کیا حالانکہ پیدل طواف افضل ہے، تاکہ سب لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لیں اور یہ لوگوں کے کثرت اور ازدحام کی وجہ سے کیا۔

قوله :یستلم الرکن بمحجن: ''**محجن**'': اس عصا کو کہتے ہیں جس کا سر ٹیڑھا ہو۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس میں میم زائد ہے۔

ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں ترمذی کے علاوہ ائمہ ستہ نے روایت کیا ہے۔ **عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ان النبی ﷺ طاف فی الحجة الوداع علی راحلته یستلم الحجر بمحجنه، لأن یراه الناس ویشرف ویسألوه، فان الناس عشیوه** اور بخاری نے حضرت جابر سے **لان یراه الناس** تک روایت کیا ہے اور مسلم نے ابوطفیل سے روایت کیا ہے **رأیت النبی ﷺ یطوف بالبیت علی زاحلة یستلم الرکن بمحجن معه، ویقبل المحجن۔**

اب یہاں ایک نیا اشکال ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ بات کئی مواضع میں بغیر کسی شبہ کے ثابت ہے کہ آپؐ نے حجۃ الوداع میں رمل کیا تھا اور ایسی بات حضرت جابر کی طویل حدیث میں گزری۔ پس اس کی طرف رجوع کریں اور رمل کرنا سواری پر طواف کرنے کے منافی ہے؟

اگر اس کا یہ جواب دیا جائے کہ یہ حدیث عمرہ پر محمول ہے تو اس کو حضرت عائشہؓ کی حدیث رد کر رہا ہے جو کہ مسلم میں ہے **طاف علیه الصلوٰة والسلام فی حجة الوداع علی راحلته یستلم الرکن کراهیة ان ینصرف الناس عنه۔ عنه** کی ضمیر میں یہ بھی احتمال ہے کہ یہ رکن کی طرف راجع ہو اور مطلب یہ ہو کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیدل طواف کرتے تو لوگ حجر اسود سے ہٹ جاتے جب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس سے گزرتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے توقیر کی وجہ سے تاکہ ازدحام نہ ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ مرجع نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہو۔ اور مطلب یہ ہوگا کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سوار ہو کر طواف نہ کرتے تو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے واپس چلے جاتے کیونکہ جو بھی آپ تک پہنچنے کی کوشش کرتا

سوال کرنے کیلئے یاد یکھنے کیلئے یا اقتداء کرنے کیلئے تو وہ قدرت نہ پاتا کثرت خلق کی وجہ سے۔ تو وہ مقصود کے حصول کے بغیر چلا جاتا تو اس احتمال پر حمل کرنا لازم ہے کیونکہ اس احتمال کے موافق ابن عباسؓ کی حدیث ہے تو اجتماع حدیثیں ہو جائے گا نہ کہ تعارض حدیثین۔

اشکال کا جواب یہ ہے کہ حج میں آفاقی کیلئے ایک طواف زائد ہوتا ہے پس ممکن ہے کہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سوار ہونا روایت کیا گیا ہے یہ یوم نحر کو طواف فرض میں ہو اور پیدل طواف قدوم میں ہو۔ اور یہی بات حضرت جابر کی گزری ہوئی طویل حدیث سے معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ انہوں نے نقل کیا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ طواف جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں داخل ہوتے وقت ابتداء کی تھی۔

اگر آپ یہ کہیں کہ کیا تطبیق ہو سکتی ہے ابن عباس اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں جس میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوار ہو کر طواف کیا تا کہ سب لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ سکیں اور سوال کر سکیں اور سعید بن جبیر کی روایت میں، جس میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوار ہو کر طواف بیماری کے عذر کی وجہ سے کیا تھا۔

جیسا کہ امام محمد نے فرمایا: **اخبرنا ابوحنیفة عن حماد بن ابی سلیمان، انه سعی بین الصفا والمروة مع عکرمة فجعل حماد یصعد الصفا وعکرمة لایصعدها، فقال حماد یا عبد الله الا تصعد الصفا والمروة؟ فقال هکذا کان طواف رسول الله ﷺ** ۔

حماد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں سعید بن جبیر سے ملا اور ان کے سامنے یہ بات ذکر کی تو انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سواری پر طواف کیا اس حال میں کہ وہ بیمار تھے اور ارکان استلام کر رہے تھے۔ عصا کے ساتھ۔ پس صفا اور مروہ کے درمیان سعی بھی سواری پر کی بس اسی وجہ سے وہ صفا مروا پر نہیں چڑھے (انتہی)۔ پس جواب یہ ہے کہ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اس کو عمرہ پر حمل کیا جائے۔

اب اگر آپ یہ اعتراض کریں کہ صحیح مسلم میں یہ ثابت ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے **انما سعی رسول الله ﷺ ورمل بالبیت لیری المشرکون قوته** اور اس کیلئے لازم ہے کہ یہ عمرہ میں ہو کیونکہ حجۃ الوداع کے موقع پر کوئی مشرک نہیں تھا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ہر ایک کو اس عمرہ پر حمل کیا جائے گا جو دوسرے کے علاوہ ہو۔ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کیلئے مناسب یہ ہے کہ اس کو عمرۃ القضاء پر حمل کیا جائے۔ کیونکہ اراء ۃ اس کا فائدہ دے رہا ہے اور بیماری کی وجہ سے سوار ہونا اس کے علاوہ میں ہو اور وہ **عمرة الجعرانه** ہے۔ (انتہی)

اور کوئی مانع نہیں ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوار ہونے کی کئی علتیں اکٹھی ہو گئی ہیں یا ہم کہتے ہیں کہ بیماری پر مطلع نے رکوب کو عذر پر محمول کیا اور غیر مطلع نے اس کو اپنے رائے پر حمل کیا۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں میرے نزدیک یہی جواب ہے۔ اور ان لوگوں کی توجہ بعید از قیاس ہے جنہوں نے رکوب کو حمل کیا ہے اس بات پر تا کہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے چلے نہ جائیں۔ کیونکہ اس جیسی علت افضل امر سے مانع بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی تو پھر واجب کے لئے نافع کیسے بن سکتی ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ پھر میں نے دیکھا کہ ابن ہمام کی یہ تطبیق ابن عباس کی آنے والی حدیث کے ظاہر پر منطبق نہیں ہو رہی ہے جس میں ہے **ان رسول الله ﷺ واصحابه اعتمدوا من الجعرانة فهلوا بالبیت** اور اس کا حمل کرنا فعل صحابہ پر ہے نہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل پر بعید از قیاس ہے۔ پھر ابن حجر کا یہ قول عجیب وغریب ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوار ہو کر طواف کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں جو کچھ تھا اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجر اسود کو مس نہیں کیا بلکہ رکن کے اوپر کا حصہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابری میں تھا اس کو مس کیا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اونٹنی کے اوپر تھے۔ وجہ غرابت یہ ہے کہ راکب کیلئے ہاتھ یا جو کچھ ہاتھ میں ہو اس کے ذریعے رکن کے محاذات کی طرف اشارہ کرنا حقیقتاً ممکن ہے۔ پس ارتکاب مجاز کی کونسی ضرورت ہے۔ حالانکہ دونوں میں فرق صاف ظاہر ہے۔

آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے بیت اللہ کا طواف اونٹ پر سوار ہو کر کیا

۲۵۷۰: وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ طَافَ بِالْبَيْتِ عَلٰى بَعِيْرٍ كُلَّمَا اَتٰى عَلَى الرُّكْنِ اَشَارَ اِلَيْهِ بِشَيْءٍ بِيَدِهٖ وَكَبَّرَ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۴۹۰/۳ حدیث رقم ۱۶۱۳۔ والترمذی فی السنن ۲۱۸/۳ حدیث رقم ۸۶۵۔ والنسائی فی السنن ۲۳۳/۵۔ حدیث رقم ۲۹۵۵۔ والدارمی ۶۵/۲ حدیث رقم ۱۸۴۵۔

ترجمہ: اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے طواف کعبہ اونٹ پر سوار ہو کر کیا' جب آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حجر اسود کے روبرو ہوتے تو اپنے ہاتھ میں موجود عصا سے اس کی طرف اشارہ کرتے اور اللہ اکبر کہتے۔''

۲۵۷۱: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ خَرَجْنَا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ لَا نَذْكُرُ اِلَّا الْحَجَّ فَلَمَّا كُنَّا بِسَرِفَ طَمِثْتُ فَدَخَلَ النَّبِيُّ ﷺ وَاَنَا اَبْكِيْ فَقَالَ لَعَلَّكِ نَفِسْتِ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ فَاِنَّ ذٰلِكِ شَيْءٌ كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلٰى بَنَاتِ اٰدَمَ فَافْعَلِيْ مَا يَفْعَلُ الْحَاجُّ غَيْرَ اَنْ لَّا تَطُوْفِيْ بِالْبَيْتِ حَتّٰى تَطْهُرِيْ (متفق علیه)۔

اخرجه البخاری فی صحیحه ۴۰۰/۱۔ حدیث رقم ۲۹۴۔ ومسلم فی صحیحه ۸۷۳/۲ حدیث رقم (۱۲۰۔ ۱۲۱۱)۔ وابوداؤد فی السنن ۳۸۲/۲ حدیث رقم ۱۷۸۲۔ والنسائی ۱۵۶/۵ حدیث رقم ۲۷۴۱۔ وابن ماجه ۹۸۸/۲ حدیث رقم ۲۹۶۳ والدارمی ۶۶/۲ حدیث رقم ۱۸۴۶۔ ومالك فی الموطأ ۴۱۱/۱ حدیث رقم ۲۲۴۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ہم نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کے ساتھ نکلے۔ تو صرف تلبیہ یعنی لبیک کہتے تھے اور بعضوں نے کہا کہ ہم سوائے حج کے اور کسی چیز کا قصد نہیں کرتے تھے۔ یعنی مقصود اصل حج تھا نہ کہ عمرہ۔ پس عمرے کا ذکر نہ کرتے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ نیت میں بھی نہ تھا پس جب کہ ہم سرف میں پہنچے تو میں حائضہ ہوگئی۔ پس نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تشریف لائے تو میں رو رہی تھی یعنی اس گمان کے مطابق کہ حیض حج سے باز رکھے گا پس حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے فرمایا شاید کہ تم حائضہ ہوگئی ہو؟ میں نے کہا ہاں! فرمایا یہ ایسی چیز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کی بیٹیوں کے مقدر میں کر دی ہے پس تو خانہ کعبہ کے طواف کے علاوہ ہر وہ عمل کر جو حاجی کرتے ہیں اور یہاں تک کہ تو پاک ہو جائے۔ اس کو بخاری اور مسلم نے کیا ہے۔

تشریح: قوله :لانذکر الا الحج:

حج چونکہ اصل اور مطلوب ہے تو اس کا ذکر کیا اور عمرہ اور مستحب ہے تو لفظ میں اس کے ذکر نہ کرنے سے اس کا نیت میں موجود نہ ہونا لازم نہیں آتا۔

قوله :فلما كنا بسرف طمثت :

''سرف'' سین کے فتحہ اور راء کے کسرہ کے ساتھ منصرف بھی ہے اور غیر منصرف بھی بقعۃ یا مکان کی تاویل میں ایک جگہ کا نام ہے مکہ کے قریب ۶ میل یا ۷ امیل یا ۱۲ میل کے فاصلہ پر ہے اسی طرح کہا گیا ہے اور آخری دو قول صحیح نہیں ہیں۔

''طمثت'' میم کے فتحہ کے ساتھ ہے اور کسرہ بھی دیا جاتا ہے۔

قوله :وانا ابكی ۔فقال لعلك نفست:

''نفست'' نون کے فتحہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ ہے اور فتح زیادہ فصیح ہے حیض کے معنی میں ہے اور جو ولادت کے معنی میں ہے تو اس میں نفست ضمہ کے ساتھ کہا جاتا ہے۔ (ذکرہ الطیبی)

قوله :قال: فان ذلك شيء كتبه الله على بنات آدم :

''**ذلك**'' کاف کے کسرہ کے ساتھ ہے یعنی **حيضك**۔

بنات آدم کی ماں حوّا کی اتباع میں ان پر حیض کو مقرر کیا جب حوا نے درخت سے کھایا اور اس کو خون آلود کیا تو اللہ نے فرمایا اگر تو اس کو خون آلود کیا تو میں تجھے اور تیری بیٹیوں کو قیامت تک خون آلود کر دوں گا۔ اس میں حضرت عائشہؓ کیلئے تسلی ہے کیونکہ مصیبت جب عام ہو جاتی ہے تو آسان ہو جاتی ہے۔

قوله :فافعلي......غير ان لا تطوفي بالبيت حتى تطهري: طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ مفعول بہ سے استثناء ہے ''لا'' زائدہ ہے۔

''**حتى تطهري**'' اور ایک صحیح روایت میں **حتى تغتسلي** ہے۔ یہ حدیث بظاہر حضرت عائشہؓ کے سابقہ قول **ولم اهلل الا بعمرة** کا منافی ہے۔ مگر یہ کہ کہا جائے کہ ان کا قول **لانذكر الا الحج** کا مطلب ہے کہ اس سفر سے ہمارا مقصد اصلی انواع حج قران، تمتع، افراد میں سے کسی ایک نوع کا حج تھا۔ پس ہم میں سے بعض نے حج افراد کیا اور بعض نے قرآن کیا اور بعض نے تمتع کیا، اور میں نے تمتع کا قصد کیا تو میں نے عمرہ کا احرام باندھا پس جب مجھے حیض کا عذر پیش آیا اور وہ عرفہ کے دن اور وقوف حج تک مستمر رہا تو آپ ﷺ نے مجھے عمرہ چھوڑنے کا حکم دیا اور یہ کہ میں حج کے تمام افعال ادا کروں سوائے طواف کے، اور اسی طرح سعی کے کہ وہ طواف کے بعد ہی صحیح ہوتی ہے نہ کہ پہلے۔ واللہ اعلم

خمدار لکڑی کے سرے کو آپ ﷺ بوسہ دیتے تھے

۲۵۷۲: وَعَنْ اَبِى الطُّفَيْلِ رأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَطُوْفُ بِالْبَيْتِ وَيَسْتَلِمُ الرُّكْنَ بِمِحْجَنٍ مَعَهُ وَيُقَبِّلُ الْمِحْجَنَ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ۹۲۷/۲ حديث رقم (۲۵۷ـ ۱۲۷۵)۔ واخرجه ابن ماجه ۹۸۳/۲ حديث رقم ۲۹۴۹۔

ترجمہ: حضرت ابی طفیلؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا۔ کہ نبی کریم ﷺ خانہ کعبہ کا طواف کرتے تھے یعنی سوار ہو کر اور حجر اسود کی طرف اشارہ کرتے تھے خمدار لکڑی کے ساتھ جو آپ ﷺ کے پاس تھی اور آپ ﷺ اس لکڑی کو بوسہ دیتے ہیں۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله :اشار اليه**: اس میں اشارہ ہے کہ رکن یمانی کی طرف استیلام سے عجز کے وقت اشارہ نہیں کیا جاتا۔ جیسا کہ ہمارے مذہب کا صحیح قول ہے۔

تخریج: طبرانی میں سند جید کے ساتھ روایت کیا ہے:

كان اذا استلم الركن قال "بسم الله والله اكبر" وكان كلما اتى الحجر الاسود قال "الله أكبر"۔

اور امام شافعیؒ نے الام میں ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: **قولوا بسم الله والله اكبر ايمانا بالله وتصديقًا بما جاء به محمد** ﷺ اور حضرت علی اور ابن عمر سے صحیح طور پر ثابت ہے: **بسم الله والله اكبر اللهم ايمانا بك وتصديقا بكتابك ، ووفاء بعهدك، واتباعًا لسنة نبيك محمد** ﷺ ''عہد سے مراد عہد میثاق ہے۔

اور طبرانیؒ کی حدیث میں ہے: **انه كان يقول، بسم الله والله اكبر عند الركن اليماني، والله اكبر عند الحجر**

الاسود مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ دونوں رکنوں میں تکبیر کہتے تھے۔

مشرک کو خانہ کعبہ کے طواف کرنے کی ممانعت

۲۵۷۳: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ بَعَثَنِی اَبُوْبَكْرٍ فِی الْحَجَّةِ الَّتِی اَمَّرَهُ النَّبِیُّ ﷺ عَلَيْهَا قَبْلَ حَجَّةِ الْوَدَاعِ يَوْمَ النَّحْرِ فِی رَهْطٍ اَمَرَهُ اَنْ يُؤَذِّنَ فِی النَّاسِ اِلاَّ لَا يَحُجَّ بَعْدَ الْعَامِ مُشْرِكٌ وَّلَا يَطُوفَنَّ بِالْبَيْتِ عُرْيَانٌ ۔

(متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤٧٧/١۔ حدیث رقم ٣٦٩۔ ومسلم فی صحیحه ٩٨٢/٢ حدیث رقم (٤٣٥۔ ١٣٤٧)۔ وابوداؤد فی السنن ٤٨٣/٢ حدیث رقم ١٩٤٦۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ حجۃ الوداع سے پہلے جس حج میں نبی کریم ﷺ نے ابوبکر صدیقؓ امیر حج بنا کر بھیجا تھا اس حج میں بھی تھا قربانی کے دن ایک جماعت کو کہاں کو حکم کیا اس کو کہ لوگوں میں اعلان کر دیں۔ کہ خبردار ہو جاؤ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے اور نہ کوئی ننگا طواف کرے کانہ کعبہ کا اس کا امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله :امره النبی ﷺ علیها قبل حجة الوداع یوم النحر فی رهط:**

''امره'' میم کی شد کے ساتھ ہے یعنی نبی ﷺ نے ان کو قافلہ حج کا امیر بنایا ۹ھ کو۔

''**یوم النحر**'' ظرف ہے بعث کیلئے۔ ''**علیها**'' امرہ کے متعلق ہے۔

''**امره**'' ضمیر رہط کی طرف راجع ہے اور رہط کے لفظ کے اعتبار سے ضمیر کو مفرد لایا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ ضمیر ابوہریرہؓ کی طرف راجع ہو بطور التفات کے۔ یہ علامہ طیبیؒ نے ذکر کیا ہے۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ضمیر رہط کی طرف تجرید کے طور پر راجع ہو یا امراحد الرہط کی تقدیر کے طور پر راجع ہو۔

قوله :امره یؤذن فی الناس: ''**یؤذن**'' ایک نسخہ میں ''**أن یؤذن**'' ہے۔ ''**امره**'' میم کی تخفیف کے ساتھ ہے۔

''**یؤذن**'' تشدید کے ساتھ ہے۔

قوله :الا لا یحج بعد العام ...... : ''**ألا**'' تنبیہ کیلئے ہے۔

''**لایحج**'' جیم کے ضمہ کے ساتھ نہی ہے یا نفی ہے بمعنی نہی کے جیم کو کسرہ اور فتح بھی دیا جاتا ہے 'نہی' کی صورت میں۔ اور اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جس میں ہے ''**لا یحججن بعد العام**''۔

''**مشرك**'' یعنی کوئی کافر حج نہ کرے اللہ کے اس ارشاد کی بناء پر ﴿**انما المشرکون نجس فلا یقربوا المسجد الحرام بعد عامهم هذا**﴾ [التوبة:۲۸] مشرک لوگ نرے ناپاک ہیں، سو یہ لوگ اس سال کے بعد مسجد حرام کے پاس نہ آنے پائیں۔

(بیان القرآن)

یعنی مطلقاً کسی ایک سال کے ساتھ مقید نہیں ہے کیونکہ اللہ کا ارشاد ہے ﴿**یا بنی آدم خذوا زینتکم عند کل مسجد**﴾ [الاعراف:۳۱] اے اولاد آدم کی ہم مسجد کی ہر حاضری کے وقت اپنا لباس پہن لیا کرو۔ (بیان القرآن)

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح طور پر ثابت ہے کہ یہ آیت مشرکین کے اس فعل کے رد میں نازل ہوئی کہ وہ بیت اللہ کا طواف ننگا ہو کر کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم اللہ کی عبادت اس لباس میں نہیں کرتے جس میں ہم نے گناہ کیے ہیں، یا اشارہ کرنے کیلئے گناہوں سے

کامل طور پر فال ہونے کی طرف۔ یا اس سے فال لیتے تھے۔ تمام عیوب سے فال ہونے پر۔

خانہ کعبہ کو دیکھ کر ہاتھ اٹھا کر دعا نہیں مانگنی چاہیے

۲۵۷۴: عَنِ الْمُهَاجِرِ الْمَكِّيِّ قَالَ سُئِلَ جَابِرٌ عَنِ الرَّجُلِ يَرَى الْبَيْتَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ فَقَالَ قَدْ حَجَجْنَا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فَلَمْ نَكُنْ نَفْعَلُهُ۔ (رواہ الترمذی وابوداود)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۴۳۷/۲ حديث رقم ۱۸۷۰۔ والترمذی ۲۱۰/۳ حديث رقم ۸۵۵۔ والنسائی ۲۱۲/۵ حديث رقم ۲۸۹۵۔

ترجمہ: حضرت مہاجر مکیؒ سے روایت ہے کہ جابر رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا' اس شخص کے بارے میں کہ وہ خانہ کعبہ کو دیکھے اور اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے یعنی یہ مشروع ہے یا نہیں؟ پس جابر رضی اللہ عنہ نے کہا ہم نے نبی کریمؐ کے ساتھ حج کیا ہم ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے خانہ کعبہ کو دیکھ کر دعا کرنے میں۔ اس کو امام ترمذیؒ اور ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

مہاجر بن ` شمار۔ یہ ''مہاجر'' ہیں۔ ''مشمار'' کے بیٹے ہیں۔ اور زہری ہیں یعنی ان (بنو زہرہ) کے آزاد کردہ ہیں۔ انہوں نے عامر بن ابی وقاص سے اور ان ۔ ، ابن ابی ذویب وغیرہ نے روایت کی ہے۔ یہ روایت میں ثقہ ہیں۔

تشریح: '' عن الرجل یری البیت'': ایک نسخہ میں ''عن الرجل الذی یری البیت '' ہے۔

قولہ :فلم نکن نفعلہ:

یعنی ہم بیت اللہ کو دیکھ کر دعا کیلئے ہاتھ نہیں اُٹھاتے۔ علامہ طیبی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں یہی امام ابوحنیفہؒ، امام مالک اور امام شافعی کا قول ہے۔ امام احمد اور سفیان ثوری رحمہا اللہ فرماتے ہیں کہ ہاتھ اٹھا کر دعا کرے۔ لیکن امام ابوحنیفہ اور شافعی سے بھی یہ قول نقل کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ انہوں نے تصریح کی ہے جب بیت اللہ دکھائی دے یا ایسے مقام تک پہنچ جائیں کہ جہاں سے بیت اللہ دیکھا جا سکتا ہو۔ اندھے پن کی وجہ سے یا اندھیرے کی وجہ سے نہ دیکھ پاتے' تو سنت ہے کہ وہ کھڑا ہو کر ہاتھ اٹھا کر دعا کرے۔

مزید روایات: ابن ہمام رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ بیہقی نے سعید ابن المسیب سے سند روایت کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں میں نے حضرت عمرؓ سے ایک کلمہ سنا ہے اور ان سے سننے والوں میں سے میرے علاوہ کوئی باقی نہیں رہا میں نے ان سے سنا کہ وہ فرما رہے تھے کہ جب بیت اللہ کو دیکھ لے تو یہ کہے: ''اللّٰھم انت السلام ومنك السلام فحینا بالسلام''۔

اور شافعی نے ابن جریج سے ذکر کیا ہے **ان النبی ﷺ کان اذا رأی البیت رفع یدیه وقال '' اللھم زد ھذا البیت تشریفًا وتعظیمًا وتکریمًا، ومھابة، وزد من شرفه و کرمه ممن حجه واعتمرہ تشریفًا وتکریمًا وتعظیمًا وبرا''**۔

اور اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو بیہقی نے سند مرسل معضل کے ساتھ روایت کیا ہے اور اس کو مضبوط کر دیتا ہے وہ ضعیف حدیث جو استقبال البیت کے وقت فرع الایدی کے بارے میں ہے، اس کو ذکر کیا ہے ابن حجر نے، غیر محل میں۔

ترمذی نے جو حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے اور اس کو حسن بھی کہا ہے کہ حضرت جابر کہتے ہیں'' **ما کنت اریٰ احدا یفعل ھذا عند رؤیة البیت الا الیھود، قد حججنا مع رسول اللہ ﷺ أفکنا نفعله**۔ اس کا جواب یہ ہے کہ رفع کو ثابت کرنے والے اولیٰ ہیں کیونکہ ان کے پاس علم زیادہ ہے اسی وجہ سے بیہقی نے کہا ہے کہ حضرت جابر کے علاوہ کی روایت اثبات رفع کے بارے میں اہل علم کے

ہاں زیادہ مشہور ہے اوران جیسے مسائل میں ان کا قول معتبر ہوتا ہے جو مثبت ہو۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ اولی یہ ہے کہ دونوں میں تطبیق پیدا کی جائے بایں طور کہ اثبات والی روایت پہلی بار دیکھنے کے بارے میں ہو اور نفی کی روایات بار بار دیکھنے کے بارے میں ہو۔

خانہ کعبہ کی طرف دیکھ کر ہاتھ اُٹھانا

۲۵۷۵: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ اَقْبَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَدَخَلَ مَكَّةَ فَاَقْبَلَ اِلَى الْحَجَرِ فَاسْتَلَمَهٗ ثُمَّ طَافَ بِالْبَيْتِ ثُمَّ اَتَى الصَّفَا فَعَلَاهُ حَتّٰى يَنْظُرَ اِلَى الْبَيْتِ فَرَفَعَ يَدَيْهِ فَجَعَلَ يَذْكُرُ اللّٰهَ مَا شَاءَ وَيَدْعُوْا۔

اخرجه مسلم فی صحیحه ۱٤٠٥/۳ حدیث رقم (۸٤۔ ۱۷۸۰)۔ وابوداؤد فی السنن ٤۳۸/۲ حدیث رقم ۱۸۷۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ مکے میں داخل ہوئے پھر حجر اسود کی طرف متوجہ ہوئے اس کو بوسہ دیا پھر خانہ کعبہ کا طواف کیا پھر صفا کے پاس آئے یعنی طواف کی نماز کے بعد۔ پس اس پر چڑھے یہاں تک کہ خانہ کعبہ کی طرف دیکھا۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر پھر اللہ کا ذکر کرنا شروع کیا اور دعا مانگی۔ اس کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔

تشریح: مسلم میں حضرت جابر سے روایت ہے کہ آپ ﷺ صفا پر چڑھے یہاں تک کہ بیت اللہ کو دیکھا اور پھر مروہ پر بھی اسی طرح کیا۔ صفا پر چڑھنا اس زمانے کے اعتبار سے تھا ورنہ اب بیت اللہ باب الصفا سے دیکھائی دیتا ہے چڑھنے سے پہلے کیونکہ اب وہاں زمین اونچی ہو چکی ہے اور صفا کی بہت ساری سڑھیاں زمین کے اندر دفن ہو چکی ہیں۔ اور بعض نے مطلقاً چڑھنے کو واجب کہا ہے۔

اور مروہ پر اب چڑھنا ہی ممکن نہیں جیسا کہ اس سے بیت اللہ کا دیکھنا ممکن نہیں ہے پس جتنا ممکن ہو اتنا چڑھنا مستحب ہے تاکہ اس کے بارے میں وارد روایات پر عمل ہو جائے۔

قولہ : "فرفع يديه": یعنی دعاء کیلئے ہاتھ اٹھائے نہ کہ بیت اللہ کو دیکھنے کی وجہ سے جیسا کہ پہلے گزر اباقی جو عوام تکبیر کے ساتھ ہاتھ اٹھاتے ہیں جیسا کہ نماز میں اٹھاتے ہیں تو اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

" فجعل يذكر الله ماشاء ويدعوا": اس میں امام محمد کے مختار قول کی طرف اشارہ ہے کہ حج کے موقع پر دعائیں متعین نہیں ہیں بلکہ جو بھی دعا کرے کیونکہ اس سے دعا کرنے والے میں خشوع پیدا ہوتا ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں کہ دعاؤں کا تعین رقت کو ختم کر دیتا ہے اور دعا کرنے والا اس شخص کے طرح ہو جاتا ہے جو اپنے یاد کیے ہوئے کو دھرا رہا ہو اور اگر ماثور دعاؤں سے تبرک حاصل کرے تو اچھا ہے۔

طواف نماز کی طرح ہے

۲۵۷٦: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ الطَّوَافُ حَوْلَ الْبَيْتِ مِثْلُ الصَّلٰوةِ اِلَّا اَنَّكُمْ تَتَكَلَّمُوْنَ فِيْهِ فَمَنْ تَكَلَّمَ فِيْهِ فَلَا يَتَكَلَّمَنَّ اِلَّا بِخَيْرٍ۔

(رواه الترمذی والنسائی والدارمی وذكر الترمذی جماعة وقفوه علی ابن عباس)

اخرجه الترمذی فی السنن ۲۹۳/۳ حدیث رقم ۹٦٠۔ والنسائی ۲۲۲/۵ حدیث رقم ۲۹۲۲۔ والدارمی ٦٦/۲ حدیث رقم ۱۸٤۷۔ واحمد فی المسند ۳۷۷/۵۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ خانہ کعبہ کے گرد طواف کرنا نماز کی طرح ہے مگر تحقیق تم اس میں بولتے ہو پس جو کوئی اس میں بولے اس کو چاہیے کہ نیکی ہی بولے اس کو امام ترمذیؒ اور نسائی اور دارمیؒ نے نقل کیا ہے اور امام ترمذیؒ نے ایک جماعت سے ذکر کیا ہے کہ یہ حدیث ابن عباسؓ پر موقوف ہے۔

تشریح: **قوله :الطواف حول البيت مثل الصلوٰة الا أنكم تتكلمون فيه:**

"**مثل**" : مرفوع ہے خبریت کی بناء پر اور نصب کو بھی جائز قرار دیا گیا ہے۔

"**الا أنكم**" استثناء متصل ہے یعنی طواف نماز کے مثل ہے ہر اس چیز میں جو نماز میں معتبر ہے وجوداً اور عرفاً سوائے تکلم کے اور جو اسکے ہم معنی دیگر منافی چیزیں ہیں جیسے اکل و شرب اور دوسرے افعال کثیرہ۔ اور یا منقطع ہے یعنی تمہیں کلام کی اجازت دی گئی ہے۔

آپؐ کے فعل سے معلوم ہوا ہے کہ طواف میں نماز کی طرح استقبال قبلہ شرط نہیں ہے اور اصل طواف کیلئے کوئی وقت مشروط نہیں ہے۔

رہے نماز کے باقی شروطِ طہارت حقیقی، حکمی، ستر عورت وغیرہ میں سے تو یہ امام شافعیؒ کے نزدیک طواف میں بھی معتبر ہیں۔ اور ہمارے نزدیک واجب ہیں کیونکہ مثل شے ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ ہر چیز میں حقیقتاً اس شے کے ساتھ مشارک ہو۔ علاوہ اس کے یہ حدیث خبر واحد ہے اور خبر واحد ظنی ہوا کرتا ہے اس سے فرضیت ثابت نہیں ہوتی۔ اور اس کے ساتھ اس بات پر اتفاق ہے کہ مطاف میں وہ نجاسات جس سے بچنا مشکل ہو وہ معاف ہیں کیونکہ نبی علیہ السلام اور صحابہ کرام کے زمانہ میں اور ان کے بعد ائمہ اعلام کے زمانہ میں ہمیشہ پرندوں کی نجاست ہوا کرتی تھی اور اس کی وجہ سے کسی نے طواف سے منع نہیں کیا ہے اور نہ اس جگہ کے تطہیر کا حکم دیا ہے اور "**مثل الصلوٰة**" میں تنبیہ ہے کہ نماز طواف سے افضل ہے۔

فقوله :فمن تكلم فيه فلايتكلمن الا بخير:

یعنی اللہ کا ذکر کرے علم کا افادہ اور استفادہ کرے اس طور پر کہ طواف کرنے والوں کو طواف میں تشویش نہ ہو اور آج کل عوام جو دنیاوی باتیں کرتی ہیں ان سے بالکل بچیں اور نہی مؤکد کراہت تحریمی یا تنزیہی پر محمول ہے۔

تخریج: ترمذی، نسائی اور دارمی نے اس حدیث کو مرفوعاً روایت کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔ اور ایک روایت میں ہے:

''**الا ان الله احل فيه النطق فمن نطق لاينطق الا بخير**''۔

حجر اسود جنت کا پتھر ہے

۲۵۷۷: **وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ نَزَلَ الْحَجَرُ الْاَسْوَدُ مِنَ الْجَنَّةِ وَهُوَ اَشَدُّ بَيَاضًا مِنَ اللَّبَنِ فَسَوَّدَتْهُ خَطَايَا بَنِیْ اٰدَمَ** ۔ (رواه احمد والترمذی وقال هذا حديث حسن صحيح)

اخرجه الترمذی فی السنن ۲۲۶/۳ حديث رقم ۸۷۷۔ واحمد فی المسند ۳۰۷/۱۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حجر اسود بہشت سے اترا ہے اور وہ دودھ سے زیادہ سفید تھا اور اس کو بنی آدم کے گناہوں نے سیاہ کر دیا اس کو امام احمدؒ اور ترمذیؒ اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

تشریح: **قوله :وهو اشد بياضاً من اللبن**: یہ جملہ حالیہ ہے۔

قوله :فسودته خطايا نبی آدم:

یعنی بنی آدم جو حجر اسود کو چھوتے ہیں ان کے گناہ اس کے سوا (کالے ہونے) کا سبب بنے۔ اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ حدیث کو

حقیقت پر محمول کیا جائے کیونکہ اس سے نہ عقل مانع ہے اور نہ نقل۔

ہمارے علماء میں سے بعض شراح فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں یہ احتمال ہے کہ اس سے مراد حجر اسود کی تعظیم شان میں مبالغہ ہو اور خطاء اور گناہوں کے معاملہ کی ہولنا کی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ حجر اسود میں چونکہ شرف، کرامت، یمن و برکت ہے تو اس کی وجہ سے یہ جنت سے آیا ہے اور بنی آدم کی خطاء اور گناہ قریب ہے کہ جماد میں اثر کر دے اور سفید کو سیاہ بنا دے۔ پس ان کے دلوں کی کیا حالت ہوگی؟ یا اس طور پر کہ یہ گناہوں کو مٹاتا ہے گویا کہ یہ جنت میں سے ہے اور بنی آدم کے کثرت ذنوب کے اٹھانے سے گویا کہ یہ بہت زیادہ سفیدی والا تھا گناہوں نے اس کو سیاہ کر دیا اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ اس میں سفید نقطے تھے پھر برابر سیاہی اس پر چڑھتی گئی یہاں تک کہ وہ ختم ہو گئے۔ اور حدیث میں ہے کہ جب بندہ گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں سیاہ نکتہ لگ جاتا ہے جب دوبارہ گناہ کر لیتا ہے تو ایک اور نکتہ لگ جاتا ہے اسی طرح ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کا پورا دل سیاہ ہو جاتا ہے اور ان لوگوں میں سے ہو جاتا ہے جن کے بارے میں ہے: ﴿**كلا بل ران على قلوبهم ما كانوا يكسبون**﴾[المطففين:١٤]

حاصل یہ ہے کہ حجر بمنزلہ آئینہ کے غایت صاف اور شفاف تھا پھر نامناسب اشیاء سے اس میں تغیر آیا یہاں تک کہ اس کے تمام اجزاء سیاہ ہو گئے اور فی الجملہ یہ ثابت ہوا کہ صحبت کا اثر ہوتا ہے اس پر عقلاء کا اجماع ہے۔

مزید روایت: احمد کی روایت میں حضرت انسؓ سے اور نسائی کی روایت میں حضرت ابن عباس ؓ سے منقول ہے:

الحجر الاسود من الجنة۔

اور میمونہ کی روایت میں ہے حضرت انسؓ سے: **الحجر الاسود من حجارة الجنة** ۔ احمد، ابن عدی اور بیہقی کی روایت میں ابن عباس ؓ سے منقول ہے: **الحجر الاسود من الجنة وكان اشد بياضًا من اللبن حتٰى سودته خطايا اهل الشرك** اور طبرانی کی روایت میں ابن عباسؓ سے وارد ہے: **الحجر الاسود من حجارة الجنة وما فى الارض من الجنة غيره وكان الابيض كالمناء، ولولامسه من رجس اهل الجاهلية مامسه ذو عاهة الابرئ۔**

حجر اسود قیامت کے دن گواہی دے گا

۲۵۷۸: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِى الْحَجَرِ وَاللّٰهِ لَيَبْعَثَنَّهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَهٗ عَيْنَانِ يُبْصِرُ بِهِمَا وَلِسَانٌ يَّنْطِقُ بِهٖ يَشْهَدُ عَلٰى مَنِ اسْتَلَمَهٗ بِحَقٍّ۔ (رواه الترمذی وابن ماجة والدارمی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٢٩٤/٢ حديث رقم ٩٦١۔ وابن ماجه ٩٨٢/٢ حديث رقم ٢٩٤٤۔ والدارمی ٦٣/٢ حديث رقم ١٨٣٩۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس ؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے حجر اسود کے حق میں فرمایا کہ اللہ کی قسم البتہ اٹھائے گا اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن اس کے واسطے دو آنکھیں ہوں گی ان کے ساتھ دیکھے گا ایک زبان ہوگی اس کے ساتھ وہ بولے گا اور اس شخص کے حق میں گواہی دے گا جس شخص نے اس کو بوسہ دیا ہوگا حق کے ساتھ اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے ابن ماجہ اور دارمیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله :قال رسول الله ﷺ فى الحجر...... يبصر بهما:** باطل اور حق پرست اور با ادب اور بے ادب کو پہچانے گا۔

قوله :ولسان ينطق به يشهد على من استلمه بحق: زیادہ ظاہر یہ ہے کہ حق سے مراد توحید ہے اور پکے عہد کو پورا کرنا

ہے۔اسی وجہ سے کہا جاتا ہے:

''اللهم ايمانا بك وتصديقا بكتابك، ووفاء بعهدك، واتباعا لسنة نبيك محمد ﷺ.

حجر اسود اور مقام ابراہیم جنت کے یاقوت ہیں

۲۵۷۹: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ اِنَّ الرُّكْنَ وَالْمَقَامَ يَاقُوْتَتَانِ مِنْ يَا قُوْتِ الْجَنَّةِ طَمَسَ اللّٰهُ نُوْرَهُمَا وَلَوْ لَمْ يَطْمِسْ نُوْرُهُمَا لَاَ ضَاءَ اَمَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ۔

(رواه الترمذی)

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ تحقیق حجر اسود اور مقام ابراہیم بہشت کے یاقوتوں میں سے یاقوت ہیں اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے نور کو دور کر دیا ہے اور اگر ان کا نور دور نہ کرتا تو البتہ روشن کر دیتا۔اس چیز کو جو مشرق و مغرب کے درمیان میں ہے اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :ان الركن والمقام ......الجنة:

قوله :طمس الله نورهما......:''طمس الله نورهما'' مشرکین کا ان کو مس کرنے کے ذریعے ان کا نور ختم کر دیا گیا۔شاید اس میں حکمت یہ ہو کہ ایمان غیبی ہو عینی نہ ہو۔

''لم يطمس'' مبنی للفاعل ہے اور مبنی للمفعول بھی جائز ہے۔

''لأضاء ا'' تثنیہ کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں لأضاء مفرد ہے اور اضاءة متعدی ہے یا لازم ہے اور تقدیری عبارت یوں ہے:

لا ستنار بهما ما بين المشرق والمغرب۔

اور یہ اس حدیث کے منافی نہیں ہے جس میں ہے:

''ولولا ما مسهما من خطايا بنى آدم لأضاء ا ما بين المشرق والمغرب'' کیونکہ جب ان کو بنی آدم کے گناہوں نے مس کیا تو تب اللہ نے ان کے نور کو ختم کر دیا اور اس بات کی تائید کہ حجر اسود جنت کا پتھر ہے اس سے ہوتی ہے کہ جب قرامطہ نے مکہ پر غلبہ پایا اور مسجد حرام اور زمزم کو لاشوں سے بھر دیا اور حجر اسود کو۔بعض نے آہنی گرز سے مارا اور کہا کب تک غیر اللہ کی عبادت کی جائی گی۔ پھر اس کو اپنے بلاد میں لے کر گئے مسلمانوں کو تکلیف پہنچانے کیلئے اور بیس سے زائد برس ان کے پاس رہا پھر ڈھیر سارے مال پر ان سے صلح ہوئی کہ وہ حجر اسود کو لوٹا دیں تو وہ کہنے لگے کہ وہ ہمارے ہاں دوسرے پتھروں کے ساتھ خلط ملط ہو گیا ہے اور اب ہم اس کی تمیز نہیں کر سکتے دوسرے پتھروں سے۔اگر تمہارے پاس کوئی ایسی علامت ہو تو وہ علامت لے کر آؤ اور اس کو دوسرے پتھروں سے الگ کر دو۔

تو اہل علم سے اس کی تمیز کرنے کیلئے علامت کے بارے میں پوچھا گیا تو اہل علم نے فرمایا کہ آگ اس پر اثر نہیں کرتی کیونکہ وہ جنت میں سے ہے،تو ان کے سامنے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے آزمایا اور جب بھی وہ کسی پتھر کو آگ میں ڈالتے تو وہ ٹوٹ جاتا' یہاں تک کہ اس کو لے کر آئے تو آگ اس میں ادنیٰ اثر بھی نہ کر سکی تو وہ جان گئے کہ یہ وہی ہے اور اس کو واپس لوٹا دیا۔

اور کہا گیا ہے کہ قابل تعجب بات یہ ہے کہ اس کو لیجاتے وقت اس کے نیچے کئی سارے اونٹ مرے اور واپسی کے وقت ایک کمزور اونٹ اس کو اٹھا کر مکہ لایا اور اس پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

طواف کرتے ہوئے واجبات وسنن وآداب کالحاظ کرنا ضروری ہے

۲۵۸۰: وَعَنْ عُبَيْدِ بْنِ عُمَيْرٍ اَنَّ ابْنَ عُمَرَ كَا نَ يُزَاحِمُ عَلَى الرُّكْنَيْنِ زِحَامًا مَا رَاَيْتُ اَحَدًا مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ يُزَاحِمُ عَلَيْهِ قَالَ اِنْ اَفْعَلْ فَاِنِّي سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ اِنَّ مَسْحَهُمَا كَفَّارَةٌ لِلْخَطَايَا وَسَمِعْتُهُ يَقُوْلُ مَنْ طَافَ بِهٰذَا الْبَيْتِ اُسْبُوْعًا فَاَحْصَاهُ كَانَ كَعِتْقِ رَقَبَةٍ وَسَمِعْتُهُ يَقُوْلُ لَا يَضَعُ قَدَمًا وَلَا يَرْفَعُ اُخْرٰى اِلَّا حَطَّ اللّٰهُ عَنْهُ بِهَا خَطِيْئَةً وَكَتَبَ لَهُ بِهَا حَسَنَةً۔ (رواہ الترمذی)

اخرجه الترمذی فی سننه ۲۹۲/۳ حدیث رقم ۹۵۹۔ والنسائی فی ۲۲۱/۵ الحدیث رقم ۲۹۱۹۔ واحمد فی المسند ۳۱۲۔

ترجمہ: حضرت عبیداللہ بن عمیرؒ سے روایت ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما لوگوں کے اوپر رکنوں کے ہاتھ لگانے پر غلبہ کرتے تھے رکنوں کے معنی حجراسود اور رکن یمانی کے ہیں۔ کہتے ہیں کہ میں نے اصحاب رسول میں سے کسی کو نہیں دیکھا کہ وہ اس پر یعنی ہر ایک پر ان دونوں رکنوں سے غلبہ کرتے ہو۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اگر میں غلبہ کروں تو میرا انکار نہ کرو۔ اس لیے کہ تحقیق میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ تحقیق ان دونوں رکنوں کو ہاتھ لگانا گناہوں کے لیے کفارہ ہے اور میں نے سنا ہے کہ حضور ﷺ فرماتے تھے جو کوئی خانہ کعبہ کا طواف سات مرتبہ کرے اور اس کی محافظت کرے۔ یعنی واجبات وسنن وآداب اس کے بجالائے تو اس کو غلام آزاد کرنے کے برابر ثواب ملے گا تو میں نے سنا حضور ﷺ کو فرماتے تھے جب کوئی طواف میں قدم رکھتا ہے اور اٹھاتا ہے دوسری مرتبہ یعنی طواف میں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس سے گناہ دور کر دیتا ہے اور اس کی وجہ سے اس کے لیے نیکی لکھی جاتی ہے۔ اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

عبید بن عمیر۔ عبید نام عمیر کے بیٹے اور کنیت ''ابوعاصم'' ہے۔ ''لیث'' گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ حجاز کے باشندہ اور اہل مکہ کے قاضی ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں پیدا ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ ﷺ کی زیارت بھی کی۔ ان کا شمار کبار تابعین میں ہوتا ہے۔ صحابہ کی ایک جماعت سے حدیث کی سماعت کی۔ اور ان سے کچھ تابعین نے روایت کی۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے پہلے وفات پائی۔ ''عبید'' اور ''عمیر'' دونوں تصغیر کے ساتھ ہیں۔

تشریح: **قوله :ما رأيت احدا......يزاحم عليه:**

یعنی ایسا مزاحمت اور زحام جو ایذاء رسانی سے خالی ہوتا تھا۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ **زحامًا عظیمًا**۔ یعنی زبردست قسم کی مزاحمت کرتے تھے۔ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ تمام چکروں میں ہو یا اول اور آخر میں ہو کیونکہ ان کی حالت زیادہ تاکید والی ہے۔

امام شافعیؒ نے الام میں فرمایا ہے کہ میں استلام کے وقت لوگوں پر غالب آنے اور اژدحام کو پسند نہیں کرتا مگر طواف کی ابتداء اور آخر میں۔ لیکن اس سے ایسا اژدحام مراد ہے جس سے لوگوں کے مزاحمت اور اژدحام سے تکلیف نہ ہو کیونکہ آپ ﷺ نے حضرت عمر سے فرمایا ''**انك رجل قوی لاتزاحم علی الحجر فتؤذی الضعیف ان وجدت خلوة فاستلمه والا فاستقبله وهلل وكبر**'' روایت کیا ہے اس کو شافعی اور احمد نے۔

بعض روایات میں ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما شدت تزاحم سے ناک زخمی کر دیتے تھے اور گویا کہ صحابہ نے اس کو چھوڑ دیا تھا کیونکہ اس پر ایذاء رسانی کا ترتب ہو رہا تھا پس صحابہ کے فعل کی اقتداء خاص کر کے اس زمانہ میں اولیٰ اور بہتر ہے۔

قوله :ان افعل فانی سمعت رسول الله ﷺ يقول :.....للخطايا:

''**فان افعل**''ان شرطیہ ہے اور جزاء مقدر ہے یعنی **فلا الام** اور دلیل جواب **فانی سمعت الخ** ہے۔

ابن عمرا پنے فعل کیلئے بطور دلیل یہ کہا کرتے تھے اور علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اپنے عذر میں یہ پیش کرتے تھے۔

قوله :من طاف بهذا البيت..... كعتق رقبة:

''**اسبوعًا**'' یعنی سات چکر جیسا کہ ایک روایت میں **سبعة اشواط**'' کے الفاظ ہیں۔اور مظہر کہتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے سات دن پے در پے کہ درمیان میں کوئی دن نہ چھوٹے (انتہی) لیکن حدیث سے یہ مطلب سمجھ میں نہیں آتا جیسا کہ ظاہر ہے۔

قوله :وسمعته يقول......: ''**وسمعته**'' یعنی میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ بھی سنا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ راوی کہتے ہیں کہ میں نے ابن عمر سے سنا اس صورت میں دوسری اور تیسری حدیث موقوف ہوگی اور مرفوع کے حکم میں ہوگی۔

''**لا يرفع**'' بظاہر **لا يرفعها** ہے اور اس کو اخریٰ صفت رفع اور وضع کے اختلاف کی وجہ سے کہا ہے۔

''**الا حط الله عنه بها الخ**'' یعنی ہر قدم پر یا ہر بار قدم اٹھانے اور رکھنے پر،اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ لف نشر مرتب ہو کہ وضع قدم کے ساتھ وضع سیئہ ہو اور رفع قدم کے ساتھ اثبات حسنہ ہو جو جنت میں رفع درجہ کے مقتضی ہے۔پھر یہ اجر وثواب اس شخص کو ملتا ہے جو اداب کا لحاظ رکھے اور جواب عوام زحام اور رش بنا لیتے ہیں جس سے لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے اور جس میں دھکے اور ایک دوسرے سے آگے نکلنا ہوتا ہے تو یہ زیادہ گناہ کا موجب ہے۔

دونوں رکنوں کے درمیان پڑھنے والی دعا

۲۵۸۱:وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ السَّائِبِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ مَا بَيْنَ الرُّكْنَيْنِ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِى الْاٰ خِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَا بَ النَّارِ۔ (رواه ابو داود)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ٤٤٨/٢ الحديث رقم ١٨٩٢۔ واحمد فی المسند ٤١١/٣

ترجمہ:حضرت عبداللہ بن سائبؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا،فرماتے تھے دونوں رکنوں کے درمیان یعنی حجر اسود اور رکن یمانی کے،اے ہمارے رب دے ہم کو بھلائی دنیا میں اور آخرت میں بھلائی اور ہم کو آگ کے عذاب سے بچا۔اس کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله :ربنا اتنا فی الدنيا حسنة:** ''**ربنا**'' منصوب ہے حرف ندا کے حذف کے ساتھ۔

یعنی علم وعمل،عفو وعافیہ،اور اچھی روزی،یا اچھی زندگی یا قناعت یا نیک اولاد۔

قوله :وفی الآخرة حسنة: یعنی بخشش،جنت اور اونچے درجات یا انبیاء کی رفاقت یا رب کی رضا یا رویت باری تعالیٰ یا باری تعالیٰ کی ملاقات مراد ہے۔

قوله :وقنا عذاب النار: جہنم کی سختیوں،اس کی گرمی،سردی،تپش،بھوک،پیاس،بدبو،تنگی،بچھو اور سانپوں سے بچا۔

حضرت علیؓ نے حسنہ اولیٰ کی تفسیر نیک عورت سے کی ہے اور حسنہ ثانیہ کی تفسیر حورعین سے کی ہے اور عذاب النار کی تفسیر مسلط ہونے والی عورت سے کی ہے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ ہمارے شیخ سید زکریا نے اپنے شیخ قطب الباری ابوالحسن البکری سے نقل کیا ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں ستر قول ہیں جس میں سے زیادہ اچھا یہ ہے کہ حسنہ اولیٰ سے مراد اتباع مولیٰ ہے اور ثانیہ سے مراد رفیق اعلیٰ ہے اور عذاب النار سے مراد

حجابِ مولیٰ ہے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک حسنہ سے مراد ہر وہ چیز ہے جس پر حسنہ کا اطلاق ہوتا ہے وہ کوئی بھی بھلائی اور حسنہ ہو۔ اور نکرہ کبھی عموم کا فائدہ دیتی ہے۔ جیسے اللہ کے اس ارشاد میں ﴿**علمت نفس ما احضرت**﴾[التکویر:١٤] اور عذاب سے مراد عقاب کے انواع اور اقسام ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سعی کی اہمیت

۲۵۸۲: وَعَنْ صَفِيَّةَ بِنْتِ شَيْبَةَ قَالَتْ اَخْبَرَتْنِي بِنْتُ اَبِيْ تُجْرَاةَ قَالَتْ دَخَلْتُ مَعَ نِسْوَةٍ مِّنْ قُرَيْشٍ دَارَ اٰلِ اَبِيْ حُسَيْنٍ نَنْظُرُ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَهُوَ يَسْعٰى بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ فَرَأَيْتُهُ يَسْعٰى وَاِنَّ مِئْزَرَهُ لَيَدُوْرُ مِنْ شِدَّةِ السَّعْيِ وَسَمِعْتُهُ يَقُوْلُ اسْعَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلَيْكُمُ السَّعْيَ۔

(رواه فی شرح السنة وروی احمد مع اختلاف)

اخرجه الدارقطنی ٢٥٦/٢ من کتاب الحج الحدیث رقم ٨٧ من باب المواقیت والبغوی فی شرح السنن ١٤٠/٧ الحدیث رقم ١٩٢١۔ واحمد فی المسند ٤٢١/٦۔

ترجمہ: شبیہ کی بیٹی صفیہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہتی ہیں کہ مجھ کو ابو تجران کی بیٹی نے خبر دی کہ میں قریش کی عورتوں کے ساتھ آلِ ابی حسین کے گھر گئی تا کہ ہم نبی کریم ﷺ کی طرف دیکھیں اور وہ صفا اور مروہ کے درمیان پھرتے ہیں تا کہ ان کے جمال و کمال سے مشرف ہو جائیں اور ان کے عمل و برکت سے مستفید ہو جائیں۔ پس میں نے ان کو صفا اور مروہ کے درمیان دوڑتے ہوئے دیکھا اس حال میں کہ تحقیق ان کا تہہ بند ان کے پاؤں کے گرد زیادہ دوڑنے کی وجہ سے پھر رہا تھا اور میں نے ان کو فرماتے ہوئے سنا کہ سعی کرو۔ پس تحقیق اللہ تعالیٰ نے تم پر سعی فرض کر دی ہے۔ اس کو شرح السنۃ میں نقل کیا گیا ہے اور امام احمدؒ نے اس کو اختلاف کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

تشریح: **قوله :بنت ابی تجراة**: تاء کے ضمہ اور جیم سکون کے ساتھ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ تاء کے فتحہ اور جیم کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ (ذکرہ ابن الملک)

ابن حجرؒ فرماتے ہیں تاء کے فتحہ اور جیم کے سکون کے ساتھ ہے اور اول تصحیح شدہ نسخوں کے موافق ہے۔ مصنف نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے اور ابن ہمامؒ کی روایت میں ہے کہ اس کا نام حبیبہ ہے بنی عبد الدار کی عورتوں میں سے ہے۔

قوله :فرأيته يسعى وان مئزره ليدور من شدة السعى: ''وإن'' ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہے اور واو حالیہ ہے۔

''**مئزره**'' میم کے کسرہ اور ہمزہ کے سکون کے ساتھ ہے اور ہمزہ یاء سے بدلا بھی جاتا ہے۔

''**من شدة السعى**'' یہ دلالت کر رہا ہے کہ آپ ﷺ پیدل تھے اور حدیث حسن میں اس کی تصریح آئی ہے اور یہ منافی نہیں ہے اس روایت کا جس میں ہے کہ آپ ﷺ نے حجۃ الوداع میں سوار ہو کر سعی کی کیونکہ تطبیق ممکن ہے۔ بایں طور کہ پیدل سعی کرنا کسی عمرہ میں ہو یا پیدل چلنے کے بعد اور سوار ہونا عمرہ میں ہو طواف قدوم سواری پر کرنے کے بعد، اور ابن حجرؒ کی تطبیق کہ آپ ﷺ نے پیدل سعی کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن جب لوگوں کا ازدحام بنا تو باقی چکروں میں آپ سوار ہوئے۔

درست نہیں ہے اور بعید از فہم ہے۔ اور ترمذی نے شافعی سے بلا عذر رکوب کے کراہت کو نقل کیا ہے۔ اور ابن المنذر نے جمہور اہل علم سے یہ نقل کیا ہے۔ پس نووی کا قول کہ ہمارا مذہب یہ ہے کہ بلا عذر سوار ہونا خلاف اولیٰ ہے مکروہ نہیں ہے اس کی کوئی توجیہ نہیں ہے۔

قوله :اسعوا فان الله كتب عليكم السعي ۔علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ فرض کیا ہے تم پر سعی، پس یہ دلالت کر رہا ہے کہ سعی فرض ہے اور جس نے سعی نہیں کی تو اس کا حج باطل ہوا امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک (انتہیٰ)۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ سعی واجب ہے اور اس طرح اس میں پیدل چلنا بھی واجب ہے اور حدیث ظنی ہے اور ترک واجب پر دم لازم ہوتا ہے۔ اور اس حدیث کو دارقطنی، شافعی اور بیہقی نے روایت کیا ہے سند حسن کے ساتھ ان الفاظ کے ساتھ ''**انه عليه الصلاة والسلام استقبل الناس في المسعٰى وقال يأيها الناس اسعوا فان الله كتب عليكم السعي** اور صحابہ کی ایک جماعت جیسے ابن عباس، ابن زبیر، انسؓ اور ان کے علاوہ تابعین نے کہا ہے کہ سعی مستحب ہے اور دلیل میں اللہ کے اس ارشاد کو پیش کیا ہے: ﴿**فلا جناح عليه ان يطوف بهما ومن تطوع خير**﴾[البقرة:۱۵۸]

اور مبنی بر انصاف قول یہ ہے سعی واجب ہے نہ کہ فرض۔ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو شافعی، ابن ابی شیبہ اور دارقطنی نے روایت کیا ہے اور صاحب تنقیح نے کہا ہے کہ جواب یہ ہے کہ ہم اس کے موجب کے قائل ہیں کیونکہ اس جیسی حدیث سے وجوب سے زائد کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ اور وجوب کے ہم قائل ہیں۔ اور باقی رکن ہونا ہمارے نزدیک اس پر کسی دلیل کے ہونے سے ثابت ہوتا ہے اور اس حدیث سے ثابت کرنا اثبات بلا دلیل ہے۔

پھر جان لیجئے کہ سیاق حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سعی مکتوب سے مراد بطن وادی میں دوڑنا ہے۔ لیکن ہمارے علم کے مطابق بغیر کسی اختلاف کے یہ مراد نہیں ہے۔ پس اس کو حمل کیا جائے کہ اس سے مراد صفاء، مروہ کے درمیان طواف اور چکر لگانا ہے کیونکہ اس پر اتفاق ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ بات اس وقت فرمائی کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسنون دوڑ شروع کر چکے تھے اور اس کے مقام یعنی بطن وادی تک پہنچ چکے تھے اور اس جگہ کے علاوہ میں دوڑ مسنون نہیں ہے برخلاف رمل کے کہ وہ چلنا ہے تیزی اور قوت کے ساتھ۔

پھر کہا گیا ہے بطن الوادی میں دوڑنے کے سبب کے بارے میں کہ حضرت ہاجرہؑ کو جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چھوڑا اور اس کو پیاس لگی تو وہ پانی کی تلاش میں نکلی اور وہ اسماعیل علیہ السلام کو بھی دیکھ رہی تھی اس پر خوف کی وجہ سے۔ جب وہ بطن الوادی میں پہنچ گئی تو اسماعیل ان سے غائب ہو گئے تو وہ دوڑی تاکہ جلدی سے صفا پر چڑھ جائے اور اسماعیل کو دیکھ لے پھر اس کو عبادت قرار دیا گیا ان کی شرافت کے اظہار کیلئے۔

ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب ابراہیم علیہ السلام کو حج کا حکم ہوا تو سعی کے وقت شیطان ان کے سامنے آ گئے اور ان کے ساتھ دوڑ میں مقابلہ کرنے لگے تو ابراہیم علیہ السلام ان سے آگے نکلے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہاں دوڑے تھے۔ مشرکین کے سامنے قوت کے اظہار کیلئے اس وجہ کا محل عمرۃ القضاء کی سعی ہے پھر اس کے بعد یہ رمل کی طرح ہوا کیونکہ حجۃ الوداع کے موقع پر مکہ میں کوئی مشرک باقی نہ تھا۔ محققین کا قول یہ ہے اس کا معنی اور مطلب تلاش نہ کیا جائے اور اس جیسے دوسرے احکام رمی وغیرہ میں بلکہ یہ توقیفی امور ہیں ان کے علم کو اللہ کے حوالہ کیا جائے۔

اور مسعیٰ' سعی کی جگہ' وہ جگہ ہے جو آج کل معروف ہے سلف وخلف کے اس پر اجماع کی وجہ سے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ پر سوار ہو کر سعی فرمائی

۲۵۸۳:وَعَنْ قُدَامَةَ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمَّارٍ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَسْعٰى بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ عَلٰى بَعِيْرٍ لَا ضَرْبَ وَلَا طَرْدَ وَلَا اِلَيْكَ اِلَيْكَ۔ (رواه في شرح السنة)

اخرجه الترمذي في السنن ۲۴۷/۳ الحديث رقم ۹۰۳۔ والنسائي ۲۷۰/۵ الحديث رقم ۳۰۶۱۔ وابن ماجه ۱۰۰۹/۲

الحدیث رقم ۳۰۳۵۔ واحمد فی المسند ۴۱۳/۳۔

ترجمہ: حضرت قدامۃ بن عبداللہ بن عمارؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتے دیکھا۔ اونٹ پر نہ مارتا تھا اور نہ ہانکتا تھا اور نہ ہی کہتا تھا کہ ایک طرف ہو جاؤ۔ ایک طرف ہو جاؤ۔ اس کو شرح السنۃ میں نقل کیا گیا ہے۔

تشریح: قولہ :عن قدامۃ:''قدامۃ'' قاف کے ضمہ اور دال کی تخفیف کے ساتھ ہے۔

راویٔ حدیث:

قدامہ بن عبداللہ۔ اسم گرامی ''قدامہ'' ہے۔ ''عبداللہ'' کے بیٹے ہیں۔ ''بنو کلاب'' میں سے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ''بنو عامر'' سے ہیں۔ پرانے مسلمان ہیں۔ مکہ میں ہی سکونت پذیر ہو گئے اور ہجرت نہیں کی۔ حجۃ الوداع میں حاضر تھے۔ بعد میں (بلادِ نجد کے مقام) ''بدر'' میں ٹھہر گئے۔ ان سے ایمن بن نائل وغیرہ نے حدیث کی روایت کی۔ ''قدامہ'' میں قاف پر ضمہ اور دال مہملہ بلا تشدید کے ہے۔

قولہ :رأیت رسول اللہ ﷺ یسعی......بعیر : قولہ :''لا ضرب ولا طرد'' دونوں فتح اور رفع دونوں کے ساتھ اور دونوں تنوین کے ساتھ ہیں۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ لوگوں کو نہ مارتے تھے اور نہ جھڑکتے تھے اور نہ یہ کہتے تھے کہ راستے سے ہٹو جیسا کہ بادشاہوں اور جبابرہ کا طریقہ اور عادت ہے مقصود اس حدیث سے ان لوگوں پر تعریض ہے جو یہ کرتے ہیں (انتہیٰ) سیوطیؒ نے ذکر کیا ہے کہ سب سے پہلی بدعت جو ظاہر ہوئی ہے وہ **الطریق الطریق** (راستہ چھوڑ، راستہ چھوڑو) ہے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ ہم اس زمانہ میں **الطریق ، الطریق**۔ اور **الیك الیك** پر راضی ہیں کیونکہ اس زمانہ میں ایسے لوگ پیدا ہوئے ہیں جو ہاتھ اور پاؤں کے ذریعے لوگوں کو راستے سے ہٹاتے ہیں اور سواریوں سے روندتے ہیں اور وہ خاموش ہوتے ہیں منہ سے کچھ نہیں بولتے، گویا وہ اس کا مصداق ہیں: ﴿**اولئك كالانعام بل هم اضل......**﴾

اضطباع کا طریقہ

۲۵۸۴: **وَعَنْ يَعْلَى ابْنِ اُمَيَّةَ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ طَافَ بِالْبَيْتِ مُضْطَبِعًا بِبُرْدٍ اَخْضَرَ۔**

(رواہ الترمذی و ابوداود و ابن ماجۃ والدارمی)

اخرجہ ابوداؤد فی السنن ۴۴۳/۲ الحدیث رقم ۱۸۸۳۔ والترمذی فی ۲۱۴/۳۔ الحدیث رقم ۸۵۹۔ وابن ماجہ ۹۸۴/۲ الحدیث رقم ۲۹۵۴۔ والدارمی فی سننہ ۶۵/۲ الحدیث رقم ۱۸۴۳۔ واحمد فی المسند ۲۲۳/۴۔

ترجمہ: حضرت یعلی بن امیہؓ سے روایت ہے تحقیق آپ ﷺ نے خانہ کعبہ کا طواف کیا اس حال میں کہ اضطباع کرنے والے تھے سبز چادر کے ساتھ یعنی سبز خطوط کی چادر تھی۔ اس کو امام ترمذیؒ اور ابوداؤد اور ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے اور دارمیؒ نے۔

تشریح: ''**مضطبعا**'' باء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ''**ضبع**'' بازو کے درمیان کو کہتے ہیں اور اس کا اطلاق بغل پر بھی ہوتا ہے۔

''اضطباع'' کہتے ہیں کہ چادر کے درمیانی حصہ کو دائیں بغل کے نیچے ڈال کر اس کے دونوں اطراف بائیں کندھے پر آگے اور

پیچھے کی طرف ڈال دیں۔اس کو اضطباع اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اس میں ضبعین یعنی بازو کھلے ہوئے ہوتے ہیں۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اضطباع اظہار شجاعت کیلئے فرماتے تھے۔

اضطباع اور رمل دونوں سنت ہیں ہر اس طواف میں جس کے بعد سعی ہو۔اور اضطباع تمام چکروں میں سنت ہے برخلاف رمل کے ۔اور طواف کے علاوہ اضطباع مستحب نہیں ہے اور جو عوام ابتداء احرام سے حج ہو یا عمرہ اضطباع کرتے ہیں اس کی کوئی اصل نہیں ہے بلکہ نماز کی حالت میں مکروہ ہے۔طواف افاضہ میں اگر وہ کپڑے پہنے ہوئے ہو تو اضطباع ساقط ہو جاتا ہے۔

تخریج: ابن ہمام رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

اضطباع کرنا سنت ہے

۲۵۸۵: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ وَ اَصْحَابَهٗ اِعْتَمَرُوْا مِنَ الْجِعِرَّانَةِ فَرَمَلُوْا بِالْبَيْتِ ثَلَاثًا وَجَعَلُوْا اَرْدِيَتَهُمْ تَحْتَ اٰبَاطِهِمْ ثُمَّ قَذَفُوْهَا عَلٰى عَوَاتِقِهِمُ الْيُسْرٰى۔ (رواہ ابو داود)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ٢/٤٤٤ الحديث رقم ١٨٨٤۔ واحمد فی المسند ١/٣٠٦۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ بے شک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھ صحابہ نے جعرانہ سے عمرہ کیا جو ایک جگہ کا نام ہے مکے سے اٹھ کوس کے فاصلے پر ہے پس جلدی چلے خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے تین مرتبہ اور اپنی چادروں کو اپنی بغلوں کے نیچے کیا پھر ان کو اپنے بائیں کندھوں پر ڈالا۔اس کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ''الجعرانة'' نوویؒ فرماتے ہیں کہ زیادہ فصیح تخفیف کے ساتھ ہے۔

''آباط'' الف ممدودہ کے ساتھ ابط کی جمع ہے۔

شافعی رحمۃ اللہ کا یہ قول عجیب وغریب ہے کہ سعی میں اضطباع سنت ہے طواف پر قیاس کرتے ہوئے۔حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سعی میں اضطباع ترک کیا ہے اور طواف میں بھی رمل اور اضطباع کی علت باعث معدوم ہے اور ان کا استدلال اس حدیث سے ''**انه عليه الصلاة والسلام طاف بين الصفا والمروة طارحاً رداء ه**'' انتہائی ناآشنا ہے اور مسلک عجیب ہے۔

تخریج: ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے بارے میں ابوداؤد نے سکوت اختیار کیا ہے اور ان کے علاوہ نے اس کو حسن کہا ہے،اس کلام سے ابن حجرؒ کے اس قول پر اعتراض ختم ہو جاتا ہے کہ انہوں نے کہا ہے رواہ ابوداؤد بسند صحیح۔

الفصل الثالث:

رکن یمانی اور حجر اسود کو ہاتھ لگانا

۲۵۸۶: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ مَا تَرَكْنَا اِسْتِيْلَامَ هٰذَيْنِ الرُّكْنَيْنِ الْيُمَانِيِّ وَالْحَجَرِ فِيْ شِدَّةٍ وَلَا رَخَاءٍ مُنْذُ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَسْتَلِمُهُمَا (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٣/٤٧١۔ الحديث رقم ١٦٠٦۔ ومسلم فی ٢/٩٢٤ الحديث رقم (٢٤٥۔ ١٢٦٨)۔ والنسائی فی ٥/٢٣٢ الحديث رقم ٢٩٥٢۔ والدارمی فی ٢/٦٣ الحديث رقم ١٨٣٨۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ہم نے ان دونوں رکنوں کو ہاتھ لگانا نہیں چھوڑا بھیڑ میں بھی' آسانی میں بھی جب سے میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ ہاتھ لگاتے تھے ان دونوں کو اس کو بخاری اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: بیہقی کی خبر میں سند ضعیف کے ساتھ ہے **انه عليه الصلاة والسلام اتى فقبله واستلم اليمانى فقبل يده،** ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہ احمد کی اس روایت کے معارض نہیں ہے جس میں ہے **انه عليه الصلاة والسلام قبل ركن اليمانى ووضع خده الايمن عليه،** کیونکہ یہ یا تو غیر ثابت ہے جیسا کہ بیہقی نے کہا ہے اور یا ضعیف ہے اگرچہ حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے (انتہیٰ)

لیکن یہ بات مخفی نہیں ہے کہ حدیث بیہقی باوجود ضعیف ہونے کے کیسے معارض نہیں ہو سکتی۔ حدیث احمد کا اور اس کے ساتھ حاکم کے اس کی سند کو صحیح قرار دینے سے وہ قوی ہو جاتا ہے پس اولیٰ یہ ہے کہ اس کو نادر حالت پر محمول کیا جائے۔

پھر ابن حجرؒ کا یہ قول کہ رکن یمانی کے استلام کا کوئی قائل نہیں امام محمد کے قول سے غفلت ہے کہ وہ فرماتے ہیں رکنین کا حکم برابر ہے۔ پھر صحیحین میں ابن عمر کی روایت ہے: **ما ارى رسول الله ﷺ ترك استلام الركنين اللذين يليان الحجر الا أن البيت لم يتم على قواعد ابراهيم عليه الصلاة والسلام۔**

باقی ایک جماعت جن میں سے ابن زبیرؓ اور معاویہؓ ہیں کا ان دونوں کا استلام کرنا یہ ان کا مذہب ہے جس میں انہوں نے صحیح احادیث کی مخالفت کی ہے اسی وجہ سے جمہور صحابہ نے ان کی مخالفت کی ہے۔

باقی حضرت معاویہ کا یہ قول: **ليس شيئ من البيت مهجورا** تو اس کا جواب امام شافعیؒ نے دیا ہے کہ ان کا استلام بیت اللہ کے ہجران کی وجہ سے نہیں چھوڑا جاتا بلکہ جن کا استلام رسول اللہ ﷺ نے کیا ہے ان کا استلام کیا جائے گا اور جن کا نہیں کیا ہے ان کا نہیں کیا جائے گا۔

یہ اختلاف اب ختم ہو چکا ہے اور اب اجماع ہے کہ ان کا استلام نہیں کیا جائے گا۔ اور اس اجماع میں اصولیین کا اختلاف ہے۔ (كذا حققه العسقلانى)

۲۵۸۷: **وَفِي رِوَايَةٍ لَهُمَا قَالَ نَافِعٌ رَأَيْتُ ابْنَ عُمَرَ يَسْتَلِمُ الْحَجَرَ بِيَدِهِ ثُمَّ قَبَّلَ يَدَهُ وَقَالَ مَا تَرَكْتُهُ مُنْذُ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَفْعَلُهُ۔**

اخرجه مسلم فى صحيحه ٢/٩٢٤ الحديث رقم (٢٤٦ـ ١٢٦٨)۔ وابوداؤد فى ٢/٤٤٠ الحديث رقم ١٨٧٦۔

ترجمہ: بخاریؒ اور مسلم شریف کی ایک روایت میں یوں ہے کہ نافعؒ نے کہا کہ میں نے دیکھا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما اپنا ہاتھ حجر اسود کو لگاتے تھے پھر اپنے ہاتھ کو بوسہ دیتے اور فرماتے ہیں کہ میں نے نہیں چھوڑا جب سے میں نے حضور ﷺ کو دیکھا ہے یہ کرتے ہوئے۔

تشریح: **قوله :يستلم الحجرثم قبل يده:** شاید یہ ازدحام کے وقت ہو، ہدایہ میں ہے کہ اگر ممکن ہو تو حجر اسود کو مس کرے ہاتھ سے یا اس چیز سے جو ہاتھ میں ہو۔ اور پھر ہاتھ یا اس چیز کو چومے اور فتاویٰ قاضیخان میں ذکر کیا ہے کہ ہاتھ کو چومنے کے بجائے چہرے پر مل لے۔

قوله :ماتركته منذ رأيت رسول الله ﷺ يفعله: یعنی مطلق استلام یا مخصوص استلام، کیونکہ آپ علیہ الصلاۃ السلام سے استلام اور چومنا دونوں ثابت ہیں۔ جیسا کہ صحیحین میں ہے اور بیہقی نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے: **ان ابن عباس رضى الله عنهما قبله اسجد عليه، ثم قال: رأيت عمر رضى الله عنه قبله وسجد عليه ثم قال: رأيت رسول الله ﷺ، يفعل هكذا، ففعلت** ۔ اور حاکم نے روایت کیا ہے اور اس کو صحیح کہا ہے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے کہ آپ ﷺ نے جب حجر اسود کو بوسہ دیا تو اس پر اپنی پیشانی سے سجدہ کیا۔ اور امام مالک نے شذوذ اختیار کیا ہے جیسا کہ قاضی عیاض نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے ہاتھ چومنے کے اور حجر اسود پر سجدہ

کرنے کو بدعت کہتے ہیں۔

عذر کی وجہ سے سوار ہو کر طواف کرنے کی اجازت ہے

۲۵۸۸: وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ شَكَوْتُ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اِنِّىْ اَشْتَكِىْ فَقَالَ طُوْفِىْ مِنْ وَّرَاءِ النَّاسِ وَاَنْتِ رَاكِبَةٌ فَطُفْتُ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُصَلِّىْ اِلٰى جَنْبِ الْبَيْتِ يَقْرَأُ بِالطُّوْرِ وَكِتَابٍ مَّسْطُوْرٍ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ۴۹۰/۳۔ الحديث قم ۱۶۳۳۔ ومسلم فی ۹۲۷/۲ الحديث رقم (۲۵۸۔ ۱۲۷۶)۔ وابوداؤد فی السنن ۴۴۳/۲ الحديث رقم ۱۸۸۲۔ وابن ماجه فی ۹۸۷/۲ الحديث رقم ۲۹۶۱۔ والنسائی فی ۲۲۳/۵ الحديث رقم ۲۹۲۶۔ ومالك فی الموطأ ۳۷۰/۱ الحديث رقم ۱۲۳ من كتاب الحج۔

ترجمہ: حضرت سلمہؓ سے روایت ہے کہتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے شکایت کی کہ میں بیمار ہوں یعنی پیدل چل کر طواف نہیں کر سکتی۔ فرمایا کہ لوگوں سے پرے پرے (یعنی دور ہو کر طواف کر اس حال میں کہ تو سوار ہو۔ پس میں نے طواف کیا اور رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے خانہ کعبہ کے پہلو میں یعنی خانہ کعبہ کی دیوار کے ساتھ متصل پڑھ رہے تھے سورۃ طور و کتاب مسطور۔ اس کو بخاری اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :انی اشتکی: شکایة مرض کو کہتے ہیں۔

قوله وانت راكبة: اس سے ثابت ہوا کہ سوار ہو کر طواف کرنا۔ آپ علیہ الصلاۃ والسلام کی خصوصیات میں سے نہیں ہے۔

قوله :"یقرأ": اس میں دو احتمال ہیں: (۱) یعنی سورۃ طور ایک رکعت میں پڑھ رہے تھے جیسا کہ آپ ﷺ کی عادت تھی۔ (۲) ادونوں رکعتوں میں یہ سورت پڑھی ہو۔

راوی کیلئے اولیٰ یہ تھا کہ یوں کہتے: یقرأ الطور اور الطور پر اکتفا کرتے اور و کتاب مسطور نہ کہتے۔

حجرِ اسود کو بوسہ نبی کریم ﷺ کی سنت ہے

۲۵۸۹: وَعَنْ عَابِسِ بْنِ رَبِيْعَةَ قَالَ رَأَيْتُ عُمَرَ يُقَبِّلُ الْحَجَرَ وَيَقُوْلُ اِنِّىْ لَاَ عْلَمُ اَنَّكَ حَجَرٌ مَا تَنْفَعُ وَلَا تَضُرُّ وَلَوْلَا اَنِّىْ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يُقَبِّلُكَ مَا قَبَّلْتُكَ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ۴۶۲/۳۔ الحديث رقم ۱۵۹۷۔ ومسلم فی ۹۲۵/۲ الحديث رقم (۲۵۱۔ ۱۲۷)۔ وابوداؤد فی ۴۳۸/۲ الحديث رقم ۱۷۷۳۔ والترمذی فی ۲۱۴/۳ الحديث رقم ۸۶۰۔ والنسائی فی ۲۲۷/۵ الحديث رقم ۲۹۳۷ وابن ماجه فی ۹۸۱/۲ الحديث رقم ۲۹۴۳۔ ومالك فی الموطأ ۳۶۷/۱ الحديث رقم ۱۱۵ من كتاب الحج۔ واحمد فی المسند ۵۴/۱۔

ترجمہ: حضرت عابس بن ربیعہؒ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حجر اسود کو بوسہ دیتے ہوئے دیکھا اور کہتے تھے کہ تحقیق میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے نہ نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ ہی تکلیف اور اگر میں نے نبی کریم ﷺ کو بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھ کو بوسہ نہ دیتا۔ اس کو امام بخاری اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

عابس بن ربیعہ۔ عابس بن ربیعہ "غطیفی" ہیں۔ فتح مصر میں شریک ہوئے۔ ان سے ان کے بیٹے عبدالرحمٰن روایت کرتے ہیں۔

تشریح: **قوله :ما تنفع:** اور ایک نسخہ میں ''**لا تنفع**'' ہے۔

قوله :ولولا انی رأیت رسول الله ﷺ ما قبلتك:

اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے اشارہ ہے کہ یہ امر تعبدی ہے ہم اس کو کر رہے ہیں اور اس کی علت کے بارے میں سوال نہیں کرتے اور اشارہ ہے توحید حقیقی کی طرف جس پر عمل مراس ہے۔اور علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے یہ اس لیے فرمایا تا کہ وہ لوگ جو نئے مسلمان ہوئے ہیں اور پتھروں کی عبادت سے مانوس ہیں وہ اس سے دھوکے میں نہ پڑیں کہ یہ عقیدہ رکھ لیں کہ یہ پتھر بالذات نفع اور نقصان پہنچانے والا ہے۔تو حضرت عمرؓ نے بیان کر دیا کہ یہ بالذات نہ نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان۔اگر چہ اس کے بارے میں حکم شرعی کا پورا کرنا جزاء کے اعتبار سے نافع ہے۔

اور تا کہ یہ بات موسم حج میں پھیل جائے اور مختلف ملکوں میں مشہور ہو جائے اور اس میں ترغیب ہے حجر اسود کے چومنے میں رسول اللہ ﷺ کی اقتداء کرنے کی (انتہی) اور اس میں اشارہ ہے کہ ارباب عقل کے بارے میں یہ خیال نہ کیا جائے اگر چہ وہ کافر ہو کہ وہ عقیدہ رکھے کہ پتھر بالذات نفع اور ضرر کا مالک ہے،اور وہ جو پتھروں کی تعظیم و عبادت کرتے تھے اس کی یہ علت بیان کرتے تھے کہ یہ اللہ کے ہاں ہماری سفارش کرنے والے ہیں اور ہمیں اللہ کے نزدیک درجے کے اعتبار سے قریب کرنے والے ہیں۔پس وہ پتھروں کو چھوتے اور بوسہ دیتے نفع کا سبب ہونے کی وجہ سے۔ہمارے اور ان کے درمیان فرق یہ ہے کہ وہ یہ سب کچھ اپنی طرف سے کر رہے ہیں۔اللہ کی طرف سے اس پر کوئی دلیل نہیں آئی ہے۔برخلاف مسلمانوں کے کہ وہ کعبہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں اس کی بنیاد اللہ کا امر اور حکم ہے۔اور پتھر کو بوسہ دیتے ہیں اس کی بنیاد متابعت رسول ﷺ ہے ورنہ ذات کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔موجودات کو جاننے والے کی نظر میں ایک گھر اور دوسرے گھر اور ایک پتھر اور دوسرے پتھر میں کوئی فرق نہیں ہے۔پس پاک ہے وہ ذات جس نے تعظیم بخشی اپنی مخلوقات میں سے جس کیلئے چاہے افراد انسانیت میں سے جیسے رسول ﷺ ہے اور افراد حوانیہ میں سے جیسے ناقۃ اللہ ہے اور جمادات میں سے جیسے بیت اللہ ہے اور مکانات میں سے جیسے حرم اللہ ہے اور زمانہ میں سے جیسے لیلۃ القدر اور ساعۃ الجمعہ ہے اور اشیاء کے خواص کو اپنے مکتوبات میں پیدا فرمایا اور زمین و آسمان کے اجزاء میں تفاوت و تمایز رکھا۔

ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حاکم نے حدیث عمر کو روایت کیا ہے اور اس میں زیادت کی ہے: **فقال علی بن أبی طالب رضی الله عنه، بلٰی یا امیر المؤمنین یضر و ینفع، ولوعلمت تأویل ذلك من کتاب الله لقلت کما اقول: ﴿واذ اخذ ربك من بنی آدم من ظهورهم ذریتهم واشهدهم علی انفسهم الست بربکم؟ قالوا: بلٰی﴾**[الاعراف:۱۷۲] **فلما اقروا انه الرب عزوجل وانهم العبید کتب میثاقهم فی رق والقمه فی هذا الحجز وانه یبعث یوم القیامة، وله عینان ولسان وشفتان یشهد لمن وافاه، فهو امین الله فی هذا الکتاب ۔قال له عمرؓ: لا ابقانی الله بأرض لست بها یا ابا الحسن**،یعنی حضرت علی نے فرمایا ہاں اے امیر المؤمنین یہ فائدہ اور نقصان پہنچاتا ہے اور اگر اس کی تفسیر مجھے اللہ کی کتاب میں معلوم ہوتی تو میں یہ کہتا اور پھر آیت **واذ اخذ ربك......** پڑھی اور فرمایا کہ جب ارواح نے اقرار کر لیا کہ وہ ان کا رب ہے اور یہ خود بندے ہیں تو اللہ نے ان کے اس میثاق کو ورق میں لکھا اور اس ورق کو اس پتھر میں رکھا اور قیامت کے دن اس پتھر کو اٹھائے گا اس کی دو آنکھیں اور زبان ہوگی اور دو ہونٹ ہوں گے اور جس شخص نے اس عہد کو پورا کیا ہو اس کیلئے گواہی دے گا۔پس یہ اللہ کا امین ہے اس کتاب پر۔حضرت عمر نے علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اللہ مجھے اس زمین پر باقی نہ رکھے جس پر آپ نہ ہوا ے ابوالحسن۔

اور حاکم نے کہا ہے کہ یہ حدیث شیخین کی شرط پر نہیں ہے کیونکہ انہوں نے ابو ہارون العبدی کو قابل احتجاج نہیں کہا ہے۔

اورغرائب متون میں سے ہے وہ روایت جوابن ابی شیبہ میں مسند ابی بکر کے آخر میں ہے **قال رجل رأ النبی ﷺ انه علیه الصلاة والسلام وقف عند الحجر فقال: انی لا علم أنك حجر لا تضر ولا تنفع، ولولا امرنی ربی ان اقبلك ما قبلك** ''پس اس کی سند کیلئے ابن ابی شیبہ کی طرف رجوع کیا جائے۔ اگر یہ صحیح ہے تو حاکم کی حدیث کے بطلان کا فیصلہ کیا جائے گا۔ کیونکہ یہ بہت بعید ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ جواب ''**بل یضرو ینفع**'' صادر ہو، بعد اس کے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ''**لا یضرو لاینفع**'' کیونکہ صورت معارضہ کی ہے اور ذہبی نے عبدی کے بارے میں کہا ہے کہ وہ ساقط ہے اور حضرت عمرؓ نے یا نبی ﷺ نے یہ جاہلیت کے وہم کو ختم کرنے کیلئے فرمایا تھا (انتہیٰ)۔

پس آپ ﷺ کے قول: **انه لولا امرنی ربی أن أقبلك لما قبلتك** کا مطلب یہ ہے کہ یہ اشارہ ہے کہ تعبدی طریقے پر عبودیت کی طرف اور احکام ربوبیت کے تحت تنزل اور تواضع کی طرف۔ ورنہ عقل حیران رہتا ہے سید الکونین صاحب لولاک کے پتھروں میں سے ایک پتھر کو بوسہ دینے پر جو پتھر جمادات کی جنس میں سے ہے وہ جمادات جومخلوقات کے **احقر الاجناس** میں سے ہے اور یہ تو **تنزلات الوهیه** اور تجلیات سبحانیہ ہے کہ اپنے بندوں کیلئے حرم بنایا جس کی طرف وہ ٹھکانا بناتے ہیں اور نمازوں اور دیگر عبادات میں اس کی طرف رخ کرتے ہیں اور اس کو بوسہ دیتے ہیں اور ہاتھوں سے مسح کرتے ہیں اور اس پر پیشانی رکھتے ہیں جیسا کہ آپ ﷺ نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

''**الحجر یمین الله فمن مسحه فقد بایع الله**''! ابن ہمام فرماتے ہیں کہ اس میں یہ مسئلہ ہے کہ اس تقبیل کیلئے آواز نہیں ہے اور کیا بوسہ کے بعد حجر پر سجدہ کرنا مستحب ہے؟ تو ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ حجر اسود کو بوسہ دیتے اور اس پر سجدہ کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ میں نے حضرت عمر کو دیکھا کہ وہ بوسہ دے کر سجدہ کرتے تھے اور فرماتے تھے میں رسول اللہ ﷺ کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے اس وجہ سے میں نے اس طرح کیا۔ اس کو منذری اور حاکم نے روایت کیا ہے اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔

مگر شیخ قوام الدین کاکی فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک بہتر یہ ہے کہ سجدہ نہ کیا جائے کیونکہ مشاہیر میں سجدہ کی روایت نہیں ہے۔

اور شیخ عزالدین نے اپنے مناسک میں ہمارے علماء سے سجدہ کرنے کو نقل کیا ہے۔ (انتہیٰ)

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ جب ہجوم نہ ہو تو بعض ایام میں سجدہ کرنا اولیٰ ہے یا اول اور آخر میں آپ ﷺ کے فعل سے تبرک کیلئے حدیث پر عمل کرنے کے جواز کی وجہ سے اگر چہ ضعیف ہو اور علماء نے حدیث کو صحیح بھی قرار دیا ہے؟ پھر ابن ہمام نے فرمایا ہے کہ ابن ماجہ کی روایت میں ہے: ''**عن ابن عمر قال استقبل النبی ﷺ الحجر: ثم وضع شفته علیه یبکی طویلا، ثم التفت، فاذا هو بعمر بن الخطاب یبکی، فقال: یا عمر هنها تسکب العبرات**''۔

رکن یمانی پر ستّر فرشتے متعین کیے گئے ہیں

۲۵۹۰: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ وُکِّلَ بِهِ سَبْعُوْنَ مَلَکًا یَعْنِی الرُّکْنَ الْیَمَانِیَّ فَمَنْ قَالَ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِیَةَ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ قَالُوْا اٰمِیْنُ۔ (رواہ ابن ماجة)

اخرجه ابن ماجه فی سننه ۹۸۵/۲ الحدیث رقم ۲۹۵۷۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ رکن یمانی پر ستّر فرشتے متعین ہیں

پس جو شخص کہے کہ اے الٰہی! میں تجھ سے گناہوں کی معافی مانگتا ہوں اور دنیا وآخرت میں عافیت مانگتا ہوں اے ہمارے رب ہمیں دنیا وآخرت میں بھلائی نصیب فرما اور ہم کو آگ کے عذاب سے بچا۔ اس کو ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ''الیمانی'' قول صحیح کے مطابق تخفیف یاء کے ساتھ ہے۔

یعنی الرکن الیمانی'' یہ کے ضمیر کے مرجع کو متعین کرنے کیلئے لایا ہے اور یہ ضد معترضہ ہے **علی طریق التفسیر** اور قائل ابو ھریرہ یا ان کے علاوہ کوئی ہے۔

''**فی الدنیا والأخرۃ**'' ممکن ہے کہ لف نشر مشوش کے طور پر ہو۔

اس روایت میں اور گزرے ہوئے روایت ''**بین الرکنین**'' میں منافات نہیں ہے کیونکہ جب وہ رکن یمانی تک پہنچے اور یہ دعا شروع کی اور وہ چل رہے تھے تو کو یہ شک نہیں یہ دونوں کے درمیان واقع ہوا ہو۔ کیونکہ دوران طواف دعا کیلئے کھڑا ہونا جائز نہیں ہے جیسا کہ جاہل عوام یہ کرتے ہیں۔

ابن ہمام علماء اعلام سے ادعیہ ماثورہ نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ جان لے کہ اگر آپ منقول دعائیں اوراذکار جو طواف کے بارے میں ہیں سب پر عمل کرنا چاہیں اور سب پڑھنا چاہیں تو دوران طواف آپ کا کھڑا رہنا چلنے سے زیادہ ہوگا کیونکہ یہ اذکار اور دعائیں ارام اور مہلت کے ساتھ منقول ہیں نہ کہ دوڑنے کے ساتھ۔

پھر بعض سلف صحابہ اور تابعین سے منقول ہے کہ انہوں نے فلاں جگہ یہ دعا پڑھی اور یہ پڑھی اور دوسرے سے منقول ہے کہ یہ پڑھی اور کسی اور سے کچھ اور منقول ہے تو متاخرین نے سب کو جمع کر دیا ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ سب ایک ہی روایت میں منقول ہیں اور ایک ہی موقع پر پڑھنا چاہیے بلکہ معروف طواف میں اللہ کا ذکر ہے اور ہمیں ایسی کوئی روایت نہیں معلوم جس میں قرآن پڑھنے کا ذکر ہو۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں شاید کہ آپ ﷺ نے طواف میں قرآن میں سے کچھ قراءت کے قصد سے نہیں پڑھا تا کہ معلوم ہو جائے کہ قراءت ارکان طواف میں سے نہیں ہے اور یہ بھی **الطواف کالصلوٰۃ** سے مستثنٰی ہے۔

تخریج: ابن ماجہ نے اس حدیث کو سند ضعیف کے ساتھ نقل کیا ہے مگر فضائل اعمال میں یہ مقبول ہے۔

مزید روایات: اور حاکم نے روایت کیا ہے''**انه علیه الصلاة والسلام قال: ما انتهیت الی الرکن الیمانی قط الا وجدت جبریل عنده، قال: قل یا محمد! قلت: وما اقول؟ قال: قال: اللهم انی اعوذبك من الکفر والفاقة ومواقف الخزی فی الدنیا والأخرة، ثم قال جبریل ان بینهما سبعین الف ملك، فاذا قال العبد هذا قالوا: آمین**'' اور ایک روایت میں **سبعون** واو کے ساتھ ہے۔ ان کے اہمال کے ساتھ یا اس طور پر کہ لفظ ان میں ضمیر شان ہے اور اس کی نظیر ''**ان کان فی امتی ملهمون**'' نہیں ہے۔ جیسا کہ ابن حجرؒ کو یہ وہم ہوا ہے کیونکہ یہ ممکن ہے کہ یہاں **کان** تامہ ہو اور اصل میں **ان وجدنی امتی ملهمون** ہو۔

اور ابوداؤد کی روایت میں ہے: ''**ما مررت بالرکن الیمانی الا وعنده ملك ینادی بقول آمین، آمین؟ فاذا مررتم به فقولوا: ربنا أتنا فی الدنیا حسنة، وفی الأخرة حسنة وقنا عذاب النار**''۔

اور ابن جوزی نے نقل کیا ہے کہ رکن یمانی پر ایک فرشتہ مقرر ہے جب سے اللہ نے آسمان وزمین کو پیدا کیا ہے پس جب تم رکن یمانی سے گزرو تو یہ کہو: ''**ربنا أتنا**...... ۔ کیونکہ وہ کہتا ہے آمین، آمین۔ اور حاکم نے سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ یمانیین کے درمیان کہتے ''**اللهم ربنا آتنا فی الدنیا حسنة وفی الأخرة حسنة وقنا عذاب النار**'' پھر فرماتے ''**اللهم قنعنی بما**

رزقتنی وبارك لی فیه واخلف علی كل غائبة لی بخیر''۔

اورازرقی نے حضرت علیؓ سے نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ جب بھی رکن یمانی سے گزرتے تو کہتے: ''بسم الله والله اكبر، السلام علی رسول الله ورحمة الله وبركاته، اللهم انی اعوذبك من الكفر والفقر ومواقف الخزی فی الدنیا والأخرة ﴿ربنا آتنا فی الدنیا حسنة وفی الأخرة حسنة وقنا عذاب النار﴾۔

اور یہ حدیث نبی ﷺ سے مرسل بھی منقول ہے مگر سند ضعیف کے ساتھ اور بعض نے اس میں یہ الفاظ زیادہ کیے ہیں کہ ایک آدمی نے کہا اللہ کے رسول ﷺ میں یہ کہوں اگر چہ میں جلدی جلدی چلوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں اگر چہ آپ بانجھ بادل سے زیادہ تیز ہو۔

طواف کی فصیلت

۲۵۹۱: وَعَنْهُ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ مَنْ طَافَ بِالْبَیْتِ سَبْعًا وَلَا یَتَكَلَّمُ اِلَّا بِسُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ مُحِیَتْ عَنْهُ عَشْرُ سَیِّئَاتٍ كُتِبَ لَهٗ عَشْرُ حَسَنَاتٍ وَرُفِعَ لَهٗ عَشْرُ دَرَجَاتٍ وَمَنْ طَافَ فَتَكَلَّمَ وَهُوَ فِیْ تِلْكَ الْحَالِ خَاضَ فِی الرَّحْمَةِ بِرِجْلَیْهِ كَخَائِضِ الْمَاءِ بِرِجْلَیْهِ۔

اخرجه ابن ماجه فی سننه ۹۸٦/۲ الحیث رقم ۲۹۵۷۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص خانہ کعبہ کا طواف سات بار کرے اور کلام نہ کرے مگر سبحان اللہ اور الحمد للہ اور لا الٰہ الا اللہ اور اللہ اکبر اور لاحول ولاقوۃ الا باللہ کہے اس سے دس برائیاں دور کی جاتی ہیں اور اس کے واسطے دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور اس کے واسطے دس درجے بلند کیے جاتے ہیں اور جو شخص کہ طواف کرے اور اس میں کلام کرے وہ اس حالت میں ہے یعنی حالت طواف میں وہ دریائے رحمت میں اپنے دونوں پاؤں کے ساتھ اس طرح داخل ہوتا ہے جس طرح اپنے پاؤں کے ساتھ کوئی شخص پانی میں داخل ہوتا ہے۔ اس کو ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ''محیت'' تمام نسخوں میں تاء تانیث کے ساتھ ہے''بکتب'' تمام نسخوں میں تذکیر کے ساتھ ہے۔

''سبحان الله'' یہ واجب النصب ہے محلا مجرور ہے۔

''والحمدلله'' یہ مرفوع علی الحکایہ ہے۔

''ومن طاف فتکلم'' کلام کو مکرر لائے تا کہ معقول محسوس کی صورت میں ظاہر ہو جائے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس نے اس کے ذکر کے علاوہ مباح کلام کیا اور اس میں اشارہ ہے کہ یہ حاصل ہونے والا ثواب اول سے کم ہے بوجہ اس کلام کے جو دوران طواف ذکر کے علاوہ کیا ہے کیونکہ یہ کمال ادب کے منافی ہے۔ اور عبادت اس کے طریقے پر واقع نہ کرنا ہے (انتہی)۔

اول درجہ زیادہ ظاہر ہے کیونکہ پہلے آپ ﷺ کی حدیث فلا یتکلمن الا بخیر، میں کلام مباح سے ممانعت آئی ہے پس کلام مباح دوران طواف مکروہ ہے۔

ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کلام مباح مسجد میں مکروہ ہے اور یہ نیکیاں کھاتا ہے (انتہی)۔

پس طواف میں کلام مباح کی کیا حالت ہوگی اور وہ نماز کے حکم میں ہے اور شوافع کے نزدیک کراہت اصل ثواب کے منافی ہے اور

اس سے کسی شے سے نہی اور اس کا برقرار رکھنے کا جمع ہونا لازم آتا ہے۔ بلکہ ثواب اس پر متفرع ہو رہا ہے حالانکہ ثواب اصل طواف کا ہے پس کلام کی تاویل کی جائے گی کہ جس نے طواف کیا اور دوران طواف کلام مباح تکلم کیا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ کلام اس قید کا محتاج نہیں ہے بلکہ اطلاق، یا مطلق نفی کلام اولیٰ ہے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ یہ حدیث کا ظاہر اور متبادر مطلب جو تکلف سے خالی ہے وہ یہ ہے کہ جس نے طواف کیا اور ادعیہ جو علماء سے منقول ہیں پر تکلم کیا۔ پس اس وقت اس قید کا فائدہ ہوگا بلکہ زیادت ثواب کا باعث ہوگا۔ کیونکہ یہ کلمات باقیات صالحات ہیں اور مجاہد سے روایت کیا گیا ہے کہ آدم علیہ السلام بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے پس فرشتے ان سے ملے اور ان سے مصافحہ کیا اور سلام کیا اور کہا تیرا حج قبول ہوا۔ اے آدم علیہ السلام، طواف کر اس گھر کا ہم آپ سے ۲ ہزار سال پہلے اس کا طواف کر چکے ہیں۔ آدم علیہ السلام نے ان سے کہا کہ تم طواف میں کیا کہا کرتے تھے؟ فرشتوں نے کہا ہم کہتے تھے، **سبحان الله، والحمدلله، ولا اله الا الله، والله اكبر**، آدم علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا اور میں اس میں زیادہ کر رہا ہوں۔ **ولا حول ولا قوة الا بالله**۔

اور عطاء نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اس طرح کی روایت کی ہے۔

بَابُ الْوُقُوْفِ بِعَرَفَةَ

وقوفِ عرفات کا بیان

یہ باب عرفہ میں حاضر ہونے کے بارے میں ہے اگر چہ ایک گھڑی کیلئے ہو۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ عرفہ ایک مشہور جگہ کا نام ہے (انتہیٰ)۔ پس اللہ کے اس ارشاد میں: ﴿**فاذا افضتم من عرفات**﴾ [البقرة:۱۹۸] جمع باعتبار اجزاء اور اماکن کے ہے۔

وجہ تسمیہ میں مختلف اقوال ہیں، امام راغب فرماتے ہیں **سمی بذلك لتعزف العباد الى الله بالعبادات هناك** اور بعض نے کہا ہے کہ یہاں آدم اور حواء کا تعارف ہوا تھا۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ بعض نے کہا ہے کہ جبرائیل علیہ السلام نے یوم عرفہ کو حضرت ابراہیم کو حج کے احکام سکھائے اور ان کی جگہیں بتائیں۔ پس جبرائیل ہر موضع پر ابراہیم علیہ السلام سے کہتے **اعرفت هذا**؟ تو ابراہیمؑ کہتے **نعم** اس وجہ سے اس کو عرفہ کہتے ہیں اور بعض نے کہا ہے: **هو يوم اصطناع المعروف اهل الحج**، اور بعض نے کہا ہے **يحرفهم الله تعالىٰ يومئذ بالمغفرة والكرامة** اور اسی اللہ کا یہ قول ہے ﴿**عرفها لهم**﴾ [محمد:٦]۔

ابن حاجب سے نقل کیا ہے کہ وہ غریب موطأ میں فرماتے ہیں کہ عرفہ کا نام اس وجہ سے رکھا ہے کہ اس دن لوگ عجز اور اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس دن لوگوں کا قیام اور دعا پر صبر کرنے کی وجہ سے کیونکہ عارف سبر کرتا ہے (انتہیٰ) کیونکہ جو کسی چیز کی قدر نہیں جانتا وہ اس کی مشقت پر صبر بھی نہیں کرسکتا۔

الفصل الاول:

عرفات کے دن تکبیر وتہلیل کہنا

۲۵۹۲: وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ اَبِیْ بَكْرِ الثَّقَفِيِّ اَنَّهٗ سَأَلَ اَنَسَ بْنَ مَالِكٍ وَهُمَا غَادِيَانِ مِنْ مِّنٰى اِلٰى عَرَفَةَ كَيْفَ كُنْتُمْ تَصْنَعُوْنَ فِيْ هٰذَا الْيَوْمِ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ كَانَ يُهِلُّ مِنَّا الْمُهِلُّ فَلَا يُنْكَرُ عَلَيْهِ وَيُكَبِّرُ

الْمُكَبِّرُ مِنَّا فَلَا يُنكَرُ عَلَيْهِ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۵۱۰/۳۔ الحدیث رقم ۱۶۵۹۔ ومسلم فی صحیحه ۹۳۳/۲ الحدیث رقم (۱۲۸۵/۲۷۴)۔ ومالك فی ۳۳۷/۱ الحدیث رقم ۴۳ من کتاب الحج۔ واحمد فی المسند ۱۱۰/۳۔

ترجمہ: محمد بن ابی بکر ثقفیؒ سے روایت ہے کہ انہوں نے انس بن مالکؓ سے پوچھا اس حال میں کہ دونوں صبح کے وقت منیٰ سے عرفات کی طرف جا رہے تھے کہ تم اس دن کس طرح کرتے تھے یعنی عرفہ میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ۔ پس انسؓ نے کہا لبیک کہتا ہم میں سے لبیک کہنے والا پس انکار نہ کیا جاتا تھا اس پر اور تکبیر کہنے والا. کہتا تھا ہم میں سے اور اس پر بھی انکار نہیں کیا جاتا تھا اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

محمد بن ابی بکر۔ یہ "محمد" ہیں۔ ابو بکر بن عوف ثقفی وحجازی ہیں۔ تابعین میں سے ہیں۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے انہوں نے اور ان سے ایک جماعت نے روایت کی۔ "ثقفی" طائف میں بسنے والے ایک قبیلہ ثقیف کی طرف منسوب ہے۔

تشریح: **قوله :وهما غاديان:** "وهما" واو حال کیلئے ہے۔ "غاديان" **الغدو** سے اسم فاعل کا صیغہ ہے بمعنی **ذاهبان اول النهاء** ہے۔

قوله :فلا ينكر عليه: "لا ينكر" صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تقریر اور صحابہ کی طرف سے اجماع سکوتی ہے۔

قوله :ويكبر المكبّر منا فلا ينكر عليه: علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ رخصت ہے اور تکبیر کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ باقی اذکار کی طرح یہ بھی جائز ہے، لیکن یوم عرفہ کو حجاج کیلئے تکبیر سنت نہیں ہے سنت تلبیہ ہے یوم النحر کو جمرہ عقبہ کے رمی تک۔ اور حجاج کے علاوہ کیلئے تمام بلاد میں یوم عرفہ کے صبح سے نمازوں کے بعد ایام التشریق کے آخر تک تکبیرات مستحب ہیں۔ (انتہیٰ)

ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس بارے میں اختلاف ہے کہ تکبیرات تشریق واجب ہیں یا سنت ہیں اکثر کی رائے واجب ہونے کی اور سنت کی دلیل واضح ہے اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مواظبت ہے اور اللہ کے اس قول سے استدلال کرنا ﴿**ويذكروا اسم الله في ايّام معلومات**﴾ [الحج:۲۸]

پس ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد ذبیحہ پر اللہ کا نام لینا ہے' زمانہ جاہلیت میں جو نام لیتے تھے اس کیلئے ناسخ ہے اور اس پر دلیل **علی ما رزقهم من بهيمة الانعام** ہے (انتہیٰ)۔ پس اولیٰ یہ ہے کہ اللہ کے اس ارشادِ گرامی سے استدلال کیا جائے ﴿**واذكروا الله في ايّام معدودات**﴾ [البقرة:۲۰۳]

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ یہ مسئلہ صحابہ میں بھی مختلف فیہ رہا ہے پس صاحبین نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول کو لیا ہے اور جو ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ یوم عرفہ کے صبح سے لے کر ایام تشریق کے آخر تک تکبیر کہتے تھے۔ اور امام ابو حنیفہؒ نے ابن مسعودؓ کے قول کو لیا ہے اور ان کا قول بھی ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن مسعود یوم عرفہ سے یوم نحر کے عصر تک تکبیر کہتے تھے اور تکبیر اس طرح کہتے تھے: **الله اكبر، الله اكبر لا إله الا الله والله اكبر الله اكبر ولله الحمد**، ابن ہمام فرماتے ہیں کہ پہلے میں تکبیر تین بار کہنا جیسا کہ امام شافعیؒ کہتے ہیں تو یہ ثابت نہیں ہے۔ اور محرم تکبیر سے ابتداء کرے اور پھر تلبیہ کہے (انتہیٰ)، امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک تکبیر واجب ہے، اس شرط کے ساتھ کہ آدمی مقیم ہو' آزاد ہو' مرد ہو اور نماز فرض ہو نا اور جماعت کے ساتھ شہر میں ہونا مستحب ہے اور صاحبین

کے نزدیک ہر اس شخص پر فرض ہے جو فرض نماز پڑھتا ہو۔

مسلم کی روایت میں ہے:"غدونا مع رسول الله ﷺ من منٰی الی عرفات ، منا الملبی و منا المکبّر۔"

وقوف کے مقامات کا ذکر

۲۵۹۳: وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ نَحَرْتُ هٰهُنَا وَمِنًى كُلُّهَا مَنْحَرٌ فَانْحَرُوْا فِی رِحَالِكُمْ وَوَقَفْتُ هٰهُنَا وَعَرَفَةُ كُلُّهَا مَوْقِفٌ وَوَقَفْتُ هٰهُنَا وَجَمْعٌ كُلُّهَا مَوْقِفٌ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۸۹۳/۲ الحدیث رقم (۱۴۹۔ ۱۲۱۸)۔ وابوداؤد السنن ۴۷۸/۲ الحدیث رقم ۱۹۳۶۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اپ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں نے نحر کیا اس جگہ پر اور منی کے مقام پر تمام جگہ نحر کرنے کی ہے پس نحر کرو اپنے ڈیروں پر اور میں نے وقوف کیا ہے اس جگہ پر ویسے تمام جگہ وقوف کرنے کی ہے اور میں نے اس جگہ وقوف کیا ہے اور مزدلفہ تمام جگہ وقوف کرنے کی ہے۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :نحرت هھنا ومنی کلھا منحر فانحروا فی رحالکم:

نحرت هھنا: ابن الملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ منیٰ کی طرف اشارہ ہے (انتہیٰ) یہ بات درست نہیں صحیح یہ ہے کہ منیٰ میں ایک مخصوص جگہ کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اس کے بعد ہے "ومنٰی الخ"" ومنٰی مبتداء ہے۔ کلھا اس کیلئے تاکید ہے اور منحرِ متبداء کیلئے خبر ہے۔

قوله :ووقفت هھنا...... وجمع کلھا موقف: بعض کا کہنا ہے کہ جمع مزدلفہ کا نام ہے کیونکہ اس میں لوگ جمع ہوتے ہیں اور بعض نے کہا ہے منیٰ کے قریب ہونے کی وجہ سے یہ ازدلاف سے ہے بمعنی اقتراب کے اور دال تاء سے بدلہ ہوا ہے جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے ﴿واذا الجنة أزلفت﴾[التکویر:۱۳] اور ﴿لیقربونا الی الله زلفیٰ﴾[الزمر:۳] قربیٰ۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں ممکن ہے کہ یہ تمام اشارے الگ الگ جگہوں میں سادر ہوئے ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی جگہ میں صادر ہو اس لیے هھنا کہا هناك ، ثم نہیں کہا (انتہیٰ) اول زیادہ ظاہر ہے اور ثانی کے مطابق وہ بعقہ اور جگہ منیٰ ہے۔ مقصود یہ ہے کہ ذبح کرنا۔ آپ ﷺ کے منحر (قربان گاہ) کے ساتھ خاص نہیں ہے اور وہ مسجد خیف کے قریب ہے جیسا کہ عنقریب آجائے گا۔

ابن حجر فرماتے ہیں کہ میں نے آپ ﷺ کے مشہور قربان گاہ میں نحر کیا اور وہاں دو تعمیرات کیے ہیں ان میں سے ایک ہر ایک کا نام مسجد النحر ہے ایک راستے پر ہے اور ایک راستے سے ہٹ کر ہے اور کہا گیا ہے کہ وہی زیادہ قریب ہے ان اوصاف کے جو آپ ﷺ کے منحر کے ذکر کیے ہیں۔

عرفہ کے دن کی فضیلت

۲۵۹۴: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ مَا مِنْ يَوْمٍ اَكْثَرَ مِنْ اَنْ يُّعْتِقَ اللّٰهُ فِيْهِ عَبْدًا مِنَ النَّارِ مِنْ يَّوْمِ عَرَفَةَ وَاِنَّهٗ لَيَدْنُوْ ثُمَّ يُبَاهِیْ بِهِمُ الْمَلَائِكَةَ فَيَقُوْلُ مَا اَرَادَ هٰؤُلَآءِ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۹۸۲/۲ الحدیث رقم (۴۳۶۔ ۱۳۴۸)۔ والنسائی فی ۲۵۱/۵ الحدیث رقم ۳۰۰۳۔ وابن ماجه ۱۰۰۳/۲ الحدیث رقم ۳۰۱۴۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ عرفہ کے دن سے زیادہ کوئی دن نہیں جس میں اللہ تعالیٰ بندوں کو

آ گ سے آزاد کرتا ہے یعنی اس عرفہ کے دن عرفات میں سب دنوں سے زیادہ اللہ تعالیٰ آزاد کرتا ہے بندوں کو آگ سے اور تحقیق اللہ تعالیٰ رحمت ومغفرت کے ساتھ نزدیک ہوتا ہے پھر حاجیوں پر فخر کرتا ہے فرشتوں کے سامنے۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ لوگ کیا چاہتے ہیں یعنی جو کچھ چاہتے ہیں وہی دونگا۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :مامن يوم اكثر ......من يوم عرفة:

''اکثر''نصب کے ساتھ ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ رفع کے ساتھ ہے۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ ''ما'' بمعنی ''لیس'' کے ہے اور اس کا اسم ''یوم'' ہے اور من زائد ہے اور تقدیری عبارت یوں ہے: ما من يوم اكثر اعتاقًا فيه الله عبدا من النار من يوم عرفة۔

''يباهي بهم الملائكة''،بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ فرشتوں پر حجاج کی فضیلت اور شرف ظاہر ہیں یا ان کو ایسے چیز کے بمنزلہ کردیتے ہیں جس پر فخر کیا جاتا ہو۔

''ما اراد هولاء''،یعنی یہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ کہ اپنے گھربار کو چھوڑ رہے اور مال خرچ کیا ہے بدن تھکا چکے ہیں یعنی یہ نہیں چاہتے مگر مغفرت' رضا' قرب اللہ کی ملاقات اور جو اس دروازے پر آتا ہے اس کو رد کرنے کا ڈر نہیں ہوتا۔ یا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ یہ چاہتے ہیں وہ ان کو حاصل ہے اور ان کے درجات ان کے مراد اور نیت کے بقدر ہیں یا مطلب ہے کہ کسی آسان اور تھوڑی چیز کا ارادہ کیا ہے کیونکہ بخشش اور مغفرت رب الارباب کے نزدیک کوئی بڑی اور مشکل چیز نہیں ہے۔

الفصل الثانی:

موقفِ عرفات کا ذکر

٢٥٩٥ :وَعَنْ عَمْرِوبْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ صَفْوَانَ عَنْ خَالٍ لَهُ يَزِيْدُ ابْنُ شَيْبَانَ قَالَ كُنَّا فِيْ مَوْقِفٍ لَنَا بِعَرَفَةَ يُبَاعِدُهُ عَمْرٌ وَمِنْ مَوْقِفِ الْإِمَامِ جِدًّا فَاَتَانَا ابْنُ مَرْبَعِ الْاَنْصَارِيِّ فَقَالَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَيْكُمْ يَقُوْلُ لَكُمْ قِفُوْا عَلٰى مَشَاعِرِكُمْ فَاِنَّكُمْ عَلٰى اِرْثٍ مِنْ اِرْثِ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ۔

(رواه الترمذى وابو داود والنسائى وابن ماجة)

اخرجه ابوداؤد فى سننه ٤٦٩/٢ الحديث رقم ١٩١٩ ـ والترمذى فى ٢٣٠/٣ الحديث رقم ٨٨٣ [والنسائى فى ٢٥٥/٥ الحديث رقم ٣٠١٤]ـ وابن ماجه فى ١٠٠١/٢ الحديث رقم ٣٠١١ـ واحمد فى المسند ١٣٧/٤ـ

ترجمہ: حضرت عمرو بن عبداللہ بن صفوان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے ماموں سے نقل کیا ہے اس کو یزید بن شیبان کے نام سے یاد کیا جاتا تھا کہتے ہیں کہ ہم میدانِ عرفات میں اپنے ٹھہرنے کی جگہ پر تھے۔ عمرو اس ٹھہرنے کی جگہ کو امام سے بہت دور بیان کرتا تھا۔ ہمارے پاس مربع انصاری کے بیٹے آئے پھر کہا کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تمہاری طرف ایلچی ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں اپنی عبادت کی جگہ پر ٹھہرو۔ پس تحقیق تم اوپر میراث کے ہو۔ یعنی متابعت کے لحاظ سے اپنے باپ کی میراث یعنی ابراہیم علیہ السلام کی میراث پر ہوں۔ اس کو امام ترمذیؒ، ابوداؤدؒ، نسائی اور ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

عمرو بن عبداللہ۔ نام ''عمرو بن صفوان'' کے بیٹے اور جمحی ہیں۔قریش میں سے ہیں۔تابعین میں سے ہیں۔یزید بن شیبان سے روایت کی اور ان سے عمرو بن رضی اللہ عنہم دینار وغیرہ نے روایت کی ہے۔

زید بن شیبان ۔ یہ یزید صحابی ہیں۔شیبان کے بیٹے ازدی نے ان سے روایت بھی نقل کی ہے۔ان کا ذکر ''وحدان'' میں کیا جاتا ہے انہوں نے ابن مربع رضی اللہ عنہ سے روایت کی۔(مربع میں میم مکسور ہے) اور ان سے عمرو بن عبداللہ بن صفوان رضی اللہ عنہ نے روایت کی۔ ان کی حدیث حج کے بارے میں ہے۔

تشریح: **قولہ :کنا فی موقف لنا بعرفۃ یباعدہ عمرو من موقف الامام جدا:**

''**موقف لنا**'' یعنی ہمارے اسلاف کا موقف تھا جہاں زمانہ جاہلیت میں وہ وقوف کرتے تھے۔

''**یباعدہ عمرو**'' بعض کا کہنا ہے کہ یہ عمرو، راوی ہے۔یزید سے اور یہ قول عمرو سے روایت کرنے والے راوی کا ہے اور وہ عمرو بن دینار ہے یعنی عمرو نے کہا ہے کہ اس موقف اور امام الحاج کے موقف کے درمیان بہت فاصلہ ہے۔

''**جدا**'' یہ یباعدہ سے متصل ہے اور اس کے متعلق سے مؤخر ہے اور منصوب ہے یا مصدریت کے بناء پر اصل میں **یبعدہ، تبعیدا جدًا** ہے یا حال ہونے کی بناء پر۔

قولہ :فاتانا ابن مربع الانصاری: ''**ابن ربع**'' میم کے کسرہ اور راء کے سکون اور باء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ان کا نام بعض نے عبداللہ، اور اول زیادہ ہے۔

''**الانصاری**'' مضاف کی صفت ہے ''**من ارث**'' من بیانیہ ہے یا تبعیض کیلئے ہے۔

قولہ :فانکم علی ارث من ارث ابیکم ابراھیم: ''**ابراھیم**'' بدل ہے یا بیان ہے۔

اس حدیث میں اشارہ ہے اللہ کے اس ارشاد کی طرف:

﴿**ھو اجتباکم وما جعل علیکم فی الدین من حرج ملۃ ابیکم ابراھیم**﴾[الحج:۷۸]

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث سے مقصود ان کے اس وہم کو ختم کرنا تھا کہ موقف وہی ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا ہے، اور ان کی دل جوئی مقصود تھی کہ وہ اپنے باپ کی سیرت اور سنت پر ہیں۔

www.KitaboSunnat.com

موقفوں کا بیان

۲۵۹۶: **وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ کُلُّ عَرَفَۃَ مَوْقِفٌ وَکُلُّ مِنًی مَنْحَرٌ وَکُلُّ الْمُزْدَلِفَۃِ مَوْقِفٌ وَکُلُّ فِجَاجِ مَکَّۃَ طَرِیْقٌ وَمَنْحَرٌ** ۔ (رواہ ابوداود والدارمی)

اخرجہ ابوداؤد فی سننہ ۴۷۸/۲ الحدیث رقم ۱۹۳۷۔ وابن ماجہ ۱۰۱۳/۲ الحدیث رقم ۳۰۴۸۔ والدارمی ۷۹/۲ الحدیث رقم ۱۸۷۹۔ واحمد فی المسند ۳۲۶/۳۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا عرفہ کا میدان ٹھہرنے کی جگہ ہے اور جو جگہ منیٰ میں ہے ذبح کرنے کی ہے اور جو جگہ مزدلفہ میں ہے ٹھہرنے کی جگہ ہے اور تمام راہیں مکہ کی راہیں ہیں اور ذبح کرنے کی جگہیں ہیں اس کو ابوداؤدؒ اور دارمیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :وكل فجاج مكة طريق ومنحر :

''فجاج''فاء کے کسرہ کے ساتھ فج کی جمع ہے کشادہ راستے کو کہتے ہیں۔

اس ارشادگرامی کا حاصل یہ ہے کہ مکہ میں اس کے تمام راستوں سے داخل ہونا جائز ہے اگر چہ ثنية الكراء سے داخل ہونا افضل ہے اوراس کے تمام نواحی میں ذبح جائز ہے کیونکہ یہ حرم میں سے ہے مقصود حرج ہے اس کو ذکر کیا ہے علامہ طیبیؒ نے۔اور تمام ھدایا کا ذبح حرم کی سرزمین پر ذبح کرنا بالاتفاق جائز ہے مگر منیٰ حرم حج کی قربانی کیلئے افضل ہے اور مکہ خاص کر کے مروہ عمرہ کی قربانی کیلئے افضل ہے۔

سواری پر کھڑے ہو کر خطبہ دینا جائز ہے

۲۵۹۷:وَعَنْ خَالِدِ بْنِ هَوْذَةَ قَالَ رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَخْطُبُ النَّاسَ يَوْمَ عَرَفَةَ عَلٰى بَعِيْرٍ قَائِمًا فِي الرِّكَابَيْنِ۔ (رواہ ابوداود)

اخرجه ابو داؤد فی ٤٦٩/٢ الحديث رقم ١٩١٧ ـ واحمد فی المسند ٣٠/٥۔

ترجمہ: حضرت خالد بن ہوذہؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ عرفہ کے دن لوگوں کو خطبہ دے رہے تھے یعنی میدان عرفات میں اونٹ پر دونوں رکابوں پر کھڑے ہو کر اس کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

خالد بن هوذة ۔یہ ہوذہ عامری کے بیٹے ہیں۔''ھوذہ'' ھا کے فتحہ' واؤ کے سکون اور ذال کے معجمہ کے ساتھ ہے۔یہ خود اور ان کے بھائی ''حرملہ'' نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے یہ خزاء کے پاس لوٹے اور اپنے اسلام کی بشارت ان کو دی۔یہ مؤلفة القلوب میں سے تھے۔یہ ''خالد بن ہوذہ'' وہی ہیں جن سے آنحضور ﷺ نے غلام اور باندی خریدی تھی اور ان کے لئے عہد نامہ لکھ دیا تھا۔

تشریح: قوله :خالد بن هوذة: ''هوذة'' ھاء کے فتحہ اور واو کے سکون کے ساتھ ہے۔

قوله :يخطب الناس يوم عرفة ......الخ:

''يوم عرفة'' اس میں دونوں احتمال ہے کہ زوال سے پہلے ہو یا بعد میں ہو اور ثانی زیادہ ظاہر ہے۔اور قائماً ، واقفاً کے معنی میں ہے یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ ﷺ سواری پر کھڑے تھے بلکہ مطلب ہے کہ آپ ﷺ ٹھہرے ہوئے تھے اس حال میں کہ آپ ﷺ کے پاؤں رکابوں میں تھے۔

''قائمًا فی الركابين'' دونوں حال مترادفہ ہیں یا حال متداخلہ ہیں۔

مسلم کی روایت میں ہے:''انه عليه السلام أمر بالقصواء بعد الزوال، فرحلت له، فاتى بطن الوادى فخطب الناس''۔

بہترین دعا عرفہ کے دن کی دعا ہے

۲۵۹۸:وَعَنْ عَمْرِوبْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ خَيْرُ الدُّعَاءِ دُعَاءُ يَوْمِ عَرَفَةَ وَخَيْرُ مَا قُلْتُ اَنَا وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ قَبْلِيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ (رواہ الترمذی)

اخرجه الترمذی فی سننه ٥٣٤/٥ الحديث رقم ٣٥٨٥۔

ترجمہ: عمرو شعیب سے روایت ہے انہوں نے اپنے باپ یعنی شعیب سے نقل کیا ہے اس نے اپنے دادا سے یعنی عبد اللہ بن عمروؓ کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا دعاؤں سے بہترین دعا عرفہ کی ہے یعنی میدان عرفات میں یا ہر جگہ اور بہترین چیز جو میں نے اور دوسرے انبیاء جو مجھ سے پہلے گزرے ہیں' نے کی۔ کوئی معبود نہیں مگر اکیلا اللہ کوئی اس کا شریک نہیں ہے اسی کے لیے بادشاہت ہے اور اسی کے لیے تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله :خير الدعاء دعاء يوم عرفة**: علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس میں اضافت یا بمعنی لام کے ہے یعنی ایسی دعاء جو عرفہ کے ساتھ مختص ہو اور **وخير ما قلت أنا الخ** بیان ہے اس دعاء کیلئے اگر آپ کہیں کہ یہ تو ثناء ہے نہ کہ دعاء تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس ثناء میں تعریض بالطلب بھی ہے اور اضافت بمعنی **فی** کے ہے تاکہ عام ہو جائے تمام دعاؤں کو جو اس میں واقع ہے (انتہی)۔

اس اشکال کا جواب یہ بھی دیا گیا ہے کہ جب ذکر، دعاء کے ساتھ حصول ثواب اور مطلوب کے حصول تک پہنچنے میں شریک ہے تو اس کو من جملہ دعاؤں میں سے شمار کرنا درست ہوا۔ پس یہ کنایات کے قبیل سے ہوگا جو قضاء حاجات میں زیادہ بلیغ ہوا کرتے ہیں کیونکہ تلویح تصریح سے اولیٰ ہوتا ہے جیسا کہ امیہ بن صلت نے ابن جذعان کے بارے میں کہا ہے:

أأذكرحا جتي ام قد كفاني حياء ك إن شيمتك الحياء

اذا اثنى عليك المرء يومًا كفاه من تعرضه الثناء

''کیا میں اپنی حاجت ذکر کروں، یا کافی ہے میرے لیے تیری حیاء، بیشک حیاء تیری عادت ہے،

جب آدمی تیری تعریف کردے ایک دن، پس اُس کیلئے اِس جملے سے وہ تعریف کافی ہو جاتی ہے۔''

اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اشارہ ہو اس بات کی طرف کہ بندہ کو چاہیے کہ وہ مولیٰ کی یاد میں مشغول ہو جائے۔ اور اعراض کر لے مطالبات سے دنیا اور آخرت میں اس کے کرم و احسان اور انعام پر اعتماد کی وجہ سے۔ پس حدیث میں منقول ہے **من شغله ذكري عن مسألتي اعطيته افضل ما اعطى السائلين**۔ جسکو میرا ذکر مانگنے سے مشغول کردے تو میں اس کو مانگنے والوں سے بہتر عطاء کر دیتا ہوں۔

اور اس مقام میں کمال تفویض اور تسلیم **بالقضاء على وجه الرضاء** ہے، جیسا کہ کہا گیا ہے:

وكلت الى المحبوب امري كله فان شاء احياني وان شاء اتلفا

کہ میں نے اپنے تمام معاملات محبوب کے حوالے کیے ہیں پس اگر وہ چاہے تو مجھے زندہ رکھے یا چاہے تو مجھے ہلاک کر دے۔

حدیث میں منقول ہے: **اللهم إن امسكت نفسي فاغفرلها، وان ارسلتها فاحفظها بما تحفظ به عبادك الصالحين، واللهم احيني ما كانت الحياة خيرا الي، وتوفني اذا كانت الوفاة خيرا الي**۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ کہا جائے کہ ذکر سے دعاء لازم آتی ہے کیونکہ دعاء کیلئے ضروری ہے کہ وہ اغراض میں سے کسی غرض کیلئے ہو اور بہتر یہ ہے کہ وہ غرض اللہ کی رضا اور بقاء کا قصد ہو۔ اور یہ بھی بعید نہیں ہے کہ کہا جائے: **خير ما قلت من الذكر** پس یہ عطف مغایر ہو جائے گا اور تقدیر عبارت یوں ہوگی: **افضل الدعاء يوم عرفة، بأى شئ كان، وخير ما قلت من الذكر فيه وفي غيره، أنا والنبيون من قبلي لا إله إلا الله الخ**۔

قوله :لا شريك له: یعنی الوہیت اور ربوبیت یا ذات وصفات میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں۔ یا یہ تاکید ثانی ہے کیونکہ توحید

ذاتی ہی مقصود اعظم ہے۔

''له الملك ''یعنی جنس ملک اس کیلئے خاص ہے جس کو چاہیے دے دیتا ہے اور جس سے چاہیے چھین لیتا ہے۔ اور دنیا اور آخرت کے ملک وحکومت کو شامل ہے اور علم وحکمت کی حکومت اور ملک کو شامل ہے اور عمل، زہد اور قناعت کے ملک کو شامل ہے۔

''وله الحمد ''یعنی اس کیلئے حمد وتعریف ہے دنیا اور آخرت میں یا حمد اس کیلئے ثابت ہے چاہے اس کی حمد کی جائے نہ کی جائے یا حامدیت اور محمودیت اس کیلئے ہے پس وہ حامد بھی ہے اور محمود بھی ہے۔

۲۵۹۹: وَرَوٰی مَالِكٌ عَنْ طَلْحَةِ ابْنِ عُبَيْدُ اللّٰهِ الى قوله لَا شَرِيْكَ لَهٗ۔

اخرجه مالك فی الموطأ ۱/ ۴۲۲ الحدیث رقم ۲۴۶ من کتاب الحج۔

ترجمہ: اس روایت کو ترمذیؒ نے نقل کیا ہے' نیز مالکؒ نے اس روایت کو طلحہ بن عبیداللہ سے الفاظ لَا شَرِيْكَ لَهٗ تک نقل کیا ہے''۔

اختلافِ نسخ:

''روی عن مالك ''اصل عفیف میں ورواہ ضمیر کے ساتھ ہے اور وہ زیادہ ظاہر ہے۔ اور مشکوۃ روی مالک ہے۔

اسنادی حیثیت: ترمذی نے کہا ہے کہ **هذا حديث حسن صحيح** اور طبرانی نے اس حدیث کو ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے ''**افضل ما قلت أنا والنبيون قبلي عشية عرفة لا إله الا الله الخ**'' اور اس کا سند حسن اور جید ہے جیسا کہ اذرعی نے کہا ہے۔

عرفہ کے دن شیطان کی رسوائی

۲۶۰۰: وَعَنْ طَلْحَةَ بْنِ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ كَرِيْزٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَارُئِيَ الشَّيْطَانُ يَوْمًا هُوَ فِيْهِ اَصْغَرُ وَلَا اَدْحَرُ وَلَا اَحْقَرُ وَلَا اَغْيَظُ مِنْهُ فِيْ يَوْمِ عَرَفَةَ وَمَا ذَاكَ اِلَّا لِمَا يَرٰى مِنْ تَنَزُّلِ الرَّحْمَةِ وَتَجَاوُزِ اللّٰهِ عَنِ الذُّنُوْبِ الْعِظَامِ اِلَّا مَا رَاٰى يَوْمَ بَدْرٍ فَقِيْلَ مَارُئِيَ يَوْمَ بَدْرٍ؟ قَالَ فَاِنَّهٗ قَدْ رَاٰى جِبْرِيْلَ يَزَعُ الْمَلَائِكَةَ. (رواه مالك مرسلا وفی شرح السنة بلفظ المصابيح)

اخرجه مالك فی ۱/ ۴۲۲ الحدیث رقم ۲۴۵ من کتاب الحج والبغوی فی شرح السنة ۷/ ۱۵۸ الحدیث رقم ۱۹۳۰۔

ترجمہ: حضرت طلحہ بن عبیداللہ بن کریز رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ شیطان کو عرفہ کے دن کے برابر کسی اور دن نہیں دیکھا گیا کہ جس میں وہ بہت ذلیل اور راندہ ہوا اور بہت حقیر ہوا اور اپنے سے بہت غصے ہوا یعنی شیطان کو ہمیشہ نیکیاں دیکھ کر غصہ آتا ہے اور خوار ہوتا ہے اور عرفہ کے دن خاص طور پر سب دنوں سے زیادہ خوار وغضبناک ہوتا ہے اس وجہ سے کہ وہ ہر خاص وعام پر رحمت کو اترتا ہوا دیکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا بڑے گناہوں کو معاف کر دینا اور بدر کے دن اس کو دیکھا گیا ہے کہ اس کی خواری عرفہ کے دن کی طرح تھی کیونکہ اسی دن مسلمانوں نے کافروں کو شکست دی اور ان کو عزت ملی اور شوکت اسلام حاصل ہوئی پس تحقیق شیطان نے دیکھا کہ جبرئیل علیہ السلام فرشتوں کی صفوں کو ترتیب دے رہے ہیں یعنی مشرکین سے لڑائی کرنے کے لیے صفوں کو ترتیب دے رہے ہیں۔ اس کو امام مالکؒ نے بطریق ارسال نقل کیا ہے اور شرح السنۃ میں یہ حدیث لفظ مصابیح کے ساتھ روایت کی ہے۔

راویٔ حدیث:

طلحہ بن عبداللہ۔ یہ طلحہ بن عبداللہ بن کریز خزاعی ہیں۔ تابعی ہیں۔ اہل مدینہ میں سے ہیں۔ یہ ایک جماعت صحابہ سے روایت کرتے ہیں۔ ان سے بھی تابعین کی ایک جماعت روایت کرتی ہے۔ ''عبید'' صیغۂ تصغیر کے ساتھ ہے۔ ''کریز،، کاف کے فتحہ' راء کے کسرۂ یاء کے سکون اور زاء کے ساتھ ہے۔ یہی ضبط اصح ہے۔ اس موقع پر شراح نے بہت طویل کلام کیا ہے۔

تشریح: ''في يوم عرفة'' مصابیح میں یوم عرفۃ ہے شارع مصابیح کہتے ہیں کہ یہ منصوب ہے اصغر یا اغیظ کیلئے ظرف ہونے کی بناء پر۔

''اصغر'' یعنی اذل اور احقر ہوگا یہ ماخوذ ہے الصغار جو الھوان اور الذل کے معنی میں آتا ہے۔

''ادحر'' اسم تفضیل ہے الدحر سے اور یہ طود اور ابعاد کو کہتے ہیں۔ اسی سے ہے ﴿من كل جانب دحورا﴾[الصفت:٩]اور ﴿أخرج منها مذؤما مدحورا﴾[الاعراف:١٨] طیبیؒ فرماتے ہیں الدحر الدفع طعنف واهانة''۔

''یزع'' اصل میں یوزع تھا۔ یعنی یکفھم فیحبس اولھم علٰی أفرھم، اس سے الوازع ہے اس شخص کو کہتے ہیں جو صف سے آگے بڑھ کر اس کو درست کرے اور لشکر میں تقدیم و تاخیر کرے۔ اور اسی سے اللہ کا یہ قول ہے: ﴿فهم يوزعون﴾[النحل:١٧] یعنی ان کو مرتب اور برابر کرتا ہے اور انتشار سے ان کو روک رہا ہے اور لڑائی کیلئے درست کر رہا ہے۔

تخریج: اور دیلمی نے اس حدیث کو سند متصل کے ساتھ روایت کیا ہے اور بیہقی نے مرسل اور متصل دونوں طرح روایت کیا ہے۔

''شعثاً'' اشعث کی جمع ہے بکھرے بالوں والے کو کہتے ہیں۔

''غبرًا'' اغبر کی جمع ہے جس کے اعضاء غبار آلود ہوں اس کو کہتے ہیں۔

''ضاجین'' جیم کی تشدید کے ساتھ ہے ضج سے ہے بمعنی آواز بلند کرنا اور ایک نسخہ میں جاء کی تخفیف کے ساتھ ہے۔ مشارق میں اس کا معنی اصابھم حد الشمس لکھا ہے اور قاموس میں ہے ضحي، برز للشمس، وكسعي ورضٰی اصابته الشمس۔

''یدھق'' ھاء کے شد اور فتحہ کے ساتھ ہے اور تخفیف کے ساتھ بھی پڑھتے ہیں۔ متھم بالسوء کے معنی میں آتا ہے۔

''عبادی'' اضافت تشریفی ہے۔

''شعثا، غبرًا'' دونوں حال ہیں۔

''من كل فج'' أتونی کے متعلق ہے۔

''فما من يوم'' علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں یہ شرط محذوف کیلئے شرط ہے۔

''اکثر'' نصب کے ساتھ ما کا خبر ہے جو بمعنی لیس کے ہے اور بعض نے کہا ہے کہ رفع کے ساتھ ہے لغت تمیمیہ کے مطابق۔

''عتیقاً'' تمیز ہے۔ ''من النار'' کے متعلق ہے۔ ''من يوم عرفة'' اکثر کے متعلق ہے۔

''الی السماء الدنیا'' شاید اس کی تخصیص اس لیے کی ہے کہ اس آسمان والے اہل دنیا پر زیادہ مطلع ہوتے ہیں۔

عرفہ کے دن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر یعنی حاجیوں پر فخر کرتا ہے

٢٦٠١: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا كَانَ يَوْمُ عَرَفَةَ اِنَّ اللّٰهَ يَنْزِلُ اِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا فَيُبَاهِيْ بِهِمُ الْمَلَائِكَةَ فَيَقُوْلُ انْظُرُوْا اِلَى عِبَادِيْ اَتَوْنِيْ شُعْثًا غُبْرًا ضَاجِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ اُشْهِدُكُمْ اِنِّيْ قَدْ

غَفَرْتُ لَهُمْ فَيَقُولُ الْمَلَائِكَةُ يَا رَبِّ فُلَانٌ كَانَ يُرْهَقُ وَفُلَانٌ وَفُلَانَةٌ قَالَ يَقُولُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ قَدْ غَفَرْتُ لَهُمْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَمَا مِنْ يَوْمٍ اَكْثَرَ عَتِيْقًا مِنَ النَّارِ مِنْ يَوْمِ عَرَفَةَ۔

اخرجه البغوی فی شرح السنة ۱۵۹/۷ الحدیث رقم ۱۹۳۱۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس وقت عرفہ کا دن ہوتا ہے تحقیق اللہ تعالیٰ آسمان دنیا کی طرف (اپنی رحمت واحسان وکرم کے ساتھ) نزول فرماتا ہے پھر حاجیوں کے ساتھ فرشتوں کے سامنے فخر کرتا ہے اور فرماتا ہے میرے بندوں کی طرف دیکھو کہ میرے پاس پراگندہ بال اور گرد آلود ہونے کی حالت میں دور سے آئے ہیں یعنی لبیک وذکر کے ساتھ کہ میں تم کو گواہ بناتا ہوں کہ تحقیق میں نے ان کو بخش دیا ہے' ان کو فرشتے کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار رفلاں شخص گناہ کرتا ہے اور رفلاں شخص اور رفلاں عورت گناہ کرتی ہے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ عزوجل ارشاد فرماتے ہیں کہ تحقیق میں نے ان کو بھی بخش دیا ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کوئی دن ایسا نہیں ہے کہ جس میں اللہ نے لوگوں کو آگ سے آزاد کیا ہو سوائے عرفہ کے دن کے۔ اس کو شرح السنۃ میں نقل کیا گیا ہے۔

تشریح: ''الملائکة'' یعنی ملائکہ سے مراد آسمان دنیا کی ملائکہ ہے یا مقرب فرشتے ہیں یا تمام ملائکہ مراد ہے۔

''وفلان وفلانة'' یعنی وہ بھی اسی طرح معاصی میں لگے ہوئے تھے اور یہ بات وہ اس لیے کہیں گے کہ ان کو تعجب ہوگا اس کے بڑے ہونے اور اس جیسے مجرم کا شمار معفورین میں بعید ہونے کی وجہ سے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ملائکہ کا قول یا تو مرہق کے حال جاننے کیلئے ہے اور یا بطور تعجب ہے۔ اور ملائکہ کے اس قول میں ادب کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ عیوب اور فجور کی تصریح نہیں کی ہے۔

''قد غفرت لهم'' یعنی سب کی مغفرت فرمائی ہے اور یہ لوگ بھی ان میں سے ہیں اور وہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے ساتھ بیٹھنے والا نامراد نہیں ہوتا۔ **فان الحج یهدم ما کان قبله** اور اس میں تحقیق ہے جو ہم اس کے موقع پر ذکر کر چکے ہیں۔

تخریج: اس حدیث کو ابن ابی الدنیا نے فضل عشر ذی الحجہ میں اور بزاد، ابن خزیمہ اور ابن منیع نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اپنے صحیح اور حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے۔ اور حاکم کی ایک روایت میں اس حدیث میں یہ الفاظ ہیں:

اما الوقوف عشیة عرفة فان الله یهبط الی السمآء الدنیا، فیباهی بهم الملائکة فیقول، هولآء عبادی، جاؤونی شعثا یرجون رحمتی، فلو کانت ذنوبکم کعدد الرمل، وکعدد القطر، او الشجر لغفرتها لکم، أفیضوا عبادی مغفورا لکم، ولن شفعتم له۔

الفصل الثالث:

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو وقوف عرفہ کا حکم

۲۶۰۲: عَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ كَانَ قُرَيْشٌ وَمَنْ دَانَ دِيْنَهَا يَقِفُوْنَ بِالْمُزْدَلِفَةِ وَكَانَ يُسَمُّوْنَ الْحُمْسَ فَكَانَ سَائِرُ الْعَرَبِ يَقِفُوْنَ بِعَرَفَةَ فَلَمَّا جَاءَ الْإِسْلَامُ اَمَرَ اللّٰهُ تَعَالٰى نَبِيَّهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَّأْتِيَ عَرَفَاتٍ فَيَقِفُ بِهَا ثُمَّ يُفِيْضُ مِنْهَا فَذٰلِكَ قَوْلُهٗ عَزَّوَجَلَّ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۸٦/۸۔ الحدیث رقم ٤٥٢٠۔ ومسلم فی ۸۹۳/۲ الحدیث رقم (۱۵۱۔ ۱۲۱۹)۔ وابوداؤد فی ٤٦٦/۲ الحدیث رقم ۱۹۱۰۔ والترمذی فی ۲۳۱/۳ الحدیث رقم ۸۸٤۔ والنسائی ۲٥٤/٥ الحدیث رقم ۳۰۱۲۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرمایا کہ قریش اور ان کے تابعین مزدلفہ میں کھڑے ہوتے تھے اور قریش حمس نام رکھے جاتے تھے یعنی شجاع اور تمام عرب میدان عرفہ میں ٹھہرا کرتے تھے پس جب اسلام آیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا یہ کہ عرفات میں آئیں اور اس میں ٹھہریں اور پھر وہاں سے لوٹیں پس اللہ تعالیٰ کے اس قول کے یہی معنی ہیں۔ پھر واس جگہ سے جہاں سے لوگ پھرتے ہیں۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ''**الحمس**'' احمس کی جمع بمعنی شجاعت کے۔ ''**يفيض منها**'' علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **الافاضة الذحف والدفع في السير، واصلها الصب ثم استعير للدفع في السير،** اور اس کا اصل **افاض نفسه** او **راحلته** ہے، پھر اس کے مفعول کو بالکل ترک کر دیا گیا اور یہ لازم کی طرح ہو گیا۔

''**يسمون الحمس**'' اس میں اشارہ ہے کہ یہ لوگ اپنے قوت و بہادری پر فخر کرتے تھے اور اپنے آپ کو اپنے جماعت اور اپنے نسب سے الگ اور ممتاز کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ہم اہل حرم ہیں ہم اس سے دیگر عوام کی طرح نہیں نکلیں گے۔

قوله :﴿من حيث افاض الناس﴾[البقرة:۱۹۹]''

یعنی جہاں سے عام لوگ لوٹتے ہیں اور وہ جگہ عرفہ ہے اور اس میں اشارہ ہے کہ متکبرین، انسانوں سے خارج ہے **فمن تواضع لله رفعه الله، ومن تكبر على الله وضعه۔**

بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، آیت میں خطاب قریش کے ساتھ ہے اور ان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو لوگوں کے ساتھ برابر کریں بعد اس کے کہ وہ اپنے آپ کو عام لوگوں سے بڑے سمجھتے تھے۔ اور ثم دونوں افاضوں کے درمیان تفاوت ظاہر کرنے کیلئے ہے کہ ایک صحیح اور دوسرا خطاء ہے (انتہیٰ) اور حدیث سے ظاہر یہ ہے کہ خطاب آپ علیہ الصلاۃ السلام کے ساتھ ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کیلئے کی وجہ سے یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی عظمت کیلئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء امت کے حق میں قبول ہونے پر شیطان کا واویلہ کرنا

۲۶۰۳: وَعَنْ عَبَّاسِ بْنِ مِرْدَاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم دَعَا لِاُمَّتِهٖ عَشِيَّةَ عَرَفَةَ بِالْمَغْفِرَةِ فَاُجِيْبَ اَنِّىْ قَدْ غَفَرْتُ لَهُمْ مَا خَلَا الْمَظَالِمَ فَاِنِّىْ اٰخِذٌ لِلْمَظْلُوْمِ مِنْهُ قَالَ اَىْ رَبِّ اِنْ شِئْتَ اَعْطَيْتَ الْمَظْلُوْمَ مِنَ الْجَنَّةِ وَغَفَرْتَ لِلظَّالِمِ فَلَمْ يُجِبْ عَشِيَّتَهٗ فَلَمَّا اَصْبَحَ بِالْمُزْدَلِفَةِ اَعَادَ الدُّعَاءَ فَاُجِيْبَ اِلٰى مَا سَاَلَ قَالَ فَضَحِكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اَوْ قَالَ تَبَسَّمَ فَقَالَ لَهٗ اَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ بِاَبِىْ اَنْتَ وَاُمِّىْ اِنَّ هٰذِهٖ لَسَاعَةٌ مَا كُنْتَ تَضْحَكُ فِيْهَا فَمَا الَّذِىْ اَضْحَكَكَ اَضْحَكَ اللّٰهُ سِنَّكَ قَالَ اِنَّ عَدُوَّ اللّٰهِ اِبْلِيْسَ لَمَّا عَلِمَ اَنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ قَدِ اسْتَجَابَ دُعَائِىْ وَغَفَرَ لِاُمَّتِىْ اَخَذَ التُّرَابَ فَجَعَلَ يَحْثُوْهُ عَلٰى رَاْسِهٖ وَيَدْعُوْ بِالْوَيْلِ وَالثُّبُوْرِ فَاَضْحَكَنِىْ مَا رَاَيْتُ مِنْ جَزْعِهٖ۔ (رواه ابن ماجة روى البيهقى فى كتاب البعث والنشور نحوه)

اخرجه ابن ماجه فى ۲/۲ ۱۰۰ الحديث رقم ۳۰۱۳۔ واحمد فى المسند ۱۴/۴۔

ترجمہ: حضرت عباس بن مرادس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کے واسطے عرفہ کی شام کو بخشش کی دعا مانگی۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا قبول کی گئی اور فرمایا کہ تحقیق میں نے سوائے بندوں کے حقوق کے ان کو بخش دیا ہے۔ پس تحقیق میں مظلوم کے واسطے ظالم سے حق لونگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اے میرے رب اگر تو چاہے تو

مظلوم کو جنت کی نعمتوں میں سے نواز اس کے حق کے بدلے جو ظالم نے لیا ہے اور ظالم کو بخش دے پس عرفہ کی شام کو قبول نہ کی گئی پھر جب حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے مزدلفہ میں صبح کی پھر دعا مانگی پس دعا قبول کی گئی اس چیز کی جو مانگی تھی پس راوی نے کہا کہ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ہنسے۔ یا راوی نے کہا کہ مسکرائے پس حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کو حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ نے عرض کیا کہ میرے ماں باپ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ پر قربان ہوں کہ یہ وقت ہنسنے کا وقت نہیں تھا۔ یعنی مقتضائے حال اس ساعت کا نہیں ہے کہ تم ہنسو۔ پس کس چیز نے آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کو ہنسایا؟ اللہ تعالیٰ ہمیشہ آپ کے دانتوں کو ہنسائے یعنی ہمیشہ آپ کو خوش رکھے۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے فرمایا کہ تحقیق خدا نے ارشاد فرمایا کہ تحقیق خدا کے دشمن ابلیس نے جب یہ جان لیا کہ اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول کر لی ہے اور میری اُمت کو بخش دیا ہے پس اپنے سر پر مٹی ڈالنی شروع کی اور ہلاکت اور ویل کے ساتھ پکارنا شروع کر دیا تو کہنے لگا بِالْوَیْلِ وَالثُّبُوْرِ پس مجھے اس کے اضطراب نے ہنسایا۔ اس کو ابن ماجہ نقل کیا اور بیہقیؒ نے کتاب البعث والنشور میں اسی کی مانند نقل کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

عباس بن مرداس۔ یہ عباس بن مرداس ہیں ان کی کنیت ''ابوالہیثم'' ہے سلمی شاعر ہیں۔ ان کا شمار ''مؤلفۃ القلوب'' میں ہے فتح مکہ سے کچھ پہلے اسلام لائے۔ فتح مکہ کے بعد اسلام میں پختگی پیدا ہوگئی۔ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو جاہلیت میں بھی شراب نوشی کو حرام سمجھتے تھے۔ ان سے ان کے بیٹے ''کنانہ'' روایت کرتے ہیں۔ ''کنانہ'' کاف کے کسرہ اور دو ''نون'' کے ساتھ ہے جس کے درمیان میں الف ہے۔

تشریح: ''آخذ'' متکلم یا اسم فاعل کا صیغہ ہے۔

''یجب'' صیغہ مجہول ہے۔

''عشیته'' یعنی **فی عشیة عرفة** اور ضمیر کا مذکر ہونا باعتبار زمان، یا مکان کے ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ضمیر آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی طرف راجع ہو۔ پس اضافت ادنیٰ ملابست کی وجہ سے ہوگی۔

''ثبور'' ثاء کے ضمہ کے ساتھ بمعنی الھلاک کے ہے یعنی وہ کہہ رہا تھا یا **ویلاہ یا ثبورا**۔ علامہ طیبیؒ کہتے ہیں **کل من وقع فی هیکة دعا بالویل والثبور**۔

''**او قال**'': ابن عباس رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا سے نقل کرنے والے راوی کو شک ہے۔

''**دعا لامته**'' ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کے ساتھ حج کرنے والے امتی ہیں نہ کہ مطلق امت۔

''**فاجیب الی ماسأل**'' یعنی جو کچھ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے طلب کیا تھا اسے علی وجہ العموم قبول کیا گیا۔ اور حضرت عباسؓ یہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سے سن رہے تھے تو انہوں نے اس کو روایت کیا گویا کہ ان کو یہ سکھایا گیا ہے۔

''**اضحك الله سنك**'' یعنی اللہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی وہ خوشی دائم رکھے جو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کے **ضحك** کے سبب بنی۔

''**یحثوه علی رأسه**'' اس میں مٹی کے تعلّی، غلبہ اور فضیلت کی طرف اشارہ ہے۔

ظاہر حدیث عموم مغفرت پر دلالت کر رہا ہے جو حقوق اللہ اور حقوق العباد کو شامل ہے۔ مگر اس قابل ہے کہ اس کو مقید کیا جائے ان لوگوں کے ساتھ جو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کے ساتھ تھے اسی سال۔ یا ان لوگوں کے ساتھ جن کا حج قبول ہوا ہو بایں طور کہ انہوں نے کوئی گناہ اور فسق کا کام نہ کیا ہو۔

لیکن میں جملہ فسق میں سے معاصی پر اصرار اور توبہ نہ کرنا بھی ہے اور توبہ کی شرائط میں سے اللہ کے فوت شدہ حقوق کی ادائیگی بھی ہے۔ جیسے نماز، زکوٰۃ وغیرہ اور حقوق العباد کو ادا کرنا بھی ہے مالی ہو، بدنی ہو، عرضی ہو۔

ہاں اگر ان حقوق پر اس کو محمول کیا جائے کہ جن کا بندے کو علم نہ ہو یا وہ اس کی ادائیگی سے عاجز ہو۔ اور یہ بحث کتاب الایمان میں تفصیل سے گزری ہے پس اس کی طرف رجوع کریں اور حدیث کے اجمال سے دھوکہ نہ کھائیں اور ساتھ اللہ کے فضل کے وسیع ہونے کا عقیدہ بھی رکھیں اللہ کا ارشاد ہے﴿ان الله لا يغفر ان يشرك به ويغفر ما دون ذلك لمن يشاء﴾[النساء:۱۱۶]

اور اسی وجہ سے آپ ﷺ نے فرمایا: ای رب! ان شئت فما شاء الله كان ومالم يشأ لم يكن ﴿ولا يسئل عما يفعل وهم يسئلون﴾

اس مسئلہ کے بارے میں، میں نے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے اور خطیب نے المتفق و المفترق میں روایت کیا ہے کہ بعض حضرات نے کہا ہے کہ جب آپ ان تمام احادیث پر غور کر لیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان احادیث میں ایسی حدیث نہیں ہے جو اس شخص کیلئے دلیل بننے کی صلاحیت رکھتی ہو کہتا ہے کہ حج مکفر ہے حقوق العباد کیلئے کیونکہ یہ حدیث ضعیف ہے بلکہ ابن جوزی نے اس کو موضوع قرار دیا ہے اور اس کے ساتھ یہ مدعی پر صریح نص نہیں ہے اس کے محتمل ہونے کی وجہ سے اور اسی وجہ سے بیہقی نے کہا ہے کہ اس میں احتمال ہے کہ یہ مغفرت ان کو کچھ عذاب چکھانے کے بعد ہو اور وہ عذاب اس سے کم ہو جس کا یہ مستحق تھے۔ پس یہ حدیث خاص ہو جائے گی ایک وقت کے ساتھ، یعنی اس صورت میں حج کا فائدہ عذاب میں تخفیف ہو بعض اوقات میں نہ کہ بالکلیہ نجات۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ حدیث عام ہو، اور نص قرآنی دلالت کر رہی ہے کہ یہ اللہ کی مشیت کے حوالے ہے۔

اس آخری مطلب کا حاصل یہ ہے کہ حدیث کو عام فرض کرنے کی صورت میں یہ محمول ہے کہ اللہ کا حقوق العباد کا ذمہ لینا اس آیت کے قبل سے ہے۔﴿ويغفر ما دون ذلك لمن يشاء﴾ اور اس میں کوئی تکفیر گناہوں کی معافی نہیں بلکہ فاعل معاصی تحت المشیت ہے۔ اور تکفیر ذنب اور موقوف علی المشیت میں بہت بڑا فرق ہے۔ اسی وجہ سے بیہقی نے کہا ہے کہ مسلمان کو چاہیے کہ وہ اس بات پر دھوکہ نہ ہو کہ حج حقوق العباد کیلئے مکفر ہے کیونکہ گناہ نحوست ہے اور جبار کی نواہی اور اوامر میں خلاف کرنا بہت بڑی جرأت ہے اور ہم سے کوئی شخص ایک ان بخار، یا ایک گھڑی درد پر صبر نہیں کر سکتا۔ پس وہ سخت عقاب اور دردناک عذاب پر کیسے صبر کر سکتا ہے۔ وہ عذاب جس کی انتہاء اللہ کے سواء کوئی نہیں جانتا۔ اگر چہ احادیث اس کے نہایت کا بیان۔ ہے نہ کہ غایہ کا اگر وہ شخص مومن ہو۔

یہ ابن المنذر کے اس قول کے منافی نہیں ہے جو انہوں نے حدیث من قام ليلة القدر ايمانا و احتسابا غفر له ما تقدم من ذنبه کے تحت فرمایا ہے کہ یہ عام ہے امید ہے کہ اس کے تمام گناہ صغائر و کبائر معاف کر دیئے جائیں کیونکہ کلام اس وعدہ میں ہے جس سے تخلف نہیں ہو سکتا۔

اور اس مسئلہ کے بارے میں شیخ الاسلام عسقلانی رحمہ الباری نے کتاب لکھی ہے جس کا نام "قوت الحجاج فی عموم المغفرة للحاج" رکھا ہے۔ اس میں ابن جوزی کے قول پر رد کیا ہے کہ یہ حدیث موضوع ہے کہ یہ حدیث صحابہ کے ایک جماعت نے روایت کیا ہے، زیادہ سے زیادہ یہ ضعیف ہے اور کثرت طرق اس کو قوی اور مضبوط کر دیتے ہیں۔

ابوداؤد نے اپنی سنن میں اس کے ایک طرق کو روایت کیا ہے اور اس پر سکوت اختیار کیا ہے امام ابوداؤد کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے اور حافظ ضیاء الدین قدسی رحمہ اللہ نے الاحاديث المختارة میں اس کی تخریج کی ہے ان راویوں سے جو دونوں حدیثوں میں نہیں ہیں۔ بیہقی نے کہا ہے له شواهد كثيرة اگر اس کے شواہد صحیح ہیں تو قابل حجت ہے اور اگر صحیح نہیں ہیں تو اللہ کا ارشاد ہے﴿ويغفر ما

دون ذلك لمن يشاء﴾ اور ایک دوسرے پر ظلم کرنا شرک ہے (انتہیٰ)

اور یہ بات مخفی نہیں ہے کہ اس بارے میں جو احادیث صحیحہ صریحہ ہیں وہ ظنی ہیں تو احادیث ضعیفہ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مسائل اعتقادیہ صرف ادلیہ قطعیہ سے ثابت ہوتے ہیں۔ ہاں غالب گمان عموم مغفرت کا ہو سکتا ہے اس شخص کیلئے جس نے حج مقبول کیا اور کہاں ہے وہ شخص جو اپنے بارے میں یا غیر کے بارے میں جزم سے کہے اگر چہ وہ عالم اور صالح ہو بلند مرتبہ والا ہو کیونکہ یہ بات معلوم ہے کہ غیر معصوم کیلئے لازم ہے کہ وہ خوف اور رجاء کے درمیان ہو۔ پس ہم اللہ سے حسن خاتمہ کا سوال کرتے ہیں۔

تخریج: اس حدیث کو کئی سارے حفاظ حدیث نے ضعیف قرار دیا ہے، اور اس کو طبرانی نے کبیر میں ایسی سند کے ساتھ روایت کیا ہے جس میں ایک راوی کا نام معلوم نہیں اور باقی رجال اس کے صحیح ہیں ان الفاظ کے ساتھ کہ آپ ﷺ یوم عرفہ کو فرمایا إن الله عزوجل يطول لكم فى هذا اليوم، فغفرلكم الا التبعات فيما بينكم، ووهب مسيئكم لمحسنكم، واعطى محسنكم ماسأل، فادعوا اور جب مزدلفہ میں تھے تو فرمایا ''إن الله قد غفر لصالحكم وشفع صالحكم فى طالحكم تنزل الرحمة فتعمهم، ثم يفرق الرحمة فيه فتقع على كل غائب ممن حفظ لسانه ويده، وابليس وجنوده على جبال عرفات ينظرون ما يصنع الله بهم، فاذا نزلت المغفرة دعا هو وجنوده بالويل والثبور يقول: كنت استفزهم حينا من الدهر، ثم جاء ت المغفرة فغشيتهم فيتفرقون وهم يدعون بالويل والثبور '' اور ابویعلیٰ نے اس کو ایسے سند کے ساتھ روایت کیا ہے جس میں ضعیف راوی ہے ان الفاظ کے ساتھ: ''ان الله يطول على اهل عرفات يباهي بهم الملائكة يقول: يا ملائكتي! انظروا الى عبادى شعثا غبرا، اقبلوا الى من كل فج عميق، فاشهدكم انى قد أجبت دعاء هم، ووهبت مسيئهم لمحسنهم، واعطيت محسنهم جميع ماسألونى غير التبعات التى بينهم، فاذا افاض القوم الى جمع ووقفوا وعادو فى الرغبة والطلب الى الله فيقول: يا ملائكتي! عبادى وقفوا وعادوا فى الرغبة والطلب، فاشهدكم انى قد اجبت دعاء هم، وشفعت رغبتهم، ووهبت مسيئهم لمحسنهم، واعطيت جميع ماسألونى، وتحملت عنهم التبعات التى بينهم۔

(رواه الخطيب فى المستفق والمتفرق)

بَابُ الدَّفْعِ مِنْ عَرَفَةَ وَالْمُزْدَلِفَةِ

عرفات اور مزدلفہ سے واپسی کا بیان

الفصل الاول:

آپ ﷺ میدانِ عرفات سے کس طرح لوٹے تھے

٢٦٠٤: عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ سُئِلَ اُسَامَةُ بْنُ زَيْدٍ كَيْفَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَسِيْرُ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ حِيْنَ دَفَعَ قَالَ كَانَ يَسِيْرُ الْعَنَقَ فَإِذَا وَجَدَ فَجْوَةً نَصَّ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى ٥١٨/٣، الحديث رقم ١٦٦٦۔ ومسلم فى صحيحه ٩٣٦/٢ الحديث رقم (٢٨٣۔ ١٢٨٦)۔

والنسائی فی سننه ٢٥٨/٥ الحديث رقم ٣٠٢٣۔ والدارمی فی ٨٠/٢ الحديث رقم ١٨٨٠۔ ومالك فی الموطأ ٣٩٢/١ الحديث رقم ١٧٦۔ واحمد فی المسند ٢١٠/٥۔

ترجمہ: حضرت ہشام بن عمرہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے باپ سے نقل کیا ہے یعنی عروہؓ سے عروہؓ نے کہا کہ اسامہ بن زیدؓ سے پوچھا گیا کہ نبی کریم ﷺ حجۃ الوداع میں کس طرح چلتے تھے جس وقت میدان عرفات سے لوٹے۔ فرمایا کہ جلدی چلتے تھے پس جب کشادہ راستہ پاتے تو اپنی سواری دوڑاتے اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

ہشام بن عروۃ۔ یہ ہشام ہیں عروہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں۔کنیت ''ابومنذر'' ہے قریشی اور مدنی۔٦١ھ میں پیدا ہوئے ۔مدینہ کے مشہور تابعین اور بکثرت روایت کرنے والوں میں سے ہیں۔ان کا شمار اکابر علماء جلیل القدر تابعین میں ہوتا ہے۔عبداللہ بن زبیر اور ابن عمر رضی اللہ عنہ سے حدیث کی سماعت کی اور ان سے بہت سے لوگوں نے روایت کی' ان میں ثوری' مالک بن انس اور ابن عیینہ جیسے حضرات بھی شامل ہیں' خلیفہ منصور کے یہاں بغداد آئے۔١٤٦ھ میں بمقام بغداد انتقال فرمایا۔

تشریح: **قوله :سئل اسامة بن زيد:**

اسامہ بن زید سے سوال خصوصی طور پر اس لئے پوچھا کیونکہ وہ عرفہ سے مزدلفہ تک آپ ﷺ کے ردیف تھے۔

قوله :كيف كان رسول الله ﷺ يسير فی حجة الوداع:

قوله :كان يسير العنق ،فاذاوجد فجوة نص:

شاید اس میں نکتہ ایک مستقل عبادت اور اطاعت کی طرف مبادرت اور مسادرت ہو۔

''**العنق**'': منصوب ہے مصدریت کی وجہ سے **قهقرٰی** کے نصب کی طرح ہے یا وصفیت کی بناء پر منصوب ہے: **ای يسير السير** ''عنق'' عین اور نون کے فتحہ کے ساتھ تیز چلنے کو کہتے ہیں۔

''**فجوة**'' فاء کے فتحہ کے ساتھ کشادگی اور گزرنے والوں سے خالی جگہ کو کہتے ہیں۔کیونکہ گزرنے والوں کے درمیان خالی جگہ ہوتی ہے اور **فجوة** دو چیزوں کے درمیان خلا کو کہتے ہیں۔

''**نص**'' صاء کی تشدید کے ساتھ یعنی بہت تیز چلا۔

بعض کا کہنا ہے کہ **نص** اصل میں استقصا اور بلوغ الی الغایۃ کو کہتے ہیں یعنی اپنی سواری کو اتنا تیز ہنکایا کہ اس نے تیز چلنے میں اپنی آخری قوت استعمال کی۔طیبیؒ فرماتے ہیں کہ عنق، چلنے کو کہتے ہیں اور نص، عنق سے تیز چلنے کو کہتے ہیں۔

اونٹوں کو تیز چلانے کے لیے مارنا منع ہے

٢٦٠٥:وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّهٗ دَفَعَ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ يَوْمَ عَرَفَةَ فَسَمِعَ النَّبِيُّ ﷺ وَرَاءَهٗ زَجْرًا شَدِيْدًا وَضَرْبًا لِلْاِبِلِ فَاَشَارَ بِسَوْطِهٖ اِلَيْهِمْ وَقَالَ اَيُّهَا النَّاسُ عَلَيْكُمْ بِالسَّكِيْنَةِ فَاِنَّ الْبِرَّ لَيْسَ بِالْاِيْضَاعِ ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحيحه ٥٢٣/٣۔ الحديث رقم ١٦٧١۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ عرفہ کے دن میدانِ عرفات سے منیٰ کی طرف لوٹے۔پس حضور ﷺ نے اپنے پیچھے زجر شدید یعنی بلند آواز کے ساتھ جانوروں کا ہانکنا بلند آواز کے ساتھ

اور اونٹوں کو مارنا سنا۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کوڑے کے ساتھ لوگوں کی طرف اشارہ کیا یعنی تا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ ہوں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سنیں اور فرمایا اے لوگو! تمہارے لیے آرام سے چلنا لازم ہے اس لیے کہ تحقیق دوڑانا نیکی نہیں ہے۔ اس کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله :دفع مع النبی ﷺ یوم عرفة:** واضح رہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما عرفہ کے دن، عرفات سے منیٰ کی طرف واپسی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے، نہ کہ منیٰ سے عرفہ کی طرف جاتے ہوئے، جیسا کہ ابن حجر کو وہم ہوا ہے۔

یا مطلب ہے خطبہ کی جگہ سے وقوف کی جگہ کی طرف جاتے ہوئے۔ اور یہ اس وجہ سے کہ ازدحام نہیں ہوتا مگر عرفہ سے رجوع کے بعد جیسا کہ مصنّفین کے اس باب کو ذکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے اور گویا وہم یوم عرفہ کے لفظ سے پیدا ہوا ہے۔

قوله :فقال :أیها الناس علیکم بالسکینة ،فان البر لیس بالایضاع:

''أیها الناس'' ایک نسخہ میں یا ایها الناس ہے۔

''الایضاع'' اونٹوں کو تیز چلنے پر ابھارنے کو کہتے ہیں۔

''فان البر لیس بالایضاع'': یعنی نیکی اور ثواب صرف اس پر حاصل نہیں ہوتا بلکہ افعال حج کی ادائیگی محظورات سے اجتناب سے حاصل ہوتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ نیک کاموں کی طرف دوڑنا مطلوب ہے لیکن اس طور پر نہیں کہ وہ مکروہات اور ناپسندیدہ امور کے ارتکاب کی طرف لیجائے۔ پس اس حدیث میں اور حدیث سابق میں کوئی منافات نہیں ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم لبیک کہتے رہے

۲۶۰۶: وَعَنْهُ اَنَّ اُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ كَانَ رِدْفَ النَّبِيِّ ﷺ مِنْ عَرَفَةَ اِلَى الْمُزْدَلِفَةِ ثُمَّ اَرْدَفَ الْفَضْلَ مِنَ الْمُزْدَلِفَةِ اِلَى مِنًى فَكِلَاهُمَا قَالَ لَمْ يَزَلِ النَّبِيُّ ﷺ يُلَبِّي حَتّٰى رَمٰى جَمْرَةَ الْعَقَبَةِ ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۵۳۲/۳۔ الحدیث رقم ۱۶۸۶۔ ۱۶۸۷)۔ ومسلم فی صحیحه ۹۳۱/۲ الحدیث رقم (۲۶۶۔ ۱۲۸۰)۔ والترمذی فی سننه ۲۶۰/۳ الحدیث رقم ۹۱۸۔ والنسائی فی ۲۷۶/۵ الحدیث رقم ۳۰۸۱۔ وابن ماجه ۱۰۱۱/۲ الحدیث رقم ۳۰۴۰۔ والدارمی فی ۸۷/۲ الحدیث رقم ۱۹۰۴۔ واحمد فی المسند ۱۱۴/۱۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے عرفہ سے مزدلفہ تک سوار تھے پھر فضل کو مزدلفہ سے منیٰ تک پیچھے بٹھایا۔ پس دونوں نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ لبیک کہتے رہے یہاں تک کہ جمرۃ العقبہ پر کنکریاں پھینکیں یعنی نحر کے دن جب جمرۃ العقبہ پر کنکریاں پھینکیں تو لبیک کہنا موقوف کیا۔ اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ''ردف'' راء کے کسری اور دال کے سکون کے ساتھ پیچھے سوار ہونے کو کہتے ہیں۔

قوله :فکلاهما قال: قال کی ضمیر کلاهما کے لفظ کی طرف راجع ہے کیونکہ وہ لفظاً مفرد اور معنیً تثنیہ ہے یہ کلاهما قالا سے زیادہ فصیح ہے۔ ارشاد باری ہے ﴿کلتا الجنتین أتت أکلها﴾ [الکهف:۳۳] یا کل واحد منهما مراد ہے۔

مغرب اور عشاء دونوں نمازوں کو مزدلفہ میں جمع کرنا

۲۶۰۷: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ جَمَعَ النَّبِيُّ ﷺ الْمَغْرِبَ وَالْعِشَاءَ بِجَمْعٍ كُلُّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُمَا بِاِقَامَةٍ وَلَمْ

يُسَبِّحْ بَيْنَهُمَا وَلَا عَلٰى اَثَرِ كُلِّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُمَا ۔ (رواه لبخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٥٢٣/٣۔ الحدیث رقم ١٦٧٣۔ وابوداؤد فی سننه ٤٧٤/٢ الحدیث رقم ١٩٢٦۔ واحمد فی المسند ٥٦/٢۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب اور عشاء کی نماز مزدلفہ میں پڑھی یعنی عشاء کے وقت میں دونوں اکٹھی پڑھیں ان میں سے ہر ایک کے لیے تکبیر کہی یعنی مغرب کے لیے علیحدہ تکبیر کہی اور عشاء کے لیے الگ تکبیر کہی اور ان دونوں کے درمیان نفل نہ پڑھے اور نہ ہی ان دونوں میں سے ہر ایک کے بعد۔ اس کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :جمع النبی صلی اللہ علیہ وسلم المغرب والعشاء بجمع کل واحد منهما باقمة:

''إثر'' ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں کسرہ کے ساتھ ہے اور ثاء کے سکون کے ساتھ **عقیب کل واحدة** کے معنی میں ہے۔

''**کل واحدة**'' رفع کے ساتھ ہے جملہ حالیہ ہونے کی صورت میں اور نصب کے ساتھ ہے بدل ہونے کی صورت میں۔

''**منهما**'' **بینهما** کی نفی کیلئے تاکید ہے اور اس کے بعد نقل کے نفی کیلئے تصریح ہے۔

''**باقامة**'' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کی نمازیں علیحدہ علیحدہ اقامت کے ساتھ ادا فرمائیں۔ یہی امام زفر کا قول ہے اور امام طحاوی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔

قوله :ولم یسبح...... کل واحدة منهما:

یہ حدیث ان نمازوں کے بعد سنت اور وتر پڑھنے کے منافی نہیں ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ صحیح مسلم میں سعید بن جبیر سے روایت ہے کہ ہم ابن عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ عرفہ سے لوٹے پس جب ہم مزدلفہ پہنچے تو انہوں نے ہمیں مغرب کی تین اور عشاء کی دو رکعت نماز پڑھائی ایک اقامت کے ساتھ اور جب سلام پھیرا تو فرمایا اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نماز پڑھائی۔ اور ابن ابی شیبہ نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے ''**ان رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم صلی المغرب والعشاء بجمع باذان واحد واقامة واحدة**''۔

پس آپ جان چکے ہیں اس میں تعارض کو پس اگر اس روایت کو جس پر صحیحین متفق ہیں ان کو ترجیح نہ دی جائے ان روایات پر جن کے ذکر میں امام مسلم اور امام داؤد منفرد ہیں۔ یہاں تک کہ دونوں ساقط ہو جائیں۔ تو اصل کی طرف رجوع کرنا ہوگا اور اصل تعداد الصلوٰۃ کو تعداد اقامہ کے ساتھ لازم کرتا ہے جیسا کہ قضاء فوائت میں ہوتا ہے بلکہ یہاں بطریق اولیٰ دو اقامتیں ہونی چاہیے کیونکہ یہاں دوسری نماز وقتی ہے پس وہ پہلی نماز جو اپنے مقررہ وقت سے مؤخر کی گئی ہے اس کیلئے اقامت کہی گی تو وقتی اور حاضر نماز کیلئے تو بطریق اولیٰ اقامت ہونی چاہیے۔

مغرب اور عشاء کی نمازوں کو مزدلفہ میں جمع کرنا

٢٦٠٨: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ مَا رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم صَلّٰى صَلَاةً اِلَّا لِمِيْقَاتِهَا اِلَّا صَلَاتَيْنِ صَلَاةَ الْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ بِجَمْعٍ وَصَلَّى الْفَجْرَ يَوْمَئِذٍ قَبْلَ مِيْقَاتِهَا۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٥٣٠/٣۔ الحدیث رقم ١٦٨٢۔ ومسلم فی ٩٣٨/٢ الحدیث رقم.(٢٩٢۔ ١٢٨٩)۔

وابوداؤد فی سننه ٤٧٧/٢ الحدیث رقم ١٩٣٦۔

ترجمه: حضرت عبداللہ مسعودؓ سے روایت ہے کہ میں نے نہیں دیکھا نبی کریم ﷺ نے کوئی نماز پڑھی ہو مگر اپنے وقت میں دو نمازوں کے علاوہ' مغرب اور عشاء کی نماز مزدلفہ میں یعنی مغرب کی نماز عشاء کے وقت میں پڑھی اور فجر کی نماز پڑھی اس دن یعنی مزدلفہ میں نحر کے دن اس کے وقت سے پہلے۔اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :مارأيت رسول الله ﷺ......المغرب والعشاء بجمع:

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ نے سفر میں جمع بین الصلوتین کے منع ہونے میں ابن مسعود کے قول کو لیا ہے۔اور علامہ عینی فرماتے ہیں کہ احادیث میں سفر میں جمع بین الصلوتین منقول نہیں۔اس کا مطلب جمع فعلا ہے نہ کہ وقتاً،اسی طرح ذکر کیا علامہ قسطلانی رحمہ اللہ نے۔

''المغرب والعشاء بجمع'': یعنی مغرب کی نماز عشاء کے وقت میں پڑھی اور اسی طرح ظہر اور عصر کی نماز عرفہ میں جمع کر کے پڑھی کیونکہ وہاں نماز عصر،ظہر کے وقت میں پڑھی۔شاید یہ حدیث مزدلفہ میں روایت کی ہو اسی وجہ سے ظہر اور عصر کا ذکر چھوڑ دیا ہے۔پس ان کا ذکر تقدیراً ضروری ہے۔یا ان کا ذکر اس لیے چھوڑا کہ ان کا جمع ہر ایک کے ہاں ظاہر ہے کیونکہ یہ جمع بہت بڑے مجمع کے سامنے علی رؤس الاشهاد دن میں واقع ہوئی پس استشہاد میں اس کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں برخلاف مزدلفہ میں جمع کے کہ وہ خاص ہوئے۔

حاصل یہ ہے کہ عبارت میں تسامح ہے ورنہ الا الصلوتين سے مراد اگر مغرب وعشاء ہو تو یہ درست نہیں بنتا چاہے استثناء متصل ہو جیسا کہ ظاہر ہے یا منقطع ہو جیسا کہ ابن حجر نے اس پر بنیاد رکھی ہے۔کیونکہ نماز عشاء اپنے اس مقررہ وقت میں پڑھی تھی جو شرعاً اور اجماعاً اس کے لیے مقرر ہے لہٰذا دو نمازیں اپنے وقت کے نہیں پڑھی گئی۔

قوله :صلى الفجر قبل ميقاتها: یعنی غلس (اندھیرے) میں پڑھی وقت معتاد سے پہلے اور وہ اسفار (روشنی) ہے لیکن فجر کے بعد پڑھی کیونکہ شرعی طور پر مقرر وقت سے پہلے پڑھنا بالاجماع ناجائز ہے۔اور بخاری میں ابن مسعود سے ثابت ہے کہ انہوں نے صبح صادق کے بعد مزدلفہ میں فجر کی نماز پڑھی اور فرمایا،الفجر فی هذه الساعة۔

ضعیفوں کو پہلے بھیج دینا مزدلفہ کی رات کو

٢٦٠٩:وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اَنَا مِمَّنْ قَدَّمَ النَّبِيُّ ﷺ لَيْلَةَ الْمُزْدَلِفَةِ فِيْ ضَعَفَةِ اَهْلِهٖ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ٥٢٦/٣۔ الحديث رقم ١٦٧٨۔ ومسلم فی ٩٤١/٢ الحديث رقم (٣٠١۔ ١٢٩٣) وابوداؤد فی السنن ٤٧٩/٢ الحديث رقم ١٩٣٩۔ والترمذی فی ٢٤٠/٣ الحديث رقم ٨٩٣۔ والنسائی ٢٦١/٥ الحديث رقم ٣٠٣٢۔ واحمد فی المسند ٣٤٤/١۔

ترجمه: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں ان شخصوں میں سے تھا کہ نبی کریم ﷺ نے مزدلفہ کی رات میں اپنے ضعیفوں کے معاملے میں آگے بھیجا۔اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ''فمن قدم النبی ﷺ'' ایک نسخہ میں النبی ﷺ کے نصب کے ساتھ ہے اس صورت میں تقدیری عبارت: ممن تقدمه ای علیه ہوگی۔

''ضعفة'' ضاء اور عین کے فتحہ کے ساتھ ضعیف کی جمع ہے۔علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ مستحب ہے کمزور کورات کے وقت بھیجا جائے تاکہ بھیڑ میں ان کو تکلیف نہ ہو (انتہیٰ) ظاہر یہ ہے کہ یہ عذر کی وجہ سے رخصت ہے۔اور صحیحین میں بھی ہے کہ حضرت سودہ اپنے ثقل بدن

کی وجہ سے مزدلفہ سے رات کے نصف آخر میں لوٹی نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے اجازت سے اور آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے نہ ان کو اور نہ ان لوگوں کو جوان کے ساتھ تھے دم ادا کرنے کا حکم دیا۔ تو یہ دلالت کر رہا ہے کہ عذر کی وجہ سے واجب کا ترک مسقط دم ہے۔

ابن حجر کا یہ قول کہ ہمارے ائمہ نے اس حدیث سے اخذ کیا ہے کہ ضروری مزدلفہ میں نصف اللیل کے بعد ایک جزء میں موجود ہونا ہے اور رات گزارنا واجب ہے نہ کہ رکن ہے اور اس میں تابعین کی ایک جماعت اور ان کے علاوہ کا اختلاف ہے پس اس کی تلافی دم سے کی جائی گی۔ تو اس حدیث میں ان کے اس قول پر کوئی دلالت نہیں ہے۔ **واللہ اعلم بالصواب۔**

رمی جمار کے لیے کنکریاں مزدلفہ کے راستے اٹھائیں

۲۶۱۰: وَعَنِ الْفَضْلِ بْنِ عَبَّاسٍ وَكَانَ رَدِيفَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَالَ فِيْ عَشِيَّةِ عَرَفَةَ وَغَدَاةِ جَمْعٍ لِلنَّاسِ حِيْنَ دَفَعُوْا عَلَيْكُمْ بِالسَّكِيْنَةِ وَهُوَ كَافٌّ نَاقَتَهٗ حَتّٰى دَخَلَ مُحَسِّرًا وَهُوَ مِنْ مِنًى قَالَ عَلَيْكُمْ بِحَصَى الْخَذْفِ الَّذِيْ يُرْمٰى بِهِ الْجَمْرَةُ وَقَالَ لَمْ يَزَلْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُلَبِّي حَتّٰى رَمَى الْجَمْرَةَ۔

اخرجه مسلم فی صحیحه ۹۳۱/۲ الحدیث رقم (۲۶۸۔ ۱۲۸۲)۔ والنسائی فی ۲۶۸/۵۔ الحدیث رقم ۳۰۵۵۔

ترجمہ: حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے پیچھے سوار تھے یعنی جب کہ مزدلفہ سے منیٰ کو چلے۔ کہ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے عرفہ کی شام کو اور مزدلفہ کی صبح کو لوگوں کو فرمایا کہ جس وقت کہ لوٹیں اور اپنی سواریوں کو ہانکا اور فرمایا تم کو کنکریاں کا اٹھانا لازم ہے یعنی اس میدان سے مارنے والی کنکریاں کی طرح جمرہ پر ماری جائیں یعنی مناروں پر اور فضل نے کہا ہے رسول خدا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم مسلسل لبیک کہتے رہے یہاں تک کہ کنکریاں جمرہ کو ماریں یعنی جمرۃ العقبہ کو جب پہلی کنکری ماری تو لبیک کہنا بند کردی۔ اس کو امام مسلم رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله :عن الفضل بن عباس كان رديف النبی ﷺ :**

"**عن الفضل بن عباس**": ملا علی قاری کے نسخہ میں **وعنه عن الفضل بن عباس** ہے۔

"**كان رديف النبی ﷺ**": ایک نسخہ میں "النبی" کے بجائے رسول اللہ کے الفاظ ہیں۔ یہ جملہ معترضہ ہے۔

قوله :قال فی عشية عرفة......عليكم بحصى الخذف الذی يرمى به الجمرة :

"**كاف**" فاء کی تشدید کے ساتھ ہے۔

"**محسرا**" سین مکسردہ کی تشدید کے ساتھ ہے۔

یہ منیٰ کے قریب مزدلفہ کے آخری حصے میں ایک جگہ کا نام ہے۔ ازرقی، جمرہ عقبہ اور وادی محسر کے درمیان منیٰ کی حدود بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جمرہ عقبہ اور وادی محسر منیٰ میں سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کے آگے جو پہاڑ ہے وہ منیٰ میں سے ہے نہ کہ جو اس کے پیچھے ہے اور ایک گروہ کے نزدیک عقبہ منیٰ میں سے ہے۔

"**الخذف**" چھوٹی چھوٹی کنکریاں جو چنے کے برابر ہوتی ہیں۔

"**يرمى به الجمرة**" **الجمرة** رفع کے ساتھ ہے نائب فاعل ہونے کی وجہ سے اور نصب کے ساتھ ہے اعنی فعل مقدر کی وجہ سے یا بعنی فعل مقدر کی وجہ سے۔

احمد رحمہ اللہ نے مسند میں ایک حاکم نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے: **عن ابن عباس قال: قال لی رسول الله ﷺ**

غداة جمع "القط لی" فلقطت له حصيات من هی الخذف فلما وضعتن فی یده قال: نعم بامثال هولآء فارموا وایاکم والغلو فی الدین فانما هلك قبلكم بالغلو فی الدین" ابن عباس فرماتے ہیں کہ یوم نحر کی صبح رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ میرے لیے کنکریاں چن لے تو میں نے آپ ﷺ کیلئے سات چھوٹی کنکریاں چن لیں جب میں نے وہ کنکریاں آپ ﷺ کے ہاتھ میں رکھ لی تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ بہترین ہیں اور ان جیسی کنکریوں سے رمی کرو اور دین میں غلو کرنے سے بچو کیونکہ تم سے پہلے لوگ دین میں غلو کرنے کی وجہ سے ہلاک ہوگئے تھے۔

لیکن یہ روایت محمول ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنے بھائی فضل بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہو۔ کیونکہ ایک صحیح روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے یوم نحر کی صبح فضل ابن عباسؓ سے فرمایا "التقط لی حصی قال ملقطت له سبع حصيات مثل حصی الخذف"۔

یہ حدیث صریح رد ہے شوافع کے اس قول پر کہ یہ کنکریاں فجر سے پہلے چننا سنت ہے اور انہوں نے اس کی بے فائدہ علتیں ذکر کی ہیں۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ خذف کنکری یا کھجور کی گٹھلی کو دونوں شہادت کی انگلیوں میں رکھ کر پھینکنے کو کہتے ہیں۔ اور اسی پر رافعی نے اعتماد کیا ہے۔ لیکن امام نوویؒ نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ صحیحین کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے خذف سے منع فرمایا ہے کیونکہ نہ تو شکار کو قتل کر سکتا ہے اور نہ دشمن کو زخمی کر سکتا ہے۔ اور یہ آنکھ کو پھوڑ دیتا ہے اور دانت کو توڑ دیتا ہے۔ اور یہ حدیث رمی جمار اور اس کے علاوہ سب کو شامل ہے اور انہوں نے خذف کی یہ صورت پسند کی ہے کہ کنکری انگوٹھے کی پشت پر رکھ کر اور شہادت کی انگلی کے ذریعے اس کو پھینکے۔ اور ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ انگوٹھے اور شہادت والی انگلی کے سروں سے پھینکے کیونکہ یہ زیادہ اچھا اور آسان ہے۔

اور ابن حجر کا یہ کہنا کہ یہ حدیث یوم نحر کے علاوہ رمی کے کنکریوں کے بارے میں ہے اور یوم نحر کے کنکریوں کو مزدلفہ سے اٹھانا سنت ہے تو یہ ان کا ایک عجیب وغریب وہم ہے کیونکہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے کہ یوم نحر کے علاوہ رمی انہی کنکریوں سے کی جائے جو ایک بار ماری جا چکی ہیں۔ کیونکہ اس پر اتفاق ہے کہ جو کنکریاں ماری جا چکی ہیں ان کو مارنا مکروہ ہے یوم نحر اور اس کے علاوہ سب کے رمی میں۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ جو ان میں سے قبول ہو جائے تو وہ یہاں سے اٹھا لے جاتے ہیں ورنہ تم یہاں پہاڑ دیکھتے یا یہ دونوں پہاڑوں کے درمیان جگہ کو بھر دیتی۔

میدانِ محسر میں آپ ﷺ اونٹنی تیز چلایا کرتے تھے

۲۶۱۱: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ اَفَاضَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ جَمْعٍ وَعَلَيْهِ السَّكِيْنَةُ وَاَمَرَهُمْ بِالسَّكِيْنَةِ وَاَوْضَعَ فِيْ وَادِيْ مُحَسِّرٍ وَاَمَرَهُمْ اَنْ يَّرْمُوْا بِمِثْلِ حَصَى الْخَذْفِ وَقَالَ لِعَلِيٍّ لَا اُرَاكُمْ بَعْدَ عَامِيْ هٰذَا لَمْ اَجِدْ هٰذَا الْحَدِيْثَ فِي الصَّحِيْحَيْنِ اِلَّا فِيْ جَامِعِ التِّرْمِذِيِّ مَعَ تَقْدِيْمٍ وَتَاخِيْرٍ۔

اخرجه ابوداؤد فی سننه ۴۸۲/۲ الحديث رقم ۱۹۴۴۔ والترمذی فی ۲۳۴/۳ الحديث رقم ۸۸۶۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرمایا نبی کریم ﷺ مزدلفہ سے چلے اور ان پر چلنے میں تسکین تھی اور لوگوں کو حکم کیا آہستہ چلنے کے ساتھ اور اپنی اونٹنی میدان محسر میں جلدی چلائی اور لوگوں کو حذف کی کنکریاں (یعنی چنے کے برابر) مارنے کا حکم دیا اور حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا: شاید میں تم کو اس سال کے بعد نہ دیکھوں گا۔ صاحب مشکوٰۃ نے کہا ہے کہ میں نے یہ حدیث صحیحین (یعنی بخاری ومسلم) میں نہیں پائی مگر جامع ترمذی میں تقدیم وتاخیر کے ساتھ پائی ہے۔

تشریح: **قوله :لعلی لا اراکم :** لعل یہاں اشفاق کیلئے ہے۔مظہر فرماتے ہیں کہ "لعل" ترجی کیلئے آتا ہے اور کبھی ظن اور عسی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے (انتہیٰ)۔

مطلب حدیث کا یہ ہے کہ مجھ سے دین کے احکام سیکھ لو کیونکہ میرا خیال ہے کہ میں آئندہ سال تمہیں نہ دیکھ سکوں گا اور اسی طرح ہوا جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال تھا کیونکہ اسی سال دس ہجری بارہ ربیع الاول کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا۔

قوله :لم اجد هذا الحديث ......مع تقديم وتاخير :

صاحب مشکوٰۃ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ صاحب مصابیح نے اس حدیث کو پہلی فعل میں نقل کیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث صحیحین کی ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ ترمذی کی روایت ہے تو اس کو دوسری فعل میں نقل کرنا چاہیے تھا اگر یہ اس صورت میں تقدیم وتاخیر کا اعتراض پھر بھی باقی رہتا۔

الفصل الثانی:

آفتاب کو پگڑیوں کے ساتھ تشبیہ دینا

۲۶۱۲: عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ قَيْسِ بْنِ مَخْرَمَةَ قَالَ خَطَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ اِنَّ اَهْلَ الْجَاهِلِيَّةِ كَانُوْا يَدْفَعُوْنَ مِنْ عَرَفَةَ حِيْنَ تَكُوْنُ الشَّمْسُ كَاَنَّهَا عَمَائِمُ الرِّجَالِ فِيْ وُجُوْهِهِمْ قَبْلَ اَنْ تَغْرُبَ وَمِنَ الْمُزْدَلِفَةِ بَعْدَ اَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ حِيْنَ تَكُوْنُ كَاَنَّهَا عَمَائِمُ الرِّجَالِ فِيْ وُجُوْهِهِمْ وَاِنَّا لَانَدْفَعُ مِنْ عَرَفَةَ حَتّٰى تَغْرُبَ الشَّمْسُ وَنَدْفَعَ مِنَ الْمُزْدَلِفَةِ قَبْلَ اَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ هَدْيُنَا مُخَالِفٌ لِهَدْيِ عَبَدَةِ الْاَوْثَانِ وَالشِّرْكِ ـ

(رواه البيهقي في شعب الا يمان وقال خطبنا وساقه ونحوه)

اخرجه الحاكم في المستدرك ۲۷۷/۲۔

ترجمہ: حضرت محمد بن قیس بن مخرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا پس فرمایا کہ تحقیق اہل جاہلیت عرفات سے اس وقت واپس آئے تھے گویا کہ آفتاب ایسا ہوگیا جیسا کہ مردوں کی پگڑیاں ان کے چہروں کے اوپر اور تحقیق ہم عرفات سے نہیں چلیں گے یہاں تک کہ آفات غروب ہو اور ہم مزدلفہ سے آفتاب کے طلوع ہونے سے پہلے چلتے۔ ہمارا طریقہ بت پوجنے والوں اور شرک کرنے والوں کے طریقے سے مختلف ہے۔

راویٔ حدیث:

محمد بن قیس ۔ یہ محمد ہیں۔ قیس بن مخرمہ کے بیٹے۔ قرشی وحجازی ہیں۔ انہوں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وعائشہ رضی اللہ عنہا سے ان سے عبداللہ بن کثیر وغیرہ نے روایت کی۔ "مخرمہ" میں میم پر فتحہ، خاء معجمہ کے سکون اور راء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

تشریح: **قوله :حين تكون الشمس......في وجوههم قبل ان تغرب :**

"في وجوههم": جار مجرور تکون کے متعلق ہے۔

"كانها عمائم الرجال في وجوههم": یہ جملہ، جملہ معترضہ ہے۔

بعض شارحین فرماتے ہیں کہ یہاں تک کہ جب سورج ان کے چہروں پر پگڑیوں کی طرح نظر آئے اور یہ اس طور پر کہ سورج کی

روشنی اس طرف پڑتی جس طرف ان کا رخ ہوتا اور یہاں علی رؤوسھم نہیں فرمایا کہ سورج ان کے سروں پر پگڑیوں کی طرح نظر آتا، کیونکہ غروب کے وقت سورج کی طرف جب رخ کیا جائے تو اس کی روشنی اس کے سیدھ پر پڑتی ہے اور انحطاط کی وجہ سے سر تک تجاوز نہیں کرتی۔ اور اسی طرح طلوع کے وقت بھی اور مردوں کی پگڑیوں کے ساتھ تشبیہ اس لیے دی ہے کہ جب انسان گھاٹیوں اور وادیوں کے درمیان ہوتا ہے تو سورج کی شعاع میں سے اس پر صرف اتنی پڑتی ہے جو اس کے پیشانی پر پگڑی کے سفیدی کی طرح چمکتی ہے اور سایہ اس کے باقی چہرے اور بدن کو چھپائے ہوئے ہوتی ہے۔ پس دیکھنے والا اس کے چہرے پر سورج کی روشنی کو پیشانی پر پگڑی کی طرح پاتا ہے۔ اور عمائم کی اضافت مزید توضیح کیلئے ہے جیسا کہ علامہ طیبیؒ نے فرمایا ہے اور یا دیہاتی عورتوں سے احتراز کیلئے ہے کیونکہ ان کے سروں پر پگڑی کی مثل چادر ہوتی ہے جیسا کہ ابن حجرؒ نے کہا ہے۔

بعض کے نزدیک غروب سے پہلے عرفات سے روانہ ہونا مکروہ ہے اور اکثر کے نزدیک عرفات میں دن و رات کا جمع کرنا واجب ہے اور طلوع شمس تک ٹھہرنا بالاتفاق مکروہ ہے۔

''قبل ان تغرب'': لیدفعون کیلئے ظرف ہے یا حین سے بدل ہے۔

قولہ :ھدینا مخالف لھدی عبدۃ الاوثان : مصابیح میں ''لھدی الاوثان والشرک'' ہے۔ جملہ مستانفہ ہے، ماقبل کیلئے علت ہے۔ شارح مصابیح فرماتے ہیں کہ اس سے مراد بت پرستوں اور مشرکین کا طریقہ ہے۔

اور شاید مخالفت کی حکمت موقف اعظم میں زیادہ دیر تک ٹھہرنے کا حصول ہو، کیونکہ وقوف عرفہ بالاجماع رکن ہے برخلاف وقوف مزدلفہ کے کہ وہ ہمارے نزدیک واجب اور امام شافعی کے نزدیک سنت ہے۔ **واللہ اعلم**۔

تخریج: (رواہ) مشکوۃ کے اصل نسخہ میں یہاں جگہ چھوٹی ہوئی ہے البتہ ایک دوسرے صحیح نسخہ میں یہ لکھا ہوا ہے **رواہ البیھقی فی شعب الایمان وقال خطبنا وساق بنحوہ**۔ اور جو ابن حجر نے کہا ہے کہ رواہ مسلم تو اگر یہ صحیح ہے تو پھر یہ صاحب مصابیح پر اعتراض ہے۔

رات میں رمی جائز نہیں

۲۶۱۳: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَدَّمَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ لَیْلَۃَ الْمُزْدَلِفَۃِ اُغَیْلِمَۃَ بَنِیْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ عَلٰی حُمُرَاتٍ فَجَعَلَ یَلْطَحُ اَفْخَاذَنَا وَیَقُوْلُ اُبَیْنِیَّ لَا تَرْمُوْا الْجَمْرَۃَ حَتّٰی تَطْلُعَ الشَّمْسُ۔

(رواہ ابوداود والنسائی وابن ماجۃ)

اخرجہ ابوداؤد فی سننہ ۴۸۰/۲ الحدیث رقم ۱۹۴۰۔ والنسائی فی ۲۷۰/۵ الحدیث رقم ۳۰۶۴۔ وابن ماجہ ۱۰۰۷/۲ الحدیث رقم ۳۰۲۵۔ واحمد فی المسند ۳۲۶/۱۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ہمیں مزدلفہ کی رات میں روانہ کیا اور عبدالمطلب کے خاندان کے ہم کئی بچے تھے اور گدھے پر ہماری سواری تھی۔ حضور اکرم ﷺ ہماری رانوں پر ہاتھ تارتے اور فرماتے تھے میرے چھوٹے بچو جب تک سورج نہ نکلے تم منارے پر کنکریاں نہ پھینکنا۔ (ابوداؤد ونسائی' ابن ماجہ)

تشریح: **قولہ :قدمنا رسول اللہ ﷺ لیلۃ المزدلفۃ اغیلمۃ بنی عبد المطلب علی حمرات** :

''قدمنا......'': علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ دلالت ہے عورتوں و بچوں کو نصف رات کے بعد پہلے روانہ کرنے پر (انتہیٰ) رات کے بعد کا لفظ محل نظر ہے لہٰذا اس سے استدلال درست نہیں ہے۔

''اغیلمۃ'' یہ منصوب ہے اختصاص کی وجہ سے یا اعنی فعل مقدر کی وجہ سے اور قدرنا کی ضمیر سے عطف بیان ہے۔

''اغیلمة'' سے مراد بچے ہیں۔ یہاں صبیان کو نسوان پر غلبہ دیا گیا ہے یہ تصغیر شاذ ہے کیونکہ غلمة بکسر الغین کی تصغیر غلیمہ آتی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ اغلمہ جمع غلام کی تصغیر قیاسی ہے اگرچہ اغلمہ کا استعمال نہیں ہوتا' اس کا استعمال قلت میں غلمہ اور کثرت میں غلمان ہے۔

''علی حمرات'' حاء اور میم کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ یہ دلالت کر رہا ہے کہ قریبی سفر میں گدھے پر حج کرنا مکروہ نہیں ہے۔

قوله :فجعل یلطح افخاذنا ویقول یابنی لاترموا الجمرة حتی تطلع الشمس:

''یلطح'' حاء کی فتحہ کے ساتھ ہے۔

''أبینی'' ہمزہ کے ضمہ اور باء کے فتح یاء کے سکون اور نون کے کسرہ اور یاء مشدہ کے فتح کے ساتھ ہے اور کبھی یاء کو کسرہ بھی دیا جاتا ہے یہ ابن کی تصغیر ہے اور مضاف ہے ی کی طرف اور یا ابن کی جمع سالم کی تصغیر ہے مگر خلاف قیاس ہے کیونکہ اس کا ہمزہ وصلی ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ تصغیر کو اصل کی طرف لوٹاتی ہے اور اسی سے ہے اللہ کا یہ قول: ﴿المال والبنون﴾ اور ابن کی اصل بنو ہے یہ ان اسماء میں سے ہے جن کا آخر محذوف ہے پس ظاہر تو یہ ہے کہ بنی کہتے مگر اس کا مفرد کے ساتھ التباس ہوتا تو اس سے بچنے کیلئے ہمزہ زیادہ کر دیا گیا۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ ابن کی تصغیر ہے یعنی اس کا مفرد مقطوع الالف تھا' اس کی تصغیر ابین بنائی گئی اور پھر اس کی جمع سالم بنائی گئی اور بعض کہتے ہیں کہ یہ ابنٰی، اعمی کے وزن پر تھا اس کے الف کو یا سے بدلا گیا یاء تصغیر کے بعد مسکور ہونے کی وجہ سے اور یاء متکلم کی طرف اس کی اضافت کی گئی ہے اور یہ اسم جمع ہے۔ اور ابن حجر کا یہ قول بہت عجیب ہے کہ یہ أُبَیْنِیَّ همزہ کے فتح بای کے سکون اور نون کے فتح اور یاء کے شد کے ساتھ ہے جیسا کہ اعمٰی کی تصغیر اعیمٰی ہے۔ نہایہ میں ہے کہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ ابن کی جمع ابناء آتی ہے مقصود بھی اور ممدود بھی اور بعض نے کہا ہے کہ یہ ابن کی تصغیر ہے اور یہ محل نظر ہے (انتہی)۔ محل نظر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ تصغیر لفظ کو اس کے اصل کی طرف لوٹاتا ہے جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں اور یا وجہ یہ ہے کہ یہ مفرد ہے اور مابعد اس کا جمع ہے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ یہ جنس ہے اور نداء اشرف کیلئے اصالۃً ہے اور بقیہ کیلئے تبعاً ہے جیسا کہ اللہ کے اس ارشاد میں ہے: ﴿یایها النبی اذا طلّقتم النسآء﴾ [الطلاق:۱]

حاصل یہ ہے کہ اس کے لفظ میں روایت متحد اور درایت مختلف ہے بہرصورت اس کا معنی ہے یا ولیداتی یا، یا ابنائی اور یا، یابنی ہے۔

''لاترموا الجمرة حتی تطلع الشمس'': یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ رات میں رمی جائز نہیں ہے۔ چنانچہ امام ابو حنیفہ اور اکثر علماء کا یہی مسلک ہے جبکہ امام شافعی کے ہاں آدھی رات کے بعد سے رمی جائز ہے اور طلوع شمس کے ساتھ اس لیے مقید کیا ہے کہ اس وقت رمی سنت ہے نیز طلوع فجر کے بعد اور سورج نکلنے سے پہلے رمی بالاتفاق جائز ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی مستدل حدیث اور اس کی تاویل

۲۶۱۴: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اَرْسَلَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم بِاُمِّ سَلَمَةَ لَیْلَةَ النَّحْرِ فَرَمَتِ الْجَمْرَةَ قَبْلَ الْفَجْرِ ثُمَّ مَضَتْ فَاَفَاضَتْ وَکَانَ ذٰلِكَ الْیَوْمُ الَّذِیْ یَکُوْنُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم عِنْدَهَا۔ (رواه ابوداود)

اخرجه ابو داؤد فی ۴۸۱/۲ الحدیث رقم ۱۹۴۲۔

ترجمہ: ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو بقر عید کی رات میں مزدلفہ بھیج دیا تھا چنانچہ انہوں نے نماز فجر سے پہلے جمرہ عقبہ پر کنکریاں ماریں پھر وہاں سے آئیں اور طواف افاضہ کیا اور یہ وہ دن تھا جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ام سلمہؓ کے پاس تھے یعنی یہ ام سلمہؓ کی باری کا دن تھا اس کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

''بام الخ'' باء زائد ہے تاکید کیلئے ہے۔

''الیوم الذی...... ''منصوب ہے بنابر خبریت کے۔

حدیث کے آخری الفاظ میں دراصل اس طرف اشارہ ہے کہ حضور ﷺ نے ام سلمہؓ کو اس رات میں منیٰ کیوں بھیجا۔ انہوں نے رات میں رمی کیوں کی اور دن ہی میں طواف افاضہ سے فارغ کیوں ہوئیں۔ جبکہ دیگر امہات المؤمنینؓ نے اگلی رات میں طواف افاضہ کیا۔

امام شافعیؒ فجر سے پہلے رمی جمرہ کے جواز کیلئے اس حدیث کو دلیل قرار دیتے ہیں اگرچہ افضل فجر کے بعد ہے اور دیگر علماء فرماتے ہیں کہ یہ سہولت و رعایت صرف ام سلمہ کو دی گئی تھی دوسروں کیلئے ابن عباس ؓ کی مذکورہ حدیث کے پیش نظر فجر سے پہلے رمی جائز نہیں ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں فجر سے مراد نماز فجر ہو کہ حضرت ام سلمہؓ نے نماز فجر سے پہلے اور طلوع فجر کے بعد رمی کی۔ ہدایہ میں ہے کہ امام شافعیؒ کی دلیل یہ روایت ہے'' انه علیه السلام رخص للرعاء ان یرمو الیلا'' کہ آپ ﷺ نے چرواہوں کو رات میں رمی کی اجازت دی تھی۔

ابن ہمام کہتے ہیں کہ اس روایت کی تخریج ابن ابی شیبہ نے کی ہے اور اپنے مصنف میں عطاء سے مرسل روایت کیا ہے اور دارقطنی نے سند ضعیف کے ساتھ روایت کیا ہے اور اس میں یہ الفاظ زیادہ ہیں'' وایة ساعة شاء من النھار'' اور دن کی جس گھڑی میں چاہے اور مصنف نے اس کو دوسری اور تیسری رات پر محمول کیا ہے کیونکہ یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ رمی کا وقت ہر دن کے داخل ہونے سے لے کر اس دن کے بعد آنے والی رات کے آخر تک ہوتا ہے پس راتیں رمی میں سابقہ ایام کے تابع ہوتی ہیں نہ کہ لاحقہ کی اور اس کی دلیل سنن اربعہ کی وہ روایت ہے جو عطاء نے ابن عباس ؓ سے نقل کی ہے:

''کان رسول اللّٰہ ﷺ یقدم ضعفاء اھله بغلس و امرھم الایرموا الجمرة حتٰی تطلع الشمس''۔

رسول اللہ ﷺ اپنے کمزور اہل وعیال کو رات کے اندھیرے میں پہلے بھیجتے اور ان کو حکم فرماتے کہ طلوع شمس سے پہلے رمی جمار نہ کریں۔

اور طحاوی نے روایت کیا ہے عن ابن عباس ؓ ان رسول اللّٰہ ﷺ امر ضعفة بنی ھاشم ان یرتحلوا من جمع بلیل ویقول ''ابینیّ لا ترموا الجمرة حتی تطلع الشمس

طحاوی کی ایک اور روایت ہے عن ابن عباس ؓ ان رسول اللّٰہ ﷺ کان یأمر نساء، و ثقله صبیحة جمع أن یفیضوا مع أوّل الفجر بسواد ولا یرموا الجمرة الا مصبحین'' اور ایک روایت میں ہے: ان رسول اللّٰہ ﷺ بعثه فی الثقل وقال: لا ترموا الجمار حتٰی تصبحوا'' ہم نے جواز ان دونوں احادیث سے اور فضیلت ماقبل والی حدیث سے ثابت کی ہے۔

مقیم یا عمرہ کرنے والا حجر اسود کو بوسہ دے

۲۶۱۵: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ یُلَبِّی الْمُقِیْمُ اَوِ الْمُعْتَمِرُ حَتّٰی یَسْتَلِمَ الْحَجَرَ .

(رواہ ابوداود وقال وروی موقوفا علی ابن عباس)

اخرجه ابو داؤد فی سننه ۲/ ۴۰۶ الحدیث رقم ۱۸۱۷۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس ؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ لبیک کہے مقیم یا عمرہ کرنے والا یہاں تک کہ بوسہ دے حجر اسود کو۔ اس کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے یعنی مرفوع اور ابوداؤدؒ نے کہا ہے کہ جو روایت کی گئی ہے یہ موقوف ہے ابن

عباس رضی اللہ عنہما پر۔

تشریح: قوله :يلبى المقيم او المعتمر حتى يستلم الحجر :

مصابیح میں يلبى المعتمر الى ان يفتتح ہے۔

"المقيم او المعتمر": مقیم سے مراد وہ معتمرین ہیں جو مکہ میں مقیم ہوں اور معتمر سے مراد وہ معتمر ہے جو باہر سے آیا ہو۔

"او" برائے تنویع ہے اور یہ بھی بعید نہیں کہ مراد مطلق معتمر ہو اور "او" راوی کی طرف سے شک ہو۔

شارح مصابیح فرماتے ہیں کہ عمرہ کرنے والا احرام کے وقت سے طواف شروع کرنے تک تلبیہ کہے اور پھر تلبیہ منقطع کر دے۔ ہدایہ میں ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عمرہ کرنے والے کی نگاہ جیسے ہی بیت اللہ پر پڑے تو تلبیہ منقطع کردے۔ اور ان سے ایک روایت ہے کہ جب مکہ کے گھروں پر نظر پڑے تو تلبیہ ختم کردے۔ ابن ہمام کہتے ہیں کہ ہمارے دلیل ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے جو ترمذی نے روایت کی ہے: **انه عليه الصلوٰة والسلام كان يمسك عن التلبية في العمرة اذا استلم وقال حديث صحيح۔** یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم تلبیہ اس وقت ختم کرتے عمرہ میں جب حجر اسود کو بوسہ دیتے۔

قوله :رواه ابوداود ...... "رواه ابو داؤد وقال" ایک نسخہ میں قال بغیر واو کے ہے۔ "وروى" بصیغہ مجہول ہے۔

"موقوفًا على ابن عباس" ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ابوداؤد نے اس کو مرفوع روایت کیا ہے اور اس کے بعد کہا ہے "وروى موقوفًا" پس اختصار مخل مصنف کی طرف سے ہے ان کو پہلے یوں ذکر کرنا چاہیے تھا **عن ابن عباس** رضی اللہ عنہما **مرفوعًا۔**

بعض نے کہا ہے کہ یہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے اور بعض علماء نے اس کو مرفوع ذکر کیا ہے۔

اور اس کو ابو داؤد نے بھی روایت کیا ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں "ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم **قال يلبى المعتمر حتى يستلم الحجر**" (انتہیٰ)۔ اس سے واضح ہوا کہ کوتاہی صاحب مشکوٰۃ کی ہے ابوداؤد سے نقل کرنے میں **والله اعلم۔**

الفصل الثالث:

عرفات سے واپسی کا ذکر

۲۶۱۶: عَنْ يَعْقُوْبَ بْنِ عَاصِمِ بْنِ عُرْوَةَ اَنَّهٗ سَمِعَ الشَّرِيْدَ يَقُوْلُ اَفَضْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم فَمَا مَسَّتْ قَدَمَاهُ الْاَرْضَ حَتّٰى اَتٰى جَمْعًا۔ (رواه ابو داود)

اخرجه احمد في المسند ٤/٣٨٩۔

ترجمہ: یعقوب بن عاصم بن عروہ تابعی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ اس نے شرید صحابی سے سنا کہ میں عرفات سے واپسی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں زمین پر نہ لگے یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مزدلفہ میں آئے۔ اس کو ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

یعقوب بن عاصم۔ یہ "یعقوب" ہیں۔ "عاصم بن عروہ بن مسعود" کے بیٹے ہیں۔ ثقفی وحجازی ہیں۔ انہوں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے حدیث کی روایت کی۔

تشریح: علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس روایت سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عرفات سے مزدلفہ تک

کا پورا راستہ سواری پر طے کیا پیدل نہیں چلے۔ یہ مطلب نہیں کہ آپ ﷺ نے پورے راستے میں زمین پر قدم ہی نہیں رکھے کیونکہ ایک روایت میں ہے کہ عرفات سے واپسی کے موقع پر راستے میں آپ ﷺ نے پیشاب کیا تو آپ ﷺ پر پانی پیش کیا گیا وضو کیلئے تو آپ ﷺ نے فرمایا نماز تو آگے آ رہی ہے۔

ظہر وعصر کی نماز جمع کرنا آپ ﷺ کی سنت ہے

۲۶۱۷: وَعَنِ ابْنِ شِهَابٍ قَالَ اَخْبَرَنِی سَالِمٌ اَنَّ الْحَجَّاجَ بْنَ يُوْسُفَ عَامَ نَزَلَ بِابْنِ الزُّبَيْرِ سَأَلَ عَبْدَاللّٰهِ كَيْفَ نَصْنَعُ فِي الْمَوْقِفِ يَوْمَ عَرَفَةَ فَقَالَ سَالِمٌ اِنْ كُنْتَ تُرِيْدُ السُّنَّةَ فَهَجِّرْ بِالصَّلَاةِ يَوْمَ عَرَفَةَ فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ صَدَقَ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَجْمَعُوْنَ بَيْنَ الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ فِي السُّنَّةِ فَقُلْتُ لِسَالِمٍ اَفَعَلَ ذٰلِكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ سَالِمٌ وَهَلْ يَتَّبِعُوْنَ ذٰلِكَ اِلَّا سُنَّتَهٗ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۵۱۳/۳۔ الحدیث رقم ۱۶۶۲۔

ترجمہ: حضرت ابن شہاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ مجھ کو سالم بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے خبر دی کہ حجاج یوسف نے اس سال مکہ میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو قتل کیا' مکہ میں آ کر عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ ہم کس طرح عرفہ کے دن ٹھہریں؟ یعنی ظہر وعصر کی نماز وقوف سے پہلے پڑھیں یا درمیان میں یا پیچھے؟ پس سالم نے کہا اگر تو سنت کا ارادہ کرتا ہے تو ظہر وعصر عرفہ کے دن صبح سویرے پڑھ۔ پس عبداللہ بن عمرؓ نے کہا کہ سالم نے سچ کہا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سنت طریقہ ادا کرنے کے لیے ظہر وعصر کو جمع کرتے تھے۔ ابن شہابؒ نے کہا کہ میں نے سالم سے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ نے اسی طرح کیا تھا؟ پس سالمؒ نے کہا اس طرح نماز پڑھ' اس معاملے میں ہم نبی کریم ﷺ کے طریقے کی اتباع کرتے ہیں۔ اس کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

حجاج بن یوسف۔ یہ حجاج بن یوسف ''ثقفی'' ہے۔ اس کے مظالم کے قصے انتہائی مشہور ہیں۔ انتہائی ظالم اور بے رحم شخص تھا۔ ''شر الناس'' کا مصداق تھا۔ سوا لاکھ مسلمانوں کو ظلماً قتل کیا۔ ان مقتولین میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی بھی ایک بڑی تعداد ہے۔ یہ عبدالملک بن مروان کی طرف سے عراق اور خراسان کا گورنر تھا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ولید گورنر ہوا۔ مقام ''واسط'' میں شوال ۹۵ھ میں وفات پائی۔ اس کی عمر چون (۵۴) سال کی ہوئی۔ اس کا ذکر مناقب قریش کے باب اور قبائل کے ذکر میں آتا ہے اس کی موت کا قصہ عنقریب حرف سین کے ماتحت سعید بن جبیر کے تذکرہ میں آئے گا۔ ''حجاج'' کا مطلب ''کثیر الحج'' بکثرت حج کرنے والا۔

پھر اسی سال عبدالملک بن مروان نے اس کو حاجیوں کا امیر مقرر کیا اور اسے حکم دیا کہ تمام افعال حج میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے افعال واقوال کی پیروی کرنا ان سے حج کے مسائل پوچھتے رہنا اور کسی معاملے میں ان کی مخالفت نہ کرنا چنانچہ حجاج نے اس وقت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت میں ذکر کردہ مسئلہ بھی پوچھا۔

تشریح: قوله :فقال سالم ان كنت تريد السنة فهجر بالصلاة يوم عرفة :

''فقال سالم'': اس میں تجرید ہے ورنہ فقلت کہنا چاہیے تھا اور انہوں نے والد سے پہلے جواب والد کے آسانی کیلئے دیا کیونکہ وہ بہت بوڑھے تھے اور حجاج کے اہانت کیلئے انہوں نے جواب دیا کیونکہ حجاج بہت متکبر تھا' بظاہر ابن عمر رضی اللہ عنہما اور ان کے بیٹے مقیم تھے تو یہ

جمع بين الصلوتين فى النسك تھا نہ کہ جمع فی السفر۔

''فهجر''نھایہ میں ہےالتهجير التبكير فى كل شئ۔

قوله :فقال عبدالله ابن عمر صدق انهم كانوا يجمعون بين الظهر والعصر فى السنة:

''إنهم''بكسر الهمزة ويفتح۔قوله :فقلت لسالم...... وهل يتبعون الا سنته:

''أفعل ذلك''ہمزہ استفہام کے اثبات کے ساتھ ہے صحیح نسخوں میں برخلاف ابن حجر کے نسخہ میں جو واقع ہے کہ وہ فرماتے ہیں ہمزہ استفہام کے حذف کے ساتھ ہے کیونکہ مقام سے اس کا ظہور ہو رہا ہے۔

''يتبعون''تشدید کے ساتھ ہے حافظ ابن حجر فرماتے ہیں''يتبعون'' تاء کی تشدید اور باء کے کسرہ کے ساتھ اتباع سے ہے اور بخاری کی ایک روایت میں''تبتعون'' دو تاء اور درمیان میں باء ساکن کے ساتھ آیا ہے اور یہ مشکوۃ کے غالب نسخوں کے خلاف ہے اور بخاری کی اکثر روایات کے خلاف ہے پس ابن حجر کا قول''لا يطلبون'' یہ لیبتغون کی تفسیر ہے۔اور ان نسخوں میں'فی' کی جگہ باء ہے۔

''الا سنة'':منصوب بنزع الخافض ہے۔

بَابُ رَمْيِ الْجِمَارِ

مناروں پر کنکریاں پھینکنے کا بیان

''الجمار''جیم کے کسرہ کے ساتھ ہے،جمرۃ کی جمع ہے چھوٹی چھوٹی کنکریوں کو کہتے ہیں۔اور ابن حجر کا اس کو یوم نحر کے ساتھ مقید کرنا غیر محل میں ہے کیونکہ باب کی روایات عام رمی پر دلالت کر رہی ہے اور جمار کی تفسیر جمرات سے بھی نہیں کی جائی گی کیونکہ اس کیلئے مستقل باب آرہا ہے۔

الفصل الاول:

حج کرنے سے پہلے حج کے احکامات سیکھنے ضروری ہیں

۲۶۱۸:عَنْ جَابِرٍ قَالَ رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَرْمِيْ عَلٰى رَاحِلَتِهٖ يَوْمَ النَّحْرِ وَيَقُوْلُ لِتَاْخُذُوْا مَنَاسِكَكُمْ فَإِنِّي لَا اَدْرِىْ لَعَلِّي لَا اَحُجُّ بَعْدَ حَجَّتِي هٰذِهٖ ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ۹۴۳/۲ الحديث رقم (۳۱۰۔ ۱۲۹۷)۔ وابوداؤد فى سننه ۴۹۵/۲ الحديث رقم ۱۹۷۰۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے نبی علیہ الصلوۃ والسلام کو اپنی سواری پر سوار ہو کر کنکریاں مارتے دیکھا قربانی کے دن اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرما رہے تھے کہ افعال حج سیکھو اس لیے کہ تحقیق میں نہیں جانتا ۔شاید میں اس حج کے بعد حج نہ کرسکوں۔اس کو امام مسلم رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :رأيت رسول الله ﷺ يرمى على راحلته يوم النحر:

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو شخص منیٰ میں سواری پر پہنچے تو اس کیلئے یہی مستحب ہے کہ وہ قربانی کے دن سوار ہو کہ جمرہ عقبہ پر کنکریاں مارے اور جو شخص منیٰ میں پیدل پہنچے تو وہ پیدل رمی کرے اور ایام تشریق کے پہلے دو دنوں میں تینوں جمرات پر پیادہ رمی کرے اور

تیرہویں تاریخ کو سوار ہو کر کنکریاں مارے۔ امام احمد اور اسحٰق فرماتے ہیں کہ قربانی کے دن پیادہ رمی کرنا مستحب ہے یہ قول علامہ طیبی نے ذکر کیا ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ ابراہیم ابن الجراح سے نقل کیا گیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں امام ابو یوسفؒ کے پاس اس بیماری کے وقت گیا جس میں ان کی وفات ہوئی۔ تو انہوں نے آنکھیں کھولی اور فرمایا کہ رمی سوار ہو کر افضل ہے یا پیادہ؟ پس جس رمی کے بعد وقوف نہ ہو تو وہ سوار ہو کر افضل ہے۔ پس میں ان کے ہاں سے چلا اور ابھی دروازے تک بھی نہیں پہنچا تھا کہ ان کی موت کی آواز سنلکی۔ پس مجھے اس حال میں ان کی علمی حرص پر تعجب آیا۔

فتاوی قاضی خان میں ہے کہ امام ابوحنیفہ اور امام محمد فرماتے ہیں کہ رمی سب کے سب سوار ہو کر افضل ہے (انتہیٰ) کیونکہ منقول ہے کہ آپ ﷺ نے ساری رمی سوار ہو کر کی ہے۔

اور امام ابو یوسف اس حدیث کو تعلیم پر محمول کرتے ہیں کہ آپ نے سوار ہو کر اس لیے رمی کی تا کہ لوگ آپ ﷺ کو دیکھ کر آپ ﷺ کی اقتدا کریں اور آپ ﷺ سے پوچھیں اور احکام حج سیکھ لیں۔ جیسا کہ آپ ﷺ کے سوار ہو کر طواف کے بارے میں یہ ذکر کیا گیا ہے۔

ظہیریہ نیں مطلقاً پیادہ پا کو مستحب قرار دیا ہے اور اگر سوار ہو کر چلائے جائے تو کوئی حرج نہیں ہے اور پیادہ پا چلنا افضل ہے اور اس کی الویت اس طرح ظاہر ہوتی ہے کہ جب ہم نے حدیث کو مذکورہ مطلب پر محمول کر لیا تو اب صرف عبادت کو ادا کرنا رہ گیا اور اس کی ادائیگی پیادہ پا خشوع اور عجز کے زیادہ قریب ہے۔ خصوصاً اس زمانے میں کیونکہ عام مسلمان اس زمانے میں پیادہ پا ہوتے ہیں پس ان کے درمیان سوار ہو کر کرنے سے کوئی تکلیف سے نہیں بچ سکتا۔

قوله :ویقول :لتاخذوا مناسککم فانی لاادری...... حجتی ھذا:

''**ویقول**'' رمی پر عطف ہے بس اس صورت میں یہ ''**علفت تبناً وماء بارداً**'' کے قبیل سے ہوگا۔ یا جملہ حالیہ ہے۔

''**لتاخذوا**'' میں لام، لام امر ہے یعنی **خذوا**۔ طیبی فرماتے ہیں کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لام تعلیل کیلئے اور معلل محذوف ہو اور تقریر یہ ہو یقول **انما فعلت لتأخذو عنی منا سککم**...... اور اول کی تائید **خذو عنی مناسککم** والی روایت سے ہوتی ہے۔

''**لا ادری**'' اس کا مفعول محذوف ہے یعنی **لا اعلم ماذا یکون**۔

''**حجتی**'' حاء کے فتحہ کے ساتھ اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ مصدر ہو اور سال کے معنی میں ہو۔

تخریج: بیہقی اور ابن عبدالبر نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے **انه** علیہ السلام **رمی ایّام التشریق ماشیاً**۔ بیہقی میں یہ بھی ذکر ہے اگر یہ روایت ہے تو پھر اس کی اتباع زیادہ اولیٰ ہے۔ اور دیگر حضرات نے کہا ہے کہ اس حدیث کو ترمذی وغیرہ نے صحیح کہا ہے۔ اور ابن عبدالبر کہتے ہیں: **وفعله جماعة من الخلفاء بعده، وعلیه العمل** اور تیرے۔ لئے کافی ہے۔ قاسم ابن محمد کی روایت کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ آپ ﷺ عرفہ کو کھڑے رہے، اور رمی سوار ہو کر کی اور یہ حدیث جابر سے لی گی ہے (انتہیٰ)۔ اور اس سے قربانی کے پہلے دن رمی جمرہ عقبہ مستثنیٰ ہے۔ **کما لا یخفی**۔

کنکریاں پھینکنے کا طریقہ

۲۶۱۹: وَعَنْهُ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ رَمَى الْجَمْرَةَ بِمِثْلِ حَصَى الْخَذَفِ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۹۴۴/۲ الحدیث رقم (۳۱۳۔ ۱۲۹۹)۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا منارے کو مارتے تھے خذف کی

کنکریوں کی طرح ۔یعنی چھوٹی چھوٹی کنکریوں کے ساتھ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :رمی الجمرة بمثل حصی الخذف:

چھوٹی چھوٹی کنکریاں جو لوبیا یا کھجور کی گٹھلی کے برابر ہوتی ہیں پس اس سے چھوٹی اور بڑی مکروہ ہیں کیونکہ بڑی کنکریوں سے ایک حدیث میں نہی آئی ہیں کہ آپ ﷺ نے کنکری اٹھا کر فرمایا اس طرح کنکری سے رمی کرو اور دین میں غلو سے بچو۔اسی وجہ سے ابن المنذ ر نے امام مالک کے اس قول الاکبر من حصی الخذف اعجب الی کہ میرے نزدیک بڑی کنکریاں زیادہ پسندیدہ ہیں۔تعجب کا اظہار کیا ہے لیکن ابن المنذ ر کے تعجب کی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ امام مالک رمی کی کنکریوں میں سے جو بڑی ہیں ان کو راجح قرار دیا ہے۔ اور حدیث میں غلو سے مراس رمی کی کنکریوں کے مقدار سے بڑی کنکریاں ہیں۔پھر امام مالک کے قول کی وجہ یہ ہے کہ یہ کنکریاں میزان میں زیادہ ثقیل ہونگی اور یا شیطان کیلئے زیادہ سخت ثابت ہوتی ہیں اور شارع نے چھوٹی کنکریوں کو بڑی کنکریوں سے پسند کیا ہے حالت ازدحام میں امت پر شفقت کی وجہ سے۔

ہدایہ میں ہے کہ کنکری انگوٹھے کی پشت پر رکھ کر شہادت کی انگلی کی مدد حاصل کرے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ یہ تفسیر ان دونوں تفسیروں کا احتمال رکھتی ہے جو رمی کے بارے میں کی گئی ہے ایک تفسیر یہ ہے کہ دائیں انگوٹھے کا سرا شہادت کی انگلی کے وسط پر رکھے اور کنکری انگوٹھے کی پشت پر رکھے یعنی ستر کی علامت بنائے اور پھر کنکری مارے اس تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ رمی دائیں ہاتھ سے مسنون ہے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ شہادت کی انگلی انگوٹھے سے ملا کر اس کے بند پر رکھے یعنی کہ دس کی علامت بنائے اور بعض نے یہ طریقہ بتایا کہ کنکری انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے سروں میں پکڑ کر مارے اور یہ طریقہ زیادہ صحیح اور آسان ہے،اور معناءً طریقہ بھی یہی ہے۔اور اس کی روایت نی دلیل آپ ﷺ کا یہ قول ہے: فارموا مثل حصی الخذف لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ رمی کی کیفیت، خذف کی کیفیت ہونی چاہیے بلکہ اس روایت کا مقصد کنکری کے مقدار کی تعین ہے۔

اور اگر جمرات کے پاس پڑی ہوئی کنکریوں سے رمی کی تو جائز ہے کیونکہ رمی پتھر کی صفت بالکل تبدیل نہیں کرتی کیونکہ وہ کنکریاں ان لوگوں کی ہوتی ہیں جن کا حج قبول نہیں ہوتا۔دارقطنی اور حاکم کی روایت میں ہے کہ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے کہا اللہ کے رسول ﷺ کہ یہ جمرات جن کو ہر سال ہم کنکریاں مارتے ہیں ہمارا خیال ہے کہ یہ کنکریاں کم ہو جاتی ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان میں سے جو قبول ہو جاتی ہیں وہ اٹھالی جاتی ہیں اگر اس طرح نہ ہوتا تو آپ یہاں کنکریوں کو پہاڑ کی طرح دیکھتے۔جیسا کہ شرح نقایہ للشمنی میں ہے۔

چاشت کے وقت کنکریاں مارنا

۲۶۲۰:وَعَنْهُ قَالَ رَمٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ الْجَمْرَةَ يَوْمَ النَّحْرِ ضُحًی وَاَمَّا بَعْدَ ذٰلِكَ فَاِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ ۔

(متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۵۷۹/۳۔ تعلیقاً۔ واخرجه مسلم فی ۹۴۵/۲ الحدیث رقم (۳۱۴۔ ۱۲۹۹)۔ وابوداؤد فی سننه ۴۹۶/۲ الحدیث رقم ۱۹۷۱ والترمذی فی ۲۴۱/۳ الحدیث رقم ۸۹۴۔ والنسائی فی ۲۷۰/۵ الحدیث رقم ۳۰۶۳۔ وابن ماجه فی ۱۰۱۴/۲ الحدیث رقم ۳۰۵۳۔ والدارمی ۸۵/۲ الحدیث رقم ۱۸۹۶۔ واحمد فی المسند ۳۱۹/۳۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے قربانی کے دن مناروں پر کنکریاں ماریں چاشت کے وقت اور قربانی کے دن جس وقت دوپہر ڈھلی اس وقت کنکریاں پھینکی۔

تشریح: ہدایہ میں ہے کہ اگر کوئی شخص کنکریاں پھینکے نہیں بلکہ ڈال دے تو یہ کافی ہو جائے گا۔

ابن ہمام کہتے ہیں کیونکہ ڈال دینے میں اسم رمی کی نفی نہیں ہے بلکہ اس میں رمی ہے مگر نقصان اور کمی کے ساتھ ہے پس یہ غیر پسندیدہ ہے برخلاف رکھنے کے کہ اس طرح کافی نہ ہوگا کیونکہ اس میں حقیقت رمی بالکلیہ ختم ہو جاتی ہے۔

''**ضحی**''ضحی دن کے اس حصے کو کہتے ہیں جو طلوع آفتاب کے بعد سے زوال آفتاب سے پہلے تک ہو۔

''**ما بعد ذلك**''یعنی یوم نحر کے بعد اور وہ ایام تشریق ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ دوسرے دن یعنی گیارہوں تاریخ کو رمی جمار کا وقت زوالِ آفتاب کے بعد ہوتا ہے اس طرح تیسرے دن بھی۔

اور امام ابوحنیفہؒ سے غیر مشہور روایت میں منقول ہے کہ مجھے دوسرے اور تیسرے دن زوال آفتاب سے پہلے رمی جمار پسند نہیں اگر کسی نے اس سے پہلے رمی کر لی تو جائز ہو جائیگی اور آپ ﷺ کے فعل کو افضلیت ہے کہ ہم انتظار کرتے تھے پس جب زوال آفتاب ہو جاتا تو ہم رمی کرتے۔ پس اس سے پہلے ایک دن کی رمی بھی جائز نہیں ہے بالا جماع جیسا کہ علامہ ماوردی کا خیال ہے لیکن اس پر اعتراض وارد ہوتا ہے کہ امام حرمین وغیرہ نے ائمہ سے اس کا جواز نقل کیا ہے۔

اور ابوداؤد نے ابن اسحٰق کی حدیث نقل کی ہے جو ابن اسحٰق نے عائشہؓ تک پہنچائی ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ یوم نحر کو لوٹے جب ظہر کی نماز پڑھی اور پھر منیٰ کی طرف لوٹے پس تشریق کے ایام وہاں ٹھہرے اور رمی جمار کرتے رہے زوال آفتاب کے بعد منذری کہتے ہیں کہ حدیث حسن ہے اور اس کو صحیح ابن حبان میں بھی روایت کیا ہے۔اسی طرح ذکر کیا ہے ابن ہمام نے۔

ملاعلی قاری فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں دلیل ہے اس پر کہ آپ ﷺ نے یوم نحر کو ظہر کی نماز مکہ میں پڑھی: **فی الجملہ** رمی نماز ظہر سے پہلے مسنون ہے اگر نماز کے فوت ہونے کا خطرہ نہ ہو جیسا کہ اس پر ابن عمر کی حدیث جو بخاری و ابن ماجہ میں ہے دلالت کرتی ہے۔

ہدایہ میں ہے کہ چوتھے دن زوال سے قبل رمی کرنا امام ابوحنیفہ کے نزدیک جائز ہے اور صاحبین کے نزدیک جائز نہیں ہے اور امام ابوحنیفہ کا مذہب ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے۔

ابن ہمام کہتے ہیں کہ بیہقی کی روایت میں ہے: **اذا انتفخ النهار من يوم النفر فقد حل الرمی والصدور. انتفاخ** بمعنی **ارتفاع** ہے اس حدیث کی سند میں طلحہ بن عمرو ہے جس کو بیہقی نے ضعیف قرار دیا ہے۔

اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ رمی کے وقت کے تعین میں پہلے دن شروع دن میں رمی کرے اور اس کے بعد والے ایام میں زوال کے بعد کرے۔ معتمد صرف آپ ﷺ کا فعل ہے باوجود یہ کہ یہ غیر معقول ہے۔ پس رمی کا وقت داخل نہیں ہوتا اس وقت سے پہلے جس میں آپؐ نے رمی کی ہے جیسا کہ رمی اس جگہ کے علاوہ میں جائز نہیں ہے جس جگہ آپ ﷺ نے رمی کی ہے۔

اور آپ ﷺ نے چوتھے دن زوال کے بعد رمی کی ہے پس اس سے پہلے رمی نہ کی جائے۔

اللہ اکبر کہہ کر کنکریاں پھینکنا

۲۶۲۱: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّهٗ اِنْتَهٰى اِلَى الْجَمْرَةِ الْكُبْرٰى فَجَعَلَ الْبَيْتَ عَنْ يَسَارِهٖ وَمِنًى عَنْ يَمِيْنِهٖ وَرَمٰى بِسَبْعِ حَصَيَاتٍ يُكَبِّرُ مَعَ كُلِّ حَصَاةٍ ثُمَّ قَالَ هٰكَذَا رَمٰى الَّذِيْ اُنْزِلَتْ عَلَيْهِ سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ۔

(متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۵۸۰/۳۔ الحدیث رقم ۱۷۴۹۔ ومسلم فی صحیحه ۹۴۲/۲ الحدیث رقم (۳۰۵۔ ۱۲۹۶)۔ وابوداؤد فی السنن ۴۹۷/۲ الحدیث رقم ۱۹۷۴ والترمذی ۲۴۵/۳ الحدیث رقم ۹۰۱۔ والنسائی فی ۲۷۴/۵ الحدیث رقم ۳۰۷۲ وابن ماجه فی ۱۰۰۸/۲ الحدیث رقم ۳۰۳۰۔ واحمد فی المسند ۴۵۸/۱۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ وہ جمرہ کبری کی طرف پہنچے۔یعنی جمرۃ العقبیٰ کے پاس اس طرح کہ خانہ کعبہ اپنے بائیں طرف کیا اور منی کو اپنے دائیں طرف اور اللہ اکبر کہہ کر کنکریاں پھینکیں اور ہر کنکری کے ساتھ اللہ اکبر کہا۔ پھر ابن مسعودؓ نے کہا کہ اسی طرح سے کنکریاں پھینکیں اس شخص نے کہ اتاری گئی ان پر سورۃ بقرہ یعنی آنحضرت۔اس کی امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله :انتهی الی الجمرة الکبری ......مع کل حصاة:** **"الجمرة الکبری"**:جمرہ کبریٰ سے مراد جمرہ عقبہ ہے اور علامہ طیبی کو وہم ہوا ہے کہ اس سے مراد وہ جمرہ ہے جو مسجد خیف کے پاس ہے۔اور صحیح وہی ہے جو ہم نے کہا ہے۔

دوسرے جمرات پر اس طرح کھڑا ہونا مستحب ہے کہ منہ قبلہ کی طرف ہو اور اس سے بعض شوافع کے اس قول کا جواب بھی ہوا کہ جمرہ کی طرف منہ اور کعبہ کی طرف پیٹھ کی جائے اور ان میں سے بعض کا قول ہے کہ کعبہ کی طرف منہ کرے اور جمرہ دائیں طرف ہو ان کا استدلال ترمذی کی اس حدیث سے ہے جس کو ترمذی نے صحیح کہا ہے اور جمہور نے شیخین کی مذکورہ حدیث لی ہے۔

"یکبر مع کل حصاة": یہ بخاری کی روایت **"انه علیه الصلاة والسلام کان یکبر فی رمی ایّام التشریق علی اثر کل حصاة** کے منافی نہیں ہے کیونکہ تعقیب،معیت کے منافی نہیں ہے۔جیسا کہ ﴿**اسلمت مع سلیمان**﴾[النمل:۴۴] میں ہے۔

بیہقی کی روایت کے مطابق آنحضرت ﷺ ہر کنکری کے ساتھ اس طرح تکبیر کہتے تھے۔ **اللہ اکبر اللہ اکبر، اللهم اجعله حجا مبرور، وذنبًا مغفورا وعملا مشکورًا۔**

قوله :هکذا رمی الذی انزلت علیه سورة البقرة:

"رمی":فعل ہے اور ایک نسخہ میں بالمصدر ہے۔

"علیه": علیہ کی ضمیر سے مراد آپ ﷺ کی ذات ہے اور اس سے ضمیر کی طرف عدول اور دیگر اوصاف کا ذکر زیادہ تقریر اور اہتمام فعل کیلئے ہے جیسا کہ اللہ کے اس قول میں ہے ﴿**وراودته التی هو فی بیتها**﴾[یوسف:۲۳] (انتہی) لیکن یہ اس وقت درست ہو سکتا ہے جب قال کی ضمیر نبی ﷺ کی طرف راجع ہو حالانکہ معاملہ ایسا نہیں ہے۔

"سورة البقرة": سورہ بقرہ کا ذکر اس مناسبت سے کیا گیا ہے کہ اس سورت میں حج کے احکام و افعال زیادہ مذکور ہیں۔

کنکریاں پھینکنے کا طریقہ

۲۶۲۲: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلِاسْتِجْمَارُ تَوٌّ وَرَمْیُ الْجِمَارِ تَوٌّ وَالسَّعْیُ بَیْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ تَوٌّ وَالطَّوَافُ تَوٌّ وَاِذَا اسْتَجْمَرَ اَحَدُکُمْ فَلْیَسْتَجْمِرْ بِتَوٍّ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۹۴۵/۲ الحدیث رقم (۳۱۵۔ ۱۳۰۰)۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ استنجا طاق ہے یعنی تین ڈھیلے کے ساتھ اور طاق عدد کنکریاں پھینکے یعنی سات کنکریاں پھینکے صفا اور مروہ کے درمیان سات چکر لگائے اور خانہ کعبہ کے گرد چکر لگانا بھی طاق ہے یعنی سات بار چکر لگائے اور جس وقت تم میں سے کوئی دھونی لے تو اس کو چاہیے کہ طاق مرتبہ لے۔

یعنی تین مرتبہ یا پانچ مرتبہ یا سات مرتبہ۔اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :الاستجمار تو......والطواف تو:

''توّ'' تاء کے فتحہ اور واو کی تشدید کے ساتھ،فرد کے معنی میں ہے۔

استنجاء میں فردیت یعنی طاق تین کے ساتھ ہے اور اس کے علاوہ سات کے ساتھ ہے۔جمرات پر کنکریاں پھینکنا واجب ہے اسی طرح صفا و مروہ کے درمیان سعی واجب ہے اور جمہور علماء کے نزدیک ایک طواف کیلئے خانہ کعبہ کے گرد سات چکر فرض ہیں جبکہ حنفیہ کے ہاں چار چکر تو فرض ہیں اور باقی واجب ہیں۔

قوله :واذا استجمر احدكم: استجمار سے مراد دھونی لینا ہے۔کیونکہ وہ بھی انگارے پر لکڑی رکھنے سے ہوتی ہے اور اس سے تکرار ختم ہو جاتا ہے اور یہ قاضی عیاض کے قول کہ دول سے مراد فعل ہے اور ثانی سے مراد پتھروں کی تعداد ہے سے بہتر ہے اور ابن حجر نے تکلف بلکہ تعسف سے کام لیا ہے کہ اس کی تقدیر یوں ہے:''اذا استجمد احدكم وانقٰى بشفع فليستجمر بتو، فليضم الى الشفع واحدة حتى يحصل فضيلة الوتر''یعنی کہ جب تم میں سے کوئی استنجاء کرے اور جفت عدد سے صفائی کرے تو پھر طاق کی فضیلت حاصل کرنے کیلئے جفت کے ساتھ ایک اور پتھر ملائے اور پھر خوشی کا اظہار کیا کہ اس کی وجہ سے تکرار سے خلاصی ہوئی۔

الفصل الثانی:

حضور ﷺ نے اُونٹنی پر سوار ہو کر رمی فرمائی (جمرۃ العقبہ کی)

۲۶۲۳:وَعَنْ قُدَامَةَ ابْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمَّارٍ قَالَ رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَرْمِي الْجَمْرَةَ يَوْمَ النَّحْرِ عَلٰى نَاقَةٍ صَهْبَاءَ لَيْسَ ضَرْبٌ وَلاَ طَرْدٌ وَلَيْسَ قِيْلَ اِلَيْكَ اِلَيْكَ۔ (رواه الشافعی والترمذی والنسائی وابن ماجة والدارمی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۲۴۷/۳ الحديث رقم ۹۰۳۔ والنسائی فی ۲۷۰/۵ الحديث قم ۳۰۶۲۔ وابن ماجه ۱۰۰۹/۲ الحديث رقم ۳۰۳۵۔ والدارمی ۸۷/۲ الحديث رقم ۱۹۰۱۔ واحمد فی المسند ۴۱۲/۳۔ ۴۱۳۔

ترجمہ: قدامہ بن عبداللہ بن عمارؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ وہ کنکریاں پھینکتے تھے قربانی کے دن جمرۃ العقبی پر۔صہباء اونٹنی پر سوار ہو کر اس جگہ مارنا نہ تھا اور نہ ہانکنا اور نہ یہ کہنا کہ ایک طرف ہو جاؤ۔اس کو امام شافعیؒ نے نقل کیا ہے اور ترمذیؒ اور نسائیؒ نے ابن ماجہؒ اور دارمیؒ نے۔

تشریح: ''صهباء''جس کی رنگت کی سفید سرخی آمیز ہو یا اس طور کہ بالوں کے سرے اوپر سے سرخ اور نیچے کی طرف سفید ہو۔طیبی کہتے ہیں:الصهبة كالشقرة۔

قوله :وليس قيل اليك اليك:''قيل''لام کے فتحہ کے ساتھ اور قاف کے کسرہ کے ساتھ اليك اليك کی طرف مضاف ہے۔

''اليك اليك''بمعنی تنح و تبعد ،ابن حجر فرماتے ہیں کہ تکرار تاکید کیلئے ہے اور یہ اسم فعل ہے بمعنی تنح عن الطريق پس اس کیلئے متعلق کی ضرورت نہیں ہے جیسا کہ علامہ طیبیؒ نے نقل کیا ہے اپنے اس قول سے:ضم اليك ثوبك وتنح عن الطريق۔

۲۶۲۴:وَعَنْ عَائِشَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ اِنَّمَا جُعِلَ رَمْىُ الْجِمَارِ وَالسَّعْىُ بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ لِاِقَامَةِ ذِكْرِ اللّٰهِ۔ (رواه الترمذی والدارمی وقال الترمذی هذا حديث حسن صحيح)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۴۴۷/۲ الحديث رقم ۱۸۸۸۔ والترمذی فی ۲۴۶/۲ الحديث رقم ۹۰۲۔ والدارمی فی ۷۱/۲

الحدیث رقم ۱۸۵۳۔ واحمد فی المسند ۱۳۹/۶۔

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا مناروں کا مارنا مقرر نہیں کیا گیا اور صفا اور مروہ کے درمیان چکر لگانا مگر خدا کی یاد کو قائم کرنے کے لیے۔ یہ ترمذیؒ اور دارمیؒ اور امام ترمذیؒ نے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ ان بابرکت مواضع میں اللہ کا ذکر کیا جائے پس ان مواضع میں ذکر سے غافل رہنے سے بچنا چاہیے۔ تمام عبادات سے مقصود اللہ کے ذکر کا قیام ہے۔ پھر ان کو مخصوص اس لیے کیا کہ ظاہری طور پر یہ فعل ایسے ہیں کہ ان کا عبادت ہونا معلوم نہیں ہوتا اس لیے فرمایا کہ یہ دونوں فعل اللہ تعالیٰ کے ذکر کو قائم کرنے کیلئے مقرر ہوئے ہیں۔ بخلاف بیت اللہ کے گرد طواف اور دعاء کیلئے وقوف کرنا کیونکہ ان میں عبادت کا اثر ظاہر ہے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ رمی جمار اور صفا و مروہ کی سعی سنت قرار دی گئی ہے اللہ کے ذکر قائم کرنے کیلئے یعنی کہ تکبیر کہنا سنت ہے، ہر کنکری پھینکنے کے ساتھ اور سعی میں وہ دعائیں جو ذکر ہوئیں سنت ہیں اور یہ بھی بعید نہیں ہے کہ رمی اور سعی میں سے ہر ایک کی ظاہری وجہ بھی ہو۔

علامہ طیبیؒ نے حدیث ذکر کی ہے: ''ان آدم علیه الصلاة والسلام رمی ابلیس بمنیٰ فاجمر بین یدیه''

''آدم علیہ السلام نے ابلیس کو منیٰ میں پتھر سے مارا تو وہ ان کے سامنے بھاگا تو اس کا نام الجماریہ رکھا گیا۔''

اور منقول ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے کے ذبح کا ارادہ کیا تو ابلیس جمرہ اولیٰ کے پاس ان کے سامنے آیا اور ان کو پھسلانے کی کوشش کی تا کہ وہ ذبح نہ کریں تو ابراہیم علیہ السلام نے اس کو سات کنکریاں ماری یہاں تک کہ وہ دھنس گیا۔ اس سے پہلے دن صرف جمرہ عقبہ پر اکتفاء کرنے کی حکمت ظاہر ہوتی ہے کہ رمی کرنے والے کا فعل اس پر حمل ہوگا کہ آدم علیہ السلام نے اس مقام پر رمی کی تھی اور باقی تین ایام میں ابراہیم علیہ السلام کی اتباع میں یا ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹے اور بیوی ہاجرہ کی اتباع میں رمی کرتے ہیں کہ ابلیس لعین نے مواضع ثلاثہ میں ان کے دلوں میں وسوسے ڈالے۔

اور سعی کے معقول المعنی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں ام اسماعیل علیہ السلام حضرت ہاجرہؓ کے عمدہ کردار کا احیاء ہے کیونکہ ابراہیم علیہ السلام جب ان دونوں کو مکہ لے کر آئے اور وہاں چھوڑ کر شام کی طرف روانہ ہونے لگے تو ہاجرہ نے ان سے کہا: ''الی من تترکنا اللہ امرك بذلك؟'' ہمیں کس کے پاس چھوڑ کر جا رہے ہو کیا اللہ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے؟ تو ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا جی ہاں، تو ہاجرہ نے کہا پس وہ اللہ ہمیں ضائع نہیں کریں گے۔ پھر ان کے پاس پانی ختم ہو گیا تو ہاجرہ کو پیاس کی وجہ سے اپنے بچے کے ہلاک ہونے کا خوف پیدا ہوا تو بچے کو زمزم کی جگہ چھوڑ کر پانی کی تلاش میں نکل گئی اور دیکھنے لگی کسی پانی لیجانے والے کو پس صفا پر چڑھ گئی تو کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ وہاں سے اتر کر مروہ کی طرف دوڑی پس مروہ پر چڑھ کر بھی کچھ نظر نہیں آیا مروہ سے پھر اتری اور صفا کی طرف دوڑنے لگی اس طرح سات چکر لگائے۔ پھر بچے کے پاس گئی تو اس کے پاس پانی دیکھا جو جبریل علیہ السلام کے پر مارنے سے ظاہر ہوا تھا۔ یا اسماعیل علیہ السلام کے پاؤں مارنے سے ظاہر ہوا گیا تھا۔ پس ہاجرہ پانی کو جمع کرنا شروع ہو گئیں اور کہہ رہی تھی ''زم زم'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یرحم اللہ ام اسماعیل لو ترکته لصار عینا معیناً'' اللہ اسماعیل کی ماں پر رحم فرمائیں اگر وہ زمزم کو اپنے حال پر چھوڑ تو آج وہ جاری چشمہ ہوتا۔

منیٰ کی جگہ سب لوگوں کے لیے برابر ہے

۲۶۲۵: وَعَنْهَا قَالَتْ قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَلَا نَبْنِي لَكَ بِنَاءً يُظِلُّكَ بِمِنًى قَالَ لَا مِنًى مُنَاخُ مَنْ سَبَقَ۔

(رواه الترمذی وابن ماجة والدارمی)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۵۲۱/۲ الحدیث رقم ۲۰۱۹۔ وابن ماجه فی ۱۰۰۰/۲ الحدیث رقم ۳۰۰۷۔ والدارمی

٢/١٠٠ الحديث رقم ١٩٣٧۔ واحمد فى المسند۔

ترجمه: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ہم نے کہا اے اللہ کے رسول! کیا ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمارت نہ بنا دیں کہ وہ آپ کو منیٰ میں سایہ کرے فرمایا نہیں ۔منی اس شخص کے اونٹ بٹھانے کی جگہ ہے جو پہلے پہنچے ۔اس کو امام ترمذیؒ اور ابن ماجہ اور دارمیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ''نبنی ''متکلم کا صیغہ ہے۔''مناخ'' بضم الیم بمعنی موضع الإناخة۔

مطلب یہ ہے کہ صحابہ نے عرض کیا کہ اللہ کے رسول ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے کوئی ایسی عمارت نہ بنائیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے سایہ ہو اور وہ عمارت ہمیشہ کیلئے آپ کی ہو کیونکہ خیمے کا سایہ کمزور ہوتا ہے وہ دھوپ کو مکمل طور پر نہیں روکتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ منیٰ میں پہنچنے کی خصوصیت سبقت کے ساتھ ہے مکان بنانے یا کوئی جگہ متعین کرنے کے ساتھ نہیں ہے یعنی منیٰ میں کسی کیلئے کوئی جگہ متعین نہیں ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ میں تعمیر کی ممانعت کی علت یہ بیان فرمائی ہے کہ منیٰ افعال حج یعنی نحر، رمی جمار، حلق وغیرہ کی جگہ ہے جس میں تمام لوگ برابر کے شریک ہیں۔اگر اس میں کوئی تعمیر کی جائے تو اس کی اقتداء میں تعمیرات زیادہ ہو جائیں گی اور لوگوں کیلئے احکام حج کی ادائیگی میں تنگی پیدا ہو جائی گی۔اور یہی حکم سڑکوں اور بازاروں کا ہے اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک حرم کی زمین وقف ہے اس کا کوئی مالک نہیں بن سکتا۔

علامہ خطابی فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں اپنے لیے اور مہاجرین کیلئے تعمیر کی اجازت اس لیے نہیں دی کہ وہ ایسی جگہ ہے جہاں سے آپ اللہ کیلئے ہجرت کر چکے تھے تو آپ یہ پسند نہیں کر رہے تھے کہ پھر وہاں لوٹے اور مکان بنائیں (انتہی) لیکن علامہ خطابی کی یہ تعلیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیل کے خلاف ہے اور اس کے ساتھ منیٰ ایسی جگہ بھی نہیں ہے جہاں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور صحابہ نے ہجرت کی تھی۔

الفصل الثالث:

ابن عمر رضی اللہ عنہما کے وقوف کا ذکر

٢٦٢٦: عَنْ نَافِعٍ قَالَ اِنَّ ابْنَ عُمَرَ كَانَ يَقِفُ عِنْدَ الْجَمْرَتَيْنِ الْاُوْلَيَيْنِ وُقُوفًا طَوِيْلاً يُكَبِّرُ اللّٰهَ وَيُسَبِّحُهُ وَيَحْمَدُهُ وَيَدْعُوْ اللّٰهَ وَلَا يَقِفُ عِنْدَ جَمْرَةِ الْعَقَبَةِ . (مالك الموطا)

اخرجه مالك فى الموطأ ٤٠٧/١ الحديث رقم ٢١٢ من كتاب الحج۔

ترجمه: حضرت نافعؒ سے روایت ہے کہ تحقیق ابن عمر رضی اللہ عنہ لمبا ٹھہرنے سے یعنی زیادہ دیر ٹھہرنے سے پہلے دو مناروں کے پاس ٹھہرتے اور اللہ اکبر کہتے اور سبحان اللہ کہتے اور الحمد اللہ کہتے اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے یعنی ہاتھ اٹھا کر اور جمرة العقبہ کے نزدیک نہ ٹھہرتے ۔اس کو امام مالکؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله : كان يقف عند الجمرتين الاوليين وقوفا طويلا:

''الجمرتين الاوليين'': علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ پہلے دو مناروں سے مراد عظمیٰ اور وسطیٰ ہے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ صحیح اولیٰ اور وسطیٰ ہے کیونکہ آگے ''اُولین'' ہے دونوں کو اولیٰ کہنا تغلیباً ہے۔اور اولیٰ سے مراد وہ منارہ ہے جو مسجد خیف کے قریب ہے اور باقی عظمیٰ اور کبریٰ، جمرہ عقبہ کے اوصاف میں سے ہے۔

''وقوفا طويلا'': مدت وقوف سورہ بقرہ جتنی دیر میں پڑھی جاتی ہے اتنی دیر ہے جیسا کہ بیہقی نے ابن عمر رضی اللہ عنہ کا فعل نقل کیا ہے۔

اور دعاء ہاتھ اٹھا کر کرے۔ ابن منذر کہتے ہیں کہ اس موقع پر دعاء میں رفع کا امام مالک کے علاوہ کوئی منکر نہیں ہے اور اتباع سنت اولیٰ ہے جیسا کہ بخاری نے روایت کیا ہے۔

قولہ : ولایقف عند جمرة العقبة: اور جمرہ عقبہ کے پاس نہ ٹھہرنے سے دعاء کا بالکلیہ ترک کرنا لازم نہیں آتا جیسا کہ عام لوگوں کا خیال ہے۔

بَابُ الْهَدْيِ

ہدی کا بیان

''ھدی'' ھاء کے فتحہ اور دال کے سکون کے ساتھ ہے۔ ان چوپایوں کو کہتے ہیں جو حرم لیجائے جاتے ہیں وہ بکری ہو یا گائے اور اونٹ ہو۔ اس کا واحد ھدیۃ ہے۔ شیخین نے روایت کیا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے موقع پر سو اونٹ بطور ہدی لے کر گئے تھے اور ایک روایت میں منقول ہے کہ عمرہ حدیبیہ میں ستر اور عمرۃ القضاء میں ساٹھ اونٹ لے کر گئے تھے۔

الفصل الاول:

ہدی کو قلادہ پہنانا' جائز ہے

۲۶۲۷: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ صَلّٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ الظُّهْرَ بِذِی الْحُلَيْفَةِ ثُمَّ دَعَا بِنَاقَتِهٖ فَاَشْعَرَهَا فِیْ صَفْحَةِ سَنَامِهَا الْاَيْمَنِ وَسَلَتِ الدَّمَّ عَنْهَا وَقَلَّدَ هَا نَعْلَيْنِ ثُمَّ رَكِبَ رَاحِلَتَهٗ فَلَمَّا اسْتَوَتْ بِهٖ عَلَی الْبَيْدَاءَ اَهَلَّ بِالْحَجِّ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۹۱۲/۲ الحدیث رقم (۲۰۵۔ ۱۲۴۳)۔ وابوداؤد فی السنن ۳۶۲/۲ الحدیث رقم ۱۷۵۲۔ والترمذی فی ۲۴۹/۳ الحدیث رقم ۹۰۶ والنسائی فی ۱۷۰/۵ الحدیث رقم ۲۷۷۴۔ والدارمی فی ۹۱/۲ الحدیث رقم ۱۹۱۲۔ واحمد فی المسند ۲۱۶/۱۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز ذی الحلیفہ میں پڑھی' پھر اونٹنی منگوائی پھر اونٹنی کو زخم کیا۔ داھنی کوہان کے کنارے میں اور خون صاف کر دیا اور گلے میں ہار ڈال دو جوتیوں کا پھر اپنی اونٹنی پر سوار ہوئے کہ اس کا نام قصوا تھا پس جب اونٹنی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اٹھایا اور بیداء جگہ پر پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے لیے لبیک کہا۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ :صلی رسول اللہ ﷺ الظھر بذی الحیفة ،ثم دعابناقته:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذوالحلیفہ میں دو رکعت نماز پڑھی کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسافر تھے اور احرام کی دو رکعتوں کیلئے بھی اس پر اکتفا کیا جیسا کہ ابن جوزی نے ذکر کیا ہے یا یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام کیلئے الگ دو رکعت نماز پڑھی۔

قولہ :فاشعرھا فی صفحة سنامھا الایمن......وقلدھا نعلین: ''سنامھا'' سین کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

اشعار کہتے ہیں کہ کوھان کی ایک جانب کو زخمی کرنا اس طور پر کہ اس سے خون نکل جائے یہ اس امر کی علامت ہوتی ہے کہ یہ ہدی کا

جانور ہے۔ تاکہ لوگ اس سے تعرض نہ کرے اور اگر یہ جانور راستہ بھٹک جائے تو لوگ اس کو اس کی جگہ پہنچا دیں۔
یہ زمانہ جاہلیت کی عادت تھی چنانچہ شارع علیہ السلام نے بھی اس طریقے کو مذکورہ مقصد کے تحت جائز رکھا۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اشعار بدعت ہے کیونکہ یہ مثلہ ہے لیکن احادیث صحیحہ اس قول کو رد کرتی ہے۔ اور یہ مثلہ نہیں ہے بلکہ یہ نشتر لگانے، پچھنے پیچھے لگوانے، ختنہ کرنے اور داغنے کی طرح ہے پس سنت طریقہ دائیں جانب میں اشعار کرنا ہے اور امام مالک فرماتے ہیں کہ بائیں جانب کرے اور یہ حدیث ان پر حجت ہے اور ایک روایت میں ''الایسر'' کے لفظ کے ساتھ آیا ہے۔
امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اشعار مکروہ ہے علماء نے اس قول کی یہ تاویل کی ہے کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے زمانہ کے اشعار کو مکروہ قرار دیا تھا کیونکہ اس وقت لوگ ہدی کو بہت زیادہ زخمی کر دیتے تھے جس سے زخم کے سرایت کر جانے کا خوف ہوتا تھا۔
قولہ :اھل بالحج: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج اور عمرہ دونوں کیلئے لبیک کہا تھا۔ کیونکہ صحیحین میں حضرت انسؓ سے منقول ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حج اور عمرہ کیلئے لبیک کہتے سنا چنانچہ اس موقع پر راوی نے **یلبی بالعمرہ** کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ اصل چونکہ حج ہی ہے اس لیے صرف حج پر اکتفا کیا یا یہ کہ راوی نے صرف حج کو سنا عمرہ نہیں سنا' یا عمرہ کا ذکر بھول گیا تھا۔

ہدی کے گلے میں ہار ڈالنا جائز ہے

۲۶۲۸:وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اَهْدٰى النَّبِيُّ ﷺ مَرَّةً اِلَى الْبَيْتِ غَنَمًا فَقَلَّدَهَا۔ (متفق علیہ)

اخرجه مسلم فی صحيحه ۹۵۸/۲ الحديث رقم (۳۶۷۔ ۱۳۲۱)۔ وابن ماجه فی السنن ۱۰۳۴/۲ الحديث رقم ۳۰۹۶۔ واحمد فی المسند ۴۲/۶۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدی بھیجی ایک مرتبہ خانہ کعبہ کی طرف بکریاں' پھر ان کے گلے میں ہار ڈالا۔ اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔
تشریح: علامہ طیبیؒ کہتے ہیں کہ تمام علماء اس بات پر متفق ہیں کہ بکریوں میں اشعار کرنا مشروع نہیں ہے البتہ ان کے گلے میں ہار ڈالنا سنت ہے لیکن اس بارے میں امام مالک کا اختلافی قول ہے اور امام شافعیؒ کے نزدیک گائے میں اشعار ہے۔

ہدی دینے کا جواز

۲۶۲۹:وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ ذَبَحَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ عَائِشَةَ بَقَرَةً يَوْمَ النَّحْرِ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ۹۵۶/۲ الحديث رقم (۳۵۶۔ ۱۳۱۹)۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے ایک گائے قربانی کے دن ذبح کی۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔
تشریح: ایک روایت میں: ''وضحیٰ عن نسائه بالبقرة'' ہے یعنی چاشت کے وقت ذبح کیا۔
یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور تمام بیویوں کی طرف سے قربانی کی جیسا کہ آنے والی روایت میں ہے۔
یہ بھی احتمال ہے کہ صرف حضرت عائشہ کی طرف سے ایک گائے ذبح کی ہو اور ایک گائے باقی ازواج کی طرف سے، حضرت عائشہ کا امتیاز ظاہر کرنے کیلئے۔
شاید گائے کو ترجیح اس لیے دی کہ فی الوقت میسر ہی یہ تھی ورنہ افضل اونٹ کی قربانی ہے یہ بات ابن حجر نے ذکر کی ہے اور زیادہ

ظاہر یہ ہے کہ یا تو یہ بیان جواز کیلئے کیا ہے اور یا بڑے اور چھوٹے کے درمیان فرق کیلئے۔

٢٦٣٠: وَعَنْهُ قَالَ نَحَرَ النَّبِيُّ ﷺ عَنْ نِسَائِهِ بَقَرَةً فِي حَجَّتِهِ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ٩٥٦/٢ الحديث رقم (٣٥٧۔ ١٣١٩)۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی بیویوں کی طرف سے ایک گائے ذبح کی اپنے حجۃ الوداع میں اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: علامہ طیبیؒ کہتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر محمول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی ازواج کی اجازت سے قربانی کی ہوگی کیونکہ دوسرے کی طرف سے قربانی اس کی اجازت کے بغیر جائز نہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ نفلی قربانی ہو جیسا کہ آپ ﷺ نے اپنی امت کی طرف سے قربانی کی تھی اور حدیث اس بات پر دلالت نہیں کر رہی ہے کہ یہ واجب قربانی تھی۔ علاوہ ازیں حاجی پر قربانی واجب بھی نہیں ہے خاص کر کے مسافر پر ہمارے نزدیک۔

بُدنہ کو ہار پہنانا جائز ہے

٢٦٣١: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ فَتَلْتُ قَلَائِدَ بُدْنِ النَّبِيِّ ﷺ بِيَدَيَّ ثُمَّ قَلَّدَهَا وَاَشْعَرَهَا وَاَهْدَاهَا فَمَا حَرُمَ عَلَيْهِ شَيْءٌ كَانَ اُحِلَّ لَهٗ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ٥٤٢/٣۔ الحديث رقم ١٦٩٦۔ ومسلم في صحيحه ٩٥٩/٢ الحديث رقم (٣٦٩۔ ١٣٢١)۔ والنسائي ١٧٥/٥ الحديث رقم ٢٧٩٣۔ ومالك في الموطأ ٣٤٠/١ الحديث رقم ٥١ من كتاب الحج۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے ہار بٹے نبی کریم ﷺ کے اونٹوں کے اور اپنے ہاتھ ان کے گلے میں ڈالے اور ان کو زخمی کیا یعنی ان کے کوہانوں کو داغا اور ان کو ہدی بنا کر خانہ کعبہ کی طرف بھیجا۔ یعنی جب نویں سال حج فرض ہوا۔ تو حضور ﷺ نے ابوبکر صدیق کو حاجیوں کا امیر بنا کر بھیجا اور ان کے ساتھ ہدی کے اونٹ بھیجے۔ پس حضور ﷺ پر کوئی چیز حرام نہ ہوئی۔ جو چیز کہ حلال کی گئی تھی۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ''القلائد'' قلادۃ کی جمع ہے اس چیز کو کہتے ہیں جو جانور کے گلے میں ڈالا جاتا ہے۔

''البدن'' بدنۃ کی جمع ہے اس گائے یا اونٹ کو کہتے ہیں جسے مکہ میں ذبح کیا جائے۔ وجہ تسمیہ یہ ہے کہ لوگ اس اونٹ کو خوب فربہ کرتے تھے۔ ''حرم'' حاء کے فتحہ اور راء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

حضرت عائشہؓ نے یہ بات اس لیے فرمائی کہ ان تک ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ فتویٰ پہنچ گیا تھا کہ وہ کہتے ہیں جو شخص خود حج کو نہ جائے اور اپنی طرف سے ہدی مکہ بھیجے تو اس پر وہ تمام چیزیں جو کہ محرم پر حرام ہوتی ہے اس وقت تک کیلئے حرام ہے جب تک کہ اس کی ہدی حرم میں پہنچ کر ذبح نہ ہو جائے۔ تو حضرت عائشہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس قول کی تردید میں یہ بات کی جیسا کہ ہمارے بعض علماء نے اس کو ذکر کیا ہے اور اسی طرح یہ رد ہے ابن عمر، عطاء، مجاہد اور سعید بن جبیر کے قول کا بھی۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں چونکہ ہدی بھیجنے والا محرم نہیں بنتا لہٰذا اس وجہ سے اس پر کوئی چیز بھی حرام نہ ہوگی۔ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا گیا ہے کہ وہ محظورات احرام سے اجتناب کیا کرتے تھے اور خطابی کا اس کی نسبت اصحاب رائے کی طرف کرنا غلط ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ صحاح ستہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث منقول ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے اون جو ہمارے پاس تھی اپنے ہاتھ سے ان اونٹوں کیلئے پٹے بنائے جو اونٹ آپ ﷺ نے مکہ بھیجے اور پھر آپؐ ہمارے پاس حلال ہو کر رہے وہ

فعل کرتے جو ایک مرد اپنی گھر والی سے کرتا ہے اور صحیحین کی روایت میں ہے کہ مسروق حضرت عائشہ کے پاس آئے اور ان سے کہا اے امّ المؤمنین ایک آدمی کعبہ ہدی بھیجتا ہے اور خود اپنے شہر میں بیٹھ کر یہ وصیت کر لیتا ہے کہ اس کے ہدی کے گلے میں پٹہ ڈال دیا جائے اور پھر وہ برابر احرام کی حالت میں رہتا ہے یہاں تک کہ لوگ احرام سے نکل جائیں؟ مروق کہتے ہیں کہ میں نے پردے کے پیچھے سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاتھ پر ہاتھ مارنے کی آواز سنی پس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا بیشک میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہدی کیلئے پٹے بنائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کعبہ کی طرف بھیجا اور اس پر کوئی چیز حرام نہ ہوتی جو ایک مرد کیلئے اپنے گھر والی سے حلال ہوتا ہے یہاں تک کہ لوگ لوٹ آئے۔ (انتہی)

اور صحیحین میں ہے: ''**عن ابن عباس من اهدى هديا حرم عليه مايحرم على الحاج فقالت عائشة !ليس كما قال انا فتلت قلائد هدى رسول الله ﷺ بيدى ثم قلدها ثم بعث بها مع ابى، فلم يحرم عليه ﷺ شيء احله الله له حتى نحر الهدى**''۔ پس یہ دونوں حدیث عبدالرحمٰن بن عطاء کی حدیث کے صراحۃً خلاف ہیں۔ چنانچہ اس کے بطلان کا حکم لازمی ہے (انتہی) حدیث عبدالرحمٰن سے مراد ان کی وہ حدیث ہے جو انہوں نے پہلے ذکر کی ہے، فرمایا: ''**عن سعيد بن جبير، انه رأى رجلا قلد فقال :اما هذا فقد احرم**'' کہ سعید ابن جبیر نے ایک شخص کو دیکھا کہ ہدی کو قلادہ ڈالا ہوا ہے تو سعید نے کہا کہ یہ محرم بن گیا ہے۔

اور عبدالرزاق نے اس کے ہم معنی مرفوع روایت ذکر کی ہے:

جابر بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کے ساتھ تشریف فرماتے کہ اچانک اپنی قمیص پھاڑ دں اور وہاں سے نکل گئے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آج کے دن کا میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ میرے ہدی کو قلادہ ڈالیں اور میں بھول گیا ہوں۔ (انتہی)

پھر (ابن ہمام) آگے فرماتے ہیں کہ حاصل یہ ہے کہ یہ ثابت ہے کہ صرف ہدی کے گلے میں قلادہ ڈال کر بھیجنے سے آدمی حالت احرام میں نہیں ہو جاتا جب تک کہ خود اس کے ساتھ نہ جائے، اور جن آثار میں مطلق اثبات احرام کا ذکر ہے تو وہ ہم نے محمول کیے ہیں ہدی کے ساتھ جانے پر تا کہ روایات میں تطبیق پیدا ہو جائے۔

۲۶۳۲: وَعَنْهَا قَالَتْ فَتَلْتُ قَلَائِدَهَا مِنْ عِهْنٍ كَانَ عِنْدِىْ ثُمَّ بَعَثَ بِهَا مَعَ اَبِىْ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ٥٤٥/٣۔ الحديث رقم ١٧٠٠۔ ومسلم ٩٥٩/٢ الحديث رقم (٣٦٩۔ ١٣٢١)۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے میں نے اونٹوں کے ہار بٹے اس اون سے جو کہ میرے پاس تھا۔ پھر اونٹوں کو ہدی کر کے میرے باپ کے ساتھ بھیجا۔ یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: یہ واقعہ اس سال کا ہے جس سال حضرت ابوبکر صدیق امیر حج بنا کر بھیجے گئے تھے۔

ہدی پر سوار ہونا مطلقاً ممنوع نہیں ہے

۲۶۳۳: وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ رَاٰى رَجُلاً يَسُوْقُ بُدْنَةً فَقَالَ ارْكَبْهَا فَقَالَ اِنَّهَا بُدْنَةٌ قَالَ ارْكَبْهَا فَقَالَ اِنَّهَا بُدْنَةٌ قَالَ ارْكَبْهَا وَيْلَكَ فِى الثَّانِيَةِ اَوِ الثَّالِثَةِ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ٥٣٦/٣۔ الحديث رقم ١٦٨٩۔ ومسلم فى ٩٦٠/٢ الحديث رقم ٣٧١۔ ١٣٢٢)۔

وابوداؤد فی السنن ۳۶۷/۲ الحدیث رقم ۱۷٦۰ والترمذی فی ۲۵٤/۳ الحدیث رقم ۹۱۱۔ والنسائی فی ۱۷٦/۵ الحدیث رقم ۲۷۹۹۔ ومالك فی الموطأ ۳۷۷/۱ الحدیث رقم ۱۳۹ من كتاب الحج واحمد فی المسند ۵۰۵/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ اونٹ ہانکتا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اس پر سوار ہو جاؤ۔ اس نے کہا کہ تحقیق یہ ہدی ہے یعنی میں کیونکر اس پر سوار ہوں وہ یہ سمجھا کہ مطلقاً ہدی پر سوار ہونا درست نہیں' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سوار ہو جاؤ اس نے کہا کہ یہ ہدی ہے فرمایا سوار ہو جاؤ میں تجھ کو کہتا ہوں اور پھر تو عذر کرتا ہے یہ بات دوسری مرتبہ فرمائی یا تیسری مرتبہ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ :"فی الثانیة":قال کے متعلق ہے۔

ہدی پر سوار ہونے کا مسئلہ

۲۶۳۴: وَعَنْ اَبِی الزُّبَیْرِ قَالَ سَمِعْتُ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ سُئِلَ عَنْ رُكُوْبِ الْهَدْيِ فَقَالَ سَمِعْتُ النَّبِیَّ ﷺ یَقُوْلُ ارْكَبْهَا بِالْمَعْرُوْفِ اِذَا اُلْجِئْتَ اِلَیْهَا حَتّٰی تَجِدَ ظَهْرًا۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۹٦۱/۲ الحدیث رقم (۳۷۵۔ ۱۳۲٤)۔ وابوداؤد فی السنن ۳٦/۲ الحدیث رقم ۱۷٦۱ والنسائی ۱۷۷/۵ الحدیث رقم ۲۸۰۲۔

ترجمہ: حضرت ابی زبیرؒ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے جابر بن عبداللہ سے سنا جبکہ ان سے ہدی پر سوار ہونے کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے اس پر اچھی طرح سوار ہو یعنی اس طرح سوار ہو کہ ضرر نہ پہنچے اس کو جس وقت تو مضطر ہو اس کی طرف یہاں تک کہ دوسری سواری نہ ملے ۔اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

ابوالزبیر۔ یہ ابوزبیر' ان کا نام ''محمد بن مسلم'' ہے مکہ کے رہنے والے ہیں۔ حکیم بن حزام کے آزاد کردہ ہیں' طبقہ ثانیہ میں سے ہیں مکہ کے تابعین میں سے جابر بن عبداللہ سے انہوں نے حدیث کو سنا ہے اور ان سے بہت لوگوں نے حدیث کا سماع کیا ہے۔ ۱۲۵ھ میں وفات پائی۔

تشریح: ابن ہمام فرماتے ہیں کہ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ اونٹ ہانکتا ہوا جا رہا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس اونٹ پر سوار ہو جاؤ اس نے کہا کہ یہ تو ہدی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا کہ اس پر سوار ہو جاؤ۔ ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اس شخص کو دیکھا کہ وہ سوار ہو کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چل رہا تھا۔

ابن عطار شرح عمدہ میں فرماتے ہیں کہ اس مبہم شخص کا نام معلوم نہ ہو سکا، اور ہدی پر سوار ہونے کے بارے میں اختلافی اقوال ہیں۔ چنانچہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ ہدی پر سوار ہونا واجب ہے حدیث مذکور میں امر مطلق کی وجہ سے اور اس کے ساتھ اس میں زمانہ جاہلیت کے لوگوں کی مخالفت بھی ہے کہ وہ سائبہ، وسیلہ اور حام پر سوار ہونے سے گریز کرتے تھے۔ لیکن اس قول کی تردید کی گئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی بھی اپنی ہدی پر سوار نہیں ہوئے اور نہ ہی لوگوں کو ہدی پر سوار ہونے کا حکم دیا ہے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ اس پر مطلقاً سوار ہونا جائز ہے بغیر ضرورت کے۔ کیونکہ حدیث مذکور مطلق ہے۔ لیکن حنفیہ اور امام شافعی کے

نزدیک اگر ضرورت ومجبوری ہوتو سوار ہوا جا سکتا ہے ورنہ نہیں حدیث مذکور کو اس پر حمل کرتے ہوئے کہ وہ شخص مجبور تھا۔لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ واقعہ حال تھا پس اس میں ضرورت اور مجبوری کا بھی احتمال ہے اور عدم ضرورت کا بھی احتمال ہے۔

پس دونوں احتمالات میں سے جس پر کوئی دلیل پائی جائیگی تو اس پر روایت کو حمل کیا جائے گا۔اور عقلی دلیل اس پر پائی جاتی ہے کہ یہ بامر مجبوری تھا اور وہ اس طرح کی ہدی مکمل طور پر اللہ کیلئے ہے۔پس اس کو اپنی ذاتی منفعت کیلئے استعمال نہیں کرنا چاہیے۔پھر ہم نے ضرورت کی شرط حدیث میں بھی پائی اور وہ صحیح مسلم میں ابوزبیر کی روایت ہے۔(یعنی مشکوۃ کی یہ روایت جس کی تشریح کی جارہی ہے از راقم)

پس عقل مطلقاً سوار ہونے کو منع کرتا ہے اور نقل نے بامر مجبوری اجازت دی ہے اور مجبوری کے علاوہ صورت میں منع ہی رہے گی جو کہ عقل کا تقاضا ہے نہ کہ مفہوم شرط کا۔حاکم نے کافی میں لکھا ہے کہ اگر ضرورت کے وقت ہدی پر سوار ہو جائے یا اس پر سامان لا دلے تو اگر اس کی وجہ سے اس میں کوئی نقصان آجائے تو اس کا ضامن ہوگا۔

علامہ طیبی کا یہ قول کہ اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ جو شخص ہدی پر سوار ہو جائے تو یہ اس کیلئے جائز ہے اور اس میں ہدی کیلئے کوئی ضرر نہیں ہے اور اس طرح اس پر سامان لادنا بھی جائز ہے اور یہی امام مالک ،امام شافعی اور امام احمد کا قول ہے اور بعض لوگوں کے نزدیک بغیر ضرورت کے جائز نہیں ہے۔یہ دو وجہوں سے باطل ہے ایک وجہ تو یہ ہے کہ روایت ہی میں قید ضرورت موجود ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ امام شافعی کے تصریح کے خلاف ہے وہ فرماتے ہیں ضرورت کی قید ضروری ہے جیسا کہ امام نوویؒ نے شرح مسلم میں ذکر کیا ہے۔

قریب المرگ ہدی کا مسئلہ

۲۶۳۵:وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ بَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ سِتَّةَ عَشَرَ بُدْنَةً مَعَ رَجُلٍ وَاَمَّرَهُ فِيْهَا فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَيْفَ اَصْنَعُ بِمَا اُبْدِعَ عَلَيَّ مِنْهَا قَالَ انْحَرْهَا ثُمَّ اصْبَغْ نَعَلَيْهَا فِي دَمِهَا ثُمَّ اجْعَلْهَا عَلٰى صَفْحَتِهَا وَلَا تَأْكُلْ مِنْهَا اَنْتَ وَلَا اَحَدٌ مِّنْ اَهْلِ رُفْقَتِكَ۔ (رواہ مسلم)

اخرجہ مسلم فی صحیحہ ۹۶۲/۲ الحدیث رقم (۳۷۷۔ ۱۳۲۵)۔ وابوداؤد فی السنن ۳۶۸/۲ الحدیث رقم ۱۷۶۳۔ واحمد فی المسند ۲۱۷/۱۔

ترجمہ:حضرت ابن عباس ؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک شخص (ناجیہ اسلمی) کے ساتھ سولہ اونٹ (بطور ہدی کے) بھیجے۔یعنی وہ نگہبانی کرتا ہوا لے جائے اور مکہ پہنچ کر ذبح کرے۔پس اس نے کہا اے اللہ کے رسولؐ! کہ میں اس اونٹ کو کیا کروں جو ان میں سے تھکاوٹ کی وجہ سے یا دبلا پن کی وجہ سے قریب المرگ ہو کر چل نہ سکے۔فرمایا اس کو ذبح کرو اور اس کی دونوں پاپوشین کو اس کے خون میں رنگ دو۔یعنی وہ جوتیاں جو بطور ہار کے گلے میں ڈالی تھیں پر پھر تو ان پاپوشوں کو اس کے کوہان کے کناروں پر رکھ دے اور تو اور تیرے دوست اس میں سے نہ کھائیں۔اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قولہ :بعث رسول اللّٰہ ﷺ ستة عشر بدنة مع رجل وامرہ فیھا :**

''**ستة عشر بدنة**'':علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ مصابیح کے نسخوں میں ''**ست عشرة**'' ہے،اور دونوں صحیح ہیں کیونکہ ''**بدنة**'' کا اطلاق مذکر اور مؤنث دونوں پر ہوتا ہے۔

''**امّر**''،میم کی تشدید کے ساتھ یعنی اس کو امیر بنایا۔

قوله : كيف اصنع بما ابدع علی منها؟

''أبدع'' صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔عرب کہتے ہیں''ابدعت الرَاحلة'' جب سواری تھک جائے۔اور کہا جاتا ہے ابدع بالرجل صیغہ مجہول کے ساتھ جب اس کی سواری تھکے اور کمزوری کی وجہ سے منقطع ہو جائے اور چل نہ سکے اسی وجہ سے ابدع بی نہیں کہا کیونکہ وہ اس پر سوار نہیں تھا۔ بلکہ وہ اس اونٹ کو ھانک رہا تھا۔ بلکہ ابدع علی کہا جو کہ جس کے معنی کو متضمن ہے۔

علامہ طیبیؒ کہے ابدع المطب کے معنی میں ہے کہا جاتا ہے **ابدع ابلدجل ای انقطع به ووقفت دابة عن السير**۔

قوله :قال :انحرهاثم اصبغ نعليها فی دمها: ''**اصبغ**'' باءموحدہ پر تینوں حرکتیں درست ہے۔'' **اغمس** ''کے معنی میں ہے۔

مسلم کی ایک روایت میں اس حدیث کے یہ الفاظ ہیں: **كان ﷺ يبعث مع ابی قبيصة بالبدن معه ثم يقول، ان عطب منها شئ فخشيت عليه موتا فانحرها ثم اغمس نعليها فی دمها، ثم اضربه صفحتها ولا تطعمها انت ولا أحد من رفقتك**۔

قوله :ولا تاكل انت ولااحد من رفقتك:

''**اهل رفقتك**'': اہل زائد ہے اور اضافت بیانیہ ہے۔''**رفقتك**'' راء کے ضمہ اور فاء کے سکون کے ساتھ ہے۔

جوتیوں کو خون میں رنگ کر اونٹ کے کوہان پر نشان لگانے کیلئے اس لیے فرمایا تا کہ اغنیاء اس کے گوشت کھانے سے اجتناب کرے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ آخر میں آپ ﷺ نے اس کی ہدایت فرمادی کہ اس کا گوشت نہ تم خود کھانا اور نہ اپنے رفقاء سفر کو کھانے دینا خواہ فقراء ومساکین ہوں یا اغنیاء ان کو گوشت کھانے سے منع اس لیے کیا کہ کہیں یہ لوگ اپنی ماندگی کا بہانہ کر کے اپنے کھانے کیلئے کوئی اونٹ ذبح نہ کر ڈالیں۔ یہ مسئلہ اس وقت ہے جب اس نے ہدی اپنے او پر واجب کی ہو اور اگر ہدی نفلی ہو تو اس کو ذبح کر کے اس سے کھانا جائز ہے کیونکہ محض گلے میں ہار ڈال لینے سے جانور ملکیت سے نہیں نکلتا۔

یہاں ایک بات محل اشکال ہے کہ ایسی صورت میں کہ گوشت کھانے سے خود محافظ کو بھی منع کیا جارہا ہے اور اس کے رفقاء کو بھی تو پھر اس گوشت کا مصرف کیا ہوگا؟ ظاہر ہے کہ وہ گوشت ضائع ہی ہوگا۔اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں وہ اونٹ ذبح ہوگا وہاں آس پاس کے رہنے والے اسے اپنے استعمال میں لے آئیں گے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ اصحاب سنن اربعہ نے ناجیہ خزاعی کی حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے ہمراہ ہدی روانہ کی اور فرمایا کہ اگر یہ ہلاک ہو جائے تو اس کو ذبح کر کے اس کے ہار کے جوتے اس کے خون میں رنگ کر اس کو لوگوں کیلئے چھوڑ دے ترمذی نے اس کو حسن صحیح کہا ہے۔اس میں ''**لاتأكل انت ولا رفقتك**'' نہیں ہے۔

واقدی نے غزوہ حدیبیہ کے شروع میں یہ واقعہ تفصیل سے ذکر کیا ہے اس میں ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے ہدی پر ناجیہ بن جندب اسلمی کو محافظ بنایا اور ان کو حکم دیا کہ وہ ان کو پہلے لے کر چلے۔واقدی کہتے ہیں کہ وہ ستر اونٹ تھے۔اس قصہ میں آگے ہے کہ ناجیہ بن جندب کہتے ہیں کہ ان میں سے ایک اونٹ قریب المرگ ہو گیا تو میں ابواء مقام میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور ان کو خبر دی تو آپ ﷺ نے فرمایا اس کو ذبح کر دے اور اس کے ہار کو اس کے خون میں رنگ دے،اس کا گوشت نہ آپ کھائیں اور نہ آپ کے رفقاء کھائیں،اور لوگوں کیلئے چھوڑ دیں۔

مسلم اور ابن ماجہ نے ابن عباس کی روایت ذکر کی ہے کہ ذؤیب خزاعی ابو قبیصہ نے ان کو بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان کے ہمراہ اونٹ روانہ کرتے اور پھر فرماتے کہ اگر ان میں سے کسی چیز کے مرنے کا خطرہ ہو تو اس کو ذبح کریں پھر اس کے جوتے اس کے خون

میں رنگ کر اس کے کوہان پر نشان لگا دے اور نہ تم خود اور نہ تیرے رفقاء میں سے کوئی اس سے کھائے۔لیکن قتادہ کی سنان سے لقاء ثابت نہیں ہے اور حدیث مسلم اور ابن ماجہ دونوں میں معنعن ہے مگر مسلم نے اس کیلئے شاہد ذکر کیا ہے اور ذؤیب کا نام مسلم نے نہیں ذکر کیا ہے۔ بلکہ کہا ہے ''ان رجلاً حدثه'' ناجیہ اور دوسروں کو کھانے سے منع اس لیے کیا تھا کہ وہ اغنیاء تھے۔

شارح کنز فرماتے ہیں کہ حدیث ناجیہ میں مدعیٰ پر کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ آپ ﷺ نے ان کو اس اونٹ کے گوشت کھانے سے منع فرمایا تھا جو راستے میں مرجائے اور کلام اس کے بارے میں ہے جو حرم پہنچ جائے کیا اس کا گوشت کھانا جائز ہے یا نہیں؟ (انتہی)۔اور ہم نے اس حدیث سے ثابت کیا ہے کہ اگر ہدی نفلی راستے میں مرجائے تو اس سے کھانا ممنوع ہے اور جب محل تک پہنچ جائے تو اس سے کھانا جائز بلکہ مستحب ہے (انتہی)۔

شمنی کہتے ہیں کہ جو ہدی ہلاک ہو جائے یا اس میں عیب فاحش پیدا ہو جائے، عیب فاحش وہ ہوتا ہے جو قربانی کے جواز کیلئے مانع ہو جیسے ثلث کان کا کٹ جانا آنکھ کا ضائع ہونا تو اگر یہ ہدی واجب ہے تو اس کو تبدیل کرے گا۔کیونکہ یہ اس کے ذمہ لازم ہے اور یہ عیب دار سے ادا نہیں ہوتا۔اور یہ عیب دار جانور اس کا ہو جائے گا۔کیونکہ اس جہت کیلئے صرف تعیین سے وہ جانور اس کی ملکیت سے نہیں نکلتا اور اب اس کا ہدی کے طور پر صرف کرنا ممتنع ہوا تو اب اس کیلئے جائز ہے کہ اس کو سمجھیں اور صرف کر دے۔اور اگر وہ ہدی تطوع ہے تو اس کو ذبح کر کے اس پر جوتے سے خون کا نشان لگائے اور اس کا فائدہ لوگوں کو یہ بتانا ہے کہ یہ ہدی ہے تا کہ فقراء اس سے کھائیں اور اغنیاء اجتناب کریں۔

۲۶۳۶:وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ نَحَرْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ عَامَ الْحُدَيْبِيَةِ الْبُدْنَةَ عَنْ سَبْعَةٍ وَالْبَقَرَةَ عَنْ سَبْعَةٍ۔

(رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۹۵۵/۲ الحدیث رقم (۳۵۰۔ ۱۳۱۸)۔ وابوداؤد فی السنن ۲۳۹/۳ الحدیث رقم ۲۸۰۹۔ والترمذی فی السنن ۲۴۸/۳ الحدیث رقم ۹۰۴ وابن ماجه ۱۰۴۷/۲ الحدیث رقم ۳۱۳۲۔ ومالك فی الموطأ ۴۸۶/۴ الحدیث رقم ۹ من کتاب الضحایا۔ واحمد فی المسند ۲۹۳/۳۔

ترجمه:حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ ہم نے نحر کیا نبی کریم ﷺ کے ساتھ حدیبیہ کے سال۔اونٹ سات آدمیوں کی طرف سے اور گائے سات کی طرف سے۔اس کو امام مسلم رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ''الحدیبیة'' اصح قول کے مطابق با کی تخفیف کے ساتھ ہے۔

حدیث کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ گائے پر بدنہ کا اطلاق نہیں ہوتا اور غالب استعمال یہی ہے۔قاموس میں ہے **البدنة محركة من الابل والبقر، كالاضحية من الغنم تهدى الى مكة (شرفها الله) للذكر والانثى۔**

اور نھایہ میں ہے کہ بدنہ ابل کا واحد ہے۔اور اونٹ کو بدنہ کہنے کی وجہ اس کی عظیم جسامت اور غربہ ہونا ہے اور اس کا اطلاق اونٹ اور اونٹنی دونوں پر ہوتا ہے اور کبھی اس کا اطلاق گائے پر بھی ہوتا ہے (انتہی)۔

باقی ابن حجر کا یہ قول کہ بدنہ کا اطلاق لغۃً اونٹ گائے، بکری پر ہوتا ہے تو یہ کتب لغت کا مخالف ہے۔

اس حدیث میں ہمارے مذہب کی دلیل ہے کہ اونٹ اور گائے میں سات آدمیوں کا شریک ہونا جائز ہے جبکہ ان ساتوں کو قربت یعنی ثواب مقصود ہو قربت خواہ ایک طرح کی ہو جیسا کہ سب کی نیت قربانی یا ہدی کے نیت سے شریک ہوں اور بعض قربانی کے۔اور امام شافعی کے نزدیک اس طرح بھی شرکت جائز ہے کہ بعض تو قربت کی نیت سے شریک ہوں اور بعض محض گوشت کی نیت سے اور امام مالک

کے نزدیک واجب قربانی یا ہدی میں مطلقاً شرکت جائز نہیں ہے۔ بکری و بھیڑ میں متفقہ طور پر تمام علماء کے نزدیک جائز نہیں ہے۔

نحر کرنے کا طریقہ

۲۶۳۷: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّهٗ اَتٰى عَلٰى رَجُلٍ قَدْ اَنَاخَ بُدْ نَتَهٗ يَنْحَرُهَا قَالَ ابْعَثْهَا قِيَا مًا مُقَيَّدَ ةً سُنَّةَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳٤٦/۳ الحدیث رقم ۱۷۱۳۔ ومسلم فی صحیحه ۹٥٦/۲ الحدیث رقم (۳٥۸۔ ۱۳۲۰)۔ وابوداؤد فی السنن ۳۷۱/۲ الحدیث رقم ۱۷٦۸۔

ترجمه: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ ایک شخص کے پاس آئے' جس نے اپنا اونٹ بٹھایا تھا اس حال میں کہ نحر کرتا تھا۔ اس کو ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا۔ تم اس کو کھڑا کرو اور پاؤں باندھو۔ یعنی پابایا پاؤں (محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کو پکڑ)۔ اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله :ينحرها**: یہ جملہ حالیہ ہے۔ **قوله :قال ابعثها قيامامقيدة سنة محمد** صلی اللہ علیہ وسلم:

''قیاماً'' حال مؤکدہ ہے اور تقریر قائمۃ ہے اور اس کا عامل محذوف ہے اول کلام اس پر دلالت کر رہا ہے یعنی **انحرها قائمةً** اس سے درایت درست ہو جاتی ہے نہ کہ **ابعثها** ہے کیونکہ **بعث قبل القيام** ہوتا ہے۔

ہاں اگر اس کو حال مقدرہ بنایا جائے جیسے اللہ کے اس قول میں ہے ﴿**فبشرناه باسحق نبياً**﴾ یعنی **ابعثها مقدرا قيامها** اور اس کو منصوب بناء بر مصدریت ماننا جائز نہیں ہے **ابعثها** کیلئے۔ کیونکہ دونوں میں معنی تقارب ہے تو پھر گویا کہ اس طرح کہا ہوگا ''**اقمها قياماً**'' تو کلام مقصود سے خالی ہو جائے گا اور وہ مقصود نحر کو مقید بالقیام کرنا ہے۔

''**مقيدة**'' حال ثانیہ ہے یا قائمہ کیلئے صفت ہے۔

''**سنة**'': منصوب ہے بنا پر مفعولیت کے تقدیر یوں ہوگی **فاعلاً بها سنة محمد** یا **اصبت سنة محمد**۔

متبداء محذوف کی خبر ہونے کی بناء پر مرفوع پڑھنا بھی درست ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ سنت طریقہ یہ ہے کہ اونٹ کو نحر کیا جائے اس کو کھڑا کر کے اور اس کی بائیں ٹانگ باندھی جائے (اور پھر اس کے سینے میں برچھی ماری جائے) گائے اور بکری کو دائیں پہلو پر لٹا کر اور ٹانگیں کھلی چھوڑ کر ذبح کیا جائے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ ابوداؤد نے حضرت جابر کی روایت نقل کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہؓ اونٹ کا نحر اس طرح کرتے تھے کہ اس کی بائیں ٹانگ باندھی جاتی تھی اور باقی ٹانگوں پر کھڑا ہوتا تھا۔ پھر ابن ہمام فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نحر قیام کی حالت میں اس آیت: ﴿**فاذاو جبت جنوبها**﴾ [الحج:۳٦] کے ظاہر پر عمل کرنے کی وجہ سے کیا کیونکہ وجوب کا معنی سقوط کے ہے اور اس کا تحقق کھڑے ہونے کی حالت میں زیادہ واضح ہوتا ہے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ اللہ کے ارشاد: ﴿**فاذكروا اسم الله عليها صواف**﴾ [الحج:۳٦] سے استدلال کرنا زیادہ ظاہر ہے کیونکہ صواف کی تفسیر حضرت ابن عباسؓ نے تین پاؤں کے کھڑے ہونے سے کی ہے اور یہ ایک پاؤں کے باندھنے سے ہوتا ہے اور بہتر یہ ہے کہ وہ بایاں ہو کہ اس میں اتباع حدیث ہے۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ میں نے اونٹ کو نحر کیا کھڑے ہونے کی حالت میں تو وہ بدک گیا اور قریب تھا کہ کچھ لوگوں کو ہلاک کر دیتا پس میں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ میں اونٹ کو ٹانگ باندھ کر بٹھا کر نحر کروں گا۔ حاصل یہ ہے کہ اونٹ کو کھڑا کر کے نحر کرنا افضل ہے اور اگر کھڑا نہ کیا جا سکے تو پھر بٹھا کر نحر کرنا لٹا کر نحر کرنے سے افضل ہے۔

ہاں! اونٹ کو ذبح کرنا خلاف اولیٰ ہے اگر امام مالکؒ سے یہ قول صحیح ثابت ہے' جو ان سے نقل کیا گیا ہے کہ اونٹوں کو ذبح کرنا حلال نہیں ہے۔لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ امام مالک سے ثابت نہیں ہے ابن منذر فرماتے ہیں کہ میں ایسا کوئی نہیں جانتا جس نے اس کو حرام کہا ہو بلکہ امام مالک نے اس کو مکروہ قرار دیا ہے۔اور جو شوافع کے بعض کتب میں مذکور ہے کہ گائے اور بکری کا نحر بالا جماع حرام ہے۔تو وہ غلط ہے اور صحیح وہ ہے جو عبدری وغیرہ نے ذکر کیا ہے کہ بالا جماع جائز ہے۔

گوشت' جھول وغیرہ اور چمڑہ کو صدقہ کرنا چاہے

۲۶۳۸: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ اَمَرَنِی رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَنْ اَقُوْمَ عَلٰی بُدْنِهٖ وَاَنْ اَتَصَدَّقَ بِلَحْمِهَا وَجُلُوْدِ هَا وَاَجِلَّتِهَا وَاَنْ لَّا اُعْطِيَ الْجَزَّارَ مِنْهَا قَالَ نَحْنُ نُعْطِيْهِ مِنْ عِنْدِنَا۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۵۵۶/۳۔ الحدیث رقم ۱۷۱۶۔ واخرجه مسلم فی صحیحه ۹۵٤/۲ الحدیث رقم (۳٤۸۔ ۱۳۱۷)۔ وابوداؤد فی السنن ۳۷۱/۲ الحدیث رقم ۱۷٦۹ والدارمی ۱۰۱/۲ الحدیث رقم ۱۹٤۰۔ وابن ماجه ۱۰۳۵/۲ الحدیث رقم ۳۰۹۹۔

ترجمہ: حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ فرمایا مجھے نبی کریم ﷺ نے کہ میں خبر گیری کروں ان کے اونٹوں کی اور یہ کہ ان کے گوشت کو صدقہ کروں پوست (چمڑہ) اور جھولیں اور ان میں سے کہ قصاب کو نہ دوں یعنی انکی مزدوری ان میں سے نہ دوں فرمایا حضور ﷺ نے ہم اس کو مزدوری اپنے پاس سے دیں گے۔اس کو امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ''بدنه'' باء کے ضمہ اور دال کے سکون کے ساتھ بدنۃ کی جمع ہے۔

''واجلتها'' جیم کے کسرہ اور لام کی تشدید کے ساتھ جلال کی جمع ہے اور جلال' جل کی جمع ہے جانوروں کے جھولے کو کہتے ہیں۔

اونٹوں سے مراد وہ اونٹ ہیں جو آنحضرت ﷺ حجۃ الوداع میں بطور ہدی مکہ لے کر گئے تھے اور ان کی تعداد سو تھی۔اس کی تفصیل پہلے گزری ہے اور اس حدیث سے نحر میں نیابت کا جواز معلوم ہوتا ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ ترمذی کے علاوہ اصحاب کتب صحاح نے یہ حدیث روایت کی ہے: ''**امرنی رسول الله ﷺ ان اقوم علی بدنه واقسم جلودها، وجلالها وامرنی ان لا اعطی الجزار منها، وقال نحن نعطیه من عندنا**'' اور بعض الفاظ میں ''**ان اتصدق بجلودها وجلالها**'' ہے اور بخاری کی روایت میں **نحن نعطیه من عندنا** نہیں ہے۔بخاری کے الفاظ میں یہ ہے ''**وامره انقسم بدنه کلها لحومها وجلالها و جلودها فی المساکین ولا یعطی فی جزارتها منها شیئا**''۔

''جزارتها'' سرقسطی فرماتے ہیں کہ یہ جیم کے ضمہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ ہے۔پس کسرہ کے ساتھ مصدر ہے اور ضمہ کے ساتھ نام ہے اگلے اور پچھلے ٹانگوں کا اور گردن کا۔قصائی ان کو اجرت میں لیتے تھے۔

ابن منذر نے ابن عمر ؓ اور اسحٰق سے حکایت کیا ہے کہ ہدی کی کھال کو فروخت کر کے اس کے ثمن کو صدقہ کرنا جائز ہے۔

اور قصائی کو احساناً کھال دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے بالاتفاق۔

قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ رکھنا جائز ہے

۲۶۳۹: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ كُنَّا لَا نَاْ كُلُ مِنْ لُحُوْمِ بُدْنِنَا فَوْقَ ثَلَاثٍ فَرَخَّصَ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ كُلُوْا وَتَزَوَّدُوْا فَاَكَلْنَا وَتَزَوَّدْنَا۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٥٥٧/٣ الحدیث رقم ١٧١٩۔ ومسلم فی ٥٦٢/٣ الحدیث رقم (٣٠۔ ١٩٧٢)۔ واحمد فی المسند ٣٨٨/٣۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں ہم قربانی کا گوشت نہیں کھاتے تھے تین دن سے زیادہ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رخصت دے دی پس فرمایا کھاؤ اور توشہ کر رکھو یعنی تین دن کے بعد بھی پس ہم نے کھایا اور توشہ کیا۔ اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ابتداء میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ہدی اور قربانی کے گوشت تین دن سے زیادہ کھانے سے منع فرمایا تھا اور بعد میں اس کی اجازت دی۔ فرمایا کھاؤ اور مستقبل کیلئے توشہ بناؤ۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اگر دم واجب ہو جیسے دم تمتع، دم قران، دم افساد، شکار کے بدلے میں دم، تو مالک کیلئے بعض اہل علم کے نزدیک اس سے کھانا جائز نہیں ہے اور یہی امام شافعیؒ کا مسلک ہے اور شمنی میں ہے کہ مالک کو نفل، تمتع اور قران کی ہدی اور قربانی سے کھانا مستحب ہے فقط۔ کیونکہ حدیث جابر میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر اونٹ سے گوشت کے ایک ٹکڑے کا حکم دیا پس وہ ہانڈی میں ڈال دیا گیا تو ان کے گوشت کو دونوں نے کھایا اور شوربہ پیا۔ ان کے علاوہ دوسرے قسم کے ہدی کا گوشت کھانا جائز نہیں ہے کیونکہ وہ کفارات وجنایات کی ہوگی۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ راجح قول کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم قارن تھے اور سو کے سو اونٹ ہدی قران کے نہ تھے پس معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہدی قران اور نفل سے بھی کھایا۔ مگر نفل ہدی سے حرم پہنچنے کے بعد کھایا۔ کیونکہ اگر وہ حرم نہ پہنچے بلکہ راستے میں ہلاک ہو کر ذبح کیا جائے تو اس سے کھانا جائز نہیں ہے کیونکہ حرم میں اس سے قربت خون بہانے سے میسر ہو جاتی ہے اور غیر حرم میں خون بہانے سے قربت حاصل نہیں ہوتی بلکہ صدقہ کرنے سے ہوتی ہے تو اس کا صدقہ کرنا لازم ہے۔ حصول قربت کیلئے اگر مالک نے نفل ہدی یا اس کے علاوہ ایسی ہدی جس سے کھانا اس کیلئے جائز نہ ہو کھالیا تو جو کھایا ہے اس کا ضامن ہوگا۔ یہی امام شافعی اور امام احمد کا مسلک ہے اور امام مالک فرماتے ہیں کہ اگر ایک لقمہ بھی کھالیا تا کل کا ضامن ہوگا۔ اور ھدایا کے گوشت کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے اگرچہ اس کا کھانا جائز ہو! گر اس نے اس میں سے کچھ فروخت کر دیا یا قصائی کو مزدوری میں دیدیا تو اس کی بقدر قیمت کا صدقہ کرنا لازم ہوگا۔ اور جہاں ہدی سے مالک کیلئے کھانا جائز ہے وہاں اغنیاء کیلئے بھی کھانا جائز ہے اور مستحب یہ ہے کہ قربانی کے گوشت کا ایک ثلث صدقہ کر دے اور ایک ثلث ھدیہ کر دے۔

مسلم کی حدیث میں ہے: ''**کنت نهیتکم عن الادخار من اجل الرأفة وقد جاء الله بالسعة فادخروا ما بدالکم**''۔

کیا قحط وغیرہ کے دور میں ذخیرہ کرنے کی حرمت پھر لوٹ سکتی ہے؟ اس میں امام شافعیؒ کے دو قول ہیں۔ زیادہ صحیح یہ ہے کہ نہیں لوٹ سکتی ہے کیونکہ اس کا منسوخ ہونا ثابت ہے۔ خواہ نہی تحریمی ہو یا تنزیہی۔

الفصل الثانی:

٢٦٤٠: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم اَهْدٰی عَامَ الْحُدَیْبِیَّةِ فِیْ هَدَایَا رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم جَمَلًا كَانَ لِاَبِیْ جَهْلٍ فِیْ رَاْسِهٖ بُرَةٌ مِنْ فِضَّةٍ وَفِیْ رِوَایَةٍ مِّنْ ذَهَبٍ یَغِیْظُ بِذٰلِكَ الْمُشْرِكِیْنَ۔

اخرجه ابوداؤد فی السنن ٣٦٠/٢۔ الحدیث رقم ١٧٤٩۔ وابن ماجه ١٠٣٥/٢ الحدیث رقم ٣١٠٠ واحمد فی المسند ٢٣٤/١۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ کے سال اپنے ساتھ ہدایا کے اونٹ لے کر گئے ابوجہل کے اونٹ کے ناک میں چاندی کی ایک نتھنی تھی اور ایک روایت میں آیا ہے کہ سونے کی۔ اس کی وجہ سے

مشرکوں کو غصہ دلاتے تھے۔اس کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :ان النبی ﷺ اهدی عام حديبية فی هدايا رسول الله ﷺ جملا كان لابی جهل:

''جملاً'' اهدٰی فعل نے نصب دیا ہے اور ھدایا میں اس کا صلہ ہے اور حق یہ تھا کہ یوں کہتے ھدایاہ پس ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو لے آئے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ ابوجہل کے اونٹ کا خاتمہ ابوجہل سے اچھا ہوا کہ اللہ کے راستے میں اس کا نحر ہوا اور اللہ کے رسول اور اولیاء نے اس کا گوشت کھایا، پھر اس حدیث کی نظیر میں اللہ کا یہ ارشاد ہے ﴿ليغيظ بهم الكفار﴾ [الفتح:۲۹]

''عام الحديبية'' ۶ھ میں آنحضرت ﷺ ادائیگی عمرہ کیلئے مکہ روانہ ہوئے مشرکین نے آپ کو حدیبیہ مقام میں روک دیا اور حدیبیہ کے حل کے اطراف میں ایک جگہ ہے اور اس کا قصہ بہت مشہور ہے۔

اور ابن حجر کہتے ہیں کہ آپ ﷺ اور مشرکین کے درمیان اس پر صلح ہوئی کہ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقاء حدیبیہ میں احرام سے نکل جائیں اور پھر اس کے بعد اپنے عمرہ کی قضاء کریں اور اس کے بعد آئندہ سال آئیں حج کریں اور عمرہ کریں۔لیکن یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ صلح اس پر ہوئی تھی کہ وہ آئندہ سال صرف عمرہ کی قضاء کریں گئیں نہ کہ حج کریں گے اور صلح میں یہ بات بھی طے پائی تھی کہ مشرکین تین دن کیلئے مکہ آپ ﷺ کیلئے خالی چھوڑیں گے۔یہاں تک کہ جب تین دن گزر گئے تو انہوں نے آپ ﷺ سے نکلنے کا مطالبہ کیا۔

قوله :فی رأسه برة من فضة يغيظ بذلك الكفار: مصابیح میں ''وفی رأسه برة فضةٍ'' اضافت کے ساتھ ہے۔

''برة'' باء کے ضمہ اور مخففہ کے فتح کے ساتھ ہے ابوعلی کہتے ہیں کہ اس کا اصل ''بروة'' ہے کیونکہ اس کی جمع برات اور برون آتی ہے۔جیسے ثبات اور ثبون،اس کا معنی ہے۔نتهنی۔

شارح مصابیح کہتے ہیں یعنی اس کے ناک میں چاندی کی نتھنی تھی۔کیونکہ برة پیتل وغیرہ کی نتھنی کو کہتے ہیں جو اونٹ کی ناک میں ڈالی جاتی ہے۔اصمعی کہتے ہیں ایک جانب کے نتھنے میں ڈالا جاتا ہے۔چونکہ ناک،سر میں سے ہے تو سعة فی رأسه کہا۔اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ یہ مجاز ہے مجاورة کی وجہ سے کہ ناک سر کے قریب ہے نہ کہ اطلاق الکل علی البعض کے قبیل سے ہے۔

''يغيظ'' حرف مضارع کے فتح کے ساتھ ہے۔

ذبح ہونے والی ہدی کا حکم

۲۶۴۱ :وَعَنْ نَاجِيَةَ الْخُزَاعِيِّ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَيْفَ اَصْنَعُ بِمَا عَطِبَ مِنَ الْبُدْنِ قَالَ انْحَرْهَا ثُمَّ اغْمِسْ نَعْلَهَا فِيْ دَمِهَا ثُمَّ خَلِّ بَيْنَ النَّاسِ وَبَيْنَهَا يَأْكُلُوْنَهَا ۔ (رواه مالك والترمذی وابن ماجة)

اخرجه الترمذی فی ۲۵۳/۳ الحديث رقم ۹۱۰ وابن ماجه ۳۶/۲ ۰ الحديث رقم ۳۱۰۶۔ ومالك فی الموطأ ۳۸۰/۱ الحديث رقم ۱۴۸ من كتاب الحج۔ واحمد فی المسند ۳۳۴/۴۔

ترجمہ: حضرت ناجیہ خزاعیؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے کہا اے اللہ کے رسول! میں اس جانور کے ساتھ کیا کروں جو مرنے کے قریب ہو ہدی کے جانور میں سے فرمایا کہ اس کو ذبح کردو پھر اس کی پاپوش کو رنگ دو اس کے خون میں یعنی جو کہ اس کا ہار ہے اس کو خون میں رنگ کر۔اس کی گردن پر چھاپ دیا جائے پھر لوگوں کے درمیان چھوڑ دے اور ہدی کے درمیان یعنی فقراء کو اس کے کھانے سے منع نہ کرو۔

تشریح: ''فیاکلونها'' یعنی فهم یاکلونها ہے۔ اصل میں اس آیت کے طرز پر ﴿ولا یؤذن لهم فیعتذرون﴾ [المرسلات:۳٦] ورنہ تو فیاکلونها کہنا چاہیے تھا۔ جیسے: ﴿ذرهم یاکلوا﴾ [الحجر:۳]۔۔۔۔۔۔

عرض مرتب: اس روایت کی مکمل تشریح پہلے گزر گئی ہے۔

۲٦۴۲: ورواه ابو داود والدارمی عن ناجية الاسلمی۔

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳٦۸/۲ الحدیث رقم ۱۷٦۲ والدارمی فی ۹۰/۲ الحدیث رقم ۱۹۰۹۔

ترجمہ: ابوداؤد اور دارمیؒ نے اس روایت کو حضرت ناجیہ اسلمی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے''۔

راویٔ حدیث:

ناجیۃ بن جندب۔ یہ ''ناجیہ'' جندب کے بیٹے ہیں اور اسلمی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اونٹوں کے نگران تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ عمرو کے بیٹے ہیں۔ اہل مدینہ میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا نام ''ذکوان'' تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ''ناجیہ'' نام رکھا۔ کیونکہ ان کو قریش سے نجات حاصل ہوئی تھی۔ یہی وہ صحابی ہیں جو حدیبیہ کے موقع پر قلیب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تیر لے کر اُترے تھے جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے۔ ان سے عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ وغیرہ نے روایت کی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں بمقام مدینہ وفات پائی۔

قوله :عن ناجية الاسلمی: تقریب میں ہے کہ ناجیہ بن جندب بن عمیر اسلمی، صحابی ہے اور ناجیہ بن خزاعی بھی صحابی ہے ان سے روایت کرنے میں عروہ متفرد ہیں اور جس نے ان دونوں کو ملایا ہے اور غلط ملط کیا ہے تو یہ ان کو وہم ہوا ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ ناجیہ بن کعب بن عمیر بن یعمر اسلمی صاحب بدن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

اور امام احمد بن حنبل نے سند میں صاحب البدن ناجیہ بن الحارث خزاعی کو قرار دیا ہے لیکن مشہور اول ہے۔

مؤلف فرماتے ہیں کہ یہ ناجیہ بن جندب اسلمی صاحب بدن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ ناجیہ بن عمرو ہے جس کا شمار اہل مدینہ میں ہوتا ہے ان کا نام زکوان تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام ناجیہ ذکوان رکھا کیونکہ یہ قریش سے بچ نکلے تھے۔ اور یہی حدیبیہ میں کنویں میں اترے تھے۔

ان سے عروہ زہری وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت امیر معاویہ کے دور میں مدینہ میں وفات پائی (انتہی) اور ناجیہ خزاعی کا ذکر نہیں کیا۔ پس صاحب مصابیح نے احمد بن حنبل کی اتباع کی ہے اور مصنف نے جمہور کی۔ واللہ اعلم۔

قربانی کے دن کی فضیلت

۲٦۴۳: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ قُرْطٍ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ اِنَّ اَعْظَمَ الْاَیَّامِ عِنْدَ اللّٰهِ یَوْمَ النَّحْرِ ثُمَّ یَوْمَ الْقَرِّ قَالَ ثَوْرٌ وَهُوَ الْیَوْمُ الثَّانِیْ قَالَ وَقُرِّبَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم بَدَنَاتٌ خَمْسٌ اَوْ سِتٌّ فَطَفِقْنَ یَزْدَلِفْنَ اِلَیْهِ بِاَیَّتِهِنَّ یَبْدَأُ قَالَ فَلَمَّا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا قَالَ فَتَکَلَّمَ بِکَلِمَةٍ خَفِیَّةٍ لَمْ اَفْهَمْهَا فَقُلْتُ مَا قَالَ قَالَ مَنْ شَآءَ اقْتَطَعَ۔ (رواه ابوداود)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳٦۹/۲ الحدیث رقم ۱۷٦۵۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن قرط رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے فرمایا دنوں میں بڑا دن اللہ کے نزدیک قربانی کا دن ہے ثور (جو کہ اس حدیث کا راوی ہے) نے کہا کہ اس کے بعد قر کا دن ہے اور وہ دوسرا دن ہے یعنی گیارہویں تاریخ کا دن ہے۔ راوی نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک پانچ یا چھ اونٹ قریب کیے گئے۔

پس اونٹوں نے حضور ﷺ کے قریب ہونا شروع کیا تا کہ کسی کو ان میں پہلے ذبح کریں۔ راوی نے کہا۔ جب جانوروں کی گردنیں زمین پر گریں تو حضور ﷺ نے آہستہ سے کچھ فرمایا کہ میں سمجھ نہ سکا۔ پھر میں نے اس شخص کو کہا جو میرے پاس تھا کہ حضور ﷺ نے کیا فرمایا؟ اس نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کا جی چاہے اس ہدی میں سے کاٹ کر لے جائے۔ اس کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله :ان اعظم الایام عندالله یوم النحر ثم یوم القر:**

''**ان اعظم الایام**'' بڑے دن سے مراد عید الاضحیٰ کا دن ہے پس یہ اس کا منافی نہیں ہے جو احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ **افضل الایام یوم عرفه** ہیں۔ یا ایام **اشهر الحرم** ہے اور یہ بات قابل بحث ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ دنوں میں بڑا دن قربانی کا دن ہے اس سے مراد یہ ہے کہ قربانی کا دن ان دنوں میں سے ایک دن ہے جو افضل ہے یہ مراد اس لیے لی گئی ہے کہ دوسرے احادیث میں عشرۃ ایام کو افضل قرار دیا ہے (انتہی)، دس دنوں سے مراد ان کا عشرہ ذی الحجہ ہے یا عشرہ رمضان ہے۔ کیونکہ حدیث میں ہے اللہ کے نزدیک ذی الحجہ کے دس دنوں میں عمل کرنے سے زیادہ کسی دن عمل کرنا محبوب نہیں ہے۔ اب رہی یہ بات جس طرح احادیث سے عشرہ ذی الحجہ کا سب سے افضل ہونا ثابت ہے اسی طرح یہ بات بھی احادیث سے ثابت ہے رمضان کا آخر عشرہ افضل ترین ہے۔ تو اس تضاد کو یوں رفع کیا جائے کہ ان احادیث کو جن سے عشرہ ذی الحجہ کا افضل ہونا ثابت ہے اشھر حرم کے ساتھ مقید کیا جائے اور عشرہ رمضان مطلق طور پر تمام دنوں سے افضل ہے۔ تعارض کو دور کرنے کیلئے بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ افضلیت باعتبار حیثیت کے مختلف ہے یا اضافی اور نسبتی ہے پس **من تبعيضيه** مقدر ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔

''**یوم نحر**'' یعنی ایام نحر کا پہلا دن کیونکہ عید اکبر ہے اور اس میں حج کے بڑے بڑے اعمال ادا کیے جاتے ہیں یہاں تک کہ اس کے بارے میں کیا گیا ہے ﴿**یوم الحج الاکبر**﴾[التوبة:۳]

''**یوم القر**'' قاف کے فتحہ اور راء کے شد کے ساتھ بمعنی قرار کا دن۔ کیونکہ اس دن حاجیوں کو قرار و سکون حاصل ہو جاتا ہے بخلاف اس سے پہلے اور بعد کے ایام کے کہ ان میں انتشار رہتا ہے بعض شراح فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ایام تشریق کا پہلا دن ہے اور اسکو یہ نام اس لیے دیتے ہیں کہ اس دن لوگ منیٰ میں منازل میں ٹھہرے ہوتے ہیں اور کہیں جاتے نہیں ہیں بخلاف آخری دو دنوں کے۔

قوله :وقرب لرسول الله ﷺ ......من شاء اقتطعها: ''**قرب**'' راء کی تشدید کے ساتھ مجہول کا صیغہ ہے۔

''**خمس او ست**'' او، راوی کی طرف سے شک ظاہر کرنے کیلئے ہے یا عبداللہ کی طرف سے تردید کیلئے ہے یعنی ان کی مراد قریبی عدد بتانا ہے۔

''**فطفقن**'' دوسرے فاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

''**بایتهن یبدأ**'' علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ ہر اونٹ آنحضرت ﷺ کے دست مبارک کی برکت حاصل کرنے کیلئے اس بات کا منتظر تھا کہ پہلے مجھے ذبح کریں (انتہی)۔ یہ دراصل آپ ﷺ معجزہ تھا۔

''**فتکلم**'' علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس میں فاء زائدہ ہے اور ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک قال کی ضمیر آپ ﷺ کی طرف راجع ہے اور **فتکلم** ، **قال** کیلئے عطف تفسیر ہے اور علامہ طیبیؒ کے نزدیک قال کی ضمیر سے مراد عبداللہ ہے۔

الفصل الثالث:

قربانی کے گوشت کا مسئلہ

۲۶۴۴: وَعَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْاَكْوَعِ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ مَنْ ضَحّٰى مِنْكُمْ فَلَا يُصْبِحَنَّ بَعْدَ ثَالِثَةٍ وَفِىْ بَيْتِهٖ مِنْهُ شَيْءٌ فَلَمَّا كَانَ الْعَامُ الْمُقْبِلُ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَفْعَلُ كَمَا فَعَلْنَا الْعَامَ الْمَاضِيَ قَالَ كُلُوْا وَاَطْعِمُوْا وَادَّخِرُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ الْعَامَ كَانَ بِالنَّاسِ جُهْدٌ فَاَرَدْتُ اَنْ تُعِيْنُوْا فِيْهِمْ ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ۱۰/۲٤ ـ الحديث رقم ۵۵٦۹ ـ ومسلم فى صحيحه ۱۵٦۳/۳ الحديث رقم (۳٤ ـ ۱۹۷٤)۔

ترجمہ: حضرت سلمہ بن اکوع سے روایت ہے کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جوشخص کہ قربانی کرے تم میں سے ۔پس وہ تیسرے دن کے بعد صبح نہ کرے اس حال میں اس کے گھر میں کچھ قربانی کا گوشت ہو۔پس جب اگلا سال آیا تو بعض صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کہا اے اللہ کے رسولؐ! کیا ہم ایسا ہی کریں جیسا کہ ہم نے گذشتہ سال کیا تھا۔یعنی قربانی کا گوشت نہ رکھیں تین دن کے بعد فرمایا کھاؤ اور کھلاؤ اور ذخیرہ کرو۔تحقیق اس سال لوگوں پر محنت ومشقت ومحتاجگی تھی پس میں نے چاہا جمع کرنے سے منع کروں تا کہ تم ان کی مدد کرو۔یعنی اب ضرورت نہیں رہی اگر رکھو گے تو اجازت ہے اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: پس منظر: ایک سال مدینہ میں اور آس پاس کے علاقوں میں شدید قحط پڑا تھا اس موقع پر باہر کے رہنے والے بڑی کثرت کے ساتھ مدینہ میں آ گئے جن سے سارا مدینہ بھر گیا تھا اسی سال آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ لوگوں کے پاس جتنا گوشت ہو تقسیم کر دیں جمع کر کے نہ رکھیں اور جمع کو حرام کر دیا اس سال۔

قوله :من ضحى منكم فلا......فعلنا العام الماضى:

''ضحى'' حاء کی تشدید کے ساتھ ہے۔''نفعل؟'' ہمزہ استفہام مقدر ہے یعنی انفعل؟۔

قوله :قال:كلوا واطعموا،وادخروا: ''ادخروا'' دال کی تشدید کے ساتھ امر اباحت ہے۔

قوله :فان ذلك العام كان بالناس جهد ،فاردت ان تعينوا فيهم:

''فان ذلك العام'' گزشتہ سال جمع کرنے کی حرمت کی علت ہے اور اشارہ ہے کہ حکم علت کے ساتھ گھومتا ہے ثبوت اور عدم کے اعتبار سے۔اس حدیث کو اس باب میں لانے کی کوئی وجہ اور مناسبت نہیں ہے جیسا کہ ارباب عقل پر واضح ہے۔

شاید اس سے فصل اول کی آخری حدیث کی تفسیر مقصود ہو۔''جهد'' جیم کے فتحہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ضمہ کے ساتھ بھوک کو کہتے ہیں اور فتحہ کے ساتھ مشقت کے معنی میں آتا ہے۔

''ان تعينوا فيهم'': یعنی تعينوا الفقرآء متعدی کو بمنزلہ لازم کے کر کے فی کے ساتھ متعدی کیا ہے۔مبالغۃً علامہ طیبی کہتے ہیں: اى توقعوا الاعانة فيهم (انتھی) یعنی علامہ نے اس کو باب تضمین میں سے قرار دیا ہے جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

بجرح فى عراقيبها نصلى

اور اسی پر اللہ کا یہ قول ہے حکایۃً: ﴿واصلح لى فى ذريتى﴾ [الاحقاف:۱۵] اور ممکن ہے کہ اس کی تقدیر ''ان تعينونى فى حقهم'' ہو کیونکہ ان کا فقر آپ ﷺ کیلئے بہت مشکل تھا۔

۲۶۴۵:وَعَنْ نُبَيْشَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّا كُنَّا نَهَيْنَا كُمْ عَنِ لُحُوْمِهَا اَنْ تَاْكُلُوْهَا فَوْقَ ثَلَاثٍ لِكَيْ تَسَعَكُمْ جَاءَ اللّٰهُ بِالسَّعَةِ فَكُلُوْ وَادَّخِرُوْا اَلَا وَاِنَّ هٰذِهِ الْاَيَّامَ اَيَّامُ اَكْلٍ وَّشُرْبٍ وَّذِكْرِ اللّٰهِ۔ (رواه ابو داود)

اخرجه ابوداؤد فى السنن ۲۴۳/۳ الحديث رقم ۲۸۱۳۔ وابن ماجه مختصراً فى ۱۰۵۵/۲ الحديث رقم ۳۱۶۰۔ والدارمى ۱۰۸/۲ الحديث رقم ۱۹۵۸۔

ترجمہ: حضرت نبیشہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ ہم کو منع کرتے تھے (جمع کرنے سے) گوشت قربانی یا ہدی کے ساتھ کہ تم اس کو تین دن سے زیادہ کھاؤ۔ تاکہ تم کو وسعت ہو۔ یعنی تمہارے فقراء کو بھی پہنچے اب اللہ تعالیٰ نے وسعت کردی ہے پس کھاؤ اور ذخیرہ کرو اور ثواب طلب کرو۔ یعنی تصدیق کرنے کے ساتھ اور تحقیق یہ دن یعنی منیٰ کے چاروں دن کھاتے اور پینے یعنی پس روزہ ان دنوں میں حرام ہے اور اللہ تعالیٰ کی یاد کرنے کے ہیں۔

تشریح: **قوله :انا كنا نهيناكم عن لحومها ان تاكلوها............جاء الله بالسعة:**

''ان تاكلوها'' بدل اشتمال ہے۔

''السعة'' سین کے فتحہ کے ساتھ ہے اور اسی پر اللہ کا یہ ارشاد ﴿**لينفق ذو سعة من سعته**﴾۔

قوله :فكلوا، وادخروا،واتجروا:

''ائتجروا'' علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ باب افتعال سے ہے اور الاجر سے مشتق ہے یعنی صدقہ کرنے کے ساتھ اجر طلب کرو اور یہ تجارت سے نہیں ہے ورنہ تو شدد ہوتا۔ اور اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ قربانی کا گوشت فروخت کرنا جائز نہیں ہے بلکہ کھایا جائے اور صدقہ کیا جائے۔

قوله :الا وان هذه الايام ،ايام اكل وشرب وذكرالله: ''اَلَا'' تنبیہ کیلئے ہے۔

''شُرب'' شین کے ضمہ کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں فتحہ کے ساتھ ہے اور قراءت سبعہ میں ﴿**فشاربون شرب الحيم**﴾ کو ضمہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ اور ایک روایت میں کسرہ بھی جائز قرار دیا گیا ہے۔

اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مطابق یہ ایام ذکر اللہ میں بہت زیادہ مشغول رہنے کے ہیں:

﴿**فاذا قضيتم مناسككم فاذكرو الله كذكركم اباء كم او اشد ذكرا**﴾[البقرة:۲۰۰]

''یعنی جب تم اپنے حج کے افعال کی ادائیگی سے فارغ ہو چکو تو اللہ تعالیٰ کو یاد کرو جیسا کہ تم اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو یعنی بہت زیادہ یاد کرنا''۔ ﴿**واذكروا الله فى ايّام معدودات**﴾[البقرة:۲۰۳]

اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان آیات میں ذکر سے مراد وہ ذکر ہو جو ھدایا کے ذبح کرنے کے وقت ہوتا ہے اللہ کے اس قول کے مطابق:

﴿**ليشهدوا منافع لهم ويذكروا اسم الله فى ايّام معلومات على مارزقهم من بهيمة الانعام فكلوا منها واطعموا البائس الفقير**﴾[الحج:۲۸]

اور شاید روزوں کی حرمت کا ماخذ یہی آیت ہو اور ممکن ہے کہ ذکر اللہ سے مراد رمی کے وقت کا ذکر اور تکبیر تشریق ہو۔ اس کی تحقیق پہلے گزر چکی ہے۔ واللہ اعلم۔

بَابُ الْحَلْقِ

سرمنڈانے کا بیان

ترجمہ باب میں قصر کا ذکر بھی ہونا چاہیے تھا لیکن ان میں سے افضل پر اکتفا کرتے ہوئے قصر کو ذکر نہیں کیا۔

الفصل الاول:

سرمنڈانا افضل ہے

۲۶۴۶: عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ حَلَقَ رَأْسَهٗ فِی حَجَّةِ الْوَدَاعِ وَاُنَاسٌ مِّنْ اَصْحَابِهٖ وَقَصَّرَ بَعْضُهُمْ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۰۹/۸، الحدیث رقم ۴۴۱۱۔ ومسلم فی صحیحه ۹۴۵/۲ الحدیث رقم (۳۱۶۔ ۱۳۰۱)۔ وابوداؤد فی السنن ۵۰۰/۲ الحدیث رقم ۱۹۸۰ واحمد فی المسند ۱۲۸/۲۔

ترجمه: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے اپنا سرمنڈایا حجۃ الوداع میں اور بعض لوگوں نے صحابیوں میں سے منڈایا اور بعض بال صحابیوں نے کتروائے اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ''حلق'' لام کی تشدید اور تخفیف دونوں کے ساتھ ہے۔ من اصحابہ میں ''من'' بیانیہ ہے یا تبعیضیہ ہے۔ ''قصر'' صاد کی تشدید کے ساتھ ہے اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ تخفیف کے ساتھ ہے۔

صحیحین وغیرهما میں منقول ہے کہ حضور ﷺ نے عمرۃ القضاء میں بال کتروائے تھے۔ اور اللہ کا ارشاد ہے ﴿محلقین رؤوسکم ومقصرین﴾[الفتح:۲۷]اس سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں چیزیں جائز ہیں لیکن افضل سرمنڈانا ہے بغیر کسی اختلاف کے۔ اور ظاہر یہ ہے کہ پورے سر کا منڈانا واجب ہے اور یہی امام مالک کا مسلک ہے اور امام نوویؒ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے اور اجماع سے مراد صحابہ اور سلف رحمہم اللہ کا اجماع ہے اور اس کی تائید آپ ﷺ کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے، ''خذوا عنی مناسککم''۔

حضور ﷺ یا آپ ﷺ کے صحابہؓ میں سے کسی سے بھی بعض سر کے منڈانے پر اکتفاء کرنا منقول نہیں ہے۔ اور اس کو بعض سر کے مسح پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ دونوں میں فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ مسح والی آیت میں ''باء'' ہے جو فی الجملہ تبعیض پر دال ہے اور حدیث ناصیہ بھی بعض سر کے مسح کا جواز بتاتی ہے اور بعض سر کے مسح کرنے سے کسی میں ممانعت بھی نہیں آئی ہے۔ اور حلق کے باب میں یہ تمام باتیں اس کے برخلاف ہیں کیونکہ اللہ کا ارشاد ہے: ﴿محلقین رؤوسکم ﴾[الفتح:۲۷] اور ﴿ولا تحلقوا رأسکم﴾ اس میں تبعیض پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ سے بعض سر کا منڈانا یا کتروانا بھی ثابت نہیں ہے۔ بلکہ قزع سے نہی منقول ہے یہاں تک کہ بچوں کیلئے بھی قزع ممنوع ہے اور قزع بعض سر کو منڈانا اور بعض کو چھوڑنے کو کہتے ہیں۔ پس ظاہر یہ ہے کہ پورے سر کے منڈائے بغیر احرام سے نہیں نکل سکتا ہے جیسا کہ امام مالکؒ فرماتے ہیں اور ابن ہمام نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میرے دل میں اس مقام پر یہ تحقیق آئی کہ ''محلقین'' کو صیغہ مبالغہ کے ساتھ لانے اور لا تحلقوا میں بغیر مبالغہ کے لانے میں حکمت اور راز یہ ہے کہ فعل حلق میں استیعاب ہونا چاہیے اور اس سے نہی قلیل اور کثیر دونوں کو شامل ہے مطلقاً۔

۲۶۴۷: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ لِي مُعَاوِيَةُ إِنِّي قَصَّرْتُ مِنْ رَأْسِ النَّبِيِّ ﷺ عِنْدَ الْمَرْوَةِ بِمِشْقَصٍ ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۵٦۱/۳ ۔ الحدیث رقم ۱۷۳۰ ۔ ومسلم فی صحیحه ۹۱۳/۲ الحدیث رقم (۲۰۹ ۔ ۱۲٤٦)۔

واخرجه ابوداؤد فی ۳۹٦/۲ الحدیث رقم ۱۸۰۲ والنسائی فی ۲٤٤/٥ الحدیث رقم ۲۹۸۷ ۔ واحمد فی المسند ۹٦/٤ ۔

ترجمه: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ کہا مجھ سے معاویہؓ نے تحقیق میں نے نبی کریم ﷺ کے بال کترے مروہ کے قریب تیر کی پیکان سے ۔اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ''مشقص'' میم کے کسرے اور قاف کے فتح کے ساتھ ہے۔ تیر کے کمان کو کہتے ہیں اور یہاں یہی معنی زیادہ مناسب ہے۔

چونکہ یہ بات ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنے حج میں سر کے بال کتروائے نہیں بلکہ منڈوائے تھے اس لیے امیر معاویہؓ کے اس بیان کا تعلق حج سے نہیں بلکہ عمرہ سے ہے۔ چنانچہ حضرت امیر معاویہؓ کے یہ الفاظ ''عند المروۃ'' مروہ کے قریب بھی اس پر دلالت کر رہے ہیں کیونکہ اگر وہ آپ ﷺ کے بال حج میں کترتے تو وہ مروہ کے قریب نہ کہتے بلکہ کہتے کہ منیٰ میں کترے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ **عمرۃ الجعرانہ** کی بات ہے سنہ ۸ھ کو جب آپؐ نے مکہ کو فتح کیا اور واپسی کے ارادے پر عمرہ ادا فرمایا۔

اور یا **عمرۃ القضاء** کی بات ہے اگر امیر معاویہؓ کی یہ بات صحیح ثابت ہو جائے جو انہوں نے فرمایا کہ میں **عمرۃ القضاء** کے موقع پر اسلام قبول کر چکا تھا لیکن صحیح یہ ہے کہ امیر معاویہؓ فتح مکہ کے سال مسلمان ہوئے تھے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ جن لوگوں نے اس روایت سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ آپ ﷺ متمتع تھے اور آپ ﷺ عمرہ کے احرام سے اس وقت نکلے جب امیر معاویہؓ نے آپ ﷺ کے بال کترے قینچی سے اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ امیر معاویہؓ فتح مکہ کے وقت مسلمان ہوئے اور فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ محرم نہ تھے تو اس سے لازم آیا کہ یہ حجۃ الوداع کی بات ہے اور اس بات پر دلیل کہ آپ ﷺ احرام عمرہ سے نکلے۔ ابوداؤد کی روایت ہے اور اس کی روایت میں ''عند المروۃ'' کے الفاظ ہیں۔ کیونکہ حج میں قصر منیٰ میں ہوتا ہے۔ تو ان کا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ کے احرام سے نہ نکلنے پر احادیث اتنی زیادہ مقدار میں منقول ہے کہ ان میں قدر مشترک حد شہرت کے قریب ہے جو کہ تواتر کے قریب ہے جیسے ابن عمر کی گزری ہوئی حدیث اور جو فتح مکہ کے بارے میں احادیث گزری ہے۔ اور حضرت جابرؓ کی طویل حدیث جو مسلم وغیرہ میں ہے اور اگر صرف ابن عمر کی حدیث ہوتی تو وہ بھی امیر معاویہؓ کی حدیث پر مقدم ہوتی پھر سب کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔

پس امیر معاویہؓ کی حدیث میں جم غفیر کی طرف سے شذوذ لازم آیا پس یا تو اس میں خطاء ہوئی ہے اور یا یہ محمول ہے۔ عمرہ الجعرانہ پر کیونکہ اس وقت امیر معاویہؓ مسلمان ہو چکے تھے۔ اور یہ عمرہ بعض لوگوں پر مخفی رہا کیونکہ یہ رات کے وقت ہوا تھا ترمذی اور نسائی کی روایت کے مطابق آپ ﷺ رات کے وقت جعرانہ کی طرف عمرہ کی نیت سے نکلے' پس رات کو مکہ میں داخل ہوئے اور پھر اسی رات مکہ سے نکلے ''الحدیث''۔

پس اس وجہ سے لوگوں پر یہ عمرہ مخفی رہا۔ اور اس کی وجہ سے سنن نسائی کی اس زیادت ''فی ایّام العشر'' پر خطا کا حکم لگانا ضروری ہے۔ محقق ابن ہمام کے گزرے ہوئے کلام سے آپ جان چکے ہوں گے کہ ''عند المروۃ'' کے الفاظ صحیحین میں نہیں ہیں بلکہ ابوداؤد کی روایت میں ہیں۔

سر منڈانے والوں کو اللہ کے رسول ﷺ نے رحمت کی دعا فرمائی

۲۶۴۸:وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ اَللّٰهُمَّ ارْحَمِ الْمُحَلِّقِيْنَ قَالُوْا وَالْمُقَصِّرِيْنَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اَللّٰهُمَّ ارْحَمِ الْمُحَلِّقِيْنَ قَالُوْا وَالْمُقَصِّرِيْنَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَالْمُقَصِّرِيْنَ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاري في صحيحه ۵۶۱/۳ الحديث رقم ۱۷۲۷۔ ومسلم في صحيحه ۹۴۵/۲ الحديث رقم (۳۱۷۔ ۱۳۰۱)

ترجمہ:حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ تحقیق نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا حجۃ الوداع کے مواقع پر اے الٰہی! سر منڈانے والوں پر رحم فرما۔صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا اور کتروانے والوں کے لیے بھی رحمت کی دعاء کیجئے اے اللہ کے رسول ﷺ فرمایا اے الٰہی سر منڈانے والوں پر رحم کر۔صحابہؓ نے عرض کیا بالوں کے کتروانے والوں کے لیے بھی رحمت کی دعا کر دیجئے اے اللہ کے رسول حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا اور کتروانے والوں پر بھی رحم کر۔اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله :ان رسول الله ﷺ قال في حجة الوداع..........قال :اللهم ارحم المحلقين:**

''**قال في حجة الوداع**'': علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ دعاء آپ ﷺ نے حجۃ الوداع میں کی تھی' مشہور قول کے مطابق جیسا کہ حدیث میں مذکور ہے اور بعض نے کہا ہے کہ حدیبیہ میں کی تھی جب آپ ﷺ نے صحابہؓ کو سر منڈوانے کا حکم دیا تو انہوں نے عمل نہیں کیا۔ دخول مکہ کے طمع کی وجہ سے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ دونوں قولوں کے جمع سے کوئی مانع نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے دونوں مواضع میں دعاء کی ہو۔

''**والمقصرين يا رسول الله** ''عطف تلقینی ہے اور ﴿**اني جاعلك للناس اماما**﴾[البقرة:۱۲۴] کے بعد' **ومن ذريتي**'' جو ہے یعنی **واجعل بعض ذريتي ائمة** باب تلقین سے نہیں ہے جیسا کہ ابن حجر کو وہم ہوا ہے۔ بلکہ یہ مستقل دعاء ہے کلام سابق سے متفرع نہیں ہے۔

اور اس کی تقریر' **وجاعل بعض ذريتي**'' کا عطف **جاعلك** کے کاف پر۔تو اس کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی۔ہاں ﴿**وارزق اهله من الثمرات من آمن منهم بالله واليوم الأخر**﴾[البقرة:۱۲۶] کے بعد ﴿**قال ومن كفر**﴾ باب تلقین میں سے ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس کی تقریر' **وارزق من كفر**'' صیغہ امر کے ساتھ اور' **أرزق من كفر**'' صیغہ متکلم کے ساتھ درست ہے یا' **ومن كفر**'' متبداء ہو اور خبر محذوف فامتعہ ہو۔

قوله :قال :اللهم ارحم المحلقين: آپ ﷺ نے حلق کرنے والون کیلئے دعاء کئی بار اس لیے فرمائی کہ انہوں نے افضل پر عمل کیا تھا کیونکہ ﴿**محلقين رؤوسكم**﴾ میں جس سے اللہ نے ابتداء کی ہے اس پر عمل کرنا زیادہ کامل ہے۔اور حلق سے میل کچیل بھی احسن طریقے سے دور ہو جاتا ہے تو ﴿**ثم ليقضوا تفثهم**﴾[الحج:۲۹] (پھر چاہیے کہ ختم کر دیں اپنا میل کچیل) (تفسیر عثمانی) پر عمل بھی اس میں زیادہ اچھے طریقے سے ہو جاتا ہے۔

قوله :قالوا :والمقصرين يا رسول الله قال والمقصرين:

''**قالوا**'' تاکید ہے استدعاء کیلئے جو کہ **محلقين** یا **مقصرين** یا دونوں کا قول ہے تینوں احتمالات ہے۔اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ دونوں قسموں مین سے بعض کا قول ہے۔

ابن ہمام نے ذکر کیا ہے کہ صحیحین کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے تیسری بار' **والمقصرين**'' کہا اور بخاری کی روایت میں

''فلما كانت الرابعة قال: والمقصرين ہے۔'' انتہیٰ۔

پس جو مؤلف نے ذکر کیا ہے یہ ان سے کوتاہی ہوئی ہے یا یہ دوسری روایت ہے۔ واللہ اعلم

۲۶۴۹: وَعَنْ يَحْىٰ بْنِ الْحُصَيْنِ عَنْ جَدَّتِهٖ اَنَّهَا سَمِعَتِ النَّبِیَّ ﷺ فِیْ حَجَّةِ الْوَدَاعِ دَعَا لِلْمُحَلِّقِيْنَ ثَلَاثًا وَلِلْمُقَصِّرِيْنَ مَرَّةً وَاحِدَةً۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ۹٤٦/۲ الحديث رقم (۳۲۱۔ ۱۳۰۳)۔

ترجمہ: حضرت یحییٰ بن حصینؒ سے روایت ہے انہوں نے نقل کیا ہے اپنی دادی سے کہ جن کی کنیت ام الحصین ہے یہ کہ اس نے حجۃ الوداع میں نبی کریم ﷺ کو سنا کہ آپ ﷺ نے سر منڈانے والوں کے لیے دعا فرمائی تین مرتبہ اور کتروانے والوں کے لیے ایک مرتبہ یعنی آخر میں۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

ام الحصین۔ یہ ام الحصین ''اسحاق'' کی بیٹی ہیں اور قبیلہ ''احمس'' کی ہیں۔ ان سے ان کے بیٹے یحییٰ بن حصین وغیرہ نے روایت حدیث کی ہے۔ یہ حجۃ الوداع میں حاضر ہوئی تھیں۔ یحییٰ بن حصین کے حالات ۲۶۴۹/۵ کے تحت گذر چکے ہیں۔

تشریح: **قوله :دعا للمحلقين ثلاثا وللمقصرين مرة واحدة:**

بخاری کی روایت ''فلما كانت الرابعة'' کو عمرہ حدیبیہ پر محمول کیا جائے کہ تین بار وہاں حلق کرنے والوں کیلئے کی تھی تا کہ دونوں احادیث میں تطبیق پیدا ہو جائے یا ہر راوی کا کلام اس پر محمول ہے جو اس نے سنا ہے اور اسکے نزدیک ثابت ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے سر منڈوانے والوں کیلئے پہلے دعا کی نہ کہ بال کتروانے والوں کیلئے اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ ﷺ کے ساتھ احرام باندھنے والوں کی اکثریت وہ تھی جن کے پاس ہدی نہیں تھی اور خود آپ ﷺ کے پاس ہدی تھی اور جن کے پاس ہدی ہو تو وہ ہدی ذبح کرنے سے پہلے سر نہیں منڈواتے۔ پس جب آپ ﷺ نے ان لوگوں کو جس کے پاس ہدی نہ تھی حلق کر کے حلال ہونے کا حکم دیا تو وہ اس پر غمگین ہوئے اور وہ چاہ رہے تھے کہ آپ ﷺ ان کو احرام میں رہنے کی اجازت دیں یہاں تک کہ وہ حج مکمل کر لیں۔ حالانکہ نبی ﷺ کی اطاعت ان کیلئے زیادہ اولیٰ تھی۔ جب ان کیلئے سوائے احرام سے نکلنے کے کوئی چارہ نہیں رہا۔ تو ان کے دلوں میں بال کٹوانا، منڈوانے سے آسان تھا تو اکثر اس کی طرف مائل ہو گئے اور بعض نے آپ ﷺ کی اطاعت کرنے میں جلدی کی اور سر منڈوائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس وجہ سے سر منڈوانے والوں کو دعا میں مقدم رکھا اور بال کتروانے والوں کو مؤخر رکھا (انتہیٰ)۔

لیکن یہ بات مخفی نہیں کہ آپ ﷺ نے ان کو احرام سے نکلنے کا حکم دیا تھا اور اس کو حلق کرنے کے ساتھ خاص نہیں کیا تھا۔ اور انہوں نے بال کتروائے اس لئے کہ وقوف کا زمانہ قریب تھا تا کہ بعد میں حلق کرنے کیلئے بال باقی رہیں یا حج کے بعد کتروانے کیلئے بال باقی رہیں۔ دونوں عملوں کو جمع کرنے کیلئے اور وہ عمل رخصت اور عزیمت ہیں اور عمرہ کے بعد رخصت پر عمل اولیٰ ہے اور حج میں بال کتروانے والوں نے رخصت پر عمل کیا زینت کیلئے بال باقی رکھنے کی وجہ سے برخلاف حلق کرنے والوں کے کہ انہوں نے عزیمت پر عمل کرنا اختیار کیا تو وہ فضیلت کے مستحق ہوئے اور چونکہ یہ صدق نیت پر اور مقام عبودیت میں اظہار عجز پر زیادہ دلالت کرتا ہے۔

باقی امام نوویؒ کا یہ کہنا انتہائی عجیب وغریب ہے کہ حلق کی افضلیت کی وجہ یہ ہے کہ بال کتروانے والا زینت باقی رکھتا ہے حالانکہ حجاج کو ترک زینت کا حکم ہے۔

اسی طرح ابن حجرؒ کا استحسان بھی عجیب ہے۔ کیونکہ حج وعمرہ سے فراغت کے بعد حجاج ترک زینت کے مامور نہیں ہوتے۔

پھر یہ تمام تفصیل اس بات کی منافی نہیں ہے جو قاضی عیاض نے بعض حضرات سے نقل کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حدیبیہ میں صحابہ کو حلق کروانے کا حکم دیا تو انہوں نے مکہ میں داخل ہونے کے طمع سے حلق نہیں کروایا۔

لیکن اس روایت میں ''امرھم بالحلق'' کے الفاظ غیر محفوظ ہیں بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلقاً احرام سے نکلنے کا حکم دیا تھا پھر بعض نے حلق اختیار کیا بوجہ افضل ہونے کے اور بعض نے قصر کیا یہاں تک کہ انہوں نے آنے والے سال حلق کروایا۔ دونوں قضیوں پر عمل کرنے کی وجہ سے اور دونوں فضیلتوں کے حصول کیلئے۔

. ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حدیبیہ کے دن بعض لوگوں نے سر منڈوائے اور بعض نے بال کتروائے تو آپ ؐ نے منڈوانے والوں کے لئے دعا فرمائی اس پر کسی نے کہا اللہ کے رسول ؐ! کیا وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر منڈوانے والوں کیلئے دعا رحم میں مبالغہ کیا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس لیے کہ انہوں نے دخول مکہ کا طمع نہیں رکھا ﴿**لتدخلن المسجد الحرام ان شاء الله امنين محلقين رؤوسكم ومقصرين**﴾[الفتح:۲۷] سے استدلال کرتے ہوئے۔ ارباب تحقیق میں سے صدیق نے اس آیت کا جواب دیا ہے کہ آیت میں اسی سال کی قید نہیں ہے اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقام پر اس کی تصریح بھی کر دی۔

جمہور کا مذہب مشہور یہ ہے کہ حلق یا قصر افعال حج میں سے واجب ہے یا رکن ہے اور حج وعمرہ کے احرام سے نکلنا ان کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ اور امام شافعیؒ کا اس بارے میں شاذ قول ہے کہ کوئی بھی ممنوع کام کے ذریعہ احرام سے نکل سکتے ہیں۔ جیسے خوشبو لگانا، سلا ہوا لباس پہننا اور صحیح اول ہے۔

۲۶۵۰: وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ اَتٰی مِنًی فَاَتَی الْجَمْرَۃَ فَرَمَاھَا ثُمَّ اَتٰی مَنْزِلَہٗ بِمِنًی وَنَحَرَ نُسُکَہٗ ثُمَّ دَعَا بِالْحَلَّاقِ وَنَاوَلَ الْحَالِقَ شِقَّہُ الْاَیْمَنَ فَحَلَقَہٗ ثُمَّ دَعَا اَبَا طَلْحَۃَ الْاَنْصَارِیِّ فَاَعْطَاہُ اِیَّاہُ ثُمَّ نَاوَلَ الشِّقَّ الْاَیْسَرَ فَقَالَ اِحْلِقْ فَحَلَقَہٗ فَاَعْطَاہُ اَبَا طَلْحَۃَ فَقَالَ اَقْسِمْہُ بَیْنَ النَّاسِ۔ (متفق علیه)

اخرجه مسلم في صحيحه ٩٤٨/٢ الحديث رقم (٣٢٦۔ ١٣٠٥)۔ وابوداؤد في السنن ٥٠٠/٢ الحديث رقم ١٩٨١۔ والترمذي في السنن ٢٥٥/٣ الحديث رقم ٩١٢۔ واخرجه احمد في المسند ١٣٧/٣۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ میں آئے پھر جمرۃ العقبہ کے پاس تشریف لائے۔ پس اس کو کنکریاں ماریں۔ پھر اپنے مکان میں تشریف لائے کہ جو منیٰ میں تھا اور اپنی ہدی ذبح کی۔ پھر مونڈنے والے کو بلایا۔ اس کا نام معمر بن عبداللہ تھا اور اپنے سر کی داہنی جانب سر مونڈنے والے کے آگے کی پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مونڈا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوطلحہ انصاریؓ کو بلایا اور منڈے ہوئے بال ان کو دیے اور پھر اپنے سر کی بائیں طرف آگے کی اور فرمایا مونڈ پس اس نے سر مونڈا۔ پس منڈے ہوئے بال آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کو دیئے اور فرمایا کہ بالوں کو لوگوں کے درمیان تقسیم کردو۔ اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :ان النبي ﷺ اتى منى ،...... ونحر نسكه:

''**منزله**'' اس کا نام اب مسجد خیف ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نحر کی جگہ عرفہ کی طرف جاتے ہوئے دائیں طرف ہے۔

''**نسكه**'' سین کے سکون کے ساتھ ہے اور کبھی سین کو ضمہ بھی دیا جاتا ہے۔ ذبیحہ کو کہتے ہیں یہاں مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اونٹ ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے ۶۳ اونٹ ذبح کیے اور باقی ۳۷ کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ ذبح کریں۔

قوله :ثم دعا للحلاق وناول الحالق شقه الايمن فحلقه:

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث دلالت کررہی ہے کہ مستحب دائیں طرف سے ابتداء کرنا ہے اور بعض کے نزدیک بائیں طرف سے ابتداء کرنا مستحب ہے (انتہی) یعنی ان کا مطلب ہے کہ مونڈنے والے کا دایاں طرف ہو۔ اور اس قول کی نسبت امام ابوحنیفہؒ کی طرف کی گئی ہے مگر انہوں نے اس سے رجوع کیا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ انہوں نے پہلے اس کو یمین الفاعل پر قیاس کیا جیسا کہ قیاس سے متبادر الی الذھن یہی ہوتا ہے لیکن جب ان کو خبر پہنچی کہ آپ ﷺ نے محلوق یعنی منڈ وانے والے کے دائیں طرف کا اعتبار کیا ہے تو اس قول سے رجوع کیا جس کی بنیاد معقول پر تھی صریح منقول قول کی طرف کیونکہ حق اتباع کا زیادہ حقدار ہے اور اگر حالق، محلوق کے پیچھے کھڑا ہو جائے تو دونوں کے دائیں طرف کا جمع ممکن ہے۔

ابن ہمام کہتے ہیں کہ ابن ماجہ کے علاوہ صحاح میں یہ روایت ہے ''**عن انس بن مالکؓ ان رسول اللہ ﷺ اتی منٰی فاتی الجمرۃ فرماھا، ثم اتی منزلہ بمنیٰ فنحر ثم قال للحلاق: خذ، واشار الیٰ جانبہ الا یمن ثم الایسر، ثم جعل یعطیہ الناس**''۔

تو اس سے معلوم ہوا کہ سر منڈ وانے میں سنت دائیں طرف سے ابتداء کرنا ہے اور معتبر منڈ وانے والے کا دایاں طرف ہے یہ امام ابوحنیفہؒ کے ذکر کردہ مذہب کے خلاف ہے اور یہی صحیح ہے۔ (انتہی)

سروجیؒ کہتے ہیں کہ محلوق یعنی سر منڈ وانے والے کے دائیں طرف سے ابتداء کی جائے امام شافعیؒ کے نزدیک اور ہمارے بعض علماء نے بھی یہی ذکر کیا ہے لیکن کسی کی طرف منسوب نہیں کیا ہے اور امام صاحب نے حلاق کے دائیں طرف کو لیا اور اس پر نکیر نہیں اگر ان کا مذہب اس کے خلاف ہوتا تو اس کی موافقت نہ کرتے۔

اور منسک ابن عجمی اور بحر میں ہے کہ یہی مختار ہے۔ نخبہ میں ہے کہ یہی صحیح ہے اور امام صاحب کا جو قول ان سے ان کے شاگردوں نے نقل کیا ہے تو اس سے ان کا رجوع بھی منقول ہے۔

کیونکہ امام صاحب نے فرمایا کہ میں نے حج میں فلاں فلاں موقع پر غلطی کی اور ان میں سے سر مونڈنے والے کے دائیں طرف سے ابتداء کرنے کو بھی ذکر کیا ہے۔ پس ان کے آخری قول کو صحیح قرار دینا درست ہے۔ ابن حجر نے ذکر کیا ہے کہ سر منڈ وانے یا بال کتروانے کے بعد ناخن کاٹنا بھی سنت ہے جیسا کہ آپ ﷺ سے صحیح طور پر منقول ہے اور ابن عمرؓ اپنی داڑھی اور مونچھوں کے زائد بال بھی کاٹتے تھے۔

ملا علی قاری کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے قول: ﴿ثم لیقضوا تفثھم﴾ کے لائق ہے۔

قولہ :ثم دعا اباطلحۃ......فحلقہ:

''ابوطلحہ انصاری'' حضرت انسؓ کے چچا اور اس کی والدہ ام سلیم کے شوہر ہیں اور آپ ﷺ کی ابوطلحہ اور ان کے گھر والوں کے ساتھ زیادہ خصوصیت اور محبت تھی جو دیگر انصار کیلئے نہ تھی اور بہت سارے مہاجرین کیلئے بھی اتنی نہ تھی۔ اور ابوطلحہ وہی ہے جنہوں نے آپ ﷺ کی قبر یف شریف کی کھدائی کی اور اس کو لحد بنایا اور اس کیلئے اینٹیں تیار کیں۔

قولہ فاعطاہ اباطلحۃ ،فقال: اقسمہ بین الناس: یہ انسان کے بالوں کی طہارت پر دلیل ہے برخلاف ان لوگوں کے جنہوں نے اس بارے میں شاذ قول اختیار کیا۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کے بالوں اور باقی آثار سے برکت حاصل کی جائے۔

نحر کے دن خوشبو کا استعمال

۲۶۵۱: وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ كُنْتُ اُطَيِّبُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَبْلَ اَنْ يُّحْرِمَ وَيَوْمَ النَّحْرِ قَبْلَ اَنْ يَّطُوْفَ بِا

لُبُیْتِ بِطِیْبٍ فِیْهِ مِسْكٌ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۹۶/۳۔ حدیث رقم ۱۵۳۹۔ ومسلم فی ۸۴۹/۲ حدیث رقم (۴۶۔۱۱۹۱)۔ وابو داؤد فی السنن ۳۵۸/۲ الحدیث رقم ۱۷۴۵۔ والترمذی فی ۲۵۹/۳ حدیث رقم ۹۱۷۔ والنسائی فی ۱۳۷/۵ الحدیث رقم ۲۶۸۵۔ وابن ماجه فی ۹۷۶/۲ حدیث رقم ۲۹۲۶۔ ومالك فی الموطأ ۳۲۸/۱ الحدیث رقم ۱۷ من کتاب الحج۔ واحمد فی المسند ۱۸۶/۶۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خوشبو لگاتی تھی احرام باندھنے سے پہلے یعنی حج کا احرام باندھنے یا عمرے کا یا دونوں کا قربانی کے دن خانہ کعبہ کا طواف کرنے سے پہلے یعنی سر منڈانے کے بعد اور کپڑے پہننے کے وقت خوشبو لگاتے کہ اس میں مشک ہوتا تھا اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ''بطیب'' اطیب کے متعلق ہے۔

اس حدیث میں ان لوگوں پر رد ہے جو کہتے ہیں کہ خوشبو تابع جماع ہے۔

نحر کے دن ظہر کی نماز کہاں پڑھی جائے؟

۲۶۵۲: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَفَاضَ يَوْمَ النَّحْرِ ثُمَّ رَجَعَ فَصَلَّى الظُّهْرَ بِمِنًى۔

اخرجه مسلم فی صحیحه ۹۵۰/۲ الحدیث رقم (۳۳۵۔ ۱۳۰۸)۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ تحقیق نبی کریم مکے میں تشریف لائے نحر کے دن بھی رمی کے بعد اور ذبح کرنے کے بعد اور فرض طواف کیا چاشت کے وقت پھر اسی روز واپس لوٹے اور منیٰ میں ظہر کی نماز پڑھی اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث میں اس کے برخلاف ہے کیونکہ اس میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز مکہ میں پڑھی ہے۔ پس اس میں شک نہیں ہے کہ دونوں احادیث میں سے ایک میں وہم ہے۔ اب جب دونوں میں تعارض آیا اور یہ بھی ضروری ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز دونوں جگہوں میں سے کسی ایک میں پڑھی ہو۔ پس مکہ میں مسجد حرام میں پڑھی ہوگی جس میں فرائض کا ثواب دگنا ہے تو اس کو ترجیح دینا زیادہ اولیٰ ہے۔ (انتہیٰ) اور یہ توجیہ کرنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز دوبارہ پڑھی مقتدی بن کر ہمارے مذہب کے مطابق اور امام بن کے امام شافعی کے مذہب کے مطابق اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو ظہر پڑھنے کا حکم دیا جب وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتظار میں تھے وہم پر حمل کرنے سے اولیٰ ہے جیسا کہ ظاہر ہے۔

اور اس کو کسی اور دن پر بھی حمل کیا جا سکتا ہے اس روایت کے مطابق جس میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر دن بیت اللہ کی زیارت فرمایا کرتے تھے اور اس تعارض کا حل پہلے گزر چکا ہے اور ترمذی کی روایت جس میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف کو رات تک مؤخر کیا تھا تو اس سے مراد اپنے ازواج کا طواف ہے یا اس سے مراد رات تک طواف کو مؤخر کرنے کا جواز ہے۔

یا وہ طواف ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج کے ساتھ کرنا تھا جیسا کہ حدیث میں ہے **زار مع نسائه لیلاً**۔

اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رمی اور حلق دونوں ظہر سے قبل واقع ہوئے تھے۔ بالاتفاق اگرچہ اس میں اختلاف ہے کہ مکہ اور منیٰ میں ہونے کا اختلاف ہے کیونکہ حلق اور افاضہ میں ترتیب معتبر ہے تو باب اور حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما میں مناسبت ظاہر ہوگئی۔

الفصل الثانی:

عورت کو سر منڈوانا ممنوع ہے

۲۶۵۳: وَعَنْ عَلِيٍّ وَعَائِشَةَ قَالَا نَهَى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَنْ تَحْلِقَ الْمَرْاَةُ رَأْسَهَا۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۲۷۵/۳ الحدیث رقم ۹۱۴۔

ترجمہ: حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے دونوں نے کہا کہ حضور ﷺ نے عورت کو سر منڈوانے سے منع فرمایا ہے۔اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ عورت جب احرام سے باہر آئے تو اپنا سر نہ منڈائے اور اس حدیث سے عورتوں کو مطلقاً سر منڈوانے کی ممانعت بھی ہوسکتی ہے کیونکہ عورتوں کا سر منڈانا مثلہ کے زمرے میں آتا ہے جس طرح مرد کو داڑھی منڈانا حرام ہے ہاں کسی ضرورت کی بنا پر عورت سر منڈواسکتی ہے۔

۲۶۵۴: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَيْسَ عَلَى النِّسَاءِ الْحَلْقُ اِنَّمَا عَلَى النِّسَاءِ التَّقْصِيْرُ۔

(رواه ابو داود والترمذی والدارمی)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۵۰۲/۲ الحدیث رقم ۱۹۸۵۔ والدارمی فی ۸۹/۲ الحدیث رقم ۱۹۰۶۔ والدارقطنی فی ۲۷۱/۲ الحدیث رقم ۱۶۵ من کتاب الحج۔

ترجمہ: اور حضرت ابن عباس ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: عورتوں کے لئے سر منڈوانا نہیں بلکہ انہیں تو فقط اپنے بال کتروانے چاہئیں۔(ابوداؤد ترمذی دارمی)

تشریح: مطلب یہ ہے کہ عورتیں جب احرام سے باہر آئیں تو سر منڈانا ان پر واجب نہیں ہے بلکہ یہ ان کیلئے حرام ہے ہاں بال کتروانا ان پر واجب ہے بخلاف مردوں کے کہ ان پر دونوں چیزوں میں سے کوئی ایک واجب ہے۔البتہ سر منڈانا افضل ہے۔

علامہ طیبیؒ نے ذکر کیا ہے کہ بال کتروانے کی کم از کم مقدار تین بال ہے اور ہمارے نزدیک ایک انگلی کے برابر بال کتروانا ہے مرد ہو یا عورت اور چوتھائی سر کے بالوں کو کتروانا واجب ہے ہمارے مذہب کے مطابق۔لیکن علامہ ابن ہمام نے اس قول کو اختیار کیا ہے جو امام مالک کا مسلک ہے کہ پورے سر کے بالوں کو کتروانا واجب ہے۔

قوله :رواه ابو داود والدارمی:

سید کے نسخہ میں داری کی جگہ والترمذی واو عطف کے ساتھ ہے اور عفیف کے نسخہ میں بغیر واو عطف کے الترمذی ہے۔

وهذا الباب خال عن الفصل الثالث : اور اس باب میں تیسری **فصل** نہیں ہے۔

بَابٌ

گزشتہ باب کے متعلقات کا بیان

باب تنوین اور سکون دونوں کے ساتھ پڑھا جاتا ہے ایک نسخہ میں باب **جواز التقدیم والتاخیر فی بعض امور الحج** ہے۔

اور ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ یہ باب چونکہ مسائل حلق سے متعلق ہے اس وجہ سے ترجمۃ الباب ذکر نہیں کیا۔یہ انتہائی عجیب ہے کیونکہ باب

حلق، رمی، ذبح اور افاضہ سب کے مسائل پر مشتمل ہے۔

الفصل الاول:

افعال حج میں تقدیم وتاخیر سے کوئی گناہ نہیں ہے

۲۶۵۵: عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِوبْنِ الْعَاصِ اَنَّ رَسُوْ لَ اللّٰهِ ﷺ وَقَفَ فِي حَجَّةِ الْوَدَا عِ بِمِنًى لِلنَّاسِ يَسْاَلُوْنَهُ فَجَا ءَ هُ رَجُلٌ فَقَالَ لَمْ اَشْعُرْ فَحَلَقْتُ قَبْلَ اَنْ اَذْبَحَ فَقَالَ اِذْبَحْ وَلَا حَرَجَ فَجَاءَ اٰخَرُ فَقَالَ لَمْ اَشْعُرْ فَنَحَرْتُ قَبْلَ اَنْ اَرْمِيَ فَقَالَ اِرْمِ وَلَا حَرَجَ فَمَا سُئِلَ النَّبِيُّ ﷺ عَنْ شَيْءٍ قُدِّمَ وَلَا اُخِّرَ اِلَّا قَالَ افْعَلْ وَلَا حَرَجَ (متفق عليه وفي رواية لمسلم) اَتَاهُ رَجُلٌ فَقَالَ حَلَقْتُ قَبْلَ اَنْ اَرْمِيَ قَالَ اِرْمِ وَلَا حَرَجَ وَاَتَاهُ اٰخَرُ فَقَالَ اَفَضْتُ اِلَى الْبَيْتِ قَبْلَ اَنْ اَرْمِيَ قَالَ اِرْمِ وَلَا حَرَجَ۔

اخرجه البخاری فی ٥٦٩/٣ الحديث رقم ١٧٣٦۔ ومسلم فی ٩٤٨/٢ الحديث رقم (٣٢٧۔ ١٣٠٦)۔ وابوداؤد فی السنن ٥١٦/٢ الحديث رقم ٢٠١٤۔ والترمذی فی ٢٥٨/٣ الحديث رقم ٩١٦۔ وابن ماجه فی ١٠١٤/٢ الحديث رقم ٣٠٥١ مالك فی الموطأ ٤٢١/١ الحديث رقم ٢٤٢۔ واحمد فی المسند ١٥٩/٢۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ حجۃ الوداع میں منیٰ کے مقام پر لوگوں کے لیے ٹھہرے اس لیے تو وہ آپ ﷺ سے مسائل پوچھتے تھے پس حضور ﷺ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ میں نہیں جانتا تھا میں نے اپنا سر ذبح کرنے سے پہلے منڈایا۔ پس فرمایا کہ ذبح کر لے اب کوئی گناہ نہیں ہے پھر ایک اور شخص آیا اس نے کہا کہ میں نہیں جانتا تھا پس میں نے کنکریاں مارنے سے پہلے نحر کیا فرمایا اب کنکریاں پھینکو اور کوئی گناہ نہیں ہے پس نبی کریم ﷺ سے کسی چیز کی تقدیم یا تاخیر کے بارے میں سوال کیا' مگر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے اور مسلمؒ کی ایک روایت میں آیا کہ حضور ﷺ کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ میں نے کنکریاں پھینکنے سے پہلے سر منڈایا فرمایا پھینکو کوئی گناہ نہیں ہے اور ایک دوسرا شخص آیا اور اس نے کہا کہ میں نے کنکریاں پھینکنے سے پہلے خانہ کعبہ کا طواف کیا۔ فرمایا اب کنکریاں پھینک لے کوئی گناہ نہیں ہے۔

تشریح: **قوله :ان رسول الله ﷺ وقف فی حجة الوداع بمنی للناس یسالونه :**

''**حجة الوداع**'' حاء اور واو کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

''**یسالونه**'' وقف کے فاعل یا الناس سے حال ہے یا استیناف ہے وقوف کے بیان کیلئے۔ اور آخری احتمال کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جس میں ہے''**وقف علی راحلة فطفق الناس یسالونه**''۔

قوله :فجاءه رجل ،فقال ......افعل ولا حرج:

''**فجاء**'' ایک نسخہ میں **فجاء ہ** ضمیر کے ساتھ ہے۔''''**قدم**'': صحیح قول کے مطابق صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

''**ولا اخر**'' علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اول میں **لا** کا مقدر ماننا ضروری ہے کیونکہ یہ کلام سیاق نفی میں ہے اور اس کی نظیر ﴿**ما ادری ما یفعل بی ولا بکم**﴾[الاحقاف:۹] ہے (انتہیٰ)۔ لیکن علامہ طیبیؒ کی بات کئی وجوہ سے قابل بحث ہے:

① کہ حدیث اس قاعدہ میں کہ **لا** کا مابعد اگر فعل ماضی ہو تو تکرار 'لا' واجب ہے جیسے: ﴿**فلا صدق ولا صلی**﴾ [القیامة:۳۱]

داخل نہیں ہے۔

④ بلکہ یہ آیت جو نظیر میں پیش کی گئی ہے یہ بھی اس قاعدہ سے خارج ہے کیونکہ مغنی وغیرہ میں ہے کہ لاؔ جس پر داخل ہے اگر وہ فعل مضارع ہے تو تکرار 'لا' واجب نہیں ہے۔ جیسے ﴿لا یحب الله الجهر بالسوء من القول﴾[النساء:۱۴۸] اور ﴿قل لا اسئلکم علیه اجرا﴾[هود:۵۱] اللہ تعالیٰ بری بات زبان پر لانے کو پسند نہیں کرتا تو کہہ میں نے مانگنا نہیں تم سے اس پر کچھ بدلہ۔

③ کبھی اس آیت کو لانے سے متبادر الی الفہم یہ ہوتا ہے کہ یہ تکرار میں ہونے کے وجود کی نظیر ہے جیسا کہ علامہ طیبیؒ کی عبارت سے یہ وہم پیدا ہو رہا ہے حالانکہ بات ایسی نہیں ہے۔

④ ''لا شلت یداك'' اور ''لا فضّ الله فاك'' میں بغیر تکرار کے ساتھ آیا ہے۔
کیونکہ ان مثالوں میں مقصد دعا ہے تو فعل مستقبل کے معنی میں ہوا۔

⑤ ان تغفر اللّٰهم فاغفر جما: وای عبدلك لا الّما میں بغیر تکرار کے آیا ہے۔

⑥ اول یا آخر میں تقدیر لا غیر معروف ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ نحر کے دن چار چیزیں ہوتی ہیں: ① جمرہ عقبہ پر کنکریاں مارنا۔ ② پھر اسکے بعد جانور ذبح کرنا۔ ③ پھر اس کے بعد سر منڈوانا۔ ④ اور پھر مکہ میں طواف افاضہ کرنا۔ اس ترتیب کے ساتھ افعال کی ادائیگی بعض علماء کے نزدیک سنت ہے۔ چنانچہ امام شافعیؒ، امام احمدؒ، اسحٰقؒ بھی ان میں شامل ہیں۔ مذکورہ حدیث کی وجہ سے۔ پس ان کے نزدیک ترتیب کے ترک پر دم واجب نہیں ہوتی۔ ابن جبیر فرماتے ہیں کہ ان افعال میں ترتیب واجب ہے اور علماء کی ایک جماعت کا یہی مسلک ہے جن میں امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ شامل ہیں یہ حضرات کہتے ہیں کہ حدیث کے الفاظ اس میں کوئی حرج نہیں کا مطلب صرف اتنا ہے کہ اس میں ناواقفیت کی وجہ سے گناہ نہیں ہے لیکن جزاء کے طور پر دم واجب ہوگا (انتہٰی) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ایسی ہی ایک حدیث روایت کی ہے جبکہ خود انہوں نے مذکورہ افعال کی تقدیم و تاخیر میں دم واجب کیا ہے اگر وہ حدیث کے معنی نہ سمجھتے جو امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے سمجھے ہیں تو وہ خود دم واجب کیوں کرتے۔

اب یہ بات سمجھ لیں کہ رمی، ذبح اور حلق میں ترتیب ابوحنیفہؒ کے نزدیک قارن اور متمتع کیلئے واجب ہے اور صاحبینؒ کے نزدیک سنت ہے اور یہی اختلاف ذبح کا یوم نحر کے ساتھ خاص ہونے میں ہے اور ذبح کا حرم کے ساتھ خاص ہونا بالاتفاق شرط ہے اگر غیر حرم میں کسی نے جانور ذبح کر دیا تو اس کا ذمہ بری نہ ہوگا جب تک کہ حرم میں ذبح نہ کریں۔ حلق اور طواف میں ترتیب واجب نہیں ہے اور اسی طرح رمی اور طواف میں بھی ترتیب واجب نہیں ہے۔ پس یہ جو کہا گیا ہے کہ ترتیب رمی، حلق اور طواف کے درمیان واجب ہے صحیح نہیں ہے۔

۲۶۵۶: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُسْئَلُ يَوْمَ النَّحْرِ بِمِنًى فَيَقُوْلُ لَا حَرَجَ فَسَأَلَهُ رَجُلٌ فَقَالَ رَمَيْتُ بَعْدَ مَا اَمْسَيْتُ فَقَالَ لَا حَرَجَ ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۵۵۹/۳ الحدیث رقم ۱۷۳۵۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نحر کے دن پوچھا گیا منیٰ میں۔ فرماتے ہیں کوئی گناہ نہیں پس آپ سے ایک شخص نے پوچھا کہ میں نے کنکریاں ماری ہیں شام ہونے کے بعد پس فرمایا کوئی گناہ نہیں ہے۔ اس کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ "شام ہونے کے بعد" سے مراد بعد عصر ہے اور اس میں کوئی کوتاہی نہیں ہے بلکہ اس وقت رمی کرنا بالاتفاق جائز ہے یہاں تک کہ یوم نحر کو بھی جائز ہے۔ اور جب سورج غروب ہو جائے تو رمی کا وقت فوت ہو جاتا ہے اس کے بعد رمی کرنے والے پر دم واجب ہوگا۔ امام شافعیؒ کے قول کے مطابق۔

حنفیہ کے ہاں اس بارے میں تفصیل ہے۔ شیخ الاسلام بسوط میں فرماتے ہیں کہ دسویں ذوالحجہ کو طلوع فجر کے بعد کا وقت کنکریاں مارنے کیلئے وقت جواز ہے مگر اساءت کے ساتھ طلوع آفتاب کے بعد سے زوال تک کا وقت مسنون ہے زوال کے بعد سے غروب تک وقت جواز ہے بغیر اساءت کے اور رات کا وقت وقت جواز ہے۔ مگر کراہت کے ساتھ۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ اساءت کیلئے ضروری ہے کہ یہ تاخیر بلا عذر ہو چنانچہ کمزوروں کا طلوع شمس سے پہلے رمی کرنا اور چرواہوں کا رات کے وقت رمی کرنا موجب اساءت نہیں ہے اور ہوگا کیسے جبکہ ان کو اجازت حاصل ہے (انتہیٰ)۔ ابن ہمام کی یہ بات چرواہوں کے بارے میں درست اور کمزوروں کے بارے میں کمزور ہے۔ بموجب حدیث صحیح **لاترموا الجمرة حتی تطلع الشمس** پھر ابن ہمام فرماتے ہیں اگر کوئی شخص بلا عذر رمی میں اتنی تاخیر کرے کہ صبح ہو جائے تو وہ رمی کرے مگر اس پر دم واجب ہوگا یہ امام صاحب کا قول ہے۔ صاحبین کا اس سے اختلاف ہے (انتہیٰ)۔

یوم نحر کے بعد دو دنوں میں کنکریاں مارنے کا وقت مسنون زوال آفتاب کے بعد سے غروب آفتاب تک ہے اور غروب آفتاب کے بعد سے فجر طلوع ہونے تک کا وقت مکروہ ہے۔ لہٰذا فجر طلوع ہوتے ہی امام اعظم کے نزدیک وقت ادا ختم ہو جاتا ہے جبکہ صاحبین کے نزدیک ادا طلوع فجر کے بعد بھی باقی رہتا ہے اور وقت قضا بالاتفاق باقی رہتا ہے اور چوتھے دن کو آفتاب غروب ہوتے ہی بالاتفاق رمی کا وقت ادا اور قضاء فوت ہو جاتا ہے۔

الفصل الثانی:

افعالِ حج میں تقدیم وتاخیر معاف ہے

۲۶۵۷: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ اَتَاهُ رَجُلٌ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اِنِّي اَفَضْتُ قَبْلَ اَنْ اَحْلِقَ قَالَ اِحْلِقْ اَوْقَصِّرْ وَلَا حَرَجَ وَجَاءَ اٰخَرُ فَقَالَ ذَبَحْتُ قَبْلَ اَنْ اَرْمِيَ قَالَ اِرْمِ وَلَا حَرَجَ۔ (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۲۵۸/۳ الحدیث رقم ۹۱۶۔

ترجمہ: حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ تحقیق میں نے طواف افاضہ کیا ہے یعنی فرض طواف سر منڈانے سے پہلے آپ ﷺ نے اس کو فرمایا سر منڈا لے یا کتروا لے اور کوئی گناہ نہیں ہے اور ایک اور شخص آیا۔ اس نے کہا کہ میں نے کنکریاں پھینکنے سے ذبح کیا ہے فرمایا کنکریاں پھینکو اور کوئی گناہ نہیں ہے۔ امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :ولا حرج: یعنی مفرد پر نہ گناہ ہے اور نہ فدیہ لازم ہے اور اگر قارن یا متمتع ہو تو ان پر کوئی گناہ نہیں ہے جب تک کہ عمداً نہ ہو لیکن ان پر کفارہ لازم ہوگا۔

الفصل الثالث:

۲۶۵۸: وَعَنْ اُسَامَةَ بْنِ شَرِيْكٍ قَالَ خَرَجْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ حَاجًّا فَكَانَ النَّاسُ يَأْتُوْنَهٗ فَمِنْ قَائِلٍ

يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ سَعَيْتُ قَبْلَ اَنْ اَطُوْفَ اَوْ اَخَّرْتُ شَيْئًا اَوْ قَدَّمْتُ شَيْئًا فَكَانَ يَقُوْلُ لَا حَرَجَ اِلَّا عَلٰى رَجُلٍ اقْتَرَضَ عِرْضَ مُسْلِمٍ وَهُوَ ظَالِمٌ فَذٰلِكَ الَّذِىْ حَرِجَ وَهَلَكَ۔ (رواہ ابوداود)

اخرجه ابوداؤد فی ۵۱۷/۲ الحديث رقم ۲۰۱۵۔

ترجمہ: حضرت اسامہ بن شریکؓ سے روایت ہے کہ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ حج کرنے کے لیے نکلا۔ پس لوگ حضور ﷺ کے پاس آئے پس بعض کہنے والوں میں سے کسی نے کہا اے اللہ رسول ﷺ میں نے طواف کرنے سے پہلے صفا ومروہ میں چکر لگایا یا میں نے ایک چیز بعد میں کی۔ یا ایک چیز پہلے کی۔ منیٰ کے ایام کے افعال میں۔ حضور ﷺ فرماتے تھے کہ کوئی گناہ نہیں ہے لیکن گناہ اس شخص کو ہے کہ وہ آبروریزی کرے مسلمان کی۔ اس حال میں کہ وہ شخص ظالم ہے پس یہ شخص گنہگار ہے اور ہلاک ہوا۔ اس کو ابوداودؒ نے نقل کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

اسامة بن شریک ۔ یہ اسامہ بن شریک الذبیانی ثعلبی ہیں۔ شرف صحابیت سے فیض یاب ہوئے۔ اہل کوفہ میں ان کی احادیث زیادہ پھیلیں ان کا شمار کوفیین میں ہی ہوتا ہے۔ ان سے زیاد بن علاقہ وغیرہ نے روایت کی ہے۔ ''شریک'' شین معجمہ کے فتحہ اور راء مہملہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

تشریح: **قوله :سعيت قبل ان اطوف:**

یعنی طواف افاضہ کرنے سے پہلے سعی کی یہ ظاہراً آفاقی اور مکہ دونوں کو شامل ہے۔ اور یہی ہمارا مذہب ہے تقدیم وتاخیر میں افضلیت کے اختلاف کے ساتھ اور امام شافعیؒ نے اس کو آفاقی کے ساتھ مقید کیا ہے۔

قوله: افترض عرض مسلم وهوظالم فذلك الذى حرج وهلك: ''إقترض'': قاف کے ساتھ اقتطع کے معنی میں ہے۔ ''حرج'': راء کے کسرہ کے ساتھ ہے یعنی وقع منہ حرج۔ ''**وهلك**'': یہ عطف تفسیری ہے۔

احادیث میں آیا ہے کہ کعبہ کے اندر ۳۶ مرتبہ ماں کے ساتھ زنا کرنا مسلمان کی آبروریزی سے کم گناہ رکھتا ہے۔

بَابُ خُطْبَةِ يَوْمِ النَّحْرِ وَرَمْيِ اَيَّامَ التَّشْرِيْقِ وَالتَّوْدِيْعِ

قربانی کے دن خطبہ ایام تشریق میں رمی اور طواف رخصت کا بیان

قوله : خطبہ مراجعت فی الکلام کو کہتے ہیں۔ خطبہ ضمہ کے ساتھ وعظ کیلئے اور کسرہ کے ساتھ عورت طلب کرنے کیلئے آتا ہے۔ (ذکرہ طیبیؒ)

''**ورمى ايام التشريق**'' خطبہ پر عطف ہے۔ ''**والتوديع**'' طیبیؒ فرماتے ہیں کہ التشریق پر عطف ہے اور مراد ایام النفر ہیں جو طواف وداع کے بعد ہوتے ہیں (انتہیٰ) اور صحیح یہ ہے کہ اس کا عطف رمی یا خطبہ پر ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ کا طواف رخصت ایام نفر والی رات میں واقع ہوتا تھا۔ اور اس بات پر اتفاق ہونے کی وجہ سے کہ طواف رخصت ایام نفر اور اسکے ایام میں بھی جائز ہے بلکہ سب کے ہاں مکہ سے خروج تک مؤخر کرنا اولیٰ ہے تو ایام نفر کے ساتھ مقید کرنے کی کوئی وجہ نہیں بنتی اور اس کے ساتھ یہ تکرار محض ہے جس کے اعادہ میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔

الفصل الاول:

منیٰ کے مقام پر خطبہ

۲۶۵۹: عَنْ اَبِیْ بَکْرَةَ قَالَ خَطَبَنَا النَّبِیُّ ﷺ یَوْمَ النَّحْرِ قَالَ اِنَّ الزَّمَانَ قَدِ اسْتَدَارَ کَهَیْئَتِهٖ یَوْمَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ السَّنَةُ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا مِنْهَا اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ثَلَاثٌ مُتَوَالِیَاتٌ ذُوالْقَعْدَةِ وَذُوالْحَجَّةِ وَالْمُحَرَّمُ وَ رَجَبُ مُضَرَ الَّذِیْ بَیْنَ جِمَادِیْ وَشَعْبَانَ وَقَالَ اَیُّ شَهْرٍ هٰذَا قُلْنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ فَسَکَتَ حَتّٰی ظَنَنَّا اَنَّهٗ سَیُسَمِّیْهِ بِغَیْرِ اسْمِهٖ فَقَالَ اَلَیْسَ ذَاالْحِجَّةِ قُلْنَا بَلٰی قَالَ اَیُّ بَلَدٍ هٰذَا قُلْنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ فَسَکَتَ حَتّٰی ظَنَنَّا اَنَّهٗ سَیُسَمِّیْهِ بِغَیْرِ اسْمِهٖ قَالَ اَلَیْسَ الْبَلْدَةُ قُلْنَا بَلٰی قَالَ فَاَیُّ یَوْمٍ هٰذَا قُلْنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ فَسَکَتَ حَتّٰی ظَنَنَّا اَنَّهٗ سَیُسَمِّیْهِ بِغَیْرِ اسْمِهٖ قَالَ اَلَیْسَ یَوْمَ النَّحْرِ قُلْنَا بَلٰی قَالَ فَاِنَّ دِمَاءَ کُمْ وَاَمْوَالَکُمْ وَاَعْرَاضَکُمْ عَلَیْکُمْ حَرَامٌ کَحُرْمَةِ یَوْمِکُمْ هٰذَا فِیْ بَلَدِکُمْ هٰذَا فِیْ شَهْرِکُمْ هٰذَا وَسَتَلْقَوْنَ رَبَّکُمْ فَیَسْاَلُکُمْ عَنْ اَعْمَالِکُمْ اَلَا فَلَا تَرْجِعُوْا بَعْدِیْ ضُلَّالًا یَضْرِبُ بَعْضُکُمْ رِقَابَ بَعْضٍ اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ قَالُوْا نَعَمْ قَالَ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ فَلْیُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ فَرُبَّ مُبَلَّغٍ اَوْعٰی مِنْ سَامِعٍ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۵۷۳/۳۔ الحدیث رقم ۱۷۴۱۔ ومسلم فی ۱۳۰۷/۳ الحدیث رقم (۳۱۔ ۱۶۷۹) وابن ماجه فی السنن ۸۵/۱ الحدیث رقم ۲۳۳۔ والدارمی ۹۳/۲ الحدیث رقم ۱۹۱۶۔ واحمد فی المسند ۴۰/۵۔

ترجمہ: حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو قربانی کے دن خطبہ دیا۔ فرمایا: تحقیق زمانہ اپنی وضع کی طرح اللہ تعالیٰ کے آسمان وزمین کو پیدا کر کے دن سے پھر گیا ہے یعنی سال بارہ مہینے کا ہو گیا ان میں سے چار مہینے با حرمت ہیں تین تو پے در پے ذیقعدہ' ذی الحجہ اور محرم اور رجب مضر کا کہ جب وہ جمادی الثانی اور شعبان کے درمیان میں ہوا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کونسا مہینہ ہے؟ ہم نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) زیادہ جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر سکوت فرمایا یہاں تک ہم نے گمان کیا کہ اس کا نام ذی الحجہ کے علاوہ رکھیں گے پھر فرمایا گیا ذی الحجہ نہیں ہے ہم نے کہا ذی الحجہ مقرر ہے۔ فرمایا تو کونسی بستی ہے؟ ہم نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) زیادہ جانتے ہیں۔ پھر سکوت فرمایا یہاں تک کہ ہم نے گمان کیا کہ وہ اس کے نام کے علاوہ نام رکھیں گے فرمایا کہ کیا بلدہ نہیں ہے جو مکہ کا نام ہے۔ ہم نے عرض کیا کہ بلدہ مقرر ہے۔ فرمایا کہ یہ کونسا دن ہے؟ ہم نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں پھر سکوت کیا یہاں تک کہ ہم نے گمان کیا کہ وہ نام رکھیں گے۔ پھر فرمایا: کیا یہ نحر کا دن نہیں ہے؟ ہم نے عرض کیا ہاں! یوم نحر ہے۔ تحقیق تمہارا خون' تمہارے اموال ورتمہاری عزت تم پر اس دن کے حرام ہونے کی طرح۔ تمہاری اس بستی کے حرام ہونے کی طرح اور تمہارے اس مہینے کے حرام ہونے کی طرح حرام ہیں اور البتہ تم اپنے پروردگار سے ملو گے پس تم سے تمہارے اعمال کے بارے میں پوچھے گا پس خبردار میری وفات کے بعد گمراہ ہو کر پھر نہ جانا کہ بعض تمہارا البعض کی گردن مارے خبردار کیا میں نے احکام الٰہی تم تک پہنچا دیئے؟ ہم نے عرض کیا کہ ہاں پہنچا دیئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا اے الٰہی تو ان کے اقرار پر گواہ رہ تاکہ قیامت کے دن منکر نہ ہوں پس چاہیے کہ حاضر غائب کو پہنچا دے

پس بعض زیادہ پہنچائیں گے جو کہ زیادہ سننے والے ہیں۔اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ :خطبنا النبی ﷺ یوم النحر :شافعیہ کے نزدیک ایام نحر کے پہلے دن خطبہ پڑھنا مستحب ہے جبکہ حنفیہ کے ہاں دوسرے دن مستحب ہے۔جن احادیث صحیحہ میں خطبہ کو دوسرے دن کے ساتھ مقید کیا ہے وہ حنفیہ کی مؤید ہیں۔اسی وجہ سے امام نوویؒ نے شوافع کے اس مسئلے پر اشکال کیا ہے کہ اصحاب شوافع کہتے ہیں سنت ہے کہ امام یا اس کو نائب یوم نحر کو نماز ظہر کے بعد ایک خطبہ دے جس میں لوگوں کو احکام حج سکھائیں: امام نوویؒ پھر فرماتے ہیں کہ نماز ظہر کے بعد کا قول مخالف ہے ان احادیث صحیحہ کا جن میں وقت چاشت کا ذکر ہے(انتہی)۔پس صحیح بات یہ ہے کہ حدیث میں مذکور خطبہ سے مراد وعظ ونصیحت کا خطبہ ہے اور جو معروف خطبہ ہے تو وہ یوم نحر کے دوسرے دن ارشاد فرمایا تھا۔

قولہ :ان الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق السموات والارض :ایک نسخہ میں ''**کھیئتہ یوم**'' اضافت کے ساتھ ہے جو کہ روایۃً اور درایۃً دونوں طرح درست نہیں ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ہیئت کسی چیز کی صورت شکل اور حالت کو کہتے ہیں اور کاف مصدر محذوف کی صفت ہے تقدیر یوں ہے **استدار استدارۃ مثل حالتہ۔**

''**الزمان**'': زمان نام ہے وقت کا قلیل ہو یا کثیر ہو۔اس حدیث میں الزمان سے مراد السنۃ یعنی سال ہے۔

یعنی زمانہ اپنی تقسیم میں سالوں کی طرف اور سال مہینوں کی طرف اصل حساب اور وضع جس کو اللہ نے آسمان وزمین پیدا کرتے وقت مقرر کیا تھا، کی طرف لوٹا۔

ہمارے علماء میں سے بعض محققین فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ زمانہ اس ترتیب کی طرف لوٹا جس ترتیب کو اللہ نے آسمان و زمین کی پیدائش کے وقت مقرر کیا تھا اور وہ ترتیب یہ ہے کہ ہر سال بارہ مہینوں کا ہو اور مہینہ انتیس یا تیس دنوں کا ہو:

ایام جاہلیت میں عرب نے سال کے مہینوں میں تغیر کر دیا تھا ایک سال کو بارہ مہینے کا رکھتے تو ایک سال کو تیرہ مہینوں کا اسی طرح وہ حج کی ادائیگی کو ہر دو برس بعد ایک مہینہ مؤخر کر دیتے تھے۔اور مؤخر کیا ہوا مہینہ ملغی ہو جاتا یہاں تک کہ یہ سال تیرہ مہینوں کا ہو جاتا اور سال کے مہینے تبدیل ہو جاتے وہ اشہر حرم کو حلال قرار دیتے اور جو مہینے اشہر حلال ہوتے ان کو حرام بنا لیتے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:﴿**انما النسیئ زیادۃ فی الکفر**﴾[التوبۃ:۳۷]یہ ہٹا دینا کفر میں اور ترقی ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان کے حساب کو باطل قرار دیا اور سال کے ہر مہینے کو اس کے اصل پر برقرار رکھا۔

چنانچہ حضور ﷺ نے جس سال حجۃ الوداع کیا ہے اس سال ذوالحجہ کا مہینہ اپنے اصل پر تھا اس لیے نبی ﷺ نے ''**ان الزمان قد استدار کھیئتہ**'' ارشاد فرما کر لوگوں کو آگاہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ مہینہ ماہ ذوالحجہ ہے اور حج کا یہی مہینہ ہے لہٰذا اس مہینے کو یاد رکھو اور زمانہ جاہلیت کی عادت کے مطابق ایک مہینہ دوسرے سے تبدیل نہ کرو(انتہی)۔

قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ اہل عرب جب ماہ حرام آتا اور ان کو اس مہینے میں لڑنا منظور ہوتا تو وہ اس ماہ کو حلال قرار دیتے اور اس کے بعد کسی اور مہینے کو حرام قرار دیتے اس طرح مہینوں کی جو اصل خصوصیت تھی اسے انہوں نے ترک کر دیا تھا صرف عدد کا اعتبار کر رکھا تھا (انتہی) تو گویا کہ عرب نسئ کے بارے میں مختلف رواج رکھتے تھے۔واللہ اعلم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے﴿**فلا تظلموا فیھن انفسکم**﴾سو ان میں ظلم مت کرو اپنے اوپر۔

بیضاوی فرماتے ہیں یعنی ان مہینوں کی ہتک حرمت اور ان میں ارتکاب حرام کے ساتھ۔لیکن علماء کی اکثریت کہتی ہے کہ ان مہینوں

میں قتل وقتال کی حرمت منسوخ ہے ان کے نزدیک مذکورہ بالا آیت میں ظلم سے مراد ارتکاب معاصی ہے ان مہینوں میں کیونکہ یہ بہت بڑا گناہ ہے جیسا کہ حرم اور حالت احرام میں اس کا ارتکاب بہت بڑا گناہ ہے۔عطاء کہتے ہیں کہ لوگوں کیلئے حرم اور اشہر الحرم میں لڑنا حلال نہیں الا یہ کہ ان سے لڑا جائے۔اکثر علماء کے قول کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ نبی ﷺ نے شوال اور ذوالقعدہ میں طائف کا محاصرہ اور ہوازن کے ساتھ جہاد کیا تھا۔

عرب محرم کو صفر تک مؤخر کرتے تا کہ اس میں لڑائی کریں اور یہی وہ نسیٔ ہے جس کا ذکر قرآن میں ہے اور یہ وہ ہر سال کیا کرتے تھے تو محرم تمام مہینوں میں گھومتا تھا۔پس حجۃ الوداع کے سال محرم اپنے اصل کی طرف لوٹ آیا۔جس اصل پر پہلے سے تھا اسی وجہ سے نبی ﷺ نے حج اس سال تک مؤخر کر دیا۔لیکن اس پر اشکال وارد ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے ابوبکر کو حجۃ الوداع سے پہلے حج کرنے کا حکم فرمایا تھا حالانکہ بالاتفاق ذوالحجہ کے علاوہ کسی ماہ میں حج کرنا صحیح نہیں ہے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ میں نے اس مسئلے پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے پھر میں نے دیکھا کہ ابن حجر بھی اس قضیہ میں میرے موافق ہیں۔جیسا کہ انہوں نے کہا ہے کہ وہ حج جو سنہ ۸ ھ کو امیر مکہ عتاب بن اسید کے امارت میں ہوا اور اس طرح وہ حج جو سنہ ۹ ھ کو ابوبکرؓ کے امارت میں ہوا تھا یہ ذوالحجہ میں تھے۔اور زمانہ کی گردش ان سالوں میں پوری ہوگئی تھی کیونکہ یہ بات محال ہے کہ آپ ﷺ نے لوگوں کو ذوالحجہ کے علاوہ کسی مہینے میں حج کرنے کا حکم دیا ہو اور یہ حدیث اس کے منافی نہیں ہے کیونکہ قد استدار اس حج اور اس سے پہلے پر صادق آتا ہے لہٰذا اس کا حمل اس سال اور اس سے پہلے دو سالوں پر متعین ہوا۔

قولہ :السنة اثنا عشر شهرا،......وشعبان:

''السنة اثنا عشرة شهرا'' علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ مستانفہ ہے جو کہ جملہ اولیٰ کیلئے بیان ہے۔

''منها اربعة حرم'' جس میں سے چار مہینے باحرمت ہے۔''ثلاث متواليات'':علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ مہینوں کی ابتداء کا اعتبار رات سے کیا گیا ہے پس ثلاث سے تاء کو حذف کر دیا اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ یہاں لیالی کو تغلیب دی گئی ہے جیسا کہ اربعۃ میں ایام کو تغلیب دیا ہے۔

''ذوالقعدة'' قاف کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ ہے۔

''ذوالحجة'' حاء کے کسرہ کے ساتھ ہے اور کبھی اس سے ذو حذف کیا جاتا ہے۔

''والمحرم'' ذوالقعدہ پر عطف ہے۔

''و رجب مضر'' اس کا عطف ثلاث پر ہے اور الذی بین جمادیٰ و شعبان سے جو اس کی تعریف بیان کی ہے تو یہ اس میں نسبتی سے پیدا ہونے والے شک اور وہم کے ازالے کیلئے ہے۔اور علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ زیادہ بیان کیلئے ہے۔

''مضر'' عمر کے وزن پر غیر منصرف ہے عرب کا ایک بہت بڑا قبیلہ ہے رجب کی نسبت اس قبیلے کی طرف کرتے ہیں اس لیے کہ یہ قبیلہ باقی مہینوں کے نسبت اس کو تعظیم زیادہ کرتے تھے اور باقی عرب بھی زیادہ کرتے تھے۔

''جمادیٰ'' جیم کے ضمہ اور دال کے فتحہ جس کے بعد الف رسم الخط میں یاء کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔

قولہ :ای شهر هذا: استفہام سے مقصود مکہ اور مہینہ کی حرمت ان کے دلوں میں راسخ کرنی تھی تا کہ اس پر ان باتوں کی بنیاد رکھے جن کا آپ ﷺ نے ارادہ فرمایا تھا۔

قولہ :ای بلد هذا......الیس البلدة: ''البلدة'' علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ البلدۃ کا اطلاق مکہ پر غالب ہوگیا ہے کہ اب

البلدة بول کر مکہ بھی مراد ہوتا ہے جیسا کہ بیت کا اطلاق کعبہ پر ہے (انتہی)۔

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہے کہ البلدة التی تعلمونها مكة اور بعض نے البلدة کو نام قرار دیا ہے (انتہی) اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ البلدة سے مراد الارض یعنی زمین ہے منیٰ میں ھذا کے ساتھ اشارہ کرنے کے قرینہ سے۔ اور البلدة اگر چہ مکہ کا نام ہے لیکن کبھی بلدة بول کر مراد ارض حرم ہوتا ہے اطلاق الکل وارادة الجزء کے قبیل سے ہے۔ اور اسی سے ہے اللہ کا قول:

﴿انما امرت ان اعبد رب هذه البلدة الذی حرمها﴾ ''مجھ کو یہی حکم ہے کہ بندگی کروں اس شہر کے مالک کی جس نے اس کو حرمت دی''۔

اور اس میں شک نہیں کہ تحریم پورے حرم کو شامل ہے۔ آپ ﷺ نے لوگوں سے مہینے، دن اور شہر کا نام اس لیے پوچھا کہ تاکہ لوگوں کے ذہن میں اس مہینے دن اور شہر کی حرمت جاگزین ہو اور اس پر عمل کرنے کا پورا عزم و یقین پیدا کریں جیسے بعد میں بیان کرنا مقصود تھا۔ آپ ﷺ کے سوال کے جواب میں لوگوں کا یہ کہنا اللہ اور اس کے رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں نہ صرف از راہ ادب تھا بلکہ اس سے یہ جاننا بھی مقصود تھا کہ اس سوال سے آپ ﷺ کی غرض کیا ہے۔

قوله :فان دمائكم واموالكم واعراضكم...... فی شهركم هذا:

مکہ میں ارتکاب معاصی بہت بڑا جرم ہے جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے اور اس کے متبعین کی ایک جماعت نے کہا کہ مکہ میں معاصی دگنا ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ اس میں حسنات دگنا ہو جاتے ہیں لیکن قابل اعتبار بات یہ ہے کہ مکہ میں گناہ کا دگنا ہونا کیفیت کے لحاظ سے ہے نہ کہ کمیت کے لحاظ سے۔ تاکہ یہ اللہ کے اس قول کے مخالف نہ ہو ﴿ومن جاء بالسيئة فلا يجزى إلا مثلها﴾ [الانعام: ۱٦٠] اور جو شخص برا کام کریگا سو اس کو اس کے برابر ہی سزا ملے گی۔ اور اللہ کا قول ﴿ومن يرد فيه بالحاد بظلم نذقه من عذاب اليم﴾ [الحج: ۲۵] اور جو اس میں چاہے ٹیڑھی راہ شرارت سے اسے ہم چکھائیں گے ایک عذاب دردناک (تفسیر عثمانی)۔

یہ تعدد کے دعویٰ کرنے والوں کیلئے دلیل نہیں بن سکتی بلکہ اس سے مراد گناہ کا عظیم ہونا ہے جیسا کہ میں نے ذکر کیا ہے۔

قوله :فلا ترجعوا بعدی ضلالا:

''ضلالا'' ضاء کے ضمہ لام کی تشدید کے ساتھ ہے۔ ضال کی جمع ہے۔

''يضرب بعضكم الخ'' استناف مبین ہے یا حال ہے اور ایک نسخہ میں جزم کے ساتھ ہے تو اس صورت میں یہ جواب نہی ہے۔

بعض روایات میں لفظ ضلالا کے بجائے كفارا ہے اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ میرے وفات کے بعد تم اعمال میں کافروں کے مشابہ نہ ہونا کہ تم بھی ایک دوسرے کے گردن مارنے لگو۔

قوله :اللهم اشهد......فرب مبلغ اوعى من سامع: ''الا'' برائے تنبیہ ہے۔

''مبلغ'' لام مفتوحہ کے ساتھ جس تک حدیث پہنچائی جائے۔ ''بلغت'' لام کی تشدید کے ساتھ ہے۔

''فليبلغ'' تشدید اور تخفیف دونوں کے ساتھ ہے۔

''فرب مبلغ اوعى من سامع'': اس جملے میں غائبین کیلئے تسلی اور تابعین کیلئے تقویت اور اشارہ ہے کہ اللہ کا در سالکین کیلئے کھلا ہے اور اس کے در سے دھتکارے نہیں جاتے مگر ہالکین۔

رمی کے وقت کا بیان

۲٦٦٠: وَعَنْ وَبْرَةَ قَالَ سَأَلْتُ ابْنَ عُمَرَ مَتٰى اَرْمِى الْجِمَارَ قَالَ اِذَا رَمٰى اِمَامُكَ فَارْمِهِ فَاَعُدْتُ عَلَيْهِ

الْمَسْأَلَةَ فَقَالَ كُنَّا نَتَحَيَّنُ فَإِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ رَمَيْنَا۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۵۷۹/۳ الحدیث رقم ۱۷۴٦۔ وابوداؤد فی السنن ٤٩٦/٢ الحدیث رقم ١٩٧٢۔

ترجمہ: حضرت وبرہؒ سے روایت ہے کہ میں نے ابن عمرؓ سے پوچھا کہ میں کس وقت کنکریاں پھینکوں مناروں پر یعنی گیارہویں' بارہویں ذی الحجہ کوفرمایا جس وقت تیراامام پھینکے یعنی تو بھی رمی میں پیروی کر۔ کہ وہ نسبت تیرے زیادہ جانتا ہے رمی کے وقت کو پھر میں عرض کیا مسئلہ یعنی میں نے تحقیق چاہی رمی کے وقت کی۔ پس فرمایا کہ ہم انتظار کرتے تھے یعنی رمی کے وقت کا جس وقت دوپہر ڈھلتی تو ہم رمی کرتے یعنی کنکریاں پھینکتے۔ اس کوامام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا۔

راویٔ حدیث:

وبرۃ بن عبدالرحمٰن۔ یہ وبرہ ہیں۔ عبدالرحمٰن کے بیٹے ہیں۔ کنیت ابوخزیمہ ہے۔ ''بنوحارث'' میں سے ہیں۔ انہوں نے ابن عمراور سعید بن جبیر سے روایت حدیث کی ہے۔ ان سے ایک جماعت روایت کرتی ہے۔ ''وبرہ'' میں واؤاور باء دونوں مفتوح ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ باءساکن ہے۔

تشریح: **قوله :اذا رمی امامك فارمه:** ''فارمه'' هاءضمیر کے ساتھ ہے یا هاءسکتہ کی ہے پہلے کے مطابق تقریر ''ارم موضع الجمرة یاارم الرمی یاالحصٰی' ہوگی۔

یعنی رمی میں اس شخص کی پیروی کرجورمی کے وقت کے بارے میں تم سے زیادہ جانتا ہو۔ اوراس کی تائید بعض حضرات کے اس قول سے ہوتی ہے ''من تبع عالمًا لقی الله سالمًا'' جس نے جاننے والے کی پیروی کی تو اللہ سے سلامتی کی حالت میں ملے گا۔ باقی ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ امام اعظم یعنی وقت کا حکمران اگر حج میں موجود ہوتو اس کی پیروی کرے ورنہ امیر حج کی کرے۔ تو اس کے بارے میں بات یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں ان کی پیروی کرنا جائز نہیں ہے۔

قوله :فقال کنا نتحین فاذا زالت الشمس رمینا:

''رمینا'' بغیر ضمیر کے ہے اور ایک نسخہ میں رمیناہ ہے۔

ابن ماجہ کی روایت میں **بعد صلوٰۃ الظھر** کی تصریح ہے اور وہ زیادہ مناسب ہے **تقدیم الاهم فالاهم** کے اعتبار سے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا کنکریاں مارنے کا طریقہ

۲٦٦١: وَعَنْ سَالِمٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّهٗ كَانَ يَرْمِيْ جَمْرَةَ الدُّنْيَا بِسَبْعِ حَصَيَاتٍ يُكَبِّرُ عَلٰى اِثْرِ كُلِّ حَصَاةٍ ثُمَّ يَتَقَدَّمُ حَتّٰى يُسْهِلَ فَيَقُوْمُ مُسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةِ طَوِيْلاً وَيَدْعُوْا وَيَرْفَعُ يَدَيْهِ ثُمَّ يَرْمِي الْوُسْطٰى بِسَبْعِ حَصَيَاتٍ يُكَبِّرُ كُلَّمَا رَمٰى بِحَصَاةٍ ثُمَّ يَأْخُذُ بِذَاتِ الشِّمَالِ فَيُسْهِلُ وَيَقُوْمُ مُسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةِ ثُمَّ يَدْعُوْ وَيَرْفَعُ يَدَيْهِ وَيَقُوْمُ طَوِيْلاً ثُمَّ يَرْمِيْ جَمْرَةَ ذَاتِ الْعَقَبَةِ مِنْ بَطْنِ الْوَادِيْ بِسَبْعِ حَصَيَاتٍ يُكَبِّرُ عِنْدَ كُلِّ حَصَاةٍ وَلَا يَقِفُ عِنْدَهَا ثُمَّ يَنْصَرِفُ فَيَقُوْلُ هٰكَذَا رَاَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَفْعَلُهٗ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۵۸۲/۳۔ الحدیث رقم ۱۷۵۲۔

ترجمہ: حضرت سالم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ وہ منارے کے نزدیک سات کنکریاں پھینکتے تھے اور وہ ہر کنکری پر اللہ اکبر کہتے تھے پھر آگے بڑھتے یہاں تک کہ نرم زمین پر آتے پھر قبلے کے

سامنے دیر تک سورۂ بقرہ پڑھنے کی بقدر کھڑے رہتے اور دعا مانگتے اور ہاتھ اٹھاتے پھر سات کنکریاں اللہ اکبر کہہ کر درمیانی برجی پر پھینکتے۔ جب کنکری پھینکتے تو پھر بائیں طرف چلتے یہاں تک کہ نرم زمین پر آتے اور قبلے کے سامنے کھڑے ہوتے۔ پھر دعا مانگتے اور دونوں ہاتھ اٹھاتے اور دیر تک کھڑے رہتے اور پھر جمرۂ عقبہ پر نالے کے اندر سے سات کنکریاں پھینکتے۔ ہر کنکری پر اللہ اکبر کہتے تھے اور اس کے نزدیک نہ ٹھہرتے پھر لوٹتے اور کہتے کہ اس طرح سے میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کرتے دیکھا ہے۔

تشریح: قولہ :انہ کان یرمی جمرۃ الدنیابسبع حصیات......حتی یسھل:

جمرۃ الدنیا: سے مراد قریبی جمرہ جو کہ **جمرۃ العقبٰی** ہے اور یہ پہلا جمرہ ہے اور اس کو قریب اس لیے کہا ہے کہ یہ مسجد خیف کے پاس ٹھہرنے والوں کے منازل کے قریب ہے اور یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اونٹ بٹھانے کی جگہ بھی تھی۔

''**بسبع حصیات**''یعنی ایام تشریق کے ہر دن۔

''**یکبر**''ابن ہمام کہتے ہیں عبداللہ ابن مسعودؓ اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اسی طرح مروی ہے۔ اور حضرت جابرؓ وغیرہ کی حدیث میں بھی اسی طرح ہے۔ روایات کے ظاہر سے لگتا ہے کہ اللہ اکبر پر اکتفا کرنا چاہیے لیکن بعض روایات میں ''بسم اللہ'' کی زیادت ہے بعض میں ''**رغما للشیطان ورضا للرحمٰن ، اللھم اجعلہ حجاً مبرورا وسعیاً مشکورا وذنباً مغفورا**'' ہے۔

''**علی اثر کل حصاۃ**'': ایک روایت میں ''**کل حصاۃ**'' ہے۔ اور ایک روایت میں **عند کل حصاۃ** ہے اور وہ زیادہ عام ہے۔

''**حتی یسھل**'' یاء کے ضمہ اور ھاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ یعنی مکان **سھل** میں داخل ہو جاتے۔

قولہ :فیقوم مستقبل القبلۃ......بسبع حصیات: ''**فیقوم**'' مرفوع ہے یتقدم پر عطف ہے۔

''**مستقبل القبلۃ**'' اور ایک صحیح نسخہ میں **فیستقبل القبلۃ** ہے۔ ''**طویلا**'' موصوف محذوف ہے یعنی **قیاماً طویلاً**۔ (دیر تک ٹھہرتے)۔

''**ویدعو**'' بخاری کی روایت میں ''**قدر سورۃ البقرۃ**'' ہے۔ ''**جمرۃ ذات العقبۃ**'' جمرہ کی اضافت کے ساتھ ہے۔

ہدایہ میں ہے کہ اگر اوپر کی جانب سے جمرہ عقبہ پر کنکریاں پھینکی جائے تو اس طرح بھی جائز ہے مگر خلاف سنت ہے۔

ابن ہمامؒ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نشیبی حصے سے کنکری پھینکنا یہ سنت ہے نہ کہ واجب ہے۔ اسی وجہ سے بہت سے صحابہ کی رمی اوپر کی جانب سے ثابت ہے مگر ان کو اعادہ کا حکم نہیں دیا۔ اور نہ ہی لوگوں میں اس کا اعلان کیا ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں ابن مسعودؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے بطن وادی سے جمرہ عقبہ پر کنکریاں پھینکی اور ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہی۔

ان سے پوچھا گیا کہ لوگ اوپر کی طرف سے کنکریاں پھینکتے ہیں؟ عبداللہ ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں یہ وہ مقام ہے جہاں سورۃ بقرہ نازل ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رمی کیلئے اس جگہ کو پسند کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جب اوپر سے کنکریاں پھینکی جائے تو اس میں نیچے سے گزرنے والوں کو تکلیف اور ایذاء کا خطرہ ہے۔ برخلاف نیچے کی طرف سے پھینکنے کے کہ اس میں یہ خطرہ نہیں ہے کہ اوپر والوں کو تکلیف پہنچ جائے (انتہی) اور اس کی تائید تمام جہات سے رمی کی جواز سے بھی ہوتی ہے۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک ہی جہت سے رمی کی ہے۔

ابن ہمامؒ کہتے ہیں، جمرہ عقبہ کے علاوہ جمرہ اولیٰ اور جمرہ وسطیٰ کے بعد پاس ٹھہرنے اور دعا کرنے کی تخصیص کی حکمت واضح نہیں ہے۔ اگر یہ خیال کیا جائے کہ پہلے دن مشاغل کی کثرت یعنی ذبح، حلق، مکہ کی طرف لوٹنے کی وجہ سے جمرہ عقبہ کے بعد یہ نہیں ہے تو یہ

امور یوم اول کے بعد والے ایام میں منعدم ہے تو وہاں بھی اس کے بعد وقوف اور دعا نہیں ہے۔مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جمرہ عقبہ کے بعد وقوف راستے میں ہوتا ہے جس کی وجہ سے لوگوں کیلئے وہاں سے گزرنا ممکن نہیں ہوتا اور وقوف کرنے والوں کا ہجوم ہوتا ہے تو اس کی وجہ سے لوگ بہت بڑے ضرر میں پڑ جاتے ہیں برخلاف باقی جمرات کے کیونکہ وہ راستے میں نہیں ہے بلکہ راستے سے ہٹ کر ہیں۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ مذکورہ ترتیب واجب ہے یا سنت ہے؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے میرے نزدیک ترتیب کا مسنون ہونا قوی ہے نہ کہ واجب۔واللہ اعلم

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ احتیاط کا تقاضیٰ یہی ہے کہ اس ترتیب کو ترک نہ کیا جائے کیونکہ یہ ترتیب امام شافعیؒ وغیرہ کے نزدیک واجب ہے۔پھر پے در پے رمی کرنا سنت ہے جیسا کہ وضوء میں ہے جبکہ امام مالکؒ کے مسلک میں واجب ہے۔

منیٰ میں رات ٹھہرنے کا حکم

۲۶۶۲:وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ اسْتَأْذَنَ الْعَبَّاسُ بْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَنْ يَّبِيْتَ بِمَكَّةَ لَيَالِيَ مِنًى مِنْ اَجْلِ سِقَايَتِهٖ فَاَذِنَ لَهٗ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۴۹۰/۳۔ الحدیث رقم ۱۷۴۵۔ ومسلم فی صحیحه ۹۵۳/۲ الحدیث رقم (۳۴۶۔ ۱۳۱۵)۔ وابو داؤد فی السنن ۴۹۱/۲ الحدیث رقم ۱۹۵۹ وابن ماجه فی ۱۰۱۹/۲ الحدیث رقم ۳۰۶۵۔ والدارمی فی ۱۰۲/۲ الحدیث رقم ۱۹۴۳ واحمد فی المسند ۱۹/۲۔

ترجمہ:حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگی رات کو مکے میں رہنے کی اور منا کی راتوں میں سبیل زمزم کی خدمت کے لیے۔پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اجازت دے دی۔اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: طواف افاضہ کے بعد آب زمزم پینا مستحب ہے اگر ازدحام کی وجہ سے کنویں سے پانی نہ پی سکے تو وہ ان حوضوں سے پی لے۔یہ آب برکت ہے۔

ان حوضوں کی نگرانی قصی کے ہاتھ میں تھی پھر ان کے بعد ان کے بیٹے عبد مناف کے ہاتھ پھر ان کے بعد ان کے بیٹے ہاشم کے ہاتھ پھر ان کے بیٹے عبدالمطلب کو حاصل ہوئی پھر ان سے ان کے بیٹے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو یہ سعادت حاصل ہوئی۔پھر ان کے بعد ان کے بیٹے عبداللہ کو یہ نگرانی ملی اور ان کے بعد ان کے بیٹے علی کو ملی اور اسی طرح اب تک جاری ہے لیکن ان کے ساتھ ان کے مددگار رہتے تھے جن کے ذریعے وہ اس خدمت کو سرانجام دیتے۔علماء کہتے ہیں کہ اب یہ خدمت ہمیشہ کیلئے آل عباس کو حاصل ہے۔

بعض حنفی علماء کہتے ہیں کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی طرح جس شخص کے سپرد زمزم پلانے کی خدمت ہو یا جس کو شدید عذر لاحق ہو تو اس کیلئے جائز ہے کہ جو راتیں منیٰ میں گزاری جاتی ہیں وہ ان میں منیٰ کا قیام ترک کردے۔گویا اس سے اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ بلا عذر سنت کو ترک کرنا جائز نہیں ہے اور کسی عذر کی بناء پر سنت ترک کرنے میں کوئی اساءت بھی نہیں ہے۔اور امام شافعیؒ کے نزدیک اکثر راتیں منیٰ میں گزارنا واجب ہے۔

اعذار میں سے جان کا خطرہ، مال کا خطرہ اور مریض کے ضیاع کا خطرہ یا ایسی بیماری کا خطرہ ہے جس کے ساتھ منیٰ میں رات گزارنا عادی مشقت کے علاوہ مشقت کے بغیر ممکن نہ ہو۔ہے۔

آبِ زمزم پلانا ثواب ہے

۲۶۶۳: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ جَاءَ اِلَى السِّقَايَةِ فَاسْتَسْقٰى فَقَالَ الْعَبَّاسُ يَا فَضْلُ اِذْهَبْ اِلٰى اُمِّكَ فَائْتِ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ بِشَرَابٍ مِّنْ عِنْدِهَا فَقَالَ اسْقِنِىْ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّهُمْ يَجْعَلُوْنَ اَيْدِيَهُمْ فِيْهِ قَالَ اسْقِنِىْ فَشَرِبَ مِنْهُ ثُمَّ اَتٰى زَمْزَمَ وَهُمْ يَسْقُوْنَ وَيَعْمَلُوْنَ فِيْهَا فَقَالَ اعْمَلُوْا فَاِنَّكُمْ عَلٰى عَمَلٍ صَالِحٍ ثُمَّ قَالَ لَوْلَا اَنْ تُغْلَبُوْا لَنَزَلْتُ حَتّٰى اَضَعَ الْحَبْلَ عَلٰى هٰذِهٖ وَاَشَارَ اِلٰى عَاتِقِهٖ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۴۹۱/۳۔ الحدیث رقم ۱۶۳۵۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ مکہ کی سبیل کی طرف تشریف لائے پس زمزم کا پانی مانگا پس عباس رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کو کہا: اے فضل! تو اپنی ماں کے پاس جا اور نبی کریم ﷺ کے لیے پانی لے کر آ۔ یعنی وہ پانی مستعمل نہ ہو۔ پس حضور ﷺ نے فرمایا مجھ کو اس میں سے پلا۔ پس حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا اے اللہ کے رسولؐ! لوگ اپنے ہاتھ اس میں ڈالتے ہیں۔ فرمایا مجھ کو اسی میں سے پلا پس حضور ﷺ نے اس پانی میں سے پیا پھر زمزم کے کنویں کے پاس آئے اور لوگ یعنی اولاد عبدالمطلب لوگوں کو پانی پلاتے تھے اور پلانے میں محنت کرتے تھے پھر فرمایا کام کیے جاؤ تم ایک نیک کام کے اوپر ہو فرمایا اگر مجھے خوف نہ ہوتا لوگ غلبہ کریں گے یعنی لوگ میری اتباع سنت سے پانی کھینچنے میں تم پر غالب آ جائیں گے اور تم لوگوں کو پانی کھینچنے نہیں دیں گے اور یہ کام تمہارے ہاتھ سے جاتا رہے گا یعنی میں اترتا اپنی اونٹنی پر سے کہ حضور ﷺ سوار تھے اس پر تا کہ لوگ دیکھیں اور احکام سیکھیں یہاں تک میں اس پر رسّی رکھتا اور اپنے کندھے کی طرف اشارہ فرمایا۔

تشریح: ''اسقنی'' ہمزہ وصلی کے ساتھ ہے یا قطعی کے ساتھ ہے۔ ''حتّٰی اضع'' رفع اور نصب دونوں کے ساتھ ہے۔

قوله: یجعلون ایدیهم فیه: حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اس بات کا مطلب یہ تھا کہ اکثریت لوگوں کی ایسی ہوتی ہے کہ جن کے ہاتھ صاف نہیں ہوتے۔ لیکن آپ ﷺ نے فرمایا اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اسی حوض سے پانی پیا گویا کہ یہ بات اس روایت کے مانند ہے جس میں منقول ہے کہ آپ ﷺ وضوء کا بچا ہوا پانی از راہ تبرک پینا پسند فرماتے تھے اور دار قطنی نے حضرت انسؓ کی مرفوع روایت نقل کی ہے کہ یہ چیز تواضع میں داخل ہے کہ آدمی اپنے بھائی کا جھوٹا پیے۔ لوگوں میں یہ حدیث مشہور ہے: ''سور المؤمن شفا'' مؤمن کا جھوٹا شفا ہے۔ لیکن یہ حدیث غیر معروف ہے۔

مسند احمد اور معجم طبرانی میں روایت ہے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہ نبی ﷺ زمزم کے پاس آئے تو ہم نے ان کیلئے ایک ڈول پانی نکالا تو آپ ﷺ نے پیا اور اس ڈول میں کلی کی پھر ہم نے اس کو زمزم کے کنویں میں ڈال دیا پھر آپ ﷺ نے فرمایا اگر مجھے اس بات کا خدشہ نہ ہوتا کہ لوگ تم پر غالب آ جائیں گے تو میں اپنے ہاتھ سے پانی نکالتا۔

ایک روایت میں جو عطاء سے منقول ہے یہ بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ جب طواف افاضہ کر چکے تو آپ ﷺ نے زمزم کے کنویں سے ڈول میں پانی کھینچا اور اس کھینچنے میں آپ ﷺ کے ساتھ کوئی اور شریک نہ تھا پھر آپ ﷺ نے اسے پیا اور جو بچ گیا اسے کنویں میں ڈال دیا۔

ان روایات اور حدیث الباب میں مطابقت ظاہر ہے کہ پہلے از دحام کی وجہ سے نہیں اترے ہوں گے اور بعد میں پانی کھینچا تو ان

روایات کا تعلق دوسری مرتبہ کے ساتھ ہے۔

۲۶۶۴: وَعَنْ انَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ صَلَّی الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ وَالْمَغْرِبَ وَالْعِشَاءَ ثُمَّ رَقَدَ رَقْدَةً بِالْمُحَصَّبِ ثُمَّ رَكِبَ اِلَى الْبَيْتِ فَطَافَ بِهٖ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۵۸۵/۳۔ الحدیث رقم ۱۷۵۶۔ والدارمی فی السنن ۷۷/۲ الحدیث رقم ۱۸۷۳۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھی اور عصر اور مغرب کی اور عشاء کی پھر سور ہے تھوڑا سا سونا محصب میں پھر سوار ہو کر خانہ کعبہ کی طرف تشریف لائے اور اس کا طواف کیا یعنی طواف الوداع۔
اس کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :ثم رقد رقدة بالمحصب: ''بالمحصب'': جار مجروہ میں ''تنازع'' ہے۔

''المحصب'': صاء کی تشدید کے ساتھ ہے اصل میں ہر اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کنکریاں زیادہ ہو۔ یہاں وہ گھاٹی مراد ہے جس کے ایک طرف منیٰ ہے اور دوسری جانب ابطح کے ساتھ متصل ہے اس سے راوی نے دونوں میں فرق نہیں کیا اس روایت میں ''صلی بالمحصب'' ذکر کیا ہے اور ایک اور روایت میں **بالابطح** ذکر کیا ہے اور اس کو **بطحاء** بھی کہتے ہیں۔ ابن ہمامؒ کہتے ہیں کہ یہ مکہ اور منیٰ کے درمیان ایک جگہ ہے جو کہ منیٰ کے زیادہ قریب ہے لیکن اس کی تحدید ثابت نہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ فناء مکہ ہے اور اس کی حدود ان دو پہاڑوں کے درمیان سے جو مقابر کے متصل ہے اس کے مقابل پہاڑوں تک ہے لیکن مقبرہ محصب میں شامل نہیں ہے۔ اس جگہ کو خیف بنی کنانہ بھی کہتے ہیں۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ تحصیب یہ ہے کہ آدمی منیٰ سے مکہ رخصت کرنے کیلئے آئے اور اس گھاٹی میں ٹھہرے جس سے ابطح کی طرف نکلتے ہیں اور رات کو تھوڑی دیر کیلئے وہاں سوئے پھر مکہ داخل ہو اور ابن عمر اس کو سنت سمجھتے تھے۔ اور یہی زیادہ صحیح ہے۔ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ اس سے ان لوگوں کے قول سے احتراز ہو جاتا ہے جو کہتے ہیں کہ یہ ارادۃً نہیں تھا لہٰذا یہ سنت نہ ہوا۔ کیونکہ بخاری میں ہے کہ ابن عباس ؓ فرماتے ہیں ''**لیس التحصیب بشیئ انما هو منزل نزله رسول الله ﷺ**'' کہ تحصیب کوئی چیز نہیں ہے بلکہ ایک جگہ ہے جہاں رسول اللہ ﷺ نے قیام فرمایا تھا۔

اور مسلم میں ابورافع کا قول منقول ہے کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے ابطح میں قیام کا حکم نہیں تھا جب منیٰ سے نکلے لیکن میں آیا اور خیمہ وہاں لگایا تو آپ ﷺ وہاں آ کر ٹھہرے۔ قول مختار کی دلیل وہ روایت ہے جو محدثین کی ایک جماعت نے اسامہ بن زید ؓ سے روایت کی ہے کہ اسامہ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا اللہ کے رسولؐ! آپ ﷺ کل حج کے موقع پر کہاں ٹھہریں گے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ عقیل نے ہمارے لیے کوئی جگہ چھوڑی ہے؟ پھر فرمایا ہم خیف بنی کنانہ جہاں کفار قریش نے قسمیں اٹھائی تھی۔ میں اتریں گے۔ یعنی محصب میں۔

صحیحین میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ہم منیٰ میں تھے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کل ہم خنیف بنی کنانہ جہاں کفار قریش نے قسمیں اٹھائی تھیں میں قیام کریں گے۔ اس جگہ میں قریش اور بنی کنانہ نے آپس میں قسمیں اٹھائی اس بات پر کہ بنو ہاشم اور بنو مطلب سے نکاح اور معاملات نہیں کریں گے، یہاں تک کہ وہ اس جگہ رسول اللہ ﷺ کو ان کے حوالہ نہ کریں۔ (انتہیٰ)

پس اس سے ثابت ہوا کہ آپ ﷺ وہاں ارادتاً ٹھہرے تھے تاکہ اللہ کی مہربانی جو اس نے آپ ﷺ پر کی ہے وہ دیکھ لیں اور وہ نعمت یاد کر لیں جو اللہ نے آپ ﷺ پر کی۔ اس حال اور کفار کے آپ ﷺ کو محصور کرنے کے درمیان موازنہ کر کے۔ اور یہ سارا کام

عبادت ہی ہے۔ پھر یہ نعمت جو آپ ﷺ کو نصر اور آپ ﷺ کو اقامت توحید کی قدرت دینا اور قواعد الٰہی کی مضبوطی جس کی طرف اللہ نے اپنے بندوں کو بلایا تاکہ اس کی وجہ سے ان کو دنیا و آخرت میں فائدہ ہو، کو شامل ہے بغیر کسی شک کے امت پر بہت بڑی نعمت ہے۔ پس اس کے بارے میں ہر ایک کیلئے سوچنا اور اس پر شکر ادا کرنا مناسب ہے تو یہ کام کرنا ان کیلئے بھی سنت ہے کیونکہ ان کے حق میں بھی یہ عبادت ہے اور اسی وجہ سے خلفاء راشدین نے تحصیب کی۔

مسلم میں ہے کہ نبی ﷺ، ابوبکر، عمر، ابطح میں قیام فرماتے تھے اور ابن عمر تحصیب کو سنت سمجھتے تھے۔ اور منیٰ سے جانے والے دن کی نماز ظہر ابن عمر محصب میں ادا کرتے تھے۔ نافع کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور ان کے بعد خلفاء نے تحصیب کی ہے۔

۲۶۶۵: وَ عَنْ عَبْدِ الْعَزِیْزِ بْنِ رُفَیْعٍ قَالَ سَأَلْتُ اَنَسَ بْنَ مَالِكٍ قُلْتُ اَخْبِرْنِی بِشَیْءٍ عَقَلْتَهٗ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اَیْنَ صَلَّی الظُّهْرَ یَوْمَ التَّرْوِیَةِ قَالَ بِمِنٰی قَالَ فَاَیْنَ صَلَّی الْعَصْرَ یَوْمَ النَّفْرِ قَالَ بِالْاَبْطَحِ ثُمَّ قَالَ افْعَلْ کَمَا یَفْعَلُ اُمَرَاؤُكَ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۵۰۷/۳۔ الحدیث رقم ۱۷۶۳۔ ومسلم فی صحیحح ۹۵۰/۲ الحدیث رقم (۳۳۶۔ ۱۳۰۹)۔ وابوداؤد فی السنن ۴۶۷/۲ الحدیث رقم ۱۹۱۲ والترمذی فی ۲۹۶/۳ الحدیث رقم ۹۶۴۔ والنسائی فی ۲۴۹/۵ الحدیث رقم ۲۹۹۷۔

ترجمہ: حضرت عبدالعزیز بن رفیع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ مجھ کو اس چیز کی خبر دو کہ جو آپ نے جانی کہ پیغمبر ﷺ نے ظہر کی نماز آٹھویں تاریخ ذی الحجہ کو کہاں پڑھی؟ انس رضی اللہ عنہ نے کہا منیٰ میں عبدالعزیز نے کہا یعنی میں نے انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ ﷺ نے نفر کے دن نماز کہاں پڑھی؟ تو انس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ابطح میں نماز پڑھی پھر انسؓ نے کہا کہ تو ایسا کر جیسا کہ تیرے سردار کرتے ہیں۔ اسکو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله :سالت انس بن مالك قلت:.....قال بمنى:**

''قلتُ''''سئلت'' سے بدل ہے۔ **قوله :قال فاین صلى الظهر یوم الترویة**: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی نماز جو آپ ﷺ نے ابطح میں پڑھی تھی وہ عصر کی نماز تھی اور حضرت انسؓ کی سابق حدیث میں تصریح ہے کہ وہ ظہر کی نماز تھی لیکن یہ اس بات کا مخالف ہے کہ آپ ﷺ تمام ایام کے رمی پر ظہر کو مقدم کرتے تھے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ آپ ﷺ کی رمی زوال کے بعد ہوتی تھی۔ اگرچہ امام ابوحنیفہؒ نے چوتھے دن میں دن کے شروع سے رمی کو جائز قرار دیا ہے مگر کراہت کے ساتھ اور باقی تمام ائمہ کے نزدیک ناجائز ہے۔ لیکن کوئی بعید نہیں کہ یوم نفر کو آپ ﷺ نے ظہر کو مؤخر کر دیا ہو اظہار رخصت کیلئے عزیمت کے بیان کے بعد۔

قوله :افعل کما یفعل امرائك: مطلب یہ ہے کہ تم اس بارے میں اپنے امیروں کی پیروی کرو کہ جس طرح وہ کریں اسی طرح تم کرو تاکہ ان کی مخالفت کرنے کی وجہ سے کوئی فتنہ انگیزی نہ ہو تو اس سے معلوم ہوا کہ عذر کی وجہ سے ان کو ترک کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، نہ کہ وہ بات ہے جو ابن حجرؒ نے کہ ہے کہ یہ عورسول اللہ ﷺ کے بارے میں ذکر ہوا یہ احکام میں حج میں سے نہیں ہے۔

ہاں واجب بالاتفاق نہیں ہے بلکہ اختلاف سنت ہونے اور نہ ہونے میں ہے۔

۲۶۶۶: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَ نُزُوْلُ الْاَ بْطَحِ لَیْسَ بِسُنَّةٍ اِنَّمَا نَزَلَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِاَنَّهٗ کَانَ اَسْمَحَ لِخُرُوْجِهٖ اِذَا خَرَجَ۔

اخرجه البخاری فی صحیحه ۵۹۱/۳۔ الحدیث رقم ۱۷۶۵۔ رمسلم فی ۹۵۱/۲ الحدیث رقم (۳۳۹۔ ۱۳۱۱)۔

وابوداؤد فی السنن ۵۱۳/۲ رقم الحديث ۲۰۰۸ والترمذی ۲٦٤/۳ الحديث رقم ۹۲۳۔ وابن ماجه ۱۰۱۹/۲ الحديث رقم ۳۰٦۷ واحمد فی المسند ۲۳۰/٦۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ابطح میں اترنا سنت نہیں ہے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس لیے اترتے تھے کہ اس میں اترنا بہت آسان تھا نکلنے کے لیے اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :ليس بسنة: تحصیب کی تفصیل پہلے گزر گی ہے۔ اور سنت نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ سنت قصدی نہیں ہے یا سنن حج میں سے نہیں ہے اور اس کی دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک اور روایت ہے جس میں ہے "ليس من المناسك" اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مراد یہ ہو کہ یہ واجبات میں سے نہیں ہے یا سنت مؤکدہ میں سے نہیں ہے

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابطح میں اس غرض سے ٹھہرے تھے تا کہ وہاں سامان وغیرہ چھوڑ کر مکہ جائیں اور وہاں طواف وداع کریں اور جب مکہ سے مدینہ واپس ہوں تو آسانی ہو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے عمرة القضاء کا بیان

۲٦٦٧: وَعَنْهَا قَالَتْ اَحْرَمْتُ مِنَ التَّنْعِيْمِ بِعُمْرَةٍ فَدَخَلْتُ فَقَضَيْتُ عُمْرَتِي وَانْتَظَرَنِي رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم بِالْاَبْطَحِ حَتّٰى فَرَغْتُ فَاَمَرَ النَّاسَ بِالرَّحِيْلِ فَخَرَجَ فَمَرَّ بِالْبَيْتِ فَطَافَ بِهٖ قَبْلَ صَلَاةِ الصُّبْحِ ثُمَّ خَرَجَ اِلَى الْمَدِيْنَةِ هٰذَا الْحَدِيْثُ مَا وَجَدْتُهُ بِرِوَايَةِ الشَّيْخَيْنِ بَلْ بِرِوَايَةِ اَبِىْ دَاوٗدَ مَعَ اخْتِلَافٍ يَسِيْرٍ فِىْ اٰخِرِهٖ.

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۵۱۲/۲ الحديث رقم ۲۰۰۵۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے تنعیم سے عمرے کا احرام باندھا۔ پس میں مکہ میں داخل ہوئی اور میں نے اپنا عمرہ ادا کیا یعنی جو کہ حیض کی وجہ سے رہ گیا تھا اس کی قضا کی جیسا کہ حجۃ الوداع کے باب میں آیا ہے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ابطح میں میرا انتظار کیا یہاں تک کہ میں فارغ ہوئی پھر لوگوں کو کوچ کرنے کا حکم فرمایا' پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ابطح سے نکلے اور خانہ کعبہ کے پاس آئے پھر فجر کی نماز سے پہلے طواف (الوداع) کیا پھر مدینے کی طرف نکلے۔ مؤلف نے کہا ہے یہ حدیث میں نے بخاریؒ اور مسلمؒ کے علاوہ نہیں پائی بلکہ ابوداؤد نے اس روایت کو آخر میں تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :قالت احرمت من التنعيم ...... حتى فرغت:

"وانتظرنی" نون کے ساتھ ہے۔ ابن حجر کے نسخہ میں لام کے ساتھ ہے، جو اصول معتمدہ سے مخالف ہے اور اس کے ساتھ میں "لا جلی" کی تاویل کی احتیاج بھی ہے۔

قوله :هذا الحديث ماوجدته برواية الشيخين: اس جملے کے ذریعے مؤلف نے صاحب مصابیح پر دو اعتراض کیے ہیں:

ایک اعتراض تو یہ کہ انہوں نے اس روایت کو فصل اوّل میں نقل کیا ہے حالانکہ یہ بخاری و مسلم میں نہیں ہے۔

دوسرا اعتراض یہ کہ نقل حدیث میں ابوداؤد کی مخالفت کی' بایں طور کہ حدیث کا آخری جز و بعینہٖ وہ نقل نہیں کیا جو ابوداؤد میں ہے۔

طوافِ وداع اُفاقی کے لیے ضروری ہے

۲٦٦۸: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ النَّاسُ يَنْصَرِفُوْنَ فِىْ كُلِّ وَجْهٍ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم لَا يَنْفِرَنَّ اَحَدٌ

كُمْ حَتّٰى يَكُونَ اٰخِرُ عَهْدِهٖ بِالْبَيْتِ اِلاَّ اَنَّهٗ خُفِّفَ عَنِ الْحَائِضِ۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۵۸۵/۳۔ الحدیث رقم ۱۷۵۵۔ ومسلم فی ۹۶۳/۲ الحدیث رقم (۳۷۹۔ ۱۳۲۷)۔ وابوداؤد فی السنن ۵۱۰/۲ الحدیث رقم ۲۰۰۲ وابن ماجه ۱۰۲۰/۲ الحدیث ۳۰۷۰۔ والدارمی ۹۹/۲ الحدیث رقم ۱۹۳۲۔ واحمد فی المسند ۲۲۲/۱۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آدمی ہر طرف پھرتے تھے یعنی حج کرنے کے بعد اپنے ملک کی طرف چلے جاتے تھے خواہ طواف کرتے نہ کرتے یعنی اس کے مقید نہیں تھے۔ کہ مکے میں آئیں اور طواف وداع کریں پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم میں کوئی نہ نکلے یعنی اُفاقی یہاں تک کہ اس کا اُخری وقت خانہ کعبہ کے ساتھ ہو۔ یعنی طواف کریں مگر حائضہ سے طواف وداع موقوف کیا گیا ہے اور اسی طرح نفاس والی عورت سے بھی اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ''خفف'' صیغہ مجہول ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں طواف وداع واجب ہے اور مستحب ہے کہ اس کو آخری طواف بنا لے۔

حاکم نے الکافی میں لکھا ہے اگرچہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ اس طواف کے بعد جتنے دن چاہیں مکہ میں مقیم رہا جائے لیکن افضل یہی ہے کہ مکہ سے روانگی کے وقت ہی یہ طواف کیا جائے۔

امام ابو یوسف اور حسن بصری سے منقول ہے کہ جب آدمی مکہ میں طواف وداع کے بعد کسی کام میں مشغول ہو جائے تو روانگی کے وقت اس کو لوٹائے کیونکہ اس کا اعتبار تب ہے کہ جب یہ طواف مکہ سے واپسی کے وقت ہو۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ مکہ وہ افعال حج کی ادائیگی کیلئے آیا ہے تو جب افعال سے فارغ ہو جائے تو اس کے واپسی کا وقت آ گیا پس اس وقت اس کا طواف واپسی ہی کیلئے ہے۔ کیونکہ وہ رجوع کا عزم کیے ہوئے ہے۔ ہاں امام ابوحنیفہؒ سے روایت منقول ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص طواف وداع کرے اور پھر عشاء تک مکہ میں مقیم رہے تو میرے نزدیک پسندیدہ یہی ہے کہ وہ مکہ سے روانگی کے وقت دوسرا طواف کرے تا کہ اس کے طواف اور روانگی میں حائل نہ آئے۔ لیکن یہ بطور استحباب کے ہے واجب نہیں ہے۔ کیونکہ عرف میں وداع کے بعد سفر میں تاخیر کو برا نہیں سمجھا جاتا بلکہ کبھی تاخیر ہو ہی جاتی ہے۔

یہ طواف نہ تو اہل مکہ پر واجب ہے، نہ اس شخص پر واجب ہے جو میقات کے اندر رہتا ہو اور نہ اس شخص پر جو مکہ میں آکر رہ گیا ہو اور پھر وہاں سے چلے جانے کا ارادہ رکھتا ہو۔ اسی طرح یہ طواف نہ تو اس شخص پر واجب ہے جس کا حج فوت ہو گیا ہو اور نہ عمرہ کرنے والے پر واجب ہے، اور عمرہ کرنے والے پر اس کے اثبات کے بارے میں جو حدیث ہے، وہ ضعیف ہے جسکو ترمذی نے روایت کیا ہے۔ بدائع میں ہے کہ امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ مکہ میں رہنے والا طواف صدر کرے کیونکہ اس طواف کا مقصد وضع افعال حج کا مکمل ہونا ہے اور یہ سبب اہل مکہ میں بھی پایا جاتا ہے۔

حائضہ کے لیے طوافِ وداع کی ضرورت نہیں ہے

۲۶۶۹: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ حَاضَتْ صَفِيَّةُ لَيْلَةَ النَّفْرِ فَقَالَتْ مَا اَرَانِي اِلاَّ حَابِسَتَكُمْ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ عَقْرٰى حَلْقٰى اَطَافَتْ يَوْمَ النَّحْرِ قِيْلَ نَعَمْ قَالَ فَانْفِرِيْ۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۵۹۵/۳۔ الحدیث رقم ۱۷۷۱۔ ومسلم فی ۹۶۵/۲ الحدیث رقم (۳۸۷۔ ۱۲۱۱) وابن

ماجه فی السنن ۱۰۲۱/۲ الحدیث رقم ۳۰۷۲۔ واحمد فی المسند ۸۵/۶۔

ترجمہ: حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے کہ نفر کے دن حضرت صفیہ ؓ حیض والی ہوئیں پس کہنے لگیں کہ میں اپنے کونہیں گمان کرتی کہ تم لوگوں کو مدینہ سے کوچ کرنے سے روکوں گی۔ اس لیے کہ میں حائضہ ہوگی ہوں اور میں نے طواف وداع نہیں کیا ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اسے ہلاک کرے اور زخمی کرے کیا اس نے قربانی کے دن طواف زیارت کیا ہے؟ فرمایا ہاں۔ فرمایا پھر چلو (اب رکنے کی ضرورت نہیں ہے)۔ اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله: فقالت ماارانی الا حابستکم**: ''ارانی'' صیغہ مجہول ہے الاراء ۃ سے ''اظن نفسی'' کے معنی میں ہے۔

''حابستکم'': تاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور تاء کے فتحہ کے ساتھ اور ایک نسخہ میں صیغہ متکلم کے ساتھ ہے۔

''حابستکم'' تاء کے فتحہ کے ساتھ منصوب بناء بر مفعولیت ہے۔

قوله: قال النبی ﷺ: عقریٰ حلقیٰ...... فانفری: ''**عقریٰ حلقیٰ**'': علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ان الفاظ کو فعلیٰ کے وزن پر بغیر تنوین کی روایت کیا گیا ہے اور ظاہر یہ ہے کہ یہ عقراً اور حلقاً تنوین کے ساتھ ہے تقدیر **عقرها و حلقها الله حلقًا** ہے یعنی اللہ اسے ہلاک و زخمی کردے۔

یہ جملہ اگرچہ بددعائیہ ہے مگر یہ بددعا کے ارادے سے استعمال نہیں کیا گیا ہے بلکہ اہل عرب کی عادت ہے کہ وہ ایسے جملے از راہ محبت و بے تکلفی استعمال کرتے ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ دونوں عورت کے صفات ہیں یعنی اس کی نحوست اس کے قوم کو ہلاک اور زخمی کر دیتی ہے۔ (انتہیٰ)

بعض نے کہا ہے کہ یہ دونوں مصدر ہیں اور العقر کا معنی ہے ''**الجروح و القتل و قطع العصب**'' اور الحلق کا معنی ہے حلق میں درد ہونا یا حلق پر مارنا یا سر کے بالوں کا مونڈنا۔ کیونکہ یہ کام عورتیں سخت مصیبت کے وقت کرتی ہیں۔

اور حق یہ ہے کہ ان دونوں کو تنوین دیا جائے لیکن تنوین کو الف سے تبدیل کیا جاتا ہے وصل کو وقف کا قائم مقام بنا کر (انتہیٰ)۔

اور اس میں یہ بات بھی ہے کہ ان کو یاء کے ساتھ لکھنا اچھا نہیں ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ فعلان کی تانیث ہے۔ یعنی **جعلها عقری یعنی عاقرًا** بمعنی بانجھ اور حلقی یعنی **جعلها صاحبة وجع الحلق**۔ یہ جملہ اور اس کے ہم مثل جملے **تربت یداہ** اس کے ہاتھ خاک آلود ہوں۔ نکلنا اور اس کی ماں روئے یا اس کی ماں اس کو گم کرے کی طرح ہے یہ کلام عرب میں خبر کی ہولناکی بتانے کیلئے واقع ہوتے ہیں ان سے مقصود دن کا مدلول اصلی نہیں ہوتا۔

''**فانفری**'' فاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ حضرت صفیہؓ نے یہ گمان کیا کہ جس طرح طواف زیارت عذر کی وجہ سے ترک نہیں کیا جاسکتا اسی طرح عذر کے سبب طواف وداع کا ترک بھی جائز نہیں اس لیے انہوں نے کہا کہ جب تک میں پاک نہ ہو جاؤں اور طواف نہ کردوں، مکہ سے روانگی جائز نہیں ہوگی۔ آپؐ یہ سمجھے کہ انہوں طواف زیارت نہیں کیا ہے۔ مگر جب آپ ﷺ کو تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ صفیہؓ نے یہ بات طواف وداع کیلئے کہی ہے تب آپ ﷺ نے فرمایا کہ طواف وداع کے بغیر ہی مدینہ روانہ ہو جاؤ۔ کیونکہ عذر کی وجہ سے طواف ساقط ہو جاتا ہے۔

الفصل الثانی:

حج اکبر کے دن کا ذکر

۲۶۷۰: عَنْ عَمْرِو بْنِ الْاَحْوَصِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ اَيُّ يَوْمٍ هٰذَا قَالُوْا يَوْمُ الحَجِّ الْاَكْبَرِ قَالَ فَاِنَّ دِمَاءَ كُمْ وَاَمْوَا لَكُمْ وَاَعْرَاضَكُمْ بَيْنَكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا اَلَا لَا يَجْنِيْ جَانٍ اِلَّا عَلٰى نَفْسِهٖ اَلَا لَا يَجْنِيْ جَانٍ عَلٰى وَلَدِهٖ وَلَا مَوْلُوْدٌ عَلٰى وَالِدِهٖ اَلَا وَاِنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ اَيِسَ اَنْ يُعْبَدَ فِيْ بَلَدِكُمْ هٰذَا اَبَدًا وَلٰكِنْ سَتَكُوْنُ لَهٗ طَاعَةٌ فِيْمَا تَحْتَقِرُوْنَ مِنْ اَعْمَالِكُمْ فَسَيَرْضٰى بِهٖ۔

(رواه ابن ما جة والترمذی وصححه)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤٠١/٤ الحديث رقم ٢١٥٩۔ وابن ماجه فی ١٠١٥/٢ الحديث رقم ٣٠٥٥۔

ترجمہ: حضرت عمرو بن احوص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے حجۃ الوداع کے موقع پر سنا' فرماتے تھے یہ کونسا دن ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یہ دن حج اکبر کا ہے پس تحقیق تمہارے خون اور تمہارے مال اور آبرو تمہارے درمیان حرام کی گئیں ہیں۔ تمہارے اس دن کی حرمت کی طرح خبردار کوئی ظلم کرنے والا ظلم نہیں کرتا۔ مگر اپنی جان پر جو کوئی کسی پر ظلم کرتا ہے اس کا وبال اس پر پڑتا ہے وہ اس کے آنے کی وجہ سے ماخوذ ہوتا ہے پکڑا نہیں جاتا خبردار رہو شیطان نا امید ہوا اس سے کہ تمہارے شہر مکہ میں اس کی عبادت کی جائے لیکن شیطان کی فرمانبرداری ان چیزوں میں ہوگی کہ جن کو تم اپنے عملوں سے حقیر جانو گے پس وہ اس کے ساتھ خوش ہوگا یعنی گناہوں کے حقیر جاننے کی وجہ سے۔ اس کو ابن ماجہ اور ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور ترمذیؒ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

راویٔ حدیث:

عمرو بن الاحوص۔ یہ عمرو بن احوص کلابی ہیں۔ ان سے ان کے بیٹے سلیمان روایت کرتے ہیں۔

تشریح: قوله :قال:يوم الحج الاكبر :

حج اکبر مطلق حج کو کہتے ہیں جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: ﴿وأذان من الله ورسوله الى الناس يوم الحج الاكبر أن الله بریٓ من المشركين ورسولُه﴾[التوبة:٣] اور سنا دینا ہے اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے لوگوں کو بڑے حج کے دن کی کہ اللہ الگ ہے مشرکوں سے اور اس کا رسول۔

قاضی بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ حج اکبر سے مرا یوم عید ہے کیونکہ نہ صرف یہ کہ اسی دن حج مکمل ہوتا ہے۔ بلکہ حج کے تمام بڑے بڑے افعال اسی دن میں ادا کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ اَب روایت میں اس کی تصریح بھی ہے۔ کہ نبی کریم ﷺ حجۃ الوداع میں قربانی کے دن جمرات کے قریب کھڑے ہوئے اور فرمایا یہ حج اکبر کا دن ہے اور بعض کہتے ہیں کہ حج اکبر سے مراد یوم عرفہ ہے کیونکہ حدیث میں ہے ''الحج عرفة'' کہ حج عرفہ کا نام ہے اور حج کو صفت اکبر کے ساتھ موصوف اس لیے کیا جاتا ہے کہ عمرہ حج اصغر کہلاتا ہے، یا اس لیے کہ حج سے مراد اس دن کے اعمال ہے اور وہ باقی اعمال سے بڑے ہوتے ہیں یا اس وجہ سے کہ اس حج میں مسلمان اور مشرکین سب جمع تھے۔ یا اس وجہ سے کہ اس حج میں مسلمانوں کے عزت اور مشرکین ذلت کا ظہور ہوا تھا (انتہی)۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حج اکبر یوم عرفہ ہے کیونکہ جس نے وقوف عرفہ پالیا تو اس نے حج پالیا۔ یا اس کو حج اکبر اس لیے کہتے ہیں کہ یوم عرفہ یوم جمعہ سے بڑا ہے اور یوم جمعہ سے مراد صرف وہ حج ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شریک تھے کیونکہ اس حج میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان جمع تھے۔ یا اس وجہ سے حج اکبر کہتے ہیں کہ اس دن یوم عرفہ جمعہ کے دن تھا اور حج اکبر کے بارے میں مشہور یہی ہے۔ اور اس کے بارے میں حدیث ہے کہ جس سال یوم عرفہ جمعہ کو ہو اس سال کا حج ستر حجوں کے برابر ہوتا ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں اس بارے میں، میں نے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے۔

اس سے پہلے حدیث گزری ہے اس میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب صحابہؓ سے پوچھا کہ یہ کونسا دن ہے؟ تو انہوں نے عرض کیا کہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ جانتے ہیں جبکہ یہاں ذکر ہے کہ انہوں نے کہا کہ یہ حج اکبر کا دن ہے بظاہر دونوں میں تضاد نظر آتا ہے حالانکہ کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ ہوسکتا ہے بعض نے وہ جواب دیا ہو اور بعض نے یہ۔ اور یا یہ جواب ایام نحر کے آخری دن دیا ہو۔

قوله :الا لا یجنی جان الا علی نفسه:''الا'' برائے تنبیہ ہے۔''**لا یجنی جان**'' اس جملے میں کئی احتمال ہیں:

(۱) یہ جملہ نفی بمعنی نہی ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے، جیسے ﴿**لا تقتلوا انفسکم**﴾ ہے۔ یعنی تم میں سے بعض بعض کو قتل نہ کریں۔ کیونکہ جو شخص کسی پر ظلم کرتا ہے وہ اس کے اپنے جان پر ظلم کا سبب بنتا ہے۔

(۲) اس جملے میں ایک احتمال یہ ہے کہ یہ نہی ہے بیٹے پر ظلم کرنے سے کیونکہ یہ زیادہ قبیح ہے۔

(۳) یہ جملہ، **لا یجنی جان الا علی نفسه** کیلئے تاکید ہے۔ کیونکہ عرب کی عادت تھی کہ وہ مجرم کے رشتہ داروں کو اس کے جرم میں پکڑ لیتے تھے۔ حاصل یہ ہے کہ یہ ظلم ایک اور ظلم کو جنم دیتا ہے زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ جملہ نفی کو ظاہر کر رہا ہے چنانچہ یہ اس آیت کے مانند ہے ﴿**ولا تزر وازرة وزر اخری**﴾[الاسراء:۱۵] اور نہ اٹھائے گا کوئی اٹھانے والا بوجھ دوسرے کا۔

(۴) بعض کہتے ہیں کہ اس کا معنی ہے کہ تم اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔ جیسا کہ بعض جاہلوں سے اس کا صدور ہوا ہے۔

یہ نفی ہے نہی کے معنی میں ہے۔ جیسے: ﴿**لا یمسه الا المطهرون**﴾[الواقعة:۷۹] ہے جیسا کہ مفسرین نے یہ ذکر کیا ہے اور اس کی نظیر ''**غفر الله** اور **رحم الله** وغیرہ کے ساتھ دعا کرنا ہے۔ کیونکہ یہ ''**اغفره وارحمه**'' سے زیادہ بلیغ ہے۔

یہاں باپ بیٹے کو بطور خاص محض اس مقصد سے ذکر کیا گیا ہے کہ یہ دونوں سب سے زیادہ قریبی اقرباء ہیں جب ان میں سے کوئی ایک دوسرے کے جرم میں ماخوذ نہیں ہوں گے تو دوسرے بطریق اولیٰ نہ ہوں گے۔

قوله :وان الشیطان قد ایس:''ینس'' ایک نسخہ میں ایس ہے۔

اسکا مطلب یہ ہے کہ شیطان ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اس بات سے ناامید ہو گیا ہے کہ اس شہر میں غیر اللہ کی عبادت سے اس کی فرمانبرداری ہو۔ باقی یہ بات کہیں سے معلوم نہیں ہوئی کہ کفار میں سے کسی نے شیطان کی عبادت کی ہو۔

یہ اور بات ہے کہ کوئی غیر مسلم چوری چھپے آ کر اس شہر میں غیر اللہ کی عبادت کر لے۔ لیکن علانیہ نہیں کر سکتا۔

ہاں تمہارے گناہ کے اعمال میں شیطان کی فرمانبرداری ہوگی جیسے: حق قتل کرنا، کسی کا مال لوٹنا۔

یا اس طرح دوسرے کبائر کا ارتکاب اور صغیرہ گناہوں کو اہمیت نہ دینا۔

اسی وجہ سے معاصی یعنی جھوٹ، خیانت وغیرہ مسلمانوں میں زیادہ پائے جاتے ہے اور کفار میں کم کیونکہ شیطان کفار سے ان کے کفر کی وجہ سے خوش ہے تو ان کے دلوں میں جزئیات کے وسوسے نہیں ڈالتے اور مسلمانوں سے چونکہ خوش نہیں ہے کیونکہ انہوں نے کفر نہیں کیا ہے تو ان کو معاصی میں مبتلا کر رہی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ نماز جس میں وسوسہ نہ ہو وہ یہود ونصاریٰ کی نماز ہے۔ اور اسی کی مثل یہ بھی ہے کہ چور اس گھر میں داخل ہوتا ہے جس میں کوئی قیمتی مال ومتاع ہو۔

قوله :ولكن ستكون له طاعة فيما تحتقرون من اعمالكم فسيرضى به :

''فسير ضى'': صیغہ معلوم کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں مجہول کے ساتھ ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ وسوسے جو وہ تمہارے دلوں میں ڈالتا ہے اور وہ صغائر جس کا تم ارتکاب کرتے ہو جب مبتلا ہونے والا ان کو حقیر سمجھتا ہے تو شیطان اس سے خوش ہو جاتا ہے اور پھر یہ بڑے فتنہ وفساد کا باعث بن جاتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں ہے ''ان الشيطان قد يئس من ان يعبده المصلون في جزيرة العرب ولكن في التحريش بينهم''۔

منیٰ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوار ہو کر خطبہ دیا

۲۶۷۱: وَعَنْ رَافِعِ بْنِ عَمْرٍو الْمُزَنِيِّ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَخْطُبُ النَّاسَ بِمِنًى حِيْنَ ارْتَفَعَ الضُّحٰى عَلٰى بَغْلَةٍ شَهْبَاءَ وَعَلِيٌّ يُعَبِّرُ عَنْهُ وَالنَّاسُ بَيْنَ قَائِمٍ وَقَاعِدٍ۔ (رواه ابو داود)

اخرجه ابوداؤد في السنن ٤٨٩/٢ الحديث رقم ١٩٥٦۔

ترجمہ: حضرت رافعؓ سے روایت ہے کہ کہا میں نے دیکھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطبہ دیتے تھے منیٰ میں لوگوں کو۔ جبکہ چاشت کا وقت ہو چکا تھا۔ یعنی نحر کے دن اول وقت خچر کے اوپر سوار ہو کر۔ اس کے بالوں کے سرے سرخ تھے اور اندر سے سفید اور حضرت علیؓ بیان کرتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یعنی جو لوگ کہ دور تھے ان کو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سمجھاتے تھے جو کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے اور بعض لوگ کھڑے تھے اور بعض بیٹھے تھے۔ اس کو ابو داؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

رافع بن عمرو مزنی: عرض مرتب: ان کے بارے میں ملا علی قاری اور مؤلف نے کچھ بھی تحریر نہیں فرمایا۔ یہ بھی صحابی ہیں۔ بصرہ کے رہنے والے تھے۔ حجۃ الوداع میں حاضر ہوئے تھے۔ سیدنا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت تک حیات رہے۔

تشریح: **قوله :وعليّ يعبر عنه:**

لوگ چونکہ بہت زیادہ تھے یعنی ان کی تعداد ایک لاکھ تیس ہزار تک پہنچ گئی تھی جس کی وجہ سے سب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز نہیں پہنچ رہی تھی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز بغیر کمی وبیش کے آگے پہنچا رہے تھے۔

۲۶۷۲: وَعَنْ عَائِشَةَ وَابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اَخَّرَ طَوَافَ الزِّيَارَةِ يَوْمَ النَّحْرِ اِلَى اللَّيْلِ۔ (رواه الترمذی وابو داود وابن ماجة)

اخرجه ابوداؤد في السنن ٥٠٩/٢ الحديث رقم ٢٠٠٠۔ والترمذي في ٢٦٢/٣ حديث رقم ٩٢٠۔ وابن ماجه في ١٠١٧/٢ الحديث رقم ٣٠٥٩۔ واحمد في المسند ٣٠٩/١۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف زیارۃ کو مؤخر کیا قربانی کے دن رات تک۔ یہ حدیث ترمذی اور ابو داؤدؒ اور ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کیلئے یا سب کیلئے قربانی کے دن طواف زیارت رات تک مؤخر کرنے کو جائز

قرار دیا۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے طواف زیارت میں رات تک تاخیر کی کیونکہ آپ ﷺ کے بارے میں تو یہ صراحت کے ساتھ ثابت ہو چکا ہے کہ آپ ﷺ نے قربانی کے دن طواف زیارت کیا اور اس کے بعد مکہ میں یا منیٰ میں ظہر کی نماز پڑھی۔

علامہ طیبیؒ کہتے ہیں کہ طواف زیارت کا وقت امام شافعیؒ کے نزدیک بقرعید کی نصف رات کے بعد شروع ہوتا ہے جبکہ دیگر ائمہ کے نزدیک بقرعید کے دن طلوع فجر کے بعد شروع ہوتا ہے اور آخری وقت کا کوئی تعین نہیں۔ جب بھی کیا جائے جائز ہو جائے گا۔ لیکن امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک طواف زیارت کی ادائیگی ایام نحر میں واجب ہے اگر کوئی شخص اتنی تاخیر کرے کہ ایام نحر پورے گزر جائیں اور پھر طواف زیارت کرے تو اس پر دم واجب ہوگا۔

۲۶۷۳: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ لَمْ یَرْمُلْ فِی السَّبْعِ الَّذِیْ اَفَاضَ فِیْهِ۔ (رواہ ابو داود وابن ماجة)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۲ / ۵۰۹ الحدیث رقم ۲۰۰۱۔ وابن ماجه فی ۱۰۱۷/۲ الحدیث رقم ۳۰۶۰۔

ترجمه: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ طواف زیارت میں رمل نہیں کیا اس کو ابوداؤدؒ اور ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ''یرمل'' میم کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

مسئلہ: جو شخص طواف قدوم میں سعی اور رمل کر چکا ہو تو وہ طواف زیارت میں رمل اور سعی نہیں کرے گا۔

۲۶۷۴: وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ اِذَا رَمٰی اَحَدُکُمْ جَمْرَةَ الْعَقَبَةِ فَقَدْ حَلَّ لَهٗ کُلُّ شَیْءٍ اِلَّا النِّسَاءُ۔ (رواہ فی شرح السنة وقال اسنادہ ضعیف)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۴۹۹/۳ الحدیث رقم ۱۹۷۸۔ والدارقطنی فی ۲۷۶/۲ الحدیث رقم ۱۸۵ من باب المواقیت۔ واحمد فی المسند ۱۴۳/۶۔

ترجمه: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی کنکریاں مارے جمرۃ العقبہ پر اس کے لیے ہر چیز حلال ہوئی' سوائے عورتوں کے یعنی عورتوں سے صحبت کرنا ابھی حلال نہیں ہوا۔ یہ طواف زیارۃ کے بعد حلال ہوں گی یہ صاحب مصابیح نے شرح السنۃ میں نقل کیا ہے اور کہا کہ اس کی اسناد ضعیف ہیں۔

تشریح: ''الا النساء'': بناء بر استثناء منصوب ہے۔

۲۶۷۵: وفی روایة احمد والنسائی عن ابن عباس قال اذا رمی الجمرة فقد حل له کل شیء الا النساء۔

اخرجه النسائی فی ۲۷۷/۵ الحدیث رقم ۳۰۸۴۔

ترجمه: اور احمد ونسائی نے اس روایت کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یوں نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے رمی جمرۂ عقبہ کر لی تو (سر منڈوانے یا بال کتروانے کے بعد) اس کے لئے عورت کے علاوہ ہر چیز حلال ہو جاتی ہے''۔

تشریح: یعنی بالاجماع اس کیلئے عورتوں سے جماع کرنا حلال ہو جاتا ہے یہاں تک کہ طواف زیارت کر لے اگرچہ سعی سے پہلے ہو ہمارے نزدیک اور اس میں امام شافعیؒ کا اختلاف ہے۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث ابوداؤد نے روایت کی ہے ایسی سند کے ساتھ جس میں حجاج بن ارطاۃ ہے اور دارقطنی نے ایک اور سند کے ساتھ نقل کیا ہے لیکن اس میں بھی ابن ارطاۃ ہے۔ اور اس حدیث میں ہے: ''اذا رمیتم وحلقتم

و ذبحتم" جب تم رمی، حلق اور ذبح کرلو۔ دارقطنیؒ کہتے ہیں کہ یہ الفاظ صرف حجاج ابن ارطاۃ نے روایت کیے ہیں۔

صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

"**طيبت رسول الله ﷺ لاحرامه قبل ان يحرم ويوم النحر قبل ان يطوف بالبيت بطيب فيه مسك**"

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے احرام سے پہلے اور یوم نحر کو طواف زیارت کرنے سے پہلے خوشبو لگائی، جس میں مشک ملا ہوتا۔"

اور اس حدیث کی معارض نہیں بن سکتی وہ روایت جو حاکم نے امام مالکؒ کیلئے بطور استدلال مستدرک میں عبداللہ ابن زبیرؓ سے روایت کی ہے کہ عبداللہ ابن زبیرؓ نے فرمایا کہ سنن حج میں سے یہ بات ہے کہ اگر کسی نے جمرہ کبریٰ کی رمی کرلی تو اس کیلئے عورتوں اور خوشبو کے علاوہ ہر چیز حلال ہوگی یہاں تک کہ طواف کرلے اور کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح علی شرط شیخین ہے (انتہیٰ)۔ اگرچہ صحابی کا قول "**من السنة**" حدیث مرفوع کے حکم میں ہوتا ہے اور اسی طرح وہ روایت جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے طریق منقطع کے ساتھ منقول ہے کہ جب تم رمی کرلو تو تمہارے لیے ہر وہ چیز حلال ہو جاتی ہے جو حرام ہوگئی تھی سوائے عورتوں اور خوشبو کے۔

پھر ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ یہ جو ہم نے دلائل ذکر کیے ان سے معلوم ہوتا ہے حلت اول کیلئے سبب رمی ہے اسی وجہ سے امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ حلق واجب نہیں ہے اور ہمارے نزدیک حلق کرنا واجب ہے کیونکہ تحلل واجب اس کے بغیر نہیں ہوسکتا اور ہم نے جو روایات ذکر کیں احناف ان کو اضمار حلق پر محمول کرتے ہیں۔ یعنی تقدیر عبارت **اذا رمی و حلق** ہے تاکہ ان روایات اور ان روایات کے درمیان جو بعض نسخوں میں **عطف علی الشرط** ہے، تطبیق پیدا ہو جائے۔

اور دارقطنیؒ کی روایت میں ہے اور اللہ کا قول ﴿**ثم ليقضوا تفثهم**﴾[الحج: ۲۹] اس سے مراد سر منڈانا اور لباس تبدیل کرنا ہے۔ ابن عمر کے قول کے مطابق اور اہل تفسیر کے قول کے مطابق سر منڈانا اور ناخن کاٹنا ہے۔

اور اسی طرح اللہ کا قول ﴿**لتدخلن المسجد الحرام ان شاء الله آمنين محلقين**﴾[الفتح: ۲۷] میں سر منڈائے ہوئے حالت میں داخل ہونے کی خبر دی ہے پس تحلیق کا وقوع ضروری ہوا۔ اگرچہ حالت دخول عمرہ میں نہ ہو۔

اور ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ وطی ایام تشریق سے مؤخر کرنا مسنون ہے تو یہ محل نظر ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

"**ايام منٰى ايّام اكل وشرب وبحال**" کہ ایام تشریق کھانے پینے اور جماع کے دن ہیں۔

کنکریاں مارنے کے اوقات

۲۶۷۶: وَعَنْهَا قَالَتْ اَفَا ضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مِنْ اٰخِرِ يَوْمِهٖ حِيْنَ صَلَّى الظُّهْرَ ثُمَّ رَجَعَ اِلٰى مِنٰى فَمَكَثَ بِهَا لَيَالِيَ اَيَّامِ التَّشْرِيْقِ يَرْمِى الْجَمْرَةَ اِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ كُلَّ جَمْرَةٍ بِسَبْعِ حَصَيَاتٍ يُكَبِّرُ مَعَ كُلِّ حَصَاةٍ وَيَقِفُ عِنْدَ الْاُوْلٰى وَالثَّانِيَةِ فَيُطِيْلُ الْقِيَا مَ وَيَتَضَرَّعُ يَرْمِى الثَّالِثَةَ فَلَا يَقِفُ عِنْدَهَا۔ (رواه ابو داود)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۴۹۷/۲ الحديه، رقم ۱۹۷۳۔ والدارقطنی فی ۲۷۴/۲ الحديث رقم ۱۷۹ من باب المواقيت۔ واحمد فی المسند ۹۰/۶۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے نحر کے دن آخر میں طواف افاضہ کیا یعنی عید قربان کے آخری روز میں اس وقت کہ ظہر کی نماز پڑھی پھر منیٰ کی طرف تشریق کے دن کی راتوں میں ٹھہرے یعنی گیارہویں، بارہویں، تیرہویں ذی الحجہ کو ہر جمرہ کو کنکریاں مارتے تھے جس وقت دو پہر ڈھل جاتی یعنی سات کنکریاں مناروں کو تکبیر کے ساتھ مارتے اور پہلے منار کے پاس ٹھہرتے اور دوسرے یعنی وسطی کے پاس اور ٹھہرنا لمبا

کرتے اذکار کے لیے اور طرح طرح کی دعاؤں کے ساتھ اور عرض حاجات کے ساتھ آہ وزاری کرتے اور تیسرے منار کو مارتے اور اس کے پاس نہ ٹھہرتے۔اس کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ''فمکث'' کاف کے فتحہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ ہے۔

''کل جمرۃ'' نصب کے ساتھ ہے بناء بر مصدریت کے اور رفع کی صورت میں مبتداء ہوگا۔

یہ حدیث دلیل ہے کہ آنحضرت ﷺ نے منیٰ میں ظہر کی نماز پڑھی اور پھر طواف افاضہ کیا۔لیکن یہ باقی احادیث سے جو ثابت ہوتا ہے اس کے خلاف ہے کیونکہ احادیث اس پر متفق ہیں کہ آپ ﷺ نے نماز ظہر طواف کے بعد پڑھی تھی اختلاف اس میں ہے کہ مکہ میں پڑھی تھی یا منیٰ میں۔

لیکن یہ بعید نہیں ہے کہ یہ آپ ﷺ نے ایام نحر میں سے کسی اور دن کیا ہو کہ منیٰ میں ظہر کی نماز پڑھی ہو اور پھر آخری دن اپنے ازواج کے ساتھ ان کو طواف زیارت کرانے کیلئے مکہ آئے ہوں۔

قوله :فلا يقف عندها:

یعنی دعا اور اذکار کیلئے جمر عقبہ کے پاس کھڑے نہیں ہوئے تھے جگہ تنگ ہونے کی وجہ سے یا لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے ورنہ اختتام پر دعا زیادہ مناسب تھی۔

تخریج و اسنادی حیثیت: منذریؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے اس کو ابن حبان نے اپنے صحیح میں روایت کیا ہے یہ بات ابن ہمامؒ نے ذکر کی ہے۔

۲۶۷۷:وَعَنْ اَبِی الْبَدَّاحِ بْنِ عَاصِمِ بْنِ عَدِيٍّ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ رَخَّصَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِرِعَاءِ الْاِبِلِ فِی الْبَيْتُوْتَةِ اَنْ يَرْمُوْا يَوْمَ النَّحْرِ ثُمَّ يَجْمَعُوْا رَمْیَ يَوْمَيْنِ بَعْدَ يَوْمِ النَّحْرِ فَيَرْمُوْهُ فِی اَحَدِهِمَا۔

(رواه مالك والترمذی والنسائی وقال الترمذی هذا حديث صحيح)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۴۹۷/۲ الحديث رقم ۱۹۷۵۔ والترمذی فی ۲۸۹/۳ احديث ۹۵۵۔ والنسائی ۲۷۳/۵ الحديث رقم ۳۰۶۹۔ وابن ماجه فی ۱۰۱/۲ الحديث رقم ۳۰۳۷۔ ومالك فی الموطأ ۴۰۸/۱ الحديث رقم ۲۱۸ من كتاب الحج۔ واحمد في المسند ۴۵۰/۵۔

ترجمہ: حضرت ابوالبداح بن عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے باپ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اونٹوں کے چرانے والوں کو منیٰ میں شب باشی یعنی رات گزارنے کو ترک کرنے پر اجازت مرحمت فرمائی اور جمرۃ العقبہ کو نحر کے دن کنکریاں ماریں پھر دو دن کے مارنے کو قربانی کے دن کے بعد جمع کیا۔پس ماریں دونوں دن کا مارنا ان دونوں میں سے ایک میں۔اس کو امام مالکؒ اور ترمذیؒ اور نسائیؒ اور کہا ہے امام ترمذیؒ نے یہ حدیث صحیح ہے۔

راویٔ حدیث:

ابوالبداح۔ یہ ''ابوالبداح'' ہیں ان کے نام میں اختلاف ہے۔کہا گیا ہے کہ ان کا نام ''عاصم بن عدی'' ہے۔ایک قول یہ ہے کہ یہ ''عاصم بن عدی'' کے بیٹے ہیں۔یہ ایک لقب ہے جس سے مشہور ہوگئے۔اور ان کی کنیت ''ابوعمر'' ہے ان کے صحابی ہونے میں اختلاف ہے بعض نے کہا کہ ان کو صحبتِ نبی ﷺ حاصل ہوئی۔ابن عبدالبر کے نزدیک صحیح یہ ہے کہ صحابی تھے۔''بداح'' میں باء موحدہ

مفتوح ہے اوردال مہملہ مشدد اور حاء مہملہ ہے۔ ۱۱۷ھ میں انتقال ہوا۔ان کی عمر چوراسی (۸۴) سال ہوئی۔انہوں نے اپنے والد سے روایت کی ہے اوران سے ابوبکر بن عبدالرحمٰن روایت کرتے ہیں۔

تشریح: قوله :رخص رسول الله ﷺ لرعاء الابل:

''رعاء'':را کے کسرہ اورمد کے سات''راعٍ'' کی جمع ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے چرواہوں کو یہ اجازت فرمادی تھی کہ وہ ایّام تشریق کی راتوں میں منیٰ میں نہ رہیں کیونکہ وہ اپنے جانوروں کی دیکھ بھال اوران کے چرانے میں مشغول رہتے ہیں اورانہیں اس بات کی بھی اجازت دی کہ وہ صرف بقرعید کے دن جمرہ عقبہ پر کنکریاں ماریں اس کے بعد دوسرے دن رمی نہ کریں۔ بلکہ تیسرے دن دونوں دنوں کی ایک ساتھ رمی کریں دوسرے دن کی قضاء ہوگی اور تیسرے کی ادا ہوگی۔امام شافعیؒ دوسرے دن کی رمی کی تقدیم کو جائز قرار نہیں دیتے (انتہیٰ) اور یہی ہمارے ائمہ کے نزدیک بھی ہے۔

اختلاف روایت:ایک روایت میں الفاظ یہ ہیں:

انه عليه الصلٰوة السلام رخص لرعاء الابل أن يتركوا المبيت بمنٰى، وان يرموا يومًا ويدعوا يومًا ثم يتداركونه۔

بَابُ مَا يَجْتَنِبُهُ الْمُحْرِمُ

جن چیزوں سے محرم کو بچنا چاہئے ان کا بیان

الفصل الاول:

محرم کن کن چیزوں سے پرہیز کرے

۲۶۷۸:عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَجُلاً سأَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ مَا يَلْبَسُ الْمُحْرِمُ مِنَ الثِّيَابِ فَقَالَ لَا تَلْبَسُوْا الْقُمُصَ وَلَا الْعَمَائِمَ وَلَا السَّرَاوِيْلَاتِ وَلَا الْبَرَانِسَ وَلَا الْخِفَافَ اِلَّا اَحَدٌ لَا يَجِدُ نَعْلَيْنِ فَيَلْبَسُ خُفَّيْنِ وَلْيَقْطَعْهُمَا اَسْفَلَ مِنَ الْكَعْبَيْنِ وَلَا تَلْبَسُوا مِنَ الثِّيَابِ شَيْئًا مَسَّهٗ زَعْفَرَانَ وَلَا وَرْسٌ۔ (متفق عليه وزاد البخاري في رواية) **وَلَا تَنْتَقِبُ الْمَرْاَةُ الْمُحْرِمَةُ وَلَا تَلْبَسُ الْقُفَّازَيْنِ۔**

اخرجه البخاري في صحيحه ٤٠١/٣ ـ الحديث رقم ١٥٤٢ ـ ومسلم في ٨٣٤/٢ الحديث رقم (١ ـ ١١٧٧)۔ وابوداؤد في السنن ٤١٠/٢ الحديث رقم ١٨٢٣ والترمذي في ١٩٤/٣ الحد ث رقم ٨٣٣۔ والنسائي في ١٢٩/٥ الحديث رقم ٢٦٦٧۔ وابن ماجه ٩٧٧/٢ الحديث رقم ٢٩٢٩۔ والدارمي في ٤٩/٢ الحديث رقم ١٧٩٨۔ ومالك في الموطأ ٣٢٤/١ الحديث رقم ٨ من كتاب الحج واحمد في المسند ٣٢/٢۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ محرم کپڑوں کی کونسی قسم پہنے اور کیا نہ پہنے؟ آپ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ کرتے پہنو اور پگڑیاں نہ باندھو اور نہ پائجامے اور بارانیاں اوڑھو اورموزے نہ پہنو۔مگروہ شخص کہ جو جوتے نہ پائے۔پس وہ موزے پہنے اور چاہیے کہ وہ موزے دونوں ٹخنوں کے نیچے

سے کاٹ ڈالے اور نہ ان کپڑوں کو پہنو جن کو زعفران لگی ہو اور نہ وہ کپڑا پہنو جن کو ورس لگی ہوئی ہو۔ اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کی ہے اور امام بخاریؒ نے اور ایک روایت میں زیادہ کیا ہے اور احرام والی عورت نہ نقاب ڈالے اور دستانے نہ پہنے۔

تشریح: قوله :ان رجلا سأل رسول الله ﷺ :ما يلبس المحرم من الثياب:

''ما يلبس المحرم'': علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: اصل میں عبارت یوں ہے: **أى عما يلبس او و عن رسول الله ﷺ**۔ یعنی عن حرف جر مقدر ہے۔ چونکہ سال متعدی بدو مفعول ہے، اور مفعول دوم کی طرف بواسطہ ''عن'' کے متعدی ہوتا ہے۔ اور مفعول اوّل کی طرف براہ راست متعدی ہوتا ہے اور کبھی برعکس ہوتا ہے، البتہ پہلا استعمال مشہور ہے۔ چنانچہ ان آیات میں یہی اسلوب ہے: ﴿**ويسئلونك عن الأهلة**﴾ [البقرة:۱۸۹] ﴿**عن المحيض**﴾[البقرة:۲۲۲] ﴿**عن الانفال**﴾[الانفال:۱] اور یہ بھی ممکن ہے کہ ''ما'' استفہامیہ ہو۔ أى: **سألته ما هذه المسئلة**۔ چنانچہ یہ آیت کریمہ اسی قبیل سے ہے۔ ﴿**يسألونك ماذا ينفقون**﴾ [البقرة:۲۱۹]

''يلبس'': باب سمعہ سے ہے، اس کا مصدر لُبسا (بروزن ظُلم) آتا ہے، اور باب ضرب سے اس کا مصدر ''لبس'' (بروزن شمس) بمعنی ''خلط'' آتا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں یہی معنی ہیں ﴿**ولا تلبسوا الحق بالباطل**﴾[البقرة:۴۲] طلبہ کو اکثر اس کے استعمال میں التباس پیش آتا ہے۔

من الثياب: ''من'' بیانیہ ہے أى: **من أنواع الثياب**،

قوله :ولاتلبسوا القمص ،ولا العمائم،ولا السراويلات،ولاالبرانس:

''القمص'' قاف اور میم دونوں پر ضمہ ہے، **قميص** کی جمع ہے۔

اس سلسلہ میں تفصیل یہ ہے کہ قمیص و کرتہ اور پاجامہ پہننے سے مراد ان کو اس طرح پہننا ہے جس طرح کہ عام طور پر یہ چیزیں پہنی جاتی ہیں جیسے قمیص و کرتہ کو گلے میں ڈال کر پہنتے ہیں یا پاجامہ ٹانگوں میں ڈال کر پہنا جاتا ہے' چنانچہ احرام کی حالت میں ان چیزوں کو اس طرح پہننا ممنوع ہے۔ ہاں اگر کوئی محرم ان چیزوں کو مروجہ طریقہ پر پہننے کی بجائے بدن پر چادر کی طرح ڈالے تو یہ ممنوع نہیں کیونکہ اس صورت میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے قمیص و کرتہ پہنا ہے یا پاجامہ پہنا ہے۔

''العمائم'' **عمامة۔ بكسر العين۔** کی جمع ہے۔

''البرانس'': ''برنس'' اس لمبی ٹوپی کو کہتے ہیں جو عرب میں اوڑھی جاتی تھی اور برنس وہ لباس بھی ہوتا ہے جس کا کچھ حصہ ٹوپی کی جگہ کام دیتا ہے جیسے برساتی وغیرہ۔ چنانچہ ''نہ برنس اوڑھو'' سے مراد یہ ہے کہ ایسی کوئی چیز نہ اوڑھو جو سر کو ڈھانپ لے خواہ وہ ٹوپی ہو یا برساتی اور خواہ کوئی اور چیز۔ ہاں جو چیز ایسی ہو جس پر عرف عام میں پہننے یا اوڑھنے کا اطلاق نہ ہوتا ہو مثلاً سر پر کونڈا یا گھڑا وغیرہ رکھ لینا یا سر پر گٹھڑ ا اٹھالینا تو اس صورت میں کوئی مضائقہ نہیں۔

قوله :ولا الخفاف الا أحد لايجد : ''الخفاف'' خاء کے کسرہ کے ساتھ ''خف'' کی ہے۔ علامہ طیبیؒ برنس کے تحت لکھتے ہیں **هو قلنسوة طويلة كان يلبسها النساك فى صدر الاسلام، قال الجوهرى، وفى النهاية: ثوب يكون رأسه ملتزقا من جبة أو درعه اه۔**

الأحد: مرفوع ہے، واؤ ضمیر سے بدل ہے۔

من الکعبین :یہاں ٹخنے سے مراد امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک وہ ہڈی ہے جو پیر کی پشت پر بیچ میں ہوتی ہے جب کہ امام شافعیؒ کے ہاں وہی متعارف ٹخنہ مراد ہے جس کو وضو میں دھونا فرض ہے۔امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ موزوں کو کعبین سے کاٹے بغیر جوں کے توں پہننا جائز ہے۔اور نعلین نہ ملنے کی صورت میں خفین کو کاٹنا واجب نہیں ہے، اور دلیل ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے۔ان کے اصحاب کا زعم کے مطابق ابن عمر کی روایت منسوخ ہے، نیز یہ کہ قطع خفین میں اضاعت مال لازم آتا ہے۔جمہور علماء یہ فرماتے ہیں کہ موزوں کو کعبین کے نیچے سے کاٹے بغیر پہننا جائز نہیں، ابن عمر کی روایت مقدم ہے، اور مطلق کو مقید پر محمول کیا جاتا ہے۔اور زیادة من الثقة مقبول ہے۔اور جہاں تک تعلق ہے اضاعۃ المال کا، سو اس کا جواب یہ ہے کہ اضاعت مال تو منہیٰ عنہ میں لازم آتی ہے۔اور مامور بہ میں اضاعت لازم نہیں آتی۔ بلکہ یہ حق شرعی ہے جس کا پورا کرنا ضروری ہے۔

اس بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں کہ جس شخص کے پاس جوتے نہ ہوں اور وہ موزے پہن لے تو آیا اس پر فدیہ واجب ہوتا ہے یا نہیں؟ چنانچہ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ تو یہ کہتے ہیں کہ اس پر کچھ واجب نہیں ہوتا لیکن امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس پر فدیہ واجب ہوتا ہے۔جس طرح یہ مسئلہ ہے کہ اگر احرام کی حالت میں کسی کو سر منڈانے کی احتیاج و ضرورت لاحق ہو جائے تو وہ سر منڈا لے اور فدیہ ادا کرے۔

امام مالک، امام شافعی اور ان کی موافقت کرنے والے حضرات کی دلیل یہ ہے کہ اس صورت میں اگر فدیہ کا لزوم ہوتا تو شارع علیہ السلام اس کو بیان فرماتے۔

قولہ :ولاتلبسوا من الثياب شيئا مسه زعفران والاورس :

''من الثياب'': بیان مقدم ہے شیئا کیلئے،

''ورس'': ایک قسم کی گھاس کا نام ہے جو زرد رنگت کے اور زعفران کے مشابہ ہوتی ہے۔اس گھاس سے رنگائی کا کام لیا جاتا ہے۔ زعفران اور اس کے رنگ آلود کپڑوں کو پہننے سے اس لئے منع فرمایا گیا ہے کہ ان میں خوشبو ہوتی ہے۔

''زعفران'' :شیئاً کی صفت ہے۔**قولہ :ولا تنتقب المأة المحرمة :**

''محرم عورت نقاب نہ ڈالے'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے منہ کو برقع اور نقاب سے نہ ڈھانکے ہاں اگر وہ پردہ کی خاطر کسی ایسی چیز سے اپنے منہ کو چھپائے جو منہ سے الگ رہے تو جائز ہے اسی طرح حنفیہ کے ہاں مرد کو بھی عورت کی طرح احرام کی حالت میں منہ ڈھانکنا حرام ہے۔امام مالکؒ اور امام احمدؒ کا مسلک بھی ایک روایت کے مطابق یہی ہے جب کہ امام شافعیؒ کا مسلک اس کے برخلاف ہے۔

ابن ہمامؒ لکھتے ہیں: اصحاب صحاح ستہ نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یوں نقل کیا ہے: **قال رجل :يا رسول الله ﷺ! ما تأمرنا أن نلبس من الثياب في الإحرام؟ قال: لا تلبسوا القميص، ولا السرا ويلات، ولا العمائم، ولا البرانس، ولا الخفاف، إلا أن أحد ليس له نعلان فيلبس الخفين، فليقطع أسفل من الكعبين، لا تلبسوا شيئا مسه زعفران ولاروس۔** مسلم اور ابن ماجہ کے علاوہ کی روایت میں اتنا اضافہ بھی ہے: **ولا تنتقب المرّة المحرمةِ ولا تلبس القفازين۔**

کہا گیا ہے کہ ''**ولا تنقتب المرأة......**'' ابن عمر کا درج ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ خلاف ظاہر ہے۔معترض نے گویا کہ وقف و رفع کا اختلاف ہی دیکھا کہ بعض نے اس روایت کو موقوفاً نقل کیا ہے، لیکن یہ موقوفاً نقل کرنا قادح نہیں۔چونکہ بسا اوقات راوی فتویٰ دیتا ہے لیکن اپنی روایت کی سند بیان نہیں کرتا۔بایں ہمہ اس روایت کے مرفوع ہونے کا قرینہ موجود ہے وہ یہ کہ بعض روایات میں نقاب کے سلسلہ میں علیحدہ سے نہی موجود ہے۔چنانچہ امام ابوداؤد نے نافع عن ابن عمر عن النبیؐ سے نقل کیا ہے: **قال: المحرمة لا تنتقب ولا**

تلبس القفازین اوراس وجہ سے بھی کہ صدر حدیث میں ان دونوں کا منہی عنہما ہونا مذکور ہے۔فصل ثانی کی ابتداء میں اس کا ذکر آئے گا۔

قوله : ولا تلبس القفازین :''القفازین'' قاف کے ضمہ، فاء کی تشدید، اورزاء کے ساتھ ہے۔علامہ طیبیؒ اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:**شيئ لبسه نساء العرب فی أيديهن، يعظى الأصابع والكف والساعدين من البرد يكون فيه قطب محشو** اوربعض کا کہنا ہے کہ ان کے ساتھ گھنڈیاں ہوتی تھیں جن کے ذریعہ سے دستانوں کو کلائیوں پر باندھا جاتا تھا۔

تحریم لباس کی حکمت:

امام نوویؒ فرماتے ہیں: لباس مذکورہ کی تحریم اورازار ورداء کی اباحت میں حکمت یہ ہے کہ حاجی ترفہ سے دور ہوجائے، اوراپنے آپ کو متصف کرے خشوع وتذلل سے، اس کا ہر ہر لمحہ اسے یاددلائے کہ وہ محرم ہے، دعا کی کثرت کرے، ذکراذکار سے اکتائے نہ۔اپنے نفس کو محظورات کا ارتکاب کرنے سے بچائے، اس سے موت کو یاد کرے، کفن پوشی کو یاد کرے اور یہ کہ قیامت کے دن اس حال میں اٹھائے جائیں گے کہ ننگے پاؤں، ننگے بدن ہوں گے۔داعی کی طرف منہ اوپر کی طرف اٹھائے ہوئے عاجزی کے ساتھ۔

خوشبواورعورتوں کی تحریم میں حکمت:

اس میں حکمت یہ ہے کہ حاجی تنعّم وتعیّش اورزینت دنیا سے دور ہو، چوں کہ حاجی پراگندہ حال پراگندہ بال ہوتا ہے، اور یہ کہ اپنی ہمت کو مقاصد آخرت کیلئے جمع رکھے۔

تحریم صید میں حکمت : اس میں حکمت یہ ہے کہ بیت اللہ اس کے حرم یعنی اس کے شکار، اورقطع شجر کی تعظیم ہے۔

ابن المنذرؒ فرماتے ہیں:**أجمع العلماء علی منع المحرم من لبس لشيئ مما ذكر فی هذا الحديث۔**

محرم کے لیے رخصت کا ذکر

۲۶۷۹:وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَخْطُبُ وَهُوَ يَقُوْلُ اِذَا لَمْ يَجِدِ الْمُحْرِمُ نَعْلَيْنِ لَبِسَ خُفَّيْنِ وَاِذَا لَمْ يَجِدْ اِزَارًا لَبِسَ سَرَاوِيْلَ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ٤/٥٧۔ الحديث رقم ١٨٤١۔ ومسلم فی صحيحه ٢/٨٣٥ الحديث رقم ٤/١١٧٨۔ وابوداؤد فی السنن ٢/٤١٣ الحديث رقم ١٨٢٩۔ والنسائی فی ٥/١٣٢ الحديث رقم ١٦٧١۔ وابن ماجه فی ٢/٩٧٧ الحديث رقم ٢٩٣١ والدارمی فی ٢/٥٠ الحديث رقم ١٧٩٩۔ واحمد فی المسند ١/٢١٥۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس ؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو خطبہ دیتے ہوئے سنا ہے کہ جس وقت محرم جوتے نہ پائے تو وہ موزے پہن لے اور جس وقت تہہ بند نہ پائے۔تو پائجامہ پہن لے۔اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :اذا لم يجد المحرم نعلين لبس خفين : موزوں کے استعمال کے بارے میں تو گزشتہ حدیث میں بتایا جاچکا ہے کہ جوتے میسر نہ ہوں تو محرم خفین پہن سکتا ہے۔اس صورت میں امام شافعیؒ کے نزدیک اس پر کوئی فدیہ واجب نہیں ہوگا۔

قوله :واذا لم يجد ازارًا لبس سراويل:

لیکن امام اعظمؒ کا مسلک اس بارے میں یہ ہے کہ اگر تہ بند نہ ہو تو پائجامہ کو پھاڑ کر اسے تہ بند کی صورت میں باندھ لیا جائے اور اگر کوئی شخص اسے پھاڑ کر استعمال نہ کرے بلکہ پائجامہ ہی پہن لے تو اس پر دم یعنی جانور ذبح کرنا واجب ہوگا۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں: تہ بند نہ ہونے کی صورت میں پاجامہ کو پھاڑے بغیر بھی پہننا جائز ہے۔لیکن اس سے دم کا واجب نہ ہونا لازم نہیں آتا۔ چونکہ ضرورت کی وجہ سے کبھی فعل محظور کا ارتکاب بھی جائز ہوتا ہے باوجودیکہ کفارہ بھی لازم آتا ہے۔جیسا کہ تکلیف کہ وجہ سے حلق کرانا۔ عذر کی وجہ سے سلاہوا کپڑا پہننا۔امام طحاویؒ نے ''آثار'' میں صراحت کی ہے کہ یہ مباح ہے البتہ کفارہ واجب ہوگا۔اس حدیث اوراس جیسی دیگر احادیث کونقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: **ذهب إلى هذه الآثار قوم .... رحمهم الله تعالى**...... اھ۔

منسک ابن جماعہ میں لکھا ہے: **وإن شاء قطع الخفين من الكعبين ولبسهما ولا فدية عند الأربعة** اھ۔امام طبری،نووی، قرطبی اور ابن حجر رحمہم اللہ نے عجیب کام کیا کہ امام ابوحنیفہؒ کی طرف منسوب کر کے بیان کرتے ہیں: **انه يجب عليه الفدية إذا لبس الخفين بعد القطع عند عدم النعلين**۔حالانکہ یہ بات خلاف مذہب ہے۔ بلکہ مطلب الفائق میں تو یہ لکھا ہے: **وهذه الرواية ليس لها وجود في المذهب بل هي منتقدة**۔اور شافعیہ کا یہ اعتراض کرنا کہ اس صورت میں اضاعتِ مال لازم آتی ہے تو اس کا جواب ماقبل میں گزر چکا ہے۔ہاں اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ پھاڑنے کے بعد اگر ستر عورت حاصل نہیں ہوتا تو بغیر پھاڑے بھی پہننا جائز ہے۔ بلکہ یہی صورت متعین وواجب ہے۔ ہاں البتہ فدیہ ادا کرنا پڑے گا۔ ابن حجرؒ کا امام ابوحنیفہ اور امام مالکؒ کی بابت **امتناع لبس السراويل على هيئة مطلقاً** کی نسبت کرنا درست ہے۔

محرم کوخوشبولگانامنع ہے

۲۶۸۰:وَعَنْ يَعْلٰى ابْنِ اُمَيَّةَ قَالَ كُنَّا عِنْدَ النَّبِيِّ ﷺ بِالْجِعِرَّانَةِ اِذْ اَتَاهُ رَجُلٌ اَعْرَابِيٌّ عَلَيْهِ جُبَّةٌ وَهُوَ مُتَضَمِّخٌ بِالْخُلُوْقِ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّي اَحْرَمْتُ بِالْعُمْرَةِ وَهٰذِهٖ عَلَيَّ فَقَالَ اَمَّا الطِّيْبُ الَّذِيْ بِكَ فَاغْسِلْهُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ وَاَمَّا الْجُبَّةُ فَانْزِعْهَا ثُمَّ اصْنَعْ فِيْ عُمْرَتِكَ كَمَا تَصْنَعُ فِيْ حَجِّكَ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ۳۹۳/۳۔ الحديث رقم ۱۵۳۶۔ ومسلم فی ۸۳۶/۲ الحديث رقم (۶۔ ۱۱۸۰)۔ وابوداؤد فی السنن ۴۰۷/۲ الحديث رقم ۱۸۱۹۔

ترجمہ: یعلی بن امیہؓ سے روایت ہے کہ ہم نبی کریم ﷺ کے پاس جعرانہ میں تھے۔کہ اچانک ایک گنوار شخص یعنی دیہاتی آیا کہ اس پر کرتہ تھا اور وہ شخص خلوق میں لتھڑا ہوا تھا جو ایک قسم کی خوشبو ہے زعفران وغیرہ سے بنتی ہے پس اس نے کہا اے اللہ کے رسول تحقیق میں نے عمرے کا احرام باندھا تھا اس حال میں کہ یہ کرتہ میرے بدن پر تھا۔پس آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ خوشبو کو تو دھوڈال تین مرتبہ اور کرتے کو اتاردو۔ پھر اپنے عمرے میں اس طرح کر جس طرح تو اپنے حج کے احرام میں کرتا ہے۔اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :''**الجعرانة**'' اس کی تحقیق ماقبل میں گزر چکی ہے۔

قوله :وهو متضمخ بالخلوق:''الخلوق''ایک قسم کی خوشبو ہے جو زعفران سے بنائی جاتی ہے۔

زعفران کا استعمال چونکہ مردوں کے لئے حرام ہے اور خلوق زعفران ہی سے تیار ہوتی تھی اس لئے آپ ﷺ نے اس شخص کو یہ حکم دیا کہ وہ اسے دھوڈالے نیز تین مرتبہ دھونے کا حکم صرف اس لئے دیا تا کہ وہ خوب اچھی طرح چھوٹ جائے ورنہ اصل مقصد تو یہ تھا کہ خلوق کو بالکل صاف کردو خواہ وہ کسی طرح اور کتنی ہی مرتبہ میں صاف ہو۔

ابن حجرؒ نے اس موقع پر بڑی عجیب بات کہی ہے وہ یہ کہ اس سے یہ اخذ ہوتا ہے کہ جس نے جہالت کی وجہ سے خوشبو لگائی، (یا سلا ہوا) لباس پہن لیا تو اس پر فدیہ نہیں۔ابن حجرؒ کی یہ بات نادرست ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس مفہوم پر روایت کی دلالت نہ نفیاً ہے اور نہ

اثبا تا ہے۔ البتہ یہ ایک اور دلیل سے سمجھ آ رہی ہے۔ فانزعھا میں امام شعبیؒ کے قول کی تردید ہو رہی ہے وہ یہ فرماتے ہیں کہ جو شخص قمیض پاجامہ کے ساتھ احرام باندھے تو اس کا یہ لباس پھاڑ دیا جائے۔ ابن حجرؒ عذر خواہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں ان کا یہ فرمانا ''معتمد'' کے بارے میں ہے، اور روایت نہیں چونکہ: **العبرة بعموم اللفظ لا بخصوص السبب،**

قوله :ثم اصنع فی عمرتك كما تصنع فی حجك:

ایک نسخہ میں تاء کے ساتھ ہے اس جملہ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ۱-**أی اجتنب فی العمرة ما تجتنب منه فی الحج۔**

۲-**أی :افعل الطواف والسعی والحلق۔**

حدیث کے آخری جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جو چیزیں حج کے احرام کی حالت میں ممنوع ہیں وہی عمرہ کے احرام کی حالت میں بھی ممنوع ہیں اسلئے تم عمرہ کے احرام کی حالت میں ان تمام چیزوں سے پرہیز کرو جن سے حج کے احرام کی حالت میں پرہیز کیا جاتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حج و عمرہ کے افعال مشترکہ، افعال حج کی مانند ہیں، اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اعرابی اعمالِ حج سے واقف تھا، اور عمرہ سے ناواقف تھا۔ (**كما ذكر الطيبیؒ**) تشبیہ سے مراد زیادت افادہ ہے اور یہ کہ احرامِ حج میں ان چیزوں سے اجتناب کرے کہ جن سے احرام عمرہ میں اجتناب برتا جاتا ہے۔ چونکہ تشبیہ بعض مرتبہ محض اشتراک کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ خواہ مشبّہ بہ اقویٰ نہ ہو بشرطیکہ مخاطب کو معلوم ہو۔ چنانچہ اسی قبیل سے علماء کی یہ عبارت بھی ہے: **يغسل فمه بمياه كأنفه۔**

اس موقع پر ایک خاص بات یہ جان لینی چاہئے کہ جو چیزیں احرام کی حالت میں حرام ہو جاتی ہیں ان کا ارتکاب اگر قصداً ہوگا تو متفقہ طور پر تمام علماء کے نزدیک اس کی وجہ سے مرتکب پر فدیہ لازم ہوگا۔ ہاں بھول چوک سے ارتکاب کرنے والے پر فدیہ واجب نہیں ہوگا جیسا کہ امام شافعیؒ، ثوریؒ، احمد اور اسحٰق کا قول ہے البتہ امام اعظم ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک اس صورت میں بھی فدیہ واجب ہوگا۔

عرض مرتب: ملا علی قاریؒ نے اس حدیث کی شرح کے ذیل میں محرم کیلئے سرمہ لگانے کی بابت کلام ذکر کیا تھا، ہم نے وہ کلام یہاں سے حذف کر کے اس کے مناسب مقام پر ذکر کیا ہے۔ چنانچہ ملاحظہ فرمائیے: حدیث: ۲۶۸۷۔ اھ

محرم آدمی نکاح نہ کرے اور نہ کسی کا نکاح کرائے

۲۶۸۱: وَعَنْ عُثْمَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا يَنْكِحُ الْمُحْرِمُ وَلَا يُنْكَحُ وَلَا يَخْطُبُ۔

اخرجه مسلم فی صحيحه ۱۰۳۰/۲ الحديث رقم (۴۱۔ ۱۴۰۹)۔ وابوداؤد فی السنن ۴۲۱/۲ الحديث رقم ۱۸۴۱۔ والترمذی فی ۱۹۹/۳ الحديث رقم ۸۴۰ والنسائی فی ۱۹۲/۵ الحديث رقم ۲۸۴۴۔ وابن ماجه ۶۳۲/۱ الحديث رقم ۱۹۶۶۔ والدارمی ۱۸۹/۲ الحديث رقم ۲۱۹۸۔ ومالك فی الموطأ ۳۴۸/۱ الحديث رقم ۷۰ من كتاب الحج۔ واحمد فی المسند ۵۷/۱۔

ترجمہ: حضرت عثمانؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ محرم کے لیے درست نہیں ہے۔ کہ نکاح کرے اور یہ بھی درست نہیں ہے کہ محرم کسی کا نکاح کروائے۔ یعنی بولایت یا بوکالت اور یہ بھی درست نہیں ہے کہ محرم منگنی کرے۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ''**لا ينكح**'': یاء کے فتحہ، کاف کے کسرہ اور حاء کے کسرہ کے ساتھ، حاء کا کسرہ التقائے ساکنین کی وجہ سے ہے، صحیح ترین نسخوں میں اسی طرح ضبط کیا گیا ہے۔ نکح، ینکح، اپنا نکاح کرنا۔

''لا ینکح'': یاء کے ضمہ اور کاف کے کسرہ کے ساتھ، حالت جزمی میں ہے۔ أنکح ینکح إنکاحا: نکاح کرانا۔

''و لا یخطب'': طاء کے ضمہ کے ساتھ، خطبة بکسر الخاء سے ماخوذ ہے، پیغام نکاح بھیجنا۔

یہ تینوں کلمات صیغۂ نفی اور صیغۂ نہی ہر دو کے ساتھ ضبط کئے گئے ہیں۔ خطابیؒ فرماتے ہیں: صیغہ نہی کے ساتھ ہونا، صیغۂ نفی کے مقابلہ میں اصح ہے، اور صیغۂ نفی کی صورت میں بھی ''نہی'' کے معنی میں ہے۔ بلکہ ابلغ ہے۔

امام شافعیؒ اور اکثر علماء کے نزدیک خود اپنا نکاح کرنے یا کسی کا نکاح کرانے کی ممانعت مکروہ تحریمی کے طور پر ہے اور منگنی کرنے کی ممانعت مکروہ تنزیہی کے طور پر ہے۔ چنانچہ ان حضرات کے نزدیک حالت احرام میں نہ تو خود اپنا نکاح کرنا درست ہے اور نہ کسی کا نکاح کرانا جائز ہے۔ لیکن امام اعظم ابوحنیفہؒ کے ہاں تینوں کی ممانعت صرف مکروہ تنزیہی کے طور پر ہے' ان کی دلیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام کی حالت میں حضرت میمونہؓ سے اپنا نکاح کیا تھا۔

تخریج: علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو امام بخاریؒ کے علاوہ محدثین کی جماعت نے نقل کیا ہے۔ مسلم اور ابوداؤد کی روایت میں ''و لا یخطب'' کا اضافہ ہے۔ اور ابن حبانؒ نے اپنی ''صحیح'' میں ''و لا یخطب'' کی زیادتی نقل کی ہے۔ اور علامہ طیبیؒ لکھتے ہیں: اس حدیث کو مسلم، ابوداؤد، ابوعیسی اور ابوعبدالرحمٰن نے اپنی اپنی کتب میں ذکر کیا ہے۔ اور معتمد علیہ روایات میں صیغۂ اثبات مروی ہے۔

۲۶۸۲: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم تَزَوَّجَ مَیْمُوْنَةَ وَهُوَ مُحْرِمٌ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٥١/٤۔ الحدیث رقم ١٨٣٧۔ ومسلم فی صحیحه ١٠٣١/٢ الحدیث رقم (٤٦۔ ١٤١٠)۔ وابوداؤد فی السنن ٤٢٣/٢ الحدیث رقم ١٨٤٤۔ والترمذی فی ٢٠١/٣ الحدیث رقم ٨٤٢۔ والنسائی فی ١٩١/٥ الحدیث رقم ٢٨٤٠۔ وابن ماجه فی ٦٣٢/١ الحدیث رقم ١٩٦٥۔ والدارمی فی ٥٨/٢ الحدیث رقم ١٨٢٢۔ واحمد فی المسند ٢٦٦/١۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میمونہؓ سے نکاح کیا حالت احرام میں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم احرام باندھے ہوئے یعنی عمرة القضاء کا اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: یہ بتایا جاچکا ہے کہ ''سرف'' ایک مقام کا نام ہے جو مکہ مکرمہ سے تقریباً چھ میل اور مقام تنعیم سے جانب شمال تین یا چار میل کے فاصلہ پر واقع ہے اسی موقع پر ایک تاریخی اتفاق بھی ذکر گیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت میمونہؓ کا نکاح بھی سرف میں ہوا (جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عمرة القضاء کے لئے مکہ تشریف لا رہے تھے اور اس وقت حالت احرام میں تھے) اور ان کی شب زفاف بھی یہیں گزری (جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ سے فارغ ہو کر مدینہ واپس ہو رہے تھے) اور پھر بعد میں ان کا انتقال بھی یہیں ہوا۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو ائمہ ستہ نے روایت کیا ہے۔ بخاریؒ نے اتنا اضافہ بھی نقل کیا ہے: **وبنی بها وهو حلال وماتت بسرف** ..... حالت احرام میں نکاح وانکاح: امام نوویؒ لکھتے ہیں: **واختلف العلماء فی هذا الحدیث، والذی قبله فقال مالك، والشافعی، وأحمد وجمهور العلماء من الصحابه ومن بعدهم: إنه لا یصح نکاح المحرم، واعتمدوا علی أحادیث. وقال ابو حنیفه والکوفیون: یصح نکاحه لحدیث میمونة اھ۔**

محرم کیلئے جماع اور دواعی جماع بالاتفاق حرام ہیں، خطبہ نکاح بالاتفاق جائز ہے، نکاح اور انکاح میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ چنانچہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک نکاح وانکاح ناجائز ہے، اور نکاح باطل ہے۔ جبکہ ائمہ حنفیہ کے نزدیک نکاح وانکاح دونوں جائز ہیں۔ البتہ حالت احرام میں ایسے کاموں کی طرف مشغول ہونا مکروہ تنزیہی ہے۔

منشائے اختلاف: پہلا منشائے اختلاف: حضور ﷺ نے حالت احرام میں نکاح وانکاح سے منع فرمایا ہے، یہ نہی کیسی ہے؟ حنفیہ کے نزدیک یہ نہی تنزیہی ہے، اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک تحریمی ہے۔

دوسرا منشاءِ اختلاف:

یہ ایک واقعہ کی تحقیق پر ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے سنہ ۷ھ میں عمرۃ القضاء کے موقع پر مکہ میں حضرت میمونہؓ سے نکاح کیا تھا۔ یہ نکاح حالت احرام میں کیا تھا؟ یا حالت احرام سے فارغ ہو کر حلال ہونے کی صورت میں کیا تھا؟ اس سلسلہ میں روایات مختلف ہیں۔ ائمہ ثلاثہ کی تحقیق یہ ہے کہ حضور ﷺ نے حلال ہونے کی حالت میں نکاح کیا تھا، اور حنفیہ کی تحقیق یہ ہے کہ حضور ﷺ نے حالت احرام میں نکاح کیا تھا۔

دلائل: ائمہ ثلاثہ کی پہلی دلیل حضرت عثمانؓ کی حدیث ہے: **لا ینکح المحرم ولا ینکح۔** دوسری دلیل خود حضرت میمونہؓ کی حدیث ہے: **تزوجنی رسول اللہ ﷺ ونحن حلان بسرف** ۔ تیسری دلیل ابورافعؓ کی حدیث ہے: **تزوج رسول اللہ ﷺ میمونۃ وھو حلال وبنی بھا وھو حلال وکنت انا الرسول فیما بینھما۔** چوتھی دلیل یزید بن اصم کی حدیث ہے: **تزوج رسول اللہ ﷺ میمونۃ وھو حلال ۔**

حنفیہ کے دلائل:

حنفیہ کا استدلال حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے ہے (جو اسی باب کی فصل اول کی روایت ہے):

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما: **أن النبی ﷺ تزوج میمونۃ وھو محرم۔**

وجوہ ترجیح: ائمہ ثلاثہ فرماتے ہیں یہ واقعہ حضرت میمونہؓ کی ذات سے متعلق ہے، ابورافع جو آپ ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے وہ درمیان میں قاصد تھے، اور یزید بن اصمؓ حضرت میمونہؓ کے بھانجے ہیں۔ لہٰذا ان خصوصیات کی بناء پر ابن عباسؓ کی روایت کا مقابلہ میں ان حضرات کی روایت کو ترجیح ہوگی۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ کا حضرت میمونہؓ سے نکاح کرنا حلال ہونے کی حالت میں مانا جائے گا۔ اور حضرت عثمانؓ کی روایت: **لا ینکح المحرم ولا ینکح** کے ساتھ فعل رسول اللہ ﷺ کا کوئی تعارض نہ ہوگا۔ برخلاف ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے کہ اس سے حضرت عثمانؓ کی روایت کا تعارض لازم آرہا ہے۔ اس لئے حضرت عثمانؓ کی روایت میں جو نہی ہے وہ برقرار رہے گی۔ چونکہ محرم کو مبیح پر ترجیح ہوتی ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کو یا تو مرجوح ہونے کی وجہ سے ترک کر دیا جائے گا۔ یا پھر اس میں تاویل کی جائے گی۔ تاویل یہ ہے کہ: **تزوج رسول اللہ ﷺ میمونۃ وھو حلال وظھر أمر تزویجھا وھو محرم۔**

حضرات حنفیہ اپنے مذہب کی مندرجہ ذیل وجوہ ترجیح بیان کرتے ہیں:

① **اصح فی الباب:** حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت بالاتفاق **اصح ما فی الباب** ہے۔ چنانچہ ائمہ ستہ نے اس کی تخریج کی ہے، بلکہ تمام محدثین اس کی تخریج وتصحیح پر متفق ہیں۔ امام بخاریؒ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کو کتاب الحج اور کتاب النکاح میں روایت کیا ہے۔ دونوں جگہ یہی حدیث پیش کی ہے۔ معلوم ہوا کہ امام بخاریؒ کے نزدیک ثبوتاً یہی روایت راجح ہے۔ ائمہ ثلاثہ کی طرف سے پیش کی جانے والی احادیث (سوائے حضرت عثمانؓ کی روایت کے) ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے قوت میں کم ہیں۔ چنانچہ یزید بن اصم اور حضرت میمونہ کی روایت کو نہ امام بخاریؒ نے ذکر کیا ہے اور نہ امام نسائیؒ نے۔ ابورافع کی حدیث کو نہ شیخین نے ذکر کیا اور نہ امام نسائی نے۔ اگرچہ ابن حبان نے نقل کیا ہے۔ لیکن وہ درجۂ صحت کو نہیں پہنچی، اسی وجہ سے امام ترمذیؒ ان کی اس حدیث کے بارے میں سوائے ''حسن'' کے کچھ نہیں لکھا اور فرمایا: **ولا نعلم أحدا أسندہ غیر حماد عن**

مطرف۔اس لئے حدیث ابن عباس ؓ کو ترجیح حاصل ہوگی۔

② **تفقه في الرواة**: حدیث ابن عباس ؓ کے ہم معنی روایت دوسرے صحابہ کرام سے بھی مروی ہیں چنانچہ امام طحاویؒ نے اپنی کتاب میں ذکر کی ہیں۔ ا-حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث ہے: **تزوج رسول الله ﷺ بعض نسائه وهو محرم**۔ ۲-حضرت عائشہ ؓ سے مروی ہے: **تزوج رسول الله ﷺ بعض نسائه وهو محرم**۔ یہاں **بعض نساء** سے حضرت میمونہؓ ہی مراد ہوسکتی ہیں۔ چونکہ ان کے علاوہ کسی کے نکاح کا بحالت احرام ہونا منقول نہیں۔ یہ تینوں صحابی تفقہ میں ان ممتاز ہیں۔ چنانچہ حضرت عائشہ ؓ حضرت میمونہؓ سے ممتاز ہیں، حضرت عبداللہ بن عباس، یزید بن اصمؒ سے ممتاز ہیں۔ چنانچہ عمرو بن دینار زہری سے فرماتے ہیں: **وما يدرى ابن الاصم الأعرابى كذا وكذا بشيء. قال أتجعله مثل ابن عباس** اور حضرت ابو ہریرہ ابورافعؓ سے ممتاز ہیں۔ اس لئے **تفقه رواة** کی بناء پر حضرت عائشہ ؓ، ابن عباسؓ اور ابو ہریرہؓ کو ترجیح دی جائے گی۔ ائمہ ثلاثہ کی طرف سے ایک وجہ ترجیح ان ''رواۃ'' کی اپنی اپنی خصوصیات تھیں، جو پیچھے ذکر ہوئیں۔ سو ان خصوصیات کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابورافع کا کام پیغام پہنچانا تھا۔ سو پیغام پہنچا کہ ان کا کام ختم ہوگیا۔ حضرت میمونہؓ نے اپنا معاملہ حضرت عباس ؓ کے حوالہ کر دیا تھا۔ گویا انہوں نے بھی معاملہ کا بوجھ اپنے اُوپر سے اتار دیا تھا، سارا معاملہ حضرت عباسؓ کے سپرد ہوگیا اس لئے حضرت عباس ؓ کو اور ان کے گھرانہ کو زیادہ علم ہوگا اور یزید بن اصم اس معاملہ میں شریک ہی نہیں تھے۔ مزید یہ کہ ان کے بارے میں عمرو بن دینار کا قول پیچھے گزر ہی چکا ہے۔ اس لئے معاملہ ابن عباس ؓ کے قول پر کرنا چاہیے۔

③ ضبط رواۃ: مستدلات حنفیہ کے رواۃ، مستدلات ائمہ ثلاثہ کے رواۃ سے فائق و ممتاز ہیں۔ مثلاً حنفیہ کے رواۃ یہ حضرات ہیں: سعید بن جبیر، طاؤس، عطاء، مجاہد، عکرمۃ، جابر بن زید رحمہم اللہ۔ جبکہ مستدلات ائمہ ثلاثہ کے رواۃ فقاہت و ضبط کے اعتبار سے ان جیسے نہیں۔

④ حضرت ابن عباس ؓ کی روایت ''مثبت زیادت'' ہے۔ بایں طور کہ حضرت میمونہؓ اور ابورافعؓ کی روایات حلال ہونے کی حالت سے **تزوج في حالة الاحرام** کا جواب معلوم ہوتا ہے، اور احرام ''حالت طارہٗ'' ہے، جس میں تزوج کا جواز ہر ایک کو معلوم نہیں، لہٰذا یہ روایت ''مثبت زیادت'' ہے۔ اسی کو ترجیح دی جائے گی۔

⑤ موافقت قیاس: نکاح محرم میں روایات متعارض ہیں، اس لئے قیاس کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ محرم کا نکاح صحیح ہونا چاہیے۔ اس لئے کہ نکاح عقود میں سے ایک عقد ہے۔ جس طرح باقی عقود جائز ہیں اسی طرح نکاح بھی جائز ہے۔ مثلاً محرم کے لئے خوشبو کا خریدنا جائز ہے، لیکن اس کا ستعمال ناجائز ہے، سراویل اور قمیص کا خریدنا جائز ہے، مگر ان کا استعمال ناجائز ہے۔ حالت احرام میں وطی کے لئے باندی خریدنا جائز ہے لیکن اس کے ساتھ جماع کرنا ناجائز ہے۔ معلوم ہوا کہ عقود کا جواز احرام کی وجہ سے ختم نہیں ہو جاتا۔ لہٰذا عقدِ نکاح بھی جائز ہوگا اور وطی ناجائز ہوگی۔ شافعیہ کے ہاں تو عقدِ نکاح بطریق اولیٰ جائز ہونا چاہیے، چونکہ وہ اس کو ''عقد مالی'' کہتے ہیں۔

حدیث عثمانؓ کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کے تیسرے جملہ سے بالاتفاق خلاف اولیٰ مراد ہے، چنانچہ حنفیہ پہلے دونوں جملوں کو بھی خلاف اولیٰ پر محمول کرتے ہیں کہ نکاح و انکار خلاف اولیٰ ہے۔

امام ترمذیؒ نے ائمہ ثلاثہ کی طرف سے حضرت ابن عباس ؓ کی روایت میں یہ تاویل ذکر کی ہے: **تزوجها حلالا، مظهر أمر تزويجها وهو محرم**۔ شیخ امام محی السنہؒ نے بھی اس سے ملتی جلتی تاویل ذکر کی ہے: **والأكثرون على أنه تزوجها حلالا وظهر**

أمر تزويجها وهو محرم، ثم بنى بها وهو حلال بسرف فى طريق مكة۔ یہ تاویلات ناقابل قبول ہیں، اس لئے کہ اہل سیر اور محدثین نے نقل کیا ہے: **ان رسول الله ﷺ تزوج ميمونة بسرف، وبنى بها سرف، وتوفيت بسرف ودفنت بسرف۔**

نکاح سرف میں دو احتمال ہیں: ایک یہ کہ یہ نکاح مکہ جاتے وقت ہوا تب تو یقیناً آپ ﷺ محرم تھے۔ اس لئے کہ ''سرف'' داخل میقات ہے اور تجاوز عن المیقات بغیر احرام ناجائز ہے، تو اس صورت میں حنفیہ کی تائید ہوگی اور **تزوجها وهو حلال** کے معنی **وتزوجها محر ما وظهر أمر تزويجها وهو حلال** ہوں گے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ سرف میں نکاح مکہ سے واپسی پر ہوا تو اس صورت میں محرم ہونے کا کوئی سوال نہیں، یقیناً آپ ﷺ واپسی میں سرف پہنچنے پر حلال تھے۔ لہٰذا **تزوجها حلالاً** تو ٹھیک ہوگا، مگر **ظهر امر تزويجها وهو محرم** کسی طرح درست نہیں ہوسکتا، چونکہ ''سرف'' کے بعد آپ ﷺ مدینہ تشریف لائے ہیں اور ظاہر بات ہے کہ مدینہ آنے کیلئے احرام نہیں ہے۔ چنانچہ **ظهر امر تزويجها وهو محرم** کو درست قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس لئے امام ترمذی اور محی السنہ کے کلام میں تاویل ضروری ہے: **تزوجها وهو محرم فى طريقه إلى مكة بسرف وظهر أمر ترويجها بعه الفراغ عن العمرة ممكه وهو حلال۔**

ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کا جواب دیتے ہوئے امام ابن حبانؒ نے یہ تاویل کی ہے کہ **وهو محرم** کے معنی داخل حرم کے ہیں، یعنی رسول اللہ ﷺ کا جب حضرت میمونہؓ سے نکاح ہوا تو آپ ﷺ حرم کے اندر تھے۔ لیکن آپ ﷺ حلال تھے۔ اور اس پر انہوں نے بطور استدلال یہ شعر پیش کیا ہے:

قتلوا ابن عفان الخليفة محرما ☆ ودعا فلم ار مثله مخذولا

یہاں ظاہر ہے ''**محرما**'' کے معنی احرام حج سے کرنا صحیح نہیں ہے، چونکہ حضرت عثمانؓ کی شہادت مدینہ میں ہوئی ہے، اس لئے کہا جائے گا کہ ''محرما'' کے معنی داخ حرم کے ہیں، اور ''حرم'' سے حرم مدینہ ہے۔ لیکن کی یہ تاویل بوجوہ درست نہیں:

① ''محرم'' کے یہ معنی ''داخل حرم'' اس مادہ میں اہل لغت سے ثابت نہیں۔

② دوسرے معنی کا بھی احتمال ہے۔ لہٰذا صرف اس معنی میں منحصر ہونا بھی درست نہیں، چنانچہ ''محرم'' کے ایک معنی ''محقون الدم'' اور ''ذوحرمت'' کے بھی ہیں۔ مذکورہ بالا شعر میں ''محرما'' کے یہی معنی (یعنی **محقون الدم** اور **ذوحرمة**) مراد ہیں۔

حالتِ احرام میں ہم بستر ہونا ممنوع ہے

۲۶۸۳: وَعَنْ يَزِيْدَ بْنَ الْأَصَمِّ ابْنِ أُخْتِ مَيْمُوْنَةَ عَنْ مَيْمُوْنَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ تَزَوَّجَهَا وَهُوَ حَلَالٌ (رواه مسلم) **قَالَ الشَّيْخُ الْإِمَامُ مُحِي السُّنَّةِ وَالْاَكْثَرُوْنَ عَلٰى اَنَّهٗ تَزَوَّجَهَا حَلَالاً وَظَهَرَ اَمْرُ تَزْوِيْجِهَا وَهُوَ مُحْرِمٌ ثُمَّ بَنٰى بِهَا وَهُوَ حَلَالٌ بِسَرِفَ فِيْ طَرِيْقِ مَكَّةَ۔**

اخرجه مسلم فى صحيحه ۱۰۳۲/۲ الحديث رقم (۴۸۔ ۱۴۱۱ ۔ وابوداؤد فى السنن ۴۲۲/۲ الحديث رقم ۱۸۴۳۔ والترمذى فى ۲۰۳/۳ الحديث رقم ۸۴۵ وابن ماجه فى ۶۳۲/۱ الحديث رقم ۱۹۶۴۔ واحمد فى المسند ۳۳۵/۶۔

ترجمہ: اصم بن یزید جو کہ میمونہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے ہیں' انہوں نے میمونہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا' اس حال میں کہ وہ احرام میں تھے اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔ شیخ امام محی السنۃؒ نے کہا ہے کہ اکثر تینوں امام اور ان کے تابعین کے نزدیک یہ ہے کہ حضور ﷺ نے میمونہ رضی اللہ عنہا سے حالت احرام کے بغیر

نکاح کیا اوران کے نکاح کا امر اس وقت ظاہر ہوا کہ وہ حالت احرام میں تھے پھران کے ساتھ ہم بستر ہوئے۔یعنی ان کے ساتھ حالت احرام کے بغیر مقام سرف میں مکہ کے راستے میں صحبت کی۔

راویٔ حدیث:

یزید بن الاصم۔ یہ یزید ہیں جو''اصم'' کے بیٹے تھے۔حضرت امّ المومنین میمونہ رضی اللہ عنہا کے ہمشیرہ زادہ ہیں۔حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا اورابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔

عرضِ مرتب: اس حدیث پر سیر حاصل بحث ماقبل میں گزر چکی ہے، ملاحظہ فرمائیے حدیث:۲۶۸۲۔

حالت احرام میں سر دھونا جائز ہے

۲۶۸۴: وَعَنْ اَبِیْ اَیُّوبَ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ کَا نَ یَغْسِلُ رَأْسَهٗ وَهُوَ مُحْرِمٌ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۵۰/٤۔ الحدیث رقم ۱۸٤۰۔ ومسلم فی ۸٦٤/۲ الحدیث رقم (۹۱۔ ۱۲۰۵)۔ وابوداؤد فی السنن ٤۲۰/۲ الحدیث رقم ۱۸٤۰ والنسائی فی ۱۲۸/۵ الحدیث رقم ۲٦٦۵۔ وابن ماجه ۹۷۸/۲ الحدیث رقم ۲۹٤۳۔ واحمد فی المسند ٤۱۸/۵۔

ترجمہ: حضرت ابوایوب انصاریؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنا سر دھوتے تھے۔حالت احرام میں۔اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: بغیر کسی اختلاف کے محرم کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنا سر دھوئے مگر اس طرح کہ سر کا کوئی بال ٹوٹنے نہ پائے' ہاں اگر کوئی خطمی سے سر دھوئے گا تو امام اعظم ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک اس پر دم یعنی جانور ذبح کرنا واجب ہوگا کیونکہ نہ صرف یہ کہ خطمی خوشبو کی قسم سے ہے بلکہ اس کے لگانے سے جوئیں مر جاتی ہیں۔البتہ (بغیر خوشبو کے) صابون یا بیری کے پتوں اور یا اسی قسم کی دوسری چیزوں سے سر دھونے کی صورت میں متفقہ طور پر تمام علماء کے نزدیک اس پر کچھ واجب نہیں ہوتا۔

صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ اس پر صدقہ ہے۔اگر کسی شخص نے ایسے شیمپو وغیرہ کے ساتھ سر دھویا کہ جس میں خوشبو تھی تو دیکھنے والے کی رائے کا اعتبار ہوگا۔یعنی اگر دیکھنے والا اس کو صابن یا شیمو وغیرہ کا نام دیتا ہے تو اس پر صدقہ لازم ہے، اور اگر خوشبو کہتا ہے تو اس پر دم واجب ہے۔(**كذا فی قاضی خان**) ایک روایت میں ہے کہ **كان يغتسل وهو محرم**۔سند ضعیف کے ساتھ ابن عباس کی بابت مروی ہے کہ وہ حالت احرام میں مقام جحفہ کے کسی حمام میں داخل ہوئے اور فرمایا: **ما يعبأ الله بأوساخنا شيئا**۔یعنی اس صورت میں فدیہ نہیں ہے، چنانچہ اس سے امام مالکؒ کی تردید ہو جاتی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ مَیل کچیل دور کرنے کی صورت میں صدقہ لازم ہے۔اس سلسلہ میں تحقیقی بات یہ ہے کہ محرم غسل کرتے وقت ازالۂ وسخ کی نیت نہ کرے۔ چونکہ ارشاد نبوی ﷺ ہے: **المحرم اشعث أغبر**۔محرم بکھرے بالوں والا غبار آلود ہوتا ہے۔

۲٦۸۵: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ احْتَجَمَ النَّبِیَّ ﷺ وَهُوَ مُحْرِمٌ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۲/٤ الحدیث رقم ۱۸۳۵۔ ومسلم فی صحیحه ۸٦۲/۲ الحدیث رقم (۸۷۔ ۱۲۰۲)۔ وابوداؤد فی السنن ٤۱۸/۲ الحدیث رقم ۱۸۳۵ والترمذی فی ۱۹۸/۳ الحدیث رقم ۸۳۹۔ والنسائی فی ۱۹۳/۵ الحدیث رقم ۲۸٤۵ وابن ماجه فی ۱۰۲۹/۲ الحدیث رقم ۳۰۸۱۔ والدارمی فی ۵۷/۲ الحدیث رقم ۱۸۱۹ واحمد فی المسند ۲۱۵/۱۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھنے لگوائے حالت احرام میں اس کو امام بخاری اور مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے نقل کیا ہے۔

تشریح: علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: اکثر علماء کے نزدیک احرام کی حالت میں سینگی کھینچوانا جائز ہے بشرطیکہ کوئی بال نہ ٹوٹے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ محرم اپنا جسم کھجلا سکتا ہے؟ تو آپؓ نے ارشاد فرمایا: **فلیحك ولیسدد**۔

احرام کی حالت میں آنکھوں پر لیپ کرنے کی اجازت ہے

۲۶۸۶: وَعَنْ عُثْمَانَ حَدَّثَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِی الرَّجُلِ اِذَا اشْتَکٰی عَیْنَیْهِ وَهُوَ مُحْرِمٌ ضَمَّدَ هُمَا بِالصَّبِرِ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۸۶۳/۲ الحدیث رقم (۸۹۔ ۱۲۰۴)۔ وابوداؤد فی السنن ۴۱۹/۲ الحدیث رقم ۱۸۳۸۔ والترمذی فی ۲۸۷/۳ والحدیث رقم ۹۵۲۔ والنسائی فی السنن ۱۴۳/۵ الحدیث رقم ۲۷۱۱۔ والدارمی ۹۸/۲ الحدیث رقم ۱۹۳۰۔

ترجمہ: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کے حق میں بیان کیا کہ جب اس کی آنکھیں دکھیں یا ضعف بصارت ہو اس حال میں کہ وہ محرم ہو تو وہ ان کو ایلوے کے ساتھ لیپ کرے۔ اس کو امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: حدیث میں مسئلہ اگرچہ محرم کے بارے میں بتایا گیا ہے لیکن محرمہ کا بھی یہی حکم ہے۔

''ضمّدھا'' بصیغۂ ماضی از باب تفصیل ہے۔ ایک نسخہ میں بصیغۂ امر مروی ہے۔ یہ امر اباحت کیلئے ہوگا۔

ضمد الضرح یضمدہ، اورضمدہ شدہ بالضماد پٹی کو کہتے ہیں۔

تاج المصادر میں ''تضمید'' کے معنی ''لیپ کرنا'' ہی لکھتے ہیں۔ لیکن کچھ علماء نے اس کے معنی ''آنکھوں کے اندر لگانا'' لکھے ہیں۔ یعنی جس طرح سرمہ لگایا جاتا ہے اسی طرح وہ آنکھوں میں ایلوا لگائے۔

اور علامہ طیبیؒ نے یہ لکھا ہے کہ تضمید ''زخم پر پٹی باندھنے کو کہتے ہیں'' اسی طرح زخم پر دوا لگانے کو بھی تضمید کہتے ہیں۔

''الصبر'' باء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ صاحب قاموس لکھتے ہیں: **صبر وزن کتف** ہے اور ضرورت شعری کی بناء پر باء کو ساکن بھی پڑھا جاتا ہے۔

احرام کی حالت میں بغیر خوشبو کا سرمہ لگانا جائز ہے بشرطیکہ اس سے زیب وزینت مقصود نہ ہو۔ اگر کوئی شخص زیب وزینت کے بغیر خوشبو کا بھی سرمہ لگائے تو مکروہ ہوگا۔

اس موقع پر خوشبودار سرمہ کے بارے میں یہ تفصیل جان لیجئے کہ اگر سرمہ میں کم خوشبو ہو تو اس کو لگانے سے صرف صدقہ واجب ہوگا اور اگر خوشبو زیادہ ہوگی تو ایسے سرمہ کو لگانے سے دم یعنی جانور ذبح کرنا واجب ہوگا۔ ایسے ہی یہ مسئلہ ہے کہ اگر کوئی محرم اپنے سر اور منہ کے علاوہ کسی اور عضو پر پٹی باندھے تو اس پر اگرچہ بطور جزاء کچھ واجب نہیں ہوتا لیکن یہ مکروہ ہے اور اگر کوئی محرم اپنے سر یا منہ کے چوتھائی حصہ یا اس سے زیادہ کو کسی کپڑے وغیرہ سے ڈھانکے گا تو اس پر دم لازم ہوگا اور چوتھائی حصہ سے کم کو ڈھانکے گا تو صرف صدقہ واجب ہوگا۔

امام بیہقی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے کہ وہ اثمد اور کالے سرمے کو زینت قرار دیتی ہیں۔ ہم اس کو مکروہ سمجھتے ہیں، حرام قرار

نہیں دیتے۔امام مالک، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ بھی یہی فرماتے ہیں، البتہ حاجت مستثنیٰ ہے۔اِس صورت میں حلت پر تمام علماء کا اتفاق ہے بشرطیکہ اس میں خوشبو نہ ہو۔البتہ مہندی ہمارے علماء کے نزدیک خوشبو ہے۔امام بیہقیؒ روایت کرتے ہیں: **ان نساء النبی ﷺ یختضبن بالحناء وھن محرمات** یہ مؤول ہے اور تاویل اس کی یہ ہے: **أی: مریدات للإحرام**۔یعنی جب احرام باندھنا ہوتا تھا۔

احرام کی حالت میں سورج کی گرمی سے سایہ کرنا جائز ہے

۲۶۸۷: وَعَنْ اُمِّ الْحُصَيْنِ قَالَتْ رَأَيْتُ اُسَا مَةَ وَبِلَالاً وَاَحَدُهُمَا اٰخِذٌ بِخِطَامِ نَاقَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَالْاٰخَرُ رَافِعٌ ثَوْبَهٗ يَسْتُرُهٗ مِنَ الْحَرِّ حَتّٰى رَمٰى جَمْرَةَ الْعَقَبَةِ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ۹۴۴/۲ الحديث رقم (۳۱۲۔ ۱۲۹۸)۔ وابوداؤد فی السنن ۴۱۶/۲ الحديث رقم ۱۸۴۳۔ النسائی فی ۲۶۹/۵ الحديث رقم ۳۰۶۰۔

ترجمہ: حضرت ام حصینؓ سے روایت ہے کہتی ہیں کہ میں نے اسامہؓ اور بلالؓ کو دیکھا اس حال میں کہ ان میں سے ایک حضور ﷺ کی اونٹنی کی مہار پکڑے ہوئے تھا اور دوسرا اپنا کپڑا اٹھائے ہوئے تھا سورج کی گرمی سے سایہ کرتا تھا۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ نے جمرۃ العقبہ کو کنکریاں ماریں اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله :وأحدهما أخذ بخطام ناقة** :''**وأحدهما أخذ**'': یہ جملہ حالیہ ہے۔''آخذ'': بصیغۂ اسم فاعل ہے۔

''**خطام**'' خاء کے کسرہ کے ساتھ، بروزن کتاب بمعنی زمام و مہار یعنی لگام۔

قوله :والآخر رافع ثوبه يستره من الحر: ''**رافع**'': تنوین کے ساتھ ہے۔

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے سر مبارک پر کپڑے سے اس طرح سایہ کر رکھا تھا کہ وہ کپڑا اونچا ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ کے سر مبارک سے لگتا نہیں تھا اور ایک روایت یہ ہے کہ ''وہ سایہ کے لئے آنحضرت ﷺ کے مبارک سر پر چھتری کی مانند ایک چیز اٹھائے ہوئے تھے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ محرم کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنے سر پر کسی چیز سے سایہ کر لے بشرطیکہ سایہ کرنے والی چیز اس کے سر کو نہ لگے' چنانچہ اکثر علماء کا یہی قول ہے لیکن امام مالکؒ اور امام احمدؒ نے اسے مکروہ کہا ہے۔

اس مسئلہ پر حدیث کی دلالت محل نظر ہے۔چونکہ احتمال یہ ہے کہ صورت حال حلال ہونے کے بعد پیش آئی ہو۔

ودج میں بیٹھنا ممنوع ہے بشرطیکہ سر ہودج میں لگتا ہو' اگر سر ہودج میں نہ لگتا ہو تو پھر اس میں بیٹھنا ممنوع نہیں ہے' اسی طرح اگر کعبہ کا پردہ یا خیمہ سر میں لگتا ہو تو ان کے نیچے کھڑا ہونا ممنوع ہے اور اگر سر میں نہ لگتا ہو تو ممنوع نہیں۔

امام مالکؒ اور امام احمدؒ سایہ حاصل کرنے کو منع فرماتے ہیں۔ان کا مستدل یہ نصوص ہیں: حضرت عمرؓ کے بارے میں مروی ہے: **ما ضرب فسطاطا فی سفر حجه**۔نیز ان کے صاحبزادہ کے بارے میں مروی ہے: **انه أمر من استظل علی بعیر بأن یبرز للشمس** ۔علاوہ ازیں ایک حدیث میں آتا ہے: **ما من محرم یضحی لشمس حتی تغرب إلا غربت بذنوبه حتی یعود کما ولدته أمه**۔

حنفیہ کی طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ ان روایات سے استدلال بوجوہ درست نہیں۔

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ علماء کا اجماع ہے کہ خیمہ میں چھت کے نیچے بیٹھنا جائز ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت عمر اور ابن عمر کی روایات میں کسی قسم کی کوئی ''نہی'' موجود نہیں ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ کسی صحابی کا یہ مذہب نہیں۔
چوتھی وجہ یہ ہے کہ مذکورہ حدیث ضعیف ہے باوجود فضائل اعمال سے تعلق رکھتی ہے۔
ابن حجرؒ نے فرمایا: **خبر مسلم مقدم علی کل ما خالفه، وهو أنه علیه الصلوة والسلام ستر بثوب من الحر حتی رمی جمرة العقبة**، اس پر اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ اس میں کسی قسم کی دلالت صریحا موجود نہیں کہ آنحضرت ﷺ حالت احرام میں تھے۔اور قامت مشہور ہے: **مع الاحتمال لالصح الاستدل**،
قوله :حتی رمی الجمرة:یہ جملہ اول ایام پر نص نہیں ہے۔اس مسئلہ میں اس روایت سے استدلال اولیٰ ہے کہ جس میں مقام عرفہ میں قبہ سے سایہ حاصل کونے کا ذکر ہے یہ روایت ماقبل میں گزر چکی ہے۔

مجبوری کی بنا پر سر منڈانا جائز ہے

۲۶۸۸: وَعَنْ كَعْبِ بْنِ عُجْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ مَرَّ بِهٖ وَهُوَ بِالْحُدَيْبِيَةِ قَبْلَ اَنْ يَّدْخُلَ مَكَّةَ وَهُوَ مُحْرِمٌ وَهُوَ يُوْقِدُ تَحْتَ قِدْرٍ وَالْقُمَّلُ تَتَهَافَتُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَقَالَ اَتُؤْذِيْكَ هَوَامُّكَ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَاحْلِقْ رَأْسَكَ وَاَطْعِمْ فَرَقًا بَيْنَ سِتَّةِ مَسَاكِيْنَ وَالْفَرَقُ ثَلَاثَةُ اٰصُعٍ اَوْ صُمْ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ اَوِ انْسُكْ نَسِيْكَةً۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاري في صحيحه ١٢/٤۔ الحديث رقم ١٨١٤۔ ومسلمؒ في ٨٦١/٢ الحديث رقم (٨٣۔ ١٢٠١)۔ والترمذي في السنن ٢٨٨/٣ الحديث رقم ٩٥٣۔ ومالك في الموطأ ٤١٧/١ الحديث رقم ٣٨ من كتاب الحج واحمد في المسند ٢٤١/١۔

ترجمہ: کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ان پر گزر ہوا اور وہ مکہ میں داخل ہونے سے پہلے حدیبیہ میں تھے اور کعب رضی اللہ عنہ محرم تھے اور وہ ہانڈی کے نیچے آگ جلا رہے تھے اور جوئیں ان کے منہ یعنی چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ پس حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا جوئیں تجھے ایذا دیتی ہیں؟ انہوں نے کہا ہاں۔ پس آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اپنا سر منڈ والو اور ایک فرق کے برابر کھانا چھ مسکینوں کو کھلا دو اور فرق تین صاع کا ہوتا ہے یا تین دن روزے رکھ یا جانور ذبح کر جو ذبح کرنے کے لائق ہو۔اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله :ان النبی ﷺ مرّ به وهو بالحدیبیة ......علی وجهه**:
"**مرّ به**": اس میں تین احتمال ہیں: ۱-اس میں تجرید ہے۔۲-اس میں التفات ہے۔۳-یہ نقل بالمعنی ہے۔
"**یو قد**" ایقاد مصدر سے مضارع معروف کا صیغہ ہے۔"**یؤ ذیك**" صیغہ مذکر ومؤنث دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔
قوله :ا تؤ ذیك هوامك :......ثلاثة اوصع:
"**هو امك**" میم کی تشدید کے ساتھ ہے۔ **هامة** کی جمع ہے۔اس کا اطلاق سکون کے ساتھ چلنے والے "دابۃ" پر ہوتا ہے، جیسا کہ چیونٹی اور جوں۔"**فا حلق رأسك و أطعم**" پہلا امر "اباحت" کیلئے ہے اور دوسرا وجوب کیلئے ہے۔
"**والفرق ثلاثة آصع**" یہ جملہ معترضہ ہے کسی راوی کی تفسیر ہے۔
"**والفرق ثلاثة آصع**" صحیح مسلم کتاب الحمیدی اور شرح السنہ میں اسی طرح ہے اور مصابیح کے نسخوں میں اُصوع ہے۔ "آصع" اور "اصوع" دونوں ہی "صاع" کی جمع ہیں۔اور یہ کہنا خالی از خطا نہیں کہ "آصع" لحن ہے۔علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ لفظ حدیث میں صحیح طور پر ثابت ہے، یہ قلب کے قبیل سے ہے، اس کی اصل "أصوع" ہے۔قلب سے مراد قلب مکانی ہے، کہ واؤ کو صاد کی جگہ لے گئے اور صاد کو واؤ کی جگہ لے گئے، واؤ کی حرکت صاد کی طرف منتقل ہوگئی اور پھر واؤ کو الف سے بدل دیا گیا۔چونکہ واؤ اصل میں

مفتوح تھی، اور ماقبل مفتوح تھا۔

''فرقا'': اس کی وضاحت میں علامہ طیبیؒ لکھتے ہیں: بالتحريك مكيال يسع ستة عشر رطلا، وهى اثنا عشر مدا أو ثلاثة آصع۔ مفاتیح میں لکھتے ہیں: قال الأزهرى: المحدثون على السكون، وكلامه العرب على التحريك، فرق بينهما القتيبى۔ فقال: الفرق بسكون الراء من الأوانى والمقادير ستة عشر رطلا، وبالفتح مكيال يسع ثمانين رطلا اھ۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: چھ مسکینوں کو کھانا کھلائے بایں طور کہ ہر مسکین کو آدھا آدھا صاع دے۔ کھانے کے سلسلہ میں کوئی تفریق نہیں۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں یہ مطلق ہے، لہٰذا اس کو فرد اکمل پر محمول کیا جائے گا اور فرد اکمل ''بر'' ہے جیسا کہ ہمارا مذہب ہے۔

قوله :او صم ثلاثة ايّام اوأنسك نسكية: أى اذبح ذبيحة ایک روایت میں یوں ہے: احلق ثم اذبح نسكًا، أو صم ثلاثة أيام، أو أطعم ستة مساكين ثلاثة آصع من تمر اور ایک روایت میں یہ ہے: لكل مسكين نصف صاع۔

یہ حدیث درحقیقت اس آیت کریمہ کی تفسیر ہے: ﴿ولا تحلقوا رؤوسكم حتى يبلغ الهدى محله فمن كان منكم مريضا أو به أذى من رأسه ففدية من صيام أو صدقة أو نسك﴾[البقرة:۱۹۶] دونوں جگہ ''أو'' تخییر کیلئے ہے۔

بہرکیف اس حدیث سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ اگر کوئی محرم کسی عذر مثلاً جوں، زخم اور درد سر وغیرہ کی وجہ سے اپنا سر منڈوائے تو اسے اختیار ہے کہ بطور جزا چاہے تو چھ مسکینوں کو کھانا کھلائے بایں طور کہ ہر مسکین کو آدھا آدھا صاع گیہوں دے دے، چاہے تین روزے رکھ لے اور چاہے جانور ذبح کرے۔ چنانچہ یہ حدیث اس آیت کریمہ کی تفسیر ہے کہ ﴿ومن كان منكم مريضا او به اذى من راسه ففدية من صيام او صدقة اونسك﴾ (ترجمہ) ''اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو (اور وہ اپنا سر منڈوادے) تو وہ بطور فدیہ یا تو روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے۔

الفصل الثانی:

عورت کے محظورات احرام

۲۶۸۹: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَنْهَى النِّسَاءَ فِي اِحْرَامِهِنَّ عَنِ الْقُفَّازَيْنِ وَالنِّقَابِ وَمَا مَسَّ الْوَرْسَ وَالزَّعْفَرَانَ مِنَ الثِّيَابِ وَالتَلْبَسْ بَعْدَ ذٰلِكَ مَا اَحَبَّتْ مِنَ الْوَانِ الثِّيَابِ مُعَصْفَرٍ اَوْ خَزًّا وَمحِلِّي اَوْ سَرَاوِيْلَ اَوْ قَمِيْصٍ اَوْ خُفٍّ۔ (رواه ابو داود)

اخرجه ابو داؤد فى السنن ۲/ ٤١٢ الحدث رقم ١٨٢٧۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے سنا کہ آپ ﷺ عورتوں کو احرام کی حالت میں دستانے پہننے اور نقاب کے ڈالنے سے منع فرماتے تھے یعنی اس طرح کے نقاب سے جو منہ کو لگے اور اس کپڑے کے پہننے سے کہ جس کو ورس اور زعفران لگی ہو اور چاہیے کہ اس کے بعد (یعنی احرام سے نکلنے کے بعد) وہ کپڑوں کی اقسام سے پہنے جو بھی قسم ہو۔ کسبی ہو یا حر ہو یا زیور ہو یا پائجامہ ہو یا کرتہ ہو یا موزہ۔ اس کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :ينهى النساء .... والزعفران من الثياب:

عرض مرتب: اس حصہ سے متعلقہ احکام ماقبل میں گزر چکے ہیں، ملاحظہ فرمایئے حدیث: ۲۶۷۸۔

قوله :ولتلبس بعد ذلك ما احبت ......او خف :

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ اسلوب کلام ایسا ہے گویا کہ راوی نے یوں کہا ہے: **سمعته يقول: لا تلبس النساء القفازين ولتلبس بعد ذلك**: مشارالیہ مذکور ہے۔

''**معصفر**'': مجرور ہے، **ألوان الثياب** سے بدل ہے۔ **أي المصبوغ بالعصفر**۔

حدیث کے ظاہر سے یوں لگتا ہے کہ مزعفر و معصفر کے درمیان فرق ہے۔ اور مذہب سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ عموم ہے۔ ابن حجرؒ کا کہنا ہے کہ ''عصفر خوشبو نہیں ہے''۔ لیکن اس کی خوشبو ابن حجرؒ کے کلام کی تردید کر رہی ہے۔

بَعْدَ ذٰلِكَ : (اس کے بعد) کا مطلب شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے تو ''احرام سے نکلنے کے بعد'' ہی لکھا ہے لیکن ملا علی قاریؒ نے یہ معنی لکھے ہیں کہ ''ان مذکورہ چیزوں کے بعد'' یعنی حدیث میں جن چیزوں کے استعمال سے منع کیا گیا ہے ان کے علاوہ اور جس قسم کا بھی کپڑا چاہے پہنے۔

نیز ملا علی قاریؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ (بعد ذلك سے یہ معنی مراد لینے کی صورت میں) حدیث سے بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ احرام کی حالت میں زعفران کا رنگا ہوا کپڑا پہننا تو ممنوع ہے لیکن کسم کا رنگا ہوا کپڑا پہننا ممنوع نہیں ہے جب کہ حنفیہ کے مسلک میں حالت احرام میں جس طرح زعفرانی کپڑا پہننا ممنوع ہے اسی طرح کسم کا رنگا کپڑا منع نہیں ہے، چنانچہ خزانۃ الاکمل اور ولوالجی اور فقہ کی دوسری کتابوں میں یہی لکھا ہے کہ اگر کسی محرم نے زعفران یا کسم میں رنگا ہوا کپڑا ایک دن پہنا تو اس پر بطور جزا دم واجب ہوتا ہے اور اگر ایک دن سے کم پہنا تو صدقہ لازم ہوگا لہٰذا اولیٰ تو یہی بہتر ہے کہ بعد ذالک کے وہی معنی مراد لئے جائیں جو شیخ عبدالحقؒ نے لکھے ہیں، یا پھر یہ تاویل کی جائے کہ حدیث میں کسم کا وہ رنگا ہوا کپڑا مراد ہے جو دھل چکا ہو اور جس میں خوشبو باقی نہ رہ گئی ہو۔

''**خز**'' : خاء معجمہ کے فتحہ اور زائے مشددہ کے ساتھ، ریشم اور صوف سے مرکب کپڑے کی قسم ہے، اور مغرب میں لکھا ہے کہ ''خز'' ایک کیڑے کا نام ہے، اس کے ''وبر'' (روئیں اور بال) سے بنے ہوئے کپڑے کو بھی ''خز'' کہا جاتا ہے۔

''**حلي**'': حاء کے ضمہ اور یاء کی تشدید کے ساتھ عورتوں کے زیب زینت کے زیورات، مثلاً بالیاں، پازیب وغیرہ۔

طیبیؒ فرماتے ہیں کہ حدیث کے آخر میں کپڑوں کے ساتھ زیور کا ذکر مجازاً کیا گیا ہے۔ اس آیت کریمہ میں ''حلی'' پر لباس کا اطلاق کیا ہے:

﴿**وتستخرجون حلية تلبسونها**﴾[الفاطر:۱۲]

سندی حیثیت: منذریؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کے سارے رجال، رجال صحیحین ہیں، سوائے ابن اسحاق کے اھ معلوم ہونا چاہیے کہ ابن ہمامؒ نے ابن اسحاق کو ''حجت'' قرار دیا ہے۔ لہٰذا یہ حدیث حسن ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا احرام کی حالت میں چہرہ کھولنے کا طریقہ

۲۶۹۰: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ الرُّكْبَانُ يَمُرُّوْنَ بِنَا وَنَحْنُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ مُحْرِمَاتٌ فَإِذَا جَاوَزُوْا بِنَا سَدَلَتْ إِحْدَانَا جِلْبَابَهَا مِنْ رَّأْسِهَا عَلٰى وَجْهِهَا فَإِذَا جَاوَزُوْنَا كَشَفْنَاهُ ـ (رواه ابو داوٗد وابن ماجة معناه)

اخرجه ابو داؤد فى السنن ٤١٦/٢ الحديث رقم ١٨٣٣ ـ وابن ماجه ٩٧٩/٢ الحديث رقم ٢٩٣٥ ـ واحمد فى المسند ٣٠/٦ـ

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ہم حالت احرام میں (سفر کے دوران) نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے اور (حالت حرام کے باعث ہمارے چہرے کھلے ہوئے تھے) اور قافلے ہمارے قریب سے گزرتے تھے، جب کوئی

قافلہ ہمارے پاس سے گزرتا تو ہم میں ہر عورت اپنی چادر (پردے کی غرض سے) اپنے سر پر (اس طرح) ڈالتی کہ وہ چادر ان کے مُنہ کے ساتھ نہ لگتی۔اس کو ابوداؤد اور ابن ماجہؒ نے اس معنی میں ذکر کیے ہیں۔

تشریح: قوله :كان الركبان يمرون بنا ونحن مع رسول الله ﷺ محرمات :

''الركبان'': راء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔''راکب'' کی جمع ہے۔

محرمات: مرفوع ہے خبر ہونے کی بناء پر۔

قوله :فإذا جاوزوا بنا سدلت احدانا جلبابها:

''جاوزوبنا'': ایک نسخہ میں جاوزنا ہے۔سیدؒ نے ھامش میں اسی طرح لکھا ہے، اور اس کو ظاہر قرار دیا ہے، حالانکہ معنوی اعتبار سے یہ غیر ظاہر ہے، چونکہ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ارسال بوقت مجاوزۃ ہوتا تھا۔ الا یہ کہ یوں کہا جائے کہ مجاوزت مرور کے معنی میں ہے ایک اور نسخہ میں حاذونا (جب وہ ہمارے مقابل ہو جاتے) کے الفاظ نقل کئے ہیں۔یہ الفاظ بالکل واضح ہیں اور ایک نسخہ میں فإذا جاوزنا ہے۔اس کی بالکل کوئی توجیہ ممکن نہیں ہے۔

علامہ طیبیؒ لکھتے ہیں: قوله :فإذا جاوزوا بنا، هكذا لفظ أبى داؤد، وفى المصابيح حاذونا اه، وهو بفتح الذال من المحاذاة بمعنى المقابلة، وهو اظهر من الكل، والله تعالىٰ أعلم۔

قوله :جلبابها: ''جلباب'': جیم کے کسرہ کے ساتھ۔

سدلت: علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: سدلت کے الفاظ نہ ابوداؤد کے ہیں اور نہ ابن ماجہ کے، تو گویا کہ ان دونوں کی روایت کے الفاظ ''دلت'' ہیں، تدلية سے ماخوذ ہے، جیسا کہ مصابیح کی روایت میں ہے۔لہٰذا یہ روایت بالمعنی ہے۔

قوله :فإذا جاوزونا كشفناه: كشفناه: کی ضمیر غائب کا مرجع قرینہ مقام کے سبب ''الوجه'' بھی ہوسکتا ہے۔

احرام کی حالت میں خوشبو کا استعمال ممنوع ہے

۲۶۹۱: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِی ﷺ كَا نَ يَدَّ هِنُ بِا لزَّيْتِ وَهُوَ مُحْرِمٌ غَيْرَ الْمُقَتَّتِ يَعْنِى غَيْرَ الْمُطَيَّبِ۔

(رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۲۹۴/۳ الحديث رقم ۹۶۲۔ وابن ماجه فی ۱۰۳۰/۲ الحديث رقم ۳۰۸۳۔ واحمد فی المسند ۱۴۵/۲۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر ؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ بغیر خوشبو کے تیل استعمال کرتے تھے احرام کی حالت میں اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :يدهن بالزيت وهو محرم غير المقتت :''يدّهن'' دال کی تشدید کے ساتھ ہے۔

''المقتت'': پہلی تاء مشدد ہے۔اس تیل کو کہتے ہیں جس میں خوشبوئے پھول ڈال کر اسے پکا لیا جائے تا کہ وہ تیل خوشبودار ہو جائے یا اس تیل میں کوئی خوشبودار تیل وغیرہ ملا دیا جائے۔

احرام کی حالت میں خوشبودار تیل استعمال کرنا مکروہ ہے۔اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر کوئی محرم کسی ایک عضو کے پورے حصہ پر یا کئی یا سب اعضاء پر روغن بنفشہ، روغن گلاب، روغن موتیا یا اسی قسم کا کوئی بھی خوشبودار تیل لگائے گا تو حنفیہ کے ہاں بالاتفاق اس پر دم یعنی جانور ذبح کرنا واجب ہوگا اور اگر زیتون یا تل کا ایسا تیل کہ جس میں خوشبو نہ ملی ہوئی ہو زیادہ مقدار میں لگائے گا تو امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک

اس صورت میں بھی دم واجب ہوگا جب کہ صاحبین یعنی امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کہتے ہیں کہ صدقہ واجب ہوگا۔لیکن یہ اختلاف اس صورت میں ہے جب کہ یہ دونوں تیل خوشبو سے بالکل خالی اور کسی خوشبودار پھول کے ساتھ پکائے ہوئے نہ ہوں' کیونکہ اگر زیتون کے یا تل کے تیل میں خوشبو ملی ہوگی یا اس میں خوشبودار پھول ڈال کر پکایا گیا ہوتو پھر سب ہی کے نزدیک اس کو استعمال کرنے کی وجہ سے دم واجب ہوگا۔اسی طرح یہ اختلاف اس صورت میں ہے جب کہ یہ تیل زیادہ مقدار میں لگائے جائیں اور اگر کم لگایا جائے تو متفقہ طور پر سب کے نزدیک اس کے استعمال کرنے سے صرف صدقہ واجب ہوگا۔

اور پھر ایک بات یہ جان لیجئے کہ ان تیلوں کے استعمال کی وجہ سے دم یا صدقہ اسی وقت واجب ہوگا جب کہ ان کو محض خوشبو کی خاطر استعمال کیا جائے اور اگر انہیں دوا کے طور پر استعمال کیا جائے گا تو پھر علی الاتفاق کچھ بھی واجب نہیں ہوگا۔ جب کہ مشک یا دوسری خوشبوؤں کے استعمال کا مسئلہ اس سے مختلف ہے کہ ان کے استعمال سے بہر صورت دم واجب ہوتا ہے خواہ بطور خوشبو استعمال ہوں خواہ بطور دوا۔

الفصل الثالث:

سلا ہوا کپڑا پہننا محرم کے لیے منع ہے

۲۶۹۲:وَعَنْ نَافِعٍ اَنَّ ابْنَ عُمَرَ وَجَدَ الْقُرَّفَقَالَ اَلْقِ عَلَیَّ ثَوْبًا یَا نَافِعُ فَاَلْقَیْتُ عَلَیْهِ بُرْنُسًا فَقَالَ تُلْقِی عَلَیَّ هٰذَا وَقَدْ نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَنْ یَّلْبِسَهُ الْمُحْرِمُ۔ (رواہ ابو داؤد)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۲/۴۱۳ الحدیث رقم ۱۸۲۸۔

ترجمہ:حضرت نافعؒ سے روایت ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نے سردی محسوس کی اور کہا کہ مجھ پر کپڑا ڈال دوا ے نافع! پس میں نے ان پر بارانی ڈال دی تو فرمایا تو مجھ پر یہ ڈالتا ہے اور تحقیق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا کہ اس کو محرم پہنے اس کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله : وجد القر فقال الق علی ثوبا** :''القر'': قاف کے ضمہ، نیز فتحہ کے ساتھ اور راء کی تشدید کے ساتھ، مطلقاً ٹھنڈ کو کہا جاتا ہے،اور بعض کا کہنا ہے کہ موسم شتاء کے ساتھ مخصوص ہے۔''ألق '':القاء مصدر سے امر کا صیغہ ہے۔

قوله :فقال:تلقی علی وقد نهی رسول الله ﷺ :کلمۂ استفہام محذوف ہے،اور استفہام انکاری ہے۔

حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ سلے ہوئے کپڑے کو اس طرح استعمال کرنا محرم کے لئے ممنوع ہے جس طرح اسے عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے بصورت دیگر ممنوع نہیں ہے مثلاً برساتی عام طور پر پہنی جاتی ہے۔اگر کوئی محرم اسے پہنے نہیں بلکہ ایسے ہی جسم پر ڈال لے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں جیسا کہ اس بارے میں پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے۔چنانچہ حضرت ابن عمرؓ نے برساتی کو اپنے جسم پر ڈال لینے سے بھی منع یا تو اس لئے فرمایا کہ وہ اپنے خیال کی بنا پر سلے ہوئے کپڑے کو مطلقاً کسی بھی استعمال کرنے سے اجتناب کرتے ہوں گے یا پھر یہ کہ نافعؒ نے ان کا سر بھی ڈھانک دیا ہوگا۔اس وجہ سے انہوں نے منع فرمایا۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں: **لبس المخیط** کا مطلب یہ ہے کہ سلائی کی وجہ سے سلا ہوا کپڑا جسم پر ٹھہر جائے۔چنانچہ جو بھی قید منتفی ہونے سے **لبس المخیط** منتفی ہو جائے گا۔چنانچہ اگر کسی شخص نے قباء کو اپنے شانوں پر ڈال لیا،لیکن بازو داخل نہیں کئے،یا طیلسان پہنا لیکن اس کے بٹن بند نہ کئے تو اس شخص پر کوئی شئ لازم نہیں،چونکہ ان صورتوں میں استمساک بنفسہ موجود نہیں ہے،چنانچہ اگر طیلسان یا

قباء کے بٹن بند کیے رہا ایک دن تو اس شخص پر دم واجب ہوگا، چونکہ خیاطت کے ساتھ ساتھ، گھنڈی/بٹن کی بنا پر ٹھہراؤ پایا جا رہا ہے، بخالف اس صورت کے اگر چادر کو گرہ لگالی، یا ازار کو کسی رسّی وغیرہ کے ذریعہ باندھ لیا تو ایسا کرنا مکروہ ہے۔ چونکہ اس ہیئت کے اختیار کرنے میں ''تشبه بالمخیط'' لازم آتا ہے۔لیکن اس شخص پر کوئی شیء بھی لازم نہیں ہوگی۔ چونکہ اشتمال بواسطہ الخیاط یہاں منتفی ہے اھ۔ابن عمر رضی اللہ عنہما کے کلام کا مطلب یہ ہوگا: **أتلقى هذا الإلقاء، والحال أنه ﷺ هى المحرم عن ستر الرأس وتغطية، والله تعالٰى أعلم۔**

حالت احرام میں سینگی لگوانا جائز ہے

۲۶۹۳: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ مَالِكِ ابْنِ بُحَيْنَةَ قَالَ احْتَجَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَهُوَ مُحْرِمٌ بِلَحْيِ جَمَلٍ مِنْ طَرِيْقِ مَكَّةَ فِي وَسَطِ رَأْسِهٖ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٥٠/٤۔ الحدیث رقم ١٨٣٦۔ ومسلم فی صحیحه ٨٦٢/٢ الحدیث رقم ١٨٣٦۔ ومسلم فی صحیحه ٨٦٢/٢ الحدیث رقم (٨٨۔ ١٢٠٣)۔ والنسائی فی السنن ١٩٤/٥ الحدیث رقم ٢٨٥٠۔ والدارمی ٥٧/٢ الحدیث رقم ١٨٢٠۔ ومالك فی الموطأ ٣٤٩/١ الحدیث رقم ٤٧ من کتاب الحج۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ مالک جو بحینہ کے بیٹے ہیں' ان سے روایت ہے' کہتے ہیں کہ سینگی کھنچوائی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے نے سر کے درمیان حالت احرام میں لحی جمل میں' مکہ کے راستے میں اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :**عبد الله بن مالك ابن بحينة:** مالک' حضرت عبداللہ کے باپ کا نام ہے اور بحینہ ان کی ماں کا نام ہے گویا ابن بحینہ' حضرت عبداللہ کی دوسری صفت ہے اسی لئے ''عبداللہ بن مالک ابن بحینہ'' میں مالک کو تنوین کے ساتھ پڑھتے ہیں اور ''ابن بحینہ'' میں الف لکھا جاتا ہے۔

قوله :**احتجم رسول الله ﷺ بلحی جمل من طریق مکة فی وسط ر أسه: "لحی"** :لام کے فتحہ، حاء کے سکون کے ساتھ، ایک جگہ کا نام ہے۔

''**وسط**'': آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سر کے بیچوں بیچ پچھنے لگوائے تو سر مبارک کے بال کچھ نہ کچھ ضرور ٹوٹے ہوں گے لہٰذا یہ حدیث ضرورت پر محمول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی عذر و ضرورت کی بناء پر سر میں پچھنے لگوائے تھے' چنانچہ اگر محرم کسی ایسی جگہ پچھنے لگوائے جہاں بال نہ ہوں تو اس پر فدیہ واجب نہیں ہوتا۔

ابن عمر اور امام مالکؒ سے مروی ہے کہ حالت احرام میں پچھنے لگوانا مکروہ ہے، اگر چہ قطع شعر کو متضمن نہ ہو۔ اور حسن بصریؒ سے مروی ہے کہ اس صورت میں فدیہ واجب ہے۔

احرام کی حالت میں پچھنے لگوانا

۲۶۹۴: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ احْتَجَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَهُوَ مُحْرِمٌ عَلٰى ظَهْرِ الْقَدَمِ مِنْ وَجْعٍ كَانَ بِهٖ۔

(رواه ابو داود والنسائی)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ٤١٨/٢ الحدیث رقم ١٨٣٧۔ والنسائی فی ١٩٤/٥ الحدیث رقم ٢٨٤٩۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سینگی کھنچوائی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم محرم تھے قدم کی پشت پر درد کی وجہ

سے اس کو ابوداؤد اور نسائیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: پیر کی پشت پر چونکہ بال نہیں ہوتے اور وہاں پچھنے لگوانے سے بال ٹوٹنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لئے اس حدیث میں کوئی اشکال نہیں ہے اور پھر یہ کہ آپ ﷺ نے ایک عذر یعنی درد کی وجہ سے یہ پچھنے لگوائے تھے۔

ممکن ہے کہ پچھنے لگوانے کے یہ دونوں واقعات ایک ہی احرام کے ہوں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں واقعات علیحدہ علیحدہ احرام میں پیش آئے ہو۔ واللہ تعالیٰ اَعلم۔ اس حدیث سے ابن عمر، امام مالک اور حسن بصری کے موقف کی تردید ہو رہی ہے۔

آپ ﷺ نے بغیر احرام کی حالت کے نکاح فرمایا

۲۶۹۵: وَعَنْ اَبِیْ رَافِعٍ قَالَ تَزَوَّجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَيْمُوْنَةَ وَهُوَ حَلَالٌ وَبَنٰى بِهَا وَهُوَ حَلَالٌ وَكُنْتُ اَنَا الرَّسُوْلُ بَيْنَهُمَا۔ (رواہ احمد والترمذی وقال ھذا حدیث حسن)

اخرجه الترمذی فی السنن ۲۰۰/۳ الحدیث رقم ۸۴۱۔ والدارمی فی ۵۹/۲ الحدیث رقم ۱۸۲۵ واحمد فی المسند ۳۳۳/۶۔

ترجمہ: ابورافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے میمونہ رضی اللہ عنہا سے اس وقت نکاح کیا جب کہ آپ ﷺ بغیر احرام کے تھے اور ان کے ساتھ شب زفاف گزاری اس وقت بھی آپ ﷺ احرام کی حالت میں نہ تھے اور میں حضور ﷺ اور میمونہ رضی اللہ عنہا کے درمیان پیغام پہنچانے والا تھا۔ اس کو امام احمدؒ اور ترمذی کے نقل کیا ہے اور امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔

تشریح: قولہ :بنی بھا: ''زفاف'' سے کنایہ ہے۔

عرض مرتب: اس حدیث پر سیر حاصل بحث ماقبل میں گزر چکی ہے، ملاحظہ فرمائیے حدیث: ۲۶۸۲۔

بَابُ الْمُحْرِمِ يَجْتَنِبُ الصَّيْدَ

محرم کے لئے شکار کی ممانعت کا بیان

لفظ باب کو ساکن علی الوقف بھی پڑھ سکتے ہیں۔ اور ''ھو'' مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی بناء پر مرفوع بھی پڑھ سکتے ہیں، اور یہ احتمال بھی ہے کہ اضافت کے ساتھ ہو۔

متفقہ طور پر تمام علماء کے نزدیک شکار یا شکار میں کسی کی اعانت محرم کے لئے حرام ہے۔ چنانچہ کسی شکار کے جانور کو قتل کرنے یا اس کے قتل میں اعانت کرنے سے محرم پر جزا لازم آتی ہے۔

شکار کی جزاء یا کفارہ:

شکار کی وجہ سے محرم پر جو جزاء یا کفارہ لازم ہوتا ہے اس سے مراد وہ قیمت ہے جو دو عادل و تجربہ کار شخص اس شکار کی تجویز کریں اور یہ قیمت یا تو اس مقام کے اعتبار سے ہو جہاں وہ شکار مارا گیا ہے یا اگر اس مقام پر کوئی قیمت نہ ہو تو اس مقام کے اعتبار سے ہو جو شکار کے مقام سے قریب تر ہو کیونکہ ایک چیز کی قیمت مختلف مقامات کے اعتبار سے بدل جاتی ہے۔ اس قیمت سے غلہ خرید کر ہر فقیر کو اگر گیہوں

ہوں تو نصف نصف صاع اور اگر جو یا کھجور ہو تو ایک ایک صاع تقسیم کر دے کسی فقیر کو اس تعداد سے کم نہ دے اور چاہے ہر فقیر کی تعداد صدقہ (یعنی نصف گیہوں یا ایک صاع جو) کے عوض ایک ایک روزہ رکھ لے۔

اگر کوئی محرم کسی شکار کو زخمی کر دے اور وہ اس زخم سے مرے نہیں یا شکار کے بال اکھاڑ ڈالے یا اس کا کوئی عضو توڑ دے تو اس شکار کی حالت صحت کی قیمت میں اس کی وجہ سے جس قدر کمی آ گئی ہو وہ اس محرم کو دینا چاہئے۔

اگر کوئی محرم کسی شکار کے ہاتھ پیر کاٹ دے یا اس کے پر نوچ اکھاڑ دے کہ جس کی وجہ سے وہ اپنی حفاظت سے معذور ہو جائے تو اس شکار کی پوری قیمت دینا پڑے گی اور اس کا دودھ دوہے تو اس دودھ کی قیمت اس پر واجب ہوگی اسی طرح اگر اس کا انڈا توڑ دے تو اس کی قیمت دینی پڑے گی۔

محرم شکار کھائے یا نہ کھائے؟ اس بارے میں تفصیل ہے اس بات میں تو بالاتفاق تمام علماء کا مسلک یہ ہے کہ اگر کوئی محرم خود شکار کرے یا کوئی دوسرا محرم شکار کرے تو وہ شکار کھانا محرم کے لئے حرام ہے ہاں اگر صورت یہ ہو کہ کوئی غیر محرم اپنے لئے شکار کرے یا محرم کے لئے اس کی اجازت سے یا اس کی اجازت کے بغیر شکار کرے تو اس کے کھانے کے بارے میں علماء کے مختلف اقوال و مسلک ہیں چنانچہ بعض صحابہ و تابعین کہ جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی ہیں کا قول تو یہ ہے کہ محرم کے لئے مطلق شکار کھانا حرام ہے ان کی دلیل حضرت صعب بن جثامہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جو اس باب کی پہلی حدیث ہے۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا مسلک یہ ہے کہ اگر محرم خود شکار کرے یا کوئی دوسرا شخص اس کے لئے یا اس کی اجازت سے یا اس کی اجازت کے بغیر شکار کرے تو اس کے لئے اس شکار کو کھانا حرام ہے۔ ہاں اگر کوئی غیر محرم اپنے لئے شکار کرے اور اس میں سے کچھ بطور ہدیہ محرم کو بھیجے تو اس کا کھانا اس کے لئے حلال ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ اور ان کے متبعین علماء کا مسلک یہ ہے کہ محرم کے لئے شکار کا گوشت کھانا حلال ہے خواہ وہ شکار اس کے لئے ہی کیوں نہ کیا گیا ہو بشرطیکہ وہ شکار نہ تو اس نے خود کیا ہو نہ اس شکار کرنے کا کسی کو حکم دیا ہو نہ اس شکار کی راہ کسی کو دکھائی ہو نہ اس شکار کی طرف کسی کو متوجہ کیا ہو اور نہ اس شکار میں خود اس نے یا کسی اور محرم نے اعانت کی ہو۔ حنفیہ کی دلیل حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔

شکار سے کونسے جانور مراد ہیں؟

محرم کے لئے جس شکار کی ممانعت ہے اس سے مراد جنگلی شکار کو قتل کرنا ہے۔ جنگلی ان جانوروں کو کہتے ہیں جن کا توالد و تناسل خشکی یا جنگل میں ہوتا ہو گو ان کی بود و باش پانی میں ہو جیسے مرغابی وغیرہ۔ اسی طرح شکار اس جانور کو کہتے ہیں جو اصل خلقت میں وحشی ہو خواہ وہ کسی وجہ سے مانوس ہو گیا ہو جیسے ہرن کہ وہ پالنے والے سے مانوس ہو جاتا ہے مگر چونکہ وہ دراصل وحشی ہے اس لئے شکار کہلائے گا۔ خواہ وہ جنگل میں رہتا ہو یا پلا ہوا ہو بہرصورت اس کا شکار کرنے سے جزا واجب ہوگی۔ جو جانور دراصل وحشی نہ ہو اس کا ذبح کرنا حالت احرام میں بھی جائز ہے چنانچہ بکری، دنبہ، بھیڑ، گائے، اونٹ اور گھر کی پلی ہوئی بطخ کو ذبح کرنا محرم کے لئے جائز ہے۔ کبوتر کو فقہاء نے وحشی الاصل قرار دیا ہے اس لئے اس کے شکار پر جزا واجب ہوتی ہے۔ دریائی جانوروں کا شکار آیت کریمہ: ﴿أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ﴾[المائدة:٩٦] کے پیش نظر محرم اور غیر محرم دونوں کے لئے حلال ہے خواہ وہ جانور کھائے جانے والے ہوں یا کھائے جانے والے نہ ہوں۔

جو جنگلی جانور کھائے جاتے ہیں ان کا شکار تو متفقہ طور پر حرام ہے ہاں جو جانور کھائے نہیں جاتے ان کی صاحب بدائع نے دو قسمیں کی ہیں ایک قسم تو ان جانوروں کی ہے جو طبعاً ایذا پہنچاتے ہیں اور اکثر و بیشتر ایذا پہنچانے میں خود ابتدا کرتے ہیں جیسے شیر، چیتا اور بھیڑیا چنانچہ ان جانوروں کو قتل کرنا محرم کے لئے جائز ہے اور ان کو قتل کرنے سے محرم پر جزا واجب نہیں ہوتی۔ دوسری قسم ان جانوروں کی ہے جو

ایذا پہنچانے میں ابتدا نہیں کرتے جیسے بجو (شکرہ کی ایک قسم وغیرہ) ایسے جانوروں کے بارے میں یہ مسئلہ ہے کہ اگر یہ جانور محرم پر پہلے حملہ کریں تو وہ ان کو مار سکتا ہے اور اس کی وجہ سے اس پر جزاء واجب نہیں ہوگی اور اگر وہ حملہ نہ کریں تو پھر محرم کے لئے یہ مباح نہیں ہے کہ وہ ان کو مارنے میں ابتدا کرے اگر ابتدا کرے گا تو اس پر جزا واجب ہوگی۔

الفصل الاول:

احرام کی حالت میں گورخر کا ہدیہ قبول نہ کرنا

۲۶۹۶: عَنِ الصَّعْبِ بْنِ جُثَّامَةَ اَنَّهٗ اَهْدٰی لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ حِمَارًا وَحْشِيًّا وَهُوَ بِالْاَبْوَاءِ اَوْ بِوَدَّانَ فَرَدَّ عَلَيْهِ فَلَمَّا رَاٰى مَا فِيْ وَجْهِهٖ قَالَ اِنَّا لَمْ نَرُدَّهٗ عَلَيْكَ اِلَّا اَنَّا حُرُمٌ۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۱/٤۔ الحدیث رقم ۱۸۲۵۔ ومسلم فی ۸۵۰/۲ الحدیث رقم (۵۰۔ ۱۱۹۳)۔ والترمذی فی السنن ۲۰۶/۳ الحدیث رقم ۸٤۹۔ والنسائی فی ۱۸۳/۵ الحدیث رقم ۲۸۱۹۔ وابن ماجه فی ۱۰۳۲/۲ الحدیث رقم ۳۰۹۰ والدارمی فی ۶۰/۲ الحدیث رقم ۱۸۳۰۔ ومالك فی الموطأ ۳۵۳/۱ الحدیث رقم ۸۳ من کتاب الحج۔ واحمد فی المسند ۳۷/٤۔

ترجمہ: حضرت صعب بن جثامہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کے پاس بطریق تحفہ گورخر بھیجا حالانکہ اس وقت آپ ﷺ مقام ابواء یا ودان میں تھے۔ پس نبی کریم ﷺ نے ان پر پھیر دیا۔ پس جب کہ حضور ﷺ نے وہ چیز دیکھی کہ جو اس کے چہرے پر تھی یعنی قبول نہ کرنے کی وجہ سے آپ ﷺ نے ناخوشی اور غم کو محسوس کیا۔ ارشاد فرمایا ہم نے واپس نہیں کیا مگر یہ کہ ہم احرام کی حالت میں تھے۔ اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

الصعب بن جثامة ۔ یہ صعب بن جثامہ ''لیثی'' ہیں' ودان اور ابواء میں جو کہ سرزمین حجاز میں واقع ہے ان کا قیام تھا۔ ان کی حدیث بھی اہل حجاز ہی میں پائی جاتی ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ سے روایت کرتے ہیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں انتقال ہوا۔ ''جثامہ'' جیم کے زبر اور ثائے مثلثہ کی تشدید کے ساتھ ہے۔

تشریح: أبواء: ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ مدینہ سے دس فرسخ کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ ایک قدیم راستہ تھا، نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام کا سفر بھی اسی راستہ پر ہوتا تھا، لیکن آج کل ان راستوں پر سفر متروک ہے۔ یہ دونوں راستے جحفہ کے قریب جدا ہو جاتے ہیں اور مدینہ کے قریب اکھٹے ہوتے ہیں۔

ودان: دال مہملہ کی تشدید کے ساتھ ہے، اَبواء سے ۸ میل کے فاصلہ پر ایک بہت بڑی بستی تھی۔ ابواء اور جحفہ کے درمیان واقع ہے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں یہ دونوں جگہیں مکہ و مدینہ کے درمیان میں واقع ہیں۔

لم نردہ: دال مشددہ کے فتحہ نیز ضمہ کے ساتھ بمعنی ''صید''

حرم: پہلے دونوں حرفوں پر ضمہ ہے۔ بمعنی ''محرمین'' حرم، حرام کی جمع ہے۔ حج کا احرام باندھنے والے کو ''حرام'' کہا جاتا ہے۔

واضح رہے کہ اس واقعہ کے بارے میں وارد روایات کے الفاظ میں شدید اختلاف ہے چنانچہ ایک روایت میں وضاحت کے ساتھ یہ منقول ہے کہ گورخر کا گوشت بھیجا گیا تھا' ایک روایت میں یہ بتایا گیا ہے کہ گورخر کی ران بھیجی گئی تھی' اسی طرح ایک روایت یہ بتاتی ہے کہ اس کا ایک ٹکڑا بھیجا گیا تھا۔

لہٰذا ان روایتوں کے پیش نظر یہ معلوم ہوتا ہے کہ زندہ گورخر نہیں بھیجا گیا تھا بلکہ یہاں حدیث میں بھی گورخر سے اس کا گوشت ہی مراد ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں زندہ گورخر ہی بھیجا گیا ہوگا جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول نہیں کیا' پھر بعد میں دوسرے گورخر کی ران بھیجی گئی اسی کو کسی نے تو گوشت سے تعبیر کیا اور کسی نے اسے اس کا ٹکڑا کہا۔

ابن حجرؒ ان روایات میں تطبیق دیتے ہوئے فرماتے ہیں: **فروایة لحمه: أی بعضه ورجله أی مع العجز وهو الشق المذكور في الأخرى، ورواية: عضو هو الرجل وما اتصل بها، فاجتمعت الروايات**۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ محرم کیلئے زندہ شکار قبول کرنا جائز نہیں، اگر چہ اس کا گوشت قبول کرنا جائز ہے اور کہا گیا ہے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت اقدس میں حمار وحشی کا گوشت پیش کیا گیا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ گورخر اس گمان کی بنا پر واپس کر دیا تھا کہ وہ بطور خاص آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کیلئے شکار کیا گیا تھا۔ چنانچہ اس کی تائید ابوقتادہ اور حضرت جابرؓ کی احادیث سے بھی ہوتی ہے اھ۔ ان دونوں روایتوں پر کلام عنقریب آئے گا۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں: مسلم کی روایت میں ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حمار وحشی کا گوشت ہدیہ کیا گیا، ایک روایت میں ہے حمار وحشی کی ٹانگ ہدیہ کی گئی، ایک روایت میں عجز حمار کے الفاظ ہیں، اور ایک میں ہے کہ ''شق حمار'' بطور ہدیہ لائی گئی۔ اس صورت حال کا تقاضا یہ ہے کہ محرم کیلئے شکار کا گوشت مطلقاً حرام ہے، خواہ شکار اس کیلئے ہو، خواہ اس کے حکم سے کیا گیا ہو، خواہ کچھ بھی ہو۔ سلف کی ایک جماعت کا یہی مذہب ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اسی کے قائل تھے۔

ہمارا مذہب ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے موافق ہے: حضرت عمر، ابو ہریرہ، طلحہ بن عبید اللہ اور حضرت عائشہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ ان حضرات کا یہ مذہب امام طحاویؒ نے نقل کیا ہے۔ ابن عباس، طاؤس اور ثوری رحمہم اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ اور شافعیہ کا مذہب وہ ہے کہ جس کی تصریح ابوقتادہؓ کی روایت میں آرہی ہے: **انه يحرم، ويكون ميتة إن صاده و صيدله، أودل أو أعان عليه أو أشار إليه**۔ فرماتے ہیں: ان کا زعم یہ ہے کہ حدیث صعب کا تعلق حجۃ الوداع سے ہے۔ لہٰذا یہ حدیث ابوقتادہ کی اگلی حدیث کیلئے ناسخ ہے۔ لیکن ان کا یہ زعم درست نہیں۔ چونکہ نسخ کی ایک شرط یہ ہے کہ جمع متعذر رہو، اور ہدیہ کو رد کرنے کی علت یہ تھی کہ وہ حالت احرام میں تھے۔ اور آپ کا گمان یہ تھا کہ یہ شکار خصوصی طور پر آپ کیلئے کیا گیا ہے۔ حدیث ابوقتادہ میں آرہا ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کے شکار کا گوشت ایک مرتبہ تناول فرمایا ہے، اور ایک مرتبہ تناول نہیں فرمایا، اگر یہ صحیح ہے تو..... نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے یہ بھی صحیح طور پر ثابت ہے کہ آپ حالت احرام میں مقام عرج پر تشریف لائے آپ کی خدمت میں ''حمار عقیرۃ'' پیش کیا گیا تو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ابوبکرؓ کو حکم دیا کہ رفقاء میں تقسیم کر دیں اور یہ بھی صحیح طور پر ثابت ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے مسئلہ پوچھا گیا کہ اس شکار کے گوشت کے بارے میں کیا فرماتے ہیں کہ جس کو کسی حلال نے شکار کیا ہو؟ تو آپ نے اس کی حلت کا فتویٰ صادر فرمایا، پھر حضرت عمرؓ کو بتایا گیا تو انہوں نے فرمایا: **أفتية بغير ذلك لأوجعتك!؟**

حنیفہ کا استدلال

۲۶۹۷: وَعَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ اَنَّهٗ خَرَجَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَتَخَلَّفَ مَعَ بَعْضِ اَصْحَابِهٖ وَهُمْ مُحْرِمُوْنَ وَهُوَ غَيْرُ مُحْرِمٍ فَرَأَوْ حِمَارًا وَحْشِيًّا قَبْلَ اَنْ يَرَاهُ فَلَمَّا رَاَوْهُ تَرَكُوْهُ حَتّٰى رَاٰهُ اَبُوْقَتَادَةَ فَرَكِبَ فَرَسًا لَهٗ فَسَاَلَهُمْ اَنْ يُنَاوِلُوْهُ سَوْطَهٗ فَاَبَوْا فَتَنَاوَلَهٗ فَحَمَلَ عَلَيْهِ فَعَقَرَهٗ ثُمَّ اَكَلَ فَاَكَلُوْا فَنَدِمُوْا فَلَمَّا اَدْرَكُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ

ﷺ سألُوْهُ قَالَ هَلْ مَعَكُمْ مِنْهُ شَيْءٌ قَا لُوْا مَعَنَا رِجْلُهُ فَاَخَذَهَا النَّبِيُّ ﷺ فَاَكَلَهَا (متفق عليه وفي رواية لهما) فَلَمَّا اَتَوْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اَمِنْكُمْ اَحَدٌ اَمَرَهُ اَنْ يَحْمِلَ عَلَيْهَا اَوْ اَشَا رَ اِلَيْهَا قَا لُوْا لَا قَالَ فَكُلُوْا مَا بَقِيَ مِنْ لَحْمِهَا)

اخرجه البخاري في صحيحح ٢٩/٤ـ الحديث رقم ١٨٢٤ـ ومسلم في صحيحه ٨٥١/٢ الحديث رقم (٥٦ـ ١١٩٦)ـ وابوداؤد في السنن ٤٢٨/٢ الحديث رقم ١٨٥٢ـ والترمذي في ٢٠٤/٣ الحديث رقم ٨٤٧ـ والنسائي في ١٨٢/٥ الحديث رقم ٢٨١٦ وابن ماجه في ١٠٣٣/٢ الحديث رقم ٣٠٩٢ـ ومالك في الموطأ ٣٥٠/١ الحديث رقم ٧٦ من كتاب الحج۔

ترجمہ: حضرت ابوقتادہؓ سے روایت ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ (حدیبیہ کے سال) نکلے پس وہ اپنے بعض دوستوں سے پیچھے رہ گئے اور ان کے دوست محرم تھے اور ابوقتادہ غیر محرم تھے پس ان کے دوستوں نے گورخر کو ان کے دیکھنے سے پہلے دیکھا پس جب ان کے دوستوں نے دیکھا تو چھوڑ دیا یہاں تک کہ اس کو ابوقتادہ نے دیکھا پس وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے پھر اپنے دوستوں سے اپنا کوڑا مانگا' مگر انہوں نے کوڑا دینے سے انکار کر دیا' پھر ابوقتادہ نے کوڑا لیا یعنی گھوڑے سے اتر کر پھر گورخر پر حملہ کیا پس اس کو مارا اور کھایا اور ساتھ والوں نے بھی کھایا پھر اس کی وجہ سے پریشان ہوئے کہ محرم کو مطلقاً شکار درست نہیں ہے پس جب حضور ﷺ سے ملاقات ہوئی۔ تو اس کا حکم پوچھا۔ کہ آیا اس کا کھانا ہمارے لیے درست تھا یا نہیں؟ فرمایا کہ کیا تمہارے پاس اس میں سے کچھ ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہمارے پاس اس کا پاؤں ہے پس اس کو نبی کریم ﷺ نے لیا اور کھایا۔ اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے اور ایک روایت ان دونوں میں سے یہ ہے کہ جب وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا تم میں سے کسی نے ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کو حکم کیا تھا یہ کہ گورخر پر حملہ کرے یا اس کی طرف اشارہ کیا تھا؟ انہوں نے کہا نہیں پس آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کھاؤ' جو اس کے گوشت میں سے باقی ہے۔

تشریح: **وهم محرمون وهو غير محرم**: مالکی کی روایت میں یوں ہے: **أحرموا كلهم إلا أبو قتادة لم يحرم،** واضح رہے کہ "ابوقتادہ" مبتدا ہے، اور "ولم یحرم" اس کی خبر ہے، اور "إلا" بمعنی "لکن" ہے۔ اس کی نظیر یہ آیت کریمہ ہے: ﴿**ولا يلتفت منكم أحد إلا امرأتك**﴾ ابو کثیر اور ابوعمر کی روایت رفع کے ساتھ ہے۔ "أمرأتك" / "أحد" سے "بدل" قرار دینا صحیح نہیں۔ چونکہ وہ ان کے ساتھ جانے والوں میں سے نہیں تھی۔ جیسا کہ قراءت نصب اس پر دلالت کر رہی ہے۔

اس حدیث کے بارے میں ایک اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہاں تو بتایا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس گورخر میں سے بچا ہوا پاؤں تیار کرا کر کھایا جب کہ ایک دوسری روایت میں یہ۔ ہے کہ آپ ﷺ نے اسے کھایا نہیں؟ لہٰذا اس اشکال کو دور کرنے کے لئے علماء ان دونوں روایتوں میں یہ مطابقت پیدا کرتے ہیں کہ آپ ﷺ خود چونکہ حالت احرام میں تھے اس لئے ابتدا میں آپ ﷺ نے یہ گمان کیا ہوگا کہ اس گورخر کے شکار میں کسی محرم کے حکم یا اس کی اعانت کو دخل رہا گا اس لئے آپ ﷺ نے اسے کھانے سے انکار کر دیا ہوگا مگر جب صحیح صورت حال سامنے آ گئی اور آپ ﷺ کو معلوم ہو گیا کہ اس کے شکار میں کسی محرم کے حکم یا اس کی اعانت کا کوئی دخل نہیں تھا تو آپ ﷺ نے اسے کھایا۔

محرم کے لئے جس طرح یہ ممنوع ہے کہ وہ شکار کے لئے کسی کو حکم دے اسی طرح دلالت اور اشارہ بھی ممنوع ہے' دلالت اور اشارہ

میں فرق یہ ہے کہ دلالت کا تعلق زبان سے ہوتا ہے اور اشارے کا تعلق اعضاء سے گے مثلاً محرم کو کسی ہاتھ سے اشارہ سے شکار کی طرف متوجہ کرے! بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ دلالت کا تعلق اس شکار سے ہوتا ہے جو نظر کے سامنے نہ ہو اور اشارہ کا تعلق اس شکار سے ہوتا ہے جو نظر کے سامنے ہو۔

اس موقع پر یہ بات جان لیجئے کہ محرم کے لئے تو دلالت حدودِ حرم میں بھی حرام ہے اور حدود حرم سے باہر بھی لیکن غیر محرم کے لئے حدود حرم میں تو حرام ہے اور حدود حرم سے باہر حرام نہیں ہے۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ محرم کو شکار کا گوشت کھانا حلال ہے بشرطیکہ وہ شکار نہ تو خود اس نے کیا ہو اور نہ اس شکار میں اس کی دلالت اشارت اور اعانت کا قطعاً دخل ہو۔ چنانچہ یہ حدیث حنفیہ کے اس مسلک کی دلیل ہے اور ان حضرات کے مسلک کی تردید کرتی ہے جو محرم کو شکار کا گوشت کھانے سے منع کرتے ہیں۔

فأخذها النبی ﷺ فاكلها: اس میں اشارہ ہے، **الجواب بالفعل أقوى من القول**۔ اور ایک صحیح روایت میں ہے: **انه عليه الصلوٰة والسلام لم يأكل منه**۔ تو یہ اس احتمال کے منافی نہیں کہ ابوقتادہ کو اس سفر میں یہ واقعہ دو مرتبہ پیش آیا ہو۔

أو أشار اليها: بعض کا کہنا ہے کہ اشارہ و دلالت دونوں ہم معنی ہیں۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں: اصحاب صحاح ستہ نے حضرت ابوقتادہ سے روایت نقل کی ہے کہ صحابہ کرام سفر میں تھے، ان میں سے بعض محرم تھے اور بعض غیر محرم تھے۔ ابوقتادہ فرماتے ہیں میں نے ایک حمار وحشی دیکھا پس میں گھوڑے پر سوار ہوا اور اپنا نیزہ پکڑا، اور سا اپنے ساتھویوں سے مدد طلب کی، پس انہوں نے مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ پس میں نے کسی سے کوڑا چھین لیا، اور حمار وحشی کو مارا، اور اسے شکار کر لیا، تو سب نے اس کا گوشت کھایا، اور کچھ بچا لیا۔ صحابہ کہتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے اس شکار کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا پوچھا کہ کیا تم نے اس کو حکم دیا تھا کہ اس پر حملہ کرے، یا کسی نے اشارہ کیا تھا؟ انہوں نے عرض کیا نہیں۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **فكلوا مابقى من لحمها** اور مسلم کی روایت میں ہے کہ: **هل اشرتم، هل اعنتم؟ قالوا: لا۔ قال فكلوا** اھ اور ایک روایت میں ہے کہ صحابہ کرام نے اس حمار کو دیکھا تو ہنس پڑے۔ پس انہوں نے بھی اس کو دیکھ لیا اور اپنے ساتھیوں سے مدد طلب کی، انہوں نے مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ دوسری روایت میں ہے کہ ابوقتادہ نے صحابہ کرام کو دیکھا کہ وہ کسی چیز کی طرف دیکھ رہے ہیں، پس آپ نے بھی اس کی طرف دیکھا تو حمار وحشی تھا۔ تو ان کے ہاتھ سے کوڑا گر گیا، پس ساتھیوں نے کہا کہ اس سلسلہ میں ہم تمہاری کچھ بھی مدد نہیں کریں گے۔ چونکہ ہم محرم ہیں۔ دوسری روایت میں ہے کہ پس انہوں نے حمار وحشی کو دیکھا اور میں مشغول تھا اور اپنے جوتے کے تسمے باندھ رہا تھا پس انہوں نے مجھے خبر نہ دی۔ اور میری خواہش تھی کہ کاش میں اسے دیکھ لیتا۔ پس میں پلٹا تو میں نے اسے دیکھ لیا۔ پس میں نے کہا مجھ کو میرا کوڑا اور نیزہ پکڑا دو، تو ساتھیوں نے کہا کہ اللہ کی قسم ہم اس مسئلہ میں تیری کچھ بھی مدد نہ کریں گے۔

یہ تمام کی تمام روایات بالکل صحیح ہیں، ان سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ صحابہ کے ہنسنے اور دیکھنے کا یہ مقصد نہیں تھا کہ وہ شکار سے آگاہ کریں ان حضرات کا ارادہ اعلام صید کا نہیں تھا، وگرنہ تو حرام ہوتا۔ شرح المهذب میں لکھا کہ دلالت ظاہرہ اور خفیہ کے درمیان فرق کا نہ ہونا متفق علیہ ہے۔

احرام کی حالت میں موذی جانوروں کو مارنا گناہ نہیں ہے

۲۶۹۸: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ خَمْسٌ لَا جُنَاحَ عَلَى مَنْ قَتَلَهُنَّ فِي الْحَرَمِ وَالْإِحْرَامِ الْفَارَةُ وَالْغُرَابُ وَالْحِدَأَةُ وَالْعَقْرَبُ وَالْكَلْبُ الْعَقُوْرُ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۵۵/٦۔ الحدیث رقم ۳۳۱۵۔ ومسلم فی ۸۵۷/۲ الحدیث رقم (۷۲۔ ۱۱۹۹)۔
وابوداؤد فی السنن ٤٢٤/٢ الحدیث رقم ١٨٤٦۔ والنسائی فی ١٨٧/٥ الحدیث رقم ٢٨٢٨۔ وابن ماجه ١٠٣١/٢
الحدیث رقم ٣٠٨٨۔ ومالك فی الموطأ ٣٥٦/١ الحدیث رقم ٨٩ من کتاب الحج واحمد فی المسند ٨/٢۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا پانچ جانوں کو حرم میں مارنا گناہ نہیں ہے نہ احرام کی حالت میں چوہا اور کوا اور چیل اور بچھو اور کاٹنے والا کتا۔ اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: خمس: ایک روایت میں ''**خمس من الدواب**'' کے الفاظ ہیں، **الفأرة**: ہمزہ کے ساتھ نیز ابدال کے ساتھ بھی۔
الغراب: ایک روایت میں ''**الأبقع الأبلق**'' کے الفاظ ہیں۔ **الحدأة**: بروزن عنبۃ۔ بعض محققین فرماتے ہیں: **حدأة** حائے مہملہ کے کسرہ کے ساتھ اور اسی طرح **الحدأ**، اور کبھی فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے۔ مشہور و معروف پرندہ ہے۔ اور ''**الحدیا**'' مصغر ہے **الحدأ** کی یا ''**حدأة**'' کی۔ یائے تصغیر کے بعد واقع ہونے والے ہمزہ کو یاء سے بدل کر، یاء کا ہاء میں ادغام کر دیا گیا، **حدیة** ہو گیا۔ پھر تاء کو حذف کر دیا گیا اور اس کے عوض میں الف لے آئے تا کہ وہ دلدلت کے معنی پر بھی دلالت کرے۔

الغراب (کوا) سے مراد الغراب الابقع (ابلق کوا) یعنی وہ سیاہ سفید کوا ہے جو اکثر مردار اور نجاسات کھاتا ہے۔ چنانچہ اگلی روایت میں اس کی وضاحت بھی ہے اس لئے وہ کوا مارنا جائز نہیں ہے جو کھیت کھلیان کھاتا ہے اور جس کے پورے جسم کا رنگ تو سیاہ اور چونچ و پاؤں کا رنگ سرخ ہوتا ہے۔

کٹ کھنے کتے کے حکم میں وہ تمام درندے جانور شامل ہیں جو حملہ آور ہوتے ہیں ایسے تمام جانوروں کو حرم میں اور احرام کی حالت میں مارنا جائز ہے۔

تخریج: اس روایت کو ابن ہمامؒ نے صحیحین کے حوالہ سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے: **خمس من الدواب لیس علی المحرم فی قتلهن جناح، العقرب، والفأرة، والکلب العقور، والغراب، والحدأة** اھ۔ اور یہ بھی صحیح ہے: **أمر رسول الله ﷺ بقتل الوزغ وسّماه فویسقا**۔

موذی جانوروں کو مارنے کا حکم

۲٦۹۹: عَنْ عَائِشَةَ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ خَمْسٌ فَوَاسِقُ یُقْتَلْنَ فِی الْحِلِّ وَالْحَرَمِ اَلْحَیَّةُ وَالْغُرَابُ الْاَبْقَعُ وَالْفَارَةُ وَالْکَلْبُ الْعَقُوْرُ وَالْحُدَیَّا۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۵۵/٦۔ الحدیث رقم ۳۳۱٤۔ ومسلم فی ۸۵٦/۲ الحدیث رقم (٦٦۔ ۱۱۹۸)۔
والترمذی فی السنن ۱۹۷/۳ الحدیث رقم ۸۳۷۔ والنسائی فی ۱۸۸/٥ الحدیث رقم ۲۸۲۹۔ وابن ماجه فی ۳۱/۲۔
الحدیث رقم ۳۰۸۷۔ واحمد فی المسند ١٦٤/٦۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پانچ موذی جانور حل میں بھی مارے جائیں اور حرم میں بھی مارے جائیں یعنی مارنے والا بغیر احرام کے ہو یا احرام باندھے ہوئے ہو۔ سانپ، سیاہ و سفید کوا، چوہا، کاٹنے والا کتا اور چیل۔ اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **خمس فواسق**: **خمس** تنوین کے ساتھ ہے، مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور صفت ہے ''خمس'' کی نیز غیر منصرف ہے۔ چنانچہ ابن حجرؒ کا اس کو منون قرار دینا خطا ہے اور اس کو منصوب علی الذم پڑھنا بھی درست نہیں خلاف روایت ہے اور ضعف

درایت بھی لازم آتا ہے۔اور مبتدا کی خبر یقتلن ہے۔علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: خمس کو اضافت کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔مفتاح میں لکھتے ہیں: **الأول هو الصحيح۔ الحديا:** حدأ کی تصغیر ہے۔اس کا واحد "حدأة" آتا ہے، اور حدأۃ کی تصغیر حدیاۃ آتی ہے۔

عرضِ مرتب: اس کتے کو مارنا حرام ہے جس سے فائدہ حاصل ہوتا ہے' اسی طرح اس کتے کو بھی مارنا حرام ہے جس سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوتا ہو تو اس سے کوئی ضرر ونقصان بھی نہ پہنچتا ہو۔

مذکورہ بالا دونوں حدیثوں میں جن جانوروں کا ذکر کیا گیا ہے مارنے کی اجازت صرف انہیں پر منحصر نہیں ہے بلکہ یہی حکم ان تمام جانوروں کا بھی ہے جن سے ایذا پہنچتی ہو جیسے چیونٹی' پسو' چچڑی اور کھٹمل وغیرہ۔ ہاں اگر جوئیں ماری جائیں گی تو پھر حسب استطاعت و توفیق صدقہ دینا واجب ہوگا۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں: صحیحین کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: **خمس من الفواسق يقتلن فى الحل والحرم: الغرب والحدأة والعقرب والفارة والكلب العقوى۔** اور مسلم کی ایک روایت میں حیة کے بجائے عقرب کے الفاظ ہیں نیز "**الغراب الا بقع**" کے الفاظ ہیں۔

الفصل الثانی:

محرم کو شکار کرنے کا ممانعت

۲۷۰۰: وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَحْمُ الصَّيْدِ لَكُمْ فِي الْاِحْرَامِ حَلَالٌ مَالَمْ تَصِيْدُوْهُ اَوْ يُصَادُ لَكُمْ۔ (رواه ابو داود والترمذی والنسائی)

اخرجه ابوداؤد فى السنن ۴۲۷/۲ الحديث رقم ۱۸۵۱۔ والترمذی فى ۱۰۳/۳ الحديث رقم ۸۴۶۔ والنسائى فى ۱۸۷/۵ الحديث رقم ۲۷۲۸۔ والدارقطنى فى ۲۹۰/۲ الحديث رقم ۲۴۳ من باب المواقيت۔ واحمد فى المسند ۳۶۲/۳۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا شکار کا گوشت تمہارے حلال ہے جب تک تم نے شکار نہ کیا ہو یا تمہارے لیے نہ کیا گیا ہو۔اس کو ابوداؤدؒ اور نسائی اور ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: او یصادلکم: اس کو مرفوع و منصوب دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: بظاہر مجزوم ہے، اور غایت توجیہ یہ ہے کہ یہ عطف علی المعنی ہے، ای: **مالم تصيدوه أو يصادلكم** اھ ہمارے بعض علماء فرماتے ہیں کہ أن مضمر ہے، چنانچہ منصوب ہے، اور "او" بمعنی "إلا" ہے۔گویا عبارت یوں ہے: **لحم صيد ذبحه حلال ميں غير دلدلة المحرم وإعانته حلال لكم، إلا أن يصاد لأجلكم۔**

حدیث کا حاصل یہ ہوا کہ اگر حالت احرام میں تم خود شکار کرو گے یا کوئی دوسرا تمہارے لئے شکار کرے گا' اگرچہ وہ شکاری حالت احرام میں نہ ہو تو اس شکار کا گوشت کھانا تمہارے لئے درست نہیں ہوگا۔امام مالکؒ اور امام شافعیؒ اس حدیث کو اپنے اس مسلک کی دلیل قرار دیتے ہیں کہ محرم کے لئے اس شکار کا گوشت کھانا حرام ہے جسے کسی غیر محرم نے اس کے لئے شکار کیا ہو۔

لیکن حنفیہ اس حدیث کے یہ معنی مراد لیتے ہیں کہ اگر حالت احرام میں زندہ شکار تمہارے لئے بطور تحفہ بھیجا جائے تو اس کا گوشت کھانا تمہارے لئے حرام ہوگا۔ ہاں اگر اس شکار کا گوشت تحفہ کے طور پر تمہارے پاس بھیجا جائے اس کا کھانا حرام نہیں ہوگا۔گویا اس

صورت میں حدیث کا حاصل یہ ہوگا کہ اگر تمہارے حکم کی بنا پر کوئی شکار کیا جائے گا تو اس کا کھانا تمہارے لئے درست نہیں ہوگا لہٰذا اس شکار کا گوشت محرم کے لئے حرام نہیں ہے جسے کوئی غیر محرم اس کے لئے ذبح کرے بشرطیکہ اس شکار میں محرم کے حکم یا اس کی اعانت اور اشارت و دلالت کا کوئی دخل نہ ہو۔

منصوب پڑھنے کے سلسلہ میں تحقیقی بات وہ ہے جو مفاتیح میں مذکور رہے، کہ ''او'' بمعنی ''اِلاّ اَن'' ہے۔ اور ''**مالم تصیدوہ**'' استثناء کے معنی میں ہے گویا کہ یوں ارشاد فرمایا گیا: **لحم الصيد لك في الإحرام حلال إلا أن تصيدوه إلا أن يصادلكم** اھ استثناء ثانی۔ استثناء اول کے مفہوم سے ہے۔ **فتامل**۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: زیادہ واضح یہ ہے کہ لغت مشہورہ ہے۔ یہ اس آیت کریمہ کی قبیل سے ہے:

﴿**إنه من يتقي ويصبر**﴾ [یوسف: ۹۰] یاء کے اثبات اور یصبر کے رفع کے ساتھ، اور شاعر کا یہ قول بھی اسی قبیل سے ہے: **الم يأتيك والأخبار تنمي** اھ۔

ابن حجرؒ کی یہ تحقیق دو وجوہ سے خطاً فاحش پر مبنی ہے۔ اول تو اس وجہ سے کہ لغت مشہورہ کا تعلق ''ناقص'' سے ہے، جب کہ ہمارا موضوع سخن کلمہ اجوف ہے۔ دوسرا اس وجہ سے کہ **یصبر** کو مرفوع پڑھنا قراءت شاذہ ہے۔ اس صورت میں ''من'' موصولہ ہوگا۔ نہ کہ جازمہ اور ہمارا کلام مجزوم پڑھنے کے بارے میں ہے۔ سبعہ میں سے بعض کی قراءت متواترہ یاء کے اثبات اور ''**یصبر**'' کے جزم کے ساتھ ہے۔ سو وہ بھی اسی لغت پر محمول ہے، یا پھر ''یاء'' کسرہ کے اشباع سے پیدا ہوا ہے۔ جیسا کہ **ضربتیہ** واحد مؤنث کے صیغہ میں پڑھا جاتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

علماء فرماتے ہیں: اس بات پر اتفاق بلکہ اجماع ہے کہ اگر محرم نے شکار کو ذبح کیا، یا حلال نے حرم کے شکار کو ذبح کیا تو وہ شکار مردار شمار ہوگا۔

ٹڈی

۲۷۰۱: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ الْجَرَادُ مِنْ صَيْدِ الْبَحْرِ۔ (رواہ ابو داود والترمذی)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۴۲۹/۲ الحدیث رقم ۱۸۵۳۔ والترمذی فی ۲۰۷/۳ الحدیث رقم ۸۵۰۔ وابن ماجه فی ۱۰۷٤/۲ الحدیث رقم ۳۲۲۲۔ واحمد فی المسند ۳۰۶/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے کہ ٹڈی دریا کے شکار سے ہے اس کو ابوداؤد اور ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: علماء کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ٹڈی کو دریا کے شکار کی مانند صرف اس اعتبار سے فرمایا کہ ٹڈی دریائی شکار یعنی مچھلی کے مشابہ ہے کہ جس طرح مچھلی بغیر ذبح کئے ہوئے کھائی جاتی ہے اسی طرح ٹڈی کو بھی بغیر ذبح کئے کھانا درست ہے۔ چنانچہ محرم کے لئے ٹڈی مارنا جائز نہیں ہے اگر کوئی محرم ٹڈی مارے گا تو اس پر صدقہ (بقدر قیمت) لازم ہوگا۔ نیز ہدایہ میں بھی یہ لکھا ہے کہ ٹڈی خشکی کے شکار کے حکم میں ہے اور ابن ہمامؒ کے قول کے مطابق اکثر علماء کا یہی مسلک ہے۔

بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ محرم کے لئے ٹڈی کا شکار یعنی ٹڈی پکڑنا جائز ہے کیونکہ یہ دریائی شکار کی مانند ہے اور اس آیت کریمہ: **وَاُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا** اور احرام کی حالت میں تمہارے لئے دریائی شکار حلال رکھا گیا ہے کے پیش نظر محرم کے لئے دریا کا شکار جائز ہے۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں: سنن ابوداؤد اور جامع الترمذی میں مروی ابو ہریرہؓ کی روایت سے اشکال پیدا ہوتا ہے۔ وہ روایت یہ ہے:
عن أبی هريرة قال: خرجنا مع رسول الله ﷺ فی حجة أو غزوة، فاستقبلنا رحل من جراد، فجعلنا نضربه بسياطنا وقسينا، فقال ﷺ، كلوه فإنه من صيد البحر..... مؤطا میں مروی ہے: **أنبأنا يحيٰی بن سعيد، أن رجلا سأل عمر عن جرادة قتلها وهو محرم، فقال عمر لكعب: تعال حتی تحكم، فقال كعب: درهم، فقال عمر: إنك لتجد الدراهم لتمرة خير من جرادة**۔ ابن ابی شیبہ نے اس روایت کو قصہ سمیت ذکر کیا ہے۔ اصحاب مذاہب نے حضرت عمرؓ کی پیروی کی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ اھ۔

میں کہتا ہوں کہ اگر ابوداؤد و ترمذی کی روایت صحیح ہے تو مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں طرح کی روایات کو جمع کیا جائے اور یوں کہا جائے کہ ٹڈی دو طرح کی ہوتی ہے: ① بحری، ② بری۔ چنانچہ ہر ایک کے بارے میں اس کے مناسب معاملہ کیا جائے۔

اسنادی حیثیت: اس روایت کا سند اضعیف ہونا متفق علیہ ہے۔

حملہ کرنے والے درندے کو مار ڈالنے کا حکم

٢٧٠٢: وَعَنْ اَبِی سَعِيْدِ الْخُدْرِیِّ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ يَقْتُلُ الْمُحْرِمُ السَّبُعَ الْعَادِیَ۔

(رواه الترمذی وابو داود ابن ماجة)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ٤٢٥/٢ الحديث رقم ١٨٤٨۔ والترمذی فی السنن ١٩٨/٣ وابن ماجه فی السنن ١٠٣٢/٢ الحديث رقم ٣٠٨٩۔ واحمد فی المسند ٣/٣۔

ترجمہ: حضرت ابی سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے کہ فرمایا محرم حملہ کرنے والے درندے کو مار ڈالے۔ اس کو امام ترمذی اور ابوداؤد اور ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: العادی: یائے مخففہ کے ساتھ ہے۔ عادی سے مراد شیر، چیتا اور بھیڑیا جیسے جانور ہیں۔ ''حملہ کرنے والے'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ جان لینے یا زخمی کرنے کے لئے چڑھ دوڑے جیسے شیر' بھیڑیا اور چیتا وغیرہ کہ یہ درندے انسان کو دیکھتے ہی اس پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔

بجو کے شکار کا حکم

٢٧٠٣: وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِی عَمَّارٍ قَالَ سَأَلْتُ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ عَنِ الضَّبُعِ اَصَيْدٌ هِیَ فَقَالَ نَعَمْ فَقُلْتُ اَيُؤْكَلُ فَقَالَ نَعَمْ فَقُلْتُ سَمِعْتَهٗ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ نَعَمْ۔

(رواه الترمذی و لنسائی والشافعی وقال الترمذی هذا حديث حسن صحيح)

اخرجه الترمذی فی السنن ٢٢٢/٤ الحديث رقم ١٧٩١۔ والنسائی فی ٢٠٠/٧ الحديث رقم ٤٣٢٣۔ والدارقطنی فی ٢٤٦/٢ الحديث رقم ٤٥ من باب المواقيت واحمد فی المسند ٣١٨/٣۔

ترجمہ: حضرت عبدالرحمٰن بن عمار ؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے جابر بن عبداللہ ؓ سے بجو جانور کے بارے میں پوچھا کہ کیا اس کا شکار ہے؟ پس انہوں نے کہا کہ ہاں۔ پس میں نے کہا کیا کھایا جائے؟ فرمایا کہ ہاں! پھر میں نے کہا کہ تم نے پیغمبر ﷺ سے سنا ہے؟ اس نے کہا ہاں۔ اس کو امام ترمذیؒ اور نسائی اور امام شافعیؒ نے اور امام ترمذیؒ

نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

تشریح: أیو کل: مذکر ومؤنث دونوں طرح پڑھا گیا ہے، بصیغۂ ثانیث پڑھنا زیادہ واضح ہے۔ **سمعته میں رسول الله ﷺ**: یہاں حرف استفہام محذوف ہے۔ أي: **أسمعته......** ۔

سائل کا مطلب یہ تھا کہ بجو شکار ہے کہ محرم کے لئے اس کا کھانا حرام ہو یا یہ کہ شکار نہیں ہے بہر کیف اس موقع پر محرم سے قطع نظر بجو کے بارے میں بنیادی اختلاف تو یہ ہے کہ اس کا گوشت ویسے بھی حلال ہے یا نہیں؟ چنانچہ امام شافعیؒ تو اس حدیث کے پیش نظر یہ فرماتے ہیں کہ بجو حلال جانور ہے اس کا گوشت کھانا درست ہے جب کہ امام مالکؒ اور امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک حلال جانور نہیں ہے اس لئے اس کا گوشت کسی کو بھی کھانا درست نہیں ہے۔ ان کی دلیل جو آگے آرہی ہے۔

بجو کے شکار کرنے پر جزا

۲۷۰۴: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الضَّبُعِ قَالَ هُوَ صَيْدٌ وَيَجْعَلُ فِيْهِ كَبْشًا إِذَا اَصَابَهُ الْمُحْرِمُ۔ (رواه ابو داود وابن ماجة والدارمی)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۱۵۸/٤ الحدیث رقم ۳۸۰۱۔ وابن ماجه فی ۱۰۷۸/۲ فی الحدیث رقم ۳۲۳٦۔ والدارمی فی ۱۰۲/۲ الحدیث رقم ۱۹٤۱۔ والدارقطنی فی ۲٤٦/۲ الحدیث رقم ٤۸ من باب المواقیت۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے بجو کا حال پوچھا فرمایا کہ وہ شکار ہے اور جس وقت محرم اس کو پہنچے تو اس کے بدلے دنبہ یا مینڈھا دے۔ اس کو ابوداؤدؒ اور ابن ماجہ اور دارمیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **هو صيد**: ضمیر کو مذکر لانا یا تو خبر کے اعتبار کی وجہ سے ہے، یا اس سے جنس مراد ہے۔ چنانچہ اس کو مذکر ومؤنث دونوں طرح پڑھنا درست ہے۔ ایک روایت میں: **هي صيد** کے الفاظ ہیں۔ **ويجعل**: ایک نسخہ میں صیغۂ مجہول کے ساتھ ہے۔ **إذا أصابه المحرم**۔ ایک روایت میں **إذا صاده المحرم** کے الفاظ ہیں۔ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں: **وانفرد بزيادة فيه كس، والباقون رووه ولم يذكروها فيه**۔ امام حاکم نے اس زیادت کے ساتھ اس کو جابرؓ سے روایت کیا ہے: قال: **قال رسول الله ﷺ: الضبع صيد، فإذا أصابه المحرم ففيه كبش مسن ويو كل**۔ یہ روایت ہمارے خصم کی دلیل ہے کہ جو اس کو ماکول اللحم سمجھتے ہیں۔ یہ حدیث باب ہمارے خلاف حجت نہیں چونکہ حرام ہونا اور صید ہونا کوئی امر متضاد نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے احرام کی حالت میں بجو کا شکار کیا اسے خریدا تو اسکی جزا کے طور پر ایک دنبہ یا ایک مینڈھا واجب ہوگا۔

بجو اور بھیڑیئے کا مسئلہ

۲۷۰۵: وَعَنْ خُزَيْمَةَ بْنِ جَزِيٍّ قَالَ سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَنْ اَكْلِ الضَّبُعِ قَالَ اَوَيَأْكُلُ الضَّبُعَ اَحَدٌ وَسَأَلْتُهُ عَنْ اَكْلِ الذِّئْبِ قَالَ اَوَ يَأْكُلُ الذِّئْبَ اَحَدٌ فِيْهِ خَيْرٌ. (رواه الترمذی وقال ليس اسناده بالقوی)

اخرجه الترمذی فی ۲۲۲/٤ الحدیث رقم ۱۷۹۲۔ وابن ماجه فی ۱۰۷۷/۲ الحدیث رقم ۳۲۳۵۔ ۱) الحدیث رقم ((النصب لست آكله ولا احرمه)) وليس ((الضبع)) اخرجه البخاری فی ٦٦۲/۹ الحدیث رقم ۵۵۳٦۔ ومسلم فی ۵٤۲/۳ الحدیث رقم (٤۰۔ ۱۹٤۳)۔ والله تعالیٰ اعلم۔

ترجمہ: حضرت خزیمہ بن جزیؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے بجو کھانے کے بارے میں

پوچھا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کیا بجو کو کوئی کھاتا ہے (یعنی کسی کو کھانا نہیں چاہیے) اور میں نے حضور ﷺ سے بھیڑیئے کے کھانے کا پوچھا فرمایا کیا بھیڑیئے کو کوئی کھاتا ہے کہ اس میں بھلائی ہو (یعنی ایمان تقویٰ) اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ اس کی اسناد قوی نہیں ہے۔

راویٔ حدیث:

خزیمۃ بن جزی۔ یہ خزیمہ ''جزء'' کے بیٹے ہیں ان کی کنیت ''ابوعبداللہ السلمی'' ہے۔ان سے ان کے بھائی ''حبان ابن جزی'' روایت حدیث کرتے ہیں۔ان کا شمار عرب کے یکتا لوگوں میں کیا جاتا ہے۔

تشریح: ''جزر'' جیم زبر زائے معجمہ کے سکون اور اس کے بعد ہمزہ کے ساتھ ہے اصحاب حدیث جزی جیم کے زبر اور زائے معجمہ کے کسرہ اور آخر میں یائے تحتانی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ یہ عبدالغنی نے بیان کیا ہے۔اور حافظ دار قطنی نے جیم کے کسرہ اور زائے معجمہ کے سکون کے ساتھ ضبط کیا ہے حبان حائے مہملہ کے کسرہ اور بائے موحدہ کی تشدید کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔

أو يأكل الضبع أحد: یہ جملہ ''بجو'' کے گوشت کی حرمت پر دلالت کرتا ہے۔جیسا کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں، بخلاف امام احمدؒ اور امام شافعیؒ کے۔**الذئب:** ہمزہ کے ساتھ، نیز ابدال کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔**أحد فيه خير:** ''**أحد**'' کی صفت ہے۔بعض نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے: **أفي الذئب خير؟ وهو من الضواری**۔ ہمزہ استفہام محذوف ہے۔ یہ کہنا تکلف و تعسّف ہے۔

جیسا کہ امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے یہ روایت اگرچہ باعتبار سند کے ضعیف ہے لیکن بذاتِ خود یہ حدیث بالکل صحیح ہے جس کی دلیل ابن ماجہ کی روایت ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ ومن یاکل الضبع نیز اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ہر ذی ناب (کونچلی والا) درندہ کھانے سے منع کیا ہے (ذی ناب درندہ اس درندہ کو کہتے ہیں جو دانت سے شکار کرتا ہے) اور بجو ذی ناب درندہ ہے' بہرکیف بجو کے مباح اور حرام ہونے کی دلیلوں میں تعارض ہے اس لئے امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک مکروہ تحریمی ہے کہ اس کا گوشت نہ کھانا چاہئے۔

سعید ابن مسیب، سفیان ثوری اور علماء کی ایک جماعت کا مؤقف بھی یہی ہے۔اور جہاں تک تعلق ہے اس حدیث: **الضبع لست آكله ولا أحرمه**، کا، سو یہ مستدل ہے امام مالکؒ کا، جو اس کی کراہت کے قائل ہیں۔ان کے نزدیک وہ چیز مکروہ ہے جس کا کھانا گناہ ہو، اور اس کی حرمت قطعی نہ ہو۔اور ہمارے ائمہ کے قواعد کا مقتضیٰ کا یہ ہے کہ اس کا کھانا مکروہ تحریمی ہے، حرام محض نہیں ہے، چونکہ دلیل قطعی معدوم ہے اور اختلاف فقہی ہے۔

الفصل الثالث:

محرم کے لیے شکار کا گوشت کھانے کا حکم

۲۷۰۶: وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عُثْمَانَ التَّيْمِيِّ قَالَ كُنَّا مَعَ طَلْحَةَ بْنِ عُبَيْدِ اللّٰهِ وَنَحْنُ حُرُمٌ فَأُهْدِيَ لَهُ طَيْرٌ وَطَلْحَةُ رَاقِدٌ فَمِنَّا مَنْ اَكَلَ وَمِنَّا مَنْ تَوَرَّعَ فَلَمَّا اسْتَيْقَظَ طَلْحَةُ وَافَقَ مَنْ اَكَلَهُ قَالَ فَاَكَلْنَاهُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم في صحيحه ۸۵۵/۲ الحديث رقم (۵۶۔ ۱۱۹۷)۔ والنسائي في السنن ۱۸۲/۵ الحديث رقم ۲۸۱۷۔

والدارمی فی ۲/ ٦٠ الحدیث رقم ۱۸۲۹ ۔ واحمد فی المسند ۱/ ١٦١ ۔

ترجمہ: حضرت عبدالرحمٰن بن عثمان تیمیؒ سے روایت ہے کہ ہم طلحہ بن عبیداللہ کے ساتھ تھے اور ہم محرم تھے پس پرندہ جانور ہدیہ بھیجا گیا اور طلحہ سوئے ہوئے تھے پس ہم میں سے بعض آدمیوں نے کھایا یعنی اس لیے کہ محرم کے لیے کھانا جائز ہے' شکار کا گوشت اگر حکم نہ کیا ہو اور بعضوں نے ہم میں سے پرہیز کیا یعنی اس گمان پر کہ محرم کو اس کا کھانا درست نہیں ہے حضرت طلحہؓ جاگے تو کھانے والوں کی موافقت کی پس طلحہؓ نے کہا ہم نے کھایا یعنی اس کی مثل نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ساتھ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

عبدالرحمٰن بن عثمان ۔ یہ عبدالرحمٰن بن عثمان تیمی قریشی ہیں جو طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ صحابی کے بھائی ہیں۔ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے آنحضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی زیارت کی ہے لیکن روایت نہیں کی ان سے بہت لوگ روایت کرتے ہیں۔

تشریح: گوشت کھانے والوں سے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی موافقت کا تعلق قول سے بھی ہوسکتا ہے اور فعل سے بھی' یعنی یا تو حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے ان سے زبانی یہ کہا ہو گا کہ تم نے گوشت کھالیا اچھا کیا اس میں کوئی حرج نہیں یہ قولی موافقت ہے پھر یہ کہ خود انہوں نے بھی باقی بچا ہوا گوشت کھایا ہو گا یہ فعلی موافقت ہے۔

طیر سے مراد جنس ہے کہ متعدد پرندے تھے، یا یہ کہ ایک ہی پرندہ تھا لیکن اتنا بڑا تھا کہ پوری جماعت کیلئے کفایت کر گیا۔ **فأکلنا مع رسول اللہ ﷺ**: ایک نسخہ میں ''فاکلناہ'' ہے۔

بَابُ الْاِحْصَارِ وفَوْتِ الْحَجِّ

احصار اور حج کے فوت ہو جانے کا بیان

احصار کے معنی: احصار کے معنی لغت کے اعتبار سے تو ''روک لیا جانا'' ہیں اور اصطلاح فقہ میں ''احرام باندھ لینے کے بعد حج یا عمرہ سے روکا جانا'' احصار کہلاتا ہے۔

① کسی دشمن کا خوف ہو! دشمن سے مراد عام ہے خواہ کوئی آدمی ہو یا درندہ جانور۔ مثلاً یہ معلوم ہو کہ راستہ میں کوئی دشمن بیٹھا ہے جو حجاج کو ستاتا ہے یا لوٹتا ہے یا مارتا ہے آگے نہیں جانے دیتا' یا ایسے ہی کسی جگہ شیر وغیرہ کی موجودگی کا علم ہو۔

② بیماری! احرام باندھنے کے بعد ایسا ہو جائے کہ اس کی وجہ سے آگے نہ جا سکتا ہو یا آگے جا تو سکتا ہے مگر مرض بڑھ جانے کا خوف ہو۔

③ عورت کا محرم نہ رہے! احرام باندھنے کے بعد عورت کا محرم یا اسکا خاوند مر جائے یا کہیں چلا جائے یا آگے جانے سے انکار کر دے۔

④ خرچ کم ہو جائے! مثلاً احرام باندھنے کے بعد مال و اسباب چوری ہو جائے' یا پہلے ہی سے خرچ کم لے کر چلا ہو اور اب آگے کی ضروریات کے لئے روپیہ پیسہ نہ رہے۔

⑤ عورت کے لئے عدت! احرام باندھنے کے بعد عورت کا شوہر مر جائے یا طلاق دے دے جس کی وجہ سے وہ پابند عدت ہو جائے یہ احصار ہو جائے گا۔ ہاں اگر وہ عورت اس وقت مقیم ہے اور اس کے جائے قیام سے مکہ بقدر مسافت سفر نہیں ہے تو احصار نہیں سمجھا

جائے گا۔

⑥ راستہ بھول جائے اور کوئی راہ بتانے والا نہ ہو۔

احصار کی یہ تمام صورتیں حنفیہ کے مسلک کے مطابق ہیں۔ بقیہ تینوں ائمہ کے ہاں احصار کی صرف ایک ہی صورت یعنی دشمن کا خوف ہے۔ چنانچہ ان حضرات کے نزدیک دیگر صورتوں میں احصار درست نہیں ہوتا بلکہ احرام کی حالت برقرار رہتی ہے۔

احصار کا حکم:

جس محرم کو احصار کی مندرجہ بالا صورتوں میں سے کوئی صورت پیش آ جائے تو اسے چاہئے کہ وہ اگر مفرد ہو تو ایک ہدی کا جانور (مثلاً ایک بکری) اور اگر قارن ہو تو دو ہدی کے جانور (مثلاً دو بکری) کسی شخص کے ذریعہ حرم میں بھیج دے تا کہ وہ اس کی طرف سے وہاں ذبح کر دے یا قیمت بھیج دے کہ وہاں ہدی کا جانور خرید کر ذبح کر دیا جائے اور اس کے ساتھ ہی ذبح کا دن اور وقت بھی متعین کر دے یعنی جس شخص کے ذریعہ جانور حرم بھیج رہا ہو اس کو یہ تاکید کر دے کہ یہ جانور وہاں فلاں دن اور فلاں وقت ذبح کیا جائے پھر وہ اس متعین دن اور وقت کے بعد احرام کھول دے۔ سر منڈانے یا بال کتروانے کی ضرورت نہیں! اور پھر آئندہ سال اس کی قضا کرے بایں طور کہ اگر اس نے احصار کی وجہ سے حج کا احرام اتارا ہے تو اس کے بدلہ ایک حج اور ایک عمرہ کرے اور اگر قران کا احرام اتارا ہے تو اس کے بدلہ ایک حج اور دو عمرے کرے جب کہ عمرہ کا احرام اتارنے کی صورت میں صرف ایک عمرہ کیا جائے گا۔

اگر ہدی کا جانور بھیجنے کے بعد احصار جاتا رہے اور یہ ممکن ہو کہ اگر محصر روانہ ہو جائے تو قربانی کے ذبح ہونے سے پہلے پہنچ جائے گا اور حج بھی مل جائے گا تو اس پر واجب ہوگا کہ وہ فوراً روانہ ہو جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر اس پر فوراً جانا واجب نہیں ہوگا۔ تاہم اگر وہ حج کو روانہ ہو جائے اور وہاں اس وقت پہنچے جب کہ ہدی کا جانور بھی ذبح ہو چکا ہو اور حج کا وقت بھی گزر چکا ہو تو اس صورت میں وہ عمرہ کے افعال ادا کر کے احرام کھول دے۔

حج فوت ہو جانے کے سلسلہ کا ایک پیچیدہ مسئلہ:

جس شخص کا حج فوت ہو رہا ہو اس کے بارے میں ایک بڑا پیچیدہ مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص وہاں بقرعید کی رات کے بالکل آخری حصہ میں اس حال میں پہنچے کہ اس نے ابھی تک عشاء کی نماز نہ پڑھی ہو اور اسے اس بات کا خوف ہو کہ اگر عرفات جاتا ہوں تو عشاء کی نماز جاتی رہے اور اگر عشاء کی نماز میں مشغول ہوتا ہوں تو وقوف عرفات ہاتھ نہیں لگے گا' اس صورت میں وہ کیا کرے؟ اس کے متعلق بعض حضرات تو یہ کہتے ہیں کہ اسے عشاء کی نماز میں مشغول ہو جانا چاہئے اگرچہ وقوف عرفات فوت ہو جائے۔ جب کہ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ وہ عشاء کی نماز چھوڑ دے اور عرفات چلا جائے۔ چنانچہ فقہ حنفی کی کتاب درمختار میں بھی لکھا ہے کہ اگر عشاء کا وقت بھی تنگ ہو اور وقوف عرفات بھی نکلا جا رہا ہو تو اس صورت میں نماز چھوڑ کر عرفات چلے جانا چاہئے۔

الفصل الاول:

احصار کا حکم

۲۷۰۷: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَدْ اُحْصِرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَحَلَّقَ رَأْسَهٗ وَجَامَعَ نِسَاءَهٗ وَنَحَرَ هَدْيَتَهٗ حَتّٰى اعْتَمَرَ عَامًا قَابِلاً۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤/٤۔ الحدیث رقم ١٨٠٩۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو روک لیا گیا پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سر منڈوایا اور صحبت کی اپنی عورتوں سے یعنی کامل حلال ہونے کے بعد اور اپنی ہدی ذبح کی اور اگلے سال عمرہ کیا اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ''روکا گیا'' کا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ کا احرام باندھ کر مکہ کو روانہ ہوئے مگر حدیبیہ کے مقام پر مشرکین مکہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مع رفقاء کے مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا۔

وجامع نسائه میں حرف ''واؤ'' مطلقاً اظہار جمع کے لئے استعمال کیا گیا ہے یعنی سر منڈانا وغیرہ یہاں ترتیب کے ساتھ ذکر نہیں کیا گیا ہے بلکہ اصل ترتیب کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نحر کے بعد احرام کھولا اور اس کے بعد اپنی ازواج سے ہمبستر ہوئے چنانچہ بخاری و مسلم کی ایک اور روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء نے حدیبیہ میں احرام کھولا جب کہ ان کو مشرکین مکہ نے (مکہ جانے سے) روکا' چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ کا احرام باندھے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نحر کیا یعنی ہدی کا جانور ذبح کیا' پھر سر منڈایا اور پھر اپنے رفقاء سے فرمایا کہ کھڑے ہو جاؤ اور نحر کرو اور پھر سر منڈاؤ' ہدایہ میں اس کے بعد یہ نقل کیا ہے کہ ''پھر (سر منڈانے کے بعد) انہوں نے احرام کھول دیا''۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ ہدایہ کے ان الفاظ سے یہ بات واضح ہوگئی کہ محصر ہدی کا جانور ذبح ہونے سے پہلے احرام نہیں کھولتا اسی لئے یہ مسئلہ ہے کہ اگر کسی محصر نے ہدی کا جانور حرم روانہ کیا اور اس جانور کو لے جانے والے سے یہ تاکید کی کہ اس جانور کو فلاں دن اور فلاں وقت ذبح کر دینا اور پھر اس نے اس متعین دن میں یہ سمجھ کر کہ اب جانور ذبح ہو گیا ہوگا اپنے کو احرام سے باہر سمجھ لیا اور کوئی ایسا فعل کیا جو حالت احرام میں ممنوع ہے مگر بعد میں معلوم ہوا کہ ہدی کا وہ جانور اس متعین دن میں ذبح نہیں ہوا تھا یا ذبح تو اسی دن ہوا تھا مگر حرم میں ذبح ہونے کی بجائے حرم سے باہر ذبح ہو گیا تھا تو اس صورت میں اس نے خلافِ احرام جس قدر فعل کئے ہوں گے ہر فعل کے عوض جزا دینی پڑے گی۔

احصار کی ہدی کہاں ذبح کی جائے؟

احصار کی ہدی کے علاوہ ہدایا کے بارے میں تو حنفیہ اور شوافع کا اتفاق ہے کہ وہ حرم کے علاوہ اور کہیں ذبح نہ کی جائیں مگر حج یا عمرہ کے احصار کی ہدی کہاں ذبح کی جائے؟ اس بارے میں دونوں کے اختلافی اقوال ہیں۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ احصار کی ہدی اسی جگہ ذبح کی جائے جہاں احصار کی صورت پیش آئی ہو جب کہ امام اعظم ابو حنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ احصار کی ہدی حرم میں بھیجی جائے اور وہاں ذبح ہو' حرم کے علاوہ اور کہیں ذبح نہ کی جائے' کیونکہ خاص دنوں میں اور خاص موقع پر ہدی کا ذبح ہونا عبادت ہے اور جب یہ بات ہے کہ ایک خاص وقت اور خاص جگہ ہدی کا ذبح کرنا عبادت شمار کیا جاتا ہے تو اگر اس کے خلاف کیا گیا یعنی اس ہدی کو ذبح کرنے کی جو خاص جگہ (یعنی حرم) ہے اگر وہاں یہ ہدی ذبح نہ کی گئی تو عبادت کہاں رہی اور جب عبادت نہ رہی تو اس کی وجہ سے حلال ہونا (یعنی احرام کھولنا) کس طرح درست ہوگا''۔

امام شافعیؒ کی دلیل مذکورہ بالا حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ نے اپنی ہدی حدیبیہ میں ذبح کی جو حل میں یعنی حرم سے باہر ہے۔ اس کا جواب حنفیہ کی جانب سے یہ دیا جاتا ہے کہ اس موقع پر ہدی کے جانوروں کا حرم میں پہنچنا ممکن ہی نہیں تھا اس مجبوری کی بنا پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور صحابہؓ نے اپنی ہدی وہیں ذبح کر دی۔ نیز بعض علماء یہ بھی کہتے ہیں کہ حدیبیہ کا کچھ حصہ تو حل میں ہے اور

کچھ حصہ حرم میں ہے اس لئے ہوسکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اور صحابہؓ نے ہدی کے جانور حدیبیہ کے اس حصہ میں ذبح کئے ہوں جو حرم میں شامل ہے۔

محصر پر قضا واجب ہے:

جیسا کہ حدیث بالا سے معلوم ہوا آنحضرت ﷺ جب احصار کی وجہ سے عمرہ ادا نہ کر سکے تو آپ ﷺ نے آئندہ سال یعنی ۷ھ میں اس عمرہ کو پورا کیا چنانچہ اس عمرہ کو عمرۃ القضاء کہا گیا ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اگر کوئی محصر ہو جائے یعنی اسے حج یا عمرہ سے روک دیا جائے تو وہ اس کی قضا کرے اسی لئے حنفیہ کے مسلک میں اس کی قضا واجب ہے جب کہ امام شافعیؒ کے ہاں محصر پر اس کی قضا واجب نہیں ہوتی آنحضرت ﷺ نے ۷ھ میں جو عمرہ کیا اس کا نام ''عمرۃ القضاء'' ہونا حنفیہ کے مسلک کی تائید کرتا ہے۔

ابن حجرؒ نے عجیب بات فرمائی: عدم وجوب قضاء کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ اہلِ حدیبیہ کی تعداد ''۱۴۰۰'' تھی، اور بعض کا کہنا ہے کہ اس سے زیادہ تھی، اور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہمراہ تقریباً نصف تعداد نے عمرہ نہیں کیا اگر قضاء واجب ہوتی تو سارے اہل حدیبیہ کرتے یا اکثر حضرات کرتے اھ۔ وجہ غرابت مخفی نہیں، چونکہ وجوب قضاء علی الفور کا کوئی قائل نہیں ہے، اور نہ اس بات کا کہ اس کی قضاء نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی معیت ہی میں ضروری تھی۔ اکثر ''کل'' کے قائم مقام نہیں ہو سکتے، لہٰذا اس کا وقوع برابر ہے خواہ پہلے ہوا ہو کہ بعد میں۔ **فتامل وتدبر۔**

حدیبیہ کا واقعہ

۲۷۰۸: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَحَالَ كُفَّارُ قُرَيْشٍ دُوْنَ الْبَيْتِ فَنَحَرَ النَّبِيُّ ﷺ هَدَايَاهُ وَحَلَقَ وَقَصَّرَ اَصْحَابُهٗ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤/٤۔ الحدیث رقم ١٨١٢۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ نکلے عمرہ کے لیے پس کفار قریش نے خانہ کعبہ کے پیچھے روک لیا پس نبی کریم ﷺ نے اپنے ہدی کے جانور کو ذبح کیے اور سر منڈایا اور ان کے اصحاب نے بال کتروائے اس کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: شرح آثار میں امام طحاویؒ فرماتے ہیں: علماء نے اس مسئلہ میں کلام کیا ہے کہ محصر جب اپنی ہدی نحر کر چکے تو کیا وہ حلق کرائے یا نہ کرائے؟ چنانچہ علماء کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ حلق کرانا ضروری نہیں۔ اس قول کے قائلین میں ابوحنیفہؒ و امام محمدؒ بھی شامل ہیں۔

جہاں تک آنحضرت ﷺ کا تعلق ہے تو آپ ﷺ نے اور صحابہؓ نے حلق یا تقصیر اس مقصد سے کیا تھا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ بس اب واپسی کا پختہ ارادہ ہو گیا ہے اور عمرہ کی ادائیگی کی صورت نہیں رہی ہے امام یوسفؒ کے نزدیک محصر کو اگرچہ سر منڈوانا یا کتروانا چاہئے لیکن اگر وہ سر نہ منڈوائے یا بال نہ کتروائے تو اس صورت میں بھی احرام سے باہر ہو جائے گا اور اس پر کچھ واجب نہیں ہوگا۔

امام طحاویؒ کا میلان اس قول کی طرف ہے، جب اس پر حلق واجب نہیں اور وہ حلال ہونے کا ارادہ کرے تو وہ کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ فعل کا ارتکاب کر گزرے جو حالت احرام میں اس کے لئے ممنوع تھا۔ **کذا فی البحر الزاخر۔** زیادہ واضح بات یہ ہے کہ حلق کرنا واجب ہے۔ اس کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے: ﴿**ولا تحلقوا رؤوسكم حتى يبلغ الهدى محله**﴾ [البقرة:١٩٦] اور دوسری دلیل نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا فعل ہے۔

۲۷۰۹:وَعَنِ الْمِسْوَرِ بْنِ مَخْرَمَةَ قَالَ إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَحَرَ قَبْلَ اَنْ يَّحْلِقَ وَاَمَرَ اَصْحَابَهٗ بِذٰلِكَ ـ

(رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۰/٤ الحدیث رقم ۱۸۱۱ـ واحمد فی المسند ۳۲۷/٤ـ

ترجمہ:حضرت مسور بن مخرمہؓ سے روایت ہے کہ تحقیق آپ ﷺ نے نحر کیا' سرمنڈ وانے سے پہلے اور اپنے صحابیوں کو حکم کیا اس کا یعنی نحر کا' سرمنڈ وانے سے پہلے اس کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

احصار کی وجہ سے حج قضاء کرے

۲۷۱۰:وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّهٗ قَالَ اَلَيْسَ حَسْبُكُمْ سُنَّةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اِنْ حُبِسَ اَحَدُكُمْ عَنِ الْحَجِّ طَافَ بِالْبَيْتِ وَبِالصَّفَا وَالْمَرْوَةِ ثُمَّ حَلَّ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ حَتّٰى يَحُجَّ عَامًا قَابِلاً فَيُهْدِیْ اَوْ يَصُوْمَ اِنْ لَّمْ يَجِدْ هَدْيًا۔

(رواه البخاری)

اخرجه النسائی فی السنن ۱٦۹/۵ الحدیث رقم ۲۷٦۹ـ

ترجمہ:ابن عمر ؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ کیا نبی کریم ﷺ کی سنت تم کو کافی نہیں ہے یعنی انکا قول کہ اگر تم میں سے کسی کو حج کرنے سے روک لیا جائے (یعنی حج کے بڑے رکن سے کوئی عذر مانع ہو جیسے کہ وقوف عرفہ ہے اور طواف اور سعی سے مانع نہ ہو) تو خانہ کعبہ کا طواف کرے اور صفا اور مروہ کی سعی کرے پھر ہر چیز سے حلال ہو جائے (جو کچھ احرام میں کرنا حرام تھا وہ درست ہوا) یہاں تک کہ اگلے سال حج کرے پھر ہدی ذبح کرے یا روزہ رکھے اگر ہدی نہ پائے اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح:أليس:استفہام انکاری ہے۔إن حبس:إن شرطیہ ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات ذہن میں رہنا چاہئے کہ:''فائت الحج'' اور''محصر'' کے حکم میں تھوڑا سا فرق ہے''فائت الحج'' کے لئے تو یہ حکم ہے کہ اگر وہ مفرد ہو (یعنی اس نے صرف حج کا احرام باندھا ہو) تو طواف وسعی کر کے احرام کھول دے اس پر صرف سال آئندہ اس حج کی قضا واجب ہے' عمرہ اور ہدی اس کے لئے واجب نہیں ہے۔

محصر کے لئے یہ حکم ہے کہ اگر وہ مفرد ہو اور اسے حرم پہنچنے سے پہلے ہی راستہ میں احصار کی کوئی صورت پیش آ جائے تو وہ پہلے ہدی کا جانور حرم بھیجے جب وہ جانور حرم میں پہنچ کر ذبح ہو جائے تو وہ احرام کھول دے اور آئندہ سال اس حج کی قضا کرے اور اس کے ساتھ ہی ایک عمرہ بھی کرے۔

اور اگر محصر قارن ہو (یعنی اس نے حج اور عمرہ دونوں کا احرام باندھا ہو) تو وہ بھی ہدی کا جانور حرم میں بھیجے اور وہاں اس جانور کے ذبح ہو جانے کے بعد احرام کھول دے' لیکن سال آئندہ اس پر اس حج کی قضا اور اس کے ساتھ دو عمرے واجب ہوں گے' اس پر ایک حج اور دو عمرے واجب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ایک حج اور عمرہ تو اصلی حج وعمرہ کے بدلہ ادا کرنا ہوگا' اور دوسرا عمرہ اس واسطے کہ اس سے حج اور عمرہ فوت ہوا اس لئے اس کی جزا کے طور پر ایک عمرہ ادا کرنا ہوگا۔

اور اگر احصار کی صورت حرم پہنچنے سے پہلے راستہ میں پیش نہ آئے بلکہ حرم پہنچ کر پیش آئے کہ وہ کسی عذر کی وجہ سے وقوف عرفات سے تو عاجز رہے مگر طواف اور سعی کر سکتا ہو تو وہ طواف وسعی کرنے کے بعد یعنی عمرہ کے افعال ادا کر کے احرام کھول دے اور پھر آئندہ سال

اس حج کی قضا کرے اور ہدی کا جانور ذبح کرے اور اگر ہدی کا جانور ذبح نہ کر سکتا ہو تو روزہ رکھے مذکورہ حدیث میں یہی صورت بیان فرمائی گئی ہے۔

"**فائت الحج**" اگر قارن ہو تو پہلے وہ عمرہ کے لئے طواف وسعی کرے پھر حج فوت ہو جانے کے بدلہ میں طواف وسعی کرے اس کے بعد سر منڈوائے یا بال کتروائے اور احرام کھول دے اس کے ذمہ سے قران کی قربانی ساقط ہو جائے گی اور اگر وہ متمتع ہوگا تو اس کا تمتع باطل ہو جائے گا اور اس کے ذمہ سے تمتع کی قربانی بھی ساقط ہو جائے گی اگر وہ اس کی قربانی کا جانور اپنے ساتھ لایا ہو تو اس کو جو چاہے کرے۔

جس طرح مفرد کا حج فوت ہو جانے کی صورت میں اس پر آئندہ سال صرف حج کی قضا ہی واجب ہوتی ہے اسی طرح قران اور تمتع کی صورت میں بھی اس پر آئندہ سال صرف حج کی قضا واجب ہوگی۔

احصار کی وجہ سے احرام کھولنا جائز ہے

۲۷۱۱: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ دَخَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَلٰى ضُبَاعَةَ بِنْتِ الزُّبَيْرِ فَقَالَ لَهَا لَعَلَّكِ اَرَدْتِ الْحَجَّ وَاللّٰهِ مَا اَجِدُنِي اِلَّا وَجِعَةً فَقَالَ لَهَا حُجِّي وَاشْتَرِطِيْ وَقُوْلِي اَللّٰهُمَّ مَحِلِّي حَيْثُ حَبَسْتَنِيْ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحه ۱۳۲/۹۔ الحديث رقم ۵۰۸۹۔ ومسلم في ۸٦٧/۲ الحديث رقم (۱۰٤۔ ۱۲۰۷)۔ والنسائي في السنن ٦٨/٥ الحديث رقم ۲۷٦٨۔ واحمد في المسند ١٦٤/٦۔

ترجمه: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ زبیر کی بیٹی ضباعہ کے پاس آئے۔فرمایا کہ شاید تو حج کا ارادہ رکھتی ہے؟ (ہمارے ساتھ اس نے کہا ہاں ارادہ رکھتی ہوں)۔لیکن اللہ کی قسم میں اپنے آپ میں چلنے کی طاقت نہیں رکھتی۔مگر بیمار ہوں اور اپنے آپ میں ضعف پاتی ہوں بیماری کی وجہ سے میں نہیں جانتی کہ بیماری کی وجہ سے حج پورا کر سکوں گی یا نہیں۔پس آپ ﷺ نے فرمایا کہ تو حج کر۔یعنی حج کا احرام باندھ اور شرط کر لو اور تو کہہ اے الٰہی میرا احرام سے نکلنے کا مکان اس جگہ ہوگا جہاں تو مجھ کو روکے۔اس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **ضباعة**: ضاء معجمہ کے ضمہ، بائے موحدہ اور عین مہملہ کے ساتھ ہے۔یہ حضرت مقداد کی اہلیہ تھیں۔ان کو اسلمیہ کہنا غلط فاحش ہے۔**وجعة**: جیم کے کسرہ کے ساتھ۔**واشترطي وقولي**: عطف تفسیری ہے۔**محلي**: میم کے فتحہ اور حاء کے کسرہ کے ساتھ۔ہمارے بعض علماء نے فرمایا: **(وقولي: اللهم محلي حيث حبستني)** اشتراط کی تفسیر ہے۔**أي: اشترطي ان أخرج من الإحرام حيث مرضت وعجزت عن إتمام الحج۔**

''میرے احرام سے نکلنے کی جگہ وہ ہے جہاں میں روک دی جاؤں'' کا مطلب یہ ہے کہ جس جگہ مجھ پر مرض غالب ہو جائے اور وہاں سے میں خانہ کعبہ کی طرف آگے نہ چل سکوں اسی جگہ میں احرام کھول دوں گی۔

جن ائمہ کا مسلک یہ ہے کہ احصار کی صرف ایک ہی صورت یعنی دشمن کا خوف ہے اور بیماری سے احصار نہیں ہوتا' ان کی دلیل یہی حدیث ہے کہ اگر مرض کی وجہ سے احرام کھول دینا مباح ہوتا تو آنحضرت ﷺ حضرت ضباعہ کو مذکورہ بالا شرط کرنے کا حکم نہ دیتے کیونکہ جب مرض کی وجہ سے احصار ہو ہی جاتا تو پھر شرط کا کیا فائدہ حاصل ہوتا۔

امام اعظم ابو حنیفہؒ کا مسلک بھی یہی ہے کہ محرم کے لئے احرام کھولنا اس وقت تک درست نہیں ہے جب تک کہ اس کی ہدی حرم میں ذبح نہ ہو جائے۔ہاں اگر وہ احرام باندھتے وقت یہ شرط کر لے کہ جس جگہ بھی مجھے احصار کی صورت پیش آ جائے گی میں وہیں احرام کھول

دوں گا تو وہ محض احصار کی صورت پیش آ جانے پر ہدی کا جانور ذبح ہوئے بغیر احرام سے باہر ہو سکتا ہے۔
علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ اس بات پر دال ہے کہ احصار مرض کے سبب سے تحلل جائز نہیں، نہ شرط کے ساتھ، نہ بغیر شرط کے۔ کہا گیا ہے کہ تحلل جائز نہیں، اور یہ حکم حضرت ضباعہ کے ساتھ ہی مخصوص تھا۔ جیسا کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے کو رفضِ حج کی اجازت دی تھی۔ اور یہ بات ان حضرات کیلئے نقصان دہ نہ تھی اور اس سے بھی ہمارے ہی مذہب کی تائید ہوتی ہے۔ **کما لایخفی۔**

الفصل الثانی:

جانوروں کو بدلنے کا حکم

۲۷۱۲: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَمَرَ اَصْحَابَهٗ اَنْ يُّبَدِّلُوا الْهَدْىَ الَّذِىْ نَحَرُوْا عَامَ الْحُدَيْبِيَةِ فِىْ عُمْرَةِ الْقَضَاءِ۔ (رواہ ابوداود)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۲/۴۳۴ الحدیث رقم ۱۸٦٤۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے اصحاب کو حکم کیا کہ وہ ہدی کے جانوروں کو بدلیں وہ جانور جو حدیبیہ کے سال میں ذبح کیے گئے تھے عمرۃ القضاء میں نقل کیا گیا ہے۔

تشریح: **أن یبدلوا:** تخفیف وتشدید ہر دو کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ **الحدیبیة:** مشدد ومخفف دونوں طرح پڑھ سکتے ہیں۔
اس حکم گرامی کا مطلب یہ تھا کہ صحابہؓ نے واقعہ حدیبیہ کے موقعہ پر عمرہ سے احصار کی صورت پیش آ جانے کی وجہ سے ہدی کے جو جانور ذبح کئے تھے سال آئندہ عمرۃ القضا کے موقع پر ان جانوروں کے بدلے دوسرے جانور حرم پہنچ کر ذبح کریں تا کہ ہدی کا حرم میں ذبح ہونا واقع ہو جائے کیونکہ احصار کی ہدی کا جانور حرم ہی میں ذبح کیا جاتا ہے جیسا کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ہے۔ لیکن مذکورہ بالا حکم کا یہ مطلب اس صورت میں ہے جب کہ یہ بات ثابت ہو کہ واقعہ حدیبیہ کے موقع پر ہدی کے جانور حرم سے باہر ذبح کئے گئے تھے اور اگر یہ کہا جائے کہ ہدی کے وہ جانور حرم ہی میں ذبح ہوئے تھے کیونکہ حدیبیہ کا اکثر حصہ حدود حرم میں واقع ہے (جیسا کہ باب کی پہلی حدیث کی تشریح کے ضمن میں ایک قول نقل کیا گیا تھا) تو پھر واقعہ حدیبیہ کے موقع پر ذبح کئے گئے جانوروں کے عوض دوسرے جانور ذبح کرنے کے اس حکم کا تعلق صرف احتیاط اور حصول فضیلت سے ہوگا اور کہا جائے گا کہ یہ حکم محض استحباب کے طور پر ہے۔
مشکوۃ کے اصل نسخہ میں لفظ رواہ کے بعد جگہ خالی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مؤلف مشکوۃ کو اس حدیث کے اصل مآخذ کی تحقیق نہیں ہو سکی تھی، لیکن ایک دوسرے نسخہ میں رواہ کے بعد ابوداؤد لاحق کیا گیا ہے یعنی اس روایت کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔ نیز ایک اور نسخہ میں رواہ ابوداؤد کے بعد ان الفاظ کا بھی اضافہ ہے: وفیه قصة وفی سنده محمد بن اسحق۔
یہ غلط ہے، چونکہ المصابیح میں آگے جو حدیث آرہی ہے اس میں "کسر أو عرج أو مرض" کے الفاظ ہیں۔ اور فصل ثالث کا اضافہ تو صاحبِ مشکوۃ کی طرف سے ہے۔

احصار دشمن کے علاوہ بھی ممکن ہے

۲۷۱۳: وَعَنِ الْحَجَّاجِ بْنِ عَمْرٍو الْاَنْصَارِىِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ كُسِرَ اَوْ عَرِجَ فَقَدْ حَلَّ وَعَلَيْهِ الْحَجُّ مِنْ قَابِلٍ۔ (رواہ الترمذی وابوداود والنسائی وابن ماجة والدارمی وزاد ابو داود فی روایة اخری اَوْ

مَرِضَ وقال الترمذی هذا حدیث حسن وفی المصا بیح ضعیف)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۴۳۳/۲ الحدیث رقم ۱۸۶۲۔ والترمذی فی ۲۷۷/۳ الحدیث رقم ۹۴۰۔ والنسائی فی ۱۹۸/۵ الحدیث رقم ۲۸۶۱۔ وابن ماجه فی ۱۰۲۸/۲ الحدیث رقم ۳۰۷۷۔ والدارقطنی فی ۲۷۷/۲ الحدیث رقم ۱۹۱ من باب المواقیت۔ واحمد فی المسند ۴۵۰/۳۔

ترجمہ: حجاج بن عمرو انصاریؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کا پاؤں ٹوٹ جائے یا لنگڑا ہو جائے پس تحقیق حلال ہو گیا یعنی جائز ہے اس کو ترک کرے احرام کو اور پھر اپنے وطن کی طرف آئے اور اس پر حج لازم ہے آئندہ سال اسکو امام ترمذیؒ اور ابوداؤد اور نسائی اور ابن ماجہ اور دارمیؒ نے روایت کیا اور زیادہ کیا ہے ایک روایت میں ابوداؤد نے یا بیمار ہو جائے اور امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ حدیث حسن ہے اور مصابیح میں کہا ہے کہ یہ ضعیف ہے۔

راویٔ حدیث:

حجاج بن عمرو۔ یہ حجاج بن عمرو انصاری مازنی ہیں۔ ان کا شمار مدینہ والوں میں کیا جاتا ہے۔ ان کی حدیث حجازیوں کے یہاں مروج ہے۔ ان سے بہت لوگوں نے روایت کی ہے۔

تشریح: **کسر**: صیغۂ مجہول کے ساتھ ہے۔ سین کے کسرہ کے ساتھ، اور فتحہ بھی پڑھا جاتا ہے۔ قاموس میں لکھتے ہیں: **أصابه شیئ فی رجله ولیس بخلقة فإذا کان خلقة فعرج کفرح أو ثیلث فی غیر الخلقة۔**

مصابیح کی روایت میں ''او مرض'' کے الفاظ ہیں۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو احرام باندھ لینے کے بعد دشمن کے خوف کے علاوہ بھی اور کوئی مانع پیش آ جائے اس کے لئے جائز ہے کہ وہ احرام کھول دے، چنانچہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دشمن کے خوف کے علاوہ احصار کی اور صورتیں بھی ہیں مثلاً بیماری وغیرہ جیسا کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے۔

وفی المصابیح ضعیف کا مطلب یہ ہے کہ اس حدیث کو بغوی نے جس سند کے ساتھ ذکر کیا ہے وہ سند ضعیف ہے لہٰذا بغوی کی سند ضعیف ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ترمذی وغیرہ کی سند بھی ضعیف ہو اور اگر اس بارے میں تعارض تسلیم بھی کر لیا جائے تو ترمذیؒ کے قول هذا حدیث حسن (یہ حدیث حسن ہے) کو بغوی کے اس کہنے پر کہ ''یہ حدیث ضعیف ہے'' تو ترجیح حاصل ہوگی، پھر یہ کہ ایک نسخہ میں ترمذی کے قول میں لفظ ''حسن'' کے بعد لفظ ''صحیح'' بھی ہے، نیز تورپشتی نے کہا ہے کہ اس حدیث کو ضعیف کہنا بالکل غلط ہے۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں: جب اس کا ذکر ابن عباس ؓ اور ابو ہریرہؓ سے کیا گیا تو دونوں نے فرمایا: صدق۔ شرح الآثار میں علقمہ سے مروی ہے: **قال: لدغ صاحب لنا وهو محرم بعمرة، فذکرناه لابن مسعود رضی الله عنه فقال: یبعث بهدی ویواعد أصحابه موعدا فإذا نحر عنه حل**۔ اور ایک روایت میں ہے کہ: **ثم علیه عمرة بعد ذلك۔**

حج کا رکن اعظم وقوف عرفہ ہے

۲۷۱۴: **وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ يَعْمُرَ الدِّيْلِمِيِّ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُوْلُ الْحَجُّ عَرَفَةُ مَنْ اَدْرَكَ عَرَفَةَ لَيْلَةَ جَمْعٍ قَبْلَ طُلُوْعِ الْفَجْرِ فَقَدْ اَدْرَكَ الْحَجَّ اَيَّامَ مِنًى ثَلَاثَةٌ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ**۔(رواه الترمذی وابوداود والنسائی و ابن ماجة والدارمی وقال الترمذی هذا حدیث حسن صحیح)

اخرجه ابوداؤد في السنن ٤٨٥/٢ الحديث رقم ١٩٤٩۔ والترمذی فی ٢٣٧/٣ الحديث رقم ٨٨٩۔ وابن ماجه في ١٠٠٣/٢۔ الحديث رقم ٣٠١٥ واخرجه الدارمي في ٨٢/٢ الحديث رقم ١٨٨٧۔ والنسائي في ٢٦٤/٥ الحديث رقم ٣٠٤٤ واحمد في المسند ٣٣٥/٤۔

ترجمه:عبدالرحمٰن بن یعمر دیلمیؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے حج عرفہ ہے یعنی حج کا بڑا رکن ذی الحجہ کی نویں تاریخ وقوف عرفہ ہے۔ کہ جس نے وقوف عرفہ پایا مزدلفہ کی رات میں یعنی ذی الحجہ کی دسویں رات میں فجر کے طلوع ہونے سے پہلے پس تحقیق اس نے حج پالیا منیٰ کے دن تین ہیں یعنی گیارہویں بارہویں تیرہویں کہ جن کو ایام تشریق کہتے ہیں۔ان تین دنوں میں منا میں رہتے ہیں اور رمی کرتے ہیں پس جو شخص کہ دو دن میں جلدی کرے پس اس پر گناہ نہیں ہے اور جو شخص کہ تاخیر کرے پس اس پر گناہ نہیں ہے۔اس کو امام ترمذیؒ اور ابوداؤد اور نسائی اور ابن ماجہ اور دارمیؒ اور امام ترمذیؒ نے کہا ہے یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

راویٔ حدیث:

عبدالرحمٰن بن یعمر ۔ یہ عبدالرحمٰن بن یعمر ''دیلمی'' ہیں ان کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شرف صحبت و روایت حاصل ہے۔کوفہ میں آئے پھر خراسان پہنچے۔ان سے صرف بکیر بن عطاء روایت کرتے ہیں ان کے سوا اور کوئی روایت نہیں کرتا۔''یعمر'' غیر منصرف ہے۔

تشریح: ''اس نے حج کو پالیا'' کا مطلب یہ ہے کہ اس کا حج فوت نہیں ہوا اور وہ حج میں کسی خرابی اور فساد سے مامون رہا' بشرطیکہ اس نے احرام کا وقت پورا ہونے سے پہلے بیوی سے ہم بستری کی یا کسی ایسے فعل کا ارتکاب نہ کیا ہو جو احرام کی حالت میں ممنوع ہے اور یہ بات تو پہلے بھی بتائی جا چکی ہے کہ جس شخص کا حج فوت ہو جائے یعنی وہ ذی الحجہ کی دسویں رات کی طلوع فجر تک ایک منٹ کے لئے بھی وقوف عرفات نہ کر سکے تو اس پر یہ واجب ہوگا کہ وہ عمرہ کے افعال یعنی طواف وسعی کے بعد احرام کھول دے' آئندہ سال کے حج تک مسلسل احرام باندھے رہنا اس کے لئے حرام ہے۔

''جو شخص جلدی کرے الخ'' کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بارھویں تاریخ کو ظہر کے بعد تینوں مناروں پر کنکریاں مار کر مکہ چلا آئے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا اور تیرھویں رات میں قیام منیٰ اور تیرھویں تاریخ کو کنکریاں مارنا اس کے ذمہ سے ساقط ہو جائے گا۔اسی طرح ''جو شخص تاخیر کرے'' کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بارھویں تاریخ کو رمی جمرات کے بعد منیٰ ہی میں ٹھہرا رہے تا آنکہ تیرھویں رات کو بھی رمی جمرات کرے تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں' گویا جواز کے اعتبار سے تو دونوں صورتیں برابر ہیں' البتہ کثرت ذکر کے پیش نظر تاخیر افضل ہے۔

منقول ہے کہ اہل جاہلیت میں دو فریق تھے' ایک فریق تو تعجیل کو گناہ کہتا تھا اور دوسرا فریق تاخیر کو' چنانچہ یہ حکم نازل ہوا کہ تعجیل اور تاخیر دونوں برابر ہیں ان میں سے کسی میں کوئی گناہ نہیں ہے۔

بَابُ حَرَمِ مَكَّةَ حَرَسَهَا اللّٰهُ تَعَالٰى

حرم مکہ کا بیان اللہ تعالیٰ اس کو آفات سے محفوظ رکھے

مکۃ سے پہلے مضاف محذوف ہے۔اصل عبارت یوں ہے:باب حرمة حرم مكة ۔

حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مکہ مکرمہ کی حرمت کو ہر قسم کی آفات حسیہ و معنویہ سے محفوظ رکھے۔

الفصل الاول:

حرم کے احرام کا بیان

۲۷۱۵: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَوْمَ فَتْحِ مَكَّةَ لَا هِجْرَةَ وَلٰكِنْ جِهَادٌ وَنِيَّةٌ وَاِذَا اسْتُنْفِرْتُمْ فَانْفِرُوْا وَقَالَ يَوْمَ فَتْحِ مَكَّةَ اِنَّ هٰذَا الْبَلَدَ حَرَّمَهُ اللّٰهُ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فَهُوَ حَرَامٌ بِحُرْمَةِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَاِنَّهٗ لَمْ يَحِلَّ الْقِتَالُ فِيْهِ لِاَحَدٍ قَبْلِيْ وَلَمْ يَحِلَّ لِيْ اِلَّا سَاعَةً مِنْ نَهَارٍ فَهُوَ حَرَامٌ بِحُرْمَةِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا يُعْضَدُ شَوْكُهٗ وَلَا يُنَفَّرُ صَيْدُهٗ وَلَا يَلْتَقِطُ لُقْطَتَهٗ اِلَّا مَنْ عَرَّفَهَا وَلَا يُخْتَلٰى خَلَاهَا فَقَالَ الْعَبَّاسُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اِلَّا الْاِذْخِرَ فَاِنَّهٗ لِقَيْنِهِمْ وَلِبُيُوْتِهِمْ فَقَالَ اِلَّا الْاِذْخِرَ۔

(متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ٤٦/٤۔ الحديث رقم ١٨٤٣۔ ومسلم فى ٩٨٦/٢ الحديث رقم (٤٤٥۔ ١٤٥٣)۔ والنسائى فى ٢٠٣/٥ الحديث رقم ٢٨٧٤۔ وابن ماجه فى ١٠٣٨/٢ الحديث رقم ٢٨٧٤۔ واحمد فى المسند ٢٥٩/١۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا فتح مکہ کے دن کہ ہجرت نہیں ہے لیکن جہاد اور نیت خالص کرنا عمل میں باقی ہے اور جس وقت جہاد کے لیے بلائے جاؤ۔ یعنی امام جہاد کا حکم کرے تو جہاد کے لیے نکلو اور فتح مکہ کے دن فرمایا تحقیق یہ شہر زمین حرم ہے اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے اس کو لوگوں پر اس کی بے حرمتی اور اس کی تعظیم ان پر واجب کی ہے اس دن سے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے یعنی اس کی حرمت اس کی قدیم سے ہے پس وہ حرام کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ کی حرمت کے ساتھ قیامت تک اور تحقیق قتال اس میں ہرگز حلال نہیں ہے کسی کے لیے مجھ سے پہلے اور میرے لیے قتال حلال نہیں ہے مگر دن سے ایک گھڑی۔ یعنی فتح مکہ کے دن پس وہ حرام کیا گیا یعنی ہر ایک پر بعد اس ساعت کے اللہ تعالیٰ کی حرمت کے ساتھ قیامت کے دن تک یعنی پہلے نفخہ تک اس کا خاردار درخت نہیں کاٹا جائے گا۔ اگرچہ اس سے تکلیف ہو اور اس کے شکار کو بھگایا نہیں جائے گا یعنی معترض نہ اس کو شکار کرے اور وحشت دلائے اور برانگیختہ کرنے کے اور اس کے لقطے کو نہ اٹھایا جائے مگر جو شخص کہ اس تعریف کرے یعنی اس کو اس کا اٹھانا جائز ہے اور اس کی گھاس نہ کاٹی جائے۔ پس ابن عباسؓ نے عرض کیا' اے اللہ کے رسولؐ! مگر اذخر یعنی اذخر ایک گھاس کا نام ہے اس لیے کہ وہ لوہاروں اور سناروں کے واسطے ہوتا ہے کیونکہ ان کو ضرورت ہوتی ہے۔ لوہے' سونے اور چاندی کے گلانے میں اور ان کے گھروں کے کام آتی ہے یعنی گھروں کی چھتوں پر کام آتی ہے پس فرمایا مگر اذخر یعنی اس کو اکھاڑنا جائز ہے اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :قال رسول الله ﷺ يوم فتح مكة لاهجرة ......فانفروا:

"يوم": ظرف ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ " لاهجرة":

یعنی پہلے کی طرح اب مکہ سے مدینہ کو ہجرت فرض نہیں ہے۔ کہا گیا ہے کہ ہجرت ارکان ایمان میں سے تھی۔

ولکن جهاد و نية یعنی جہاد اور ہجرت وغیرہ ہر عمل خیر میں اخلاص نیت ضروری ہے۔بعض نے اس کا ایک دوسرا مطلب بیان کیا ہے وہ یہ کہ ہجرت عن المعاصی کے ذریعے اعلاء دین کا قصد وعزم اب بھی باقی ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ (ایک وقت تھا کہ جب) مکہ سے مدینہ ہجرت (ضروری) تھی۔پھر جب مکہ فتح ہو گیا تو اس ہجرت کا سلسلہ منقطع ہو گیا جو فرض تھی (کیونکہ اس کے بعد مکہ دارالحرب نہیں رہا تھا) پس اگر اب کوئی ہجرت کرے تو اسے وہ درجہ حاصل نہیں ہو گا جو مہاجرین کو حاصل ہو چکا ہے البتہ جہاد اور اعمال میں حسن نیت کا اجر اب بھی باقی ہے اور ہمیشہ ہمیشہ باقی رہے گا' اسی طرح وہ ہجرت بھی باقی ہے جو اپنے دین کی حفاظت کے لئے ہوتی ہے اور اس کا اجر بھی ملتا ہے۔یہ حدیث پیشین گوئی ہے کہ مکہ ہمیشہ دارالاسلام رہے گا۔لہٰذا یہاں سے ہجرت کر کے جانے کا کبھی بھی تصور نہیں ہو سکتا۔

''وإذا استنفرتم'': بصیغۂ مجہول ہے۔أي إذا طلبتم للنفر وهو الخروج إلى الجهاد۔

اور ابن حجرؒ کی اصل میں یوں ہے: فإذا استفرتم۔یہ ''اصول معتمدہ'' کے مخالف ہے۔چنانچہ ابن حجرؒ نے تقدیری عبارت کا تکلف کیا ہے: وإذا وجب الجهار مع النية الصالحة فإذا استنفرتم

''فانفروا'': فاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

اس خروج کی اصل الاصل یہ آیت ہے: ﴿انفروا خفافا وثقالا وجاهدوا بأموالكم وأنفسكم في سبيل الله ذلكم خير لكم إن كنتم تعلمون﴾[التوبة:٤١]

قوله :وقال يوم فتح مكة إن هذا البلاد حرمه الله يوم خلق السموات والأرض:

''وقال يوم فتح مكة'': اس جملہ کے اعادہ میں دو احتمال ہیں:

(۱) یہ اعادہ برائے تاکید ہے۔

(۲) اس میں اشارہ ہے کہ اگلا کلام بھی اسی دن مگر کسی اور وقت ارشاد فرمایا تھا۔واللہ أعلم بالصواب.

ایک شبہ اور اس کا جواب :شبہ یہ ہوتا ہے کہ حدیث میں آتا ہے: إن إبراهيم حرم مكة فجعلها حراما إني حرمت المدينه ۔اور حدیث باب سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بوقت خلق سموات وارض اس کو حرم بنا دیا تھا۔شبہ خلاصہ یہ ہے کہ مکہ کو حرم کب اور کس نے بنایا؟

جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوح محفوظ میں لکھ دیا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام مکہ کو حرم قرار دیں گے۔

تحقیقی بات یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حرم مکہ کو ظاہر کیا تھا، اس کی حدود مقرر کیں اور اس بقعۂ مبارک کی تجدید کی تھی، اور کعبہ کو بلند کیا تھا، چونکہ طوفان (طوفانِ نوح) کے سبب آدم علیہ السلام کے دست اقدس سے لباس تعمیر کو زیب تن کرنے والے کعبہ کی عبارت منہدم ہو چکی تھی۔خلاصہ کلام یہ کہ تحریم مکہ کا بیان چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان مبارک سے ہوا تھا، اس لئے ان کی طرف نسبت کر دی گئی۔

قوله :فهو حرام بحرمة الله الى يوم القيامة:

اس جملہ میں اشارہ ہے کہ مکہ کی حرمت نفخۂ اولیٰ تک برقرار رہے گی، یہ ابدی ہے، نا قابل منسوخ ہے۔

قوله :وإنه لم يحل القتال فيه :

www.KitaboSunnat.com

''إنه'': یہ ضمیر شان ہے۔

یہ جملہ امام ابوحنیفہؒ اور جمہور کے مذہب کی دلیل ہے کہ فتح مکہ عنوۃ اور قہراً ہوئی تھی۔مزید یہ کہ اس خاص گھڑی میں بھی صرف خون

ریزی ہی حلال ہوئی تھی، شکار اور قطع شجر اس وقت بھی حلال نہیں ہوا تھا۔

قوله :لا یعضد شوكة:

بعض شوافع کا قول ہے کہ موذی خاردار کو کاٹا جاسکتا ہے۔لیکن یہ قول اطلاقِ نص کے مخالف ہے۔چنانچہ متاخرین کی ایک جماعت حرمت قطع مطلقاً کی قائل ہے۔امام نوویؒ نے شرح مسلم میں اس کو صحیح قرار دیا ہے، نیز اپنی کئی کتابوں میں اسی کو اختیار کیا ہے۔خطابیؒ فرماتے ہیں: **كل أهل العلم على إباحة قطع الشوك، ويشبه أن يكون المحظور منه الشوك الذى يرعاه الإبل، وهو مادق دون الصلب الذى لاترعاه، فإنه يكون بمنزلة الحطب** ۔اھ شاید کہ ''اہل علم'' سے یہاں مراد علمائے مالکیہ ہیں۔

قوله :ولا ينفر صيده و لا يلتقط لقطته إلا من عرفها:

''**لا ينفر**'' فائے مفتوحہ مشددہ کے ساتھ۔

یعنی کوئی بھی شخص شکار کی غرض سے یا محض بھڑکانے ستانے کے لئے یہاں کے کسی جانور کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہ کرے۔

''**لا يلتقط**'': بصیغۂ مجہول ہے۔**أى لايؤخذ**

''**لقطة**'': لام کے ضمہ اور قاف کے فتحہ کے ساتھ بمعنی **ساقطة**۔

''لقطہ'' اس چیز کو کہتے ہیں جو کہیں گری پڑی پائی جائے اور اس کا مالک معلوم نہ ہو۔

الا من عرفها: تشدید کے ساتھ ہے۔یہ استثناء منقطع ہے۔اور ایک نسخہ میں بصیغہ معلوم ہے۔یہ واضح ہے، چونکہ تقدیری عبارت یوں ہوگی: **لا يلتقطها احد الا من عرفها**۔

عام لقطہ کا حکم یہ ہے کہ ملتقط (لقطہ اٹھانے والا شخص) اس کو مالک تک پہنچانے کی نیت سے اٹھائے۔اس کو اپنے پاس رکھنے کیلئے نہ اٹھائے کہ اس سے نفع حاصل کرے گا۔(بلکہ ملتقط عام لوگوں میں یہ اعلان کراتا رہے کہ مجھے ایک چیز ملی ہے جس شخص کی ہو وہ مجھ سے لے لے۔اگر اس اعلان کے بعد بھی اس چیز کا مالک نہ ملے تو وہ شخص اگر خود ضرورت مند ہے تو اسے اپنے استعمال میں لے آئے ورنہ کسی نادار کو صدقہ کردے۔پھر اگر کسی وقت اس کا مالک مل جائے تو اس کو اس کی قیمت ادا کرے۔)

سرزمین حرم کے لقطہ کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔کہا گیا ہے کہ اس کا حکم یہ ہے کہ جب تک اس کے مالک کا پتہ نہ لگے اس وقت تک اس کا اعلان کیا جاتا رہے، اور بس (یعنی مالک نہ ملنے کی صورت میں اس کو نہ تو اپنے استعمال میں لاسکتا ہے نہ کسی کو بطور صدقہ دیا جاسکتا ہے اور نہ اپنی ملکیت بنایا جاسکتا ہے۔) چنانچہ امام شافعیؒ کا یہی مسلک ہے۔کہا گیا ہے کہ حرم اور غیر حرم کے لقطہ کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے حنفیہ کا مسلک یہی ہے۔

اس حدیث میں سرزمین حرم کے لقطہ کے بارے میں اس غلط فہمی و گمان کو دور کرنا مقصود ہے کہ اعلان کو صرف ایام حج کے ساتھ مخصوص نہ کرے۔(بلکہ عام لقطہ کی طرح سال بھر اس کا اعلان کرتا رہے۔)

قوله :ولا يختلى خلاها،فقال العباس يارسول الله إلا الاذخر......۔''**لا يختلى**'' بصیغۂ مجہول ہے۔

''**خلا**'': خاء کے فتحہ کے ساتھ، مقصور ہے۔

''**إلا الاذخر**'': اکثر نسخوں میں منصوب ہے۔بعض نسخوں میں مرفوع ہے، اس کو ''تلقین والتماس'' پر محمول کیا ہے۔**أى قل :إلا الأذخر**۔

الاذخر: ہمزہ کے کسرہ، ذال معجمہ ساکنہ، خائے معجمہ، اور رائے مہملہ کے ساتھ۔چوڑے پتوں والا ایک پودا

عرض مرتب: صاحب مصباح اللغات لکھتے ہیں: الاذخر: سبز گھاس، ایک قسم کی خوشبودار گھاس۔اھ۔دیکھئے: مادہ: ذ خ ر

قصہ مختصر یہ کہ اذخر نفع بخش گھاس ہے، لوگوں کو حیا دیتا اس کی ضرورت پڑتی ہے۔لوہاروں اور سناروں کے لئے لوہا اور سونا گلانے کے کام میں آتی ہے، وہ سوختنی لکڑی اور کوئلہ کے بجائے یہ گھاس استعمال کرتے ہیں۔علاوہ ازیں گھروں اور قبروں کی چھتیں بنانے میں بھی اس کی ضرورت پڑتی ہے۔اس لئے اس کو کاٹنے کی اجازت دے دیجئے۔

عرض مرتب: حضرت عباسؓ کی اس درخواست کا قبول ہونا درحقیقت حضرت عباس کا اس امت مسلمہ پر بہت بڑا احسان ہے۔کہ اس کا استثناء ایک بہت بڑی نعمت ہے۔اھ۔

ممانعت کا حاصل یہ ہے کہ اس مقدس سرزمین کی گھاس اور نباتات کاٹنا ممنوع ہے۔ہمارے بعض ائمہ فرماتے ہیں الخلا۔قصر کے ساتھ۔سبز گھاس کو کہتے ہیں۔اور حشیش خشک گھاس کو کہتے ہیں۔گھاس خواہ خشک ہو، خواہ تر ہو، حرمت قطع میں دونوں برابر ہیں۔اکثر علماء اس کے قائل ہیں۔اھ۔یہ بات مشہور مذہب کے خلاف ہے۔شمنی فرماتے ہیں : اور اسی طرح اگر کسی حلال (غیر محرم) آدمی نے حرم کا شکار ذبح کیا۔یعنی اس شخص پر اس کی قیمت لازم آئے گی، اور وہ اسے ہدیہ کردے، یا کھلا دے، بطور جزاء کے روزہ رکھنا کافی نہیں، یا حشیش کاٹی، یا درخت کاٹا، الا یہ کے قاطع کا مملوک تھا، یا منبت تھا، یا خشک تھا۔

۲۷۱۶: وفی روایۃ اَبِیْ هُرَیْرَۃَ لَا یُعْضَدُ شَجَرُهَا وَلَا یَلْتَقِطُ سَا قِطَتَهَا اِلاَّ مُنْشِدٌ

اخرجه مسلم فی صحیحه ۹۸۸/۲ الحدیث رقم (۴۴۷۔ ۱۳۵۵) وابوداؤد فی السنن ۵۱۸/۲ الحدیث رقم ۲۰۱۷۔ واحمد فی المسند ۲۳۸/۲۔

ترجمہ: اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ "نہ یہاں کا درخت کاٹا جائے اور نہ یہاں کی گری پڑی کوئی چیز اٹھائی جائے البتہ اس (کے مالک) کو تلاش کرنے والا اٹھا سکتا ہے"۔

"**لا یعضد**": بصیغۂ مجہول ہے۔

"**لا یلتقط**": بصیغۂ معروف ہے۔أی: لایأخذ۔

شمنیؒ فرماتے ہیں: اصحاب کتب ستہ نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے:

قال: لما فتح الله علی رسوله ﷺ مکة قام فحمد الله وأثنی علیه ، ثم قال: إن الله حبس عن مکة الفیل، وسلط علیها رسوله والمؤمنین ، وانها أحلت لی ساعة من نهار، ثم هی حرام إلی یوم القیامة، لا یعضد شجرها، ولا ینفر صیدها، ولا یختلی خلاها، ولا تحل ساقطتها، الا لمنشد، فقال العباس: إلا الإذخر فإنه لقبورنا وبیوتنا فقال علیه الصلٰوة والسلام إلا الإذخر۔ والخلایا بالقصر: الحشیش الرطب، واختلاء ہ قطعه، ولایرعی الحشیش، وجوزه أبو یوسف رحمه الله دفعًا للحرج عن الزائرین والمقیمین۔ اھ۔ کلامه۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: یہ تعلیل معرض نص میں ہے، لہٰذا اس سے مقصود (یعنی استدلال) تام نہیں ہوسکتا۔

ابن حجرؒ لکھتے ہیں: حرم مکہ کے نباتات واشجار سے جانوروں کو چرانا جائز ہے، چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں اور صحابہ کرام کے زمانہ میں جانور یہاں کھلے منہ ہنکائے جاتے تھے۔اھ۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جانور تو مکلف نہیں، لیکن راعی تو مکلف ہے۔اس کی تائید استثناء الدواب کی بابت مروی روایت سے ہوتی ہے۔واللہ أعلم بالصواب

شوافع کے نزدیک اصح یہ ہے کہ حرام ہے، اور اکثر حضرات کراہت کے قائل ہیں۔حرم کی مٹی، یہاں کا پتھر، حرم سے باہر لے جانا حتی کہ حرم مکہ میں لے جانا بھی ممنوع ہے۔جیسا کہ حرم مدینہ کی مٹی اور پتھر کسی اور جگہ لے جانا منع ہے حتیٰ کہ حرم مکہ کی طرف بھی لے جانا منع ہے اور حل کی مٹی کو منتقل کرنا بھی مکروہ ہے۔

علماء فرماتے ہیں: فرق یہ ہے کہ شریف کی اہانت، کمینہ کی رفعت سے زیادہ قبیح ہے؛ البتہ زم زم کو تبرک کی خاطر لے جانا مندوب ہے، اس پر علماء کا اتفاق ہے۔دلیل یہ ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام مدینہ منورہ میں تھے، آپ ﷺ نے حدیبیہ کے سال سہیل بن عمرو سے زمزم بطور ہدیہ مانگا، چنانچہ انہوں نے آپ ﷺ کی طرف دو مشکیزے روانہ کئے۔اس کو امام بیہقیؒ نے نقل کیا ہے۔فرمایا: ایک روایت میں ہے: **أنه عليه الصلوة والسلام حمله في الأداوى والقرب، وكان يصب على المرضى، ويستشفيهم به۔** اور حضرت عائشہ صدیقہؓ سے صحیح طور پر ثابت ہے کہ وہ بھی پانی منگواتی تھیں، اور فرمایا کرتی تھیں کہ آنحضرت ﷺ بھی منگواتے تھے۔

بغیر ضرورت کے مکہ مکرمہ میں ہتھیار اُٹھانا جائز نہیں ہے

۲۷۱۷: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ لَا يَحِلُّ لِاَحَدِكُمْ اَنْ يَحْمِلَ بِمَكَّةَ السَّلَاحَ

(رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۹۸۹/۲ الحدیث رقم (۴۴۹۔ ۱۳۵۶)۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا کسی کے لیے حلال نہیں ہے تم میں سے یہ کہ اٹھائے مکہ میں ہتھیار اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: جمہور کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ مکہ میں بلاضرورت ہتھیار اٹھانا درست نہیں اور حسن فرماتے ہیں کہ مکہ میں ہتھیار اٹھانا مطلقا درست نہیں ہے۔

جمہور کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام عمرۃ القضاء کے سال ہتھیاروں سمیت داخل ہوئے تھے، نیز فتح مکہ کے سال قتال کی تیاری کے ساتھ تشریف لائے تھے۔(**كذا ذكره عياض رحمه الله**)۔علامہ طیبیؒ اور ابن حجر دونوں نے انکی اتباع کی ہے۔ لیکن یہ مقام بحث سے خالی نہیں۔

حمل سلاح سے مراد یہ ہے کہ اسلحہ کو اس طرح کھلم کھلا اٹھایا جائے کہ جس سے کسی مسلمان پر رعب پڑے یا کسی کو تکلیف ہوئی ہو، جیسا کہ آج کل مشاہدہ ہے۔اور اس کی تائید ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے بھی ہوتی ہے کہ وہ ایام حج میں اس سے منع فرماتے تھے۔

فتح مکہ کا سال اس حکم سے مستثنیٰ ہے چونکہ اسلحہ وغیرہ اٹھانا تو کسی کیلئے بھی جائز نہیں تھا لیکن اس موقع پر نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے مباح قرار دیا گیا تھا۔

حرم پاک میں قصاص کا مسئلہ

۲۷۱۸: وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ دَخَلَ مَكَّةَ يَوْمَ الْفَتْحِ وَعَلٰى رَأْسِهِ الْمِغْفَرُ فَلَمَّا نَزَعَهُ جَاءَ رَجُلٌ وَقَالَ اِنَّ ابْنَ خَطَلٍ مُتَعَلِّقٌ بِاَسْتَارِ الْكَعْبَةِ فَقَالَ اقْتُلُوْهُ۔ (متفق عليه)

اخرجه فی صحیحه ۴۶/۴۔ الحدیث رقم ۱۸۴۶۔ ومسلم فی ۹۸۹/۲ الحدیث رقم (۴۵۰۔ ۱۳۵۷)۔ والترمذی فی ۱۷۴/۴ الحدیث رقم ۱۶۹۳۔ والنسائی فی ۲۰۰/۵ الحدیث رقم ۲۸۶۷۔ والدارمی ۱۰۱/۲ الحدیث رقم ۱۹۴۸۔

ومالك فى الموطأ ٤٢٣/١ الحديث رقم ٢٤٧ من كتاب الحج۔ واحمد فى المسند ١٦٤/٣۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ مکہ میں داخل ہوئے فتح مکہ کے دن اور ان کے سر مبارک پر خود تھا۔ پس جب کہ اتارا اس کو۔ ایک شخص آیا یعنی فضل بن عبید اور کہا کہ تحقیق ابن خطل کعبہ کے پردے کو پکڑے ہوئے ہے۔ فرمایا اس کو مار ڈال۔ اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ''المغفر'': میم کے کسرہ اور فاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ ''خود'' کو کہتے ہیں۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا خود پہن کر مکہ میں داخل ہونا امام شافعیؒ کے مسلک کی دلیل ہے کہ جو شخص حج یا عمرہ کا ارادہ نہ رکھتا ہو وہ احرام کے بغیر مکہ میں داخل ہو سکتا ہے۔ امام شافعی کے دو قولوں میں سے صحیح ترین قول یہی ہے۔ شمنی فرماتے ہیں ہماری دلیل آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے جس کو ابن ابی شیبہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے:

ان النبى ﷺ قال: **لاتجاوزوا الميقات بغير احرام** ۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''کوئی شخص احرام باندھے بغیر میقات سے آگے نہ بڑھے''۔

نیز یہ کہ احرام اس مقدس جگہ کی تعظیم کے لئے باندھا جاتا ہے اس لئے خواہ کوئی حج یا عمرہ کے لئے مکہ جائے یا کسی اور غرض سے سب برابر ہیں۔ (کہ خانہ کعبہ کی تعظیم کے پیش نظر احرام کے بغیر مکہ میں کوئی بھی داخل نہ ہو۔) اور فتح مکہ کے دن اس خاص ساعت میں بغیر احرام مکہ میں داخل ہونا آپ ﷺ کے لئے حلال ہو گیا تھا' چنانچہ آپ ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر فرمایا:

اِنَّها لَاتَحِلُّ لَا حَدٍ قَبْلِیْ وَلاتَحِلّ لاحد بعدی ،وانما احلت لی ساعة من نهار ثم عادت حراما یعنی بغیر احرام کے مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کا حکم پھر سے لوٹ آیا ہے۔ (لہٰذا آئندہ کوئی شخص بغیر احرام کے یہاں نہ آئے۔)

قوله بجَاءَ رَجُلٌ وَقَالَ اِنَّ ابْنَ خَطَلَ مُتَعَلِّقٌ بِاَ سْتَارِ الْكَعْبَةِ فَقَالَ اقْتُلْهُ:

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں یہ خبر لانے والے صاحب فضل بن عبید ابو برزہ اسلمی تھے۔ اور ابن خطل یہ مرتد ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے ایک مسلمان خدمت گار کو قتل کر دیا تھا۔ نیز اس نے دو پیشہ ور گانے والی لڑکیاں رکھی ہوئی تھیں جو آنحضرت ﷺ آپ کے صحابہ کرامؓ اور اسلام کے احکام کی ہجو کرتی تھیں، چنانچہ آپ ﷺ نے اس کو قصاصا مار ڈالنے کا حکم دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص خارج حرم میں کوئی جنایت کرے، اور حرم میں پناہ لے لے تو حرم مکہ اقامت قصاص وحدود میں مانع نہیں۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں میں کہتا ہوں کہ آنحضرت ﷺ نے ابن خطل کے قتل کا حکم محض اس لئے دیا کہ وہ مرتد ہو گیا تھا۔ یا یہ کہ مرتد ہونے کے ساتھ ساتھ وہ قاتل بھی تھا۔ اگر تسلیم کر لیا جائے کہ آپ ﷺ نے اس کو قصاص کے طور پر قتل کرایا تو پھر یہ کہا جائے گا کہ اس کا قتل اس خاص ساعت میں ہوا ہوگا جس میں آنحضرت ﷺ کے لئے سرزمین حرم مباح کر دی گئی تھی۔ اس بات کی دلیل کہ یہ قتل قصاصا نہیں تھا، یہ ہے کہ یہاں شرائط قصاص مطالبہ، دعوی، شہادت نہیں پائی جا رہی ہیں۔ اس تقریر سے ابن حجر کے قول کا بطلان بھی ہو گیا، وہ فرماتے ہیں: **وتاويل ابى حنيفة له بان هذا كان فى الساعة التى احلت له وحينئذ مكة كغيرها بخلافها بعدها مردود......**۔

دخولِ مکہ کے وقت آپ ﷺ سیاہ عمامہ باندھے ہوئے تھے

۲۷۱۹: وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ دَخَلَ يَوْمَ فَتْحِ مَكَّةَ وَعَلَيْهِ عِمَامَةٌ سَوْدَاءُ بِغَيْرِ اِحْرَامٍ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ٩٩٠/٢ الحديث رقم (٤٥١۔ ١٣٥٨)۔ والنسائى فى السنن ٢٠١/٥ الحديث رقم ٢٨٦٩۔

والدارمی فی ۱۰۱/۲ الحدیث رقم ۲۸۶۹۔ والدارمی فی ۱۰۱/۲ الحدیث رقم ۱۹۳۹۔

ترجمہ:حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکے میں داخل ہوئے فتح مکہ کے دن بغیر احرام کے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سیاہ پگڑی تھی۔اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله عمامة**:عین کے کسرہ کے ساتھ۔اس حدیث کے ظاہر سے اور ماقبل سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سر پر خود پہن کر اس کے اوپر سیاہ عمامہ باندھ رکھا ہوگا'بغیر احرام مکہ میں داخل ہونے کے بارے میں کلام ماقبل میں گذر چکا ہے۔

تعارض:حضرت جابرؓ کی اس روایت سے معلوم ہوا کہ فتح مکہ کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیاہ عمامہ باندھا ہوا تھا۔جبکہ حضرت انسؓ کی پچھلی روایت میں گزرا کہ نبیؐ فتح مکہ کے دن مکہ معظمہ میں داخل ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک پر خود تھا۔(دیکھئے:حدیث:۲۴۱۸)

قاضی عیاضؒ نے اس تعارض کا جواب یہ دیا ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں ابتداءً داخل ہوئے تو خود پہن رکھا تھا،اور پھر اس کے بعد سیاہ عمامہ باندھ لیا۔اس پر انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے:**خطب الناس وعليه عمامة سوداء**۔اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے باب کعبہ کے پاس خطبہ دیا تھا اھ۔(نقله النووی عن عیاض واقره منه وتبعهما الطیبی)

ان دونوں کو جمع کرنے کی یہ صورت اشکال سے خالی نہیں۔

اور یہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر پر خود پہن کر اس پر سیاہ عمامہ باندھا ہو،اور بعد میں ''خود'' کو اتار کر صرف عمامہ کو باقی رکھا ہو۔

فی الجملہ کالے کپڑا کا استعمال عمامہ وغیرہ کے طور پر درست ہے۔سفید عمامہ باندھنا افضل ہے،چونکہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام اکثر سفید عمامہ باندھتے تھے،شافعیہ بہت عجیب بات کہتے ہیں کہ خطیب کیلئے کالا عمامہ باندھنا بدعت ہے،چاہیے کہ اس عادت کو ترک کیا جائے اور سفید باندھا جائے۔مگر میں اس کو ناپسند سمجھتا ہوں خاص طور پر جیسا کہ عباسی کیا کرتے تھے۔علامہ طیبی کی یہ عبارت بہت اچھی ہے کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ سیاہ رنگ کی پگڑی خطبہ میں استعمال کرنا جائز ہے اگرچہ سفید افضل ہے۔

تخریب کعبہ لشکر کا ذکر

۲۷۲۰: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَغْزُوْ جَيْشٌ الْكَعْبَةَ فَإِذَا كَانُوْا بِبَيْدَاءَ مِنَ الْاَرْضِ يُخْسَفُ بِاَوَّلِهِمْ وَاٰخِرِهِمْ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ وَكَيْفَ يُخْسَفُ بَاَوَّلِهِمْ وَاٰخِرِهِمْ وَفِيهِمْ اَسْوَاقُهُمْ وَمَنْ لَيْسَ مِنْهُمْ قَالَ يُخْسَفُ بِاَوَّلِهِمْ وَاٰخِرِهِمْ ثُمَّ يُبْعَثُوْنَ عَلٰى نِيَّاتِهِمْ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۳۸/٤ الحدیث رقم ۲۱۱۸ کتاب الحج باب هدم الکعبة ومسلم فی صحیحه ۲۲۱۰/٤ الحدیث رقم (۲۸۸٤/۸) بلفظ مختلف۔

ترجمہ:حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک لشکر خانہ کعبہ کو خراب کرے گا۔پس جس وقت ایک زمین میں پہنچے گا دھنسایا جائے گا۔اپنے اول حصے کے ساتھ اور آخر کے ساتھ بھی یعنی تمام لوگوں کو دھنسا دیا جائے میں نے کہا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح دھنسایا جائے گا اپنے اول اور اپنے اُخر کے ساتھ اور ان میں ان کے بازار ہونگے اور وہ شخص کہ نہیں ہے ان میں سے یعنی کفر میں اور خانہ کعبہ کے خراب کرنے میں شریک نہیں ہے بلکہ کمزور اور ان کے قیدی ہونگے۔فرمایا ان کو بھی دھنسایا جائے گا اپنے اول اور اپنے آخر کے ساتھ پھر ان کو اپنی نیتوں پر اٹھایا جائے گا۔اس کو امام بخاریؒ اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :يغزو جيش......باولهم و آخرهم:

يخسف: صیغۂ مجہول کے ساتھ ہے۔

جيش :اس کی تنوین برائے تعظیم ہے۔ای عسکر عظیم

فاذاكانوا ببيداء من الارض : یہاں بیداء سے مراد بیابان ہے۔اور ابن حجر نے اس بات پر جزم کیا ہے کہ اس سے مراد وہ معروف جگہ ہے جو مدینہ کے قریب واقع ہے۔لیکن حدیث اس پر دلالت نہیں کر رہی ہے۔

يخسف باولهم و آخرهم'' یہ کنایہ ہے کہ وہ سارے کے سارے ہلاک کر دیئے جائیں گے۔

قوله :و كيف يخسف......ثم يبعثون على نياتهم: ''و كيف يخسف'': یہ جملہ حالیہ ہے۔

وفيهم اسواقهم :یہ جملہ حالیہ ہے۔''أسواقهم'': علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: اگر یہ ''سوق'' کی جمع ہے تو تقدیری عبارت یوں ہوگی: أهل أسواقهم اور اگر ''سوقہ'' کی جمع ہے بمعنی الرعایا ہے، اس صورت میں تقدیری عبارت کی ضرورت نہیں۔

اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ قرب قیامت میں ایک بہت بڑا لشکر خانہ کعبہ کو نقصان پہنچانے کے ناپاک ارادہ کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہوگا۔ چنانچہ جب وہ لشکر زمین کے ایک میدانی حصہ میں پہنچے گا تو وہ سارے کا سارا لشکر پہلے ہی زمین میں دھنسا دیا جائے گا۔ان ہلاک شدگان میں کمزور اور قیدی بھی شامل ہوں گے جو نہ سب لشکر والوں کی طرح کافر ہوں گے اور نہ کعبہ کو نقصان پہنچانے میں ان کے ہمنوا و شریک ہوں گے بلکہ ان کو زبردستی لشکر میں شامل کر لیا ہوگا۔ان کی نیت اگر چہ تخریب کعبہ کی نہیں تھی مگر چونکہ اہل باطل کی تعداد میں اضافہ کا باعث بنے، اور ان کے ساتھ فتنہ پروری میں شریک تھے اس لئے یہ بھی ان کے ساتھ ہلاک کر دیئے جائیں گے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿واتقوا فتنة لاتصيبن الذين ظلموا منكم﴾

پھر قیامت میں سب کو ان کی نیتوں کے مطابق اٹھایا جائے گا کہ جس کی نیت میں اسلام تھا وہ جنت میں داخل کیا جائے گا، اور جس کی نیت کفر کی تھی اس کو دوزخ میں بھیج دیا جائے گا۔

خانہ کعبہ کی خرابی حبشی کے ہاتھوں ہوگی

۲۷۲۱:وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُخَرِّبُ الْكَعْبَةَ ذُوالسُّوَيْقَتَيْنِ مِنَ الْحَبَشَةِ ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى ٤٦٠/٣ الحديث رقم ١٥٩٦۔ ومسلم فى ٢٢٢/٤ الحديث رقم (٥٧۔ ٢٩٠٩) واخرجه النسائى فى السنن ٢١٦/٥ الحديث رقم ٢٩٠٤ واحمد فى المسند ٣١٠/٢۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ خانہ کعبہ کو خراب کرے گا دو چھوٹی اور پتلی پنڈلیوں والا حبشیوں میں سے۔اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ''يخرب'': راء کی تشدید و تخفیف کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔

''السويقتين'': تصغیر کے ذریعہ یہ بتلانا مقصود ہے کہ اسکی ٹانگیں چھوٹی چھوٹی اور پتلی پتلی ہوں گی۔ یہ شخص کافروں میں سے ہوگا۔

خانہ کعبہ کو خراب کرنے والے شخص کا ذکر

۲۷۲۲:وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ كَاَنِّي بِهٖ اَسْوَدَ اَفْحَجَ يَقْلَعُهَا حَجَرًا حَجَرًا۔ (رواه البخارى)

اخرجه البخارى فى صحيحه ٤٦٠/٣۔ الحديث رقم ١٥٩٥۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ فرمایا کہ میں دیکھتا ہوں۔ خانہ کعبہ کے خراب کرنے والے کو وہ ایک شخص ہوگا سیاہ رنگ والا پھڈا خانہ کعبہ کا پتھر پتھر اکھاڑے گا۔ اس کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قولہ : کأنی بہ اسود افحج:**

''**کأنی بہ**'': تقدیری عبارت یوں ہے: **کأنی متلبس إلیہ**۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے گویا کہ پہلے یہ فرمایا: **ویخرب الکعبۃ احد** ...... اور پھر (کسی اور موقع پر مزید وضاحت فرماتے ہوئے) اس کا یہ حلیہ بیان فرمایا۔

مظہرؒ فرماتے ہیں: ضمیر مجرور، حدیث ابو ہریرہؓ میں مذکور (حبشی شخص) کی طرف راجع ہے۔اھ۔ یہ مفہوم غیر واضح ہے، چونکہ ان دونوں حدیثوں کا اتصال معروف نہیں، خصوصاً جب کہ دونوں روایات بھی مختلف ہیں۔

اور پھر فرمایا: یہ کہنا اولیٰ ہے کہ وہ ضمیر مبہم ہے، اس کی تفسیر مابعد کلام کر رہا ہے اھ۔ یہ بھی محل اشکال ہے۔ چونکہ مابعد کلام تفسیر بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا، الا یہ کہ تقدیری عبارت یوں ہو: **کأنی برجل أسود افحج** ...... ۔ ''**أسود**'': مصابیح میں یہ قید موجود نہیں ہے، اس میں ترکیبی دو احتمال ہیں: (۱) ''بہ'' کی ضمیر مجرور سے بدل ہے۔ (۲) بہ کی ضمیر مجرور سے ''حال'' ہے۔

''**أفحج**'' میں بھی یہی ترکیبی احتمالات ہیں۔

أفحج: میں پہلے حا اور پھر جیم ہے۔ وہ شخص کہ جس کے پیر کے اگلے حصے قریب اور ایڑیاں دور ہوں دونوں ٹانگوں کو کھول کر چلتا ہو۔ اور ''**فجیج**'' دوہری جیم کے ساتھ۔ اس شخص کو کہتے ہیں ٹانگیں پھیلا کر چلتا ہو۔ **فجیج** "**افجح**" سے زیادہ قبیح ہوتا ہے۔

قولہ :یقلعھا حجرا حجرا:

''**حجرا حجرا**'': یہ دونوں اسم ''حال'' ہیں، یہ'' **بوبتہ بابا بابا** " کی نظیر ہے (ذکرہ ابن حجرؒ) اور زیادہ واضح یہ ہے کہ یہ دونوں ضمیر کعبہ سے ''بدل'' ہیں۔ مزید یہ کہ ''حجر'' جامد ہے، اور باب مشتق ہے، چنانچہ ایک کا اطلاق دوسرے پر نہیں ہوسکتا۔ **فتدبر**

اس سے مراد یہ کہ وہ شخص کعبہ کی عمارت کو ڈھائے گا۔ کہا گیا ہے کہ وہ اسے سمندر میں ڈال دیں گے۔ محدثین کا اتفاق ہے کہ خانہ کعبہ کی تعمیر کا اتنے طویل عرصہ تک برقرار رہنا خوارق عادیہ میں سے ہے۔

الفصل الثانی:

حرم میں ذخیرہ اندوزی کی ممانعت

۲۷۲۳: عَنْ یَعْلٰی ابْنِ اُمَیَّۃَ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ احْتِکَارُ الطَّعَامِ فِی الْحَرَمِ اِلْحَادٌ فِیْہِ۔ (رواہ ابو داود)

اخرجہ ابو داؤد فی السنن ۵۲۲/۲ الحدیث رقم ۲۰۲۰۔

ترجمہ: حضرت یعلی بن امیہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تحقیق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا حرم میں غلہ کا بند کرنا کجروی ہے۔ اس کو ابو داؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ''احتکار'' کا مطلب یہ ہے کہ گراں بازاری کے دور میں غلہ اس نیت سے خرید کر رکھنا کہ جب گرانی اور زیادہ بڑھے گی تو اسے فروخت کیا جائے گا۔ یہ فعل ویسے تو ہر جگہ حرام ہے لیکن حرم میں اس کا ارتکاب حرمت کے اعتبار سے بہت ہی زیادہ سخت ہے۔ چنانچہ اس پر ''کجروی'' (یعنی حق چھوڑ کر باطل کی طرف مائل ہونا) کا اطلاق فرمایا گیا ہے اور حرم میں کجروی کے بارے میں حق

تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾

''اور جو شخص حرم میں ظلم کے ساتھ کجروی کا ارادہ کرے گا ہم اسے دردناک عذاب کا مزہ چکھا دیں گے''۔

مکہ کی فضیلت

۲۷۲۴: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِمَكَّةَ مَا اَطْيَبَكِ مِنْ بَلَدٍ وَاَحَبَّكِ اِلَيَّ وَلَوْلَا اَنَّ قَوْمِي اَخْرَجُوْنِي مِنْكِ مَا سَكَنْتُ غَيْرَكِ۔ (رواه الترمذی وقال هذا حديث حسن صحيح غريب اسنادا)

اخرجه الترمذی فی السنن ٦٧٩/٥ الحديث رقم ٣٩٢٦۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا مکے سے ۔یعنی جب فتح مکہ کے دن وہاں سے رخصت ہوئے کیا خوب شہر ہے اور میرے نزدیک بہت زیادہ محبوب ہے اگر میری قریش قوم مجھے تجھ سے نہ نکالتی تو میں تیرے علاوہ کہیں نہ رہتا۔اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے سند کے اعتبار سے۔

تشریح: قوله :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِمَكَّةَ مَا اَطْيَبَكِ مِنْ بَلَدٍ وَاَحَبَّكِ اِلَيَّ:

''ما أطيبك'': تعجب کا صیغہ ہے۔وأحبك کا عطف ماقبل پر ہو رہا ہے۔

پہلی قید اس کی ذات کی نسبت سے ہے، یا مطلق ہے، اور دوسری قید تخصیص کیلئے ہے۔

آنحضرت ﷺ نے فتح مکہ کے دن مکہ سے الوداع ہوتے وقت یہ کلمات مکہ کو مخاطب کر کے ارشاد فرمائے تھے۔آنحضرت ﷺ کا مکہ سے خطاب فرمانا دلیل ہے کہ اس کو بھی فہم وسماعت حاصل ہے۔

قوله :وَلَوْلَا اَنَّ قَوْمِي اَخْرَجُوْنِي مِنْكِ مَا سَكَنْتُ غَيْرَكِ:

قریش کی طرف اخراج کی نسبت بایں طور ہے کہ وہ آپ ﷺ کے خروج کا سبب بنے تھے۔

یہ حدیث جمہور کی دلیل ہے کہ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ سے افضل ہے، بخلاف امام مالک کے۔امام مالک مدینہ کے مکہ سے افضل ہونے کے قائل ہیں۔امام سیوطیؒ نے اس پر مستقل رسالہ تصنیف کیا ہے۔

قوله :رواه الترمذی وقال هذا حديث حسن صحيح غريب اسنادا اسنادا: ترکیبی اعتبار سے یہ تمیز واقع ہو رہا ہے۔

زمین میں سب سے زیادہ محبوب مقام مکہ ہے

۲۷۲۵: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَدِيِّ بْنِ حَمْرَاءَ قَالَ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ وَاقِفًا عَلَى الْحَزْوَرَةِ فَقَالَ وَاللّٰهِ اِنَّكِ لَخَيْرُ اَرْضِ اللّٰهِ وَاَحَبُّ اَرْضِ اللّٰهِ اِلَى اللّٰهِ وَلَوْلَا اِنِّي اُخْرِجْتُ مِنْكِ مَا خَرَجْتُ۔ (رواه الترمذی وابن ماجة)

اخرجه الترمذی فی السنن ٦٧٩/٥ الحديث رقم ٣٩٢٥۔ وابن ماجه فی ١٠٣٧/٢ الحديث رقم ٣١٠٨۔ والدارمی فی ٣١١/٢ الحديث رقم ٢٥١٠۔ واحمد فی المسند ٣٠٥/٤۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عدی بن حمراءؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو حزورہ مقام کے اوپر کھڑے ہوئے دیکھا۔پس فرمایا اللہ کی قسم تحقیق تو خدا کی زمین میں سب سے بہتر ہے اور بہت محبوب ہے خدا کی زمین

میں خدا کے نزدیک۔ اگر میں تجھ سے نہ نکالا جاتا تو نہ نکلتا میں تجھ سے اس کو امام ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

عبداللہ بن عدی۔ یہ عبداللہ بن ''عدی وقریشی'' زہری ہیں۔ یہ اہل حجاز میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ ''قدید'' اور ''عسفان'' کے درمیان رہتے تھے۔ ان سے ابوسلمہ عبدالرحمٰن اور محمد ابن جبیر روایت کرتے ہیں۔

تشریح: قوله :رأيت رسول الله ﷺ واقفاعلى الحزورة:

''**الحزورة**'': علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: بروزن قسورة مکہ میں ایک جگہ کا نام ہے۔ اور بعض نے حزورة کو مشدد پڑھا ہے۔ حزورة اصل میں چھوٹے ٹیلہ کو کہا جاتا ہے۔ اور یہی اس کی وجہ تسمیہ ہے، چونکہ یہاں ایک چھوٹا ٹیلا تھا۔ اور کہا گیا ہے کہ ''جرہم'' کے بعد خانہ کعبہ کا متولی وکیع بن سلمۃ بن زہیر بن ایاد بنا، تو اس نے یہاں ایک محل تعمیر کرایا اور وہاں ایک قوم کو آباد کیا، جس کو حزورہ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کو جزوی مکہ کہا جانے لگا۔ اھ بعض کا کہنا ہے کہ حزورة، مکہ میں واقع ایک بازار کا نام تھا، یہ بازار آج کل ''غرورة'' کے نام سے معروف ہے۔ یہی ''باب الوداع'' ہے۔

قوله :فقال :والله ......منك ماخرجت:

یہ جملہ دلالت کررہا ہے کہ مؤمن کو چاہیے کہ وہ حتی الامکان مکہ سے نہ نکلے، الا یہ کہ حقیقةً یا حکماً کسی ضرورت دینی یا دنیوی کی وجہ سے نکلنے پر مجبور ہو۔ چنانچہ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ مکہ مکرمہ میں داخل ہونا سعادت ہے، اور باہر نکلنا شقاوت ہے۔

فقہاء حنفیہ اس جملہ سے استیناس کے طور پر فرماتے ہیں کہ ''مودّع'' کیلئے مستحب ہے کہ وہ اپنے پیچھے کی طرف یوں ملتفت ہو جیسا کہ وہ شخص کہ جو یہاں سے جانے پر سخت شرمندہ ہو، بلکہ اس شخص کی طرح کی جس کو زبردستی یہاں سے نکالا جارہا ہو، اس میں ایک پہلو تعظیم کا بھی ہے کہ بیت اللہ سے جدا ہو رہا ہے۔ الٹے پاؤں لوٹنا اگرچہ بدعت ہے، لیکن سنت سے متزاحم نہیں، یہ بدعت حسنہ ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں بلکہ مرفوعاً بیان کرتے ہیں: **ما رأه المسلمون حسنا فهو عند الله حسن۔**

انك لخير ارض الله واحب ارض الله: اس میں تصریح ہے مکہ مدینہ منورہ سے افضل ہے، جیسا کہ جمہور کا مذہب ہے، البتہ زمین کا وہ ٹکڑا کہ جس پر نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا جسم مبارک ہے مکہ مکرمہ سے افضل ہے۔ بلکہ کعبہ سے افضل ہے، بلکہ بالا جماع عرش سے بھی افضل ہے۔ مبنی ومعنی ہر اعتبار سے حضرات مالکیہ نے اس حدیث کا رد کیا ہے جیسا کہ ائمہ مالکیہ میں سے ابن عبدالبر بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں۔

انتہائی تعجب کی بات ہے کہ ان حضرات نے اس حدیثِ ثابت کا معارضہ ایسی روایات سے کیا ہے جو نہ صرف ضعیف بلکہ موضوع بھی ہیں۔ چنانچہ اسی قبیل سے یہ روایت پیش کی جاتی ہے: **اللهم إنهم أخرجوني من أحب البلاد إلى فاسكني في أحب البلاد إليك۔** اس روایت کے موضوع ہونے پر محدثین کا اجماع ہے۔ جیسا کہ ابن عبدالبر اور ابن دحیہ فرماتے ہیں، بلکہ امام مالکؒ سے بھی منقول ہے۔ اس طرف التفات نہ کیا جائے کہ امام حاکم نے مستدرک میں اس روایت کی تخریج کی ہے۔ چونکہ ائمہ فرماتے ہیں: **من كمال تساهله في كتابه عطل تمام النفع له،** بالفرض یہ روایت ثابت بھی ہو تو ''**بعد مكة**'' مقدر مانا جائے گا۔ چونکہ زمین کا جو حصہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ترین ہوگا، نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی وہی حصہ محبوب ترین ہوگا۔ علاوہ ازیں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ آپ ﷺ مکہ سے مدینہ، بحرین یا قنسرین جہاں چاہیں تشریف لے جائیں۔ چنانچہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ دعا فرمائی کہ ان شہروں میں سے جو شہر سب سے بہتر ہے اور فتنہ فساد سے مأمون ومحفوظ ہے میرے لئے پسند فرمالیجئے۔

طبرانی کی روایت ہے: المدينة خير من مكة۔ یہ حدیث ضعیف ہے۔ امام ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ منکر وواہی ہے۔ اور اگر اس کو صحیح تسلیم کر بھی کیا جائے تو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ پر محمول ہوگی، کہ آنحضرت ﷺ کے وجود اقدس کے باعث مدینہ منورہ کثیر الفوائد تھا۔ چونکہ مدینہ منورہ کا یہ شرف وفضل اپنی ذات کے اعتبار سے نہیں ہے، بلکہ سرکار دعالم ﷺ کے وجود بابرکت کے یہاں موجود ہونے کی وجہ سے ہے۔ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر برکات الٰہیہ کے نزول کی وجہ سے ہے۔

نیز واضح رہے کہ ان دونوں مقامات مقدسہ کیلئے سفر کرنے کے مسئلہ میں بھی فرق ہے۔ مکہ کا سفر کرنا واجب ہے اور مدینہ منورہ کی حاضری مسنون ہے بلانزاع۔ اور یہ بھی مجمع علیہ ہے کہ نفس مدینہ، مکہ مکرمہ سے افضل نہیں ہے۔ چونکہ یہاں اصلاً تضاعف نہیں ہے، بلکہ مضاعفت کا تعلق دونوں مسجدوں کے ساتھ ہے۔ چنانچہ ایک حدیث صحیح میں آتا ہے: **صلاة فى مسجدى هذا أفضل من الف صلاة فى غيره من المساجد إلا المسجد الحرام، وصلاة فى مسجد الحرام أفضل من الصلاة فى مسجدى هذا بمائة ألف صلاة۔** بعض حفاظ کا فرمانا ہے کہ یہ حدیث شیخین کی شرط پر ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: **صلاة واحدة بالمسجد الحرام أفضل من مائة ألف صلاة بمسجد النبى عليه الصلوٰة والسلام۔** یہ حدیث اگرچہ موقوف ہے، لیکن مرفوع کے حکم میں ہے، چونکہ اس جیسی بات اپنی رائے سے نہیں کہی جاسکتی۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں: علماء کا مکہ مکرمہ کی مجاورت کے بارے میں کراہت وعدم کراہت کا اختلاف ہے۔ چنانچہ بعض شافعیہ نے ذکر کیا ہے کہ مختار یہ ہے کہ یہاں کی مجاورت مستحب ہے۔ الا یہ کہ کسی محذور میں مبتلی ہونے کا ظن غالب ہو۔ یہ قول صاحبینؒ کا ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام مالکؒ اس کو مکروہ قرار دیتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے تھے: **إنها ليست بدار هجرة۔** امام مالکؒ سے اس بابت استفسار کیا گیا تو فرمایا: **ما كان الناس إلا علىٰ الحج والرجوع۔** پہلا قول ''اعجب'' اور یہ دوسرا قول ''احوط'' ہے۔ چونکہ اس کے برعکس میں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے والی بات ہے۔

.اور اسی وجہ سے بھی کہ انسان خطا کا پتلا ہے۔ جیسا کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے: **كل ابن آدم خطؤه المضاعف يضاعف۔ أى كمية۔** ایسا ہی ابن مسعود سے مروی ہے، اگر وہ صحیح طور پر ثابت ہو۔ وگرنہ تو بلاشبہ اس اللہ کے حرم میں اس کا ارتکاب ''أفحش وأغلظ'' ہے۔ سخت عذاب کا موجب ہے اور یہ سارے امور اللہ کی ناراضگی کا سبب ہیں،

ابن عباس رضی اللہ عنہما جیسا محب رسول ﷺ یہ کہتے ہوئے طائف کو اپنا وطن بنا بیٹھا:

لأن أذنب خمسين ذنبا بركية۔ وهو موضع بقرب الطائف۔ أحب إلى أن أذنب ذنباً واحدا بمكة۔

حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے: **مامن بلدة يؤخذ العبد فيها بالهمة قبل العمل إلا مكة** اور یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿**ومن يرد فيه بإلحاد بظلم نذقه من عذاب أليم**﴾[الحج:۲۵]

مدینہ سے ایک شخص طلب علم کیلئے آیا، سعید ابن المسیب نے اس سے فرمایا: **ارجع إلى المدينة، فإنا نسمع أن ساكن مكة لايموت حتى يكون الحرم عنده بمنزلة لحل لما يستحل من حرمها۔**

حضرت عمر فاروقؓ سے مروی ہے: **خطيئة أصيبها بمكة أعزّ على من سبعين خطيئة بغيرها۔**

ہاں اللہ کے کچھ ایسے بندے بھی ہیں کہ جن کو اللہ جل شانہ نے طبائع کے تقاضوں سے سنوار لیا ہے، یہی لوگ اہل جوار ہیں، یہی وہ لوگ ہیں کہ جو مضاعف حسنات کی فضیلت سے ہم کنار ہونے والے ہیں۔

ایک حدیث میں آتا ہے: **صلاة فى مسجدى هذا أفضل من ألف صلاة فيما سواه من المساجد إلا المسجد**

الحرام، وصلاة في المسجد الحرام أفضل من مائة الف في مسجده۔

امام احمدؒ کی ایک روایت میں ابن عمر سے مروی ہے میں نے ان کو سنا یعنی نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے:

من طاف أسبوعا يحصيه وصلى ركعتين كان كعدل رقبة۔ وقال: سمعته يقول: ما رفع رجل قدماً ولا وضعها إلا كتب الله له عشر حسنات، وحط عنه عشر سيئات، ورفع له عشر درجات۔

ابن ماجہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی نقل کرتے ہیں:

من أدرك رمضان بمكة وصامه وقام منه ما تيسر كتب له مائة ألف شهر رمضان فيما سواه، وكتب الله له بكل يوم عتق رقبة، وبكل ليلة عتق رقبة، وكل يوم حملان فرس في سبيل الله۔

صحیح مسلم کی حدیث ہے:

لا يصبر على لأواء المدينة وشدتها أحد من أمتي إلا كنت له شفيعا يوم القيامة أو شهيدا۔

ترمذی وغیرہ نے ابن عمر سے نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی نقل کیا ہے:

من استطاع أن يموت بالمدينة فليمت، فإني أشفع لمن يموت بها اھ۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ظهر الفساد في البر والبحر﴾ (سورة الروم: ٤١) لاحول ولا قوة إلاّ بالله العظيم۔

دوسری جگہ فرمایا: ﴿يا معشر الجن والإنس إن استطعتم أن تنفذوا من أقطار السموات والأرض فانفذوا لا تنفذون إلا بسلطان﴾ (سورة الرحمن: ٣٣)

تخریج: اس حدیث کو اور محدثین نے بھی روایت کیا ہے۔ سندی اعتبار سے یہ حدیث صحیح ہے۔

والله المستعان وعليه التكلان، ولعله لابؤ اخذنا بالفضل والإحسان۔

الفصل الثالث:

حرمت مکہ کا بیان

۲۷۲۶: عَنْ اَبِیْ شُرَیْحٍ الْعَدَوِیِّ اَنَّهٗ قَالَ لِعَمْرِو بْنِ سَعِیْدٍ وَهُوَ یَبْعَثُ الْبُعُوْثَ اِلٰی مَكَّةَ اِئْذَنْ لِیْ اَیُّهَا الْاَمِیْرُ اُحَدِّثْكَ قَوْلًا قَامَ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ الْغَدَ مِنْ یَوْمِ الْفَتْحِ سَمِعَتْهُ اُذُنَایَ وَوَعَاهُ قَلْبِیْ وَاَبْصَرَتْهُ عَیْنَایَ حِیْنَ تَكَلَّمَ بِهٖ حَمِدَ اللّٰهَ وَاَثْنٰی عَلَیْهِ ثُمَّ قَالَ اِنَّ مَكَّةَ حَرَّمَهَا اللّٰهُ وَلَمْ یُحَرِّمْهَا النَّاسُ فَلَا یَحِلُّ لِاِمْرِئٍ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ یَّسْفِكَ بِهَا دَمًا وَلَا یَعْضُدُ بِهَا شَجَرَةً فَاِنْ اَحَدٌ تَرَخَّصَ بِقِتَالِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِیْهَا فَقُوْلُوْا لَهٗ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَذِنَ لِرَسُوْلِهٖ وَلَمْ یَأْذَنْ لَكُمْ وَاِنَّمَا اَذِنَ لِیْ فِیْهَا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ وَقَدْ عَادَتْ حُرْمَتُهَا الْیَوْمَ كَحُرْمَتِهَا بِالْاَمْسِ وَلْیُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ فَقِیْلَ لِاَبِیْ شُرَیْحٍ مَا قَالَ لَكَ عَمْرٌو قَالَ قَالَ اَنَا اَعْلَمُ بِذٰلِكَ مِنْكَ یَا اَبَا شُرَیْحٍ اِنَّ الْحَرَمَ لَا یُعِیْذُ عَاصِیًا وَلَا فَارًّا بِدَمٍ وَلَا فَارًّا بِخَرْبَةٍ۔

(متفق عليه وفي البخاري اَلْخَرْبَةُ اَلْجِنَا يَةُ)

اخرجه البخاري في صحيحه ٤١/٤۔ الحديث رقم ١٨٣٢۔ ومسلم في ٩٨٧/٢ الحديث رقم (٤٤٦۔ ١٣٥٤)۔

والترمذی ۱۷۳/۳ الحدیث رقم ۸۰۹ واحمد فی المسند ۳۸۵/۶۔

ترجمہ: حضرت ابوشریح عدوی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے عمرو بن سعد سے اس وقت جبکہ وہ مکہ کی طرف لشکر بھیج رہے تھے' یہ عرض کیا کہ اے میرے سردار! مجھے اجازت دیں' میں آپ کے سامنے وہ حدیث بیان کروں جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے اگلے روز ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا کہ میرے کانوں نے اس کو سنا اور میرے دل نے اسے یاد رکھا اور میری آنکھوں نے اس کو دیکھا۔ اللہ تعالیٰ کی تعریف اور ثنا کی پھر فرمایا تحقیق مکہ کو اللہ نے بزرگی دی ہے اور اس کو لوگوں نے بزرگی نہیں دی۔ پس مکہ اس شخص کے واسطے حلال نہیں ہے جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے کہ اس میں خونریزی کرے یعنی اگرچہ قتل کے لائق ہو اور جو قتل کے لائق ہے اس کو ہر جگہ قتل کرنا حرام ہے خواہ حرم میں ہو خواہ غیر حرم میں اور حلال نہیں ہے کہ اس میں درخت کاٹے۔ اگر کوئی مکہ میں قتال کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے رخصت تلاش کرے تو اس کو کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اجازت دی تھی' تمہیں اجازت نہیں دی۔ چنانچہ مجھے بھی صرف ایک ساعت کے لئے اس شہر میں قتال کی اجازت دی گئی تھی۔ آج کے دن اس شہر کی قدر و عظمت گزشتہ روز کی طرح ہی ہے اور چاہیے کہ حاضر غائب کو پہنچائے۔ پس ابوشریح سے کہا گیا کہ عمرو نے تجھ کو کیا جواب دیا؟ ابو شریح نے کہا عمرو نے کہا کہ میں اس حدیث کو آپ سے زیادہ جانتا ہوں اے ابوشریح! تحقیق حرم گنہگار کو' خون کے ساتھ بھاگنے والے کو اور تقصیر کے ساتھ بھاگنے والے کو پناہ نہیں دیتا۔ اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ اور بخاری نے نقل کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

ابوشریح۔ یہ ''ابوشریح'' خویلد بن عمرو کعبی' عدی' خزاعی ہیں۔ فتح مکہ سے پہلے اسلام لائے۔ ۶۸ھ میں مدینہ میں ان کا انتقال ہوا۔ ان سے ایک جماعت روایت کرتی ہے۔ اور یہ اپنی کنیت ہی سے زیادہ مشہور ہیں۔ اہل حجاز میں ان کا شمار ہے۔ ''شریح'' تصغیر کے ساتھ ہے۔

تشریح: بخاری کی روایت میں ''الخربة کے معنی ''قصور'' ہیں۔

قوله :عن ابی شریح العدوی انه قال لعمرو بن سعید العدوی: عین اور دال کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

عمرو بن سعید بن عاص اموی قریشی' اپنے چچازاد بھائی خلیفہ عبدالملک بن مروان کی جانب سے مدینہ کے حاکم تھے' ان کو حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے قتال کیلئے بھیجا گیا تھا۔ حالانکہ اس وقت مکہ، اس کے مضافات، اور عراق وغیرہ پر حضرت عبداللہ بن زبیر کی برحق خلافت قائم تھی، اور شام میں عبدالملک کا غلبہ تھا۔

قوله :وهو يبعث البعوث الى مكة ......واثنى عليه:

''البعث'': جماعة من الجند يرسلها الأمير إلى قتال فرقة وفتح بلاد۔ (فوج)

''ائذن'': ذال کے فتحہ، ہمزہ ثانی کو ابتداء یاء سے بھی بدلا جاتا ہے۔ ''إذن'' مصدر سے امر کا صیغہ ہے۔

''أحدثك'': مجزوم ہے۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ مرفوع ہے۔

''أذناى'': ذال کے ضمہ، نیز سکون کے ساتھ۔

''حمد الله'': جملہ مستانفہ بیانیہ ہے۔

ولا يعضد: ضاد معجمہ کے کسرہ کے ساتھ ہے، ضمہ بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

اُحَدِّثُكَ قَوْلاً قَا مَ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ الْغَدَ مِنْ يَوْمِ الْفَتْحِ سَمِعْتُهُ اُذُ نَا ىَ وَوَعَاهُ قَلْبِىْ وَاَبْصَرَتْهُ عَيْنَا ىَ حِيْنَ تَكَلَّمَ بِهٖ حَمِدَ اللّٰهَ وَاَثْنٰى عَلَيْهِ، اس کلام میں پے در پے کئی تاکیدات ہیں، جو بالکل عیاں ہیں۔

قوله :قَالَ:اِنَّ مَكَّةَ حَرَّمَهَا اللّٰهُ ...... اَنْ يَّسْفِكَ بِهَا دَمًا وَلَا يَعْضُدُ بِهَا شَجَرَةً :

اِنَّ مَكَّةَ حَرَّمَهَا اللّٰهُ وَلَمْ يُحَرِّمْهَا النَّاسُ: یعنی مکہ کو اللہ تعالیٰ نے عظمت بخشی ہے اور یہاں کے باسیوں کو بھی تبعا حرمت حاصل ہے۔ مکہ کو لوگوں نے اپنی طرف سے بزرگی نہیں دی ہے۔ یہ مطلب مراد لینے کی صورت میں یہ اس بات کے منافی نہیں کہ اس شہر کو حرمت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دی ہے۔

قوله :فَلَا يَحِلُّ لِاِمْرِئٍ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ......وَلَا يَعْضُدُ بِهَا شَجَرَةً :

" يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ": مؤمن بہ کے صرف دو اطراف کو ذکر کیا، چونکہ یہ بقیہ مؤمن بہ کی طرف سے کفایت کرتے ہیں۔

" اَنْ يَّسْفِكَ بِهَا دَمًا ":

یعنی کسی مسلمان کیلئے اس شہر میں خونریزی حلال نہیں ہے، خواہ وہ خون ریزی کسی کو زخمی کرنے کی صورت میں ہو، خواہ کسی کو قتل کرنے کی صورت میں ہو اگرچہ وہ مقتول و مجروح لائق قتل ہی کیوں نہ ہو، اور کسی کو ناحق قتل یا زخمی کرنا تو ہر جگہ حرام ہے خواہ حرم مکہ کے اندر ہو خواہ حرم کے باہر ہو۔

" وَلَا يَعْضُدُ بِهَا شَجَرَةً ": یہاں اگرچہ شجر کا ذکر ہے مگر نباتات و حشیش کا بھی یہی حکم ہے۔ یہاں تک تو عمرو بن سعید کی بات کا جواب تھا۔ آگے نیا کلام ہے۔

قوله :فإن أحد ترخص......وليبلغ الشاهد الغائب:

"إن": شرطیہ ہے۔"أحد" فاعل ہے فعل محذوف وجوباً کا، اور مابعد ترخص اس کی تفسیر کر رہا ہے۔ ترکیبی اعتبار سے اس کی نظیر یہ آیات کریمہ ہیں: ﴿وإن أحد من المشركين استجارك﴾۔﴿إذا السماء انشقت﴾۔

"وإنما أذن لی": یہ جملہ ابتدائیہ ہے، اس کا عطف جملہ شرطیہ پر ہے۔ اس کلام میں صنعت التفات ہے۔ ابن حجر کو یہاں وہم ہوا ہے۔

قوله :وَقَدْ عَادَتْ حُرْمَتُهَا الْيَوْمَ كَحُرْمَتِهَا بِالْاَمْسِ وَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ:

" اليوم": سے مراد خطبہ والا دن ہے۔

"الامس": سے مراد اس وقت کے علاوہ دوسری گھڑی ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد زمانہ ماضی ہو۔

"وليبلغ": لام اوّل کو ساکن و مکسور دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے اور دوسرا لام مشدد و مکسور ہے۔ اور مخفف بھی درست ہے۔

قوله :ماقال لك عمرو؟......ولا فارا بخربة:

"ما": یہ ما استفہامیہ ہے۔

"بذلك": اس کا مشار الیہ حدیث یا حکم محذوف ہے۔

" یااباشریح ": اس نداء میں دو احتمال ہیں:

پہلا احتمال یہ ہے کہ یہ ماقبل کا تتمہ ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ مابعد کیلئے تمہید ہے۔

"الحرم": حرم سے مراد مکہ ہے، جیسے کہ ایک حدیث میں اس کی تصریح ہے۔

"لايعيذ عاصيا ولا فارا بدم":

عمرو بن سعید کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ زمین حرم اس شخص کو پناہ نہیں دیتی جو خلیفہ سے بغاوت کر کے نافرمانی کا مرتکب ہوا ہو' گویا عمرو بن سعید کے زعم کے مطابق عبدالملک بن مروان خلیفہ برحق تھا اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اس کے باغی تھے۔ حالانکہ عبدالملک بن مروان خلیفہ برحق نہیں تھا کہ اس کی خلافت کا انکار کرنے والا شرعی اعتبار سے باغی قرار دیا جاتا۔

''خربة'': ایک نسخہ میں الخیانة ہے، خیانة أمانة کی ضد ہے۔ شرح مسلم میں عند الخربة البلیة کے الفاظ ہیں۔

''الخربة'': خائے معجمہ کے فتحہ اور راء کے سکون کے ساتھ۔ خاء پر ضمہ بھی پڑھا جاتا ہے۔ اس کے معنی ہیں جنایت، اور اس کے اصل معنی ''سرقة الابل'' ہیں۔

اگر کوئی شخص خارج حرم میں جنایت قتل کے علاوہ کوئی جرم کر کے حرم میں پناہ حاصل کر لے تو ایسے شخص کا حقہ پانی بند کر دیا جائے، یعنی اس پر تنگی کی جائے، اس کو نہ کھانا دیا جائے، نہ پانی پلایا جائے، اس کو اشیائے خورد ونوش فروخت نہ کی جائیں، تاکہ وہ باہر نکلنے پر مجبور ہو جائے، اس کے بعد اس سے قصاص (بدلہ) لیا جائے۔ ابن حجر نے اس روایت کو اپنے مذہب کی دلیل قرار دیا ہے کہ حرم میں حدود وقصاص کا نفاذ ہوگا۔

تعظیم مکہ کا بیان

۲۷۲۷: وَعَنْ عَيَّاشِ بْنِ اَبِیْ رَبِيْعَةَ الْمَخْزُوْمِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا تَزَالُ هٰذِهِ الْاُمَّةُ بِخَيْرٍ مَا عَظَّمُوْا هٰذِهِ الْحُرْمَةَ حَقَّ تَعْظِيْمِهَا فَاِذَا ضَيَّعُوْا ذٰلِكَ هَلَكُوْا۔ (رواہ ابن ماجۃ)

اخرجه ابن ماجه فی السنن ۳۸/۲۔ الحدیث رقم ۳۱۱۰۔

ترجمہ: حضرت عیاش بن ربیعہ مخزومیؓ سے روایت ہے کہتے ہیں۔ کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا یہ امت ہمیشہ بھلائی کے ساتھ قائم رہے گی جب تک اس حرمت کی تعظیم کرے گی۔ یعنی مکہ اور اس کے حرم کی جیسے تعظیم کا حق ہے اور جس وقت اس تعظیم کو ضائع کریں گے۔ ہلاک ہو جائیں گے۔ اس کو ابن ماجہؒ نے نقل کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

عیاش بن ابی ربیعة۔ عیاش بن ابی ربیعہ مخزومی قریشی ''ابوجہل'' کے ماں شریک بھائی ہیں۔ آنحضور ﷺ کے ''دار ارقم'' میں داخل ہونے سے پہلے ہی شروع میں اسلام لے آئے۔ ملک حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ پھر انہوں نے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ ان کے پاس ''ہشام'' کے دونوں بیٹے ''ابوجہل'' اور ''حارث'' آئے اور کہا کہ تمہاری ماں نے قسم کھائی ہے کہ میں جب تک کہ تم کو نہ دیکھ لوں گی اس وقت تک نہ سر میں تیل ڈالوں گی اور نہ سائے میں آرام کروں گی۔ اس لئے یہ ان کے ساتھ اپنی ماں کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پس ان دونوں نے ان کو ایک رسّی سے باندھ دیا اور مکہ میں قید کر دیا۔ اس پر آنحضور ﷺ ان کے لئے قنوت میں دعا فرمایا کرتے تھے کہ اے اللہ! ''عیاش بن ابی ربیعہ'' کو کافروں کی قید سے خلاصی دے۔ جنگ یرموک میں شہید ہوئے۔ ان سے عمر رضی اللہ عنہ بن خطاب وغیرہ روایت کرتے ہیں۔

تشریح: ''عیاش'' دو نقطوں والی یاء کے مشدد اور شین معجمہ کے ساتھ ہے۔

''لا تزال'': بصیغۂ مذکر ومؤنث دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ ''بخیر'': تنوین برائے تعظیم ہے۔

''ما عظموا'' : یہ ماظرفیہ ہے۔ أی :مدة تعظیمهم۔ ''ذلك'' :اس کا مشار الیہ تعظیم ہے یا مذکورہ حرمت ہے۔

اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ اُمت اجابت اس وقت تک بہت ہی بھلائی کے ساتھ رہے گی جب تک کہ حرمت مکہ اور حرم مکہ کی تعظیم کرتی رہے گی جیسا کہ اس کی تعظیم کا حق ہے اور اہل عرب کے ہاں مسلم ہے۔اس کی تعظیم نہ کرنا اس کی اہانت کے مترادف ہے۔ چنانچہ جب لوگ اس تعظیم کو ترک کر دیں گے تو وہ اپنے اس فعل بد کی بدولت ہلاک کر دیئے جائیں گے۔

بَابُ حَرَمِ الْمَدِيْنَةِ حَرَّسَهَا اللّٰهُ تَعَالٰى

حرم مدینہ کا بیان (اللہ اس کو آفات سے محفوظ رکھے)

مدینہ اور اس کے گرداگرد زمین کی حرمت کے بارے میں بھی احادیث منقول ہیں' لیکن اس سلسلہ میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں' چنانچہ حنفی علماء کے نزدیک مدینہ اور اس کے گرداگرد زمین کی حرمت کا مطلب یہ ہے کہ اس شہر مقدس اور اس کے چاروں طرف کی زمین کی تعظیم وتکریم کی جائے' نہ یہ کہ اس کا بھی وہی حکم ہے جو مکہ اور اس کی گرداگرد زمین کا ہے' لہٰذا حنفی مسلک کے مطابق مدینہ اور اس کی اطراف کی زمین میں درخت وغیرہ کاٹنا اور شکار کرنا حرام نہیں ہے لیکن ائمہ ثلاثہ کے نزدیک چونکہ حرم مکہ اور حرم مدینہ کا ایک ہی حکم ہے اس لئے ان کے مسلک میں مدینہ اور اس کے اطراف کی زمین میں وہ تمام چیزیں حرام ہیں جو مکہ اور اس کے اطراف کی زمین میں حرام ہیں تاہم ان ائمہ کے ہاں بھی حرم مدینہ میں ان چیزوں کے ارتکاب سے جزا واجب نہیں ہوتی۔

چنانچہ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: **المشهور من مذهب مالك والشافعي، أنه لاضمان في صيد المدينة وقطع شجرها، بل ذلك حرام بلاضمان، وقال بعض العلماء: يجب الجزاء كحرم مكة، وقال بعضهم: لا يخرم أيضا** اھ۔ اور تورپشتیؒ لکھتے ہیں: **قوله عليه الصلوٰة والسلام: حرمت المدينة، أراد بذلك تحريم التعظيم، دون ما عداه من الأحكام المتعلقة بالحرم** اھ۔ ہمارے بعض اصحاب نے لکھا ہے: **قوله عليه الصلوٰة والسلام في الحديث السابق: أحرم من الحرمة لامن التحريم بمعنى أعظم المدينة جمعا بين الدليلين بقدر الإمكان، وله نقول فنعظمها ونوقرها أشد التوقير والتعظيم، لكن لا نقول بالتحريم لعدم القاطع احترازا عن الجرأة على تحريم ما أحل الله تعالى۔**

دلائل ائمہ ثلاثہ: ائمہ ثلاثہ کا مستدل حضرت سعدؓ کی حدیث ہے۔ یہ حدیث اسی باب کی فصل اول میں آئے گی۔" **عن سعد رضي الله عنه: قال: قال رسول الله ﷺ اني...... الا كنت له شفيعا او شهيدا يوم القيامة**"۔" اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں مدینہ کے دونوں پہاڑوں کے کناروں کے درمیان کو حرام (باعظمت) قرار دیتا ہوں' لہٰذا نہ تو اس زمین کے (جو ان دونوں پہاڑوں کے درمیان ہے) خاردار درخت کاٹے جائیں اور نہ اس میں شکار مارا جائے (حنفیہ کے نزدیک یہ ممانعت نہی تنزیہی کے طور پر ہے) مدینہ ان (لوگوں) کے لئے (جو مدینہ میں رہتے ہیں) بہتر ہے (یعنی مدینہ کا قیام دنیاو عقبٰی کی بھلائی کا ضامن ہے) بشرطیکہ وہ (اس کی بھلائی و بہتری کو جانیں) تو اس شہر کی اقامت کو ترک نہ کریں اور دنیا کے آرام و راحت کے لئے اس کو چھوڑ کر اور کہیں نہ جائیں جو بھی شخص بے رغبتی کے ساتھ (یعنی بلاضرورت) اس شہر کو چھوڑے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ کسی دوسرے ایسے شخص کو مقیم کر دے گا جو اس سے بہتر ہوگا (یعنی بے رغبتی کے ساتھ مدینہ کو چھوڑنا مدینہ کے لئے نقصان دہ نہیں ہوگا بلکہ اس کے لئے مفید ہی ہوگا کہ اس شخص کی جگہ کوئی اس سے بہتر شخص آ کر مقیم ہوگا کہ ضرورت و مجبوری کے تحت مدینہ کو چھوڑنا اس حکم میں داخل نہیں) اور جو بھی شخص مدینہ میں سختیوں اور بھوک پر ثابت قدم رہے گا (یعنی وہاں کی ہر تنگی و پریشانی پر صبر کرے گا) تو میں قیامت کے

دن اس کی شفاعت کروں گا یا یہ فرمایا کہ میں اس (کی اطاعت) کا گواہ بنوں گا''۔

ان حضرات کا دوسرا مستدل فصل ثانی کی پہلی حدیث سے بھی ہے: عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ اَبِيْ عَبْدِ اللهِ قَالَ رَاَيْتُ سَعْدَ بْنَ اَبِيْ وَقَّاصٍ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ وَلٰكِنْ اِنْ شِئْتُمْ دَفَعْتُ اِلَيْكُمْ ثَمَنَهٗ۔ ''حضرت سلیمان بن ابوعبداللہ (تابعی) کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو پکڑا جو اس حرم مدینہ (یعنی مدینہ کے اطراف) میں شکار مار رہا تھا جسے رسول اللہ ﷺ نے حرام (یعنی قابل تعظیم) قرار دیا ہے' چنانچہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اس شخص کے کپڑے (زجر و تنبیہ کے طور پر) چھین لئے' پھر اس شخص کے مالک آئے اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے اس کے بارے میں گفتگو کی' حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس حرم کو حرام قرار دیا ہے۔ نیز آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص کسی ایسے آدمی کو پکڑے جو اس میں شکار مار رہا ہو تو وہ اس کا سامان چھین لے''۔ لہٰذا جو چیز رسول اللہ ﷺ نے مجھے دلوائی ہے (یعنی جو چیز میں نے آپ ﷺ کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے حاصل کی ہے) وہ تو میں (کسی حال میں بھی) واپس نہیں کروں گا' ہاں اگر تم چاہو تو میں اس کی قیمت (از راہِ مروت و احسان) تمہیں دے دوں''۔

دلائل حنفیہ: (ا) عن أنسؓ قال: كان لأبي طلحة ابن أم سليم، يقال له أبو عمير، وكان رسول الله ﷺ يضاحكه إذا دخل، وكان له طير، فدخل رسول الله ﷺ فرأى أباه عمير حزيناً۔ فقال: ماشأن أبي عمير؟ فقيل: يا رسول الله: مات نغيره، فقال رسول الله ﷺ: يا أبا عمير! ما فعل النغير؟

اس حدیث کے بارے میں ابن اثیرؒ لکھتے ہیں: هذا حديث صحيح قد أخرجه البخاري، ومسلم في كتابيهما، وكذا الإمام أحمد، والترمذي، والنسائي، وابن ماجه۔ امام طحاویؒ فرماتے ہیں یہ واقعہ مدینہ منورہ کا ہے۔ اگر مدینہ منورہ بھی (ہر اعتبار سے) مکہ کی طرح حرم ہوتا، اور اس میں شکار ناجائز ہوتا تو رسول اللہ ﷺ ان کو پرندہ قید رکھنے کا اجازت نہ دیتے، اور پرندہ پکڑا ہوا دیکھ کر چھوڑ دینے کا حکم صادر فرماتے جیسا کہ مکہ میں یہی حکم ہے، اور اس کے ساتھ کھیلنے کی اجازت بھی نہ مرحمت فرماتے۔ اھ

خلاصہ کلام یہ کہ اگر حرم مدینہ کا حکم حرم مکہ کی طرح ہوتا تو پھر رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں پرندے کو قید میں رکھنا کیوں کر درست ہوسکتا تھا؟۔

تورپشتیؒ فرماتے ہیں: اگر حدود مدینہ میں پرندہ کو قید کرنا حرام ہوتا تو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام (اس) موضع حاجت میں سکونت نہ فرماتے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ممکن ہے کہ یہ (واقعہ) قباء میں پیش آیا ہو۔ اور قباء حرم کا حصہ نہیں ہے تو اس کو جواب یہ ہے کہ ایسا کہنے سے ڈرنا چاہیے۔ آپ یہ کیوں کہتے ہیں کہ قباء حرم کا حصہ نہیں ہے۔ چونکہ متعدد حضرات نے مدینہ کے حرم کی حدود ''بریدٌ فی بریدٍ'' بیان کی ہے، اور ''برید'' چار فرسخ کا ہوتا ہے، اور قباء سے مدینہ کی مسافت ایک فرسخ سے بھی کم ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حدیث نغیر کا یہ واقعہ تحریم مدینہ سے پہلے کا ہو یا یہ کہ یہ پرندہ ''حل'' سے شکار کر کے لایا گیا ہو۔ اس احتمال کا جواب یہ ہے کہ یہ احتمال تاویل ہے۔ اور (جب) راوی کی تاویل حجت نہیں، تو دوسرے کی تاویل کیسی ہوگی؟ مزید یہ کہ اگر حل سے شکار کر کے لایا گیا تھا تو تب بھی ہمیں موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا، چونکہ حل کا شکار جب حرم میں داخل ہو جائے تو اس کا حکم حنفیہ کے نزدیک صیدِ حل کا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا یہ بات ہمارے خلاف نہیں جاتی، بلکہ خود ان کے خلاف حجت ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں: ولكن أصلهم هذا ضعيف فيرد عليهم اھ۔ امام نوویؒ کا یہ کہنا کیسے صحیح ہوسکتا ہے جب کہ ہمارا استدلال نص سے ہے، اور ان کا مستدل قیاس ہے۔ چنانچہ بلاشبہ نص کو قیاس پر مقدم کیا جائے گا۔

کافی میں لکھتے ہیں: لأن حل الاصطياد عرف بالنصوص القاطعة، فلا يحرم الابراهين ساطعة، ومرويهم محتمل وهو لا يصلح حجة۔

کہ ہر جگہ شکار کرنے اور درخت کاٹنے کی اجازت دلائل قطعیہ سے ثابت ہے، کسی مقام پر حرمت اصطیاد اور حرمت قطع اشجار کیلئے بھی نصوص قطعیہ کی ضرورت ہے۔ اور ائمہ ثلاثہ نے جو دلائل پیش کئے ہیں وہ محتمل ہیں، اس لئے محض ان محتمل نصوص کے پیش نظر مدینہ کے شکار اور درخت کاٹنے کو حرام قرار نہیں دیا جا سکتا۔

صحیحین کی حدیث ہے: **أن النبی ﷺ لما أخذہ کان نخل وقبوی لمشرکین وخرب۔ فأمر النبی ﷺ بالنخل فقطع۔ وقولہ، أخذہ أی مکان المسجد۔**

خلاصہ کلام یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ مسجد نبوی کی تعمیر کے وقت مدینہ کے کھجوروں کے درخت کٹوا کر مسجد کی چھت کا انتظام فرمایا، اگر حرم مدینہ کے احکام حرم مکہ جیسے ہوتے تو دربار نبوی سے قطع نخل کی اجازت نہ دی جاتی۔

حنفیہ کا استدلال حضرت ابن مسعود اور ابن زبالہ وغیرہ کی روایت سے بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سلمہ سے فرمایا تھا: **أما انك لو كنت تصيده بالعقيق لشيعتك اذا ذهبت و تلقيتك إذا جئت فإني أحب العقيق۔**

حضرت سلمہ بن اکوع فرماتے ہیں کہ میں نے وحشی جانوروں کا شکار کر کے گوشت نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں بطور ہدیہ پیش کیا تو رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا اگر تم شکار کرنے کیلئے وادی عقیق جاتے تو جاتے وقت میں تمہارے ساتھ مشایعت کرتا (یعنی رخصت کرنے کیلئے باہر تک ساتھ جاتا) اور جب تم واپس آتے تو میں تمہارا استقبال کرتا۔ چونکہ میں وادی عقیق کو پسند کرتا ہوں۔ واضح رہے کہ وادی عقیق مدینہ کا ایک حصہ ہے، یہ وہی جگہ ہے جہاں حضرت سعد نے درخت کاٹنے والے غلام سے سامان سلب کر لیا تھا۔ مقام عقیق سے شکار کی ترغیب خود رسول اللہ ﷺ دے رہے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ حرم مدینہ اور اس کے شکار کا حکم حرم مکہ اور اس کے شکار کے حکم کی طرح نہیں ہے۔

اسی باب کی فصل اول میں حضرت ابو سعید کی حدیث مذکور ہے: **ولا تخبط فيها شجر إلا لعلف**، کہ مدینہ کے اشجار سوائے چارے کے نہ کاٹے جائیں۔ اس حدیث میں آپ ﷺ نے حرم مدینہ کے درختوں کے پتے چارے کیلئے جھاڑنے کی اجازت دی ہے۔ جبکہ حرم مکہ کے اشجار کے پتوں کو جانوروں کے چارہ کیلئے بھی کاٹنا جائز نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حرم مدینہ کے نباتات کا حکم، حرم مکہ کے نباتات کے حکم کی طرح نہیں ہے۔

امام طبرانیؒ نے اپنی اوسط میں حضرت انسؓ سے حدیث نقل کی ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **احد جبل يحبنا ونحبه، فإذا جئتموه فكلوا من شجره ولو من عضاه۔** کہ احد پہاڑ ہم سے محبت کرتا ہے، اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں، جب تم احد آؤ تو اس کے درخت سے کچھ کھاؤ۔

اِس حدیث کے راوی کثیر بن زید ہیں، امام احمد نے ان کی توثیق کی ہے۔ مزید یہ کہ اس سے ملتی جلتی روایت ابن ابی شیبہ نے بھی روایت کی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ درخت سے کچھ کھانے کیلئے اس کو درخت سے توڑنے کی اجازت کو مستلزم ہے۔ اور احد حرم مدینہ کا ایک حصہ ہے، حرم مکہ میں خودرو درخت کے پتے توڑنے کی اجازت نہیں، جبکہ حرم مدینہ کے درختوں کے پتے اور پھل توڑنے کی اجازت اس حدیث سے ثابت ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مقام احد کے علاوہ وغیرہ میں ممانعت استحبابی ہے، نا کہ تحریمی۔ یا یہ ممانعت برائے بیع تھی، برائے اکل نہ تھی تا کہ تنگی لازم نہ آئے۔ نیز یہاں شکار بھی بکثرت ہوتا ہے۔ چنانچہ نہی میں شدید کا اسلوب اختیار کیا، لیکن اصطیاد و انتفاع کے معاملہ میں توسع برتا۔ اس کی نظیر وہ تاویل ہے جو حدیث صید میں ذکر کی گئی۔

الفصل الاول:

احترام مدینہ کا بیان

۲۷۲۸: عَنْ عَلِيٍّ قَالَ مَا كَتَبْنَا عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اِلَّا الْقُرْاٰنَ وَمَا فِيْ هٰذِهِ الصَّحِيْفَةِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْمَدِيْنَةُ حَرَامٌ مَا بَيْنَ عَيْرٍ اِلٰى ثَوْرٍ فَمَنْ اَحْدَثَ فِيْهَا اَوْ اٰوٰى مُحْدِثًا فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ لَا يُقْبَلُ مِنْهُ صَرْفٌ وَلَا عَدْلٌ ذِمَّةُ الْمُسْلِمِيْنَ وَاحِدَةٌ يَسْعٰى بِهَا اَدْنَاهُمْ فَمَنْ اَخْفَرَ مُسْلِمًا فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ لَا يُقْبَلُ مِنْهُ صَرْفٌ وَلَا عَدْلٌ وَمَنْ وَالٰى قَوْمًا بِغَيْرِ اِذْنِ مَوَالِيْهِ فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ لَا يُقْبَلُ مِنْهُ صَرْفٌ وَلَا عَدْلٌ (متفق عليه) (وَفِيْ رِوَايَةٍ لَهُمَا مَنِ ادَّعٰى اِلٰى غَيْرِ اَبِيْهِ اَوْ تَوَلّٰى غَيْرَ مَوَالِيْهِ فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ لَا يُقْبَلُ مِنْهُ صَرْفٌ وَّلَا عَدْلٌ)۔

اخرجه البخاری فی صحیحه ٨١/٤۔ الحدیث رقم ١٨٧٠۔ ومسلم فی صحیحه ٩٩٤/٢ الحدیث رقم (٤٦٧۔ ١٣٧٠)۔ وابوداؤد فی السنن ٥٢٩/٢ الحدیث رقم ٢٠٣٤۔ والترمذی فی ٣٨١/٤ الحدیث رقم ٢١٢٧۔ والدارمی فی ٣١٧/٢ الحدیث رقم ٢٥٢٩۔ واحمد فی المسند ٨١/١۔

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوائے ان باتوں کے یا اس چیز کے کہ جو صحیفہ میں ہے کچھ نہیں لکھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ صحیفہ میں یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مدینہ عیر اور ثور کے درمیان حرم ہے پس جو شخص مدینہ میں بدعت پیدا کرے یا وہ چیز کہ جو کتاب وسنت کے مخالف ہو یا بدعتی کو ٹھکانا دے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہو۔ اس کے فرض قبول نہیں کیے جاتے یعنی اس کے فرائض و نوافل کامل قبول نہیں ہوتے۔ مسلمانوں کا عہد ایک ہے' اس کوشش کو ان کا ادنیٰ حاصل کر سکتا ہے۔ پس جو شخص مسلمانوں کے عہد کو توڑے تو اس پر بھی اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں کی اور سب آدمیوں کی لعنت ہے اس سے فرائض و نوافل قبول نہیں کیے جاتے اور جو شخص ایک قوم سے سوال کرے اپنے ساتھیوں کی اجازت کے بغیر تو اس پر خدا کی اور فرشتوں کی اور سو آدمیوں کی لعنت ہے۔ اس کے فرض و نوافل قبول نہیں کئے جائیں گے۔ اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے بخاری اور مسلمؒ کی ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ جو شخص اپنے باپ کے علاوہ کی طرف دعوی کرے یعنی یہ کہے کہ میں فلاں کا بیٹا ہوں اور حقیقت میں اس کا بیٹا نہیں ہے یا اپنے کو غیر مالک کی طرف نسبت کرے پس اس پر اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں کی اور سب لوگوں کی لعنت ہے اس سے فرائض اور نوافل قبول نہیں کئے جائیں گے۔

تشریح: قوله :ماکتبنا عن رسول الله ﷺ الا القرآن ومافی هذه الصحیفة:

یہ حدیث دلیل ہے کہ علی رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قرآن کریم اور صحیفہ مذکورہ کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں لکھی تھی۔

مسند احمد میں ابوحسان سے مروی ہے: **أن علیا کان یأمر بالا مرفیؤتی، فیقال: قد فعلنا کذا، فیقول: صدق الله ورسوله۔ قال: فقال له الأشتر: إن هذا الذی تقول تفشغ فی الناس أهو شئ عهده إلیك رسول الله ﷺ؟ قال: ما عهد إلی رسول الله ﷺ دون الناس إلا شیئ سمعته منه فهو فی صحیفة فی قراب سیفی. قال: فلم یزالوا به حتی**

أخرج الصحيفة، فإذا فيها :من أحدث حدثا۔ الحديث. تفشغ: فاء، شین اور پھر غین، بمعنی ظہر و انشر۔ (كذا فی النهاية)
امام نوویؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث شیعہ حضرات کے زعم اور اس بہتان تراشی کی تردید کر رہی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک وصیت نامہ مرتب کرایا تھا' جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا خلیفہ اول مقرر کرنے کی ہدایت بھی تھی۔ اس میں کچھ خاص راز کی باتیں بھی تھی، اور اس وصیت نامہ میں اہل بیت کیلئے کچھ مخصوص امور تھے جن کا علم اہل بیت کے علاوہ اور کسی کو نہیں تھا۔ یہ ساری باتیں باطل دعوے ہیں، اختراعات فاسدہ ہیں، ان کی کوئی اصل نہیں۔ اور اس کے ابطال کیلئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول (ما كتبنا عن رسول الله ﷺ الا القرآن ومافی هذه الصحيفة) کافی شافی ہے۔ اور یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ علم کی باتوں کو لکھنا مستحب ہے۔

قوله :قال:قال رسول الله ﷺ :المدينة حرام ما بين عير الى ثور:

قال: یہ اس صحیفہ کی تفسیر ہے۔

''**المدينة حرام**'': ہمارے نزدیک یہاں ''حرام'' بمعنی محترم ممنوع کے ہے۔ (یعنی مدینہ منورہ اور اس کے اطراف زمین کا وہ حصہ جو عیر اور ثور کے درمیان ہے بزرگی اور عظمت والا ہے۔ اس میں ایسی چیزوں کا ارتکاب ممنوع ہے جو شہر مقدس اور اس کی باعظمت زمین کی توہین وحقارت کا سبب ہوں) اور شافعیہ کے نزدیک حرام ''حرم'' کے معنی میں ہے۔ (یعنی مدینہ منورہ اور اس کے اطراف زمین کا وہ حصہ جو عیر اور ثور کے درمیان ہے حرم کہ کی مانند ہے کہ جو چیزیں مثلاً شکار وغیرہ حرم مکہ میں حرام ہیں وہ یہاں میں بھی حرام ہیں۔)

''**عير**'': عین کے فتحہ اور یاء کے سکون کے ساتھ ہے۔ ''**عير**'' اور ''**ثور**'' یہ دونوں پہاڑ مدینہ کے اطرف میں واقع ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ عیر مدینہ کے ایک مشہور پہاڑ کا نام ہے، البتہ ''ثور'' مدینہ میں نہیں بلکہ مکہ کا ایک پہاڑ ہے، اور وہ غار بھی اسی میں ہے جہاں رسول اللہ ﷺ بوقت ہجرت روپوش ہوئے تھے۔ اور ایک روایت میں ''**ما بين غير و احد**'' کے الفاظ ہیں۔ (چونکہ حدیث میں حرم مدینہ کی حدود بیان کرنا مقصود تھا) چنانچہ ثور کا ذکر باعث اشکال ہے۔ (شاید یہی وجہ ہے کہ امام بخاریؒ نے ''عیر'' کا ذکر تو کیا ہے، لیکن ثور کا ذکر نہیں کیا اور اس کو مبہم رکھا ہے۔ چنانچہ بخاری کی ایک روایت میں اس طرح ہے: **المدينة حرم ما بين عائر إلى كذا**۔) اس لئے بعض علماء نے تو یہ جواب دیا ہے کہ اگرچہ پہلی روایت زیادہ مشہور ہے مگر راوی سے غلطی ہوئی ہے کہ اس نے ''احد'' کے بجائے ثور نقل کر دیا۔ (بعض نے یہ کہا ہے کہ جبل احد کے قریب ایک چھوٹا سا پہاڑ ہے جو غیر مشہور ہے، اسے ''ثور'' کہا جاتا ہے، اور حدیث میں یہی مراد ہے۔ اس لئے حدیث میں ثور کا ذکر صحیح ہے، باقی جن علماء نے اس کا انکار کیا ہے وہ اس کی عدم شہرت کی وجہ سے ہے۔)

بعض نے یہ کہا ہے کہ مکہ معظمہ میں ''جبل ثور'' کی طرح ایک ''جبل عیر'' بھی ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کا منشا یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان مکہ میں جتنا فاصلہ ہے اتنی ہی جگہ مدینہ کی حرم ہے۔ مکہ میں ایک پہاڑ ہے جس کو عیر عدوی کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور پہاڑ ہے جسے ثور اطحل کہا جاتا ہے۔ کہا گیا ہے ایک احتمال یہ ہے کہ اس سے مراد حرتین ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث صحیح میں مروی ہے: **انه قال بحرم مابين لابتي المدينة على لساني**۔ حرتین میں سے ایک کو عیر سے تشبیہ دی، اور دوسرے کو ثور سے تشبیہ دی۔ یا ان سے مراد **مازمی المدينة** (مدینہ کی دو تنگ جگہیں) ہیں ان کو عیر وثور سے تشبیہ دی ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے: **حرام مابين مازميها**۔

قوله :فمن احدث فيها حدثا او آوى محدثا:

''**احدث فيها حدثا**'': یعنی ایسی بات کہے یا رائج کرے جو قرآن وحدیث کے خلاف ہو یا منکر ہو۔

''**آوى**'': کو مد وقصر دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔

''**محدث**'': دال کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ جو کسی بدعتی کو پناہ دے، یا جانی کو پناہ دے یا بایں طور

کہ جانی اور اس کے خصم کے درمیان قصاص لینے کی راہ میں حائل ہو جائے۔

ایک روایت صحیحہ میں ''محدث'' دال کے فتحہ کے ساتھ بھی مروی ہے۔اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ جو بدعت کے کام کو جگہ دے، بایں طور کہ اس پر راضی ہو، تو ان دونوں پر خدا کی، فرشتوں کی اور سب لوگوں کی لعنت ہے۔الخ

قولہ :لا یقبل منہ صرف ولا عدل:

یہ اس صحیفہ علی کے پہلے حکم کا بیان ہے۔

''صرف'' : کے کئی معنی آتے ہیں، یہاں اس کے مندرجہ ذیل تمام معنی مراد لئے جاسکتے ہیں:

(۱)فرض۔ (۲)نفل۔ (۳)توبہ۔ (۴)شفاعت

''عدل'': کے بھی کئی معانی آتے ہیں، یہاں اس کے مندرجہ ذیل معانی مراد ہو سکتے ہیں:

(۱)نفل۔ (۲)فرض۔ (۳)فدیہ۔ (۴)شفاعت۔ (۵)توبہ

عدم قبولیت سے مراد قبولیت تامہ ہے۔عدل اور فدیہ میں مناسبت یہ ہے کہ فدیہ ''مفدی'' کا معادل (مساوی) ہوتا ہے۔

قولہ :فعلیہ لعنۃ اللہ والملائکۃ والناس اجمعین :

''فعلیہ'': ای کل واحد منھما یعنی ان دونوں میں سے ہر ایک پر۔دونوں سے مراد ایک وہ شخص جو مدینہ میں بدعت پیدا کرے، اور دوسرا وہ شخص جو کسی بدعتی کو پناہ دے۔اور جو شخص بھی ان کاموں میں ان کی (یعنی ان ملعون افراد کی) اتباع کرے گا، یا ان کے افعال مذکورہ پر راضی ہوگا اس پر بھی لعنت ہوگی، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

''لعنۃ اللہ'': یعنی اس شخص پر اللہ کی پھٹکار ہے، وہ راندہ درگاہ ہے، رسوا ہے، اللہ کی رحمت سے دور ہے۔

''الملائکۃ'': سے مراد کراما کاتبین ہیں، یا تمام ملائکہ مراد ہیں چونکہ وہ عاصیوں کو ناپسند کرتے ہیں۔اور ملائکہ کے لعنت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس عاصی کے حق میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دوری کی بددعا کرتے ہیں۔

''والناس اجمعین'': یعنی مذکورہ بالا دو اشخاص کے علاوہ ہر شخص ان پر لعنت بھیجتا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ دونوں بھی ان لعنت بھیجنے والوں میں شامل ہوں بایں طور کہ یہ بددعا کرتے ہوں :الا لعنۃ اللہ علی الظالمین۔اور ظلم کہتے ہیں شیء کو اس کے غیر موقع محل میں رکھنے کو،

قولہ :ذمۃ المسلمین واحدۃ یسعی بھاادناھم،فمن اخفر مسلما......ولاعدل:

یہ اس صحیفہ کا دوسرا حکم ہے۔

''اخفر'' :خائے معجمہ کے ساتھ ہے۔بمعنی ''نقض''، یہ خفرۃ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں عہد و پیان، اور باب افعال میں اس کے معنی ہیں ''ازالۃ الخفرۃ'' (یعنی عہد و پیان کو زائل کرنا)

مسلمانوں کے عہد و پیان شیء واحد کی طرح ہیں۔اس میں اختلاف مراتب کا فرق نہیں ہے۔اس کو توڑنا جائز نہیں ہے، اگرچہ عاقد فرد واحد ہی کیوں نہ ہو۔اور جو شخص اپنے بھائی کے ذمہ کو توڑے گا وہ اس شخص کی مانند ہے جو کسی سے عہد کر کے توڑ دے۔چنانچہ ایسا شخص اضاعت عہد و پیاں کے باعث مذموم ہے۔گویا کہ سب مسلمان جسم واحد ہیں، جب اس کے کسی ایک حصہ کو تکلیف پہنچتی ہے تو سارا جسم بے قرار ہو جاتا ہے۔پس ایفائے عہد کے لئے ان میں سے ادنیٰ مرتبہ کا شخص بھی کوشش کر سکتا ہے۔یعنی تمام مسلمانوں کا ذمہ ایک ہی ہے، خواہ ایک سے صادر ہوا ہو، یا افراد کثیرہ سے، خواہ عہد کسی معزز آدمی نے کیا ہو، خواہ کسی گھٹیا آدمی نے کیا ہو۔علامہ طیبی فرماتے ہیں

جب مسلمانوں میں سے کسی ایک مسلمان نے کسی کافر کو امان دے دی تو کسی کیلئے بھی جائز نہیں کہ اس کے ذمہ کو توڑے۔ اگر چہ وہ مسلمان غلام ہی کیوں نہ ہو۔ ۔اھ، البتہ ہمارے امام اعظم نے غلام کی امان کا اعتبار نہیں کیا۔ (کما ھو مقرر فی محلہ)

لہٰذا جو شخص کسی مسلمان کے عہد کو توڑے، بایں طور کہ جس کافر کو امان دی گئی تھی اسے قتل کر دیا، یا اس کا مال لوٹ لیا، اس پر اللہ کی' فرشتوں کی اور سب لوگوں کی لعنت ہے' نہ تو اس کے فرض قبول کئے جاتے ہیں اور نہ نفل۔

قوله :من والى قوما بغير اذن مواليه: یہ اس صحیفہ علی کا تیسرا الحکم ہے۔ یعنی جو شخص اپنی آزادی کی نسبت آزاد کرنے والے کی بجائے کسی دوسرے کی طرف کرے تو وہ مستحق لعنت ہے۔ بایں طور کی اپنے مولیٰ کے علاوہ کسی اور کو اپنا مولیٰ کہے یا قرار دے۔ "بغیر اذن موالیہ" کی قید کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ حکم عدم اذن کے ساتھ مقید ہے۔ (یعنی یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر مالک اجازت دے دے تو پھر غیر مالک کی طرف نسبت کرنا درست ہو جائے گا۔) بلکہ یہ قید اکثر کے اعتبار سے ہے (کہ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے) کہ اگر آزادی یافتہ غلام اپنے مالک سے اس بات کی اجازت چاہتا ہے کہ وہ اپنی آزادی کی نسبت اس کی بجائے کسی دوسرے کی طرف کرے تو وہ اس کی اجازت نہیں دیتا۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ کہا گیا ہے کہ یہاں ولاء موالات مراد ہے۔ ولاء عتق مراد نہیں ہے۔ مثلاً کوئی شخص اپنے باپ کے علاوہ کسی اور شخص کو اپنا باپ بتلائے۔ اور "بغیر اذن موالیہ" کی قید در حقیقت مانع کی طرف اشارہ ہے، اور وہ ہے ان کا حق اور انکی امانت۔ یہ کلام باعتبار غالب کے ہے بطور قید کے نہیں ہے، چنانچہ انتساب کی اجازت ہو تو تب بھی غیر کی طرف انتساب درست نہیں ہوگا۔

قوله :من ادعى الى غير ابيه ......الخ: "**ادعى**" :انتسب کے معنی میں ہے

"**او تولى غير ابيه**": اس عطف سے ان حضرات کی تائید ہوتی ہے جنہوں نے "موالات" کی تفسیر "ولاء عتاقہ" کے ساتھ کی ہے۔

اس آخری حکم میں دو افراد کیلئے ایک ہی وعید ذکر فرمائی، چونکہ عتق اس حیثیت سے کہ وہ "**لحمة كلحمة النسب**" ہے، تو جب وہ اصل شخص سے ہٹ کر کسی غیر کی طرف نسبت کرے گا تو یہ اس شخص کی مانند ہوگا جو اپنے اصل (یعنی اصل باپ) سے براءت کا دعویٰ کرے۔ اور اپنے آپ کو کسی غیر کی طرف منسوب کرے۔ چنانچہ یہ شخص بددعا کا مستحق ہوگا۔

حرمت مدینہ کا بیان

۲۷۲۹: وَعَنْ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنِّى اُحَرِّمُ مَا بَيْنَ لَا بَتَيِ الْمَدِيْنَةِ اَنْ يُّقْطَعَ عِضَاهُهَا اَوْ يُقْتَلَ صَيْدُ هَا وَقَالَ الْمَدِيْنَةُ خَيْرٌ لَّهُمْ لَوْ كَانُوْ ا يَعْلَمُوْنَ لَا يَدَعُهَا اَحَدٌ رَغْبَةً عَنْهَا اِلَّا اَبْدَلَ اللّٰهُ فِيْهَا مَنْ هُوَ خَيْرٌ مِّنْهُ وَلَا يَثْبُتُ اَحَدٌ عَلٰى لَاْوَائِهَا وَجَهْدِ هَا اِلَّا كُنْتُ لَهٗ شَفِيْعًا اَوْ شَهِيْدًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ۹۹۲/۲ الحديث رقم (۴۵۹۔ ۱۳۶۳) واحمد فى المسند ۱۸۱/۱۔

ترجمه: حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تحقیق میں مدینہ کے پہاڑوں کے دونوں کناروں کے درمیان حرام کرتا ہوں کہ اس کے خاردار درخت، کاٹے جائیں یا مارا جائے اس کا شکار اور فرمایا مدینہ بہتر ہے ان کے واسطے یعنی اس کے مومنین کے رہنے والوں کے لیے دنیا اور آخرت میں اگر اس کی بھلائی کو جان لیں۔ تو اس کو نہ چھوڑیں اور نہ وہاں سے جائیں اور نہ چھوڑے گا۔ اس کو کوئی بے رغبتی سے بلکہ اللہ تعالیٰ اس میں اس شخص کو بدلے گا کہ وہ بہتر ہوگا اس سے یعنی مدینہ کو اس کے نہ ہونے سے ضرر نہیں ہوگا۔ بلکہ اس کے لیے مفید ہوگا یعنی کوئی اس کی سختی اور بھوک پر صبر نہیں کرے گا اور اس کی مشقت پر مگر میں اس کے واسطے شفاعت کرنے والا ہوگا۔ فرمایا کہ گواہ ہونگا یعنی اس کی اطاعت کا قیامت کے دن اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے

تشریح: قوله :انی احرم ما بین لابتی المدینة،ان یقطع او یقتل صیدها:

" انی احرم ": یعنی میں مدینہ کے دونوں پہاڑوں کے کناروں کے درمیان کو قابل تعظیم یا ممنوع قرار دیتا ہوں۔

''أن یقطع'':مفعول سے ''بدل الاشتمال'' ہے۔''عضاه'': عضة کی جمع ہے،حروف اصلیہ میں سے ''ھاء'' محذوف ہے۔ ہروہ بڑا درخت جو کانٹے دار ہو۔

قوله :المدینة خیرلهم: اگر فتح سے قبل ہو تو مطلق مراد ہے،اور اگر فتح مکہ کے بعد ہے تو غیر مکہ کی قید کے ساتھ مقید ہوگا۔یا معیشت میں برکت کے اعتبار سے ''خیر'' ہونا مراد ہے۔چنانچہ یہ فضیلت مکہ مکرمہ کو حاصل فضیلت زائدہ کے منافی نہیں۔

قوله :لا یدعها احد رغبة عنها إلا أبدل الله فیها من هو خیر منه: " لا یدعها": جملہ مستانفہ مبینہ ہے۔

إلا أبدل الله فیها: مطلب یہ ہے کہ اس غیر صابر کے مدینہ منورہ میں نہ ہونے سے مدینہ منورہ کو کوئی نقصان نہیں ہے، بلکہ اس جیسے شخص کا نہ ہونا مفید ہے، کہ چلو اس کا شر اس بقعہ مبارکہ سے کہیں اور منتقل ہوگیا۔حدیث مبارکہ کے اس جملہ کی نظیر یہ آیت کریمہ ہے: ﴿**وإن تتولوا یستبدل قوما غیرکم ثم لا یکونوا أمثالکم**﴾ اور کہا گیا ہے کہ یہ ''ابدال'' نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ کے ساتھ خاص تھا۔بظاہر یہ مطلق ہے،تمام احوال وایّام کو شامل ہے۔

قوله :ولایثبت احد علی لاوائها وجهدها الا کنت شفیعا او شهیدا یوم القیامة:

لأواء: پہلا ہمزہ ساکن ہے،اور ابدال کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے۔اس کے معنی ہیں سخت قسم کی بھوک۔

جهد: جیم کے فتحہ نیز ضمہ کے ساتھ،بمعنی مشقت یعنی یہاں کی گرمی شدت، پردیس کی مشقت،اور یہاں رہنے والے بدعتی لوگوں سے اہل سنت کو پہنچنے والی اذیتیں۔

لا یثبت أحد علی لأوائها: جوہریؒ فرماتے ہیں:''اللأواء'' کے معنی ہیں" الشدة"۔اور یہاں لأواء سے مراد یہاں قحط اور معیشت کی تنگی ہے۔جیسا کہ اکثر روایات میں **علی لأواء ها و شدتها** کے الفاظ ہیں۔لہٰذا ان دونوں کے معنی میں قدرے اختلاف ضروری ہے،اگر چہ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ عطف تفسیری وتاکیدی ہو چونکہ: **التأسیس أولٰی ، والأصل فی العطف التغایر**۔

شفیعا أوشهیدا: کہا گیا ہے کہ ''أو' راوی کے شک کا بیان ہے۔یہ بات انتہائی مستبعد ہے چونکہ بہت سارے صحابہؓ نے اس حدیث کو اسی طرح روایت کیا ہے،اور متعدد صحابہ کا شک پر متفق ہونا بعید معلوم ہوتا ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ بیان تقسیم کیلئے ہے۔**أی شفیعا للعاصی شهیدا للمطیع أو شهیدا لمن مات فی زمانه شفیعا لمن مات بعده**۔اور کہا گیا ہے کہ ''أو'' بمعنی ''واوَ'' ہے۔

اس جملہ میں اشارہ ہے کہ اس کا خاتمہ بالخیر ہوگا۔قاضیؒ فرماتے ہیں: آنحضرتؐ کا گناہگاروں کیلئے عمومی شفاعت فرمانا،اور ساری امت پر گواہی دینا وہ تو ہے ہی، حدیث باب میں مذکور یہ فضیلت ایک اضافی خصوصیت ہے۔نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے شہداء احد کے بارے میں فرمایا:**أنا شهید علی هؤلاء**۔چنانچہ ان حضرات کی تخصیص ان کی قدرومنزلت کی رفعت کو بیان کررہی ہے۔

اس حدیث میں یہ تنبیہ بھی ہے کہ مؤمن کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ صبر کا مظاہرہ کرے، بلکہ حرمین شریفین (یعنی مکہ مکرمہ ومدینہ منورہ) کی اقامت پر اللہ تعالیٰ کا شکر کرتا رہے نیز یہ کہ وہ ان مقدس شہروں کے علاوہ کی ظاہری نعمتوں پر نظر نہ کرے۔چونکہ اصل اعتبار تو آخرت کی حقیقی نعمتوں کا ہے۔جیسا کہ حدیث میں آتا ہے:

اللّٰهم لا عیش الا عیش الاخرة ۔

''اے اللہ! آخرت کی راحت وآرام کے علاوہ اور کوئی راحت وآرام نہیں ہے''۔

اور ایک حدیث میں آیا ہے: من صبر علی حر مکة ساعة تباعد من نار جهم مائتی سنة۔
کسی کہنے والے نے کیا ہی خوب کہا:

إذا لم یطب فی طیبة عند طیب تطیب به الدنیا فأین تطیب

اللہ جل شانہ کا فرمان ہے: ﴿ألم یروا أنا جعلنا حرما أمنا ویتخطف الناس من حولهم﴾ ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ﴿فلیعبدوا رب هذا البیت الذی أطعمهم من جوع و آمنهم من خوف﴾ [قریش:] حیات طیبہ کی اصل یہ ہے کہ رزق پہنچتا رہے اور امن حاصل ہو۔ امن ہی درحقیقت کمال رفق ہے۔

مدینہ منورہ کی سکونت کی فضیلت

۲۷۳۰: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا یَصْبِرُ عَلَی الْاَوْاءِ الْمَدِیْنَةِ وَشِدَّتِهَا اَحَدٌ مِّنْ اُمَّتِیْ اِلَّا کُنْتُ لَهٗ شَفِیْعًا یَوْمَ الْقِیَامَةِ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۱۰۰٤/۲ الحدیث رقم (٤٨٤۔ ۱۳۷۸)۔ ومالك فی الموطأ ۸۸٥/۲ الحدیث رقم ۳ من کتاب المدینة۔ واحمد فی المسند ۲۸۸/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تحقیق نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص مدینہ کی سختی اور بھوک پر اور محنت پر میری امت میں سے صبر کرے گا میں اس کیلئے شفاعت کرونگا قیامت کے دن اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔
عرض مرتب: تشریح کیلئے پچھلی حدیث ملاحظہ فرمائیے۔

نیک پھل دیکھ آپ ﷺ مدینہ کے لیے دُعا فرماتے

۲۷۳۱: وَعَنْهُ قَالَ کَانَ النَّاسُ اِذَا رَاَوْا اَوَّلَ الثَّمَرَةِ جَاءُ وْا بِهٖ اِلَی النَّبِیِّ ﷺ فَاِذَا اَخَذَهٗ قَالَ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِیْ ثَمَرِنَا وَبَارِكْ لَنَا فِیْ مَدِیْنَتِنَا وَبَارِكْ لَنَا فِیْ صَاعِنَا وَبَارِكْ لَنَا فِیْ مُدِّنَا اَللّٰهُمَّ اِنَّ اِبْرَاهِیْمَ عَبْدُكَ وَخَلِیْلُكَ وَنَبِیُّكَ وَاِنِّیْ عَبْدُكَ وَنَبِیُّكَ وَاِنَّهٗ دَعَاكَ لِمَکَّةَ وَاَنَا اَدْعُوْكَ لِمَدِیْنَةِ بِمِثْلِ مَا دَعَاكَ لِمَکَّةَ وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ ثُمَّ قَالَ یَدْعُوْ اَصْغَرَ وَلِیْدٍ لَّهٗ فَیُعْطِیْهِ ذٰلِكَ الثَّمَرَ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۱۰۰۰/۲ الحدیث رقم (٤٧٣۔ ۱۳۷۳) والترمذی فی السنن ٤٧٢/٥ الحدیث رقم ۳٤٥٤۔ وابن ماجه فی ۱۱۰٥/۲ الحدیث رقم ۳۳۲۹۔ والدارمی فی ۱٤٥/۲ الحدیث رقم ۲۰۷۲۔ ومالك فی الموطأ ۸۸٥/۲ الحدیث رقم ۲ من کتاب المدینة، واحمد فی المسند ۳۳۰/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ لوگ جس وقت نیا پھل دیکھتے تو حضور ﷺ کے پاس لے کر آتے تھے تو جس وقت حضور ﷺ لیتے تو کہتے اے الٰہی ہمارے واسطے ہمارے میوے ہمارے شہر ہمارے صاع اور ہمارے مد میں برکت دے۔ اے الٰہی تحقیق ابراہیم تیرا بندہ ہے اور تیرا گہرا دوست ہے اور تیرا نبی ہے اور تحقیق میں تیرا بندہ اور تیرا نبی ہوں اور ابراہیم نے تجھ سے مکہ کے لئے دعا کی تھی جو کہ اس آیت میں مذکور ہے: ﴿فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ﴾ اور میں تجھ سے مدینے کے لیے دعا کرتا ہوں جس طرح ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کے واسطے کی تھی اور مثل اس کے اس کی دعا کے

ساتھ یعنی اس کی دعا کے دوگنا ہونے کے ساتھ پھر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اہل بیت میں سے سب سے چھوٹے بچے کو بلاتے اور اس کو پھل دیتے۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :كان الناس اذا رأوا أول ثمرة جاء وا به الى النبى صلى اللہ علیہ وسلم :

''**أول ثمرة**'': اس کو باکورہ اور اُنموذج بھی کہتے ہیں۔ **جاؤوا به**: ضمیر اول ثمر کی طرف راجع ہے اور ایک نسخہ میں **جاؤوا بها** ہے۔ اس صورت میں توجیہ یہ ہے کہ یہاں مضاف الیہ سے اکتساب ثانیث کیا ہے۔

قوله :اللهم بارك فى ثمرنا...... وبارك لنا فى مدنا:

''**اللهم بارك فى ثمرنا**'': یعنی اے اللہ! ہمارے پھلوں میں حسی اور معنوی برکت عطا فرما۔

''**و بارك لنا فى مدينتنا**'': ہمارے شہر میں برکت عطا فرما' یعنی شہر کی ذات میں از روئے وسعت برکت عطا فرما، یہاں کے رہنے والوں کو وسعت عطا فرما۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اس طرح قبول ہوئی کہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں توسیع ہوئی، اس کے اطراف میں توسیع ہوئی، مسلمان کثیر تعداد میں یہاں آباد ہوئے، حتی کہ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں جب مدینہ میں موجودان گھوڑوں کو شمار کیا گیا جو جہاد کیلئے تیار کئے تھے ان کی تعداد چالیس ہزار تھی۔

بارك لنا فى صاعنا...... مدنا: صاع ایک پیمانہ کا نام تھا اور مد بھی ایک پیمانہ کا نام تھا۔ مد صاع سے کم ہوتا ہے۔ صاع اور مد میں برکت سے مراد یہ ہے کہ ان کے ذریعے تولے جانے والے رزق میں کمیت و کیفیت کے اعتبار سے فراخی عطا فرما۔

عرض مرتب: ملا علی قاریؒ نے یہاں نبی و رسول کے درمیان فرق کی طویل بحث چھیڑی ہے۔ ہم نے وہ بحث یہاں سے حذف کر دی ہے اھ۔

قوله :وانى عبدك ونبيك: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حبیب ہونے کا ذکر نہیں کیا۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں:

(۱) بسبب تواضع اپنی یہ صفت ذکر نہیں کی۔ (۲) ممکن ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر کی ہو لیکن راوی اس کا ذکر بھول گئے ہوں۔

(۳) ممکن ہے جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی ہو اس وقت تک آپ کو اپنے حبیب ہونے کا علم نہ ہوا ہو۔

قوله وانه دعاك لمكة ......ومثله معه:

ثم قال:يدعو أصغر وليد فيعطيه ذلك الثمر:

سید جمال الدین مصابیح میں لکھتے ہیں: قال :**ثم يدعوا**۔ میں اسی کو درست سمجھتا ہوں۔

''**وليد**'': مکبّر ہے، اور کہا گیا ہے کہ تصغیر کے ساتھ ہے۔ **أى ولد صغير**۔ مفاتیح میں لکھا ہے کہ جب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام دعا مانگ کر فارغ ہو جاتے تو اپنے اہل بیت میں سے سب سے چھوٹے بچہ کو بلواتے۔ بعض کا کہنا ہے کہ مطلق مراد ہے۔ یعنی کسی چھوٹے بچے کو بلواتے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: **ثم يعطيها أصغر وليد يحضره من الولدان** اھ۔ اس میں تقیید و اطلاق دونوں کا احتمال ہے۔ اور تعدّد پر حمل کرنا بھی ممکن ہے۔

بعض کا کہنا ہے کہ صغیر کی تخصیص اس وجہ سے تھی کہ چھوٹے بچے نیا پھل دیکھ کر بہت ہی خوش ہوتے ہیں۔

کہا گیا ہے کہ اس میں تنبیہ ہے کہ نفوس کاملہ کیلئے یہ بات مناسب نہیں کہ وہ انواع باکورہ میں سے کچھ بھی اس وقت تک استعمال کریں کہ جب تک وہ چیز عام نہ ہو جائے اور ہر شخص اس کے کھانے پر قادر نہ ہو جائے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ روایت مطلق ہے، اور متن کی روایت مقید ہے۔ چنانچہ متن کی روایت میں تاْمیل کی جائے۔ یہ 'انسب' ہے۔ یا مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے۔

عصام الدینؒ شرح شمائل میں فرماتے ہیں: وقوله :**يدعو أصغر وليد يستمد بسرور قلبه على إجابة دعائه** :اس جملہ کے بابت ذکر کردہ اقوال میں یہ توجیہ سب سے لطیف ہے، چونکہ باکورہ اور ولید میں گہری مناسبت ہے، وہ یہ کہ دونوں ہی قرب عہد بالا یجاد ہوتے ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ محل نظر ہے، باوجود یہ کہ جمع میں کوئی مانع نہیں۔

فرمایا: بعض روایات میں: **ثم يدعو أصغر وليد له** آیا ہے، ہوسکتا ہے کہ **له**، **يدعو** کے متعلق ہو، ولید کیلئے قید نہ ہو۔ أی: **يدعوا للثمر**۔ چنانچہ یہ روایت اطلاق وتقید کے مخالف نہ ہوگی اھ۔ اس توجیہ کا بعید ہونا مخفی نہیں۔

تحقیقی بات یہ ہے کہ دونوں روایتیں دو الگ الگ حالتوں پر محمول ہیں۔ اور مطلب یہ ہے کہ جب آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے آس پاس کہیں کوئی اپنا بچہ ہوتا تو اس کو عنایت فرماتے، اور اگر کسی اور کا بچہ ہوتا تو اس کو عنایت فرما دیتے، اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ جب کوئی اپنا بچہ بھی پاس ہوتا ہوگا، اور کسی اور کا بچہ بھی پاس ہوتا ہوگا تو دونوں کو عنایت فرما دیتے ہوں گے۔ ہاں جب پاس کوئی بھی بچہ نہ ہوتا ہوگا تو بلا شبہ ایسی صورت میں اپنے اہل میں سے کسی بچہ کو بلا لیتے ہوں گے۔ چونکہ وہ اس حسن سلوک کا دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ حق دار ہے۔

حرمت مدینہ کا بیان

۲۷۳۲:وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ اِنَّ اِبْرَاهِیْمَ حَرَّمَ مَكَّةَ فَجَعَلَهَا حَرَامًا وَاِنِّی حَرَّمْتُ الْمَدِیْنَةَ حَرَامًا مَا بَیْنَ مَازِمَیْهَا اَنْ لَّا یُهْرَاقَ فِیْهَا دَمٌ وَلَا یُحْمَلَ فِیْهَا سِلَاحٌ لِقِتَالٍ وَلَا تُخْبَطُ فِیْهَا شَجَرَةٌ اِلَّا لِعَلَفٍ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۲/۱۰۰۱ الحدیث رقم (۴۷۵۔ ۱۳۷۴) واحمد فی المسند۔

ترجمہ: حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے فرمایا کہ ابراہیمؑ نے مکے کو بزرگی دی۔ یعنی ظاہری بزرگی۔ پس اس کو حرام گھر دانا یعنی شمار کیا اور تحقیق میں نے مدینہ منورہ کو بزرگی دی۔ اس کی دونوں طرفوں کے درمیان اس کے ساتھ کہ خون ریزی نہ کی جائے اس میں اور نہ اس میں ہتھیار اٹھایا جائے لڑائی کے لیے اور نہ اس میں درخت کو جھاڑا جائے یعنی درخت کے پتے مگر جانوروں کے کھانے کے واسطے اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله :ان ابراهيم حرم مكة فجعلها حراما وانی حرمت المدينة حراما بين مازميها**:

''حراما'': منصوب علی المصدر ہے۔ حرمت فعل کیلئے بغیر لفظہ اور یہ بھی ممکن ہے کہ علی حذف الزوائد ہو، یعنی فعل مقدر کیلئے مفعول مطلق ہو۔ أی **حرمت فحرمت**۔

ما بين: کہا گیا ہے کہ مفعول ثانی ہے، اور زیادہ واضح بات یہ ہے کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔

مأزم: میم کے فتحہ، ہمزہ کے سکون اور زاء کے کسرہ کے ساتھ، ہمزہ کو ابدال کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے۔ أی **الموضع الضيف بين الجبال، حيث يلتقى بعضها ببعض ويستمع ما وراء ه**، اس سے مدینہ کی دونوں جانبیں مراد ہیں۔

قوله :أن لايهراق فيها دم ،ولايحمل فيها سلاح:

''**لايهراق**'': ھاء کے فتحہ وسکون کے ساتھ، اور حرف جر محذوف ہے: أی :**بأن لا يراق**۔

فيها دم: کہا گیا ہے کہ یہ حدیث کا مفعول ہے اور **لا** زائدہ ہے۔ اس کی مثال یہ آیت کریمہ ہے: ﴿**لئلا يعلم أهل الكتاب**﴾۔

أی: لکی یعلم۔ یا مفعول له ہے۔ أی: لئلا یهراق۔ یا ما حرم کی تفسیر ہے۔ أی: أن لا یسفك بها دم۔

قوله: و لا تخبط فیها شجرة الا لعلف: " لا تخبط ": اس کو بصیغۂ مذکر و مؤنث دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔

لعلف: لام کو ساکن و متحرک دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے۔ صاحب النہایۃ لکھتے ہیں: باسکان اللام مصدر علفت علفا، وبالفتح اسم الحشیش والتبن والشعر ونحوها۔

عرض مرتب: ملا علی قاریؒ نے اس حدیث کے تحت مدینہ کے حرم ہونے پر طویل بحث کی ہے۔ ہم نے اس بحث کو یہاں سے حذف کر کے آغاز باب میں ذکر کیا ہے، وہاں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

مدینہ منورہ کے درخت کاٹنے کی ممانعت

۲۷۳۳: وَعَنْ عَامِرِ بْنِ سَعْدٍ اَنَّ سَعْدًا رَكِبَ اِلٰی قَصْرِهٖ بِالْعَقِيْقِ فَوَجَدَ عَبْدًا يَقْطَعُ شَجَرًا اَوْ يَخْبِطُهٗ فَسَلَبَهٗ فَلَمَّا رَجَعَ سَعْدٌ جَاءَهٗ اَهْلُ الْعَبْدِ فَكَلَّمُوْهُ اَنْ يَّرُدَّ عَلٰى غُلَامِهِمْ اَوْ عَلَيْهِمْ مَا اَخَذَ مِنْ غُلَامِهِمْ فَقَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ اَرُدَّ شَيْئًا نَفَّلَنِيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَاَبٰى اَنْ يَّرُدَّ عَلَيْهِمْ۔ (رواہ مسلم).

اخرجه مسلم فی صحیحه ۹۹۳/۲ الحدیث رقم (۴۶۱۔ ۱۳۶۴) واحمد فی المسند ۱۶۸/۱۔

ترجمہ: حضرت عامر بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سعد رضی اللہ عنہ اپنے محل کی طرف سوار ہوئے جو کہ عقیق مقام پر واقع تھا پس ایک غلام کو پایا کہ اس کے درخت کاٹتا تھا یا پتے جھاڑتا تھا۔ پس سعد رضی اللہ عنہ نے اس کے کپڑے چھین لے۔ پس جب سعد رضی اللہ عنہ مدینہ کی طرف آئے تو غلام کے مالک ان کے پاس آئے اور گفتگو کی یہ کہ جو چیز آپؓ نے اس غلام سے لی ہے (یعنی اس کے کپڑے) وہ اس کو واپس کر دیں یا اس کے مالکوں کو واپس کر دیں یعنی اس کے کپڑے پس سعدؓ نے کہا۔ خدا کی پناہ یہ کہ میں لوٹا دوں اس کی طرف اس چیز کو جو مجھے نبی کریم ﷺ نے دلوائی ہے سعدؓ نہ مانے۔ اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: ان سعدا رکب الی قصره ......ما آخذ من غلامهم:

"**العقیق**": مدینہ کے قریب واقع ایک جگہ کا نام ہے اور ابن حجرؒ کا کہنا ہے کہ ذو الحلیفہ کی حدود میں ہے۔ اس کے ایک راستہ کی مانند ہے۔

"**یخبطه**": باء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ (پتھر وغیرہ مار کر پتے جھاڑنا)

"**فسلبه**": (بصیغۂ فعل ماضی معروف ہے۔) اور " **سلب** " سین اور لام کے فتحہ کے ساتھ بمعنی " **مسلوب** " آتا ہے۔

قوله: فکلموه ان یرد علی ...... وأبی أن یردعلیهم:

"**علی غلامهم او علیهم**": راوی کو شک ہے (کہ کیا الفاظ ارشاد فرمائے تھے)۔

"**معاذ الله**": میم کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ فعل مقدر کا مصدر (یعنی مفعول مطلق) ہے۔ **ای اعوذ بالله معاذا**

"**نفلنیه**": **أی جعلنیه نفلا أو أعطانیه نفلا ای غنیمة** ۔ یعنی نبی کریم ﷺ نے ہر اس شخص کو سلب لینے کی اجازت دی تھی کہ جو کسی کو یہاں شکار کرتا ہوا دیکھے یا درخت کاٹتا ہوا دیکھے۔

وأبی أن یرد: اور ایک روایت میں یوں ہے: **فلا أرد علیکم طعمة أطعمنیها رسول الله ﷺ، ولکن إن شئتم دفعت إلیکم ثمنه**۔ اور ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں: **انه کان یخرج فیجد الحاطب معه شجر رطب فیسأله فیکلم فیه**

فيقول: لا أدع غنيمة غنمنيها رسول الله ﷺ، وإني لمن أكثر الناس مالا۔ یہ حدیث منسوخ ہے، یا مؤول ہے جیسا کہ ماقبل میں گزرا۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ امام مالک اور امام شافعیؒ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ مدینہ میں شکار کرنے یا درخت کاٹنے کی وجہ سے بدلہ (کفارہ) واجب نہیں ہوتا البتہ ایسا کرنا حرام ہے اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ جس طرح مکہ میں (ان چیزوں کے ارتکاب سے) جزاء واجب ہوتی ہے اسی طرح مدینہ میں بھی (ان چیزوں کے ارتکاب سے) جزا واجب ہوتی ہے، اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ چیزیں حرام بھی نہیں ہیں۔ اھ۔ یہ ہمارا مذہب ہے، البتہ مکروہ ہیں، جیسے کہ ماقبل میں گذرا۔

مدینہ منورہ کے لیے برکت کی دعا

۲۷۳۴: وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ لَمَّا قَدِمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْمَدِيْنَةَ وُعِكَ اَبُوْبَكْرٍ وَبِلَالٌ فَجِئْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَاَخْبَرْتُهٗ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ حَبِّبْ اِلَيْنَا الْمَدِيْنَةَ كَحُبِّنَا مَكَّةَ اَوْ اَشَدَّ وَصَحِّحْهَا وَبَارِكْ لَنَا فِيْ صَاعِهَا وَمُدِّهَا وَانْقُلْ حُمَّاهَا فَاجْعَلْهَا بِالْجُحْفَةِ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاري في صحيحح ٩٩/٤۔ الحديث رقم ١٨٨٩۔ ومسلم في صحيحه ١٠٠٣/٢ الحديث رقم (٤٨٠۔ ١٣٧٦)۔ ومالك في الموطأ ٨٩٠/٢ الحديث رقم ١٤ من كتاب الجامع۔ واحمد في المسند ٥٦/٦۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب نبی کریم ﷺ مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ اور بلال رضی اللہ عنہ بخار میں مبتلا ہو گئے پھر میں نبی کریم ﷺ کے پاس آئی اور میں نے ان کو خبر دی۔ پس فرمایا اے الٰہی تو مدینہ منورہ کو ہمارا محبوب بنا دے جس طرح تو نے مکہ کو ہمارا محبوب بنایا تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ محبوب بنا دے تو مدینہ کی آب وہوا کو درست کر اور ہمارے واسطے اس کے صاع اور مد میں برکت ڈال دے اور اس کی تپ (یعنی بخار) کو نکال یعنی تپ کی شدت و کثرت کو نکال کر جحفہ میں منتقل فرما۔ اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :وعك ابوبكر وبلال فاخبرته: "وعك": صیغۂ مجہول کے ساتھ ہے۔ بمعنی: حُمَّ۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: الوعك: الحمى۔ اور کہا گیا ہے کہ بخار کے درد و تکلف کو کہتے ہیں۔

" فاخبرته: "اس کا پس منظر یہ ہے کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ شدت بخار میں مبتلا ہوئے تو حضرت عائشہؓ ان کی مزاج پرسی کے لئے تشریف لے گئیں اور ان سے پوچھا ابا جان کیا حال ہے؟ تو آپؓ نے یہ شعر کہا:

كل امرىء مصبح في أهله والموت أدنى من شراك نعله

اور جب حضرت بلالؓ کا بخار ٹوٹا تو انہوں نے بآواز بلند یہ شعر کہے:

ألا ليت شعري هل أبيتن ليلة بواد وعندي أذخر و جليل

وهل أردن يوما مياه مجنة وهل تبدون لي شامة وطفيل

شامہ اور طفیل دو پہاڑ تھے۔ جلیل اور میاہ مجنۃ مکہ کے قریب چشمے تھے۔ آپؓ مکہ کو یاد کرتے، مکہ کی صحت افزا آب وہوا یاد آتی، مکہ کے میٹھے پانیوں کی یاد ستاتی، مکہ کے پہاڑوں کی لطافت اور نباتات یاد آتے اور مکہ کی نبات کی ہواؤں کے جھونکے جو بمنزلہ ان کے بچے بچیوں کے تھے، رہ رہ کر یاد آتے تھے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ نے آنحضرت ﷺ سے ان حضرات کا حال ذکر کیا تو آپ ﷺ نے مذکورہ بالا دعا فرمائی۔

قوله :اللهم حبب الينا المدينة......في صاعها ومدها:

''أو أشد'':(أو بمعنی ''بل'' ہے) أی: بل اکثرو اعظم۔ اور اس کی تائید ایک روایت سے بھی ہوتی ہے کہ جس میں ''وأشد'' کے الفاظ ہیں۔ ابن حجرؒ وغیرہ نے اس ''أو'' کا برائے شک ہونا بھی جائز قرار دیا ہے، لیکن یہ درست نہیں کیونکہ اس صورت میں کلام گویا ہوجائے گا: كحبنا اشد: اہل علم کیلئے یہ تکلف مخفی نہیں۔

یہ روایت پچھلی روایت کے منافی نہیں، کہ آپ نے مکہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا:إنك أحب البلاد إليّ، وإنك أحب أرض الله إلى الله۔ اور ایک روایت میں ہے:لقد عرفت أنك أحب البلاد إلى الله وأكرمها على الله۔ اس سے مبالغہ مراد ہے۔ یا یہ کہ جب اللہ تعالیٰ نے مہاجرین پر مدینہ کی مجاورت، ترک وطن کو لازم قرار دیا، اور مکہ کے سکون کو خیر باد کہنے کا حکم دیا تو اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے قلوب میں مدینہ کی محبت مزید بڑھ جائے، تاکہ کسی بھی غرض کے پیش نظر وہ (کسی اور جانب) ادنیٰ سا بھی میلان رکھیں۔ چونکہ یہاں محبت سے مراد محبت زائدہ ہے، وہ محبت مراد نہیں ہے جو کثرت مثوبہ پر مرتب ہوتی ہے۔ چنانچہ حیثیت مختلف ہے۔

''بارك لنا في صاعها ومدها'': اور ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: اللهم اجعل بالمدينة ضعفي ما بمكة من البركة۔ یہاں بھی باہمی کوئی تضاد نہیں، چونکہ مکہ کیلئے جو مضاعفہ مثوبہ مخصوص ہے وہ اہل مدینہ کیلئے نہیں ہے۔

فقوله :وانقل حماها فاجعلها جحفة:

خطابیؒ وغیرہ فرماتے ہیں اس وقت ''جحفہ'' میں یہود آباد تھے۔

اللہ جل شانہ نے آپ کی اس دعا کو بھی شرف قبولیت بخشا، چنانچہ بخاری کی وباء وہاں منتقل ہوگئی، حتی کہ جو شخص جحفہ کا پانی پیتا اسے بخار چڑھ جاتا، مزید یہ کہ اگر کوئی پرندہ جحفہ کی فضا سے گزر جاتا تو اس کو بھی بخار ہوجاتا تھا۔

مدینہ کی وباء کا ذکر

۲۷۳۵: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ فِي رُؤْيَا النَّبِيِّ ﷺ فِي الْمَدِيْنَةِ رَأَيْتُ امْرَأَةً سَوْدَاءَ ثَائِرَةَ الرَّأْسِ خَرَجَتْ مِنَ الْمَدِيْنَةِ حَتّٰى نَزَلَتْ مَهْيَعَةَ فَتَأَوَّلْتُهَا اَنَّ وَبَاءَ الْمَدِيْنَةِ نُقِلَ اِلٰى مَهْيَعَةِ وَهِيَ الْجُحْفَةُ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۴۲٦/۱۲ الحدیث رقم ۷۰۳۹۔ والترمذی فی السنن ٤٦٩/٤ الحدیث رقم ۲۲۹۰۔ وابن ماجه فی ۱۲۹۳/۲ الحدیث رقم ۳۹۲٤۔ والدارمی فی ۱۷٤/۲ الحدیث رقم ۲۱٦۱۔ واحمد فی المسند ۱۰۷/۲۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب دیکھنے کے بارے میں مدینہ کی بابت کہ میں نے ایک کالی عورت پراگندہ بالوں والی دیکھی مدینہ منورہ سے نکلی۔ یہاں تک کہ وہ مھیعۃ میں اتری۔ جو کہ ایک جگہ کا نام ہے پس تعبیر ٹھہرائی میں نے اس کی اور تحقیق مدینہ کی وبا ہے کہ مھیعۃ کی طرف گئی جو کہ جحفہ کا نام ہے اس کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :قال:رأيت امرأة سوداء......حتى نزلت مهيعة:

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں اصل عبارت یوں ہے قال في حديث رؤيا النبي ﷺ في شأن المدينة: رأيت الخ، چنانچہ ''رأيت'' حکایت خواب ہے جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرما رہے ہیں۔

''مهيعة'': ھاء ساکن ہے۔البقعة الأرض المبسوطة الواسعة۔

قوله :فتأولتها ان وباء المدينة ......وهى الجحفة:" تاویل": کے معنی ہیں:تفسير الشيئ بما يؤول إليه۔
"وباء":مدّ وقصر،مرض عام کو بھی کہتے ہیں،اور عام ہلاکتوں کو بھی۔اور کبھی اس کا اطلاق اس زمین پر بھی ہوتا ہے کہ جس میں امراض کی کثرت ہو۔خصوصاً پردیسیوں کیلئے کہا جاتا ہے۔
"أرض مهيعة": أى مبسوطة۔ یہ جگہ اسی نام سے معروف تھی،جب سیلاب لوگوں کو بھی بہا کر لے گیا تو اس جگہ کو جحفہ کہا جانے لگا۔
وهي الجحفة: یہ جملہ کسی راوی کی طرف سے بیان کردہ تفسیر ہے۔اصمعیؒ فرماتے ہیں:لم يولد بغدير خم أحد فعاش إلى أن يحتلم إلا أن يتحوّل منها۔غدیر خم جحفہ میں واقع ہے۔
یہاں ایک اشکال ہوتا ہے وہ یہ کہ مدینہ ایک وبائی مقام تھا۔مسلمان وہاں قدم برنجاں کیوں ہوئے؟ حالانکہ حدیث صحیح میں دباء والی جگہ پر جانے کی ممانعت آئی ہے۔امام نوویؒ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ مدینہ تشریف آوری اس نہی سے پہلے ہو چکی تھی۔دوسرا جواب یہ دیا کہ حدیث نہی میں وباء سے مراد ایسی وباء ہے جو پھیلی ہو،جیسا کہ طاعون وغیرہ،چنانچہ مدینہ میں اس قسم کی کوئی وباء نہیں تھی کہ وہاں جانا حدیث نہی کے مخالف سمجھا جائے۔مدینہ مسئلہ صرف اتنا تھا کہ بخار شدید ہو جاتا تھا اور پھر طول پکڑ جاتا تھا۔نیز یہ معاملہ بیرون سے آنے والوں کے ساتھ پیش آتا تھا۔علاوہ ازیں یہ بخار ایسا بھی نہیں ہوتا تھا کہ جس کے سبب سے موت واقع ہو جائے۔

حضور ﷺ کی اہل مدینہ کے بارے میں پیشن گوئی

۲۷۳۶:وَعَنْ سُفْيَانَ بْنَ اَبِىْ زُهَيْرٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ يُفْتَحُ الْيَمَنُ فَيَأْتِىْ قَوْمٌ يَبُسُّوْنَ فَيَتَحَمَّلُوْنَ بِاَهْلِيْهِمْ وَمَنْ اَطَاعَهُمْ وَالْمَدِيْنَةُ خَيْرٌ لَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ وَيُفْتَحُ الشَّامُ فَيَأْتِىْ قَوْمٌ يَبُسُّوْنَ فَيَتَحَمَّلُوْنَ بِاَهْلِيْهِمْ وَمَنْ اَطَاعَهُمْ وَالْمَدِيْنَةُ خَيْرٌ لَّهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ وَيُفْتَحُ الْعِرَاقُ فَيَأْتِىْ قَوْمٌ يَبُسُّوْنَ فَيَتَحَمَّلُوْنَ بِاَهْلِيْهِمْ وَمَنْ اَطَاعَهُمْ وَالْمَدِيْنَةُ خَيْرٌ لَّهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ٩٠/٤۔ الحديث رقم ١٨٧٥۔ ومسلم فى صحيحه ١٠٠٩/٢ الحديث رقم (٤٩٧۔ ١٣٨٨)۔ ومالك فى الموطأ ٨٨٧/٢ الحديث رقم ٧ من كتاب الجامع۔ واحمد فى المسند ٢٢٠/٥۔

ترجمہ:حضرت سفیان بن ابی زہیرؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا فرماتے تھے۔کہ یمن فتح کیا جائے گا پس ایک قوم ہوگی پس اپنے اہل والوں کے ساتھ کوچ کریں گے اور اپنے تابعداروں کے اور مدینہ ان کے واسطے بہتر ہوگا اگر مدینہ کا بہتر ہونا جان لیں تو وہ اس کو نہ چھوڑیں اور شام فتح کی جائے پھر ایک قوم آہستہ چلیں گے۔وہ اپنے اہل والوں کے ساتھ کوچ کریں گے اور اپنے تابعداروں کے اور مدینہ ان کے لیے بہتر ہوگا ان کے لیے اگر وہ جان لیں تو مدینہ کو نہ چھوریں اور عراق فتح کیا جائے گا پس ایک قوم آئے گی چلیں گے پس وہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ کوچ کریں گے اور اپنے تابعداروں کے اور مدینہ ان کے لیے بہتر ہوگا اگر وہ جانیں تو مدینہ کو نہ چھوڑیں اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

سفیان بن ابی زہیر۔یہ "سفیان" ہیں "ابو زہیر" کے بیٹے ہیں۔ازدی ہیں قبیلہ شنوہ سے تعلق رکھتے ہیں' حجازیوں میں ان کی

حدیث مروج ہے ابن الزبیر وغیرہ ان سے روایت کرتے ہیں۔

تشریح: **قولہ :یفتح الیمن فیأتی قوم یبسون فیتحملون......والمدینة خیر لهم لوکانوا یعلمون :**

"**یفتح الیمن**": اس فعل کو بصیغہ تذکیر وتانیث دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔

"**فیأتی قوم**": اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ مدینہ میں ایسے لوگ ہونگے جو آہستہ رو ہونگے' جو محنت ومشقت سے دور رہ کر دنیا کی راحت وآرام کے طالب ہوں گے، چنانچہ وہ لوگ جب یمن پہنچیں گے تو بلاد یمن ،اور وہاں کی عیش وعشرت ان کا دل موہ لے گی ،اورانہیں مدینہ سے اپنے اہل وعیال کے ساتھ یمن ہجرت پر ابھارے گی، چنانچہ وہ لوگ اپنے اہل وعیال سمیت مدینہ چھوڑ کر چلے جائیں گے حالانکہ مدینہ ان کے لئے ہر جگہ سے بہتر جگہ ہوگی اگر وہ مدینہ کے بہتر ہونے کو جانیں تو مدینہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ کو ترجیح نہ دیتے۔

اور کوئی بعید نہیں کہ "لو" تمنائیہ ہو۔بعض کا کہنا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان علاقوں کی فتوحات کے ساتھ ساتھ لوگ مدینہ آکر آباد ہوں گے،حتی کہ اہل مدینہ کی تعداد بہت بڑھ جائے گی ،اور مدینہ ان کیلئے یمن ،شام اور عراق سے بہتر جگہ ہوگی اگر وہ جانیں۔

"**یبسّون**": کو دو طرح پڑھا جاسکتا ہے۔۱- مجرد سے، یأ کے فتحہ اور باء ضمہ کے ساتھ ،۲-مزید فیہ سے یاء کے ضمہ، باء کے کسرہ کے ساتھ۔سین دونوں صورتوں میں مشدد ہے۔کہا جاتا ہے: **أبست الدابة، وبستها۔ أی: سقتها أی یسیرون سیرا شدیدا**

"**والمدینة خیر لهم لوکانوا یعلمون**" :یہ جملہ حالیہ ہے۔ مدینہ اس اعتبار سے بہتر ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا حرم ہے،نزول وحی کا مستقر ہے،اور یہاں دنیوی اوراخروی برکات کا نزول ہوتا ہے۔

قولہ :یفتح الشام ...... یفتح العراق......والمدینة خیر لهم لوکانوا یعلمون :

قولہ :یفتح الشام :اس فعل کو بھی بصیغہ تذکیر وتانیث دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔

قولہ :یفتح العراق :اس فعل کو فقط بصیغہ تذکیر پڑھا گیا ہے۔

یہ حدیث بھی مدینہ کے مکہ سے افضل ہونے پر دلالت نہیں کرتی ۔مزید یہ کہ اس حدیث میں بعض اخبار غیب کا بیان ہے۔

مدینہ منورہ کی دوسری بستیوں پر فضیلت

۲۷۳۷ :وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اُمِرْتُ بِقَرْيَةٍ تَأْكُلُ الْقُرٰى يَقُوْلُوْنَ يَثْرِبُ وَ هِيَ الْمَدِيْنَةُ تَنْفِي النَّاسَ كَمَا يَنْفِي الْكِيْرُ خَبَثَ الْحَدِيْدِ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۸۷/٤۔ الحدیث رقم ۱۸۷۱۔ ومسلم فی صحیحه ۱۰۰٦/۲ الحدیث رقم (٤۸۸۔ ۱۳۸۲) والترمذی فی السنن ٦۷۷/٥ الحدیث رقم ۳۹۲۰ ومالك فی الموطأ ۸۸٦/۲ الحدیث رقم ٥ من كتاب الجامع۔ واحمد فی المسند ۳۸٤/۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے ہجرت کرنے کا حکم کیا گیا ہے ایسی بستی میں کہ وہ سب بستیوں پر غالب آتی ہے اس کو یثرب کہتے ہیں اور وہ مدینہ منورہ ہے مدینہ برے آدمیوں کو دور کرتا ہے جیسے بھٹی لوہے کی میل کو دور کرتی ہے اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کی ہے۔

تشریح: **قولہ :بقریة تأکل القری:**

"**بقریة**": یہاں مضاف محذوف ہے۔**أی ینسرولها، أو استیطانها۔**

" تأكل القرى": فائق میں لکھتے ہیں: یہاں تأكل سے مراد تفتح ہے۔ أي يفتح أهلها القرى۔ کہ اس بستی کے رہنے والے تمام بستیوں پر غالب رہتے ہیں۔ ان کے اموال باہم تقسیم کرتے ہیں۔ پس قری کی طرف اکل کی نسبت علىٰ سبيل التمثيل ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس بستی کی دوسری بستیوں پر فضیلت بتانا مقصود ہو۔ جیسا کہ عرب کہتے ہیں: هذا حديث يأكل الأحاديث۔ أي يفضلها۔ اور بعض حضرات فرماتے ہیں: "أكل" کے اصل معنی کسی شیئ کو فناء کرنے کے ہیں۔ پھر یہ لفظ فتوح بلاد اور سلب اموال کیلئے بطور استعارہ استعمال ہونے لگا۔ جو گویا کہ یوں فرمایا گیا ہے: يأكل أهلها القرىٰ۔ یا یہ کہا جائے کہ "قریٰ" کی طرف "اکل" کی نسبت اس لئے کی گئی ہے کہ اموال ان شہروں میں جمع اور فناء ہوں گے۔

"جو تمام بستیوں پر غالب رہتی ہے" کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ مدینہ میں رہتے ہیں وہ دوسرے لوگوں پر غالب رہتے ہیں اور دوسرے شہروں کو فتح کرتے ہیں' چنانچہ تاریخی طور پر اس عظیم الشان شہر کی یہ خصوصیت ثابت ہے کہ مدینہ میں آ کر بسنے والے دوسروں پر غالب اور بیشتر شہروں کے فاتح رہے ہیں' پہلے قوم عمالقہ آ کر شہر میں آباد ہوئی اس نے غلبہ حاصل کیا اور کتنے ہی شہروں اور علاقوں کو فتح کیا' پھر یہود آئے تو وہ عمالقہ پر غالب ہوئے پھر انصار پہنچے تو انہوں نے یہودیوں پر اپنا اقتدار قائم کیا' یہاں تک کہ جب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین کرامؓ نے اس شہر کو اپنا مسکن بنایا تو ان کو جس طرح غلبہ حاصل ہوا اور جس طرح انہوں نے مشرق سے لے کر مغرب تک پورے عالم کو اپنے زیر اثر کیا وہ سامنے کی بات ہے۔

قوله :يقولون يثرب ،وهي المدينة:

اس شہر کا نام پہلے یثرب اور اثرب تھا' جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرما کر یہاں تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شہر کی مدنیت اور کثرت آبادی کے پیش نظر اس کا نام "مدینہ" رکھا' نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ آئندہ اس شہر کو یثرب نہ کہا جائے' کیونکہ اول تو یہ زمانہ اسلامی سے قبل کا نام تھا جس سے عہد جاہلیت کی بو آتی تھی' دوسرے یہ کہ معنوی طور پر بھی یہ نام بالکل نامناسب تھا اس لئے کہ یثرب کے معنی ہیں "ہلاک وفساد" نیز یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یثرب ایک بت یا ایک بڑے ظالم شخص کا نام تھا۔

"تثریب" کے معنی "لوم" اور "توبیخ" کے آتے ہیں۔ حکایت حال کرتے ہوئے فرمایا: (لا تثريب عليكم اليوم) امام نوویؒ فرماتے ہیں: عیسی بن دینار سے مروی ہے کہ جو شخص مدینہ کو "یثرب" کا نام دیتا ہے اس پر ایک خطیئہ لکھ دی جاتی ہے۔ اور قرآن کریم میں لفظ یثرب کا استعمال ان منافقین کے قول کی حکایت کے طور پر آیا ہے کہ جن کے دلوں میں روگ ہے۔ بعض سلف مروی ہے کہ مدینہ کو یثرب کہنا حرام ہے۔ اس کی تائید مسند احمد کی روایت سے ہوتی ہے۔ حضرت براءؓ سے مرفوعاً مروی ہے: من سمى المدينه يثرب فليستغفر الله وهي طابة هي طابة۔ "جو شخص "مدینہ منورہ" کو "یثرب" کہے وہ استغفار کرے، یہ طابہ ہے، یہ طابہ ہے"۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: اس سے ظاہر ہوا کہ جو شخص اس چیز کی تحقیر کرے کہ جس کو اللہ جل شانہ نے عظمت شان عطا فرمائی ہو اور جس کو اللہ جل شانہ نے ایمان کا وصف دیا ہو اس کو اس کے نامناسب اوصاف سے متصف کرے، ایسا کرنے والا شخص "عاصی" کہلوانے کا حقدار ہے، بلکہ وہ کافر ہے۔ ابن حجرؒ نے اس کلام پر گرفت کی ہے۔ فائق میں لکھتے ہیں: أسند تسميتها بيثرب إلى الناس تحاشيا عن معنى التثريب، وكان يسميها طابة مطيبة، ويقولون: صفة للقرية، والراجع منها إليها محذوف والأصل يقولون لها۔

قوله :تنفي الناس كما ينفي الكير خبث الحديد:

" الناس": أي شرارهم وهم جهم۔ برے آدمیوں سے مراد اہل کفر وشرک ہیں جو اسلام کا غلبہ ہو جانے کے بعد اس شہر سے

نکال دیئے گئے تھے' چنانچہ کفار ومشرکین پر اس شہر کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند کردیئے گئے ہیں۔

''کیر'': کے ساتھ تشبیہ دینا اسی معنی پر دلالت کر رہا ہے، چونکہ بھٹی لوہے کے میل کچیل کو نکالتی ہے۔

''خبث'': خاء کے فتحہ، باء کے سکون اور تاء مثلثہ کے ساتھ: ردیئة۔

۲۷۳۸: وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ سَمّٰى الْمَدِيْنَةَ طَابَةً۔

اخرجه مسلم فی صحيحه ۱۰۰۷/۲ الحديث رقم (۴۹۱۔ ۱۳۸۵)۔ واحمد فی المسند ۱۰۸/۵۔

ترجمه: حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا ہے کہ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے مدینہ منورہ کا نام طابہ رکھا اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :سمی المدينة طابة: اور ایک روایت میں ''طیبہ'' ہے۔ اسماء کی کثرت مسمّٰی کی عظمت پر دلالت کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے اللہ جل شانہ نے لوحِ محفوظ میں مدینہ کا نام طیبہ رکھا ہے۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالہ نے اپنے حبیب ﷺ کو حکم دیا کہ اس کا نام طیبہ رکھیں تا کہ منافقین پر رد ہو۔ اس کو یثرب کہنے میں اشارہ ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا کہ یہ اپنی ذات کے اعتبار سے طیبہ ہے، یہاں آنا اور یہاں سے جانا برابر ہے۔ اس پر طاری ہونے والے مختلف احوال سے اس کی پاکیزگی میں کوئی فرق نہیں آتا۔

مدینہ میں رہنا آپ ﷺ کو محبوب تھا

۲۷۳۹: وَعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ اَنَّ اَعْرَابِيًّا بَايَعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَاَصَابَ الْاَعْرَابِيَّ وَعْكٌ بِالْمَدِيْنَةِ فَاَتَى النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ اَقِلْنِيْ بَيْعَتِيْ فَاَبٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ثُمَّ جَاءَهٗ فَقَالَ اَقِلْنِيْ بَيْعَتِيْ فَاَبٰى ثُمَّ جَاءَهٗ فَقَالَ اَقِلْنِيْ بَيْعَتِيْ فَاَبٰى فَخَرَجَ الْاَعْرَابِيُّ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّمَا الْمَدِيْنَةُ كَالْكِيْرِ تَنْفِيْ خَبَثَهَا وَتَنْصَعُ طِيْبَهَا۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ۹۶/۴۔ الحديث رقم ۱۸۸۳۔ ومسلم فی صحيحه ۱۰۰۶/۲ الحديث رقم (۴۸۹۔ ۱۳۸۳)۔ والنسائی فی السنن ۱۵۱/۷ الحديث رقم ۴۱۸۵ ومالك فی الموطأ ۸۸۶/۲ الحديث رقم ۴ من كتاب الجامع واحمد فی المسند ۳۰۶/۳۔

ترجمه: حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ تحقیق ایک اعرابی نے نبی کریم ﷺ سے بعیت کی یعنی حضور ﷺ کے پاس رہے پھر اس اعرابی کو مدینہ میں بخار ہوا اور شدید بخار ہوا۔ اس نے مدینہ میں رہنا ناپسند کیا اور وہاں سے نکلنا چاہا۔ پس وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور اس نے کہا اے محمد ﷺ میری بیعت مجھے لوٹا دو۔ پس نبی کریم ﷺ نے انکار کیا پھر حضور ﷺ کے پاس آیا اور کہا کہ لوٹا دو مجھ کو میری بعیت پس نبی کریم ﷺ نے انکار کیا پھر وہ حضور ﷺ کے پاس آیا اور کہا کہ لوٹا دو میری بیعت۔ پس حضور ﷺ نے انکار کیا۔ پھر وہ اعرابی مدینہ سے نبی کریم ﷺ کی اجازت کے بغیر نکل گیا۔ پس نبی کریم ﷺ ارشاد فرمایا یہ مدینہ بھٹی کی مانند ہے اپنی میل کو دور کرتا ہے اور اپنے اچھے کو ہے خالص کرتا ہے یعنی برے آدمی کو نکال دیتا ہے۔ اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :أن اعرابيا بايع رسول الله ﷺ ،فاصاب الاعرابی وعك بالمدينة:

''أن اعرابيا'': علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ شخص مہاجرین میں سے تھا۔

''وعك'': واؤ کے فتحہ اور عین مہملہ کے سکون کے ساتھ ہے۔اس کے معنی ہیں تیز بخار اور اس سے ہونے والا سخت قسم کا درد

قوله :يا محمد أقلني بيعتي......فخرج الاعرابي: ''اقلنی بیعتی'': اقالہ بیع سے استعارہ ہے۔

''فابی'': علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں' آنحضرت ﷺ نے اس کی بیعت کو فسخ کرنے سے اس لئے انکار فرمایا کہ جس طرح اسلام کی بیعت کو فسخ کرنا جائز نہیں تھا اسی طرح آپ ﷺ کے ساتھ رہنے کی بیعت کو بھی فسخ کرنا جائز نہیں تھا۔اھ۔

بیعتِ اسلام کا اقالہ تو اس وجہ سے جائز نہیں کہ ایسا کرنا رضا بالکفر اور تسبیب للکفر کو متضمن ہے۔اور بیعت اقامہ مع النبی ﷺ کا اقالہ اس وجہ سے جائز نہیں کہ یہ ''ہجران مہاجرہ'' کو متضمن ہے۔اس شخص کا اقالۂ بیعت پر اصرار کرنا ممکن ہے کہ اس نے اس کو اقالۂ بیع پر قیاس کیا ہو کہ اقالۂ بیع، بیع کے مکارم اخلاق میں سے ہے۔اور نبی کریم ﷺ نے اقالۂ بیع کی فضیلت بیان فرمائی ہے:

من أقال نادما أقال الله عثرته يوم القيامة۔

قوله :انما المدينة كالكير تنفي خبثها وتنصع طيبها:

خبثها: خاء اور باء دونوں مفتوح ہیں۔ خَبَثُ کے معنی ہیں: **ما تبرزه النار من الجواهر المعدنية التى تصلح للطبع فتخلصهما بما تبرزه عنها من ذلك** یعنی جواہر معدنیات کا وہ میل کچیل جو بھٹی میں تپانے یا کوٹنے کے وقت نکلتا ہے۔''خبثها'' خاء کے ضمہ اور باء کے سکون کے ساتھ بھی مروی ہے۔''**الشیئ الخبیث**'' علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: ''کیر'' کی مناسبت سے پہلا ضبط ''اشبہ'' ہے۔

وتنصع: مرتب عرض کرتا ہے ہمارے نسخہ میں بصیغہ واحد مؤنث غائب ہے۔یعنی تاء کے فتحہ اور صاد مہملہ کے ساتھ۔اور ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ روایت صحیحہ کا ضبط بصیغہ واحد مذکر غائب ہے۔بمعنی **يصفوا ويخلص ويتميز۔**

بعض شراح فرماتے ہیں (تصنع) تاء کے ضمہ اور نون کے سکون کے ساتھ مروی ہے۔لفظاً و معنیً یہ روایت بہت ہی سخت ہے۔ **نصع لونه نصعا** سے ماخوذ ہے بمعنی **اشتد بياضه وخلص۔ وأنصعه غيره۔** لغت قیاسیہ ہے،اور **منصع** صاد کی تشدید کے ساتھ ،وہ بھی اس کے ہم معنی ہے۔اکثر حضرات نے تشدید کے ساتھ روایت کیا ہے۔

طيبها: صحیح روایت کے مطابق طاء کے فتحہ اور یائے مشددہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔اور ایک روایت میں طاء کے کسرہ اور باء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔،علامہ طیبی فرماتے ہیں: معنی کے اعتبار سے پہلا (ضبط) اقوم ہے،چونکہ خبیث کے مقابلہ میں مذکور ہے اور دوسری بات یہ کہ ''کیر'' اور ''طیب'' کے درمیان کوئی مناسبت نہیں ہے۔

یعنی اللہ تعالی نے مدینہ کو مثل بھٹی کے قرار دیا ہے، اور اہل مدینہ کو پہنچنے والی جہد و بلاء کو بھٹی کے میل کچیل کی مانند قرار دیا ہے۔ کہ جس طرح بھٹی کے ذریعہ خبیث وطیب میں امتیاز کیا جاتا ہے کہ خبیث کو نکال باہر کرتی ہے اور طیب، خالص وصاف ستھرا ہو کر باقی رہ جاتا ہے،جیسا کہ حضرت عمر بن خطابؓ کے دور میں ہوا کہ آپ نے اہل کتاب کو مدینہ سے نکالا،اور مدینہ میں عدل واحسان کا چرچا ہوا۔قرآن کریم نے حق و باطل کی تمثیل بیان کرتے ہوئے اس تاویل کی طرف اشارہ کیا ہے: ﴿**وأما الزبد فيذهب جفاء وأما ما ينفع الناس فيمكث فى الأرض كذلك يضرب الله الأمثال**﴾

۲۷۴۰: وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَنْفِى الْمَدِيْنَةُ شَرَارَهَا كَمَا يَنْفِى الْكِيْرُ خَبَثَ الْحَدِيْدِ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ۲/۱۰۰۵ الحديث رقم (۴۸۷۔ ۱۳۸۱)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا قیامت قائم نہیں ہوگی ۔قیامت تک یہاں تک کہ مدینہ اپنے شریروں کو دور کردے گا۔ جیسے کہ بھٹی لوہے کے میل کو دور کردیتی ہے اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: ممکن ہے اس خاصیت کا تعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانہ کے ساتھ خاص ہو، چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت قیامت کی نشانیوں میں سے ہے۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس خاصیت کا تعلق خروج دجال کے ساتھ ہو، کہ جب وہ مدینہ کا رخ کرے گا۔(تو اس وقت مدینہ میں بسنے والے اشرار یہاں سے نکل کر دجال کی اتباع کریں۔)

مدینہ منورہ میں دجال اور طاعون کا داخلہ ممنوع ہے

۲۷۴۱:وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَلٰى اَنْقَابِ الْمَدِيْنَةِ مَلَائِكَةٌ لَّا يَدْخُلُهَا الطَّاعُوْنُ وَلَا الدَّجَّالُ۔

(متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ٩٥/٤ الحديث رقم ١٨٨٠۔ ومسلم فی ١٠٠٥/٢ الحديث رقم (٤٨٥۔ ١٣٧٩) والترمذی فی السنن ٤٤٦/٤ الحديث رقم ٢٢٤٢۔ ومالك فی الموطأ ٨٩٢/٢ الحديث رقم ١٦ من كتاب الجامع۔ واحمد فی المسند ٣٩٣/٣۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مدینے کے دروازوں یا راستوں پر فرشتے نگہبان مقرر ہیں اس میں طاعون کی بیماری اور دجال داخل نہ ہونگے ۔اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله :على انقاب المدينة ملائكة**:"أنقاب" نقب۔بسکون القاف۔کی جمع ہے۔دو پہاڑوں کے درمیانی راستہ کو"نقب" کیا جاتا ہے (قالہ الطیبی) زیادہ واضح بات یہ ہے کہ اس سے مطلق طریق مراد ہے یا"انقاب" سے مراد"ابواب" ہیں۔اور ملائکہ سے مراد حفاظت پر مامور فرشتے ہیں۔

قوله :لا يدخلها الطاعون ولا الدجال:اس میں دو احتمال ہیں۔پہلا احتمال یہ ہے کہ یہ حکم مستقل ہو،اور ملائکہ کا انقاب مدینہ پر کھڑا ہونا تعظیما ہو۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ حکم پہلے پر مرتب ہو رہا ہے۔یہ ملائکہ ان کفار جنات کو مدینہ میں داخل نہ ہونے دیں گے جن کے اثرات و طعن سے طاعون ظاہر ہوتا ہے۔بطور آزمائش مسلمان ابتداء میں دجال کیلئے مسخر کردیئے جائیں گے،لیکن اللہ جل شانہ ان دونوں مقدس مقامات کی برکت سے اہل حرمین شریفین کی حفاظت فرمائے گا۔

۲۷۴۲:وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَيْسَ مِنْ بَلَدٍ اِلَّا سَيَطَأُهُ الدَّجَّالُ اِلَّا مَكَّةَ وَالْمَدِيْنَةَ لَيْسَ نَقْبٌ مِنْ اَنْقَابِهَا اِلَّا عَلَيْهِ الْمَلَائِكَةُ صَافِّيْنَ يَحْرُسُوْنَهَا فَيَنْزِلُ السَّبِخَةَ فَتَرْجُفُ الْمَدِيْنَةَ بِاَهْلِهَا ثَلَاثَ رَجْفَاتٍ فَيَخْرُجُ اِلَيْهِ كُلُّ كَافِرٍ وَمُنَافِقٍ۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ٩٥/٤ الحديث رقم ١٨٨١۔ ومسلم فی صحيحح ٢٢٦٥/٤ الحديث رقم (١٢٣۔ ٢٩٤٣) واحمد فی المسند ١٩١/٣۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مکہ اور مدینہ کے سوا کوئی شہر ایسا نہیں ہے جس کو دجال پامال نہ کرے گا اور مکہ اور مدینے کے راستوں میں سے کوئی راستہ ایسا نہیں ہے مگر یہ کہ اس پر فرشتے صف

باندھے کھڑے ہوئے ہیں اور اس کی نگہبانی کرتے ہیں پس دجال مدینہ سے باہر زمین شور میں اترے گا۔ پس اپنے رہنے والوں کے ساتھ تین مرتبہ ہلے گا۔ اس زلزلے کے نتیجے میں ہر کافر اور منافق مدینہ سے نکل کر دجال کے پاس چلا جائے گا۔۔ اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :ليس من بلد الاسيطأه الدجال إلا مكة و المدينة:''إلا مكة'':منصوب ہے مستثنٰی ہونے کی وجہ سے۔

قوله :ليس نقب من انقابها إلا عليه الملائكة:''عليه'' :أي عليٰ ذلك النقب۔ابن حجرؒ کی اصل میں''عليها'' ہے۔ یہ مخالف ''اصول'' ہے۔انہوں نے اس سلسلہ میں تکلیف سے کام لیا ہے اور لکھا ہے کہ اس کو مؤنث لانا باعتبار''طریق'' کے ہے، چونکہ طریق مذکر و مؤنث دونوں طرح مستعمل ہے۔

قوله :فينزل سبخة فترجف المدينة باهلها ثلاث رجفات :''سبخة'': باء کے کسرہ کے ساتھ،شوریلی زمین اور باء کے فتحہ کے ساتھ مدینہ کے قریب واقع ایک جگہ کا نام ہے۔

فترجف:جیم کے ضمہ کے ساتھ ہے۔بأهلها :اس باء کے بارے میں چار احتمال ہیں:

(۱) یہ باء برائے سببیت ہے۔أي تتزلزل و تضطرب بسبب أهلها لينفض إلى الدجال الكافر و المافق(طیبی)

(۲) (محذوف سے متعلق ہو کر حال ہے)۔''حال'' ہے۔أي ترجف ملتبسة بهم۔(طیبی)

(۳) مظہرؒ فرماتے ہیں:ترجف المدينة بأهلها أتحركهم وتلقى ميل الدجال في قلب من ليس بمؤمن خالص العقل۔فرمایا:اس تقریر پر''باء''فعل کا صلہ ہے اھ۔

(۴) کہا گیا ہے کہ یہ باء برائے تعدیہ ہے۔أي تحركهم وتزلزلهم۔

میرکؒ فرماتے ہیں: بظاہر یہ باء برائے تعدیہ ہے۔ میں کہتا ہوں اس ظاہر کے علاوہ کچھ بھی ظاہر نہیں ہے، یا اس بات کے منافی نہیں کہ باء کا صلہ ہو۔جیسا کہ واضح سی بات ہے۔''رجفات'':جیم کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

مدینہ والوں سے مکروفریب کرنا ناممکن ہے

۲۷۴۳:وَعَنْ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا يَكِيْدُ اَهْلَ الْمَدِيْنَةِ اَحَدٌ اِلَّا اِنْمَاعَ كَمَا يَنْمَاعُ الْمِلْحُ فِي الْمَاءِ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۹۴/٤ الحدیث رقم ۱۸۷۷۔ ومسلم فی صحیحه ۱۰۰۸/۲ الحدیث رقم (٤٩٤۔ ۱۳۸۷)۔ وابن ماجه فی السنن ۱۰۳۹/۲ الحدیث رقم ۳۱۱٤۔

ترجمہ: حضرت سعدؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مدینہ والوں سے کوئی مکر نہیں کرے گا مگر کہ گھل جائے گا۔ جیسا کہ نمک پانی میں گھلتا ہے س کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: گھلنے سے مراد یہ ہے کہ وہ گھل کر ہلاک ہو جائے گا۔

آپ ﷺ کو مدینہ بہت زیادہ محبوب تھا

۲۷۴۴:وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِىَّ ﷺ كَانَ اِذَا قَدِمَ مِنْ سَفَرٍ فَنَظَرَ اِلٰى جُدُرَانِ الْمَدِيْنَةِ اَوْضَعَ رَاحِلَتَهٗ وَاِنْ كَانَ عَلٰى دَابَّةٍ حَرَّكَهَا مِنْ حُبِّهَا۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٩٨/٤ الحدیث رقم ١٨٨٦۔ والترمذی فی السنن ٤٦٥/٥ الحدیث رقم ٣٤٤١۔ واحمد فی المسند ١٥٩/٣۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے۔ یہ کہ تحقیق نبی کریم ﷺ جس وقت کے سفر سے آتے تو مدینہ کے دیواروں کی طرف دیکھتے اپنے اونٹ کو دوڑاتے اور اگر دابہ پر ہوتے یعنی گھوڑے پر یا خچر پر یا ان کے مانند۔ مدینہ کی محبت کی وجہ سے اس کو تیز چلاتے۔ اس کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ''جُدران'': جیم اور دال دونوں پر ضمہ ہے۔ جدار۔ جدر۔

''أوضع'': ایضاع سے ماخوذ ہے۔ یہ اونٹ کے ساتھ مخصوص ہے۔ (اوضع البعیر: اونٹ کا تیز دوڑنا)

راحلة، نجیبة، نجیب، یہ سب اونٹ کے نام ہیں۔ ایک حدیث میں آتا ہے: **الناس کإبل مائة لاتجد فیها راحلة حرکها من حبها**: اس میں تنازع فعلین ہے۔ أی: **من اجل حبه ﷺ إباها أو أهلها۔ أو من أجل حبّها له ﷺ۔**

اسی (حدیث شریف کے) معنی میں یہ کلام ہے:

إذا دنت المنازل زاد شوقی ☆ فلمح العین دون الحجر شهر
ولا سیما إذا بدت الخیام ☆ فرجع الطرف دون الشهر عام
وأعظم ما یکون الشوق یوما ☆ إذا دنت الخیام من الخیام

اُحد پہاڑ سے آپ ﷺ کی اظہار محبت

٢٧٤٥: وَعَنْهُ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ طَلَعَ لَهٗ اُحُدٌ فَقَالَ هٰذَا جَبَلٌ یُّحِبُّنَا وَنُحِبُّهٗ اَللّٰهُمَّ اِنَّ اِبْرَاهِیْمَ حَرَّمَ مَکَّةَ وَاِنِّیْ اُحَرِّمُ مَا بَیْنَ لَابَتَیْهَا۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٣٠٤/١٣ الحدیث رقم ٧٣٣٣۔ ومسلم فی صحیحه ٩٩٣/٢ الحدیث رقم (٤٦٤۔ ١٣٦٥)۔ وابن ماجه فی السنن ١٠٤٠/٢ الحدیث رقم ٣١١٥۔ ومالك فی الموطأ ٨٨٩/٢ الحدیث رقم ١٠ من کتاب الجامع۔ واحمد فی المسند ١٤٩/٣۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کو احد پہاڑ ظاہر ہوا پس فرمایا یہ پہاڑ ہمیں دوست رکھتا ہے او رہم اس کو پسند کرتے ہیں اے الٰہی ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرام کو حرام کیا۔ یعنی ظاہر کیا اس کا حرام ہونا اور تحقیق میں اس جگہ کو حرام کرتا ہوں جو مدینہ کے سنگستان کے دونوں طرف ہے اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله: هذا جبل یحبنا و نحبه: کہا گیا ہے کہ کسی حی کا جمادات سے محبت کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ چیز اس کو اچھی لگتی ہے اور نفس کو اس سے سکون حاصل ہوتا ہے، اور اس چیز میں دکھائی دینے والی منفعت سے موانست ہوتی ہے اور جمادات کا کسی حیّ سے محبت کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ مجاز ہے اس بات سے کہ یہ اس کیلئے نافع ہے، اور اس کے اور ایذاء رساں شیء کے درمیان حائل ہے۔ خطابیؒ فرماتے ہیں: (**احد سے**) احد کے اطراف کے شہداء واحیاء مراد ہیں۔

محی السنۃؒ فرماتے ہیں: یہ بلاشبہ اپنے ظاہری معنی ہی پر محمول ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جمادات میں بھی انبیاء، اولیاء اور اہل طاعت کی محبت رکھی ہے، جیسا کہ آنحضرت ﷺ کی مفارقت کی وجہ سے کھجور کے تنے کے رونے کا واقعہ ہے کہ لوگوں نے بھی اس کے رونے کی آواز سنی، علاوہ ازیں نبی کریم ﷺ نے خبر دی کہ مکہ میں ایک پتھر مجھے قبل از نبوت سلام کیا کرتا تھا۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں اس بات کا انکار

نہ کیا جائے کہ جبل احد اور مدینہ کے تمام اجزاء آنحضرت ﷺ سے محبت کیا کرتے تھے۔ اور آپ ﷺ کی عدم موجودگی میں آپ ﷺ کی ملاقات کیلئے مشتاق رہا کرتے تھے۔

قوله :اللهم ان ابراهيم حرم مكة ،وانى احرم ما بين لابتيها:

"**وانى احرم ما بين لابتيها**": کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے مکہ کے حرم ہونے کو ظاہر کیا اور میں اس قطعہ زمین کو قابل تعظیم قرار دیتا ہوں جو سنگلاخ مدینہ کے دونوں کناروں کے درمیان ہے۔ یہاں حرام قرار دینے کا ایک دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ میں سنگلاخ مدینہ کے دونوں کناروں کے درمیان تخریب اور اس کی زینت ضائع کرنے کو حرام قرار دیتا ہوں۔ اور اس پر اجماع ہے کہ اس سے مکہ کی طرح کی حرمت مراد نہیں ہے۔ (یعنی یہ مراد نہیں ہے کہ مکہ کی طرح مدینہ اور اس کے اطراف میں بھی درخت کاٹنا اور اس میں شکار وغیرہ حرام ہے۔)

۲۷۴۶: **وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اُحُدٌ جَبَلٌ يُحِبُّنَا وَنُحِبُّهٗ۔**

(رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۴۴/۳۔ الحدیث رقم ۱۴۸۲۔ ومسلم فی ۱۰۱۱/۲ الحدیث رقم (۵۰۴۔ ۱۳۹۳)۔

ترجمه: حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ احد پہاڑ ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس کو پسند کرتے ہیں اس کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: اس کو خصوصی طور پر شاید اس وجہ سے ذکر کیا ہے کہ جب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے تین اصحاب کے ساتھ اس پر چڑھے تو وہ خوشی سے جھوم اٹھا تھا۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اس موقع پر اس کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: **اثبت أحد فإنما عليك نبى و صديق و شهدان۔**

تخریج: اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے حضرت انسؓ سے، احمد طبرانی اور ضیاء نے حضرت سوید بن عامر انصاری وغیرہ سے روایت کیا ہے۔ امام طبرانیؒ نے الأوسط میں ابوعمیر بن جبیر سے سند ضعیف کے ساتھ ان الفاظ میں روایت کیا ہے: **أحد هذا جبل يحبنا ونحبه، وانه على باب من أبواب الجنة، وهذا عير جبل يبغضنا ونبغضه، وانه على باب من أبواب النار۔**

سہل بن سعد سے مروی طبرانی کی ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: **أحد ركن من أركان الجنة۔**

الفصل الثانی:

حرمت مدینہ کا بیان

۲۷۴۷: **عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ اَبِىْ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ رَأَيْتُ سَعْدَ بْنَ اَبِىْ وَقَّاصٍ اَخَذَ رَجُلًا يَصِيْدُ فِىْ حَرَمِ الْمَدِيْنَةِ الَّذِىْ حَرَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَسَلَبَهٗ ثِيَابَهٗ فَجَاءَ مَوَالِيْهِ فَكَلَّمُوْهُ فِيْهِ فَقَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ حَرَّمَ هٰذَا الْحَرَمَ وَقَالَ مَنْ اَخَذَ اَحَدًا يَصِيْدُ فِيْهِ فَلْيَسْلُبْهُ فَلَا اَرُدُّ عَلَيْكُمْ طُعْمَةً اَطْعَمَنِيْهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَلٰكِنْ اِنْ شِئْتُمْ دَفَعْتُ اِلَيْكُمْ ثَمَنَهٗ۔** (رواه ابوداود)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۵۳۳/۲ الحدیث رقم ۲۰۳۷۔ واحمد فی المسند ۱۷۰/۱۔

ترجمه: حضرت سلیمان بن ابی عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ انہوں

نے ایک شخص کو پکڑا کہ جو حرم میں شکار کرتا تھا یعنی مدینہ کے گرد۔ وہ حرم کہ جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حرم ٹھہرایا ہے پس سعد رضی اللہ عنہ نے اس کے کپڑے چھین لیے پس اس کے مالک آئے اور سعد رضی اللہ عنہ سے اس کے مقدمہ کے بارے میں کلام کیا۔ پس سعد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تحقیق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام ٹھہرایا ہے یہ حرم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص کسی شکار کرنے والے کو اس میں پکڑے پس چاہیے کہ اس کا سامان چھین لے۔ پس میں وہ بخشش تم پر نہیں لوٹاؤں گا جو مجھ کو نبی نے دلوائی ہے لیکن اگر تم چاہو تو بطور احسان کے تمہیں اس کی قیمت دے دوں۔ اس کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

سلیمان بن ابی عبداللہ۔ یہ سلیمان ابن ابی عبداللہ ''تابعی'' ہیں۔ ان انہوں نے مہاجرین صحابہ کا زمانہ پایا ہے۔ یہ سعید بن ابی وقاص اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی حدیث ''فضائل مدینہ'' میں ذکر کی ہے۔

تشریح: **قوله :اخذ رجلا ...... فسلبه ثيابه فجاء مواليه فكلموه فيه:**

فسلبه ثيابه: بدل اشتمال ہے۔

قوله :إن رسول الله ﷺ حرم هذا الحرام......فليسلبه:

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ جملہ دلالت کرتا ہے کہ ان کا اعتقاد یہی تھا کہ اس کی حرمت بھی مکہ کی طرح ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: یہ دلالت نہ تو لفظ تحریم سے ثابت ہو رہی ہے، اور نہ اخذ سلب سے، چونکہ تحریم یعنی تعظیم ہے، اور ''حرم'' بمعنی ''المحترم المعظم'' کے ہے۔ اور اخذ سلب اس بات کے منافی ہے کہ اس کی حرمت، تحریم مکہ کی طرح ہے۔ چونکہ یہ مسئلہ اجماعی ہے کہ حرم میں کوئی بھی جزاء بصورت سلب ثیاب کی نہیں ہے۔ مزید یہ کہ اس میں جمہور صحابہ کی مخالفت لازم آتی ہے۔

قوله :فلاارد عليكم طعمة ...... دفعت اليكم ثمنه: **طعمة:** طاء کے ضمہ کے ساتھ ہے، بمعنی رزق۔

''**إن شئتم دفعت إليكم ثمنه**'': یعنی اگر تم چاہو تو میں اس کی قیمت از روئے تبرع تمہیں دے دوں۔ (قاله الطيبي) یہ دفع ثمن احتیاط کے پیش نظر ہے، چونکہ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔

مدینہ کے درخت کاٹنے کی ممانعت

۲۷۴۸: وَعَنْ صَالِحٍ مَوْلًى لِسَعْدٍ اَنَّ سَعْدًا وَجَدَ عَبِيْدًا مِنْ عَبِيْدِ الْمَدِيْنَةِ يَقْطَعُوْنَ مِنْ شَجَرَةِ الْمَدِيْنَةِ فَاَخَذَ مَتَاعَهُمْ وَقَالَ يَعْنِي لِمَوَالِيهِمْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَنْهٰى اَنْ يُقْطَعَ مِنْ شَجَرِ الْمَدِيْنَةِ شَیْءٌ وَقَالَ مَنْ قَطَعَ مِنْهُ شَيْئًا فَلِمَنْ اَخَذَهٗ سَلَبُهٗ۔ (رواه ابو داود)

اخرجه ابوداؤد في السنن ۲/ ۳۳ ٥ الحديث رقم ۲۰۳۸۔

ترجمہ: صالح رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جو کہ حضرت سعد کے غلام تھے تحقیق سعد رضی اللہ عنہ نے مدینہ کے غلاموں میں سے کچھ غلام پائے کہ جو مدینہ کے درخت کاٹ رہے تھے۔ پس سعد رضی اللہ عنہ نے ان کا سامان لے لیا اور غلاموں کو کہا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم منع فرماتے تھے کہ مدینہ کا درخت کاٹا جائے اور فرمایا جو اس میں سے کچھ کاٹے پس اس کا سامان اس شخص کے لیے ہے جو شخص اس کو پکڑے۔ اس کو ابوداؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله :وعن صالح مولى لسعد:**

یہاں "عن صالح مولی لسعد" کی بجائے صحیح اس طرح ہے "عن صالح عن مولی لسعد"۔
شیخ جزری فرماتے ہیں: اس حدیث کو تو اُمہ کے مولی صالح نے حضرت سعدؓ کے مولیٰ سے نقل کیا ہے اور سعد کے مولی مجہول ہیں۔ اور صالح موثق ہیں۔ ابوداؤد ترمذی اور ابن ماجہ نے ان سے روایت کی ہے۔ ابوحاتمؒ فرماتے ہیں: لیس بالقوی، اور امام احمدؒ نے ان کو "صالح الحدیث" قرار دیا ہے۔ اھ چنانچہ اس روایت میں صالح کے بعد "عن" یا مشکوۃ کے کاتبین سے رہ گیا ہے۔ یا خود مصنف سے سہو ہوا ہے اھ امام میرکؒ فرماتے ہیں: اس کی تائید شیخ کی بات سے بھی ہوتی ہے کہ کتب اسماء رجال کے مصنفین میں سے کسی نے بھی حضرت سعد کے کسی صالح نامی مولیٰ کا ذکر نہیں کیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

قولہ: یعنی لموا الیھم: یہ جملہ راوی کی تفسیر ہے۔ ان یقطع من شجر المدینۃ: یہ "من" تبعیضیہ ہے۔ ای بعض اشجارھا۔

مقام وج کی فضیلت واہمیت

۲۷۴۹: وَعَنِ الزُّبَيْرِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ صَيْدَوَجٍّ وَعِضَاهَهٗ حَرَمٌ مُحَرَّمٌ لِلّٰهِ (رواہ ابو داود) وَقَالَ مُحی السنة وَجٌّ ذَكَرُوْا اَنَّهَا مِنْ نَاحِيَةِ الطَّائِفِ وَقَالَ الْخَطَّابِيُّ اَنَّهٗ بَدَلَ اَنَّهَا ۔

اخرجه ابوداؤد في السنن ۵۲۸/۲ الحديث رقم ۲۰۳۲۔ واحمد في المسند ۱۶۵/۱۔

ترجمہ: حضرت زبیرؓ سے روایت ہے۔ کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا شکار وج کا اور اس کے خار درخت حرام ہیں اللہ تعالیٰ کے لیے حرام کئے گئے ہیں اس کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے اور محی السنہ نے کہا ہے کہ علماء نے تحقیق کی ہے وہ طائف کی جائب ایک جگہ ہے اور خطابی نے کہا ہے کہ انہ کا لفظ انھا کے بدل ہے۔

تشریح: قولہ: ان صید وج وعضاھه حرم محرم لله: "وج": واؤ کے فتحہ اور جیم مشددہ کے ساتھ ہے، صاحب النھایۃ لکھتے ہیں: طائف میں ایک جگہ کا نام ہے۔ اور قاموس میں لکھتے ہیں: "وج" طائف کی ایک وادی کا نام ہے، اس مسئلہ میں جوہری سے غلطی ہوئی ہے۔ یہ جبل محترق اور احیدین کے درمیان واقع ہے۔ اور اسی معنی میں یہ بھی ہے: آخر وطأة وطأ الله بوج۔ غزوہ حنین مراد ہے' نا کہ طائف اور جوہری سے غلطی ہوئی ہے۔ اور حنین ایک وادی ہے جو وج سے پہلے واقع ہے۔ اور جہاں تک بات ہے غزوہ طائف کی سوا اس غزوہ میں قتال نہیں ہوا تھا۔

"حرم": سید جمال الدینؒ فرماتے ہیں: حرم وحرام، دو لغات ہیں، جیسا کہ حل وحلال۔ ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں: اس آیت کریمہ میں دونوں طرح پڑھا گیا ہے: ﴿وحرام على قرية أهلكناها أنهم لا يرجعون﴾[الانبیاء:۹۵]

"محرم": یہ "حرم" کی تاکید ہے۔ "لله": محرم کے متعلق ہے۔ أی: لأمره، أو لأجل أوليائه۔ مروی ہے کہ اس کی حرمت غازیوں کے گھوڑوں کی چراگاہ ہونے کے باعث ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: احتمال ہے کہ حرمت کا تعلق ایک مخصوص زمانہ کے ساتھ ہو اور بعد میں منسوخ ہوگئی ہو۔ امام شافعی نے ذکر کیا ہے کہ یہاں (یعنی مقام وج میں) نہ شکار کیا جائے، نہ یہاں کا درخت کاٹا جائے، اس میں انہوں نے ضمان (یعنی بطور جزاء وکفارہ کسی چیز کے واجب ہونے) کا ذکر نہیں کیا۔ اور نقیع بھی اسی حکم میں ہے۔

شرح السنہ کی عبارت ماقبل میں گذر چکی ہے۔ اس کا حاصل ہمارے مذہب کے موافق ہے۔ کہ نقیع کی چراگاہ کو نبی کریم ﷺ نے صدقہ کے اونٹوں اور جزیہ کے جانوروں کیلئے "حمی" قرار دیا تھا، اور فقہاء یہاں کے شکار، اور قطع اشجار کی حلت پر متفق ہیں۔ چونکہ اس سے مقصود عام لوگوں کو منع کرنا تھا، نہ نقیع کی بیع جائز ہے، اور نہ یہاں کے درختوں کی بیع جائز ہے، اس کی بیع موقوف کی بیع کی طرح ہے۔ ایک

شارح لکھتے ہیں ممکن ہے کہ یہ تحریم بر سبیل حرمت و تعظیم ہو۔تا کہ مسلمانوں کی حمی کے طور پر برقرار رہے۔یعنی مجاہدین کے گھوڑوں کی چراگاہ کے طور پر رہے۔دوسرے لوگ اپنے جانور نہ چرائیں۔بعض شروح میں لکھا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ طائف کا ارادہ رکھتے تھے ،اللہ جل شانہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ فرمادیا کہ عنقریب آپ کے ساتھ جم غفیر ہوگا ،پس اس کے پیش نظر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریم کا فیصلہ فرمادیا تا کہ مسلمان اس سے فائدہ اٹھاسکیں۔

قوله رواه ابو داود:

امام میرک فرماتے ہیں: حدیث زبیر کو امام ابوداؤد نے ذکر کیا ہے اور اس میں ایک قصہ ہے۔اس کی سند میں محمد بن سنان طائفی اور اس کے والد ہیں۔امام حاتم رحمۃ اللہ علیہ سے محمد (بن سنان طائف) کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: **لیس بالقوی، وفی حدیثه نظر** امام بخاری نے اپنی التاریخ میں ان کا ذکر کیا ہے، اوران کی یہ حدیث ذکر کر کے فرمایا: **لم یتابع علیه** ان کا ذکر امام مسلم نے بھی کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: **لم یصح حدیثه** اور اسی طرح ابن حبان فرماتے ہیں۔اھ۔اصل سارے کلام سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس حدیث سے حرمت جیسے عظیم الشان حکم کے مسئلہ پر استدلال درست نہیں ہے۔

قوله :وقال محی السنة وج ذکروا انها من ناحیة الطائف:

''**من ناحیة الطائف**'' :ابن حجر فرماتے ہیں: بظاہر یہ اضافت بیانیہ ہے، **أی ناحیة هی الطائف**۔اس سے یہ لازم آتا ہے کہ سارا طائف حرم ہے۔میرے گمان کے مطابق اس بات کا کوئی ایک شخص بھی قائل نہیں ہے۔مزید یہ کہ یہ تحقیق اہل لغات کے اقوال کے بھی مخالف ہے۔نیز حرم کی بیت کے بیان کے بھی معارض ہے، جیسا کہ طائف کی وجہ تسمیہ کی بات منقول ہے: **إن جبریل اقتلع تلك الارض من أهل الشام، ثم حملها علی جناحه وأتی بها مكة، فطاف بها بالبیت سبعا، ثم وضعها ثمة** ،اور اس میں بھی کوئی بعد نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس قطعۂ ارض کو اس لئے حرام قرار دیا ہو تا کہ اس کا سبب تحریم تازہ ہوتا ہے۔اور پورے ہی طائف کی تعظیم مستقل برقرار رہے، اور سارے کا سارا حرام قرار نہیں دیا، چونکہ ایسا کرنے میں لوگوں کیلئے مشقت ہے، اس وجہ سے کہ لوگوں کو اس کے بنات وصید کی بہت زیادہ حاجت رہتی ہے۔اھ اس سارے کلام میں مناقضہ بالکل واضح ہے۔نیز تحریم مکہ اجماعا اور تحریم مدینہ عندھم میں بھی معارضہ ہے چونکہ مشقت تو عام ہے، بلکہ حرمین شریفین میں زیادہ ہے۔

قوله :وقال الخطابی انه بدل انها:''أنه'' :ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔تذکیر باعتبار ''موضع'' کے ہے۔اور'' **انها** ''میں تانیث باعتبار ''**بقعة**'' کے ہے۔

مدینہ مرنے کی فضیلت

۲۷۵۰: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنِ اسْتَطَاعَ اَنْ يَّمُوْتَ بِالْمَدِيْنَةِ فَلْيَمُتْ بِهَا فَاِنِّىْ اَشْفَعُ لِمَنْ يَّمُوْتُ بِهَا۔ (رواه احمد والترمذی وقال هذا حدیث حسن صحیح غریب اسنادا)

اخرجه الترمذی فی السنن ٦٧٦/٥ الحدیث رقم ٣٩١٧۔ وابن ماجه فی ١٠٣٩/٢ الحدیث رقم ٣١١٢۔ واحمد فی المسند ٧٤/٢۔

ترجمہ:حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص کہ طاقت رکھے مدینہ میں مرے۔پس چاہیے کہ مدینہ میں مرے پس تحقیق میں شفاعت کرونگا اس شخص کے واسطے جو مرے مدینہ میں اس کو نقل کیا ہے احمد اور ترمذی نے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے غریب ہے سند کے اعتبار سے۔

تشریح: مطلب یہ ہے کہ جوشخص اس بات پر قادر ہو کہ مدینہ میں اپنی زندگی کے آخری لمحات تک رہ سکے' تو اسے چاہئے کہ وہ مدینہ ہی میں رہے تا آنکہ اس کی موت اسی مقدس شہر میں واقع ہو اور میں اس کی شفاعت کروں بایں طور کہ اگر وہ گنہگار ہوگا تو میں اسے بخشواؤں گا اور اگر نیکوکار ہوگا تو اس کے درجات بلند کرواؤں گا۔

واضح رہے کہ یہاں شفاعت سے مراد وہ خاص شفاعت ہے جو صرف مدینہ میں رہنے والوں ہی کو حاصل ہوگی اور کسی دوسرے کو نصیب نہ ہوگی۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ افضل یہ ہے کہ جس کی عمر زیادہ ہو جائے یا کشف وغیرہ کے ذریعہ اسے معلوم ہو جائے کہ اس کی موت کا وقت قریب آ گیا ہے تو وہ مدینہ منورہ میں جا رہے تا کہ وہاں کی موت نصیب ہو جائے اور وہ آنحضرت ﷺ کی شفاعت خاص کی اس عظیم سعادت کا حق دار ہو جائے۔ اس کی تائید حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس دعا سے بھی ہوتی ہے۔

اللّٰھم ارزقنی شھادۃ فی سبیلک واجعل موتی ببلد رسولک ۔

''اے اللہ! مجھے اپنے راستے میں شہادت عطا فرما اور اپنے رسول ﷺ کے شہر میں مجھے موت دے''۔

واضح رہے کہ یہ حدیث بھی افضلیت مدینہ علی المکہ مطلقاً کے مسئلہ میں صریح نہیں ہے، چونکہ کبھی مفضول کو کسی خاص حیثیت سے فاضل پر فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ بقیع کو جو ن پر فضیلت حاصل ہے، یا تو اس وجہ سے کہ اکثر صحابہ کرام کی قبریں یہاں ہیں، یا اس وجہ سے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آرام گاہ قریب میں واقع ہے۔ اور یہ بھی کوئی بعید نہیں کہ اس سے مہاجرین مراد ہوں، چونکہ (ان کے حق میں) مکہ کی موت کا ارادہ مذموم ہے۔ (کما قرر فی محلہ)

۲۷۵۱: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اٰخِرُ قَرْيَةٍ مِّنْ قُرَى الْاِسْلَامِ خَرَابًا نِ الْمَدِيْنَةُ رواہ الترمذی وقال۔ (ھذا حدیث حسن غریب)

اخرجه الترمذی فی السنن ٥/٦٧٦ الحدیث رقم ٣٩١٩۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اسلام کی بستیوں میں سے آخری بستی جو خراب ہونے والی ہوگی وہ مدینہ ہوگا اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

تشریح: قولہ : آخر قریة . . . المدینة: اس میں ترکیبی دو احتمال ہیں:

(۱) ''آخر'' مبتدا، اور ''المدینة'' اس کی خبر ہے۔ (۲) ''المدینة'' مبتدا مؤخر اور ''آخر'' خبر مقدم ہے۔

اس حدیث میں اشارہ ہے کہ اسلام کی عمارت مدینہ کی عمارت پر قائم ہے۔ (جب قیامت قریب ہوگی تو تمام آبادیاں اور شہر ویران ہو جائیں گے اور ان میں مدینہ سب سے آخر میں ویران ہوگا۔) اور یہ اس وجہ سے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وجود بابرکت یہاں ہے۔

۲۷۵۲: وَعَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اَوْحٰى اِلَیَّ اَیَّ هٰٓؤُلَآءِ الثَّلَاثَةِ نَزَلْتَ فَهِیَ دَارُ هِجْرَتِكَ الْمَدِيْنَةُ اَوِ الْبَحْرَيْنُ اَوْ قِنَسْرِيْنَ۔ (رواہ الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٥/٦٧٨ الحدیث رقم ٣٩٢٣۔ فی المخطوطة ((ھجرة))۔

ترجمہ: حضرت جریر بن عبداللہ سے روایت ہے' انہوں نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے فرمایا کہ تحقیق اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی کی جو کسی ان تین بستیوں میں سے اترے گا تم یعنی رہنے کے لیے پس وہ بھی تمہاری ہجرت کا گھر ہے مدینہ یا بحرین یا قنسیترین اس کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قولہ : ان اللّٰہ اوحی الی ای ھؤلاء الثلاثة : ''ای'': منصوب علی الظرفیہ ہے ''نزلت'' کیلئے۔ ابن حجرؒ کا کہنا

ہے کہ کہ استفہام کی وجہ سے مقدم ذکر کیا ہے۔ایک شارح اس بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: **أغرب فی قوله**۔وجہ تعجب یہ ہے کہ "أی" یہاں استفہام نہیں ہے۔۔

قوله : المدینة او البحرین او قنسرین: "المدینة": ثلاثة سے بدل ہونے کی وجہ سے مجرور ہے۔بعض نسخوں میں لفظ مدینہ کو منصوب ضبط کیا گیا ہے۔اس صورت میں أعنی مقدر ہوگا۔ایک دوسرے نسخہ میں رفع کے ساتھ ہے۔اس صورت میں ھی مبتدا محذوف کیلئے خبر ہوگا۔

"البحرین": لفظ بحرین میں کئی لغات ہیں، جو ماقبل میں گذر چکی ہیں۔یہ جگہ آج بھی مشہور ہے۔کہا گیا ہے کہ یہ بصرہ اور عمان کے درمیان واقع ہے۔ایک قول یہ ہے کہ یمن میں ہے۔علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ بحر عمان کا ایک جزیرہ ہے۔

"قنسرین": قاف کے کسرہ، اور نون اولیٰ مشددہ کے فتح کے ساتھ ہے، کسرہ بھی درست ہے۔واضح رہے کہ قنسرین غیر منصوف ہے۔ملک شام کے ایک شہر کا نام ہے۔

تعارض: ایک دوسری حدیث میں آتا ہے کہ آپ ﷺ کو جو جگہ دکھائی گئی تھی وہ مکہ تھی یہ آپ کا دار ہجرت ہے اور مدینہ کی طرف ہجرت کا حکم ملا تھا جیسا کہ اس روایت سے زیادہ صحیح روایات میں مروی ہے۔

جواب یہ ہے کہ اولاً نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف وحی کی گئی کہ آپ ان تینوں مقامات میں جو جگہ چاہیں پسند کرلیں، پھر ان مقامات میں سے مدینہ کی تعیین کردی گئی، مدینہ ان تینوں مقامات میں افضل ہے۔

الفصل الثّالث:

دجال مدینہ منورہ میں داخل نہیں ہوگا

۲۷۵۳: وَعَنْ اَبِیْ بَكْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ لَا يَدْ خُلُ الْمَدِيْنَةَ رُعْبُ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ لَهَا يَوْمَئِذٍ سَبْعَةُ اَبْوَابٍ عَلٰى كُلِّ بَابٍ مَلَكَانِ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی ٩٥/٤ الحديث رقم ١٨٧٩۔ واحمد فی المسند ٤٧/٥۔

ترجمه: حضرت ابی بکرہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے فرمایا کالے دجال کا رعب جو مدینہ میں داخل نہیں ہوگا اور اس دن مدینہ کے دجال کے خروج کے وقت سات دروازے ہونگے یعنی سات راہیں ہوں گی ہر دروازے پر دو دو فرشتے ہونگے یعنی دائیں بائیں محافظت کے لیے اس کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: **قوله :لایدخل المدینة رعب المسیح الدجال** :

"رعب": راء کے ضمہ اور عین کے سکون کے ساتھ ہے۔عین پر ضمہ بھی پڑھا گیا ہے۔رعب کے معنی ہیں خوف۔

قوله :لها یومئذ سبعة ابواب علی کل باب ملکان:

"لها": (یہاں اصل میں مضاف محذوف ہے۔) ای لسؤرھا • "سبعة ابواب": اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں:

(۱) اس کے سات دروازے ہونگے۔(۲) اس کے سات پہاڑی راستے ہونگے۔

"علی کل باب ملکان" ستے) اس کے بھی دو مطلب ہو سکتے ہیں:

(۱) ہر دروازہ پر دائیں بائیں دو دو فرشتے مدینہ کی حفاظت پر مامور ہوں گے۔

(۲) ہر دروازہ پر دائیں بائیں دو طرح کے فرشتے مدینہ کی حفاظت پر مامور ہوں گے۔

۲۷۵۴: وَعَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ بِالْمَدِیْنَةِ ضِعْفَی مَا جَعَلْتَ بِمَكَّةَ مِنَ الْبَرَكَةِ۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۹۷/٤ الحدیث رقم ۱۸۸۵۔ ومسلم فی صحیحه ۹۹٤/۲ الحدیث رقم (٤٦٦۔ ۱۳٦۹)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے فرمایا کہ اے الٰہی تو مدینہ میں دو چند (دوہری برکت) دے جیسے تو نے مکے میں کی۔ اس کو امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: دعا کا مطلب یہ ہے کہ ''اے اللہ! یعنی (اہل) مدینہ کی روزی میں (اور یہاں کی پیداوار میں) اس برکت سے دوگنی برکت عطا فرما جو تو نے مکہ کو عطا کی ہے۔ یہ دعا مدینہ پر مکہ کی فضیلت کے منافی باین اعتبار نہیں ہے کہ مکہ کی وجہ ترجیح حسنات کی زیادتی کے اعتبار سے ہے۔ اس لئے کہ پہلا ارتفاق (مدد طلبی) حسی و دینوی ہے، اور دوسرا اخروی معنوی ہے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں یہ حدیث مبارکہ پچھلی ایک حدیث: بمثل ما دعاك بمكة ومثله معه کے موافق ہے۔

۲۷۵۵: وَعَنْ رَجُلٍ مِّنْ اٰلِ الْخَطَّابِ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ مَنْ زَارَنِیْ مُتَعَمِّدًا كَانَ فِیْ جِوَارِیْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَمَنْ سَكَنَ الْمَدِیْنَةَ وَصَبَرَ عَلٰی بَلَائِهَا كُنْتُ لَهٗ شَهِیْدًا وَشَفِیْعًا یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَمَنْ مَاتَ فِیْ اَحَدِ الْحَرَمَیْنِ بَعَثَهُ اللّٰهُ مِنَ الْاٰمِنِیْنَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ۔

اخرجه البیهقی فی شعب الایمان۔

ترجمہ: ایک شخص سے روایت ہے جو کہ خطابؓ کی اولاد میں سے تھا نقل کی اس سے نبی کریم ﷺ سے کہ جس شخص نے قصداً میری زیارت کی وہ قیامت کے دن میرے پڑوس میں ہوگا اور میری پناہ میں ہوگا اور جو شخص مدینہ منورہ میں رہا اور اس کی سختیوں پر صبر کیا میں اس کی طاعت پر گواہ رہونگا اور شفاعت کرنے والا یعنی اس کے گناہوں کی قیامت کے دن اور جو شخص کہ مرے گا دونوں حرموں میں سے ایک مکہ و مدینہ کے اس کو اللہ تعالیٰ امن والوں میں سے اٹھائے گا یعنی قیامت کے دن بڑے خوف سے ہوگا۔

قوله: من آل الخطاب: ''الخطاب'': خاء معجمہ کے فتحہ اور طاء مشددہ کے ساتھ ہے۔ میرکؒ حاشیہ میں لکھتے ہیں: آل حاطب، حاء مہملہ اور طاء کے کسری کے ساتھ۔ اور اس پر ظاہری نشان ڈالا ہے اور اس کے نیچے لکھا ہے: كذا فی الترغیب للمنذری۔

قوله: من زارنی متعمدا كان فی جواری یوم القیامة:

''جوار'': جیم کے کسرہ کے ساتھ، أی فی مجاورته أو محافظتی۔

یہ فضیلت اسی صورت میں حاصل ہوگی کہ صرف آنحضرتؐ کی زیارت کا قصد ہو، مدینہ آنے میں جن امور کا قصہ ہوتا ہے وہ نہ ہو۔ مثلاً تجارت، شہرت، دکھلاوا یا اسی طرح کی اور کسی غرض فاسد کے لئے نہ ہو، بلکہ ثواب کی امید اور خالص ثواب حاصل کرنے کیلئے آئے۔

کسی عارف کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے حج کیا، لیکن نبی کریم ﷺ کی زیارت نہیں کی، اور فرمایا تمام کاموں سے فارغ ہو کر علیحدہ سے زیارت کروں گا۔ تو گویا کہ انہوں نے اس حدیث کے ظاہر کو لیا، تمام علماء عارفین نے خلاصۃ المعنی کی طرف نظر کی۔ چنانچہ زائر کیلئے مستحب ہے کہ وہ مسجد نبوی، مقبرہ بقیع، قبور شہداء اور تمام ''مشاہد'' کی زیارت کی نیت کرے۔ چونکہ عبارات اور امور دینیہ ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔ جس طرح کے دو رکعتیں مختلف نیتوں مثلاً شکر وضوء، تحیۃ المسجد، سنت یا فرض کی نیت کے ساتھ ادا کی جاتی ہیں۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس فرمان: نیة المؤمن خیر من عمله (مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے۔) کا ایک

مطلب یہی بیان کیا گیا ہے جو اوپر گزرا۔ ابن ہمامؒ بھی اسی عارف کے قول کی طرف مائل دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں: **الأولیٰ تجريد النية للزيارة، ثم إن حصل له إذا قدم زيارة المسجد أو يستفتح فضل الله سبحانه وتعالیٰ فی مرة أخرى ينويهما فيها۔**

قوله :من سكن المدينة وصبر علی بلائها كنت له شهيدا شفيعا يوم القيامة: یعنی جس شخص نے مدینہ میں اقامت اختیار کی یا اس کو اپنا وطن بنا لیا اور یہاں پہنچنے والی تکلیفوں مثلاً گرمی، تنگ گذران، اور یہاں رہنے والے روافض وغیرہ سے پہنچنے والی تکلیف پر صبر کیا۔ یہ روافض نظیر ہیں منافقین کی، کہ جن سے صحابہ کو تکالیف پہنچیں۔ تو ایسے صابر شخص کو مذکورہ فضیلت حاصل ہوگی۔

"**شهيدا و شفيعا**": ایک احتمال یہ بھی ہے کہ واؤ بمعنی "اَوْ" ہو۔

روضۂ اطہر کی زیارت کی فضیلت

۲۷۵۶: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ مَرْفُوْعًا مَنْ حَجَّ فَزَارَ قَبْرِی بَعْدَ مَوْتِی كَانَ كَمَنْ زَارَنِی فِی حَيَاتِی۔

(رواهما البيهقی فی شعب الا يمان)

اخرجه البيهقی فی شعب الايمان۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوع روایت ہے کہ جس شخص نے حج کیا پھر میری قبر کی زیارت کی۔ میرے مرنے کے بعد اس شخص شخص نے میری زندگی میں زیارت کی بیہقی نے شعب الایمان یہ دونوں حدیثیں نقل کیا ہیں۔

تشریح: قوله :من حج فزار قبری بعد موتی:

"**فزار**": فاء تعقیب کیلئے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی زیارت حج کے بعد کرنا چاہیے، جیسا کہ قواعد شرعیہ کا یہی تقاضا ہے کہ فرض سنت پر مقدم ہے۔ البتہ امام حسن بن زیادؒ نے امام ابوحنیفہؒ سے بڑی اچھی تفصیل نقل کی ہے۔ وہ یہ کہ اگر حج فرض ہو تو پھر افضل یہ ہے کہ حج سے ابتداء کرے، اور اگر نفل حج ہے تو پھر اسے اختیار ہے جس سے چاہے ابتداء کرے۔ اظہر یہ ہے کہ ہر صورت میں حج سے ابتداء کرے۔ او یک تو اس وجہ سے کہ حدیث مطلق ہے اس میں فرض یا نفل کی کوئی قید نہیں ہے، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق پر مقدم ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ تحیۃ المسجد النبوی کو زیارتِ قبر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر مقدم کیا جا سکتا ہے۔

كان كمن زارنی فی حياتی: یعنی جس شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی زیارت کی تو وہ اس شخص کی مانند ہوگا جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رزق دیا جاتا ہے۔

اس باب میں بہت سی احادیث وارد ہیں، نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے روضۂ اقدس کی زیارت کے فضائل مشہور و معروف ہیں۔ جو شخص اس سلسلہ کی بعض فضیلتوں کا منکر ہے سو اس وجہ سے کہ اس میں سے اکثر ایسی بدعات پر مشتمل ہیں جو گناہ کبیرہ ہیں۔

عرض مرتب: اس مقام پر مظاہر حق میں بہترین کلام کیا ہے۔ افادہ کی خاطر پیش خدمت ہے:

روضۂ اطہر کی زیارت کرنے والے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرنے والے کی مانند اس لئے ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حیات ہیں! یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ روضۂ اطہر کی زیارت حج کے افعال سے فراغت کے بعد کی جائے۔

ایک اور روایت میں منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص میری قبر کی زیارت کرتا ہے اس کے لئے میری شفاعت واجب و لازم ہوتی ہے"۔ نیز ایک روایت میں یہ ہے کہ "جس شخص نے حج بیت اللہ کیا اور میری زیارت نہیں کی اس نے مجھ پر ظلم کیا"۔ اسی طرح ایک روایت میں یہ منقول ہے کہ "جس شخص نے مکہ (یعنی حج) کا قصد کیا اور پھر میری زیارت اور میری مسجد میں شرف حاضری کے حصول

کا قصد کیا تو اس کے لئے یعنی اس کے نامۂ اعمال میں دو مقبول حج لکھے جاتے ہیں۔اھ۔

سرزمین مدینہ کی فضیلت بوجہ روضۂ اطہر کے

۲۷۵۷: وَعَنْ يَحْيَ بْنِ سَعِيْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ جَالِسًا وَقَبْرٌ يُحْفَرُ بِالْمَدِيْنَةِ فَاطَّلَعَ رَجُلٌ فِي الْقَبْرِ فَقَالَ بِئْسَ مَضْجَعُ الْمُؤْمِنِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِئْسَمَا قُلْتَ قَالَ الرَّجُلُ اِنِّي لَمْ اُرِدْ هٰذَا اِنَّمَا اَرَدْتُّ الْقَتْلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا مِثْلَ الْقَتْلِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَا عَلَى الْاَرْضِ بُقْعَةٌ اَحَبَّ اِلَيَّ اَنْ يَّكُوْنَ قَبْرِيْ بِهَا مِنْهَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ۔ رواہ مالک مرسلاً

اخرجه مالك في الموطأ ٢/٤٦٢ الحديث رقم ٣٣ من كتاب الجهاد۔

ترجمہ: یحییٰ بن سعیدؒ سے روایت ہے۔کہ تحقیق نبی کریم ﷺ بیٹھے ہوئے تھے اور ایک قبر کھودی جارہی تھی مدینہ منورہ میں پس ایک شخص نے قبر میں جھانکا اور کہا مومن کی خوابگاہ بری ہے یعنی قبر۔پس فرمایا کہ بری وہ چیز ہے کہ جو تو نے کہی۔ اس شخص نے کہا کہ میں نے ارادہ نہیں کیا اس کا سوائے اس کے کہ میں نے قتل فی سبیل اللہ کا پس آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قتل فی سبیل کی طرح کوئی چیز نہیں ہے میرے نزدیک زمین میں کوئی جگہ محبوب تر نہیں ہے میرے نزدیک کہ میری قبر اس میں ہو مدینہ سے آپ ﷺ نے تین مرتبہ یہ دعا ارشاد فرمائی۔ مالک علیہ السلام نے یہ بات بطریق ارسال کے روایت کی۔

تشریح: قوله :فاطلع رجل في القبر فقال بئس مضجع المؤمن :

''اطلع'': طاء کی تشدید کے ساتھ ہے۔ بئس مضجع المؤمن: علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: أي: هذا القبر، یعنی مخصوص بالذم محذوف ہے۔اور اس کی بات کا مطلب یہ تھا کہ مومن کو اس کی موت کے بعد اس جیسی جگہ میں لٹانا اچھا نہیں ہے۔

''مضجع'': جیم کے فتحہ کے ساتھ ہے۔بمعنی مرقد ومدفن۔

قوله :فقال بئس ماقلت ......اردت القتل في سبيل الله:

یعنی تمہاری یہ بات بری ہے کہ قبر مؤمن کے لئے بری خوابگاہ ہے، حالانکہ مؤمن کی قبر جنت کے باغات میں سے ایک باغ ہے۔ چنانچہ اس شخص نے اپنی بات کی وضاحت کی کہ میری مراد یہ نہیں تھی، یا یہ اطلاق مراد نہیں تھا، بلکہ میرا مطلب تو یہ تھا کہ اللہ کی راہ میں شہید ہونا گھر میں بستر پر مرنے سے بہتر ہے۔

قوله :لامثل القتل في سبيل الله:.....ثلاث مرات: ''مثل'': منصوب ہے۔أي ليس شيئ مثل القتل۔

'' أحبّ'': مرفوع ہے، اور کہا گیا ہے کہ حالت نصبی میں ہے۔''ثلاث مرات'': مکمل مقولہ ثانی کیلئے ظرف ہے۔

یعنی اللہ کے راستے میں قتل کئے جانے کی مانند تو کوئی بھی چیز نہیں۔اور پھر آپ ﷺ نے اس شخص کی فضیلت ذکر فرمائی جو مدینہ میں مرے اور مدینہ ہی میں دفن کیا جائے خواہ وہ شہید ہو یا غیر شہید۔کہ اللہ کی راہ میں شہید ہونے سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے لیکن یہ بات بھی ہے کہ روئے زمین کا کوئی بھی ٹکڑا ایسا نہیں ہے جس میں میری قبر بنے اور وہ مجھے مدینہ سے زیادہ محبوب ہو۔

علماء کا اجماع ہے کہ مدینہ کی موت، مکہ میں فوت سے افضل ہے۔مکہ و مدینہ میں سے کس کی مجاورت افضل واکمل ہے' سو یہ مسئلہ اختلافی ہے۔چنانچہ حضرت عمرؓ یہ دعا مانگا کرتے تھے: اللهم ارزقني شهادة في سبيلك واجعل موتي في بلد رسولك۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: معناه أني ما أردت أن القبربئس مضجع المؤمن مطلقًا بل أردت أن موت المؤمن في

الغربة شهيدا خير من موته فى فراشه وبلده وأجاب رسول الله ﷺ بقوله :لا مثل القتل أى ليس الموت بالمدينة مثل القتل فى سبيل الله أى الموت فى الغربة، بل هو أفضل وأكمل، فوضع قوله :ما علىٰ الأرض بقعة الخ موضع قوله : بل هو أفضل وأكمل، فإذا "لا" بمعنى "ليس" واسمه محذوف والقتل خبره اھ۔اس کلام کا ظاہر خلافِ اجماع ہے، چونکہ شہادت فی سبیل اللہ، مدینہ کی مجرد موت سے افضل ہے، بلکہ ماقبل میں حدیث گزری جو دلالت کرتی ہے کہ پردیس کی موت، مدینہ کی موت سے افضل ہے۔پس فضیلت کاملہ یہ ہے کہ پردیس کی موت کا ثواب بھی حاصل ہو جائے اور مدینہ کا مدفن مل جائے۔والله تعالىٰ أعلم۔
یہ حدیث بھی اُفضلیت مدینہ کی دلیل نہیں ہے۔

قوله :رواه مالك مرسلا :اس کی تفصیل وتوضیح یہ ہے کہ امام مالکؒ نے اس حدیث کو یحییٰ بن سعد انصاری مدنی سے روایت کیا ہے، وہ اکابر تابعین میں سے ہیں، انہوں نے انس بن مالک، سائب بن یزید اور ان کے علاوہ حضرات سے سماع کیا ہے، ان سے روایت کرنے والوں میں ہشام بن عروہ ،مالک بن انس، شعبہ، ثوری، ابن عیینہ، اور ابن مبارک وغیرہ شامل ہیں ۔(ذکرہ المؤلف) جب تابعی کا نام محذوف ہو اور صحابی کا نام مذکور ہو تو حدیث مرسل کہلاتی ہے۔اس حدیث میں مدینہ کی افضلیت کی کوئی دلیل نہیں ہے حالانکہ اس پر اجماع ہے کہ مدینہ مکہ سے بلکہ عرش اعظم سے بھی افضل ہے۔

وادیٔ عقیق کی فضیلت

۲۷۵۸:وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ وَهُوَ بِوَادِى الْعَقِيْقِ يَقُوْلُ اَتَانِى اللَّيْلَةَ اٰتٍ مِنْ رَبِّى فَقَالَ صَلِّ فِى هٰذَا الْوَادِى الْمُبَارَكِ وَقُلْ عُمْرَةٌ فِى حَجَّةٍ وَفِى رِوَايَةٍ وَقُلْ عُمْرَةٌ وَحَجَّةٌ ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۹۱/۳۔ الحدیث رقم ۱۵۳٤۔ وابو داؤد فی السنن ۳۹٤/۲ الحدیث رقم ۱۸۰۰۔ وابن ماجه ۹۹۱/۲ الحدیث رقم ۲۹۷٦۔ واحمد فی المسند ۲٤/۱۔ ۱) وهی قراءة شاذة۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ عمر بن خطابؓ نے کہا کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا اور آپ ﷺ وادی عقیق میں تھے فرمایا میرے پاس آ جاتی رات آنے والا آیا ہے میرے پروردگار کی طرف سے یعنی فرشتہ اور کہا کہ نماز پڑھو اس مبارک جنگل میں اور کہو عمرہ حج میں اور ایک روایت میں آیا ہے کہ کہو عمرہ اور حج ۔یعنی اس میں نماز عمرہ اور حج کے لیے اس کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: وقوله :سمعت رسول الله يقول وهو بوادى العقيق:
''وادی عقیق'' ذوالحلیفہ کے قریب واقع ایک جگہ کا نام ہے۔(ذکرہ ابن حجر)
قاموس میں لکھتے ہیں: مدینہ میں ایک جگہ کا نام ہے، ایک اور وادی عُتیق بھی ہے جو مدینہ کے علاوہ کسی اور جگہ واقع ہے۔
النہایہ میں لکھتے ہیں: مدینہ کی ایک وادی ہے اور ذات عرق کے قریب ایک جگہ ہے۔

وقوله :يقول اتانى الليلة من ربى آت ......وقل:عمرة فى حجة :
''عمرة'': رفع کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں نصب کے ساتھ ہے۔علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں:أى احب صلاتك هذه واعدلها بعمرة داخلة فى حجة، والقول يستعمل فى جميع الأفعال كما مر، ويحتمل أن يقال: المعنى صل فى هذا الوادى المبارك الاِلحرام وقارن بين العمرة والحجة اھ۔یہ احتمال بعید ہے چونکہ انبیاء کرام کے خواب وحی ہوتے ہیں اور نبی

کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے یہاں سے عمرہ کا احرام باندھنا ثابت نہیں، چہ جائیکہ ان دونوں کو جمع فرمایا ہو۔

لہٰذا اس کا درست مطلب یہ ہے: **ان ثواب الصلوٰۃ فيه يعدل ثواب عمرة في ضمن حجة**۔ اس میں اشارہ ہے کہ جب عمرہ مقرون بالحج ہوگا بایں طور کہ دونوں ایک ہی سفر میں بجالائے جائیں تو عمرہ مفردہ سے بہتر ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ "فی"، بمعنی "مع" ہو۔ اس کی دلیل یہ اگلا جملہ ہے۔

وقوله :وفي رواية: وقل: عمرة وحجة: "**عمرة و حجة**" برفع کے ساتھ ہے، **أي صلاة فيه لعمرة وحجة**۔ (یعنی اس وادی میں نماز پڑھنا حج وعمرہ ہے، یعنی ان کے مترادف ہے۔) یہ تشبیہ بلیغ کے قبیل سے ہے۔ نصب پڑھنے کی صورت میں یہ منصوب **علی نزع الخافض** ہے۔ اس صورت میں یہ تشبیہ ناقص کو کامل کے ساتھ ملحق کرنے کے باب سے ہوگا۔

اس مقام پر نماز پڑھنے کی فضیلت کی وجہ صاحب شریعت علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی جانتے ہیں، بظاہر یہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس مقام کی خصوصیت کے پیش نظر ہے۔ اور گویا کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ جل شانہ سے تعجیل عمرہ وحج کا ارادہ ظاہر فرمایا تو آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے فرمایا گیا: **صل ، فإن الصلاة معراج الانبياء عليهم الصلوٰت والتسليمات ولك في مقابلتها ثواب العمرة والحج نبيك على وجه التمام**۔ ہماری اس بات کی دلیل یہ ہے کہ صحابہ کرام اور علمائے انام میں سے کسی سے یہ بات ثابت نہیں کہ اس مقام کو ان "مشاہد عظام" میں شمار کیا ہو کہ جس کی عوام وخواص زیارت کرتے ہیں۔

فارس نے منسک میں ذکر کیا ہے ابن جریر طبری "تہذیب الاخبار" میں فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم متمتع نہیں تھے، چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: **لو استقبلت من امري ماستدبرت ماسقت الهدى ولجعلتها عمرة** اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مفرد تھے، اس لئے کہ اس صورت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہدی ضروری تھی، جیسا کہ فرماتے ہیں۔ اور وہ نہیں ہوتی مگر قارن کیلئے، اور اس لئے کہ روایات صحیحہ بکثرت اس بارے میں وارد ہوئی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج وعمرہ دونوں کیلئے تلبیہ کہا تھا۔ تو گویا کہ جس نے اضافہ کیا وہ اولی ہے۔ فرمایا وجہ اختلاف یہ ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب عقد احرام کیا تو کبھی آپ تلبیہ میں حج کا ذکر فرماتے، کبھی عمرہ کا ذکر فرماتے، اور گاہے دونوں کا ذکر فرماتے، اس امید پر کہ دونوں میں سے کسی کا معاملہ واضح ہو جائے، اس سارے عمل میں آپ حج کی نیت کئے ہوئے تھے، اور عمل کی کیفیت طلب کرتے حتی کہ جبرائیل علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے اور فرمایا: **قل :عمرة في حجة** یوں یہ پردہ اٹھا، اور مطلوب واضح ہوا۔ یہ کلام کئی اعتبار سے محل نظر ہے:

① وجوب ہدی اس شخص کیلئے ہے جس کی مفرد ہونا ممنوع ہو۔ بلکہ فتح حج بالعمرہ ممنوع ہو اس لئے ہو اس کا مقتضیٰ خروج من الاحرام ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**ولا يحلقوا رؤوسكم حتى يبلغ الهدى محله**﴾

② طبریؒ کا یہ کہنا: "**لعله أن يتبين** "معلول ہے، چونکہ کیفیت میں تردد کے رہتے ہوئے نیت درست نہیں۔ حالانکہ نبیؐ کو حج کا حکم دیا گیا، اور آپؐ نے عمرہ کئی بار ادا کیا، نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یا تو ابتداء ان دونوں کی نیت کی تھی یا پہلے حج کی نیت کی، پھر عمرہ۔ اس ارشاد باری تعالیٰ پر عمل کرتے ہوئے: ﴿**وأتموا الحج والعمرة لله**﴾[البقرة:١٩٦] **أقيموا** کی قراءت کی بناء پر۔

③ وادی عقیق بالاتفاق مدینہ کے قریب ہے، اور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ذوالحلیفہ سے احرام باندھنا بھی مجمع علیہ ہے، لہٰذا تحقیق بات وہی ہے جو ماقبل میں گزری۔ **والله سبحانه وتعالىٰ أعلم**۔

ترجمۃ الباب سے حدیث کی مناسبت یہ ہے کہ یہ وادی مدینہ کے قریب واقع تھی اور مدینہ کا اردگرد بھی مدینہ کی فضیلت میں شامل ہے اس لئے مصنف نے اس حدیث کو اس باب میں ذکر کیا۔ **والله تعالىٰ أعلم بالصواب**۔

کِتَابُ الْبُیُوْعِ

خرید وفروخت کا بیان

امام زہری فرماتے ہیں کہ عرب کے ہاں "بعت" یہ فروخت کرنے اور خریدنے پر دو معنی میں استعمال ہوتا ہے اسی طرح لفظ شراء بھی دونوں معنوں میں مستعمل ہے۔ اس لئے کہ "ثمن" اور "مثمن" ہر ایک پر "مبیع" کا اطلاق ہوتا ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ شارع کے احکامات کا تعلق متعدد چیزوں سے ہے:

① خالص حقوق اللہ۔ ② خالص حقوق العباد۔

③ جس میں دونوں کا حق ہو لیکن اللہ کا حق غالب ہو۔ ④ اس کا برعکس۔

اللہ کے حقوق عبادات، سزائیں اور کفارات ہیں۔

مصنف نے ابتداء ان حقوق سے کی جو خالصاً اللہ کا حق ہیں یہاں تک کہ اس کی آخری نوع تک پہنچے، پھر معاملات کو ذکر کیا جو کہ حقوق العباد میں سے ہیں۔

بیع مصدر ہے، کبھی مفعول کے معنی میں ہوتا ہے اسی اعتبار سے اس کی جمع لائی جاتی ہے جیسے مبیع کی جمع۔

کبھی مصدری معنی میں مستعمل ہوتا ہے اور یہی اصل ہے اس صورت میں جمع لانا باعتبار بیع کی انواع کے ہے اس لئے کہ بیع کی متعدد انواع ہیں۔ مثلاً

(۱) بیع سلم: پیشگی رقم ادا کر کے مبیع متعین کرنا۔ (۲) اگر اس کا الٹ ہو کہ مبیع دیکر ثمن وصول کرے تو اس کو بیع مطلق کہتے ہیں۔

(۳) بیع صرف: نقد کا تبادلہ نقد سے (۴) بیع مقائضہ: مبیع بھی مال ہو اور ثمن بھی مال ہو۔ (۵) بیع مرابحہ (۶) بیع تولیہ (۷) بیع وضیعہ (۸) بیع نسیئہ۔

بیع کا اطلاق خرید وفروخت دونوں پر ہوتا ہے اسلئے یہ اضداد کے قبیل سے ہے۔ کہا جاتا ہے: باعہ' یہ اس وقت کہتے ہیں جب بائع مبیع کو اپنی ملکیت سے نکال کر مشتری کی ملکیت میں داخل کردے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے: باعہ اس موقع پر کہ جب کوئی شخص کوئی چیز خرید لے۔

کبھی بغیر حرف جر کے متعدی ہوتا ہے اور کبھی حرف جر کے واسطہ سے، ۔ جیسے: باع زید الثوب و باعه منه

بیع کا لغوی معنی: فخر الاسلام فرماتے ہیں کہ مال کے ساتھ مال بدلنا "بیع" کہلاتا ہے۔

بیع کا شرعی معنی: آپس کی رضامندی سے مال کا مال سے تبادلہ کرنا۔

بیع کی مشروعیت کتاب وسنت دونوں سے ثابت ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے: ﴿احل اللّٰہ البیع﴾ [بقرہ: ۲۷۵]

حدیث میں مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: اے تاجروں کی جماعت! بیشک تمہاری اس بیع میں فضول اور جھوٹی باتیں ہوتی ہیں، پس اس کو صدقہ کے ساتھ ملاؤ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا گیا تو لوگ پہلے سے آپس میں بیع شراء کرتے تھے تو حضورؐ نے اس پر تقریر ثبت فرمائی۔

نیز بیع کی مشروعیت پر اجماع بھی ہے۔

بیع کی مشروعیت کا سبب: اس کے ساتھ انسانی بقا کا تعلق ہے۔ وہ یوں کہ اگر انسان اپنی بعض ضروریات کو پیدا کرنے میں مستقل ہو جائے کہ زمین کو جوتے پھر اس میں گندم بوئے اور اس کی خدمت اور چوکیداری کرے' اس کو کاٹے' گا ہے۔ اس کو اڑائے' اور صاف کرے' اپنے ہاتھ سے پیسے اور گوندھے تو اس پر وہ قادر نہیں، اور پٹ سن اور اون اور اس کا پہننا اور اس سے ایسا لباس بنانا جو اس کو گرمی اور سردی سے بچائے وغیرہ۔ پس ضروری ہے کہ وہ اپنی ضرورت کو پورا کرے کسی کی چیز کو خریدا کرے۔ پس اگر بیع مشروع نہ ہوتی دونوں عوضوں کی تملیک کیلئے سبب کے طور پر تو پھر انسان اس کو زبردستی اور طاقت کے ساتھ لینے پر مجبور ہوتا یا مانگنے اور گداگری کے ساتھ لینے پر مجبور ہوتا۔ یا صبر کرتا یہاں تک کہ مرجاتا اور ان میں سے ہر ایک میں وہ فساد اور برائی ہے جو کسی سے مخفی نہیں ہے اور دوسرے میں ذلت اور خواری ہے جس پر ہر ایک قادر نہیں ہوتا اور اس کے لئے عیب اور عار کی بات ہوتی ہے۔ پس بیع کی مشروعیت میں ضرورت مند مکلف انسانوں کی بقاء ہے، اور ان کی ضروریات کو ایک بہترین نظام کے ساتھ پورا کرتی ہے۔

بَابُ الْكَسْبِ وَطَلَبِ الْحَلَالِ

کسب اور طلب حلال کا بیان

اس باب میں کمائی کی فضیلت' اور حلال وحرام کمائی کی تعیین کا بیان ہے۔

حرام سے بچنا طلب حلال کے لوازمات میں سے ہے۔ طلب حلال نماز کے بعد اہم فریضہ ہے۔ جب کہ دوسرا قول یہ ہے کہ اس کی فرضیت نماز سے مقدّم ہے۔ دوسرا قول زیادہ ظاہر ہے جیسا کہ قرآن میں ہے:

﴿كلوا من الطيبات واعملوا صالحا﴾ [المؤمنون۔ ٥١] ''اے پیغمبر تم (اور تمہاری امتیں) نفیس چیزیں کھاؤ اور نیک کام (یعنی عبادت) کرو۔''

الفصل الاول:

۲۷۵۹: عَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِيْكَرِبَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم مَا اَكَلَ اَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَيْرًا مِّنْ اَنْ يَّاْكُلَ مِنْ عَمَلِ يَدَيْهِ وَاِنَّ نَبِيَّ اللّٰهِ دَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ يَاْكُلُ مِنْ عَمَلِ يَدَيْهِ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤/٣٠٣ الحديث رقم ٢٠٧٢۔

ترجمه: ''حضرت مقدام بن معدی کربؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کبھی کسی شخص نے اپنے ہاتھ کی محنت کی کمائی سے بہتر کوئی کھانا نہیں کھایا' (اور یہی وجہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھوں کی محنت سے کمائی ہوئی روزی کھاتے تھے''۔ (بخاری)

تشریح: قط : قاف کے فتحہ اور طاء کی تشدید کیساتھ،

خیرا : کے یہاں تین مطلب ہو سکتے ہیں: (۱) افضل زیادہ فضیلت والا (۲) أحل زیادہ حلال (۳) اطیب زیادہ پاکیزہ

یدیه : تثنیہ کا صیغہ لایا گیا اس لئے کہ کام عام طور پر دونوں ہاتھوں سے ہوتا ہے۔

وان نبی اللہ داود علیہ السلام : لفظ داؤد منصوب ہے بدل یا عطف بیان ہونے کی وجہ سے۔
حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر بطور خاص اس لئے کیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو اس کی تعلیم دی تھی جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿**وعلمناہ صنعۃ لبوس لکم**﴾

کان یاکل من عمل یدیہ :

مظہر فرماتے ہیں کہ اس میں کسب حلال پر ابھارنا مقصود ہے چونکہ اس میں بہت فوائد ہیں:

① اگر کسی دوسرے کیلئے کام کیا تو اس سے اجرت اجرت ملے گی۔ ② اگر عمل تجارت ہو تو اصل مال بڑھے گا۔ ③ کسب سے عام لوگوں کو بھی نفع پہنچتا ہے کہ بایں طور کہ لوگوں کی ضروریات پوری ہوتی ہیں جیسے کپڑا اس کی سلائی اور وہ چیزیں جو محنت سے حاصل ہوتی ہیں۔ مثلاً درخت لگانا، کھیتی باڑی کرنا، اناج اور پھل۔ ④ کسب کی وجہ سے کمائی کرنے والا بے ہودہ کاموں سے محفوظ رہتا ہے۔ ⑤ کسب میں کسر نفس بھی ہے جس کی وجہ سے نافرمانی بہت کم ہوتی ہے۔ ⑥ کمائی کی وجہ سے آدمی مانگنے اور احتیاج کی ذلت سے محفوظ رہتا ہے۔

کمائی کرنے والے کیلئے یہ شرط ہے کہ وہ رزق کا اعتقاد کسب سے وابستہ نہ کرے۔ بلکہ یہ اعتقاد رکھے کہ رزق اللہ کریم کی طرف سے ہے جو رزاق اور ذی القوۃ المتین ہے

"**وان نبی اللہ**" تاکید وتحریض ہے یہ اس بات کا بیان ہے کہ کسب حلال انبیاء کی سنت ہے۔ حضرت داؤدؑ اپنے ہاتھ سے زرہ بناتے تھے اور اپنی گزراوقات کیلئے فروخت کرتے تھے۔ لہٰذا انبیاء کی سنت کو اختیار کرو۔

حضرت داؤدؑ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ اپنی حکومت میں لوگوں سے اپنے بارے میں رائے حاصل کرتے رہتے تھے، چنانچہ جو شخص ان کو نہ پہچانتا اس سے دریافت کرتے کہ بتاؤ داؤد کیسا ہے۔ ایک دن اللہ نے فرشتہ کو انسان کی صورت میں بھیجا۔ داؤد علیہ السلام اس کی طرف بڑھے اور اس سے بھی اسی قسم کے سوال کئے۔ اس نے جواب میں کہا کہ داؤد علیہ السلام تو اچھے آدمی ہیں مگر اتنی بات ضرور ہے کہ وہ بیت المال سے کھاتے ہیں، چنانچہ داؤد علیہ السلام نے دعا کی کہ اے اللہ مجھے بیت المال سے مستغنی کر دے۔ اللہ نے دعا قبول کی اور زرہ بنانے کا ہنر سکھایا وہ ایک زرہ چار ہزار درہم میں فروخت کرتے تھے۔ کہا گیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام ہر روز اک زرہ بناتے اور اس کو چھ ہزار درہم میں فروخت کرتے تھے پھر اس چھ ہزار کو اس طرح صرف کرتے کہ دو ہزار اپنے اور اپنے اہل وعیال کیلئے اور چار ہزار درہم بنی اسرائیل کے فقرا مساکین میں بطور صدقہ وخیرات تقسیم فرما دیتے تھے۔

اکثر علماء کے نزدیک اتنا کمانا واجب ہے جو کمانے والے اور اس کے اہل وعیال کی معاشی ضروریات کیلئے کافی ہو ضروریات سے زائد کمانا مباح ہے جبکہ نیت اپنی شان وشوکت نہ ہو۔ جبکہ ایک قول ہے کہ کمائی میں مشغول ہونا مکروہ ہے اس لئے کہ عبادت الٰہی میں مشغول ہونا ہر ایک پر واجب ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون**﴾ (ذاریات:۵۶ پ۲۷) ۔ ہم کہتے ہیں کہ عبادت سے مراد معرفت ہے جو کہ کسب حلال کے منافی نہیں۔ اور اگر عبادت ہی مراد ہو تو عبادات مفروضہ مراد ہوں گی ہم کہتے ہیں کہ یہ بھی کسب حلال اس کے منافی نہیں۔۔ چونکہ سارا وقت نہیں گھیرتیں۔

۲۷۶۰: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْ لُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اللّٰهَ طَيِّبٌ لَا يَقْبَلُ اِلَّا طَيِّبًا وَاِنَّ اللّٰهَ اَمَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ بِمَا اَمَرَ بِهِ الْمُرْسَلِيْنَ فَقَالَ يٰاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا وَقَالَ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ثُمَّ ذَكَرَ الرَّجُلَ يُطِيْلُ السَّفَرَ اَشْعَثَ اَغْبَرَ يَمُدُّ يَدَيْهِ اِلَى السَّمَآءِ يَا رَبِّ يَا رَبِّ وَمَطْعَمُهٗ حَرَامٌ وَمَشْرَبُهٗ حَرَامٌ وَمَلْبَسُهٗ حَرَامٌ وَغُذِيَ بِالْحَرَامِ فَاَنّٰى يُسْتَجَابُ لِذٰلِكَ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۷۰۳/۲ الحدیث رقم (۶۵۔ ۱۰۱۵)۔ والترمذی فی السنن ۲۰۵/۵ الحدیث رقم ۲۹۸۹۔ والدارمی فی ۳۸۹/۲ الحدیث رقم ۲۷۱۷۔ واحمد فی المسند ۳۲۸/۲۔ (۱) اخرجه ابوداوٗد فی السنن ۶۶۰/۳ الحدیث رقم ۳۳۲۶۔ والترمذی فی ۵۱٤/۳۔ (۱) فی المخطوطة ((المال))۔ (۱) سورة المؤمنون آیة ۵۲۔ (۱) سورة البقرة۔ آیة رقم ۱۷۲۔ (۱) البخاری فی صحیحه ۸۱/٦ الحدیث رقم ۲۸۸۷۔

ترجمه:''اور حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بلاشبہ اللہ تعالیٰ (تمام کمی اور عیوب سے) پاک ہے' اس پاک ذات کی بارگاہ میں صرف وہی (صدقات واعمال) مقبول ہوتے ہیں جو (شرعی عیوب اور نیت کے فساد سے) پاک ہوں۔ (یاد رکھو!) اللہ تعالیٰ نے جس چیز (یعنی حلال مال کھانے اور اچھے اعمال) کا حکم اپنے رسولوں کو دیا ہے اسی چیز کا حکم تمام مؤمنوں کو بھی دیا ہے' چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یَاأَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا (یعنی اے رسولو! حلال و پاکیزہ روزی کھاؤ اور اچھے اعمال کرو) نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ (یعنی اے مؤمنو! تم صرف وہی پاکیزہ وحلال رزق کھاؤ جو ہم نے تمہیں عطا کیا ہے) پھر آپ ﷺ نے (بطور مثال) ایک شخص کا حال ذکر کیا کہ وہ طویل سفر اختیار کرتا ہے پراگندہ بال اور غبار آلود ہے وہ اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاتا ہے اور کہتا ہے' اے میرے پروردگار! اے میرے پروردگار (یعنی وہ اپنے مقاصد کے لئے دعا مانگتا ہے) حالانکہ اس کا کھانا حرام' اس کا لباس حرام اور اس کا پینا حرام (شروع سے اب تک) اس کو حرام غذا دی گئی پھر ایسے شخص کی دعا کیسے قبول ہو؟ (مسلم)

تشریح: قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ طیب ''خبیث'' کی ضد ہے۔ جب ''طیب'' اللہ کی صفت بنے تو مراد تمام عیوب ونقائص اور آفات سے پاک ہونا ہوتا ہے۔ اور جب اس کا تعلق بندے کے ساتھ ہو تو اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ آدمی اخلاق رذیلہ اور اعمال قبیحہ سے مبرا ہے' اور اس کے برعکس اخلاق واعمال سے مزین ہے۔ اور اس صفت کا تعلق مال سے ہو تو حلال اور اچھا مال مراد ہوتا ہے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تمام عیوب سے پاک ہے پس وہ حرام مال قبول نہیں کرتا۔ پھر اصل یہی ہے کہ اللہ کا قرب اس صفت کے ذریعہ حاصل کیا جائے کہ اچھا حلال مال تلاش کیا جائے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے: ﴿**لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون**﴾ [آل عمران ۹۲] ''تم خیر کامل کو کبھی نہ حاصل کرسکو گے، یہاں تک کہ اپنی پیاری چیز کو خرچ نہ کرو گے۔''

قوله :وان الله امر المومنین بما امر به المرسلین : ما موصولہ ہے مراد اکل حلال اور تحسین اموال ہے

قوله :﴿**یآیها الرسل کلوا من الطیبات واعملوا صالحا انه بما تعملون علیم**﴾[المؤمنون:۵۱] ''اے پیغمبر تم (اور تمہاری امتیں) نفیس چیزیں کھاؤ اور نیکو کار و (یعنی عبادت) کرو (اور) تم سب کے کئے ہوئے کام کو خوب جانتا ہوں'' یہ خطاب تمام انبیاء کو ہے لیکن ایک ہی مرتبہ نہیں بلکہ ہر ایک کو اس کے زمانہ نبوت میں' اس لئے کہ انبیاء کو مختلف اوقات میں مبعوث کیا گیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یثاق کے دن یہ خطاب خصوصی طور پر تمام انبیاء کو ہوا ہو، یا یہ اس اعتبار سے ہے کہ اللہ کیلئے کوئی صبح نہیں ہے اور نہ کوئی شام ہے اس میں اس پر بھی تنبیہ ہے کہ حلال مال پہلے سے مشروع ہے، اور رہبانیت پر اعتراض ہے کہ انہوں نے لذتوں کو چھوڑ دیا اور ساتھ ساتھ اس بات کی طرف اشارہ بھی کہ حلال مال سے نیک اعمال وجود میں آتے ہیں جن کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔

قوله :وقال :﴿ **یا ایها الذین امنوا**..... ﴾: ''اے ایمان والو! جو پاک چیزیں ہم نے تم کو مرحمت فرمائیں ان میں سے کھاؤ اور حق تعالیٰ کی شکر گزاری کرو، اگر تم خاص ان کے ساتھ غلامی کا تعلق رکھتے ہو'' اس امر میں کئی احتمال ہیں: (۱) امر اباحت کیلئے ہے۔ (۲) وجوب کیلئے ہے جیسے کوئی ہلاکت کے قریب ہو تو اس کیلئے کھانا واجب ہے۔ (۳) امر استحباب کیلئے ہے جیسے مہمان کے ساتھ کھانا اور عبادت پر استعانت کے لئے کھانا مستحب ہے۔ **طیبات** '' سے مراد حلال اشیاء ہیں یا لذیذ اشیاء مراد ہیں

واشکروا الله ان کنتم ایاه تعبدون [البقرة:۱۷۲] اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ نے تمام اشیاء اپنے بندوں کے لئے پیدا کی ہیں جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿**هو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعا**﴾[بقرہ :۲۹] ''وہ ذات پاک ایسی

ہے جس نے پیار کیا تمہارے فائدے کے لیے جو کچھ بھی زمین میں موجود ہے' وہ لیکن بندے کو اپنی معرفت اور عبادت کیلئے پیدا کیا جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون ماأريد يد منهم من رزق وما أريد ان يطعمون﴾[ذاریات ۵۶] ''اور میں نے جن وانس کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں' میں ان سے (مخلوق کی) رزق رسانی کی درخواست نہیں کرتا اور نہ ہی یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ مجھ کو کھلایا کریں''۔

قوله :ثم ذكر الرجل : منصوب ہے مفعول ہونے کی وجہ سے بعض نسخوں میں مرفوع بھی پڑھا گیا بنا بر مبتدا کے اور مابعد اس کے لئے خبر ہے پھر پورا جملہ محلاً منصوب مفعول ہوگا۔

يطيل السفر : لمبا سفر کرتا ہے اور عباد مثلاً حج' عمرہ' جہاد' تعلیم وتعلّم اور دیگر نیکی کے کام بکثرت کرتا ہے۔

اشعث اغبر يمد يديه : یہ حال مترادفہ یا متداخلہ ہیں ''يمديديه'' اسم فاعل ''مارا'' کی تاویل میں ہے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاتا ہے، اس لئے کہ آسمان دعا کیلئے قبلہ ہے اور یہ بار بار کہتا ہے۔

يا رب يا رب : لفظ ربّ کے ذکر کرنے میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اس لفظ کا دعا کی قبولیت میں بڑا اثر ہے' اس لئے کہ اس میں اعتراف ہے کہ اس بندہ کا وجود اللہ کی تربیت، احسان اور سخاوت سے کسب فیض کرتا ہے۔ اسی لئے جعفر صادق فرماتے ہیں کہ جس کو کوئی اہم معاملہ پیش آئے اور پانچ مرتبہ کہے: ربَّنا، تو اللہ اس کو خوف سے نجات دیں گے اور مراد بھی پوری ہوگی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ آل عمران میں ان کے بارے میں نقل کیا ہے کہ انہوں نے پانچ مرتبہ '' ربنا'' کہا۔

مطعمه : مصدر میمی ہے بمعنی مفعول یا ظرف مکان یا زمان ہے۔ اور پورا جملہ حال ہے اسی طرح'' **ومشربه حرام**'' اور ''**ملبسه حرام**'' بھی حال ہیں۔

غذى : غین کے فتحہ اور ذال معجمہ مخففہ کے کسرہ کیساتھ۔ امام نووی نے ایسے ہی ضبط کیا ہے۔ مصابیح کے بعض نسخوں میں ذال کی تشدید کے ساتھ بھی مروی ہے۔ امام طیبی نے بھی ایسے ہی ذکر کیا۔ اسی طرح مشکوٰۃ کے بعض نسخوں میں بھی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ بچپن سے بڑھاپے تک تربیت حرام سے کی گئی۔ اشرف فرماتے ہیں کہ'' **غذى بالحرام**'' کو'' **مطعمه حرام**'' کے بعد ذکر کیا کہ حرام کھانے سے غذائیت کا حاصل ہونا ضروری نہیں، یا اس بات پر تنبیہ ہے کہ دونوں حال برابر ہیں کہ وہ خود بڑھاپے میں خرچ کرے یا بچپن میں اس پر خرچ ہوا ہو جبکہ حرام اس کے پیٹ تک پہنچا ہو۔'' **مطعمه حرام**'' سے اشارہ بڑے ہونے کی حالت کی طرف اور'' **غذى بالحرام**'' سے اشارہ بچپن کی طرف ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ واؤ ترتیب کیلئے نہیں ہوتی۔ مظہرؒ نے دوسری وجہ جبکہ امام طیبیؒ نے پہلی وجہ کو ترجیح دی ہے لیکن دونوں مراد لینے میں بھی کوئی مانع نہیں ہے۔ پس اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ دعا کا قبول نہ ہونا حرام کے پہننے اور کھانے پر اصرار کی وجہ سے۔

اشرف فرماتے ہیں کہ''يطيل'' کا محل نصب ہے، اس لئے کہ ''الرجل'' کی صفت ہے اور'' الرجل'' جنس کے اعتبار سے نکرہ ہے جیسے شعر میں جنس معرفہ کی صفت نکرہ آئی ہے۔ **ولقد أمر على اللئيم ينسبى** کہ میں ایسے کمینے آدمی کے پاس سے گزرا جو مجھے گالی دے رہا تھا۔ میں کہتا ہوں یہ اس آیت کی طرح ہے:﴿ **كمثل الحمار يحمل اسفارا** ﴾ [الجمعة: ۵] ''ان کی حالت اس گدھے کی سی ہے جو بہت سی کتابیں لادے ہوئے ہے''۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ راوی کی مراد ثم ذکر الرجل'' سے یہ ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے کلام میں اس کا ذکر آخر میں کیا (یہ بتانے کے لئے) کہ اللہ تعالیٰ سے یہ بہت بعید ہے کہ وہ حرام کھانے والے کی دعا قبول کرے، اس لئے کہ حرام اللہ کے ہاں انتہائی مبغوض ہے، اور اللہ کی پاک ذات سے اس کی مناسبت انتہائی بعید ہے۔

پس فعل ''الرجل'' کے اوپر واقع کیا اور اس کو منصوب کر دیا ہے۔ اور اگر حضور ﷺ سے ''الرجل'' مرفوع منقول ہو تو پھر بنا بر ابتداء

کے مرفوع ہوگا اور "یطیل" اس کی خبر ہوگا۔ "اشعث اغبر یمد" فعل کے فاعل سے حال مترادفہ ہیں۔ اَی یمد یدیه فائلا یا رب یعنی اس نے ہاتھ پھیلائے ہوئے تھے اس حال میں کہ کہہ رہا تھا اے میرے ربّ۔ **مطعمة مسر به**' **ملبسه**' اور **غذی** یہ **قائلاً** کے فاعل سے حال ہیں۔

یہ تمام احوال اس بات پر دال ہیں کہ دعا کرنے والا اس چیز کا مستحق ہے کہ اس کی دعا قبول کی جائے۔ لیکن ناکامی دلالت کرتی ہے اس بات پر کہ مانع انتہائی سخت اور قوی ہے۔ (انتھی) پھر **مطعمه** وغیرہ جو حال ہیں ان کا تقاضا یہ بھی ہے دعا کرنے والا اجابت کا مستحق نہیں، جیسا کہ اگلے کلام سے واضح ہے۔

فانّی یہ "**کیف**" یا "**مِن اَینَ**" کے معنی میں ہے' کہ کیسے اور کہاں سے اس کی دعا قبول ہو۔ استفہام بُعد کیلئے ہے۔ کہ دعا کا قبول ہونا بہت بعید ہے۔

یستجاب لذلك اس کے مشار الیہ میں دو احتمال ہیں: (۱) **الرجل** (۲) **لأجل ماذکره من حال الرجل** (اس مرد کیلئے یا ان حالات میں جو اس مرد کے بیان ہوئے ہیں)

اشرف فرماتے ہیں کہ اس میں یہ بتلایا ہے کہ حلال کھانا پینا ان چیزوں میں سے ہے جن پر دعا کی قبولیت موقوف ہے، اسی لئے تو کہا گیا ہے کہ دعا کے دو پَر ہیں حلال کھانا اور سچ بولنا۔

امام تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ رجل سے مراد حاجی ہے جس پر سفر کے آثار ہوں جو مشقت سے پہنچا ہو اور پراگندہ حال ہو گیا پھر اسی حالت میں دعا مانگنے لگا کہ اس کے ہاں مشقت اور پراگندہ حال ہونا اجابت دعا کیلئے معاون ہے لیکن اس کی دعا قبول نہیں کی گئی اور نہ ہی اس کی مشقت کو لائق اعتبار سمجھا گیا اس لئے کہ وہ حرام پہننے والا تھا حلال حرام میں بغیر تمیز کے خرچ کرنے والا تھا۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ جب حاجی جو کہ اللہ کے راستے میں ہوتا ہے کی یہ حالت ہے تو دوسروں کی کیا ہوگی۔ مجاہد کے بارے میں حضور ﷺ کا ارشاد کہ خوشخبری ہے اس کیلئے جو گھوڑے کی لگام پکڑے پراگندہ بال گرد آلود پاؤں لئے اللہ کے راستہ میں نکلے۔

حلال کھانے کی عظیم خاصیت یہ ہے کہ معرفت کا نور لینے کی استعداد کو مؤکد کرنا ہے۔

تقویٰ کے درجات: تقویٰ کا کم از کم درجہ یہ ہے کہ علماء جس کو حرام قرار دیں اس سے رکا جائے یہ عام لوگوں کا تقویٰ ہے پھر اس کے بعد اُن امور سے بچنا جن میں تحریم کا احتمال ہو اگر چہ جائز ہی کیوں نہ قرار دے۔ یہ صالحین کا تقویٰ ہے۔ متقین کا تقویٰ یہ ہے کہ جن چیزوں میں کوئی حرج نہ ہو ان کو چھوڑ دینا اس خوف سے کہ کہیں حرج والی چیزوں میں پڑنا لازم آجائے۔

پھر ہر اس چیز سے بچنا جس کے استعمال سے مقصود اللہ کی طاعت پر قوّت نہ ہو یا یہ کہ استعمال اس کا بعض اوقات معصیت یا مکروہ ہوتا ہے یہ صدیقین کا تقویٰ ہے۔

اس زمانہ میں اکثر اوقات حلال نہیں ملتا، پس سالک اس چیز پر اکتفاء کرے جس سے تقویٰ محفوظ رہے تاکہ بھوک سے موت واقع نہ ہو۔ بعض عقلاء کہتے ہیں: **یقول لی الجهول بغیر علم دع المال الحرام و کن قنوعا فلمالم أحد حلالا ولم آکل حراما مت جوعا** "جاہل کہتے ہیں کہ حرام مال چھوڑ دو اور قناعت اختیار کرو"۔

پس جب میرے پاس حلال مال نہ ہو اور حرام بھی نہ کھاؤں تو میں بھوک سے مر جاؤں گا۔

لیکن حرام اور مشتبہ چیزوں کے درجات کا لحاظ رکھنا واجب ہے، پس جب جو چیز حلال کے زیادہ قریب ہو تو اس چیز کو نہ استعمال کیا جائے جو اس سے دور ہو یہاں تک کہ بعض مشائخ نے فرمایا ہے کہ اضطراری حالت میں اگر مضطر کو مردار بکری اور مردار گدھا ملے تو بکری استعمال کرے، اسی طرح مردار گدھے کو مردار کتے پر ترجیح دے، اور مردار کتے کو خنزیر پر ترجیح دے۔ تمام اشیاء کو برابر رکھنا کسی طور پر مناسب نہیں جیسا کہ بعض بے وقوف فقہاء کہتے ہیں کہ حلال وہ ہے جسے ہم حلال کہیں اور حرام وہ ہے جس کو ہم حرام کہیں۔

۲۷۶۱: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَاْتِیْ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يُبَالِی الْمَرْءُ مَا اَخَذَ مِنْهُ اَمِنَ الْحَلَالِ اَمْ مِنَ الْحَرَامِ. (رواہ البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲۹٦/٤۔ الحدیث رقم ۲۰۵۹۔

ترجمه: ''اور حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ آدمی کو جو مال ملے گا اس کے بارے میں وہ پرواہ نہیں کرے گا کہ وہ مال حلال ہے یا حرام''۔ (بخاریؒ)

تشریح: قوله: یاتی علی الناس زمان لایبالی المرء ماأخذ منه أمن الحلال ام من الحرام: (''زمان'' موصوف ہے اور مابعد جملہ اس کی صفت ہے اور ضمیر عائد محذوف ہے۔) ای لایبالی المرء فیه۔ اور منه کی ضمیر کا مرجع ''زمانہ'' ہے اور مضاف مقدر ہے۔ ای من أهل الزمان۔ اور ''ما'' سے مراد مال ہے۔ اس کو مبہم رکھا گیا تا کہ یہ ماخوذ کی تمام انواع ہبہ، صدقہ وغیرہ کو شامل ہو۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ''منه'' کی ضمیر کا مرجع ''شیء'' ہے جو مذکور نہیں اور ''شیء'' سے مراد مال ہے کیونکہ یہ دوسری روایت میں لفظ مال مذکور ہے۔ اور مطلب یہ ہوا کہ وہ یہ پرواہ کئے بغیر کہ مال حلال ہے یا حرام' لے لیگا۔ بہر حال دونوں میں کوئی تفاوت نہیں۔ (میرک نے ایسے ہی ذکر کیا۔)

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ''ما'' کو موصولہ یا موصوفہ قرار دینا جائز ہے' اور ضمیر مجرور اسی طرف عائد ہے اور ''من'' زائدہ ہو جیسا کہ امام اخفش کا مذہب ہے اور ''ما'' منصوب بنزع الخافض ہو ای لایبالی بما اخذ من المال۔ ''ام'' متصلہ ہے اور ''من'' کا متعلق محذوف ہے ہمزہ استفہام سے استفہام کے معنی سلب ہیں' اور استواء کے معنی کی وجہ سے تجرید کی گئی ہے۔ پس ''من الحلال اخذام من الحرام'' مرفوع ہے موضع مبتدا میں ہے۔ اور ''لا یبالی'' خبر مقدم ہے۔

یعنی حلال' حرام دونوں برابر ہیں کسی کے لینے میں کوئی پرواہ نہیں اور نہ ہی توجہ حلال اور حرام کے درمیان فرق کرنے کی طرف گئی۔ جیسے ارشاد باری ہے: ﴿سواء علیهم ء انذرتهم ام لم تنذرهم﴾ (بقرہ پ۱) آپ کا ڈرانا اور نہ ڈرانا ان کے لئے برابر ہے۔

۲۷۶۲: وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْحَلَالُ بَيِّنٌ وَالْحَرَامُ بَيِّنٌ وَبَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ لَا يَعْلَمُهُنَّ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ فَمَنِ اتَّقَى الشُّبُهَاتِ اسْتَبْرَأَ لِدِيْنِهٖ وَعِرْضِهٖ وَمَنْ وَقَعَ فِی الشُّبُهَاتِ وَقَعَ فِی الْحَرَامِ كَالرَّاعِیْ يَرْعٰى حَوْلَ الْحِمٰى يُوْشِكُ اَنْ يَّرْتَعَ فِيْهِ اَلَا وَاِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى اَلَا وَاِنَّ حِمَى اللّٰهِ مَحَارِمُهٗ اَلَا وَاِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ اَلَا وَهِیَ الْقَلْبُ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱/ الحدیث رقم ۵۲۔ ومسلم فی صحیحه ۱۲۱۹/۳ الحدیث رقم (۱۰۷۔ ۱۵۹۹)۔ وابوداوٗد فی السنن ۲٦۳/۳ الحدیث رقم ۳۳۲۹۔ الترمذی فی ۵۱۱/۳ الحدیث رقم ۱۲۰۵۔ والنسائی فی ۲٤۱/۷ الحدیث رقم ٤٤۵۳۔ وابن ماجه فی ۱۳۱۸/۲ الحدیث رقم ۳۹۸٤۔ والدارمی فی ۳۱۹/۲ الحدیث رقم 2531 واحمد فی المسند ۲٦۷/٤۔

ترجمه: ''اور حضرت نعمان بن بشیر راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: حلال ظاہر ہے' حرام بھی ظاہر ہے اور ان دونوں کے درمیان مشتبہ چیزیں ہیں جن کو بہت سے لوگ نہیں جانتے' لہٰذا جس شخص نے مشتبہ چیزوں سے پرہیز کیا اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کو بچالیا۔ (یعنی مشتبہ چیزوں سے بچنے والے کے نہ تو دین میں کسی خرابی کا خوف رہے گا اور نہ کوئی اس پر طعن وتشنیع کرے گا) اور جو شخص مشتبہ چیزوں میں مبتلا ہو گیا تو وہ حرام میں مبتلا ہو گیا اور اس کی مثال اس چرواہے کی سی ہے جو ممنوعہ چراگاہ کے آس

پاس (جانوروں کو) چراتا ہے تو قریب ہے یہ بات کہ وہ (اپنے جانوروں کو) اس (ممنوعہ چراگاہ) میں چرائے۔ جان لو! ہر بادشاہ کی ممنوعہ چراگاہ ہوتی ہے اور یاد رکھو! اللہ تعالیٰ کی ممنوعہ چراگاہ حرام چیزیں ہیں اور اس بات کو بھی ملحوظ رکھو کہ انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست حالت میں رہتا ہے (یعنی جب وہ ایمان وعرفان اور یقین کے نور سے منور رہتا ہے) تو (اعمال خیر اور حسن اخلاق واحوال کی وجہ سے) پورا جسم درست حالت میں رہتا ہے اور جب اس ٹکڑے میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے اور یاد رکھو! گوشت کا وہ ٹکڑا دل ہے"۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله :الحلال بين :

بین میں "یا" مکسورہ مشدد ہے، کہ بالکل واضح ہے جس کی حلت میں کسی قسم کا خفا نہیں' اس کا حلال ہونا منصوص ہے یا اس کی اصل موجود ہے جس سے جزئیات کے احکام نکالے جا سکتے ہیں جیسے ارشاد باری ہے: ﴿**خلق لكم ما فى الارض جميعا**﴾[بقرہ] "لام" نفع کیلئے ہے پس معلوم ہوا کہ اشیاء میں اصل حلت ہے الا یہ کہ جس میں مضرت ہو۔

قوله :الحرام بين : بالکل واضح ہے اس کی حرمت میں کوئی شک نہیں اس لئے کہ منصوص ہے جیسا کہ فواحش' محارم اور وہ چیزیں جن کی وجہ سے حدّ لازم آتی ہو' مردار' خون' خنزیر کا گوشت اور اس جیسی دیگر اشیاء۔ یا جن کی اصل موجود ہو اور اس سے استخراج ممکن ہو۔ جیسے: **كل مسكر حرام**۔

قوله :وبينهما مشتبهات بائے موحدہ کے کسرہ کیساتھ، وہ امور جن کے حلال یا حرام ہونے میں التباس ہو معاملہ واضح نہ ہو اس لئے کہ حلال والی بھی جہت ہوتی ہے اور حرام والی جہت بھی ہوتی ہے۔

قوله:لا يعلمهن كثير من الناس : مراد حقیقت ہے کہ دلائل کے تعارض کی وجہ سے اکثر لوگ ان کی حقیقت نہیں جانتے لیکن مجتہدین اور علم میں رسوخ رکھنے والے ان چیزوں کو پہچان سکتے ہیں قوت دلیل کی بناء پر۔ علامت حلت وعلامت حرمت میں سے کسی ایک دوسرے پر ترجیح دے سکتے ہیں۔

شرح السنہ میں ہے کہ اوامر مشتبہات دو قسم پر ہیں، (۱) جن کی حلت اور حرمت بالکل معلوم نہ ہو ایسی اشیاء کو از روئے ورع چھوڑنا بہتر ہے۔ (۲) جن کے حلال اور حرام ہونے کی اصل موجود ہے تو پھر اصل کو دیکھتے ہوئے عمل کیا جائے گا اس سے انحراف بغیر یقینی علم کے نہیں کیا جائے گا۔

امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ علماء کا اس حدیث کے عظیم اور فوائد کثیرہ پر مشتمل ہونے پر اتفاق ہے۔ یہ اُن احادیث میں سے ایک ہے جن پر اسلام کی بنیاد ہے، اور وہ تین احادیث ہیں:

(۱) حدیث: **انما الاعمال بالنيات**۔ (۲) **من حسن اسلام المرء تركه مالا يعنيه**۔ (۳) مذکورہ حدیث۔

اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر تنبیہ فرمائی کہ بندہ اپنے کھانے، پینے اور لباس وغیرہ کی اصلاح کرے کہ یہ حلال ہوں اور حلال کی پہچان کی طرف رہنمائی چراگاہ کی مثال دے کر واضح فرمائی۔ اس میں صلاح وفساد اور ان کی بنیادوں کا بیان کامل ہے۔

"**الحلال بين** کا مطلب یہ ہے کہ تین طرح کی چیزیں ہوتی ہیں

پہلی وہ جو واضح طور پر حلال ہوں۔ جیسے روٹی' پھل اور دیگر مطعومات' اسی طرح بات کرنا، نکاح کرنا، دیکھنا، چلنا اور دیگر تصرفات۔ دوسری جن کا حرام ہونا بالکل واضح ہو جیسے شراب، خنزیر، مردار' بہنے والا خون، اسی طرح زنا، جھوٹ بولنا، غیبت کرنا، چغل خوری' امرد اور اجنبیہ کو دیکھنا۔

تیسری متشابہ جس میں دونوں احتمال ہوں، پس دیکھنے والا اشتباہ میں ہوتا ہے کہ اس کو کس کے ساتھ ملحق کرے "**لا يعلمهن كثير من الناس**" میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔ اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ بہت کم علماء ان چیزوں کا حکم نص، قیاس یا استصحاب حال

کے ذریعے جانتے ہیں۔پس جب کوئی چیز حلال اور حرام کے درمیان دائر ہو اور کوئی نص یا اجماع موجود نہ ہو تو مجتہد اجتہاد کے ذریعے اس کو کسی ایک کے ساتھ دلیل شرعی کی روشنی میں لاحق کرے گا۔پس اس کے الحاق کے بعد وہ حلال یا حرام ہو جائے گی، اور جب اس کو یہ دلائل نہ ملیں تو پھر ورع کا تقاضا یہ ہے کہ ان کو چھوڑ دیا جائے اس لئے اس صورت میں یہ شبہات میں داخل ہے۔(استبرأ : براءت میں مبالغہ کرنا۔

علماء کے اس میں تین مذاہب ہیں۔بنیاد اختلاف کی کہ اشیاء میں شریعت کے وارد ہونے سے پہلے حلت تھی یا حرمت۔اول مذہب راجح یہ کہ نہ حلت کا حکم لگایا جائے نہ حرمت کا اور نہ اباحت کا اس لئے کہ مکلف ہونا شریعت سے ہوتا ہے۔ثانی مذہب: یہ کہ حرمت کا حکم لگایا جائے۔ثالث مذہب: یہ کہ اباحت کا حکم لگایا جائے

قوله :من وقع فی الشبهات وقع فی الحرام : علامہ تورپشتی فرماتے ہیں کہ کبھی چیز کے اندر وقوع کا مطلب اس کے اندر گرنا ہوتا ہے اور ہر سقوط شدید کو اس (یعنی وقوع) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اس میں دو صورتیں ممکن ہیں جو شبہات میں اکثر پڑتا رہے تو نہ چاہتے ہوئے بھی حرام میں پڑ جائے گا اور کبھی کبھار گنہگار رہتا ہے جب وہ تحری میں کوتاہی کرتا ہے دوسری صورت یہ کہ اس سے سستی کی عادت پڑتی ہے اور شبہ در شبہ میں پڑنے کی ہمت ہو جاتی ہے اور پھر اسی طرح یہ سلسلہ آگے بڑھتا رہتا ہے یہاں تک عمداً حرام کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔یہ مطلب ہے فقہاء کی اس بات کا: **المعاصی تسوق الی الکفر** ۔گناہ کفر کی طرف لیجاتے ہیں۔

قوله : کالراعی یرعی حول الحمی : ضرب المثل ہے، اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ معقولی باتیں محسوسات کی صورت میں واضح ہو جاتی ہیں۔اس لئے کہ محسوس چیزوں کی حقیقت انتہائی واضح ہوتی ہے اظہار حقائق میں اور دقائق کے چہروں سے کشف نقاب میں (۱) ضرب الامثال کی عجیب شان ہے۔اسی لئے ضرب الامثال کثیر تعداد میں قرآن وحدیث میں مذکور ہیں۔حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو آدمی مشتبہات میں پڑ جاتا ہے تو حرام میں پڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے جیسا کہ چرواہے کا حال ہوتا ہے۔

یرعی : ''الراعی'' کی صفت ہے جو کہ معنی نکرہ ہے اور یہ احتمال بھی ہے کہ ''الراعی'' سے حال ہو۔

الحمی : حاء کے کسرہ اور میم مخففہ کے فتحہ کیساتھ، (اس چراگاہ کو کہتے ہیں جس کو بادشاہ اپنے جانوروں کیلئے خاص کر دے اور دیگر چرواہوں کو روک دے) لیکن اس طرح روکنے کا حق صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے تھا۔جیسا کہ ارشاد ہے: **لا حمی الا لله ورسوله**

ان یرتع فیه حفاظت میں سستی، چرنے پر جرأت اور چراگاہ اور غیر چراگاہ میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے وہ '' حمی'' میں جا پڑے لہٰذا یہ بادشاہ کی سزا کا مستحق ہوگا۔بعض روایات میں ''یرتع'' کی جگہ ''یقع'' آیا ہے، جب کہ ایک روایت میں ''ان یواقعه باب مفاعلہ سے مروی ہے اس صورت میں راعی متعدی ہوگا یعنی جو اونٹ اور بکریاں وغیرہ چرائے۔

الا : ہمزہ استفہام اور حرف نہی سے مرکب ہے، جو آنے والی بات کے وجود پر تنبیہ کرنے کیلئے آتا ہے۔

وان لکل ملك : یعنی زمانہ جاہلیت کے ہر بادشاہ کی مخصوص چراگاہ ہوتی تھی۔یا یہ پیشینگوئی ہے زمانہ اسلام کے ظالم مراد ہیں۔

''وان'' میں ''واؤ'' ابتدائیہ ہے جس کو نحوی استینافیہ کہتے ہیں۔جس سے اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ مابعد ماقبل سے منقطع ہے جیسا کہ صاحب مغنی نے فرمایا ہے۔راجح یہ ہے کہ یہ عاطفہ ہے جیسا کہ لفظ ''او'' سے سمجھا جا رہا ہے، اور ''ان لکل ملك'' کا بھی تقاضا یہی ہے۔پس اس تاویل پر عطف درست ہوا اس لئے کہ مفرد کا عطف جملہ پر اس وقت درست ہوتا ہے جب مفرد کو فعل کے معنی میں کر دیا جائے جیسا کہ قرآن میں ﴿ **فالق الاصباح وجعل اللیل سکنا** ﴾ [الانعام:۹۶]

قوله :الا وان حمی الله محارمه : محارم معصیت کی مختلف اقسام ہیں۔پس جو جرم کا مرتکب ہو کر اس میں داخل ہو گا وہ سزا کا مستحق ہوتا ہے۔بعض معاصی ایسے ہیں کہ جن پر بالکل مغفرت نہیں ہوتی اور وہ شرک ہے، اور بعض معاصی اللہ کی مشیت کے تحت ہیں چاہے معاف کرے، چاہے پکڑ لے۔لیکن حقیقی توبہ سے سب معاف ہو جاتے ہیں۔خلاصہ یہ کہ محارم کو تشبیہ دی اس حیثیت سے کہ ان میں تبسط

ممنوع ہے' بادشاہ کی چراگاہ سے۔ معصیت کا ارتکاب اور تقویٰ کا حصول چونکہ دِل کے میلان کے ساتھ جڑا ہوا ہے آگے اس پر تنبیہ کی ہے۔

قوله :الا وان فی الجسد لمضغة :"مضغه" گوشت کے ٹکڑے کی وہ مقدار جو چبائی جا سکے۔اور دل کو مضغہ اس لئے کہا کہ یہ جسم کا ایک ٹکڑا ہے۔علماء فرماتے ہیں (لفظ مضغہ کے ذریعہ) قلب کی تصغیر مراد ہے باقی جسم کی نسبت سے باوجودیکہ جسم کا صحیح یا خراب ہونا دِل کے تابع ہوتا ہے۔

اذا صلحت :لام کے فتحہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ ہے، فتحہ فصیح ہے۔**فسدت** :سین کے فتحہ کے ساتھ جب کہ ضمہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔

فسد الجسد كله :اس کا حاصل یہ ہے کہ ہر عاقل بالغ کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنے دل کی طرف متوجہ رہے اور اس کو خواہشاتِ نفسانی میں منہمک ہونے سے روکے تاکہ وہ آگے بڑھ کر مشتبہ چیزوں کی حد میں داخل نہ ہو اور اپنے اعضاء کو محرمات میں ملوث نہ کرے۔

قوله :الا وهی القلب :پس دل بادشاہ کی طرح ہے اور اعضاء رعایا کی طرح ہیں۔پس اس کی رعایت رکھنا اہم امور میں سے ہے۔پس اگر اس کا ارادہ صالح ہو تو جسم کی حرکت بھی صالح ہوتی ہے اور اس کے برعکس (یعنی اگر اس کا ارادہ بُرا ہو تو جسم کی حرکت بھی بُری ہوتی ہے۔) اور یہی مطلب ہے اس کا جو کہا گیا ہے:"**الناس علی دین ملوکهم**" کہ لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں۔اور اس کا بھی یہی مطلب ہے:"**الاناء یترشح بما فیه**" برتن وہی چھلکاتا ہے جو اس میں ہو۔اور قلب لغت میں کہتے ہیں کسی چیز کا اس کے عکس کی طرف پھیرنا، اور دِل کے زیادہ پھرنے کی وجہ سے اس کا نام" قلب" رکھا گیا ہے، جیسا کہ اس کی طرف ایک حدیث میں اشارہ ہے' **ان القلوب بین أصبعین من اصابع الرحمن یقلبها کیف یشاء** کہ بیشک دل رحمٰن کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہے وہ جیسے چاہے اس طرف پھیر دیتا ہے، اور ایک اور حدیث میں ہے **مثل القلب کر بشة بأرض فلاة تقلبها الریاح ظهر البطن** دل کی مثال اس پر کی طرح ہے جو خالی زمین میں پڑا ہو، اور اس وجہ سے رسول اللہ ﷺ اکثر یہ دعا مانگا کرتے تھے: "**یا مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینك**" اے دلوں کو پھیرنے والے میرے دل کو اپنے دین پہ ثابت رکھ۔شاعر نے کہا:

دل کا نام قلب رکھا گیا ہے اس کے پھرنے کی وجہ سے
پس ڈر دل سے اس کے پھرنے اور پھرنے سے

دل کا ایک ظاہر ہے، وہ صنوبری شکل کا ٹکڑا جو سینہ میں بائیں جانب رکھا ہوا ہے۔وہ لطیفۂ انسانی کا محل ہے اور اسی وجہ سے اس کی طرف صلاح اور فساد کی نسبت کی جاتی ہے، اور اس دل کا ایک باطن ہے، وہ نورانی ربانی جاننے والا لطیفہ ہے، جہاں اللہ کے انوارات کا نزول ہوتا ہے اسی کی وجہ سے انسان انسان ہوتا ہے اور اسی کی وجہ سے امتثال اوامر اور اجتناب نواہی کے لئے مستعد ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ بدن کی اصلاح اور فساد کا تعلق ہے، وہ ایک خلاصہ ہے جو پیدا ہوتا ہے روحانی روح سے' اور اس کو تعبیر کیا جاتا ہے نفس ناطقہ سے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿ونفس وما سواها﴾[الشمس۔۷] (اور جان کی اور اس کی جس نے اس کو درست بنایا) فاخذ رعلی القلب من قلب وتحویل اور روح کے بارے میں اللہ کا فرمان ہے:﴿قل الروح من امر ربی﴾[الاسراء ۸۵] اور روح ایمان کا مستقر ہے: [أولئك كتب فی قلوبهم الایمان] [المجادلة۔۲۲] یہی ہیں جن کے دلوں میں لکھا گیا ہے ایمان' جیسا کہ سینہ محل ایمان ہے:[افمن شرح صدره للاسلام] اور دل مشاہدہ کا مستقر ہے :[وما كذب الفؤاد مارأی] [النجم ۔۱۱] (قلب نے دیکھی ہوئی چیز میں کوئی غلطی نہیں کی) اور"لب"، یعنی عقل مقام توحید ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

[انما يتذكر اولوالالباب] [آل عمران :۷] (وہی لوگ نصیحت پکڑتے ہیں جو اہل عقل ہیں)"اولوالباب" وہ ہیں جو مجازی وجود کے چھلکے سے نکلے اور حقیقی وجود کے مغز ساتھ باقی رہے لیکن اس کی حقیقت کی پہچان مشکل ہے۔اور اس کی حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ارباب حقائق کیلئے گراں ہے، اور حدیث میں اشارہ ہے کہ جسم کی اصلاح یہ ہے کہ وہ حلال غذا استعمال کرے گا تو صاف ہو جائے

گا۔ اور اس کی صفائی کا اثر دل پر ہوتا ہے اور وہ (نور ہدایت سے) منور ہو جاتا ہے اور اس کا نور پھر جسم کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ پس اس سے اعمال صالحہ صادر ہوتے ہیں، اور یہی مطلب ہے دل کی صلاح گا، اور جب حرام کی غذا سے پلتا ہے تو وہ شیطان اور نفس کو چرانے والا ہے، چنانچہ (اس جسم) میں کدورت پیدا ہو جاتی ہے' دل میں کدورت پیدا ہو جاتی ہے، اس میں ظلمت پیدا ہو جاتی ہے اور پھر اس دل کی ظلمت وتاریکی جسم کی طرف منتقل ہو جاتی ہے، چنانچہ اس سے صرف گناہ ہی صادر ہوتے ہیں اور یہی مطلب ہے دل کے فساد کا۔ یہ بعض محققین اور بعض باریک بین لوگوں کے کلام کا خلاصہ ہے۔

شرح السنہ میں ہے کہ یہ حدیث تقویٰ کا ایک اصل اور قانون ہے، اور وہ یہ ہے کہ جب کسی معاملے کے حلال اور حرام ہونے میں اشتباہ پیدا ہو جائے اور پہلے سے اس کی کوئی اصل معلوم نہ ہو، تو تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو چھوڑ دیا جائے اور اس سے اجتناب کیا جائے، اس لئے کہ اگر وہ چھوڑے گا نہیں اور اس پر مستمر رہے گا اور اس کا عادی بن جائے گا تو یہ اس کو حرام میں واقع ہونے کی طرف لے جاتا ہے۔ اگر ایک آدمی اپنے گھر میں کوئی چیز پاتا ہے اور اس کو معلوم نہیں کہ یہ چیز اس کی ہے یا کسی اور کی تو تقویٰ یہ ہے کہ اس سے گریز کرے، لیکن اگر اس نے لے لی تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے اس لئے کہ یہ چیز اس کے قبضہ میں ہے، اور اس باب میں یہ معاملہ بھی داخل ہے کہ جس کے مال میں شبہ ہو یا سودی مال کی ملاوٹ ہو، تو بہتر یہ ہے کہ اس سے احتراز کرے اور اس کو چھوڑ دے۔ اور اس کے فساد کا فیصلہ نہ کرے جب تک یقین نہ ہو کہ اس کی عین اور اصل حرام ہے، اس لئے کہ آپ علیہ السلام نے اپنی ایک زرہ ایک یہودی کے پاس گروی رکھی تھی اس جَو کے بدلے میں جو گھر والوں کے خرچ کیلئے لیے تھے باوجود یکہ وہ سودی معاملات کرتے تھے اور شراب کی قیمت کو حلال سمجھتے تھے۔

حضرت علی سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا، تو بادشاہوں سے کوئی چیز نہ مانگ' اگر بغیر مانگے وہ تجھے دیں تو قبول کر لے، اس لئے کہ ان کے پاس حلال مال اس سے زیادہ مقدار میں ہوتا ہے جو وہ تجھے دے رہے ہیں۔

ابن سیرین سے روایت ہے کہ عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما بادشاہوں کے عطایا قبول کرتے تھے اور قاسم بن محمد، ابن سیرین، اور ابن مسیب بادشاہوں کے عطایا قبول نہیں کرتے تھے۔ ابن میسّب سے پوچھا گیا؟ تو فرمایا کہ ان عطایا کو ردّ کیا ہے اس نے جو مجھ سے بہتر ہے ان پر جوان سے بہتر تھے۔ یعنی صحابہؓ نے اپنے دور کے سلاطین وامراء کے ہدیئے قبول نہیں کیے' چنانچہ ہم بھی نہیں کریں گے۔

ابو حامد غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہمارے زمانے کے بادشاہ ظالم ہیں یہ بہت کم کسی چیز کو جائز طریقے سے لیتے ہیں لہٰذا ان کے ساتھ اور ان کے متعلقین کے ساتھ معاملات کرنا جائز نہیں' یہاں تک کہ قاضی کے ساتھ بھی اور نہ ان بازاروں میں تجارت جائز ہے جو بازار انہوں نے ناجائز طریقے سے بنائے ہیں۔ اور تقویٰ تو یہ ہے کہ اجتناب کرے ان مکانات سے جو فقراء کیلئے بنائے گئے ہوں اور مدارس سے اور پلوں سے جو غصب کے اس مال سے بنائے گئے ہوں، جن کا مالک معلوم نہ ہو۔

ابن ''اثیر کتاب المناقب'' میں ابن شہاب سے روایت کرتے ہیں کہ ابن شہابؒ نے فرمایا' کہ میں ایک رات سفیان ثوری کے ساتھ تھا، تو انہوں نے دور سے آگ دیکھی، پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ میں نے کہا یہ ''صاحب الشرط'' کی آگ ہے، تو انہوں نے فرمایا' کہ ہمیں کسی اور راستے سے لیکر چلو اس لئے کہ یہ آدمی ان کی آگ سے روشنی کر رہا ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اس کے مناسب اللہ کا یہ ارشاد ہے: ﴿ولا تر کنوا الی الذین ظلموا فتمسكم النار﴾ [هود: ۱۱۳]

۲۷۶۳: وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيجٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ثَمَنُ الْكَلْبِ خَبِيْثٌ وَمَهْرُ الْبَغِيِّ خَبِيْثٌ وَكَسْبُ الْحَجَّامِ خَبِيْثٌ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۱۱۹۹/۳ الحدیث رقم (۴۱۔ ۱۵۶۸)۔ وابوداؤد فی السنن ۷۰۶/ الحدیث رقم ۳۴۲۱۔ والترمذی فی ۵۷٤ الحدیث رقم ۱۲۷۵۔ والدارمی فی ۳۵۱/۲ الحدیث رقم ۲۶۲۱۔ واحمد فی المسند ٤٦٤/٣۔

ترجمہ: ''اور حضرت رافع ابن خدیجؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کتے کی قیمت' بدکار کی اجرت' سینگی کھینچنے والے کی کمائی ناپسندیدہ وخبیث مال ہے''۔ (مسلم)

تشریح: **قوله :ثمن الكلب خبيث** :اس سے امام شافعی رحمہ اللہ نے کتے کی بیع کے عدم جواز پر استدلال کیا ہے چاہے وہ کتا معلم (سدھایا ہوا ہو) یا غیر معلم (یعنی سدھا ہوا نہ ہو) اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے اس کو جائز قرار دیا ہے، اور حدیث کا جواب دیا ہے کہ لفظ ''خبیث'' حرمت پر دلالت نہیں کرتا اس لئے کہ حدیث میں ہے: ''**كسب الحجام خبيث**'' حالانکہ (سینگی کھینچنے والے کی اجرت) بالاتفاق حرام نہیں ہے۔ تو خبیث کا مطلب ہے ناپاک، پس وہ مکروہ نہ کہ حرام۔ اور حدیث کا اطلاق اس پر اس اعتبار سے ہے کہ یہ کمائی کا گھٹیا طریقہ ہے۔

البغي : یا کی تشدید کے ساتھ' یہ اصل میں فعول بمعنیٰ'' **فاعلة**'' ہے' یہ مشتق ہے **بغت المرأة بغاء** (زنا کرنا) سے ''**بغاء**'' کسرہ کے ساتھ ہے، اور اسی سے اللہ کا یہ ارشاد ہے: ﴿**ولا تكرهوا فتياتكم على البغاء**﴾ [النور۔ ۳۳] (اور اپنی لونڈیوں کو زنا کرانے پر مجبور مت کرو)۔

''**مهر البغي خبيث**'' : کا مطلب یہ ہے کہ زانیہ کا مہر حرام ہے بالاجماع، اس لئے کہ وہ عوض لیتی ہے زنا کا جو کہ حرام ہے، اور حرام کا ذریعہ بھی حرام ہوتا ہے، اور اس کو مہر کہا گیا ہے، مجازاً اس لئے کہ یہ بضع (شرم گاہ) کے عوض میں ہوتا ہے۔

قوله : كسب الحجام خبيث : یعنی مکروہ ہے بوجہ اس کے گھٹیا ہونے کے۔ قاضی فرماتے ہیں کہ خبیث درحقیقت اس چیز کو کہتے ہیں جس کو اس کے گھٹیا اور خسیس ہونے کی وجہ سے ناپسند سمجھا جاتا ہو اور یہ لفظ ''حرام'' کیلئے استعمال کیا جاتا ہے اس حیثیت سے کہ شارع نے اس کو ناپسند کیا ہے اور رذیل سمجھا ہے، جیسا کہ لفظ ''طیب'' حلال کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے: ﴿**ولا تتبدلوا الخبيث بالطيب**﴾ [النساء۔ ۲] (اور تم اچھی چیز سے بری چیز کو مت بدلو)۔ یعنی حرام کو حلال سے۔ اور زانیہ جو زنا کے عوض مہر ہے وہ حرام ہے۔ لہٰذا ''خبیث'' کی نسبت اس کی طرف بمعنیٰ ''حرام'' ہے۔

اور سینگی کھینچنے والے کی اجرت چونکہ حرام نہیں ہے، کیونکہ آپ نے سینگی لگوائی اور حجام کو مزدوری دی، تو اس کی طرف (خبیث کی) نسبت دوسرے معنی میں ہوگی۔ اور کتے کے بیع کی جو ممانعت ہے، پس جس نے اس کو صحیح قرار دیا ہے جیسے احناف تو انہوں نے ''خبیث'' کی تفسیر گھٹیا سے کی ہے اور جن حضرات نے اس کو صحیح قرار نہیں دیا، جیسے ہمارے اصحاب (شوافع) تو انہوں نے اس کی تفسیر ''حرام'' سے کی ہے۔

۲۷۶۴: **وَعَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدِ الْاَ نْصَارِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰی عَنْ ثَمَنِ الْكَلْبِ وَمَهْرِ الْبَغْیِ وَحُلْوَانِ الْكَاهِنِ** (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤٢٦/٤۔ الحدیث رقم ٢٢٣٧۔ ومسلم فی ١١٩٨/٣ الحدیث رقم (٣٩۔ ١٥٦٧) وابوداوٗد فی السنن ٧١٠/٣ الحدیث رقم ٣٤٢٨۔ والترمذی ٥٧٥/٣ الحدیث رقم ١٢٧٦ والنسائی فی ٣٠٩/٧ الحدیث رقم ٤٦٦٦۔ وابن ماجه ٧٣٠/٢ الحدیث رقم ٢١٥٩ والدارمی فی ٣٣٢/٢ الحدیث رقم ٢٥٦٨۔ ومالك فی المؤطا ٦٥٦/٢ الحدیث رقم ٦٨ من كتاب البیوع۔ واحمد فی المسند ١١٨/٢۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو مسعود انصاریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتے کی قیمت' بدکار عورت کی اجرت اور کاہن کی شیرینی (یعنی نیاز) (کو استعمال کرنے) سے منع فرمایا ہے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: **قوله :نهى عن ثمن الكلب** : یہ حکم حنفی علماء کے ہاں اس وقت تھا جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کتوں کو مار ڈالنے کا حکم دیا تھا۔ نیز آپ نے کتوں سے فائدہ حاصل کرنے کی بھی ممانعت کی تھی، بعد میں آپ نے یہ اجازت دے دی تھی کہ کتوں سے فائدہ

اٹھایا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ بھی منقول ہے کہ ایک شخص نے ایک شکاری کتے کو مار ڈالا تو آپ نے اسے حکم دیا تھا کہ وہ کتے کے مالک کو چالیس درہم ادا کرے۔ اسی طرح ایک شخص نے ایک ریوڑ کے نگہبان کتے کو مار ڈالا تھا تو آپ نے اس کو حکم دیا کہ وہ مالک کو اس کتے کے بدلے میں ایک دنبہ دے۔ (اس کو ذکر کیا ہے ابن الملک نے۔)

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ نہ تو کتے کی خرید وفروخت جائز ہے اور نہ کسی کتے کو قتل کرنے والے کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ اس کتے کی قیمت اس کے مالک کو ادا کرے، کتا خواہ معلّم ہو یا غیر معلّم ہو، اسی طرح خواہ اس کتے کا پالنا جائز ہو یا نا جائز ہو، امام اعظم ابوحنیفہؒ نے اس کتے کی خرید وفروخت جائز قرار دی ہے، جس سے فائدہ اٹھانا مقصود ہو، اگر کوئی شخص ایسے کتے کو مار ڈالنے تو اس کیلئے یہ ضروری قرار دیا ہے کہ وہ اس کتے کی قیمت اس کے مالک کو ادا کرے۔ اور امام مالک رحمہ اللہ سے اس بارے میں مختلف روایات ہیں، پہلی روایت ان سے یہ ہے کہ نا جائز ہے اور (مار ڈالنے والے پر) قیمت لازم ہوگی۔ دوسری روایت امام ابوحنیفہؒ کی طرح ہے، اور تیسری روایت امام شافعی کی طرح ہے۔

قوله: ومهر البغي: اس کی تشریح پہلے بیان ہو چکی ہے۔

وحلوان الکاهن: حاء کے ضمہ اور لام کے سکون کے ساتھ، وہ چیز جو کاہن کو اس کی کہانت پر دی جائے۔ ہرویؒ فرماتے ہیں کہ یہ اصل میں "حلاوۃ" سے ہے، دی ہوئی چیز کی تشبیہ دی گئی ہے میٹھی چیز کے ساتھ، اس لئے کہ وہ اس کو آسانی کے ساتھ لیتا ہے نہ کوئی کلفت نہ کوئی مشقت اور کاہن وہ ہے جو کائنات کے بارے میں مستقبل کی خبریں بتائے، اور چھپی ہوئی باتوں کی معرفت کا دعویٰ کرے۔ عرب کے کاہن کائنات کے بہت سارے امور کی معرفت کا دعویٰ کرتے تھے، اور وہ گمان کرتے تھے کہ کچھ جنات ان کے تابع ہیں جو (غیب) کی خبریں ان تک پہنچاتے ہیں، اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو امور کی معرفت کا دعویٰ کرتے ہیں اپنی سمجھ سے جو ان کو دی گئی ہے۔

اور بعض لوگ "نجومی" کو "کاہن" کہتے ہیں اس وجہ سے کہ وہ (آئندہ) امور کی خبر دیتا ہے، جیسے بارش کا آنا، کسی وباء کا آنا، قتل وغارت کا ظہور، کسی کا منحوس یا خوش قسمت ہونا، اور اس جیسی اور مثالیں۔ اور حدیث میں کاہنوں کے پاس آنے سے جو منع ہے وہ ان سب کو شامل ہے، اور ان کی تصدیق کرنے اور ان کی باتوں کی طرف رجوع کرنے کی ممانعت بھی ان سب کو شامل ہے۔

۲۷۶۵: وَعَنْ اَبِیْ جُحَیْفَةَ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ نَهٰی عَنْ ثَمَنِ الدَّمِ وَثَمَنِ الْکَلْبِ وَکَسْبِ الْبَغِیِّ وَلَعَنَ اٰکِلَ الرِّبَا وَمُؤْکِلَهٗ وَالْوَاشِمَةَ وَالْمُسْتَوْشِمَةَ وَالْمُصَوِّرَ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۱۴/۴۔ الحدیث رقم ۲۲۳۸ واحمد فی المسند ۳۰۹/۲۔

ترجمہ: "اور حضرت ابوجحیفہؓ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے خون کی قیمت، کتے کی قیمت اور بدکار عورت کی اجرت (کے طور پر حاصل ہونے والے مال کے استعمال) سے منع فرمایا ہے نیز آپ ﷺ نے سود کھانے والے اور سود کھلانے والے گوندنے والی اور گوندوانے والی اور مصور پر لعنت فرمائی ہے"۔ (بخاری)

تشریح: قوله: نهی عن ثمن الدم: شرح السنہ میں ہے کہ خون کا بیچنا جائز نہیں ہے کیونکہ خون نجس ہوتا ہے، اور بعض حضرات نے "نهی عن ثمن الدم" (خون کی قیمت) کو سینگی کھینچنے والے کی اجرت پر محمول کیا ہے۔ اس صورت میں ممانعت کا تعلق مکروہ تنزیہی سے ہوگا۔

قوله: وثمن الکلب: اس کا بیان گذر چکا ہے۔ **وکسب البغی**: یہاں "کسب" بمعنی "مکسوب" ہے۔ یعنی بدکاری سے کمایا ہوا۔ اس کی تفصیل ماقبل میں تفصیل کے ساتھ گذر چکی ہے۔

قوله: اکل الربا ومؤکله: ہمزہ کے ساتھ ہے، اور ہمزہ کو واؤ سے تبدیل بھی کیا جاتا ہے۔ یعنی دینے والا اور لینے والا اور کھانے والا اور کھلانے والا، اس لئے کہ یہ دونوں فعل میں مشترک ہوتے ہیں۔ اگر چہ ان میں ایک مغتبط ہے، اور دوسرا ظلم کرنے والا ہے۔

والواشمة : یعنی گودنے والی عورت۔ نہایہ میں ہے کہ "وشم" (گودنے) کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جلد کو سوئی سے گود کر سرمہ یا نیل بھر دیتے ہیں جس سے وہ گودی گئی جگہ نیلی یا سبز ہو جاتی ہے۔

والمستوشمة آپ نے اس سے منع اس لئے فرمایا ہے کہ یہ فاسقوں اور غیر مسلموں کا کام ہے، نیز یہ اللہ کی خلقت کو تبدیل کرنا ہے، اور "روضہ" میں ہے کہ کہ جس نے اپنے بدن کے کسی حصے کو چیرا اور اس میں کوئی چیز رکھی یا ہاتھ کو گودا یا اس کے علاوہ کسی عضو کو، تو یہ گودنے کے وقت نجس ہو جاتا ہے۔ اور "تعلیق القراء" میں میں لکھا ہے کہ وشم کو علاج کے ذریعے مٹایا جائے، اور اگر زخم وخراش کے بغیر ممکن نہ ہو تو زخم کی تکلیف برداشت کرنے کی ضرورت نہیں، اور توبہ کرنے کے بعد اس پر کوئی گناہ نہ ہوگا۔

والمصور مصور سے مراد وہ ہے جو جاندار کی تصویر بنائے نہ کہ وہ جو درختوں اور دوسرے نباتات کی تصویر بنائے، اس لئے کہ وہ بت جن کی پوجا ہوتی تھی جانداروں کی صورت پر بنے ہوتے تھے۔ خطابیؒ نے لکھا ہے کہ اس نہی میں ہر وہ تصویر داخل ہے جو کسی چمڑے یا کاغذ پر بنی ہو اور مقصود بالذات تصویر اور چمڑا اس کا تابع، اور برتنوں اور پیالوں پر بنی ہو تصویر (مقصود بالذات نہیں ہوتی بلکہ) ان برتنوں کے تابع ہوتی ہے جیسے وہ تصویر جو گھر، دیواروں، چھتوں، قالین اور پردوں پر بنی ہوتی ہے، اس کا بیچنا صحیح ہے۔

۲۷۶۶: وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ عَامَ الْفَتْحِ وَهُوَ بِمَكَّةَ اِنَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ حَرَّمَ بَيْعَ الْخَمْرِ وَالْمَيْتَةِ وَالْخِنْزِيْرِ وَالْاَصْنَامِ فَقِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَرَأَيْتَ شُحُوْمَ الْمَيْتَةِ فَاِنَّهٗ تُطْلٰى بِهَا السُّفُنُ وَيُدَّهَنُ بِهَا الْجُلُوْدُ وَيَسْتَصْبِحُ بِهَا النَّاسُ فَقَالَ لَا هُوَ حَرَامٌ ثُمَّ قَالَ عِنْدَ ذٰلِكَ قَاتَلَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَّا حَرَّمَ شُحُوْمَهَا اَجْمَلُوْهُ ثُمَّ بَاعُوْهُ فَاَكَلُوْا ثَمَنَهٗ. (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۴۲۴/۴۔ الحدیث رقم ۲۲۳۶۔ ومسلم فی صحیحه ۱۲۰۷/۳ الحدیث رقم (۷۱۔ ۱۵۸۱)۔ وابوداؤد فی السنن ۷۵۶/۳ الحدیث رقم ۳۴۸۶ والترمذی فی ۵۹۱/۳ الحدیث رقم ۱۲۹۷۔ والنسائی ۱۷۷/۷ الحدیث رقم ۴۲۵۶۔

ترجمہ: "اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فتح مکہ کے سال مکہ میں رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے شراب، مردار، خنزیر اور بتوں کی خرید وفروخت کو حرام قرار دیا ہے۔ جب آپ ﷺ سے عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ! ہمیں مردار کی چربی کا حکم بھی بتایئے؟ کیونکہ اس کے ذریعے کشتیوں کو روغن کیا جاتا ہے نیز اس سے چمڑوں کو چکنا کیا جاتا ہے اور لوگ (گھروں میں) اس کے ذریعے چراغ جلاتے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا نہیں، مردار کی چربی بھی حرام ہے (اس لئے اس سے یہ فائدے اٹھانے جائز نہیں)۔ پھر آپ ﷺ نے اسی وقت یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہود کو غارت کرے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے مردار کی چربی کو حرام قرار دیا تو یہود نے مردار کی چربی کو پگھلا کر فروخت کیا اور پھر اس کی قیمت کو کھالیا۔ (بخاری ومسلم)

سمع النبی : تصحیح شدہ نسخہ میں (نبی کی جگہ) "رسول الله" ہے۔

یقول عام الفتح وهو بمکة : امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ "عام الفتح" کے بعد "وهو بمکة" لانا ایسا ہے، جیسا عرب کا یہ قول ہے: "رأيته بعيني واخذته بيدی" اھ لیکن امام طیبیؒ کا فرمانا درست نہیں ہے جیسا کہ ظاہر ہے، اس لئے کہ "عام الفتح" سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ مکہ میں ہوں، اس احتمال کی بناء پر کہ ممکن ہے کہ وہ اسی سال مدینہ میں ہوں یا اس کے علاوہ کسی اور جگہ ہو ہاں مقصود (دونوں کلمات) سے سننے کی تحقیق اور تاکید ہے۔

قوله : ان الله ورسوله حرم بيع الخمر : مراد یہ ہے کہ اللہ نے اپنی کتاب میں شراب کی حرمت بیان کی ہے اور اس کو ناپاک قرار دیا ہے اور اس کی خرید وفروخت کو حرام ٹھہرایا ہے، اور اس کے رسول نے بھی اپنی احادیث میں اس کی حرمت بیان کی ہے، اگلی چیزوں کی حرمت کا بھی یہی مطلب ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں رسول کے ذکر سے پہلے اللہ کا ذکر، ذکر رسول کیلئے بطور تمہید ہے، اور بتانا یہ مقصود

ہے کہ رسول کا مذکورہ اشیاء کی خرید وفروخت کو حرام ٹھہرانا درحقیقت اللہ کے حرام کرنے کی وجہ سے ہے، اس لئے کہ وہ اللہ کے رسول اور خلیفہ ہیں۔

ھاءِ ضمیر کا مرجع شحوم ہے، یا ھاءِ ضمیر قصہ ہے۔ اور اس کی تائید کرتا ہے وہ تصحیح شدہ نسخہ کہ جس میں، "انه" مذکر کی ضمیر کے ساتھ، یعنی ضمیر شان کے ساتھ ہے۔

السفن : سین اور فا کے ضمہ کے ساتھ جمع ہے "**سفينة**" کی

يدهن : دال کی تشدید کے ساتھ اور ایک نسخہ میں ھا کی تشدید کے ساتھ ہے۔

يستصبح : با کے کسرہ کے ساتھ، "**يستصبح**" میں سین طلب کیلئے ہے اور مراد اس طلب سے یہ کہ لوگوں کی اس روشنی کی طرف شدت احتیاج ہے اس لئے وہ اس کے حصول کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں، اور یہ بھی جائز ہے کہ سین صرف تاکید کیلئے ہو۔

هو حرام : ضمیر کا مرجع انتفاع ہے۔ یعنی ممنوع ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ضمیر مرفوع اس مقدر کی طرف راجع ہے جو کلمہ استخبار "ارأيت" کے بعد ہے، اور "لا" اس مقدر کے رد کیلئے ہے۔ اور اس مقدر عبارت میں دو احتمال ہیں، ایک تو یہ ہے کہ تقدیری عبارت یہ ہو: "**اخبرني ايحل انتفاع شحوم الميتة**" یعنی مجھے بتائے کہ کیا مردار کی چربی سے فائدہ اٹھانا جائز ہے، یہاں دوسرا احتمال مراد ہے امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "**لا هو حرام**" کا مطلب ہے کہ تم اس کو نہ بیچو اس لئے کہ اس کا بیچنا حرام ہے، پس "هو" ضمیر بیع کی طرف راجع ہے نہ کہ انتفاع کی طرف۔ امام شافعیؒ اور ان کے اصحاب کے ہاں یہی صحیح ہے، اور جمہور کے ہاں اس سے کسی بھی قسم کا فائدہ حاصل کرنا جائز نہیں ہے نہی کے عموم کی وجہ سے، سوائے اس کے کہ جس کی تخصیص کی گئی ہے (نص کے ذریعے) اور وہ دباغت شدہ چمڑا ہے۔ پس ہمارے مسلک صحیح کے مطابق جو تیل ناپاک ہوں ان سے خارجی فائدہ اٹھانا جائز ہے جیسے تیل اور گھی جو نجس ہو اس سے چراغ جلانا اور اس طرح تیل سے صابن بنانا امام اعظم ابوحنیفہؒ اور ان کے متبعین علماء نے نجس زیت کو بیچنے کی اجازت دی ہے، بشرطیکہ اس کو بیان کرے کہ یہ نجس ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ مردار کی خرید وفروخت کی تحریم کے عموم میں یہ بھی داخل ہے کہ مردار کافر کی نعش کا بیچنا حرام ہے، اور حدیث میں ہے کہ نوفل مخزومی خندق کے دن قتل ہوا، تو کفار نے اس کی نعش کے حصول کیلئے دس ہزار درہم دینا چاہے تو آپ نے قبول نہیں کئے۔

عند ذلك کا مشارالیہ قول مذکور: ارأيت...... " ہے۔ **قاتل الله اليهود** : یعنی ان کو ہلاک کرے اور لعنت ان پر کرے، اس میں ایک احتمال ہے کہ یہ خبر ہو اور ایک احتمال یہ ہے کہ یہ بددعا ہو اور یہ "**عاقبت اللص**" کے باب سے ہے۔ قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسکا معنی ہے: "**عاداهم**" کہ اللہ نے ان سے دشمنی کی، اور بعض کہتے ہیں کہ یہ بمعنی قتلهم ہے اور "**مغالبه**" کی صورت میں لایا گیا ہے۔

ان الله لما حرم شحومها : مشکاۃ کے نسخے میں واحد کی ضمیر کے ساتھ ہے اور "مفاتیح" میں "**شحومهما**" تثنیہ کی ضمیر کے ساتھ ہے، اور ضمیر غیر مذکور کی طرف لوٹ رہی ہے اور مراد گائے بکری ہے جیسے اللہ کے اس فرمان میں ہے: ﴿**ومن البقر والغنم حرمنا عليهم شحومهما**﴾ [الانعام:۱۴۶] (اور گائے اور بکری میں سے ان دونوں کی چربیاں ان پر ہم نے حرام کردی تھی) اور "**شحومها**" بھی روایت کیا گیا ہے، پس اس صورت میں ضمیر "**كل واحدة**" کی طرف لوٹے گی۔ "**البقر**" اور "**الغنم**" اسم جنس ہے، معنی کے اعتبار سے اس کو مؤنث لانا جائز ہے۔

اجملوه : جیم کے ساتھ اور ضمیر منصوب "**شحوم**" کی طرف راجع ہے "مذکور" کی تاویل کے ساتھ، (اس کو امام طیبی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔) اور ظاہر یہ ہے کہ یہ راجع ہے "**شحم**" کی طرف جو "**شحوم**" سے مفہوم ہورہا ہے۔ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بھی جائز ہے کہ ضمیر "**شحوم**" کے ہم معنی کی طرف راجع ہے، اس لئے کہ اگر کہا جائے "**حرم شحومها**" تو معنی پر کوئی فرق نہیں پڑے گا یہ اللہ کے اس فرمان کی طرح ہوگا ﴿**فاصدق واكن**﴾۔

نہایہ میں ہے: اجملت الشحم واجملته بمعنی اذبته ہے (یعنی میں نے پگھلایا)۔ اور قاموس میں ہے: جمل الشحم اذابه کاَ اجمله واجتمله۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں "جملت" بنسبت "اجملت" کے زیادہ فصیح ہے "اجملت"، جمیل سے مشتق نہیں ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ دونوں فصیح ہیں، بلکہ زیادہ اچھا یہ ہے کہ کہا جائے، کہ "اجمل" زیادہ بلیغ ہے کیونکہ یہ مبالغہ کا فائدہ دے رہا ہے، اس لئے کہ الفاظ کی زیادتی معنی کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے۔ پس مطلب یہ ہوگا کہ انہوں نے اس کام میں مبالغہ سے کام کیا اور اس پر مستمر رہے اور اس سے منع نہ ہوئے۔

ثم باعوه: اس کو بیع کہنا صورتاً ہے ورنہ حقیقت میں تو وہ معاملہ باطل تھا۔ "فاکلوا ثمنه" میں زیادہ جھڑک ہے۔ شرح السنہ میں ہے کہ اس حدیث میں ہر اس حیلے کے بطلان پر دلیل ہے جس کے کرنے سے حرام کے ارتکاب تک پہنچنا ہو، اور اس میں دلیل ہے کہ کسی چیز کی ہیئت اور نام کے تبدیل ہونے سے اس کا حکم تبدیل نہیں ہوتا۔

۲۷۶۷: وَعَنْ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ قَاتَلَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ حُرِّمَتْ عَلَيْهِمُ الشُّحُوْمُ فَجَمَلُوْهَا فَبَاعُوْهَا (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤١٤/٤۔ الحدیث رقم ۲۲۳۳۔ ومسلم فی ۱۲۰۷/۳ الحدیث رقم (۷۲۔ ۱۵۸۲)۔ والنسائی فی السنن ۱۷۷/۷ الحدیث رقم ٤٢٥٧ والدارمی فی ۱۵٦/۲ الحدیث رقم ۲۱۰٤۔ واحمد فی المسند ۲۵/۱۔

ترجمه: "اور حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ یہودیوں کو ہلاک کرے ان پر (مردار کی) چربیاں حرام کی گئیں تو انہوں نے اس کو پگھلایا (تا کہ چربی کا نام باقی نہ رہے) اور پھر اس کی خرید و فروخت شروع کر دی (اس کی وضاحت حدیث بالا میں کی جا چکی ہے)۔" (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: فجملوها: (تخفیف کے ساتھ) یعنی اس کو آگ سے پگھلایا تا کہ اس سے "شحم" (چربی کا نام ختم ہو جائے اور "ودك" پگھلی ہوئی چربی) بن جائے۔

۲۷٦٨: وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى عَنْ ثَمَنِ الْكَلْبِ وَالسِّنَّوْرِ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۱۱۹۹/۳ الحدیث رقم (٤٢۔ ۱۵٦۹)۔ وابوداؤد فی السنن ۷۵۲/۳ الحدیث رقم ۳٤۷۹۔ والترمذی فی ۵۷۷/۳ الحدیث رقم ۱۲۷۹ وابن ماجه فی ۷۳۱/۲ الحدیث رقم ۲۱٦۱۔ والدار قطنی فی ۷۲/۳ الحدیث رقم ۲۷۱ من کتاب البیوع۔

ترجمه: "اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کتے اور بلی کی قیمت (کو استعمال میں لانے) سے ممانعت فرمائی ہے"۔ (مسلم)

تشریح: قوله: نهى عن ثمن الكلب والسنور: سین کے کسرہ اور تشدید اور نون کے فتحہ کے ساتھ، بلی کو کہتے ہیں۔ شرح السنہ میں ہے کہ یہ ممانعت محمول ہے اس بلی پر جس میں کوئی منفعت نہ ہو یا کراہت تنزیہی پر محمول ہے، کہ لوگوں میں بلی ہبہ کرنے، عاریت پر دینے اور سخاوت کرنے کی عادت ہو، جیسا کہ عام طور پر ہے۔ اگر وہ بلی نافع ہے اور اس کو بیچا تو بیع صحیح ہو جائے گی، اور اس کی قیمت حلال ہوگی، یہ جمہور علماء کا مذہب ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ اور تابعین کی ایک جماعت اس کو ناجائز سمجھتی ہے اور یہ لوگ حدیث کے ظاہر سے دلیل پکڑتے ہیں۔ جو علامہ خطابیؒ اور ابن عبدالبر نے ذکر کیا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے، تو ایسا نہیں ہے جیسا انہوں نے کہا ہے، بلکہ یہ حدیث صحیح ہے۔

ابن عبدالبر کا یہ کہنا کہ اس کو ابو زبیر سے حماد بن سلمہ کے علاوہ کسی نے روایت نہیں کیا ہے، تو یہ غلط ہے۔ اس لئے کہ مسلم نے اس کو اپنی صحیح میں عن معقل بن عبداللہ عن ابی الزبیر سے روایت کیا ہے یہ دونوں ثقہ ہیں، (انتہی) اس حدیث سے امام ابو حنیفہؒ اور ان کے

اصحاب کے مذہب کی تائید ہوتی ہے کتے کی بیع کے جواز میں۔اسلئے کہ نہی میں دو معطوفات کے درمیان مناسبت، اس کو لازم کرتی ہے۔

ابن الملک فرماتے ہیں کہ ظاہر حدیث کی وجہ سے بعض حضرات نے گھریلو اور وحشی بلی کے بیچنے کو مکروہ جانا ہے، اور اکثر نے اس ممانعت کو وحشی بلی پر محمول کیا ہے، چونکہ مائع ایسی بلی مشتری کے حوالہ کرنے سے عاجز ہوتا ہے۔اس لئے کہ اگر اس کو باندھے تو اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا، چونکہ اس کا فائدہ چوہے کا شکار کرنا ہے۔اور اگر اس کو نہ باندھے تو وہ بھاگ جاتی ہے تو وہ مال جو اس کے ثمن میں صرف کیا تھا وہ ضائع ہو جائے گا۔

۲۷۶۹:وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ حَجَمَ اَبُوْ طَيْبَةَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَاَمَرَ لَهُ بِصَاعٍ مِّنْ تَمْرٍ وَاَمَرَ اَهْلَهُ اَنْ يُخَفِّفُوْا عَنْهُ مِنْ خَرَاجِهِ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی ۳۲٤/٤۔ الحدیث رقم ۲۱۰۲۔ ومسلم فی ۱۲۰٤/۳ الحدیث رقم (٦٤۔ ۱۵۷۷) وابوداوٗد فی ۷۰۸/۳ الحدیث رقم ۳٤۲٤۔ والترمذی فی ۵۷٦/۳ الحدیث رقم ۱۲۷۸۔ ومالك فی المؤطا ۹۷٤/۲

ترجمہ:''اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ابوطیبہ نے رسول اللہ ﷺ کے پچھنے لگائے تو آپ ﷺ نے اس کو ایک صاع کھجوریں (تقریباً ڈھائی کلو کھجوریں) دیئے جانے کا حکم فرمایا' نیز آپ ﷺ نے اس کے مالکوں کو اس کے خراج میں تخفیف کرنے کا حکم صادر فرمایا۔(بخاری ومسلم)

تشریح: خراج : خَاء کے فتحہ کے ساتھ۔امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ غلام کو اس کے رضامندی سے کمائی پر لگانا جائز ہے۔اور اس کی صورت یہ ہے کہ مالک اپنے غلام سے کہے کہ تم کما کر لاؤ اور اپنی کمائی میں سے ہر روز مجھے اتنا دو اور باقی تمہارا ہے:اور غلام کہہ دے کہ میں اس پر راضی ہوں۔اور اس سے پچھنے لگوانے کا جواز بھی معلوم ہوتا ہے۔اور وہ افضل ترین دوا ہے، اور یہ کہ علاج کرنا مباح ہے، اور علاج پر طبیب کیلئے اجرت لینا جائز ہے۔اور یہ کہ صاحب حق اور صاحب دین سے تخفیف کی سفارش کرنا جائز ہے۔

الفصل الثانی :

۲۷۷۰:عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ اِنَّ اَطْيَبَ مَا اَكَلْتُمْ مِنْ كَسْبِكُمْ وَاِنَّ اَوْلَادَكُمْ مِنْ كَسْبِكُمْ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَفِيْ رِوَايَةِ اَبِيْ دَاوٗدَ وَالدَّارِمِيِّ) اِنَّ اَطْيَبَ مَا اَكَلَ الرَّجُلُ مِنْ كَسْبِهٖ وَاِنَّ وَلَدَهُ مِنْ كَسْبِهٖ.

اخرجه الترمذی فی السنن ٦۳۹/۳ الحدیث رقم ۱۳۵۸۔ والنسائی فی ۲٤۰/۷ الحدیث رقم ٤٤۵۰۔ وابن ماجه فی ۷٦۸/۲ الحدیث رقم ۲۲۹۰ والدارمی فی ۳۲۱/۲ الحدیث رقم ۲۵۳۷۔ واحمد فی المسند ۱٦۲/٦۔

ترجمہ:''حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: سب سے زیادہ پاکیزہ چیز وہ ہے جو تم اپنی کمائی سے حاصل کر کے کھاتے ہو اور تمہاری اولاد بھی تمہاری کمائی میں سے کمائی ہے''۔(ترمذی' نسائی' ابن ماجہؒ)

ابوداؤدؒ اور دارمیؒ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ''سب سے زیادہ پاکیزہ کھانا' آدمی کا اپنی کمائی سے کھانا ہے اور اس کی اولاد بھی اس کی کمائی میں سے ہے''۔

تشریح: ان اطیب ما اکلتم : ''طیب'' بمعنی ''احل'' ہے زیادہ حلال۔ ما موصولہ ہے، یا موصوفہ ہے، یا مصدریہ ہے، اور مصدر (ما اکلتم) مفعول (ماکول) کے معنی میں ہے۔

قولہ :وان اولادکم من کسبکم :

یعنی من جملہ (کسب میں سے) اولاد بھی ہے۔اس لئے کہ وہ تمہارے نکاح کے نتیجے میں حاصل ہوئی ہے لہٰذا تمہارے لئے اولاد کی کمائی سے کھانا جائز ہے جب تم محتاج ہوں ورنہ تو نہیں، مگر یہ کہ وہ اپنے طیب نفس کے ساتھ دے، یہی قول ہمارے علماء کا ہے۔

امام طیبیؒ کہتے ہیں کہ اگر والدین محتاج ہوں اور کمائی سے عاجز ہوں تو ان کی ضروریات زندگی پورا کرنا لڑکے پر واجب ہے، امام شافعیؒ کے مسلک میں اس وجوب کی شرط یہ ہے کہ وہ کمانے سے معذور ہوں جبکہ دوسرے علماء کے ہاں یہ شرط نہیں ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ''ولد'' کو ''کسب'' مجازاً کہا ہے۔علامہ ابن الھمام فرماتے ہیں، کہ (اس کو) ابن ماجہ نے روایت کیا ہے حضرت جابر سے سند صحیح کے ساتھ، ابن قطانؒ اور منذریؒ نے بیان کیا ہے کہ ایک آدمی نے کہا اے اللہ کے رسولؐ میرے پاس مال ہے اور اولاد بھی ہے اور میرا والد مجھ سے میرا مال لینا چاہتا ہے۔آپ نے فرمایا: ''انت و مالك لابيك'' تُو اور تیرا مال تیرے والد کا ہے طبرانی نے ''الاصغر'' میں اور بیہقی نے ''دلائل النبوۃ'' میں حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا اللہ کے رسولؐ میرا باپ مجھ سے میرا مال لینا چاہتا ہے۔آپ نے فرمایا کہ اس کو میرے پاس بلا لینا۔پس جب وہ آیا، تو آپ علیہ السلام نے فرمایا: کہ آپ کے بیٹے کا خیال یہ ہے کہ آپ اس کا مال لینا چاہتے ہیں۔تو والد نے کہا کہ آپ ان سے پوچھئے کہ میں اس کی پھوپی کے لئے لینا چاہتا ہوں یا اس کے قرابت داروں کیلئے لیتا ہوں یا میں اپنے اوپر اور اپنے گھر والوں پر خرچ کرتا ہوں۔

راوی کہتا ہے کہ جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور کہا یا رسول اللہ! اس بوڑھے نے اپنے دل میں شعر کہے ہیں جو خود اس کے کانوں نے بھی نہیں سنے، تو آپ نے اس سے دریافت کیا کہ تُو نے اپنے دل میں شعر کہے ہیں جو تیرے کانوں نے بھی نہیں سنے، تو وہ سنا دے۔اس نے کہا کہ اللہ ہمارا آپ پر ایمان اور یقین مسلسل بڑھاتا جا رہا ہے۔پھر اس نے یہ اشعار سنائے:

غذوتك مولودا ومنتك يافعا
تعل بما اجنى عليك وتنهل

میں نے تجھے بچپن میں غذا دی اور جوان ہونے کے بعد بھی تمہاری ذمہ داری اٹھائی تمہارا سب کھانا پینا میری ہی کمائی سے تھا۔

اذا ليلة ضاقتك بالسقم لم ابت
لسقمك الا ساهرا اتململ

جب کسی رات میں تمہیں کوئی بیماری پیش آ گئی تو میں نے تمام رات تمہاری بیماری کے سبب بیداری اور بیقراری میں گزاری۔

تخاف الورى نفسي عليك وانها
لتعلم ان الموت حق موكل

میرا دل تمہاری ہلاکت سے ڈرتا رہا حالانکہ میں جانتا تھا کہ موت کا ایک دن مقرر ہے پہلے پیچھے نہیں ہو سکتی۔

كانى انا المطروق دونك بالذى
طرقت به دونى فعيناك تهمل

گویا کہ تمہاری بیماری مجھے ہی لگی ہے تمہیں نہیں، جس کی وجہ سے میں تمام شب روتا رہا۔

فلما بلغت السن والغاية التى
اليك مراماً فيك قد كنت آمل

پھر جب تم اس عمر اور اس حد تک پہنچ گئے جس کی میں تمنا کیا کرتا تھا۔

جعلت جزائى غلظة وفظاظة

كانك انت المنعم المتفضل

تو تم نے میرا بدلہ سختی اور سخت کلامی بنا دیا گویا کہ تم مجھ پر احسان وانعام کر رہے ہو۔

فليتك اذا لم ترع حق ابوتی

فعلت كما جار المجاور يفعل

کاش! اگر تم سے میرے باپ ہونے کا حق ادا نہیں ہو سکتا تو کم از کم ایسا ہی کر لیتے جیسا ایک شریف پڑوسی کیا کرتا ہے۔

راوی کہتا ہے کہ آپ علیہ السلام رونے لگے اور پھر اس کے بیٹے کے گریبان کو پکڑا اور فرمایا: (اذهب انت ومالك لابيك) کہ چلے جا تُو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی پہلی حدیث کئی طرق سے روایت کی گئی ہے۔

۲۷۷۱: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا يَكْسِبُ عَبْدٌ مَا لَ حَرَامٍ فَيَتَصَدَّقُ مِنْهُ فَيُقْبَلُ مِنْهُ وَلَا يُنْفِقُ مِنْهُ فَيُبَارَكُ لَهٗ فِيْهِ وَلَا يَتْرُكُهٗ خَلْفَ ظَهْرِهٖ اِلَّا كَانَ زَادَهٗ اِلَى النَّارِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَمْحُوْ السَّيِّءَ بِالسَّيِّي وَلٰكِنْ يَمْحُوْا السَّيِّءَ بِالْحَسَنِ اِنَّ الْخَبِيْثَ لَا يَمْحُوْا الْخَبِيْثَ

(رَوَاهُ اَحْمَدُ وَكَذَا فِي شَرْحِ السُّنَّةِ)

اخرجه البغوی فی شرح السنة ۱۰/۸ الحديث رقم ۲۰۳۰۔ واحمد فی المسند ۳۸۷/۱۔

ترجمہ: ''اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ رسول اللہ ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ کوئی بندہ حرام مال کما کر اس میں سے صدقہ وخیرات کرتا ہے اور اس کا وہ صدقہ قبول کر لیا جاتا ہے (یعنی اگر کوئی شخص حرام ذرائع سے کمایا ہوا مال صدقہ وخیرات کرے تو اس کا صدقہ قطعاً قبول نہیں ہوتا اور نہ اس پر کوئی ثواب ملتا ہے) اور نہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ شخص اس حرام مال کو (اپنی ذات اور اپنے اہل وعیال پر) خرچ کرتا ہے اور اس میں اسے برکت حاصل ہوتی ہے (یعنی حرام مال میں سے جو بھی خرچ کیا جاتا ہے اس میں بالکل برکت نہیں ہوتی) اور جو شخص اپنے (مرنے کے بعد) حرام مال ترکہ میں چھوڑ جاتا ہے تو وہ اس شخص کے لئے (جہنم کی) آگ میں اضافہ کا سبب بنتا ہے اور (یہ بات یاد رکھو کہ) اللہ تعالیٰ برائی کو برائی کے ذریعہ مٹاتا بلکہ برائی کو بھلائی کے ذریعہ دور کرتا ہے اسی طرح ناپاک مال ناپاک مال کو نہیں مٹاتا (یعنی حرام مال برائی کو دور نہیں کرتا بلکہ حلال مال برائی کو دور کرتا ہے)۔'' (احمد، شرح السنة)

تشریح: فيتصدق منه: رفع کے ساتھ ''يكسب'' پر عطف ہے۔

فينفق منه) مجہول کے صیغے کے ساتھ ہے یہ بھی مرفوع ہے، اور اس کا عطف ''فيتصدق'' پر ہے۔

فيقبل: اور ایک صحیح نسخہ میں (فيقبل) نصب کے ساتھ ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ نصب میں ایک احتمال تو یہ ہے کہ جواب نفی ہو اور ''ان'' مقدر ہو۔ ای فلا یکون اجتماع الکسب والتصدق سببا للقبول یعنی اس کی کمائی اور صدقہ کی اجتماع قبولیت کا سبب نہیں ہو سکتا۔

فلا ينفق منه برفع کے ساتھ ''فيتصدق'' پر عطف ہے۔ فيبارك له فيه: صیغہ مجہول کے ساتھ، جواب ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ ولا يترك'' کا عطف فيتصدق پر ہے۔ خلف ظهره: موت سے کنایہ ہے

اس لئے کہ جب وہ، حرام طریقے سے مال جمع کرنے کی وجہ سے گناہ گار رہا اور پھر مر گیا اور مال ورثاء کیلئے چھوڑا، تو قیامت تک اس پر اس کا گناہ ہوگا یعنی جو دوسرے کے گناہ کے ارتکاب کا ذریعہ بنے وہ بھی اس وعید کا مستحق ہو جاتا ہے۔ اور لفظ ''زاده'' زاء معجمہ کے ساتھ ہے، تقدیری عبارت یوں ہے: حال كونه موصلا له الى النار۔

ابن الملک فرماتے ہیں اس کو راء مہملہ کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے، یعنی یہ مشتق ہے ''رود'' سے **ای مانعه عن الجنة و ملجئه الی النار** یعنی اس کو جنت سے روکنے والا اور جہنم کی طرف پہنچانے والا ہے۔ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث تقسیم حاصر میں سے ہے' اس لئے کہ جو شخص مال کماتا ہے وہ دو حال سے خالی نہیں، یا تو وہ آخرت کیلئے ذخیرہ کرتا ہے تو اس میں سے صدقہ کرتا ہے، یا صدقہ نہیں کرتا۔ دوسری صورت پھر دو حال سے خالی نہیں کہ وہ اپنے نفس پر اور عیال پر خرچ کرتا ہے یا نہیں کرتا دوسری صورت یہ ہے کہ وہ مال کو ذخیرہ کرتا ہے اپنی دنیا کیلئے اور اس کو اپنے نفس کیلئے خزانہ بنا کر رکھتا ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ حرام نہ تو اس کے کام آتا ہے اور نہ اس کو نفع دیتا ہے اس میں جو اس نے ارادہ کیا ہے۔

قوله : ان الله لا يمحوا السی با لسيئ : یہ جملہ مستانفہ ہے' یعنی مال حرام سے صدقہ قبول نہ ہونے کی علت کو بیان کرنے کیلئے لایا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مال حرام کا صدقہ کرنا گناہ ہے۔ اور اللہ برے اعمال کو برائی سے نہیں مٹاتا، بلکہ بعض علماء نے تو یہاں تک کہا ہے اگر کوئی مال حرام میں سے صدقہ و خیرات کرے اور پھر اس پر ثواب کی امید رکھے تو وہ کافر ہو جاتا ہے نیز اگر کسی فقیر کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس کو صدقہ دینے والا بطور صدقہ جو مال دے رہا ہے وہ حرام ذرائع سے حاصل کیا گیا ہے اور اس کے باوجود صدقہ دینے والے کیلئے دعا کرے وہ بھی کافر جاتا ہے۔

قوله : ولكن يمحو السئی بالحسن : اس میں اللہ کے اس فرمان کی طرف اشارہ ہے : [**ان الحسنات يذهبن السيئات**][ھود۔۱۱۵] ''بے شک نیک کام مٹا دیتے ہیں برے کاموں کو''۔ اور یہ سب جملے تمہید اور مقدمہ کے طور پر ہیں اس جملے کے لئے :''**ان الخبيث لا يمحو الخبيث**''، یعنی ناپاک چیز ناپاک کو پاک نہیں کرتی بلکہ پاک ہی اس کو پاک کرتا ہے، اور امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ مال حرام کبھی فائدہ نہیں دیتا عدم نفع کو ''خبث'' سے تعبیر کیا ہے۔

۲۷۷: **وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ لَحْمٌ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ وَكُلُّ لَحْمٍ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ كَانَتِ النَّارُ اَوْلٰى بِهٖ** ۔ (رواه احمد والدارمی والبيهقی فی شعب الا يمان)

اخرجه الدارمی فی السنن ۲/۴۰۹ الحديث رقم ۲۷۷۶۔ واحمد فی المسند ۳/۳۲۱۔

ترجمہ:''اور جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وہ گوشت جس نے حرام مال سے پرورش پائی ہے جنت میں داخل نہیں ہوگا اور ہر وہ گوشت جو حرام مال سے نشو و نما پائے جہنم کی آگ اس کی زیادہ حقدار ہے۔ (احمد' دارمی' بیہقی)

تشریح: **قوله : لا يدخل الجنة** : اس میں متعدد تاویلات کی گئی ہیں: (۱) دوزخ میں داخل ہونے سے مراد یہ ہے کہ ایسا شخص شروع میں نجات یافتہ لوگوں کے ساتھ جنت میں داخل نہ ہوگا بلکہ اس نے جتنا مال حرام کھایا ہوگا اس کے بقدر سزا بھگتے گا جب تک اس کو معاف نہ کیا جائے (۲) ایسا شخص جنت کے اعلیٰ درجات میں داخل نہیں ہو سکے گا۔ (۳) مراد یہ ہے کہ وہ لوگ جنت میں داخل نہیں ہوں گے جو حرام مال کو حلال سمجھ کر کے کھاتے ہیں۔ اور اس کا ضروریات دین میں سے ہونا معلوم ہے۔ (۴) اس سے زجر شدید اور سخت وعید مراد ہے اسی وجہ سے۔ اس کو کسی قید کے ساتھ مقید نہیں کیا ہے۔

لحم : (یہاں مضاف محذوف ہے۔) ای**، صاحب لحم** یعنی صاحب لحم مراد ہے۔

السحت : سین کے ضمہ اور حا کے سکون کے ساتھ، بمعنی حرام

جنت میں نہ داخل ہونے کی نسبت ''لحم'' گوشت کی طرف کی ہے نہ کہ صاحب لحم کی طرف تاکہ علت معلوم ہو جائے۔ اور یہ ناپاک ہے تو یہ پاک (یعنی جنت) میں داخل ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اس لئے کہ خبیث' خبیث کیلئے ہوتا ہے۔ اس لئے اگلا جملہ ارشاد فرمایا:

قوله : وكل لحم نبت من السحت كانت النار اولى به : اور ایک نسخہ میں ''**كان النار**'' ہے۔ جنت کے مقابلے میں

(جہنم اس کے لئے بہتر ہے) تا کہ آگ اس کو جلا کر حرام سے پاک کر دے۔ ظاہر میں تو وہ اسی سزا کا مستحق ہے لیکن اگر وہ توبہ کر لے یا بغیر توبہ کے اللہ اس کو بخشش دے یا خصم کو راضی کر دے اور یا اسے کسی کی شفاعت حاصل ہو جائے تو وہ شخص اس وعید سے مستثنیٰ ہوگا۔

۲۷۷۳: وَعَنِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ قَالَ حَفِظْتُ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ دَعْ مَا يُرِيْبُكَ اِلٰى مَا لَا يُرِيْبُكَ فَاِنَّ الصِّدْقَ طَمَانِيْنَةٌ وَاِنَّ الْكِذْبَ رِيْبَةٌ ۔ رواه احمد والترمذی والنسائی وروی الدارمی الفصل الاول

اخرجه الترمذی فی السنن ٥٧٦/٤ الحديث رقم ٢٥١٨۔ والنسائی فی ٣٢٧/٨ الحديث رقم ٥٧١١۔ والدارمی فی ٣١٩/٢ الحديث رقم ٢٥٣٢۔ واحمد فی المسند ٢٠٠/١۔

ترجمہ: ''اور حضرت حسن بن علیؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد گرامی کو (خود سنا ہے اور اسے) یاد رکھا ہے کہ ''جو چیز تم کو شک میں مبتلا کر دے اس کو چھوڑ دو اور اس چیز کی طرف میلان رکھو جو تم کو شک میں مبتلا نہ کرے کیونکہ سچائی دِل کے اطمینان کا باعث ہے اور جھوٹ شک وتردد کا موجب ہے (احمدؒ ترمذیؒ نسائیؒ اور دارمیؒ نے حدیث کا صرف پہلا حصہ (یعنی دَعْ مَا يُرِيْبُكَ اِلٰى مَا لَا يُرِيْبُكَ) نقل کیا ہے''۔

تشریح: **يريبك** : یاء کے فتحہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ روایت کیا گیا ہے، لیکن فتحہ زیادہ مشہور ہے۔ ''ریب'' شک کو کہتے ہیں، بعض کا کہنا ہے کہ ''ریب'' اس شک کو کہتے ہیں جس کے ساتھ تہمت بھی ہو۔

تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یعنی جس چیز میں آپ کو شک ہو جائے تو اس کو چھوڑ کر اس کی طرف پھر جانا جس میں شک نہ ہو۔ کہا جاتا ہے: **دع ذلك الى ذلك اى استبدله به**، (انتہی)۔ اور مطلب یہ ہے کہ جن اقوال واعمال میں آپ کو شک ہو جائے کہ وہ ممنوع ہیں یا ممنوع نہیں ہیں، یا سنت ہیں کہ بدعت ہیں؟ تو اس کو چھوڑ کر اس کی طرف میلان رکھیں جس میں شک نہ ہو۔ مقصود حدیث سے یہ ہے کہ مکلف کو اپنے ہر معاملے کی بنیاد یقین اور حق پر رکھنی چاہئے اور اپنے دین کے معاملے میں بصیرت پر ہونا چاہئے۔

قوله : فان الصدق طمأنينة وان لكذب : کاف کے فتح اور ذال کے کسرہ کے ساتھ، سید کے نسخے میں کاف کے کسرہ اور ذال کے سکون کے ساتھ ضبط کیا ہے، لیکن پہلا والا ضبط زیادہ صحیح ہے اور قرآن میں واقع ہے۔ اور دوسرا ضبط محض ایک لغت ہے۔ کہا گیا ہے کہ کذب کا تقابل صدق کے ساتھ تو یہ زیادہ بہتر ہے، چونکہ دونوں کے درمیان موازنت ہے

(**ريبة** : راء کے کسرہ کے ساتھ۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ دل کو کھٹکا ہوتا ہے اور مضطرب ہو جاتا ہے۔ اور کسی چیز کا مشکوک ہونا یہ ہے کہ نفس اس کے بارے میں کھٹکے اور کسی چیز کا صحیح اور سچا ہونا یہ ہے کہ نفس اس کے بارے میں مطمئن ہو اور اسی سے ہے: [**ريب المنون**] یعنی زمانے کے حوادث جو نفس میں کھٹکیں اور بعض کہتے ہیں کہ ''ریب'' کا معنی ہے موت۔

علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قول ماقبل کے کلام کیلئے بطور تمہید آیا ہے، اور مطلب یہ ہے کہ جب کسی چیز کے بارے میں تیرا نفس شک میں پڑ جائے تو اس کو چھوڑ دے۔ چونکہ کہ مؤمن کا نفس سچ سے مطمئن ہوتا ہے اور جھوٹ سے شک میں پڑ جاتا ہے، پس تیرا شک کرنا کسی چیز کے بارے میں یہ اس کے باطل ہونے پر مبنی ہے یا اس کے باطل ہونے کا گمان ہے۔ پس اس سے بچنا اور تیرا کسی چیز کے بارے مطمئن ہونا اس کے حق ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ پس آپ اس کو لازم پکڑنا، صدق اور کذب اقوال اور افعال دونوں کیلئے استعمال ہوتے ہیں۔ اور حق ہو یا باطل اعتقاد کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، یہ وصف مخصوص ہے ان شریف اور پارسہ نفوس کے ساتھ جو ہر قسم کے گناہوں کے ضرر اور میل کچیل سے پاک ہوں۔ (انتہی)۔

بعض عارفین کا کہنا ہے کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب تو صحیح دل کا مالک ہوگا' پاکیزہ باطن ہوگا غیب کا مراقبہ کرنے والا ہوگا فرشتہ کے الہام اور شیطان کے وسوسہ کے درمیان امتیاز کر سکے اور الہام اور حدیث النفس میں فرق کر سکے، اور نور فراست اور صفائی دل سے حق اور باطل کے درمیان تمیز کرنے والا بن جائے' تو جو اغلوطات شبہات نفسانیہ اور شبہات شیطانیہ تجھ میں ڈالیں تو تُو اس کی طرف

مائل ہو جا جو تجھ کو شک میں نہ ڈالے جس کا تیرے دل تیری عقل اور تیری روح پر نزول ہوتا ہے اور وہ ہے الہام الٰہی اور وہ علم لدنی جو کتاب اور حدیث نبوی کے مطابق ہو۔

تو جیسے اس چیز کا ترک مامور ہے جو تجھے شک میں ڈالے تو اسی طرح ہر شک میں ڈالنے والی ہر چیز کا ترک مامور ہے۔ پس معلوم ہوا کہ جو چیز عام لوگوں کیلئے سمجھنا مشکل ہو اور وہ ان کو شک میں مبتلا کرنے والی ہو تو اس کا چھوڑنا بطریق اولیٰ مامور ہے۔ جیسا کہ اس کی طرف حسن بن علی کرم اللہ وجہہ نے اشارہ کیا ہے:

انی لاکتم من علمی جواهره
کیلا یری الحق ذوجهل فیفتننا

میں اپنے علم کے بعض جواہرات چھپاتا ہوں، تاکہ جاہل اس کو حق سمجھ کر فتنہ میں نہ پڑے۔

یا رب جوهر علم لو ابوح به
لقیل لی انت ممن تعبد الوثنا

بہت سارے علمی جواہرات ایسے ہیں اگر میں انکو ظاہر کروں تو مجھے کہا جائے گا کہ تو بتوں کی پوجا کرنے والوں میں سے ہے۔

ولاستحل رجال مسلمون دمی
یرون اقبح ما یأتونه حسناً

اور مسلمان مرد میرے خون کرنے کو حلال سمجھیں گے، اور وہ اپنے سب سے برے کام کو جو وہ کرتے ہیں، اچھا سمجھیں گے

قوله :رواه احمد والترمذی والنسائی وروی الدارمی الفصل الاول :

یعنی امام احمدؒ ترمذی اور نسائی نے مکمل حدیث روایت کی ہے، اور دارمی نے حدیث کا صرف پہلا حصہ (یعنی دَعْ مَا یُرِیْبُكَ اِلٰی مَا لَا یُرِیْبُكَ) نقل کیا ہے۔ اور اس کو فصل کہا ہے اس لئے کہ آخری جملہ کی تفریع پہلے والے جملے پر ہے تو یہ جملے کلام کی دو فصلوں کی طرح ہوئے۔ اگرچہ ان کے درمیان مکمل ربط ہے۔

۲۷۷۴:وَعَنْ وَابِصَةَ بِنِ مَعْبَدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ یَاوَابِصَةُ جِئْتَ تَسْأَلُ عَنِ الْبِرِّ وَالْاِثْمِ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ فَجَمَعَ اَصَابِعَهٗ فَضَرَبَ بِهَا صَدْرَهٗ وَقَالَ اسْتَفْتِ نَفْسَكَ وَاسْتَفْتِ قَلْبَكَ ثَلَاثًا اَلْبِرُّ مَا اطْمَأَنَّتْ اِلَیْهِ النَّفْسُ وَاطْمَأَنَّ اِلَیْهِ الْقَلْبُ وَالْاِثْمُ مَا حَاكَ فِی النَّفْسِ وَتَرَدَّدَ فِی الصَّدْرِ وَاِنْ اَفْتَاكَ النَّاسُ۔ (رواه احمد والدارمی)

اخرجه الدارمی فی السنن ۲/ ۳۲۰ الحدیث رقم ۲۵۳۳۔ واحمد فی المسند ۴/ ۲۲۸۔

ترجمہ: ”اور حضرت وابصہ بن معبدؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمایا: تم نیکی اور گناہ کے بارے میں سوال کرنے آئے ہونا؟ میں نے عرض کیا کہ جی ہاں۔ وابصہ نے کہا (یہ سن کر) آپ ﷺ نے اپنی انگلیوں کو اکٹھا کیا اور میرے سینے پر مار کر فرمایا کہ اپنے نفس سے دریافت کرو۔ اپنے دل سے پوچھو آپ ﷺ نے یہ جملہ تین مرتبہ ارشاد فرمایا اور پھر فرمایا کہ ”نیکی وہ ہے جس سے انسان کا نفس اور اس کا دِل مطمئن ہو جائے اور گناہ وہ ہے جو تیرے نفس میں کھٹکے اور تیرے سینے میں تردد پیدا کرے اگرچہ لوگ فتویٰ دیں تمہیں۔ (احمد، دارمی)

تشریح: البر : کسرہ کے ساتھ بمعنی ”احسان“ (نیکی) یہ لفظ تمام بھلائیوں کو جامع ہے۔ اور اسی سے اللہ جل شانہ کا یہ فرمان ہے: ﴿ولکن البر من اتقٰی﴾ [البقرة:۱۸۹] ”لیکن فضیلت یہ ہے کہ کوئی شخص حرام سے بچے۔“

اور حاصل دونوں کا طاعت اور معصیت ہے۔

فقلت نعم : یہ اعجاز نبوت میں سے ہے اس لئے کہ آپ نے اس کے ضمیر کے اندر کی بات اس کے بات کرنے سے پہلے بتادی۔

فضرب بھا صدرہ : اس میں احتمال ہے کہ "صدرہ" کی ضمیر وابصہ کی طرف بطور التفات لوٹ رہی ہو۔ اور اسی کو امام طیبیؒ نے یقین کے ساتھ نقل کیا ہے، اور پھر کہا ہے کہ بعض کا کہنا یہ ہے کہ "صدرہ" کی ضمیر رسول اللہ ﷺ کی طرف لوٹ رہی ہے ان کو اس بارے میں وہم ہوا ہے، کہا ہے کہ اس میں یہ احتمال ہے کہ یہ وابصہ کے علاوہ کسی اور راوی کا کلام ہو، اور یہ سیاق کے زیادہ موافق ہے، جیسا کہ گزرا۔ (انتہیٰ)۔

ابن الملک فرماتے ہیں کہ انگلیوں کو سینہ پر رکھا تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ دل سینے میں ہے یعنی اس کے بائیں جانب ہے، اور تاکہ آپ ﷺ کے دست مبارک کے لگنے سے ان کو آپ کے کلام کی پوری سمجھ حاصل ہو جائے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ضمیر نبی ﷺ کی طرف لوٹ رہی ہے، (انتہیٰ)۔

پس اس صورت میں یہ نظیر ہوگی اس حدیث کی: (ان التقویٰ ھٰھُنا) یعنی آپ نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ تقویٰ کا مقام یہ ہے، واللہ اعلم۔

قولہ : استفتت نفسك، استفت قلبك : امام نووی رحمہ اللہ نے صرف دوسرے جملے پر اکتفاء کیا ہے، پس یہاں دونوں کا یکجا مذکور ہونا تاکید کیلئے ہے، یعنی اپنے دل سے فتویٰ طلب کر۔ اس لئے کہ وہ سلوک میں درجہ کمال تک پہنچ چکا ہے، اور اس نے "وصول" کو طلب کیا وصال کی آنکھ سے مقام قلب تک۔

اور تفصیل اس کی یہ ہے کہ انسان کا حق کی طرف چلنا یہ باطن کے ذریعے ہوتا ہے، اگرچہ یہ ظاہر کی مدد سے ہوتا ہے، چونکہ ہیئات بدنیہ کا چڑھنا نفس اور دل کے خیر کی طرف اور ہیئات نفسانیہ اور قلبیہ کا اترنا ظاہر کی طرف، دونوں کے درمیان علاقہ کی وجہ سے۔ "فتویٰ" مشتق ہے "الفتو" سے اس لئے کہ یہ کسی حادثہ کے جواب میں ہوتا ہے۔ یا کسی حکم کا احداث ہوتا ہے، یا کسی مشکل کا حل ہوتا ہے، (جیسا کہ مغرب میں ہے) یعنی وہ فتویٰ میں ملاحظہ کرتا ہے وہ چیز جو قوت اور حدوث حکم کی خبر دیتی ہے۔

ثلاثا : ظرف ہے، قال کیلئے تاکیداً، اور یہ بھی احتمال ہے کہ ظرف ہو "استفت" کیلئے، اس صورت میں یہ بمنزلہ تکرر ستخارہ کے ہوگا۔

قولہ : والبر ما اطمأنت الیہ النفس واطمأن الیہ القلب : قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب سالک کیلئے کوئی چیز مشکل ہو جائے اور ملتبس ہو جائے اور یہ ظاہر نہ ہو کہ یہ کس قبیل سے ہے، پس اگر وہ اہل اجتہاد میں سے ہے تو غور وفکر کرے اور اگر مقلدین میں سے ہے تو مجتہدین سے پوچھے، پس اگر وہ ایسا جواب پائے جس سے اس کے نفس کو سکون حاصل ہو اور دل کو اطمینان ہو اور اس پر اس کا شرح صدر ہو۔ تو چاہئے کہ اس کو لے لے اور اپنے نفس کیلئے اس کو اختیار کرے، ورنہ تو اس کو چھوڑ دے اور وہ لے لے جس میں شک وشبہ نہ ہو، یہی تقویٰ اور حتیاط کا راستہ ہے۔ اور اس کا حاصل بھی حسن بن علیؓ کی حدیث سے ہی تعلق رکھتا ہے۔

اور ممکن ہے کہ "اطمینان قلب" کا عطف "اطمینان نفس" پر تقدیر اور تاکید کیلئے ہو، چونکہ جب نفس کو کسی معاملے میں تردد ہو اور نفس اس معاملے میں حیران ہو اور اس کا قرار ختم ہو جائے تو اس کے پیچھے دل دھڑکنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس لئے نفس اور دل جو نفس کا اول متعلق ہے کے درمیان علاقہ ہے، پس اس ہیئت سے علاقہ دل کی طرف اثر منتقل کر دیتا ہے۔ چنانچہ دل میں دھڑکن اور اضطراب پیدا ہو جاتا ہے اور پھر کبھی یہ اثر تمام قویٰ کی طرف سرایت کر جاتا ہے پس یہ اس کے ذریعے حلال اور حرام کو محسوس کرتا ہے، اور جب نفس سے یہ حالت ختم ہو جائے اور اس میں قرار اور اطمینان پیدا ہو جائے تو معاملہ الٹ ہو جاتا ہے اور حالت تبدیل ہو جاتی ہے اسکے فروع واعضاء کی۔

بعض کہتے ہیں اپنے دل سے دریافت کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے اس کا تعلق ان ارباب بصیرت کے ساتھ ہے جو صحیح غور وفکر کرنے والے ہیں اور صاحب فراست ہیں' پاکیزہ نفوس اور قلوب سلیمہ کے مالک ہیں۔ اس لئے کہ ان کی طبائع خیر وبھلائی کی طرف مائل اور برائی سے بیزار ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ ہر چیز اپنے مناسب چیز کو جذب کرتی ہے اور مخالف سے نفرت کرتی ہے۔ اور ان کے نفوس اکثر

احوال میں ان کو درست بات کا الہام کرتے ہیں۔علامہ تورپشتی فرماتے ہیں کہ یہ قول اگر چہ مستبعد نہیں، لیکن حدیث کو اس کے عموم کے اعتبار سے ان پر محمول کرنا احق واہدی ہے جن میں تقویٰ ہے اور دین کے دائرہ نے ان کا احاطہ کیا ہوا ہے۔

اور بعض کہتے ہیں ''نفس'' لغت میں ''حقیقۃ الشیءکو'' کہتے ہیں۔اور اصطلاح میں وہ جوہر لطیف جو جسم میں روح کے بدن کے ساتھ ملاپ سے پیدا ہوتا ہے۔اور دونوں کا اتصال معاً ہوتا ہے۔

حاك : یہ **حاك يحيك** سے ہے، اور زمخشری فرماتے ہیں کہ ''**حك** '' کاف کی تشدید کے ساتھ ہے۔

یعنی اس میں اثر کرے اور قرار نہ پکڑے، اور ''مفاتیح'' میں ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تیرے دل میں اثر کرے یا تجھے پریشان کرے کہ یہ گناہ ہے، اور اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے: **ان الاثم ما حاك فی نفسك و كرهت ان يطلع عليه الناس**'' بیشک گناہ وہ ہے جو تیرے نفس میں کھٹکے اور تو اس پر لوگوں کے مطلع ہونے کو ناپسند کرتے۔''

وتردد فی الصدر : یعنی اس کیلئے سینہ نہ کھلے۔یہ حالت اس شخص کی ہوتی ہے جس کے سینے کو اللہ نے اسلام کیلئے کھولا ہو۔وہ اپنے ربّ کی طرف سے ایک نور پر ہوتا ہے۔

وان افتاك الناس : یعنی اگر چہ لوگ آپ سے کہیں کہ یہ حق ہے، تو آپ ان کی بات کو نہ لیں اس لئے کہ یہ کبھی غلطی اور اکل مشتبہ میں مبتلا کر دیتی ہے جیسا کہ آپ کسی شخص کو دیکھیں جس کے پاس حلال اور حرام مال ہو، پس آپ اس سے کچھ نہ لیں اگر چہ مفتی آپ کو فتویٰ دے دے، کہ کہیں آپ حرام کھالیں، اس لئے کہ فتویٰ اور چیز ہے اور تقویٰ اور چیز ہے۔یہ جملہ شرطیہ ہے اس کو جزاء سے کاٹا گیا ہے، کلام سابق کو تمام کرنے اور مضبوط کرنے کیلئے مبالغہ کے طور پر۔حدیث اربعین میں یہ لفظ زیادہ ہے: ''**وافتوك**'' یہ تاکید کے طور پر ہے، اور اسی مضمون کے بارے میں بعض ارباب معنی نے یہ اشعار پڑھے ہیں:

اتخذ طاعة الاله سبيلا
تجد الفوز بالجنان وتنجو

''تو اللہ کی فرمانبرداری کو راستہ بنا، جنت کی کامیابی اور نجات پالے گا۔''

واترك الاثم والفواحش طرا
يؤتك الله ما يدوم وينجو

''اور چھوڑ دے گناہ اور فواحش سب کے سب اللہ تجھے وہ دے دیگا جو ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔اور نجات دے گا۔

اسنادی حیثیت: امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے۔

۲۷۷۵: وَعَنْ عَطِيَّةَ السَّعْدِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا يَبْلُغُ الْعَبْدُ اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ حَتّٰى يَدَعَ مَا لَا بَاْسَ بِهٖ حَذَرًا لِمَا بِهٖ بَاْسٌ (رواه الترمذی وابن ماجة)

اخرجه الترمذی فی السنن ٥٤٧/٤ الحديث رقم ٢٤٥١۔ وابن ماجه ١٤٠٩/٢ الحديث رقم ٤٢١٥۔

ترجمه: ''اور حضرت عطیہ سعدیؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بندہ اس وقت تک (کامل) متقی و پرہیز گاروں کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا یہاں تک کہ وہ ان چیزوں کو ترک نہ کر دے جن میں کوئی قباحت نہیں ہے تا کہ اس طرح وہ ان چیزوں سے بچ سکے جن میں قباحت ہے''۔(ترمذی، ابن ماجہ)

حالاتِ راوی:

عطیۃ بن قیس۔یہ عطیہ بن قیس ''سعدی'' ہیں۔''سعدی'' قبیلہ بنو سعد کی طرف منسوب ہے۔آنحضور ﷺ کی زیارت سے

آنکھوں کو ٹھنڈا کیا۔ احادیث مبارکہ سنیں اور آگے بھی پہنچائیں۔ اہل یمن اور اہل شام ان سے روایت کرتے ہیں۔

تشریح: لا یبلغ العبد ان یکون۔ حذراً : مفعول لہ ہے۔ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "**ان یکون**" ظرف ہے "**یبلغ**" کیلئے بتقدیر مضاف ای "**درجه المتقین**"۔ اور "**متقی**" از روئے لغت صیغہ اسم فاعل ہے، عرب کے اس قول سے مشتق ہے: **وقاه فاتقی**۔ اور "**الوقاية**" انتہائی حفاظت کو کہتے ہیں۔ اور شریعت میں متقی کہتے ہیں جو اپنے آپ کو دور رکھے ایسی چیزوں سے جن کے کرنے یا نہ کرنے سے عذاب کا مستحق ہو، بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ تقویٰ کے تین درجے ہیں:

اول: شرک سے اجتناب۔ چنانچہ جو بندہ شرک سے بچتا ہے وہ دائمی عذاب سے نجات پاتا ہے۔ اس آیت کریمہ: ﴿**والزمهم كلمة التقوى**﴾ اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تقویٰ کی بات پر جمائے رکھا، میں یہی درجہ مراد ہے۔

دوم: ہر وہ کام جس کے کرنے یا نہ کرنے سے آدمی گناہ گار ہوتا ہو اس سے بچنا یہاں تک کہ بعض کے ہاں صغیرہ گناہوں سے بھی اجتناب اس میں داخل ہے، چنانچہ تقویٰ کی جو مشہور شرعی اصطلاح ہے اس کا اطلاق اسی درجہ پر ہوتا ہے، اور اس آیت کریمہ: ﴿**ولو ان اهل القرى أمنوا واتقوا**﴾ [الاعراف۔ ۹۶] اور اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور پرہیز کرتے، میں یہی درجہ مراد ہے۔

سوم: ہر اس چیز سے جس میں پڑنے سے اس کا باطن حق سے مشغول ہو جائے، پرہیز کرنا اور مکمل توجہ کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ ہونا یہی حقیقی تقویٰ ہے، اور اللہ کے اس فرمان میں یہ مطلوب ہے: ﴿**اتقوا اللّٰه حق تقاته**﴾ [آل عمران۔ ۱۰۲] "اللہ تعالیٰ سے ڈرا کرو، جیسا کہ ڈرنے کا حق ہے۔"

حدیث سے اگرچہ تقویٰ کے دوسرے درجہ کیلئے استشہاد کیا ہے لیکن یہ بھی درست ہے کہ اس سے درجہ سوم مراد ہو، واللہ تعالیٰ اعلم۔
اور یہ حدیث تقویٰ کے بارے میں پہلی دو حدیثوں کے مقابلے میں زیادہ بلیغ اور جامع ہے۔

۲۷۷۶: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِي الْخَمْرِ عَشَرَةً عَاصِرَهَا وَمُعْتَصِرَهَا وَشَارِبَهَا وَحَامِلَهَا وَالْمَحْمُوْلَةَ اِلَيْهِ وَسَاقِيَهَا وَبَائِعَهَا وَاٰكِلَ ثَمَنِهَا وَالْمُشْتَرِيَ لَهَا وَالْمُشْتَرٰى لَهٗ۔ (رواه الترمذی وابن ماجة)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵۸۹/۳ الحدیث رقم ۱۲۹۵۔ وابن ماجه فی ۱۱۲۲/۲ الحدیث رقم ۳۳۸۱۔

ترجمہ: "اور حضرت انس کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے شراب کے معاملہ میں ان دس قسم کے آدمیوں پر لعنت فرمائی ہے (۱) شراب کشید کرنے والے پر (۲) شراب کشید کرانے والے پر (۳) شراب پینے والے پر (۴) شراب اٹھانے والے پر یعنی وہ شخص جو کسی کو شراب اٹھا کر دے (۵) شراب اٹھوانے والے پر جو کسی کو شراب اٹھا لانے کا حکم دے) (۶) شراب پلانے والے پر (۷) شراب بیچنے والے پر (۸) شراب کی قیمت کھانے والے پر (۹) شراب خریدنے والے پر (یعنی وہ شخص جو کسی دوسرے کے پینے کے لئے یا اس کی تجارت کے لئے بطریق وکالت یا بطریق ولایت شراب خریدے) (۱۰) جس کے لئے شراب خریدی جائے یعنی وہ شخص جو کسی دوسرے سے اپنے پینے یا اپنی تجارت کے لئے شراب خرید کر منگوائے"۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

تشریح: قوله : لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم فى الخمر : ظرفیت مجازی ہے، یا تعلیلیہ ہے، ای فی **شأنها أو لأجلها** "**عشرة** : اس کی تمیز محذوف ہے۔ **أى عشرة اشخاص**۔

عاصرها : نصب کے ساتھ مفعول بہ سے بدل ہے،

المحمولة اليه : اصل میں یہ عبارت "**المحمولة هي**" تھی۔ لیکن "**هي**" کو حذف کیا ہے، اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کہ اس کا حذف جائز ہے جب التباس کا خطرہ نہ ہو۔

بائعها : ہمزہ کے ساتھ یعنی اس کا سودا کرنے والا، اگرچہ وہ کسی کا وکیل یا دلال ہو۔

والمشترى له : یعنی پینے کیلئے، یا تجارت کیلئے وکالت کے ساتھ ہو یا اس کے علاوہ خریدے۔

لام تعدیہ کیلئے ہے، یا لام زائد ہے مفعول میں تقویت پیدا کرنے کے لئے لایا گیا ہے۔

والمشترٰی له : صیغہ مفعول کے ساتھ ہے، یعنی جس کیلئے خریدا جائے وکالت کے طور پر، اور ظاہر میں تو "**والمشتراۃ له**" کہنا چاہیے تھا لیکن "**مشترٰی له**" سے تا کا حذف کرنا ایک لغت ہے جیسا کہ تسہیل وغیرہ میں ذکر ہے:

اور اسی سے ہے **انارۃ العقل مکسوف بطوع ھوٰی**۔

اور ایک احتمال یہ ہے کہ خمر کو مذکر لانا اس کے مترادفات کے اعتبار سے ہو کہ وہ مذکر ہیں۔ مثلاً **العقار**' **الراح** اور **المدام** وغیرہ یا معنی کے اعتبار سے اس کو مذکر لایا گیا ہے، یعنی مشروب کے معنی میں ہونے کی وجہ سے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ تذکیر خمر بھی ایک لغت ہے۔ لیکن تعجب ہے شراح پر کہ انہوں نے اس کی طرف کسی قسم کی توجہ ہی نہیں دی حالانکہ نسخ صحیحہ اور اصول معتمدہ میں اس کو اسی طرح ضبط کیا ہے۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آپ نے لعنت فرمائی ہے اس شخص پر جس نے کسی بھی قسم کی سعی کی اس میں اس طریقے پر جو اوپر گنے گئے ہیں کشید کرنے والا اور کشید کروانے والا اور جوان کے بعد ذکر کئے ہیں۔ اور اس کو تفصیل سے اس لئے ذکر کیا تا کہ یہ شامل ہو ہر اس شخص کو جس نے کسی بھی قسم کی کوشش کی۔ اور جس نے شراب نچوڑنے والے کو انگور بیچے اور جس نے اس کی قیمت لی وہ زیادہ حقدار ہے لعنت کے، اسلئے کہ یہ وہ لوگ ہیں جب ان پر شراب حرام کی گئی تو انہوں نے شراب کی اصل یعنی انگور کو بیچا ان لوگوں پر جن کے بارے میں انکو معلوم ہے کہ یہ اس سے شراب کشید کریں گے اور کوئی بعید نہیں کہ یہ بھی انکی طرح ہوں جن کے بارے میں کہا گیا ہے: **قاتل اللّٰہ الیھود حرمت علیھم الشحوم فجملوھا وباعوھا** "اللہ تباہ کردے یہود کو کہ ان پر چربی حرام کی گئی تو انہوں نے اس کو پگھلا کر بیچا۔

۲۷۷۷: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَعَنَ اللّٰهُ الْخَمْرَ وَشَارِبَهَا وَسَاقِيَهَا وَبَائِعَهَا وَمُبْتَاعَهَا وَعَاصِرَهَا وَمُعْتَصِرَهَا وَحَامِلَهَا وَالْمَحْمُوْلَةَ اِلَيْهِ. (رواہ ابوداود وابن ماجۃ)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۸۱/۴ الحدیث رقم ۳۶۷۴ وابن ماجه فی ۱۱۲۱/۲ الحدیث رقم ۳۳۸۰ واحمد فی المسند ۲۵/۲۔

ترجمہ: "اور حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے شراب پر' شراب پینے والے پر' شراب بیچنے والے پر' شراب خریدنے والے پر' شراب کشید کرنے والے پر' شراب کشید کرانے والے پر' شراب اٹھانے والے پر' شراب اٹھوانے والے پر لعنت فرمائی ہے"۔ (ابوداؤد' ابن ماجہ)

تشریح: **قوله :لعن الله الخمر** : یعنی شراب کی ذات پر اس لئے کہ یہ ام الخبائث ہے۔ یہ مبالغۃً کہا ہے اس سے نفرت پیدا کرنے کیلئے تاہم یہ احتمال بھی ہے کہ یہاں شراب سے مراد وہ شخص ہو جو شراب کی قیمت کے طور پر حاصل ہونے والا مال کھاتا ہو۔

وشاربها وساقيها : ساقی کو مؤخر ذکر کیا یہ چونکہ شراب پینے میں اس کا رتبہ آخری ہوتا ہے۔

۲۷۷۸: وَعَنْ مُحَيِّصَةَ اَنَّهُ اسْتَاْذَنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فِيْ اُجْرَةِ الْحَجَّامِ فَنَهَاهُ فَلَمْ يَزَلْ يَسْتَاْذِنُهُ حَتّٰى قَالَ اَعْلِفْهُ نَاضِحَكَ وَاَطْعِمْهُ رَقِيْقَكَ (رواہ مالک والترمذی وابوداود وابن ماجۃ)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۷۰۷/۳ الحدیث رقم ۳۴۲۲۔ والترمذی فی ۵۷۵/۳ الحدیث رقم ۱۲۷۷۔ واحمد فی المسند ۴۳۵/۵۔

ترجمہ: "اور حضرت محیصہؓ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے پچھنے لگانے والے کی کمائی کے بارے میں کھانے کی اجازت طلب کی تو آپ ﷺ نے انہیں منع فرما دیا چنانچہ وہ آپ ﷺ سے بار بار اجازت طلب کرتے رہے تو یہاں تک کہ آپ ﷺ نے انہیں یہ حکم دیا کہ اس کمائی کا مال اپنے اونٹ کو کھلا دو یا اپنے بردہ (غلام یا لونڈی) کو کھلا دو"۔

(مالک' ترمذی' ابوداؤد' ابن ماجہ)

حالاتِ راوی:

حویصۃ۔ یہ حویصہ مسعود بن کعب انصاری حارثی کے بیٹے اور محیصہ کے بھائی ہیں۔''حویصہ'' اپنے بھائی محیصہ سے عمر میں بڑے ہیں۔لیکن اسلام ''محیصہ'' کے بعد لائے ہیں۔غزوۂ احد' غزوۂ خندق اور ان کے بعد غزوات میں شریک رہے ہیں۔محمد بن سہل وغیرہ محدثین نے ان سے روایت حدیث کی ہے۔''حویصہ'' حاء کے پیش واؤ کے زبر' یائے تحتانی مشدد مکسور اور صاد مہملہ کے ساتھ ہے۔

تشریح: امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہ نہی تنزیہی ہے' گھٹیا پیشہ کے ختم کرنے کیلئے یہ نہی فرمائی اور ومکارم اخلاق اور کمال ہمتی کی ترغیب دی' کیونکہ اگر یہ حرام ہوتا تو پھر اس میں آزاد اور غلام کا فرق نہ کرتے۔اس لئے کہ آقا کیلئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے غلام کو حرام مال کھلائے۔

فلم یزل یستأذنه : کہ اکثر صحابہ کی ملکیت میں غلاموں کی ایک بڑی تعداد تھی اور وہ ان کی کمائی کھایا کرتے تھے' اور اس کو سب زیادہ پاک کمائی شمار کرتے تھے' پس جب محیصہؓ نے اس نہی کے بارے میں سنا تو ان پر یہ بات بہت دشوار گزری۔کیونکہ اس کو پچھنے لگانے کی اجرت استعمال کرنے کی بہت ضرورت تھی' اس لئے انہوں نے بار بار آپ سے اجازت طلب کی۔

اعلفه : ہمزہ وصل کے ساتھ اور لام کے کسرے کے ساتھ' مطلب یہ ہے کہ اس کا چارہ بنادو۔

''ناضح'': اس اونٹ کو کہتے ہیں جس کے ذریعے پانی لایا جاتا ہو۔

واطعمه رقیقك : یعنی اپنے غلاموں اور لونڈیوں کو کھلانے کی اجازت مرحمت فرمائی کیونکہ لونڈی اور غلام ایسا شرف نہیں رکھتے جو اس پیشہ کی اناءت کے منافی ہو' بخلاف آزاد لوگوں کے۔آزاد لوگوں کیلئے اس کمائی کی حرمت کے بارے میں یہ حدیث ظاہر ہے' لیکن اجماع اس بات پر ہے کہ آزاد کیلئے اس کا استعمال جائز ہے' لہٰذا اس نہی کو مکروہ تنزیہی پر حمل کیا جائے گا۔(اس طرح ابن الملک نے ذکر کیا ہے۔)

۲۷۷۹: **وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ ثَمَنِ الْكَلْبِ وَ كَسْبِ الزَّمَّارَةِ .**

(رواہ فی شرح السنۃ)

اخرجه البغوی فی شرح السنة ۲۲/۸ الحدیث رقم ۲۰۳۸۔

ترجمہ:''اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کتے کی قیمت اور گانے والیوں (گلوکارہ یا بدکارہ عورت) کی کمائی (کھانے) سے منع فرمایا ہے''۔(شرح السنۃ)

حالاتِ راوی:

محیصۃ بن مسعود۔ یہ ''محیصہ'' ہیں۔مسعود کے بیٹے ہیں۔اور انصاری وحارثی ہیں۔اہل مدینہ میں شمار ہوتے ہیں۔اور ان میں ہی ان کی حدیثیں ملتی ہیں۔غزوہ احد' غزوۂ خندق اور اس کے بعد دیگر غزوات حاضر وشریک ہوئے ان سے ان کے بیٹے ''سعد'' نے روایت کی۔محیصہ میں میم پر پیش اور حاء غیر منقوطہ پر زبر اور یاء مشدد کے نیچے زیر اور صاد غیر منقوطہ پر زبر ہے۔

تشریح: قاموس میں لکھتے ہیں حویصہ اور محیصہ میں صاد مشدد ہے۔یہ دونوں مسعود کے بیٹے ہیں۔دونوں صحابی ہیں۔حافظ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ مؤطا کے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ یائے مکسورہ کے ساتھ پڑھنا زیادہ مشہور لغت ہے۔''التقریب'' میں ہے کہ ان دونوں اسماء میں یاء مشدد مکسور اور ساکن مخفف دونوں طرح پڑھنا درست ہے۔البتہ تشدید زیادہ مشہور ہے۔تصحیح شدہ متن کے نسخوں اور اصول میں بھی اسی طرح ضبط کیا گیا ہے۔

قوله :نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن ثمن الکلب و کسب الزمارة :

''الزمارۃ'' زاء کے فتحہ اور میم کے شد کے ساتھ بدکار عورت کو کہتے ہیں۔ یہ مشتق ہے: ''زمرت فلانا بکذا ای اغریته سے۔ اس لئے کہ بدکار عورت مردوں کو فحاشی کے لئے ورغلاتی ہے اور ان کو اپنے آپ پر فریفتہ کرتی ہے یا یہ مشتق ہے ''زمرت القربة ای ملأتها سے، جا کا مطلب ہے بھرنا، پس زانیہ بھی اپنے رحم کو مختلف نطفوں سے بھرتی ہے، یا اس لئے کہ وہ لوگوں کی ایک جماعت سے مباشرت کرتی ہے۔ (اسی طرح میرک نے زین العرب سے نقل کیا ہے۔)

اور اس سے ابوعبید کا وہ اعتراض بھی ختم ہو گیا جو انہوں نے اس حدیث کی تفسیر میں کیا ہے۔ ''زمارۃ'' بمعنی زانیہ ہے اور یہ میں نے اس حدیث کے علاوہ کہیں نہیں سنا ہے۔ اور مجھے نہیں معلوم کہ یہ کس چیز سے لیا گیا ہے۔

ہروی نے ازہری سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ اس میں یہ بھی احتمال ہے یہ نہی گانے والی عورت کی کمائی سے ہو۔ کہا جاتا ہے ''غناء زمیر'' ای حسن۔ اور کہا جاتا ہے ''زمر ای غنٰی اور کہا جاتا ہے: ''زمر الرجل''، جب وہ بانسری بجائے۔ اور عورت کو ''زامرۃ'' کہا جاتا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ ''زمارۃ'' سے مراد وہ عورت ہے جو بانسری بجاتی ہے اور یہ حرام ہے، اسلئے کہ بانسری بجانا شرابیوں کا شیوہ ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ''زانیہ'' کا نام ''زمارۃ'' رکھا' اس لئے کہ اس برے فعل میں مشہور پیشہ ور بدکار عورتیں عام طور پر گلوکار بھی ہوتی ہیں۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس لفظ میں صحیح یہ ہے کہ زاء معجمہ سے پہلے رائے مہملہ ہے یعنی ''رمازۃ'' ہے' وہ عورت جو ہونٹوں اور آنکھوں سے اشارہ کرتی ہے۔ اور بدکار عورتیں بھی اس طرح کرتی ہیں شاعر کہتا ہے:

رمزت الی مخافة من بعلها
من غیر ان یبدو هناك كلامها

میری طرف آنکھوں سے اشارہ کیا بوجہ شوہر سے ڈرنے کے، بغیر اس کے کہ وہاں اس کا کلام ظاہر ہو۔

۲۷۸۰: وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا تَبِیْعُوْا الْقَیْنَاتِ وَلَا تَشْتَرُوْهُنَّ وَلَا تُعَلِّمُوْهُنَّ وَثَمَنُهُنَّ حَرَامٌ وَفِیْ مِثْلِ هٰذَا اُنْزِلَتْ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْتَرِیْ لَهْوَالْحَدِیْثِ (رواہ احمد والترمذی وابن ماجة وقال الترمذی هذا حدیث غریب وعلی بن یزید الراوی ویضعف فی الحدیث وستذکر حدیث جابر) نَهٰی عَنْ اَكْلِ الْهِرِّ فِی بَابِ مَا یَحِلُّ اَكْلُهٗ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰی ۔ (احمد بن حنبل' مسند)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵۷۹/۳ الحدیث رقم ۱۲۸۲ وابن ماجه فی ۷۳۳/۲ الحدیث رقم ۲۱۶۸۔ واحمد فی المسند ۲۶۴/۵۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: گانے والی لونڈیوں کو نہ بیچو نہ ان کو خریدو اور نہ لونڈیوں کو (گانا سکھانے کی تربیت دو) اور ان (گانے والی لونڈیوں) کی قیمت حرام ہے' اور اسی سلسلہ میں (یعنی گانے والیوں کو خریدنے کی مذمت میں) یہ آیت نازل ہوئی: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْتَرِیْ لَهْوَ الْحَدِیْثِ'' یعنی اور انسانوں میں بعض ایسے (نادان وغلط کار) لوگ بھی ہیں جو بیہودہ باتیں خریدتے ہیں''۔ (احمدؒ ترمذیؒ ابن ماجہ) امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس کے ایک راوی علی بن یزید روایت حدیث کے سلسلہ میں ضعیف شمار کئے جاتے ہیں۔ ہم جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کردہ حدیث آپ ﷺ نے بلی کھانے کی ممانعت فرمائی ہے۔ باب ما یحل اکلہ میں ذکر کریں گے۔ ان شاءاللہ

تشریح: ''القینات'' : قاف کے فتحہ اور یاء کے سکون کے ساتھ۔ صحاح میں ہے کہ ''قین ''لونڈی کو کہتے ہیں چاہے گاتی ہو یا نہ گاتی ہو۔ علامہ تورپشتی فرماتے ہیں کہ حدیث میں مراد گانے والی ہے اس لئے کہ اگر وہ گانے والی نہیں ہے تو اس کی خرید وفروخت سے

منع کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

وثمنھن حرام : بعض علماء نے حدیث کے ظاہری الفاظ کے پیش نظر یہ کہا ہے کہ گانے والی لونڈیوں کو بیچنا جائز نہیں ہے۔ قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نہی مقصود ہے اس خرید وفروخت پر جو گانے کی وجہ سے ہو، اور اس کی قیمت کی حرمت اس کی بیع کے فاسد ہونے کی دلیل ہے اور جمہور نے اس کی بیع صحیح قرار دی ہے۔ اور حدیث بوجہ طعن اگرچہ ضعیف ہے لیکن اس کے باوجود اس کی تاویل یہ کی جاتی ہے کہ ان کے گانے سے حاصل ہونے والی اجرت مال حرام ہے، جیسا کہ کسی شراب بنانے والے کے ہاتھ انگور فروخت کئے جائیں تو اس سے حاصل ہونے والی اجرت مال حرام کے حکم میں ہے' اس لئے کہ یہ حرام کے حصول کی طرف پہنچاتا ہے اور مدد کرنا ہے۔ نہ اس وجہ سے کہ اس کا بیچنا صحیح نہیں ہے (انتہٰی) ابن ملک نے بھی اس کے مطابق ہی مطلب بیان کیا ہے۔

نزلت : اور ایک نسخہ میں ''انزلت'' ہے۔

ومن الناس من یشتری لھو الحدیث : اور بعض آدمی ایسے بھی ہیں جو ان باتوں کے خریدار بنتے ہیں جو غافل کرنے والی ہیں۔ یعنی خریدتے ہیں گانے، گیت اور حرام آوازیں جو ذکر اللہ سے باز رکھیں۔ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں ''لھو'' کی اضافت بمعنیٰ ''من'' بیان کیلئے ہے، جیسے ''**جبة خز وباب ساج**'' میں ہے۔ آیت کے تقدیری عبارت یوں ہے: **یشتری اللھو من الحدیث**۔ اس لئے کہ کھیل باتوں کے قبیل سے بھی ہوتا ہے اور اس کے علاوہ سے بھی اور ''الحدیث'' سے مراد بری باتیں ہیں۔ پس اس میں داخل ہیں، جھوٹی کہانیاں بے اصل باتیں اور خرافات ٹھٹھے کی باتیں گانا' موسیقی سیکھنا اور اس قسم کے دیگر فضول ولغو کلام۔

اس آیت کے نزول کا پس منظر یہ ہے کہ ایک شخص نضر بن حارث تھا جو گانے والی لونڈیاں اس مقصد سے خریدتا تھا کہ ان کے ذریعے لوگوں کو اللہ کے راستے سے گمراہ کرے اس کی مذمت میں یہ آیت نازل ہوئی۔

قاضی بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اضافت بمعنیٰ ''من'' ہے اور یہ ''من'' تبیینیہ ہے اگر ''الحدیث'' سے مراد ''المنکر'' ہو، اور تبعیضیہ ہے اگر ''الحدیث'' سے مراد عام ہو۔ کہا گیا ہے کہ نضر بن حارث نے عجمیوں کی لکھی ہوئی کتابیں خریدی تھی جن کو پڑھ کر قریش کو سنایا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ محمد، تو تمہارے سامنے قوم عاد وثمود کے قصص بیان کرتے ہیں اور میں تمہارے سامنے رستم اور اسفندیار بادشاہوں کی کہانیاں سناتا ہوں، تو اللہ نے یہ آیت اس کی مذمت میں نازل فرمائی۔

بعض کہتے ہیں وہ گانے والی لونڈیاں خریدتا تھا اور ان کو ان لوگوں کے ساتھ معاشرت پر ابھارتا تھا جو اسلام لانے کا ارادہ کرتے اور اس طرح ان کو اسلام سے روکتا [**لیضل عن سبیل اللہ**] یعنی اللہ کے دین سے یا اللہ کی کتاب کے پڑھنے سے۔ ابن کثیر ابو عمرو نے ''لیضل'' یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے تو اس صورت میں معنیٰ ہوگا تاکہ وہ اپنی گمراہی پر برقرار رہے اور گمراہی میں اور زیادہ بڑھ جائے، لیضل میں لام ''بغیر علم'' کی عاقبت کیلئے ہے۔

یعنی جو خرید رہا ہے اس کی حالت پر یا تجارت کی حالت کا علم اس کو نہ تھا، کہ اس نے قرآن پڑھنے کے مقابلے میں کھیل لیا۔ ''**ویتخذھا**'' میں ضمیر منصوب کا مرجع ''سبیل'' ہے۔

''**ھزوا**'' بمعنیٰ **سخریة** ہے۔ اور اس کا عطف ''**یشتری**'' پر ہے حمزہ، کسائی اور حفص نے لیضل پر عطف کرتے ہوئے اس کو منصوب پڑھا ہے [**اولئک لھم عذاب مھین**] [لقمان: ٦] ''ایسے لوگوں کے لئے ذلت کا عذاب ہے'' بوجہ حق کی توہین کرنے اور باطل کو حق پر ترجیح دینے کے۔

www.KitaboSunnat.com

قولہ: قال الترمذی ھذا حدیث غریب وعلی بن یزید الراوی ویضعف فی الحدیث :

یضعف : تشدید کے ساتھ ہے یعنی اس کو ضعف کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

قولہ: وسنذکر حدیث جابر: نَهٰی عَنْ اَكْلِ الْهِرِّ فِي بَابِ مَا يَحِلُّ اَكْلُهُ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰی :

یعنی حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث: ''نهى عن اكل الهر کو صاحب مصابیح نے اس باب میں ذکر کیا ہے، ہم اس حدیث کو'' باب ما يحل اكله''، میں ذکر کریں گے، اس لئے کہ وہ حدیث معنی کے اعتبار سے اس باب کے زیادہ مناسب ہے۔

الفصل الثالث :

۲۷۸۱: عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ طَلَبُ كَسْبِ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ۔

رواه البيهقى فى شعب الايمان ٦/ ٤٤٠ الحديث رقم ٨٧٤١۔

ترجمہ: ''عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا: حلال روزی کمانا فرض کے بعد ایک فرض ہے''۔ (بیہقی)

تشریح: عن عبد الله بن مسعود : ملا علی قاریؒ کے نسخہ میں صرف ''عبداللہ'' ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ عبداللہ سے مراد ابن مسعودؓ ہیں جیسا کہ ایک نسخہ میں ہے۔

كسب الحلال فريضة : یعنی کمانا اس شخص پر فرض ہے جو اپنی ذات اور اپنے اہل وعیال کی ضروریات زندگی کی کفالت کیلئے کمائی کا محتاج ہو، اور حلال کمائی سے مراد وہ روزی ہے جس کا حرام نہ ہونا یقینی ہوتا کہ یہ مال مشتبہ کو بھی شامل ہو جائے کیونکہ احادیث میں مشتبہ سے پرہیز کا حکم محض احتیاط کے طور پر ہے، فرض ہونے کے طور پر نہیں ہے، نیز اس حدیث میں جو حلال روزی کمانے کو فرض کہا گیا ہے اس کا مخاطب ہر شخص بذاتہ نہیں ہے، کیونکہ بہت سے لوگوں کی ضروریات زندگی کی کفالت دوسروں پر واجب ہوتی ہے۔

بعد الفريضة : یہ کنایہ ہے اس بات سے کہ حلال روزی کا کمانا نماز، روزہ، حج وغیرہ کی طرح فرض نہیں ہے۔ پس مطلب یہ ہوا کہ یہ فرض ہے اس عام فرض کے بعد جو ہر مکلف پر بعینہ لازم ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ فرض متعاقب ہے کہ بعض فرائض بعض کے بعد آتے ہیں اس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اس لئے کہ حلال کمائی ورع کی اصل اور تقویٰ کی بنیاد ہے۔

تخریج: اسی طرح اس حدیث کو امام طبرانی نے روایت کیا ہے، اور دیلمی نے مسند فردوس میں حضرت انسؓ سے مرفوعاً یوں روایت کیا ہے: ''طلب الحلال واجب على كل مسلم''۔

۲۷۸۲: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّهٗ سُئِلَ عَنْ اُجْرَةِ كِتَابَةِ الْمُصْحَفِ فَقَالَ لَا بَاسَ اِنَّمَا هُمْ مُصَوِّرُوْنَ وَاِنَّهُمْ اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ مِنْ عَمَلِ اَيْدِيْهِمْ ۔ (رواه رزين)

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عباسؓ کے بارے میں منقول ہے کہ ان سے کتابت قرآن کی اجرت سے متعلق حکم دریافت کیا گیا (کہ کتابت قرآن کی اجرت کھانا جائز ہے یا نہیں؟) تو انہوں نے فرمایا کہ اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ کاتب لوگ تو صرف نقش کھینچنے والے ہیں اور وہ تو اپنے ہاتھوں کی کمائی ہی کھاتے ہیں''۔ (رزین)

تشریح: قوله :عن ابن عباس انه سئل عن اجرة كتابة المصحف : یعنی کتابت قرآن کی اجرت کے لینے کے بارے میں پوچھا باوجودیکہ قرآن اللہ کی صفت قدیم ہے۔ تو انہوں نے فرمایا کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں اس لئے کہ قرآن کا اطلاق جیسے اس صفت پر ہوتا ہے اسی طرح اس کا اطلاق دو گتوں کے درمیان موجود نقوش پر بھی ہوتا ہے۔ پس وہ ان نقوش کی اجرت لیتے ہیں جو اس صفت پر دلالت کرتے ہیں۔ اسی لئے تو عبداللہ ابن عباس نے اگلی بات فرمائی کہ وہ محض حروف کے نقش بنانے والے ہیں۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ 'صورة '' ہیئت اور نقش کو کہتے ہیں اور یہاں اس سے مراد نقش ہے، اور ''انما'' مجموع پر دلالت کر رہا ہے۔ اس لئے کہ اس نے نقش کو ثابت کیا اور منقوش کی نفی کی؛ قرآن قراءۃ اور مقروء کے مجموعہ کا نام ہے، یا کتابت اور مکتوب کے مجموعہ کا نام ہے۔ پس ''مکتوب'' اور ''مقروء'' قدیم ہے، اور کتابت اور قراءۃ قدیم نہیں ہے، اس لئے کہ یہ قاری اور کاتب کے افعال ہیں، پس جب سائل نے دیکھا مقروء اور مکتوب کے معنی میں باہم تمیز کو اور اس بات کو کہ بیشک وہ دونوں انسان کی صفات میں سے ہیں، تو اس کو جائز قرار دیا۔

۲۷۸۳: وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ قَالَ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَیُّ الْكَسْبِ اَطْيَبُ قَالَ عَمَلُ الرَّجُلِ بِيَدِهٖ وَكُلُّ بَيْعٍ مَبْرُوْرٍ۔ (رواہ احمد)

اخرجه أحمد في المسند ١٤١/٤۔

ترجمہ: ''اور حضرت رافع بن خدیج راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے یہ پوچھا گیا کہ کونسی کمائی پاکیزہ ہے؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آدمی کا اپنے ہاتھ سے کام کرنا اور ہر وہ تجارت جو مقبول (یعنی شرعی اصول و قواعد کے مطابق) ہو''۔ (احمد)

تشریح: ای الکسب : یہاں مضاف محذوف ہے۔ای ای انواع الکسب یعنی اس کی انواع میں سے کونسی نوع زیادہ اچھی اور پاکیزہ ہے۔ زراعت، تجارت، کتابت، اور صنعت۔

وکل بیع مبرور : جر کے ساتھ صفت ہے ''بیع'' کی۔اور ''کل'' کا عطف ''عمل'' پر ہے۔اور مبرور سے مراد یہ ہے کہ وہ دھوکے اور خیانت سے پاک ہو، یا مراد یہ ہے کہ جو شریعت میں مقبول ہو، بایں طور کہ نہ فاسد ہو، نہ خبیث ہو یعنی ردی نہ ہو قصہ مختصر یہ کہ شرعی اصول وضوابط کے مطابق ہو۔یا مطلب یہ ہے کہ عنداللہ مقبول ہو بایں طور کہ باعث ثواب ہو۔

۲۷۸۴: وَعَنْ اَبِیْ بَكْرِ بْنِ اَبِیْ مَرْيَمَ قَالَ كَانَتْ لِمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِیْ كَرِبَ جَارِيَّةٌ تَبِيْعُ اللَّبَنَ وَيَقْبِضُ الْمِقْدَامُ ثَمَنَهٗ فَقِيْلَ لَهٗ سُبْحَانَ اللّٰهِ اَتَبِيْعُ اللَّبَنَ وَتَقْبِضُ الثَّمَنَ فَقَالَ نَعَمْ وَمَا بَاسٌ بِذٰلِكَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ لَيَاتِيَنَّ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يَنْفَعُ فِيْهِ اِلَّا الدِّيْنَارُ وَالدِّرْهَمُ۔

اخرجه احمد في المسند ١٣٣/٤۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابوبکر بن مریم (تابعی) کہتے ہیں کہ حضرت مقدام بن معدی کرب رضی اللہ عنہ (صحابی) کی ایک باندی (ان کے گھر کے جانوروں کا) دودھ بیچا کرتی تھی اور مقدام اس سے (دودھ کی حاصل ہونے والی) قیمت لے لیا کرتے تھے۔ چنانچہ (ایک روز) مقدام سے کسی نے کہا کہ سبحان اللہ! (کتنی عجیب بات ہے کہ) وہ باندی دودھ بیچتی ہے اور تم اس کی قیمت لے لیتے ہو؟ مقدام نے کہا جی ہاں! اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا جس میں درہم و دینار کے علاوہ کوئی چیز نفع نہیں دے گی''۔ (احمد)

تشریح: قیل له، سبحان الله : یہ تعجب، اور تنزیہ کے طور پر کہا۔(اور یہ آپ جیسے کی شان کے لائق نہیں ہے۔)

تبیع : ضمیر مستتر ''الجارية'' کی طرف لوٹ رہی ہے۔

اللبن...... : یعنی وہ آپ کی موجودگی میں دودھ بیچ رہی ہے اور آپ اس کے پاس چوکیدار کی طرح کھڑے ہیں۔

تقبض : فاعل اس میں مستتر ضمیر ''انت'' ہے۔

علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ہوسکتا ہے کہ حدیث میں ''تبیع'' کی نسبت لونڈی کی طرف حقیقۃً ہو (اس صورت میں مطلب یہ ہوگا) کہ کہنے والے نے لونڈی کے بیچنے اور مقدام کے اس کی قیمت کو قبضہ کرنے کو برا سمجھا۔تو یہاں اس کی نکیر اس پیشہ کے گھٹیا ہونے کے اعتبار سے ہے، یعنی آپ ایک گھٹیا لونڈی کے ایک گھٹیا کام کرنے پر راضی ہے کہ تو اس کی قیمت لیتا ہے۔اور یہ بھی جائز ہے کہ تبیع کی نسبت مقدام کی طرف ہو مجازاً اس صورت میں کہنے والی کی نکیر اس بیچنے اور ان کے قیمت وصول کرنے پر ہوگی۔

فقال نعم : یعنی بات ایسے ہی ہے۔(وما بأس : اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ چونکہ کہ اس میں شرعی اعتبار سے کوئی نقص نہیں ہے، اس لئے کہ نہ تو یہ حرام ہے اور نہ مکروہ ہے، یہ مطلب اس وقت ہوگا کہ جب ''وما بأس'' حرمت اور کراہت دونوں کی نفی کیلئے ہو، اور ''ما'' بمعنی ''لیس'' ہو، اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ بأس اس کی وجہ سے مرفوع ہو، اور ''ما'' بمعنی ''لا'' نفی جنس کے لئے نہ ہو۔

قوله : لیأتین علی الناس زمان لا ینفع فیه الا الدّینار والدرهم : یعنی مال جس کو دینار اور دراہم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس لئے کہ یہ دونوں اصل ہیں، اور مراد یہاں اس کی کمائی اور جمع کرنا ہے جس طریقے سے بھی ہو۔اس لئے کہ جب اس زمانے کے لوگوں پر دین کے اعتبار سے نقص غالب ہوگا تو وہ اہل علم وکمال کی قدر ومنزلت کی طرف متوجہ نہیں ہوں گے بلکہ مالداروں کی خدمت کریں گے، اور اہل اللہ ان سے بالکلیہ اعراض کریں گے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ مطلب اس کا یہ ہے کہ لوگوں کو صرف کمائی فائدہ دے گی اگر اس کو چھوڑ دیں تو حرام میں پڑ جائیں گے، جیسا کہ بعض علماء سے مروی ہے۔ چنانچہ کسی عالم سے کہا گیا کہ یہ کمائی تجھے دنیا کے قریب کر رہی ہے، فرمایا مجھے دنیا کے قریب نہیں کر رہی ہے بلکہ دنیا سے بچا رہی ہے اور سلف آپس میں ایک دوسرے سے کہا کرتے تھے کہ تجارت کرو اور کماؤ اس لئے کہ تم ایک ایسے زمانے میں ہو کہ جب تم سے کوئی محتاج اور تنگ دست ہوگا تو سب سے پہلے اپنے دین کو کھا جائے گا۔

اور سفیان ثوریؒ سے روایت کیا گیا ہے کہ ان کے پاس کچھ پونجی تھی وہ اس کو الٹ پلٹ رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ اگر یہ نہ ہوتی تو بنو عباس مجھے رومال بنا کر مجھ سے اپنا میل کچیل صاف کرتے۔

۲۷۸۵: وَعَنْ نَافِعٍ قَالَ كُنْتُ أُجَهِّزُ اِلَى الشَّامِ وَاِلَى مِصْرَ فَجَهَّزْتُ اِلَى الْعِرَاقِ فَاَتَيْتُ أُمَّ الْمُؤْمِنِيْنَ عَائِشَةَ فَقُلْتُ لَهَا يَا أُمَّ الْمُؤْمِنِيْنَ كُنْتُ أُجَهِّزُ اِلَى الشَّامِ فَجَهَّزْتُ اِلَى الْعِرَاقِ فَقَالَتْ لَا تَفْعَلْ مَالَكَ وَلِمَتْجَرِكَ فَاِنِّي سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ اِذَا سَبَّبَ اللّٰهُ لِاَحَدِكُمْ رِزْقًا مِنْ وَجْهٍ فَلَا يَدَعْهُ حَتّٰى يَتَغَيَّرَ لَهُ اَوْ يَتَنَكَّرَ لَهُ. (رواه احمد وابن ماجه)

اخرجه ابن ماجه في السنن ۷۲۷/۲ الحديث رقم ۲۱۴۸۔

ترجمہ: ''اور حضرت نافعؒ کہتے ہیں کہ میں (اپنی تجارت کا) مال واسباب تیار کر کے (اپنے ملازموں اور وکیلوں کی سپردگی میں) شام اور مصر بھیجا کرتا تھا' پھر بعد میں (ایک مرتبہ) میں نے اپنا تجارتی سامان عراق کی طرف بھیجنے کا ارادہ کیا۔ میں اُم المؤمنین حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے عرض کیا کہ اے اُم المؤمنین! میں (پہلے تو) اپنا تجارتی سامان شام بھیجا کرتا تھا مگر اب میرا ارادہ ہے کہ اپنا تجارتی سامان عراق بھیجنے کا ارادہ کیا۔ (یہ سن کر) حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ ایسا نہ کرو' تمہیں اور تمہاری تجارت کو کیا ہوا ہے؟ (کہ تم شام کے سلسلۂ تجارت کو منقطع کرتے ہو) میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ تم میں سے کسی کے رزق کا کوئی سبب کسی صورت میں پیدا کر دے تو اس کو چھوڑنا نہیں چاہئے یہاں تک کہ (منافع نہ ہونے کی وجہ سے) اس میں کوئی تبدیلی واقع ہو جائے یا نقصان پہنچنے لگے''۔ (احمد' ابن ماجہ)

تشریح: اجهز : ھاء کی تشدید کے ساتھ، مطلب ہے سامان تیار کرنا۔

والی مصر : دوسری مرتبہ، اور میں ان دونوں سے تجاوز نہیں کرتا تھا۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اجھز کا مفعول محذوف ہے اور تقدیری عبارت یوں ہے: كنت اجهز و كلائي ببضاعتي ومتاعي الى الشام والى مصر،

فجهزت الى العراق : یعنی اس کے سفر کی طرف مائل ہوا۔

فأتيت ام المؤمنين : اور ایک نسخہ میں '' الى ام المؤمنين'' ہے۔

عائشة، فقلت لها اجهز الى الشام : وضاحت کی وجہ سے اختصار کیا اور مصر کا ذکر نہیں کیا یا اس طرف اشارہ کرنے کیلئے کہ مصر کی طرف ان کا سامان تجارت بھیجنا قلیل نادر تھا۔

فقالت، لا تفعل : اس کا مفعول یہ محذوف ہے۔ای هذا التجهيز والتبديل۔اس لئے کہ اللہ کسی قوم کی (اچھی حالت) اس وقت تبدیل نہیں فرماتے جب تک وہ اپنی حالت کو تبدیل نہ کرے خاص کر کے جب دور کی مسافت ہو جو بری حرص پر دلالت کرتا ہے۔

لمتجرك : تجارت سے اسم مکان ہے۔(تجارت کی جگہ یا تجارت کا عمل)

یعنی کیا واقعہ پیش آیا ہے اور کیا باعث ہے تجھے تیری تجارت گاہ سے دوسری جگہ کی طرف لے جانے کا، کیا تجھے وہاں سے کوئی خسارہ ہوا ہے؟ جو تجھے تیری اس تجارت گاہ سے روک رہا ہے جہاں سے اللہ نے تجھے نفع حاصل کرنے کا عادی بنایا تھا۔ اور جب تک وہ اپنی حالت پر ہے تو اس سے عدول درست نہیں ہے۔

قوله :اذ سبب الله واحدكم رزقا من وجه : مثلاً تم میں سے کسی کی روزی کے حصول کا سبب تجارت بنایا ہے تو وہ اس سبب یا اس روزی کو نہ چھوڑے۔ جب تک یہاں سے فائدہ حاصل ہو۔

او يتنكر له یہاں ''او'' تنویع کیلئے ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ''او'' شک کیلئے ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو شخص از قسم مباح کسی اچھی چیز کو حاصل کرلے تو اس کو چاہئے کہ وہ اس کو برقرار رکھے اور بغیر کسی قوی عذر کے اسے چھوڑ کر کسی غیر کی طرف مائل نہ ہو، اس لئے کہ آدمی کیلئے وہ کام آسان کیا گیا ہے، جس کیلئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔

۲۷۸۶: وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ كَانَ لِاَبِیْ بَكْرٍ غُلَامٌ يُخَرِّجُ لَهُ الْخَرَاجَ فَكَانَ اَبُوْ بَكْرٍ يَاكُلُ مِنْ خَرَاجِهٖ فَجَاءَ يَوْمًا بِشَیْءٍ فَاَكَلَ مِنْهُ اَبُوْ بَكْرٍ فَقَالَ لَهُ الْغُلَامُ تَدْرِیْ مَا هٰذَا فَقَالَ اَبُوْ بَكْرٍ وَمَا هُوَ قَالَ كُنْتُ تَكَهَّنْتُ لِاِنْسَانٍ فِی الْجَاهِلِيَّةِ وَمَا اُحْسِنُ الْكِهَانَةَ اِلَّا اَنِّیْ خَدَعْتُهٗ فَلَقِيَنِیْ فَاَعْطَانِیْ بِذٰلِكَ فَهٰذَا الَّذِیْ اَكَلْتَ مِنْهُ قَالَتْ فَاَدْخَلَ اَبُوْبَكْرٍ يَدَهٗ فَقَاءَ كُلَّ شَیْءٍ فِیْ بَطْنِهٖ۔

اخرجه البخاری فی صحيحه ۵۷/۷۔ الحديث رقم ۳۸۴۲۔

ترجمہ: ''اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس ایک غلام تھا آپ کو خراج دیا کرتا تھا (یعنی اپنی کمائی میں سے ایک مقررہ حصہ حضرت ابوبکر ؓ کو دیا کرتا تھا) حضرت ابوبکرؓ کو دیا کرتا تھا (جیسا کہ اہل عرب کا معمول تھا کہ وہ اپنے غلاموں کو کمائی پر لگا دیتے تھے اور ان کو حاصل ہونے والی اجرت میں سے کچھ حصہ اپنے لئے مقرر کر لیتے تھے) چنانچہ حضرت ابوبکرؓ اس غلام کی لائی ہوئی چیز کو کھالیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ غلام کوئی چیز لایا جس میں سے حضرت ابوبکرؓ نے بھی کھایا' ان کے کھانے کے بعد غلام نے کہا کہ آپ جانتے بھی ہیں یہ کیا چیز ہے؟ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ (مجھے کیا معلوم) تم ہی بتاؤ یہ کیا چیز ہے؟ غلام نے کہا کہ میں ایام جاہلیت میں (یعنی حالت کفر میں) ایک شخص کے لئے کہانت کی تھی (یعنی اس غیب کی باتیں بتائی تھیں) حالانکہ میں کہانت کا فن (یعنی پوشیدہ باتیں بتانے کا فن) اچھی طرح نہیں جانتا تھا بلکہ میں نے اس کو (غلط سلط باتیں بتا کر) فریب دیا تھا (اتفاقاً آج) اس شخص سے میری ملاقات ہوگئی تو اس نے مجھے یہ چیز دی' یہ وہی چیز ہے جو آپ نے کھائی ہے۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ (یہ سنتے ہی) حضرت ابوبکرؓ نے اپنے منہ (یعنی حلق) میں ہاتھ ڈالا اور جو کچھ پیٹ میں تھا (ازراہِ احتیاط) قے کر کے سب باہر نکال دیا''۔ (بخاری)

تشریح: يخرج : راء کی تشدید کے ساتھ، نکالنا' لانا' پیش کرنا۔

له الخراج : امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ مضاف مقدر ہے۔ **ای یکسب له مال الخراج** ۔

ما هذا؟ : مشار الیہ ''شیئ ماکول'' ہے

کنت تکهنت الانسان فی الجاهلية : یعنی میں نے اس کو موہوم غیب کی خبر بتائی تھی اور ان خبروں کے دینے کی وجہ میری نسبت کہانت کی طرف کی جاتی تھی۔

وما احسن الكهانة : کاف کے فتح کے ساتھ ہے اور کسرہ کے ساتھ بھی آیا ہے۔ یہ جملہ حالیہ ہے۔

الا انی خدعته : امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ استثناء منقطع ہے۔ **ای لم أکن أحید الکهانة لکن خد عته** .یعنی مطلب یہ ہے کہ میں کہانت اچھی طرح نہیں جانتا تھا بلکہ میں نے اس کو فریب دیا ہے۔

فا عطانی بذلك : یہ بأ برائے مقابلہ ہے ای بمقابلة کھانتی یعنی اس کہانت کے بدلے مجھے یہ چیز دی، اور بعض کہتے ہیں کہ "بذلك" میں "با" زائدہ ہے۔ اس کی حرمت شدید ہونے کی وجہ سے ابوبکر نے قے کر دی۔ کہ اس میں کہانت اور فریب جمع تھے، اور امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں قے کاہن کے معاوضہ کی وجہ سے کی تھی نہ کہ فریب کی وجہ سے۔

ابن الملک فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکر کے اس فعل سے امام شافعی نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی حرام چیز کھالی ہو، یالا علمی میں کھائی ہو، اور بعد میں اسے معلوم ہوا کہ وہ چیز حرام تھی تو اس پر لازم ہے کہ فوراً قے کر کے اس چیز کو پیٹ سے نکال دے۔ (انتہیٰ)

امام غزالیؒ نے "منہاج العابدین" میں حضرت ابوبکرؓ کے اس فعل کو "ورع" قرار دیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے لکھا ہے کہ ورع کا حکم یہ ہے کہ تم کسی سے کوئی چیز اس وقت تک نہ لو جب تک کہ اس کے بارے میں پوری تحقیق نہ کر لو پھر تحقیق کے بعد یہ یقین بھی حاصل کر لو کہ اس چیز میں کسی بھی درجے کا اشتباہ نہیں ہے، اگر اس چیز کے بارے میں پوری تحقیق نہ ہو سکے تو اس چیز کو نہ لو اور اگر لے لی ہے تو واپس کر دو۔ ہم سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی روایت نقل کی گئی ہے، کہ ان کا غلام ان کے پاس دودھ لایا تو حضرت ابوبکر نے وہ پی لیا پھر غلام نے کہا، کہ میں جب آپ کے پاس کوئی چیز لاتا ہوں تو آپ اس چیز کے بارے میں مجھ سے پوچھتے ہیں، لیکن اس دودھ کے بارے میں آپ نے نہیں پوچھا؟ حضرت ابوبکر نے فرمایا، کہ کیا قصہ ہے اس کا، غلام نے کہا کہ میں زمانہ جاہلیت کے دوران ایک قوم کیلئے کہانت کرتا تھا، انہوں نے مجھے یہ دودھ دیا، تو حضرت ابوبکر نے فوراً قے کر دی، پھر حضرت ابوبکر نے فرمایا، اے اللہ میری قدرت میں تو یہ تھا باقی جو میری رگوں میں رہ گیا ہے تو اس کے معاملے میں تو ہی میرے لئے کافی ہے۔

۲۷۸۷: عَنْ اَبِیْ بَكْرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ جَسَدٌ غُذِيَ بِالْحَرَامِ ۔

اخرجه البيهقى فى شعب الايمان۔

ترجمہ: "اور حضرت ابوبکرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس بدن نے حرام مال سے پرورش پائی ہو وہ (شروع ہی میں نجات یافتہ لوگوں کے ساتھ اور بزاء بھگتے بغیر) جنت میں داخل نہیں ہوگا"۔ (بیہقی)

تشریح: **بالحرام** : اور ایک نسخہ میں بحرام ہے، یعنی الف لام کے بغیر۔

۲۷۸۸: وَعَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ اَنَّهٗ قَالَ شَرِبَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ لَبَنًا وَاَعْجَبَهٗ وَقَالَ لِلَّذِیْ سَقَاهُ مِنْ اَيْنَ لَكَ هٰذَا اللَّبَنُ فَاَخْبَرَهٗ اَنَّهٗ وَرَدَ عَلٰى مَاءٍ قَدْ سَمَّاهُ فَاِذَا نَعَمٌ مِّنْ نَعَمِ الصَّدَقَةِ وَهُمْ يَسْقُوْنَ فَحَلَبُوْا لِیْ مِنْ اَلْبَانِهَا فَجَعَلْتُهٗ فِیْ سِقَائِیْ وَهُوَ هٰذَا فَاَدْخَلَ عُمَرُ يَدَهٗ فَاسْتَقَاءَهٗ ۔

اخرجه البيهقى فى شعب الايمان ٥/٦٠ الحديث رقم ٥٧٧١۔

ترجمہ: "اور حضرت زید بن اسلم (جو حضرت عمر فاروقؓ کے آزاد کردہ غلام تھے) کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) حضرت عمر بن خطابؓ نے دودھ پیا جو ان کو خوشگوار معلوم ہوا' انہوں نے اس شخص سے پوچھا کہ جس نے دودھ لا کر پلایا تھا' کہ یہ دودھ تمہیں کہاں سے ملا؟ تو اس نے ان کو بتایا کہ وہ (یعنی میں) پانی کے ایک چشمے یا کنویں پر گیا تھا' اس نے چشمے یا کنویں کا نام بھی بتایا' وہاں زکوٰۃ کے کچھ جانور (یعنی اونٹ و بکری وغیرہ پانی پینے کے لئے آئے ہوئے) تھے اور وہ (یعنی ان جانوروں کے نگران) ان کا دودھ نکال کر لوگوں کو پلا رہے ہیں' چنانچہ انہوں نے میرے لئے بھی دودھ دوہا۔ جسے میں نے لے کر اپنی مشک میں ڈال لیا یہ وہی دودھ تھا (یہ سن کر) حضرت عمرؓ نے (اپنے حلق میں) ہاتھ ڈال کر قے کر دی (اور اس دودھ کو پیٹ سے باہر نکال دیا کیونکہ وہ زکوٰۃ کا مال تھا جو ان کے لئے جائز نہیں تھا) ان دونوں روایتوں کو بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے"۔

تشریح: **فاذا** : مفاجات کیلئے ہے۔ **نعم** :نون اور عین کے فتحہ کے ساتھ، **سقائی** : پہلے حرف کے کسرہ کے ساتھ۔

قوله :**رواهما** : ایک صحیح نسخہ میں "رواہ" ہے۔

توضیح: سید جمال الدینؒ نے لکھا ہے کہ یہ حدیث مشکوۃ کے اکثر نسخوں میں موجود نہیں ہے۔ ہمارے سماع کے مطابق یہ حدیث اس کے حاشیہ میں لکھی ہوئی ہے، اس لئے درست بات یہی ہے کہ اس حدیث کا اس باب سے حذف ہے۔ (انتہیٰ) اس لئے کہ بعینہٖ یہ حدیث ''کتاب الزکوۃ'' میں گزری ہے، اور اس وجہ سے بھی کہ امام طیبیؒ نے اس حدیث کو اس فصل کی احادیث میں شمار نہیں کیا ہے، بلکہ حدیث عائشہ کو چھٹی، حدیث ابی بکر کو ساتویں، اور حدیث ابن عمر کو آٹھویں حدیث کے طور پر ذکر کیا ہے۔ پس جب اس کا حذف کرنا زیادہ صحیح ہے۔ تو وہ نسخہ زیادہ صحیح ہے جس میں رواہ البیھقی لکھا ہے۔

۲۷۸۹: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ مَنِ اشْتَرٰی ثَوْبًا بِعَشْرَةِ دَرَاهِمَ وَفِيْهِ دِرْهَمٌ حَرَامٌ لَمْ يَقْبَلِ اللّٰهُ تَعَالٰی لَهٗ صَلَاةً مَا دَامَ عَلَيْهِ ثُمَّ اَدْخَلَ اِصْبَعَيْهِ فِيْ اُذُنَيْهِ وَقَالَ صُمَّتَا اِنْ لَمْ يَكُنِ النَّبِيُّ ﷺ سَمِعْتُهٗ يَقُوْلُهٗ۔

(رواه احمد والبيهقى فى شعب الا يمان وقال اسناده ضعيف)

اخرجه البيهقى فى شعب الايمان ۱۴۲/۵ الحديث رقم ۶۱۱۴۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ جس شخص نے مثلاً ایک کپڑا دس درہم میں خریدا اور ان میں ایک درہم بھی حرام مال کا شامل ہوگیا تو اللہ تعالیٰ اس وقت تک اس شخص کی نماز قبول نہیں فرمائے گا جب تک کہ آدمی کے جسم پر وہ کپڑا ہوگا۔ اس کے بعد حضرت ابن عمرؓ نے اپنی (شہادت کی) دونوں انگلیاں اپنے کانوں میں ڈالیں اور کہا کہ اگر اس نے یہ حدیث رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے نہ سنی ہو تو یہ دونوں کان بہرے ہو جائیں۔ (احمد' بیہقیؒ) اور بیہقیؒ نے کہا ہے کہ اس حدیث کی اسناد ضعیف ہے''۔

تشریح: **لم يقبل الله تعالٰى له صلاة**: اس کو نماز کا کامل ثواب نہیں ملے گا، اگرچہ اصل ثواب مل جائے گا، باقی نفس نماز بغیر کسی کلام کے صحیح ہو جائے گی۔ (اس کو ابن الملک نے ذکر کیا ہے۔) امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ظاہر تو یہی ہے کہ وہ صحیح نہ ہو لیکن مطلب یہ ہے کہ اللہ اس کیلئے مقبول نماز نہیں لکھتے باوجودیکہ وہ نماز جائز ہو جائے گی، اور قضاء کو ساقط کردے گی، جیسے مغصوبہ گھر میں نماز کا حکم ہے۔ (انتہیٰ) اور یہی زیادہ ظاہر ہے اللہ کے اس ارشاد کی بنیاد پر: ﴿انما يتقبل الله من المتقين﴾ [المائدة۔ ۲۷] ''اللہ تعالیٰ متقیوں ہی کا عمل قبول کرتے ہیں'' اور ثواب قبولیت پر مرتب ہوتا ہے، جیسا کہ نماز کی صحت، شرائط اور ارکان کے حصول پر مرتب ہوتی ہے، اور اہل سنت والجماعت کے ہاں صحت طاعات کیلئے تقویٰ شرط نہیں ہے۔

فى اذانيه: اک نسخہ میں ''اذنيه'' ہے ضمتین اور سکون ثانی کے ساتھ دونوں طرح درست ہے۔

صمتا: صاد مہملہ کے ضمہ اور میم کے شد کے ساتھ، اور ایک نسخہ میں صاد مہملہ کے فتحہ کے ساتھ ہے، اور ضمیر ''اذنيه'' کی طرف لوٹ رہی ہے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ صاد کے فتحہ کے ساتھ زیادہ ظاہر ہے، اگرچہ ضمہ کے ساتھ بھی صحیح ہے، پس معنی ہوگا ''سدتا'' کہ بند ہو جائیں یہ ماخوذ ہے ''صمت القارورة'' بمعنیٰ ''سددتها'' (میں نے شیشے کی بوتل بند کی) یہ اپنے کانوں کیلئے بددعا ہے۔ اور یہ اپنے سماع کے ثابت کرنے کے لئے تاکید اور تقدیر کے طور پر کہا ہے عرب کی عادت کے مطابق' کہ وہ کہتے ہیں. **سمعته باذنى** (انتہیٰ)۔

(ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں) کہ یہ ان کے قول کی نظیر ہے نہ کہ مثل ہے، پس غور فرمالیجئے۔

قوله: ان لم يكن النبى صلى الله عليه وسلم سمعته يقوله: امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''کان'' کا اسم ''النبى'' ہے اور خبر ''سمعته'' ہے جیسے ''زيد ضربته'' اور ''زيد انطلق ابوه'' میں ہے اور یہ اسناد سببی میں سے ہے، اس لئے کہ خبر کا اسناد مبتدا کے متعلق کی طرف ہے یا جواب شرط محذوف ہے، اور ماقبل کا کلام ''صمتا'' اس پر دلالت کر رہا ہے۔ اور یہ زیادہ بلیغ ہے اس سے کہ وہ یوں کہتے ''ان لم اكن سمعت النبى ﷺ يقول۔

ابن جنیؒ فرماتے ہیں کہ وہ (یعنی علمائے نحاۃ) کہتے ہیں ''زيد ضربته'' زیادہ بلیغ ہے بنسبت ''ضربت زيداً'' کے۔ اس لئے کہ انہوں نے مفعول کو مقدم کیا ہے، اس لئے کہ یہاں فاعل کا ذکر کرنا مقصد نہیں ہے بلکہ مفعول کا ذکر کرنا مقصود ہے، پس مفعول کو مقدم کیا

پھر اسی پر قناعت نہیں کیا، یہاں تک کہ اس کو لفظ کے فضلہ ہونے سے بھی زائل کیا اور لفظ اس کو جملے میں عمدہ بنایا۔ پس اس کو رفع دیا مبتدا ہونے کی وجہ سے اور ''ضربته'' کو اس کا آخری حصہ بنایا اور فضلہ بنایا جو اس کے ساتھ ملحق ہے۔ (انتہی کلامہ)

اسی طرح حدیث میں مقصود اس قول کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ہونا ہے اور یہی مہتم بالشان ہے، اور ابن عمر کا سماع اس کے تابع ہے، اور اس کا عکس ہوتا اگر وہ یوں کہتے: سمعت النبی ﷺ یقوله

اسنادی حیثیت: امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کی سند ضعیف ہے۔

بَابُ الْمُسَاهَلَةِ فِي الْمُعَامَلَةِ

معاملات میں نرمی کرنے کا بیان

الفصل الاول:

۲۷۹۰: عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم رَحِمَ اللّٰهُ رَجُلاً سَمْحًا اِذَا بَا عَ وَاِذَا اشْتَرٰی وَاِذَا اقْتَضٰی

(رواہ البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۰۶/٤ الحدیث رقم ۲۰۷٦۔ وابن ماجه فی السنن ۷٤۲/۲ الحدیث رقم ۲۲۰۳۔

ترجمہ: ''حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ اس شخص پر اپنی رحمت نازل فرمائے جو بیچتے' خریدتے اور تقاضا کرتے وقت نرمی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ (بخاری)

تشریح: قوله: رحم الله: یہ دعا ہے یا خبر ہے۔ رجلا: شخص کے معنی میں ہے۔

سمحًا: پہلے حرف کے فتحہ اور دوسرے کے سکون کے ساتھ، مراد وہ نرم اور سخی شخص ہے جو اپنا بعض حق چھوڑ دیتا ہے۔

اذا باع واذا اشترٰی، واذا اقتضٰی: یعنی جب وہ مقروض سے ہے مانگتا ہے اپنا قرض، تو نرمی اور آسانی کے ساتھ طلب کرتا ہے، سختی اور تندی کے مظاہرہ نہیں کرتا۔

تخریج: امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ ''الجامع الصغیر'' میں لکھتے ہیں: اس حدیث کو امام بخاری اور ابن ماجہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: ''رحم الله عبدا سمحًا' اذا اشترٰی سمحًا 'اذا اقضٰی سمحًا اذا اقتضٰی''۔

۲۷۹۱: وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اِنَّ رَجُلاً كَا نَ فِيْمَنْ كَا نَ قَبْلَكُمْ اَتَاهُ الْمَلَكُ لِيَقْبِضَ رُوْحَهُ فَقِيْلَ لَهُ هَلْ عَمِلْتَ مِنْ خَيْرٍ قَالَ مَا اَعْلَمُ قِيْلَ لَهُ اُنْظُرْ قَالَ مَا اَعْلَمُ شَيْئًا غَيْرَ اَنِّي كُنْتُ اُ بَايِعُ النَّاسَ فِي الدُّنْيَا وَاُجَا زِيْهِمْ فَاُنْظِرُ الْمُوْسِرَ وَاَتَجَاوَزُ عَنِ الْمُعْسِرِ فَاَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ. (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤۹٤/٦ الحدیث رقم ۳٤۵۱۔ ومسلم فی ۱۱۹٤/۳ الحدیث رقم (۲٦۔ ۱۵٦۰)۔ والدارمی فی ۳۲٤/۲ الحدیث رقم ۲۵٤٦۔ واحمد فی المسند ۳۹۵/۵۔

ترجمہ: ''اور حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں (یعنی گزشتہ امتوں) میں سے ایک شخص کا واقعہ ہے کہ جب اس کے پاس موت کا فرشتہ اس کی روح قبض کرنے آیا تو اس سے پوچھا گیا کہ کیا تو نے کوئی نیک کام کیا ہے؟ اس نے کہا مجھے یاد نہیں ہے (کہ میں نے کوئی نیک کام کیا ہو) اس سے پھر پوچھا گیا کہ اچھی طرح سوچ لے۔ اس نے کہا کہ مجھے قطعاً یاد نہیں آ رہا ہے سوائے اس عمل کے کہ میں دنیا میں جب لوگوں سے (خرید و فروخت کے) معاملات کیا کرتا تھا تو

تقاضا کے وقت (یعنی مطالبات کی وصولی میں) ان پر احسان کیا کرتا تھا بایں طور کہ میں مالدار شخص کو تو مہلت دے دیتا تھا اور جو نادار ہوتے ان کو معاف کر دیتا تھا (یعنی اپنے مطالبات کا کوئی حصہ یا پورا مطالبہ ان کے لئے معاف کر دیتا تھا) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے (اس کے اسی عمل سے خوش ہو کر) اس کو جنت میں داخل فرما دیا''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله : كان فيمن قبلكم : صدر صلہ کے حذف کے ساتھ ہے، اور تصحیح شدہ نسخہ میں ''فيمن كان قبلكم'' ہے اصل کے مطابق' اس لئے کہ صلہ صرف جملہ ہی ہوا کرتا ہے۔

اتاه ملك خود عزرائیل علیہ الصلوٰۃ السلام یا ان کے ماتحت بعض فرشتے آئے' اس بارے میں جو احادیث میں ظاہری طور پر تعارض ہے اس کی تطبیق یوں ہے کہ مقدمات (یعنی روح قبض کرنے) کی ذمہ داری کبھی خود عزرائیل علیہ الصلوٰۃ السلام پوری کرتے ہیں اور کبھی ان کے ماتحت فرشتے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ ارواح عزرائیلؑ ہی قبض کرتے ہیں، پھر ان کے قبض کرنے کے بعد رحمت یا عذاب کے فرشتے ان سے لے لیتے ہیں' اور یہی مطلب اللہ کے اس فرمان کا ہے: ﴿قل يتوفكم ملك الموت الذى وكل بكم﴾ [السجدة۔ ۱۱] آپ فرما دیجئے کہ تمہاری جان موت کا فرشتہ قبض کرتا ہے جو تم پر متعین ہے۔

اور حقیقت میں روح قبض کرنے والا اور موت طاری کرنے والا تو اللہ تعالیٰ ہے جو معبود برحق ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہی مطلب ہے اس آیت کا: ﴿الله يتوفى الانفس حين موتها﴾ [الزمر: ٤] اللہ تعالیٰ قبض کرتا ہے، جانوں کو انکی موت کے وقت۔

قوله : فقيل له : یعنی اللہ پاک نے خود اس سے کہا یا بعض فرشتوں نے پوچھا، اور یہ قول بھی بعید نہیں ہے یہ بعض لوگوں نے اس سے پوچھا ہو اور زیادہ واضح بات تو یہ ہے کہ اس شخص سے یہ سوال روح قبض کرنے سے پہلے کیا گیا تھا، جیسا کہ حدیث کے ابتدائی الفاظ سے مفہوم ہوتا ہے، اور شیخ مظہر کہتے ہیں کہ یہ سوال اس سے قبر میں کیا گیا تھا۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ سوال قیامت میں ہو۔

هل عملت من شى :اور ایک نسخہ میں ''لام'' کی تقدیم کے ساتھ ہے یعنی ''هل علمت من خير عملت به''

فانظر الموسر : انظار سے ہے اس کا معنی ہے مالدار کو مہلت دینا۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں تنگ دست کو مہلت دینے اور اس سے اپنے حق کو معاف کرنے تھوڑا ہو یا زیادہ ہو' کی فضیلت کا بیان ہے، اور مال دار سے تقاضا کے وقت مسامحت سے کام لینے کی فضیلت ہے، اور اس میں یہ بھی ہے کہ خیر اور بھلائی کے کام کو حقیر نہیں سمجھنا چاہئے، ہوسکتا ہے کہ وہ نیک بختی اور رحمت کا سبب بن جائے۔

۲۷۹۲: وفى رواية لمسلم نحوه عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ وَاَبِىْ مَسْعُوْدِ الْاَنْصَارِىِّ فَقَالَ اللّٰهُ اَنَا اَحَقُّ بِذَا مِنْكَ تَجَاوَزُوْا عَنْ عَبْدِىْ .

اخرجه مسلم فى صحيحه ١١٩٥/٣ الحديث رقم (٢٦۔ ١٥٦٠)۔ واحمد فى المسند ١١٨/٤۔

ترجمہ: اور مسلم کی ایک اور روایت میں جو عقبہ بن عامرؓ اور ابو مسعود انصاریؓ نے اسی کے مثل (یعنی کچھ الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ) نقل کی ہے' یہ الفاظ ہیں کہ (جب اس شخص نے اپنا یہ عمل بیان کیا) تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میں اس کا (یعنی معاف کرنے کا) تجھ سے زیادہ حقدار ہوں (اور پھر فرشتوں سے کہا کہ) میرے اس بندہ سے درگزر کرو''۔

تشریح: عن عقبة بن عامر وابى مسعود الانصارى :

توضیح : شیخ جزریؒ فرماتے ہیں کہ میں کہتا ہوں اس حدیث کو ''مسلم'' نے موقوف روایت کیا ہے حضرت حذیفہ پر، اور مرفوع روایت کیا ہے عقبہ ابن عامر اور ابو مسعود انصاری سے جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے۔ لیکن یہ وہم ہے امام دارقطنی اور دیگر حفاظ حدیث نے اس پر تنبیہ کی ہے۔ صحیح یہ ہے کہ عقبہ ابن عامر کی اس باب میں کوئی روایت نہیں ہے اور حفاظ حدیث کا کہنا ہے کہ یہ حدیث صرف ابو مسعود عقبہ بن عمر انصاری سے محفوظ ہے، اور شاید یہ (اوپر والی بات) کاتبوں کا تصرف ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ (ذکرہ میرک شاہ)

فقال انا احق بذا : اور ایک نسخہ میں ''بذلك'' ہے

تجاوز وا عن عبدی : (اس اسلوب میں اشارہ ہے کہ) میری صفت سے موصوف ہے اور میرے اخلاق سے آراستہ ہے، جیسا کہ اضافت تشریفیہ سے معلوم ہو رہا ہے۔

۲۷۹۳: وَعَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِیَّاکُمْ وَکَثْرَةَ الْحَلَفِ فِی الْبَیْعِ فَاِنَّهٗ یُنَفِّقُ ثُمَّ یَمْحَقُ.

(رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحح ۱۲۲۸/۳ الحدیث رقم (۱۳۲۔ ۱۶۰۷)۔ وابن ماجه فی السنن ۷۴۵/۲ الحدیث رقم ۲۲۰۹۔ واحمد فی المسند ۱۱۸/٤۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابوقتادہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تجارت میں زیادہ قسمیں کھانے سے بچو کیونکہ اس سے تجارت کو فروغ تو ملتا ہے لیکن پھر وہ ختم ہو جاتی ہے۔ (مسلمؒ)

تشریح: **قوله :اياكم و كثرة الحلف فی البیع** : یعنی زیادہ قسمیں کھانے سے بچو اگرچہ تم اس میں سچے کیوں نہ ہو، اس لئے کہ زیادہ قسموں کی وجہ سے کبھی وہ جھوٹی قسموں میں پڑ جاتا ہے۔ اسی وجہ سے حدیث میں وارد ہے . ''**كفٰی بالمرء كذباً ان يحدث بكل ما سمع**'' کہ آدمی کے جھوٹا ہونے کیلئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی ہوئی بات کو آگے بیان کردے، اور اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے: ''**الراعی حول حمی**'' یہاں قسموں کو کثرت کے ساتھ مقید کرنا احتراز ہے قلت سے اس لئے کہ قلیل یعنی کبھی کبھار قسم کی ضرورت پڑتی ہے لہٰذا وہ اس وعید کے تحت داخل نہیں ہے، اور اس وجہ سے بعض طرق میں یوں آیا ہے **رجل جعل الله بضا عته لایشتری الا بیمینه و لا یبیع الا بیمینه** کہ ایک آدمی ہے جس کی پونجی کو اللہ نے اس طرح بنایا ہے کہ وہ جب خریدتا ہے تو بھی اللہ کے قسم کے ساتھ اور فروخت کرتا ہے تو بھی اس کی قسم کے ساتھ۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''**ایاکم**''، منصوب ہے بنا بر تخدیر، تو مطلب اس کا یہ ہوگا کہ اپنے آپ کو زیادہ قسموں سے بچاؤ اور زیادہ قسموں کو اپنے آپ سے بچاؤ۔ مکرر ذکر کیا تاکید کیلئے اور نفرت پیدا کرنے کیلئے، اور یہاں زیادہ قسموں کے کھانے سے منع کرنا کم قسموں کے جائز ہونے پر دلالت نہیں کرتا اس لئے کہ یہاں ممانعت بازار والوں کے بارے میں وارد ہوئی ہے اور ان کی عادت زیادہ قسمیں کھانے کی ہوتی ہے۔ جیسے کہ اللہ کے اس فرمان میں وارد ہے: ﴿**لا تأكلوا الربا اضعافا مضاعفة**﴾

صحیح یہ ہے کہ اس میں کم قسموں کے کھانے کا جواز ہے بشرطیکہ وہ سچ ہو اور اس پر اجماع ہے۔

ینفق : فاء مکسورہ کی تشدید کے ساتھ اور ایک نسخہ میں تخفیف کے ساتھ ہے۔ سید جمال الدینؒ نے زین العرب سے اس کی شرح میں نقل کیا ہے کہ شارح کہتے ہیں کہ **ینفق**، **تنفیق** سے ہے بمعنی تدریج، نہ کہ ''**انفاق**'' سے ہے اور شارح نے پہلی لغت کو بیان کیا ہے اس روایت کے مطابق جس میں یاء کے ضمہ نون کے سکون اور فا کی تخفیف کے ساتھ وارد ہوا ہے۔ یعنی سامان کو رواج دیتا ہے اور اس میں رغبت کو زیادہ کرتا ہے۔

یمحق : پہلے فتح ہے پھر سکون پھر فتحہ ہے، اور ''**ثم**'' تراخی فی الزمان کیلئے ہے۔ یعنی وقتی طور پر تو اس کو رواج دیتا ہے لیکن مستقبل میں اس کو مٹا دیتا ہے، جیسا کہ عبداللہ ابن مسعود اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ﴿**یمحق الله الربا**﴾ [البقرة۔۲۷۶] (اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں) اگرچہ وہ زیادہ ہو یا کم ہو یا جس حالت میں ہو، یعنی اس کا مٹانا زیادہ بلیغ اور قوی ہے، اور مٹانے سے مراد دینی اور دنیوی اعتبار سے اس کے فائدے کا نہ ہونا ہے۔

۲۷۹۴: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ الْحَلِفُ مَنْفَقَةٌ لِلسِّلْعَةِ مُمْحَقَةٌ لِلْبَرَکَةِ

(متفق علیه)

اخرجه البخاری ٣١٥/٤۔ الحدیث رقم ٢٠٨٧ ومسلم فی ١٢٢٨/٣ الحدیث رقم (١٣١۔ ١٦٠٦) وابوداؤد فی السنن ٦٣٠/٣ الحدیث رقم ٣٣٣٥۔ والنسائی فی ٢٤٦/٧ الحدیث رقم ٤٤٦١۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ قسم (شروع میں تو) مال و اسباب کو رواج دیتی ہے لیکن (انجام کار) برکت کے خاتمے کا سبب بن جاتی ہے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: یقول : ''الحلف'' :اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں (۱) قسم کی زیادتی (۲) جھوٹی قسم،

منفقة : پہلے اور تیسرے حرف کے فتحہ اور دوسرے کے سکون کے ساتھ ہے اور یہی ضبط حرکات ''ممحقة'' کا ہے۔ (اس کو ذکر کیا ہے میرک نے۔)

للسعلة : سین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ یعنی قسم کھانے والے کے گمان میں یہ قسم سامان کو رواج دینے کا سبب ہے۔

قوله :ممحقة للبركة : یعنی کمائی کی برکت ختم ہو جانے کا سبب بن جاتی ہے۔ بایں طور کہ مال تلف ہو جاتا ہے، یا ایسی جگہ میں خرچ ہو جاتا ہے جس کا کوئی فائدہ نہ تو اسے دنیا میں حاصل ہوتا ہے اور نہ اخروی طور پر اسے کچھ اجر و ثواب ملتا ہے۔ یا وہ اس کے پاس باقی رہتا ہے مگر وہ اس کی منفعت سے محروم ہوتا ہے۔ یا ایسا شخص اس کا وارث بن جاتا ہے جو اس کی کوئی اچھائی ہی بیان نہیں کرتا۔ اور میم کے ضمہ اور تیسرے حرف کے کسرہ کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے۔

۲۷۹۵: وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ ثَلَاثَةٌ لَا یُکَلِّمُھُمُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْھِمْ وَلَا یُزَکِّیْھِمْ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ قَالَ اَبُوْذَرٍّ خَابُوْا وَخَسِرُوْا مَنْ ھُمْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ الْمُسْبِلُ وَالْمَنَّانُ وَالْمُنَفِّقُ سِلْعَتَہٗ بِالْحَلْفِ الْکَاذِبِ. (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحح ١٠٢/١ الحدیث رقم (١٧١۔ ١٠٦)۔ والنسائی فی السنن ٢٤٥/٧ الحدیث رقم ٤٤٥٨۔ وابن ماجه ٧٤٤/٢ الحدیث رقم ٢٢٠٨۔ والدارمی فی ٣٤٥/٢ الحدیث رقم ٢٦٠٥۔ واحمد فی المسند ١٥٨/٥۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابوذرؓ نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تین شخص ہیں کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ تو ان سے (مہربانی وعنایت کا) کلام کرے گا نہ (بنظر رحمت وعنایت) ان کی طرف دیکھے گا اور نہ ان کو (گناہوں سے) پاک کرے گا اور ان تینوں کے لئے دردناک عذاب ہے۔ ابوذرؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! وہ تو ناکام و نامراد ہو گئے۔ وہ کون لوگ ہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک تو پائنچے (ٹخنوں سے نیچے) لٹکانے والا' دوسرا (کسی کو کوئی چیز دے کر) احسان جتلانے والا اور تیسرا جھوٹی قسمیں کھا کر اپنی تجارت بڑھانے والا''۔ (مسلم)

تشریح: ثلثة :اس کی تمیز محذوف ہے۔ ای ثلاثه اشخاص ۔

ولا یزکیھم : یعنی نہ تو ان کے نیک اعمال بڑھائے گا اور نہ ان کو گناہوں سے پاک کرے گا۔

وخسرو : یعنی اپنے نفس اور اہل وعیال کے اعتبار سے ٹوٹے میں ہیں۔

قال المسبل : یعنی اپنی ازار کو ٹخنوں سے نیچے لٹکانے والا اور شلوار کو زمین کی طرف دراز کرنے والا، تکبر کے طور پر،

المنان : اس سے مراد وہ شخص ہے جو چیز احسان کے طور پر دیتا ہے جیسا کہ ایک روایت میں ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ مراد وہ شخص ہے جو دینے کے بعد دوسروں کے سامنے احسان جتاتا ہے اگر چہ ایک کے سامنے ہی کیوں نہ ہو، لہٰذا اس میں مبالغہ شرط نہیں ہے، مثلاً وہ یوں کہے میں نے فلاں کو یہ چیز دی ہے اور حال یہ ہے کہ فلاں اس بات کو ناپسند کرتا ہے۔ (انتہیٰ)

پس یہ اس منت اور احسان میں سے ہے جس میں اچھائی جتائی جاتی ہے، اگر یہ احسان جتانا کسی صدقہ میں ہو تو اس کے ثواب کو باطل کر دیتا ہے اور اگر کسی اچھائی میں ہو تو اس اچھائی اور بھلائی میں کدورت پیدا کر دیتا ہے۔

والمنفق : ہمارے اصول نسخ میں تشدید کے ساتھ ہے۔ اور امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں تخفیف کے ساتھ ہے، بمعنی روّج ہے، یہ مشتری کو کہتا ہے کہ بخدا یہ میں نے سو دینار کی خریدی ہے اور تاکہ مشتری یہ گمان کرلے کہ یہ سامان سو دینار کا ہے یا اس سے زیادہ کا ہے، پس وہ اس سامان کے خریدنے کی طرف مائل ہوجاتا ہے۔

الفصل الثانی :

۲۷۹۶: عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِیْنُ مَعَ النَّبِیِّیْنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَاءِ . (رواہ الترمذی والدارمی والدارقطنی)

اخرجہ الترمذی فی السنن ۵۱۵/۳ الحدیث رقم ۱۲۰۹۔ والدارمی فی ۳۲۲/۲ الحدیث رقم ۲۵۳۹۔

ترجمہ: ''حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (قول وفعل میں) سچا اور امانتدار تاجر (قیامت کے دن) انبیاء کرام صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔ (ترمذی، دارمی، دارقطنی)

تشریح: التاجر : یعنی جو خرید وفروخت اور تجارت میں مشغول ہو جس طریقے سے بھی ہو، اور پہلے گزرا ہے کہ سب سے بہتر تجارت کپڑے کی تجارت ہے اس کے بعد عطاری ہے،۔

الصدوق : وہ شخص جو قول وفعل میں زیادہ سچا ہو۔

الامین : جو صفت امانت کے ساتھ موصوف ہو اور خیانت اور بد دیانتی سے محفوظ ہو۔

صدوق اور امین دونوں صیغے مبالغہ کے ہیں، پس جو شخص ان دو صفات کے ساتھ متصف ہوگیا وہ تمام صفات کمالیہ سے متصف ہوگیا، پس وہ مستحق ہے کہ اس کا حشر ان معزز ہستیوں کے ساتھ ہو یا وہ جنت میں ان کے ساتھ ہو۔

مع النبیین : بوجہ ان کی فرمانبرداری کرنے کے، والصدیقین : ان کے ساتھ ان کے خاص وصف صدق میں موافقت کی وجہ سے، والشہداء : بوجہ ان کے صفت صدق اور امانت پر گواہی دینے کے۔

۲۷۹۷: ورواہ ابن ماجۃ عَنِ ابْنِ عُمَرَ وَقَالَ التِّرْمِذِیُّ وَھٰذَا حَدِیْثٌ غَرِیْبٌ.

اخرجہ ابن ماجہ فی السنن ۷۴۲/۲ الحدیث رقم ۲۱۳۹۔

ترجمہ: اور ابن ماجہؒ نے یہ روایت ابن عمرؓ سے نقل کی ہے۔ نیز ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے''۔

تشریح: روایات باب : اس حدیث کو امام حاکم اور ابن ماجہ نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے : ''التاجر الامین الصدوق المسلم مع الشہداء یوم القیامۃ'' اور دیلمی نے حضرت انسؓ سے اس طرح روایت کیا ہے: ''التاجر الصدوق تحت ظل العرش یوم القیامۃ''۔

۲۷۹۸: وَعَنْ قَیْسِ بْنِ اَبِیْ غَرْزَۃَ قَالَ کُنَّا نُسَمّٰی فِیْ عَھْدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ السَّمَاسِرَۃَ فَمَرَّبِنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ فَسَمَّانَا بِاِسْمٍ ھُوَ اَحْسَنُ مِنْہُ فَقَالَ یَا مَعْشَرَ التُّجَّارِ اِنَّ الْبَیْعَ یَحْضُرُہُ اللَّغْوُ وَالْحَلْفُ فَشُوْبُوْہُ بِالصَّدَقَۃِ. (رواہ ابوداؤد والترمذی والنسائی وابن ماجۃ)

اخرجہ ابوداؤد فی السنن ۶۲۰/۳ الحدیث رقم ۳۳۲۶۔ والترمذی فی ۵۱۴/۳ الحدیث رقم ۱۲۰۸۔ والنسائی فی ۲۴۷/۷ الحدیث رقم ۴۴۶۳۔ وابن ماجہ فی ۷۲۶/۲ الحدیث رقم ۲۱۴۵۔

ترجمہ: ''اور قیس بن ابوغرزہ (جو سوداگری کرتے تھے) کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ہم تاجروں کو (یعنی سوداگروں کو) ''سماسرۃ'' (یعنی دلال) کہا جاتا تھا' چنانچہ (ایک دن کا ذکر ہے کہ) رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس سے گزرے تو

آپ ﷺ نے ہمارے طبقے کو ایک ایسا نام عطا فرمایا جو ہمارے پہلے نام سے کہیں بہتر تھا' چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے تاجروں کی جماعت! تجارت میں اکثر لغو باتیں اور (بہت زیادہ) قسم (یا کبھی کبھی جھوٹی قسم) کھانے کی صورتیں پیش آتی رہتی ہیں لہٰذا تم تجارت کے ساتھ صدقہ وخیرات کو شامل کرلیا کرو۔ (ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ)

حالاتِ راوی:

قیس بن ابی غرزة۔ نام قیس' ابوغرزہ کے بیٹے ہیں۔ خاندانی اعتبار سے ''غفاری'' ہیں۔ ان کا شمار اہل کوفہ میں ہے۔ ان سے ابووائل شقیق ابن سلمہ نے روایت کی ہے۔ ان سے صرف ایک ہی روایت مروی ہے جو تجارت کے بیان میں آئی ہے۔

تشریح: ''غرزہ'' میں غین معجمہ پر فتحہ' راء مہملہ پر فتحہ اور اس کے بعد زائے معجمہ پر فتحہ ہے۔

تسمی : مجہول کے صیغہ کے ساتھ

السماسرة : نصب کے ساتھ مفعول ثانی ہے۔ پہلے سین کے فتحہ اور دوسرے کے کسرہ کے ساتھ، صیغہ جمع ہے۔ آج کل بائع اور مشتری کے درمیان بیع کو نافذ کرنے کیلئے جو لوگ واسطہ بنے ہوئے ہوتے ہیں ان کو کہتے ہیں۔ یہ جمع ہے **سمسار** کی سمسار کسرہ کے ساتھ ہے۔ اصل میں سمسار کہتے ہیں کسی چیز کے منتظم اور محافظ کو' پھر یہ دلال کیلئے استعمال ہونے لگا، اور کبھی اس کا اطلاق قیمت لگانے والے پر بھی ہوتا ہے۔

قوله : فمربنا رسول الله صلى الله عليه وسلم فسمانا باسم وهو احسن منه : بعض حضرات کہتے ہیں کہ ''تاجر'' عرف عام میں اچھا اور اشرف سمجھا جاتا ہے **سمسار** سے اور شاید اچھا ہونے کی وجہ یہ ہو کہ اب ''سماسرۃ'' کا اطلاق ٹیکس وصول کرنے والوں پر ہوتا ہے، یا شاید اس وجہ سے کہ آپ ﷺ کے زمانہ میں اس کا اطلاق اس پر ہوتا تھا جس میں کوئی نقص ہو۔ (انتہیٰ)

سب سے بہتر سلام وہ ہے جو امام طیبی نے ذکر فرمایا ہے کہ ''تجارت'' عبارت ہے رأس المال میں تصرف کرنے سے، جو فائدے کے طلب کیلئے ہو اور ''**سمسرة**'' کا بھی یہی مطلب ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ''تجارت'' کا ذکر کئی مرتبہ قرآن میں بطور مدح کیا ہے، (۱) ﴿**هل ادلكم على تجارة تنجيكم**﴾[الصف۔۱۰] (اے ایمان والو! کیا میں تم کو ایسی سوداگری بتلاؤں جو تمہیں نجات دے) (۲) ﴿**تجارة عن تراض**﴾[النساء۲۹] (۳) ﴿**تجارة لن تبور**﴾[فاطر۔۲۹] (ایسی تجارت جو کبھی ماند نہ ہوگی)، (انتہیٰ)۔

اور شاید علامہ کی مراد یہ آیت بھی ہو: ﴿**رجال لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله واقام الصلوٰة وايتاء الزكاة يخافون يوما تتقلب فيه القلوب والابصار**﴾[النور۔۳۷] (ایسے لوگ جن کو اللہ کی یاد سے اور نماز پڑھنے سے اور زکوۃ دینے سے نہ خرید غفلت میں ڈالے پاتی ہے اور نہ فروخت، وہ ایسے دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں بہت سے دل اور بہت سی آنکھیں الٹ جائیں گی)۔

اس نام کے ساتھ ان کو تنبیہ مقصود ہے کہ وہ ان صفات کے ساتھ خصوصیت سے متصف ہوں، اور اس نام میں اشارہ ہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرف: ﴿**ان الله اشترى من المؤمنين انفسهم واموالهم بان لهم الجنة**﴾[التوبة] (بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مال کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی)۔

قوله : فقال يا معشر التجار ان البيع يحضره اللغو ''لغو'' بے فائدہ کلام کو کہا جاتا ہے اور بعض کہتے ہیں وہ باتیں بغیر کسی غور وفکر کے کہی جائیں لغو کلام کے قائم مقام ہوتی ہیں۔ ''لغو''۔ چڑیا کی آواز کو کہا جاتا ہے، اس کو ذکر کیا ہے امام طیبیؒ نے)، اور ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد وہ کلام ہے جو لایعنی ہو، جس کے تحت کوئی فائدہ نہ ہو، اور جس کا کوئی دینی یا دنیوی فائدہ نہ ہو، اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿**والذين هم عن اللغو معرضون**﴾ (اور جو لغو باتوں سے برکنار رہنے والے ہیں)۔ اور کبھی اس کا اطلاق قول قبیح پر بھی ہوتا ہے جیسے گالی وغیرہ اور اسی سے اللہ کا یہ قول ہے: ﴿**واذا سمعوا اللغو اعرضوا عنه**﴾ (اور جب کوئی لغو بات سنتے ہیں تو اس کو

ٹال جاتے ہیں)۔اور باطل کام پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے،اور اس سے اللہ کا یہ قول ہے:﴿واذا مروا باللغو مروا کراما﴾(اور اگر بے ہودہ مشغلوں کے پاس کو ہو کر گزریں تو سنجیدگی کے ساتھ گزر جاتے ہیں)۔

(فشوبوه : شین کے ضمہ کے ساتھ :اس لئے کہ یہ اللہ کے غصے کو بجھا دیتا ہے،اور بیشک نیکیاں برائیوں کو مٹاتی ہیں اسی طرح کہا گیا ہے،اور اس میں اشارہ ہے اللہ کے اس فرمان کی طرف:﴿و آخرون اعترفوا بذنوبهم خلطوا عملا صالحا و آخر سیئا عسی الله ان یتوب علیهم ان الله غفور رحیم﴾[التوبة۔۱۰۲] (اور کچھ لوگ ہیں جو اپنی خطا مقر ہو گئے جنہوں نے ملے جلے عمل کیے تھے کچھ بھلے اور کچھ برے اللہ سے امید ہے کہ ان پر توجہ فرمادیں بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے بڑی رحمت والے ہیں)۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں گری پڑی باتوں سے اور زیادہ قسموں سے اکثر نفس میں کدورت پیدا ہو جاتی ہے، پس اس کی صفائی اور ازالے کی ضرورت پڑتی ہے،اس کدورت کی صفائی اور ازالے کیلئے صدقہ کرنے کا حکم دیا امام طیبی فرماتے ہیں کہ اس میں علامت ہے زیادہ صدقہ کرنے کی اس لئے کہ تھوڑا سا صاف پانی گدلے پانی سے گدلا پن ہی لے سکتا ہے۔(انتہیٰ)

اور قرآن میں ہے:﴿وان تك حسنة یضاعفها ویؤت من لدنه اجراً عظیما﴾[النساء ۴۰] (اور اگر نیکی ہوگی تو اس کو کئی گنا کر دینگے اور اپنے پاس سے اور اجر عظیم دینگے)

اور مشہور یہ ہے کہ تھوڑا سا صدقہ زیادہ گناہوں کو ختم کر دیتا ہے،اور مدار اصل قبولیت پر ہے اور اللہ کا فضل عقل کے تصور سے بھی زیادہ کشادہ ہے۔

۲۷۹۹:وَعَنْ عُبَیْدِ بْنِ رِفَاعَةَ عَنْ اَبِیْهِ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ التُّجَّارُ یُحْشَرُوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ فُجَّارًا اِلاَّ مَنِ اتَّقٰی وَبَرَّ وَصَدَقَ. (رواه الترمذی وابن ماجة والدارمی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵۱۵/۳ الحدیث رقم ۱۲۱۰۔ وابن ماجه فی ۷۲۶/۲ الحدیث رقم ۲۱۴۵ والدارمی فی ۳۲۲/۲ الحدیث رقم ۲۵۳۸۔ واحمد فی المسند ۴۲۸/۳۔

ترجمه:''اور حضرت عبید ابن رفاعہ (تابعی) اپنے والد محترم (حضرت رفاعہ بن رافع انصاریؓ صحابی) سے اور وہ نبی کریمؐ سے نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: قیامت کے دن تاجروں کا حشر' فاجروں (یعنی دروغ گو اور نافرمان لوگوں) کے ساتھ ہوگا' سوائے ان تاجروں کے ساتھ ہوگا' یعنی (وہ تاجر اس سے مستثنٰی ہوں گے) جنہوں نے تقویٰ و پرہیز گاری کو اختیار کیا (یعنی خیانت اور فریب دہی وغیرہ میں مبتلا نہ ہوئے) اور نیکی کی (یعنی اپنے تجارتی معاملات میں لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا یا یہ کہ عبادت خداوندی کرتے رہے) اور سچ پر قائم رہے۔(ترمذی' ابن ماجہ' دارمی)

حالاتِ راوی:

عبید اللہ بن رفاعة ۔ یہ عبید اللہ رفاعہ بن رافع کے بیٹے ہیں''عبید'' تصغیر کے ساتھ ہے۔اور''رفاعہ'' میں راء مہملہ مکسور ہے۔انصار میں سے زرقی ہیں ۔مشہور تابعی ہیں۔اپنے والد''رفاعہ'' رضی اللہ عنہ اور''اسماء بنت عمیس'' رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں اور ایک جماعت ان سے روایت کرتی ہے۔

تشریح: **التجار** : تاء کے ضمہ اور جیم کی تشدید کے ساتھ' جمع ہے''تاجر'' کی۔

فجارا : جمع ہے فاجر کی' فجور سے مشتق ہے،اور فجور کہتے ہیں ارادے سے پھرنے کو اور جھوٹا بھی فاجر ہوتا ہے بوجہ سچ سے جھوٹ کی طرف پھرنے کے۔

قاضی (عیاض) رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سوداگروں کی عادت معاملات میں دھوکہ کی ہوتی ہے اور سامان کی ترویج اور مشہوری کی خواہش ہوتی ہے جو ان کیلئے آسان ہو جھوٹی قسموں وغیرہ کے ساتھ اسی وجہ سے ان پر فجور کا حکم لگایا اور اس سے مستثنٰی ہے جو حرام سے بچا

اور اپنی قسم میں بری ہوا اور باتوں میں سچا ہوا، اور اسی مطلب کی طرف شارحین گئے ہیں اور فجور کو لغو کلام اور قسم پر محمول کیا ہے۔

۲۸۰۰: وَرَوَى الْبَيْهَقِيُّ فِي شُعَبِ الْإِيْمَانِ عَنِ الْبَرَاءِ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ۔

اخرجه الترمذی فی السنن ۳/۵۱٤ الحدیث رقم ۱۲۰۸۔

ترجمہ: اور بیہقی نے شعب الایمان میں اس روایت کو حضرت براءؓ سے نقل کیا ہے نیز امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے''۔

تشریح: وقال : اور ایک نسخہ میں (بغیر واؤ کے قال ہے۔

بَابُ الْخِيَارِ

خیار کا بیان

نہایہ میں ہے کہ یہ ''اختیار'' کا اسم ہے، اس کے معنی ہیں دو چیزوں میں سے کسی ایک اچھی چیز کا انتخاب کرنا یعنی بیع کو نافذ کرنے یا فسخ کرنے کا نام ''خیار'' ہے۔

الفصل الاول :

۲۸۰۱: عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْمُتَبَايِعَانِ كُلُّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا بِالْخِيَارِ عَلٰى صَاحِبِهٖ مَا لَمْ يَتَفَرَّقَا اِلَّا بَيْعَ الْخِيَارِ (متفق علیه وفی روایة لمسلم) اِذَا تَبَايَعَ الْمُتَبَايِعَانِ فَكُلُّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا بِالْخِيَارِ مِنْ بَيْعِهٖ مَا لَمْ يَتَفَرَّقَا اَوْ يَكُوْنَ بَيْعُهُمَا عَنْ خِيَارٍ فَاِذَا كَانَ بَيْعُهُمَا عَنْ خِيَارٍ فَقَدْ وَجَبَ وَفِيْ رِوَايَةٍ لِّلتِّرْمِذِيِّ اَلْبَيِّعَانِ بِالْخِيَارِ مَا لَمْ يَتَفَرَّقَا اَوْ يَخْتَارَا (وَفِي الْمُتَّفَقِ عَلَيْهِ) اَوْ يَقُوْلُ اَحَدُهُمَا لِصَاحِبِهٖ اخْتَرْ بَدَلَ اَوْ يَخْتَارَا۔

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤/۳۲٦۔ الحدیث رقم ۲۱۰۷۔ ومسلم فی صحیحه ۳/۱۱٦۳ الحدیث رقم ۱۵۳۱/٤۳۔ وابوداؤد فی السنن ۳/۷۳۲ الحدیث رقم ۳٤۵٤ والترمذی فی ۳/۵٤۷ الحدیث رقم ۱۲٤۵۔ والنسائی فی ۷/۲٤۸ الحدیث رقم ٤٤٦۵ وابن ماجه فی ۲/۷۳٦ الحدیث رقم ۲۱۸۱۔ ومالك فی الموطا ۲/٦۷۱ الحدیث رقم ۷۹ فی کتاب البیوع۔ واحمد فی المسند ۲/۵۲۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: خرید و فروخت کرنے والوں میں سے ہر ایک اپنے دوسرے صاحب معاملہ پر اختیار رکھتا ہے اس بات کا کہ چاہے تو وہ خرید و فروخت کے معاملے کو باقی رکھے اور چاہے تو ختم کر دے۔ جب تک کہ وہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں (یعنی جس مجلس میں وہ معاملہ طے پایا ہوگا جب وہ ختم ہو جائے گی با ایں طور کہ وہ ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے تو ان میں سے کسی کو بھی یہ اختیار حاصل نہیں رہے گا)۔ ہاں بیع خیار اس سے مستثنیٰ ہے (یعنی جس بیع میں خریدار نے اس اختیار کی شرط طے کر لی: کہ اگر میں چاہوں تو اس خریدی ہوئی چیز کو رکھوں گا اور اگر نہ چاہوں گا تو واپس کر دوں گا' اس بیع میں ایک دوسرے سے جدا ہونے کے بعد بھی اختیار باقی رہتا ہے)۔ (بخاری و مسلم) اور مسلمؒ کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ''جب دو بیع کرنے والے خرید و فروخت کا کوئی معاملہ کرتے ہیں تو ان میں سے ایک کو (معاملے کو باقی رکھنے یا فسخ کر دینے کا) اختیار حاصل ہوگا جب تک کہ وہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں یا یہ کہ ان کی خرید و فروخت کا معاملہ بشرط خیار ہوا گر وہ خیار شرط کے ساتھ کوئی تجارتی معاملہ کریں گے تو اس صورت میں (جدائی کے بعد بھی) اختیار کا حق حاصل رہے گا۔ ترمذی کی روایت میں یوں ہے کہ خرید و فروخت کرنے والے دونوں جب تک ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں انہیں اختیار حاصل ہے الا یہ کہ وہ (اپنے

تجارتی معاملے میں) خیار کی شرط طے کریں (یعنی اگر وہ اپنا تجارتی معاملہ مذکورہ بالا خیار شرط کے ساتھ طے کریں گے تو انہیں جدائی کے بعد بھی اختیار حاصل رہے گا)۔ لیکن بخاری و مسلمؒ کی ایک روایت میں (ترمذی کی اس روایت کے آخری الفاظ) **او یختار : (الا** یہ کہ وہ خیار کی شرط طے کریں) کی بجائے یہ الفاظ ہیں اِختَر کہ الا یہ کہ ان دونوں میں سے ایک اپنے دوسرے صاحب معاملہ سے یہ کہہ دے کہ اختیار کی شرط طے کرلو (اور وہ دوسرا کہہ دے کہ مجھے یہ منظور ہے)۔

تشریح: كل واحد منهما بالخيار :''**بالخيار**'' خبر ہے ''**كل واحد**'' کیلئے ،ای **كل واحد محكوم بالخيار** اور پورا جملہ خبر ہے ''**المتبايعان**'' کیلئے

اس خیار سے خیار قبول مراد ہے نہ کہ خیار مجلس، امام شافعی اور امام احمد رحمہ اللہ کے ہاں خیار مجلس مراد ہے۔

على صاحبه جار مجرور ''**الخيار**'' کے متعلق ہے۔ شرح طحاوی میں ہے کہ خیار سے مراد وہ (وقت) ہے جو بائع کے قول ''**بعتك**'' اور مشتری کے قول ''**قبلت منك**'' کے درمیان ہوتا ہے۔ (انتھی) تفصیل اس کی یہ ہے کہ جب متعاقدین میں سے کوئی ایک بیع کا ایجاب کرے تو دوسرے کو اختیار ہے چاہے بیع کو قبول کرے اور چاہے تو قبول نہ کرے، اور ایجاب کرنے والے کو اختیار ہوگا۔ اپنی بات سے رجوع کرنے کا جب تک کہ دوسرے نے قبلت نہ کہا ہو اور اختیار کی یہ صورت ثابت ہے۔

ما لم يتفرقا : یعنی گفتگو کے اعتبار سے، پس اگر گفتگو کے اعتبار سے جدا ہو گئے کہ ایک نے کہا ''**بعت**'' میں نے بیچا اور دوسرے نے کہا ''**اشتريت**'' میں نے خریدا تو اب خیار باقی نہیں رہے گا۔ اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے: ''**المتبايعان بالخيار ما لم يتفرقا عن بيعهما**'' کہ بیچنے والے اور خریدنے والے کو اختیار ہوتا ہے جب تک کہ وہ اپنی بیع سے جدا نہ ہوئے ہوں، اور یہ جو کہا گیا ہے کہ راوی حدیث حضرت عبداللہ ابن عمرؓ اس حدیث کو دوسروں سے زیادہ جاننے والے ہیں انھوں نے جدائی کو جسموں کی جدائی پر محمول کیا ہے لہٰذا جو تاویل اس کے مخالف ہے اس کو چھوڑنا متعین ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ راوی کی تاویل اس کے غیر پر حجت نہیں ہوتی، لہٰذا یہ اس احتمال کو رد نہیں کرسکتی باوجودیکہ اس کو تائید حاصل ہے: ''**ما لم يتفرقا عن بيعهما**'' والی حدیث سے، اور اس تاویل سے تمام روایات کے درمیان جمع اور تطبیق بھی ہو جاتی ہے۔

''**الا بيع الخيار**'' یہ استثناء ہے اس سے جو مفہوم ہو رہا ہے **ما لم يتفرقا** سے یعنی ہر ایک کو اختیار ہے جب تک جدا نہ ہوئے ہوں، پس اگر وہ جدا ہو گئے تو بیع لازم ہو جائے گی، سوائے اس بیع کے جس میں معاملے کے وقت تین دن یا اس سے کم کی خیار شرط لگائی ہو، تو وہ خیار شرط جدائی کے بعد بھی باقی رہے گا۔ (اسی طرح اس کو ذکر کیا ہے ابن الملک نے۔)

علامہ تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ ''**ما لم يتفرقا**'' کے مطلب کے بارے میں علماء میں اختلاف ہوا ہے، پس ایک جماعت تو اس طرف گئی ہے کہ اس سے مراد تفرق بالابدان (یعنی جسموں کی جدائی) ہے۔ انہوں نے متعاقدین کیلئے خیار مجلس کو ثابت کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ حدیث میں ان دونوں کو متعاقدین کہا ہے اس لئے کہ بیع ان اسماء مشتقہ میں سے ہے جو افعال فاعلین سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ ان کے فعل کے حصول کے بعد واقع ہوتی ہے۔ اور عقد کے بعد کوئی جدائی نہیں ہے، سوائے جسموں کے الگ ہونے کے۔

دوسرے بعض اس طرف گئے کہ جب وہ عقد کرلیں تو اب کسی کو اختیار نہیں ہوگا، سوائے ان کے جنہوں نے خیار کی شرط لگائی ہو، اور یہ کہتے ہیں کہ جدائی سے مراد گفتگو کی جدائی ہے۔ اور اس کی نظیر اللہ کا یہ ارشاد ہے: ﴿**وان يتفرقا يغن الله كلا من سعته**﴾ [النساء ۱۳۰] (اور اگر دونوں میاں بیوی جدا ہو جاویں تو اللہ تعالیٰ اپنی وسعت سے ہر ایک کو بے احتیاج کر دیگا) باقی ان کا نام متبایعین رکھنا، پس اس میں یہ بھی صحیح ہے کہ یہ بمعنیٰ ''**متساويين**'' ہو اور یہ ''**قيمة الشئى باسم ما يؤول اليه او يقرب منه**'' کے قبیل سے ہو۔

قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ یہاں استثناء مفہوم غایت سے ہے، اور معنی اس کا یہ ہے کہ بائع اور مشتری کو اختیار ہے جب تک جدا نہ ہوں، پس جب وہ جدا ہو جائیں گے تو خیار ساقط ہو جائے گا اور بیع لازم ہو جائے گی سوائے بیع خیار کے یعنی ایسی بیع جس میں خیار کی شرط

لگائی گئی ہو، اس لئے کہ اس میں اختیار کا جواز باقی رہتا ہے اس وقت کے گزرنے تک جو خیار شرط کیلئے متعین کیا گیا ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ استثناء اصل حکم سے ہے اور مطلب یہ ہے کہ متعاقدین کو اختیار ہے سوائے اس بیع میں جس میں خیار کو ساقط کیا ہو یا نفی خیار کی شرط لگائی گئی، تو اس میں خیار نہیں ہوتا تو یہاں مضاف کو حذف کیا ہے اور مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام بنایا ہے اصل میں یوں ہے: **الا بیع نفی الخیار** اور ان ہی دو احتمالات کی وجہ سے خیار مجلس کے قائلین میں نفی خیار مجلس کے صحیح ہونے کے بارے میں اختلاف پیدا ہوا ہے۔ پہلا زیادہ ظاہر ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے، **الا بیعا جری التخایر فیه**۔ یعنی سوائے اس بیع کے جس میں تخایر چلا ہو، اور اس کی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے ساتھی سے کہے، "اختر" کہ تو اختیار کر، تو وہ کہے "اخترته" میں نے اختیار کیا، پس اس صورت میں عقد لازم ہو جائے گا اور اس میں خیار ساقط ہو جائے گا، اگرچہ ابھی تک ان میں جدائی نہ ہوئی ہو۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ اس سے ظاہر ہوا کہ آنے والے قول "**او یختار**" میں "او" "**لالزمنك او تعطینی حقی** کے "او" کی طرح ہے (یعنی او بمعنی "الا ان" کے ہے) ای "**الا ان یختار**"۔

علامہ تورپشتی فرماتے ہیں "**الا بیع الخیار**" کا مطلب ان لوگوں کے ہاں جو خیار مجلس کے قائل نہیں ہیں، خیار شرط ہے۔ علامہ خطابیؒ نے اس تاویل پر نکیر کی ہے اور اس کے فاسد ہونے کی تصریح کی ہے اور کہا ہے کہ استثناء اثبات سے نفی ہوتی ہے اور نفی سے اثبات ہوتا ہے۔ اور اول اثبات الخیار ہے تو یہ جائز نہیں ہے کہ مستثنیٰ بھی اسی طرح کا اثبات ہو۔ لیکن علامہ خطابی سے یہ بات گویا بغیر غور وفکر کے صادر ہوئی ہے اس لئے کہ "**ما لم یتفرقا**" میں واضح دلیل ہے وجوب بیع کے بعد نفی خیار کی، لہٰذا یہاں استثناء معنی منفی سے واقع ہوا ہے۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ یہی حق ہے اس لئے کہ کلام آخری جملے سے تمام ہوتا ہے۔ اور یہ سب من حیث الاجتہاد ہے باقی حدیث میں تو صرف وجوب بیع اور نفی اختیار ہے یا شرط لگانے کے ذریعہ یا لفظ اختر کے ذریعہ اس لئے کہ آنے والی روایات اس کیلئے بیان ہیں۔

فکل واحد منهما بالخیار من بیعه :(ما لم یتفرقا : گفتگو کے اعتبار سے یا بدن کے اعتبار سے۔

او یکون بیعهما عن خیار یکون منصوب ہے "او" مقدر کی وجہ سے جو بمعنی الاّ کے ہے۔ اور یکون رفع کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے اگر "او" اپنے اصلی معنی پر ہو (جیسا کہ اس کو ذکر کیا ہے سید جمال الدینؒ نے)۔ اور قول اول معتمد ہے روایۃً اور درایۃً اور یہی امام طیبی کی شرح سے مفہوم ہو رہا ہے۔ اور وجہ رفع غیر ظاہر ہے، الاّ یہ کہ یوں کہا جائے کہ یہ معطوف ہے "**یتفرقا**" کا اور پہلے کے جزم کے بعد دوسرے کو جزم نہیں دیا، دونوں لغتوں کو جمع کرتے ہوئے یا پورے "**ما لم یتفرقا**" پر عطف ہے، یا اس کو محمول کیا جائے اس پر کہ "ان" مصدر یہ مقدر "ان" کے بعد والے فعل کو کبھی رفع بھی دیتا ہے۔ جیسا کہ ابن محیصن کی قرأۃ اس آیت میں ہے ﴿**لمن اراد ان یتم الرضاعة**﴾ [البقرۃ۔۲۳۳] "یہ مدت اس لئے ہے کہ جو کوئی شیر خوارگی کی تکمیل کرنا چاہے" **یتم** رفع کے ساتھ ہے جیسا کہ مغنی میں ہے۔

(فاذا کان بیعهما عن خیار فقد وجب) یعنی عقد لازم ہو جاتا ہے یا یہ کہ خیار شرط ثابت ہو جاتا ہے اور جدائی سے ساقط نہیں ہوتا۔

او یقول : نصب کے ساتھ اور ایک نسخہ میں رفع کے ساتھ ہے، اس طریقے کے مطابق جو اوپر گزرا۔

(احدهما لصاحبه اختر : نصب کے ساتھ ہے۔ **ای موقع فی المتفق علیه او یقول** ......۔

قوله :فی روایة للترمذی : اس عبارت میں اشارہ ہے صاحب مشکوۃ کی جانب سے صاحب مصابیح پر اعتراض کی طرف کہ انہوں نے اس حدیث کو فصل اول میں ذکر کیا ہے بوجہ ان کو وہم ہونے کے، کہ "**او یختارا**" والی روایت صحیحین میں ہے یا کسی ایک میں ہے حالانکہ بات ایسی نہیں ہے۔ (انتہیٰ)

۲۸۰۲: وَعَنْ حَكِيْمِ بْنِ حِزَامٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْبَيِّعَانِ بِالْخِيَارِ مَا لَمْ يَتَفَرَّقَا فَاِنْ صَدَقَا وَبَيَّنَا بُوْرِكَ لَهُمَا فِيْ بَيْعِهِمَا وَاِنْ كَتَمَا وَكَذَبَا مُحِقَتْ بَرَكَةُ بَيْعِهِمَا (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۰۹/٤۔ الحدیث رقم ۲۰۷۹۔ ومسلم فی صحیحه ۱۱٦٤/۳ الحدیث رقم (٤۷۔ ۱۵۳۲)۔ والترمذی فی ۵٤۸/۳ الحدیث رقم ۱۲٤٦ واحمد فی المسند ٤۰۳/۳۔

ترجمہ: ''اور حضرت حکیم بن حزامؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا: خرید وفروخت کرنے والوں کو (اپنے تجارتی معاملہ کو باقی رکھنے یا فسخ کر دینے کا) اختیار حاصل رہتا ہے۔ (لیکن یہ اختیار اس وقت تک حاصل رہتا ہے) جب تک کہ وہ جدا نہ ہوں اور (یاد رکھو) جب خرید وفروخت کرنے والے (فروخت کی جانے والی چیز اور اس کی تعریف میں) سچ بولتے ہیں اور (اس چیز میں جو عیب ونقصان ہوتا ہے اس کو) ظاہر کر دیتے ہیں (تاکہ کسی دھوکہ اور فریب کا دخل نہ رہے) تو ان کے تجارتی معاملے میں برکت ڈال دی جاتی ہے اور جب وہ عیب چھپاتے ہیں اور جھوٹ بولتے ہیں تو ان کی خرید وفروخت میں برکت ختم کر دی جاتی ہے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: محقت : مجہول کے صیغہ کے ساتھ بمعنی ازیلت۔

۲۸۰۳: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَجُلٌ لِلنَّبِيِّ ﷺ اِنِّی اُخْدَعُ فِی الْبُیُوْعِ فَقَالَ اِذَا بَایَعْتَ فَقُلْ لَا خِلَابَةَ فَکَانَ الرَّجُلُ یَقُوْلُهٗ. (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی ۳۹۵/٤۔ الحدیث رقم ۲۱۱۷۔ ومسلم فی صحیحه ۱۱٦۵/۳ الحدیث رقم (٤۸۔ ۱۵۳۳)۔ وابوداؤد فی السنن ۷٦۵/۳ الحدیث رقم ۳۵۰۰۔ والنسائی فی ۲۵۲/۷ الحدیث رقم ٤٤۸٤۔ ومالك فی المؤطا ٦۸۵/۲ الحدیث رقم ۹۸ من کتاب البیوع۔ واحمد فی المسند ۸/۲۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ ''میں خرید وفروخت کے معاملے میں دھوکہ کھا جاتا ہوں''۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''تم جب خرید وفروخت کا کوئی معاملہ کرو تو اس وقت یہ کہہ دیا کرو کہ (دین میں) فریب (کی) کوئی گنجائش نہیں ہے''۔ چنانچہ وہ شخص اسی طرح کہہ دیا کرتا تھا''۔ (بخاری ومسلمؒ)

تشریح: اخدع : واحد متکلم مجہول کا صیغہ ہے۔

البیوع : باء کے ضمہ کے ساتھ ہے اور اس کو کسرہ بھی دیا جاتا ہے۔

قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ یہ آدمی حبان بن منقذ بن عمرو الانصاری المازنی تھے۔ اور بعض روایات میں اس کی تصریح بھی ہے۔

قولہ : فقال : اذا بایعت فقل لا خلابة : خاء معجمہ کے کسرہ لام کی تخفیف اور اس کے بعد با کے ساتھ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اس بیع میں مجھے کوئی نقصان اور دھوکہ نہ ہو۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ جس شخص نے بیع کے وقت یہ الفاظ کہے تو غبن کی صورت میں اس کو مبیع لوٹانے کا حق ہوگا اور جمہور کے ہاں مطلقاً اس کو لوٹانے کا حق نہیں ہے۔

ان الفاظ سے مقصود تنبیہ کرنی ہے کہ وہ آدمی کہے مجھے خرید وفروخت میں واقفیت نہیں ہے۔ پس یعنی اس کے ساتھ معاملہ کرنے والا اس کو نقصان پہنچانے سے احتراز کرے اور اس کیلئے وہی پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے، اور اس زمانے میں لوگ اپنے بھائیوں کے ساتھ رعایت کا معاملہ زیادہ کرتے تھے، اور ان کا خیال رکھتے تھے۔ (اس کو ذکر کیا ہے ابن الملک نے۔)

بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس روایت میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں: ثم انت بالخیار فی کل سلعة ابتعتها۔ پھر تجھے اختیار ہوگا اس مال میں جو تو نے خریدا ہو۔

تو حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ ''لا خلابة'' کے لفظ کو شرعاً وضع کیا ہے تین دن تک خیار شرط لگانے کیلئے اور اگر اس کا معنی مجہول ہو تو پھر بیع باطل ہو جاتی ہے۔ اور گمان یہ ہے کہ یہ صرف اس شخص کے ساتھ خاص ہے جس کو آپ علیہ السلام نے مخاطب کیا تھا، لیکن یہ درست نہیں ہے، اس لئے کہ خصوصیت کیلئے کسی دلیل کا ہونا ضروری ہے۔ (انتہیٰ)

لفظ ''لا خلابة'' کا شرعاً موضوع ہونا جیسا کہ پہلے گزر ا محل بحث ہے۔

قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ حدیث اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ غبن نہ تو بیع کو فاسد کرتا ہے اور نہ ہی اختیار کو ثابت کرتا ہے۔ اس لئے کہ اگر اس سے بیع فاسد ہوتی یا اختیار ثابت ہوتا، تو آپ اس پر تنبیہ فرماتے اور اس صحابی کو اس شرط لگانے کا حکم نہ دیتے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ غبن فاحش بیع کو فاسد کرتا ہے اور خیار کو ثابت کرتا ہے اس کے قائلین کے ہاں، اور ان صاحب نے مطلقا غبن کے بارے میں کہا تھا جیسا کہ ظاہری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے۔ پھر (قاضی عیاض) آگے فرماتے ہیں کہ امام مالک فرماتے ہیں کہ اگر مشتری کو معاملات میں واقفیت نہ ہو تو اس کو لوٹانے کا اختیار ہوگا، اور ابو ثور فرماتے ہیں کہ اگر غبن فاحش ہو کہ اس جیسا غبن عام طور پر لوگ نہ کرتے ہوں، تو بیع فاسد ہو جائے گی اور یہ کہ جب یہ کلمہ ''لا خلابة'' عقد میں ذکر کیا جائے اور پھر اس میں غبن ظاہر ہو جائے تو اس کو اختیار ہوگا، تو گویا کہ اس نے شرط لگائی ہے کہ مبیع کی قیمت' قیمت مثلی سے زیادہ نہ ہوگی تو یہ مشابہ ہو جائے گا اس صورت کے کہ جب مشتری مبیع میں کسی مقصودی وصف کی شرط لگائے اور بعد میں اس کے خلاف ظاہر ہو جائے تو اس کو لوٹانے کا اختیار ہوتا ہے۔ اور یہی امام احمد کا قول ہے۔ اور اکثر علماء اس طرف گئے ہیں کہ صرف یہ لفظ غبن کی وجہ سے خیار کو لازم نہیں کرتا، پس ان میں سے بعض نے تو حدیث کو ''حبان'' کے ساتھ خاص کیا ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ آپ نے ان کو خیار شرط لگانے کا حکم دیا تھا اور شرط کو اس کلمہ کے ساتھ صادر کرنا یہ معاملہ کرنے والے کو امانت کی حفاظت اور دھوکہ سے بچنے پر ابھارنے کیلئے ہے۔ چنانچہ مروی ہے کہ آپ نے اس سے کہا تھا: ''قل لا خلابة ''واشترط الخيار ثلاثه ايام۔ تو اس صورت میں خیار غبن کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ شرط لگانے والے کو متعین مدت کے اندر فسخ کرنے کا اختیار ہوگا چاہے اس میں غبن ہو یا نہ ہو، اور مدت گزرنے کے بعد اس کو فسخ کرنے کا اختیار نہ ہوگا اگرچہ ظاہر ہو جائے۔

علامہ تورپشتی فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو اس بات کی تلقین کی تھی تا کہ ان کے ساتھ معاملہ کرنے والے شخص کو یہ تنبیہ ہو جائے کہ یہ صاحب شئی کی معرفت مقدار اور قیمت کے بارے میں اصحاب بصیرت میں سے نہیں ہیں' چنانچہ وہ ان کو نقصان پہنچانے اور دھوکہ دینے سے احتراز کرے گا اور اس کیلئے وہی پسند کرے گا جو اپنے لئے پسند کرتا ہے، اور اس زمانے میں لوگ اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ رکھتے تھے اور اپنے نفس کے خیال سے زیادہ ان کا خیال رکھتے تھے۔

امام طیبی نے بھی اس وجہ کو پسند کیا ہے، اور ''لا خلابة'' کی ترکیب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''لا'' نفی جنس کیلئے ہے اور اس کی خبر محذوف ہے حجازیوں کے نزدیک۔ اور مطلب یہ ہے کہ ہمارے دین میں فریب کی گنجائش نہیں ہے اس لئے کہ دین سراسر خیر خواہی کا نام ہے۔

الفصل الثانی:

تجارتی معاملات میں فریقین کی رضامندی اور طمانیت ضروری ہے

۲۸۰۴: عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ الْبَيِّعَانِ بِالْخِيَارِ مَالَمْ يَتَفَرَّقَا اِلَّا اَنْ يَكُوْنَ صَفْقَةَ خِيَارٍ وَلَا يَحِلُّ لَهٗ اَنْ يُفَارِقَ صَاحِبَهٗ خَشْيَةَ اَنْ يَسْتَقِيْلَهٗ۔ (رواہ الترمذی وابوداود والنسائی)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۷۳٦/۳ الحديث رقم ۳٤٥٦۔ والترمذی فی ۵۵۰/۳ الحديث رقم ۱۲٤۷۔ والنسائی فی ۲۵۱/۷ الحديث رقم ٤٤٨٣۔ واحمد فی المسند ۱۸۳/۲۔

ترجمہ: ''حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: خرید و فروخت کرنے والے (اسی وقت تک بیع کو باقی رکھنے یا اس کو فسخ کردینے کا) اختیار رکھتے ہیں جب تک کہ وہ جدا نہ ہوں مگر یہ کہ ان کی بیع خیار ہو (تو اس میں جدائی کے بعد بھی اختیار باقی رہتا ہے) اور ان دونوں میں سے کسی کے لئے (از روئے تقویٰ) یہ

حلال نہیں ہے کہ وہ معاملہ کرتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہو اس خوف سے کہیں دوسرا فریق معاملے کو فسخ کرنے کا اختیار نہ مانگ لے (یعنی جب تک کسی معاملے میں دونوں فریق پوری طرح مطمئن نہ ہو جائیں ایجاب وقبول میں ان میں سے کوئی محض اس لئے جلد بازی نہ کرے کہ مبادا فریق ثانی معاملے کو فسخ کر دے یا معاملہ طے کرتے ہی ان میں سے کوئی محض اس وجہ سے نہ بھاگ کھڑا ہو کہ کہیں دوسرا فریق بیع کو فسخ کرنے کے اختیار کی شرط نہ چاہنے لگے"۔ (ابوداؤد' نسائی)

تشریح: قوله :البيعان بالخيار ما لم يتفرقا، الا ان يكون صفقة خيار : یعنی جب جدا ہو جائے تو ان کا خیار باطل ہو جائے گا۔ مگر یہ کہ عقد بیع خیار ہو، یعنی ایسی بیع جس میں اختیار کی شرط لگائی گئی ہو۔ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں اضافت بیان کیلئے ہے اس لئے کہ "صفقة" بیع کیلئے بھی ہوتا ہے اور عہد کیلئے بھی۔ نہایہ میں ہے' وہ یہ ہے کہ ایک آدمی اپنا عہد و میثاق دوسرے کو دے اور اپنا ہاتھ دوسرے کے ہاتھ میں رکھے جیسا کہ عام طور پر کیا جاتا ہے۔ اور "صفقة" اسم مرۃ ہے تصفیق بالیدین سے اور مطلب یہ ہے کہ بیچنے اور خریدنے والے کا اختیار ان کی جدائی سے ختم ہو جاتا ہے، مگر یہ کہ ایسی بیع ہو جس میں اختیار کی شرط لگائی گئی ہو، جیسا کہ پہلے گزرا۔ (انتہیٰ)

حاصل یہ ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ میں رکھنا یہ امر اغلبی اور عرفی ہے شریعت میں اس کا کوئی اعتبار نہیں اور شاید جدائی سے مراد ہاتھوں کا جدا ہونا ہو، اس لئے کہ یہ عقد کے تمام ہونے کے بعد ہوتا ہے۔ اور اس سے ہمارے مذہب کو تقویت پہنچتی ہے۔ کہ وہ تفریق قولی اور بدنی دونوں کو شامل ہے اور اس سے اس بات کا بھی جواب ہو جاتا ہے جو قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جدائی کا مفہوم جسموں کی جدائی ہے اور اس پر اہل لغت کا اجماع ہے۔ اس آیت میں طلاق کو بھی جدائی کہا ہے ﴿وان يتفرقا يغن الله كلا عن سعته﴾[النساء ۔۱۳۰] اس وجہ سے کہ یہ جسموں کی جدائی کو لازم کر دیتی ہے۔ (انتہیٰ)

اس کا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گفتگو کے ساتھ عقد کا تمام ہونا یہ بھی تفرق بالابدان کو لازم کرتا ہے۔ اور بائع اور مشتری کیلئے اس کا جواز ثابت کرتی ہے۔ باقی ایجاب شرعی کا معنی لغوی میں کوئی دخل نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

قوله :ولا يحل ان يفارق صاحبه خشية ان يستقبله : اقالہ بیع کو باطل کرنے کو کہتے ہیں۔ یہ ہمارے مذہب کی صریح دلیل ہے اس لئے کہ اقالہ عقد کے تمام ہونے کے بعد ہی ہوتا ہے' ورنہ اگر اس کو خیار مجلس کا حق ہوتا تو وہ اپنے ساتھی سے اقالہ کیوں طلب کرے۔ شیخ مظہر فرماتے ہیں کہ بیع کو منعقد ہونے کے بعد باطل کرنے کو فسخ کہتے ہیں عاقد بیع کے لازم ہونے کے بعد دونوں کے رضا مندی سے بیع کو ختم کرے تو اس کیلئے اقالہ استعمال ہوتا ہے۔ اور اگر مدت خیار میں بیع کو ختم کرے تو اس کو "فسخ" کہتے ہیں۔

تو حدیث کا مطلب یہ ہے کہ متقی کیلئے مناسب نہیں ہے کہ وہ عقد کے بعد فوراً مجلس سے کھڑا ہو کر نکل جائے اس خوف سے کہ دوسرا عاقد خیار مجلس کی وجہ سے بیع کے فسخ کرنے کا مطالبہ نہ کر دے' اس لئے کہ یہ دھوکہ کے مشابہ ہے (انتہیٰ)۔

اقالے کی تاویل فسخ مقید کے ساتھ غیر ظاہر ہے، اور یہ جو روایت کیا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ جب کسی آدمی سے بیع کرتے اور ارادہ یہ ہوتا کہ وہ ان سے اقالہ نہ کرلے تو آرام سے کھڑے ہو کر چلنے لگتے۔ اور امام طیبی فرماتے ہیں کہ اس سے ثابت ہوا کہ مفارقت سے مراد مفارقت بالابدان ہے۔ (انتہیٰ) تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا اعتبار ایک صحابی کی رائے میں ہے جو دوسروں پر حجت نہیں ہے۔

۲۸۰۵:وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ لَا يَتَفَرَّقَنَّ اثْنَانِ اِلَّا عَنْ تَرَاضٍ۔ (رواه ابوداود)

اخرجه ابوداؤد فی ۷۳۷/۳ الحدیث رقم ۳۴۵۸۔ والترمذی فی ۵۵۱/۳ الحدیث۔

ترجمہ: "اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: (بائع و مشتری) دونوں آپس کی رضامندی کے بغیر ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں"۔ (ابوداؤد)

تشریح: لا يتفرقن اثنان الا عن تراض : اور یہ اللہ کے اس قول سے اقتباس ہے: ﴿لا تأكلو أموالكم بينكم

بالباطل الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم﴾[النساء۔۹] (آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق طور پر مت کھاؤ، لیکن کوئی تجارت ہو جو باہمی رضامندی سے ہو، تو مضائقہ نہیں)۔

ایجاب وقبول کے بعد تجارت رضامندی کے ساتھ ہوتی ہے تو تخییر پر موقوف نہیں ہوتی، پس اللہ نے مباح کر دیا ہے مشتری کیلئے تخییر سے پہلے کھانا، پس مراد حدیث سے (واللہ اعلم) یہ ہے کہ دونوں صاحب معاملہ کوئی تجارتی معاملہ طے کرنے کے بعد اس وقت تک ایک دوسرے سے الگ نہ ہوں جب تک قیمت کی ادائیگی اور خرید کردہ چیزوں کی حوالگی میں دونوں کی رضا ورغبت نہ پائی جائے۔ کیونکہ اس کے بغیر ضرر وضرار کا احتمال رہے گا جو شریعت میں ممنوع ہے۔

یا اس سے مراد یہ ہے کہ جب معاملہ طے ہو جائے اور دونوں اصحاب معاملہ میں سے کوئی ایک وہاں سے اٹھ کھڑا ہونے کا ارادہ کرے تو دوسرے فریق سے پہلے پوچھ لے کہ کیا اس معاملے پر تم راضی ہو گئے ہو؟ اس کے بعد اگر دوسرا فریق معاملے کو فسخ کرنا چاہے تو وہ بھی معاملے کو فسخ کر دے، اس صورت میں یہ حدیث معنی کے اعتبار سے پہلی حدیث کے موافق ہوگی، نیز یہ ممانعت نہی تنزیہی کے طور پر ہے کیونکہ اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے کہ ایک دوسرے کی اجازت اور علم کے بغیر جدا ہونا حلال ہے۔ اور ہمارے مذہب کی تائید اس آیت کے اطلاق سے بھی ہوتی ہے: ﴿یا ایھا الذین امنوا أوفوا بالعقود﴾[المائدۃ:۱] (اے ایمان والو! عہدوں کو پورا کرو)۔

اور یہ عقد قبل از تخییر ہے، اور اسی طرح اس آیت سے بھی ہمارے مذہب کی تائید ہوتی ہے: ﴿واشھدوا اذا اتبایعتم﴾ [البقرۃ۔۲۸۲] (اور خرید وفروخت کے وقت گواہ کر لیا کرو)۔ اس میں حکم دیا ہے معاملے کو گواہی کے ساتھ مضبوط کرنے کا تاکہ بیع کا انکار نہ ہو، اور بیع صحیح ہو جاتی ہے خیار سے پہلے اور ایجاب وقبول کے بعد، پس اگر خیار ثابت ہو اور بیع اس سے پہلے لازم نہ ہو تو اس سے ان تمام نصوص کا ابطال لازم آئے گا۔

ابن الہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حبان بن منقذ کی حدیث جس میں آپ نے ان سے فرمایا تھا: اذا ابتعت فقل: لا خلابۃ ولی الخیار۔ اس حدیث میں آپ نے ان کیلئے خیار شرط کو ثابت کیا ہے اور اس کو تین دن تک مؤخر کیا ہے، پس یہ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ تین دن تک اختیار ثابت نہیں ہوتا مگر اصل عقد میں شرط لگانے کے ساتھ نہ کہ اصل خیار (کہ وہ بغیر شرط کے ثابت ہوتا ہے)۔ پس اس صورت میں تفرق سے جو قبول خیار کیلئے غایت ہے، تفرق اقوال مراد ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہوگی کہ دوسرا فریق ایجاب کے بعد کہے کہ میں نہیں خریدتا، یا موجب قبول سے پہلے اپنی بات سے رجوع کر لے، اور ''تفریق'' کی اسناد ''ناس'' کی طرف کر کے اس سے تفرق اقوال مراد ہونا شرع اور عرف میں کثرت کے ساتھ وارد ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے ﴿وما تفرق الذین اوتو الکتاب الا من بعد ماء جاء تھم البینۃ﴾ [البینہ۔۴] (اور جو لوگ اہل کتاب تھے وہ اس واضح دلیل کے آنے ہی کے بعد مختلف ہو گئے)۔

اور آپ ﷺ نے فرمایا: افترقت بنو اسرائیل علی ثنتین وسبعین فرقۃ، وستفترق امتی علی ثلاث وسبعین فرقۃ۔ بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹ گئے تھے اور میری امت تہتر فرقوں میں بٹے گی۔

نکاح، خلع، اور مال کے بدلے عتق پر قیاس کرنا، پس ان دونوں میں سے ہر ایک عقد معاوضہ ہے جو بغیر خیار مجلس کے تمام ہو جاتا ہے، بلکہ صرف ایسے لفظ سے تمام ہو جاتا ہے جو رضامندی پر دلالت کرے۔ پس اسی طرح بیع ہے۔ (انتہی ملخصا)

امام طیبی فرماتے ہیں کہ عن تراض یہ صفت ہے مصدر محذوف کیلئے اور استثناء متصل ہے، ای لا یتفرق اثنان الاتفرقا صادرا عن تراض یعنی دو معاملہ کرنے والے ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں مگر ایسی جدائی کے ساتھ جو باہم رضامندی سے ہو۔ اشرف فرماتے ہیں کہ اس میں دلیل ہے کہ عاقدین کی جدائی خیار مجلس کے ختم کرنے کیلئے جائز نہیں ہے مگر باہم رضامندی سے، (انتہی)۔

پہلے گزرا ہے کہ بغیر رضامندی کے جدا ہونا اجماعی طور پر جائز ہے اور ممانعت تنزیہی ہے، اور اشرف کا کہنا ہے کہ اس حدیث میں متعاقدین کیلئے خیار مجلس کے ثبوت کی دلیل ہے، ورنہ تو پھر اس قول (الا عن تراض) کا کوئی معنی نہ ہوگا۔ (انتہی)

ملاعلی قاری فرماتے ہیں کہ آپ اس قول کا مطلب اور تحقیق پہلے جان چکے ہیں۔

الفصل الثّالث:

عقد بیع کے بعد فسخ کا اختیار

۲۸۰۶: عَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ خَيَّرَ اَعْرَابِيًّا بَعْدَ الْبَيْعِ۔

(رواه الترمذی وقال هذا حديث حسن صحيح غريب)

الترمذی فی السنن ۵۵۱/۳ الحدیث رقم ۱۲۴۹۔

ترجمہ: ''اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک اعرابی کو خرید وفروخت کا معاملہ ہوجانے کے بعد (دوسرے فریق کی رضامندی سے اس معاملے کو فسخ کرنے کا) اختیار دیا تھا۔ ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: امام طیبی فرماتے ہیں کہ حدیث کا ظاہر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب پر دلالت کر رہا ہے، اس لئے کہ اگر خیار مجلس عقد کرنے کے ساتھ ثابت ہوتا تو پھر یہاں اس کو اختیار دینا عبث ہے۔ اور جواب یہ ہے کہ یہ حدیث مطلق ہے اس کو حمل کیا جائے گا مقید پر جیسا کہ باب کی پہلی حدیث میں ہے، (انتہیٰ) لیکن ظاہر یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ یہ حدیث نص ہے اور اس متنازع فیہ کے لئے رافع جو اول باب میں مذکور ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ بعض نسخوں میں ''حسن'' کا اضافہ موجود نہیں ہے۔

باب الرِّبٰوا

سود کا بیان

''ربا'' رأس المال پر زیادتی کو کہتے ہیں، لیکن شریعت میں اس کو ایک مخصوص زیادت کے ساتھ خاص کیا گیا ہے اور ''زیادۃ'' کے معنی میں یہ آیت ہے:

﴿وما آتيتم من ربا ليربو فى أموال الناس فلا يربو عند الله﴾[الروم۔۳۹]

(اور جو چیز تم اس غرض سے دو گے کہ وہ لوگوں کے مال میں پہنچ کر زیادہ ہوجائے، تو یہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا)

اور اس آیت: ﴿يمحق الله الربا ويربي الصدقات﴾[البقرۃ۔۲۷۶] (اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں اور صدقات کو بڑھاتے ہیں)۔ میں اس پر تنبیہ کی ہے اصل اور معقول زیادتی جس کو ''برکت'' سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ ''ربا'' سے اٹھالی گئی ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''ربا اسم'' مقصور ہے، ربا یربو سے، لہٰذا اس کو الف کے ساتھ لکھا جاتا ہے اور اس کے تثنیہ کو یاء کے ساتھ لکھا جاتا ہے حرف اول کے کسرہ کی وجہ سے۔ علماء فرماتے ہیں کہ ''رباء'' کو قرآن میں واؤ کے ساتھ لکھا ہے فراء فرماتے ہیں کہ واؤ کے ساتھ اس لئے لکھا ہے کہ اہل حجاز نے خط اہل حیرہ سے سیکھا ہے، اور ان کی لغت میں ''ربو'' واؤ کے ساتھ ہے، تو انہوں نے خط کی صورت اپنی لغت کے مطابق ان کو سکھائی۔ فراء فرماتے ہیں کہ ابوسلیمان العدوی نے اسی طرح اس کو پڑھا ہے، اور ابوحمزہ اور کسائی نے امالہ کے ساتھ پڑھا ہے بوجہ راء کے کسرہ کے۔ اور باقی حضرات نے ''تفخیم'' کے ساتھ پڑھا ہے بوجہ با کے فتحہ کے۔ فراء فرماتے ہیں لہٰذا اس کو واؤ، الف، اور یاء تینوں کے ساتھ جائز ہے۔

شرح السنہ میں ہے کہ عبداللہ بن سلام فرماتے ہیں کہ ربا میں بہتر ۷۲ گناہ ہیں۔ سب سے چھوٹا یہ ہے کہ آدمی اسلام کی حالت میں

اپنی ماں سے زنا کرے، اور ربا کے ایک درہم کا گناہ، تینتیس ۳۳ مرتبہ زنا سے زیادہ ہے۔ اور فرمایا کہ اللہ قیامت کے دن نیک و فاجر کو کھڑے ہونے کی اجازت دیں گے سوائے سود خور کے۔ پس وہ کھڑا نہ ہو گا مگر اس شخص کی طرح جس کو جنات کے اثر نے مخبوط الحواس کر دیا ہو۔

الفصل الاول :

سود لینے دینے والے پر لعنت

۲۸۰۷: عَنْ جَابِرٍ قَالَ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اٰكِلَ الرِّبَا وَمُؤْكِلَهٗ وَكَاتِبَهٗ وَشَاهِدَيْهِ وَقَالَ هُمْ سَوَاءٌ ۔ (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ۱۲۱۹/۳ الحديث رقم (۱۰۶ ـ ۱۵۹۸)۔ والترمذى فى السنن ۵۱۲/۳ الحديث رقم ۱۲۰۶۔

ترجمہ: ''حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے پر' سود کھلانے والے پر (سودی لین دین کا کاغذ) لکھنے والے پر اور اس کے گواہوں پر سب ہی پر لعنت فرمائی ہے' نیز آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ سب (اصل گناہ میں) برابر ہیں (اگرچہ مقدار کے اعتبار سے مختلف ہوں''۔ (مسلم)

تشریح: **اکل الربا** : سے مراد سود لینے والا ہے اگرچہ وہ نہ کھائے۔ کھانے کے ساتھ خاص اس لئے کیا کہ کھانا نفع اٹھانے کی بڑی انواع میں سے ہے۔ جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: ﴿**ان الذين يأكلون اموال اليتامٰى ظلمًا**﴾ [النساء : ۱۰] (بلاشبہ جو لوگ یتیموں کا مال بلا استحقاق کھاتے ہیں)۔

و مؤكله : ہمزہ کے ساتھ ہے اور ہمزہ کو واؤ سے بھی تبدیل کیا جاتا ہے۔ مراد سود دینے والا ہے اس شخص کو جو سود لے رہا ہو، اگرچہ وہ اس میں سے نہ کھائے۔ ''اکل'' کی تعبیر اس لئے اختیار فرمائی کہ یہی زیادہ غالب ہے یا اعظم منافع میں سے ہے، جیسا کہ پہلے گزرا۔

خطابی فرماتے ہیں' آپ نے سود کھانے والے اور کھلانے والے کو برابر قرار دیا ہے، اس لئے کہ ہر ایک دوسرے کی معاونت اور شرکت سے ہی سود کھانے تک پہنچتا ہے۔ پس یہ دونوں گناہ میں بھی شریک ہوں گے جیسے کہ فعل میں شریک ہیں۔ اگرچہ ان میں سے ایک اچھی حالت والا ہے بوجہ بیع میں زیادتی وصول کرنے کے اور دوسرا بری حالت والا ہے بوجہ نقصان کرنے کے، پس اللہ پاک کی حدود ہیں ان سے تجاوز کرنا کسی بھی حالت میں جائز نہیں، یعنی نفع کے وجود کے وقت نفع نہ ہونے کے وقت' تنگی کی حالت میں، آسانی کی حالت۔ اور ضرورت بھی کسی درجے میں اس کی نہیں پڑتی کہ وہ کسی کو سود کھلائے اسی لئے کہ وہ اپنی حاجات کو اس کے راستوں سے پورا کر سکتا ہے دوسرے معاملات اور بیع وغیرہ کے ذریعے۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ اضطرار' دینے والے کو لاحق ہو، پس اس کو چاہئے کہ وہ صریح سود سے احتراز کرے اور معاملات کی کسی اور قسم سے اپنی ضرورت کو پورا کرے' اللہ کے اس ارشاد کی وجہ سے: ﴿**واحل الله البيع وحرم الربا**﴾ [البقرة۔ ۲۷۵] (اور اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال فرمایا ہے اور سود کو حرام کر دیا ہے) مگر شدید خوف اور ڈر کے ساتھ، کہ شاید اللہ پاک اس کے ساتھ درگزر کا معاملہ فرمالیں، لیکن سود خور ایسا نہیں ہے۔

و كاتبه و شاهديه : امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہ تصریح ہے کہ سود لینے دینے کے معاملہ کی کتابت اور گواہی دونوں حرام ہیں چونکہ اس میں باطل کی اعانت ہے۔ اور یہ لوگ بنیادی طور پر گناہ میں برابر کے شریک ہیں اگرچہ مقدار کے لحاظ سے مختلف ہوں۔

تخریج: مسلم کے علاوہ ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ نے بھی اس کو ابن مسعود سے روایت کیا ہے۔ اور مسلم نے ابن مسعود سے صرف ''**اكل الربا و موكله**'' روایت کیا ہے۔ اور طبرانی نے ابن مسعود سے یوں روایت کیا ہے: ''**لعن الله الربا و اٰكله و مؤكله و كاتبه و شاهده وهم يعلمون**''۔

۲۸۰۸: وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلذَّهَبُ بِالذَّهَبِ وَالْفِضَّةُ بِالْفِضَّةِ وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ وَالشَّعِيْرُ بِالشَّعِيْرِ وَالتَّمْرُ بِالتَّمْرِ وَالْمِلْحُ بِالْمِلْحِ مِثْلاً بِمِثْلٍ سِوَاءً بِسَوَاءٍ يَدًا بِيَدٍ فَإِذَا اخْتَلَفَتْ هٰذِهِ الْاَصْنَافُ فَبِيْعُوْا كَيْفَ شِئْتُمْ إِذَا كَانَ يَدًا بِيَدٍ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۱۲۱۱/۳ الحدیث رقم (۸۱۔ ۱۵۸۷)۔

ترجمہ: ''اور حضرت عبادہ ابن صامتؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''سونا' سونے کے عوض اور چاندی' چاندی کے عوض اور گندم' گندم کے عوض اور جو' جو کے عوض اور نمک' نمک کے عوض اگر لیا دیا جائے تو ان کا لین دین (مقدار) میں مثل بمثل یعنی مساوی ودست بدست ہونا چاہئے' اگر یہ قسمیں مختلف ہوں (مثلاً گیہوں کا تبادلہ جو کے ساتھ یا جو کا تبادلہ کھجور کے ساتھ ہو) تو پھر (اجازت ہے کہ) جس طرح چاہو خرید وفروخت کرو (یعنی برابر سرابر ہونا ضروری نہیں ہے) البتہ لین دین کا دست بدست ہونا (اس صورت میں بھی) ضروری ہے''۔ (مسلم)

تشریح: **الذهب** : رفع کے ساتھ پڑھا جائے تو ''یباع'' فعل مقدر ہوگا اور نصب کے ساتھ ہو تو ''بیعوا'' فعل مقدر ہوگا

البر : باءِ موحدہ کے ضمہ کے ساتھ، بمعنی **حنطة**

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ وہ علت جو ان چھ اشیاء میں حرمت ربا کیلئے سبب ہے اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک سونے اور چاندی میں ربا کی علت ثمنیت ہے، پس ان کے مسلک کے مطابق سونے، چاندی کے علاوہ موزونی چیزوں میں مثلاً لوہا، تانبا وغیرہ میں ربا کا حکم جاری نہ ہوگا، بوجہ معنیٰ ''ثمنیت'' کے نہ ہونے کے، لیکن باقی چار چیزوں میں ربا کی علت محض ''مطعومیت'' (یعنی صرف غذائیت) ہے۔ لہٰذا ان کے مسلک میں تمام مطعومات میں خواہ وہ غذا ہوں' خواہ میوہ جات ہوں خواہ ادویہ ہوں مثلاً اہلیلج اور سقمونیا ربا کا حکم جاری ہوگا۔ اور وہ چیز جو اکیلی کھائی جاتی ہو، یا کسی دوسری چیز کے ساتھ ملا کر کھائی جاتی ہو، پس زعفران میں بھی صحیح قول کے مطابق ربا کا حکم جاری ہوگا۔

امام مالک رحمہ اللہ کے ہاں سونے اور چاندی میں امام شافعیؒ کی طرح ثمنیت علت ہے اور باقی چار چیزوں میں ربا کی علت قوت مدخر (محفوظ رہنے والی غذا) ہونا ہے۔ اس لئے امام مالک کے ہاں کشمش اور بغیر چھلکے کے جو میں ربا کا حکم جاری ہوگا اس لئے کہ یہ بھی گندم اور جو کی طرح ہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ہاں سونے اور چاندی میں ربا کی علت وزن ہے اس لئے ہر اس چیز کے باہمی لین دین میں ربا کا حکم جاری ہوگا جو موزون ہو، جیسے تانبا، لوہا، وغیرہ۔ اور باقی چار چیزوں میں ربا کی علت کیل ہے اس لئے ہر اس چیز میں ربا کا حکم جاری ہوگا جو مکیلی ہو جیسے چونا، اشنان وغیرہ۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے ہاں' اور امام شافعیؒ کے قول قدیم میں، آخری چار چیزوں میں ربا کی علت' غذائیت، وزن اور کیل ہے۔ پس ان کے ہاں تربوز اور بہی وغیرہ میں ربا کا حکم جاری نہ ہوگا۔ اس لئے کہ مماثلت عام ہے قدر کو بھی شامل ہے' بخلاف مساوات کے، یعنی عوضین کا مساوی ہونا مقدار اور قبضہ میں۔

یدا بید : اس سے معلوم ہوتا ہے عوضین کا فی الحال اور مجلس عقد ہی میں قبضہ کرنا کرنا ضروری ہے۔ اور یہ دونوں ان تین شرطوں میں سے ہیں کہ پہلی شرط وزن اور کیل میں مماثلت ہے' دوسری شرط عوضین پر قبضہ کرنے کی مجلس ایک ہو جس میں تفرق ابدان نہ ہو، تیسری شرط حلول (نقد) ہے کہ نسیئتاً (ادھار) نہ ہو۔

فاذا اختلفت هذه الاصناف...... : امام تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ ہم نے مصابیح کے بہت سارے نسخوں میں پایا ہے کہ لفظ ''اصناف'' کو کر اس کی جگہ ''اجناس'' لکھا ہوا ہے۔ اور اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے اور اس میں ''الاصناف'' کا لفظ ہے نہ کہ اس

کے علاوہ۔ میں اس کو بعض کاتبوں کا تصرف سمجھتا ہوں، کہ ان کے گمان میں لفظ ''اجناس'' زیادہ صحیح ہے۔ اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک چیز ایک علیحدہ جنس ہے۔ اور صنف، جنس سے خاص ہوتی ہے، لیکن ان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس مقام پر اصناف زیادہ اچھا ہے، اس لئے کہ آپ کا ارادہ اس جنس کو بیان کرنا ہے، جس میں ربا کا حکم جاری ہوتا ہے، پس آپ نے اس کی مختلف اصناف ذکر فرما دیں، علاوہ ازیں عرب بعض قریب المعنی الفاظ کو ایک دوسرے کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔ (انتھی) مطلب یہ ہے کہ جس کسی چیز کو مخالف جنس کے بدلے بیچا جائے اگرچہ وہ علت میں مشترک ہو مثلاً گندم کو جو کے بدلہ میں بیچنا کہ اس کو تفاضل کے ساتھ بیچنا جائز ہے۔ اور یہی مطلب ہے اس قول کا ''فبیعوا کیف شئتم''، لیکن گزری ہوئی شرطوں میں سے آخری دو شرطوں کا بیان بھی ہونا ضروری ہے، بوجہ اگلے قول کے۔

اذا کان : اسم کان ''بیع'' ہے۔

یدا! بید : یعنی فی الحال ہو اس مجلس میں قبضہ ہو، ایک کی دوسرے سے جدائی سے پہلے۔

۲۸۰۹ : وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلذَّهَبُ بِالذَّهَبِ وَالْفِضَّةُ بِالْفِضَّةِ وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ وَالشَّعِیْرُ بِالشَّعِیْرِ وَالتَّمْرُ بِالتَّمْرِ وَالْمِلْحُ بِالْمِلْحِ مَثَلاً بِمَثْلٍ یَدًا بِیَدٍ فَمَنْ زَادَ اَوِ اسْتَزَادَ فَقَدْ اَرْبٰی الْآخِذُ وَالْمُعْطِیْ فِیْهِ سَوَاءٌ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۱۲۱۱/۳ الحدیث رقم (۸۲۔ ۱۵۸۴)

ترجمہ: ''اور حضرت ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''سونا' سونے کے عوض اور چاندی' چاندی کے عوض اور گندم گندم کے عوض اور جو جو کے عوض اور کھجور' کھجور کے عوض اور نمک' نمک کے عوض میں اگر دیا جائے تو ان کا لین دین مساوی اور دست بدست ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا جس نے (ایسا نہیں کیا بلکہ) زیادہ دیا یا زیادہ طلب کیا تو گویا اس نے سود لیا' سود لینے والا اور دینے والا اس (گناہ میں) برابر ہیں''۔ (مسلم)

تشریح: قوله :الذهب بالذهب...... یدا بید : زین العرب کہتے ہیں کہ اس حدیث میں چھ/۶ سودی چیزوں کا ذکر ہے، لیکن ربا صرف ان چھ کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ ان کو اس لئے ذکر کیا ہے تاکہ دیگر اشیاء کو ان پر قیاس کر لیا جائے۔

فمن زاد : کو مقدم کیا اس لئے کہ معاملہ اس کے اختیار میں اولیٰ ہوتا ہے'

فقد اربی : یعنی اپنے آپ کو سودی معاملہ میں واقع کر دیا، تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس کا معنی ہے کہ ربا کا معاملہ کیا اور سود دیا، اور لفظ کا معنی یہ ہے کہ اس کو دیئے ہوئے سے زیادہ لیا۔ ''ربا الشئی یربو'' سے ماخوذ ہے، بمعنی زاد۔

طیبی فرماتے ہیں کہ شاید یہ کہنے کی وجہ یہ ہو کہ اس نے ایک فعل حرام کا ارتکاب کیا ہے، اس لئے کہ جس نے دس مثقال چاندی ایک مثقال سونے کے بدلے خریدی تو اس نے زیادہ لیا اور یہ ربا نہیں ہے۔

۲۸۱۰ :وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا تَبِیْعُوْا الذَّهَبَ بِالذَّهَبِ اِلَّا مِثْلاً بِمِثْلٍ وَلَا تُشِفُّوْا بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ وَلَا تَبِیْعُوْا الْوَرِقَ بِالْوَرِقِ اِلَّا مِثْلاً بِمِثْلٍ وَلَا تُشِفُّوْا بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ وَلَا تَبِیْعُوْا مِنْهَا غَائِبًا بِنَاجِزٍ (متفق علیه وفی روایة) لَا تَبِیْعُوْا الذَّهَبَ بِالذَّهَبِ وَلَا الْوَرِقَ بِالْوَرِقِ اِلَّا وَزْنًا بِوَزْنٍ.

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۷۹/٤ الحدیث رقم ۲۱۷۷۔ ومسلم فی (۱۲۰۸/۳) الحدیث رقم (۱۵۸٤۰۷۵)۔ والنسائی فی السنن ۲۷۸/۷ الحدیث رقم ٤۵۷۰۔ ومالك فی الموطا ۶۳۲/۲ الحدیث رقم ۳۰ من کتاب البیوع۔ واحمد فی المسند ۹۳/۳۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: سونے کو سونے کے عوض فروخت نہ کرو مگر یہ کہ دونوں وزن میں مساوی ہوں اور دونوں میں کمی بیشی نہ کرو' اسی طرح چاندی کو چاندی کے عوض میں فروخت نہ کرو مگر یہ کہ دونوں

مساوی ہوں اور دونوں میں کمی بیشی نہ کرو نیز ان (سونے اور چاندی) میں سے کسی غیر موجود چیز کو موجود چیز کے عوض نہ بیچو۔ (بخاری ومسلم) اور ایک روایت میں ہے کہ سونے کو سونے کے عوض اور چاندی کو چاندی کے عوض باہم مساوی وزن میں بیچو۔

تشریح: **ولا تشفوا** : پہلے حرف کے ضمہ دوسرے کے کسرہ اور فاء کی تشدید کے ساتھ، ماقبل کیلئے تاکید ہے۔

بعضها : امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ضمیر ذھب کی طرف راجع ہے، اور ذھب ایک معروف جوہر ہے، اور کبھی اس کو مؤنث بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ (انتہی)

قاموس میں ہے کہ "ذھب" تبر (سونے کے ڈھیلے) کو کہا جاتا ہے یہ مؤنث ہے اور اس کا واحد تاء کے ساتھ "ذھبة" آتا ہے۔

حدیث میں "ذھب" سے مراد وہ ہے جو "تبر" اور اس کے علاوہ سب کو شامل ہو، اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ تانیث جنس کیلئے ہے، یہ بتانے کیلئے کہ شرعاً سونے کی مختلف اقسام کی تمیز کا کوئی اعتبار نہیں ہے، یا مطلب یہ ہے: **لاتزيدوا في البيع بعض العين البيعة التي هي الذهب على بعض** کہ تم زیادہ نہ کرو بیع میں بعض متعین مبیع کو جو کہ سونا ہے بعض پر۔

شرح السنہ میں ہے کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے جو شخص سونے کے زیور کا سونے کے ساتھ تبادلہ کرے تو یہ جائز نہیں ہے مگر یہ کہ وزن میں برابر سرابر ہو، زیور کی بنائی لینی جائز نہیں ہے، اس لئے کہ یہ سونے کو سونے کے بدلے میں بیچنا ہے (اور اس میں زیادتی جائز نہیں ہے۔) **الورق** : راء کے کسرہ کے ساتھ، اور سکون کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے، چاندی کو کہتے ہیں۔

ورق کو مؤنث ذکر کیا ہے اس لئے کہ یہ بمعنی "فضة" ہے۔ **ولا الورق** : "لا" کی زیادتی تاکید کیلئے ہے۔

الا وزنا بوزن : أي موزونين وزنا مقابلا و مماثلا بوزن۔

۲۸۱۱: وَعَنْ مَعْمَرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ كُنْتُ اَسْمَعُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ الطَّعَامُ بِالطَّعَامِ مَثَلاً بِمَثَلٍ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ۱۲۱۴/۳ الحديث رقم (۹۳۔ ۱۵۹۲)۔

ترجمہ: "اور حضرت معمر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ غلہ کے عوض غلہ باہم مساوی ہونا چاہیے (یعنی غلہ کو ہم جنس غلہ کے بدلے میں اگر لیا دیا جائے تو یہ لین دین برابر سرابر ہونا چاہئے)۔ (مسلم)

تشریح: **الطعام** : ہر کھانے کی چیز کو طعام کہا جاتا ہے، اور کبھی اس کا اطلاق گندم پر بھی ہوتا ہے، اگر یہاں مراد گندم ہو تو دوسری اشیاء کو اس پر قیاس کیا جائے گا جنس کے متحد ہونے کے وقت، اور اگر مراد اس سے کھانے کی چیز ہو تو پھر یہ مشروبات کو بھی شامل ہو گا، پس اگلے الفاظ "مثلاً بمثل" کی بناء پر اس کو جنس کے متحد ہونے پر محمول کیا جائے گا۔

۲۸۱۲: وَعَنْ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلذَّهَبُ بِالذَّهَبِ رِبًا اِلَّا هَاءَ وَهَاءَ وَالْوَرِقُ بِالْوَرِقِ رِبًا اِلَّا هَاءَ وَهَاءَ وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ رِبًا اِلَّا هَاءَ وَهَاءَ وَالشَّعِيْرُ بِالشَّعِيْرِ رِبًا اِلَّا هَاءَ وَهَاءَ وَالتَّمْرُ بِالتَّمْرِ رِبًا اِلَّا هَاءَ وَهَاءَ. (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ۳۴۷/۴۔ الحديث رقم ۲۱۳۴۔ ومسلم فی صحيحه (۱۲۰۹/۳) الحديث رقم (۷۹۔ ۱۵۸۶)۔ وابوداوٗد فی السنن ۶۴۳/۳ الحديث رقم ۳۳۴۸۔ والترمذی فی ۵۴۵/۳ الحديث رقم ۱۲۴۳۔ والنسائی فی ۲۷۳/۷ الحديث رقم ۴۵۵۸۔ وابن ماجه فی ۷۵۹/۲ الحديث رقم ۲۲۵۹۔ والدارمی فی ۳۳۶/۲ الحديث رقم ۲۵۷۸ ومالك فی الموطأ ۶۳۶/۲ الحديث رقم ۳۸ من كتاب البيوع۔

ترجمہ: "اور عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: سونے کو سونے کے عوض، چاندی کو چاندی کے عوض، گندم کو گندم کے عوض، جو کو جو کے عوض، کھجور کو کھجور کے عوض ادھار خرید وفروخت کرنا سود ہے لیکن اگر دست بدست ہو تو جائز ہے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: **هاء** : مد اور قصر، دونوں کے ساتھ ہے، اسم فاعل بمعنی "خذوا" ہے، لیکن مد کے ساتھ زیادہ فصیح اور مشہور ہے، اور ہمزہ مفتوح ہے اور کسرہ کے ساتھ بھی کہا گیا ہے۔ (اس کو ذکر کیا ہے امام نوویؒ نے) سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی اصل "هاك"

ہے بمعنی خذ، کاف کو حذف کیا اور اس کے عوض میں مدّ اور ہمزہ کو لایا گیا (انتہی)۔لیکن اس میں تسامح ہے جیسا کہ ظاہر ہے۔

وھاء : یعنی قبضہ کیا جائے اور لیے جائیں اسی مجلس میں، جدائی سے پہلے اس طور پر کہ ایک کہے یہ لے اور دوسرا بھی یہی کہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس کا معنی ہے ''لے اور دے''۔اس حدیث میں دلیل ہے بیع تعاطی کے صحیح ہونے کی یہاں تک کہ قیمتی اشیاء میں بھی۔ ابن الہمام کی شرح میں ہے کہ ابو معاذ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے سفیان ثوری رحمہ اللہ کو دیکھا کہ وہ انار والے کے پاس آئے، اس کے پاس پیسے رکھے، انار لیا اور کوئی بات کئے بغیر چلے گئے۔

فائق میں ہے کہ ''ھاء'' اسم صوت ہے بمعنی خذ، اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے ﴿**ھاء م اقرؤا کتابیه**﴾[الحاقة۔۱۹]

مالکیؒ فرماتے ہیں ''ھاء'' کا حق یہ ہے کہ یہ ''الّا'' کے بعد واقع نہ ہو، جیسے ''خذ''، الّا کے بعد واقع نہیں ہوتا، اور اس حدیث میں اس سے پہلے تقدیری عبارت ماننا ضروری ہے، وہ اس کے ساتھ محکی ہوگا۔تو گویا تقدیری عبارت یوں ہوں گی: **ولا الذهب بالذهب الا مقولا عنده من المتبايعين هاء وهاء**۔امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے، اور مستثنیٰ منہ مقدر ہے، تقدیری عبارت یوں ہے: **بيع الذهب بالذهب وباقي جميع الحالات الا حال الحضور والتقابض**۔تو **هاء وهاء** کنایہ ہے **تقابض** سے اس لئے کہ یہ اس کا لازم ہے۔

۲۸۱۳:وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ وَاَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اِسْتَعْمَلَ رَجُلاً عَلٰی خَیْبَرَ فَجَاءَهُ بِتَمْرٍ جَنِیْبٍ فَقَالَ اَکُلُّ تَمْرِ خَیْبَرَ هٰکَذَا قَالَ لَا وَاللّٰهِ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا لَنَاْخُذُ الصَّاعَ مِنْ هٰذَا بِالصَّاعَیْنِ وَالصَّاعَیْنِ بِالثَّلَاثِ فَقَالَ لَا تَفْعَلْ بِعِ الْجَمْعَ بِالدَّرَاهِمِ ثُمَّ ابْتَعْ بِالدَّرَاهِمِ جَنِیْبًا وَقَالَ فِی الْمِیْزَانِ مِثْلُ ذٰلِكَ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاري في صحيحه ٣٩٩/٤۔ الحديث رقم ٢٢٠١۔ ومسلم في (١٢١٥/٣) الحديث رقم (٩٥۔ ١٥٩٣)۔ والنسائي في السنن ٢٧١/٧ الحديث رقم ٤٥٥٣۔ والدارمي في ٣٣٥/٢ الحديث رقم ٢٥٧٧۔ ومالك في الموطأ ٦٢٣/٢ الحديث رقم ٢١ من كتاب البيوع۔

ترجمه:''حضرت ابو سعیدؓ اور ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو خیبر کا گورنر بنا کر بھیجا چنانچہ جب وہ شخص وہاں سے واپس آیا تو آپ ﷺ کی خدمت میں بہت عمدہ قسم کی کھجوریں لے کر حاضر ہوا۔آپ ﷺ نے وہ کھجوریں دیکھ کر اس سے پوچھا کہ کیا خیبر کی سب کھجوریں ایسی ہی اچھی ہوتی ہیں؟ اس نے کہا کہ نہیں! یا رسول اللہ! اللہ کی قسم (سب کھجوریں ایسی نہیں ہوتیں) بلکہ ہم ایسا کرتے ہیں کہ دو صاع (خراب) کھجوروں کے عوض میں ایک صاع اچھی کھجوریں اور تین صاع (خراب) کھجوروں کے عوض دو صاع اچھی کھجوریں لے لیتے ہیں۔آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایسا نہ کرو بلکہ پہلے تمام (خراب) کھجوروں کو ملا کر درہموں کے عوض فروخت کرو اور پھر ان درہموں کے عوض اچھی کھجوریں خریدو''۔اور پھر فرمایا جو چیزیں ترازو (یعنی وزن) کے ذریعے لی دی جاتی ہیں ان کا بھی یہی حکم ہے''۔(بخاری و مسلم)

تشریح: **بتمر جنیب** : اضافت کے ساتھ بھی ہے اور عدم اضافت کے ساتھ بھی ہے' ثانی زیادہ صحیح ہے۔

جنیب : جیم کے فتحہ' نون کے کسرہ اور یاء کے سکون کے ساتھ ہے، اور آخر میں باء ہے۔کھجور کی انواع میں سے عمدہ قسم ہے۔

والصاعین بالثلاث : ممکن ہے کہ یہ اختلاف اس کے وجود کی قلت و کثرت کی وجہ سے ہو، یا نوع اور جنس کے اختلاف کی وجہ سے ہو۔

فقال لا تفعل : یعنی اس طرح نہ کرو، اور جو ہوا تھا اس پر آپ نے ان کا مواخذہ نہیں کیا، اس لئے کہ وہ اس کی حرمت سے ناواقف تھے۔صحابہ آپ ﷺ کی زندگی میں تھے، جو شریعت کے افشاء کا وقت تھا اس لئے وہ معذور تھے بعض فروعات کے بارے میں جو جن سے وہ واقف نہ تھے، جیسا کہ اس مسئلہ میں ہے۔

مطلب حدیث یہ ہے کہ آپ عمدہ کھجور کو دوسری کھجور کے بدلے میں نہ خریدیں مگر برابر سرابر، اگر چہ ان میں سے ایک دوسرے سے عمدہ ہو، بلکہ جب آپ ایک قسم کو دوسری کے بدلے میں زیادتی کے ساتھ بیچنا چاہتے ہوں، تو **الجمع** : کھجور کی ہر وہ قسم جس کا نام معلوم نہ ہو، یا ردی کھجور کو یا ان کھجوروں کو کہتے ہیں جس میں مختلف قسم کی کھجوریں ملی ہوئی ہوں' اور اس میں رغبت نہ ہو، اور جو ملائی گئی ہوں آپس میں اس کے گھٹیا ہونے کی وجہ سے۔ **بالدراھم** مطلب یہ ہے کہ اس چیز کے بدلے بیچو جو اموال ربویہ میں سے نہ ہو۔

مثل ذلك : رفع کے ساتھ متبداء مؤخر ہے۔ اور بعض نسخوں میں نصب کے ساتھ ہے۔ مصدر محذوف کیلئے صفت ہے۔ ای قال **فیه قولاً مثل ذلك**، یعنی جس طرح مکیل کے بارے میں فرمایا تھا کہ اس میں جو غیر جید ہے اس کو بیچا جائے پھر اس کی قیمت سے عمدہ کھجور خریدلیں، لیکن عمدہ کو ردی کے بدلے نہ لیا جائے وزن میں کمی وزیادتی اور جنس کے متحد ہونے کے ساتھ۔

شرح السنۃ میں ہے کہ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جس شخص کا ارادہ اموال ربویہ میں سے کسی چیز کو اس کی جنس سے تبدیل کرنے کا ہو اور اس کے بدلے زیادہ لے تو یہ جائز نہیں ہے، یہاں تک کہ اس کی جنس کو تبدیل کرلے اور جو اس نے خریدا ہے اس کو قبض کر کے پھر اس کو زیادہ قیمت پر بیچے اس قیمت سے جو اس نے دی ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے حنفیہ نے اپنے مذہب پر استدلال کیا ہے، اس لئے کہ اس حدیث میں کیل اور وزن کا ذکر کیا ہے۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حنفیہ کا طریقہ استدلال اس طرح ہے کہ حدیث عبادہ میں اصناف مذکورہ میں علت ربا کیل، اور وزن بیان کی ہے، نہ کہ غذائیت اور ثمنیت، اس لئے کہ آپ علیہ السلام نے کھجور کا حکم بیان کیا جو مکیلی ہے، اور اس کے ساتھ حکم میں وزن کی جانے والی اشیاء کو ملایا، اور اگر علت ربا غذائیت اور ثمنیت ہوتی تو آپ اسطرح فرماتے: **وفی النقد مثل ذلك**، کہ نقدی میں بھی اس طرح ہے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ اس حدیث میں درحقیقت راہ نمائی ہے اس شخص کیلئے جو راہ راست کھو چکا، اور سود میں پڑ گیا ہو۔ پس اس حدیث میں اس کی راہ نمائی کی ہے سود سے چھٹکارے کیلئے عمل کے طریقہ کے ساتھ، اور مفہوم اس حدیث میں بالکل مسدود ہے۔ (انتہیٰ)

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ جب آپ غور کریں گے اس جواب پر تو آپ پر یہ ظاہر ہو جائے گا کہ یہ راہ راست سے انحراف اور عدول ہے، یہ حدیث ایک بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے جس پر فروعات کی بنیاد ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے ہمارے اصحاب نے استدلال کیا ہے، کہ سود کے مقصد تک پہنچنے کیلئے لوگ جو حیلہ کرتے ہیں وہ حرام نہیں ہے، اور اس کی صورت یہ ہے کہ جب ایک آدمی دوسرے کو سو ۱۰۰ درہم دینا چاہتا ہو، دوسو کے بدلے، تو یہ اس کو ایک کپڑا دوسو کا بیچے اور پھر وہی کپڑا اس سے سو درہم کا خرید لے، اس لئے کہ آپ علیہ السلام نے فرمایا ہے: "**بع ھذا و اشتر بثمنه من ھذا**" کہ یہ بیچ دے اور اس کی قیمت سے یہ خرید لے، یہ حیلہ امام شافعیؒ کے ہاں حرام نہیں ہے۔ امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حرام ہے۔ (انتہیٰ)

قول اول امام اعظم رحمہ اللہ اور ان کے متبعین علماء امت کا مذہب ہے۔ واللہ اعلم

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام مالک اور امام احمد کے قول کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس کو رزین بن ارقم نے اپنی کتاب میں روایت کیا ہے' حضرت ام انس سے کہ وہ کہتی ہیں کہ رزین بن ارقم کی ام ولد حضرت عائشہؓ کے پاس آئی، اور بولی کہ میں نے زید کو آٹھ سو درہم کی لونڈی بیچی عطاء (یعنی تنخواہ) تک، اور مدت پوری ہونے سے پہلے پھر میں نے اس سے چھ سو کی خرید لی، میں نے اس کے ساتھ شرط لگائی تھی کہ اگر تم اس کو فروخت کرو گے تو میں اس کو تجھ سے خریدوں گی، حضرت عائشہؓ نے فرمایا، کہ بہت برا ہے جو تو نے بیچا اور بہت برا ہے جو تو نے خریدا اور زید بن ارقم کو میرا یہ پیغام پہنچا دینا کہ اس نے اپنا وہ جہاد باطل کر دیا جو اس نے رسول اللہ ﷺ کی معیت میں کیا تھا اگر اس معاملہ سے توبہ نہیں کی، تو اس عورت نے حضرت عائشہؓ سے کہا، تو پھر وہ کیا کرے؟ وہ عورت کہتی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے

اس سے فرمایا"فمن جاء ہ موعظة من ربه فانتهی فله ماسلف و امره الی الله" پھر جس شخص کو اس کے پروردگار کی طرف سے نصیحت پہنچی اور وہ باز آ گیا تو جو کچھ پہلے ہو چکا ہے وہ اسی کا رہا۔حضرت عائشہ کے اس قول پر کسی نے رد نہیں کیا حالانکہ اس وقت صحابہ وافر مقدار میں موجود تھے۔

شرح السنہ میں ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس روایت کے جواب میں فرمایا ہے کہ اگر یہ روایت ثابت ہو تو حضرت عائشہؓ نے اس بیع کو مدت عطاء کی وجہ سے برا جانا، اس لئے کہ مدت غیر معلوم تھی۔(انتہیٰ) اور یہ بھی ممکن ہے کہ بیع اور شرط کو جمع کرنے کی وجہ سے حضرت عائشہؓ نے اس کو ناپسند کیا ہو، یا اس وجہ سے کہ یہ بیع قبل القبض تھی۔واللہ اعلم

پھر امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت زیدؓ صحابی ہیں، اور جب صحابہ کا کسی مسئلہ میں اختلاف ہو۔تو ہمارا مذہب قیاس ہوتا ہے، اور قیاس حضرت زید کے ساتھ ہے۔امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت عائشہؓ نے مدت کے مجہول ہونے کی وجہ سے اس بیع کو درست قرار نہ دیا ہو، اس لئے کہ "عطاء" اس کو کہتے ہیں جو بیت المال سے سال میں ایک مرتبہ یا دو مرتبہ دی جاتی ہے، لیکن عام طور پر یہ ایک مقرر وقت پر دی جاتی ہے۔اور اس پر حدیث میں ان دونوں کا یہ قول بھی دلالت کرتا ہے: **قبل حلول الاجل**۔ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ اس کے باوجود بھی اس میں ایک قسم کی جہالت پائی جاتی ہے۔جیسا کہ ہمارے زمانے میں اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

(امام طیبیؒ) فرماتے ہیں کہ حضرت زیدؓ کے فعل کو قیاس کی وجہ سے ترجیح دینا مشکل ہے، چونکہ قیاس اور حضرت زیدؓ کے قول کے درمیان جامعیت اور مناسبت میں بعد ہے۔اور اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ حضرت عائشہؓ کا قول حضرت زید کے فعل کے مقابلے میں راجح ہے۔اور اس روایت کی وجہ سے بھی۔احمد، ابوداؤد، نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "**اذا تبايعتم العينة واخذتم اذ ناب البقر' ورضيتم بالررع، وتركتم الجهاد، سلط الله عليكم ذلا، لا ينزعه حتى ترجعوا الى دينكم**"۔یعنی کہ جب تم بیع عینہ کرنے لگو، گائیوں کی دم پکڑ لو گے' اور کھیتی پر راضی ہو جاؤ گے اور جہاد کو چھوڑ دو گے تو اللہ پاک تم پر ذلت مسلط کر دے گا اور اس وقت تک تم سے نہیں ہٹائے گا جب تک تم اپنے دین کی طرف نہ لوٹ آؤ گے۔

العينة: عین کے فتحہ' یا کے سکون اور نون کے فتحہ کے ساتھ ہے۔اس بیع کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک شخص کسی کو سامان فروخت کر دے، معلوم ثمن کے ساتھ معلوم وقت تک، پھر اس قیمت سے کم پر خرید لے جس قیمت پر اس نے بیچا تھا۔

۲۸۱۴:**وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ جَاءَ بِلَالٌ اِلَی النَّبِیِّ ﷺ بِتَمْرٍ بَرْنِیٍّ فَقَالَ لَهُ النَّبِیُّ ﷺ مِنْ اَیْنَ هٰذَا قَالَ عِنْدَنَا تَمْرٌ رَدِیٌّ فَبِعْتُ مِنْهُ صَاعَیْنِ بِصَاعٍ فَقَالَ اَوَّهْ عَیْنُ الرِّبَا لَا تَفْعَلْ وَلٰکِنْ اِذَا اَرَدْتَ اَنْ تَشْتَرِیَ فَبِعِ التَّمْرَ بِبَیْعٍ اٰخَرَ ثُمَّ اشْتَرِبِهٖ۔** (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحح ٤٩٠/٤ الحدیث رقم ٢٣١٢۔ ومسلم فی صحیحه ١٢١٥/٣ الحدیث رقم (١٥٩٤/٩٦) والنسائی فی السنن ٢٧٣/٧ الحدیث رقم ٤٥٥٧۔

ترجمہ:"اور حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) حضرت بلالؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اچھی قسم کی کھجور لے کر تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ "یہ کہاں سے لائے ہو؟" انہوں نے عرض کیا کہ ہمارے پاس کچھ خراب کھجوریں تھیں' اس سے میں نے دو صاع کھجوریں دے کر اس کے عوض میں ایک صاع یہ (اچھی) کھجوریں لے لی ہیں"۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "افسوس! یہ تو بالکل سود ہے' ایسا نہ کرو' البتہ جب تم (اچھی کھجوریں) خریدنا چاہو تو (یہ طریقہ اختیار کرو کہ پہلے) اپنی (خراب) کھجوریں (درہم یا روپے کے عوض) فروخت کر دو پھر ان درہموں یا روپیوں کے ذریعے اچھی کھجوریں خریدو"۔(بخاری و مسلم)

تشریح: **برنی**: با کے فتحہ اور راء کے سکون کے ساتھ ہے اور آخر میں یا مشددہ ہے۔عمدہ کھجور کو کہتے ہیں۔

ردی ء: "**فعیل**" کے وزن پر "رداء ۃ" سے مشتق ہے، اس میں ہمزہ بھی پڑھا جاتا ہے "ردی ء" اور ادغام کے ساتھ "ردی

'' بھی پڑھا جاتا ہے دغام کے ساتھ مشہور ہے۔

اوہ : اصول معتمدہ میں ہمزہ کے فتحہ' واؤ کی تشدید اور ھا کے سکون کے ساتھ ہے۔ یہ کلمہ حسرت اور ندامت کیلئے کسی کو تکلیف اور ملامت پہنچنے کے وقت استعمال ہوتا ہے۔ بعض نسخوں میں واؤ کے سکون اور ھاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ نہایہ میں ہے کہ آدمی یہ کلمہ ہے تکلیف اور ورد کے وقت کہتا ہے۔ یہ واؤ کے سکون اور ھاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور کبھی واؤ کو الف سے تبدیل کرتے ہیں، اور کہتے ہیں: ''**آہ من کذا**'' اور کبھی اس کو واؤ کی مشددہ کے کسرہ اور ھاء کے سکون کے ساتھ بولتے ہیں۔ اور بعض واؤ کے فتحہ اور تشدید کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ **عین الربا** تاکید اور تشدید کیلئے مکرر ذکر کیا ہے۔

یہ حدیث بھی پہلے والی حدیث کی طرح صریح ہے اس حیلہ کے جواز پر جس کے امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ قائل ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ آپ نے ان کو حکم دیا ردی کھجور کے فروخت کرنے کا دراہم کے ساتھ اور ان دراہم سے عمدہ کھجور خریدنے کا، آپ کے اس حکم، اس کی کوئی تفصیل نہیں ہے کہ دوبارہ اسی مشتری سے خریدے یا کسی اور سے، بلکہ کلام کے سیاق سے ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد وہی ہے جو اس مشتری کے ذمہ تھا، ورنہ تو آپ اس کو بیان کرتے، اس لئے کہ گفتگو کے ایسے مواقع میں تفصیل کو ترک کرنا، بات کے عموم پر دلالت کرتا ہے۔ (ذکرہ ابن الملک)

۲۸۱۵: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ جَآءَ عَبْدٌ فَبَايَعَ النَّبِيَّ ﷺ عَلَى الْهِجْرَةِ وَلَمْ يَشْعُرْ اَنَّهٗ عَبْدٌ فَجَاءَ سَيِّدُهٗ يُرِيْدُهٗ فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ ﷺ بِعْنِيْهِ فَاشْتَرَاهُ بِعَبْدَيْنِ اَسْوَدَيْنِ وَلَمْ يُبَايِعْ اَحَدًا بَعْدَهٗ حَتّٰى يَسْاَلَهٗ اَعَبْدٌ هُوَ اَوْ حُرٌّ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۱۲۲۵/۳ الحدیث رقم (۱۲۳۔ ۱۶۰۲)۔ والترمذی فی السنن ۵۴۰/۳ الحدیث رقم ۱۲۳۹۔ وابن ماجه ۹۵۸/۲ الحدیث رقم ۲۸۶۹۔

ترجمہ: ''اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ایک غلام نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے آپ ﷺ سے ہجرت پر بیعت کی (یعنی اس نے آپ ﷺ سے عہد کیا کہ میں اپنے وطن کو چھوڑ کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر باش رہوں گا) حالانکہ آپ ﷺ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ غلام ہے (کچھ دنوں کے بعد) جب اس کا مالک اس کو تلاش کرتا ہوا آیا تو نبی کریم ﷺ نے اس سے فرمایا کہ ''اس غلام کو میرے ہاتھ بیچ دو''۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس غلام کو دو سیاہ فام غلاموں کے عوض خرید لیا اور پھر اس کے بعد آپ ﷺ کسی شخص سے بیعت نہیں لیتے تھے یہاں تک کہ یہ معلوم نہ کرلیں کہ وہ غلام ہے یا آزاد''۔ (مسلم)

تشریح: قوله :فبایع النبی صلی الله علیه وسلم علی الهجرة : ''**بایع**'' **عاهد** کے معنی کو متضمن ہے، اس لئے اس کو ''علی'' کے ساتھ متعدی کیا۔

فجاء سیده یریده : اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: اس کو تلاش کر رہا تھا، یا اس سے خدمت لینا چاہتا تھا۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں آپ ﷺ کے مکارم اخلاق اور آپ کے احسان عام کا ذکر ہے، کہ آپ نے اس کو ناپسند کیا کہ اس غلام کو ناکام و نامراد واپس لوٹا دیا جائے جس نے ہجرت کرنے اور آپ ﷺ کی صحبت میں رہنے کا ارادہ کیا تھا۔

قوله :فاشتراہ بعبدین أسودین :

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو چیزیں مال ربا میں داخل نہیں ان کا لین دین اس طرح کرنا کہ ایک طرف کم اور دوسری طرف زیادہ ہو جائز ہے۔ شرح السنہ میں لکھا ہے کہ علماء نے اسی بنیاد پر یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ ایک جانور دو جانوروں کے بدلے میں دست بدست لینا' دینا جائز ہے خواہ دونوں طرف سے ایک ہی جنس کے جانور ہوں یا دو جنس کے۔

رافع بن خدیج نے ایک اونٹ کو دو اونٹوں کے بدلے خریدا، پس ایک اونٹ اس کو (اسی وقت) دے دیا اور کہا کہ دوسرا ان شاء اللہ کل تیرے پاس لاؤں گا۔ سعید بن المسیبؒ کے ہاں اگر دونوں جانور ماکول اللحم ہوں اور ذبح کرنے کیلئے خریدے جا رہے ہوں تو اس

صورت میں زیادتی کے ساتھ ان کا لین دین جائز نہیں ہے، اگر چہ جنس مختلف ہو۔

اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ آیا جانور کا جانور کے بدلے میں ادھار لین دین جائز ہے یا نہیں؟ چنانچہ صحابہؓ میں سے ایک جماعت اس کے عدم جواز کی قائل تھی، کہ نبی ﷺ نے جانور کو جانور کے بدلے ادھار فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے۔ خطابیؒ فرماتے ہیں کہ اس نہی کی توجیہ میرے ہاں یہ ہے کہ آپ نے اس بیع سے منع فرمایا جس میں دونوں طرف سے ادھار ہو، چونکہ یہ بیع الکالئ بالکالئ کے قبیل سے ہو جائے گا جو کہ نا جائز ہے' اور دلیل عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کا قول ہے جو اس باب کے آخر میں آ رہا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ حیوان کو حیوان کے بدلے ادھار فروخت کرنا اس وقت منع ہے کہ جب دونوں طرف سے ادھار ہو، اور اس سے دونوں حدیثیں جمع ہو جاتی ہیں۔

اور بعض صحابہ نے اس کی اجازت دی ہے، اور یہ منقول ہے' حضرت علیؓ اور ابن عمر ؓ سے اور یہی امام شافعیؒ کا قول ہے، اور انہوں نے دلیل پکڑی ہے۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص کی روایت سے کہ نبی ﷺ نے ان کو لشکر کی تیاری کا حکم دیا، پس اونٹ ختم ہو گئے چنانچہ آپ نے ان کو حکم دیا کہ صدقہ کے اونٹوں میں سے لے لیں وہ ایک اونٹ دو اونٹوں کے بدلے لے رہے تھے۔ اور اس حدیث میں حیوان میں بیع سلم کے جواز کی دلیل بھی ہے۔

اعبد هو او حر : ان الفاظ کی زیادتی مسلم حمیدی اور جامع الاصول میں نہیں ہے، لیکن شرح السنہ میں ''او حر'' کے لفظ کے اور مصابیح کے بعض نسخوں میں ''ام حر'' ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں یہاں لفظ ''او'' کا بیان کے لئے ہونا زیادہ اچھا ہے، اس لئے کہ ''ام'' وہاں لایا جاتا ہے کہ جہاں دو امور میں سے کوئی ایک ثابت ہو، لیکن ان کے تعین میں تردد ہو، اور ''او'' نفس ثبوت کے بارے میں سوال کیلئے آتا ہے، **اى عبدنيته ثابتة او حريته**۔ یعنی کہ اس کا غلام ہونا ثابت ہے، یا آزاد ہونا۔

ہم جنس اشیاء کا تبادلہ

۲۸۱۶: وَعَنْهُ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ الصُّبْرَةِ مِنَ التَّمْرِ لَا يُعْلَمُ مَكِيْلَتُهَا بِالْكَيْلِ الْمُسَمّٰى مِنَ التَّمْرِ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ١١٦٢/٣ الحديث رقم (٤٢۔ ١٥٣٠)۔ والنسائى فى السنن ٢٦٩/٧ الحديث رقم ٤٥٤٧۔

ترجمہ: ''اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کھجور کے معلوم شدہ وزن کے ڈھیر کے عوض کھجوروں کے غیر معلوم شدہ وزن کے ڈھیر کے عوض بیچنے سے منع فرمایا ہے۔ (مسلم)

تشریح: الصبرة : صاد کے ضمہ اور با کے سکون کے ساتھ غلے کے ڈھیر کو کہتے ہیں جیسے مٹی کا ڈھیر ہوتا ہے۔

من التمر : یہ حال ہے'' **بيع الصبرة**'' سے۔

لا يعلم مكيلتها : یہ حال ثانی ہے۔ **بالكيل** : '' **البيع**'' کے متعلق ہے۔ **المسمى** : صفت ہے'' **الكيل**'' کی۔

من التمر : ''المسمی'' سے حال ہے۔ یعنی آپؐ نے لین دین کی اس صورت سے منع فرمایا ہے کہ ایک طرف تو کھجوروں کی غیر معین مقدار کا ڈھیر ہو اور دوسری طرف کھجوروں کی ایک معین مقدار کا ڈھیر ہو، اور جنس ایک ہو۔ شرح السنہ میں ہے اموال ربو یہ اپنی جنس کے بدلے اٹکل سے فروخت کرنا جائز نہیں ہے، چونکہ حالت عقد میں برابری مجہول ہے' پس اگر وہ اس طرح کہے، میں آپ کے ساتھ بیچ رہا ہوں اپنی گندم کا یہ آپ کی اس گندم کے ڈھیر کے بدلہ جو اس کے مقابل ہو یا کہے کہ اپنے دینار کو آپ کے اس دینار کے بدلہ میں جو اس کے برابر ہو، تو یہ جائز ہے، جب دونوں طرف سے اس مجلس میں قبضہ ہو، اور بڑے دینار اور بڑے ڈھیر کی زیادتی بائع کے لئے ہو گی' ہاں جب جنس مختلف ہو تو پھر بعض کو بعض کے بدلے اٹکل کے ساتھ فروخت کرنا جائز ہے، اس لئے کہ ان میں کمی بیشی حرام نہیں ہے۔

سونے کے خرید وفروخت کا مسئلہ

۲۸۱۷: وَعَنْ فَضَالَةَ بْنِ اَبِیْ عُبَیْدٍ قَالَ اشْتَرَیْتُ یَوْمَ خَیْبَرَ قِلَادَةً بِاثْنَیْ عَشَرَ دِیْنَارًا فِیْهَا ذَهَبٌ وَخَرَزٌ فَفَصَّلْتُهَا فَوَجَدْتُ فِیْهَا اَکْثَرَ مِنِ اثْنَیْ عَشَرَ دِیْنَارًا فَذَکَرْتُ ذٰلِكَ لِلنَّبِیِّ ﷺ فَقَالَ لَا تُبَاعُ حَتّٰی تُفَصَّلَ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۱۲۱۳/۳ الحدیث رقم (۱۵۹۱/۹۰)۔ وابوداوٗد فی السنن ۶۴۹/۳ الحدیث رقم ۳۳۵۲۔ والترمذی فی ۵۵۶/۳ الحدیث رقم ۱۲۵۵۔ والنسائی فی ۲۷۹/۷ الحدیث رقم ۴۵۷۳۔ واحمد فی المسند ۲۱/۶۔

ترجمہ: ''اور حضرت فضالہ بن عبیدؓ کہتے ہیں کہ میں نے خیبر کے دن ایک ہار بارہ دینار میں خریدا جو سونے کا تھا اور اس میں نگینے جڑے ہوئے تھے، پھر جب میں نے اسے کھول دیا (یعنی نگینوں کو سونے سے نکال ڈالا) تو وہ سونا بارہ دینار سے زائد قیمت کا پایا، میں نے اس کا ذکر نبی کریم ﷺ سے کیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (ایسا ہار) اس وقت تک فروخت نہ کیا جائے جب تک کہ سونا اور نگینہ الگ الگ نہ کر لئے جائیں''۔ (مسلم)

تشریح: **قلادۃ** : قاف کے کسرہ کے ساتھ۔ وہ چیز جس کو گردن میں لٹکایا جائے۔ **خرز** : خاء معجمہ اس کے بعد راء اور پھر زاء ہے۔ **فصلتھا** :تشدید کے ساتھ **فقال :لا تباع** : یہاں نفی بمعنی نہی ہے۔

حتی تفصل : شرح السنہ میں ہے کہ بعض روایات میں ''**حتی تمیز**'' کے الفاظ ہیں۔ اور مراد یہ ہے کہ عقد میں نگینے اور سونے کی تمیز ہو جائے، نہ کہ بعض مبیع کو بعض سے الگ کرنا، اور اس میں دلیل ہے، کہ اگر کوئی شخص اموال ربویہ میں سے کوئی چیز اس کی جنس کے بدلے فروخت کرے یا ان دونوں کے ساتھ یا کسی ایک کے ساتھ کوئی اور چیز بھی ہو، مثال کے طور پر اگر وہ فروخت کرتا ہے ایک درہم اور ایک کپڑا دو ۲/ درہموں یا دو دیناروں کے بدلے، یا ایک درہم اور ایک کپڑا دو درہم اور ایک کپڑے کے بدلے، تو یہ جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ معاملہ کی طرفین میں سے کسی ایک طرف میں اختلاف جنس یہ لازم کرتا ہے اس کے مقابل کی تقسیم کو اس پر باعتبار قیمت کے۔ اور قیمت، اندازہ ہے اور یہ جہل معرفت کا فائدہ نہیں دیتا (انتہی) نہی کی علت سونے کا سونے کے مقابلے میں ہونا ہے اور فضل ربا کے حصول کو لازم کرنے والی ہے۔ بخلاف اس صورت کے کہ جب مبیع کا سونا قیمت کے سونے سے کم ہو، چونکہ اس صورت میں زیادت کا سونے کے علاوہ کے مقابلے میں ہونا متعین ہو، جیسا کہ ہمارے مذہب کے قواعد کا تقاضا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ کے ہاں درہم کو آدھے درہم اور کچھ پیسوں کے بدلے یا کچھ کھانے کے بدلے فروخت کرنا جائز ہے، چونکہ یہ ضرورت کے درجہ میں ہے اور اس سے زائد کو وہ منع کرتے ہیں۔ (انتہیٰ)

ابن الہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اشیاء خورد ونوش کو فروخت کرنا جائز ہے، کیل کر کے بھی اور اٹکل سے بھی۔ یعنی بغیر ناپ وتول کے بلکہ صرف ڈھیر دکھا کر فروخت کرنا بھی جائز ہے۔

اور ''جزف'' لینے میں زیادتی کے معنی کیلئے مستعمل ہے جیسا کہ عرب کا قول ہے: **جزف له فی الکیل اذا کثر**۔ اور اس کا مرجع مساهلة ہے۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ اٹکل سے کسی چیز کو فروخت کرنا یہ مقید ہے ان اموال کے ساتھ جس میں ربا کا حکم جاری نہیں ہوتا جب اس کو اس کی جنس کے بدلے فروخت کیا جائے، باقی اموال ربوبہ جب ان کو فروخت کیا جائے اس کی جنس کے بدلے تو وہ اٹکل سے جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں ربا کا احتمال ہے، اور یہ حقیقی ربا کی طرح منع ہے۔ ابن الہمام فرماتے ہیں کہ یہ بھی مقید ہے اس کے ساتھ جو کیل کے تحت داخل ہو، اور جو کیل کے تحت داخل نہ ہو جیسے ایک لپ کو دو لپ کے بدلے فروخت کرنا تو یہ جائز ہے۔ فتاویٰ صغریٰ میں امام محمد سے نقل کیا ہے کہ وہ ایک کھجور کو دو کے بدلے فروخت کرنے کو ناپسند کرتے تھے اور فرمایا کہ جو کثیر میں حرام ہے وہ قلیل میں بھی حرام ہے۔

الفصل الثانی :

سود کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی

۲۸۱۸:عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَیَاْتِیَنَّ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ لَا یَبْقٰی اَحَدٌ اِلَّا اٰکِلُ الرِّبَا فَاِنْ لَّمْ یَاْکُلْهُ اَصَابَهٗ مِنْ بُخَارِهٖ وَیُرْوٰی مِنْ غُبَارِهٖ. (رواہ ابو داود والنسائی وابن ماجۃ)

اخرجه ابوداوٗد فی السنن ۲۷۴/۷ الحدیث رقم ۴۵۶۰ وابن ماجه فی ۷۵۷/۲ الحدیث رقم ۲۲۵۴۔

ترجمه: ''حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا جب سود کھانے والوں کے علاوہ اور کوئی باقی نہیں رہے گا اور اگر کوئی شخص سود نہیں بھی کھائے گا تو اس تک سود کا اثر ضرور پہنچے گا۔ نیز (بعض کتابوں میں لفظ من بخارہ کی بجائے) من غبارہ (یعنی اس تک سود کا گرد وغبار ضرور پہنچے گا) نقل کیا گیا ہے''۔ (احمد'ابوداؤد'نسائی'ابن ماجہ)

تشریح: قوله :لا یبقیٰ احد الا اٰکل الربا : ''آکل'' صیغہ اسم فاعل ہے، یا ماضی کا صیغہ ہے، اور مستثنیٰ ''احد'' کی صفت ہے اور مستثنیٰ منہ محذوف ہے۔ اور تقدیری عبارت یوں ہے: ولا یبقیٰ احد منهم له وصف کونه اٰکل الربا۔ پس یہ کنایہ ہے کہ سود لوگوں میں اس طرح پھیل جائے گا کہ ہر ایک سود خور ہوگا۔

اصابه من بخاره : اور ایک روایت میں ''من غبارہ'' ہے۔ یعنی اس تک سود کا اثر پہنچے گا اس طور پر کہ وہ سودی معاملے کا گواہ ہوگا، یا لکھنے والا ہوگا، یا سود خور کی ضیافت کو کھانے والا ہوگا، یا اس کا ہدیہ لینے والا ہوگا، یعنی اگر کوئی شخص سود کی حقیقت سے محفوظ ہوگا تو اس کے اثر سے محفوظ نہ رہے گا، اگرچہ وہ بہت کم ہی کیوں نہ ہو۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں مستثنیٰ منہ تمام اوصاف کو عام اور شامل تھا، تو تمام اوصاف کی نفی فرمادی' سوائے کھانے کے۔ ہم بہت سارے لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ انہوں نے حقیقی طور پر سود نہیں کھایا تو چاہیے کہ اس سے مراد عموم مجاز ہو۔ پس یہ شامل ہوگا حقیقت اور مجاز دونوں کو' اسی لئے اس کے بعد اس کی تفصیل ذکر فرمائی کہ اگر وہ حقیقتاً نہیں کھائے گا مجازاً' تو بہرحال کھائے گا ہی۔ ''بخار'' اور ''غبار'' کو بطور استعارہ لائے ہیں' ربا کو آگ اور مٹی سے تشبیہ دی ہے۔

مختلف الجنس چیزوں کا دست بدست باہمی لین دین

۲۸۱۹:وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا تَبِیْعُوْا الذَّهَبَ بِالذَّهَبِ وَ لَا الْوَرِقَ بِالْوَرِقِ وَلَا الْبُرَّ بِالْبُرِّ وَ لَا الشَّعِیْرَ بِالشَّعِیْرِ وَلَا التَّمْرَ بِالتَّمْرِ وَلَا الْمِلْحَ بِالْمِلْحِ اِلَّا سَوَاءً بِسَوَاءٍ عَیْنًا بِعَیْنٍ یَدًا بِیَدٍ وَلٰکِنْ بِیْعُوْا الذَّهَبَ بِالْوَرِقِ وَالْوَرِقَ بِالذَّهَبِ وَالْبُرَّ بِالشَّعِیْرِ وَالشَّعِیْرَ بِالْبُرِّ وَالتَّمْرَ بِالْمِلْحِ وَالْمِلْحَ بِالتَّمْرِ یَدًا بِیَدٍ کَیْفَ شِئْتُمْ. (رواہ الشافعی)

اخرجه النسائی فی السنن ۲۸۴/۷ الحدیث رقم ۴۵۶۰ وابن ماجه فی ۷۵۷/۲ الحدیث رقم ۲۲۵۴۔

ترجمه: ''اور حضرت عبادہ بن صامتؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سونا سونے کے عوض' چاندی چاندی کے عوض' گندم گندم کے عوض' جو جو کے عوض' کھجور کو کھجور کے عوض اور نمک کو نمک کے عوض فروخت نہ کرو مگر یہ کہ وہ مساوی اور دست بدست ہوں۔ جس طرح چاہو خرید وفروخت کرو۔ (نسائی)

تشریح: یدا بید : یعنی مجلس میں قبضہ کیا گیا ہو جسموں کی جدائی سے پہلے،

کیف شئتم : امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ لفظ لکن کا حق یہ ہے کہ دو ایسے کلاموں کے درمیان واقع ہو، جو نفی اور اثبات کے اعتبار سے

متغایر ہو، ای لاتبیعوا النقدین ولا المطعومات اذا کانا متفقین 'لکن بیعو هما اذا اختلفا۔ یعنی تم نقدی اور اشیاء خورد ونوش کو نہ بیچو جب وہ جنس کے اعتبار سے متفق ہوں' لیکن ان کو بیچو جب وہ جنس کے اعتبار سے مختلف ہوں، اور اس قول میں ''الا سواء بسواء'' کا استثناء بیان رخصت کے طور پر ہے۔

اور ''یدا بید'' یہ تاکید ہے ''عینا بعین'' کے لئے ،جیسا کہ حدیث سابق میں ''سواء بسواء'' تاکید تھا ''مثلاً بمثل'' کیلئے۔

خشک اور تازہ پھلوں کا تبادلہ

۲۸۲۰: وَعَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَ قَّاصٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ سُئِلَ عَنْ شِرَاءِ التَّمْرِ بِالرُّطَبِ فَقَالَ اَیَنْقُصُ الرُّطَبُ اِذَا یَبِسَ فَقَالَ نَعَمْ فَنَهَاهُ عَنْ ذَالِكَ

اخرجه ابو د اود فی السنن ٣/٦٥٤ الحدیث رقم ٣٣٥٩، والترمذی فی ٣/٥٢٨ الحدیث رقم ١٢٢٥، والنسائی فی ٧/٢٦٨ الحدیث رقم ٤٥٤٥،وابن ماجه ٢/٧٦١ الحدیث رقم ٢٢٦٤ومالك فی الموطأ٢/٦٢٤ الحدیث رقم ٢٢من کتاب البیوع واحمد فی المسند ١/١٧٥۔

ترجمہ: ''اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا' آپ ﷺ سے تازہ کھجور کے عوض (خشک) کھجور خریدنے کا مسئلہ دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''کیا تازہ کھجور خشک ہونے کے بعد کم ہو جاتی ہے''۔ عرض کیا گیا کہ جی ہاں! چنانچہ آپ ﷺ نے اس طرح لین دین سے منع فرمایا''۔

(مالک' ترمذی' ابوداؤد' نسائی' ابن ماجہ)

تشریح: ''ینقص'' نقص سے مشتق ہے، فعل لازم ہے، اور متعدی بھی جائز ہے۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں استفہام سے مراد قضیہ کی حقیقت جاننا نہیں ہے (یعنی کہ وہ کم ہوتا ہے یا نہیں) اس لئے کہ یہ تو بالکل واضح سی بات ہے جو وضاحت سے مستغنیٰ ہے۔ بلکہ استفہام سے مراد تنبیہ کرنی ہے کہ خشک ہونے کی حالت میں مماثلت شرط ہے۔ پس تر اور خشک کھجور کا تماثل کافی نہیں ہے تر ہونے کی حالت میں اور نہ خشک فرض کرنے کی حالت میں' کیونکہ یہ تو صرف ایک تخمینہ اور اندازہ ہے اس میں کوئی تعین نہیں ہے، پس اس حالت میں ایک کو دوسرے کے بدلے فروخت کرنا جائز نہیں ہے' اور یہی اکثر علما کا مذہب ہے۔ امام ابوحنیفہؒ نے تر کھجور کو خشک کے بدلے فروخت کرنے کو جائز قرار دیا ہے جب کہ وہ کیل میں برابر ہوں۔ اور حدیث کو ادھار بیچنے پر محمول کیا ہے۔ اس لئے کہ اسی راوی سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے تر کھجوروں کو خشک کے بدلے ادھار فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (انتہٰی) اور اسی پر قیاس ہے، انگور کو بیچنا کشمش کے بدلے میں اور تر گوشت کو بیچنا خشک گوشت کے بدلے میں۔

گوشت اور جانور کے باہمی تبادلے کا مسئلہ

۲۸۲۱: وَعَنْ سَعِیْدِ بْنِ الْمُسَیَّبِ مُرْسَلاً اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ نَهٰی عَنْ بَیْعِ اللَّحْمِ بِالْحَیْوَانِ قَالَ سَعِیْدٌ کَانَ مِنْ مَیْسِرِ اَهْلِ الْجَاهِلِیَّةِ.

اخرجه مالك فی الموطأ٢/٦٥٥ الحدیث رقم ٦٤من کتاب البیوع۔

ترجمہ: ''اور حضرت سعید ابن مسیب بطریق ارسال نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جانور کے عوض میں گوشت کا لین دین کرنے سے منع فرمایا ہے۔ نیز حضرت سعیدؒ کا بیان ہے کہ یہ (جانور کے عوض گوشت کا لین دین) زمانہ جاہلیت کے جوئے کی ایک قسم تھی۔ (شرح السنۃ)

تشریح: قوله : نهٰی عن بیع اللحم بالحیوان : حرکات کے ساتھ ہے، ''حیوان'' اصل ''حییان'' تھا جیسا کہ قاموس

میں ہے، مراد نوع حیوان ہے۔میسر: سین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔قاموس میں ہے کہ "میسر" یا نرد سے کھیلنے کو کہتے ہیں یا ہر جوے کو کہتے ہیں۔اور سین کے فتحہ کے ساتھ بھی ہے۔

مراد یہ ہے کہ ان سب میں لوگوں کے مال ناجائز طریقے سے کھائے جاتے ہیں۔اگرچہ کھانے کا طریقہ ان میں مختلف ہوتا ہے، کہ وہ کھیل کے ساتھ کھایا جاتا ہے، اور یہ ایک عقد اور کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔خطابی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ جب حیوان کی بیع حیوان کے بدلے ادھار منع ہے تو یہ ہے یہ امام شافعیؒ کے مذہب کے علاوہ دیگر مذاہب پر مبنی ہے۔اس لئے کہ امام شافعی رحمہ اللہ کے ہاں حیوان میں ربا کا حکم جاری ہی نہیں ہوتا، جیسا کہ پہلے گزرا۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کہ "میسر" یسر سے مشتق ہے۔اس لئے کہ اس میں کسی آدمی کا مال آسانی اور سہولت کے ساتھ لیا جاتا ہے بغیر کسی کوشش اور تھکاوٹ کے، یا "یسار" سے مشتق ہے، اس لئے کہ یہ اس کے یسار (تونگری) کو سلب کر لیتا ہے۔

فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جانور کے عوض گوشت کا لین دین حرام ہے، خواہ گوشت اس جانور کی جنس کا ہو یا کسی اور جنس کے جانور کا ہو، نیز چاہے وہ جانور کھایا جاتا ہو، یا نہ کھایا جاتا ہو۔امام شافعیؒ کا یہی قول ہے۔(انتہیٰ)

امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے ہاں یہ جائز ہے، اور حدیث میں ممانعت کا تعلق دراصل گوشت اور جانور کے باہم لین دین کی اس صورت سے ہے کہ جب لین دین دست بدست نہ ہو بلکہ ایک طرف سے نقد اور دوسری طرف سے ادھار ہو، اس لئے کہ جو بعد میں دے گا اس کا ضبط ممکن نہیں ہے۔

۲۸۲۲: وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ نَهٰى عَنْ بَيْعِ الْحَيَوَانِ بِالْحَيَوَانِ نَسِيْئَةً.

(رواه الترمذی وابوداود والنسائی وابن ماجه والدارمی)

اخرجه ابوداود فی السنن ۵۳۸/۳ الحدیث رقم ۱۲۳۷، والترمذی فی ۵۳۸/۳ الحدیث رقم ۱۲۳۷، والنسائی فی ۲۹۲/۷ الحدیث رقم ۶۶۲۰، وابن ماجه فی ۷۶۳/۲ الحدیث رقم ۲۲۷۰، والدارمی فی ۳۳۱/۲ الحدیث رقم ۲۵۶۴، واحمد فی المسند ۱۲/۵۔

ترجمہ: "اور حضرت سمرہ بن جندبؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے جانور کو جانور کے عوض ادھار لین دین کرنے سے منع فرمایا ہے"۔(ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، دارمی)

تشریح: نسیئة: نون پر فتحہ، سین پر کسرہ یاء پر سکون پھر ہمزہ، اور آخر میں ھاء ہے۔اس کی تحقیق پہلے گزر چکی ہے۔

غیر مثلی چیز کے عوض لینے کا مسئلہ

۲۸۲۳: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ اَمَرَهٗ اَنْ يُّجَهِّزَ جَيْشًا فَنَفِدَتِ الْاِبِلُ فَاَمَرَهٗ اَنْ يَّاْخُذَ عَلٰى قَلَائِصِ الصَّدَقَةِ فَكَانَ يَاْخُذُ الْبَعِيْرَ بِالْبَعِيْرَيْنِ اِلٰى اِبِلِ الصَّدَقَةِ. (رواه ابوداود)

اخرجه ابوداود فی السنن ۶۵۲/۳ الحدیث رقم، واحمد فی المسند ۱۷۱/۲۔

ترجمہ: "اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کے بارے میں مروی ہے کہ (ایک غزوہ کے موقع پر) نبی کریم ﷺ نے ان کو حکم دیا کہ لشکر کا سامان درست کرلو۔(یعنی لشکر میں شامل ہونے کے لئے سواری اور ہتھیار وغیرہ تیار رکھو) چنانچہ اونٹ کم پڑ گئے (یعنی جتنے اونٹ تھے وہ اکثر لوگوں میں تقسیم ہو گئے اور کچھ لوگ کہ جن میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ بھی شامل تھے اونٹ حاصل نہ کر سکے) تو آپ ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ "وہ زکوٰۃ کے اونٹ کے عوض میں اونٹ (بطور قرض) لے لیں"۔چنانچہ وہ زکوٰۃ کے اونٹ آنے تک (کے وعدے پر) دو اونٹ کے عوض ایک اونٹ لیا کرتے تھے"۔(ابوداؤد)

تشریح: نفدت: نون کے فتحہ، فا کے کسرہ کے اور دال کے ساتھ ہے، بمعنی "فنیت" اور "نقصت"۔اور مصابیح کے نسخوں

میں ''فبعدت'' ہے باء کے فتحہ اور عین کے ضمہ کے ساتھ معنی دونوں کا قریب ہے۔

''قلائص'' جمع ''قلوص'' کی ہے۔ جوان اونٹ کو کہتے ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ انہوں نے اونٹ قرض لے کر لشکر کو مکمل کیا، اور اس کی ادائیگی زکوٰۃ کے اونٹوں سے کی۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں دو اشکال ہیں:

(۱) کہ حیوان کو حیوان کے بدلے ادھار فروخت کرنا۔ (۲) مدت کا معلوم نہ ہونا۔ (انتہیٰ)

ابن الملک فرماتے ہیں کہ ان کے ہاں مدت معلوم ہوتی تھی۔ اور یہ حدیث حیوان میں بیع سلم کے جواز پر دلالت کر رہی ہے زیادتی کے ساتھ، اور یہی امام شافعی اور امام احمد کا مسلک ہے۔ ہمارے بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس حدیث اور حضرت سمرہ کی پچھلی حدیث میں تطبیق ان حضرات کے ہاں جو حیوان میں سلم کے جواز کے قائل ہیں، یہ ہے کہ ممانعت اس صورت پر محمول ہے کہ جب دونوں طرف سے جانور ادھار ہوں، اور جو حضرات جانور میں بیع سلم کے جواز کے قائل نہیں ان کے ہاں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ حیوان کو حیوان کے بدلے ادھار فروخت کرنا یہ ربا کی حرمت سے پہلے تھا، بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ (انتہیٰ)

دونوں طرح سے ادھار ہونے کی صورت یہ ہو گی کہ ایک شخص کہے میں نے آپ کو گھوڑا بیچا جس کے اوصاف یہ ہیں، گھوڑے یا اونٹ کے بدلے، جس کے اوصاف یہ یہ ہیں۔

الفصل الثالث:

اُدھار لین دین میں سود کا مسئلہ

۲۸۲۴: عَنْ اُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ الرِّبَا فِی النَّسِيْئَةِ (وَفِی رِوَايَةٍ) قَالَ لَارِبَا فِيْمَا كَانَ يَدًا بِيَدٍ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۸۱/٤ الحدیث رقم ۲۱۷۹، ومسلم فی ۱۲۱۸/۳ الحدیث رقم (۱۰۲-۱۵۹۶) والنسائی فی السنن ۲۷۱/۷ الحدیث رقم ٤۵۸۰، وابن ماجه فی ۷۵۷/۲ الحدیث رقم ۲۲۵۷، والد ار می فی ۳۳٦/۲ الحدیث رقم ۲۵۸۰ واحمد فی المسند ۲۰۰/۵۔

ترجمہ: ''حضرت اسامہ بن زیدؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ادھار لین دین میں سود ہے''۔ ایک اور روایت میں یوں ہے کہ اس لین دین میں سود نہیں جو دست بدست ہو''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: الربا: الف لام عہد کیلئے ہے، مراد وہ ربا ہے جس کا ہونا معلوم ہے، نقدی میں، اشیاء خورد و نوش میں، کیلی اور موزونی اشیاء میں اس اختلاف کے ساتھ جو ثابت ہے۔

اس لفظ کو امام طیبی نے ذکر کیا ہے۔

لا ربًا: تنوین کے ساتھ بھی ہے اور بغیر تنوین کے بھی ہے۔ پہلی صورت میں لاء ملغا ہو گا اور مابعد مبتدا ہے اور دوسری صورت میں لاء کا اسم ہے۔

کان یدا بید: امام طیبی فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ اتحاد جنس کی صورت میں برابری کی شرط کے ساتھ، اور کمی بیشی کی صورت میں اختلاف الجنس کی شرط کے ساتھ۔ (انتہیٰ)

حاصل یہ ہے کہ سود کی صورت نہیں ہو گی اگر ایسی دو چیزوں کا باہمی تبادلہ کیا جائے جو ایک جنس کی ہوں اور برابر سرابر ہوں، نیز دونوں فریقین اپنی اپنی چیز اسی مجلس میں اپنے اپنے قبضے میں کر لیں، یہ جائز ہے۔ اور اگر دونوں چیزیں ایک جنس کی نہ ہوں تو پھر کمی بیشی

کے ساتھ بھی یہ معاملہ جائز ہوگا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہاں حصر سے مراد حصر اضافی ہے، اور قرینہ اس پر یہ ہے کہ یہ اس شخص کے سوال کے جواب میں فرمایا ہے جس نے دو ۲/۲ جنسوں میں کمی بیشی کے بارے میں پوچھا تھا، تو گویا کہ اس کو یہ کہا کہ جس چیز کے بارے میں تم نے پوچھا ہے اس میں سود نہیں ہے، بلکہ سود تو ادھار کی صورت میں ہے۔ لہٰذا یہ منافی نہیں ہے اس کے کہ مثلین میں کمی بیشی کی صورت میں اور ادھار جو زمانہ جاہلیت میں مشہور تھا، میں بھی ربا ہے۔

اسبیجابی فرماتے ہیں کہ علماء کا اتفاق ہے کہ جو شخص ربا نسیۂ کا منکر ہو وہ کافر ہے اور ربا فضل کے بارے میں اختلاف ہے، اس لئے کہ عبداللہ ابن عباسؓ صرف ربا نسیۂ کو ''ربا'' کہتے تھے، لیکن ان کا اس سے رجوع ثابت ہے، جب ابی بن کعب نے سختی کے ساتھ ان سے فرمایا کہ کیا تو نے رسول اللہ ﷺ سے وہ سنا ہے اور وہ دیکھا ہے جو ہم نے نہیں سنا اور نہیں دیکھا؟ اور پھر ان کے سامنے ان سب کی حرمت پر صریح حدیث بیان کی، اور فرمایا، کہ سب گواہ رہو، کہ میں اس کو حرام قرار دیتا ہوں اور اللہ کی طرف براءت کا اعلان کرتا ہوں اس سے۔ (ذکرہ ابن الملک)

سود کھانے پر وعید

۲۸۲۵: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ حَنْظَلَةَ غَسِيْلِ الْمَلَائِكَةِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ دِرْهَمُ رِبًا يَاكُلُهُ الرَّجُلُ وَهُوَ يَعْلَمُ اَشَدُّ مِنْ سِتَّةٍ وَثَلَاثِيْنَ زِنْيَةً رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالدَّارَقُطْنِيُّ وَرَوَى الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَزَادَ وَقَالَ مَنْ نَبَتَ لَحْمُهُ مِنَ السُّحْتِ فَالنَّارُ اَوْلٰى بِهٖ۔

اخرجه احمد فى المسند ٥/٢٢٥

ترجمہ: ''اور حضرت عبداللہ بن حنظلہ غسیل ملائکہ (ان کا لقب ہے ؒ) کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص سود کا ایک درہم' یہ جاننے کے باوجود کھاتا ہے کہ یہ سود ہے' تو یہ چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے بھی زیادہ سنگین گناہ ہے''۔ (احمد' دارقطنی) اس روایت کو بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے۔ نیز بیہقیؒ نے اس روایت میں حضرت ابن عباسؓ کے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ ''آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ جس شخص کا گوشت حرام مال سے پیدا ہوا ہو (یعنی جس شخص کی جسمانی نشوونما حرام مال مثلاً سود و رشوت وغیرہ سے ہوئی ہو) تو دوزخ کی آگ اس کی زیادہ حقدار ہے۔''۔

تشریح: **قولہ: وهو يعلم**: اسی طرح اگر وہ نہیں جانتا لیکن اس نے ''تعلم'' (جاننے) میں کوتاہی کی ہے۔ اس لئے کہ ائمہ کرام نے فرض عین علم میں کوتاہی کرنے والے کو عالم کے ساتھ ملایا ہے، کہ وہ (غیر عالم) گناہ میں اس (عالم) کی طرح ہوتا ہے۔

زنية: زا کے کسرہ اور نون کے سکون کے ساتھ ہے۔

ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد مبالغہ ہے، حرام کھانے پر زجر کیلئے اور حلال کے طلب پر ابھارنے کیلئے اور حقوق العباد میں کوتاہی سے بچنے کیلئے، اور چھتیس کے عدد کو بطور خاص ذکر کرنے کی حکمت شارع ہی بہتر جانتا ہے، اور ہوسکتا ہے کہ یہ سخت وعید اپنی حقیقت پر ہو، تو پس ایک مرتبہ کا سود گناہ میں چھتیس بار زنا سے زیادہ ہے۔ اس حکمت کا علم اللہ ہی کو ہے، اور کبھی وہ اپنے بعض خاص بندوں کو بھی اس حکمت سے آگاہ کر دیتا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ سخت وعید اس وجہ سے ہے کہ سود، سود خور کو برے خاتمہ کی طرف لیجاتا ہے۔ نعوذ باللہ منہ، جیسا کہ علماء نے اس حکم کو اللہ کے اس ارشاد سے اخذ کیا ہے: ﴿فان لم تفعلوا فاذنو بحرب من الله ورسوله﴾ [البقرۃ۔ ۵۹] (پھر اگر تم نہ کرو گے تو اعلان سن لو جنگ کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے)۔ اور جس شخص کے خلاف اللہ اور اس کا رسول اعلانِ جنگ کرے، یا جو شخص اللہ اور اس کے رسول سے برسر جنگ ہو، تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ پس جس شخص کی موت کا وقت قریب آجائے اور

وہ سود پر مصر ہوتو یہ شیطان کا اس کو گمراہ کرنے میں مددگار رہتا ہے یہاں تک کہ یہ شیطان کا مطیع وفرمانبردار ہو جاتا ہے اور کفر پر مرجاتا ہے، تا کہ اس کے بارے میں وہ اعلانِ جنگ ثابت ہو جائے، اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے بھی سود خور کے کفر کا خطرہ معلوم ہوتا ہے ﴿**یا ایھا الذین آمنوا لا تأکلوا الربا**﴾[آل عمران۔۱۳۱] (اے ایمان والو! سود مت کھاؤ اور اس آگ سے بچو جو کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے)۔

السحت : سین کے ضمہ اور حاء کے ضمہ کے ساتھ ہے اور سکون کے ساتھ بھی درست ہے مراد اس سے حرام ہے جو سود و رشوت اور اس کے علاوہ جس کے ساتھ بندوں کا حق متعلق ہو سب کو شامل ہے، یا اس سے بھی عام ہے۔

فالنار اولی به : ضمیر مجرور کا مرجع ''لحم'' بھی ہو سکتا ہے اور صاحب اللحم'' بھی۔ یعنی اس کے گوشت کیلئے، یا سود خور کیلئے۔ اس میں خفی اشارہ ہے وعید کے سخت اور شدید ہونے کی وجہ کی طرف، کہ ربا سے جب انسان کے بدن کی نشوونما ہوگی تو یہ انسان کو بہت سارے اور گناہوں کی طرف لے جائے گی، یا اس وجہ سے کہ ربا کی پہچان مشکل ہونے کی وجہ سے عموماً جاہل لوگ اس کو حلال سمجھنے لگ جاتے ہیں جس کی وجہ سے وہ کافر ہو جاتے ہیں، برخلاف زنا کے کہ اس کا گناہ ہونا جاہلیت اور اسلام دونوں میں معروف و مشہور ہے۔

۲۸۲۶: **وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ الرِّبَا سَبْعُوْنَ جُزْءًا اَیْسَرُهَا اَنْ یَّنْکِحَ الرَّجُلُ اُمَّهٗ۔**

اخرجه ابن ماجه فی السنن ۲/۷٦٤ الحدیث رقم ۲۲۷٤۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: سود کے گناہ کے ستر درجے ہیں اور ان میں جو سب سے کمتر درجہ ہے وہ یہ ہے جیسا کہ کوئی شخص اپنی ماں سے صحبت کرے''۔

تشریح: **سبعون جزءًا** : بعض روایات میں ''جزءا'' کے بجائے ''بابا'' اور بعض میں ''حوبا'' آیا ہے۔

ایسرھا اثمًا : کہ ایک روایت میں ''ادناھا'' ہے۔ **ان ینکح الرجل امه** اور ایک روایت میں ہے: **الربا ثلاثة وسبعون بابا ایسرھا مثل ان ینکح الرجل امه، وان اربی الربا عرض الرجل المسلم**، کہ سود کے گناہ کے تہتر درجے ہیں اور ان میں جو سب سے ادنیٰ درجہ ہے وہ ایسا ہے جیسا کہ کوئی شخص اپنی ماں سے صحبت کرے۔ اور سب سے بڑا سود مسلمان آدمی کی پردہ دری ہے، اس کو مالکؒ نے ابن مسعودؓ سے روایت کیا ہے۔

اور ایک روایت میں ہے ''**الربا اثنان وسبعون باباً ادناھا مثل اتیان الرجل امه وان اربی الربا استطالة الرجل فی عرض اخیه**'' ''سود کے بہتر درجے ہیں اور ان میں جو سب سے ادنیٰ درجہ ہے وہ ایسا ہے جیسا کہ آدمی اپنی ماں سے صحبت کرے، اور سب سے بڑا سود آدمی کا اپنے بھائی کی عزت پر ہاتھ ڈالنا ہے۔ اس کو امام طبرانی نے حضرت براء بن عازب سے روایت کیا ہے۔

ان دونوں حدیثوں میں اس بات پر دلالت پائی جاتی ہے کہ سود کے گناہ کا زنا سے زیادہ ہونا اس وجہ سے ہے کہ یہ حقوق العباد سے تعلق رکھتا ہے، اس لئے کہ زنا عام طور پر زانیہ کی رضامندی سے ہی ہوتا ہے اور اسی وجہ سے اس آیت میں زانیہ کے ذکر کو پہلے لایا ہے: ﴿**الزانیة والزانی**﴾[النور۔۲] ورنہ تو ہتک حرمت سے بڑھ کر کونسی عصمت دری ہے، اور تہمت زنا کا درجہ زنا سے کم ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

۲۸۲۷: **وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ الرِّبَا وَاِنْ کَثُرَ فَاِنَّ عَاقِبَتَهٗ تَصِیْرُ اِلٰی قُلٍّ رَوَاهُمَا ابْنُ مَاجَةَ وَالْبَیْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ وَرَوٰی اَحْمَدُ الْاَخِیْرَ۔**

اخرجه ابن ماجه فی السنن ۲/۷٦۵ الحدیث رقم ۲۲۷۹ واحمد فی المسند ۱/۳۹۵

ترجمہ: ''اور حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: سود (سے حاصل شدہ مال) خواہ کتنا ہی کثیر ہو مگر آخر کار اس میں کمی (یعنی بے برکتی) آجاتی ہے''۔ ان دونوں روایتوں کو ابن ماجہ نے اور بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے نیز دوسری روایت کو امام احمد نے بھی نقل کیا ہے''۔

تشریح: قل : قاف کے ضمہ اور لام کی تشدید کے ساتھ ہے، بمعنی فقر و ذلت۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ "القل" اور "القلة" الذل اور ذلة کی طرح ہے، مطلب ہے کہ اس کی برکت ختم کردی جاتی ہے۔

۲۸۲۸: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَتَيْتُ لَيْلَةَ اُسْرِیَ بِیْ عَلٰی قَوْمٍ بُطُوْنُهُمْ كَالْبُيُوْتِ فِيْهَا الْحَيَّاتُ تُرٰی مِنْ خَارِجِ بُطُوْنِهِمْ فَقُلْتُ مَنْ هٰؤُلَاءِ يَا جِبْرِيْلُ قَالَ هٰؤُلَاءِ اَكَلَةُ الرِّبَا۔ (رواه احمد وابن ماجة)

اخرجه ابن ماجه فی السنن ۲/۷٦۳ الحديث رقم ۲۲۷۳، واحمد فی المسند ۲/۳٦۳۔

ترجمہ: "اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: معراج کی رات میں ایک قوم کے پاس آیا جن کے پیٹ گھروں اور مکانوں کی مانند (بڑے بڑے) تھے اور ان کے پیٹوں میں سانپ بھرے ہوئے تھے جو پیٹوں کے باہر سے بھی نظر آ رہے تھے، میں نے (انہیں دیکھ کر بڑی حیرت کے ساتھ جبرئیل علیہ السلام سے) پوچھا کہ اے جبرئیل! یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ یہ سود خور ہیں"۔ (احمد، ابن ماجہ)

تشریح: اتيت : صیغہ معروف کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں مجہول کے ساتھ ہے۔ ليلة اسرى بى : صحیح قول کے مطابق اضافت کے ساتھ ہے علی قوم : اتیت کا متعلق ہے نہ کہ اسری کا، جیسا کہ گمان کیا گیا ہے۔ بطونهم كالبيوت: با کے کسرہ کے ساتھ ہے اور ضمہ کے ساتھ بھی درست ہے۔ یہ جملہ "قوم" کی صفت ہے۔ فيها ضمیر کا مرجع "بطون" ہے۔ الحيات : حية کی جمع ہے۔ ترى :صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ قوله :ترى من خارج بطونهم :ان کے حال کی برائی اور مستقبل کی رسوائی کیلئے ہوگی۔ قال: هؤلاء أكلة الربا : اور ایک روایت میں "من امتك" کے الفاظ بھی ہیں۔

سود خور پر لعنت

۲۸۲۹: وَعَنْ عَلِيٍّ اَنَّهُ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ لَعَنَ اٰكِلَ الرِّبَا وَمُوْكِلَهُ وَ كَاتِبَهُ وَمَانِعَ الصَّدَقَةِ وَكَانَ يَنْهٰی عَنِ النَّوْحِ۔ (رواه النسائی)

اخرجه النسائی فی السنن ۸/۱٤۷ الحديث رقم ۵۱۰۳۔

ترجمہ: "اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ آپ ﷺ نے سود لینے والے پر، سود کھلانے والے پر، سود کا حساب کتاب لکھنے والے پر اور صدقہ سے منع کرنے والے پر لعنت فرمائی ہے۔ نیز آپ ﷺ نوحہ کرنے سے منع فرمایا کرتے۔ (نسائی)

تشریح: قوله :لعن اكل الربا وموكله، وكاتبه، ومانع الصدقة :یعنی مطلقاً صدقہ مراد ہے، یا واجب صدقہ کو ترک کرنے والا مراد ہے۔

النوح : با آواز بلند روتے ہوئے زمانہ جاہلیت کے اس جیسے الفاظ کہنا واكهفاه و اجبلاه 'اے پہاڑ وغیرہ

ربا کی بابت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد

۲۸۳۰: وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ اِنَّ اٰخِرَ مَا نَزَلَتْ اٰيَةُ الرِّبَا وَاَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قُبِضَ وَلَمْ يُفَسِّرْهَا لَنَا فَدَعُوا الرِّبَا وَالرِّيْبَةَ۔ (رواه ابن ماجة والدارمی)

اخرجه ابن ماجه فی السنن ۲/۷٦٤ الحديث رقم ۲۲۷٦۔

ترجمہ: "اور حضرت عمر فاروقؓ کا یہ ارشاد منقول ہے کہ جو چیز سب سے آخر میں نازل ہوئی ہے وہ آیت الربا ہے۔ چنانچہ رسول

اللہ ﷺ اس دنیا سے اس حالت میں تشریف لے گئے کہ آپ ﷺ نے ہمیں اس کی تفسیر بیان نہیں فرمائی لہٰذا سود کو اور جو چیز سود کے مثل ہو اسے ترک کردو۔ (ابن ماجہ' دارمی)

تشریح: قوله :عنه آخر ما نزلت آية الربا : یعنی وہ آیت جس کا تعلق معاملات کے ساتھ ہے نہ کہ مطلق آیت، اس لئے کہ سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیت علی الاطلاق یہ ہے: ﴿اليوم اكملت لكم دينكم﴾ [المائدہ۔۳] ''آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے کامل کردیا''۔

وان رسول الله صلى الله عليه وسلم :ان کے کسرہ کے ساتھ، ہو تو جملہ متانفہ یا جملہ حالیہ ہوگا اور ان کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا عطف پہلے والے أنَّ پر ہوگا۔

حاصل یہ ہے کہ آیت ربا نازل ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ اس دنیا میں بہت کم عرصہ تشریف فرما رہے، اور اس مدت میں اس آیت کی تفسیر سے زیادہ اہم دینی ضروریات میں مشغول رہے، خاص کر کے جب کہ آیت کا مقصود بھی واضح تھا، آیت پر عمل آپ کی تفسیر پر موقوف نہ تھا، بلکہ آپ کی تفسیر پر وہ لطائف اور باریکیاں موقوف تھیں جس کی طرف آیت سے اشارہ ہو رہا ہے، لیکن اس طرح کے معارف اور علوم اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی طرف سے اپنے رسول کو اس کی زندگی اور اس کے ورثاء کو اگرچہ رسول کی وفات کے بعد ہو، عطاء فرما دیتے ہیں۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو آیت سود کی حرمت کے بارے میں نازل ہوئی وہ یہ ہے ﴿الذين يأكلون الربا۔۔۔ لا تظلمون ولا تظلمون﴾ [البقرۃ۔۲۷۹] یہ ثابت ہے نہ کہ منسوخ ہے، صریح اور واضح ہے نہ کہ مشتبہ ہے اس لئے آپ ﷺ نے اس کی مزید تفسیر بیان نہیں کی بلکہ ان آیات کو ان کے ظاہر پر چھوڑا۔ پس تم اس میں شک نہ کرو، اور سود کے حلال ہونے کے حیلے چھوڑ دو، اور یہی مطلب ہے حضرت عمر کے اس قول کا فدعوا الربا والريبة۔ یعنی ربا کے شبہ کو چھوڑ دو یا اس چیز میں شک وشبہ کرنا چھوڑ دو جس کو یہ آیات اور احادیث مشتمل ہیں، اس لئے کہ اس میں سے کسی چیز میں شک کرنا کبھی کفر کی طرف لے جاتا ہے۔

قرض خواہ کا مقروض سے تحفہ وصول کرنا

۲۸۳۱: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا اَقْرَضَ اَحَدُكُمْ قَرْضًا فَاَهْدٰى اِلَيْهِ اَوْحَمَلَهٗ عَلَى الدَّابَّةِ فَلَا يَرْكَبْهُ وَلَا يَقْبَلْهَا اِلَّا اَنْ يَكُوْنَ جَرٰى بَيْنَهٗ وَبَيْنَهٗ قَبْلَ ذٰلِكَ ۔ (رواه ابن ماجة والبيهقي في شعب الا يمان)

اخرجه ابن ماجه في االسنن ۸۱۳/۲ الحديث رقم ۲۴۲۳ ،ولبيهقي في شعب الايمان ۔

ترجمہ: 'اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص کسی کو قرض دے اور پھر وہ (قرض لینے والا اس (قرض دینے والے) کے پاس کوئی تحفہ بھیجے یا سواری کے لئے کوئی جانور دے تو وہ (قرض دینے والا) نہ اس جانور پر سوار ہو اور نہ اس کا تحفہ قبول کرے مگر یہ کہ ان دونوں قرض دینے والے اور قرض لینے والے) کے درمیان پہلے سے یہ کام (تحفہ یا سواری کے جانور کا لینا دینا) جاری ہو تو پھر اس کو قبول کرلینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے''۔ (ابن ماجہ' بیہقی)

تشریح: قرضا :اسم مصدر ہے، اور مصدر درحقیقت ''الا قراض'' ہے، اور قرضا'' کا یہاں ''مقروض'' کے معنی میں ہونا بھی جائز ہے، اس صورت میں یہ مفعول ثانی ہوگا، اور مفعول اول مقدر ہوگا۔ جیسا کہ اس آیت میں '' قرضاً ''، مفعول ثانی ہے: ﴿من الذی يقرض الله قرضًا حسناً﴾ [البقرۃ۔۲۴۵] ''یہ ایسا شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرض دے اچھے طور پر''۔

او حمله علی الدابة :یعنی اپنی سواری پر، یا قرض خواہ کے سواری پر۔

فلا یرکبه : ضمیر منصوب ''مرکوب'' کی طرف راجع ہے، اور ایک نسخہ میں 'فلا یرکبها'' ہے، اس صورت میں ضمیر مؤنث 'دابة

'' کی طرف راجع ہوگی،

فلا یر کبه و لا یقبلها اس عبارت میں لف نشر غیر مرتب ہے، فہم سامع پر اعتماد کرتے ہوئے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ''فاهدی'' میں ضمیر فاعل مفعول مقدر کی طرف لوٹ رہی ہے، اور ''لا یقبلها'' کی ضمیر ''اهدٰی'' کے مصدر کی طرف راجع ہے، اور ''فاهدی'' کا عطف شرط پر ہے، اور اس کا جواب ''فلا یر کبه و لا یقبلها'' ہے۔

الا ان یکون : کی ضمیر مذکور کی طرف لوٹ رہی ہے ۔ **ای المذکور من المعروف أو الاهلاء**

قبل ذلك : اس ممانعت کی وجہ یہ روات ہے: ''**کل قرض جر منفعه فهو ربا**''

امام مالک فرماتے ہیں کہ قرض دار کا تحفہ قبول نہ کیا جائے، جب تک کہ قرض سے پہلے بھی اس جیسے تحفے کا رواج نہ ہو، یا اس تحفہ دینے کا کوئی موجب پیدا نہ ہو۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس مسئلے کی نظیر قاضی کو تحفہ دینے کا مسئلہ ہے، اور اولیٰ اس کیلئے یہ ہے کہ اس سے بچے۔

اگر یہ کہا جائے کہ اولیٰ یہ ہے کہ وہ اس کے تحفے کے برابر یا اس سے زائد کوئی چیز اس کو بدلے میں دے دے۔

اور متقین کے امام امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اپنے زمانے میں اس میں بہت زیادہ احتیاط سے کام لیا ہے، چنانچہ ایک دن وہ اپنے قرض دار کے ہاں اپنے قرض کے تقاضے کیلئے گئے، اس وقت بڑی سخت گرمی تھی، اور اس کے گھر کی دیوار کا سایہ بھی تھا، امام صاحب دھوپ میں کھڑے رہے یہاں تک کہ بہت دیر کے بعد وہ قرض دار گھر سے نکلا، اور امام صاحب اس وقت تک اسی دھوپ میں کھڑے رہے، اور اس تکلیف پر صبر کرتے رہے لیکن اس سایہ سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ تاکہ مقروض کی طرف سے کسی منفعت کا حصول لازم نہ آئے۔

امام صاحب کا مذہب یہ ہے کہ قرض دار کا فائدہ اٹھانا حرام ہے سود کی طرح۔ ہمارا مذہب عام اور اکثر علماء کی طرح ہے کہ یہ حرام نہیں ہے الا یہ کہ جس عقد کی وجہ سے یہ قرض لازم ہوا ہے اگر صاحب عقد قرض دار کے ساتھ کسی منفعت کی شرط لگائی۔

۲۸۳۲: وَعَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ اِذَا اَقْرَضَ الرَّجُلُ الرَّجُلَ فَلَا يَاخُذْ هَدِيَّةً ۔

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۲۹/۷ الحدیث رقم ۳۸۱٤

ترجمه: ''اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا: جو شخص کسی کو قرض دے تو وہ اس (قرضدار) سے بطور تحفہ بھی کوئی چیز قبول نہ کرے۔ امام بخاریؒ نے اس روایت کو اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے نیز المنتقٰی میں بھی اسی طرح کی روایت منقول ہے۔

تشریح: **قوله :اذا اقرض الرجل احدکم** :اور ایک نسخہ میں ''الرجل'' نصب کے ساتھ ہے مفعولیت کی بناء پر۔

فلا یأخذ :ایک نسخہ میں نفی کے صیغہ کے ساتھ ہے۔ **هدیةً** :اس کی تنوین برائے تنکیر ہے۔

قوله :رواه البخاری فی تاریخه، هکذا فی المنتقٰی :

المنتقٰی :میم کے ضمہ، نون کے سکون، تاء منقوطہ اور قاف دونوں کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

یہ احادیث کی ایک کتاب کا نام ہے جس کو امام احمد کے اصحاب میں سے کسی نے کی فقہ کے ترتیب پر مدون کیا ہے۔

۲۸۳۳: وَعَنْ اَبِىْ بُرْدَةَ ابْنِ اَبِىْ مُوْسٰى قَالَ قَدِمْتُ الْمَدِيْنَةَ فَلَقِيْتُ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ سَلَامٍ فَقَالَ اِنَّكَ بِاَرْضٍ فِيْهَا الرِّبَا فَاشٍ فَاِذَا كَانَ لَكَ عَلٰى رَجُلٍ حَقٌّ فَاَهْدٰى اِلَيْكَ حِمْلَ تِبْنٍ اَوْ حِمْلَ شَعِيْرٍ اَوْ حَبْلَ قَتٍّ فَلَا تَاخُذْهُ فَاِنَّهٗ رِبًا ۔

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۲۹/۷ الحدیث رقم ۳۸۱٤

ترجمه: ''اور حضرت ابو بردہ بن ابی موسیٰ (تابعی) کہتے ہیں کہ جب میں مدینہ آیا اور میں نے حضرت عبداللہ بن سلامؓ (صحابیؓ) سے ملاقات کی تو انہوں نے فرمایا کہ تم ایک ایسی سرزمین پر ہو جہاں سود کا بہت رواج ہے لہٰذا اگر کسی پر تمہارا حق ہو (یعنی کوئی تمہارا

قرض دار ہو) اور وہ تمہیں بھوسے کا ایک گٹھر لایا جو کی ایک گٹھری یا گھانس کا ایک گٹھا بھی تحفہ کے طور پر دے تو تم ہرگز اسے قبول نہ کرنا کیونکہ وہ سود (کا حکم رکھتا) ہے''۔(بخاری)

تشریح: **حمل تبن** :اتنی مقدار جو گدھے یا خچر وغیرہ کا بوجھ بنے۔

حبل : حاء مہملہ اور بائے موحدہ دونوں کے فتحہ کے ساتھ ہے،''**فعل**'' بمعنی''**مفعول**'' ہے۔**ای مشدو دالحبل**۔

القت قاف کے فتحہ اور تاء کی تشدید کے ساتھ ہے، ایک معروف گھاس ہے، جانوروں سب سے عمدہ چارہ ہے، اس کو''رطبہ'' کہتے ہیں۔

نہایہ میں ہے کہ''حبل'' حرکات کے ساتھ رہے، بمعنی مفعول ہے۔(انتہی)

اور ایک نسخہ میں باء کے سکون کے ساتھ ہے، یہ ظاہر ہے، ای المربوط بہ یعنی رسی کے ساتھ بندھا ہوا۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہاں ہدیہ کو جانوروں کے چارے کے ساتھ خاص کیا ہے، تحائف کے قبول کرنے سے ممانعت میں مبالغہ کیلئے، اس لئے کہ یہ جائز نہیں ہے کہ جانوروں کو حرام کا چارہ کھلایا جائے۔

بَابُ الْمَنْهِيِّ عَنْهَا مِنَ الْبُيُوْعِ

جن بیعوں سے منع کیا گیا ہے ان کا بیان

الفصل الاول:

۲۸۳۴: عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الْمُزَابَنَةِ اَنْ يَّبِيْعَ ثَمَرَ حَائِطِهٖ اِنْ كَانَ نَخْلاً بِتَمْرٍ كَيْلاً وَاِنْ كَانَ كَرْمًا اَنْ يَّبِيْعَهٗ بِزَبِيْبٍ كَيْلاً اَوْ كَانَ (وَعِنْدَ مُسْلِمٍ) وَاِنْ كَانَ زَرْعًا اَنْ يَّبِيْعَهٗ بِكَيْلِ طَعَامٍ نَهٰى عَنْ ذٰلِكَ كُلِّهٖ (متفق عليه وفى رواية لهما) نَهٰى عَنِ الْمُزَابَنَةِ قَالَ وَالْمُزَابَنَةُ اَنْ يُّبَاعَ مَا فِيْ رُؤُوْسِ النَّخْلِ بِتَمْرٍ بِكَيْلٍ مُسَمًّى اِنْ زَادَ فَلِيْ وَاِنْ نَقَصَ فَعَلَيَّ۔ (رواه البخاری ومسلم)

اخرجه البخارى فى صحيحه ٤/٤٠٣ الحديث رقم ٢٢٠٥، ومسلم فى ٣/١١٧٢ الحديث رقم (٧٦-١٥٤٢) والترمذى فى السنن ٣/٥٩٣ الحديث رقم ١٣٠٠ والسنائى فى ٧/٢٧٠ الحديث رقم ٤٥٤٩، وابن اماجه فى ٢/٧٦١ الحديث رقم ٢٢٦٥ ومالك فى الموطأ ٢/٦٢٤ الحديث رقم ٢٣ من كتاب البيوع، واحمد فى المسند ٢/٧۔

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مزابنہ سے منع فرمایا ہے اور وہ (مزابنہ) یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے باغ کا پھل (تازہ پھل) اگر وہ کھجور ہو تو خشک کھجوروں (چھواروں) کے عوض پیمانہ کے ذریعہ (مثلاً دس پیمانے کے بقدر) بیچے (یعنی ایک شخص کے باغ میں تازہ کھجوریں لگی ہوئی ہوں اور ایک دوسرے شخص کے پاس خشک کھجوریں رکھی ہوئی ہوں تو باغ والا شخص اس دوسرے شخص سے دس پیمانے بھر کر خشک کھجوریں لے لے اور اس کے عوض اپنے درخت پر لگی ہوئی تازہ کھجوریں اسی پیمانے کے مطابق اندازہ کر کے دے) اور اگر میوہ انگور ہو تو اس کو خشک انگور (کشمش) کے عوض پیمانے کے ذریعہ فروخت کرے)۔(حاصل یہ کہ بیع مزابنہ کا مطلب ہے درخت پر لگے ہوئے تازہ پھل کو خواہ وہ کھجور ہو یا کوئی اور پھل، رکھے ہوئے خشک پھل کے عوض بیچنا) اور مسلم میں ہے کہ اگر کھیتی ہو تو اس میں بیع مزابنہ کی شکل یہ ہے کہ اس کو غلہ کے عوض پیمانہ کے ذریعہ بیچے (یعنی گندم کی فصل کھیت میں کھڑی ہے اور ایک دوسرے شخص کے پاس گندم رکھی ہوئی ہے تو پہلا شخص اپنے کھیت میں کھڑی ہوئی گندم کا اندازہ کر کے اس کو دوسرے شخص کے ہاتھ بیچ دے اور اس کے عوض اس شخص سے وہ رکھا ہوا گیہوں اپنے اندازے کے مطابق پیمانہ بھر کے لے لے)

آپ ﷺ نے بیع کی ان تمام قسموں سے منع فرمایا ہے''۔(بخاری ومسلم)اور بخاری ومسلم ہی کی ایک روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے بیع مزابنہ سے منع فرمایا ہے نیز فرمایا کہ بیع مزابنہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے درخت پر لگی ہوئی تازہ کھجوروں کو کسی شخص کے ہاتھ اس کے پاس رکھی ہوئی خشک کھجوروں کے عوض معین پیمانہ کر کے فروخت کرے اور خریدار سے کہہ دے کہ اگر درخت کی کھجوریں (معین پیمانہ سے) زائد ہوں گی تو میری ہیں (یعنی میں اسے لے لوں گا) اور اگر کم نکلیں تو اس کا میں ذمہ دار ہوں گا (کہ اس کمی کو میں پورا کر دوں گا)۔

تشریح: قوله ::نهى رسول الله ﷺ عن المزابنة :

شرح السنہ میں ہے کہ''مزابنة'' کہتے ہیں درخت پر لگی ہوئی کھجوروں کو فروخت کرنا اس کی جنس کے بدلے جو زمین پر رکھی ہوئی ہو یہ ''زبن'' سے مشتق ہے، اور''زبن'' کا معنی ہے دفع کرنا اس لئے کہ متعاقدین میں سے جب کوئی خریدی ہوئی چیزیں کسی نقصان پر واقف ہوتا ہے اور عقد کے فسخ کرنے کا ارادہ کرتا ہے اور دوسرے کا ارادہ عقد کو جاری رکھنے کا ہوتا ہے، اور ہر ایک اپنے ساتھی کو اس کے حق سے دفع کرتا ہے بوجہ اس کے جو اس نے اپنے ساتھی سے زیادہ لیا ہے۔

کھجور کو درخت کے اوپر اس کی جنس کے بدلے فروخت کرنے کو''مزابنة'' کے ساتھ خاص کیا ہے، اس لئے کہ ان کے درمیان مساوات شرط ہے، اور درخت کے اوپر لگے ہوئے پھلوں کو کیل اور وزن کے ساتھ معلوم نہیں کیا جا سکتا، بلکہ وہ مقدار اٹکل کے ساتھ ہوتا ہے جو محض ایک اندازہ اور گمان ہے، جس میں کمی بیشی سے نہیں بچا جا سکتا اور تازہ کھجوروں کو خشک کھجور کے بدلے، اور انگور کو خشک انگور کے بدلے بیچنا جائز ہے، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے ہاں۔ اور امام شافعیؒ مالک اور احمد رحمہم اللہ کے ہاں جائز نہیں ہے نہ کیل کے ساتھ اور نہ وزن کے ساتھ، جب تازہ پھل درخت کے اوپر نہ لگا ہو، باقی جب تازہ کھجور درخت پر لگے ہوں اور اس کو اس کے جنس کے بدلے بیچنا ہو تو یہ عرایا ہے، اور اس پر بحث آئندہ آئے گی۔

ان يبيع ثمر حائطه: بدل ہے یا بیان ہے''مزابنة'' کیلئے۔**ان كان :**ضمیر مستتر''ثمر'' کی طرف راجع ہے۔

نخلاً : سے مراد''رطباً'' ہے یا مضاف محذوف ہے، ای ثمر نخل۔**ان يبيعه بزبيب كيلا :** امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ تمام شروط بیان کیلئے تفصیل ہیں. اور شرط ثانی کی جزاء مقدر ہے، جو نہی ہے سیاق اس پر قرینہ ہے اس لئے کہ مذکورہ عبارت میں جزاء بننے کی صلاحیت نہیں ہے، اور اسی طرح شرط اول کی جزاء بھی مقدر ہے جو''نهى ان يبيعه'' ہے شرط ثانی کے قرینہ کی وجہ سے۔

او كان وعند مسلم وان كان :یعنی''او كان'' کی جگہ''ان كان'' ہے۔ حاصل یہ ہے کہ بخاری کی روایت''وكان ذرعا'' ہے اور مسلم کی روایت''وان كان'' ہے۔

ذرعا ان يبيعه بكيل طعام) اضافت کے ساتھ ہے، اور''طعام'' سے مراد گندم ہے۔ **كله :** تاکید ہے۔ تمام افراد کو شامل ہے اور یہ جملہ تاکید ہے پہلے والی نہی کیلئے۔**بتمر :**متعلق ہے''يباع'' کیلئے۔ **بكيل :** بدل ہے، اعادہ جار کے ساتھ۔ **(مسمى)** بمعنی''معين'' ہے صفت ہے''كيل'' کیلئے۔

ان زاد : حال ہے بائع کے قول مقدر سے، جو''يباع'' سے مفہوم ہو رہا ہے۔ تقدیری عبارت یوں ہے: **اى يبيع قائلا ان زادالتمر على ذلك الكيل المسمى۔فلى :**اى فالزائد لى تو وہ زائد میری ہے میں اسے لوں گا۔

۲۸۳۵:وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ نَهَى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الْمُخَابَرَةِ وَالْمُحَاقَلَةِ وَالْمُزَابَنَةِ وَالْمُحَاقَلَةُ اَنْ يَّبِيْعَ الرَّجُلُ الزَّرْعَ بِمِائَةِ فَرَقٍ حِنْطَةٍ وَالْمُزَابَنَةُ اَنْ يَّبِيْعَ التَّمْرَ فِي رُؤُوْسِ النَّخْلِ بِمِائَةِ فَرَقٍ وَالْمُخَابَرَةُ كِرَاءُ الْاَرْضِ بِالثُّلُثِ وَالرُّبْعِ . (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فى صحيحه ٣/١١٧٤ الحديث رقم (٨١-١٥٣٦)۔

ترجمہ:''اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مخابرہ، محاقلہ اور مزابنہ سے منع فرمایا ہے اور محاقلہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی کھیتی کو سو فرق (وزن کا پیمانہ) گندم کے عوض فروخت کردے اور مزابنہ یہ ہے کہ کوئی شخص درختوں پر لگی ہوئی کھجوروں کو سو فرق رکھی ہوئی کھجوروں کے عوض فروخت کرے اور مخابرۃ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی زمین کو ایک معین حصہ جیسے تہائی یا چوتھائی پر کاشت کے لئے دے دے''۔(مسلم)

تشریح: **مخابرۃ** : خاء کے ساتھ ہے، بعض فرماتے ہیں کہ ''**مخابرۃ**'' کہتے ہیں اپنی زمین کسی دوسرے کو بٹائی پر کاشت کیلئے دیدینا معین حصہ پر جیسے تہائی، چوتھائی وغیرہ۔ بعض کہتے ہیں کہ ''**مخابرۃ**'' **خیبر** سے ہے، اس لئے کہ نبی ﷺ نے اہل خیبر کو خیبر کی زمین پر برقرار رکھا آدھا محصول دینے کی شرط پر۔ چنانچہ کہا گیا: **خابرهم ای عاملهم فی خیبر**۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ ''**خبار**'' سے مشتق ہے، یہ نرم زمین کو کہتے ہیں جیسا کہ شرح السنہ میں ہے، اور نہایہ میں بھی ہے۔ علامہ ابن الہمام نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت نقل کی ہے کہ وہ فرماتے ہیں:''**كنا نخابر اربعين سنة ولا نرى بذلك بأسًا حتى اخبرنا رافع بن خديج انه ﷺ نهى عن المخابرة، فتركناه**''''ہم چالیس برس تک مخابرہ کرتے رہے یہاں تک کہ رافع بن خدیج نے ہمیں خبر دی کہ آپ ﷺ مخابرہ سے منع فرماتے تھے۔ پس ہم نے اسے چھوڑ دیا۔''

المحاقلة : حائے مہملہ اور قاف کے ساتھ۔ فائق میں ہے کہ یہ **حقل** سے ہے۔ حقل کے معنی ہیں ''**قراح من الارض**'' وہ اچھی مٹی جو کھاری پانی سے پاک ہو اور کاشت کے قابل ہو، اور اسی سے ہے: **حقل يحقل** بمعنی **زرع**۔ اور **محاقلة، مفاعله** : سے ہے

فرق : فاء اور راء کے فتحہ کے ساتھ، اور ایک نسخہ میں راء کے سکون کے ساتھ ہے، اور فرق کا ذکر محض مثال کے طور پر ہے نہ کہ متعین مقدار بتانے کیلئے ہے۔

حنطة : نصب کے ساتھ ہے بناء بر تمیز اور ایک نسخہ میں ماقبل کی اضافت کے ساتھ ہے

اس سے ممانعت اس لئے ہے کہ خشک گندم اور تازہ گندم کے درمیان برابری معدوم ہوتی ہے۔

نہایہ میں ہے کہ ''**فرق**'' راء کی حرکت کے ساتھ ایک پیمانہ کا نام ہے، جس میں سولہ رطل آتے ہیں، اور سولہ رطل بارہ مد اور تین صاع کے برابر ہوتے ہیں، اہل حجاز کے ہاں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ فرق میں پانچ اقساط ہوتے ہیں، اور ایک قسط آدھے صاع کے برابر ہے، اور فرق راء کے سکون کے ساتھ ایک سو بیس /۱۲۰ رطل کا ہوتا ہے۔ علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے معلوم نہیں کہ روایت میں محاقلہ کی یہ تفسیر کس نے کی ہے؟ مگر اس کی تفسیر ''**مائة فرق**'' کے ساتھ ساقط ہے، اور اس طرح باقی تفسیر بھی۔ بلاغت کا حق تو یہ تھا کہ ایسی مثال لائے جس میں عدد معین نہ ہوتا، اس لئے کہ ''**بمائة فرق**'' سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے، کہ اگر اس مخصوص مقدار سے کم یا زیادہ ہوگا تو وہ محاقلہ نہیں ہوگا۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عرب کبھی مثال میں ایسی عبارت ذکر کرتے ہیں کہ جس سے مثال کی صورت سامع کے سامنے بن جاتی ہے، زیادت توضیح کیلئے۔ ہاں اگر صرف مثلاً ''**مأة**'' کا لفظ ذکر کرتے تو اس پر کوئی اشکال نہ ہوتا، اور اس قدر ذکر کرنے میں اہل بلاغت کے ہاں کوئی حرج نہیں ہے۔

فی بمعنی ''**علی**'' ہے۔ **كراء الارض** :اجارے پر دینا۔

الثلث : ثاء اور لام کے ضمہ کے ساتھ ہے، اور لام کے سکون کے ساتھ بھی ہے، اور اسی طرح ضبط ''**الربع**'' کا ہے۔ واؤ بمعنی ''**او**'' ہے۔ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں مطلب اس کا یہ ہے کہ کوئی اپنی زمین کسی دوسرے کو کاشت کیلئے دیدے کہ بیج اور عمل کاشت کرنے والے کی طرف سے ہوگا، اور جو کچھ اس میں پیدا ہوگا اس کا چوتھائی یا تہائی زمین کا مالک لے گے۔ **خبر**' **بالضم** سے مشتق ہے، بمعنی ''**نصيب**''، حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے اول تو اس لئے کہ اس میں اجرت مجہول ہوتی ہے، دوسرے حاصل ہونے والی چیز معدوم

ہوتی ہے۔(انتہی)

امام اعظم ابوحنیفہؒ کے ہاں مزارعت جائز نہیں ہے اور صاحبین کے ہاں جائز ہے۔فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے اس لئے کہ اس کی طرف لوگوں کی احتیاج زیادہ ہے۔

۲۸۳۶: وَعَنْهُ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الْمُحَاقَلَةِ وَالْمُزَابَنَةِ وَالْمُخَابَرَةِ وَالْمُعَاوَمَةِ وَعَنِ الثُّنْيَا وَرَخَّصَ فِي الْعَرَايَا. (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۳/۱۱۷۵ الحدیث رقم (۸۵۔۱۵۳۶)، والترمذی فی السنن ۳/۶۰۵ الحدیث رقم ۱۳۱۳، واحمد فی المسند ۳/۳۱۳۔

ترجمہ: ''اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے محاقلہ، مزابنہ، مخابرہ، معاومہ (یعنی باغ کو کئی سال کے لئے ٹھیکے پر دینا) اور ثنیا سے منع فرمایا ہے لیکن آپ ﷺ نے عرایا کی اجازت دی ہے''۔(مسلم)

تشریح: **قوله : نهٰى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن المحاقلة، والمزابنة، والمخابرة** : ان سب کا مطلب پہلے ذکر ہو چکا ہے۔

والمعاومة : اور ایک نسخہ میں عن **المعاومة** ہے، اور یہ ''مفاعلة'' کے وزن پر ہے ''عام'' سے ماخوذ ہے جیسے ''**مسانهة**'' **سنة** اور ''**مشاهرة**'' **شهر** سے مشتق ہے۔

نہایہ میں ہے ''**معاومت**'' کے معنی یہ ہیں کہ درختوں کے پھلوں کو نمودار ہونے سے پہلے دو سال یا تین سال یا زیادہ مدت کیلئے فروخت کر دیا جائے یہ بیع باطل ہے، اس لئے کہ یہ ایسی چیز کی بیع ہے جو ابھی پیدا نہیں ہوئی۔ پس یہ کسی بچے کو پیدا ہونے سے پہلے بیچنے کی طرح ہے۔

کہا جاتا ہے: ''**عاومت النخلة**'' جب وہ ایک سال پھل دے اور دوسرے سال نہ دے۔ یہ'' عام '' بمعنی سنۃ (سال)۔ سے ''**مفاعله**'' کے وزن پر ہے

الثنيا : ثاء مثلثہ کے ضمہ نون کے سکون اور یائے تحتیہ کے ساتھ اسم ہے استثناء سے، اور استثناء کیا جاتا ہے اس سے ایک معلوم مقدار کا جیسا کہ عنقریب آ رہا ہے۔ ہدایہ میں ہے کہ حدیث میں آیا ہے:''**من استثنٰى فله ثنياه**''، ''ثنیا'' ''دنیا'' کے وزن پر ہے یعنی جو اس نے مستثنیٰ کیا۔

محی السنۃ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ثنیا کا مطلب ہے کہ باغ کے پھلوں کو فروخت کیا جائے اور اس سے ایک غیر معین مقدار کا حصہ مستثنیٰ کیا جائے۔ یہ بیع فاسد ہے، جہالت مبیع کی وجہ سے۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی ممانعت کا مقتضی یہ ہے کہ ''**مفضى الى جهالة قدر المبيع**'' ہے۔ اسی لئے تو فقہاء فرماتے ہیں کہ اگر ایک شخص دوسرے سے یہ کہہ دے کہ میں تجھ کو یہ ڈھیر فروخت کرتا ہوں سوائے ایک صاع کے اور اس ڈھیر کے کل صاع مجہول تھے تو یہ عقد فاسد ہے، اس لئے کہ اس کی وجہ سے مبیع معلوم القدر ظاہراً یا تقدیراً ہونے سے خارج ہوگئی ہاں اگر وہ بیچے اور اس سے ایک متعین حصہ مستثنیٰ کرے جیسے تہائی، چوتھائی وغیرہ تو یہ عقد صحیح ہو جائے گا، بوجہ اس کی مقدار کے معلوم ہونے کے۔

قوله : رخص فى العرايا :**عرية** کی جمع ہے یاء کی تشدید کے ساتھ۔ فائق میں ہے کہ ''**عرية**'' کھجور کے اس درخت کو کہتے ہیں جو کسی محتاج کو بطور عاریت دیا جائے یعنی اس کے پھل کو اس کے لئے خاص کر دے۔ عاریت پر دینے والے کو یہ اجازت دی گئی ہے کہ وہ اس کے پھل کو خرید لے رکھے ہوئے پھل کے بدلے، بوجہ معری کی طرف سے ضرورت پڑنے کے، اس کا نام ''**عرية**'' رکھا، اس لئے کہ جب اس درخت کا پھل چلا جاتا ہے، تو گویا کہ اس نے اس کو اس کے پھل سے خالی اور ننگا کر دیا پھر اسی سے الاعراء مشتق کیا گیا۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ''عریة'' کا مطلب ہے کہ ایک اندازہ لگانے والا درختوں کا اندازہ لگا لے پھر کہے کہ یہ تازہ کھجور جب یہ خشک ہو جائے گی تو اس سے مثلاً تین ۳؍وسق کھجور حاصل ہوں گی۔ پس وہ کسی دوسرے کے ہاتھ تین وسق کھجور کے بدلے فروخت کر دیتا ہے، اور اسی مجلس میں دونوں قبضہ کر لیتے ہیں، مشتری کھجور حوالہ کر دیتا ہے اور بائع درخت حوالہ کر دیتا ہے یہ پانچ وسق سے کم میں جائز ہے اور اس سے زیادہ میں جائز نہیں ہے۔ پانچ وسق میں جواز کے بارے میں امام شافعیؒ کے دو قول ہیں، ان میں سے قول اصح یہ ہے کہ یہ جائز ہے اس لئے کہ اصل میں تو خشک کھجور کو تازہ کے بدلے فروخت کرنا حرام ہے، اور عرایا کے بارے میں رخصت وارد ہے۔ اور صحیح تر قول کے مطابق یہ اغنیاء اور فقراء دونوں کیلئے جائز ہے، اور تازہ کھجور اور انگور کے علاوہ پھلوں میں بھی جائز ہے۔ اور ایک ضعیف قول کے مطابق یہ فقراء کے ساتھ خاص ہے۔ (انتہیٰ)

روایت کیا گیا ہے کہ فقراء مدینہ آپ کے پاس آئے اور کہا اللہ کے رسول، آپ نے تازہ کھجور کو خشک کھجور کے بدلے فروخت کرنے سے منع کیا ہے اور ہمارے پاس سونا اور چاندی نہیں ہے کہ ہم تازہ کھجور خرید لیں، اور ہمیں اس کی خواہش ہے، پس آپ نے ان کو اس کی اجازت دی اس کی، چنانچہ وہ تازہ کھجور خریدتے تھے اس خشک کھجور کے بدلے جو ان کے پاس سال کے خرچ سے بچی ہوتی تھی۔ لیکن اصولیین کے ہاں معتمد یہ ہے کہ اعتبار الفاظ کے عموم کا ہوتا ہے نہ کہ سبب کے خصوص کا۔

۲۸۳۷: وَعَنْ سَهْلِ بْنِ اَبِیْ حَثْمَةَ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ التَّمْرِ بِالتَّمْرِ اِلاَّ اَنَّهٗ رَخَّصَ فِی الْعَرِيَّةِ اَنْ تُبَاعَ بِخَرْصِهَا تَمْرًا يَّاْكُلُهَا اَهْلُهَا رُطَبًا۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤/٣٨٧ الحدیث رقم ٢١٩١، ومسلم فی صحیحه ٣/١١٧٠ الحدیث رقم (٧۔١٥٤٠) والنسائی فی السنن ٧/٢٦٨ الحدیث رقم ٤٥٤٢۔

ترجمہ: ''اور حضرت سہل بن ابی حثمہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے درخت پر لگی ہوئی کھجوروں کو خشک کھجوروں کے عوض فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے لیکن آپ ﷺ نے عریہ (کسی محتاج کو دیئے گئے درخت) کے متعلق یہ اجازت دی کہ اس درخت پر لگے ہوئے پھل کو اس کے خشک ہونے (کے بعد کی مقدار) کا اندازہ کر کے فروخت کیا جائے (یعنی یہ اندازہ کر لیا جائے کہ اس درخت پر لگی ہوئی تازہ کھجوریں خشک ہونے کے بعد کتنی رہیں گی اور پھر اتنی ہی مقدار میں خشک کھجوریں اس محتاج شخص کو دے کر اس درخت پر لگی ہوئی کھجوریں خرید لی جائیں) اس طرح اس کے مالک اس درخت کا تازہ پھل کھائیں''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: **قوله: نهی رسول الله ﷺ عن بیع التمر بالتمر**: ثاء مثلثہ کے ساتھ ہے۔ زرکشی فرماتے ہیں کہ مراد اس سے رطب ہے۔ **التمر**: تاء کے ساتھ ہے اسی طرح اس کو ضبط کیا ہے سید کے نسخہ میں اور اس کے علاوہ اصول مصححہ میں پہلا لفظ ثاء کے ساتھ اور دوسرا تاء کے ساتھ، اور اسی طرح ضبط کیا ہے زرکشی نے۔ اور عسقلانی فرماتے ہیں کہ پہلا لفظ تاء مثناۃ کے ساتھ (تمرا) ہے اور دوسرا ثاء مثلثہ کے ساتھ (ثمرا) ہے (ثمر) اور اس کا عکس بھی ہے اور دلیل اگلا کلام ہے۔

الا انه رخص فی العرية: عین کے فتحہ، راء کے کسرہ اور یاء کے شد کے ساتھ ''تعری'' سے ماخوذ ہے، اس کے معنی ہیں ''تجرد'' لغت میں ''عرية'' کھجور کے درخت کو کہتے ہیں، اور ''عرية'' **فعيلة** بمعنی ''**فاعلة**'' ہے، جمہور کے نزدیک۔ اس لئے کہ اس کو خالی کر دیا ہے مالک کے خالی کرنے باقی درختوں سے۔ امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ دلالت کر رہا ہے اس بات پر کہ ''عریة'' کو ''مزابنہ'' سے مستثنیٰ کیا گیا ہے، اس لئے کہ ''**بیع الثمر بالتمر**'' اسی کا نام ''**مزابنه**'' ہے۔

قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ ''**عرية**'' **فعيلة** بمعنی ''**مفعول**'' ہے اور تاء لفظ کو وصفیت سے اسمیت کی طرف نقل کرنے کے لئے ہے۔ پس اس کو نقل کیا، اس عقد کی طرف جو اس پر وارد ہوتا ہے، اور اس کے خالی کرنے کو متضمن ہوتا ہے۔

شرح السنہ میں ہے کہ اس کا نام ''**عرية**'' رکھا گیا ہے اس لئے کہ یہ حرمت سے خالی کیا گیا ہے۔ یعنی حکم حرمت سے نکل گیا ہے،

پس یہ ''فعیلة'' بمعنی ''فاعلة '' ہے۔اور بعض کہتے ہیں کہ یہ باغ سے خالی کیا گیا ہے اس کے پھلوں کا اندازہ کرنے اور فروخت کرنے کے ساتھ، یعنی نکالا گیا ہے باغ سے۔

ان تباع : ضمیر'' عریة'' کی طرف راجع ہے،

بخرصها : خاء معجمہ کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ ہے، یعنی اس کے اندازہ کے ساتھ، یہاں خرص بمعنی "مخصروص" ہے ۔ای بمخروصها کیلا حال کون المخروص

تمرا: امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''تمراً'' تمیز ہے۔اور یہ بھی احتمال ہے کہ حال مقدرہ ہو۔اور اس احتمال کی تائید اگلے قول سے ہوتی ہے:''یاکلها اهلها رطبا'' کہ یہاں ''رطباً'' حال ہے۔اور اس سے تائید ہوتی ہے ان لوگوں کے مذہب کی جو کہتے ہیں کہ واجب ہے کہ حال مشتق ہو چاہے حقیقۃً ہو یا تاً ویلاً ہو۔اس لئے کہ مطلوب یہاں وصف ہے نہ کہ ذات ورنہ تو آپس میں تبدیل کرنا عبث ہوگا۔(انتہی) تمرا کی تمیز ہونے کے احتمال کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے:'' بخرصها من التمر''اور خرص' ''حرز'' کے معنی میں ہے۔اور خاء کے کسرے کے ساتھ یہ اسم ہے، جیسا کہ قاموس میں ہے۔اور مشارق میں ہے کہ ''خرص'' خاء کے کسرہ کے ساتھ اسم ہے اس چیز کا جس کا اندازہ لگایا گیا ہو، اور خاء کے فتحہ کے ساتھ اسم فعل ہے، اور یعقوب فرماتے ہیں کہ ''خرص'' بالکسر اور بالفتح دونوں لغتیں ہیں ''شئ مخروص'' میں۔اور حاشیہ زرکشی میں ہے کہ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہ فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ ہے، لیکن فتحہ کے ساتھ زیادہ مشہور ہے۔امام قرطبی فرماتے ہیں کہ روایت کسرہ کے ساتھ ہے، اس طور پر کہ یہ ''شئ مخروص'' کا نام ہے، اور جنہوں نے فتح دیا ہے تو انہوں نے اس کو اسم فعل بنایا ہے۔

۲۸۳۸: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَرْخَصَ فِیْ بَيْعِ الْعَرَايَا بِخَرْصِهَا مِنَ التَّمْرِ فِيْمَا دُوْنَ خَمْسَةِ اَوْ سُقٍ اَوْ فِیْ خَمْسَةِ اَوْ سُقٍ شَكَّ دَاوُدُ بْنُ الْحُصَيْنِ. (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤/٣٨٧ الحدیث رقم ٢١٩٠،ومسلم فی ٣/١١٨١ الحدیث رقم (٧١ـ١٥٤١)وابو داوٗد فی السنن ٣/٦٦٢ الحدیث رقم ٣٣٦٤ والترمذی فی ٣/٥٩٥ الحدیث رقم ١٣٠١ومالك فی الموطأ٢/٦٢٠ الحدیث رقم ١٤من كتاب البيوع۔

ترجمہ:''اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے عاریۃً (محتاجوں کو دیئے گئے درختوں کے پھلوں) کو خشک کھجوروں کے ساتھ اندازہ کر کے بیچنے کی اجازت دے دی ہے۔یعنی اگر عرایا پر لگی ہوئی کھجوروں کو خشک کھجوروں کے عوض خریدنا ہو تو پہلے یہ اندازہ کر لیا جائے کہ یہ تازہ کھجوریں خشک ہونے کے بعد کتنی رہیں گی پھر اتنی ہی مقدار میں خشک کھجوریں لے کر وہ تازہ کھجوریں دے دی جائیں مگر اس اجازت کا تعلق اس صورت سے ہے) جبکہ وہ پانچ وسق سے کم ہوں۔یہ حدیث کے ایک راوی داؤد بن ابن حصینؒ کا شک ہے (کہ آپ ﷺ کے ارشاد میں پانچ وسق سے کم کا تذکرہ تھا یا پانچ وسق کا تذکرہ تھا)''۔(بخاری ومسلم)

تشریح: ارخص : اور ایک نسخہ میں'' رخّص '' تشدید کے ساتھ ہے، فائدہ: یہ جواز بطور رخصت کے تھا نہ کہ بطور عزیمت کے۔فی بیع العرایا : یہاں مضاف محذوف ہے۔ ای فی بیع تمر العرایا۔ بخرصها : یہ باء بسببیت کے لئے ہے۔من التمر : ظاہر یہ ہے کہ منؔ بیانیہ ہے، اور تمیز ہے مخروص کیلئے ،اور امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ متعلق ہے'' عرایا '' کے اور بخرصها میں باسببیت کیلئے ہے یعنی اجازت دی ہے درخت پر لگے ہوئے کھجوروں کو پڑی ہوئی کھجوروں کے بدلے فروخت کرنے کی، اس کے اندازہ کرنے کے واسطہ سے۔

اوسق : وسق کی جمع ہے، واؤ کے فتحہ اور سین کے سکون کے ساتھ ہے۔ایک وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے، اور ایک صاع پانچ رطل اور ثلث رطل کا ہوتا ہے، بغدادی رطل کے ساتھ (اس کو ذکر کیا ہے امام طیبی رحمہ اللہ نے۔)

او فی خمسة وسق : امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ راوی کی طرف سے شک ہے، پس اس صورت میں کم کو لینا ضروری ہے، اور وہ پانچ وسق سے کم ہے، اور پانچ وسق حرمت ہی کے حکم پر باقی رہیں گے، احتیاط اسی میں ہے جیسا کہ پہلے گزرا۔

قوله :شلك داود بن الحصين : امام مالک کے شیخ ہیں اس حدیث کے رواۃ میں سے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ داؤد بن ابی الہند ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ داؤد بن قیس ہے۔

پھل ظاہر ہونے سے پہلے بیچنے کی ممانعت

۲۸۳۹: **وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ الثِّمَارِ حَتّٰى يَبْدُوَ صَلَاحُهَا نَهٰى الْبَائِعَ وَالْمُشْتَرِيَ** (متفق علیه وفی روایة لِمُسْلِمٍ) **نَهٰى عَنْ بَيْعِ النَّخْلِ حَتّٰى تَزْهُوَ وَعَنِ السُّنْبُلِ حَتّٰى يَبْيَضَّ وَيَاْمَنَ الْعَاهَةُ.** (رواہ بخاری ومسلم)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤/٣٩٤ الحدیث رقم ٢١٩٤ ومسلم فی ٣/١١٦٥ الحدیث رقم (٤٩۔١٥٣٤) وابو داؤد فی السنن ٣/٦٦٣ الحدیث رقم ٣٣٦٧ وابن ماجه فی ٢/٧٤٦ الحدیث رقم ٢٢١٤۔

ترجمہ: ''اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے پھلوں کی بیع سے اس وقت تک منع فرمایا ہے جب تک کہ ان کی صلاحیت ظاہر نہ ہو جائے۔ آپ ﷺ نے بائع اور مشتری دونوں کو منع فرمایا ہے۔ (بخاری ومسلم) مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے کھجور کے پھل کو اس وقت تک بیچنے سے منع فرمایا ہے جب تک کہ وہ سرخ و زرد نہ ہو جائیں' نیز آپ ﷺ نے کھیتی کے خوشوں (بالیوں) کو اس وقت تک بیچنے سے منع فرمایا ہے جب تک کہ وہ سعید نہ ہو جائیں اور کسی آفت سے محفوظ نہ ہو جائیں''۔

تشریح: **الثمار** : ثاء مثلثہ کے کسرہ کے ساتھ جمع ہے ''ثمر'' کی' ثمر میں دونوں حرفوں پر فتحہ ہے۔

یبدو : دال کے ضمہ کے ساتھ ہے اور اس کے بعد واؤ ہے' بمعنی **یظھر**۔

صلاحھا : اور اس سے فائدہ حاصل کرنا ممکن ہو جائے۔

شرح السنہ میں ہے کہ اہل علم کے ہاں عمل اس پر ہے کہ پھلوں کو درخت کے اوپر لگے ہوئے پختگی ظاہر ہونے سے پہلے مطلقاً بیچنا ناجائز ہے۔ اس کے بارے میں حضرت ابن عباسؓ حضرت جابر' حضرت ابو ہریرہ' حضرت زید بن ثابت' حضرت ابوسعید الخدری اور حضرت عائشہؓ سے روایات مروی ہیں اور یہی امام شافعی کا قول ہے، اس لئے کہ اس میں پھل ہلاک ہونے سے محفوظ نہیں ہوتے کسی آفت کے نازل ہونے کی وجہ سے بوجہ پھلوں کے چھوٹے اور کمزور ہونے کے اور جب پھل ہلاک ہو جائے گا تو مشتری کیلئے کچھ نہ رہے گا۔

قوله :نهی البائع والمشتری : یعنی اس بیع سے منع فرمایا تا کہ وہ خریدار کے مال کو بغیر کسی عوض کے لینے والا نہ ہو۔ اور خریدنے سے اس لئے منع فرمایا تا کہ اس کا ثمن ہلاک نہ ہو پھلوں کے ہلاک ہونے کی صورت میں۔

قوله :وفی روایة لمسلم نهی عن بیع النخل

حتی تزهو : تانیث کے ساتھ اس۔ ئے کہ لفظ نخل مؤنث اور مذکر دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے: ﴿**نخل خاوية**﴾ [الحاقة۔٧] صفت مؤنث لائی گئی ہے۔

[**نخل منقعر**][القمر۔٢٠] صفت مذکر ذکر فرمائی ہے،''**زها النخل**'' سے ماخوذ ہے، یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب اس کا پھل ظاہر ہو جائے۔ خطابی فرماتے ہیں کہ اسی طرح اس کو روایت کیا گیا ہے لیکن صحیح عربیت میں ''**تزهی**''**أزهی النخل**'' سے ہے بمعنی **احمر واصفر**، اور یہ علامت ہوتی ہے اس کے پھلوں کی پختگی کی۔ اور آفت سے بچنے کی۔ (انتہیٰ)

یہ محل نظر ہے چونکہ لغت میں "زھت النخل و ازھت" بھی آیا ہے۔ چنانچہ قاموس میں ہے: زھا النخل، طال کا زھی، والبسر تلوت کا زھی وزھی کعنی و کدعا قلیلة۔

قولہ: وعن السنبل: جنس ہے مفرد اس کا "سنبلة" ہے یعنی اس کے دانے کی بیع سے منع فرمایا۔

حتی یبیض: ضاد کی تشدید کے ساتھ۔ ویأ من العامة یہ سب عطف تفسیری ہے۔

ابن الملک فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے خوشوں کے اندر دانے کے فروخت کا جواز معلوم ہوتا ہے، اور یہی ہمارا مذہب ہے۔ اخروٹ اور بادام کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے کہ ان دونوں کو ان کے چھلکوں کے اندر بیچا جاتا ہے۔

۲۸۴۰: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ الثِّمَارِ حَتّٰى تُزْهِيَ قِيْلَ وَمَا تُزْهِيَ قَالَ حَتّٰى تَحْمَرَّ وَقَالَ اَرَاَيْتَ اِذَا مَنَعَ اللّٰهُ الثَّمَرَةَ بِمَ يَاْ خُذُ اَحَدُ كُمْ مَا لَ اَخِيْهِ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤/٣٩٨ الحدیث رقم ٢١٩٨ ومسلم فی ٣/١١٩٠ الحدیث رقم (١٥-١٥٥٥) والنسائی فی السنن ٧/٢٦٤ الحدیث رقم ٥٢٦، واملك فی الموطأ ٢/٦١٨ الحدیث رقم ١١ من کتاب البیوع۔

ترجمہ: "اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے پھلوں کو درختوں پر اس وقت تک بیچنے سے منع فرمایا ہے جب تک کہ وہ پختہ ہو جائیں۔ عرض کیا گیا کہ پختہ ہونے کا کیا مطلب ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہاں تک وہ سرخ ہو جائیں (یعنی پک نہ جائیں) اور پھر فرمایا تم ہی بتاؤ جب اللہ تعالیٰ پھلوں کو (پکنے سے) روک دے تو تم میں سے کوئی کیسے اپنے مسلمان بھائی کا مال حاصل کرے گا"۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: حتی تزھی: ازھی سے ہے۔

قیل وما تزھی: یاء کے فتحہ کے ساتھ ہے اور یک نسخہ میں سکون کے ساتھ ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ آپ ﷺ کے قول کی حکایت ہو، یعنی تقدیری عبارت یوں ہو: ما معنی قولك حتی تزھی اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ "تسمع بالمعیدی" کے باب سے ہو۔ یعنی کہا گیا کہ "زھو" کیا چیز ہے۔ اگلے کلام کے پیش نظر اول ہی صحیح

وقال: یہ بھی ممانعت کی علت اور قلت اور حکمت کی طرف اشارہ ہے امت پر رحم کے بناء پر، ارأیت میں، خطاب عام کے۔ بم یأخذ: ما استفہامیہ کے الف کو حذف کیا ہے، مال اخیه: استفہام انکاری ہے یعنی یہ کیسے جائز ہے۔ یعنی یہ لینا اس کیلئے جائز نہیں ہے۔

پھلدار درختوں کو کئی سالوں کے لئے پیشگی بیچ ڈالنے کی ممانعت

۲۸۴۱: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ السِّنِيْنَ وَاَمَرَ بِوَضْعِ الْجَوَائِحِ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی قسمین فی ٣/١١٧٨ الحدیث رقم ١٠١-١٥٣٦) وفی ٣/١١٩١ الحدیث رقم (١٧-١٥٥٤) وابو داوٗد فی السنن ٣/٦٨٠ الحدیث رقم ٣٣٧٤ والنسائی فی ٧/٢٦٦ الحدیث رقم ٤٥٣١، وابن ماجه فی ٢/٧٤٧ الحدیث رقم ٢٢١٨ واحمد فی المسند ٣/٣٠٩۔

ترجمہ: "اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے چند سالوں کیلئے پھل بیچنے سے منع فرمایا ہے (یعنی ایک سال یا دو سال یا تین سال یا اس سے زائد سالوں کے لئے درختوں کا پھل پیشگی نہیں بیچنا چاہیے) نیز آپ ﷺ نے آفت زدہ کے ساتھ رعایت کرنے کا حکم فرمایا ہے"۔ (مسلم)

تشریح: عن بیع السنین: سین کے کسرہ کے ساتھ، جمع ہے سنة کی سین کے فتحہ کے ساتھ، اس سے مراد بیع معاومة ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا۔

قولہ: وامر بوضع الجوائح: جیم کے فتحہ کے ساتھ جمع ہے جائحة کی۔ ابن الملک فرماتے ہیں کہ یہ حکم استحبابی ہے اکثر کے

نزدیک، اسلئے کہ قبضہ وملکیت میں آجانے کے بعد مبیع کے ہر نفع ونقصان کا ذمہ دار خریدار ہی ہوتا ہے، اس میں اختلاف ہے مالکؒ کا۔ طحاوی فرماتے ہیں کہ یہ حکم خراجی زمین کے بارے میں ہے، اور یہ حکم امام کی صواب دید پر ہے، اس لئے کہ اس میں مسلمانوں کی مصلحت ہے۔

۲۸۴۲: **وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَوْبِعْتَ مِنْ اَخِيْكَ ثَمَرًا فَاَصَابَتْهُ جَائِحَةٌ فَلَا يَحِلُّ لَكَ اَنْ تَأْخُذَ مِنْهُ شَيْئًا بِمَ تَأْخُذُ مَالَ اَخِيْكَ بِغَيْرِ حَقٍّ۔** (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۳/ ۱۱۹۰ الحدیث رقم (۱۴ـ۱۵۵٤)وابو داوٗد فی السنن ۳/ ۷٤٦ الحدیث رقم ۳٤۷۰، والنسائی فی ۷/ ۲٦٤ الحدیث رقم ٤۵۲۷ وابن ماجه فی ۲/ ۷٤۷ الحدیث رقم ۲۲۱۹۔

ترجمہ: اور حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر تم نے اپنے مسلمان بھائی کے ہاتھ پھل فروخت کیا اور اس پر کوئی آفت آجائے (پھر وہ پھل ضائع ہو جائے) تو تمہارے لئے اس میں سے کچھ لینا حلال نہیں ہے (تم خود سوچو کہ ایسی صورت میں) ایک بھائی کا مال ناحق کیسے لوگے"۔ (مسلم)

تشریح: **ثمرا** : ثاء مثلثہ کے ساتھ ہے۔ ابن الملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ اگر مبیع خریدار کی سپردگی میں جانے سے پہلے ضائع ہو جائے تو اس کا نقصان بیچنے والے کو برداشت کرنا ہوگا، اس صورت میں حدیث میں کوئی تاویل کرنے کی ضرورت نہیں، اور اگر مبیع خریدار کے قبضے میں جانے کے بعد ضائع ہو تو پھر "کچھ لینا حلال نہیں ہے" کا مطلب یہ ہے کہ از روئے تقویٰ وورع کچھ لینا حلال نہیں ہے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ کلام تہدید پر محمول ہے۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "**فلا یحل**" لو کا جواب اور "لو" بمعنی "اِن" ہے۔ یا جواب مقدر ہے اور "**فلا یحل**" اس پر عطف ہے۔ تقدیری عبارت یوں ہے: "**لو بعت من اخیك ثمرا فهلك لا تأخذ منه شیأ فلا یحل لك**" اور تکرار برائے تقریر ہے، جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿**كذبت قبلهم قوم نوح فكذبوا عبدنا**﴾ [القمر۔ ۹]

بم تأخذ مال اخیك بغیر حق : حق تو یہ ہے کہ ظاہر حدیث امام مالک کے ساتھ ہے، اور ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ یہاں ایک قید مقدر ہے اور اصل عبارت یوں ہے:)**لو بعت من أخیك ثمرا قبل الزهوا**۔ اگر تو نے پھل پکنے سے پہلے اپنے بھائی کو بیچے تو پھر یہ حکم اتفاقی ہوگا۔

اشیاء منقولہ میں قبل قبضہ دوسری بیع جائز نہیں ہے

۲۸۴۳: **وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانُوْا يَبْتَاعُوْنَ الطَّعَامَ فِي اَعْلَى السُّوْقِ فَيَبِيْعُوْنَهُ فِيْ مَكَانِهٖ فَنَهَاهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ بَيْعِهٖ فِيْ مَكَانِهٖ حَتّٰى يَنْقُلُوْهُ ۔** (رواہ ابوداود ولم احدہ فی الصحیحین)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤/ ۳۷۵ الحدیث رقم ۲۱٦۷ ومسلم فی صحیحه ۳/ ۱۱٦۰ الحدیث رقم (۳۳ـ۱۵۲۷) وابو داوٗد فی السنن ۳/ ۷٦۰ الحدیث رقم ۳٤۹۳ والنسائی فی ۷/ ۲۸۷ الحدیث رقم ٤٦۰٦ ومالك فی الموطیٰ ۲/ ٦٤۱ الحدیث رقم ٤۲ من كتاب البیوع۔

ترجمہ: اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ بازار کے اس حصے میں جو بلندی کی جانب واقع تھا لوگ غلہ خریدتے اور پھر اسی جگہ قبضہ میں لینے سے قبل (غلہ کو) فروخت کر دیتے تھے' چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو اس بات سے منع فرمایا کہ جب تک غلہ کو (خریدنے کے بعد) وہاں سے منتقل نہ کیا جائے اس (غلہ) کو اسی جگہ فروخت نہ کیا جائے"۔ اس روایت کو ابوداؤد نے نقل کیا اور مجھے یہ روایت بخاری ومسلم میں نہیں ملی ہے)۔

تشریح: **قوله**: "فاء" تعقیبیہ بیع قبل از قبض کا فائدہ دے رہی ہے، اور آنے والی حدیث قبل از استیفاء پر دلالت کر رہی ہے۔

وجہ ممانعت یہ ہے کہ اشیاء منقولہ میں قبضہ اس کو اپنی جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے ساتھ ہوتا ہے، (اس کو امام طیبی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔) ابن الملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اشیاء منقولہ کا قبضہ اس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف منتقل کرنے سے ہوتا ہے۔

قوله :رواه ابوداود ولم اجد ه فی الصحیحین : یہ دراصل صاحب مصابیح امام بغویؒ پر اعتراض ہے کہ انہوں نے یہ حدیث پہلی فصل میں ذکر کی ہے، حالانکہ یہ روایت نہ بخاری میں ہے اور نہ مسلم میں ہے۔

۲۸۴۴:**وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنِ ابْتَاعَ طَعَامًا فَلَا يَبِعْهُ حَتّٰى يَسْتَوْفِيَهُ۔**

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤/٣٤٤ الحدیث رقم ٢١٢٦ ومسلم فی ٣/١١٦٠ الحدیث رقم (٣٢-١٥٢٦) وابو داوٗد فی السنن ٣/٧٦٠ الحدیث رقم ٣٤٩٢ والنسائی فی ٧/٢٨٦ الحدیث رقم ٤٦٠٤ وابن ماجه فی ٢/٧٤٩ الحدیث رقم ٢٢٢٦ والدار می فی ٢/٣٢٩ الحدیث رقم ٢٥٥٩ ومالك فی الموطأ ٢/٦٣٠ الحدیث رقم ٤٠ من كتاب البیوع واحمد فی المسند ٢/٢٢۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص غلہ خریدے تو اس کو اس وقت تک فروخت نہ کرے جب تک کہ اسے پوری طرح نہ لے لے۔

تشریح: **فلا یبیعه** : نفی بمعنی نہی ہے۔ **حتی یستو فیه** :یعنی مکمل طور پر قبضہ کرلے، وزن کر کے یا کیل کر کے۔

۲۸۴۵:**وَفِیْ رِوَايَةِ ابْنِ عَبَّاسٍ حَتّٰى يَكْتَالَهُ.** (متفق علیه)

اخرجه مسلم فی صحیحه ٣/١١٦٠ الحدیث رقم (٣٢-١٥٢٥) وابو داوٗد فی السنن ٣/٧٦٢ الحدیث رقم ٣٤٩٦ والترمذی فی ٣/٥٨٦ الحدیث رقم ١٢٩١ والنسائی فی ٧/٢٧٥ الحدیث رقم ٤٥٩٧ ،وابن ماجه فی ٢/٧٤٩ الحدیث رقم ٢٢٢٧۔

ترجمہ:اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ جب تک کہ اس کو ناپ لے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: ابن الملک فرماتے ہیں کہ جس نے غلہ خریدا ناپ کر، تو وہ اس کو فروخت نہ کرے یہاں تک کہ اس کو دوبارہ ناپ لے، اور خریدنے کو ہم نے مقید کیا کیل کے ساتھ اس لئے کہ اگر وہ اٹکل کے ساتھ خرید لے گا تو اس میں ناپنا شرط نہیں ہے، اور اشتراء کی قید سے معلوم ہوا کہ اگر ایک آدمی کسی مکیلی چیز کا مالک ہوجائے ہبہ یا میراث کے ذریعہ یا اس کے علاوہ کسی ذریعے سے، تو اس کے لئے بیع قبل از کیل جائز ہے، اور ''**فلا یبیعة**'' سے پتہ چلتا ہے کہ اگر اس نے ھبہ کیا تو جائز ہے یہی امام محمد رحمہ اللہ قول ہے۔اور ناپنے سے پہلے بیچنے سے جو منع فرمایا ہے یہ اس لئے کہ جو چیزیں مکیلی ہوں تو ان کو کیل کر کے بیچنا اتمام قبضہ میں سے ہے۔اس لئے کہ یہ ناپ ہی کے ذریعے متعین ہوتا ہے، پس جس طرح مبیع پر قبضہ کرنے سے پہلے اس کو بیچنا ممنوع ہے اسی طرح قبضہ تمام ہونے سے پہلے بھی مبیع کو بیچنا ممنوع ہے۔

بعض علماء نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ اگر بیچنے والا خریدار کے سامنے غلہ کو ناپ کردے۔

اگر آپ یہ اعتراض کریں کہ آپ نے جو بات ذکر کی یہ تو اس حدیث کی مخالف ہے کہ آپ نے غلہ کو بیچنے سے منع فرمایا ہے، یہاں تک کہ اس میں دوصاع چلیں ایک صاع بائع کا اور دوسرا صاع مشتری کا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث محمول ہے اس پر کہ جب دو (۲) سودے ''بابِ سلم'' میں جمع ہوجائیں اور اس کی صورت یہ ہے کہ جب ''مسلم الیہ'' یعنی بائع کسی آدمی سے کوئی چیز خریدے ناپ کر اور ''رب السلم'' یعنی مشتری کو حکم دے اس کو قبضہ کرنے کا۔تو یہ صحیح نہیں جب تک کہ اس میں دوصاع نہ چلیں، چونکہ اس میں، دو معاملات جمع ہوگئے ہیں ناپ کی شرط کے ساتھ۔ایک ''مسلم الیہ'' کا خریدنا اور دوسرا ''رب السلم'' کا قبضہ کرنا اور یہ بیع جرید کی طرح ہے۔

۲۸۴۶: **وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اَمَّا الَّذِیْ نَهٰى عَنْهُ النَّبِیُّ ﷺ فَهُوَ الطَّعَامُ اَنْ يُّبَاعَ حَتّٰى يُقْبَضَ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ وَلَا اَحْسِبُ كُلَّ شَیْءٍ اِلَّا مِثْلَهُ** (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤/٣٤٩ الحدیث رقم٢١٣٥ ومسلم فی ٣/١١٥٩ الحدیث رقم (٣٠-١٥٢٥)۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس چیز کو منع کیا ہے وہ غلہ ہے کہ اس کو قبضے میں لانے سے قبل فروخت کرنا ممنوع ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا کہ میرا گمان ہر چیز کے بارے میں یہی ہے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: **یقبض** : مجہول کے صیغہ کے ساتھ، **ولا أحسب** : سین کے کسرہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ ہے ''لا اظن'' کے معنی میں ہے۔ **کل شئی الا مثله** : یعنی غلہ کیطرح ہے کہ خریدار کیلئے اس کا فروخت کرنا جائز نہیں ہے قبضہ کرنے سے پہلے۔

ابن الملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ظاہر یہ ہے کہ یہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

٢٨٤٧: **وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا تَلَقَّوُا الرُّکْبَانَ لِبَیْعٍ وَلَا یَبِعْ بَعْضُکُمْ عَلٰی بَیْعِ بَعْضٍ وَلَا تَنَاجَشُوْا وَلَا یَبِعْ حَاضِرٌ لِبَادٍ وَلَا تُصَرُّوْا لِاِبِلَ وَالْغَنَمَ فَمَنِ ابْتَاعَهَا بَعْدَ ذٰلِكَ فَهُوَ بِخَیْرِ النَّظْرَیْنِ بَعْدَ اَنْ یَّحْلُبَهَا اِنْ رَضِیَهَا اَمْسَکَهَا وَاِنْ سَخِطَهَا رَدَّهَا وَصَاعًا مِنْ تَمْرٍ** (متفق علیه وفی روایة لمسلم) **مَنِ اشْتَرٰی شَاةً مُصَرَّاةً فَهُوَ بِالْخِیَارِ ثَلَاثَةَ اَیَّامٍ فَاِنْ رَدَّهَا رَدَّمَعَهَا صَاعًا مِّنْ طَعَامٍ لَا سَمْرَاءَ**.

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤/٣٦١ الحدیث رقم ٢١٥٠ ومسلم فی ٣/١١٥٥ الحدیث رقم (١١-١٥١٥) وابو داؤد فی ٣/٧٢٢ الحدیث رقم ٣٤٤٣ والنسائی فی ٧/٢٥٣ الحدیث رقم ٤٤٨٧ وابن ماجه فی ٢/٧٥٣ الحدیث رقم ٢٢٣٩ ومالك فی الموطأ ٢/٦٨٣ الحدیث رقم ٩٦ من کتاب البیوع۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم (شہر سے باہر جا کر) قافلے والوں سے خرید و فروخت کے لئے ملاقات نہ کرو اور تم میں سے کوئی شخص کسی کی بیع پر بیع نہ کرے اور نجش (یعنی قیمت بڑھانے کی غرض سے بولی دینا) نہ کرے اور شہر کا آدمی کسی دیہاتی کا مال فروخت نہ کرے اور اونٹ وبکری کے تھنوں میں دودھ جمع نہ کرو اور اگر کوئی شخص ایسا جانور خریدے جس کے تھنوں میں دودھ جمع کیا گیا ہو تو دودھ دوہنے کے بعد اسے اس جانور کو رکھ لینے یا واپس کر دینے کا اختیار ہوگا کہ اگر اس کی مرضی ہو تو اس جانور کو رکھ لے اور اگر مرضی ہو تو اس کو پھیر دے اور اس کے ساتھ ہی صاع (ساڑھے تین سیر) کھجوریں دے دے''۔ (بخاری ومسلم) مسلم کی ایک روایت میں یوں ہے کہ جو شخص ایسی بکری خریدے جس کے تھنوں میں دودھ جمع کیا گیا ہو تو اس شخص کو بکری کو رکھ لینے یا واپس کر دینے کا تین دن تک اختیار رہتا ہے چنانچہ اگر وہ (ان تین دنوں میں) اس بکری کو واپس کرے تو اس کے ساتھ ایک صاع کھجوریں دے دے گندم نہ دے''۔

تشریح: **قال لا تلقوا** : تاء اور لام کے فتحہ کے ساتھ، اور واؤ کے سکون کے ساتھ حالت وقف میں اور واؤ کے ضمہ کے ساتھ حالت وصل میں اور اس کی اصل ''لا تتلقوا''۔

الرکبان : راء کے ضمہ کے ساتھ ''راکب'' کی جمع ہے' بمعنی قافلہ۔

قوله : البیع مطلب یہ ہے کہ جب تمہیں کسی قافلے کے آنے کی خبر ملے تو تم ان سے اس غرض سے نہ ملو کہ تم ان سے سامان تجارت سستے داموں خرید لو، ان کے بازار میں آنے اور وہاں کے بھاؤ معلوم کرنے سے پہلے۔ اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے دھوکہ اور نقصان سے بچا جا سکے۔

قوله : ولا یبع بعضکم علی بیع بعض : مثلاً کوئی شخص کسی سے کوئی چیز بشرط خیار خریدے اور تیسرا آدمی جا کر مشتری سے کہہ دے کہ آپ اس معاملے کو فسخ کر دیں میں آپ کو ایسی چیز اس سے سستے داموں دیدوں گا، یا اس سے اچھی چیز اتنی ہی قیمت پر دے دوں گا۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ ممانعت خاص ہے اس صورت کے ساتھ جب اس میں غبن نہ ہو، اور اگر اس میں کوئی غبن ہو تو پھر اس کے لئے جائز ہے کہ وہ اسے یہ معاملہ فسخ کرنے کی دعوت دے اور اس سے سستے داموں اس کو بیچے تاکہ اس کو نقصان سے بچالے۔

قوله :ولا تناجشوا :ایک تاء کے حذف کے ساتھ ''بخش'' کے معنی ہیں سامان کی قیمت کو بڑھانا،اس کو خریدنے میں رغبت نہ ہو تاکہ خریدار کو فریب اور ترغیب دے اور مالک سامان کو نفع ہو۔

قوله :ولا یبع حاضر جیسا کہ کوئی دیہاتی شہر میں سامان لیکر آئے تاکہ اس دن کے رائج قیمت پر اس کو بیچ کر واپس لوٹ جائے اور شہری اس کی طرف سے وکیل بن جائے کہ اس کو مہنگے داموں بتدریج بیچے گا یہ امام شافعی رحمہ اللہ کے ہاں حرام ہے۔اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ہاں مکروہ ہے۔اس سے آپ نے اس لئے منع فرمایا کہ اس میں بیوپاریوں پر نرمی کا دروازہ بند کرنا ہے۔(اور مخلوق خدا کو نفع سے باز رکھنا ہے)۔

قوله :ولا تصروا الابل والغنم : تاء کے ضمہ اور را کی تشدید کے ساتھ ہے۔عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ تاء کے ضمہ اور راء کے فتحہ کے ساتھ ''تزکوا'' کے وزن پر ہے اور بعض نے اس کو پہلے کے ضمہ اور ثانی کے فتحہ کے ساتھ ضبط کیا ہے۔اور اول زیادہ صحیح ہے۔(انتہی)

یہ ''**صریت الشاة**'' سے ماخوذ ہے، یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب بکری کو کئی دن تک دوہا نہ جائے تاکہ اس کے تھنوں میں دودھ جمع ہو جائے (اسی طرح ذکر کیا ہے بعض حضرات نے ،)اور یہ قول ثانی کی تائید کر رہا ہے۔اور صحیح یہ ہے کہ یہ ''**تصریة**'' سے ماخوذ ہے، اور ''**تصریة**'' کہتے ہیں کہ بیچنے سے پہلے اس کے تھنوں کو باندھا جائے تاکہ خریدار یہ گمان کرے کہ یہ زیادہ دودھ دینے والی ہے،تو وہ قیمت زیادہ کر دیتا ہے،اور اس کی ممانعت دھوکہ کی وجہ سے ہے۔

سخطها : خاء کے کسرہ کے ساتھ۔**قوله :ردها وصاعاً** :(یہ واؤ بمعنی ''مع'' ہے۔)ای مع صاع.

من تمر : کھجور اس دودھ کے عوض میں دے جو اس نے دوہا ہے،اس لئے کہ خریدار نے جو دودھ دوہا ہے اس میں کچھ حصہ تو وہ ہے جو خریدار کی ملکیت میں آنے کے بعد پیدا ہوا ہے اور کچھ وہ ہے جو خریداری کے وقت جانور کے تھن میں تھا اور مبیع کا حصہ تھا اس صورت میں دودھ کے ان دونوں حصوں کا تعین و امتیاز ناممکن ہونے کی وجہ سے نہ تو دودھ واپس کیا جا سکتا ہے،اور نہ ہی اس کی قیمت متعین کر کے دی جا سکتی ہے،لہٰذا شارع نے اس کا حل یہ نکالا کہ طرفین میں فتنہ وفساد کے دفعیہ کیلئے ایسے دودھ کا عوض ایک صاع کھجوریں متعین کر دیں اور اس سلسلے میں دودھ کی کمی بیشی کو بنیاد نہیں بنایا، چنانچہ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ شارع نے خون ناحق کی دیت ایک سو اونٹ مقرر کی ہے، حالانکہ مراتب وحیثیت کے اعتبار سے ہر جان اور ہر خون یکساں نہیں ہوتا،لیکن اس بارے میں شریعت نے اس تفاوت کو بنیاد نہیں بنایا۔اس حدیث پر امام شافعیؒ نے عمل کیا ہے،اور کہا ہے کہ اس طرح کے جانور کی بیع میں خیار حاصل ہوتا ہے لیکن امام ابوحنیفہؒ نے کہا ہے کہ اس میں خیار نہیں ہوتا،ان کے نزدیک حدیث میں مذکورہ حکم متروک ہے۔اس لئے کہ یہ اس اصول کے مخالف ہے جو اس آیت سے معلوم ہو رہا ہے ﴿**فمن اعتدی علیکم فاعتدوا علیه بمثل ما اعتدی علیکم**﴾(سو جو تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس پر زیادتی کرو،جیسی اس نے زیادتی کی)۔

یہ اصل عین کے فوت ہونے کی صورت میں اس کی مثل یا قیمت کو لازم کرتا ہے، یا یہ حکم ربا کے حرام ہونے سے پہلے تھا جبکہ معاملات میں اس قسم کی چیزیں جائز تھیں،اب یہ منسوخ ہو گیا ہے۔(جیسا کہ سیر میں ہے اس کو ذکر کیا ہے ابن الملک نے شرح المشارق میں۔)

قوله :من اشتریٰ شاة مصراة فهو بالخیار ثلاثة ایام فان ردها رد معها صاعًا من طعام :طعام سے مراد تمر ہے۔

علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ جانور واپس کرتے ہوئے اس کے دودھ کے عوض میں کھجوروں کے علاوہ اور کچھ دینا جائز نہیں ہے، اگرچہ بیچنے والا کوئی بھی چیز لینے پر راضی ہو چونکہ ان کی غذا زیادہ تر کھجور اور دودھ ہی تھا اس لئے دودھ کی بجائے کھجور دینا مقرر کیا گیا۔بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اگر بیچنے والا راضی ہو تو کھجور کے علاوہ اور کوئی چیز بھی دی جا سکتی ہے،تو گویا کہ اس نے اپنے حق کو اس سے تبدیل کیا۔

۲۸۴۸ :وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا تُلَقُّوْا الْجَلَبَ فَمَنْ تَلَقَّاهُ فَاشْتَرٰی مِنْهُ فَاِذَا اَتٰی سَيِّدُهُ السُّوْقَ

فَهُوَ بِالْخِيَارِ. (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ۳/۱۱۵۷ الحديث رقم (۱۷۔۱۵۱۹)وابو داوٗد فی ۳/۷۱۸ الحديث رقم ۳٤۳۷ والترمذی فی ۳/٥۲٤ الحديث رقم ۱۲۲۱، والنسائی فی ۷/۲٥۷ الحديث رقم ٤٥۰۱ وابن ماجه فی ۲/۷۳٥الحديث رقم ۲۱۷۸والدارمی فی ۲/۳۳۱ الحديث رقم ۲٥٦٦۔

ترجمہ: اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (شہر سے باہر جا کر غلہ لینے کے لئے) قافلے والوں سے نہ ملو۔ اگر کوئی شخص جا کر ملا اور کچھ سامان خرید لیا اور پھر سامان کا مالک بازار میں آیا تو اس کو اختیار ہوگا (کہ چاہے بیع کو قائم رکھے چاہے فسخ کر دے)۔ (مسلم)

تشریح: قوله :لا تلقوا الجلب : جیم اور لام کے فتحہ کے ساتھ بمعنیٰ ''مجلوب'' ہے یعنی وہ اونٹ' گائے' بکری' غلام' جو ایک شہر سے دوسرے شہر میں تجارت کیلئے لائے جاتے ہیں۔

قوله :فمن تلقاه فاشترىٰ منه فاذا اتى سيده)۔ السوق فهو بالخيار : یہ دلیل ہے بیع کی صحیح ہونے کی اس لئے کہ بیع فاسد میں خیار نہیں ہوتا۔

ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر اس کے بھاؤ شہر کے بھاؤ سے گراں یا اس کے برابر ہوں تو اس میں دو صورتیں ہیں، ایک صورت میں تو خیار ثابت ہوگا اس لئے کہ حدیث مطلق ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ اس کو اختیار نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ اس میں غبن نہیں ہوا ہے۔

۲۸٤۹:وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا تَلَقَّوُا السِّلَعَ حَتّٰى يُهْبَطَ بِهَا اِلَى السُّوْقِ. (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ٤/۳۷۳ الحديث رقم ۲۱٦٥ومسلم فی ۳/۱۱٥٦ الحديث رقم (۱٤۔۱٥۱۷)وابو داوٗد السنن ۳/۷۱٦ الحديث رقم ۳٤۳٦، والترمذی فی ۳/٥۲٤ الحديث رقم ۱۲۲۰والدارمی فی ۲/۳۳۲ الحديث رقم ۲٥٦۷، واحمد فی المسند ۲/۹۱۔

ترجمہ: اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم سامانِ تجارت کو شہر سے باہر جا کر نہ ملو یہاں تک کہ ان کا سامان بازار میں آ کر نہ اتر جائے (یعنی شہر پہنچنے سے پہلے راستے ہی میں سامان لانے والے قافلے سے نہ ملو جب تک کہ سامانِ تجارت بازار میں نہ آ جائے)۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: لا تلقوا السلع : سین کے کسرہ اور لام کے فتحہ کے ساتھ' یہ جمع ہے ''سلعة'' کی سین کے کسرہ اور لام کے سکون کے ساتھ، سامان اور ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کی تجارت کی جاتی ہو۔

يهبط : صیغہ مجہول کے ساتھ بمعنی ینزل۔

بها الى السوق : ''با'' تعدیہ کیلئے ہے، اور معنی اس کا ہے، یہاں تک کہ اس کو جانوروں کی پیٹھ سے اتارا جائے بازار میں۔

۲۸٥۰:وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا يَبِيْعُ الرَّجُلُ عَلٰى بَيْعِ اَخِيْهِ وَلَا يَخْطُبُ عَلٰى اَخِيْهِ اِلَّآ اَنْ يَّاْذَنَ لَهٗ (رواہ مسلم)

اخرجه البخاری فی صحيحه ۹/۱۹۸ الحديث رقم ٥۱٤۲ومسلم فی ۳/۱۱٥٤ الحديث رقم (۸۔۱٤۱۲)ابو داوٗد فی ۲/٥٦٥ الحديث رقم ۲۰۸۱ والنسائی فی ٦/۷۳ الحديث رقم ۳۲٤۳،وابن ماجه فی ۱/۔٦۰ الحديث رقم ۱۸٦۸ والدارمی فی ۲/۱۸۱ الحديث رقم ۲۱۷٦ ومالك فی الموطأ۲/٥۲۳ الحديث رقم ۲من كتاب النكاح واحمد فی المسند ۲/٤۲۔

ترجمہ: اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کوئی شخص اپنے (مسلمان) بھائی کی بیع پر بیع نہ کرے اور

نہ کوئی شخص اپنے (مسلمان) بھائی کے نکاح کے پیغام پر اپنے نکاح کا پیغام بھیجے مگر یہ کہ اس کو اس کی اجازت دے دی جائے"۔ (مسلم)

تشریح: **لا يبع الرجل** : صیغہ نہی کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں "**لا يبيع**" ہے صیغہ نفی کے ساتھ، "**رجل**" سے مراد شخص ہے، جو عورت کو بھی شامل ہے۔

على بيع اخيه : اس طور پر کہ بائع اور مشتری کے درمیان قیمت طے پا چکی ہو کوئی آدمی آ کر قیمت کو بڑھا دے، (کہ میں اس سے زیادہ قیمت پر لینے کو تیار ہوں) بیع کا اطلاق اس پر مجازاً ہوا ہے

ولا يخطب : جزم کے ساتھ، اور ایک نسخہ میں رفع کے ساتھ ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "**يبيع**" اور "**يخطب**"، میں رفع والی روایت ہے خبر بمعنی انشاء کے ہے اس لئے کہ یہ زیادہ بلیغ ہے اور یہ ممانعت تب ہے کہ جب مہر پر موافقت اور رضامندی ہو چکی ہو۔ **خطبة** : خاء کے کسرہ کے ساتھ، **الا ان يأذن له** : یعنی اسکا بھائی، یہ استثناء ماقبل کے دونوں حکموں سے ہے یا صرف آخری سے ہے۔

۲۸۵۱: **وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَا يَسُمِ الرَّجُلُ عَلٰى سَوْمِ اَخِيْهِ الْمُسْلِمِ** (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ۱۱۵٤/۳ الحديث رقم (۹۔۱۵۱۵) وابن ماجه فى ۷۳٤/۲ الحديث رقم ۲۱۷۲ واحمد فى المسند ۵۲۹/۲۔

ترجمہ: "اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کے سودے پر سودا نہ کرے (یعنی کسی سے خرید و فروخت کا معاملہ ہو رہا ہو تو اس میں دخل اندازی نہ کرے اور چیز کی زیادہ قیمت نہ لگائے"۔ (مسلم)

تشریح: **لا يسم** : یاء کے فتحہ، سین کے ضمہ اور میم کے جزم کے ساتھ، اور حالت وصل میں میم کے کسرہ کے ساتھ التقاء ساکنین کی وجہ سے۔

مساومة کہتے ہیں کہ جب بائع اور مشتری کسی قیمت پر راضی ہو چکے ہوں، تو ان کے درمیان میں داخل ہو کر بات کرنا قیمت بڑھانے کی۔ یہ مکروہ ہے، اگرچہ بیع صحیح ہو جائے گی۔

ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس بارے میں مسلمان کے حکم میں ذمی، معاہد اور مستامن بھی داخل ہے اور مسلمان بھائی کا ذکر رقت کیلئے ہے نہ کہ مقید کرنے کیلئے جیسا کہ بعض لوگوں کا گمان ہے، اور ابن عبدالبر نے اس پر اجماع کی طرف اشارہ کیا ہے۔

شہری کسی دیہاتی کا مال فروخت نہ کرے

۲۸۵۲: **وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا يَبِعْ حَاضِرٌ لِبَادٍ دَعُوْا النَّاسَ يَرْزُقُ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ مِنْ بَعْضٍ.** (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ۱۱۵۷/۳ الحديث رقم (۲۰۔۱۵۲۲) وابو داوٗد فى السنن ۷۲۱/۳ الحديث رقم ۳٤٤۲ والترمذى فى ۵۲٦/۳ الحديث رقم ۱۲۲۳ والنسائى فى ۲۵٦/۷ الحديث رقم ٤٤۹۵ وابن ماجه فى ۷۳٤/۲ الحديث رقم ۲۱۷٦۔

ترجمہ: "اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: شہری آدمی دیہاتی کا مال فروخت نہ کرے۔ لوگوں کو (ان کے حال پر) چھوڑ دو کہ اللہ تعالیٰ ان میں سے بعض کے ذریعہ بعض کو رزق پہنچاتا ہے"۔ (مسلم)

تشریح: **لا يبيع** : صیغہ نفی کے ساتھ۔

دعوا الناس : لوگوں کو چھوڑ دو تا کہ وہ اپنے سامان کو سستے داموں بیچیں۔

يرزق الله : قاف کے کسرہ کے ساتھ، جواب امر کی وجہ سے مجرور ہوگا۔ اور قاف کے ضمہ کے ساتھ مرفوع بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

بیع ملامسہ اور منابذہ کی ممانعت

۲۸۵۳: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ لِبْسَتَيْنِ وَعَنْ بَيْعَتَيْنِ نَهٰى عَنِ الْمُلَامَسَةِ وَالْمُنَابَذَةِ فِي الْبَيْعِ وَالْمُلَامَسَةُ لَمْسُ الرَّجُلِ ثَوْبَ الْآخَرِ بِيَدِهٖ بِاللَّيْلِ اَوْ بِالنَّهَارِ وَلَا يَقْلِبُهٗ اِلَّا بِذٰلِكَ وَالْمُنَابَذَةُ اَنْ يَنْبِذَ الرَّجُلُ اِلَى الرَّجُلِ بِثَوْبِهٖ وَيَنْبِذَ الْآخَرُ ثَوْبَهٗ وَيَكُوْنُ ذٰلِكَ بَيْعُهُمَا عَنْ غَيْرِ نَظْرٍ وَلَا تَرَاضٍ وَاللِّبْسَتَيْنِ اشْتِمَالُ الصَّمَّاءِ وَالصَّمَّاءُ اَنْ يَّجْعَلَ ثَوْبَهٗ عَلٰى اَحَدِ عَاتِقَيْهِ فَيَبْدُوْا اَحَدُ شِقَّيْهِ لَيْسَ عَلَيْهِ ثَوْبٌ وَاللِّبْسَةُ الْاُخْرٰى اِحْتِبَاءُهٗ بِثَوْبِهٖ وَهُوَ جَالِسٌ لَيْسَ عَلٰى فَرْجِهٖ مِنْهُ شَيْءٌ. (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی ۲۷۸/۱۰ الحدیث رقم ۵۸۲۰ومسلم فی ۱۱۵۲/۳ الحدیث رقم (۳۔۱۵۱۲)وابو داوٗد فی السنن ۶۷۳/۳ الحدیث رقم ۳۳۷۷ والنسائی فی ۲۶۱/۷ الحدیث رقم ٤٥١٥وابن ماجه فی ۷۳۳/۲ الحدیث رقم ۲۱۷۰ والدارمی فی ۳۳۰/۲ الحدیث رقم ۲۵٦۲ واحمد فی المسند ۹۵/۳۔

ترجمہ: اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے دوطرح کے لباس سے اور دوطرح کی بیع سے منع فرمایا ہے۔ آپ ﷺ نے بیع ملامسہ اور بیع منابذہ سے منع فرمایا ہے۔ ملامست یہ ہے کہ ایک شخص (یعنی خریدار) دوسرے شخص (یعنی تاجر) کے کپڑے کو (جسے وہ لینا چاہتا ہے) دن میں یا رات میں صرف ہاتھ سے چھولے اسے الٹ پلٹ کر نہ دیکھے اور اس کا یہ چھونا بیع کے لئے ہو اور منابذت یہ ہے کہ معاملہ کرنے والوں میں سے ہر ایک اپنے کپڑے کو دوسرے کی طرف پھینک دے اور اس طرح بغیر دیکھے بھالے اور بغیر اظہار رضامندی کے بیع ہو جائے اور جن دو طرح کے پہناوے سے منع فرمایا ہے ان میں سے ایک کپڑے اشتمال الصماء وہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے ایک کندھے پر اس طرح کپڑا رکھے کہ اس کی دوسری سمت کہ جس پر کپڑا نہ ہو ظاہر و برہنہ رہے اور دوسرا پہناوا (جس سے منع کیا گیا ہے) یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے گرد اس طرح کپڑا لپیٹ لے کہ جب وہ بیٹھے تو اس کی شرم گاہ پر بالکل کپڑا نہ ہو۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: **لبستین**: لام کے کسرہ کے ساتھ۔

وعن بیعتین: باکے فتحہ کے ساتھ، اور اعادہ جار اس افادہ کیلئے ہے کہ نہی دونوں امور میں سے ہر ایک کی طرف متوجہ ہے۔

نهی عن الملامسة والمنابذة فی البیع: وضاحت اور بیان ہے، دونوں بیوع کیلئے، اور اسلوب بیان اس آیت کی طرح ہے: ﴿**یوم تبیض وجوه وتسود وجوه فا ماالذین اسودت وجوههم**﴾ [آل عمران۔۱۰٦]

باللیل او بالنهار: اعادہ جار کے ساتھ۔ **ولا یقلبه**: تخفیف کے ساتھ،

الا بذلك: یعنی اس کا یہ چھونا بیع کیلئے ہو، نہ تو آپس میں قولی ایجاب وقبول ہوتا تھا اور نہ فعلی ایجاب وقبول ہوتا تھا (جسے اصطلاح فقہ میں تعاطی کہتے ہیں)۔ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کپڑے کو علاوہ چھونے کے نہ الٹے نہ کھولے، یعنی چاہئے تو یہ کہ کپڑے کو کھولا جائے، اور اچھی طرح دیکھا بھالا جائے، مگر ملامست کرنے والے صرف چھونے پر اکتفاء کرتے تھے۔

باء موحدہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور سید کے نسخہ میں اس کو ضمہ کے ساتھ ضبط کیا ہے سرخ قلم کے ساتھ، لیکن یہ سہو قلم ہے، اس لئے کہ یہ کتب لغت کے مخالف ہے۔

بثوبه: باء زائدہ ہے تعدیہ کی تاکید کیلئے ہے۔ **وینبذ الاخر**: خاء کے فتحہ کے ساتھ۔ **ثوبه**: باء جان کے بغیر ہے۔

ویکون ذلك: یعنی ان میں سے ہر ایک کا اپنا کپڑا دوسرے کی طرف پھینکنا۔ **بیعهما**: نصب کے ساتھ ہے اس بناء پر کہ یہ خبر ہے کان کی، اور ایک نسخہ میں رفع کے ساتھ ہے، اس صورت میں خبر **کان ذلك** ہوگا۔

عن غیر نظر : اور ایک نسخہ میں ''من نظر'' ہے، یعنی دوسرے کے کپڑے کو بغیر دیکھے، اور بعض کہتے ہیں کہ بغیر غور وفکر کے۔
ولا تراض : یعنی ایجاب وقبول، اور تعاطی کے بغیر، اور لا کی زیادتی تاکید کیلئے ہے۔
واللبستین : یاء کے ساتھ ہے اعراب حکائی ہے، اور اللبستان بھی روایت کیا گیا ہے، قاعدہ کے مطابق۔
الصماء : صاد کے فتحہ کے ساتھ اور میم ممدودہ کی تشدید کے ساتھ۔ **احد شقیہ** :شین کے کسرہ کے ساتھ بمعنی جانبیہ۔ **لیس علیہ ثوب** : حال ہے، یا جملہ متانفہ ہے بیان کیلئے لایا گیا ہے۔ **واللبسۃ الاخری** :مرفوع ہے مبتدا ہونے کی وجہ سے اور اس کی خبر آنے والا کلمہ ہے۔ **احتباؤہ بثوبہ وھو جالس** :حال ہے اور اسی طرح اگلا جملہ بھی حال ہے۔ **لیس علی فرجہ** :فرج سے مراد عورت ہے جو ران کو بھی شامل ہے۔ **منہ** : ضمیر کا مرجع ثوب ہے۔

بیع حصاۃ اور بیع غرر کی ممانعت

۲۸۵۴: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ بَیْعِ الْحَصَاةِ وَعَنْ بَیْعِ الْغَرَرِ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۳/۱۱۵۳ الحدیث رقم (٤-۱۵۱۳) وابو داوٗد فی ۳/۶۷۲ الحدیث رقم ۳۳۷۶ والترمذی فی ۳/۵۳۲ الحدیث رقم ۱۲۳۰ والنسائی فی ۷/۲۶۲ الحدیث رقم ٤۵۱۸ وابن ماجه فی ۲/۸۳۹ الحدیث رقم ۲۱۹٤ والدارمی فی ۲/۳۳۰ الحدیث رقم ۲۵۶۳ واحمد فی المسند ۲/۲۵۰

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع حصات اور بیع غرر سے ممانعت فرمائی ہے''۔ (مسلم)

تشریح: **بیع الحصاۃ** : اس کی صورت یہ ہے کہ خریدار بیچنے والے سے کہے جب میں تیری اس چیز پر کنکری ماردوں تو سمجھ لینا کہ بیع واجب ہوگئی ہے، یا بائع خریدار سے کہے میں نے اپنے سامان میں سے وہ چیز تمہیں بیچی جس پر تمہاری پھینکی ہوئی کنکری آ گرے۔ یا میں نے یہ زمین وہاں تک تک تمہارے ہاتھ فروخت کی جہاں تک تمہاری پھینکی ہوئی کنکری جا گرے۔ بیع کا یہ طریقہ ایام جاہلیت میں رائج تھا۔

وعن بیع الغرر : غین اور راء اول کے فتحہ کے ساتھ ہے، یعنی جس کا انجام معلوم نہ ہو خطرے کی وجہ سے' جس سے معلوم نہ ہو کہ یہ ہونے والا ہے یا نہیں ہونے والا ہے' جیسے مفرور غلام کو بیچنا، ہوا میں اڑتے ہوئے پرندے کو، اور پانی کے اندر مچھلی کو، اور غائب مجہول چیز کا بیچنا۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس چیز پر عقد ہو رہا ہے وہ یا تو مجہول ہو یا بیچنے والے کے قبضہ قدرت سے باہر ہو، یعنی بعینہ وہ چیز اس سے لپیٹ لی گئی ہو۔

''غر الثوب'' سے ماخوذ ہے بمعنی لپیٹنا، یا ''غرۃ'' غین کے کسرہ کے ساتھ، سے ماخوذ ہے بمعنی غفلۃ کے آتا ہے، یا غرور سے مشتق ہے۔ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بیع فاسد ہے، مبیع کے مجہول ہونے کی وجہ سے یا اس کے تسلیم سے عجز کی وجہ سے۔ (انتہی)

شوافع کے ہاں باطل اور فاسد ایک چیز ہے، اور حنفیہ کے مذہب کی تفصیل یہ ہے کہ اگر عوضین بیع کے قابل ہی نہ ہوں تو بیع باطل ہے، اور اگر عوضین بیع کے قابل ہوں لیکن عدم صحت کے مقتضی کو شامل ہوں جیسے ربا، تو بیع فاسد ہے۔ اور بیع فاسد قبضے کے بعد ملک خبیث کا فائدہ دیتی ہے۔ صرف اور اگر مبیع قابل نہ ہو یا ثمن قابل نہ ہو فقط تو صحیح یہ ہے کہ اول کو اول کے ساتھ اور ثانی کو ثانی کے ساتھ ملحق کیا جائے گا۔

بیع حبل الحبلہ کی ممانعت

۲۸۵۵: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ عَنْ بَیْعِ حَبَلِ الْحَبَلَةِ وَکَانَ بَیْعًا یَتَبَایَعُهُ اَهْلُ الْجَاهِلِیَّةِ کَانَ الرَّجُلُ یَبْتَاعُ الْجَزُوْرَ اِلٰی اَنْ تُنْتَجَ النَّاقَةُ ثُمَّ تُنْتَجُ الَّتِیْ فِیْ بَطْنِهَا. (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۵٦/٤ الحدیث رقم ۲۱٤۳ ومسلم فی ۱۱۵۳/۳ الحدیث رقم (۵۔۱۵۱٤) وابو داؤد فی السنن ٦۷۵/۳ الحدیث رقم ۳۳۸۰ والترمذی فی ۵۳۱/۳ الحدیث رقم ۱۲۲۹ والنسائی فی ۲۹۳/۷ الحدیث رقم ٤٦۲۵، وابن ماجه فی ۷٤۰/۲ الحدیث رقم ۲۱۹۷ ومالك فی الموطأ ٦۵۳/۲ الحدیث رقم ٦۲ من کتاب البیوع واحمد فی المسند ۱۵/۲۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع حبل الحبلہ (یعنی جانور کا حمل) بیچنے سے منع فرمایا ہے۔ (حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں) کہ اہل جاہلیت اس طرح کی بیع کیا کرتے تھے' جس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ کوئی شخص اس وقت تک کے وعدے پر اونٹنی خرید تا تھا کہ یہ اونٹنی بچہ جنے گی اور پھر وہ بچہ' بچہ جنے گا (یعنی وہ اس وعدے پر اونٹنی خرید تا تھا کہ جب اس اونٹنی کے پیٹ سے پیدا ہونے والے بچے کے پیٹ سے بچہ پیدا ہوگا تب اس کی قیمت ادا کرے گا''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: حبل الحبلة : دونوں الفاظ حاء اور با کے فتحہ کے ساتھ ہیں، مصدر ہے اور اس کے ساتھ نام رکھا گیا ہے ایک مجہول چیز کا، تاء مبالغہ کیلئے ہے اور اس کی تانیث بتانے کیلئے ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ وہ بیچے اونٹنی کے پیٹ میں موجود حمل کو، بشرطیکہ اونٹنی کا حمل مؤنث ہو۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ قیمت کو مؤجل کرنا یہاں تک کہ اس اونٹنی کے پیٹ میں جو حمل ہے وہ حاملہ ہو جائے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے اس وجہ سے کہ راوی حدیث عبداللہ ابن عمر نے اس کی یہی تفسیر کی ہے۔ ابوعبیدہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ جب اس اونٹنی کے پیٹ میں جو بچہ ہے وہ بچے جنے تو وہ اس کو بیچ رہا ہے، تو یہ بیع معدوم ہے اور پہلی صورت میں مدت مجہول ہے۔

وكان : ضمیر کا مرجع بیع ہے اور اس کا عطف ہے ''نہی'' پر۔ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تقدیری عبارت یوں ہے: نہی عن بیع كان۔

تنتج : صیغہ مجہول کے ساتھ۔ اور ایک نسخہ میں پہلی تاء کے فتحہ اور دوسری کے کسرہ کے ساتھ ہے بمعنی تلد۔

الناقة ثم تنتج : رفع کے ساتھ ہے، اور ایک نسخہ میں نصب کے ساتھ ہے دونوں طرح ضبط ہے۔

یہ بیع اور اسکے دوسرے نظائر بیع غرر میں داخل ہیں، لیکن اس کو الگ ذکر کیا، اس لئے کہ یہ ایام جاہلیت کی بیوعات میں سے ہے۔

توضیح وتخریج: پہلے جملے کو احمد اور اصحاب کتب اربعہ نے بھی روایت کیا ہے۔

نر کو مادہ پر چھوڑنے کی اجرت کی ممانعت

۲۸۵٦: وَعَنْهُ قَالَ نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ عَسْبِ الْفَحْلِ . (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤٦۱/٤ الحدیث رقم ۲۲۸٤ وابو داؤد فی السنن ۷۱۱/۳ الحدیث رقم ۳٤۲۹ والترمذی فی ۵۷۲/۳ الحدیث رقم ۱۲۷۳ واحمد فی المسند ۱٤/۲۔

ترجمہ: ''اور ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے نر سے جفتی کروانے پر اجرت وصول کرنے سے منع فرمایا ہے''۔ (بخاری)

تشریح: نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن عسب، الفحل : عین کے فتحہ اور سین کے سکون کے ساتھ، اس کے جست کرنے اور اس کے پانی کی اجرت کو کہتے ہیں۔ اور اس سے منع فرمایا ہے بوجہ غرر اور دھوکہ کے، اس لئے کہ نر جانور کبھی جست کر جاتا ہے اور کبھی جست نہیں کرتا اور اسی طرح مادہ کبھی بار آور ہوتی ہے اور کبھی نہیں۔ اس لئے اکثر صحابہ اور فقہاء نے اسے حرام قرار دیا ہے۔ ہاں نر جانور کو مادہ پر جست کرنے کیلئے عاریۃً دینا مستحب ہے، البتہ اگر مستعیر اپنی طرف سے اسے کچھ بطور انعام دے تو اس کو قبول کرنا درست ہے۔

پانی بیچنے کی ممانعت

۲۸۵۷: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ ضِرَابِ الْجَمَلِ وَعَنْ بَيْعِ الْمَاءِ وَالْاَرْضِ لِتُحْرَثَ.

(رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۳/۱۱۹۷ الحدیث رقم (۳۵-۱۵۶۵) والنسائی فی السنن ۷/۳۱۰ الحدیث رقم ۴۶۷۰۔

ترجمه: ''اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اونٹنی کو جفتی کے لئے کرایہ پر دینے اور (کھیتی باڑی کے لئے) پانی و زمین کو کاشت کے لئے فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے''۔ (مسلم)

تشریح: ضراب الجمل: ضاد کے کسرہ کے ساتھ کہ اونٹ کے جفتی کرنے پر کچھ لینا۔

لتحرث: صیغہ مجہول کے ساتھ لتزرع کے معنی میں ہے،

مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی زمین اور وہ پانی جو اس زمین سے متعلق ہو کسی شخص کو اس شرط کے ساتھ دے کہ یہ زمین اور پانی تو میرا ہے، تخم اور محنت تمہاری ہے، زمین کو جوتو، اس میں سے جو کچھ پیدا ہوگا اس کا اتنا حصہ میں لے لوں گا اس کو ''مخابرت'' کہتے ہیں۔ اس کے بارے میں تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

ضرورت سے زائد پانی کو بیچنے کی ممانعت

۲۸۵۸: وَعَنْهُ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ فَضْلِ الْمَاءِ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۳/۱۱۹۷ الحدیث رقم (۳۴-۱۵۶۵) ابن ماجه فی ۲/۸۲۸ الحدیث رقم ۲۴۷۷۔

ترجمه: ''اور جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ضرورت سے زائد پانی کو فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے''۔ (مسلم)

تشریح: پانی خود پینا چاہتا ہو، یا جانوروں کو پلانا چاہتا ہو، (تو اس کیلئے اس پانی کا بیچنا جائز نہیں)۔ اور اگر کوئی شخص اپنے کھیتوں یا درختوں کو سیراب کرنے کیلئے وہ پانی چاہے تو پھر مالک کیلئے جائز ہے کہ وہ اس پانی کو بغیر معاوضہ کے نہ دے۔

۲۸۵۹: وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا يُبَاعُ فَضْلُ الْمَاءِ لِيُبَاعَ بِهِ الْكَلَاءُ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۵/۳۱ الحدیث رقم ۲۳۵۳۔ ومسلم فی ۳/۱۱۹۸ الحدیث رقم (۳۸-۱۵۶۶) وابو داؤد فی ۳/۷۴۷ الحدیث رقم ۳۴۷۳ والترمذی فی ۳/۵۷۲ الحدیث رقم ۱۲۷۲ وابن ماجه فی ۲/۸۲۸ الحدیث رقم ۲۴۷۸ ومالك فی لموطأ ۲/۷۴۴ الحدیث رقم ۲۹ من کتاب الأقضية۔ واحمد فی المسند ۲/۲۷۳۔

ترجمه: ''اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اپنی ضرورت سے زائد پانی کو فروخت نہ کیا جائے کہ اس کی وجہ سے گھاس فروخت کی جائے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: لا یباع فضل الماء لیباع به باء سببیہ ہے۔ أی بسبب بیعه۔ ''الکلاء'': کاف اور لام کے فتحہ کے ساتھ اسم مقصور ہے۔ قاموس میں ہے کہ ''کلا از روئے وزن ''جبل'' کی طرح ہے خشک وتر گھاس کو کہتے ہیں۔

یعنی کنویں کا مالک اپنی حاجت سے زائد پانی کو نہ بیچے اس لئے کہ پانی کا خریدار اس پانی کی وجہ سے مویشی والوں پر سختی کرے گا جو گھاس چرانے کے محتاج ہوتے ہیں اس زمین میں پس یہ مجبور کر دے گا ان کو علیحدہ سے پانی خریدنے پر یا پانی اور گھاس دونوں خریدنے پر مجبور کر دے گا اور یہ پانی والے کا ظلم تجاوز کر جائے گا، یہاں تک وہ پانی اور گھاس دونوں کے خریدنے پر مجبور ہوں گے، تو یہ ظلم اور تعدی میں مبالغہ ہوگا۔ یا پانی کے خریدنے کو بمنزلہ گھاس کے خریدنے کے قرار دیا ہے، اس لئے کہ مویشی کے مالکان پانی کے بدلے جو مال خرچ کر رہے ہیں وہ اس لئے کہ ان کے مویشیوں کو پانی پینے پر قدرت حاصل ہوگی تو قادر ہوں گے۔

علامہ خطابی فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی آدمی، کسی بنجر زمین میں کنواں کھود لیتا ہے تو وہ اس کا مالک بن جاتا ہے، اس کے احیاء کے ساتھ، پس جب کوئی اس کے پاس اس بنجر زمین میں اترے اور اس کے نباتات کو چرائے اور وہاں پانی نہ ہو، سوائے اس کنویں کے، تو اس کیلئے جائز نہیں ہے کہ یہ منع کرے اس قوم کو اس پانی کے پینے سے اس لئے کہ اگر یہ ان کو منع کرے گا تو پھر ان کیلئے اس زمین چرانا ممکن نہ ہوگا، اور یہ منع کرنا ضد اور عناد کی وجہ سے ہوگا، اور یہ جائز نہیں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ وہ زائد پانی کو نہ بیچے کہ اس کا ارادہ پانی کے بیچنے سے اور اس کو خرچ نہ کرنے سے اس گھاس کو بیچنا ہے جو اس پانی کے سبب حاصل ہوئی ہے۔ پھر علماء کا اختلاف ہے کہ یہ ممانعت تحریمی ہے، یا تنزیہی ہے۔ لیکن زیادہ صحیح یہی ہے کہ یہ ممانعت تنزیہی ہے۔

قوله :متفق عليه :

ایک نسخہ میں ہے ''**رواه مسلم**'' لیکن پہلے والے کی تائید اس سے ہوتی ہے جو جامع الاصول میں ہے: **رواه البخاری ومسلم**۔

فریب دہی سے بچو

۲۸۶۰: وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ مَرَّ عَلٰى صُبْرَةِ طَعَامٍ فَاَدْخَلَ يَدَهُ فِيْهَا فَنَالَتْ اَصَابِعُهُ بَلَلاً فَقَالَ مَا هٰذَا يَا صَاحِبَ الطَّعَامِ قَالَ اَصَابَتْهُ السَّمَاءُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اَفَلاَ جَعَلْتَهُ فَوْقَ الطَّعَامِ حَتّٰى يَرَاهُ النَّاسُ مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنِّىْ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ۱/۹۹ الحديث رقم ۱۶۴-۱۰۲) والترمذی فی السنن ۳/۶۰۷ الحديث رقم ۱۳۱۵ وابن ماجه فی ۲/۷۴۹ الحديث رقم ۲۲۲۴۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ غلہ کے ایک ڈھیر کے پاس سے گزرے اور اپنا ہاتھ اس ڈھیر میں داخل کیا تو آپ ﷺ کی انگلیوں کو کچھ تری محسوس ہوئی' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے غلے کے مالک! یہ کیا ہے؟ (یعنی ڈھیر کے اندر یہ تری کہاں سے پہنچی اور تم نے غلہ کو تر کیوں کیا؟) اس نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ اس پر بارش ہوگئی تھی (جس کی وجہ سے غلہ کا کچھ حصہ تر ہوگیا ہے میں نے قصداً تر نہیں کیا ہے) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تو پھر تم نے غلہ کو اوپر کی جانب کیوں نہیں رکھا تاکہ لوگ اس کو دیکھ لیتے (اور کسی دھوکے میں مبتلا نہ ہوتے) یاد رکھو! جو شخص دھوکہ دے وہ مجھ سے نہیں ہے (یعنی میرے طریقہ پر نہیں ہے)۔ (مسلم)

تشریح: صبرة طعام : صاد کے ضمہ اور باء کے سکون کے ساتھ ہے۔ غلے کے اس ڈھیر کو کہتے ہیں جو بغیر ناپ اور وزن کے جمع کیا گیا ہو، جیسا کہ قاموس میں ہے۔ طعام سے مراد کھانے دانوں کی جنس ہے

بللا : با اور لام کے فتحہ کے ساتھ تری کے معنی میں ہے۔

قال اصابته السمآء : سماء سے مراد بارش ہے، اس لئے کہ سماء بارش کی جگہ ہے، بایں طور کہ بارش اس سے نازل ہوتی ہے۔

شاعر کہتا ہے:

اذا نزل السماء بارض قوم
رعيناه وان كانوا غضابا

جب کسی قوم کی زمین پر بارش ہوتی ہے، ہم اس زمین کو چراتے ہیں اگرچہ وہ قوم غصہ ہو۔

یا رسول الله : یہ ایمان کا اعتراف اور تصدیق کا اقرار ہے۔

فوق الطعام حتی یراہ الناس : اس میں خبر ہے کہ محتسب کو چاہئے کہ وہ بازار کے سامان کی جانچ پڑتال کیا کرے تا کہ ملاوٹ وغیرہ کا پتہ چل سکے غش خیانت۔ یہ ضد ہے نصح کی۔

قوله :فلیس منی : یعنی وہ میرے سنت اور میرے طریقہ پر نہیں ہے۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ ''منی'' میں ''من'' اتصالیہ ہے جیسے اس آیت میں ہے: ﴿**المنافقون والمنافقات بعضهم من بعض**﴾ [التوبة:٦٧] (منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک طرح کے ہیں)۔

تخریج و روایات باب: ترمذی نے آخری جملہ کو اس طرح روایت کیا ہے: **''من غش فلیس منا''**۔

اس حدیث کو طبرانی نے ''الکبیر'' میں اور ابونعیم نے ''حلیہ'' میں ابن مسعودؓ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

''من غشنا فلیس منا والمکرو الخداع فی النار''۔

الفصل الثانی :

بیع ثنیا کی ممانعت

۲۸۶۱: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ نَھٰی عَنِ الثُّنْیَا اِلَّا اَنْ یُّعْلَمَ (رواہ الترمذی)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۱۱۷۵/۳ الحدیث رقم (۸۵۔۱۵۳٦)وابو داوٗد فی السنن ٦۹۳/۳ الحدیث رقم ۳٤۰٤ والترمذی فی ۵۸۵/۳ الحدیث رقم ۱۲۹۰ والنسائی فی ۲۹٦/۷ الحدیث رقم ٤٦۳۳ واحمد فی المسند ۳٦٤/۳۔

ترجمہ: ''حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع ثنیا (یعنی غیر معین چیزوں میں استثناء کرنے) سے منع فرمایا مگر یہ کہ وہ چیز معلوم ہو تو جائز ہے۔'' (ترمذی)

تشریح: **قوله :عن جابر قال ان** : اور ایک نسخہ میں ''عن جابر انّ'' ہے۔ (یعنی ''قال'' کا اضافہ نہیں ہے۔)

نهی عن الثنیا : یعنی ایسے استثناء سے جو مفضی الی الجہالہ ہو۔ اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔

ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ثنیا کا معنی ہے مثلاً باغ وغیرہ کے پھل کو بیچا جائے اور ایک غیر معلوم جزء اس سے مستثنیٰ کر لیا جائے اس کے بطلان کا سبب غرر ہے مبیع کے مجہول ہونے کی وجہ سے، چنانچہ اگر کوئی شخص معلوم مقدار کو مستثنیٰ کرتا ہے جیسا کہ چوتھائی وغیرہ یا متعین درختوں کے پھل کو، تو یہ جائز ہے جہل کے انتفاء کی وجہ سے۔

پھل اور کھیتی پکنے کے بعد ہی فروخت کی جائے

۲۸٦۲: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ نَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ عَنْ بَیْعِ الْعِنَبِ حَتّٰی یَسْوَدَّ وَعَنْ بَیْعِ الْحَبِّ حَتّٰی یَشْتَدَّ ھٰکَذَا (رواہ الترمذی وابوداوٗد عَنْ اَنَسٍ وَالزِّیَادَۃُ الَّتِیْ فِی الْمَصَابِیْحِ وَھِیَ قَوْلُہٗ) **نَھٰی عَنْ بَیْعِ التَّمْرِ حَتّٰی تَزْھُوَ اِنَّمَا ثَبَتَتْ فِیْ رِوَایَتِھِمَا عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ نَھٰی عَنْ بَیْعِ النَّخْلِ حَتّٰی تَزْھُوَ۔**

(و قال الترمذی هذا حدیث حسن غریب)

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ٦٦۸/۳ الحدیث رقم ۳۳۷۱ والترمذی فی ۵۳۰/۳ الحدیث رقم ۱۲۲۸وابن ماجه فی ۷٤۷/۲ الحدیث رقم ۲۲۱۷ واحمد فی المسند ۲۲۱/۳۔

ترجمہ: اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے انگور کو اس وقت تک فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے جب تک کہ وہ سیاہ نہ ہو جائے (یعنی پک نہ جائے) اسی طرح آپ ﷺ نے غلہ کو بھی اس وقت تک فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے جب تک کہ وہ

سخت نہ ہو جائے (یعنی قابل انتفاع نہ ہو جائے) اس روایت کو ترمذی اور ابوداؤد نے حضرت انسؓ سے اسی طرح نقل کیا ہے اور صاحب مصابیح نے اس روایت میں یہ الفاظ ''آپ ﷺ نے کھجور کو اس وقت تک فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے جب تک کہ وہ سرخ نہ ہو جائے''۔ جو مزید نقل کئے ہیں وہ ترمذی وابوداؤد میں (حضرت انسؓ سے منقول نہیں ہیں بلکہ) حضرت ابن عمرؓ سے منقول ہیں اور وہ بھی اس طرح ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ نے کہا کہ ''آپ ﷺ نے کھجور کو اس وقت تک فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے جب تک کہ وہ سرخ نہ ہو جائے''۔ امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے''۔

تشریح: یسود : دال کی تشدید کے ساتھ

نهي عن بيع التمر : تائے فوقانیہ کے ساتھ ہے، اور صحیح نسخہ میں ثاء مثلثہ کے ساتھ ''ثمر'' ہے۔

حتى تزهو : شاید تانیث باعتبار جنس کے ہو۔ ثبتت کی خیر فاعل ''زیادہ'' کی طرف راجع ہے۔

في روايتهما عن ابن عمر : اس عبارت میں امام بغوی اعتراض ہے۔ جب مضاف کو حذف کیا، تو مضاف الیہ کی نسبت فعل کی طرف کرتے ہوئے فعل کو مؤنث لایا گیا۔

وحتّٰى : یہ غایت ہے نہی مخصوص کیلئے (اس کو ذکر کیا امام طیبی نے) اس میں امام بغوی پر ایک اور اعتراض ہے، حدیث کے لفظ اور معنی کے نقل کرنے میں۔

تز هو : ابن حجر فرماتے ہیں تز ھو بمعنٰی ''تحمر'' کے ہے، اس روایت سے اور ''تبيض او تحمر'' والی روایت ''حتى تسود'' والی روایت اور ''حتى يشتد'' کے الفاظ والی روایت میں ان الفاظ سے بدو صلاح مراد ہے' جس پر بیع کا جواز موقوف ہے، شرط قطع کے بغیر۔

اُدھار کو اُدھار کے ساتھ بیچنے کی ممانعت

۲۸۶۳: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ نَهٰى عَنْ بَيْعِ الْكَالِئِ بِا لْكَالِئِ. (رواه الدار قطنی)

اخرجه الدارقطني فی ۳/ ۷۱ الحديث رقم ۲۶۹ من كتاب البيوع

ترجمہ: اور ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ادھار کو ادھار کے ساتھ بیچنے سے منع فرمایا ہے''۔ (دار قطنی)

تشریح: كالیء : ہمزہ کے ساتھ بھی ہے بغیر ہمزہ کے بھی۔

لفظ بیع اصل نسخہ میں موجود ہے اور اکثر نسخوں سے ساقط ہے۔

شرح طیبی میں ہے کہ عفیف الدین الصفوی کے نسخہ اور نور الدین الایجی کے نسخہ میں بھی ساقط ہے۔ نہایہ میں ہے کہ اس کی صورت یہ ہے کہ ایک آدمی کسی سے کوئی چیز ایک متعین مدت کے وعدے پر خرید لے اور جب وہ مدت آجائے اور خریدار قیمت ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو بیچنے والے سے یہ کہے کہ اس چیز کو ایک اور مدت کیلئے مجھے زیادہ قیمت پر فروخت کر دو اور وہ بیچنے والا اس کو بیچ دے اس طرح یہ معاملہ آپس کے قبضہ کے بغیر طے ہو جائے۔

بعض راوی ''الكالیء'' کو ہمزہ کے ساتھ نہیں پڑھتے۔ بعض کہتے ہیں کہ اسکی صورت یہ ہے کہ ایک آدمی اپنے اس دین کو بیچ دے جو مشتری پر لازم ہے اس کو بیچے اس دین کے بدلے جو مشتری کا کسی تیسرے آدمی پر لازم ہے، (اسکو ذکر کیا ہے امام طیبیؒ نے۔)

بیعانہ کا مسئلہ

۲۸۶۴: وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ الْعُرْبَانِ.

(رواه مالك وابوداود وابن ماجة)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۷٦۸/۳ الحدیث رقم ۳۵۰۲ وابن ماجه فی ۷۳۸/۲ الحدیث رقم ۲۱۹۲ ومالك فی الموطأ ۶۰۹/۲ الحدیث رقم ۱ من کتاب البیوع

ترجمہ: اور حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع عربان سے منع فرمایا ہے"۔ (مالک ابوداؤد ابن ماجہ)

تشریح: قوله :عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده : یعنی ابن عمرو سے جیسا کہ سیوطی کی جامع صغیر میں ہے۔

قوله:قال نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن بیع العربان : عین کے ضمہ راء کے سکون کے ساتھ اور اس کے بعد با ہے۔ یہ نام ہے اس چیز کا جو دی گئی ہو۔ یہ عرب کی بیع میں ہوتا تھا۔ بعض شارحین فرماتے ہیں کہ اس لفظ میں چھ/۶ لغات ہیں: عربان، اربان، عربون، اربون، پہلے لفظ کے ضمہ اور دوسرے کے سکون کے ساتھ سب میں، اور آخری دو میں پہلے لفظ کے فتحہ کے ساتھ بھی ہے، تو یہ کل چھ لغات ہو گئیں۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ اس معاملے سے منع فرمایا ہے جس میں "بیعانہ" ہو۔

نہایہ میں ہے کہ اس کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص کسی سے کوئی چیز خریدے اور بیچنے والے کو کچھ رقم پیشگی دے اور یہ طے کر دے کہ اگر یہ معاملہ مکمل ہو گیا تو یہ رقم قیمت میں محسوب ہو جائے گی اور اگر معاملہ نہ ہو، تو یہ رقم اس چیز کے مالک کی ہو گی مشتری واپسی کا مطالبہ نہ کرے گا۔

فقہاء کے ہاں یہ بیع باطل ہے، اس لئے کہ اس میں شرط اور غرر ہے۔ ابن عمر اور امام احمد اس کے جواز کے قائل ہیں، اور ممانعت کی حدیث منقطع ہے۔

بیع مضطر کی ممانعت

۲۸٦۵: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ الْمُضْطَرِّ وَعَنْ بَيْعِ الْغَرَرِ وَعَنْ بَيْعِ الثَّمَرَةِ قَبْلَ اَنْ تُدْرِكَ. (رواہ ابوداود)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ٦۷٦/۳ الحدیث رقم ۳۳۸۲، واحمد فی المسند ۱/۱۱٦

ترجمہ: اور حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع مضطر (یعنی مجبور اور بے بس شخص کی بیع) سے دھوکہ وفریب کی بیع اور پھلوں کی "بیع" سے اس سے قبل کہ وہ پک جائیں منع فرمایا ہے"۔ (ابوداؤد)

تشریح: المضطر : مفتعل کے وزن پر "ضر" سے ماخوذ ہے۔ اصل "مضترر" تھا راء کو راء میں مدغم کیا اور تاء کو طاء سے تبدیل یا ضاد کی وجہ سے۔ نہایہ میں ہے کہ مضطر دو/۲ طرح کا ہوتا ہے:

ایک وہ ہے کہ جس کو عقد پر مجبور کیا جائے۔ اس کی بیع فاسد ہے، منعقد نہیں ہوتی۔

دوسرا وہ ہے کہ جس کو بیچنے پر مجبور کیا جائے بوجہ دین کے جو اس پر لازم ہے، یا خرچ جو اس پر چڑھا ہوا ہے۔ پس وہ اپنے ہاتھ میں موجود چیز کو بیچ دیتا ہے کم قیمت پر ضرورت کی وجہ سے، یہ دین کے وصول کرنے کا راستہ ہے۔ لیکن مروت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو اس طرح بیچنے پر مجبور نہ کیا جائے، بلکہ اس کو عار دلایا جائے، یا اس کو قرض دیا جائے مالدار ہونے تک۔ یا اس سے وہ چیز پوری قیمت پر خریدی جائے، لیکن اگر ضرورت کی وجہ سے اس طریقے پر اس کے ساتھ یہ عقد اور معاملہ ہوا تو یہ بیع صحیح ہو جائے گی، باوجودیکہ اہل علم اس کو ناپسند اور مکروہ سمجھتے ہیں۔

یہاں حدیث میں بیع سے مراد شراء ہے، یا مبایعہ ہے یا قبول بیع ہے۔ ابن الملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "مکرہ" سے مراد وہ مکرہ ہے جس کو باطل طریقے سے مجبور کیا گیا ہو باقی جس کو کسی حق کی وجہ سے مکرہ کیا ہو تو وہ مراد نہیں ہے۔ جیسا کہ قاضی کسی کو دین کے ادئیگی پر

مجبور کرے اس کے مال میں سے کسی چیز کے بیچنے کے ذریعہ۔

بیع الغرر : اس بیع کو کہتے ہیں کہ جس کے ظاہر کو دیکھ کر مشتری دھوکہ میں پڑ جائے اور اس کا باطن مجہول ہو۔ شیخ الازہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں' غرر وہ ہے جو بغیر کسی عہد و اعتماد کے ہو، اور اس میں وہ تمام بیوعات داخل ہیں جن کی حقیقت کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا، متعاقدین میں سے ہر اک مجہول ہو۔ اس کی مثالیں پہلے گزر چکی ہیں۔

نر کو مادہ پر چھوڑنے کی اجرت لینا ممنوع ہے

۲۸۶۶: وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَجُلاً مِّنْ كِلاَبٍ سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ عَنْ عَسْبِ الْفَحْلِ فَنَهَاهُ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا نُطْرِقُ الْفَحْلَ فَنُكْرَمُ فَرَخَّصَ لَهٗ فِي الْكَرَامَةِ. (رواہ الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۳/۵۷۳ الحدیث رقم ۱۲۷٤۔

ترجمہ: اور حضرت انس کہتے ہیں کہ قبیلہ کلاب کے ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے نر سے جفتی کرانے کی اجرت کے بارے میں سوال کیا تو آپ ﷺ نے اس کو منع فرمایا (کہ اجرت نہ لو) پھر اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ) ہم نر کو عاریۃً دیتے ہیں اور ہمیں اس سلسلے میں بطور انعام کچھ دیا جاتا ہے (یعنی ہم کوئی اجرت مقرر کر کے اپنا نر جانور نہیں دیتے بلکہ عاریۃً دیتے ہیں مگر جانور لے جانے والا بلا طلب ہمیں بطور انعام کچھ دیتا ہے تو کیا ہم پھر بھی نہ لیں! آپ ﷺ نے اسے انعام قبول کرنے کی اجازت عطا فرمائی''۔ (ترمذی)

تشریح: جمہور کے نزدیک ممانعت تحریمی ہے۔ ''نطرق ''نون کے ضمہ اور راء کے کسرہ کے ساتھ۔ نہایہ میں ہے کہ حدیث میں ہے: ''ومن حقها اطراق فحلها'' یعنی جفتی کیلئے عاریۃً دینا۔ اور طرق اصل میں نر کے پانی (یعنی مادہ منویہ) کو کہتے ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں جست کو کہتے ہیں، پھر یہی نام اس کے مادہ منویہ کا رکھ دیا گیا۔

فنکرم : متکلم مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے (یعنی ہمارا اکرام کیا جاتا ہے)۔ اشرف فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں دلیل ہے کہ اگر کوئی جفتی کے لئے نر جانور کو عاریۃً دے اور عاریت پر لینے والا کوئی چیز اس کو بطور انعام دے دے، تو اس کا قبول کرنا جائز ہے، اگرچہ اجرت لینا جائز نہیں ہے۔

جو چیز اپنے پاس نہ ہو اس کی بیع نہ کرو

۲۸۶۷: وَعَنْ حَكِيْمِ بْنِ حِزَامٍ قَالَ نَهَانِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَنْ اَبِيْعَ مَا لَيْسَ عِنْدِيْ (رواہ الترمذی وفی روایة له ولا بی داود والنسائی) قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ يَأْتِيْنِي الرَّجُلُ فَيُرِيْدُ مِنِّي الْبَيْعَ وَلَيْسَ عِنْدِيْ فَاَبْتَاعُ لَهٗ مِنَ السُّوْقِ قَالَ لَا تَبِعْ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ.

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ۳/۷٦۸ الحدیث رقم ۳۵۰۳ والترمذی فی ۳/۵۳٤ لحدیث رقم ۱۲۳۳ والنسائی فی ۷/۲۸۹ الحدیث رقم ٤٦۱۳ وابن ماجہ فی ۲/۷۳۷ الحدیث رقم ۲۱۸۷ واحمد المسند ۳/٤۰۲۔

ترجمہ: ''اور حضرت حکیم بن حزام کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے ایسی چیز کو فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے جو میرے پاس نہیں ہے (ترمذی) ''ترمذی' ابوداؤد اور نسائی کی ایک روایت میں یوں ہے کہ حضرت حکیم کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! ایک شخص میرے پاس آتا ہے اور مجھ سے ایک ایسی چیز خریدنے کا ارادہ کرتا ہے جو میرے پاس نہیں ہوتی تو میں اس چیز کو اس کے لئے بازار سے خرید لاتا ہوں (یعنی میں اس چیز کا معاملہ اس سے کر لیتا ہوں پھر وہ چیز بازار سے خرید لاتا ہوں اور اس شخص کے حوالے کر دیتا ہوں) آپ ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ ''تم کسی ایسی چیز کو نہ فروخت کرو جو تمہارے پاس نہیں ہے''۔

تشریح: قوله :نهانی رسول الله صلی الله علیه وسلم ان ابیع ما لیس عندی :
جیسے مفرور غلام جس کی جگہ معلوم نہ ہو، اور ہواء میں اڑتا ہوا پرندہ، اور پانی کے اندر مچھلی۔

قلت یا رسول الله یأتینی الرجل فیرید منی البیع : مصدر بمعنی مفعول ''مبیع'' ہے، جیسے الصید بمعنی مصید، جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿احل لکم صید البحر﴾ ای مصیدہ۔

لیس عندی : حال ہے'' البیع'' سے، شرح السنہ اور مصابیح کے بعض نسخوں میں واؤ کے ساتھ'' ولیس عندی'' ہے۔

فاتباع :اشتریٰ کے معنی میں ہے۔

له من السوق : ابن الملک فرماتے ہیں کہ اس میں دو احتمال ہیں: ایک تو یہ ہے کہ یہ کسی سے اس کیلئے سامان خریدے تو اس صورت میں یہ صرف دلال ہوگا، اور یہ صحیح ہے۔ اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ اس کے ہاتھ ایسا سامان فروخت کرے جو اس کی ملکیت میں نہیں ہے اور اس کے بعد پھر مالک سے وہ سامان خریدے اور اس کو دیدے۔ یہ صورت باطل ہے اس لئے کہ ایسی چیز کو بیچا ہے جو بیع کے وقت اس کے پاس نہیں ہے، اور یہی مطلب اگلے جملہ قول کا ہے۔

لا تبع ما لیس عندك۔ شرح السنہ میں ہے کہ یہ ممانعت اعیان کی بیوع میں ہے نہ کہ صفات کی بیوع میں۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ ایسی چیز میں سلم کرنا جس کے اوصاف بیان کئے گئے ہو اور مشروط جگہ میں عمومی طور پر پائی جاتی ہو جائز ہے۔ اگرچہ عقد کے وقت اس کی ملکیت میں نہ ہو۔ جو چیز اس کے پاس نہ ہو اس کی بیع کے فاسد ہونے میں مفرور غلام کی بیع اور قبل القبض بیع بھی داخل ہے اور اسی طرح اس کے معنی میں اس مال غیر کی بیع بھی شامل ہے جو اس کی اجازت کے بغیر ہوئی ہو اس لئے کہ معلوم نہیں کہ مالک اس بیع کو جائز قرار دیتا ہے یا نہیں، امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک ہے۔

اور علماء کی ایک جماعت کے نزدیک یہ بیع اجازت مالک پر موقوف رہے گی۔ یہ امام مالک اور اصحاب ابی حنیفہ اور امام احمد رحمہم اللہ کا قول ہے۔

ایک بیع میں دو بیع نہ کرو

۲۸۶۸:وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ بَیْعَتَیْنِ فِیْ بَیْعَةٍ

(رواه مالك والترمذی وابوداود والنسائی)

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ۷۳۸/۳ الحدیث رقم ۳٤٦۱ والترمذی فی ۵۲۳/۳ الحدیث رقم ۱۲۳۱ والنسائی فی ۲۹۵/۷ الحدیث رقم (٤٦۳۲)۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک بیع میں دو بیع کرنے سے منع فرمایا ہے''۔

(مالک، ترمذی، ابوداؤد، نسائی)

تشریح: یہاں بیع سے مراد معاملہ اور عقد ہے۔ شیخ مظہر فرماتے ہیں اور اسی طرح شرح السنہ میں ہے۔'' ایک بیع'' میں دو بیع کی علماء نے دو طرح تفسیر کی ہے:

ایک قول تو یہ ہے کہ مثلاً کوئی شخص کسی سے کہے کہ میں اپنا کپڑا تمہارے ہاتھ دس روپے نقد میں اور بیس روپے ادھار میں بیچتا ہوں۔ تو یہ اکثر اہل علم کے نزدیک فاسد ہے اس لئے کہ اس میں یہ معلوم نہیں کہ ان دونوں میں سے کس کو قیمت قرار دیا ہے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ کوئی شخص کسی سے یوں کہے کہ میں اپنا یہ غلام دس دینار کے عوض تمہارے ہاتھ بیچتا ہوں مگر شرط یہ ہے کہ تم اپنی باندی اتنے کے عوض میرے ہاتھ فروخت کر دو، یہ بھی فاسد ہے، اس لئے کہ اس میں بیع اور شرط ہے اور دوسرا یہ کہ یہ جہالت ثمن کی طرف

بیچا جاتا ہے، اس لئے کہ اس عقد کا پورا کرنا لونڈی بیچنے کے ساتھ ضروری نہیں ہے، حالانکہ اس نے اس کو ثمن کا حصہ بنایا ہے اور اس شرط کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ پس یہ شرط غیر لازم ہے، اور جب اس شرط کا پورا کرنا لازم نہیں تو ثمن کا بعض حصہ باطل ہوا تو مبیع کا باقی حصہ ثمن کے دوسرے حصے کے عوض میں ہوا اور وہ مجہول ہے۔

۲۸۶۹: وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ بَيْعَتَيْنِ فِيْ صَفْقَةٍ وَّاحِدَةٍ۔

اخرجه البغوی فی شرح المسنة ۸/ ۱٤٤ الحدیث رقم ۲۱۱۲۔

ترجمہ: ''اور حضرت عمرو بن شعیبؒ اپنے والد (شعیب) سے اور وہ اپنے دادا (حضرت عبداللہ بن عمرؓ) سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک معاملے پر دو بیع کرنے کی ممانعت فرمائی ہے''۔ (شرح السنۃ)

تشریح: قوله :نهی عن بیعتین فی صفقة واحدة :

صفقہ سے مراد بیع ہے اور بیع کا نام ''صفقہ'' اس لئے رکھا ہے کہ عرب کی عادت تھی کہ بیع کے وقت متعاقدین میں سے ہر ایک اپنا ہاتھ دوسرے کے ہاتھ پر مارتا تھا۔

بیع کو قرض کے ساتھ نہ ملاؤ

۲۸۷۰: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا يَحِلُّ سَلَفٌ وَّبَيْعٌ وَّلَا شَرْطَانِ فِيْ بَيْعٍ وَّلَا رِبْحُ مَا لَمْ يُضْمَنْ وَلَا بَيْعُ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ (رواه الترمذی وابوداود والنسائی وقال الترمذی هذا حدیث صحیح)

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ۳/۷۷۵ الحدیث رقم ۳۵۰٤ والترمذی فی ۳/۵۳۵ الحدیث رقم ۱۲۳٤ والنسائی فی ۷/۲۸۸ الحدیث رقم ٤٦۱۱ وابن ماجه فی ۲/۷۳۷ الحدیث رقم ۲۱۸۸ واحمد فی المسند ۲/۱۷۸

ترجمہ: ''اور حضرت عمرو بن شعیب ناقل ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قرض اور بیع (ایک ساتھ) حلال ہیں نہ ایک بیع میں دو شرطیں، نہ ہی اس چیز سے نفع اٹھانا درست ہے جو ابھی اپنے ضمان (قبضہ) میں نہیں آئی اور اس چیز کو بیچنا جائز نہیں جو تمہارے پاس (یعنی تمہاری ملکیت میں) نہیں آئی''۔ (ترمذی، ابوداوٗد، نسائی اور امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے)۔

تشریح: قوله :قال رسول اللّٰہ ﷺ لا یحل سلف وبیع : ''سلف'' سین اور لام کے فتحہ کے ساتھ۔

یعنی قرض بیع کے ساتھ، اس طور پر کہ ایک دوسرے کے ساتھ مشروط ہوں۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''سلف'' کا اطلاق سلم اور قرض دونوں پر ہوتا ہے، یہاں مراد قرض کی شرط ہے، حذف مضاف کے ساتھ تقدیری عبارت یوں ہے: **لا یحل بیع مع شرط سلف**، مثلاً کوئی شخص دوسرے سے کہے کہ میں تیرے ہاتھ اپنا یہ کپڑا دس روپے کا فروخت کر رہا ہوں اس شرط پر کہ تو مجھے دس روپے قرض دے۔ روایت میں اس حلت کی نفی ہے جو صحت بیع کو لازم ہے، تاکہ یہ فساد بیع پر دلالت کرے بطریق ملازمت، باقی علت حلال نہ ہونے کی اس بیع میں اور ہر اس بیع میں جو شرط کو متضمن ہو ثابت نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کے ساتھ غرض متعلق ہے، جیسا کہ پہلے حدیث میں گزرا۔

بعض کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً کوئی شخص کسی کو کچھ روپے بطور قرض دے اور اس کے ساتھ اپنی کوئی چیز اس قرض دار کے ہاتھ اصل قیمت سے زائد پر بیچے، یہ حرام ہے۔ اس لئے کہ اس کے قرض نے اس کے سامان کو اس قیمت کے ساتھ رائج کیا ہے، اور یہ قاعدہ ہے کہ جو بھی قرض کوئی نفع کھینچ کر لائے وہ حرام ہے۔

قوله :ولا شرطان فی بیع: اسکی ایک تفسیر تو وہی ہے جو اوپر بیعتین (یعنی ایک بیع میں دو بیع نہ کرے) کی وضاحت میں گزری۔
بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بیچنے والا اپنی کوئی چیز دو/۲ شرطوں کے ساتھ نہ بیچے مثلاً وہ خریدار سے یوں کہے کہ

میں نے یہ کپڑا تمہارے ہاتھ اتنے روپے میں بیچا، بایں طور کہ میں اس کپڑے کو دھلوا بھی دوں گا، اور سی بھی لوں گا، اور اسی طرح کسی چیز کا اس شرط پر بیچنا کہ وہ خریدار اپنا گھر اس کو کرایہ پر دے گا، اور اپنا غلام اس کو عاریۃً دے گا۔ اس تفسیر کو امام احمدؒ نے اختیار کیا ہے۔ انہوں نے اس کے مفہوم پر بنا کی ہے اس مسئلے کی کہ ایک شرط کے ساتھ بیع درست ہے۔ لیکن یہ قول ضعیف ہے، اس لئے کہ معنی کے لحاظ سے ایک شرط اور دو شرطوں میں کوئی فرق نہیں ہے، اور اس وجہ سے بھی کہ روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا ہے بیع اور شرط سے، باقی دو شرطوں کی تخصیص اس روایت میں شاید اس وجہ سے ہو کہ عرب کی عادت دو شرطوں کی تھی۔

مفہوم مخالف کا اعتبار ہمارے ہاں نہیں ہے مطلقاً اور مفہوم عدد حجت نہیں ہے جمہور کے ہاں' جو مفہوم مخالف کو جائز قرار دیتے ہیں۔ پھر مراد یہاں شرط ہے جس کا عقد تقاضا نہ کرتا ہو، جیسا کہ ظاہر ہے۔

قوله :ولا ربح ما لم يضمن: نفع سے مراد اس چیز کا نفع ہے جو اس نے خریدی ہو، اور اس پر قبضہ نہ کیا ہو اور نہ ہی وہ بیچنے والے کے ضمان سے اس کے ضمان میں منتقل ہوئی ہو۔ اس کا بیچنا فاسد ہے۔ شرح السنہ میں ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ فائدہ اٹھانا کسی بھی چیز سے اس وقت حلال ہوتا ہے جب اس چیز کا نقصان بھی اس پر لازم ہو، اگر اس پر اس کا ضمان لازم نہیں جیسا کہ بیع قبل القبض میں جب مبیع ہلاک ہو جائے تو اس کا ضمان بیچنے والے پر ہے، تو مشتری کیلئے جائز نہیں ہے کہ وہ ان منافع کی واپسی کا مطالبہ کرے جو بائع کے قبضہ کرنے سے پہلے حاصل کیے ہیں، اس لئے کہ مبیع قبضہ کرنے سے پہلے خریدار کے ضمان میں داخل نہیں ہوئی تو خریدار کیلئے قبضہ سے پہلے اس سے فائدہ اٹھانا حلال نہیں ہے۔

ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بھی جائز ہے کہ ''ربح'' سے مراد اس چیز کا بیچنا ہو، اور اس کو ربح سے تعبیر کیا ہے۔ اس لئے کہ یہ بیچنا ہی اس کا سبب ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ حقیقت ربح مراد ہو، جو ان تمام زائد چیزوں کو شامل ہے جو مبیع سے حاصل ہوتی ہیں جیسے دودھ، انڈے وغیرہ۔

قوله :ولا تبع ما ليس عندك : اس کی تفصیل پہلے گزری ہے۔

ادائیگی قیمت میں سکّہ کی تبدیلی جائز ہے

۲۸۷۱:وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كُنْتُ اَبِيْعُ الْاِبِلَ بِالنَّقِيْعِ بِالدَّنَانِيْرِ فَاٰخُذُ مَكَانَهَا الدَّرَاهِمَ وَاَبِيْعُ بِالدَّرَاهِمِ فَاٰخُذُ مَكَانَهَا الدَّنَانِيْرَ فَاَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ فَذَكَرْتُ ذٰلِكَ لَهٗ فَقَالَ لَا بَأْسَ اَنْ تَاْخُذَهَا بِسِعْرِ يَوْمِهَا مَا لَمْ تَفْتَرِقَا وَبَيْنَكُمَا شَيْءٌ. (رواه الترمذی وابوداود والنسائی والدارمی)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۶۵۰/۳ الحديث رقم ۳۳۵۴ والترمذی فی ۵۴۴/۳ الحديث رقم ۱۲۴۲ والنسائی فی ۲۸۱/۷ الحديث رقم ۴۵۸۲ وابن ماجه فی ۷۶۰/۲ الحديث رقم ۲۲۶۲ والدار می فی ۳۳۶/۲ الحديث رقم ۲۵۸۱۔

ترجمه: ''اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نقیع میں (جو مدینہ کے قریب ایک جگہ ہے) اونٹوں کو دیناروں کے عوض بیچا کرتا تھا اور ان کے عوض درہم لے لیا کرتا تھا' اسی طرح جب (اونٹوں کو) درہم کے عوض بیچتا تو درہم کے عوض دینار لے لیا کرتا تھا۔ پھر (جب) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تذکرہ کیا' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ (تم دینار کے بدلے درہم اور درہم کے بدلے دینار لے لو) جب تم نرخ اسی دن کے مطابق وصول کرو اور تم دونوں ایک دوسرے سے اس حال میں جدا ہو کہ تمہارے درمیان کوئی لین دین باقی نہ ہو''۔ (ترمذی' ابوداؤد' نسائی)

تشریح: **النقيع** : نہایہ اور اسی طرح شرح تورپشتی میں ہے کہ ''نقیع'' نون کے ساتھ، مدینہ کے قریب ایک جگہ ہے، جس میں پانی جمع ہوتا تھا (انتہیٰ)۔

بعض کہتے ہیں کہ پھر وہ جگہ بھر گئی تھی اس میں گھاس اُگتا ہے۔ اور بعض حضرات کا فیصلہ ہے کہ یہ 'باء' کے ساتھ بقیع ہے، اس لئے کہ عرب اکثر ایام غرقد میں بازار میں قیام کرتے تھے، اور ''کنت ابیع'' بھی استمرار پر دلالت کر رہا ہے۔ اور ''نقیع'' نون کے ساتھ، ایک چراگاہ ہے، مدینہ سے بیس فرسخ کی دوری پر۔ وہاں استمرار مناسب نہیں۔ (انتہیٰ)

اس کا جواب یہ بھی ممکن ہے کہ ''نقیع'' بعض ایام میں وہاں بازار لگا کرتا ہو تو پھر یہ دوام اور استمرار کے منافی نہیں ہوگا۔

فاخذ : متکلم کے صیغہ کے ساتھ ہے۔

فاتیت النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فذکرت ذلک له : بعض نے یہاں یہ اعتراض کیا ہے کہ مناسب یہ تھا کہ وہ اس کام کا ارادہ کرنے کے بعد اور کام کرنے سے پہلے آپ علیہ السلام کے پاس آتے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ عبداللہ ابن عمرؓ فقہاء و مجتہدین صحابہ میں سے تھے، انہوں نے پہلے اپنی رائے کے ساتھ اجتہاد کیا اس کے جواز کا پھر یہ معاملہ کیا، پھر آپ سے پوچھا، تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ ان کا اجتہاد نفس الامر اور حقیقت کے مطابق ہے یا نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کے زمانہ میں اجتہاد جائز تھا بلکہ آپؐ کی موجودگی میں بھی جائز تھا، اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ظنی پر عمل جائز ہے یقین پر قدرت کے باوجود، اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یقین کی طرف رجوع کرنا بہتر ہے ظنی پر استمرار سے (ان کو ذکر کیا ہے ابن حجر رحمہ اللہ نے۔)

أن تأخذها : ایک نسخہ میں ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہے یہ اس صورت میں ہے کہ جب ''اِن'' شرطیہ ہو۔ ضمیر منصوب نقدین میں سے کسی ایک کی طرف لوٹے گی بدلیت کے طور پر۔ (جیسا کہ اس کو ذکر کیا امام طیبی رحمہ اللہ نے۔)

ما لم تفترقا:

وبینکما شئی : یعنی ایسا کوئی عمل جو عقد صرف کی رو سے واجب ہو، اور وہ قبضہ کرنا ہے عوضین پر یا کسی ایک پر مجلس میں جدائی سے پہلے، (اس کو ذکر کیا ہے ہمارے بعض علماء نے۔)

ابن الملک فرماتے ہیں یعنی اس تبدیل کرنے کے متعلق کوئی چیز نہ ہو، اور وہ قبضہ کرنا ہے مجلس میں نقدی کو نقدی کے بدلے بیچنے میں، اگرچہ جنس مختلف ہو۔ (انتہیٰ)

علامہ ابن الہمام فرماتے ہیں کہ درہم چونکہ غیر متعین ہے، اس لئے اگر کوئی شخص کسی کو ایک درہم دکھا کر کہے کہ اس کے عوض فلاں چیز میرے ہاتھ بیچ دو، پھر جب وہ اسے وہ چیز بیچ دے تو اس درہم کے بجائے دوسرا درہم دینا جائز ہے، بشرطیکہ دونوں درہم مالیت میں یکساں ہوں۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث میں لفظ ''شئ'' کو نکرہ لایا گیا ہے، اور مبہم چھوڑا ہے' اس لئے کہ اس کی مراد معلوم ہے اور مجلس میں نقدین پر قبضہ کرنا ایسا مشہور ہے کہ کسی کو بھی اس کے بارے میں التباس نہیں ہوتا۔ آپ نے اس کے جواب میں فرمایا: **لا بأس**، اور پھر اس کو مقید کیا ''**ان تاخذ ها**......'' کے ساتھ، یہ ''قول بالواجب'' کے باب سے ہے، گویا کہ آپ ﷺ نے اس طرح فرمایا ہے **لاباس أن تاخذ بدل الدینار الدراهم**..... ، کہ کوئی حرج نہیں ہے کہ تم دنانیر کے بدلے دراہم لو یا اس کا عکس کرو' مجلس میں قبضہ کرنے کی شرط کے ساتھ، اور اس دن کے نرخ کے ساتھ مقید کرنا یہ قید استحبابی ہے امام شافعیؒ کے نزدیک۔

شرح السنہ میں ہے کہ نقدین کو آپس میں تبدیل کرنے کی صورت میں مجلس میں قبضہ شرط ہے' پھر یہ برابر ہے کہ وہ جس کے ساتھ تبدیل کر رہا ہے وہ علت ربا میں اس کے موافق ہو یا نہ ہو، اور نبی ﷺ نے قبضہ کی شرط اس لئے لگائی کہ دراہم اور دنانیر علت ربا میں موافق ہیں، اور نقدین میں سے ایک کو دوسرے کے بدلے بیچنے میں قبضہ کرنا مجلس میں شرط ہے، اور اگر کوئی دین کے بدلے تبدیل کرے کسی شئی مؤجل کو تو یہ جائز نہیں ہے اس لئے کہ یہ ادھار کو ادھار کے بدلے بیچنا ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔

آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے متعلق ایک بیع کا ذکر

۲۸۷۲: وَعَنِ الْعَدَّاءِ بْنِ خَالِدِ بْنِ هَوْذَةَ اَخْرَجَ كِتَابًا هٰذَا مَا اشْتَرٰى الْعَدَّاءُ بْنُ خَالِدِ بْنِ هَوْذَةَ مِنْ مُحَمَّدٍ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اشْتَرٰى مِنْهُ عَبْدًا اَوْ اَمَةً لَا دَاءَ وَلَا غَائِلَةَ وَلَا خِبْثَةَ بَيْعُ الْمُسْلِمِ الْمُسْلِمَ.

(رواه الترمذی وقال هذا حديث غريب)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤/٣٠٩معلقا فی کتاب البیوع باب اذابت لبائعات (١٩) والترمذی فی السنن ٣/٥٢٠ الحدیث رقم ١٢١٦ وابن ماجه ٢/٧٥٦ الحدیث رقم ٢٢٥١

ترجمه: ''اور حضرت عداء بن خالد بن ہوذہؓ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے ایک تحریر نکال کر دکھائی جس میں یہ لکھا تھا کہ ''یہ بیع نامہ ہے جو محمد رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اور عداء بن خالد بن ہوذہؓ کی خریداری کے بارے میں ہے۔ عداء نے محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے ایک غلام یا لونڈی خریدی' جس میں نہ کوئی بیماری ہے' نہ کوئی بدی ہے اور نہ ہی کوئی اخلاقی برائی ہے' یہ ایک مسلمان کی ایک مسلمان سے بیع ہے''۔
(امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے)

تشریح: **قوله العداء** ...... : یہ کلام اجمال کے بعد تفسیر ہے۔ **عبدًا او امةً** : یہ شک ہے کسی راوی کی طرف سے۔
غائلة : جیسے زنا، چوری، شراب نوشی جیسی اخلاقی برائیاں۔ **خبثة** : خاء معجمہ کے کسرہ اور باء موحدہ کے سکون کے ساتھ اور اس کے بعد ثاء ہے، مطلب یہ ہے کہ اس کی خلقت و جبلت میں کوئی ایسی برائی نہیں ہے جس سے افعال قبیحہ اور اخلاق شنیعہ پیدا ہوں جیسے اس کا ولد الزنا ہونا، فاسق ہونا، جھوٹا یا جواری ہونا، اور نہ ہی اس کی ملکیت میں کوئی برائی ہے جس سے شبہ پیدا ہو اس کی ملکیت میں، جیسے قیدی ہونا ان لوگوں میں سے جن کے قیدی بنانے میں شک ہو، یا ان کے قیدی بنانے کی حرمت کا یقین ہو، جیسے مسلمان، معاہد وغیرہ، (اس کو ذکر کیا ہے ابن حجر رحمہ اللہ نے۔)

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بیماری سے مراد وہ عیب ہے جو خیار عیب کو لازم کرنے والا ہو، اور ''غائلة'' سے مراد وہ عیب ہے جو خریدار کے مال کے نقصان کا باعث بنے جیسے غلام کا چور ہونا یا بھگوڑا ہونا۔ اور ''خبثة'' سے مراد یہ ہے کہ اس کی خلقت میں خبث اور برائی ہو جو مالک کیلئے کبھی اچھی نہیں ہو سکتی، یا اس کا مملوک بنانا حرام ہو، جیسے معاہدین وغیرہ کی اولاد میں سے کسی کو قید کرنا، جن کو قیدی بنانا جائز نہ ہو۔ حرمت کو خبث سے تعبیر کیا جیسے حلال ہونے کو طیب سے تعبیر کرتے ہیں۔

قوله : بيع المسلم المسلم : بیع منصوب ہے بناء بر مصدریت : **ای انما باعه بيع المسلم من المسلم** ''**بيع**'' کی اضافت ''**المسلم**'' کی طرف اضافت الی الفاعل ہے، اور یہ منصوب ہے مفعول ہونے کی بناء پر، (اس کو ذکر کیا ہے امام طیبی نے)۔ اور ایک نسخہ میں ''**بيع**'' کے رفع کے ساتھ ہے، یہ خبر ہے مبتدا محذوف کی جو کہ **هو** ہے۔ یا ''**هذا**'' ہے، یا مبتدا ہے خبر محذوف کا۔

امام تورپشتی فرماتے ہیں کہ اس میں اس بات پر کوئی دلالت نہیں پائی جاتی کہ جب ایک مسلمان، کسی مسلمان سے معاملہ کرتا ہے تو وہ اس کے ساتھ زیادہ خیر خواہی سے پیش آتا ہے، بنسبت غیر کے ساتھ خیر خواہی کے، بلکہ اس سے مراد مسلمانوں کے آپس میں معاملہ اور عقد کرنے کی حالت بیان کرنا ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے ساتھ ہر معاملہ میں خیر خواہی اور ایک دوسرے کے حقوق کا پورا لحاظ رکھیں کہ دونوں ایک دوسرے سے سچ بولیں اور جو عیب کسی ایک سے چھپا ہوا ہو وہ اس کے سامنے بیان کریں، اور تقدیری عبارت ہے: ''**باعه بيع المسلم المسلم، واشتراه شراء المسلم المسلم**''، عقد کے دو اطراف میں سے ایک کے ذکر پر اکتفاء کیا۔ (انتہیٰ)

حاصل اور خلاصہ یہ ہے کہ اس کی مراد ایسی بیع ہے جس میں تمام شرائط جمع ہو، جیسے ایک مسلمان کی بیع دوسرے مسلمان کے ساتھ تمام شرائط سمیت، اور اس میں اشارہ ہے کہ اس بیع میں حقوق اسلام کی مکمل رعایت رکھی گئی، باقی اس (حدیث) میں کسی غیر مسلم کے ساتھ معاملہ کرنے کی ممانعت نہیں ہے۔

ابن الملک نے فرمایا ہے کہ ''بیع''،مفعول مطلق ہے''اشتری'' کیلئے اس لئے کہ شراء کا اطلاق بیع پر بھی ہوتا ہے،جیسا کہ بیع کا اطلاق شراء پر ہوتا ہے اور یہ تاکید ہو جائے گا اشتری والے پہلے جملہ کے مضمون کیلئے۔اور شارح نے جو یہ تقدیری عبارت نکالی ہے: ''باعه بيع المسلم المسلم او اشتراه شراء المسلم المسلم''اس کا جواب بھی ہو جائے گا۔ابن الملک کی یہ بات حقیقت سے دور ہے۔اور اللہ ہی توفیق دینے والے ہیں۔

بطریق نیلام بیع جائز ہے

۲۸۷۳:وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ بَاعَ حِلْسًا وَقَدَحًا فَقَالَ مَنْ يَشْتَرِىْ هٰذَا الْحِلْسَ وَالْقَدَحَ فَقَالَ رَجُلٌ اٰخُذُهُمَا بِدِرْهَمٍ فَقَالَ النَّبِىُّ ﷺ مَنْ يَزِيْدُ عَلٰى دِرْهَمٍ فَاَعْطَاهُ رَجُلٌ دِرْهَمَيْنِ فَبَاعَهُمَا مِنْهُ۔

(رواه الترمذی و ابو داؤد و ابن ماجة)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۲/۲۹۲ الحديث رقم ۱٦٤۱ والترمذی فی ۳/۵۲۲ الحديث رقم ۱۲۱۸ والنسائی فی ۷/۲۵۹ الحديث رقم ٤۵۰۸ ،وابن ماجه فی ۲/ ۷٤۰ الحديث رقم ۲۱۹۸ واحمد فی المسند ۳/۱۱٤

ترجمہ:''اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جب ایک ٹاٹ اور ایک پیالہ بیچا تو ارشاد فرمایا کہ اس ٹاٹ اور پیالہ کو کون خریدے گا؟ (جو خریدنا چاہتا ہو وہ اس کی قیمت لگائے) ایک شخص نے عرض کیا کہ ''میں ان دونوں چیزوں کو ایک درہم کے عوض لے سکتا ہوں''۔ نبی کریم ﷺ نے پھر ارشاد فرمایا: ایک درہم سے زائد قیمت کون دے گا؟ چنانچہ ایک دوسرے شخص نے آپ ﷺ کو دو درہم پیش کئے اور آپ نے وہ دونوں چیزیں اس شخص کے ہاتھ (دو درہم کے عوض) فروخت کر دیں''۔ (ترمذی،ابوداؤد،ابن ماجہ)

تشریح: **حلسا** : حاء کے کسرہ اور لام کے سکون کے ساتھ ہے، وہ چادر جو اونٹ کی پیٹھ پر پالان کے نیچے ڈالی جاتی ہے جو اس سے جدا نہیں ہوتی (اس کو ذکر کیا ہے نہایہ میں)۔اور بعض کہتے ہیں کہ ایک بچھونا ہے جو بچھایا جاتا ہے۔

اس بیع کا اصل واقعہ یوں ہے، کہ ایک شخص نے رسول اکرم ﷺ سے صدقہ مانگا، آپ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ تمہارے پاس کچھ سامان بھی ہے؟ اس نے عرض کیا میرے پاس کوئی سامان نہیں، سوائے ایک چادر اور ایک پیالہ کے، آپ ﷺ نے فرمایا: کہ ان دونوں کو بیچ دو اور اس کی قیمت کے طور پر جو کچھ وصول ہو اس کو کھاؤ اس کے بعد جب تمہارے پاس کچھ نہ رہے ہو تب صدقہ و خیرات مانگو۔ آپ نے ان دونوں چیزوں کو بیچ ڈالا۔ **من يزيد علی درهم** : اس سے معلوم ہوا کہ قیمت میں زیادتی جائز ہے جب بیچنے والا اس قیمت پر راضی نہ ہو جو خریدنے والے نے متعین کی ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ کسی کے دام پر دام لگانا نہیں ہے، اس لئے کہ دام پر دام لگانا اس وقت ہوتا ہے کہ جب بیچنے والا اور خریدنے والا ایک قیمت پر متفق ہو جائیں اور ابھی تک عقد ہوا نہیں، کہ ایک تیسرا شخص آکر کہے کہ میں اس کو اتنے پر خریدنے کیلئے تیار ہوں، یہ حرام ہوتا ہے قیمت مقرر ہونے کے بعد اور باقی سامان پر دام لگانا بیچنے کیلئے کہ جو آخری بولی بولے اس کو دونگا، تو یہ حرام نہیں ہے۔

اس حدیث کا ظاہر اس بات کی دلیل ہے کہ معاملات میں بیچنے والے کا چیز دینا اور خریدار کا قیمت دینا کافی ہے، اگرچہ زبانی ایجاب و قبول نہ ہو۔

الفصل الثالث :

عیب دار چیز دھوکہ سے بیچنے والے کیلئے وعید

۲۸۷٤:عَنْ وَاثِلَةَ بْنِ الْاَسْقَعِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ مَنْ بَاعَ عَيْبًا لَمْ يُنَبِّهْ لَمْ يَزَلْ فِىْ مَقْتِ

اللّٰہِ اَوْلَمْ تَزَلِ الْمَلَا ئِکَۃُ تَلْعَنُہٗ. (رواہ ابن ماجۃ)

اخرجہ ابن ماجہ فی السنن ۲/۷۵۵ الحدیث رقم ۲۲۴۷

ترجمہ: ''حضرت واثلہ بن اسقعؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جس شخص نے کسی عیب دار چیز کو اس طرح بیچا کہ ''اس کے عیب سے خریدار کو باخبر نہ کیا تو وہ ہمیشہ اللہ کے غضب میں گرفتار رہے گا یا یہ فرمایا کہ اس پر فرشتے ہمیشہ لعنت بھیجتے رہیں گے''۔ (ابن ماجہ)

تشریح: عیبا :عیب دار چیز۔ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ مصدر جب فاعل یا مفعول کی جگہ ذکر کیا جاتا ہے، تو وہ مبالغہ کیلئے ہوتا ہے، جیسے رجل عدل یعنی وہ مجہول عدل ہے، تو یہاں بھی معیب چیز کو نفس عیب قرار دیا ہے، یہ اس معاملہ کی زیادہ شناعت پر اور اس بات پر دلالت کرنے کیلئے ہے یہ بذات خود عیب ہے اور یہ مسلمانوں کی شان کے لائق نہیں جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: من غش فلیس منی۔ جس نے فریب کیا وہ مجھ سے نہیں ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہاں مضاف محذوف ہے۔ ای ذا عیب' اور تنکیر تقریر کیلئے ہے۔

لم ینبہ : باء مشددہ کے کسرہ کے ساتھ۔ لم یزل فی مقت اللّٰہ :اس میں دو مبالغے ہیں، ایک تو یہ کہ ''مقت'' سخت غصے کو کہتے ہیں، دوسرا مبالغہ یہ کہ اس کو ''مقت اللہ'' ظرف بنایا ہے۔ أولم تزل الملائکۃ تلعنہ :او شک کیلئے ہے، یا تنویع کیلئے ہے۔

بابُ

گزشتہ باب کے متعلقات کا بیان

الفصل الاول :

پھلدار درخت کی بیع کا مسئلہ

۲۸۷۵:عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ مَنِ ابْتَاعَ نَخْلاً بَعْدَ اَنْ تُؤَبَّرَ فَثَمَرَتُھَا لِلْبَائِعِ اِلاَّ یَشْتَرِطَ الْمُبْتَاعُ وَمَنِ ابْتَاعَ عَبْدًا وَلَہٗ مَالٌ فَمَا لُہٗ لِلْبَائِعِ اِلَّا اَنْ یَّشْتَرِطَ الْمُبْتَاعُ. (رواہ مسلم وروی البخاری المعنی الاول وحدہ)

اخرجہ البخاری فی صحیحہ ۵/۴۹ الحدیث رقم ۲۳۷۹ ومسلم فی ۳/۱۱۷۳ الحدیث رقم (۸۰-۱۵۴۳) والترمذی فی السنن ۳/۵۴۶ الحدیث رقم ۱۲۴۴ والنسائی فی ۷/۲۹۷ الحدیث رقم ۴۶۳۶ وابن ماجہ فی ۲/۷۴۶ الحدیث رقم ۲۲۱۱ واحمد فی المسند ۲/۷۸

ترجمہ: ''حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اجس شخص نے تابیر (پیوند کاری) کیا ہوا کھجور کا درخت خریدا تو اس کا پھل بیچنے والے کا ہے مگر یہ کہ خریدنے والا پھل مشروط کر دے' اسی طرح جس شخص نے کوئی ایسا غلام خریدا جس کے پاس مال ہو تو اس کا مال بیچنے والے کا ہے۔ مگر یہ کہ خریدنے والا مشروط کر دے۔ (مسلم) بخاری نے اس حدیث کا صرف پہلا جزو یعنی مَنِ ابْتَاعَ نَخْلاً نقل کیا ہے''۔

تشریح: قولہ :مَنِ ابْتَاعَ نَخْلاً بَعْدَ اَنْ تُؤَبَّرَ فَثَمَرَتُھَا لِلْبَائِعِ اِلاَّ یَشْتَرِطَ الْمُبْتَاعُ

ابتاع :اشتری کے معنی میں ہے۔ ان تؤبر : باء کے فتحہ اور تشدید کے ساتھ، ''تابیر'' کی صورت یہ ہے کہ کھجور کے نر درخت کا پھول' کھجور کے مادہ درخت میں رکھ دیا جائے اس کے پھٹنے کے بعد، تو اللہ کے حکم سے اس کا پھل زیادہ اور اچھا ہو جاتا ہے۔

ان یشترط المبتاع :مبتاع سے مراد مشتری ہے۔ یعنی وہ خریدار کہے کہ میں اس درخت کو اس کے پھل سمیت خریدتا ہوں۔

حنفیہ کے نزدیک ''غیر مؤثر'' درخت کا بھی یہی حکم ہے۔ لیکن امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ کا مسلک یہ ہے کہ ''غیر مؤبر'' درخت کا پھل مشتری کا ہوتا ہے مگر یہ کہ بائع پر شرط لگائے کہ یہ میرے ہوں گے، تو پھر یہ پھل بائع کے ہوں گے، وہ حدیث کے مفہوم مخالف کو لیتے ہیں' (اسی طرح ذکر کیا ہے ابن الملک رحمہ اللہ نے)۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ اگر کسی نے پھل دار مؤبر درخت بیچا تو اس کا پھل بیچنے والے کا ہوگا یہ کہ شرط لگائی جائے کہ یہ پھل بھی عقد میں داخل ہے، اور یہی اکثر اہل علم کا مسلک ہے، اور اسی طرح یہی حکم اس درخت کا بھی ہے جس میں انشقاق ہو، لیکن اس کی ابھی تأبیر نہ ہوئی ہو، اس لئے کہ پھل کو درخت سے جدا کرنے کا موجب وہ پھلوں کا ظہور ہے، جو کہ مماثل ہے حمل کی جدائی کے اور شاید کہ حدیث میں پھل کے ظہور کو تأبیر سے تعبیر کیا ہو، اس لئے کہ عام طور پر پھلوں کا ظہور تأبیر سے خالی نہیں ہوتا، اور اگر وہ درخت کو بیچے پھلوں کے ظاہر ہونے کے زمانہ سے پہلے تو پھر پھل اصل کے تابع ہیں، اور مشتری کی طرف منتقل ہوتے ہیں، جنین یعنی حمل پر قیاس کرتے ہوئے اور مفہوم حدیث کو لیتے ہوئے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ پھل ہر حال میں بائع کے ہوتے ہیں۔ اور ابن ابی لیلی فرماتے ہیں کہ پھل ہر حال میں اصل کے تابع ہوتے ہیں اور مشتری کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں۔

قولہ مال : لہ لام اختصاص کیلئے ہے، اس لئے کہ غلام کی ملکیت نہیں ہوتی اس میں امام مالک کا اختلاف ہے۔

فما لہ : لام کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ للبائع : یعنی اپنی اصل پر باقی رہے گا اور وہ ہے بیچنے سے پہلے بائع کی ملک میں ہونا ہے

الا ان یشترط المبتاع : شرح السنہ میں ہے کہ اس میں بیان ہے اس بات کا کہ غلام کسی حال میں کسی چیز کا مالک نہیں بن سکتا، اگر چہ مالک اس کو کسی چیز کا مالک بنا دے' اس لئے کہ غلام خود مملوک ہے تو یہ جائز نہیں ہے کہ وہ مالک ہو جائے، جیسے چوپائے ہوتے ہیں۔

''**لہ مال**'' میں اضافت مجازاً اور ظاہر کے اعتبار سے ہے، نہ کہ اضافت ملک ہے' جیسا کہ زین کی نسبت گھوڑے کی طرف' پالان کی نسبت گدھے کی طرف اور بکریوں کی نسبت چرواہے کی طرف ہوتی ہے۔ اور ''**فما لہ للبائع**'' بھی اس بات پر دلالت کر رہا ہے، کہ ایک ہی حالت میں ملک کی اضافت غلام اور بائع دونوں کی طرف کی ہے، اور یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک چیز پوری کی پوری ایک ہی وقت میں دو آدمیوں کی ملک ہو، پس ثابت ہوا کہ مال کی اضافت ''غلام'' کی طرف مجازاً ہے یعنی اختصاص کیلئے ہے، اور مولیٰ کی طرف حقیقۃً ہے یعنی اضافت ملک ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام مالک اور امام شافعی کا قدیم مذہب یہ ہے کہ جب مولیٰ اپنے غلام کو کسی مال کا مالک بنائے تو وہ اس کا مالک ہو جاتا ہے' لیکن جب مولیٰ اس غلام کو فروخت کر دے تو اس کا مال بائع کا ہوگا، الّا یہ کہ خریدار اس کی شرط لگائے کہ میں غلام کو مال سمیت خریدتا ہوں۔ ظاہر حدیث اس کی دلیل ہے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اگر غلام کے پاس مال دراہم ہو، تو جائز نہیں ہے اس غلام اور ان دراہم کو فروخت کیا جائے' دراہم کے عوض، اور اسی طرح اگر وہ مال' دنانیر ہے یا گندم ہے تو جائز نہیں ہے غلام اور دنانیر کو فروخت کرنا سونے کے عوض یا غلام اور گندم کو گندم کے عوض۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جائز ہے اگر خریدار نے اس کی شرط لگائی ہو اگر چہ وہ مال دراہم کی صورت میں ہو اور قیمت بھی دراہم ہوں' اس لئے کہ حدیث مطلق ہے۔ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ غلام کی بیع کے وقت وہ کپڑے جو اس کے جسم پر ہوں بیع میں داخل نہیں ہوتے' الّا یہ کہ خریدار ان کپڑوں سے بیع کو مشروط کر دے، اس لئے کہ کپڑے بھی من جملہ مال ہیں۔

حنفیہ کے بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ کپڑے بیع میں داخل ہوتے ہیں۔ بعض علماء کا قول یہ ہے کہ صرف اس قدر بیع میں داخل ہوتے ہیں جو ستر پوشی کے لئے کافی ہوں۔ لیکن زیادہ صحیح بات یہی ہے کہ حدیث کے ظاہر مفہوم کے مطابق اس کا کوئی بھی سامان بیع میں داخل نہیں ہوتا، اور لفظ ''عبد'' کپڑوں کو شامل نہیں ہوتا۔

قوله :روى البخاری...... : امام بخاریؒ نے اس حدیث کا صرف پہلا جز ومعناً نقل کیا ہے،اور دوسرا حصہ نہ لفظاً نقل کیا ہے اور نہ معنیً۔

مشروط بیع کا مسئلہ

۲۸۷۶: وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّهٗ كَانَ يَسِيْرُ عَلٰى جَمَلٍ لَهٗ قَدْ اَعْيٰى فَمَرَّ النَّبِىُّ ﷺ بِهٖ فَضَرَبَهٗ فَسَارَ سَيْرًا لَيْسَ يَسِيْرُ مِثْلَهٗ ثُمَّ قَالَ بِعْنِيْهِ بِوُقِيَّةٍ قَالَ فَبِعْتُهٗ فَاسْتَثْنَيْتُ حُمْلَانَهٗ اِلٰى اَهْلِيْ فَلَمَّا قَدِمْتُ الْمَدِيْنَةَ اَتَيْتُهٗ بِالْجَمَلِ وَنَقَدَنِيْ ثَمَنَهٗ وَفِيْ رِوَايَةٍ فَاَعْطَانِيْ ثَمَنَهٗ وَرَدَّهٗ عَلَيَّ (متفق عليه وفی رواية للبخاری) اَنَّهٗ قَالَ لِبِلَالٍ اِقْضِهٖ وَزِدْهُ فَاَعْطَاهُ وَزَادَهٗ قِيْرَاطًا.

اخرجه البخاری فی صحيحه ٥/٣١٤ الحديث رقم ٢٧١٨ ومسلم فی ٣/١٢٢١ الحديث رقم (١٠٩-٧١٥)

ترجمہ:''اور حضرت جابرؓ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ (ایک سفر کے دوران جب کہ وہ مدینہ آ رہے تھے) اپنے اونٹ پر سوار تھے اور وہ (اتنا) تھک گیا تھا (کہ چلنے سے معذور ہو رہا تھا) چنانچہ رسول اللہ ﷺ جب جابرؓ کے قریب سے گزرے تو آپ ﷺ نے ان کے اونٹ کو (لکڑی سے یا اس چابک سے جو آپ ﷺ کے دست مبارک میں تھا) مارا پھر تو وہ (آپ ﷺ کے دست مبارک کی برکت سے) اتنی تیز رفتاری سے چلنے لگا کہ پہلے کبھی اتنی تیز رفتاری سے نہ چلا تھا' پھر اس کے بعد آپ ﷺ نے (حضرت جابرؓ سے) فرمایا کہ تم اس اونٹ کو میرے ہاتھ ایک اوقیہ (چاندی) کے عوض بیچ دو! حضرت جابرؓ نے کہا کہ میں نے یہ اونٹ آپ ﷺ کے ہاتھ فروخت کر دیا لیکن میں نے اپنے گھر تک اس پر سواری کو مستثنیٰ کر دیا (یعنی میں اس شرط کے ساتھ اس کو فروخت کرتا ہوں کہ اپنے گھر تک اسی اونٹ پر سوار ہو کر جاؤں گا۔) چنانچہ (حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ) جب میں مدینہ آیا تو وہ اونٹ لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ نے مجھے اس کی قیمت ادا کر دی۔ ایک روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے مجھے قیمت عطا فرمائی اور اونٹ واپس کر دیا یعنی اس کی قیمت بھی ادا کی اور اونٹ بھی عطا فرما دیا۔ (بخاری ومسلم)۔ بخاری کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ''جب حضرت جابرؓ نے آپ ﷺ کو اونٹ دیا تو'' آپ ﷺ نے حضرت بلالؓ سے فرمایا کہ جابرؓ کو اونٹ کی قیمت ادا کر دو اور کچھ زیادہ بھی دے دو' چنانچہ حضرت بلالؓ نے انہیں اونٹ کی قیمت بھی ادا کر دی اور ایک قیراط (جو درہم کا چھٹا حصہ ہوتا تھا) اس سے زیادہ بھی ادا کیا''۔

تشریح: ابن الملک فرماتے ہیں کہ ''اعیا'' لازم بھی آتا ہے اور متعدی بھی۔

بوقية : واؤ کے ضمہ' قاف کے سکون اور یاء کی تشدید کے ساتھ ہے، ایک وقیہ چالیس ۴۰ درہم کا ہوتا ہے، اس کا وزن ''أفعولة'' ہے اور الف زائدہ ہے۔ اس کی جمع ''اواقی'' ہے تشدید کے ساتھ، اور تخفیف کے ساتھ بھی آتی ہے۔ (انتہی)

ایک درہم چودہ قیراط کا ہوتا ہے' اور ایک قیراط سات درمیانہ جو کا ہوتا ہے' اور قاموس میں ہے کہ ''اوقية'' ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ سات مثقال کا ہوتا ہے، جیسا کہ ''وقيه'' واؤ کے ضمہ اور یاء کی تشدید کے ساتھ، چالیس درہم کا ہوتا ہے، اور اس کی جمع ''اواقی'' ''اواق'' اور ''وقايا'' آتی ہے۔ مصباح میں ہے، کہ ''اوقيه'' ہمزہ کے ضمہ اور یاء کی تشدید کے ساتھ، عرب کے ہاں چالیس درہم کا ہوتا ہے، اس کا وزن ''افعولة'' ہے جیسے ''احدوثة، اعجوبة''، اور اس کی جمع ''اواقی''، تشدید کے ساتھ آتی ہے، اور تخفیف کے ساتھ بھی آتی ہے۔ ثعلب فرماتے ہیں کہ دراصل پہلے حرف کے ضمہ کے ساتھ لفظ ''اوقيه'' ہے اور ''وقيه'' اسی میں ایک لغت ہے' یہ واؤ کے ضمہ کے ساتھ ہے، اسی طرح اس کو السکیت کی کتاب میں ضبط کیا ہے۔ شیخ زہری فرماتے ہیں کہ لیث کہتا ہے کہ ''وقيه'' سات مثقال کا ہوتا ہے اور اسکو بھی ضبط کیا گیا ہے ضمہ کے ساتھ۔ مطرزی فرماتے ہیں کہ اسی طرح شرح السنہ میں متعدد مقامات پر اس کو ضبط کیا گیا ہے، اور لوگوں کی زبان پر یہ فتحہ کے ساتھ جاری ہے، اور یہ بھی ایک لغت ہے۔ بعض حضرات نے اس کو حکایت کیا ہے، اور اس کی جمع ''وقايا''

ہے جیسے ''عطیه'' کی جمع ''عطایا'' ہے۔

حدیث سے معلوم ہوا کہ مال کے مالک سے مال کے بیچنے کا مطالبہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اگر چہ اس نے مال کو بیچنے کیلئے پیش نہ کیا ہو۔

حملانه : حاء کے ضمہ کے ساتھ ''رکوب'' کے معنی میں ہے، **حمل یحمل حملانا** کا مصدر ہے، یعنی میں نے ان کے ساتھ یہ شرط لگائی کہ میں اس اونٹ پر اپنا کجاوہ اور سامان لادوں گا اور آپ ﷺ اس شرط پر راضی ہوگئے۔

اس حدیث سے امام احمد نے استدلال کیا ہے کہ اگر جانور کو فروخت کیا جائے اور ایک مدت تک اس پر سواری اپنے لئے مستثنیٰ کی جائے، دیگر شرائط کی رعایت کے ساتھ، تو یہ جائز ہے، ہمارے اور امام شافعی کے ہاں یہ حضرت جابر کے ساتھ خاص تھا دوسروں کیلئے جائز نہیں ہے یا یہ ہے کہ یہ استثناء بیع کرنے کے بعد تھا کہ حضرت جابر نے اس پر سواری کی اجازت چاہی تو آپ ﷺ نے اس سے وعدہ کر لیا دینے کا، یا یہ کہ ان کے درمیان حقیقت میں بیع نہیں ہوئی اس لئے کہ نہ اس میں قبضہ ہے اور نہ حوالہ کرنا، بلکہ آپ ﷺ کا ارادہ تھا حضرت جابر کو کوئی فائدہ پہنچانے کا، پس اونٹ کی بیع کو اس کیلئے ذریعہ بنایا۔ اور اس کی دلیل ہے جب اس کو وقیہ دے رہے تو اس وقت آپ ﷺ نے فرمایا: ''**ما كنت لآخذ جملك فخذ جملك**''۔ (اس کو ذکر کیا ہے ابن الملک رحمہ اللہ نے)

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام احمد اور جن لوگوں نے ان کی موافقت کی، استدلال کیا ہے کہ اگر کوئی شخص جانور کو بیچے اس شرط پر کہ ایک مدت تک یہ جانور اس کے زیر سواری رہے گا تو یہ جائز ہے۔ اور امام مالک فرماتے ہیں کہ یہ اس وقت جائز ہے کہ جب مسافت قریب ہو۔ امام شافعی ابو حنیفہ اور دوسرے علماء کے ہاں یہ جائز نہیں ہے، چاہے مسافت قریب ہو یا بعید ہو، اور ان کی دلیل وہ حدیث ہے جو پہلے گزری، جس میں بیع ثنیا سے منع کیا گیا ہے۔ اور وہ حدیث جس میں بیع اور شرط سے منع کیا گیا ہے۔ اور حدیث جابر کا جواب ان کی طرف سے یہ ہے کہ یہ ایسا قضیہ ہے کہ جس میں بہت زیادہ احتمالات ہیں، اس لئے کہ آپ کا ارادہ صرف ثمن دینے کا تھا حقیقت بیع کا ارادہ نہیں تھا، اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ شرط دوران عقد نہ ہو، وہ شرط مضر ہے جو دوران عقد لگائی گئی ہو۔ اور شاید کہ یہ شرط پہلے کی ہو، پس یہ مؤثر نہیں ہے۔ پھر آپ ﷺ نے تبرعاً ان کو سواری کیلئے دیدیا۔

فلما قدمت المدينة اتيته بالحمل ونقدني : یعنی مجھے دیا۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث دلالت کرتی ہے ادائیگی دین میں وکالت جائز ہے اور حقوق کے ادا کرنے میں وکالت کے جواز پر، اور دین کے ادا کرنے کے استحباب پر اور وزن کو جھکتا ہوا رکھنے پر۔

فأعطاه وزاد قيراطا : اک قیراط آدھے وانق کا ہوتا ہے اور ایک وانق درہم کا چھٹا حصہ ہوتا ہے۔

شرح السنہ میں ہے کہ اس میں جواز ہے مشاع چیز کے ہبہ کرنے کا، اس لئے کہ ایک قیراط کا زیادہ کرنا یہ ہبہ تھا اور اس کو کل قیمت سے الگ نہیں کیا تھا۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس بات میں بحث ہے اس لئے کہ ''**فاعطاه قيراطا**'' اس بات کی تائید نہیں کرتا، اور اسی طرح حضرت جابر سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا یہ قیراط جو رسول اللہ ﷺ نے مجھے زیادہ دیا ہے یہ مجھ سے کبھی جدا نہ ہوگا، پس اس کو میں نے تھیلی میں رکھا، پس وہ میرے پاس ہی رہا یہاں تک کہ حرہ کے دن جب اہل شام آئے تو انہوں نے جو سامان لیا اس میں وہ تھیلی بھی لے گئے۔

حق ولاء آزاد کرنے والے کو حاصل ہوتا ہے

۲۸۷۷: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ جَاءَ تْ بَرِيْرَةُ فَقَالَتْ اِنِّيْ كَاتَبْتُ عَلٰى تِسْعِ اَوَاقٍ فِيْ كُلِّ عَامٍ وَقِيَّةٌ فَاَعِيْنِيْنِيْ فَقَالَتْ عَائِشَةُ اِنْ اَحَبَّ اَهْلُكِ اَنْ اَعُدَّهَا لَهُمْ عُدَّةً وَاحِدَةً وَاُعْتِقَكِ فَعَلْتُ وَيَكُوْنُ وَلَاءُ كِ لِيْ فَذَهَبَتْ اِلٰى

اَهْلِهَا فَاَبَوْا اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ الْوَلَاءُ لَهُمْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ خُذِيْهَا وَاَعْتِقِيْهَا ثُمَّ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِي النَّاسِ فَحَمِدَ اللّٰهَ وَاَثْنٰى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ اَمَّا بَعْدُ فَمَا بَالُ رِجَالٍ يَشْتَرِطُوْنَ شُرُوْطًا لَيْسَتْ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ مَا كَانَ مِنْ شَرْطٍ لَيْسَ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ فَهُوَ بَاطِلٌ وَاِنْ كَانَ مِائَةَ شَرْطٍ فَقَضَاءُ اللّٰهِ اَحَقُّ وَشَرْطُ اللّٰهِ اَوْثَقُ وَاِنَّمَا الْوَلَاءُ لِمَنْ اَعْتَقَ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاري في صحيحه ٤/٣٧٦ الحديث رقم ٢١٦٨ ومسلم في ٢/١١٤١ الحديث رقم (٦-١٥٠٤) وابو داوٗد في السنن ٤/٢٤٥ الحديث رقم ٣٩٢٩، والترمذي في ٣/٥٥٧ الحديث رقم ١٢٥٦ وابن ماجه في ٢/٨٤٢ الحديث رقم ٢٥٢١ ومالك في الموطأ ٢/٧٨٠ الحديث رقم ١٧ من باب كتاب العتق واحمد في المسند ٦/٢١٣

ترجمہ:''اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ (ایک دن) بریرہ میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ میں نے نو اوقیہ پر مکاتبت اس شرط کے ساتھ کی ہے کہ ہر سال ایک اوقیہ ادا کیا کروں گی' لہٰذا آپ میری مدد کیجئے! حضرت عائشہؓ (کہتی ہیں کہ یہ سن کر میں) نے کہا کہ ''اگر تمہارے مالکوں کو یہ پسند ہو کہ میں سب کے سب اوقئے ایک ہی مرتبہ میں انہیں ادا کر دوں اور پھر تجھے آزاد کر دوں تو ایسا کر سکتی ہوں لیکن اس صورت میں حق ولاء مجھے حاصل ہوگا۔ (بریرہ نے یہ سن کر کہا کہ) میں اپنے مالک کے پاس گئی (اور ان کے سامنے یہ صورت رکھی) مگر انہوں نے اس سے انکار کر دیا اور کہا کہ ہم صرف اس شرط کے ساتھ (تجھے) فروخت کر سکتے ہیں کہ حق ولاء ہمیں حاصل ہو' رسول اللہ ﷺ (کو جب اس کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے) حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ تم اسے لے کر آزاد کر دو اس کا حق ولاء تمہیں ہی حاصل ہوگا''۔ پھر رسول اللہ ﷺ لوگوں کے سامنے کھڑے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کے بعد فرمایا کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایسی شرطیں کرتے ہیں جو کتاب اللہ میں نہیں ہیں (یعنی مشروع نہیں ہیں) جو شرط کتاب اللہ میں نہیں ہے وہ باطل ہے اگر چہ وہ سو شرائط ہوں (یعنی جو شرط ناجائز و نامشروع ہے اسے چاہے کوئی سو ۱۰۰ بار ہی کیوں نہ عائد کرے وہ باطل ہی رہے گی اور اس کی کوئی حیثیت نہیں رہے گی) اور خدا ہی کا حکم سب سے زیادہ اس لائق ہے (کہ اس پر عمل کیا جائے) اور اللہ تعالیٰ ہی کی شرط سب سے زیادہ مضبوط ہے (یعنی خرید و فروخت کے معاملات میں خدا نے جو احکام دیئے ہیں بہر صورت ان ہی کی تعمیل ضروری ہے اور خدا نے جو شرائط مقرر کی ہیں صرف انہی کا لحاظ ضروری ہے اپنی طرف سے عائد کردہ کوئی شرط بھی قابل عمل نہیں ہوگی) جان لو حق ولاء اسی شخص کو حاصل ہوتا ہے جو آزاد کرے)''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: **جاء ت بریرة** : یہ حبشن تھیں' باندی تھیں' شرف صحابیت رکھتی ہیں۔ **ان اعدها** : ہمزہ کے فتحہ اور سین کے ضمہ کے ساتھ، **اعطی** کے معنی میں ہے اور ھا ضمیر **تسع اواق** کی طرف راجع ہے۔ **اعتقك** : ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ **یکون** : رفع کے ساتھ ہے، اور ایک نسخہ میں نصب کے ساتھ ہے۔ **ولاء** : واؤ کے فتحہ کے ساتھ۔

الا ان تکون الولاء لهم : امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ استثناء مفرغ ہے اس لئے کہ ابیٰ میں نفی کا معنی ہے۔ صاحب کشاف نے اس آیت: ﴿**ویأبی الله الا ان یتم نوره**﴾ میں ''ابی'' کو ''لم یرد'' کی جگہ بتلایا ہے، کیا دیکھتے نہیں کہ کیسے تقابل کیا گیا ہے اس آیت میں: [**یریدون لیطفؤا نور الله**][الصف-۸] کا [**ویأبی الله**][التوبة-۳۲] کے ساتھ، اور اس کو لم یرد کی جگہ لایا ہے۔

ظاہر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مکاتب غلام کا بیچنا جائز ہے اور یہی امام اور احمد کا مسلک ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بریرہ کی بیع ان کی رضامندی کے ساتھ ہوئی تھی، اور یہ کتابت کو فسخ کرنا ہے، (یہ جواب ابن الملک نے ذکر کیا ہے۔)

یا یہ کہ وہ بدل کتابت کے ادا کرنے سے عاجز ہو گئی تھی، لہٰذا یہ عقد لونڈی محض پر واقع ہوا ہے نہ کہ مکاتبہ پر۔ اور اس کی تائید بریرہ کے اس قول سے ہوتی ہے: **فا عینینی**۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا ظاہری مقدمہ مکاتب غلام کی بیع کے جائز ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ نخعی، مالک،

اوراحمد کا مذہب یہی ہے، یہ حضرات کہتے ہیں کہ مکاتب کا بیچنا درست ہے، لیکن اس کی کتابت فسخ نہیں ہوگی، یہاں تک کہ اگر یہ مکاتب غلام بدل کتابت کی قسطیں مشتری کوادا کردے تو یہ آزاد ہو جائے گا، اوراس کی ولاء اس کے بائع کی ہوگی، جس نے اس کو مکاتب بنایا تھا۔

امام شافعی نے اس حدیث میں تاویل کی ہے کہ یہ فروخت کرنا بریرہ کی رضامندی سے تھا' یہ ان طرف سے کتابت کا فسخ ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ بریرہ بدل کتابت کے ادا کرنے سے عاجز آ گئی ہوں تو ان کے مالکوں نے اسے عاجز قرار دے کر فروخت کر دیا ہوں۔

مکاتب کا بدل کتابت قسطوں میں ہو تو اس کو بیچنے کے جواز میں علماء کا اختلاف ہے، امام ابوحنیفہ اور امام شافعی اس کو منع کرتے ہیں، اور امام مالک اس کو جائز قرار دیتے ہیں۔

اور حدیث بریرہ میں حضرت عائشہؓ کے اس قول سے دلیل پکڑتے ہیں: ''**اعدها لهم**'' اور یہاں 'ھا' ضمیر ''نو اوقیہ'' کی طرف لوٹ رہی ہے جن پر بریرہ کی کتابت واقع ہوئی تھی' اور اس طرح وہ استدلال کرتے ہیں جو بعض روایات میں آتا ہے: **فان احبوا ان اقضی عنك كتابتك**، لیکن اس کو رد کرتا ہے حضرت عائشہ کا بریرہ کو آزاد کرنا، اور جو روایت کیا ہے ابن شہاب نے عروہ سے اور انہوں نے عائشہؓ سے کہ آپؐ نے فرمایا: ''**ابتاعی و اعتقی**'' اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''**اشتریها و اعتقیها**''۔

باقی انہوں نے جس بات سے استدلال کیا ہے تو وہ ان کے خلاف حجت ہے۔ اس لئے کہ بدل کتابت کی قسطوں کو خریدنے والا، قسطوں کو نہ شمار ہے اور نہ ادا کرتا ہے بلکہ وہ اس کا بدل ادا کرتا ہے۔ باقی غلام کو خریدنے والا جب وہ غلام کو خرید لے اس مقدار کے عوض جس مقدار پر اس کی کتابت واقع ہوئی تھی، تو وہ ہوتا ہے اس عوض کو دینے والا اور ادا کرنے والا، اور اس کیلئے لفظ **اعدها** استعمال کیا ہے، اور مضمون حدیث دلالت کرتا ہے آزادی کی شرط کے ساتھ غلام کی بیع کے جواز پر، اس لئے کہ انہوں نے ولاء کی شرط اپنے لئے لگائی تھی اور شرط ولاء بغیر شرط عتق متصور نہیں ہوسکتی۔ اور آپ ﷺ نے حضرت عائشہ کو اجازت دی تھی ان سے اس شرط کے ساتھ خریدنے کی، اگر یہ عقد فاسد ہوتا تو آپ ﷺ اس کی اجازت نہ دیتے اور نہ ہی عقد پر تقریر فرماتے یہ مسلک ہے نخعی، شافعی، ابن ابی یعلی، اور ابوثور رحمہم اللہ کا۔ اور اصحاب ابی حنیفہ اس کے فساد کے قائل ہیں۔

اس عقد کے صحیح ہونے کے قائلین کا شرط میں اختلاف ہے۔ پس بعض شرط کو صحیح قرار دیتے ہیں اور یہی امام شافعی کا قول جدید ہے، اس لئے کہ آپ نے اس شرط کی اجازت دی تھی۔ اور اس لئے بھی کہ اگر یہ شرط فاسد ہوتی تو عقد بھی فاسد ہوتا اس لئے کہ یہ ایسی شرط ہے جس کے ساتھ غرض متعلق ہے۔ اور یہ ثابت نہیں ہے کہ پس نص کی وجہ سے اور ان دونوں وجودہ کی وجہ سے
بعض شرط کو ملغی قرار دیتے ہیں جیسے ابن ابی یعلیٰ ابوثور،

شرط ولاء کے ساتھ بیع کے صحیح ہونے اور شرط کے فاسد ہونے پر یہ بھی دلالت کرتا ہے کہ آپ ﷺ نے اس عقد کو صحیح قرار دیکر نافذ کیا اور شرط کے باطل ہونے کا فیصلہ کیا اور فرمایا: ''**انما الولاء لمن اعتق**'' اور یہی ابن ابی یعلی اور ابوثور کا قول ہے اور امام شافعی کا قول قدیم ہے، اکثر حضرات اس عقد کے فساد کے قائل ہیں اس نص اور معنی کی وجہ سے جو پہلے گزری ہے۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ بریرہ کے بیچنے میں کوئی شرط جاری نہیں ہوئی تھی، بلکہ اس شرط کا اس قوم نے ولاء کی طمع میں کیا تھا اور وہ ناواقف تھے اس بات سے کہ ولاء تو صرف معتق کیلئے ہوتی ہے،

ہشام بن عروہ عن ابیہ عن عائشہؓ کی سند سے ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''**خذيها و اشترطيها**'' تو یہ زیادت ہے، اور ہشام اس میں متفرد ہیں۔ اور اس زیادت کو ترک کرنے والے ابن شہاب عن عروۃ عن عائشہ اور قاسم بن محمد سے غلطی ہونے کے تعداد کے لحاظ سے، لہٰذا یہ زیادت نہیں سنی جائے گی' اس لئے کہ ایک سے غلطی کا احتمال زیادہ ہوتا ہے بنسبت جماعت کے۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رسول کا اللہ کے ہاں اتنا بڑا مرتبہ ہونے کے باوجود یہ کیسے جائز ہوسکتا ہے کہ وہ لوگوں پر نکیر کریں شرط باطل کی وجہ سے' اور اپنے اہل کو اس شرط باطل کے قبول کرنے کا حکم دیں، حالانکہ وہ اللہ کے احکام کے بارے میں اپنے اہل پر زیادہ

سخت تھے۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ اس تقدیر اور احتمال پر منہدم ہو جاتے ہیں وہ استدلالات جو ہم نے ذکر کئے۔ اور اس حدیث میں شرط عتق کے ساتھ عقد اور شرط کے صحیح ہونے پر کوئی دلالت نہیں ہے۔

ثم قال اما بعد : یہ فصل خطاب، اور عتاب کے قصد سے۔ ارشاد فرمایا۔

فما بال رجال : تصحیح شدہ نسخہ اور اصول معتمدہ مشکاۃ کے، میں ''فا'' ہی کے ساتھ ہے۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بخاری میں بغیر ''فا'' کے ہے۔ مالکی فرماتے ہیں ''اما'' حرف ہے یہ اور اس کے ساتھ ملا ہوا فعل اداۃ شرط کا قائم مقام ہوتا ہے، اس وجہ سے نحوی اس کی تقدیر ''**مهما يكن من شي**'' نکالتے ہیں، اور اس کے ساتھ متصل کلمہ کے ساتھ متصل فعل کا حق یہ ہے کہ اس پر ''فا'' داخل ہو، جیسے: [**فا ما عاد فا ستكبر وا في الارض**] [فصلت۔ ۱۵] اور عام طور پر یہ 'فاء' حذف نہیں کیا جاتا مگر شعر میں یا ایسے قول سے جس کے ذکر سے اس کے مقولہ نے مستغنی کر دیا ہو، جیسے: [**فاما الذين اسودت وجوهم اكفرتم**] **اى فيقال لهم اكفرتم**، اور آپ ﷺ کا قول: ''**اما موسى فكاني أنظر اليه**'' اور حضرت عائشہ کا قول: **واما الذين جمعوا بين الحج والعمرة طافوا طوافا واحدا**، اس حدیث میں قاعدہ کے خلاف کیا گیا ہے، پس تحقیق سے معلوم ہوا کہ اس کے حذف میں تنگی نہیں ہے، اور جن لوگوں نے اس کو خاص کیا ہے شعر کے ساتھ یا نثر کی معین صورت کے ساتھ سو وہ فتویٰ میں کوتاہی ہیں، اور اپنے دعویٰ کی نصرت کرنے سے عاجز ہیں۔

في كتاب الله : کتاب اللہ سے مراد حکم اللہ ہے نہ کہ قرآن مراد ہے، اس لئے کہ ''**الولاء لمن اعتق**'' قرآن میں نہیں ہے، یا کتاب سے مراد لوح محفوظ ہے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ کتاب سے مراد قرآن ہے اور اس کی نظیر ابن مسعودؓ کا قول ہے **واشمة** (بال جوڑنے والی) کے بارے میں: ''**مالي لا العن من لعن رسول الله ﷺ وهو في كتاب الله**''، پھر اللہ کی کتاب میں ہونے پر انہوں نے اس آیت سے استدلال کیا: ﴿**وما اتاكم الرسول فخذوه ومانهاكم عنه فانتهوا**﴾ (اور رسول تم کو جو کچھ دیدیا کرے وہ لے لیا کرو، اور جس چیز سے تم کو روک دے تم رُک جایا کرو)۔

ما كان من شرط ليس في كتاب الله : ''ما'' شرطیہ ہے اور ''من'' زائدہ اس لے کہ کلام غیر موجب ہے، اور جزاء یہ قول ہے: **فهو باطل وان كان مائة شرط** :'ان' وصلیہ ہے مبالغہ کیلئے ہے اور مفہوم عدد معتبر نہیں ہے۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ مطلب اس کا یہ ہے کہ اگرچہ سو/۱۰۰ بار شرط لگائے، اس شرط کو کلام سابق کے پیچھے لایا گیا ہے بغیر جزاء کے مبالغہ اور تقریر کی غرض سے۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ اس میں 'فاء' بتا رہا ہے کہ یہ شرط محذوف کا جواب ہے، اور لفظ قضاء بتا رہا ہے کہ ''**ليست في كتاب الله**'' میں ''کتاب اللہ سے مراد'' اللہ کا حکم اور فیصلہ ہے۔

وشرط الله اوثق : یعنی اس پر عمل کرنے میں۔ اس سے مراد یہ ارشاد ہے: (**وانما الولاء لمن اعتق**) الولاء میں الف لام عہد کیلئے ہے نہ کہ جنس کیلئے، اس سے جواب ہوا امام شافعی کا' کہ وہ فرماتے ہیں کہ 'ولاء مولاۃ'' باطل ہے، اس لئے کہ یہاں الف لام جنس کیلئے ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہاں جو ولاء کی شرط لگائی ہے اس میں اشکال ہے، اس لئے کہ بیع کا فائدہ دے رہا ہے اور یہ کیسے ہوسکتا ہے، حالانکہ یہ دھوکہ اور فریب کو متضمن ہے۔ یا آپ ﷺ نے کیسے اپنے اہل کو ایسی چیز کی اجازت دی جو صحیح نہیں ہے۔ اسی اشکال کی وجہ سے بعض علماء نے اس پوری حدیث کا انکار کر دیا ہے اور اس کے ہم معنی دوسری روایات کہ جس میں ہے: ''**واشترطى لهم الولاء فان الولاء لم اعتق**''۔

لیکن جمہور علماء فرماتے ہیں کہ یہ الفاظ حدیث صحیح ہیں، اس کے تاویل میں ان کا اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ لھم بمعنی علیھم کے ہے۔ جیسا کہ آیت میں ہے: لھم اللعنة [غافر۔۵۲] ای علیھم اللعنة اور وان أسأتم فلھا ای فعلیھا۔ لیکن یہ جواب کمزور ہے اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر شرط لگانے کا انکار کیا ہے اگر ایسا ہوتا تو پھر آپ انکار نہ کرتے۔ بعض نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس شرط کا انکار کیا ہے اس سے مراد وہ شرط ہے جس کا ارادہ انہوں نے ابتداء امر میں کیا تھا۔

صحیح جواب اس کا وہی ہے جو ہمارے علماء نے کتب فقہ میں ذکر کیا ہے کہ یہ شرط خاص ہے حضرت عائشہؓ کے اس قضیہ کے ساتھ، اور یہ بھی احتمال ہے کہ پہلے آپ نے اس کی اجازت دی اور پھر بعد میں اس کو باطل کر دیا ہو اور یہ ایک خاص قضیہ ہے اور معین قضیہ میں ہوا ہے جس میں عموم نہیں ہے۔

علماء فرماتے ہیں کہ اس کے اجازت دینے اور پھر اس کے بعد اس کو باطل کرنے کی حکمت یہ ہے کہ اس بارے میں ان کی عادت ختم کرنے میں مبالغہ سے کام لینا تھا، اور اس جیسے معاملہ پر انکو زجر مقصود تھا جیسا کہ نبی کریم نے حج کے حرام میں اجازت دی تھی اور پھر ان کو حکم دیا کہ وہ اس کو عمرہ سے بدل دیں۔ ان کی عادت ختم کرنے کے لئے جو اشہر حج میں عمرہ سے منع کرنے کی تھی۔ اور کبھی بڑے فائدے اور مصلحت کیلئے چھوٹے فساد اور نقصان کو برداشت کیا جاتا ہے۔

علماء فرماتے ہیں کہ بیع میں شرط لگانے کی کئی اقسام ہیں، ان میں سے بعض وہ ہیں کہ جن کا تقاضا عقد کرتا ہے جیسا کہ بیع کو مشتری کے حوالہ کرنے کی شرط، یا پھل کو درخت پر چھوڑنے کی شرط پھل چننے اور کاٹنے کے وقت تک اور بعض ان میں سے وہ شروط ہیں جن میں مصلحت ہوتی ہے اور اس کی ضرورت پڑتی ہے، جیسے شرط تضمین، شرط خیار وغیرہ۔ پس یہ دو قسم کی شرطیں جائز ہیں اور عقد کی صحت پر یہ اثر انداز نہیں ہوتیں بغیر کسی اختلاف کے، اور بعض ان شرائط میں سے یہ ہیں کہ مثلاً غلام اور لونڈی کی شرط آزادی میں ترغیب کیلئے۔

حق ولاء کو بیچنا یا اس کو ہبہ کرنا نا جائز ہے

۲۸۷۸: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ بَيْعِ الْوَلَاءِ وَعَنْ هِبَتِهٖ. (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۶۷/۵ الحدیث رقم ۲۵۳۵ ومسلم فی صحیحه ۱۱۴۵/۲ الحدیث رقم (۱۶۔۱۵۰۶) وابو داؤد فی السنن ۳۳۴/۳ الحدیث رقم ۲۹۱۹ والترمذی فی ۵۳۷/۳ الحدیث رقم ۱۲۳۶ وابن ماجه فی ۹۱۸/۲ الحدیث رقم ۲۷۴۷ والدار می فی ۴۹۰/۲ الحدیث رقم ۳۱۵۶ ومالك فی الموطأ ۷۸۲/۲ الحدیث رقم ۲۰ من کتاب العتق

ترجمه: "اور ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے ولاء کو فروخت کرنے یا اس کو ہبہ کرنے سے منع فرمایا ہے"۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: وجہ ممانعت یہ ہے کہ حق ولاء یہ نسب کی طرح ہے تو جس طرح نسب غیر کی طرف منتقل نہیں ہوتا اسی طرح حق ولاء بھی معتق کے علاوہ کی طرف منتقل نہیں ہوتا، اس لئے کہ یہ عتق کے حقوق میں سے ہے، (اس کو ابن الملک نے ذکر کیا ہے۔)

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ولاء کو بیچنا اور ہبہ کرنا دونوں درست نہیں ہیں اس لئے کہ ولاء اپنے مستحق سے منتقل نہیں ہوتا، چونکہ یہ قرابت نسب کی طرح اک قرابت ہے، اور سلف اور خلف میں سے جمہور علماء کا مذہب ہے۔ اور بعض سلف نے اجازت دی ہے اس کے منتقل کرنے کی، شاید ان کو یہ حدیث نہ پہنچی ہو۔

تخریج: اس حدیث کو امام احمد، ائمہ اربعہ، اور طبرانی نے عبد اللہ بن اوفی سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: "**الولاء لحمة کلحمة النسب لا یباع ولا یوھب**" اور اسی طرح اس حدیث کو امام حاکم نے مستدرک میں، اور بیہقیؒ نے سنن میں روایت کیا ہے۔

الفصل الثانی :

جونقصان کا ذمہ دار ہے وہی نفع کا بھی حقدار ہے

۲۸۷۹: عَنْ مَخْلَدِ بْنِ خُفَافٍ قَالَ ابْتَعْتُ غُلَامًا فَاسْتَغْلَلْتُهٗ ثُمَّ ظَهَرْتُ مِنْهُ عَلٰی عَيْبٍ فَخَاصَمْتُ فِيْهِ اِلٰی عُمَرَبْنِ عَبْدِ الْعَزِيْزِ فَقَضٰی لِیْ بِرَدِّهٖ وَقَضٰی عَلَیَّ بِرَدِّ غَلَّتِهٖ فَاَتَيْتُ عُرْوَةَ فَاَخْبَرْتُهٗ فَقَالَ اَرُوْحُ اِلَيْهِ الْعَشِيَّةَ فَاُخْبِرُهٗ اَنَّ عَائِشَةَ اَخْبَرَتْنِیْ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَضٰی فِیْ مِثْلِ هٰذَا اَنَّ الْخَرَاجَ بِالضَّمَانِ فَرَاحَ اِلَيْهِ عُرْوَةُ فَقَضٰی لِیْ اَنْ اٰخُذَ الْخَرَاجَ مِنَ الَّذِیْ قَضٰی بِهٖ عَلَیَّ لَهٗ ۔ (رواہ فی شرح السنة)

اخرجه أبو داوٗد فی السنن ۷۷۹/۳ الحدیث رقم ۳۵۰۹ والترمذی فی ۵۸۱/۳ الحدیث رقم ۱۲۸۵ والنسائی فی ۲۵٤/۷ الحدیث رقم ٤٤۹۰ واحمد فی المسند ٤۹/٦۔

ترجمہ: ''حضرت مخلد بن خفاف کہتے ہیں کہ میں نے ایک غلام خریدا جس کی کمائی میں وصول کرتا رہا پھر مجھے اس کے ایک ایسے عیب کا علم ہوا (جو اس میں خریداری سے پہلے تھا اور بیچنے والے نے مجھے اس سے مطلع نہیں کیا تھا) چنانچہ اس غلام کے معاملہ کو میں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز (خلیفہ وقت) کی خدمت میں پیش کیا انہوں نے مجھے یہ فیصلہ سنایا کہ غلام کو واپس (پہلے مالک کی طرف لوٹا دیا جائے) اور اس کے ساتھ ہی اس کی کمائی بھی واپس کوٹا دی جائے۔ پھر میں حضرت عروہ بن زبیرؒ کی خدمت میں حاضر ہوا (جو ایک جلیل القدر تابعی اور فقہاء میں سے تھے) اور انہیں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے فیصلہ سے آگاہ کیا۔ حضرت عروہؒ نے ارشاد فرمایا کہ میں شام کے وقت حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی خدمت میں حاضر ہوں گا اور ان کو مطلع کروں گا کہ حضرت عائشہؓ نے مجھے بتایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسی قسم کے ایک معاملہ میں یہ فیصلہ دیا تھا کہ ''منفعت' ضمان (یعنی تاوان) کے ساتھ ہے چنانچہ حضرت عروہؒ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے پاس تشریف لے گئے (اور ان کو رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد سے مطلع کیا' حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے (یہ ارشاد گرامی سننے کے بعد) پھر مجھے یہ حکم دیا کہ میں غلام کی کمائی اس شخص سے وصول کروں گا جسے دینے کے لئے مجھے پہلے حکم دیا گیا تھا''۔ (شرح السنۃ)

تشریح: **فاستغللته** یعنی میں نے اس کی کمائی لی یعنی اس کا کرایہ اور اجرت لی۔ نہایہ میں ہے کہ ''غلة'' اس داخلی چیز کو کہتے ہیں جو حاصل ہو کھیتی، پھل، دودھ، کرایہ، بچہ وغیرہ کی صورت میں۔

خاصمت فيه : یعنی میں اس غلام کے حق قضیہ لے گیا۔ یا اس کے بیچنے والے کا اس کے عیب کو چھپانے کے بارے میں۔

العشية : دن کا آخری یا رات کا پہلا حصہ۔ **الخراج** : خاء کے فتحہ کے ساتھ۔

بالضمان : امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بالضمان میں با محذوف سے متعلق ہے، تقدیری عبارت یوں ہے: ''**الخراج مستحق بالضمان**'' یعنی ضمان (تاوان) کے سبب سے ہے' اور بعض کہتے ہیں کہ با مقابلہ کیلئے ہے اور مضاف محذوف ہے، ای **منافع المبيع بعد القبض تبقى للمشتری فی مقابلة الضمان**...... یعنی مبیع کے منافع قبضہ کے بعد مشتری کے ہوتے ہیں اس ضمان (تاوان) کے مقابلہ میں جو مبیع کے ہلاک ہونے کی صورت میں اس پر لازم آتا ہے اور اس مبیع کے نقصان کی صورت میں اس پر لازم آتا ہے۔ اور یہی مطلب ہے: **من عليه غرمه فعليه غنمه** کا، اور خراج سے مراد خریدی ہوئی چیز سے حاصل ہونے والے منافع ہیں چاہے وہ چیز غلام ہو یا باندی ہو، یا اس کے علاوہ کوئی اور مملوکہ چیز، اور اس کی صورت یہ ہے کہ کسی شخص نے کوئی چیز خریدی اور ایک وقت تک اس کے منافع حاصل کئے اور پھر وہ اس میں ایک ایسے عیب پر مطلب ہوا جو بیع سے پہلے کا تھا اور بائع نے اس کو اس عیب کی اطلاع نہیں دی تھی یا پتہ نہیں چل سکتا تھا، تو اب اس کو اختیار ہے کہ یہ عیب دار چیز واپس کر دے اور قیمت لے لے اور جو منافع اس نے اس مبیع

سے حاصل کئے ہیں وہ اس مشتری کیلئے ہیں ان کا واپس کرنا لازم نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگر یہی مبیع مشتری کے ہاتھ میں ہلاک ہو جاتی تو اس کا ضمان اسی مشتری پر لازم آتا نہ کہ بائع پر۔

شرح السنہ میں ہے کہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں ان چیزوں کے بارے میں جو مشتری کے پاس پیدا ہوں مثلاً جانور کے بچے لونڈی کی اولاد، بھیڑ بکری کا دودھ اور اون، درخت کے پھل، یہ سب کے سب خریدار کے ہوں گے اور وہ اصل چیز کو عیب کی وجہ سے لوٹانے کا حق رکھتا ہے۔

ائمہ احناف فرماتے ہیں کہ مشتری کے پاس بچہ پیدا ہونے یا پھل پیدا ہونے سے یہ اصل کو واپس کرنے سے مانع چونکہ عیب پیدا ہو چکا ہے۔ بلکہ وہ بائع سے رجوع کرے گا، تاوان کا۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اصل کے ساتھ بچے کو بھی لوٹائے گا، اور اون کو نہیں لوٹائے گا، اگر کسی شخص نے باندی خریدی، اور پھر اس باندی کے ساتھ شبہ کی وجہ سے ہمبستری کی گئی خریدار کے ہاتھ میں یا اس نے خود ہمبستری کی اور پھر عیب پر مطلع ہوا، اب اگر وہ باندی ثیبہ تھی تو یہ اس کو عیب کی وجہ سے واپس کر دے گا۔ اور اس کا مہر اس مشتری کیلئے ہوگا، اور اگر ہمبستری اس نے خود کی ہے تو اس کی وجہ سے اس پر کچھ بھی لازم نہیں، اور اگر وہ باکرہ ہے، تو اس کی بکارت چاک ہو چکی ہے، تو اب اس کو واپس لوٹانے کا حق نہیں ہے، اس لئے کہ بکارت کا زائل ہونا عیب ہے جو مشتری کے پاس پیدا ہوا ہے، بلکہ یہ عیب کے بقدر بائع سے قیمت واپس لے لے۔ یہی امام مالک اور شافعی کا قول ہے۔

قوله : فقضى لي ان اخذ الخراج من الذي قضى به علي له : ابن الملک فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ اگر قاضی فیصلہ کرنے میں غلطی کر لے اور پھر اس کو یقین کے ساتھ معلوم ہو جائے کہ یہ فیصلہ غلط ہے تو اس فیصلے کا توڑنا ضروری ہے، جیسے عمر بن عبد العزیز نے عروہ کے خبر دینے سے کیا۔

بائع اور مشتری کے درمیان نزاع کی صورت میں کس کا قول معتبر ہوگا

۲۸۸۰: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا اخْتَلَفَ الْبَيِّعَانِ فَالْقَوْلُ قَوْلُ الْبَائِعِ وَالْمُبْتَاعُ بِالْخِيَارِ (رواه الترمذى وفى رواية ابن ماجة والدارمى) **قَالَ الْبَيِّعَانِ اِذَا اخْتَلَفَا وَالْمَبِيْعُ قَائِمٌ بِعَيْنِهٖ وَلَيْسَ بَيْنَهُمَا بَيِّنَةٌ فَالْقَوْلُ مَا قَالَ الْبَائِعُ اَوْ يَتَرَادَّانِ الْبَيْعَ.** (ترمذى)

اخرجه ابو داوٗد فى السنن ٣/٧٨٠ الحديث رقم ٣٥١١ والنسائى فى ٣٠٢/٧ الحديث رقم ٤٦٤٨ وابن ماجه فى ٧٣٧/٢ الحديث ررقم ٢١٨٦ والدار مى فى ٣٢٥/٢ الحديث رقم ٢٠٤٩ واحمد فى المسند ٤٦٦/١۔

ترجمه: ''اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب بائع اور مشتری میں اختلاف پیدا ہو جائے تو اس صورت میں بائع کا قول معتبر ہوگا اور مشتری کو بیع فسخ کر دینے یا باقی رکھنے کا اختیار حاصل ہوگا'' ۔ (ترمذی) ابن ماجہ اور دارمی کی روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب مشتری اور بائع یعنی بیچنے والے کے درمیان اختلاف پیدا ہو جائے اور مبیع (بیچی یا خریدی جانے والی چیز) جوں کی توں باقی ہو اور ان دونوں کے درمیان کوئی گواہ نہ ہو تو اس صورت میں بائع کا قول معتبر ہوگا یا پھر وہ دونوں بیع کو فسخ کر دیں'' ۔ (ترمذی)

تشریح : **قوله : اِذَا اخْتَلَفَ الْبَيِّعَانِ فَالْقَوْلُ قَوْلُ الْبَائِعِ وَالْمُبْتَاعُ بِالْخِيَارِ**

البیعان : یاء کی تشدید اور کسرہ کے ساتھ، یعنی بائع اور مشتری کا اختلاف ہو قیمت کی مقدار میں، یا خیار شرط میں، یا مدت میں یا اس کے علاوہ عقد کی شرائط وصفات میں ہو۔

چاہے تو بیچنے والے کی اس بات پر راضی ہو جائے جو اس نے قسم کھا کر کہی ہے اور چاہے وہ بھی قسم کھائے اور کہے میں نے یہ چیز اس قیمت پر نہیں خریدی ہے بلکہ اس قیمت پر خریدی ہے، اور یہی امام شافعیؒ کا مسلک ہے، اور پھر جب دونوں اپنی اپنی بات پر قسم کھائیں گے تو ان کا معاملہ اسی صورت میں باقی رہے گا جب ان میں سے کوئی ایک دوسرے کی بات کو تسلیم کر لے گا، ورنہ تو قاضی معاملہ کو فسخ کر دے گا، مبیع باقی ہو اپنی حالت پر یا نہ ہو۔

امام ابوحنیفہؒ اور امام مالک کہتے ہیں کہ اگر مبیع ہلاک ہو جائے تو پھر دونوں فریق قسم نہیں کھائیں گے بلکہ اس صورت میں خریدار کا قول قسم کے ساتھ معتبر ہوگا، اور حدیث کے الفاظ ''المبیع قائم'' ان دونوں کے مذہب کی تائید کرتے ہیں، (اسی طرح ذکر کیا ہے ابن الملک نے۔

قوله :البیعان اذا...... یعنی اس کی قسم کے ساتھ، پس جب بائع قسم کھالے تو مشتری کو اختیار ہوگا، جیسا کہ پہلے گزرا۔

او یترا دان البیع : اور اگر نزاع کے وقت مبیع بعینہ باقی نہ ہو، تو پھر اس صورت میں قسم کے ساتھ خریدار کا قول معتبر ہوگا بائع قسم نہیں اٹھائے گا کو قسم نہیں، یہی امام ابوحنیفہ اور امام مالک کا مذہب ہے۔ (مظہر)

اقالہ بیع کا مسئلہ

۲۸۸۱:وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ اَقَالَ مُسْلِمًا اَقَالَهُ اللّٰهُ عَثْرَتَهٗ یَوْمَ الْقِیَامَةِ.

(رواه ابوداود وابن ماجة وفی شرح السنة بلفظ المصابیح عن شریح الشامی مرسلا)

اخرجه ابو داوٗد فی ۸۳۸/۳ الحدیث رقم ۳٤٦۰ وابن ماجه فی ۸٤۱/۲ الحدیث رقم ۲۱۹۹ واحمد فی المسند ۲۵۲/۲

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص مسلمان کی بیع کو واپس کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی خطائیں بخش دے گا۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ) اور شرح السنۃ میں یہ روایت ان الفاظ میں ذکر کی گئی ہے جو مصابیح میں شریح شامی سے مرسلاً منقول ہیں''۔

تشریح: قوله :مَنْ اَقَالَ مُسْلِمًا اَقَالَهُ اللّٰهُ عَثْرَتَهٗ یَوْمَ الْقِیَامَةِ :

من اقال مسلما : مضاف محذوف ہے۔ ای بیع مسلم ہے۔ **یوم القیامة :** اس میں اس بات کی خبر ہے کہ اقالہ کرنا مستحب ہے اگر بیچنے والا اور خریدار راضی ہوں۔ شرح السنہ میں ہے اقالہ بیع اور سلم میں قبل از قبضہ اور بعد قبضہ جائز ہے۔ اقالہ بیع فسخ کرنے کو کہتے ہیں۔

قوله :رواه ابو داود وابن ماجه :

یعنی امام ابوداؤد اور ابن ماجہ نے سند متصل کے ساتھ روایت کیا ہے، اور حاکم نے بھی حضرت ابو ہریرہ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ البتہ بیہقی نے ان سے روایت کیا ہے: **''من اقال نادما اقال اللّٰه یوم القیامة''**۔

قوله :وفی شرح السنة بلفظ المصابیح عن شریح الشامی مرسلا :

شرح السنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: **''من اقال أخاه المسلم صفقة کرهها اقال اللّٰه تعالیٰ عثرته یوم القیامة''**۔

فائدہ: شریح تصغیر کے ساتھ ہے۔ (یعنی شین پر پیش اور راء پر زبر ہے)

اس عبارت میں مصنف نے امام بغوی پر اعتراض کیا ہے۔ کہ اولیٰ کو چھوڑ کر ترک اولیٰ کا ارتکاب کیا ہے، بایں طور کہ مرسل روایت کو ذکر کیا ہے اور متصل روایت کو ذکر نہیں کیا۔

الفصل الثالث:

ایک سبق آموز واقعہ

۲۸۸۲:عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِشْتَرٰی رَجُلٌ مِّمَّنْ کَانَ قَبْلَکُمْ عَقَارًا مِنْ رَجُلٍ فَوَجَدَ

الَّذِی اشْتَرٰی الْعَقَارَ فِیْ عَقَارِهٖ جَرَّةً فِيْهَا ذَهَبٌ فَقَالَ لَهُ الَّذِیْ اشْتَرٰی الْعَقَارَ خُذْ ذَهَبَكَ عَنِّیْ اِنَّمَا اشْتَرَيْتُ الْعَقَارَ وَلَمْ اَبْتَعْ مِنْكَ الذَّهَبَ فَقَالَ بَائِعُ الْاَرْضِ اِنَّمَا بِعْتُكَ الْاَرْضَ وَمَا فِيْهَا فَتَحَاكَمَا اِلٰی رَجُلٍ فَقَالَ الَّذِیْ تَحَاكَمَا اِلَيْهِ اَلَكُمَا وَلَدٌ فَقَالَ اَحَدُهُمَا لِیْ غُلَامٌ وَقَالَ الْاٰخَرُ لِیْ جَارِيَةٌ فَقَالَ اَنْكِحُوْا الْغُلَامَ الْجَارِيَةَ وَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِمَا مِنْهُ وَتَصَدَّقُوْا. (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٦/٥١٢ الحديث رقم ٣٤٧٢ ومسلم فی ٣/١٣٤٥ الحديث رقم (٢١-١٧٢١) وابن ماجه فی السنن ٢/٨٣٩ الحديث رقم ٢٥١١ واحمد فی المسند ٢/٣١٦۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ واقعہ بیان فرمایا کہ تم سے پہلے (زمانہ کے) لوگوں میں سے ایک شخص نے ایک دوسرے شخص سے زمین خریدی (اور اس کو اپنے تصرف میں لایا) اتفاق کی بات کہ جس شخص نے زمین خریدی تھی اس نے اپنی اس خرید کردہ زمین میں ایک ایسا گھڑا پایا جس میں سونا بھرا ہوا تھا' اس نے زمین بیچنے والے سے کہا کہ تم اپنا یہ سونا لے لو کیونکہ میں نے تو صرف زمین خریدی تھی یہ سونا میں نے نہیں خریدا تھا۔ بیچنے والے نے کہا کہ میں نے تمہارے ہاتھ صرف زمین ہی نہیں بیچی تھی بلکہ ہر وہ چیز فروخت کر دی تھی جو اس زمین میں موجود ہے''۔ (اس لئے یہ سونا بھی تمہارا ہے اسے تم ہی رکھو مگر خریدار اس پر تیار نہیں ہوا) یہاں تک کہ دونوں اپنا معاملہ ایک شخص (حکم وثالث) کے پاس لے گئے (بعض کہتے ہیں کہ وہ حکم حضرت داؤدؑ ہیں) اس حکم نے (واقعہ کی تفصیل سن کر) ان دونوں سے پوچھا کہ کیا تم دونوں کی اولاد ہے؟ ان میں سے ایک نے تو کہا کہ میرے ہاں ایک لڑکا ہے اور دوسرے نے کہا کہ میرے ہاں ایک لڑکی ہے۔ حکم نے (یہ سن کر) کہا کہ اس لڑکے کا نکاح لڑکی سے کر دو اس سونے کو ان دونوں پر خرچ کرو اور (پھر جو کچھ بچے اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں) صدقہ کر دو''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: عقارا: عین کے فتحہ کے ساتھ۔ زمین اور جو اس سے متصل ہو لفظی مطلب جائیداد ہے۔

من رجل: ''اشتریٰ'' کا متعلق ہے، پہلے والا ''من'' بیانیہ ہے، با **بعضیت** کیلئے ہے۔

جرة: جیم کے فتحہ اور راء کی تشدید کے ساتھ ہے۔ مطلب گھڑا ہے۔ **خذ ذهبك عنى:** ''عن'' بمعنیٰ ''من'' کے ہے یا ''موليا عنی'' ہے۔ **ولم ابتع:** اشتری کے معنی میں ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث بائع اور مشتری کے درمیان صلح صفائی کرانے کی فضیلت پر دلالت کرتی ہے۔ نیز مخالف اشخاص میں صلح کرانا قاضی وحاکم کیلئے اسی طرح مستحب ہے جس طرح غیر قاضی کیلئے مستحب ہے۔

بَابُ السَّلَمِ وَالرَّهْنِ

بیع سلم اور رہن کا بیان

''سلم'' سین اور لام کے فتحہ کے ساتھ ہے، کسی معلوم کام کیلئے معلوم چیز کے عوض سونا یا چاندی دینا، اس کو ''سلم'' کہتے ہیں۔ تو گویا کہ قیمت سپرد کر دی جیسا کہ نہایہ میں ہے۔

امام راغب کہتے ہیں کہ ''رہن'' وہ ہے جو دین کیلئے بطور وثیقہ کے رکھا جائے، اور ''رہان'' کا بھی یہی مطلب ہے۔ اصل میں یہ دونوں مصدر ہیں۔ کہا جاتا ہے: ''رهنت الرهن وارهنته رهانا فهو رهين مرهون'' اور ''رہن'' کی جمع میں رهان' رُهن اور رهون آتی ہے اور ارتهنت کا معنی ہے: **اخذت الرهن**۔ (یعنی میں نے رہن لیا)

الفصل الاول :

بیع سلم کی شرائط صحت

۲۸۸۳: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَدِمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ الْمَدِيْنَةَ وَهُمْ يُسْلِفُوْنَ فِى الثِّمَارِ السَّنَةَ وَالسَّنَتَيْنِ وَالثَّلٰثَ فَقَالَ مَنْ اَسْلَفَ فِى شَىْءٍ فَلْيُسْلِفْ فِىْ كَيْلٍ مَّعْلُوْمٍ وَوَزْنٍ مَعْلُوْمٍ اِلٰى اَجَلٍ مَعْلُوْمٍ. (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤/٤٢ الحدیث رقم ٢٢٣٩ومسلم فی ٣/١٢٢٧ الحدیث رقم (١٢٧-١٦٠٤)وابو داوٗد السنن ٣/٧٤١ الحدیث رقم ٣٤٦٣ والترمذی فی ٣/٦٠٢ الحدیث رقم ١٣١١ والنسائی فی ٧/٢٩٠ الحدیث رقم ٤٦١٦ وابن ماجه فی ٢/٧٦٥ الحدیث رقم ٢٢٨٠ والدار می فی ٢/٣٣٧ الحدیث رقم ٢٥٨٣ واحمد فی المسند ١/٢١٧۔

ترجمہ: ''حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ (جب مکہ سے ہجرت فرما کر) مدینہ تشریف لائے تو وہ لوگ (اہل مدینہ) پھلوں میں ایک سال، دو سال، تین سال کی بیع سلم کیا کرتے تھے (یعنی پیشگی قیمت دے کر کہہ دیا کرتے تھے کہ ایک سال یا دو سال یا تین سال کے بعد پھل پہنچا دینا) چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص کسی چیز کی بیع سلم کرے اسے چاہئے کہ معین پیمانہ، معین وزن اور معین مدت کے ساتھ بیع سلم کرے''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: وهم یسلفون فی الثمار : یہ جملہ حالیہ ہے۔

اسلاف کہتے ہیں ثمن دینا بیع کے عوض ایک مدت تک یعنی وہ قیمت فی الحال دیتے تھے اور مبیع کو بعد میں لیتے تھے۔

السنة والسنتین والثلاث : تینوں منصوب ہیں۔ اس کی وجہ اعراب میں دو احتمال ہیں: (۱) منصوب بنزع الخافض ہیں ای یشترون الی السنة، (۲) بناء بر مصدریت منصوب ہیں۔ تقدیری عبارت یہ ہے اسلاف لسنة۔

قوله : فقال من ...... یہ حدیث دلالت کر رہی ہے کہ مکیلی اور موزونی چیزوں میں ناپ، وزن، اور مدت کا متعین کرنا ضروری ہے۔ اور ان میں سے کسی ایک کا مجہول ہونا یہ بیع کو فاسد کر دیتا ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی مکیلی چیز میں سلم کر رہا ہے تو اس کا کیل اور ناپ معلوم ہونا چاہئے۔ اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ بیع سلم مؤجل ہی ہوتی ہے بلکہ سلم کا فی الحال اور معجل ہونا بھی جائز ہے اس لئے کہ جب یہ مؤجل جائز ہے تو فی الفور کا جائز ہونا زیادہ بہتر ہے اس لئے کہ یہ ''غرر'' سے دور ہے۔

حدیث میں اجل اور مدت کا ذکر یہ مدت کے شرط ہونے کیلئے نہیں ہے، بلکہ اس کا معنی ہے کہ اگر سلم مؤجل ہے تو پھر مدت تاجیل معلوم ہونی چاہئے، اور سلم کے فی الحال جائز ہونے میں اختلاف ہے، امام شافعی اور دیگر علماء نے اس کو جائز قرار دیا ہے، اور مالک، امام ابو حنیفہ اور دوسرے ائمہ نے اس کو ممنوع قرار دیا ہے۔ اور انہوں نے اس کے اشتراط وصف پر اجماع کیا ہے جس طرح اس کو ضبط کیا جا سکے۔

اُدھار خریدنا اور گروی رکھنا جائز ہے

۲۸۸۴: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتِ اشْتَرٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ طَعَامًا مِنْ يَهُوْدِيٍّ اِلٰى اَجَلٍ وَرَهَنَهٗ دِرْعًا لَهٗ مِنْ حَدِيْدٍ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤/٣٠٢ الحدیث رقم ٢٠٦٨ومسلم فی ٣/١٢٢٦ الحدیث رقم (١٦٢-١٦٠٣) والنسائی فی السنن ٧/٢٨٨ الحدیث رقم ٤٦٠٩وابن ماجه فی ٢/٨١٥ الحدیث رقم ٢٤٣٦ واحمد فی المسند ٦/١٦٠

ترجمہ: ''اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک یہودی سے کچھ غلہ ایک معینہ مدت کے ادھار پر خریدا اور اپنے

لوہے کی ایک زرہ اس کے پاس بطور گروی رکھی"۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: شرح السنہ میں ہے کہ اس حدیث سے چند مسائل معلوم ہوئے۔ یہ کہ کوئی چیز ادھار قیمت پر خریدنا، اور دین کے بدلے کسی چیز کا رہن رکھنا جائز ہے۔ اور یہ کہ سفر کے علاوہ میں بھی رہن رکھنا جائز ہے اگر چہ قرآن کریم نے اس کو سفر کے ساتھ مقید کیا ہے، اور اہل ذمہ کے ساتھ معاملات کرنا جائز ہے، اگر چہ ان کا مال سود اور شراب کی قیمت سے خالی نہیں ہوتا۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کا مال ومتاع بہت کم رکھتے تھے اور فقر کو لازم تھامے ہوئے تھے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اہل ذمہ کے پاس مسلمانوں کا سامان جنگ گروی رکھنا جائز ہے۔ اور جو کچھ ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے اس میں ان کی ملکیت ثابت ہے، اور آیت: ﴿**وان کنتم علی سفر ولم تجدوا کاتبا فرھان مقبوضة**﴾ [البقرۃ۔ ۲۸۳] کیلئے یہ حدیث تفسیر ہے، اس لئے کہ آیت میں جو خطاب ہے وہ متروک ہے، (یعنی یہ آیت خاص نہیں ہے سفر کے ساتھ)۔

سوال: باقی گروی رکھنے کا یہ معاملہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی سے کیا، صحابہؓ سے نہیں کیا۔ بعض تو یہ کہتے ہیں کہ یہ شاید بیان جواز کی خاطر تھا، اور بعض کہتے ہیں یہودی سے یہ معاملہ اس لئے کیا تھا کہ اس وقت اپنی حاجت وضرورت سے زائد غلہ یہودیوں کے علاوہ اور کسی کے پاس نہیں تھا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ اس لئے کیا تھا کہ صحابہ نہ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے رہن رکھواتے اور نہ ہی قیمت کا مطالبہ کرتے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی کی طرف رجوع کیا تا کہ صحابہ پر تنگی کا باعث نہ بنیں۔

مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ اہل ذمہ اور کفار کے ساتھ معاملات جائز ہیں جب تک یقین کے ساتھ معلوم نہ ہو کہ ان کے پاس جو کچھ ہے یہ خالص حرام ہے۔ لیکن مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ کسی کافر ہتھیار بیچے یا ایسی چیز بیچے جس سے کفار کے مذہب کو تقویت پہنچتی ہو، نیز کسی کافر کے ہاتھ قرآن بیچنا مطلقاً جائز نہیں ہے اور نہ کوئی مسلمان غلام کسی کافر کو بیچنا جائز ہے مطلقاً۔

علامہ ابن الہمام فرماتے ہیں کہ بیع نقد اور ادھار قیمت کے ساتھ جائز ہے اس لئے کہ یہ آیت مطلق ہے: ﴿**واحل اللہ البیع**﴾ [البقرۃ۔ ۲۷۵] اور جو مؤجل قیمت کے ساتھ ہو وہ بیع ہے، اور صحیح بخاری میں عن عائشہ اور آگے حدیث ذکر کی ہے اور کہا ہے کہ صحیحین میں "**طعامًا بنسیئة**" ہے اور سنن بیہقی میں اس یہودی کا نام ذکر کیا ہے۔ حضرت جابر سے روایت نقل کی ہے کہ آپ علیہ السلام نے اپنی زرہ کو رہن کے طور پر رکھا بنی ظفر میں سے ایک آدمی ابوالشحم کے پاس، جو کے بدلے

مدت کا معلوم ہونا ضروری ہے اس لئے کہ جہالت مدت حوالہ کرنے اور مطالبہ کرنے میں نزاع کی طرف مفضی ہے، کہ ایک قریب کے زمانہ میں مطالبہ کرے گا، اور دوسرا دور کا زمانہ بتائے گا، اور اس وجہ سے بھی کہ آپ نے ایک جگہ مدت کو شرط قرار دیا ہے، اور وہ جگہ سلم ہے کہ آپ نے اس میں تعین مدت کو لازم قرار دیتے ہوئے فرمایا: "**من اسلف فی ثمر فلیسلف فی کیل معلوم ووزن معلوم الی اجل معلوم**"۔ اور ان سب پر اجماع بھی منعقد ہے۔

۲۸۸۵: **وَعَنْهَا قَالَتْ تُوُفِّيَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ وَدِرْعُهٗ مَرْهُوْنَةٌ عِنْدَ يَهُوْدِيٍّ بِثَلَاثِيْنَ صَاعًا مِنْ شَعِيْرٍ.** (رواہ البخاری)

اخرجہ البخاری فی صحیحہ ۶/۹۹ الحدیث رقم ۴۴۶۷۔

ترجمہ: اور اُم المؤمنین حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس حال میں وصال ہوا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زرہ ایک یہودی کے پاس تیس ۳۰ صاع جو کے عوض بطور گروی رکھی ہوئی تھی"۔ (بخاری)

تشریح: توفی: تاء اور واؤ کے ضمہ اور فا کے کسرہ اور تشدید کے ساتھ، بمعنی قبض۔ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ یہ وہی واقعہ ہو جو پچھلی حدیث میں گزرا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ دوسرا واقعہ ہو۔

باقی یہ جو روایت میں آتا ہے "**نفس المؤمن معلقة بدینه حتی یقضٰی عنه**" کہ مؤمن کے نفس کو روکا جاتا ہے دین کی وجہ

سے یہاں تک کہ وہ اس کی طرف سے ادا کیا جائے۔ اس کو احمد، ترمذی، ابن ماجہ اور حاکم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس کو اس کے اعلیٰ مقام سے روکا جاتا ہے۔ علامہ عراقی فرماتے ہیں کہ اس کا معاملہ موقوف کیا جاتا ہے نہ اس کی نجات کا فیصلہ کیا جاتا ہے اور نہ ہلاکت کا یہاں تک کہ دیکھا جاتا ہے کہ کیا اس پر جو دین ہے وہ ادا کیا جاتا ہے یا نہیں۔ (انتہیٰ)

اور اس میں برابر ہے کہ میت نے "مال وفاء" چھوڑا ہو یا نہ چھوڑا ہو، جیسا کہ ہمارے جمہور علماء نے اس کی تصریح کی ہے، اور ماوردی نے شذوذ اختیار کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث محمول ہے اس پر جس نے "مال وفاء" نہ چھوڑا ہو، (جیسا کہ سیوطی نے حاشیہ ترمذی پر ذکر کیا ہے) لیکن صحیح یہ ہے کہ ماوردی نے کوئی شذوذ اختیار نہیں کیا ہے، اس لئے کہ علماء کی ایک جماعت نے اس کی موافقت کی ہے، کہ انہوں نے حدیث کو محمول کیا ہے اس شخص پر جس نے صاحب دین کے پاس اتنا کچھ نہ چھوڑا ہو جس سے حق وصول ہو سکے، اور انبیاء اس سے مستثنیٰ ہیں۔

اور یہ بھی کہا ہے کہ یہ حدیث محمول ہے اس شخص پر جس نے معصیت اور گناہ کیلئے دین لیا ہو، یا اس نیت سے لیا ہو کہ واپس نہیں لوٹائے گا۔ اور یہ بات ثابت ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے آپ کے تمام وعدے پورے کئے اور حضرت علیؓ نے آپ ﷺ کے تمام دیون ادا کئے اور حضرت ابو بکر صدیقؓ نے آپ ﷺ کی زرہ کو رہن سے چھڑا کر حضرت علیؓ کے حوالے کر دیا تھا۔

انتفاعِ رہن کا مسئلہ

۲۸۸۶: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلظَّهْرُ يُرْكَبُ بِنَفَقَتِهٖ اِذَا كَانَ مَرْهُوْنًا وَلَبَنُ الدَّرِّ يُشْرَبُ بِنَفَقَتِهٖ اِذَا كَانَ مَرْهُوْنًا وَعَلَى الَّذِیْ يَرْكَبُ وَيَشْرَبُ النَّفَقَةُ. (رواه البخاری)

صحیح بخاری' کتاب الرهن' باب الرهن مرکوب ومحلوب' ح ۲۵۱۲۔

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۴۳/۵ الحدیث رقم ۲۵۱۲ وابو داؤد فی السنن ۷۹۵/۳ الحدیث رقم ۳۵۲۶ والترمذی فی ۵۵۵/۳ الحدیث رقم ۱۲۵۴ وابن ماجه ۸۱۶/۲ الحدیث رقم ۲۴۴۰ واحمد فی المسند ۴۷۲/۲

ترجمہ: اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب سواری کا جانور گروی ہو اس پر جو کچھ خرچ کیا جاتا ہے اس کے عوض میں اس پر سواری کی جا سکتی ہے اور اگر دودھ والا جانور گروی ہو تو اس پر جو کچھ خرچ کیا جاتا ہے اس کے عوض اس کا دودھ پیا جائے اور جو شخص سواری کرے اور دودھ پئے وہی اس کے خرچہ کا ذمہ دار ہے"۔ (بخاری)

تشریح: قوله: اَلظَّهْرُ يُرْكَبُ بِنَفَقَتِهٖ اِذَا كَانَ مَرْهُوْنًا:

الظهر: بعض کہتے ہیں قوی اونٹ کی پیٹھ مراد ہے، اس میں واحد اور جمع برابر ہے۔ جانور کو "ظہر" شاید اس وجہ سے کہتے ہیں کہ جانور پر سوار ہونے سے مقصود پیٹھ ہوتی ہے۔ یرکب: مجہول کے صیغہ کے ساتھ۔

بنفقته: یعنی اس کے سبب سے اس کی مقدار کے برابر۔ ابن الملک فرماتے ہیں کہ راہن کیلئے جائز ہے کہ وہ مرہون جانور پر سواری کرے اور اسے بار برداری کے کام میں لائے اس لئے کہ اس کا چارہ وغیرہ اس پر ہوتا ہے۔ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کا یہی مسلک ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر مرہون غلام مرجائے تو اس کا کفن مالک پر لازم ہے۔

قوله: وَلَبَنُ الدَّرِّ يُشْرَبُ بِنَفَقَتِهٖ اذا كان مرهونا وعلى الذى يركب ويشرب النفقة:

ابن الملک فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ "شیئ مرهونه" پر قبضہ کا دوام شرط نہیں ہے رہن میں' اس لئے کہ مالک جب اس پر سوار ہوگا تو یہ مرتہن کے قبضہ سے خارج ہوگا۔ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ظاہر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ "شیئ مرهونه" کو مہمل

نہ چھوڑا جائے اور اس کے منافع معطل نہیں ہونے چاہئیں بلکہ چاہئے کہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے، اور اس پر خرچ کیا جائے اور اس میں اس بات پر کوئی دلالت نہیں ہے کہ "من له غنمه علیه غرمه" کہ جس چیز کا فائدہ جس کیلئے ہو نقصان بھی اس پر ہوگا۔

علماء کا اس میں اختلاف ہے۔ اکثر کا مذہب یہ ہے کہ رہن کے منافع راہن کیلئے ہوتے ہیں اور اس کے خرچ کا ذمہ دار بھی راہن ہوتا ہے، اس لئے کہ اصل چیز راہن کی ہے اور فروع اصل کے تابع ہوا کرتی ہیں، اور اسی طرح یہ اصول ہے: "الغرم بالغنم"۔ اور دلیل یہ ہے کہ اگر یہ غلام رہن ہو اور وہ مر جائے تو اس کا کفن راہن پر ہوگا۔

ابن المسیب نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت نقل کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **لا یغلق الرهن الرهن من صاحبه الذی رهنه له غنمه وعلیه غرمه**)۔ امام احمد اور اسحق فرماتے ہیں کہ مرتہن مرہون سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، مثلاً مرہون جانور تو اس کا دودھ دوہنا اور اس پر سواری کرنا۔ ان کے علاوہ کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا ہے۔ اور یہ (فائدہ بھی) خرچ کے بقدر اٹھائے گا۔ ان دونوں نے اسی حدیث سے استدلال کیا ہے۔ اور وجہ استدلال یہ ہے کہ حدیث اپنے منطوق کے اعتبار اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ انفاق کے بدلے نفع حاصل کرنا جائز ہے۔ اور راہن کا فائدہ لینا اس طرح نہیں ہے بلکہ اس کے انتفاع کی اباحت اس چیز پر ملکیت کی وجہ سے ہے۔ اور (یہ حدیث) اپنے مفہوم کے اعتبار سے اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ فائدہ حاصل کرنا منفعت کی مذکورہ دو قسموں پر مقصور ہے۔ اور راہن کے لئے انتفاع جواز ان دو قسموں پر مقصور نہیں ہے۔ لہٰذا اس سے مراد یہ ہے کہ مرتہن کیلئے جائز ہے کہ وہ اس شئی مرہونہ سے دودھ دوہے اور سواری کرنے کے ذریعہ نفع حاصل کرے نفقہ اور خرچ کرنے کے بدلے اور جب وہ یہ فائدہ حاصل کرے گا تو اس کا نفقہ اس مرتہن پر لازم ہوگا۔

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے اس لئے کہ یہ سود ہے، چونکہ اس طرح مرتہن فائدہ اٹھائے گا شئی مرہونہ سے اپنے دین کے بدلے، جو قرض نفع لائے وہ حرام ہے۔ اس کا بہترین جواب یہ ہے کہ کہا جائے کہ "بنفقته" میں با بدلیت کیلئے نہیں ہے بلکہ معیت کیلئے ہے، اور معنی یہ ہے کہ جانور پر سواری کی جاتی ہے اور خرچ کیا جاتا ہے، پس رہن راہن کو شئی مرہونہ سے فائدہ اٹھانے سے منع نہیں کرتا اور نہ ہی راہن سے اس کا خرچ ساقط ہوتا ہے۔ جیسا کہ دوسری حدیث میں اس کی تصریح ہے۔

الفصل الثانی :

شئے مرہون راہن کی ملکیت سے جاہر نہیں ہوتی

۲۸۸۷: **عَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ لَا يَغْلَقُ الرَّهْنُ الرَّهْنَ مِنْ صَاحِبِهِ الَّذِیْ رَهَنَهُ لَهُ غُنْمُهُ وَعَلَيْهِ غُرْمُهُ** (رواه الشافعی مرسلا)

اخرجه الدار قطنی فی السنن ۳/۳۳ الحدیث رقم ۱۳۳ من کتاب البیوع۔

ترجمہ: حضرت سعید بن مسیب (تابعی) کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کسی چیز کو گروی رکھنا مالک کو کہ جس نے وہ چیز بطور گروی رکھی ہے (ملکیت سے) نہیں روکتا (یعنی کسی چیز کو گروی رکھ دینے سے راہن کی ملکیت مرہونہ چیز سے ختم نہیں ہوتی) اس لئے اس گروی رکھی ہوئی چیز کے ہر نفع و بڑھوتری کا حقدار راہن ہے اور وہی اس کے نقصان کا ذمہ دار بھی ہے۔ اس روایت کو امام شافعیؒ نے بطریق ارسال نقل کیا ہے۔

تشریح: لا یغلق : یاء اور لام دونوں کے فتحہ اور غین کے سکون کے ساتھ **لا یمنع** کے معنی میں ہے۔

پہلے لفظ "رہن" سے عقد رہن مراد ہے اور دوسرے لفظ "الرهن" شئے مرہون مراد ہے۔

اس طور پر کہ اس کے منافع ختم ہو جائیں بلکہ شئے مرہون تو ایسی ہوتی ہے جیسا کہ راہن کے ملکیت میں باقی ہے۔ اور نہایہ میں ہے

کہ اس کا معنی ہے کہ مالک اس کی رہائی طلب نہ کرے۔

یہ زمانہ جاہلیت کا رواج تھا کہ راہن پر جو لازم ہوتا تھا اگر وہ وقت مقررہ تک اس کو واپس نہ کرتا تو مرتہن شئے مرہونہ کا مالک بن جاتا تھا۔ اسلام نے اس رواج کو باطل کر دیا۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ حدیث میں ''رہن اول'' مصدر ہے اور ''رہن ثانی'' مفعول ہے۔

غریبین میں ہے کہ مرتہن شے مرہون کا مستحق نہیں ہوتا جب راہن وہ چیز جس کے بدلے رہن رکھ ہے نہ لوٹائے۔

فائق میں ہے کہ کہا جاتا ہے ''**غلق الرهن غلوقاً**''۔ جب وہ مرتہن کے ہاتھ میں باقی رہے اور راہن اس کے حصول پر قادر نہ ہو۔ ابراہیم نخعی سے **غلق رهن** کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا ''اگر کل تک میں نے اس کو نہیں چھڑایا تو یہ تیرا ہے''۔ نہایہ میں یہ اضافہ ہے کہ شیخ ازہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کہا جاتا ہے: ''**غلق الباب وانغلق واستغلق**''، جب اس کا کھولنا مشکل ہو۔ ''**رهن**'' میں ''**غلق**'' **فلك** (چھوڑنے) کی ضد ہے۔ جب راہن مرہون کو چھڑا لیتا ہے، تو وہ اس کو (یعنی اپنے آپ کو) اس شئ مرہونہ) کے معاہدے سے آزاد کرا لیتا ہے۔

له : ضمیر راہن کی طرف لوٹ رہی ہے۔ **غنمه** : پہلے حرف کے ضمہ کے ساتھ، اس کے فوائد اور بڑھوتری۔

غرمه : غین کے ضمہ کے ساتھ، یعنی جس چیز سے شئے مرہون کو چھڑایا جائے اس کا ادا کرنا، اور جو حضرات رہن کے ضمان کو مرتہن پر نہیں سمجھتے وہ اس کی تفسیر کرتے ہیں کہ مرہون کا نفقہ اور ضمان (راہن کے ذمہ ہے) جب وہ ہلاک ہو جائے مرتہن کے ہاتھ میں، (جیسا کہ ذکر کیا ہے اس کو ہمارے علماء نے۔)

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''**غنمه**'' سے مراد اس کی زیادت ہے اور ''**غرمه**'' سے مراد اس کی ہلاکت اور نقصان ہے۔

شرح السنہ میں ہے کہ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ وہ زوائد جو مرہون سے حاصل ہوں وہ راہن کیلئے ہیں اور جب یہ مرتہن کے ہاتھ میں ہلاک ہو جائے تو یہ راہن کے ضمان سے ہلاک ہوگا۔ اور اس کی ہلاکت سے مرتہن کے حق میں سے کچھ بھی ساقط نہ ہوگا۔ اور جب حدیث اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ منافع رہن راہن کیلئے ہیں تو اس میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ رہن میں شئے مرہونہ پر قبضہ میں دوام شرط نہیں ہے، اس لئے کہ راہن اس پر سواری نہیں کر سکتا مگر اس وقت کہ جب وہ مرتہن کے قبضہ سے خارج ہو۔

مغرب میں ہے کہ ابو عبیدہ فرماتے ہیں کہ حدیث کا معنی یہ ہے کہ شئے مرہون راہن پر لوٹے گی تو اس کا فائدہ اس کیلئے ہوگا، اور مرتہن اپنے حق کا رجوع راہن سے کرے گا، تو اسکا نقصان بھی اس پر ہوگا۔

شرح السنہ میں ہے کہ حدیث میں ''**من صاحبه**'' سے مراد ''**لصاحبه**'' ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ''**من ضمان صاحبه**'' ہے۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ یہ کہا جائے ''**غلق**'' **منع** کے معنی کو متضمن ہے' اور مطلب یہ ہے کہ رہن شئے مرہون کو مالک کے تصرف سے منع نہیں کرتا۔ پھر اس کے بعد اس کا بیان لایا گیا' اور تحقیق کی غرض سے خبر کو مبتدا پر مقدم کر دیا گیا۔ یعنی اس کے تصرف میں مانع نہیں ہے پس اس کا نفع اس کے مالک کیلئے ہوگا نہ کہ کسی غیر کیلئے اور اس کا نقصان اس کے مالک پر ہوگا نہ کہ کسی غیر پر، اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتہن کے لئے رہن میں صرف اپنے دین کا وثیقہ ہے' اگر وہ رہن ہلاک ہو جائے یا اس میں کوئی نقص پڑ جائے تو راہن سے رجوع کرے۔

قوله : **رواه الشافعي مرسلا** : امام شافعی نے صحابی کے واسطہ کو حذف کرتے ہوئے حضرت سعید تابعی سے روایت کیا ہے۔

۲۸۸۸: وروى مثله او مثل معناه لا يخالفه عنه عن ابي هريرة متصلا۔

اخرجه الحاكم في المستدرك ۲/ ۵۱۔

ترجمہ: اور اس قسم کی ایک اور حدیث (یعنی ہم معنی بھی اور ہم لفظ بھی) حضرت سعید بن مسیبؒ سے روایت کی گئی ہے جسے سعید

بن مسیب نے حضرت ابو ہریرہؓ سے بطریق اتصال نقل کیا ہے یا وہ روایت ہم معنی ہے اور اس کے الفاظ مختلف ہیں مگر الفاظ کا یہ اختلاف ایسا نہیں ہے جو اس کے ہم معنی ہونے کے منافی ہو"۔

تشریح: روی : صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ اور ایک نسخہ میں رویٰ صیغہ معروف کے ساتھ ہے پس ضمیر فاعل شافعی کیطرف لوٹے گی، اور لفظ "مثل"، منصوب ہی ہے گا۔

لا یخالفه : اور ایک نسخہ میں ولا یخالفه ہے۔

عن ابی هریرة : "روی" کے متعلق ہے، اور" یخالفه" کی ضمیر مستتر "روی" کے فاعل متروک کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یہ تقریر "روی" کے مجہول ہونے کی صورت میں ہے،

اور برتقدیر "روی" کے معروف ہونے کے "لا یخالف" حال مؤکدہ ہے "مثله او مثل معناه" سے، اور "عنه" کی ضمیر دونوں صورتوں میں سعید کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور لا یخالف کی ضمیر مستتر فاعل متروک کی طرف لوٹ رہی ہے، جیسا کہ گزرا' اور دوسرے احتمال کے مطابق (یعنی روی کے معروف ہونے کی صورت میں) "لا یخالف" کی ضمیر مستتر شافعی کی طرف لوٹے گی، جیسا کہ بعض کا کہنا ہے۔

اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ تقدیری عبارت یوں ہے: "لا یخالف المروی او الراوی المروی'

متصلاً" یہ حال ہے حدیث سے یا اس کی سند سے۔ تورپشتی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو ہم نے کتاب یعنی مصابیح السنہ میں متصل، پایا ہے حضرت ابو ہریرہ سے مسنداً مروی ہے۔

اور ظاہر یہ ہے کہ یہ اس کے ساتھ ملایا گیا ہے، اس لئے کہ اس کے بارے میں صحیح بات یہ ہے کہ یہ سعید بن المسیب کی مراسیل میں سے ہے' اور اسی طرح سے پر ابوداؤد نے اس کو اپنی کتاب میں روایت کیا ہے اور ابن ابی انیسہ کے علاوہ کسی نے اس کو متصل ذکر نہیں کیا۔

ناپ تول میں کمی کرنے والوں کیلئے وعید

۲۸۸۹: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ الْمِكْيَالُ مِكْيَالُ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَالْمِيْزَانُ مِيْزَانُ اَهْلِ مَكَّةَ .

(رواه ابوداود والنسائی)

اخرجه ابو داؤد من السنن ۳/۶۳۳ الحدیث رقم ۳۳۴۰ والنسائی فی ۷/۲۸۴ الحدیث رقم ۲۵۹۴

ترجمہ: اور حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: پیمانہ اہل مدینہ کا معتبر ہے جبکہ اوروزن اہل مکہ کا معتبر ہے"۔ (ابوداؤد' نسائی)

تشریح: **قوله: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ ...... والمیزان میزان اهل مکة** :

وعن ابن عمر ان النبی : اور ایک نسخہ میں "رسول الله" ہے۔

اس لئے کہ وہ زراعت پیشہ ہیں، پس وہ پیمانوں کے بارے میں زیادہ واقفیت رکھتے ہیں۔

والمیزان میزان اهل مکة : اس لئے کہ وہ تجارت پیشہ ہیں اور موازین سے ان کا تعلق اور اوزان کے بارے میں ان کی واقفیت زیادہ تھی جیسا کہ قاضی عیاض نے فرمایا ہے۔

شرح السنہ میں ہے کہ حدیث حقوق شرعیہ سے متعلق ہے جو مثلاً زکوۃ، کفارات صدقہ فطر، وغیرہ یہاں تک کہ دراہم میں اس وقت تک زکوٰۃ واجب نہیں ہے جب تک کہ وہ مکہ کے وزن کے مطابق دوسو درہم تک نہ پہنچ جائیں، اور صدقہ فطر میں ایک صاع، اہل مدینہ کے صاع کے مطابق، ہر صاع پانچ رطل اور ایک تہائی رطل کا ہوتا ہے۔

۲۸۹۰: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِاَ صْحَابِ الْكَيْلِ وَالْمِيْزَانِ اِنَّكُمْ قَدْ وُلِّيْتُمْ اَمْرَيْنِ هَلَكَتْ فِيْهِمَا الْاُمَمُ السَّابِقَةُ قَبْلَكُمْ. (الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۳/۵۲۱ الحدیث رقم ۱۲۱۷۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ناپ تول کرنے والوں سے ارشاد فرمایا کہ تمہارے ذمہ ایسے دو کام ہیں (یعنی ناپنا اور تولنا) جن میں (کمی و بیشی) کے سبب تم سے پہلی قومیں ہلاک کی جا چکی ہیں''۔ (ترمذی)

تشریح: قوله: قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ...... هَلَكَتْ فِيْهِمَا الْاُ مَمُ السَّا بِقَةُ قَبْلَكُمْ:

لاصحاب الكيل والميزان انكم: اس کلام کا مخاطب کون ہے؟ اس میں دو احتمال ہیں:

(۱) یہ خطاب دونوں گروہوں یعنی اہل مکہ اور اہل مدینہ سے ہے، اور خطاب ایک ساتھ ہوا۔

(۲) اصحاب کیل سے مراد اہل مدینہ ہیں اور اصحاب میزان سے مراد اہل مکہ ہیں۔ اور ہر ایک سے ان کے مقام پر خطاب کیا۔ اور ابن عباس نے دونوں کو ایک ساتھ جمع کر دیا، سامع کے فہم پر اعتماد کرتے ہوئے، پس یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرح ہے: ﴿یا ایها الناس كلوا من الطيبات﴾۔ **قد وليتم**: واؤ کے ضمہ اور لام کی تشدید اور کسرہ کے ساتھ۔

امرين: یعنی دو کاموں کے تم حاکم بنائے گئے ہو۔ ''امرین'' کو مبہم اور نکرہ ذکر کیا تفخیم شان پر دلالت کرنے کیلئے، اور اسی وجہ سے ان کے حق میں کہا گیا ہے: [**ويل للمطففين**] [المطففین۔۱]

هلكت فيهما الامم السابقة قبلكم: جیسے قوم شعیبؑ کہ وہ لوگوں سے چیز تو م لیتے تھے اور جب لوگوں کو دیتے تھے تو کمی کر کے دیتے تھے۔

بیع سلم میں مبیع کو قبضہ سے پہلے فروخت کرنے کی ممانعت

۲۸۹۱: عَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ اَسْلَفَ فِيْ شَيْءٍ فَلَا يَصْرِفْهُ اِلٰى غَيْرِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّقْبِضَهٗ. (رواه ابوداؤد وابن ماجة)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳/۷۴۴ الحدیث رقم ۳۴۶۸ وابن ماجه فی ۲/۷۶۶ الحدیث رقم ۲۲۸۳۔

ترجمہ: ''حضرت ابو سعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص کسی چیز کے بارے میں بیع سلم کا معاملہ کرے تو اس چیز کو قبضہ میں کرنے سے قبل اس کو کسی دوسرے کی طرف منتقل نہ کرے''۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: قوله: مَنْ اَسْلَفَ فِيْ شَيْءٍ فَلَا يَصْرِفْهُ اِلٰى غَيْرِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّقْبِضَهٗ:

فلا يصرفه: صیغہ نہی کے ساتھ ہے بعض کہتے ہیں کہ صیغہ نفی کے ساتھ ہے، اور ضمیر ''بارزشئی'' کی طرف لوٹ رہی ہے۔

غيره کی ضمیر کے مرجع میں کئی احتمال ہیں: (۱) ''من اسلف'' میں ''من'' کی طرف راجع ہو، یعنی کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت نہ کرے قبضہ کرنے سے پہلے۔ (۲) ''شئی'' کی طرف راجع ہو، یعنی مبیع کو دوسری چیز سے تبدیل نہ کرے قبضہ کرنے سے پہلے۔

بَابُ الْاِحْتِكَارِ

احتکار کا بیان

''احتکار'' کا معنی ہے، غلہ کو روکنا جب لوگوں کو اس کی ضرورت ہو، یہاں تک کہ وہ مہنگا ہو جائے۔

الفصل الاوّل :

احتکار کرنے والا گنہگار ہے

۲۸۹۲: عَنْ مَعْمَرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنِ احْتَكَرَ فَهُوَخَا طِئٌ. (رواہ مسلم)

اخرجہ مسلم فی صحیحہ ۱۲۲۷/۳ الحدیث رقم (۱۲۹۔۱۶۰۵)وابو داوٗد فی السنن ۷۲۸/۳ الحدیث رقم ۳۴۴۷وابن ماجہ فی ۷۲۸/۲ الحدیث رقم ۲۱۵۴والدار می فی ۳۲۳/۲ الحدیث رقم ۲۵۴۳ واحمد فی لمسند ۴۰۰/۶۔

ترجمہ: حضرت معمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جوشخص احتکار (ذخیرہ اندوزی) کرے وہ گنہگار ہے"۔(مسلم)
اور ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کردہ حدیث "بنونضیر کے اموال" کو باب الفئی میں ذکر کردیں گے' ان شاء اللہ۔

تشریح: امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو احتکار حرام ہے وہ صرف غذائی چیزوں میں ہے اس طور پر کہ ایک آدمی غلہ خریدے مہنگائی کے دور میں اور فی الحال اس کو فروخت نہ کرے بلکہ ذخیرہ کریں، تا کہ وہ مہنگا ہو جائے۔ البتہ جو اس کے گاؤں سے آئے یا وہ ارزانی کے وقت میں خرید لے اور ذخیرہ کرلے اور گرانی کے وقت فروخت کرے تو یہ احتکار نہیں ہے اور نہ ہی اس میں کسی قسم کی حرمت ہے۔ البتہ

غذائی اشیاء کے علاوہ میں کسی بھی حال میں احتکار حرام نہیں ہے۔ (انتہی)

امام مالک نے حدیث کے عموم سے استدلال کیا ہے کہ احتکار حرام ہے غذائی اشیاء میں اور اس کے علاوہ میں بھی۔ (جیسا کہ ابن الملک نے مشارق میں ذکر کیا ہے۔)

تخریج: اس کو روایت کیا ہے احمد اور مسلم، اور ابوداؤد اور ترمذی، ابن ماجہ سے "**لا یحتکر**" کے لفظ کے ساتھ۔

اس حدیث کی مناسبت "فی" کے ساتھ زیادہ ظاہر ہے۔ امام بغوی رحمہ اللہ نے اس کو یہاں ذکر کیا ہے باب کے ساتھ اس کے تعلق کو دیکھتے ہوئے اس طور پر کہ اس میں بیان ہے کہ اہل وعیال کے خرچ کیلئے غلہ کو روکنا احتکار نہیں ہے۔ واللہ اعلم

الفصل الثانی :

احتکار کرنے والے کیلئے وعید

۲۸۹۳: عَنْ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ الْجَالِبُ مَرْزُوْقٌ وَالْمُحْتَكِرُ مَلْعُوْنٌ. (رواہ ابن ماجۃ والدارمی)

اخرجہ ابن ماجہ فی السنن ۷۲۸/۲ الحدیث رقم ۲۱۵۳ والدار می فی ۳۲۴/۲ الحدیث رقم ۲۵۴۴

ترجمہ: حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: (بازار میں) غلہ لانے والے کو رزق دیا جاتا ہے اور احتکار کرنے والا (ذخیرہ اندوز) ملعون ہے"۔ (ابن ماجہ' دارمی)

تشریح: یعنی تاجر کو بغیر کسی گناہ کے فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اور احتکار کرنے والا ملعون ہے' یعنی گناہ گار ہے بھلائی سے دور ہے جب تک وہ اس فعل میں مبتلا ہے اور اس کو کوئی برکت بھی حاصل نہیں ہوتی۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں "**ملعون**" کو "**مرزوق**" کے مقابل ذکر کیا ہے اور مقابل حقیقی "**مرحوم**" ہے یا "محروم" ہے تا کہ عام ہو۔ تقدیر کلام اس طرح ہے "**التاجر مرحوم مرزوق**" ہے تاجر بوجہ لوگوں پر وسعت اور کشادگی لانے کے محمود ہے' اور احتکار کرنے والا ملعون ومحروم ہے بوجہ لوگوں پر تنگی لانے کے۔ امام حاکم نے ابن عمر سے روایت کیا ہے: "**المحتکر ملعون**"

حاکم اپنی طرف سے نرخ مقرر نہ کرے

۲۸۹۴: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ غَلَا السِّعْرُ عَلٰى عَهْدِ النَّبِيِّ ﷺ فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ سَعِّرْلَنَا فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمُسَعِّرُ الْقَابِضُ الْبَاسِطُ الرَّازِقُ وَاِنِّي لَاَرْجُوْ اَنْ اَلْقٰى رَبِّي وَلَيْسَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ يَطْلُبُنِي بِمَظْلِمَةٍ بِدَمٍ وَّلَا مَالٍ ۔ (رواه الترمذی وابوداود وابن ماجة)

اخرجه ابوداوٗد فی السنن ۷۳۱/۳ الحدیث رقم ۳۴۵۱ والترمذی فی ۶۰۵/۳ الحدیث رقم ۱۳۱۴وابن ماجه فی ۷۴۱/۲ الحدیث رقم ۲۲۰۰ والدارمی فی ۳۲۴/۲ الحدیث رقم ۲۵۴۵ واحمد فی المسند ۱۵۶/۳۔

ترجمہ: ''اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں غلہ کا نرخ مہنگا ہوگیا تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! ہمارے لئے نرخ مقرر فرما دیجئے یعنی تاجروں کو حکم دے دیجئے کہ وہ اس نرخ سے غلہ فروخت کیا کریں۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''اللہ ہی نرخ مقرر کرنے والا' اللہ ہی تنگی پیدا کرنے والا ہے' اللہ ہی فراخی دینے والا ہے اور اللہ ہی رزق دینے والا ہے میں اس بات کا امیدوار اور خواہش مند ہوں کہ میں اپنے پروردگار سے اس حال میں ملوں کہ مجھ پر تم میں سے کوئی خون اور مال کے بارے میں مطالبہ نہ کرے''۔ (ترمذی' ابوداوٗد' ابن ماجہ)

تشریح: '' سعر '' : تسعیر سے امر کا صیغہ ہے' اور '' تسعیر '' کہتے ہیں اشیاء کی قیمت مقرر کرنا۔ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ '' سعر '' قیمت کو کہتے ہیں' تا کہ اسی کے ساتھ بازار میں خرید وفروخت عام ہو۔

قوله :اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمُسَعِّرُ الْقَابِضُ الْبَاسِطُ الرَّازِقُ :المسعر : عین مکسورہ کی تشدید کے ساتھ۔

القابض الباسط : ان کا معنی اسماء حسنیٰ میں گزر چکا ہے۔ **الرازق** : اور ایک نسخہ میں '' **الرزاق** '' صیغہ مبالغہ کے ساتھ ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ حدیث کے الفاظ '' **ان اللّٰه المسعر** ...... '' یہ جواب ہے نرخ مقرر کرنے کی ممانعت کے لئے علت کے طور پر، یہاں '' ان '' کو لایا گیا ہے اور '' ان '' کے اسم کے بعد ضمیر فصل لائی گئی ہے اور خبر کو معرف باللام ذکر کی ہے تا کہ یہ تاکید اور تخصیص پر دلالت کرے۔ پھر اس حکم کو تین پے در پے خبروں پر مرتب کیا حکم کا وصف مناسب پر مرتب ہونے کی طرح اور اللہ یہ علت ہے نرخ کے مہنگا ہونے کی اور اللہ کا '' باسط '' ہونا یہ علت ہے نرخ کی ارزانی کی، اور اللہ کا '' رازق '' ہونا بندوں پر روزی تنگ اور کشادہ کرتا ہے۔

پس جس نے نرخ میں تصرف کیا تو اس نے اللہ کے ساتھ معارضہ اور جھگڑا کیا اس چیز میں جس کا اللہ نے ارادہ کیا ہے اور وہ بندوں کے حقوق کو منع کرتا ہے ان حقوق میں جن کا اللہ پاک نے ان کو ذمہ دار بنایا ہے گرانی اور ارزانی کا، اور اس آخری معنی کی طرف آپ ﷺ نے اگلے جملہ میں اشارہ کیا ہے۔

قوله :وليس احد منكم يطلبني : یہ جملہ حالیہ ہے۔

مظلمة : لام کے کسرہ کے ساتھ، '' جو تجھ سے کوئی ظلم کر کے لے'' اور '' مغرب '' میں ہے '' **مظلمة** '' ظلم کو کہتے ہیں، اور محمد کا قول '' **وهذا مظلمة للمسلمين** '' اسم ہے۔ عرب کے اس قول سے ماخوذ ہے: **عند فلان مظلمتی و ظلامی ای حقی الذی خذمنی ظلما** ، یعنی میرا وہ حق جو مجھ سے ظلم کے ساتھ لیا ہے۔

دم : بدل ہے '' **مظلمة** '' سے۔

ولا مال : امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کو لا نافیہ کے ساتھ لایا تاکید کے واسطے بغیر تکرار، اس لیے کہ معطوف علیہ سیاق نفی میں ہے، اور مال سے مراد یہ '' تسعیر '' ہے اس لئے کہ یہ مظلوم سے لیا گیا ہے یہ جنایت کے تاوان کی طرح ہے۔ اور '' **مظلمة** '' اس کیلئے تمہید کے طور پر لایا ہے۔

قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ حدیث کے الفاظ ''وانی لا رجوا الخ''۔ اس میں اشارہ ہے کہ آپ کو نرخ مقرر کرنے سے منع کرنے والی بات 'لوگوں کے اموال میں ظلم کا خوف ہے۔ اس لئے کہ نرخ مقرر کرنا یہ مال میں مالک کی اجازت کے بغیر تصرف ہے، پس یہ ظلم ہو جائے گا۔ اور نرخ مقرر کرنے کا ایک مفسدہ یہ ہے کہ یہ رغبتوں میں تیزی پیدا کر دیتا ہے' اور بیع سے رکنے پر ابھارتا ہے اور پھر یہ بسا اوقات قحط کی طرف لیجاتا ہے۔

تخریج: اس حدیث کو احمد، ابن حبان اور بیہقی نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: ''ان الله هو الخالق القابض الباسط الرازق المسعر' وانی لا رجوا الله ان القی ولا یطلبنی احد بظلمة ظلمتها ایاه فی دم ولا مال''۔ واللہ اعلم

الفصل الثالث:

غلہ کی ناجائز ذخیرہ اندوزی کرنے والوں کیلئے موعظت وعبرت

۲۸۹۵: عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ مَنِ احْتَكَرَ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ طَعَامَهُمْ ضَرَبَهُ اللّٰهُ بِالْجُذَامِ وَالْإِفْلَاسِ. (رواه ابن ماجة والبیهقی فی شعب الایمان ورزین فی کتابه (ابن ما جة' لبیهقی رزین)

اخرجه ابن ماجه فی السنن ۲/ ۷۲۹ الحدیث رقم ۲۱۵۵ واحمد فی المسند ۱/ ۲۱

ترجمہ: ''حضرت عمر بن خطابؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرمائے ہوئے سنا کہ جس شخص نے غلہ روک کر گراں نرخ پر مسلمانوں کے ہاتھ فروخت کیا اللہ تعالیٰ اسے جذام کے مرض اور وافلاس میں مبتلا کر دیتا ہے''۔ (ابن ماجہ' بیہقی' رزین)

تشریح: قوله: يَقُوْلُ من احتكر على المسلمين طَعَامَهُمْ ضَرَبَهُ اللّٰهُ بِالْجُذَامِ وَالْإِفْلَاسِ:

طعامهم: ''طعام'' کی اضافت ''مسلمین'' کی طرف کی ہے اگر چہ یہ 'محتکر'' کی ملکیت ہے' یہ بتانے کیلئے کہ یہ غلہ مسلمانوں کی غذا ہے جیسے اور اسی سے ان کی زندگانی ہے اس آیت میں ''اموال'' کی اضافت ہے: ﴿ولا تؤتوا السفهاء اموالكم﴾ [النساء۔ ۵] اسلئے کہ یہ اس چیز کی جنس میں سے جس کے ذریعے لوگ اپنے معاش کو قائم کرتے ہیں۔

لجذام: جیم کے ضمہ کے ساتھ۔ ''جذام' ایک بیماری ہے جس میں جلد پھٹ جاتی ہے اور گوشت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر جاتا ہے۔

فائدہ: حدیث سے معلوم ہوا کہ جو مسلمانوں کو ادنیٰ سا بھی نقصان پہنچانے کا ارادہ کرے گا اللہ اس کو جسمانی اور مالی بلاؤں میں مبتلا کر دیتا ہے اور جو مسلمانوں کو نفع پہنچانے کا ارادہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے جسم و مال میں خیر و برکت عطا کرتا ہے۔

۲۸۹۶: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنِ احْتَكَرَ طَعَامًا اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا يُرِيْدُ بِهِ الْغَلَاءَ فَقَدْ بَرِئَ مِنَ اللّٰهِ وَبَرِئَ اللّٰهُ مِنْهُ (رواه رزين)

اخرجه البیهقی فی شعب الایمان ۷/ ۵۲۵ الحدیث رقم ۱۱۲۱۵۰۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے چالیس دن تک قیمت بڑھانے کے خیال سے ذخیرہ اندوزی کی تو گویا وہ اللہ سے بیزار ہوا اور اللہ اس سے بیزار ہوا''۔ (رزین)

تشریح: قوله: مَنِ احْتَكَرَ طَعَامًا اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا ...... چالیس دن سے مراد خاص وقت کی تحدید نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ احتکار کو اپنی حرفت بنالے۔ اور اس سے اس کا ارادہ اپنا فائدہ اور دوسرے کا نقصان۔ اگلے جملہ کا بھی یہی مطلب ہے۔ کم از کم مدت جس میں آدمی اپنی حرفت میں مالدار بن جاتا ہے وہ یہ مدت ہے۔

فقد برئ من الله وبرئ الله منه: یعنی اس نے اللہ کے ساتھ کئے ہوئے میثاق اور وعدہ کو توڑ دیا۔ یہاں اس کی براءت کو اللہ

کی براءت پر مقدم کیا ہے یہ اس لئے کہ اس کا اللہ کے ساتھ اس وعدہ کو پورا کرنا مقدم ہے اللہ کے اس کے ساتھ وعدے کو پورا کرنے سے۔ جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿أوفوا بعهدی أوف بعهدكم﴾[البقرة۔۴۰] (اور پورا کرو تم میرے عہد کو پورا کروں گا میں تمہارے عہد کو)۔ یہ بہت سخت وعید اور بہت بڑی دھمکی ہے احتکار ذخیرہ اندوزی کے بارے میں۔

اس حدیث کو امام احمد و حاکم نے یوں روایت کیا ہے:

من احتكر حكرة يريد ان يغلى بها على المسلمين فهو خاطىء وقد برئت منه ذمة الله ورسوله،

''جس نے ذخیرہ اندوزی کی اس ارادے سے کہ اس کے ذریعے مسلمانوں پر گرانی کرے تو یہ شخص گنہگار ہے اور اللہ اور رسول کا ذمہ اس سے بَری ہے۔''

۲۸۹۷: وَعَنْ مُعَاذٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ بِئْسَ الْعَبْدُ الْمُحْتَكِرُ اِنْ اَرْخَصَ اللّٰهُ الْاَسْعَارَ حَزِنَ وَاِنْ اَغْلَاهَا فَرِحَ. (رواه البيهقى فى شعب الا يمان ورزين فى كتابه)

اخرجه البيهقى فى شعب الايمان ۷/۵۲۵ الحديث رقم ۱۱۲۱۵۰۔

ترجمہ: ''اور حضرت معاذؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: غلہ وغیرہ کی ناجائز ذخیرہ اندوزی کرنے والا بندہ بہت برا ہے اگر اللہ تعالیٰ نرخوں میں کمی کرتا ہے تو وہ غمگین ہو جاتا ہے اور اگر نرخوں کو بڑھاتا ہے تو وہ خوش ہو جاتا ہے''۔ (بیہقی، رزین)

تشریح: حزن: زاء کے کسرہ کے ساتھ لازم ہے اور فتحہ کے ساتھ متعدی ہے۔ یہاں مراد اول ہے۔

۲۸۹۸: وَعَنْ اَبِىْ اُمَامَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنِ احْتَكَرَ طَعَامًا اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا ثُمَّ تَصَدَّقَ بِهٖ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كَفَّارَةً.

رواه رزين

ترجمہ: ''اور حضرت ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے چالیس دن تک ذخیرہ اندوزی کی اور پھر اسے (اللہ کی راہ میں) خیرات کر دیا تو وہ اس کے لئے کفارہ نہیں ہوگا''۔ (رزین)

تشریح: قوله: قال من احتكر طعاما ...... یعنی اس غلے کو فرض صدقہ کی مد میں اداء کرے یا مطلب یہ ہے کہ وہ پورا صدقہ کر دے۔

كفارة: نصب کے ساتھ ہے اور ''له'' ظرف لغو ہے اور ایک نسخہ میں رفع کے ساتھ ہے، اس صورت میں 'کان' ناقصہ ہوگا۔ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ 'به' کی ضمیر ''طعام'' کی طرف راجع ہے۔ ذخیرہ کیا ہوا غلہ صدقہ نہیں کیا جاتا، پس لازم ہے کہ یہاں ''ارادة'' کو مقدر مانا جائے تو یہ مبالغہ کا فائدہ دے گا کہ جس نے احتکار کا ارادہ اور نیت کی تو اس کا حال یہ ہے، تو جس نے اس فعل کا ارتکاب کیا اس کا کیا حال ہوگا؟

روایات باب: ابن عساکر نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

''من احتكر طعاما على امتى اربعين يومًا وتصدق به لم يقبل منه''۔

بَابُ الْاِفْلَاسِ وَالْاِنْظَارِ

افلاس اور مہلت دینے کا بیان

نہایہ میں ہے: ''افلس الرجل'' اس وقت کہتے ہیں کہ جب آدمی کے پاس مال میں سے کچھ بھی باقی نہ رہے، یا اس کے دراہم، پیسوں سے بدل جائے۔ بعض کہتے ہیں کہ ایسی حالت ہو جائے کہ کہا جائے کہ اس کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ اور ''انظار'' ''تاخیر''

اور مہلت کو کہتے ہیں۔

الفصل الاول :

مفلس ہو جانے والے کے بارے میں ایک مسئلہ

۲۸۹۹:عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَيُّمَا رَجُلٍ اَفْلَسَ فَاَدْرَكَ رَجُلٌ مَا لَهُ بِعَيْنِهٖ فَهُوَاَ حَقُّ بِهٖ مِنْ غَيْرِهٖ ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٥/٦٢ الحدیث رقم ٢٤٠٢ ومسلم فی صحیحه ١١٩٤/٣ وابو داؤدفی السنن ٧٩١/٣ الحدیث رقم ٣٥٢٠ والترمذی فی ٥٦٢/٣ الحدیث رقم ١٢٦٢ والنسائی فی ٣١١/٧ الحدیث رقم ٤٦٧٦ وابن ماجه فی ٧٩٠/٢ الحدیث رقم ٢٥٩٠ ومالك فی لموطا ٦٧٨/٢ الحدیث رقم ٨٨ من کتاب البیوع واحمد فی المسند ٤٦٨/٢۔

ترجمہ:''حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر کوئی شخص مفلس ہو جائے اور کوئی شخص (کہ جس نے اس کے ہاتھ اپنا مال بیچا تھا اس کے پاس) اپنا مال اسی صورت میں پائے تو وہ (مال والا) شخص کسی دوسرے کے مقابلے میں اس مال کا زیادہ حقدار ہے''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله : اَيُّمَا رَجُلٍ اَفْلَسَ ...... : مراد یہ ہے کہ نہ اس میں حسی تبدیلی آئی ہو اور نہ معنوی طور پر تصرفات شرعیہ کے ساتھ جیسے ہبہ اور وقف وغیرہ ہے۔

یہی امام شافعی اور مالک کا مسلک ہے، اور ہمارے نزدیک نہ اس کو فسخ کرنے کا اختیار ہے اور نہ مال واپس لینے کا حق پہنچتا ہے۔ بلکہ وہ باقی تمام قرض خواہوں کی طرح ہے۔ ہم حدیث کو محمول کرتے ہیں کہ جب بیع میں خیار شرط ہو، یعنی خیار شرط بائع کی طرف سے ہو اور مدت خیار کے اندر اس کو معلوم ہو جائے کہ مشتری دیوالیہ ہے، تو اب اس کیلئے زیادہ مناسب یہ ہے کہ وہ بیع کو فسخ کر دے۔ (جیسا کہ ذکر کیا ہے ابن الملکؒ نے۔)

شرح السنہ میں ہے کہ اکثر اہل علم کا عمل اس پر ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ جب خریدار دیوالیہ ہو جائے قیمت ادا نہ کر سکتا ہو، اور بیچنے والا اپنا مال بعینہ اس کے پاس پالے تو اس کو چاہئے کہ بیع کو فسخ کرلے اور مال اپنا بعینہ لے لے، اور اگر اس نے قیمت لی تھی کہ باقی کی ادائیگی سے پہلے ہی مفلس ہو گیا تو یہ قیمت کے بقدر اپنا مال لے لے، یہی فیصلہ حضرت عثمانؓ نے کیا ہے اور حضرت علیؓ سے بھی روایت کیا گیا ہے۔ اور ہم نہیں جانتے کہ صحابہ میں سے کسی نے ان دونوں کی مخالفت کی ہو، اور یہی امام مالکؒ اور شافعیؒ کا مسلک ہے۔

مفلس ہو جانے والے کی امداد کرنے کا حکم

۲۹۰۰:وَعَنْ اَبِیْ سَعِيْدٍ قَالَ اُصِيْبَ رَجُلٌ فِیْ عَهْدِ النَّبِیِّ ﷺ فِیْ ثِمَارٍ ابْتَاعَهَا فَكَثُرَ دَيْنُهٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ تَصَدَّقُوْا عَلَيْهِ فَتَصَدَّقَ النَّاسُ عَلَيْهِ فَلَمْ يَبْلُغْ ذٰلِكَ وَفَاءَ دَيْنِهٖ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِغُرَمَائِهٖ خُذُوْا مَاوَجَدْتُّمْ وَلَيْسَ لَكُمْ اِلَّا ذٰلِكَ. (رواه مسلم)

اخرجه فی صحیحه ١١٩١/٣ الحدیث رقم (١٨-١٥٥٦) والترمذی فی السنن ٤٤/٣ الحدیث رقم ٦٥٥ والنسائی فی ٣١٢/٧ الحدیث رقم ٤٦٧٨ وابن ماجه فی ٧٨٩/٢ الحدیث رقم ٢٣٥٦۔

ترجمہ:''اور حضرت ابو سعیدؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ایک شخص کو پھلوں کی تجارت میں نقصان ہوا (جو اس نے خریدے تھے) اور اس کی وجہ سے وہ بہت زیادہ مقروض ہو گیا (اس کی حالت دیکھ کر) رسول اللہ ﷺ نے لوگوں سے فرمایا کہ اس پہ

صدقہ کرو (تا کہ یہ قرض کے بوجھ سے ہلکا ہو) لوگوں نے صدقہ کے ذریعہ اس کی مدد کی مگر لوگوں کی مدد بھی اس کے قرض کی پوری ادائیگی کے لئے کافی نہ ہوسکی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس کے قرض خواہوں سے فرمایا کہ تم اس سے جو کچھ بھی پاؤ بس اس سے وہ لے لو تمہارے لئے بس یہی کچھ ہے۔ (مسلم)

راویٔ حدیث:

امیۃ بن صفوان۔ یہ امیہ بن صفوان ہیں جو ''امیہ بن خلف جمحی'' کے بیٹے تھے۔ یہ اپنے والد صفوان سے روایت کرتے ہیں اور اپنے بھتیجے عمرو وغیرہ سے عاریت کے مسئلہ میں روایت کی ہے۔ امیہ تصغیر کے ساتھ ہے ''صفوان'' میں صاد مہملہ مفتوح اور فاء ساکن ہے۔

تشریح: رجل : اکمل کہتے ہیں یہ معاذ بن جبل تھے۔ **ثمار** : اصیب کا متعلق ہے۔

فكثر دينه : ثاء کے ضمہ کے ساتھ، یعنی وہ پھل بیچنے والے نے اس کے قیمت کا مطالبہ کیا اور اسی خرچ دوسرے قرض خواہوں نے بھی مطالبہ کیا اور اس کے پاس مال نہیں تھا کہ ان کا قرض ادا کرتا۔

وليس لكم الا ذلك : یعنی جو تم نے پایا مطلب یہ ہے کہ تمہارے لئے نہیں مگر جو تم نے پایا اس کا لینا اور باقی میں اس کو مہلت دینا مالداری تک۔

مظہرؒ فرماتے ہیں تمہارے لئے مناسب نہیں ہے اس کو تنگ کرنا اور قید کرنا، اس لئے کہ اس کا افلاس ظاہر ہو چکا ہے، اور جب ایک آدمی کا افلاس ثابت ہو جائے تو اب اس کو دین کی وجہ سے قید کرنا جائز نہیں ہے بلکہ اس کو چھوڑا جائے اور اس کو مہلت دی جائے یہاں تک کہ اس کے پاس مال آجائے، تو قرض خواہ وہ لے لیں، اور اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو تم نے پایا یہی ہے تمہارے لئے بس یہی ہے اور اسکے علاوہ جو تمہارے قرض ہے وہ ساقط ہو گیا۔ چونکہ اللہ کا ارشاد ہے: ﴿وان كان ذو عسرة فنظرة الى ميسرة﴾ [البقرة۔ ٢٨٠]

وصولی قرض میں درگزر کرنے کا اجر

٢٩٠١: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ كَانَ رَجُلٌ يُدَايِنُ النَّاسَ فَكَانَ يَقُوْلُ لِفَتَاهُ اِذَا اَتَيْتَ مُعْسِرًا تَجَاوَزْ عَنْهُ لَعَلَّ اللّٰهَ اَنْ يَّتَجَاوَزَ عَنَّا قَالَ فَلَقِیَ اللّٰهَ فَتَجَاوَزَ عَنْهُ. (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤/٣٠٨ الحديث رقم ٢٠٧٨ ومسلم فی ٣/١١٩٦ الحديث رقم (٣١۔١٥٦٢) واحمد فی المسند ٢/٢٦٣

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک شخص تھا جو لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا اور اس نے اپنے ملازم سے کہہ رکھا تھا کہ جب کسی تنگدست کے پاس (قرض وصول کرنے) جاؤ تو اس سے درگزر کرو شاید اللہ تعالیٰ ہم سے درگزر فرمائے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''جب اس نے اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی (یعنی اسکا انتقال ہوا) تو اللہ تعالیٰ نے اس سے درگزر فرمایا (اور اس کے گناہوں پر مواخذہ نہیں فرمایا)''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: **فكان يقول لفتاه** : امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اپنے غلام کو کہا کرتا تھا، جیسا کہ دوسری روایت میں اس کی تصریح ہے۔

تجاوز عنه : یعنی اس سے قرض کا مطالبہ کرنے اور حق وصول کرنے اور اس چیز کے قبول کرنے میں جس میں کچھ عیب ہو، چشم پوشی اور تسامح سے کام لے۔

لعل الله ان يتجاوز عنا : امام طیبی فرماتے ہیں کہ ''لعل'' یہاں بمعنیٰ ''عسی'' ہے، اسلئے اس کو ''ان'' کے ساتھ لائے ہے یعنی اصل میں ''عسی الله ان يجاوز عنا'' ہے، اسلئے کہ ''لعل الله ان يجاوز'' نہیں کہا جاتا بلکہ بغیر ''ان'' کے ''يجاوز'' کہا جاتا ہے۔

سوال: اگر آپ یہ کہیں کہ آپ ﷺ نے ''يتجاوز عنا'' صیغہ جمع کے ساتھ کہنے کے بعد **فتجاوز عنه** کیسے کہا۔ جواب یہ ہے کہ قائل کی

مراد اپنا ہی نفس تھا، لیکن اس نے ضمیر جمع کو ذکر کیا، اس ارادے سے کہ جو اس طرح کا کام کرے اس سے بھی اللہ درگزر فرمائے اور یہ اس میں داخل ہو دخول اولیٰ کے ساتھ، اسی لئے تو دعا کرنے والے کے لیے یہ مستحب ہے کہ وہ دعاء عام کرے صرف اپنے آپ کو خاص نہ کرے، شاید کہ اللہ پاک دوسروں کی برکت سے اس کی دعا قبول فرمائے۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں تنگ دست کو مہلت دینے اپنا پورا دین یا بعض دین چھوڑنے کی فضیلت ہے اور قرض اور دین کے مطالبہ کرنے اور وصول کرنے میں چشم پوشی کرنے کی فضیلت ہے، اس میں تنگ دست اور مالدار برابر ہے، اور بھلائی کے کسی کام کو حقیر نہیں سمجھا چاہئے شاید کہ یہی کام کامیابی اور سعادت کا سبب ہو، اور اس حدیث سے معلوم ہوا کہ غلام کو وکیل بنانا اور اس کو تصرفات کی اجازت دینا جائز ہے۔ اور یہ ان لوگوں کا قول ہے جو کہتے ہیں کہ ہم سے پہلی شریعتوں کے احکام ہمارے لئے بھی ہیں۔ (انتہیٰ کلامہ)

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ اس بات کی ضرورت نہیں ہے چونکہ جب شارع نے اس کو اچھا جانا، اور برقرار رکھا اور نکیر نہیں فرمائی تو یہ ایک مستقل دلیل ہے۔

۲۹۰۲: وَعَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ سَرَّهٗ اَنْ یُّنْجِیَهُ اللّٰهُ مِنْ كُرَبِ یَوْمِ الْقِیَامَةِ فَلْیُنَفِّسْ عَنْ مُّعْسِرٍ اَوْ یَضَعْ عَنْهُ. (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ٣/١١٩٦ الحدیث رقم (٣٢-١٥٦٣)۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو قتادہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص کو یہ پسند ہو کہ اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن کی سختیوں سے محفوظ رکھے تو اسے چاہئے کہ وہ مفلس وتنگدست کو اپنا قرض وصول کرنے میں مہلت دے یا اس کو معاف کردے (یعنی اپنا پورا قرض یا جس قدر ممکن ہو معاف کردے)''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: مَنْ سَرَّهٗ اَنْ یُّنْجِیَهُ اللّٰهُ مِنْ كُرَبِ ......: ان ینجیه الله: اور ایک نسخہ میں جیم کی تشدید کے ساتھ ہے کرب: کاف کے ضمہ اور راؤ کے فتحہ کے ساتھ جمع ہے ''کربة'' کی سخت ازمائش اور مشقت کو کہتے ہیں۔ فلینفس: فاء کی تشدید کے ساتھ۔ عن معسر: یعنی اتنی مدت تک جس میں وہ مال پالے۔ یضع: جذم کے ساتھ۔

فائدہ: یوں تو فرض اعمال نفل اعمال سے ستر درجے زیادہ فضیلت کے حامل ہیں لیکن بعض مسائل میں نفل اعمال فرض اعمال سے زیادہ فضیلت رکھتے ہیں:

اول: تنگ دست کو اپنا حق معاف کردینا اگرچہ مستحب ہے لیکن مفلس وتنگ دست کو مہلت دینے سے افضل ہے جو واجب ہے۔

دوم: دوسرے کو سلام کرنا سنت ہے لیکن یہ افضل ہے سلام کے جواب دینے سے جو فرض ہے۔

سوم: وقت سے پہلے وضوء کرنا مستحب ہے لیکن یہ افضل ہے وقت شروع ہوجانے کے بعد وضوء کرنے سے جو فرض ہے۔

۲۹۰۳: وَعَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ مَنْ اَنْظَرَ مُعْسِرًا اَوْ وَضَعَ عَنْهُ اَنْجَاهُ اللّٰهُ مِنْ كُرَبِ یَوْمِ الْقِیَامَةِ. (رواہ مسلم)

اخرجه فی صحیحه ٤/٢٣٠٢ الحدیث رقم (٧٣-٣٠٠٦)۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو قتادہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جس شخص (اپنا مطالبہ وصول کرنے میں) مفلس کو مہلت دی یا اس کو (اپنا پورا مطالبہ یا اس کا کچھ حصہ) معاف کردیا تو اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن کی سختیوں سے نجات عطا فرمائے گا''۔ (مسلم)

۲۹۰۴: وَعَنْ اَبِی الْیَسَرِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ مَنْ اَنْظَرَ مُعْسِرًا اَوْ وَضَعَ عَنْهُ اَظَلَّهُ اللّٰهُ فِیْ

ظِلِّهِ. (رواہ مسلم)

اخرجه فی صحیحه ۴/۲۳۰۲ الحدیث رقم (۷۳-۳۰۰۶)۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابوالیسرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا' جس شخص نے تنگدست کو مہلت دی یا اس کو معاف کر دیا تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے سایہ رحمت میں جگہ دے گا (یعنی قیامت کے دن اسے گرمی کی تپش اور اس دن کی سختیوں سے محفوظ رکھے گا''۔ (مسلم)

تشریح: **اظله الله فی ظله**: اس کی توضیح میں علماء کی مختلف آراء ہیں:

(۱) قیامت کی گرمی کے تپش سے اسے محفوظ رکھے گا۔ اس صورت میں ''**فی ظله**'' بطور کنایہ ہے۔

(۲) حقیقۃً اللہ تعالیٰ اس کو اپنے عرش کے سائے تلے کھڑا کریں گے، (اس کو امام طیبی نے ذکر کیا ہے۔)

(۳) ابن الملک فرماتے ہیں کہ اس سے مراد اس کی عزت اور اکرام ہے، اور بری جگہ میں کھڑا ہونے سے بچانا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے: **فلان فی ظل فلان**۔ یعنی اس کی حفاظت اور رعایت میں ہے۔

تخریج: امام احمد، ابن ماجہ، اور حاکم نے حضرت بریرہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے:

''من تنظر معسرا فله بکل یوم مثله صدقته قبل ان یحل الدین فاذا حل الدین فانظره فله بکل یوم مثلاه صدقة''

''جو شخص مفلس و تنگدست کو مہلت دے تو ادائیگی کا دن آنے تک اس کو ہر دن کے بدلے اس کے قرض کے برابر صدقہ کا ثواب ملتا ہے، اور پھر جب ادائیگی کا دن آئے اور پھر وہ اسے مہلت دے دے تو اس کو ہر دن کے بدلے اس کے قرض کی دگنی مقدار کے برابر صدقہ کا ثواب ملتا ہے۔''

خوبی کے ساتھ قرض اداء کرنے والا بہترین شخص ہے

۲۹۰۵: وَعَنْ اَبِیْ رَافِعٍ قَالَ اسْتَسْلَفَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بَكْرًا فَجَاءَ تْهُ اِبِلٌ مِّنَ الصَّدَقَةِ قَالَ اَبُوْرَافِعٍ فَاَمَرَنِیْ اَنْ اَقْضِیَ الرَّجُلَ بَكْرَهٗ فَقُلْتُ لَا اَجِدُ اِلَّا جَمَلًا خِيَارًا رَبَاعِيًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْطِهِ اِيَّاهُ فَاِنَّ خَيْرَ النَّاسِ اَحْسَنُهُمْ قَضَاءً. (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۳/۱۲۲۴ الحدیث رقم (۱۱۸-۱۶۰۰) وابوداوٗد فی السنن ۳/۶۴۱ الحدیث رقم ۳۳۴۶ والترمذی فی ۳/۶۰۹ الحدیث رقم ۱۳۱۸ والنسائی فی ۷/۷۹۱ الحدیث رقم ۴۶۱۷ وابن ماجه فی ۲/۷۶۷ الحدیث رقم ۲۲۸۵ والدارمی ۲/۳۳۱ الحدیث رقم ۲۵۶۵

ترجمہ: اور حضرت ابورافعؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) رسول اللہ ﷺ نے ایک جوان اونٹ بطور قرض لیا اور پھر جب آپ ﷺ کے پاس زکوۃ کے اونٹ آئے تو ابورافعؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ میں اس شخص کو (کہ جس سے آپ ﷺ نے اونٹ بطور قرض لیا تھا) ایسا ہی ایک جوان اونٹ دے دوں۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے اس جیسا کوئی اونٹ نظر نہیں آ رہا ہے البتہ ایک اونٹ ہے جو اس کے اونٹ سے اچھا ہے اور سات سال کی عمر کا ہے (لہٰذا میں اس کے اونٹ سے اچھا اونٹ کیسے دیدوں؟) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اسے اچھا ہی اونٹ دے دو کیونکہ لوگوں میں بہترین شخص وہی ہے جو قرض کی ادائیگی میں سب سے اچھا ہو''۔ (مسلم)

تشریح: **بکرا**: باء کے فتحہ اور کاف کے سکون کے ساتھ، جوان اونٹ کو کہتے ہیں، جیسا کہ انسانوں میں غلام ''لڑکا'' ہوتا ہے۔

قال ابو رافع فأمرنی أن قضی الرجل بکره فقلت لا اجد الا جملا خیارا:

کہا جاتا ہے: **جمل خیار وناقة خیارة ای مختارة**

رباعیا : راء کے فتحہ' باء اور یاء کی تخفیف کے ساتھ، وہ اونٹ جس کی عمر چھ سال ہو کر ساتواں سال شروع ہو، اس وقت اس کے رباعی دانت ظاہر ہو چکے ہوتے ہیں۔

قال رسول الله ﷺ اعطه اياه فان خير الناس أحسنهم قضاء :

صاحب شرح السنہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کے تحت چند فقہی مسائل تحریر فرمائے ہیں، جو یہ ہیں:

(۱) امام بادشاہ کیلئے جائز ہے کہ وہ فقراء کیلئے قرض لے جب وہ دیکھے کہ ان کو ضرورت ہے اور پھر اس کو زکوٰۃ کے مال سے اداء کرے اگر وہ قرض محتاجوں تک پہنچا یا ہو۔ (۲) جانور کا قرض لینا جائز ہے اور پھر اس کا قرض دار کے ذمہ میں ثابت ہونا بھی معلوم ہوا۔ یہ اکثر اہل علم کا قول ہے اور یہی امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک ہے۔ (۳) جس نے کوئی چیز قرض لی تو وہ اس کی مثل لوٹائے گا جو اس نے قرض لی تھا، چاہے وہ ذوات القیم میں سے ہو' نبی ﷺ نے اس کا مثل لوٹانے کا حکم دیا تھا۔ (۴) جس نے کوئی چیز بطور قرض کے لی اور پھر اس سے اچھی یا زیادہ لوٹائی بغیر شرط کے تو یہ اچھا ہے، اور قرض خواہ کیلئے یہ حلال ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قرض خواہ کیلئے زیادت جائز ہے چاہے وہ زیادہ صفت کے اعتبار سے ہو یا عدد کے اعتبار سے، اور امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ عدد کے اعتبار سے زیادہ لینا منع ہے' اور ہمارے علماء کی دلیل آپ ﷺ کی اس حدیث کا عموم ہے: "**فان خير الناس احسنهم قضاء**"۔ حدیث میں دلیل ہے کہ قرض میں یا دین میں اچھی چیز لوٹانا سنت ہے اور مکارم اخلاق میں سے ہے، اور یہ اس قرض میں سے نہیں ہے جو: "**كل قرض جر نفعا فهو ربو**" ہو اس لئے کہ زیادہ لینا اس وقت ناجائز ہے جب عقد قرض کے وقت زیادت کی شرط لگائی ہو۔

سوال: اس حدیث میں ایک اشکال ہے کہ وہ صدقات اور زکوٰۃ کی دیکھ بھال کرنے والے کیلئے اس میں سے کوئی چیز بطور تبرع دینا جائز نہیں ہے تو پھر آپ علیہ السلام نے قرض خواہ کو اس کے حق سے بڑھ کر کیسے دیا؟

جواب: یہ ہے کہ آپ علیہ السلام نے یہ اونٹ اپنے لئے قرض لیا تھا اور پھر ادائیگی قرض کیلئے زکوٰۃ کے اونٹوں میں سے ایک اونٹ خریدا، اور قرض اداء کیا۔ اور اس پر ابوہریرہ کی حدیث دلالت کرتی ہے: "**اشتروا له بعيرا فاعطوه اياه**"

اس حدیث میں دلیل ہے ہر قسم کے جانور قرض لینا جائز ہے۔ امام مالک' شافعی اور جمہور علماء سلف وخلف کا مذہب یہی ہے، البتہ باندی کو قرض کے طور پر دینا جائز نہیں ہے۔

اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ جانوروں کا قرض لینا جائز نہیں ہے، اور احادیث صحیحہ اس کے خلاف ہیں اور منسوخ ہونے کا دعویٰ بغیر دلیل کے قبول نہیں۔

اکمل الدین کہتے ہیں کہ اس حدیث سے جانوروں کے قرض لینے کا جواز اور اس کا ذمہ میں ثابت ہونا معلوم ہوتا ہے، اور یہ اکثر علماء کا قول ہے۔ لیکن یہ محل نظر ہے اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ یہ وہ ادائیگی ہو جس کے ساتھ وہ اونٹ خریدا گیا تھا' اس لئے کہ حدیث میں اس بات پر دلیل نہیں ہے کہ یہ اونٹ بطور قرض کے لیا تھا۔

تخریج: امام ابن ماجہ نے حضرت عرباض بن ساریہ سے آخری جملہ یوں روایت کیا ہے: "**خير الناس خيرهم قضاء**"۔

قرض خواہ تقاضا کرسکتا ہے

۲۹۰۶ : وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَجُلاً تَقَاضٰى رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَاَغْلَظَ لَهٗ فَهَمَّ اَصْحَابُهٗ فَقَالَ دَعُوْهُ فَاِنَّ لِصَاحِبِ الْحَقِّ مَقَالاً فَاشْتَرَوْا لَهٗ بَعِيْرًا فَاَعْطُوْهُ اِيَّاهُ قَالُوْا لَا نَجِدُ اِلاَّ اَفْضَلَ مِنْ سِنِّهٖ قَالَ اشْتَرَوْهُ فَاَعْطُوْهُ اِيَّاهُ فَاِنَّ خَيْرَكُمْ اَحْسَنُكُمْ قَضَاءً. (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤/٤٨٣ الحدیث رقم ٢٣٠٦ ومسلم فی ٣/٢٢٥ الحدیث رقم (١٢٠-١٦٠١) والترمذی فی ٣/٦٠٨ الحدیث رقم ١٣١٧ واحمد فی المسند ٢/٤١٦۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے ''قرض کی واپسی کا تقاضا کیا وہ آپ ﷺ سے سخت کلامی سے پیش آیا۔ آپ ﷺ کے صحابہؓ نے (جب اس کو ''اس سخت کلامی اور آدابِ نبوت کے خلاف اس کی حرکت پر) اس کو سزا دینے کا ارادہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اسے چھوڑ دو کیونکہ صاحب حق (قرض خواہ) کو کہنے کا اختیار ہے البتہ ایسا کرو کہ ایک اونٹ خرید کر اسے دے دو (تا کہ اس کا حق ادا ہو جائے اور اسے پھر کچھ کہنے کا اختیار نہ رہے) صحابہؓ نے عرض کیا کہ ''اس نے آپ (ﷺ) کو بطور قرض جو اونٹ دیا تھا) ہم اس کی عمر سے زیادہ عمر کے سوا کوئی اونٹ نہیں پاتے (یعنی اس کا اونٹ چھوٹا اور کمتر تھا اور ہمیں جو اونٹ مل رہا ہے وہ اس کے اونٹ سے بڑا اور اچھا ہے) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا (جو اونٹ تمہیں مل رہا ہے) اسی کو خرید لو (اگر وہ اس کے اونٹ کی بہ نسبت بڑا اور اچھا ہے) اور اسے دے دو' کیونکہ تم میں بہتر وہ شخص ہے جو قرض ادا کرنے میں اچھا ہو''۔

(بخاری و مسلم)

تشریح: **قوله : ان رجلا تقاضٰی رسول الله صلی الله علیه وسلم :** نہایہ میں ہے کہ تقاضٰی کا مطلب ہے کہ آپ ﷺ سے اس چیز کا مطالبہ کیا، اور اپنے دین کے لینے کا ارادہ کیا۔ (انتھیٰ)۔ اور شاید یہ تاخیر اس لئے ہوئی ہو کہ اس جیسا اونٹ یا اس کی قیمت نہیں تھی۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اغلاظ سے مراد یہاں مطالبہ کرنے میں سختی ہے جس میں کوئی بری بات نہ ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ کہنے والا کوئی کافر یا کوئی یہودی۔ وغیرہ ہو۔ اور بعض کہتے ہیں کہ شاید یہ تقاضا کرنے والا گنوار دیہاتی تھا، یا ان لوگوں میں سے تھا جن کے دل میں ایمان ابھی تک راسخ نہیں تھا۔

فهم اصحابه : یعنی ارادہ کیا کہ اس کو ڈانٹا ڈپٹا جائے اور کوئی سزا دی جائے، لیکن آپ آداب کا خیال رکھتے ہوئے انہوں نے ایسا نہیں کیا۔

فان لصاحب الحق مقالا :

ابن الملک فرماتے ہیں کہ یہاں حق سے مراد قرض ہے یعنی اگر کسی شخص کا کسی پر قرض ہو اور وہ ادائیگی قرض میں تاخیر کرے تو قرض خواہ کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اس سے سختی کے ساتھ تقاضا کرے، اس پر اظہار ناراضگی کرے اور حاکم وعدالت کی طرف رجوع کرے۔ اور یہی مراد ہے ''مقال'' اور ''صاحب'' کے اختیار سے۔ (جیسا کہ شرح المشارق میں ہے۔)

شرح مصابیح میں ہے کہ اس حدیث سے جواز معلوم ہوتا ہے صاحب حق قرض دار سے نرمی کے ساتھ بات کرنے کا بجائے سختی سے بات کرے اس طور پر کہ اس پر زبان کھولے اور اس کو ظلم کی طرف منسوب کرے اور ناجائز طریقے سے لوگوں کے مال کھانے کی طرف منسوب کرے جب اس کی طرف سے ٹال مٹول اور مماطلت ثابت ہو جائے۔ (انتھیٰ)

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا تصور آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علاوہ قرض دار کے بارے میں کیا جا سکتا ہے۔ اس حدیث کی بنیاد درحقیقت آپ کی دوسری حدیث ''**مطل الغنی ظلم**'' ہے۔ اور شاید یہ اللہ پاک کے اس ارشاد سے اقتباس ہو: ﴿**لا یحب الله الجهر بالسوء**﴾ الآیۃ (اللہ تعالیٰ بُری بات کو زبان پر لانا پسند نہیں کرتا)۔

قالوا لا نجد الا افضل من سنه : اس کا اونٹ چھوٹا اور بے کار تھا اور جو موجود تھا وہ رباعی اور بہت ہی اچھا تھا۔

اور روایت کیا ہے اس کو طبرانی اور ابن حبان، اور حاکم، بیہقی نے حضرت زید بن سعنہ سے، ''سعنۃ'' عین اور نون کے فتحہ کے ساتھ جیسا کہ اس کو مقید کیا ہے اس کے ساتھ عبدالغنی نے اور دارقطنی نے اس کو یاء کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

اور یہ شخص وہی ہے جیسا کہ امام نوویؒ نے کہا ہے کہ یہود کے بڑے علماء میں سے جنہوں نے اسلام قبول کیا تھا، جس نے کہا تھا کہ علامات نبوت میں سے کوئی چیز ایسی نہیں رہی جس کو میں نے نہ دیکھا سوائے دو علامات کے ان کے بارے میں مجھے خبر نہیں ہو سکی کہ اس کا حلم اور بردباری اس کے غصہ اور جہل سے سبقت کرے گی اور غصہ اور جہل کی زیادتی اس پر زیادہ نہیں کرے گی مگر حلم اور بردباری۔ پس میں آپ کے ساتھ نرمی سے پیش آتا تھا تاکہ میرا آپ کے ساتھ اختلاط ہو اور میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بردباری اور غصہ کو پہچانوں۔ پس میں نے آپ علیہ السلام کے ہاتھ کھجور فروخت کیں ایک مدت تک کے لئے، میں نے کھجور آپ علیہ السلام کو دیدیں اور مدت پوری ہونے سے دو یا تین دن پہلے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، میں آپ کو قمیص کے گریبان اور چادر سے پکڑا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سخت چہرہ سے دیکھا، پھر میں نے کہا کہ اے محمد! کیا تو میرا حق مجھے نہیں دیتا؟ خدا کی قسم تم اے بنی عبد المطلب! ٹال مٹول کرنے والے ہو، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے اللہ کے دشمن کہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہہ رہا ہے جو میں سن رہا ہوں، پس خدا کی قسم اگر نہ ہوتی چیز جس کے فوت ہونے کا مجھے ڈر ہے تو میں تیرے سر کو تلوار کے ساتھ الگ کر دیتا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سکون، محبت اور تبسم سے دیکھ رہے تھے پھر فرمایا: ''کہ میں اور یہ تجھ سے اس کے علاوہ محتاج ہیں اے عمر! کہ تو مجھے اچھی طرح ادائیگی کا حکم دے، اور اس کو اچھی طرح پیچھا کرنے کا، اس کو لے جاؤ اے عمر، اور اس کا قرض ادا کر دے اور اس کو بیس صاع زیادہ دے اس بات کے عوض جو تم نے اس سے پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسا ہی کیا، میں نے کہا اے عمر! جب میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کی طرف دیکھا تو تمام علاماتِ نبوت کو میں نے پہچان لیا، سوائے دو کے جن کی مجھے خبر نہ ہوئی کہ ان کا حلم ان کے غصہ پر سبقت کرے گا اور غصہ اور جہل کی زیادتی اس پر زیادہ نہیں کرے گی، مگر بردباری، پس مجھے ان دونوں کی بھی خبر ہو گئی، پس تو گواہ رہ کہ میں راضی ہوں اللہ کے رب ہونے پر اور اسلام کے دین ہونے پر اور محمدؐ کے نبی ہونے پر۔

اور اس سے بھی زیادہ عجیب وغریب واقعات ہوئے ہیں، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت، کرم اور اپنے نفس اور مال کے بارے میں تکالیف پر صبر اور بردباری کی انتہاء پر دلالت کرتے ہیں' اور ان لوگوں کی جفا اور گنوار پن سے درگزر کرنے پر جن کا ارادہ تھا اسلام سے الفت اور محبت مال کی وجہ سے

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا رہا تھا، اور آپ کے جسم پر نجرانی چادر تھی جس کے کنارے موٹے تھے۔ ایک دیہاتی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو چادر سے پکڑ کر کھینچا، حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ کی گردن کے کنارے کو دیکھا کہ اس پر چادر کے کناروں کے نشانات پڑ گئے تھے زیادہ کھینچنے کی وجہ سے، پھر اس نے کہا اے محمد! حکم دے دمیرے لئے اللہ کے اس مال میں سے جو تیرے پاس ہے، پس آپ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور ہنس پڑے اور اس کو دینے کا حکم دیا۔ (بخاری)

ابو داؤد نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ ایک دن آپ نے ہمیں بیان فرمایا اور پھر کھڑے ہو گئے اور ہم بھی آپ کے ساتھ کھڑے ہو گئے، پس ہم نے دیکھا ایک دیہاتی کو کہ اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پکڑ کر چادر سے کھینچا، آپ کی گردن سرخ ہو چکی تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر کھردری تھی۔ آپ اس کی طرف متوجہ ہو گئے، وہ دیہاتی کہنے لگا' میرے ان دو اونٹوں پر میرے لئے سامان لا ددے' اس لئے کہ تو نہ اپنے مال سے اور نہ اپنے باپ کے مال سے میرے لئے لا دو گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں استغفر اللہ' نہیں استغفر اللہ، میں نہیں لا دوں گا جب تک تو میری گردن کے کھینچنے کا قصاص نہ دے'' اور دیہاتی ہر مرتبہ کہتا تھا کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بدلہ نہیں دوں گا۔ پس حدیث ذکر کی یہاں تک کہ کہا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو بلایا اور اسے کہا کہ ''اس کے اونٹوں پر لا دو' اس کے ایک اونٹ پر کھجور اور ایک پر جو لا دو''۔ اور شفاء کے بہت سے نسخوں میں جوانہ جذبہ بازارہ کے الفاظ ہیں' یہ صحیح نہیں ہے۔

ادائیگی قرض پر قادر ہونے کے باوجود قرض ادا نہ کرنا ظلم ہے

۲۹۰۷: وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ مَطْلُ الْغَنِيِّ ظُلْمٌ فَاِذَا اُتْبِعَ اَحَدُكُمْ عَلٰى مَلِيْءٍ فَلْيَتْبَعْ. (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ٤/٤٦٤ الحديث رقم ٢٢٨٧ ومسلم فی ٣/١١٩٧ الحديث رقم (٣٣-١٥٦٤) وابو داؤد فی السنن ٣/٦٤٠ الحديث رقم ٣٣٤٥ والترمذی فی ٣/٦٠٠ الحديث رقم ١٣٠٨ والنسائی فی ٧/٣١٧ الحديث رقم ٤٦٩١ وابن ماجه فی ٢/٨٠٣ الحديث رقم ٢٤٠٣ والدارمی فی ٢/٣٣٨ الحديث رقم ٢٥٨٦ ومالك الموطأ ٢/٦٧٤ الحديث رقم ٨٤ من كتاب البيوع واحمد فی المسند ٢/٧١۔

ترجمه: ''اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مالدار شخص کا (ادائیگی قرض میں) ٹال مٹول کرنا ظلم ہے اور جب تم میں سے کسی کو کسی مالدار شخص کے پیچھے لگا دیا جائے (تا کہ اس سے قرض وصول کرو) تو اس کے پیچھے لگ جانا چاہیے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: قَالَ مَطْلُ الْغَنِيِّ ظُلْمٌ فَإِذَا أُتْبِعَ أَحَدُكُمْ عَلٰى مَلِيْءٍ فَلْيَتْبَعْ :

''**مطل**'' کہتے ہیں جس کی ادائیگی کا حق ہو اس کی ادائیگی نہ کرنا اور یہ حرام ہے، اگر قادر شخص یوں کرے، اور اگر مالدار ہے لیکن ادائیگی پر قادر نہیں ہے تو اس کیلئے ادائیگی پر قدرت تک تاخیر جائز ہے۔ (اس کو ذکر کیا ہے امام نووی نے) امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ فسق ہے اور اس کی وجہ سے ایسے شخص کی گواہی رد ہو جاتی ہے، اگر چہ یہ نادہندگی ایک ہی مرتبہ کیوں نہ ہو۔ اور بعض کہتے ہیں کہ جب بار بار نادہندگی میں مبتلا ہو، اور یہی قول اولیٰ ہے۔

فاذا اتبع: ہمزہ قطعی کے ضمہ، تاء کے سکون اور باء کے کسرہ کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں ہمزہ وصل، اور تاء مشددہ کے ضمہ کے ساتھ۔

ملیء: میم پر فتحہ، لام پر کسرہ، یاء پر سکون اور اس کے بعد ہمزہ ہے۔ اور ایک نسخہ میں ادغام کے ساتھ ہے، بمعنی مالدار ہے۔ نہایہ میں ہے ''**ملیء**'' ہمزہ کے ساتھ ثقہ مالدار کو کہتے ہیں، اور لوگ اس میں ہمزہ کے ترک اور تاء کی تشدید بہت گرویدہ ہیں۔

فلیتبع: یاء کے فتحہ، تاء کے سکون اور باء کے فتحہ کے ساتھ، اور ایک نسخہ میں تاء کی تشدید اور باء کے کسرہ کے ساتھ ہے، یعنی حوالہ کو قبول کرلے۔ کہا جاتا ہے: **اتبع فلان بفلان**، صیغہ مجہول کے ساتھ، یعنی اس کے حوالے کیا گیا۔ اور اتبع، تاء کی تشدید کے ساتھ کسی کے پیچھے چلا اور اس کی اقتداء کی۔ اور مغرب میں ہے: ''**اتبعت زیدا عمرو فتبعه**، یعنی میں نے اس کو تابع بنایا اور اس پر اس کو ابھارا۔ اور حدیث بھی اسی سے ہے۔ عسقلانی شرح بخاری میں فرماتے ہیں کہ مشہور لغت میں اور روایت میں جیسا کہ امام نووی نے فرمایا ''**اتبع**'' میں تاء کا سکون ہے اور ''**فلیتبع**'' مجہول ہے، جیسے ''**اذا علم فیعلم**'' ہے۔

اور قرطبیؒ فرماتے ہیں ''**اتبع**'' ہمزہ کے ضمہ اور تاء کے سکون کے ساتھ صیغہ مجہول ہے اتفاقاً، اور ''**فلیتبع**'' اکثر کے نزدیک تاء کی تخفیف کے ساتھ ہے اور بعض نے اس کو مقید کیا ہے تشدید کے ساتھ، اور اوّل زیادہ بہتر ہے۔ اور مقدمہ میں کہا ہے کہ پہلے لفظ میں تاء ساکن ہے اور دوسرے میں تشدید کے ساتھ ہے، اور بعض کہتے ہیں دونوں میں سکون کے ساتھ ہے اور علامہ خطابی نے تشدید کو خطا کہا ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ ہمارا اور جمہور علماء کا مذہب یہ ہے کہ یہ حکم استحبابی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ بطریق اباحت ہے اور بعض کہتے ہیں یہ حکم بطریق وجوب ہے۔

قرض خواہ و قرض دار کا تنازعہ ختم کرانا

۲۹۰۸: وَعَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّهٗ تَقَاضٰى ابْنَ اَبِيْ حَدْرَدٍ دَيْنًا لَهٗ عَلَيْهِ فِيْ عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِي الْمَسْجِدِ فَارْتَفَعَتْ اَصْوَاتُهُمَا حَتّٰى سَمِعَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَهُوَ فِيْ بَيْتِهٖ فَخَرَجَ اِلَيْهِمَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ حَتّٰى كَشَفَ سِجْفَ حُجْرَتِهٖ وَنَادٰى كَعْبَ بْنَ مَالِكٍ قَالَ يَا كَعْبُ قَالَ لَبَّيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَاَشَارَ بِيَدِهٖ اَنْ ضَعِ الشَّطْرَ مِنْ دَيْنِكَ قَالَ كَعْبٌ قَدْ فَعَلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ قُمْ فَاقْضِهٖ. (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱/۵۵۱ الحدیث رقم ٤٥٧ ومسلم فی صحیحه ۳/۱۱۹۲ الحدیث رقم (۲۰۔۱۵۵۸) وابوداوٗد فی السنن ٤/۲۰ الحدیث رقم ۳۵۹۵ والنسائی فی ۸/۳۳۵ الحدیث رقم ۵٤۰۸ وابن ماجه فی ۲/۸۱۱ الحدیث رقم ۲٤۲۹ واحمد فی المسند ٦/۳۹۰۔

ترجمہ: ''اور حضرت کعب بن مالکؓ کے بارے میں منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں (ایک دن) انہوں نے مسجد میں ابن ابی حدرد رضی اللہ عنہ سے اپنے قرض کی واپسی کا تقاضا کیا تو ان دونوں کی آوازیں بلند ہوئیں یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ نے جو اس وقت اپنے حجرہ مبارک میں تشریف فرما تھے۔ان دونوں کی آوازیں سنیں تو رسول اللہ ﷺ نے حجرہ سے باہر آنے کا ارادہ فرمایا' چنانچہ آپ ﷺ نے اپنے حجرہ کا پردہ ہٹایا اور کعب بن مالک کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ''اے کعب! کعب بن مالک نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میں حاضر ہوں'' آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ کے ذریعے ان کی طرف اشارہ کیا کہ اپنے قرض کا نصف حصہ معاف کر دو۔کعب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ ''یا رسول اللہ ﷺ! میں نے معاف کر دیا''۔اس کے بعد آپ ﷺ نے (ابن ابی حدرد رضی اللہ عنہ سے) فرمایا کہ ''کھڑے ہو جاؤ اور باقی قرض ادا کر دو''۔(بخاری)

تشریح: حدرد : حاء کے فتحہ اور دال کے سکون کے ساتھ۔

فار تفعت اصواتهما : ''اصوات'' کی جمع یہ اپنی پر حقیقت پر ہے نہ کہ [**صفت قلوبکما**] کے قبیل سے ہے جیسا کہ بعض کو وہم ہے،اس لئے کہ مراد ان کے کلمات اور اقوال کی آوازیں ہیں۔

حتی سمعارسول الله صلی الله علیه وسلم : '' حتّٰی ''غایت ہے آوازوں کی بلندی کیلئے۔

فی بیته : جملہ حالیہ ہے۔ **سجف**، سین کے کسرہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ ہے اور جیم کے سکون کے ساتھ دونوں لغتیں ہیں اور اوّل زیادہ صحیح ہے، پردے کو کہتے ہیں' بعض کہتے کہ پردے کی ایک طرف کو کہتے ہیں،اور راوی فرماتے ہیں کہ **سجف** دروازے کو کہتے ہیں۔اور بعض کہتے ہیں کہ ''سجف'' اس پردے کو کہتے ہیں جس کے درمیان میں شق ہو جیسے پٹ ہوتے ہیں۔

قال یا کعب : بیان نداء کیلئے استیناف ہے۔اور نداء سے مقصود بات قبول کرنے کیلئے توجہ دلانا تھا۔''**یا رسول الله**'' یہ حکم پورا کرنے میں مبالغہ ہے۔

قم فا قضه اور ایک نسخہ میں ھاء سکتہ کے ساتھ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کمی کرنا اور تاخیر کرنا، دونوں جمع نہیں ہو سکتے۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا: (۱) مسجد میں کسی سے اپنے قرض کی واپسی کا مطالبہ کرنا جائز ہے۔ (۲) حقدار سے سفارش کرنا جائز ہے۔(۳) جھگڑنے والوں میں صلح صفائی کرانا، ان کے درمیان اچھا واسطہ اور ثالث بننا چاہئے۔(۴) کسی کی سفارش قبول کرنا، بشرطیکہ اس سفارش کا تعلق کسی معصیت سے نہ ہو، جائز ہے۔(۵) اشارہ پر اعتماد کرنا اور اس کو قول کے قائم مقام بنانا جائز ہے جیسا کہ یہاں ہے:**فاشار بیده ان اضع الشطر**،اسلئے کہ حدیث میں اسکی تفسیر ہے کہ اشارہ میں قول کا معنی ہے۔

ادائیگی قرض میں تاخیر کرنے والوں کیلئے ایک عبرتناک واقعہ

۲۹۰۹:وَعَنْ سَلْمَةَ بْنِ الْاَکْوَعِ قَالَ کُنَّا جُلُوْسًا عِنْدَ النَّبِیِّ ﷺ اِذَا اُتِیَ بِجَنَازَۃٍ فَقَالُوْا صَلِّ عَلَیْهَا فَقَالَ هَلْ عَلَیْهِ دَیْنٌ قَالُوْا لَا فَصَلّٰی عَلَیْهَا ثُمَّ اُتِیَ بِجَنَازَۃٍ اُخْرٰی فَقَالَ هَلْ عَلَیْهِ دَیْنٌ قِیْلَ نَعَمْ قَالَ فَهَلْ تَرَکَ شَیْئًا قَالُوْا ثَلَاثَةَ دَنَانِیْرَ فَصَلّٰی عَلَیْهَا ثُمَّ اُتِیَ بِالثَّالِثَةِ فَقَالَ هَلْ عَلَیْهِ دَیْنٌ قَالُوْا ثَلَاثَةُ دَنَانِیْرَ قَالَ هَلْ تَرَکَ شَیْئًا قَالُوْا لَا قَالَ صَلُّوْا عَلٰی صَاحِبِکُمْ قَالَ اَبُوْ قَتَادَةَ صَلِّ عَلَیْهِ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَعَلَیَّ دَیْنُهٗ فَصَلّٰی عَلَیْهِ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤/٤٦٦ الحدیث رقم ٢٢٨٩ و ابو داؤد فی السنن ٣/٦٣٨ الحدیث رقم ٣٣٤٣

ترجمہ: ''اور حضرت سلمہ بن اکوع کہتے ہیں کہ ہم لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے تھے کہ ایک جنازہ لایا گیا' صحابہؓ نے (آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے) عرض کیا کہ جنازہ کی نماز پڑھ لیجئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا اس میت کے ذمہ قرض ہے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ نہیں! چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نماز جنازہ پڑھی۔ پھر ایک اور جنازہ لایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''کیا اس میت کے ذمہ قرض ہے؟'' عرض کیا گیا ''ہاں'' ہے! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا اس نے کوئی چیز بطور ترکہ چھوڑی ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ''تین دینار اس نے چھوڑے ہیں'' (یہ سن کر) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نماز جنازہ پڑھی! پھر ایک تیسرا جنازہ لایا گیا' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''کیا اس میت کے ذمہ قرض ہے؟'' صحابہ نے عرض کیا کہ ''ہاں تین دینار اس پر قرض ہیں''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا اس نے کوئی چیز بطور ترکہ چھوڑی ہے؟'' صحابہ نے عرض کیا کہ ''کچھ نہیں''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تو پھر تم اپنے ساتھی کی نماز جنازہ پڑھ لو''۔ ابو قتادہؓ نے (جب یہ سنا تو) کہا کہ ''یا رسول اللہ! آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کی نماز جنازہ پڑھا دیجئے اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمہ ہے (یعنی میں اس کا قرض ادا کر دونگا) تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نماز جنازہ پڑھی''۔ (بخاری)

تشریح: **جلوسا :** مصدر بمعنی للفاعل ہے۔ ای جالسین یا مضاف محذوف ہے۔ **ای ذوی جلوس۔**

هل علیه دین : یعنی حقوق العباد میں سے کوئی مالی حق تو نہیں ہے۔

فصلی علیها : اور ایک نسخہ میں **علیه** ہے۔

ابن الملک فرماتے ہیں کہ اللہ پاک نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو الہام کر دیا کہ اس نے جو مال چھوڑا ہے وہ اس کے قرض کی ادائیگی کیلئے کافی ہے یا اس سے زیادہ ہے۔ (انتہیٰ)

سوال کرنے سے مراد یہ نہیں تھا کہ کیا اس نے اتنا مال چھوڑا ہے جس سے اس کا قرض پورا اداء ہو جائے گا اس لئے کہ اگر ایسا ہوتا تو وہ جواب دیتے ''نعم'' ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر وہ مقدار مسطور دین مذکور سے زیادہ تھی تو پھر یہ جواب من اسلوب الحکیم کی ایک نوع ہوگا۔

ثم اتی بالثالثة : ہوسکتا ہے یہ تینوں جنازے ایک ہی دن اور ایک ہی مجلس میں لائے گئے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ الگ الگ دن اور الگ الگ مجلس میں لائے گئے ہوں، اور راوی نے درایت کی وضاحت کے لئے۔ سب کو جمع کیا ہے روایت میں

قالوا لا : اس میں دو احتمال ہیں ایک تو یہ کہ اس نے کچھ بھی نہ چھوڑا ہو اور دوسرا یہ کہ چھوڑا ہو لیکن قرض کیلئے کافی نہ ہو۔

قال :صلوا علی صاحبکم : اس سے معلوم ہوا کہ نماز جنازہ فرض کفایہ ہے۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قرض دار کی کیا جس نے اتنا مال بھی نہیں چھوڑا تھا جس سے اس کا قرض اداء ہو پر کی کیا شاید اس وجہ سے ہو کہ لوگوں کو قرض لینے سے ڈرانا مقصود ہو اور اگر بدرجہ مجبوری قرض لیں تو اس کی ادائیگی میں تأخیر و تقصیر سے باز رہیں، یا اس وجہ سے کہ میں اس کیلئے دعا کروں اور دعاء قبول نہ ہو کیونکہ اس پر لوگوں کا حق تھا، اور اس نے لوگوں پر مظالم کئے تھے۔

قال ابو قتادة صل علیه یا رسول الله و علی دینه : شرح السنہ میں ہے کہ اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ میت کی طرف سے ضامن ہونا جائز ہے خواہ میت نے ادائیگی قرض کیلئے مال چھوڑا ہو یا نہ چھوڑا ہو، چنانچہ امام شافعی اور اکثر علماء کا یہی مسلک ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ کفالت صحیح نہیں ہے۔ اور یہ اتفاقی مسئلہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی آزاد تنگدست شخص کی طرف سے ضامن بنا اور پھر وہ قرض دار مر گیا تو یہ ضمان اپنے حال پر رہے گا، تو جب تنگدست کی موت دوام ضمان کے منافی نہیں تو ابتداء بھی اس کے منافی نہیں۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ حدیث سے استدلال کرنا اس قیاس سے اولیٰ ہے۔ ہمارے بعض علماء کہتے ہیں کہ امام مالک، امام شافعی، امام احمد، اور امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ نے اس حدیث سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ اس میت کی طرف سے کفالت جائز ہے

جس نے کچھ بھی مال نہ چھوڑا ہو اور اس پر قرض ہو، یہ حضرات کہتے ہیں کہ اگر میت کی طرف سے کفالت جائز نہ ہوتی تو نبی ﷺ اس میت پر جنازہ نہ پڑھتے،

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مفلس میت کی طرف سے کفالت صحیح نہیں ہے، کیونکہ مفلس میت کی طرف سے کفالت دراصل دین ساقط کی کفالت ہے اور یہ بالکل صاف مسئلہ ہے کہ دین ساقط کی کفالت باطل ہے۔ اور حدیث میں اس بات کا بھی احتمال ہے کہ حضرت ابوقتادہ نے سابقہ کفالت کا اقرار کیا ہو، اس لئے کہ لفظ اقرار اور انشاء کفالہ میں برابر ہیں۔ اور حکایت فعل میں عموم نہیں ہے، اور یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت ابوقتادہؓ نے میت کی طرف سے کفالت نہ لی ہو بلکہ از راہِ احسان قرض اداء کرنے کا وعدہ کیا ہو۔ اور آپ ﷺ کا اس پر نماز جنازہ پڑھانے سے انکار بھی اس لئے تھا' تا کہ اس کے قرض کی ادائیگی کی کوئی صورت پیدا ہو جائے، جب یہ صورت ظاہر ہوئی، تو تب آپ ﷺ نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔

قرض کو ادا کرنے کی نیت رکھنے والے کی اللہ تعالیٰ مدد کرتا ہے

۲۹۱۰: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ مَنْ اَخَذَ اَمْوَالَ النَّاسِ يُرِيْدُ اَدَاءَ هَا اَدَّى اللّٰهُ عَنْهُ وَمَنْ اَخَذَ يُرِيْدُ اِتْلَافَهَا اَتْلَفَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٥/٥٣ الحدیث رقم (٢٣٨٧ واحمد فی المسند ١/٣٦١۔

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص لوگوں کا مال لے اور اس کے ادا کرنے کا ارادہ بھی رکھتا ہو (یعنی کسی ضرورت و احتیاج کی بناء پر لوگوں سے قرض لے اور قرض کی ادائیگی کا ارادہ بھی رکھتا ہو اور اس کو ادا کرنے کی کوشش بھی کرتا ہو) تو اللہ تعالیٰ اس سے وہ مال ادا کرا دیتا ہے (یعنی قرض کو ادا کرنے کی نیت رکھنے والے کی اللہ تعالیٰ مدد فرماتا ہے بایں طور کہ یا تو دنیا میں قرض ادا کرنے کی استطاعت دے دیتا ہے یا آخرت میں حقدار کو راضی کر دیتا ہے) اور جو شخص لوگوں کا مال لے اور اس کو ضائع کرنے کا ارادہ رکھتا ہو (یعنی احتیاج و ضرورت کے بغیر کسی سے قرض لے اور پھر اس قرض کی ادائیگی کی نیت بھی نہ رکھتا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے مال کو ضائع فرما دیتا ہے (یعنی جو شخص کسی سے قرض لے اور اس قرض کو نہ ادا کرے اور نہ ادا کرنے کی نیت رکھے تو اللہ تعالیٰ نہ صرف یہ کہ ادائیگی قرض پر اس کی مدد نہیں فرماتا اور اس کے رزق میں وسعت و فراخی عطا نہیں فرماتا بلکہ اس کا مال تلف و ضائع بھی کر دیتا ہے کیونکہ وہ ایک مسلمان کا مال ضائع کرنے کی نیت رکھتا ہے)''۔ (بخاری)

تشریح: **قوله: قال من اخذ اموال الناس یرید اداء ها:** یعنی کسی ضرورت و احتیاج کی بناء پر قرض لے اور اس کی ادائیگی کا ارادہ بھی رکھتا ہو اور اس کو اداء کرنے کی کوشش بھی کرتا ہو۔

ادی اللّٰہ عنه: یعنی اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرتا ہے، بایں طور کہ یا تو دنیا میں اس کو اداء کرنے کی استطاعت دیتا ہے یا آخرت میں حقدار کو راضی کر دیتے ہیں۔

و من اخذ یرید اتلافها: یعنی بغیر ضرورت کے قرض لے اور اس کی ادائیگی کی نیت نہ رکھتا ہو۔

اتلفه اللّٰه علیه: یعنی نہ تو اللہ اس کی مدد کرتا ہے اور نہ اس کے رزق میں وسعت اور فراخی عطاء کرتا ہے، بلکہ اس کے مال کو ضائع کر دیتا ہیں کیونکہ وہ ایک مسلمان کے مال کو ضائع کرنے کی نیت رکھتا ہے۔ اور ایک مطلب یہ ہے کہ (یہاں مضاف محذوف ہے' یعنی اللہ تعالیٰ اس کا مال تلف کر دیتا ہے۔

اتلفه اس لئے کہا ہے کہ مال کا تلف ہونا جان کے تلف ہونے کی طرح ہے' زیادت زجر کیلئے'' **اتلف**'' کہا ہے اس لئے کہ ''**اتلف**'' کا معنی ہے **اهلك**، (ہلاک کرنا) یہ جملہ جزائیہ ہے اور اس سے پہلا جملہ خبریہ ہے لفظاً و معنیً اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ جملہ انشائیہ ہو معنیً اور اس کو اس کیلئے بطور دعاء کے لایا گیا ہو۔

تخریج: اسی طرح احمد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے جیسا کہ جامع صغیر میں ہے لیکن اس میں لفظ "علیہ" نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ حقوق العباد معاف نہیں کرتا

۲۹۱۱: وَعَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ قَالَ قَالَ رَجُلٌ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَرَاَیْتَ اِنْ قُتِلْتُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ صَابِرًا مُحْتَسِبًا مُقْبِلاً غَیْرَ مُدْبِرٍ یُکَفِّرُ اللّٰهُ عَنِّیْ خَطَایَایَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ نَعَمْ فَلَمَّا اَدْبَرَ نَادَاهُ فَقَالَ نَعَمْ اِلاَّ الدَّیْنَ کَذٰلِكَ قَالَ جِبْرِیْلُ. (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۳/۱۵۰۱ الحدیث رقم (۱۱۷۔۱۸۸۵) والترمذی فی السنن ٤/۱۸٤ الحدیث رقم ۱۷۱۲ والنسائی فی ٦/۳٤ الحدیث رقم ۳۱۵٦ والدارمی فی ۲/۲۷۳ الحدیث رقم ۲٤۱۲ ومالك فی المطا ۲/٤٦۱ الحدیث رقم ۳۱ من کتاب الجهاد واحمد فی المسند ۵/۲۹۷۔

ترجمہ: "اور حضرت ابوقتادہؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے بتایئے اگر میں اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں اس حال میں کہ میں صبر کرنے والا اور ثواب کی امید رکھنے والا ہوں (یعنی میں ریا کاری کی غرض سے نہیں بلکہ محض اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کی خاطر اور ثواب کی طلب میں اللہ کی راہ میں جہاد کروں) اور اس طرح جہاد کروں کہ میدانِ جنگ میں دشمن کو پیٹھ نہ دکھاؤں بلکہ ان کے سامنے سینہ سپر رہوں (یہاں تک کہ میں لڑتے لڑتے شہید ہو جاؤں) تو کیا اللہ تعالیٰ میرے گناہوں کو معاف فرما دے گا؟ رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا کہ "ہاں!" پھر جب وہ شخص (اپنے سوال کا جواب پا کر) واپس ہوا تو آپ ﷺ نے اسے آواز دی اور فرمایا کہ "ہاں! (اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ یقیناً معاف کر دے گا) مگر قرض کو معاف نہیں کرے گا' مجھ سے جبرئیل علیہ السلام نے اسی طرح کہا ہے"۔ (مسلم)

تشریح: قال: "قال" کے تکرار کے ساتھ ہے، تصحیح شدہ نسخہ میں یعنی **قال ابو قتادة قال**۔

غیر مدبر: حال مؤکدہ ہے اور مترادف میں پختگی اور مضبوطی پیدا کرنے کیلئے ہے، جیسا یہ قول ہے: **امس الدابر لایعود**۔

یکفر عنی خطایای: ہمزہ استفہام کے حذف کے ساتھ ہے۔

فقال نعم الا الدین: استثناء ہے اس سے جو "نعم" کے ساتھ ثابت ہو چکا ہے یعنی **ای نعم یکفر اللہ خطایاك الا الدین**۔ دین خطایا کے جنس میں سے نہیں ہے تو پھر اس کو اس سے کیسے مستثنیٰ کیا گیا؟ جواب یہ ہے کہ یہ مستثنیٰ منقطع ہے **لکن الدین لم یکفر** ہے اس لئے کہ یہ حقوق العباد میں سے ہے، پس جب اس کو اداء کرے گا یا خصم کو راضی کرے گا تو اس کے ذمہ سے بری ہو گا۔

اور احتمال یہ بھی ہے کہ مستثنیٰ متصل ہو اور مضاف محذوف ہوا: "**الا خطیئة الدین**" یا اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے باب سے ﴿**یوم لا ینفع مال ولا بنون الا من اتی اللہ بقلب سلیم**﴾۔ پس جنس خطیئة کے افراد دو قسم کے ہیں: (۱) متعارف (۲) غیر متعارف، تو استثناء کے ذریعے ایک قسم نکل گئی، یہ مبالغہ ہے قرض لینے سے ڈرانے میں اور اس کی ادائیگی میں تاخیر اور تقصیر سے زجر ہے۔

فوائد حدیث: اشرف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس حدیث سے معلوم ہوا:

(۱) حقوق اللہ میں آسانی ہے کہ اللہ اپنے حقوق معاف فرما دیتے ہیں۔ (۲) حقوق العباد کا مسئلہ بڑا سخت اور کٹھن ہے۔ (۳) جبرئیل آپ علیہ السلام تک قرآن کے علاوہ بھی اللہ کے پیغامات پہنچاتے تھے۔

۲۹۱۲: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ یُغْفَرُ لِلشَّهِیْدِ کُلُّ ذَنْبٍ اِلاَّ الدَّیْنُ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه فی صحیحه ۳/۱۵۰۲ الحدیث رقم (۱۱۹۔۱۸۸٦)۔

ترجمہ: ''اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: شہید کے تمام (صغیرہ اور کبیرہ) گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں سوائے قرض کے (یعنی حقوق العباد) کی معافی نہیں ہوتی''۔ (مسلم)

تشریح: عبد الله بن عمرو : ''عمرو'' واؤ کے ساتھ ہے۔

''دین'' سے مراد حقوق العباد ہیں، خواہ اس کے ذمہ کسی کا مال ہو، یا اس نے کسی کا ناحق خون کیا ہو یا کسی کی آبروریزی کی ہو، تو یہ شہادت سے معاف نہیں ہوتے جیسا کہ بعض شراح نے اس کو ذکر کیا ہے۔

ابن الملک فرماتے ہیں کہ بعض علماء کا یہ قول ہے کہ اس حدیث کا تعلق بری جنگ کے شہداء سے ہے، کیونکہ ابن ماجہ نے ابوامامہ کی یہ مرفوع روایت نقل کی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا:

''بحری جنگ میں شہید ہونے والوں کے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں حتیٰ کہ دین بھی بخش دیا جاتا ہے۔''

قرضدار کی جنازہ پڑھنے سے آنحضرت ﷺ کا اجتناب

۲۹۱۳: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یُؤْتٰی بِالرَّجُلِ الْمُتَوَفّٰی عَلَیْهِ الدَّیْنُ فَیَسْئَالُ هَلْ تَرَكَ لِدَیْنِهٖ قَضَاءً فَاِنْ حُدِّثَ اَنَّهٗ تَرَكَ وَفَاءً صَلّٰی وَاِلَّا قَالَ لِلْمُسْلِمِیْنَ صَلُّوْا عَلٰی صَاحِبِكُمْ فَلَمَّا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَیْهِ الْفُتُوْحَ قَامَ فَقَالَ اَنَا اَوْلٰی بِا لْمُؤْ مِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ فَمَنْ تُوُفِّیَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فَتَرَكَ دَیْنًا فَعَلَیَّ قَضَاؤُهٗ وَمَنْ تَرَكَ مَالاً فَهُوَ لِوَرَثَتِهٖ. (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤/٤٧٧ الحدیث رقم ٢٢٩٨ ومسلم فی ٣/١٢٣٧ الحدیث رقم (٤-١٦١٩) وابو داوٗد فی السنن ٣/٦٣٨ الحدیث رقم ٣٣٤٣، والترمذی فی السنن ٣/٣٨٢ الحدیث رقم ١٠٧٠ والسنائی فی ٤/٦٦ الحدیث رقم ١٩٦٣ وابن ماجه فی ٢/٨٠٧ الحدیث رقم ٢٤١٥ واحمد فی المسند ٢/٤٥٣۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کے سامنے کسی ایسے شخص کا جنازہ لایا جاتا جس پر قرض ہوتا تو آپ ﷺ پہلے پوچھتے کہ کیا یہ شخص اپنا قرض ادا کرنے کے لئے کچھ مال چھوڑ کر مرا ہے؟ اگر یہ بتایا جاتا کہ یہ شخص اتنا مال چھوڑ کر مرا ہے جس سے اس کا قرض ادا ہو سکتا ہے تو آپ ﷺ اس کی نماز جنازہ پڑھ لیتے ورنہ مسلمانوں سے فرماتے کہ تم اپنے ساتھی کی نماز جنازہ پڑھ لو۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر فتوحات کے دروازے کھول دیئے (اور مشرکین وکفار سے جنگ کے بعد غنیمت کی صورت میں مال وزر میں وسعت وکشادگی نصیب ہوئی تو) آپ ﷺ (ایک دن) خطبہ کے لئے کھڑے ہوئے اور (مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے) فرمایا کہ میں (دین ودنیا کے تمام امور میں) مسلمانوں پر ان کی جانوں سے زیادہ حق رکھتا ہوں لہٰذا جو مسلمان اس حالت میں مرے کہ اس کے ذمہ قرض ہو (اور اس نے اتنا مال نہ چھوڑا ہو جس سے اس کا قرض ادا ہو سکے) تو اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمہ ہے اور جو شخص مال چھوڑ کر مرا (تو اس مال سے اس کا قرض ادا کرنے کے بعد جو کچھ بچے) وہ اس کے ورثاء کا حق ہے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: **علیه الدین** : جملہ حالیہ ہے۔ **حدث** : صیغہ مجہول کے ساتھ بمعنی اخبر ہے۔ **انه ترك وفاء صلی** : ایک نسخہ میں ''علیه'' ہے۔ **والا** : اس میں گزرے ہوئے دونوں احتمال ہے۔

فقال انا اولٰی بالمؤمنین من انفسهم : یہ حدیث مبارکہ درحقیقت اللہ جل شانہ کے اس ارشاد گرامی سے اقتباس ہے: ﴿النبی اولٰی بالمؤمنین من انفسهم﴾ [الاحزاب-٨] یعنی دین ودنیا کے تمام امور میں مسلمانوں پر ان کی جانوں سے زیادہ حق رکھتا ہوں۔

اسی لئے کہ اس کو مطلق ذکر کیا مقید نہیں کیا، پس مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کو اپنی جانوں سے زیادہ محبوب رکھیں

آپ ﷺ کے حکم اور آپ ﷺ کی خواہش، اپنے نفس کے حکم اور اپنے نفس کی خواہش پر مقدم رکھیں، اور آپ ﷺ کے حق کو اپنی جانوں کے حق سے مقدم جانیں، اور ان کے قلوب اپنی جانوں کی محبت وشفقت سے زیادہ آنحضرت ﷺ کی شفقت ومحبت سے لبریز ہوں۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ کی شان رحمت بھی یہی ہے کہ ایک مسلمان اپنی ذات پر جتنا شفیق ومہربان ہوسکتا ہے، آنحضرت ﷺ اس کے حق میں اس سے کہیں زیادہ شفیق ومہربان ہیں، پس جب آپ کے پاس غنیمت کا مال حاصل ہوا تو آپ ﷺ زیادہ حق دار تھے ان کے قرضوں کی اداء کرنے کے۔

فمن توفی: ماقبل کا مسبب ہے، یعنی جو مر گیا۔ اس مسئلہ میں علماء کی مختلف آراء ہیں۔

پہلی رائے: بعض حضرات تو یہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ مردوں کے قرض کی ادائیگی بیت المال سے فرمایا کرتے تھے، اور یہی بات زیادہ قرین قیاس ہے۔

بعض علماء کا قول یہ ہے کہ آپ ان کا قرض اپنے مال میں سے اداء کرتے تھے۔

اسی طرح بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ قرض کی ادائیگی آپ ﷺ پر واجب تھی۔

بعض کہتے ہیں کہ آپ تبرعاً قرض اداء کرتے تھے۔ یہ دونوں قول پہلے دو قولوں پر متفرع ہیں۔

الفصل الثانی:

دیوالیہ کا حکم

۲۹۱۴: عَنْ اَبِیْ خَلْدَةَ الزُّرَقِیِّ جِئْنَا اَبَا هُرَیْرَةَ فِیْ صَاحِبٍ لَّنَا قَدْ اَفْلَسَ فَقَالَ هٰذَا الَّذِیْ قَضٰی فِیْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَیُّمَا رَجُلٍ مَاتَ اَوْ اَفْلَسَ فَصَاحِبُ الْمَتَاعِ اَحَقُّ بِمَتَاعِهٖ اِذَا وَجَدَهٗ بِعَیْنِهٖ۔ (رواه الشافعی وابن ماجه)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳/۷۹۳ الحدیث رقم ۳۵۲۳ وابن ماجه فی ۲/۷۹۰ الحدیث رقم ۲۳۶۰

ترجمہ: ''حضرت ابوخلدہ زرقی کہتے ہیں کہ ہم حضرت ابو ہریرہؓ کے پاس اپنے ایک ایسے ساتھی کا معاملہ لے کر آئے جو مفلس ہو گیا تھا (مگر اس کے پاس لوگوں کا وہ سامان موجود تھا جس کی قیمت اس نے ادا نہیں کی تھی۔ ہم نے حضرت ابو ہریرہؓ سے پوچھا کہ اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟) حضرت ابو ہریرہؓ نے ارشاد فرمایا کہ اس شخص کا معاملہ بالکل اس شخص جیسا ہے جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے یہ فیصلہ صادر فرمایا تھا کہ جو شخص مر جائے یا مفلس ہو جائے (اور اس کے ذمے لوگوں کے حقوق ہوں) تو مال کا مالک اس مال کا زیادہ حقدار ہے جبکہ وہ مال کو بالکل اسی حالت میں پائے بشرطیکہ وہ مال جوں کا توں موجود ہے۔ اس کی وضاحت کے لئے اسی باب کی پہلی فصل میں حدیث نمبر ا دیکھئے''۔ (شافعی، ابن ماجہ)

حالاتِ راوی:

ابوخلدۃ۔ ابوخلدہ خالد بن دینار تمیمی سعدی بصری ہیں جو درزی کا کام کرتے تھے۔ ''خلدہ'' خائے معجمہ کے فتحہ، اور لام کے سکون کے ساتھ ہے۔ ''زرقی'' میں زائے معجمہ کے ضمہ، رائے مہملہ کے فتحہ اور قاف کے ساتھ ہے۔ انصار کے ایک بطن بنوزریق کی طرف منسوب ہے۔ ثقات تابعین میں سے ہیں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں ان سے وکیع رحمہ اللہ وغیرہ نے روایت کی ہے۔ ''خلدہ'' خائے معجمہ کے فتحہ اور لام کے سکون کے ساتھ ہے۔

الزرقی: زاء پر ضمہ، راء کے فتحہ اور اس کے بعد قاف ہے۔ بنی زریق کی طرف نسبت ہے جو انصار میں سے ایک قبیلہ ہے۔

تشریح: قضی فیه رسول الله صلی الله علیه وسلم: پھر اس معاملہ اور شان کی تفسیر کی اپنے اگلے جملے میں فرمائی۔

ایما رجل مات او ...... اشرفؒ کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ بعینہٖ ایسا فیصلہ آپ ﷺ نے کسی شخص کے بارے میں کیا تھا بلکہ مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فیصلہ کیا ہے ہر اس شخص کے بارے میں جس کی افلاس میں حالت یہ ہو۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ ممکن ہے مشار الیہ الامر والشان ہو اور اسکی تائید **ایما رجل**... سے بھی ہوتی ہے، اس لئے کہ یہ بیان ہے اور مبہم کیلئے بطور استیناف کے ہے اور اسی طرح اسکی تائید اس قول سے بھی ہوتی ہے: **جئننا فی صاحب لنا ای فی شان صاحب لنا۔**

"**بعینہ**" : "**وجدہ**" بمعنیٰ "علم" کا مفعول ثانی نہیں ہے، پس یہ حال ہے۔ **ای صادفہ حاضرا بعینہٖ** اور اس پر تفصیلی کلام "باب الافلاس" کے شروع میں ہو چکا ہے۔

قرض دار کی روح قرض کی ادائیگی تک معلق رہتی ہے

۲۹۱۵: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ نَفْسُ الْمُؤْمِنِ مُعَلَّقَةٌ بِدَیْنِهٖ حَتّٰی یُقْضٰی عَنْهُ.

(رواہ الشافعی واحمد والترمذی وابن ماجۃ والدارمی)

اخرجہ الترمذی فی السنن ۳/۳۸۹ الحدیث رقم ۱۰۷۸ واھن ماجہ فی ۲/۸۰۶ الحدیث رقم ۲۴۱۳ والدار می فی ۲/۳۴۰ الحدیث رقم ۲۵۹۱ واحمد فی المسند ۲/۴۴۰

ترجمہ: "اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مؤمن کی روح اپنے قرض کی وجہ سے اس وقت تک معلق رہتی ہے جب تک کہ اس کا قرض اس کی طرف سے ادا نہ کر دیا (یعنی جب کوئی شخص مقروض ہونے کی حالت میں قرض دار مرتا ہے تو اس کی روح اس وقت تک بندگانِ صالح کی ارواح کی جماعت میں داخل نہیں ہوتی جب تک کہ اس کا قرض اس کی طرف سے ادا نہ کر دیا جائے"۔ (شافعی، احمد، ابن ماجہ، دارمی)

تشریح: **حتٰی یقضٰی عنہ** : صیغہ مجہول کے ساتھ،

مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے مقصد کے ساتھ کامیاب نہیں ہوتا جنت میں داخل ہونے یا اونچے مرتبہ تک پہنچنے یا بندگان صالح کی جماعت میں داخل کے ساتھ اور اس کی تائید آنے والے حدیث "**یشکو الی ربہ الوحدۃ**" سے ہوتی ہے۔ یا اس کی روح لذت نہیں پائے گی جب تک اس پر قرض ہو۔

پھر علماء کہتے ہیں کہ قرض دار جس کو جنت سے روکا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ قرض اداء ہو جائے۔ یہ وہ قرض دار ہے جس نے قرض لے کر بیوقوفی اور اسراف میں خرچ کیا ہو، ہاں جس شخص نے حقوق واجبہ کی تکمیل کیلئے قرض لیا ہو جیسا کہ فاقہ ہے اور قرض اداء کرنے کیلئے کچھ مال نہ چھوڑا ہو، تو اللہ اس کو جنت سے نہیں روکے گا انشاء اللہ۔ اس لئے کہ سلطان وقت کا یہ اخلاقی فریضہ ہے کہ وہ اس کا قرض اداء کرے اور اگر اس نے اداء نہیں کیا، تو پھر اللہ پاک اس کا قرض اداء کر دے گا، قرض خواہوں کو راضی کر دیگا، اس لئے کہ ابن ماجہ نے مرفوع روایت نقل کی ہے:

قرض دار سے بدلہ لیا جائے گا قیامت کے دن مگر جس نے تین خصلتوں کی وجہ سے قرض لیا ہو: ایک وہ آدمی جو اللہ کے راستہ (جہاد) میں ہو اور اس کی قوت کمزور ہو رہی ہو اور اس نے قرض لیا تا کہ اس کی قوت دشمن کے مقابلے میں بڑھ جائے۔ اور ایک وہ آدمی کہ جس کے پاس کوئی مسلمان مر رہا ہو اور اس کے پاس اتنا مال نہ ہو جس سے اس کی تجہیز و تکفین کر سکے، بغیر قرض کے۔ اور ایک وہ آدمی جس کو گناہ میں پڑنے کا خطرہ ہو اور وہ قرض لیکر نکاح کر دیتا ہے، اپنے دین پر ڈرنے کی وجہ سے۔ تو اللہ پاک ان سب کی طرف سے ان کا قرض قیامت کے دن اداء کر دے گا۔ (جیسا کہ اس کو ذکر کیا ہ ابن الملک نے شرح المشارق میں۔)

قولہ :رواہ الشافعی واحمد وابن ماجہ والدارمی :

ایک نسخہ میں ہے:"وقال الترمذی هذا حدیث غریب"۔اس کو امام حاکم نے اپنی مستدرک میں روایت کیا ہے۔

۲۹۱۶:وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ صَاحِبُ الدَّيْنِ مَاْسُوْرٌ بِدَيْنِهٖ يَشْكُوْا اِلٰى رَبِّهٖ الْوَحْدَةَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ رَوَاهُ فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ۔

اخرجه البغوی فی شرح السنة۸/۲۰۳ الحدیث رقم ۲۱۴۸

ترجمہ: "اور حضرت براء بن عازبؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قرض دار اپنے قرض کی وجہ سے قید ہے (یعنی جنت میں داخل ہونے اور بندگانِ صالح کی ارواح کی صحبت میں پہنچنے سے روک دیا جائے گا) چنانچہ وہ قیامت کے دن اپنے پروردگار سے اپنے اکیلے پن کی شکایت کرے گا"۔(شرح السنة)

تشریح: قوله :صَاحِبُ الدَّيْنِ مَاْسُوْرٌ بِدَيْنِهٖ ...... پس مناسب یہ ہے کہ اصل حدیث میں "فی قبرہ" مقدر مانا جائے اور "یوم القیامة" منصوب بنزع الخافض ہو،ای الی یوم القیامة۔

یعنی اس کی تھکاوٹ اور عذاب تنہائی کی وجہ سے ہوگا' اور اس کو کوئی ایسا شخص بھی نظر نہیں آئے گا جو اس کی طرف سے قرض اداء کر دے اور اس کو ادائیگی قرض سے چھڑا دے، چنانچہ جب تک وہ اس قرض کے ذمہ سے چھٹکارا نہیں پائے گا وہ اسی تنہائی میں رہے گا، بایں طور کہ یا تو وہ اس قرض کے بقدر اپنی نیکیاں قرض خواہوں کو دے دے، یا قرض خواہوں کے گناہوں کو ان کے قرض کے عوض اپنے اوپر لاد لے، یا اللہ تعالیٰ اس کے قرض خواہوں کو اپنے فضل وکرم سے راضی کر دے۔

اس کو طبرانی نے الاوسط میں اور ابن نجار نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

"صاحب الدین مأسور بدینه فی قبره یشکوا الی الله الوحدة"۔

اور دیلمی نے مسند فردوس میں ابوسعید سے مرفوعاً روایت کیا ہے:

"صاحب الدین مغلول فی قبره لا یفکه الا قضاء دینه"

۲۹۱۷:وَرُوِیَ اَنَّ مُعَاذًا كَانَ يَدَّانُ فَاَتٰى غُرَمَاؤُهٗ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَبَاعَ النَّبِيُّ ﷺ مَالَهٗ كُلَّهٗ فِيْ دَيْنِهٖ حَتّٰى قَامَ مُعَاذٌ بِغَيْرِ شَيْءٍ مُرْسَلٌ هٰذَا لَفْظُ الْمَصَابِيْحِ وَلَمْ اَجِدْهُ فِي الْاُصُوْلِ اِلَّا فِي الْمُنْتَقٰى۔

ترجمہ: روایت کی گئی ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ (لوگوں سے) قرض لیا کرتے تھے (ایک دن) ان کے قرض خواہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے (اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے قرض کا تقاضا کرنے لگے) نبی کریم ﷺ نے ان کے قرض کی ادائیگی کے لئے ان کا سارا مال ومتاع فروخت کر دیا یہاں تک کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے پاس کوئی چیز بھی نہ بچی' یہ روایت مرسل ہے۔یہ الفاظ مصابیح کے ہیں۔میں نے اس روایت کو اصول کی تمام کتب میں سوائے منتقٰی کے اور کسی کتاب میں نہیں پایا۔

تشریح: روی :صیغہ مجہول کے ساتھ۔

یدان : ملاعلی قاری کے نسخہ میں 'یداین' ہے' چنانچہ وہ لکھتے ہیں: مضارع کا صیغہ ہے ادان سے تشدید کے ساتھ باب افتعال ہے۔یعنی قرض لیا کرتا تھا۔تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ یہ دال کی تشدید کے ساتھ باب افتعال، دان فلان یدین دینا سے ہے، جب وہ قرض لے اور اس کے ذمہ دین ہو جائے اور اس قرض دار کو 'دائن' کہتے ہیں۔شاعر کہتا ہے:

ندین ویقضی الله عنا وقد نری
مصارع قوم لا یدینون ضیعا

ہم قرض لیتے ہیں اور اللہ پاک ہمارا قرض اداء فرما دیتے ہیں، اور ہم کھڑی ہوئی قوم کو دیکھتے ہیں کہ وہ قرض نہیں لیتے، ضائع ہونے کے ڈر سے۔

علامہ تورپشتی فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں ارسال کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ یہ معنی کے اعتبار سے درست نہیں ہے اسلئے کہ اس میں ذکر ہے کہ نبیؐ نے معاذ کے مال کو بیچ ڈالا' نہ انکو قید کیا' نہ انکو اسکا مکلف بنایا یا اس سے ادئیگی قرض کا مطالبہ کرتے اور وہ منع کرتے۔

حق تو یہ تھا کہ معاذ کو قید کرتے یہاں تک کہ وہ اپنا مال فروخت کرتے اس قرض میں، اس لئے کہ حاکم کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ کسی کا مال اس کی اجازت کے بغیر بیچے۔

میں کہتا ہوں حدیث میں یہ نہیں ہے کہ یہ بیچنا اجباری تھا اور معاذ کی رضامندی کے بغیر تھا، باوجودیکہ مرسل حدیث ہمارے علماء اور جمہور کے نزدیک حجت ہے، خاص کر کے جب اس کی تائید آنے والی متصل حدیث سے بھی ہو رہی ہے۔

اور قاضی عیاض نے اس کا جواب دیا ہے کہ حدیث اگرچہ مرسل ہے اور ہمارے ہاں مرسل حجت نہیں ہے لیکن اس پر عمل کیا جائے گا' اس لئے کہ مراسیل کو قبول کیا جاتا ہے، اور اس حدیث میں دلیل ہے اس بات کی کہ قاضی کیلئے جائز ہے کہ وہ مفلس پر پابندی کے بعد اس کا مال قرض خواہوں کے مطالبہ کرنے پر فروخت کردے۔

۲۹۱۸:وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كَانَ مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ شَابًّا سَخِيًّا وَكَانَ لَا يُمْسِكُ شَيْئًا فَلَمْ يَزَلْ يَدَّانُ حَتّٰى اَغْرَقَ مَالَهُ كُلَّهُ فِي الدَّيْنِ فَاَتَى النَّبِيَّ ﷺ فَكَلَّمَهُ لِيُكَلِّمَ غُرَمَاءَهُ فَلَوْ تَرَكُوْا لِاَحَدٍ لَتَرَكُوْا لِمُعَاذٍ لِاَجْلِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَبَاعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَهُمْ مَالَهُ حَتّٰى قَامَ مُعَاذٌ بِغَيْرِ شَيْءٍ.

(رواہ سعید فی سننہ مرسلا)

اخرجه الدار قطني في السنن ٤/ ٢٣٠ الحديث رقم ٩٥ من باب المراة تقتل اذا ارتدت

ترجمہ:حضرت عبدالرحمٰن بن کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بڑے صابر اور سخی تھے۔ وہ کوئی چیز اپنے پاس نہیں رکھتے تھے اور ہمیشہ مقروض رہتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کا سارا مال ان کے قرض کی ادائیگی میں ڈوب گیا۔ چنانچہ وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے کہ آپؐ ان قرض خواہوں سے سفارش کریں اگر وہ (قرض خواہ) کسی کو چھوڑتے تو رسول اللہ ﷺ کی خاطر معاذ کو چھوڑتے۔ رسول اللہؐ نے حضرت معاذؓ کے مال ومتاع کو ان کے قرض خواہوں کے لئے فروخت کردیا۔ یہاں تک کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے پاس کوئی چیز نہ بچی۔ سعد نے اس روایت کو اپنی سنن میں مرسلاً روایت کیا ہے۔

تشریح: مذکورہ عبدالرحمٰن یہ تابعی ہیں مصنف کہتے ہیں کہ یہ انصاری ہیں اور مدینہ کے تابعین میں شمار ہوتے ہیں۔ اور ان سے زہری نے روایت کی ہے۔ **کان معاذ بن جب ثابا** :یعنی قوی بردبار اور صبر کرنے والے تھے۔

سخیا : یعنی سخی شریف اور قدردان تھے۔ **فلو ترکو الاحد** : فاء محذوف پر مرتب ہے تقدیری عبارت یوں ہے: **النبی صلی اللہ علیہ وسلم غرماء ہ لان یترکوا مطالبۃ لہ فلم یترکوا ولو ترکو الاحد**

لترکوا لمعاذ لاجل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم :اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کا مطالبہ یہ صرف سفارش تھی نہ کہ حکم تھا اور نہ ان کیلئے سوائے چھوڑنے کے کوئی چارہ نہیں تھا۔

ما لہ :یعنی حضرت معاذ کا مال، ان کے اختیار سے یا جبراً اس کو حکم کے بناء پر۔ **قولہ :رواہ سعید فی سننہ مرسلا** :یعنی صورتاً مرسل ہے ورنہ ظاہر تو یہ ہے کہ انہوں نے صحابی سے سنی ہے۔ کس سے سنی ہے؟ اس میں دو احتمال ہیں:

(۱) حضرت معاذ سے سنی ہے۔ (۲) حضرت معاذ کے علاوہ کسی اور سے سنا ہو۔

بلا عذر قرض ادا نہ کرنے والا مستطیع شخص قابل ملامت ہے

۲۹۱۹:وَعَنِ الشَّرِيْدِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَيُّ الْوَاجِدِ يُحِلُّ عِرْضَهُ وَعُقُوْبَتَهُ قَالَ ابْنُ الْمُبَارَكِ يُحِلُّ

عِرْضَهُ يُغَلَّظُ لَهُ وَعُقُوبَتَهُ يُحْبَسُ لَهُ. (رواه ابوداود والنسائی) 61

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ٤/٤٥ الحديث رقم ٣٦٢٨، والنسائی فی ٧/٣١٦ الحديث رقم ٤٦٩٠وابن ماجه فی ٢/٨٨١ الحديث رقم ٢٤٢٧ واحمد فی المسند ٤/٣٨٩

ترجمه: ''اور حضرت شرید کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مالدار شخص کا (ادائیگی کی قرض میں) ٹال مٹول کرنا اس کی بے عزتی اور اسے سزا دینے کو حلال کرتا ہے''۔ ابن مبارک فرماتے ہیں کہ ایسے شخص کی بے آبروئی کا حلال ہونا یہ ہے کہ اسے برا بھلا کہا جائے اور اسے سزا دینا سے مراد یہ ہے کہ اس کو قید کر دیا جائے''۔ (ابوداؤد نسائی)

تشریح: قوله :لَيُّ الْوَاجِدِ يُحِلُّ عِرْضَهُ ......: لی الواجد :'لی' لام کے فتحہ اور یاء کی تشدید کے ساتھ، یعنی قرض کی ادائیگی پر قادر مالدار شخص کا ٹال مٹول کرنا ''لویت حقه'' سے ہے ای **دفعته** اور ''**واجد**'' مالدار کو کہتے ہیں، عرب کے اس قول سے ہے: **وجد فی المال وجدا**، واؤ کے فتحہ' کسرہ اور ضمہ تینوں کے ساتھ اور جیم کے سکون کے ساتھ، **وجدة**: بمعنی **استغنٰی** (مالدار ہوا)۔ **یحل** :حرف مضارع کے ضمہ کے ساتھ، **وعقوبته** :یعنی حاکم کے حکم سے اس کو قید کرنا۔ **یغلظ** :لام مشدد کے فتحہ کے ساتھ، یعنی اس کو سخت بات کہی جائے۔

تورپشتی فرماتے ہیں کہ اس کو ملامت کیا جائے اور ظلم کی طرف منسوب کیا جائے اور لوگوں کا مال ناجائز طریقے سے کھانے والا کہا جائے۔ **یحبس له**: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے اور ضمیر مرفوع واجد کی طرف راجع ہے' اور ضمیر مجرور ''لی'' کی طرف راجع ہے۔ ای **عقوبة الواجد حبسه لأجل مطله**۔

قرض دار مرنے والے کی نماز جنازہ پڑھنے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار

۲۹۲۰: وَعَنْ اَبِیْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ قَالَ اُتِیَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم بِجَنَازَةٍ لِيُصَلِّيَ عَلَيْهَا فَقَالَ هَلْ عَلٰی صَاحِبِكُمْ دَيْنٌ قَالُوْا نَعَمْ قَالَ هَلْ تَرَكَ لَهُ مِنْ وَفَاءٍ قَالُوْا لَا قَالَ صَلُّوْا عَلٰی صَاحِبِكُمْ قَالَ عَلِيُّ بْنُ اَبِیْ طَالِبٍ عَلَیَّ دَيْنُهُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَتَقَدَّمَ فَصَلّٰی عَلَيْهِ وَفِیْ رِوَايَةٍ مَعْنَاهُ وَقَالَ فَكَّ اللّٰهُ رِهَانَكَ مِنَ النَّارِ كَمَا فَكَكْتَ رِهَانَ اَخِيْكَ الْمُسْلِمِ لَيْسَ مِنْ عَبْدٍ مُسْلِمٍ يَقْضِیْ عَنْ اَخِيْهِ دَيْنَهُ اِلَّا فَكَّ اللّٰهُ رِهَانَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (رواه فی شرح السنة)

اخرجه البغوی فی شرح السنة٨/٢١٣ الحديث رقم ٢١٥٥والدار قطنی فی السنن ٣/٧٨ الحديث رقم ٢٩١من كتاب البيوع

ترجمه: ''اور حضرت ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک جنازہ لایا گیا تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی نماز پڑھیں' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (جنازہ لانے والوں سے) دریافت فرمایا کہ ''کیا تمہارے اس ساتھی کے ذمہ قرض بھی ہے؟ لوگوں نے جواب دیا کہ ''جی ہاں'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر پوچھا کہ ''کیا یہ شخص اپنے قرض کی ادائیگی کے بقدر (مال) چھوڑ گیا ہے؟ لوگوں نے جواب دیا کہ ''نہیں!'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تو پھر تم لوگ اپنے ساتھی کی نماز جنازہ پڑھ لو (میں نہیں پڑھوں گا) حضرت علی نے (یہ سن کر) کہا کہ ''یا رسول اللہ! اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمہ ہے۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھے اور اس کی نماز جنازہ پڑھی۔ ایک اور روایت میں جو اسی مضمون کی منقول ہے (مگر اس کے لفاظ اس سے مختلف ہیں) یہ الفاظ بھی نقل کئے گئے ہیں کہ ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (حضرت علی رضی اللہ عنہ) سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری جان کو دوزخ کی آگ سے اسی طرح نجات دے جس طرح تم نے اپنے ایک مسلمان بھائی کی جان کو (قرض کے بوجھ سے) نجات دی' (یاد رکھو) جو بھی مسلمان بندہ اپنے مسلمان بھائی کا قرض ادا کرے گا۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی جان کو نجات عطا کرے گا''۔ (شرح السنة)

تشریح: أتی النبی صلی اللہ علیه وسلم : صیغہ مجہول

جنازة :نهایہ میں ہے کہ یہ فتح اور کسرہ دونوں کے ساتھ میت کو کہتے ہیں۔بعض کہتے ہیں کہ کسرہ کے ساتھ چار پائی اور فتح کے ساتھ میت کو کہتے ہیں۔(انتہیٰ)۔پس یہاں فتحہ اولیٰ ہے اگلے جملے کی وجہ سے۔

اس لئے کہ ضمیر"جنازة" کی طرف راجع ہے اور مراد اس سے میت ہے، پہلے قول کے مطابق اس میں استخدام ہے، اور اگر اس سے مراد صرف چار پائی لی جائے تو پھر اس میں مجاز ہے کہ"محل" کو ذکر کر کے مراد اس سے حال ہے۔

من وفاء : من زائدہ ہے اس لئے کہ یہ سیاق استفہام میں ہے۔یعنی کیا اس نے کچھ چھوڑا ہے جس سے اس کا قرض پورا اداء ہو؟

قال صلوا :اور تصحیح شدہ نسخہ میں"فصلوا" ہے۔

رهانك :راء کے کسرہ کے ساتھ۔كما فككت رهان اخيك المسلم :

تورپشتی فرماتے ہیں کہ "فك الرهن" کا معنیٰ رہن کا چھڑانا ہے، اور فك الانسان نفسه، کا معنی ایسے اعمال کی کوشش کرنا جس کے ذریعے وہ اللہ کے عذاب سے آزاد ہو، اور"رهان" رهن کی جمع ہے، مطلب یہ ہے کہ قرض دار آدمی کا نفس مرنے کے بعد قرض کے بدلے گروی ہوتا ہے جیسا کہ وہ دنیا میں قرض کی وجہ سے قید تھا، اور انسان اپنے اعمال کے بدلے گروی ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿كل نفس بما كسبت رهينة﴾[المدثر۔۳۸](ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے میں محبوس ہوگا)۔یعنی رکا ہوا ہوتا تھا آگے بھیجے ہوئے اعمال کی جزاء میں، پس جب یہ اپنے مؤمن بھائی کے چھڑانے کیلئے کوشش کرتا ہے اس سے جس میں وہ قرض کی وجہ سے قید ہے، تو آپ نے اس کیلئے دعاء کی ہے اس کے نفس کے چھڑانے کی جو اعمال کے بدلے گروی ہے۔

الافك الله رهانه يوم القيامة :اور شاید رہان کو صیغہ جمع کے ساتھ اسلئے ذکر کیا ہے کہ یہ تنبیہ ہے کہ انسان کا ہر جز اسکی کمائی کے بدلے گروی ہے یا اس وجہ سے کہ نفس نے گناہوں کا ارتکاب کیا ہے یکے بعد دیگرے تو اسکے بدلے اپنے نفس کو کئی بار گروی رکھا ہے۔

قرض کے بوجھ سے ہلکا ہو کر مرے والے کیلئے بشارت

۲۹۲۱:وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ مَاتَ وَهُوَ بَرِيْءٌ مِنَ الْكِبْرِ وَالْغُلُوْلِ وَالدَّيْنِ دَخَلَ الْجَنَّةَ.

(رواه الترمذى وابن ماجة والدارمى)

اخرجه الترمذى فى السنن ١١٧/٤ الحديث رقم ١٥٧٢، وابن ماجه فى ٨٠٦/٣ الحديث رقم ٢٤١٢ والدار مى فى ٣٤١/٢ الحديث رقم ٢٥٩٢ واحمد فى المسند ٢٧٦/٥۔

ترجمہ:"اور حضرت ثوبانؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص اس حالت میں مرا کہ وہ تکبر، خیانت اور قرض سے بری یعنی پاک ہو تو وہ (مقبول بندوں کے ساتھ) جنت میں داخل ہوگا"۔(ترمذی، ابن ماجہ، دارمی)

تشریح:قوله :مَنْ مَاتَ وَهُوَ بَرِيْءٌ مِنَ الْكِبْرِ ...... :"بری"،فعیل کے وزن پر مبنی للفاعل ہے

الكبر : بعض کہتے ہیں کہ کبر کہتے ہیں حق کو ٹھکرانا کہ اس کو قبول ہی نہ کرے اور لوگوں کو حقیر سمجھے کہ لوگ اس کو نظر ہی نہ آئیں۔

والغلول : غین کے ضمہ کے ساتھ، نہایہ میں ہے کہ"غلول"، غنیمت میں خیانت کرنے، اور غنیمت کے مال میں سے تقسیم سے قبل چوری کرنے کو کہتے ہیں اس کو"غلول" اس لئے کہتے ہیں کہ ہاتھ اس سے بندھے ہوئے ہیں۔

والدين : دین کو سب سے قبیح جنایات اور شنیع برائیوں کے ساتھ ملا کر ذکر کیا ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرض بھی انہی میں سے ہے، اور اس سے مراد وہ قرض ہے جو آدمی پر اس کے اختیار سے لازم ہو اور وہ اس کے اداء کرنے کی نیت نہ رکھتا ہو۔

بالکل مفلسی کی حالت میں قرض دار مرنا ایک بڑا گناہ ہے

۲۹۲۲:وَعَنْ اَبِيْ مُوْسٰى عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ اِنَّ اَعْظَمَ الذُّنُوْبِ عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ يَلْقَاهُ بِهَا عَبْدٌ بَعْدَ الْكَبَائِرِ

الَّتِیْ نَهَی اللّٰهُ عَنْهَا اَنْ یَّمُوْتَ رَجُلٌ وَعَلَیْهِ دَیْنٌ لَا یَدَعُ لَهٗ قَضَاءً. (رواہ احمد وابوداود)

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ۳/۶۳۷ الحدیث رقم ۳۳۴۲، واحمد فی المسند ۴/۳۹۲۔

ترجمہ:''اور حضرت ابوموسیٰؓ نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کبیرہ گناہوں کے بعد اللہ کے نزدیک سب سے عظیم گناہ جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے یہ ہے کہ بندہ مرنے کے بعد اپنے پروردگار سے اس حال میں ملاقات کرے کہ اس کے ذمہ قرض ہو اور وہ (دنیا میں) قرض کی ادائیگی کے لئے کوئی چیز چھوڑ نہ گیا ہو''۔(احمد' ابوداؤد)

تشریح:قوله :قَالَ اِنَّ اَعْظَمَ الذُّنُوْبِ عِنْدَ اللّٰهِ...... رَجُلٌ وَعَلَیْهِ دَیْنٌ لَا یَدَعُ لَهٗ قَضَاءً :

ان اعظم الذنوب عند الله ان یلقاه :یہ خبر ہے''ان'' کی۔

عبد :یلقی کا فاعل ہے۔

بعد الکبائر التی نهی الله عنها :یہ''**اعظم الذنوب**'' سے بمنزلہ استثناء کے ہے۔

ان یموت الرجل :**ان یلقا** سے بدل ہے۔اس لئے کہ بندہ کی ملاقات اپنے ربّ سے وہ موت کے بعد ہوتی ہے،ای ان اعظم الذنوب عنداللہ موت الرجل جب آپ کہیں کہ سب سے بڑا گناہ اللہ کے ہاں آدمی کا مرنا ہے۔

وعلیه دین :''رجل'' اسم ظاہر ہے جو''عبد'' کی ضمیر کی جگہ لایا گیا ہے،اور پہلے لفظ''عبد'' کے ذکر کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ اس عیب کے ساتھ اپنے مالک اور ربّ کے ساتھ ملاقات کا بُعد اور دوری بتانا ہے،پھر اس کو لفظ''رجل'' کے ساتھ نکرہ ذکر کیا تحقیر شان اور اس امر کے اہانت کیلئے۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر آپ یہ کہیں کہ اس سے پہلے''**یغفر للشهید کل ذنب الا الدین**'' کے تحت گزرا کہ حقوق اللہ کا مبنیٰ چشم پوشی پر ہے لیکن حقوق العباد کا معاملہ ایسا نہیں ہے اور یہاں اس کو کبیرہ سے کم قرار دیا ہے تو دونوں کے درمیان وجہ توفیق کیا ہو گی؟ جواب یہ ہے کہ اس کی وجہ ہم نے بیان کیا ہے کہ وہاں بطور مبالغہ کے تھا قرض لینے سے لوگوں کو ڈرانے اور بچانے کیلئے اور یہاں اس کے ظاہر پر جاری ہے۔(انتہیٰ)۔

''**وعلیه دین**'' حال ہے۔''**لا یدع له قضاء**'' صفت ہے''دین'' کیلئے

یعنی اس قرض کیلئے اتنا کچھ نہ چھوڑے جس سے وہ قرض اداء ہو،اور اس میں تحذیر ہے زیادہ قرضوں کے لینے سے اور اس کے اداء کرنے میں کوتاہی برتنے سے۔

شیخ مظہر فرماتے ہیں کہ کبائر کا ارتکاب اللہ کی نافرمانی ہے اور قرض لینا گناہ نہیں ہے بلکہ قرض لینا اور دین التزام جائز ہے۔آپ نے اس شخص پر سختی کی ہے جو مرا اس حال میں کہ اس پر قرض ہو اور قرض اداء کرنے کیلئے مال بھی نہ چھوڑا ہو،تاکہ لوگوں کے حقوق ضائع نہ ہوں۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ قرض بذاتِ خود منع نہیں ہے بلکہ مستحب ہے جیسا کہ بعض احادیث میں اس کا ذکر ہے بلکہ یہ ایک عارض جو کہ لوگوں کے حقوق کا ضائع کرنا ہے کی وجہ سے منع ہے،بخلاف کبیرہ کے کہ وہ بذاتِ خود ممنوع ہے۔

حرام چیزوں میں صلح ناجائز ہے

۲۹۲۳:وَعَنْ عَمْرِو بْنِ عَوْفٍ الْمُزَنِیِّ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ الصُّلْحُ جَائِزٌ بَیْنَ الْمُسْلِمِیْنَ اِلَّا صُلْحًا حَرَّمَ حَلَالًا اَوْ اَحَلَّ حَرَامًا وَالْمُسْلِمُوْنَ عَلٰی شُرُوْطِهِمْ اِلَّا شَرْطًا حَرَّمَ حَلَالًا اَوْ اَحَلَّ حَرَامًا۔

(رواہ الترمذی وابن ماجة وابوداود وانتهت روایته عند قوله) عَلٰی شُرُوْطِهِمْ.

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ۳/۱۹ الحدیث رقم ۳۵۹۴ والترمذی فی السنن ۳/۶۳۴ الحدیث رقم ۱۳۵۲ وابن ماجه فی

۲/۷۸۸ الحديث رقم ۲۳۵۳

ترجمہ: ''اور حضرت عمرو بن عوف مزنیؓ نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مسلمانوں کے درمیان صلح جائز ہے ہاں ایسی صلح جائز نہیں ہے جو حلال چیز کو حرام کردے یا حرام چیز کو حلال کردے اور مسلمان اپنی شرطوں پر قائم ہیں (یعنی مسلمان صلح و جنگ یا ان کے علاوہ دوسرے معاملات میں آپس میں جو شرطیں یعنی عہد و پیمان کرتے ہیں ان کی پاسداری و پابندی ضروری ہے) سوائے اس شرط کے جو حلال کو حرام کردے یا حرام کو حلال کردے۔ (ترمذی' ابن ماجہ' ابوداؤد) ابوداؤد نے اس روایت کو لفظ علی شروطهم تک نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :قال الصلح جائز بين المسلمين...... الا صلحا ...... جیسا کہ کوئی اس بات پر صلح کرے کہ وہ بیوی کی سوکن سے جماع نہیں کرے گا، یا شراب اور خنزیر پر صلح کرے۔ الا شرطا حرم حلالاً :مثلاً کوئی اپنی بیوی سے یہ شرط لے کہ وہ اپنی لونڈی سے جماع نہیں کرے گا۔ او احل حراما۔ مثلاً کوئی یہ شرط لگائے کہ میں اپنی بیوی کی موجودگی میں اسکی بہن سے شادی کروں گا۔

توضیح و تخریج: احمد، ابوداؤد، اور حاکم نے حضرت ابو ہریرہ سے صرف پہلا حصہ روایت کیا ہے۔

الفصل الثالث:

آنحضرت ﷺ کا پائجامہ خریدنا

۲۹۲۴: عَنْ سُوَيْدِ بْنِ قَيْسٍ قَالَ جَلَبْتُ اَنَا وَمُخْرَفَةُ الْعَبْدِيُّ بَزًّا مِنْ هَجَرٍ فَاَتَيْنَا بِهِ مَكَّةَ فَجَاءَ نَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَمْشِيْ فَسَاوَمَنَا بِسَرَاوِيْلَ فَبِعْنَاهُ وَثَمَّ رَجُلٌ يَزِنُ بِالْاَجْرِ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ زِنْ وَارْجِحْ۔

(رواه احمد وابوداوٗد والترمذی وابن ماجة والدارمی وقال الترمذی هذا حديث حسن صحيح)

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ۶۳۱/۳ الحديث رقم ۳۳۳۶ والترمذی فی ۵۹۸/۳ الحديث رقم ۱۳۰۵ والنسائی فی ۲۸۴/۷ الحديث رقم ۲۵۹۲ والدارمی فی ۳۳۸/۲ الحديث رقم ۲۵۸۵ واحمد فی المسند ۳۵۲/۴

ترجمہ: ''حضرت سوید بن قیسؓ کہتے ہیں کہ میں اور مخرفہ عبدی نے مقام ہجر سے (جو مدینہ کے قریب واقع ہے) فروخت کرنے کے لئے کپڑا لیا ہم اسے لے کر مکہ میں آئے' رسول اللہ (کو جب یہ معلوم ہوا کہ ہم بیچنے کے لئے کپڑا لے کر مکہ آئے ہیں) تو رسول اللہ ﷺ چل کر (بغیر سواری کے) ہمارے پاس تشریف لائے اور ہم سے ایک شلوار کی قیمت طے کی چنانچہ جب ہم نے وہ شلوار آپ ﷺ کو فروخت کردی تو آپ ﷺ نے اس شخص سے کہ جو اس جگہ اجرت پر لوگوں کے اسباب تولا کرتا تھا فرمایا کہ تم (میرے چاندی کے یہ ٹکڑے) تول دو (تاکہ میں یہ ٹکڑے اس پائجامہ کی قیمت کے طور پر دے دوں) اور (جتنے ٹکڑوں کی بات طے ہوئی ہے اس سے) کچھ زیادہ ہی تول دو''۔ (احمد' ابوداؤد' ترمذی' ابن ماجہ' دارمی) اور امام ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے''۔

تشریح: ومخرفة : میم پر فتحہ' خاء پر سکون کے ساتھ، اس کے بعد راء اور پھر فاء ہے، بعض کہتے ہیں کہ فاء کی جگہ میم ہے یعنی ''مخرمه'' ہے، لیکن صحیح اوّل ہے جیسا کہ ''استیعاب'' میں ہے، اور مصنفؒ نے ان کو صحابہ میں ذکر کیا ہے، اور ''واؤ'' عاطفہ ہے یا معیت کے معنی میں ہے۔ بز : زاء کی تشدید کے ساتھ۔ یعنی کپڑے۔

هجر : هاء اور جیم کے فتحہ کے ساتھ۔ مدینہ کے قریب ایک جگہ کا نام ہے۔

''بز'' کپڑوں میں سے کپڑا فروش کے سامان کو کہا جاتا ہے' اور مغرب میں ہے کہ ''بز'' کپڑے کی ایک قسم ہے، امام محمد سیر میں فرماتے ہیں کہ ''بز'' اہل کوفہ کے ہاں پٹسن اور روئی کے کپڑے کو کہا جاتا ہے نہ کہ اون اور ریشم کے کپڑے کو۔

فجاء نا رسول الله الله عليه وسلم يمشی :''يمشی'' حال ہے ای جاء نا ماشيا۔

ثم : ثاء کے فتحہ کے ساتھ یعنی وہاں۔زن :زاء کے کسرہ کے ساتھ۔ارجح :ہمزہ کے فتحہ اور جیم کے کسرہ کے ساتھ۔
اور قاموس میں ہے:''رجح المیزان یرجح''تینوں حرکات کے ساتھ'رجوحاً ورجحانا بمعنی مائل ہونا' جھکنا، ارجح له ورجح بمعنی اعطاه راجحا، یعنی اس کو زیادہ دیا اور پلہ جھکا کر دیا۔امام طیبی فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں آنحضرت ﷺ کی تواضع وانکساری کا بیان ہے کہ آپ ﷺ کے پاس چل کر آئے نہ سوار ہو کر اور ان کے ساتھ پائجامہ کا بھاؤ لگایا، اور اس میں آپ ﷺ کے اخلاق اور کرم فرمائی کا اظہار بھی ہوتا ہے، کہ آپ ﷺ نے قیمت سے زیادہ دیا، اور اس سے وزن کرنے والے کا وزن پر اجرت لینے کا جواز بھی معلوم ہے، (انتہی) یہ آخری بات محل نظر ہے۔
ابن حجر فرماتے ہیں آپ کے پائجامہ پہننے میں علماء کا اختلاف ہے۔بعض نے جزم کے ساتھ نہ پہننے کا کہا ہے، اور حضرت عثمانؓ نے صرف شہادت کے دن پہنا تھا اور آپ علیہ السلام کا پائجامہ خریدنا صحیح طور پر ثابت ہے۔علامہ ابن قیم فرماتے ہیں کہ ظاہر یہ ہے کہ آپ نے پہنا ہے اور آپ کے زمانہ میں لوگ پائجامہ پہنتے تھے۔

قرض کی واپسی میں غیر مشروط زیادتی جائز ہے

۲۹۲۵:وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ كَانَ لِي عَلَى النَّبِيِّ ﷺ دَيْنٌ فَقَضَانِي وَزَادَنِي . (رواه ابوداود)

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ۳/۶۴۲ الحديث رقم ۳۳۴۷ والنسائی فی ۷/۲۸۳ الحديث رقم ۴۵۹۱۔

ترجمہ:''اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے ذمہ میرا کچھ قرض تھا چنانچہ جب آپ ﷺ نے وہ قرض مجھے ادا کیا اور مجھے کچھ زیادہ دیا''۔(ابوداؤد)

تشریح: یہ حدیث ماقبل میں گزر چکی۔

ادائیگی قرض کا جلد انتظام کرو

۲۹۲۶:وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِي رَبِيعَةَ قَالَ اسْتَقْرَضَ مِنِّي النَّبِيُّ ﷺ اَرْبَعِيْنَ اَلْفًا فَجَاءَهُ مَالٌ فَدَفَعَهُ اِلَيَّ وَقَالَ بَارَكَ اللّٰهُ تَعَالٰى فِي اَهْلِكَ وَمَالِكَ اِنَّمَا جَزَاءُ السَّلَفِ الْحَمْدُ وَالْاَدَاءُ . (رواه النسائی)

اخرجه النسائی فی السنن ۷/۳۲۴ الحديث رقم ۴۶۸۳ وابن ماجه فی ۲/۸۰۹ الحديث رقم ۲۴۲۴۔

ترجمہ:''اور حضرت عبداللہ بن ابی ربیعہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مجھ سے ایک موقع پر چالیس ہزار (درہم) قرض لئے تھے' پھر جب آپ ﷺ کے پاس (ایک بڑی مقدار میں) مال آیا تو آپ ﷺ نے مجھے (وہ سب مال یا اس مال میں سے میرے قرض کے بقدر دیا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اہل وعیال اور تمہارے اموال میں برکت عطا فرمائے! قرض کا بدلہ یہی ہے کہ شکریہ ادا کیا جائے اور قرض کی ادائیگی کا انتظام کیا جائے''۔(نسائی)

حالاتِ راوی:

عبداللہ بن ربیعہ۔کے بارے میں ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ ''مؤلف'' ؒ نے ''الاکمال'' میں ان کا اسم گرامی ذکر نہیں فرمایا۔
تشریح: اربعین الفا :اور کاشف میں ہے کہ تیس ہزار تھے اور ظاہر یہ ہے کہ یہ دراہم تھے۔بعض کہتے ہیں کہ یہ غزوہ حنین کے موقع پر لئے تھے۔ وقال :اور ایک نسخہ میں ''فقال'' ہے۔بارك الله فی مالك واهلك :اہل کی زیادتی دعاء میں زیادتی ہے۔ السلف :دو فتحوں کے ساتھ قرض کو کہتے ہیں۔
امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اگر آپ کہیں کہ اس سے یہ وہم ہو سکتا ہے کہ قرض کی مقدار سے زیادہ دینا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ اس

سے حکم مذکور ثابت ہوتا ہے اور اس کے سواء کی نفی ہوتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث میں جس کا ذکر ہے یہ بطریق وجوب کے ہے کہ منعم کا شکر اداء کرنا اور اس کا حق دینا دونوں واجب ہیں اور واجب مقدار سے زیادہ دینا فضل اور احسان ہے۔

مہلت دینے والے کو ثواب ملتا ہے

۲۹۲۷: وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ كَانَ لَهُ عَلٰى رَجُلٍ حَقٌّ فَمَنْ اَخَّرَهُ كَانَ لَهُ بِكُلِّ يَوْمٍ صَدَقَةٌ. (رواه احمد)

اخرجه احمد فی المسند ٤/٤٤٢۔

ترجمہ: "اور حضرت عمران بن حصین ؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص کا کسی پر کوئی حق (یعنی قرضہ وغیرہ) ہو اور وہ اس حق (کو وصول کرنے) میں تاخیر کرے (یعنی قرض دار کو مہلت دے) تو اسے (دی ہوئی مہلت کے) ہر دن کے بدلے صدقہ کا ثواب ملے گا"۔ (احمد)

تشریح: قوله :من كان له على رجل حق فمن اخره كان له بكل يوم صدقة :

تا کہ یہ صاحب حق اور اس کے علاوہ جو تاخیر کے سبب بنے سب کو شامل ہو۔

دین میراث پر مقدم ہے

۲۹۲۸: وَعَنْ سَعْدِ بْنِ الْاَطْوَلِ قَالَ مَاتَ اَخِيْ وَتَرَكَ ثَلَاثَمِائَةِ وَتَرَكَ وَلَدًا صِغَارًا فَاَرَدْتُ اَنْ اُنْفِقَ عَلَيْهِمْ فَقَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اَخَاكَ مَحْبُوْسٌ بِدَيْنِهِ فَاقْضِ عَنْهُ قَالَ فَذَهَبْتُ فَقَضَيْتُ عَنْهُ ثُمَّ جِئْتُ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَدْ قَضَيْتُ عَنْهُ وَلَمْ تَبْقَ اِلَّا امْرَاَةٌ تَدَّعِيْ دِيْنَارَيْنِ وَلَيْسَتْ لَهَا بَيِّنَةٌ قَالَ اَعْطِهَا فَاِنَّهَا صَادِقَةٌ. (رواه احمد)

اخرجه احمد فی لمسند ٤/١٣٦۔

ترجمہ: "اور حضرت سعد بن اطول ؓ کہتے ہیں کہ جب میرا بھائی فوت ہوا تو اس نے تین سو دینار اور چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑے تھے' چنانچہ میں نے چاہا کہ ان (تین سو دیناروں) کو اس کے چھوٹے بچوں پر خرچ کر دوں (اور اس کا قرض ادا نہ کروں) لیکن رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ تمہارا بھائی اپنے قرض کی وجہ سے (عالم برزخ میں) قید ہے (جس کے سبب وہ وہاں کی نعمتوں اور صلحاء کی ارواح کی صحبت سے محروم ہے) لہٰذا تم اس کی طرف سے اس کا قرض ادا کرو۔ حضرت سعد ؓ کہتے ہیں کہ (یہ سنتے ہی) میں گھر آیا اور اپنے بھائی کا قرض ادا کیا۔ پھر میں (آپ ﷺ کی خدمت میں) حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے اپنے بھائی کا قرض ادا کر دیا ہے' اب کوئی قرض خواہ باقی نہیں ہے۔ سوائے ایک عورت کے جو دو دینار کا دعویٰ کر رہی ہے لیکن اس کا کوئی گواہ نہیں ہے' آپ ﷺ نے فرمایا "اس کو بھی دو دینار دے دو وہ سچی عورت ہے"۔ (احمد)

تشریح: ولدا : واؤ اور لام دونوں کے فتحہ کے ساتھ ہے اول کے ضمہ اور دوسرے کے سکون کے ساتھ بھی ہے۔

صغارا : پہلے حرف کے کسرہ کے ساتھ۔ جوھری کا کہنا ہے کہ "ولد" کبھی واحد ہوتا ہے اور کبھی جمع اور اسی طرح "ولد" ہے۔

ولم تبق الا المراۃ تدعی دینارین : معنوی اعتبار سے "قضیت" پر عطف ہے۔ ای قضیت دیون من کانت له بینة ولم أقض لهذه المراۃ۔ اور یہ بھی جائز ہے، کہ یہ حال ہو قضیت کی ضمیر فاعل سے، (اس کو ذکر کیا ہے امام طیبیؒ نے۔)

ولیست لها بینة : اس میں بھی گزشتہ دونوں احتمالات ہیں۔ (جو پچھلے جملے میں تھے۔)

قال اعطها فانها صادقة :

سعد کے بھائی کے قرض کا حال آپ ﷺ کو کیسے معلوم ہوا؟ اس میں دو احتمال ہیں:

(۱) آپ کو بغیر وحی کے معلوم تھا اس لئے آپ نے سعد کو قرض اداء کرنے کا حکم دیا، کیونکہ حاکم کیلئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنی معلومات پر اعتماد کرتے ہوئے حکم جاری کر دے۔

(۲) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی معلوم ہوا۔ تو یہ آپ کی خصوصیت ہوئی۔ (اس کو ذکر کیا ہے امام طیبیؒ نے۔)

بار بار کی شہادت بھی قرض کا کفارہ نہیں ہو سکتی

۲۹۲۹: وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ جَحْشٍ قَالَ كُنَّا جُلُوْسًا بِفِنَاءِ الْمَسْجِدِ حَيْثُ يُوْضَعُ الْجَنَائِزُ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ جَالِسٌ بَيْنَ ظَهْرَيْنَا فَرَفَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بَصَرَهُ قِبَلَ السَّمَاءِ فَنَظَرَ ثُمَّ طَأْطَأَ بَصَرَهُ وَوَضَعَ يَدَهُ عَلٰى جَبْهَتِهٖ قَالَ سُبْحَانَ اللّٰهِ سُبْحَانَ اللّٰهِ مَاذَا نَزَلَ مِنَ التَّشْدِيْدِ قَالَ فَسَكَتْنَا يَوْمَنَا وَلَيْلَتَنَا فَلَمْ نَرَ اِلَّا خَيْرًا حَتّٰى اَصْبَحْنَا قَالَ مُحَمَّدٌ فَسَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ مَا التَّشْدِيْدُ الَّذِیْ نَزَلَ قَالَ فِی الدَّيْنِ وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ لَوْ اَنَّ رَجُلًا قُتِلَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ عَاشَ ثُمَّ قُتِلَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ عَاشَ ثُمَّ قُتِلَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ عَاشَ وَعَلَيْهِ دَيْنٌ مَا دَخَلَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يُقْضٰى دَيْنُهٗ۔

اخرجه احمد فی المسند ۵/۲۸۹۔

ترجمہ: "اور حضرت محمد بن عبداللہ بن جحشؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) ہم لوگ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس صحن میں بیٹھے ہوئے تھے جہاں جنازے لاکر رکھے جاتے تھے' ہمارے درمیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف فرما تھے' اچانک آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نگاہ آسمان کی طرف بلند کی اور دیکھا پھر اپنی نگاہ جھکا لی اور اپنا ہاتھ پیشانی پر رکھ کر (انتہائی تعجب کے عالم میں) فرمایا کہ "سبحان اللہ! سبحان اللہ! کس قدر سختی نازل ہوئی ہے؟ راوی کہتے ہیں کہ "ہم ایک دن اور ایک رات خاموش رہے (یعنی ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی سوال نہیں کیا) اور ہمیں اچھائی کے علاوہ کوئی سخت بات نظر نہیں آئی (یعنی صحابہؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے یہ سمجھے کہ شاید اس وقت کوئی عذاب نازل ہونے والا ہے یا کوئی سخت مصیبت آنے والی ہے مگر وہ پورا دن گزر گیا' پوری رات گزر گئی نہ کوئی عذاب نازل ہوا اور نہ کوئی مصیبت پیش آئی) یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ حدیث کے راوی محمد بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ "اس کے بعد میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ وہ کیا سختی ہے جو نازل ہوئی ہے" (اور جس کا اظہار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنی حیرانگی کے ساتھ کل فرمایا تھا) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دَین (یعنی قرض وغیرہ) کے بارے میں وہ سختی نازل ہوئی ہے' قسم ہے اس پاک ذات کی جس کے قبضے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے اگر کوئی شخص اللہ کی راہ میں (یعنی جہاد کرتے ہوئے) قتل کیا جائے اور پھر زندہ ہو' پھر اللہ کی راہ میں قتل کیا جائے اور پھر زندہ ہو' پھر اللہ کی راہ میں مارا جائے اور پھر زندہ ہو اور اس پر قرض ہو تو وہ اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہوگا جب تک کہ اس کا قرض ادا نہ کر دیا جائے (یعنی اگر کوئی قرض دار بار بار بھی اللہ کی راہ میں قتل کیا جائے تو یہ بار بار کی شہادت بھی اس کے قرض کا کفارہ نہیں ہو سکتی) اس روایت کو امام احمدؒ نے نقل کیا ہے۔ نیز شرح السنۃ میں بھی اسی طرح کی حدیث منقول ہے"۔ (جس کا مضمون تو یہی ہے مگر الفاظ دوسرے ہیں)

تشریح: قال كنا جلوسا : مصدر بنی للفاعل ہے، ای جالسین۔

بفناء المسجد : فاء کے کسرہ کے ساتھ گھر کے سامنے صحن کو کہتے ہیں، جیسا کہ نہایہ میں ہے۔

معلوم ہوا کہ صحابہ کرام مسجد کے اندر جنازے نہیں پڑھتے تھے، اور لفظ ظهرین کو تاکید کیلئے زیادہ کیا ہے تاکہ زیادہ قریب ہونے اور ملے ہوئے ہونے پر دلالت کرے۔

قبل : قاف کے کسرہ اور باء کے فتحہ کے ساتھ۔ **طأطأ** : دو ہمزوں کے ساتھ، قال : **سبحان الله** : یہ تعجب کے طور پر فرمایا' اور

دوسرا ''سبحان الله'' تاکیداً کہا۔ما نزل من التشديد :یعنی سختی اوروعید۔

فلم نر الا خيرا : یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان کی خاموشی صرف اس وجہ سے تھی کہ ان کو یقین تھا کہ جو چیز نازل ہوئی ہے وہ عذاب ہے۔حتٰی اصبحنا : میں دو احتمال ہے کہ یہ غایت ہے ''سکتنا'' کیلئے یا ''لم نر'' کیلئے۔

فسألت رسول الله صلى الله عليه وسلم ماالتشديد يد الذى نزل قال فى الدين : سوال کیا تقدیر یوں ہے: ''ما التشديد النازل'' تو آپ ﷺ نے جواب دیا: فی الدین

حتٰى يقضٰى دينه : صیغہ مجہول کے ساتھ ہے اور ''دین'' رفع کے ساتھ ہے، اور ایک نسخہ میں فعل صیغہ معلوم کے ساتھ اور دينه کے نصب کے ساتھ ہے۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ معروف اور مجہول دونوں جائز ہیں۔معروف پڑھنے کی صورت میں یہ احتمال ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ اس کے ورثہ اداء کریں مضاف کو حذف کر کے فعل کی اسناد مضاف الیہ کی طرف کی ہو۔اور یہ مراد بھی ہوسکتا ہے کہ قرض دار حساب کے دن اپنا قرض اداء کرے گا۔راوی کہتا ہے میری عمر کی قسم! ہم اس سے زیادہ سخت نص دین کے باب میں نہیں پاتے۔

بَابُ الشِّرْكَةِ وَالْوَكَالَةِ

شرکت اور وکالت کا بیان

الشركة : شین کے کسرہ اور راء کے سکون کے ساتھ، الو كالة : واؤ کے فتحہ کے ساتھ اور کبھی اس کو کسرہ بھی دیا جاتا ہے۔(جیسا کہ قاموس میں ہے۔)

شرکت کی اقسام: شرح السنہ میں ہے کہ شرکت کی کئی قسمیں ہیں: اول: عین اور منفعت دونوں میں شرکت ہو۔
اس طور پر کہ ایک جماعت کو مال وراثت میں ملا یا وہ خریدنے سے اس کے مالک ہو گئے، یا ہبہ کے ذریعے یا وصیت کے ذریعے مالک ہو گئے، یا وہ مال آپس میں ایسے ملا لیں کہ اس میں امتیاز نہ ہو سکے۔

ثانی: شرکت اعیان میں ہو نہ کہ منافع میں۔ مثلاً ایک آدمی نے وصیت کی کہ میرے گھر کے منافع کسی آدمی کیلئے ہیں تو گھر ورثہ کا ہو گا اور منافع موصی له کیلئے ہوں گے، یا اس کا عکس ہو، بایں طور کہ ایک جماعت نے کوئی گھر کرایہ پر لیا، یا کوئی چیز کسی جماعت کیلئے وقف کر دی کہ منافع ان کو حاصل ہوں گے، عین حاصل نہ ہو گی۔

ثالث: ابدان کے حقوق میں شرکت ہے۔جیسا کہ حد قذف اور قصاص کہ کوئی جماعت اس کی وارث ہو جائے۔

رابع: اموال کے حقوق میں شرکت ہے۔جیسا کہ حق شفع ایک جماعت کیلئے ثابت ہوتا ہے۔

جو شرکت مال کو ملانے کے اعتبار سے ہو، تو جب ہر ایک شریک اپنے ساتھی کو تصرف کرنے کی اجازت دیدے، تو جو منافع حاصل ہو گا وہ مال کے بقدر ان کے درمیان تقسیم ہو گا۔اس کو ''شرکت عنان'' کہا جاتا ہے۔

الفصل الاول :

عقود میں شرکت جائز ہے

۲۹۳۰:عَنْ زُهْرَةَ بْنِ مَعْبَدٍ اَنَّهٗ كَانَ يَخْرُجُ بِهٖ جَدُّهٗ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ هِشَامٍ اِلَى السُّوْقِ فَيَشْتَرِى الطَّعَامَ فَيَلْقَاهُ

ابْنُ عُمَرَ وَابْنُ الزُّبَيْرِ فَيَقُوْلَانِ لَهُ اَشْرِكْنَا فَاِنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَدْ دَعَا لَكَ بِالْبَرَكَةِ فَيُشْرِكُهُمْ فَرُبَّمَا اَصَابَ الرَّاحِلَةَ كَمَا هِيَ فَيَبْعَثُ بِهَا اِلَى الْمَنْزِلِ وَكَانَ عَبْدُ اللّٰهِ ابْنُ هِشَامٍ ذَهَبَتْ بِهِ اُمُّهُ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَمَسَحَ رَاسَهُ وَدَعَا لَهُ بِالْبَرَكَةِ. (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٥/١٣٦ الحدیث رقم ٢٥٠١ (٢) فی المخطوطة (والشرکة)

ترجمہ: ''حضرت زہرہ بن معبدؒ تابعی کے بارے میں منقول ہے کہ ان کو ان کے دادا حضرت عبداللہ بن ہشامؓ بازار لے جایا کرتے تھے جہاں وہ غلہ خریدا کرتے تھے چنانچہ (جب وہ غلہ خرید لیتے تو) وہاں ان سے حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن زبیرؓ ملاقات کرتے اور وہ دونوں ان سے کہتے کہ ہم کو بھی اپنا شریک بنا لو کیونکہ نبی کریم ﷺ نے تمہارے لئے برکت کی دعا کی ہے (حضرت زہرہؒ کہتے ہیں کہ) میرے دادا ان کو شریک کر لیا کرتے تھے اور آپ ﷺ کی دعا کی برکت سے) ان کو بسا اوقات ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر غلہ کا فائدہ ہوتا تھا جسے وہ اپنے گھر بھیج دیا کرتے تھے (اور ان کے حق میں آنحضرت ﷺ کے دعا کا واقعہ یہ ہے کہ) حضرت عبداللہ بن ہشامؓ کی والدہ انہیں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لے گئیں تو آپ ﷺ نے ان کے سر پر اپنا دست مبارک پھیرا اور ان کے لئے برکت کی دعا کی تھی''۔ (بخاری)

حالاتِ راوی:

زہرہ بن معبد۔ یہ زہرہ ہیں معبد کے بیٹے۔ ان کی کنیت ''ابوعقیل'' (عین کے زبر کے ساتھ) ہے۔ یہ قریشی ہیں اور وطناً مصری ہیں۔ انہوں نے اپنے دادا عبداللہ بن ہشام وغیرہ سے حدیث سنی ہے۔ ان سے روایت کرنے والی بھی ایک بڑی جماعت ہے اور ان کی حدیث کا بڑا حصہ اہل مصر کے یہاں ہے۔

تشریح: زاء معجمہ کے ضمہ اور ھاء کے سکون کے ساتھ ہے۔ ''معبد'' میں میم مفتوح، عین مہملہ ساکن، بائے موحدہ مفتوح اور آخر میں دال مہملہ ہے۔

یخرج به جده عبد الله بن هشام: ''به'' میں باء تعدیت کیلئے ہے یا مصاحبت کیلئے ہے۔ ''عبد الله بن هشام'' : یہ بدل ہے یا عطف بیان ہے ''جده'' کیلئے۔

الی السوق :یخرج کا متعلق ہے۔ **اشر کنا** :ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ،

قاموس میں ہے: **شر که فی البیع والمیراث، علمه** کی طرح ہے۔ ''**شر کة**'' شین کے کسرہ کے ساتھ ہے، اور مصباح میں ہے **شر که فی الامر** باب ''**تعب**'' سے ہے **شر کا وشر کة بروزن کلم** اور **کلمۃ** پہلے حرف کے فتحہ اور دوسرے کے کسرہ کے ساتھ، شریک ہونا۔

اور **اشر کته فی الامر** کا معنی ہے: **جعلته شریکا**۔ علامہ قسطلانی شرح بخاری میں فرماتے ہیں کہ ''**اشر کنا** ''ہمزہ وصل کے ساتھ ہے، اور ''الفرع'' ایک کتاب کا نام ہے، اس میں ہے کہ یہ راء کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ ہے، اور اس کے علاوہ کتابوں میں ہمزہ قطعی کے ساتھ اور راء کے کسرہ کے ساتھ ہے

یشر کهم : پہلے حرف کے ضمہ اور تیسرے کے کسرہ کے ساتھ اور ایک نسخہ میں دونوں فتحہ کے ساتھ ہے۔ علامہ قسطلانی بھی فرماتے ہیں کہ یاء اور راء کے فتحہ کے ساتھ ہے اھ اور ایک نسخہ میں ''**فیشر کهما**'' ہے۔ صاحب مفاتیح فرماتے ہیں کہ راوی کے قول ''**فیشر کهم**'' کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں کو شریک کر دیتے تھے، اور **فیشر کهما** بھی روایت کیا گیا ہے۔ (انتہیٰ)۔

اس سے معلوم ہوا کہ عقود میں شرکت جائز ہے۔

فربما اصاب الراحلة : فعل کی ضمیر مستتر ابن ہشام کی طرف راجع ہے۔
یہ ذکر ''حامل'' اور مراد ''محمول'' کے قبیل ہے۔
ای حال کونها بتة علی وصف هی مخلوقة علیه۔

ایک حدیث میں ہے: **الناس کابل مائة لا تجد فیها راحلة**۔ نہایہ میں ہے کہ ''راحلة'' اس اونٹ کو کہتے ہیں جو سفر کرنے اور بار برداری کی طاقت رکھتا ہو، اور مذکر اور مؤنث اس میں برابر ہے، اور آخر میں تاء مبالغہ کیلئے ہے۔ یہ وہ اونٹ ہوتا ہے جس کو آدمی اپنی سواری کیلئے پسند کرتا ہے۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ اس میں یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ اس کو اونٹ کے بار برابر غلہ کا فائدہ ہوتا ہو۔ اور یہ بھی احتمال ہوسکتا ہے کہ بار بردار اونٹ کا فائدہ ہوتا ہو، یعنی راحلہ سے مراد حامل ہو، لیکن پہلا احتمال زیادہ بہتر ہے، اس لئے کہ ماقبل کلام غلہ کے بارے میں وارد ہے، اور شیخ مظہر نے مجموعہ مراد لیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء کی برکت سے کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ آپ نفع کے ذریعہ سے پورا لدا ہوا اونٹ بھی خرید لیتے تھے۔

عبد الله بن هشام : قرشی التیمی ان کا شمار اہل حجاز میں ہوتا ہے۔ ان کی والدہ کا نام زینب بنت حمید تھا اور یہ چھوٹے تھے۔ مصنف کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے چھوٹے ہونے کی وجہ سے ان کے ساتھ بیعت نہیں کی اور ان سے ان کے بیٹے زہرہ نے حدیث روایت کی ہے۔

انصار کے مال میں مہاجرین کی شرکت

۲۹۳۱: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَتِ الْاَنْصَارُ لِلنَّبِيِّ ﷺ اَقْسِمْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ اِخْوَانِنَا النَّخِيْلَ قَالَ لَا تَكْفُوْنَنَا الْمُؤْنَةَ وَنُشْرِكُكُمْ فِي الثَّمَرَةِ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا . (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۵/۸ الحدیث رقم ۲۳۲۵

ترجمہ: ''اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (جب مکہ سے مہاجرین مدینہ آئے تو) انصار (یعنی مدینہ کے لوگوں) نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ہمارے کھجوروں کے درختوں کو ہمارے اور ہمارے مہاجرین بھائیوں کے درمیان تقسیم فرما دیجئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا نہیں (انصار نے مہاجرین کو کہا کہ) تم محنت کرو اور ہمیں (کھجوروں کی) پیداوار میں شریک کرلیں گے۔ انصار نے کہا: ہم نے سن لیا اور ہم نے مان لیا''۔ (بخاری)

تشریح: **اقسم** : ہمزہ وصلی مکسورہ اور سین کے کسرہ کے ساتھ۔ **قال لا** : **ای لااقسم بینکم و بینهم** ۔ **تکفوننا المؤنة** : خبر بمعنی امر کے ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ ''مؤنة'' یہ ''فعولة'' کے وزن پر ہے۔ اس پر عرب کا یہ قول بھی دلالت کرتا ہے: **مأنهم امأنهم مانا**، محنت مشقت برداشت کرنا۔ اور بعض کہتے ہیں یہ ''مفعلة'' ضمہ کے ساتھ ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ''اون'' سے ہے۔ یہ حرج کو کہتے ہیں اس لئے کہ انسان پر بھاری ہوتا ہے۔

نشرککم : نون اور راء کے فتحہ کے ساتھ، (یعنی ہم تمہارے شریک ہوں گے) اور ایک نسخہ میں نون کے ضمہ اور راء کے کسرہ کے ساتھ ہے (یعنی ہم تمہیں شریک بنائیں گے۔)

حاصل یہ ہے کہ آپ علیہ السلام نے تقسیم سے انکار کیا، تاکہ ان کے درخت ان ہی کے پاس باقی ہیں کہ جس سے ان کا معاش قائم ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام اس طور پر پیش کیا کہ ان کو یہ خیال دیا کہ گویا کہ آپ کا ارادہ اپنے آپ اور اپنے مہاجرین ساتھیوں پر آسانی اور تخفیف کا ہے، اور شرکت اختیار کی اس لئے کہ یہ دونوں قبیلوں کیلئے آسان اور فائدہ مند تھا۔ مطلب یہ ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ

مہاجرین درختوں کے آباد کرنے کی یعنی ان کی تابیر کرنے اور سیراب کرنے وغیرہ کی طاقت نہیں رکھتے، بلکہ اپنے درختوں کی خود حفاظت کرو اور ان کی اصلاح کرو، اور ان میں حسب ضرورت کام کرو ان کو آباد کرنا وغیرہ پس جو پھل حاصل ہوں گے وہ ہم تمہارے درمیان تقسیم کریں گے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کرنا اور ان کی طرف سے محنت و مشقت کرنا مستحب ہے۔ یہ حدیث بھی شرکت کے صحیح ہونے کی دلیل ہے۔ ایک حدیث میں ہے: "المعونة تأتي على قدر المؤنة"۔

معاملات میں وکیل بنانا جائز ہے

۲۹۳۲: وَعَنْ عُرْوَةَ بْنِ اَبِی الْجَعْدِ الْبَارِقِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَعْطَاهُ دِيْنَارًا لِيَشْتَرِىَ لَهُ شَاةً فَاشْتَرٰى لَهُ شَاتَيْنِ فَبَاعَ اِحْدَاهُمَا بِدِيْنَارٍ وَاَتَاهُ بِشَاةٍ وَدِيْنَارٍ فَدَعَا لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِىْ بَيْعِهٖ بِالْبَرَكَةِ فَكَانَ لَوِ اشْتَرٰى تُرَابًا لَرَبِحَ فِيْهِ. (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٦٣٢/٦ الحدیث رقم ٣٦٤٢ وابو داوٗد فی السنن ٦٧٧/٣ الحدیث رقم ٣٣٨٤ والترمذی فی ٥٥٩/٣ الحدیث رقم ١٢٥٨ وابن ماجه فی ٨٠٣/٢ الحدیث رقم ٢٤٠٢ واحمد فی المسند ٣٧٥/٤۔

ترجمہ: "اور حضرت عروہ بن الجعد بارقیؓ کے بارے میں منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں ایک دینار دیا تا کہ وہ آپ ﷺ کے لئے ایک بکری خرید لائیں' چنانچہ انہوں نے ایک دینار میں دو بکریاں خرید لیں اور پھر ان میں سے ایک بکری کو ایک دینار کے بدلے (کسی کے ہاتھ) فروخت کر دیا' اس طرح انہوں نے آپ ﷺ کو ایک بکری دی اور ایک دینار بھی دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے (ان کی اس ذہانت سے خوش ہو کر) ان کے لئے خرید و فروخت کے معاملات میں برکت کی دعا فرمائی' جس کا اثر یہ ہوا کہ اگر وہ مٹی خرید لیتے تو اس میں بھی وہ نفع حاصل کرتے تھے۔" (بخاری)

حالاتِ راوی:

عروۃ بن ابی الجعد۔ عروہ بن ابی "الجعد" بارقی ہیں۔ "جعد" میں جیم مفتوح اور عین مہملہ ساکن ہے۔ "بارقی" بارق کی طرف منسوب ہے۔ "بارق" ایک پہاڑ کا نام ہے جہاں "ازد" کے کچھ لوگ آ کر آباد ہوئے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو "کوفہ" کا قاضی بنایا تھا۔ یہ کوفیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی حدیث کوفیوں میں پائی جاتی ہے بعضوں نے کہا ہے کہ یہ "عروہ جعد" کے بیٹے ہیں۔ ابن مدینی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو ان کو "ابن جعد" کہتا ہے وہ غلطی کرتا ہے۔ "عروہ" تو "ابو جعد" کے بیٹے ہیں۔ ان سے شعبی رحمہ اللہ وغیرہ روایت کرتے ہیں۔

تشریح: ابن الملک فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تجارتی معاملات میں وکالت جائز ہے، اسی طرح ان تمام چیزوں میں بھی کسی کو اپنا وکیل بنانا درست ہے جس میں نیابت چلتی ہو۔ اگر کوئی شخص کسی کا مال اس کی اجازت کے بغیر بیچے تو بیع منعقد ہو جاتی ہے، لیکن اس کا صحیح ہونا مال کے مالک کی اجازت پر موقوف رہتا ہے، اگر مالک اجازت دیدے تو بیع صحیح ہو جائے گی' یہ حنفیہ کا مسلک ہے۔

امام شافعیؒ کے نزدیک ایک قول میں مالک کی اجازت کے بغیر اس کا مال بیچنا سرے سے جائز ہی نہیں ہے، اگرچہ بعد میں مالک کی اجازت بھی حاصل کیوں نہ ہو جائے۔ اور حدیث میں یہ تاویل کرتے ہیں کہ یہ وکالت مطلق تھی اور وکیل مطلق کو بیچنے اور خریدنے کا اختیار ہوتا ہے، لہٰذا اس کے تصرفات مالک کی اجازت سے صادر ہوتے ہیں۔

الفصل الثانی:

امانت دار شرکاء کا اللہ تعالیٰ محافظ رہتا ہے

۲۹۳۳: عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَفَعَهُ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ يَقُوْلُ اَنَا ثَالِثُ الشَّرِيْكَيْنِ مَا لَمْ يَخُنْ اَحَدُهُمَا صَاحِبَهُ فَاِذَا خَانَهُ خَرَجْتُ مِنْ بَيْنِهِمَا (رواہ ابوداوٗد وزاد ارزین) وَجَاءَ الشَّيْطَانُ .

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ۳/۶۷۷ الحدیث رقم ۳۳۸۳۔

ترجمہ: "اور حضرت ابو ہریرہؓ نبی کریم ﷺ کی یہ حدیث بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ جب دو شرکاء میں سے ایک شریک دوسرے کے ساتھ خیانت والا معاملہ نہیں کرتا تو میں ان کا تیسرا ہوتا ہوں اور جب وہ خیانت و بد دیانتی پر اتر آتے ہیں تو میں ان کے درمیان سے نکل جاتا ہوں"۔ (ابوداوٗد) اور رزینؒ نے اس روایت کے آخر میں یہ الفاظ بھی نقل کیے ہیں کہ "اور پھر (ان کے درمیان) شیطان آ جاتا ہے"۔

تشریح: **یقول انا ثالث الشریکین** : یعنی ان دونوں کے ساتھ حفاظت اور برکت کے ساتھ ہوتا ہوں۔ ان دونوں کے مال کی حفاظت کرتا ہوں، ان دونوں کو رزق دیتا ہوں اور ان کے معاملات میں خیر و بھلائی عطا کرتا ہوں۔ یعنی ان کی مدد کرتا ہوں جب تک ان میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کے ساتھ مدد کرتا ہے۔

فاذا خانہ خرجت من بینھما : یعنی برکت ختم ہو جاتی ہے حفاظت کا کے نکلنے کی وجہ سے۔

زاد رزین وجاء الشیطان : یعنی ان کے درمیان داخل ہو جاتا ہے اور ان میں سے تیسرا بن جاتا ہے۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شرکت عبارت ہے اس سے کہ بعض لوگ اپنا مال بعض لوگوں کے مال کے ساتھ اس طور پر ملائیں کہ اس میں امتیاز نہ ہو سکے۔ اور اللہ کی شرکت ان دونوں کے ساتھ یہ استعارہ ہے، گویا کہ اللہ تعالیٰ نے برکت، فضل اور فائدے کو بمنزلہ مال مخلوط (ملایا ہوا) کے قرار دیا، اور اپنے آپ کو ان کا تیسرا کہا۔ اور شیطان کی خیانت اور برکت کے مٹنے کو بمنزلہ مال مخلوط کے قرار دیا، اور شیطان کو ان کا تیسرا قرار دیا، اور "خرجت من بینھما" یہ استعارہ ترشیحیہ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ معاملات میں شرکت مستحب ہے کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ برکت نازل ہوتی ہے جو تنہا کاروبار کرنے والے کو حاصل نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک اپنے دوسرے شریک کے مال کی حفاظت و نگرانی میں کوشاں رہتا ہے۔

اور یہ بات معلوم ہی ہے کہ کوئی بندہ جب تک اپنے مسلمان بھائی کی مدد اور خیر خواہی میں لگا رہتا ہے اللہ تعالیٰ کی مدد اس کے شامل حال رہتی ہے۔

خائن سے انتقام کا جذبہ تمہیں خیانت پر نہ اُکسا دے

۲۹۳۴: وَعَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ اَدِّ الْاَ مَانَةَ اِلٰى مَنِ ائْتَمَنَكَ وَلَا تَخُنْ مَنْ خَانَكَ ۔

(رواہ الترمذی وابوداود والدارمی)

اخرجه ابود اود فی السنن ۳/۸۰۵ الحدیث رقم ۳۵۳۵ والترمذی فی ۳/۵٦٤ الحدیث رقم ۱۲٦٤ والدار می فی ۲/۳٤۳ الحدیث رقم ۲۵۹۷

ترجمہ: "اور حضرت ابو ہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص تمہارے پاس

امانت رکھوائے اس کی امانت کو ادا کر دو جو شخص تمہارے ساتھ خیانت کرے تم اس کے ساتھ خیانت مت کرو"۔ (ترمذی' ابوداؤد' دارمی)

تشریح: "اد' امر ہے: "أدى يؤدى تأدية سے۔

ولا تخن : خاء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

قاضی کہتے ہیں کہ خائن نے تمہارے ساتھ جو معاملہ کیا ہے وہی معاملہ تم اس کے ساتھ نہ کرو اور خیانت کا مقابلہ خیانت کے ساتھ نہ کرو، پس تم بھی اس کی طرح خائن قرار دے جاؤ گے۔ اور اس (حکم) میں وہ شخص داخل نہیں ہے، جو جاحد (مکر جانے والے) سے اپنے حق کے بقدر اس کا مال لے لے' کیونکہ یہ تو اس سے اپنا حق لے رہا ہے جو کوئی ظلم اور زیادتی نہیں ہے، جبکہ خیانت ظلم ہے۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ بہتر یہ ہے کہ اس حدیث کو اس آیت کے معنی پر اتارا جائے: ﴿**ولا تسوى الحسنة ولا السيئة ادفع بالتي هي احسن**﴾[فصلت۔۳٤] (اور نیکی اور بدی برابر نہیں ہوئی' آپ نیک برتاؤ سے سے ٹال دیا کیجئے)۔ یعنی جب تیرا ساتھی خیانت کرے تو اس کا بدلہ خیانت کے ساتھ مت دے، اگرچہ یہ اچھا ہو، بلکہ آپ اس کو بدلہ دیں اس طریقے سے جو زیادہ اچھا ہے اور وہ عدم مکافاۃ (یعنی برابری نہ کرنا) ہے، اور احسان ہے اس کے ساتھ جس نے تیرے ساتھ برائی کی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وکیل

۲۹۳۵: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ اَرَدْتُّ الْخُرُوْجَ اِلٰى خَيْبَرَ فَاَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ وَقُلْتُ اِنِّي اَرَدْتُّ الْخُرُوْجَ اِلٰى خَيْبَرَ فَقَالَ اِذَا اَتَيْتَ وَكِيْلِي فَخُذْ مِنْهُ خَمْسَةَ عَشَرَ وَسْقًا فَاِنِ ابْتَغٰى مِنْكَ اٰيَةً فَضَعْ يَدَكَ عَلٰى تَرْقُوَتِهٖ (رواه ابو داؤد)

اخرجه ابو داؤد فى السنن ٤/٤٧ الحديث رقم ٣٦٣٢ (٣) فى المخطوطة (الوداع) (٤) فى المخطوطة (خير)۔

ترجمہ: "اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) میں نے خیبر جانے کا ارادہ کیا تو (رخصت ہونے کے ارادہ سے) میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا اور عرض کیا کہ میں نے خیبر جانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم خیبر میں میرے وکیل کے پاس جاؤ تو اس سے پندرہ وسق (کھجوریں) لے لینا اگر وہ تم سے کوئی نشانی کا مطالبہ کرے تو اپنا ہاتھ اس کے حلق پر رکھ دینا"۔ (ابوداؤد)

تشریح: **خيبر** : مدینہ کے قریب ایک جگہ ہے۔ یہ غیر منصرف ہے۔

وقلت : اور ایک نسخہ میں **فقلت** ہے۔

وسقا : پہلے فتحہ اور پھر سکون ہے، ایک وسق ساٹھ/٦٠ صاع کا ہوتا ہے۔

ترقوة : تاء کے فتحہ' راء کے سکون' قاف کے ضمہ اور واؤ کے فتحہ کے ساتھ۔ مغرب میں ہے "ترقوة" ہنسلی اور کندھے کے درمیان والی ہڈی کا نام ہے دونوں جانبوں سے' اور فارسی میں اس کو "خیر کردن" کہتے ہیں۔ اور قاموس میں ہے حلق کے آگے اور سینہ کے اوپر کی طرف جہاں سے سانس چڑھتا ہے اس کو "ترقوة" کہتے ہیں۔

الفصل الثالث:

شرکت مضاربت میں خیر و بھلائی ہے

۲۹۳٦: عَنْ صُهَيْبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ثَلَاثٌ فِيْهِنَّ الْبَرَكَةُ الْبَيْعُ اِلٰى اَجَلٍ وَالْمُقَارَضَةُ وَاِخْلَاطُ

الْبُرِّ بِالشَّعِيْرِ لِلْبَيْتِ لَا لِلْبَيْعِ . (رواه ابن ماجة)

اخرجه ابن ماجه فی السنن ۲/۷۶۸ الحدیث رقم ۲۲۸۹۔

ترجمہ: ''حضرت صہیبؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تین چیزیں ایسی ہیں جن میں برکت ہے (یعنی بہت زیادہ خیر و بھلائی) ایک (معینہ) مدت تک (ادھار) بیچنا (۲) مضاربت کرنا (۳) (گندم میں جو ملانا گھر میں استعمال کے لئے بیچنے کے لئے نہیں''۔ (ابن ماجہ)

تشریح: ثلاث : اس کی تمیز محذوف ہے ای خصال۔ یعنی خریدار کو قیمت اداء کرنے میں مہلت دینے میں برکت ہے' چونکہ اس پر بہت زیادہ ثواب اور ثناء جمیلہ مرتب ہوتی ہے۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مضاربت کہتے ہیں کہ آدمی اپنے اموال میں سے ایک حصہ الگ کر کے دوسرے کو دے تا کہ وہ اس سے کام کرے اور منافع کو آپس میں تقسیم کریں۔ اس میں اشارہ ہے قناعت پر اور اس پر کہ پونجی کی زیادتی کیلئے حرص نہ ہونی چاہئے۔

البر : باء کے ضمہ کے ساتھ گندم کو کہتے ہیں۔ آخری حکم کی بنیاد معاش کے علم پر ہے، جو کہ اللہ کے اس ارشاد سے: مستفاد ہے ﴿والذين اذا انفقوا لم يسرفوا ولم يقتروا و كان بين ذلك قواما﴾ [الفرقان۔۶۷] (اور وہ جب خرچ کرنے لگتے ہیں، تو فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں اور ان کا خرچ کرنا اس کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے)۔ ان تینوں خصلتوں میں اپنے حق کو توڑنا ہے' پہلے دونوں میں فائدہ غیر کو جاتا ہے اور تیسرے میں اپنے نفس کی طرف جاتا ہے کہ یہ شہوات کو توڑتا ہے' اس لئے فرمایا: ''للبیت لا للبیع'' اگر یہ کام بیع میں ہوگا تو اس میں مسلمانوں کے ساتھ ایک قسم کا فریب ہے۔

ایک واقعہ

۲۹۳۷: وَعَنْ حَكِيْمِ بْنِ حِزَامٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ بَعَثَ مَعَهُ بِدِيْنَارٍ لِيَشْتَرِىَ لَهُ بِهٖ اُضْحِيَّةً فَا شْتَرٰى كَبْشًا بِدِيْنَارٍ وَبَاعَهُ بِدِيْنَارَيْنِ فَرَجَعَ فَاشْتَرٰى اُضْحِيَّةً بِدِيْنَارٍ فَجَاءَ بِهَا وَبِالدِّيْنَارِ الَّذِىْ اسْتَفْضَلَ مِنَ الْاُخْرٰى فَتَصَدَّقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِالدِّيْنَارِ فَدَعَا لَهُ اَنْ يُّبَارَكَ لَهُ فِىْ تِجَارَتِهٖ ۔

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳/۶۸۹ الحدیث رقم ۳۳۸۶ و الترمذی فی ۳/۵۵۸ الحدیث رقم ۱۲۵۷

ترجمہ: ''اور حضرت حکیم بن حزامؓ کے بارے میں منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں ایک دینار دے کر بھیجا تا کہ وہ اس دینار سے آپ ﷺ کے لئے قربانی کا جانور خرید لیں' چنانچہ انہوں نے اس دینار کے بدلے ایک مینڈھا یا دنبہ خریدا اور پھر اسے دو دینار میں فروخت کر دیا' (اس سے فارغ ہو کر) وہ پھر واپس گئے اور انہوں نے قربانی کا جانور ایک دینار میں خریدا اور اس جانور کے ساتھ وہ دینار بھی لا کر آپ ﷺ کو دے دیا جو پہلے خریدے گئے جانور کی وصول شدہ قیمت میں سے بچ گیا تھا' رسول اللہ ﷺ نے اس دینار کو تو صدقہ کر دیا اور حکیم بن حزامؓ کے حق میں یہ دعا فرمائی کہ ان کی تجارت میں برکت ڈال دی جائے''۔ (ترمذی' ابوداؤد)

تشریح: قوله : ان رسول الله صلى الله عليه وسلم بعث معه بدينار : امام طیبی فرماتے ہیں کہ مفعول پر باء زائد ہے، جیسا کہ اس آیت میں: ﴿ولا تلقوا بايديكم الى التهلكة﴾ [البقرۃ۔۱۹۵] اس قول کی بنیاد پر کہ آیت میں ''ایدی'' سے مراد ''انفس'' ہے، یعنی کہ تم اپنے نفسوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو، اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ یہاں مفعول محذوف ہے اور تقدیر یوں ہے: ولا تلقوا بايديكم انفسكم اليها۔

بَابُ الْغَصَبِ وَالْعَارِيَةِ

غصب اور عاریت کا بیان

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ ''عارية'' یاء کی تشدید کے ساتھ ہے۔خطابی ''غریب'' میں کہتے ہیں کہ کبھی اس کی یاء کو مخفف بھی پڑھا جاتا ہے۔تورپشتی فرماتے ہیں کہ یہ ''عار'' کی طرف منسوب ہے،اس لئے کہ عرب اس کے مانگنے کو عار اور عیب سمجھتے تھے۔شاعر کہتا ہے:

انما انفسنا عارية ☆ والعواری قصارها ان ترد

بے شک ہمارے نفس عاریۃً ہے،اور عاریت کی آخری کوشش یہ ہے کہ وہ لوٹائی جائے۔

اور ''العاری'' بھی ''عارية '' کی طرح ہے،اور بعض کہتے ہیں کہ '' تعاور ''سے (ماخوذ) ہے،بمعنی تداول (باری باری لینا) یہ (ماخذ) بھی بعید نہیں ہے۔

الفصل الاول :

۲۹۳۸:عَنْ سَعِيْدِ بْنِ زَيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ مَنْ اَخَذَ شِبْرًا مِنَ الْاَرْضِ ظُلْمًا فَاِنَّهٗ يُطَوَّقُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ سَبْعِ اَرَضِيْنَ . (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۲۹۳/۶ الحدیث رقم ۳۱۹۸ ومسلم فی ۱۲۳۱/۳ الحدیث رقم (۱۴۰۔۱۶۱۰) والترمذی فی السنن ۲۰/۴ الحدیث رقم ۱۴۱۸ والدار می فی ۳۴۶/۲ الحدیث رقم ۲۶۰۶ واحمد فی المسند ۱۸۷/۱۔

ترجمہ:''حضرت سعید بن زیدؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص (کسی کی) بالشت بھر زمین بھی از راہ ظلم لے لے گا قیامت کے دن ساتوں زمینیں اس کے گلے میں بطور طوق ڈالی جائیں گی''۔(بخاری ومسلم)

تشریح: **اخذ شبرا** : یہاں مضاف محذوف ہے۔ای قدر شبر یعنی بالشت کی مقدار۔

''**ظلما**''،مفعول له ہے یا حال ہے یا مفعول مطلق ہے۔**فانه** ضمیر ''شبر'' کی طرف عائد۔**یطوقه** :صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

أرضين : راء کے فتحہ اور سکون دونوں کے ساتھ ہے۔کشاف میں ہے: ارضون، راء کی حرکت کے ساتھ ہے،اس لئے کہ قیاس کے مطابق (اس کی جمع) ''ارضات'' (آنی چاہئے تھی) ثمرات کی طرح۔جب تاء کے عوض واؤ اور نون لائے گئے،تو زاء کا فتحہ اپنی حالت پر باقی رہا،اور کبھی اس کو ساکن بھی کر دیا جاتا ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ زمینیں سات (۷) ہیں اور یہ اس آیت کے موافق ہے:﴿**سبع سمٰوٰت ومن الارض مثلهن**﴾[الطلاق۔۱۲]

اور ان لوگوں کا قول ظاہر کے خلاف ہے جو کہتے ہیں کہ سات سے مراد سات اقلیم ہیں،اس لئے کہ جس نے زمین میں سے ایک بالشت غصب کی تو اس کے گلے میں ہر ایک اقلیم سے ایک بالشت کو طوق نہیں بنایا جائے گا،بخلاف زمین کے طبقات کے،کہ وہ اس بالشت کے تابع ہیں ملک کے اعتبار سے۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے:''**کلفه اللّٰه ان یحفره حتٰی یبلغ آخر سبع ارضین**''۔

شرح السنہ میں ہے کہ طوق ڈالنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اس کو زمین میں دھنسائے گا چنانچہ زمین کا وہ قطعہ جو اس نے غصب کیا ہو گا اس کے گلے کو طوق کی مانند جکڑے گا۔

اور بعض کہتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ قیامت کے دن اس کو اس زمین کے اٹھانے کا مکلّف بنایا جائے گا لہٰذا یہاں طوق تکلیف مراد ہے نہ کہ طوق تقلید، اس وجہ سے کہ سالم نے اپنے والد سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''جس نے کسی کی زمین میں سے کچھ بغیر حق کے لیا تو قیامت کے دن اس کو ساتویں زمین تک دھنسایا جائے گا''۔ (انتہی)

یہ بخاری کی روایت ہے احمد سے،

اِن دونوں روایتوں کے درمیان جمع اور تطبیق یوں ممکن ہے کہ اس کے ساتھ یہ سب کچھ کیا جائے گا یا اشخاص کے اختلاف سے ظالم اور مظلوم کا عذاب بھی سخت اور کم ہونے کے اعتبار سے مختلف ہوگا۔

کسی جانور کا دودھ مالک کی اجازت کے بغیر نہ دوھو

۲۹۳۹: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ لَا یَحْلِبَنَّ اَحَدٌ مَاشِیَةَ امْرِیءٍ بِغَیْرِ اِذْنِہٖ اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یُّؤْتٰی مَشْرُبَتُہٗ فَتُکْسَرُ خِزَانَتُہٗ فَیُنْتَلُ طَعَامُہٗ وَاِنَّمَا یَخْزُنُ لَھُمْ ضُرُوْعَ مَوَاشِیْھِمْ اَطْعِمَا تِھِمْ۔ (متفق علیہ)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۸۸/۵ الحدیث رقم ۲٤۳۵ ومسلم فی ۱۳۵۲/۳ الحدیث رقم (۱۳-۱۷۲٦) وابوداؤد فی ۹۱/۳ الحدیث رقم ۲٦۲۳ وابن ماجه فی ۷۷۲/۲ الحدیث رقم ۲۳۰۲ ومالك فی الموطأ ۹۹۷۱/۲ الحدیث رقم ۱۷ من کتاب الاستیذان

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے جانور کا دودھ اس کی اجازت (یعنی اس کے حکم و رضا) کے بغیر نہ دوہے! کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات کو پسند کر سکتا ہے کہ کوئی شخص اس کے خزانہ (یعنی اس کے غلہ کے گودام میں آئے اور اس کے گودام کا تالا توڑ دیا جائے اور اس کا غلہ (گودام سے) نکال لیا جائے اسی طرح (جان لو کہ) ان کے جانوروں کے تھن ان کی غذا (یعنی دودھ) کی حفاظت کرتے ہیں''۔ (مسلم)

تشریح: **لا یحلبن**: لام کے ضمہ کے ساتھ ہے اور کسرہ بھی جائز ہے جیسا کہ قاموس میں ہے۔ **ماشیة**: بکری، اونٹ، اور گائے مراد ہے۔ **أیحب احدکم**: استفہام انکاری ہے۔ **ان یؤتٰی**: صیغہ مجہول کے ساتھ، بصیغہ مؤنث اور مذکر دونوں طرح ہے،

مشربة: میم کے فتحہ اور راء کے ضمہ کے ساتھ، راء کو فتحہ بھی دیا جاتا ہے بمعنی کمرہ وہ بالا خانہ جس میں سامان رکھا جاتا ہو۔

خزانته: خاء کے کسرہ کے ساتھ جیسے ''کتابة'' ہے، خزانچی کا پیشہ، مال جمع کرنے کی جگہ کو کہتے ہیں، اور اس کو کھولا نہیں جاتا جیسے خزانہ اور قضاء حاجت کا برتن نہیں کھولا جاتا۔

فینتل: شرح السنہ میں نہایہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''فینقل متاعه'' یاء، نون اور ثاء مثلثہ کے ساتھ اس کا معنی ہے: **یستخرج ویؤخذ**۔

یخزن: بصیغہ مذکر و مؤنث دونوں طرح ہے، اور زاء کے ضمہ کے ساتھ۔

أطعماتهم: یہ جمع الجمع ہے ''طعام'' کی اور برائے مبالغہ لائی گئی ہے مفعول ہے ''یخزن'' کا، مطلب یہ ہے کہ ان کے مویشیوں کے تھن دودھ کی حفاظت میں بمنزلہ تمہارے خزانے اور گودام کے ہیں جو تمہارے غلہ وغیرہ کی حفاظت کرتے ہیں۔

پس جس نے ان کے جانوروں کا دودھ دوھا یا چوری کی تو ایسا ہے جیسا کہ ان کے خزانے کو توڑا ہو۔

شرح السنہ میں لکھا ہے کہ اکثر علماء نے اس ارشادِ گرامی پر عمل کرتے ہوئے یہ فتویٰ دیا ہے کہ کسی کے جانور کا دودھ مالک کی اجازت کے بغیر دوھنا جائز نہیں ہے۔ ہاں اگر کوئی شخص بھوک سے بے حال ہو رہا ہو، تو اس کیلئے اجازت ہے کہ وہ کسی کے جانور کا دودھ پی لے، پھر اس کی قیمت اداء کرے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس پر ضمان نہیں ہے اس لئے کہ شریعت نے اس کیلئے یہ مباح کیا ہے۔

امام احمد اور اسحق وغیرہ کا مسلک یہ ہے کہ مضطر کے علاوہ کیلئے بھی یہ مباح ہے، جب مالک وہاں موجود نہ ہو۔
پہلی دلیل: مدینہ ہجرت کے وقت حضرت ابو بکر صدیقؓ نے رسول اللہ ﷺ کیلئے قریش کے ایک آدمی کی بکریوں کا دودھ دوہا تھا اور وہ بکریاں اس مالک کا غلام چرا رہا تھا اور مالک خود غائب تھا۔
دوسری دلیل: حضرت سمرہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: کہ "جب تم میں سے کوئی جانوروں کے پاس آئے اور ان کا مالک موجود نہ ہو، تو تین آوازیں لگائیں، پس اگر کسی نے جواب دے دیا تو اس سے اجازت لے لے اور اگر کسی نے بھی جواب نہیں دیا تو دودھ دوہ لے اور پی لے اور ساتھ لے کر نہ جائے"۔
بعض نے مسافر کیلئے کسی دوسرے کے پھل کھانے کی اجازت دی ہے، اس روایت کی وجہ سے جو ابن عمر سے سند غریب کے ساتھ نقل کی گئی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: "جو کسی کے باغ میں کھانے کے لئے داخل ہو جائے اور چھپا کر نہ لے جائے تو اس پر کچھ نہیں ہے"۔
لیکن اکثر علماء کے ہاں مالک کی اجازت کے بغیر جائز نہیں ہے مگر بھوک کی ضرورت کی وجہ سے جیسا کہ پہلے گزرا۔
علامہ تورپشتی فرماتے ہیں کہ بعض نے ان احادیث کو بھوک اور ضرورت پر محمول کیا ہے، اس لئے کہ یہ ان نصوص کے قائم مقام نہیں ہوسکتیں جو مسلمان کے مال کی حرمت کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ اگر غیر مضطر کو مالک کے بارے میں معلوم ہو، یا گمان ہو کہ اس کی اجازت کے بغیر کھانے سے اس کا دل خوش ہوگا نہ کہ ناراض تو پھر اس کیلئے کھانا جائز ہے۔ مضطر اگر پاتا ہو مردار اور کھانا جو کسی غیر کا ہو، تو دونوں میں سے کیا کھائے؟ تو اس میں اختلاف ہے ہمارے ہاں زیادہ صحیح یہ ہے کہ وہ مردار کھائے۔

ایک واقعہ

۲۹۴۰: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ عِنْدَ بَعْضِ نِسَائِهٖ فَاَرْسَلَتْ اِحْدٰى اُمَّهَاتِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِصَحْفَةٍ فِيْهَا طَعَامٌ فَضَرَبَتِ الَّتِي النَّبِيُّ ﷺ فِيْ بَيْتِهَا يَدَ الْخَادِمِ فَسَقَطَتِ الصَّحْفَةُ فَانْفَلَقَتْ فَجَمَعَ النَّبِيُّ ﷺ فِلَقَ الصَّحْفَةِ ثُمَّ جَعَلَ يَجْمَعُ فِيْهَا الطَّعَامَ الَّذِيْ كَانَ فِي الصَّحْفَةِ وَيَقُوْلُ غَارَتْ، اُمُّكُمْ ثُمَّ حَبَسَ الْخَادِمَ حَتّٰى اُتِيَبِصَحْفَةٍ مِنْ عِنْدِ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا فَدَفَعَ الصَّحْفَةَ الصَّحِيْحَةَ اِلَى الَّتِيْ كُسِرَتْ صَحْفَتُهَا وَاَمْسَكَ الْمَكْسُوْرَةَ فِيْ بَيْتِ الَّتِيْ كَسَرَتْ۔ (رواہ البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۹/۳۲۰ الحدیث رقم ۵۲۲۵ والنسائی فی السنن ۷/۷۰ الحدیث رقم ۳۹۵۵ واحمد فی المسند ۳/۲۶۳۔

ترجمہ: "اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ اپنی کسی زوجہ مطہرہ (یعنی حضرت عائشہ صدیقہؓ) کے ہاں قیام فرماتے کہ ازواج مطہرات میں سے کسی نے (یعنی حضرت زینبؓ یا حضرت صفیہؓ اور یا حضرت اُم سلمہؓ نے) ایک پلیٹ بھیجی جس میں کھانے کی کوئی چیز تھی (اسے دیکھتے ہی) ان زوجہ مطہرہ نے کہ جن کے ہاں آپ ﷺ قیام فرماتے (یعنی حضرت عائشہؓ نے) خادم کے ہاتھ پر (اس طرح) مارا کہ وہ پلیٹ گر پڑی اور ٹوٹ گئی۔ نبی کریم ﷺ نے رکابی کے وہ (ٹوٹے ہوئے) ٹکڑے اکٹھے کئے اور پھر ان ٹکڑوں میں کھانے کی وہ چیز جمع کی جو پلیٹ میں موجود تھی۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "تمہاری ماں کو غیرت آ گئی تھی" بہرکیف آپ ﷺ نے (کچھ دیر) خادم کو روکے رکھا یہاں تک کہ جن زوجہ مطہرہ کے گھر آپ ﷺ قیام فرماتے (یعنی حضرت عائشہؓ) ان کے ہاں سے دوسری پلیٹ مہیا کی گئی اور پھر آپ ﷺ نے (اسی خادم کے ذریعہ) ان زوجہ مطہرہ کے ہاں جن کی پلیٹ ٹوٹ گئی تھی وہ صحیح وسالم پلیٹ بھیج دی اور وہ ٹوٹی ہوئی پلیٹ ان زوجہ مطہرہ کے گھر رکھ لی جنہوں نے اس پلیٹ کو توڑا تھا"۔ (بخاری)

تشریح: تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ اس روایت کے دوسرے طرق سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ جس نے خادم کے ہاتھ پر مارا تھا وہ

حضرت عائشہ تھیں۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت انس نے اپنے اس قول "**عند بعض نسائه**" میں ابہام رکھا ہے اور مراد حضرت عائشہؓ تھیں، یہ تفخیم شان کیلئے تھا اور اس وجہ سے کہ اس میں کوئی خفا نہیں تھا اور نہ التباس تھا کہ یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تھیں، اسلئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہدایا اور تحائف اس وقت آتے تھے جب آپ حضرت عائشہؓ کے گھر میں ہوتے تھے۔ (انتہیٰ)

ظاہر یہ ہے کہ یہ مبہم ذکر کرنے کی علت نہیں ہے، بلکہ اس نے جو اس کو مبہم ذکر کیا تھا وہ بھولنے کی وجہ سے تھا، یا تردد کی وجہ سے یا تعدد واقعہ کی وجہ سے، ہاں یہ قرائن مجمل کو واضح اور مبہم کو متعین کرتے ہیں۔ واللہ اعلم

ارسلت احدىٰ امهات المؤمنين : بعض کہتے ہیں کہ یہ حضرت صفیہ تھیں، بعض کہتے ہیں کہ زینب تھیں اور بعض کہتے ہیں کہ حضرت ام سلمہ تھیں۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ بھیجنے والی کو "ام المؤمنین" کی صفت کے ساتھ ذکر کیا اس کی شفقت اور اس کی کسر غیرت کے اظہار کے لئے کہ اس نے اپنی سوکن کے گھر پیالہ میں ہدیہ بھیجا تھا۔

فلق : فاء کے کسرہ اور لام کے فتحہ کے ساتھ جمع ہے "**فلقة**" کی۔ ٹوٹے ہوئے ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ **جعل** : بمعنی شرع ہے۔

یہ فعل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال تحمل، انتہائی تواضع، حسن معاشرت، اور اپنے ربّ کی نعمت کی بہت زیادہ تعظیم کا مظہر ہے۔

قوله : ويقول غارت امكم : امام طیبی فرماتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خطاب عام ہے دراصل واقعہ کو سننے پڑھنے والوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ کی طرف سے عذر بیان کیا تا کہ لوگ حضرت عائشہؓ کے اس فعل کو برائی پر محمول نہ کریں، بلکہ یہ سوکنوں کی اس طبعیت کی وجہ سے ہوا جو ان کی عادت ہے، جو ہر عورت کی جبلت و سرشت میں داخل ہے اور اس کے بس میں نہیں ہے کہ وہ اپنے نفس کو اس سے محفوظ رکھ سکے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ خطاب ان مؤمنین سے ہے جو اس حاضر تھے۔

حتى أتي : صیغہ مجہول کے ساتھ۔ **كسرت** : صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

بيت التي كسرت : صیغہ معلوم کے ساتھ ہے، تورپشتی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا تعلق نہ تو غصب سے ہے اور نہ ہی عاریۃ سے ہے بلکہ مناسب یہ تھا کہ اس کو "**باب ضمان المتلفات**" میں ذکر کرتے۔

قاضی نے کہا ہے کہ اس حدیث کو اس باب میں نقل کرنے کی وجہ یہ ہے کہ آپ علیہ السلام نے رکابی کو مارنے والی پر رکابی کے بدل کا تاوان لازم کیا اس لئے کہ وہ رکابی اس کے خادم کے ہاتھ کو مارنے کی وجہ سے ٹوٹی تھی اور غصب کے اقسام میں سے کسی کے مال کو تلف کرنا ہے خواہ برادہ راست تلف کیا جائے یا کسی اور سبب سے زیادتی کے طور پر تلف کیا ہو۔

ابن الملک شرح المشارق میں فرماتے ہیں کہ اگر یہ کہا جائے کہ اس کا رکابی کا ضمان قیمت کے ساتھ لازم تھا اس کے لئے کہ یہ ذوات الامثال میں سے نہیں تھی تو پھر آپ علیہ السلام نے رکابی کے بدلے رکابی کیوں دی؟ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور مروت کے دیا تھا نہ کہ ضمان کے طور پر، اس لئے کہ رکابیاں دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تھیں اور بعض کہتے ہیں کہ اس وقت رکابیاں ایک جیسی ہوتی تھیں تو یہ عددیات متقاربہ کی طرح تھی، ان میں سے ایک کو دوسری کی جگہ دینا جائز تھا، اور بعض کہتے ہیں کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کی رضامندی کے ساتھ کیا تھا لہٰذا قیمت کا دعوٰی باقی نہ رہا۔

کسی مسلمان کا مال لوٹنا حرام ہے

۲۹۴۱: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ يَزِيْدَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ اَنَّهٗ نَهٰى عَنِ النُّهْبَةِ وَالْمُثْلَةِ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٥/١١٩ الحدیث رقم ٢٤٧٤۔

ترجمہ: ''اور حضرت عبداللہ بن زیدؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ڈاکہ ڈالنے اور مثلہ کرنے (یعنی مردے کے اعضاء کاٹنے) سے منع فرمایا ہے''۔ (بخاری)

تشریح: النهبة : نون کے ضمہ کے ساتھ۔

شرح السنہ میں لکھا ہے کہ اس حدیث میں وارد نہی کی یہ تاویل کی جائے گی کہ یہ اس جماعت کے بارے میں ہے کہ جو غنیمت کا مال لوٹے اور اس کو تقسیم میں شامل نہ کرے، یا اس قوم کے بارے میں کہ ان کے پاس کہیں سے غلہ آ جائے اور وہ اس کو لوٹ لیں اور اس طرح کی اور صورتیں، ورنہ مسلمانوں کا مال لوٹنا ہر ایک پر حرام ہے۔

المثلة : میم کے ضمہ کے ساتھ۔ نہایہ میں ہے کہ کہا جاتا ہے: مثلت بالحيوان أمثل به مثلا، جب اس کے اطراف کاٹے جائیں، اور اس کو بدنما اور بدرو کیا جائے، اور بعض کہتے ہیں اس سے مراد تخلیق میں بدنمائی پیدا کرنا ہے، ناک، کان کاٹنے اور آنکھوں کے پھوڑنے کے ساتھ۔ (انتہیٰ)

بعض کہتے ہیں مثلہ مقتول کے اعضاء ''قصاصًا'' یا کفر کی وجہ سے، یا حدًا (بطور حد) کاٹنے کو کہتے ہیں اس لئے کہ غرض حیاۃ کا ختم کرنا ہے اور وہ حاصل ہو چکا ہے تو اس کے بعد اس کے کاٹنے میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔

حاجیوں کا سامان چرانے والے کا عبرتناک حشر

۲۹۴۲: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ انْكَسَفَتِ الشَّمْسُ فِيْ عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ يَوْمَ مَاتَ اِبْرَاهِيْمُ ابْنُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَصَلّٰى بِالنَّاسِ سِتَّ رَكَعَاتٍ بِاَرْبَعِ سَجَدَاتٍ فَانْصَرَفَ وَقَدْ اٰضَتِ الشَّمْسُ وَقَالَ مَا مِنْ شَيْءٍ تُوْعَدُوْنَهٗ اِلَّا قَدْ رَاَيْتُهٗ فِيْ صَلَاتِيْ هٰذِهٖ لَقَدْ جِيْءَ بِالنَّارِ وَذٰلِكَ حِيْنَ رَاَيْتُمُوْنِيْ تَاَخَّرْتُ مَخَافَةَ اَنْ تُصِيْبَنِيْ مِنْ لَفْحِهَا وَحَتّٰى رَاَيْتُ فِيْهَا صَاحِبَ الْمِحْجَنِ يَجُرُّ قُصْبَهٗ فِي النَّارِ وَكَانَ يَسْرِقُ الْحَاجَّ بِمِحْجَنِهٖ فَاِنْ فُطِنَ لَهٗ قَالَ اِنَّمَا تَعَلَّقَ بِمِحْجَنِيْ وَاِنْ غُفِلَ عَنْهُ ذَهَبَ بِهٖ وَحَتّٰى رَاَيْتُ فِيْهَا صَاحِبَةَ الْهِرَّةِ الَّتِيْ رَبَطَتْهَا فَلَمْ تُطْعِمْهَا وَلَمْ تَدَعْهَا تَاْكُلُ مِنْ خَشَاشِ الْاَرْضِ حَتّٰى مَاتَتْ جُوْعًا ثُمَّ جِيْءَ بِالْجَنَّةِ وَذٰلِكَ حِيْنَ رَاَيْتُمُوْنِيْ تَقَدَّمْتُ حَتّٰى قُمْتُ فِيْ مَقَامِيْ وَلَقَدْ مَدَدْتُ يَدِيْ وَاَنَا اُرِيْدُ اَنْ اَتَنَاوَلَ مِنْ ثَمَرَتِهَا لِتَنْظُرُوْا اِلَيْهِ ثُمَّ بَدَا لِيْ اَنْ لَّا اَفْعَلَ۔ (رواہ مسلم)

اخرجه فی صحیحه ۲/۶۲۳ الحدیث رقم (۱۰-۹۰۴) واحمد فی المسند ۳/۳۱۸

ترجمہ: ''اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں آپ ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کی وفات کے دن سورج گرہن ہوا' چنانچہ آپ ﷺ نے لوگوں کو (سورج گرہن کی) نماز چھ رکوع اور چار سجدوں کے ساتھ پڑھائی (یعنی دو رکعتیں پڑھیں اور ہر رکعت میں تین تین رکوع اور دو دو سجدے کئے) اور جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو سورج پہلے کی طرح روشن ہو چکا تھا پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس چیز کا (یعنی جنت اور دوزخ کا) تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ میں نے آج اپنی اس نماز میں دیکھ لی ہے' چنانچہ دوزخ کو میرے سامنے لایا گیا اور یہی وہ وقت تھا جب (نماز کے دوران) تم نے مجھے پیچھے ہٹتے ہوئے دیکھا تھا اور میں اس خوف سے پیچھے ہٹ گیا تھا کہ کہیں اس کی گرمی مجھے اپنی لپیٹ میں نہ لے لے' میں نے (اس وقت) دوزخ میں خمدار لکڑی والے شخص (یعنی عمرو بن الحی) کو اس حال میں دیکھا کہ وہ اس میں اپنی انتڑیوں کو گھسیٹ رہا تھا' یہ شخص اپنی خمدار لکڑی کے ذریعہ حاجیوں کا سامان چرایا کرتا تھا (جس کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ وہ چلتے چلتے کسی کی کوئی چیز اپنی خمدار لکڑی میں الجھا لیتا تھا) اگر کوئی اس کی یہ حرکت دیکھ لیتا تو وہ یہ کہہ دیتا کہ یہ چیز خود بخود میری لکڑی میں الجھ آئی ہے اور اگر کسی کو اس حرکت کے بارے میں معلوم نہ

ہوتا تو وہ اس چیز کو غائب کر دیتا تھا۔ نیز میں نے اس وقت دوزخ میں اس بلی والی عورت کو بھی دیکھا جس نے ایک بلی باندھ رکھی تھی جسے نہ وہ کچھ کھلاتی تھی اور نہ اسے چھوڑتی تھی کہ وہ حشرات الارض یعنی چوہے وغیرہ کھالے یہاں تک کہ وہ بلی بھوکی مرگئی۔ پھر میرے سامنے جنت کو پیش کیا گیا اور یہی وہ وقت تھا جب تم نے مجھے (نماز کے دوران) آگے بڑھتے ہوئے دیکھا تھا یہاں تک مگر پھر میں اپنی جگہ کھڑا ہو گیا اور میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ میں اس کے پھل کو توڑنا چاہتا تھا جسے تم بھی دیکھ لو لیکن پھر مجھے ظاہر ہوا کہ میں ایسے نہ کروں (تاکہ تمہارے ایمان بالغیب میں رخنہ نہ پڑے)''۔ (مسلم)

تشریح: علی عهد رسول الله : اور ایک نسخہ میں "**فی عهد النبی**" ہے۔

ابراهیم ابن رسول الله صلی الله علیه وسلم : خطاً اثبات الف کے ساتھ ہے اور لفظاً نون کے ساتھ ہے۔

رکعات : کاف کی حرکت کے ساتھ یہاں رکعت سے مراد رکوع ہے۔

آضت الشمس : امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''اضت''، ہمزہ ممدودہ کے ساتھ ہے اسی طرح اس کو ضبط کیا ہے تمام راویوں نے ہمارے بلاد میں، یعنی اپنی پہلے والی حالت کی طرف لوٹا، اور اسی سے '' ایضاً '' ہے جو مصدر ہے آض یئیض کا۔

لفحها : لام کے فتحہ اور حاء کے سکون کے ساتھ "**مخافة**" منصوب ہے مفعول لہ ہونے کی بناء پر، ای **خشیة اصابة لفحها** ای۔ نہایہ میں ہے "**لفح النار**" فاء اور حاء کے ساتھ، آگ کے بھڑکنے اور اس کی گرمی کو کہتے ہیں۔

المحجن : میم کے کسرہ، حاء کے سکون اور جیم کے فتحہ کے ساتھ۔ لاٹھی کو کہتے ہیں جس کا سر ٹیڑھا ہو، جیسے ٹیڑھی لکڑی ہوتی ہے، اور میم زائد ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس لمبی لکڑی کو کہتے ہیں جس کے سرے پر ٹیڑھا لوہا لگا ہو، **محجن** اسم ہے '' **حجن** '' سے حاء جیم پر مقدم ہے، اور '' **حجن** '' کسی چیز کو اپنی طرف کھینچنے کو کہتے ہیں۔

'' **صاحب** '' سے مراد عمرو بن لحی ہے۔ '' لحی '' لام کے ضمہ، حاء کے فتحہ اور یاء کی تشدید کے ساتھ ہے۔

القصب : انتڑی کو کہتے ہیں اور اس کی جمع '' **اقصاب** '' آتی ہے۔ اور بعض کہتے ہیں '' **قصب** '' تمام انتڑیوں کو کہتے ہیں اور بعض کہتے ہیں پیٹ کے نیچے والے حصے کی انتڑیوں کو کہتے ہیں۔

فطن له : صیغہ مجہول کے ساتھ۔ **فلم تطعمها** : پہلے حرف کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ **ولم تدعها** : **لم تترك** کے معنی میں ہے۔

خشاش الارض : خاء کے فتحہ کے ساتھ، کبھی اس کو کسرہ بھی دیا جاتا ہے۔ زمین کے کیڑے مکوڑے۔ بعض کہتے ہیں کہ **خشاش**، خاء پر تینوں حرکات درست ہیں، کیڑوں مکوڑوں کو کہا جاتا ہے اور حاء کے ساتھ خشک گھاس کو کہا جاتا ہے۔

لی ان لا افعل بدا : نہایہ میں ہے کہ "**بداء**" کسی چیز کو درست پانے اور نہ جاننے کے بعد جاننے کو کہتے ہیں۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شاید ان کو یہ بات درست نظر آئی ہو کہ جنت کے پھل صحابہ کے سامنے ظاہر نہ کریں، تاکہ ایمان غیبی شہودی سے نہ بدل جائے، یا یہ کہ اگر ان کو جنت کے پھل دکھاتے تو پھر یہ بھی لازم تھا کہ جہنم کے شعلے بھی دکھاتے، اور اس وقت پھر خوف اُمید پر غالب ہو جاتا، تو انکے معاش کے امور باطل ہو جاتے اور اسی وجہ سے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اگر تم جان لو وہ جو میں جانتا ہوں تو تم زیادہ روؤ گے اور کم ہنسو گے۔'' واللہ تعالیٰ اعلم

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ علماء فرماتے ہیں کہ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ آپ علیہ السلام نے جنت اور دوزخ کو آنکھوں سے دیکھا ہو، کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو منکشف کر دیا ہو اور آپ ﷺ اور ان کے درمیان پردوں کو ہٹا دیا ہو، جیسا کہ مسجد اقصیٰ کو آپ ﷺ کیلئے ظاہر کیا گیا تھا، اور پردے ہٹا دیئے گئے تھے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ رؤیت علم اور وحی ہو، بطور تفصیل اور تعریف کے کہ اس سے پہلے آپ کو ان کے بارے میں اتنی زیادہ معرفت نہیں تھی۔ تو اس سے آپ ﷺ کو وہ خشیت حاصل ہوئی جو پہلے نہ تھی، لیکن پہلی والی تاویل زیادہ بہتر ہے اور الفاظ حدیث کے ساتھ زیادہ مشابہہ ہے۔ اس لئے کہ اس میں ایسے امور ہیں جو آنکھوں سے دیکھنے پر دلالت کر رہے ہیں جیسا کہ آپ کا

پیچھے ہٹنا تا کہ دوزخ کی گرمی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ پہنچے اور آگے بڑھنا جنت کے پھل کے خوشہ لینے کیلئے۔

اس حدیث سے کئی باتیں معلوم ہوئیں:

۱ جنت اور دوزخ عالم وجود میں آ چکی ہیں، اور موجود ہیں

۲ جنت کے پھلوں کا وجود اور عین ہے جیسا کہ دنیا کے پھل ہیں، اور یہی اہل سنت کا مسلک ہے۔

۳ عذاب اور ہلاکت کی جگہ سے ہٹ جانا سنت ہے،

۴ تھوڑا سا عمل نماز کو باطل نہیں کرتا۔

۵ بعض لوگ اس وقت بھی دوزخ کے عذاب میں گرفتار ہیں۔

۶ اس عورت کو دوزخ کا عذاب ہونا بلی کو باندھنے کی وجہ سے تھا، یہ دلالت کر رہا ہے کہ اس کا یہ فعل گناہ کبیرہ تھا۔ اس لئے کہ بلی کا باندھنا اور پھر اس پر اصرار کرنا یہاں تک کہ وہ مرگئی یہ گناہ صغیرہ پر اصرار ہے، اور صغیرہ پر اصرار اس کو کبیرہ بنا دیتا ہے۔

جانور کا عاریۃً مانگ لینا جائز ہے

۲۹۴۳: وَعَنْ قَتَادَةَ قَالَ سَمِعْتُ اَنَسًا يَقُوْلُ كَانَ فَزَعٌ بِالْمَدِيْنَةِ فَاسْتَعَارَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم فَرَسًا مِنْ اَبِیْ طَلْحَةَ يُقَالُ لَهُ الْمَنْدُوْبُ فَرَكِبَ فَلَمَّا رَجَعَ قَالَ مَا رَاَيْنَا مِنْ شَيْءٍ وَاِنْ وَجَدْنَاهُ لَبَحْرًا۔ (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ۲۴۰/۵ الحديث رقم ۲۶۲۷ ومسلم فی ۱۸۰۳/۴ الحديث رقم (۴۹-۲۳۰۷) وابو داؤد فی السنن ۲۶۳/۵ الحديث رقم ۴۹۸۸ والترمذی فی ۱۷۲/۴ الحديث رقم ۱۶۸۶ واحمد فی المسند ۱۷۱/۳ (۱فی المخطوطة (واستحلاب)۔

ترجمہ: "اور حضرت قتادہؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ایک دن (اس خیال سے کہ کفار کا لشکر مدینہ کے قریب آ گیا ہے) مدینہ میں شور برپا ہو گیا (یہ دیکھ کر) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا گھوڑا کہ جسے مندوب یعنی سست کہا جاتا تھا' عاریۃً مانگا اور اس پر سوار ہو کر (تحقیق حال کے لئے مدینہ سے باہر) نکلے پھر جب آپؐ واپس تشریف لائے تو فرمایا کہ ہم نے خوف و گھبراہٹ کی کوئی چیز نہیں دیکھی' نیز ہم نے اس گھوڑے کو (تیز رفتاری میں) سمندر پایا ہے"۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: "یقول:" حال ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ مفعول ثانی ہے۔

فزع: فا اور زاء دونوں کے فتحہ کے ساتھ، خوف چیخ۔ **المندوب**: اس کی سستی کی وجہ سے کہا جاتا تھا۔

اور نہایہ میں ہے کہ "مندوب" سے مراد "مطلوب" ہے۔ یہ "الندب الرھن" سے ہے، جس کو مقابلہ میں شرط کیلئے رکھا جائے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ اس کے جسم میں نشان کی وجہ سے اس کو مندوب کہتے ہیں۔ "لذوب" یہ نشان زخم کو کہتے ہیں۔

فلما قال ما رأینا من شیء: یعنی خوف و گھبراہٹ میں سے یا اس سستی میں سے جو مندوب کے بارے میں کہی جاتی تھی۔

وان وجدناہ: "فرس" مذکر اور مؤنث دونوں کیلئے استعمال ہوتا ہے جیسا کہ قاموس میں ہے۔

بحر: یعنی کشادہ قدم۔ جیسا کہ سمندر کشادہ ہوتا ہے' اور بعض کہتے ہیں کہ "بحر" تیز رفتار گھوڑے کو کہتے ہیں' کشادہ چال کی وجہ سے اس کو بحر کہتے ہیں یعنی وہ چلنے میں سمندر کے پانی کے چلنے کی طرح ہے۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "ان وجدنا" میں "ان" مخففہ من المثقلہ ہے اور "وجدناہ" کی ضمیر "فرس" کی طرف راجع ہے۔ جو عاریۃً لیا تھا۔ (انتہی) پس "ان" کا اسم محذوف ہے اور وہ ضمیر شان ہے' اور "لبحرا" کا لام "ان" نافیہ اور "ان" مخففہ کے درمیان فرق کیلئے ہے۔

شیخ مظہر فرماتے ہیں کہ "ان" یہاں 'ما' نافیہ کے معنی میں ہے۔ اور لام "الا" کے معنی میں ہے، اور تقدیری عبارت یوں ہے: **ما وجدناه الا بحرا**۔ اور عرب کہتے ہیں: **ان زید لعاقل ای ما زید الا عاقل**، (انتہیٰ)۔ یہ کوفیین کے مذہب کے مطابق ہے جیسا کہ مغنی میں ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا:

① جانور عاریۃً مانگنا جائز ہے۔
② کلام میں توسع اور کشادگی مباح ہے۔
③ ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ تشبیہ دینا اس کے معانی میں سے کسی معنی میں جائز ہے، اگرچہ تمام صفات میں برابر نہ ہو۔
④ کسی جانور کو کسی نام سے موسوم کرنا جائز ہے، اور یہ عرب کی عادات میں سے ہے۔
⑤ اسی طرح سامانِ جنگ کا نام رکھنا بھی جائز ہے، تاکہ طلب کے وقت جلدی مل جائے۔
⑥ کسی انسان کا اکیلے خبر کی تحقیق اور ٹوہ لگانے کیلئے جانا جائز ہے، جب تک ہلاکت متحقق نہ ہو۔
⑦ ازالہء خوف کے بعد، خوف کے خاتمہ کی خوشخبری لوگوں کو دینا مستحب ہے۔
⑧ آپ ﷺ کس قدر شجاع اور قوی القلب تھے۔

الفصل الثانی:

بنجر زمین کو آباد کرنے والا اس زمین کا مالک ہے

۲۹۴۴: **وَعَنْ سَعِيْدِ بْنِ زَيْدٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ اَنَّهٗ قَالَ مَنْ اَحْيٰى اَرْضًا مَيْتَةً فَهِيَ لَهٗ وَلَيْسَ لِعِرْقٍ ظَالِمٍ حَقٌّ۔**

(رواه احمد والترمذی وابوداود)

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ۴۵۳/۳ الحديث رقم ۳۰۷۳ والترمذی فی ۶۶۲/۳ الحديث رقم ۱۳۷۸

ترجمہ: "حضرت سعید بن زیدؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے مردہ زمین کو زندہ کیا وہ زمین اسی کی ہے اور ظالم کی رگ کا کوئی حق نہیں ہے"۔ اس روایت کو احمد، ترمذی، ابوداوٗد نے (بطریق اتصال) نقل کیا ہے۔

تشریح: **من احییٰ ارضا میتة**: کہ پہلے سے وہ کسی مسلمان کی ملکیت نہ ہو، اور نہ کسی شہر و گاؤں کی کسی ضرورت و مصلحت سے متعلق ہو، مثلاً جانوروں کے بیٹھنے کی جگہ ہو۔

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک حکومت وقت کی اجازت بھی شرط ہے۔ صاحبین نے ان سے اختلاف کیا ہے، امام شافعی اور احمد رحمہم اللہ کا مسلک بھی یہی ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ حدیث مطلق ہے۔

(امام ابوحنیفہ کی دلیل یہ حدیث ہے) آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ "آدمی کیلئے جائز نہیں ہے مگر وہ جس پر حاکم کا دل خوش ہو"۔ یہ اجازت کے شرط ہونے پر دلالت کرتا ہے، پس اس مطلق کو اس پر محمول کیا جائے گا۔ اس لئے کہ یہ دونوں حدیثیں ایک ہی حادثہ کے بارے میں ہیں۔ (جیسا کہ اس کو ذکر کیا ہے ابن الملک نے)

قاضی فرماتے ہیں کہ "ارض میتة" سے مراد بنجر زمین ہے جو غیر آباد ہو، اور اس کا زندہ کرنا اس کی آبادی اور تعمیر ہے۔ زمین کی تعمیر کو بدن کی حیات سے تشبیہ دی ہے اور زمین کے بنجر ہونے اور تعمیر سے خالی ہونے کو زندگی کے مفقود و زائل ہونے سے تشبیہ دی ہے۔

عرق: عین کے کسرہ کے ساتھ "عراق" اور "ظالم": دونوں تنوین کے ساتھ ہے اور موصوف صفت ہیں۔

یعنی دوسرے کی آباد کی ہوئی زمین میں کاشت کرے یا درخت لگائے اس سے وہ اس زمین کا مستحق نہیں بن جائے گا۔ اور "عرق"

سے مراد لگائے گئے درخت ہیں۔یہ نام اس لئے رکھا ہے کہ ظلم اس کے ساتھ حاصل ہوا ہے، تو یہ اسناد مجازی ہے۔اور اس کو اضافت کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے۔اس صورت میں اس سے مراد درخت لگانے والا ہوگا جس کو ظالم کہا گیا ہے۔اس لئے کہ یہ دوسرے کی ملکیت میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف ہے۔اور یہ معنی زیادہ موافق ہے حکم سابق کے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ جس نے درخت لگائے یا کاشت کی دوسرے کی زمین میں بلا اجازت، تو اس کے درختوں اور کھیتی کا باقی رہنے کا حق نہیں ہے بلکہ مالک کو اختیار ہے اس کے اکھیڑنے کا بغیر ضمان کے (اس کو ذکر کیا ہے ابن الملک نے امام طیبی کے اتباع میں) اور سیوطی مختصر النہایہ میں فرماتے ہیں کہ ''العرق'' کی روایت تنوین کے ساتھ ہے، اور مضاف محذوف ہے۔ای لذی عرق ظالم، کہ اس میں نفس رگ کو ظالم قرار دیا ہے اور یہ وصف صاحب رگ کا ہے اور وہ درخت کی ایک جڑ ہے۔

۲۹۴۵: ورواه مالك عن عروة مرسلا وقال الترمذي هذا حديث حسن غريب۔

اخرجه مالك في الموطأ ۲/۷۴۳ الحديث رقم ۲٦ من كتاب الاقضية۔

ترجمه: جب کہ مالکؒ نے اس روایت کو عروہ سے بطریق ارسال روایت کیا ہے۔نیز امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے''۔

تشریح: پس یہ حدیث ایک وجہ سے مرسل ہے۔

قاضیؒ کہتے ہیں تعجب کی بات ہے کہ مصابیح میں اس حدیث کی نسبت سعید بن زیدؓ کی طرف ہے اور وہ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اور اس کو مرسل بھی کہا ہے، اور شاید یہ ناسخ نے کیا ہو۔اور شیخ نے متصل اور مرسل میں سے ایک روایت متن میں ذکر کی ہو اور کسی اور نے دوسری حدیث حاشیہ میں لکھی۔تو ناسخ کو التباس ہوا ہے اور اس نے یہ گمان کیا کہ یہ دونوں متن کی روایتیں ہیں تو اس نے دونوں کو متن میں لکھ دیا ہو۔

امام طیبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ بھی جائز ہے کہ صحابی نے حدیث مرسل روایت کی ہو، اس طور پر کہ اس نے کسی اور صحابی سے سنی ہو اور پھر اس کی طرف نسبت نہ کی ہو لیکن یہ حدیث اس میں سے نہیں ہے، بوجہ مصنفؒ کے اس قول کے ''**وقال الترمذي هذا حديث حسن غريب**''، (انتہیٰ)۔لیکن اس میں یہ بات ہے کہ مصنفؒ کے قول ''**رواه مالك عن عروة مرسلا**'' سے معلوم ہوتا ہے کہ عروہ نے صحابی کے واسطہ کو حذف کیا ہے، اب اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ وہ صحابی سعید ہوں یا کوئی اور ہو۔اور دوسری بات یہ ہے کہ مراسیل صحابہ معتبر ہیں اجماعاً، بخلاف مرسل تابعی کے کہ وہ جمہور کے ہاں حجت ہے، اور امام شافعیؒ کے ہاں حجت نہیں ہے۔اور اس کی حجت کیلئے کم از کم اتنا ضروری ہے کہ اس کی سند حسن ہو۔امام طیبی کا کہنا ہے کہ یہ حدیث اس میں سے نہیں بوجہ مصنفؒ کے قول...... یہ غیر ظہر ہے۔ واللہ اعلم۔

اور روایت کیا ہے احمد، اور نسائی، اور ابن حبان اور ضیاء نے حضرت جابرؓ سے:

''**من احيا ارضا ميتة فله فيها اجر، و ما اكلت العافية منه فهوله صدقة**''۔

اور بیہقی نے سند حسن کے ساتھ حضرت عائشہ سے مرفوع روایت کیا ہے:

''**العباد عباد الله، ولبلاد بلاد الله، فمن احيا من موات الارض شيئا فهو له وليس لعرق ظالم حق**''۔

جب کہ مالکؒ نے اس روایت کو عروہ سے بطریق ارسال کیا ہے۔نیز امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے''۔

کسی دوسرے کا مال بغیر اجازت حلال نہیں ہے

۲۹۴٦: وَعَنْ اَبِیْ حُرَّةَ الرَّقَاشِيِّ عَنْ عَمِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلَا لَا تَظْلِمُوْا اَلَا لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِءٍ

اِلَّا بِطِيْبِ نَفْسٍ مِنْهُ (رواه البيهقى فى شعب الا يمان و الدارقطنى فى المجتبى)

احمد فى المسند ٥/٧٢و البيهقى فى شعب الايمان ۔

ترجمہ:''اور حضرت ابوحرہ رقاشی (تابعیؒ) اپنے چچا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: خبردار کسی پر ظلم نہ کرنا! جان لو! کسی بھی شخص کا مال (لینا یا استعمال کرنا) اس کی خوشدلی کے بغیر حلال نہیں۔ اس روایت کو بیہقی نے شعب الایمان میں اور دارقطنی نے مجتبیٰ میں نقل کیا ہے''۔

تشریح: **الا** : تخفیف کے ساتھ تنبیہ کیلئے ہے۔

لا تظلموا : یعنی تم میں سے بعض، بعض پر ظلم نہ کریں، کذا قبل اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ تم اپنے نفسوں پر ظلم نہ کرو۔ یہ ظلم قاصر (یعنی اپنے نفس تک محدود) اور متعدی دونوں کو شامل ہے۔

الا : یہ بھی تنبیہ کیلئے ہے، اور اس کو مکرر ذکر کیا اس بات پر تنبیہ کیلئے کہ یہ دونوں جملے ایک مستقل حکم ہیں، اس پر متنبہ ہونا چاہئے اور دوسرے کے ساتھ چونکہ حقوق العباد متصل ہیں تو یہ زیادہ لائق ہے کہ اس کی طرف اشارہ کیا جائے اور اس کو خاص کیا جائے۔

کسی کا مال لوٹنے والا اسلامی برادری کا فرد بننے کے قابل نہیں ہے

۲۹۴۷: وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ اَنَّهٗ قَالَ لَا جَنَبَ وَلَا شِغَارَ فِي الْاِسْلَامِ وَمَنِ انْتَهَبَ نُهْبَةً فَلَيْسَ مِنَّا ۔ (رواه الترمذى)

اخرجه ابو داؤد فى السنن ٣/ ٦٧ الحديث رقم ٢٥٨١ و الترمذى فى ٣/ ٤٣١ الحديث رقم ١١٢٣ و النسائى فى ٦/ ١١٠ الحديث رقم ٣٣٣٤ و احمد فى المسند ٤/ ٤٣٩

ترجمہ:''اور حضرت عمران بن حصینؓ نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اسلام میں جلب' جنب اور شغار (جائز) نہیں ہے اور یاد رکھو جو شخص لوٹ مار کرے وہ ہم میں سے نہیں (یعنی وہ ہماری جماعت میں سے نہیں ہے یا ہمارے طریقہ پر نہیں ہے حاصل یہ کہ ایسا شخص اس قابل نہیں کہ اسے اسلامی برداری کا ایک فرد سمجھا جائے)''۔ (ترمذی)

حالاتِ راوی:

عمران بن حصین: ان کی کنیت ابونجید تھی' نون کے ضمہ اور جیم کے فتحہ کے ساتھ' خیبر کے سال مسلمان ہوئے اور اپنی وفات تک بصرہ میں ہی مقیم رہے۔ ان کی وفات ۵۲ھ میں ہوئی۔ یہ فقہاء صحابہ میں سے تھے۔

تشریح: **جلب' جنب** : دونوں میں پہلے دو حرف مفتوح ہیں۔ **شغار** : پہلے حرف کے کسرہ کے ساتھ۔

فی الاسلام : ظاہر تو یہ ہے کہ اسلام کی قید سب کے ساتھ ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ صرف آخری کے ساتھ ہو۔

قاضیؒ کہتے ہیں کہ ''جلب'' گھوڑ دوڑ میں یہ ہے کہ گھوڑا دوڑانے والا شخص ایک آدمی کو اپنے گھوڑے کے پیچھے رکھے کہ وہ گھوڑے کو دوڑائے اور دھتکارے۔ اور ''جنب'' یہ ہے کہ اپنے گھوڑے کے ساتھ ایک خالی گھوڑا رکھے تاکہ سواری کا گھوڑا اگر تھک جائے تو یہ اس دوسرے گھوڑے پر سوار ہو جائے۔ جلب اور جنب زکوٰۃ میں بھی ہوتا ہے ان کی تفسیر ''کتاب الزکوٰۃ'' میں گزر گئی ہے۔ ''شغار'' یہ ہے کہ ایک شخص اپنی بہن کا نکاح کسی سے اس شرط کے ساتھ کرے کہ وہ اپنی بہن کا نکاح اس کے ساتھ کر دے اور مہر کچھ نہ مقرر ہو، بلکہ یہ شرط ہی مہر کے قائم مقام ہو۔ یہ ''شغر البلد'' سے ماخوذ ہے' یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب شہر لوگوں سے خالی ہو جائے، چونکہ یہ عقد بھی مہر سے خالی ہوتا ہے اور حدیث اس عقد کے فساد پر دلالت کرتا ہے اس لئے کہ اگر یہ صحیح ہوتا، تو یہ اسلام میں ہوتا۔ اور یہ اکثر علماء کا قول ہے، اور فساد کا مقتضی بضع میں شرکت ہے اس کو مہر بنانے کی وجہ سے۔

امام ابوحنیفہ اور ثوری رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ یہ عقد صحیح ہے اور ہر ایک کیلئے مہر مثل ہوگا۔ ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس بات کو جان لو کہ نفی کا متعلق مسمّٰی شغار ہے اور مہر سے خالی ہونا، اور بضع کو قرار دینا اس کے مفہوم سے ماخوذ ہے۔ اور ہم اس ماہیت اور حقیقت نفی کے قائل ہیں اور جو اس پر صادق آئے شرعاً، پس نکاح اس طرح برقرار نہیں رہا بلکہ ہم اس کو باطل کررہے ہیں، اور باقی رکھ رہے ہیں ایسا نکاح جس میں ایسی چیز مقرر کی گئی ہے جو مہر بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی وایسا نکاح منعقد ہو جائے گا جو مہر مثل کو لازم کرنے والا ہے۔ جیسا کہ وہ نکاح جس میں شراب کو مہر مقرر کیا ہو، پس جو نفی کا متعلق ہے ہم اس کو ثابت نہیں کرتے اور جس کو ہم ثابت کررہے ہیں اس کے ساتھ نفی کا تعلق نہیں ہے۔

نهبة : نون کے ضمہ اور ھاء کے سکون کے ساتھ، قاموس میں ہے کہ ''نهب''، غنیمت کو کہتے ہیں اور اسم ''نهبة'' ہے۔

تخریج: اسی طرح نسائی اور ضیاء نے حضرت انس سے **''فی الاسلام''** تک روایت کیا ہے۔ احمد اور ترمذی نے حضرت انس سے **''من انتهب فلیس منا''** روایت کیا ہے۔ اور اسی طرح اس کو احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ، اور ضیاء نے حضرت انس سے روایت کیا ہے۔

کسی کی کوئی چیز ہنسی مذاق میں لیکر ہڑپ نہ کر جاؤ

۲۹۴۸: وَعَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيْدَ عَنْ اَبِيْهِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ لَا يَأْخُذُ اَحَدُكُمْ عَصَا اَخِيْهِ لَاعِبًا جَادًّا فَمَنْ اَخَذَ عَصَا اَخِيْهِ فَلْيَرُدَّهَا اِلَيْهِ (رواه الترمذی و ابوداؤد و روایة الی قوله جادا)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۵/۲۷۳ الحدیث رقم ۵۰۰۳ والترمذی فی ۴/۴۰۲ الحدیث رقم ۲۱۶۰ واحمد فی المسند ۴/۲۲۱۔

ترجمہ: ''اور حضرت سائب بن یزیدؓ اپنے والد مکرم سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی کا عصا (لاٹھی) ہنسی مذاق میں اور اس کو غصہ دلانے کے لئے نہ لے جو شخص اپنے کسی بھائی سے عصا لے تو اسے چاہیے کہ اس کو واپس کردے۔ (ترمذی، ابوداؤد) لیکن ابوداؤد کی روایت لفظ جادا تک ہے۔

تشریح: **لا یأخذ** : صیغہ نہی کے ساتھ اور بعض کہتے ہیں کہ نفی کا صیغہ ہے۔

احدکم عصا اخیه : یعنی مثال کے طور پر۔

لا عبا جادا : دونوں ''یأخذ'' کے فاعل سے حال ہیں۔ اگر یہ دونوں حال مترادفہ ہوں تو پھر دونوں میں تناقض ہوگا اور اگر تداخل ہو تو پھر صحیح ہے۔ (اس کو امام طیبی نے ذکر کیا ہے یعنی کہ ''جادا'' اول سے حال ہوگا۔ لیکن ظاہر یہ ہے دوسرا حال مقدر ہے تاکہ تناقض لازم نہ آئے خواہ دونوں حال مترادفہ ہوں یا دونوں متداخلہ ہوں، اتنی بات ہے کہ اول کو ظاہر پر محمول کیا جائے گا اور دوسرے کو باطن پر، یعنی **''لاعبا ظاهرا'' ''جادا باطنا''** یعنی اس کو مذاق کے طور پر لے اور مقصد اس کو اپنے پاس روکے رکھنا ہو، تاکہ مذاق اور حقیقت دونوں ایک وقت میں نہ ہوں، اسی لئے شیخ مظہر نے کہا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس چیز کو لے لے بھروسہ اور مزاح کے طور پر اور پھر اپنے پاس رکھے اور واپس نہ کرے تو یہ حقیقت میں لینا ہو جائے گا۔

شرح السنہ میں ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے، کہ وہ کسی کا سامان لے لے اور چوری کا ارادہ نہ ہو بلکہ اس کو غضبناک کرنا مقصود ہو، تو یہ چوری کرنے میں مزاح کررہا ہے اور اس کو غصہ دلانے ڈرانے اور تکلیف دینے میں سنجیدہ ہے۔ (انتہیٰ) اور پہلے قول کی تائید اگلے جملہ سے ہوتی ہے

قوله :فمن اخذ عصا اخیه فلیردها الیه : علامہ تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ یہاں مثال کے طور پر لاٹھی کا ذکر اسلئے کیا کہ لاٹھی حقیر چیزوں میں سے ہے کہ مالک کے نزدیک جس کی کوئی بڑی قدر وعظمت نہیں ہے، تو جو چیز اس سے اچھی ہو تو وہ اس حکم کے زیادہ لائق ہے۔

اپنا چوری کا مال جس کے پاس دیکھو اس سے لے لو

۲۹۴۹: وَعَنْ سَمُرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ مَنْ وَجَدَ عَيْنَ مَالِهِ عِنْدَ رَجُلٍ فَهُوَ اَحَقُّ بِهِ وَيَتَّبِعُ الْبَيِّعَ مَنْ بَاعَهُ.

(رواه احمد وابوداود والنسائی)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۸۰۲/۳ الحدیث رقم ۳۵۳۱ والنسائی فی ۳۱۳/۷ الحدیث رقم ۳۶۱ واحمد فی المسند ۱۳/۵۔

ترجمہ: ''اور سمرہؓ نبیؐ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص اپنا مال بعینہٖ کسی شخص کے پاس دیکھے تو وہ ''اس کا زیادہ حقدار ہے اور اس کو خریدنے والا اس شخص کا پیچھا کرے جس نے اسے فروخت کیا ہے''۔ (احمد، ابوداؤد، نسائی)

تشریح: **من وجد عین ماله** : تورپشتی فرماتے ہیں کہ اس سے مراد غصب کی ہوئی چیز یا چوری کی ہوئی چیز یا گمشدہ مال ہے۔

یتبع : تاء کی تشدید اور باء کے کسرہ کے ساتھ، اور ایک نسخہ میں تاء کی تخفیف اور باء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

البیع : یاء کی تشدید کے ساتھ بمعنی مشتری۔

جس سے کوئی چیز لو اس کو واپس کر دو

۲۹۵۰: وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ عَلَى الْيَدِ مَا اَخَذَتْ حَتّٰى تُؤَدِّيَ ۔ (رواه الترمذی وابوداؤد وابن ماجة)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۸۲۲/۳ الحدیث رقم ۳۵۶۱ والترمذی فی ۵۶۶/۳ الحدیث رقم ۱۲۶۶ وابن ماجه فی ۸۰۲/۲ الحدیث رقم ۲۴۰۰ والدارمی فی ۳۴۲/۲ الحدیث رقم ۲۵۹۶ واحمد فی المسند ۸/۵

ترجمہ: ''اور حضرت سمرہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہاتھ پر لازم ہے کہ اس نے جو چیز لی ہے وہ (اس چیز کو) واپس کرے''۔ (ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: **علی الید ما اخذت** : یعنی ہاتھ پر اس چیز کا لوٹانا واجب ہے جو اس نے لی ہے۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''ما'' موصولہ مبتدا ہے اور ''علی الید'' اس کی خبر ہے۔ اور راجع محذوف ہے۔ ای ما اخذته الید، یعنی ہاتھ نے جو چیز لی ہے اس کا ضمان اس ہاتھ والے پر لازم ہے اور ہاتھ کی طرف نسبت مبالغہ کیلئے ہے اس لئے کہ ہاتھ ہی تصرف کرنے والا ہے۔

حتی تؤدی : مضارع معروف واحد مؤنث کا صیغہ ہے اور ضمیر مستتر ''ید'' کی طرف راجع ہے۔

یعنی یہاں تک کہ وہ چیز اس کے مالک کی طرف واپس کر دی جائے۔ لہٰذا چھینا ہوا مال اس کے مالک کو واپس کر دینا واجب ہے اگرچہ مالک اس کا مطالبہ نہ کرے، اسی طرح عاریۃً لی ہوئی چیز وہ مدت پوری ہو جانے کے بعد مالک کو واپس کر دینا ضروری ہے اگر مدت مقرر کی گئی ہو، اگرچہ مالک مطالبہ نہ کرے، اور جو چیز بطور امانت رکھی ہوئی ہو اس کا واپس کرنا لازم نہیں ہے جب تک مالک مطالبہ نہ کرے۔ (اس کو ذکر کیا ہے ابن الملک نے)۔ اور یہ بہترین تفصیل ہے جو شیخ مظہر کے کلام کو واضح کر دیتی ہے۔ (وہ فرماتے ہیں) کہ جس نے کسی کا مال لیا غصب کر کے یا عاریۃً یا امانت کے طور پر اس کا واپس کرنا اس پر لازم ہے۔

تخریج: اس طرح احمد، نسائی اور حاکم نے روایت کیا ہے، انہوں نے ضمیر کے ساتھ ''حتی تؤدیه'' کے الفاظ نقل کئے ہیں۔

کسی کے باغ وغیرہ کو جانور کے نقصان پہنچانے کا مسئلہ

۲۹۵۱: وَعَنْ حَرَامِ بْنِ سَعْدِ بْنِ مُحَيِّصَةَ اَنَّ نَاقَةً لِلْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ دَخَلَتْ حَائِطًا فَاَفْسَدَتْ فَقَضٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَنَّ عَلٰى اَهْلِ الْحَوَائِطِ حِفْظَهَا بِالنَّهَارِ وَاَنَّ مَا اَفْسَدَتِ الْمَوَاشِيْ بِاللَّيْلِ ضَامِنٌ عَلٰى اَهْلِهَا.

(رواه مالك وابوداود وابن ماجة)

اخرجه ابوداوٗد في السنن ۳/ ۸۲۸ الحديث رقم ۳۵۶۹ وابن ماجه في ۲/ ۷۸۱ الحديث رقم ۲۳۳۲ ومالك في الموطأ ۲/ ۷۴۷ الحديث رقم ۳۷ من كتاب الاقضية واحمد في المسند ۵/ ۴۳۶۔

ترجمه: ''اور حضرت حرام بن سعد بن محیصہؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) حضرت براء بن عازبؓ کی اونٹنی ایک باغ میں گھس گئی اور باغ کو خراب کر ڈالا (جب یہ معاملہ رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچا) تو رسول اللہ ﷺ نے یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ دن میں باغات کی حفاظت باغ والوں کے ذمہ ہے اور جو جانور رات میں باغات کو خراب کریں تو اس کا ضمان یعنی تاوان جانوروں کے مالکوں پر ہے''۔ (مالک ٔابوداوٗد ٔابن ماجہ)

حالاتِ راوی:

یہ حرام بن سعد ہیں: حرام جو ضد ہے حلال کا۔ یہ اپنے والد اور براء بن عازب سے روایت کرتے ہیں جیسا کہ جامع الاصول میں ہے اور مصنفؒ نے ان کا ذکر نہیں کیا ہے۔

تشریح: **محیصة**: یاء مکسورہ کی تشدید کے ساتھ ہے اور بعض کہتے ہیں سکون کے ساتھ ہے۔

حائطا: نہایہ میں ہے حائط اس باغ کو کہتے ہیں جس پر حائط ہو۔

ضامن: اسم فاعل بمعنی مفعول، ''**مضمون**'' کے ہے جیسے ''**کاتم**'' بمعنیٰ ''**مکتوم**'' کے یا مضاف محذوف ہے یعنی ذو ''ضمان''۔

شرح السنہ میں ہے کہ اہل علم اس طرف گئے ہیں کہ اگر کوئی جانور دن میں کسی کے باغ کو خراب کر دے تو اس کا تاوان جانور کے مالک پر نہیں آتا۔ اور اگر رات کو نقصان پہنچائے تو اس کا تاوان جانور کے مالک پر واجب ہوگا۔ اس لئے کہ عرف میں دن میں باغ کی حفاظت کرنا باغ والے کی ذمہ داری ہے اور جانوروں کی حفاظت رات میں ان کے مالک کی ذمہ داری ہے۔ پس جس نے اس عادت کی خلاف ورزی کی تو وہ حفاظت کرنے کے رسم ورواج سے خارج ہے۔ یہ ساری تفصیل اس صورت میں ہے جبکہ جانور کا مالک جانور کے ساتھ نہ ہو۔ اگر مالک جانور کے ساتھ ہوگا خواہ وہ جانور پر سوار ہو یا اسے کھینچ کر لے جا رہا ہو، یا پیچھے سے ہنکار رہا ہو، یا جانور کھڑا ہو، تو تاوان جانور کے مالک پر ہوگا۔ چاہے وہ جانور اپنے ہاتھ پاؤں سے نقصان پہنچائے چاہے منہ سے۔ اور یہی امام مالک اور امام شافعی کا مسلک ہے۔ اس بارے میں حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر جانور کا مالک جانور کے ساتھ نہ ہو تو پھر اس پر نقصان کا تاوان واجب نہیں ہوتا خواہ وہ جانور دن میں نقصان پہنچائے خواہ رات میں۔

۲۹۵۲: **وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ الرِّجْلُ جُبَارٌ وَقَالَ النَّارُ جُبَارٌ**. (رواه ابوداود)

اخرجه ابوداوٗد في السنن ۴/ ۷۱۴ الحديث رقم ۴۵۹۲ وابن ماجه في ۲/ ۸۹۱ الحديث رقم ۲۶۷۶۔

ترجمه: ''اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (جانور کے) پاؤں کا روندا ہوا معاف ہے اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا کہ آگ کا جلایا ہوا معاف ہے (یعنی اگر کسی نے اپنی زمین میں آگ جلائی اور پھر آندھی میں آگ کو اڑا کر کسی اور جگہ لے گئی اور وہاں آگ لگ گئی تو یہ نقصان بھی معاف ہے)''۔ (ابوداوٗد)

تشریح: **قوله: الرِّجْلُ جُبَارٌ**: **الرجل**: راء کے کسرہ کے ساتھ، یعنی جانور کا پاؤں۔ یہ ''تسمية السبب باسم المسبب'' کے قبیل سے ہے۔ یعنی جو جانور کسی چیز کو پاؤں سے روندے یا مار دے راستے میں۔ **جبار**: جیم کے ضمہ اور باء کی تخفیف کے ساتھ یعنی رائیگاں وباطل۔

ابن الملک فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی جانور پر سوار ہو اور وہ جانور پچھلے پاؤں سے کسی انسان کو مار دے تو یہ معاف ہے اور اگر

اگلے پاؤں سے مار دے تو اس کا تاوان مالک پر لازم ہوگا۔ یہ اس لئے کہ سوار کے اختیار میں جانور کے اگلے پاؤں کا تصرف ہوتا ہے نہ کہ پچھلے کا۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تاوان لازم ہونے میں اگلے اور پچھلے پاؤں برابر ہیں۔

قوله :وَقَالَ النَّارُ جُبَار : وقال :ضمیر نبی ﷺ کی طرف راجع ہے۔ اور قال کا اعادہ اس لئے کیا کہ اس سے اشارہ کرنا مقصود ہے کہ یہ قول پہلے قول سے الگ صادر ہوا ہوا' اور اس پر دلالت کر رہا ہے کہ حدیث کے پہلے حصہ کو روایت کیا ہے ابوداؤد نے اور دوسرے کو ابو داؤد اور ابن ماجہ نے، جیسا کہ جامع الصغیر میں ہے۔

حدیث مبارکہ کے اس جملہ کا حاصل یہ ہے کہ جو آگ کی چنگاری نے جلایا بغیر زیادتی کے، اس طور پر کہ اس نے آگ جلائی ہو اپنی ضرورت کیلئے نہ کہ ایذاء رسانی کیلئے۔

شرح السنہ میں ہے اگر کوئی آدمی اپنی ملکیت میں آگ جلاتا ہے اور ہوا میں کوئی چنگاری اڑ کر کسی دوسرے کے مال پر جا کر پڑے اور اس کا لوٹانا بھی ممکن نہ ہو، تو اس کا ضمان واجب نہ ہوگا بلکہ یہ معاف ہے۔ لیکن یہ اس وقت ہے جب وہ آگ جلا رہا ہو تو اس وقت ہوا رُکی ہوئی ہو اور بعد میں ہوا چلے۔

حالت اضطرار میں دوسرے کے جانور کا دودھ پینے کی اجازت

۲۹۵۳: وَعَنِ الْحَسَنِ عَنْ سَمُرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ اِذَا اَتٰی اَحَدُکُمْ عَلٰی مَاشِیَةٍ فَاِنْ کَانَ فِیْهَا صَاحِبُهَا فَلْیَسْتَأْذِنْهُ وَاِنْ لَّمْ یَکُنْ فِیْهَا فَلْیُصَوِّتْ ثَلَاثًا فَاِنْ اَجَابَهٗ اَحَدٌ فَلْیَسْتَأْذِنْهُ وَاِنْ لَّمْ یُجِبْهُ اَحَدٌ فَلْیَحْتَلِبْ وَلْیَشْرَبْ وَلَا یَحْمِلْ. (رواه ابوداود)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳/۸۹ الحدیث رقم ۲۶۱۹ والترمذی فی ۳/۵۹۰ الحدیث رقم ۱۲۹۶۔

ترجمہ: ''اور حضرت حسن حضرت سمرہؓ سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص (دودھ کے) جانوروں کے پاس آئے تو اگر وہاں ان جانوروں کا مالک موجود ہو تو اس سے (دودھ پینے کی) اجازت مانگے اور اگر وہاں مالک موجود نہ ہو تو اس شخص کو چاہئے کہ وہ تین مرتبہ آواز دے۔ اس کی آواز سن کر اگر کوئی جواب دے تو اس سے اجازت مانگے اور اگر کوئی جواب نہ دے تو وہ بقدر ضرورت دودھ دوہ کر پی لے مگر وہ اپنے ساتھ بالکل نہ لے جائے''۔ (ابوداؤد)

تشریح: قوله :قَالَ اِذَا اَتٰی اَحَدُکُمْ ...... : امام طیبی فرماتے ہیں کہ اتی متعدی بنفسہ ہے اور یہاں اس کو ''علی'' کے ساتھ متعدی کیا ہے اس لئے کہ یہ ''نزل'' کے معنی کو متضمن ہے۔ اور جانوروں کو بمنزلہ میزبان بنایا ہے، اور اس میں معنیٰ اچھی تعلیل ہے اور یہ اس وقت ہے کہ جب اترنے والا مہمان مضطر ہو۔

فلیستأذنه :لام کے سکون کے ساتھ اور کسرہ بھی جائز ہے۔ **فلیصوت** :واؤ کی تشدید کے ساتھ۔

ابن الملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ضرورت کی وجہ سے جائز ہے یعنی بھوک کے مارے مرا جا رہا ہو، یا سفر کرنے سے عاجز ہو رہا ہو، اور اس کی قیمت مالک کو لوٹائے قدرت کے وقت۔ اور بعض کہتے ہیں کہ قیمت لوٹانا ضروری نہیں ہے۔ (انتہی)

اور امام احمد فرماتے ہیں کہ یہ بغیر مجبوری کے بھی جائز ہے اور اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

دوسرے کے باغ کا پھل مالک کی اجازت کے بغیر کھانے کا مسئلہ

۲۹۵۴: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ مَنْ دَخَلَ حَائِطًا فَلْیَاْکُلْ وَلَا یَتَّخِذْ خُبْنَةً۔

(رواه الترمذی وابن ماجة وقال الترمذی هذا حدیث غریب)

اخرجه الترمذی فی السنن ۳/۵۸۳ الحدیث رقم ۱۲۸۷ وابن ماجه فی ۲/۷۷۲ الحدیث رقم ۲۳۰۱

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عمرؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص (کسی دوسرے شخص کے) باغ میں داخل ہو جائے تو اسے چاہئے کہ (بقدرِ ضرورت) وہ وہاں کے پھل کھالے (لیکن) جیب اور جھولے میں بھر کر نہ لے جائے۔ (ترمذی ٔابن ماجہ) امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے''۔

تشریح: خبنة : خاء پر ضمہ ٔباء پر سکون اور اس کے بعد نون ہے۔ کپڑے کے کنارے کو کہتے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ اس میں سے کچھ بھی کپڑے میں ڈال کر نہ لے جائے۔ اور یہ اجازت بھی اس مسافر کو ہے جو مضطر ہو ورنہ یہ احادیث ان نصوص کے برابر نہیں ہیں جو مسلمانوں کے مال کے حرام ہونے کے بارے میں وارد ہے۔ (ذکرہ ابن الملک) یہ روایت متن اور سند دونوں کے اعتبار سے پہلے گزری ہے،

مستعار لی ہوئی چیز امانت کے حکم میں ہے

۲۹۵۵: وَعَنْ اُمَيَّةَ بْنِ صَفْوَانَ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ اسْتَعَارَ مِنْهُ اَدْرَاعَهُ يَوْمَ حُنَيْنٍ فَقَالَ اَغَصْبًا يَا مُحَمَّدُ قَالَ بَلْ عَارِيَةٌ مَضْمُوْنَةٌ. (رواہ ابوداود)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳/۸۲۲ الحدیث رقم ۳۵٦۲ واحمد فی المسند ٦/٤٦٥

ترجمہ: ''اور حضرت امیہ بن صفوان اپنے والد (صفوان) سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حنین کی جنگ کے دن ان (صفوان) سے کئی زرہیں عاریۃً لیں انہوں نے پوچھا کہ اے محمد (ﷺ) کیا آپ (ﷺ) یہ زرہیں غصب کے طور پر لے رہے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں بلکہ عاریۃً لے رہا ہوں جو واپس کردی جائیں گی''۔ (ابوداؤد)

تشریح: قوله : وَعَنْ اُمَيَّةَ بْنِ ...... :ادراع : درع کی جمع ہے

ابن الملک فرماتے ہیں کہ یہ زرہوں کے مالک تھے اور کافر تھے، آپ علیہ السلام کی اجازت سے مدینہ آئے تاکہ قرآن وحدیث سنیں اور دین کے احکام سیکھیں اس شرط کے ساتھ کہ اگر ان کو دین اسلام پسند آیا تو یہ مسلمان ہو جائیں گے ورنہ تو اپنے وطن کی طرف لوٹیں گے مسلمانوں کی طرف سے بغیر کسی تکلیف پہنچنے کے، انہوں نے گمان کیا کہ آپ ﷺ مجھ سے زرہیں لے رہے ہیں اور واپس نہیں لوٹائیں گے۔

فقال اغصبا : اس کی ترکیب میں معتمد بات وہی ہے جو ہم پہلے مصنفؒ سے نقل کر چکے ہیں۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ ''غصبا'' معمول ہے ہمزہ کے مدخول کا۔ تقدیری عبارت یوں ہے أتأخذها غصبا لا تردها علی۔

یا محمد : بعض کہتے ہیں کہ یہ نداء کسی مؤمن سے صادر نہیں ہو سکتی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿**لا تجعلوا دعاء الرسول بینکم کدعاء بعضکم بعضا**﴾ (تم لوگ رسول کے بلانے کو ایسے مت سمجھو جیسا تم میں ایک دوسرے کو بلالیتا ہے)۔

اور امام طیبی نے یہاں اللہ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے: ﴿**ولا تجهروا له بالقول کجهر بعضکم لبعض**﴾ تو یہ اس مقام کے مناسب نہیں ہے اور مقصد کے لائق نہیں۔ تورپشتی فرماتے ہیں کہ اس وقت یہ کافر تھے اور جاہلیت کی نفرت ان کے دل میں پیوست تھی۔

عاریة : یاء کی تشدید کے ساتھ ہے اور کبھی تخفیف کے ساتھ ہوتا ہے یہ منصوب ہے اور مرفوع بھی پڑھا گیا ہے اور یہی وجوہ اعراب ''مضمونۃ'' میں بھی ہیں۔

مضمونة : بمعنیٰ ''مردودۃ'' کے ہے یعنی میں یہ تمہاری عاریۃً لے رہا ہوں اور واپس کروں گا، تو ضمان کو رد کی جگہ رکھا۔ لوٹانے میں مبالغہ کیلئے یعنی میں یہ کیسے واپس نہیں کروں گا، حالانکہ ان کا واپس کرنا مجھ پر لازم ہے۔ پس جس نے کہا ہے مستعار لی ہوئی چیز کا ضمان لازم نہیں ہے تو انہوں نے ظاہر کلام کو دیکھا ہے اور جو کہتے ہیں کہ ضمان لازم ہے انہوں نے اس باریک نکتہ کو دیکھا ہے (جیسا کہ اس کی تحقیق

کی ہے امام طیبی نے۔)

ابن الملک فرماتے ہیں کہ "مضمونة" کی تاویل "ضمان رد" کے ساتھ کی جائے گی یعنی "مستعیر" پر اس چیز کا مالک کی طرف لوٹانا لازم ہے اور اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ اگر شئے مستعار بعینہٖ موجود ہو تو اس کا لوٹانا واجب ہے۔

قاضی کہتے ہیں کہ یہ حدیث دلیل ہے اس بات پر کہ "مستعیر" پر شئے مستعار کا تاوان واجب ہے۔ پس اگر وہ اس کے ہاتھ میں ہلاک ہو جائے تو اس پر ضمان لازم ہوگا اور یہی حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ کا قول ہے۔ اور یہی عطاء، شافعی اور احمد کا مسلک ہے۔

شریح، حسن بصری، نخعی، امام ابو حنیفہ اور ثوری کا مسلک یہ ہے کہ شئے مستعار، مستعار لینے والے کے پاس بطور امانت ہوتی ہے، تلف کی صورت میں اس کا بدلہ دینا واجب نہیں، ہاں اگر اس کو تعدی کے ساتھ تلف کیا تو بدلہ دینا واجب ہوگا۔ اور یہ مروی ہے حضرت علی اور ابن مسعودؓ سے۔

"مضمونة" کی تاویل کرتے ہیں "ضمان رد" کے ساتھ، لیکن یہ تاویل ضعیف ہے، اس لئے کہ وہ اس معنی میں استعمال نہیں ہوتا چنانچہ کہا جاتا ہے "الودیعة مردودة" لیکن "الودیعة مضمونة" نہیں کہا جاتا۔ اور اگر لفظ "ضمان" کا "رد" کی جگہ استعمال صحیح بھی ہو، تو یہاں لفظ "ضمان" کو "رد" پر محمول کرنا ظاہر سے عدول ہے بلا دلیل۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ اگر اس چیز کی ہلاکت مخفی ہو یعنی مستعیر کے پاس اس کے تلف ہونے پر گواہ نہ ہو تو بدلہ دینا لازم ہوگا ورنہ نہیں ہوگا۔

مستعار چیز کو واپس کر دینا واجب ہے

۲۹۵۶: وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ الْعَارِيَةُ مُؤَدَّاةٌ وَالْمِنْحَةُ مَرْدُوْدَةٌ وَالدَّيْنُ مُقْضِيٌّ وَالزَّعِيْمُ غَارِمٌ . (رواه الترمذی وابوداود)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۸۲۴/۳ الحدیث رقم ۳۵۶۵ والترمذی فی ۵٦۵/۳ الحدیث رقم ۱۲٦۵ وابن ماجه فی ۸۰۱/۲ الحدیث رقم ۲۳۹۸ واحمد فی المسند ۲٦۷/۵۔

ترجمہ: "اور حضرت ابو امامہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ عاریۃً لی ہوئی چیز واپس کی جائے (یعنی کسی کی کوئی چیز عاریۃً لینے والے پر واجب ہے کہ وہ اس چیز کو اس کے مالک کے پاس واپس پہنچا دے) منحہ کا واپس کرنا ضروری ہے (یعنی عطاء کے طور پر ملے ہوئے دودھ دوہنے والے جانور واپس کر دیئے جائیں) قرض کو ادا کیا جائے (یعنی قرض کو ادا کرنا واجب ہے) اور ضامن ضمانت پوری کرنے پر مجبور ہے (یعنی اگر کوئی شخص کسی کے قرض وغیرہ کا ضامن ہو تو اس کی ادائیگی اس پر لازم ہے)"۔ (ترمذی، ابوداؤد)

تشریح: قوله: الْعَارِيَةُ مُؤَدَّاةٌ وَالْمِنْحَةُ مَرْدُوْدَةٌ :...... العارية : تشدید کے ساتھ ہے اور مخفف بھی پڑھا جاتا ہے۔

مؤداة : ہمزہ کے ساتھ ہے اور ہمزہ کو واؤ سے تبدیل بھی کیا جاتا ہے۔ تورپشتی فرماتے ہیں کہ اس کا معنی ہے کہ وہ مالک کی طرف واپس کی جائے گی۔ اور اس کی تاویل میں وہی اختلاف ہے جو اوپر "مضمونة" کے بارے میں تھا۔ پس جو لوگ ضمان دینے کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس کا معنی ہے کہ عین کو واپس کرنا لازم ہے اگر وہ موجود ہو اور قیمت اداء کرنا لازم ہے تلف ہونے کی صورت میں۔ اور جو ضمان دینے کے قائل نہیں ہیں ان کے اداء کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ "مستعیر" پر شئے مستعار کے واپس لوٹانے کا بوجھ لازم کرنا ہے، کہ یہ اس پر لازم ہے۔

المنحة : میم کے کسرہ اور نون کے سکون کے ساتھ، "منحه" اسے کہتے ہیں کہ کوئی شخص کسی کو اپنا جانور دودھ پینے کیلئے دیدے۔ یا کسی کو اپنی زمین یا باغ پھل کھانے کیلئے دیدے، یا کاشت کرنے کیلئے دے دے۔ اور ایک روایت میں "المينحة" ہے۔

مردودة : اس بات کا اعلان ہے کہ اس میں صرف منفعت کا مالک بنایا جاتا ہے نہ کہ اصل چیز کا مالک بنایا جاتا ہے۔
قوله : وَالزَّعِيْمُ غَارِمٌ : غرم کہتے ہیں ایسے چیز کا اداء کرنا جو اس پر لازم ہو، تخریج: اسی طرح احمد، ابن ماجہ وضیاء نے روایت کیا ہے۔

درخت سے گرے ہوئے پھل اٹھانے کا مسئلہ

۲۹۵۷ : وَعَنْ رَافِعِ بْنِ عَمْرٍوبْنِ الْغِفَارِيِّ قَالَ كُنْتُ غُلَامًا اَرْمِيْ نَخْلَ الْاَنْصَارِ فَاُتِيَ بِيَ النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَ يَا غُلَامُ لِمَ تَرْمِي النَّخْلَ قُلْتُ آكُلُ قَالَ فَلَا تَرْمِ وَكُلْ مِمَّا سَقَطَ فِيْ اَسْفَلِهَا ثُمَّ مَسَحَ رَأْسَهُ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ اَشْبِعْ بَطْنَهُ۔

(رواه الخرجه ابوداوٗد فی السنن ۳/۹۰ الحديث رقم ۲۶۲۲ والترمذی فی ۳/۵۸۴ الحديث رقم ۱۲۸۸ وابن ماجه فی ۲/۷۷۱ الحديث رقم ۲۲۹۹ واحمد فی المسند ۵/۳۱۔

ترجمہ: ''اور حضرت رافع بن عمرو غفاریؓ کہتے ہیں کہ جب میں بچہ تھا تو انصار کے کھجوروں کے درختوں پر پتھر مارا کرتا تھا (ایک دن) مجھے پکڑ کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لے جایا گیا' آپ ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمایا: ''اے لڑکے! تو کھجوروں پر پتھر کیوں مارتا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ کھجوریں کھانے کے لئے (یعنی کھجوریں کھانے کے لئے ان کے درختوں پر پتھر مارتا ہوں کسی اور مقصد سے پتھر نہیں پھینکتا) آپ ﷺ نے فرمایا ''پتھر نہ مارا کرو وہاں جو کھجوریں درخت کے نیچے گری پڑی ہوں ان کو کھالیا کرو''۔ پھر آپؐ نے اس کے سر پر اپنا دست مبارک پھیرا اور فرمایا کہ ''اے اللہ! تو اس کا پیٹ بھر''۔ (ترمذی' ابوداوٗد' ابن ماجہ)

حالاتِ راوی:

رافع بن عمرو۔ یہ رافع بن عمرو غفاری ہیں۔ ''غفاری'' میں غین معجمہ پر کسرہ ہے۔ ان کا شمار بصریوں میں کیا جاتا ہے۔ ان سے عبداللہ بن صامت نے روایت کی ہے ''اکل تمر'' کے بارے میں ان کی حدیث ہے۔

تشریح: أتى : صیغہ مجہول کے ساتھ۔ بی النبی صلی الله علیه وسلم : ''نبی'' منصوب ہے
وقال : اور ایک نسخہ میں ''فقال'' ہے اور ایک نسخہ میں صرف ''قال'' ہے۔
وكل مما سقط فی اسفلها : اس لئے کہ عام طور پر درختوں سے گرے ہوئے پھل اٹھانے والے کو کوئی منع نہیں کرتا خاص طور پر چھوٹے بچے جو پھلوں کے زیادہ شوقین ہوتے ہیں۔
شیخ مظہر فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ان کو گرے ہوئے پھلوں کے کھانے کی اجازت دی ان کے اضطرار اور مجبوری کی وجہ سے ورنہ تو ان کیلئے درختوں سے گرے ہوئے پھلوں کا کھانا بھی جائز نہ تھا اس لئے کہ وہ غیر کا مال ہے جیسا کہ درختوں پر لگی ہوئی کھجور ہے۔
علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ اگر وہ مضطر اور مجبور ہوتے تو پھر ان کیلئے جائز تھا کہ اگر زمین پر کچھ نہ ہوتا تو وہ پتھر مار کر پھل گرا کر کھاتے لیتے۔
قوله :فقال اللهم اشبع بطنه : بعض کہتے ہیں کہ یہ دلالت کر رہا ہے کہ وہ مضطر نہیں تھے۔
اللقطة : لام کے ضمہ اور قاف کے فتحہ کے ساتھ، اور قاف کو ساکن بھی کیا جاتا ہے۔ اس میں فعلی اعتراض ہے۔

الفصل الثّالث:

زمین غصب کرنے کی سزا

۲۹۵۸ :عَنْ سَالِمٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ اَخَذَ مِنَ الْاَرْضِ شَيْئًا بِغَيْرِ حَقِّهٖ خُسِفَ بِهٖ يَوْمَ

الْقِیَامَةِ اِلٰی سَبْعِ اَرَضِیْنَ ۔ (رواہ البخاری)

اخرجہ البخاری فی صحیحہ ۵/۱۰۳ الحدیث رقم ۲۴۵۴ واحمد فی المسند ۲/۹۹۔

ترجمه: ''حضرت سالمؒ اپنے والد مکرم سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی بیان کیا کہ ''جس شخص نے زمین کا کوئی حصہ ناحق وصول کیا (یعنی کسی کی زمین کا کوئی بھی قطعہ از راہ ظلم وزبردستی لے گا) تو قیامت کے دن اسے سات زمینوں تک دھنسادیا جائے گا''۔ (بخاری)

تشریح: من اخذ من الارض شیأ :اور ایک نسخہ میں ''شبرا'' ہے۔

خسف به : صیغہ مجہول کے ساتھ ہے، اور باء متعدی کرنے کیلئے ہے۔ جملہ خبریہ ہے، یا انشائیہ ہے بمعنی دعاء کے، اور اول زیادہ ظاہر ہے۔ ارضین :راء کی حرکت کے ساتھ، اور سکون کے ساتھ دونوں طرح درست ہے۔ اس میں خبر ہے کہ آخرت میں بھی زمین کے سات طبقات ہوں گے۔

۲۹۵۹: وَعَنْ یَعْلٰی بْنِ مُرَّةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ مَنْ اَخَذَ اَرْضًا بِغَیْرِ حَقِّھَا کُلِّفَ اَنْ یَحْمِلَ تُرَابَھَا الْمَحْشَرَ. (رواہ احمد)

اخرجہ احمد فی المسند ۴/۱۷۲۔

ترجمه: ''اور حضرت یعلی بن مرۃؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جس شخص نے زمین کا کوئی بھی حصہ ناحق (یعنی از راہِ ظلم) وصول کیا اسے حشر کے دن اس بات پر مجبور کیا جائے گا کہ وہ اس زمین کی (ساری) مٹی اپنے سر پر اٹھائے''۔ (احمد)

حالاتِ راوی:

یعلی بن مرۃ ۔ یہ ''یعلیٰ مرہ'' کے بیٹے ہیں۔ ''بنوثقیف'' میں سے ہیں۔ حدیبیہ اور اس کے بعد کے تمام غزوات۔ غزوہ خیبر۔ فتح مکہ۔ حنین۔ طائف اور تبوک میں حاضر تھے۔ ان سے ایک جماعت نے حدیث روایت کی ہے۔ ان کا شمار اہل کوفہ میں ہوتا ہے۔

تشریح: قوله :مَنْ اَخَذَ اَرْضًا بِغَیْرِ حَقِّھَا کُلِّفَ اَنْ یَحْمِلَ تُرَابَھَا الْمَحْشَرَ :

المحشر : شین کے فتحہ کے ساتھ ہے اور اس کو کسرہ بھی دیا جاتا ہے اور ایک نسخہ میں ''الی المحشر'' ہے۔ ''محشر'' جمع ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ اور قاموس میں ہے ''الحشر'' بمعنی جمع ہے یحشر ویحشر شین کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ، اور ''محشر'' میں شین کو فتح دیا جائے گا۔ انتہیٰ۔

صاحب قاموس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ کسرہ قوی ہے، لیکن لغت قرآنی جو کہ زیادہ فصیح ہے مضارع میں شین کے ضمہ کے ساتھ ہے قراءت متواترہ میں اور قراءۃ شاذۃ کسرہ کے ساتھ ہے، پس محشر میں فتحہ زیادہ فصیح زیادہ ہلکا اور مشہور ہے۔ اور یہی اکثر کا قول ہے۔

ابن الملک فرماتے ہیں کہ یہ نہ کہا جائے کہ قیامت کا دن تکلیف (یعنی مکلّف بنانے) کا زمانہ نہیں ہے؟ اس لئے کہ ہم کہتے ہیں کہ تکلیف سے مراد تکلیف تعجیز ہے جو ایذاء رسانی کیلئے ہے تکلیف ابتلا مراد نہیں ہے جو جزاء اور ثواب کیلئے ہوتی ہے، اور اسی میں سے ہے تصویر بنانے والوں کو قیامت کے دن تصویروں میں روح پھونکنے کا مکلّف بنانا۔

تخریج: طبرانی اور ضیاء نے یہ حدیث حکیم بن حارث سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کی ہے:

''من اخذ من طریق المسلمین شیأ جاء به یوم القیامة یحمله من سبع ارضین''۔

۲۹۶۰: وَعَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ اَیُّمَا رَجُلٍ ظَلَمَ شِبْرًا مِنَ الْاَرْضِ کَلَّفَهُ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ

اَنْ يَحْفِرَهٗ حَتّٰى يَبْلُغَ اٰخِرَ سَبْعِ اَرْضِيْنَ ثُمَّ يُطَوِّقُهٗ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ حَتّٰى يَقْضٰى بَيْنَ النَّاسِ

اخرجه احمد في لمسند ٤/١٧٣

ترجمہ: ''اور حضرت یعلی بن مرۃؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ ''جو شخص (کسی کی) بالشت بھر بھی زمین از راہ ظلم لے گا اسے (اس کی قبر میں) اللہ عزوجل اس بات پر مجبور کرے گا کہ وہ اس زمین کو ساتویں طبقہ زمین تک کھودتا رہے پھر وہ زمین اس کے گلے میں طوق بنا کر ڈال دی جائے گی (اور وہ قیامت تک اسی حال میں رہے گا) یہاں تک کہ (قیامت کے دن) لوگوں کے درمیان فیصلہ ہو جائے''۔ (احمد)

تشریح: قوله :يَقُوْلُ اَيُّمَا رَجُلٍ ظَلَمَ شِبْرًا...... يُطَوِّقُهٗ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ حَتّٰى يَقْضٰى بَيْنَ النَّاسِ :

ايما رجل ظلم : علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مفعول بہ محذوف ہے اور ''شبرا'' مفعول مطلق ہو یا مفعول فیہ ہو دونوں جائز ہیں، اور تقدیری عبارت: ''مقدارا'' یا ''ظلم شبر'' ہے۔

من الارض : بیانیہ ہے، یا تبعیضیہ ہے۔ عز: یعنی وہ غالب ہے اپنے حکم فیصلے اور انداز پر۔

و جل : یعنی بہت اونچا اور بڑا ہے اس سے کہ اس کا کوئی کام بغیر حکمت کے ہو۔ يطوقه :صیغہ مفعول کے ساتھ، یہ مرفوع ہے اور ایک نسخہ میں منصوب ہے۔ یقضی :مبنی للمفعول ہے۔ اور ایک نسخہ میں مبنی للفاعل ہے اور فاعل اللہ تعالیٰ ہے۔ اس میں اشارہ ہے عذاب کے استمرار کی طرف اور عذاب سے خلاصی نہ پانے کی طرف۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر آپ یہ کہیں گے کہ ''ثم يطوقه الى يوم القيامة'' اور ''حتى يقضى بين الناس'' کے درمیان کیسے موافقت اور مطابقت ہوگی؟

امام طیبی فرماتے ہیں کہ اس کے بارے میں، میں کہتا ہوں کہ ''الی'' مطلق غایت کا فائدہ دیتا ہے، باقی اس کا حکم داخل ہونا اور حکم سے خارج ہونا یہ ایک الگ امر ہے جو دلیل کے ساتھ گھومتا ہے۔ پس جس میں حکم سے خروج کی دلیل ہو اس کی مثال یہ ہے: [فنظرة الى ميسرة] [البقرة۔ ۲۸۰] کیونکہ ''اعسار'' یہ علت ہے ''انظار'' کیلئے، اور ''میسرہ'' کے وجود کے ساتھ علت ختم ہو جاتی ہے، اس لئے کہ یہاں کلام مکمل قرآن حفظ کرنے کیلئے لایا گیا ہے (جیسا کہ کشاف میں ہے۔) اور اسی طرح یہاں اس حدیث میں بھی ہے کہ ''یوم القیامة'' یہ غایت ہے اور ماقبل کے حکم میں داخل ہے، یہاں تک کہ لوگوں کے درمیان حق کا فیصلہ کیا جائے، ''حتى يقضى'' غایت کیلئے بیان کی طرح ہے۔ (انتہی)۔ اور اس میں کلام ہے جو مخفی نہیں ہے۔

بَابُ الشُّفْعَةِ

ملانے کا بیان

''شفعہ'' حرف اول کے ضمہ کے ساتھ۔ مغرب میں ہے: الشفعة اسم للملك المشفوع بملكك۔ عرب کے اس قول سے ماخوذ ہے: كان وترا فشفعته بآخر، یعنی میں اس کو اس کا جفت بنایا۔ اور اس کی نظیر ''الا کلة'' اور ''اللقمة'' ہے کہ ان میں سے ہر ایک ''فعلة'' بمعنیٰ ''مفعول'' ہے یہ اس کی اصل ہے۔ پھر اس کو عبارت بنایا گیا تملک سے، یعنی جس کے ساتھ مشتری مالک بنا تھا اسی کے ساتھ اس چیز کا مالک بننا، اور شعبی نے اپنے اس قول میں ان دونوں معنوں کو جمع کیا ہے: من بيعت شفعته وهو حاضر فلم يطلب بذلك فلا شفعة له۔

الفصل الاول :

حق شفعہ صرف شریک کو حاصل ہوتا ہے یا ہمسایہ کو بھی

۲۹۶۱: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَضَى النَّبِيُّ ﷺ بِالشُّفْعَةِ فِي كُلِّ مَالَمْ يُقْسَمْ فَإِذَا وَقَعَتِ الْحُدُودُ وَصُرِفَتِ الطُّرُقُ فَلَا شُفْعَةَ. (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤/٤٠٧ الحدیث رقم ٢٢١٣ وابو داوٗد فی السنن ٣/٧٨٤ الحدیث رقم ٣٥١٤ والترمذی فی ٣/٦٥٢ الحدیث رقم ١٣٧٠ وابن ماجه فی ٢/٩٣٥ الحدیث رقم ٢٤٩٩ واحمد فی المسند ٣/٣٩٩

ترجمہ: ''حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہر اس (غیر منقول) چیز میں حق شفعہ ثابت ہونے کا فیصلہ صادر فرمایا ہے جو (شراکت میں ہو اور) شرکاء کے درمیان تقسیم نہ کی گئی ہو' لہٰذا جب حدود مقرر ہو جائیں (یعنی مشترک ملکیت کی زمین یا مکان' باہم تقسیم ہو جائے) اور (ہر ایک حصہ کے) راستے علیحدہ کر دیئے جائیں تو پھر شفعہ کا حق باقی نہیں رہتا (یعنی اس صورت میں چونکہ شرکت باقی نہیں رہتی اس لئے کسی کو بھی حق شفعہ حاصل نہیں ہوتا)''۔ (بخاری)

تشریح: **قوله :قضى النبى صلى الله عليه ......:** اس میں شریک کیلئے شفعہ کا ثبوت ہے ان چیزوں میں جو تقسیم نہ کی گئی ہو۔ پھر یہ عام ہے چاہے وہ تقسیم ہو سکتی ہو جیسے گھر اور زمین وغیرہ ہیں' یا نہ ہو سکتی ہو۔ اور امام شافعیؒ کے ہاں جو چیز تقسیم نہ ہو سکتی ہو اس میں شفعہ جائز نہیں ہے۔ یہ حدیث اپنے عموم کے ساتھ ان کے خلاف حجت ہے (جیسا کہ اس کو ذکر کیا ہے ابن الملکؒ نے)۔ نیز ''**ما لم يقسم**'' (یعنی جس کو تقسیم نہ کیا گیا ہو) کو خصوصی طور پر ذکر کرنا یہ دوسری چیزوں سے حکم کی نفی پر دلالت نہیں کرتا۔

قوله :فَإِذَا وَقَعَتِ الْحُدُودُ وَصُرِفَتِ الطُّرُقُ فَلَا شُفْعَةَ

حدود واقع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جب خریدی ہوئی ملکیت باہم تقسیم ہو جائے اور حدود مقرر ہو جائیں۔

ابن الملک فرماتے ہیں یعنی متعین ہو جائے اور ہر ایک حصہ اس میں سے تقسیم وافراز کے ذریعہ ظاہر ہو جائے۔

صرفت : صیغہ مجہول کے ساتھ۔ یعنی بیان ہو جائیں' بایں طور کہ راستے متعدد ہو جائیں اور ہر ایک کو مخصوص راستہ مل جائے۔

پس اس سے معلوم ہوا کہ شفعہ صرف شریک کو حاصل ہوتا ہے نہ کہ ہمسایہ کو، اور یہ امام شافعی کا مذہب ہے۔ اور بعض حضرات ہمسایہ کو شفعہ کا حق دینے کے قائل ہیں ان احادیث کی وجہ سے جو اس بارے میں وارد ہیں۔ یہ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا مذہب ہے، یہ حضرات کہتے ہیں کہ **فاذا وقعت الحدود......** یہ حدیث کا حصہ نہیں ہے بلکہ اس کو حضرت جابر نے زیادہ کیا ہے، اور اس کو حدیث کے ساتھ ملا دیا ہے۔ اور اس کو اس توجیہ پر حمل کرنا اولیٰ ہے تاکہ احادیث کے درمیان موافقت پیدا ہو جائے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ جو روایت کیا ہے کہ رسولؐ نے فرمایا: ''**اذا وقعت الحدود** تو اس کا مطلب یہ ہے: **لاحق فى المبيع لارتفاعها بصرف الطرق**۔

(جیسا کہ اس کی تحقیق کی ہے ہمارے بعض علماء نے مصابیح کے شراح میں سے۔) مالکی فرماتے ہیں کہ ''**صرفت الطرق**'' کا معنی ہے کہ خالص کر دیا جائے اور بیان کر دیا جائے۔ یہ ''**صرف**'' سے مشتق ہے' اور جو ہر چیز کے سے خالص حصہ کو کہتے ہیں۔

توضیح وتخریج: تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث بخاری نے ان الفاظ یعنی مصابیح کے الفاظ کے ساتھ نقل نہیں کی ہے۔ یعنی ''**الشفعة فيما لم يقسم......**'' ہے، اور مسلم نے بھی یہ حدیث نقل نہیں کی ہے بلکہ مسلم نے اس حدیث کے بعد والی حدیث نقل کی ہے۔ اور مؤلف مصابیح پر لازم تھا کہ جب وہ تقسیم کے بارے میں ایسی حدیث نقل کر رہے تھے جس کو شیخین یا کسی ایک نے روایت کیا ہے تو حدیث کے الفاظ میں بخاری سے عدول نہ کرتے اس لئے کہ دونوں صیغوں کے درمیان بہت دوری ہے، اور جس کو علم حدیث سے لگاؤ ہو وہ اس میں تسامح اور سے کام نہ لے سکے۔

قاضی کہتے ہیں کہ یہ مسند امام ابوعبداللہ محمد الشافعی میں اس طرح حدیث مذکور ہے "الشفعة فيما لم يقسم فاذا وقعت الحدود فلا شفعة"۔ اور صحیح بخاری میں اس طرح ہے: "قضیٰ رسول الله صلى الله عليه وسلم بالشفعة" الخ۔ تو شیخ نے بخاری کی عبارت اختیار کی، لیکن "قضٰی بالشفعة فيما لم يقسم" کو "الشفعة فيما لم يقسم" کے ساتھ تبدیل کر دیا۔ چونکہ انہوں نے معنی میں زیادہ تفاوت نہیں پایا اور اس عبارت کے ساتھ بھی صحیح روایت وارد ہے پس اس سے ان لوگوں کا اعتراض ختم ہو گیا جنہوں نے مصنف پر تشنیع کی ہے۔

اگر آپ یہ کہیں کہ دونوں عبارتوں میں برابری کیسے ہے، جبکہ مصنف کی عبارت حصر عرفی کا تقاضا کرتی ہے اور جو بخاری نے ذکر ہے وہ اس کا تقاضا نہیں کرتی ہے، اس لئے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ حکایت ہو کسی واقعہ کے حال کی یا کسی مخصوص قضیہ میں فیصلہ ہو؟

میں کہتا ہوں کہ اس احتمال کو دفع کرنے کیلئے روایت میں ان الفاظ کے بعد والا جملہ کافی ہے اور اس کو حرف تعقیب کے ساتھ اس پر مرتب کیا ہے، اور یہ بات صحیح نہیں ہے کہ "یہ روایت کا حصہ نہیں ہے بلکہ راوی نے زیادہ کیا ہے، روایت کے ساتھ"۔ اسلئے کہ ایسا کرنا یہ تلبیس اور تدلیس ہے۔ اور اس راوی اور ان ائمہ کا منصب بہت اعلیٰ ہے جنہوں نے اس حدیث کی تدوین کی اور اس روایت کو اس عبارت کے ساتھ ذکر کیا ہے، ان کے بارے میں اس جیسا تصور کیسے کیا جا سکتا ہے۔ اور حدیث جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں اپنے منطوق کے ساتھ صراحۃً دلالت کر رہی ہے کہ مشترک چیز جو ابھی تک تقسیم نہ ہوئی ہو اس میں شفعہ کا حق حاصل ہوتا ہے اور جب وہ چیز تقسیم ہو جائے اور حقوق الگ الگ ہو جائیں تو پھر شفعہ کی اس میں مجال نہیں ہے، اس طرح شفعہ کا حق صرف شریک کو حاصل ہے نہ کہ ہمسایہ کو۔

اور یہ اکثر علماء کا مذہب ہے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، اور تابعین میں سے ابن المسیب، سلیمان بن یسار، عمر بن عبد العزیز، زہری، یحییٰ بن سعید انصاری، ربیعہ بن عبدالرحمٰن۔ اور یہی مسلک ہے امام اوزاعی، مالک، شافعی، احمد، اسحٰق، ابوثور اور ان کے بعد والوں میں کا صحابہ اور بعد والوں میں سے بہت کم لوگ ہمسایہ کیلئے ثبوت شفعہ کی طرف مائل ہیں اور انہوں نے استدلال کیا ہے اس سے جو بخاری نے ابورافع سے روایت کیا ہے: الجار احق بسقبه۔

امام طیبی کہتے ہیں کہ توریشتی کا کہنا کہ جب مصنف نے معنی میں زیادہ تفاوت نہیں پایا...... یہ مصنف پر نکیر کو ختم نہیں کرتا۔ اس لئے کہ اس صفت کے لوگوں نے تصریح کی ہے کہ جب قائل یہ کہے "رواه البخاری" یا "رواه مسلم" مثلاً تو پھر اس کے لئے روایت بالمعنی کرنا جائز ہے۔ لیکن جب وہ کہے کہ فلاں کی کتاب میں ایسا ہے تو پھر اس کے لئے اس کے صریح الفاظ سے عدول کرنا جائز نہیں ہے اور شیخ نے کتاب کے خطبہ میں ذکر کیا ہے: واعني بالصحاح ما اورده الشيخان في جامعيهما او احدهما۔

باقی توریشتی کا کہنا کہ "اس احتمال کو دفع کرنے کیلئے یہ کافی ہے الخ۔ تو اس میں بحث ہے اس لئے کہ یہاں حصر اداۃ حصر اور تقدیم اور خبر کے معرفہ ذکر کرنے کے ساتھ نہیں ہے، بلکہ مفہوم کے اعتبار سے ہے اور "الشفعة فيما لم يقسم" کا مفہوم یہ ہے کہ جو چیز تقسیم ہو گئی ہو اس میں شفعہ نہیں ہے، اس صورت میں مابعد اس کے لئے بیان اور تقریر ہے۔ اور "قضى رسول الله صلى الله عليه وسلم في كل ما لم يقسم"۔ کا مفہوم لم یقض فيما قسم ہے ان دونوں کے درمیان بہت بُعد ہے۔

تخریج: اس حدیث کو بخاری و مسلم کے علاوہ دیگر حضرات نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس طریقے پر روایت کیا ہے جس طرح بخاری نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے۔

www.KitaboSunnat.com

حق شفعہ صرف زمین اور مکان کے ساتھ مخصوص ہے

۲۹۶۲: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَضٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِالشُّفْعَةِ فِىْ كُلِّ شِرْكَةٍ لَمْ تُقْسَمْ رَبْعَةٍ اَوْحَائِطٍ لَا يَحِلُّ لَهٗ اَنْ يَبِيْعَ حَتّٰى يُؤْذِنَ شَرِيْكَهٗ فَاِنْ شَاءَ اَخَذَ وَاِنْ شَاءَ تَرَكَ فَاِذَا بَاعَ وَلَمْ يُؤْذِنْهُ فَهُوَ اَحَقُّ بِهٖ. (رواه مسلم)

اخرجه فی صحیحه ۳/۱۲۲۹ الحديث رقم (۱۳۴-۱۶۰۸)

ترجمہ: ''اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ حکم صادر فرمایا کہ ہر ایسی مشترک زمین میں شفعہ ثابت ہے جو تقسیم نہ کی گئی ہو خواہ وہ گھر ہو یا باغ ہو۔ نیز ایسی مشترک زمین کے کسی بھی شریک کو اپنا حصہ فروخت کرنا حلال نہیں ہے یہاں تک کہ وہ اپنے دوسرے شریک کو مطلع نہ کر دے (اطلاع کے بعد) وہ دوسرا شریک چاہے تو وہ حصہ خود خرید لے اور چاہے چھوڑ دے (یعنی کسی دوسرے کو بیچنے کی اجازت دے دے) اور اگر کسی شریک نے اپنے دوسرے شریک کو اطلاع دیئے بغیر اپنا حصہ فروخت کر دیا تو وہ دوسرا شریک اس (بات) کا حقدار ہے (کہ وہ اس فروخت شدہ حصہ کو خرید لے)''۔ (مسلم)

تشریح: قوله : قَضٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِالشُّفْعَةِ...... لَا يَحِلُّ لَهٗ ...... **شركة** : شین کے کسرہ اور راء کے سکون کے ساتھ، اس کا مضاف محذوف ہے۔ ای ذی شركة يعنی ''مشتركة''۔

لم تقسم : '' شركة'' کی صفت ہے۔ **ربعة** : راء کے فتحہ اور باء کے سکون کے ساتھ، گھر، مکان، زمین۔

او حائط : یہ دونوں (یعنی ربعۃ اور حائط'' شركة'' سے بدل ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ یہ دونوں مرفوع ہیں مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی وجہ سے، اور وہ مبتدا ''ہی'' ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حق شفعہ صرف غیر منقولہ جائیداد جیسے زمین، گھر، باغات، کے ساتھ مخصوص ہے۔ اشیاء منقولہ جیسے سامان، جانور وغیرہ میں حق شفعہ نہیں ہوتا۔ تمام علماء کا متفقہ طور پر یہی مسلک ہے۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ علماء کہتے ہیں کہ حق شفعہ کے حاصل ہونے میں حکمت شریک کو ضرر سے بچانا ہے۔ اور پھر اس حق کو زمین کے ساتھ خاص کیا ہے اسلئے کہ اس میں ضرر سب سے زیادہ ہے۔ اور علماء کا اتفاق ہے کہ زمین یعنی غیر منقولہ جائیداد کے علاوہ جانوروں، کپڑوں، متاع اور تمام منقولہ اشیاء میں شفعہ نہیں ہے۔ ہمارے علماء نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ شفعہ صرف اس زمین میں ہے جو قابل تقسیم ہو، بخلاف حمام، چکی وغیرہ کے۔ پھر حق شفعہ صرف مسلمان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ مسلمان اور ذمی کے درمیان بھی شفعہ جاری ہوتا ہے، اور یہی جمہور کا مسلک ہے۔ شعبی، حسن، اور احمد کا مسلک یہ ہے کہ ذمی کو مسلمان پر حق شفعہ حاصل نہیں ہے۔

حتی يؤذن : ہمزہ کے سکون کے ساتھ ہے' ہمزہ کو واؤ سے تبدیل بھی کیا جاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی اپنا حصہ بیچنے کا ارادہ کرے' پہلے اپنے دوسرے شریک پر پیش کرنا واجب ہے۔

قوله : فَاِنْ شَآءَ اَخَذَ وَاِنْ شَآءَ تَرَكَ فَاِذَا بَاعَ وَلَمْ يُؤْذِنْهُ فَهُوَ اَحَقُّ بِهٖ :

بعض کہتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بغیر اطلاع کے یہ بیع باطل ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے اس لئے کہ یہ بیع بغیر اطلاع کے صحیح ہے، لیکن یہ خریدار کی جانب سے شفیع کی طرف منتقل ہو جائے گا۔ اگلے جملہ کا مطلب یہی ہے۔

اشکال کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں ''حلال'' بمعنیٰ ''مباح'' ہے۔ اور بیع مذکور مکروہ ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے مکروہ پر یہ صادق آتا ہے کہ وہ حلال نہیں ہے۔ اس لئے کہ مباح اس کو کہتے ہیں جسمیں دونوں اطراف برابر ہوں، اور مکروہ میں جانب ترک راجح ہوتا ہے۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ علماء کا اختلاف ہے کہ اگر بیچنے والا شریک کو بیع کی اطلاع دیدے اور وہ اس کو اجازت دیدے، اور پھر یہ شریک اس کو شفعہ کے ساتھ لینے کا ارادہ کرے' تو امام شافعیؒ مالک، ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب، اور ان کے علاوہ دوسرے علماء کہتے ہیں کہ شریک کو اختیار ہے کہ وہ اس چیز کو شفعہ کے ذریعے لے لے۔ اور ثوری اور محدثین کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ اس کو لینے کا اختیار نہیں ہے۔ اور امام احمد سے دو روایتیں ہیں، دونوں مذہبوں کی طرح۔

ہمسایہ کو حق شفعہ حاصل ہونے کی دلیل

۲۹۶۳: وَعَنْ اَبِیْ رَافِعٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْجَارُ اَحَقُّ بِسَقَبِهٖ. (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤/٤٣٧ الحدیث رقم ٢٢٥٨

ترجمہ: ''اور حضرت ابورافعؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہمسایہ اپنے قرب کی وجہ سے (شفعہ کا) زیادہ حقدار ہے''۔ (بخاری)

تشریح: سقبه : سین اور قاف کے فتحہ کے ساتھ۔ عسقلانی فرماتے ہیں کہ قاف میں فتحہ اور سکون دونوں جائز ہیں۔ اس کے معنی ہیں قرب اور ملاصقت (چپکانا)۔ (انتہیٰ)

بعض کہتے ہیں کہ یہ سین اور صاد دونوں کے ساتھ روایت کیا گیا ہے اور دونوں کا معنی ایک ہے یعنی قرب۔ مطلب یہ ہے کہ ہمسایہ قریب ہونے کے سبب سے شفعہ کا زیادہ حقدار ہے غیر ہمسایہ سے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ سقبہ سے مراد شفعہ ہے۔ اور دلیل اگلی حدیث ہے: **الجار احق بشفعته**۔ اس حدیث سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے ہمسایہ کیلئے ثبوت شفعہ پر استدلال کیا ہے۔

اور حدیث کو اس پر محمول کرنا کہ جار سے مراد شریک ہے۔ سو ممکن ہے کہ اس کا جواب یہ دیا جائے کہ شریک کیلئے حق شفعہ دوسری حدیث سے ثابت ہے اتفاقاً اگر اس حدیث کو بھی شریک پر حمل کیا جائے تو اعادہ لازم آئے گا۔ اور افادہ اعادہ سے بہتر ہے، اور امام شافعی کی حدیث کو حمل کیا جائے گا اس مطلب پر کہ تقسیم کی وجہ سے شفعہ کا حق حاصل نہیں ہوتا۔ تا کہ دونوں حدیثیں جمع ہو جائیں۔ مقام کے مناسب اس پر کلام پہلے ہو چکا ہے۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ ہمسایہ کو شفعہ کا حق اس وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ ملاصق (یعنی ملا ہوا) ہو۔ اور ''بسقبه'' میں باء ''احق'' کا صلہ ہے، اس لئے کہ یہ باء سبب کیلئے ہے، اور ''سقب'' سے مراد ''ساقب'' ہے، **ای ذو سقب من داره** : یعنی گھر کے قریب۔

عمر بن شرید کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے جب یہ فرمایا تو آپ سے پوچھا گیا: **وما سقبه؟** آپ نے فرمایا: ''**شفعته**'' یعنی اس کا شفعہ مراد ہے۔

خطابی فرماتے ہیں کہ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ سقبہ سے مراد نیکی اور امداد اور اس کے ہم معنی امور ہوں۔

تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ رحم کرے ابوسلمان پر کہ وہ اس تعسف کے لائق نہیں تھے اور وہ جانتے ہیں کہ یہ حدیث صحابی سے مروی ہے، ایک قصہ میں کہ جس کا بیان بھی اس کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ اور اسی وجہ سے علماء نقل نے اس کو کتب احکام میں باب شفعہ میں ذکر کیا ہے۔ اور ان میں سے سب سے اول و افضل امام بخاری ہیں انہوں نے اس قصہ کو شرید سے آخر تک نقل کیا ہے۔ (انتہیٰ)

تخریج: جامع الصغیر میں ہے: **الجار احق بصقبه**۔ صاد کے ساتھ۔ اور روایت کیا ہے بخاری، ابوداؤد، اور نسائی اور ابن ماجہ نے حضرت ابورافع سے اور آخری دونوں نے شرید بن سوید سے بھی روایت کیا ہے۔

ہمسائیگی کا حق

٢٩٦٤: **وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا یَمْنَعُ جَارٌ جَارَهٗ اَنْ یَّغْرِزَ خَشَبَةً فِیْ جِدَارِهٖ.** (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٥/١١٠ الحدیث رقم ٢٤٦٣ ومسلم فی ٣/١٢٣٠ اللحدیث رقم (٣٦-١٦٠٩) وابو داوٗد فی السنن ٤/٤٩ الحدیث رقم ٣٦٣٤ والترمذی فی ٣/٦٣٥ الهدیث رقم ١٣٥٣ وابن ماجه فی ٢/٧٨٣ الحدیث رقم ٢٣٣٥ ومالك فی الموطأ ٢/٧٤٥ الحدیث رقم ٣٢ من کتاب الاقضیة واحمد فی المسند ٢/٤٦٣۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کوئی ہمسایہ اپنے دوسرے ہمسایہ کو اپنی دیوار میں شہتیر رکھنے سے منع نہ کرے''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: لا یمنع : جزم کے ساتھ ہے اگر یہ صیغہ نہی کا ہو۔ اور ابوذر کی روایت میں رفع کے ساتھ ہے اس صورت میں یہ خبر بمعنی نہی ہوگی۔ اور احمد کی روایت میں ''لا یمنعن'' نون تاکید کی زیادتی کے ساتھ ہے۔ یہ روایت جزم کی تائید کر رہی ہے۔ (اس کو

عسقلانی نے نقل کیا ہے۔) مطلب یہ ہے کہ مروت اور استحباب کے طور پر نہ کرے۔

یعرز : راء کے کسرہ کے ساتھ۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے مطلب میں علماء کا اختلاف ہے کہ پڑوسی کو جگہ دینا اور اس کی لکڑی کو دیوار پر رکھنے سے منع نہ کرنا یہ حکم مستحب ہے یا بطور وجوب کے ہے۔ اس میں دو قول ہیں امام شافعی کے اور اصحاب مالک کے۔ صحیح قول استحباب کا ہے۔ اور یہی امام ابوحنیفہ کا قول ہے اور دوسرا قول وجوب کا ہے اور یہی امام احمد اور محدثین کا قول ہے۔ اور ظاہر بھی یہی ہے حضرت ابو ہریرہ کے قول کی بناء پر جو اس روایت کے بعد فرماتے تھے: "**ما لی اراکم عنها معرضین والله لارمین بها بین اکتافکم**"۔ حضرت ابو ہریرہ نے یہ اس لئے کہا کہ انہوں نے اس روایت پر عمل کرنے میں توقف کیا تھا اور ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ انہوں نے سر جھکا لئے تو حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا: **ما لی اراکم اعرضتم**، یعنی اس سنت سے یا خصلت سے یا نصیحت سے یا ان کلمات سے۔ تم اعراض کر رہے ہو حضرت ابو ہریرہ کے اس قول "**لارمین بها بین اکتافکم**" کا معنی یہ ہے کہ میں یہی فیصلہ کروں گا اور اسکو واضح کر کے بیان کروں گا اور تمہیں یہ سنا سنا کر تکلیف دوں گا، جیسا کہ کسی انسان کو مارا جائے کسی چیز کے ساتھ کندھوں کے درمیان۔ اور پہلے قول والے کہتے ہیں کہ ان کا اعراض کرنا اس وجہ سے تھا کہ وہ اس کو مستحب سمجھ رہے تھے نہ کہ واجب اور اگر یہ واجب ہوتا تو پھر ان کو اعراض کرنے کی طاقت نہ تھی۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ یہ بھی جائز ہے کہ "**لارمین بها**" کی ضمیر "**خشبة**" کی طرف راجع ہو۔ اور یہ کنایہ ہو ان پر حجت قاطعہ کے لازم کرنے سے جس کا انہوں نے دعویٰ کیا ہے، ای **لا أقول أن الخشبة ترمی علی الجدار 'بل بین اکتافکم** ...... یعنی میں یہ نہیں کہتا کہ لکڑی دیوار پر رکھی جائے گی بلکہ تمہارے کندھوں پر رکھی جائے گی۔ چونکہ آپ ﷺ نے ہمسایہ کے حق کے بارے میں وصیت کی تھی نیکی اور احسان کرنے کی اور اس کا بوجھ برداشت کرنے کی۔

راستے کے سلسلے میں ایک ہدایت

۲۹۶۵: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا اخْتَلَفْتُمْ فِی الطَّرِیْقِ جُعِلَ عَرْضُهٗ سَبْعَةَ اَذْرُعٍ۔

(متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۵/۱۱۸ الحدیث رقم ۲۴۷۳ ومسلم فی ۳/۱۲۳۲ الحدیث رقم (۱۴۳-۱۶۱۳) وابوداؤد فی السنن ۴/۴۸ الحدیث رقم ۳۶۳۳ والترمذی فی ۳/۶۳۷ الحدیث رقم ۱۳۵۶ وابن ماجه فی ۲/۷۸۴ الحدیث رقم ۲۳۳۸

ترجمه: "اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب راستہ کی چوڑائی کے بارے میں تم میں اختلاف پیدا ہو جائے تو اس کی چوڑائی سات ہاتھ متعین کر دی جائے گی"۔ (مسلم)

تشریح: **جعل** : صیغہ مجہول کے ساتھ "طریق" مذکر بھی استعمال ہوتا ہے اور مؤنث بھی۔

سبعة اذرع : امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اکثر نسخوں میں "**سبع اذرع**" ہے، اور دونوں روایتیں صحیح ہیں اس لئے کہ ذراع مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ (انتہیٰ)

مطرزی کہتے ہیں کہ **ذراع** کہنیوں سے لیکر انگلیوں کے سروں تک ہوتا ہے۔ پھر یہ نام رکھا گیا مجازاً اس لکڑی کا جس کے ذریعے پیمائش کی جاتی ہے، اور یہ مذکر اور مؤنث دونوں طرح مستعمل ہے لیکن تانیث زیادہ فصیح ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ راستہ کی مقدار کے بارے میں حکم یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی اپنی مملوکہ زمین میں گزرنے والوں کیلئے راستہ بنائے تو اس کی مقدار اس کی صواب دید پر ہے۔ پس افضل یہ ہے کہ وہ راستہ کشادہ رکھے۔ اور اس حدیث سے یہ صورت مراد نہیں ہے، پس اگر راستہ کسی قوم کی زمین میں ہو اور وہ اس زمین کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں اور راستہ کے بارے میں کسی مقدار پر اتفاق کر لیں تو وہی راستہ ہوگا اور اگر راستہ کی مقدار کے متعین کرنے میں

اختلاف پیدا ہو جائے تو پھر راستہ کی چوڑائی سات ہاتھ متعین ہوگی۔ اور حدیث سے یہی مراد ہے، ہاں جب ہم کسی جاری راستہ کو سات ہاتھ سے زیادہ چوڑا پائیں تو اس صورت میں کسی کیلئے جائز نہیں کہ وہ اس زائد حصے پر قابض ہو جائے' لیکن اس کے ارد گرد بنجر زمین کو آباد کر سکتا ہے اور اس کے آباد کرنے سے وہ اس کی ملکیت ہو جائے گی' جبکہ اس سے گزرنے والوں کو تکلیف اور نقصان نہ پہنچے۔

شرح السنہ میں ہے یہ حدیث عام اور کشادہ زمین کے بارے میں ہے، پس اگر راستہ کسی بند گلی میں ہو تو وہ گلی والوں کی ملکیت ہے لہٰذا نہ اس میں تعمیر کی جائے گی اور گلی کو تنگ نہیں کیا جائے گا اور نہ اس کی طرف دروازہ کھولا جائے گا، مگر اس جماعت کی اجازت سے اور اگر گلی کھلی ہو تو پھر اس میں عام مسلمانوں کو گزرنے کا حق ہے۔

اس کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر کوئی کھلی گلی میں تعمیر کرے یا فروخت کرنے کیلئے تیار کرے اس طور پر کہ گزرنے کیلئے راستہ چھوڑے تو اس کو منع نہیں کیا جائے گا۔ اس لئے کہ اس قدر سے گزرنے والوں کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح دیہات کی زمینوں میں جن کو کاشت کیا جاتا ہے جب وہ (یعنی لوگ) زمینوں کی حدود سے اطراف کی طرف نکلیں تو ان کو نہیں روکا جائے گا۔ جب وہ گزرنے کیلئے سات ہاتھ راستہ چھوڑیں۔

باقی گھروں کا راستہ جو ایک مکان میں تقسیم کیے گئے ہوں اور ان کا اندر جانے کا راستہ بھی اسی میں ہو تو اس کو اس مقدار میں بنایا جائے گا کہ وہ ان کے ضروری مقاصد سے تنگ نہ ہو جیسے پانی کا نالہ، سامان لانا، جنازہ لیجانا وغیرہ۔ (انتہی)۔

ظاہر یہ ہے کہ یہ متعین مقدار راستہ کی عام اور غالب بناء پر ہے ورنہ یہ معاملہ مختلف ہے شہروں' لوگوں' زمانہ اور جگہ کے اختلاف کے ساتھ، جیسا کہ اس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے مکہ کی گلیوں میں اور اس کے بازاروں میں موسم حج وغیرہ کے دوران۔

جامع صغیر میں سیوطی کے ان الفاظ کے ساتھ ہے: "**اذا اختلفتم فی الطریق فاجعلوہ سبعة اذرع**"۔ اس کو روایت کیا ہے احمد، ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ سے۔ اور احمد، ابن ماجہ اور بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ سے۔

شاید مصنفؒ نے کتاب کے الفاظ کو بالمعنی نقل کیا ہے۔ اور امام طیبی نے جواب میں حیلہ سے کام لیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

الفصل الثانی:

غیر منقولہ جائیداد کو بلا ضرورت بیچنا مناسب نہیں ہے

۲۹۶۶: عَنْ سَعِيْدِ بْنِ حُرَيْثٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ مَنْ بَاعَ مِنْكُمْ دَارًا اَوْ عَقَارًا قَمِنٌ اَنْ لَّا يُبَارَكَ لَهُ اِلَّا اَنْ يَجْعَلَهُ فِيْ مِثْلِهٖ۔ (رواه ابن ماجة والدرمی)

اخرجه ابن ماجه فی السنن ۸۳۲/۲ الحدیث رقم ۲۴۹۰ والدارمی فی ۳۵۳/۲ الحدیث رقم ۲۶۲۵ واحمد فی المسند ۳۰۷/۴

ترجمہ: "حضرت سعید بن حریثؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ "تم میں سے جو شخص اپنا مکان یا زمین فروخت کرے تو مناسب یہ ہے کہ اس (کی قیمت) میں برکت نہ رکھی جائے مگر یہ کہ وہ اس (قیمت) کو اس ہی جیسی جائیداد کی خریداری میں خرچ کر دے"۔ (ابن ماجہ، دارمی)

تشریح: قولہ: **مَنْ بَاعَ مِنْكُمْ دَارًا اَوْ عَقَارًا قَمِنٌ اَنْ لَّا يُبَارَكَ لَهُ اِلَّا اَنْ يَجْعَلَهُ فِيْ مِثْلِهٖ**:

دارا أو عقارا: عقار زمین کو کہتے ہیں یا ہر اس مال کو کہتے ہیں جس کی اصل گویا زمین ہو، جیسا کہ مغرب میں ہے'اور' 'أو" تنویع کیلئے ہے۔ **قمن**: قاف کے فتحہ اور میم کے کسرہ کے ساتھ یعنی۔ ہے' حقدار۔ **ان لا یبارك**: راء کے فتحہ کے ساتھ۔

له: ضمیر بائع کی طرف راجع ہے۔

شیخ مظہر فرماتے ہیں کہ زمینوں اور گھروں کو فروخت کر کے ان کی قیمت منقولی اشیاء میں صرف کرنا غیر مستحب کام ہے، اس لئے کہ

غیر منقولی جائیداد کے منافع زیادہ ہیں اور نقصان کم ہے کہ نہ تو چور اس کو چوری کر سکتا ہے اور نہ لٹیرا اس کو لوٹ سکتا ہے، بخلاف منقولی اشیاء کے، پس بہتر یہ ہے کہ ان کو نہ بیچا جائے اور اگر بیچے تو پھر بہتر یہ ہے کہ اس کی قیمت گھر یا زمین پر صرف کی جائے۔

ابن ماجہ اور ضیاء نے حضرت حذیفہ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

"من باع دارا ثم لم یجعل ثمنها فی مثلها لم یبارك له فیها"۔

طبرانی نے سند حسن کے ساتھ معقل بن یسار سے روایت کیا ہے، ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے:

"من باع دارا من غیر ضرورة سلط اللّٰه علی ثمنها تلفا یتلفه"۔

ہمسایہ کو حق شفعہ حاصل ہوتا ہے

۲۹۶۷: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْجَارُ اَحَقُّ بِشُفْعَتِهٖ يُنْتَظَرُ لَهَا وَاِنْ كَانَ غَائِبًا اِذَا كَانَ طَرِيْقُهُمَا وَاحِدًا. (رواه احمد والترمذی وابوداود وابن ماجة والدارمی)

اخرجه وابوداوٗد فی السنن ۷۸۷۳ الحدیث رقم ۳۵۱۸ والترمذی فی ۶۵۱/۳ الحدیث رقم ۱۳۶۹ وابن ماجه فی ۸۳۳/۲ الحدیث رقم ۲۴۹۴ والدار می فی ۳۵۴/۲ الحدیث رقم ۲۶۲۸ واحمد فی المسند ۳۰۳۳۔

ترجمہ: "اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہمسایہ اپنے شفعہ کا زیادہ حقدار ہے اگر وہ غائب ہو تو اس کے شفعہ کی وجہ سے اس کا انتظار کیا جائے (اور ہمسایہ شفعہ کا اس صورت میں حق دار ہے) جب کہ دونوں کا راستہ ایک ہو"۔

(احمد' ترمذی' ابوداؤد' ابن ماجہ)

تشریح: **الجار احق بشفعته** : یعنی ہمسایہ کے شفعہ کا جیسا کہ جامع الصغیر کی روایت میں ہے: بشفعة جاره

وان کان غائبا : واؤ کے ساتھ اور ان وصلیہ ہے اور مصابیح کے نسخوں میں واؤ کے حذف کے ساتھ ہے' یہ اصول معتمدہ اور تصحیح شدہ نسخوں کے خلاف ہے۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ' دارمی' جامع الاصول اور شرح السنہ میں واؤ کے اثبات کے ساتھ ہے۔ اور مصابیح کے نسخوں میں اسقاط واؤ کے ساتھ ہے۔ اول زیادہ صحیح ہے۔

سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جامع الصغیر میں اس کو روایت کیا ہے احمد اور اصحاب کتب اربعہ نے۔ شرح السنہ میں ہے اس کو عبد الملک بن ابی سلیمان کے علاوہ کسی نے بھی عطاء عن جابر کی سند سے نقل نہیں کیا ہے اور شعبہ نے اس حدیث کی وجہ سے عبد الملک پر کلام کیا ہے۔ اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے غیر محفوظ ہونے کا خوف ہے

شیخ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں وہ لوگ جو تقسیم کی گئی چیز میں شفعہ ثابت کرتے ہیں جب ان کا راستہ مشترک ہو۔ اور اس طرح استدلال کرتے ہیں: **فاذا وقعت الحدود وصرفت الطرق** سے' اور مراد وہ راستہ ہے جو مشترک چیز میں ہو اس لئے کہ اس کا راستہ بھی شرکاء میں مشترک ہوتا ہے تو ان میں سے ہر ایک جہاں سے چاہتا ہے داخل ہوتا ہے پس جب اس کو تقسیم کیا جائے تو پھر ہر ایک کو دوسرے کے حق میں راستہ بنانے سے روکا جائے گا۔ تو تقسیم میں راستہ بھی الگ ہوگا۔

قاضی کہتے ہیں یہ حدیث اگر طعن سے سالم بھی ہو، تو معارض نہیں ہو سکتی ان احادیث کے جو ہم نے ذکر کی ہیں۔ چہ جائیکہ یہ راجح ہو' یہ لوگ اس حدیث کے مقتضی کے قائل نہیں ہیں جیسا کہ پہلے گزرا۔

شفعہ کا تعلق ہر غیر منقول جائیداد سے ہے

۲۹۶۸: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ الشَّرِيْكُ شَفِيْعٌ وَالشُّفْعَةُ فِيْ كُلِّ شَيْءٍ. (رواه الترمذی)

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عباسؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا (وہ شخص جو فروخت کی جانے والی جائیداد میں) شریک ہو'شفعہ کا حق رکھتا ہے اور شفعہ ہر چیز میں ہو سکتا ہے (جو غیر منقولہ جائیداد ہو جیسے زمین اور باغ وغیرہ) اس روایت کو امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے۔

تشریح: قوله :**الشريك شفيع والشفعة في كل شيء :**
یعنی غیر منقول میں یا ہر اس چیز میں جو شفعہ کا احتمال رکھتی ہو۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔اور بعض لوگوں نے شذوذ اختیار کیا ہے کہ وہ اسباب اور جانوروں میں بھی شفعہ ثابت کرتے ہیں۔

۲۹۶۹:وقدروی عن ابن ابی ملیکة عن النبی ﷺ مرسلا وهو اصح۔

اخرجه الترمذی فی السنن ٦٥٤/٣ الحديث رقم ١٣٧١۔

ترجمہ: یہ حدیث حضرت ابن ابی ملیکہؒ سے بھی نبی کریم ﷺ سے بطریق ارسال مروی ہے اور وہی زیادہ صحیح ہے''۔

بیری کا درخت کاٹنے پر وعید

۲۹۷۰:وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ حُبَيْشٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ قَطَعَ سِدْرَةً صَوَّبَ اللّٰهُ رَأْسَهُ فِي النَّارِ (رواه ابوداود وقال هذا الحديث مختصر) **يَعْنِي مَنْ قَطَعَ سِدْرَةً فِي فَلَاةٍ يَسْتَظِلُّ بِهَا ابْنُ السَّبِيْلِ وَالْبَهَائِمُ غَشْمًا وَظُلْمًا بِغَيْرِ حَقٍّ يَكُوْنُ لَهُ فِيْهَا صَوَّبَ اللّٰهُ رَأْسَهُ فِي النَّارِ.**

اخرجه ابو داؤد فی السنن ٤٠٤/٥ الحديث رقم ٥٢٣٩۔

ترجمہ: ''اور حضرت عبداللہ بن حبیشؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے بیری کا درخت کاٹا اللہ تعالیٰ اسے سر کے بل دوزخ میں ڈالے گا۔امام ابوداؤد نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث مختصر ہے جس کا پورا مفہوم یہ ہے کہ جس شخص نے ازراہِ ظلم اور ناحق جنگل میں بیری کے کسی ایسے درخت کو کاٹا جس کے سایہ میں مسافر اور جانور پناہ حاصل کرتے ہیں' تو اللہ تعالیٰ اسے سر کے بل دوزخ میں ڈالے گا''۔

تشریح: قوله :**مَنْ قَطَعَ سِدْرَةً صَوَّبَ اللّٰهُ رَأْسَهُ فِي النَّارِ : قطع :** تخفیف کے ساتھ۔
سدرة : سین کے کسرہ اور دال کے سکون کے ساتھ،''نبق''''نبق''نون کے فتحہ اور باء کے کسرہ کے ساتھ،
بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد مکہ کی بیری کا درخت ہے اس لئے کہ وہ حرم ہے اور بعض علماء کہتے ہیں کہ مدینہ کی بیری کا درخت مراد ہے کہ اس کے کاٹنے سے منع کیا گیا ہے تا کہ لوگ اس سے سایہ حاصل کریں، اور وہ لوگ جو مدینہ کی طرف ہجرت کریں وہ وحشت محسوس نہ کریں، اور شاید تخصیص کی وجہ یہ ہو کہ مدینہ کے بیری کے درختوں کا سایہ دوسروں سے زیادہ ٹھنڈا ہوتا ہے' ورنہ حکم اس کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ عام ہے ہر اس درخت کا حکم یہی ہے جس کے سایہ میں لوگ اور جانور راحت پاتے ہیں۔
صوب الله : واؤ کی تشدید کے ساتھ' بمعنی نکس و خفض۔
علماء نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا سر ابتداءً جہنم میں پھینکے گا' یا (صرف) سر پھینک دے گا، یا مراد تمام بدن ہے اور اسی طرح ضیاء نے بھی اس حدیث کو نقل کیا ہے۔
قوله :وقال هذا الحديث مختصر۔ يَعْنِي ......صَوَّبَ اللّٰهُ رَأْسَهُ فِي النَّارِ. :قال : ضمیر ابوداؤد کی طرف راجع ہے۔
هذا الحديث مختصر : مطلب یہ ہے کہ اس کا معنی مختصر ہے یا مؤول ہے' اسی لئے ہذا الحدیث ''مقتصر''نہیں کہا۔
فلاة : فاء کے فتحہ کے ساتھ۔جنگل۔**غشما :** غین کے فتحہ اور شین کے سکون کے ساتھ ظلم کو کہتے ہیں۔

وظلما : یہ عطف تفسیری ہے اور دونوں کو تاکید کے واسطے جمع کیا ہے۔
بغیر حق یکون له فیها :"یکون له فیها" یہ "حق" کی صفت ہے۔
حق سے مراد نفع اور فائدہ ہے۔ اس لئے کہ کبھی آدمی کوئی کام از راہ ظلم کرتا ہے اور اس میں اس کا فائدہ بھی ہوتا ہے۔ اور یہ اس کے برخلاف ہے جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے ﴿ویبغون فی الارض بغیر الحق﴾ (اور ناحق دنیا میں سرکشی کرتے ہیں)۔

الفصل الثالث:

ہر غیر منقول جائیداد میں شفعہ ہے خواہ وہ تقسیم ہو سکتی ہو یا نا قابل تقسیم ہو

۲۹۷۱: عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ قَالَ اِذَا وَقَعَتِ الْحُدُوْدُ فِی الْاَرْضِ فَلَا شُفْعَةَ فِيْهَا وَلَا شُفْعَةَ فِیْ بِئْرٍ وَلَا فَحْلِ النَّخْلِ. (رواه مالك)

اخرجه مالك فی الموطأ ۲/ ۷۱۷ الحدیث رقم ٤ من کتاب الشفعة۔

ترجمہ: "حضرت عثمان بن عفانؓ فرماتے ہیں کہ جب زمین میں حدود قائم ہو جائیں (یعنی مشترک زمین شرکاء میں باہم تقسیم ہو جائے اور ہر ایک کے حصے الگ الگ ہو جائیں) تو (شریک کا) شفعہ باقی نہیں رہتا اور نہ کنویں میں شفعہ کا حق حاصل ہوتا ہے اور نہ پیوند لگی کھجور کے درخت میں"۔ (مالک)

تشریح: قوله :اذا وقعت الحدود فی الارض فلا شفعة فیها :
عرض مرتب: اس پر کلام پہلے گزر چکا ہے۔
قوله :ولا شفعة فی بئر : امام طیبی فرماتے ہیں اس وجہ سے کہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ شفعہ صرف اس زمین میں ہے جو تقسیم ہو سکے۔ ولا فحل النخل :نهایه میں ہے "فحل النخل" نر کھجور کو کہتے ہیں۔ کہ اس کا شگوفہ مادہ کھجور میں ڈالتے ہیں۔ اور اس میں شفعہ اس لئے ثابت نہیں ہوتا کہ مثلاً چند لوگوں کو کچھ کھجور کے درخت مشترک طور پر وراثت میں حاصل ہوئے جنہیں انہوں نے آپس میں تقسیم کرلیا، لیکن ان میں ایک نر درخت بھی تھا جس کا شگوفہ لیکر سب ہی لوگ اپنے اپنے کھجور کے درختوں پر ڈالتے تھے، اب انہی میں سے کوئی شخص اپنے حصہ کے کھجور کے درختوں کے ساتھ اس نر درخت کے حقوق بھی فروخت کرے تو شرکاء کو اس فروخت میں شفعہ کا حق حاصل نہیں ہوگا، اس لئے کہ اس کو تقسیم کرنا ممکن نہیں ہے۔

بَابُ الْمُسَاقَاةِ وَالْمُزَارَعَةِ

مساقات اور مزارعت کا بیان

مساقات کی صورت یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے درخت کسی کو اس شرط پر دے کہ وہ ان کو سیراب کرے، ان کی دیکھ بھال کرے، اللہ پاک جو پھل عطا فرمائے گا وہ ان دونوں کے درمیان متعین مقدار سے تقسیم ہوگا۔ اور زمینوں میں مزارعت کی صورت بھی یہی ہے۔

الفصل الاول:

خیبر کی زمین کا بندوبست

۲۹۷۲: عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ دَفَعَ اِلٰی یَهُوْدِ خَیْبَرَ نَخْلَ خَیْبَرَ وَاَرْضَهَا اِلٰی اَنْ

يَعتَمِلُوهَا مِنْ اَمْوَالِهِمْ وَلِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ شَطْرُ ثَمَرِهَا (رواه مسلم وفی رواية البخاری) اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَعْطٰى خَيْبَرَ الْيَهُوْدَ اَنْ يَعْمَلُوْهَا وَيَزْرَعُوْهَا وَلَهُمْ شَطْرُ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا.

اخرجه البخاری فی صحيحه ٤/٤٦٢ الحديث رقم ٢٢٨٥ ومسلم فی صحيحه ٣/١١٨٧ الحديث رقم (٥ـ١٥٥١) وابو داؤد فی السنن ٣/٦٩٧ الحديث رقم ٣٤٠٩ والترمذی فی ٣/٦٦٦ الحديث رقم ١٣٨٣ وابن ماجه فی ٢/٨٢٤ الحديث رقم ٢٤٦٧ والدارمی فی ٢/٣٤٩ الحديث رقم ٢٦١٤ واحمد فی المسند ٢/١١٧ وسياتی فی الحديث التالی الهذا

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کی کھجوروں کے درخت اور وہاں کی زمین اس شرط پر خیبر کے یہودیوں کے حوالہ کر دی کہ وہ اس میں اپنے اموال سے کام کریں گے اور اس کا آدھا پھل (یعنی پیداوار کا آدھا حصہ) رسول اللہ ﷺ کے لئے ہوگا''۔ (مسلم) اور بخاری کی روایت میں یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کو (یعنی وہاں کی زمین اور درخت کو) اس شرط پر یہودیوں کے حوالہ کر دیا تھا کہ وہ اس میں کام کریں اور کاشت کاری کریں اور پھر اس کی پیداوار کا آدھا حصہ یہودیوں کا حق ہوگا (اور آدھا حصہ رسول اللہ ﷺ کا حق ہوگا)۔''

تشریح: ''خیبر'': خیبر مدینہ کے قریب ایک جگہ ہے، اور یہ غیر منصرف ہے۔

عنوۃ فتح کیا گیا تھا، وہاں کے لوگ آپ ﷺ کے غلام بن چکے تھے۔ آپ ﷺ نے اہل خیبر کو وہاں سے نکالنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن انہوں نے آپ ﷺ سے درخواست کی کہ وہ ان کو وہیں پر برقرار رکھیں۔

اس شرط پر کہ وہ اس میں زمین کو آباد کرنے اور اس کی دیکھ بھال کرنے کی کوشش کریں گے اور کام کے تمام ضروری آلات استعمال کریں گے۔ جیسے کلہاڑا، درانتی وغیرہ۔ من اموالهم میں نسبت مجازی ہے۔

قوله: ولرسول الله صلی الله علیه وسلم شطر ثمرها: شرط کا معنی ہے آدھا، اور ''ثمر'' سے مراد عام ہے جو کھیتی کو بھی شامل ہے، اس لئے صرف اس کے ذکر پر اکتفاء کیا، یا اس کے مقابل ذرع کو قیاس کرتے ہوئے چھوڑا ہے۔

(فقال صلی الله علیه وسلم نقركم على ذلك ما اقركم الله عليه) پس وہ اسی معاہدہ پر تھے نبی ﷺ کے زمانہ میں حضرت ابو بکرؓ کے عہد خلاف اور حضرت عمرؓ کے دور خلافت کی ابتداء تک، یہاں تک کہ حضرت عمر نے ان کو شام کے شہر ''اریحا'' اور ''اذرعات'' کی طرف ملک بدر کر دیا۔ **ویزرعوها:** یہ تخصیص بعد از تعمیم ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ دلالت کرتا ہے اس بات پر کہ اگر آپ ﷺ عامل اور مزدور کے حصہ کو بیان کرتے اور اپنے حصہ کے بیان کرنے سے سکوت اختیار کرتے تو یہ جائز تھا۔ اور اگر اس کا عکس کرتے بعض کہتے ہیں کہ یہ بھی جائز تھا، عکس پر قیاس کرتے ہوئے۔

قاضی فرماتے ہیں کہ میں نے نہیں دیکھا علماء میں سے کسی کو جو مساقات کو مطلقاً منع کرتا ہو سوائے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے۔ اور مساقات کے جواز کی دلیل یہ ہے کہ یہ آپ ﷺ سے ثابت ہے اور اتنا عام ہوا ہے اس کا ثبوت حد تواتر تک پہنچا ہے کہ آپ ﷺ نے اہل خیبر کی ساتھ خیبر کی کھجوروں پر مساقات کا معاملہ کیا آدھے کی شرط پر۔ جیسا کہ اس پر یہ حدیث دلالت کر رہی ہے۔ اور حدیث کی یہ تاویل کرنا کہ آپ ﷺ نے یہود کو خیبر میں کام پر لگایا یہ جزیہ کے بدلے میں تھا اور جو آدھا ان کو دیا کرتے تھے یہ آپ ﷺ کی طرف سے عطیہ اور ان کی مدد تھی۔ اس لئے کہ ان کو کام کرنے کا مکلف بنایا تھا۔ یہ بعید ہے، جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ تاویل تو ہر ایک بعید ہوتی ہے جہاں بھی دکھائی دے، باقی اس کا سہارا اس لئے لیا جاتا ہے تا کہ مختلف احادیث مرویہ کو جمع کیا جا سکے فرمایا مزارعت کی صورت یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنی زمین کسی کے حوالہ کر دے تا کہ وہ زمین کاشت کرے اور بیج مالک کی طرف سے ہوگا، اس شرط پر کہ جو غلہ نکلے گا وہ دونوں کے درمیان تقسیم ہوگا حصص کے اعتبار سے۔ ہمارے ہاں مزارعت، مساقات کے ضمن میں جائز ہے کہ خالی زمین درختوں کے درمیان میں ہے بایں طور کہ اس کو الگ کرنا محنت اور کام کے اعتبار سے ناممکن

یا مشکل ہو، جیسا کہ خیبر میں تھا یہ اس حدیث کی وجہ سے جائز ہے اور مستقل مزارعت جائز نہیں ہے اس حدیث کی بناء پر کہ جو ابن عمر نے روایت کی ہے کہ ہم مزارعت میں کوئی حرج نہیں دیکھتے تھے یہاں تک کہ میں نے رافع بن خدیج سے سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ امام مالک اور ابوحنیفہ رحمہم اللہ اس کو مطلق ممنوع قرار دیتے ہیں، اور اکثر اہل علم اس کو مطلقاً جائز سمجھتے ہیں صحابہ میں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ' حضرت علیؓ، ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ اور سعد بن مالکؓ اور تابعین میں سے ابن مسیب، قاسم بن محمد، محمد بن سیرین، طاوس اور ان کے علاوہ جیسے زہری، عمر بن عبدالعزیز، ابن ابی یعلی، احمد، اسحٰق، ابو یوسف، محمد بن الحسن رحمہم اللہ تعالیٰ۔ ظاہر حدیث کی وجہ سے، اور قیاس بھی اس جواز کی تائید کرتا ہے، مساقات اور مضاربت پر قیاس کرتے ہوئے (انتہیٰ) فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے (یعنی مزارعت جائز ہے)۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ احادیث سے مساقات کا جواز معلوم ہوتا ہے اور یہی جمہور محدثین اور فقہاء کا مسلک ہے۔

(اور امام ابوحنیفہ نے) احادیث کی یہ تاویل کی ہے کہ خیبر کو عنوۃ فتح کیا تھا تو آپ ﷺ نے ان سے جو لیا تھا وہ آپ ﷺ ہی کا تھا۔ اور جمہور نے اس قول سے استدلال کیا ہے: "**علی ان یعتملوھا من اموالھم**"، اور اس قول سے "**اقرکم ما اقرکم اللہ علیہ**"۔ اور یہ تصریح ہے اس بات کی کہ وہ غلام نہیں تھے۔ (انتہیٰ)

امام نووی کا یہ کہنا ہے کہ یہ "صریح" ہے یہ صریح محل نظر ہے، اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ خیبر عنوۃ فتح ہوا تھا یا صلح کے ساتھ فتح ہوا تھا، یا اہل خیبر کو بغیر قتال کے جلاوطن کر دیا تھا، یا بعض کو اور بعض صلح کے ساتھ اور بعض کو وہاں سے جلاءِ وطن کر کے فتح کیا تھا۔ یہ سب سے زیادہ صحیح قول ہے۔ (انتہیٰ)

اب اس بات کو ثابت کرنے کی ضرورت ہے کہ مزارعت اس زمین میں واقع ہوئی تھی جو عنوۃ نہیں لی گئی تھی تاکہ یہ امام ابوحنیفہ کے خلاف دلیل ہو، ورنہ احادیث میں کئی احتمالات کے موجود ہونے کی وجہ سے ان سے استدلال کرنا درست نہیں ہے۔

امام شافعی اور ان کے موافقین کا مسلک یہ ہے کہ مزارعت، مساقات کے ضمن میں جائز ہے اور الگ سے جائز نہیں ہے، جیسا کہ خیبر میں جاری تھا۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ مزارعت نہ الگ جائز ہے اور نہ مساقات کے تابع ہو کر مگر صرف اس زمین میں جو درختوں کے درمیان میں ہو۔ امام ابوحنیفہ اور زفر فرماتے ہیں کہ مزارعت اور مساقات دونوں مطلقاً فاسد ہیں۔ اکثر علماء مساقات اور مزارعت کے جواز کے قائل ہیں الگ الگ بھی اور ایک ساتھ بھی۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ حدیث خیبر کی وجہ سے یہ مذہب ظاہر اور پسندیدہ ہے۔ اور یہ دعویٰ قبول نہیں ہے کہ خیبر میں مزارعت، مساقات کے تابع تھی، بلکہ وہ مستقل تھی۔ اور اس وجہ سے کہ مساقات کو جائز قرار دینے والا معنی مزارعت کے اندر موجود ہے۔ اور قیاس کرتے ہوئے مضاربت پر اس لئے کہ وہ بالاجماع جائز ہے اور وہ تمام چیزوں میں مزارعت کی طرح ہے، اور اس وجہ سے بھی کہ مسلمانوں کا عمل مزارعت پر ہمیشہ رہا ہے ہر زمانہ اور ہر شہر میں۔ اور مخابرت سے نہی کی احادیث کو محمول کیا جائے گا اس صورت پر کہ جب اس میں شرط لگائی جائے ہر ایک کیلئے ایک زمین کے ایک متعین حصہ کی۔ اور ابن خزیمہ نے مزارعت کے جواز کے بارے میں کتاب لکھی ہے اور اس میں دلائل کی انتہاء تک پہنچے ہیں۔ اور ممانعت کی احادیث کا جواب دیا ہے۔ (انتہیٰ کلامہ)

شرح السنہ میں محی السنۃ کے کلام سے ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ مزارعت کے جواز کی طرف مائل ہیں' مطلقاً۔ (جیسا کہ اس کو ذکر کیا ہے امام طیبی نے۔)

مخابرت کی ممانعت

۲۹۷۳: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ كُنَّا نُخَابِرُ وَلَا نَرٰى بِذٰلِكَ بَاْسًا حَتّٰى زَعَمَ رَافِعُ بْنُ خُدَيْجٍ اَنَّ النَّبِيَّ

ﷺ نَهٰی عَنْهَا فَتَرَكْنَا هَا مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۱۱۷۹/۳ الحدیث رقم (۱۰۶-۱۵۴۷)وابن ماجه فی ۸۱۹/۲ الحدیث رقم ۲۴۵۰۔

ترجمہ: ''اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ ہم لوگ مخابرت کیا کرتے تھے اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے یہاں تک کہ جب حضرت رافع بن خدیجؓ نے یہ بتایا کہ نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے تو ہم نے اس وجہ سے اسے چھوڑ دیا''۔ (مسلم)

تشریح: **قال کنا نخابر** : یعنی مزارعت کرتے تھے یا ہم مزارعت کو جائز کہتے تھے اور اس کے صحیح ہونے کا اعتقاد رکھتے تھے۔ زعم یہاں ''زعم'' بمعنی ''قول'' ہے۔ **رافع بن خدیج** یہ غزوہ اُحد اور اس کے بعد اکثر غزوات میں شریک ہوئے۔

ان النبی صلی اللہ علیه وسلم نهی عها فترکنا ها من اجل ذلك : مشارالیہ ممانعت ہے۔

شرح السنہ میں ہے کہ ''مخابرہ'' جائز نہیں ہے اس لئے کہ یہ ''مساقاۃ'' کی طرح نہیں ہے' اس لئے کہ ''مخابرہ'' میں تخم عامل کی طرف سے ہوتا ہے۔ پس مزاعت کہتے ہیں عامل کو کرایہ پر لینا بعض پیداوار کے بدلے، اور مخابرہ کہتے ہیں عامل کا زمین کو کرایہ پر لینا بعض پیداوار کے عوض۔ اور اکثر فقہاء مزارعت کے جواز کے قائل ہیں جیسا کہ پہلے گزرا۔ (انتہیٰ)

شمنی کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ہاں مزارعت اور مساقات جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ مزارعت، مخابرہ کو کہتے ہیں اور مخابرہ سے حدیث میں منع کیا گیا ہے۔ اور جو آپ علیہ السلام نے اہل خیبر سے لیا تھا وہ خراج مقاسمہ تھا جو بطور احسان اور صلح کے لیا تھا اور یہ جائز ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ علیہ السلام نے ان کیلئے مدت مقرر نہیں کی تھی اور مزارعت کے جواز کے قائلین کے ہاں بھی مدت کے معین کرنے کے بغیر مزارعت جائز نہیں ہے۔ ابوبکر رازی فرماتے ہیں کہ اس بات کی دلیل کہ آپ علیہ السلام اہل خیبر سے جو کھجوریں اور غلہ لیا کرتے تھے وہ بطور جزیہ کے تھا' یہ ہے کہ آپ علیہ السلام نے وفات تک اہل خیبر سے جزیہ نہیں لیا' نہ حضرت ابوبکر نے لیا یہاں تک کہ وہ وفات پا گئے اور نہ حضرت عمر نے لیا یہاں تک کہ ان کو جلا وطن کر دیا، اگر یہ جزیہ نہ ہوتا تو آپ ﷺ ان سے جزیہ لیتے جب آیت جزیہ نازل ہوئی۔

اجرت یا لگان پر زمین دینے کا ذکر

۲۹۷۴: وَعَنْ حَنْظَلَةَ بْنِ قَيْسٍ عَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ قَالَ اَخْبَرَنِىْ عَمَّایَ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْرُوْنَ الْاَرْضَ عَلٰى عَهْدِ النَّبِيِّ ﷺ بِمَا يَنْبُتُ عَلَى الْاَرْبِعَاءِ اَوْ شَیْءٍ يَسْتَثْنِيْهِ صَاحِبُ الْاَرْضِ فَنَهَانَا النَّبِيُّ ﷺ عَنْ ذٰلِكَ فَقُلْتُ لِرَافِعٍ فَكَيْفَ هِيَ بِالدَّرَاهِمِ وَالدَّنَانِيْرِ فَقَالَ لَيْسَ بِهَا بَاْسٌ وَكَانَ الَّذِیْ نُهِيَ عَنْ ذٰلِكَ مَا لَوْ نَظَرَ فِيْهِ ذَوُوا الْفَهْمِ بِالْحَلَالِ وَالْحَرَامِ لَمْ يُجِيْزُوْهُ لِمَا فِيْهِ مِنَ الْمُخَاطَرَةِ. (متفق علیه)

اخرجه ابخاری فی صحیحه ۲۵/۵ الحدیث رقم ۲۳۴۶ احمد فی المسند ۱۴۲۴

ترجمہ: ''حضرت حنظلہ بن قیس (تابعی) حضرت رافع بن خدیجؓ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے (یعنی رافعؓ نے) فرمایا کہ مجھے میرے دو چچاؤں نے بتایا کہ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں صحابہ کرامؓ نالیوں پر ہونے والی پیداوار کے عوض اپنی زمین اجرت پر دیا کرتے تھے (یعنی صحابہؓ اپنی زمین کو کسی دوسرے شخص کو اس شرط کے ساتھ اجرت پر دے دیا کرتے تھے کہ وہ شخص اپنی محنت اور اپنا تخم لگا کر اس میں کاشت کرے اور اس زمین کی پانی کی نالیوں کے کناروں پر جو کچھ پیدا ہوگا وہ اس زمین کی اجرت میں مالک کا حق ہوگا اور اس کے علاوہ باقی زمین کی پیداوار کاشت کرنے والے کا حق ہوگا) یا اپنی زمین کو اس قطعہ (کی پیداوار) کے عوض اجرت پر دیتے تھے جسے مالک اپنے لئے علیحدہ کر لیتا تھا (یعنی زمین کو اجرت پر دینے کی دوسری صورت یہ ہوتی تھی کہ وہ اپنی زمین جب کسی کو کاشت کے لئے دیتے تو اس کا کوئی قطعہ اپنے لئے علیحدہ متعین کر دیتے تھے اور یہ طے ہو جاتا تھا کہ کاشت کرنے والا اپنی محنت اور

اپنا تخم لگا کر پوری زمین پر کاشت کرے پھر اس متعین قطعہ کی جو کچھ پیداوار ہوگی وہ تو مالک لے لے گا اور باقی زمین کی پیداوار کاشت کرنے والا لے گا) چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اس سے منع فرمایا (کیونکہ اس میں نقصان اور فریب میں مبتلا ہونے کا خوف رہتا تھا) حدیث کے راوی حضرت حنظلہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت رافعؓ سے پوچھا کہ درہم و دینار کے عوض مزارعت کا کیا حکم ہے (یعنی اپنی زمین کسی کو کاشت کرنے کے لئے دے دی جائے اور اس کے عوض بطور لگان روپے لئے جائیں تو کیا حکم ہے؟) حضرت رافعؓ نے فرمایا کہ ''اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اور جس چیز سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ (یعنی مزارعت کی مذکورہ دونوں صورتیں) وہ ایسی چیز ہے کہ اگر حرام وحلال کی سمجھ رکھنے والا شخص اس میں غور کرے تو نقصان پہنچنے کے خوف سے اسے پسند نہ کرے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: **''عمای''** : میم کی تشدید کے ساتھ ''عم'' کا تثنیہ ہے یائے ضمیر کی طرف مضاف ہے۔

یکرون : یاء کے ضمہ کے ساتھ۔ اجارہ پر دینا۔ **علی عهد النبی** : اور ایک نسخہ میں ''**رسول الله**'' ہے۔

بما ینبت : باء کے ضمہ کے ساتھ، اور ایک نسخہ میں مبنی للمفعول ہے۔

الاربعاء : ہمزہ کے فتحہ اور باء کے فتحہ کے ساتھ اسم ممدود ہے، ''ربیع'' کی جمع ہے، چھوٹی نہر کو کہتے ہیں جس کو کاشت کار سیراب کرے۔ کہا جاتا ہے: **ربیع و اربعاء و اربعة** جیسے **نصیب و انصباء و انصبة**۔

قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث کا معنی یہ ہے کہ صحابہ اپنی زمین کسی دوسرے شخص کو اس شرط کے ساتھ اجرت پر دیا کرتے تھے کہ وہ شخص اپنا تخم لگا کر اس میں کاشت کرے اور اس زمین کی پانی کی نالیوں کے کنارے پر جو کچھ پیدا ہوگا وہ اس زمین کی اجرت میں مالک کا حق ہوگا اور اس کے علاوہ باقی زمین کی پیداوار کاشت کرنے والے کا حق ہوگا اس کی محنت اور تخم کے بدلے میں۔ یعنی گویا کہ وہ کہتے تھے کہ جو اس متعین قطعہ میں پیدا ہوگا وہ مالک کیلئے ہوگا۔ اور جو اس قطعہ زمین کے علاوہ زمین میں پیدا ہوگا وہ کاشتکار ہوگا۔

فنهانا النبی صلی الله علیه وسلم عن ذلك : شاید ممانعت کا مقتضیٰ یہ ہو کہ اس میں ہے۔ اس لئے کہ کبھی اس متعین حصہ میں پیداوار ہو جاتی ہے اور دوسرے میں نہیں ہوتی، تو ایک کل پیداوار لے جاتا ہے اور دوسرے کا حق بالکلیہ ضائع ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ مساقات میں کوئی متعین درختوں کے پھلوں کی اپنے لیے شرط لگا لے اور باقی کی عامل کیلئے۔

فیکف هی : ضمیر مخابرۃ کی طرف راجع ہے۔ **کان** : تشدید کے ساتھ۔ **نهی** : صیغہ مجہول کے ساتھ۔

عن ذلك ما : ''ما'' بمعنی الذی اسم موصول ہے۔ **لو نظر فیه ذووا الفهم بالحلال والحرام** : ''ذوو'' دو (۲) واؤ کے ساتھ ہے اور صحیح نسخہ میں ایک واؤ کے ساتھ ہے۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ روایۃً ایک واؤ کے ساتھ ہے جیسا کہ مصابیح کے نسخوں میں ہے۔ تورپشتی فرماتے ہیں کہ ''**ذووا الفهم**'' دو (۲) واؤ کے ساتھ ہے اور مراد اس سے جمع ہے۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ علامہ تورپشتی کو اس توجیہ پر جس نے ابھارا ہے وہ یہ قول ہے: **لم یجیزوه**۔

اس کے جواب میں ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ **ذو الفهم** میں باعتبار جنس کے عموم ہے لہٰذا ''**الم یجیزوه**'' میں ضمیر کو جمع لانا جائز ہے (انتہیٰ)۔ عسقلانی فرماتے ہیں کہ سلفی اور ابن سیویہ کی روایت میں ''**ذو الفهم**'' بلفظ مفرد ہے جنس مراد ہونے کی وجہ سے اور آگے ''**لم یجزه**'' ہے۔

قوله : لما فیه من المخاطرة : یعنی غرر اور ہے ایسی چیز حلال نہیں ہے اس لئے کہ ہر ایک شریک کا حصہ مجہول ہے۔ اور ''**مخاطرة خطر**'' سے ہے ہلاکت پر مطلع ہونے کو کہتے ہیں اور کلام کے سیاق سے ظاہر یہ ہے کہ یہ رافع کا کلام ہے۔

تورپشتی فرماتے ہیں کہ یہ زیادۃ حدیث رافع بن خدیج میں مدرج ہے لیکن اسی طریقے پر بخاری کی روایت بھی ہے اور مجھے یہ معلوم نہ ہوسکا کہ یہ کسی راوی کا قول ہے یا امام بخاری کا قول ہے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ "کان" کا اسم اسم موصول اپنے صلہ کے ساتھ مل کر ہے اور خبر اسم موصول ثانی ہے اور "و کان" میں واؤ "لیس" کی خبر سے حال ہے۔

اس لئے کہ رافع سے جب پوچھا گیا دراہم کے بدلے زمین کرایہ پر دینے کے بارے میں تو ان کے پاس کوئی نص نہیں تھی اور ان دونوں کے درمیان انہوں نے کوئی جامع علت بھی نہیں دیکھی کہ اس پر قیاس کر دیتے تو انہوں نے اپنے اس قول کے ساتھ اس کو بیان کر دیا "و کان الذی نهی...... اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ امام بخاری کا قول ہے تو اس کا ماقبل کے ساتھ کوئی ربط پیدا نہ ہوگا۔ اسی وجہ سے قاضی نے کہا کہ سیاق کلام سے ظاہر یہ ہے کہ یہ رافع کا کلام ہے اور اس کی تائید آگے آنے والی دوسری حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں ہے: "فربما اخرجت ذہ ولم تخرج ذہ فنہا ھم النبی صلی اللہ علیہ وسلم"۔

مزارعت کی ایک ممنوع صورت

۲۹۷۵: وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ قَالَ كُنَّا اَكْثَرَ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ حَقْلاً وَكَانَ اَحَدُنَا يُكْرِی اَرْضَهُ فَيَقُوْلُ هٰذِهِ الْقِطْعَةُ لِیْ وَهٰذِهِ لَكَ فَرُبَّمَا اَخْرَجَتْ ذِهِ وَلَمْ تُخْرِجْ ذِهِ فَنَهَاهُمُ النَّبِیُّ ﷺ ۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۵/۵ الحديث رقم ۲۳۳۲ و اخرجه مسلم فی صحیحه ۱۱۸۳/۳ الحديث رقم (۱۱۷-۱۵٤۷)

ترجمہ: "اور حضرت رافع بن خدیجؓ کہتے ہیں کہ ہم اکثر مدینہ والے کھیتوں کے مالک تھے اور ہم میں سے کوئی اپنی زمین (کسی کو) کرایہ پر دیتا تو یوں کہہ دیتا (کہ تم اس پوری زمین پر کاشت کرو اس کے عوض میں) اس زمین کا یہ قطعہ ٹکڑا میرے لئے ہے (یعنی زمین کے اس قطعہ کی پیداوار میں لوں گا) اور یہ ٹکڑا تمہارے لئے ہے (یعنی اس دوسرے قطعہ کی پیداوار تم لے لینا) اور بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ ایک قطعہ میں پیداوار ہو جاتی تھی لیکن دوسرے قطعہ میں کچھ بھی پیدا نہیں ہوتا تھا' چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے (مزارعت کی اس صورت سے) منع فرما دیا۔ (کیونکہ اس کی وجہ سے ایک شخص کو تو اپنے حصہ کی پیداوار مل جاتی تھی اور دوسرے شخص کا حق تلف ہو جاتا تھا)"۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قال کنا اکثر اھل المدینة حقلاً : حاء کے فتحہ اور قاف کے سکون کے ساتھ۔ مغرب میں ہے کہ "حقل" کھیتی کو کہتے ہیں۔ "محاقلة" کی کئی تفسیریں کی گئی ہیں: ① خوشے کے اندر غلہ کو گندم کے بدلے بیچنے کو کہتے ہیں۔ ② بعض کہتے ہیں کھیتی کو گندم کے بدلے فروخت کرنے کو کہتے ہیں۔ ③ بعض کہتے ہیں کہ تہائی یا چوتھائی پر بٹائی کو کہتے ہیں وغیرہ۔ ④ بعض کہتے ہیں گندم کے بدلے زمین کو کرایہ اور بٹائی پر دینے کو کہتے ہیں۔

"ذہ" : ھاء کے سکون کے ساتھ اور بعض کہتے ہیں اشباع کے ساتھ ہے۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے قطعہ زمین کی طرف اشارہ ہے اور یہ اسماء مبہمہ میں سے ہے جس سے اشارہ کیا جاتا ہے مؤنث کی طرف۔ اس میں "ذی" اور "ذہ" ھاء کے سکون کے ساتھ بھی کہا گیا ہے۔

یہ حضرت رافع کا قول ہے عدم جواز کیلئے اس خطرے کے پائے جانے کی وجہ سے جو منع ہے۔ یعنی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس علیحدہ کئے ہوئے قطعہ میں تو پیداوار ہو جاتی ہے اور اس کے علاوہ زمین میں نہیں ہوتی یا اس کے برعکس ہو جاتا ہے، پس ایک تو کل پیداوار لے کر کامیاب ہو جاتا ہے، اور دوسرے کا حق بالکل ضائع ہو جاتا ہے۔

کسی کو اپنی زمین بطور عاریت دینا بہتر ہے

۲۹۷۶: وَعَنْ عَمْرٍو قَالَ قُلْتُ لِطَاوُسٍ لَوْ تَرَكْتَ الْمُخَابَرَةَ فَاِنَّهُمْ يَزْعُمُوْنَ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ نَهٰی عَنْهُ قَالَ

اَیْ عَمْرُو اِنِّی اُعْطِیْهِمْ وَاُعِیْنُکُمْ وَاِنَّ اَعْلَمَهُمْ اَخْبَرَنِیْ یَعْنِی ابْنَ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ لَمْ یَنْهَ عَنْهُ وَلٰکِنْ قَالَ اَنْ یَمْنَحَ اَحَدُکُمْ اَخَاهُ خَیْرٌ لَّهٗ مِنْ اَنْ یَّاْخُذَ عَلَیْهِ خَرْجًا مَعْلُوْمًا. (متفق علیه)

اخرجه البخاری صحیحه ۵/۱۴ الحدیث رقم ۲۳۳۰ومسلم فی ۳/۱۱۸۴ الحدیث رقم (۱۲۰۔۱۵۵۰) وابوداوٗد فی۳/۶۸۲ الحدیث رقم ۳۳۸۹ والنسائی فی ۷/۳۶ الحدیث رقم ۳۸۷۳ واحمد فی المسند ۱/۲۳۴ (۲) المخطوطة (ریعا) (۲) اخرجه ابوداوٗد فی السنن ۳/۶۸۹ الحدیث رقم ۳۳۹۵۔

ترجمه: ''اور حضرت عمرو بن دینار (تابعی) کہتے ہیں کہ میں نے حضرت طاؤس (تابعی) سے کہا کہ کاش آپ مخابرہ کو چھوڑ دیتے کیونکہ لوگوں کا گمان یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ طاؤس نے کہا کہ اے عمرو! میں (اپنی زمین کاشت کرنے کے لئے) لوگوں کو دیتا ہوں اور ان کی مدد بھی کرتا ہوں اور ان میں سب سے بڑے عالم یعنی حضرت ابن عباسؓ نے مجھے بتایا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس سے منع نہیں فرمایا لیکن آپ ﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ اگر تم میں سے کوئی ایک اپنے بھائی کو (کاشت کاری کے لئے) بغیر کسی عوض زمین دے یہ بہتر ہے اس سے کہ وہ اس سے معینہ لگان وصول کرے''۔ (بخاری و مسلم)

حالاتِ راوی:

عمرو بن دینار۔ یہ عمرو ''دینار'' کے بیٹے ہیں۔ کنیت ''ابو یحییٰ'' ہے۔ سالم بن عبد اللہ وغیرہ سے روایت کی اور ان سے دونوں حمادؒ اور معتمرؒ نے روایت کی ہے۔ کئی محدث ان کو روایت میں ''ضعیف'' کہتے ہیں۔

تشریح: لو ترکت المخابرة: اس ''لو'' میں دوسرا احتمال یہ ہے کہ ''لو'' تمنی کیلئے ہے۔

یزعمون: یعنی کہتے ہیں اور گمان کرتے ہیں' یقین سے نہیں کہتے۔ **نهی عنه:** ضمیر مخابرہ کی طرف راجع ہے، اور کی تاویل یہ ہوگی: **نهی عن الزرع فی ارض غیره۔ واعینهم:** ''اعانة'' سے ماخوذ ہے۔

وان اعلمهم: ۔امام طیبیؒ فرماتے ہیں اعلمهم کی ضمیر اس کی طرف راجع ہے جس کی طرف ''یزعمون'' کی ضمیر راجع ہے' اور وہ علماء کی ایک جماعت ہے کہ ان کا مسلک مخابرہ کے بارے میں طاوس کے خلاف تھا' اس لئے اس کو لفظ ''زعم'' کے ساتھ ذکر کیا۔ حاصل یہ ہے کہ یہ ان سے زیادہ علم والے ہیں۔

اخبرنی یعنی: یعنی طاوس کی مراد اعلمهم سے ابن عباس تھے۔

ابن عباس ان النبی ﷺ لم ینه عنه: یعنی زمین کو بٹائی پر دینا اس طریقے پر جو کہ حدیث رافع میں مذکور ہے۔

ولکن قال: ضمیر نبی ﷺ کی طرف رافع ہے۔

ان یمنح: ہمزہ اور حاء کے فتحہ کے ساتھ اس بنیاد پر کہ ''ان'' تعلیلیہ ہو، اور ہمزہ کے کسرہ اور حاء کے سکون کے ساتھ ہے اگر ''ان'' شرطیہ ہو، لیکن اول زیادہ مشہور ہے۔ (اس کو ذکر کیا ہے عسقلانی نے)۔ اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ ''ان'' مصدریہ ہے اور محلاً مرفوع ہے مبتدا ہونے کی وجہ سے۔ اور ''یمنح'' یاء اور نون کے فتحہ کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں یاء کے ضمہ اور نون کے کسرہ کے ساتھ ہے، اور اس کا فاعل آنے والا قول ''احدکم'' ہے، معنی یہ ہے کہ دے تم میں سے کوئی اپنی زمین اُجرت پر۔

اس وجہ سے کہ اس میں احتمال ہے کہ بارش نہ برسے یا زمین سے پیداوار نہ نکلنے۔ تو اس صورت میں اس کا مال بغیر کسی عوض کے چلا جائے گا۔ (یعنی ضائع ہو جائے گا۔)

علامہ تورپشتی فرماتے ہیں کہ مزارعت کے بارے میں احادیث جو مؤلف نے ذکر کی ہیں یا جو کتب حدیث میں موجود ہیں ان میں بظاہر بہت بڑا تباین اور اختلاف ہے، اور من جملہ جامع قول یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ رافع بن خدیج نے ممانعت کے بارے میں احادیث سنیں اور ان کی علل مختلف تھیں، پس انہوں نے ان سب کو ایک ایک لڑی میں پرو دیا' اس لئے کبھی وہ کہتے ہیں: **سمعت رسو ل**

الله صلی الله علیه وسلم اور کبھی کہتے ہیں: حدثنی عمومی، اور کبھی کہتے ہیں: اخبرنی عمای۔ ان احادیث میں سے بعض میں علت یہ ہے کہ وہ فاسد قسم کی شرائط لگاتے تھے اور غیر معلوم اجرت پر معاملات کرتے تھے تو ان کو اس سے منع کیا گیا۔ بعض میں علت یہ ہے کہ وہ زمین کی اجرت کے بارے میں آپس میں لڑتے تھے یہاں تک تقابل کی نوبت آ جاتی۔ پس نبی ﷺ نے فرمایا: ان کان هذا اشانکم فلا تکروا المزارع ''اگر تمہاری یہ حالت ہے تو پھر تم بٹائی پر کاشت نہ کرو''۔ اس کو زید بن ثابت نے اپنی حدیث میں بیان کیا ہے۔

اور بعض میں علت یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ناپسند کیا کہ ایک آدمی اپنے مسلمان بھائی سے زمین پر معلوم مقدار میں اجرت لے۔ اور پھر بارش نہ ہو یا زمین سے پیداوار نہ ہو اور اس کا مال بغیر کسی چیز کے چلا جائے۔ اس سے آپس میں نفرت اور بغض پیدا ہوتا ہے۔ یہ ابن عباس کی حدیث ''من کانت له ارض فلیزرعها......'' سے واضح ہے۔ تو یہ بطور مروت اور مواسات کے فرمایا۔ اور بعض میں علت یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ناپسند کیا کہ یہ لوگ کھیتی باڑی کے فتنہ اور لالچ میں پڑ جائیں اور اسی کے ہو جائیں، اور اللہ کے راستے میں جہاد کرنے سے رہ جائیں، اور مال غنیمت اور فئی میں ان کا حصہ فوت ہو جائے۔ اس پر ابو امامہ کی حدیث دلالت کر رہی ہے۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ اسی معنی پر اس اضطراب کو محمول کرنا چاہئے جو شرح السنہ میں امام احمد سے مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ رافع بن خدیج کی حدیث میں اضطراب ہے' کہ کبھی تو وہ فرماتے ہیں: سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم اور کبھی کہتے ہیں: حدثنی عمومتی، اس اضطراب کو محدثین کے اصطلاحی اضطراب پر محمول نہ کیا جائے اس لئے کہ وہ اضطراب ضعف کی اقسام میں سے ایک قسم ہے اور جناب شیخین کی شان بہت بلند و بالا ہے وہ اپنی کتابوں میں اس قسم کی احادیث کیسے ذکر کر سکتے ہیں۔

اپنی زمین کو بیکار نہ چھوڑو

۲۹۷۷: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ كَانَتْ لَهٗ اَرْضٌ فَلْيَزْرَعْهَا اَوْ لِيَمْنَحْهَا اَخَاهُ فَاِنْ اَبٰى فَلْيُمْسِكْ اَرْضَهٗ. (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۵/۲۲ الحدیث رقم ۲۳۴۰ ومسلم فی ۳/۱۱۷۶ الحدیث رقم (۸۹-۱۵۳۶) والنسائی فی السنن ۷/۳۶ الحدیث رقم ۳۸۷٤ وابن ماجه فی ۲/۸۱۹ الحدیث رقم ۲۶۵۱ واحمد فی المسند ۳/۳۷۳۔

ترجمہ: ''اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص کے پاس زمین ہو تو اسے چاہئے کہ وہ اس میں خود کاشت کرے یا (خود کاشت نہ کر سکے تو) اپنے کسی بھائی کو عاریۃً دے دے اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تو پھر اسے چاہئے کہ اپنی زمین اپنے پاس ہی رکھے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: فلیزرعها: امر اباحت کیلئے ہے۔ فلیمسك ارضه: یہ حکم توبیخ اور تنبیہ کیلئے ہے۔

بعض کہتے ہیں معنی یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس کی زمین عاریۃً قبول کرنے سے انکار کر دے، تو اپنی زمین اپنے پاس رہنے دے اس صورت میں یہ حکم اباحت کے طور پر ہوگا۔ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس میں اس کی کوئی کوتاہی نہیں ہے۔

شیخ مظہر فرماتے ہیں کہ انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے مال سے نفع حاصل کرے۔ پس جس شخص کے پاس زمین ہو اسے چاہئے کہ وہ اس میں خود کھیتی باڑی کرے تاکہ اس کی وجہ سے اسے نفع ہو، یا اپنے مسلمان بھائی کو عاریۃً دیدے تاکہ اسے ثواب ملے، لیکن اگر وہ ان دو صورتوں میں سے کوئی صورت پسند نہ کرے تو پھر اپنی زمین اپنے پاس رہنے دے۔ اس میں تنبیہ ہے ایسے شخص کیلئے جس کے پاس مال ہو اور وہ اس سے فائدہ حاصل نہ کرے۔

امام طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حکم گویا ان دونوں صورتوں کو ترک کرنے اور مزارعت، اور مخابرہ وغیرہ کو اختیار کرنے پر از راہ تنبیہ دیا گیا ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ امام شافعی نے سونے' چاندی کے بدلے زمین کو اجارہ پر دینے کی اجازت دی ہے، اور حدیث نہی کی دو تاویلیں کی ہے۔ پہلی تاویل یہ ہے کہ ممانعت اس صورت میں ہے کہ وہ اجارہ پر دے اس شرط کے ساتھ کہ جو پیداوار' ماذیانات' پر ہوگی وہ مالک کی ہوگی زمین کے عوض میں۔''ماذیانات'' یہ ذال معجمہ پر کسرہ اور اس کے بعد یاء ہے۔ پانی بہنے کی جگہوں (مثلاً نالی' کھال) کو کہتے ہیں۔

دوسری تاویل: بعض کہتے ہیں کہ اس شرط پر کہ جو پانی کی نالیوں اور چھوٹی ندی کے کناروں پر پیدا ہو، وہ مالک کا ہوگا۔ یہ لفظ معرّب ہے۔

زراعت میں مشغولیت کی وجہ سے جہاد ترک کرنے پر وعید

۲۹۷۸: وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ وَرَاٰیٔ سِكَّةً وَشَيْئًا مِّنْ اٰلَةِ الْحَرْثِ فَقَالَ سَمِعْتُ النَّبِیَّ ﷺ يَقُوْلُ لَا يَدْخُلُ هٰذَا بَيْتَ قَوْمٍ اِلَّا اَدْخَلَهُ اللّٰهُ الذُّلَّ. (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٥/٤ الحدیث رقم ٢٣٢١۔

ترجمه: ''حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے (ایک جگہ) ہل اور کھیتی باڑی کا کچھ سامان دیکھا تو انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ یہ سامان کسی قوم کے جس گھر میں داخل ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس گھر میں ذلت داخل فرما دیتا ہے''۔ (بخاری)

تشریح: **ورأى سكة** : واؤ حالیہ ہے۔''سكة'' سین کے کسرہ اور کاف کی تشدید کے ساتھ ہے، اس لوہے کو کہتے ہیں جس کے ذریعے زمین کو جوتا جائے۔ (اس کو''ہل'' کہا جاتا ہے۔ازمرتب)

سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم : اور ایک نسخہ میں''نبی'' ہے۔

يقول لا يدخل هذ : یعنی جو ذکر ہوئے کھیتی باڑی کے آلات میں سے۔

بيت قوم الا ادخله : ''اللہ'' جیسا کہ صحیح نسخہ میں ہے۔

الذل : ذال کے ضمہ کے ساتھ یعنی ذلت ٹیکس اور عشر کی ادیگی۔ مقصود جہاد کی ترغیب ہے۔

تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ کھیتی باڑی کے آلہ کو ذلت کا آلہ اس لئے قرار دیا ہے کہ کھیتی باڑی کرنے والے اس کو اختیار کرتے ہیں بزدلی کی وجہ سے، یا کم ہمتی کی وجہ سے۔ پھر ان میں سے اکثر سرکاری حقوق کے پابند ہوتے ہیں، خراجی زمین میں اور اگر یہ جہاد کو ترجیح دیتے تو ان کا رزق بڑھ جائے اور راہیں کشادہ ہو جائیں' اور مال ان کے پاس بطور ٹیکس کے آئے بجائے اس کے کہ ان سے ٹیکس وصول کیا جائے۔ اور اسی معنی کے قریب یہ حدیث ہے: کہ''عزت گھوڑوں کی پیشانیوں میں ہے اور ذلت گائیوں کی دموں میں ہے۔''

ہمارے بعض شارحین فرماتے ہیں کہ زراعت کی وجہ سے ذلت آتی ہے لیکن بات ایسی نہیں ہے اس لئے کہ زراعت مستحب ہے اور اس میں لوگوں کیلئے منافع ہیں اور حدیث میں ہے:''اطلبوا الارض من جثايا ها''۔ یہ آپ ﷺ نے اس لئے فرمایا تا کہ صحابہ زمینوں آباد کاری میں لگ کر جہاد کو ترک نہ کر دیں اور کفار ان پر غالب آجائیں اور اس سے بڑھ کر کونسی ذلت ہوگی۔

بعض علما فرماتے ہیں اس وعید کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو دشمنان دین کے قریب اقامت پذیر ہوں' اگر ایسے لوگ اپنی تمام تر توجہ زراعت کی طرف مبذول کر کے جہاد کو فراموش کر دیں گے تو دشمن ان پر غالب آجائیں گے۔

الفصل الثانی:

کسی کی زمین میں بلا اجازت کاشت نہ کرو

۲۹۷۹: عَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ مَنْ زَرَعَ فِیْ اَرْضِ قَوْمٍ بِغَيْرِ اِذْنِهِمْ فَلَيْسَ لَهٗ مِنَ الزَّرْعِ

شَیْءٌ وَلَهُ نَفَقَتُهُ. (رواه الترمذی وابوداود وقال الترمذی هذا حدیث غریب)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۶۹۲/۳ الحدیث رقم ۳۴۰۳ والترمذی فی ۶۴۸/۳ الحدیث رقم ۱۳۶۶ وابن ماجه فی ۸۲۴/۲ الحدیث رقم ۲۴۶۶ واحمد فی المسند ۴۶۵/۳۔

ترجمه: ''حضرت رافع بن خدیج نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشادفرمایا: جوشخص کسی کی زمین میں اس کی اجازت کے بغیر (یعنی مالک کی رضا اور اس کے حکم کے بغیر) کاشت کرے تو اس کو زمین کی پیداوار میں سے کچھ نہیں ملے گا وہ شخص صرف اس چیز کا حقدار ہے جس کو اس نے (زمین کی کاشت میں) خرچ کیا۔ (ترمذی' ابوداؤد) امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: فلیس له من الزرع شیء : یعنی زمین کی ساری پیداوار زمین کے مالک کو ملے گی اور کاشت کرنے والے کو صرف اس کا تخم ملے گا جو اس نے لگایا ہے' ملے گا، یہ امام احمد کا مسلک ہے۔ دوسرے علماء یہ کہتے ہیں کہ ایسی صورت میں زمین کی پیداوار کاشت کرنے والے ہی کو ملے گی، البتہ اس کیلئے یہ ضروری ہوگا کہ وہ زمین کا نقصان مالک کو ادا کرے، ابن الملک نے یہ کہا ہے کہ ایسے شخص پر زمین پر قبضہ کے دن سے زمین کے خالی ہونے کے دن تک اس زمین کا معاوضہ واجب ہوگا۔ (کذا ذکرہ مظہر)

ولہ نفقته : یعنی اس کو محنت کی اجرت ملے گی اور بعض کہتے ہیں کہ اس نے جو خرچ کیا ہے پیداوار کے حاصل ہونے کے بعد وہ اس کو ملے گا۔

شرح السنہ میں ہے کہ بعض اہل علم نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے اور امام احمد سے نقل کیا گیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ ''بغیر اذنھم'' کے الفاظ اسحٰق نے زیادہ کئے ہیں' اس کے علاوہ کسی نے یہ ذکر نہیں کئے اور ابواسحٰق وہی ہے جس نے یہ حدیث رافع بن خدیج سے روایت کی ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ جب کسی کی زمین کاشت کی جائے تو پیداوار زمین کے مالک کی ہوگی اور کاشت کرنے والے کیلئے اجرت ہوگی۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ:

مزارعت کا ثبوت

۲۹۸۰: عَنْ قَیْسِ بْنِ مُسْلِمٍ عَنْ اَبِیْ جَعْفَرٍ قَالَ مَا بِالْمَدِیْنَةِ اَهْلُ بَیْتِ هِجْرَةٍ اِلَّا یَزْرَعُوْنَ عَلَی الثُّلُثِ وَالرُّبُعِ وَزَارَعَ عَلِیٌّ وَسَعْدُ بْنُ مَالِكٍ وَعَبْدُ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ وَعُمَرُ بْنُ عَبْدِالْعَزِیْزِ وَالْقَاسِمُ وَعُرْوَةُ وَاٰلُ اَبِیْ بَكْرٍ وَاٰلُ عَلِیٍّ وَابْنُ سِیْرِیْنَ وَقَالَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ الْاَسْوَدِ كُنْتُ اُشَارِكُ عَبْدَ الرَّحْمٰنِ بْنِ یَزِیْدَ فِی الزَّرْعِ وَعَامَلَ عُمَرُ النَّاسَ عَلٰی اِنْ جَاءَ عُمَرُ بِالْبَذْرِ مِنْ عِنْدِهٖ فَلَهُ الشَّطْرُ وَاِنْ جَاءُوْا بِالْبَذْرِ فَلَهُمْ كَذَا۔

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۴/۵ معلقا عناب الحرث والمزارعة باب المزارعة بالشطر۔

ترجمه: ''حضرت قیس بن مسلم (جدلی)' حضرت ابوجعفر یعنی امام محمد باقر سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: مدینہ میں مہاجرین کا کوئی ایسا گھر نہ تھا جو تہائی اور چوتھائی (کی بٹائی پر) کھیتی باڑی نہ کرتا ہو اور حضرت علی' حضرت سعد بن مالک (یعنی سعد بن ابی وقاص) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم' حضرت عمرو بن عبدالعزیز' قاسم' عروہ' حضرت ابوبکرؓ کی اولاد' حضرت علیؓ کی اولاد اور ابن سیرین ان سب نے کھیتی باڑی کی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن اسودؒ تابعی کا بیان ہے کہ میں کھیتی باڑی میں حضرت عبدالرحمٰن بن یزید کے ساتھ شراکت کیا کرتا تھا۔ نیز حضرت عمرؓ نے لوگوں سے اس شرط پر (مزارعت کا) معاملہ کیا تھا کہ اگر عمرؓ بیج اپنے پاس سے دیں گے تو (پیداوار کا) نصف حصہ ان کا ہوگا اور اگر وہ لوگ خود بیج لائیں گے تو پیداوار میں اس کے مطابق ان کا اتنا حصہ ہوگا

(یعنی نصف' یا تہائی یا چوتھائی جو بھی مقرر ہوتا ہو)۔'' (بخاری)

حالاتِ راوی:

قیس بن مسلم۔ نام قیس ہے۔ مسلم کے بیٹے ہیں۔ ''بنو جدیلہ'' میں سے ہیں۔ کوفہ کے باشندہ ہیں۔ طبقۂ تابعین سے تعلق رکھتے ہیں۔ سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ سے روایت حدیث کی اور ان سے ثوری اور شعبہ وغیرہ حدیث کی روایت کرتے ہیں۔

تشریح: ''الجدلی'' میں جیم اور دال مہملہ دونوں پر زبر ہے۔ ۱۲۰ھ میں وفات پائی۔

الثلث : ثاء اول اور لام دونوں کے ضمہ کے ساتھ اور لام کے سکون کے ساتھ اور اسی طرح لفظ ''ربع'' بھی ہے۔

والربع : واؤ بمعنی او ہے۔ اگلا کلام تخصیص بعد از تعمیم ہے۔ **سعد بن مالك** : ان کے حالات مصنف نے ذکر نہیں کئے۔

عمر بن عبد العزیز : خیار تابعین میں سے ہیں۔ **عروۃ** سے مراد عرف ابن زبیر بن العوام ہیں۔ یہ اکابر تابعین میں سے ہیں۔ مدینہ کے فقہاء سبعہ میں سے تھے۔ **وال ابی بکر** : یہ تعمیم بعد التخصیص ہے۔

ابن سیرین : رفع کے ساتھ ہے۔ یہ فضلاء تابعین میں سے ہیں۔ **عبد الرحمن بن الاسود** : قرشی زہری حجازی مدینہ کے مشہور تابعین میں سے ہیں اور ان کے ثقات میں سے ہیں اور ''عزیز الحدیث'' ہیں۔

عبد الرحمٰن بن یزید : سلمی مدنی وعلماء نے ضعیف قرار دیا ہے۔ مصنفؒ نے ان کو تابعین میں ذکر کیا ہے۔

علی ان : ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ۔ **البذر** : باء کے فتحہ کے ساتھ۔

فلھم کذا ''کذا'' کنایہ ہے مقدار معروف سے۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ یہ '**علی ان جاء**'' یہ حال ہے 'عامل'' کے فاعل سے اور یہ جملہ شرطیہ ہے محلا مجرور ہے اور اعراب چکائی ہے: **ای عاملھم بناء علی ھذا الشرط**۔ یعنی ان کے ساتھ معاملہ کیا اس شرط کی بناء پر۔

توضیح : میرک شاہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خود بخاری اور اس کی شروح سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو جعفر کی عبارت لفظ ''**والربع**'' پر ختم ہوگئی ہے، اور باقی عبارت خود بخاری کا کلام ہے۔ یہ سب آثار ہیں جن کو بخاری نے چونکہ بغیر سند کے نقل کیا ہے اس لئے معلق ہیں۔ چنانچہ مؤلف کیلئے ضروری تھا کہ وہ روایت کے آخر میں ''**رواہ البخاری تعلیقا**'' فرماتے۔

بَابُ الْاِجَارَةِ

اجارہ کا بیان

''اجارہ'' ہمزہ کے کسرہ ضمہ دونوں کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔ اس کے معنی ہیں: ''اثابہ'' کہا جاتا ہے: **آجرته، اذا أثبته** مد کے ساتھ اور بغیر مد کے بھی، (اس کو ذکر کیا ہ عسقلانی۔ نے۔)

مغرب میں ہے ''اجارہ'' کہتے ہیں کسی چیز کی منفعت کا کسی کو مالک بنانا عوض کے بدلے شرعاً۔ اور لغت میں ''اجرۃ'' کا اسم ہے۔ '' اجرۃ'' مزدور کی مزدوری کو کہتے ہیں۔ کہتے ہیں: **قد اجرہ اذا أعطا أجرته**، مزدوری دینا۔

الفصل الاول:

اجارہ کا جواز

۲۹۸۱: عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مُغَفَّلٍ قَالَ زَعَمَ ثَابِتُ بْنُ الضَّحَّاكِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى عَنِ الْمُزَارَعَةِ وَاَمَرَ

بِالْمُؤَجَرَةِ وَقَالَ لَا بَاسَ بِهَا . (رواه مسلم)

اخرجه فى صحيحه ۳/۱۱۸٤ الحديث رقم (۱۱۹ـ۱۵٤۹)۔

ترجمہ:''حضرت عبداللہ بن مغفلؓ کہتے ہیں کہ حضرت ثابت بن ضحاکؓ نے یہ بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے مزارعت سے منع فرمایا ہے اور مؤاجرہ (ٹھیکے) کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے''۔(مسلم)

تشریح: **المؤاجرة** : ہمزہ کے ساتھ ہے اور ہمزہ کو واؤ سے تبدیل بھی کیا جاتا ہے۔امام طیبی فرماتے ہیں کہ''المزارعة'' اور المؤاجرة دونوں میں الف لام عہد کیلئے ہے۔پس مزارعت سے مراد وہ ہے جو نا جائز ہے اور''مؤاجرة'' سے مراد جو اسکے برعکس ہے۔

وقال لا بأس بها : ظاہر یہ ہے کہ ضمیر ثابت کی طرف راجع ہے۔امام احمد نے پہلے حصہ کو روایت کیا ہے۔

۲۹۸۲:وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ احْتَجَمَ فَاَعْطَى الْحَجَّامَ اَجْرَهُ وَاسْتَعَطَ. (متفق عليه)

اخرجه البخارى فى صحيحه ۱۰/۱٤۷ الحديث رقم ۵٦۹۱ ومسلم فى ۳/۱۲۰۵ الحديث رقم (٦۵ـ۱۲۰۲)وابو داؤد فى ۳/۷۰۸ الحديث رقم ۳٤۲۳ وابن ماجه فى ۲/۷۳۱ الحديث رقم ۲۱٦۲ واحمد فى لمسند ۱/۲۵۸۔

ترجمہ:''اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے (ایک مرتبہ) بھری ہوئی سینگی کھینچوائی اور سینگی کھینچنے والے کو اجرت عطا فرمائی' نیز آپ ﷺ نے اپنی ناک میں دواڈلوائی''۔(بخاری ومسلم)

تشریح: **الحجام** : جیم کی تشدید کے ساتھ۔ یہ دلالت کرتا ہے کہ سینگی کھینچنے کی اجرت مباح ہے۔

استعط : تاء کے فتحہ کے ساتھ۔ناک میں دواڈالنا۔امام طیبی فرماتے ہیں کہ''السعوط'' فتحہ کے ساتھ اس دوا کو کہتے ہیں جو ناک میں ڈالی جاتی ہے۔کہا جاتا ہے:**اسعطت الرجل واستعط هو بنفسه** اور **استعط** ۔مبنی للمفعول استعمال نہیں ہوتا۔

اس سے اجارہ پر لینے کا جواز اور دواء کے استعمال کا جواز معلوم ہوا۔

سرکارِ دوعالم ﷺ نے اُجرت پر بکریاں چرائی ہیں

۲۹۸۳:وَعَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ مَا بَعَثَ اللّٰهُ نَبِيًّا اِلَّا رَعَى الْغَنَمَ فَقَالَ اَصْحَابُهُ وَاَنْتَ فَقَالَ نَعَمْ كُنْتُ اَرْعٰى عَلٰى قَرَارِيْطَ لِاَهْلِ مَكَّةَ. (رواه البخاری)

اخرجه البخارى فى صحيحه ٤/٤٤١ الحديث رقم ۲۱٤۹ وابن ماجه فى السنن ۲/۷۲۷الحديث رقم ۲۱٤۹

ترجمہ:''اور حضرت ابو ہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ایسا کوئی نبی مبعوث نہیں فرمایا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں'' (یہ سن کر) آپ ﷺ کے صحابہؓ نے پوچھا کہ''کیا آپ ﷺ نے بھی بکریاں چرائی ہیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا:''ہاں! میں چند قیراط کے عوض اہل مکہ کی بکریاں چرایا کرتا تھا''۔(بخاری)

تشریح: **قوله :ما بعث الله نبيا الا رعى الغنم** : شیخ مظہر فرماتے ہیں کہ انبیاء کے بکریوں کو چرانے کی علت یہ ہے کہ جب وہ بکریوں کے ساتھ اختلاط کرتے ہیں تو ان کی تحمل اور شفقت بڑھ جاتی ہے،اس لئے کہ جب وہ بکریاں کی چرانے میں مشقت سہتے ہیں اور ان کی درندوں اور اُچکوں سے حفاظت کرتے ہیں اور ان کی طبیعتوں کے اختلاف کو سمجھتے ہیں چراگاہ اور گھاٹ میں ان کے متفرق ہونے کے بعد ان کو جمع کرتے ہیں' ان کے ضعف اور کمزوری اور ان کی ایک چراگاہ سے دوسرے چراگاہ کی طرف منتقل کرنے کی ضرورت اور چراگاہ سے واپس لانے کا طریقہ جان لیا۔تو اس نے لوگوں کے ساتھ باہمی ربط وتعلق کو جان لیا ان کی طبیعتوں اور قسموں کے مختلف ہونے کے باوجود اور ان میں سے بعض کے عقل وشعور کے کم ہونے کے باوجود،اور سنجیدگی کے کم ہونے کے باوجود۔پس امتوں کی طرف سے ملنے والی تکالیف پر صبر کیا اور ان کی طبیعتیں امتوں سے متنفر نہیں ہوتیں اور ان کے دل اُکتاتے نہیں' ان کو دین کی طرف دعوۃ دینے

سے ان کی مشقت اور تکالیف کو برداشت کرنے کے عادی ہو چکے ہوتے ہیں۔ اور اسی طریقہ سے ایک بادشاہ کو اپنے قوم اور رعایا سے پیش آنا چاہئے۔

قراریط : قیراط کی جمع ہے اور قیراط نصف دانق کا ہوتا ہے اور دانق درہم کا چھٹا حصہ ہوتا ہے۔ اہل مکہ نے مجھے اجرت پر رکھا بکریاں چرانے کیلئے ہر دن ایک قیراط پر۔ قراریط کو جمع ذکر کیا اس لئے کہ آپ کی مراد مہینہ کی قسط تھی چرانے کی اجرت میں سے۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ ''قراریط'' دینار کی مقدار تک نہیں پہنچتے تھے۔ یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی مقدار کو ذکر کرنا نہیں چاہتے تھے جلدی جلدی ملنے والے حصہ کو ہیچ سمجھنے کی وجہ سے۔ یا یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی کمیت بھول چکے تھے، بہر حال جو بھی ہو لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات تواضع اور اللہ کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر احسانات کی تصریح کرنے کے طور پر فرمایا۔ (اس کو ذکر کیا ہے تورپشتی نے)

ابن الملک کی شرح المشارق میں ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ آزاد کو اجرت پر لینا جائز ہے۔ اور جو کہتے ہیں کہ ''قراریط'' مکہ میں ایک جگہ کا نام ہ اور ''علی'' ''بمعنی'' ''فی'' ہے اس لئے کہ آپ علیہ السلام بہت اونچی شان والے تھے یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ کام پر اجرت لیتے۔ ان قائلین کا یہ کلام تعسف ہے۔ اس لئے کہ انبیاء اس کام پر اجرت لینے سے بچتے تھے جو اللہ کیلئے ہو نہ کہ اپنے نفس کیلئے کسی کام پر۔ اور مصنف نے یہ حدیث امام بغوی کی اتباع میں ''باب الاجارہ'' میں ذکر کی ہے۔ اس توجیہ کے مطابق یہ حدیث اس باب میں ذکر نہیں کرنا چاہئے تھا۔ واللہ اعلم بالصواب

مزدور کو اس کی مزدوری نہ دینے والے کیلئے وعید

۲۹۸۴: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی ثَلَاثَةٌ اَنَا خَصْمُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ رَجُلٌ اَعْطٰی بِیْ ثُمَّ غَدَرَ وَرَجُلٌ بَاعَ حُرًّا فَاَكَلَ ثَمَنَهٗ وَرَجُلٌ اسْتَاجَرَ اَجِيْرًا فَاسْتَوْفٰی مِنْهُ وَلَمْ يُعْطِهٖ اَجْرَهٗ۔ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٤١٧/٤ الحدیث رقم ٢٢٢٧، وابن ماجه فی ٨١٦/٢ الحدیث رقم ٢٤٤٢ واحمد فی المسند ٣٥٨/٢۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: کہ تین شخص ایسے ہیں جن سے میں قیامت کے دن جھگڑا کرونگا' ایک تو وہ شخص ہے جس نے میرا نام لے کر (لوگوں سے) عہد کیا اور پھر اس کو توڑ ڈالا' دوسرا شخص وہ ہے جس نے کسی آزاد شخص کو فروخت کیا اور اس کی قیمت کھا گیا اور تیسرا شخص وہ ہے جس نے کسی مزدور کو اجرت پر لگایا اور اس سے پورا کام لیا (یعنی جس کام کے لئے لگایا تھا وہ پورا کام اس سے کرایا) لیکن اس کو اس کی اجرت نہ دی''۔ (بخاری)

تشریح: **ثلاثة** : اس کی تمیز محذوف ہے ای **رجال او اشخاص**۔ **خصم** قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''الخصم'' **خصمته و اخصمه**، کا مصدر ہے اس کے ساتھ صفت لانا، مبالغہ کیلئے ہے جیسے ''عدل'' ہے۔ ابن ماجہ نے اس روایت میں یہ الفاظ زیادہ نقل کئے ہیں: ''**ومن کنت خصمه خصمته**، یعنی میں جھگڑے میں اس پر غالب آ جاؤں گا۔

رجل اعطی بی : یعنی میرے نام پر عہد کیا اور میرے نام کی قسم کھائی، یا میرے نام کے ساتھ کسی کو امان دی، یا اس طریقے پر جو میرے دین میں مشروع ہے۔ **ثم غدر** : یعنی اس کو توڑا۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قرینہ ہے خصوصیت کے ساتھ عہد کی پاسداری کرنے کا۔ اور ''بی'' حال ہے ''**موثقاً بی**'' کیونکہ عہد ان امور میں سے جس کے ذریعے اللہ کے نام کی قسموں کو مضبوط کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿**الذین ینقضون عهد الله من بعد میثاقه**﴾ (جو کہ توڑتے رہتے ہیں اس معاہدے کو جو اللہ تعالیٰ سے کر چکے تھے اس کے بعد)۔

ورجل باع حرا فاکل ثمنه : ''اکل ثمن کی قید کو توبیخ میں زیادتی کے لئے کیا ہے۔

قولہ:ورجل استاجرا جیرا فاستوفی منه :''جوکام اس سے لینا چاہتا تھا وہ پورا لیا''۔اس کوذکر کیا اس کام کو برا بتانے کیلئے، اور زیادتی کیلئے۔

ولم یعطه اجره :اور ابن ماجہ کی روایت میں ''لم یوفه'' ہے یعنی اس کی مزدوری پوری نہیں دی۔

جھاڑ پھونک کرنے والا اُجرت لے سکتا ہے

۲۹۸۵:وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ نَفَرًا مِّنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ مَرُّوْا بِمَاءٍ فِيْهِمْ لَدِيْغٌ اَوْ سَلِيْمٌ فَعَرَضَ لَهُمْ رَجُلٌ مِنْ اَهْلِ الْمَاءِ فَقَالَ هَلْ فِيْكُمْ مِنْ رَاقٍ اِنَّ فِي الْمَاءِ رَجُلاً لَدِيْغًا اَوْ سَلِيْمًا فَانْطَلَقَ رَجُلٌ مِّنْهُمْ فَقَرَأَبِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ عَلٰى شَاءٍ فَبَرَأَفَجَا ءَ بِا لشَّاءِ اِلٰى اَصْحَابِهٖ فَكَرِهُوْا ذٰلِكَ وَقَالُوْا اَخَذْتَ عَلٰى كِتَابِ اللّٰهِ اَجْرًا حَتّٰى قَدِ مُوْا الْمَدِ يْنَةَ فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَخَذَ عَلٰى كِتَابِ اللّٰهِ اَجْرًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اَحَقَّ مَا اَخَذْ تُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا كِتَابُ اللّٰهِ (رواه البخاری وفی روایة) اَصَبْتُمْ اَقْسِمُوْا وَاضْرِبُوْا لِيْ مَعَكُمْ سَهْمًا.

اخرجه ابخاری فی صحیحه ۱۹۸/۱۰ الحدیث رقم ۵۷۳۷وابن ماجه فی السنن ۷۲۹/۲ الحدیث رقم ۲۱۵۶ واحمد فی السمند ۸۳/۳

ترجمہ:''اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) نبی کریم ﷺ کے صحابہؓ کی ایک جماعت کا گزر پانی (کے ایک گھاٹ) کے پاس سے ہوا۔وہاں ایک ایسا شخص تھا جس کو بچھونے یا سانپ نے ڈس لیا تھا۔چنانچہ پانی کے پاس رہنے والے لوگوں میں سے ایک شخص ان صحابہؓ کے پاس آیا اور ان سے پوچھا کہ کیا آپ لوگوں میں کوئی شخص جھاڑ پھونک کرنے والا بھی ہے؟ کیونکہ ہماری بستی میں ایک شخص کو بچھو یا سانپ نے ڈس لیا ہے؟ (اگر ایسا کوئی شخص ہے تو وہ میرے ساتھ چل کر اس شخص پر دم کر دے) چنانچہ ان میں سے ایک صحابیؓ تشریف لے گئے اور انہوں نے چند بکریوں کے عوض اس شخص پر سورۂ فاتحہ پڑھی۔ (یعنی انہوں نے کہا کہ میں اس شخص پر اس شرط کے ساتھ جھاڑ پھونک کروں گا کہ میں اس کے عوض اتنی بکریاں لوں گا' اسے بستی والوں نے منظور کر لیا لہذا صحابیؓ نے سورۂ فاتحہ پڑھ کر اس شخص پر دم کیا کیونکہ منقول ہے کہ فاتحة الکتاب شفاء من السم یعنی سورۂ فاتحہ زہر کے لئے شفاء ہے۔لہٰذا وہ شخص اچھا ہو گیا) پھر جب وہ صحابیؓ بکریاں لے کر اپنے ساتھیوں کے پاس آئے تو ان ساتھیوں نے اس کو ناپسند کیا اور کہا کہ (بڑے تعجب کی بات ہے کہ) تم نے کتاب اللہ (پڑھنے) پر اجرت لی؟ یہاں تک کہ وہ سب صحابہؓ مدینہ پہنچے اور انہوں نے (رسول اللہ ﷺ سے) عرض کیا کہ ''یارسول اللہ! فلاں صحابیؓ نے کتاب اللہ (پڑھنے) پر اجرت لی ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ جس چیز پر اجرت لینے کے تم زیادہ حقدار ہو وہ کتاب اللہ ہے۔'' (بخاری) ایک اور روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ ''تم نے اچھا کیا' ان (بکریوں) کو آپس میں تقسیم کر لو اور اپنے ساتھ میرا حصہ بھی لگاؤ''۔ایک اور روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا کہ ''تم نے اچھا کیا' ان بکریوں کو (آپس میں) تقسیم کر لو اور اپنے ساتھ میرا حصہ بھی لگاؤ''۔

تشریح: مروا بماء : قاضی کہتے ہیں کہ یہاں ''ماء'' سے مراد ''اهل الماء'' ہیں یعنی وہ قبیلہ جن کے پاس انہوں نے پڑاؤ ڈالا تھا۔

فیهم : ضمیر (''ماء'' کے) مضاف محذوف کی طرف راجع ہے۔

لدیغ او سلیم : راوی کو شک ہے۔''لدیغ'' بمعنیٰ ''ملدوغ'' ہے۔''لدیغ'' کا اطلاق اکثر اس شخص پر ہوتا جس کو بچھو کاٹ لے اور ''سلیم'' کا اطلاق اس پر ہوتا ہے جسے سانپ ڈس لے۔ایسے ڈسے ہوئے شخص کو ''سلیم'' تفاؤلاً کہا جاتا ہے۔

راق : اسم فاعل ہے رقی یرقی سے، ماضی میں قاف کے فتحہ اور مضارع میں کسرہ کے ساتھ ہے۔ ''راقی'' اس کو کہتے ہیں جو دم درود کرے منتر پڑھے۔

ان فی الماء رجلا لدیغا او سلیما : جملہ مستانفہ ہے علت بیان کرنے کیلئے لایا گیا ہے۔

قولہ :فامطالق رجل منھم : بعض کہتے ہیں کہ یہ ابوسعید خدریؓ تھے۔ ''شاء'' : شاۃ کی جمع ہے۔

برأ : راء کے فتحہ کے ساتھ ہے راء کو کسرہ بھی دیا جاتا ہے۔ نہایہ میں ہے: برأ المریض یبرأ فتحہ کے ساتھ فھو باریء وابرأہ اللہ۔ اور غیر اہل حجاز ''بریٔ'' کسرہ کے ساتھ ''برأ ضمہ'' کے ساتھ کہتے ہیں۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ تیس بکریاں لی تھیں، اور یہ تیس آدمی تھے۔

قولہ :وقالوا اخذت علی کتاب اللہ اجرا :حتی قدموا : امام طیبی فرماتے ہیں کہ یہ ''قالوا :اخذت علی کتاب اللہ'' کا متعلق ہے اور مطلب یہ ہے کہ وہ راستے میں اِس پر مسلسل نکیر کر رہے تھے یہاں تک کہ مدینہ پہنچ گئے۔

فقالوا یا رسول اللہ : غایہ میں مغیا میں داخل ہے جیسا کہ ''سمکۃ'' کے مسئلہ میں ہے۔

قولہ :ان احق ما اخذتم علیہ اجرا کتاب اللہ :

قاضی فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن پڑھنے کیلئے اور اس کے ذریعے دم کرنے کیلئے کسی کو اجرت پر لینا جائز ہے اور تعلیم قرآن پر اجرت لینا جائز ہے، اور ایک جماعت اس کی حرمت کی قائل ہے۔ یہ زہری، امام ابوحنیفہ، اور اسحٰق رحمہم اللہ کا قول ہے۔ انہوں نے عبادہ بن الصامت کی اگلی حدیث سے استدلال کیا ہے۔

شرح السنہ میں ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی آیتوں اور ذکر اللہ کے ذریعے جھاڑ پھونک کرنا اور اس کی اجرت لینا جائز ہے، اس لئے کہ قراءت مباح کاموں میں سے ہے، اور اسی سے استدلال کیا ہے جنہوں نے قرآن کریم کو بیچنے' خریدنے اور اس کی کتابت پر اجرت لینے کو جائز قرار دیا ہے۔ اور یہی حسن، شعبہ اور عکرمہ کا مسلک ہے اور یہی امام مالک' شافعی' سفیان ثوری اور اصحاب ابی حنیفہ کا مسلک ہے۔

وفی روایۃ : بظاہر یہ بھی بخاری کی روایت ہے۔ اقسموا : ہمزہ وصل اور سین کے کسرہ کے ساتھ۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ تقسیم کرنا اپنے ساتھیوں کے ساتھ مروت' احسان اور برابری کے طور پر تھا۔ ورنہ تو تمام بکریاں دم کرے والے کی ملکیت تھیں۔

''اپنے ساتھ میرا بھی حصہ لگاؤ'' یہ فرمانا ان صحابہ کے دلوں کی صفائی اور ان کی تعریف میں مبالغہ کیلئے تھا، کہ یہ حلال ہے اور اس میں کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں ہے۔

الفصل الثانی:

جس طرح غیر شرعی جھاڑ پھونک ناجائز ہے اسی طرح اس کی اجرت بھی حرام ہے

۲۹۸۶:عَنْ خَارِجَةَ بْنِ الصَّلْتِ عَنْ عَمِّهٖ قَالَ اَقْبَلْنَا مِنْ عِنْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَاَتَيْنَا عَلٰى حَيٍّ مِنَ الْعَرَبِ فَقَالُوْا اِنَّا اُنْبِئْنَا اَنَّكُمْ قَدْ جِئْتُمْ مِنْ عِنْدِ هٰذَا الرَّجُلِ بِخَيْرٍ فَهَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ دَوَاءٍ اَوْ رُقْيَةٍ فَاِنَّ عِنْدَنَا مَعْتُوْهًا فِي الْقُيُوْدِ فَقُلْنَا نَعَمْ قَالَ فَجَاءُوْا بِمَعْتُوْهٍ فِي الْقُيُوْدِ فَقَرَاْتُ عَلَيْهِ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ غُدْوَةً وَعَشِيَّةً اَجْمَعُ بُزَاقِيْ ثُمَّ اَتْفُلُ قَالَ فَكَاَنَّمَا اُنْشِطَ مِنْ عِقَالٍ فَاَعْطَوْنِيْ جُعْلًا فَقُلْتُ لَا حَتّٰى اَسْاَلَ النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَ كُلْ فَلَعَمْرِيْ لَمَنْ اَكَلَ بِرُقْيَةٍ بَاطِلٍ لَقَدْ اَكَلْتَ بِرُقْيَةٍ حَقٍّ. (رواہ احمد وابوداود)

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ۳/ ۷۰٦ الحدیث رقم ۳٤۲۰ واحمد فی المسند ۵/ ۲۱۰ (۲) فی المخطوطة (الناقص)

ترجمہ: "حضرت خارجہ بن صلتؒ اپنے چچا سے نقل کرتے ہیں کہ (انہوں نے کہا کہ) ہم لوگ رسول اللہ ﷺ سے رخصت ہو کر (اپنے وطن کی طرف) روانہ ہوئے تو راستے میں ہمارا گزر عرب کے ایک قبیلے پر ہوا جس (کے کچھ لوگوں) نے ہم سے کہا کہ ہمیں معلوم ہوا ہے تم اس شخص (یعنی رسول اللہ ﷺ) کے پاس سے بھلائی (یعنی قرآن کریم اور ذکر اللہ) لے کر آئے ہو تو کیا تمہارے پاس کوئی دوا یا جھاڑ پھونک بھی ہے؟ کیونکہ ہمارے ہاں ایک شخص پاگل دیوانہ ہو گیا ہے جو (رسیوں میں) جکڑا پڑا ہے۔ ہم نے کہا کہ ہاں (ہمارے پاس ایسا عمل ہے جس سے ہم اس کا علاج کر سکتے ہیں) چنانچہ وہ اس پاگل کو (رسیوں میں) جکڑے ہوئے ہمارے پاس لائے اور میں نے اس پر تین دن تک صبح و شام سورۂ فاتحہ اس طرح پڑھی کہ (پڑھتے وقت) اپنا لعاب جمع کرتا رہتا اور پھر (پڑھنے کے بعد) اس پر تھوک دیتا۔ راوی کہتے ہیں کہ (میرے چچا نے فرمایا کہ) اس کے بعد (وہ اتنی جلدی اچھا ہو گیا) گویا اسے بندھی ہوئی رسی سے کھول دیا گیا ہو پھر انہوں نے مجھے اس کی اجرت (کے طور پر کوئی چیز) دی تو میں نے کہا کہ یہ چیز اس وقت تک نہیں کھاؤں گا جب تک کہ میں اس کے بارے میں آنحضرت ﷺ سے نہ پوچھ لوں' چنانچہ (میں نے آپ ﷺ سے دریافت کیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "جو کچھ تمہیں ملا ہے اسے کھا لو کیونکہ میری عمر کی قسم! کوئی شخص باطل منتر کی اجرت کھاتا ہے (وہ برا کرتا ہے) تم نے تو حق اور سچے منتر کی اجرت کھائی ہے"۔ (احمد' ابو داؤد)

تشریح: **دواء او رقية** :"او" تنویع کیلئے ہے یا شک کیلئے ہے۔

معتوه :یعنی پاگل۔ مغرب میں ہے "ناقص العقل" کو کہتے ہیں اور بعض کہتے ہیں اس مدہوش کو کہتے ہیں جو جنون کے علاوہ کسی اور سب سے مدہوش ہو۔

فقلنا :نعم فجاء وا :اور ایک نسخہ میں ہے "قال" (یعنی اس کے چچا نے)

اجمع :استیناف ہے بیان کیلئے' صیغہ متکلم کے ساتھ ہے۔ **بزاق** :باء کے ضمہ کے ساتھ۔ "تھوک" کو کہتے ہیں۔

اتفل :فاء کے ضمہ کے ساتھ۔ اس کو کسرہ بھی دیا جاتا ہے، تھوکنا۔ جیسا کہ قاموس میں ہے۔ اور اقتطاف میں ہے کہ "تفل" بزاق کے مشابہ ہے، کہا جاتا ہے: **بزق ثم تفل ثم نفث ثم نفخ**، اور نہایہ میں ہے کہ "تفل" اس پھونکنے کو کہتے ہیں جس کے ساتھ تھوک ہو، یہ نفث سے زیادہ ہوتا ہے۔

أنشط :صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ **عقال** :عین کے کسرہ کے ساتھ

مراد یہ ہے کہ اس کا وہ جنون اور پاگل پن فوراً ختم ہو گیا۔ تورپشتی فرماتے ہیں کہ کہا جاتا ہے: **نشطت الحبل انشطه نشطا وأنشطته**، یعنی میں نے اس کو باندھا اور کھولا۔ اور یہ قول یعنی "**انشط من عقال**"، اس کو عرب اس وقت بولتے ہیں جب بندھے ہوئے شخص کو خلاصی اور ناپسندیدہ چیز تھوڑے سے وقت میں زائل ہو جائے۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ اس کلام میں تشبیہ ہے' جنون سے بواسطہ قراءت فاتحہ اور پھونکنے بہت جلد اچھا ہونے کو۔ باندھے ہوئے اونٹ کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو رسی سے نکل جائے تو آپ اس کو دیکھیں گے اپنی جگہ سے تیزی کے ساتھ اٹھتا ہے۔

جعلا :جیم کے ضمہ کے ساتھ۔ یہ "**فقال :كل**" کا عطف کلام محذوف پر ہے ای ذهبت الی رسول اللہ ﷺ فاخبرته اخبر وسالته فقال یعنی میں آپ علیہ السلام کے پاس گیا اور آپ کو اس معاملہ کی خبر دی، تو آپ نے فرمایا: کھا لو۔ **لعمری** :عین کے فتحہ کے ساتھ ہے، لام' لام ابتداء ہے۔

"**لمن اكل برقية باطل**" جواب قسم ہے۔ یعنی بعض لوگ باطل منتر کی اجرت کھاتے ہیں، جس میں ستاروں اور جنات وغیرہ کا ذکر ہوتا ہے اور ان سے مدد مانگی جاتی ہے۔

آپ ﷺ نے اپنی زندگی کی قسم کھائی اس لئے کہ اللہ نے بھی اس کی قسم کھائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿**لعمرك انهم لفی**

سکرتھم یعمھون﴾[الحجر۔۷۲] (آپ کی جان کی قسم! وہ اپنی مستی میں مدہوش تھے)۔
شیخ مظہر فرماتے ہیں کہ ''لعمری ''، عین کے فتحہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ ہے۔یعنی میری زندگی، اور قسم میں صرف عین کے فتحہ کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔اور''لمن اکل''میں لام جواب قسم ہے:ای من الناس من یرقی باطل ویاخذ علیها عوضا'أما أنت فقد رقیت برقیة حق ۔اھ یعنی لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو باطل طریقے پر جھاڑ پھونک کرتے ہیں اور اس پر اجرت لیتے ہیں' البتہ آپ نے تو حق طریقہ سے جھاڑ پھونک کی ہے۔(انتہیٰ)۔یہ حاصل معنی ہے، پس یہ گمان نہ کیا جائے کہ حدیث میں تو صرف فاء ہے، بلکہ لام بھی ہے جیسا کہ عنقریب آنے والا ہے۔اگر یہ اشکال کیا جائے کہ اللہ کے نام اور صفات کے علاوہ غیر اللہ کی قسم آپ ﷺ نے کیسے کھائی؟ اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں ''لعمری'' سے مراد قسم نہیں ہے بلکہ عرب کی رسم اور عادت کے مطابق آپ ﷺ کے کلام میں یہ لفظ استعمال ہوا۔

امام طیبی یہ کہتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ کو اس قسم کی اجازت ہو اور آپؐ کی خصوصیات میں سے ہو۔قولہ:لقد اکلت برقیة حق: یعنی جس میں اللہ کا ذکر اور اس کا کلام تھا۔اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی وجہ سے:[لعمرك انهم لفی سکرتهم یعمهون] [الحجر۔۷۲] بعض حضرات کہتے ہیں کہ اللہ پاک نے صرف آپ کی زندگی کی قسم کھائی ہے آپ کے علاوہ کسی کی زندگی کی قسم نہیں کھائی ہے یہ آپ ﷺ کی کرامت ہے۔

لمن اکل میں''من'' شرطیہ ہے لام قسم کیلئے تمہید ہے اور لام ثانی جواب قسم ہے جو قائم مقام ہے جزاء کا۔ای لعمری لئن کان ناس یاکلون برقیة باطل لأنت أكلت برقیة حق۔یعنی''اپنی زندگی کی قسم کہ اگر لوگ باطل منتر کی اجرت کھاتے ہیں تو تو نے حق منتر کی اجرت کھائی ہے''۔

اس کو صیغہ ماضی کے ساتھ لایا ہے تا کہ یہ دلالت کرے ان کے استحقاق پر اور اس پر کہ یہ حق ثابت ہے، اور اس کی اجرت صحیح ہے۔

مزدور کو اس کی مزدوری دینے میں تاخیر نہ کرو

۲۹۸۷: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَعْطُوا الْاَ جِيْرَ اَجْرَهٗ قَبْلَ اَنْ يَّجِفَّ عَرَقُهٗ

(رواه ابن ماجة)

اخرجه ابن ماجه فی فی السنن ۲/۸۱۷ الحدیث رقم ۲۴۴۳ (۳) لم احده عند ولاغیره واللّٰه تعالیٰ اعلم۔

ترجمہ: ''اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مزدور کو اس کی اجرت اس کا پسینہ خشک ہونے سے قبل ادا کردو (یعنی جب مزدور اپنا کام پورا کر چکے تو اس کی مزدوری فوراً ادا کردو،اس میں تاخیر نہ کرو)''۔(ابن ماجہ)

تشریح: ان یجف : یاء کے فتحہ' جیم کے کسرہ اور فاء کی تشدید کے ساتھ۔کہا جاتا ہے: جف الثوب ضرب، کے وزن پر، بمعنی یبس خشک ہونا، مراد جلدی دینے میں مبالغہ ہے اور پورا دینے میں ٹال مٹول کو ترک کرنا ہے۔عرقہ: کے ساتھ

اسنادی حیثیت: اس کی سند حسن ہے۔

اس حدیث کو ابو یعلی نے حضرت ابو ہریرہ سے، طبرانی نے اوسط میں حضرت جابر سے اور حکیم ترمذی نے حضرت انس سے روایت کیا ہے۔عرض مرتب: صاحب تخریج کا کہنا ہے کہ ان کو یہ روایت نہ ترمذی شریف میں ملی اور نہ کسی دوسری کتاب میں۔اھ واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۹۸۸: وَعَنِ الْحُسَيْنِ بْنِ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِلسَّائِلِ حَقٌّ وَاِنْ جَاءَ عَلٰی فَرَسٍ

اخرجه ابوداوٗد فی السنن ۲/۳۰۶ الحدیث رقم ۱۶۶۵ ومالك فی الموطأ ۲/۹۹۶ الحدیث رقم ۳ من کتاب الصدقة واحمد فی المسند ۱/۲۰۱۔

ترجمہ: ''اور حضرت حسن بن علیؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سائل کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ ''وہ (بہر صورت دیئے جانے کا) مستحق ہے اگر چہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے''۔ (احمد، ابوداؤد) اور مصابیح میں کہا گیا ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے''۔

تشریح: **قوله :وعن الحسين** :اور ایک نسخہ میں ''**الحسن**'' دو فتحوں کے ساتھ ہے۔

قوله :قال رسول الله ﷺ :للسائل حق وان جاء علی فرس :

یعنی آپ اس کو واپس نہ کریں اگر چہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے اور آپ سے اپنے لئے کھانا اور سواری کیلئے چارہ مانگ رہا ہو۔ ابن اثیر نہایہ میں فرماتے ہیں کہ سائل سے مراد ''طالب'' ہے اور معنی یہ ہے کہ سائل پر حسن ظن کا حکم ہے کہ آپ اس کو ناکام واپس نہ کریں، کہ آپ اس کی تکذیب کریں، اور واپس لوٹا دیں، حالانکہ ممکن ہے کہ وہ سچا ہو ا (اور واقعی ضرورت مند ہو)۔ یعنی سائل کو خالی ہاتھ واپس نہ کریں اگر چہ اس کی ظاہری حالت تجھے دھوکہ میں ڈال رہی ہو اور وہ گھوڑے پر سوا ہو کر تیرے پاس آئے، اس لئے کہ کبھی اس کے پاس گھوڑا بھی ہوتا ہے اور اس کے پیچھے اس کے اہل وعیال ہوتے ہیں یا قرض ہوتا ہے جس کے ہوتے ہوئے اس کو صدقہ وغیرہ لینا جائز ہوتا ہے، یا وہ مجاہدین میں سے ہوتا ہے، یا قرض داروں میں سے ہوتا ہے اور اس کا صدقہ اور زکوٰۃ میں حصہ ہوتا ہے۔

اسی طرح ضیاء نے بھی، اور ابوداؤد نے حضرت علی سے، طبرانی نے کبیر میں ہرماس بن زیاد سے ہے اور ابن عدی نے کامل میں حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے اور الفاظ یہ ہیں: ''**اعطوا السائل وان جاء علی فرس**''۔

اور سیوطی نے ابوداؤد پر اپنی تعلیقات میں ذکر کیا ہے: منقول ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ''سائل کا حق ہے، اگر چہ وہ ایسے گھوڑے پر سوار ہو کر آئے جس کی گردن میں چاندی کا طوق ہو۔ (انتہیٰ)۔

قاضی نے کہا ہے کہ سائل کو خالی ہاتھ نہ پھیرو، اگر چہ ایسی حالت میں تمہارے پاس مانگنے آئے جو اس کے مستغنی ہونے ہونے پر دلالت کرے، کیونکہ تمہیں یہ سوچنا چاہئے کہ اگر اسے سوال کرنے کی حاجت نہ ہوتی تو وہ تمہارے سامنے اپنے آپ کو ذلیل کیوں کرتا۔

قوله :وفي المصابيح مرسل : تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں مصابیح میں اس حدیث کو ارسال کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اب مجھے معلوم نہیں کہ ارسال اصل میں ہے، یا ملحق ہے۔ میں نے اس کو ابن عمر سے مسند پایا ہے۔ اور باقی حدیث کو ابوداؤد نے اپنی کتاب میں اس کی سند کے ساتھ نقل کیا ہے: ''**عن الحسين بن علیؓ قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم للسائل حق**''۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ اس میں لازمی طور پر خبط ہے اس لے کہ دونوں حدیثیں متصل اور مستقل ہیں، اور مصابیح ان دونوں کو ایک مستقل مرسل حدیث قرار دیا ہے اور مستقل ہونے کی صورت میں دوسری حدیث اس باب کے تحت داخل نہیں ہوسکتی۔ اور ممکن ہے کہ بطور تنزل اور بطور ثبوت ارسال کے صاحب مصابیح کی طرف سے یہ کہا جائے کہ انہوں نے دوسرے طریق سے یہ حدیث مرسلاً روایت کی ہے اور اس طریق میں یہ دونوں حدیثیں ایک ہی حدیث کے طور پر ہوں۔

الفصل الثالث:

مزدوری کے سلسلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر

۲۹۸۹: عَنْ عُتْبَةَ بْنِ الْمُنْذِرِ قَالَ كُنَّا عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَرَأَ طٰسٓمّٓ حَتّٰى بَلَغَ قِصَّةَ مُوْسٰى قَالَ اِنَّ مُوْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ اٰجَرَ نَفْسَهٗ ثَمَانَ سِنِيْنَ اَوْ عَشْرًا عَلٰى عِفَّةِ فَرْجِهٖ وَطَعَامِ بَطْنِهٖ . (رواه احمد و ابن ماجة)

اخرجه ابن ماجه في السنن ۲/۸۱۷ الحديث رقم ۲۴۴۴۔

ترجمہ: ''حضرت عتبہ بن منذرؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے کہ آپ ﷺ نے طسم پڑھی یہاں تک کہ جب آپ ﷺ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ پر پہنچے تو فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی شرم گاہ کی حفاظت کے

لئے اور شکم سیری کے لئے اپنے آپ کو آٹھ سال یا دس سال کی اجرت پر دے رکھا تھا''۔(احمد،ابن ماجہ)

تشریح:عتبة : عین کے ضمہ اور تاء کے سکون کے ساتھ۔

المنذر :اسم فاعل کے صیغہ کے ساتھ ہے''انذار'' سے۔معجمہ کے ذال ساتھ،اور صحیح نسخہ میں نون کے ضمہ دال مہملہ کے فتحہ اور راء کی تشدید کے ساتھ ہے۔میرک شاہ نے کہا ہے کہ اسی طرح بعض نسخوں میں واقع ہے اور یہی صحیح ہے۔(انتہیٰ) مؤلف اور صاحب مغنی نے اس کو ذکر نہیں کیا ہے۔

قوله :ان موسیٰ آجر نفسه ثمان سنین او عشرا ...... : بخاری وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ حضرت موسیٰ نے دونوں مدتوں میں سے لمبی مدت پوری کی تھی اور اس کے بعد پھر دس سال مزید ان کے پاس رہے پھر اس کے بعد واپس لوٹنے کا عزم کیا۔

عفة : عین کے کسرہ اور فاء کی تشدید کے ساتھ۔امام طیبی فرماتے ہیں کہ یہ نکاح سے کنایہ ہے۔ادب کی وجہ سے ایسا کیا اور تنبیہ ہے اس بات پر کہ اپنے نفس کی عفت کیلئے مال کی تیاری کرنا مناسب ہے۔

اس میں علماء کا اختلاف ہے۔چنانچہ حنفی علماء فرماتے ہیں یہ جائز نہیں ہے کہ کسی عورت کا نکاح اس کے عوض کیا جائے کہ خاوند ایک سال تک اس کی خدمت کرے گا۔ہاں یہ جائز ہے کہ عورت کا نکاح اس کے عوض کیا جائے کہ شوہر کا غلام ایک سال تک اس کی خدمت کرے گا۔اور حضرت موسیٰ کے معاملہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ممکن ہے ان کی شریعت میں یہ جائز ہو۔اور یہ بھی احتمال ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی کا مہر تو کچھ اور مقرر کیا ہو اور اتنا عرصہ بکریاں چرانے کی خدمت بطور احسان قبول کی ہو۔امام شافعیؒ کے نزدیک بعض کاموں کی مزدوری وخدمت کے عوض نکاح کرنا درست ہے۔بشرطیکہ''مستاجر له''دے گا یا''مخدوم فیه''معلوم ومتعین ہو۔

دین کی تعلیم پر اجرت لینے کا مسئلہ

۲۹۹۰:وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ رَجُلٌ اَهْدٰى اِلَيَّ قَوْسًا مِّمَّنْ كُنْتُ اُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْقُرْآنَ وَلَيْسَتْ بِمَالٍ فَاَرْمِيْ عَلَيْهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَالَ اِنْ كُنْتَ تُحِبُّ اَنْ تُطَوَّقَ طَوْقًا مِنْ نَارٍ فَاقْبَلْهَا.

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۷۰۱/۳ الحدیث رقم ۳۴۱۶ وابن ماجه فی ۷۳۰/۲ الحدیث رقم ۲۱۵۷ واحمد فی المسند ۳۱۵/۵۔

ترجمہ:''اور حضرت عبادہ بن صامتؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ''یارسول اللہ!ایک شخص نے مجھے بطور تحفہ ایک کمان بھیجی ہے اور وہ شخص ان لوگوں میں سے ہے جنہیں میں کتاب وقران کی تعلیم دیا کرتا تھا اور(میں سمجھتا ہوں کہ اس کمان کو قبول کر لینے میں اس لئے کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ)کمان کوئی مال کی قبیل میں سے نہیں ہے۔اس کمان کے ذریعے میں راہ خدا(یعنی جہاد)میں تیر اندازی کروں گا''۔آپ ﷺ نے فرمایا''اگر تمہیں یہ پسند ہو کہ(قیامت کے دن)تمہارے گلے میں آگ کا طوق پہنایا جائے تو اسے قبول کرلو''۔(ابوداؤد،ابن ماجہ)

تشریح:ابن حاجب نے اپنے قصیدہ میں''قوس''کو ان اسماء میں شمار کیا ہے جو واجب التانیث ہیں۔

كنت اعلمه الكتاب :یعنی قرآن لکھاتا تھا اور کتابت کا بھی احتمال ہے کہ میں اسے کتابت سکھاتا تھا۔اور اس کا''قوس''سے حال بننا درست نہیں ہے اس لئے کہ وہ نکرہ ہے،پس یہ حال ہوگا''اهدی''کے فاعل سے یا ضمیر متکلم سے۔

حضرت عبادہ کی مراد یہ تھی کہ کمان عرف میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے اجرت شمار کیا جائے،یا مراد یہ ہے کہ وہ کوئی ایسا مال نہیں ہے جو میں بیچنے کے لئے لے رہا ہوں بلکہ لڑائی کا ایک سامان ہے۔

ان تطوق :واؤ مشددہ کے فتحہ کے ساتھ۔''طوق پہنانا''۔

یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی واضح دلیل ہے۔ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کے سوال کرنے کی) وجہ یہ تھی کہ حضرت عبادہؓ تعلیم قرآن پر اجرت لینے کو درست نہیں سمجھتے تھے اس لئے آپ ﷺ سے پوچھا کہ یہ جو اس نے کیا ہے یہ تعلیم قرآن پر اجرت ہے یا نہیں ہے؟ تا کہ وہ اس سے بچیں اور اگر اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے تو میں اسے لے لوں۔ تو آپ ﷺ نے جواب دیا کہ یہ اگر چہ تمہیں کلام اللہ کی تعلیم کی اجرت کے طور پر نہیں ملی ہے اور نہ ہی یہ کوئی ایسی چیز ہے جسے اجرت شمار کیا جائے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ تمہارے اس اخلاص کو ختم کر دے گی جس کی نیت تم نے تعلیم دینے میں کی تھی، پس تم اسے قبول نہ کرو۔ (انتہیٰ کلامہ)۔ یہ کلام ظاہر حدیث اور اس کے مقصد سے مناسب نہیں رکھتا۔

ابونعیم نے حلیہ میں اور بیہقی نے شعب الایمان میں یوں روایت کیا ہے:

"من أخذ على تعليم القرآن قوسا قلده الله مكانها قوسا من نار جهنم يوم القيامة"

بَابُ اِحْيَاءِ الْمَوَاتِ وَالشِّرْبِ

غیر آباد زمین کو آباد کرنے اور پانی پلانے کے حق کا بیان

''موات'' میم کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ ''شرب'' حرف اول کے کسرہ کے ساتھ۔ مغرب میں ہے ''موات'' خراب اور بنجر زمین کو کہتے ہیں اور اس کے برعکس (زمین کے خطہ) کو 'عامر' کہتے ہیں۔ طحاوی سے منقول ہے کہ 'موات' اس زمین کو کہتے ہیں جو نہ کسی کی ملکیت میں ہو اور نہ اس کے ساتھ شہر کے منافع متعلق ہوں اور شہر سے باہر ہو چاہے شہر قریب ہو یا دور ہو۔ اور ''شرب'' کسرہ کے ساتھ اس کا معنی ہے پانی کا حصہ، اور اصطلاح شریعت میں 'شرب' پانی سے فائدہ اٹھانے کے اس حق کو کہتے ہیں جو اپنے کھیتی کو سیراب کرنے اور جانوروں کو پلانے کیلئے حاصل ہو۔

الفصل الاول :

افتادہ و بنجر زمین کو آباد کرنے والا اس زمین کا مالک ہوتا ہے

۲۹۹۱: عَنْ عَائِشَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ مَنْ عَمَرَ اَرْضًا لَيْسَتْ لِاَحَدٍ فَهُوَ اَحَقُّ قَالَ عُرْوَةُ قَضٰى بِهٖ عُمَرُ فِيْ خِلَافَتِهٖ. (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۵/۱۸ الحدیث رقم ۲۳۳۵ واحمد فی المسند ۶/۱۲۰

ترجمہ: ''حضرت عائشہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص کسی ایسی (افتادہ و بنجر) زمین کو آباد کرے جس کا کوئی مالک نہ ہو تو وہ (آباد کرنے والا شخص) ہی اس زمین کا سب سے زیادہ حق دار ہے؟'' حضرت عروہؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنی خلافت کے دور میں اسی کے مطابق فیصلہ صادر فرمایا تھا''۔ (بخاری)

تشریح: قوله: **مَنْ عَمَرَ اَرْضًا لَيْسَتْ لِاَحَدٍ فَهُوَ اَحَقُّ قَالَ عُرْوَةُ قَضٰى بِهٖ عُمَرُ فِيْ خِلَافَتِهٖ :**

عمر ارضا : میم کی تخفیف کے ساتھ اور ایک نسخہ میں تشدید کے ساتھ ہے۔ اور مصابیح کے بعض نسخوں میں الف کی زیادت کے ساتھ ہے، لیکن وہ درست نہیں ہے اس لئے کہ 'اعمرت الارض'' کا معنی ہے ''وجدتها عامرة'' میں نے اس کو آباد پایا۔ او یہ ''عمر'' کے معنی میں نہیں ہے۔ اور بخاری کی کتاب میں 'عمر'' سے ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس کا جواب یہ ہے کہ عرب اعمد

بلك منزلك بمعنیٰ ''**عمر**'' استعمال کرتے ہیں۔تو اس لئے جواز ہے ''**اعمرت الارض**'' کو ''**عمرتها**'' کے معنی میں استعمال کرنے کا۔اس لیے کہ استعمال میں اصل حقیقت ہے اور حقائق میں اصل ان کا چھوڑنا ہے۔اشرف کہتے ہیں کہ بات ایسی نہیں ہے اس لئے کہ جوہری نے ''**اعمر الله منزلك**'' اور ''**عمر الله بك**'' کو ذکر کرنے کے بعد ابوزید سے یہ ذکر کیا ہے کہ نہیں کہا جاتا: ''**اعمر الرجل منزله**'' الف کے ساتھ،اور عسقلانی کی شرح بخاری میں ہے کہ قاضی عیاض نے کہا ہے ''**من اعمر**'' ہمزہ اور میم دونوں کے فتحہ کے ساتھ ہے' رباعی سے ہے جیسا کہ واقع ہے لیکن صحیح **عمر** ثلاثی ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿**وعمروها اكثر مما عمروها**﴾

ہاں اگر مراد یہ ہو کہ انہوں نے اپنے آپ کو اس میں ''**عمار**'' بنایا ہو۔ابن بطال کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ اس کی اصل **اعتمر ارضا** ہو،ای ''**اتخذها**''۔اصل سے تاء ساقط ہوئی ہو،دوسرے حضرات کہتے ہیں کہ اس میں رباعی بھی سنا گیا ہے۔کہا جاتا ہے: **اعمر الله بك منزلك**،پس ''**اعمر ارضا**'' سے مراد اس کو آباد کرنا ہے۔

احق : ای بها،جیسا کہ ایک نسخہ میں ہے یعنی اس زمین کا حاکم وقت کی اجازت کی شرط کے ساتھ۔امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس حدیث کی بناء پر جس میں منقول ہے: ''**ليس للمرء الا ما طابت به نفس امامه**''۔پس مطلق کو اس پر محمول کیا جائے گا۔ اس لئے کہ قاعدہ ہے کہ ساکت کو ناطق پر حمل کیا جائے،جب وہ ایک ہی حادثہ میں ہوں۔(ذکرہ ابن الملک)

عسقلانی فرماتے ہیں کہ ''**احق**'' کے متعلق کو اس کے معلوم ہونے کی وجہ سے حذف کیا ہے،اور اسماعیلی نے اضافہ نقل کیا ہے: **فهو احق بها**،ابوذر کی روایت میں ''**من اعمر**'' ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ واقع ہے،یعنی اس کا غیر اس کو آباد کرے اور غیر سے مراد حاکم اور امام ہے۔اور حمیدی نے اپنی جامع میں لفظ ''**عمر**'' ثلاثی کے ساتھ ذکر کیا ہے۔اور اسی طرح اسماعیلی کے نزدیک ہے دوسرے طریق سے جس میں امام بخاری کے شیخ یحییٰ بن بکیر ہیں۔

قاضی کہتے ہیں کہ منطوق حدیث دلالت کرتا ہے کہ تملک کے لئے آبادکاری کافی ہے' اذن امام کا محتاج نہیں ہے اور مفہوم حدیث دلالت کرتا ہے کہ صرف تحجیر اور نشانی سے مالک نہیں بنتا بلکہ اس کا آباد کرنا ضروری ہے' اور آباد کرنا مقاصد کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف ہے۔

قوله :قال عروة قضى به عمر فى خلافته : یعنی اس کے مطابق فیصلہ کیا تھا،اس پر کسی نے نکیر نہیں کی تھی،یہ دلیل ہے اس بات کی کہ یہ حدیث منسوخ نہیں ہے۔

چراگاہ کو اپنے لئے مخصوص کرنے کی ممانعت

۲۹۹۴: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ الصَّعْبَ بْنَ جَثَّامَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ لَا حِمٰى اِلَّا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهِ. (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحيحه ٥/٤٤ الحديث رقم ٢٣٧٠ واحمد فی المسند ٤/٣٨۔

ترجمہ:''اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضرت صعب بن جثامہؓ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ چراگاہ تو صرف اللہ اور اس کے لئے ہے''۔(بخاری)

تشریح:**قوله : لَا حِمٰى اِلَّا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهِ :حمٰى** : حاء کے کسرہ اور میم مفتوحہ کی تخفیف کے ساتھ، بمعنی **محمٰى**۔اس جگہ کو کہتے ہیں جس کی حفاظت کی جاتی ہو لوگوں اور جانوروں سے،تاکہ اس کا گھاس زیادہ ہو۔

یعنی کسی کیلئے ایسا کرنا مناسب نہیں ہے اللہ اور رسول کی اجازت کے بغیر۔نبی ﷺ جہادی گھوڑوں اور زکوٰۃ کے اونٹوں کیلئے چراگاہ مخصوص کرتے تھے۔

قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں عرب کے سرداریوں کرتے تھے کہ جس زمین میں گھاس اور پانی ہوتا اسے اپنے گھوڑوں، اونٹوں اور تمام جانوروں کیلئے مخصوص چراگاہ بنا لیتے تھے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو باطل کردیا اور اس سے منع کیا کہ اللہ اور رسول کی اجازت کے بغیر چراگاہ مخصوص نہ کی جائے۔

شرح السنہ میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جائز تھا کہ وہ اپنے لئے چراگاہ مخصوص کرتے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا۔ اور نقیع کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مخصوص چراگاہ بنایا تھا، مسلمانوں کے مصالح اور ان گھوڑوں کیلئے جو اللہ کے راستے میں جہاد کیلئے تیار کیے جاتے تھے۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس شہر میں جائز نہیں ہے جو کشادہ نہ ہو اور اس کی وجہ سے اہل مویشی کو تکلیف اور تنگی ہو۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی حاکم کیلئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی چراگاہ کو اپنے لیے مخصوص کرے۔ اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے، کہ مسلمانوں کے مصالح کیلئے چراگاہ مخصوص کرنا جائز ہے یا ناجائز ہے۔ بعض تو اس حدیث کی وجہ سے اسے ناجائز کہتے ہیں اور بعض اس کو جائز قرار دیتے ہیں، جیسی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے مصالح کیلئے مخصوص کی تھی۔ بشرطیکہ اس کا ضرر واضح نہ ہو۔

ابن الملک فرماتے ہیں کہ اپنے لئے چراگاہ مخصوص کرنا تو جائز نہیں ہے لیکن مصالح مسلمین کیلئے جائز ہے۔ اور نہایہ میں ہے کہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں جب کوئی سردار اپنے قبیلہ کی کسی زمین میں اترتا تو کتے کو بھونکواتا۔ جہاں تک کتے کے بھونکنے کی آواز پہنچتی وہاں تک اس زمین کو مخصوص چراگاہ بنالیتا، اس میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہ ہوتا اور وہ قوم کے ساتھ تمام چراگاہوں میں شریک ہوتا۔ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا۔

چراگاہ کی اضافت ''اللہ'' اور ''رسول'' کی طرف کی یعنی سوائے اس کے کہ چراگاہ مخصوص کی جائے ان گھوڑوں کیلئے جو جہاد کیلئے تیار کیے جاتے ہوں اور ان اونٹوں کیلئے جن پر اللہ کے راستے میں بوجھ لادا جائے اور زکوۃ کے اونٹوں وغیرہ کیلئے جیسے عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے نقیع کو زکوۃ کے اونٹوں کیلئے اور جہاد کیلئے تیار کیے جانے والے گھوڑوں کیلئے مخصوص چراگاہ بنایا تھا۔ اسی طرح احمد اور ابوداؤد نے بھی۔

کھیتوں میں پانی لے جانے کا ایک تنازعہ

۲۹۹۳: وَعَنْ عُرْوَةَ قَالَ خَاصَمَ الزُّبَيْرُ رَجُلاً مِنَ الْاَنْصَارِ فِيْ شِرَاجٍ مِنَ الْحَرَّةِ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ اِسْقِ يَا زُبَيْرُ ثُمَّ اَرْسِلِ الْمَاءَ اِلٰى جَارِكَ فَقَالَ الْاَنْصَارِيُّ اَنْ كَانَ ابْنَ عَمَّتِكَ فَتَلَوَّنَ وَجْهُهٗ ثُمَّ قَالَ اِسْقِ يَا زُبَيْرُ ثُمَّ احْبِسِ الْمَاءَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَى الْجِدَارِ ثُمَّ اَرْسِلِ الْمَاءَ اِلٰى جَارِكَ فَاسْتَوْعَى النَّبِيُّ ﷺ لِلزُّبَيْرِ حَقَّهٗ فِيْ صَرِيْحِ الْحُكْمِ حِيْنَ اَحْفَظَهُ الْاَنْصَارِيُّ وَكَانَ اَشَارَ عَلَيْهِمَا بِاَمْرٍ لَهُمَا فِيْهِ سَعَةٌ. (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٣٤/٥ الحدیث رقم ٢٣٥٩ ومسلم فی ١٨٢٩/٤ الحدیث رقم (١٢٩۔٢٣٥٧) وابو داؤد فی السنن ٥١/٤ الحدیث رقم ٣٦٣٧ والترمذی فی ٦٤٤/٣ الحدیث رقم ١٣٦٣ والنسائی فی ٢٣٨/٨ الحدیث رقم ٥٤٠٧ وابن ماجه فی ٨٢٩/٢ الحدیث رقم ٢٤٨٠ واحمد فی المسند ٥/٤

ترجمہ: ''اور حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) حضرت زبیر کا ایک انصاری شخص سے حرہ کے برساتی نالوں کے بارے میں تنازعہ ہوگیا (جب وہ معاملہ بارگاہ رسالت میں پہنچا تو) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''زبیر! پہلے تم اپنے کھیتوں کو سیراب کرو پھر اپنے ہمسایہ (یعنی اس انصاری) کے کھیتوں میں پانی چھوڑ دو''۔ (یہ فیصلہ سن کر) اس انصاری نے کہا کہ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ اس لئے کیا ہے) کیونکہ زبیر رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی کے بیٹے ہیں (یہ سنتے ہی) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک کا رنگ (غصہ کی وجہ سے) متغیر ہوگیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے زبیر! (اپنے کھیت کو) پانی سے سیراب کرو اور پھر پانی کو روک کے رکھو (یعنی پانی کو اس انصاری کے کھیت میں نہ جانے دو) یہاں تک کہ (تمہارا پورا کھیت اچھی طرح سیراب ہو جائے) اور پانی کھیت کی منڈیر تک پہنچ

جائے اس کے بعد اس نالی کا رخ اپنے ہمسایہ (یعنی اس انصاری) کے کھیت کی طرف کر دو۔ گویا آپ ﷺ نے اس صریح حکم کے ذریعے حضرت زبیرؓ کو ان کا پورا حق دے دیا۔ جبکہ اس انصاری نے آپ ﷺ کو (آپ کے فیصلہ پر اعتراض کر کے) غضب آمیز کر دیا تھا حالانکہ آپ ﷺ نے ابتداء میں ان دونوں کے بارے میں جو فیصلہ صادر فرمایا تھا اس میں دونوں ہی کے لئے آسانی و وسعت تھی"۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: شراج: امام نووی فرماتے ہیں کہ یہ شین کے کسرہ اور آخر میں جیم کے ساتھ ہے، پانی کی نالیوں کو کہتے ہیں اور اس کا واحد شرجة ہے۔

الحرة: یعنی کالی کنکریوں والی زمین۔ جب یہ دونوں ایک بہنے والے پانی سے اپنی کھیتوں کو سیراب کرتے تھے، پس ان کا تنازعہ ہوا پہلے پانی لے جانے کے بارے میں تو فیصلہ آپ ﷺ کے پاس لے کر آئے۔

اسق یا زبیر: ہمزہ قطعی کے فتحہ کے ساتھ اور ہمزہ وصلی کے کسرہ کے ساتھ' دونوں طرح درست ہے۔

ثم ارسل الماء الی جارك: اس لئے کہ حضرت زبیر کی زمین بلندی پر تھی انصاری کی زمین سے۔

فقال الانصاری ان: ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

قاضی نے کہا ہے کہ "هو" ضمیر مقدر ہے "بان" کے ساتھ یا "لان" کے ساتھ۔ اور حرف جر کو اس کے ساتھ حذف کیا جاتا ہے تخفیف کے ساتھ اکثر۔ اس لئے کہ اس میں اس کے صلہ کے ساتھ طوالت پائی جاتی ہے،

یعنی یہ تقدیم اور ترجیح اس وجہ سے اور سبب سے ہے کہ وہ آپ کی پھوپھی کے بیٹے ہیں۔ اور اسی طرح یہ آیت ہے: ﴿ان کان ذا مال وبنین﴾ [القلم۔١٤] یعنی آپ ﷺ ان کی اطاعت و فرمانبرداری نہ کریں ان عیوب کے ساتھ' اس وجہ سے کہ وہ مالدار اور بیٹوں والا ہے۔ اور یہ بات (کہنے) کی وجہ سے اس آدمی کو نفاق کی طرف منسوب کیا گیا۔

تورپشتی فرماتے ہیں کہ مفسرین کی بہت بڑی جماعت نے اس آدمی کو کبھی نفاق اور کبھی یہودیت کی طرف منسوب کرنے کی جرأت کی ہے اور دونوں قول حق سے پھرے ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ یہ صحیح طور پر ثابت ہے کہ یہ انصاری تھے اور انصار من جملہ یہود میں سے نہیں تھے' اور اگر اس آدمی کے دین میں عیب تھا تو اس کو انصاری کے وصف کے ساتھ متصف نہ کرتے اس لئے کہ یہ مدح کا وصف ہے۔ اور انصار میں سے اگرچہ کچھ لوگ ایسے تھے جن پر نفاق کا الزام تھا، لیکن قرن اول کے لوگوں اور ان کے بعد سلف نے احتراز کیا ہے کہ جس شخص کا ذکر نفاق کے ساتھ کیا گیا ہو اس کو انصاری کے ساتھ مشہور کرے اور اس پر انصاری کا اطلاق کریں۔

اور اپنے دین پر حریص کیلئے لائق یہ ہے کہ وہ کہے کہ یہ بات شیطان کے پھسلانے کی وجہ سے صادر ہوئی کہ غصہ کے وقت شیطان نے اس پر قابو پایا۔ اور اس جیسی باتوں اور گستاخی میں مبتلا ہونا بشری صفات کی وجہ سے کوئی نئی بات نہیں ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ قاضی عیاض نے کہا ہے داودی نے نقل کیا ہے کہ یہ آدمی منافق تھا اور حدیث میں اس کو انصاری کہنا یہ اس کا منافی نہیں ہے اس لئے کہ وہ انصار کے قبیلے سے تعلق رکھتا تھا نہ کہ انصار مسلمین میں سے تھا۔ اور حدیث کے آخر میں جو ہے کہ زبیر نے فرمایا کہ میرا گمان ہے کہ یہ آیت ﴿فلا وربك لا یؤمنون﴾ [النساء۔٦٥] اس کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اسی وجہ سے ایک جماعت علماء کی اس آیت کے سبب نزول کے بارے میں کہتی ہے کہ اگر یہ کلام کسی انسان سے صادر ہوا تو وہ کافر ہے اور اس کے کہنے والے پر مرتدوں کے احکام جاری ہوں گے یعنی قتل وغیرہ، تو پھر آپ ﷺ نے اس کو قتل کیوں نہیں کیا؟ اس کا جواب یہ دیا ہے کہ آپ ﷺ نے اس کو اس لئے چھوڑا کہ ابتداء اسلام میں آپ لوگوں کو اسلام کی طرف مائل کرتے تھے اور ان کو بدلہ احسان سے دیا کرتے تھے اور منافقین کی تکالیف پر صبر کرتے تھے، اور فرماتے تھے: لوگ یہ طعنہ نہ دیں کہ محمد تو اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔

فتلون وجهه: یعنی حرمت نبوت کی ہتک اور اس آدمی کے قبیح کلام کی وجہ سے آپ ﷺ کا چہرہ غصہ سے متغیر ہوگیا۔ اور فرمایا پانی

کورو کے رکھو اور جانے نہ دو۔

الجدر : جیم کے فتحہ اور دال مہملہ کے سکون کے ساتھ اور ایک نسخہ میں جیم کے کسرہ کے ساتھ ہے۔جیم اور دال کے ضمہ کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے کہ یہ جمع ہے "جدار" کی، اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد منڈیر ہے۔یہ زمین کیلئے ایسے ہیں جیسے گھر کیلئے دیوار یعنی زمین اور کھیت کے درمیان حائل۔اور بعض کہتے ہیں کہ مراد دیوار ہی ہے، اور بعض کہتے ہیں دیوار کی بنیاد مراد ہے۔اور علماء نے اس کی مقدار کی بابت یہ طے کیا ہے کہ پانی پوری زمین میں بلند ہو جائے یہاں تک کہ انسان کے پاؤں کے ٹخنے تک پہنچ جائے۔

ثم ارسل الماء الی جار۔فاستوعی "وعاء" سے ماخوذ ہے۔اس برتن کو کہتے ہیں جس میں بہت ساری اشیاء جمع ہوں، گویا کہ اس کے حق کو اس کے برتن میں جمع کیا

شرح السنۃ میں ہے کہ آپ ﷺ کا یہ فرمانا:" اسق یا زبیر ثم ارسل الی جارك" اس میں حضرت زبیر کو یہ حکم تھا بھلائی اور مسامحت کا، اور پڑوسی کے ساتھ اچھائی کا اپنے بعض حق کے چھوڑنے کے ساتھ نہ کہ یہ آپ ﷺ کی طرف سے فیصلہ تھا، پس جب انصاری کو دیکھا کہ اس نے یہ فیصلہ قبول نہیں کیا تو پھر آنحضرت ﷺ نے حضرت زبیرؓ کو اپنا پورا پورا حق حاصل کرنے کا حکم دیا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تعزیر کو معاف کرنا جائز ہے جیسا کہ آپ ﷺ نے انصاری پر تعزیر قائم نہیں کی جب اس نے ایسی بات کی جس نے آپ ﷺ کو غصہ آمیز کر دیا تھا۔اور بعض کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کی آخری بات یہ اس کیلئے عقوبت مالی تھی اور اس وقت بعض عقوبتیں مال میں بھی واقع ہوتی تھیں، قول اول زیادہ صحیح ہے۔مسئلہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے انصاری کے خلاف فیصلہ غصے کی حالت میں کیا حالانکہ حاکم اور قاضی کو غصہ کی حالت میں فیصلہ کرنے سے منع کیا گیا ہے۔چونکہ آپ ﷺ معصوم تھے۔سخط و رضا ہر دو حال میں صرف حق ہی کہا کرتے تھے۔اور حدیث میں ہے کہ ندیوں اور نالیوں کا پانی جس کے چشمے کا کوئی مالک نہ ہو یہ مباح ہیں اور لوگ سب اس میں برابر ہیں اور جو اس ماء مباح کی طرف سبقت کرے گا وہ دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ حقدار ہوگا۔اور بلندی پر واقع زمین والا پانی کے حق میں مقدم ہے نیچے والوں سے بوجہ ان سے پہلے ہونے کے اور اس کو نیچے والوں سے روکنے کا حق نہیں ہے اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے بعد۔

جو پانی تمہاری ضرورت سے زائد ہو اسے جانوروں کے پلانے سے نہ روکو

۲۹۹۴: وَعَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا تَمْنَعُوْا فَضْلَ الْمَاءِ لِتَمْنَعُوْا بِهٖ فَضْلَ الْکَلَاءِ. (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۳۱/۵ الحدیث رقم ۲۳۵۴ ومسلم فی ۱۱۹۸/۳ الحدیث رقم (۳۷۔۱۵۶۶) وابو داؤد فی السنن الحدیث رقم ۷۴۷/۳ الحدیث رقم ۳۴۷۳ فی والترمذی فی ۵۷۲/۳ الحدیث رقم ۱۲۷۲ وابن ماجه فی ۸۲۸/۲ الحدیث رقم ۲۴۷۸ واحمد فی المسند ۲۴۴/۲۔

ترجمه:" اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:" جو گھاس ضرورت سے زائد ہو اس کو روکنے کے لئے اس پانی کو مت روکو جو تمہاری ضرورت سے زائد ہو"۔(بخاری و مسلم)

تشریح: اس حدیث کی تشریح "باب النهی عنه من البیوع" کے فصل اول میں گزر چکی ہے۔

۲۹۹۵: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ثَلَاثَةٌ لَا یُکَلِّمُهُمُ اللّٰهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ رَجُلٌ حَلَفَ عَلٰی سِلْعَةٍ لَقَدْ اُعْطِیَ بِهَا اَکْثَرَ مِمَّا اُعْطِیَ وَهُوَ کَاذِبٌ وَرَجُلٌ حَلَفَ عَلٰی یَمِیْنٍ کَاذِبَةٍ بَعْدَ الْعَصْرِ لِیَقْتَطِعَ بِهَا مَالَ رَجُلٍ مُّسْلِمٍ وَرَجُلٌ مَنَعَ فَضْلَ مَاءٍ فَیَقُوْلُ اللّٰهُ اَلْیَوْمَ اَمْنَعُكَ فَضْلِیْ کَمَا مَنَعْتَ فَضْلَ مَاءٍ لَمْ تَعْمَلْ یَدَاكَ. (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۴۳/۵ الحدیث رقم ۲۳۶۹ ومسلم فی ۱۰۳/۱ الحدیث رقم (۱۷۳۔۱۰۳) وابو داؤد فی

السنن ۳/۷٤۹ الحدیث رقم ۳٤۷٤ والنسائی فی ۷/۲٤٦ الحدیث رقم ٤٤٦۲ وابن ماجه فی ۲/۷٤٤ الحدیث رقم ۲۲۰۷ واحمد فی المسند ۲/۲۵۳۔

ترجمه: ''اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تین شخص ایسے ہیں جن سے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ (رحم و کرم کی) کلام نہیں فرمائے گا اور نہ ہی ان کی طرف (بنظر عنایت) دیکھے گا' ایک تو وہ (تاجر) شخص ہے جو قسم کھا کر (خریدار سے) کہتا ہے کہ اس چیز کی جو قیمت تم نے مجھے دی ہے اس سے زائد قیمت اسے مل رہی تھی (یعنی جب وہ کسی کو اپنی کوئی چیز فروخت کرتا ہے اور خریدار اس کی قیمت دیتا ہے تو وہ قسم کھا کر کہتا ہے کہ مجھے اس چیز کی اس سے زیادہ قیمت مل رہی تھی) حالانکہ وہ شخص (اپنی قسم میں) جھوٹا ہوتا ہے (کیونکہ درحقیقت اس سے زیادہ قیمت انہیں مل رہی تھی) دوسرا شخص وہ ہے جو عصر کے بعد جھوٹی قسم کھائے تاکہ اس کے ذریعے وہ کسی مسلمان شخص کا مال کھا جائے اور تیسرا شخص وہ ہے جو زائد پانی (پینے پلانے) سے لوگوں کو روکتا ہو ایسے شخص سے (قیامت کے دن) اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ جس طرح تو نے (دنیا میں) اپنے زائد پانی سے لوگوں کو روکے رکھا تھا باوجود یکہ وہ پانی تو نے اپنے ہاتھ سے نہیں نکالا تھا اسی طرح میں بھی آج تجھے اپنے فضل سے روکے رکھوں گا''۔ (بخاری)

تشریح: لا یکلمهم الله یوم القیامة : یعنی رحم و کرم کی بات، نہ کہ ہمیشہ کا کلام مراد ہے۔

ولا ینظر الیهم : یعنی بنظر عنایت نہ، کہ بنظر قہمت اور غضب کے۔

سلعة : کسرہ کے ساتھ ہے۔ **لقد اعطی بها اکثر مما اعطی** : دونوں فعل صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔ اور یہ اس کا حلف کا مفہوم ہے۔ اور اگر اس کے قول کو نقل کرتے ، تو پھر اس طرح کہتے: **لقد اعطیت بها اکثر اعطینته**۔ پہلا فعل مجہول اور دوسرا معروف ہوتا۔ یعنی یہ سامان مجھ سے اس سے پہلے زیادہ دام کے ساتھ مانگا جارہا تھا جس دام سے آپ مانگ رہے ہیں۔

بعد العصر : عصر کے بعد کی تخصیص فرمائی، اس کی مندرجہ ذیل وجوہات بیان کی گئی ہیں:

(۱) اس وجہ سے ہے کہ مغلظ قسمیں اسی وقت کھائی جاتی ہیں۔

(۲) کہ چونکہ یہ وقت بغیر منافع کے گھر کی طرف لوٹنے کا تھا، پس اس نے منافع پر جھوٹی قسم کھائی۔

(۳) اس وجہ سے کہ عصر کے بعد کا وقت چونکہ زیادہ بافضیلت اور بابرکت ہے اس لئے اس وقت جھوٹی قسم کھانا زیادہ شنیع اور گناہ کی بات ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ فیصلہ کیلئے عصر کے بیٹھتے تھے۔

بها مال رجل مسلم : اور یہی حکم ذمی کے مال کا ہے۔

ورجل منع فضل ماء : اور ایک روایت میں ''**فضل مائه**'' ہے اور احمد، بخاری اور مسلم، اور کتب اربعہ کی روایت میں ہے ''**ورجل علی فضل ماء بافلاة یمنعه من ابن سبیل**''۔

ماء : ہمزہ کے ساتھ ہے۔

لم تعمل یداك : ''**ماء**'' کی صفت ہے اور راجع محذوف ہے ای فیه۔ مظہر فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ پانی میرے قدرت سے نکلا تھا نہ کہ تیری محنت سے۔

الفصل الثانی:

اُفتادہ زمین کی دیوار کے ذریعے حد بندی کردینے سے ملکیت ثابت ہوتی ہے یا نہیں؟

۲۹۹٦: عَنِ الْحَسَنِ عَنْ سَمُرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ مَنْ اَحَاطَ حَائِطًا عَلَی الْاَرْضِ فَهُوَ لَهٗ۔

(رواه ابوداود)

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ٣/٤٥٦ الحدیث رقم ٣٠٧٧ واحمد فی المسند ٥/٢١۔

ترجمہ: ''حضرت حسن بصریؒ حضرت سمرہؓ سے اور وہ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص (افتادہ وبنجر) زمین پر چار دیواری کردے تو وہ اسی کی ہوجاتی ہے''۔(ابوداوٗد)

تشریح: یعنی اسکی ملکیت ہوجاتی ہے جب تک یہ اس میں ہو، جیسے کوئی شخص مباح چیز کے لینے کیلئے سب سے پہلے چلا جائے۔ تورپشتی فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں وہ لوگ جو صرف تحجیر (حد بندی) کے ذریعے ملکیت کے ثبوت کے قائل ہیں اور اس حدیث سے ان کی حجت قائم نہیں ہوتی' اس لئے کہ ملکیت کے ثبوت کیلئے آباد کرنا شرط ہے اور زمین کی (حد بندی) اور دیوار کھینچنا آباد کرنے کے مفہوم میں داخل نہیں ہے۔ پھر یہ قول ''علی ارض' محتاج بیان ہے اس لئے کہ ہر زمین پر آباد کرنے سے ملکیت ثابت نہیں ہوتی۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ بیان کیلئے ''من احاط'' کافی ہے اس لئے کہ یہ دلالت کرتا ہے کہ اس نے جو دیوار بنائی ہے اس نے زمین کے اندر کی تمام اشیاء کا احاطہ کیا ہوا ہوگا۔ جیسے وہ بکریوں کے باڑہ یا مویشیوں کے باڑہ کیلئے دیوار بنائے۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر وہ جانوروں کیلئے باڑہ یا پھل سکھانے کیلئے یا لکڑی اور گھاس رکھنے کیلئے باڑہ بنانے کا ارادہ کرے تو اس کے گرد دیواروں کا کرنا ضروری ہے، صرف لکڑی کھڑی کرنا اور پتھر رکھنا بغیر تعمیر کے' یہ کافی نہیں ہے۔

آپ ﷺ کی طرف سے صحابہ کو افتادہ زمین کا جاگیری عطیہ

٢٩٩٧: وَعَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ اَبِیْ بَكْرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَقْطَعَ لِلزُّبَيْرِ نَخِيْلاً. (رواه ابو داود)

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ٣/٤٥١ الحدیث رقم ٣٠٦٩۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی صاحبزادی حضرت اسماءؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت زبیرؓ کے لئے جاگیر میں کھجوروں کے درخت عطا فرمائے''۔(ابوداوٗد)

تشریح: قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اقطاع، کہتے ہیں قطعہ زمین کو کسی غیر کیلئے متعین کرنا۔

شرح السنہ میں ہے کہ محل کے اعتبار سے جاگیر' دو قسم کی ہے: (١) جاگیر تملک۔ جس کا آدمی آباد کرنے کی وجہ سے مالک بن جاتا ہے۔(٢) جاگیر ارفاق' جس کا آدمی کسی بھی حالت میں مالک نہیں بن سکتا۔ جیسے کہ حاکم بازار میں بیٹھنے کی جگہ کسی کو جاگیر میں دے تاکہ وہ وہاں بیٹھ کر معاملات وغیرہ کرے۔ حضرت زبیرؓ کی جاگیر پہلی قسم کی تھی۔

شیخ مظہر فرماتے ہیں کہ کھجور کے درخت ایسا مال ہیں جس کا نفع حاضر ہے، جیسے معارف ظاہرہ تو ہوسکتا ہے کہ حضرت زبیر کو جو دیئے تھے وہ دراصل اس خمس میں سے ہوں جو ان کا حق تھا، یا اس غیر آباد زمین میں سے تھے جس کا کوئی مالک نہیں تھا تو حضرت زبیر آباد کرنے کے ذریعے اس کے مالک بنے۔

٢٩٩٨: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ اَقْطَعَ لِلزُّبَيْرِ حُضْرَ فَرَسِهٖ فَاَجْرٰى حَتّٰى فَرَسَهٗ قَامَ ثُمَّ رَمٰى بِسَوْطِهٖ فَقَالَ اَعْطُوْهُ مِنْ حَيْثُ بَلَغَ السَّوْطُ. (رواه ابو داود)

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ٣/٤٥٣ الحدیث رقم ٣٠٧٢ واحمد فی المسند ٢/١٥٦۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت زبیر کو ان کے گھوڑے کی دوڑ کے بقدر مسافت کا رقبہ بطور جاگیر (یعنی ایک دوڑ میں گھوڑا جہاں تک پہنچ کر ٹھہر جائے وہاں تک کی زمین) عطا کردی چنانچہ (اس مقصد کے لئے) حضرت زبیرؓ نے اپنا گھوڑا دوڑایا یہاں تک کہ ان کا گھوڑا کھڑا ہوگیا پھر حضرت زبیرؓ نے اپنا کوڑا پھینکا اس کے بعد آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

(زبیر کا) کوڑا جہاں جا کر گرا وہاں تک کی زمین اسے (بطور جاگیر) دیدی جائے"۔ (ابوداؤد)

تشریح: حضر : حاء کے ضمہ اور ضاد کے سکون کے ساتھ، یعنی گھوڑے گی دوڑ' اور اس کا نصب حذف مضاف کی وجہ سے ہے۔ای قدر حضر فرسہ یعنی گھوڑے کی ایک دوڑ کی مقدار کے برابر.

بسوطه : "با" زائدہ ہے،

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں دلیل ہے کہ امام اور حاکم کا بیت المال کی مملوکہ زمین کسی کو جاگیر کے طور پر دینے کے جواز پر جس کا کوئی مالک نہیں ہوسکتا کبھی مصلحت کی وجہ سے اصل زمین ہی کو جاگیر میں دے دیتا ہے اور وہ انسان اس کا مالک بن جاتا ہے، اس کا مالک بننا جائز ہے، جیسا کہ مالک بن جاتا ہے ان دراہم ودنانیر وغیرہ کا جو حاکم اس کو دے' اور کبھی اس جاگیر کی منفعت اس کو دے دیتا ہے' تو مدت جاگیر تک وہ اس سے فائدہ اٹھانے کا مستحق ہوتا ہے۔ اور "موات" کا ہر ایک مالک بن سکتا ہے آباد کرنے کے ذریعے اور اس میں حاکم کی اجازت کی ضرورت نہیں، یہ امام مالک اور شافعی اور جمہور کا مذہب ہے۔ (انتہیٰ)

اور بغوی اور شیخ مظہر کے کلام میں گزر چکا ہے کہ حضرت زبیر کی جاگیر وہ غیر آباد زمین میں سے تھی۔ پس وہ دلیل ہے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی اور مطلق احادیث اسی پر محمول ہیں۔

۲۹۹۹: وَعَنْ عَلْقَمَةَ بْنِ وَائِلٍ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ اَقْطَعَهُ اَرْضًا بِحَضْرَ مَوْتَ قَالَ فَاَرْسَلَ مَعِيَ مُعَاوِيَةَ قَالَ اَعْطِهَا اِيَّاهُ. (رواہ الترمذی والدارمی)

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ۳/۴۴۳ الحدیث رقم ۳۰۵۸ والترمذی فی ۳/۶۶۵ الحدیث رقم ۱۳۸۱ والدارمی فی ۲/۳۴۷ الحدیث رقم ۲۶۰۹ واحمد فی المسند ۶/۳۹۹۔

ترجمہ: "اور حضرت علقمہ بن وائل اپنے والد (حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ) سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ان (وائل بن حجر) کو حضر موت میں کچھ زمین بطور جاگیر عطا فرمائی' چنانچہ حضرت وائلؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت معاویہؓ کو میرے ساتھ بھیجا (تا کہ وہ اس زمین کی پیائش کر دیں) اور معاویہؓ سے فرمایا کہ وہ زمین (ناپ کر) وائل کو دے دو"۔ (ترمذی' والدارمی)

تشریح: "حضر موت" یمن میں ایک شہر کا نام ہے یہ دو اسم ہیں جن سے ایک نام بنایا گیا ہے اور یہ غیر منصرف ہے، علمیت اور ترکیب کی وجہ سے۔ یہ حاء مہملہ' راء اور میم کے فتحہ' اور ضاد معجمہ کے سکون کے ساتھ ہے۔ اور قاموس میں ہے میم کے ضمہ کے ساتھ ایک شہر اور ایک قبیلہ کا نام ہے۔ کہا جاتا ہے حضر موت، اور اضافت کے ساتھ بھی کہا جاتا ہے: **هذا حضر موت**" راء کے ضمہ کے ساتھ اور اگر آپ چاہیں تو دوسرے کو تنوین نہ دیں۔ سیوطی فرماتے ہیں کہ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم جب ہلاک ہوگئی تو وہ مؤمنین کے ساتھ یہاں آگئے جب وہ یہاں پہنچے تو وفات پا گئے تو (اس موقع پر) کہا گیا: **حضر موت**۔ اور مبرد نے ذکر کیا ہے کہ یہ عامر کا لقب ہے، جو جدِ اہل یمن تھے، یہ جس لڑائی میں بھی حاضر ہوتے اس میں مقتولین بہت زیادہ ہوتے جو بھی ان کو دیکھتا تو کہا" **حضر موت**"، ضاد کی حرکت کے ساتھ پھر کثرت استعمال کی وجہ سے ضاد ساکن ہوگیا۔

قوله : فَاَرْسَلَ مَعِيَ مُعَاوِيَةَ قَالَ اَعْطِهَا اِيَّاهُ :

ظاہر یہ ہے کہ معاویہ سے مراد ابن الحکم سلمی ہیں یا ابن جاہمہ سلمی ہیں۔ معاویہ بن ابی سفیان اور انکے والد فتح مکہ کے مسلمانوں میں سے ہیں اور مؤلفۃ القلوب میں سے تھے جیسا کہ مؤلف نے ذکر کیا ہے۔ وہ یہاں مراد نہیں ہیں اگرچہ مطلقاً یہ نام میں معاویہ بن ابی سفیان ہی کے لئے بولا جاتا ہے۔

۳۰۰۰: وَعَنْ اَبْيَضَ بْنِ حَمَّالٍ الْمَارِبِيِّ اَنَّهُ وَفَدَ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَاسْتَقْطَعَهُ الْمِلْحَ الَّذِيْ بِمَارِبَ

فَاَقْطَعَهُ اِيَّاهُ فَلَمَّا وَلّٰى قَالَ رَجُلٌ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّمَا اَقْطَعْتَ لَهُ الْمَاءَ الْعِدَّ قَالَ فَرَجَعَهُ مِنْهُ قَالَ وَسَأَلَهُ مَاذَا يُحْمٰى مِنَ الْاَرَاكِ مَا لَمْ تَنَلْهُ اَخْفَافُ الْاِبِلِ. (رواه الترمذی و ابن ماجة والدارمی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۳/۶۶٤ الحديث رقم ۱۳۸۰ وابن ماجه فی ۲/۸۲۷ الحديث رقم ۲٤۷۵ والدار می فی ۲/۳٤۷ الحديث رقم ۲۶۰۸۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابیض بن حمال ماربیؒ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے آپ ﷺ سے مارب میں نمک کی کان جاگیر کے طور پر طلب کی' چنانچہ آپ ﷺ نے انہیں نمک کی وہ کان بطور جاگیر عطا فرما دی' جب ابیض واپس مڑے تو ایک شخص (یعنی اقرع بن حابس تمیمی رضی اللہ عنہ) نے عرض کیا کہ ''یارسول اللہ! آپ ﷺ نے ابیضؓ کو تیار پانی (یعنی کان میں بالکل تیار نمک) دے دیا ہے؟'' راوی کہتے ہیں کہ (جب آپ ﷺ کو حضرت اقرعؓ سے یہ معلوم ہوا کہ ابیضؓ کو ایک ایسی نمک کی کان دے دی گئی ہے جس میں نمک بالکل تیار ہے تو) آپ ﷺ نے وہ کان ابیضؓ سے واپس لے لی۔ راوی کہتے ہیں کہ اس شخص (یعنی حضرت اقرع رضی اللہ عنہ) نے آپ ﷺ سے یہ بھی دریافت کیا کہ پیلو کے درختوں کی کون سی زمین گھیری جائے؟ (یعنی کون سی افتادہ وغیر آباد زمین کو آباد کر کے اپنی ملکیت بنایا جائے؟) تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''وہ زمین جہاں اونٹوں کے پاؤں نہ پہنچ سکیں''۔ (ترمذی' ابن ماجہ' دارمی)

حالاتِ راوی:

ابیض۔ یہ ابیض حمال کے بیٹے ہیں۔قوم سباء کے شہر مارب میں سے۔حضرت ﷺ کی خدمت میں ایک وفد کے ساتھ حاضر ہوئے اور صحبت سے مشرف ہوئے یمن میں رہتے تھے' ان سے کم حدیثیں مروی ہیں۔حمال میں حاء مفتوح اور میم مشدّد ہے۔مارب کے میم پر فتح ہے اور ہمزہ ساکن اور راء مکسور ہے۔آخر حرف باء ہے ایک شہر ہے یمن صفاء کے قریب۔السبائی میں سین مہملہ مفتوح اور واء موحدہ فتح ہے اور ہمزہ (بعد الف)۔

تشریح: **مارب** : یمن میں ایک جگہ ہے۔یہ غیر منصرف ہے۔

العد : عین کے کسرہ اور دال کی تشدید کے ساتھ، ہمیشہ رہنے والا جس کا مادہ منقطع نہ ہو۔''عد'' تیار کو کہتے ہیں۔

قال : ضمیر''رجل'' کی طرف راجع ہے، ابن الملک فرماتے ہیں کہ ظاہر یہ ہے کہ راوی حدیث ابیض کی طرف راجع ہے۔

منه : ضمیر''ابیض'' کی طرف راجع ہے۔ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ زیادہ ظاہر یہ ہے کہ قال کی ضمیر مرفوع''رجل'' کی طرف راجع ہے، ورنہ تو پھر مناسب یہ تھا کہ''**رجعه منی**'' کہتے۔

حاصل یہ ہے کہ جب آپ ﷺ کو معلوم ہوا کہ اس میں نمک تیار ہو چکا ہے جیسے تیار پانی ہو تو آپ ﷺ نے اس سے واپس لے لی۔ اس سے معلوم ہوا کہ حکومت کی طرف سے کوئی کان کسی شخص کو بطور جاگیر عطا ہو سکتی ہے، بشرطیکہ وہ زیر زمین پوشیدہ ہو اور اس سے محنت ومشقت کے بغیر کچھ حاصل نہ ہو سکتا ہو، جیسے نمک کی کان' تیل' فیروز' گندھک کے کان وغیرہ۔ہاں جو کانیں برآمد ہو چکی ہوں اور ان سے نکلنے والا مال کسی محنت ومشقت کے بغیر حاصل ہو سکتا ہو تو انہیں کسی کی جاگیر بنا دینا جائز نہیں ہے، بلکہ تمام لوگ اس میں شریک ہوں گے جیسے گھاس' ندیوں کا پانی وغیرہ۔اور اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حاکم اگر کوئی فیصلہ صادر کرے، اور پھر ظاہر ہو کہ یہ فیصلہ حقیقت کے منافی ہے، تو وہ اس فیصلے کو منسوخ کر دے اور اس سے رجوع کرے۔

یحمٰی : صیغہ مجہول کے ساتھ۔اس میں موجود ضمیر مستتر''ذا'' کی طرف عائد ہے۔**من الاراك** : یہ بیان ہے کیلئے قطعہ زمین۔ جیسا کہ قاموس میں ہے اور شاید اس سے مراد وہ زمین ہو کہ جس میں پیلو کی درخت ہوں۔

مظہر فرماتے ہیں کہ یہاں''**حمٰی**'' سے مراد آباد کرنا ہے، **حمٰی متعارف** اس کو مخصوص کرنا کسی کیلئے بھی جائز نہیں ہے۔

لم تنلہ : نون کے فتحہ کے ساتھ۔ مطلب یہ ہے کہ وہ چراگاہوں اور آبادی سے دور ہو۔ اس سے معلوم ہوا اس افتادہ زمین کا آباد کرنا' جائز نہیں ہے جو آبادی کے قریب ہو کیونکہ وہ جانوروں کو چرانے اور اہل بستی کی دیگر ضروریات کیلئے استعمال ہوتی ہے۔ اس کی طرف آپ نے اس قول اشارہ کیا ہے "ما لم تنلہ اخفاف الابل" یعنی احیاء اور آباد کرنا ایسے دور زمین میں ہو' جہاں تک چرنے والے اونٹ نہ پہنچیں۔

فائق میں ہے کہ بعض کہتے ہیں کہ "اخفاف" بوڑھے اونٹوں کو کہتے ہیں۔ اصمعی کہتے ہیں کہ "خف" بوڑھے اونٹ کو کہتے ہیں معنی یہ ہے کہ جو چراگاہ قریب ہو اس کا آباد نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس کو بوڑھے اونٹوں کیلئے چھوڑا جائے گا اور جوان کی طرح دوسرے کمزور جانور ہوں جو چرنے کیلئے مسافت طے کرنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ اس جگہ کو مخصوص چراگاہ نہیں بنایا جائے گا جہاں اونٹوں کے پاؤں پہنچتے ہوں اور اونٹوں کے پاؤں ہر جگہ تک پہنچتے ہیں۔

خدا کی تین عام نعمتیں

۳۰۰۱: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْمُسْلِمُوْنَ شُرَكَاءُ فِیْ ثَلَاثٍ فِی الْمَاءِ وَالْكَلَاءِ وَالنَّارِ۔

(رواہ ابوداود وابن ماجة)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳/ ۷۵۰ الحدیث رقم ۳۴۷۷ وابن ماجه فی ۲/ ۸۲۶ الحدیث رقم ۲۴۷۲ واحمد فی المسند ۵/ ۳۶۴۔

ترجمہ: "اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مسلمان تین چیزوں یعنی پانی' گھاس اور آگ میں شریک ہیں"۔ (ابوداؤد' ابن ماجہ)

تشریح: قولہ : اَلْمُسْلِمُوْنَ شُرَكَاءُ فِیْ ثَلَاثٍ فِی الْمَاءِ وَالْكَلَاءِ وَالنَّارِ :

ثلاث : قاضیؒ فرماتے ہیں کہ اسماء ثلاثہ جمع کے معنی میں تھے اس اعتبار سے " ثلاث" کہا۔

فی الماء : بدل ہے اعادہ جار کے ساتھ۔

مراد وہ پانی ہے جو کسی کے نکالنے اور محنت سے پیدا نہ ہوا ہو جیسے تالاب اور کنویں کا پانی۔ اور وہ پانی مراد نہیں جو کسی نے برتن' باسن وغیرہ میں بھرا ہو، یا نالی جو نہر سے نکالی ہو۔

الکلاء : جو "موت" میں اُگی ہو۔ والنار : علماء نے اس کے دو مطلب بیان فرمائے ہیں:

(۱) آگ میں اشتراک سے مراد یہ ہے کہ کسی کو آگ لینے سے یا چراغ جلانے سے نہیں روکا جائے گا۔ لیکن آگ جلانے والے کیلئے جائز ہے کہ روکے اس شخص کو جو اس آگ سے وہ لکڑی لینا چاہے جو اس میں جل رہی ہو، کیونکہ اس سے آگ میں کمی آ جائے گی اور ہوتے ہوتے بجھ جائے گی۔ (۲) بعض علماء نے کہا ہے کہ اس سے سنگ چقماق (وہ پتھر جس کے مارنے سے آگ نکلتی ہے) مراد ہے، کسی شخص کو اس کے لینے سے نہ روکا جائے گا جب وہ "ارض موات" میں ہو۔

کسی مباح چیز کو جو شخص پہلے حاصل کرے گا وہ اسی کی ہوگی

۳۰۰۲: وَعَنْ اَسْمَرَ بْنِ مُضَرِّسٍ قَالَ اَتَيْتُ النَّبِیَّ ﷺ فَبَايَعْتُهٗ فَقَالَ مَنْ سَبَقَ اِلٰی مَاءٍ لَّمْ يَسْبِقْهُ اِلَيْهِ مُسْلِمٌ فَهُوَ لَهٗ. (رواہ ابوداود)

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ۳/۳۵۲ الحدیث رقم ۳۰۷۱

ترجمہ: ''اور حضرت اسمر بن مضرسؓ کہتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے آپ ﷺ سے بیعت کی (یعنی اسلام قبول کیا) چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''جو شخص کسی ایسے پانی کی طرف جہاں پہلے کوئی مسلمان نہ پہنچا ہو سبقت لے جائے سبقت کرے (یعنی اس پانی کو حاصل کرے) تو وہ اسی کا ہے''۔ (ابوداوٗد)

حالاتِ راوی:

اسمہ۔ یہ اسمہ مضرس طائی صحابی کے بیٹے ہیں۔ ان کا شمار بصرہ کے اعرابیوں میں ہے۔ مضرس میں میم مضموم اور ضاد معجمۃ مفتوح اور راء مسکورہ مشدّد ہے۔

تشریح: قولہ: مَنْ سَبَقَ اِلٰی مَاءٍ: اس طرح دیگر مباحات کا حکم ہے۔ جیسے گھاس، لکڑی وغیرہ۔ اور ایک روایت میں ہے ''الی مایہ'' ما موصولہ ہے۔ یعنی جو اس نے لے لیا وہ اس کی ملکیت ہو جائے گا اور جو اس جگہ میں باقی ہے وہ اس کی ملکیت نہیں ہوگا۔

اس طرح ضیاء نے حضرت ابن جندب سے روایت کیا ہے۔

جس قوم میں کمزور لوگوں کے حقوق محفوظ نہ ہوں وہ برائیوں سے پاک نہیں ہوتی

۳۰۰۳: وَعَنْ طَاوٗسٍ مُرْسَلًا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنْ اَحْيَا مَوَاتًا مِّنَ الْاَرْضِ فَهُوَ لَهٗ عَادِيُّ الْاَرْضِ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ هِيَ لَكُمْ مِنِّيْ رَوَاهُ الشَّافِعِيُّ۔

اخرجه الشافعی فی الام ٤/٤٥ کتاب احکام الهبة باب عمارة مالیس معمورا۔

ترجمہ: حضرت طاوٗس سے یہ حدیث مرسلا مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے کسی بنجر زمین کو آباد کیا تو وہ اسی کی ہے۔ قدیم افتادہ و بنجر زمین اللہ اور اس کے رسول کی ہے۔ پھر یہ زمین میری جانب سے تمہارے لئے ہے۔

تشریح: قولہ: من احیا مواتا من الارض فھو لہ:

اس پر کلام گزر چکا ہے۔

قولہ: عَادِيُّ الْاَرْضِ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثم ھی لکم منی: عادی الارض: یاء مضمومہ کی تشدید کے ساتھ، وہ عمارتیں اور زمین جو قدیم ہو جس کے مالک کا کوئی علم نہ ہو۔ اس میں زمین کی لفظی نسبت ''عاد'' یعنی قوم یہود علیہ السلام کی طرف محض ایسی زمین کی قدامت کے اظہار میں مبالغہ کیلئے ہے کیونکہ قوم عاد کی یہاں بہت زیادہ پرانی تھی۔ مراد افتادہ زمین ہے۔

للہ رسولہ: یعنی اس میں تصرف کرتا ہے اللہ کا رسول ﷺ جیسے چاہے اور جس طرح صحیح سمجھے۔ اور میں اجازت دیتا ہوں اور جائز قرار دیتا ہوں تمہارے لیے اس کا آباد کرنا، اور تعمیر کرنا۔ قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کا ذکر اس کی عظمت شان اور آپ کے ذکر کیلئے بطور تمہید کے ہے۔ اور آپ ﷺ کا حکم و فیصلہ اللہ کا حکم و فیصلہ ہے، اس لئے ''لی'' متکلم سے ''الی رسولہ'' کی طرف عدول کیا، اور اس میں التفات ہے۔

۳۰۰۴: وَرُوِيَ فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ اَقْطَعَ لِعَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ الدُّوْرَ بِالْمَدِيْنَةِ وَهُوَ بَيْنَ ظَهْرَانَيْ عِمَارَةِ الْاَنْصَارِ مِنَ الْمَنَازِلِ وَالنَّخْلِ فَقَالَ بَنُوْ عَبْدِ بْنِ زُهْرَةَ نَكِّبْ عَنَّا ابْنَ اُمِّ عَبْدٍ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَلِمَ ابْتَعَثَنِيَ اللّٰهُ اِذًا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُقَدِّسُ اُمَّةً لَا يُؤْخَذُ لِلضَّعِيْفِ فِيْهِمْ حَقُّهٗ۔

اخرجه الشافعی فی المسند ۲/۱۳۳ کتاب الجهاد باب ماجاء فی الحماو القطایع۔

ترجمہ: ''اور شرح السنۃ میں منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو مدینہ میں چند مکانات بطور جاگیر دیے۔

وہ انصار کی آبادی یعنی ان کے مکان اور ان کے کھجور کے درختوں کے درمیان واقع تھے' چنانچہ عبدابن زہرہ کے بیٹوں نے کہا کہ آپ اُم عبد کے بیٹے (یعنی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ) کو ہم سے دور کر دیں (اس کے جواب میں) رسول اللہ ﷺ نے ان سے ارشاد فرمایا کہ "پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے کیوں بھیجا ہے (یاد رکھو) اللہ تعالیٰ اس قوم کو پاکیزگی عطا نہیں فرماتا جس میں ان کے کمزور لوگوں کو ان کا حق نہ دلایا جائے"۔

تشریح: وروی : صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔بعض کہتے ہیں بصیغہ معلوم ہے۔اس صورت میں ضمیر امام بغوی یعنی صاحب مصابیح کی طرف لوٹے گی۔

قوله :اقطع لعبد الله بن مسعود الدور بالمدينة :

قاضی کہتے ہیں کہ "دور" سے مراد "منازل" ہیں اور وہ خالی زمین ہے جو رسول اللہ ﷺ نے عبداللہ بن مسعود کو دی تھی تاکہ وہ اس میں مکان بنائیں اور ایک حدیث میں ہے:"انه صلى الله عليه وسلم اقطع للمهاجرين الدور بالمدينة"۔اس کی تاویل یہ کی ہے کہ عرب "منازل" کو بھی "دار" کہتے ہیں اگرچہ ابھی تک اس میں گھر بنا نہ ہو،اور بعض کہتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ان کو یہ گھر عاریۃً دئے تھے اور اسی طرح تمام مہاجرین کو ان کے گھر عاریۃً دئے تھے۔لیکن یہ ضعیف ہے اس لئے کہ آپ ﷺ نے حکم دیا تھا کہ مہاجرین کے گھروں کے وارث ان کی عورتیں ہوں گی اور عاریت میں وراثت نہیں چلتی۔

بين ظهر انى عمارة الانصار :اصل میں ظهری عمارة تهم "تھا الف اور نون کو مبالغہ کیلئے زیادہ کیا ہے،

من المنازل والنخل : یہ بیان ہے "دور" کیلئے۔اس میں دلیل ہے کہ وہ افتادہ زمین جس کو تعمیرات نے گھیرا ہو،اس کو جاگیر کے طور پر دینا تاکہ اس کو آباد کیا جائے یہ جائز ہے۔

بنو عبد بن زهرة : زاء کے ضمہ اور هاء کے سکون کے ساتھ' یہ قریش کا ایک قبیلہ ہے۔رسول اللہ ﷺ کی والدہ بھی اسی قبیلے سے تھیں۔اور یہ مہاجرین میں سے تھے۔

نكب : کاف مکسورہ کی تشدید کے ساتھ بمعنی "بعد "و اصرف" کے ہے۔اللہ تعالیٰ کا اشاد ہے: ﴿**انهم عن الصراط لناكبون**﴾ یعنی سیدھے راہ سے پھرنے والے ہیں۔

"**ابن ام عبد** سے مراد عبداللہ بن مسعود ہیں۔یہ نام انہوں نے ان کی قربت کی حقارت اور ملال کے باعث کہا۔ان لوگوں نے آپ ﷺ سے درخواست کی کہ ان سے وہ قطعہ زمین واپس لے لیں۔

ابتعثنى الله :از باب افتعال ہے "بعث" سے بمعنی "ارسلنى الله"

اذا : تنوین کے ساتھ ہے یعنی جب میں صاحب حق کو اس کا حق دلانے میں کمزور اور طاقتور کے درمیان برابری نہ کرسکوں تو اللہ نے مجھے کس لئے بھیجا ہے،اور ابن مسعود ایک کمزور انسان ہیں۔

قاضی فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک نے مجھے کمزور اور قوی کے درمیان انصاف اور برابری قائم کرنے کیلئے بھیجا ہے، پس جب میری قوم کمزور کو اس کے حق سے ہٹائے اور منع کرے تو میرے بھیجنے کا کیا فائدہ ہوا۔

نہر وغیرہ سے کھیتوں کو سیراب کرنے کا ضابطہ

۳۰۰۵:وَعَنْ عَمْرِوبْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَضٰى فِى السَّيْلِ الْمَهْزُوْرِ اَنْ يُّمْسَكَ حَتّٰى يَبْلُغَ كَعْبَيْنِ ثُمَّ يُرْسِلَ الْاَ عْلٰى عَلَى الْاَ سْفَلِ. (رواه ابوداود وابن ماجة)

اخرجه ابوداوٗد فى السنن ٤/٥٣ الحديث رقم ٣٦٣٩وابن ماجه فى ٢/٨٣٠ الحديث رقم ٢٤٨٢ومالك فى الموطأ

۸۴۴/۲ الحدیث رقم ۲۸ من کتاب الاقضیة

ترجمہ: ''اور حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد (حضرت شعیب) سے اور وہ اپنے دادا (یعنی حضرت عبداللہ بن عمروؓ) سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سیل مہزور کے پانی کے بارے میں یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ (جب اس کا پانی کھیت وغیرہ میں ٹخنوں تک بھر جائے تو اسے بند کر دیا جائے اور پھر اوپر والے حصے سے نشیبی حصے کی جانب پانی چھوڑا جائے''۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: قوله : قَضٰی فِی ...... السبیل المهزور : دونوں (کلمے) لام تعریف کے ساتھ ہیں، اور زاء راء پر مقدم ہے۔ عسقلانی فرماتے ہیں کہ یہ مدینہ میں ایک مشہور وادی ہے۔ اور نہایہ میں ہے کہ ''**مهزور**''، زاء معجمہ کا راء غیر معجمہ پر تقدیم کے ساتھ حجاز میں بنوقریظہ کے علاقہ میں ایک وادی ہے، اور راء کی زاء پر تقدیم کے ساتھ مدینہ میں ایک جگہ ہے جس کو رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں پر صدقہ کیا تھا اور اسی طرح فائق میں ہے' البتہ اتنا اضافہ ہے کہ ''**مهزول**'' لام کے ساتھ' جبل یثرب کے قریب وادی کا نام ہے۔

تورپشتی فرماتے ہیں کہ اس لفظ کو ہم نے اس کی اصل سے پھرا ہوا پایا ہے، پس بعض نسخوں میں ''**السبیل المهزور**'' ہے اکثر میں یہی ہے۔ اور بعض میں ''**سیل المهزور**'' اضافت کے ساتھ ہے۔ یہ دونوں خطا ہیں اور صحیح یہ ہے کہ دونوں بغیر الف لام کے ہیں علم کی طرف اضافت کے ساتھ۔

قاضی کہتے ہیں کہ ''**مهزور**''، علم منقول ہے صفت سے ہیں جو مشتق ہے ''**هزره**'' سے بمعنیٰ ''**غمضه**'' (باریک اور دقیق کرنا) اس پر الف لام داخل کرنا اور نہ کرنا دونوں جائز ہیں۔ (انتہیٰ)

اور حاصل یہ ہے کہ اس میں الف لام اصل کی طرف اشارہ کرنے کیلئے ہے اور وہ صفت ہے۔ اور اس کے باوجود **سیل المهزور** میں یہ ظاہر ہے، پس ''**مهزور**'' بدل ہے ''**سیل**'' سے حذف اضافت کے ساتھ ای ''**سیل مهزور**''۔

ان یمسك : صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

حتی یبلغ الکعبین ثم یرسل : نصب کے ساتھ اور بعض کہتے ہیں کہ رفع کے ساتھ ہے۔

اپنی جائیداد کے ذریعے کسی کو تکلیف نہ پہنچاؤ

۳۰۰۶: **وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ اَنَّهٗ کَانَتْ لَهٗ عَضَدٌ مِنْ نَخْلٍ فِیْ حَائِطِ رَجُلٍ مِنَ الْاَنْصَارِ وَمَعَ الرَّجُلِ اَهْلُهٗ فَکَانَ سَمُرَةُ یَدْخُلُ عَلَیْهِ فَیَتَاَذّٰی بِهٖ فَاَتَی النَّبِیَّ ﷺ فَذَکَرَ ذٰلِكَ لَهٗ فَطَلَبَ اِلَیْهِ النَّبِیُّ ﷺ لِیَبِیْعَهٗ فَاَبٰی فَطَلَبَ اَنْ یُنَاقِلَهٗ فَاَبٰی قَالَ فَهَبْهُ لَهٗ وَلَكَ کَذَا اَمْرًا رَغَّبَهٗ فِیْهِ فَاَبٰی فَقَالَ اَنْتَ مُضَارٌّ فَقَالَ لِلْاَنْصَارِیِّ اِذْهَبْ فَاقْطَعْ نَخْلَهٗ** (رواہ ابوداود وذکر حدیث جابر من احیی ارضا فی باب الغصب بروایة سعید بن زید)

اخرجه ابوداوٗد فی السنن ۵۰/۴ الحدیث رقم ۳۶۳۶ (۲) فی المخطوطة تناظره (۳) فی المخطوطة سمر (۴) فی المخطوطة القاضی (رحمداللّٰہ)۔

ترجمہ: ''اور حضرت سمرہ بن جندبؓ کے بارے میں منقول ہے کہ ان کے کھجوروں کے چند درخت ایک انصاری (جن کا نام بعض علماء نے مالک بن قیس لکھا ہے) کے باغ میں تھے اور اس کے اہل وعیال بھی اس شخص کے ساتھ تھے۔ چنانچہ جب سمرہؓ (اپنے درختوں کی وجہ سے) باغ میں داخل ہوتے تو ان ان سے تکلیف محسوس کرتا۔ (ایک دن) وہ انصاری نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ سے اس کا ذکر کیا' نبی کریم ﷺ نے سمرہؓ کو اپنی مجلس میں طلب کیا تاکہ (ان سے یہ فرمائیں کہ) وہ (اپنے کھجور کے ان درختوں کو) انصاری کے ہاتھ فروخت کر دیں (تاکہ ان درختوں کی وجہ سے انصاری کو جو تکلیف پہنچتی ہے وہ اس سے نجات پائے) لیکن سمرہؓ نے (اپنے درختوں کو فروخت کرنے سے) انکار کر دیا' پھر آپ ﷺ نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ سمرہؓ اپنے

ان درختوں کو انصاری کے (ان) درختوں سے بدل لیں (جو کسی دوسری جگہ واقع تھے) مگر سمرہؓ اس پر بھی انکار کر دیا' تب آپ ﷺ نے سمرہؓ سے یہ فرمایا کہ اچھا اپنے درخت انصاری کو بطور ہدیہ دے دو تمہیں اس کا اتنا اجر (بہشت کی نعمتوں کی صورت میں) مل جائے گا۔ گویا آپ ﷺ نے (بطور سفارش) اور رغبت دلانے کے لئے یہ حکم دیا (یا امراً رغبہ کا ترجمہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے سمرہ سے ترغیب کی ایک بات فرمائی یعنی اپنے درخت کو بطور ہدیہ دے دینے کا ثواب ذکر فرمایا) لیکن سمرہؓ نے اس سے بھی انکار کر دیا۔ (آخر میں) آپ ﷺ نے (سمرہؓ سے) فرمایا کہ ''تم (واقعی اس انصاری کو) تکلیف پہنچانے والے ہو' اس لئے آپ ﷺ نے انصاری سے فرمایا کہ ''تم جاؤ اور اس کے کھجوروں کے درختوں کو کاٹ پھینکو''۔ (ابوداؤد) حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے ''جس نے بنجر زمین کو آباد کیا'' سعید بن زید کی روایت سے باب الغضب میں ذکر کی گئی ہے اور ابوصرمہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ''جس نے کسی کو ایذا پہنچائی تو اللہ اسے ایذا پہنچائے گا'' ہم اس روایت کو ''باب ما ینھی عن التھاجر'' میں ذکر کریں گے۔

تشریح: عضد : دو فتحوں کے ساتھ' حرف ثانی کے ضمہ کے ساتھ' اور اس کو ساکن بھی کیا جاتا ہے۔

من نخل : بعض کہتے ہیں اس کا معنی ہے چند چھوٹے پے در پے کھجور کے درخت تھے اور ایک لمبا راستہ تھا کھجوروں میں، اور بعض کہتے ہیں ایک طرف کے راستے کو کہتے ہیں اور قاموس میں ہے کھجوروں کی قطار کو کہتے ہیں اور حرکت کے ساتھ پے در پے درختوں کو کہتے ہیں۔ (انتہیٰ)

تو من نخل میں تجرید ہے اور فائق میں ہے: **قالوا للطریقه من النخل عضد لانها متنا ضرة فی جهة**۔

رجل من النصار : بعض کہتے ہیں کہ یہ انصاری بنی نجار میں سے تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ ان کا نام مالک بن قیس تھا اور بعض کہتے ہیں لبابہ بن قیس تھا اور بعض کہتے ہیں ملاک بن اسعد تھا۔ یہ شاعر تھے۔

امام طیبی فرماتے ہیں کہ ''اھل'' اور ''تاذی'' کا ذکر دونوں دلالت کرتے ہیں کہ انصاری کو ان کے گزرنے سے تکلیف پہنچتی تھی۔

لیبیعه : امام طیبی فرماتے ہیں کہ طلب کو لام کے ساتھ متعدی کرنا دلالت کر رہا ہے کہ آپ ﷺ نے ان سے بیچنے کی سفارش کی تھی اور اس طرح باقی میں بھی۔

فابی قال فھبه له : تورپشتی فرماتے ہیں کہ الفاظ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ درخت ایک تھا۔ اس لئے کہ پے در پے اس کی طرف مذکر کی ضمیر لوٹائی ہے، لیبیعه اور ینا قله، فھبه وغیرہ میں۔ اور یہ بھی ہے کہ اگر کھجور کے درختوں کی قطار ہوتی تو اس کے کاٹنے کا آپ حکم نہ دیتے۔ اس لئے کہ اس میں انصاری سے زیادہ ضرر سمرہ کو پہنچتا، لیکن پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ وہ قطار تھی اور ضمیر مفرد اس لئے لائی گئی ہے کہ لفظ مفرد ہے۔ (ولك كذا : کہ تیری جنت میں باغات، حوریں، محلات اور خوشیاں ہوگی۔

امرا رغبه فیه حکم اور امر میں۔ اور اس کا نصب اختصاص کی وجہ سے ہے اور فھبه کیلئے تفسیر ہے، یعنی گویا کہ آپ ﷺ نے بطور سفارش اور رغبت دلانے کے لئے یہ حکم دیا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ حال ہو ''قال'' کے فاعل سے ای قال امرا مرغبا فیہ یعنی ایک بات فرمائی جس میں ترغیب تھی اور یہ بھی جائز ہے کہ اس کا نصب مصدریت کی بناء پر ہو اس لئے کہ ''امر'' قول کے معنی میں ہے۔ ای قال قولا مرغبا فیہ یعنی ترغیب کی ایک بات فرمائی اور یہ تمام وجوہ اعراب اللہ کے اس قول میں بھی جاری ہوتے ہیں: ﴿**فیها یفرق کل امر حکیم امرا من عندنا**﴾ [الدخان۔ ٤۔ ٥] (جیسا کہ اس کی تحقیق کی ہے امام طیبی نے۔)

فقال انت مضار : شیخ مظہر فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ ان چیزوں کو قبول نہیں کرتے تو آپ کا ارادہ سوائے لوگوں کو نقصان اور تکلیف پہنچانے کے اور کچھ نہیں، اور جس کا ارادہ لوگوں کو تکلیف پہنچانے کا ہو، تو اس کے تکلیف اور نقصان کو رفع کرنا ضروری ہے اور تیرے ضرر و نقصان کا دفع کرنا تیرے درختوں کا کاٹنا ہے۔

فقال للانصاری اذهب فقطع نخله : اور شاید انصاری کو سمرہ کے درختوں کو کاٹنے کا حکم اس لئے دیا کہ آپ ﷺ کو معلوم تھا

کہ اس کا مقصد صرف ضرر پہنچانا ہے اور یہ بھی معلوم تھا کہ سمرہ نے یہ درخت عاریۃً لگائے تھے۔

صرمة : صاد کے کسرہ اور راء کے سکون کے ساتھ۔

من ضار اضر الله به : جیسا کہ یہاں مشکوۃ کے اصل میں ہے۔

ان الفاظ کے ساتھ "ضار الله به ومن شاق شاق الله علیه" اور ظاہر یہ ہے کہ اول سہو قلم ہے۔

الفصل الثالث:

پانی، نمک اور آگ دینے سے انکار نہ کرو

۳۰۰۷: عَنْ عَائِشَةَ اَنَّهَا قَالَتْ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ مَا الشَّیْءُ الَّذِیْ لَا یَحِلُّ مَنْعُهٗ قَالَ الْمَاءُ وَالْمِلْحُ وَالنَّارُ قَالَتْ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هٰذَا الْمَاءُ قَدْ عَرَفْنَاهُ فَمَا بَالُ الْمِلْحِ وَالنَّارِ قَالَ یَا حُمَیْرَاءُ مَنْ اَعْطٰی نَارًا فَکَاَنَّمَا تَصَدَّقَ بِجَمِیْعِ مَا اَنْضَجَتْ تِلْكَ النَّارُ وَمَنْ اَعْطٰی مِلْحًا فَکَاَنَّمَا تَصَدَّقَ بِجَمِیْعِ مَا طَیَّبَتْ تِلْكَ الْمِلْحُ وَمَنْ سَقٰی مُسْلِمًا شَرْبَةً مِنْ مَاءٍ حَیْثُ یُوْجَدُ الْمَاءُ فَکَاَنَّمَا اَعْتَقَ رَقَبَةً وَمَنْ سَقٰی مُسْلِمًا شَرْبَةً مِنْ مَاءٍ حَیْثُ لَا یُوْجَدُ الْمَاءُ فَکَاَنَّمَا اَحْیَاهَا (رواه ابن ماجة)

اخرجه ابن ماجه فی السنن ۲/۸۲٦ الحدیث رقم ۲٤۷٤

ترجمہ: "اُم المؤمنین حضرت عائشہؓ کے بارے میں روایت ہے کہ (ایک دن) انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! وہ کون سی چیز ہے جس کو دینے سے انکار کرنا حلال نہیں ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: پانی، نمک اور آگ۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے (یہ سن کر) عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! پانی کی اہمیت کا تو ہمیں علم (کہ یہ خدا کی ایک ایسی عام نعمت ہے جو کسی شخص کی ذاتی ملکیت نہیں ہے اور چونکہ کیا انسان اور کیا حیوان ساری ہی مخلوق کی ضرورتیں اس سے وابستہ ہیں اس لئے اس سے منع کرنا بہت زیادہ تکلیف وضرر کا باعث بن سکتا ہے) لیکن نمک اور آگ میں ایسی بات نہیں ہے (کہ یہ دونوں چیزیں پانی کے مثل نہیں ہیں اور بظاہر بالکل حقیر وکمتر چیزیں ہیں جن کا دیا جانا اور نہ دیا جانا کیا حیثیت رکھ سکتا ہے؟) آپ ﷺ نے فرمایا: حمیراء (یہ مت سمجھو کہ ان دونوں چیزوں کے دینے یا نہ دینے کی کوئی اہمیت نہیں ہے کیونکہ) جس شخص نے کسی کو آگ دی تو گویا اس نے اس آگ پر پکنے والی تمام چیزیں بطور صدقہ دیں۔ اسی طرح جس نے کسی کو نمک دیا گویا اس نے وہ تمام چیزیں جنہیں اس نمک نے ذائقہ دار بنایا، بطور صدقہ دیں اور (پانی کی اہمیت تو تم جانتی ہو۔ لیکن تمہیں یہ معلوم نہیں کہ) جس شخص نے کسی کو اس جگہ کہ جہاں پانی دستیاب ہو ایک بار پانی پلایا تو گویا اس نے ایک غلام آزاد کیا اور جس شخص نے کسی کو اس جگہ کہ جہاں پانی دستیاب نہ ہو ایک بار پانی پلایا تو گویا اس نے اس کو (یعنی ایک مسلمان کو) زندہ کر دیا"۔ (ابن ماجہ)

تشریح: قوله :ما الشیء الذی لا یحل منعه :شیء سے مراد جنس شئے ہے۔

قوله :قلت یا رسول الله هذا الماء قد عرفناه فما بال الم ح والنار :

امام طیبی فرماتے ہیں کہ "قد عرفناه" جملہ حال ہے اور اس میں عامل هذا میں موجود اشارہ کا معنی ہے اور ذوالحال میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اسم اشارہ میں مقدر ہے اور وہ مجرور ہے اور بعض کہتے ہیں خبر ہے۔ حضرت عائشہ کی مراد یہ تھی کہ پانی کی حالت تو ہمیں معلوم ہے کہ یہ لوگوں اور جانوروں کی ضرورت ہے اور اس سے روکنے میں ان کو تکلیف پہنچتی ہے۔ نمک اور آگ کا معاملہ تو ایسا نہیں ہے۔

قوله :قال یا حمیراء : حمراء کی تصغیر ہے، مراد "بیضاء" ہے۔ ابن حجر امام جمال الدین یوسف المزنی سے نقل کرتے ہیں کہ ہر وہ

حدیث جس میں "یا حمیراء" ہو، وہ موضوع ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔ لیکن یہ بات علی العموم درست نہیں ہے اس لئے کہ صرف حدیث کا "یا حمیراء" پر مشتمل ہونا موضوع ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔ ہاں اگر اس کے ساتھ دوسرے اسباب ہوں جو وضع پر دلالت کرتے ہوں تو پھر وضع کا حکم لگایا جائے گا ورنہ تو نہیں۔ (انتہیٰ)۔ شاید ان کی مراد ہر وہ حدیث ہو جس کے شروع میں "یا حمیراء" ہو۔ اور علماء نے ایسی احادیث کا تتبع کیا تو ان کو موضوع پایا، اور اس کی نظیر وہ ہے جو سمنانی نے کہا ہے کہ احادیث موضوعہ میں سے وہ حدیث بھی ہے جس میں حضرت عائشہ کا نام "یاحمیراء" ہو۔

آپ ﷺ نے حضرت عائشہ کو جواب بر سبیل اسلوب حکیم انتہائی وضاحت کے ساتھ دیا۔ یعنی آپ اس کو چھوڑیں اور یہ دیکھیں کہ اتنے بڑے ثواب سے محرومی ہو رہی ہے اس حقیر چیز کو روکنے سے جس کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی۔ اسی وجہ سے "ملح" کی طرف ضمیر مؤنث کی لوٹائی "طیبت" اور "تلك" میں کہ اس سے مراد قلت وندرت ہے۔

قولہ :ومن سقی مسلما شربة من ماء حیث لا یوجد الماء فکأنما احیاھا :

ھاء ضمیر مسلم کی طرف راجع ہے، بتاویل نفس کے یا نسمۃ کے۔ یہ ارشاد گرامی اقتباس ہے اللہ کے اس ارشاد سے: ﴿**ومن احیاھا فکأنما احیا الناس جمیعا**﴾[المائدۃ۔ ۳۲] (اور جو شخص کسی شخص کو بچالے، تو گویا اس نے تمام آدمیوں کو بچالیا)۔ جواب میں پانی کا ذکر کیا حالانکہ سوال پانی کے بارے میں نہیں تھا۔ پانی کے بارے میں حضرت عائشہ کی بات رد کرنے کیلئے کہ تم اس کو اس تفصیل کے ساتھ نہیں جانتی۔ اسی لئے اس کو ذکر میں مؤخر کیا۔

بَابُ الْعَطَایَا

عطایا کا بیان

"عطایا" عطیۃ کی جمع ہے، عطایا سے مراد امراء کے انعام ہیں۔

امام غزالی نے منہاج العابدین میں لکھا ہے کہ اگر آپ یہ سوال کریں کہ آپ اس زمانہ کے سلاطین کے انعامات کے قبول کرنے کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ تو جان لیجئے کہ اس بارے میں علماء کے اختلافی اقوال ہیں۔

(۱) بعض علماء تو یہ کہتے ہیں کہ اگر وہ بخشش وانعام کسی ایسے مال کی صورت میں ہو جس کے حرام ہونے کا یقین نہ ہو تو اسے قبول کر لینا درست ہے۔ (۲) بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ جب تک اس مال کے حلال ہونے کا یقین نہ ہو تو اسے قبول نہ کرنا ہی اولیٰ ہے۔ کیونکہ موجودہ زمانے میں سلاطین کے پاس غالب اموال حرام کے ہیں اور ان کے ہاتھوں میں حلال مال معدوم ونادر ہے۔ (۳) بعض یہ فرماتے ہیں کہ غنی اور فقیر دونوں کیلئے امراء وسلاطین کے ہدایا اور تحفے حلال ہیں بشرطیکہ ان کا حرام ہونا تحقیقی طور پر ثابت نہ ہو۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اسکندریہ کے بادشاہ مقوقس کا تحفہ قبول فرمایا تھا اور ایک یہودی سے قرض لیا تھا، باوجود یہ کہ یہود کے بارے میں قرآن نے [**اکالون للسحت**][المائدۃ۔ ۴۲] (حرام مال کھانے والے) فرمایا ہے۔ یہ علماء فرماتے ہیں کہ صحابہ کی ایک جماعت ظالموں کے ایام پائے ہیں اور اس وقت انہوں نے تحفے قبول کیے ہیں۔ ان میں سے حضرت ابوہریرہ، ابن عباسؓ ابن عمرؓ اور ان کے علاوہ صحابہؓ ہیں۔ (۴) بعضوں نے یہ کہا ہے کہ ان کے اموال میں سے کچھ بھی حلال نہیں ہے نہ غنی کے لئے اور نہ فقیر کیلئے۔ اس لئے کہ وہ لوگ ظلم کے ساتھ موسوم ہیں، اور ان کے اموال کا غالب اور زیادہ حصہ مردار اور حرام ہے اور حکم غالب اور اکثر پر لگتا ہے، پس اس سے اجتناب لازم ہے۔ (۵) بعضوں نے یہ کہا ہے کہ جس مال کے حرام ہونے کا یقین نہ ہو وہ فقیر کے لئے حلال ہے، لیکن غنی کے لئے حلال نہیں ہے، الا یہ کہ فقیر جان لے کہ یہ بعینہٖ وہی غصب کا مال ہے تو پھر اس کے لئے لینا حلال نہیں ہے مگر اس نیت سے کہ اس کو مالک پر

لوٹائے گا اور فقیر کے لئے بادشاہ کا مال لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اسلئے کہ اگر وہ مال بادشاہ کی ملکیت ہے اور اس نے فقیر کو دیدیا ہے تو اس کیلئے بغیر کسی شک کے لینا جائز ہے، اور اگر وہ فیٔ خراج یا عشر کا مال ہے تو پھر فقیر کا اس میں حق ہے اور یہی حکم اہل علم کیلئے بھی ہے۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جو اسلام میں خوشی سے داخل ہوا اور ظاہراً قرآن بھی پڑھا، اس کے لئے بیت المال سے سالانہ دوسو ۲۰۰ درہم ہیں اور بعض روایات میں ہے کہ دوسو دینار ہیں اگر اس نے دنیا میں نہیں لیے تو آخرت میں لے لے گا۔ پس جب ایسا ہے تو پھر فقیر اور عالم اپنا ہی حق لے رہے ہیں۔ یہ علماء فرماتے ہیں کہ جب مال میں غصب شدہ مال ملا ہوا ہو بایں طور کہ اس کا امتیاز نہ ہو سکے یا صرف غصب شدہ مال ہے۔ جس کو مالک یا اس کے وارث کی طرف لوٹانا ممکن نہیں ہے تو بادشاہ کیلئے کوئی مخلص نہیں ہے سوائے اس کے کہ وہ مال صدقہ کر دے اور اللہ پاک نے اس کو وہ مال فقیر پر صدقہ کرنے کا حکم نہیں دیا ہے اور نہ ہی فقیر کو اس کے قبول کرنے سے روکا ہے اور نہ قبول کرنے کا حکم دیا ہے کہ وہ اس پر حرام ہے۔ پس اس صورت میں فقیر کے لئے اس کا لینا جائز ہے مگر معینہ غصب اور حرام مال کا لینا جائز نہیں ہے۔

الفصل الاول:

۳۰۰۸: عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ عُمَرَ اَصَابَ اَرْضًا بِخَيْبَرَ فَاَتَى النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّي اَصَبْتُ اَرْضًا بِخَيْبَرَ لَمْ اُصِبْ مَالًا قَطُّ اَنْفَسَ عِنْدِيْ مِنْهُ فَمَا تَاْمُرُنِيْ بِهٖ قَالَ اِنْ شِئْتَ حَبَسْتَ اَصْلَهَا وَتَصَدَّقْتَ بِهَا فَتَصَدَّقَ بِهَا عُمَرُ اَنَّهٗ لَا يُبَاعُ اَصْلُهَا وَلَا يُوْهَبُ وَلَا يُوْرَثُ وَتَصَدَّقَ بِهَا فِي الْفُقَرَاءِ وَفِي الْقُرْبٰى وَفِي الرِّقَابِ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَالضَّيْفِ لَا جُنَاحَ عَلٰى مَنْ وَلِيَهَا اَنْ يَّاْكُلَ مِنْهَا بِالْمَعْرُوْفِ اَوْ يُطْعِمَ غَيْرَ مُتَمَوِّلٍ قَالَ ابْنُ سِيْرِيْنَ غَيْرَ مُتَاَثِّلٍ مَالًا۔ (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٥/٣٥٤ الحدیث رقم ٢٧٣٧ ومسلم فی صحیحه ٣/١٢٥٥ الحدیث رقم (١٥-١٦٣٢) والنسائی فی السنن الحدیث رقم ٣٥٩٧ وابن ماجه فی ٢/٨٠١ الحدیث رقم ٢٣٩٦ أحمد فی المسند ٢/١٢

ترجمه: ''حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ خیبر کی کچھ زمین (کہ جس میں کھجوریں پیدا ہوتی تھیں) حضرت عمرؓ کو (مال غنیمت کے طور پر) حصہ میں آئی تو وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ''یا رسول اللہ! مجھے خیبر کی جو زمین (بطور غنیمت) حصہ میں آئی کہ اس سے زیادہ بہتر وعمدہ مال مجھے اس سے پہلے کبھی نہیں ملا ہے (اور اب میں چاہتا ہوں کہ اس زمین کو اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی میں دے دوں اس لئے) آپ ﷺ مجھے اس بارے میں کیا حکم فرماتے ہیں' حکم فرمائیے (کہ میں اس بارے میں کیا کروں؟) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر تم چاہو اس کا اصل مال تم رکھ لو اس سے جو کچھ پیدا ہو اسے صدقہ کر دو'۔ چنانچہ حضرت عمر نے اس زمین کو اس شرط کے ساتھ اللہ کی راہ میں دے دیا (یعنی اسے وقف کر دیا) کہ اصل زمین کو نہ تو فروخت کیا جائے' نہ ہبہ کیا جائے اور نہ اسے کسی کی میراث قرار دی جائے اور اس کی پیداوار کو فقراء' قرابتداروں کو نفع پہنچانے غلاموں کو آزاد کرانے (یعنی جس طرح مکاتب کو زکوٰۃ دے دی جاتی ہے تاکہ وہ اس کے ذریعے اپنے مالک کو بدل کتابت دے کر آزاد ہو جائے اسی طرح اس زمین کی پیداوار سے بھی مکاتب کی اعانت کی جائے) اللہ کی راہ میں (یعنی غازیوں اور حاجیوں پر خرچ کیا جائے) مسافروں کی ضرورتیں پوری کی جائیں (باوجودیکہ وہ اپنے وطن میں مال وزر کے مالک ہوں) اور مہمانوں کی مہمانداری میں خرچ کیا جائے اور اس زمین کے متولی پر بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ اچھے طریقے سے اس میں سے کھائے یا اپنے اہل وعیال کو (کہ جو مستطیع نہ ہونے کی وجہ سے اس کے زیر کفالت ہوں) کھلائے بشرطیکہ وہ متولی (اس وقف کی آمدنی سے) مالدار نہ بنے (یعنی جو شخص اس زمین کی دیکھ بھال کرنے اور اس کی پیداوار کو مذکورہ بالا لوگوں پر خرچ کرنے کی ذمہ داری پر بطور متولی مامور کیا جائے اگر وہ بھی اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضروریات زندگی پوری کرنے کے لئے اس زمین کی پیدوار اور آمدنی میں سے کچھ لے لیا کرے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ ہاں اسے اس بات کی اجازت نہیں ہوگی کہ وہ اس زمین کے ذریعے مالدار ومتمول بن جائے۔ چنانچہ ابن سیرینؒ نے (غیر

متمول کا مطلب) یہی بیان کیا ہے کہ وہ متولی اس زمین کو اپنے مال وزر جمع کرنے کا ذریعہ نہ بنائے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح : قوله : اَنَّ عُمَرَ اَصَابَ اَرْضًا بِخَيْبَرَ...... قَالَ اِنْ شِئْتَ ......انفس : بہترین' عمدہ۔ اور اسی سے اللہ کا یہ ارشاد ہے: ﴿**لقد جاء كم رسول من انفسكم**﴾ [التوبة۔۱۲۸] فاء کے فتحہ کے ساتھ قراءت شاذہ میں۔ اور امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ''انفس'' بمعنیٰ ''اجود'' ہے، اور یہ **نفس نفاسة**، سے ہے از باب کرم، اور اس مال کا نام ''ثمغ'' ثاء کے ساتھ' میم کے سکون کے ساتھ اور غین کے ساتھ ہے۔

فما تامرنی بهٔ : بمعنیٰ ''فی'' ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ وہ زمین اللہ کی رضا اور خوشنودی میں دیدوں، لیکن میں نہیں جانتا کہ کس طریقے سے دیدوں۔

حبست : باء کی تشدید کے ساتھ اور تخفیف کے ساتھ بھی درست ہے، **فی الفقراء** : یعنی فقراء مدینہ پر یا صفہ پر۔

القربی : ''اقرب'' کا مؤنث ہے جیسا کہ کہا گیا ہے۔ زیادہ ظاہر یہ ہے کہ یہ بمعنیٰ ''قرابة'' ہے اور مضاف مقدر ہے اور اس کی تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے: ﴿**واتی ذاالقربی حقه**﴾ [الاسراء۔۲۶] اور مراد اس سے رسول اللہ ﷺ کے قرابتدار ہیں یا حضرت عمر کے اپنے قرابتدار ہیں۔ اور ظاہر یہ ہے کہ یہ ان کے محتاج اور غنی دونوں قسم کے قرابتداروں کو شامل ہے۔

الرقاب : راء کے کسرہ کے ساتھ ''رقبۃ'' کی جمع ہے اور مراد اس سے مکاتب ہیں۔ یعنی ان کے بدل کتابت کی ادائیگی میں خرچ کیا جائے اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ اس کے ذریعے غلاموں کو خریدا جائے اور آزاد کیا جائے۔

لا جناح : یعنی کوئی گناہ نہیں ہے۔ **غیر متمول** : ''ولیها'' کے فاعل سے حال ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث وقف کے صحیح ہونے کی دلیل ہے اور اس میں طریقہ جاہلیت کی مخالفت ہے۔ اور تمام مسلمانوں کا بالاتفاق یہ مسلک ہے، نیز یہ حدیث اس بات کی بھی دلیل ہے کہ وقف جائیداد نہ فروخت کی جاسکتی ہے نہ ہبہ ہوسکتی ہے اور نہ کسی کی میراث بن سکتی ہے۔ اور واقف کی شرائط کے مطابق اس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ اور اس میں دلیل ہے واقف کے شرائط لگانے کے صحیح ہونے کے۔ یہ حدیث وقف کی فضیلت کو ظاہر کرتی ہے کیونکہ وقف ایک صدقہ جاریہ ہے، اور اس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اور امور میں فضیلت والے اور نیک لوگوں کے ساتھ مشورہ کرنے کی فضیلت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خیبر ''**عنوة**'' فتح ہوا تھا۔ اور مال غنیمت لینے والے اس کے مالک قرار پائے اور انہوں نے آپس میں تقسیم کیا، اور ان کی ملکیت ان کے حصوں پر ہمیشہ رہی۔ اور اس حدیث میں صلہ رحمی کی فضیلت اور قرابتداروں پر وقف کرنے کی فضیلت ہے۔

شرح السنہ میں لکھا ہے کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جس نے کوئی چیز وقف کی اور اس کے لئے کوئی متعین ذمہ دار مقرر نہیں کیا تو یہ جائز ہے۔ اس لئے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''**ولا جناح علی من ولیها ان یأکل منها**'' اور متولی کو متعین نہیں کیا۔ اور اس میں دلیل ہے کہ وقف کرنے والے کیلئے جائز ہے کہ وہ اپنے وقف سے بقدر ضرورت نفع حاصل کرے کیونکہ آپ ﷺ نے بقدر ضرورت اس شخص کیلئے مباح قرار دیا جو اس کا متولی ہو اور واقف اپنے وقف کا متولی ہوتا ہے۔ اور اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے اس شخص سے جو ہدی جانور ساتھ لایا تھا یہ فرمایا کہ اس پر سوار ہو جا، نیز اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ایسا کوئی شخص ہے جو بئر رومہ (مدینہ کا ایک کنواں تھا) خریدے؟ اس کویں میں اس شخص کا ڈول مسلمانوں کے ڈول کی طرح ہوگا۔ چنانچہ حضرت عمر نے اس کنویں کو خریدا اور مسلمانوں کیلئے وقف کر دیا۔ اور حضرت انس نے ایک گھر کو وقف کیا تھا۔ اور حضرت انس جب وہاں آتے تو اس میں رہتے تھے۔

ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو ''باب الوقف'' میں ذکر کرنا زیادہ مناسب تھا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

۳۰۰۹: وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ الْعُمْرٰى جَائِزَةٌ. (متفق علیه)

اخرجه فی صحیحه ۵/۲۳۱ الحديث رقم ۲۶۲۶ ومسلم فی صحیحه ۳/۲۴۸ الحديث رقم (۳۲-۱۶۲) وابوداوٗد فی السنن ۳/۸۱۶ الحديث رقم ۳۵۴۸ والنسائی فی ۶/۲۷۷ الحديث رقم ۳۵۴۸ واحمد فی المسند ۲/۳۴۷

ترجمہ: ''اور حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: عمریٰ (ساری عمر کا عطیہ) جائز ہے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: **العمریٰ** : عین پر ضمہ، میم پر سکون، راء پر فتحہ اور اس کے بعد الف مقصورہ ہے۔ عسقلانی فرماتے ہیں کہ میم کا ضمہ بھی نقل کیا گیا ہے حرف اول کے ضمہ کے ساتھ، اور حرف اول کا فتحہ بھی نقل کیا گیا ہے میم کے سکون کے ساتھ۔ ماخوذ ہے ''**العمر**'' سے اور ''**رقبٰی**'' اس کے وزن پر ہے ماخوذ ہے ''**المراقبة**'' سے۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''عمریٰ'' قائل کا یہ قول ہے: **اعمرتك هذه الدار او جلعتها لك عمرك او حياتك او ما عشت**، کہ میں نے یہ مکان تمہیں تمہاری زندگی تک کیلئے دیدیا ہے، یا وہ الفاظ جو اس معنی کا فائدہ دیں۔ ابن الملک فرماتے ہیں کہ ''عمریٰ'' کہتے ہیں گھر ''**معمور له**'' (جس کو کوئی چیز بطور ''عمریٰ'' دی جائے) کو اس کی زندگی تک دینا اس شرط کے ساتھ کہ جب وہ مرجائے تو یہ گھر ''واہب'' کی طرف لوٹے گا۔ یہ شرط باطل ہے کیونکہ حدیث میں ہے: ''**فهی له حال حياته ولورثته بعده**'' یعنی ''معمورلہ'' کے زندگی تک اُس کا ہوگا اور اس کے بعد اس کے ورثاء کا۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ ہمارے علماء کہتے ہیں کہ عمری کی تین صورتیں ہیں:

اول: کوئی شخص کسی کو مکان دے دے اور یہ کہے کہ میں نے اپنا یہ مکان تمہیں دیا، جب تک تم زندہ رہو گے یہ تمہارا ہے، تمہارے مرنے کے بعد تمہارے وارثوں کا ہو جائے گا، اس صورت کے بارے میں تمام علماء کا بالاتفاق مسلک یہ ہے کہ یہ ہبہ ہے اور یہ جس شخص کو دیا گیا ہے اس کی ملکیت میں آجاتا ہے' اس شخص کے مرنے کے بعد اس کے ورثاء اس مکان کے مالک ہو جاتے ہیں، اگر ورثاء نہ ہوں تو بیت المال میں داخل ہو جاتا ہے' ''واہب'' کی ملک میں کبھی نہیں لوٹے گا۔

دوم: وہ صرف اپنے اس قول پر اکتفاء کریں کہ یہ مکان تمہاری زندگی تک تمہارا ہے اور اس کے سوا کوئی بات نہ کریں۔ اس صورت کے بارے میں امام شافعیؒ کے دو قول ہیں اور ان میں سے زیادہ صحیح قول جدید ہے، کہ ''عمریٰ'' کی یہ صورت درست ہے اور اس کا بھی وہی حکم ہے جو پہلی صورت کا حکم ہے۔

سوم: دینے والا کہے کہ یہ مکان تمہاری زندگی تک تمہارا ہے، تمہارے مرنے کے بعد میری' اور میرے وارثوں کی ملکیت میں آجائے گا۔ اس کے صحیح ہونے میں اختلاف ہے۔ ہمارے ہاں صحیح یہ ہے کہ یہ صورت بھی درست ہے اور اس کا حکم بھی وہی ہے جو پہلی صورت کا ہے۔ انہوں نے احادیث مطلقہ پر اعتماد کیا ہے اور قیاس کی شرائط سے عدول کیا ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ عمریٰ مطلقہ صحیح ہے جس میں کوئی قید وشرط نہ ہو اور مؤقت فاسد ہے۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ ''عمریٰ'' کی تمام صورتوں میں منافع کی تملیک ہے۔ مثلاً منافع دار کی تملیک۔ ہے اور ''معمرلہ'' عین کا کسی بھی حالت میں مالک نہیں بنتا۔ اور امام ابوحنیفہ کا مذہب ہمارے مذہب کی طرح ہے۔

ہمارے علماء میں سے بعض شراح فرماتے ہیں کہ ''عمریٰ'' نام ہے اس کا کہ میں نے یہ چیز تمہاری زندگی تک تمہیں دیدی۔ اور یہ بالاتفاق جائز ہے اور قبضہ کرنے کے ساتھ مالک ہو جاتا ہے جیسے ہبہ کی دیگر تمام اقسام میں ہوتا ہے۔ اور ''عمریٰ'' کے طور پر دی ہوئی چیز کی معمرلہ کی طرف سے وارث بھی بنتے ہیں جیسا کہ اس کے باقی تمام اموال میں ہوتا ہے، یہ اکثر علماء کا مسلک ہے، اس حدیث کے بعد متصل آنے والی دو حدیثوں کی وجہ سے۔ اور اس میں اختلاف ہے امام مالک کا کہ ان کے نزدیک ''معمِر'' کی طرف لوٹے گا۔ انہوں نے استدلال کیا ہے حضرت جابر کی حدیث سے جو اگلی دو حدیثوں کے بعد آرہی ہے۔ اور اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ایک تاویل ہے جو حضرت جابر نے اپنی طرف سے بیان کی ہے اور حضرت جابر کی وہ احادیث جو انہوں نے نبی ﷺ سے نقل کی ہیں اس کے خلاف پر

دلالت کر رہی ہیں۔

تخریج: سیوطی کی الجامع الصغیر میں ہے: "**العمرٰی جائزة لاهلها**"۔ اور اس کو روایت کیا ہے احمد، بخاری اور مسلم، نسائی نے حضرت جابر سے اور حضرت ابو ہریرہ سے بھی، اور روایت کیا ہے احمد ابو داؤد، اور نسائی نے حضرت زید بن ثابت اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور روایت کیا ہے مسلم، ابوداؤد، اور نسائی نے حضرت جابر سے ان الفاظ کے ساتھ: "**العمرٰی لمن وهبت له**"۔

عمریٰ، معمولہ کے ورثاء کی ملکیت بن جاتا ہے

۳۰۱۰: وَعَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ اِنَّ الْعُمْرٰی مِيْرَاثٌ لِاَ هْلِهَا. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ۱۲۴۷/۳ الحديث رقم (۳۱-۱۶۲۵)۔

ترجمہ: "اور حضرت جابرؓ نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: عمریٰ اپنے مالک (یعنی معمرلہ) کے ورثاء کی میراث ہے"۔ (مسلم)

تشریح: قوله :ان العمرٰی میراث لاهلها :

یہ حدیث دلیل ہے کہ عمریٰ کو کہتے ہیں۔ یہ مالک کے خلاف حجت ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ عمریٰ میں صرف منفعت کا مالک بنایا جاتا ہے، نہ کہ اصل چیز کا۔

قوله :رواه مسلم : یعنی حضرت جابر اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے جیسے کہ الجامع الصغیر میں ہے۔ اور طبرانی نے روایت کیا ہے صحیح سند کے ساتھ حضرت زید بن ثابت سے اور اس کے الفاظ یہ ہیں: "**العمرٰی والرقبٰی سبیلها سبیل المیراث**"۔ رقبیٰ کا معنی اور حکم عنقریب آرہا ہے۔

۳۰۱۱: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَيُّمَا رَجُلٍ اَعْمَرَ عُمْرٰی لَهٗ وَلِعَقِبِهٖ فَاِنَّهَا لِلَّذِیْ اُعْطِيَهَا لَا يَرْجِعُ اِلَی الَّذِیْ اَعْطَاهَا لِاَنَّهٗ اَعْطٰی عَطَاءً وَقَعَتْ فِيْهِ الْمَوَارِيْثُ. (متفق عليه)

اخرجه البخاری فی صحيحه ۲۳۸/۵ الحديث رقم ۲۶۲۵ ومسلم فی ۱۲۴۵/۳ الحديث رقم (۲۰-۱۶۲۵) وابو داؤد فی السنن ۸۱۹/۳ الحديث رقم ۳۵۵۳ والترمذی فی ۶۳۲/۳ الحديث رقم ۱۳۵۰ وابن ماجه فی ۷۹۶/۲ الحديث رقم ۲۳۸۰۔

ترجمہ: "اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اگر کسی شخص اور اس کی اولاد کو کوئی چیز بطور عمریٰ دی گئی تو وہ عمریٰ انہی کا ہو جاتا ہے جنہیں وہ دیا گیا ہے (یعنی وہ چیز اس کی ملکیت ہو جاتی ہے) عمریٰ دینے والے کی ملکیت میں واپس نہیں آئے گی کیونکہ دینے والے نے ایسا عطیہ دیا ہے کہ اس میں میراث واقع ہو گئی ہے"۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله :اَيُّمَا رَجُلٍ اَعْمَرَ عُمْرٰی لَهٗ وَلِعَقِبِهٖ فَاِنَّهَا لِلَّذِیْ اُعْطِيَهَا :

اعمر : صیغہ مجہول کے ساتھ۔ **عمرٰی :** مفعول مطلق ہے۔ **له :** اعمر کا متعلق ہے اور ضمیر "رجل" کی طرف راجع ہے۔

عقبه : قاف کے کسرہ کے ساتھ۔ بعض کہتے ہیں کہ سکون کے ساتھ ہے۔

فانها : ضمیر عمرٰی کی طرف راجع ہے۔ **للذی اعطیها :** صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

لا ترجع : صیغہ مؤنث کے ساتھ ہے اور بعض کہتے ہیں کہ صیغہ مذکر کے ساتھ ہے۔

لانه اعطی : صیغہ فاعل کے ساتھ ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ مبنی للمفعول ہے۔

معنی یہ ہے کہ جو چیز کسی شخص کو بطور عمریٰ دی جاتی ہے وہ اس شخص (یعنی معمرلہ) کی ہو جاتی ہے، اور اس کے مرنے کے بعد اس کے

وارثوں کی ہو جاتی ہے، جیسے اس کی باقی تمام املاک وارثوں کی ملکیت میں چلی جاتی ہے اور ''معمر'' کی ملکیت میں واپس نہیں آتی۔ جیسا کہ ہبہ کی ہوئی چیز میں رجوع کرنا جائز نہیں ہے۔ اور یہی امام ابوحنیفہ اور شافعی کا مسلک ہے خواہ اس نے عقبہ کا لفظ ذکر کیا ہو، یا نہ کیا ہو۔ اور امام مالک فرماتے ہیں کہ دینے والے کی ملکیت میں واپس آجاتی ہے اگر وہ زندہ ہو اور اس کے ورثاء کے ملکیت میں آجاتی ہے، اگر وہ مر گیا ہو بشرطیکہ اس نے عقبہ کا ذکر نہ کیا ہو۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ حدیث اپنے ظاہری مفہوم کے اعتبار سے دلالت کر رہی ہے کہ مطلق عمریٰ میں وراثت نہیں چلتی، بلکہ وہ ''معمر'' کی طرف واپس آجاتی ہے۔ اور حضرت جابر سے منقول قول میں بھی اس کی تصریح ہے مگر وہ غیر مرفوع ہے۔

مسلک جمہور کے خلاف حضرت جابر کی روایت اور اس کی تاویل

۳۰۱۲: وَعَنْهُ قَالَ اِنَّمَا الْعُمْرٰى الَّتِىْ اَجَازَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَنْ يَّقُوْلَ هِىَ لَكَ وَلِعَقِبِكَ فَاَمَّا اِذَا قَالَ هِىَ لَكَ مَا عِشْتَ فَاِنَّهَا تَرْجِعُ اِلٰى صَاحِبِهَا. (متفق علیه)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۳/۱۲۳۶ الحدیث رقم (۲۳-۱۶۲۵) وابو داؤد فی ۳/۸۲۰ الحدیث رقم ۳۵۵۱ واحمد فی المسند ۳/۲۹٤

ترجمه: ''اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے عمریٰ کی جس صورت کو جائز قرار دیا ہے وہ یہ ہے کہ مالک (یعنی دینے والا) یوں کہے کہ ''یہ چیز (تمہاری زندگی تک) تمہاری اور (تمہارے مرنے کے بعد) تمہارے ورثاء کی ہے۔ اگر صرف یوں کہے کہ ''یہ عمریٰ اس وقت تک تمہارے لئے ہے جب تک تم زندہ ہو تو اس صورت میں (اس شخص کے مرنے کے بعد) وہ عمریٰ مالک (یعنی دینے والے) کی ملکیت میں واپس لوٹ آئے''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: قوله: **اِنَّمَا الْعُمْرٰى الَّتِىْ اَجَازَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَنْ يَّقُوْلَ هِىَ لَكَ وَلِعَقِبِكَ** :

قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عمریٰ بالاتفاق جائز ہے اور قبضہ کرتے ہی ملکیت ثابت ہو جاتی ہے جیسے ہبہ کے تمام اقسام کا حکم ہے۔ اور بطور عمریٰ دی ہوئی چیز کا ''معمرلہ'' کی طرف سے وارث بھی بن جاتے ہیں جیسا کہ اس کے باقی تمام اموال میں ہوتا ہے خواہ اس نے مطلق ذکر کیا ہو یا اس کے بعد یہ بھی کہا ہو کہ تیرے بعد یہ تیرے ورثاء کی ہوگی۔ اور یہ اکثر علماء کا مذہب ہے۔ حضرت جابر کی اس روایت کی وجہ سے کہ جس میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''**العمرىٰ ميراث لاهلها**''. یعنی ''معمرلہ'' کے اہل کی۔ اور چونکہ عمریٰ کو مطلق ذکر کیا ہے نہ کہ مقید کیا ہے۔

ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ اگر دینے والے نے مطلق ذکر کیا کہ یہ تیرے لئے تمہاری زندگی تک اور اس کے بعد یہ نہیں کہا کہ تیرے بعد تیرے ورثا کیلئے ہے تو پھر اس میں وراثت نہیں چلے گی، بلکہ یہ دینے والے کی طرف واپس آجائے گا' اور اس میں صرف منفعت کا مالک بنانا ہوگا۔ یہ زہری اور امام مالک کا قول ہے۔ ان کی دلیل حضرت جابر کی دوسری حدیث ہے جس میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ''**ايما رجل اعمر** ......''. کیونکہ مفہوم شرط جس کو 'ایما'' متضمن ہے اور مفہوم تعلیل یہ دلالت کرتے ہیں کہ جس کو یہ چیز بطور عمریٰ نہیں دی گئی ہے وہ عمریٰ کو بطور میراث بھی نہیں لے سکتا بلکہ دینے والے کی طرف واپس آجائے گا۔ اور دوسری دلیل حضرت جابر کی تیسری روایت ہے' وہ فرماتے ہیں: **انما العمرىٰ التى اجاز** ......

پہلی دلیل کا جواب یہ ہے کہ آپ کی دلیل کی بنیاد تین امور پر مبنی ہے: (۱) مفہوم پر' (۲) عموم پر (۳) منطوق میں تخصیص کے جواز پر۔

اور دوسری دلیل کا جواب یہ ہے کہ یہ ایک تاویل اور قول ہے جو حضرت جابر کی اپنی رائے اور اجتہاد سے صادر ہوا ہے، پس یہ جمہور

کے خلاف کوئی دلیل نہیں ہے۔

الفصل الثانی:

عمریٰ اور رقبیٰ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ممانعت اور اس کی وضاحت

۳۰۱۳: عَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ لَا تُرْقِبُوْا وَلَا تُعْمِرُوْا فَمَنْ اُرْقِبَ شَيْئًا اَوْ اُعْمِرَ فَهِيَ لِوَرَثَتِهِ.

(رواه ابوداود)

اخرجه ابو داوٗد في السنن ۳/ ۸۲۰ الحديث رقم ۳۵۵۶، والنسائي في ۶/ ۲۷۳ الحديث رقم ۳۷۳۱۔

ترجمہ: ''حضرت جابرؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم بطور رقبیٰ کوئی چیز دو نہ بطور عمریٰ کوئی چیز دو۔ جس شخص کو بطور رقبیٰ یا بطور عمریٰ کو کوئی چیز دی گئی تو وہ اس کے ورثاء کی (ملکیت میں) ہے۔''۔(ابوداؤد)

تشریح: **قوله :لا ترقبوا** :''ارقاب'' سے ہے بمعنیٰ'' **مراقبه**''۔اور اسم ''رقبیٰ'' آتا ہے۔

رقبیٰ کی صورت یہ ہے کہ میں نے اپنا یہ گھر تمہیں ہبہ کر دیا، پس اگر تو مجھ سے پہلے مرا تو یہ میری ملکیت میں آجائے گا اور اگر میں تجھ سے پہلے مر گیا تو یہ گھر تمہاری ملکیت میں رہے گا۔

اس تشریح کی روشنی میں ''رقبیٰ'' مراقبہ سے ماخوذ ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کی موت کے انتظار میں ہوتا ہے جیسا کہ تلخیص النہایہ میں ہے۔''رقبیٰ'' امام ابوحنیفہ اور محمد کے نزدیک جائز نہیں ہے اور امام ابو یوسف کے ہاں جائز ہے۔

قوله :ولا تعمروا :اعمار سے ہے۔بعض حنفی شارحین حدیث نے اس حدیث کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ یہ نہی ارشاد ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اپنا مال ایک مدت تک کیلئے ہبہ نہ کرو کہ جب وہ مدت پوری ہو جائے تو اپنا مال واپس لے لو' بلکہ جب تم کوئی چیز ہبہ کر دو تو وہ تمہاری ملکیت سے نکل گئی اب وہ تمہاری ملکیت میں نہیں آئے گی، خواہ تم وہ چیز ہبہ کے طور پر دو یا عمریٰ و رقبیٰ کے طور پر دو۔

اور رقبیٰ اسم ہے۔''**ارقب الرجل**'' سے ماخوذ ہے۔ جب وہ کسی کو کہے کہ میں نے چیز تجھ ہبہ کر دی اس شرط پر کہ اگر میں تم سے پہلے مر گیا تو یہ چیز تیرے ہی پاس رہے گی اور اگر تم مجھ سے پہلے مر گئے، تو چیز واپس میری طرف لوٹے گی۔اس کی اصل 'مراقبہ' ہے اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کی موت کا انتظار کرتا ہے۔

ارقب شيا او اعمر :دونوں صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

فهي :یہ ضمیر اس عمریٰ یا رقبیٰ' کی طرف لوٹ رہی ہے جو فعلوں سے مفہوم ہو رہے ہیں۔اور ایک نسخہ میں' **وهي**'' ہے۔اور ظاہر یہ ہے کہ یہ ''**فهو**'' ہے شئی کی تاویل میں ہے۔

لورثته :امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ضمیر ''**معمر له**'' کی طرف راجع ہے اور اسی طرح اهلها میں ہے' اور ''**فمن ارقب**'' میں' فاء نہی کا سبب اور علت بیان کرنے کے لئے ہے۔مطلب یہ ہے کہ تم رقبیٰ اور عمریٰ کے طور پر کوئی چیز نہ دو کہ تم اس گمان اور دھوکے میں پڑے ہو کہ ان میں سے ہر ایک 'معمر له' کی ملکیت میں نہیں جاتا بلکہ اس کی موت کے بعد تمہاری ملکیت میں واپس آجائے گا، حالانکہ ایسا نہیں ہے' بلکہ جس نے کوئی چیز کسی کو بطور رقبیٰ یا عمریٰ دے دی تو وہ 'معمر له'' کے ورثاء کی ہوگی اس کے بعد۔پس اس معنی کے اعتبار سے جمہور کے مذہب کا صحیح ہونا متحقق ہو جاتا ہے کہ عمریٰ ''معمر له'' کی ہوتی ہے اور وہ ملک تام کے ساتھ اس کا مالک بن جاتا ہے وہ اس میں بیع وغیرہ جیسے تصرف کر سکتا ہے اور اس کے بعد یہ اس کے ورثہ کی ملکیت میں چلی جاتی ہے۔اور اس تاویل کی تائید فصل ثالث میں آنے والی حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

نہایہ میں ہے کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ اس طرح کرتے تھے تو شارع نے اس کو باطل قرار دیدیا، اور ان کو بتا دیا کہ جو کسی کو کوئی چیز

اس کی زندگی تک بطور عمریٰ یا رقبیٰ دیدے تو وہ اس کی موت کے بعد اس کے ورثاء کی ہو جاتی ہے۔ بہت ساری روایات اس پر متفق ہیں۔ اور فقہاء کا اس میں اختلاف ہے، پس بعض تو ان میں سے حدیث کے ظاہر پر عمل کرتے ہیں اور اس کو تملیک قرار دیتے ہیں اور بعض اس کو عاریت کی طرح قرار دیتے ہیں اور حدیث میں تاویل کرتے ہیں۔

عمریٰ اور رقبیٰ جائز ہے

۳۰۱۴: وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ الْعُمْرٰی جَائِزَةٌ لِاَ هْلِهَا وَالرُّقْبٰی جَائِزَةٌ لِاَهْلِهَا

(رواہ احمد والترمذی وابوداود)

اخرجه ابوداوٗد فی السنن ۳/۸۲۱ الحدیث رقم ۳۵۵۷ والترمذی فی ۳/۶۳۳ الحدیث رقم ۱۳۵۱ والنسائی فی ۶/۲۷٤ الحدیث رقم ۲۸۳۹ وابن ماجه فی ۲/۷۹۷ الحدیث رقم ۲۳۸۳ واحمد فی المسند ۳/۳۰۳

ترجمہ: ''اور حضرت جابرؓ نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''عمریٰ' معمر لہ کے گھر والوں کے لئے جائز ہے (یعنی جس شخص کو کوئی چیز بطور عمریٰ دی گئی وہ اس کے لئے جائز ہے) اور رقبیٰ' مرقب لہ کے گھر والوں کے لئے جائز ہے (یعنی جو چیز بطور رقبیٰ کسی کو دی گئی وہ اس کے لئے جائز ہے''۔ (احمد' ترمذی' ابوداود)

تشریح: اسی طرح نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے احمد، اور نسائی نے حضرت ابن عباس سے ان الفاظ کے ساتھ:
''العمریٰ جائزة لمن اعمرها' والرقبیٰ جائزة لمن ارقبها والعائد فی هبته کالعائد فی هبته''۔

الفصل الثالث:

جواز عمریٰ کی بظاہر مخالف ایک اور حدیث

۳۰۱۵: عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَمْسِکُوْا اَمْوَالَکُمْ عَلَيْکُمْ لَا تُفْسِدُوْهَا فَاِنَّهٗ مَنْ اَعْمَرَ عُمْرٰی فَهِيَ لِلَّذِيْ اُعْمِرَ حَيًّا وَّمَيِّتًا وَّلِعَقِبِهٖ. (رواہ مسلم)

اخرجه فی صحیحه ۳/۱۲٤٦ الحدیث رقم (۲٦-۱٦۲۵) واحمد فی المسند ۳/۳۱۲۔

ترجمہ: ''حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم اپنے مال اپنے پاس رکھو انہیں خراب مت کرو' کیونکہ جس کسی کو اپنی کوئی چیز عمریٰ کے طور پر دی تو وہ چیز (یعنی مکان یا زمین) کہ جو عمریٰ کے طور پر دی گئی ہے زندگی و موت دونوں حالتوں میں اس شخص کی ملکیت رہتی ہے جسے وہ چیز بطور عمریٰ دی گئی ہے (بایں طور کہ جب تک وہ زندہ رہتا ہے تو خود اس چیز کا مالک رہتا ہے اور اس کے مرنے کے بعد) پھر اس کی اولاد مالک بن ہے''۔ (مسلم)

تشریح: قوله: **اَمْسِکُوْا اَمْوَالَکُم...... مَنْ اَعْمَرَ عُمْرٰی ...... لا تفسدوها** : یہ نہی امر کیلئے تاکید ہے۔

فانه : ضمیر شان ہے۔ **للذی اعمر** : صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

حیا : یہ دلالت کرتا ہے کہ ''**معمر له**'' اس کا مالک بن جاتا ہے اور اس کے لئے اس کو فروخت کرنا اور دیگر تمام تصرفات جائز ہیں۔ خواہ وہ اس کے ذریعے قرض اداء کرے یا وصیت کرے کسی کیلئے یا وقف کر دے۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ان کو بتا دیا کہ عمریٰ ایک صحیح ہبہ ہے اور جس کو ہبہ کیا جائے اس کو ملک تمام حاصل ہو جاتی ہے واہب کی طرف کبھی بھی واپس نہیں لوٹے گی۔ اور جب یہ بات جان لی، پس جو چاہے کوئی چیز بطور عمریٰ کے دے اور اس میں بصیرت کے ساتھ داخل ہو اور جو چاہے تو چھوڑ دے اس لئے کہ وہ اس کو عاریت کی طرح سمجھتے تھے اور اس میں رجوع کرتے تھے یہ امام شافعی اور ان کے موافقین کی دلیل ہے، (انتہیٰ) حق یہ تھا کہ اس طرح کہتے کہ یہ امام ابوحنیفہ اور ان کے متبعین کی دلیل ہے۔

بَابٌ

گزشتہ باب کے متعلقات کا بیان

الفصل الاول :

خوشبودار پھول کا تحفہ واپس نہ کرو

۳۰۱۶: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ عُرِضَ عَلَیْهِ رَیْحَانٌ فَلَا یَرُدُّهٗ فَاِنَّهٗ خَفِیْفُ الْمَحْمَلِ طَیِّبُ الرِّیْحِ (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ٤/١٧٦٦ الحدیث رقم (٢٠-٢٢٥٣) وابو داوٗد فی ٤/٤٠٠ الحدیث رقم ٤١٧٢ والترمذی فی السنن ٥/١٠٠ الحدیث رقم ٢٧٩١ والنسائی ٨/١٨٩ الحدیث رقم ٥٢٥٩

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص کو خوشبودار پھول (تحفہ کے طور پر) پیش کیا جائے تو وہ اسے واپس نہ کرے کیونکہ (اول تو) وہ ہلکا سا احسان ہے اور (دوسرے یہ کہ) وہ ایک اچھی خوشبو ہے''۔ (مسلم)

تشریح: قولہ: مَنْ عُرِضَ عَلَیْهِ رَیْحَانٌ فَلَا یَرُدُّهٗ :

ریحان : اُگنے والی خوشبودار چیز جو سونگھے جانے والی چیزوں کی انواع سے ہو۔ جیسا کہ نہایہ میں ہے۔

فلا یردہ : دال مشدد کے ضمہ کے ساتھ ہے' فتحہ کے ساتھ بھی منقول ہے اور اول تصحیح شدہ نسخوں میں منقول ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قاضی عیاض رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ محدثین کی روایت اس حدیث میں دال کے فتحہ کے ساتھ ہے، اور فرمایا کہ اہل عربیت میں سے ہمارے محققین شیوخ نے اس پر نکیر کی ہے، اور فرمایا ہے کہ یہ رواۃ کی طرف سے غلطی ہے، اور درست دال کے ضمہ کے ساتھ ہے، فرمایا میں نے بعض مشائخ کے خط کے ساتھ بضم الدال پایا ہے۔ اور یہی ان کے نزدیک درست ہے سیبویہ کے مذہب کے مطابق۔ اور یہ مضاعف میں ہے کہ جب اس پر ھاء داخل ہو تو امر میں اس کے ماقبل کو ضمہ دیا جاتا ہے، اور اس طرح مجزوم ہو (تو تب بھی اس کے ماقبل کو ضمہ دیا جاتا ہے) میں اس واؤ کی رعایت کرتے ہوئے جس کو لازم کرتا ہے اس کے بعد ھاء کا ضمہ اور واؤ کا ماقبل ہمیشہ مضموم ہوتا ہے۔ یہ کلام تو مذکر کے صیغہ میں ہے، اور جو مؤنث ہے جیسے ردھا، وحدھا، دال کے فتحہ کے ساتھ ہے الف کی رعایت کرتے ہوئے، (یہ قاضی کا آخری کلام ہے)۔ باقی ردھا اور اس کی نظیر مؤنث میں تو اس میں دال کا فتحہ لازم ہے بالاتفاق۔ اور ردہ وغیرہ مذکر میں تین وجوہ ہیں: سب سے فصیح وجوب ضمہ ہے (جیسا کہ اس کو ذکر کیا ہے قاضی نے) دوسری وجہ کسرہ کے ساتھ ہے۔ یہ ضعیف ہے، اور تیسری وجہ فتحہ کے ساتھ ہے۔ یہ اضعف ہے۔ (انتہی کلامہ)

علامہ تفتازانی رحمہ اللہ شرح زنجانی میں فرماتے ہیں کہ جب مجزوم کے ساتھ حالت ادغام میں ھاء مل جائے تو اس میں ایک ہی وجہ لازم ہے، جیسا ''ردھا'' وغیرہ میں فتحہ کے ساتھ اور ''ردہ'' وغیرہ میں ضمہ کے ساتھ۔ فصیح ہے اور ''ردہ'' کو کسرہ کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے۔ یہ ضعیف ہے۔ (انتہی)

اور ظاہر یہ ہے کہ فتح فصیح ہے جو افصح کا مقابل ہے، لیکن یہ مخالف ہے اس کا جو شافیہ میں ہے کہ کسرہ ایک لغت ہے اور ثعلب نے غلطی کی ہے فتحہ کے جواز میں، (انتہی)

اور شاید محققین نے فتحہ کو جو منسوب کیا ہے غلطی کی طرف، باوجودیکہ یہ عربیت میں ایک وجہ ہے۔ آپ ﷺ کے کلام کو غیر افصح پر محمول کرنے سے بچانے کیلئے، حالانکہ آپ ﷺ نے فرمایا: "انا افصح العرب بید انی من قریش"۔ اور محدثین کا فتحہ کو اختیار کرنے میں یہ عذر پیش کرنا کہ قطع نظر اس کے کہ فتح اخف الحرکات ہے، کہ تاکہ نصب ہو نہی کی بناء پر اس لئے کہ ضمہ میں نفی اور نہی دونوں کا احتمال ہے بلکہ زیادہ ظاہر نفی ہے **فتامل** 'اور اس کے باوجود رفع ارفع ہے محققین کے نزدیک برتقدیر نہی موافقت عربیت کی وجہ سے' اور برتقدیر نفی زیادہ بلیغ طریقہ کی وجہ سے' اس لئے کہ مقام نہی میں شارع کی طرف سے نفی، صریح نہی سے زیادہ مؤکد ہے۔

فانه : یعنی ریحان، یا اس کا دینا، یا اس کا قبضہ کرنا اور لینا۔ "**خفیف المحمل**" کا مطلب یہ ہے کہ یہ کم احسان والی ہے۔

طیب الریح : اس لئے کہ اس سے جنت کی خوشبو سونگھی جاتی ہے۔ چونکہ منقول ہے کہ یہ جنت سے نکلا ہے جیسے کہ حدیث میں عنقریب آنے والا ہے۔

امام طیبی فرماتے ہیں تحفہ کو واپس نہ کرنے کی علت یہ ہے کہ تحفہ جب کمتر ہونے کی وجہ سے زیادہ احسان نہیں رکھتا اور مفید زیادہ ہے تو اسے واپس نہ کرو تاکہ جس شخص نے وہ تحفہ دیا ہے اس کی دل شکنی نہ ہو، (انتہی)۔ اس میں اشارہ ہے لوگوں کے دلوں کا خیال رکھنے کی طرف ان کے تحفوں کو قبول کرنے کے ساتھ اور حدیث میں وارد ہے: "**تھادوا تحابوا**"۔

۳۰۱۷: وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ كَانَ لَا يَرُدُّ الطِّيْبَ (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۰/ ۳۷۰ الحدیث رقم ۵۹۲۹۔ والنسائی فی السنن ۸/ ۱۸۹ الحدیث رقم ۵۲۵۸۔

ترجمہ: "اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ خوشبو (کے تحفے) کو واپس نہیں لوٹایا کرتے تھے"۔ (بخاری)

تشریح: الطیب : طاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

کسی کو کوئی چیز دے کر پھر واپس لے لینا ایک بری مثال ہے

۳۰۱۸: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْعَائِدُ فِیْ هِبَتِهٖ كَالْكَلْبِ يَعُوْدُ فِیْ قَيْئِهٖ لَيْسَ لَنَا مَثَلُ السَّوْءِ. (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۵/ ۲۳۴ الحدیث رقم ۲۶۲۲ ومسلم فی ۳/ ۱۲۴۰ الحدیث رقم (۵/ ۱۶۲۲) وابو داؤد فی السنن ۳/ ۸۰۸ الحدیث رقم ۳۵۳۸ والنسائی فی ۶/ ۲۶۷ الحدیث رقم ۳۷۰۱ وابن ماجه فی ۲/ ۷۹۷ الحدیث رقم ۲۳۸۵

ترجمہ: "اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اپنے تحفہ کو واپس لینے والا (یعنی کسی کو کوئی چیز بطور ہدیہ و تحفہ دے کر پھر اسے واپس لینے والا) اس کتے کی مانند ہے جو اپنی قے کر کے چاٹتا ہے اور ہمارے لئے بری مثال نہیں ہے (کہ ہم کسی بری مثال سے تشبیہ دیئے جائیں)"۔ (بخاری)

تشریح: قوله : اَلْعَائِدُ فِیْ هِبَتِهٖ كَالْكَلْبِ يَعُوْدُ فِیْ قَيْئِهٖ لَيْسَ لَنَا مَثَلُ السَّوْءِ :

اس جملہ میں قبیح طبعی کو تشبیہ قبیح حسی کے ساتھ دی ہے۔

السوء : حرف اول کے فتحہ کے ساتھ، اور ضمہ کے بھی درست ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری ملت اور قوم کیلئے مناسب نہیں ہے کہ وہ ایسا کام کرے جس کی وجہ سے ان کو بری تشبیہ دی جائے۔ اور قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے لئے مناسب نہیں ہے، مراد آپ ﷺ کا اپنا نفس اور مؤمنین ہیں، کہ ہم ایسی بری صفات کے ساتھ متصف ہوں جس میں خسیس حیوانات اپنی خسیس حالت میں ہمارے برابر ہوں۔ اور "

مثل" کا اطلاق اس صفت میں ہوتا ہے جس کی شان غریب اور عجیب ہو خواہ وہ صفت مدح ہو یا ذم ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿للذین لا یؤمنون بالآخرۃ مثل السوء للّٰہ المثل الاعلی﴾ [النحل۔۶۰]

اس سے استدلال کیا گیا ہے ہبہ کی ہوئی چیز میں رجوع کے عدم جواز پر، جس شخص پر ہبہ کیا گیا ہے اس کے قبضہ کرنے کے بعد۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ مثال ظاہر ہے ہبہ اور صدقہ میں ان پر قبضہ کرنے کے بعد رجوع کرنے کی حرمت میں اور یہ محمول ہے اجنبی کے ہبہ پر نہ کہ جو بیٹے یا پوتے پر ہبہ کیا گیا ہو، جیسا کہ نعمان بن بشیر کی حدیث میں اس کی تصریح ہے اور یہ امام شافعی، مالک اور اوزاعی کا مسلک ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور دیگر فقہاء فرماتے ہیں کہ ہر ہبہ کرنے والا رجوع کر سکتا ہے، سوائے بیٹے کے اور ہر قریبی رشتہ دار کے۔ تور پشتی فرماتے ہیں کہ جن لوگوں کے ہاں اجنبی سے ہبہ میں رجوع کرنا جائز ہے ان کے ہاں یہ حدیث کراہت تنزیہی پر محمول ہے نہ کہ رجوع کی حرمت پر اور حضرت عمرؓ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ جب انہوں نے اس گھوڑے کو خریدنے کا ارادہ کیا جو انہوں نے اللہ کے راستے میں صدقہ کیا تھا، تو اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، آپ نے فرمایا کہ "اسے نہ خریدو اگرچہ وہ تمہیں ایک درہم کے عوض دے اور اپنے صدقہ میں نہ لوٹنا اس لئے کہ صدقہ میں رجوع کرنے والا اس کتے کی طرح ہے جو اپنی قے چاٹتا ہے"۔ امام صاحب فرماتے ہیں کہ جب اس قول سے صدقہ کی ہوئی چیز کے خریدنے کی حرمت لازم نہیں اسی طرح یہ حدیث بھی ہبہ میں رجوع کی حرمت کو لازم نہیں۔ (انتہٰی)

اس پر امام طیبی نے گرفت کی ہے جو قابل تعجب ہے۔

تخریج: "الجامع الصغیر" میں لکھتے ہیں: "العائد فی ھبتہ کالعائد فی قیئہ" اس حدیث کو امام احمد، شیخین، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

کوئی چیز دینے میں اولاد کے درمیان فرق وامتیاز نہ کرو

۳۰۱۹: **وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ اَنَّ اَبَاهُ اَتٰى بِهٖ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ اِنِّىْ نَحَلْتُ ابْنِىْ هٰذَا غُلَامًا فَقَالَ اَكُلَّ وَلَدِكَ نَحَلْتَ مِثْلَهٗ قَالَ لَا قَالَ فَارْجِعْهُ (وَفِىْ رِوَايَةٍ) اَنَّهٗ قَالَ اَيَسُرُّكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا اِلَيْكَ فِى الْبِرِّ سَوَاءً قَالَ بَلٰى قَالَ فَلَا اِذًا وَفِىْ رِوَايَةٍ اَنَّهٗ قَالَ اَعْطَانِىْ اَبِىْ عَطِيَّةً فَقَالَتْ عَمْرَةُ بِنْتُ رَوَاحَةَ لَا اَرْضٰى حَتّٰى تُشْهِدَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَاَتٰى رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ اِنِّىْ اَعْطَيْتُ ابْنِىْ مِنْ عَمْرَةَ بِنْتِ رَوَاحَةَ عَطِيَّةً فَاَمَرَتْنِىْ اَنْ اُشْهِدَكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اَعْطَيْتَ سَائِرَ وَلَدِكَ مِثْلَ هٰذَا؟ قَالَ لَا قَالَ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْدِلُوْا بَيْنَ اَوْلَادِكُمْ قَالَ فَرَجَعَ فَرَدَّ عَطِيَّتَهٗ (وَفِىْ رِوَايَةٍ) اَنَّهٗ قَالَ لَا اُشْهَدُ عَلٰى جَوْرٍ.** (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه۵/۲۱۱ الحدیث رقم ۲۵۸۷ ومسلم فی صحیحه ۳/۱۲۴۱ الحدیث رقم (۱۶۲۳/۹) والترمذی فی السنن ۳/۶۴۹ الحدیث رقم ۱۳۶۷ ولنسائی فی ۶/۲۵۸ الحدیث رقم ۳۶۷۲ وابن ماجه فی ۲/۷۹۵ الحدیث رقم ۲۳۷۵ ومالك فی الموطأ ۲/۷۵۱ الحدیث رقم ۳۹ من کتاب الاحکام واحمد فی المسند ۴/۲۶۹

ترجمه: "اور حضرت نعمان بن بشیرؓ کے بارے میں منقول ہے کہ (ایک دن) ان کے والد (حضرت بشیر) انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے اور عرض کرنے لگے کہ میں نے اپنے اس بیٹے (نعمانؓ) کو ایک غلام عطا کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کیا تم نے اپنے سب بیٹوں کو اسی طرح ایک ایک غلام دیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "تو پھر (نعمان سے بھی) اس غلام کو واپس لے لو"۔ ایک اور روایت میں یوں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (نعمانؓ کے والد سے) فرمایا کہ کیا تم یہ پسند

کرتے ہو کہ تمہارے سب بیٹے تمہاری نظر میں نیکی کے اعتبار سے برابر ہوں (یعنی کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تمہارے سب بیٹے تمہارے ساتھ اچھا سلوک کریں اور سب ہی تمہاری فرمانبرداری اور تمہاری تعظیم کریں؟) انہوں نے عرض کیا کہ ہاں کیوں نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اس صورت میں (جب کہ تم اپنے تمام بیٹوں سے اپنے بارے میں مساوی سلوک کے خواہشمند ہوتو) پھر تم ایسا کیوں نہیں کرتے۔ ایک اور روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ "حضرت نعمانؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) میرے والد نے مجھے ایک چیز دی تو عمرہ بنت رواحہ (میری والدہ) نے (میرے والد حضرت بشیرؓ سے) کہا کہ میں اس پر اس وقت تک رضامند نہیں ہوں جب تک کہ تم اس (ہبہ) پر رسول اللہ ﷺ کو گواہ نہ بنالو چنانچہ وہ (حضرت بشیر رضی اللہ عنہ) آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے کہ "یارسول اللہ! میں نے اپنے بیٹے (نعمانؓ) کو جو عمرہ بنت رواحہ کے بطن سے ہے ایک چیز دی ہے یارسول اللہ! اور عمرہ بنت رواحہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اس ہبہ پر آپ ﷺ کو گواہ بنالوں۔ آپ ﷺ نے (یہ سن کر) ارشاد فرمایا کہ "تم نے اپنے سب بیٹوں کو اسی طرح کا ایک ایک غلام دیا ہے؟" انہوں نے کہا کہ "نہیں" آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ سے ڈرو! اور اپنی اولاد کے درمیان انصاف کا برتاؤ کرو!" حضرت نعمانؓ کہتے ہیں کہ میرے والد (آپ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی سن کر) واپس آئے اور اپنا عطیہ (مجھ سے) واپس لے لیا"۔ ایک اور روایت میں اس طرح ہے کہ "آپ ﷺ نے (حضرت بشیرؓ کی یہ بات سن کر) فرمایا کہ "میں ظلم پر گواہ نہیں بنتا"۔ (بخاری و مسلم)

راویٔ حدیث:

نعمان بن بشیر مسلمانوں میں سے انصار کا پہلا بچہ جو ہجرت کے بعد پیدا ہوا۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کی وفات کے وقت ان کی عمر آٹھ سال سات مہینے تھی اور ان کے والدین صحابی تھے۔

تشریح: **نحلت** : نون اور حاء کے فتحہ کے ساتھ۔ نہایہ میں کہا ہے کہ "نحل" عطیہ اور ہبہ کو کہتے ہیں جو ابتداء میں بغیر کسی عوض اور استحقاق کے ہو۔

فقال اکل ولدك : "کل" کے نصب کے ساتھ ہے۔

نحلت مثله : یہ دلالت کر رہا ہے کہ کسی چیز کے دینے میں بیٹوں اور بیٹیوں کے درمیان برابری کرنا مستحب ہے۔

قال لا قال فارجعه : ابن الملک فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ اس غلام کو واپس لے لو اور یہ حکم اولیٰ پر تنبیہ کیلئے ہے۔

الیك فی البر سواء : یعنی تیرے ساتھ اچھا سلوک کرنے، فرماں برداری، آداب واحترام اور تعظیم کرنے میں برابر ہوں۔

اذا : تنوین کے ساتھ ہے،

عمرة بنت رواحة : پہلے دو حرفوں کے فتحہ کے ساتھ، نعمان کی والدہ ہے۔

لا ارض : یعنی میرے بیٹے کو یہ عطیہ دینے پر۔

حتی تشهد رسول الله صلی الله علیه وسلم : یعنی اس قضیہ پر اس کو گواہ بنادے۔

قال اعطیت سائر ولدك مثل هذا : یعنی اپنے باقی سب بیٹوں کو اس طرح کا دیا ہے۔ ہمزہ استفہام کے حذف کے ساتھ ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کو ہمزہ ممدودہ کے ساتھ پڑھا جائے۔

واعدلوا بین اولادکم : اور خطاب عام حکم کے عموم کی طرف اشارہ ہے۔

فرد عطیة : اس سے معلوم ہوا کہ والد کا بیٹے سے ہبہ واپس لے لینا جائز ہے۔

جو حضرات اولاد کے درمیان فرق و امتیاز کو جائز قرار نہیں دیتے وہ جور کی تفسیر ظلم کے ساتھ کرتے ہیں، اور جو حضرات جائز قرار دیتے ہیں کراہت کے ساتھ وہ اس کی تفسیر "میل" کے ساتھ کرتے ہیں۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ اولاد کے درمیان ہبہ میں برابری کرنا مستحب ہے، پس بعض کو بعض پر فضیلت اور فوقیت نہ دی جائے خواہ بیٹے ہوں یا بیٹیاں ہوں۔ ہمارے بعض علماء نے کہا ہے کہ ایک بیٹے کو دو بیٹیوں کے برابر دینا چاہئے، لیکن ظاہر حدیث کی وجہ سے صحیح اول ہے۔ پس اگر کوئی شخص اپنی اولاد میں بعض کو دے اور بعض کو نہ دے، تو امام شافعی، امام مالک اور امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ کا مذہب یہ ہے کہ یہ مکروہ ہے' حرام نہیں ہے' اور یہ ہبہ صحیح ہو جائے گا۔ اور امام احمد، ثوری، اور اسحٰق رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حرام ہے۔ انہوں نے استدلال کیا ہے: ''**لا أشهد علی جور**'' اور ''**واعدلوا بین اولادکم**'' سے۔ اور اول الذکر نے ان الفاظ سے استدلال کیا: ''**فاشهد علی هذا غیری**، یعنی تم اس بارے میں میرے علاوہ کسی اور کو گواہ بنالو، اگر یہ ہبہ حرام یا باطل ہوتا تو آپ ﷺ یہ نہ فرماتے۔ اور اس طرح اس قول سے بھی استدلال کیا ہے ''**فارجعه**'' اگر یہ ہبہ نافذ نہیں ہوا تھا، تو پھر رجوع کی ضرورت کیوں پڑی۔

اگر یہ کہا جائے کہ آپؐ نے اس کو بطور تنبیہ اور تہدید کے فرمایا تھا؟ تو ہم کہتے ہیں کہ اصول اس کے خلاف ہے کہ صیغہ **افعل** جب مطلق ذکر ہو تو اس کو وجوب یا استحباب پر حمل کیا جاتا ہے۔ اور اگر اس پر محمول کرنا متعذر ہو تو اباحت پر محمول کرتے ہیں۔

باقی ''**جور**'' کا معنی حرام کا نہیں ہے، اس لئے کہ ''**جور**'' برابری اور اعتدال سے پھرنے اور میلان کو کہتے ہیں اور جو بھی حد اعتدال سے نکل جائے تو وہ ''**جور**'' ہے خواہ وہ حرام ہو یا مکروہ ہو۔

شرح السنہ میں ہے کہ حدیث سے معلوم ہوا کہ اولاد کے درمیان برابری کرنا کسی چیز کے دینے اور اس کے علاوہ بھلائی کی تمام اقسام میں حتی کہ بوسہ لینے میں مستحب ہے۔ اور اگر کسی نے اس کے خلاف کیا تو نافذ ہو جائے گا۔ اور ترجیح دی تھی حضرت ابوبکرؓ نے اپنی اولاد میں حضرت عائشہؓ کو اکیس وسق کے ساتھ کہ اس کو دیئے تھے نہ کہ تمام اولاد کو اور حضرت عمر بن الخطاب نے عاصم کو دینے میں ترجیح دی تھی اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے ام کلثوم کے بیٹے کو ترجیح دی تھی۔ قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ تقریر اور کسی نے ان پر نکیر نہیں کی ہے، پس اس پر اجماع ہوا۔

الفصل الثانی:

ہبہ واپس لے لینا مناسب نہیں ہے

۳۰۲۰: عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَایَرْجِعُ اَحَدٌ فِیْ هِبَتِهٖ اِلَّا الْوَالِدُ مِنْ وَلَدِهٖ.

(رواه النسائی وابن ماجة)

اخرجه النسائی فی السنن ٦/٢٦٤ الحديث رقم ٣٦٨٩ وابن ماجه فی ٢/٧٩٦ الحديث رقم ٢٣٧٨ واحمد فی المسند ٢/١٨٢۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کوئی شخص اپنا تحفہ واپس نہ لے (یعنی تحفہ واپس لے لینا مناسب نہیں ہے) ہاں باپ بیٹے سے تحفہ واپس لے سکتا ہے''۔ (نسائی' ابن ماجہ)

تشریح: قوله: **لَایَرْجِعُ اَحَدٌ فِیْ هِبَتِهٖ اِلَّا الْوَالِدُ مِنْ وَلَدِهٖ**:

لا یرجع: رفع کے ساتھ ہے۔ یہ نفی ہے اور معنی نہی کا ہے جیسا کہ کہا گیا ہے۔ اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ اس کا معنی ہے **لاینبغی ان یرجع** یعنی مناسب نہیں ہے رجوع کرنا۔

هبته: ھاء کے کسرہ کے ساتھ اس کی اصل ''**وهبة**'' ہے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ہبہ واپس لینے کی حرمت پر دلالت کر رہی ہے اور بیٹے سے لینا جائز ہے اس لئے کہ بیٹا اور اس کا مال اس کے والد کے ہیں اور اس کو امام شافعیؒ نے لیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ہبہ میں رجوع درست نہیں ہے، سوائے والد کیلئے۔ اور اس

میں یہ بھی جائز ہے کہ نفی انفراد مراد ہو، یعنی کسی کیلئے منفرد طور پر اور نہ مستقل طور پر ہبہ میں بغیر فیصلہ اور رضامندی کے رجوع کرنا جائز نہیں ہے، سوائے والد کے کہ اس کو انفرادی طور پر ضرورت کے وقت یہ اختیار حاصل ہے۔

کسی کوئی چیز دے کر پھر واپس لے لینا مروت کے خلاف ہے

۳۰۲۱: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ وَابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ لَا یَحِلُّ لِلرَّجُلِ اَنْ یُّعْطِیَ عَطِیَّۃً ثُمَّ یَرْجِعُ فِیْھَا اِلَّا الْوَالِدُ فِیْمَا یُعْطِیْ وَلَدَہٗ وَمَثَلُ الَّذِیْ یُعْطِی الْعَطِیَّۃَ ثُمَّ یَرْجِعُ فِیْھَا کَمَثَلِ الْکَلْبِ اَکَلَ حَتّٰی اِذَا شَبِعَ قَاءَ ثُمَّ عَادَ فِیْ قَیْئِہٖ۔ (رواہ ابوداود والترمذی والنسائی وابن ماجۃ وصححہ الترمذی)

اخرجه ابوداوٗد فی السنن۳/۸۰۸ الحدیث رقم ۳۵۳۹ والترمذی فی ٤/۳۸٤ الحدیث رقم ۲۱۳۲ والنسائی فی ٦/۲٦٥ الحدیث رقم ۳٦۹۰ وابن ماجه فی ۲/۷۹٥ الحدیث رقم ۲۳۷۷ واحمد فی المسند ۱/۲۳۷

ترجمہ: ''حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کسی شخص کے لئے یہ حلال نہیں ہے (یعنی از راہِ مروت یہ بات مناسب نہیں ہے) کہ وہ کسی کو اپنی کوئی چیز (بطور تحفہ) دے اور پھر اس کو واپس لے لے' البتہ باپ اپنی اس چیز کو واپس لے سکتا ہے جو وہ اپنے بیٹے کو (بطور تحفہ) دے! اور مثال اس شخص کی جو کسی کو کچھ دے کر پھر واپس لے لیتا ہے اس کتے کی سی ہے جس نے (پیٹ بھر کر) کھایا اور جب وہ سیر ہو گیا تو اس نے قے کر ڈالی اور پھر اس قے کو چاٹنے لگا''۔ (ابوداؤد' نسائی' ابن ماجہ) امام ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

تشریح: قولہ: لَا یَحِلُّ لِلرَّجُلِ اَنْ یُّعْطِیَ عَطِیَّۃً ثُمَّ یَرْجِعُ فِیْھَا اِلَّا الْوَالِدَ فِیْمَا یُعْطِیْ وَلَدَہٗ:

ثم یرجع: ظاہر تو یہ ہے کہ اس پر نصب ہے لیکن ہمارے اصل سماع اور سننے میں رفع ہے (اس کو ذکر کیا ہے ہمارے مشائخ کے شیخ میرک شاہ نے) اور شاید رفع کی وجہ ''ھو'' کا مقدر ہونا ہو اور یہ ضمیر ''رجل'' کی طرف راجع ہو۔

الا الوالد: نصب کے ساتھ ہے استثناء کی وجہ سے، اس لئے کہ ''رجل'' سے مراد جنس ہے، گویا کہ اس طرح کہا ہے **لا یحل الرجل**......۔

اس حدیث کے ظاہر پر امام شافعی اور ان کے متبعین نے عمل کیا ہے یہ بھی جائز ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ حلال نہیں ہے دیانت اور مروت کے طور پر۔ پس یہ مکروہ ہوگا' نہ کہ یہ مراد ہے کہ اس کے لئے قضاء اور حکماً حلال نہیں ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: ''**لا یحل لرجل یؤمن باللہ والیوم الآخر ان یبیت شبعان وجارہ طاویا**''۔ حلال نہیں کسی آدمی کیلئے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو کہ وہ رات گزارے اس حال میں کہ اس کا پیٹ بھرا ہو اور اس کا ہمسایہ خالی پیٹ اور بھوکا ہو، یعنی اس کے لئے یہ لائق نہیں ہے دیانت اور مروت کے طور پر اگرچہ قضاء اور حکماً یہ جائز ہے۔

قولہ: وَمَثَلُ الَّذِیْ یُعْطِی الْعَطِیَّۃَ ثُمَّ یَرْجِعُ فِیْھَا کَمَثَلِ الْکَلْبِ اَکَلَ حَتّٰی اِذَا شَبِعَ ......۔

ومثل الذی یعطی العطیۃ: اس سے باپ مستثنیٰ ہے۔

شبع: باء کے کسرہ کے ساتھ۔

قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں صریح نص ہے کہ ہبہ میں رجوع کا جواز مقصور ہے اس میں جو والد نے ہبہ کیا ہو بیٹے کو۔ اور یہی امام شافعی کا مسلک ہے۔ ثوری اور اصحاب ابوحنیفہ اس کے برعکس کے قائل ہیں اور انہوں نے کہا ہے کہ رجوع جائز نہیں ہے ہبہ کرنے والے کے لئے جو اس نے ہبہ کیا ہو اپنے بیٹے' یا کسی قریبی رشتہ دار کے لئے' یا زوجین میں سے ایک نے دوسرے کے لئے ہبہ کیا ہو۔ اور اس کے لئے واپس لینا جائز ہے جو اس نے ہبہ کیا ہو اجنبی لوگوں پر۔ امام مالک نے مطلقاً رجوع کو جائز

قرار دیا ہے، سوائے اس ہبہ کے جو زوجین میں سے ایک نے دوسرے پر کیا ہو۔
بعض احناف نے اس حدیث کی یہ تاویل کی ہے کہ "لا یحل" سے مراد ہبہ میں رجوع سے ڈرانا ہے نہ کہ جواز کی نفی کرنا ہے جیسا کہ تیرے اس قول میں ہے: لا یحل للواجد رد السائل، اور "الا الوالد لولده" کا مطلب یہ ہے کہ والد کیلئے جائز ہے کہ وہ لے لے جو اس نے بیٹے پر ہبہ کیا ہے اور اس کو خرچ کرے اپنے نفقہ میں اور ان تمام ضروریات میں جو بیٹے پر لازم ہیں ضرورت کے وقت' جیسا کہ اس کے باقی تمام اموال میں والد کو اپنے حق کے وصول کرنے کی وجہ سے تصرف کرنے کا حق حاصل ہے نہ کہ ہبہ میں رجوع کرنے اور ہبہ کو توڑنے کی وجہ سے۔ یہ تاویل بعید ہونے کے ساتھ ساتھ ظاہر سے بلا دلیل عدول ہے۔
ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ مجتہد دلیل کا قیدی ہوتا ہے جب تک اس کے پاس دلیل نہ ہو اس کو تاویل کی ضرورت نہیں پڑتی۔ قاضی نے کہا ہے کہ ان حضرات نے حضرت عمرؓ کے قول سے استدلال کیا ہے: "من وهب وهبة لذی رحم جازت ومن وهب لغير ذی رحم فهو احق بها مالم یثب منها" (جس نے قرابت دار کو کوئی چیز ہبہ کے طور پر دی تو یہ جائز ہے اور جس نے کسی غیر قرابت دار کو کوئی چیز ہبہ کے طور پر دی تو یہ زیادہ حقدار ہے اس چیز کا۔ جب تک کہ اس کا عوض حاصل نہ کیا ہو۔
باوجود یہ کہ یہ ایسی کوئی دلیل نہیں ہے جو تاویل کو قبول کرے' اور اولیٰ یہ ہے کہ اس کی تاویل یہ کی جائے کہ حضرت عمرؓ نے اجانب اور محارم کے ہبہ میں فرق بیان کیا ہے عوض کے تقاضے میں، کہ جس نے کسی اجنبی کو کوئی چیز ہبہ کے طور پر دی بدلہ کی طمع پر اور اس کو کوئی عوض نہیں ملا تو اس کو رجوع کرنے کا حق حاصل ہے۔ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے صراحۃً بھی منقول ہے اور امام شافعی کا قول قدیم بھی اس کے قریب ہے۔ اور امام ابوحنیفہ تو عوض کو بالکل لازم نہیں سمجھتے تو پھر اس سے کیسے استدلال کریں گے؟
ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ کوئی انوکھی نہیں ہے کہ امام ابوحنیفہ رجوع کے عدم جواز کے قائل ہیں حصول عوض کے وقت' باوجود یہ کہ وہ عوض کو لازم نہیں سمجھتے۔
امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب حدیث ابن عباسؓ میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ہبہ سے رجوع کرنا مذموم ہے اور صحیح نہیں ہے، یا اچھا نہیں ہے مؤمنین کے لئے کہ وہ اس بری مثال کے ساتھ متصف ہو جائیں، اور پہلے گزرا کہ حدیث عمرؓ اس کے لئے تاکید کے طور پر ہے، کہ مناسب یہ ہے کہ اولاد سے بھی ہبہ میں رجوع نہ کیا جائے' اور جو جائز قرار دیا ہے تو وہ درحقیقت رجوع نہیں ہے اس لئے کہ بیٹا اور اس کا مال والد کے لئے ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اس کی دلیل ہے: ﴿وعلى المولود له رزقهن﴾ [البقرة۔ ۲۳۳] (اور جس کا بچہ ہے اس کے ذمہ ہے' اس کا کھانا)۔ یعنی جس کے لئے یہ جنا گیا ہے گویا کہ یہ اس کی ملکیت ہے، اور آپ کا ارشاد ہے کہ سب سے پاک جو تم نے کھایا وہ تمہاری کمائی میں سے ہے۔ اور کبھی مصلحت یہ تقاضا کرتی ہے کہ رجوع کیا جائے بیٹے کے لئے تأدیب اور سیاست کے طور پر اس لئے کہ کبھی والد بیٹے سے ایسے امور دیکھتا ہے جو باپ کو پسند نہیں ہوتے۔
تخریج: اصحاب کتب اربعہ نے بھی اس کو مختصر طور پر روایت کیا ہے۔

تحفہ کا بدلہ تحفہ

۳۰۲۲: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ اَعْرَابِيًّا اَهْدٰى لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ بَكْرَةً فَعَوَّضَهٗ مِنْهَا سِتَّ بَكَرَاتٍ فَتَسَخَّطَ فَبَلَغَ ذٰلِكَ النَّبِیَّ ﷺ فَحَمِدَ اللّٰهَ وَاَثْنٰى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ اِنَّ فُلَانًا اَهْدٰى اِلَیَّ نَاقَةً فَعَوَّضْتُهٗ مِنْهَا سِتَّ بَكَرَاتٍ فَظَلَّ سَاخِطًا لَقَدْ هَمَمْتُ اَنْ لَّا اَقْبَلَ هَدِيَّةً اِلَّا مِنْ قُرَشِيٍّ اَوْ اَنْصَارِيٍّ اَوْ ثَقَفِيٍّ اَوْ دَوْسِيٍّ.

(رواه الترمذی وابوداود والنسائی)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۳/۸۰۷ الحدیث رقم ۳۵۳۷ والترمذی فی ۵/۶۸۶ الحدیث رقم ۳۹۴۵ والنسائی فی ۶/۲۸۰

الحدیث رقم ۳۷۵۹ (۳) کذا مررہ فی المخطوطة۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دیہاتی نے رسول اللہ ﷺ کو بطور ہدیہ ایک جوان اونٹنی پیش کی' چنانچہ آپ ﷺ نے بھی اس (دیہاتی) کو اس (ایک اونٹنی) کے بدلے میں چھ جوان اونٹنیاں عطا فرمائیں لیکن وہ دیہاتی پھر بھی خوش نہ ہوا۔ جب یہ بات نبی کریم ﷺ تک پہنچی تو آپ ﷺ نے پہلے خدا کی حمد و ثنا بیان کی (جیسا کہ آپ ﷺ کا معمول تھا آپ ﷺ جب خطبہ دیتے یا کوئی بات شروع کرتے تو پہلے خدا کی حمد و ثنا بیان فرماتے) اس کے بعد آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ فلاں شخص بطور ہدیہ میرے لئے ایک اونٹنی لایا تھا' میں نے بھی اس کے بدلے میں اس کو چھ اونٹنیاں عنایت کیں مگر وہ پھر بھی ناخوش رہا' چنانچہ میں نے یہ ارادہ کیا کہ اب میں قریشی' انصاری' ثقفی اور دوسی کے علاوہ اور کسی کا کوئی ہدیہ قبول نہ کروں''۔ (ترمذی' ابوداؤد' نسائی)

تشریح: **قوله :ان اَعْرَابِيًّا اَهْدٰى لِرَسُوْلِ اللهِ...... فَعَوَّضَهُ مِنْهَا سِتَّ بَكَرَاتٍ فَظَلَّ سَاخِطًا :**

بکرۃ : باء کے فتحہ اور کاف کے سکون کے ساتھ' جوان اونٹ کو کہتے ہیں جیسے غلام لوگوں میں سے نوجوان کو کہتے ہیں۔ اور اس کا مؤنث ''بکرۃ'' ہے جیسا کہ نہایہ میں ہے۔

بکرات : باء اور کاف کے فتحہ کے ساتھ۔

فسخط : یعنی دیہاتی نے ناراضگی اور غصے کا اظہار کیا اور آپ ﷺ کے اس دینے کو کم سمجھا۔ اس لئے کہ اس کی طمع اس سے زیادہ کی تھی اس لئے کہ اس نے آپ علیہ السلام کی سخاوت اور فیاضی کے بارے میں سنا تھا۔

فلانا : اس کے نام سے کنایہ ہے اور شاید اس کے نام کی تصریح اس کے تحفہ قبول کرنے سے احتراز کرنے کے لئے کی۔

فظل :اصبح یا صار کے معنی میں ہے۔

قوله :لَقَدْ هَمَمْتُ اَنْ لَّا اَقْبَلَ هَدِيَّةً اِلَّا مِنْ قُرَشِيٍّ اَوْ اَنْصَارِيٍّ اَوْ ثَقَفِيٍّ اَوْ دَوْسِيٍّ

لقد هممت : قسم مقدر کا جواب ہے

قرشی : قریش کی طرف نسبت ہے زوائد کے حذف کے ساتھ۔

انصاری : ایک قوم کی طرف منسوب ہے جسے ''انصار'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ ان میں سے کوئی ایک مراد ہے۔

ثقفی : ثاء اور قاف کے فتحہ کے ساتھ ''ثقیف'' کی طرف نسبت ہے جو ایک مشہور قبیلہ ہے۔

دوسی : دال کے فتحہ اور واؤ کے سکون کے ساتھ، ''دوس'' کی طرف نسبت ہے، ''ازد'' میں سے ایک قبیلہ ہے،

تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آپ علیہ السلام نے ان لوگوں سے تحفہ قبول کرنے کو ناپسند کیا ہے جو اس ہدیہ کے باعث زیادہ کا طلب گار تھا۔ اور ان قبیلوں کو بطور خاص اس لئے ذکر کیا کہ آپ ان کی سخاوت نفس' عالی ہمتی، اور عوض قطع نظری کو جان چکے تھے۔ امام طیبی فرماتے ہیں کہ جان لے کہ یہ خصلت (یعنی عوض اور زیادتی کا طمع) اخلاق رذیلہ خسیسہ میں سے ہے۔ اس لئے آپ علیہ السلام نے قبائل اور ان کے اچھے اخلاق کو پیش کر کے یہ ظاہر کیا کہ اس دیہاتی کا قبیلہ اس کے برخلاف ہے۔ اور اللہ پاک نے اپنے حبیب کو اس رذیل خصلت سے منع فرمایا ہے: ﴿ولا تمنن تستكثر﴾ [المدثر]

کشاف میں ہے کہ نہ دیں اس حال میں کہ آپؐ زیادتی کے طلب گار ہوں، اور آپ کو'' استعوار'' سے منع فرمایا'' استعوار'' یہ ہے کہ کوئی کسی کو کوئی چیز ہبہ کے طور پر دے اس طمع اور لالچ سے کہ جس کو ہبہ دیا ہے وہ ہبہ کی ہوئی چیز سے زیادہ بدلہ دیدے گا اور یہ جائز ہے۔ اور اسی سے ہے: **المستعو ثياب منى هبته** اور یہ ممانعت یا تو تحریمی ہے جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خاص ہے یا ممانعت تنزیہی ہے جو آپ اور آپ کی اُمت کے لئے ہے۔

شرح السنہ میں ہے کہ علماء کا اختلاف ہے اس ہبہ کے بارے میں جو مطلق ہو یعنی اس میں بدلہ کی شرط نہ ہو' تو فقہاء میں سے ایک جماعت کہتی ہے کہ یہ عوض کا تقاضا کرتی ہے اس حدیث کی وجہ سے۔ اور فقہاء میں سے بعض نے ہبہ کے بارے میں لوگوں کے تین طبقے بتائے ہیں: ایک آدمی کا ہبہ کرنا ہوتا ہے اپنے سے کم درجے والے کو' تو یہ اس کی طرف سے اکرام اور مہربانی ہے، یہ عوض کا تقاضا نہیں کرتا۔ اور اسی طرح آدمی کا ہبہ کرنا ہے اپنی نظیر اور برابر والے کو۔ اور تیسرا آدمی کا ہبہ کرنا ہے اپنے سے بڑے کو تو یہ عوض کا تقاضا کرتا ہے اس لئے کہ دینے والے کا ارادہ بخشش اور بدلے کا ہوتا ہے،

عوض کی مقدار عرف وعادت پر ہے اور بعض کہتے ہیں کہ موہوب کی قیمت کی مقدار ہو۔ اور بعض کہتے ہیں اتنا ہو جس سے واہب خوش ہو جائے۔ امام شافعی کا ظاہر مذہب یہ ہے کہ ہبہ مطلقاً عوض کا تقاضا نہیں کرتا' چاہے وہ اپنے برابر کو یا کمتر کو یا اپنے سے بڑے کو ہبہ کرے، اور جو عوض کو لازم کرتے ہیں تو جب اس ہبہ کا عوض نہ ملے تو واہب کو رجوع کا حق حاصل ہے۔

۳۰۲۳: وَعَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ مَنْ اُعْطِيَ عَطَاءً فَوَجَدَ فَلْيَجْزِ بِهٖ وَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَلْيُثْنِ فَاِنَّ مَنْ اَثْنٰى فَقَدْ شَكَرَ وَمَنْ كَتَمَ فَقَدْ كَفَرَ وَمَنْ تَحَلّٰى بِمَا لَمْ يُعْطَ كَانَ كَلَابِسِ ثَوْبَىْ زُوْرٍ.

(رواه الترمذی وابوداود)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ١٥٨/٥ الحديث رقم ٤٨١٣ والترمذی فی ٣٣٢/٤ الحديث رقم ٢٠٣٤۔

ترجمہ: "اور حضرت جابرؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص کو کوئی چیز (بطور ہدیہ) دی جائے اور وہ اس کا بدلہ ادا کرنے پر قادر ہو تو اسے چاہئے کہ وہ اس کا بدلہ ادا کرے اور جو شخص بدلہ ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو وہ ہدیہ دینے والے کی تعریف وتوصیف کرے (اور اس کے دیئے ہوئے ہدیہ کا اظہار کرے) کیونکہ جس شخص نے (اپنے محسن کی) تعریف کی اس نے گویا (اس کا) شکر ادا کیا (یعنی فی الجملہ اس کا بدلہ ادا کیا) اور جس شخص نے (کسی کا احسان) چھپایا (یعنی نہ تو اس نے کچھ دے کر اور نہ تعریف کر کے اس کا بدلہ ادا کیا) تو اس نے کفرانِ نعمت کیا اور (یاد رکھو) جو شخص اپنے آپ کو کسی ایسی چیز سے مزین کرے جو اسے نہیں دی گئی ہے تو اس کی مثال جھوٹ موٹ کے دو کپڑے پہننے والے کی مانند ہے"۔ (ترمذی' ابوداؤد)

تشریح: قوله: مَنْ اُعْطِيَ عَطَاءً فَوَجَدَ...... فَقَدْ شَكَرَ وَمَنْ كَتَمَ فَقَدْ كَفَرَ:

اعطی: صیغہ مجہول کے ساتھ "عطاء"؛ مفعول مطلق ہے اور ایک روایت میں شیئا ہے اس صورت میں یہ مفعول ثانی ہے۔

فليجز: جیم کے سکون کے ساتھ۔

فليثن: یاء کے ضمہ کے ساتھ متعلق محذوف ہے ای علیه، اور ایک روایت میں "به" ہے۔

فان من اثنٰى: اور ایک روایت میں "فان اثنٰى به" ہے۔

فقد شكر: اور ایک روایت میں "شکره" ہے

فقد كفر: یعنی کفران نعمت کیا، یعنی اس کے حق کو اداء کرنا ترک کر دیا، اور ایک روایت میں ہے: ان كتمه فقد كفره۔

قوله: وَمَنْ تَحَلّٰى بِمَا لَمْ يُعْطَ كَانَ كَلَابِسِ ثَوْبَىْ زُوْرٍ:

لم يعط: طاء کے فتحہ کے ساتھ۔

كان كلابس ثوبى زور: اور ایک روایت میں "فانه كلابس ثوبى زور" ہے یعنی جس نے دو جھوٹ بولے یا دو جھوٹے چیز ظاہر کیے۔

آپ ﷺ نے یہ اس عورت کے جواب میں کہا تھا جس نے کہا اللہ کے رسول میری ایک سوکن ہے کیا مجھ پر گناہ ہو گا کہ میں اپنے

آپ کو ایسی چیز کے ساتھ سیر ظاہر کروں جو مجھے میرے شوہر نے نہ دی ہو۔تو ایک جھوٹ اس کا یہ کہنا تھا کہ مجھے شوہر نے یہ دیا ہے اور دوسرا جھوٹ یہ ظاہر کرنا تھا کہ میرا شوہر مجھ سے میری سوکن سے زیادہ محبت کرتا ہے۔

خطابی فرماتے ہیں کہ عرب میں ایک شخص تھا جو مشہور لوگوں کے لباس کی طرح دو کپڑے پہنتا تھا، تا کہ لوگ اس کو مشہور اور محترم آدمی خیال کریں۔اس لئے کہ مشہور و محترم لوگ جھوٹ نہیں بولتے، پس جب لوگ اس ہیئت پر دیکھتے تو اس کی بات پر اعتماد کر لیتے اور اس کی جھوٹی گواہی پر اعتماد کر لیتے بوجہ اس کے اپنے آپ کو سچوں کے ساتھ مشابہ بنانے کے، اور اس کے یہ کپڑے اس کے جھوٹ کے سبب بنے تھے اس لئے ان کا نام جھوٹ کے دو کپڑے رکھا گیا۔یا اس وجہ سے کہ اس نے یہ کپڑے جھوٹ کے لئے پہنے تھے۔اور چادر اور تہ بند کے اعتبار سے اس کو تثنیہ ذکر کیا، پس اس عورت کو تشبیہ اس آدمی کے ساتھ دی۔

اور نہایہ میں ہے کہ ''حلی'' ہر اس چیز کا نام ہے جس کے ذریعے اپنے آپ کو آراستہ اور مزین کیا جائے۔ابوعبیدہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ دکھلاوے والے ہیں جو صلحاء کا لباس پہن کر اپنے آپ کو صالح ظاہر کریں۔اور اس کے علاوہ دوسرے حضرات کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو ایسا پیراہن پہنے جس کی آستینوں کے نیچے مزید دو آستینیں لگائے، تا کہ دیکھنے والے یہ سمجھیں کہ اس نے دو پیراہن پہن رکھے ہیں۔گویا کہ وہ اپنے آپ سے مذاق کرتا تھا۔معنی یہ ہے کہ بمنزلہ اس جھوٹے کے ہے جو ایسی بات کرنے والا ہے جو ہوئی نہ ہو۔

اور بعض کہتے ہیں کہ دو کپڑوں کے ساتھ تشبیہ اس لئے دی ہے کہ ان کے ساتھ اپنے آپ کو آراستہ کرنے والے نے دو جھوٹ بولے کہ اپنے آپ کو ایسی صفت کے ساتھ متصف کیا جو اس کے اندر موجود نہیں ہے اور دوسرے اس کو اس صفت کے ساتھ متصف کرے کہ اس کو صلہ رحمی کے ساتھ خاص کریں۔تو اس بات کے ساتھ اس نے دو جھوٹ جمع کئے۔ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ اس قول سے حدیث کے دونوں جملوں میں مناسبت ظاہر ہوگئی، اور سبب ورود کے ساتھ موافقت بھی ہوگئی۔گویا کہ آپ نے فرمایا کہ جس شخص نے کچھ نہیں دیا اور وہ ظاہر یہ کرتا ہے کہ اس نے دیا ہے تو یہ دو مرتبہ جھوٹا ہے۔

تخریج: اس حدیث کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ''الادب المفرد'' میں اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔

محسن کے لئے دعاء اجر و خیر

۳۰۲۴: وَعَنْ اُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم مَنْ صُنِعَ اِلَيْهِ مَعْرُوْفٌ فَقَالَ لِفَاعِلِهٖ جَزَاكَ اللّٰهُ خَيْرًا فَقَدْ اَبْلَغَ فِي الثَّنَاءِ. (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۳۳۳/٤ الحدیث رقم ۲۰۳۵۔

ترجمہ: ''اور حضرت اسامہ بن زید کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس شخص کے ساتھ بھلائی کی جائے اور وہ بھلائی کرنے والے کے حق میں یہ دعا کرے جزاك الله خيرا (یعنی اللہ تعالیٰ تجھے اس کا بہتر بدلہ دے) تو اس نے (اپنے محسن کی) بہت اچھی تعریف کی''۔(ترمذی)

اسنادی حیثیت: امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

تشریح: قوله: مَنْ صُنِعَ اِلَيْهِ مَعْرُوْفٌ فَقَالَ لِفَاعِلِهٖ جَزَاكَ اللّٰهُ خَيْرًا فَقَدْ اَبْلَغَ فِي الثَّنَاءِ:

صنع اليه: صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

معروف: ایک نسخہ میں ''معروفا'' نصب کے ساتھ ہے۔

حاصل یہ کہ جس شخص کے ساتھ کوئی احسان کیا جائے اور وہ احسان کرنے والے کے حق میں یہ دعا کرے یعنی اللہ تعالیٰ تجھے بہتر

بدلہ دے، یا اللہ تجھے دنیا و آخرت کی بھلائی اور خیر دے۔تو اس نے اپنے محسن کی کامل تعریف کی، خواہ یہ دعا اس کا بدلہ دینے سے عاجز آنے کے بعد کرے یا مطلقاً کرے اس نے ادائیگی شکر کا حق اداء کر دیا۔ کیونکہ اس نے اپنے محسن کا بدلہ اتارنے اور اس کی تعریف کرنے میں اپنے قصور و کوتاہی کا اعتراف کیا اور اپنے عاجز ہونے کا اقرار کر کے اس کا بدلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سونپ دیا کہ اللہ تعالیٰ اس کو پورا پورا اجر عطاء فرمائے۔

تخریج: اسی طرح نسائی اور ابن حبان نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔

انسان کا شکر نہ اداء کرنے والا اللہ کا بھی شکر ادا نہیں کرتا

۳۰۲۵: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ لَّمْ یَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْكُرِ اللّٰهَ

(رواه احمد والترمذی)

اخرجه ابوداوٗد فی السنن ۱۵۷/۵ الحدیث رقم ۴۸۱۱ والترمذی فی ۲۹۹/۴ الحدیث رقم ۱۹۵۵ واحمد فی المسند ۲۵۸/۲

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے لوگوں کا شکر ادا نہ کیا اس نے اللہ کا شکر ادا نہ کیا''۔(احمد' ترمذی)

تشریح: قال رسول اللہ ﷺ من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ :

قاضی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ کے شکر کے ادائیگی کی تکمیل اس بات پر منحصر ہے کہ اس کی تابعداری کی جائے اور اس کے اوامر کو بجالایا جائے۔اور اس کے اوامر میں سے لوگوں کا شکر اداء کرنا ہے۔ جو اس تک اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے پہنچنے کا واسطہ بنے ہیں۔پس جس شخص نے اس میں اللہ تعالیٰ کی تابعداری نہیں کی، تو اس نے اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کیا۔

یا اس کا مطلب یہ ہے کہ جس نے لوگوں میں سے اُس شخص کے شکر اداء کرنے میں کوتاہی کی، جس نے اس کے ساتھ احسان کیا۔ باوجود یہ کہ انسان تعریف پر اور نعمت کا شکر ادا کرنے پر حریص ہوتا ہے۔اور اعراض اور کفران نعمت پر اس کو تکلیف ہوتی ہے۔تو یہ زیادہ لائق ہے کہ اس ذات کا شکر اداء کرنے میں کوتاہی کرے جس کے ہاں شکر اور کفرانِ نعمت برابر ہے۔

تخریج: حدیث الجامع الصغیر میں ہے کہ احمد' ترمذی، اور ضیاء نے حضرت ابو سعیدؓ سے روایت کیا ہے۔

شکرانِ نعمت کی اہمیت

۳۰۲۶: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ لَمَّا قَدِمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ الْمَدِیْنَةَ اَتَاهُ الْمُهَاجِرُوْنَ فَقَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا رَاَیْنَا قَوْمًا اَبْذَلَ مِنْ كَثِیْرٍ وَلَا اَحْسَنَ مَوَاسَاةً مِنْ قَلِیْلٍ مِنْ قَوْمٍ نَزَلْنَا بَیْنَ اَظْهُرِهِمْ لَقَدْ كَفَوْنَا الْمُؤْنَةَ وَاَشْرَكُوْنَا فِی الْمَهْنَا حَتّٰی لَقَدْ خِفْنَا اَنْ یَذْهَبُوْا بِالْاَجْرِ كُلِّهٖ فَقَالَ لَا مَادَعَوْتُمُ اللّٰهَ لَهُمْ وَاَثْنَیْتُمْ عَلَیْهِمْ۔

(رواه الترمذی وصححه)

ترجمہ: ''اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ (مکہ سے ہجرت فرما کر) مدینہ تشریف لائے تو (ایک دن) مہاجرین صحابہ کرام ؓ کی ایک جماعت آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ ''یا رسول اللہ! ہم نے ایسی کوئی قوم نہیں دیکھی جو زیادہ مالداری میں بہت زیادہ خرچ کرنے اور کم مالداری میں اچھی خدمت اور مدد کرنے کے وصف میں اس قوم سے بہتر ہو جس میں ہم آکر اترے ہیں' انہوں نے (یعنی انصار نے) ہمیں محنت کرنے سے روک دیا ہے اور تمام تر منفعت میں ہمیں شریک کر لیا ہے اور اب (ان کے اس جذبہ سخاوت و ایثار کو دیکھتے ہوئے) ہمیں تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ سارا اجر و ثواب کہیں

انہی کے حصہ میں نہ آجائے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''نہیں (تمام تر ثواب انہی کے حصہ میں نہیں آئے گا) جب تک کہ تم ان کے لئے اللہ سے دعا گو رہو گے اور ان کی تعریف (یعنی شکرانہ نعمت ادا) کرتے رہو گے''۔امام ترمذی نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور اسے صحیح کہا ہے''۔

تشریح: **اتاه المهاجرون** : یہ اس وقت کی بات ہے جب انصار نے ان کی خدمت کی تھی اور اپنے مکانات اور باغات آدھے آدھے تقسیم کئے تھے۔ یہاں تک کہ بعض نے اپنی بیویوں میں سے سب زیادہ خوبصورت کو طلاق دے دی۔ تاکہ مہاجر اس سے شادی کرلے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس ایثار کی خبر اپنے اس ارشاد میں دی ہے: ﴿**والذين تبوؤ ا الدار والايمان من قبلهم يحبون من هاجر اليهم ولا يجدون فى صدورهم حاجة مما أوتوا ويؤترون على أنفسهم ولو كان بهم حصاصة**﴾ [الحشر۔۹]

معنی یہ ہے کہ ہمارے ساتھ اچھا سلوک کیا چاہے وہ مالدار ہو یا کم مال والا اور محتاج ہو۔علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: کہ دونوں جار یعنی ''**من قليل**'' اور ''**وكثير**'' دونوں متعلق ہیں بذل اور مواساۃ کے' اور ''**من قوم**'' صلہ ہے ''ابذل'' اور ''احسن'' کے لئے۔ علی سبیل تنازع اور ''قوم'' مفصل ہے۔ اور قوم سے مراد انصار ہیں۔ اور انصار سے ''قوم'' کی طرف عدول کیا تا کہ تنکیر دلالت کرے تفخیم شان پر۔ پس ممکن ہو جائے گا آنے والے اوصاف کا جاری کرنا اس پر ابہام کے بعد' تا کہ یہ اوقع فی النفس ہو۔ اس لئے کہ ابہام کے بعد وضاحت اوقع فی النفس ہوتی ہے اور زیادہ بلیغ ہوتی ہے۔

المؤنته : یعنی انہوں نے ہمیں خدمت کرنے سے باز رکھا۔ بایں طور کہ گھروں کی تعمیر اور باغات آباد کرنے وغیرہ کی مشقت، ومحنت انہوں نے اپنے ذمہ لے لی ہے۔

المهناء : میم اور نون کے فتحہ کے ساتھ یعنی جو ضرورت اور اصلاح معاش کے لئے کافی ہو۔ اور بعض کہتے ہیں، جو تجھے بغیر کسی محنت ومشقت کے حاصل ہو۔ ابن الملکؒ فرماتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ انہوں نے درختوں کے پھلوں میں ہمیں برابر کا شریک بنایا اور ان کو سیراب کرنے اور دیکھ بھال کی مشقت اپنے ذمہ لے لی۔ اور ہمیں آدھا پھل بھی دیا۔

لقد : اور ایک صحیح نسخہ میں حق لقد ہے۔ **خفنا ان يذهبوا** : ضمیر مرفوع انصار کی طرف راجع ہے۔

بالاجر كله : یعنی کہ اللہ تعالیٰ ہماری مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنے اور تمام عبادات کا اجر وثواب ان کو دیدے ان کے زیادہ احسان کی وجہ سے ہمارے ساتھ۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کہ وہ تمہارے سارے اجر وثواب کو نہیں لے سکتے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم بہت وسیع ہے۔ تمہیں تمہاری عبادت کا ثواب ملے گا اور ان کو ان کی مددگاری کا اجر ملے گا۔

ما دعوتم الله لهم واثنيتم عليهم : یعنی جب تک ان کیلئے بھلائی کی دعا کرتے رہو گے۔ کیونکہ ان کے حق میں تمہاری یہی دعا ان کے احسان کا بدلہ ہو جائے گی۔ اور تمہاری عبادتوں کا ثواب تم ہی کو ملتا رہے گا۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، کہ جب انہوں نے محنت ومشقت کی ذمہ داری خود لے لی، اور ہمیں آرام اور آمدنی میں شریک بنایا، تو پس سارا اجر وثواب انہوں نے محفوظ کرلیا۔ ہم ان کو بدلہ کیسے دیں۔ تو آپ ﷺ نے جواب دیا، کہ ایسا معاملہ نہیں ہے، جیسا کہ تم سمجھ رہے ہو۔ اس لئے کہ تم نے ان کی تعریف کی ہے ان کے احسان کا شکر اداء کرنے کے لئے اور اس پر قائم ہو۔ پس تم نے ان کا بدلہ دے دیا ہے۔

آپس میں تحفہ لین دین عداوتوں کو دور کرتا ہے

۳۰۲۷: وَعَنْ عَآ ئِشَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ تَهَادُوْا فَإِنَّ الْهَدِيَّةَ تُذْهِبُ الضَّغَائِنَ

ترجمہ: ''اورامُ المؤمنین حضرت عائشہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک دوسرے کو تحفہ دیا کرو کیونکہ تحفہ کینہ وعداوت کو دور کرتا ہے''۔ (ترمذی)

تشریح: **تهادوا** : دال کے فتحہ کے ساتھ ہے امر ہے ''تهادی'' بمعنیٰ ''مهاداة''۔

فان الهدية تذهب الضغائن : جمع ہے ضعینۃ کی۔ کینہ کو کہتے ہیں۔ یعنی بغض وعداوت کو ختم کر دیتا ہے اور الفت ومحبت کو بڑھا دیتا ہے۔ جیسا کہ منقول ہے، کہ تم آپس میں تحفہ دیا کرو، ایک دوسرے سے محبت کرنے لگو گے۔ اور آپس میں مصافحہ کرو۔ تمہارے آپس میں کینہ کو ختم کردے گا۔ جیسا کہ ابن عساکرؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ اور ان کی ایک روایت میں حضرت عائشہؓ سے بھی منقول ہے: **تهادوا تذداد حبا**۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، یہ اس لئے کہ ناراضگی حسد، کینہ لاتی ہے۔ اور تحفہ رضامندی لاتا ہے۔ پس جب رضامندی کا سبب آ جائے گا تو ناراضگی خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔

رواه : یہاں اصل میں بیاض ہے۔ بعد میں کسی نے '' **الترمذی** '' بڑھا دیا ہے۔ میرک شاہؒ فرماتے ہیں: اسی طرح جزریؒ نے کہا ہے، اور اس کے حاشیہ میں ہے کہ جزری نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔

کمتر چیز کے تحفہ کا لینا دینا حقیر نہ سمجھو

۳۰۲۸: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ تَهَادُوْا فَاِنَّ الْهَدِیَّةَ تُذْهِبُ وَحَرَ الصَّدْرِ وَلَا تَحْقِرَنَّ جَارَةٌ لِجَارَتِهَا وَلَوْ شِقَّ فِرْسِنِ شَاةٍ. (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۳۸۳/۴ الحدیث رقم ۲۰۳۰ واحمد فی المسند ۲۶۴/۲۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک دوسرے کو تحفہ دیا کرو کیونکہ تحفہ سینے کی کدورت کو دور کرتا ہے اور (یاد رکھو) کوئی ہمسایہ اپنے دوسرے ہمسایہ کے (کسی کمتر چیز کے) تحفہ کو حقیر نہ جانے اگرچہ وہ بکری کے کھر کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو''۔ (ترمذی)

تشریح: "**وحر**" واؤ کے فتحہ اور حاء کے ساتھ۔ دل کی کدورت اور وسوسوں کو کہتے ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں، کہ اس کا معنی ہے، کینہ اور غصہ اور بعض فرماتے ہیں، کہ سخت غصے کو کہتے ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ عداوت کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ نہایہ میں ہے۔

ولا تحقرن جارة لجارتها : جار مجرور محذوف کا متعلق ہے، جو ''**تحقرن**'' کا مفعول ہے۔ تقدیری عبارت یوں ہے: **لا تحقرن جارة هدية مهدة لجارتها**، اور یہ کلام سابق کیلئے تتمہ ہے۔ (اس کو ذکر کیا ہے علامہ طیبی رحمہ اللہ نے) اور نہایہ میں ہے کہ ''**جارة**'' سے مراد سوکن ہے، دو سوکنوں کے درمیان مجاورۃ (ہمسائیگی) کی وجہ سے اس کو ''**جارة**'' کہا ہے۔ اور اسی سے حدیث ام زرع کے الفاظ ہیں: **وغيظ جارتها** یعنی وہ اس کے حسن کو دیکھ کر غصہ ہو جاتی تھی۔

قوله :ولو شق فرسن بشاة :

''**شق**''، شین کے کسرہ کے ساتھ۔ یعنی اس کا آدھا یا بعض حصہ۔ جیسا کہ منقول ہے **اتقوا النار ولو بشق تمرة**. کہ آگ سے بچو! اگرچہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ساتھ ہو۔

''**فرسن**'' فاء اور سین کے کسرہ کے ساتھ کم گوشت والی ہڈی کو کہتے ہیں۔ بکری اور اونٹ کا کھر۔ قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جیسے دوسرے جانوروں کیلئے ''**حافر**'' ہوتا ہے اس طرح بکری اور اونٹ کیلئے ''**فرسن**'' بمنزلہ ''**حافر**'' کے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی ہمسایہ اپنے ہمسایہ کے دیئے ہوئے تحفہ کو حقیر نہ سمجھے اگرچہ وہ بکری کا کھر ہی کیوں نہ ہو۔

اور بعض روایات میں ''و لو بشق فرسن شاۃ'' آیا ہے حرف جر کی زیادۃ کے ساتھ، تقدیری عبارت یوں ہے: **ولو أن تبعث الیها أو رفقدھا**۔ طیبیؒ فرماتے ہیں، کہ ترمذیؒ کی روایت میں باء کے بغیر ہے، اور اسی طرح جامع الاصول میں ہے۔ اس حدیث میں آپ علیہ السلام نے لوگوں کی راہنمائی کی اس بات کی طرف کہ آپس میں ہدیہ کینہ اور بغض کو ختم کرتا ہے۔ پھر آپ علیہ السلام نے اس میں مبالغہ فرمایا، یہاں تک کہ سب سے کمتر اور حقیر چیز کا ذکر کیا۔ آپس میں سب سے زیادہ بغض رکھنے والوں میں سے ایک کی طرف سے۔ یہ مطلب اس وقت ہوگا جب جارۃ کو ضرۃ یعنی سوکن پر محمول کیا جائے۔ اور ظاہر بھی یہی ہے، اس لئے کہ اس میں تمیم کا معنی ہے۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں، کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ پڑوسن کو چاہئے کہ وہ اپنی پڑوسن کو جو اس کے پاس کھانے کی چیزیں ہیں ان میں سے بھیجے اگرچہ وہ کم ہی کیوں نہ ہوں۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں، کہ اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے، جو ابن عدی نے کامل میں حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے: **تھادوا الطعام بینکم. فان ذلك توسعة فی ارزاقکم**۔ کہ تم آپس میں کھانے کی چیزیں بطور تحفہ دیا کرو کہ اس سے تمہاری روزی میں وسعت اور کشادگی پیدا ہوگی۔ اس طرح امام احمدؒ نے بھی اور بیہقی نے حضرت انس سے روایت کیا ہے **تھادوا فان الھدیة تذھب بالسخیمة** یعنی کینہ کو۔ اور طبرانی نے حضرت ام حکیم سے روایت کیا ہے **فان الھدیة تضعف الحب. وتذھب بغوائل الصدر** یعنی اس کے وسوسے۔

۳۰۲۹: **وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ثَلَاثٌ لَا تُرَدُّ الْوَسَائِدُ وَالدُّهْنُ وَاللَّبَنُ** (رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث غریب) **قِیْلَ اَرَادَ بِالدُّهْنِ الطِّیْبَ**۔

اخرجه الترمذی فی السنن ۵/ ۱۰۰ الحدیث رقم ۲۷۹۰۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تین چیزیں ایسی ہیں جنہیں واپس نہیں کرنا چاہیے (یعنی ان کو قبول کرنے سے انکار نہیں کرنا چاہیے) (۱) تکیہ (۲) تیل (۳) دودھ۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔ نیز کہا جاتا ہے کہ ''تیل'' سے آپ ﷺ کی مراد خوشبو تھی''۔

تشریح: لا ترد: یعنی ان کے قبول کرنے سے انکار مناسب نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس کا احسان کم ہے اور انکار سے تحفہ دینے والے کو تکلیف پہنچتی ہے۔

الوسائد والدھن واللبن: علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، مراد یہ ہے کہ مہمان کی تواضع اور اس کا اکرام کیا جائے تکیہ، خوشبو اور دودھ کے ساتھ۔ اور یہ تحفہ ہے جس کا احسان کم ہے۔ اس سے انکار مناسب نہیں ہے۔ (انتہی)

گویا کہ انہوں نے ''دھن'' سے مراد خوشبو لیا ہے، اور اس کو ''طیب'' سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن زیادہ ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد مطلقاً تیل ہے، اس لئے کہ عرب تیل کو اپنے سر کے بالوں میں استعمال کرتے ہیں۔ باقی ابن الملکؒ کا کہنا ہے کہ تکیہ سے مراد وہ تکیہ ہے جس کی بھرائی کھجور کی چھال یا اون کی ہو۔ اس لئے کہ تکیہ کی بھرائی عام طور پر ان سے ہوتی تھی۔ اھ۔ ان کا یہ قول مردود ہے: اس لئے کہ اعتبار الفاظ کے عموم کا ہوتا ہے۔

قیل اراد بالدھن الطیب: اور اس کی وجہ پہلے گزر چکی ہے، اور شاید اس کے قائل کی مراد اس حدیث اور اس حدیث کے درمیان جو باب کے شروع میں گزری ہے، اور جو اس فصل کے آخر میں ہے، ان کو جمع کرنا اور ان میں تطبیق پیدا کرنا ہے۔ (واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب)

خوشبو دار پھول کا تحفہ واپس نہ کرو

۳۰۳۰: **وَعَنْ اَبِیْ عُثْمَانَ النَّهْدِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا اُعْطِیَ اَحَدُكُمُ الرَّیْحَانَ فَلَا یَرُدُّهٗ فَاِنَّهٗ**

خَرَجَ مِنَ الْجَنَّةِ (رواه الترمذی مرسلا)

اخرجه الترمذی فی السنن ۵/ ۱۰۰ الحدیث رقم ۲۷۹۱

ترجمہ: ''اور حضرت ابو عثمان نہدیؒ (تابعی) کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کسی کو خوشبودار پھول (بطور تحفہ وہدیہ) دیا جائے تو وہ اسے واپس نہ لوٹائے (یعنی قبول کرنے سے انکار نہ کرے) کیونکہ وہ پھول جنت سے آیا ہے''۔ اس روایت کو امام ترمذی نے بطریق ارسال نقل کیا ہے''۔

تشریح: **اذا اعطی** : صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

الریحان : منصوب ہے مفعول ثانی ہونے کی وجہ سے۔

یرده : دال مشدد کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور دال کو فتحہ بھی دیا جاتا ہے۔

قولہ: **فانه خرج من الجنة** : یعنی اس کی جڑ جنت سے آتی ہے۔

یعنی اس سے جنت کی خوشبو آتی ہے۔ مزید یہ کہ یہ بہت کم احسان رکھتا ہے۔ جیسا کہ پہلے گزرا ہے، یعنی بوجھ اور احسان کے اعتبار سے قلیل ہے۔ اس لئے اس کو رد نہیں کرنا چاہئے۔ اور بھی بہت ساری چیزوں کی جڑ جنت سے نکلی ہے۔

قوله : رواه الترمذی مرسلا : مفعول سے حال ہے۔ اور معنی اس کا یہ ہے کہ اس میں صحابی کا واسطہ حذف ہے۔ اور ابوداؤد نے بھی اس کو اپنی مراسیل میں روایت کیا ہے۔

الفصل الثالث:

۳۰۳۱: عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَتْ امْرَأَةُ بَشِيْرٍ اَنْحِلِ ابْنِيْ غُلَامَكَ وَاَشْهِدْ لِيْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم فَاَتٰى رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم فَقَالَ اِنَّ ابْنَةَ فُلَانٍ سَأَلَتْنِيْ اَنْ اَنْحَلَ ابْنَهَا غُلَامِيْ وَقَالَتْ اَشْهِدْ لِيْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم فَقَالَ اَلَهٗ اِخْوَةٌ قَالَ نَعَمْ قَالَ اَفَكُلَّهُمْ اَعْطَيْتَهُمْ مِثْلَ مَا اَعْطَيْتَهٗ قَالَ لَا قَالَ فَلَيْسَ يَصْلُحُ هٰذَا وَاِنِّيْ لَا اَشْهَدُ اِلَّا عَلٰى حَقٍّ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحیحه ۳/ ۱۲۴٤ الحدیث رقم (۱۹-۱٦۲٤) واحمد فی المسند ۳/ ۳۲٦

ترجمہ: ''حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ (ایک صحابی) حضرت بشیرؓ کی زوجہ نے ان سے کہا کہ تم ''میرے بیٹے (نعمان) کو اپنا غلام ہبہ کر دو اور اس پر میرے اطمینان کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنا لو' چنانچہ بشیرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ فلاں کی بیٹی (یعنی عمرہ بنت رواحہ) نے (جو میری بیوی ہے) مجھ سے یہ خواہش کی ہے کہ میں اس کے بیٹے (نعمان) کو اپنا غلام ہبہ کر دوں' نیز اس نے یہ بھی کہا ہے کہ (اس بارے میں میرے اطمینان کے لئے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنا لوں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (یہ سن کر) فرمایا کہ ''کیا اس بیٹے کے اور بھائی بھی ہیں؟'' انہوں نے عرض کیا کہ ''ہاں'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم نے ان سب کو اسی طرح (ایک ایک غلام) دیا ہے جس طرح اس (نعمان) کو دیا ہے''۔ انہوں نے عرض کیا کہ ''نہیں''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ درست نہیں ہے اور میں حق بات کے سوا کسی پر گواہ نہیں بنتا''۔ (مسلم)

تشریح: **انحل** : ہمزہ وصل اور نون کے سکون اور حاء کے فتحہ کے ساتھ۔

ابنی غلامك : یہ ''انحل'' کے لئے مفعول ہے۔ قاموس میں ہے: **انحله ماءاعطاه و مالا خصه بشیء منه کنحله فیها**

سألتنی ان أنحل : اس کو ''ان'' مصدر یہ اور صیغہ مضارع کے ساتھ ضبط کیا ہے۔

ابنها غلامی : یہ عبارت ضبط اول کی تائید کر رہی ہے۔ اور سید کے نسخہ میں ہے: **فعدلت عنه** اس ضبط اول کی تائید اگلے کلام

سے بھی ہوتی ہے۔

وقالت)" سألتنی "پر عطف ہے۔ای "وقالت لی ایضا۔ اخوة :اخ کی جمع ہے۔

کلھم : نصب کے ساتھ اور ایک نسخہ میں رفع کے ساتھ ہے۔ اعطیتھم مثل ما اعطیته ...... :استفہام فعل اول پر نصب ہے۔ اور مثل منصوب ہے مفعول ثانی ہونے کے بناء پر۔ وانی لا اشھد الا علی حق اس کے متعلق کلام پہلے گزر چکا ہے۔

آنحضرت ﷺ نئے پھل کا ہدیہ کس طرح قبول کرتے

۳۰۳۲:وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ رَأَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اِذَا اُتِیَ بِبَاکُوْرَةِ الْفَاکِهَةِ وَضَعَهَا عَلٰی عَیْنَیْهِ وَعَلٰی شَفَتَیْهِ وَقَالَ اَللّٰهُمَّ کَمَا اَرَیْتَنَا اَوَّلَهٗ فَاَرِنَا اٰخِرَهٗ ثُمَّ یُعْطِیْهَا مَنْ یَکُوْنُ عِنْدَهٗ مِنَ الصِّبْیَانِ۔

ترجمہ: "اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب کوئی نیا پھل پیش کیا جاتا تو (پہلے) اس پھل کو (قبول فرما کر) اپنی آنکھوں اور ہونٹوں سے لگاتے پھر یہ فرماتے "اے اللہ! جس طرح تو نے ہمیں اس پھل کا آغاز دکھایا ہے اسی طرح اس کا اختتام بھی ہمیں دکھا"۔ اسکے بعد آپؐ وہ پھل کسی ایسے بچے کو دیتے جو آپ ﷺ کے پاس موجود ہوتا"۔ (بیہقی)

تشریح: بباکورة الفاکھة : نہایہ میں ہے ہر چیز کے اول کو "باکورة" کہا جاتا ہے۔

قولہ:وضعھا علی عینیه وعلی شفتیه :اللہ کی نعمت کی تعظیم کی وجہ سے اور اس نعمت کے شکر میں

قوله :وقال :اللھم کما أریتنا اوله فأرنا آخره : دنیا میں تو یہ دعا درازی عمر کے لئے ہے۔اور عقبٰی میں ہو تو اشارہ ہے، کہ آخرت کے آگے دنیا کی کیا حقیقت ہے۔اور دنیا کی نعمتیں ختم ہونے والی ہے اور یہ آخرت کی نعمتوں کا ایک نمونہ ہیں۔

ثم یعطیھا من یکون عنده۔ من الصبیان : اس لئے کہ بچوں کا میلان اس کی طرف زیادہ ہوتا ہے۔اور موافقت ان کے درمیان اتم ہے۔اور علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، کہ آپؐ نئے پھل کو بچوں کو اس لئے دیتے تھے کہ بچہ دل کا پھل اور انسان کا نیا پھل ہوتا ہے۔

جزریؒ نے حصن میں ذکر کیا ہے کہ آپ جب نیا پھل دیکھتے تو یہ دعاء پڑھتے "اللھم بارك لنا فی ثمرنا وبارك لنا فی منابتنا وبارك لنا فی صاعنا وبارك لنا فی مدنا"۔اور جب آپ ﷺ کے پاس کوئی نیا پھل لایا جاتا، تو وہاں حاضر بچوں میں سے سب سے چھوٹے کو بلاتے اور یہ پھل اس کو دیدیتے۔اس کو روایت کیا ہے مسلمؒ، ترمذیؒ، نسائی اور ابن ماجہؒ سب نے حضرت ابو ہریرہؓ سے۔

بَابُ اللُّقْطَةِ

لقطہ کا بیان

"لقطة" لام کے ضمہ اور قاف کے فتحہ کے ساتھ، اور قاف کو ساکن بھی کیا جاتا ہے۔مغرب میں ہے کہ "لقطه" وہ چیز جو تم کو (راستہ میں) پڑی ہوئی ملے اور تم اٹھالو۔ازہریؒ کہتے ہیں کہ "لقطة" کو قاف کے سکون کے ساتھ میں نے لیث کے علاوہ کسی سے نہیں سنا ہے۔

ہمارے علماء میں سے بعض شراح فرماتے ہیں کہ قاف کے فتحہ کے ساتھ گرے ہوئے مال کو کہتے ہیں۔لقط الشیء و التقط سے ہے بمعنی اخذه من الارض "زمین سے اٹھانا"۔اور یہی اکثر کی رائے ہے۔اور خلیل فرماتے ہیں، کہ "لقطة" قاف کے فتحہ کے ساتھ" ملتقط "(اٹھانے والے) کو کہتے ہیں۔اسم فاعل کے دوسرے نظائر پر قیاس کرتے ہوئے جیسے "همزة" اور لمزة، اور گرے ہوئے مال کو "لقطة" قاف کے سکون کے ساتھ کہتے ہیں۔

الفصل الاول :

۳۰۳۳: عَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَسَئَالَهُ عَنِ اللُّقْطَةِ فَقَالَ اَعْرِفُ عِفَا صَهَا وَوِكَاءَ هَا ثُمَّ عَرِّفْهَا سَنَةً فَاِنْ جَاءَ صَاحِبُهَا وَاِلَّا فَشَأْنُكَ بِهَا قَالَ فَضَالَّةُ الْغَنَمِ قَالَ هِيَ لَكَ اَوْلِاَ خِيْكَ اَوْلِلذِّئْبِ قَالَ فَضَالَّةُ الْاِبِلِ قَالَ مَالَكَ وَلَهَا مَعَهَا سِقَاءُ هَا وَحِذَاءُ هَا تَرِدُ الْمَاءَ وَتَاْكُلُ الشَّجَرَ حَتّٰى يَلْقَاهَا رَبُّهَا (متفق عليه وَفِىْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ) فَقَالَ عَرِّ فْهَا سَنَةً ثُمَّ اَعْرِفْ وِكَاءَ هَا وَعِفَاصَهَا ثُمَّ اسْتَنْفِقْ بِهَا فَاِنْ جَاءَ رَبُّهَا فَاَدِّهَا اِلَيْهِ۔

اخرجه البخاری فی صحیحه ٥/٩١ الحدیث رقم ٢٤٢٩ ومسلم فی صحیحه ٣/١٣٤٦ الحدیث رقم (١-١٧٢٢) وابو داوٗد فی السنن ٢/٣٣١ الحدیث رقم ١٧٠٤ والترمذی فی ٣/٦٥٥ الحدیث رقم ١٣٧٢ وابن ماجه فی ٢/٨٣٦ الحدیث رقم ٢٥٠٤ ومالك فی الموطأ ٢/٧٥٧ الحدیث رقم ٤٦ من كتاب الاقضية واحمد فی المسند ٤/١١٦

ترجمہ: ''حضرت زید بن خالدؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے آپ سے لقطہ کے بارے میں دریافت کیا (کہ اگر کوئی گری پڑی چیز پائی جائے تو کیا کیا جائے؟) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: پہلے تو اس کی تھیلی اور اسے باندھنے والی رسّی کو پہچان لو (یعنی اگر وہ چیز کسی کپڑے یا چمڑے کے تھیلے وغیرہ میں ہے تو اسے شناخت میں رکھو) پھر ایک سال تک اس کا اعلان کرو (ایک سال کی مدت میں) اگر اس کا مالک آجائے تو وہ چیز اس کے حوالہ کردو اور اگر (ایک سال کی مدت میں) وہ نہ آئے تو پھر اسے اپنے استعمال میں لے آؤ۔ پھر اس شخص نے گمشدہ بکری کے بارے میں دریافت کیا (کہ اگر کسی کی گم شدہ بکری کوئی شخص پکڑ لائے تو اس کا کیا کرے؟) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''وہ تمہاری ہے یا تمہارے بھائی کی ہے اور یا بھیڑیئے کی ہے''۔ اس کے بعد اس شخص نے گمشدہ اونٹ کے بارے میں دریافت کیا (کہ اس کا کیا حکم ہے؟) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تمہیں اس سے کیا مطلب ہے (یعنی اسے نہ پکڑو کیونکہ وہ ضائع ہو جانے والی چیز نہیں ہے اس لئے اس کو پکڑ کر لانے کی ضرورت نہیں) اس کا (پانی کا) مشکیزہ اور اس کے موزے اس کے ساتھ ہیں۔ جب تک اس کا مالک اس کے پاس نہ پہنچ جائے وہ (پیاس لگنے پر) پانی کے گھاٹ تک جا سکتا ہے اور درخت کے پتے کھا سکے گا''۔ (بخاری ومسلم) اور مسلم کی ایک روایت میں یوں ہے کہ ''(جب اس شخص نے لقطہ کے بارے میں دریافت کیا تو) آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک سال تک اس کا اعلان کرو اور اس کی رسّی اور تھیلے کو پہچان لو (اس مدت تشہیر میں اگر اس کا مالک نہ آئے تو) پھر اسے اپنے استعمال میں لے آؤ اور اگر اس کے بعد اس کا مالک آجائے۔ اس چیز کی قیمت ادا کردو''۔

تشریح: **قال :جاء رجل الی رسول اللہ ﷺ فسا له عن اللقطة :**

عفاصها : عین کے کسرہ کے ساتھ برتن۔

و کاء : واؤ کے کسرہ کے ساتھ یعنی جس کے ذریعے باندھا جاتا ہے۔ فائق میں ہے کہ ''عفاص'' اس برتن کو کہتے ہیں جس میں لقطہ ہو۔ خواہ چمڑے کپڑے وغیرہ۔ اور نہایہ میں ہے کہ ''وکاء'' اس دھاگے کو کہتے ہیں جس کے ذریعے تھیلی، اور بٹوہ وغیرہ کو باندھا جاتا ہے۔

ابن الملک کہتے ہیں، کہ آپ نے اس چیز کا ظرف اور سر بند پہچان لینے کا حکم اس لئے دیا، کہ جو شخص اس کی ملکیت کا دعویٰ کرے گا اس پہچان کی وجہ سے اس کا سچا یا جھوٹا ہونا معلوم ہو جائے۔

شرح السنۃ میں ہے کہ ''اعرف عفا صها'' میں علماء کا اختلاف ہے، کہ اگر کوئی شخص لقطہ اٹھانے والے کے پاس آئے اور ظرف اور اس کے سر بند کی پہچان کرا دے اور اس لقطہ کا مالک ہونے کا دعویٰ کرے تو وہ لقطہ اسے دیدینا واجب ہے یا نہیں؟

چنانچہ امام مالک اور امام احمد تو یہ کہتے ہیں، کہ اس صورت میں وہ لقطہ اسے بغیر کسی گواہی کے دیدینا واجب ہے۔ کیونکہ ظرف اور اسکے سربند کی پہچان رکھنے کا یہی مقصد ہے۔ لیکن امام شافعیؒ اور حنیفہؒ کہتے ہیں، کہ اگر کوئی شخص لقطہ کے ظرف اور اسکے سربند کی پہچان اور اس لقطہ کا وزن یا عدد بتادے، نیز لقطہ اٹھانے والے کے دل میں یہ بات آجائے کہ یہ شخص سچا ہے تب وہ لقطہ اس شخص کو دیدینا جائز ہے' ورنہ تو گواہ پیش کرنے کے بعد دے۔ اسلئے کہ کبھی وہ لقطہ کی صفات کو صحیح بیان کر دیتا ہے چونکہ لقطہ اٹھانے والے کو لقطہ کا وصف بیان کرتے ہوئے سنا ہوتا ہے۔ پس اس صورت میں ظرف اور سربند کی پہچان رکھنے کا مطلب یہ ہوگا، ملتقط اس لقطہ کی نشانیاں اچھے طریقہ سے پہچان لے تاکہ وہ اسکے مال میں اس طرح خلط ملط نہ ہو جائے، کہ جب لقطہ کا مالک آئے تو وہ اپنے مال واسباب اور لقطہ کے درمیان امتیاز نہ کر سکے۔

عرفھا : راء مشددہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں، کہ ظاہر میں ایک سال اس کی تشہیر کرنے کا حکم تکرار کا تقاضا کرتا ہے عرف اور عادت کے طور پر۔ اگرچہ ''**سنة**'' کی ظرفیت تعریف کیلئے۔ ایک مرتبہ واقع ہونے پر بھی صادق آتا ہے، لیکن لازم ہے، اس کو حمل کرنا ''معتاد'' طریقے پر۔ کہ گاہے بگاہے اس کا اعلان کرے۔ اور بارہا اس کا اعلان کرے جب بھی اس کے مالک کے وجود کا گمان ہو۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں، کہ پہلے ہفتے میں ہر روز دو مرتبہ اعلان کرے، ایک مرتبہ صبح اور ایک مرتبہ شام کو۔ اور دوسرے ہفتے میں ہر روز ایک مرتبہ اعلان کرے، پھر ہر ہفتے میں ایک مرتبہ اعلان کرے۔ اور امام محمدؒ نے اصل میں تشہیر کی مدت ایک سال متعین کی ہے کم اور زیادہ کی تفصیل کے بغیر۔ ان کی دلیل یہی حدیث ہے اور یہی امام مالکؒ، شافعیؒ اور احمدؒ کا قول ہے۔

صحیح یہ ہے کہ مذکورہ بالا مقدار میں سے کوئی بھی لازم نہیں ہے۔ بلکہ یہ لقطہ اٹھانے والے کی رائے پر موقوف ہے حدیث مسلم کے اطلاق کی وجہ سے کہ آپ ﷺ نے لقطہ کے بارے میں فرمایا: ''**عرفھا فان جاء احد یخبرك بعددھاو وعائھاو وکائھا فاعطہ ایاھا والا فاستمتع**'' (اس میں ''سنۃ'' کی قید نہیں ہے۔) اور اس حدیث میں جو ''سنۃ'' کی قید ہے، یہ شاید اس وجہ ہو کہ جس لقطہ کے بارے میں آپ ﷺ سے سوال کیا گیا تھا، اس کا تقاضا یہی تھا۔ اور اس لئے کہ غالب یہی ہے کہ لقطہ عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔

فان جاء صاحبھا : شرط ہے، جزاء معلوم ہونے کی وجہ سے حذف کر دی۔ **ای فردھا الیہ أوفبھاو نعمت أو أخذھا**۔

فشأنك بھا : ہمزہ کے ساتھ ہے، اور ہمزہ کو الف سے تبدیل بھی کیا جاتا ہے۔ یہ منصوب ہے، مصدریت کی بناء پر۔ کہا جاتا ہے: **شأنت شانہ ای قصدت قصدہ، وشأن شأنك** یعنی وہ عمل کر جس کو تو اچھا سمجھے۔ (اس کو ذکر کیا ہے علامہ طیبی رحمہ اللہ نے۔)

اور بعض کہتے ہیں کہ یہ مفعول ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ **ای خذ شأنك** ہے۔ یعنی اس کے ساتھ وہ معاملہ کریں جو آپ چاہیں، صدقہ کرنا بیچنا، کھانا وغیرہ۔

حاصل یہ ہے کہ اگر لقطہ اٹھانے والا خود محتاج ہے، تو وہ اس سے خود فائدہ اٹھائے ورنہ صدقہ کر دے۔ قاضیؒ فرماتے ہیں، کہ اس سے معلوم ہوا کہ جس نے لقطہ اٹھایا اور پھر ایک سال تک اس کی تشہیر کی، اور اس کا مالک ظاہر نہ ہوا، تو یہ اس کا مالک بن جاتا ہے، چاہے یہ مالدار ہو یا فقیر ہو۔ چنانچہ اکثر صحابہ' تابعین، امام شافعیؒ امام احمدؒ اور اسحٰقؒ کا یہی مسلک ہے۔

اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ مالدار آدمی لقطہ کو صدقہ کرے، اور خود اس سے فائدہ نہ اٹھائے، اور اس کا مالک نہ بن جائے۔ ثوری، ابن المبارک اور حنفیہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ مسلک اول کی تائید ابی بن کعب کی اس روایت سے ہوتی ہے۔ **وجدت صرۃ۔ الی قولہ، فان جاء صاحبھا والا فاستمتع بھا**، اور حضرت ابی انصار کے مالداروں میں سے تھے۔

قال : ضمیر مرفوع الرجل کی طرف راجع ہے۔

فضالة الغنم؟ : لام کی تشدید کے ساتھ، گمشدہ یا چھوڑی ہوئی۔ یہ مبتدا ہے۔ اور اس کی خبر محذوف ہے۔ **ای ماحکمھا؟** یعنی اس کا کیا حکم ہے؟

قال هي لك : یعنی اگر آپ نے اس کو لیا اس کی تشہیر کی، اور اس کے مالک کو نہیں پایا، تو پھر آپ اس کے مالک بن سکتے ہیں۔

أو لا خيك : مراد اس سے مالک ہے، یعنی اگر آپ نے اس کو لیا اور پھر اس کا مالک ظاہر ہوا، تو یہ اس کی ہے۔ یا آپ نے اس کو چھوڑ دیا، اور اتفاق سے مالک نے اس کو پالیا، تو پھر بھی اس کی ہے۔ بعض کہتے ہیں، کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اگر آپ اس کو بطور لقطہ نہیں لیں گے، تو تیرے علاوہ کوئی اور اس کو بطور لقطہ لے لے گا۔ (**أو للذئب** :ہمزہ کے ساتھ ہے، اور ہمزہ کو یاء سے تبدیل بھی کیا جاتا ہے۔ یعنی اگر آپ اس کو چھوڑ دیں گے، تو بھیڑیا اسے پکڑ لے گا۔ اس میں اس کے لینے پر ترغیب ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ اس کو چھوڑ دیں اور آپ کے علاوہ کسی اور کو بھی اس کے لینے کا اتفاق نہیں ہوا، تو پھر غالب یہ ہے کہ اس کو بھیڑیا کھالے گا۔ گویا کہ آپ ﷺ نے تنبیہ کی، اس کے پکڑنے اور مالک بننے کے جواز پر' اور اس کے پکڑنے کی علت پر تنبیہ کی، اور وہ اس کا ضائع ہونا ہے، تا کہ یہ دلالت کرے اس حکم کے مطرد ہونے پر ہر اس جانور میں جو بغیر چرواہے اور نگہبان کے اپنی حفاظت نہ کر سکتا ہو۔

مالك لها : کہا گیا ہے، کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا اس سے کیا کام ہے، یعنی آپ اسے چھوڑ دیں، اور مت پکڑیں۔

سقاؤ : سین کے کسرہ کے ساتھ یعنی اس کا معدہ، یہ سیراب کرنے میں مشک کے مانند ہے، اس لئے کہ اونٹ جب پانی پیتا ہے، تو وہ اتنا پیتا ہے، جو کئی دن تک اس کی پیاس کیلئے کافی ہوتا ہے۔ **حذا** :حاء کے کسرہ کے ساتھ، کھر۔

معها سقائها وحذاؤها : ظاہر یہ ہے کہ جملہ مستانفہ ہے، علت بیان کرنے کیلئے لایا گیا ہے۔

بعض شراح فرماتے ہیں، کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اونٹ کے پاس اپنے اسباب معاش ہوتے ہیں جس کے ذریعے وہ زندہ رہ سکتا ہے۔ یعنی اس کے پیاس سے مرنے کا کوئی خطرہ نہیں ہے، اس لئے کہ وہ پیاس پر صبر کر سکتا ہے۔ اور چراگاہ تک جانے کی طاقت رکھتا ہے۔ ''سقاء'' دودھ اور پانی کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ یہاں اس سے مراد اس کی اوجڑی کے اندر کا پانی ہے۔ اس لئے کہ وہ سیراب کرنے میں مَشک کے مانند ہے۔ یا مراد یہ ہے کہ وہ پیاس کو برداشت کر سکتا ہے' اس لئے کہ اونٹ تمام جانوروں میں پیاس کو زیادہ برداشت کرنے والا جانور ہے۔

ترد الماء : یعنی آتا ہے اور اس سے پیتا ہے۔ اور اسی سے اللہ کا یہ ارشاد ہے: ﴿**ولما ورد ماء مدين**﴾ ترجمہ: ''اور جب مدین کے پانی پر پہنچے''۔

وتأكل الشجر حتى يلقها ربها : یہاں رب سے مراد' مالک'' ہے۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ سقاء سے مراد یہ ہے کہ یہ جب پانی پر جاتا ہے تو اتنا پیتا ہے، کہ وہ پیاس بجھا لیتا ہے، اور یہ سب سے زیادہ پیاس برداشت کرنے والا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اونٹ ضرورت کے وقت پانی کی طرف جاتا ہے۔ پس آپ ﷺ نے اس کے پیاس برداشت کرنے کو یا پانی پر اترنے کو بمنزلہ مَشک قرار دیا۔ اور' حذاء'' سے مراد اس کے کھر ہیں' جس کی وجہ وہ چلنے اور دور مسافت کو قطع کرنے اور دور پانی تک جانے کی طاقت رکھتا ہے۔

اس ارشاد گرامی میں آپ ﷺ نے اونٹ کو اس مسافر سے تشبیہ دی ہے، جس کے پاس جوتے اور مَشک وغیرہ ہوں۔ اور رب کی اضافت اس کی طرف کی ہے اس لئے کہ جانور نہ عبادت پر مامور ہیں، اور نہ ہی مخاطب ہیں۔ پس یہ بمنزلہ ان اموال کے ہیں، کہ جن کی طرف مالک کی اضافت جائز ہوتی ہے۔ اور مالک کو ان کیلئے'' رب'' قرار دینا درست ہوتا ہے (جیسے رب المال)۔

قاضیؒ فرماتے ہیں کہ'' **معها سقاء ها**'' کی قید سے اشارہ کیا ہے، کہ اونٹ کو بطور لقطہ لینے سے مانع اور اونٹ اور بکری کے درمیان فرق وہ اونٹ کا'' استقلال بالتعیش'' ہے، یہ صورت ان اونٹوں میں متحقق ہے جو صحراء میں پائے جاتے ہیں۔ باقی جو کسی بستی یا شہروں میں پایا جائے، تو اس کو بطور لقطہ پکڑنا جائز ہے کسی مانع کے نہ ہونے کی وجہ سے اور موجب کے وجود کی وجہ سے اور وہ موجب اس کے تلف

ہونے کا خطرہ اور نظروں کی طمع ہے۔

علماء کی ایک جماعت کا مسلک یہ ہے کہ اونٹ اور اس طرح کے بڑے جانوروں میں کوئی فرق نہیں ہے، کہ ان کو آبادی میں یا صحراء میں پکڑا جائے اس لئے کہ ممانعت مطلق ہے۔ ابن الملک فرماتے ہیں، کہ حنفیہ کے نزدیک بکری اور اس کے علاوہ جانوروں کو بطور لقطہ پکڑنے کی فضیلت میں کوئی فرق نہیں ہے جب اس کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو، اور وہ اپنے آپ پر گواہ بنادے، کہ اس نے یہ جانور اسلئے پکڑا ہے، کہ اسکو مالک کی طرف لوٹائے گا۔ اور حضرت زید کی روایت کے بارے میں حنفیہ یہ کہتے ہیں، کہ اس میں مذکورہ حکم اس زمانہ میں تھا جب کہ امانت دار اور خیر و بھلائی کے حامل لوگوں ہی کا غلبہ تھا۔ اگر کسی جانور کو کوئی نہ پکڑتا تھا، تو کسی خائن کا ہاتھ اس تک نہیں پہنچتا تھا۔ اور ہمارے زمانہ میں یہ بات مفقود ہے۔ تو جانور کی پکڑنے میں اس کا احیاء اور مالک کے لئے اس کی حفاظت ہے۔ یہ زیادہ بہتر ہے۔

ثم اعرف وكاء ها وعفاصها : ظاہر یہ ہے کہ ثم سے مراد یہاں صرف عطف ہے، تاکہ ماقبل مطابق ہو جائے۔ اور اسی سے اللہ کا یہ ارشاد ہے: ﴿**ثم آتينا موسى الكتاب**﴾ . واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

ابن حجرؒ فرماتے ہیں، کہ اس (روایت) میں معرفہ کو "تعریف" مؤخر ذکر کیا گیا ہے برخلاف پہلی روایت کے، اس میں اشارہ ہے کہ لقطہ اٹھانے والا دو مرتبہ پہچان کرنے پر مامور ہے، پہلے اس کا ظرف پہچانے۔ پس جب ایک سال تک اس کی تشہیر کرے، اور پھر اس کے مالک بننے کا ارادہ کرلے، تو اس کیلئے مستحب ہے، کہ دوسری مرتبہ پھر اس کی پہچان کرلے۔ تاکہ مالک کا سچ ظاہر ہو، جب وہ اس کا وصف بیان کرے۔ (انتہیٰ)۔ اس بات کا بعید ہونا کوئی مخفی نہیں ہے۔

ثم استنفق : یعنی جب اس کا مالک نہ پہچانا جائے، تو پھر آپ اس کے مالک بن جائیں، اور اس کو اپنے اوپر خرچ کریں، امر اباحت کیلئے ہے۔

پھر جب لینے والا اس میں تصرف کرلے اپنے فقیر ہونے کی صورت میں یا صدقہ کردے فقیر پر تو پھر مالک کو اختیار ہے جس سے چاہے تاوان لے۔ اور ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر رجوع کرنے کا حق نہ ہوگا۔ اور یہی مطلب ہے "**فان جاء ربها فأدها اليه**" کا یعنی اگر عین موجود ہے تو مالک کے سپرد کردے، ورنہ اس کی قیمت اداء کردے۔

لقطہ کو بغیر تشہیر اپنے پاس رکھنا خیانت ہے

۳۰۳۴: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ اٰوٰی ضَالَّةً فَهُوَ ضَالٌّ مَالَمْ يُعَرِّفْهَا. (رواہ مسلم)

اخرجه مسلم فى صحيحه ١٣٥١/٣ الحديث رقم (١٢-١٧٢٥) واحمد فى المسند ١١٧/٤۔

ترجمہ: "اور حضرت زیدؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص (کسی کی) کوئی گم شدہ چیز کو پناہ دے (یعنی اٹھا کر رکھ لے) تو وہ گمراہ ہے جب تک کہ وہ اس کا اعلان نہ کرے"۔ (مسلم)

تشریح: آوىٰ : مد کے ساتھ بھی ہے، اور قصر کے ساتھ بھی۔ ملانا اور جمع کرنا۔

ضالة : گمشدہ جانور کو کہتے ہیں، چاہے نر ہو یا مادہ۔ اور لقطہ عام ہے لیکن اس کا زیادہ استعمال جانوروں کے علاوہ چیزوں کیلئے ہوتا ہے۔

فهو ضال : یعنی حق سے مائل اور منحرف کو کہتے ہیں۔

يعرفها : راء کی تشدید کے ساتھ ہے۔

یعنی جس نے اس کو لیا اور بغیر تشہیر کے پاس رکھا وہ گمراہ ہے، اور جس نے لوٹانے یا اعلان کرنے کی نیت سے اٹھایا تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ابن الملکؒ فرماتے ہیں، کہ تعریف کا معنی تشہیر اور مالک کو طلب کرنا ہے۔

شمس الائمہ حلوانی فرماتے ہیں، کہ کم از کم تعریف یہ ہے کہ وہ لینے پر کسی کو گواہ بنادے، اور یہ کہے کہ میں اس کو لوٹانے کے ارادہ

سے اظہار ہا ہوں۔ اگر اس نے اس طرح کیا اور پھر اس کا اعلان نہیں کیا، تو بھی کافی ہے۔
علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، کہ ''فهو ضال '' کا مطلب یہ ہے کہ وہ پانے والا راہ راست پر نہیں ہے گر وہ اس کا اعلان نہ کرے۔ یا جو چیز اس نے پائی ہے وہ اسی طرح گمشدہ ہے جس طرح تھی۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہ بھی جائز ہے کہ ''ضال'' سے مراد گمشدہ اونٹ وغیرہ ہو جن کو بطور تملک پکڑنا جائز نہیں ہے' بلکہ ان کو حفاظت کی نیت سے پکڑا جاتا ہے۔ پس وہ شخص گمراہ ہے جس نے اس کی حفاظت کی اور اعلان نہیں کیا۔

تخریج: اسی طرح احمدؒ نے بھی۔

حنفیہ کے ہاں زمین حل اور زمین حرم کا لقطہ برابر ہے

۳۰۳۵: وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عُثْمَانَ التَّيْمِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى عَنْ لُقْطَةِ الْحَاجِّ. (رواه مسلم)

اخرجه مسلم فی صحيحه ٣/١٣٥١ الحديث رقم (١-١٧٢٤) وابوداوٗد فی ٢/٣٤٠ الحديث رقم ١٧١٩ واحمد فی المسند ٣/٤٩٩

ترجمہ: ''اور حضرت عبدالرحمٰن بن عثمان تیمیؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حجاج کرام کی گری پڑی چیز اٹھانے سے منع فرمایا ہے''۔ (مسلم)

حالاتِ راوی:

عبد الرحمن بن عثمان التیمی صحابی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ انہوں نے آپ کو پایا ہے لیکن ان سے کوئی روایت نہیں ہے۔ اور ان سے علماء کی ایک جماعت نے روایت کی ہے۔ اس کو مؤلف نے ذکر کیا ہے۔ پس ان کی یہ حدیث مراسیل صحابہ میں سے ہوگی' اور وہ سب کے ہاں حجت ہے۔

تشریح: قوله: ان رسول الله ﷺ نهى عن لقطة الحاج: یعنی ان کے لقطہ کے مالک بننے سے یا مطلقاً اٹھانے سے یا حرم میں اٹھانے سے فرمایا ہے۔ قاضیؒ کہتے ہیں، کہ یہ حدیث اس بات کا احتمال رکھتی ہے، کہ اس سے مراد حرم میں حاجیوں کے لقطہ اٹھانے سے ممانعت ہو۔ حدیث میں حرم اور غیر حرم کے لقطہ میں فرق آیا ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ مطلقاً اس کے اٹھانے سے ممانعت ہو، کہ اسی جگہ پر اس کو چھوڑ دیا جائے اور بلند آواز سے اسی جگہ اس کا اعلان کیا جائے۔ اس لئے کہ یہ طریقہ سب سے زیادہ قریب ہے اس کے مالک کے ظاہر ہونے کے لئے۔ اس لئے کہ حجاج ایک ساتھ بہت کم دنوں تک جمع رہتے ہیں' پھر الگ ہو جاتے ہیں، تو ان کے منتشر ہونے کے بعد اعلان کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ (انتہی)۔ ہمارے بعض علماء نے قاضیؒ کی اس بات کی اتباع کی ہے۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں، کہ یہاں لقطہ سے مراد حرم مکہ کا لقطہ ہے، یعنی حرم مکہ کی حدود میں پائے جانے والے لقطہ کا اعلان ہونے کے بعد بھی مالک ہونا جائز نہیں ہے بلکہ اٹھانے والے کیلئے واجب ہے کہ وہ اس کو ہمیشہ کیلئے محفوظ رکھے مالک کے واسطے۔ چنانچہ امام شافعیؒ کا یہی مسلک ہے، اور ہمارے نزدیک حرم اور غیر حرم کا لقطہ برابر ہے۔ ابن ہمام کی شرح ہدایہ میں ہے کہ ابن وہب فرماتے ہیں، کہ اس وقت تک اس کو چھوڑے رکھے جب تک کہ اس کا مالک نہ آئے۔ لیکن اس زمانہ میں اس پر عمل نہیں ہے، چوری کے عام ہونے کی وجہ سے مکہ میں کعبہ کے اردگرد چہ جائیکہ متروک چیز کو کوئی چھوڑ دے۔

اور احکام کی مشروعیت جب معلوم ہو جائے باعتبار شرط کے۔ پھر اسکی ضد کا ثبوت معلوم ہو جائے جو کسی فساد کو متضمن ہو، اسکی مشروعیت کے ساتھ' تو وہ احکام منقطع ہو جاتے ہیں۔ برخلاف ان احکام کے جن کی مشروعیت معلوم ہو کسی سبب کی وجہ سے جب سبب کا انتفاء معلوم ہو جائے، اور بقاء حکم میں کوئی مفسدہ نہ ہو تو اسکا منقطع ہونا لازم نہیں۔ جیسے رمل اور طواف میں اضطباع طاقت کے اظہار کے لئے۔

اسی طرح احمدؒ اور ابوداؤدؒ نے بھی روایت کیا ہے۔

الفصل الثانی:

ویران وغیر آباد زمین کے لقطہ اور دفینہ کا حکم

۳۰۳۶: عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اَنَّهٗ سُئِلَ عَنِ الثَّمَرِ الْمُعَلَّقِ فَقَالَ مَنْ اَصَابَ مِنْهُ مِنْ ذِىْ حَاجَةٍ غَيْرَ مُتَّخِذٍ خُبْنَةً فَلَا شَيْءَ عَلَيْهِ وَمَنْ خَرَجَ بِشَيْءٍ مِّنْهُ فَعَلَيْهِ غَرَامَةُ مِثْلَيْهِ وَالْعُقُوْبَةُ وَمَنْ سَرَقَ مِنْهُ شَيْئًا بَعْدَ اَنْ يُّؤْوِيَهُ الْجَرِيْنُ فَبَلَغَ ثَمَنَ الْمِجَنِّ فَعَلَيْهِ الْقَطْعُ وَذَكَرَ فِى ضَالَّةِ الْاِبِلِ وَالْغَنَمِ كَمَاذَكَرَ غَيْرُهٗ قَالَ وَسُئِلَ عَنِ اللُّقْطَةِ فَقَالَ مَاكَانَ مِنْهَا فِى الطَّرِيْقِ الْمِيْتَاءِ وَالْقَرْيَةِ الْجَامِعَةِ فَعَرِّفْهَا سَنَةً فَاِنْ جَاءَ صَاحِبُهَا فَادْفَعْهَا اِلَيْهِ وَاِنْ لَّمْ يَاتِ فَهُوَ لَكَ وَمَاكَانَ فِى الْخَرَابِ الْعَادِىِّ فَفِيْهِ وَفِى الرِّكَازِ الْخُمُسُ (رواه النسائى وروى ابوداود عَنْهُ مِنْ قَوْلِهٖ) وَسُئِلَ عَنِ اللُّقْطَةِ (اِلٰى اٰخِرِهٖ)۔

اخرجه ابو داوٗد فى السنن ۲/۳۳۶ الحديث رقم ۱۷۱۰ والترمذى فى ۳/۵۸۴ الحديث رقم ۱۲۸۹ والنسائى فى ۸/۸۵ الحديث رقم ۴۹۵۸ وابن ماجه فى ۲/۸۶۵ الحديث رقم ۲۵۹۶ واحمد فى المسند ۲/۲۸۰

ترجمہ: ”حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد (حضرت شعیبؒ) سے اور شعیب اپنے دادا (یعنی حضرت عبداللہ بن عمروؓ) سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے (درختوں پر) لگے ہوئے پھلوں کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر کوئی حاجت مند کچھ پھل (توڑ کر) کھالے مگر اپنی جھولی میں بھر کر نہ لے جائے تو اس پر کچھ گناہ نہیں اور جو شخص (کھائے بھی اور جھولی بھر کر لے بھی جائے تو اس پر دوگنا تاوان اور سزا ہے اور جو شخص ان پھلوں میں سے کچھ چرائے جو کھلیان میں رکھے جا چکے ہوں اور وہ چرائی ہوئی مقدار ایک سپر (ڈھال) کی قیمت کے بقدر ہو تو اس کے لئے ہاتھ کاٹنے کی سزا ہے۔ راوی نے گمشدہ اونٹ اور بکری کے بارے میں اس سوال و جواب کا تذکرہ کیا جو دوسروں نے بیان کیا ہے (اور جو پہلے گزر چکا ہے) اس کے بعد راوی کہتے ہیں کہ پھر آپ ﷺ سے لقطہ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو لقطہ کسی ایسے راستے پر پایا جائے جس پر آمد و رفت رہتی ہو اور گاؤں و آبادی کے قریب ہو تو اس کے بارے میں حکم یہ ہے کہ اس کا ایک سال تک تشہیر واعلان کرو اور پھر جب (اس کا) مالک آجائے تو وہ لقطہ اس کے حوالہ کر دو اور اگر مالک نہ آئے تو وہ لقطہ تمہارا ہے (کہ تم اسے اپنے استعمال میں لا سکتے ہو) اور وہ لقطہ ویران، قدیم جگہ میں پایا جائے اس کا اور زمین سے برآمد ہونے والے دفینے کا یہ حکم ہے کہ اس میں خمس (یعنی پانچواں حصہ) لازم ہے (یعنی اس چیز کا یا دفینہ کا پانچواں حصہ اللہ کی راہ میں دے دیا جائے) (نسائی) اور ابوداؤد نے اس روایت کو عمرو بن شعیبؒ سے وَسُئِلَ عَنِ اللُّقْطَةِ تک نقل کیا“۔

تشریح: ثمر: ثاء اور میم کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

خبنة: خاء کے ضمہ اور باء کے سکون کے ساتھ ہے۔ وہ خوراک جو چھپا کے لیجائی جائے۔

العقوبة: رفع کے ساتھ۔ یہاں اس سے ”تعزیر“ مراد ہے۔

ان یؤویه: حاضر تمام نسخوں میں یاء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ تورپشتیؒ فرماتے ہیں۔ آویٰ اور أوی. ایک معنی میں ہے۔ اور مقصور دونوں سے متعدی اور لازم دونوں استعمال ہوتا ہے۔ اور متعدی میں سے یہ حدیث ہے۔ اس کا معنی ہے ملانا اور جمع کرنا۔

الجرین: جیم کے فتحہ اور راء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ پھل سکھانے کی جگہ کو کہتے ہیں، یہ پھلوں کیلئے ایسا ہے، جیسے گندم کیلئے کھلیان ہوتا ہے۔ اور عادتاً اس کو ”حرز“ سمجھا جاتا ہے۔

المجن : میم کے کسرہ جیم کے فتحہ اور نون کے شد کے ساتھ ''ڈھال'' کو کہتے ہیں۔ اسکو عربی میں '' درقه'' بھی کہتے ہیں۔

الطريق الميتاء : جامع الاصول میں اسی طرح ہے، اور مصابیح کے نسخوں میں اور مشکوٰۃ کے بعض نسخوں میں '' طريق الميتاء '' اضافت کے ساتھ ہے۔ '' ميتاء '' میم کے کسرہ اور یاء کے سکون کے ساتھ عام آمد و رفت والا راستہ اس کو '' الجادة '' بھی کہا جاتا ہے۔ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ '' ميتاء '' عام راستے کو کہتے ہیں، اور '' مجتمع الطريق '' (جہاں بہت سارے راستے ملتے ہوں) اس کو بھی '' ميتاء '' کہتے ہیں۔ اور '' الميتاد '' اس راستے کو کہتے ہیں جس پر راہ گیر چلتے ہوں۔ یہ '' اتيان '' سے '' مفعال '' کے وزن پر ہے۔ یعنی جس پر لوگوں کی آمد و رفت ہو۔ (انتہی)۔

پس '' ميتاء '' میں یاء اصل میں ہمزہ ہے اس کو یاء سے تبدیل کیا ہے جوازاً اور اس میں ہمزہ اصل میں یاء ہے، جس کو ہمزہ سے تبدیل کیا ہے وجوباً۔ فتأمل۔

العادى : یاء کی تشدید کے ساتھ۔ بمعنی قدیم۔ خمس : خاء اور میم کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ من ذى حاجة : من کیلئے بیان ہے۔

غير متخذ : '' غیر '' نصب کے ساتھ ہے۔ '' اصاب '' کے فاعل سے حال ہونے کی بناء پر۔ اور ایک نسخہ میں جر کے ساتھ ہے ذی حاجة کی صفت ہونے کی بناء پر۔

وان لم يأت : ضمیر مرفوع '' صاحبها '' کی طرف راجع ہے۔ اور اس کلام میں تفنن ہے۔

ذى حاجة : ضرورت مند سے مراد فقیر ہے، یا مضطر ہے

غير متخذ خبنة فلا شىء عليه : ان پر کلام باب الغصب میں گزر چکا ہے۔ ابن ملک فرماتے ہیں، کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ لیکن اس پر تاوان لازم ہے۔ یا یہ حکم ابتداء اسلام میں تھا پھر منسوخ ہو گیا' اور امام احمد نے اس کو بغیر ضرورت کے بھی جائز قرار دیا ہے۔

قوله : ومن خرج بشىء فعليه غرامة مثليه : یعنی دوگنی قیمت اس پر لازم ہوگی۔

والعقوبة : ابن الملک فرماتے ہیں، کہ یہ زجر اور وعید کے طور پر ہے۔ ورنہ تلف کرنے والے پر قیمت مثلی سے زیادہ لازم نہیں ہے۔ اور حضرت عمرؓ اسی کے مطابق فیصلہ فرماتے تھے' ظاہر حدیث پر عمل کرتے ہوئے۔ اور یہی امام احمدؒ کا مسلک ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ ابتداء اسلام میں تھا پھر منسوخ ہو گیا۔

شرح السنہ میں ہے کہ یہ لازم کرنا تاوان اور تعزیر کے طور پر ہے، اس چیز میں جو اس نے نکالی ہے۔ اس لئے کہ یہ اس ضرورت کے تحت نہیں آتا جس کی رخصت دی گئی ہے، اور اس وجہ سے بھی کہ مالکان اس میں چشم پوشی بھی نہیں کرتے۔ برخلاف اس تھوڑی سی مقدار کے جس کو کھایا جائے۔ اور شاید دوگنا تاوان زجر میں مبالغہ کیلئے ہو یا اس وجہ سے کہ ابتداء اسلام میں اسی طرح سخت حکم تھا پھر منسوخ ہو گیا۔ اور اس میں ہاتھ کاٹنے کو لازم نہیں کیا، بلکہ اس پر لازم کیا اس میں جو پایا جائے جو کھلیان میں جمع ہو

ومن سرق منه شيأ : الى آخره . اس لئے کہ باغات مدینہ میں اس زمانہ میں محفوظ اور (چار دیواری میں گھرے ہوئے نہیں ہوتے تھے۔ اسی لئے اس کو مقید کیا ہے

بعد أن يؤويه الجرين : جرین پھلوں کے لئے ایسا ہوتا ہے، جیسا کہ بکریوں کے لئے باڑہ ہوتا ہے۔ اور اشیاء کی حفاظت عادت کے مطابق ہوتی ہے۔

فبلغ ثمن المجن : قیمت سے مراد نصاب سرقہ ہے۔ اس لئے کہ اس زمانہ میں ڈھال چوتھائی دینار کے برابر تھی۔ بعض کہتے ہیں، کہ دس درہم کے برابر ہوتی تھی جو چوری کا نصاب ہے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ہاں۔

فعليه القطع : اور شرح السنہ میں ہے کہ ڈھال کی قیمت سے مراد تین دراہم ہیں، اور اس کی شہادت اس روایت سے ملتی ہے، جو

ابن عمر رضی اللہ عنہما نے روایت کی ہے، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ڈھال جس کی قمت تین دراہم تھی اس کے چوری کرنے پر ہاتھ کاٹا۔

قولہ : سئل عن اللقطة، فقال ما كان فى الطريق الميتاء۔۔۔ فاد فعها اليه، وان لم يات فهو لك یعنی تیری ملکیت ہے، یا تیرے لیے خاص ہے، اس میں تصرف کر۔ حاصل یہ ہے کہ جو لقطہ کسی ایسے راستہ پر پایا جائے، جو آبادی کے قریب ہونے کی وجہ سے گزرگاہ عام وخاص ہو، تو اس کی تشہیر واعلان واجب ہے، کیونکہ غالب گمان ہے کہ وہ کسی مسلمان کا ہوگا۔

قولہ : وما كان فى الخراب العادى ففيه وفى الركاز الخمس : اس سے مراد یہ ہے کہ جو لقطہ کسی ویران گاؤں یا قدیم زمین جہاں مسلمانوں کی عمارات نہ ہوں، اور نہ کسی مسلمان کی ملکیت میں داخل ہوں، خواہ وہ چیز سونا یا چاندی ہو یا برتن اور فرنیچر وغیرہ۔

اس کو دفینہ کا حکم دیا اس لئے کہ ظاہر یہ ہے کہ یہ اس کی ملکیت نہیں ہے۔

''الرکاز'' راء کے کسرہ کے ساتھ جاہلیت کے دفینہ کو کہتے ہیں، گویا کہ اس کو زمین میں گاڑا گیا ہے۔

لقطہ استعمال میں آجانے کے بعد اس کا مالک طلب کرے تو اس کا بدل دینا چاہئے

۳۰۳۷: وَعَنْ اَبِى سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ اَنَّ عَلِيَّ بْنَ اَبِيْ طَالِبٍ وَجَدَ دِيْنَارًا فَاَتٰى بِهٖ فَا طِمَةَ فَسَاَلَ عَنْهُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ هٰذَا رِزْقُ اللّٰهِ فَاَكَلَ مِنْهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَاَكَلَ عَلِيٌّ وَفَاطِمَةُ فَلَمَّا كَانَ بَعْدَ ذٰلِكَ اَتَتِ امْرَاَةٌ تَنْشُدُ الدِّيْنَارَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَاعَلِيُّ اَدِّالدِّيْنَارَ. (رواہ ابوداود)

اخرجه ابو داوٗد فى السنن ۲/۳۳۷ الحديث رقم ۱۷۱۴۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) حضرت علی بن ابی طالب نے (کسی راستہ میں بطور لقطہ) ایک دینار پایا۔ حضرت علیؓ اسے حضرت فاطمہؓ کے پاس لے آئے۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''یہ اللہ کا رزق ہے''۔ پھر اس دینار (سے خریدی ہوئی چیز) کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کھایا اور حضرت علیؓ وحضرت فاطمہؓ نے بھی کھایا اس کے بعد جب ایک عورت اپنا دینار ڈھونڈتی ہوئی آئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ ''اے علی! اس عورت کو دینار دے دو''۔ (ابوداؤد)

تشریح: تنشد : شین کے ضمہ کے ساتھ بمعنی طلب کرنا۔

أكل منه رسول الله واكل علي : اس میں عامل مکرر لایا گیا ہے مبالغہ کیلئے یا تعظیم کیلئے۔

یہ حدیث اعلان نہ کرنے پر دلالت نہیں کرتی، اور نہ عدم پر دلالت کر رہی ہے۔ کہ اس وقت تک کہ جب غالب گمان یہ ہو کہ اب مالک اس چیز کو نہیں ڈھونڈے گا۔ اس لئے کہ فاء کبھی صرف ''بعدیت'' بتانے کیلئے آتا ہے، تو ترتیب کا فائدہ دیتی ہے۔ اور اگر فاء تعقیب کیلئے بھی ہو، تو اس صورت میں تعقیب ہر چیز میں اس کے مطابق ہوتی ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے: **تزوج فلان فولد له**۔ یہ اس وقت کہا جاتا ہے، جب نکاح اور ولادت کے درمیان صرف مدت حمل گزری ہو۔ اگرچہ مدت لمبی ہی کیوں نہ ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿**الم تر ان الله انزل من السمآء ماء فتصبح الارض مخضرة**﴾ [الحج۔۶۳]: ''اور اے مخاطب! کیا تجھ کو یہ خبر نہیں، کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی برسایا جس سے زمین سرسبز ہوگئی''۔

پس صاحب شرح السنہ کا یہ قول کہ ''یہ دلیل ہے کہ شیئ قلیل کیلئے اعلان نہیں کیا جائے گا'' تو یہ محل بحث ہے۔

اور اسی طرح ابن الملکؒ کا یہ قول کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے پاس رکھنے اور اس کی تشہیر کرنے کا حکم نہیں دیا اس لئے کہ لقطہ جب شئ قلیل ہو، تو اس کی تشہیر نہیں کی جاتی۔ (انتہیٰ)

لیکن یہ مذہب محفوظ کے خلاف ہے، اس لئے کہ دینار شیئ قلیل نہیں ہے، کہ جس کے اعلان کی ضرورت نہ ہو۔ جیسا کہ اس قاضی

خان اوران کے علاوہ علماء نے تصریح کی ہے۔اشرف ؒ کہتے ہیں، کہ اس حدیث سے معلوم ہوا، کہ غنی لقطہ کا مالک بن سکتا ہے، جیسا کہ فقیر بن سکتا ہے، اور یہ کہ لقطہ استعمال کرنا ان لوگوں کیلئے بھی حلال ہے، جن کیلئے صدقہ حلال نہیں ہے اس لئے کہ نبی علیہ السلام غنی تھے' چونکہ اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مال فئی عطاء کیا تھا۔اور آپ اور علیؓ اور فاطمہؓ ان لوگوں میں سے تھے جن کیلئے صدقہ کا مال حلال نہیں تھا۔(انتہیٰ)

ابن الملکؒ نے ان کی پیروی کی ہے، اور اس لئے کہ یہ ان کے مذہب کے خلاف ہے، کہ مالدار لقطہ کا مالک نہیں بن سکتا۔باوجود یہ کہ یہ بات بھی محل بحث ہے کہ آپ علیہ السّلام مال فئی کی وجہ سے مالدار تھے۔اس لئے کہ غنی سے یہاں مراد وہ ہے، جو سونے چاندی وغیرہ نصاب کا مالک ہو۔

قوله :یا علی أد الدینار : اس سے معلوم ہوا کہ لقطہ اٹھانے والے پر مالک کو لقطہ کا بدلہ دینا واجب ہے، جب مالک ظاہر ہو جائے۔یہ اشرفؒ نے کہا ہے۔اور اسی طرح اگر مالک صدقہ کرنے کے ثواب پر راضی نہ ہوا اگر ملتقط نے صدقہ کر دیا ہو۔

لقطہ بری نیت سے نہ اُٹھاؤ

۳۰۳۸:وَعَنِ الْجَارُوْدِ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ضَالَّةُ الْمُسْلِمِ حَرَقُ النَّارِ. (رواه الدارمی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/٢٦٥ الحدیث رقم ١٨٨١ والدارمی فی ٢/٣٤٤ الحدیث رقم ٢٦٠١ واحمد فی المسند ٥/٨٠

ترجمہ: ''اور حضرت جارودؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مسلمان کی گم شدہ چیز (اگر بغیر تشہیر واعلان کے اٹھالی جائے تو وہ دوزخ کی) آگ کا ایک شعلہ ہے''۔(دارمی)

تشریح: **ضالة المسلم** : نہایہ میں ہے **هی الضائعة من کل ما یقتنی من الحیوان** وغیرہ۔کہا جاتا ہے: **ضل الشیء** ضائع ہونا۔اور یہ اصل میں'' **فاعلة** '' ہے۔پھر اس میں توسع ہوا تو صفات غالبہ میں سے ہوگیا۔یہ مذکر، مؤنث تثنیہ، جمع، سب پر بولا جاتا ہے۔اور اس کی جمع ''**ضوال**'' آتی ہے۔ **حرق** : حاء اور راء کے فتحہ کے ساتھ ہے، اور کبھی راء کو ساکن بھی کیا جاتا ہے۔

مراد یہ ہے کہ لقطہ کا لینا اس شخص کو جہنم کے شعلوں کی طرف لے جاتا ہے جو اسکا اعلان وتشہیر نہ کرے اور اس میں خیانت کی نیت ہو۔

تخریج: اس حدیث کو احمد، ترمذی، نسائی اور ابن حبان نے۔عبداللہ بن شخیر سے اور طبرانی نے عصمہ بن مالک سے روایت کیا ہے۔

جب لقطہ اٹھاؤ تو کسی کو گواہ بنالو

۳۰۳۹:وَعَنْ عِيَاضِ بْنِ حِمَارٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ وَجَدَ لُقْطَةً فَلْيُشْهِدْ ذَاعَدْلٍ اَوْذَوَىْ عَدْلٍ وَلَا يَكْتُمْ وَلَا يُغَيِّبْ فَاِنْ وَجَدَ صَاحِبَهَا فَلْيَرُدَّهَا عَلَيْهِ وَاِلاَّ فَهُوَ مَالُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ.

(رواه احمد و ابو داود و الدارمی)

أخرجه أبو داؤد فی السنن ٢/٣٣٥ الحدیث رقم ١٧٠٩۔ وابن ماجه فی ٢/٨٣٧ الحدیث رقم ٢٥٠٥ واحمد فی المسند ٤/١٦١۔

ترجمہ: ''اور حضرت عیاض بن حمارؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص کسی جگہ کوئی گری پڑی چیز پائے تو چاہئے کہ وہ کسی عادل شخص کو یا فرمایا کہ دو عادل شخصوں کو گواہ بنالے اور (اس کی تشہیر واعلان نہ کر کے) اس لقطہ کو نہ چھپائے اور نہ اسے (کسی دوسری جگہ بھیج کر) غائب کرے۔پھر اگر (اس کا) مالک آجائے تو وہ لقطہ اس کے حوالہ کر دے ورنہ وہ اللہ کا مال ہے کہ اللہ جسے چاہتا ہے (غیب سے) مال عطا فرماتا ہے''۔(احمد،ابوداؤد،دارمی)

تشریح: **عیاض** : عین کے کسرہ اور یاء کی تخفیف کے ساتھ۔

حمار : حاء کے کسرہ اور میم کی تخفیف کے ساتھ ہے۔بعض نسخوں میں جو حاء کے فتحہ اور میم کے شد کے ساتھ ضبط کیا ہے۔یہ تصحیف

ہے۔اس کی طرف مغنی نے اشارہ کیا ہے۔چنانچہ لکھتے ہیں:عیاض بن حمار بلفظ حیوان ناهق.اھ

لا یغیب : غین معجمہ کے فتحہ اور یاء تحیہ کے شد کے ساتھ ہے۔"**ولا یکتم**" کا تعلق "**لقطه**" کے ساتھ ہوتا ہے۔اور"**تغیب**" کا تعلق "**ضالة**" کے ساتھ ہے۔

أو ذوی عدل : راوی کو شک ہے۔یا أو بمعنی بل ہے۔یا أو تنویع کیلئے ہے۔

شرح السنہ میں ہے کہ یہ حکم تأدیبی اور ارشادی ہے۔یہ حکم دو وجہ سے دیا ہے:ایک تو اس لئے تا کہ شیطان اس کو وہ لقطہ اپنے پاس رکھنے اور امانت اداء کرنے کے ترک پر نہ ابھارے۔دوسرا اس وجہ سے تا کہ وہ لقطہ کے مال کو باقی ترکہ میں چھوڑے ہوئے مال کے ساتھ نہ ملا دے۔اور بعض حضرات نے حدیث کے ظاہر مفہوم کی وجہ سے گواہ بنانے کو واجب کہا ہے۔

قولہ:**فهو مال الله یؤتیه من یشاء** : شرح طیبیؒ میں ہے:قولہ :**فهو مال الله** اور حدیث سابق میں "**رزق الله**" ہے۔یہ دونوں عبارت ہیں حلت سے'اور یہ معتزلہ کیلئے دلیل نہیں بن سکتا کہ حرام رزق نہیں ہے۔اس لئے کہ یہ مقام لقطہ کی مدح کا ہے، نہ کہ حلال وحرام بیان کرنے کا مقام ہے۔اور"**فهو مال الله**"میں فاء جواب شرط کیلئے ہے۔اور اس کا گرانا جائز ہے۔جیسا کہ بخاری کی روایت میں ہے:**والا استمتع بها**.مالکی فرماتے ہیں کہ حدیث میں جواب شرط سے فاء اور مبتدا دونوں کو ایک ساتھ حذف کیا ہے۔

لقطہ کی وہ مقدار جس میں اعلان وتشہیر کی ضرورت نہیں

۳۰۴۰:**وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ رَخَّصَ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِی الْعَصَا وَالسَّوْطِ وَالْحَبْلِ وَاَشْبَاهِهٖ یَلْتَقِطُهُ الرَّجُلُ یَنْتَفِعُ بِهٖ.** (رواہ ابوداود)

اخرجه ابو داود فی السنن ۲/۳۳۹ الحدیث رقم ۱۷۱۷۔

ترجمہ:"اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں لاٹھی' کوڑے' رسی اور اسی کی مانند اشیاء کے بارے میں (کہ جو عام طور پر کم تر سمجھی جاتی ہیں) یہ رخصت دی تھی کہ آدمی اسے اپنے استعمال میں لاکر فائدہ حاصل کرے"۔(ابوداؤد)

تشریح: **العصا** : الف مقصورہ کے ساتھ ہے۔

یلتقطه الرجل : یہ صفت ہے یا حال ہے۔

ینتفع به : اس کا حکم یہ ہے کہ اسے اٹھانے والا فقیر ہو تو بغیر تشہیر کے اپنے استعمال میں لے آئے۔

شرح السنہ میں لکھا ہے، کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے، کہ اکثر لقطہ شئی قلیل ہو تو اس کی تشہیر نہ کی جائے۔بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ اگر وہ لقطہ دس دراہم سے کم ہو تو وہ قلیل ہے۔اور بعض حضرات کہتے ہیں، کہ جو لقطہ ایک دینار اور اس سے کم ہو، تو وہ کمتر مال ہے جیسا کہ حضرت علیؓ سے منقول حدیث سے معلوم ہوا۔اور بعض کا کہنا ہے کہ کمتر اور حقیر مال جس کی تشہیر نہ کی جاتی ہو، وہ جوتا، لاٹھی، اور جراب وغیرہ ہے۔

فتاویٰ قاضی خان میں ہے لقطہ کو مالک کے لئے حفاظت کی نیت سے اٹھانا اس کے چھوڑنے سے افضل ہے۔اگر علماء کے نزدیک۔اور بعض فرماتے ہیں، کہ اس کا اٹھانا حلال ہے اور چھوڑنا افضل ہے۔اور متعسف حضرات فرماتے ہیں کہ اس کا اٹھانا بھی جائز نہیں ہے۔لیکن صحیح قول ہمارے علماء کا قول ہے خصوصاً ہمارے زمانہ میں۔

اور جب کوئی لقطہ اٹھالے، تو اس کا اعلان کرے اور کہے کہ میں نے لقطہ اٹھایا ہے، یا کوئی گمشدہ چیز پائی ہے' یا میرے پاس کوئی چیز ہے۔پس جس کو تم سنو کہ وہ اس کو طلب کر رہا ہے، تو میری طرف اس کی راہنمائی کرو۔اور اس تشہیر کے بارے میں روایات مختلف ہیں۔امام محمد رحمہ اللہ کتاب میں فرماتے ہیں، کہ ایک سال تک اس کی تشہیر کرے، اور انہوں نے لقطہ کے کم اور زیادہ کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی

ہے۔اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے اس بارے میں دو روایتیں ہیں، ایک روایت میں ہے کہ اگر وہ لقطہ دو سو درہم یا اس سے زیادہ مالیت کا ہو، تو ایک سال تک اس کا اعلان کرے۔اور اگر دو سو درہم سے کم کا ہو اور دس درہم یا اس سے زیادہ ہو گا تو ایک ماہ تک اعلان کرے اور اگر دس درہم سے کم مالیت ہو تو تین دن تک اس کا اعلان کرے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ اگر پانچ درہم تک کی مالیت کی چیز ہو، تو ایک دن اس کا اعلان کرے۔اور اگر پانچ سے دس تک کی ہو، تو دو سے زیادہ دن تک اس کا اعلان کرے۔اور اگر دس سے پچاس درہم کی مالیت کا ہو، تو ایک ہفتہ اس کی حفاظت کرے۔اور پچاس سے سو تک کی ایک ماہ تک تشہیر و اعلان کرے۔اور سو سے دو سو تک کا چھ ماہ تک اعلان کرے۔اور دو سو سے ہزار تک اور اس سے زیادہ کا ایک سال تک اعلان کرے۔

اور بعض علماء فرماتے ہیں، کہ ایک درہم کی تین دن تک حفاظت کرے، اور دانق یا اس سے زیادہ کی ایک دن حفاظت کر لے اور اعلان کرے۔اور اگر اس سے کم ہو تو دائیں بائیں دیکھ کر صدقہ کر دے۔

امام اجل ابو بکر محمد بن ابی سہل سرخسی فرماتے ہیں، کہ مدت کی مقدار میں یہ کوئی بھی لازم نہیں ہے، بلکہ لقطہ اٹھانے والے کی رائے کے حوالہ کیا جائے، کہ وہ اس کا اعلان کرے اس وقت تک کہ جب اس کو غالب گمان یہ ہو کہ اب مالک اس کے بعد اس کو طلب نہیں کرے گا۔پس اگر اس کے بعد مالک آئے تو اس کے حوالہ کر دے۔اور اگر نہ آئے تو پھر اس کو اختیار ہے، چاہے تو اس کو مالک کے آنے تک پاس رکھے اور چاہے تو صدقہ کر دے۔اور اگر صدقہ کرنے کے بعد مالک آجائے، تو پھر مالک کو اختیار ہے چاہے تو صدقہ کو جائز قرار دے دے اور ثواب اس کیلئے ہو جائے اور اگر صدقہ کو جائز قرار نہیں دیتا، تو پھر اگر وہ لقطہ فقیر کے پاس محفوظ ہے، تو اس سے لے لے۔اور اگر وہ فقیر کے پاس موجود نہیں ہے، تو پھر اس کو اختیار ہے، چاہے تو فقیر سے تاوان لے اور چاہے تو لقطہ اٹھانے والے سے تاوان لے۔اور جس سے بھی تاوان لے لے وہ دوسرے سے رجوع نہیں کر سکتا۔

لقطہ اٹھانے والے کو چاہئے کہ وہ لقطہ اٹھاتے وقت کسی کو گواہ بنا لے، کہ وہ یہ لقطہ مالک کیلئے حفاظت کی نیت سے اٹھا رہا ہے۔پس اگر اس نے گواہ بنایا تو لقطہ اس کے ہاتھ میں امانت ہو گا۔اور اگر گواہ نہیں بنایا، تو وہ گنہگار ہو گا امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور محمدؒ کے قول کے مطابق۔اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے ہاں ہر حال میں امانت ہو گا جب اس کا ارادہ اپنے لئے رکھنے کا نہ ہو۔

لقطہ اٹھانے والا ضامن نہیں ہو گا، مگر اس پر ظلم اور تعدی کرنے کی صورت میں یا مانگتے وقت روکنے کی صورت میں، یہ اس صورت میں ہے کہ جب کسی کو گواہ بنانا ممکن ہو۔اور اگر وہ کسی کو گواہ بنانے کیلئے نہ پائے یا اس کو خوف ہو کہ اگر وہ کسی کو گواہ بنائے گا تو ظالم آدمی اس سے یہ لقطہ لے لے گا، تو اس نے گواہ نہیں بنایا تو تلف ہونے کی صورت میں یہ ضامن نہ ہو گا۔

معدی کرب : غیر منصرف ہے۔

یہ مکمل روایت یوں ہے: **الا لایحل الحمار الاهلی ولا کل ذی ناب من السباع ولا لقطة معاهد الأن یستغنی عنها صاحبهاالا لا یحل** ضمن میں جس کا اکثر حصہ اس باب کے مناسب ہیں۔واللہ اعلم بالصواب

بَابُ الْفَرَائِضِ

فرائض کا بیان

''**فرائض**''، ہمزہ کے ساتھ'' **فریضة**'' کی جمع ہے۔چھوڑے ہوئے مالیت میں شریعت کی طرف سے مقرر کئے ہوئے حصوں کو کہتے ہیں۔شرح السنۃ میں ہے کہ'' **فراض** ''اصل میں ''قطع'' کرنے کو کہتے ہیں۔کہا جاتا ہے: ''**فرضت لفلان**''، جب کسی کیلئے مال

میں سے کوئی چیز الگ کی جائے۔ اور مغرب میں ہے کہ فریضہ نام ہے ہر اس چیز کا جو مکلّف پر مقرر کی جائے۔ اور مقرر کی ہوئی چیز کو بھی ''فریضہ'' کہا جاتا ہے۔ میراث کے حصوں کو بھی ''فرائض'' کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ ورثاء کیلئے مقرر ہوتے ہیں۔ مگر میراث کے مسائل کے علم کو ''علم الفرائض'' کہا جاتا ہے اور اس کے جاننے والے یعنی عالم کو ''فرضی'' اور ''فارض'' کہا جاتا ہے۔ اور حدیث میں ہے: ''افرضکم زید'' تم میں سے میراث کو تم میں سب سے زیادہ جاننے والا زید ہے۔

الفصل الاول:

۳۰۴۱: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ اَنَا اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ فَمَنْ مَاتَ وَعَلَیْهِ دَیْنٌ وَلَمْ یَتْرُكْ وَفَاءً فَعَلَیَّ قَضَاؤُهٗ وَمَنْ تَرَكَ مَا لاً فَلِوَرَثَتِهٖ (وَفِیْ رِوَایَةٍ) مَنْ تَرَكَ دَیْنًا اَوْضِیَاعًا فَلْیَاْتِنِیْ فَاَنَا مَوْلَاهُ (وَفِیْ رِوَایَةٍ) مَنْ تَرَكَ مَا لاً فَلِوَرَثَتِهٖ وَمَنْ تَرَكَ كَلًّا فَاِلَیْنَا. (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۵/۶۱ الحدیث رقم ۳۹۹ ومسلم فی ۳/۱۲۳۷ الحدیث رقم (۱۵-۱۶۱۹) وابو داؤد فی السنن ۳/۳۶۱ الحدیث رقم ۲۹۵۵ والنسائی فی ۴/۶۶ الحدیث رقم ۱۹۶۳ وابن ماجه فی ۲/۸۰۷ الحدیث رقم ۲۴۱۵ واحمد فی المسند ۲/۴۵۶

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہؓ نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میں مسلمانوں کا ان کی جانوں سے بھی زیادہ حقدار ہوں (یعنی دین و دنیا کے ہر معاملہ میں ایک مسلمان اپنے اوپر جتنا شفیق و مہربان ہوسکتا ہے میں اس پر اس سے بھی زیادہ شفیق و مہربان ہوں۔ اسی لئے ان کے قرضوں کو ادا کرنے میں زیادہ حق دار ہوں) لہٰذا جو شخص (یعنی مسلمان) انتقال کر جائے اور اس کے ذمہ قرض ہو اور اس نے اتنا مال نہ چھوڑا ہو جس سے اس کا قرض ادا ہوسکتا ہو تو اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمہ ہے۔ اور جو شخص (اتنا) مال چھوڑ جائے (جو اس کے قرض کی ادائیگی اور اسکی کی ہوئی وصیت کی شرعی تکمیل کے بعد بھی بچ جائے) تو وہ اس کے ورثاء کا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ''جو شخص مقروض ہونے کی حالت میں یا اہل و عیال چھوڑ کر مر جائے (اور اس نے اتنا مال نہ چھوڑا ہو جس سے اس کے قرض کی ادائیگی ہوسکے یا اس کے اہل و عیال کی ضرورت پوری ہوسکے) تو (اس کا وکیل یا وصی) میرے پاس آئے میں ان کا حامی و مددگار ہوں (یعنی میں اس کا قرض ادا کروں گا اور اس کے عیال کی نگہداشت و غم خواری کروں گا)۔ ایک اور روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص مال چھوڑ کر مرے تو وہ مال اس کے ورثاء کا ہے اور جو بھاری چیز (یعنی قرض اور عیال) چھوڑ کر مرے تو اس (کے وکیل یا وصی) کو چاہیے کہ ہمارے پاس آئے۔ (یعنی میں اس کا قرض ادا کرونگا اور اس کے اہل و عیال کی نگہداشت و غم خواری کروں گا''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: ضیاعا: ضاد کے فتحہ کے ساتھ کسرہ بھی دیا جاتا ہے۔ ''عیال'' کے معنی میں ہے۔ قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ ''ضیاع'' فتحہ کے ساتھ ہے، اور مراد اس سے ''عیال'' ہے۔ ''العالة'' مصدر ہے اسم فاعل کی جگہ اس کو ذکر کیا ہے مبالغہ پیدا کرنے کیلئے۔ جیسے ''عدل'' اور ''صوم'' ہے اور ضاد کے کسرہ کے ساتھ بھی روایت کیا ہے یہ جمع ہے ''ضائع'' کی جیسے ''جیاع''، جمع ہے ''جائع'' کی۔ شرح السنہ میں ہے کہ ''ضیاع'' نام ہے اس چیز کا جس کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو اگر اس کی نگہبانی اور غور نہ کیا جائے، جیسے چھوٹے بچے اور اپاہج جو اپنے امور کو نہیں سنبھال سکتے اور وہ لوگ جوان کی طرح ہوں۔

کلا: کاف کے فتحہ اور لام کے شد کے ساتھ اس کے معنی ہیں ثقل۔ جیسے اللہ کا ارشاد ہے: ﴿وهو كلّ على مولاه﴾ [النحل-۷۶] ''اور وہ اپنے مالک پر ایک وبال جان ہے''۔ یہ دین اور عیال دونوں کو شامل ہے۔

ترك: اسی سے ''التركة'' ہے۔ فائق میں ہے، کہ ''تركه'' نام ہے ''متروک'' کا جیسا کہ ''طلبة'' اسم مطلوب'' کا' اور ترکة المیت'' اسی سے ہے۔

انا اولی بالمؤمنین من انفسهم : یعنی دین و دنیا کے ہر معاملہ میں ایک مسلمان اپنے اوپر خود جتنا شفیق و مہربان ہو سکتا ہے میں اس پر اس سے بھی زیادہ مہربان و شفیق ہوں۔اس لئے ان کے قرضوں کو اداء کرنے میں زیادہ حق دار ہوں۔

وفی روایة من ترك مالا فلورثة ومن ترك كلا فالینا : یعنی اس ٹھکانہ ہم ہیں' وہ ہمارے پاس آئے۔ان کی وفات کے بعد میں ان کے امور کا ذمہ دار ہوں ان کی مدد اس مدد سے بڑھ کر کروں گا جو مدد وہ مرنے والا ان کی کرتا اگر وہ زندہ ہوتا۔

پس اگر انہوں نے کچھ مال چھوڑا ہو، تو میں اس سے ناجائز طریقے سے کھانے والوں کو دفع کروں گا، کہ وہ اس کے ارد گرد نہ پھریں تا کہ وہ مال ورثاء کیلئے خالص رہے۔اور اگر انہوں نے مال نہیں چھوڑا، اور عیال اور اولاد کا بوجھ چھوڑا ہو تو میں ان کی کفالت کروں گا، اور میں ان کا ٹھکانہ ہوں، اور اگر انہوں نے قرض چھوڑا ہو، تو اس کا اداء کرنا میری ذمہ داری ہے۔اور اسی وجہ سے تو اللہ پاک نے اس آیت میں آپ ﷺ کا یہ وصف بیان کیا ہے: ﴿بالمؤمنین رؤف رحیم﴾ [التوبة۔۱۲۸]

اور آیت میں فرمایا: ﴿النبی اولی بالمؤمنین من انفسهم﴾ [الاحزاب۔٦] ترجمہ: "نبی مومنین کے ساتھ خود ان کے نفس سے بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں"۔اور مناسب یہ ہے کہ آیت کی یہی تفسیر کی جائے اسلئے کہ اس آیت: ﴿وازواجه امهاتهم﴾ ترجمہ: "اور آپ ﷺ کی بیبیاں اُن کی مائیں ہیں"۔کا مطلب اس وقت میل کھاتا ہے کہ جب ہم کہیں کہ آپ ﷺ شفیق باپ کی طرح ہیں، بلکہ زیادہ نرم دل اور مہربان ہیں۔

اس حدیث کو احمدؒ، نسائیؒ، اور ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔

۳۰۴۲: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْحِقُوْ الْفَرَائِضَ بِاَهْلِهَا فَمَا بَقِیَ فَهُوَ لِاَوْلٰی رَجُلٍ ذَکَرٍ. (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ١٢/٤٩و الحدیث رقم ٦٧٣٢ومسلم فی صحیحه ٣/١٢٣٣ الحدیث رقم (٢۔١٦١٥) وابوداؤد فی السنن ٣/٣١٩ الحدیث رقم ٢٨٩٨ والترمذی فی السنن ٤/٣٦٤ الحدیث رقم ٢٠٩٨ والدار می فی ٢/٤٦٤ الحدیث رقم ٢٩٨٧۔

ترجمہ: "اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میراث کے مقررہ حصے (جو قرآن کریم میں متعین کئے گئے ہیں) حصہ داروں کو دو' پھر جو کچھ بچے وہ میت کے ایسے مرد ورثاء (عصبہ) کا حق ہے جو رشتہ میں میت کا سب سے قریبی ہو"۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: **الحقو** : ہمزہ کے فتحہ اور حاء کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

بقی : قاف کے کسرہ کے ساتھ۔

الا ولی : "اقرب" کے معنی میں ہے۔شرح طیبی میں ہے کہ علماء فرماتے ہیں کہ "اولیٰ" سے مراد "اقرب" ہے یہ "ولی" سے مأخوذ ہے جس کے معنی ہیں "قرب"

فما بقی فهو لأولی رجل ذکر : "ذکر" کی قید تاکید کیلئے ہے۔یا "خنثی" سے احتراز ہے۔اور بعض کہتے ہیں، کہ اس سے مراد ہے کہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو، اور "رجل" کو یہاں "ذکر" کے ساتھ متصف کرنا اس بات پر تنبیہ ہے، کہ اس کی میراث کے استحقاق کا سبب "ذکورة" ہے جو سبب "عصوبة" ہے۔جو میراث میں ترجیح کا سبب ہے۔اسی وجہ سے تو مرد کیلئے دو عورتوں کے برابر حصہ مقرر کیا ہے۔

اس کی حکمت یہ ہے کہ مردوں پر خرچ کا بوجھ زیادہ پڑتا ہے، اہل و عیال کیلئے انتظام کرنا' مہمانوں کیلئے انتظام کرنا آنے والوں کی مدد کرنا مانگنے والوں کے ساتھ مواسات کرنا اور ناوان وغیرہ۔

ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "اولیٰ" یہاں "احق" کے معنی میں نہیں ہے، اس لئے کہ یہ ہم نہیں جانتے کہ کون زیادہ حقدار ہے،

بلکہ یہ ''اقوب'' کے معنی میں ہے۔ اوراس سے معلوم ہوا کہ ''اقرب'' ہی وہی ہے جو زیادہ حقدار ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ذوی الفروض کو متعین کرنے کے بعد فرمایا: ﴿آباؤکم وابناؤکم لا تدرون أیھم اقوب لکم نفعا﴾[النساء ۔۱۱] ترجمہ: ''تمہارے اصول وفروع جو ہیں، تم پورے طور پر یہ نہیں جان سکتے کہ اُن میں کونسا شخص نفع پہنچانے میں نزدیک تر ہے''۔

اور ''رجلا'' کے بعد ''ذکرا'' کا ذکر کرنا تاکید کیلئے ہے، اس لئے کہ ''رجل'' مشہور (استعمال) کے مطابق بنی آدم میں سے ''بالغ نر'' کو کہتے ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ ''خنثی'' مشکل سے احتراز کرنے کیلئے ہے۔ اس لئے کہ اس کو نہ تو عصبہ بنایا جاتا ہے، اور نہ ذوی الفروض میں شمار ہوتا ہے یقینی طور پر بلکہ اس کیلئے میراث میں ایک متعین اور حتمی مقدار مقرر ہے، اور وہ مقدار اس کو مرد اور عورت فرض کرنے کی صورت میں جو کم ہو وہ ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ ''ذکرا'' کی قید یہ اس بات کے بیان کیلئے ہے کہ عصبہ کو میراث میں حصہ ملتا ہے، چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو۔ برخلاف زمانہ جاہلیت کی عادت کے کہ وہ میراث صرف اس کو دیتے تھے جو حد ''رجولیت'' تک پہنچا ہو۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ مجاز کی نفی کیلئے ذکر کیا ہے، اس لئے کہ کبھی قوی اور طاقتور عورت کو بھی ''رجل'' کہا جاتا ہے مجازاً۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہاں موصوف کو صفت کے ساتھ ''عصبة'' کی جگہ لایا گیا ہے، گویا کہ اصل میں اس طرح کہا گیا ہے: **فیما بقی فھو لأقرب**: کہ جو مال بچ جائے وہ عصبات میں سے زیادہ قریبی رشتہ دار کیلئے ہے۔ اوران کا نام ''عصبہ'' رکھا ہے، اس لئے کہ وہ اس کا احاطہ کرتے ہیں اور یہ ان کی وجہ سے مضبوط ہوتا ہے۔ ''عصبہ'' باپ کی طرف سے قریبی رشتہ داروں کو کہتے ہیں۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ علماء کا اجماع ہے، کہ جو مال ذوی الفروض سے بچ جائے وہ عصبات کیلئے ''**الاقوب فالاقوب**'' کے اعتبار سے ہوگا۔ پس عصبہ نسبی کی موجودگی میں عصبہ بعید کو میراث نہیں ملے گی اور عصبات نسب باپ بیٹا، اور جو ان کے قریب ہو۔ ان میں سے بیٹوں کو مقدم کیا جائے گا پھر پوتوں کو مقدم کیا جائے گا۔ اگرچہ نیچے کے درجے کے ہوں۔ پھر باپ مقدم ہے' پھر دادا' پھر ماں باپ شریک بھائی یا باپ شریک بھائی یہ ایک درجہ میں ہیں۔ شرح السنہ میں ہے کہ ارشاد گرامی اس بات کی دلیل ہے کہ بعض وارث بعض دوسرے وارثوں کے حق میں حاجب ہوتے ہیں، چنانچہ حجب دو طرح کا ہوتا ہے: اول حجب نقصان' دوم حجب حرمان۔

۳۰۴۳: وَعَنْ اُسَامَةَ بْنِ زَیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ لَا یَرِثُ الْمُسْلِمُ الْکَافِرَ وَلَا الْکَافِرُ الْمُسْلِمَ .

(متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۱۱/۱۲ الحدیث رقم ٦٧٦٤ ومسلم ف ۱۲۳۳/۳ الحدیث رقم (۱/۱٦۱٤ وابوداوٗد فی السنن ۳۲٦/۳ الحدیث رقم ۲۹۰۹ والترمذی فی ۳٦۹/٤ الحدیث ر ۲۱۰۷ وابن ماجه فی ٦۱۰/۲ الحدیث رقم ۲۷۲۹ والدارمی فی ٤٦٦/۲ الحدیث رقم ۳۰۰۰ ومالك فی الموطأ ۵۱۹/۲ الحدیث رقم ۱۰ من کتاب الفرائض واحمد فی المسند ۲۰۹/۵

ترجمہ: ''اور حضرت اسامہ بن زیدؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: نہ تو مسلمان کافر کا وارث ہوسکتا ہے اور نہ کافر مسلمان کا وارث ہوسکتا ہے''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: قوله: **لا یرث السلم الکافر ولا الکافر المسلم**: امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ اس بات پر تو تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوتا، لیکن اس بارے میں اختلاف ہے کہ مسلمان کافر کا وارث ہوتا ہے یا نہیں؟

چنانچہ جمہور صحابہ وتابعین اور ان کے بعد والے علماء کہتے ہیں، کہ مسلمان بھی کافر کا وارث نہیں ہوتا۔ معاذ بن جبلؓ، سعید بن مسیب، اور مسروق رحمہم اللہ کا مسلک یہ ہے کہ مسلمان کافر کا وارث ہوتا ہے۔ انہوں نے آپ ﷺ کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے: ''

الاسلام یعلو ولا یعلی علیه" کہ اسلام غالب ہوتا ہے، مغلوب نہیں ہوتا۔

جمہور کی دلیل یہ صحیح حدیث ہے۔ ان کی ذکر کردہ حدیث میں اسلام سے مراد یہ ہے کہ اسلام کو غیر ادیان پر فضیلت حاصل ہے۔ اس میں میراث کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ پس اس کی وجہ سے صریح نص کو نہیں چھوڑا جائے گا۔

اسی طرح اس بات پر بھی تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ کافر کی طرح مرتد بھی مسلمان کا وارث نہیں ہوتا، لیکن اس بارے میں بھی اختلاف ہے کہ مسلمان، مرتد کا وارث ہوتا ہے یا نہیں؟ چنانچہ امام مالک، امام شافعی، ربیعہ اور ابن ابی لیلیٰ وغیرہ تو یہ کہتے ہیں کہ مسلمان بھی مرتد کا وارث نہیں ہوتا۔ امام ابوحنیفہؒ یہ فرماتے ہیں، کہ مرتد نے اپنے ارتداد کے دور میں جو کچھ کمایا ہے وہ بیت المال میں جائے گا، اور حالت اسلام میں جو کمایا ہے، وہ اس کے مسلمان ورثاء کو ملے گا۔ امام محمد رحمہ اللہ اپنی موطا میں فرماتے ہیں کہ مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوتا اور کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوتا اور کفر ایک ہی ملت ہے، اسی کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے وارث ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان کی ملتیں مختلف ہوں۔ پس یہودی نصرانی کا وارث ہوتا ہے، اور نصرانی یہودی کا وارث ہوتا ہے۔ اور یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ہمارے اکثر فقہاء کا قول ہے۔

۳۰۴۴: **وَعَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ مَوْلَى الْقَوْمِ مِنْ اَنْفُسِهِمْ.** (رواه البخاری)

اخرجه البخاری فی صحیحه ١٢/٤٨ الحدیث رقم ٦٧٦١۔

ترجمہ: "اور حضرت انسؓ نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قوم کا مولیٰ (یعنی قوم کا آزاد کردہ غلام) اسی قوم میں سے ہوتا ہے"۔ (بخاری)

تشریح: **معتق**، غلام کا وارث ہوتا ہے عصبہ بننے کی وجہ سے، جب اس (غلام) کا عصبہ نسبیہ نہ ہو۔

بعض کہتے ہیں، یہاں "مولیٰ" سے مراد آزاد شدہ غلام ہے۔ یعنی غلام کو جس قبیلہ و قوم نے آزاد کیا ہو، اس (غلام) کا وہی حکم ہے، جو حکم اس قبیلہ کا ہے، جیسے قرشی کے آزاد کردہ غلام کیلئے صدقہ لینا حلال نہیں ہے۔ (جیسا کہ اس کو ذکر کیا ہے ہمارے علماء میں سے بعض شراح نے۔)

ابن الملکؒ فرماتے ہیں، کہ یہ حدیث دلیل ہے ان لوگوں کی جو بنی ہاشم اور بن عبد المطلب کے آزاد کردہ غلام کیلئے صدقہ لینے کو حرام قرار دیتے ہیں۔ اور ان لوگوں کے لئے (بھی دلیل ہے) جو کہتے ہیں کہ اگر کسی نے وصیت کی بنی فلان (یعنی فلاں کے بیٹوں) کیلئے تو اس میں اس کے آزاد کردہ غلام بھی داخل ہوں گے۔

شیخ مظہرؒ فرماتے ہیں کہ "مولیٰ" کا اطلاق لغت میں "معتق" (آزاد کرنے والے) اور "عتیق" آزاد کردہ دونوں پر ہوتا ہے۔ علماء نے یہاں "مولیٰ" کی تفسیر آزاد کرنے والے کے ساتھ کی ہے۔ یعنی معتق اپنے آزاد کردہ غلام کا وارث ہوتا ہے، جب اس کا نسبی عصبہ میں سے کوئی نہ ہو۔ آزاد کردہ غلام اپنے آقا کا وارث نہیں ہوتا۔ صرف طاوس کے نزدیک ہوتا ہے۔

۳۰۴۵: **وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِبْنُ اُخْتِ الْقَوْمِ مِنْهُمْ.** (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ١٢/٣٩ الحدیث رقم ٦٧٦٢ ومسلم فی صحیحه ٢/٧٣٥ الحدیث رقم (١٣٣-١٠٥٩)۔

ترجمہ: "اور حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قوم کا بھانجہ اسی قوم میں شمار ہوتا ہے"۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: **ابن اخت القوم منهم** : شیخ مظہرؒ فرماتے ہیں کہ بھانجا ذوی الارحام میں سے ہے۔ چنانچہ امام اعظم ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک ذوی الارحام میت کے وارث ہوتے ہیں۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ ذوی الارحام کو میت کے ترکہ میں سے میراث اس صورت میں ملتی ہے، جب میت کے ذوی الفروض اور عصبات موجود نہ ہوں۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ''منھم'' میں ''من'' اتصالیہ ہے، یعنی بھانجا ملا ہوا ہے اپنے رشتہ داروں کے ساتھ تمام ان چیزوں میں جن میں ان کے ساتھ متصل ہونا ضروری ہے۔ ولی بننے مدد کرنے، میراث اور اس طرح کے دوسرے امور میں۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرح ہے: ﴿و اولوا الارحام بعضھم اولٰی ببعض فی کتاب اللہ﴾[الاحزاب۔٦] ''اور رشتہ دار کتاب اللہ میں ایک دوسرے سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں''۔

اس کے احکام اور فرائض ہیں۔ ''کتاب'' اکثر فریضہ کے معنی میں آتا ہے۔ اس حدیث سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے اصحاب نے ذوی الارحام کے وارث ہونے پر استدلال کیا ہے۔ اور اس کی تائید فصل ثانی میں حدیث مقدام سے ہوتی ہے۔ **والخال وارث من لا وارث له.**

تخریج: اور اس کو روایت کیا ہے احمد، ترمذی، اور نسائی نے حضرت انسؓ سے' ابوداؤد نے حضرت ابوموسیٰ سے' طبرانی نے جبیر بن مطعم' ابن عباس' ابی مالک الاشعری کی سند سے۔

قوله : وذكر حديث عائشة انما الولاء في باب قبل "باب السلم : طویل حدیث کے درمیان میں اس کو ذکر کیا ہے۔ ابن الملک فرماتے ہیں کہ اس حدیث اور حضرت انسؓ کی حدیث کے بارے میں بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس میں دلیل ہے، کہ آزاد کرنے والا ولاء کی وجہ سے وارث ہوتا ہے، جب آزاد کردہ غلام کا عصبات نسبیہ میں سے کوئی نہ ہو۔

قوله : وسنذكر حديث البرأ : الخالة بمنزلة الام في باب بلوغ الصغير وحضانته : یعنی میراث میں خالہ ماں کی طرح ہے۔ پس اگر خالہ اور پھوپھی جمع ہو جائیں تو دو ثلث پھوپھی کیلئے اور ایک ثلث خالہ کیلئے ہوگا۔

اس حدیث کو باب بلوغ الصغیر میں جو ذکر کیا ہے، باوجودیکہ اس کی مناسبت اس باب کے ساتھ ہے۔ اس لئے کہ یہ ٹکڑا ایک لمبی حدیث کے ضمن میں واقع ہے۔ جو اسی باب کے مناسب ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ہاں سیوطیؒ نے یہ جملہ الجامع الصغیر میں ذکر کیا ہے، اور کہا ہے کہ اس کو شیخین اور ترمذی نے حضرت براء سے اور ابوداؤد نے حضرت علی سے روایت کیا ہے۔

الولاء : واؤ کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ **المسلم :** سین اور لام دونوں کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

البراء : باء اور راء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ **حضانته :** حاء کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ ہے۔ بمعنی کم سنی میں تربیت کرنا۔

الفصل الثانی :

۳۰۴٦: عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا يَتَوَارَثُ اَهْلُ الْمِلَّتَيْنِ شَتّٰى .

(رواه ابوداود وابن ماجة)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳۲۷/۳ الحدیث رقم ۲۹۱۱ وابن ماجه فی ۹۱۲/۲ الحدیث رقم ۲۷۳۱ واحمد فی المسند ۱۹۵/۲۔

ترجمه: ''حضرت عبداللہ بن عمروؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: دو مختلف مذہب کے حامل افراد کے درمیان وراثت قائم نہیں ہوسکتی''۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: شتّٰی : شین کے فتحہ اور تاء کی تشدید کے ساتھ بمعنی متفرق

ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ ''شتّٰی'' اهل کی صفت ہے۔ اور علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ''لا یتوارث'' کے فاعل سے حال ہے۔ تقدیری عبارت یوں ہے: **لا يتوارث اهل ملتين متفرقين مختلفين.** اور بعض کہتے ہیں کہ یہ بھی جائز ہے کہ یہ صفت ہو ''ملتین'' کی اور تقدیر یوں ہو: **ملتين متفرقتين.**

ابن الملکؒ فرماتے ہیں، کہ حدیث کا ظاہری مفہوم دلالت کر رہا ہے، اس بات پر کہ کفر میں بھی اختلاف مذاہب ایک دوسرے کے وارث ہونے سے مانع ہے۔ جیسے یہود نصاریٰ، مجوسی اور بت پرست۔ اور یہی امام شافعیؒ کا مسلک ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ حدیث میں ''ملتین'' سے مراد اسلام اور کفر ہے۔ اس لئے کہ کفر سب کا سب ایک ہی ملت ہے، جب ان کا مقابلہ مسلمانوں کے ساتھ ہو۔ اگر چہ وہ اپنے عقائد کے اعتبار سے مختلف ملتوں اور مذہبوں میں بٹے ہوں۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، کہ کافر بعض بعض کے وارث بنتے ہیں، جیسے یہودی کا نصرانی، اور اس کے برعکس، مجوسی کا ان دونوں سے وارث ہونا' اور ان کا مجوسی سے ہونا، اور یہی امام شافعیؒ کا مسلک ہے۔ لیکن حربی کافر ذمی کافر کا وارث نہیں ہوسکتا۔ اور ذمی' حربی کا وارث نہیں ہوسکتا۔ اور اسی طرح اگر دونوں حربی ہوں دونوں الگ الگ دار الحرب میں ہوں تو ہمارے اصحاب فرماتے ہیں کہ یہ بھی ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوسکتے۔ (جیسا کہ شرح مسلم میں ہے۔)

۳۰۴۷:: ورواہ الترمذی ' عن جابر۔

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/ ٣٧٠ الحديث رقم ٢١٠٨۔

ترجمہ: امام ترمذی نے اس روایت کو حضرت جابرؓ سے نقل کیا ہے''۔

۳۰۴۸: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْقَاتِلُ لَا يَرِثُ ۔ (رواہ الترمذی وابن ماجة)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/ ٣٧٠ الحديث رقم ٢١٠٩ وابن ماجه فی ٢/ ٩١٣٠ الحديث رقم ٢٧٣٥

ترجمہ: ''اور ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قاتل (مقتول کا) وارث نہیں بن سکتا''۔

(ترمذی' ابن ماجہ)

تشریح: قوله: القاتل لا یرث: ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ یہ اس قتل میں ہے، جس قتل کی وجہ سے قاتل پر قصاص یا کفارہ لازم ہو۔ اس لئے کہ ہمارے ہاں قتل بالسبب کے ساتھ میراث سے محروم ہونے کا تعلق نہیں ہے۔

شیخ مظہرؒ فرماتے ہیں، کہ علماء کے ہاں عمل اس حدیث پر ہے۔ خواہ قتل عمد ہو یا خطا ہو' قاتل خواہ بچہ ہو یا مجنون ہو یا ان کے علاوہ کسی سے بھی سرزد ہوا ہو۔ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ قتل خطاء میراث سے محروم نہیں کرتا۔ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ اگر نابالغ بچہ اپنے مورث کو قتل کرے، تو وہ میراث سے محروم نہیں ہوتا۔ (انتہیٰ) اور اسی طرح مجنون بھی ہے اس لئے کہ یہ دونوں مکلف نہیں ہیں۔ پس ان کا یہ فعل، فعل نہ ہونے کی طرح ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، کہ اگر علت نفس قتل کو بنایا جائے جو منصوص علیہ ہے، تو پھر یہ حکم عام ہے۔ اور اگر علت معنی اور اس سے جو تعلق کا ختم ہونا پیدا ہوا ہے۔ اس کو قرار دیا جائے تو پھر پہلے قول کے مطابق القاتل میں الف لام جنس کیلئے ہوگا۔ اور دوسرے قول کے مطابق عہد کیلئے ہوگا۔ اور اسی پر متفرع ہے وہ کلام جو نوویؒ نے روضہ میں ذکر کیا ہے، کہ جب حاکم اپنے مورث کو حداً قتل کردے تو منع میراث میں کئی صورتیں ہیں۔ تیری صورت یہ ہے کہ اگر ثبوت بینہ کے ذریعہ ہے تو مانع ہے' اور اگر اقرار کے ذریعہ تو عدم تہمت کی وجہ سے مانع نہیں ہوگا۔

زیادہ صحیح یہ ہے کہ میراث سے منع مطلق ہے' اس لئے کہ وہ قاتل ہے، اور سید شریف کی شرح الفرائض میں ہے کہ ہمارے ہاں قاتل اس وقت میراث سے محروم ہوتا ہے جب قتل میں وہ حق پر نہ ہو۔ اور جب وہ اپنے مورث کو قصاص یا حد کی وجہ سے یا اپنا دفاع کرتے ہوئے قتل کردے تو محروم نہ ہوگا۔ اسی طرح سلطان عادل کا اپنے باغی مورث کو قتل کرنا بھی ہے۔ اور اس کے برعکس میں امام ابو یوسف کا اختلاف ہے۔

ترمذی کی روایت میں ہے: ''لیس للقاتل شیء''. اور بیہقیؒ نے ابن عمروؓ سے یوں روایت کیا ہے: ''لیس للقاتل من المیراث

شیء" ابوداؤد نے بھی ابن عمر سے سند حسن کے ساتھ روایت کیا ہے: "**ليس للقاتل شیء وان لم يكن له وارث فوارثه اقرب الناس ولا يرث القاتل شيأ**"۔

اگر "مقتول کا کوئی وارث نہ ہو، تو لوگوں میں سے جو اس کے زیادہ قریب ہو وہ اس کا وارث ہوگا۔ لیکن کسی چیز کا وارث نہ ہوگا"۔

۳۰۴۹: وَعَنْ بُرَيْدَةَ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ جَعَلَ لِلْجَدَّةِ السُّدُسَ اِذَا لَمْ تَكُنْ دُوْنَهَا اُمٌّ۔ (رواه ابو داود)

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ۳/۳۱۷ الحديث رقم ۲۸۹۵ والدارقطنی فی ۴/۹۱ الحديث رقم ۷۴ من كتاب الفرائض

ترجمہ: "اور حضرت بریدہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے (میت کی) ماں نہ ہونے کی صورت میں دادی یا نانی کا چھٹا حصہ مقرر کیا ہے"۔ (ابوداؤد)

تشریح: "جدة" سے مراد دادی اور نانی دونوں ہے۔

سدس: دال کے ضمہ اور ساکن کے ساتھ ہے۔

یعنی دادی کا چھٹا حصہ ہے اگر میت کی ماں نہ ہو۔ اگر میت کی ماں وہاں موجود ہے، تو پھر نہ دادی وارث ہوگی اور نہ نانی۔ (اس کو ابن الملکؒ نے ذکر کیا ہے۔) علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، کہ "دون" یہاں بمعنی "قدام" ہے۔ اس لئے کہ حاجب، وارث اور میراث کے درمیان آڑ کی طرح ہوتا ہے۔

علامہ سیوطیؒ نے "نقایہ" میں جدہ کو بالاتفاق وارثوں میں شمار کیا ہے۔ اور فرمایا، کہ اسی وجہ سے آپ ﷺ نے جدہ کیلئے چھٹا حصہ مقرر کیا ہے۔ اس کو ابوداؤدؒ نے مغیرہ سے اور حاکمؒ نے عبادۃ سے روایت کیا ہے۔ اور انہوں نے اس کو صحیح قرار دیا ہے کہ آپ ﷺ نے دادی اور نانی کیلئے میراث میں سے چھٹے حصے کا فیصلہ کیا، جو دونوں میں برابر تقسیم ہو۔

۳۰۵۰: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا اسْتَهَلَّ الصَّبِيُّ صُلِّيَ عَلَيْهِ وَوَرِثَ۔

(رواه ابن ماجة والدارمی)

اخرجه ابن ماجه فی السنن ۲/۹۱۹ الحديث رقم ۲۷۵۰ والدارمی فی ۲/۴۸۵ الحديث رقم ۳۱۲۶۔

ترجمہ: "اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر بچہ نے (پیدائش کے وقت) کوئی آواز نکالی ہو (اور اس کے بعد وہ فوت ہو جائے) تو اس کی نماز جنازہ ادا کی جائے گی اس کی وراثت بھی تقسیم ہوگی"۔ (ابن ماجہ، دارمی)

تشریح: استهل: آواز بلند کرنا، مراد، زندگی کی علامت ہے۔ (یعنی کوئی بھی ایسی حرکت جس سے اسکا زندہ ہونا معلوم ہو)۔

ورث: واؤ کے ضمہ اور راء مکسورہ کے شد کے ساتھ ہے۔

قال رسول الله ﷺ اذا استهل الصبی صلی علیه: یعنی اس کو غسل اور کفن دینے کے بعد پھر کو دفن کیا جائے گا۔ جیسا کہ مسلمانوں کے تمام مُردوں کو دفن کیا جاتا ہے۔

شرح السنہ میں ہے کہ اگر کوئی شخص مر جائے، اور اس کا وارث ماں کے پیٹ میں ہو، تو اس کی میراث رکھ چھوڑی جائے گی۔ پھر اگر وہ زندہ پیدا ہوا تو وہ وارث قرار پائے گا۔ اگر وہ زندہ پیدا نہ ہوا، تو وارث نہیں ہوگا اور وہ میراث دوسرے وارثوں کو مل جائے گی۔ پس اگر وہ زندہ پیدا ہوا اور پھر مرا، تو اس کا حصہ دوسرے ورثاء کو اس کی میراث میں مل جائے گا۔ خواہ اس نے آواز نکالی ہو، یا نہ نکالی ہو۔ بعد اس کے کہ اس میں زندگی کی کوئی علامت پائی گئی ہو مثلاً چھینکنا یا سانس لینا یا ایسی حرکت کرنے جو زندگی پر دلالت کرے۔ شرمگاہ سے نکلنے کی حرکت کے سوا۔ یہ ثوریؒ، اوزاعیؒ، اور امام شافعیؒ اور اصحاب ابوحنیفہ کا یہی مسلک ہے۔ اور ایک قوم کا مسلک یہ ہے کہ وہ اس وقت تک وارث نہ ہوگا جب تک کہ وہ آواز نہ نکالے۔ انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔ اور "استهلال" آواز بلند کرنے کو کہتے ہیں۔ دوسرے علماء کے ہاں اس سے مراد علامت زندگی ہے۔ اور اس کو "استهلال" سے تعبیر کیا ہے چونکہ عام طور پر بچہ پیدا ہوتے وقت

آواز نکالتا ہے، اور اسی سے اس کا زندہ ہونا معلوم ہوتا ہے۔ زہریؒ فرماتے ہیں، کہ میں چھینک کو" استھلال" سمجھتا ہوں۔

۳۰۵۱: وَعَنْ كَثِيْرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَوْلَى الْقَوْمِ مِنْهُمْ وَحَلِيْفُ الْقَوْمِ مِنْهُمْ وَابْنُ اُخْتِ الْقَوْمِ مِنْهُمْ. (رواه الدارمی)

اخرجه الدارمی فی السنن ۲/۳۱۷ الحدیث رقم ۲۵۲۷۔

ترجمہ: "اور حضرت کثیر بن عبداللہ اپنے والد (حضرت عبداللہ تابعی) سے اور وہ کثیرؒ کے دادا (یعنی اپنے والد حضرت عمرو بن عوف مزنی رضی اللہ عنہ) صحابی سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قوم کا مولی (یعنی اس قوم کا آزاد کردہ غلام) اسی قوم میں شمار ہوتا ہے' قوم کا حلیف اسی قوم میں شمار ہوتا ہے اور قوم کا بھانجا اسی قوم میں شمار ہوتا ہے"۔ (دارمی)

تشریح: **قوله: قال رسول الله ﷺ مولى القوم منهم**: اس کی تشریح پہلے گزر چکی ہے۔

وحليف القوم منهم: ابن الملکؒ فرماتے ہیں، کہ حلیف سے مراد 'عهید" (معاہدہ کرنے والا) ہے۔ اور اس سے مراد 'مولی موالاۃ" ہے۔ اس لئے کہ ہمارے ہاں وہ وارث ہوتا ہے جب میت کا اس کے سوا کوئی وارث نہ ہو۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ حلیف کی وضاحت یہ ہے کہ پہلے عرب میں یہ دستور تھا، کہ وہ آپس میں قسم وحلف کے ذریعہ باہمی اقرار کر لیتے تھے، اور کہتے تھے کہ میرا خون تیرا خون ہوگا' میری عزت تیری عزت ہوگی، میری صلح تیری صلح ہوگی' میری جنگ تیری جنگ ہوگی' میں تیرا وارث بنوں گا، اور تم میرے وارث بنوں گے۔ پس آیت میراث کے ذریعہ یہ حکم منسوخ ہوگیا۔ بیضاوی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ﴿والذين عقدت ايمانكم﴾ "اور جن لوگوں سے تمہارے عہد بندھے ہوئے ہیں"۔ کہ اس سے مراد مولی مولات ہے ﴿فاتوهم نصيبهم﴾ [النساء۔ ۳۳] "اُن کو اُن کا حصہ دیدو"۔ حلیف اپنے حلیف کا وارث ہوتا تھا چھٹے حصے میں اس کے مال میں سے۔ پھر یہ منسوخ ہوا اور ناسخ یہ آیت ہے: ﴿وأولو الارحام بعضهم اولى ببعض﴾ [الاحزاب: ٦٠]۔ (انتہی)

لیکن یہ بات محل نظر ہے۔ اس لئے کہ آیت میں حلیف کی میراث کی نفی پر کوئی دلالت نہیں ہے، اس کے قائل حضرات کہتے ہیں کہ یہ وارث ہوں گے اس وقت جب میت کیلئے عصبات اور اولوالارحام نہ ہوں۔ بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ سے منقول ہے، کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے ہاتھ پر اسلام قبول کرلے اور آپس میں یہ عہد واقرار کرلیں، کہ وہ ایک دوسرے کے تاوان میں شریک ہوں گے، اور ایک دوسرے کے وارث ہوں گے تو یہ درست ہے، اور وہ وارث ہوگا۔ سید شریف رحمہ اللہ شرح فرائض میں فرماتے ہیں کہ 'مولی موالاۃ" کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص جس کا نسب مجہول ہے، دوسرے سے کہتا ہے، کہ آپ میرے مولیٰ ہیں جب میں مروں تو آپ میرے وارث ہوں گے اور آپ میری طرف سے تاوان اداء کریں گے جب میں کوئی جنایت کروں۔ اور دوسرا کہے کہ میں نے قبول کیا۔ تو ہمارے نزدیک یہ عقد درست ہے وہ اس کا وارث اور عاقلہ ہوگا اور اس کو 'مولی موالاۃ" کا نام دیا جاتا ہے۔ اگر یہ دوسرا شخص بھی مجہول النسب ہے اور یہ پہلے شخص سے اسی طرح کی بات کہہ دے اور پہلا شخص قبول کرلے۔ تو ان میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کا وارث ہوگا' اور اس کی طرف سے تاوان اداء کرے گا۔

ابراہیم نخعیؒ فرماتے تھے، کہ جب کوئی شخص کسی شخص کے ہاتھ پر اسلام قبول کرلے اور اس کو اپنا مولیٰ بنادے، تو یہ درست ہے۔ شمس الائمہ سرخسی فرماتے ہیں کہ عقد موالات کے صحیح ہونے کیلئے اس کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنا شرط نہیں ہے' اور اس میں جو ذکر کیا ہے یہ بطور عادت کے ہے۔ اور شعبی فرماتے تھے کہ 'ولاء عتاقه کے علاوہ کوئی ولاء نہیں ہے۔ اور اسی کو امام شافعیؒ نے اختیار کیا ہے اور زید بن ثابت کا مذہب بھی یہی ہے۔ جس کو ہم نے اختیار کیا وہ حضرت عمر، حضرت علی، اور ابن مسعودؓ کا مذہب ہے۔

وابن أخت القوم منهم اس کا بیان ماقبل میں گزر چکا ہے۔

تخریج: طبرانی نے یہ حدیث عمرو بن عوفؓ سے یوں روایت کی ہے: **"حليف القوم منهم وابن خت القوم منهم"**.

٣٠٥٢:وَعَنِ الْمِقْدَامِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَنَا اَوْلٰى بِكُلِّ مُؤْمِنٍ مِنْ نَفْسِهٖ فَمَنْ تَرَكَ دَيْنًا اَوْ ضَيْعَةً فَاِلَيْنَا وَمَنْ تَرَكَ مَالاً فَلِوَرَثَتِهٖ وَاَنَا مَوْلٰى مَنْ لَّا مَوْلٰى لَهٗ اَرِثُ مَا لَهٗ وَاَفُكُّ عَانَهٗ وَالْخَالُ وَارِثُ مَنْ لَّا وَارِثَ لَهٗ يَرِثُ مَا لَهٗ وَيَفُكُّ عَانَهٗ (وَفِىْ رِوَايَةٍ) وَاَنَا وَارِثُ مَنْ لَّا وَارِثَ لَهٗ اَعْقِلُ عَنْهُ وَاَرِثُهٗ وَالْخَالُ وَارِثُ مَنْ لَّا وَارِثَ لَهٗ يَعْقِلُ عَنْهُ وَيَرِثُهٗ. (رواه ابوداود)

اخرجه ابو داؤد فى السنن ٣/ ٣٢٠ الحديث رقم ٢٩٠٠ وابن ماجه فى ٢/ ٩١٤ الحديث رقم ٢٧٣٨

ترجمہ: ”اور حضرت مقدامؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں ہر مؤمن کے حق میں خود اس سے زیادہ عزیز و خیر خواہ ہوں لہٰذا جو شخص اپنے ذمہ عیال یا قرض چھوڑ جائے تو اس کے قرض کی ادائیگی اور اس کے عیال کی پرورش ہمارے ذمہ ہے اور جو شخص مال چھوڑ کر مرے تو وہ اس کے ورثاء کا ہے اور جس شخص کا کوئی مددگار نہیں میں اس کا مولیٰ و مددگار ہوں۔ جس کا کوئی کارساز نہیں چنانچہ میں اس کے مال کا میں وارث بنوں گا اور اس کے قیدی کو نجات دلواؤں گا (یعنی اس کی زندگی میں اس پر جو خون بہا لازم ہوا تھا اور وہ خون بہا ادا کرنے سے پہلے مر گیا تو اس کی وجہ سے چونکہ اس کا نفس عالم برزخ میں ایک قیدی کی طرح سختیوں میں مبتلا ہے اس لئے میں اس کا خون بہا اپنے پاس سے ادا کر کے اسے عالم برزخ کی سختیوں سے نجات دلاؤں گا) اور ماموں اس شخص کا وارث ہوتا ہے جس کا کوئی وارث نہیں، وہ میت کے مال کا وارث ہوگا اور اس کے قیدی کو نجات دلائے گا (یعنی جس شخص کے ذوی الفروض اور عصبی ورثاء نہیں ہوتے اس کا ماموں کہ جو اس کے ذوی الارحام میں سے ہے اس کا وارث ہوتا ہے چنانچہ وہ میت کا ترکہ پاتا ہے اور اس پر جو خوں بہا وغیرہ لازم تھا اس کو ادا کر کے اس کی روح کو عالم برزخ کے عذاب سے نجات دلاتا ہے) ایک دوسری روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”میں اس شخص کا وارث ہوتا ہوں جس کا کوئی وارث نہیں چنانچہ میں اس کی طرف سے اس کا خون بہا ادا کرونگا اور اس کا وارث بھی بنوں گا (یعنی اس کا ترکہ اپنی نگرانی میں لے کر بیت المال میں داخل کرونگا) اور جس شخص کا (ذوی الفروض و عصبات میں سے) کوئی وارث نہیں ہوتا تو (ذوی الارحام میں سے) اس کا ماموں اس کا وارث ہوتا ہے جو اس کی طرف سے خون بہا ادا کرے گا اور اس کی میراث کا وارث بنے گا۔“ (ابوداؤد)

تشریح: ضيعة : عیال کے معنی میں ہے۔

عانه : اس کی اصل عانیہ ہے۔ یاء کو حذف کیا ہے تخفیف کیلئے جیسے ”ید“ میں کیا ہے۔ کہا جاتا ہے ”عنا يعنو“ بمعنی خضع، و ذل، یعنی ذلیل ہونا۔

یہ گزری ہوئی حدیث کے ہم معنی ہے، جس میں ہے: **أنا اولى بالمؤمنين من انفسهم**. یہ اس کی تشریح گزر چکی ہے۔

یعنی ان کا رجوع کرنا۔ یا ان کا معاملہ ہمارے حوالے ہے۔

قوله :ومن ترك ما لا فلورثته : یعنی اس کا قرض اداء کرنے اور وصیت پوری کرنے کے بعد۔

أرث ماله : قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس کا مال مسلمانوں کے بیت المال میں صرف کیا جائے گا۔ اس لئے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہے۔

و افك عانه : یعنی اس کی طرف سے فدیہ دیکر اس کے قیدی کو چھڑاتا ہوں۔ اس سے مراد وہ ہے جس کے ساتھ حقوق متعلق ہوں جنایات کی وجہ سے۔

قوله :والخال وارث من لا وارث له، يرث ما له : یعنی اگر کسی کا بھانجا مر جائے اور وہ اپنے پیچھے سوائے ماموں کے کوئی نہ چھوڑے تو یہ ماموں اس کا وارث ہوگا۔ یہ ذوی الارحام کے وارث ہونے کی دلیل ہے دوسرے ورثاء کے نہ ہونے کی وجہ سے۔ اور جو لوگ ماموں کو وارث نہیں مانتے انہوں نے اس حدیث کی تاویل کی ہے کہ ”**الخال وارث من لا وارث له**“ عرب کے اس قول کی

طرح ہے: **الجوع زاد من لا زاد له** کہ بھوک توشہ ہے جس کیلئے کوئی توشہ نہ ہو۔اور''**یرث ماله**'' کو **الخال وارث**'' کے لئے بمنزلہ تقریر قرار دیا ہے۔اور تقریر وہاں لائی جاتی ہے جہاں معنی سابق میں مجاز کا کوئی وہم ہو، یہاں اس کو تقریر قرار دینا کیسے صحیح ہے اللہ رحم کرے ان لوگوں پر جو حق کے تابع ہوئے' انصاف کیا' تعصب کو چھوڑا اور تعسف سے کام نہیں لیا۔

جان لے کہ ذورحم ہر اس قریبی رشتہ دار کو کہتے ہیں، جو نہ ذوی الفروض میں سے ہو اور نہ عصبات میں سے ہو۔پس اکثر صحابہ جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ، علیؓ، ابن مسعودؓ، ابوعبیدہ بن الجراح، معاذ بن الجبل، ابودرداء، ابن عباس، رضوان اللہ علیہم اجمعین اور ان کے علاوہ سے مشہور روایت یہ ہے کہ یہ ذوی الارحام کے وارث ہونے کے قائل ہیں۔اور ان کی اتباع کی ہے تابعین میں سے علقمہ نخعی، شریح، حسن، ابن سیرین، عطاء، مجاہد وغیرہ نے۔اور یہی ہمارے علماء احناف، ابوحنیفہ ابو یوسف، محمد، زفر، اور ان کے متبعین کا مسلک ہے۔زید بن ثابت اور ابن عباس سے شاذ روایت ہے کہ ذوی الارحام کا میراث میں کوئی حصہ نہیں ہے بلکہ ذوی الفروض اور عصبات کے نہ ہونے کی صورت میں میت کا مال بیت المال میں دے دیا جائے گا۔اور اس میں ان کی اتباع کی ہے تابعین میں سے سعید بن المسیب، سعید بن جبیر نے اور یہی امام مالکؒ اور شافعیؒ کا مسلک ہے۔

پہلا استدلال: ذوی الارحام کی میراث سے نفی کرنے والوں نے استدلال کیا ہے۔کہ اللہ تعالیٰ نے آیت میراث میں ذوی الفروض اور عصبات کے حصص بیان کئے ہیں اور ذوی الارحام کیلئے کچھ بھی ذکر نہیں کیا ہے۔اگر ان کا وارث ہونا حق ہوتا، تو اللہ اس آیت میراث میں اس کو بیان فرماتے۔اور تیرا رب بھولنے والا نہیں۔

دوسرا استدلال: انہوں نے اس سے بھی استدلال کیا کہ جب آپ علیہ السلام سے پھوپھی اور خالہ کی میراث کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: **أخبرني جبرائيل أن لاشيئ لهما** جبرائیلؑ نے خبر دی ہے کہ ان کیلئے میراث میں کچھ بھی نہیں ہے۔

حنیفہ وغیرہ کے دلائل:

اور ہماری دلیل یہ آیت ہے: ﴿**و اولوا الارحام بعضهم اولى ببعض فى كتاب الله**﴾[الاحزاب-٦] ''اور رشتہ دار کتاب اللہ میں ایک دوسرے سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں''۔

اس کا معنی یہ ہے کہ وہ زیادہ حقدار ہے ان میں سے بعض کی میراث کا اس میں جو اللہ نے لکھا ہے، اور اس کا فیصلہ کیا ہے۔اس لئے کہ اس آیت نے موالات کے ذریعے توارث کو منسوخ کر دیا۔جیسا کہ مدنی دور کی ابتداء میں یہی رواج تھا۔تو جو حصہ اس زمانہ میں ''مولی مولاۃ'' یا ''مواخاۃ'' کیلئے تھا۔اس کو ذوی الارحام کی طرف پھیر دیا اور مولیٰ موالات کیلئے میراث میں جو حصہ باقی تھا وہ ذوی الارحام کی وارثت سے مؤخر ہو گیا۔پس ان کیلئے میراث مشروع ہے بلکہ تفصیل اور فرق بایں طور کیا ان ذوی الارحام کے درمیان کے ذوی الفروض اور عصباب ہو، اور جس کے دونوں میں سے کوئی بھی نہ ہو۔پس میراث سب کیلئے اسی آیت سے ثابت ہوئی۔آیت مواریث میں سب کی تفصیل ضروری نہیں ہے۔

دوسری دلیل: اسی طرح ہماری ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ایک آدمی نے سھل بن حنیف، کی طرف تیر پھینکا اور ان کو قتل کر دیا۔ان کے ماموں کے علاوہ ان کا کوئی وارث نہ تھا۔ان کے بارے میں ابوعبیدہ بن الجراح نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خط لکھا۔تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا، نبی ﷺ نے فرمایا ہے: **الله ورسوله مولى من لا مولى له' والخال وارث من لا وارث له.**

یہ نہ کہا جائے کہ اس طرح کے کلام سے مقصود نفی ہوتی ہے نہ کہ اثبات جیسے ''**الصبر حيلة من لا حيلة له**'' چونکہ صبر حیلہ نہیں ہے۔پس گویا کہ اس طرح کہا گیا ہے: **من كان وارثه الخال فلا وارث له** کہ جس کا وارث ماموں ہو تو اس کا کوئی وارث ہی نہیں ہے۔چونکہ ہم کہتے ہیں حدیث کے شروع کے الفاظ اس تاویل کا انکار کرتے ہیں۔بلکہ ہم کہتے ہیں کہ کسی حکم شرعی کو اثبات کے لفظ کے

ساتھ بیان کرنا اور نفی مراد لینا یہ تو التباس کی طرف لیجاتا۔ پس صاحب شریعت تو کاشف شریعت ہوتا ہے اس کی طرف سے ایسا کلام جائز نہیں ہے۔

تیسری دلیل: کہ جب ثابت بن دحداع وفات پا گئے تو آپ علیہ السلام نے قیس بن عاصم سے فرمایا، کہ کیا تم اس کے سب کے بارے میں جانتے ہو، تو انہوں نے کہا کہ یہ ہم میں اجنبی تھے پس ہم نہیں جانتے ان کا کوئی رشتہ دار سوائے ایک بھانجے کے جو ابولبابہ ابن عبد المنذر رہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے میراث ان کو دے دی۔

ہماری مرویات قرآن کے موافق ہے اور جو تم نے روایت بیان کی ہے وہ قرآن کے مخالف ہیں۔ یہ ہے کہ جو تم نے روایت کی ہے اس کو آیت کریمہ کے نزول سے پہلے پر محمول کیا جائے۔ یا یہ کہ حمل کیا جائے اس بات پر کہ خالہ اور پھوپھی، عصبات اور ذوی الفروض کی موجودگی میں وارث نہیں ہوتی بلکہ وہ مال ذوی الفروض پر لوٹایا جاتا ہے۔ اس لئے کہ ذوی الفروض پر رد مقدم ہے ذوی الارحام کو وارث بنانے سے۔ اگرچہ یہ وارث ہوتے ہوں ان کے ساتھ جن پر رد نہیں ہوتا، جیسے زوج اور زوجہ ہے۔ محقق سید شریف جرجانی رحمہ اللہ نے شرح الفرائض میں اسی طرح ذکر کیا ہے۔

ويفك عانه: یعنی اس طریق سے دیت ادا کرنے کے ساتھ یا اس کے قید ہونے کے وقت اس کا فدیہ ادا کرے۔

أعقل عنه: یعنی میں ادا کروں گا اس کی طرف سے جو اس پر جنایات اور نقصان کرنے کی وجہ سے لازم ہو گیا ہو۔ جس کو عاقلہ برداشت کرتے ہیں۔ اور مصابیح کے نسخوں میں "اعقله" ہے۔ کہا جاتا ہے **عقلت له دم فلان**. جب قصاص کو دیت کی وجہ سے چھوڑا جائے۔ لیکن حدیث میں اس کا کوئی معنی نہیں بنتا۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کا معنی ہے کہ میں اس کو دوں گا اور اس کی طرف سے ادا کروں گا۔

والخال وارث من لا وارث له، يعقل عنه:

تخریج: امام مذی نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے: **الخال وارث من لا وارث له.**

۳۰۵۳: وَعَنْ وَاثِلَةَ بْنِ الْاَسْقَعِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ تَحُوْزُ الْمَرْأَةُ ثَلَاثَ مَوَارِيْثَ عَتِيْقَهَا وَلَقِيْطَهَا وَوَلَدَهَا الَّذِيْ لَاعَنَتْ عَنْهُ. (رواه الترمذی وابوداود)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۳/۳۲۵ الحديث رقم ۲۹۰۶ والترمذی فی السنن ٤/۳۷۳ الحديث رقم ۲۱۱۵ وابن ماجه فی ۲/۹۱٦ الحديث رقم ۲۷٤۲ واحمد فی المسند ۳/٤۹۰ (۲) الم احده بهذا اللفظ وقد ورد بمعناه (الولاء لمن اعتق) (۳) فی المخطوطة (احوازة)

ترجمہ: "اور حضرت واثلہ بن اسقعؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: عورت وراثتیں لے سکتی ہیں ایک تو اپنے آزاد کئے ہوئے غلام کی دوسرے اپنے لقیط (یعنی اپنے پالے ہوئے بچے) کی اور تیسرے اپنے اس بچے کی جس کی وجہ سے لعان ہوا"۔

(ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: **تحوز**: جمع کرنا، اور احاطہ کرنا۔ **مواريث**: میراث کی جمع ہے۔ **لقيط**: بمعنی **ملقوطه** ہے۔

اس لئے کہ جب عورت کسی غلام کو آزاد کر دے اور وہ مر جائے، اور اس کا کوئی وارث نہ ہو، تو وہ گا۔

ولقيطها: کی میراث اس لئے کہ "ملتقط" کا وارث ہوتا ہے اسحٰق بن راہویہ کے مذہب کے مطابق اور اکثر علماء کا مسلک یہ ہے کہ "ملتقط" وارث نہیں ہوتا اس لئے کہ آپ علیہ السلام نے اس کو خاص کیا ہے معتق کے ساتھ اور فرمایا: **لا ولاء الا ولاء العتاقة** کہ کوئی ولاء نہیں ہے سوائے ولاء عتاقہ کے۔ ممکن ہے یہ حدیث ان کے نزدیک منسوخ ہو۔

و ولدها الذى لا عنت عنه: شرح السنہ میں ہے، یہ حدیث اہل نقل کے نزدیک ثابت نہیں ہے۔ اور علماء کا اتفاق ہے کہ وہ عورت اپنے آزاد کردہ غلام کی میراث لے گی۔ اور وہ بچہ جس کی نفی کی ہو آدمی نے لعان کے ساتھ تو اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ان

میں سے ایک دوسرے کا وارث نہیں ہوسکتا۔اس لئے کہ وارث ہونا نسب کی وجہ سے ہوتا ہے اور لعان کی وجہ سے نسب کی نفی ہوگئی ہے، باقی اس کا نسب ماں کی طرف سے ثابت ہے ایک دوسرے کے وارث ہوں گے۔

قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ ملتقط کا لقیط کی میراث کو جمع کرنا یہ محمول ہے اس پر کہ اس مال کا جو اس نے پیچھے چھوڑ رہا ہے، اس کو اس ملتقط کی طرف پھیرنا اس کے غیر کی طرف پھیرنے والی ہے جیسے بیت المال کے مال کو مسلمان افراد کی طرف پھیرا جاتا ہے، بیت المال کا ترکہ مسلمانوں کیلئے ہوتا ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اس کی وارث ہوگی، جیسے آزاد کرنے والی اپنے آزاد کردہ غلام کی وارث ہوگی۔ باقی ولد الزنا کا حکم وہی ہے، جو ''منفی'' (یعنی جس کی نسب کی نفی کی گئی ہے) کا حکم ہے دونوں کے حکم میں کوئی فرق نہیں ہے۔

۳۰۵۴: وَعَنْ عَمْرِوبْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ اَيُّمَا رَجُلٍ عَاهَرَ بِحُرَّةٍ اَوْ اَمَةٍ فَالْوَلَدُ وَلَدُ زِنًا لَا يَرِثُ وَلَا يُوْرَثُ. (رواه الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/٣٧٢ الحديث رقم ٢١١٣ وابن ماجه فی ٢/٩١٧ الحديث رقم ٢٧٤٥۔

ترجمہ: ''اور حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد حضرت شعیبؒ اور حضرت شعیبؒ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس شخص نے کسی آزاد عورت یا لونڈی سے زنا کیا تو (اس کے نتیجہ میں) جو بچہ پیدا ہوگا وہ ولد الزنا (حرامی بچہ) ہے، وہ بچہ کسی کا وارث ہوگا اور نہ کوئی اس (کے مال) کا وارث بنے گا''۔ (ترمذی)

تشریح: (عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده) : یعنی ابن عمرو بن العاص جیسے کہ اس کی تصریح کی ہے سیوطی۔

عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده : یعنی ابن عمرو بن العاص سے جیسا کہ سیوطی نے الجامع الصغیر میں اسکی تصریح کی ہے۔

نہایہ میں ہے کہ ''عاهر'' زانی کو کہتے ہیں۔اور قد عهر اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی مرد رات کے وقت کسی عورت کے پاس زنا کرنے آئے۔ پھر اس کا غلبہ مطلقاً زانی پر ہوا۔

ولد زنا : ایک نسخہ میں ''ولد الزنا'' معرف باللام ہے۔

ولا يورث : راء کے فتحہ کے ساتھ ہے اور بعض کہتے ہیں کہ کسرہ کے ساتھ ہے۔

ولا يورث : ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ حرامی زانی کا وارث ہوتا ہے، اور نہ اس کو زانی کے اقرباء کی کوئی میراث ملتی ہے۔ کیونکہ وارثت نسب کی وجہ سے ہوتی ہے۔ جب کہ ''حرامی'' اور زانی کے درمیان نسب کا کوئی وجود نہیں ہوتا، اسی طرح زانی اور اس کے اقرباء اس حرامی کے وارث نہیں ہوں گے۔

۳۰۵۵: وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ مَوْلًى لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ مَاتَ وَتَرَكَ شَيْئًا وَلَمْ يَدَعْ حَمِيْمًا وَلَا وَلَدًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَعْطُوْا مِيْرَاثَهٗ رَجُلًا مِنْ اَهْلِ قَرْيَتِهٖ. (رواه ابو داود والترمذی)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ٣/٣٢٢ الحديث رقم ٢٩٠٢ وابن ماجه فی ٢/٩١١ الحديث رقم ٢٧٣٣۔

ترجمہ: ''اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ایک آزاد کردہ غلام مر گیا اور اس نے کچھ مال چھوڑا لیکن نہ تو اس نے کوئی قریبی رشتہ دار چھوڑا اور نہ ہی کوئی بیٹا جو (اس کے ترکہ کا وارث ہوتا) چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس کی میراث اس کی بستی کے کسی آدمی کو دے دو''۔ (ابوداؤد، ترمذی)

تشریح: **اعطوا ميراثه رجلا من اهل قرية** : اس لئے کہ دیگر مسلمان افراد سے وہ زیادہ حقدار ہے۔

قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ اس کی بستی کے کسی آدمی کو دینے کا حکم دیا، ممکن ہے کہ اس کی طرف سے صدقہ کے طور پر ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ بطور ''ترفع'' دیا ہو۔ یا اس لئے کہ اس ترکہ کا حقدار بیت المال تھا اور بیت المال کا مصرف مسلمانوں کی ضروریات پورا کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے آپ ﷺ نے اس مال کو اس کے بستی والوں کو دیا، کہ آپ ﷺ نے ان کو دینے میں مصلحت سمجھی۔ چونکہ جیسے کوئی شخص

انبیاء کا وارث نہیں ہوتا اسی طرح انبیاء بھی کسی کے وارث نہیں ہوتے بعض شراح فرماتے ہیں انبیاء صلوات اللہ وسلام علیہم نہ کسی کے وارث ہوتے ہیں اور نہ کوئی ان کا وارث ہوتا ہے۔ چونکہ ان کی شان بہت بلند و بالا ہے' وہ اس گھٹیا دنیا کے ساتھ اپنے آپ کو مشغول نہیں کرتے' وہ اسباب دنیا سے منقطع ہوتے ہیں۔ پہلے ایک حدیث میں گزرا: ''أنا مولیٰ من لا مولیٰ اور ارث ما لہ'' تو اس سے مراد حقیقی میراث نہیں ہے۔ بلکہ آپ ﷺ کی مراد اس سے یہ ہے کہ ان کی میراث کا معاملہ میرے حوالہ ہے۔ میں اس کو صدقہ کروں مسلمانوں کے مصالح اور ضروریات میں خرچ کروں کسی اور کو اس کا مالک بناؤں۔

دیلمیؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا آزاد کردہ غلام کھجور کے درخت سے گرا اور مر گیا، تو رسول اللہ ﷺ کے پاس اس کی میراث لائی گئی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: کہ اس کا کوئی قریبی رشتہ دار تلاش کرلو۔ تو صحابہ نے کہا کہ اس کا کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: کہ اس کے کسی بستی والے کو تلاش کرلو، اور اس کی میراث اس کو دے دو۔ (جیسا کہ سیوطی کی الجامع الکبیر میں ہے۔)

۳۰۵۶: وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ مَاتَ رَجُلٌ مِّنْ خُزَاعَةَ فَأُتِيَ النَّبِيُّ ﷺ بِمِيرَاثِهٖ فَقَالَ الْتَمِسُوْا لَهٗ وَارِثًا اَوْ ذَارَحِمٍ فَلَمْ يَجِدُوْا لَهٗ وَارِثًا وَلَا ذَا رَحِمٍ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَعْطُوْهُ الْكُبْرَ مِنْ خُزَاعَةَ.

(رواه ابوداود وفي رواية له قال انظروا اكبر رجل من خزاعة)

اخرجه ابوداوٗد في السنن ۳/۳۲٤ الحديث رقم ۲۹۰٤ واحمد في المسند ۳٤۷/۵۔

ترجمہ: ''اور حضرت بریدہؓ کہتے ہیں کہ قبیلہ خزاعہ کا ایک شخص مر گیا تو اس کی میراث نبی کریم ﷺ کے پاس لائی گئی۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس کا کوئی وارث یا کوئی قریبی رشتہ دار تلاش کرو۔ (یعنی پہلے تو ذوی الفروض اور عصبات میں سے کوئی وارث تلاش کرو اگر ان میں سے کوئی وارث نہ ملے تو) چنانچہ (تلاش کے بعد) انہوں نے نہ تو (ذوی الفروض اور عصبات میں سے) کوئی وارث پایا اور نہ ہی کوئی قریبی رشتہ دار تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس کی میراث قبیلہ خزاعہ کے کسی بوڑھے شخص کو دے دو (ابوداؤد) اور ابوداؤد ہی کی ایک اور روایت میں یوں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''قبیلہ خزاعہ کے کسی بوڑھے شخص کو دیکھو (اور اس کو یہ میراث دے دو)''۔

تشریح: قولہ: اعطو الکبر من خزاعة: ہمارے علماء میں سے بعض شراح فرماتے ہیں، کہ اس سے مراد قوم کا بڑا اور رئیس ہے۔ اور آپ علیہ السلام کا اس کو میراث کا یہ مال دینا بطور تفضّل اور احسان کے تھا نہ کہ بطور میراث کے۔ اور بعض کہتے ہیں اس سے مراد ان میں سے بڑا ہے جو پردادا کے زیادہ قریب ہو' اور یہ بھی بطور احسان کے تھا نہ کہ بطور میراث کے۔

تشریح: قولہ: قال: انظروا اکبر رجل من خزاعة:

نہایہ میں ہے کہ کہا جاتا ہے: ''فلان کبر قومه'' کاف کے ضمہ کے ساتھ۔ جب وہ نسب میں بہت دور کا رشتہ دار ہو۔ یہ وہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنی نسبت کرے اپنے آباء میں سے پردادا کی طرف۔ ''اکبر رجل''، بمعنیٰ ''کبیرهم'' ہے، یہ ان میں سے پردادا کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ (انتہیٰ)

حاصل یہ ہے کہ اس سے مراد مطلقاً سن رسیدہ بوڑھا نہیں ہے۔ (بلکہ دور پار کا کوئی رشتہ دار ہی مراد ہے)

۳۰۵۷: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ اِنَّكُمْ تَقْرَؤُوْنَ هٰذِهِ الْاٰيَةَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَا اَوْ دَيْنٍ وَاَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَضٰى بِالدَّيْنِ قَبْلَ الْوَصِيَّةِ وَاَنَّ اَعْيَانَ بَنِي الْاُمِّ يَتَوَارَثُوْنَ دُوْنَ بَنِي الْعَلَّاتِ الرَّجُلُ يَرِثُ اَخَاهُ لِاَبِيْهِ وَاُمِّهٖ دُوْنَ اَخِيْهِ لِاَبِيْهِ (رواه الترمذي وابن ماجة: وفي رواية الدارمي) قَالَ الْاُخْوَةُ مِنَ الْاُمِّ يَتَوَارَثُوْنَ دُوْنَ بَنِي

الْعَلَّاتِ اِلٰی اٰخِرِہٖ .

اخرجه الترمذی فی السنن ٣١٩/٤ الحديث رقم ٢٠٩٥ وابن ماجه فی ٩١٥/٢ الحديث رقم ٢٧٣٩ والدارمی فی ٤٦٤/٢ الحديث رقم ٢٩٨٤ واحمد فی المسند ١٤/١

ترجمہ: ''اور حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ (ایک دن) انہوں نے (لوگوں سے) کہا کہ تم اس آیت کی تلاوت کرتے ہو: من بعد وصية توصون بها او دين : (وصیت پوری کرنے کے بعد جو تم وصیت کرتے ہو یا قرض ادا کرنے کے بعد) بے شک نبی کریم ﷺ نے وصیت پوری کرنے سے پہلے قرض کی ادائیگی کا فیصلہ فرمایا ہے اور (آپ ﷺ نے یہ حکم بھی صادر فرمایا ہے) کہ حقیقی بھائی وارث ہوتے ہیں نہ کہ سوتیلے بھائی (یعنی حقیقی بھائیوں کی موجودگی میں سوتیلے بھائیوں کو وراثت میں سے کچھ نہیں ملتا) اور یہ کہ آدمی اپنے حقیقی بھائی کا وارث ہوتا ہے نہ کہ سوتیلے بھائی کا (یہ جملہ پہلے جملہ کی تاکید کے طور پر استعمال کیا گیا ہے) (ترمذی' ابن ماجہ) اور دارمی کی روایت میں یوں ہے کہ حضرت علیؓ نے ارشاد فرمایا: وہ بھائی جو ماں شریک ہوں (یعنی باپ اور ماں دونوں میں شریک ہوں کہ جنہیں حقیقی بھائی کہتے ہیں) وارث ہوتے ہیں نہ کہ وہ بھائی جو صرف باپ شریک ہوں (یعنی سوتیلے بھائی) وارث نہیں ہوں گے آگے حدیث کے وہی الفاظ ہیں جو اوپر نقل ہوئے ہیں''۔

تشریح: **وأن** :أن کے فتحہ کے ساتھ ہے' اور واؤ عطف کیلئے ہے۔**ای وقضی بأن** ۔

و أن اعيان :ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے اور حرف جارہ حذف ہے اور اس کا عطف ہے''**بالدين**'' پر۔ مصابیح کی یہ روایت اس پر دلیل ہے:**قضی رسول الله ﷺ أن اعيان بنی الام** ۔

یہ جملہ مستانفہ ہے اور ماقبل کیلئے بمنزلہ تفسیر کے ہے۔''**اعيان**'' **عين الشیء** سے ہے۔ نفس شئی کو کہتے ہیں۔

بنی العلات : جن کے باپ ایک اور مائیں مختلف ہوں۔ ہمارے علماء حنفیہ میں سے بعض محققین نے فرمایا ہے کہا''**عيان القوم**'' قوم کے اشراف کو کہتے ہیں۔ اور''**اعيان**''ان بھائیوں کو کہتے ہیں جو ماں باپ شریک ہوں' اور ان بھائیوں کو''**معاينة**'' بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں ماں کا ذکر حقیقی بھائیوں کی سوتیلے بھائیوں پر ترجیح کے بیان کیلئے ہے۔ اور''علاتی بھائی'' آدمی کے ان بیٹوں کو کہا جاتا ہے۔ جو مختلف نسبتوں سے ہوں۔ اور ان کا نام''علات'' رکھا گیا ہے اس لئے کہ شوہر پہلی سے سیراب ہونے کے بعد، بعد والی پر چڑھائی کر چکا ہوتا ہے (یعنی صحبت کر چکا ہوتا ہے)۔ مطلب یہ ہے کہ جب حقیقی بیٹے علاتی بیٹوں کے ساتھ جمع ہو جائیں۔ تو میراث حقیقی بیٹوں کو ملے گی قوت قرابت کی بناء پر۔ (انتہیٰ)۔ اور اگر ماں ایک ہو اور باپ الگ الگ ہوں تو ان کو''اخیافی'' کہتے ہیں۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ''**انكم تقرأون**'' یہ اخبار ہے اور اس میں معنی استفہام کا ہے یعنی تم یہ آیت پڑھتے ہو' کیا تم اس کا معنی سمجھتے ہو؟ پس وصیت مقدم ہے قرض پر قراءۃ میں، اور مؤخر ہے ادائیگی میں۔ اور آیت میں بھائیوں، اور بہنوں کا ذکر مطلق ہے جس سے برابری کا وہم ہو سکتا تھا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے قرض کی ادائیگی کو وصیت پر تعمیل سے مقدم کرنے کا فیصلہ کیا، اور بھائی، بہنوں میں فرق کا فیصلہ کیا۔

الرجل يرث اخاه لابيه وامه دون اخيه لأبيه : پس اگر آپ یہ کہیں کہ جب ادائیگی قرض' وصیت پر تعمیل سے مقدم ہے، تو پھر قرآن میں وصیت کو قرض پر کیوں مقدم کیا ہے؟ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں، کہ یہ اہتمام شان کیلئے۔ (الکشاف)

وصیت مشابہ تھی میراث کے، بغیر عوض کے حاصل ہونے میں' تو اس کی تعمیل ورثاء پر گراں گزر سکتی تھی اور وہ دل کی خوشی سے اس کو ادا نہ کرتے' اس کے ادائیگی میں کوتاہی کا خطرہ تھا برخلاف قرض کے۔ کہ دل اس کی ادائیگی پر مطمئن ہوتے ہیں۔ پس اسی وجہ سے وصیت کو دین پر مقدم کیا۔ اس کے وجوب اور قرض کے ساتھ اس کے جلدی اداء کرنے پر آگاہی کیلئے، اسی لئے کلمہ''او'' کے ساتھ لایا گیا وجوب میں دونوں کی برابری کی وجہ سے۔

۳۰۵۸: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ جَاءَ تِ امْرَأَةُ سَعْدِ بْنِ الرَّبِيْعِ بِا بْنَتَيْهَا مِنْ سَعْدِ ابْنِ الرَّبِيْعِ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هَاتَانِ ابْنَتَا سَعْدِ بْنِ الرَّبِيْعِ قُتِلَ اَبُوْهُمَا مَعَكَ يَوْمَ اُحُدٍ شَهِيْدًا وَاِنَّ عَمَّهُمَا اَخَذَ مَالَهُمَا وَلَمْ يَدَعْ لَهُمَا مَالاً وَلَا تُنْكَحَانِ اِلاَّ وَلَهُمَا مَالٌ قَالَ يَقْضِىْ اللّٰهُ فِىْ ذٰلِكَ فَنَزَلَتْ اٰيَةُ الْمِيْرَاثِ فَبَعَثَ رُسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِلٰى عَمِّهِمَا فَقَالَ اَعْطِ لِاِ بْنَتَىْ سَعْدِ الثُّلُثَيْنِ وَاَعْطِ اُمَّهُمَا الثُّمُنَ وَمَا بَقِىَ فَهُوَ لَكَ. (رواہ الترمذی وابوداود وابن ماجة وقال الترمذی ھذا حدیث غریب)

اخرجه ابو داوٗد فی السنن ۳/۳۱٦ الحدیث رقم ۲۸۹۲ والترمذی فی ٤/۳٦۱ الحدیث رقم۲۰۹۲ وابن ماجه فی ۲/۹۰۸ الحدیث رقم ۲۷۲۰ واحمد فی المسند ۳/۳۵۲۔

ترجمه: ''اور حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ (ایک دن) حضرت سعد بن ربیعؓ کی زوجہ اپنی دونوں بیٹیوں کو جو حضرت سعد بن ربیعؓ سے تھیں' لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کرنے لگیں کہ ''یا رسول اللہ! یہ دونوں بیٹیاں سعد بن ربیع کی ہیں' ان کا باپ غزوہ احد کے دن آپ کے ساتھ شریک ہوکر میدانِ جنگ میں شہید ہوگیا۔ ان کا مال ان کے چچا نے لے لیا ہے (یعنی ان کے باپ کا جو ترکہ ان لڑکیوں کو ملنا تھا وہ زمانۂ جاہلیت کی رسم کے مطابق سعد کے بھائی نے لے لیا ہے) اور ان کے لئے کچھ بھی مال نہیں چھوڑا ہے' جب تک ان کے پاس مال نہ ہوگا ان کا نکاح نہیں ہوسکتا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (کچھ دنوں کے لئے صبر کرو) ان لڑکیوں کے معاملہ کا اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائے گا (یعنی ان کے بارے میں جب کوئی وحی نازل ہوگی تو فیصلہ ہوگا) چنانچہ (کچھ دنوں کے بعد) آیت میراث یعنی: (یوصیکم الله فی اولاد کم ......) نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے کسی کے ہاتھ ان لڑکیوں کے چچا کے پاس پیغام بھیجا (اور بلاکر) کہا کہ سعدؓ کی بیٹیوں کو (سعدؓ کے ترکہ میں سے) دو تہائی اور ان دونوں لڑکیوں کی والدہ کو آٹھواں حصہ دے دو اور جو کچھ باقی بچے وہ تمہارا ہے۔ (احمد' ترمذی' ابوداوٗد' ابن ماجہ) اور امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے''۔

تشریح: علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، کہ جائز نہیں ہے کہ ''معك'' قتل کا متعلق ہو۔ کشاف میں اس آیت کے تحت لکھا ہے: ﴿ودخل معه السجن فتیان﴾ [یوسف۔۳٦] کہ ''مع'' مصاحبت کے لئے ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے: خرجت مع الامیر أی مصاحباله اس سے مراد اس کا ہمراہ ہونا ہوتا ہے۔ تو لازم ہے کہ ان دونوں کا دخول (یعنی یوسف علیہ) کے ہمراہ ہو۔ اور اس آیت: ﴿فلما بلغ معه السعی﴾ میں ''معه'' کا ''بلغ'' کا متعلق ہونا صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ اس کا تقاضا ہوگا کہ وہ دونوں ایک ساتھ چلنے کو حد کو پہنچے۔ پس یہ بیان ہے، گویا کہ تقدیری عبارت اس طرح ہے کہ جب کہا ''فلما بلغ السعی'' یعنی اس حد تک جس حد تک وہ سعی پر قادر تھا تو کہا گیا مع من؟ یعنی کس کے ساتھ؟ کہا گیا مع ابیه یعنی اپنے ابا کے ساتھ۔ یہی تقدیری عبارت یہاں بھی ہے یعنی جب کہا گیا کہ قتل یوم احد، کہ وہ اُحد کے دن شہید کئے گئے، تو کہا گیا، مع من؟ کس کے ہمراہ؟ کہا گیا معك یعنی آپ ﷺ کے ہمراہ۔

شهیدا : یہ تمیز ہے، اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ حال مؤکدہ ہو اس لئے کہ سابق لفظ ''شهادة'' کے معنی میں ہے۔ اور کلمہ ''فوق'' صلہ ہے۔ جیسے اس آیت میں ہے: ﴿فاصربوا فوق الاعناق﴾

شهیدًا وان عمهما اخذ ما لهما : یعنی زمانہ جاہلیت کی رسم کے مطابق کہ عورتوں کو میراث سے محروم رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کے چچا نے ان کیلئے کوئی مال نہیں چھوڑا جو ان پر خرچ کیا جائے۔ یا ان کی شادی کی تیاری کی جائے۔ اور عادت کے مطابق ان سے کوئی نکاح نہیں کرے گا' یا غالباً ان سے نکاح کیلئے کوئی تیار نہیں' یا عزت کے ساتھ ان کی شادی نہ ہوگی۔

فنزلت آیة المیراث ﴿یوصیکم الله فی اولادکم﴾

فبعث رسول الله ﷺ الی عمهما فقال : اعط لا بنتي سعد الثلثین واعط امهما الثمن : اور یہ اس آیت کی بناء پر ہے: ﴿فان کان لکم ولد فلهن الثمن مما ترکتم﴾ [النساء۔۱۲] ترجمہ: ''اور اگر تمہارے کچھ اولاد ہو تو اُن کو تمہارے ترکہ سے

آٹھواں حصہ ملے گا''۔

وما بقي فهو لك : یعنی عصبہ ہونے کی وجہ سے، یہ اسلام میں میراث کا اول حکم تھا۔ قاضی بیضاویؒ فرماتے ہیں، کہ دو بیٹیوں کی میراث میں حصہ کے بارے میں اختلاف ہے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں، کہ دو کا حکم ایک ہی کا حکم ہے، یعنی ان کا حکم جمع کا نہیں ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے دو ثلث' دو سے زائد کیلئے مقرر کئے ہیں۔ اور باقی حضرات کہتے ہیں کہ دو بیٹیوں کا حکم دو سے زیادہ کا حکم ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے کہ ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔ جب اس کے ساتھ ایک عورت ہو تو اس کا حصہ دو ثلث ہوگا، تو یہ تقاضا کرتا ہے، کہ دو عورتوں کیلئے دو ثلث مقرر کئے گئے ہیں، پھر جب یہ وہم ہو سکتا تھا، کہ عدد کے زیادہ ہونے کے ساتھ حصہ بھی زیادہ ہو گا، تو اس قول کے ساتھ وہم کو دور کیا [**فان كن نساء فوق اثنتين**] اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جب ایک بیٹی اپنے بھائی کے ساتھ ایک تہائی کی مستحق ہوتی ہے تو اپنی بہن کے ساتھ بطریق اولیٰ ایک تہائی کی مستحق ہونی چاہئے۔ اور دو بیٹیاں دو بہنوں سے زیادہ حقدار ہیں، اور دو بہنوں کیلئے دو ثلث مقرر کیا ہے: ﴿**فلهما الثلثان مما ترك**﴾ [النساء۔۱۷۶] ترجمہ: ''تو ان کو اُس کے کل ترکہ میں سے دو تہائی ملے گا''۔ (انتہیٰ)

اور یہ حدیث قول جمہور کے موافق ہے، اور شاید ابن عباس کو یہ حدیث پہنچی نہ ہو، یا ان کے نزدیک صحیح نہ ہو۔

۳۰۵۹: وَعَنْ هُزَيْلِ بْنِ شُرَحْبِيلَ ؒ قَالَ سُئِلَ اَبُوْ مُوْسٰى عَنِ ابْنَةٍ وَبِنْتِ ابْنٍ وَاُخْتٍ فَقَالَ لِلْبِنْتِ النِّصْفُ وَلِلْاُخْتِ النِّصْفُ وَاْتِ ابْنَ مَسْعُوْدٍ فَسَيُتَابِعُنِیْ فَسُئِلَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ وَاُخْبِرَ بِقَوْلِ اَبِیْ مُوْسٰى فَقَالَ لَقَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَمَا اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ اَقْضِیْ فِيْهَا بِمَا قَضٰى النَّبِیُّ ﷺ لِلْبِنْتِ النِّصْفُ وَلِاِبْنَةِ الْاِبْنِ السُّدُسُ تَكْمِلَةَ لِلثُّلُثَيْنِ وَمَا بَقِیَ فَلِلْاُخْتِ فَاَتَيْنَا اَبَا مُوْسٰى فَاَخْبَرْنَاهُ بِقَوْلِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ فَقَالَ لَا تَسْاَلُوْنِیْ مَا دَامَ هٰذَا الْحِبْرُ فِيْكُمْ. (رواه البخاری)

ترجمہ: ''اور حضرت ہزیل بن شرحبیل (تابعی) کہتے ہیں کہ حضرت ابوموسیٰؓ (صحابی) سے یہ سوال کیا گیا کہ (مثلاً زید مر گیا اور اس کے ورثاء میں) ایک بیٹی ایک پوتی اور ایک بہن ہے (تو زید کی میراث کو کس طرح ان تینوں کے درمیان تقسیم کیا جائے گا؟) حضرت ابوموسیٰؓ نے جواب دیا کہ (زید کا ترکہ) آدھا بیٹی کو اور آدھا بہن کو ملے گا (پوتی زید کی وراثت سے محروم رہے گی) پھر حضرت ابوموسیٰؓ نے سائل سے کہا کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس جاؤ (اور ان سے بھی یہی مسئلہ دریافت کرو) وہ بھی میرے مطابق جواب دیں گے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی یہ مسئلہ دریافت کیا گیا اور اس کا جو جواب حضرت ابوموسیٰؓ نے دیا تھا وہ بھی انہیں بتایا گیا' حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے (مسئلہ اور حضرت ابوموسیٰؓ کا جواب سن کر) کہا کہ ایسی صورت میں (یعنی ابوموسیٰ نے جو فتویٰ دیا ہے وہی فتویٰ اگر میں بھی دیدوں تو) میں گمراہ تصور کیا جاؤں گا اور اپنے آپ کو راہِ ہدایت پر نہ پاؤں گا' لہٰذا اس مسئلہ میں' میں وہی فیصلہ دوں گا جو رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق ہے اور وہ یہ ہے کہ بیٹی کو آدھا ملے گا اور دو تہائی پورا کرنے کے لئے پوتی کو چھٹا حصہ ملے گا (یعنی میت کے ترکہ میں سے دو یا دو سے زائد بیٹیوں کو تہائی ملتا ہے اب چونکہ بیٹی ایک ہے اس لئے اس کو نصف حصہ ملا ہے تو پوتی کو چھٹا حصہ دے کر دو تہائی پورا کر دیا جائے گا) اور جو کچھ باقی بچے (یعنی ایک تہائی) وہ بہن کا حصہ ہے (یعنی اس حدیث بیٹوں کی موجودگی میں بہن کو عصبہ قرار دو' کے مطابق بہن عصبہ ہو کر باقی ماندہ ترکہ لے لے گی چنانچہ اکثر علماء کا یہی مسلک ہے) راوی کہتے ہیں کہ (حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا یہ جواب سن کر) ہم حضرت ابوموسیٰؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہیں حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے جواب سے آگاہ کیا۔ حضرت ابوموسیٰؓ نے فرمایا کہ (مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے کیونکہ ابن مسعودؓ نے جو فتویٰ دیا ہے وہی صحیح اور حق ہے لہٰذا) جب تک تمہارے درمیان یہ عالم (یعنی ابن مسعود رضی اللہ عنہ) موجود ہیں مجھ سے کوئی مسئلہ دریافت نہ کیا کرو''۔ (بخاری)

حالاتِ راوی:

هزيل بن شرحبيل : مولف فرماتے ہیں کہ یہ ازدی وکوفی اور نابینا تھے،انہوں نے عبداللہ بن مسعود سے حدیث سنی ہے،اوران سے ایک جماعت نے روایت کی ہے۔

تشریح: ''**هزيل**'' :**هزل** کی تصغیر ہے،زاء کے ساتھ،اور'' **هزل** ''جد کی ضد ہے۔

شرحبيل : شین کے ضمہ'راء کے فتحہ' حاء کے سکون اور باء کے کسرہ کے ساتھ ہے،اور غیر منصرف ہے،اور تہذیب الاسماء میں ہے کہ شرحبیل،شین کے ضمہ کے ساتھ عجمی نام ہے،اور غیر منصرف ہے۔اور کبھی'هزیل'میں تصحیف کی جاتی ہے۔ ''**هذی**'' ''**ذال**'' کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے۔یہ صریح طور پر غلط ہے۔

السدس : سین اور دال کے ضمہ کے ساتھ ہے اور کبھی دال کو ساکن کیا جاتا ہے۔

لا تسألونی : نون کی تخفیف کے ساتھ ہے،اس لئے کہ''لا'' ناہیہ ہے۔

تكملة الثلثين : حاضر تمام نسخوں میں اضافت کے ساتھ ہے،اور نصب مفعولیت کے بناء پر ہے۔ای لتکمیل الثلثین علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں،کہ یہ مصدر مؤکدہ ہے،اس لئے کہ جب آپ سدس کو نصف کے ساتھ ملا دیتے ہیں،تو دو ثلث مکمل ہو جاتے ہیں۔اور یہ بھی جائز ہے،کہ یہ حال مؤکدہ ہو۔

وللاخت النصف : اللہ کے اس قول کی وجہ سے ہے:﴿**ان امرؤ هلك ليس له ولد وله اخت فلها نصف ما ترك**﴾ [النساء: ۱۷٦] :''اگر کوئی شخص مرجائے جس کے اولاد نہ ہو اور اس کے ایک بہن تو ہو اس کو اس کے تمام ترکہ کا نصف ملے گا''۔اس میں محل نظربات یہ ہے کہ''ولد'' بیٹی کو بھی شامل ہے،لیکن گویا وہ اس سے غافل رہے،یا یہ سمجھا کہ''**ولد**'' خاص ہے مذکر کے ساتھ۔یا یہ کہا کہ بہن کیلئے عصبہ ہونے کی وجہ سے آدھا ہے۔

وأت ابن مسعود :اس لئے کہ وہ مجھ سے زیادہ جاننے والے ہیں،یا اس وجہ سے کہ دو علم ایک علم سے بہتر ہیں۔

فقال، لقد ضللت اذا :یعنی اگر اس جواب میں میں ان کی موافقت کروں۔

وما أنا من المهتدين :سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ ان کا یہ قول،اقتباس کے جواز کے دلائل میں سے ہے۔

اقضی فيها بما قضی النبی ﷺ :یعنی اس جیسے مسئلہ میں۔**للبنت نصف** :اس کی وجہ پہلے گزر چکی ہے۔

لابنة الابن السدس تكملة الثلثين وما بقی فلأخت :اس لئے کہ بہن،بیٹیوں کے ساتھ عصبہ ہے،اور تفصیل اس کی یہ ہے کہ بیٹیوں کا حق دو تہائی ہے،جیسا کہ پہلے گزرا،تو ایک بیٹی نے آدھا لے لیا قوۃ قرابت کی بناء پر،تو بیٹیوں کے حق میں سے ایک سدس حصہ رہ گیا،وہ پوتیاں لے لیں گی،خواہ ایک ہو یا متعدد ہوں،اور جو ترکہ باقی رہ گیا وہ قریبی عصبات کیلئے ہے۔پس پوتیاں ایک بیٹی کے ساتھ ذوی الفروض میں سے ہیں،جیسا کہ اس کو سید نے شرح الفرائض میں ذکر کیا ہے۔

اکثر صحابہ کا مذہب یہی ہے،کہ بیٹیوں کی موجودگی میں بہنیں عصبہ ہوتی ہیں۔اور یہی جمہور علماء کا مسلک ہے،آپ علیہ السلام کی اس حدیث کی وجہ سے:''**اجعلوا الاخوات مع البنات عصبة**''.کہ بیٹیوں کے موجودگی میں بہنوں کو عصبہ بناؤ۔اور ابن عباس فرماتے ہیں،کہ بہنیں،بیٹیوں کی موجودگی میں عصبہ نہیں بنتیں،اور بیٹی اور بہن جب جمع ہو جائے تو اس کا حکم یہ ہے کہ بیٹی کیلئے آدھا ہوگا،اور بہن کیلئے کچھ نہ ہوگا۔تو ان سے کہا گیا کہ حضرت عمرؓ فرماتے تھے،کہ ترکہ میں سے جو باقی بچے وہ بہن کیلئے ہے،تو ابن عباسؓ غصہ ہو گئے،اور فرمایا کہ تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ یعنی ان کی مراد یہ آیت تھی :﴿**ان امرؤ هلك ليس له ولد وله اخت فلها نصف ما ترك**﴾[النساء۔۱۷٦] ترجمہ:''اگر کوئی شخص مرجائے جس کے اولاد نہ ہو اور اس کی ایک بہن ہو تو اس کو اس کے تمام ترکہ کا نصف ملے

گا''۔ پس یہاں ''ولد'' کو بہن کیلئے حاجب قرار دیا ہے۔ اور لفظ ''ولد'' مذکر اور مؤنث دونوں کو شامل ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ''ولد'' سے مراد یہاں صرف مذکر ہے، اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ﴿وهو يرثها ان لم يكن لها ولد﴾ [النساء: ۱۷۶] یہاں ولد سے مراد بالاتفاق بیٹا ہے، اس لئے کہ بھائی، بیٹی کے ساتھ وارث ہوتا ہے، اور اس کی تائید ہزیل کی حدیث سے ہوتی ہے، کہ وہ دلالت کر رہی ہے کہ آپ ﷺ نے بہن کو بیٹی کے ساتھ عصبہ قرار دیا ہے۔

۳۰۶۰: وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ اِنَّ ابْنِی مَاتَ فَمَالِیْ مِنْ مِيْرَاثِهٖ قَالَ لَكَ السُّدُسُ فَلَمَّا وَلّٰى دَعَاهُ قَالَ لَكَ سُدُسٌ اٰخَرُ فَلَمَّا وَلّٰى دَعَاهُ قَالَ اِنَّ السُّدُسَ الْاٰخَرَ طُعْمَةٌ لَّكَ. (رواه احمد والترمذی وابوداود وقال الترمذی هذا حديث حسن صحيح)

اخوجه ابوداوٗد فی السنن ۳/۳۱۸ الحديث رقم ۲۸۹۶ والترمذی فی ٤/۳٦٥ الحديث رقم ۲۰۹۹۔

ترجمہ: ''اور حضرت عمران بن حصین کہتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا کہ میرا پوتا مر گیا ہے اس کی میراث میں سے میرا کتنا حصہ ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تمہارے لئے (اس کی میراث میں سے) چھٹا حصہ ہے''۔ جب وہ (یہ جواب سن کر) واپس مڑا تو آپ ﷺ نے اسے بلایا اور فرمایا کہ ''تمہیں چھٹا حصہ اور ملے گا) پھر جب وہ واپس مڑا تو آپ ﷺ نے (دوبارہ) بلایا اور کہا کہ ''یہ دوسرا چھٹا حصہ (زیادہ ورثاء نہ ہونے کی وجہ سے) تمہارا رزق ہے''۔ (احمد' ترمذی' ابوداؤد) اور امام ترمذی نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے''۔

تشریح: الآخر : خاء کے کسرہ کے ساتھ ہے اور ایک نسخہ میں خاء کے فتحہ کے ساتھ ہے، لیکن یہاں کسرہ کے ساتھ مراد ہے۔ یعنی اس کی دو بیٹیاں بھی تھیں، جن کا حصہ میراث میں دو تہائی تھا، لیکن یہ ان کو معلوم تھا۔

قوله :ان السدس الآخر طعمة : ایک نسخہ میں ''لك'' ہے۔ ذوی الفروض کے زیادہ نہ ہونے کے سبب سے۔ اور یہ آخر کا چھٹا حصہ ذی فرض ہونے کی حیثیت سے نہیں ہے اس لئے کہ اگر ذوی الفروض زیادہ ہو جائیں تو یہ آخر کا چھٹا حصہ ختم ہو جائے گا۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، کہ اس مسئلہ کی صورت یہ ہے کہ میت نے اپنے وارثوں میں دو بیٹیاں اور ایک یہ سائل یعنی دادا چھوڑے۔ چنانچہ میت کے ترکہ میں بیٹیوں کو دو تہائی ملا، اور ایک تہائی باقی رہ گیا، تو آپ علیہ السلام نے سائل کو چھٹا حصہ ذی فرض ہونے کی حیثیت سے دیدیا اس لئے کہ وہ میت کے دادا تھے۔ پھر وہ چلا گیا، تو آپ ﷺ نے اس کو بلایا اور آخری چھٹا حصہ بھی اس کو دیدیا، تاکہ وہ یہ گمان نہ کرے کہ ذی فرض ہونے کی حیثیت سے دادا کا حصہ تہائی ہے۔ اور **طعمة** کا معنی یہاں ''تعصیب'' ہے' یعنی یہ تیری روزی ہے' فرض نہیں ہے اور سدس آخر کے ساتھ ''**طعمة** '' کہا' **سدس** کہ اول کے ساتھ ''طعمہ'' نہیں کہا۔ اس لئے کہ سدس اول فرض ہے اور فرض میں تبدیلی نہیں آتی بخلاف عصبہ ہونے کے' تو جب عصبہ ہونا کوئی مستقل چیز نہیں ہے جو ہمیشہ کیلئے ثابت ہو تو اس کو ''**طعمة**'' کہا۔

۳۰۶۱: وَعَنْ قَبِيْصَةَ بْنِ ذُؤَيْبٍ قَالَ جَاءَتِ الْجَدَّةُ اِلٰى اَبِیْ بَكْرٍ تَسْاَلُهٗ مِيْرَاثَهَا فَقَالَ لَهَا مَالَكِ فِیْ كِتَابِ اللّٰهِ شَیْءٌ وَمَا لَكِ فِیْ سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ شَیْءٌ فَارْجِعِیْ حَتّٰى اَسْاَلَ النَّاسَ فَسَاَلَ فَقَالَ الْمُغِيْرَةُ بْنُ شُعْبَةَ حَضَرْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَعْطَاهَا السُّدُسَ فَقَالَ اَبُوْبَكْرٍ هَلْ مَعَكَ غَيْرُكَ فَقَالَ مُحَمَّدُ بْنُ مَسْلَمَةَ مِثْلَ مَا قَالَ الْمُغِيْرَةُ فَاَنْفَذَهٗ لَهَا اَبُوْ بَكْرٍ ثُمَّ جَاءَتِ الْجَدَّةُ الْاُخْرٰى اِلٰى عُمَرَ تَسْاَلُهٗ مِيْرَاثَهَا فَقَالَ هُوَ ذٰلِكَ السُّدُسُ فَاِنِ اجْتَمَعْتُمَا فَهُوَ بَيْنَكُمَا وَاَيَّتُكُمَا خَلَتْ بِهٖ فَهُوَ لَهَا۔

(رواه مالك واحمد والترمذی وابوداود والدارمی وابن ماجة)

اخرجه ابوداوٗد فی السنن ۳/۳۱٦ الحديث رقم ۲۸۹٤ والترمذی فی ٤/۳٦٥ الحديث رقم ۲۱۰۰و اخرجه ابن ماجه

فی ۹۰۹/۲ الحدیث رقم ۲۸۲٤ والدارمی فی ٤٥٦/۲ الحدیث رقم ۲۹۳۹ ومالك فی الموطأ ۵۱۳/۲ الحدیث رقم ٤ من کتاب الفرائض واحمد فی المسند ۲۲۵/٤

ترجمہ: ''اور حضرت قبیصہ بن ذویبؓ کہتے ہیں کہ (ایک متوفی شخص کی) دادی یا نانی حضرت ابوبکر صدیق کی خدمت میں حاضر ہوئی اور ان سے اپنی میراث دلوائے جانے کا مطالبہ کرنے لگی' حضرت ابوبکرؓ نے اس سے فرمایا کہ کتاب اللہ میں تمہارے لئے کوئی حصہ مقرر نہیں ہے اور نہ سنت رسول اللہ ﷺ میں تمہارے لئے کوئی حصہ مقرر کیا گیا ہے (یعنی مجھے جو حدیثیں یاد ہیں ان میں سے کسی حدیث میں دادی' نانی کا کوئی حصہ مقرر نہیں کیا گیا۔ اس لئے اب تم واپس جاؤ یہاں تک کہ میں لوگوں سے (یعنی علماء صحابہؓ سے) پوچھ لونگا (شاید ان میں سے کسی کو دادی' نانی کے بارے میں آپ ﷺ کا کوئی ارشاد معلوم ہو) چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے لوگوں سے پوچھا تو حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے کہا کہ میں (ایک دن) رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھا (تو میں نے دیکھا کہ) آپ ﷺ نے دادی' نانی کو چھٹا حصہ دلوایا۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت مغیرہؓ سے کہا کہ تمہارے علاوہ کوئی اور شخص بھی تمہارے ساتھ تھا؟ (یعنی حضرت ابوبکرؓ نے بطور احتیاط ان سے پوچھا کہ تمہارے علاوہ کسی اور شخص نے بھی رسول اللہ ﷺ سے یہ حکم سنا یا دیکھا ہے؟) چنانچہ (ایک اور صحابی) حضرت محمد بن ابن مسلمہؓ نے (حضرت مغیرہ کے قول کی تائید کی یعنی انہوں نے) وہی کہا جو حضرت مغیرہؓ نے کہا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کو (جب اطمینان ہو گیا کہ میت کے ترکہ میں سے دادی' نانی کا بھی حصہ ہے تو انہوں) نے اس دادی' نانی کو (میت کے ترکہ میں سے چھٹا حصہ دیئے جانے کا فیصلہ کر دیا۔ پھر دوسری دادی' نانی حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس نے ان سے اپنی میراث دلوائے جانے کا مطالبہ کیا حضرت عمرؓ نے کہا وہی چھٹا حصہ تمہارے لئے بھی ہے' اگر تم دو ہو تو وہ چھٹا حصہ تم دونوں کے درمیان مشترک ہے اور اگر تم میں سے کوئی ایک ہے تو وہ چھٹا حصہ اس ایک کے لئے ہوگا''۔ (مالک' احمد' ترمذی' ابوداؤد' دارمی' ابن ماجہ)

تشریح: **ذلك** : کاف کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور ایک نسخہ میں کاف کے فتحہ کے ساتھ ہے، اس صورت میں خطاب عام ہوگا۔

السدس : یہ صفت ہے، **ذلك** کے لئے، یا اس کیلئے عطف بیان ہے۔

قال جاء ت الجدة : **''الی ابی بکرؓ تسالہ میر اثھا''**۔ اور ایک روایت میں ہے کہ وہ کہہ رہی تھی **اعطنی میراث ولد ابنتی**، کہ میرے نواسے کی میراث مجھے دو۔

فارجعی حتی أسال الناس : اس لئے کہ جس نے یاد کیا وہ حجت ہے، اس پر جس نے یاد نہیں کیا۔ اور ایک روایت میں ہے، کہ حضرت ابوبکر نے فرمایا کہ تم صبر کرو' تاکہ میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرلوں۔ اس لئے کہ تیرے بارے میں نہ اللہ کی کتاب میں کوئی نص پاتا ہوں اور نہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے تیرے مسئلہ کے بارے میں کچھ سنا ہے۔ پھر صحابہ سے پوچھا۔

ثم جاء ت الجدة الأخرىٰ : یعنی اسی میت کی دادی تھی اگر پہلے والی نانی ہو، اور یا نانی تھی اگر پہلے والی دادی ہو۔ جیسا کہ علامہ طیبیؒ نے یہ کہا ہے۔ اور سید شریف کی روایت میں ہے: **ثم جاء ت أم الاب** کہ پھر دادی آ گئی۔

فان اجتمعتما : یہ صراحت ہے اس کا جو پہلے ضمناً معلوم ہوا، اور منطوق کی وضاحت ہے، جو پہلے مفہوماً سمجھا گیا۔ اور خطاب دادی اور نانی دونوں کو ہے۔

یہ فیصلہ صحابہ ﷡ کے سامنے کیا۔ اور کسی نے اس پر نکیر نہیں کی لہٰذا یہ اجماع ہوا۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، **''فان اجتمعتا......''** یہ بیان مسئلہ ہے۔ اور **''فان اجتمعتا''** اور **''ایتکما''** میں خطاب جنس کو ہے، ان دو جدات کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ پس حضرت ابوبکر نے اس چھٹے حصے کو تنہا نانی کو دینے کا حکم دیا، کیونکہ ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ میت کی دادی بھی ہے۔ لیکن حضرت عمر فاروق ﷛ کو جب یہ بھی معلوم ہوا کہ دوسری جدہ بھی ہے تو انہوں نے حکم دیا، کہ اس چھٹے حصے میں دونوں شریک ہیں۔ واللہ اعلم

تخریج: ایک روایت میں ہے کہ میت کی دادی حضرت عمر ﷛ کے پاس آ گئی اور کہنے لگی کہ میں میراث کی زیادہ حقدار ہوں میت

کی نانی سے۔ اس لئے کہ اگر یہ نانی مرجائے تو اس کی بیٹی کی اولاد اس کی وارث نہ ہوگی اور اگر میں مرجاؤں تو میرے پوتے وارث ہوں 69 69
گے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، کہ وہی چھٹا حصہ تم دونوں کا ہے۔ تو شیخین کا اجماع ہے کہ جدات صحیحہ چھٹے حصے میں برابر کی شریک ہوتی ہیں۔ اور ابن عباسؓ فرماتے ہیں، کہ نانی، ماں کے قائم مقام ہے ماں کے ہونے کی صورت میں یہ میراث میں ایک تہائی لے گی جب میت کی اولاد اور بھائی نہ ہوں، اور چھٹا حصہ لے گی جب ان میں سے کوئی موجود ہو۔

۳۰۶۲: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ فِی الْجَدَّةِ مَعَ ابْنِهَا اَنَّهَا اَوَّلُ جَدَّةٍ اَطْعَمَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم سُدُسًا مَعَ ابْنِهَا وَابْنُهَا حَیٌّ. (رواه الترمذی والدارمی والترمذی ضعفه)

اخرجه الترمذی فی ٤/٣٦٧ الحديث رقم ٢١٠٢ والدارمی فی ٢/٤٥٥ الحديث رقم ٢٩٣٢۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے اس دادی' نانی کے بارے میں جس کا بیٹا موجود ہو یہ کہا کہ (میراث دلوائی جانے والی) وہ پہلی دادی' نانی تھی جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بیٹے کی موجودگی میں چھٹا حصہ دیا تھا حالانکہ اس کا بیٹا زندہ تھا''۔ (ترمذی' دارمی) اور امام ترمذی نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے''۔

تشریح: انها : ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''انها اول جدة'' یہ قول کا مقولہ ہے۔ اور ضمیر جدہ کی طرف راجع ہے جو مسئلہ میں مذکور ہے۔ یعنی ابن مسعود نے اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے دادی اور باپ چھوڑا، یہ بات کہی۔ شیخ مظہرؒ فرماتے ہیں کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میت کی دادی کو میت کے باپ کی موجودگی میں چھٹا حصہ دیا۔ حالانکہ باپ کی موجودگی میں دادی میراث سے محروم ہوتی ہے۔

شرح السنہ میں ہے کہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ جدات کیلئے میراث میں کوئی حصہ نہیں ہے، بلکہ وہ روزی ہے، جوان کو دی جاتی ہے، اور اس میں قریب اور بعید برابر ہیں۔

ابن الملکؒ کی شرح میں ہے کہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بطور احسان دیا تھا نہ کہ بطور میراث کے۔ اور ابن مسعودؓ کا مذہب ہے کہ دادی اور نانی کا میراث میں حصہ نہیں ہے، خواہ اس کے ساتھ میت کے زیادہ قریب کا وارث ہو، یا نہ ہو۔ اور سید کی شرح الفرائض میں ہے، کہ دادی، باپ کی وجہ سے محروم ہو جاتی ہے۔ اور یہ حضرت عثمان، علی، اور زید بن ثابتؓ کا قول ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ' ابن مسعود اور ابو موسیٰ اشعری سے نقل کیا گیا ہے، کہ میت کی دادی میت کے باپ کی موجودگی میں بھی وارث ہوتی ہے۔ اور اس کو شریح، حسن اور ابن سیرین نے اختیار کیا ہے۔ بوجہ اس روایت کے جو ابن مسعود نے نقل کی ہے کہ آپ علیہ السلام نے باپ کی موجودگی میں دادی کو میراث میں سے چھٹا حصہ دیا تھا۔ اور اس کی تاویل یہ کی گئی ہے کہ اس میں احتمال ہے کہ اس میت کا باپ غلام یا کافر تھا۔

۳۰۶۳: وَعَنِ الضَّحَاكِ بْنِ سُفْيَانَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم كَتَبَ اِلَيْهِ اَنْ وَرِّثِ امْرَاَةَ اَشْيَمِ الضِّبَابِیِّ مِنْ دِيَةِ زَوْجِهَا (رواه الترمذی وابو داود وقال الترمذی هذا حديث حسن صحيح)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ٣/٣٣٩ الحديث رقم ٢٩٢٧ والترمذی فی السنن ٤/٣٧١ الحديث ٢١١٠ وابن ماجه فی ٢/٨٨٣ الحديث رقم ٢٦٤٢ ومالك فی الموطأ ٢/٨٦٦ الحديث رقم ٩ من كتاب العقول واحمد فی المسند ٣/٤٥٢۔

ترجمہ: ''اور حضرت ضحاک بن سفیانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے نام خط لکھا کہ اشیم ضبابیؓ کی زوجہ کو اس کے خاوند کے خون بہا میں سے میراث دو۔ امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے''۔ (ترمذی' ابوداؤد)

حالاتِ راوی:

مصنف فرماتے ہیں کہا گیا ہے کہ ضحاک بن سفیان اپنی بہادری کی وجہ سے سو شہسواروں کے برابر شمار کیے جاتے تھے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم

کی حفاظت کیلئے تلوار لے کران کے سر پر کھڑے رہتے تھے۔آپ ﷺ نے انہیں ان کی قوم کے مسلمان افراد پر نگران مقرر کیا تھا۔

تشریح: ورث :راءمکسرہ کی تشدید کے ساتھ ہے۔

أشیم :ہمزہ کے فتحہ،شین کے سکون اور یاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔

کتب أن : میں ''أن'' مصدر یہ،یا تفسیر یہ ہے اس لئے کہ کتابت میں ''قول'' کا معنی پایا جاتا ہے۔

شرح السنہ میں لکھا ہے، کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ دیت پہلے تو مقتول کیلئے واجب ہوتی ہے، پھر اس دیت میں حاصل ہونے والا مال مقتول کی دوسری املاک کی طرح اس کے ورثاء کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، چنانچہ اکثر علماء کا یہی قول ہے۔حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ دیت میں سے ماں شریک بھائی،شوہر،اور بیوی کو بالکل کوئی میراث نہیں ملے گی۔

۳۰۶۴:وَعَنْ تَمِيمِ الدَّارِيِّ قَالَ سَأَلْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ مَا السُّنَّةُ فِي الرَّجُلِ مِنْ اَهْلِ الشِّرْكِ يُسْلِمُ عَلٰى يَدَى رَجُلٍ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ فَقَالَ هُوَ اَوْلَى النَّاسِ بِمَحْيَاهُ وَمَمَاتِهِ۔

(رواه الترمذی وابن ماجة والدارمی)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۴۵/۱۲ معلقا فی کتاب الفرائض باب اذا اسلم علی یدبه ابوداؤد فی السنن ۳۳۳/۳ الحدیث رقم ۲۹۱۸ والترمذی فی ۳۷۲/٤ الحدیث رقم ۲۱۱۲ وابن ماجه فی ۹۱۹/۲ الحدیث رقم ۲۷۵۲ والدارمی فی ٤۷۱/۲ الحدیث رقم ۳۰۳۳ واحمد فی المسند ۱۰۳/٤

ترجمہ: ''اور حضرت تمیم داریؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ اس مشرک کے بارے میں کیا حکم ہے جو مسلمانوں میں سے کسی ایک شخص کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوا ہو؟ (یعنی وہ مسلمان اس نو مسلم کا مولی ہوتا ہے یا نہیں؟) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ مسلمان (جس کے ہاتھ پر وہ مشرک اسلام لایا ہے) اس کی زندگی میں اور اس کے مرنے کے بعد اس کا سب سے زیادہ حقدار ہے۔(یعنی وہ مسلمان اس نو مسلم کا مولیٰ ہے)''۔(ترمذی،ابن ماجہ،دارمی)

تشریح: **اولی الناس بمحیاہ ومماتہ** : شیخ مظہر فرماتے ہیں، کہ امام ابوحنیفہ امام شافعیؒ،امام مالک اور ثوری رحمہم اللہ کے نزدیک وہ مولیٰ نہیں بنتا' اور عمر بن عبدالعزیز،سعید بن المسیب اور عمرو بن اللیث کے نزدیک اس حدیث کی بناء پر وہ مولیٰ بن جاتا ہے۔ امام شافعی اور ان کے متبعین کی دلیل آپ علیہ السلام کی یہ حدیث ہے: **الو لاء لمن اعتق**،اور تمیم داری کی حدیث میں احتمال ہے۔کہ یہ ابتداء اسلام کی بات ہو کہ مولیٰ آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوتے تھے اسلام اور نصرت کی وجہ سے۔پھر یہ حکم منسوخ ہو گیا۔اور حدیث کے الفاظ ''وہ سب سے زیادہ حقدار ہے اس کی زندگی میں اور مرنے کے بعد''۔سے مراد اعانت ہو اس کی زندگی میں اور اس پر نماز جنازہ پڑھنا ہے مرنے کے بعد۔لہٰذا یہ حدیث ان کی حجت نہیں بن سکتی۔(انتہٰی)

امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کو امام شافعیؒ کے اتباع میں سے قرار دینا بہت عجیب وغریب ہے۔

۳۰۶۵:وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَجُلًا مَاتَ وَلَمْ يَدَعْ وَارِثًا اِلَّا غُلَامًا كَانَ اَعْتَقَهُ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ هَلْ لَهُ اَحَدٌ قَالُوْا لَا اِلَّا غُلَامٌ لَهُ كَانَ اَعْتَقَهُ فَجَعَلَ النَّبِيُّ ﷺ مِيرَاثَهُ لَهُ . (رواه ابوداود والترمذی وابن ماجة)

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۳۵٤/۳ الحدیث رقم ۲۹۰۵ والترمذی فی ۳۸٦/٤ الحدیث رقم ۲۱۰٦ وابن ماجه فی ۹۱۵/۲ الحدیث رقم ۲۷٤۱ واحمد فی المسند ۲۲۱/۱۔

ترجمہ: ''اور حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص مر گیا جس نے اپنے ایک غلام کے علاوہ کہ جسے وہ آزاد کر چکا تھا اور کوئی وارث نہیں چھوڑا۔چنانچہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ کیا اس کا کوئی وارث ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ سوائے ایک غلام کے جسے وہ آزاد کر چکا تھا کوئی وارث نہیں ہے' البتہ ایک غلام ہے جسے اس نے آزاد کر دیا تھا۔لہٰذا نبی کریم ﷺ نے اس میت کی میراث

اس (کے آزاد کردہ غلام) کو دیدی''۔ (ابوداؤد' ترمذی' ابن ماجہ)

تشریح: الا غلاما : مستثنیٰ منقطع ہے۔

فجعل النبی ﷺ میراثه له : اور یہ میراث دینا اس طرح تھا جیسا کہ اس سے پہلے حضرت عائشہ کی حدیث میں گذرا کہ آنحضرت ﷺ نے ایک لاوارث میت کی میراث کے بارے میں فرمایا کہ اس کی میراث اس کے بستی کے کسی شخص کو دے دو۔ یہ بطور تبرع تھا اس لئے کہ اِس کا مال بیت المال کیلئے ہو گیا تھا۔ شیخ مظہر فرماتے ہیں، کہ شریح اور طاؤس نے کہا ہے کہ جس طرح آزاد کرنے والا اپنے آزاد کردہ غلام کا وارث ہوتا ہے، اسی طرح آزاد شدہ غلام بھی اپنے آزاد کرنے والے کا وارث ہوتا ہے۔

۳۰۶۶: **وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ يَرِثُ الْوَلَاءَ مَنْ يَّرِثُ الْمَالَ .**

(رواه الترمذی وقال هذا حديث اسناده ليس با لقوی)

اخرجه الترمذی فی السنن ٤/٣٧٣ الحديث رقم ٢١١٤۔

ترجمہ: ''اور حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص مال کا وارث ہوتا ہے وہ ولاء کا بھی وارث ہوتا ہے''۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ اس حدیث کی اسناد قوی نہیں ہے''۔

تشریح: الولاء : واؤ کے فتحہ کے ساتھ، مراد آزاد کردہ غلام کا مال ہے۔

یہاں اس وراثت سے مراد عصبہ بنفسہ ہے۔ شیخ مظہرؒ فرماتے ہیں کہ یہ مخصوص ہے یعنی جو عصبہ وارث بنفسہ ہونے کی حیثیت سے میت کے مال کا وارث ہوتا ہے، وہی عصبہ ولاء کا وارث ہوگا۔ اور عورت اگرچہ وارث ہوتی ہے مگر عصبہ نہیں ہوتی۔ عصبہ تو صرف مرد ہی ہوتے ہیں، عورتیں عصبہ نہیں ہوتیں۔ اور ولاء بیت المال کی طرف منتقل نہیں ہوتی، اور نہ ہی عورتیں ولاء کی وارث ہوتی ہیں۔ عورت ایسے آزاد شدہ غلام کے مال کی وارث ہوتی ہے، جسے اس نے خود آزاد کیا ہو، یا اس کو اس کے آزاد کردہ غلام نے آزاد کیا ہو۔

قوله : هذا حديث اسناده ليس بالقوی : اور ایک نسخہ میں 'لیس بقوی'' ہے۔

الفصل الثالث:

۳۰۶۷: **عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَا كَانَ مِنْ مِيْرَاثٍ قُسِمَ فِی الْجَاهِلِيَّةِ فَهُوَ عَلٰى قِسْمَةِ الْجَاهِلِيَّةِ وَمَا كَانَ مِنْ مِيْرَاثٍ اَدْرَكَهُ الْاِ سْلَامُ فَهُوَ عَلٰى قِسْمَةِ الْاِسْلَامِ.** (رواه ابن ماجة)

اخرجه ابن ماجه فی السنن ٢/٩١٨ الحديث رقم ٢٧٤٩۔

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو میراث زمانۂ جاہلیت میں تقسیم کی گئی ہے وہ زمانۂ جاہلیت ہی کی تقسیم کے مطابق رہے گی اور جس میراث نے اسلام کا زمانہ پایا وہ اسلام ہی کی تقسیم کے مطابق ہے''۔ (ابن ماجہ)

تشریح: قسم : تخفیف کے ساتھ ہے۔

۳۰۶۸: **وَعَنْ مُحَمَّدِ بْنِ اَبِیْ بَكْرِ بْنِ حَزْمٍ اَنَّهٗ سَمِعَ اَبَاهُ كَثِيْرًا يَقُوْلُ كَانَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ يَقُوْلُ عَجَبًا لِلْعَمَّةِ تُوْرِثُ وَلَا تَرِثُ.** (رواه مالك)

اخرجه مالك فی المطوطا ٢/٥١٧ الحديث رقم ٩ من كتاب الفرائض۔

ترجمہ: ''اور حضرت محمد بن ابی بکر بن حزمؒ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے والد سے سنا جو اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ پھوپھی کے بارے میں تعجب سے فرمایا کرتے تھے' کہ اس کا بھتیجا تو اس کا وارث بنتا ہے مگر وہ اپنے بھتیجے کی وارث

نہیں بنتی''۔(مالک)

تشریح: قولہ : کان عمر بن الخطاب یقول :عجبا للعمة تورث ولا ترث :

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، حضرت عمر کا یہ تعجب محض عقل وقیاس کی بنیاد پر تھا، ورنہ اگر بجا آوری حکم کے نکتہ نظر سے دیکھا جائے تو اس کی حکمت ومصلحت اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے' تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔

۳۰۶۹:وَعَنْ عُمَرَ قَالَ تَعَلَّمُوْا الْفَرَائِضَ وَزَادَابْنُ مَسْعُوْدٍ وَالطَّلَاقَ وَالْحَجَّ قَالَا فَاِنَّهٗ مِنْ دِيْنِكُمْ ۔

(رواہ الدارمی)

اخرجہ الدارمی فی السنن ۲/ ۴۴۱ الحدیث رقم ۲۸۵۱

ترجمہ:''اور حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: فرائض کے احکام ومسائل سیکھو'۔ نیز حضرت ابن مسعودؓ نے ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے کہ'' طلاق اور حج کے احکام ومسائل (بھی) سیکھو'۔ ان دونوں نے کہا کہ (ان علوم کا سیکھنا اس لئے ضروری ہے کہ) یہ علم تمہارے اہم دینی امور میں سے ہے''۔(دارمی)

تشریح: فانہ : ضمیر''علم'' کی طرف راجع ہے اور ایک نسخہ میں''فانھا'' ہے اس صورت میں ضمیر فرائض، یا مذکورات کی طرف عائد ہے۔

من دینکم : یعنی دین کی ضروریات میں سے ہے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، کہ اس بارے میں یہ روایت بھی ہے :''**تعلموا الفرائض وعلموھا الناس' فانھا نصف العلم**''.اور اس کو نصف علم یا تو کلام میں توسع کی بناء پر کہا گیا ہے۔ یا دونوں حالات یعنی زندگی، اور مرنے کے اعتبار سے کہا ہے۔ واللہ اعلم۔

سید شریف فرماتے ہیں، کہ اسی طرح ہے فقہاء کی روایت، پس فرائض جمع ہے فریضۃ کی۔''فریضہ'' میراث کے مقررہ حصص کو کہتے ہیں۔ اس کو نصف علم قرار دیا ہے' اس لئے کہ یہ انسان کی دو حالتوں میں سے ایک کے ساتھ خاص ہے، اور وہ موت ہے۔ نہ کہ دوسرے دینی علوم کے وہ زندگی کے ساتھ خاص ہیں

یا اس وجہ سے کہ یہ خاص ہے، ملکیت کے دو سببوں میں سے ایک سبب کے ساتھ، یعنی سبب ضروری کے ساتھ نہ کہ اختیاری کے ساتھ جیسے خریدنا، ہدیہ قبول کرنا، وصیت قبول کرنا وغیرہ۔

یا اس کو سیکھنے کی ترغیب کیلئے کہا ہے۔ اسلئے کہ یہ بہت اہم امور کے ساتھ متعلق ہے۔ دارمی اور دار قطنی کی روایت میں ہے:''**تعلموا العلم وعلموہ الناس، تعلموا الفرائض وعلموھا الناس**''.اس روایت کے مطابق فرائض سے مراد وہی مذکورہ یعنی میراث مراد ہے۔ اور یا اللہ کے بندوں پر فرض کردہ احکام ہیں۔ اور اس کا ذکر تعمیم کے بعد خصوصیت کے ساتھ مزید اہتمام کی وجہ سے کیا۔(انتہیٰ)

پہلے احتمال کی تائید حدیث مذکور کے آخر سے ہوتی ہے :''**تعلموا القرآن وعلموا الناس فانی امرء مقبوض، والعلم سیقبض ویظھر الفتن حتی یختلف اثنان فی فریضة لا یجدان احدا یفصل بینھما**''.

اگر کہا جائے کہ اس کی تقدیر یوں کیوں نہیں نکالتے کہ کتاب یعنی قرآن میں مقرر حصص کو سیکھو، اور لوگوں کو سکھاؤ۔ اس لئے کہ علم میراث کا آدھا ہے۔ اس لئے کہ علم میراث کی دو قسمیں ہیں: (۱) ذوی الفروض کا علم: (۲) عصبات کا علم۔ تو اس صورت میں تکلف کی حاجت نہیں ہوگی۔

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں، کہ ایک مانع اس کو جائز قرار نہیں دیتا۔ اور وہ مانع آپ علیہ السلام کا یہ ارشاد ہے: فرائض کو سیکھو، اور لوگوں کو سکھاؤ، اس لئے کہ یہ سب سے پہلے بھلایا جائے گا، تو سب سے پہلے ذوی الفروض کے حصص کو نہیں بھلایا جائے گا، اس لئے کہ اس کا بھولنا موقوف ہے قرآن کے بھلانے پر، اور قرآن کائنات کے ختم ہونے تک باقی رہنے والا ہے۔ تو سب سے پہلے بھلایا جانے والا

قضیہ یہ نہیں ہے، مگر یہ کہا جا سکتا ہے، کہ اس کی معرفت کو بھلا دی جائے گی۔ یا اس پر سب سے پہلے عمل کرنا چھوڑا جائے گا، جیسا کہ ہمارے زمانہ میں اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے۔ اللہ ہی اپنے دین کا محافظ اور مددگار ہے۔

بَابُ الْوَصَایَا

وصیتوں کا بیان

''وصایا'' وصیت کی جمع ہے، اسم ہے مصدر کے معنی میں ہے۔ ازہریؒ فرماتے ہیں، کہ یہ مشتق ہے ''وصیت الشیء'' سے یعنی جب اس کو ملایا جائے۔ اس کا نام وصیت اس لئے رکھا ہے کہ اس میں ملانا ہے، اس چیز کا جو زندگی میں ہو زندگی کے بعد کے ساتھ۔ اور کہا جاتا ہے ''وصی اوصٰی۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں، کہ یہ آیت ان دونوں لغات کے ساتھ پڑھی گئی ہے: ﴿وصی بها ابراهیم لبنیه ویعقوب﴾ [البقرۃ۔۱۳۲] اور کبھی ''وصیت''، بمعنی ''نصیحت''، بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور اسی سے اللہ کا یہ ارشاد ہے: ﴿لقد وصینا الذین أوتوا الکتاب من قبلکم وایاکم أن اتقوا الله﴾ [النساء:۱۳۱]

الفصل الاول:

۳۰۷۰: عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا حَقُّ امْرِءٍ مُسْلِمٍ لَهٗ شَیْءٌ یُوْصٰی فِیْهِ یَبِیْتُ لَیْلَتَیْنِ اِلَّا وَوَصِیَّتُهٗ مَکْتُوْبَةٌ عِنْدَهٗ. (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ۵/۳۵۵ الحدیث رقم ۲۷۳۸ ومسلم فی صحیحه ۳/۱۲۴۹ الحدیث رقم (۱/۱۶۲۷) وابوداوٗد فی ۳/۲۸۲ الحدیث رقم ۲۸۶۲ والترمذی فی السنن ۴/۳۷۵ الحدیث رقم ۲۱۱۸ والنسائی فی ۶/۲۳۸ الحدیث رقم ۳۶۱۵ وابن ماجه فی ۲/۹۰۲ الحدیث رقم ۲۷۰۲ والدارمی فی ۲/۴۹۵ الحدیث رقم ۳۱۷۵ ومالك فی الموطأ ۲/۷۶۱ الحدیث رقم ۱ من کتاب الوصیه واحمد فی المسند ۲/۴

ترجمہ: ''حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس مسلمان مرد کے (مال یا آپسی تعلقات کے) معاملے میں کوئی بات وصیت کے قابل ہو تو اس کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ دو راتیں بھی یوں گزارے کہ اس کے پاس وصیت لکھی ہوئی موجود نہ ہو''۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: **یوصی فیه**: صاد کے فتحہ، اور کسرہ دونوں کے ساتھ ہے۔

یبیت لیلتین: اس میں حذف ہے اور تقدیری عبارت یہ ہے أن یبیت اور یہ اللہ کے اس ارشاد کی طرح ہے: ﴿ومن آیاته یریکم البرق﴾ یعنی ان یریکم۔ اس کو ذکر کیا ہے عسقلانیؒ نے۔

یعنی احتیاط اور موت کے تنبیہ کے پیش نظر اس کو یہ حق نہیں ہے، کہ وہ وصیت لکھنا چھوڑ دے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، کہ ''ما'' بمعنی لیس کے ہے۔ اور یبیت تیسری صفت ہے امرء کے لئے، اور یوصی فیه، شیء کی صفت ہے۔ اور مستثنیٰ، لیس کی خبر ہے، پھر شیخ مظہرؒ کے قول کے مطابق لیلتین کا قید تاکید ہے، نہ کہ تحدید ہے۔

مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کیلئے مناسب نہیں، کہ اس پر کسی بھی حل میں کوئی زمانہ اگرچہ کم کیوں نہ ہو، گزرے مگر یہ کہ وہ اس حال میں رات گزارے کہ اس کی وصیت نامہ اس کے پاس لکھا ہوا ہو۔ اس لئے کہ اس کو کچھ معلوم نہیں کہ موت کب اس کو آئے گی۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، کہ دو راتوں کی تخصیص میں تسامح ہے، مبالغہ کے ارادہ سے یعنی اس کو ایک رات گزارنا بھی درست نہیں ہے،

لیکن ہم نے اتنی مقدار میں چشم پوشی کی ہے، لہٰذا اس سے تجاوز کرنا مناسب نہیں ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں، کہ ایک رات کی تخصیص میں بھی چشم پوشی اور تسامح ہے، اس لئے کہ موت کا تصور تو لمحہ غفلت میں ہو سکتا ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں، کہ اس حدیث میں دلیل ہے، وصیت کے واجب ہونے پر، اور جمہور علماء کے نزدیک وصیت مستحب ہے۔ اور یہی امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک ہے۔ اور اس کا معنی یہ ہے کہ مسلمان کیلئے احتیاط یہ ہے کہ وصیت نامہ اس کے پاس لکھا ہوا ہو، اور اہل ظواہر میں داؤد وغیرہ کہتے ہیں، کہ وصیت واجب ہے، اس حدیث کے بنیاد پر۔ اور اس میں وجوب پر کسی قسم کی دلیل نہیں ہے۔ لیکن اگر انسان پر قرض ہو، یا اس کے پاس کسی کا امانت ہو، تو اس کی وصیت اس پر لازم ہے، اور جلد سے جلد وصیت لکھنا مستحب ہے، نیز یہ ضروری ہے کہ وصیت نامہ لکھ کر اس پر کسی گواہ بنالے، پھر اگر کوئی نیا امر پیش آجائے، اور اس کی وصیت کی ضرورت ہو، تو یہ بھی اس کے ساتھ ملا دے۔ اور یہ جو ہم نے کہا کہ اس پر گواہ بنالے، اس لئے کہ بغیر گواہی کے وصیت کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں، کہ بعض حضرات نے حدیث کے ظاہری مفہوم کی وجہ سے وصیت کو واجب کہا ہے۔ اور جمہور کے نزدیک مستحب ہے۔ اس لئے کہ آپ علیہ السلام نے اس کو مسلمان کیلئے حق اور لازم کیا ہے، نہ کہ اس پر لازم کیا ہے۔ اگر وصیت واجب ہوتی تو پھر لہ کی جگہ علیہ فرماتے، اور لفظ جس پر دلالت کر رہا ہے، وہ اس کے برخلاف ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں، کہ یہ مستحب وصیت کے بارے میں ہے، باقی قرض، اور امانت کے واپس کرنے جو اس پر لازم ہے، تو اس کی وصیت واجب ہے۔ پھر ظاہر حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے، کہ صرف لکھنا بغیر گواہی کے کافی ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے بلکہ اکثر علماء کے ہاں دو گواہ بنانا ضروری ہے۔ اس لئے کہ غیر کا حق اس کے ساتھ متعلق ہے، تو اس کے ازالہ کیلئے حضت شرعی کا ہونا ضروری ہے، اور یہ بھی کافی نہیں ہے کہ ان کو لکھے ہوئے پر گواہ بنا دے ان کو وصیت پر مطلع کرنے کے بغیر۔ (انتہیٰ)

اور یہ حدیث اس وصیت کے بارے میں جو کسی نے از راہ تبرع کیا ہو۔ اور اس کی تائید شيء يوصي فيه سے ہوتی ہے۔ کہ یہاں عليه شيء نہیں کہا۔ اور ایک روایت میں ہے له شيء يرير أن يوصي فيه.

تخریج: اس کو روایت کیا ہے مالک، احمد اور ابن ماجہ نے۔

سیوطیؒ کی شرح صدور میں ہے کہ ابن عساکرؒ نے زید بن الم، عن ابیہ کے طریق سے یہ روایات کی ہے۔ زید بن اسلم فرماتے ہیں، کہ مجھے وہ روایت یاد آگئی جو ابن عمر رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے، کہ "**ما حق امرء مسلم يبيت ثلاث ليال الا ء وصيته لكتوبة عند راسه**"۔ پس میں نے دواۃ اور کاغذ منگوایا، تاکہ میں اپنی وصیت لکھ لوں، اور مجھ پر نیند کا غلبہ تھا، پس میں سو گیا اور وصیت نامہ نہیں لکھا۔ پس اس دوران کہ میں سویا ہوا تھا، اچانک ایک سفید لباس والا خوبصورت چہرے والا جس سے بہترین خوشبو آرہی تھی، داخل ہوا، پس میں ن کہا کہ یہ کیا ہے؟ آپ کو کس نے یہاں آنے دیا؟ وہ کہنے لگا مجھے اس گھر کے مالک نے یہاں آنے کی اجازت دی ہے، میں نے کہا تم کون ہو؟ اس نے کہا، میں موت کا فرشتہ ہوں۔ پس میں اس سے خوف زدہ ہوا، وہ کہنے لگا کہ آپ مت ڈرے، مجھے آپ کے روح قبضہ کرنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ پس میں نے کہا کہ آپ میرے لئے آگ سے براءت لکھ دے۔ اس نے کہا کہ دواۃ اور کاغذ لے آؤ۔ پس میں نے ہاتھ بڑھایا اس دواۃ اور کاغذ کی طرف جس پر میں سویا تھا، اور وہ میرے سرہانے کے پاس تھے۔ پس میں نے وہ اس کو پکڑا دیئے، تو اس نے لکھا "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، استغفر اللہ، استغفر اللہ"۔ یہاں تک کہ کاغذ کو دونوں طرف بھر دیا، پھر مجھے پکڑا دیا، اور کہا یہ تیری براءت ہے، اللہ تجھ پر رحم کرے۔ تو میں خوف کے حالت میں بیدار ہو، اور چراغ کو منگوایا، پس جب میں نے اس کاغذ کو دیکھا جو میرے سوتے وقت میرے سر کے پاس رکھا ہوا تھا، تو اس میں دونوں طرف سے لکھا ہوا تھا استغفر اللہ۔ (انتہیٰ)

شاید اس میں اشارہ تھا اس حدیث کی طرف جس میں منقول ہے، کہ جس کو یہ پسند ہو کہ اس کا نامہ اعمال اس کو خوش کرے تو وہ کثرت سے استغفار کرے۔ اس کو روایت کیا ہے طبرانی نے اوسط میں زبیر ابن عوام سے مرفوع۔

۳۰۷۱: وَعَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ قَالَ مَرِضْتُ عَامَ الْفَتْحِ مَرَضًا اَشْفَيْتُ عَلَى الْمَوْتِ فَاَتَانِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَعُوْدُنِیْ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ لِیْ مَالاً كَثِيْرًا وَلَيْسَ يَرِثُنِیْ اِلاَّ ابْنَتِیْ اَفَاُوْصِیْ بِمَالِیْ كُلِّهٖ قَالَ لاَ قُلْتُ فَثُلُثَیْ مَالِیْ قَالَ لاَ قُلْتُ فَالشَّطْرُ قَالَ لاَ قُلْتُ فَالثُّلُثَ قَالَ الثُّلُثُ وَالثُّلُثُ كَثِيْرًا اِنَّكَ اَنْ تَذَرَ وَرَثَتَكَ اَغْنِيَاءَ خَيْرٌ مِنْ اَنْ تَذَرَهُمْ عَالَةً يَتَكَفَّفُوْنَ النَّاسَ وَاِنَّكَ لَنْ تُنْفِقَ نَفَقَةً تَبْتَغِیْ بِهَا وَجْهَ اللّٰهِ اِلاَّ اُجِرْتَ بِهَا حَتّٰى اللُّقْمَةَ تَرْفَعُهَا اِلٰى فِیِّ امْرَاَتِكَ. (متفق علیه)

اخرجه البخاری فی صحیحه ٥/٣٦٣ الحدیث رقم ٢٧٤٢ومسلم فی صحیحه ١٢٥٠/٣ الحدیث رقم ١٦٢٨/٥ والترمذی فی ٣٧٤/٤ الحدیث رقم ٢١١٦ والنسائی ٢٤١/٦ الحدیث رقم ٣٦٢٦وابن ماجه فی ٩٠٣/٢ الحدیث رقم ٢٧٠٨۔

ترجمہ: ''اور سعد بن ابی وقاصؓ کہتے ہیں کہ میں فتح مکہ کے سال اتنا شدید بیمار ہوا یہاں تک کہ میں موت کے کنارہ پر پہنچ گیا' چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ میری عیادت کے لئے میرے پاس تشریف لائے تو میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میرے پاس بہت مال ہے' اور ایک بیٹی کے سوا میرا کوئی وارث نہیں ہے تو کیا میں اپنے سارے مال کے بارے میں وصیت کر جاؤں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''نہیں''۔ میں نے عرض کیا کہ ''کیا دو تہائی مال کے بارے میں وصیت کر جاؤں؟''۔ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ نصف مال کی؟ فرمایا: نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ ایک تہائی مال کی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! تہائی مال کے بارے میں وصیت کر سکتے ہو اگرچہ تہائی مال بھی بہت ہے اور یاد رکھو! اگر تم اپنے ورثاء کو مال دار اور خوش حال چھوڑ جاؤ گے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ تم ان کو مفلس و تنگدست چھوڑ جاؤ اور وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتے پھریں' (جان لو) تم اپنے مال کا جو بھی حصہ اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے لئے خرچ کرو گے تو تمہیں اس کا اجر و ثواب دیا جائے گا' یہاں تک کہ تمہیں اس لقمہ کا بھی ثواب دیا جائے گا جو تم اپنی بیوی کے منہ تک لے آتے ہو''۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: **عام الفتح** : میرک شاہؒ کے نسخہ کے حاشیہ میں ہے کہ صحیح عام حجۃ الوداع ہے۔

اشفیت : کہا جاتا ہے: **اشفٰی علی کذا**، یعنی اس کے قریب ہوا، اور اس کے کنارے پر وہا۔ اور اس کا استعمال صرف شر کے امور میں ہوتا ہے۔

کثیر : حاضر تمام نسخوں میں ''ثاء'' کے ساتھ ہے۔ علامہ سیوطی فرماتے ہیں، کہ اس کو ثاء اور باء دونوں کے ساتھ روایت کیا گیا ہے۔ اور وہ دونوں روایت صحیح ہے۔

أفاوصی: تخفیف اور تشدید دونوں کے ساتھ ہے۔ **أن تذر** :ہمزہ اور راء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ اور ایک صحیح نسخہ میں ہمزہ کے کسرہ اور راء کے سکون کے ساتھ ہے۔ ان تترك کے معنی میں ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ **أن تذر**، ہمزہ کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ دونوں روایات صحیح ہیں۔ (**اجعوت بها** :صیغہ مجہول کے ساتھ ہے۔

یعودنی : رسول اللہ سے حال ہے۔

فالشطر : جر کے ساتھ ہے۔ اور ایک نسخہ میں بالنصف ہے۔ اور ایک دوسرے نسخہ میں رفع کے ساتھ ہے۔ ابن الملکؒ فرماتے ہیں، کہ نصب کے ساتھ جائز ہے، اور اس کا عطف ہوگا جار، مجرور پر اور رفع بھی جائز ہے۔ اور تقدیر یہ ہوگی: ''**فالشطر کاف**'' اور جر کے ساتھ عطف ہوگا، باء کے مجرور پر۔

فالثلث : جر کے ساتھ ہے اور نصب اور رفع بھی جائز ہے، گزرے ہوئے تفصیل کے مطابق۔

قال الثلث : نصب کے ساتھ ہے، اور ایک صحیح نسخہ میں رفع کے ساتھ ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں، کہ ثلث اول میں نصب اور رفع دونوں جائز ہے۔ پس نصب اغراء کی وجہ سے ہوگا۔ یا فعل محذوف کی وجہ سے ہوگا۔ تقدیر یہ ہوگی: اعط الثلث. اور رفع فاعل ہونے کی وجہ سے ہوگا، تقدیر یوں ہوگی یکفیك الثلث. یا اس وجہ سے کہ یہ مبتدا ہے، اور خبر محذوف ہے یا اس کا عکس ہے۔

و الثلث : یہ صرف رفع کے ساتھ ہے نہ کہ اس کے غیر کے ساتھ۔ اور یہ مبتدا ہے اور خبر اس کی "**کثیر**" ہے۔ **أن تذر** : یہ جملہ پورا خبر ہے انك کے لئے۔ اور فائق میں ہے کہ أن تذر محلا مرفوع ہے۔ مبتدا ہونے کی وجہ سے۔ یعنی تقدیر یوں ہوگی **ترکك اولادك اغنیاء خیر**. اور پھر یہ پورا جملہ انك کے لئے خبر ہے۔ اشرفؒ کہتے ہیں، "ان" کو صرف شرط بنانا درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس صورت شرط بلا جزاء ہوگی۔ اس لئے کہ "خیر" کو اس کے لئے جزاء بنانا جائز نہیں ہے۔ اور اس زمانہ کے لوگ اس میں اکثر تصحیف کرتے ہیں۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ جب یہ روایت صحیح ہو، تو پھر اس قول کی طرف توجہ نہیں کی جائے گی کہ جملہ اسمیہ سے فاء کا حذف کرنا جائز نہیں ہے۔ بلکہ یہ روایت حذف فاء پر دلیل ہوگی۔ پھر ایک زمانہ کے بعد میں نے امام ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ بن مالک الطائی سے یہ نقل کیا ہوا پایا: کتاب: "**شواهد التوضیح و التصحیح لمشکالت جامع الصحیح**" میں۔ کہ انہوں نے حدیث میں اس کو شرط لایا ہے، اور کہا ہے کہ یہ اصل میں **ان ترکت ورثتك اغنیاء فهو خیر**، ہے۔ تو فاء اور مبتدا کو حذف کیا گیا ہے۔ اور اس کی نظیر آپ علیہ السلام کا یہ قول ہے ابی بن کعب سے "**فان جاء صاحبها و لا استمتع بها**". اور آپ ﷺ کا قول ہلال بن امیہ سے "**البنیة و الاحد فی ظهرك**". اور اس کے بارے میں حویوں کا گمان ہے، کہ یہ ضرورت کے ساتھ مخصوص ہے۔ حالانکہ یہ ضرورت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ اس کا استعمال شعر میں زیادہ ہے، اور اس کے علاوہ میں کم ہے۔ اور جس نے اس حذف کو خاص کیا ہے، شعر کے ساتھ۔ اس نے تحقیق سے دشمنی کی ہے۔ اور بے جا تنگی کی ہے۔ **نفقه** :مفعول بہ ہے، یا مفعول مطلق ہے۔

حتی اللقمة : نصب کے ساتھ ہے، اور ایک نسخہ میں جر کے ساتھ ہے۔ اور رفع کے ساتھ بھی حکایت کیا گیا ہے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، انك لن تنفق کا عطف ہے۔ وانك ان تذر پر۔

ولیس یرثنی : یعنی ذوی الفروض میں سے۔ **الا ابنتی** :اس لئے کہ ان عصبہ بہت سارے تھے، اس کو مظہرؒ نیز کر کیا ہے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس تاویل کی تائید ورثتك سے بھی ہوتی ہے۔ اور بیٹی کے ذکر کو خاص شاید اس کے عجز اور کمزور کے بناء پر کیا ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ میرا ایسا کوئی وارث نہیں جس پر مجھے خوف ہو، سوائے ایک بیٹی کے۔

و الثلث کثیر :ابن الملکؒ فرماتے ہیں، کہ اس میں اس بات کا بیان ہے کہ تہائی کا وصیت کرنا جائز ہے، اور اس سے کم کا کرنا بہتر ہے۔

انك ان تذر ورثتك اغنیاء :یعنی لوگوں سے مستغنی ہوں۔

خیر من ان تذرهم عالة یتکففون الناس :یعنی ان سے مانگے ہاتھ پھیلا کر۔ اس میں اشارہ ہے کہ اس کے ورثاء مفلس اور فقیر تھے۔ اور وہ صدقہ کے زیادہ لائق تھے دوسروں سے۔

حتی اللقمة ترتعها الی فی امرأتك : اور ایک روایت میں ہے **حتی ما تجعل فی فی امرأتك**. مطلب یہ ہے کہ اللہ کے رضا مندی کے لئے خرچ کرنے والے کو اجر دیا جاتا ہے۔ اگر چہ خرچ کرنے کا محل خواہشات کا پورا کرنا اور طبیعت کی خوشی ہو، اس لئے کہ اعمال کا دارومدار نیت پر ہے، اور مؤمن کا نیت اس کے کام کرنے سے بہتر ہے۔

اور **انك ان تذر** اور **انك من تفق**، یہ علت ہے ایک تہائی سے زیادہ وصیت کی ممانعت کی۔ گویا کہ کہا گیا کہ آپ ایسا نہ کریں اس لئے کہ اگر آپ مر جائیں اور اپنے ورثاء کو مالدار چھوڑ جاؤ یہ بہتر ہے اس سے کہ ان کو مفلس چھوڑ جاؤ۔ اور اگر آپ زندہ رہے اور جو ثلث یعنی تہائی میں سے باقی ہے وہ صدقہ کر دیں اور اپنے اہل وعیال پر خرچ کریں، تو یہ تیرے لئے بہتر ہوگا۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ اس سے معلوم ہوا کہ مریض کا اپنے درد جو وہ محسوس کر رہا ہو، اس کا ذکر کسی کے سامنے جائز ہے،

صحیح غرض کی وجہ سے، یعنی دواء، دعاء یا وصیت وغیرہ میں سے۔ اور یہ مکروہ اور ناپسندیدہ ہے۔ جب بطور ناراضگی کے ہو۔ اس لئے کہ اس سے مریض کے اجر میں کمی آجاتی ہے۔ (انتہی)

اور اس میں یہ ہے کہ حدیث میں صرف یہ بات بیان کی ہے کہ وہ بیمار ہوئے خطرناک مرض کے ساتھ۔ اور کہا ہے کہ یہ حدیث جہاں اس بات کی دلیل ہے کہ مال جمع کرنا مباح ہے وہیں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ وارثوں کے حق میں عدل وانصاف کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔

تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جس میت کے وارث موجود ہوں تو اس کی وصیت اس کے تہائی مال سے زائد جاری نہیں ہوتی۔ البتہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور اس کے متبعین اس کو جائز قرار دیتے ہیں، اور اسحٰق اور احمد کا بھی ایک ہی ہے۔

اس حدیث میں اس بات کی ترغیب دلائی گئی ہے کہ رشتہ داروں اور عزیزوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ اور ورثاء کے ساتھ شفقت کا معاملہ کیا جائے۔ اس لئے کہ رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک اور ان کے ساتھ احسان کرنا زیادہ افضل ہے غیروں سے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خیر کے کاموں میں خرچ کرنا مستحب ہے، اور یہ کہ آدمی کو اس کے عمل کا ثواب نیت پر ملتا ہے۔

اور اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنے سے ثواب ملتا ہے بشرطیکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے پیش نظر ہو۔ اور مباح چیز میں جب اللہ کی رضا کا ارادہ کیا جائے، تو وہ طاعت بن جاتی ہے، چنانچہ بیوی اگر چہ جسمانی ودنیاوی لذت وراحت کا ذریعہ ہے اور خوش اور مسرت کے وقت اس کے منہ میں نوالہ دینا محض ایک خوش طبعی ہے، جس کا عبادت وطاعت اور امور آخرت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود آنحضرت ﷺ نے یہ بتایا کہ اگر بیوی کے منہ میں نوالہ دینے میں اللہ تعالیٰ کی رضاء وخوشنودی کی طلب کی نیت ہو، تو اس میں ثواب ملتا ہے۔ لہٰذا اس کے علاوہ دوسری حالتوں میں بطریق اولیٰ ثواب ملے گا۔ (انتہی)

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں، کہ نووی کا یہ کہنا کہ اس کا طاعت اور امور آخرت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، اس میں تسامح ہے، اور شاید انہوں نے طاعت سے عبادت مراد لی ہو، ورنہ طاعت جو بمقابلہ معصیت کے ہے اس کا یہاں لانا درست نہیں ہے۔ جیسا کہ یہ مخفی نہیں ہے۔

تخریج: اس کو مالک، احمد، اور کتب اربعہ نے بھی روایت کیا ہے۔

الفصل الثانی:

۳۰۷۲: عَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ قَالَ عَادَنِی رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ وَاَنَا مَرِیْضٌ فَقَالَ اَوْصَیْتَ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ بِکَمْ قُلْتُ بِمَالِیْ کُلِّہٖ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ قَالَ فَمَا تَرَکْتَ لِوَلَدِکَ قُلْتُ ھُمْ اَغْنِیَاءُ بِخَیْرٍ فَقَالَ اَوْصِ بِالْعُشْرِ فَمَا زِلْتُ اُنَاقِصُہٗ حَتّٰی قَالَ اَوْصِیْ بِالثُّلُثِ وَالثُّلُثُ کَثِیْرٌ. (رواہ الترمذی)

اخرجه الترمذی فی السنن ۳/۳۰۵ الحدیث رقم ۹۷۵ والنسائی فی السنن ۶/۲۴۳ الحدیث رقم ۳۶۳۱

ترجمہ: ''حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کہتے ہیں کہ جب میں بیمار تھا تو خود رسول اللہ ﷺ میری عیادت کی' چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا تم نے وصیت کرنے کا ارادہ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: کتنے مال کی وصیت کا تم نے ارادہ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ''میں نے تو اللہ کی راہ میں اپنے سارے مال کی وصیت کرنے کا ارادہ کیا ہے''۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اولاد کے لئے کیا چھوڑا ہے؟ میں نے عرض کیا وہ خود مالدار خوشحال ہیں''۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''(اگر وصیت کرنا ہی چاہتے ہو تو) اپنے مال کے دسویں حصہ کی وصیت کردو''۔ (حضرت سعدؓ کہتے ہیں کہ جب میں آپ ﷺ کی بتائی ہوئی اس مقدار کو) میں اس مقدار کو اصرار کر کے بار بار کم کہتا رہا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اچھا تہائی مال کے بارے میں وصیت کردو اگر چہ یہ تہائی بھی بہت ہے''۔ (ترمذی)

تشریح: عادنی: بمعنی زادنی کے ہے اور اس میں تجرید ہے انا مریض کی وجہ سے۔

لولدك : واؤ اور لام دونوں کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ اور ایک نسخہ میں واؤ کے ضمہ اور لام کے سکون کے ساتھ ہے۔ اور اس میں دلیل ہے کہ ولد کا اطلاق بنت یعنی بیٹی پر بھی ہوتا ہے، جیسا کہ پہلے گزرا۔

بالعشر : عین کے ضمہ اور شین کے سکون کے ساتھ ہے۔

أنا قصه : صاد کے ساتھ ہے، اور ایک نسخہ میں ضاد کے ساتھ ہے۔ (بخیر : خیر سے مراد مال ہے۔

وانا مریض : یہ حال ہے۔ (بخیر : یہ خبر ثانی ہے یا صفت ہے تقدیر یوں ہے ملتبسون بخیر.

فام ترکت لولدك قلت هم : اس میں تغلیب ہے عصبہ کو بنت یعنی بیٹی پر۔

اغنیاء : یعنی مجموعی طور پر نہ کہ سب کے سب تو یہ گزرے ہوئے کا منافی نہیں ہے۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں، کہ حضرت سعد نے فرمایا، کہ فما زلت انا قض النبی۔ یہ مناقضہ سے ہے۔ یعنی ایک دوسرے کے بات کو توڑنا، یعنی آپ علیہ السلام میری بات کو توڑ رہے تھے، کہ میں بار بار رجوع کرتا تھا۔ زیادہ مال کی وصیت کرنے کے حرص کے بناء پر، اور اس کو صاد کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے، تو پھر یہ قصان سے ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، یعنی میں بار بار آپ ﷺ سے کمی کے بارے میں رجوع کرتا رہا، یعنی جس مقدار کا آپ ﷺ نے ذکر کیا تھا اس کو میں کم سمجھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ نے فرمایا: کہ ای تہائی کی وصیت کرلو۔ اور اگر اس کو ضاد کے ساتھ روایت کیا جائے، تو پھر مناقضہ سے ہوگا۔ نہایہ میں ہے کہ نفلی روزے کے بارے میں ہے، فناقجی و ناقضیته۔ یعنی وہ میری بات کو توڑ رہا تھا، اور میں اس کی بات کو توڑ رہا تھا۔ نقض البناء سے ہے یعنی عمارت کو توڑنا۔ مراد اس سے رجوع کرنا، اور لوٹنا ہے۔

پہلے گزرا ہے، جن نے ترمذیؒ کی موافقت کی ہے اصحاب سنن میں سے، اور ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ "ان الله یصدق علیکم عند وفاتکم بثلث اموالکم زیادة لکم فی اعمالکم".

۳۰۷۳: وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ فِیْ خُطْبَتِهٖ عَامَ حَجَّةِ الْوَدَاعِ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَعْطٰی کُلَّ ذِیْ حَقٍّ حَقَّهٗ فَلَا وَصِیَّةَ لِوَارِثٍ (رواہ ابوداود وابن ماحة وزاد الترذی) **وَالْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وَلِلْعَاهِرِ حَجَرٌ وَحِسَابُهُمْ عَلَی اللّٰهِ۔**

اخرجه ابوداؤد فی السنن ۳/۲۹۰ الحدیث رقم ۲۸۷۰ والترمذی فی ٤/۳۷٦ الحدیث رقم ۲۱۲۰ وابن ماجه فی ۲/۹۰۵ الحدیث رقم ۲۷۱۳ و اخرجه احمد فی المسند ٥/۲٦۷

ترجمہ: "اور حضرت ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو حجۃ الوداع کے سال اپنے خطبہ میں یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ "اللہ تعالیٰ نے ہر حقدار کو اس کا حق دے دیا ہے۔ لہٰذا وارث کے لئے وصیت نہیں ہے"۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ) اور امام ترمذی نے یہ مزید نقل کیا ہے کہ بچہ صاحب فراش (یعنی بیوی کے مالک) کا ہے اور زنا کرنے والے کے لئے (بطور سزا کے) پتھر ہے نیز ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے اور امام ترمذی نے یہ مزید نقل کیا ہے کہ بچہ صاحب فراش کے لئے ہے اور زنا کرنے والے کے لئے پتھر ہے نیز ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔

تشریح: الوداع : واؤ کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ ہے۔

للفراش : فاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ ماں کو کہتے ہیں۔ نہایہ میں ہے کہ عورت کو فراش کہا جاتا ہے۔ اسلئے کہ مرد اس کو بچھونا بناتا ہے۔

ان الله قد اعطی کل ذی حق حقه : یعنی اس کا وہ حصہ جو اس کیلئے مقرر کیا ہے وہ بیان کر دیا ہے۔

فلا وصیة لوارث : شیخ مظہرؒ فرماتے ہیں کہ آیت میراث کے نزول سے قبل اقرباء کیلئے وصیت واجب تھی، جب آیت میراث نازل ہوگئی، تو وصیت منسوخ ہوگئی۔ پس اگر کسی نے وصیت کی اور دیگر ورثاء نے اس کو جائز قرار دیا تو یہ وصیت صحیح ہوجائے گی۔

الولد للفراش: یعنی بچہ صاحب فراش کی طرف منسوب ہوتا ہے، خواہ وہ عورت کا خاوند ہو یا لونڈی کا آقاء ہو، یا وہ شخص جس نے شبہ میں مبتلا ہو کر عورت سے صحبت کر لی تھی اور زانی کا اس کے نسب میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کیلئے اس کے فعل کے استحقاق میں حد مقرر کیا گیا ہے۔ اور وہ یہ قول ہے "**وللعاهر الحجر**"۔

تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، کہ اس سے مراد محرومی ہے۔ جیسے کہ عام بول چال میں جس کو کچھ نہیں ملتا، کہہ دیا کرتے ہیں، کہ اس کو خاک پتھر ملے گا، اور جن نے اس سے مراد سنگسار کرنا لیا ہے، تو اس نے غلطی کی ہے، اس لئے کہ سنگسار کرنا ہر زانی پر جاری نہیں ہوتا۔ اور **كل ذى حق حقه**، دلالت کرتا ہے، کہ جب اللہ پاک نے حصے بیان کر دیئے تو اس کے بعد میت کے مال میں کسی کا حصہ لازم نہیں ہے، سوائے اس اجنبی کے جس کے حق میں وصیت کی جائے۔ اس لئے کہ لوگ دو قسم پر ہے ایک وہ جو میت کی طرف منسوب ہوتے ہیں، دوم وہ جو اس کی طرف منسوب نہیں ہوتے۔ اور جو منسوب ہوتے ہیں، یا تو وہ حقیقتاً ہوتے ہیں یا صرف نسبت کا دعویٰ ہوتا ہے۔ تو اول کیلئے کوئی حصہ نہیں ہے تو دوسرے کیلئے کیا ہوگا۔ اور ظاہر میں تو اس طرح کہنا چاہئے تھا۔ کہ **لا حق للعاهر ثم له التراب**، لیکن یہاں ثواب یعنی مٹی کی جگہ حجر کو رکھا تا کہ یہ اشارۃ النص کے طور پر حد پر دلالت کرے اور عبارۃ النص کے طور پر محرومی پر دلالت کرے، تو یہ زیادہ جامع ہے، اس سے کہ اگر کہتے **له التراب**.

وحسابهم على الله: شیخ مظہر فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم تو زنا کرنے والوں پر حد قائم کرتے ہیں، اور ان کا حساب اللہ پر ہے چاہے تو آخرت میں ان کو معاف فرما دے اور چاہے تو ان کو سزا دے۔ یہ حدیث کا مفہوم ہے۔ اور منقول ہے کہ جس پر دنیا میں حد قائم کی گئی تو اس گناہ کی وجہ سے قیامت میں اس کو عذاب نہیں دیا جائے گا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ بہت زیادہ کریم ہے اس بات سے کہ وہ دوبارہ سزا دے اس شخص کو جس پر حد قائم کی گئی ہے۔ اور اس کے مطلب میں یہ بھی احتمال ہے کہ جو شخص زنا کرے یا کسی اور گناہ میں مبتلا ہو۔ اور اس پر حد قائم نہ ہو یعنی دنیا میں اسے کوئی سزا نہ دیجائے۔ تو اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے چاہے تو اسے بخش دے اور چاہے تو عذاب میں مبتلا کرے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں، کہ ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ ہم تو ظاہر پر شریعت کے احکام جاری کرتے ہیں، اور دل کے باتوں کو جاننے والا اللہ تعالیٰ ہے، تو ان کا حساب اللہ پر ہے، اور ان کا جزاء اللہ کے ہاں ہے۔ یا ان کا باقی محاسبہ اور بدلہ اس گناہ پر اصرار کرنے اور باقی تمام گناہوں کے ارتکاب کا اللہ کے مشیت کے تحت ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، کہ **حسابهم** کی ضمیر جب **عاهر** کی طرف لوٹائی جائے جنس کے اعتبار سے تو درست ہے۔ جب حجر سے مراد حد ہو۔ اور جب حجر سے مراد صرف محرومی ہو تو پھر جائز نہیں اور ممکن ہے کہ کہا جائے کہ یہ ضمیر راجع ہے ورثاء اور عاهر کی طرف جو حدیث سے مفہوم ہو رہے ہیں۔ اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے خود ورثاء کے حصے تقسیم کئے ہیں۔ پس ہم میں سے بعض کو زیادہ حصہ دیا ہے اور بعض کو کم، اور بعض کو حاجب بنایا ہے اور بعض کو محروم کر دیاہ۔ اور اسکا حساب اور حکمت اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ پس تم نص کو نصب کو تبدیل نہ کرو۔ وارث اور زانی کیلئے وصیت کرنے کے ساتھ تو اس مطلب کے مطابق **وحسابهم على الله** حال ہوگا۔ اعطٰی کے مفعول سے اور پہلے مطلب کے مطابق **وللعاهر الحجر** میں خبر میں ضمیر مستتر سے حال ہوگا۔

اور سیوطی کی الجامع الصغیر میں ہے "**الولد للفراش، وللعاهر الحجر**"۔ اس کو روایت کیا ہے شیخین نے اور ابوداؤد اور نسائی نے ابن مسعود اور ابن زبیر سے۔ اور ابن ماجہ نے حضرت عمر سے، اور ابوامامہ رحمہ اللہ سے، اور اس حدیث کو متواتر میں سے شمار کیا گیا ہے۔

۳۰۷۴: وَيُرْوٰى عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ الْوَارِثَةُ مُنْقَطِعٌ هٰذَا لَفظُ الْمَصَابِيحِ وَفِىْ رِوَايَةِ الدَّارَقُطْنِيِّ قَالَ لَا تَجُوْزُ وَصِيَّةٌ لِوَارِثٍ اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ الْوَرَثَةُ۔

اخرجه الدار قطنى فى السنن ٤/٣٧ الحديث رقم ٨٩ (٢) الجامع الصغير ٢/٥٧٦ الحديث رقم ٩٩٣٣۔

ترجمہ: اور حضرت ابن عباسؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ نقل کیا ہے کہ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) ''وارث کے لئے وصیت جائز نہیں ہے مگر جب کہ ورثاء چاہیں'' یہ حدیث منقطع ہے اور یہ مصابیح کے الفاظ ہیں'' اور دارقطنی کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) ''وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں ہوتی مگر جب کہ ورثاء چاہیں''۔

تشریح: ان یشاء : فعل مذکر اور مؤنث دونوں کے ساتھ ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں، کہ منقطع اس کو کہتے ہیں، کہ جس سند میں تابعی تک پہنچ سے پہلے ایسا راوی ہو جس نے اوپر والے سے حدیث نہ سنی ہو۔ اور ان کے درمیان میں ساقط راوی مذکور نہ ہو، اور اس میں وہ سند بھی داخل ہے جس میں بعض راویوں کو بینهم لفظ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ جیسے رجل، شیخ وغیرہ۔ (انتہیٰ)۔ اس لئے کہ مجہول معدوم کے حکم میں ہوتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

هذا : یعنی یہ جو حدیث کے الفاظ ذکر ہوئے۔

لا یجوز : یاء اور تاء دونوں کے ساتھ ہے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں، کہ دارقطنی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ بھی روایت کیا ہے ''لا وصية لوارث''۔ جیسا کہ الجامع الصغیر میں ہے۔

۳۰۷۵: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اِنَّ الرَّجُلَ لَيَعْمَلُ وَالْمَرْأَةُ بِطَاعَةِ اللّٰهِ سِتِّيْنَ سَنَةً ثُمَّ يَحْضُرُهُمَا الْمَوْتُ فَيُضَارَّانِ فِي الْوَصِيَّةِ فَتَجِبُ لَهُمَا النَّارُ ثُمَّ قَرَأَ اَبُوْ هُرَيْرَةَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَا اَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَارٍّ اِلٰى قَوْلِهٖ تَعَالٰى وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ. (رواه احمد والترمذی وابوداود وابن ماجة)

اخرجه ابو داؤد فی السنن ۲۸۸/۳ الحدیث رقم ۲۸۶۷ والترمذی فی ۳۷۵/٤ الحدیث رقم ۲۱۱۷ وابن ماجه فی ۹۰۲/۲ الحدیث رقم ۲۷۰٤

ترجمہ: ''اور حضرت ابوہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک مرد اور عورت ساٹھ برس تک اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں نیک عمل کرتے ہیں اور جب ان کی موت کا وقت قریب آتا ہے تو وہ دونوں وصیت کے ذریعہ (وارثوں کو) نقصان پہنچاتے ہیں۔ لہٰذا ان دونوں کے لئے دوزخ واجب ہو جاتی ہے''۔ اس کے بعد حضرت ابوہریرہؓ نے اس آیت کریمہ کی تلاوت فرمائی: وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَا اَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَارٍّ۔ یعنی وراثت کی تقسیم وصیت کے نافذ ہو جانے اور قرض کی ادائیگی کے بعد ہے بشرطیکہ وہ وصیت (یعنی وصیت کرنے والا) کسی کو نقصان پہنچانے والی نہ ہو۔'' حضرت ابوہریرہؓ نے یہ آیت ارشاد ربانی وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (اور یہ بڑی کامیابی ہے) تک تلاوت فرمائی''۔ (ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: والمرأة : نصب کے ساتھ ہے إنّ کے اسم پر عطف ہے۔ اور معطوف کی خبر محذوف ہے جس پر معطوف علیہ کی خبر دلالت کر رہی ہے۔ اور اس میں بھی رفع جائز ہے اور خبر اس کی کذلك ہے۔ اور ''بطاعة الله'' میں تنازع ہے۔ فعل مذکور اور محذوف کا۔

غیر مفار : 'غیر' حال ہے۔ یوصٰی کے اعل سے اور ایک صحیح نسخہ میں ہے کہ یوصٰی صیغہ مجہول کے ساتھ ہے اور یہ قراءۃ متواترہ ہے تو پھر یہ حال ہوگا، یوصٰی مقدر سے، اس لئے کہ جب کہا گیا یوصٰی تو معلوم ہوا کہ یہاں موصی بھی ہے۔

من بعد وصية : یہ متعلق ہے ماقبل موروریت کے تقسیم سے۔

ان الرجل لیعمل : یعنی اللہ کی عبادۃ کرتے ہیں علم و عمل کے ساتھ۔ **والمرأة بطاعة الله ستين سنة** : یعنی مثال کے طور پر یا مراد تکثیر اور زیادتی بتلانا ہے۔ **ثم یحضرهما الموت** : یعنی موت کے علامات۔

فیغاران فی الوصیت : یہ مفارۃ سے ہے یعنی وارث کو نقصان پہنچاتے ہیں، کہ وہ اپنے مال میں تہائی سے زیادہ کی وصیت کسی غیر شخص کے حق میں کر جاتے ہیں، یا اپنا سارا مال کسی ایک وارث کو ہبہ کر دیتے ہیں۔ تا کہ دوسرے وارثوں کو کچھ نہ ملے۔ تو یہ مکروہ اور ناجائز ہے اور اللہ کے حکم سے روگردانی ہے۔ اس کو ابن الملکؒ نے ذکر کیا ہے۔

اس میں یہ ہے کہ ان دونوں وجھوں سے تو کسی کو بھی ضرر اور نقصان نہیں ہوتا؟ تو اس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے، کہ مطلب یہ ہے کہ ضرر اور نقصان کا ارادہ کرتے ہیں۔ اور بعض نے اس کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ وہ وصیت کر جاتا ہے اس شخص کیلئے جو وصیت کا اہل نہ ہو یا وصیت کر جاتا ہے جس چیز کی وصیت اس پر لازم تھی اس کے نافذ نہ کرنے کی اس طور پر کہ وہ پشیمان ہو جائے وصیت پر۔ یا بعض وصیت کو توڑ دے۔

فستجب لهما النار : مطلب یہ ہے کہ وہ سزاء کے مستحق ہو جاتے ہیں، لیکن وہ مشیت کے تحت ہوتے ہیں۔ ﴿**مم بعد وصية يوصٰى بها او دين غير مفار**﴾ یعنی اپنے ورثاء کو تکلیف اور نقصان پہنچانے والا نہ ہو، وصیت کرنے کے سبب سے۔ **الا قوله** : ﴿**و ذلك الفوز العظيم**﴾ یعنی اللہ کی طرف سے وصیت ہے اور جاننے وال بردبار ہیں۔ یہ اللہ کے مرر کئے ہوئے حدود ہیں اور جس نے اطاعت کی اللہ اور اس کے رسول کی، تو اس کو داخل کر دے گا ایسے باغات میں جن کے درمیان میں نہریں جاری ہیں، ہمیشہ کیلئے اس میں رہیں گے۔ آیت کے آخر تک استشہاد تو صرف پہلے والی آیت سے ہے اور دوسری آیت پہلے والی کیلئے بطور تاکید کے پڑھی۔ اور اس طرح اس کے بعد تیسری آیت آیات میں سے۔ گویا کہ دوسری آیت کو کافی سمجھا تیسری کے پڑھنے سے۔

الفصل الثالث:

۳۰۷۶: عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ مَاتَ عَلٰى وَصِيَّةٍ مَاتَ عَلٰى سَبِيْلٍ وَسُنَّةٍ وَمَاتَ عَلٰى تُقًى وَشَهَادَةٍ وَمَاتَ مَغْفُوْرًا لَّهٗ. (رواه ابن ماجة)

اخرجه ابن ماجه في السنن ۲/ ۹۰۲ الحديث رقم ۲۷۰۱

ترجمہ: ''حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص وصیت کر کے مرا (یعنی جس شخص نے اپنی موت کے وقت اپنے مال کا کچھ حصہ اللہ کی راہ میں مثلاً فقراء کو دینے کی وصیت کی) تو وہ سیدھے راستہ اور پسندیدہ طریقہ پر مرا اور پرہیز گاری اور شہادت پر مرا (یعنی متقیوں اور شہیدوں میں شامل ہوا) اور اس حال میں مرا کہ اس کی بخشش کی گئی''۔ (ابن ماجہ)

تشریح: **و سنة** : علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ تنوین تکثیر کیلئے ہے۔ اور چونکہ یہ ماقبل کیلئے تفسیر ہے اسلئے جارہ کا اعادہ نہیں کیا۔

تقى : تاء کے ضمہ اور تنوین کے ساتھ **هُدیً** کے وزن پر ہے۔

مات على سبيل : یعنی راہ مستقیم اور مضبوط دلیل پر۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ سبیل یعنی راستے کو مبہم رکھا، تا کہ یہ عظیم المرتبت پر بلیغ طریقے سے دلالت کرے۔ یعنی راہ پر اور کس عظیم راہ۔ پھر اس قول سے اس کی تفسیر کی ''**و سنة**''، یعنی پسندیدہ طریقے پر، سنت حسنہ پر۔

ومات على تقى : یعنی اللہ سے ڈر پر طاعات پر عمل کرنے اور معاصی سے اجتناب کے ساتھ، اس میں اشارہ ہے حسن خاتمہ کی طرف علم و عمل کے اعتبار سے۔

وشهادة : یعنی شہادت حکمی پر، یا اللہ کے حضور میں شہید ہے اور اس کے علاوہ سے شہادۃ چھپی ہوئی ہے۔

ومات مغفورا له : علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ یہاں موت کو مکرر ذکر کیا ہے، اور اس کا اعادہ کیا ہے تا کہ یہ صفت تقویٰ اور شہادۃ کے استقلال پر دلالت کرے، پھر اس کے بعد تیسرے مرتبہ غفران کی صفت ذکر کی ہے، یہ بطور ترقی ہے اس لئے کہ غفران یعنی مغفرت اور بخشش انتہائی مطلوب اور مقصود ہے۔ اس لئے تو اللہ نے اپنے رسول کو تمام نعمت سے پہلے استغفار کا حکم دیا اس قول میں: ﴿**اذا جاء نصر الله و الفتح**﴾ اور قرینہ ثانیہ میں اعادہ جار نہیں کیا، اس لئے کہ سابقہ حالات وہ ہیئات ہیں جو بندہ سے صادر ہوتے ہیں، اور آخری وہ ہیئت ہے جو اللہ تعالیٰ سے صادر ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے دونوں میں فرق کا۔

۳۰۷۷: وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ الْعَاصَ بْنَ وَائِلٍ اَوْصٰى اَنْ يُّعْتَقَ عَنْهُ مِائَةُ رَقَبَةٍ فَاَعْتَقَ ابْنُهٗ هِشَامٌ خَمْسِيْنَ رَقَبَةً فَاَرَادَ ابْنُهٗ عَمْرٌو اَنْ يُّعْتِقَ عَنْهُ الْخَمْسِيْنَ الْبَاقِيَةَ فَقَالَ حَتّٰى اَسْاَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَاَتَى النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اَبِيْ اَوْصٰى اَنْ يُّعْتَقَ عَنْهُ مِائَةُ رَقَبَةٍ وَاِنَّ هِشَامًا اَعْتَقَ عَنْهُ خَمْسِيْنَ وَبَقِيَتْ عَلَيْهِ خَمْسُوْنَ رَقَبَةً اَفَاُعْتِقُ عَنْهُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّهٗ لَوْ كَانَ مُسْلِمًا فَاَعْتَقْتُمْ عَنْهُ اَوْ تَصَدَّقْتُمْ عَنْهُ اَوْحَجَجْتُمْ عَنْهُ بَلَغَهٗ ذٰلِكَ. (رواه ابوداود)

اخرجه ابوداؤدفی السنن ۳/۳۰۲ الحدیث رقم ۲۷۰۱۔

ترجمه: ''اورحضرت عمرو بن شعیب اپنے والد (حضرت شعیب) سے اور شعیب اپنے دادا (حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ) سے نقل کرتے ہیں کہ عاص بن وائل نے یہ وصیت کی تھی کہ میری طرف سے سوغلام آزاد کئے جائیں۔ چنانچہ پچاس غلام تو ان کے بیٹے ہشامؓ نے آزاد کر دیئے پھر جب ان کے (دوسرے) بیٹے عمروؓ نے یہ ارادہ کیا کہ باقی پچاس غلام آزاد کرنے کا ارادہ کیا تو یہ کہا کہ میں اس وقت تک ان غلاموں کو آزاد نہیں کروں گا یہاں تک کہ میں رسول اللہ ﷺ سے دریافت نہ کرلوں (کہ آیا یہ پچاس غلام اس وقت آزاد کرنا جائز اور مفید بھی ہے یا نہیں؟) چنانچہ عمروؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ''یا رسول اللہ! میرے باپ (عاص) نے یہ وصیت کی تھی کہ ان کی طرف سے سوغلام آزاد کئے جائیں۔ لہٰذا ہشامؓ نے پچاس غلام تو آزاد کر دیئے ہیں ان پر (یعنی ہشامؓ ہی کے ذمہ یا میرے ذمہ) پچاس غلام باقی رہ گئے ہیں۔ تو کیا میں اپنے باپ کی طرف سے (وہ باقی پچاس غلام آزاد کردوں؟) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''وہ (تمہارے والد عاص) اگر مسلمان ہوتے اور تم ان کی طرف سے غلام آزاد کرتے یا ان کی طرف سے صدقہ دیتے یا ان کی طرف سے حج کی ادائیگی کرتے تو ان کو اس کا ثواب پہنچتا''۔ (ابوداؤد)

تشریح: اوصی بان یعتق عنه مائة رقبة : صیغہ مجہول کے ساتھ ہے، یعنی اس کے ورثاء اس کی طرف سے آزاد کرے، اس کے وفات کے بعد، سوغلام۔ یا باندھیاں۔

فقال : یعنی اپنے دل میں یا اپنے بھائی سے یا اپنے ساتھیوں سے۔ **حتی** : یعنی میں آزاد نہیں کرتا، یہاں تک کہ۔

أسال رسول الله ﷺ : یعنی اس بارے میں کہ اس کی طرف سے آزاد کرنا جائز ہے یا نہیں۔

خمسین : یعنی غلام، جیسے کہ ایک نسخہ میں ہے۔ **وبقیت علیه** : یعنی اس کے وصیت پر۔

فقال رسول الله ﷺ انه : یعنی نہیں، دلیل سے مدلول پر اکتفاء کیا، یعنی اس دلیل سے کہ ''**لو کان مسلما فأعتقتم عنه**''. یعنی اے ورثاء یا اے مؤمنوں! پس مفرد سے جمع کی طرف عدول کیا افادہ عموم کیلئے۔

أو تصدقتم عنه، او حججتم عنه، بلغه ذلك : لیکن جب وہ مسلمان نہیں ہوئے تو اس کا ثواب اس کو نہیں پہنچ سکتا شرائط کے نہ ہونے کے اور وہ شرط اسلام ہے۔ لیکن آزاد کرنے کا ثواب آزاد کرنے والے کی طرف لوٹتا ہے، اگر وہ مسلمان ہو، اور یہی نکتہ باعث بنا کہ آپ ﷺ نے جواب میں ''لا'' یعنی نہیں نہیں فرمایا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

۳۰۷۸: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ قَطَعَ مِيْرَاثَ وَارِثِهٖ قَطَعَ اللّٰهُ مِيْرَاثَهٗ مِنَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (رواه ابن ماجة)

اخرجه ابن ماجه فی السنن ۲/۹۰۲ الحدیث رقم ۲۷۰۳۔

ترجمه: ''اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے اپنے وارث کی میراث کاٹی تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی جنت کی میراث کاٹے گا۔ (ابن ماجہ)

تشریح: میراث : امام راغب فرماتے ہیں، کہ وراثت کہتے ہیں تیرے ملکیت کی طرف اونٹنی یا بکری کا منتقل کرنا غیر کے ملکیت سے بغیر عقد، اور جو اس کے قائم مقام ہو۔ اور اسی کے ساتھ میت سے منتقل ہونے والے مال کا نام رکھا گیا ہے اور جس شخص کو بغیر کسی تھکاوٹ ومحنت کے کوئی چیز حاصل ہو جائے تو کہا جاتا ہے ورث کذا۔ اور جس شخص کو کوئی چیز مفت میں عطاء کی جائے تو اس کے بارے میں کہا جاتا ہے، اورث۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿تلك الجنة التی اورثموها﴾.

من قطع میراث وارثه قطع الله میراثه من الجنة یوم القیامة : علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، کہ قیامت کی تخصیص اور اس کے جنت کی میراث کو کاٹنے کی تخصیص زیادہ نقصان اور خسارے پر دلالت کرنے کے لئے ہے، اور وجہ مناسبت یہ ہے کہ جیسا کہ وارث نے انتظار کیا مورث سے میراث کے وصول ہونے کا عافیت اور آخر میں تو اس نے اس کے میراث کو کاٹ ڈالا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اس کے مال اور کامیابی تک پہنچنے کے وقت محروم کردے گا۔ (انتہیٰ)

۳۰۷۹ :وَرَوَاهُ الْبَیْهَقِیُّ فِیْ شُعْبِ الْاِیْمَانِ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ ۔

ترجمہ: اور بیہقی نے اس روایت کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے"۔

❀ ❀ ❀

www.KitaboSunnat.com